سیرت رسول امین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

واقعات کا تجزیاتی اور معروضی مطالعہ

اسباق ودروس اور حکمتوں کی روشنی میں

تالیف

ڈاکٹر علی محمد صلابی

مترجم

ڈاکٹر عنایت اللہ وانی ندوی

دار الأصالة

ناشر

دار الاصالہ للنشر والتوزیع، استانبول، ترکی

سیرت رسول امین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

واقعات کا تجزیاتی اور معروضی مطالعہ

اسباق ودروس اور حکمتوں کی روشنی میں

تالیف

ڈاکٹر علی محمد صلابی

مترجم

ڈاکٹر عنایت اللہ وانی ندوی

ناشر

دار الأصالة للنشر والتوزيع، استانبول، ترکی

تفصیلات کتاب

نام کتاب (عربی): السيرة النبوية

عرض وقائع وتحليل أحداث، دروس وعبر

نام کتاب اردو: سیرت رسول امین ﷺ

واقعات کا تجزیاتی اور معروضی مطالعہ

اسباق ودروس اور حکمتوں کی روشنی میں

مؤلف: ڈاکٹر علی محمد صلابی

مترجم: ڈاکٹر عنایت اللہ وانی ندوی

ناشر: دارالأصالۃ للنشر والتوزیع، استانبول، ترکی

رقم الإصدار: 101

ترقيم الدولي:

ISBN: 978-625-6250-09-3

فہرست مضامین

عناوین فصول	عناوین ابواب	صفحہ
عرض مترجم		30
مقدمہ مصنف		32
پہلی فصل بعثت سے پہلے سے لے کر وحی کے نزول تک کے اہم تاریخی واقعات		42
	پہلا باب بعثت سے پہلے کی تہذیبیں اور ان کے مذاہب	43
	۱: رومی سلطنت	43
	۲: ایرانی سلطنت	44
	۳: ہندوستان	44
	دوسرا باب بعثت محمدی سے پہلے دنیا کی صورتحال	46
	۱: عربوں کی اصل اور ان کی تہذیب	49
	۲: جزیرۃ العرب کی تہذیبیں اور تمدن	51
	تیسرا باب عربوں کے مذہبی، سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور اخلاقی حالات	54
	۱: مذہبی اور دینی حالات	54
	۲: سیاسی صورتحال	56
	۳: معاشی اور اقتصادی صورتحال	58
	۴: معاشرتی اور سماجی حالات	60

66	۵: اخلاقی حالات	
73	چوتھا باب حبیب مصطفی ﷺ کی ولادت باسعادت سے پہلے کہ اہم واقعات	
73	ا: زمزم کا کنواں کھودنے کا واقعہ	
75	۲: اصحاب فیل کا واقعہ	
78	واقعۂ فیل سے حاصل شدہ اسباق و دروس اور فوائد	
83	پانچواں باب نبی کریم ﷺ کی ولادت باسعادت سے حلف الفضول تک	
83	ا: نبی کریم کا نسب و خاندان	
85	۲: عبداللہ بن عبدالمطلب کا آمنہ بنت وہب کے ساتھ نکاح	
86	۳: حبیب مصطفی کی ولادت باسعادت	
88 92	۴: آپ کی رضاعی مائیں ➢ اسباق و دروس	
94	۵: آپ کی والدہ کی وفات اور دادا اور پھر چچا کی کفالت	
96	۶: آپ کا بکریاں چرانا	
99	۷: بعثت سے پہلے نبی کے لیے حفاظتی انتظامات	
100	۸: بچپن میں بحیرہ راہب کی رسول اللہ سے ملاقات	
102	۹: جنگ فجار	
102	۱۰: حلف الفضول	
104	➢ اسباق و دروس اور فوائد	
106	چھٹا باب	

	حضرت خدیجہؓ کے لئے تجارت اور ان سے نکاح اور بعثت تک کے اہم واقعات	
106 107	۱: حضرت خدیجہؓ کے لئے تجارت اور ان سے نکاح ➢ دروس واسباق اور فوائد	
109 111	۲: آپؐ کی خانہ کعبہ کی تعمیر میں شرکت ➢ اسباق ودروس اور فوائد	
112	۳: نبوت محمدی کے استقبال کے لئے لوگوں کو آمادہ اور تیار کرنا	
119		دوسری فصل وحی کا نزول اور خفیہ دعوت
120	پہلا باب سید الخلق ﷺ پر وحی کا نزول	
121	۱: سچے خواب	
122	۲: خلوت نشینی اور غار حرا میں عبادت ومراقبہ	
123	۳: غار حرا میں حق کا منکشف ہونا	
125	۴: نزول وحی کے وقت مشقت اور وحی کی کیفیت	
128	۵: وحی کی اقسام	
130	۶: دعوتی میدان میں نیک عورت کا کردار	
134	۷: نبی کریم ﷺ کی حضرت خدیجہؓ کے ساتھ وفاداری	
135	۸: رسولوں کی تکذیب کی سنت	
136	۹: "فترۃ وحی" انقطاع وحی کا زمانہ	
137	دوسرا باب رازداری اور خفیہ دعوت	

	۱: تبلیغِ رسالت کا حکمِ الٰہی	137
	۲: خفیہ دعوت کا آغاز	138
	۳: نبی کریم ﷺ کا دعوت میں استمرار و تسلسل	148
	۴: تربیت حاصل کرنے والی پہلی جماعت کی اہم خصوصیات	152
	۵: نبی کریم ﷺ کی شخصیت اور قائدین بنانے میں اس کا اثر و کردار	155
	۶: دار ارقم کا نصاب تعلیم و تربیت	156
	۷: دار ارقم کے انتخاب کے اسباب	157
	۸: پہلی جماعت کی صفات	158
	۹: ذیلی قبائل قریش میں دعوت کا پھیلاؤ اور دعوت کی بین الاقوامی حیثیت	161
	تیسرا باب مکی دور میں عقیدہ کی تعمیر	163
	۱: قوانین الٰہیہ کے بارے میں نبی کریم ﷺ کا تفقہ	163
	۲: انقلاب و تبدیلی کا ضابطہ اور عقیدہ کی تعمیر کے ساتھ اس کا تعلق	167
	۳: عقیدہ کے اعتبار سے صحابہ کرامؓ کی اصلاح و تصحیح	168
	۴: قرآن کریم میں جنت کا ذکر اور صحابہ کرام پر اس کے اثرات	176
	۵: قرآن کریم میں جہنم کی منظر کشی اور صحابہ کرام پر اس کے اثرات	188
	۶: قضاو قدر کا مفہوم اور صحابہ کرام کی تربیت میں اس کا اثر	198
	۷: انسان کی حقیقت کے بارے میں صحابہ کی آگاہی	200
	۸: آدمؑ اور شیطان کے واقعہ کے بارے میں صحابہ کرام کا تصور	205
	۹: کائنات، زندگی اور بعض مخلوقات کے بارے میں صحابہ کرام کا نقطہ نظر	214

221	چوتھا باب عہد مکی میں عبادت و اخلاق کی تعمیر	
221	۱: مختلف عبادات کے ذریعہ صحابہ کرام کا تزکیہ	
230	۲: عقل کا تزکیہ	
233	۳: جسمانی تربیت	
236	۴: صحابہ کرام کی اخلاقی تربیت	
245	۵: قرآنی واقعات کے ذریعہ مکارم اخلاق کی تربیت	
251		تیسری فصل دعوت کا اعلان اور مشرکین کے نت نئے حربے
252	پہلا باب اعلانِ دعوت	
255	مشرکین کے اہم اعتراضات	
255	۱: شرک باللہ	
257	۲: آخرت کا انکار	
260	۳: رسول ﷺ کے بارے میں مشرکین کے اعتراضات	
262	۴: قرآن کریم کے بارے میں ان کا موقف	
265	۵: عہد مکی میں دعوت کے انکار کے محرکات	
270	دوسرا باب ابتلاو آزمائش کا قانون اور اس کی حکمتیں	
275	تیسرا باب دعوت کے مقابلہ میں مشرکین کے اسالیب	

	۱: نصرت وحمایت سے حضرت ابو طالب کو دور رکھنے کی کوشش	275
	۲: دعوت کی شبیہ بگاڑنے کی کوشش	279
	۳: اللہ کے رسول ؐ کو پہنچنے والی ایذا اور تکلیف	291
	۴: صحابہ کرام کو پہنچنے والی ایذا اور تکلیف	295
	۵: مکہ مکرمہ میں قتال سے اجتناب اور داخلی تربیت پر توجہ دینے کی حکمت	314
	۶: صحابہ کرام کی نفسیاتی کیفیت کو بلند کرنے میں قرآن کا اثر	321
	۷: مذاکرات اور ڈائیلاگ کا اسلوب	325
	۸: بحث ومباحثہ کا اسلوب اور بے بس کرنے کی کوشش	331
	۹: مکی دور میں یہود کا کردار اور مشرکین کی ان سے استعانت	337
	۱۰: اقتصادی اور معاشرتی بائکاٹ اور محاصرہ	345
	➢ دروس واسباق	348
چوتھی فصل ہجرت حبشہ، طائف کی آزمائش اور اسراو معراج کا تمغہ		354
	پہلا باب اسباب اختیار کرنے کے ضابطہ کے بارے میں نبی کریم ﷺ کا طرزِ عمل	355
	اللہ پر توکل اور اسباب اختیار کرنے کے مابین تطبیق	357
	دوسرا باب ہجرتِ حبشہ	360
	۱: سرزمینِ حبشہ کی جانب پہلی ہجرت	361
	۲: ہجرت اولی کے بعد مکہ واپس آنے کے اسباب	367

372	۳: حبشہ کی جانب دوبارہ ہجرت	
376	➢ اسباق ودروس اور فوائد	
387	تیسرا باب عام الحزن اور طائف کی آزمائش	
387	ا: عام الحزن (غم کا سال)	
388	۲: طائف کا سفر	
405	چوتھا باب اسرا و معراج اور عزت و تکریم کا تاج	
406	ا: اسرا و معراج کا واقعہ احادیث کی روشنی میں	
410	➢ ۲: اسباق ودروس اور فوائد و عبرتیں	
420		پانچویں فصل قبائل کو دعوت اور مدینہ کی جانب ہجرت صحابہ
421	پہلا باب قبائل سے ملاقات	
422	ا: سازشوں کا توڑ کرنے میں نبی کریمؐ کی حکمتِ عملی	
423	۲: بنو عامر کے ساتھ مذاکرات	
424	۳: بنو شیبان کے ساتھ مذاکرات	
426	➢ ۳: دروس واسباق اور فوائد	
428	دوسرا باب خیر کے قافلے اور نور کے کرنیں	
428	ا: حج اور عمرہ کے دوران انصار سے پہلا رابطہ	
429	۲: انصار کے اسلام کا آغاز	
431	۳: بیعتِ عقبۂ اولیٰ	

	۴: اسید بن حضیرؓ اور سعد بن معاذؓ کے قبولِ اسلام کا واقعہ	432
	➢ ۵: دروس واسباق اور فوائد وعبرتیں	435
	تیسرا باب بیعت عقبہ ثانیہ	438
	➢ دروس واسباق اور فوائد وعبرتیں	440
	چوتھا باب مدینہ منورہ کی جانب ہجرت	446
	۱: ہجرت کی تمہید اور اس کی تیاری	446
	۲: سورۃ العنکبوت کی غور طلب بعض آیات	447
	۳: مہاجرین کے ہراول دستے	449
	۴: ہجرت سے روکنے کے لئے قریش کے حربے اور ہجرت کے چند مناظر	451
	۵: پناہ دینے والے گھرانے اور دلوں میں اس کے اثرات	458
	۶: مدینہ منورہ کو دارالخلافہ منتخب کرنے کی وجہ	462
	۷: مدینہ منورہ کے چند فضائل	463
چھٹی فصل نبی کریمؐ اور صدیق اکبرؓ کی ہجرت		468
	پہلا باب مشرکین کے منصوبہ کی ناکامی اور ہجرت کے لئے عظیم نبوی منصوبہ بندی	469
	۱: نبی کریم ﷺ کو شہید کرنے کے منصوبے کی ناکامی	469
	۲: ہجرت کے لئے نبوی ترتیب	470
	۳: رسول ﷺ کی گھر سے روانگی اور غار تک کا سفر	472

472	۴: مکہ سے نکلتے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا	
473	۵: اللہ تعالیٰ کی عنایت ورعایت	
475	۶: سفرِ ہجرت میں حضرت ام معبد کا خیمہ	
477	۷: سراقہ رسول اللہ کا پیچھا کرتا ہے	
479	۸: مقلب القلوب ذات پاک وبرتر ہے	
479	۹: انصار کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا استقبال	
481	➢ ۱۰: دروس واسباق اور فوائد وعبرتیں	
499	دوسرا باب مہاجرین کی تعریف وتوصیف،ان کے لئے وعدے اور پیچھے رہنے والوں کے لئے وعید	
500	۱: مہاجرین کی تعریف وتوصیف	
506	۲: مہاجرین کے لئے وعدے	
511	۳: ہجرت نہ کرنے والوں کے لئے وعید	
514		ساتویں فصل مدینہ میں اسلامی حکومت کے بنیادی ستون
515	پہلا باب پہلا ستون: مدینہ میں عظیم نبوی مسجد کی تعمیر	
516	۱: مسجد کے تابع حجرات	
517	۲: مدینہ منورہ میں اذان	
518	۳: مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پہلا خطبہ	
518	۴: مسجد نبوی کے تابع صفہ	

524	➢ ۵: دروس واسباق اور عبرت ونصائح	
534	دوسرا باب مہاجرین وانصار کے مابین مؤاخات	
536	ا: مدینہ میں مؤاخات	
538	➢ ۲: دروس واسباق اور فوائد وعبرتیں	
551	تیسرا باب میثاق مدینہ	
551	ا: مہاجرین وانصار اور یہود کے مابین معاہدہ	
556	۲: میثاق مدینہ سے مستفاد دروس واسباق اور فوائد	
565	۳: مدینہ میں یہود کا موقف اور سازشیں	
589	۴: مفسدین کا عمل ناقابل اصلاح	
592	چوتھا باب باطل طاقتوں کی سرکوبی کا قانون اور جہادی تحریک	
592	ا: باطل طاقتوں کی سرکوبی کا قانون	
599	۲: جہاد فی سبیل اللہ کے اہداف ومقاصد	
608	۳: غزوہ بدر سے قبل کے اہم سرایا اور عسکری مشن	
613	۴: اسباق ودروس اور فوائد	
625	پانچواں باب تربیتی اور علمی عمل میں استمرار وتسلسل	
627	ا: اہم تربیتی اصولِ تعلیم وتربیت	
635	۲: علم حاصل کرتے وقت صحابہ کرام کا طرزِ عمل	

	چھٹا باب نئی صورتحال اور تشریع و قانون سازی	640
	۱: اقتصادی بحران کا علاج	640
	۲: بعض تشریعات واحکام	645
آٹھویں فصل غزوۂ بدر		653
	پہلا باب معرکہ سے پہلے کا مرحلہ	654
	۱: بدر کی جانب دوران سفر کے بعض واقعات	655
	۲: بدر میں مسلمانوں کے ساتھ مڈ بھیڑ کا عزم	656
	۳: نبی کریمؐ کی صحابہ کرام کے ساتھ مشاورت	657
	۴: دشمن کی طرف کوچ اور معلومات جمع کرنا	659
	۵: حضرت حباب بن منذرؓ سے مشورہ	661
	۶: مشرکین کے کوچ کرنے کی قرآنی منظر کشی	662
	۷: بدر پہنچ کر مشرکین کی صورتحال	663
	۸: جائے وقوع کی قرآنی منظر کشی	666
	دوسرا باب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہلِ ایمان معرکہ کارزار میں	667
	۱: مرکز قیادت کی تعمیر	667
	۲: معرکہ سے پہلے مسلمانوں پر اللہ کے انعامات	667
	تیسرا باب معرکہ آرائی اور مشرکین کی شکست	677

678	۱: فرشتوں کے ذریعہ مسلمانوں کی مدد	
681	۲: اہل ایمان کی فتح اور اہلِ قلیب کا انجام	
684	چوتھا باب معرکہ کے چند اہم مناظر اور واقعات	
684	۱: سرغنوں کا قتل	
690	۲: عظمت وعزیمت کے چند مناظر	
693	پانچواں باب مالِ غنیمت اور قیدیوں کے بارے میں اختلاف	
693	۱: مالِ غنیمت کے بارے میں اختلاف	
697	۲: قیدی	
708	چھٹا باب غزوۂ بدر کے نتائج اور نبی کریمؐ کو شہید کرنے کی کوشش	
708	۱: غزوہ بدر کے نتائج	
711	۲: نبی کریم ﷺ کو شہید کرنے کی کوشش	
714	ساتواں باب غزوۂ بدر سے مستفاد بعض اسباق ودروس اور فوائد	
714	۱: حقیقی نصرت ومدد اللہ کی طرف سے	
715	۲: یوم الفرقان	
717	۳: ولاء اور براء ایک ایمانی تقاضا	
720	۴: غزوہ بدر کے موقع پر ظہور پذیر ہونے والے معجزات	
723	۵: مشرک سے استعانت کا حکم	
724	۶: حذیفہ بن یمان اور اسید بن حضیر	

725	۷: بدر میں میڈیا کی جنگ	
727	آٹھواں باب غزوۂ بدر اور احد کے مابین کے واقعات	
727	۱: بدر و احد کے مابین کے غزوات	
730	۲: غزوہ بنو قینقاع	
736	۳: اسلامی ریاست کے خلاف اکسانے والوں کا تصفیہ اور کعب بن اشرف کا قتل	
745	۴: بعض سماجی واقعات	
748		نویں فصل غزوۂ احد
749	پہلا باب معرکہ سے پہلے کے واقعات	
749	۱: غزوہ کے اسباب	
751	۲: قریش کا مکہ سے مدینہ کی جانب کوچ	
752	۳: نبوی انٹیلیجنس کی دشمن کی نقل و حرکت پر مسلسل نظر	
753	۴: صحابہ کرامؓ کے ساتھ مشاورت	
756	۵: احد کی جانب مسلم فوج کی روانگی	
761	۶: کفار مکہ کے مقابلہ میں رسول اللہ کا منصوبہ اور حکمت عملی	
763	دوسرا باب میدانِ کارزار کے مناظر	
763	۱: جنگ کا آغاز، گھمسان کی لڑائی اور مسلمانوں کی فتح کا آغاز	
765	۲: تیر اندازوں کی خطرناک غلطی	
768	۳: منتشر لشکر کو متحد کرنے کے لئے رسول اللہ ﷺ کا منصوبہ	

770	۴: شہدائے احد	
785	۵: نبوت کے بعض دلائل	
787	تیسرا باب معرکہ کے بعد کے واقعات	
787	۱: رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کے ساتھ ابوسفیان کی گفتگو	
788	۲: رسول اللہ کا شہداء کو تلاش کرنا	
789	۳: احد کے دن رسول اللہ ﷺ کی دعا	
790	۴: دشمن کی سمت کا علم	
791	۵: غزوۂ حمراء الاسد	
795	۶: معرکہ احد میں مسلم خواتین کی شرکت	
798	۷: صحابیات کے صبر استقامت میں دروس واسباق	
801	چوتھا باب غزوۂ احد؛ بعض دروس واسباق اور فوائد وعبرتیں	
801	۱: قوانین الہیہ کے بارے میں تذکیر اور ایمانی اعتبار سے بلند ہونے کی دعوت	
802	۲: اہلِ ایمان کو تسلی اور حکمتوں کی وضاحت	
803	۳: غلطیوں کا علاج کرنے کا طریقہ	
804	۴: سابقہ مجاہدین کی مثال اور نمونہ	
804	۵: امیر کی مخالفت ناکامی کا سبب	
807	۶: دنیا کو ترجیح دینے کے نقصانات	
808	۷: دین کے ساتھ ربط و تعلق	
810	۸: تیر اندازوں اور منافقین کے ساتھ نبی کریم ﷺ کا معاملہ	

812	۹: جبل احد سے محبت	
813	۱۰: احد میں فرشتے	
814	۱۱: نصرت وہزیمت کے قوانین	
816	۱۲: شہداء کی فضیلت اور انعام واکرام	
819		دسویں فصل غزوۂ احد اور خندق کے مابین کے اہم واقعات
820	پہلا باب اسلامی ریاست کو متزلزل کرنے کے لئے مشرکین کی کوششیں	
820	۱: اسلامی ریاست کے بارے میں بنو اسد کا لالچ	
821	۲: عبداللہ بن انیس بمقابلہ خالد بن سفیان ہذلی	
824	۳: قبیلہ عضل اور قارہ کی غداری اور واقعہ رُجیع	
837	دوسرا باب اُم المساکینؓ اور اُم سلمہؓ کے ساتھ نبی کریم ﷺ کا نکاح اور متفرق واقعات	
837	۱: اُم المساکین حضرت زینب بنت خزیمہؓ	
837	۲: اُم سلمہؓ کے ساتھ نبی کریم ﷺ کا نکاح	
841	۳: حسن بن علیؓ کی ولادت	
842	۴: حضرت زید بن ثابتؓ کا یہود کی زبان سیکھنا	
843	تیسرا باب یہودِ بنو نضیر کی جلاوطنی	
843	۱: غزوۂ بنی نضیر کی تاریخ اور اس کے اسباب	
845	۲: بنو نضیر کو جلاوطنی کی آگاہی اور ان کا محاصرہ	

	➢ ۳: اس غزوہ سے متعلق اسباق ودروس اور عبرتیں	847
	چوتھا باب غزوۂ ذات الرقاع	859
	۱: تاریخ، اسباب اور وجہِ تسمیہ	859
	۲: صلاۃ الخوف اور سرحدوں کی حفاظت	861
	۳: رسول ﷺ کی شجاعت اور حضرت جابرؓ کے ساتھ آپ ؐ کا معاملہ	863
	پانچواں باب غزوۂ بدر دوم اور غزوۂ دومۃ الجندل	867
	۱: غزوۂ بدر دوم	867
	۲: غزوۂ دومۃ الجندل	868
	چھٹا باب غزوۂ بنی المصطلق	872
	۱: بنو المصطلق کون ہیں؟ یہ غزوہ کب پیش آیا؟ اور اس کے اسباب کیا ہیں؟	872
	۲: حضرت جویریہ بنت حارث کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا نکاح	874
	۳: منافقین کے ذریعہ مہاجرین وانصار کے مابین فتنہ پروری کی کوشش	876
	۴: غزوۂ بنی المصطلق کے بعد مسلم معاشرہ کے لئے قرآنی تعلیمات	881
	۵: منافقین کے ذریعہ نبی کریم ؐ کی عزت پر حملہ	883
	۶: واقعۂ اُفک سے متعلق آیات سے مأخوذ اہم آداب واحکام	888
	➢ ۷: واقعۂ اُفک اور غزوۂ بنی المصطلق سے مستفاد دروس واسباق	892
گیارھویں فصل غزوۂ اُحزاب (5ھ)		897

898	پہلا باب غزوہ کی تاریخ، اسباب اور واقعات	
898	۱: غزوہ کی تاریخ اور اسباب	
899	۲: احزاب پر مسلمانوں کی نظر	
901	۳: داخلی محاذ کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اہتمام	
904	دوسرا باب مسلمانوں کی آزمائش میں شدّت	
904	۱: بنو قریظہ کی عہد شکنی اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش	
905	۲: محاصرہ کی شدت، منافقین کی علحیدگی اور افواہوں کا عام ہونا	
908	۳: قبیلۂ غطفان کے ساتھ صلح کا معاہدہ اور دشمنوں کی صفوں میں افواہیں پھیلانے کا کام	
911	تیسرا باب اللہ کی نصرت اور غزوۂ احزاب کے بارے میں قرآنی منظر کشی	
911	۱: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تضرع اور دعا کا اہتمام اور نصرت کا نزول	
913	۲: لشکروں کی واپسی پر مسلسل نظر	
915	۳: غزوۂ احزاب اور اس کے نتائج کے بارے میں قرآنی منظر کشی	
917	۴: بنو قریظہ سے چھٹکارا اور ان کا محاسبہ	
920	چوتھا باب اسباق و دروس اور فوائد و عبرتیں	
920	۱: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حسّی معجزات	
922	۲: تصور اور واقع کے درمیان فرق	
922	۳: سلمانؓ ہم اہلِ بیت میں سے ہیں	

923	۴: صلاۃ وسطیٰ (درمیانی نماز)	
923	۵: حلال و حرام	
924	۶: رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی حضرت صفیہؓ کی شجاعت	
924	۷: حضرت حسانؓ کی بزدلی کے بارے میں ایک ضعیف روایت کی حقیقت	
925	۸: پہلا اسلامی فوجی ہسپتال	
925	۹: گناہ سرزد ہونے کے بعد فوری توبہ	
927	۱۰: حضرت سعد بن معاذؓ کے فضائل	
930	۱۱: حیی بن اُخطب اور کعب بن اُسد کا قتل	
932	۱۲: زبیر بن باطا اور رفاعہ بن سموءل کے بارے میں سفارش	
934	۱۳: اختلاف کے آداب	
935	۱۴: بنو قریظہ کے مالِ غنیمت کی تقسیم اور حضرت ریحانہ بنت عمرو کا قبولِ اسلام	
937	۱۵: غزوۂ احزاب میں اسلامی میڈیا	
939		بارہویں فصل غزوۂ احزاب اور صلح حدیبیہ کے مابین کے اہم واقعات
940	پہلا باب حضرت زینب بنت جحشؓ کے ساتھ نبی کریم ﷺ کا نکاح	
940	۱: نام اور نسب	
940	۲: حضرت زید بن حارثہؓ کے ساتھ آپؓ کا نکاح	
941	۳: حضرت زینبؓ کو زیدؓ کی طلاق	
942	۴: حضرت زینبؓ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے نکاح کرنے کی حکمت	

	۵: رسول اللہ ﷺ کے ساتھ زینبؓ کا نکاح اور اس میں موجود اسباق و دروس	945
	دوسرا باب دفاعی مرحلہ کے بعد اقدامی مرحلہ کا آغاز	951
	۱: بنوالقرطاء کی جانب سریہ محمد بن سلمہ	951
	۲: سیف البحر کی جانب سریہ اَبی عبیدہ بن الجراح	953
	۳: دومۃ الجندل کی جانب سریہ عبدالرحمن بن عوف	958
	۴: غداروں کے خلاف تادیبی کاروائی؛ غزوۂ بنی لحیان، غزوۃ الغابہ اور دیگر غزوات	961
	۵: قبیلۂ عرینہ کی جانب سریہ کُرز بن جابر الفہری	965
	تیسرا باب ریاست کے خلاف بغاوت پر ابھارنے والوں کا تصفیہ	968
	۱: سلام بن اَبی الحقیق کا قتل کرنے کے لئے سریہ عبداللہ بن عتیک	968
	۲: یُسیر بن رِزَام یہودی کی جانب سریہ عبداللہ بن رواحہؓ	972
تیرہویں فصل فتح مبین ”صلح حدیبیہ“		974
	پہلا باب تاریخ، اسباب اور مکہ کی جانب رسول اللہ ﷺ کا خروج	975
	۱: تاریخ و اسباب	975
	۲: نبی کریم ﷺ کا عُسفان پہنچنا	976
	۳: رسول اللہ ﷺ کا راستہ بدلنا اور حدیبیہ میں قیام کرنا	977
	۴: قصواء کا بیٹھ جانا	978
	۵: رسول اللہ ﷺ اور قریش کے مابین سفارت کاری	980

	۶: قریش کی جانب نبوی وفود اور مسلمانوں کے ذریعہ بعض گرفتاریاں	986
	۷: بیعتِ رضوان	989
	دوسرا باب صلح حدیبیہ اور اس پر مرتب ہونے والے واقعات	993
	۱: سہیل بن عمرو کی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بات چیت	993
	۲: ابو جندلؓ کا موقف اور ایفائے عہد	997
	۳: مخلصانہ اپوزیشن کا احترام	999
	۴: احرام کی پابندیوں سے حلال ہونا اور حضرت ام سلمہؓ کا مشورہ	1000
	۵: مدینہ کی جانب واپسی اور سورۃ الفتح کا نزول	1002
	۶: ابو بصیرؓ مدینہ منورہ میں اور آزاد اسلامی محاذ کی قیادت	1006
	۷: مہاجر خواتین کو واپس کرنے سے رسول اللہ ﷺ کا انکار	1009
	تیسرا باب غزوۂ حدیبیہ سے مستفاد دروس واسباق اور فوائد وعبرتیں	1011
	۱: عقیدہ سے متعلق احکام	1011
	۲: فقہی اور اصولی احکام	1013
	۳: نبوی تربیت کا ایک نمونہ	1017
چودہویں فصل حدیبیہ اور فتح مکہ کے مابین کے اہم واقعات		1019
	پہلا باب غزوۂ خیبر	1020
	۱: غزوۂ خیبر کی تاریخ اور اسباب	1020
	۲: خیبر کی جانب اسلامی لشکر کی روانگی	1021

1024	۳: خیبر کے قلعوں کا سقوط	
1025	۴: شہید اعرابی، سیاہ رنگ کے چرواہے کا واقعہ، اور ایک جانباز جہنم کی طرف	
1027	۵: حضرت جعفر بن ابی طالب اور دیگر صحابہ کی حبشہ سے واپسی	
1029	٦: اموالِ غنیمت کی تقسیم	
1031	۷: حضرت صفیہ بنت حیی بن اخطب کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا نکاح	
1033	۸: یہود کی ایک خطرناک کوشش: زہر آلود بکری	
1035	۹: حجاج بن علاط سلمی اور مکہ سے مال کی واپسی	
1037	۱۰: غزوۂ خیبر سے متعلق بعض فقہی احکام	
1041	دوسرا باب ملوک وامراء کو دعوت	
1041	۱: صلح حدیبیہ اسلام کی نشر واشاعت کے آغاز کا اعلان	
1045	۲: اسلامی سفیر کی صفات	
1047	۳: دروس واسباق اور فوائد وعبرتیں	
1053	تیسرا باب عمرۃ القضاء	
1053	۱: قریش کی جانب سے بد عہدی کے بارے میں احتیاطی تدابیر	
1054	۲: مکہ میں داخلہ، طواف اور سعی	
1056	۳: حضرت میمونہ بنت الحارثؓ کے ساتھ نکاح	
1056	۴: حضرت حمزہ بن عبد المطلب کی صاحبزادی کی مسلمان قافلہ میں شمولیت	
1059	۵: جزیرۃ العرب پر عمرۃ القضا کے اثرات اور اہم صحابہ کا قبولِ اسلام	

	چوتھا باب غزوۂ موتہ (سن 8ہجری)	1063
	۱: اسباب وتاریخ	1063
	۲: اسلامی لشکر کی روانگی	1065
	۳: مقام مَعان پر لشکر کا پہنچنا اور تینوں امراء کی شہادت	1065
	۴: حضرت خالد بن ولیدؓ بحیثیتِ سپہ سالار	1067
	۵: معجزۂ رسولؐ اور اسلامی لشکر کے بارے میں اہلِ مدینہ کا موقف	1068
	۶: دروس واسباق اور فوائد	1069
	پانچواں باب سریہ ذات السلاسل	1073
پندرھویں فصل غزوۂ فتح مکہ (8ھ)		1077
	پہلا باب فتح مکہ کے اسباب، تیاری اور آغاز	1078
	۱: اسباب	1078
	۲: روانگی کی تیاری	1080
	۳: روانگی کا آغاز اور راستے میں پیش آنے والے واقعات	1085
	دوسرا باب مکہ میں داخلہ اور فتح مکہ کا نبوی منصوبہ	1091
	۱: قائدین صحابہ کے مابین ذمہ داریوں کی تقسیم	1091
	۲: متکبر فاتح کے بجائے متواضع فاتح کا داخلہ	1093
	۳: عمومی معافی کا اعلان	1096

	۴: بنوجذیمہ کی جانب حضرت خالد بن ولیدؓ کی روانگی	1099
	۵: بت خانوں کا منہدم کرنا	1100
	تیسرا باب دروس واسباق اور عبرت وفوائد	1103
	۱: سورہ النصر اور رسول اللہ ﷺ کے لئے اس میں بعض علامتیں	1103
	۲: دعوتی موقف اور دوسروں کے ساتھ تعامل کی حکمتِ عملی	1104
	۳: حدود اللہ کے بارے میں سفارش اور رسول ﷺ کا ردّ عمل	1110
	۴: اے اُم ہانی! جس کو آپ نے پناہ دی ہم نے بھی اسے پناہ دی	1111
	۵: عبداللہ بن سعد بن اُبی السرح کا واقعہ	1111
	۶: انصار کے ساتھ رسول ﷺ کا اظہارِ ہمدردی	1112
	۷: شاعرِ قریش عبداللہ بن زبعری کا قبولِ اسلام	1112
	۸: بعض شرعی احکام اور مکہ میں رسولؐ کی جائے قیام	1113
	۹: فتح مکہ کے نتائج	1114
سولہویں فصل غزوۂ حنین وطائف (8ھ)		1116
	پہلا باب غزوہ کے اسباب اور معرکہ کے واقعات	1117
	۱: غزوۂ حنین کے اہم واقعات	1117
	۲: اُوطاس وطائف کی جانب بھاگنے والوں کا تعاقب	1121
	دوسرا باب لوگوں کے ساتھ تعامل میں رسول ﷺ کی حکمتِ عملی	1125

1133	تیسرا باب غزوۂ حنین سے مستفاد دروس واسباق اور عبرت وفوائد	
1133	۱: غزوۂ حنین کے بارے میں نازل شدہ آیات	
1134	۲: حُنین میں ہزیمت ونصرت کے اسباب وعوامل	
1135	۳: غزوۂ حنین وطائف سے مستنبط احکام	
1138	۴: بعض صحابہ اور صحابیات کے اہم مواقف	
1140	۵: کعبؓ بن زہیر شاعر کا قبولِ اسلام اور جزیرۃ العرب میں میڈیا پر کنٹرول	
1142	۶: غزوۂ حنین اور طائف کے نتائج واثرات	
1143	چوتھا باب غزوۂ حنین اور تبوک کے مابین کے اہم واقعات	
1143	۱: صدقات اور جزیہ کی وصولیابی کے لئے عمال کی تعیین	
1144	۲: اس مرحلہ کے اہم سرایا	
1145	۳: حضرت عدی بن حاتمؓ کا قبول اسلام	
1147	۴: سن آٹھ ہجری کے متفرق واقعات	
1149		سترہویں فصل غزوۂ تبوک (غزوۃ العسرہ)
1150	پہلا باب غزوہ کی تاریخ، اس کے مختلف نام اور اسباب	
1150	۱: اس غزوہ کی تاریخ اور اس کے مختلف نام	
1151	۲: غزوۂ تبوک کے اسباب	
1152	۳: اس غزوہ میں انفاق اور اہلِ ایمان کا شوقِ جہاد	
1156	۴: غزوۂ تبوک کے بارے میں منافقین کا موقف	

1158	۵: نفیرِ عام کا اعلان اور لشکر کی تیاری	
1161	دوسرا باب راستے کے واقعات اور تبوک پہنچنے تک کا سفر	
1161	ا: حضرت ابوذر غفاریؓ کا واقعہ	
1162	۲: حضرت ابو خیثمہؓ کا واقعہ	
1165	۳: تبوک میں آمد	
1166	۴: دیارِ ثمود سے گزرتے ہوئے رسول ﷺ کی ہدایات	
1167	۵: صحابیٔ رسولؐ حضرت عبداللہ ''ذوالبجادین'' کی وفات	
1168	۶: اس غزوہ میں ظہور پذیر بعض معجزات	
1171	۷: غزوۂ تبوک کے دوران منافقین کے بارے میں قرآن کریم کے بیانات	
1173	تیسرا باب تبوک سے مدینہ واپسی، غزوہ سے پیچھے رہنے والوں اور مسجد ضرار کے بارے میں قران کی تصریحات	
1173	ا: شرعی عذر والے لوگ	
1173	۲: جن کے پاس شرعی عذر نہیں تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کی	
1174	۳: مدینہ کے آس پاس رہنے والے اُعراب منافقین	
1175	۴: منافقینِ مدینہ	
1176	۵: مسجدِ ضرار	
1181	چوتھا باب پیچھے رہ جانے والے تین صحابہ کا قصہ	
1190	پانچواں باب قصۂ تبوک سے مستفاد اسباق و دروس اور فوائد و عبرتیں	

	۱: غزوۂ تبوک کے بارے میں منہجِ قرآنی کی امتیازی خصوصیات	1190
	۲: اس غزوہ میں شورائی نظام پر عمل کا نمونہ	1191
	۳: سخت جان عملی تربیت	1192
	۴: اس غزوہ کے اہم نتائج	1193
	چھٹا باب غزوۂ تبوک اور حجۃ الوداع کے مابین کے اہم واقعات	1194
	۱: ثقیف کا وفد اور ان کا قبولِ اسلام	1194
	۲: رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی بن سلول کی وفات	1197
	۳: ازواجِ مطہرات کو اختیار (نبوی گھرانوں سے دروس واسباق)	1200
	۴: حضرت ابو بکرؓ کا لوگوں کو حج کرانا	1204
	۵: عام الوفود (سن نو ہجری)	1206
	۶: اسلامی مبادیات کی تعلیم اور تنظیمی امور کی ترتیب کے لئے ٹیموں کی روانگی	1213
	ساتواں باب حجۃ الوداع (10ھ)	1217
	۱: نبی کریم ﷺ کے حج کی کیفیت	1217
	۲: اسباق ودروس اور فوائد واحکام	1223
	آٹھواں باب مرض کا آغاز اور رفیقِ اعلیٰ کی جانب	1229
	۱: آپؐ کی وفات سے متعلق آیات واحادیث	1229
	۲: رسول اللہ ﷺ کا مرض الوفات	1232
	۳: آخری ایام میں آپ ﷺ کی بعض وصیتیں	1234

	۴: حضرت ابو بکرؓ امامت فرماتے ہیں	1236
	۵: اللہ کے رسول ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کی آخری ساعتیں	1236
	۶: رسول اللہ ﷺ کی وفات پر بعض مرثیے (آقا کی یاد میں اشک بہاتی آنکھیں)	1243
اختتامیہ		1248
فہرست مراجع و مصادر		1250

باسمہ تعالیٰ

عرضِ مترجم

رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ ایک بین الاقوامی مشن کی آئینہ دار اور قرآن کے ابدی نظام کی عملی تفسیر ہے، آپ ؐ کی حیاتِ طیبہ پر ہر زمانہ میں ہر محبِ رسول ﷺ نے قلم اٹھایا ہے اور ہر ایک نے اپنے اپنے انداز سے رسول اللہ ﷺ کی ہمہ جہت شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے، لیکن کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا ہے کہ اس نے سیرت نگاری اور آپ ﷺ کی مدحت کا حق ادا کر دیا ہے، یہ تو سیرت نگار کے لئے خود حصولِ سعادت کا ایک اہم ذریعہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی سیرت کا مقصد صرف تاریخ نویسی اور سیرت نگاری نہیں ہے بلکہ سیرتِ رسول ؐ کا اصل مقصد عبرت پذیری اور سیرت رسول ﷺ سے مستفاد دروس واسباق کو اپنے لئے نقشِ راہ بنانا ہے، اس لئے بعض سیرت نگاروں نے 'فقہ السیرۃ' کے پہلو پر خاص توجہ دی ہے جن میں ایک اہم نام ڈاکٹر علی محمد صلابی کا بھی ہے، ڈاکٹر صلابی- جو اصلا لیبیا سے تعلق رکھتے ہیں- نے دور حاضر میں تاریخِ اسلامی پر کافی کام کیا ہے جس کا آغاز انہوں نے دورِ نبوی سے کیا ہے اور سیرت رسول ﷺ کے موضوع پر انتہائی جامع اور مفصل کتاب تصنیف کی ہے، سیرت کی اس کتاب میں مؤلف نے حیاتِ رسول ﷺ کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے، اس کتاب میں ایک قاری واقعات کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ ان سے حاصل ہونے والے دروس واسباق اور فوائد وعبرتوں سے بھی واقف ہوتا ہے، اس کتاب میں یہ پہلو بھی نظر آتا ہے کہ اس میں قرآنی تناظر میں سیرت پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس لئے کہ قرآن اور سیرت کا آپس میں انتہائی گہرا ربط وتعلق ہے، اس کتاب کی جامعیت کے بارے میں مؤلفِ کتاب ڈاکٹر صلابی رقمطراز ہیں: ''...... جہاں تک تعلق ہے جدید سیرت نگاروں کا تو علامہ سباعیؒ نے ان پہلوؤں کا ذکر کیا ہے جن کا ذکر غزالیؒ نے نہیں کیا ہے، بوطی نے ان چیزوں کو بیان کیا ہے جن کو "الغضبان" نے نہیں ذکر کیا ہے، یہی صورت حال میں نے تفسیر میں بھی دیکھی اور شروحاتِ حدیث جیسے کہ ''فتح الباری''، ''شرح النووی'' میں بھی یہی صورتحال پائی جاتی ہے، فقہاء نے بھی ایسے مسائل کا ذکر کیا ہے جن کا ذکر قدیم وجدید سیرت نگاروں نے نہیں کیا ہے، لہذا اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ توفیق عطا فرمائی کہ میں ان تمام اسباق ودروس اور واقعات وفوائد کا احاطہ کروں، میں نے ان تمام چیزوں کو ایک ہی ہار میں پرونے کی کوشش کی جس کو دیکھنا سب کے لئے آسان ہو اور قاری کو یہ پکے ہوئے بہترین پھل آسانی کے ساتھ ایک ہی جگہ کھانے کا موقع میسر ہو۔ یہ کتاب سینکڑوں مصادر ومراجع سے جمع کئے گئے علمی ورثہ اور علمی افکار کا ماحصل ہے''۔ (مقدمہ کتاب)

عربی زبان میں لکھی گئی سیرت کی اس عظیم کتاب کے اردو ترجمہ کی سعادت اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا کی، یہ میری زندگی کے سب سے بہتر اور قیمتی ایام ہیں جن میں مجھے اپنے رسول ونبی، مقتدا وپیشوا، حبیب مصطفی ﷺ کی ذات سے علمی، فکری اور روحانی فیض حاصل کرنے کی سعادت نصیب ہوئی، اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صلابی کو جزائے خیر عطا فرمائے جنہوں نے امت کے لئے یہ عظیم علمی تحفہ پیش کیا اور پھر انہوں نے مجھے اس کتاب کو عربی سے اردو میں منتقل کرنے کی اجازت عنایت عطا فرمائی، میرے لئے اس عظیم کام کا ذریعہ اور محرک میرے سب سے قریبی دوست ورفیق برادرم مجیب الرحمن عتیق ندوی بنے، وہ اس عظیم پراجیکٹ میں میرے شریک وسہیم رہے اور ہر اہم موقع پر

رہنمائی کا کام بھی کرتے رہے،اللہ ان کو اس کا اجرِ جزیل عطا فرمائے، کتاب چونکہ کافی ضخیم تھی اس لئے دیگر کاموں کے ساتھ ساتھ یہ کام بھی مسلسل ہوتا رہا یہاں تک کہ ایک سال کی مدت میں یہ پائے تکمیل کو پہنچ گیا، والحمد للہ علیٰ ذلک۔ کمپوزنگ کا اہم کام چھوٹے بھائی برادرم ظفراللہ وانی نے کیا جس کی وجہ سے اس پراجیکٹ کی تکمیل میرے لئے کافی آسانی ہوگئی، اللہ تعالیٰ برادرم ظفراللہ کو بھی شایان شان اجر عطا فرمائے، گھر کے تمام افراد بطور خاص شریکِ حیات اور تینوں بچوں (عبداللہ عزام، محمد حماد اور رائد صلاح) نے یکسوئی کے ساتھ یہ کام کرنے کا موقع فراہم کیا،اس کے لئے ان کے لئے دل سے اظہارِ تشکر و امتنان۔ اولاد کے اچھے کاموں کی سب سے زیادہ خوشی والدین کو ہوا کرتی ہے،یقیناً یہ کام والدین کے لئے باعثِ مسرت و خوشی ثابت ہوگا "رب ارحمهما كما ربياني صغيرا"۔ اس کے علاوہ جن جن احباب نے اس کی پروف ریڈنگ میں معاونت کی یا اپنے ذریں مشوروں سے نوازا اللہ تعالیٰ سب کو جزائے خیر عطا فرمائے اور ہم سب کے لئے اس عظیم کام کو ذخیرۂ آخرت اور شافعِ محشر کی شفاعت کا ذریعہ بنائے۔آمین یارب العالمین، وصلی اللہ علی النبي الحبیب المصطفی صلی اللہ علیہ وسلم۔

عنایت اللہ وانی ندوی

ڈوڈہ، جموں و کشمیر

2023/12/28م– 14/جمادی الثانیة1445ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں، اسی کی ہم حمد و تعریف کرتے ہیں، اسی سے مدد چاہتے ہیں اور اسی سے ہم مغفرت طلب کرتے ہیں، اپنے نفس کے شر اور اعمال کے بُرے اثرات سے ہم اللہ کی پناہ طلب کرتے ہیں، جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت دے اس کو کوئی گمراہ نہیں کر سکتا ہے اور جس کو وہ گمراہ کر دے اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں ہے، میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، وہ تنہا ہے، اس کا کوئی شریک و سہیم نہیں ہے، اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں۔

﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱتَّقُواْ ٱللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِۦ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسۡلِمُونَ﴾ (آل عمران:102)

﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ ٱتَّقُواْ رَبَّكُمُ ٱلَّذِى خَلَقَكُم مِّن نَّفۡسٍ وَٰحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا وَبَثَّ مِنۡهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَآءًۚ وَٱتَّقُواْ ٱللَّهَ ٱلَّذِى تَسَآءَلُونَ بِهِۦ وَٱلۡأَرۡحَامَۚ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ عَلَيۡكُمۡ رَقِيبًا﴾ (النساء:1)

﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱتَّقُواْ ٱللَّهَ وَقُولُواْ قَوۡلًا سَدِيدًا ۝٧٠ يُصۡلِحۡ لَكُمۡ أَعۡمَٰلَكُمۡ وَيَغۡفِرۡ لَكُمۡ ذُنُوبَكُمۡۗ وَمَن يُطِعِ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ فَقَدۡ فَازَ فَوۡزًا عَظِيمًا﴾ (الأحزاب: 70-71)

اے رب کریم! حمد و ستائش تیرے ہی لئے ہے، جو تیری ذات کے جلال اور تیری سلطنت کی عظمت کے لائق ہے، حمد و تعریف تیرے ہی لئے ہیں یہاں تک کہ تو راضی ہو جائے اور اس وقت بھی تعریف تیرے ہی لئے ہے جب تو راضی ہو جائے اور راضی ہونے کے بعد بھی حمد و ستائش تیرے ہی لئے ہیں۔

اَمّا بعد! بے شک سیرتِ نبوی کا مطالعہ ہر مسلمان کے لئے اہمیت رکھتا ہے، اس کے مطالعہ سے کئی مقاصد حاصل ہوتے ہیں، جن میں اہم ترین یہ ہیں: آپ ﷺ کی شخصیت، آپؐ کے اقوال اور افعال اور طرزِ زندگی سے واقفیت کے ذریعہ آپ کی اقتدا و پیروی، اس کے ذریعہ ایک مسلمان کے دل میں آپ کی محبت پیدا ہوتی ہے، اس میں اضافہ ہوتا ہے اور اس کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں، صحابہ کرام کی زندگی سے انسان متعارف ہوتا ہے جنہوں نے رسول ﷺ کی معیت میں جدوجہد کی، اس لئے سیرت کے مطالعہ کے نتیجے میں ان کی بھی محبت پیدا ہوتی ہے اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے اور اُن کا راستہ اختیار کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اسی طرح سیرت نبویؐ کے ذریعہ ایک مسلمان کے سامنے رسول اللہ ﷺ زندگی کی جملہ تفصیلات اور باریکیاں ظاہر و نمایاں ہو جاتی ہیں، ولادت سے لے کر وفات تک، بچپن، جوانی، دعوت و جہاد، صبر و ثبات اور مخالفین کے مقابلہ میں آپؐ کی نصرت و کامیابی تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے آپؐ کی شخصیت کے متنوع پہلوؤں کو شوہر کی حیثیت سے، والد کی حیثیت سے، قائد و رہبر کی حیثیت سے، حاکم و مربی کی حیثیت سے، داعی و زاہد کی حیثیت سے اور قاضی اور جج کی حیثیت سے بالکل نمایاں کرتی ہے، اس لئے ہر مسلمان کو اس میں اپنی ضرورت و چاہت کے مطابق رہنمائی مل جاتی ہے۔ (السیرۃ النبویۃ، دراسۃ و تحلیل، د۔ محمد ابو فارس، ص:۵۰)

ایک داعی کو سیرت نبویؐ میں دعوت کے مختلف طریقے اوراس کے مسلسل مراحل کا سراغ مل جاتاہے، ہر مرحلہ کے لئے مناسب طریقہ کار سے واقفیت حاصل ہوتی ہے، اس لئے لوگوں تک پہنچنے اور ان کو اسلام کی دعوت دینے کے سلسلہ میں وہ سیرت سے استفادہ کرتا ہے اور اُس عظیم جہد ومشقت کا اسے احساس ہوتا ہے جو اعلاء کلمۃ اللہ کی خاطر رسول ﷺ نے برداشت کی، رکاوٹوں اور مشکلات کے سامنے کیا حکمتِ عملی اختیار کی جائے ؟اس کا علم بھی اُسے ہوتا ہے اور مصائب ومشکلات اور آزمائش کے مقابلہ میں صحیح اور درست حکمتِ عملی سے بھی وہ واقف ہوتا ہے۔

لوگوں کی عمومی تربیت اوران پر اثر اندازی کے سلسلہ میں ایک مربی آپ ﷺ کی سیرت کے اسباق اور دروس کا مطالعہ کرتا ہے، بطور خاص آپ ﷺ کے اُن صحابہ کرام کے سلسلہ میں جن کی تربیت آپ ﷺ نے اپنے ہاتھوں سے فرمائی، ان پر خصوصی توجہ مرکوز فرمائی اوران میں سے ایک نابغۂ روزگار قرآنی نسل تیار کی اور ایک ایسی بہترین امت تشکیل دی جس کو تمام نوعِ انسانی کے لئے برپا کیا گیا، جس کا کام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تھا، اور وہ اللہ عزوجل پر ایمان ویقین سے لبریز تھی، ان کے ذریعہ ایک ایسی حکومت قائم کی جن کے ذریعہ مشرق ومغرب میں عادلانہ نظام عام اور نافذ ہوا، ایک قائد وسپہ سالار کو آپؐ کی سیرت میں فوجی قیادت کے سلسلہ میں اور قبائل واقوام اور امت کی رہبری کے سلسلہ میں ایک مستحکم نظام اور باریک بینی پر مبنی حکمتِ عملی کے نقوش ملتے ہیں، اس کو منصوبہ بندی اوراس کے نفاذ کے سلسلے میں انتہائی باریک بینی کا واضح نمونہ ملتاہے، عادلانہ اصول وضوابط کو عملی شکل دینے اور امیر ومأمورین اور قائد ورعایہ کے مابین شورائی نظام کے قیام کی عملی تصویر ملتی ہے۔

ایک سیاست دان کو یہ بات سیکھنے کا موقع ملتاہے کہ آپ ﷺ اپنے سخت ترین سیاسی مخالفین کے ساتھ کیا طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں، جیسے کہ رئیس المنافقین عبداللہ بن سلول جس نے اسلام کا اعلان تو کیا تھا مگر دل میں کفر اور اللہ کے رسول ﷺ کے لئے نفرت و عداوت چھپا رکھی تھی، وسازشوں کا جال بُنتا تھا اور ایسی افواہیں عام کرتا تھا جس کا مقصد آپ ﷺ کو کمزور کرکے اور لوگوں کو آپ سے دور کر کے پریشان کرنا ہوتا تھا، سیرت سے معلوم ہوجاتاہے کہ آپؐ نے اس کے ساتھ کیسا معاملہ کیا، کیسے اس کو اوراس کی نفرت وعداوت کو انگیز کیا، یہاں تک کہ تمام لوگوں کے سامنے اس کی حقیقت واضح ہوگئی اور سب نے یہاں تک کہ اس کے قریبی لوگوں نے اس کو کنارہ کردیا، اس کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور سب لوگ نبی کریم ﷺ کی امارت وقیادت پر متفق ہوگئے۔

علماء اور اہلِ علم کو سیرت میں وہ نکات پڑھنے کو ملتے ہیں جو کتاب اللہ کے فہم میں ان کی مدد کرتے ہیں، اس لئے کہ عملی اعتبار سے اصلاً سیرت ہی قرآن کریم کی وضاحت وتفسیر کرنے والی ہے، اسی میں اسباب نزول اور بہت سی آیات کی تفسیر موجود ہے جن سے ان آیات کو سمجھنے، ان سے استنباط کرنے اوران کے اسباب نزول کے مناظر وواقعات ساتھ کچھ وقت گزارنے کا موقع ملتاہے، علماء ان سے شرعی احکام اور شرعی سیاست کے اصول وضوابط اخذ کرتے ہیں اور مختلف اسلامی علوم کے سلسلہ میں صحیح رہنمائی حاصل کرتے ہیں، اسی کے ذریعہ ناسخ ومنسوخ اور دیگر علوم سے واقفیت حاصل کرتے ہیں اور اسی کے ذریعہ اسلامی روح اوراس کے بلند مقاصد سے شناسا ہوجاتے ہیں۔

اہلِ زہد و تقوی کو سیرت میں زہد کے اصل معنی، اس کی حقیقت اور اس کا مقصد معلوم ہوتا ہے، تاجر اس سے تجارت کے مقاصد، اس کا نظام اور اس کے مختلف طریقے سیکھ لیتے ہیں، ابتلاء و آزمائش کے مراحل سے گزرنے والے اس کے ذریعہ صبر و ثبات کی اعلی مثالیں سیکھ لیتے ہیں، جس کے نتیجے میں دعوتی راستے میں چلتے ہوئے ان کے عزائم مزید پختہ ہو جاتے ہیں، اللہ پر ان کا اعتماد و یقین دوچند ہو جاتا ہے اور ان کو یقین ہو جاتا ہے کہ بہترین انجام اہل تقوی کو حاصل ہوتا ہے۔ (مدخل لدراستہ السیرۃ، ڈاکٹر یحیی الیحیی، ص ۱۴)

سیرت نبویؐ سے امت کو آداب عالیہ، اخلاق حمیدہ، صحیح عقائد و عبادات، اسی طرح روح کی بلندی، قلب کی پاکیزگی، اللہ کے راستے میں جہاد کی محبت اور اس کی راہ میں شہادت کی طلب اور اس طرح کی بہت سی چیزیں سیکھنے کو ملتی ہیں، اسی لئے حضرت علیؓ بن حسن نے فرمایا ہے: "ہم رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت اسی طرح سکھاتے تھے جیسے کہ ہم قرآن کی کوئی سورۃ سکھاتے تھے"۔ واقدی فرماتے ہیں: میں نے محمد بن عبداللہ کو فرماتے ہوئے سنا وہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے چچا امام زہریؒ کو فرماتے ہوئے سنا: "سیرت و مغازی کے علم میں دنیا و آخرت کا علم موجود ہے"۔

اسماعیل بن محمد بن سعد بن ابی وقاص فرماتے ہیں: "ہمارے والد ہمیں رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت سکھاتے تھے، ایک ایک واقعہ کو بیان کرتے تھے اور فرماتے تھے: یہ تمہارے آباء و اجداد کے کارنامے ہیں، لہذا ان کے تذکرہ کو مت بھولنا"۔ (البدایہ و النھایہ ۲/۲۴۲)

بے شک امت کی تربیت اور اسلامی نظام کے قیام کے نبوی طریقہ کار کے ذریعہ علماء، قائدین، فقہاء اور حکام کو اسلام اور مسلمانوں کی عزت و سربلندی کے حصول کا طریقہ اور اسبابِ عروج و زوال معلوم کرنے میں مدد ملتی ہے، ان کو افراد کی تربیت، جماعت کی تشکیل، سوسائٹی کی تعمیر و احیائے نو اور قیامِ حکومت کے سلسلہ میں نبوی فہم و فراست کا علم ہوتا ہے، ایک مسلمان دعوتی میدان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طرز عمل کو دیکھتا ہے، ان مراحل سے واقف ہوتا ہے جن سے آپؐ کو گزرنا پڑا، دعوتی کشمکش میں مشرکین کے متنوع حربوں کا سامنا کرنے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قدرت و مہارت کا علم ہوتا ہے، حبشہ کی جانب ہجرت کرنے کے حوالے سے آپؐ کی حیران کن منصوبہ بندی کا پتہ چلتا ہے، دعوت کے ذریعہ اہلِ طائف کو مطمئن کرنے کی آپؐ کی کوششوں سے واقفیت حاصل ہوتی ہے، قبائل کے سامنے مختلف مواقع پر اپنے آپ کو پیش کرنے، انصار کو دعوت دینے میں تدریجی مراحل اختیار کرنے اور پھر مدینہ منورہ کی جانب ہجرت کرنے کا علم حاصل ہوتا ہے۔

جو شخص بھی واقعۂ ہجرت پر غور کرے گا اور اس کے آغاز سے لے کر آخر تک اور اس کے مقدمات سے لے کر بعد کے واقعات تک آپؐ کی باریک بینی پر مبنی منصوبہ بندی و تنفیذ کو دیکھے گا اس کو معلوم ہو جائے گا کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ کی جانے والی منصوبہ بندی وحی کی رہنمائی میں ہو رہی ہے اور یہ منصوبہ بندی سنت نبویؐ کا ایک اہم حصہ ہے اور اُن احکامِ الٰہیہ کا بھی ایک جزء ہے جن کا ایک مسلمان سے مطالبہ کیا گیا ہے۔

ایک مسلمان نبوی طرزِ زندگی کے ذریعہ کشمکش و مقابلہ آرائی کا سامنا کرنے اور ہر مرحلہ پر مہارت و ہنر مندی کے تمام طریقوں کو سیکھ لیتا ہے، یہ بھی جان لیتا ہے کہ آپ ﷺ نے یہودیوں، منافقین، کفار اور نصاری جیسی تمام مخالف طاقتوں کا کیسے سامنا کیا اور اللہ کی توفیق وتائید کے ذریعہ اور نصرت کی تمام مطلوبہ شرائط واسباب کی پابندی کرتے ہوئے ان تمام طاقتوں پر کیسے غلبہ حاصل کیا۔

مجھے اس پر مکمل شرحِ صدر اور یقین ہے کہ اس امت کے لئے غلبہ واقتدار، عزت و سربلندی اور شریعت الٰہی کی تحکیم وتنفیذ نبوی طرزِ زندگی کو اختیار کرنے کے ساتھ مشروط ہے، فرمان الٰہی ہے: ﴿قُلْ أَطِيعُواْ ٱللَّهَ وَأَطِيعُواْ ٱلرَّسُولَ ۖ فَإِن تَوَلَّوْاْ فَإِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُم مَّا حُمِّلْتُمْ ۖ وَإِن تُطِيعُوهُ تَهْتَدُواْ ۚ وَمَا عَلَى ٱلرَّسُولِ إِلَّا ٱلْبَلَٰغُ ٱلْمُبِينُ﴾ (سورۂ نور:54) ترجمہ: ''کہو، اللہ کے مطیع بنو اور رسول کے تابعِ فرمان بن کر رہو، لیکن اگر تم منہ پھیرتے ہو تو خوب سمجھ لو کہ رسولؐ پر جس فرض کا بار رکھا گیا ہے اُس کا ذمہ دار وہ ہے اور تم پر جس فرض کا بار ڈالا گیا ہے اُس کے ذمہ دار تم ہو، اُس کی اطاعت کرو گے تو خود ہی ہدایت پاؤ گے ورنہ رسول کی ذمہ داری اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ صاف صاف حکم پہنچادے''۔ اس آیت کریمہ میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ حصولِ عزت واقتدار نبی کریم ﷺ کی اتباع میں مضمر ہے، اس کے بعد کی آیات میں غلبہ واقتدار اور اس کی شرائط کی وضاحت کی گئی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَعَدَ ٱللَّهُ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ مِنكُمْ وَعَمِلُواْ ٱلصَّٰلِحَٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي ٱلْأَرْضِ كَمَا ٱسْتَخْلَفَ ٱلَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ ٱلَّذِي ٱرْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّنۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا ۚ يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْـًٔا ۚ وَمَن كَفَرَ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْفَٰسِقُونَ ﴿٥٥﴾ وَأَقِيمُواْ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتُواْ ٱلزَّكَوٰةَ وَأَطِيعُواْ ٱلرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿٥٦﴾﴾ (سورۂ نور:55-56) ترجمہ:'' اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے اُن لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اُسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح اُن سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے، اُن کے لئے اُن کے اُس دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کردے گا جسے اللہ تعالیٰ نے اُن کے حق میں پسند کیا ہے، اور اُن کی (موجودہ) حالتِ خوف کو امن سے بدل دے گا، بس وہ میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں۔ نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو، اور رسولؐ کی اطاعت کرو، امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا''۔

اللہ کے رسول ﷺ اور آپؐ کے اصحاب نے غلبہ واقتدار کی تمام شرائط کو پورا کرکے دکھایا، انہوں نے ایمان کو اس کے معانی اور تمام ارکان کے ساتھ اپنایا، عملِ صالح کو اس کی تمام انواع واقسام کے ساتھ عملی جامہ پہنایا، خیر کی تمام اقسام اور نیکی کی تمام انواع کو اپنے قلب ودماغ میں جگہ دی، زندگی کے تمام معاملات میں اللہ کی مکمل عبادت کی، شرک اور اس کی تمام انواع و مضمرات کے ساتھ محاذ آرائی کی، انفرادی اور اجتماعی طور پر غلبہ واقتدار کے تمام مادی و معنوی اسباب وذرائع کو اختیار کیا، یہاں تک کہ مدینہ منورہ میں اسلامی نظام قائم کردیا اور وہیں سے پھر اقوامِ عالم تک اللہ کے دین کو عام کیا۔

آج عالمی قیادت سے امت مسلمہ کا دور ہونا ان کا اپنے حقیقی پیغام کو بھلا دینے کا منطقی نتیجہ ہے، امت اپنے مقام اور ذمہ داری سے دستبردار ہو گئی ہے، انہوں نے علم و عمل کے میدان میں اوہام و خرافات کے شوائب شامل کر لئے ہیں، ربانی اصول و قوانین سے پہلو تہی اختیار کر لی ہے اور اس خام خیالی میں مبتلا ہیں کہ غلبہ واقتدار تمناؤں، آرزؤں اور خوابوں کے ذریعہ حاصل ہو گا۔

بلاشبہ مسلمانوں کو لاحق ایمانی کمزوری، روحانی فقدان، فکری انتشار، نفسیاتی اضطراب، ذہنی پراگندگی اور اخلاقی زوال.... اس کا بنیادی سبب وہ خلا ہے جو امت اور قرآن کے درمیان، امت اور نبوی طرزِ زندگی کے درمیان، امت اور خلفائے راشدین کے عہد کے درمیان اور اس کی تاریخ کے روشن صفحات کے درمیان پیدا ہوا ہے۔

کیا آپ ان بہت سے لوگوں کو نہیں دیکھتے ہیں جو اسلام کے نام لیوا ہیں جبکہ وہ قرآن سے، نبوی طرزِ زندگی سے اور خلفائے راشدین کی سیرتوں سے کوسوں دور ہیں، انہوں نے مغربی تہذیب کے سامنے اپنی نفسیاتی شکست کے نتیجے میں خود ساختہ نئی اصطلاحات اور کمزور مفاہیم داخل کئے ہیں، وہ الفاظ کے ساتھ کھلواڑ کرتے ہیں، ان کی غلط تاویلات کرتے ہیں، کئی کئی گھنٹوں تک اپنے افکار بیان کرتے ہیں، مقالات اور مضامین لکھتے ہیں، زندگی، کائنات اور انسان کے فلسفہ کے بارے میں اور انقلابی تبدیلی کے طریقوں کے بارے میں کتابیں تصنیف کرتے ہیں، ان کی گفتگو میں اور ان کے مضامین میں دور دور تک کہیں یہ بات نظر نہیں آتی ہے کہ انہوں نے قرآن کریم کے مطالعہ کے ذریعہ، نبوی طرزِ زندگی کو پڑھ کر، انبیائے کرام کی دعوت کا مطالعہ کر کے اور ہماری عظیم تاریخ میں غواصی کر کے غلبہ و تمکین کے اصول وضوابط کو اور اقوام کے سلسلہ میں قوانین الہیہ کو اچھی طرح سمجھا ہو۔ وہ ہمارے سامنے نور الدین زنگی، صلاح الدین ایوبی، یوسف بن تاشفین، محمود غزنوی، محمد الفاتح اور ان جیسے نبوی طرزِ زندگی کو اختیار کرنے والے قائدین و مربیوں کے بجائے ان مشرق و مغرب کے سیاستدانوں، مفکرین اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں کی زندگیوں سے استدلال کرتے ہیں جو آسمانی وحی اور ربانی طرزِ زندگی سے سب سے زیادہ دور ہوتے ہیں۔

میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو مختلف اقوام کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کی مخالفت کرتے ہیں، اس لئے کہ حکمت مومن کا گمشدہ خزانہ ہے وہ اس کا سب سے زیادہ حق دار ہے جہاں بھی اس کو وہ ملے۔ میں ان لوگوں کا مخالف ہوں جو ربانی نظام زندگی سے ناواقف ہوتے ہیں یا بتکلف ناواقف بنتے ہیں اور اسباق ودروس اور عبرتوں سے بھرپور امت کی سنہری تاریخ کو طاقِ نسیاں پر رکھتے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ وہ اس بات کے متمنی ہوتے ہیں کہ وہ قرآن کریم اور نبوی طریقہ سے دور اپنی خواہشات اور آراء کے ذریعہ مسلمانوں کی زمام قیادت اپنے ہاتھ میں لیں۔ علامہ ابن قیمؒ نے کیا خوب فرمایا ہے:

والله ما خوفي الذنوب فإنها — لعلى طريق العفو والغفران
لكنما أخشى انسلاخ القلب — تحكيم هذا الوحي والقرآن
ورضاً بآراء الرجال وخرصها — لا كان ذاك بمنة الرحمن

ترجمہ: ”اللہ کی قسم! مجھے گناہوں کا بہت زیادہ خوف اور ڈر نہیں ہے، اس لئے کہ ان کے لئے عفو و مغفرت کا دروازہ کھلا ہے، البتہ مجھے اس بات کا سخت خوف ہے کہ دل سے وحی اور قرآن کے نفاذ اور تحکیم کی فکر و سوچ ختم ہو جائے اور لوگوں کی خود ساختہ آرا پر دل مطمئن اور راضی ہو جائے، اللہ ایسا کرے کہ ایسا کبھی نہ ہو، اللہ اپنا فضل اور حفاظت عطا فرمائے!۔

ہمیں امت کی تربیت اور نظام اسلامی کے قیام کے سلسلہ میں نبوی طرزِ عمل کو جاننے کی اور اقوام و ملل اور ملک و سلطنت کے بارے میں قوانین الہیہ سے واقف ہونے کی سخت ضرورت ہے، اس کو معلوم کرنے کی بھی ضرورت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان قوانین الہیہ پر کیسے عمل کیا، جب آپؐ اللہ کے دین کو لوگوں تک پہنچانے کے لئے نکلے، تاکہ آپ ﷺ کے طرزِ عمل کے ذریعہ ہم دعوت اور دین کو نافذ کرنے کے صحیح طریقے سے واقف ہو سکیں اور ہم اسلام اور دعوت کی عمارت درست بنیادوں پر قائم کر سکیں جس کے اصول و فروع کتاب اللہ اور سنتِ رسولؐ سے ماخوذ ہوں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: [لَّقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا] (سورة الأحزاب: 21) ترجمہ: ”درحقیقت تم لوگوں کے لئے اللہ کے رسول میں ایک بہترین نمونہ ہے، ہر اس شخص کے لئے جو اللہ اور یومِ آخرت کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے“۔

امت کی تربیت اور حکومت کے قیام کے سلسلہ میں آپ ﷺ کا فہم وسیع، کامل اور متوازن تھا، اور معاشرہ کے تئیں، قوموں کی تعمیرِ نو اور قیام حکومت کے سلسلہ میں الٰہی قوانین کے تابع تھا، چنانچہ آپ ﷺ نے ان قوانین پر انتہائی حکمت اور ذہانت و فطانت کے ساتھ عمل کیا: جیسے کہ بتدریج و مرحلہ وار کام کرنے کا ضابطہ، ایک قوم کے ذریعہ دوسری قوم کو ہٹانے کا قانون، ابتلاء اور اسباب اختیار کرنے کا قانون اور انسانوں میں انقلاب لانے کا قانون۔

اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے اصحاب کے دلوں میں منہجِ ربانی کو اس کے وسیع مفاہیم و اقدار کے ساتھ جاگزیں کیا، اسی طرح اللہ، کائنات، انسان، زندگی، جنت، جہنم اور قضاو قدر کے بارے میں صحیح عقائد و تصورات کے بیج ان کے قلب و دماغ میں بوئے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تربیت میں آپؐ کے منہج سے بہت زیادہ متاثر ہوتے تھے اور آپ ﷺ کی طرف سے ملنے والے احکام و اوامر پر عمل پیرا ہونے کے انتہائی حریص تھے، چنانچہ جب آپؐ کی مجلس غائب رہنے والا کوئی شخص حاضر ہو جاتا تھا تو اپنے ساتھیوں سے اس کے غائبانہ میں نبی کریمؐ کے احوال و کوائف، آپؐ کی تعلیمات و ارشادات اور نازل شدہ وحی کے بارے میں دریافت کرتا، وہ ہر چھوٹے بڑے عمل میں رسول ﷺ کے نقشِ قدم کی اتباع کرتے اور اس حوالے سے صرف اپنی ذات پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ اپنی اولاد اور متعلقین کو بھی اس کی ترغیب دیتے تھے۔

زیرِ نظر کتاب میں سیرت نبویؐ کے تمام واقعات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، مؤلف نے بعثت سے پہلے کے دنیا کے حالات، اس وقت کی تہذیب، سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی اور اخلاقی صورتحال پر مفصل گفتگو کی ہے، آپ ﷺ کی ولادت سے پہلے کے اہم واقعات، نزول وحی، دعوتی مراحل، مکی دور میں عقائد و عبادات اور اخلاق تصورات پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے، دعوتی کشمکش میں

مشرکین کے مختلف اسالیب، ہجرت حبشہ، واقعۂ طائف، اِسراء و معراج کے تحفۂ الٰہی، قبائل کے سامنے آپ ﷺ کا پیش ہونا، اہلِ یثرب کی جانب سے نور کی کرنیں پھوٹنا اور ہجرت نبوی جیسے تمام واقعات کا احاطہ کیا ہے۔

اس کتاب میں قاری واقعات کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ ان سے حاصل ہونے والے اسباق و دروس اور فوائد و عبرتوں سے بھی واقف ہوتا ہے تاکہ موجودہ دنیا میں بھی مسلمان اس سے استفادہ کر سکیں۔ مؤلفِ کتاب نے نبی کریم ﷺ کے مدینہ منورہ تشریف لانے کے وقت سے آپؐ کی وفات تک کی حیاتِ مبارکہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کس حکمت کے ساتھ معاشرہ کی بنیادوں کو مستحکم کیا، اس کی صحیح تربیت کی، اور قیامِ حکومت میں اندرون و بیرون دشمنوں کے ساتھ مقابلہ آرائی میں آپ کے وسائل و ذرائع کیا تھے؟ اس کے ذریعہ قاری کو معلوم ہوگا کہ معاشرہ کی تعمیر میں آپ صلی اللہ علیہ علیہ وسلم کی حکمتِ عملی کیا تھی اور اہلِ کتاب کے ساتھ کئے گئے معاہدہ میں، آپ کی تحریکِ جہاد میں، آپ کے اقتصادی و معاشی طرز عمل میں اور ایک مسلمان کو اُس دین کے مفاہیم کی جانب گامزن کرنے میں آپ ﷺ کی حکمتِ عملی کیا تھی جو دین انسانیت کو گھٹاٹوپ تاریکیوں سے، بتوں کی پوجا اور پرستش سے اور شریعتِ الٰہی کے بارے میں منحرفانہ طرزِ عمل سے نکالنے کے لئے نازل کیا گیا ہے۔

مؤلفِ کتاب کی کوشش ہے کہ بہت سے افرادِ امت کے اذہان سے سیرت نبویؐ کو دور رکھنے اور محو کرنے کے مرض کا سدباب کیا جائے، چنانچہ اسی سلسلہ میں ماضی کی دہائیوں میں سیرت نبوی کے سلسلہ میں بہترین تحقیقات اور کتابیں سامنے آئی ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے کافی مقبولیت عطا کی جیسے کہ علامہ صفی الدین مبارکپوریؒ کی "الرحیق المختوم" شیخ غزالیؒ کی "فقہ السیرۃ" شیخ ابوالحسن علی ندویؒ کی "السیرۃ النبویہ"۔ یہ کتابیں مختصر تھیں اور سیرت کے تمام واقعات کا احاطہ نہیں کرتیں ہیں، بعض یونیورسٹیوں میں ان کتابوں کو شاملِ نصاب کیا گیا ہے، وہاں کے بعض طلباء کا خیال یہ ہے کہ جس نے ان کتابوں کا بالاستیعاب مطالعہ کر لیا اس نے مکمل سیرت نبوی کا احاطہ کر لیا، حالانکہ یہ واضح غلط سوچ ہے اور سیرت نبوی کے سلسلہ میں اس طرح کی سوچ خطرناک بھی ہے، اسی طرح کی سوچ بعض ائمہ مساجد اور بعض تحریکوں کے قائدین تک بھی در آئی ہے، اور اس کا اثر ان کے متبعین میں بھی ظاہر ہو رہا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بہت سے لوگوں کے یہاں سیرت کا انتہائی ناقص تصور پیدا ہو گیا، شیخ محمد الغزالیؒ نے اپنی کتاب "فقہ السیرۃ" کے اختتام پر اس طرح کے تصور کی خطرناکی پر متنبہ کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: "تمہارے ذہن میں یہ بات آسکتی ہے کہ تم نے محمد ﷺ کی زندگی کا مطالعہ کر لیا جب کہ آپ نے آپ ﷺ کی ولادت سے وفات تک کی سوانح حیات پڑھ لی ہو، حالانکہ یہ بہت بڑی غلطی ہے، اس لئے کہ آپ سیرت کو صحیح طریقہ سے اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے ہو جب تک کہ آپ قرآن کریم اور سنت مطہرہ کا مطالعہ نہ کریں، آپ ان سرچشموں سے جس قدر فیضیاب ہوں گے اسی قدر آپ کا تعلق نبی کریم ﷺ سے مضبوط ہوگا"۔ (فقہ السیرۃ، محمد الغزالی، ص: 476)

زیرِ نظر کتاب میں قاری کو یہ پہلو بھی نظر آئے گا کہ اس میں قرآنی تناظر میں بھی سیرت پر روشنی ڈالی گئی ہے اس لئے کہ قرآن کا سیرت کے ساتھ گہرا تعلق ہے، جیسے کہ غزوۂ بدر، غزوۂ احد، غزوۂ احزاب، غزوۂ بنی نضیر، صلح حدیبیہ، غزوۂ تبوک وغیرہ جیسے واقعات کے سلسلہ میں مصنف نے ان واقعات کے ضمن میں موجود اسباق و دروس عبرتوں اور نصیحتوں اور نصرت و کامیابی کے الٰہی ضابطے اور قوانین پر

سیر حاصل گفتگو کی ہے، اور بیان کیا ہے کہ واقعات اور پیش آمدہ صورتحال کے ذریعہ کیسے قرآنِ کریم نے قلبی اور نفسیاتی امراض کا علاج کیا ہے۔

سیرت نبوی کے ذریعہ ہر نسل کو اس چیز کی رہنمائی ملتی ہے جس کی اس کو زندگی کے سفر میں ضرورت پڑتی ہے، یہ سیرت ہر زمان ومکان کے مطابق بھی ہے اور زندگی کے رخ کو درست کرنے کی بھی صلاحیت رکھتی ہے۔

میں نے اپنی زندگی کی کئی بہاریں قرانِ کریم اور سیرت نبوی کی غواصی اور بحث و تحقیق میں صرف کی ہیں، وہ میری زندگی کے سب سے بہتر ایام تھے، اس بحث و تحقیق کے دوران میں اپنی غریب الوطنی اور ہجرت کو بھول گیا، اور میں قرآن وحدیث کے مراجع ومصادر کے اوراق میں موجود ہیرے، جواہرات، موتیوں اور خزانوں کو حاصل کرنے میں منہمک رہا، میں نے ان کو جمع کیا، مرتب و منظم کیا، تاکہ وہ میری عظیم امت کی نسلِ نو کے ہاتھوں تک پہنچ سکیں، مجھے محسوس ہوا کہ قدیم وجدید سیرت نگاروں کے ہاں واقعات اور اسباق وفوائد کو ذکر کرنے میں بڑا فرق ہے، چنانچہ کبھی ابن ہشام اس واقعہ کا ذکر کرتے ہیں جس کو ذھبی نے ذکر نہیں کیا ہے، اور کبھی ابن کثیر ایسے پہلو کا ذکر کرتے ہیں جس کو اصحاب سنن نے بیان نہیں کیا ہے۔

یہ تو ہے قدیم سیرت نگاروں کی صورتحال، جہاں تک تعلق ہے جدید سیرت نگاروں کا تو علامہ سباعیؒ نے ان پہلوؤں کا ذکر کیا ہے جن کا ذکر غزالیؒ نے نہیں کیا ہے، بوطی نے ان چیزوں کو بیان کیا ہے جن کو "الغضبان" نے نہیں ذکر کیا ہے، یہی صورت حال میں نے تفسیر میں بھی دیکھی اور شروحاتِ حدیث جیسے کہ ''فتح الباری''''شرح النووی'' میں بھی یہی صورتحال پائی جاتی ہے، فقہاء نے بھی ایسے مسائل کا ذکر کیا ہے جن کا ذکر قدیم وجدید سیرت نگاروں نے نہیں کیا ہے، لہذا اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ توفیق عطا فرمائی کہ میں ان تمام اسباق ودروس اور واقعات وفوائد کا احاطہ کروں، میں نے ان تمام چیزوں کو ایک ہی ہار میں پرونے کی کوشش کی جس کو دیکھنا سب کے لئے آسان ہو اور قاری کو یہ پکے ہوئے بہترین پھل آسانی کے ساتھ ایک ہی جگہ کھانے کا موقع میسر ہو۔

یہ کتاب سینکڑوں مصادر ومراجع سے جمع کئے گئے علمی ورثہ اور علمی افکار کا ماحصل ہے، اس پروجیکٹ کی تکمیل میں لیبیا، یمن، عراق، مصر، سوڈان، سعودی عرب، امارات، قطر اور شام کے بہت سے رفقاء اور اسکالرز کا بذریعہ گفتگو، بحث ومباحثہ اور ورکشاپس حصہ رہا ہے، بعض احباب نے اہم نادر مصادر و مراجع کی رہنمائی اور ان کو مہیا کرنے کی ذمہ داری نبھائی، جبکہ بعض نے ان ضوابط و قوانین پر توجہ مرکوز کرنے پر زور دیا جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی مبارک تحریک کے دوران اختیار کئے، بعض احباب نے اس جانب توجہ دلائی کہ تاریخی اور سوانحی سیرت کو عملی سیرت اور اس سیرت کے ساتھ مربوط کیا جائے جس کو کسی حدیث میں یا عملِ نبوی میں بیان کیا گیا ہے۔ قرآن کریم کا طریقہ کار یہ ہے کہ وہ سیرت کے ایک واقعہ کو دوسرے واقعہ کے ذریعہ ثابت کرتا ہے اور ایک متوازن طریقہ کے ساتھ ان کو ملا کر بیان کرتا ہے، اور یہ سیرت نسلِ نو کو وسیع علم، گہری فکر وسوچ اور جوش وجذبہ مہیا کرتی ہے، یہ سیرت روح کی غذا، عقل کے لئے ذریعۂ علم، دل کے لئے زندگی اور نفس کے لئے پاکیزگی کا ذریعہ ہے۔

سیرت نبوی ان تمام پہلوؤں پر محیط ہے جن کی دعوت اسلامی کے سفر میں ضرورت پڑتی ہے، نبی کریم ﷺ اس کے بعد ہی اس دنیا سے تشریف لے گئے جب کہ آپ ﷺ نے ہر اس شخص کے لئے بہت سی مثالیں اور نمونے چھوڑ دئے تھے جو بھی دعوت و تربیت، تعلیم و تمدن، جہاد اور زندگی کے تمام معاملات میں آپ ؐ کی اتباع کرنا چاہے، اسی طرح سیرت نبویؐ کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ غور و فکر ایک قاری کو ان عظیم اخلاقی پہلوؤں سے واقف ہونے میں معاون بنتا ہے جن میں اللہ کے رسول ﷺ تمام نوع انسانی میں ایک امتیازی شان رکھتے ہیں، اسی طرح ان اوصاف حمیدہ سے بھی واقف ہوتا ہے جن سے متصف ہو کر آپ ؐ اس دنیا میں زندگی گزارتے رہے، چنانچہ سیرت کا مطالعہ کرنے والا آپ ﷺ کی ذات گرامی کو شاعر کے ان اشعار کا مصداق پاتا ہے:

وأحسن منك لم تر قطّ عيني   وأجمل منك لم تلد النساء

خلقت مبرأ من كل عيب   كأنك قد خلقت كما تشاء

ترجمہ: ''آپ سے زیادہ حسین کبھی میری آنکھوں نے نہیں دیکھا اور نہ ہی آپ سے زیادہ خوبصورت عورتوں نے کسی کو نہیں جنا ہے، آپ کو ہر عیب اور کمزوری سے پاک اور منزہ پیدا کیا گیا ہے، ایسا لگتا ہے کہ گویا کہ آپ کو اپنی مشیت وچاہت کے مطابق پیدا کیا گیا ہے''۔

البتہ میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا ہوں کہ میں نے کوئی ایسی چیز پیش کی ہے جس کو اسلاف پیش نہیں کر سکے، اللہ کے ﷺ کا مقام اور شخصیت عظیم تر ہے، آپ کی سیرت کے تمام پہلوؤں کو بیان کرنے کے لئے حساس اور نرم دل، دقیق فقہ و سمجھ، عظیم ذہانت وفطانت اور گہرا ایمان مطلوب ہے، اسی طرح میں اپنے اس کام میں عصمت و کمال کا بھی دعویٰ نہیں کرتا ہوں، کیونکہ یہ تو انبیاء اور رسولوں کی خصوصیت ہے، جس نے یہ سوچا کہ اس نے تمام علم کا احاطہ کر لیا وہ اپنی ذات سے ناواقف ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان سچ ہے ﴿وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلرُّوحِ ۖ قُلِ ٱلرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّى وَمَآ أُوتِيتُم مِّنَ ٱلْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا﴾ ترجمہ: یہ لوگ تم سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہو ''یہ روح میرے رب کے حکم سے آتی ہے، مگر تم لوگوں نے علم سے کم ہی بہرہ پایا ہے''۔

علم تو بحر بے کنار ہے، شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

وقل لمن يدعي في العلم فلسفة   حفظت شيئا وغابت عنك أشياء

ترجمہ: جو علم میں برتری کا دعوی کرے اس سے کہہ دو کہ آپ کو بعض چیزیں تو معلوم ہوئی جبکہ بہت سی چیزیں آپ سے غائب ہو گئیں۔

علامہ ثعالبی فرماتے ہیں: جو شخص بھی کوئی کتاب تصنیف کرتا ہے جب ایک رات گزر جاتی ہے تو رات گزرنے کے بعد ہی وہ چاہتا ہے کہ اس میں کچھ حذف واضافہ کر لے، یہ ایک رات کا حال ہے، کئی سال گزرنے کے بعد کیا حال ہو گا!

عماد اصفہانی کہتے ہیں: میرا خیال ہے کہ جو بھی انسان دن میں کوئی کتاب لکھتا ہے تو دوسرے ہی دن وہ کہتا ہے اگر اس میں یہ تبدیلی کی جائے تو زیادہ بہتر ہو گا اور اگر یہ اضافہ کیا جائے تو اچھا لگے گا، اگر اس کو مقدم کیا جائے گا اور اگر اس کو چھوڑ دیا جائے تو زیادہ خوبصورت لگے گا، اس میں انسان کے لئے عظیم سبق ہے، اور یہ تمام انسانوں میں نقص و کمی کی دلیل ہے۔

اخیر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ عمل اسی کی ذات کے لئے خالص ہو، اس کے بندوں کے لئے مفید ہو، اور میرے تحریر کئے ہوئے ہر حرف کا مجھے بہتر بدلہ ملے، اللہ اس کو میرے نیکیوں والے پلڑے میں شامل فرمائے، میرے ان تمام احباب کو بھی جزائے خیر عطا فرمائے جنہوں نے اپنی تمام ممکنہ چیزوں کے ذریعہ اس کتاب کی تکمیل میں تعاون فراہم کیا۔

شاعر کا قول ہے:

أَسير خَلْفَ رِكَاب القوم ذَا عَرَجٍ　　مؤَمِّلاً جبر ما لاقَيتَ منْ عوَجِ
فَإِنَّ لَحِقْتُ بهم من بعد ما سبَقُوا　　فَكَمْ لِرب السَّما فِي النَّاسِ مِنْ فَرَجِ
وَإِنْ ظَلَلْتُ بقفرِ الأرضِ مُنْقَطعًا　　فما عَلَى عَرجٍ فِي ذَاكَ مِنْ حرَجِ

ترجمہ: میں قوم کے قافلے کے پیچھے اپنے لولے پن کے ساتھ اس امید کے ساتھ چلتا رہا کہ مجھے لاحق اپاہج پن کی تلافی ہو۔ اگر ان کے آگے جانے کے بعد بھی میں ان کے ساتھ مل گیا تو یہ رب کا احسان ہو گا، اس لئے کہ رب کائنات کی طرف سے انسانوں پر کتنے ہی احسانات و آسانیاں ہیں اگر میں بیاباں میں قافلے سے پیچھے رہ گیا تو لولے پن میں ایسا ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

سبحانك اللهم وبحمدك ، أشهد أن لا إله إلا أنت ، أستغفرك وأتوب إليه.

محتاجِ عفو و درگذر بندہ

علی محمد الصلابی

2001ء/1422 ھ

پہلی فصل

بعثت سے پہلے سے لے کر وحی کے نزول تک کے اہم تاریخی واقعات

پہلا باب

بعثت سے پہلے کی تہذیبیں اور ان کے مذاہب

ا: رومی سلطنت:

مشرقی رومی سلطنت "بیز نطینی سلطنت" کے نام سے معروف تھی اور اس سلطنت کا دائرہ اقتدار یونان، بلقان، ایشیاء، شام، فلسطین، بحر متوسط کے آس پاس کے پورے علاقہ، مصر اور پورے شمالی افریقہ پر محیط تھا، اس کا دارالسلطنت "قسطنطنیہ" تھا، یہ ایک ظالمانہ حکومت تھی جس نے اپنی زیرِ حکومت اقوام کو ظلم وجور اور زیادتیوں کی چکی تلے دبا رکھا تھا، ان پر کئی گنا ٹیکس عائد کر رکھے تھے، بغاوتوں اور مخالفین کی کثرت تھی، ان کی مجموعی زندگی لہو ولہب، ناچ گانے اور فضول خرچی سے عبارت تھی۔

جہاں تک مصر کا تعلق ہے تو وہ مذہبی ظلم اور سیاسی استبداد کا شکار تھا، اس کو بیز نطینیوں نے ایک دودھ دینے والی گائے بنا رکھا تھا، جس سے وہ دودھ اچھی طرح حاصل کرتے تھے اور اس کو چارہ دینے میں کوتاہی کرتے تھے۔

جہاں تک شام کا تعلق ہے تو وہاں مظالم اور غلاموں کی کثرت تھی، وہاں عوام پر حکومت کرنے کا انحصار طاقت و قوت اور انتہائی ظلم وزیادتی پر تھا، وہاں رومی آرزؤں کی تکمیل ہوتی تھی، حکومت اجنبیوں اور باہر سے آئے ہوئے لوگوں کی ہوتی تھی جو صرف طاقت کی زبان استعمال کرتے تھے اور محکوم قوم پر کسی طرح کی نرمی نہیں برتتے تھے، اکثر وبیشتر شام کے لوگ اپنے بچوں کو بیچتے تھے تاکہ اپنے قرضوں کی ادائیگی کر سکیں۔

رومی معاشرہ تضاد وتناقض اور اضطراب سے بھرا ہوا تھا، اس کی منظر کشی "الحضارة ماضيها وحاضرها" کتاب میں اس طرح کی گئی ہے:

"بیز نطینیوں (رومیوں) کی معاشرتی زندگی میں خطرناک قسم کا تضاد تھا، مذہبی رجحان ان کے ذہنوں میں رچ بس گیا تھا، رہبانیت اور ترکِ دنیا ان کے ہاں عام تھی اور وہ سلطنت کے طول و عرض میں پھیل چکی تھی، ایک عام سے شخص نے بھی عمیق مذہبی مسائل اور قومی اختلافات میں دخل اندازی شروع کر دی تھی، اسی میں وہ لگے رہتے تھے، اسی طرح ان کی نجی عمومی زندگی میں باطنی مذہب اور قومی اختلافات اور اسرار پسندی کی چھاپ تھی، لیکن دوسری طرف یہی لوگ ہر قسم کے لہو لعب، ناچ نغمہ اور تعیش پسندی کے انتہائی دلدادہ بھی تھے، ان کے ہاں کھیل تماشے کے وسیع میدان تھے، جن میں اسی ہزار (۸۰۰۰۰) لوگوں کی گنجائش تھی، ان میں کبھی تو انسانوں کے مابین آپس میں مقابلہ آرائی کر کے دل بہلاتے تھے اور کبھی انسانوں اور درندوں کے مابین مقابلہ آرائی کراتے، تماشائیوں کو دو قسم نیلے اور سبز رنگوں میں تقسیم کرتے تھے، وہ حسن و جمال کے دلدادہ تھے اور ظلم و جبر اور درندگی کے عاشق تھے، اکثر و بیشتر ان کے کھیل خونریز اور المناک ہوتے تھے، ان کی سزائیں اتنی خوفناک ہوتی تھیں جن کو دیکھ کر لرزہ طاری ہو جاتا تھا، ان کے امراء و قائدین اور خواص کی زندگی بے شرمی، اسراف، سازشوں، چاپلوسی، برائیوں اور بری خصلتوں کا مجموعہ تھی۔(السيرة النبوية، علامہ ندویؒ، ص: 31)

۲: ایرانی سلطنت:

ایرانی سلطنت "فارسی یا کسروی" سلطنت کے نام سے معروف تھی، وہ مشرقی رومن سلطنت سے کہیں بڑی اور وسیع تھی، اس میں منحرف مذاہب کی کثرت تھی جیسے کی زردشت مذہب، مانی مذہب جس کی بنیاد تیسری صدی عیسوی کے اوائل میں "مانی" نے ڈالی، اس کے بعد پانچویں صدی عیسوی میں مزدکی مذہب کا ظہور ہوا، جس نے ہر چیز میں کھلی بے حیائی کی دعوت دی، جس کے نتیجے میں کسانوں کی طرف سے بغاوت شروع ہوئی اور امراء کے محلات کی لوٹ مار میں اضافہ ہوتا گیا، وہ لوٹ مار کرتے، عورتوں کو قید کرتے، مال و دولت اور جائیداد پر قابض ہو جاتے، پوری زمین، کھیتوں اور مکانات کی حالت ایسی ہو گئی ایسا لگتا تھا جیسے کہ وہ کبھی آباد ہی نہیں ہوئے ہوں۔

ان کے بادشاہ مورثی نظام کے مطابق حکومت کرتے تھے، اپنے آپ کو انسانوں سے بالاتر سمجھتے تھے، اس لئے کہ وہ اپنے آپ کو معبودوں اور خداؤں کی نسل میں شمار کرتے تھے، سلطنت کے تمام ذرائع ان ہی کی ملکیت اور تصرف میں تھے، وہ ان میں انتہائی عیاشی اور اسراف کے ساتھ تصرف کرتے تھے جس کا تصور بھی ممکن نہیں ہے، لیکن ان کی زندگی جانوروں کی سی زندگی تھی، یہاں تک کہ تنگ آکر بہت سے کسانوں نے کام کرنا ہی چھوڑ دیا، وہ چرچوں اور عبادت گاہوں میں ٹیکسوں سے اور فوجی خدمات سے پریشان ہو کر بھاگ گئے، ان کو خون ریز اور ہلاکت خیز جنگوں میں ڈھال کے طور پر استعمال کیا جاتا جو رومیوں اور فارسیوں کے مابین سالہا سال تک جاری رہیں، وہاں عوام اور رعایا کا کام صرف امراء اور بادشاہوں کی خواہش کی تکمیل تھی۔ (السیرۃ النبویۃ، علامہ ندویؒ، ص: 33)

۳: ہندوستان:

تمام مؤرخین کا اس پر اتفاق ہے کہ ہندوستان میں دینی، اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی اعتبار سے سب سے زیادہ بدترین دور وہ رہا ہے جس کا آغاز چھٹی صدی عیسوی سے ہوتا ہے، اس دور میں بے حیائی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی یہاں تک کہ عبادت گاہوں میں بھی، اس لئے کہ عبادت گاہوں میں ان کو تقدس حاصل تھا، عورت کی کوئی قیمت اور اس کی عزت و عصمت کی کوئی اہمیت نہیں تھی، جس عورت کا شوہر مر جاتا اس کو اسی کے ساتھ جلانے "ستی" کی رسم عام تھی، ہندوستان دوسری دنیا کے مقابلہ میں طبقاتی عدم مساوات اور انسانوں کے مابین فرق و امتیاز میں ممتاز تھا، اس امتیازی سلوک کو سماجی، سیاسی، اور مذہبی پشت پناہی حاصل تھی، جس کو ان ہندوستانی قانون سازوں نے وضع کیا تھا جن کو مذہبی حیثیت بھی حاصل تھی، یہی معاشرہ کا عمومی قانون اور دستورِ حیات بن گیا تھا، ہندستان سخت قسم کی انارکی، انتشار اور طوائف الملوکی کا شکار تھا، وہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم تھا جو اکثر برسرِ پیکار رہتی تھیں، ہندوستان دنیا سے کٹ کر، عالمی حالات سے بے خبر ہو کر الگ تھلگ زندگی گزار رہا تھا جہاں بدامنی، بدانتظامی، رسم و رواج کی کثرت، طبقاتی امتیاز اور قومی و نسلی تعصب رائج تھا۔

ایک ہندو مؤرخ ودیا دھر مہاجن (سابق پروفیسر تاریخ، پنجاب یونیورسٹی) اسلام کی آمد سے قبل ہندوستان کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہندوستانی معاشرہ جمود اور کمزوری کا شکار تھا، وہاں ذات پات کی پابندیاں شدید تھی، ایک خاندان اور دوسرے خاندان کے مابین شرمناک حد تک امتیاز تھا، ان کے ہاں بیواؤں کو شادی کی اجازت نہیں دی جاتی تھی، کھانے پینے کے سلسلہ میں شدید پابندیاں تھیں، اچھوت شہر کے باہر رہنے پر مجبور تھے". (السیرۃ النبویۃ للندوي، ص:39)

ہندوستان کے باشندوں کو چار طبقوں میں تقسیم کردیا گیا تھا:

1) مذہب کے اجارہ دار اور پروہت جن کو "برہمن" کہا جاتا تھا۔

2) سپاہی اور فوج میں بھرتی ہونے والے افراد، یعنی چھتری۔

3) زراعت پیشہ اور تجارت کرنے والے یعنی ویش۔

4) نوکر چاکر اور خدمت گار یعنی "اچھوت" اور "شودر" یہ آخری طبقہ ذلت و پستی کی آخری منزل میں تھا، اس کے متعلق یہ تصور تھا کہ وہ خالقِ کائنات کے پاؤں سے پیدا ہوا ہے اور اس کا کام صرف ان تینوں طبقوں کی خدمت کرنا اور ان کو راحت و آرام پہنچانا ہے۔

اس قانون نے برہمنوں کو مرکزیت عطا کی تھی اور ان کو اتنا بلند مقام اور ان کے حقوق دیئے تھے جن میں کوئی ان کے برابر نہ تھا۔ برہمن کے تمام گناہ معاف تھے اگرچہ وہ تینوں دنیاؤں کو اپنے گناہوں اور بداعمالیوں سے تباہ و برباد کردے، اس پر کوئی ٹیکس نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ اس کو کسی بھی صورت میں سزائے موت نہیں دی جاسکتی تھی، اس کے برعکس "اچھوت" نہ کچھ کما سکتے تھے، نہ جمع کرسکتے تھے، نہ کسی برہمن کے قریب بیٹھ سکتے تھے، اور نہ ہی مقدس کتابوں کو پڑھ سکتے تھے"۔

(اس قانون کی تفصیلات اور دفعات جاننے کے لئے "منو شاستر" کا مطالعہ کریں۔ باب 1،2،8،9،10،11 بحوالہ: السیرۃ النبویۃ، علامہ ندویؒ، ص:38)

دوسرا باب

بعثتِ نبویؐ سے پہلے دنیا کی صورت حال

اسلام کی عظیم صبحِ صادق کے طلوع ہونے سے پہلے انسانیت اپنے تمام مذہبی، معاشی، سیاسی اور اجتماعی امور میں تاریخ انسانی کے تاریک ترین اور گھٹیا دور میں زندگی بسر کر رہی تھی، اور زندگی کے تمام معاملات میں عمومی انارکی سے دوچار تھی، عقائد وافکار، تصورات اور قلب ودماغ میں جاہلی رجحانات غالب تھے، جہالت، خواہش پرستی، بے دینی، برائیاں، غرور وتکبر اور ظلم وزیادتی جیسی بُری عادتیں اس وقت رائج وغالب اور جاہلی طور طریقہ کی امتیازی پہچان بن چکی تھیں۔ (دیکھیں: الغرباءالأولون، سلمان العودۃ، ص57)

آسمانی مذاہب میں تبدیلی، تحریف اور تغیر کی وجہ سے زندگی میں ان کی اثر انگیزی تقریبا ختم ہو کر رہ گئی تھی، اور اس کی وجہ سے ان کی یہ اہمیت بھی ختم ہو گئی کہ یہ اللہ کی مخلوق کی جانب اس کا پیغام ہے، اہل مذاہب ایسے عقائدی اور نظریاتی جھگڑوں میں مشغول ہو گئے جن کی اصل وجہ ان مذاہب میں انسانی افکار اور غلط قسم کے تصورات کا داخل ہونا تھا، یہاں تک کہ ان اختلافات کی وجہ سے ان کے درمیان خونریز جنگیں تک ہوئیں، ان میں سے جو لوگ تحریف وتبدیلی کرنے سے محفوظ رہے وہ انتہائی قلیل اور نادر تھے، اور انہوں نے عمومی زندگی سے کنارہ کشی اختیار کرنے کو ترجیح دی اور اُنہوں نے گوشہ نشینی اور علٰحیدگی اختیار کر کے اپنے آپ کو بچانے میں عافیت سمجھی، اس لئے کہ وہ اصلاح سے بالکل مایوس ہو گئے تھے اور فساد وبگاڑ ہر قسم کے لوگوں تک اور ہر میدان میں بلا استثناء داخل ہو گیا تھا، چنانچہ دینی اعتبار سے لوگ یا تو دین سے مرتد ہو گئے تھے یا اس میں سرے سے داخل ہی نہیں ہوئے تھے یا پھر آسمانی مذاہب میں تحریف وتبدیلی کے مرتکب ہو گئے تھے۔ اور جہاں تک قانونی پہلو کا تعلق ہے تو لوگوں نے اللہ کی شریعت کو پس پشت ڈال دیا تھا اور خود ساختہ قوانین اور من گھڑت شریعتیں گڑھ لی تھیں جو عقل وفطرت اور قوانین الٰہیہ سے متصادم تھیں۔

اس فساد وبگاڑ کی باگ ڈور اور قیادت قوم کے لیڈروں، راہبوں، پادریوں، قبائل کے سرداروں اور بادشاہوں کے ہاتھ میں تھی اور پوری دنیا گھٹاٹوپ تاریکی اور خوفناک رات میں تبدیل ہو کر اللہ کے عطا کردہ نظام حیات سے انحراف کا شکار تھی۔

یہودیت چند بے جان رسموں اور روایات کا مجموعہ تھی، جن میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہ تھی اور نہ ہی کوئی روح، یہودیوں نے اپنی پڑوسی قوموں کے اثر سے یا غالب وفاتح عوام کے دباؤ سے ان کے بہت سے عقائد کو قبول کر لئے تھے، ان کی بہت سی بت پرستانہ جاہلی رسمیں اختیار کر لیں، اس کا اعتراف خود یہودیوں کے مؤرخین نے کیا ہے۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویۃ، ابوالحسن ندویؒ، ص:20)

"جیویش انسائیکلوپیڈیا" کا مقالہ نگار لکھتا ہے: "بت پرستی کے خلاف انبیاء کا غیظ وغضب یہ ظاہر کرتا ہے کہ دیوتاؤں کی پرستش اسرائیلی عوام کے دلوں میں گھر کر چکی تھی اور بابل کی جلاوطنی سے واپس آنے کے وقت تک پوری طرح اس کا استیصال نہیں ہوا تھا، انہوں نے بہت سے مشرکانہ عقائد اور خرافات اختیار کر لئے تھے، تلمود سے بھی اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ بت پرستی میں یہود کے لئے بڑی جاذبیت اور کشش تھی۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویہ، ابوالحسن ندویؒ، ص:20)

بعثتِ نبویؐ سے پہلے یہودی معاشرہ ذہنی پستی و زوال اور مذہبی ذوق کے بگاڑ کی انتہا کو پہنچ گیا تھا، اگر آپ بابل کی تلمود کا مطالعہ کریں گے جس کی تقدیس میں یہود مبالغہ آرائی کرتے ہیں اور وہی چھٹی صدی عیسوی میں یہودیوں کے ہاں متداول ورائج تھی، آپ کو اس میں کم عقلی، بدزبانی، خدا کے حضور جسارت و گستاخی، حقائق و مسلمات اور دین و عقل کے ساتھ تمسخر واستہزاء کے عجیب و غریب نمونے ملیں گے۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویہ، ابوالحسن ندویؒ، ص: 20)

جہاں تک عیسائیت کا تعلق ہے تو وہ اپنے دورِ اول ہی سے انتہا پسندوں کی تحریف اور جاہلوں کی تاویل کا شکار ہو گئی تھی، توحید اور اخلاص کے ساتھ اللہ کی عبادت کا نور گہرے بادلوں کے اندر چھپ چکا تھا۔ (سابقہ حوالہ: ص: 20)

اس وقت شام و عراق کے عیسائیوں اور مصر کے عیسائیوں کی جنگ پورے شباب پر تھی، یہ جنگ حضرت عیسی علیہ السلام کی حقیقت وماہیت کے موضوع پر ہو رہی تھی اور اس کی وجہ سے مدارس، کلیسا اور گھر سب متحارب کیمپ میں تبدیل ہو گئے تھے، عیسائی معاشرہ میں بت پرستی مختلف شکلوں اور متنوع رنگوں میں ظاہر ہو گئی تھی۔

"مسیحیت علم جدید کی روشنی میں" کتاب کا مصنف لکھتا ہے: ''بت پرستی ختم تو ہوئی مگر مکمل تباہ نہیں ہوئی بلکہ جذب کرلی گئی، تقریباً سب ہی کچھ جو بت پرستی میں تھا، عیسائیت کے نام سے چلتا رہا، جن لوگوں کو اپنے دیوتاؤں اور مشاہیر سے ہاتھ دھونے پڑے تھے، انہوں نے غیر شعوری طور پر بہت آسانی سے کسی شہید کو پرانے دیوتاؤں کے اوصاف سے متصف کر کے کسی مقامی مجسمہ کو اس کا نام دے دیا، اور اس طرح مشرکانہ عمل اور بت پرستی ان شہداء کے نام پر منتقل ہو گئی، اس صدی کے اختتام کو پہنچتے پہنچتے ان اولیاء اور شہداء کی پوجا پرستش عام ہو گئی تھی، اور خدائی اوصاف سے متصف اولیاء کے عقیدہ کی بنیاد پڑ گئی، ان اولیاء نے ایک جانب تو 'آرایوسین' کے عقائد کی بنا پر انسان اور خدا کے درمیان واسطے اور وسیلے کی شکل اختیار کرلی اور دوسری جانب یہ قرونِ وسطی کے تقدس اور پارسائی کا نشان بن گئے، بت پرستانہ تہوار قبول کر کے ان کے نام بدل دئے گئے، یہاں تک کہ سن 400 تک پہنچتے پہنچتے سورج دیوتا کے قدیم تہوار نے عیسی علیہ السلام کی یوم پیدائش کی شکل اختیار کرلی"۔ (السیرۃ النبویۃ، ابوالحسن ندویؒ، ص: 23)

"جدید کیتھولک انسائیکلوپیڈیا" کا مقالہ نگار "عقیدہ تثلیث" کے متعلق لکھتا ہے: "یہ عقیدہ کہ خدائے واحد تین اقانیم سے مرکب ہے، عیسائی دنیا کی پوری زندگی اور افکار میں چوتھی صدی کے آخر ہی میں سرایت کر چکا تھا، اور طویل عرصہ تک سرکاری اور تسلیم شدہ عقیدہ کی حیثیت سے پوری مسیحی دنیا میں قابل اتباع اور باقی رہا، یہاں تک کہ انیسویں صدی عیسوی کے نصف ثانی میں اس عقیدہ کے بغیر اور اس شکل تک پہنچنے کا راز فاش ہوا''۔ (مقالہ تثلیث مقدس 395/14)

عیسائیوں کے مابین جنگ وجدال اپنے عروج پر تھا، وہ ایک دوسرے کی تکفیر میں مشغول اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، اس کی وجہ سے عیسائیوں کو اس کی فرصت نہ تھی کہ عالمگیر فساد کے انسداد اور اصلاحِ حال کی کوشش کرتے اور انسانیت کو فلاح و نجات کا راستہ دکھاتے۔ (دیکھیں: فتح العرب لمصر، تعریب: محمد ابو حدید، ص 48/38/37)۔

جہاں تک مجوسیوں (ایران کے پارسیوں) کا تعلق ہے تو وہ قدیم زمانہ سے ہی طبعی عناصر کی عبادت کرنے میں معروف رہے ہیں، جس میں آگ کی پوجا سب سے مقدم تھی، ملک کے طول و عرض میں آتش کدے اور آتش پرستی عام تھی، اس کے لئے مخصوص قسم کی عبادت گاہیں تعمیر کی گئی تھی، اس کے لئے بہت منظم اور دقیق قوانین اور اصول متعین کیے گئے تھے، جن پر عملدر آمد لازمی تھا، عبادت گاہوں سے باہر وہ بالکل آزاد تھے، جہاں وہ اپنی مرضی اور خواہشِ نفس کے مطابق زندگی گزارتے تھے، ایک مجوسی اور ایک بے دین، بے ضمیر اور بے کردار شخص کے مابین کوئی فرق اور امتیاز باقی نہیں رہا تھا۔

"ایران بعہد ساسانیان" کے مصنف 'آرتھر کرسٹین سین' نے اس زمانہ کے مذہبی فرائض اور ذمہ داریوں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ: "سرکاری ملازمین کے لئے لازمی تھا کہ وہ دن میں چار بار سورج کی پوجا کریں، چاند کی، آگ کی اور پانی کی پوجا اس کے علاوہ تھی، سونے، جاگنے، نہانے، زنار پہننے، کھانے پینے، حجامت بنوانے، ناخن ترشوانے، قضائے حاجت اور شمع جلانے ہر کام کے لئے دعائیں تھیں، اور ان کا ذکر کرنا ان پر ضروری تھا، اس کی پابندی بھی ضروری تھی کہ آگ کسی وقت بجھنے نہ پائے اور آگ اور پانی ایک دوسرے سے نہ ملیں، دھات کو زنگ نہ لگے، اس لئے کہ معدنیات بھی ان کی نگاہ میں مقدس تھیں"۔ (ایران بعہد ساسانیان، ص: 155، بحوالہ: السیرۃ النبویۃ، ابوالحسن ندویؒ، ص27)

اہل ایران آگ کی طرف رخ کر کے عبادت کرتے تھے، ایران کے آخری بادشاہ یزدگرد نے ایک مرتبہ سورج کی قسم کھاتے ہوئے یہ جملہ کہا تھا کہ "میں سورج کی قسم کھاتا ہوں جو سب سے بڑا معبود ہے"۔ اہل ایران ہر دور میں ثنویت کا تصور وعقیدہ رکھتے رہے ہیں، یہاں تک کہ یہ ان کی علامت اور پہچان بن گئی، وہ دو خداؤں کے قائل تھے، ایک روشنی یا خیر کا خدا "یزداں" اور دوسرا ظلمت یا شر کا خدا "اہرمن"۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویہ، ابوالحسن ندویؒ، ص: 27)

جہاں تک ہندوستان اور وسط ایشیا میں موجود بدھ مذہب کا تعلق ہے تو وہ بھی ایک بت پرستانہ مذہب میں تبدیل ہو گیا تھا، جہاں بھی وہ جاتے بت ان کے ساتھ رہتے تھے، وہاں بدھ کی مورتی نصب کی جاتی اور معبد تیار کیا جاتا۔ (ایضاً، ص: 28)

اور جہاں تک ہندو مذہب کا تعلق ہے جو کہ ہندوستان کا قدیم مذہب رہا ہے تو وہ دیوی دیوتاؤں کی کثرت میں دوسرے مذاہب سے بہت آگے ہے، چھٹی صدی میں بت پرستی اس میں پورے شباب پر تھی، اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہندو مذہب اور بدھ مت دونوں بت پرستی میں برابر ہیں، اس وقت کی آباد دنیا بحر اوقیانوس سے لیکر بحر الکاہل تک بت پرستی میں غرق تھی، عیسائیت، سامی مذہب، بدھ مت بتوں کی تعظیم و تکریم میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش میں مصروف تھے۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر قسم کے لوگوں میں اور ہر میدان میں اس بگاڑ کی عمومیت کی جانب اشارہ فرمایا ہے، ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے خطبہ کے دوران ارشاد فرمایا: "سن لو! بیشک میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں آپ کو وہ سکھاؤں جو اس نے مجھے آج کے دن سکھایا ہے، ہر وہ مال جو میں بندے کو عطا کروں وہ اس کے لئے حلال ہے، میں نے اپنے بندوں کو شرک کی ہر آمیزش سے پاک اور موحد پیدا کیا ہے، ان کے پاس شیاطین آئے تو ان کو ان کے اصل دین سے ہٹا دیا اور ان کے لئے ان چیزوں کو حرام کر دیا جو میں نے ان کے لئے حلال

کی تھیں، انہوں نے ان کو میرے ساتھ شرک کرنے پر آمادہ کیا جس کی میں نے کوئی دلیل نازل نہیں کی تھی، اللہ تعالی نے تمام روئے زمین کے لوگوں کو دیکھا تو ان میں عرب و عجم سب کو برائیوں میں مبتلا پایا سوائے اہل کتاب کے بعض بچے ہوئے لوگوں کو"۔(صحیح مسلم، کتاب الجنۃ، حدیث: 2865)

اس حدیث میں انسانوں کے متعدد پہلوؤں میں انحراف کی جانب توجہ دلائی گئی ہے، جیسے کہ اللہ کے ساتھ شرک کرنا، اس کی شریعت کو پس پشت ڈالنا، ادیان سماویہ کے حاملین کا فساد و بگاڑ کا شکار ہونا اور لوگوں کی گمراہی میں ان کا ساتھ دینا۔ (الغرباء الأولون، ص:59)

....

ا: عربوں کی اصل اور ان کی تہذیب

ا: عربوں کی اصل:

مؤرخین نے عربوں کو ان کے نسب کے اعتبار سے تین قسموں میں تقسیم کیا ہے:

1) عرب بائدہ: اس قسم میں عاد، ثمود، عمالقہ، طسم، جدیس، اُمیم، جرہم، حضرموت اور ان کی نسل سے متعلق دیگر قبائل شامل ہیں، اسلام کی آمد سے پہلے ہی یہ قبائل ختم ہو چکے تھے اور ان کے آثار اور اثرات بھی ماند پڑ گئے تھے، ان میں ایسے بادشاہ بھی تھے جن کی حکومت شام اور مصر تک پھیلی ہوئی تھی۔ (دیکھیں: فقہ السیرۃ النبویہ، عضبان، ص:45)

2) عرب عاربہ: یہ وہ عرب ہیں جو یعرب بن یشحب بن قحطان کی نسل سے تھے، ان کو قحطانی عرب بھی کہا جاتا ہے۔"جنوبی عربوں" کے نام سے معروف ہیں، ان میں یمن، معین، سبأ، حمیر کے بادشاہ بھی گزرے ہیں۔(السیرۃ النبویۃ، ابوشہبہ: 1/47)

3) عدنانی عرب: عدنانی عرب ان کو عدنان کی جانب نسبت کرتے ہوئے کہا جاتا ہے، جن کا نسب حضرت اسماعیل بن ابراہیم علیہما السلام تک پہنچتا ہے، ان کو عرب مستعربہ بھی کہا جاتا ہے، یعنی وہ عرب جن کی نسل میں غیر عرب اقوام کا خون بھی شامل ہو گیا اور دونوں طرح کے خون آپس میں مل گئے اور عربی زبان اس نئی نسل کی زبان بن گئی۔

اس نسل میں شمالی عرب داخل ہیں جن کا اصل وطن مکہ مکرمہ تھا اور ان میں حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی اولاد شامل ہیں۔ قبیلہ جرہم وہ قبیلہ ہے جن سے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے عربی زبان سیکھی، ان کی نسل میں شادیاں کیں اور ان کی اولاد انہی کی طرح عربوں کے مثل پروان چڑھی، اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے اہم ترین شخصیت نبی کریم ﷺ کے جد امجد "عدنان" ہیں اور عدنان ہی کی نسل میں عرب قبائل اور تمام عرب کی شاخیں آتی ہیں، عدنان کے بعد ان کے بیٹے 'معد' اور پھر 'نزار' آتے ہیں اور نزار کے بعد ان کے دو بیٹے مضر اور ربیعہ آتے ہیں۔

جہاں تک ربیعہ بن نزار کا تعلق ہے تو ان کی نسل سے پیدا ہونے والے مشرقی علاقہ میں آباد ہوئے، قبیلہ عبدالقیس بحرین میں آباد ہوا، قبیلہٗ حنیفہ نے یمامہ میں سکونت اختیار کی، بنو بکر بن وائل نے بحرین اور یمامہ کے درمیانی علاقہ کو آباد کیا، قبیلہ تغلب نے فرات کو عبور کرکے دجلہ اور فرات کے مابین جزیرہ میں قیام کیا اور قبیلہٗ تمیم بصرہ کے دیہاتی علاقے میں آباد ہوا۔(مدخل لفہم السیرۃ، ص: 99-98)

جہاں تک قبیلہٗ مضر کا تعلق ہے تو ان کی نسل سے پیدا ہونے والے قبائل میں قبیلہٗ سلیم مدینہ کے قریب آباد ہوا، قبیلہ ثقیف طائف میں آباد ہوا، پورے قبیلہ ہوازن نے مکہ کے مشرق کو اپنا وطن بنالیا، قبیلہ اسد نے تیماء کے مشرق میں کوفہ کے مغربی علاقہ تک سکونت اختیار کی، قبیلہٗ ذبیان اور عبس نے تیماء سے حوارن تک کے علاقہ کو آباد کیا۔(دیکھیں: الطریق الی المدائن، عادل کمال، ص40)

جمہورِ ماہرینِ انساب اور دیگر علماء نے عربوں کو عدنانی اور قحطانی قبائل میں تقسیم کیا ہے، جب کہ بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ عدنانی اور قحطانی تمام عرب اصلاً حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد سے ہیں اور وہی ان کے جدامجد ہیں۔(دیکھیں: السیرۃ النبویۃ، ابوشہبہ، 1/48)

امام بخاریؒ نے اپنی 'صحیح' میں اس کے لئے یوں باب قائم کیا ہے: "باب نسبۃ الیمن الی اسماعیل علیہ السلام" (یعنی اسماعیل علیہ السلام کی جانب یمن کی نسبت کے سلسلہ میں باب) اس باب میں امام بخاریؒ نے حضرت ام سلمہؓ سے ایک حدیث نقل کی ہے کہ وہ فرماتی ہیں: اللہ کے رسول ﷺ کچھ لوگوں کے پاس سے گزرے جو تیر اندازی کا مقابلہ کررہے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: بنی اسماعیل تیر اندازی کرو اور میں فلاں قبیلہ کے ساتھ ہوں۔ ان میں سے ایک سے آپؐ نے فرمایا۔(یہ سن کر) وہ رک گئے تو آپؐ نے ان سے پوچھا: آپ کو کیا ہوا، کیوں رک گئے؟ انہوں نے جواب دیا: ہم کیسے تیر اندازی کرسکتے ہیں جب کہ آپ فلاں قبیلہ کے ساتھ ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: تیر اندازی کرو، میں آپ سب کے ساتھ ہوں۔ (صحیح بخاری: 3507)

بعض روایات میں ہے: بنی اسماعیل! تیر اندازی کرو کیونکہ تمہارے والد (جدامجد) تیر انداز تھے۔(صحیح بخاری: 2899، مسند اُحمد 4/50، ابن حبان: 4693)

امام بخاریؒ فرماتے ہیں: اور اسلم بن افصی بن حارثہ بن عامر کا تعلق قبیلہ خزاعہ سے ہے، یعنی خزاعہ کا تعلق اُن قبائل سبأ سے ہے جو "سیل العرم" طوفان کی وجہ سے منتشر ہوئے تھے۔(السیرۃ النویۃ، ابوشہبہ 1/48)

اور اللہ کے رسول ﷺ کا تعلق بھی قبیلہٗ مضر سے ہے، امام بخاریؒ نے کلیب بن وائل سے نقل کیا ہے فرماتے ہیں کہ مجھ سے نبی کریم ﷺ کی سوتیلی بیٹی زینب بنت ابی سلمہ نے بیان کیا جب کہ میں نے ان سے دریافت کیا کہ آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا نبی ﷺ کا تعلق قبیلہ مضر سے ہے؟ انہوں نے جواب دیا: مضر کے علاوہ اور کس سے آپ کا تعلق ہوسکتا ہے؟! آپؐ بنوالنضر بن کنانہ سے تھے۔(صحیح بخاری: 3491)

قریش بھی کنانہ ہی کی ایک شاخ تھی اور یہ سب فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ کی اولاد ہیں اور قریش مختلف قبائل میں منقسم ہوئے، ان میں مشہور قبائل یہ تھے: جمح، سہم، عدی، مخزوم، تیم، زہرہ اور قصي بن کلاب کی الگ الگ شاخیں (اور وہ سب عبدالدار بن قصی سے تعلق

رکھتے ہیں)اسد بن عبد العزی بن قصی، عبد مناف بن قصی۔اور عبد مناف کی چار شاخیں تھیں: عبد شمس، نوفل، مطلب، ھاشم۔اور ہاشم کی شاخ وہ ہے جس سے سیدنا محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب بن ہاشم ﷺ کو منتخب کیا گیا۔(دیکھیں: فقہ السیرۃ النبویہ، عضبان، ص:47)

آپ ﷺ کا فرمان ہے: اللہ تعالیٰ نے کنانہ کو اولادِ اسماعیل میں سے منتخب کیا، اور قریش کو کنانہ سے منتخب کیا، اور قریش کو بنی ھاشم سے اور مجھے بنی ہاشم سے منتخب کیا۔(مسلم:2276، ترمذی: 3605، 3606 مسند أحمد 107/4)

۲: جزیرۃ العرب کی تہذیبیں اور تمدن:

عرب میں قدیم زمانہ میں اعلیٰ تہذیبیں اور عظیم تمدن پروان چڑھے جن میں سے مشہور تہذیبیں مندرجہ ذیل ہیں:

ا: یمن میں قومِ سبأ کی تہذیب:

قرآنِ کریم نے اس تہذیب کا ذکر کیا ہے، یمن میں وہاں کے باشندوں نے بارشوں اور سیلاب کے پانی کو کام میں لایا جو ریت میں ضائع ہو جاتا تھا اور سمندروں میں جا پہنچتا تھا، انہوں نے اس کی ذخیرہ اندوزی کے لئے انجینئر نگ کے ترقی یافتہ طریقے اختیار کر کے بڑے بڑے باندھ تعمیر کئے اور ان میں معروف ترین بندھ "سد مأرب" ہے، اس کے پانی کو مختلف کھیتوں اور نفیس باغوں کی سینچائی میں استعمال کیا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكَنِهِمْ ءَايَةٌ جَنَّتَانِ عَن يَمِينٍ وَشِمَالٍ كُلُواْ مِن رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَٱشْكُرُواْ لَهُۥ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَرَبٌّ غَفُورٌ ﴿١٥﴾ فَأَعْرَضُواْ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ ٱلْعَرِمِ وَبَدَّلْنَٰهُم بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ أُكُلٍ خَمْطٍ وَأَثْلٍ وَشَيْءٍ مِّن سِدْرٍ قَلِيلٍ ﴿١٦﴾ ذَٰلِكَ جَزَيْنَٰهُم بِمَا كَفَرُواْ وَهَلْ نُجَٰزِيٓ إِلَّا ٱلْكَفُورَ ﴿١٧﴾﴾ ترجمہ: ''سبأ کے لئے اُن کے اپنے مسکن ہی میں ایک نشانی موجود تھی، دو باغ دائیں اور بائیں کھاؤ، اپنے رب کا دیا ہوا رزق، اور شکر بجا لاؤ اُس کا، ملک ہے عمدہ و پاکیزہ اور پروردگار ہے بخشش فرمانے والا - مگر وہ منہ موڑ گئے آخر کار ہم نے اُن پر بند توڑ سیلاب بھیج دیا اور ان کے پچھلے دو باغوں کی جگہ دو اور باغ انہیں دئے جن میں کڑوے کسیلے پھل اور جھاؤ کے درخت تھے اور کچھ تھوڑی سی بیریاں - یہ تھا ان کے کفر کا بدلہ جو ہم نے ان کو دیا، اور ناشکرے انسان کے سوا ایسا بدلہ ہم اور کسی کو نہیں دیتے:-(سورۃ سبأ:17-15)

قرآن کریم کے بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ ماضی میں یمن اور حجاز اور شام کے درمیان کچھ متصل بستیاں آباد تھیں، اور تجارتی قافلہ اور مسافر یمن سے شام کی جانب چلتے تھے تو پورے سفر میں کہیں سایہ کی، پانی کی، کھانے کی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ ٱلْقُرَى ٱلَّتِي بَٰرَكْنَا فِيهَا قُرًى ظَٰهِرَةً وَقَدَّرْنَا فِيهَا ٱلسَّيْرَ سِيرُواْ فِيهَا لَيَالِيَ وَأَيَّامًا ءَامِنِينَ ﴿١٨﴾ فَقَالُواْ رَبَّنَا بَٰعِدْ بَيْنَ أَسْفَارِنَا وَظَلَمُوٓاْ أَنفُسَهُمْ فَجَعَلْنَٰهُمْ أَحَادِيثَ وَمَزَّقْنَٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَءَايَٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ ﴿١٩﴾﴾ ترجمہ: ''اور ہم نے اُن کے اور اُن بستیوں کے درمیان، جن کو ہم نے برکت عطا کی تھی، نمایاں بستیاں بسادی تھیں اور اُن میں سفر کی مسافتیں ایک اندازے پر رکھ دی تھیں، چلو پھرو اِن راستوں میں رات دن پورے امن کے

ساتھ۔ مگر انہوں نے کہا "اے ہمارے رب، ہمارے سفر کی مسافتیں لمبی کر دے" انہوں نے اپنے اوپر آپ ظلم کیا، آخر کار ہم نے انہیں افسانہ بنا کر رکھ دیا اور انہیں بالکل تتر بتر کر ڈالا، یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ہر اُس شخص کے لئے جو بڑا صابر و شاکر ہو"۔ (سورہ سبأ: 19-18)

2: احقاف میں قوم عاد کی تہذیب:

قوم عاد حضر موت کے شمال میں آباد تھی، انہی کی جانب اللہ تعالیٰ نے ہود علیہ السلام کو مبعوث فرمایا تھا، قوم مضبوط و مستحکم عمارتوں، متنوع کارخانوں، سر سبز و شاداب باغات، کھیتوں اور چشموں کی وجہ سے مشہور زمانہ رہی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿كَذَّبَتْ عَادٌ ٱلْمُرْسَلِينَ ﴿١٢٣﴾ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ هُودٌ أَلَا تَتَّقُونَ ﴿١٢٤﴾ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿١٢٥﴾ فَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١٢٦﴾ وَمَآ أَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۖ إِنْ أَجْرِىَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ ٱلْعَٰلَمِينَ ﴿١٢٧﴾ أَتَبْنُونَ بِكُلِّ رِيعٍ ءَايَةً تَعْبَثُونَ ﴿١٢٨﴾ وَتَتَّخِذُونَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ ﴿١٢٩﴾ وَإِذَا بَطَشْتُم بَطَشْتُمْ جَبَّارِينَ ﴿١٣٠﴾ فَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١٣١﴾ وَٱتَّقُوا۟ ٱلَّذِىٓ أَمَدَّكُم بِمَا تَعْلَمُونَ ﴿١٣٢﴾ أَمَدَّكُم بِأَنْعَٰمٍ وَبَنِينَ ﴿١٣٣﴾ وَجَنَّٰتٍ وَعُيُونٍ ﴿١٣٤﴾﴾ ترجمہ: "عاد نے رسولوں کو جھٹلایا۔ یاد کرو جبکہ ان کے بھائی ہودؑ نے ان سے کہا تھا" کیا تم ڈرتے نہیں؟!۔ میں تمہارے لئے ایک امانت دار رسول ہوں ۔لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں میرا اجر تو رب العالمین کے ذمہ ہے۔ یہ تمہارا کیا حال ہے کہ ہر اونچے مقام پر لا حاصل ایک یادگار عمارت بنا ڈالتے ہو۔ اور بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے ہو گویا تمہیں ہمیشہ رہنا ہے۔ اور جب کسی پر ہاتھ ڈالتے ہو جبّار بن کر ڈالتے ہو۔ پس تم لوگ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ ڈرو اُس سے جس نے وہ کچھ تمہیں دیا ہے جو تم جانتے ہو۔ تمہیں جانور دیئے، اولادیں دیں، باغ دیئے اور چشمے دیئے"۔ (سورۃ الشعراء: 134-123)

3- حجاز میں قوم ثمود کی تہذیب:

قرآن کریم کی آیات سے پتہ چلتا ہے کہ (الحجر) علاقہ بھی ایک تہذیب کا گہوارہ رہا ہے، اور وہاں کے باشندے پہاڑوں کو تراش کر عمارتیں بنانے میں ماہر تھے، اور ان کا علاقہ چشموں، باغات اور کھیتوں سے مالا مال تھا۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویہ، ابوشہبہ 1/50)

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿كَذَّبَتْ ثَمُودُ ٱلْمُرْسَلِينَ ﴿١٤١﴾ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ صَٰلِحٌ أَلَا تَتَّقُونَ ﴿١٤٢﴾ إِنِّى لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿١٤٣﴾ فَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١٤٤﴾ وَمَآ أَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۖ إِنْ أَجْرِىَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ ٱلْعَٰلَمِينَ ﴿١٤٥﴾ أَتُتْرَكُونَ فِى مَا هَٰهُنَآ ءَامِنِينَ ﴿١٤٦﴾ فِى جَنَّٰتٍ وَعُيُونٍ ﴿١٤٧﴾ وَزُرُوعٍ وَنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيمٌ ﴿١٤٨﴾ وَتَنْحِتُونَ مِنَ ٱلْجِبَالِ بُيُوتًا فَٰرِهِينَ ﴿١٤٩﴾ فَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١٥٠﴾﴾ ترجمہ: "ثمود نے رسولوں کو جھٹلایا۔ جب ان سے ان کے بھائی صالح نے کہا، کیا تم ڈرتے نہیں ۔ میں تمہارے لئے اللہ کا ایک امانتدار رسول ہوں۔ پس تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں، میرا اجر تو بس اللہ رب العالمین کے ذمہ ہے ۔ کیا تمہیں رہنے دیا جائے گا اس (عیش وطرب) میں جس میں تم یہاں ہو ہر خطرے سے محفوظ۔ باغوں

اور چشموں میں - کھیتوں اور نخلستانوں میں جن کے خوشے رس بھرے ہیں - تم پہاڑ کھود کھود کر فخریہ ان میں عمارتیں بناتے ہو۔ پس اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو](سورۃ الشعراء: 150 -141)

ان کے بارے میں مزید ارشاد فرمایا: ﴿وَٱذْكُرُوٓاْ إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنۢ بَعْدِ عَادٍ وَبَوَّأَكُمْ فِى ٱلْأَرْضِ تَتَّخِذُونَ مِن سُهُولِهَا قُصُورًا وَتَنْحِتُونَ ٱلْجِبَالَ بُيُوتًا ۖ فَٱذْكُرُوٓاْ ءَالَآءَ ٱللَّهِ وَلَا تَعْثَوْاْ فِى ٱلْأَرْضِ مُفْسِدِينَ﴾ ترجمہ: "یاد کرو وہ وقت جب اللہ نے قوم عاد کے بعد تمہیں اس کا جانشین بنایا اور تم کو زمین میں یہ منزلت بخشی کہ تم اُس کے ہموار میدانوں میں عالی شان محل بناتے اور اس کے پہاڑوں کو مکانات کی شکل میں تراشتے ہو پس اس کی قدرت کے کرشموں سے غافل نہ ہو جاؤ اور زمین میں فساد برپا نہ کرو"۔ (سورۂ اعراف: 74)

یہ سب کچھ بہت پہلے قصۂ پارینہ بن گیا اور ان کے صرف کچھ نشانات، کھنڈرات اور ٹیلے باقی رہے، بستی اور شہر ویران ہو گئے، مکانات اور محلات اجڑ گئے، چشمے اور درخت سوکھ گئے، اور باغات اور کھیتیاں بنجر زمین میں تبدیل ہو گئی"۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویۃ، ابو شہبہ: 1/51)

....

تیسرا باب

عربوں کے مذہبی، سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور اخلاقی حالات

ا: مذہبی اور دینی حالات:

عرب لوگ انتہائی دینی پسماندگی، گھٹیا اور نا قابل مثال بت پرستی، اخلاقی و معاشرتی بگاڑ، سیاسی اور قانونی انارکی میں مبتلا ہو گئے تھے، اس لئے ان کا مقام و مرتبہ بھی گر گیا تھا اور وہ تاریخ کے حاشیہ پر زندگی بسر کرنے لگے، بہتر حالات میں بھی وہ یا تو فارسی سلطنت یا پھر رومی سلطنت کے تابعِ فرمان رہتے تھے، ان کے دلوں میں آباء واجداد کے ورثہ کی عظمت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، اور ان کی اتباع کو باعث فخر واعتزاز سمجھتے تھے، اگرچہ اس میں انحراف، بے راہ روی اور گمراہی ہی کیوں نہ ہو، یہیں سے ان کے ہاں بت پرستی کا آغاز ہو گیا، اور ہر قبیلہ کا مخصوص بت ہوتا تھا۔ ہزیل بن مدرکہ کا 'سواع' نامی بت تھا، کلب کے لئے 'ود' مذحج کے لئے 'یغوث' خیوان کے لئے 'یعوق' حمیر کے لئے "نسر" مخصوص تھا، اور قبیلۂ خزاعہ اور قریش اساف اور نائلہ کی عبادت کرتے تھے۔ مناۃ ساحل سمندر پر تھا، تمام عرب اور خاص طور پر اوس اور خزرج کے لوگ اس کو پوجتے تھے۔ 'لات' قبیلۂ ثقیف میں تھا اور 'عزیٰ' ذاتِ عرق کے بالائی علاقے میں تھا، اور یہ قریش کے نزدیک سب سے بڑا بت سمجھا جاتا تھا۔ (دیکھیں،: الغرباء الأولون، ص: ٦٠)

ان تمام بڑے بتوں کے علاوہ ان کے ہاں نا قابل شمار چھوٹے چھوٹے بت تھے جن کو سفر میں ساتھ لے جانا اور گھروں میں رکھنا ان کے لئے آسان ہوتا تھا، امام بخاریؒ نے اپنی 'صحیح' میں أبورجاء العطاردی سے نقل کیا ہے وہ کہتے ہیں: ''ہم پتھروں کو پوجا کرتے تھے جب ہم کو اس سے اچھا کوئی پتھر مل جاتا تھا تو پہلے والے کو پھینک دیتے تھے اور اچھے والے کو لے کر اس کی پوجا کرتے تھے، اگر ہمیں کوئی پتھر نہیں ملتا تھا تو مٹی کا ڈھیر جمع کرتے تھے، اس کے بعد بکری لا کر اس پر اُس کو دوہتے تھے اور پھر اس کا طواف کرتے تھے!''۔ (صحیح بخاری: 4376)

یہ گھٹیا بت پرستی عربوں کے درمیان اور اللہ تعالی کی معرفت، اس کی عظمت و توقیر، اس پر ایمان اور یوم آخرت پر ایمان لانے کے درمیان رکاوٹ بن گئی تھی، اگرچہ ان کا تصور یہ تھا کہ ان بتوں کی حیثیت ان کے اور اللہ کے درمیان وسیلہ اور قریب کرنے کا ذریعہ ہونے سے زیادہ کچھ نہیں ہے، لیکن یہ خود ساختہ بت ان کے دلوں پر، اعمال و تصرفات پر اور زندگی کے تمام شعبوں میں غالب اور حاوی تھے اور ان کے دلوں میں اللہ تعالی کی عظمت انتہائی کمزور اور مضمحل ہو چکی تھی، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿إِنَّمَا يَسْتَجِيبُ ٱلَّذِينَ يَسْمَعُونَ وَٱلْمَوْتَىٰ يَبْعَثُهُمُ ٱللَّهُ ثُمَّ إِلَيْهِ يُرْجَعُونَ﴾ ترجمہ: ''دعوت حق پر لبیک وہی لوگ کہتے ہیں جو سننے والے ہیں، رہے مُردے، تو انہیں تو اللہ بس قبروں ہی سے اٹھائے گا اور پھر وہ (اس کی عدالت میں پیش ہونے کے لئے) اسی کے پاس واپس لائے جائیں گے''۔ (سورۃ أنعام: 36)

جہاں تک تعلق ہے دینِ ابراہیمی کے باقی ماندہ حصہ کا تو وہ بھی تحریف و تبدیلی اور تغیر کا شکار ہو گیا تھا، چنانچہ حج فخر و مباہات اور آپسی عداوت کے اظہار کا تہوار بن گیا تھا، اور ملتِ ابراہیمیؑ کے دیگر اعمال و عقائد بھی اپنی اصل حقیقت سے انحراف کا شکار ہو گئے تھے اور ان کے ساتھ بہت سارے اوہام و خرافات شامل کر دیئے گئے تھے۔

البتہ اس زمانہ میں حنیفیت پر قائم بعض افراد بھی پائے جاتے تھے، جو بت پرستی اور اس سے متعلق دیگر چیزوں کا انکار کرتے تھے، انہی افراد میں زید بن عمرو بن نفیل بھی تھے وہ بتوں کے نام پر جانور ذبح نہیں کرتے تھے، نہ ہی مردار اور خون کھاتے تھے اور کہا کرتے تھے:

أربا واحدا أم ألف رب　　أدين إذا تقسمت الأمور؟

عزلت اللات والعزى جميعا　　كذلك يفعل الجلد الصبور

فلا عزى أدين ولا ابنتيها　　ولا صنمي بني عمرو أزور

ولا هبلا أدين وكان ربا لنا　　في الدهر، إذ حلمي يسير

ولكن أعبد الرحمن ربي　　ليغفر ذنبي الرب الغفور

ترجمہ: کیا ایک رب بہتر ہے یا ہزار یا ہزار ربوں کو میں مانوں جبکہ تمام امور کو تقسیم کر دیا گیا ہو؟!۔ میں نے لات و عزیٰ سب سے کنارہ کشی اختیار کرلی، ایک ڈٹ کر رہنے والا جواں مرد ایسا ہی کرتا ہے۔ نہ میں عزیٰ کو مانتا ہوں اور نہ ہی میں اس کی دونوں بیٹیوں کو مانتا ہوں، اور نہ ہی میں بنو عمرو کے دونوں بتوں کے قریب جاتا ہوں۔ اور نہ ہی میں "غنم" (ھبل) کو مانتا ہوں حالانکہ ایک زمانہ تک ہم اس کو اپنا رب مانتے رہے، جب کہ میری عقل چھوٹی تھی۔ لیکن میں اپنے رب رحمان کی عبادت کرتا ہوں تاکہ وہ رب غفور میرے گناہوں کو معاف فرما دے- (السیرۃ النبویۃ، ابن کثیر 1/163)

اسی طرح حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی شریعت پر قائم رہنے والوں میں قسس بن ساعدہ الایادی بھی تھے، وہ ایک خطیب، عقلمند اور زیرک شخصیت کے مالک تھے، وہ فضل و کمال کے حامل تھے اور اللہ کو ایک ماننے، اس کی عبادت کرنے اور بتوں کی عبادت ترک کرنے کی دعوت دیتے تھے، وہ بعث بعد الموت پر بھی ایمان رکھتے تھے، انہوں نے نبی کریم ﷺ کے بارے میں پیشن گوئی بھی کر دی تھی۔ ابو نعیم نے "دلائل النبوۃ" (1/104-105، حدیث نمبر 55) میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں:

"قسس بن ساعدہ سوق عکاظ میں اپنی قوم کے سامنے تقریر کر رہے تھے تو انہوں نے اپنی تقریر میں کہا: عنقریب اس سمت سے حق ظاہر ہو جائے گا، اور انہوں نے مکہ کی جانب اشارہ کیا، لوگوں نے دریافت کیا: یہ حق کیا ہے؟ انہوں نے کہا: لؤی بن غالب کی اولاد میں سے ایک ایسا شخص جو تمہیں کلمۂ اخلاص، ہمیشہ کی زندگی اور نہ ختم ہونے والی نعمتوں کی طرف دعوت دے گا، لہذا جب وہ تمہیں دعوت دے تو اس پر لبیک کہنا اور اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میں ان کی بعثت تک زندہ رہتا تو میں ان کی پکار پر لبیک کہنے والا پہلا شخص ہوتا۔ چنانچہ انہوں نے نبی

کریم ﷺ کے زمانہ کو پایا لیکن آپ ﷺ کی بعثت سے پہلے ہی ان کا انتقال ہوگیا"۔(السیرۃ النبویہ فی ضوء القرآن والسنہ، أبو شہبہ 1/80)

وہ اپنے یہ اشعار اکثر پڑھا کرتے تھے:

في الذّاهبين الأوّلين	من القرون لنا بصائر
لمّا رأيت مواردا	للموت، ليس لها مصادر
ورأيت قومي نحوها	يمضي الأصاغر والأكابر
لا يرجع الماضي ولا	ينجو من الباقين غابر
أيقنت أنّي لا محا لة	حيث صار القوم صائر

ترجمہ: "پچھلی نسلوں اور اقوام میں سے گزر جانے والوں میں ہمارے لئے عبرت ونصیحت کا سامان موجود ہے۔ جب میں نے دیکھا کہ سب موت کے گھاٹ پر جاتے ہیں لیکن وہاں سے کوئی واپس نہیں آتا ہے اور میں نے اپنی قوم کو دیکھا کہ تمام چھوٹے بڑے اس (گھاٹ) کی جانب رواں دواں ہیں، اور نہ ہی ماضی میرے پاس لوٹ کر آتا ہے اور نہ ہی موت کے منہ میں جانے والا کوئی واپس آتا ہے، یہ سب دیکھ کر میں نے یقین کرلیا کہ میں بھی اسی انجام سے دوچار ہونے والا ہوں جس انجام سے سب لوگ دوچار ہوئے"۔(السیرۃ النبویۃ فی ضوء القران والسنۃ، ابو شہبہ 1/80)

بعض عرب کے لوگوں نے عیسائیت اختیار کی تھی، بعض یہودیت میں داخل ہوگئے تھے، لیکن جہاں تک اکثریت کا تعلق ہے تو وہ بتوں کی پوجا و پرستش میں مبتلا تھے۔

۲: سیاسی صورتحال:

جزیرۃ العرب کے باشندے شہری اور دیہاتی دو (۲) قسموں میں منقسم تھے اور ان کے ہاں قبائلی نظام رائج تھا، یہاں تک کہ وہاں کے متمدن سلطنتوں میں بھی یہی قبائلی نظام عام تھا، جیسے کہ جنوب میں یمن کا علاقہ، شمال مشرق میں حیرہ کا علاقہ اور شمال مغرب میں غساسنہ کی حکومت، ان میں کوئی بھی گروہ قبیلہ سے الگ نہیں ہو سکتا تھا، بلکہ تمام قبائل آپس میں مضبوط و مستحکم اکائیوں کی حیثیت سے زندگی گزارتے تھے۔

عرب قبیلہ مختلف لوگوں کے مجموعہ کا نام تھا جن کے درمیان خون اور نسب رابطہ کا کام کرتا تھا، اسی ربط و تعلق کو بنیاد بنا کر ان کے ہاں سماجی اور معاشرتی قانون بنا تھا جو فرد و جماعت کے حقوق و فرائض کے سلسلہ میں تنظیم کا کام کرتا تھا، اور سیاسی و معاشرتی نظام میں اسی سماجی قانون کی پاسداری قبیلہ کی ذمہ داری ہوتی تھی۔(السیرۃ النبویۃ فی ضوء القرآن والسنۃ، ابو شہبہ 1/60)

قبیلہ کے سردار کو قیادت کے لئے قبیلہ میں اس کے مقام و مرتبہ، اس کی شجاعت و بہادری، شرافت و سخاوت جیسی صفات وخصوصیات کی بنیاد پر منتخب کیا جاتا تھا، قبیلہ کے سردار کے کچھ سماجی اور مادی حقوق ہوا کرتے تھے، سماجی حقوق میں اہم ترین اس کی عزت و

توقیر، اس کے حکم کی بجاآوری اور اس کے فیصلہ کو تسلیم کرنا شامل تھا، اور جہاں تک مادی حقوق کا تعلق ہے تو سردار کے لئے یہ اموال خاص تھے:

ہر مال غنیمت میں سے "المرباع" چوتھائی حصہ۔ "الصفایا" مال غنیمت کی تقسیم سے پہلے جو وہ خود اپنے لئے منتخب کر لے۔ "النشیطة" وہ مال جو دشمن سے مڈبھیڑ سے پہلے ہی حاصل ہو جائے۔ "الفضول" مال غنیمت کی وہ چیزیں جن کو تقسیم نہ کیا جاسکتا ہو۔

ایک عربی شاعر نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس کو بیان کیا ہے:

لك المرباع فينا، والصفايا　　　وحكمك، والنشيطة والفضول

ترجمہ: ''آپ ہی کے لئے ہمارے درمیان "مرباع" اور "صفایا" ہے اور آپ ہی کا حکم قابل اطاعت و تسلیم ہے اور "نشیطہ" اور "فضول" بھی آپ ہی کا حق ہے''۔

ان حقوق کے مقابلہ میں سردارِ قبیلہ کے ذمہ کچھ فرائض اور ذمہ داریاں عائد تھیں، حالت امن میں وہ فیاض اور سخی ہوا کرتا تھا اور حالتِ جنگ میں وہ اگلی صفوں میں ہوتا تھا اور صلح اور معاہدوں میں وہی ذمہ دار ہوتا تھا۔

قبائلی نظام میں حریت و آزادی کا ماحول ہوتا تھا، ایک عربی شخص آزادانہ ماحول میں پروان چڑھتا، اسی لئے حریت و آزادی عربوں کی اہم ترین خصوصیات میں شمار ہوتی ہے، جو ان کی گھٹی میں پڑی تھیں اور ہر قسم کی ذلت ورسوائی اور ظلم کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے تھے، قبیلہ کا ہر فرد اپنے قبیلہ کی نصرت و مدد کرتا تھا، اس کے کارناموں اور خصائص کو فخریہ انداز میں بیان کرتا تھا اور قبیلہ کے ہر فرد کی حق وناحق ہر حال میں مدد کرتا تھا یہاں تک کہ یہ ان کا بنیادی شعار بن گیا تھا: ''انصر أخاك ظالما أو مظلوما''۔ یعنی: ''اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم"۔ (صحیح بخاری: 6952/2444/2443 مسند أحمد: 3/99)

ان کا شاعر اس کی منظر کشی اس طرح کرتا ہے:

ولا يسألون أخاهم حين يندبهم　　　في النائبات على ما قال برهانا

ترجمہ: ''ان کا بھائی جب مصیبت و آزمائش کے موقع پر ان کو پکارتا ہے تو وہ اس سے کسی دلیل کا مطالبہ نہیں کرتے ہیں۔

ان کے قبیلہ کا ہر فرد جماعت کے تابع فرمان ہوتا تھا، اجتماعی رائے پر ان کا فخر و اعتزاز اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ فرد کی شخصیت جماعت کی شخصیت میں تحلیل ہو جاتی تھی، درید بن الصمۃ کہتا ہے:

وهل أنا إلا من غزية إن غوت　　　غويت وإن ترشد غزية أرشد

ترجمہ: ''میں تو بس قبیلۂ غزیہ کا ایک فرد ہوں اگر وہ بے راہ روی کا شکار ہو جائے تو میں بھی اس راہ پر چل پڑوں گا اور اگر غزیہ راہ راست پر چلے تو میں بھی راہ راست پر چلوں گا''۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویۃ، أبو شہبہ 1/61)

عرب قبائل میں سے ہر قبیلہ کی مخصوص سیاسی حیثیت ہوتی تھی اور اسی حیثیت کی بنیاد پر وہ دیگر قبیلوں کے ساتھ معاہدہ کرتا تھا، اور اسی کی بنیاد پر وہ کسی قبیلہ کے خلاف بر سرِ پیکار ہوتا تھا، عرب قبائل کے مابین ہونے والے مشہور معاہدوں میں "حلف الفضول" (حلف المطیبین) کے معاہدوں کو شمار کیا جاسکتا ہے۔(دیکھیں: دراسۃ تحلیلیۃ لشخصیۃ الرسول، ﷺ، محمّد قلعجی، ص:31)

قبیلوں کے مابین جنگیں مسلسل چھڑتی رہتی تھیں، ان جنگوں میں مشہور ترین فجار کی جنگ ہے۔(ایضاً، ص: 35/34/33)

ان بڑی جنگوں کے علاوہ قبائل میں کچھ انفرادی حملوں کا سلسلہ بھی رہتا تھا، جن کا سبب بعض اوقات شخصی اور انفرادی اسباب ہوتے تھے یا پھر کبھی حصول رزق ومال بھی ہوتا تھا، اس لئے کہ بعض قبائل روزی روٹی کے لئے اکثر وبیشتر تلوار ہی کا سہارا لیتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ہر قبیلہ کو یہ ڈر رہتا تھا کہ دوسرا قبیلہ رات یا دن کسی بھی وقت اس پر حملہ آور ہو سکتا ہے، اور اس کے مال مویشی اور اسباب کو لوٹ کر ان کے گھروں کو ویران کر سکتا ہے۔(ایضاً: ص:35)

۳: معاشی واقتصادی حالات:

جزیرۃ العرب کا اکثر علاقہ وسیع وعریض ریگستان پر مشتمل ہے، یہی وجہ ہے کہ زراعت اور کھیتی باڑی اس علاقے میں مفقود تھی، سوائے یمن، شام اور بعض آس پاس کے میدانی علاقوں کے۔ دیہاتی علاقوں میں اونٹوں اور بھیڑ بکریوں کو چرایا جاتا تھا، گھاس کی تلاش میں قبائل ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے تھے، ان کو خیموں میں ہی استقرار اور ٹھہراؤ نصیب ہوتا تھا۔

جہاں تک صنعت وحرفت کا تعلق ہے ان کی نگاہ میں اس کی زیادہ اہمیت نہیں تھی، اس سے بے اعتنائی برتتے تھے، اور غلاموں اور عجمیوں کو اس طرح کے کاموں میں لگاتے تھے، یہاں تک کہ جب انہوں نے خانہ کعبہ کی تعمیر کرنے کا ارادہ کیا انہوں نے ایک قبطی شخص کی خدمت حاصل کی جو جدہ میں غرق ہونے والی کشتی سے بچ نکلا تھا اور اس کے بعد وہ مکہ میں مقیم ہو گیا تھا۔ (فقہ السیرۃ النبویۃ، منیر غضبان، ص:60)

اگرچہ جزیرۃ العرب زراعت وصنعت کی نعمت سے محروم تھا لیکن افریقہ اور مشرقی ایشیاء کے درمیان اہم جائے وقوع پر ہونے کی وجہ سے وہ اس وقت عالمی تجارت کا ایک بڑا مرکز بن گیا تھا، جزیرۃ العرب کے باشندوں میں تجارت پیشہ افراد میں شہروں کے لوگ بطور خاص اہل مکہ میں پیش پیش تھے، تجارتی میدان میں ان کو ایک نمایاں مرکزیت حاصل تھی، اہلِ حرم ہونے کی وجہ سے عربوں کے دلوں میں ان کو ایک اہم مقام حاصل تھا، عام عرب نہ ان کے ساتھ تعرض کرتے تھے اور نہ ہی ان کی تجارت کو کوئی نقصان پہنچاتے تھے، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان پر یہ احسان جتلایا ہے: ﴿أَوَلَمْ يَرَوْاْ أَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا ءَامِنًا وَيُتَخَطَّفُ ٱلنَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ۚ أَفَبِٱلْبَٰطِلِ يُؤْمِنُونَ وَبِنِعْمَةِ ٱللَّهِ يَكْفُرُونَ﴾ ترجمہ: ’’کیا یہ دیکھتے نہیں ہیں کہ ہم نے ایک پُر امن حرم بنادیا ہے حالانکہ اِن کے گردوپیش لوگ اُچک لئے جاتے ہیں؟ کیا پھر بھی یہ لوگ باطل کو مانتے ہیں اور اللہ کی نعمت کا کفران کرتے ہیں؟‘‘۔(سورۃ عنکبوت:67)

قریش دو مشہور تجارتی سفر کرتے تھے: سردیوں میں یمن کا سفر اور گرمیوں میں شام کا سفر۔ وہ امن واطمینان کے ساتھ سفر کیا کرتے تھے، جبکہ ان کے آس پاس کے لوگوں پر ڈاکے ڈال کر پریشان کیا جاتا تھا، ان دو سفروں کے علاوہ بھی سال بھر وہ مختلف سفر کرتے رہتے تھے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لِإِيلَٰفِ قُرَيْشٍ ① إِۦلَٰفِهِمْ رِحْلَةَ ٱلشِّتَآءِ وَٱلصَّيْفِ ② فَلْيَعْبُدُوا۟ رَبَّ هَٰذَا ٱلْبَيْتِ ③ ٱلَّذِىٓ أَطْعَمَهُم مِّن جُوعٍ وَءَامَنَهُم مِّنْ خَوْفٍۭ ④﴾ ترجمہ: "اس لئے کہ قریش کو مانوس کر دیا۔ ان کو جاڑے اور گرمی کے سفر سے مانوس کرنے کے باعث۔ ان کو اس گھر کے مالک کی عبادت کرنی چاہیے۔ جس نے ان کو بھوک میں کھلایا اور ان کو خوف سے امن دیا"۔ (سورہ قریش: 1-4)

یہ تجارتی قافلے اپنے ساتھ عطر، بخور، لوبان، مسالے، کھجور، خوشبودار لکڑی، ہاتھی دانت، آبنوس، جواہرات، چمڑا، یمنی چادریں، ریشمی کپڑے، اسلحہ اور جزیرۃ العرب میں پائی جانے والی یا درآمد کی ہوئی اشیاء ساتھ لے کر جاتے تھے، یہ چیزیں لے کر وہ شام اور دیگر علاقوں میں جاتے تھے اور وہاں سے گیہوں، گلہ، کشمش، زیتون، شامی مصنوعات اور دیگر اشیاء لے کر آتے تھے۔

اہل یمن بھی تجارت میں مشہور تھے، ان کی تجارت خشکی اور سمندری دونوں راستوں سے ہوتی تھی، انہوں نے افریقہ کے سواحل، ہندوستان، انڈونیشیا، سومطرہ، ایشیائی ممالک کے دیگر شہروں اور بحر ہند کے ساحلی علاقوں کی جانب رخت سفر باندھا، انہوں نے جب اسلام قبول کیا تو ان علاقوں میں اسلام کا پیغام پہنچانے کے سلسلہ میں ان کا اہم رول رہا ہے۔

جزیرۃ العرب میں سودی لین دین عام تھا، شاید عربوں کی جانب یہ مہلک مرض یہود کے ذریعہ پہنچا۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویۃ، أبو شہبہ 101-1/98)

اشراف قوم اور معاشرہ کے دیگر لوگ سب اس مرض میں مبتلا تھے، بسا اوقات سود کی نسبت سو فیصد سے بھی زیادہ ہوتی تھی۔ (دیکھیں: دراسۃ تحلیلیۃ لشخصیۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم، ص 19)

عربوں کے ہاں بعض مشہور بازار اور میلے لگتے تھے، ان میں معروف ترین یہ ہیں: عکاظ، مجنّہ، ذوالمجاز۔ بعض مؤلفین نے مکہ کے حالات میں ذکر کیا ہے کہ عرب ذیقعدہ کے آغاز میں سوق عکاظ میں قیام کرتے تھے، وہاں سے ذی قعدہ کے بیس دن گزارنے کے بعد مجنہ جاتے تھے، جب وہ ذوالحجہ کا ہلال دیکھتے تو پھر ذوالمجاز چلے جاتے، وہاں آٹھ راتیں قیام کرتے، اس کے بعد عرفہ جاتے اور عرفہ میں اور ایام منی میں خرید وفروخت نہیں کرتے تھے، یہاں تک کہ اسلام آیا، تو اسلام نے وہاں خرید وفروخت کو جائز قرار دیا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَبْتَغُوا۟ فَضْلًا مِّن رَّبِّكُمْ ۚ فَإِذَآ أَفَضْتُم مِّنْ عَرَفَٰتٍ فَٱذْكُرُوا۟ ٱللَّهَ عِندَ ٱلْمَشْعَرِ ٱلْحَرَامِ ۖ وَٱذْكُرُوهُ كَمَا هَدَىٰكُمْ وَإِن كُنتُم مِّن قَبْلِهِۦ لَمِنَ ٱلضَّآلِّينَ﴾ ترجمہ: "اور اگر حج کے ساتھ ساتھ اپنے رب کا فضل بھی تلاش کرتے جاؤ، تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں پھر جب عرفات سے چلو، تو مشعر حرام (مزدلفہ) کے پاس ٹھہر کر اللہ کو یاد کرو اور اُس طرح یاد کرو جس کی ہدایت اس نے تمہیں دی ہے، ورنہ اس سے پہلے تم لوگ بھٹکے ہوئے تھے"۔ (سورۂ بقرہ: 198)

اسلام کا سورج طلوع ہونے کے بعد ایک زمانہ تک یہ بازار جاری رہے، اس کے بعد ختم ہو گئے، یہ بازار صرف تجارت کے لئے نہیں تھے بلکہ ان بازاروں میں ادبی، شعری اور خطابت کی محفلیں بھی ہوتی تھیں، جن میں بلند پایہ شعراء میں اور خطباء جمع ہوتے تھے، اپنے حسب ونسب، مفاخر اور کارنامے ذکر کرنے میں مقابلہ آرائی کرتے تھے، اس اعتبار سے یہ بازار تجارتی مراکز ہونے کے ساتھ ساتھ لغت وادب کے بھی اہم مراکز اور سرچشمہ ہوتے تھے۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویۃ، أبو شہبہ: 1/102)

۴: معاشرتی وسماجی حالات:

عربوں کی زندگیوں میں رسم ورواج اور تقالید کا بہت غلبہ تھا، حسب ونسب، قبائل اور افراد کے مابین آپسی تعلقات کے سلسلہ میں ان کے ہاں کچھ مخصوص سماجی قوانین بن گئے تھے، ان کی معاشرتی حالت کو مندرجہ ذیل نکات میں بیان کیا جاسکتا ہے:

(الف): حسب ونسب پر انتہائی فخر واعتزاز:

وہ اپنے نسب کی حفاظت کے انتہائی حریص تھے، اسی لئے وہ دیگر اقوام کے ہاں رشتے نہیں کرتے تھے، جب اسلام آیا تو اسلام نے اس نسلی تفاخر کا خاتمہ کیا اور واضح کیا کہ افضلیت کا معیار تو صرف تقویٰ اور عمل صالح پر ہے۔

ب: زبان وبیان اور شعر گوئی پر فخر واعتزاز:

عرب فصیح زبان اور بلیغ اسلوب کے بے تاج بادشاہ تھے، ان کے اشعار میں ان کے کارناموں اور حسب ونسب کا ریکارڈ موجود تھا اور ان کے علوم ومعارف اور جذبات واحساسات کی ترجمانی بھی اشعار ہی کے ذریعہ ہوتی تھی، لہٰذا اس میں کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے اگر ان میں شعلہ بیان خطباء اور بلند پایہ شعراء پیدا ہوئے، شعر کا ایک مصرعہ کسی قبیلہ کو عزت وبلندی کے عروج پر پہنچا دیتا تھا، جب کہ کوئی مصرعہ کسی قبیلہ کی ذلت ورسوائی اور پستی کا ذریعہ بنتا تھا، اسی لئے شاعر کا کسی قبیلہ میں پیدا ہونا ان کے لئے سب سے زیادہ خوشی کا سبب ہوتا ہے۔

ج: عربی معاشرہ میں عورت کی حیثیت:

بہت سے عرب قبائل میں عورت کی حیثیت گرے پڑے مال ومتاع کی سی تھی، اس کو بطورِ وراثت تقسیم کیا جاتا تھا، باپ کی وفات کے بعد بڑے بیٹے کو یہ حق دیا جاتا تھا کہ وہ اپنی سوتیلی ماں سے نکاح کرلے یا نکاح کے بغیر اس کو آزاد کردے، یہاں تک کہ اسلام نے اس طرح کے نکاح کو حرام اور کالعدم قرار دیا، بیٹا اپنے باپ کی بیوی سے شادی کیا کرتا تھا تو اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا: ﴿وَلَا تَنكِحُواْ مَا نَكَحَ ءَابَآؤُكُم مِّنَ ٱلنِّسَآءِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ۚ إِنَّهُۥ كَانَ فَٰحِشَةً وَمَقْتًا وَسَآءَ سَبِيلًا﴾ ترجمہ: ''اور جن عورتوں سے تمہارے باپ نکاح کرچکے ہوں اُن سے ہرگز نکاح نہ کرو، مگر جو پہلے ہوچکا سو ہوچکا، درحقیقت یہ ایک بے حیائی کا فعل ہے، ناپسندیدہ ہے اور بُرا چلن ہے''۔ (سورۂ نساء: 22)

عام طور پر عربوں کے ہاں اصول (جیسے کہ مائیں)، فروع (جیسے کہ بیٹیاں)، باپ کی فروع (جیسے کہ بہنیں) اور دادا کی طرف سے فروع کا پہلا طبقہ (جیسے کہ خالہ اور پھوپھی) کو حرام سمجھا جاتا تھا. (دیکھیں: دراسۃ تحلیلیۃ لشخصیۃ الرسول ﷺ، ص: 24،23،22)

اسی طرح بیٹیوں کو، عورتوں کو اور بچوں کو وراثت کے حق سے محروم رکھا جاتا تھا، اسی کو وراثت دیتے تھے جو مالِ غنیمت حاصل کرتا اور گھوڑے پر سوار ہو کر جنگ کرتا۔ عورتوں اور بچوں کو وراثت سے محروم رکھنا ان کے ہاں اس وقت تک معمول رہا یہاں تک کہ رسول ﷺ کے عہد میں حضرت اوس بن ثابت کی وفات ہوئی اور انہوں نے اپنے پیچھے ایک بیٹا اور دو بیٹیاں چھوڑیں جو شکل و صورت میں اچھی نہیں تھیں، ان کے چچا کے دو بیٹے - جو عصبہ تھے - آئے اور پوری میراث پر قبضہ کر لیا، حضرت اوس ؓ کی زوجہ نے ان دونوں سے کہا: ان دو لڑکیوں سے شادی کر لو، لیکن انہوں نے ان کی بدصورتی کی وجہ سے انکار کر دیا، وہ اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! اوس کی وفات ہو گئی اور اپنے پیچھے ایک بیٹا اور دو بیٹیاں چھوڑی ہیں۔ ان کے چچا کے دو بیٹے سوید اور عرطفہ آئے اور ان کی پوری میراث لے گئے۔ میں نے ان دونوں سے کہا کہ ان کی بیٹیوں سے نکاح کر لو مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا: "میراث میں سے کسی بھی چیز کو ابھی ہاتھ مت لگانا"۔ (الدر المنثور، 2/439)

اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نازل ہوا: ﴿لِّلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ ٱلْوَٰلِدَانِ وَٱلْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ ٱلْوَٰلِدَانِ وَٱلْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ ۚ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا﴾ ترجمہ: ''مردوں کے لئے اُس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو، اور عورتوں کے لئے بھی اُس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو، خواہ تھوڑا ہو یا بہت، اور یہ حصہ (اللہ کی طرف سے) مقرر ہے''۔ (سورۂ نساء: 7) (تفصیل کے لئے دیکھیں: تفسیر قرطبی: 5/45)

عرب بیٹیوں کو باعثِ ننگ و عار سمجھتے تھے، اس لئے کہ بیٹی نہ تو جنگ میں شریک ہو سکتی تھی اور نہ ہی حملہ آوروں سے اپنی حفاظت کر سکتی تھی، نہ ہی مردوں کی طرح کام کر کے مال کما سکتی تھی، اور اگر اس کو قید کیا جاتا تو صرف نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لئے استعمال کی جاتی، کئی کئی افراد کی بے جا ہوس کا نشانہ بنتی، بلکہ بدکاری کو بطور پیشہ اور حصول مال کے لئے اس کو مجبور کیا جاتا، تاکہ اس کا آقا اس کے حاصل کئے ہوئے مال پر قابض ہو سکے اور عربوں کے ہاں یہ چیز جائز تھی، یہی وجہ تھی کہ جب کسی کے ہاں بیٹی کی ولادت ہوتی تو باپ کو عار، غم اور فکر لاحق ہوتی، قرآن کریم نے اس صورتحال کی منظر کشی کی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِٱلْأُنثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُۥ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ﴿٥٨﴾ يَتَوَٰرَىٰ مِنَ ٱلْقَوْمِ مِن سُوٓءِ مَا بُشِّرَ بِهِۦٓ ۚ أَيُمْسِكُهُۥ عَلَىٰ هُونٍ أَمْ يَدُسُّهُۥ فِى ٱلتُّرَابِ ۗ أَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُونَ﴾

ترجمہ: ''جب ان میں سے کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اُس کے چہرے پر کلونس چھا جاتی ہے اور وہ بس خون کا سا گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے، لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے کہ اِس بری خبر کے بعد کیا کسی کو منہ دکھائے، سوچتا ہے کہ ذلت کے ساتھ بیٹی کو لئے رہے یا مٹی میں دبا دے؟ دیکھو کیسے بُرے حکم ہیں جو یہ خدا کے بارے میں لگاتے ہیں''۔ (سورۂ نحل: 59-58)

اکثر و بیشتر اس کو مٹی تلے دفن کرنے اور زندہ در گور کر دینے کو ترجیح دیتے تھے، اس کا گناہ صرف یہ ہوتا کہ وہ لڑکی ہے۔(دیکھیں: دراسة وتحليلة لشخصية الرسول صلى الله عليه وسلم، ص: 26-25)

اسی لئے قرآن کریم نے ان کے اس عمل شنیع پر نکیر کی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ ۝ بِأَيِّ ذَنبٍ قُتِلَتْ﴾ ترجمہ: ''اور جب زندہ در گور کی ہوئی بچی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس قصور میں ماری گئی؟۔(سورہ التکویر 9-8)

بعض عرب لوگ اپنی اولاد کو فقر و غریبی کی وجہ سے یا صرف غریبی کے ڈر کی وجہ سے قتل کر دیتے تھے، اسلام نے آکر اس کو حرام قرار دیا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ ۖ نَّحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ ۚ إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْئًا كَبِيرًا﴾ ترجمہ: ''اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشہ سے قتل نہ کرو، ہم انہیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی، درحقیقت اُن کا قتل ایک بڑی خطا ہے''۔ (سورۃ الاسراء: 31)

البتہ بعض قبائل بچیوں کو زندہ در گور نہیں کرتے تھے، اسی طرح ان میں ایسے افراد بھی تھے جو اس عمل شنیع کو برا سمجھتے تھے، جیسے کہ زید بن عمرو بن نفیل۔(دیکھیں: السیرۃ النبویۃ، اُبو شہبہ 1/92)۔

اسی طرح بعض قبائل عورت کو احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اور شادی کے سلسلہ میں اس کی رائے کا لحاظ کرتے تھے، آزاد عرب عورت اپنے شوہر کے علاوہ کسی اور کے ساتھ رہنے اور تعلق قائم کرنے کو باعثِ عار سمجھتی تھی، وہ شجاعت و بہادری کی صفات سے متصف تھی، جنگ کرنے والوں کے ساتھ جاتی اور ان کی حوصلہ افزائی کرتی تھی اور ضرورت پڑنے پر قتال اور جنگ میں بھی شریک ہوتی، دیہاتی عرب عورت اپنے شوہر کے ساتھ جانور چرانے میں اور ان کو پانی پلانے میں معاونت کرتی تھی، اور اون کاتتی تھی اور کپڑے، چادریں اور لباس بُن کر تیار کرتی تھی لیکن یہ سب کچھ پاکدامنی اور اپنی عفت کی حفاظت کے ساتھ کرتی تھی۔(دیکھیں: السیرۃ النبویہ، اُبو شہبہ 1/88)

ھ: نکاح اور شادی:

عربوں میں کئی طرح کے نکاح متعارف تھے اور ان میں سے کسی طرح کے نکاح کو بھی باعث عیب و شرم نہیں سمجھا جاتا تھا، ام المؤمنین سیدہ عائشہؓ نے نکاح کے ان رائج طریقوں کو بیان کیا ہے، فرماتی ہیں: "زمانۂ جاہلیت میں نکاح چار طریقوں سے ہوتا تھا:

1) ایک طریقۂ نکاح تو وہی تھا جو آج لوگوں میں رائج ہے، ایک شخص دوسرے شخص کے پاس جا کر اس کے زیرِ کفالت لڑکی یا اس کی بیٹی کے لئے پیغام نکاح دیتا اور مہر دے کر اس لڑکی سے نکاح کر لیتا۔

2) نکاح کا دوسرا طریقہ یہ رائج تھا کہ کوئی مرد اپنی بیوی سے کہتا کہ جب تو حیض سے پاک ہو جائے تو فلاں کو پیغام بھیج دینا اور اس سے ازدواجی تعلق قائم کر لینا، یہ شوہر اس سے علیحدگی اختیار کر لیتا اور اس وقت تک اس سے تعلق قائم نہ کرتا یہاں تک کہ جس مرد سے اس نے تعلق قائم کیا ہے اس کے نطفہ سے اس کا حمل واضح ہو جاتا، اور جب حمل واضح ہو جاتا تو اس کا شوہر چاہتا تو اس سے تعلق قائم کر لیتا، اور ایسا وہ اس لئے کرتے تھے تا کہ ہونے والی اولاد ذہین و فطین اور اعلیٰ صفات پیدا ہو، اس نکاح کو "نکاح استبضاع" کہتے تھے۔

3) نکاح کاایک طریقہ یہ رائج تھا کہ کم وبیش دس آدمی ایک عورت کے پاس جمع ہوتے اور وہ تمام باری باری اس سے تعلق قائم کرتے، جب حمل ٹھہرتااور وہ عورت بچہ جنتی توکچھ ایام کے بعد وہ ان سب مردوں کو بلاتی، کوئی بھی آنے سے منع نہیں کر سکتا تھا، جب وہ جمع ہو جاتے تو ان سے کہتی: آپ سب کواپنامعاملہ معلوم ہی ہے اب میں نے بچہ جنا ہے، ان میں سے جس کو چاہتی اس کانام لے کر اس سے کہتی: اے فلاں، یہ آپ کا بیٹا! اپنے بیٹے کواس مرد کے حوالے کرتی، وہ مرد اس سے انکار نہیں کر سکتا۔

4) نکاح کاچوتھاطریقہ یہ تھا کہ بہت سے لوگ کسی عورت کے پاس جمع ہو جاتے، وہ اس سے تعلق قائم کرتے وہ کسی کو اپنے پاس آنے سے نہ روکتی، یہ طوائف اور بدکار قسم کی عورتیں ہوتیں، وہ علامت اور نشان کے طور پر اپنے گھروں کے دروازوں پر جھنڈے لگادیتیں، جو بھی وہاں آناچاہتابلارکاوٹ داخل ہو جاتا، پھر جب ان میں سے کسی کے ہاں حمل ٹھہر جاتاہے اور بچے کو جنم دیتی تو وہ سب مرد اس کے ہاں جمع ہو جاتے، وہ قیافہ شناس کو بلاتے، وہ قیافہ شناس جس مرد کے بارے میں کہتا کہ یہ بچہ اس کا ہے تو عورت اس بچے کواس کی طرف منسوب کر دیتی، اور اس کابیٹاقرار دیاجاتا، وہ اس سے منع نہیں کر سکتا تھا۔

پھر جب حضرت محمد ﷺ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا گیا تو آپ ﷺ نے جاہلیت کے تمام نکاح ختم کر دئے، سوائے اس نکاح کے جولوگوں میں معروف ومروج ہے"۔(صحیح بخاری: 5127، أبو داؤد: 2272)

بعض علماء نے زمانۂ جاہلیت کے نکاح کے دیگر طریقوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ جن کا ذکر حضرت عائشہؓ نے نہیں کیا ہے، جیسے کہ "نکاح خدن "یعنی چوری چھپے آشنائیاں کرنے والے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں اس کہ ذکر کیا گیا ہے: [وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ] ترجمہ:"اور نہ چوری چھپے آشنائیاں کریں۔(سورۂ نساء: 25). وہ کہا کرتے تھے: جب تک وہ راز میں رہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور اگر ظاہر ہو جائے تو وہ باعثِ ملامت ہے اور اس طرح کا تعلق نکاح کے بجائے بدکاری کے زیادہ قریب ہے۔

اسی طرح"نکاح متع" کارواج بھی تھا، یعنی: ایسانکاح جو متعین وقت تک کے لئے کیا جاتا تھا۔ ایک "نکاح بدل" بھی رائج تھا، اس کا مطلب یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں ایک شخص دوسرے شخص سے کہتا: تم میرے لئے اپنی بیوی سے دستبردار ہو جاؤ اور میں تمہارے لئے اپنی بیوی سے دستبردار ہوتا ہوں۔(فتح الباری 9/150)

باطل نکاح کی اقسام میں سے ایک قسم "نکاح شغار" بھی ہے، یعنی کوئی شخص اپنی بیٹی کا نکاح کسی دوسرے شخص کے ساتھ کرے اس شرط کے ساتھ کہ وہ اپنی بیٹی کا نکاح اس سے کرے اور ان کے درمیان کوئی مہر طے نہ ہو۔(دیکھیں: السیرۃ النبویۃ، أبوشہبہ 1/90)

اسی طرح زمانۂ جاہلیت میں دو بہنوں کا ایک ساتھ نکاح میں رکھنا جائز سمجھا جاتا تھا، سی طرح ایک شخص کے لئے یہ بھی جائز تھا کہ وہ جتنی بیویاں چاہئے اپنے عقد میں رکھے۔ جن لوگوں نے ایک ہی وقت میں چار سے زائد بیویاں اپنے نکاح میں رکھی ہوئی تھیں وہ ناقابل شمار تھے، اسلام جب آیا تو اس وقت کسی کی دس، کسی کی اس سے زیادہ یا کم بیویاں تھیں، تو اسلام نے ان کی تعداد کو چار تک محدود کر دیا، اس شرط کے ساتھ کہ وہ ان کے نان ونفقہ کا اہل ہو، اور ان کے مابین عدل کر سکتا ہو، اور اگر اس کو عدل ومساوات نہ کرنے کا اندیشہ ہو تو پھر صرف ایک ہی پر اکتفا کرے، زمانۂ جاہلیت میں بیویوں کے مابین عدل کرنے کا اہتمام وخیال نہیں کرتے تھے بلکہ ان کے ساتھ بدسلوکی اور ظلم

کرتے تھے، ان کے حقوق دباتے تھے، یہاں تک کہ اسلام آیا تو اس نے ان کو انصاف اور ان کے حقوق دلائے، اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے کی ہدایت کی اور ان کے لئے حقوق متعین کئے جن کا وہ خواب دیکھا کرتی تھیں۔(السیرۃ النبویہ، اُبو شہبہ، 1/88)

و: طلاق:

زمانۂ جاہلیت میں طلاق دینے کا عام رواج تھا اور ان کے ہاں طلاق دینے کی کوئی متعین تعداد نہیں تھی، ایک شخص اپنی بیوی کو طلاق دیتا، پھر رجوع کر لیتا، پھر اس کو طلاق دیتا اور پھر رجوع کر لیتا اور اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہتا اور اسلام کے آغاز میں بھی یہی طریقہ معمول بہ رہا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل کیا: [اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ ‌ؕ وَلَا يَحِلُّ لَـكُمۡ اَنۡ تَاۡخُذُوۡا مِمَّآ اٰتَيۡتُمُوۡهُنَّ شَيۡـــًٔا اِلَّاۤ اَنۡ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ ‌ؕ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا يُقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَا فِيۡمَا افۡتَدَتۡ بِهٖ ‌ؕ تِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ فَلَا تَعۡتَدُوۡهَا ۚ وَمَنۡ يَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ] ترجمہ: ”طلاق دو بار ہے پھر یا تو سیدھی طرح عورت کو روک لیا جائے یا بھلے طریقے سے اس کو رخصت کر دیا جائے اور رخصت کرتے ہوئے ایسا کرنا تمہارے لئے جائز نہیں ہے کہ جو کچھ تم انہیں دے چکے ہو، اُس میں سے کچھ واپس لے لو، البتہ یہ صورت مستثنیٰ ہے کہ زوجین کو اللہ کے حدود پر قائم نہ رہ سکنے کا اندیشہ ہو ایسی صورت میں اگر تمہیں یہ خوف ہو کہ وہ دونوں حدودِ الٰہی پر قائم نہ رہیں گے، تو اُن دونوں کے درمیان یہ معاملہ ہو جانے میں مضائقہ نہیں کہ عورت اپنے شوہر کو کچھ معاوضہ دے کر علیحدگی حاصل کر لے، یہ اللہ کے مقرر کردہ حدود ہیں، اِن سے تجاوز نہ کرو اور جو لوگ حدودِ الٰہی سے تجاوز کریں، وہی ظالم ہیں“۔(سورۂ بقرۃ: 229)

اسلام نے طلاق کی تعداد کو مقید و متعین کیا، اور شوہر کو موقع دیا کہ وہ دو مرتبہ تک تدارک کر سکتا ہے، اور اپنی مطلقہ بیوی سے رجوع کر سکتا ہے اور اگر اس نے تیسری طلاق بھی دے دی تو اب نکاح کا بندھن ٹوٹ گیا، اور اس کے لئے یہ عورت اب حلال نہیں رہی سوائے اس کے کہ کوئی دوسرا اس سے نکاح کرے اور وہ اس کو طلاق دے دے۔ قرآن کریم میں اس حکم کو یوں بیان کیا گیا ہے ﴿فَإِن طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُۥ مِنۢ بَعۡدُ حَتَّىٰ تَنكِحَ زَوۡجًا غَيۡرَهُۥۗ فَإِن طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَآ أَن يَتَرَاجَعَآ إِن ظَنَّآ أَن يُقِيمَا حُدُودَ ٱللَّهِۗ وَتِلۡكَ حُدُودُ ٱللَّهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوۡمٍ يَعۡلَمُونَ﴾ ترجمہ: ”پھر اگر (دوبارہ طلاق دینے کے بعد شوہر نے عورت کو تیسری بار) طلاق دے دی تو وہ عورت پھر اس کے لئے حلال نہ ہو گی، الّا یہ کہ اس کا نکاح کسی دوسرے شخص سے ہو اور وہ اسے طلاق دے دے، تب اگر پہلا شوہر اور یہ عورت دونوں یہ خیال کریں کہ حدودِ الٰہی پر قائم رہیں گے، تو ان کے لئے ایک دوسرے کی طرف رجوع کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں، یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں، جنہیں وہ اُن لوگوں کی ہدایت کے لئے واضح کر رہا ہے، جو (اس کی حدود کو توڑنے کا انجام) جانتے ہیں“۔(سورۂ بقرۃ: 230)

عورت کو حرام قرار دینے کے سلسلہ میں طلاق کے ساتھ 'ظہار' کو بھی شامل کر دیا گیا تھا۔ ظہار کا مطلب یہ ہے کہ شوہر اپنی بیوی سے کہے: تو میرے لئے میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہے، اس کے ذریعہ عورت کو ہمیشہ کے لئے حرام سمجھا جاتا تھا یہاں تک کہ اسلام آیا تو اسلام

نے اس کو انتہائی بری بات اور جھوٹ قرار دیا، اور شوہر کے لئے کفارہ کے ذریعہ اس سے نکلنے کا راستہ عطا کیا، ارشاد باری تعالی ہے: [اَلَّذِيْنَ يُظَاهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَآئِهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهَاتِهِمْ ؕ اِنْ اُمَّهَاتُهُمْ اِلَّا اللّٰٓئِيْ وَلَدْنَهُمْ ؕ وَاِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ (2) وَالَّذِيْنَ يُظَاهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ؕ ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (3) فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ؕ فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ؕ ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَلِلْكَافِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (4)] ترجمہ: "جو لوگ تم میں سے اپنی عورتوں سے ظہار کرتے ہیں وہ ان کی مائیں نہیں ہو جاتیں، ان کی مائیں تو وہی ہیں جنہوں نے انہیں جنا ہے، اور بے شک انہوں نے ایک بیہودہ اور جھوٹی بات منہ سے نکالی ہے اور بے شک اللہ معاف کرنے والا بخشنے والا ہے۔ اور جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں پھر اس کہی ہوئی بات سے پھرنا چاہیں تو ایک دوسرے کو ہاتھ لگانے سے پہلے ایک غلام آزاد کر دیں، یہ اس لئے کہ اس سے تمہیں نصیحت ہو، اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس کی خبر رکھتا ہے۔ پس جو شخص نہ پائے تو دو مہینے کے لگاتار روزے رکھے اس سے پہلے کہ ایک دوسرے کو چھوئیں، پس جو کوئی ایسا نہ کر سکے تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے، یہ اس لئے کہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور یہ اللہ کی حدیں ہیں اور منکروں کے لئے دردناک عذاب ہے"۔ (المجادلہ: 2-4)

ز: جنگ، ایک دوسرے پر حملے اور غارت گری:

ان کے مابین معمولی اسباب کی بنیاد پر جنگیں چھڑ جاتی تھیں، وہ اپنی معروف معاشرتی اقدار کے دفاع کے سلسلہ میں جنگ کرنے اور کسی کا خون بہانے کی کوئی پرواہ نہیں کرتے تھے اگرچہ یہ معاشرتی اقدار کسی اہمیت کی حامل نہ بھی ہوں۔

تاریخ نے ہمارے لئے زمانۂ جاہلیت کی اہم جنگوں کا ایک طویل سلسلہ نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کے دلوں میں جنگجویانہ جذبہ کسی قدر راسخ تھا، اور عقل و فکر پر اس کا کتنا غلبہ تھا، مثلاً ان جنگوں میں "جنگ بسوس" کا ذکر آتا ہے اور یہ جنگ قبیلہ بکر اور قبیلہ تغلب کے مابین جرمی کی اونٹنی کی وجہ سے شروع ہوئی، یہ جرمی، جساس بن مرۃ کی خالہ بسوس بنت منقذ کا پڑوسی تھا اور تغلب کے سردار کلیب نے اپنے اونٹوں کے لئے ایک مخصوص چراگاہ متعین کر رکھی تھی، تو اس نے جب اس جگہ اس اونٹنی کو دیکھا تو اس کو مار دیا، اس سے جرمی کو تکلیف ہوئی اور پڑوسی ہونے کی وجہ سے بسوس بھی اس سے دلبرداشتہ ہوئی، جب جساس نے یہ سب کچھ دیکھا تو وہ کلیب کو قتل کرنے کا موقع تلاش کرتا رہا، یہاں تک کہ اس کو قتل کر دیا، اس کے بعد ان دونوں قبیلوں کے مابین چالیس سال تک خون ریز جنگوں کا سلسلہ جاری رہا۔ (دیکھیں: الکامل فی التاریخ، ابن اثیر، 1/312)

اسی طرح داحس و غبراء کی جنگ بھی ایک معمولی سبب سے چھڑ گئی، اس کا سبب ایک گھوڑ دوڑ کا مقابلہ تھا جو داحس اور غبراء نامی گھوڑوں کے مابین تھا، داحس قیس بن زہیر کا گھوڑا تھا اور غبراء حذیفہ بن بدر کا، حذیفہ نے ایک شخص کو یہ ذمہ داری دی کہ وہ وادی میں کھڑا رہے اور اگر دیکھے کہ داحس آگے نکل گیا ہے تو اس کو روک دے، اس نے ایسا ہی کیا اور گھوڑے کو تھپڑ مارا یہاں تک کہ اس کو پانی میں گرا دیا،

اس وقت تک غبراء آگے نکل گیا،اس کے بعد قتل وانتقام کا سلسلہ شروع ہوااور عبس وذبیان قبیلوں کے مابین جنگیں شروع ہو گئیں۔(ایضاً 1/343)

اسی طرح زمانۂ جاہلیت میں اوس اور خزرج کے مابین جنگوں کا ایک سلسلہ نظر آتا ہے، یہ دونوں قبائل آپس میں چچازاد تھے،اس لئے کہ اوس اور خزرج حارثہ بن ثعلبہ کی اولاد تھے اور ان کے درمیان مسلسل جنگیں جاری رہیں۔ان کی آخری جنگ "جنگ بعاث" تھی،اس کا پس منظر یہ تھا کہ اوس کے حلیف یہود نے ان کی مدد کرنے کا از سر نو معاہدہ کیا،اوس وخزرج کی اکثر جنگوں کو یہود نے بھڑکانے کا کام کیا ہے تاکہ وہ دونوں قبیلوں کو کمزور کرسکیں،اور قیادت وسیادت ہمیشہ انہی کو حاصل رہے،ہر گروہ نے اپنے قریب کے حلیف قبیلوں کی مدد حاصل کی اور آپس میں خطرناک ترین جنگ ہوئی جس میں بالآخر فتح اوس کو حاصل ہوئی۔(التاریخ الاسلامی،ڈاکٹر عبدالعزیز الحمیدی 1/55)

بعض قبائل مال لوٹنے کے لئے،آزاد افراد کو قید کرنے اور ان کو بیچنے کے لئے غارت گری اور حملے کرتے تھے، جیسے کی حضرت زید بن حارثہؓ اصلاً ایک آزاد عربی شخص تھے، لیکن ان کو قید کرکے غلام بنایا گیا،اسی طرح حضرت سلمان فارسیؓ ایک آزاد فارسی (ایرانی) شخص تھے،ان کو بھی غلام بنادیا گیا،اسلام نے ان سب چیزوں کا خاتمہ کیا یہاں تک کہ ایک خاتون یا کوئی شخص صنعاء سے حضرموت تک کا سفر تنہا کیا کرتے،ان کو اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ ہوتا یا پھر اپنی بکریوں کے بارے میں بھیڑیے کا خوف ہوتا۔(دیکھیں: السیرۃ النبویۃ، أبو شہبہ، 1/93)

ح: علم اور پڑھنا لکھنا:

عرب یہود ونصاری کی طرح اہل علم اور اصحاب کتاب نہیں تھے، بلکہ ان پر جہالت،ناخواندگی،پرانے طرزِ زندگی کی تقلید اور اس پر جمود- اگرچہ غلط ہی کیوں نہ ہو- غالب تھا،عرب قوم نہ لکھنا جانتی تھی اور نہ ہی حساب جانتی تھی،اکثریت کا یہی حال تھا،ان میں بہت کم لوگ تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے،جہالت کے باوجود اور علوم ومعارف میں کم مائیگی کے باوجود وہ ذہانت وفطانت،فہم وفراست،احساس میں لطافت و باریک بینی اور علم و معرفت اور صحیح رہنمائی کو قبول کرنے کی صلاحیت واستعداد جیسی صفات میں مشہورِ زمانہ تھے،جب اسلام کا سورج طلوع ہوا تو وہی علماء، حکماء اور فقہاء بن گئے، جہالت وامیت ان سے کافور ہوگئی اور علم و معرفت ان کی امتیازی شان بن گئی،ان میں بعض علمِ قیافہ کے ماہر تھے، بعض طبیب وڈاکٹر تھے، جیسے کہ حارث بن کلدہ،ان کا علمِ طب ان تجربات پر مبنی تھا جو انہوں نے زندگی اور سوسائٹی سے حاصل کئے تھے۔(دیکھیں السیرۃ النبویۃ، أبو شہبہ، 1/93)

۵: اخلاقی حالات:

عربوں کی اخلاقی حالت بگڑ چکی تھی،وہ جوئے اور شراب کے دلدادہ ہوگئے تھے، قافلوں پر ڈاکہ ڈالنا،ان پر حملہ کرنا، قومی عصبیت، ظلم،خونریزی،انتقامی جذبہ،مال کی لوٹ مار، یتیموں کا مال کھانا، سودی کاروبار، چوری اور بدکاری جیسی بری عادتیں عام ہوگئی تھیں،البتہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ بدکاری غلاموں اور باندیوں میں اور طوائف قسم کی عورتوں میں رائج تھی،آزاد عورتوں کے ہاں شاذ ونادر ہی ایسا ہوتا تھا،

اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ فتح مکہ کے بعد جب اللہ کے رسول ﷺ نے عورتوں سے بیعت لی کہ "وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے، نہ چوری کریں گی اور نہ ہی زنا کریں گی" اس وقت ابو سفیان کی بیوی سیدہ ہند بنت عتبہ نے کہا: "کیا ایک آزاد عورت زنا کرے گی؟!!"۔(صحیح بخاری:4894، مسلم: 1709) (دیکھیں:السیرۃ النبویۃ، اُبوشہبہ، 1/94)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان میں سب کے سب برے نہیں تھے بلکہ ان میں کثیر تعداد ان لوگوں کی تھی جو بدکاری سے دور تھے، شراب کے قریب نہیں جاتے تھے، خونریزی اور ظلم کے مرتکب نہیں ہوتے تھے، یتیموں کا مال کھانے کو باعثِ ننگ وعار سمجھتے تھے، سودی کاروبار سے باز رہتے تھے اور ان میں خیر اور بھلائی کی اعلیٰ صفات اور خصوصیات موجود تھیں، جن کی وجہ سے وہ پیغام اسلام کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر اٹھانے کے اہل قرار پائے، ان اعلیٰ صفات اور خصوصیات میں مندرجہ ذیل خصائص قابل ذکر ہیں:

فہم وفراست اور ذہانت وفطانت:

ان کے دلوں کی تختیاں بالکل صاف و شفاف تھیں، ان میں ایسے فلسفے، اوہام و خرافات کا کوئی اثر نہ تھا جن کو مٹانا مشکل ہوتا، برخلاف ہندوستانیوں، رومیوں، یونانیوں اور ایرانیوں کے، گویا کہ ان کے دل اس دنیا کے عظیم ترین پیغام یعنی اسلام کو قبول کرنے اور دوسروں تک پہنچانے کے لئے تیار تھے، اسی لئے وہ اس زمانہ کی ذہین ترین اور حافظہ کے اعتبار سے قوی ترین قوم تھی، اسلام نے اسی ذہانت و حافظہ کی صفت کو دین کی حفاظت وحمایت کے لئے استعمال کیا، ان کی فکری صلاحیتیں اور فطری صفات ان میں موجود تھیں، وہ خیالی فلسفوں میں، فضول بیز نطینی بحث و مناظروں میں اور پیچیدہ کلامی بحثوں میں ضائع نہیں ہوئی تھیں۔(دیکھیں:السیرۃ النبویۃ، الندویؒ، ص: 12)

ان کی زبان کی وسعت، ان کی قوتِ حفظ اور ذہانت کی واضح دلیل ہے، اگر شہد کے اسی (۸۰) نام ہیں، لومڑی کے دو سو (۲۰۰)، شیر کے پانچ سو (۵۰۰)، اونٹ کے ہزار (۱۰۰۰)، اسی طرح تلوار کے ہزار (۱۰۰۰)، مصیبت کے تقریبا چار ہزار (۴۰۰۰) نام، تو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ان سارے ناموں کا احاطہ کرنے کے لئے طاقتور، تیز اور مستحضر دماغ کی ضرورت ہے۔(بلوغ الأدب، 39، 1/40)

ان کی ذہانت وفطانت کا حال یہ تھا کہ وہ الفاظ وعبارت کا استعمال کیے بغیر ہی اشاروں سے بہت سی باتیں سمجھ جاتے تھے، بہت سی مثالیں موجود ہیں۔(دیکھیں: مدخل لفقہ السیرۃ، ص:80- 79)

جود وسخاوت:

جود وسخاوت کی صفت عربوں کے رگ وپے میں شامل تھی، ان میں سے اگر کسی کے پاس صرف ایک اونٹنی ہوتی اور اس کے یہاں مہمان آجاتا تو جلدی سے اسی کو ذبح کرلیتا، ان میں سے بعض لوگ صرف انسانوں کو ہی نہیں بلکہ جنگلی جانوروں، پرندوں تک کو کھلاتے پلاتے تھے، حاتم طائی کی سخاوت تو پوری دنیا میں ضرب المثل اور مشہور زمانہ ہے۔(دیکھیں:السیرۃ النبویۃ، اُبوشہبہ، 1/95)

شجاعت و مروءت اور دوسروں کی نصرت و مدد:

عربوں میں یہ بات قابل فخر و تعریف سمجھی جاتی تھی اگر کوئی لڑتے لڑتے قتل کیا جاتا، اور یہ بات باعث ذلت و عار تھی اگر کسی کو بستر پر موت آتی، ایک عربی شخص کو جب اپنے بھائی کے قتل ہونے کی خبر ملی تو اس نے کہا: اگر اس کو قتل کیا گیا تو اس کے والد، بھائی اور چچا بھی قتل کئے گئے ہیں، اللہ کی قسم! ہم فطری موت نہیں مرتے ہیں بلکہ نیزوں کی نوک سے اعضاء کو کاٹ کر اور تلواروں کے سائے میں جان دے کر ہم دنیا سے جاتے ہیں:

وما ماتَ منّا سيدٌ حَتْفَ أنفه   وَلَا طُلَّ منّا حيْثُ كانَ قَتِيلُ

ترجمہ: ''ہم میں سے کوئی بھی سردار اپنی فطری موت نہیں مرتا ہے اور نہ ہی ہم میں سے کسی مقتول کا خون رائیگاں جاتا ہے چاہے وہ جہاں بھی قتل ہو''۔

تَسيلُ عَلَى حَدِّ الظِّبَاتِ نفُوسنَا   ولَيستْ عَلَى غَيرِ الحَديدِ تَسيلُ

ترجمہ: ''تلواروں کی دھار پر ہماری جانیں نکلتی ہیں، تلواروں کی دھار کے علاوہ اور کہیں بھی ہماری جان نہیں نکلتی ہے''۔

عرب لوگ عزت و مروت اور عفت کی حفاظت سے زیادہ اہم کسی چیز کو نہیں سمجھتے تھے اور اس کی راہ میں جانیں نچھاور کرنے سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ عنترۃ کہتا ہے:

بكَرتْ تُخَوفني الْحُتوفَ كَأَنَّني ... أَصبَحتُ عَنْ غَرَضِ الحُتُوفِ بِمَعْزلِ
فَأَجبتُها إِنَّ المَنَيَّةَ منهلٌ ...   لا بدَّ أَنْ أُسقَى بكَأْسِ المَنْهَلِ
فَأَقْنِي حياءَكِ لا أبَا لَكِ واعلَمي ... أَنِّي امرؤٌ سأَموتُ إِنْ لَمْ أُقْتَلِ

ترجمہ: ''وہ صبح تڑکے آئی اور مجھے موت کا خوف دلانے لگی وہ سمجھ رہی تھی کہ میں موت کا شکار ہونے سے بچ جاؤں گا، میں نے اس کو جواب دیا کہ موت تو ایک ایسا گھاٹ ہے جس کے چشمہ کا پانی مجھے ضرور پلایا جائے گا، لہذا ذرا شرم کرو، تمہارا برا ہو! اور جان لو کہ اگر میں جنگ میں نہ مارا جاؤں گا، تو ایسے ہی موت تو آنی ہی ہے''۔(دیوان عنترۃ، ص: 252)

اسی کے یہ اشعار بھی ہیں:

لا تستقني ماء الحياة بذلّة ... بل فاسقني بالعز كأس الحنظل
ماء الحياة بذلّة كجهنّم ... وجهنّم بالعز أطيب منزل

ترجمہ: ''مجھے ذلت ورسوائی کے ساتھ زندگی کا جام مت پلاؤ بلکہ عزت کے ساتھ حنظل کا جام پلانا مجھے گوارا ہے، ذلت کے ساتھ زندگی گزارنا جہنم کی طرح ہے، لیکن عزت کے ساتھ یہ جہنم بھی بہترین جائے مقام بن جاتی ہے''۔(دیوان عنترۃ، د۔ فاروق الطباع، ص: 82)

عرب لوگ فطری طور پر غیرت و مروءت والے تھے، اس چیز کی ان کے ہاں کوئی گنجائش نہیں تھی کہ طاقتور کسی کمزور، بے بس، عورت، یا بزرگ پر ظلم وزیادتی کرے، اور جب کبھی کوئی ان کو مدد کے لئے پکارتا تو اس کی ندا پر لبیک کہتے تھے، اور اگر کوئی ان کی پناہ میں ہو تو اس کو بے یار و مددگار چھوڑنے اور دشمنوں کے حوالے کرنے کو ذلت ورسوائی سمجھتے تھے۔

حریت وآزادی سے محبت اور ذلت ورسوائی سے نفرت:

ہر عربی شخص فطری طور پر حریت وآزادی پسند تھا، اسی کے لئے زندہ رہتا اور اسی کے لئے جان دیتا، وہ آزاد فضاؤں میں پروان چڑھتے، کسی کا بھی ان پر جبر وزور نہیں تھا، اور ذلت ورسوائی کے ساتھ زندہ رہنے کو ناپسند کرتے، کوئی ان کی عزت وناموس کی جانب میلی آنکھ سے دیکھتا تو اس کے دفاع میں جان بھی دینی پڑتی دریغ نہیں کرتے تھے۔(دیکھیں السیرۃ النبویۃ، أبو شہبہ: 1/95)

وہ ذلت ورسوائی اور ظلم وزیادتی کو ناپسند کرتے تھے، کوئی ان کو حقیر اور چھوٹا سمجھتا تو اس کو سبق سکھادیتے، اس کی مثال اور دلیل ملاحظہ فرمائیں:

حیرہ کا بادشاہ عمرو بن ہند اپنے ہمراز وہمساز ہمنشینوں کے ساتھ بیٹھا تھا تو ان سے پوچھا: کیا عربوں میں کوئی ایسا شخص ہوگا جس کی ماں میری ماں کی خدمت کرنے کو باعثِ عار سمجھتی ہو؟ جواب ملا: ہاں، صعالک شعراء میں سے شاعر عمرو بن کلثوم کی ماں۔

بادشاہ نے عمرو بن کلثوم کو دعوت دی اور اس کی ماں کو بھی اپنی ماں سے ملاقات کی دعوت دی، اپنی ماں سے بادشاہ نے یہ طے کرلیا کہ کھانا کھانے کے بعد وہ باتوں باتوں میں عمرو بن کلثوم کی ماں سے کہہ دے کہ آپ کے پاس جو پلیٹ رکھی ہوئی ہے ذرا مجھے دے دیجئے۔ جب وہ آئیں اور طے شدہ اسکیم کے مطابق اس سے پلیٹ اٹھاکر دینے کو کہا، تو اس نے جواب دیا: جس کو ضرورت ہے وہ اپنا کام خود کرلے۔ اس نے بار بار اس سے پلیٹ مانگی مگر اس نے بھی اٹھاکر نہیں دی، اور وہ یعنی عمرو بن کلثوم کی ماں لیلی زور زور سے چلانے لگی! ہائے ذلیل ورسوا کردیا! اے تغلب کے لوگو! اس کے بیٹے نے یہ چیخ وپکار سنی تو وہ آپے سے باہر ہوگیا، اس نے وہاں بادشاہ کی تلوار لٹکی ہوئی دیکھی اور وہی لے کر بادشاہ عمرو بن ہند کا سر قلم کردیا، اور بنی تغلب کو بھی بدلہ لینے کے لئے پکارا، وہاں محل میں جو کچھ تھا انہوں نے وہ سب کچھ لوٹ لیا اور ایک قصیدہ نظم کیا جس میں بادشاہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

بأيِّ مشيئةَ عِمرو بن هنْد ... نكُونُ لقَيْلكُم فيها قَطيناً
بأيِّ مشيئةً عمرو بن هنْدَ ... تُطيع بنَا الوشاةَ وتزدرينا
تَهدَّدناَ وأَوعدْنَا رويدًا ... متَى كُنّا لأُمك مقْتوينا
إذا ما الملْك َسام النَّاس خسفاً... أَبينا أَنْ نُقرَّ الخَسف فينَا

ترجمہ: اے عمرو بن کلثوم! ایسی کونسی بات ہے جسَ کی وجہ سے ہم تمہارے سرداروں اور بڑوں کے نوکر بن جائیں۔ اے عمرو بن کلثوم! ایسی کون سی بات ہے کہ آپ چغلخوری کرنے والوں اور ہماری مخالفت کرنے والوں کی بات مان رہے ہیں اور ہمیں حقیر سمجھ رہے

ہیں۔ ذرا سوچ سمجھ کر ہمیں ڈرانے اور دھمکی دینے کی کوشش کرو ہم کب آپ کی ماں کے خادم رہے ہیں؟ اگر کوئی بادشاہ لوگوں کو ذلت آمیز کام کرنے پر مجبور کرے تو ہم ذلت برداشت کرتے ہوئے اس کی بات ماننے سے انکار کرتے ہیں۔

عہد کی پاسداری حق گوئی اور صراحت کے ساتھ بات کرنے کی عادت:

عرب لوگ کذب بیانی اور جھوٹ کو ناپسند کرتے تھے اور اس کو عیب سمجھتے تھے، وہ عہد کو وفا کرنے والے اور اس کی پاسداری کرنے والے تھے، یہی وجہ ہے کہ اسلام میں داخل ہونے کے لئے زبان سے شہادت کافی سمجھی جاتی تھی، جھوٹ کو ناپسند کرنے اور مروءت کے خلاف سمجھنے کی دلیل ہرقل کے سامنے ابوسفیان کا وہ بیان ہے جبکہ ہرقل نے ان سے اللہ کے رسول ﷺ کے بارے میں دریافت کیا، حالانکہ مشرکین اور اہل ایمان کے مابین کشمکش کی صورتحال تھی۔ ابوسفیان نے بعد میں کہا کہ: "اگر اس بات کا اندیشہ نہ ہوتا کہ لوگ میری زبان سے جھوٹ سن لیں گے تو میں ضرور آپ ﷺ کے بارے میں جھوٹ بولتا"۔ (صحیح بخاری: 7، مسلم: 1773)

جہاں تک تعلق ہے عہد کی پاسداری کا تو عربوں کی وفاداری کی بہترین منظر کشی نعمان بن منذر نے کسریٰ کے سامنے یوں کی تھی کہ: "ان میں سے اگر کوئی انکھوں آنکھوں میں باتیں کرتا ہے یا اشارہ کرتا ہے تو یہ ان کے نزدیک ایسا وعدہ اور عہد وپیمان ہوتا ہے جس کو کوئی نہیں توڑ سکتا ہے، سوائے اس کے کہ اس کی جان ہی نکل جائے۔ ان میں سے اگر کوئی کسی کو زمین سے لکڑی اٹھا کر دے اور اسی کو قرض کے عوض میں بطور رہن رکھ لے تو اس کا یہی رہن قبول کیا جاتا، اس سے کئے ہوئے وعدے کو وفا کیا جاتا۔ ان میں سے اگر کسی شخص کو یہ معلوم ہوتا کہ کسی شخص نے اس کی پناہ لی ہے اور وہ اس کے گھر سے دور ہوتا اور اس کو کوئی گزند پہنچتی تو اس وقت تک پناہ دینے والا شخص چین کی سانس نہ لیتا، یہاں تک کہ اس کو تکلیف پہنچانے والے قبیلے ہی کو ختم نہ کردیتا، یا پھر اسی کا قبیلہ انتقام لیتے لیتے ختم ہو جاتا، اس لئے کہ اس کی پناہ میں آئے ہوئے شخص کے ساتھ دھوکہ کیا گیا۔

بسا اوقات کوئی انجان اور غیر معروف مجرم ان کی پناہ میں آجاتا تو اس کی جان کی حفاظت کے لئے اپنی جانیں اور اس کے مال کی حفاظت کے لئے اپنا مال نچھاور کرتے۔ (بلوغ الأدب، 1/150)

ایفائے عہد اور وعدہ کی پاسداری عربوں کی فطری صفت ہے، جب اسلام آیا تو اسلام نے اس صفت کو صحیح رخ دیا، ایسے شخص کو سختی سے ممانعت کی جو کسی مجرم اور گنہگار کو پناہ دے، چاہے اس کا مقام و مرتبہ اور حسب و نسب کچھ بھی ہو۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اللہ کی لعنت ہو اس شخص پر جو کسی مجرم کو پناہ دے"۔ (مسلم: 1978، نسائی 7/232)

ان کی عہد کی پاسداری کی دلیل وہ واقعہ ہے کہ حارث بن عباد نے قبیلۂ تغلب سے لڑنے کے لئے بکر کے تمام قبائل کی قیادت کی، تغلب کا قائد و سردار مہلہل تھا جس نے جنگ بسوس میں حارث کے بیٹے کو قتل کیا تھا اور کہا تھا: "تم کلیب کے جوتوں کے تسموں کے برابر بھی نہیں ہو، چنانچہ حارث نے مہلہل کو قید کیا لیکن وہ اس کو پہچانتا نہیں تھا، حارث نے اس سے کہا کہ مجھے مہلہل بن ربیعہ کو دکھا دو میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔ اس (یعنی مہلہل) نے اس سے کہا! مجھ سے اس کا وعدہ کرو اگر میں نے تم کو وہ دکھا دیا تو اسے چھوڑ دوگے۔ اس نے کہا: ہاں وعدہ ہے۔ کہا: میں ہی مہلہل ہوں، حارث نے اس کی پیشانی کے بال کاٹ کر اس کو رہا کر دیا"۔ (دیکھیں: مدخل لفہم السیرۃ، ص 90)

یہ عہد کی پاسداری اور جرأت و بہادری کی نادر اور قابل قدر مثال ہے۔

ان کے ایفائے عہد کے واقعات میں سے یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ نعمان بن منذر نے جب کسری کو اپنی بیٹی نکاح میں دینے سے انکار کیا تو اسے اپنے بارے میں کسری کی طرف سے خوف لاحق ہو گیا، نعمان نے اپنے ہتھیار اور اہل و عیال ھانی بن مسعود شیبانی کے پاس بطور امانت لئے اور خود کسری کی طرف کوچ کیا، کسری نے اسے گرفتار کر لیا اور پھر ھانی سے نعمان کی تمام رکھی ہوی امانتوں کو حوالے کرنے کا مطالبہ کیا، لیکن اس نے حوالے کرنے سے انکار کر دیا، اس کے نتیجہ میں کسری نے اس سے لڑنے کے لئے فوج روانہ کر دی۔ ھانی نے اپنی قوم آل بکر کو جمع کیا اور ان میں کھڑے ہو کر تقریر کرتے ہوئے کہا: ”اے بکر کے لوگو! ہلاک ہونے والا معذور شخص فرار اختیار کر کے نجات پانے والے سے کہیں بہتر ہے۔ خوف اور ڈر موت کے مقابلہ میں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا ہے۔ صبر اور ڈٹ کر مقابلہ کرنا فتح و کامیابی کے اسباب میں سے ہے۔ ذلت و رسوائی کے بجائے موت کو ترجیح دو، موت کا استقبال کرنا اس کو پیٹھ دکھانے سے بہتر ہے۔ تلواروں اور نیزوں کے وار سینے کی طرف سے سہنا پیٹھ اور کمر پر سہنے سے زیادہ باعث عزت ہے۔ اے آل بکر! لڑو اور قتال کرو، اس لئے کہ موت سے کوئی چارہ کار نہیں ہے"۔ (تاریخ طبری عن یوم ذی قار 2/207)

بنو بکر نے ذی قار کی جنگ میں فارسیوں کو شکست دی، اس شخص کی وجہ سے جس نے ذلت و رسوائی کی زندگی کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا اور ایفائے عہد کے راستے میں موت کا سامنا کرنے کی کوئی پرواہ نہیں کی۔

مصیبتوں پر صبر، برداشت کرنے کی صلاحیت اور معمولی پر قناعت:

عرب لوگ زیادہ کھانے کو پسند نہیں کرتے تھے اور کہا کرتے تھے: زیادہ کھانا عقل کو ختم کرتا ہے اور وہ بہت زیادہ کھانے والے لالچی شخص کو ناپسند کرتے تھے۔ ان کا ایک شاعر کہتا ہے:

إذا مُدَّت الأيدي إلى الزَّاد لم أكنْ ⋯ بأعجَلهم إذا أجشَعُ القوم أَعجلُ

ترجمہ: جَب لوگ کھانے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہیں تو میں ان میں پہل کرنے والا نہیں ہوتا ہوں، اس لئے کہ لالچی اور حریص شخص ہی زیادہ جلدی کرنے والا ہوتا ہے۔

عربوں کے اندر مصائب اور برے حالات کو برداشت کرنے اور صبر کرنے کا زبردست مادہ تھا، شاید یہ صلاحیت ان کے اندر بے آب و گیاہ صحراؤں اور خشک علاقے میں رہنے کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی، وہ خوفناک پہاڑوں کو عبور کرنے اور دوپہر کی تپتی دھوپ میں چلنے سے مانوس تھے، نہ سردی اور گرمی سے متاثر ہوتے تھے، اور نہ ہی راستے کی خوفناکی، مسافت کی دوری اور بھوک و پیاس کا ان پر کوئی اثر ہوتا، لہٰذا جب وہ حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے تو صبر و ثبات اور مصائب و آلام کو برداشت کرنے کی مثالیں قائم کیں، وہ معمولی پر قناعت کرتے تھے، وہ کئی کئی ایام تک سفر کرتے رہتے اور اتنی کھجوروں اور پانی پر اکتفا کرتے جس سے ان کی کمر سیدھی رہ سکے۔ (دیکھیں: بلوغ الأدب، 1/377)

جسمانی طاقت اور روحانی عظمت وبلندی:

عرب لوگ نفسیانی اور روحانی عظمت و قوت کے ساتھ ساتھ جسمانی طاقت میں بھی مشہورِ زمانہ تھے، اور جب جسمانی طاقت کے ساتھ ساتھ نفسیاتی شجاعت و بہادری جمع ہوتی ہے تو عجیب وغریب کرشمے وقوع پذیر ہوتے ہیں، اور کچھ ایسی ہی صورتحال اس وقت ظہور پذیر ہوئی جب وہ حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔

طاقت کے باوجود عفوودرگذر اور پڑوسی کی حفاظت وحمایت:

وہ اپنے مخالفین اور دشمنوں کے ساتھ لڑتے تھے، جنگ کرتے تھے لیکن جب ان کو گرفتار کرکے اپنے کنٹرول میں کرلیتے تو معاف کرکے ان کو چھوڑ دیتے تھے، زخمیوں کو تکلیف اور نقصان پہنچانے سے گریز کرتے تھے، پڑوسیوں کے حقوق کا پاس ولحاظ کرتے، خاص طور پر عورتوں اور ان کی عفت وعزت کا خیال رکھتے تھے۔ ایک عرب شاعر کہتا ہے:

وأغضُّ طرفي إنْ بدت لي جارتي ... حتَّى يواري جارتي مأواها

ترجمہ: اگر میری پڑوسن میرے سامنے نمودار ہوتی ہے تو میں اپنی نگاہیں جھکالیتا ہوں یہاں تک کہ میری پڑوسن اپنی منزل میں پردہ نشین نہ ہوجائے۔
اور جب کوئی بھی ان کی پناہ میں آنا چاہتا تو وہ اس کو پناہ دیتے تھے اور بسا اوقات اس کی حفاظت کے لئے اپنی جان، مال اور اولاد قربان کردیتے۔

یہ عمدہ اور اعلیٰ قسم کے اخلاق وفضائل عربوں کی متاع گراں قدر تھی، جب اسلام آیا تو اسلام نے ان کو پروان چڑھایا، ان کو تقویت پہنچائی اور حق اور خیر کی جانب ان کا رخ موڑ دیا، لہذا اس میں کوئی قابل تعجب بات نہیں ہے اگر وہ صحرا سے نکلتے ہیں تو پاک طینت فرشتوں کی طرح نظر آتے ہیں، علاقوں کو فتح کرتے ہیں اور ان کو ایمان سے بھر دیتے ہیں حالانکہ وہاں کفر کا دور دورہ تھا، وہاں عدل وانصاف قائم کرتے ہیں حالانکہ وہاں ظلم وجور کی حکومت تھی، فضائل کو عام کرتے ہیں جبکہ وہاں رذائل عام تھے، اور خیر کے دروازے وا کردیتے ہیں جبکہ وہاں شر کے دروازے چوپٹ کھلے تھے۔ (السیرۃ النبویۃ، أبو شہبہ، 1/97)

....

یہ اس معاشرہ کے بعض اخلاق واوصاف کی تصویر ہے جس میں ایک عربی فرد پروان چڑھا، یہ اس وقت کے معاشروں میں سب سے بہتر معاشرہ تھا، اسی لئے اللہ کے رسول ﷺ کا انتخاب اس معاشرہ میں کیا گیا، اور آپ ﷺ کے لئے اس معاشرہ کو، اس نادر اور انوکھے ماحول کو اور اس اعلی ترین گروہ کو منتخب کیا گیا، اگرچہ اس وقت فارسی، رومی، ہندوستانی اور یونانی اقوام بھی موجود تھیں، لیکن اپنی علمی وسعت ومعارف کے باوجود فارسی قوم میں سے انتخاب نہیں کیا گیا، اپنی فلسفیانہ گہرائی کے باوجود ہندوستانی قوم کو نہیں چنا گیا، نوع بنوع میدانوں میں آگے ہونے کے باوجود رومیوں میں سے انتخاب نہیں کیا گیا، خیالات اور شاعری میں عبقریت کے باوجود یونان سے انتخاب عمل میں نہیں آیا، بلکہ اسی نوخیز معاشرہ کا انتخاب عمل میں آیا، اس لئے کہ بقیہ اقوام اگرچہ علوم ومعارف اور دیگر اعتبارات سے بہت بلند پایہ تھیں مگر عرب جس فطری سلامتی، حریتِ ضمیر اور روح کی بلندی کے مقام پر فائز تھے دوسرے ان کے سامنے ان اوصاف میں بونے نظر آتے تھے۔ (نظرات فی السیرۃ، امام حسن البناؒ، ص14)

چوتھا باب

حبیبِ مصطفی ﷺ کی ولادت باسعادت سے پہلے کے اہم واقعات

اللہ کی مشیت کا فیصلہ یہ ہوا کہ نوع بشر پر رحم کیا جائے اور انسانیت کو عزت و تکریم سے نوازا جائے اور بالآخر وہ گھڑی آ ہی گئی جس میں محبوب کبریاء حضرت محمد ﷺ کی بعثت ہوئی اور انسان کو ہر قسم کے شر سے آزادی نصیب ہو گئی۔

اس سے پہلے کہ ہم آپ ﷺ کی ولادتِ باسعادت، آپ کی پرورش، نزول وحی سے پہلے اللہ عز و جل کے ذریعہ خصوصی رعایت وحفاظت کا انتظام اور بعثت سے پہلے آپ کی معطر سیرت کو بیان کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ان عظیم نشانیوں اور اہم واقعات کا ذکر کریں جو آپ ﷺ کی ولادتِ باسعادت سے پہلے ظہور پذیر ہوئے، اس لئے کہ آپ ؐ کی ولادت سے پہلے عظیم نشانیاں اور اہم واقعات پیش آئے جو طلوع صبح صادق کے قریب ہونے کی خوشخبری دے رہے تھے۔

اس کائنات میں یہ اللہ تعالی کی سنت ہے کہ آسانی اور کشادگی شدت و سختی کے بعد ظہور میں آتی ہے، اندھیرے اور تاریکی کے بعد روشنی آتی ہے اور سختی کے بعد آسانی آتی ہے۔ (دیکھیں: ھذا الحبیب محمد ﷺ یا محب، الجزائری، ص 51)

ان اہم واقعات میں مندرجہ ذیل واقعات قابل ذکر ہیں:

ا: نبی کریم ﷺ کے جد امجد حضرت عبد المطلب کا زمزم کا کنواں کھودنے کا واقعہ:

شیخ ابراہیم العلی نے اپنی اہم کتاب "صحیح السیرۃ النبویہ" میں چاہ زمزم کی کھدائی کے سلسلہ میں حضرت علی بن ابی طالب ؓ کی صحیح روایت ذکر کی ہے، فرماتے ہیں کہ "عبد المطلب نے بیان کیا: میں ایک مرتبہ خانہ کعبہ کے مقامِ حجر میں سویا ہوا تھا کہ خواب میں کسی نے آکر مجھ سے کہا: "طیبہ" کی کھدائی کرو۔ میں نے اس سے پوچھا کہ "طیبہ" سے کیا مراد ہے؟ اس نے کوئی جواب نہ دیا اور چلا گیا۔ دوسرے دن پھر میں اسی جگہ سویا ہوا تھا کہ خواب میں آنے والے نے مجھ سے کہا "برّہ" کو کھودو۔ میں نے اس سے پوچھا کہ "برہ" سے کیا مراد ہے؟ وہ مجھے کوئی جواب دیئے بغیر چلا گیا۔

اس سے اگلے دن پھر میں اسی جگہ سویا ہوا تھا کہ خواب میں کسی نے مجھ سے کہا کہ "مضنونہ" کی کھدائی کرو۔ میں نے اس سے پوچھا کہ "مضنونہ" سے کیا مراد ہے؟ اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا اور چلا گیا۔ اگلے دن پھر میں وہیں سویا ہوا تھا کہ آنے والے نے خواب میں مجھ سے کہا کہ "زمزم" کی کھدائی کرو۔ میں نے اس سے کہا: "زمزم" کیا ہے؟ اس نے کہا کہ وہ ایسا پانی ہے جو کبھی ختم نہ ہوگا اور نہ کبھی کم ہوگا، حج کرنے والے تمام حاجیوں کو سیراب کرے گا، وہ کنواں گوبر اور خون کے ڈھیر کے پاس جہاں لوگ ذبح کرتے ہیں، وہاں چونٹیوں کے بل کے قریب اس جگہ پر ہے، جہاں سفید ٹانگوں والا کوا آکر بیٹھے۔

ابن اسحاق کا بیان ہے کہ جب عبد المطلب کو خواب میں بار بار اس کنویں کی تفصیلات دکھائی گئیں اور اس کی جگہ کے متعلق بھی نشاندہی کر دی گئی اور انہیں یقین ہو گیا کہ یہ ایک سچا خواب ہے تو انہوں نے صبح کدالی لی اور ان کے ساتھ ان کا اکلوتا بیٹا حارث بن عبد المطلب

تھا، انہوں نے اس جگہ کھدائی شروع کی تو کھدائی کرتے کرتے جب کنویں کے نشانات مل گئے تو (خوشی کے مارے) اللہ اکبر کہا، قریش کے لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ عبد المطلب کو ان کا مقصود مل گیا ہے تو انہوں نے آکر کہا: اے عبد المطلب! یہ تو ہمارے باپ سیدنا اسماعیل علیہ السلام کا کنواں ہے، اس میں ہمارا بھی حق ہے، لہذا اپنے ساتھ ہمیں بھی شریک کریں، انہوں نے کہا: میں ایسا کرنے والا نہیں ہوں۔ یہ ایک ایسی خصوصیت ہے کہ اللہ کی طرف سے تم سب میں سے یہ امتیاز صرف مجھے عطا کیا گیا ہے، پوری قوم نے کہا: آپ ہمارے ساتھ انصاف کریں، ورنہ اس کی خاطر ہمیں آکر آپ سے لڑائی بھی کرنی پڑے تو ہم دریغ نہیں کریں گے، عبد المطلب نے کہا: اچھا تم جسے چاہو اس معاملہ میں حکم مقرر کر لو وہ جو فیصلہ کرے گا ہم سب اسے قبول کریں گے۔ قوم نے کہا: بنو سعد بن ہذیل کی معروف نجومی عورت کو ہم اس بارے میں فیصلے کے لئے منتخب کرتے ہیں۔ عبد المطلب نے کہا کہ مجھے اس کا فیصلہ منظور ہے، وہ عورت شام کے دور دراز علاقہ میں رہتی تھی۔ چنانچہ عبد المطلب، بنو عبد مناف کے کچھ لوگ اور قریش کے ہر قبیلہ سے ایک ایک شخص قافلے کی صورت میں روانہ ہوئے، وہ زمین بے آب و گیاہ اور صحرائی تھی، دورانِ سفر عبد المطلب اور ان کے ساتھیوں کا پینے کا پانی ختم ہو گیا، سب کو اس قدر پیاس لگی تھی کہ ان کو موت کا ڈر لاحق ہوا۔ جن کے پاس ابھی کچھ پانی باقی تھا باقی لوگوں نے ان سے پانی مانگا لیکن انہوں نے دینے سے انکار کر دیا اور یہ مجبوری ظاہر کی کہ ہم اس وقت صحرا میں ہیں ہمیں اندیشہ ہے کہ ہم بھی آپ کی طرح مشکل میں پھنس جائیں گے۔ یہ حالت دیکھ کر عبد المطلب نے کہا: میری رائے یہ ہے کہ ہم میں جس قدر ہمت ہے ہر کوئی اپنے لئے ایک گڑھا کھودے تاکہ ہم میں سے اگر کوئی آدمی مر جائے تو باقی لوگ اسے گڑھے میں ڈال کر اوپر سے مٹی ڈال دیں، اس طرح یہ ہو گا کہ ہم سب بغیر قبر کے مرنے کے بجائے صرف آخری آدمی بغیر قبر کے رہ جائے گا، اور ایک شخص کا ضائع ہونا پورے قافلے کے ضائع ہونے کے مقابلہ میں کم تکلیف دہ بات ہے۔ سب نے کہا: آپ کی تجویز بہت عمدہ ہے، چنانچہ سب نے گڑھے کھودے اور پیاسے بیٹھے موت کا انتظار کرنے لگے۔

اسی دوران عبد المطلب نے اپنے ساتھیوں سے کہا: اللہ کی قسم! ہمارا اس طرح اپنے آپ کو موت کے حوالے کرنا اور دوڑ دھوپ نہ کرنا اور زندگی بچانے کی کوشش نہ کرنا انتہائی کم ہمتی ہے۔ اٹھو، یہاں سے کوچ کرو، شاید اللہ تعالیٰ ہمیں کہیں سے پانی مہیا کر دے۔ ان کی یہ بات سن کر سب لوگ اٹھ کر کوچ کی تیاریاں کرنے لگے، عبد المطلب جیسے ہی اپنی سواری کی طرف بڑھے تو اونٹنی کے پاؤں کے نیچے سے شیریں پانی کا چشمہ ابل پڑا، پانی دیکھ کر عبد المطلب اور ان کے ساتھیوں نے خوشی سے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا۔ سب لوگ رک گئے اور سیر ہو کر پانی پیا اور اپنے پاس موجود تمام مشکیزے اور برتن بھی پانی سے بھر لئے۔

اس کے بعد عبد المطلب نے قریش کے قبائل کو بلایا جو یہ سب منظر دیکھ رہے تھے اور ان سے فرمایا کہ اللہ نے ہمیں وافر مقدار میں شیریں پانی مہیا فرما دیا ہے، آؤ تم بھی پانی سے مستفید ہو جاؤ، چنانچہ سب آئے اور پانی سے سیر اب ہو گئے اور پھر کہہ اٹھے: اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ نے آپ کے حق میں اور ہمارے خلاف فیصلہ کر لیا ہے۔ اللہ کی قسم! ہم زمزم کے بارے میں کبھی بھی آپ سے جھگڑا نہیں کریں گے، جس ذات نے آپ کو اس بیابان میں پانی عطا کیا اسی نے آپ کو زمزم کی سعادت سے نوازا ہے۔ اب یہیں سے سرخرو ہو کر واپس چلئے، لہذا سب وہیں سے مکہ مکرمہ کی طرف لوٹ آئے اور اس کاہنہ عورت کے پاس نہیں گئے اور زمزم کا مکمل انتظام عبد المطلب کے حوالے کر دیا۔

ابن اسحاق کہتے ہیں: یہ وہ روایت ہے جو زمزم کے بارے میں مجھ تک حضرت علی بن ابی طالبؓ کے واسطے سے پہنچی ہے۔(بحوالہ: الدلائل للبیہقی: 1/93-94،ابن ہشام 153-1/151)

آبِ زمزم کی فضیلت کے سلسلہ میں بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں، ان میں ایک روایت وہ ہے جس کو امام مسلمؒ نے اپنی صحیح میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کے سلسلہ میں روایت کیا ہے کہ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: "وہ (آبِ زمزم) بابرکت پانی ہے، وہ کھانے والے کے لئے کھانا بھی ہے" (صحیح مسلم: 2473)

دار قطنی (2713) نے اور حاکم (1/473) نے روایت نقل کی ہے اور اس کو صحیح قرار دیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "آبِ زمزم ہر اس ضرورت کے لئے ہے جس کے لئے پیا جائے، اگر آپ اسے شفا کی نیت سے پیوگے، اللہ آپ کو شفا عطا کرے گا، اگر آپ اس کو بھوک مٹانے کے لئے پیوگے، اللہ آپ کو شکم سیر کردے گا، اگر آپ اس کو پیاس بجھانے کے لئے پیوگے، تو اللہ تعالیٰ آپ کی پیاس مٹادے گا، وہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کا اپنے پر یا پیر زمین پر مارنے کے نتیجے میں ظاہر ہوا اور اللہ تعالیٰ نے اسماعیل علیہ السلام کے لئے اس کے ذریعہ پانی کا انتظام کیا"۔

شیخ محمد ابو شہبہ فرماتے ہیں "کچھ بھی ہو حافظ دمیاطی (جو متاخرین میں ماہر و متقن حفاظ میں سے ہیں) نے "آب زمزم ہر اس ضرورت کے لئے ہے جس کے لئے پیا جائے" والی حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔(دیکھیں: السیرۃ النبویہ الصحیحۃ 1/158) اور حافظ عراقی نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ (دیکھیں: مقدمہ ابن الصلاح اور حافظ عراقی کی اس کی شرح، ص: 13)

۲: اصحابِ فیل کا واقعہ:

یہ واقعہ قرآنِ کریم اور سنت نبویہؐ سے ثابت ہے اور اس کی تفصیلات کتب سیرت وتاریخ میں موجود ہیں، اسی طرح مفسرین نے بھی اپنی تفاسیر میں اس کا ذکر کیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: [اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ (1) اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ (2) وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ (3) تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ (4) فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ (5)] ترجمہ: ''کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ آپ کے رب نے ہاتھی والوں سے کیا کیا۔ کیا اس نے ان کی تدبیر کو بے کار نہیں بنا دیا تھا۔ اور اس نے ان پر غول کے غول پرندے بھیجے۔ جو ان پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر پھینک رہے تھے۔ پھر انہیں کھائے ہوئے بھوسے کی طرح کر ڈالا''۔(سورۂ فیل: 1-5)

اللہ کے رسول ﷺ نے اس واقعہ کی تفصیلات کی جانب جابجا ارشاد فرمایا، جیسے کہ رسول ﷺ جب حدیبیہ کے زمانہ میں مکہ مکرمہ کے لئے روانہ ہوئے تو جب اس گھاٹی میں پہنچے جہاں سے نیچے کی طرف آتے ہیں تو وہاں آپؐ کی اونٹنی بیٹھ گئی، لوگوں نے اٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں اٹھی، لوگوں نے کہا: قصواء بدک گئی ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: "قصواء بدکی نہیں ہے اور نہ ہی یہ اس کی عادت ہے بلکہ ہاتھی روکنے والے نے اس کو روک رکھا ہے"۔(صحیح بخاری: 2731، مسند أحمد 4/323)

ابوحاتم کی "السیرۃ النبویۃ" میں اس واقعہ کی تفصیلات یوں مذکور ہیں: "ہاتھی کا واقعہ یہ تھا کہ یمن میں ایک بادشاہ تھا جس نے یمن میں غلبہ حاصل کیا تھا، حالانکہ وہ اصلاً حبشہ سے تھا، اس کا نام ابرہہ تھا، اس نے صنعاء میں ایک کنیسہ (گرجا گھر) بنایا، اور اس کا نام "قُلّیس"

رکھا، اس کا منصوبہ تھا کہ عرب کے حج کا مرکز اس کو بنادے، اس نے یہ قسم کھائی کہ وہ خانہ کعبہ جا کر اس کو ڈھادے گا، یہ سن کر حمیر کے بادشاہوں میں سے "ذونفر" نامی بادشاہ اپنی قوم کے لوگوں کے ساتھ اس کے مقابلہ کے لئے نکلا اور اس سے جنگ کی اور ابرہہ نے اسے شکست دی اور اس کو گرفتار کرلیا، جب اس کو ابرہہ کے سامنے پیش کیا گیا تو ذونفر نے اس سے کہا: اے بادشاہ! مجھے قتل مت کیجئے، اس لئے کہ مجھے زندہ رکھنا مجھے مار دینے سے زیادہ بہتر ہے، ابرہہ نے اسے زندہ رکھا اور اس کو باندھ لیا اور خود خانہ کعبہ کا قصد کئے ہوئے روانہ ہوا، یہاں تک کہ قبیلہ خثعم کے علاقے کے قریب پہنچا، تو نفیل بن حبیب خثعمی اور اس کے ساتھ یمن کے جمع شدہ دوسرے قبائل اس کے مقابلہ کے لئے نکلے، سب نے اس کا مقابلہ کیا لیکن اس نے سب کو شکست دی اور نفیل کو گرفتار کرلیا، نفیل نے اس سے کہا: اے بادشاہ! میں عرب کی سرزمین سے واقف ہوں، لہذا مجھے قتل نہ کریں اور یہ میری قوم بھی سمع و طاعت کے لئے تیار ہے، اس لئے ابرہہ نے اس کو زندہ رکھا اور وہ اس کے ساتھ اس کی رہنمائی کرتے ہوئے نکلا، یہاں تک کہ جب وہ مقامِ طائف تک پہنچا، وہاں مسعود بن معتب ثقیف کے لوگوں کے ساتھ اس کے پاس گیا اور اس سے کہا: اے بادشاہ! ہم آپ کے غلام اور تابعِ فرمان ہیں، ہمارا آپ سے کوئی اختلاف اور جھگڑا نہیں ہے اور آپ جس ارادہ سے آئے ہیں اس کا تعلق ہم سے نہیں ہیں۔ (ان کا مطلب یہ تھا کہ ہم "لات" کو ماننے والے ہیں) آپ کا مقصود تو وہ گھر ہے جو مکہ میں ہے، ہم آپ کے ساتھ ایسا شخص بھیج دیں گے جو آپ کو اس کا پتہ بتائے گا۔

انہوں نے اس کے ساتھ ابورغال نامی اپنا ایک غلام بھیج دیا، وہ ان کے ساتھ چلا یہاں تک کہ جب وہ مقام "مغمس" پر پہنچے تو ابو رغال کا انتقال ہو گیا اور یہی وہ شخص ہے جس کی قبر پر لوگوں نے (رجم) سنگ باری کی، ابرہہ نے مغمس سے ایک دوسرے شخص جس کا نام اسود بن مقصود تھا، کو اپنے لشکر کے آگے بھیجا، سب اہلِ حرم اس کے پاس جمع ہوگئے، اس نے عبدالمطلب کے دو سو اونٹ مقام 'اُرک' میں غضب کرلئے، اس کے بعد ابرہہ نے 'حناطہ الحمیری' کو اہلِ مکہ کے پاس بھیجا اور کہا: وہاں کے سردار کے بارے میں معلوم کرو اور اس کو باخبر کردو کہ میں لڑنے کے لئے نہیں آیا ہوں، بلکہ میں تو صرف خانہ کعبہ کو منہدم کرنے کے لئے آیا ہوں۔

حناطہ روانہ ہوا یہاں تک کہ مکہ میں داخل ہو گیا اور عبدالمطلب بن ہاشم سے ملاقات کی، ان سے کہا: مجھے بادشاہ نے آپ کے پاس یہ پیغام لے کر بھیجا ہے کہ وہ آپ سے جنگ کرنے کے لئے نہیں بلکہ اس گھر کو ڈھانے کے لئے آئے ہیں اور اس کو منہدم کر کے وہ واپس چلے جائیں گے، عبدالمطلب نے کہا: ہم اس سے جنگ نہیں کر سکتے ہیں، ہم اس کے اور خانہ کعبہ کے درمیان آڑے نہیں آئیں گے، اگر اللہ تعالیٰ اس کو اپنا گھر ڈھانے کی مہلت دے گا تو واللہ! ہمارے پاس اس کے مقابلہ کے لئے کوئی طاقت نہیں ہے۔ حناطہ نے کہا: آپ خود ہی میرے ساتھ بادشاہ کے پاس چلیں، حضرت عبدالمطلب اس کے ساتھ روانہ ہوئے یہاں تک کہ فوجی چھاؤنی پہنچ گئے۔ ذونفر حضرت عبدالمطلب کے دوست تھے۔ وہ اس کے پاس گئے اور اس سے کہا: اے ذونفر! کیا آپ ہماری اس مصیبت میں ہمیں کوئی فائدہ پہنچا سکتے ہیں؟! اس نے کہا: ایک قیدی شخص کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے جس کو یہ ڈر لگا ہوا ہے کہ صبح یا شام کبھی بھی اس کو قتل کر دیا جائے، البتہ میں آپ کے متعلق ہاتھی بان 'انیس' نامی شخص کو پیغام بھیجواتا ہوں، اور اس سے کہتا ہوں کہ وہ آپ کے لئے بادشاہ کے پاس جو بھی کچھ کر سکتا ہو کرے، اور آپ کی شخصیت اور مقام و مرتبہ کو اس کے سامنے بڑھا چڑھا کے پیش کرے۔ کہتے ہیں: اس نے انیس کے پاس ایک قاصد کو بھیجا اور اس نے اس سے

کہا: بے شک یہ قریش کے سردار ہیں، مکہ کے قافلۂ تجارت کے سرپرست ہیں، جو میدانی علاقوں میں لوگوں کے لئے کھانے کا انتظام کرتے ہیں، اور پہاڑوں میں بھی جانوروں کو کھلاتے ہیں، بادشاہ نے ان کے دو سو اونٹ چھین لئے ہیں اگر آپ ان کو کوئی فائدہ پہنچا سکتے ہو تو ان کے کام آجاؤ کیونکہ وہ میرے دوست ہیں۔

انیس ابرہہ کے پاس گیا اور کہا: اے بادشاہ! یہ سردارِ قریش اور مکہ کے قافلۂ تجارت کے سرپرست اعلی ہیں، جو میدانی علاقوں میں لوگوں کے لئے کھانے کا انتظام کرتے ہیں، اور پہاڑوں میں بھی جانوروں کو کھلاتے ہیں، وہ آپ سے ملنے کی اجازت چاہتے ہیں اور ان کی چاہت ہے کہ آپ ان کو اجازت دے دیں، وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہیں اور وہ نہ آپ کے مخالف ہیں اور نہ ہی آپ کے خلاف کسی کا ساتھ دینے والے ہیں، لہٰذا ان کو اجازت دے دیجئے۔ عبد المطلب ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے، جسمانی ڈیل ڈول والے اور خوبرو تھے، جب ان کو ابرہہ نے دیکھا تو ان کو بڑا سمجھا اور ان کا اکرام کیا اور اس بات کو ناپسند کیا کہ وہ اس کے ساتھ اس کے تخت پر بیٹھیں اور یہ بات بھی ناپسند کی کہ وہ ان کے نیچے بیٹھیں، اس لئے وہی نیچے آکر فرش پر بیٹھا، عبد المطلب نے اس سے کہا: اے بادشاہ! آپ نے میرا اہم اور قیمتی مال لے لیا ہے وہ واپس دے دیجئے۔ ابرہہ نے یہ سن کر کہا: جب میں نے آپ کو دیکھا تھا تو آپ کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا تھا لیکن اب آپ کی شخصیت میرے نزدیک بہت زیادہ اہم نہیں ہے۔ عبد المطلب نے کہا ایسا کیوں؟ کیا بات ہوگئی؟! اس نے کہا: میں اس گھر کو ڈھانے کے لئے آیا ہوں جس پر تمہارا اور تمہارے آباؤ اجداد کا دین قائم ہے اور اسی کے نتیجہ میں تم لوگوں کو عزت وقوت حاصل ہے۔ اس کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں کرتے ہو اور اپنے دو سو اونٹوں کی بات کرتے ہو! عبد المطلب نے کہا: میں تو اونٹوں کا مالک ہوں (اس لئے اس کی فکر کرتا ہوں) اور اس گھر کا بھی ایک مالک ہے، وہ خود ہی اس کی حفاظت کرے گا۔ ابرہہ نے کہا: وہ اس کو مجھ سے کہاں بچا سکتا ہے! عبد المطلب نے کہا: تم جانو اور اس گھر کا مالک جانے! کہتے ہیں کہ ابرہہ نے ان کے اونٹوں کے بارے میں حکم دیا اور وہ واپس لوٹا دئے گئے، اس کے بعد عبد المطلب نکلے اور قریش کو پوری صورتحال سے آگاہ کر دیا اور ان کو حکم دیا کہ اپنی حفاظت کے لئے گھاٹیوں میں پناہ لے لیں۔

ابرہہ صبح کے وقت مقام مغمس میں تھا اور اس نے مکہ میں داخل ہونے کی تیاری کرلی، اپنا لشکر تیار کیا، اپنا ہاتھی اپنے قریب لایا اور اس پر جو سامان لادنا چاہا اس پر لاد دیا جبکہ وہ کھڑا تھا، جب اس کو چلایا تو وہ رک گیا، وہ زمین پر بیٹھنے لگا، اس کے سر پر لوہے کی سلاخوں سے مارا لیکن وہ نہیں اٹھا، اس کو ڈنڈوں اور برچھوں سے مارا لیکن وہ نہیں اٹھا، اس کا رخ یمن کی جانب کیا تو وہ تیزی سے دوڑنے لگا، پھر حرم کی جانب پھیرا تو رک گیا اور ہاتھی وہیں ایک پہاڑ میں رک گیا، اس وقت اللہ تعالیٰ نے سمندر کی جانب سے بگلے کی طرح چڑیوں کے جھنڈ بھیجے، ہر پرندے کے ساتھ تین پتھر تھے: دو دو پتھر اپنے پنجوں میں اور ایک پتھر اپنی چونچ میں، اور یہ پتھر دال اور چنے کی طرح چھوٹے تھے، جب سب لوگ جمع ہوئے تو پرندوں نے پتھروں کی بارش کر دی، یہ پتھر جس کو بھی لگتے وہ ہلاک ہو جاتا، لیکن سب لوگوں کو نہیں لگے، اسی کو اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا ہے: [أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ الْفِيلِ (1) أَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِي تَضْلِيلٍ (2) وَأَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا أَبَابِيلَ (3) تَرْمِيهِم بِحِجَارَةٍ مِّن سِجِّيلٍ (4) فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ (5)] ترجمہ: " کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ آپ کے رب نے ہاتھی

والوں سے کیا کیا۔ کیا اس نے ان کی تدبیر کو بے کار نہیں بنا دیا تھا۔ اور اس نے ان پر غول کے غول پرندے بھیجے۔ جو ان پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر پھینک رہے تھے۔ پھر انہیں کھائے ہوئے بھوسے کی طرح کر ڈالا"۔(سورۂ فیل: 1-5)

اللہ تعالیٰ نے ابرہہ کے جسم میں خطرناک قسم کی بیماری پیدا کر دی، سب لوگوں نے گرتے پڑتے مختلف علاقوں سے واپسی کا راستہ پکڑ لیا۔ ابرہہ کی انگلیوں کا ایک ایک پور گرتا رہا جیسے ہی کوئی پور گرتا تو وہاں سے خون اور پیپ نکلنا شروع ہوتا۔ وہ یمن اپنے بچے ہوئے لوگوں کے ساتھ اس حال میں پہنچا جیسے کہ وہ ایک پرندہ کے بچے کی طرح ہو گیا ہو، اس کے بعد بری طرح جان دی۔(السیرۃ النبویۃ، ابو حاتم البستی، ص34-39، مزید دیکھیں: السیرۃ النبویۃ، ابن کثیر، 37 - 1/30)

ابن اسحاقؒ نے اپنی سیرت میں ذکر کیا ہے جیسے کہ ابن ہشام نے ان سے اپنی سیرت میں نقل کیا ہے کہ عبد المطلب نے خانہ کعبہ کے دروازہ کی کنڈی پکڑی اور ان کے ساتھ قریش کے لوگوں کا ایک گروہ بھی تھا اور وہ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنے لگے اور ابرہہ اور اس کی فوج کے مقابلہ میں مدد چاہنے لگے۔ عبد المطلب نے خانہ کعبہ کے دروازے کی کنڈی پکڑ کر کہا:

لاهم إنّ المرء يم ... نع رحله فامنع حلالك

لا يغلبن صليبهم ... ومحالهم أبدا محالك

إن كنت تاركهم وقب ... لتنا فأمر ما بدا لك

ترجمہ: "اے اللہ! بندہ تو اپنی سواری کی حفاظت کر سکتا ہے تو اپنے حرم کی حفاظت فرما، یہ ہر گز نہیں ہو سکتا ہے کہ ان کی صلیب اور ان کی ڈولیں تیری ڈولوں پر غالب آجائیں۔ اگر تو ان کو اور ہمارے قبلہ کو بے یار و مددگار چھوڑ دیتا ہے اور یہ اس بلد حرام میں داخل ہو جاتے ہیں تو تو جیسا چاہے کر"۔

یہ دعا کرنے کے بعد عبد المطلب نے بابِ کعبہ کی کنڈی چھوڑ دی اور خود قریش کے لوگوں کے ساتھ پہاڑوں کی چوٹیوں پر چلے گئے۔ وہاں جا کر پناہ لی اور انتظار کرتے رہے کہ اگر ابرہہ مکہ میں داخل ہوتا ہے تو وہاں کیا کرتا ہے۔ اس کے بعد ابن اسحاق نے ابرہہ اور اس کے لشکر کی ہلاکت کا مکمل واقعہ بیان کیا ہے۔(دیکھیں: السیرۃ النبویہ، ابن ہشام، شرح أبوذر الخشنی 1/84-91)

واقعۂ فیل سے حاصل شدہ اسباق و دروس اور فوائد:

1)واقعۂ فیل کے ذریعہ سب سے پہلے گھر خانہ کعبہ کی عظمت و شرف کا پتہ چلتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عرب کے مشرکین کیسے اس کی تعظیم و تقدیس کرتے تھے اور اس کے مقابلہ میں کسی چیز کو ترجیح نہیں دیتے تھے، یہ مقام و مرتبہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل (علیہما السلام) کے دین کے باقی ماندہ اثرات کا نتیجہ تھا۔

2)اس سے پتہ چلتا ہے کی عیسائی مکہ اور خانہ کعبہ کی تعظیم کرنے والے عربوں سے کتنا بغض اور نفرت رکھتے تھے، اور اُن سے حسد کرتے تھے، اسی لئے ابرہہ نے ارادہ کیا کہ قلیس نامی کنیسہ (گرجاگھر) بنا کر عربوں کو بیت اللہ کی تعظیم سے ہٹا کر گرجا کی طرف پھیر دیا جائے، اگرچہ

اس نے ترغیب وترہیب کے تمام حربے استعمال کئے لیکن عربوں نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ایک عربی شخص نے قلیس گرجاگھر میں ناپاکی کر دی۔

امام رازیؒ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں: ''جان لو کہ "کید" دوسرے کو خفیہ طریقہ سے نقصان پہنچانے کے قصد وارادے کا نام ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو "کید" کیوں کہا حالانکہ یہ معاملہ تو ظاہر ونمایاں تھا؟ ابرہہ تو صراحت اور اعلانیہ طور پر خانہ کعبہ کو ڈھانے کی بات کہہ رہا تھا! اس کا جواب یہ ہے کہ بات اگرچہ ایسی ہی ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کے دل میں جو کچھ تھا وہ اس ظاہر سے کہیں برا اور خطرناک تھا۔ اس لئے کہ وہ عربوں کے لئے حسد ودشمنی اپنے دل میں رکھتا تھا اور خانہ کعبہ کی وجہ سے ان کو حاصل ہونے والے شرف و عزت کو اپنی طرف اور اپنے شہر کی طرف پھیرنا چاہتا تھا''۔ (تفسیر رازی: 32/94)

3) مقدسات کے لئے ایثار وقربانی:

شاہانِ حمیر میں سے ایک بادشاہ ابرہہ کے لشکر کے مقابلہ میں کھڑا ہوتا ہے اور وہ بادشاہ قید ہو جاتا ہے۔ اسی طرح نفیل بن حبیب خثعمی اور اس کے ساتھ یمنی قبائل بھی ابرہہ کے مقابلہ میں آئے اور ابرہہ سے لڑنے کی کوشش کی لیکن وہ اس لشکرِ جرار کے مقابلہ میں ٹک نہ سکے اور شکست کھائی، البتہ انہوں نے اپنے مقدسات کے دفاع میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ بیشک مقدسات کی طرف سے دفاع کرنا اور اس سلسلہ میں قربانی دینا انسان میں ایک فطری جذبہ ہے۔

4) امت کے ساتھ خیانت کرنے والے ذلیل وخوار ہونے والے ہیں:

وہ مفاد پرست لوگ جنہوں نے ابرہہ کا ساتھ دیا اس کے جاسوس اور مخبر بن گئے، اور اس کو بیت اللہ کا پتہ بتایا، ایسے لوگ دنیا اور آخرت دونوں جگہ ملعون اور ذلیل وخوار قرار پائے، اللہ کی طرف سے ان پر لعنت برسی اور لوگوں کے نزدیک بھی ملعون قرار پائے۔ ابورغال کی قبر خیانت ودغابازی کی علامت بن گئی اور لوگوں کے دلوں میں وہ شخص قابل نفرت ہو گیا، جو بھی اس کی قبر کے پاس سے گزرتا اس پر سنگ باری کرتا۔

5) اللہ اور اس کے دشمنوں کے مابین معرکہ کی حقیقت:

سردار مکہ عبدالمطلب کا یہ قول: "ہم اس (ابرہہ) کے اور خانہ کعبہ کے درمیان آڑے نہیں آئیں گے، اگر اللہ تعالیٰ اس کو اپنا گھر ڈھانے کی مہلت دے گا تو واللہ! ہمارے پاس اس کے مقابلہ کی کوئی طاقت نہیں ہے"۔

یہ قول اللہ تعالیٰ اور اس کے دشمنوں کے مابین جاری کشمکش اور معرکہ کی اصل حقیقت کی انتہائی باریک بینی پر مبنی وضاحت ہے۔ دشمن خدا اور اس کی فوج کے پاس چاہے جتنی بھی طاقت وقوت ہو لیکن وہ اللہ کی قدرت، اس کی پکڑ اور اس کے انتقام کے سامنے تھوڑی دیر بھی ٹکنے کی صلاحیت وقدرت نہیں رکھتے ہیں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ جب چاہے کسی کو زندگی دے سکتا ہے اور جب چاہے اس سے زندگی چھین سکتا ہے۔ (دیکھیں، السیرۃ النبویۃ، ابو فارس، ص:112)

علامہ قاسمیؒ نے اپنی تفسیر میں علامہ قاشانی کا قول نقل کیا ہے کہ: اصحاب فیل کا واقعہ مشہور زمانہ ہے، اور ان کا واقعہ عہد نبوی ﷺ سے بالکل قریب ہے، وہ اللہ کی قدرت کی ایک اہم نشانی ہے اور جو بھی اس کے حرم کو پامال کرنے کی جرأت کرے گا اس سے ناراضگی اور انتقام کی واضح دلیل ہے۔(دیکھیں: محاسن التفسیر، القاسمی، 17/262)

6) بیت اللہ اور اہلِ بیت اللہ کی عزت و تعظیم:

جب اللہ نے اپنے گھر کی مفسدین اور شرپسندوں کے شر سے اور خفیہ تدبیر کرنے والوں کی سازشوں سے خود حفاظت و حمایت کی تو یہ دیکھ کر عرب لوگوں کے دلوں میں بیت اللہ کی عزت و تعظیم میں مزید اضافہ ہوا، اور عرب لوگ قریش کو بھی عظمت کی نگاہ سے دیکھنے لگے اور کہنے لگے: یہ اہل اللہ اور اس کے خاص لوگ ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف سے مقابلہ کر کے دشمن کو شکست و ریخت سے دوچار کر دیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک اہم نشانی اور معجزہ تھا، اور مکہ میں ایک ایسے نبی کی بعثت کی تمہید اور مقدمہ تھا جو نبی خانہ کعبہ کو بتوں سے پاک کرے گا اور اس کو اپنا اصل مقام و مرتبہ واپس دلائے گا۔(دیکھیں: السیرۃ النبویۃ، الندویؒ، ص:92)

7) اصحابِ فیل کا واقعہ نبوت کے دلائل میں ہے:

بعض علماء کا قول ہے کہ واقعۂ فیل نبوت کے شواہد و دلائل میں سے ہیں، ان علماء میں علامہ ماوردیؒ بھی ہیں، وہ فرماتے ہیں: "مالکِ کون و سماء کی آیات و نشانیاں نمایاں ہیں اور نبوت کے دلائل و شواہد بھی واضح اور مبرہن ہیں، ان کی 'ابتدا' انجام کا پتہ دیتی ہے، لہٰذا ان میں سچ کے ساتھ جھوٹ کے خلط ملط ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے، اور نہ ہی اس حق کے ساتھ کوئی افترا اندازی کر سکتا ہے۔ اس کی قوت و وسعت کے اعتبار سے ہی اس کے متعلق خوشخبری اور آگاہی بھی ہو گی، جب اللہ کے رسول ﷺ کی ولادت باسعادت کا زمانہ قریب آیا تو آپؐ کی نبوت کی آیات نے ہر چہار سو کو معطر کر دیا، اور آپؐ کی برکت کی نشانیاں ظہور پذیر ہوئیں، ان نشانیوں میں سب سے زیادہ اہمیت کی حامل اور شہرت کے اعتبار سے ظاہر و واضح نشانی اصحاب فیل کا واقعہ تھا........ اس واقعہ کی تفصیلات نیز تبصرہ کرنے کے بعد فرماتے ہیں: اصحاب فیل کے واقعہ میں آپ ﷺ کی رسالت کی دلیل اور نشانی یہ ہے کہ آپ ﷺ اس وقت مکہ مکرمہ میں اپنی والدہ کے بطن میں بطورِ حمل تھے، اس لئے کہ واقعۂ فیل کے پچاس دن بعد اور اپنے والد کی وفات کے بعد آپؐ کی پیدائش بارہ ربیع الاول بروز پیر ہوئی، لہٰذا واقعۂ فیل دو اعتبارات سے نشانی ہے:

1) اگر ابرہہ اور اس کا لشکر کامیاب ہو جاتے تو وہاں کے لوگوں کو قید کر لیتے اور غلام بنا لیتے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو ہلاک کر دیا تاکہ آپ ﷺ کو ماں کے بطن میں بھی اور پیدائش کے بعد بھی غلامی کے عیب سے محفوظ رکھا جائے۔

2) قریش کے پاس اتنی طاقت و قوت اور حیثیت نہیں تھی جس کے ذریعہ وہ اصحاب فیل کا مقابلہ کر سکتے، اور نہ ہی وہ اہل کتاب تھے۔ اس لئے کہ ان میں سے بعض بتوں کی عبادت و اطاعت کرنے والے تھے، بعض زندقہ اور بے دینی کے قائل تھے، اور بعض دوبارہ زندہ ہونے کے منکر تھے، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے نبوت کی بنیاد ڈالتے ہوئے اور خانہ کعبہ کی عظمتِ رفتہ کو بحال کرنے کے لئے اسلام کو پھر سے ظاہر و غالب کرنے کا ارادہ کیا، اسی طرح جب عربوں میں یہ بات عام ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ نے ابرہہ کے لشکر کو کس انجام سے دوچار کیا، تو حرم کی عظمت

عربوں کے دلوں میں گھر کر گئی، وہ اس کو تعظیم کی نگاہ سے دیکھنے لگے اور دلوں میں اس کا احترام بڑھ گیا، اور سب عرب قریش کے تابعِ فرمان بن گئے، وہ کہنے لگے: اہل اللہ اور اس کے خاص لوگ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف سے مقابلہ کیا اور ان کے دشمن کی تدبیر کو خاک میں ملا دیا۔ اس لئے اس کی عزت و تعظیم اور شرف و مقام میں ان کے نزدیک مزید اضافہ ہوا، اور قریش نے وفادہ (وہ مال جس کو قریش ہر سال نکالتے تھے اور اس کے ذریعہ ایامِ منی میں لوگوں کے لئے کھانا تیار کرتے تھے) سدانہ (خدمت کعبہ) اور سقایہ (آب زمزم کا انتظام وانصرام) کی ذمہ داریاں سنبھالیں، نتیجتاً وہ قابلِ اطاعت ائمہ اور رہبر و رہنما اور قائد بن گئے اور اصحاب فیل بعد میں آنے والوں کے لئے نشانِ عبرت اور مثال بن گئے۔ (أعلام النبوۃ، الماوردی، ص، 189-185)

علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: یہ واقعہ ٔفیل نبی کریم ﷺ کی ولادتِ باسعادت کے سال پیش آیا، اور خانہ کعبہ کے آس پاس کے لوگ مشرک تھے، وہ بتوں کی عبادت کرتے تھے، اور نصاری کا دین ان سے بہتر تھا۔ لہذا اس سے یہ معلوم ہوا کہ یہ اہم نشانی اس وقت خانہ کعبہ کے پڑوسیوں کی وجہ سے ظہور پذیر نہیں ہوئی بلکہ بیت اللہ کی وجہ سے ظہور پذیر ہوئی، یا نبی کریم ﷺ کی وجہ سے ظاہر ہوئی اس لئے کہ آپ ﷺ کی ولادت خانہ کعبہ کے پاس اسی سال ہوئی، یا یہ سب وجوہات اس نشانی کے ظہور پذیر ہونے کے اسباب میں ہیں۔ سبب جو بھی ہو لیکن یہ نبوت کے دلائل میں سے ہے۔ (دیکھیں، الجواب الصحیح، 4/122)

علامہ ابن کثیرؒ واقعہ ٔفیل کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "یہ واقعہ حضور ﷺ کی بعثت کا پیش خیمہ اور آپؐ کی آمد کی اطلاع اور تمہید تھا، اس لئے کہ آپ ﷺ کی ولادتِ باسعادت مشہور قول کے مطابق اسی سال ہوئی، گویا خدائے قادرِ مطلق زبانِ حال سے فرمارہا ہے کہ اے قریش کے لوگو! حبشہ کے اس لشکر پر تمہیں تمہاری بھلائی کی وجہ سے فتح نہیں ملی ہے بلکہ اس بیت عتیق کی وجہ سے ہوئی ہے جسے ہم شرف و بزرگی اور عظمت و عزت میں خاتم النبیین نبی اُمی حضرت محمد ﷺ کی بعثت و نبوت کے ذریعہ بڑھانے والے ہیں۔ (تفسیر ابنِ کثیر (4/548-549

8) اللہ تعالیٰ کے ذریعہ بیتِ عتیق کی حفاظت:

اس حفاظت کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ کتاب (ابرہہ اور اس کے لشکر کو) بیت اللہ کو ڈھانے کی قدرت اور مہلت نہیں دی، اسی طرح ارض مقدسہ پر تسلط حاصل کرنے کا موقع نہیں دیا، اگرچہ اس وقت شرک اس سرزمین کو ناپاک کر رہا تھا اور اہلِ مشرق خانہ کعبہ کے متولی اور ذمہ دار تھے، ایسا اس لئے ہوا تا کہ بیتِ عتیق غاصبوں کے تسلط سے اور شرپسندوں کی چالوں سے محفوظ رہے اور اس زمین کی حریت و آزادی برقرار رہے، تا کہ نیا عقیدہ اس میں آزادانہ طریقہ سے پروان چڑھ سکے، نہ اس پر کسی طاقتور کا کنٹرول ہو، نہ کسی سرکش اور جابر کی سرکشی کا اندیشہ ہو، اور نہ ہی اس دین پر کسی کی اجارہ داری ہو جو تمام ادیان اور تمام انسانوں پر غالب ہونے کے لئے آیا ہے، اسی کے ہاتھ میں بنی نوع انسان کی قیادت ہو، نہ کہ کوئی اور اس پر اپنی اجارہ داری قائم کر کے اس کو اپنی مرضی سے استعمال کرے، یہ اللہ کی اپنے گھر اور اپنے دین کے لئے پیشگی منصوبہ بندی اور تدبیر تھی، قبل اس کے کہ کسی کو معلوم ہوتا کہ اس دین کو لانے والے نبی کی ولادتِ باسعادت اسی سال میں ہوئی ہے۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویۃ، ابو فارس، ص 113)

اس واضح پیغام کے ذریعہ آج بھی ہمیں امید کی کرن نظر آتی ہے اور عالمی صہونیت اور صلیبیت کے آلہ کاروں کی جانب سے مقامات مقدسہ کے تئیں مکارانہ اور شاطرانہ عزائم کے مقابلہ میں واقعۂ فیل کے ذریعہ ملنے والے پیغام کو پڑھ کر ہم مطمئن ہیں، اگرچہ ان مکارانہ اور شاطرانہ عزائم کی تکمیل کے لئے خفیہ اسکیموں اور منصوبہ بندیوں کا جال ہر لمحہ بُنا جارہا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی وہ ذات جس نے اپنے گھر کو اہل کتاب سے محفوظ رکھا، جبکہ بیت اللہ کے متولی مشرکین تھے، وہ اللہ آج بھی -ان شاءاللہ- اپنے گھر کی اور اپنے رسول ﷺ کے شہر کی شرپسندوں کی ہر چال سے اور مکروفریب سے پُر منصوبوں سے حفاظت کرے گا۔(دیکھیں: فی ظلال القرآن، 6/3980)

9) واقعۂ فیل عربوں کی تاریخ کی بنیاد:

اصحاب الفیل کے ساتھ جو کچھ پیش آیا عربوں میں اس واقعہ کو اہمیت وعظمت حاصل ہوئی، اور اس سے انہوں نے نئی تاریخ شروع کی، چنانچہ انہوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ یہ بات عام الفیل (یعنی واقعۂ فیل) والے سال میں پیش آئی، فلاں شخص عام الفیل میں پیدا ہوا، یہ واقعہ عام الفیل کے اتنے سال بعد کا ہے، عام الفیل کا واقعہ 570ء میں پیش آیا۔(السیرۃ النبویہ، الندویؒ، ص: 93)

....

پانچواں باب

نبی کریم ﷺ کی ولادتِ باسعادت سے حلف الفضول تک

1) نبی کریم ﷺ کا نسب وخاندان:

اللہ کے رسول ﷺ حسب ونسب کے اعتبار سے لوگوں میں سب سے زیادہ معزز اور شکل وصورت اور اخلاق وکردار کے اعتبار سے سب سے زیادہ کامل ومکمل شخصیت کے حامل تھے، آپ ﷺ کے عالی نسب کے سلسلہ میں متعدد وصحیح احادیث وارد ہیں۔امام مسلمؒ نے روایت کیاہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیلؑ کو ابراہیمؑ کی اولاد میں سے منتخب فرمایا،اور بنی اسماعیلؑ سے کنانہ کا انتخاب فرمایا، کنانہ سے قریش کو منتخب کیااور قریش سے بنی ہاشم کو منتخب کیااور بنی ہاشم سے میراانتخاب کیا"۔

امام بخاریؒ نے نبی کریم ﷺ کا نسب ذکر کیاہے، فرماتے ہیں: آپ ﷺ کا نسب اس طرح ہے: ابوالقاسم ، محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لؤی بن غالب بن فہر بن مالک بن النضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان۔(صحیح بخاری7/205- 206)

امام بغویؒ شرح السنۃ (13/193) میں عدنان تک آپؐ کامبارک نسب ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: "عدنان کے بعد نسب صحیح طور پر محفوظ نہیں ہے"۔

علامہ ابن قیمؒ بھی عدنان تک نسب ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: "یہاں تک کانسب صحت کے ساتھ معلوم ہے، ماہرین انساب کے نزدیک متفق علیہ ہے، اور اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے، اور عدنان کے بعد اختلاف پایاجاتاہے، البتہ اس میں کسی کااختلاف نہیں ہے کہ عدنان کاتعلق اولاداسماعیل علیہ السلام سے ہے"۔(زاد المعاد: 1/71)

ابن سعد "طبقات" میں فرماتے ہیں: ہمارے نزدیک عدنان کے بعد حضرت اسماعیلؑ تک توقف راجح ہے۔(طبقات ابن سعد، 1/58)

حضرت عروہ بن زبیرؓ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا: "عدنان اور قحطان کے بعد جن کو بھی ہم جانتے ہیں وہ صرف ایک اندازہ ہے"۔(ایضاً)

علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں: اور اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ عدنان کا تعلق اسماعیل بن ابراہیم علیہما السلام سے ہے، البتہ عدنان اور حضرت اسماعیلؑ کے مابین سلسلۂ نسب کے بارے میں اختلاف پایاجاتاہے۔(السیرۃ النبویہ ،للذھبی، ص 1)

نسبی شرف وبلندی کی پہلے بھی اوراب بھی لوگوں کے دلوں میں اہمیت رہی ہے، اس لئے کہ عالی نسب شخصیت کی قیادت وصدارت کاانکار کم ہی کیاجاتاہے، چاہے نبوّت ہو یا بادشاہت، نسب میں کم مقام حامل شخص کے سلسلہ میں پس وپیش سے کام لیاجاتاہے، بہت سے لوگ اس کے ماتحت رہنے سے کتراتے ہیں، چنانچہ اللہ کے رسولؐ کو نبوّت کے لئے تیار کیاجارہاتھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو عالی نسب کاشرف بھی عطاکیاتاکہ یہ لوگوں کے لئے آپؐ کے قریب آنے میں معاون بن سکے۔ (دراسۃ تحلیلیۃ لشخصیۃ الرسول، ص: 96)

بلاشبہ نبی کریم ﷺ کا سرچشمہ نسب پاکیزہ اور نفیس ہے، آپ ﷺ ذبیح اللہ حضرت اسماعیلؑ اور خلیل اللہ حضرت ابراہیمؑ کی نسل سے ہیں، ابراہیمؑ کی دعا کا نتیجہ اور عیسیٰؑ کی بشارت کا مصداق ہیں، جیسے کی آپ ﷺ نے بذات خود اپنے بارے میں ارشاد فرمایا ہے: "بے شک میں اپنے جد امجد ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا اثر اور اپنے بھائی عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت کا مصداق ہوں"۔ (مسند أحمد، 4/127، مستدرک حاکم 2/600 مجمع الزوائد 8/222)

سرچشمۂ نسب کی پاکیزگی اور حسب و نسب کی رفعت و بلندی انسان کو گھٹیا امور سے بلند کرتی ہے، اور عالی شان امور و فضائل کو اختیار کرنے کا سبب بنتی ہے، انبیاء اور رسول اپنے حسب و نسب کو پاک و صاف رکھنے کے حریص ہوتے ہیں، اور اس اعتبار سے لوگوں کے نزدیک معروف ہوتے ہیں، اس لئے ان کے نزدیک قابل حمد و ستائش قرار پاتے ہیں اور وہ ان پر اعتماد اور بھروسہ کرتے ہیں۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویۃ، ابو فارس، ص 102)

یہ بات بالکل واضح اور مبرہن ہوگی کہ آپ ﷺ شریف النسب تھے، اس میں اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کے مقابلہ میں عربوں کو خاص امتیاز عطا کیا تھا اور دیگر قبائل کے مقابلہ میں قریش کو امتیازی فضیلت عطا کی تھی، اس لئے اللہ کے رسول ﷺ سے محبت کا تقاضہ ہے کہ ان لوگوں سے بھی محبت کی جائے جن میں آپؐ کا ظہور ہوا، اور اس قبیلہ سے بھی محبت کی جائے جس میں آپؐ تولد ہوئے، افراد و جنس کے اعتبار سے نہیں بلکہ صرف اس اصول اور حقیقت کے پیشِ نظر کہ آپؐ کا تعلق جس قوم اور قبیلے سے ہے اس سے محبت کی جائے، اس لئے کہ عرب قریشی خاندان کو اصل مقام و شرف رسول ﷺ کے ساتھ نسبت ہونے کی وجہ سے حاصل ہوا ہے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑھتا ہے کہ عرب یا قریشیوں میں سے جو لوگ صراط مستقیم سے منحرف ہوگئے، یا کسی برائی کا ارتکاب کیا، یا اللہ کی طرف سے عطا کردہ اسلامی عزت و کرامت کے مقام سے گر گئے، اس لئے کہ اس شخص اور انفرادی انحطاط کا خاصہ یہ ہے کہ اس کے نتیجہ میں آپؐ کے ساتھ نسبت و تعلق کالعدم قرار پایا اور اس کا کوئی اعتبار باقی نہیں رہتا۔ (دیکھیں، فقہ السیرۃ، البوطی، ص: 45)

....

2) حضرت عبداللہ بن عبدالمطلب کا حضرت آمنہ بنت وہب کے ساتھ نکاح اور آپ ﷺ کی والدہ حضرت آمنہ کا خواب

حضرت عبداللہ بن عبدالمطلب اپنے والد کے نزدیک اولاد میں سب سے زیادہ محبوب تھے، جب وہ حضرت عبدالمطلب کی مانی ہوئی نذر کے مطابق ذبح ہونے سے بچ گئے اور حضرت عبدالمطلب نے ان کے بدلے سو اونٹ بطور فدیہ دیئے تو ان کا نکاح مکہ کی سب سے زیادہ شریف النسب خاتون سے کیا اور وہ خاتون حضرت آمنہ بنت وہب بن عبد مناف بن زہرہ بن کلاب ہیں۔(دیکھیں: وقفات تربویۃ مع السیرۃ، احمد فرید، ص46)

رسول ﷺ حضرت آمنہ کے شکم میں تھے کہ آپؐ کے والد حضرت عبداللہ کی وفات ہو گئی، ان کو اپنے نانہال بنو عدی بن نجار میں مدینہ منورہ میں دفن کیا گیا، کیونکہ وہ تجارت کی غرض سے شام گئے ہوئے تھے تو واپس لوٹتے ہوئے مدینہ منورہ میں انتقال ہو گیا، اور اپنے پیچھے ایک مبارک شخصیت چھوڑ گئے، گویا کہ تقدیر ان سے کہہ رہی تھی کہ زندگی میں آپ کی ذمہ داری اب حسنِ اختتام کو پہنچ چکی ہے اور اس پاکیزہ جنین کی پرورش، تربیت اور تیاری کی ذمہ داری اب اللہ تعالیٰ اپنی خاص حکمت و رحمت کے ساتھ خود نبھائے گا تاکہ یہ انسانیت کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لانے کا کام کر سکیں۔

نبوی زندگی کا آغاز حضرت عبداللہ اور حضرت آمنہ کے نکاح سے ہی نہیں ہوتا ہے بلکہ اللہ کے رسول ﷺ سے دریافت کیا گیا: آپ کا نقطہ آغاز کیا ہے؟ اللہ کے رسول ﷺ نے جواب دیا: "میں اپنے جد امجد ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا اثر اور عیسی علیہ السلام کی خوشخبری اور بشارت کا مصداق ہوں، میری والدہ نے دیکھا کہ ان سے ایک ایسا نور نمودار ہوا جس سے شام کے محلات روشن ہو گئے"۔ (مسند أحمد 5/262، المعجم الکبیر: 7729، مجمع الزوائد، 8/221)

ابراہیم علیہ السلام کی دعا اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں نقل کی گئی ہے: [رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ] ترجمہ: "اور اے رب، ان لوگوں میں خود انہی کی قوم سے ایک ایسا رسول اٹھائیو، جو انہیں تیری آیات سنائے، ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیاں سنوارے تو بڑا مقتدر اور حکیم ہے"۔(سورہ بقرۃ: 129)

اور عیسیٰؑ کی بشارت کا ذکر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہوا ہے جس میں عیسیٰؑ کی گفتگو بیان کی گئی: [وَإِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُم مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِن بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ ۖ فَلَمَّا جَاءَهُم بِالْبَيِّنَاتِ قَالُوا هَٰذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ] ترجمہ: "اور یاد کرو عیسیٰؑ ابن مریمؑ کی وہ بات جو اس نے کہی تھی کہ "اے بنی اسرائیل، میں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں اُس توراۃ کی جو مجھ سے پہلے آئی ہوئی موجود ہے، اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا جس کا نام احمد ہو گا مگر جب وہ ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آیا تو انہوں نے کہا یہ تو صریح دھوکا ہے"۔(سورۃ الصف: 6)

آپ کا یہ فرمان کہ میری والدہ نے دیکھا گویا کہ ان سے ایک ایسا نور نمودار ہوا جس سے شام کے محلات روشن ہو گئے۔ علامہ ابن رجب ؒ فرماتے ہیں: "آپ ﷺ کی ولادت کے وقت اس نور کا نمودار ہونا، یہ اس نور کی جانب اشارہ ہے جو آپ ﷺ لے کر آئیں گے جس کے ذریعہ تمام روئے زمین کے لوگوں نے ہدایت حاصل کی اور اس کے ذریعہ شرک کی ظلمت و تاریکی کافور ہو گئی، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: [يَآ أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۚ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتَابٌ مُّبِيْنٌ (15) يَهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمَاتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (16)] ترجمہ: اے اہل کتاب! تحقیق تمہارے پاس ہمارا رسول آیا ہے جو بہت سی چیزیں تم پر ظاہر کرتا ہے جنہیں تم کتاب میں سے چھپاتے تھے اور بہت سی چیزوں سے در گزر کرتا ہے، بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی اور واضح کتاب آئی ہے۔ اللہ سلامتی کی راہیں دکھاتا ہے اسے جو اس کی رضا کا تابع ہو، اور ایسے لوگوں کو اپنے حکم سے اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالتا ہے، اور انہیں سیدھی راہ پر چلاتا ہے"۔ (سورۃ المائدہ، 15-16)

علامہ ابن کثیر ؒ فرماتے ہیں: "سرزمینِ شام کو نور کے ظہور کے ساتھ خاص کرنے میں بلادِ شام میں دین کے استقرار و ثبات کی جانب اشارہ ہے، اسی لئے شام آخری زمانہ میں اسلام اور اہل اسلام کے لئے محفوظ قلعہ بن جائے گا۔ وہیں دمشق کے مشرقی منارہ پر عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا۔ اسی لئے صحیحین میں یہ روایت مروی ہے کہ "میری امت کا ایک گروہ مسلسل حق پر غالب رہے گا، ان کو بے یار و مددگار چھوڑ دینے والا اور ان کی مخالفت کرنے والا ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا ہے یہاں تک کہ اللہ کا حکم آجائے اور وہ اسی حال میں ہوں گے"۔ صحیح بخاری میں یہ الفاظ وارد ہیں کہ "وہ شام میں ہوں گے"۔ (صحیح بخاری: 3641، مسلم: 1923)

3) حبیب مصطفی ﷺ کی ولادتِ باسعادت:

حبیبِ مصطفی ﷺ کی ولادت باسعادت بالاتفاق دوشنبہ (پیر) کے دن ہوئی، اکثر سیرت نگاروں کی رائے یہ ہے کہ اس دن ربیع الاول کی بارہ تاریخ تھی۔ (دیکھیں: صحیح السیرۃ النبویۃ، ابراہیم العلی، ص: 47)۔

اس پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ آپ ؐ کی ولادت عام الفیل (مطابق، 570 عیسوی) میں ہوئی۔ (السیرۃ النبویۃ، ابن کثیر 1/203)۔ آپ کی پیدائش شعبِ بنی ھاشم میں حضرت ابو طالب کے گھر میں ہوئی۔ (وقفات تربویہ مع السیرۃ النبویۃ، ص: 47)

احمد شوقی نے حبیبِ مصطفی ﷺ کی ولادت کے سلسلہ میں یہ اشعار کہے ہیں:

وُلِدَ الهدى فَالكائناتُ ضياءُ ۔۔۔ وفَمُ الزمان تَبَسُّم وثَناء
الرَوح والمَلَأُ المَلائكُ حولَه ۔۔۔ للدينِ والدُنيا به بُشَراءُ
والعرش يزهو والحظيرةُ تَزدَهي ۔۔۔ والمُنتَهى والسِدرَةُ العَصماءُ
وَحَديقَةُ الفُرقان ضاحِكَةُ الرُبا ۔۔۔ بالتَرجُمانِ شَذيَّةٌ غَنّاءُ
والوَحيِ يَقطُرُ سَلسَلاً من سَلسَلٍ ۔۔۔ وَاللَوح والقَلَم البَديع رواء
نُظِمت أَسامي الرسلِ فَهي صَحيفَةٌ ۔۔۔ في اللَوحِ واسمُ مُحَمَّدٍ طُغَراءُ

اسمُ الجَلالَة في بَديعِ حُــروفه ... أَلفٌ هُنالكَ وَاسمُ طَه الباءُ
يا خيرَ من جاء الوجود تحيَّةً ... من مُرسَلين إلى الهدى بك جاؤوا
بيتُ النبيين الّذي لا يلتقي ... إلّا الحنائفُ فيه والحُنَفاءُ
خيرُ الأُبُوَّة حازهم لَكَ آدمٌ ... دونَ الأنامِ وأحرزَت حوّاءُ
ذُعِرت عُرُوشُ الظالمين فزُلزِلَت ... وعلَت على تيجانهم أصداءُ
والنارُ خاويةُ الجوانبِ حولَهم ... خَمَدَت ذوائبها وغَاضَ الماءُ

ترجمہ: سراپاہدایت شخصیت (رسول ہدایت) ﷺ کی ولادت ہوئی تو کائنات روشن ہوگئی،اور زمانہ کے چہرے پر مسکراہٹ وخوشی اور منہ سے تعریف وثنا جاری ہوگئی۔روح القدس حضرت جبرئیلؑ اور ان کے ارد گرد فرشتے ان کے ذریعہ دین ودنیا کی خوشخبری دینے لگے۔عرشِ الٰہی روشن ہے اور جنت اور محفوظ سدرۃ المنتہی بھی روشن ومنور ہیں۔ قرآن کا باغیچہ لہلہا رہا ہے،زبان حق ترجمان کے ذریعہ مہک رہا ہے اور سرسبز وشاداب ہے۔ اور وحی رحمت کی پھوار برسا رہی ہے،لوحِ محفوظ اور بے مثال قلم مزین وخوشنما ہیں۔رسولوں کے ناموں کو ترتیب دیا گیا لوحِ محفوظ میں وہ ایک صحیفے کی شکل میں ہیں،ان میں محمد ﷺ کا نام بالکل نمایاں ہے۔ اللہ جل جلالہ کا نام انوکھے اور جلی حروف میں رقم ہے۔وہاں 'الف' ہے،اور طہٰ (حضرت محمدؐ) کا نام 'با' کی جگہ ہے۔(یعنی اللہ کے بعد آپؐ کو مقام بلند حاصل ہے)۔ اے وہ بہتر ذات جو دنیا میں جلوہ افروز ہوئی،تمام رسولوں کی طرف سے آپ کو سلام پیش ہے،آپ ہی کے ذریعہ وہ ہدایت کی طرف آئے۔انبیاء کا گھرانہ وہ ہے جس میں صرف حنفاء اور موحد ہی جمع ہوتے ہیں۔ آپ کے لئے آدم علیہ السلام نے تمام انسانوں کے مقابلے میں بہترین باپ ہونے کا شرف جمع کر رکھا ہے اور حضرت حوا نے بھی ماں ہونے کا شرف محفوظ کر رکھا ہے۔ ظالموں کے عرش خوفزدہ اور لرزاں ہیں،ان پر زلزلہ طاری ہے،ان کے تاجوں پر موت منڈلا رہی ہے۔ ان کے چاروں طرف آگ کے شعلے بھی بجھ گئے ہیں،اس کی لپٹیں مانند پڑ گئیں ہیں اور پانی بھی زمین میں جذب ہوگیا ہے۔

لیبی شاعر وادیب استاذ محمد بشیر المغیربی نے 1947 میں رسول ﷺ ولادتِ باسعادت کو یاد کرتے ہوئے اشعار کہے ہیں جو بنغازی سے نکلنے والے "جریدۃ الوطن" میں شائع ہوئے:

بلغ الزمان من الحياة عتيا *** لكن يوما لا يزال فتيا
يمشي على الأحقاب مشية فاتح *** في موكب جعل السنين مطيا
تخدت له الأعوام في أيامها *** عرشا فأصبح تاجها الأبديا
ومضت به الأجيال خطوات من *** بلغ الرشاد وكان قبل صبيا
أعظم بيوم جاء يحمل رحمة *** للعالمين وعزة ورقيا
ولدت به للكائنات حقيقة *** أضحى بها سر الحياة جليا
وأنار في الأولى الطريق إلى الورى *** ليسير للأخرى الأنام تقيا
كادت به الدنيا تقول لشمسها *** عني فقد رجع الضياء إليا

ترجمہ: زمانہ اپنی زندگی کی انتہائی عمر کو پہنچ گیا، لیکن ایک دن اب بھی مسلسل عالم شباب میں ہے۔ وہ ہر زمانہ میں ایک فاتح کی طرح ایک لشکر کے ساتھ چلتا ہے جس نے برسوں اور سالوں کو اپنی سواری بنا رکھا ہے۔ سالوں اور برسوں نے اپنے ایام میں اس کے لئے عرش تیار کیا اور وہ دن اس عرش کا ابدی تاج بن گیا۔ نسلیں اس کے ذریعہ سنِ بلوغت کو پہنچنے والوں کے نقش قدم پر چلتی رہیں جبکہ وہ اس سے پہلے بچپن کے دور سے گزر رہا تھا۔ وہ دن کتنا ہی عظیم ہے جو "رحمۃ للعالمین" اور عزت و عروج کو لے کر آیا۔ اس دن کے ذریعہ کائنات کے لئے ایک ایسی حقیقت کا ظہور ہوا جس کے ذریعہ زندگی کا راز واضح اور نمایاں ہو گیا۔ اس دن نے دنیا میں مخلوق تک پہنچنے کا راستہ روشن کر دیا تاکہ تمام لوگ آخرت تک متقی اور پرہیزگار بن کر پہنچیں۔ قریب ہے کہ دنیا اس دن کی وجہ سے سورج سے کہہ دے کہ چلے جاؤ ہمیں اب تمہاری ضرورت نہیں ہے، کیونکہ ہمارے پاس اب روشنی آچکی ہے۔ (بحوالہ: جریدۃ الوطن، بنغازی، 1947)

1949 میں قاہرہ میں "طرابلس الغرب" کے ثقافتی پروگرام میں انہوں نے یہ اشعار کہے:

مالي وما بي من شمول　　اشدو على رغم العذول

اني اطالع في السماء　　كانها سفر جليل

وأرى النجوم تمثلت لي　　كالملائك في مثول

والبدر خلت شعاعه　　وحي الرسالة في نزول

واذا بصوت من ضمير　　الكون مبتهجا يقول

في مثل هذه الليلة الغراء　　قد ولد الرسول

وأشع نور مُحَمَّد　　فوق الروابي والسهول

ملأ الزمان وكان قبل ذلك　　يهيم في ليل طويل

ترجمہ: مجھے کیا ہو گیا ہے حالانکہ میں کسی نشے کی حالت میں نہیں ہوں، میں ملامت و تنقید کے باوجود شعر گا رہا ہوں۔ میں آسمان کا مشاہدہ کر رہا ہوں گویا کہ وہ عظیم کتاب کی مانند ہے۔ میں ستاروں کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ مطیع و فرمانبردار فرشتوں کی طرح میرے سامنے آرہے ہیں۔ اور چودھویں چاند کا منظر دیکھ کر مجھے اس کی شعاعیں ایسی محسوس ہوئیں گویا کہ رسول پر وحی کا نزول ہو رہا ہو۔ اچانک کائنات کے ضمیر سے خوشی اور مسرت کے ساتھ ایک آواز آتی ہے جو کہہ رہی ہے کہ اسی طرح کی روشن رات میں رسول اکرم ﷺ کی ولادت ہوئی ہے، اور محمد ﷺ کی نور کی ضیا پاش کرنوں نے بلند پہاڑوں اور میدانی علاقوں کو روشن اور منور کر دیا۔ پوری دنیا کو اپنے نور سے بھر دیا جبکہ وہ اس سے پہلے ایک طویل رات کو تاریکی میں سرگرداں و پریشان تھی۔ (یہ قصیدہ میں نے شاعر سے بالمشافہ (براہ راست) سنا ہے)۔

4) آپ ﷺ کی رضاعی مائیں:

آپ ﷺ کی پرورش اور دیکھ ریکھ کرنے والی خاتون حضرت ام ایمن "برکۃ الحبشیہ" تھیں جو آپؐ کے والد محترم کی باندی تھیں اور سب سے پہلے آپ ﷺ کو دودھ پلانے کا شرف جس خاتون کو ملا وہ آپ ﷺ کے چچا ابو لہب کی باندی حضرت ثوبیہ ہیں۔ (دیکھیں: وقفات تربویۃ مع السیرۃ النبویۃ، ص48)

حضرت زینب بنت ابی سلمہؓ فرماتی ہیں کہ حضرت ام حبیبہؓ نے ان کو بتایا کہ اُنہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میری بہن ابوسفیان کی بیٹی سے نکاح کر لیجئے۔ آپؐ نے فرمایا: کیا تم یہ بات پسند کرو گی (کہ وہ تمہاری سوکن بنے)؟! میں نے عرض کیا: جی ہاں، میں تو پسند کرتی ہوں، اگر میں اکیلی آپ کی بیوی ہوتی تو پسند نہ کرتی۔ لہذا میں چاہتی ہوں کہ میرے ساتھ بھلائی میں جو شریک ہو وہ میری بہن ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس طرح کرنا میرے لئے حلال نہیں ہے۔ میں نے عرض کیا: ہمیں پتہ چلا ہے کہ آپ ابوسلمہ کی بیٹی سے نکاح کرنا چاہتے ہو۔ آپ نے پوچھا: ام سلمہ کی بیٹی سے؟ میں نے کہا: ہاں: جی ہاں۔ آپؐ نے فرمایا: اگر وہ میری ربیبہ اور میری پرورش میں نہ ہوتی تب بھی وہ میرے لئے حلال نہ ہوتی۔ وہ میری رضاعی بھتیجی (رضائی بھائی کی بیٹی) ہے، مجھ کو اور ابوسلمہ کو ثوبیہ نے دودھ پلایا ہے، لہذا اپنی بیٹیوں اور بہنوں کو مجھ سے نکاح کرنے کے لئے نہ کہو"۔ (صحیح بخاری: 5101، مسلم، 1449)

حضرت اسامہ بن زیدؓ کی والدہ حضرت اُم ایمن کا اصل پسِ منظر یہ تھا کہ وہ حضرت عبداللہ بن عبدالمطلب کی خادمہ تھیں اور وہ حبشہ سے تھیں، جب رسول اللہ ﷺ کے والد کی وفات کے بعد حضرت آمنہ کے ہاں آپ ﷺ کی ولادت ہوئی تو حضرت ام ایمن ہی آپ کی دیکھ ریکھ اور پرورش کرتی تھیں، یہاں تک کہ اللہ کے رسول ﷺ بڑے ہوئے تو آپ ﷺ نے ان کو آزاد کر دیا اور اس کے بعد ان کا نکاح حضرت زید بن حارثہ سے کر دیا، اللہ کے رسول ﷺ کی وفات کے پانچ ماہ بعد ان کا انتقال ہوا۔ (صحیح بخاری: 2630، مسلم 1771)

1: بنو سعد میں آپؐ کی رضاعی ماں حضرت حلیمہؓ:

حضرت حلیمہ السعدیہؓ کی بذاتِ خود حبیبِ مصطفیٰ ﷺ کی ذاتِ اقدس کی وجہ سے حاصل شدہ ان برکتوں کا عجیب وغریب واقعہ بیان کرتی ہیں جن برکتوں کا مشاہدہ انہوں نے اپنی ذات میں، اپنے بچے میں، اپنی فصل میں اور اپنے گھر میں کیا تھا۔

حضرت عبداللہ بن جعفرؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں: جب اللہ کے رسول ﷺ کی ولادت ہوئی تو حضرت حلیمہ بنت حارث قبیلہ بنو سعد بن بکر کی خواتین کے ساتھ مکہ مکرمہ شیر خوار بچوں کی تلاش میں آئیں۔ حضرت حلیمہؓ فرماتی ہیں: میں بھی پہلے پہل نکلنے والی عورتوں کے ساتھ اپنی ایک چتکبری گدھی پر سوار ہو کر نکلی اور میرے ساتھ میرے شوہر حارث بن عبدالعزی تھے جو بنو سعد بن بکر اور پھر بنو ناضرہ کے ایک فرد تھے، ہماری یہ گدھی طویل سفر کی وجہ سے زخموں سے چور تھی، میرے ساتھ قافلہ میں ایک دوسری اونٹنی بھی تھی، اللہ کی قسم! وہ دودھ کا ایک قطرہ بھی نہیں دیتی تھی، وہ قحط سالی کا زمانہ تھا سب لوگ کھانے پینے کی چیزوں کی وجہ سے بہت زیادہ پریشان حال تھے، میرے ساتھ اپنا ایک بیٹا بھی تھا۔ اللہ کی قسم! وہ رات بھر بھوک کی وجہ سے سو نہیں پاتا تھا، مجھے کوئی ایسی چیز بھی نہیں مل پا رہی تھی جس کے ذریعہ میں اس کو بھلا سکوں، البتہ ہمیں بارش کی امید تھی اور ہمارے پاس کچھ بکریاں تھیں ان سے کچھ امید تھی۔

جب ہم مکہ مکرمہ پہنچے، ہم میں سے کوئی ایسی عورت باقی نہیں بچی جس کے سامنے اللہ کے رسول ﷺ کو پیش نہ کیا گیا ہو لیکن ہر عورت نے آپ کے بارے میں بے رغبتی اختیار کی، ہم نے کہا: یہ تو یتیم بچہ ہے، اور دائی کو والد ہی کچھ اکرامیہ دیتا ہے اور وہی اس کے ساتھ حسنِ سلوک کرتا ہے، ہم نے کہا: ان کی ماں، چچا یا دادا سے کیا امید کی جا سکتی ہے؟ میری تمام ہمسفر خواتین نے کوئی نہ کوئی بچہ لے لیا اور مجھے جب کوئی بچہ نہ ملا تو میں آپ کے پاس واپس گئی اور آپؐ کو لے لیا۔ اللہ کی قسم! میں نے آپؐ کو صرف اور صرف اس لئے لیا کیونکہ مجھے آپ

کے علاوہ اور کوئی بچہ نہ مل سکا! میں نے اپنے شوہر سے کہا: اللہ کی قسم! میں بنو عبد المطلب کے اسی یتیم بچے کو لوں گی، ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کے ذریعہ فائدہ پہنچائے۔ میں دوسری خواتین کے ساتھ بغیر کوئی بچہ لئے ہوئے کیسے واپس جاسکتی ہوں؟ اُنہوں نے کہا: آپ ٹھیک کہتی ہو!

فرماتی ہیں: میں نے آپ کو لیا اور آپ کو لیکر اپنے خیمے میں واپس آئی، اللہ کی قسم! جیسے ہی آپ کو خیمے میں لے کر آئی تو، میرے پستان دودھ سے بھر گئے، میں نے ان کو سیر ہو کر دودھ پلایا اور ان کے بھائی کو بھی پلایا، ان کے والد اس اونٹنی کے پاس گئے اور اس کے تھنوں کو دیکھا تو وہ دودھ سے بھرے ہوئے تھے، اس کو دوھیا، مجھے دودھ پلایا اور خود بھی پیا۔ انہوں نے کہا: اے حلیمہ! تمہیں پتہ ہے، اللہ کی قسم! ہمیں ایک بابرکت شخصیت ملی ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کی وجہ سے وہ نوازشیں اور عنایتیں عطا فرمائی ہیں جن کا ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے! فرماتی ہیں: ہم نے وہ رات شکم سیر ہو کر پورے اطمینان کے ساتھ گزاری اور ہم پوری پوری رات بچے کے بلکنے کی وجہ سے سو نہیں پاتے تھے۔

دوسرے دن صبح ہم ساتھ کی خواتین کے ساتھ اپنے گھر کی طرف واپس لوٹے، میں اپنی چتکبری اونٹنی پر سوار ہوئی، میں نے آپ ﷺ کو بھی اپنے ساتھ سوار کیا، اس ذات کی قسم! جس کے قبضہ میں حلیمہ کی جان ہے! میں قافلہ کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل گئی، یہاں تک کہ عورتیں کہنے لگیں: ذرا ہمیں بھی ٹھہرو، کیا یہ وہی گدھی ہے جس پر آپ گھر سے سوار ہو کر آئی تھیں؟ میں نے کہا: ہاں، یہ وہی ہے۔ انہوں نے کہا: آتے ہوئے تو یہ زخمی ہو گئی تھی۔ اب اس کو کیا ہو گیا؟ فرماتی ہیں: میں نے ان سے کہا: اللہ کی قسم! اس پر ایک بابرکت بچہ سوار ہے۔

فرماتی ہیں: وہاں سے واپسی کے بعد مسلسل اللہ تعالیٰ ہمیں خیر سے نوازتا رہا یہاں تک کہ ہم واپس آئے اور پورا علاقہ قحط سالی میں مبتلا تھا، چرواہے صبح اپنے جانوروں کو لے کر نکلتے اور پھر شام کو واپس لے کر آتے تو پورے بنو سعد قبیلے کی بکریاں خالی پیٹ واپس آتیں اور میری بکریاں شکم سیر ہو کر دودھ سے بھری ہوئی واپس آتیں، ہم دودھ دوھتے اور پیٹ بھر کر پیتے، لوگ کہتے: حارث بن عبد العزی اور حلیمہ کی بکریوں کا کیا مسئلہ ہے کہ وہ شکم سیر ہو کر دودھ سے بھری ہوئی واپس آتی ہیں اور تم سب کی بکریاں خالی پیٹ ہوتی ہیں؟ تمہارا برا ہو! وہیں تم بھی اپنی بکریاں لے جایا کرو جہاں ان کی بکریاں چرتی ہیں، وہ ہماری بکریوں کے ساتھ ہی لے جانے لگے، لیکن اسی طرح خالی پیٹ واپس آنے لگیں اور ہماری بکریاں شکم سیر ہو کر اسی طرح لوٹنے لگیں۔

فرماتی ہیں: وہ اس طرح تیزی سے جوان ہو رہے تھے جیسے کہ عام طور پر بچے جوان نہیں ہوتے ہیں، وہ دنوں میں ہی سال کے بچہ کی طرح لگ رہے تھے، جب وہ پورے دو سال کے ہو گئے تو ہم اور ان کے رضاعی والد ان کو مکہ لے کر آئے، ہم نے آپس میں مشورہ کیا کہ اللہ کی قسم! اگر ان کو اپنے ہی پاس رکھنے کی کوئی صورت بنتی تو ان کو ہم اپنے سے جدا نہیں کرتے۔ جب ہم ان کی والدہ کے پاس آئے تو ہم نے ان سے کہا: اللہ کی قسم! ہم نے ان سے زیادہ بابرکت والا بچہ کبھی نہیں دیکھا ہے، ہمیں ان کے بارے میں اندیشہ ہے کہ مکہ کی آب وہوا اور یہاں کی بیماریاں ان کو نقصان نہ پہنچائیں، لہذا ان کو ہمارے پاس ہی رہنے دیں یہاں تک کہ آپ بھی اچھی طرح ٹھیک ہو جائیں، ہم مسلسل ان سے اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ وہ تیار ہو گئیں اور اجازت دے دی، ہم ان کو لے کر واپس آئے، دوبارہ آنے کے بعد تین یا چار مہینے ہوئے

ہوں گے کہ ایک روز وہ اور ان کے بھائی ہماری بکریوں کے ساتھ تھے اور گھروں کے پیچھے کھیل رہے تھے، اچانک ان کا بھائی دوڑتا ہوا آیا اور کہا: میرے اس قریشی بھائی کے پاس دو شخص سفید کپڑے پہنے ہوئے آئے، ان دونوں نے ان کو پکڑ کر لٹایا اور ان کا سینہ چاک کیا، یہ سن کر میں اور ان کے ابّو دوڑتے ہوئے نکلے، ان کو دیکھا کہ وہ کھڑے ہیں اور ان کا رنگ تبدیل ہے، جب انہوں نے ہمیں دیکھا تو تیزی کے ساتھ ہماری طرف لپکے اور رو پڑے۔

فرماتی ہیں: میں نے اور ان کے ابّو نے ان کو سینے سے چمٹا لیا ان کو قریب کر کے پوچھا: میرے ماں باپ آپ پر قربان! کیا ہوا آپ کو؟ اُنہوں نے کہا: میرے پاس دو لوگ آئے اور مجھے لٹا کر میرے سینے کو چاک کیا اور اس میں کوئی چیز رکھی اور پھر اس کو ویسے ہی کر دیا جیسے کہ وہ تھا۔ ان کے والد کہنے لگے: واللہ! میرے اس بیٹے کو کچھ ہو گیا ہے، لہذا ان کے گھر والوں کے پاس جا کر ان کو ان کے حوالے کر دو، اس سے پہلے کہ کسی ناپسندیدہ چیز کا ظہور ہو جائے۔ فرماتی ہیں: ہم نے ان کو لیا اور ان کے والدہ کے پاس لے کر آئے، جب انہوں نے ہمیں دیکھا تو ہمیں دیکھ کر انہیں بڑا تعجب ہوا اور پوچھا: ہمارے کہے بغیر ان کو کیوں لے کر آئے؟ آپ تو ان کو اپنے پاس رکھنے کے بارے میں اصرار کر رہے تھے؟ ہم نے کہا: نہیں، بات کچھ بھی نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے رضاعت کی مدت مکمل کرا دی اور جو کچھ ہم نے دیکھا اس سے ہمیں بڑی مسرت ہوئی، اس لئے ہم نے سوچا کہ آپ کی چاہت کے مطابق ہی ہم ان کو اپنے پاس رکھیں گے۔

یہ سن کر اُنہوں نے کہا: نہیں، کچھ تو ضرور ہوا ہے، لہٰذا مجھے بتاؤ کہ کیا ہوا ہے؟ اُنہوں نے اس وقت تک ہماری خلاصی نہیں کی یہاں تک کہ ہم نے ان کو پورا قصہ بتا نہ دیا۔ پورا قصہ سن کر وہ کہنے لگیں: اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ ہر گز ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا، بے شک میرے اس بیٹے کی عجیب شان ہے، میں تم دونوں کو ان کا قصہ بتاتی ہوں، یہ میرے بطن میں تھے، اللہ کی قسم! میرے بطن میں اب تک جو بھی بچہ رہا ہے ان سے زیادہ ہلکا اور آسان حمل آج تک میں نے نہیں دیکھا ہے، پھر میں نے زمانۂ حمل میں ایسا نور دیکھا جو مجھ سے نکلا اور بصری کے اونٹوں کی گردنوں، یا انہوں نے "بصری کے محلات" کہا۔ کو روشن کر دیا۔ پھر جب ان کی ولادت ہوئی تو واللہ! یہ عام بچوں کی طرح دنیا میں نہیں آئے بلکہ یہ پیدا ہوئے تو یہ اپنے دونوں ہاتھوں سے زمین پر ٹیک لگائے ہوئے تھے اور اپنا سر آسمان کی طرف اٹھائے ہوئے تھے، لہذا ان کے بارے میں تم دونوں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے! یہ سن کر میں نے ان کو لے لیا اور ہم واپس چل دیئے۔ (مسند اُبو لعلی: 7163، ابنِ حبان: 6335، المعجم الکبیر: 24/212 - 215، مجمع الزوائد: 8/220 - 221، دلائل البیہقی 1/133 - 136)

اسباق ودروس

أ: حضرت حلیمہ سعدیہ کے ہاں نبی کریم ﷺ کی برکت:

حضرت حلیمہ سعدیہ کے ہاں ہر چیز میں برکت کا ظہور ہوا۔ یہاں تک کہ ان کی چھاتی کے دودھ میں بھی زیادتی اور کثرت کا ظہور ہوا، حالانکہ ان کا دودھ اپنے بچے کے لئے بھی کافی نہیں ہوتا تھا، آپ ؐ کی برکت سے ان کا بچہ بھی پرسکون ومطمئن ہو گیا، حالانکہ وہ بہت زیادہ روتا اور بلکتا تھا۔ اپنی ماں کو پریشان کرتا، بے سکونی کرتا اور سونے نہیں دیتا، اب وہ شکم سیر اور پرسکون ہوتا، اپنی ماں کو آرام کرنے اور سونے دیتا۔ آپ ﷺ کی برکت ان کی لاغر وکمزور بکریوں میں بھی ظاہر ہوئی جن سے تھن خالی ہوتے اور اب وہ دودھ سے بھری ہوتیں جیسا کہ کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔

ب: یہ برکتیں اللہ کے اعزاز واکرام کی واضح نشانی تھی:

بات صرف اتنی سی نہیں ہے کہ آپ ﷺ کی وجہ سے حضرت حضرت حلیمہ سعدیہ کے پورے گھرانے کو عزت واکرام سے نوازا گیا، اس میں کوئی زیادہ تعجب خیز بات نہیں ہے، بلکہ اس کے پس منظر میں یہی حکمت پوشیدہ ہے کہ اس گھرانے کے تمام لوگ اس بچے سے محبت کرنے لگیں، ان کے ساتھ شفقت کا معاملہ کرنے لگیں اور ان کی دیکھ ریکھ حفاظت اور پرورش بہتر سے بہتر طریقے سے کرتے رہیں، اور ایسا ہی ہوا چنانچہ وہ سب اپنی اولاد سے زیادہ آپ سے محبت کرتے اور ان کے ساتھ رحم دلی اور شفقت کا معاملہ کرتے تھے۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویۃ، ابو فارس، ص 105)

ج: بندے کے لئے اللہ تعالی کا انتخاب زیادہ بابرکت اور افضل ہے:

اللہ تعالی نے حضرت حلیمہ ؓ کے لئے اس یتیم بچے کا انتخاب فرمایا، اور انہوں نے آپ ﷺ کو نہ چاہتے ہوئے لیا، اس لئے کہ ان کو آپ کے علاوہ اور کوئی نہیں ملا، لیکن اللہ تعالی نے ان کے لئے جس چیز کا انتخاب کیا تھا اس میں خیر ہی خیر تھا اور آپ ﷺ کو گود لیتے ہی اس انتخاب کے نتائج ظاہر ہونے لگے۔ اس میں ہر مسلمان کے لئے سبق ہے کہ اس کا دل اللہ کی تقدیر اور اس کے انتخاب پر مطمئن اور راضی ہو اور گزری ہوئی چیز پر یا جس کو اللہ تعالی نے مقدر میں نہ رکھا ہو اس پر افسوس نہ کرے۔

د: جسمانی صحت، نفس کی پاکیزگی اور عقلی ذہانت میں دیہات کا اثر:

شیخ محمد الغزالی -رحمہ اللہ- فرماتے ہیں: "دیہات میں اولاد کی پرورش اس لئے ضروری ہے تاکہ وہ فطری ماحول میں چل پھر سکیں، وہاں کی تازہ فضا اور بے غبار شعاعوں سے لطف اندوز ہو سکیں، اس طرح کی پرورش میں اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ فطرت میں پاکیزگی پیدا ہو، اعضائے جسم اور احساسات اچھی طرح پروان چڑھیں اور افکار وجذبات کو کھلی فضا میں آگے بڑھنے کا موقع ملے۔

یہ ہلاکت اور محرومی کی بات ہے کہ ہمارے بچے تنگ فلیٹس میں اور ایک دوسرے سے ملے ہوئے گھروں میں زندگی گزاریں، ایسا لگتا ہے کہ آج کل کے مکانات ڈبے ہیں جن میں رہنے والوں کو اوپر سے بند کر دیا گیا ہو اور ان کو تازہ ہوا میں گہری سانس لینے کی لذت سے محروم کر دیا گیا ہو۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جدید تہذیب کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اعصابی تناؤ کا ایک اہم سبب فطری ماحول سے دوری اور مصنوعی ماحول اور اشیاء کا بے جا استعمال بھی ہے، ہم اہلِ مکہ کی اس بات کو انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ وہ دیہات کا رخ کرتے تھے تاکہ وہ وسیع و عریض میدانوں اور کھلی فضاؤں میں بچپن کے قیمتی ایام گزار سکیں۔

بہت سے علمائے تربیت کی رائے یہ ہے کہ بچے کے لئے پہلی تربیت گاہ فطری ماحول ہونا چاہیے تاکہ کائناتی حقائق کے ساتھ اس کے احساسات وصلاحیتیں ہم آہنگ ہو سکیں، لیکن لگتا ہے یہ ایسا خواب ہے جو اب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا ہے۔(فقہ السیرۃ، ص60-61)

اللہ کے رسول ﷺ نے بنو سعد کے دیہاتی ماحول میں فصیح عربی زبان سیکھی اور اس کے بعد تمام لوگوں میں فصیح ترین شخص بن گئے، چنانچہ جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! میں نے آپ سے زیادہ فصیح شخص کوئی نہیں دیکھا ہے، آپ ﷺ نے جواب دیا: "اس میں کون سی بات ہے جب کہ میں قریش سے ہوں اور بنو سعد میں میری پرورش ہوئی ہے".(الروض الأنف، السہیلی1/188)

شق صدر کے واقعہ سے کیا سبق حاصل ہوتا ہے؟

شق صدر کا واقعہ جو آپ ﷺ کے ساتھ بنو سعد میں رہتے ہوئے پیش آیا اس واقعہ کو نبوت کے تمہیدی امور میں شمار کیا جاتا ہے اور یہ اس کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ایک عظیم کام کے لئے منتخب کیا ہے۔(السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ، العمری: 1/104)

امام مسلمؒ نے اپنی 'صحیح' میں بچپن میں آپ ﷺ کے شقِ صدر کے واقعہ کو روایت کیا ہے، حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ حضرت جبرائیلؑ آپؐ کے پاس آئے، انہوں نے آپ ﷺ کو پکڑ کر چت لٹایا، پھر آپ کے قلب مبارک کو چاک کیا، دل کو باہر نکال کر اس سے ایک سیاہ ٹکڑا نکالا اور فرمایا: یہ آپ کے جسم میں شیطان کا حصہ ہے، اس کے بعد آپ کے دل کو ایک سونے کی طشتری میں رکھ کر آبِ زمزم سے دھویا، پھر اس کو ٹھیک کر کے اس کو اس کی جگہ واپس رکھ دیا، وہاں موجود بچے آپ صلی اللہ وسلم کی ماں (یعنی دائی) کے پاس دوڑتے ہوئے آئے اور کہا کہ محمد ﷺ کو مار ڈالا گیا، سب لوگ آپ کے پاس پہنچ گئے، تو دیکھا کہ آپ ﷺ کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں آپ کے سینے مبارک پر سلائی کا نشان دیکھا کرتا تھا۔(مسلم: 262/261، مسند أحمد3/149دلائل البیہقی: 2/5)

بلاشبہ شیطانی حصہ سے تطہیر و پاکی نبوت کی ابتدائی تمہید اور آپ ﷺ کو ہر قسم کے شر اور غیر اللہ کی عبادت سے محفوظ رکھنے کی تیاری ہے، آپؐ کے دل میں صرف توحید خالص جا گزیں ہوتی، آپ کے بچپن کے حالات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے، آپ ﷺ نے کبھی گناہ کا ارتکاب نہیں کیا اور نہ ہی کبھی کسی بت کے سامنے سجدہ ریز ہوئے حالانکہ یہ قریش میں یہ عام تھا۔(السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ، العمری 1/104)

ڈاکٹر بوطی اس بات کی حکمت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: بظاہر اس میں یہ حکمت نظر آتی ہے کہ اس کے ذریعہ رسالت کا اعلان مقصود تھا اور مادی اور ظاہری وسائل کے ذریعہ بچپن سے ہی عصمت و وحی کے لئے آپؐ کو تیار کیا جا رہا تھا، تاکہ یہ دیکھ کر لوگوں کے لئے آپؐ پر ایمان لانا اور تصدیق کرنا آسان ہو جائے، بلاشبہ یہ اصلاً معنوی تطہیر کا عمل تھا، لیکن اس نے یہ مادی اور حسّی شکل اختیار کی تاکہ اس کے ذریعہ لوگوں کے سامنے واشگاف انداز میں الٰہی اعلان ہو جائے۔(دیکھیں: فقہ السیرۃ النبویۃ، ص: 47)

لوتھڑے کو جسم سے نکالنے کے ذریعہ رسول ﷺ کو بچپن کے لغو، لایعنی اور ہوائے نفس پر مبنی حالات سے پاک کر کے سنجیدگی، عقلمندی، دوراندیشی، توازن اور دیگر سچی مردانہ صفات سے آراستہ کرنا مقصود تھا، جیسے کہ اللہ تعالیٰ کی آپ کے ساتھ خاص عنایت و حفاظت سے اس کی تصدیق ہوتی ہے اور واضح ہوتا ہے کہ شیطان کا آپ پر کوئی کنٹرول نہیں ہے۔ (السیرۃ النبویۃ، ابو فارس، ص106-107)

۵: آپؐ کی والدہ کی وفات اور دادا اور پھر چچا کی کفالت

نبی کریم ﷺ کی عمر مبارک جب چھ سال کی ہوئی تو آپ ﷺ کی والدہ ماجدہ مکہ اور مدینہ کے درمیان مقام اَبواء میں انتقال فرما گئیں، وہ آپ کے ننھیال بنو عدی بن نجار میں آپ کو لے کر آئیں تھیں تاکہ آپؐ کی ان سے ملاقات کرا لیں تو جب وہ وہاں سے مکہ واپس آ رہی تھیں تو راستے میں ہی انتقال فرما گئیں۔(سیرۃ ابن ہشام: 1/168)

مقام ابواء میں ہی آپؓ کو دفن کیا گیا، والدہ کی وفات کے بعد آپؐ کی کفالت آپ کے دادا حضرت عبد المطلب نے کی، انہی کی کفالت میں آپ نے پرورش پائی، وہ اپنے بیٹوں میں یعنی آپ ﷺ کے چچاؤں کے مقابلہ میں آپ کو ترجیح دیتے تھے۔آپ ﷺ کے دادا جان بارعب شخصیت کے مالک تھے، ان کے بیٹوں میں سے کوئی بھی ان کے رعب کی وجہ سے ان کے فرش پر بیٹھنے کی جرأت نہیں کرتا تھا، آپ ﷺ کے چچا اپنے والد کے فرش پر بیٹھنے سے گھبراتے تھے، جب کہ اللہ کے رسول ﷺ ان کے فرش پر بیٹھ جاتے تھے، آپ ﷺ کے چچا آپ کو اپنے والد کے فرش سے ہٹانے کی کوشش کرتے تو آپ کی طرف سے آپ کے جد امجد ان کو جواب دیتے تھے اور آپ کو فرش پر بٹھائے رکھنے میں خوشی محسوس کرتے تھے، آپ کی ذات میں خیر کی علامتیں دیکھتے اور محسوس کرتے کہ عنقریب ان کا ایک مقام ہوگا۔(السیرۃ النبویۃ، ابو فارس، ص101)

آپ ﷺ کے دادا جان آپ سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے، وہ آپ ﷺ کو کسی ضرورت سے بھیجتے تو آپ وہ کام کر دیتے، ایک روز آپ ﷺ کو اونٹوں کی تلاش کے لئے بھیجا تو آپ ﷺ کو کافی دیر ہو گئی، چنانچہ وہ بیت اللہ کا طواف کرنے لگے اور یہ اشعار پڑھنے لگے: رب رد راكبي   رد لي واصنع عندي يدا

ترجمہ: اے میرے رب میرے سوار کو لوٹا دیجئے، اس کو میرے لئے لوٹا دیجئے اور مجھ پر احسان کر دیجئے۔

جب نبی کریم ﷺ واپس تشریف لائے اور اونٹ بھی لے کر آئے تو ان سے کہا: اے میرے بیٹے! میں ایک عورت کی طرح آپ کے بارے میں غمگین ہوا، اور ایسا غم جو میں کبھی نہیں بھولوں گا۔(الدلائل للبیہقی 21-2/20، متدرک حاکم 2/603- 604)

اس کے بعد جب آپ ﷺ کی عمر مبارک آٹھ سال کی تھی تو حضرت عبد المطلب کا بھی انتقال ہو گیا۔(دیکھیں: السیرۃ النبویۃ، ابو فارس، ص101)

آپ ﷺ کے دادا نے آپؐ کے چچا حضرت ابو طالب کو آپ کے بارے میں وصیت کی اور آپ ﷺ کے چچا نے آپ کی کفالت کی ذمہ داری لی، انہوں نے آپ کے ساتھ مشفقانہ معاملہ کیا اور آپ کا ہر اعتبار سے خیال رکھا۔(دیکھیں: مدخل لفہم السیرۃ، الیحییٰ، ص119)

اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ اللہ کے رسول ﷺ یتیمی کی حالت میں پروان چڑھیں، صرف اللہ تعالیٰ کی حفاظت و توجہات آپ کے ساتھ رہیں، ہر قسم کے ایسے دستِ تعاون سے دور رہیں جو آپ کے لاڈلے پن اور ناز نخروں کا سبب بنے، اور مال و دولت سے بھی دور رہیں جو آپ کو تعیش پسند بنانے کا سبب بنے، تاکہ آپ کا دل مال و جاہ کا دلدادہ نہ بنے، اور نہ ہی آپ سرداروں کی سرداری اور لیڈروں کی لیڈری کا اپنے لئے انتخاب کریں یا اس سے متاثر ہوں، جس کے نتیجے میں لوگوں کے لئے نبوت کا تقدس اور دنیاوی جاہ خلط ملط ہو جائیں گے، اور وہ یہ نہ سمجھ لیں کہ نبوت کا لبادہ اوڑھ کر دنیا تک پہنچانا مقصود ہے۔(دیکھیں: فقہ السیرۃ، البوطی، ص46)

اللہ کے رسول ﷺ کو ایامِ طفولت سے ہی مصائب و آزمائشوں کے مراحل سے گزرنا پڑا، جیسے کہ والد ماجد کے سایۂ عاطفت سے محرومی کے بعد والدہ ماجدہ کا انتقال اور پھر دادا کی وفات، یکے بعد دیگرے آپؐ حزن و غم کا کڑوا گھونٹ پیتے رہے، ان تمام آزمائشوں نے آپ کو رقیق القلب اور حسّاس بنا دیا تھا، کیونکہ غم نفس کو صیقل کرتا ہے اور اس کو سختی و درشتی اور کبر و غرور کی گندگی سے آزاد کرتا ہے اور اس کو اور زیادہ نرم اور متواضع بناتا ہے۔

زندگی کی تقریبا بیس بہاریں گزارنے کے بعد آپ ﷺ کے والدین کی وفات کسی جسمانی کمزوری یا بیماری کی وجہ سے نہیں تھی، چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ جان لیوا بیماری میں مبتلا والدین کی اولاد نہیں تھے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس وقت اس دنیا سے واپس بلا یا جب کہ ان دونوں نے وہ ذمہ داری احسن طریقہ سے ادا کی جس کے لئے ان کو منصۂ وجود پر لایا گیا تھا، آپ کے والدین پہلے ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئے تاکہ ہر وہ شخص اللہ کے رسول ﷺ سے تسلی حاصل کر سکے جس کے ماں باپ یا ان میں سے کسی ایک کا سایہ بچپن میں ہی اس کے سر سے اٹھ جائے، مزید یہ دلیل بھی قائم ہو جائے کہ یتیمی کے باوجود آپ ﷺ کا ادب و اخلاق سے آراستہ ہونا اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بذات خود آپ کی رعایت و حفاظت اور آداب و اخلاق سے آراستہ کرنے کی ذمہ داری لی تھی، تاکہ آپ ﷺ ارادہ میں پختہ، عزیمت کی راہ پر گزر جانے والے اور اپنے کاموں میں کسی کا سہارا نہ لینے والی شخصیت کے مالک بن سکیں، والدین کا آپ کے دعوتی مشن پر کوئی اثر نہ پڑے، آپ کی تربیت و رہنمائی میں کسی انسانی سہارے کی دخل اندازی نہ ہو، براہ راست اللہ تعالیٰ کے ذریعہ آپ کی تربیت و نگہداشت ہوتی رہے، ہر قسم کے مراسمِ جاہلیت اور رسم و رواج سے آپ پاک وصاف اور آزاد رہیں اور حکیم و خبیر ذات کی طرف سے آپ

رہنمائی حاصل کرتے رہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے جس نے آپ کو اپنی حفاظت اور پناہ عطا کی اور آپ کے لئے مادی سہارے کے طور پر آپ کے دادا اور چچا کے دلوں میں آپ کی محبت و شفقت اور تربیت کا جذبہ پیدا فرمایا، جبکہ روحانی، اخلاقی اور فکری تربیت ایک ربانی ذمہ داری اور الٰہی عمل تھا۔(فقہ السیرۃ النبویۃ، الغضبان، ص84،85)

٦: آپ ﷺ کا بکریاں چرانا

حضرت ابو طالب معاشی اعتبار سے کمزور تھے،اس لئے نبی کریم ﷺ بکریاں چرا کر اپنے چچا کی معاونت کرتے تھے، چنانچہ آپ ﷺ نے اپنی ذات گرامی کے بارے میں اور دیگر انبیاء کے بارے میں بیان فرمایا ہے کہ وہ بکریاں چرایا کرتے تھے۔ جہاں تک اللہ کے رسول ﷺ کا تعلق ہے تو آپؐ نے اہل مکہ کی بکریاں چرائی ہیں جبکہ آپ چھوٹے تھے،اور آپ ﷺ بکریاں چرانے کی اجرت لیتے تھے، صحیح حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: کوئی ایسا نبی نہیں ہے جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں۔ یہ سن کر صحابہ کرام نے پوچھا:آپ نے بھی بکریاں چرائی ہیں؟فرمایا کہ ہاں! میں مکہ والوں کی بکریاں چند قیراط کی اجرت پر چرایا کرتا تھا۔ (بخاری:2262،ابن ماجہ: 2149)

بکریاں چرانے کا عمل نبی کریم ﷺ کو وہ سکون واطمینان فراہم کرتا تھا جس کی آپ کی ذات اقدس کو ضرورت تھی،آپ کو صحرا کے حسن و جمال سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملتا تھا، عظیم مخلوقات میں مظاہرِ الٰہی پر غور و فکر کرنے کا وقت ملتا تھا،پر سکون رات میں، چاند کی روشنی میں اور وقتِ سحر کی بادِ نسیم میں کائنات کے ساتھ مناجات کرنے کا موقع ملتا تھا اور صبر، بردباری، سنجیدگی اور شفقت و رحمت کی نفسیاتی تربیت حاصل کرنے کا موقع ملتا تھا۔(دیکھیں: محمد رسول اللہ ﷺ، محمد الصادق عرجون 1/177)

آپ ﷺ کا بکریاں چرانا ہمیں آپ ﷺ کے ان فرمودات کو یاد دلاتا ہے جن میں اہل ایمان کو حیوانات کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا گیا ہے، لہذا بکریاں چرانے کے ذریعہ نبی کریم ﷺ کو اقوام و ملل کی رہبری اور سیادت و قیادت کے لئے تیار کیا جارہا تھا۔(دیکھیں: السیرۃ النبویہ الصحیحۃ،العمری:1/106)

بکریاں چرانے کے ذریعہ انسان میں چند تربیتی اوصاف پیدا ہوتے ہیں،ان میں سے بعض مندرجہ ذیل ہیں:

ا) صبر: کیونکہ بکریاں آہستہ آہستہ چرتی چگتی ہیں، اس لئے ان کے ساتھ طلوع آفتاب سے لے کر غروب تک صبر کرنا پڑتا ہے، لہذا بکریاں چرانے والوں کو صبر و تحمل کی بے حد ضرورت ہوتی ہے، اور یہی صورتحال انسانوں کی تربیت کا بھی ہے۔ (دیکھیں: مدخل لفہم السیرۃ، الیحییٰ، ص124)

بے شک بکریاں چرانے والا نہ ہی کسی عالیشان محل میں اور نہ ہی مسرفانہ اور مترفانہ زندگی بسر کرتا ہے، وہ سخت قسم کی گرمی اور بطور خاص جزیرۃ العرب کے ماحول میں زندگی گزارتا ہے،اس کو اپنی پیاس بجھانے کے لئے کافی پانی کی ضرورت پڑتی ہے، کھانے کے لئے اس کو موٹا جھوٹا کھانا نصیب ہوتا ہے اور سخت زندگی گزارنی پڑتی ہے، لہٰذا اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس قسم کے سخت حالات کو برداشت کرنے کے لئے تیار کرے،ان سے مانوس ہو اور ان پر صبر کرنے کا مادہ پیدا کرے۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویۃ، ابو فارس، ص114-115)

۲) تواضع: بکریاں چرانے والے کا اصل کام بکریوں کی خدمت کرنا، ولادت کے وقت ان کے ساتھ رہنا اور ان کو مدد فراہم کرنا، ان کی حفاظت کرنا اور ان کے قریب سونا ہے، اس کے جسم کو کبھی کبھار ان کا پیشاب یا مینگنی میں سے کچھ لگ سکتا ہے، اور وہ ان تمام چیزوں سے پریشان نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی اس کو غصہ آتا ہے، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی ذات سے غرور و تکبر ختم ہو جاتا ہے اور تواضع کی صفت اس کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ (ایضاً)

صحیح مسلم میں روایت مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: "وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہوگا"۔ایک شخص نے عرض کیا: ایک انسان یہ چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اور اس کا جوتا بہتر ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا: بے شک اللہ تعالی جمیل ہے، جمال کو پسند کرتا ہے، تکبر نام ہے: حق کا انکار کرنا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا۔ (مسلم: 91، ترمذی: 1999، مستدرک حاکم،: 1/26)

۳) شجاعت و بہادری: بکریاں چرانے کے کام کی نوعیت یہ ہوتی ہے کہ اس کو خونخوار جنگلی جانوروں کے ساتھ مقابلہ کرنا پڑتا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ اس کے اندر شجاعت و بہادری کا مادہ ہو جس کے ذریعہ وہ جنگلی جانوروں کو زیر کر کے اپنی بکریوں کو شکار ہونے سے روک سکتا ہے۔ (ایضاً)

۴) رحم اور شفقت: بکریاں چرانے والے کا کام تقاضا کرتا ہے کہ وہ بکریوں کی ہر ممکن مدد کرے، اگر وہ بیمار ہو جاتی ہیں، ان کے جسم کا کوئی حصہ ٹوٹ جاتا ہے یا وہ زخمی ہو جائیں، زخمی یا بیمار ہونے کی حالت میں ان پر رحم و شفقت، علاج و معالجہ اور تکلیف کو دور کرنے کی ضرورت پڑتی ہے، لہذا جو حیوانات اور جانوروں پر رحم کرے گا وہ انسانوں پر اور زیادہ رحم کرے گا، خاص طور پر جب کہ وہ اللہ کا رسول ہو جس کو اللہ تعالی نے انسانوں کی تعلیم و رہنمائی کے لئے، ان کو جہنم سے بچانے کے لئے اور دنیا و آخرت میں کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لئے بھیجا ہو۔ (دیکھیں: مدخل لفهم السيرة، ص127)

۵) خون پسینے کی کمائی سے محبت:

اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ حضرت محمد ﷺ کو بکریاں چرانے سے بے نیاز کر دیتا لیکن اس کے ذریعہ آپ ﷺ اور آپ کی امت کو یہ تربیت دینا مقصود تھا کہ محنت و مشقت اور خون پسینے کی کمائی کھانی چاہیے اور بکریوں کو چرانا محنت و مشقت والی کمائی ہے، یہ ایک داعی کے لئے ضروری ہے کہ وہ لوگوں کے مال واسباب سے بے نیاز ہو اور نہ ہی وہ ان پر انحصار کرے، اس کے ذریعہ اس کی اہمیت برقرار رہے گی، اس کا مقام و مرتبہ بلند ہوگا، اور ہر قسم کے شکوک و شبہات سے دور رہے گا، اور مزید اس کا عمل خالص اللہ کے لئے ہو جائے گا۔ ایسا داعی ان کفار اور ظالموں کے شبہہ کی عملی تردید کرے گا جو لوگوں سے کہتے پھرتے ہیں کہ انبیاء اپنی دعوت کے ذریعہ دنیا کے طالب ہوتے ہیں۔ (دیکھیں: مدخل لفهم السيرة، ص1371)

ارشاد باری تعالی ہے: [قَالُوٓا أَجِئۡتَنَا لِتَلۡفِتَنَا عَمَّا وَجَدۡنَا عَلَيۡهِ ءَابَآءَنَا وَتَكُونَ لَكُمَا ٱلۡكِبۡرِيَآءُ فِي ٱلۡأَرۡضِ وَمَا نَحۡنُ لَكُمَا بِمُؤۡمِنِينَ]

ترجمہ: اُنہوں نے جواب میں کہا" کیاتواس لئے آیاہے کہ ہمیں اُس طریقہ سے پھیر دے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایاہے اور زمین میں بڑائی تم دونوں کی قائم ہو جائے؟تمہاری بات تو ہم ماننے والے نہیں ہیں"۔(سورۂ یونس:78)

فرعون بھی موسیٰ علیہ السلام سے ایسے ہی کہا کرتا تھا، کیونکہ ان کی عقل وذہن پر دنیااور اسبابِ دنیا کی محبت چھائی ہوتی ہے،اس لئے وہ سمجھتے ہیں کہ کسی بھی فکر وسوچ اور حرکت و عمل کا مقصود دنیا ہی ہوتی ہے،اسی لئے انبیاء علیہم السلام اپنی قوم سے اپنی بے نیازی کا اعلان کرتے تھے اور کہتے تھے:[وَيٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔـلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَي اللّٰهِ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْـهَلُوْنَ] ترجمہ: "اوراے برادران قوم! میں اِس کام پر تم سے کوئی مال نہیں مانگتا، میرا اجر تواللہ کے ذمہ ہے اور میں اُن لوگوں کو دھکے دینے سے بھی رہا جنہوں نے میری بات مانی ہے، وہ آپ ہی اپنے رب کے حضور جانے والے ہیں، مگر میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ جہالت برت رہے ہو"۔(سورۂ ہود:29)

امام بخاریؒ حضرت مقدامؓ سے روایت کرتے ہیں،وہ اللہ کے رسول ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: کسی نے اپنے ہاتھ کی کمائی سے زیادہ بہتر کمائی کبھی نہیں کھائی،اور اللہ کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی کھایا کرتے تھے۔(صحیح بخاری:2072)

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ کسبِ حلال پر اعتماد کے نتیجے میں انسان کو کلمہ حق کہنے اور اس کا اعلان کرنے کی مکمل آزادی اور طاقت حاصل ہوتی ہے۔(مدخل لفہم السیرۃ،ص:137)

کتنے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ظالموں اور سرکشوں کے سامنے اپنے سر جھکائے رہتے ہیں،ان کے غلط طرزِ عمل پر سکوت اختیار کرتے ہیں اور انکی بے جا غلط خواہشات کا ساتھ دیتے ہیں،ڈر صرف یہ ہوتا ہے کہ ان کے ہاں ان کی ملازمت داؤپر نہ لگ جائے۔(ایضاً:128)

کسی بھی فکر وسوچ کے داعی کی لوگوں کے نزدیک کوئی قیمت باقی نہیں رہتی ہے جبکہ اس کی کمائی اور روزی کا ذریعہ اس کی دعوت ہو یاوہ لوگوں کے عطیات اور صدقات بات پر پلتا ہو،اسی لئے اسلامی دعوت کی حامل شخصیت کے لئے تمام لوگوں کے مقابلہ میں ضروری تھا کہ وہ اپنی معیشت میں شخصی محنت و کوشش یا کسی ایسے شریفانہ ذریعہ آمدنی پر انحصار کرے جس میں کسی کی محتاجی نہ ہو،تاکہ لوگوں میں سے کسی کا بھی اس پر کوئی فضل واحسان نہ ہو،ورنہ یہ چیز کلمۂ حق کا اعلان واظہار کرنے میں رکاوٹ بنے گی۔

اگرچہ یہ معانی اور مفاہیم اللہ کے رسول ﷺ کے دل میں اس وقت نہ رہے ہوں،اس لئے کہ آپ ﷺ کو یہ معلوم نہ تھا کہ آپ کو دعوت ورسالت کی ذمہ داری سونپی جانے والی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے لئے جو منہج اختیار کیا تھا وہ اسی حکمت پر مبنی تھا اور یہ منہج واضح کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ تھی کہ بعثت سے پہلے رسول ﷺ کی زندگی میں کوئی ایسی چیز وقوع پذیر نہ ہو جو آپ کی دعوت کی راہ میں رکاوٹ بنے یا بعثت کے بعد اس کا کوئی منفی اثر ظاہر ہو۔(فقہ السیرۃ،البوطی،ص:50)

بلاشبہ نبی کریم ﷺ کا کسبِ رزق کی غرض سے بکریاں چرانے کا عمل آپ ﷺ کی بابرکت شخصیت کے اہم اوصاف اور اور پہلوؤں کی جانب اشارہ کرتا ہے،ان میں سے ایک اہم پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو بلند ذوق اور لطیف احساس سے نوازا تھا،

اگرچہ آپ ﷺ کے چچا مکمل توجہ کے ساتھ آپ کی کفالت وحفاظت فرمارہے تھے اورایک مشفق باپ کی طرح آپ کے ساتھ شفقت و محبت کا معاملہ کرتے تھے، لیکن اس کے باوجود اللہ کے رسول ﷺ نے جیسے ہی اپنے اندر کسبِ معاش کی صلاحیت محسوس کی تو فوراً کسبِ معاش کی جانب متوجہ ہوئے،انفاق ومصارف میں اپنے چچا کی معاونت کرنے میں محنت ومشقت کرتے،اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آپؐ کے مزاج میں فطانت وبلندی، معاملات اور برتاؤ میں اخلاص اور استطاعت کے بقدر خرچ کرنے کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود تھا۔(فقہ السیرۃ، البوطی،ص:50)

دوسرا اہم پہلو اس سے معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ اس کے ذریعہ اس طرزِ زندگی کو واضح کردیا گیا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے صالح بندوں کے لئے پسند کیا ہے، یہ بہت آسان تھا کہ نبی کریم ﷺ کے لئے ابتدائی زندگی میں ہی رفاہیت وخوشحالی کے تمام اسباب مہیا کردیتا جو آپ کو محنت ومشقت اور بکریوں کو چرانے سے بے نیاز کردیتے، لیکن اللہ کی حکمت کا تقاضا ہم سے یہ ہے کہ ہم اچھی طرح یہ بات جان لیں کہ انسان کے لئے سب سے بہتر مال وہ ہے جو وہ اپنے ہاتھ سے کمائے یا اپنی سوسائٹی اور بنی نوع انسان کی خدمت کے نتیجے میں حاصل ہو۔ (دیکھیں: فقہ السیرۃ،البوطی،ص: 50)

۷: بعثت سے پہلے نبی ﷺ کے لئے حفاظتی انتظامات

بے شک اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی جاہلیت کے شرک سے اور بت پرستی سے اپنے نبی حضرت محمد ﷺ کی حفاظت فرمائی،امام اُحمد نے اپنی مسند میں ھشام بن عروہ سے اور وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں فرماتے ہیں: کہ مجھ سے حضرت خدیجہؓ کے پڑوسی نے بیان کیا کہ اس نے نبی کریم ﷺ سے اس وقت سنا جب کہ آپ ﷺ حضرت خدیجہؓ سے فرمارہے تھے: اے خدیجہ! اللہ کی قسم!"میں کبھی بھی لات وعزی کی عبادت نہیں کرتا ہوں"۔(مسند احمد:4/222،5/362)۔راوی کہتے ہیں کہ یہ ان کے وہ بت تھے جن کی عبادت کرکے وہ سویا کرتے تھے۔اسی طرح آپ ﷺ بتوں کے نام پر ذبح کیا ہوا نہیں کھاتے تھے اور اس سلسلہ میں آپ ہی جیسا طرزِ عمل زید بن عمرو بن نفیل کا بھی تھا۔(دیکھیں: وقفات تربویۃ،احمد فرید،ص،51)

اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو جوانی کے ان غلط رجحانات اور بے جاجذبات سے محفوظ فرمایا تھا جن کی جانب جوانی انسان کو مائل کرتی ہے،اور وہ داعیوں کے وقار اور رہبری کرنے والوں کے مقام ومرتبہ کے شایان شان نہیں ہوتے ہیں۔(دیکھیں: محمد رسول اللہ ﷺ، محمد صادق عرجون،1/51)

حضرت علی بن ابی طالبؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: میں نے دومرتبہ کے علاوہ کبھی بھی جاہلیت کے اعمال میں سے کسی بھی عمل کا ارادہ نہیں کیا،اور دونوں بار اللہ تعالیٰ نے میری حفاظت فرمائی۔ایک قریشی نوجوان جو میرے ساتھ مکہ کے بالائی علاقہ میں بکریاں چرایا کرتا تھا،ایک رات میں نے اس سے کہا: آج تم میری بکریوں کی دیکھ بھال کرو تاکہ میں بھی دوسرے جوانوں کی طرح رات قصہ کہانی کی محفل میں شریک ہوجاؤں،اس نے کہا: ٹھیک ہے۔چنانچہ میں نکلا اور مکہ کے کنارے

کے ایک گھر کے پاس پہنچا۔ وہاں میں نے گانے بجانے دف اور موسیقی کی آواز سنی۔ میں نے پوچھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ لوگوں نے کہا: فلاں قریش کے ایک مرد نے قریش کی ایک عورت سے شادی کی ہے، اور یہ اسی کی محفل ہے۔ میں اس آواز اور گانے کو سننے لگا تو فوراً میری آنکھ لگ گئی، اور میں سوتا رہا یہاں تک کہ اگلی صبح سورج کی کرنوں سے بیدار ہوا۔ میں واپس آیا تو اس جوان نے پوچھا: رات کو کیا کیا؟ میں نے اس کو ساری بات بتادی۔ پھر میں نے ایک اور رات اس سے دوبارہ بکریوں کی دیکھ بھال کرنے کو کہا، تو اس نے بات مان لی، اور میں نکل پڑا، پھر میں نے ایسی ہی آواز سنی اور مجھ سے یہی کہا گیا کہ یہاں شادی کی محفل ہے، تو میں اس آواز کو سننے لگا لیکن پھر آنکھ ایسی لگی کہ سورج کی دھوپ سے ہی بیدار ہوا۔ اور پھر اپنے ساتھی کے پاس واپس آگیا، اس نے پوچھا: کیا کیا؟ میں نے کہا: میں نے کچھ بھی نہیں کیا، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: اللہ کی قسم! اس کے بعد میں نے کبھی بھی عملِ جاہلیت کا ارادہ نہیں کیا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے نبوت عطا کر دی۔ (الدلائل، ابو نعیم: 128، السنن الکبری للبیہقی 2/33، 34، البزار، 2403 مجمع الزوائد 6/226)

اس حدیث سے ہمارے سامنے دو قسم کے حقائق واضح ہوتے ہیں جو انتہائی اہم ہیں:

1) نبی کریم ﷺ کی شخصیت میں تمام بشری خصائص موجود تھے، اور آپ کی ذات میں وہ تمام فطری رجحانات و جذبات موجود تھے جو ایک نوجوان کے اندر ہوا کرتے ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے مطابق تمام انسانوں میں رکھا ہے، چنانچہ آپ ﷺ رات کی محفلوں اور لہو و لعب کے احساسات محسوس کرتے تھے اور اس کے اندر جو مزہ ہے اس کو محسوس کرتے تھے اور آپ کا نفس آپ سے کہتا تھا: اگر آپ بھی اس سے لطف اندوز ہو جائیں جیسے کہ دوسرے لوگ لطف اندوز ہوتے ہیں!۔

2) اللہ تعالیٰ نے اس سب کے باوجود آپ ﷺ کو ہر قسم کے انحراف کے مظاہر سے محفوظ رکھا، اسی طرح ہر اس چیز سے بھی حفاظت فرمائی جو دعوتی تقاضوں سے میل نہ کھاتی ہو جس دعوت کے لئے آپ کی ذات کو تیار کیا گیا تھا۔ (دیکھیں: فقہ السیرۃ النبویۃ، البوطی، ص: 50-51)

۸: بچپن میں بحیرا راہب کی رسول ﷺ سے ملاقات

حضرت ابو طالب شام کے سفر پر نکلے تو ان کے ساتھ نبی کریم ﷺ بھی قریش کے بڑے بزرگوں کے ساتھ نکلے جب اُنہوں نے وہاں راہب (عیسائیوں کے بزرگ) کو دیکھا تو وہ رک گئے اور وہاں پڑاؤ ڈالا، راہب ان کے پاس خود ہی گیا، اس سے پہلے بھی وہ وہاں سے نکلتے تھے تو وہ نہ ہی ان کے پاس جاتا اور نہ ہی ان پر کوئی توجہ دیتا۔

ابھی وہ اپنا سامان کھول ہی رہے تھے تو راہب ان کے درمیان پہنچ گیا، یہاں تک کہ آکر اللہ کے رسول ﷺ کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا: یہ سید العالمین ہیں، یہ رب العالمین کے رسول ہیں، ان کو اللہ تعالیٰ رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجے گا۔ قریش کے بزرگوں نے ان سے پوچھا: آپ کو کیسے اس کا علم ہے؟ اس نے کہا: آپ لوگ جیسے ہی گھاٹی سے نمودار ہوئے تو کوئی درخت اور پتھر ایسا نہیں تھا جس نے سجدہ نہ کیا ہو، اور یہ درخت اور پتھر صرف کسی نبی کو ہی سجدہ کر سکتے ہیں، اور میں ان کو ان کے شانہ مبارک کے نچلی طرف موجود سیب جیسی مہرِ نبوت کے ذریعہ پہچانتا ہوں۔ اس کے بعد وہ واپس گیا اور ان کے اکرام میں کھانا تیار کیا، جب وہ ان کے پاس کھانا لے کر آیا تو اللہ کے رسول ﷺ اونٹوں کو چرانے

تشریف لے گئے تھے، اس نے کہا کہ آپ ﷺ کو بلاؤ، چنانچہ آپ ﷺ تشریف لائے تو آپ پر ایک بادل سایہ فگن تھا۔ جب لوگوں کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ لوگ درخت کے سائے میں پہلے ہی جگہ لے چکے ہیں۔ جب آپ ﷺ تشریف لائے تو درخت کا سایہ آپ کی جانب مائل ہوا تو راہب نے کہا: دیکھو درخت کا سایہ آپ کی طرف جھک گیا ہے۔

راوی کہتے ہیں: وہ ان کے پاس ہی کھڑا تھا اور ان کو قسم دے کر کہہ رہا تھا کہ ان کو لے کر رومیوں کے پاس نہ جائیں، اس لئے کہ رومی اگر ان کی صفات پہچان لیں گے تو ان کو قتل کر دیں گے، یہ بات کرتے ہی وہ پیچھے مڑا تو دیکھا کہ رومیوں میں سے سات افراد آئے ہوئے ہیں، اس نے ان کا استقبال کیا اور پوچھا: آپ لوگ کیوں آئے ہو، انہوں نے کہا: ہمیں یہ معلوم ہوا ہے کہ ایک نبی اس مہینے میں نکلنے والا ہے، اس لئے کوئی راستہ ایسا نہیں بچا ہے جہاں لوگوں کو نہ بھیجا گیا ہو، ہمیں ان کے متعلق پوری تفصیلات بتا دی گئی ہیں، ہمیں آپ کے اس راستے کے لئے منتخب کیا ہے۔ اس نے کہا: تمھارا ایسے معاملہ کے بارے میں کیا خیال ہے جس کو اللہ تعالی نے کرنے کا فیصلہ کر لیا ہو، تو کیا لوگوں میں سے کوئی اس کو روک سکتا ہے؟! انہوں نے کہا: نہیں، کوئی نہیں روک سکتا ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ یہ سن کر انہوں نے اس راہب سے بیعت کر لی اور اسی کے ساتھ قیام کیا۔

راہب نے (قافلہ والوں سے) کہا: میں تمہیں اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ یہ بتاؤ کہ تم میں سے ان کے ساتھ کس کی قرابت داری ہے؟ لوگوں نے جواب دیا: ابو طالب۔ وہ مسلسل ابو طالب سے آپ ﷺ کو وہیں سے واپس لے جانے پر اصرار کرتا رہا، یہاں تک کہ ابو طالب نے آپ ﷺ کو وہیں سے واپس لایا۔ (الدلائل للبیہقی 2/24-25، ترمذی: 3620، مستدرک حاکم 2/85 الدلائل لأبی نعیم: 109)

<u>بحیرا کے واقعہ سے کئی امور معلوم ہوتے ہیں:</u>

1) اہل کتاب میں سے سچے راہب اچھی طرح جانتے تھے کہ محمد ﷺ تمام انسانوں کے لئے بحیثیتِ رسول بھیجے گئے ہیں اور یہ بات ان کو اپنی کتابوں میں موجود علامتوں اور اوصاف کے ذریعہ معلوم تھی۔

2) اس سے شجر و حجر کا نبی کریم ﷺ کے لئے سجدہ کرنا، بادلوں کا سایہ کرنا اور درخت کا ان پر سایہ فگن ہونا ثابت ہوتا ہے۔

3) نبی کریم ﷺ نے اپنے سفر سے اور اپنے چچا کے ساتھ بطور خاص قریش کے بزرگوں سے کافی استفادہ کیا، آپ ﷺ دوسروں کے تجربات اور علوم سے واقف ہوئے، ان کی آراء سے فائدہ اٹھایا، اس لئے کہ یہ سب لوگ ایسے تجربات اور مشاہدات رکھتے تھے جن سے نبی کریم ﷺ کو ابھی اس عمر میں سابقہ نہیں پڑا تھا۔

4) بحیرا نے عیسائیوں کے بارے میں ڈرایا اور اندیشہ ظاہر کیا کہ اگر ان کو نبی کریم ﷺ کے بارے میں معلوم ہوا تو وہ آپ ﷺ کو جان سے مار دیں گے، اس نے آپ کے چچا اور مکہ کے بزرگوں کو تاکید کے ساتھ مشورہ دیا کہ آپ ﷺ کو رومیوں کے پاس نہ لے کر جائیں کیونکہ اگر انہوں نے آپ کو اوصاف کے ذریعہ پہچان لیا تو وہ آپ کو قتل کر دیں گے، رومیوں کو اس کا علم تھا کہ اس رسول کے آنے سے

پورے علاقے میں ان کا استعماری اثر و نفوذ ختم ہو جائے گا، اس لئے وہی ان کا اصل دشمن ہے جو رومی سلطنت کے مفادات کا خاتمہ کرے گا اور ان مصالح اور فوائد کو اصل حقداروں کو لوٹا دے گا، یہی وہ چیز تھی جس سے رومی سہمے ہوئے تھے۔

۹: جنگ فجار

قریش اور قبیلہ کنانہ کے جو لوگ قریش کے ساتھ تھے، ان کے درمیان اور قبیلہ ہوازن کے درمیان جنگ چھڑ گئی، اس کا سبب یہ بنا کہ عروۃ الرحال بن عتبہ بن ہوازن نے سوقِ عکاظ کے لئے لائے ہوئے سامانِ تجارت سے لدے ہوئے اونٹوں کو پناہ دی۔ براض بن قیس بن کنانہ نے اس سے کہا کہ کیا تم نے کنانہ کے مقابلہ میں ان کو پناہ دی ہے؟ اس نے کہا: ہاں، بلکہ تمام لوگوں کے مقابلہ میں ان کو پناہ دی ہے۔ عروۃ ان اونٹوں کو لے کر نکل گیا، براض موقع تلاش کرتا رہا یہاں تک کہ اس کو قتل کر دیا، کنانہ کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے وہاں سے کوچ کر لیا مگر ہوازن کے لوگوں کو اس کا علم نہیں ہو پایا، اس کے بعد ان کو پتہ چلا تو انہوں نے ان کا پیچھا کیا اور حرم میں داخل ہونے سے پہلے پہلے ان کو پکڑ لیا، دونوں کی آپس میں خوب لڑائی ہوئی، یہاں تک کہ رات کا وقت ہو گیا اور وہ حرم میں داخل ہو گئے، اس لئے ہوزان کے لوگوں نے ان سے لڑائی بند کر دی۔ مگر اس کے بعد بھی پھر کئی دنوں تک لڑائی جاری رہی، اور قریش نے کنانہ کا ساتھ دیا، اللہ کے رسول ﷺ بھی ان کی بعض مڈ بھیڑوں میں شریک رہے، آپ ﷺ کے چچا آپ کو اپنے ساتھ لے گئے تھے، اس کو جنگ فجار اس لئے کہا گیا کیونکہ اس میں حرم مکی کے مقدس مقام کو پامال کیا گیا، حالانکہ وہ تمام عربوں کے نزدیک ایک مقدس مقام تھا۔ (دیکھیں: وقفات تربویہ مع السیرۃ النبویہ، ص 53)

اللہ کے رسول ﷺ نے اس جنگ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے: "میں اپنے چچاؤں کو دشمنوں کی طرف سے آنے والے تیر اٹھا اٹھا کر دیتا تھا"۔ (ابن ہشام 1/198 السیرۃ الحلبیۃ 129- 1/127)

اس وقت اللہ کے رسول ﷺ چودہ یا پندرہ برس کے تھے، ایک قول بیس سال ہونے کا بھی ہے۔ البتہ پہلا قول اس لئے راجح معلوم ہوتا ہے کیونکہ آپ ﷺ تیر جمع کر کے دیتے تھے اور اپنے چچاؤں کو جمع کر کے دیتے تھے جس سے آپ کی کم سنی کا پتہ چلتا ہے۔

اس طرح اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے اندر جرأت و بہادری اور اقدام کرنے کی صلاحیت پیدا کی، جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی قتال کی مشق بھی کی، اس طرح یہ جنگ بھی عربوں کی دوسری جنگوں کی طرح اپنے اختتام کو پہنچ گئی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں الفت پیدا فرمائی اور ان میں اسلام کا نور عام ہونے کی وجہ سے بہت سی گمراہیاں کافور ہو گئیں۔ (دیکھیں: وقفات تربویۃ، ص، 53)

۱۰: حلف الفضول

جنگ فجار سے قریش کی واپسی کے بعد حلف الفضول کا واقعہ پیش آیا، اس کا سبب یہ بنا کہ (یمن کے) علاقہ زبید کا ایک شخص مکہ مکرمہ کچھ سامانِ تجارت لے کر آیا اور یہ سب سامان عاص بن وائل نے خرید لیا، لیکن اس کا حق اس کو دینے سے انکار کر دیا، زبیدی نے سردارانِ قریش کی حمایت حاصل کرنا چاہی، لیکن عاص بن وائل کی حیثیت و مقام کی وجہ سے انہوں نے اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا، بالآخر زبیدی خانۂ کعبہ کے پاس کھڑا ہوا، اور آل فہر اور اصحابِ غیرت و حمیت سے فریاد کی اور بآوازِ بلند چند اشعار میں اپنی مظلومیت کا نقشہ کھینچا!

يا آلَ فِهْرٍ لمظلومٍ بضاعتُه ... ببطْنِ مكّةَ نائي الدّارِ والنَّفرِ
ومحرمٍ أَشْعثٍ لَمْ يقْضِ عُمرتَه ... يا للرِّجالِ وبينَ الْحِجرِ والْحَجَرِ
إنَّ الْحَرامَ لمَنْ تَمّتْ كرامتُه ... ولا حرامَ لثوبِ الْفاجرِ الْغُدَرِ

ترجمہ: اے آل فہر! وادی مکہ میں ایک مظلوم و بے سہارا کو اس کا سامانِ تجارت واپس دلا دو، جس کا گھر اور ساتھ دینے والے کافی دور ہیں۔ اے غیرت مند مردو! احرام میں ملبوس اس پراگندہ بال شخص کی مدد کرو جس نے ابھی اپنا عمرہ بھی مکمل نہیں کیا ہے اور وہ مقام حجر اور حجر اسود کے درمیان پریشان ہے۔ کامل شرافت و عزت والے شخص کے لئے یہ حرم قابل احترام ہے، لیکن ایک فاجر اور دھوکہ دینے والے شخص کے ذریعہ خریدے جانے والے کپڑے اور سامان کی کوئی حُرمت نہیں ہے۔

یہ سن کر زبیر بن عبدالمطلب کھڑے ہوئے اور کہا: اس معاملہ کو یوں ہی نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس کے بعد بنو ہاشم، بنو زہرہ، بنو تمیم بن مرہ، عبداللہ بن جدعان کے گھر میں جمع ہوئے، اس نے ان کے لئے کھانے کا انتظام کیا اور وہیں پر سب نے ذوالقعدہ کے محترم مہینہ میں عہد و پیمان کیا، اللہ کی قسم کھا کر یہ عہد کیا کہ وہ ظالم کے مقابلہ میں مظلوم کا ساتھ دینے میں ایک ہاتھ کی طرح رہیں گے، جب تک کہ مظلوم کا حق واپس نہ دلا دیا جائے، اور یہ کام وہ ہمیشہ ہمیش کرتے رہیں گے۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویۃ، أبو شہبہ، 1/213)

اس کے بعد سب لوگ عاص بن وائل کے پاس گئے اور اس سے زبیدی کا پورا سامان چھین کر زبیدی کے حوالے کیا۔

قریش نے اس معاہدہ کا نام 'حلف الفضول' رکھا اور کہنے لگے کہ اس معاہدہ میں شریک سب کے سب لوگ فضل والے کام میں شریک ہوئے، اسی معاہدہ کے بارے میں زبیر بن مطلب کہتے ہیں:

إنَّ الْفضولَ تعاقَدوا وتحالَفوا ... ألَّا يقيمَ ببطْنِ مكّةَ ظالِمُ
أَمْرٌ عليه تعاقَدوا وتواثَقوا ... فالْجارُ والْمعترُّ فيهم سالِمُ

ترجمہ: فضول یعنی فضل نامی کئی لوگوں نے آپس میں یہ عہد و پیمان کیا کہ مکہ کی وادی میں کوئی بھی ظلم کرنے والا نہیں رہ سکتا ہے۔ یہ ایک ایسا معاملہ تھا جس پر سب نے پختہ عہد و پیمان اور معاہدہ کیا، لہذا یہاں رہنے والا اور باہر سے آنے والا اس میں محفوظ و مامون ہوگا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس اہم معاہدہ میں موجود تھے جس کے ذریعہ ظلم کے محل کو زمین بوس کر دیا گیا اور منارۂ حق کو بلند کیا گیا، اس کو عرب کے مفاخر اور اہم کارناموں میں اور ان کے حقوق انسانی سے آشنا ہونے کی دلیل کے طور پر سمجھا جاتا ہے۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویہ، أبو شہبہ، 1/214)

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: "میں اپنے چچاؤں کے ساتھ جب کہ میں ابھی نو عمر تھا، حلف المطیبین (حلف الفضول) میں شریک ہوا تھا۔ مجھے یہ پسند نہیں کہ میں اس معاہدہ کو توڑ ڈالوں اگرچہ مجھے اس کے بدلہ میں سرخ اونٹ دیئے جائیں"۔ (مسند أحمد، 1/190، الأدب المفرد للبخاری: 567، مسند أبو یعلی: 844، 845، 846)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مزید یہ بھی فرمایا ہے کہ: "یقیناً میں عبداللہ بن جدعان کے گھر میں ایک ایسے معاہدہ میں شریک ہوا، مجھے یہ پسند نہیں ہے کہ مجھے اس کے بدلے سرخ اونٹ دیئے جائیں، اور اگر مجھے اس کے لئے اسلام کے بعد بھی بلایا جائے تو میں ضرور شریک ہوں گا"۔ (السنن الکبری للبیہقی 3/367، سیرت ابن ہشام: 1/141- 142)

اسباق ودروس اور فوائد:

1)عدل ایک قدرِ مشترک ہے،اس کا تعلق کسی مخصوص قوم یا طبقہ سے نہیں ہے،اسی لئے اللہ کے رسول ﷺ بعثت سے دو(۲) دھائی پہلے عدل پر مبنی معاہدہ میں شرکت پر فخر واعتزاز فرماتے ہیں، کیونکہ ایجابی اقدار کو تقویت پہنچانااور ان میں تعاون کرناانسان کی بنیادی ذمہ داری ہے اگرچہ یہ ایجابی اقدار اہلِ جاہلیت ہی سے کیوں نہ صادر ہوں۔(دیکھیں:السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ،العمری 1/112)

2)حلف الفضول جاہلیت کی گھٹاٹوپ تاریکی میں روشنی کی ایک کرن تھا،اس میں یہ واضح دلیل موجود ہے کہ کسی بھی نظام یا معاشرہ میں فساد و انارکی کے عام ہونے کا مطلب ہر گزیہ نہیں ہوتا ہے کہ وہ ہر قسم کے خیر اور فضائل سے خالی ہے،مکہ ایک ایسے جاہلی معاشرہ پر مشتمل تھا جس پر بت پرستی، ظلم، بدکاری اور سود جیسے اخلاقِ مذمومہ کا غلبہ تھا لیکن اس کے باوجود اس میں غیرت وحمیت اور خودداری کے حامل لوگ تھے،جو ظلم کو ناپسند کرتے تھے اور نہ کسی پر ظلم ہونے دیتے تھے،دعوتی کام کرنے والوں اور مصلحین کے لئے اس میں عظیم سبق ہے جو ایسے معاشرہ میں کام کرتے ہیں جہاں اسلامی نظام قائم نہیں ہے یا وہاں لوگ اسلام کے خلاف برسرِ پیکار ہیں۔(دیکھیں: فقہ السیرۃ النبویۃ، الغضبان،ص110)

3)بلاشبہ ظلم بہر صورت ناقابل قبول ہے، ظالموں کے خلاف کھڑے ہونے کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ حق کے داعیوں پر ہونے والے ظلم کے خلاف آواز بلند کی جائے، بلکہ ظالموں کے خلاف ہر محاذ پر آواز بلند کرنا ضروری ہے ،اگرچہ ظلم کسی معمولی عام انسان ہی پر کیوں نہ ہو ،اسلام ظلم کے خلاف جنگ کرتا ہے اور مظلوم کا ساتھ دیتا ہے، یہ دیکھے بغیر کہ اس کا رنگ، دین، وطن اور قوم کیا ہے۔(دیکھیں: السیرۃ النبویۃ،ابو فارس،ص: 121)

4)اس کے ذریعہ خیر کے کسی بھی کام پر معاہدہ کرنے اور آپس میں عہد وپیمان کرنے کا جواز معلوم ہوتا ہے،اس کا تعلق اس تعاون سے ہے جس کا قرآن کریم میں حکم دیا گیا ہے،ارشاد باری تعالی ہے: [يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآئِدَ وَلَاۤ اٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ] ترجمہ:"اے لوگو جو ایمان لائے ہو! خدا پرستی کی نشانیوں کو بے حرمت نہ کرو، نہ حرام مہینوں میں سے کسی کو حلال کرو، نہ قربانی کے جانوروں پر دست درازی کرو، نہ اُن جانوروں پر ہاتھ ڈالو جن کی گردنوں میں نذر خداوندی کی علامت کے طور پر پٹے پڑے ہوئے ہوں، نہ اُن لوگوں کو چھیڑو جو اپنے رب کے فضل اور اس کی خوشنودی کی تلاش میں مکان محترم (کعبہ) کی طرف جا رہے ہوں، ہاں جب احرام کی حالت ختم ہو جائے تو شکار تم کر سکتے ہو اور دیکھو، ایک گروہ نے جو تمہارے لئے مسجد حرام کا راستہ بند کر دیا ہے تو اس پر تمہارا غصہ تمہیں اتنا مشتعل نہ کردے کہ تم بھی ان کے مقابلہ میں ناروا

زیادتیاں کرنے لگو، نہیں! جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں ان میں سب سے تعاون کرو اور جو گناہ اور زیادتی کے کام ہیں ان میں کسی سے تعاون نہ کرو، اللہ سے ڈرو، اس کی سزا بہت سخت ہے"۔ (سورۃ المائدہ: 2)

اور مسلمانوں کے لئے جائز ہے کہ اس طرح کی صورتحال میں آپس میں معاہدہ کریں، اس لئے کہ اس کے ذریعہ ایسی چیز کو مضبوط اور مستحکم کیا جاتا ہے جو شرعی طور پر مطلوب ہے، البتہ یہ کوئی اس طرح کا عمل نہ ہو جو مسجدِ ضرار کے مشابہ ہو، اس طور پر کہ یہ معاہدہ ایسی گروہ بندی میں تبدیل ہو جائے جس کا نقصان دوسرے مسلمانوں کو ظلم و زیادتی کی شکل میں پہنچے، لیکن جہاں تک تعلق ہے اس بات کا کہ مسلمان دوسروں کے ساتھ مل کر ظلم کا خاتمہ کرنے یا ظالم کا مقابلہ کرنے کا معاہدہ کریں تو یہ ان کے لئے اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ اس میں اسلام اور مسلمانوں کے حال اور مستقبل کے مفاد کو پیشِ نظر رکھا گیا ہو۔ حدیث میں اس کی دلیل موجود ہے، حلف الفضول کے بارے میں اللہ کے رسول ﷺ کا یہ قول دلیل ہے: "مجھے یہ بات پسند نہیں ہے کہ مجھے اس کے بدلے سرخ اونٹ مل جائیں"۔ اس لئے کہ اس سے عدل قائم ہوتا ہے ظلم کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ کا یہ قول بھی اس کی دلیل ہے: "اگر مجھے اسلام کے بعد بھی اس کے لئے بلایا جائے گا تو میں ضرور شریک ہوں گا"۔ اس میں اللہ کے رسول ﷺ نے اسلام کے بعد بھی اس طرح کے معاہدہ میں شریک ہونے کے لئے تیار رہنے کی وضاحت کی ہے۔ (دیکھیں: الأساس فی السنۃ 4/172)

5) ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی سوسائٹی میں نمایاں اور مثبت کردار کا حامل ہو، ایسا نہ ہو کہ وہ اپنی سوسائٹی اور ماحول میں مختلف حالات میں صرف ایک گنتی کا فرد شمار کیا جاتا ہو، اللہ کے رسول ﷺ کی حیثیت اپنے معاشرہ میں یہ تھی کہ کسی بھی موقع پر نگاہیں آپ ؐ کی جانب اٹھتی تھیں اور آپ اس معاشرہ میں ضرب المثل بن گئے تھے، یہاں تک کہ وہ آپ کو امین کے لقب سے پکارتے تھے، اللہ کے عطا کردہ اخلاق کریمانہ کی وجہ سے مرد و خواتین سب کے دل آپ کی طرف جھکے جاتے تھے، آپ کی شخصیت مسلسل خوب سے خوب تر ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ پوری قوم کے دلوں میں آپ نے جگہ بنالی، اس کے ذریعہ معاشرہ میں اخلاق کی قیمت اور صاحبِ اخلاق کے احترام کی زندہ تصویر دیکھنے کو ملتی ہے اگرچہ معاشرہ انحراف کا شکار ہی کیوں نہ ہو، اخلاق کی قیمت بہر صورت مسلم ہے۔ (دیکھیں: فقہ السیرۃ، العضبان، ص110-111)

چھٹا باب

حضرت خدیجہؓ کے لئے تجارت اور ان سے نکاح اور بعثت تک کے اہم واقعات

ا: حضرت خدیجہؓ کے لئے تجارت اور ان سے نکاح:

حضرت خدیجہ بنت خویلدؓ اثر و رسوخ والی ایک بیوہ خاتون تھیں اور مال و دولت کے اعتبار سے بھی نامور تھیں، تجارتی کاروبار بھی کرتی تھیں، اپنا مال دوسروں کو دیتیں اور لوگ ان کے مال میں تجارت کرکے اپنی محنت کا معاوضہ پاتے تھے، جب حضرت خدیجہؓ کو رسول ﷺ

کی راست گفتاری، امانت داری اور حسنِ گفتار کا علم ہوا تو انہوں نے آپ ﷺ سے پیشکش کی کہ آپ ان کا مال تجارت کی غرض سے شام لے کر جائیں اور اس کے عوض میں وہ آپ کو اس سے کہیں زیادہ معاوضہ دیں گی جو وہ عام تاجروں کو دیا کرتی ہیں۔ آپ ﷺ نے ان کی بات قبول کرلی اور حضرت خدیجہؓ کا غلام 'میسرہ' سفر میں آپ کے ساتھ نکلا، اور دونوں شام پہنچ گئے، آپ ﷺ نے وہ تمام مال فروخت کر دیا جو آپ لے کر نکلے تھے اور اس کے بدلے میں وہاں سے کچھ سامان خریدا، جب آپ ﷺ مکہ واپس آئے تو حضرت خدیجہؓ نے وہ سب مال فروخت کیا جو آپ ﷺ لے کر آئے تھے تو ان کو اس مال میں کئی گنا فائدہ ہوا۔

اللہ کے رسول ﷺ کو اس سفر میں تجارتی فائدہ کے ساتھ ساتھ اور بھی عظیم فوائد حاصل ہوئے۔ چنانچہ آپ ﷺ کو اس شہر کو دیکھنے کا موقع ملا جس کی جانب آپ ﷺ نے بعد میں ہجرت فرمائی اور جس کو اپنی دعوت کا مرکز بنایا، اور ان علاقوں سے بھی گزرے جن کو آپ ﷺ نے فتح کیا اور ان میں دین کی نشر واشاعت کی، اسی طرح آپ ﷺ کا یہ سفر حضرت خدیجہؓ کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کا سبب بھی بنا جبکہ میسرہ نے حضرت خدیجہؓ سے آپ ﷺ کی جذبۂ خیر خواہی، راست گفتاری اور سچائی اور اخلاق کریمانہ کی روداد بیان کی، اور حضرت خدیجہؓ نے بھی اس مرتبہ اپنے مال میں ایسی برکت دیکھی جو اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی، اسی طرح آپ ﷺ کے اوصاف کریمانہ کا بھی علم ہوا، اور اس طرح ان کو اپنی متاعِ گمشدہ مل گئی۔ یہ سب دیکھ کر انہوں نے اپنے دل کی بات اپنی سہیلی نفیسہ بنت منبّہ سے ظاہر کر دی اور وہ حضرت خدیجہؓ سے نکاح کرنے پر آمادہ کرنے کے لئے آپ ﷺ کے پاس حاضر ہو گئی۔ (دیکھیں: رسالۃ الأنبیاء، عمر احمد عمر 3/27، مواقف تربویہ، ص:56)

آپ ﷺ نے اس پیشکش کو قبول فرمایا اور اس پیشکش کا ذکر اپنے چچاؤں سے بھی کیا اور وہ بھی اس پر راضی ہو گئے، آپ ﷺ کے ساتھ آپ کے چچا حضرت حمزہ بن عبد المطلب گئے اور انہوں نے حضرت خدیجہؓ کو آپ کے بارے میں پیغام نکاح دیا اور اللہ کے رسول ﷺ ان کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے اور بیس (20) جوان اونٹ بطور مہر ادا فرمائے، یہ سب سے پہلی خاتون تھیں جن سے اللہ کے رسول ﷺ نے نکاح فرمایا اور ان کی وفات تک آپ نے کسی اور خاتون سے نکاح نہیں فرمایا۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویۃ، ابو فارس، 122)

حضرت خدیجہؓ کے بطن سے آپ ﷺ کی اولاد میں چار بیٹیاں اور دو بیٹے تولد ہوئے، آپ کے بیٹوں کے نام تھے: حضرت قاسمؓ اور انہی کے نام سے آپ کی کنیت ابو القاسم تھی، اور دوسرے بیٹے حضرت عبد اللہؓ تھے اور ان کے لقب "الطاہر" اور "الطیب" تھے۔

حضرت قاسم کی وفات اس عمر میں ہوئی جس میں ایک انسان جانور پر سوار ہونے کے لائق ہو جاتا ہے، اور حضرت عبد اللہ کی وفات تو بالکل بچپن میں ہی ہو گئی، اور یہ واقعات بعثت سے پہلے ہی پیش آئے۔ اور جہاں تک تعلق ہے آپ کی بیٹیوں کا تو ان کے نام ہیں: حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ، حضرت ام کلثومؓ۔ یہ سب اسلام میں داخل ہوئیں اور مدینہ منورہ کی جانب سب نے ہجرت بھی کی اور سب رشتۂ ازدواج میں منسلک بھی ہوئیں۔ (دیکھیں: رسالۃ الأنبیاء: 3/28)

جس وقت اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت خدیجہؓ سے نکاح فرمایا اس وقت آپ کی عمر مبارک پچیس سال کی تھی اور حضرت خدیجہؓ چالیس سال کی تھیں۔ (السیرۃ النبویہ، ابو فارس، ص 122)

دروس واسباق اور فوائد:

1) امانت داری اور سچائی ایک کامیاب تاجر کی اہم صفات میں سے ہیں، تجارت میں نبی کریم ﷺ کی امانت داری اور راست گفتاری ہی وہ صفات تھیں جن کی وجہ سے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کو اپنا مال تجارت کے لئے دینے کی پیشکش کی، آپ ﷺ ان کا مال لے کر شام تشریف لے گئے تو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے مال تجارت میں خوب برکت عطا فرمائی اور اُن کے لئے خیر کے دروازے وا کر دیئے جن کا ایک کریم و شریف انسان مستحق ہوتا ہے۔

2) بے شک تجارت اُسبابِ رزق کے سرچشموں میں سے ایک ایسا سرچشمہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے لئے بعثت سے پہلے مسخر کیا، نبی کریم ﷺ نے اس کے گر سیکھ لئے، چنانچہ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے: "بے شک اس دین کو ماننے والا سچا اور امانت دار تاجر بروز قیامت انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ اٹھایا جائے گا"۔ یہ پیشہ مسلمانوں کے لئے انتہائی اہم ہے، تجارت کرنے والا شخص دوسروں کے ماتحت رہنے کے بجائے، ان کی خدمت کرتے ہوئے اور ان کی زیادتی اور ذلت سے بالاتر ہو کر آزادانہ طریقہ سے کام کرتا ہے۔ وہ لوگوں کا محتاج نہیں ہوتا ہے، بلکہ دوسرے لوگ اس کی ذات کے، اس کے تجربات، امانت داری اور سچائی کے محتاج ہوتے ہیں۔

3) حبیب مصطفی ﷺ کا حضرت خدیجہؓ کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونا تقدیرِ الٰہی کا فیصلہ تھا، اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے لئے ایک ایسی زوجہ مطہرہ کا انتخاب فرمایا جو آپ کی شخصیت کے عین مناسب تھیں، وہ آپ ﷺ کی معاون و مددگار بنیں، آپ کو لاحق ہونے والے مصائب و آلام کو ہلکا کرتیں، رسالت کی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے میں آپ کی جانب دستِ تعاون بڑھاتیں، اور آپ کی فکروں اور غموں میں آپ کے شریک رہتیں۔(دیکھیں: السیرۃ النبویہ، اُبو شہبہ 1/122)

شیخ محمد الغزالیؒ فرماتے ہیں: "حضرت خدیجہؓ اس خاتون کی بہترین مثالیں ہیں جو ایک انسان کی زندگی کی تکمیل کرتی ہے، رسالت کے حاملین انتہائی حساس دل کے مالک ہوتے ہیں، اور اس سوسائٹی کی طرف سے زیادہ ان کو بہت زیادہ ناامیدی کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس میں وہ تبدیلی لانا چاہتے ہیں، خیر اور بھلائی کا نفاذ کرتے کرتے ان کو بہت زیادہ جہد و مشقت برداشت کرنا پڑتی ہے، ان کو سب سے پہلے کسی ایسے شخص کی ضرورت ہوتی ہے جو ان کی انفرادی اور نجی زندگی میں ان کا انیس و غمخوار ہو، ان کا ہمراز و ہمساز ہو، اور حضرت خدیجہؓ اس میدان کی شہسوار تھیں، ان کا آپ ﷺ کی زندگی میں انتہائی اہم کردار رہا ہے"۔ (فقہ السیرۃ، الغزالی، ص 75)

4) نبی کریم ﷺ نے بیٹوں کو کھونے کا غم برداشت کیا، اسی طرح اس سے پہلے والدین کا سایہ اٹھ جانے کا غم بھی برداشت کیا، اور اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ کے تحت یہ مقدر فرمایا کہ آپ ﷺ کی اولادِ نرینہ میں سے کوئی زیادہ دن حیات نہ رہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو بچپن میں ہی اپنے پاس بلا لیا، تاکہ بعض لوگ ان کی وجہ سے کسی فتنہ میں مبتلا نہ ہوں، اور نہ ہی کوئی ان کے بارے میں نبوت کا دعوی کر سکے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو بیٹے اس لئے عطا کئے تاکہ انسانی فطرت کی تکمیل ہو اور انسان کی فطری خواہش بھی پوری ہو، مزید اس لئے بھی تاکہ نبی کے مردانہ کمال میں کوئی بدخواہ کمی نہ نکال سکے اور نہ ہی کوئی افترا اندازی کرنے والا افترا اندازی کر سکے۔ ایک حکمت اس میں یہ بھی ہے کہ یہ بات

ان لوگوں کے لئے سامانِ تسلی اور باعثِ اطمئنان بن جائے جو بیٹوں کی نعمت سے محروم ہوں اور بیٹے عطا کئے جانے کے بعد وہ فوت ہو جائیں۔ اسی طرح یہ ابتلاء و آزمائش کی بھی ایک قسم ہے اور لوگوں میں سب سے زیادہ آزمائش انبیاء کی ہوتی ہے۔(سنن ترمذی: 2398، ابنِ ماجہ: 4023) گویا کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہوئی کہ غم اور رقت و نرمی کی کیفیت آپ ﷺ کی شخصیت کا جزو لاینفک بن جائے، اس لئے کہ قوموں کی سیادت و قیادت کرنے والے لوگ ظلم و جور کی راہ اسی وقت اپناتے ہیں جب کہ ان کے دلوں میں قساوت و سختی اور خودسری رچ بس گئی ہو، اور انہوں نے اپنی زندگی میں صرف فرحت و شادمانی کا مشاہدہ کیا ہو، اور غم واندوہ اور الم و تکلیف نے کبھی ان کی زندگی کو مکدر نہ کیا ہو، لیکن جہاں تک تعلق ہے اس شخص کا جس نے آلام و تکالیف سہی ہوں تو ایسا شخص کس غمزدہ شخص کی غمخواری کرنے اور زخموں سے چور شخص کی دادرسی کرنے میں پیش پیش ہوگا۔ (فقہ السیرۃ، الغزالی، ص:75)

5) سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے ساتھ نبی کریم ﷺ کے رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کے واقعہ سے ایک مسلمان کے سامنے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ نبی کریم ﷺ کے لئے جسمانی لطف اندوزی کے اسباب اور ذرائع کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے، اگر آپ ﷺ کے نزدیک دوسرے نوجوانوں کی طرح اس کی اہمیت ہوتی تو آپ ﷺ کسی ایسی خاتون سے نکاح فرماتے جو آپؐ سے عمر میں کم ہوتی یا کم از کم آپ سے عمر میں بڑی نہ ہوتی، لیکن آپ ﷺ نے حضرت خدیجہؓ کی ذات میں ان کے شرف و عزت اور مقام و مرتبہ کی وجہ سے دلچسپی ظاہر فرمائی، زمانۂ جاہلیت میں حضرت خدیجہؓ 'عفیفہ' (پاکدامن) اور 'طاہرہ' (پاکیزہ) کے لقب سے معروف تھیں۔

6) سیدہ خدیجہؓ کے ساتھ نبی کریم ﷺ کے نکاح کرنے میں ایسے دلائل موجود ہیں جن سے اسلام سے جلنے والے مستشرقین اور سیکولر قسم کے لوگوں کے منہ بند ہو جاتے ہیں اور ان کے قلم پر لگام لگ جاتی ہے جنہوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ ان کو نبی کریم ﷺ کے نکاح کے موضوع میں ایسے زہر آلود تیر مل گئے ہیں جن کے ذریعہ وہ اسلام پر تابڑ توڑ حملے کریں گے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ کی تصویر اس شہوت پرست شخص کی طرح پیش کی ہے جو اپنی شہوت رانی اور لذت پرستی میں ڈوبا ہوا ہو۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ (25) پچیس سال تک ایک جاہلی معاشرہ میں عفت و پاکدامنی کے اعتبار سے بے مثال زندگی بسر کرتے ہیں، آس پاس کے فاسد رجحانات میں سے کسی کی طرف ذرہ برابر مائل نہیں ہوتے ہیں، اسی طرح ایک ایسی خاتون سے نکاح فرماتے ہیں جن کی عمر آپ ﷺ سے تقریباً دوگنی تھی اور آپؐ اپنی جوانی، ادھیڑ عمر اور پھر بڑھاپے کی ابتدائی عمر حضرت خدیجہؓ کے ساتھ ہی بسر کرتے ہیں، آپؐ کے بجائے اور کسی جانب اپنی نگاہ نہیں اٹھاتے، حالانکہ بہت سی خواتین آپ کے آس پاس موجود تھیں، اور آپ کے لئے کوئی رکاوٹ بھی نہیں تھی، لیکن یہ رشتہ ازدواج اس وقت تک قائم و دائم رہتا ہے یہاں تک کہ (65) سال کی عمر میں حضرت خدیجہؓ آپ ﷺ کو داغِ مفارقت دے کر مالک حقیقی سے جا ملتی ہیں، اس وقت اللہ کے رسول ﷺ کی عمر مبارک پچاس برس کی تھی، اس دوران آپ ﷺ نے کسی اور خاتون سے نکاح کرنے کا سوچا بھی نہیں، حالانکہ بیس اور پچاس برس کے درمیان کی عمر وہ ہوتی ہے جس میں عام طور پر ایک سے

زیادہ نکاح کرنے کی رغبت ہوتی ہے، لیکن نبی کریم ﷺ نے اس زمانہ میں حضرت خدیجہؓ کے ساتھ کوئی دوسری زوجہ یا باندی شریک کرنے کا خیال بھی اپنے دل میں نہ لایا، اگر آپ ایسا کرنا چاہتے تو بہت سی خواتین آپ ﷺ کے اشارہ ابرو کے تابع تھیں۔

اور جہاں تک تعلق ہے اس کے بعد آپ ؐ کا حضرت عائشہؓ اور دیگر امہات المومنینؓ سے نکاح کرنے کا، تو ان میں سے ہر ایک کی مستقل ایک روداد ہے اور ان میں سے ہر ایک کے ساتھ نکاح کرنے کا مخصوص اسباب اور حکمتیں ہیں جن سے واقف ہونے کے بعد حضرت محمد ﷺ کی عظمت، آپؐ کے مقامِ بلند اور کمال درجہ کے اخلاق پر ایک مسلمان کا ایمان دوچند ہو جاتا ہے۔ (فقہ السیرۃ، البوطی، ص، 53- 54)

2: آپ ﷺ کی خانہ کعبہ کی تعمیر میں شرکت

جب آپ ﷺ کی عمر مبارک پینتیس (۳۵) سال کی ہوئی تو قریش کے لوگ از سر نو خانہ کعبہ کی تعمیر کے لئے جمع ہوئے، کیونکہ آگ لگنے کی وجہ سے اور زور دار سیلاب کی وجہ سے اس کو نقصان پہنچا تھا اور اس کی دیواریں خستگی کا شکار ہو گئی تھیں، اور وہ اب بھی ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر کے مطابق قد آدم سے کچھ اونچی چہار دیواری کی شکل میں تھا، اس لئے انہوں نے اس کی عمارت کو منہدم کرنا چاہا تاکہ اس کی دیواروں کو اونچا کر کے اس پر اوپر سے چھت ڈال دیں، لیکن اس کو منہدم کرنے کی کسی کو ہمت نہیں ہوتی تھی، اور وہ ڈر رہے تھے کہ اس کو گرانے کے نتیجہ میں کچھ غلط نہ ہو جائے، بالآخر ولید بن مغیرہ نے کہا: میں اس کو منہدم کرنے کا آغاز کرتا ہوں، اس نے کدال لی، اس کے بعد خانہ کعبہ پر کھڑے ہو کر کہنے لگا: اے اللہ! ہم کجروی کا شکار نہیں ہوئے ہیں اور ہم اس کے ذریعہ خیر کے علاوہ کچھ نہیں چاہتے ہیں۔

اس نے دو کونوں کی جانب سے اس کو شہید کیا، لوگ اس رات انتظار کرتے رہے اور کہنے لگے: ہم دیکھتے ہیں اگر ان کو کوئی نقصان پہنچتا ہے تو ہم اس سے چھیڑ چھاڑ نہیں کریں گے اور اس کو دوبارہ ویسا ہی کر دیں گے جیسا کہ وہ تھا، اور اگر اس پر کوئی آفت نہیں آتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اس عمل سے خوش ہے۔ لوگوں نے دیکھا کہ ولید پھر صبح کے وقت آتے ہیں اور اس کو منہدم کرنے کا عمل جاری رکھتے ہیں، یہ دیکھ کر سب لوگ ان کے ساتھ شریک ہو گئے یہاں تک کہ اونٹ کے کوہان نما سبز پتھروں تک گراتے گراتے پہنچ گئے، وہ پتھر ایک دوسرے کے ساتھ مل گئے تھے۔

انہوں نے کام کو آپس میں تقسیم کر رکھا تھا اور ہر قبیلہ کو متعین کونے کی ذمہ داری دی گئی تھی، قریش کے سردار اور بزرگ پتھروں کو اٹھانے اور منتقل کرنے میں شریک رہے۔ نبی کریم ﷺ اور آپؐ کے چچا حضرت عباسؓ نے بھی خانہ کعبہ کی تعمیر میں شرکت کی، آپ دونوں پتھر ڈھو رہے تھے، حضرت عباسؓ نے نبی کریم ﷺ سے فرمایا: اپنا ازار اپنی گردن پر رکھ لیں، اس کے ذریعہ پتھروں کے نشانات سے محفوظ رہیں گے۔ آپ ﷺ نے جب ایسا کیا تو آپؐ بے ہوش ہو کر زمین پر گر گئے اور آپ کی نگاہیں آسمان کی جانب ہو گئیں، جب آپ ﷺ ہوش میں آئے تو فرما رہے تھے: میرا آزار! میرا ازار! پھر آپؐ نے اپنا ازار پھر سے زیب تن کر لیا۔ (صحیح بخاری: 1582، مسلم: 340)

جب تعمیر کرتے کرتے عمارت حجر اسود تک بلند ہو گئی تو حجر اسود کو اس کے مقام پر رکھنے کے سلسلہ میں جھگڑا شروع ہو گیا، ہر قبیلہ یہ چاہتا تھا کہ حجر اسود کو اس کے مقام پر رکھنے کا شرف وامتیاز اسی کو حاصل ہو، معاملہ اس قدر شدت اختیار کر گیا کہ جنگ وقتال تک نوبت جا پہنچی، ابو

امیہ بن مغیرہ نہ ہوتا تو خون خرابہ ہو جاتا، اس نے فیصلہ کی صورت یہ نکالی اس نے کہا: اے قریش کے لوگو! مسجد حرام کے دروازہ سے دوسرے دن جو سب سے پہلے داخل ہوگا اسے فیصلہ کرنے کا حق دو۔ لوگوں نے یہ تجویز منظور کر لی اور سب سے پہلے داخل ہونے والے حضرت محمد مصطفی ﷺ تھے۔ لوگوں نے جب آپ ؐ کو دیکھا تو سب پکار اٹھے: یہ امین ہیں، ہم ان کے فیصلے پر خوش ہیں۔ جب لوگوں نے آپ ﷺ کو معاملہ کی تفصیل بتائی تو آپ ؐ نے فرمایا: ایک چادر لاؤ، آپ کو چادر لا کر دی گئی تو آپ نے اپنے ہاتھ سے حجر اسود کو اس میں رکھ کر فرمایا: ہر قبیلہ چادر کا کنارہ پکڑ لے اور پھر ایک ساتھ سب اٹھائیں گے۔ چنانچہ سب نے پکڑ کر ایک ساتھ اس کو اٹھایا یہاں تک کہ حجر اسود کی جگہ تک پہنچ گئے تو آپ ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے اس کو اس کے مقام پر رکھا، اس کے بعد اس پر بقیہ تعمیر کی گئی۔ (مستدرک حاکم 1/458-459، عبدالرزاق 5/100-101، الدلائل للبیہقی 2/56)

تعمیر کے بعد خانہ کعبہ کی اونچائی اٹھارہ گز (نو میٹر) ہو گئی، اس کے دروازے کو سطح زمین سے اتنا بلند رکھا گیا کہ سیڑھی لگا کر اس پر چڑھا جا سکے، تاکہ ہر کوئی اس میں داخل نہ ہو اور جس کو وہ چاہیں داخل کر سکیں، اور ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پانی خانہ کعبہ کے اندر نہ داخل ہو، اس کی چھت کے نیچے لکڑی کے چھ ستون لگائے گئے، لیکن قریش کے حلال مال میں کمی پڑ گئی جس کی وجہ سے وہ اسماعیلی بنیادوں کی تکمیل نہ کر سکے اس لئے "حجر" کے حصہ کو انہوں نے اس میں شامل نہیں کیا اور اس پر ایک چھوٹی سی دیوار تعمیر کر دی جس سے یہ ظاہر ہو کہ یہ بھی خانہ کعبہ ہی کا حصہ ہے۔

خانہ کعبہ کی تعمیر مکمل نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے یہ شرط لگا دی تھی کہ خانہ کعبہ کی تعمیر میں صرف حلال رقم ہی استعمال کی جائے گی، اس میں کسی فاحشہ کی اجرت کا مال، سودی رقم اور کسی سے ناحق لیا ہوا مال استعمال نہیں کیا جائے گا۔ (دیکھیں: وقفات تربویۃ، ص 57، رسالہ الانبیاء، عمر احمد عمر 29/3)

اسباق ودروس اور فوائد:

ا: قریش کے نزدیک بھی خانہ کعبہ اہمیت کا حامل اور مقدس تصور کیا جاتا تھا، اس کی اہمیت وتقدس کے لئے یہی بات کافی ہے کہ از سر نو اس کی بنیادوں کو بلند کرنے کا کام ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بیٹے اسماعیل علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے انجام دیا تاکہ یہ ایک اللہ کی عبادت کا اولین گھر بن سکے۔

۲: خانہ کعبہ کی تعمیر پورے عرصہ میں یقینی طور پر چار مرتبہ ہوئی ہے:

1: پہلی مرتبہ وہ تعمیر ہوئی جس کو ابراہیم علیہ السلام نے انجام دیا اور ان کی معاونت ان کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کر رہے تھے۔

2: دوسری مرتبہ اس کی تعمیر قریش نے بعثت سے پہلے کی ہے اور اس تعمیر میں نبی کریم ﷺ بھی شریک رہے۔

3: تیسری تعمیر اس وقت ہوئی جب یزید بن معاویہ کے زمانہ میں خانہ کعبہ آتش زنی کا شکار ہو گیا اور یہ آتش زنی اس محاصرہ کی وجہ سے ہوئی جو الحصین السکونی نے حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف کیا تھا، تاکہ وہ خود سپردگی کر دیں، اس وقت حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے دوبارہ خانہ کعبہ کی تعمیر کی۔

4: چوتھی مرتبہ خانہ کعبہ کی تعمیر عبدالملک بن مروان کے زمانہ میں ہوئی جب کہ حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کو شہید کر دیا گیا، اس نے خانہ کعبہ کو اسی حالت میں تعمیر کیا جیسا کہ وہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں تھا۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویہ، البوطی، ص57- 58)

اس لئے کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے خانہ کعبہ کی عمارت کو بلند کیا اور چھ گز کی مقدار کو اس میں شامل کیا جو کہ مصارف کی کمی کی وجہ سے شامل نہ کیا جا سکا تھا اور اس کی اونچائی دس گز کے بقدر کر دی اور اس کے دو دروازے رکھے، ایک دروازہ داخل ہونے کے لئے اور دوسرا نکلنے کے لئے، اس زیادتی کی ہمت ان کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے ہوئی جو وہ حضور ﷺ سے نقل کرتی ہیں، آپ ﷺ نے ان سے فرمایا تھا: "اے عائشہ! اگر آپ کی قوم زمانہ جاہلیت سے قریب نہ ہوتی تو میں اس حصہ کو بھی از سر نو شامل کر دیتا جو اس سے خارج کر دیا گیا ہے، اور میں اس کو سطح زمین کے قریب کرتا اور اس کے دو مشرقی اور مغربی دروازے بناتا اور اس کو ابراہیمی بنیادوں کے مطابق بناتا"۔ (بخاری: 1586، مسلم: 1333، 401)

۳: اختلاف اور جھگڑے کو ختم کرنے کا طریقہ انتہائی عادلانہ اور توفیق الٰہی پر مبنی تھا، اور سب کے نزدیک قابل قبول بھی تھا جس نے خون خرابہ سے بچا لیا اور خونریز جنگ کی نوبت نہیں آئی، آپ کا عادلانہ فیصلہ ایسا تھا کہ تمام قبائل اس سے مطمئن اور راضی ہو گئے اور حجر اسود کو اپنے مقام پر رکھنے کا شرف صرف کسی ایک قبیلہ کے حصہ میں آنے کے بجائے سب کے حصہ میں آیا، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے رسول ﷺ کو مبعوث کرنے سے پہلے توفیق اور رہنمائی کی اہم دلیل ہے۔ اس خطرناک مسئلہ کو حل کرنے کے لئے اللہ کے رسول ﷺ کا صفا کے دروازے سے داخل ہونا اللہ کا تقدیری فیصلہ تھا، یہ مسئلہ آپ ﷺ کے داخل ہوتے ہی ذہنی اور نفسیاتی طور پر تقریباً حل ہو گیا تھا، اس سے پہلے کہ عملی طور پر حل کیا جاتا اس لئے کہ آپ ﷺ کی شخصیت اور آپ کے فیصلہ کے سامنے سب نے سر تسلیم خم کر لیا تھا، آپ ﷺ

ایسی امانت دار شخصیت کے مالک تھے جن کے ذریعہ کسی پر ظلم کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی، ایسے امین جو کسی کی طرف داری نہیں کر سکتے تھے، اور نہ ہی بگاڑ کا سبب بن سکتے تھے، آپ ﷺ خانہ کعبہ کے، انسانی خون اور جانوں کے بھی امین تھے۔(دیکھیں: السیرۃ النبویہ، ابو فارس، ص125)

۴: بے شک تعمیرِ کعبہ کی تجدید کے واقعہ سے قریش کے درمیان نبی کریم ﷺ کے اعلیٰ مقام و مرتبہ کا اظہار ہوا، اور اس واقعہ میں رسول ﷺ کو دو قسم کے شرف حاصل ہوئے:

أ) اختلاف اور جھگڑے کو ختم کرنے اور قبائل قریش کے درمیان متوقع لڑائی کا خاتمہ کرنے کا شرف۔

ب) پوری قوم کا آپ ﷺ کی ذات پر اتفاق اور اپنے دست مبارک سے حجر اسود کو اس کے مقام پر رکھنے کا شرف۔ آپ ﷺ نے ہی حجر اسود کو اس کو اوپر اٹھانے کے بعد پکڑا اور خانہ کعبہ میں اس کو اپنے مقام پر رکھا۔(دیکھیں: السیرۃ النبویۃ، ابو فارس، 126-125)

۵: تعمیرِ کعبہ کی تجدید کے واقعہ میں ایک مسلمان اس بات کا بخوبی مشاہدہ کر سکتا ہے کہ سیرت رسول ﷺ میں ہر جگہ پر مکمل حفاظت ربانی اور کامل توفیق الٰہی آپ ﷺ کے ساتھ ہے، اسی طرح اس کا بھی اچھی طرح اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو کس طرح اس عظیم صلاحیت سے نوازا تھا کہ آپ ﷺ انتہائی جلد اور آسان طریقہ سے مسائل اور مشکلات کو حل کرتے تھے، یہ چیز آپ ﷺ کی پوری زندگی میں دیکھنے کو ملتی ہے اور یہ آپ ﷺ کی رسالت کا ایک امتیازی نشان ہے۔ آپ ﷺ کی رسالت کا امتیازی پہلو یہ ہے کہ اہم حقائق کو اقرب ترین طریقہ سے جلد دوسروں تک پہنچایا جائے اور آسان ترین اسلوب کے ساتھ مشکلات اور مسائل کو حل کیا جائے۔(دیکھیں: الأساس فی االسنۃ وفقھا، السیرۃ النبویہ، 1/175)

٦: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو جوانی میں جاہلیت کے انحرافات، عیوب اور ہر قسم کے غلط اعمال سے محفوظ رکھا تھا، اس کی واضح دلیل یہ واقعہ بھی ہے کہ آپ ﷺ جب تعمیر کعبہ کے دوران پتھر ڈھو رہے تھے، اور آپؐ نے اپنے ازار کو اپنی گردن پر رکھا تو آپؐ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑے اور آپ کی آنکھیں آسمان کی جانب ہو گئیں، پھر جب ہوش آیا تو یہ فرما رہے تھے: میرا ازار! میرا ازار! اور آپؐ نے فوراً اپنا ازار زیب تن کر لیا، چنانچہ آپ ﷺ کو اس کے بعد کبھی بھی کسی نے برہنہ نہیں دیکھا۔ (صحیح بخاری:1582، مسلم:340)

نبوت محمدیؐ کے استقبال کے لئے لوگوں کو آمادہ اور تیار کرنا

اللہ تعالیٰ کی حکمت اس بات کی متقاضی ہوئی کہ حضرت محمد ﷺ کی نبوت کو تسلیم کرنے اور اس کا استقبال کرنے کے لئے پہلے سے لوگوں کو مختلف طریقوں سے آمادہ اور تیار کیا جائے، ان میں سے چند طریقے مندرجہ ذیل ہیں:

ا: انبیائے کرام کا حضرت محمدؐ ﷺ کے بارے میں بشارت دینا:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا مانگی کہ عربوں میں انہی میں سے ایک رسول معبوث فرمائے، اسی دعا کو قبول کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو بحیثیت رسول بھیجا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: [رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا

عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَيُزَكِّيۡهِمۡ ۞ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ] ترجمہ: ”اور اے رب، ان لوگوں میں خود انہی کی قوم سے ایک ایسا رسول مبعوث فرما، جو انہیں تیری آیات سنائے، ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے، بے شک تو بڑا مقتدر اور حکیم ہے "۔(سورہ بقرہ:129)

قرآن کریم نے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالی نے انبیائے سابقین پر نازل کردہ کتبِ سماویہ میں حضرت محمد ﷺ کی بعثت کے بارے میں بشارت نازل کی ہے، فرمان الٰہی ہے:[اَلَّذِيۡنَ يَتَّبِعُوۡنَ الرَّسُوۡلَ النَّبِىَّ الۡاُمِّىَّ الَّذِىۡ يَجِدُوۡنَهٗ مَكۡتُوۡبًا عِنۡدَهُمۡ فِى التَّوۡرٰٮةِ وَالۡاِنۡجِيۡلِ يَاۡمُرُهُمۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَيَنۡهٰٮهُمۡ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيۡهِمُ الۡخَبٰۤئِثَ وَيَضَعُ عَنۡهُمۡ اِصۡرَهُمۡ وَالۡاَغۡلٰلَ الَّتِىۡ كَانَتۡ عَلَيۡهِمۡ ۞ فَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا بِهٖ وَعَزَّرُوۡهُ وَنَصَرُوۡهُ وَاتَّبَعُوا النُّوۡرَ الَّذِىۡۤ اُنۡزِلَ مَعَهٗۤ ۙ اُولٰۤئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ] ترجمہ: ”(پس آج یہ رحمت اُن لوگوں کا حصہ ہے)جو اس پیغمبر، نبی امی کی پیروی اختیار کریں جس کا ذکر اُنہیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے، وہ انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی سے روکتا ہے، ان کے لئے پاک چیزیں حلال او رناپاک چیزیں حرام کرتا ہے، اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو اُن پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے ،لہٰذا جو لوگ اس پر ایمان لائیں اور اس کی حمایت اور نصرت کریں اور اُس روشنی کی پیروی اختیار کریں جو اس کے ساتھ نازل کی گئی ہے، وہی فلاح پانے والے ہیں۔(سورۃ الأعراف:157)

اور عیسیٰ علیہ السلام نے بھی آپ ﷺ کے بارے میں خوشخبری دی ہے، اور اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسی علیہ السلام کی دی ہوئی بشارت کا ذکر قرآن پاک میں کیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَإِذۡ قَالَ عِيسَى ٱبۡنُ مَرۡيَمَ يَٰبَنِيٓ إِسۡرَٰٓءِيلَ إِنِّي رَسُولُ ٱللَّهِ إِلَيۡكُم مُّصَدِّقٗا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيَّ مِنَ ٱلتَّوۡرَىٰةِ وَمُبَشِّرَۢا بِرَسُولٖ يَأۡتِي مِنۢ بَعۡدِي ٱسۡمُهُۥٓ أَحۡمَدُۖ فَلَمَّا جَآءَهُم بِٱلۡبَيِّنَٰتِ قَالُواْ هَٰذَا سِحۡرٞ مُّبِينٞ﴾ ترجمہ:”اور یاد کرو عیسیٰؑ ابن مریمؑ کی وہ بات جو اس نے کہی تھی کہ "اے بنی اسرائیل، میں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں اُس توراۃ کی جو مجھ سے پہلے آئی ہوئی موجود ہے، اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی، جو میرے بعد آئے گا جس کا نام احمد ہوگا، مگر جب وہ ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آیا تو انہوں نے کہا یہ تو صریح دھوکہ ہے“۔(سورۃ الصف:6)

اللہ نے تمام انبیائے کرام کو آپ ﷺ کی بعثت کے بارے میں باخبر کیا اور ان کو حکم دیا کہ اپنے متبعین کو اس بات کی ہدایت کریں کہ اگر انہوں نے آپ ﷺ کا زمانہ پایا تو ان کے لئے آپؐ پر ایمان لانا اور آپ کی اتباع کرنا واجب ہے۔ (دیکھیں: دراسۃ تحلیلیۃ لشخصیۃ الرسول ﷺ، ص102،101)

جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَإِذۡ أَخَذَ ٱللَّهُ مِيثَٰقَ ٱلنَّبِيِّـۧنَ لَمَآ ءَاتَيۡتُكُم مِّن كِتَٰبٖ وَحِكۡمَةٖ ثُمَّ جَآءَكُمۡ رَسُولٞ مُّصَدِّقٞ لِّمَا مَعَكُمۡ لَتُؤۡمِنُنَّ بِهِۦ وَلَتَنصُرُنَّهُۥۚ قَالَ ءَأَقۡرَرۡتُمۡ وَأَخَذۡتُمۡ عَلَىٰ ذَٰلِكُمۡ إِصۡرِيۖ قَالُوٓاْ أَقۡرَرۡنَاۚ قَالَ

﴿فَٱشۡهَدُواْ وَأَنَا۠ مَعَكُم مِّنَ ٱلشَّٰهِدِينَ﴾ ترجمہ: ”یاد کرو، اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا تھا کہ "آج ہم نے تمہیں کتاب اور حکمت و دانش سے نوازا ہے، کل اگر کوئی دوسرا رسول تمہارے پاس اُسی تعلیم کی تصدیق کرتا ہوا آئے جو پہلے سے تمہارے پاس موجود ہے، تو تم کو اس پر ایمان لانا ہوگا، اور اس کی مدد کرنی ہوگی"۔ یہ ارشاد فرما کر اللہ نے پوچھا: "کیا تم اِس کا اقرار کرتے ہو اور اس پر میری طرف سے عہد کی بھاری ذمہ داری اٹھاتے ہو؟"۔ اُنہوں نے کہا: ہاں، ہم اقرار کرتے ہیں، اللہ نے فرمایا: "اچھا تو گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں“۔(سورہ آل عمران: 81)

تورات اور انجیل کے مختلف نسخوں میں تحریف و تبدیلی کی گئی ہے اور ان میں موجود محمد ﷺ کے نام کی صراحت حذف کر دی گئی ہے، سوائے ”السامرہ“ والے تورات کے نسخے میں، اور ”انجیل برنباس“ جو اسلام کی آمد سے پہلے موجود تھا اور پانچویں صدی عیسوی کے اواخر میں کنیسہ (چرچ) نے اس پر پابندی لگا کر اس سے استفادہ کو حرام قرار دیا، حال ہی میں بحر مردار کے علاقہ میں ملنے والے مخطوطات سے بھی ان کی تائید ہوتی ہے، انجیل برنباس میں نبی کریم حضرت محمد ﷺ کے نام کی صراحت کے ساتھ عبارتیں موجود ہیں، جیسے کہ ”سفر الأصحاح: 41“ میں اس کی صراحت موجود ہے، عبارت کے الفاظ کا ترجمہ ہے: اللہ تعالیٰ پردہ خفا میں چلا گیا اور ان دونوں کو میخائل نے جنت الفردوس سے نکال دیا۔ جب آدم علیہ السلام متوجہ ہوئے تو انہوں نے دروازے کے اوپر لکھا ہوا دیکھا: "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ﷺ" ۔(دیکھیں: السیرۃ النبویۃ الصحیحہ، العمری 1/118)

علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: اہل کتاب کی قدیم کتابوں میں حضرت محمد ﷺ کی صفات کے متعلق روایات ان سے تواتر کے ساتھ منقول ہیں۔ پھر آگے فرماتے ہیں: انبیائے کرام کا آپ ﷺ کے بارے میں پہلے ہی خوشخبری دینا کئی اعتبارات سے معلوم ہے:

۱) ان کتابوں کے ذریعہ جو کہ آج اہل کتاب کے پاس موجود ہیں۔

۲) ان لوگوں کے خبر دینے کے ذریعہ جنہوں نے ان کتابوں کو پڑھا یا دیکھا ہے، ان میں سے بعض اسلام لائے اور بعض نے اسلام قبول نہیں کیا۔ انہوں نے آپ ﷺ کا ذکر اپنی کتابوں میں موجود پایا، جیسے کہ تواتر کے ساتھ یہ بات منقول ہے کہ انصار کے اہل کتاب پڑوسی ان کو آپ ﷺ کی بعثت کے بارے میں بتلاتے رہتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ اللہ کے رسول ہیں، ان کا ذکر ان کے ہاں موجود ہے اور وہ آپ ﷺ کا انتظار کر رہے تھے، وہ سب سے اہم محرک تھا جو انصار کے قبول اسلام کا ذریعہ بنا، جب آپ ﷺ نے ان کو اسلام کی دعوت دی تو وہ فوراً ایمان لائے اور انہوں نے آپ ﷺ کے ساتھ بیعت کی"۔(دیکھیں: الجواب الصحیح، ابن تیمیہؒ 1/340)

حضرت سلمہ بن سلامہ بن وقش رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے اور وہ بدری صحابہ میں سے تھے، فرماتے ہیں: ”بنو عبد الاشہل میں ہمارا ایک یہودی پڑوسی تھا، فرماتے ہیں: نبی کریم ﷺ کی بعثت سے کچھ ہی پہلے وہ ایک روز اپنے گھر سے نکلا اور عبد الاشہل کی مجلس میں آ گیا۔ حضرت سلمہ فرماتے ہیں: اس مجلس میں جتنے لوگ تھے میں ان میں سب سے چھوٹا تھا۔ میرے جسم پر ایک چادر تھی اور وہی اوڑھ کر میں اپنے گھر کے صحن میں لیٹا ہوا تھا، اس یہودی نے بعث بعد الموت، قیامت، حساب، میزان، جنت اور جہنم کا ذکر کیا اور ان سب چیزوں کا تذکرہ وہاں موجود لوگوں کے سامنے کیا، اور وہ سب اہل شرک اور بت پرست لوگ تھے، وہ اس بات کو نہیں مانتے تھے کہ موت کے بعد دوبارہ زندہ کیا

جائے گا۔اس کی باتیں سن کر لوگوں نے اس سے کہا: اے فلاں! افسوس ہے تم پر! کیا تم یہ جانتے ہو کہ یہ سب کچھ ہونے والا ہے کہ لوگوں کو مرنے کے بعد ایک ایسے گھر کے لئے دوبارہ اٹھایا جائے گا جس میں جنت اور جہنم ہو گی اور اس میں ان کو ان کے اعمال کی جزا ملے گی؟ اس نے کہا: اس ذات کی قسم جس کی قسم کھائی جاتی ہے! ہاں ایسا ضرور ہونے والا ہے۔اس دن انسان چاہے گا کہ اگر اس آگ کے بدلے دنیا میں ہی بڑے سے بڑا تنور ہو جس کو گرم کیا جائے اور اس کے بعد اس کو اس میں ڈال کر اوپر سے بند کر دیا جائے اور انسان (جہنم کی) اس آگ سے بچ جائے تو یہ بہتر ہے۔لوگوں نے اس سے کہا: افسوس ہے تم پر! اس کی نشانی اور دلیل کیا ہے؟ اس نے کہا: اس کی نشانی ایک نبی ہے جن کو اس علاقہ میں مبعوث کیا جائے گا اور اس نے مکہ اور یمن کی جانب اشارہ کیا۔لوگوں نے پوچھا: ہم ان کو دیکھیں گے؟ حضرت سلمہؓ فرماتے ہیں: اس نے میری طرف دیکھا، اور میں ان میں سب سے کم عمر تھا، اور کہا: اگر یہ لڑکا اپنی عمر پوری کرے گا تو ان کو پالے گا۔ حضرت سلمہؓ فرماتے ہیں: اللہ کی قسم! گردش لیل ونہار برقرار رہی یہاں تک کہ اللہ تعالی نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث کر دیا اور وہ ہمارے درمیان حیات ہیں، ہم ان پر ایمان لائے اور اس نے تعصب اور حسد کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انکار کیا۔ ہم نے اس سے کہا: اے فلاں! افسوس ہے تم پر! کیا تم وہی شخص نہیں ہو جس نے ہم سے فلاں بات کہی تھی؟! اس نے کہا: ہاں، میں نے کہا تھا مگر یہ وہ نبی نہیں ہیں"۔(دیکھیں: مسند أحمد 3/467، الدلائل للبیہقی 2/78- 79، سیرت ابن ہشام 1/225- 226)

علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: "میں نے خود زبور کے بعض نسخے دیکھے ہیں جن میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی آپؐ کے نام کے ساتھ صراحت موجود ہے۔ میں نے زبور ہی کا ایک دوسرا نسخہ بھی دیکھا مگر اس میں یہ موجود نہیں تھا، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ممکن ہے کہ بعض نسخوں میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ صفات مذکور ہوں جو دوسرے نسخوں میں نہ ہوں"۔(الجواب الصحیح 1/340)

حضرت عبداللہ بن عمرو- رضی اللہ عنہ- نے تورات میں وارد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفات کا ذکر کیا ہے، فرماتے ہیں: "اللہ کی قسم! تورات میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہی صفات مذکور ہیں جن کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے، یعنی: اے نبی! ہم نے آپ کو بطور گواہ، خوشخبری دینے والا، ڈرانے والا اور امیین کی حفاظت کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔ آپ میرے بندے اور میرے رسول ہو، میں نے آپ کا نام متوکل رکھا ہے، وہ تند خو اور سخت دل نہیں ہیں اور نہ ہی بازاروں میں شور اور ہنگامہ کرنے والے ہیں، وہ برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے ہیں بلکہ عفو و درگذر کرتے ہیں اور بخش دیتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ اس وقت تک ان کو دنیا سے واپس نہیں لے گا جب تک کہ ان کے ذریعہ کجروی کی شکار ملت کو درست نہیں کرے گا اور وہ کہہ دیں: لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ، اور ان کے ذریعہ اندھی آنکھوں کو، بہرے کانوں کو اور پردہ پڑے ہوئے دلوں کو کھول نہ دے"۔(صحیح بخاری: 2125،4838، مسند احمد: 2/174 الدلائل للبیہقی 374- 375)

حضرت کعب احبارؓ کی حدیث ہے، فرماتے ہیں: میں تورات میں لکھا ہوا دیکھتا ہوں کہ: "محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، وہ نہ تند خو ہوں گے اور نہ ہی سخت دل اور نہ ہی بازاروں میں شور اور ہنگامہ کرنے والے، وہ برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیں گے، بلکہ عفو و درگذر کریں گے اور بخش دیں گے، ان کی اُمت بہت زیادہ حمد و ثنا کرنے والی ہو گی، وہ ہر نشیب اور منزل میں اترتے وقت تسبیح و تحمید کریں گے، اور ہر بلندی پر چڑھتے وقت تکبیر (اللہ اکبر) کہیں گے، ازار ٹخنوں سے اوپر آدھی پنڈلیوں تک باندھیں گے، اور اعضائے وضو کو دھوئیں گے، نماز کے دوران

اور قتال میں ان کی صف بندی ایک جیسی ہوگی، ان کا منادی آسمان کی فضاؤں میں ندا لگائے گا۔(اللہ کو یاد کرتے ہوئے) رات میں ان کی آواز شہد کی مکھی کی بنبناہٹ جیسی ہوگی، ان کی جائے پیدائش مکہ ہوگی، جائے ہجرت طابہ (مدینہ طیبہ) ہوگی اور ان کی حکومت شام میں ہوگی"۔ (الدلائل للبیہقی،376-377)

2: اہلِ کتاب علماء کی آپ ﷺ کی نبوّت کے بارے میں بشارت:

حضرت سلمان فارسیؓ نے اسلام قبول کرنے کے اپنے مشہور واقعہ میں عموریہ کے راہب کے بارے میں بیان کیا ہے جبکہ اس کی موت کا وقت قریب آیا تو اس نے حضرت سلمانؓ سے کہا: "ایک نبی کی بعثت کا زمانہ قریب آگیا ہے جو دین ابراہیمی کے ساتھ عرب کی سرزمین میں مبعوث ہوں گے، ان کی جائے ہجرت دو حروں کے درمیان کی سرزمین ہوگی، ان دو حروں کے درمیان کھجور کے باغات ہوں گے، ان کی ذات میں کچھ علامتیں ہوں گی جو کسی سے مخفی نہیں ہوں گی، وہ ہدیہ کھائیں گے اور صدقہ کا استعمال نہیں کریں گے، ان کے دونوں شانوں کے درمیان مہرِ نبوت ہوگی، ممکن ہو تو ان سے اس علاقے میں جاکر ضرور ملنا"۔

اس کے بعد حضرت سلمانؓ نے اپنے مدینہ منورہ آنے کا تفصیلی واقعہ بیان کیا ہے، ان کو غلام بنایا جانا، ہجرت کے ساتھ ہی رسول رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ان کی ملاقات، صدقہ کے طور پر آپ ﷺ کو کھانا پیش کرنا جس کو اللہ کے رسول ﷺ نے نہیں کھایا، اور پھر ہدیہ کے طور پر آپ ﷺ کو کھانا پیش کرنا جس کو آپ ﷺ نے کھایا، اس کے بعد دونوں شانوں کے درمیان مہرِ نبوت کو دیکھنا، اور اس کے فوراً بعد اسلام قبول کرنا..... سب حضرت سلمانؓ نے بیان کیا ہے۔(دیکھیں: مسند اُحمد 5/441 - 444، مستدرک حاکم 602/3، الدلائل للبیہقی 97/2 دلائل اُبی نعیم:199 سیرت ابن ہشام 1/228- 234)

اسی طرح علمائے یہود اور ان کے اہم لوگوں نے بھی آپ ﷺ کی بعثت کے قریب ہونے کی پیشن گوئیاں کی ہیں، اس طرح کی پیشن گوئیوں میں سے ابو التیہان کا واقعہ بھی ہے جو ملک شام سے نکلے اور بنو قریظہ میں آکر قیام کیا، اور بعثت نبوی سے دو سال پہلے ان کی وفات ہوگئی، جب ان کی موت کا وقت آیا تو انہوں نے بنو قریظہ کے لوگوں سے کہا: اے یہود کے لوگو! آپ کا کیا خیال ہے کہ وہ کون سی چیز ہے جس نے مجھے شراب و کباب کی سرزمین یعنی شام سے نکال کر پریشانی اور بھوک والی سرزمین یعنی حجاز میں قیام کرنے پر مجبور کیا؟ انہوں نے کہا: آپ ہی کو اس کا زیادہ علم ہوگا، انہوں نے کہا: میں اس شہر میں اس لئے آیا ہوں کیونکہ میں ایک نبی کے نکلنے کا انتظار کر رہا ہوں، جن کی بعثت کا زمانہ قریب ہے، اور میں امید کرتا تھا کہ وہ معبوث ہوں گے تو میں ان کی اتباع کروں گا۔

اس کی یہ بات مشہور ہوگئی اور یہودیوں کے درمیان اتنی عام ہوگئی کہ ان کے ہاں قطعیت کے درجہ تک پہنچ گئی، اسی بنیاد پر یہود مدینہ منورہ کے لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ ایک نبی کی بعثت کا زمانہ قریب آچکا ہے جن کو اب معبوث کیا جائے گا، ہم تم کو ان کے ساتھ مل کر عاد و ارم کی طرح قتل کریں گے، اور یہی باتیں بہت سے انصار کے لوگوں کے اسلام قبول کرنے کا سبب بنی۔ انصار کہا کرتے تھے: اللہ کی رحمت و فضل اور اس کی ہدایت کے ساتھ ساتھ ہمارے اسلام لانے کا سبب جو چیزیں بنیں وہ یہ ہے کہ ہم یہودی لوگوں سے کچھ باتیں سنا کرتے تھے، ہم اہلِ شرک اور بت پرست لوگ تھے، جب کہ وہ اہلِ کتاب تھے، ان کے پاس علم تھا جو ہمارے پاس نہیں تھا، ہمارے اور ان کے درمیان

مسلسل کشمکش اور چپقلش رہتی تھی، جب ہم ان کو کچھ نقصان پہنچاتے جس سے ان کو تکلیف پہنچتی تو وہ ہم سے کہا کرتے تھے: ایک نبی کی بعثت کا زمانہ قریب آچکا ہے جن کو اب مبعوث کیا جائے گا، ہم ان کے ساتھ مل کر تم کو عاد وارم کی طرح قتل کریں گے۔ (سیرت ابن ہشام 1/231) دراسۃ تحلیلیۃ، د، محمد قلعجی، ص 107)

شاہِ روم ہر قل نے بھی جب نبی کریم ﷺ کا نامہ مبارک وصول کیا تھا، اس نے اس وقت کہا تھا: "مجھے اس کا علم تھا کہ وہ نکلنے والے ہیں، لیکن میں یہ نہیں سمجھتا کہ وہ تم میں سے ہوں گے"۔ (صحیح بخاری: 7، صحیح مسلم: 1773)

3: بعثت نبویؐ کے وقت لوگوں کی عمومی صورتحال:

مولانا ابوالحسن ندویؒ نے بہت عمدہ اسلوب میں اس صورتحال کی منظر کشی کی ہے جو اس وقت عرب وغیر عرب اقوام میں پائی جاتی تھی، مولانا رقمطراز ہیں: چھٹی صدی عیسوی کے وسط میں حالات کا بگاڑ بڑھ گیا تھا اور انسانیت کی پستی اس حد کو پہنچ چکی تھی کہ اب وہ کسی مصلح، ریفارمر اور معلمِ اخلاق کے بس کی بات نہ تھی، مسئلہ کسی ایک عقیدہ کی تصحیح کا، کسی مخصوص عادت کو بدلنے کا یا کسی طریقۂ عبادت کی ترویج کا، یا کسی معاشرہ کی سماجی اصلاح کا نہ تھا، اس کے لئے وہ مصلح اور معلمین اخلاق کافی تھے جن سے کوئی زمانہ اور کوئی علاقہ کبھی خالی نہیں رہا۔

مسئلہ یہ تھا کہ جاہلیت کے مشرکانہ وبت پرستانہ اور انسانیت کے اس مہلک اور تباہ کن ملبہ کو کس طرح ہٹایا اور صاف کیا جائے، جو صدیوں اور نسلوں سے تلے اوپر جمع ہو رہا تھا، اور جس کے نتیجہ میں انبیائے کرام کی صحیح تعلیمات اور مصلحین کی مساعی اور خدمات دفن تھیں، پھر اس کی جگہ پر وہ نئی مستحکم اور عظیم الشان، وسیع وعریض اور بلند وبالا عمارت کیسے قائم کی جائے جس کے سائے رحمت میں ساری انسانیت کو پناہ مل سکے، مسئلہ یہ تھا کہ وہ انسان کیوں کر بنایا جائے جو اپنے پیش رو انسان سے ہر چیز میں جدا ہو اور ایسا نظر آئے کہ وہ ابھی ابھی وجود میں آیا ہے اور اس کو نئی زندگی ملی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿أَوَمَن كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَٰهُ وَجَعَلْنَا لَهُۥ نُورًا يَمْشِى بِهِۦ فِى ٱلنَّاسِ كَمَن مَّثَلُهُۥ فِى ٱلظُّلُمَٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ۚ كَذَٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكَٰفِرِينَ مَا كَانُوا۟ يَعْمَلُونَ﴾ ترجمہ: "کیا وہ شخص جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندگی بخشی اور اس کو وہ روشنی عطا کی جس کے اجالے میں وہ لوگوں کے درمیان زندگی کی راہ طے کرتا ہے، اُس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہوا ہو اور کسی طرح اُن سے نہ نکلتا ہو؟ کافروں کے لئے تو اسی طرح ان کے اعمال خوشنما بنا دئے گئے ہیں"۔ (سورۂ انعام: 122)

یہ مسئلہ فساد کی جڑ کو ہمیشہ ہمیش کے لئے ختم کرنے اور بت پرستی کی بنیاد کو بیخ وبن سے اس طرح اکھاڑ پھینکنے کا تھا کہ دور دور اس کا کوئی اثر اور نشان باقی نہ رہ جائے اور عقیدۂ توحید نفسِ انسانی کی گہرائیوں میں عملاً اس طرح پیوست اور راسخ کر دیا جائے کہ اس سے زیادہ تصور کرنا مشکل ہے۔ اس کے اندر اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی اور عبادت کا رجحان، انسانیت کی خدمت اور حق پرستی کا جذبہ اور ہر غلط خواہش اور شوق کو لگام دینے کا ملکہ اور اس کی صلاحیت وقوت پیدا کی جائے، مختصر یہ کہ انسانیت کو (جو خودکشی پر آمادہ تھی بلکہ اس کے لئے پر تول چکی تھی اور اس میں

اپنی دانست میں اس نے کوئی کسر نہ چھوڑی تھی) کمر پکڑ کے دنیا و آخرت کے جہنم سے بچایا جائے، اور اس کو اس شاہراہ پر ڈالا جائے جس کا پہلا سرا وہ حیاتِ طیبہ ہے جو عارفین و اہل ایمان کو اس دنیا ہی میں نصیب ہوتی ہے، اور دوسرا اور انتہائی سرا وہ ہمیشہ رہنے والی جنت ہے جس کا تقوی کی زندگی اختیار کرنے والوں سے وعدہ کیا گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے احسان کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جو ارشاد فرمایا ہے، اس سے بڑھ کر اس صورتحال کی کوئی تصویر اور ترجمانی نہیں ہو سکتی ہے، ارشاد ہے: ﴿وَٱعۡتَصِمُواْ بِحَبۡلِ ٱللَّهِ جَمِيعٗا وَلَا تَفَرَّقُواْۚ وَٱذۡكُرُواْ نِعۡمَتَ ٱللَّهِ عَلَيۡكُمۡ إِذۡ كُنتُمۡ أَعۡدَآءٗ فَأَلَّفَ بَيۡنَ قُلُوبِكُمۡ فَأَصۡبَحۡتُم بِنِعۡمَتِهِۦٓ إِخۡوَٰنٗا وَكُنتُمۡ عَلَىٰ شَفَا حُفۡرَةٖ مِّنَ ٱلنَّارِ فَأَنقَذَكُم مِّنۡهَاۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ ٱللَّهُ لَكُمۡ ءَايَٰتِهِۦ لَعَلَّكُمۡ تَهۡتَدُونَ﴾ ترجمہ: "سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو اللہ کے اُس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، اُس نے تمہارے دل جوڑ دیئے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے، تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے، اللہ نے تم کو اس سے بچا لیا، اس طرح اللہ اپنی نشانیاں تمہارے سامنے روشن کرتا ہے شاید کہ اِن علامتوں سے تمہیں اپنی فلاح کا سیدھا راستہ نظر آ جائے" (سورۂ آل عمران: 103) تفصیل کے لئے دیکھیں: نبی رحمت، مولانا ابوالحسن ندوی، ص 77-78، مزید دیکھیں: الأساس فی السنة وفقهها، السیرة النبویة، سعید حوی 1،181/180)

4: آپ ﷺ کی نبوت کی تمہید اور دیباچہ:

آپ ﷺ کی نبوت سے پہلے بعض خرقِ عادت امور اور تمہیدی چیزیں بطورِ ارہاصات وقوع پذیر ہوتی رہیں، جیسے کہ نبوت سے پہلے پتھر کا آپ کو سلام کرنا، چنانچہ حضرت جابر بن سمرہؓ سے روایت ہے، فرماتے ہیں اللہ کہ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: "میں مکہ میں ایک پتھر کو اچھی طرح جانتا ہوں جو میری بعثت سے پہلے مجھے سلام کرتا تھا، میں اب بھی اس کو جانتا ہوں"۔ (مسند أحمد 5/89، صحیح مسلم 2277، ترمذی: 3624)

اسی طرح آپ ﷺ کو نبوت سے پہلے سچے خواب دکھائے گئے اور ان سچے خوابوں کے ذریعہ ہی وحی کی ابتدا کی گئی، آپ ﷺ جو بھی خواب دیکھا کرتے تھے تو وہ صبحِ صادق کی طرح سچ ہو کر سامنے آتا ہے۔ (صحیح بخاری: 3، صحیح مسلم: 160)

اسی طرح تنہائی، عزلت نشینی اور مخصوص انداز سے عبادت آپ ﷺ کے نزدیک محبوب بن گی۔ آپ ﷺ مکہ کے شمال مغربی جانب واقع پہاڑ کی غارِ حرا میں خلوت نشینی اختیار کرتے تھے اور کئی کئی راتیں عبادت کرتے ہوئے گزارتے، کبھی دس راتیں اور کبھی اس سے بھی زیادہ مہینہ مہینہ تک وہاں وقت گزارتے، اس کے بعد واپس گھر تشریف لاتے، گھر میں کچھ ہی وقت گزارتے یہاں تک کہ پھر سے مزید خلوت نشینی کے لئے زادِ راہ ساتھ لیتے اور غارِ حرا واپس تشریف لے جاتے، آپ کی یہی عادتِ مبارکہ رہی، یہاں تک کہ آپ پر وحی کا نزول ہوا جب کہ آپ ﷺ وہیں خلوت نشین تھے۔ (دیکھیں: فقہ السیرة النبویہ، البوطی، ص: 60)

....

دوسری فصل

وحی کا نزول اور خفیہ دعوت

پہلا باب

سید الخلق ﷺ پر وحی کا نزول

نبی کریم ﷺ نے جب اپنی عمر مبارک کے چالیس سال مکمل کئے تو آپؐ غارِ حرا میں اکیلے خلوت نشین ہوتے اور اس کائنات اور خالق کائنات کے بارے میں غور و فکر کرتے، غار حرا میں عبادت کرتے ہوئے متواتر کئی کئی راتیں گزرتیں یہاں تک کہ زادِ راہ ختم ہوتا تو گھر واپس تشریف لے جاتے، اور پھر سے مزید راتوں کے لئے توشہ ساتھ لیتے۔ (دیکھیں: صحیح السیرۃ، ص: 67)

ماہِ رمضان میں بروزِ پیر دن میں آپ ﷺ کے پاس حضرت جبرئیل علیہ السلام پہلی مرتبہ غارِ حرا میں حاضر ہوئے۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ، العمری 1/125)

امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث نقل کی ہے (اور امام بخاریؒ تمام کتبِ صحاح، کتبِ سنن، مسانید اور کتبِ تاریخ میں امامت کا درجہ رکھتے ہیں) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، فرماتی ہیں: ”رسول اللہ ﷺ پر وحی کی ابتدا اچھے پاکیزہ اور سچے خوابوں کے ذریعہ ہوئی، آپ ﷺ خواب میں جو کچھ دیکھتے تھے وہ صبح کی روشنی کی طرح صحیح اور سچا ہوتا۔ اس کے بعد آپ ﷺ تنہائی پسند ہو گئے اور آپؐ غارِ حرا میں خلوت نشینی اختیار فرماتے اور کئی کئی راتیں وہاں مسلسل عبادت اور ذکر و فکر میں مشغول رہتے تھے، جب تک گھر آنے کو دل نہیں چاہتا زادِ سفر لئے ہوئے وہاں رہتے، توشہ ختم ہونے پر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لاتے اور پھر توشہ ہمراہ لے جاتے، آپ کا یہی طریقہ جاری رہا یہاں تک کہ حق آپ پر منکشف ہو گیا جبکہ آپ ﷺ غار حرا ہی میں قیام پذیر تھے، اچانک آپ کے پاس حضرت جبرئیل علیہ السلام حاضر ہوئے اور کہنے لگے: پڑھیے، آپ ﷺ فرماتے ہیں: میں نے کہا: میں پڑھنا نہیں جانتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا کہ فرشتے نے مجھے پکڑ کر اتنے زور سے بھینچا کہ میری طاقت جواب دے گئی۔ پھر مجھے چھوڑ کر کہا کہ پڑھیئے۔ میں نے کہا: میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ اس نے مجھے دوبارہ پکڑا اور نہایت زور سے بھینچا یہاں تک کہ مجھ کو سخت تکلیف ہوئی۔ پھر مجھے چھوڑ کر کہا: پڑھیئے، میں نے کہا: میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ فرشتے نے مجھے پھر پکڑا اور تیسری بار پھر مجھ کو بھینچا اور پھر چھوڑ دیا اور کہا: ﴿ٱقۡرَأۡ بِٱسۡمِ رَبِّكَ ٱلَّذِي خَلَقَ ① خَلَقَ ٱلۡإِنسَٰنَ مِنۡ عَلَقٍ ② ٱقۡرَأۡ وَرَبُّكَ ٱلۡأَكۡرَمُ ③ ٱلَّذِي عَلَّمَ بِٱلۡقَلَمِ ④ عَلَّمَ ٱلۡإِنسَٰنَ مَا لَمۡ يَعۡلَمۡ ⑤﴾ ترجمہ: ”اپنے رب کے نام سے پڑھیے جس نے سب کو پیدا کیا۔ انسان کو خون کے ایک لوتھڑے سے پیدا کیا۔ پڑھیے اور آپ کا رب سب سے بڑھ کر کرم والا ہے۔ جس نے قلم سے سکھایا۔ انسان کو سکھایا جو وہ نہ جانتا تھا“۔ (سورۃ العلق: 5-1)

آپ ﷺ یہی آیات سن کر اس حال میں غار حرا سے واپس آئے کہ آپ کا دل کانپ رہا تھا۔ آپ ﷺ حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لائے اور فرمایا: مجھے کمبل اوڑھا دو، مجھے کمبل اوڑھا دو، آپ کو چادر اڑھا دی گئی یہاں تک کہ خوف کی یہ کیفیت دور ہو گئی۔

اس کے بعد آپ ﷺ نے حضرت خدیجہؓ کو تفصیل کے ساتھ یہ واقعہ سنایا اور فرمایا کہ مجھ پر ایک ایسی کیفیت طاری ہوئی ہے کہ مجھے اپنی جان کا خوف ہو گیا ہے۔ یہ سن کر حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کی ڈھارس بندھائی اور کہا: ہر گز نہیں! اللہ کی قسم! اللہ آپ کو ضائع نہیں کرے گا، آپ تو صلہ رحمی کرنے والے ہیں، بوجھ میں دبے ہوئے لوگوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، مفلسوں کے لئے کام آتے ہیں، مہمان نوازی میں آپ قابل مثال ہیں اور مشکل وقت میں آپ امر حق کا ساتھ دیتے ہیں۔ اس کے بعد حضرت خدیجہؓ آپ کو ساتھ لے کر ورقہ بن نوفل بن اسد بن عبد العزی کے پاس گئیں۔ جو آپ کے چچازاد بھائی تھے، وہ زمانۂ جاہلیت ہی میں نصرانی مذہب اختیار کر چکے تھے اور وہ عبرانی زبان کے کاتب تھے۔ چنانچہ انجیل کو بھی حسب منشائے خداوندی عبرانی زبان میں لکھا کرتے تھے، وہ بہت بوڑھے ہو گئے تھے یہاں تک کہ ان کی بینائی بھی رخصت ہو چکی تھی۔ حضرت خدیجہؓ نے ان سے کہا کہ میرے چچازاد بھائی! ذرا اپنے بھتیجے کی بات سنو۔ ورقہ نے کہا: بھتیجے! آپ نے جو کچھ دیکھا ہے اس کی تفصیل بیان کرو۔ چنانچہ آپ ﷺ نے جو کچھ دیکھا تھا سب بیان کر دیا۔ ورقہ نے سنتے ہی کہا: یہ تو وہی ناموس یعنی فرشتہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسی علیہ السلام کے پاس بھیجا تھا۔ کاش میں آپ کی نبوت کے زمانہ میں قوی ہوتا اور کاش میں اس وقت زندہ ہوتا جبکہ آپ کی قوم آپ کو وطن سے نکالے گی!۔ آپؐ نے تعجب سے پوچھا: کیا میری قوم مجھے نکال دے گی؟! ورقہ نے کہا: ہاں، کیونکہ جب بھی کوئی آدمی وہ پیغام حق لے کر آتا ہے، جو آپ لائے ہیں تو اس کی قوم نے اس کو ضرور ستایا ہے، اور اگر میں نے وہ زمانہ پایا تو میں آپ کی بھرپور مدد کروں گا۔ مگر ورقہ کچھ ہی دنوں بعد انتقال کر گئے اور کچھ عرصہ تک وحی کی آمد موقوف رہی۔

جب ہم سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی مذکورہ حدیث میں غور و فکر کرتے ہیں تو اس سے حبیبِ مصطفی ﷺ کی سیرت سے متعلق اہم امور اخذ ہوتے ہیں ان میں سے چند اہم امور درج ذیل ہیں:

1) سچے خواب:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے: "رسول اللہ ﷺ پر وحی کی ابتداء صالح (اچھے پاکیزہ) خوابوں کے ذریعہ ہوئی"۔ بعض روایات میں "سچے خواب" کے الفاظ وارد ہیں۔ خوابوں سے مراد یہاں ایسے پاکیزہ خواب ہیں جن کے ذریعہ قلبی اطمئنان و انشراح حاصل ہو اور وہ پاکیزہ ہو۔ (دیکھیں: طریق النبوۃ والرسالۃ، حسین مؤنس، ص: 21)

شاید خوابوں کے ذریعہ وحی کا آغاز کرنے میں اللہ کی یہ حکمت ہو کہ اگر خوابوں کے بجائے اچانک آپؐ کے پاس فرشتہ وحی لے کر آتا اور آپؐ کو اس سے پہلے کسی فرشتے کو دیکھنے کا سابقہ نہ پڑا ہوتا تو آپؐ بہت زیادہ گھبراہٹ کا شکار ہو جاتے اور فرشتے سے کچھ اخذ نہ کر پاتے، اس لئے اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ آپؐ پر ابتدائی مرحلہ میں وحی کا نزول خواب کے ذریعہ ہو، تاکہ آپ کو اس کی مشق ہو جائے اور آپ اس کے لئے اچھی طرح تیار ہو جائیں۔ (منامات الرسول ﷺ عبد القادر الشیخ ابراہیم، ص: 57)

سچے اور پاکیزہ خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہیں، جیسے کی حدیث میں وارد ہے۔ (صحیح بخاری: 6983، مسند احمد 3/126، ابن ماجہ: 3893)

علماء کا قول ہے کہ آپ ﷺ کو اچھے پاکیزہ خواب چھ مہینے تک آتے رہے، امام بیہقیؒ نے اس قول کا ذکر کیا ہے، البتہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ قرآن کا کوئی بھی حصہ آپ ﷺ پر نیند کی حالت میں نازل نہیں ہوا ہے، بلکہ پورا قرآن حالت بیداری میں نازل ہوا ہے۔

نیک خواب دنیاوی زندگی میں خوشخبری کی حیثیت رکھتے ہیں، نبی کریم ﷺ سے یہ فرمان منقول ہے: ''اے لوگو! نبوت کی بشارتوں میں سے اب صرف نیک خواب باقی بچے ہیں، ایک مسلمان اس طرح کے خواب دیکھتا ہے یا اس کو دکھائے جاتے ہیں''۔ (مسند أحمد 1/219، صحیح مسلم: 479، ابوداؤد: 876، نسائی 2/189، ابن ماجہ 3899)

اللہ کے رسول ﷺ غار حرا میں وحی کے نزول سے پہلے خوشگوار خواب دیکھتے تھے جس کی وجہ سے آپ ﷺ قلبی اعتبار سے مطمئن اور زندگی کے جمالیاتی پہلو سے استفادہ کے لئے نفسیاتی اعتبار سے مستعد ہو جاتے تھے۔(دیکھیں: طریق النبوۃ والرسالۃ، ص: 22)

وحی کے آغاز سے متعلق تمام روایات میں یہ بات مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر وحی کی ابتدا سچے اور پاکیزہ خوابوں کے ذریعہ ہوئی جو آپ ﷺ نیند کی حالت میں دیکھتے تھے، اسی کے مطابق واقعہ پیش آتا، بالکل اسی طرح جیسے کہ نیند میں دیکھا ہوتا۔ اس میں سے کوئی بھی چیز غائب نہ ہوتی، ایسا لگتا تھا گویا کہ وہ بات آپ کے قلب و دماغ میں نقش ہو گئی ہو۔ حضرت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا جو فصاحت و بلاغت میں اپنی مثال آپ ہیں، نے رسول اللہ ﷺ کے خوابوں کے ظہور پذیر ہونے اور ان کے کمالِ وضاحت کو صبح صادق کی روشنی کے ساتھ تشبیہ دی ہے، جس روشنی کے بعد گھٹاٹوپ تاریکی کافور ہو جاتی ہے۔ حضرت عائشہؓ کی یہ منظر کشی ایسی بیانی تصویر ہے جس سے زیادہ بلیغ تصویر عربوں کی فصاحت و زبان دانی کے باوجود ممکن نہیں ہے۔(دیکھیں: محمد رسول اللہ ﷺ، محمد صادق عرجون 1/254)

2) خلوت نشینی اور غارِ حرا میں عبادت و مراقبہ:

نبوت سے پہلے پہل نبی کریم ﷺ کے نزدیک خلوت نشینی اور تنہائی محبوب بن گئی، تاکہ آپ کا قلب و ذہن اور روح نبوت کا بار گراں اٹھانے کے لئے یکسو ہو جائیں، اس لئے آپ ﷺ نے غار حرا کو عبادت گاہ بنا دیا تاکہ آپ زندگی کے مشاغل، ہنگاموں اور لوگوں سے منقطع ہو کر اپنے قوائے فکریہ کو، روحانی شعور کو، نفسیاتی احساسات کو اور صلاحیتوں کو مجتمع کر سکیں اور خالقِ کون و سماء کے ساتھ ذکر و مناجات کے لئے فارغ اور یکسو ہو جائیں۔(دیکھیں: محمد رسول اللہ ﷺ، محمد صادق عرجون 1/254)

غار میں بار بار آنے جانے سے حبیب مصطفی ﷺ کو غور و فکر اور تدبر کا موقع ملتا تھا، آپ تاحد نگاہ دیکھتے تو پہاڑوں کا مشاہدہ فرماتے، ایسا لگتا تھا گویا کہ وہ اللہ کی عظمت کے سامنے سجدہ ریز اور جھکے ہوئے ہوں، اوپر نگاہ اٹھاتے تو کھلا ہوا وسیع و عریض نیلگوں صاف آسمان آپ سے محو گفتگو ہوتا، اسی طرح مکہ مکرمہ کا پورا منظر آپ کی نگاہوں کے سامنے ہوتا۔(دیکھیں: السیرۃ النبویۃ، أبو شہبہ 1/256)

نبی کریم ﷺ کی یہ خلوت نشینی اور تنہائی پسندی مادی اور بشری آلائش سے نفس کو پاک کرنے کا ایک مخصوص طریقہ تھا، ساتھ ہی ساتھ تربیتِ الٰہی اور ربانی نگرانی ہر وقت آپ ﷺ کی ہمرکاب تھی، اسی طرح نبوت سے پہلے آپ ﷺ کا طریقۂ عبادت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ آپ ﷺ آسمانوں کے عظیم اور انوکھے نظام پر غور و فکر کرتے اور کائنات میں پھیلی ہوئی ان آیات پر تدبر اور مشاہدہ فرماتے جن

میں اللہ تعالیٰ کی عجیب کاریگری، عظیم قدرت، مستحکم اور انوکھے نظام کے واضح دلائل موجود ہیں۔ (دیکھیں: محمد رسول اللہ ﷺ، محمّد صادق عرجون 1/469)

بعض اہلِ سلوک نے اس کے ذریعہ مراحل سلوک کے دوران ذکر وعبادت کے ساتھ خلوت نشینی اور مراقبہ کی فکر کو اخذ کیا ہے، اس خلوت نشینی کا مقصد دل کو منور کرنا، اس کی ظلمتوں کو زائل کرنا اور اس کو غفلت وشہوت اور آلائشوں سے پاک کرنا ہے، اسی لئے نبی کریم ﷺ کی سنن میں سے ایک سنت رمضان میں اعتکاف کی سنت بھی ہے۔ (دیکھیں: الأساس في السنة وفقهها، السيرة النبوية، سعيد حوى 1/195)

علاوہ ازیں تطہیرِ قلبی اور تزکیہ کی اہم ذمہ داری ہر مسلمان پر عائد ہوتی ہے، چاہے وہ حاکم ہو یا عالم، قائد ہو یا تاجر، تاکہ نفس وقلب کو ہر قسم کی آلائشوں سے پاک وصاف کیا جاسکے، ہمیں اپنی حالت کو کتاب وسنت کی روشنی میں درست کرنا چاہیے اور اپنا محاسبہ کرنا چاہئے اس سے پہلے کہ ہمارا احساب لیا جائے۔

دعوتی میدان میں کام کرنے والوں کے لئے بھی مناسب ہے کہ وہ اپنا مکمل محاسبہ کرنے کے لئے، توبہ وانابت کے لئے، دعوتی صورتِ حال پر غور وفکر کرنے، دعوت کے کمزور اور قوی پہلوؤں پر غور کرنے، کمزوری کے اسباب معلوم کرنے اور سوسائٹی کے خیر وشر تمام پہلوئوں کی تفصیلات جاننے کے لئے کوئی وقت فارغ کریں، اور اگر بگاڑ اتنا عام ہو جائے کہ دنیا ہر شخص پر اثر انداز ہو رہی ہو اور خواہشِ نفس کی پیروی مقصود ومطلوب بن گئی ہو تو اس وقت گوشہ نشینی اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، البتہ یہ ضروری ہے کہ یہ گوشہ نشینی ایجابی اور مثبت ہو، نہ کہ سلبی، یا یں طور کے اس کے بعد راہِ حق پر چلنے کا سفر برقرار رہے۔ (دیکھیں: الطريق الى المدينة، محمّد عبده)

حضرت عائشہؓ کے اس قول "آپ ﷺ کئی کئی راتوں تک عبادت کیا کرتے تھے"۔ اس کے بارے میں شیخ محمد عبداللہ دراز فرماتے ہیں: ”اس میں اس بات کا اشارہ ہے کہ ان راتوں کی تعداد نہ ہی انتہائی کم ہوتی تھی اور نہ ہی بہت زیادہ ہوتی تھی، اور نبی کریم ﷺ کا توسط و اعتدال کا یہی طرزِ عمل ہمیشہ ملت اسلامیہ کا شعار اور نبوی طرز زندگی کی علامت رہا ہے، بعثت سے پہلے بھی آپ ﷺ کا یہی طرز عمل تھا اور آپ کو رحمۃ اللعالمین بنا کر مبعوث کئے جانے کے بعد بھی آپ اسی اعتدال کی شاہرہ پر گامزن رہے“۔ (دیکھیں: المختار من كنوز السنة، ص 19، ط 1978، دار الانصار، القاہرہ)

3) غارِ حرامیں حق کا منکشف ہونا:

آپ ﷺ کے پاس فرشتہ آیا اور کہا: پڑھئے۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں: میں نے کہا: میں پڑھنا نہیں جانتا ہوں....... یہاں تک کہ اس نے مجھے پکڑ کر تیسری مرتبہ بھینچا اور چھوڑ دیا اور کہا: ﴿ٱقْرَأْ بِٱسْمِ رَبِّكَ ٱلَّذِى خَلَقَ ۝١ خَلَقَ ٱلْإِنسَٰنَ مِنْ عَلَقٍ ۝٢ ٱقْرَأْ وَرَبُّكَ ٱلْأَكْرَمُ ۝٣ ٱلَّذِى عَلَّمَ بِٱلْقَلَمِ ۝٤ عَلَّمَ ٱلْإِنسَٰنَ مَا لَمْ يَعْلَمْ﴾ ترجمہ: ”اپنے رب کے نام سے پڑھیے جس نے

سب کو پیدا کیا۔ انسان کو خون کے جمے ہوئے لوتھڑے سے پیدا کیا۔ پڑھیے اور آپ کا رب سب سے بڑھ کر کرم والا ہے۔ جس نے قلم سے سکھایا۔ انسان کو سکھایا جو وہ نہ جانتا تھا"۔(سورہ العلق 5-1)

سورۃ العلق کی یہ آیاتِ مبارکہ قرآن کریم کی ابتدائی اور اولین آیات تھیں، ان میں اس بات کی تنبیہ اور وضاحت ہے کہ انسان کی تخلیق کی ابتدا ایک لوتھڑے سے ہوئی ہے اور یہ اللہ کا فضل واحسان ہے کہ اس نے انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا، اس کو علم کے ذریعہ شرف وعزت عطا کی، اور یہی وہ چیز تھی جو آدم علیہ السلام کو فرشتوں کے مقابلہ میں ممتاز کرتی تھی، اور علم کبھی تو ذہن ودماغ میں ہوتا ہے اور کبھی اس کا اظہار زبان سے ہوتا ہے اور کبھی قلم وقرطاس کے ذریعہ ہوتا ہے۔(دیکھیں: تفسیر ابن کثیر 4/528)

اور یہی وہ آیات ہیں جن کے ذریعہ حضرت محمد ﷺ کی نبوت کا آغاز ہوا، یقیناً یہ ایک عظیم واقعہ اور تاریخی گھڑی تھی، سید قطبؒ نے اپنی تفسیر "فی ظلال القرآن" میں اس کی منظر کشی کی ہے، وہ فرماتے ہیں: "بلاشبہ یہ واقعہ بہت عظیم ہے، اس کی عظمت لامحدود ہے، آج ہم اس کی عظمت کو جاننے کی کتنی ہی کوشش کریں تو اس کے بہت سے پہلو ہمارے تصور سے خارج رہ جائیں گے! یہ واقعہ اپنی حقیقت کی وجہ سے عظیم ہے، اپنے معنی ومفاہیم کی وجہ سے عظیم ہے اور پوری انسانی زندگی میں اپنے اثرات کی وجہ سے عظیم ہے، جس گھڑی میں یہ واقعہ وقوع پذیر ہوا اس گھڑی کو بلا مبالغہ اس روئے زمین کی طویل تاریخ کی عظیم ترین گھڑی شمار کیا جاتا ہے۔

اس واقعہ کی حقیقت کیا ہے جو اس گھڑی میں ظہور پذیر ہوا؟ اس کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ جل جلالہ کی عظیم، جبار، قہار، متکبر اور تمام کائنات کی مالک ذات نے کرم فرمائی کی، اور انسان کے نام سے موسوم اس مخلوق پر نظرِ رحمت فرمائی، اس انسان پر جو اس کائنات کے ایک کونے میں بستا ہے جو اس پوری کائنات میں ایک ذرے کی حیثیت رکھتا ہے اور دور سے دکھائی بھی نہیں دے پاتا ہے، کائنات کے اس حصے کو کرۂ ارضی کہا جاتا ہے، پوری کائنات میں سے اس مخلوق کا انتخاب کرکے اس کو نورِ الٰہی کا مستحق، اپنی حکمت کا امین، اپنے کلمات کو لینے کا اہل اور اپنے اس پروگرام کا نمائندہ بنایا جس پروگرام کا نفاذ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس مخلوق سے چاہتا ہے"۔(فی ظلال القرآن 6/3936)

علم اور قلم کے ذکر کے ساتھ وحی الٰہی کے آغاز کے ذریعہ قلم کی اہمیت ونزاکت کو اجاگر کرنا اور اقوام وامم کی تعمیر میں علم اور اس کے مقام کو بیان کرنا مقصود تھا، اور اس میں اس بات کا واضح اشارہ موجود ہے کہ انسان کی اہم ترین خصوصیت اور امتیاز علم ومعرفت ہے۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویۃ، ابوشہبہ 1/260)

اس عظیم واقعہ کے ذریعہ اسلام میں علم کا مقام ومرتبہ ظاہر ہوتا ہے، نبوت ورسالت کا اولین کلمہ جو رسول اللہ ﷺ تک پہنچتا ہے وہ پڑھنے کے حکم پر مشتمل ہے: [اقرأ باسم ربك الذي خلق] (العلق: 1)

اسلام ہمیشہ علم پر ابھارتا رہا ہے، اس کو حاصل کرنے کا حکم دیتا ہے، اہل علم کو بلند مقام عطا کرتا ہے اور دوسروں کے مقابلہ میں ان کو نمایاں مقام عطا کرتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِذَا قِيلَ لَكُمۡ تَفَسَّحُواْ فِي ٱلۡمَجَٰلِسِ فَٱفۡسَحُواْ يَفۡسَحِ ٱللَّهُ لَكُمۡۖ وَإِذَا قِيلَ ٱنشُزُواْ فَٱنشُزُواْ يَرۡفَعِ ٱللَّهُ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ مِنكُمۡ وَٱلَّذِينَ أُوتُواْ ٱلۡعِلۡمَ دَرَجَٰتٖۚ وَٱللَّهُ بِمَا تَعۡمَلُونَ خَبِيرٞ﴾ ترجمہ: "اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم سے کہا جائے کہ اپنی مجلسوں میں کشادگی پیدا کرو تو جگہ کشادہ کردیا

کرو، اللہ تمھیں کشادگی بخشے گا اور جب تم سے کہا جائے کہ اٹھ جاؤ تو اٹھ جایا کرو، تم میں سے جو لوگ ایمان رکھنے والے ہیں اور جن کو علم بخشا گیا ہے، اللہ ان کو بلند درجے عطا فرمائے گا، اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے"۔(سورۃ المجادلہ:11)۔

مزید دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿أَمَّنْ هُوَ قَٰنِتٌ ءَانَآءَ ٱلَّيْلِ سَاجِدًا وَقَآئِمًا يَحْذَرُ ٱلْءَاخِرَةَ وَيَرْجُواْ رَحْمَةَ رَبِّهِۦ ۗ قُلْ هَلْ يَسْتَوِى ٱلَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَٱلَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۗ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُوْلُواْ ٱلْأَلْبَٰبِ﴾ ترجمہ:"(کیا اس شخص کی روش بہتر ہے یا اس شخص کی) جو مطیع فرمان ہے، رات کی گھڑیوں میں کھڑا رہتا اور سجدے کرتا ہے، آخرت سے ڈرتا اور اپنے رب کی رحمت سے امید لگاتا ہے؟ ان سے پوچھو، کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے دونوں کبھی یکساں ہو سکتے ہیں؟ نصیحت تو عقل رکھنے والے ہی قبول کرتے ہیں"۔(سورۃ الزمر:9)

بے شک علمِ نافع کا مصدر اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، وہی ہے جس نے قلم کے ذریعہ تعلیم دی اور انسان کو ان چیزوں کا علم عطا کیا جن کو وہ نہیں جانتا تھا، اور جب انسانیت اس منہج الٰہی سے ہٹ گئی اور اس کا علم منہج ربانی کا پابند نہیں رہا تو اس کا علم اس کے لئے وبالِ جان اور اس کی ہلاکت کا سبب بن گیا۔(دیکھیں: الوحی و تبلیغ الرسالہ، د۔یحییٰ الیحییٰ، ص:34)

4) نزولِ وحی کے وقت مشقت اور وحی کی حقیقت:

حضرت جبرئیل علیہ السلام نے نبی کریم ﷺ کو آغوش میں لے کر اس قدر بھینچا کہ آپ کی طاقت جواب دے گئی اور آپؐ تھک گئے اور بعد میں بھی اللہ کے رسول ﷺ وحی کے ذریعہ تھکن اور بوجھل پن محسوس کرتے رہے، جیسے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: [إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا] ترجمہ:"ہم تم پر ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں"۔(سورۂ مزمل:5) اس میں عظیم حکمت مضمر تھی، ان میں سے ایک حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس دین کی اہمیت و عظمت اور اس کے بارے میں انتہائی اہتمام کو بیان کرنا مقصود ہو، اور امت کو یہ پیغام دینا مقصود ہو کہ جس دین سے وہ فیضیاب ہو رہے ہیں وہ تکلیف و مشقت کے بعد ہی ان کے پاس آیا ہے۔(دیکھیں: الوحی و تبلیغ الرسالہ، یحییٰ الیحییٰ، ص30-31)

بے شک وحی ایک معجزۂ الٰہی اور عام فطری ضوابط و قوانین سے بالاتر عمل ہے، جس میں نبی کریم ﷺ کلام الٰہی یعنی قرآن کو ایک فرشتہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے واسطہ سے اخذ کرتے ہیں، لہٰذا وحی کا الہام، باطنی تفکر و تأمل یا اندرونی احساس و شعور کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ وحی نبی کریم ﷺ کی ذات اور شخصیت کے باہر سے حاصل ہونے والی ایک چیز ہے اور آپ ﷺ کی ذمہ داری صرف یہ تھی کہ آپ نازل شدہ وحی کو محفوظ کریں اور اس کو دوسروں تک پہنچائیں، جہاں تک اس کو بیان کرنے اور اس کی تفسیر وضاحت کا تعلق ہے تو وہ نبی کریم ﷺ اپنے اسلوب میں کرتے تھے، جیسے کی آپ ﷺ کے اقوال واحادیث سے ظاہر ہوتا ہے۔(دیکھیں: السیرۃ النبویہ الصحیحۃ، العمری 1/129)

بے شک وحی ہی وہ اُساس وبنیاد ہے جس پر دین کے تمام حقائق، عقائد، قوانین واحکام اور اخلاق کی عمارت قائم ہے، یہی وجہ ہے کہ مستشرقین اوران سے پہلے ملحدوں نے وحی کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنے اوراس پر طعن و تشنیع کرنے پر پوری طاقت صرف کی ہے،اورانہوں نے وحی کی من مانی تشریحات کرنے اوراس کی حقیقت کے بارے میں تحریف وتبدیلی کرنے کی کوشش کی ہے، جیسے کہ بہت سے سیرت کے واقعات اس طرح کے ملتے ہیں اور قابل اعتماد مؤرخین نے ان کو بیان کیا ہے، کسی نے اس طرح کااعتراض پیش کیاہے کہ محمد ﷺ نے قرآن اوراسلام کے بنیادی احکام بحیرہ راہب سے سیکھے، بعض نے اپنے ہذیان کواس طرح بیان کیاکہ محمد ﷺ عصبی المزاج اور تناؤ کا شکار تھے، یامرگی جیسے مرض میں مبتلا تھے۔(نعوذ باللہ من ذلک)۔(فقہ السیرۃ النبویہ،البوطی، ص64)

حالانکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ جب غار حرا میں تشریف فرما تھے توآپ ﷺ نے اچانک حضرت جبرئیل علیہ السلام کواپنی حقیقی آنکھوں سے اپنے ساتھ دیکھااوروہ آپ ﷺ سے کہہ رہے تھے:اقرأ(پڑھو)۔اس سے صاف ظاہر ہوتاہے کہ وحی کوئی ایسی ذاتی یاداخلی چیزنہیں ہے جس کاسبب نفس کے اندرونی خیالات ہوں، بلکہ وحی ایک خارجی حقیقت کااستقبال وحصول ہے جس کانفس اور اندرونی خیالات سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں ہے۔فرشتے کا تین مرتبہ آپ ﷺ بھینچنااور تین مرتبہ آپ کو "اقرأ" کہتے ہوئے چھوڑنا۔اس کے ذریعہ مزید تاکیداور وضاحت ہوتی ہے کہ یہ ایک خارجی حقیقت کااستقبال اور حصول تھا،اوراسی کے ذریعہ اس تصور کی بھی سختی کے ساتھ نفی ہوتی ہے کویہ صرف ایک داخلی اور خیالی چیزہے۔

نبی کریم ﷺ نے نزول وحی کے موقع پر جوکچھ دیکھااور سنااس کے نتیجہ میں آپ ﷺ پر رعب اور خوف کی کیفیت طاری ہوگئی ،یہاں تک کہ آپ ﷺ فوراً گھر تشریف لے گئے اور آپ کے اعضائے جسم کانپ رہے تھے،اس سے یہ معلوم ہوتاہے کہ نبی کریم ﷺ اس رسالت کے خود شوقین اور طلبگار نہیں تھے جس کواٹھانے اور لوگوں تک پہنچانے کاآپ ؐکومکلف بنایاجارہاتھا۔ (دیکھیں: فقہ السیرۃالنبویۃ،البوطی، ص64)

اللہ تعالیٰ نے اس پہلو کواجاگر کرتے ہوئے تاکید کے ساتھ ارشادفرمایاہے:﴿وَكَذَٰلِكَ أَوۡحَيۡنَآ إِلَيۡكَ رُوحٗا مِّنۡ أَمۡرِنَاۚ مَا كُنتَ تَدۡرِي مَا ٱلۡكِتَٰبُ وَلَا ٱلۡإِيمَٰنُ وَلَٰكِن جَعَلۡنَٰهُ نُورٗا نَّهۡدِي بِهِۦ مَن نَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِنَاۚ وَإِنَّكَ لَتَهۡدِيٓ إِلَىٰ صِرَٰطٖ مُّسۡتَقِيمٖ﴾ ترجمہ:"اوراسی طرح ہم نے آپ کی طرف اپنے حکم سے قرآن نازل کیا،آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیاہے اور ایمان کیاہے اور لیکن ہم نے قرآن کوایسانور بنایاہے کہ ہم اس کے ذریعہ سے اپنے بندوں سے جسے چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں،اور بے شک آپ سیدھاراستہ بتاتے ہیں۔اس اللہ کاراستہ جس کے قبضہ میں آسمانوں اور زمین کی سب چیزیں ہیں،خبردار! اللہ ہی کی طرف سب کام رجوع کرتے ہیں"۔(سورۃالشوری:52-53)

ایک اور جگہ ارشادفرمایاہے: ﴿وَإِذَا تُتۡلَىٰ عَلَيۡهِمۡ ءَايَاتُنَا بَيِّنَٰتٖ قَالَ ٱلَّذِينَ لَا يَرۡجُونَ لِقَآءَنَا ٱئۡتِ بِقُرۡءَانٍ غَيۡرِ هَٰذَآ أَوۡ بَدِّلۡهُۚ قُلۡ مَا يَكُونُ لِيٓ أَنۡ أُبَدِّلَهُۥ مِن تِلۡقَآيِٕ نَفۡسِيٓۖ إِنۡ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰٓ إِلَيَّۖ إِنِّيٓ أَخَافُ إِنۡ عَصَيۡتُ رَبِّي

عَذَابَ يَوۡمٍ عَظِيمٍ ۝١٥ قُل لَّوۡ شَآءَ ٱللَّهُ مَا تَلَوۡتُهُۥ عَلَيۡكُمۡ وَلَآ أَدۡرَىٰكُم بِهِۦۖ فَقَدۡ لَبِثۡتُ فِيكُمۡ عُمُرًا مِّن قَبۡلِهِۦٓۚ أَفَلَا تَعۡقِلُونَ ۝١٦﴾ ترجمہ: ’’اور جب ان کے سامنے ہماری واضح آیتیں پڑھی جاتی ہیں وہ لوگ کہتے ہیں جنہیں ہم سے ملاقات کی امید نہیں کہ اس کے سوا کوئی قرآن لے کر آؤ یا اسے بدل دو، تو کہہ دے میرا کام نہیں کہ اپنی طرف سے اسے بدل دوں، میں اسی کی تابعداری کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جائے، اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ کہہ دو اگر اللہ چاہتا تو میں اسے تمہارے سامنے نہ پڑھتا اور نہ ہی تمہیں اس سے خبردار کرتا، کیونکہ اس سے پہلے تم میں ایک عمر گزار چکا ہوں، کیا پھر تم نہیں سمجھتے‘‘۔(سورۂ یونس:15-16)

وحی کی حقیقت کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنے والوں کے تمام شکوک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بیان کردہ صحیح حدیث کے سامنے زمین بوس ہو جاتے ہیں، اس کے بعد بھی وحی کے مستقل نزول میں یہی طرز عمل برقرار رہا اور یہ ثابت ہوتا رہا کہ وحی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جیسے کہ شکوک وشبہات پھیلانے والوں نے عام کیا ہے۔ ڈاکٹر البوطی نے اس حقیقت کو اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے جس کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے:

1) قرآن اور حدیث دونوں کے درمیان نمایاں فرق اور حد فاصل قائم کر دی گئی ہے، اس لئے کہ اللہ کے رسول ﷺ قرآن کو لکھنے اور نوٹ کرنے کا فوری طور پر حکم فرماتے تھے، جبکہ (ابتدا میں) حدیث کے بارے میں اسی پر اکتفا فرماتے تھے کہ صحابہ کرام کے حافظے ان کو محفوظ کر لیں، ایسا اس لئے نہیں ہوتا تھا کہ حدیث آپ ﷺ کا اپنا کلام ہے جس کا نبوت سے کوئی تعلق نہ ہو، بلکہ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کیونکہ قرآن اپنے الفاظ اور حروف کے ساتھ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے واسطے سے آپ پر بذریعہ وحی نازل ہوا، اور جہاں تک حدیث کا تعلق ہے تو اس کے معنی ومفاہیم اللہ کی طرف سے وحی کئے جاتے ہیں جبکہ اس کے الفاظ اور جملے کی ترکیب وساخت رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ہوتی ہے، اس لئے آپ ﷺ اس بات سے خائف رہتے تھے کہیں جبریل امین کی وساطت سے ملنے والا کلامِ الٰہی آپ ﷺ کے کلام کے ساتھ خلط ملط نہ ہو جائے۔

2) نبی کریم ﷺ سے بعض معاملات کے بارے میں سوالات کئے جاتے تھے تو آپ ﷺ ان کے بارے میں از خود جواب نہیں دیتے تھے، بسا اوقات طویل وقت بھی گزر جاتا تھا یہاں تک کہ اس سوال کے جواب کے بارے میں قرآن کی کوئی آیت نازل ہوتی، اور کبھی کبھی بعض معاملات کے بارے میں اللہ کے رسول ﷺ کوئی فیصلہ یا عمل کر لیتے تھے اور اس کے بارے میں بھی قرآنی آیات نازل ہوتی تھیں، اور آپ ﷺ کی صحیح رہنمائی کی جاتی تھی، بسا اوقات وہ آیات سرزنش اور سخت تنبیہ پر بھی مشتمل ہوتی تھیں۔

3) اللہ کے رسول ﷺ اُمی تھے، یہ بات امکان سے باہر ہے کہ ایک انسان مکاشفہ نفسیہ سے تاریخی حقائق کا علم حاصل کر سکے، جیسے کہ یوسف علیہ السلام کا واقعہ، موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا اپنے بچے کو سمندر میں ڈالنے کا واقعہ، اسی طرح فرعون کا واقعہ، آپ ﷺ کا اُمی ہونا بھی اللہ تعالیٰ کی حکمتوں میں سے ایک اہم حکمت تھی، تاکہ لوگ آپ کے بارے میں شک نہ کر سکیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَا كُنتَ

تَتْلُواْ مِن قَبْلِهِۦ مِن كِتَٰبٖ وَلَا تَخُطُّهُۥ بِيَمِينِكَۖ إِذٗا لَّٱرْتَابَ ٱلْمُبْطِلُونَ﴾ ترجمہ: "(اے نبیؐ) تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے، اگر ایسا ہوتا تو باطل پرست لوگ شک میں پڑ سکتے تھے"۔(سورۃ العنکبوت:48)

4) نبی کریم ﷺ کا چالیس سال تک اپنی قوم میں سچ بولتے رہنا اور اس صفت کے ساتھ آپ کا مشہور ہونا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ آپ سب سے پہلے اپنی ذات کے ساتھ سچائی کا معاملہ کرنے والے ہوں، اس لئے ضروری ہے کہ وحی کے بارے میں غور وفکر کرنے کے دوران آپ نے ہر قسم کے شکوک وشبہات کا ازالہ کر دیا ہو جو آپ کی آنکھوں یا فکر وسوچ کو لاحق ہوئے ہوں۔ ایسا لگتا ہے کہ گویا کہ یہ آیت کریمہ نبی کریم ﷺ کے وحی پر ابتدائی غور وفکر کرنے کے لئے نازل کی گئی ہے: ﴿فَإِن كُنتَ فِي شَكّٖ مِّمَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ فَسْـَٔلِ ٱلَّذِينَ يَقْرَءُونَ ٱلْكِتَٰبَ مِن قَبْلِكَۚ لَقَدْ جَآءَكَ ٱلْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ ٱلْمُمْتَرِينَ﴾ ترجمہ:"اب اگر تجھے اُس ہدایت کی طرف سے کچھ بھی شک ہو جو ہم نے تجھ پر نازل کی ہے تو اُن لوگوں سے پوچھ لے جو پہلے سے کتاب پڑھ رہے ہیں فی الواقع یہ تیرے پاس حق ہی آیا ہے تیرے رب کی طرف سے، لہٰذا تو شک کرنے والوں میں سے نہ ہو۔(سورۃ یونس:94)

اسی لئے مروی ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "نہ میں شک کرتا ہوں اور نہ ہی میں پوچھوں گا"۔ (مصنف عبدالرزاق:10211، الدرالمنثور للسیوطی 4/389)

5) وحی کی اقسام:

علمائے کرام نے وحی کی اقسام کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کی ہے، اُنہوں نے مندرجہ ذیل اقسام کا ذکر کیا ہے:

1) سچے خواب: سچے اور پاکیزہ خواب آنا آپ ﷺ پر وحی کے نزول کا ابتدائی مرحلہ تھا، آپ ﷺ جو بھی خواب دیکھا کرتے تھے تو وہ صبح کی روشنی کی طرح سچا واقعہ ہوتا تھا، حدیث میں آیا ہے: "انبیاء کے خواب وحی کے درجہ میں ہیں"۔ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا ہے: ﴿فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ ٱلسَّعْيَ قَالَ يَٰبُنَيَّ إِنِّيٓ أَرَىٰ فِي ٱلْمَنَامِ أَنِّيٓ أَذْبَحُكَ فَٱنظُرْ مَاذَا تَرَىٰۚ قَالَ يَٰٓأَبَتِ ٱفْعَلْ مَا تُؤْمَرُۖ سَتَجِدُنِيٓ إِن شَآءَ ٱللَّهُ مِنَ ٱلصَّٰبِرِينَ﴾ ترجمہ:" وہ لڑکا جب اس کے ساتھ دوڑ دھوپ کرنے کی عمر کو پہنچ گیا تو (ایک روز) ابراہیمؑ نے اس سے کہا، "بیٹا، میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں، اب تو بتا، تیرا کیا خیال ہے؟ اُس نے کہا، "ابا جان! جو کچھ آپ کو حکم دیا جا رہا ہے اسے کر ڈالئے، آپ ان شاءاللہ مجھے صابروں میں سے پائیں گے"۔ (سورۃ الصافات:102)

2) الہام: الہام کی صورت یہ ہے کہ فرشتہ آپ ﷺ کے قلب مبارک میں کوئی بات القا کرے بغیر اس کے کہ فرشتہ نظر آئے، جیسے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: "بے شک روح القدس (حضرت جبرئیلؑ) نے میرے دل میں یہ بات ڈالی کہ کوئی انسان اس وقت تک اس دنیا سے جا نہیں سکتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنا رزق اور عمر مکمل نہ کرے، لہذا تقویٰ اختیار کرو اور مانگنے میں حسنِ طلب پیدا کرو"۔ (شرح السنۃ للبغوی 13/304)

3) گھنٹیوں جیسی آواز: کبھی کبھی وحی کے آنے کی کیفیت گھنٹیوں جیسی آواز کی سی ہوتی تھی، اور یہ وحی کی قوی ترین کیفیت ہوتی تھی، جیسے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ حضرت حارث ؓ نے اللہ کے رسول ﷺ سے دریافت کیا: آپ پر وحی کیسے نازل ہوتی ہے؟ آپ ؐ نے جواب دیا: کبھی کبھی مجھ پر وحی گھنٹی کی آواز کی شکل میں نازل ہوتی ہے اور یہ کیفیت مجھ پر سب سے زیادہ شاق ہوتی ہے، اور جب یہ کیفیت ختم ہو جاتی ہے تو میرے دل و دماغ پر اس (فرشتے) کے ذریعہ نازل شدہ وحی محفوظ ہو جاتی ہے، اور کسی وقت فرشتہ انسان کی شکل میں میرے سامنے آتا ہے اور مجھ سے ہم کلام ہوتا ہے اور جو کچھ وہ کہتا ہے میں اسے محفوظ کر لیتا ہوں"۔ (صحیح بخاری: 2، صحیح مسلم: 87/2333)

4) فرشتے کے واسطے کے بغیر اللہ تعالیٰ کا اپنے نبی کی جانب وحی کرنا: کبھی اللہ تعالیٰ براہِ راست فرشتے کے واسطے کے بغیر نبی کی جانب وحی کرتا ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام کو ہمکلامی کا شرف بخشا اور یہ والی شکل موسیٰ علیہ السلام کے لئے نصِ قرآنی سے ثابت ہوتی ہے اور نبی کریم ﷺ کے لئے اسراء و معراج کی حدیث میں اس کا ثبوت ملتا ہے۔ (دیکھیں: الرؤی والأحلام فی النصوص الشرعیہ، اُسامہ عبدالقادر، ص: 108)

5) فرشتہ کا اصل شکل میں نظر آنا: کبھی کبھی فرشتہ اپنی اصل شکل میں ظاہر ہوتا تھا اور پھر اللہ کی جانب سے جو وحی پہنچانی ہوتی اس کا نزول کیا جاتا۔

6) نبی ﷺ کے سامنے فرشتہ انسانی شکل میں ظاہر ہونا: بسااوقات نبی کریم ﷺ کے سامنے فرشتہ انسانی شکل میں ظاہر ہوتا تھا اور آپ ﷺ سے ہم کلام ہوتا اور آپ ﷺ اس کا بیان کیا ہوا سب یاد اور محفوظ کر لیتے، اس میں بسااوقات صحابہ کرام بھی اس فرشتہ کا مشاہدہ کرتے تھے۔ (دیکھیں: زاد المعاد فی ہدی خیر العباد 33-1/34)

علامہ ابن قیم ؒ نے مراتبِ وحی کے سلسلہ میں جو کچھ بیان فرمایا ہے، یہ اس کا خلاصہ تھا۔

اللہ کے رسول ﷺ پر وحی کا نزول یقیناً تاریخ انسانی میں ایک نئے عہد کا آغاز تھا، جبکہ وحی کا یہ سلسلہ منقطع ہو گیا تھا اور انسانیت گھٹا ٹوپ تاریکی میں سرگرداں اور پریشان تھی، اللہ کے رسول ﷺ پر نزول وحی کے وقت جو کیفیات طاری ہوتی تھیں وہ آپ پر انتہائی گراں اور شاق ہوتی تھیں جیسے کہ نصوصِ احادیث سے واضح ہوتا ہے، اگرچہ اللہ کے رسول ﷺ لوگوں میں سب سے زیادہ دلیر اور بہادر تھے اور دل کے اعتبار سے سب سے زیادہ قوی تھے، جیسے کی تئیس (۲۳) سال کے دوران کے واقعات سے واضح ہوتا ہے، ایسا اس لئے ہوتا تھا کیونکہ معاملہ ایک انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ مخاطب ہونے کا نہیں تھا بلکہ معاملہ فرشتوں میں عظیم ترین فرشتے سے مخاطب ہونے کا تھا جو اللہ کے کلام کا حامل ہوتا تھا، اور اس کا استقبال اس ذات کو کرنا ہوتا تھا جس کا انتخاب اللہ تعالیٰ نے اس کلام کے بارِ گراں کو اٹھانے اور تمام انسانوں تک اس کو پہنچانے کے لئے کیا تھا۔

یقیناً یہ خوف سے لبریز منظر اور عظیم ذمہ داری تھی جس کا سامنا صرف وہی شخص کر سکتا تھا جس کا انتخاب اللہ تعالیٰ نے اس پیغام کو اٹھانے اور دوسروں تک پہنچانے کے لئے کیا ہو۔(دیکھیں التاریخ الاسلامی، مواقف وعبر، الحمیدی 1/60)

اس منظر کے خوفناک ہونے کی اصل تصویر روایات میں موجود اللہ کے رسول ﷺ کے اس قول سے سامنے آتی ہے جب کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "مجھے اپنے بارے میں ڈر لگ رہا ہے"۔اسی طرح مذکورہ حدیث میں حضرت عائشہؓ کے قول سے بھی اس کی منظر کشی ہوتی ہے، وہ فرماتی ہیں: "آپ ﷺ یہ آیات لے کر حرا سے اس حال میں واپس آئے کہ آپ کا دل کانپ رہا تھا۔ آپ ﷺ حضرت خدیجہؓ کے پاس تشریف لے گئے اور کہا: مجھے کمبل اوڑھا دو، مجھے کمبل اوڑھا دو، چنانچہ آپ کو چادر اڑھا دی گئی یہاں تک کہ خوف کی کیفیت دور ہو گئی"۔

نزولِ وحی کے موقع پر وحی کی شدت و گرانی کی وضاحت اس روایت سے ہوتی ہے جس کو امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کی سند سے نقل کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: "میں نے آپ ﷺ پر سخت ترین سردی والے دین میں وحی نازل ہوتے ہوئے دیکھا ہے، اور جب وحی کی کیفیات ختم ہو جاتی تھیں تو آپ کی پیشانی سے پسینہ بہہ رہا ہوتا تھا"۔(صحیح بخاری:2، صحیح مسلم 86/2333)

اسی طرح حضرت عبادہ بن صامتؓ کی حدیث میں مذکور ہے، وہ فرماتے ہیں: "اللہ کے نبی ﷺ پر جب وحی نازل ہوتی تھی تو یہ آپ پر شاق گزرتا تھا اور آپ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا"۔(صحیح مسلم:2334، مسند احمد:5/317)

6) دعوتی میدان میں نیک عورت کا کردار:

اللہ کے رسول ﷺ یہ آیات لے کر غار حرا سے اس حال میں واپس آئے کہ آپ ﷺ کا دل کانپ رہا تھا، آپ ﷺ حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے اور کہا: مجھے کمبل اوڑھا دو، مجھے کمبل اوڑھا دو، چنانچہ آپ ﷺ کو چادر اوڑھا دی گئی یہاں تک کہ خوف کی کیفیت دور ہو گئی۔اس کے بعد حضرت خدیجہؓ کو تفصیل کے ساتھ یہ واقعہ سنایا اور فرمایا کہ مجھ پر ایک ایسی کیفیت طاری ہوئی ہے کہ مجھے اپنی جان کا خوف ہو گیا ہے۔یہ سن کر حضرت خدیجہؓ نے آپ کی ڈھارس بندھائی اور کہا: "ہرگز نہیں! اللہ کی قسم! اللہ آپ کو ہرگز ضائع نہیں کرے گا۔ آپ تو صلہ رحمی کرنے والے ہیں، بوجھ میں ڈوبے ہوئے لوگوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، مفلسوں کے لئے کماتے ہیں، مہمان نوازی میں آپ قابل مثال ہیں اور مشکل وقت میں امر حق کا ساتھ دیتے ہیں"۔(صحیح بُخاری:3، صحیح مسلم:160)

حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے موقف کے ذریعہ پتہ چلتا ہے کہ وہ مضبوط دل کی حامل اور بہادر تھیں، اس لئے کہ وہ یہ پورا واقعہ سن کر گھبرا ہٹ اور خوف کا شکار نہیں ہوئیں، بلکہ پورے اطمئنان اور سکون کے ساتھ اس کو سنا، اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ یہ واقعہ سن کر فوراً ورقہ بن نوفل کے پاس چلی گئیں اور ان کے ساتھ پوری صورتحال کو بیان کیا۔(دیکھیں:التاریخ الاسلامی، الحمیدی 1/61)

وحی کے ابتدائی واقعہ کے بارے میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا موقف ان کی وسعتِ ادراک کا غماز ہے، کیونکہ انہوں نے پیش آمدہ صورتحال کا نبی کریم ﷺ کی عملی زندگی کے ساتھ موازنہ کیا تو انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جس کی زندگی مکارم اخلاق کی آئینہ دار ہو گی،

اللہ تعالیٰ ہر گزاس کو ضائع نہیں کرے گا،اس موقع پر انہوں نے آپ ﷺ کے جو اوصاف بیان کیے ان میں ایک صفت یہ تھی کہ آپ ﷺ صلہ رحمی کرتے ہیں،اور انسان کا صلہ رحمی کرنا اور قرابت داری کا خیال رکھنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس شخص کے اندر دوسروں تک خیر پہنچانے اور دوسروں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے۔اس لئے کہ انسان کے قرابت دار ہی اس کے اخلاق کا عکس دیکھنے کا آئینہ ہوتے ہیں،اگر وہ اپنے اقارب اور رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے میں کامیاب ہوا اور ان کے حقوق ادا کر کے ان کو اپنا بنا لینے میں کامیابی حاصل کر لی تو پھر یہ ایک فطری بات ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کو بھی اپنا بنا لینے میں کامیاب ہو جائے گا۔(ایضاً 1/64)

حضرت ام المومنین سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا فطری طور پر ایمان ویقین کی دولت سے سرشار تھیں اور اللہ تعالیٰ کے اپنی مخلوقات کے تئیں ضوابط وقوانین سے بھی وہ واقف تھیں،اور حضرت محمد ﷺ جن اخلاق وشمائل سے آراستہ تھے اس پر بھی ان کو عین الیقین کی حد اعتماد تھا،وہ یہ یقین رکھتی تھیں کہ آپ ﷺ کی طرح اور کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو لوگوں کے ساتھ فطری زندگی گزارنے میں اس طرح کے اخلاق وشمائل سے آراستہ ہو،وہ اس کا بھی اچھی طرح مشاہدہ کر چکی تھیں اور اس کے واضح دلائل بھی دیکھ چکی تھیں کہ آپ ﷺ کی عمومی زندگی میں عنایتِ ربانی اور تائید ونصرتِ الٰہی ہمرکاب اور شانہ بشانہ رہی ہے،اور ایسی صورتحال میں جبکہ آپ کو ابھی نبوت ورسالت سے سرفراز نہیں کیا گیا تھا اور نہ ہی اس کے معجزات اور خرق عادت امور کا ابھی ظہور ہوا تھا،اور آپ ﷺ کے اخلاق حمیدہ اور شمائل کا تعلق اہل فضل وکمال اور مکارم اخلاق سے آراستہ عام انسانی فضائل ہی سے تھا،ان تمام پہلوؤں کو مد نظر رکھتے ہوئے حضرت خدیجہؓ نے اس موقع پر اپنے ردعمل کا اظہار فرمایا۔(دیکھیں: محمد رسول اللہ ﷺ ، محمد الصادق عرجون 1/307)

حضرت خدیجہؓ کو اس بات کا پورا یقین تھا کہ ان کے شوہر نامدار باکمال فطری اوصاف،پائیدار اخلاقِ حسنہ،خوش کن عادات وفضائل،بلند واعلیٰ شمائل اور کامل انسانی طبیعت کے مالک ہیں جو آپؐ کے لئے فوز وفلاح کے ضامن بھی ہیں اور انہی کے نتیجے میں فلاح وکامیابی حاصل کی جاسکتی ہے،چنانچہ حضرت خدیجہؓ نے اپنے بلیغ الفاظ کے ذریعہ کمالِ محمدی پر استدلال کیا۔(دیکھیں: محمد رسول اللہ ﷺ محمد الصادق عرجون 308-1/307)

حضرت خدیجہؓ نے نبی کریم ﷺ کی ان صفات عالیہ سے آراستہ ہونے کے ذریعہ یہ نتیجہ اخذ کیا کہ آپ ﷺ اپنی زندگی میں ہرگز ذلت ورسوائی کا سامنا نہیں کریں گے،اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے مکارم اخلاق کو آپ کی فطرت میں ودیعت کیا ہے اور پھر انہوں نے جامع کمالات کو مثال اور دلیل کے طور پر بھی پیش کیا ہے۔

اس کائنات میں زندگی کے جو اجتماعی ومعاشرتی اصول وقوانین ہیں ان کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی بندے کو فطری طور پر اخلاقِ کریمانہ سے نوازا ہو اور پھر اس کو زندگی میں ذلت ورسوائی کا سامنا کرنا پڑا ہو،اور حضرت محمد ﷺ تو مکارمِ اخلاق کے اعلیٰ معیار پر فائز تھے،ایسی فطری شخصیت سے آپ کو سرفراز کیا گیا تھا جس کا نہ کوئی مقابلہ اور ہمسری کر سکتا ہے اور نہ ہی وہاں تک پہنچنا کسی کے بس کی بات ہے۔(دیکھیں: محمد رسول اللہ، محمد الصادق عرجون 1/232)

حضرت خدیجہؓ نے نبی کریم ﷺ کے مکارم اخلاق کے ذریعہ آپ کی نبوت پر استدلال کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ آپ ﷺ کو لے کر اپنے چچازاد بھائی، جلیل القدر عالم ورقہ بن نوفل کے پاس لے کر گئیں، جو نبی آخر الزماں کے ظہور کے انتظار میں تھے، کیونکہ علمائے اہل کتاب نے ان کو ایک نبی کی بعثت اور زمانہ کے قریب ہونے کے بارے میں بتادیا تھا، اور ورقہ کی آپ ﷺ کے ساتھ کی گئی گفتگو کا نبی کریم ﷺ کو اطمئنان اور حوصلہ دینے میں ایک نمایاں کردار رہا، اُنہوں نے آپ ﷺ کو آگاہ کردیا کہ آپ سے ہم کلام ہونے والے عظیم صاحبِ اسرار ہیں، جو اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیاء کے درمیان سفیر اور قاصد ہونے کا شرف رکھتے ہیں۔ حضرت ورقہ نے اس سلسلہ میں اشعار بھی کہے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں نبی پاک ﷺ کی بعثت اور ظہور کا انتظار تھا، ان کے اشعار یہ ہیں:

لَجَجْت وكُنْت في الذّكْرى لَجوجا ... لهمّ طَالَما بعثَ النّشيجا

ووَصف من خديجة بعد وصفٍ ... فقَدْ طَالَ انتظاري يا خديجا

ببطْنِ الْمكّتين على رجائي ... حديثك أَنْ أَرَى منه خُروجا

بما خبرتنا من قولِ قس ... من الرهبان أَكْره أَنْ يعوجا

بأَنّ محمدا سيسود فينا ... ويخصم من يكُون له حجيجا

ترجمہ: ایک فکر اور سوچ مجھے اتنی دامن گیر رہی یہاں تک کہ اس نے بسااوقات مجھے رونے پر مجبور کیا اور مجھے بار بار اس کی یاد دہانی ہوتی رہی۔ خدیجہؓ کی طرف سے بار بار اس کو بیان کیا جاتا رہا، اب تو اے خدیجہ! انتظار کی گھڑیاں بہت طویل ہوگئیں۔ آپ کی بیان کی ہوئی باتوں کے نتیجے میں مجھے امید ہے کہ مکہ کے اندر سے ان کا خروج ہوگا۔ کیونکہ آپ نے مجھے نیک اور صالح قس بن ساعدہ کے قول کے بارے میں بتایا کہ محمد ﷺ ہماری قیادت وسیادت کریں گے اور ان کی مخالفت کرنے والے پر وہ غالب آئیں گے۔ اس لئے مجھے یہ بات ناپسند ہے کہ اس پیشن گوئی کی تکمیل نہ ہو۔ (سیرت ابن ہشام 1/194)

نبی کریم ﷺ نے ورقہ بن نوفل کے بارے میں جنت کی خوشخبری دی ہے، چنانچہ امام حاکم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "ورقہ کو برا بھلا مت کہو، اس لئے کہ میں نے ان کے لئے متعین ایک جنت یا دو جنتوں کو دیکھا ہے"۔ (مستدرک حاکم 2/609 مسند البزار 2750، 276، مجمع الزوائد 9/416)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ حضرت خدیجہؓ نے اللہ کے رسول ﷺ سے حضرت ورقہ کے بارے میں دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: "میں نے ان کو خواب میں دیکھا تو میں نے ان کی جسم پر سفید کپڑے دیکھے، اس لئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر وہ اہل جہنم میں سے ہوتے تو ان کے جسم پر سفید کپڑے نہ ہوتے"۔ علامہ ہیثمی فرماتے ہیں کہ ابویعلی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ سے حضرت ورقہ بن نوفل کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: "میں نے ان کو جنت کے وسط میں دیکھا اور ان کے جسم پر سندس (باریک ریشم) کا لباس تھا"۔ (مسند ابویعلی: 2047، مجمع الزوائد 9/416)

حضرت خدیجہؓ نے نبی کریم ﷺ کی زندگی میں اہم اور نمایاں کردار ادا کیا ہے، اس لئے کہ ان کی شخصیت اپنی قوم اور سوسائٹی میں ایک نمایاں مقام رکھتی تھی، اسی طرح نفسیاتی پہلو کے اعتبار سے ان کی شخصیت رحم، بردباری، حکمت، دوراندیشی اور دیگر مکارمِ اخلاق کی آئینہ دار تھی، اور اللہ کے رسول ﷺ کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایسی مثالی زوجہ مطہرہ اس لئے مقدر کر رکھی تھی کیونکہ آپ ﷺ تمام انسانوں کے لئے اور بطور خاص داعیوں کے لئے قدوہ اور نمونہ ہیں۔

حضرت خدیجہؓ کے اس عظیم کردار کے ذریعہ اللہ تعالیٰ گویا کہ تمام حاملین دعوتِ اسلامیہ کو یہ پیغام دینا چاہتا ہے کہ وہ بھی رسول اللہ ﷺ کی اتباع کرتے ہوئے اسی طرح کی مثالی خاتون کا انتخاب کرکے یہی طریقہ اختیار کریں، تاکہ ان بلند مقاصد کا حصول ممکن ہو جن کے لئے وہ جدوجہد کرتے ہیں۔ (دیکھیں: التاریخ الاسلامی، الحمیدی 1/69)

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ سیدہ خدیجہؓ دعوتی میدان میں کام کرنے والوں کے لئے بہترین مثال اور اعلیٰ نمونہ ہیں، ایک داعی ان عام انسانوں کی طرح نہیں ہے جو دعوتی ذمہ داریوں سے دور رہتے ہیں، اور یہ ناممکن ہے کہ ایک داعی ہر چیز میں عام انسانوں کی طرح ہو، وہ تو ایک پیغام کا علمبردار اور صاحبِ فکر شخص ہوتا ہے، وہ امت کی تباہی، فساد و بگاڑ کے عام ہونے اور اہلِ باطل اور شر پسندوں کے غلبہ کی فکر اور غم میں گھٹتا رہتا ہے، وہ ہر وقت اس صورتحال سے پریشان اور مغموم رہتا ہے، جس کا سامنا مسلمانوں کو مشرق و مغرب میں کرنا پڑتا ہے، چاہے ان کے متعلق سازشیں ہوں، ظلم و زیادتی ہو، معاشی پابندیاں ہوں، تذلیل و تحقیر ہو، یا اہلِ حق اور داعیوں کے ساتھ ہونے والا ظلم و زیادتی، جلاوطنی اور تعذیب ہو، ان سب چیزوں کے ذریعہ اس کو پریشانی لاحق ہوتی ہے، اور ان تمام امور کے ساتھ ساتھ وہ ایک ایسے پیغام کا بھی حامل ہے جس کی دوسروں تک ادائیگی اور تبلیغ اس کے ذمہ واجب ہے، اور اس ذمہ داری کے نتیجہ میں اس کو اپنا کافی وقت دینا پڑتا ہے، اس کو اپنی راحت و آرام اور نیند کا وقت، اپنی شریکِ حیات اور اولاد کے حصہ کا وقت قربان کرنا پڑتا ہے، اسی طرح مال، وقت اور اس کو حاصل تمام نعمتوں کی قربانی دینی پڑتی ہے، بشرطیکہ یہ تمام چیزیں اللہ کے راستے میں اور اس کی رضا کے حصول کی نیت سے ہوں، اور اگر اس کی شریکِ حیات اخلاق، تقویٰ، حسن و جمال اور حسب و نسب جیسی صفات سے آراستہ ہو لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی شریکِ حیات اس صفت سے بھی متصف ہونی چاہیے کہ وہ دعوت کی ذمہ داری اور اس کی اہمیت و مقام کا بھی ادراک رکھتی ہو، اور اس سے بھی وہ اچھی طرح واقف ہو کہ اس کا شوہر کس مقام پر فائز ہے۔ اس پر کیا ذمہ داری عائد ہیں اور اس کو کن کن مشکلات اور پریشانیوں کا سامنا ہے؟ لہٰذا وہ اس کے شانہ بشانہ کھڑی رہے گی، اس کی ذمہ داری کی ادائیگی میں اس کے لئے آسانیاں فراہم کرے گی اور اس کی معاون و مددگار ہوگی، نہ کہ وہ اس کے لئے رکاوٹ اور راستے کا کانٹا ثابت ہو۔ (دیکھیں: وقفات تربویۃ من السیرۃ النبویۃ، البلالی، ص 40)

یقیناً ایک نیک اور صالح خاتون کا دعوت کو کامیاب بنانے میں انتہائی اہم رول ہے، اس کی واضح مثال حضرت خدیجہ رضا کا موقف اور کردار ہے کہ کس طرح وہ آپ ﷺ پر پہلی وحی کے نزول کے وقت آپ ﷺ کے ساتھ کھڑی رہتی ہے، بلاشبہ اس پیغامِ حق کو اٹھانے کی اہل نیک و صالح شریکِ حیات کا اپنے شوہر کو اپنے مقصد میں کامیاب کرانے میں اہم کردار ہوتا ہے، اور دعوت الٰہی وہ عظیم ذمہ

داری ہے جس کو ایک انسان اپنے سر لیتا ہے تو جب ایک داعی کو نیک اور باصلاحیت شریک حیات کا ساتھی مل جاتا ہے تو یہ اس کی کامیابی کا اہم سبب قرار پاتا ہے۔(دیکھیں: التاریخ الاسلامی، الحمیدی 1/68)

اللہ کے رسول ﷺ نے بجا فرمایا ہے کہ: "دنیا متاع (چند روزہ سامان) ہے اور دنیا کا بہترین متاع (فائدہ بخش سامان) نیک عورت ہے"۔ (مسند أحمد 2/168، صحیح مسلم: 1467 السنن الکبری للنسائی: 5325، سنن ابن ماجہ: 1855)

7) نبی کریم ﷺ کی حضرت خدیجہؓ کے ساتھ وفاداری:

اللہ کے رسول ﷺ وفاداری اور اہل و مستحق کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے میں اعلیٰ نمونے کے حامل تھے، چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ اپنی باصفا و مخلص شریکِ حیات حضرت خدیجہؓ کے تئیں ان کی زندگی میں بھی اور وفات کے بعد بھی انتہائی وفادار رہے، آپؐ نے ان کو ان کی حیات میں ہی ان کے لئے مخصوص جنت میں ایک گھر کی خوشخبری سنائی، اور ان کو اللہ تعالی کی طرف سے اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کی طرف سے سلام پہنچایا۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں: حضرت جبرئیلؑ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمایا: اے اللہ کے رسولؐ! یہ خدیجہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہی ہیں، ان کے پاس ایک برتن ہے جس میں سالن- یا کہا: کھانا- یا کہا: مشروب ہے۔ جب آپ کے پاس حاضر ہوں تو ان کو ان کے رب عز و جل کی طرف سے اور میری طرف سے سلام پہنچا دیجئے گا اور انہیں جنت میں موتیوں کے ایک محل کی بشارت دے دیجئے گا، جہاں نہ شور ہو گا اور نہ تکلیف و تھکن ہو گی۔ (صحیح بخاری: 3820 صحیح مسلم: 2432)

حضرت عائشہؓ بھی نبی کریم ﷺ کی حضرت خدیجہؓ کے ساتھ ان کی وفات کے بعد وفاداری کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتی ہیں، فرماتی ہیں: "مجھے نبی کریم ﷺ کی ازواج میں سے کسی پر اتنا رشک نہیں ہوا جتنا رشک میں نے سیدہ خدیجہؓ پر کیا، حالانکہ میں نے ان کو دیکھا نہیں ہے، لیکن اللہ کے رسول ﷺ ان کا بہت زیادہ تذکرہ فرماتے تھے اور کبھی ایسا ہوتا تھا کہ جب آپ بکری ذبح فرماتے اور تو اس کے حصے الگ الگ کرتے اور ان حصوں کو حضرت خدیجہؓ کی سہیلیوں کے ہاں بھیجتے، (فرماتی ہیں) کبھی کبھی میں آپ سے کہہ دیتی تھی کہ کیا اس دنیا میں صرف خدیجہ ہی ایک عورت ہے؟! آپ ﷺ فرماتے: وہ ایسی اور ایسی تھیں اور انہی سے میری اولاد بھی تھی۔ (صحیح بخاری: 3818، صحیح مسلم: 2435، الفاظ بخاری کے ہیں)

آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں جب حضرت خدیجہؓ کی بہن حاضر ہوئیں، آپ ﷺ نے ان کو دیکھ کر بشاشت اور خوشی کا اظہار فرمایا، اس لئے کہ ان کو دیکھ کر آپ ﷺ کو حضرت خدیجہؓ یاد آئیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، فرماتی ہیں: ایک مرتبہ حضرت خدیجہؓ کی بہن حضرت ہالہؓ بنت خویلد نے اللہ کے رسول ﷺ سے اندر آنے کی اجازت چاہی، تو آپ ﷺ کو خدیجہؓ کی اجازت لینے کی ادا یاد آ گئی اور آپ کو اس کی وجہ سے اطمئنان بھی ہوا اور تعجب بھی، آپؐ نے فرمایا: اللہ! یہ تو ہالہ بنت خویلد ہیں!۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: مجھے اس پر غیرت آئی اور میں نے کہا: آپ قریش کی کس عورت کا ذکر کرتے ہیں جس کے مسوڑوں پر دانتوں کے

ٹوٹ جانے کی وجہ سے صرف سرخی باقی رہ گئی تھی، اور جس کو دنیا سے گئے ہوئے بھی ایک زمانہ گزر چکا ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے بہتر بیوی عطا کی ہے۔(صحیح بُخاری: 3821، صحیح مسلم: 2437)

اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ نے ایک ایسی خاتون کے ساتھ انتہائی اہتمام اور توجہ کا معاملہ فرمایا جو ان کے پاس حضرت خدیجہؓ کے زمانہ میں آیا کرتی تھیں اور آپؐ نے فرمایا: "بے شک عہد کی پاسداری ایمان کا حصہ ہے"۔ (دیکھیں: التاریخ الاسلامی، الحمیدی 1/71)

8) رسولوں کی تکذیب کی سنت:

ورقہ بن نوفل نے کہا تھا: "کاش میں آپ کی نبوت کے زمانہ میں قوی ہوتا! اور کاش میں اس وقت زندہ ہوتا جبکہ آپ کی قوم آپ کو وطن سے نکالے گی! آپ ﷺ نے تعجب سے پوچھا: کیا میری قوم مجھے نکالے گی؟ ورقہ نے کہا: ہاں، کیونکہ جب بھی کوئی آدمی وہ پیغامِ حق لے کر آیا ہے جو آپ لائے ہیں تو اس کی قوم نے اس کو ضرور ستایا ہے، اور اگر میں نے وہ زمانہ پایا تو میں آپ کی بھرپور مدد کروں"۔(صحیح بخاری: 3، مسلم: 160)

اس حدیث کے ذریعہ قوم کے ایک ردعمل اور سنت کا ذکر کیا گیا ہے کہ قومیں اپنے انبیاء اور داعیوں کے ساتھ کیا ردعمل اختیار کرتی ہیں، وہ ردعمل ہے: تکذیب یعنی: جھٹلانا اور بے وطن کرنا۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے قومِ لوط کے متعلق فرمایا ہے: ﴿فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِۦٓ إِلَّآ أَن قَالُوٓاْ أَخْرِجُوٓاْ ءَالَ لُوطٍ مِّن قَرْيَتِكُمْۖ إِنَّهُمْ أُنَاسٌ يَتَطَهَّرُونَ﴾ ترجمہ: ”مگر اُس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انہوں نے کہا: "نکال دو لوطؑ کے گھر والوں کو اپنی بستی سے، یہ بڑے پاکباز بنتے ہیں"۔(سورۂ نمل: 56)

اسی طرح قومِ شعیبؑ کا ردّعمل یوں تھا: ﴿قَالَ ٱلْمَلَأُ ٱلَّذِينَ ٱسْتَكْبَرُواْ مِن قَوْمِهِۦ لَنُخْرِجَنَّكَ يَٰشُعَيْبُ وَٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ مَعَكَ مِن قَرْيَتِنَآ أَوْ لَتَعُودُنَّ فِى مِلَّتِنَاۚ قَالَ أَوَلَوْ كُنَّا كَٰرِهِينَ﴾ ترجمہ: ”اس کی قوم کے سرداروں نے، جو اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں مبتلا تھے، اس سے کہا کہ "اے شعیبؑ، ہم تجھے اور اُن لوگوں کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں اپنی بستی سے نکال دیں گے ورنہ تم لوگوں کو ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا" شعیبؑ نے جواب دیا "کیا زبردستی ہمیں پھیرا جائے گا خواہ ہم راضی نہ ہوں؟!“۔(سورۃ الأعراف: 88)

دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے: ﴿وَقَالَ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُم مِّنْ أَرْضِنَآ أَوْ لَتَعُودُنَّ فِى مِلَّتِنَاۖ فَأَوْحَىٰٓ إِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ ٱلظَّٰلِمِينَ﴾ ترجمہ: ”آخر کار منکرین نے اپنے رسولوں سے کہہ دیا کہ "یا تو تمہیں ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا ورنہ ہم تمہیں اپنے ملک سے نکال دیں گے"۔ تب اُن کے رب نے اُن پر وحی بھیجی کہ "ہم اِن ظالموں کو ہلاک کر دیں گے“۔(سورۂ ابراہیم: 13)

9) "فترۃ وحی" "انقطاع وحی کا زمانہ:

قدیم وجدید علمائے سیرت "فترۃ الوحی" کے بارے میں کلام کیا ہے، حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: اور "فترۃ الوحی" کا مطلب ہے: کچھ مدت کے لئے وحی کا مؤخر ہونا، اور ایسا اس لئے ہوتا تھا کہ آپ ﷺ پر خوف اور گھبراہٹ کی جو کیفیت طاری ہوتی تھی وہ ختم ہو جائے اور دوبارہ وحی کا اشتیاق پیدا ہو۔ (فتح الباری: 1/36)

حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا، جب کہ آپؐ انقطاعِ وحی کے زمانہ کے بارے میں گفتگو فرما رہے تھے: "میں ایک مرتبہ چل رہا تھا کہ اچانک میں نے آسمان سے ایک آواز سنی، میں نے اپنی نگاہ اٹھائی تو دیکھتا ہوں کہ وہی فرشتہ زمین و آسمان کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہے جو غار حرا میں میرے پاس آیا تھا۔ میں اسے دیکھ کر گھبرا گیا اور میں واپس گھر آیا، میں نے کہا: مجھے کپڑا اوڑھا دو! اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائی [يَٰٓأَيُّهَا ٱلۡمُدَّثِّرُ ، قُمۡ فَأَنذِرۡ ، وَرَبَّكَ فَكَبِّرۡ ، وَثِيَابَكَ فَطَهِّرۡ ، وَٱلرُّجۡزَ فَٱهۡجُرۡ] "اے کپڑے میں لپٹنے والے۔ اٹھو پھر ڈراؤ۔ اور اپنے رب کی بڑائی بیان کرو۔ اور اپنے کپڑے پاک رکھو"۔ اس کے بعد وحی تیزی کے ساتھ اور مسلسل نازل ہونے لگی"۔ (صحیح بخاری: 4، صحیح مسلم: 161)

علامہ صفی الرحمن مبارکپوریؒ فرماتے ہیں: جہاں تک 'فترۃ الوحی' یعنی انقطاع وحی کے زمانہ کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں ابن سعد نے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے جس کا خلاصہ ہے کہ وہ چند دنوں کی مدت تھی اور یہی راجح معلوم ہوتا ہے بلکہ تمام پہلوؤں پر غور کرنے سے یہی قول متعین ہو جاتا ہے۔ اور جہاں تک اس قول کے مشہور ہونے کا تعلق ہے کہ یہ تین سال یا ڈھائی سال کے طویل زمانہ پر محیط ہے، تو یہ کسی طور پر بھی صحیح نہیں ہے۔ یہاں پر اس کی تفصیل بیان کرنے کا موقع نہیں ہے، البتہ اللہ کے رسول ﷺ انقطاع وحی کے زمانہ میں نڈھال اور غمگیں رہتے تھے اور آپؐ پر حیرت اور گھبراہٹ کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ (الرحیق المختوم، ص: 79،80)

امام بخاریؒ نے اپنی "صحیح" میں روایت نقل کی ہے کہ آپ ﷺ انقطاع وحی کی وجہ سے اتنے غمگیں ہو گئے کہ آپ ﷺ نے کئی مرتبہ پہاڑ کی بلند چوٹی سے اپنے آپ کو گرا دینا چاہا لیکن جب بھی آپ کسی پہاڑ کی چوٹی پر چڑھتے تاکہ اس پر سے اپنے آپ کو گرادیں تو حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ کے سامنے آجاتے، اور کہتے: اے محمد! آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں۔ اس سے نبی کریم ﷺ پُر سکون ہو جاتے اور مطمئن ہو جاتے اور واپس آجاتے۔ اور جب انقطاعِ وحی کا زمانہ اور طویل ہو جاتا تو آپ ﷺ پھر سے ایسا ہی کرتے اور جب پہاڑ کی چوٹی پر چڑھتے تو حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ کے سامنے آجاتے اور آپ سے اسی طرح کی بات فرماتے۔ (صحیح بخاری: 6982، ابنِ حبان: 33، الدلائل للبیہقی 2/138)

....

دوسرا باب

رازداری اور خُفیہ طریقہ سے دعوت

1: تبلیغِ رسالت کا حکم الٰہی:

نبی کریم ﷺ کو یہ علم الیقین حاصل ہو گیا کہ وہ رحیم و کریم اللہ کی طرف سے نبی بنائے گئے ہیں، آپ ﷺ کے پاس دوسری مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام آئے اور اللہ تعالی نے اپنے نبی پر یہ آیات نازل فرمائیں: [یَا أَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ(1) قُمْ فَأَنذِرْ(2) وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ(3) وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (4)] ترجمہ: ''اے کپڑے میں لپٹنے والے۔ اٹھو پھر ڈراؤ۔ اور اپنے رب کی بڑائی بیان کرو۔ اور اپنے کپڑے پاک رکھو''۔ (سورۃ المدثر: 1-4)

ان مسلسل آیات کے ذریعہ اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے اس بات کو واضح کیا گیا کہ ماضی کا آرام و سکون، نیند اور راحت والا دور اب ختم ہو گیا ہے، اور اب آپ کے سامنے ایک عظیم عمل ہے جو بیداری، جہدِ مسلسل، انذار اور اتمامِ حجت کا متقاضی ہے، اس لئے آپ اس رسالت کی ذمہ داری اٹھائیں، لوگوں کی رہنمائی کا کام کریں، وحی سے مانوس ہوں، اس کے لئے قوت حاصل کریں، اس لئے کہ وہی مصدرِ رسالت اور دعوت کے لئے کمک کا ذریعہ ہے۔ (دیکھیں: فقہ السیرۃ، الغزالی، ص: 90)

ان آیات کو دعوت و تبلیغ اور دعوتی ذمہ داری کی ادائیگی کا اولین حکم تصور کیا جاتا ہے، ان آیات میں ایسے امور کی جانب اشارہ کیا گیا ہے جو دعوت اسلامی اور ان اسلامی حقائق کا خلاصہ ہیں جن پر پورے اسلام کی بنیاد ہے اور وہ ہیں: توحید، یومِ آخرت پر ایمان، تطہیر و تزکیۂ نفس، سوسائٹی سے اجتماعی فساد و بگاڑ کا خاتمہ اور جلبِ منفعت۔ (دیکھیں: دولۃ الرسول ﷺ من التکوین الی التمکین، د. کامل سلامہ، ص: 181)

یہ آیات اللہ کے رسول ﷺ کے عزم و ہمت کو مہمیز دینے کے لئے تھیں تا کہ آپؐ اپنے رب کی طرف سے عطا کردہ رسالت کی تبلیغ کے لئے اٹھ کھڑے ہوں، دعوت کو لے کر پیش قدمی کریں اور کسی قسم کی رکاوٹوں اور پریشانیوں کی پرواہ نہ کریں، اللہ تعالی کی اس ندا اور پکار میں شفقت و رحمت بھی تھی، حکم اور اعلان بھی تھا، ''یَا أَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ'' کے اسلوب کے ذریعہ اس میں مزید تاکید بھی پیدا کی گئی اور راحت و آرام اور نیند کے اوقات کو الوداع کہنے کی ترغیب بھی تھی، اور اس ندا کے فوراً بعد لفظ "قم" کے ذریعہ عزیمت کے ساتھ اور حکیمانہ قوت کے ساتھ اٹھ کھڑے ہونے کا تاکیدی حکم بھی تھا، جس کے نتیجہ میں آپ ﷺ دعوتی ذمہ داری کی ادائیگی کے لئے صحیح سمت میں سفر کا آغاز کر سکیں۔ انقطاعِ وحی کے بعد نبی کریم ﷺ پر نازل ہونے والی پہلی وحی میں "تبشیر" کے بجائے صرف "انذار" کا حکم دیا گیا ہے، اس کے ذریعہ یہ باور کرانا مقصود تھا کہ آپ ﷺ کی رسالت کی بنیاد صبر و ثبات سے لبریز اور پیہم کشمکش اور انتہائی پریشان کن جہاد و کوشش پر ہے۔ ان آیات کے ذریعہ اللہ کے رسول ﷺ کے عزم و ارادہ کو مزید تقویت پہنچائی گئی، آپ کو ہمت اور حوصلہ دیا گیا، اور آپ کو اس مقصد کی جانب گامزن ہونے کی ترغیب دی گئی جس پر آپ کو مأمور کیا گیا تھا، اور اس سلسلہ میں جس طرح کی بھی رکاوٹ کا سامنا کرنا پڑے ان کی بالکل پرواہ نہ کریں۔ مخلوق کے امور میں سے کسی بھی چیز کو بڑا نہ سمجھیں، ان میں سے کسی چیز کی عظمت آپ کے دل میں گھر نہ کرے، ان

کے افعال میں سے کسی فعل کی وجہ سے گھبراہٹ کا شکار نہ ہوں، ان میں سے کسی سے نہ ڈریں، اور اپنے ہی رب کی عظمت کو دل میں بٹھائیں جس نے اس وقت آپ کا خیال رکھا جب کہ آپ ابھی اس دنیا میں تشریف بھی نہیں لائے تھے، اسی نے اپنے فضل واحسان کے دستر خوان پر آپ کی پرورش کی اور اپنی جود و سخا کے ذریعہ آپ کی حفاظت کی، یہاں تک کہ نبی اور رسول کی حیثیت سے آپ کو مبعوث کر دیا، جبکہ عظیم ترین رسالت کی امانت کا بارِ گراں اٹھانے کے لئے اس سے پہلے تخلیق اور اخلاق ہر اعتبار سے آپ کو مکمل طور پر تیار کر دیا تھا، اس لئے ہر قسم کی تعظیم، کبریائی اور بڑائی اللہ تعالی ہی کا حق ہے۔"وربک فکبر" جس میں کوئی فردِ بشر یا کوئی دوسری مخلوق اللہ کی شریک و سہیم نہیں ہے۔ (دیکھیں: محمد رسول اللہ ﷺ، محمد صادق عرجون 1/589)

اور اللہ کے اس قول: "وثیابک فطھر" کے ذریعہ آپ سے گویا کہ یہ بات کہی جارہی ہے کہ اگرچہ آپ انسانی کمال کے اعتبار سے فطری طور پر پاکیزگی اور طہارت سے آراستہ ہیں کیونکہ اللہ تعالی نے آپ کو عظیم ترین اخلاق سے نوازا ہے اور آپ کو نبوت عطا کر کے آج کے دن کے لئے تیار کیا ہے، اس لئے مقام بلند کا تقاضا ہے کہ مزید نفس کی پاکیزگی اور طہارت حاصل کرتے رہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ زندگی میں مزید اخلاقی بلندی حاصل ہوگی۔ چنانچہ آپؐ آج تمام جہانوں کے لئے بحیثیت رسول ہیں، اور رسالت کا کمال معاشرتی اخلاقیات کے کمال میں مضمر ہے، جس میں صبر و بردباری بھی ہو اور حسن سلوک بھی، اور دعوت الی اللہ کی راہ میں سنجیدگی اور جہدِ مسلسل بھی جس کے ہمرکاب ہو، کوئی ایذا اور تکلیف آپ کو اس مشن سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو، اور نہ ہی کوئی ابتلاء و آزمائش آپ کو اپنے مقصد سے روک سکے۔ (ایضاً، ص: 592)

اور اس آیت: "والرجز فاھجر" کے ذریعہ آپ ﷺ سے گویا کہا جارہا ہے کہ آپ نے فطری اور طبعی طور پر جن چیزوں کو ترک کیا ہے ان سے اجتناب اور دوری حکم خداوندی سمجھ کر اور عبادت کی نیت سے ہو، تاکہ آپ کی امت کے لئے یہ قابل تقلید عمل بن سکے اور اس کی طہارت و پاکیزگی کا یہی عنوان قرار پائے۔ (ایضاً، ص: 593)

2) خُفیہ دعوت کا آغاز:

سورۂ مدثر کی آیات نازل ہونے کے بعد اللہ کے رسول ﷺ نے خفیہ طریقہ سے لوگوں کو اللہ کی طرف اور اسلام کی طرف بلانے کی ذمہ داری ادا کرنا شروع کر دی، اور یہ فطری بات تھی کہ آپ ﷺ اس کا آغاز اپنے اہلِ خانہ، دوست واحباب اور قریب ترین لوگوں سے کرتے۔

ا: سیدہ خدیجہؓ کا قبولِ اسلام:

نبی کریم ﷺ پر سب سے پہلے ایمان لانے والی خاتون حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا تھیں، بلکہ آپؓ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ مردوں، عورتوں، بچوں اور بزرگوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والی حضرت خدیجہؓ ہی تھیں۔ یہی فردِ بشر میں پہلی خاتون ہیں جنہوں نے رسول اکرم ﷺ کی زبانِ مبارک سے وحی الٰہی کو سنا، اور یہی وہ پہلی خاتون ہیں جنہوں نے رسول اکرم ﷺ سے قرآن سننے کے بعد اس کی

تلاوت کی، اسی طرح یہی وہ پہلی خاتون ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ سے نماز سیکھی، آپؓ کا گھر غارِ حرا کے بعد پہلی جگہ ہے جہاں حضرت محمد مصطفی ﷺ کے قلبِ مبارک پر جبرئیل امین علیہ السلام کی وساطت سے نازل ہونے والی پہلی وحی کی تلاوت کی گئی۔ (دیکھیں: المراۃ فی العہد النبوی، د۔عصمۃ الدین کرکر، ص36)

احکامِ شریعت میں سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض کیا جانے والا سب سے پہلا حکم، توحید کے اقرار کے بعد، نماز کا حکم تھا۔ روایات میں اس کی تفصیلات وارد ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی زوجہ مطہرہ حضرت خدیجہؓ کو نماز کی فرضیت کے بعد وضو اور نماز کا طریقہ سکھایا، اللہ کے رسول ﷺ کے پاس جبرئیلؑ تشریف فرما تھے، حضرت جبریلؑ نے وادی کے ایک کونے میں ایڑی سے مارا تو وہاں ایک چشمہ پھوٹ پڑا، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے وضو کیا تاکہ آپ ﷺ کو نماز کے لئے وضو کرنے کا طریقہ دکھائیں۔ آپ ﷺ یہ سب دیکھ رہے تھے، اس کے بعد اللہ کے رسول ﷺ نے اسی طریقہ سے وضو فرمایا جیسے جبرئیلؑ نے کیا تھا، اس کے بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام کھڑے ہوئے اور آپ ﷺ کو نماز پڑھانے لگے اور آپ ﷺ ان کی نماز دیکھ کر نماز ادا فرما رہے تھے، اس کے بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لے گئے۔ اللہ کے رسول ﷺ حضرت خدیجہؓ کے پاس تشریف لائے، اور ان کے سامنے وضو کیا، تاکہ ان کو بھی نماز کے لئے وضو کا طریقہ سکھا دیں، جیسے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے آپ ﷺ کو سکھایا تھا۔ اس کے بعد حضرت خدیجہؓ نے اسی طرح وضو کیا جیسے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے وضو کیا تھا، اور پھر آپ ﷺ نے ان کو ویسے ہی نماز پڑھائی جیسے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ کو نماز پڑھائی تھی، حضرت خدیجہؓ نے آپ ﷺ کی نماز دیکھ کر نماز ادا فرمائی۔ (سیرت ابن ہشام: 1/260)

۲) حضرت علی بن ابی طالبؓ کا قبولِ اسلام:

سیدہ خدیجہؓ کے ایمان لانے کے بعد حضرت علی بن ابی طالبؓ نے اسلام قبول کیا، اور حضرت علیؓ بچوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے تھے، اور اس وقت ان کی عمر راجح قول کے مطابق دس سال کی تھی۔ علامہ طبری اور ابن اسحاق کا یہی قول ہے۔ (سیرۃ النبی، اُبو شہبہ 1/284)

اللہ تعالیٰ نے حضرت علیؓ پر یہ انعام و احسان کیا کہ اسلام سے پہلے ہی ان کی پرورش آپ ﷺ کے زیرِ سایہ ہونے کا انتظام کیا، آپ ﷺ نے ان کو اپنے چچا حضرت ابو طالب سے لے کر اپنے ساتھ گھر میں شامل کیا۔ (سیرۃ ابن ہشام 1/246)

حضرت علیؓ تیسرے فرد ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ اور حضرت خدیجہؓ کے بعد نماز قائم کی۔ (دیکھیں: عیون الأثر، ابنِ سید الناس 1/115)

بعض اہلِ علم نے ذکر کیا ہے کہ جب نماز کا وقت ہو جاتا تو اللہ کے رسول ﷺ مکہ کی گھاٹیوں میں نکل جاتے اور آپ کے ساتھ حضرت علیؓ بھی اپنے والد، چچاؤں اور سب لوگوں سے چھپتے چھپاتے نکل جاتے اور دونوں وہیں نماز ادا کرتے، اور جب شام ہوتی تو دونوں واپس اس گھر میں تشریف لاتے جو ایمان کی وجہ سے پاک و صاف تھا، وفاداری کا امین اور زرخیزی میں اپنی مثال آپ تھا۔ (دیکھیں: المرأۃ فی العہد النبوی، د۔عصمۃ الدین، ص،42)

۳) حضرت زید بن حارثہ کا قبولِ اسلام:

غلاموں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے نبی کریم ﷺ کے چہیتے، آپ کے آزاد کردہ غلام اور متبنی حضرت زید بن حارثہ الکلبی رضی اللہ عنہ ہیں، جنہوں نے اللہ کے رسول ﷺ کو اپنے والد اور گھر والوں پر ترجیح دی، جبکہ وہ انہیں اللہ کے رسول ﷺ سے خرید کر واپس لے جانے کے لئے آئے تھے، اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت زیدؓ کو اختیار دے دیا کہ کس کے ساتھ رہنا ہے۔ حضرت زیدؓ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: میں آپ کے مقابلہ میں اور کسی کو اختیار نہیں کر سکتا ہوں، آپ میرے والد اور چچا کی طرح ہیں۔ یہ سن کر ان کے والد اور ان کے چچا نے کہا: افسوس ہے تم پر! تم آزادی اور اپنے والد، چچا اور گھر والوں کے مقابلہ میں غلامی کو منتخب کر رہے ہو! انہوں نے جواب دیا: جی ہاں! میں نے اس شخص کہ اندر ایسی چیز کا مشاہدہ کیا ہے کہ میں ان کے مقابلہ میں اب کبھی بھی کسی کو ترجیح نہیں دوں گا۔ (دیکھیں: دراسۃ تحلیلیۃ لشخصیۃ الرسول ﷺ، د۔ محمّد قلعجی، ص 191)

۴) نبی کریم ﷺ کی صاحبزادیاں:

اسی طرح اسلام قبول کرنے میں نبی کریم ﷺ کی تمام صاحبزادیوں نے بھی پہل کی، حضرت زینبؓ، حضرت ام کلثومؓ، حضرت فاطمہؓ اور حضرت رقیہؓ تمام صاحبزادیوں نے اسلام قبول کیا اور بعثت سے پہلے اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے استقامت اور حسنِ سیرت کی راہ اختیار کی، اور بت پرستی، گناہوں کے ارتکاب اور اہل جاہلیت کے ہر غلط کام سے دور رہیں، اسی طرح اپنی والدہ ماجدہ حضرت خدیجہؓ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اسلام قبول کرنے میں پہل کی۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویۃ، أبو شہبہ 1/284)

اس طرح نبوی گھرانہ ایسا پہلا گھرانہ بن گیا جس کا ہر فرد صاحبِ ایمان اور اسلامی شریعت کا پابند تھا، دعوتِ اسلامی کی تاریخ میں اس اولین گھرانۂ نبوت کو ایک عظیم مقام حاصل ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بعض اہم خصوصیات سے سرفراز کیا، اور ایمان میں، تلاوت قرآن میں اور نماز قائم کرنے میں اولیت کا شرف عطا کیا۔

- یہ گھرانہ سب سے پہلی جگہ ہے جس میں غار حرا کے بعد آسمانی وحی کی تلاوت کی گئی۔
- سب سے پہلا گھر ہے جس میں ایمان لانے والی اور اسلام میں سبقت کرنے والی پہلی خاتون رہتی تھیں۔
- سب سے پہلا گھر جس میں نماز قائم کی گئی۔
- سب سے پہلا گھر جس میں اسلام کی طرف سبقت کرنے والی تینوں شخصیات حضرت خدیجہؓ، حضرت علیؓ اور حضرت زید بن حارثہؓ ایک ساتھ جمع ہوئے۔
- سب سے پہلا گھر جس نے نصرت و مدد کی راہ اپنائی، اور اس کے افراد میں سے کسی بھی چھوٹے یا بڑے فرد نے دعوت کی آبیاری میں نہ کوتاہی کی اور نہ ہی پس و پیش سے کام لیا۔ (دیکھیں: المرأۃ فی العہد النبوی، عصمۃ الدین، ص 43)

یہ گھرانہ اس کا مستحق ہے کہ اس کو قابل تقلید نمونہ بنایا جائے، اس گھر کی مربیہ خاتون اس کی اہل ہیں کہ وہ مسلم گھرانوں کے لئے، ان کی خواتین کے لئے اور تمام اہل ایمان کے لئے ایک زندہ مثال اور نمونہ قرار پائیں، اس گھرانہ کی زوجہ پاکباز، مخلصہ اور صدق وامانت کی پاسدار ہیں، پروردہ اور زیرِ کفالت چچازاد بھائی مطیع وفرمانبردار اور معاون ورفیق کار ہے، متبنی (منہ بولا بیٹا) صاحبِ ایمان، سچا ساتھ دینے والا اور مددگار ہے۔اور بیٹیاں تصدیق کرنے والیں، بات سننے والیں، مؤمنات اور اطاعت شعار ہیں۔(ایضاً: ص 45)

یہ پورا گھرانہ حسین ترین ایمانی زیور سے آراستہ تھا، اور ایمان وتصدیق کے نور نے اس کو سراپا روشن اور منور کر دیا تھا، جس کے نتیجہ میں زوجین کے مابین ایک دوسرے کی بات سننے کا جذبہ اور باہم دیگر ایک دوسرے کی ضروریات اور احساسات وجذبات کی تکمیل کی فکر تھی، اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کو عملی جامہ پہنانے کی عملی تصویر موجود تھی جس کی منظر کشی باری تعالیٰ نے یوں فرمائی ہے: ﴿هُوَ ٱلَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفۡسٖ وَٰحِدَةٖ وَجَعَلَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا لِيَسۡكُنَ إِلَيۡهَاۖ فَلَمَّا تَغَشَّىٰهَا حَمَلَتۡ حَمۡلًا خَفِيفٗا فَمَرَّتۡ بِهِۦۖ فَلَمَّآ أَثۡقَلَت دَّعَوَا ٱللَّهَ رَبَّهُمَا لَئِنۡ ءَاتَيۡتَنَا صَٰلِحٗا لَّنَكُونَنَّ مِنَ ٱلشَّٰكِرِينَ﴾ ترجمہ: "وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا تا کہ اس کے پاس سکون حاصل کرے، پھر جب مرد نے عورت کو ڈھانک لیا تو اسے ایک خفیف سا حمل رہ گیا جسے لئے لئے وہ چلتی پھرتی رہی، پھر جب وہ بوجھل ہو گئی تو دونوں نے مل کر اللہ، اپنے رب سے دعا کی کہ اگر تو نے ہم کو نیک بچہ دیا تو ہم تیرے شکر گزار ہوں گے"۔سورۃ الأعراف:189)

اس گھرانے میں اللہ کے رسول ﷺ کے اس فرمان کی بھی عملی تصویر نظر آتی تھی جو آپ ﷺ نے تربیت کے حوالے سے ارشاد فرمایا ہے کہ: "ہر پیدا ہونے والا بچہ فطرت کے مطابق پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی بناتے ہیں، یا عیسائی بناتے ہیں، یا اس کو مجوسی (آتش پرست) بناتے ہیں"۔ (صحیح بخاری: 1358، صحیح مسلم: 2658) یہ صحیح تربیت ہی کا نتیجہ تھا کہ آپ ﷺ کی صاحبزادیاں (رضی اللہ عنہن) ایمان اور تصدیق میں سبقت کرنے والی تھیں، اور اس اعتبار سے گھرانۂ نبوت کو پہلا مقام حاصل تھا، لہذا ہمارے لئے اور ہر اس شخص کے لئے جس نے اللہ کو بحیثیت رب اور حضرت محمد ﷺ کو بحیثیت نبی اور رسول تسلیم کیا، ضروری ہے کہ معاشرت میں، سچائی اور تصدیق کے عمدہ طرزِ عمل میں اور اطاعت وفرمانبرداری اور عمل میں یہ گھرانہ ہمارے لئے قابل تقلید نمونہ ہو اور ایسا آئیڈیل ہو جس کے راستے پر چل کر ہم اپنی زندگی کا سفر طے کریں۔(دیکھیں: المرأة في العهد النبوي، ص: 46)

اللہ تعالیٰ کے ضوابط وقوانین کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اصلاح وتعمیر کے مراحل میں پہلا مرحلہ صالح فرد اور صالح گھرانہ کی تعمیر کا ہے، اس کے بعد پھر صالح معاشرہ کی اصلاح وتعمیر کا مرحلہ آتا ہے۔ یہ بات بالکل عیاں ہے کہ اسلام نے ایک مسلم فرد کی تربیت واصلاح پر سب سے زیادہ توجہ مرکوز کی ہے اور کسی بھی دوسرے عمل کے مقابلہ میں اسی کو مقدم رکھا ہے، کیونکہ مسلم فرد ہی کسی بھی معاشرتی عمارت کی بنیادی اینٹ کی حیثیت رکھتا ہے، اسی لئے گھر کے تمام افراد ایک نومولود فرد کا ولادت کے وقت سے ہی استقبال کرتے ہیں اور اس کی زندگی کے ایک طویل مرحلہ تک اس کی دیکھ بھال اور تعلیم وتربیت کا خیال کرتے ہیں، بلکہ گھرانہ اس کی زندگی کے مکمل سفر میں

ساتھ نبھاتا رہتا ہے، وہی اس کی اوّلین تربیت گاہ ہوتی ہے جس کے ذریعہ اس کی شخصیت کی خصوصیات، صفات اور امتازیات متعین ہوتے ہیں،اسی طرح یہی گھرانہ ایک فرداور معاشرہ کے درمیان کڑی کا کام انجام دیتا ہے،اگر یہ کڑی درست اور طاقتور ہو تو یہ اپنے دونوں سروں فرد اور معاشرہ کو بھی سلامتی اور قوت فراہم کرتی رہتی ہے۔(دیکھیں: دولۃالرسول ﷺ من التکوین الی التمکین، کامل سلامہ، ص208)

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے خاندان اور گھرانہ کی تعمیر واصلاح پر بہت زیادہ توجہ مرکوز کی ہے اور اس کو کافی اہمیت دی ہے،اس کو وہ بنیادیں فراہم کی ہیں جو اس کے قیام وبقااور صحیح ترقی کی بھی ضامن ہیں اور اس کو ربانی رخ دینے میں بھی اہم رول ادا کرتی ہیں،تاکہ یہ فرد اسلامی معاشرہ کی تشکیل میں اور اسلامی نظام کے قیام میں ایک مضبوط کڑی کا کردار ادا کرسکے،اور دنیائے انسانیت میں ربانی تہذیب وتمدن کی تعمیر کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوسکے۔(ایضاً)

اسلام کی نظر میں خاندان اور گھرانے کی اہمیت کا اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ دعوتِ اسلامی کی تحریک نے ابتدائی وقت سے ہی اس پر خصوصی توجہ مرکوز کی ہے،اس لئے کہ تقدیر الٰہی کے فیصلے کے مطابق سابقینِ اولین میں پہلا مقام ایک خاتون حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو حاصل ہوا،اس کے ذریعہ اسلام میں عورت کے مقام کا بھی ثبوت ملتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے خاندان اور گھرانے پر ہی اپنی بنیاد قائم کی ہے،اسی طرح سابقینِ اوّلین میں دوسرا مقام ایک بچے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حاصل ہے، جس میں اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ دعوت کو نئے اور تازہ ذہن کی ضرورت ہے اور اسلام نئی نسل پر خصوصی توجہ مرکوز کرتا ہے تاکہ دعوت اپنے درست مراحل پر گامزن رہے، اور معاشرہ کی تشکیل کے بعد عادلانہ نظام قائم ہو،اور پھر تہذیب وتمدن کا تناور درخت ثمر آور ثابت ہو۔(دیکھیں:الأخوات المسلمات وبناء الأسرۃالمسلمۃ، محمود الجوھری، ص7)

اس دعوت کا آغاز حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا جیسی خاتون سے، حضرت زید بن حارث رضی اللہ عنہ جیسے غلام سے، حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ جیسے بچے سے،اور نبی اکرم ﷺ کے دیگر افراد خانہ سے ہوتا ہے، دعوت کے اس نقطہ آغاز پر غور وفکر سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اسلامی دعوت کے مخاطبین چھوٹے، بڑے، مرد، عورت، آقا اور غلام ہر قسم کے لوگ ہیں، معاشرہ کے اندر تمام طبقوں کا، چاہے مرد ہوں یا عورتیں، بچے ہوں یا غلام، سب کا معاشرہ کی تعمیر وتشکیل میں، حکومت کے قیام میں اور تہذیب وتمدن کے استحکام میں اور پھیلاؤ میں اپنا اپنا کردار اہم ہے۔(دیکھیں: دولۃالرسول ﷺ من التکوین الی التمکین، ص208)

۵)حضرت ابو بکر صدیقؓ کا قبولِ اسلام:

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ وہ پہلے شخص ہیں جو آزاد اور معزز مردوں میں نبی کریم ﷺ پر سب سے پہلے ایمان لائے، وہ بعثت سے پہلے رسول اکرم ﷺ کے سب سے زیادہ خصوصی اور قریبی ساتھی تھے،انہی کے بارے میں اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ہے: "جس کو بھی میں نے اسلام کی دعوت دی اس نے تردد اور پس وپیش سے کام لیا، سوائے ابو بکرؓ کے، جب میں نے ان کو دعوت دی تو نہ تو انہوں نے انتظار کیا اور نہ ہی اس کو قبول کرنے میں تردد اور پس وپیش سے کام لیا"۔(الدلائل للبیہقی 2/164)

لہٰذا حضرت ابو بکرؓ اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھی اور دوست ہیں، وہ رسول اللہ ﷺ کی نیکیوں کا امتداد اور صدقۂ جاریہ ہیں، ان کا قبولِ اسلام کسی ایک شخص کا قبولِ اسلام نہیں بلکہ ایک امت کا قبول اسلام تھا، قریش میں ان کا مقام—جیسا کہ ابنِ اسحاق نے ذکر کیا ہے— ایسا ہی تھا جیسے کہ انسانی جسم میں آنکھ کا ہے۔

- أبو بکر رضی اللہ عنہ اپنی قوم میں محبوب، پسندیدہ اور نرم مزاج تھے۔
- قریش میں سب سے زیادہ ماہر انساب، قریش کے بارے میں سب سے زیادہ جاننے والے اور قریش میں موجود خیر و شر کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔
- آپؓ ایک تاجر، بااخلاق اور صاحب خیر شخص تھے۔
- آپؓ کی قوم کے افراد آپ کے پاس آتے تھے اور ان کے علم، تجربات اور بہترین صحبت کی وجہ سے آپ سے بہت سے معاملات میں آپ کی رائے لیتے تھے۔(دیکھیں: السیرۃ النبویۃ، ابنِ ھشام 1/371)

حضرت ابو بکرؓ ایک ایسے خزانہ کی مانند تھے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کے لئے محفوظ کر رکھا تھا، آپ قریش سے سب سے زیادہ محبت کرنے والے تھے، یہی اللہ کی طرف سے عطا کردہ ایسا اخلاقی وصف تھا جس نے ان کو نرم خو بنایا تھا، آپ ان لوگوں میں سے تھے جو لوگوں کو چاہتے ہیں اور لوگ ان کو چاہتے ہیں اور عمدہ اخلاقی وصف ہی تنہا وہ عنصر ہے جو قوم کی الفت و محبوبیت کے لئے کافی ہے، حضرت ابو بکرؓ وہ شخص ہیں جن کے بارے میں اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: "میری امت میں سب سے زیادہ میری امت پر رحم کرنے والے ابو بکر ہیں"۔(مسند أحمد: 281/، 3/184، سنن ترمذی: 3790، 3791، ابنِ ماجہ: 154)

عربوں کے نزدیک علم الأنساب اور علم تاریخ اہم ترین علوم شمار کئے جاتے ہیں اور حضرت ابو بکر صدیقؓ کے پاس ان دونوں علوم کا ایک وافر حصہ موجود تھا، اور قریش نے حضرت ابو بکرؓ کے بارے میں یہ اعتراف کیا تھا کہ وہ ان کے نسب کے بارے میں سب سے زیادہ ماہر اور ان کی تاریخ کو اور ان میں موجود خیر و شر کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔ چنانچہ تعلیم یافتہ طبقہ حضرت ابو بکرؓ کی مجلس میں آتا تھا تاکہ ان کے علم کے ذریعہ اپنی تشنگی کو بجھائیں جو انہیں اس وسعت و فراوانی کے ساتھ اور کہیں نہیں ملتا تھا، اسی لئے باصلاحیت اور زیرک و عقل مند نوجوان ہمیشہ ان کی مجلس میں شریک اور حاضر رہتے تھے، یہی وہ فکری اور علمی اعتبار سے منتخب اور چنیدہ طبقہ تھا جو آپؓ سے یہ علوم حاصل کرنا چاہتا تھا، یہ ان کی عظمت کے پہلوؤں میں سے ایک دوسرا پہلو ہے۔

اسی طرح مکہ کے تجارت پیشہ اور اصحاب ثروت لوگ بھی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی مجلس کے حاضر باش ہوا کرتے تھے، اگرچہ حضرت ابو بکرؓ پہلے اور تنہا مکہ کے تاجر نہیں تھے لیکن وہ مکہ کے مشہور تجار میں شمار ہوتے تھے، ضرورتمند لوگ بھی آپ ہی کا رخ کرتے تھے، ان کی نرم خوئی اور حسنِ اخلاق کی وجہ سے عام لوگ آپ رضی اللہ عنہ کے گھر کا رخ کرتے تھے آپؓ ایسے مہمان نواز، ملنسار اور با اخلاق تھے جو مہمانوں کے ذریعہ خوشی محسوس کرتے تھے اور ان کے ساتھ انسیت کا معاملہ کرتے تھے، مکی معاشرہ کے تمام طبقے حضرت ابو بکرؓ کے پاس اپنا اپنا حصہ پاتے تھے۔ اللہ آپ سے راضی ہو۔(دیکھیں: التربیۃ القیادیۃ، العضبان 1/115)

مکہ کی سوسائٹی میں آپؓ کا ادبی، علمی اور معاشرتی اعتبار سے بہت زیادہ حصہ اور بلند مقام تھا، اسی لئے آپؓ نے جب اسلام کی دعوت کا آغاز کیا تو سوسائٹی کے بہترین اور بلند مقام کے حامل افراد نے آپ کی دعوت پر لبیک کہا اور ان افراد میں خاص طور پر مندرجہ ذیل افراد قابل ذکر ہیں:

- حضرت عثمان بن عفانؓ جو قبول اسلام کے وقت 34 سال کے تھے۔
- حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ جو قبول اسلام کے وقت 30 سال کے تھے۔
- حضرت سعد بن ابی وقاصؓ جو قبولِ اسلام کے وقت 17 سال کے تھے۔
- حضرت زبیر بن عوامؓ جو قبول اسلام کے وقت 12 سال کے تھے۔
- حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ جو قبول اسلام کے وقت 13 سال کے تھے۔(دیکھیں: التربیۃ القیادیۃ 1/116)

تحریک اسلامی کے یہ پانچ چمکدار ستارے حضرت ابو بکر صدیقؓ کی دعوت کے ثمر بار درخت کا اولین ثمر تھے، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ان کو جیسے ہی اسلام کی دعوت دی، انہوں نے فوراً آپ کی دعوت پر لبیک کہا، اور اُن کو لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ کے سامنے کلمۂ شہادت ادا کر کے حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ چنانچہ یہی وہ بنیادی ستون تھے جن پر دعوت کا عالیشان محل تعمیر ہوا، انھوں نے اللہ کے رسول ﷺ کو تقویت پہنچانے اور نصرت و مدد کرنے میں پہلی کمک کا کردار ادا کیا، انہی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو سر بلندی اور نصرت و تائید کی اور اس کے بعد پھر لوگ جوق در جوق حلقہ بگوش اسلام ہوتے چلے گئے، اس ہر اول دستہ کا ہر فرد اسلام کا پر جوش داعی بن گیا، اور سابقین اولین کا گروہ ایک ایک دو دو اور چند افراد کی شکل میں ان کے کاروان میں شامل ہوتے گئے، یہاں تک کہ قلتِ تعداد کے باوجود یہی افراد دعوت کا دستہ اور رسالت و نبوت کے لئے مضبوط قلعہ بن گئے، جن کی نظیر اسلامی تاریخ میں نہ اس سے پہلے اور نہ ہی اس کے بعد دیکھنے کو ملتی ہے۔(دیکھیں: محمد رسول اللہ ﷺ، العرجون 1/533)

بلاشبہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے دعوت الی اللہ کے سلسلہ میں کردار کے ذریعہ اور ان کی حرکیت کے ذریعہ اس دین پر ایمان اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم پر لبیک کہنے کی حقیقی تصویر واضح ہوتی ہے، ایک ایسے مؤمن کی تصویر جس کو اس وقت تک قرار نہیں آتا ہے اور نہ ہی وہ اس وقت تک سکون و اطمئنان سے بیٹھتا ہے یہاں تک کہ دنیائے انسانیت میں اس چیز کو پورا نہ کرے جس پر وہ ایمان رکھتا ہے، حضرت ابو بکرؓ کا ایمان اور اُن کی دعوتی سرگرمی کوئی جذباتی اور وقتی اثر نہیں تھا جو فوراً ہی ماند پڑ جائے، پگھل جائے اور ختم ہو جائے، بلکہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی سرگرمی اور ان کا دعوتی جوش اس وقت تک باقی رہا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے پاس بلا لیا، نہ ان کے جوش و جذبہ میں کمی آئی، نہ کمزوری کا شکار ہوئے، نہ ہی اُکتائے اور نہ ہی بے بسی اور عاجزی کا مظاہرہ کیا، یہ بات قابل غور ہے کہ اثر و رسوخ اور مقام کے حامل افراد کا دعوت کے لئے انصار و مددگار جمع کرنے میں اہم رول ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اسلام میں حضرت ابو بکر صدیقؓ کی اثر انگیزی دوسروں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ تھی۔(دیکھیں: الوحی و تبلیغ الرسالہ، د۔ یحییٰ الیحی، ص 62)

اگرچہ ابتدا میں صدیق اکبرؓ اور اللہ کے رسول ﷺ کا آپسی تعلق اور ساتھ صرف نفسیاتی اور اخلاقی انسیت و ہم آہنگی کی بنیاد پر تھا، لیکن یہی تعلق پھر ایمان باللہ اور ابتلاء و آزمائشی مراحل میں نصرت و تائید کی بنیاد پر قائم ہوا، اور حضرت ابو بکر صدیق کے مقام و مرتبہ کو، لوگوں کی ان سے انسیت و تعلق کو اور لوگوں کے نزدیک ان کے مقام و مرتبہ کو آپ ﷺ نے حق کی دعوت کے لئے سرچشمۂ قوت کے طور پر استعمال کیا، اس پر مستزاد یہ کہ بذاتِ خود آپ ﷺ زبردست نفسیاتی طاقت و قوت، اور اللہ تعالیٰ اور لوگوں کے نزدیک مقامِ بلند رکھتے تھے۔(دیکھیں: خاتم النبیین، ابوزہرہ، ص398)

خفیہ طریقہ سے اور انفرادی سطح پر دعوت کا کارواں آگے بڑھتا رہا، معاشرہ کے ان عناصر کا انتخاب کیا جاتا رہا جن کے ذریعہ اس ایمانی گروہ کی تشکیل ہوسکتی تھی، جو دنیا کے اندر اسلامی نظام کے قیام کے لئے کوشاں رہے اور انسانوں کو اپنے رب کے دین کی طرف دعوت دیتا رہے اور جو بہت جلد ایک ایسی ربانی تہذیب کے قیام کا ذریعہ بنے جس کی کوئی نظیر موجود نہ ہو۔

٦)دوسرا گروپ:

پہلے گروپ کے قبولِ اسلام کے بعد دوسرے گروپ کا نمبر آیا، اس گروپ میں سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں مندرجہ ذیل حضرات شامل ہیں:

حضرت ابو عبیدہ بن جراح، حضرت ابو سلمہ بن عبداللہ بن عبدالاسد بن مخزوم بن مرہ - یہ اللہ کے رسول ﷺ کی پھوپھی حضرت برہ بنت عبدالمطلب کے بیٹے، یعنی آپ ﷺ کے پھوپھی زاد اور رضاعی بھائی تھے۔حضرت اَرقم بن اَبی الاَرقم مخزومی، حضرت عثمان بن مظعون الجمحی، حضرت عبیدہ بن حارث بن عبدالمطلب، حضرت سعید بن زید بن عمرو بن نفیل، حضرت قدامہ، حضرت عبداللہ-یہ دونوں مظعون کے بیٹے تھے-حضرت فاطمہ بنت الخطاب بن نفیل- یہ حضرت عمر بن الخطاب کی بہن اور حضرت سعید بن زید کی زوجہ تھیں-حضرت اَسماء بنت ابی بکر الصدیق، حضرت عائشہ بنت ابی بکر الصدیق، اور بنو زہرہ کے حلیف حضرت خباب بن الاَرت (رضی اللہ عنہم اَجمعین)۔ (دیکھیں: دولۃ الرسول ﷺ من التکوین الی التمکین، ص212)

٧)تیسرا گروپ:

اس گروپ میں اسلام قبول کرنے والوں کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

حضرت عمر بن ابی وقاص - یہ حضرت سعد بن ابی وقاص کے بھائی ہیں-حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت مسعود بن القاری - ان کا مکمل نام ہے: مسعود بن ربیعہ بن عمرو-حضرت سلیط بن عمرو، ان کے بھائی حضرت حاطب بن عمرو، حضرت عیاش بن ابی ربیعہ، ان کی زوجہ حضرت اَسماء بنت سلمہ، حضرت خنیس بن حزافہ السہمی، حضرت عامر بن ربیعہ - یہ آل خطاب کے حلیف تھے-حضرت عبداللہ بن جحش، ان کے بھائی اَبو احمد، حضرت جعفر بن ابی طالب، ان کی زوجہ حضرت اسماء بنت عمیس، حضرت حاطب بن الحارث، ان کی زوجہ حضرت فاطمہ بن المحلّل، ان کے دوسرے بھائی حضرت حطاب بن حارث، ان کی زوجہ حضرت فکیہہ بنت یسار، ان کے کے تیسرے بھائی حضرت معمر بن

الحارث، حضرت سائب بن عثمان بن مظعون، حضرت مطلب بن أزہر،ان کی زوجہ حضرت رملہ بنت ابی عوف، حضرت نحام بن عبداللہ بن أسید، حضرت ابو بکر کے آزاد کردہ غلام حضرت عامر بن فہیرہ،ان کی والدہ حضرت فہیرہ - اور یہ (یعنی: حضرت عامر) طفیل بن حارث بن سخبرہ کے غلام تھے تو حضرت ابو بکرؓ نے ان کو خرید کر آزاد کر دیا - حضرت خالد بن سعید بن العاص بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف بن قصی،ان کی زوجہ حضرت أمینہ بنت خلف، حضرت أبوحذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ بن عبد شمس، حضرت واقد بن عبداللہ بن عبد مناف، بکیر بن عبد یالیل کے تمام بیٹے: حضرت خالد، حضرت عامر، حضرت عاقل اور حضرت ایاس۔ حضرت عمار بن یاسر، یہ بنو مخزوم بن یقظہ کے حلیف تھے،ابن هشام نے حضرت عمار کی نسبت عنسی بیان کی ہے،اور ذکر کیا ہے کہ ان کا تعلق قبیلہ مذحج سے ہے،اور حضرت صہیب بن سنان جو رومیوں میں قبول اسلام میں سبقت کرنے والے ہیں۔

سابقین اولین میں حضرت ابو ذر غفاریؓ،ان کے بھائی حضرت انیسؓ اور ان کی والدہ بھی ہیں۔(دیکھیں: السیرۃالنبویۃ، أبو شہبہ 1/287)

اسی طرح پہلے ہی مرحلہ میں اسلام قبول کرنے والوں میں حضرت بلال بن رباح حبشی بھی ہیں،ان تمام سابقین کا تعلق قریش کی تمام شاخوں سے ہے۔ابن ہشام نے ان کی تعداد چالیس افراد سے زیادہ شمار کی ہے۔

ابن اسحاق فرماتے ہیں:اس کے بعد مردوزن سب لوگ اسلام میں گروہوں اور جماعتوں کی شکل میں داخل ہونے لگے یہاں تک کہ مکہ میں اسلام کاذکر عام ہوگیااور وہ لوگوں کی گفتگو کا موضوع بن گیا۔(ایضاً: 1/262)

سابقہ أسماء کو پیش کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام میں سابقین اولین اپنی قوم کے بہترین اور معزز افراد تھے،وہ کمتر قسم کے لوگ یا صرف غلام نہیں تھے،جن کا مقصد قبولِ اسلام کے ذریعہ آزادی حاصل کرنایااس طرح کے کسی دوسرے فائدہ کا حصول نہیں تھا، جیسے کہ دشمنان اسلام عام لوگوں کے سامنے اس کی تصویر پیش کرناچاہتے ہیں۔

بعض سیرت نگاروں نے جب سابقین اولین کے متعلق گفتگو کی ہے توانہوں نے حقیقت کے بجائے جانبداری سے کام لیاہے، بعض کی تحریروں میں اس طرح کااسلوب ملتاہے،سابقین اولین کے بارے میں ان میں سے بعض لکھتے ہیں: "سیرت سے ہمیں یہ پتہ چلتاہے کہ اس مرحلہ میں جو لوگ اسلام میں داخل ہوئے ان کی اکثریت فقراء، کمزوروں اور غلاموں پر مشتمل تھی لہذااس میں کیا حکمت ہے؟"۔(فقہ السیرۃ،البوطی، ص77)

اسی طرح بعض نے اس طرح لکھاہے:" ابتداسے لے کراب تک تین سال گزرنے کے بعد دعوت کا کل اثاثہ چالیس مردوزن پر مشتمل تھا،جن میں سے زیادہ فقراء، کمزور، آزاد کردہ غلام اور غلام تھے،جن میں پیش پیش عجمیوں کی ایک بڑی تعداد تھی، جیسے کہ حضرت صہیب رومیؓ اور حضرت بلال حبشیؓ۔(فقہ السیرۃ،البوطی،ص79)

اسی طرح بعض نے لکھاہے: "لہذاآپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کمزور طبقے کے کچھ مردوں، عورتوں،اور غلاموں نے ایمان لایا"۔(حدائق الأنوار ومطالع الأسرار،ابن الربیع 1/301)

باریک بینی کے ساتھ بحث و تحقیق کے بعد یہ ثابت ہوتا ہے کہ جن افراد کو فقراء، کمزور، غلام اور عجمی لوگ کہا جارہا ہے ان کی مجموعی تعداد تیرہ (13) ہے، اسلام میں داخل ہونے والوں کی مجموعی تعداد کے مقابلہ میں اس تعداد کو 'اکثریت' 'اکثر' 'بڑی تعداد' 'زیادہ تر' نہیں کہا جاسکتا ہے۔

بے شک اس وقت اسلام قبول کرنے والوں کے پیشِ نظر کوئی دنیاوی مفاد نہیں تھا بلکہ اس کا محرک صرف اور صرف ان کا حق پر ایمان تھا جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ان کو شرح صدر عطا کیا تھا، اسی طرح اس کا محرک نبی کریم ﷺ کی نصرت وتائید بھی تھی، اس محرک میں آزاد، غلام، مالدار اور فقیر سب شریک ہیں اور اس میں حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت بلالؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت صہیبؓ سب برابر ہیں۔ (دیکھیں: من معین السیرۃ، صالح الشامی، ص: 40)

استاذ صالح الشامی کہتے ہیں: ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم (سابقین اولین میں) کمزورں اور غلاموں کی موجودگی کی سرے سے نفی کریں ، بلکہ ہم صرف اس موقف کی تردید کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اکثریت میں تھے، اس لئے کہ یہ بات ثابت شدہ حقائق کے بر خلاف ہے، اگر ان کی اکثریت ایسے افراد پر مشتمل ہوتی تو یہ ایک طبقاتی دعوت قرار پاتی جس میں کمزور اور غلام طاقتور اور اصحابِ اقتدار کے خلاف کھڑے ہوتے ہیں ، ان تمام تحریکوں کی طرح جن کا مطمح نظر دنیاوی مفادات ہوا کرتے ہیں، اس طرح کی کوئی بھی سوچ اسلام قبول کرنے والے کسی بھی مسلمان کے حاشیۂ خیال میں نہیں تھی، وہ تو اس دین میں یہ سوچ کر داخل ہوتے تھے کہ وہ اس عقیدہ کے سایہ میں بھائی بھائی اور اللہ کے بندے بن کر رہیں گے ، اس دعوت کے اندر ایسی قوت اور کشش تھی کہ پہلے ہی مرحلہ میں اس کو قبول کرنے والوں کی اکثریت قوم کے شریف اور معزز افراد پر مشتمل تھی اور انہوں نے اس عقیدہ کی راہ میں ہر قسم کی تذلیل و تعذیب برداشت کرنے کو ترجیح دی، حالانکہ اس سے پہلے کبھی ان کو اس طرح کی آزمائشوں سے سابقہ نہیں پڑا تھا اور نہ ہی اس کے بارے میں کبھی سوچا تھا۔ (ایضاً)

اسلام انتہائی سرعت کے ساتھ ان باصلاحیت نفوس، روشن عقلوں، اور پاکیزہ دلوں میں سرایت کر رہا تھا، جن کو اللہ تعالیٰ نے اس دین کے لئے تیار کر رکھا تھا، ابتدائی مرحلہ میں اسلام قبول کرنے والوں میں یہ نام سر فہرست ہیں: حضرت خدیجہؓ، حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عبدالرحمنؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت ابو عبیدہؓ، حضرت ابو سلمہؓ، حضرت عثمان بن مظعونؓ، حضرت سعید بن زیدؓ، حضرت عبداللہ بن جحشؓ، حضرت جعفرؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت فاطمہ بنت الخطابؓ، حضرت خالد بن سعیدؓ، حضرت ابو حذیفہ بن عتبہؓ، اور دیگر اہم شخصیات کے نام ہیں۔ اور یہ سب سردارانِ قوم اور معزز افراد تھے۔ (دیکھیں: من معین السیرۃ، صالح الشامی، ص40)

یہ وہ سابقین اولین افراد ہیں جنہوں نے نبی کریم ﷺ کی دعوت پر ایمان لانے اور تصدیق کرنے میں سبقت کی۔

3) نبی کریم ﷺ کا دعوت میں استمرار و تسلسل:

نبی کریم ﷺ نے انتہائی رازداری کے ساتھ دعوت دینے کا عمل جاری رکھا، اپنے اقارب اور ساتھیوں میں سے انصار و متبعین کی ایک تعداد کو قبول اسلام کے لئے تیار کر لیا، خاص طور پر ان افراد کو اپنے ساتھ شامل کر لینے میں کامیابی حاصل کر لی جن کو مکمل رازداری کے ساتھ اسلام کے بارے میں مطمئن کر لینے کا موقع ملا، اور یہ تمام افراد رازداری کے ساتھ دعوت کے دائرہ کو وسیع کرنے کے سلسلہ میں اللہ کے رسول ﷺ کے بہترین مددگار اور سہارا تھے، رسول اللہ ﷺ کی دعوتی زندگی کے اس سخت جان مرحلہ میں رسول اللہ ﷺ اور دوسرے ایمان لانے والوں کو دعوتی کام کرنے کے سلسلہ میں کافی مشقت اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑا، اس لئے وہ صرف اسی فرد کو مخاطب بناتے تھے جس کے بارے میں ان کو پورا اطمئنان اور بھروسہ ہوتا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ دعوتی مراحل سست رفتاری اور احتیاط کے متقاضی ہوتے ہیں، اسی طرح ان کا لازمی تقاضا یہ بھی ہوتا ہے کہ دعوت کے مطالب و معانی کو ان کے مصدر و سرچشمہ سے حاصل کرنے میں اور پھر ان کی تنفیذ اور عملی جامہ پہنانے میں بھی مشکلات اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا، مثلاً دین میں داخل ہونے والے کے لئے ضروری تھا کہ وہ ابتدا سے ہی نماز کی پابندی کرے اور بقدرِ استطاعت قرآن کا بھی مطالعہ اور تلاوت کرے، لیکن وہ سب کے سامنے نماز نہیں پڑھ سکتا تھا اور نہ ہی قرآن کی تلاوت کر سکتا تھا، اس لئے مسلمان گھاٹیوں میں اور وادیوں میں چھپتے چھپاتے نماز ادا کرتے تھے۔ (دیکھیں: الغرباء الأولون، سلمان العودہ)

ا: حفاظتی احساس اور تدابیر:

اس مرحلہ کی اہم خصوصیت رازداری ہے یہاں تک کہ قریب ترین لوگوں سے بھی امور کو راز رکھا جاتا ہے، رازداری کے وجوب کی بارے میں نبوی احکام و اُوامر بالکل واضح اور دو ٹوک تھے، اللہ کے رسول ﷺ بعض اسلام قبول کرنے والوں کے گروپ تشکیل دیتے تھے اور یہ گروپ ربانی منصوبہ کے مطابق حفاظتی اقدامات اور مشق کے طور پر چھپتے تھے، نہ کہ بزدلی اور فرار کے طور پر، اس لئے اللہ کے رسول ﷺ نے چھوٹے چھوٹے گروپ اور ٹیمیں تشکیل دینا شروع کئے، وہ شخص جو طاقت و قوت اور مالی وسعت کا حامل ہوتا اپنے ساتھ ایک ایک دو دو اسلام قبول کرنے والوں کو شامل کر لیتا، اور وہ اسی کے ساتھ رہتے، اُسی کے زائد کھانے پر گزارہ کر لیتے، وہ ان کا ایک گروپ بنا لیتا، اور جو قرآن کا کوئی حصہ یاد کر لیتا وہ دوسرے کو سکھا دیتا، اس طرح ان گروپوں کے ذریعہ اخوت پر مبنی گروپ اور تعلیمی حلقے تشکیل پاتے۔

اللہ کے رسول ﷺ نے جس منہج کے مطابق اپنے متبعین کی تربیت فرمائی، وہ قرآن کریم کا منہج تھا، اور نبی کریم ﷺ اپنے اصحاب کی ہمہ جہت تربیت فرماتے تھے، عقائد و عبادات کے اعتبار سے، اخلاق اور حفاظتی حس کی بیداری کے اعتبار سے، اسی طرح دیگر پہلوؤں کے اعتبار سے، اسی لئے قرآن کریم میں ہمیں ایسی آیات ملتی ہیں جو احتیاطی اور حفاظتی تدابیر کو اختیار کرنے کے سلسلہ میں رہنمائی کرتی ہیں، اس لئے کہ امت کے عروج کے اہم اسباب میں ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس کے تمام افراد میں احتیاطی حس پروان چڑھے، خاص طور پر اس منظم گروہ میں یہ صفت موجود ہونی چاہیے جو اسلام کی طرف سے دفاع اور اس کو دنیا میں غالب کرنے کی سعی کی ذمہ داری ادا کر رہا ہو، یہی وجہ ہے کہ ہم

دیکھتے ہیں کہ احتیاطی اور حفاظتی تربیت کی اولین بنیاد مکہ مکرمہ میں رکھی گئی، اور دعوت کے دائرہ کے وسیع ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی نظام کے قیام تک اس میں بھی وسعت آتی چلی گئی، جن مکی آیات میں اس کی جانب رہنمائی کی گئی ہے ان میں سے ایک آیت یہ ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: [يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ] ترجمہ: میرے بچو، جا کر یوسفؑ اور اس کے بھائی کی کچھ ٹوہ لگاؤ، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، اس کی رحمت سے تو بس کافر ہی مایوس ہوا کرتے ہیں"۔(سورۂ یوسف:87)

اس آیت میں وجہِ استدلال یہ ہے کہ یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے مطالبہ کیا کہ وہ یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائی کے بارے میں کھوج کریں اور ان کو تلاش کریں۔ اس آیت کے ذریعہ ایک نبی کی طرف سے اس بات کا حکم اور ثبوت ملتا ہے کہ دوسروں کے بارے میں معلومات جمع کی جائیں، انٹیلیجنس کی دنیا میں معلومات کا حصول بنیادی عنصر کی حیثیت رکھتا ہے، معلومات کو جمع کرنے کے ضابطہ کو" ولا تيأسوا" یعنی "مایوس مت ہونا" مزید مؤکد کرتا ہے۔(دیکھیں: الاستخبارات العسكرية في الإسلام، عبدالله علي، ص:105)

بلاشبہ صحابہ کرام جس کو بھی اسلام کی دعوت دینا چاہتے تھے اس کے بارے میں معلومات جمع کرتے تھے اور قیادت کی رہنمائی اور نگرانی میں یہ کام ہوتا تھا، اسی لئے نبی کریم ﷺ نے سیکورٹی کا ایک مستحکم شعبہ قائم کیا تھا جو قیادت اور کارکنان کے درمیان منظم رابطہ کی نگرانی کرتا تھا تاکہ رازداری کے ضابطہ کی مکمل پاسداری ہو سکے۔

اس ضمن میں مکی آیات میں ہمیں یہ آیت بھی اس پہلو کی جانب رہنمائی کرتی ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے: [وَقَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ ۡ فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۙ وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰٓي اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ] ترجمہ:" اُس نے بچے کی بہن سے کہا اس کے پیچھے پیچھے جا، چنانچہ وہ الگ سے اس کو اس طرح دیکھتی رہی کہ (دشمنوں کو) اس کا پتہ نہ چلا۔ اور ہم نے بچّے پر پہلے ہی دُودھ پلانے والیوں کی چھاتیاں حرام کر رکھی تھیں (یہ حالت دیکھ کر) اُس لڑکی نے اُن سے کہا" میں تمہیں ایسے گھر کا پتہ بتاؤں جس کے لوگ اس کی پرورش کا ذمہ لیں اور خیر خواہی کے ساتھ اسے رکھیں؟"۔(سورۃ القصص:12،11)

اس آیت میں ہمیں مندرجہ ذیل نکات کی رہنمائی ملتی ہے:

1) موسی علیہ السلام کی ماں نے معلومات جمع کرنے اور حصول معلومات کے ضابطہ پر عمل کیا تاکہ اپنے بیٹے کی حفاظت کر سکیں۔ "اِقصّ" کا مطلب ہے: نشانات اور علامتوں کی کھوج لگانا اور معلومات جمع کرنا۔

2) اس فرد کا انتخاب کیا جو امین بھی ہے اور بذات خود حصول معلومات کا جذبہ اس کے اندر پایا جاتا ہے، تاکہ معلومات صحیح، قابل اعتماد اور امانت داری پر مبنی ہوں، چنانچہ موسی علیہ السلام کی والدہ نے بہن کے علاوہ اور کسی کا انتخاب نہیں کیا اس لئے کی کہ بہن کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو اس طرح کی صورت حال میں اندرونی جذبات سے سرشار ہوتی ہیں اور نہایت امانت داری سے یہ کام انجام دیتی ہے، معلومات جمع

کرنے اور خبریں معلوم کرنے کا جذبہ اس کی اپنے اندر کی آواز ہوتی ہے۔اس لئے یہ بات انتہائی اہمیت کے حامل ہے کہ انٹیلیجنس (معلومات حاصل کرنے) کے کام پر مأمور شخص کے اندر یہ جذبہ پایا جاتا ہو،اوراس کو یہ ذمہ داری ادا کرنے کا محرک اپنا جذبہ بھی ہو۔

3)کھوج، تلاش اور حالات کا جائزہ اس طرح ہو کہ نہ کوئی اشارہ کیا جائے اور نہ ہی دوسروں کی نگاہوں کو متوجہ کیا جائے، حضرت موسی علیہ السلام کی ماں نے بیٹی سے کہا: "قُصِّيۡهِ "(القصص:11)جس کے معنی ہیں:اس طرح کوشش کرنا کہ دوسروں کو پتہ نہ چلنے پائے۔اسی لئے موسی علیہ السلام کی بہن ان پر اس طرح نظر رکھتی ہیں کہ کسی کو اس کا احساس نہ ہو۔

4)معلومات جمع کرتے وقت انتہائی باریک بيني اور حاضر دماغی سے کام لیا جائے، ارشاد ہے[فَبَصُرَتۡ بِهٖ عَنۡ جُنُبٍ وَّهُمۡ لَا يَشۡعُرُوۡنَ] ترجمہ:"وہ الگ سے اس کو اس طرح دیکھتی رہی کہ (دشمنوں کو)اس کا پتہ نہ چلا"۔سورۃ القصص:11)

5)موسی علیہ السلام کی بہن نے دور حاضر کی انٹیلیجنس کے ایک اہم طریقہ کا استعمال کیا اور وہ ہے:اصل مسئلہ سے توجہ ہٹا کر دوسری بات ذہن میں ڈالنا،جب انہوں نے دیکھا موجود عورتیں موسی علیہ السلام کو دودھ پلانے سے بے بس ہوگئیں تو انہوں نے کہا:[هَلۡ اَدُلُّكُمۡ عَلٰٓى اَهۡلِ بَيۡتٍ يَّكۡفُلُوۡنَهٗ لَـكُمۡ وَهُمۡ لَهٗ نٰصِحُوۡنَ] ترجمہ:"میں تمہیں ایسے گھر کا پتہ بتاؤں جس کے لوگ اس کی پرورش کا ذمہ لیں اور خیر خواہی کے ساتھ اسے رکھیں؟"۔(سورۃ القصص:12)

6)معلومات جمع کرنے کے دوران ہدف اور مقصد تک پہنچنے کی کوشش کرنا۔چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے صرف اس پر اکتفا نہیں کیا کہ اس جگہ کا علم حاصل کرلیں جہاں موسیٰ علیہ السلام موجود تھے،بلکہ وہ کھوج کرتے کرتے موسیٰؑ کی جگہ معلوم کر کے وہیں پہنچ جاتی ہیں اور موسیٰ علیہ السلام کو اپنی والدہ کے پاس واپس پہنچانے کی کوشش کرتی ہیں اور اس میں وہ کامیاب ہو جاتی ہیں۔(دیکھیں:الاستخبارات العسکریہ فی الاسلام،ص111-112)

مذکورہ آیات کے ذریعہ صحابہ کرام کے اندر حفاظتی اور احتیاطی احساس بیدار کرنے کی اور دعوتی سفر میں احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کی تربیت کی جارہی تھی۔

یقیناً سیرت نبوی ﷺ میں افراد کی تربیت سے لے کر اسلامی نظام کے قیام تک احتیاطی تدابیر اور حفاظتی اصول وضوابط کے بارے میں رہنمائی موجود ہے،اسلامی تحریکوں اور مسلم ممالک کے لئے ضروری ہے کہ وہ دورِ حاضر میں ترقی یافتہ حفاظتی وسائل اور خفیہ ایجنسیاں قائم کریں،جو دشمنانِ اسلام یہود، نصاری اور ملحدین سے اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کر سکیں،اسی طرح داخلی سطح پر دشمنوں کی سازشوں سے مسلمانوں کو محفوظ رکھ سکیں اور مخالفین اور معارضینِ اسلام کی سازشوں کو بے نقاب کرتی رہیں،تاکہ ایمان سے آراستہ ان خفیہ ایجنسیوں کی دی گئی معلومات سے قیادت استفادہ کرسکے،البتہ یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ یہ ایجنسیاں قرآن اور سنت کے اصول وضوابط کے مطابق قائم کی جائیں اور ان میں کام کرنے والے افراد کے اخلاق انتہائی اعلیٰ اور بلند ہوں جن کی زندگیوں میں ایمان اور اسلام سے آراستہ سپاہیوں کی صفات کا عکس نظر آتا ہو۔

اس پہلو پر توجہ دینے کے نتیجہ میں مسلمان اچانک ہونے والے دشمنانہ حملوں سے محفوظ رہیں گے ،اس لئے کہ معروف قاعدہ ہے:
"جب تم نے دشمن کو پہچان لیا اور اپنے آپ کو بھی پہچان لیا تو پھر سو (100) معرکوں کے نتائج سے بھی ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔اور اگر آپ نے اپنے آپ کو پہچان لیا لیکن دشمن کو نہیں پہچانا تو پھر آپ کو ہر معرکہ میں شکست کا سامنا کرنا پڑے گا"۔
(دیکھیں:الاستخبارات العسکریۃ فی الاسلام،ص،111-112)

خفیہ ایجنسیوں اور انفارمیشن دفاتر کا قیام کوئی نئی چیز نہیں ہے، بلکہ یہ چیز ہمیشہ انسانی تاریخ میں موجود رہی ہے، اسی طرح نبوت اور خلافت راشدہ کے زمانہ سے لے کر آج تک مسلمانوں کی تاریخ میں یہ چیز ہمیشہ مختلف شکلوں میں موجود رہی ہے،تاکہ ان شعبوں کے ذریعہ قیادت کو صحیح معلومات اور رپورٹ ملتی رہے،اور وہ اسی کے مطابق مناسب منصوبہ بندی کرتے رہیں۔

عروج اور سربلندی کے اہم ترین اسباب میں ایک اہم سبب یہ ہے کہ اس پہلو پر کماحقہ توجہ دی جائے،اس میں ترقی کی جائے اور عصرِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق اس پر کام کیا جائے۔(دیکھیں: فقہ التمکین فی القران، علی الصلابی، ص311)

صحابہ کرام کی مختلف النوع تربیت کے سلسلہ میں نبی کریم ﷺ بذاتِ خود نگرانی اور رہنمائی فرماتے تھے، آپ ﷺ نے ان کو مختلف گروپوں میں تقسیم کیا تھا، مثلاً حضرت فاطمہ بنت الخطاب،ان کے شوہر حضرت سعید بن زید (یہ حضرت عمر بن خطابؓ کے چچازاد بھائی تھے) اور نُعیم بن عبداللہ النّحام بن عدی ایک گروپ میں تھے اور ان کے معلم واستاد حضرت خباب بن الأرت تھے۔اور ان کا کام صرف قرآن پاک کی تلاوت، اس کی تجوید، اس کو زیادہ سے زیادہ یا تیزی کے ساتھ پڑھ لینے تک محدود نہیں تھا بلکہ ان کا مشن اس کا بغور مطالعہ، اس کو سمجھنا، اس کے أوامر ونواہی کو جاننا اور اس پر عمل پیرا ہونا تھا۔(دیکھیں: الدعوۃ الاسلامیہ، د-عبدالغفار محمد عزیز، ص96)

نبی کریم ﷺ انتہائی باریک بینی کے ساتھ منظم منصوبہ بندی کیا کرتے تھے، ہر مرحلہ اور ہر قدم کے لئے پوری تیاری کرتے تھے، آپ ﷺ اس بات کا مکمل ادراک رکھتے تھے کہ عنقریب ایک دن آنے والا ہے جب اعلانیہ طور پر دعوت دینے کا حکم دیا جائے گا،اور اس مرحلہ کے اپنے تقاضے اور مطالبات ہوں گے،اس لئے منظم مؤمن جماعت کے لئے ضروری ہے کہ رسولِ مربیؐ اپنے کارکن صحابہ کرامؓ کے ساتھ بار بار ملتے رہیں اور اس طرح کی ملاقات اور اجتماع کے لئے ایک مرکز ضروری ہے،اور حضرت خدیجہؓ کا گھر اب زیادہ افراد کے لئے کافی نہیں تھا، اس لئے نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی نظرِ انتخاب حضرت اَرقم بن اَبی الاَرقم کے گھر پر پڑی، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کو ادراک تھا کہ اس معاملہ میں انتہائی باریک بینی، رازداری، اور تنظیم کی ضرورت ہے اور کسی پُر امن اور نظروں سے دور جگہ کا ہونا ضروری ہے، جہاں مربی قائد اپنے متبعین کے ساتھ ملاقات کر سکیں، اس لئے کہ قائد اور متبعین کے درمیان مسلسل اور منظم ملاقاتیں عملی اور نظری تربیت اور قائدانہ اور داعیانہ شخصیت کی تعمیر کا بہترین ذریعہ ہیں۔

اللہ کے رسول ﷺ اپنے رفقاء اور متبعین کو اس طرح تیار کر رہے تھے کہ وہ ایک حکومت کے بانی، دعوت کے حاملین اور اُمت کے قائدین بن سکیں، اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ اللہ کے رسولؐ باریک بینی کے ساتھ اور رازدارانہ طریقہ سے تنظیمی ڈھانچہ کی تشکیل کا انتہائی درجہ کا اہتمام کرتے تھے، اگر آپ مجرد ایک داعی ہوتے تو یہ سب کچھ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

اگر آپ ﷺ صرف یہ چاہتے تھے کہ اس دعوت کو لوگوں تک پہنچا دیا جائے تو اس کے لئے بہترین اور مناسب جگہ خانہ کعبہ تھی جو قریش کے تمام لوگوں کی مجلس اور جمع ہونے کی جگہ تھا، لیکن معاملہ اس سے کچھ مختلف تھا، اس لئے ضروری تھا کہ تنظیمی امور میں اپنے رفقا کے ساتھ ملنے کی جگہ کے سلسلہ میں اور ملاقات کے اس طریقہ کے بارے میں انتہائی رازداری سے کام لیا جائے۔ (دیکھیں: دولۃ الرسول ﷺ من التکوین الی التمکین، ص:218)

۲) دار اَرقم بن اَبی الاَرقم - قیادت کا مرکز:

کتبِ سیرت میں مذکور ہے کہ دار اَرقم کو نبوی قیادت کا مرکز اس وقت بنایا گیا جب کہ اہل ایمان اور مشرکین کا پہلی مرتبہ آمنا سامنا ہوا، اور اس میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے دفاعی کردار ادا کیا تھا۔ ابن اسحاقؒ فرماتے ہیں: اصحابِ رسول ﷺ جب نماز پڑھتے تھے تو مکہ کی گھاٹیوں میں چلے جاتے تھے اور لوگوں سے چھپ کر نماز پڑھتے تھے، ایک مرتبہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ مکہ کی ایک گھاٹی میں دیگر صحابہ کرامؓ کے ساتھ تھے کہ اچانک مشرکین کا ایک گروہ نمودار ہوا، جب کہ مسلمان نماز ادا کر رہے تھے، مشرکین نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور ان کے اس عمل پر ان کو برا بھلا کہا، نوبت لڑائی تک جا پہنچی، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے مشرکین میں سے ایک شخص کو اونٹ کی ایک ہڈی ماری جس سے وہ زخمی ہو گیا اور یہ اسلام میں بہایا جانے والا پہلا خون تھا۔ (سیرت ابن ہشام: 282- 1/281)

دار اَرقم دعوت کا ایک نیا مرکز بن گیا جہاں مسلمان جمع ہوتے تھے اور اللہ کے رسول ﷺ کی نصیحت، تذکیر اور تلاوت قرآن سنتے، اور اپنے دل کی باتیں اور اپنے حالات کو آپ ﷺ کے سامنے بیان فرماتے، آپ ﷺ اپنے سامنے اسی طرح ان کی تربیت فرماتے جیسے کہ آپ ﷺ نے اللہ کی نگرانی میں تربیت پائی تھی، اس مرکز میں جمع ہونے والے افراد نبیؐ کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان بن گئے۔ (دیکھیں: التربیۃ القیادیۃ 1/198)

۴: تربیت حاصل کرنے والی پہلی جماعت کی اہم خصوصیات:

جس پہلی جماعت نے اللہ کے رسول ﷺ کے زیر سایہ تربیت پائی، ان کے اندر ایسی اہم خصوصیات پیدا ہو گئیں جن کی وجہ سے مضبوط بنیادوں پر ان کی مسلم شخصیت پروان چڑھتی چلی گئی، جو ایک اسلامی حکومت اور بہترین تہذیب کے قیام کا ذریعہ بن سکے، اس گروہ کی اہم خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:

- **وحی کے سامنے سر تسلیم خم اور اس سے سرِ مو انحراف سے اجتناب:**

بلاشبہ عقائد و احکام اور آداب وغیرہ کے بارے میں کامل اور صحیح علم و فقہ کا اہم ترین سرچشمہ قرآن اور سنت کی شکل میں نازل شدہ وحی ہے، اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں، اس کے اسماء و صفات کے بارے میں، اور اس کے افعال کے بارے میں، صحیح اور یقینی علم حاصل ہوتا ہے، اسی طرح اس کی ذات کے بارے میں کن چیزوں کا لحاظ ضروری ہے، اور کن چیزوں سے وہ منزہ اور پاک ہے؟ اس کا بھی علم حاصل ہوتا ہے، علاوہ ازیں فرشتوں کے بارے میں، اللہ کی نازل کردہ کتابوں کے بارے میں، انبیاء کے بارے میں، آخرت کے بارے میں

اور جنت و جہنم کے بارے میں علم حاصل ہوتا ہے، مختلف شریعتوں کے بارے میں اجمالی اور تفصیلی علم اور مکلف افراد سے متعلق احکام کی تفصیلات بھی معلوم ہوتی ہیں، اسی طرح خوشی اور غضب، امیری اور غریبی، امن اور خوف، خیر اور شر اور صلح اور جنگ جیسے تمام حالات میں صحیح طرزِ عمل کے بارے میں مکمل رہنمائی حاصل ہوتی ہے، جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے ایمان کی نعمت سے سرفراز کیا ہے ان کا طرز عمل یہی ہوتا ہے کہ وہ ہر کام میں شرعی دلیل کی پابندی کرتے ہیں۔(دیکھیں: صفۃ الغرباء، سلمان العودۃ، ص:83)

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: [وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ أُمَّةٌ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ] ترجمہ: ”ہماری مخلوق میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو ٹھیک حق کے مطابق ہدایت اور حق ہی کے مطابق انصاف کرتا ہے“۔(سورۃ الأعراف:181)

صحابہ کرامؓ دلیلِ شرعی اور وحی کے ذریعہ تمام لوگوں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ رہنمائی حاصل کرتے تھے، اور دلیلِ شرعی کے سامنے سر تسلیم خم کر لیتے تھے، اس کے متعدد اسباب تھے، ان میں سے چند اسباب مندرجہ ذیل ہیں:

أ) ان کے دلوں کی پاکیزگی، شرعی نصوص کے علاوہ ہر قسم کی خواہش اور رجحان سے ان کا پاک ہونا، اور اللہ کے رسول ﷺ کے احکام کو قبول کرنے کی مکمل صلاحیت، بغیر کسی حرج، تردد اور پس وپیش کے مطلقاً ان کی اطاعت و پابندی۔

ب) احکام سازی اور نزول وحی کے وقت کی ہمعصری اور اللہ کے رسول ﷺ کی صحبت، یہی وجہ تھی کہ ان کو ان حالات اور پس منظر کا سب سے زیادہ علم تھا جن میں نصوص شرعیہ کا نزول ہوتا تھا، اور یہ بات بدیہی ہے کہ کسی بھی واقعہ یا نص کے نزول کے حالات اور پس منظر سے واقفیت، اس نص کو سمجھنے اور اس کی اصل روح سے واقفیت کا اہم ترین سبب ہے۔

ج) قرآن وسنت کے نصوص کا نزول اور ورود اکثر وبیشتر ایسے اسباب کی بنیاد پر ہوتا تھا جن کا تعلق انفرادی طور پر یا اجتماعی طور پر ان کے ساتھ ہوتا تھا، یہ نصوص ان کو براہِ راست خطاب کرتے تھے، اور اس کا ان پر اثر براہ راست ہوتا تھا، اس لئے کہ یہ نصوص پیش آمدہ مشاہداتی واقعات کا حل پیش کرتے تھے اور اس وقت رہنمائی کرتے تھے جبکہ نفوس میں اثر پذیری کی سب سے زیادہ صلاحیت ہوتی تھی، اور اس سلسلہ میں احکام کو قبول کرنے اور ان پر عمل کرنے کے لئے وہ بالکل تیار ہوتے تھے۔

د) نبوی عہد سے قریب ہونے کی وجہ سے نصوص کی چھان بین اور تحقیق کے سلسلہ میں وہ بریٔ الذمہ تھے، جب کہ بعد والوں کو ان کی تحقیق وتفصیل کی ضرورت پڑتی تھی، ان کو اکثر سلسلۂ اسناد (سند) کی ضرورت نہیں پڑتی تھی، نہ ہی ان کو راویوں کی تحقیق اور علت وسبب کو معلوم کرنے کی ضرورت پڑتی تھی، ان کے عہد میں صحیح اور غیر صحیح میں اختلاط کا کوئی اندیشہ نہیں تھا، اس لئے ان کے ہاں کسی بھی نص کے ثبوت کے سلسلہ میں کوئی تردد اور پس وپیش نہیں ہوتا تھا— جیسا کہ بعد کے زمانہ کے لوگوں کے یہاں ہوتا ہے—خاص طور پر مریضانہ ذہنیت کے حامل یا جاہل لوگوں کی وجہ سے جو صورت حال پیش آئی جنہوں نے نہ تو سنت کا روایۃً اور درایۃً مطالعہ کیا ہوتا ہے اور نہ ہی اس کو اچھی طرح سمجھا ہوتا ہے، دورِ نبوی اور دورِ صحابہ کی صورتحال تو یہ تھی کہ جب کسی کو یہ کہتے ہوئے سنتے تھے: قال رسول اللہ ﷺ (اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے) تو لوگ فوراً گوش بر آواز ہو جاتے، جیسے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا ہے۔(دیکھیں: صفۃ الغرباء، ص (94-92

- **وحی اور ایمان کے ذریعہ گہرا وجدانی تاثر:**

صحابہ کرامؓ کا طرزِ عمل علمِ صحیح کے بارے میں ایسا نہیں تھا کہ وہ مجرد علمی حقائق ہیں، جس کا تعلق عقل سے تو ہو مگر قلب وجوارح سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو، اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کے اُسماء وصفات اور اس کے افعال کے بارے میں صحیح علم کے نتیجہ میں ان کے اندر اللہ کی محبت، اس سے انتہائی درجہ کا لگاؤ، اس سے ملاقات اور جنت میں اس کے دیدار کا شوق پیدا ہوا تھا، اسی طرح اس کے ذریعہ ان کے اندر اللہ کی عظمت، اس کا خوف، اس کے عذاب، سزا، اس کی پکڑ کا ڈر پیدا ہوا تھا، اللہ کی رحمت وانعامات کی امید، اس کی جنت اور رضامندی کا لالچ، اور اس کے بارے میں حسنِ ظن بھی ان کے اندر پیدا ہو گیا تھا، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کے یہاں اللہ کے بارے میں علم اور اس پر ایمان کے آثار ونتائج محبت، خوف اور امید کی شکل میں مکمل طور پر ظاہر ہوتے تھے۔

جنت وجہنم کے بارے میں علم کے نتیجہ میں ان کے اندر ابدی وسرمدی نعمتوں کی رغبت اور دردناک عذاب کا خوف جاگزیں ہو گیا تھا، ان کے دلوں کی کیفیات بدلتی رہتی تھیں، کبھی وہ کسی نعمت کے امیدوار ہوتے تھے اور کبھی اس کے فوت ہونے کا اندیشہ لاحق ہوتا تھا، کبھی عذاب کے ڈر سے سہم جاتے تھے اور کبھی عذاب آنے کا خوف لاحق ہوتا تھا، اس لئے فکر مندی، خوف اور امید کے اعتبار سے ان کے دلوں میں آخرت بس گئی تھی، ایسا لگتا تھا گویا کہ وہ بعث بعد الموت، قیامت، میزان، پل صراط اور جنت وجہنم کے مختلف احوال کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتے تھے، تقدیر پر ایمان وعلم کے نتیجہ میں ان کے اندر توکل علی اللہ، اسباب پر عدمِ توکل، نعمتوں پر نہ اِترانا، آزمائشی مراحل میں غم نہ کرنا اور مانگنے میں حسنِ طلب جیسی صفات پیدا ہو گئی تھیں، ان کو اس بات پر یقین تھا کہ جو انسان کے مقدر میں ہے وہ اس کو مل کر رہے گا اور جو اس کے مقدر میں نہیں ہے وہ اس کو ہرگز نہیں مل سکتا ہے، اسی طرح تقدیر پر ایمان کے نتیجہ میں ان کے اندر شجاعت وبہادری اور اقدامی سوچ پیدا ہو گئی تھی، موت کے بارے میں صحیح علم وفہم اور اس پر ایمان کے نتیجہ میں ان کے اندر دنیا کی بے رغبتی، آخرت کا اہتمام اور عمل صالح کی پابندی جیسی صفات پیدا ہو گئی تھیں، اس لئے کہ کسی انسان کو اس کا علم نہیں ہے کہ اس کو موت کب لاحق ہو گی اور موت تو انسان سے قریب ہے، انہی جذبات ومفاہیم اور معانی کا پیدا کرنا حصولِ علم کا بنیادی مقصد ہے، اگر یہ مفقود ہوں تو پھر علم کوئی فائدہ نہیں دے سکتا ہے، بلکہ وہ دنیا اور آخرت دونوں اعتبار سے نقصان دہ ثابت ہو گا۔ (دیکھیں: صفۃ الغرباء، ص، 97)

صحابہ کرامؓ کو ان وجدانی معانی ومفاہیم کا ایک وافر حصہ ملا تھا، اس لئے کہ ان کا ایمان دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ کامل اور راسخ تھا، انہوں نے اِیمان کو براہِ راست تازہ بتازہ نبی کریم ﷺ سے حاصل کیا تھا، جو خواہشات اور غفلت کی ہر طرح کی آلودگی سے پاک تھا۔ (اَیضاً، ص، 102)

صحابہ کرامؓ دن کے شہسوار اور رات کے عبادت گزار تھے، ان کا علم، ان کا حقیقی ایمان اور اللہ کا خوف ان کے لئے خرید وفروخت، کھیتی باڑی، نکاح، اہل وعیال کی دیکھ ریکھ اور دیگر ضروریات اور دنیاوی امور کی انجام دہی میں مانع اور رکاوٹ نہیں بنتا تھا، خود پسندی اور غرور سے وہ انتہائی دور تھے، جبکہ ان کے بعد آنے والے بعض عبادت گزاروں کو یہ مرض لاحق ہو گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ دوسروں کے اعمال کو حقیر اور کمتر سمجھنے لگے، دین کے لئے دوسروں کی کوششوں کو اور ان کے مقام ومرتبہ کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگے، لہٰذا وہ فی الحقیقت اپنی ذات

کی عبادت اور اپنی ہی تعظیم کرنے لگے، اور اس طرح کا رویہ ہر اخلاقی برائی کی جڑ اور ہر عملِ خیر کو اکارت اور ضائع کرنے کا سبب ہے، جو لوگ اس مہلک بیماری کا شکار ہوتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ وہی تنہا اس دین کے ٹھیکیدار ہیں، دوسروں کے فضائل وصفات سے اپنی عقلیں اور نگاہیں موندھ لیتے ہیں اور ان کو صرف عیوب اور برائیاں نظر آتی ہیں، بلکہ فضائل اور اچھائیاں بھی ان کے نزدیک عیوب اور برائیاں بن جاتی ہیں۔ (دیکھیں: صفۃ الغرباء، ص، 103-104)

۵: نبی کریم ﷺ کی شخصیت اور قائدین بنانے میں اس کا اثر و کردار:

دار اُرقم بن اُبی الاُرقم تعلیم و تربیت کے اعتبار سے انسانی تاریخ کا سب سے بڑا مدرسہ تھا، ایسا کیوں نہ ہوتا جبکہ اس کے استاد و مربی تمام انسانیت کے معلم اللہ کے رسول ﷺ تھے، اور اس مدرسہ کے شاگرد اور متعلمین وہ داعی وہادی اور ربانی قائد تھے جنہوں نے انسانیت کو بندوں کی غلامی سے آزاد کرایا، اور ان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لایا، اور اللہ تعالیٰ نے اپنی نگاہوں کے سامنے ایسی تربیت کرائی جو نہ اس سے پہلے کی گئی اور نہ بعد میں کسی کی ایسی تربیت ہوئی۔ (دیکھیں: دولۃ الرسول ﷺ من التکوین الی التمکین، ص 219)

دار اُرقم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو صحابہ کرام کی ایسی پہلی جماعت تیار کرنے کی توفیق عطا فرمائی جس کو آپ ﷺ نے جاہلیت کی تاریکیوں سے نکال کر ایمان کی روشنی میں لاکر کھڑا کیا، اور وہ سب کے سب عظیم لوگوں، مشاہیرِ عالم اور تاریخ سازوں کی صف میں کھڑے ہوگئے، اور انسانی تاریخ کی عظیم ترین دعوت کے پیامبر قرار پائے۔

دار اُرقم کے مدرسہ کے فارغین کا شمار دنیائے انسانیت کے عظیم ترین لوگوں میں ہوتا ہے، یہی وہ لوگ ہیں جن پر دعوت و جہاد، اسلامی نظام اور اسلامی تہذیب کی بنیاد رکھی گئی، تاریخِ انسانی کوئی بھی ایک انسان حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عثمان بن عفانؓ، حضرت علی بن ابی طالبؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ جیسے افراد پیدا نہیں کر سکی!۔

عظیم ترین مربّی اللہ کے رسول ﷺ اس رازدارانہ اور خفیہ مرحلہ میں اور دار الاُرقم میں ان نابغۂ روزگار اور بے مثال افراد کی تربیت کرنے میں کامیاب ہوگئے، جنہوں نے توحید و جہاد اور دعوت کا عَلم اٹھایا تو پورا جزیرۃ العرب ان کے زیر نگین ہوگیا اور نصف صدی کے اندر انہوں نے عظیم فتوحات حاصل کیں۔

دعوت کے ابتدائی تین سالوں کے دوران دعوت کے لئے ابتدائی عناصر کے انتخاب کے سلسلہ میں آپ ﷺ نے اپنی تمام صلاحیتوں اور مہارت کو بروئے کار لایا، اسی طرح ان منتخب عناصر کی اس انداز سے تربیت کی اور اس طرح ان کو تیار کیا کہ وہ قیادت سنبھالنے اور رسالت کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے اہل ہوسکیں، اس لئے کہ عظیم پیغام حق اور بلند انسانی اہداف کو صرف نابغۂ روزگار، قائدانہ صلاحیت کے حامل بڑے لوگ اور دعوتی میدان کے شہسوار ہی اپنے کندھوں پر اٹھا سکتے ہیں، دار اُرقم دنیا کے مدارس اور یونیورسٹیوں میں ایک عظیم مدرسہ تھا، جس میں رسول مربی سابقینِ اولین کی پہلی صف کے منتخب اور چنیدہ افراد کے ساتھ ملتے تھے، اس مسلسل ملاقات کے ذریعہ اس تربیت گاہ کے سپاہیوں کو سپاہیانہ صفات، احکام کی بجاآوری، اطاعت و قیادت اور اس کے اصول و آداب کی عملی ٹریننگ اور تربیت دی جاتی تھی، اور اس فوج کا سب سے بڑا قائد اپنے سپاہیوں اور پیروکاروں کو اللہ پر اعتماد اور بھروسہ، عزیمت اور استقامت کا درس دیتا تھا، اور تعلیم

وتربیت اور تہذیب وتزکیہ کے ذریعہ ان کی شخصیت سازی کرتا تھا،اس منظم ملاقات کے ذریعہ عزائم مزید پختہ تر ہوتے تھے، عزم وہمت کو جلاملتی اور ایثار وقربانی اور انفاق کے جذبہ میں مزید شدت پیدا ہوتی۔(دیکھیں: دولۃ الرسول ﷺ من التکوین الی التمکین، ص: 220)

پہلی ربانی تربیتی تحریک کانقطہ آغاز یہ ہوتا تھا کہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ مدعو کی ملاقات ہوتی، صرف نبی کریم ﷺ سے ملاقات اور صحبت کے نتیجہ میں مدعو کے اندر ایک عجیب وغریب تبدیلی اوراچانک راہ یابی کی کیفیت پیدا ہو جاتی، چنانچہ وہ تاریکی کی دنیا سے نکل کر روشنی کی دنیا میں داخل ہو جاتا، ایمان سے فیضیاب ہو جاتا، اور کفر کے پردوں کو چاک کرکے پھینک دیتا اور وہ اس نئے دین اور بہترین عقیدہ کی راہ میں مصائب وآلام اور ہر قسم کی پریشانیاں برداشت کرنے کے لئے تیار ہو جاتا۔

اللہ کے رسول ﷺ کی شخصیت اسلام کے لئے اولین محرک تھی کیونکہ آپ ﷺ کی شخصیت کے اندر قوّتِ کشش اور دوسروں پر اثر انگیزی کی زبردست صلاحیت تھی، اللہ تعالیٰ نے اپنی نگاہوں کے سامنے آپ کو بنایا تھا اور تاریخ اُرضی میں آپ ﷺ کو کامل ترین اور عظیم انسان بنایا تھا، عظمت ہمیشہ محبوب ہوتی ہے اور انسانوں کی طرف سے اس کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، اس کو پسند کرنے والے اس کے ارد گرد جمع ہوتے ہیں اور پسندیدگی اور محبت کے جذبات کے ساتھ اس کے ساتھ چمٹے رہتے ہیں، اللہ کے رسول ﷺ کو اس عظمت کے ساتھ ساتھ یہ مقامِ بلند بھی حاصل تھا کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول تھے، اللہ کی طرف سے نازل ہونے والی وحی کو حاصل کرنے والے اور پھر اس وحی کو لوگوں تک پہنچانے والے تھے، یہ آپ ﷺ کی شخصیت کا ایک دوسرا پہلو ہے جس کا ایک مؤمن کے جذبات کو مہمیز دینے میں اپنا خاص اثر ہے، ایک مؤمن آپ ﷺ سے صرف آپ کی ذات کی وجہ سے محبت نہیں کرتا ہے جیسے کہ عام عظماء سے محبت کی جاتی ہے، بلکہ آپ ﷺ سے محبت اس ربانی عنصر کی وجہ سے کی جاتی ہے جس کو من جانب اللہ آپ کی شخصیت میں شامل کیا گیا تھا، چنانچہ صاحبِ ایمان شخص اللہ کی طرف سے نازل کی جانے والی وحی کے وقت آپ کے ساتھ ہوتا تو وہاں وہ آپ کی شخصیت میں عظیم انسان اور عظیم رسول کا مشاہدہ کرتا اور بالآخر دونوں حیثیتیں ایک قالب کی شکل اختیار کرلیتیں جس کے آغاز وانتہا میں امتیاز نہیں کیا جاسکتا تھا، رسالت کی صفات کے حامل انسان یا انسانی صفات کے حامل رسول کے ساتھ انتہائی گہری اور لامحدود محبت پائی جاتی، اللہ تعالیٰ کی محبت اس کے رسول ﷺ کی محبت کے ساتھ مربوط ہو جاتی، اور دونوں قسم کی محبتیں صاحب ایمان شخص کے دل میں گھل مل جاتیں، اور اس کے احساسات و جذبات کے لئے دونوں قسم کی محبتیں نقطۂ ارتقاء بن جاتیں اور شعوری وعملی تمام حرکات وسکنات کا محور بن جاتیں، صحابہ کرام کی پہلی صف کے لئے محرک بننے والی پہلی محبت اسلامی تربیت کی کنجی، اس کا نقطۂ ارتکاز اور اس کا نقطہ آغاز تھی۔(منہج التربیۃ الاسلامیہ، محمد قطب، ص 35-34)

۶: دار اُرقم کا نصابِ تعلیم وتربیت:

دار اُرقم میں نبی کریم ﷺ جس نصاب تعلیم کے مطابق تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے وہ قرآن کریم کا نصاب تھا، وہی تنہا حصولِ علم کا ذریعہ اور سرچشمہ تھا، حبیبِ مصطفی ﷺ نے حصولِ علم کے اسی ایک سرچشمہ سے سیراب ہونے پر انحصار کرنے کو پسند فرمایا اور چاہا کہ قرآنِ کریم ہی تنہا وہ منہج، نصاب اور مرکزی فکر ہو جس کے مطابق ایک مسلمان فرد کی، مسلمان خاندان کی اور مسلمان جماعت کی تربیت

ہو، روح القدس حضرت جبرئیل علیہ السلام تازہ بتازہ رسول اللہ ﷺ پر آیات لے کر حاضر ہوتے تو صحابہ کرام اللہ کے رسول ﷺ کی زبان مبارک سے ان کو براہ راست سنتے، وہ ان کے دلوں میں جا گزیں ہوتیں، ان کی روح کے لئے غذا کا کام کرتیں، ان کے رگ وپے میں خون کی طرح سرایت کرتیں، ان کے دل اور روح قرآن کی آواز پر لبیک کہتے اور اس سے متاثر ہوتے جس کے نتیجہ میں ان میں سے ہر انسان اپنی اقدار، اپنے احساسات، اپنے اہداف و مقاصد، اپنے طرز زندگی اور اپنی امیدوں کے اعتبار سے ایک نئے انسان میں تبدیل ہو جاتا، اللہ کے رسول ﷺ کی شدید خواہش تھی کہ قرآن کریم ہی تنہا وہ نصاب اور سلیبس رہے جس کے مطابق صحابہ کرام کی تربیت ہو اور ان کی تعلیم وتربیت میں قرآن کے علاوہ کسی دوسری چیز کا عمل دخل نہ ہو۔ (دیکھیں: دولۃ الرسول ﷺ من التکوین الی التمکین، ص: 225)

دار اُرقم میں انہوں نے سیکھا کہ: قرآن کریم اور حبیبِ مصطفی ﷺ کی تعلیمات دونوں ہی دعوت، زندگی، حکومت اور تہذیب کے لئے اعلی ترین دستور اور قانون ہیں، قرآن کریم ہی تنہا ایسا سلیبس تھا جس کو مدرسہ اُرقم کے طلباء نے مربی اعظم حضرت محمد ﷺ کے پاس پڑھا، وہی حصولِ علم کا تنہا سرچشمہ تھا اور عظیم امت کی یکتائے روزگار نسل اسی کے مطابق پروان چڑھی، یہی قرآن اس امت کی زندہ کتاب اور خیر خواہ رہبر ورہنما ہے اور یہی اس کا وہ مدرسہ ہے جہاں سے وہ اپنی زندگی کا سبق حاصل کرتی ہے۔

بلاشبہ پہلی نسل نے قرآن کریم کو سنجیدگی اور احساس وشعور کے ساتھ حاصل کیا، اس کی تعلیمات کو سمجھنے کا اور باریک بینی کے ساتھ ان پر عمل پیرا ہونے کا انہیں انتہائی شوق تھا، چنانچہ وہ قرآنی آیات کے اندر ایسی چیزوں کے متلاشی ہوتے تھے جو ان کی موجودہ اور آئندہ کی زندگی کے تمام امور میں رہنمائی کا کام کر سکیں۔

پہلی نسل کی پرورش قرآن کریم کی تعلیمات کے مطابق ہوئی اور انہوں نے ان ربانی تعلیمات کے عملی نمونے پیش کیے، چنانچہ قرآنِ کریم ایسا الٰہی مدرسہ تھا جہاں سے داعی اور ربانی قائدین نکلے، اس مدرسہ سے ایک ایسی نسل نکلی، جس کی انسانی تاریخ میں نہ پہلے اور نہ بعد میں کوئی مثال ملتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اللہ کے رسول ﷺ کے قلبِ مبارک پر قرآن کریم کا نزول فرمایا تاکہ آپ ﷺ اس کے ذریعہ ایک امت کی بنیاد ڈالیں، اس کے ذریعہ ایک حکومت کا قیام عمل میں لائیں، اس کے ذریعہ ایک معاشرہ تشکیل دیں، ضمیر، اخلاق اور عقلوں کی تربیت کریں اور اس کے ذریعہ عقائد، تصورات، اخلاق اور احساسات وجذبات کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کریں، چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ نے پہلی ایک ایسی مسلم جماعت تیار کی جو عقائد کے اعتبار سے، روحانی، اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی اعتبار سے تمام میدانوں میں تمام معاشروں سے فائق اور ممتاز تھی۔ (دیکھیں: دولۃ الرسول ﷺ من التکوین الی التمکین، ص 335)

۷: دارِ اُرقم کے انتخاب کے اسباب:

دار اُرقم کو تربیت گاہ کے طور پر منتخب کرنے کے متعدد اسباب تھے، ان میں سے چند اہم اسباب مندرجہ ذیل ہیں:

1) حضرت اُرقمؓ کا مسلمان ہونا معروف ومشہور نہیں تھا، ان کے اسلام لانے کی خبر ابھی عام نہیں تھی، اس لئے کسی کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں آتی تھی کہ حضرت محمد ﷺ اور ان کے اصحاب کی ملاقات ان کے گھر میں ہوتی ہے۔

2)حضرت اَرقم بن اَبی الارقمؓ کا تعلق قبیلۂ بنی مخزوم سے تھا،اور قبیلۂ بنی مخزوم اور بنو ہاشم کی آپس میں سخت دشمنی تھی،بنو ہاشم کے خلاف جنگ کی قیادت قبیلۂ مخزوم ہی کرتا تھااور حضرت اَرقم کا اسلام لانا بھی معروف نہیں تھا،اس لئے کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ ملاقات ان کے گھر میں ہو سکتی ہے، کیونکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ ملاقات دشمن کی صفوں کے درمیان ہو رہی ہے۔

3)حضرت اَرقم بن اَبی الارقم قبولِ اسلام کے وقت کم عمر نوجوان تھے، چنانچہ وہ اس وقت تقریبا سولہ (۱۶) سال کے تھے، لہذا اگر قریش کے لوگ اسلامی مرکز کے بارے میں تلاش اور تحقیق کریں گے تو ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی ہے کہ وہ مرکز اصحاب محمد ﷺ میں سے کم عمر نوجوان کے گھروں میں ہو سکتا ہے، بلکہ ان کی تلاش و تحقیق کبارِ صحابہ یا بذات خود نبی کریم ﷺ کے گھر سے شروع ہو گی۔

ان کے ذہن میں یہ بات آسکتی تھی کہ زیادہ امکان یہ ہے کہ اہل ایمان کے جمع ہونے کا مقام بنی ہاشم کا کوئی گھر، یا حضرت ابو بکر صدیقؓ کا، یا اور کسی کا گھر ہو سکتا ہے،اسی لئے معلوم ہوتا ہے کہ اس گھر کا انتخاب سیکورٹی اور حفاظتی اعتبار سے انتہائی حکمت پر مبنی تھا، سیرت و تاریخ میں کہیں یہ بات نہیں ملتی ہے کہ کبھی قریش نے اس مرکز پر حملہ کیا ہو یا ملاقات واجتماع کی اس جگہ کا انکشاف کیا ہو۔(دیکھیں: المنہاج الحرکی، العضبان 1/49)

۸: پہلی جماعت کی صفات:

دعوت کے پہلے مرحلہ میں رازداری اور انفرادی رابطہ کے اصول کے مطابق کام کیا جا رہا تھا،اور نبوی منصوبہ بندی انتہائی باریک بینی پر مبنی، منظم اور مستحکم سیاست پر قائم تھی، اللہ کے رسول ﷺ نے دار اَرقم کا انتخاب صرف اس لئے نہیں کیا تھا تاکہ وہاں مسلمان جمع ہو کر بعض نصیحتیں، کچھ مواعظ اور چند ارشادات گوش گزار کر لیتے، بلکہ وہ قیادت کا ایک اہم مرکز تھا، تعلیم و تربیت کا مدرسہ تھا،اور دعوت و قیادت کی تیاری کی ایسی تربیت گاہ تھا جہاں پر سکون طریقہ سے گہرائی کے ساتھ انفرادی تربیت پر توجہ مرکوز تھی، بعض افراد اور عناصر پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی تاکہ وہ دعوت و قیادت کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکیں، گویا کہ رسول مربی ﷺ نے ان میں سے ہر فرد کے لئے اس کا کام مکمل باریک بینی اور حکیمانہ تنظیم کے ساتھ متعین کر رکھا تھا۔ ہر شخص اپنے متعلقہ کردار کو اچھی طرح جانتا تھا اور ہر شخص دعوت کی طبیعت اور دعوت کے اس وقت کے مرحلہ سے اچھی طرح واقف تھا،اور ہر شخص انتہائی احتیاط، مکمل رازداری اور پابندی کا اہتمام کرتا تھا۔(دیکھیں: دولۃ الرسول ﷺ، من التکوین الی التمکین، ص237)

مکی دور میں مؤمن جماعت کی تشکیل و تعمیر انتہائی سکون، تدریج اور رازداری کے ساتھ ہو رہی تھی،اور اس مرحلہ کا شعار اللہ عزوجل کی وہ ہدایت تھی جس کو قرآن پاک میں یوں بیان کیا گیا ہے:[وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا] ترجمہ: ”اور اپنے دل کو اُن لوگوں کی معیت پر مطمئن کرو جو اپنے رب کی رضا کے طلب گار بن کر صبح و شام اُسے پکارتے ہیں،اور اُن سے ہر گز نگاہ نہ پھیرو ، کیا تم

دنیا کی زینت پسند کرتے ہو؟ کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی اختیار کرلی ہے اور جس کا طریق کار افراط و تفریط پر مبنی ہے"۔(سورۂ کہف:28)

اس آیت کریمہ میں نبی کریم ﷺ کو حکم دیا گیا ہے کہ دعوت کو قبول کرنے والوں کی لغزشوں اور خطاؤں پر صبر کرتے رہیں، ان کے زیادہ سوالات اگرچہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہوں، کو بھی برداشت کرتے رہیں، اسلامی تعلیمات کو قبول کرنے کے سلسلہ میں اگر وہ پس و پیش کا شکار ہوں، اس کو بھی برداشت کرتے رہیں، اعدائے دعوت کی فتنہ پروری اور آزمائشوں پر ان کو صبر کی تلقین کرتے رہیں، اور ان کے سامنے اس کی وضاحت کریں کہ اس دعوت کی طبیعت کیا ہے؟ اور یہ مشکل اور دشوار ہے اور کوئی دھوکہ دینے والا اس کے بارے میں دھوکہ نہ دینے پائے جس کے ذریعہ وہ اس کو دعوت سے دور کر دے، کسی تنقید کرنے والے کی بات پر دھیان نہ دیا جائے، اور کسی ایسے متکبر کی بات نہ تسلیم کی جائے جس کے دل کو اللہ تعالیٰ نے حقائق کو سمجھنے سے غافل کر دیا ہو۔(دیکھیں: الطریق الی جماعۃ المسلمین، حسین بن محسن، ص: 170)

سورہ کہف کی مذکورہ آیت کریمہ ہمارے سامنے اولین مسلم جماعت کی بعض صفات کو بیان کرتی ہے ان میں سے چند اہم صفات مندرجہ ذیل ہیں:

أ- "واصبر نفسک" میں صبر":

صبر کا لفظ قرآن کریم میں اور نبی کریم ﷺ کی احادیث میں بار بار وارد ہوا ہے، لوگ بھی ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے رہتے ہیں، اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ خسران اور گھاٹے سے بچنے والے گروہوں کی چار صفات میں ایک اہم صفت کے طور پر اس کا ذکر کیا گیا ہے ارشاد ربانی ہے: وَالْعَصْرِ (1) إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ (2) إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (3)] ترجمہ: "قسم ہے زمانہ کی! بے شک انسان گھاٹے میں ہے، مگر جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے اور حق پر قائم رہنے کی اور صبر کرنے کی آپس میں وصیت کرتے رہے"۔(سورۃ العصر: 1-3)

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کے لئے گھاٹے اور نقصان کا حکم لگایا ہے سوائے ان لوگوں کے جو ان چار صفات کے حامل ہوں:

ا: ایمان باللہ۔ ۲: عمل صالح۔ ۳: ایک دوسرے کو حق کی وصیت۔ ۴: ایک دوسرے کو صبر کی وصیت۔

اس لئے کہ انسان کو اسی صورت میں نجات مل سکتی ہے جب کہ وہ اپنے آپ کو ایمان اور عمل صالح کے ذریعہ مکمل کرے اور دوسرے کو نصیحت و رہنمائی کے ذریعہ کامل اور مکمل بنانے کی کوشش کرے، جس کے ذریعہ وہ حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کی ادائیگی کا جامع ہوگا، اور ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کرتے رہنا، اس راہ کی ایک ضرورت ہے، اس لئے کہ ایمان اور عمل صالح پر قائم رہنا اور حق اور عدل کی حفاظت و نگہبانی مشکل ترین ذمہ داری ہے، جس کی ادائیگی میں فرد کو بھی اور جماعت کو بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور نفس کا مقابلہ کرنے کے لئے اور غلط کار افراد کا مقابلہ کرنے کے لئے صبر کی ضرورت پڑتی ہے، اسی طرح مصائب و آلام اور تکالیف برداشت کرنے کے لئے صبر کی ضرورت پڑتی ہے، باطل کی خود سری اور سرکشی کے مقابلہ میں صبر کی ضرورت پڑتی ہے، راہ کے دراز ہونے، مراحل کی سست رفتاری، نشانِ راہ کے مٹ جانے اور منزل کی دوری پر صبر کی ضرورت پڑتی ہے۔(دیکھیں: فی ظلال القرآن 6/3968)

ب- دعااور اللہ کے سامنے آہ وزاری کی کثرت:

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں اس صفت کا ذکر کیا گیا ہے: "یدعون ربہم بالغداۃ والعشی"۔ دعا ایک دروازہ ہے جب وہ بندے کے لئے کھل جاتا ہے تو اس پر خیر کی بارش شروع ہوتی ہے، اور برکتوں کے چشمے پھوٹ پڑتے ہیں، اس لئے جن افراد کو پیغامِ حق اور امانت کی ادائیگی کے لئے تیار کیا جا رہا ہو، ان کے لئے ضروری ہے کہ ان کی تربیت اس طرح کی جائے کہ ان کا اپنے رب سے بہترین تعلق ہو، اور کثرت سے وہ اس سے دعا بھی کرتے رہیں، اس لئے کہ یہ نصرت و مدد کے عظیم اور اہم ترین عوامل میں سے ہے۔ (دیکھیں: فقہ التمکین فی القرآن الکریم، ص 221)

ج- اخلاص وللہیت:

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں اس صفت کا ذکر کیا گیا ہے: "یریدون وجہہ" ۔ افراد کی ربانی تربیت کرتے ہوئے یہ بات لازمی ہے کہ ان کی تربیت اس انداز سے کی جائے کہ ان کے اقوال، اعمال اور ان کی تمام کوششیں اللہ کی رضا کے لئے اور بہترین اجر و ثواب کی نیت سے ہوں، کسی طرح کے منصب، مال و متاع، لقب یا ترقی یا تنزلی کا حصول پیش نظر نہ ہو، یہاں تک کہ عقیدہ کے لئے اور نظام الٰہی کے نفاذ اور دفاع کے لئے وہ ایک سپاہی کا کردار ادا کرنے کے لئے تیار رہیں، اور اپنے عمل اور زبانِ حال سے گواہی دے رہے ہوں کہ : [قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ] ترجمہ: "کہو، میری نماز، میرے تمام مراسم عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنا، سب کچھ اللہ رب العالمین کے لئے ہے، جس کا کوئی شریک نہیں، اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے سر اطاعت جھکانے والا میں ہوں"۔(سورۃ الأنعام:162-163)

بلاشبہ اخلاص، قبولِ عمل کے لئے ایک اہم ترین رکن ہے اور یہ بات معلوم ہے کہ اللہ کے نزدیک عمل اسی وقت قبول ہوتا ہے جب اس میں اخلاص اور صحیح نیت ہو اور وہ شریعت و سنت کے عین مطابق ہو۔

د- ثابت قدمی:

اللہ تعالیٰ کے اس قول میں اس صفت کا ذکر کیا گیا ہے: [وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ] ترجمہ: "اور اُن سے ہرگز نگاہ نہ پھیرو"۔

ثابت قدمی کی مذکورہ صفت عمومی ثابت قدمی کی ایک اہم قسم ہے جس سے ایک داعی ربانی کا متصف ہونا ضروری ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: [مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ڮ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا] ترجمہ: "ایمان لانے والوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے اللہ سے کئے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا ہے، ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی وقت آنے کا منتظر ہے انہوں نے اپنے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں کی"۔(سورۂ احزاب:23)

آیت کریمہ میں تین صفات کا ذکر کیا گیا ہے: ایمان، جواں مردی، سچائی۔

راہِ حق اور منہج ربانی پر ثابت قدمی کے لئے یہ عناصر لازمی اور اہم ہیں، اس لئے کہ ایمان انسان کو اعلیٰ اقدار کو اختیار کرنے اور ان کو مضبوطی کے ساتھ پکڑنے پر آمادہ کرتا ہے، اور پھر اعلیٰ مقصد کے بقا کے لئے جان کی قربانی تک کے لئے انسان کو تیار کرتا ہے۔

'جواں مردی'نفس کو اس مقصد کی جانب گامزن ہونے کے لئے مہمیز دینے اور تحریک کا کام کرتی ہے، چھوٹے چھوٹے امور کی پرواہ کئے بغیر ہمیشہ بلند ہدف اور اعلی مقصد کی جانب اس کو ابھارتی رہتی ہے۔

'سچائی' کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر قسم کے تغیر و تبدیلی سے انسان کو روکتی ہے، ان تینوں صفات کے نتیجہ میں ایسی ثابت قدمی پیدا ہوتی ہے کہ انسان تلوّن اور دورنگی سے بالکل دوری اختیار کرتا ہے، اگرچہ اس کی گردن پر تلوار لٹک رہی ہو، یا پھانسی کا پھندا اس کا منتظر ہو، یا دنیاوی مال و متاع اس کو حاصل ہو رہا ہو، یا کوئی لیلیٰ اس کی اسیرِ زلف ہو رہی ہو۔

بلاشبہ جن افراد کو دعوتی ذمہ داری کی ادائیگی کے لئے نظام اسلامی کے قیام کے لئے اور ایک نئی تہذیب کی تشکیل و تعمیر کے لئے تیار کیا جا رہا ہو، ان کے لئے ثبات و استقامت کی صفت انتہائی ضروری ہے، جو بلند ہدف، حسین و جمیل مقاصد اور اعلیٰ اقدار کے حصول و تکمیل میں مد و معاون بن سکے۔ (دیکھیں: دعوۃ اللہ بین التکوین والتمکین، د۔ علی جریشہ، ص: 91،92)

یہ وہ اہم صفات ہیں جن سے پہلی مؤمن جماعت متصف تھی۔

۹: قریش کے تمام ذیلی قبائل میں دعوت کا پھیلاؤ اور دعوت کی بین الأقوامی حیثیت:

دعوت کے رازداری والے مرحلہ میں قریش کے تمام ذیلی قبائل میں اسلام کی دعوت اور اس کے پھیلاؤ کے سلسلہ میں پورے توازن کا خیال رکھا گیا تھا، کسی بھی قبیلہ کا اس حیثیت سے پلڑا بھاری نہیں تھا، البتہ اس وقت اس طرح کی بات قبائلی زندگی کی فطرت کے برخلاف تھی، اگر اس سلسلہ میں توازن کا خیال نہ کیا جاتا تو اسلام اس وقت کے قبائلی طرزِ زندگی سے جدید دعوت کی حفاظت اور اس کے پھیلاؤ کے حوالے سے مکمل فائدہ حاصل کرنے سے قاصر رہتا، اور دوسرے قبائل قبولِ اسلام سے یہ دلیل دے کر کتراتے کہ دعوت کے ذریعہ مخصوص قبیلہ کو فائدہ پہنچایا جا رہا ہے، اور دوسرے قبائل کے مقابلہ میں اسی کے مقام و مرتبہ کو بلند کیا جا رہا ہے، شاید اسی متوازن حکمتِ عملی کا نتیجہ یہ تھا کہ قومی و قبائلی تحفظات سے بالاتر ہو کر تمام قریشی قبائل میں اسلام پھیلتا چلا گیا۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ کا تعلق قبیلۂ تیم سے تھا، حضرت عثمانؓ بن عفان کا تعلق بنو امیہ سے، حضرت زبیر بن العوامؓ کا تعلق بنو اسد سے، حضرت مصعب بن عمیرؓ کا تعلق بنو عبدالدار سے، حضرت علی بن ابی طالبؓ کا تعلق بنو ہاشم سے، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا تعلق بنو زہرہ سے، حضرت سعید بن زیدؓ کا تعلق بنو عدی سے، حضرت عثمانؓ بن مظعون کا تعلق بنو جُمح سے تھا، بلکہ اسلام قبول کرنے والوں کی ایک تعداد کا براہِ راست تعلق قریش سے نہیں تھا، چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا قبیلہ ہذیل سے، حضرت عتبہ بن غزوان قبیلۂ مازن سے، حضرت عبداللہ بن قیسؓ اشعریوں سے، حضرت عمار بن یاسرؓ قبیلۂ مذْحج کی شاخ عنس سے، حضرت زید بن حارثہؓ قبیلہ کلب سے، حضرت طفیلؓ بن عمرو قبیلۂ دوس سے، حضرت عمرو بن عبسہ قبیلۂ سلیم سے، حضرت صہیبؓ النمری قبیلۂ بنو النمر بن قاسط سے تھا۔ یہ بات بالکل واضح اور عیاں تھی کہ اسلام مکہ کے ساتھ ہی خاص نہیں تھا۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ، العمری 1/133)

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکمل منصوبہ بندی اور باریک بینی کے ساتھ، اور توکل علی اللہ کے ساتھ ساتھ اسباب کو اختیار کرتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھا، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مستحکم تربیت، باریک بینی پر مبنی تشکیل، وسیع آفاقی تعلیم، حفاظتی و احتیاطی تدابیر، معاشرہ کے ساتھ

فطری ہم آہنگی اور خفیہ مرحلہ کے بعد کے مرحلہ کے لئے مکمل تیاری کا اہتمام کیا، اس لئے کہ آپ ﷺ جانتے تھے کہ دعوت الی اللہ صرف اس لئے نازل نہیں ہوئی ہے کہ وہ ایک خفیہ دعوت کی حیثیت سے رہے اور ایک فرد کے بعد دوسرے فرد کو مخاطب بنایا جاتا رہے، بلکہ وہ تمام انسانوں پر حجت قائم کرنے کے لئے اور لوگوں کو شرک و جاہلیت کی تاریکیوں سے نکال کر اسلام اور توحید کی روشنی کی طرف نکالنے کے لئے آیا ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس دعوت کی حقیقت اور اس کے اصل میدان کے بارے میں ابتدائی مرحلہ میں واضح کر دیا تھا، اور مکی دور میں نازل والے قرآن میں دعوت کی وسعت اور اس کی عالمیت کا اعلان کر دیا گیا تھا، اشاد باری تعالیٰ ہے: [اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ] ترجمہ: "یہ تو ایک نصیحت ہے تمام جہان والوں کے لئے"۔ (سورۂ ص: 87)

دوسری جگہ ارشاد ہے: [وَمَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ] ترجمہ: "حالانکہ یہ تو سارے جہان والوں کے لئے ایک نصیحت ہے"۔ (سورۃ القلم: 52)

دعوت اس لئے آئی تھی تاکہ تمام انسانوں کو اس کا مخاطب بنایا جائے اور جن لوگوں کے لئے اللہ کی طرف سے خیر مقدر ہے ان کو غلط راہوں سے نکالا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دعوت کی خصوصیات ہیں: اعلان، کھل کر بیان کرنا، پہنچانا، واضح کرنا اور ڈرانا، اور اس ذمہ داری کو ادا کرتے ہوئے جس قسم کی تکذیب، تکلیف اور قربانیوں کی ضرورت پڑے سب کو برداشت کرتے رہنا۔

بے شک نبی کریم ﷺ کا ابتدائی مرحلہ کی دعوت میں رازداری سے کام لینا مخصوص حالات کی وجہ سے ایک استثنائی معاملہ تھا، وہ دعوت کے ابتدائی مرحلہ کی کمزوری اور اجنبیت کے حالات تھے، اور یہ بات ضروری ہے کہ اس صورتحال کو انہی خیالات کی روشنی میں سمجھا جائے۔

اگرچہ اسلام کے صلح وجنگ کے بہت سے امور میں رازداری مصلحت کا تقاضا ہے، البتہ یہ رازداری دعوت کے میدان میں بھی اہمیت کی حامل ہے، چنانچہ دعوت کو خفیہ رکھنا اس وقت کی صورتحال کا ایک تقاضا تھا، ورنہ اصل حکمتِ عملی یہ ہے کہ اللہ کے دین، اس کی شریعت اور اس کے احکام کو تمام لوگوں کے سامنے بیان کیا جائے۔ اور جہاں تک تعلق ہے دعوت کے علاوہ دوسرے وسائل کی منصوبہ بندی اور دیگر تفصیلات کا تو اس کا تعلق مصلحت سے ہے، جس کا فیصلہ غور وفکر اور اجتہاد کے ذریعہ کیا جائے گا، اس لئے کہ اس کی وجہ سے کتمانِ حق یا دین اور حق کے بارے میں خاموش رہنے کا جرم مرتب نہیں ہوتا ہے، اور ان امور کو بیان کرنا یا دوسروں تک پہنچانا بنیادی دعوت کا حصہ نہیں ہے، مثال کے طور پر دعوت کے ذریعہ ایمان لانے والوں کی تعداد کا مسئلہ، اس کا تعلق مصلحت سے ہے، اس کا تعلق اس ابلاغ وانذار کے ساتھ نہیں ہے جس کے لئے کتابوں کا نزول ہوا اور انبیائے کرام کی بعثت ہوئی، اس لئے اس تعداد کو پوشیدہ رکھا جاسکتا ہے اگر مصلحت کا تقاضا یہی ہو، البتہ دعوت اور تبلیغ کی ذمہ داری ادا کی جاتی رہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ دعوت کا اعلان کرنے کے بعد انذار کا فریضہ ادا کرنے کے بعد اور نبوت کا اعلان کرنے کے بعد بھی بہت سی چیزوں کو مخفی اور پوشیدہ رکھتے رہے جن کی وجہ سے ابلاغ اور بنیادی دعوت پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا، جیسے کہ متبعین اور ایمان لانے والوں کی تعداد، ان کے ساتھ ملنے کی جگہ اور مخالفین کی سازشوں کے مقابلہ میں اختیار کی جانے والی حکمتِ عملی اور منصوبہ بندی کا مسئلہ۔ (دیکھیں: الغرباء الأولون، ص124- 126)

تیسرا باب
مکی دور میں عقیدہ کی تعمیر

۱۔ قوانینِ الٰہیہ کے بارے میں نبی کریم ﷺ کا تفقہ:

بے شک حکومتوں کی تشکیل و تعمیر، قوموں کی تربیت اور قوموں کو عروج و ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کا مسئلہ ایسے اصول وضوابط اور قوانینِ الٰہیہ کے تابع ہے جو افراد واقوام اور حکومتوں کے سفر میں فیصلہ کن ہوا کرتے ہیں۔ حبیب مصطفی ﷺ کی سیرتِ پاک میں غور و فکر کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آپ ﷺ نے قوانینِ الٰہیہ اور ربانی اصول وضوابط پر انتہائی حکمت اور مہارت کے ساتھ عمل کیا ہے۔

ربانی سنن و قوانین اللہ تعالی کے وہ احکام ہیں جو اس کائنات میں ہر زمان و مکان میں انسان پر لاگو ہوتے ہیں، قوانین بہت زیادہ ہیں ان میں سے بعض وہ ہیں جن کا تعلق اس کتاب کے موضوع سے ہے، یعنی وہ قوانین جن کا اقوام کے عروج وزوال سے گہرا تعلق ہے۔

تمام کائنات کے رب اللہ کی مشیت کا تقاضا یہ رہا ہے کہ اس دین بلکہ اس کائنات کا نظام خرقِ عادت اور غیر فطری قوانین کے بجائے عمومی قوانین کے مطابق چلتا رہے، ایسا اس لئے ہے تاکہ بعد میں آنے والی کوئی نسل یہ کہہ کر پیچھے نہ ہٹ جائے کہ سابقہ لوگوں کی مدد تو خرقِ عادت اور غیر فطری چیزوں کے ذریعہ کی گئی، اور رسالت کے اختتام اور نبوّت کے منقطع ہونے کے بعد خرقِ عادت امور کا امکان ختم ہو گیا۔ (دیکھیں: واقعنا المعاصر، محمد قطب، ص414)

قرآن کریم کی آیات پر غور وفکر کرنے والے کے سامنے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآنی آیات ان قوانینِ الٰہیہ کے ذکر سے بھری ہوئی ہیں جن میں تغیر و تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں ہے، ان قوانین کو نمایاں طور پر بیان کرنے کا، ان کی جانب متوجہ کرنے کا، ان سے عبرت حاصل کرنے کا اور ان کے تقاضوں پر عمل کرنے کا خاص اہتمام کیا گیا ہے، تاکہ ایسے مسلم معاشرہ کی تعمیر ہو سکے جو اللہ کے احکام کی بجا آوری کرے۔

قرآنِ کریم جب اہل ایمان کو روئے زمین پر اللہ تعالی کے اصول و قوانین کی جانب متوجہ کرتا ہے تو اس کے ذریعہ وہ ان کو ان بنیادوں اور ضوابط کی جانب متوجہ کرتا ہے جن پر ان اصول و قوانین کی بنیاد ہے، اور مسلمان اس دنیا کی کوئی پہلی یا نئی قوم نہیں ہے، لہذا جو ضوابط اس کائنات، اقوام و ملل، حکومتوں اور افراد میں کار فرما ہیں وہ تغیر و تبدلی سے بالا تر ہیں، دنیا میں کوئی بھی کام بے ہنگم اور بغیر کسی ضابطہ کے نہیں ہوتا ہے، اور نہ ہی روئے زمین پر زندگی بے مقصد گزرتی ہے، بلکہ تمام امور اور زندگی ضوابط و قوانین کے تابع ہیں، لہذا جب مسلمان ان ضوابط و قوانین کا مطالعہ کریں گے اور ان کی روح کا ادراک کریں گے تو مختلف واقعات کے پیچھے کار فرما حکمتوں کے راز کھلیں گے اور ان واقعات کے مقاصد واضح ہو جائیں گے اور پھر ان کو اس نظام کے بارے میں اطمئنان ہو جائے گا جس کے مطابق یہ واقعات وقوع پذیر ہوتے ہیں، اسی طرح اس نظام کے پسِ پردہ پوشیدہ حکمت پر بھی اطمئنان ہو جائے گا، اور ماضی کی روشنی میں وہ آگے کے سفر کے نشانِ راہ معلوم کریں

گے اور وہ اس خام خیالی میں مبتلا نہیں ہوں گے کہ وہ مسلمان ہیں اس لئے وہ ہر حال میں اسباب اختیار کئے بغیر ہی نصرت و مدد اور عروج و سر بلندی کے مستحق قرار پائیں گے۔(دیکھیں: فی ظلال القرآن 1/478)

زندگی میں کار فرما اصول و ضوابط ایک جیسے ہیں، ان میں سے جو کسی زمانہ میں وقوع پذیر ہوئے ہیں ہر زمانہ میں وہی نافذ العمل اور جاری ہوں گے۔(ایضاً)

انہی ضوابط و قوانین کے مطابق اللہ تعالیٰ زندگی کا نظام چلاتا ہے، اور پوری کائنات انہی فطری قوانین کے تابعِ فرمان ہے، انسانی زندگی میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو بغیر کسی ضابطہ اور قانون کے وقوع پذیر ہوتی ہو، زندگی میں ہر چیز اللہ کے ان قوانین کے مطابق چلتی ہے، جن میں نہ کسی تبدیلی یا توقف کی کوئی گنجائش ہے اور نہ ہی وہ مخلوق میں سے کسی کی طرف داری کرتے ہیں، اور نہ ہی وہ انسانی خواہشات کے مطابق چلتے ہیں۔(دیکھیں: التمکین للأمۃ الاسلامیۃ، محمد السید، ص208)

مسلمانوں کو سب سے زیادہ اپنے رب کے ان قوانین کا ادراک ہونا چاہیے جو کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ میں ان کے لئے بیان کئے گئے ہیں تاکہ وہ اس عزت واقتدار کو حاصل کر سکیں جس کے وہ امیدوار ہیں، اس لئے کہ اقتدار یوں ہی نہیں ملتا ہے، نہ وہ بنا کسی ضابطہ اور قوانین کے بے ہنگم آسمان سے اترتا ہے، بلکہ اس کے لئے وہ ضوابط اور قوانین ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس کتاب میں درج کیا ہے تاکہ اس کے مؤمن بندے ان سے واقف ہوں اور پوری بصیرت کے ساتھ ان پر عمل پیرا ہوں۔(دیکھیں: جیل النصر المنشود، القرضاوی، ص15)

افراد و اقوام کے بارے میں فطری قوانین اور خدائی ضابطوں کے سلسلہ میں صحیح طرزِ عمل کی پہلی شرط یہ ہے کہ ہم ان قوانین کو صحیح طور پر مکمل آفاقیت اور وسعت کے ساتھ سمجھیں اور وہ خدائی ضابطہ کے مطابق کیسے عمل کرتے ہیں، اس سے بھی اچھی طرح واقف ہوں، جس کو "فقہ السنن" کہا جاتا ہے، پھر اسی فہم کے مطابق معاشرتی قوانین اور تہذیبی ضابطوں کا بھی استنباط کریں،(دیکھیں: المشروع الاسلامی لنھضۃ الأمۃ، قراءۃ فی فکر البنا، ص58)

خدائی قوانین کے بارے میں صحیح طرزِ عمل کے منہج کو بیان کرتے ہوئے شیخ حسن البناؒ فرماتے ہیں: ''کائنات کے فطری قوانین کے ساتھ تصادم والا رویہ نہ اپناؤ، اس لئے کہ وہ غالب اور نافذ ہونے والے ہیں، البتہ ان پر کنٹرول کرنے کی کوشش کرو، ان کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کرو، ان کے رخ کو بدلو، ان میں سے بعض قوانین کے ذریعہ اپنے حق میں مدد حاصل کرو اور نصرت و کامیابی کی ساعت کے منتظر رہو، اور وہ تم سے زیادہ دور نہیں ہے۔(دیکھیں: رسالۃ المؤتمر الخامس، ص: 127)

شیخ حسن البنا (رحمہ اللہ) کے اس کلام میں چند اہم نکات قابل غور ہیں:

۱۔ قوانینِ الٰہیہ کے ساتھ عدمِ تصادم ۲۔ قوانینِ الٰہیہ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کرنا

۳۔ قوانینِ الٰہیہ کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کرنا ۴۔ قوانینِ الٰہیہ کے رخ کو بدلنا

۵۔ اپنے حق میں مدد حاصل کرنا ۶۔ نصرت و کامیابی کی ساعت کا انتظار۔ (دیکھیں: المشروع الاسلامی لنھضۃ الأمۃ، ص58)

بے شک شیخ البناؒ کے بیان کردہ ان نقاط کے ذریعہ یہ پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے سیرت نبویہ، تاریخِ اسلامی اور اقوام کے تجربات کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے اور جس معاشرہ میں وہ رہتے تھے اس سے اچھی طرح واقف تھے، اور مرض کی بھی صحیح تشخیص کی اور اس کے لئے صحیح علاج بھی متعین کیا۔

پہلی اسلامی تحریک جس میں دعوتی کوششوں کو منظم کرنے کی، اسلامی نظام قائم کرنے کی اور مہذب ربانی اور مثالی انسان کی تعمیر کی قیادت اور باگ ڈور نبی کریم ﷺ کے ہاتھ میں تھی وہ تحریک ان قوانین وضوابط کے مطابق آگے بڑھ رہی تھی جن میں سے بعض کا ذکر اختصار کے ساتھ کر دیا گیا ہے، جیسے کہ تہذیبوں کی تعمیر میں قیادت کا ضابطہ، باطل کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک منظم مؤمن جماعت کی اہمیت، اس منہج کی اہمیت جس سے عقائد، اخلاق، عبادات، اقدار اور تصورات اُخذ کئے جاتے ہیں۔

اللہ تعالٰی کے انہی ضابطوں میں سے ایک ضابطہ تدریج کا ضابطہ ہے، اللہ تعالٰی کا یہ ضابطہ اس کی مخلوق میں اور پوری کائنات میں کارفرما ہے، یہ اللہ تعالٰی کے ان اہم قوانین میں سے ہے جس کو ملحوظ رکھنا امت کے لئے خاص طور پر اس وقت ضروری ہے جب کہ وہ اللہ کے دین کو سربلند کرنے اور خدائی نظام کو غالب کرنے کے لئے کوشاں ہو۔

اس ضابطہ کی اہمیت اس لئے بھی ہے کیونکہ راستہ انتہائی طویل ہے، خاص طور پر موجودہ زمانہ میں جس میں جاہلیت کا غلبہ ہے، اور اس نے ہر اعتبار سے پوری تیاری کر رکھی ہے، اسی طرح شر اور بگاڑ نے مختلف اقوام میں اپنی جڑیں مضبوط کر رکھی ہیں اور اس کو سرے سے ختم کرنے میں تدریج کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔

اسلامی تحریک کا پہلا مرحلہ بتدریج شروع ہوا جس میں رفقاء اور کارکنان کا قافلہ باریک بینی پر مبنی حکمتِ عملی کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا، چنانچہ سب سے پہلے موزوں افراد کے انتخاب اور بنیادیں قائم کرنے کا مرحلہ شروع ہوا، اس کے بعد براہِ راست دعوت دینے اور کشمکش کا مرحلہ آیا، اور پھر نصرت وکامیابی اور غلبہ کا مرحلہ آیا، یہ ممکن نہیں تھا کہ یہ تمام مراحل بیک وقت ایک ساتھ شروع ہوتے، ورنہ مشکلات اور بے بسی سے دوچار ہونا پڑتا، اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ ان میں سے کسی مرحلہ کو دوسرے سے مقدم کیا جائے ورنہ اضطراب اور پسپائی کا سامنا کرنا پڑتا۔ (دیکھیں: التمکین للأمة الاسلامیة، ص 227)

اس ضابطہ اور قانون کو پیش نظر رکھنا انتہائی اہم اور ضروری ہے، اس لئے کہ دعوتی میدان میں کام کرنے والے بعض افراد یہ سمجھتے ہیں کہ فتح ونصرت اور غلبہ راتوں رات حاصل ہو سکتا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ جس سوسائٹی میں امتِ مسلمہ رہتی ہے پلک جھپکتے ہی بدل ڈالیں، ان کی نگاہ نہ انجام پر ہوتی ہے اور نہ ہی وہ سوسائٹی کے حالات اور اس کے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، اور نہ ہی اس سوسائٹی میں دعوتی کام کا آغاز کرنے کے اُسباب ووسائل کے اعتبار سے کوئی تیاری کرتے ہیں۔ (دیکھیں: آفات علی الطریق 1/57)

اللہ تعالٰی نے کئی مقامات پر اس ضابطہ کی جانب توجہ مبذول کرائی ہے، چنانچہ اللہ تعالٰی نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، اُن دنوں کی حقیقت اور مقدار کا تو اللہ تعالٰی ہی بہتر جانتا ہے، البتہ اللہ تعالٰی پل بھر میں ان کو پیدا کرنے پر قادر تھا، اسی طرح انسان، حیوانات اور نباتات کی تخلیق کے مراحل کا معاملہ ہے،

ان تمام مخلوقات کی تخلیق بھی بتدریج ہوتی ہے یہاں تک کہ یہ مخلوقات اللہ تعالیٰ کے حکیمانہ ضابطہ کے مطابق نمو پاتی ہیں، اپنے کمال کو پہنچتی ہیں اور تکمیلی مرحلہ سے گزرتے ہوئے اختتام کو پہنچتی ہیں۔

شریعتِ اسلامی میں بھی تدریج کا ضابطہ واضح اور نمایاں شکل میں ایک طے شدہ ضابطہ ہے، یہ انسانوں کے لئے اسلام کے آسان ہونے کا ایک اہم پہلو ہے، کیونکہ اسلام میں جو بھی فرائض یا محرمات مشروع کئے گئے ہیں ان میں تدریج کے ضابطہ کا لحاظ کیا گیا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ جب نماز، روزہ، زکوۃ جیسے فرائض مشروع کئے گئے تو ان کو مرحلہ وار اور بتدریج شروع کیا گیا، یہاں تک کہ یہ اپنی تکمیل اور آخری شکل میں پہنچ گئے جس پر یہ بعد میں برقرار رہے۔(دیکھیں: التمکین للأمۃ الاسلامیۃ، ص227)

شاید یہی وجہ ہے کہ اسلام نے تدریج کی رعایت کرتے ہوئے غلامی کے نظام کو بالکل کالعدم قرار دینے کا اقدام نہیں کیا، جبکہ ظہورِ اسلام کے وقت غلامی کا نظام پوری دنیا میں عام اور رائج تھا، اس کو بالکلیہ ختم کر دینے کے نتیجہ میں معاشرتی اور اقتصادی زندگی میں ایک زلزلہ پیدا ہو جاتا، لہذا حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ اس کے دائرہ کو تنگ کیا جاتا بلکہ بقدرِ امکان اس کے سوتوں کو خشک کیا جاتا اور غلاموں کو آزاد کرنے کے لئے غلامی کے مصارف کو زیادہ سے زیادہ وسعت دی جاتی، جس کے نتیجہ میں تدریجاً غلامی کا نظام آہستہ آہستہ ختم ہو جاتا۔(دیکھیں: الخصائص العامۃ للاسلام، القرضاوی، ص،166)

جب ہم گہرائی کے ساتھ قرآن کریم اور سنتِ مطہرہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کیسے اور کس تدریج اور ہم آہنگی کے ساتھ بلادِ عرب میں اور وہاں سے پوری دنیا میں نبی کریم ﷺ کے ذریعہ اسلامی انقلاب برپا ہوا ــــ چنانچہ تمام امور آہستہ آہستہ رفتار کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے، یہاں تک کہ وہ اس مقام پر آکر ٹھہر گئے جہاں رب العالمین نے ان کا استقرار چاہا تھا۔(دیکھیں: التمکین للأمۃ الاسلامیۃ، ص229)

لوگوں کی رہنمائی اور قیادت کرتے ہوئے مناسب ہے کہ تدریج کے اس ربانی ضابطہ کا اہتمام اور خیال کیا جائے، اسی صورت میں اسلام کے نفاذ اور مکمل اسلامی زندگی پر عمل کرنے کی کوششوں کا نتیجہ غلبہ اور اقتدار کی شکل میں سامنے آئے گا، لہذا اگر ہم حقیقی اسلامی معاشرہ کی تشکیل چاہتے ہیں تو ہمیں اس خام خیالی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ ایسا کسی صدر مملکت، بادشاہ یا پارلیمنٹ اور اسمبلی کی طرف سے صادر ہونے والے حکم نامہ اور آرڈر کے نتیجہ میں ہو جائے گا، بلکہ ایسا اسی وقت ممکن ہے جب تدریج کے ضابطہ پر عمل کیا جائے گا، یعنی فکری، نفسیاتی اور اجتماعی ہر اعتبار سے مکمل تیاری کے بعد ہی یہ سب کچھ ممکن ہے۔

یہی وہ منہج تھا جسے نبی کریم ﷺ نے جاہلیت زدہ زندگی کو اسلامی زندگی میں تبدیل کرنے کے لئے اختیار کیا، آپ ﷺ تیرہ (13) سال مکہ مکرمہ میں رہے تو آپؐ نے وہاں رہتے ہوئے صرف اس پر توجہ مرکوز کی کہ ایک صاحبِ ایمان نسل کی تربیت کی جائے، جو دعوتی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکے، اور اس کی حفاظت اور پوری دنیا میں اس کی نشرواشاعت کے لئے جدوجہد کر سکے اور اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات کو برداشت کر سکے، یہی وجہ ہے کہ مکی دور میں تشریع اور احکام سازی اس قدر دیکھنے میں نہیں آتی ہے جس قدر تربیتی اور اجتماعی تشکیل کا پہلو نظر آتا ہے۔(دیکھیں: الخصائص العامۃ للاسلام، ص168)

۲- انقلاب و تبدیلی کا ضابطہ اور عقیدہ کی تعمیر کے ساتھ اس کا تعلق:

عروج و سربلندی کے اہم ضابطوں میں سے ایک ضابطہ وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں بیان فرمایا ہے: [لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۭ وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْۗءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ] ترجمہ: "ہر شخص کے آگے اور پیچھے اس کے مقرر کئے ہوئے نگراں لگے ہوئے ہیں جو اللہ کے حکم سے اس کی دیکھ بھال کر رہے ہیں حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی اور جب اللہ کسی قوم کی شامت لانے کا فیصلہ کر لے تو پھر وہ کسی کے ٹالے نہیں ٹل سکتی، نہ اللہ کے مقابلہ میں ایسی قوم کا کوئی حامی و مددگار ہو سکتا ہے"۔(سورۂ رعد، 11)

امت کے عروج و سربلندی کے ساتھ اس ربانی ضابطہ کا تعلق بالکل صاف اور واضح ہے، اس لئے کہ امت مسلمہ کی موجودہ صورتحال میں اس کے لئے عروج و سربلندی کے حصول کا امکان نہیں ہے، اس لئے اس صورتحال میں تبدیلی ضروری ہے، اسی طرح اس امت کو عروج و غلبہ ہر گز حاصل نہیں ہو سکتا ہے جس نے اپنے لئے ذلت و پسماندگی کی زندگی کو پسند کر رکھا ہو اور اپنی صورتحال کو بدلنے کے لئے اور غلامی کی زنجیروں سے آزاد ہونے کے لئے کوشاں نہ ہو۔(دیکھیں: التمکین للأمۃ الاسلامیہ، ص210)

جب پہلی مرتبہ اسلام کا سورج طلوع ہوا اس وقت اس کو جزیرۃ العرب اور روئے زمین کے سخت قسم کے حالات کا سامنا کرنا پڑا، اس کو مختلف قسم کے اقدار و تصورات سے دوچار ہونا پڑا، مختلف نظامہائے حیات اور حالات اس کے مقابلہ میں آئے اور اس کی راہ میں الگ الگ مفادات اور تعصبات رکاوٹوں کی شکل میں حائل ہو گئے۔

جس روز اسلام کا آغاز ہوا اس وقت اس کے مابین اور جزیرۃ العرب اور پوری دنیا کی صورتحال کے مابین کی مسافت کافی دور تھی، اسلام جس مسافت کو طے کرنا چاہتا تھا وہ انتہائی دراز تھی، ایک طویل تاریخ اس وقت رائج صورتحال کا ساتھ دے رہی تھی، مختلف مصالح اور مفادات اس کے حامی اور مددگار تھے، مختلف قسم کی طاقتیں اس کے ساتھ تھیں، یہ تمام چیزیں اس نئے دین کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہو گئیں، یہ دین صرف چند عقائد، نظریات، اقدار، عادات، تقالید، اخلاق، اور جذبات کو تبدیل نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ وہ اس کے ساتھ ساتھ ہر قسم کے نظام کو، معاشرہ کو اور قوانین اور شریعت کو تبدیل کرنا چاہتا تھا، اسی طرح وہ طاغوت اور جاہلیت کے ہاتھ سے انسانوں کی قیادت کو لے کر اللہ اور اس کے ہاتھ میں دینا چاہتا تھا۔(دیکھیں: ھذا الدین، سید قطب، ص52-57)

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جو چیز ایک مرتبہ وقوع پذیر ہوئی وہ دوسری مرتبہ بھی ہو سکتی ہے، جو کچھ پیش آیا وہ ایک نافذ العمل ضابطہ کے مطابق ہوا، نہ کہ خرقِ عادت معجزات کے مطابق، یہ عمارت فطرت کے منہج کے مطابق تعمیر ہوئی، اور یہ فطری منہج ہر اس شخص کے لئے کارگر ہے جو بھی اس کے مطابق کام کرے گا، اس کو اپنے ذہن و دماغ میں جگہ دے گا اور صحیح جہت کی جانب اس کے مطابق سفر کرے گا۔(ایضاً)

بے شک جس انقلاب کی قیادت نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے منہج اور طریقہ کار کے مطابق کی، اس کا آغاز آپ ﷺ نے نفسِ انسانی سے کیا اور اسی کے ذریعہ آپ ﷺ نے عظیم مردانِ کار اور شخصیات تیار کیں، اس کے بعد انہی افراد کو لے کر آپ ﷺ

آگے بڑھے تاکہ معاشرہ میں عظیم ترین تبدیلی اور انقلاب برپا کریں، چنانچہ آپ ﷺ نے لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف طرف ،اور جہالت سے نکال کر علم کی دنیا میں لاکر کھڑا کیا، اور ان کو پسماندگی سے اٹھا کر عروج و ترقی کی چوٹی پر پہنچادیا، اور ان کے ذریعہ تاریخِ انسانی کی سب سے بہترین تہذیب کی بنیاد ڈالی۔ (دیکھیں: نفوس ودروس فی اطار التصویر القرآنی، توفیق محمد سبع، ص367)

نبی کریم ﷺ نے قرآنی منہج کے مطابق اپنے اصحاب اور رفقاء کے دلوں میں تصورات و نظریات میں اور اخلاق وجذبات میں انقلاب برپا کیا، جس کے نتیجہ میں آس پاس کی دنیا میں بھی ماحول میں تبدیلی آگئی، سب سے پہلے مدینہ میں انقلاب آیا، پھر مکہ میں، پھر پورے جزیرۃ العرب میں اور پھر روم وفارس بھی اس عالمی تحریک کے ساتھ شریک ہوگئے، جس کے کارکنان صبح وشام اپنے خالق کے ذکر و تسبیح میں رطب اللسان ہوتے تھے۔

عہدِ مکی میں قرآن نے اپنے منہج کے مطابق عقیدہ پر سب سے زیادہ توجہ مرکوز کی، قرآن مختلف اسالیب اور طریقوں سے عقیدہ کو پیش کرتا ہے، جس کے نتیجہ میں ان کے دلوں میں ایمان کے معانی جاگزیں ہوگئے، اور ان کے اندر ایک عظیم انقلاب برپا ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس عظیم مرحلہ وار انقلاب کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے: [اَوَ مَنۡ كَانَ مَيۡتًا فَاَحۡيَيۡنٰهُ وَجَعَلۡنَا لَهٗ نُوۡرًا يَّمۡشِىۡ بِهٖ فِى النَّاسِ كَمَنۡ مَّثَلُهٗ فِى الظُّلُمٰتِ لَيۡسَ بِخَارِجٍ مِّنۡهَا‌ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلۡكٰفِرِيۡنَ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ] ترجمہ: ”کیا وہ شخص جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندگی بخشی اور اس کو وہ روشنی عطا کی جس کے اجالے میں وہ لوگوں کے درمیان زندگی کی راہ طے کرتا ہے اُس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہوا ہو اور کسی طرح اُن سے نہ نکلتا ہو؟ کافروں کے لئے تو اسی طرح ان کے اعمال خوشنما بنادئے گئے ہیں۔ (سورۃ الأنعام:122)

یقیناً یہ ایک عجیب و غریب اور بہترین تصویر اور منظر ہے جس کو بیان کرنے سے قلم حیران اور عاجز ہیں! قرآن کا اسلوب ہی کچھ ایسا ہے جس کے سرچشمہ سے عقلیں سیراب ہوتی ہیں، نت نئے اسالیب اس کے سوتوں سے پھوٹتے ہیں، اور تعبیرات اس کو صحیح طریقے سے بیان کرنے سے عاجز ہیں، موت سے زندگی میں آنے کی تصویر، تاریکیوں سے نور کی طرف آنے کا منظر، کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟! دونوں مقامات کے درمیان ایک طویل مسافت ہے! اور ایسا عظیم انقلاب جس کی عظمت کو وہی پہچان سکتا ہے اور وہی اس کی مقدار کا ادراک کر سکتا ہے جس نے قرآن کی اس معجز بیانی کی روشنی میں اپنے اندر فراست پیدا کی ہو۔ (دیکھیں: الانحرافات العقدیۃ والعلمیۃ، الزہرانی 1/25)

۳۔ عقیدہ کے اعتبار سے صحابہ کرام کی اصلاح و تصحیح:

اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں لوگوں کا تصور بعثت سے پہلے ناقص اور افراط و تفریط پر مبنی تھا، اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے بارے میں حق سے انحراف پایا جاتا تھا، ارشاد ربانی ہے: [وَلِلّٰهِ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰى فَادۡعُوۡهُ بِهَا‌ۖ وَذَرُوا الَّذِيۡنَ يُلۡحِدُوۡنَ فِىۡۤ اَسۡمَآٮِٕهٖ‌ؕ سَيُجۡزَوۡنَ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ] ترجمہ: ”اللہ اچھے ناموں کا مستحق ہے، اس کو اچھے ہی ناموں سے پکارو، اور اُن لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے نام رکھنے میں راستی سے منحرف ہو جاتے ہیں جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں اس کا بدلہ وہ پاکر رہیں گے“۔ سورۃ الأعراف:180)

چنانچہ لوگ اللہ تعالیٰ کی بعض صفات کا انکار کرتے تھے، اللہ کو ایسے ناموں سے پکارتے تھے جو اللہ کی ذات کے شایانِ شان نہیں تھے، یا جن میں غلط مفاہیم کا امکان ہوتا تھا، اللہ کی ذات کے ساتھ اولاد اور محتاجی جیسے عیوب اور کمزوریوں کی نسبت کرتے تھے، بعض یہ تصور کرتے تھے کہ فرشتے (نعوذ باللہ) اللہ کی بیٹیاں ہیں، جنات کو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے تھے: [وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍ بِغَيْرِ عِلْمٍ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ] ترجمہ: "اِس پر بھی لوگوں نے جنوں کو اللہ کا شریک ٹھہرا دیا، حالانکہ وہ اُن کا خالق ہے، اور بے جانے بوجھے اس کے لئے بیٹے اور بیٹیاں تصنیف کر دیں، حالانکہ وہ پاک اور بالا تر ہے اُن باتوں سے جو یہ لوگ کہتے ہیں"۔ (سورۃ الأنعام: 100) دوسری جگہ یوں بیان فرمایا ہے: [وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ] ترجمہ: "یہ خدا کے لئے بیٹیاں تجویز کرتے ہیں، سبحان اللہ! اور اِن کے لئے وہ جو یہ خود چاہیں؟"۔ (سورۃ النحل: 57)

قرآن کریم نازل ہوا تو اس کے مقاصد میں یہ بات شامل تھی کہ اہلِ ایمان کے دلوں میں صحیح عقیدہ کو راسخ اور مستحکم کیا جائے، اور تمام لوگوں کے لئے اس کو واضح شکل میں بیان کیا جائے اور ایسا اس طور پر کیا جائے کہ توحیدِ ربوبیت، توحید الوہیت اور توحید اسماء وصفات کی حقیقت کو بیان کر دیا جائے، اور اللہ تعالیٰ نے جن امور پر ایمان لانے کا حکم دیا ہے ان کو واضح کر دیا جائے، جیسے کہ فرشتوں، اللہ کی نازل کردہ کتابوں، انبیاء، تقدیر چاہے وہ خیر ہو یا شر اور یوم آخرت پر ایمان۔ اسی طرح رسولوں کی رسالت اور انہوں نے جو کچھ بتایا ہے اس پر ایمان لانے کی حقیقت اور دلائل بیان کر دیئے جائیں۔ (دیکھیں: أهمية الجهاد في نشر الدعوة، علی علیانی، ص، 47)

مکہ میں نازل ہونے والے قرآن نے لوگوں کو اس بات سے آشنا کرایا کہ معبود برحق کون ہے جس کی عبادت ضروری ہے، نبی کریم ﷺ انہی عظیم آیاتِ قرآنیہ کے مطابق صحابہ کرام کی تربیت فرماتے، نبی کریم ﷺ نے پہلے ہی روز سے اس بات کی کوشش کی کہ لوگوں کو اپنے رب کے بارے میں اور ان پر اس کے حقوق کے بارے میں صحیح تصور دیا جائے، آپ کو اس بات کا احساس تھا کہ اس تصور کے نتیجہ میں ان لوگوں کے دلوں میں تصدیق ویقین کی صفت گھر کر جائے گی جن کے دل پاکیزہ ہوں گے اور جن کی فطرت سلیم اور درست ہو گی، قرآن کریم سے ماخوذ اس تصور کو پیدا کرنے کے سلسلہ میں نبی کریم ﷺ کی توجہ چند امور پر مرکوز تھی، جن میں مندرجہ ذیل نکات قابل ذکر ہیں:

1) اللہ تعالیٰ ہر قسم کی کمزوری اور نقائص سے پاک، اور لا محدود کمالات سے متصف ہے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ تنہا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہے، نہ اس کی کوئی بیوی اور جوڑا ہے اور نہ ہی اس کی کوئی اولاد ہے۔

2) اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے اور مالک ہے اور تمام چیزوں پر اسی کا کنٹرول ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: [اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا ۙ وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍ بِاَمْرِهٖ ۭ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ۭ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ] ترجمہ: "در حقیقت تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر اپنے تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوا جو رات کو دن پر ڈھانک دیتا ہے اور پھر دن رات کے پیچھے دوڑا چلا آتا ہے، جس نے سورج اور چاند اور

تارے پیدا کیے، سب اس کے فرمان کے تابع ہیں، خبر دار رہو! اُسی کی خلق ہے اور اسی کا امر ہے، بڑا بابرکت ہے اللہ، سارے جہانوں کا مالک و پروردگار"۔(سورۃ الاعراف:54)

3)اللہ تعالیٰ اس کائنات کی ہر نعمت کا مصدر و سرچشمہ ہے، چاہے وہ نعمت چھوٹی ہو یا بڑی، ظاہر ہو یا پوشیدہ۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:[وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْـَٔرُوْنَ] ترجمہ:"تم کو جو نعمت بھی حاصل ہے اللہ ہی کی طرف سے ہے پھر جب کوئی سخت وقت تم پر آتا ہے تو تم لوگ خود اپنی فریادیں لے کر اُسی کی طرف دوڑتے ہو"۔(سورۃ النحل:53)

4)اللہ تعالیٰ کا علم ہر چیز پر محیط ہے، نہ ہی زمین کی اور نہ ہی آسمان کی کوئی چیز اس سے مخفی ہے اور نہ ہی وہ بات اس سے پوشیدہ ہے جس کو انسان چھپاتا ہے یا اس کا اعلان کرتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:[اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ۭ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ڏ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا] ترجمہ: "اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے اور زمین کی قسم سے بھی اُنہی کے مانند، ان کے درمیان حکم نازل ہوتا رہتا ہے (یہ بات تمہیں اس لئے بتائی جارہی ہے) تاکہ تم جان لو کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے، اور یہ کہ اللہ کا علم ہر چیز پر محیط ہے"۔(سورۃ الطلاق:12)

5)اللہ تعالیٰ فرشتوں کے ذریعہ انسان کے تمام اعمال کو ایک ایسی کتاب میں نوٹ کر آتا ہے جس میں ہر چھوٹی بڑی چیز کو محفوظ کر لیا جاتا ہے اور مناسب وقت اور موقع پر اس کو سامنے لایا جائے گا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:[مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ] ترجمہ:"کوئی لفظ اس کی زبان سے نہیں نکلتا جسے محفوظ کرنے کے لئے ایک حاضر باش نگراں موجود نہ ہو"۔(سورۂ ق:18)

6)اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنے بندوں کو ایسی چیزوں کے ذریعہ آزماتا ہے جو ان کی خواہشات اور مرضی کے برخلاف ہوتی ہیں، تاکہ لوگوں کی اصل حقیقت، فطرت اور خصلت واضح ہو جائے، اور یہ واضح ہو جائے کہ ان میں سے کون اللہ کے فیصلہ اور تقدیر پر راضی ہے اور ظاہر و باطن کے اعتبار سے اس کے سامنے سر تسلیم خم کر لیتا ہے، اور ایسا ہی شخص خلافت و امامت اور سیادت و قیادت کا مستحق قرار پاتا ہے، اسی طرح آزمائش کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ واضح ہو جائے کہ کون آزمائش سے ناراض اور ناخوش ہوتا ہے، ایسے شخص کا انجام اللہ کے غضب کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، اور ہر طرح سے محروم کر دیا جاتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: [الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ] ترجمہ:"جس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے، اور وہ زبردست بھی ہے اور درگزر فرمانے والا بھی"۔(سورۂ ملک:2) اگرچہ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا علم اس کے وجود میں آنے سے پہلے ہی ہوتا ہے۔

7)جو شخص اللہ کی پناہ میں آتا ہے وہ اس کا دامن پکڑ لیتا ہے، اور ہر ظاہر و پوشیدہ معاملہ میں اس کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کر لیتا ہے، اللہ ایسے شخص کو توفیق دیتا ہے اور اس کی نصرت و تائید کرتا ہے، ارشاد ہے:[اِنَّ وَلِيِّۦَ اللّٰهُ الَّذِيْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ ڮ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ] ترجمہ:"میرا حامی و ناصر وہ خدا ہے جس نے یہ کتاب نازل کی ہے اور وہ نیک آدمیوں کی حمایت کرتا ہے"۔(سورۃ الاعراف:196)

8)اللہ کا بندوں پر یہ حق ہے کہ وہ اسی کی عبادت کریں، اس کی توحید کا اقرار کریں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: [بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ] ترجمہ: "لہٰذا (اے نبیؐ) تم بس اللہ ہی کی بندگی کرو اور شکر گزار بندوں میں سے ہو جاؤ"۔ (سورۃ الزمر: 66)

9)اللہ تعالیٰ نے اس عبودیت اور اس توحید کے مضمون اور اس کی حدود اربعہ کو قرآن کریم میں متعین کیا ہے۔ (دیکھیں: منہج الرسول ﷺ فی غرس الروح الجھادیۃ، ص: 16-10)

اولین جماعت۔ رضی اللہ عنہم -کی تربیت اس طور پر ہوئی کہ وہ اللہ کی صفات اور اس کے اسمائے حسنیٰ کا صحیح فہم رکھتے تھے، انہی کے مطابق اس کی عبادت کرتے تھے، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کے دلوں میں عظمت راسخ تھی اور اللہ کی رضا اور خوشنودی اس سعی اور جدوجہد کا نصب العین اور مقصد بن گئی، ہر وقت اللہ کی نگرانی اور ماہیت کا انہیں احساس رہا، لہٰذا انہوں نے ہر قسم کی لغزش اور غلطی سے اپنے آپ کو دور رکھا، اس لئے کہ انہیں یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز سے واقف ہے، اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ کے اصحاب شرک کی تمام انواع و اقسام سے پاک تھے، وہ اس اعتقاد سے بھی پاک تھے کہ کسی بھی چیز میں اللہ عزوجل کے ساتھ کوئی شریک و سہیم ہے اور کائنات کو کنٹرول کرنے میں، کسی چیز کو وجود لانے، یا ختم کرنے میں، زندہ کرنے اور موت دینے میں، خیر عطا کرنے اور شر کو دور کرنے میں وہ تنہا متصرف ہے، اسی طرح وہ ہر اس اعتقاد سے پاک تھے جو اس کے اسماء وصفات کے تقاضوں کے بر خلاف ہو، جیسے کہ علم غیب اور اللہ کی عظمت و کبریائی کے بارے میں عقیدہ، اسی طرح حاکمیت کے متعلق اور اطاعتِ مطلقہ اور دیگر امور کے بارے میں عقیدہ۔ (دیکھیں: أھمیۃ الجھاد فی نشر الدعوۃ، ص 53)

بے شک توحید کے بارے میں صحابہ کرام کی صحیح نبوی تربیت ہی وہ اساس اور بنیاد ہے جس پر دینِ اسلام کی عمارت قائم ہے، اور یہی وہ صحیح طریقہ کار ہے جس کے مطابق آپ ﷺ سے پہلے انبیاء اور رسولوں نے اپنا سفر جاری رکھا، قوم کو اس بات کی دعوت دی کہ اللہ ہی تنہا عبادت کا مستحق ہے، اللہ تعالیٰ نوح علیہ السلام کی زبانی ارشاد فرماتا ہے: [وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ اِنِّىْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۞ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ] ترجمہ: (اور ایسے ہی حالات تھے جب) ہم نے نوحؑ کو اُس کی قوم کی طرف بھیجا تھا (اُس نے کہا) "میں تم لوگوں کو صاف صاف خبردار کرتا ہوں کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو، ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ تم پر ایک روز دردناک عذاب آئے گا"۔ (سورۂ ھود: 25-26)

ھود علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ربانی ہے: [وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ۭ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ] ترجمہ: "اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہودؑ کو بھیجا، اُس نے کہا "اے برادرانِ قوم، اللہ کی بندگی کرو، تمہارا کوئی خدا اُس کے سوا نہیں ہے تم نے محض جھوٹ گڑھ رکھے ہیں"۔ (سورۂ ھود: 50)

حضرت صالح علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہے: [وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ۭ اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ] ترجمہ: " اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالحؑ کو

بھیجا، اُس نے کہا: "اے میری قوم کے لوگو، اللہ کی بند گی کرو، اُس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے، وہی ہے جس نے تم کو زمین سے پیدا کیا ہے اور یہاں تم کو بسایا ہے، لہٰذا تم اس سے معافی چاہو اور اس کی طرف پلٹ آؤ، یقیناً میرا رب قریب ہے اور وہ دعاؤں کا جواب دینے والا ہے"۔(سورۂ ھود:61)

حضرت شعیب علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہے: [وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ ؕ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِکْیَالَ وَالْمِیْزَانَ اِنِّیْٓ اَرٰىکُمْ بِخَیْرٍ وَّاِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْکُمْ عَذَابَ یَوْمٍ مُّحِیْطٍ] ترجمہ: ”اور مدین والوں کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیبؑ کو بھیجا، اُس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو، اللہ کی بند گی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے اور ناپ تول میں کمی نہ کیا کرو، آج میں تم کو اچھے حال میں دیکھ رہا ہوں، مگر مجھے ڈر ہے کہ کل تم پر ایسا دن آئے گا جس کا عذاب سب کو گھیر لے گا“۔(سورۂ ھود:84)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہے: [اِنَّ اللّٰہَ رَبِّیْ وَرَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْہُ ؕ ھٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ] ترجمہ: ”اللہ میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی، لہٰذا تم اُسی کی بند گی اختیار کرو، یہی سیدھا راستہ ہے"۔(سورۂ آل عمران:51)

خلاصہ کلام یہ کہ تمام رسولوں علیہم السلام نے توحید کی دعوت دی، یعنی: اللہ تعالیٰ کو عبادت کا تنہا مستحق سمجھنا اور طاغوت اور اصنام وبتوں سے اجتناب کرنا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّۃٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْھُمْ مَّنْ ھَدَی اللّٰہُ وَمِنْھُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَیْہِ الضَّلٰلَۃُ ؕ فَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الْمُکَذِّبِیْنَ] ترجمہ: ”ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیج دیا، اور اُس کے ذریعہ سے سب کو خبر دار کر دیا کہ "اللہ کی بند گی کرو اور طاغوت کی بند گی سے بچو" اس کے بعد ان میں سے کسی کو اللہ نے ہدایت بخشی اور کسی پر ضلالت مسلط ہو گئی، پھر ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہو چکا ہے“۔(سورۃ النحل:36)

اللہ کے رسول ﷺ نے بھی اپنے صحابہ کی تربیت اس طور پر فرمائی کہ توحید کو اپنی تمام انواع کے اعتبار سے اللہ کے لئے خالص کیا جائے، اور اللہ کے رسول ﷺ بذاتِ خود ایک مؤمن کی اعلیٰ وارفع مثال تھے۔ ارشادی باری تعالیٰ ہے: قُلْ اِنَّنِیْ ھَدٰىنِیْ رَبِّیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۚ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّۃَ اِبْرٰھِیْمَ حَنِیْفًا ۚ وَمَا کَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ۝ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ قُلْ اَغَیْرَ اللّٰہِ اَبْغِیْ رَبًّا وَّھُوَ رَبُّ کُلِّ شَیْءٍ ؕ وَلَا تَکْسِبُ کُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَیْھَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ۚ ثُمَّ اِلٰی رَبِّکُمْ مَّرْجِعُکُمْ فَیُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ فِیْہِ تَخْتَلِفُوْنَ] ترجمہ: ”اے محمدؐ! کہو میرے رب نے بالیقین مجھے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے، بالکل ٹھیک دین جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں، ابراہیمؑ کا طریقہ جسے یکسو ہو کر اُس نے اختیار کیا تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا، کہو، میری نماز، میرے تمام مراسم عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنا، سب کچھ اللہ رب العالمین کے لئے ہے۔ جس کا کوئی شریک نہیں، اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے سر اطاعت جھکانے والا میں ہوں۔ کہو، کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور رب تلاش کروں حالانکہ وہی ہر چیز کا رب ہے؟ ہر شخص جو کچھ کماتا ہے اس کا ذمہ دار وہ خود ہے، کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا، پھر تم سب کو اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے، اُس وقت وہ تمہارے اختلافات کی حقیقت تم پر کھول دے گا“۔(سورۂ اَنعام: 161-164)

اللہ کے رسول ﷺ نے صحابہ کرام کی جس انداز سے تربیت کی تھی وہ ثمر آور ثابت ہوئی، چناچہ صحابہ کرام ان تمام چیزوں سے پاک و صاف تھے جو توحیدِ الوہیت، توحیدِ ربوبیت اور توحیدِ اسماء وصفات کے منافی تھیں، اُنھوں نے ایک اللہ کے سوا کسی کو حاکم نہیں مانا، اللہ کے علاوہ کسی کی اطاعت نہیں کی، اللہ کی ناراضگی مول لے کر کسی کی اتباع اور پیروی نہیں کی، اللہ سے محبت کرنے کی طرح کسی اور سے ویسی محبت نہیں کی، اللہ کے علاوہ کسی اور سے نہیں ڈرے، اللہ کے علاوہ کسی دوسرے پر توکل نہیں کیا، اللہ کے علاوہ کسی سے پناہ نہیں مانگی، سوال و مغفرت کی دعا ایک اللہ کے علاوہ کسی سے نہیں کی، ذبح صرف اللہ کے نام پر کیا، نذر صرف اللہ ہی کے لئے مانی، اللہ ہی سے نصرت و مدد طلب کی، جن چیزوں پر اللہ ہی قادر ہے ان کے بارے میں صرف ایک اللہ سے استعانت کی، اللہ کے سوا نہ کسی کے سامنے رکوع اور سجدہ کیا اور نہ کسی دوسرے کے لئے حج اور طواف کیا، اور نہ کسی کی عبادت کی، اللہ کو نہ مخلوقات کے ساتھ تشبیہ دی، نہ ہی معدومات کے ساتھ، بلکہ ہر اعتبار سے اللہ کو منزہ اور پاک سمجھا، اللہ کو ان صفات سے متصف مانا جن کو اللہ نے خود اپنے لئے اور اس کے رسول ﷺ نے بیان کیا ہے، نہ ان صفات میں تحریف کی، نہ ان میں تعطیل (یعنی اللہ کے بارے میں ثابت شدہ صفات کی نفی کرنا) کی، اور نہ ہی کوئی تاویل کی، رازہائے سربستہ سے واقف ہونے کا خوف اللہ کے علاوہ کسی سے نہیں رکھا، اطاعت مطلقہ کا حق صرف اللہ کے لئے خاص سمجھا، ربوبیت کی خصوصیات میں کسی مخلوق کو اللہ کے ساتھ شریک نہیں ٹھہرایا، جیسے کہ زندگی اور موت دینے کا اختیار، رزق رسانی، وسیع ومحیط علم، قدرتِ کاملہ، قیومت، بقائے مطلق، تحلیل وتحریم کا حق اور اسی طرح دیگر صفات۔ (دیکھیں: أھمیۃ الجھاد فی نشر الدعوۃ، ص54،55)

مکی دور میں نازل شدہ قرآن میں عقیدۂ توحید کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے، اور حضرت محمد ﷺ کو تمام جن وانس کے لئے بحیثیتِ رسول معبوث کئے جانے کے دلائل دیئے گئے ہیں، ارشاد باری تعالی ہے: [وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ] ترجمہ: ''اور (اے نبیؐ) ہم نے تم کو تمام ہی انسانوں کے لئے بشیر ونذیر بنا کر بھیجا ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں''۔ (سورۂ سبأ: 28)

دوسری جگہ ارشاد ہے: [قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا ۨ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُـحْيٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ] ترجمہ: ''اے محمدؐ، کہو کہ "اے انسانو، میں تم سب کی طرف اُس خدا کا پیغمبر ہوں جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے، اُس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے، پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے بھیجے ہوئے نبی اُمی پر جو اللہ اور اس کے ارشادات کو مانتا ہے، اور پیروی اختیار کرو اُس کی، امید ہے کہ تم راہ راست پالو گے"۔ (سورۂ اعراف: 158)

ایک اور جگہ ارشاد ربانی ہے: [وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ۞ قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۞ يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ] ترجمہ: (اور وہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے) جب ہم جنوں کے ایک گروہ کو تمہاری طرف لے آئے تھے تاکہ قرآن سنیں جب وہ اُس جگہ پہنچے (جہاں تم قرآن پڑھ رہے تھے) تو انہوں نے آپس میں کہا: خاموش

ہو جاؤ، پھر جب وہ پڑھا جا چکا تو وہ خبر دار کرنے والے بن کر اپنی قوم کی طرف پلٹے۔ انہوں نے جا کر کہا: "اے ہماری قوم کے لوگو، ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰؑ کے بعد نازل کی گئی ہے، تصدیق کرنے والی ہے، اپنے سے پہلے آئی ہوئی کتابوں کی رہنمائی کرتی ہے، حق اور راہ راست کی طرف۔ اے ہماری قوم کے لوگو، اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت قبول کر لو اور اس پر ایمان لے آؤ، اللہ تمہارے گناہوں سے در گزر فرمائے گا اور تمہیں عذاب الیم سے بچادے گا"۔(سورہ أحقاف:29،31)

ان آیات کے علاوہ قرآن پاک میں اس سلسلہ کی بہت سی آیات ہیں، جن میں توحید کے ساتھ ساتھ رسالت کو بھی ثابت کیا گیا ہے۔ (دیکھیں: أھمیۃ الجھاد فی نشر الدعوۃ، ص: 56)

اسی طرح مکی قرآن نے توحید کے بارے میں رسول اور رسالت کے بارے میں صحابہ کرام کے دلوں میں صحیح عقیدہ کو راسخ کیا، فرشتوں کے بارے میں ان کے عقیدہ کو درست کیا، اور واضح کیا کہ وہ اللہ کی ایک مخلوق ہیں، اللہ کے لئے سجدہ ریز رہتے ہیں اور اس کی عبادت سے کتراتے نہیں ہیں اور نہ ہی آسمان اور زمین میں ان کی کوئی شراکت ہے، اور وہ اللہ کے حکم کے بغیر نہ کسی کو نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہی نقصان، ارشاد باری تعالیٰ ہے: [وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ ۚ وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ وَهُمْ يُجَادِلُوْنَ فِى اللّٰهِ ۚ وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ] ترجمہ: ’’بادلوں کی گرج اس کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرتی ہے اور فرشتے اس کی ہیبت سے لرزتے ہوئے اُس کی تسبیح کرتے ہیں، وہ کڑکتی ہوئی بجلیوں کو بھیجتا ہے اور (بسا اوقات) اُنہیں جس پر چاہتا ہے عین اس حالت میں گرا دیتا ہے جبکہ لوگ اللہ کے بارے میں جھگڑ رہے ہوتے ہیں، فی الواقع اس کی چال بڑی زبردست ہے‘‘۔(سورۃ الرعد:13)

دوسری جگہ ارشاد ہے: [وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ] ترجمہ: ’’زمین اور آسمانوں میں جس قدر جان دار مخلوقات ہیں اور جتنے ملائکہ ہیں سب اللہ کے آگے سر بسجود ہیں، وہ ہرگز سرکشی نہیں کرتے‘‘۔(سورۃ نحل:49)

ایک اور جگہ ہے: [اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِىْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۭ يَزِيْدُ فِى الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ] ترجمہ: ’’تعریف اللہ ہی کے لئے ہے جو آسمانوں اور زمین کا بنانے والا اور فرشتوں کو پیغام رساں مقرر کرنے والا ہے، (ایسے فرشتے) جن کے دو دو اور تین تین اور چار چار بازو ہیں، وہ اپنی مخلوق کی ساخت میں جیسا چاہتا ہے اضافہ کرتا ہے یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے‘‘۔ سورۃ فاطر:1)

ایک اور مقام پر ہے: [قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَلَا فِى الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ] ترجمہ: (اے نبیؐ، اِن مشرکین سے) کہو کہ پکار دیکھو اپنے اُن معبودوں کو جنہیں تم اللہ کے سوا اپنا معبود سمجھ بیٹھے ہو، وہ نہ آسمانوں میں کسی ذرہ برابر چیز کے مالک ہیں، نہ زمین میں، وہ آسمان و زمین کی ملکیت میں شریک بھی نہیں ہیں، ان میں سے کوئی اللہ کا مددگار بھی نہیں ہے‘‘۔(سورۃ سبأ:22)

دوسرے مقام پر ہے: [إِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ] ترجمہ: ”جو فرشتے تمہارے رب کے حضور تقرب کا مقام رکھتے ہیں وہ کبھی اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں آکر اس کی عبادت سے منہ نہیں موڑتے اور اس کی تسبیح کرتے ہیں، اور اس کے آگے جھکے رہتے ہیں“۔(سورۃالأعراف:206)

اسی طرح مکی قرآنی آیات میں اہل ایمان کے دلوں میں اپنے معجزانہ اسلوب کے ذریعہ ایمان کے دیگر تمام ارکان کی بنیاد ڈالی، اور تمام لوگوں کے لئے ان کو واضح کیا، چنانچہ ان آیات میں رسول اللہ ﷺ پر نزول قرآن کی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے، ارشاد ربانی ہے: ﴿وَقُرْءَانًا فَرَقْنَٰهُ لِتَقْرَأَهُۥ عَلَى ٱلنَّاسِ عَلَىٰ مُكْثٍ وَنَزَّلْنَٰهُ تَنزِيلًا﴾ ترجمہ: ”اور اس قرآن کو ہم نے تھوڑا تھوڑا کرکے نازل کیا ہے تاکہ تم ٹھیر ٹھیر کر اسے لوگوں کو سناؤ، اور اسے ہم نے (موقع موقع سے) بتدریج اتارا ہے“۔(سورۃالاسراء106)۔

دوسرے مقام پر ہے: ﴿ٱللَّهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ ٱلْحَدِيثِ كِتَٰبًا مُّتَشَٰبِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُودُ ٱلَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَىٰ ذِكْرِ ٱللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ هُدَى ٱللَّهِ يَهْدِي بِهِۦ مَن يَشَآءُ ۚ وَمَن يُضْلِلِ ٱللَّهُ فَمَا لَهُۥ مِنْ هَادٍ﴾ ترجمہ: ”اللہ نے بہترین کلام اتارا ہے، ایک ایسی کتاب جس کے تمام اجزاء ہم رنگ ہیں اور جس میں بار بار مضامین دہرائے گئے ہیں اُسے سن کر اُن لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرنے والے ہیں، اور پھر ان کے جسم اور ان کے دل نرم ہو کر اللہ کے ذکر کی طرف راغب ہو جاتے ہیں، یہ اللہ کی ہدایت ہے جس سے وہ راہ راست پر لے آتا ہے جسے چاہتا ہے اور جسے اللہ ہی ہدایت نہ دے اس کے لئے پھر کوئی ہادی نہیں ہے“۔(سورۂزمر:23)

ایک اور مقام پر ہے: ﴿وَمَا قَدَرُوا۟ ٱللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِۦٓ إِذْ قَالُوا۟ مَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ عَلَىٰ بَشَرٍ مِّن شَىْءٍ ۗ قُلْ مَنْ أَنزَلَ ٱلْكِتَٰبَ ٱلَّذِى جَآءَ بِهِۦ مُوسَىٰ نُورًا وَهُدًى لِّلنَّاسِ ۖ تَجْعَلُونَهُۥ قَرَاطِيسَ تُبْدُونَهَا وَتُخْفُونَ كَثِيرًا ۖ وَعُلِّمْتُم مَّا لَمْ تَعْلَمُوٓا۟ أَنتُمْ وَلَآ ءَابَآؤُكُمْ ۖ قُلِ ٱللَّهُ ۖ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِى خَوْضِهِمْ يَلْعَبُونَ﴾ ترجمہ: ”ان لوگوں نے اللہ کا بہت غلط اندازہ لگایا جب کہا کہ اللہ نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا ہے، ان سے پوچھو، پھر وہ کتاب جسے موسیٰؑ لایا تھا، جو تمام انسانوں کے لئے روشنی اور ہدایت تھی، جسے تم پارہ پارہ کر کے رکھتے ہو، کچھ دکھاتے ہو اور بہت کچھ چھپا جاتے ہو، اور جس کے ذریعہ سے تم کو وہ علم دیا گیا جو نہ تمہیں حاصل تھا اور نہ تمہارے باپ دادا کو، آخر اُس کا نازل کرنے والا کون تھا؟ بس اتنا کہہ دو کہ اللہ، پھر اُنہیں اپنی دلیل بازیوں سے کھیلنے کے لئے چھوڑ دو“۔(سورۃ الأنعام:91)

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بیان کر دیا ہے کہ قرآن کے علاوہ دوسری کتابیں بھی اس نے نازل کی ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَرَبُّكَ أَعْلَمُ بِمَن فِى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ ۗ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ ٱلنَّبِيِّۦنَ عَلَىٰ بَعْضٍ ۖ وَءَاتَيْنَا دَاوُۥدَ زَبُورًا﴾ ترجمہ: ”تیرا رب زمین اور آسمانوں کی مخلوقات کو زیادہ جانتا ہے ہم نے بعض پیغمبروں کو بعض سے بڑھ کر مرتبے دیے، اور ہم نے ہی داؤدؑ کو زبور دی تھی“۔ (سورۃالاسراء:55)

دوسرے مقام پر یوں بیان کیا گیا ہے: ﴿نَزَّلَ عَلَيْكَ ٱلْكِتَٰبَ بِٱلْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَأَنزَلَ ٱلتَّوْرَىٰةَ وَٱلْإِنجِيلَ﴾ ترجمہ: ''اس نے تم پر یہ کتاب نازل کی ہے، جو حق لے کر آئی ہے اور اُن کتابوں کی تصدیق کر رہی ہے جو پہلے سے آئی ہوئی تھیں، اس سے پہلے وہ انسانوں کی ہدایت کے لئے تورات اور انجیل نازل کر چکا ہے''۔(سورۂ آل عمران: 3).

اللہ تعالیٰ نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ اس نے بہت سے انبیاء مبعوث کئے ہیں، ارشاد ہے: ﴿وَكَمْ أَرْسَلْنَا مِن نَّبِيٍّ فِي ٱلْأَوَّلِينَ﴾ ترجمہ: ''پہلے گزری ہوئی قوموں میں بھی بارہا ہم نے نبی بھیجے ہیں''۔(سورۂ زخرف: 6)

ان میں سے بعض انبیاء کا ذکر قرآن نے کیا ہے جبکہ بعض کا ذکر نہیں کیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ مِنْهُم مَّن قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُم مَّن لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ۗ وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَن يَأْتِيَ بِـَٔايَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ ٱللَّهِ ۚ فَإِذَا جَآءَ أَمْرُ ٱللَّهِ قُضِيَ بِٱلْحَقِّ وَخَسِرَ هُنَالِكَ ٱلْمُبْطِلُونَ﴾ ترجمہ: ''اے نبیؐ، تم سے پہلے ہم بہت سے رسول بھیج چکے ہیں جن میں سے بعض کے حالات ہم نے تم کو بتائے ہیں اور بعض کے نہیں بتائے کسی رسول کی بھی یہ طاقت نہ تھی کہ اللہ کے اذن کے بغیر خود کوئی نشانی لے آتا پھر جب اللہ کا حکم آ گیا تو حق کے مطابق فیصلہ کر دیا گیا اور اُس وقت غلط کار لوگ خسارے میں پڑ گئے''۔(سورۂ غافر: 78)

۴- قرآنِ کریم میں جنت کا ذکر اور صحابہ کرام پر اس کا اثر:

مکہ میں نازل ہونے والے قرآن میں یوم آخرت پر بہت زیادہ توجہ مرکوز کی گئی ہے، اکثر سورتوں میں قیامت کے بعض حالات، انعام یافتہ اور کامیاب لوگوں کے احوال، عذاب کے مستحق لوگوں کے احوال، لوگوں کے محشر میں جمع ہونے اور ان کے حساب کی کیفیات کو اس انداز سے بیان کیا گیا ہے گویا کہ انسان اپنی آنکھوں سے قیامت کا مشاہدہ کر رہا ہو، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَا قَدَرُوا۟ ٱللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِۦ وَٱلْأَرْضُ جَمِيعًا قَبْضَتُهُۥ يَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِ وَٱلسَّمَٰوَٰتُ مَطْوِيَّٰتٌۢ بِيَمِينِهِۦ ۚ سُبْحَٰنَهُۥ وَتَعَٰلَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿٦٧﴾ وَنُفِخَ فِي ٱلصُّورِ فَصَعِقَ مَن فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَن فِي ٱلْأَرْضِ إِلَّا مَن شَآءَ ٱللَّهُ ۖ ثُمَّ نُفِخَ فِيهِ أُخْرَىٰ فَإِذَا هُمْ قِيَامٌ يَنظُرُونَ ﴿٦٨﴾ وَأَشْرَقَتِ ٱلْأَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا وَوُضِعَ ٱلْكِتَٰبُ وَجِاْىٓءَ بِٱلنَّبِيِّـۧنَ وَٱلشُّهَدَآءِ وَقُضِيَ بَيْنَهُم بِٱلْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٦٩﴾ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُوَ أَعْلَمُ بِمَا يَفْعَلُونَ ﴿٧٠﴾ وَسِيقَ ٱلَّذِينَ كَفَرُوٓا۟ إِلَىٰ جَهَنَّمَ زُمَرًا ۖ حَتَّىٰٓ إِذَا جَآءُوهَا فُتِحَتْ أَبْوَٰبُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَآ أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَتْلُونَ عَلَيْكُمْ ءَايَٰتِ رَبِّكُمْ وَيُنذِرُونَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هَٰذَا ۚ قَالُوا۟ بَلَىٰ وَلَٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ ٱلْعَذَابِ عَلَى ٱلْكَٰفِرِينَ ﴿٧١﴾ قِيلَ ٱدْخُلُوٓا۟ أَبْوَٰبَ جَهَنَّمَ خَٰلِدِينَ فِيهَا ۖ فَبِئْسَ مَثْوَى ٱلْمُتَكَبِّرِينَ ﴿٧٢﴾ وَسِيقَ ٱلَّذِينَ ٱتَّقَوْا۟ رَبَّهُمْ إِلَى ٱلْجَنَّةِ زُمَرًا ۖ حَتَّىٰٓ إِذَا جَآءُوهَا وَفُتِحَتْ أَبْوَٰبُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلَٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَٱدْخُلُوهَا خَٰلِدِينَ ﴿٧٣﴾ وَقَالُوا۟ ٱلْحَمْدُ لِلَّهِ ٱلَّذِي صَدَقَنَا وَعْدَهُۥ وَأَوْرَثَنَا ٱلْأَرْضَ نَتَبَوَّأُ مِنَ ٱلْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ ۖ فَنِعْمَ أَجْرُ ٱلْعَٰمِلِينَ ﴿٧٤﴾ وَتَرَى ٱلْمَلَٰٓئِكَةَ حَآفِّينَ مِنْ حَوْلِ ٱلْعَرْشِ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ۖ وَقُضِيَ بَيْنَهُم بِٱلْحَقِّ وَقِيلَ ٱلْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ ٱلْعَٰلَمِينَ

﴿۷۵﴾ ترجمہ: ''اور انھوں نے اللہ کی قدر نہیں کی جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق ہے، اور یہ زمین قیامت کے دن سب اسی کی مٹھی میں ہو گی اور آسمان اس کے داہنے ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہوں گے، وہ پاک اور برتر ہے اس سے جو وہ شریک ٹھہراتے ہیں۔ اور صور پھونکا جائے گا تو بے ہوش ہو جائے گا جو کوئی آسمانوں اور جو کوئی زمین میں ہے مگر جسے اللہ چاہے، پھر وہ دوسری دفعہ صور پھونکا جائے گا تو یکایک وہ کھڑے دیکھ رہے ہوں گے۔ اور زمین اپنے رب کے نور سے چمک اٹھے گی اور کتاب رکھ دی جائے گی اور نبی اور گواہ لائے جائیں گے اور ان میں انصاف سے فیصلہ کیا جائے گا اور ان پر ظلم نہ کیا جائے گا۔ اور ہر شخص کو جو کچھ اس نے کیا تھا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور وہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ کر رہے ہیں۔ اور جو کافر ہیں دوزخ کی طرف گروہ گروہ ہانکے جائیں گے، یہاں تک کہ جب اس کے پاس آئیں گے تو اس کے دروازے کھول دیے جائیں گے اور ان سے اس کے داروغہ کہیں گے کیا تمہارے پاس تم ہی میں سے رسول نہیں آئے تھے جو تمہیں تمہارے رب کی آیتیں پڑھ کر سناتے تھے اور آج کے دن کے پیش آنے سے تمہیں ڈراتے تھے، کہیں گے ہاں، لیکن عذاب کا حکم (علم ازلی میں) منکروں پر ہو چکا تھا۔ کہا جائے گا دوزخ کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ اس میں ہمیشہ رہو گے، پس وہ تکبر کرنے والوں کے لئے کیسا برا ٹھکانہ ہے۔ اور وہ لوگ جو اپنے رب سے ڈرتے رہے جنت کی طرف گروہ گروہ لے جائے جائیں گے، یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچ جائیں گے اور اس کے دروازے کھلے ہوئے ہوں گے اور ان سے اس کے داروغہ کہیں گے تم پر سلام ہو، تم اچھے لوگ ہو، اس میں ہمیشہ کے لئے داخل ہو جاؤ۔ اور وہ کہیں گے اللہ کا شکر ہے جس نے ہم سے اپنا وعدہ سچا کیا اور ہمیں اس زمین کا وارث کر دیا کہ ہم جنت میں جہاں چاہیں رہیں، پھر کیا خوب بدلہ ہے عمل کرنے والوں کا۔ اور آپ فرشتوں کو حلقہ باندھے ہوئے عرش کے گرد دیکھیں گے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح پڑھ رہے ہیں، اور ان کے درمیان انصاف سے فیصلہ کیا جائے گا اور سب کہیں گے: سب تعریف اللہ ہی کے لئے ہے جو سارے جہانوں کا رب ہے''۔ (سورۂ زمر: 67،75)

اسی طرح قرآنی آیات میں جنت کا بھی ذکر کیا گیا ہے، مختلف انداز سے اس کی منظر کشی کی گئی ہے جس نے صحابہ کرام کے دلوں میں عجیب وغریب اثرات مرتب کئے، جنت کی منظر کشی کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے کہ اس کی کوئی نظیر نہیں ہے، اس کے خاص قسم کے دروازے ہیں، اس میں مختلف درجے اور مقامات ہیں، اس کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، اس میں چشمے ہوں گے، محلات اور خیمے ہوں گے، اس قسم کے درخت ہوں گے جیسے کی سدرۃ المنتہیٰ، شجرۂ طوبیٰ۔ اسی طرح قرآن کریم نے اہل جنت کی نعمتوں کے کھانے، پینے، مشروبات، برتن، لباس، زیورات، فرش، خدام، ان کی گفتگو اور ان کی عورتوں کا ذکر کیا ہے، ان کو عطا کی جانے والی اعلیٰ اور افضل ترین نعمتوں کا اور ان اختتامی کلمات کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ سب ذکر ایسے اسلوب وانداز سے کیا گیا ہے کہ جنت کے یہ قرآنی مناظر اہل ایمان کے اعضاء وجوارح، ان کے احساسات وجذبات اور دماغ کی آواز بن گئے، قرآن کریم میں جنت کا ذکر جس انداز سے کیا گیا ہے، اس کے بعض پہلو مندرجہ ذیل سطور میں بیان کئے جا رہے ہیں:

جنت بے نظیر ہے:

جنت ایک ایسا انعام ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے متقی بندوں کے لئے تیار کر رکھا ہے، یہ جنت اللہ تعالیٰ کے جود و کرم اور فضل کا نتیجہ ہے، اللہ تعالیٰ نے جنت کی کچھ نعمتوں کا تذکرہ کیا ہے اور جو کچھ اللہ نے ہم سے مخفی رکھا ہے وہ کہیں زیادہ اور اعلیٰ ہے جس کا نہ عقل ادراک کر سکتی ہے اور نہ ان کی اصل حقیقت تک فکر و نظر کی پرواز ہو سکتی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَآءً بِمَا كَانُواْ يَعْمَلُونَ﴾ ترجمہ: ''پھر جیسا کچھ آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ان کے اعمال کی جزا میں ان کے لئے چھپا رکھا گیا ہے اس کی کسی متنفس کو خبر نہیں ہے''۔(سورۂ سجدہ: 17)

اللہ تعالیٰ نے اس انعام اور بدلے کا سبب بھی بیان کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ کی توفیق کے نتیجے میں انہوں نے اور انفاق فی سبیل اللہ جیسے عظیم کام انجام دیئے، ارشاد ربانی ہے: ﴿تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ ٱلْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا وَمِمَّا رَزَقْنَٰهُمْ يُنفِقُونَ ۝١٦ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَآءً بِمَا كَانُواْ يَعْمَلُونَ﴾ ترجمہ: ''اُن کی پیٹھیں بستروں سے الگ رہتی ہیں، اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے ہیں، اور جو کچھ رزق ہم نے اُنہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ پھر جیسا کچھ آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ان کے اعمال کی جزا میں ان کے لئے چھپا رکھا گیا ہے اس کی کسی متنفس کو خبر نہیں ہے''۔(سورۃ السجدہ: 16،17)

جنت کے درجات:

اہل جنت اپنے اعمال اور توفیق الہی کے اعتبار سے مختلف درجات میں تقسیم ہوں گے، آخرت میں ان میں سے بعض درجات دوسروں کے مقابلہ میں بلند اور اعلی ہوں گے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَن يَأْتِهِۦ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ ٱلصَّٰلِحَٰتِ فَأُوْلَٰٓئِكَ لَهُمُ ٱلدَّرَجَٰتُ ٱلْعُلَىٰ﴾ ترجمہ: ''اور جو اس کے حضور مؤمن کی حیثیت سے حاضر ہو گا، جس نے نیک عمل کیے ہوں گے، ایسے سب لوگوں کے لئے بلند درجات ہیں''۔(سورۃ: طہ، 75)

اہل ایمان اولیاء ان درجات میں اپنے ایمان و تقوی کے اعتبار سے مقیم ہوں گے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ٱنظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۚ وَلَلْءَاخِرَةُ أَكْبَرُ دَرَجَٰتٍ وَأَكْبَرُ تَفْضِيلًا﴾ ترجمہ: ''جو لوگ ایمان لائے ہیں اور اُن کی اولاد بھی کسی درجہ ایمان میں ان کے نقش قدم پر چلی ہے ان کی اُس اولاد کو بھی ہم (جنت میں) اُن کے ساتھ ملا دیں گے اور اُن کے عمل میں کوئی گھاٹا ان کو نہ دیں گے، ہر شخص اپنے کسب کے عوض رہن ہے''۔(سورۂ طور: 21)

دوسرے مقام پر ہے: ﴿لَٰكِنِ ٱلَّذِينَ ٱتَّقَوْاْ رَبَّهُمْ لَهُمْ غُرَفٌ مِّن فَوْقِهَا غُرَفٌ مَّبْنِيَّةٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا ٱلْأَنْهَٰرُ ۖ وَعْدَ ٱللَّهِ لَا يُخْلِفُ ٱللَّهُ ٱلْمِيعَادَ﴾ ترجمہ: ''البتہ جو لوگ اپنے رب سے ڈر کر رہے اُن کے لئے بلند عمارتیں ہیں، منزل پر منزل بنی ہوئی، جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی یہ اللہ کا وعدہ ہے، اللہ کبھی اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا ہے''۔(سورۃ الزمر: 20)

جنت کی نہریں:

قرآن کریم نے متعدد آیات میں جنت کی نہروں کا ذکر کیا ہے،ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿مَّثَلُ ٱلْجَنَّةِ ٱلَّتِى وُعِدَ ٱلْمُتَّقُونَ ۖ فِيهَآ أَنْهَـٰرٌ مِّن مَّآءٍ غَيْرِ ءَاسِنٍ وَأَنْهَـٰرٌ مِّن لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهُۥ وَأَنْهَـٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشَّـٰرِبِينَ وَأَنْهَـٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى ۖ وَلَهُمْ فِيهَا مِن كُلِّ ٱلثَّمَرَٰتِ وَمَغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ ۖ كَمَنْ هُوَ خَـٰلِدٌ فِى ٱلنَّارِ وَسُقُوا۟ مَآءً حَمِيمًا فَقَطَّعَ أَمْعَآءَهُمْ﴾ ترجمہ: ''پرہیزگاروں کے لئے جس جنت کا وعدہ کیا گیا ہے اس کی شان تو یہ ہے کہ اس میں نہریں بہہ رہی ہوں گی، نتھرے ہوئے پانی کی، نہریں بہہ رہی ہوں گی ایسے دودھ کی جس کے مزے میں ذرا فرق نہ آیا ہوگا، نہریں بہہ رہی ہوں گی ایسی شراب کی جو پینے والوں کے لئے لذیذ ہوگی، نہریں بہہ رہی ہوں گی صاف شفاف شہد کی، اُس میں اُن کے لئے ہر طرح کے پھل ہوں گے اور اُن کے رب کی طرف سے بخشش (کیا وہ شخص جس کے حصہ میں یہ جنت آنے والی ہے) اُن لوگوں کی طرح ہو سکتا ہے جو جہنم میں ہمیشہ رہیں گے اور جنہیں ایسا گرم پانی پلایا جائے گا جو ان کی آنتیں تک کاٹ دے گا؟۔(سورۃ محمدؐ:15)

جنت کے چشمے:

جنت میں بہت سے چشمے ہوں گے جن کی لذت، مزہ اور کیفیات مختلف ہوں گی، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ ٱلْمُتَّقِينَ فِى جَنَّـٰتٍ وَعُيُونٍ﴾ ترجمہ: ''بلاشبہ متقی لوگ باغوں اور چشموں میں ہوں گے''۔(سورۃ الحجر:45)۔دوسرے مقام پر ہے: ﴿إِنَّ ٱلْمُتَّقِينَ فِى ظِلَـٰلٍ وَعُيُونٍ﴾ ترجمہ: ''متقی لوگ سایوں اور چشموں میں ہوں گے''۔(سورۃ المرسلات:41) اللہ تعالیٰ کے جو دو جنتیں اپنے رب سے ڈرنے والوں کے لئے تیار کی ہیں ان کی منظر کشی یوں فرمائی ہے: ﴿فِيهِمَا عَيْنَانِ تَجْرِيَانِ﴾ ترجمہ: دونوں باغوں کے درمیان دو بہتے ہوئے چشمے ہوں گے''۔(سورۃ الرحمن:50) ﴿فِيهِمَا عَيْنَانِ نَضَّاخَتَانِ﴾ ترجمہ: ''دونوں باغوں میں دو چشمے فواروں کی طرح ابلتے ہوئے''۔(سورۃ الرحمن:66)

جنت میں دو چشمے ایسے ہوں گے جن کا پانی مقرب لوگ پئیں گے، ان کا پانی خالص بھی ہوگا اور کوئی چیز اس میں ملی ہوئی نہیں ہوگی جبکہ اسی پانی میں دیگر چیزیں بھی ملی ہوئی ہوں گی:

پہلا چشمہ: کافور کا چشمہ۔ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ ٱلْأَبْرَارَ يَشْرَبُونَ مِن كَأْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُورًا﴾﴿عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا عِبَادُ ٱللَّهِ يُفَجِّرُونَهَا تَفْجِيرًا﴾ ترجمہ: ''نیک لوگ (جنت میں) شراب کے ایسے ساغر پئیں گے جن میں آبِ کافور کی آمیزش ہوگی۔ یہ ایک بہتا چشمہ ہوگا جس کے پانی کے ساتھ اللہ کے بندے شراب پئیں گے اور جہاں چاہیں گے بسہولت اس کی شاخیں لیں گے''۔ (سورۃ الانسان:5-6)

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ اَبرار (نیک لوگ) پانی پئیں گے تو ان کا مشروب کافور ملا ہوا ہوگا، جبکہ اللہ کے بعض بندے خالص اور سادہ پانی پیئیں گے۔

دوسرا چشمہ: چشمۂ تسنیم: ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ ٱلۡأَبۡرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ۝٢٢ عَلَى ٱلۡأَرَآئِكِ يَنظُرُونَ ۝٢٣ تَعۡرِفُ فِي وُجُوهِهِمۡ نَضۡرَةَ ٱلنَّعِيمِ ۝٢٤ يُسۡقَوۡنَ مِن رَّحِيقٖ مَّخۡتُومٍ ۝٢٥ خِتَٰمُهُۥ مِسۡكٞۚ وَفِي ذَٰلِكَ فَلۡيَتَنَافَسِ ٱلۡمُتَنَٰفِسُونَ ۝٢٦ وَمِزَاجُهُۥ مِن تَسۡنِيمٍ ۝٢٧ عَيۡنٗا يَشۡرَبُ بِهَا ٱلۡمُقَرَّبُونَ﴾ ترجمہ: ”بے شک نیکوکار جنت میں ہوں گے۔ تختوں پر بیٹھے دیکھ رہے ہوں گے۔ آپ ان کے چہروں میں نعمت کی تازگی معلوم کریں گے۔ ان کو خالص شراب مہر لگی ہوئی پلائی جائے گی۔ اس کی مہر مشک کی ہو گی اور رغبت کرنے والوں کو اس کی رغبت کرنی چاہیے۔ اور اس میں تسنیم ملی ہو گی۔ وہ ایک چشمہ ہے اس میں سے مقرب پیئیں گے“۔ (سورۃ المطففین: 22-28)

جنت کی ایک نہر کا نام سلسبیل ہوگا، فرمان الٰہی ہے: ﴿وَيُسۡقَوۡنَ فِيهَا كَأۡسٗا كَانَ مِزَاجُهَا زَنجَبِيلًا ۝١٧ عَيۡنٗا فِيهَا تُسَمَّىٰ سَلۡسَبِيلٗا﴾ ترجمہ: ”ان کو وہاں ایسی شراب کے جام پلائے جائیں گے جس میں سونٹھ کی آمیزش ہو گی۔ یہ جنت کا ایک چشمہ ہو گا جسے سلسبیل کہا جاتا ہے“۔ (سورۃ الانسان: 17- 18)

جنت کے بعض درختوں کی منظر کشی:

أ: سدرۃ المنتہیٰ: اس درخت کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس کتاب میں کیا ہے اور بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت جبریل علیہ السلام کو اپنی اصل شکل میں اس درخت کے پاس دیکھا، اور اس کے پاس جنت الماٗوی ہے، اور اس بیری کے درخت کے آس پاس ایسی چیزیں ہیں جن کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَقَدۡ رَءَاهُ نَزۡلَةً أُخۡرَىٰ ۝١٣ عِندَ سِدۡرَةِ ٱلۡمُنتَهَىٰ ۝١٤ عِندَهَا جَنَّةُ ٱلۡمَأۡوَىٰٓ ۝١٥ إِذۡ يَغۡشَى ٱلسِّدۡرَةَ مَا يَغۡشَىٰ ۝١٦ مَا زَاغَ ٱلۡبَصَرُ وَمَا طَغَىٰ﴾ ترجمہ: ”اور اس نے اس کو ایک بار اور بھی دیکھا ہے۔ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس جس کے پاس جنت الماٗوی ہے۔ جب کہ اس سدرۃ پر چھا رہا تھا جو چھا رہا تھا (یعنی نور)۔ نہ تو نظر بہکی نہ حد سے بڑھی“۔ (سورۃ النجم: 13-17)

ب- شجرۂ طوبیٰ:

یہ درخت کافی بڑا اور پھیلا ہوا ہے، اس سے اہلِ جنت کے کپڑے تیار کئے جاتے ہیں، حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”طوبیٰ جنت میں ایک ایسا درخت ہے جس کا رقبہ سو سال کی مسافت بقدر ہے۔ جنتیوں کے کپڑے اس کے غلاف سے بنائے جائیں گے“۔ (مسند أحمد 3/71) مسند أبو یعلی: 1374، مجمع الزوائد 10/67)

ایک ایسا درخت جس کے سائے میں ایک سوار سو سال چلتا رہے تو اس کی مسافت ختم نہیں ہو گی، یہ درخت اتنا بڑا ہے کہ اس کی حقیقی مقدار اس کے خالق کے سوا کوئی نہیں جان سکتا ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے اس درخت کی منظر کشی یوں بیان فرمائی ہے کہ مقابلہ کے لئے تیار کئے گئے تیز رفتار گھوڑے پر سوار شخص کو اس کی مسافت کو طے کرنے کے لئے سو سال درکار ہوں گے بشرطیکہ وہ تیز رفتاری کے ساتھ چلے۔ صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے وہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "بے شک جنت

میں ایک ایسا درخت ہے جس کے سائے میں ایک سوار سو سال تک چل سکتا ہے اور اگر چاہو تو پڑھ لو: "وظـــل ممـــدود"۔(صحیح بخاری: 3252، صحیح مسلم:2826)

اس کے ذریعہ اللہ سبحانہ وتعالی کے مبدعانہ تخلیق، قدرتِ قاہرہ اور صنعت وکاریگری کا کچھ اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اہل جنت کا کھانا پینا:

اللہ تعالی نے بیان فرمایا ہے کہ جنت میں خود پسند، نوع بنوع کھانے اور پینے کی چیزیں ہوں گی، ارشاد باری تعالی ہے:[وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُونَ] ترجمہ:"اور وہ اُن کے سامنے طرح طرح کے لذیذ پھل پیش کریں گے، جسے چاہیں چن لیں"۔(سورۃ الواقعہ:20)

دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿يُطَافُ عَلَيْهِم بِصِحَافٍ مِّن ذَهَبٍ وَأَكْوَابٍ ۖ وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ ۖ وَأَنتُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾ ترجمہ:"اُن کے آگے سونے کے تھال اور ساغر گردش کرائے جائیں گے اور ہر من بھاتی اور نگاہوں کو لذت دینے والی چیز وہاں موجود ہوگی، ان سے کہا جائے گا:"تم اب یہاں ہمیشہ رہو گے"۔(سورۂ زخرف:71)

اللہ تعالی نے اہل جنت کے لئے یہ بات جائز کررکھی ہے کہ وہ جنت کی ہر اچھی چیز، قسم قسم کے کھانے اور مشروبات جو چاہیں گے استعمال کرسکتے ہیں، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا أَسْلَفْتُمْ فِي الْأَيَّامِ الْخَالِيَةِ﴾ ترجمہ: "(ایسے لوگوں سے کہا جائے گا)مزے سے کھاؤ اور پیو اپنے اُن اعمال کے بدلے جو تم نے گزرے ہوئے دنوں میں کئے ہیں"۔(سورۃ الحاقہ:24)

اہل جنت کی شراب:

جنتیوں کو جو مشروب اللہ تعالی کی طرف سے عطا کیا جائے گا وہ شراب کا مشروب ہوگا، لیکن جنت کی شراب ہر قسم کے اُن عیوب اور بیماریوں سے پاک ہوگی جو کہ دنیا کی شراب میں پائی جاتی ہیں، دنیا کی شراب عقل کو خراب کرتی ہے اور سر چکرا جاتا ہے، پیٹ میں تکلیف کا باعث بنتی ہے، جسم میں امراض کا سبب بنتی ہے، اور اس کو بنانے کا طریقہ اور اس کا رنگ بھی ناپسندیدہ ہوسکتا ہے، لیکن جہاں تک جنت کی شراب کا تعلق ہے تو وہ اس طرح کے تمام عیوب اور نقائص سے پاک ہے اور خوبصورت صاف وشفاف اور عمدہ ہے۔(دیکھیں: الیوم الآخر فی الجنۃ والنار، عمر الأشقر، ص23)

ارشاد باری تعالی ہے: ﴿يُطَافُ عَلَيْهِم بِكَأْسٍ مِّن مَّعِينٍ ﴿٤٥﴾ بَيْضَاءَ لَذَّةٍ لِّلشَّارِبِينَ ﴿٤٦﴾ لَا فِيهَا غَوْلٌ وَلَا هُمْ عَنْهَا يُنزَفُونَ﴾ ترجمہ:"شراب کے چشموں سے ساغر بھر بھر کران کے درمیان پھرائے جائیں گے۔ چمکتی ہوئی شراب، جو پینے والوں کے لئے باعثِ لذّت ہوگی۔نہ ان کے جسم کو اس سے کوئی ضرر ہوگا اور نہ ان کی عقل اس سے خراب ہوگی۔(سورۃ الصافات:45- 47)

چنانچہ اللہ تعالی نے اس کے رنگ کا جمال بیان کرنے کے لئے "بیضاء"(سفید) کا لفظ استعمال کیا ہے اور پھر بیان کیا ہے کہ وہ پینے والے کے لئے باعثِ لذت ہوگی، اور اس کے پینے سے اس کو اکاہٹ نہیں ہوگی۔

ایک اور مقام پر جنت کی شراب کی منظر کشی کرتے ہوئے بیان کیا ہے: ﴿يَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُونَ ۝ بِأَكْوَابٍ وَأَبَارِيقَ وَكَأْسٍ مِّن مَّعِينٍ ۝ لَّا يُصَدَّعُونَ عَنْهَا وَلَا يُنزِفُونَ﴾ ترجمہ: ''اُن کی مجلسوں میں ابدی لڑکے چشمۂ جاری سے، لبریز پیالے کنٹر اور ساغر لئے دوڑتے پھرتے ہوں گے، جسے پی کر نہ اُن کا سر چکرائے گا، نہ ان کی عقل میں فتور آئے گا''۔(سورۃ الواقعہ: 17-19)

اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا ہے: ﴿يُسْقَوْنَ مِن رَّحِيقٍ مَّخْتُومٍ ۝ خِتَامُهُ مِسْكٌ ۚ وَفِي ذَٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ﴾ ترجمہ: ''ان کو نفیس ترین سربند شراب پلائی جائے گی جس پر مشک کی مہر لگی ہو گی۔ جو لوگ دوسروں پر بازی لے جانا چاہتے ہوں وہ اِس چیز کو حاصل کرنے میں بازی لے جانے کی کوشش کریں''۔(سورۃ المطففین: 25-26)

'رحیق' شراب ہی کا دوسرا نام ہے، اس شراب کی دو صفات ذکر کی گئی ہیں:

۱۔ وہ مہر بند ہو گی، یعنی حکمِ الٰہی کی مہر اس پر لگی ہو گی۔

۲۔ وہ جب اس شراب کو پئیں گے تو پینے کے اخیر میں مشک کی خوشبو محسوس کریں گے۔(دیکھیں: تفسیر ابن کثیر 6/514)

اہلِ جنت کا کھانا ہر قسم کی آلودگی سے پاک ہو گا:

جنت ایک ایسی جگہ ہے جو ہر قسم کی تکلیف سے پاک ہے اور اہلِ جنت اہل دنیا کے ہر قسم کے میل کچیل اور گندگی سے پاک وصاف ہوں گے، اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: ''میری امت کا سب سے پہلا گروہ جو جنت میں داخل ہو گا وہ چودھویں رات کے چاند کی طرح ہوں گے، پھر ان کے بعد جو گروہ جائے گا وہ آسمان کے سب سے زیادہ چمکتے ہوئے ستارے کی طرح ہوں گے، اس کے بعد کے لوگوں کے الگ الگ درجات ہوں گے، جنتی بول و براز نہیں کریں گے، نہ ناک سنکیں اور نہ ہی تھوکیں گے''۔(صحیح بخاری: 3327، صحیح مسلم: 2834)

حدیث کے مطابق اہلِ جنت میں تفاوت اور فرق ان کے نور کے اعتبار سے ہو گا، البتہ ہر قسم کی گندگی اور آلودگی سے پاک وصاف ہونے میں وہ سب مشترک ہوں گے، وہ نہ بول و بزار کریں گے، نہ تھوکیں گے، نہ ناک سنکیں گے، ان کے کھانے پینے کے فضلات مشک نما پسینہ میں تبدیل ہو کر ان کے جسم سے باہر آجائیں گے، اسی طرح بعض فضلات ڈکار کے ذریعہ خارج ہوں گے، اور وہ ڈکار ایسی ہو گی جس سے معطر و پاکیزہ اور روح پرور خوشبو پھوٹے گی۔

اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے: "بے شک جنت کے لوگ کھائیں گے اور پئیں گے، لیکن نہ تھوکیں گے، نہ پیشاب کریں گے، نہ پاخانہ کریں گے، اور نہ ناک سنکیں گے۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: پھر کھانے کا کیا ہو گا؟ آپؐ نے فرمایا: ڈکار آئے گی اور پسینہ آئے گا جس سے مشک کی خوشبو آئے گی"۔(صحیح مسلم: 2835، ابوداؤد: 4741)

اہلِ جنت کا لباس، ان کے زیورات اور ان کی خوشبو:

اہلِ جنت اعلیٰ قسم کا فاخرانہ لباس پہنیں گے، اور سونے، چاندی اور موتیوں سے بنے ہوئے قسم قسم کے زیورات کے ذریعہ زینت اختیار کریں گے، ان کا لباس ریشم کا ہوگا، اور ان کے زیورات سونے، چاندی اور موتیوں کے ہوں گے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿جَنَّٰتُ عَدۡنٖ يَدۡخُلُونَهَا يُحَلَّوۡنَ فِيهَا مِنۡ أَسَاوِرَ مِن ذَهَبٖ وَلُؤۡلُؤٗاۖ وَلِبَاسُهُمۡ فِيهَا حَرِيرٞ﴾ ترجمہ: ”ہمیشہ رہنے والی جنتیں ہیں جن میں یہ لوگ داخل ہوں گے، وہاں انہیں سونے کے کنگھنوں اور موتیوں سے آراستہ کیا جائے گا، وہاں ان کا لباس ریشم ہوگا“۔(سورۂ فاطر: 33)۔ دوسری جگہ ہے: ﴿عَٰلِيَهُمۡ ثِيَابُ سُندُسٍ خُضۡرٞ وَإِسۡتَبۡرَقٞۖ وَحُلُّوٓاْ أَسَاوِرَ مِن فِضَّةٖ وَسَقَىٰهُمۡ رَبُّهُمۡ شَرَابٗا طَهُورًا﴾ ترجمہ: ”اُن کے اوپر باریک ریشم کے سبز لباس اور اطلس ودیبا کے کپڑے ہوں گے، ان کو چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے، اور ان کا رب ان کو نہایت پاکیزہ شراب پلائے گا“۔(سورۃ الانسان: 21)

ان کے کپڑے رنگ برنگی ہونگے، سندس واستبرق کے سبز کپڑے زیب تن کئے ہوں گے: ﴿أُوْلَٰٓئِكَ لَهُمۡ جَنَّٰتُ عَدۡنٖ تَجۡرِي مِن تَحۡتِهِمُ ٱلۡأَنۡهَٰرُ يُحَلَّوۡنَ فِيهَا مِنۡ أَسَاوِرَ مِن ذَهَبٖ وَيَلۡبَسُونَ ثِيَابًا خُضۡرٗا مِّن سُندُسٖ وَإِسۡتَبۡرَقٖ مُّتَّكِـِٔينَ فِيهَا عَلَى ٱلۡأَرَآئِكِۚ نِعۡمَ ٱلثَّوَابُ وَحَسُنَتۡ مُرۡتَفَقٗا﴾ ترجمہ: ”یہی وہ خوش نصیب ہیں جن کے لئے ہیشگی کی جنتیں ہیں، جن کے نیچے نہریں رواں ہیں، وہ ان جنتوں میں سونے کے کنگنوں سے آراستہ کئے جائیں گے، وہ سبز باریک ریشمی کپڑوں پر ٹیک لگائے بیٹھے ہوں گے، کیا ہی خوب صلہ ہے اور کیا ہی خوب ٹھکانہ ہے“۔(سورۂ کہف: 31)

اللہ کے رسول ﷺ نے بتایا ہے کہ اہلِ جنت کی کنگھیاں سونے، چاندی کی ہوں گی، عمدہ قسم کی عود کی لکڑی کا بخور جلائیں گے، ساتھ میں ان کے پاکیزہ جسموں سے مشک کی خوشبو آرہی ہوگی۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: "ان کے برتن سونے چاندی کے ہوں گے۔ ان کی کنگھیاں سونے کی ہوں گی۔ ان کی انگیٹھیوں کا ایندھن عمدہ عود ہوگا، اور ان کا پسینہ مشک ہوگا۔ (صحیح بخاری: 3246، صحیح مسلم، 17/2834)

اہل جنت کے کپڑے اور ان کے زیورات نہ بوسیدہ ہوں گے اور نہ ختم ہوں گے، اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے: ”جو جنت میں داخل ہوگا وہ خوشحال رہے گا، کبھی بدحالی کا شکار نہیں ہوگا، نہ اس کے کپڑے بوسیدہ ہوں گے، اور نہ ہی اس کی جوانی ختم ہوگی“۔(صحیح مسلم: 2836، مسند أحمد: 2/369-370، 407، 462، 416، دارمی: 2861، صفۃ أھل الجنۃ لأبی نعیم: 97)

اہل جنت کی مجالس ملاقات اور گفتگو:

اہلِ جنت ایک دوسرے سے ملاقات کریں گے، اور پاکیزہ مجلسوں میں ایک دوسرے کے ساتھ جمع ہوں گے، اور دنیاوی زندگی میں پیش آمدہ باتوں کو یاد کریں گے، اور جنت میں داخلہ کی نعمت اور احسان کا ذکر کریں گے، اللہ تعالیٰ اہل جنت کے جمع ہونے کی کیفیت یوں بیان فرماتا

ہے: ﴿وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ﴾ ترجمہ: "اُن کے دلوں میں جو تھوڑی بہت کھوٹ کپٹ ہو گی اسے ہم نکال دیں گے، وہ آپس میں بھائی بھائی بن کر آمنے سامنے تختوں پر بیٹھیں گے"۔(سورۃ الحجر:47)

قرآن کریم نے اہل جنت کی آپس کی مختلف گفتگو کا بھی ذکر کیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿قَالُوٓا۟ إِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِىٓ أَهْلِنَا مُشْفِقِينَ ﴿٢٦﴾ فَمَنَّ ٱللَّهُ عَلَيْنَا وَوَقَىٰنَا عَذَابَ ٱلسَّمُومِ ﴿٢٧﴾ إِنَّا كُنَّا مِن قَبْلُ نَدْعُوهُ ۖ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلْبَرُّ ٱلرَّحِيمُ﴾ ترجمہ: "اور ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر آپس میں پوچھیں گے۔ کہیں گے ہم تو اس سے پہلے اپنے گھروں میں ڈرا کرتے تھے۔ پس اللہ نے ہم پر احسان کیا اور ہمیں لو کے عذاب سے بچالیا۔ بے شک ہم اس سے پہلے اسے پکارا کرتے تھے، بے شک وہ بڑا ہی احسان کرنے والا نہایت رحم والا ہے"۔(سورۂ طور:25-28)

وہ ان شر پسندوں کا ذکر بھی کریں گے جو اہل ایمان میں شکوک و شبہات پیدا کرتے تھے اور ان کو کفر کی طرف بلاتے تھے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَسَآءَلُونَ ﴿٥٠﴾ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ إِنِّى كَانَ لِى قَرِينٌ ﴿٥١﴾ يَقُولُ أَءِنَّكَ لَمِنَ ٱلْمُصَدِّقِينَ ﴿٥٢﴾ أَءِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَٰمًا أَءِنَّا لَمَدِينُونَ ﴿٥٣﴾ قَالَ هَلْ أَنتُم مُّطَّلِعُونَ ﴿٥٤﴾ فَٱطَّلَعَ فَرَءَاهُ فِى سَوَآءِ ٱلْجَحِيمِ ﴿٥٥﴾ قَالَ تَٱللَّهِ إِن كِدتَّ لَتُرْدِينِ ﴿٥٦﴾ وَلَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّى لَكُنتُ مِنَ ٱلْمُحْضَرِينَ ﴿٥٧﴾ أَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِينَ ﴿٥٨﴾ إِلَّا مَوْتَتَنَا ٱلْأُولَىٰ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ ﴿٥٩﴾ إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ ٱلْفَوْزُ ٱلْعَظِيمُ ﴿٦٠﴾ لِمِثْلِ هَٰذَا فَلْيَعْمَلِ ٱلْعَٰمِلُونَ ﴿٦١﴾﴾ ترجمہ: "پس وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر آپس میں سوال کریں گے، ان میں سے ایک کہنے والا کہے گا کہ میرا ایک ساتھی تھا، وہ کہا کرتا تھا کہ کیا تو تصدیق کرنے والوں میں ہے۔ کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں گے تو کیا ہمیں بدلہ دیا جائے گا۔ کہے گا کیا تم بھی دیکھنا چاہتے ہو۔ پس وہ جھانکے گا تو اسے دوزخ کے درمیان دیکھے گا۔ کہے گا اللہ کی قسم! تو تو قریب تھا کہ مجھے ہلاک ہی کر دے۔ اور اگر میرے رب کا فضل نہ ہوتا تو میں بھی حاضر کئے ہوئے مجرموں میں ہوتا۔ پس کیا اب ہم مرنے والے نہیں۔ مگر ہمارا پہلی بار کا مرنا اور ہمیں عذاب نہیں دیا جائے گا۔ بے شک یہی بڑی کامیابی ہے۔ ایسی ہی کامیابی کے لئے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہیے"۔(سورۂ صافات:50-61)

اہلِ جنت کی بیویاں:

دنیا میں ایک مؤمن کی جو بیوی ہو گی وہی آخرت میں بھی اس کی بیوی ہو گی، بشرطیکہ وہ مؤمنہ ہو، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿جَنَّٰتُ عَدْنٍ يَدْخُلُونَهَا وَمَن صَلَحَ مِنْ ءَابَآئِهِمْ وَأَزْوَٰجِهِمْ وَذُرِّيَّٰتِهِمْ ۖ وَٱلْمَلَٰٓئِكَةُ يَدْخُلُونَ عَلَيْهِم مِّن كُلِّ بَابٍ﴾ ترجمہ: "ایسے باغ جو اُن کی ابدی قیام گاہ ہوں گے، وہ خود بھی ان میں داخل ہوں گے اور ان کے آباء واجداد اور اُن کی بیویوں اور اُن کی اولاد میں سے جو جو صالح ہیں وہ بھی اُن کے ساتھ وہاں جائیں گے، ملائکہ ہر طرف سے اُن کے استقبال کے لئے آئیں گے۔(سورۂ رعد:

23) جنتی جنت میں اپنی ازواج کے ساتھ خوش و خرم ہوں گے، سایہ میں ٹیک لگائے ہوئے خوش ہوں گے، ارشاد ہے: ﴿هُمْ وَأَزْوَاجُهُمْ فِي ظِلَالٍ عَلَى الْأَرَائِكِ مُتَّكِئُونَ﴾ ترجمہ: '' وہ اور ان کی بیویاں گھنے سایوں میں ہیں، مسندوں پر تکیے لگائے ہوئے''۔ (سورۃ یٰسین:56)

دوسری جگہ ہے: ﴿ادْخُلُوا الْجَنَّةَ أَنتُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُونَ﴾ ترجمہ:''داخل ہو جاؤ جنت میں تم اور تمہاری بیویاں، تمہیں خوش کر دیا جائے گا"۔(سورۃ الزخرف:70)

حور عین:

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿كَذَٰلِكَ وَزَوَّجْنَاهُم بِحُورٍ عِينٍ﴾ ترجمہ'': یہ ہو گی ان کی شان اور ہم گوری گوری آہو چشم عورتیں ان سے بیاہ دیں گے''۔(سورۃ الدخان:54) حور کا لفظ حوراء کی جمع ہے۔ حور ایسی عورت کو کہتے ہیں جس کی آنکھ کی سفیدی انتہائی سفید اور اس کا سیاہ پن انتہائی سیاہ ہو۔ اور "عین" کا لفظ 'عیناء' کی جمع ہے۔ 'عیناء' بڑی آنکھوں والی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں حور عین کی منظر کشی کرتے ہوئے ان کو "کواعب اترابا" قرار دیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ مَفَازًا ﴿٣١﴾ حَدَائِقَ وَأَعْنَابًا ﴿٣٢﴾ وَكَوَاعِبَ أَتْرَابًا﴾ ترجمہ:''یقیناً متقیوں کے لئے کامرانی کا ایک مقام ہے: باغ اور انگور، اور نوخیز ہم سن لڑکیاں''۔ (سورۃ النبا31-33) کاعب: وہ خوبصورت عورت جس کے پستان ابھر آئے ہوں۔ اور "اتراب" ہم عمر عورتوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔''حور عین'' جنت میں اللہ کی خاص تخلیق ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے خاص اٹھان پر بنایا ہو گا اور ان کو کنواریاں، دلربا اور ہم عمر رکھا ہو گا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: [إِنَّا أَنشَأْنَاهُنَّ إِنشَاءً ﴿﴾ فَجَعَلْنَاهُنَّ أَبْكَارًا ﴿﴾ عُرُبًا أَتْرَابًا] ترجمہ: ''ان کی بیویوں کو ہم خاص طور پر نئے سرے سے پیدا کیا ہے۔ اور انہیں باکرہ بنایا ہے۔ اپنے شوہروں کی عاشق اور عمر میں ہم سن''۔(سورۃ الواقعہ:35-37) ان کا کنواریاں ہونا یہ بتاتا ہے کہ اس سے پہلے ان سے کسی نے بھی نکاح نہیں کیا ہو گا، جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿فِيهِنَّ قَاصِرَاتُ الطَّرْفِ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ﴾ ترجمہ:''اِن نعمتوں کے درمیان شرمیلی نگاہوں والیاں ہوں گی جنہیں اِن جنتیوں سے پہلے کسی انسان یا جن نے چھوا نہ ہو گا''۔(سورۃ الرحمن:56)

قرآن کریم نے اہلِ جنت کی عورتوں کے حسن و جمال کو بھی بیان کیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَحُورٌ عِينٌ ﴿٢٢﴾ كَأَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُونِ﴾ ترجمہ:''اور ان کے لئے خوبصورت آنکھوں والی حوریں ہوں گی۔ ایسی حسین جیسے چھپا کر رکھے ہوئے موتی''۔ (سورۃ الواقعہ:22-23)۔ "مکنون" سے مراد: پوشیدہ اور محفوظ جس کے صاف رنگ کو سورج کی روشنی نے اور ہاتھوں کے مسّ نے تبدیل نہ کیا ہو۔ ایک دوسری جگہ ان عورتوں کو یاقوت و مرجان سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فِيهِنَّ قَاصِرَاتُ الطَّرْفِ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ ﴿٥٦﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿٥٧﴾ كَأَنَّهُنَّ الْيَاقُوتُ

﴿وَٱلۡمَرۡجَانُ﴾ ترجمہ : ’’اِن نعمتوں کے درمیان شرمیلی نگاہوں والیاں ہوں گی جنہیں اِن جنتیوں سے پہلے کسی انسان یا جن نے چھوا نہ ہوگا۔اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے ؟۔ایسی خوبصورت جیسے ہیرے اور موتی۔ (سورۂ رحمن: 56-58) یاقوت اور مرجان دو عمدہ قسم کے پتھروں کا نام ہے، جو جمال اور حسین عمدہ منظر سے بھرپور ہوتے ہیں۔ حور کو "قاصرات الطرف" بھی کہا گیا ہے،اس سے مراد وہ حسین عورتیں ہیں جن کی نگاہیں اپنے شوہر تک محدود رہتی ہیں،اور شوہروں کے علاوہ اور کسی کی جانب ان کی نگاہیں نہیں اٹھتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے جنت کی حوروں کے بارے میں حسن وجمال کی گواہی دی ہے جس کے حسنِ وجمال کی گواہی اللہ تعالیٰ دے گا، اس کے حسن کی انتہا کیا ہوگی، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فِيهِنَّ خَيۡرَٰتٌ حِسَانٞ ۝٧٠ فَبِأَيِّ ءَالَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ﴾ ترجمہ:’’اِن نعمتوں کے درمیان خوب سیرت اور خوبصورت بیویاں۔اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے ؟۔(سورۃ الرحمن:70-71)

جنت کی عورتیں دنیا کی عورتوں کی طرح نہیں ہوں گی، جنت کی عورتیں حیض ونفاس، تھوک، ناک اور بول وبراز سے پاک ہوں گی۔(دیکھیں:الوسطیۃ فی القرآن الکریم، ص433)

اللہ کے رسول ﷺ نے جنت کے مردوں اور اہل جنت کی عورتوں کے جمال کی منظر کشی کی ہے، آپ ﷺ نے فرمایاہے: ’’جو گروہ سب سے پہلے جنت میں داخل ہوگا ان کی صورتیں چودھویں چاند کی طرح ہوں گی، نہ وہ جنت میں تھوکیں گے، نہ ناک صاف کریں گے، اور نہ ہی بول وبزار کریں گے، اس میں ان کے برتن سونے کے ہوں گے، ان کی کنگھیاں سونے، چاندی کی ہوں گی، ان کی انگیٹھیوں میں عود سلگتا ہوگا، پسینے سے مشک کی خوشبو آرہی ہوگی، ان میں سے ہر ایک کی دو بیویاں ہوں گی جن کی پنڈلیوں کا گودا خوبصورتی کی وجہ سے گوشت کے بیچ سے نظر آئے گا‘‘۔(صحیح مسلم:17/2834) صحیح بخاری:3245)

جس حسن وجمال کا تذکرہ اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے اصحاب کے سامنے فرمایا، کیا دنیا میں اس کی کوئی نظیر نہیں مل سکتی ہے ؟! ’’اور اگر جنت کی کوئی عورت روئے زمین کے لوگوں کی طرف جھانک بھی لے تو زمین وآسمان کے درمیان کا حصہ منور ہو جائے گا، اس پوری مسافت کو وہ خوشبو سے معطر کردے گی اور اس کے سر کا دوپٹہ دنیا اور اس کی ساری چیزوں سے کہیں بہتر ہے‘‘۔(صحیح بخاری:2796، مسند احمد:1/143، سنن ترمذی:1657، ابنِ حبان:7399)

اہل جنت کو دی جانے والی افضل ترین نعمت:

اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے: "جب جنتی لوگ جنت میں داخل ہوجائیں گے تو اللہ تبارک وتعالیٰ ان سے دریافت کرے گا: کوئی ایسی چیز ہے جو میں تمہیں مزید عطا کروں؟ وہ جواب دیں گے: کیا آپ نے ہمارے چہروں کو روشن نہیں کیا؟! کیا آپ نے ہمیں جنت میں داخل نہیں کیا؟! اور کیا آپ نے ہمیں جہنم سے نجات نہیں دی؟! فرماتے ہیں: پھر اللہ تعالیٰ حجاب اٹھائے گا تو اہل جنت کو عطا کی جانے والی چیزوں میں کوئی ایسی چیز کو اتنی محبوب پسند نہیں ہوگی جتنا اپنے رب کا دیدار انہیں محبوب ہوگا‘‘۔ایک دوسری روایت میں ہے: اس کے بعد

آپ ﷺ نے یہ آیتِ کریمہ تلاوت فرمائی: ﴿لِّلَّذِينَ أَحْسَنُواْ ٱلْحُسْنَىٰ وَزِيَادَةٌۖ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوهَهُمْ قَتَرٌ وَلَا ذِلَّةٌۚ أُوْلَٰٓئِكَ أَصْحَٰبُ ٱلْجَنَّةِۖ هُمْ فِيهَا خَٰلِدُونَ﴾ ترجمہ:''جن لوگوں نے بھلائی کا طریقہ اختیار کیا ان کے لئے بھلائی ہے اور مزید فضل ان کے چہروں پر رُوسیاہی اور ذلّت نہ چھائے گی وہ جنت کے مستحق ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے''۔(سورۂ یونس:26)مسند اُحمد 332-4/333) صحیح مسلم:181، سنن ترمذی:2555، سنن ابنِ ماجہ:187)

اور جہاں تک تعلق ہے اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور خوشنودی کا جو اہل جنت کو عطا کی جائے گی، اس کے بارے میں حضرت اُبو سعید خدریؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:''اللہ تعالیٰ اہل جنت سے کہے گا: اے جنت والو! وہ جواب دیں گے: اے ہمارے رب ہم حاضر ہیں اور تیری خدمت کے لئے مستعد ہیں، اور سب خیر تیرے ہاتھوں میں ہے۔ اللہ تعالیٰ پوچھے گا: کیا تم خوش ہو ؟ وہ جواب دیں گے: اب ہم کیوں خوش نہیں ہوں گے ؟! تو نے تو ہمیں وہ چیزیں عطا کی ہیں جو کسی مخلوق کو عطا نہیں کی گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا میں تمہیں اس سے افضل انعام نہ دے دوں؟ وہ کہیں گے: اے رب! اس سے افضل کیا چیز ہو سکتی ہے ؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میں اپنی خوشنودی اور رضا کے دروازے تمہارے لئے وا کرتا ہوں، اب کبھی اس کے بعد تم سے ناراض نہیں ہوں گا''۔(صحیح بخاری: 6549، صحیح مسلم:2829)

اہلِ جنت کی گفتگو کا اختتامیہ:

میدانِ حشر کی جاں گسل صورتحال میں اہل ایمان ہولناک مناظر سے گزریں گے، اس کے بعد وہ صراطِ مستقیم سے گزریں گے اور خوف وہول کا سامنا کریں گے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ ان کو نعمتوں والی جنت میں داخل کرے گا، اور اس سے پہلے ان سے ہر قسم کے غم وحزن کو دور کر دیا جائے گا، جب وہ عظیم نعمتوں کا مشاہدہ کریں گے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے تیار کی ہوں گی، وہ اپنے رب کی تسبیح وتقدیس میں رطب اللسان ہو جائیں گے، اللہ نے ان کے ہر قسم کے غم کو دور کر دیا ہوگا، ان سے کئے ہوئے وعدہ کو مکمل کیا ہوگا، اور ان کو جنت کا وارث بنایا ہوگا، ارشاد ربانی ہے: ﴿جَنَّٰتُ عَدْنٍ يَدْخُلُونَهَا يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِن ذَهَبٍ وَلُؤْلُؤًاۖ وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ ۝٣٣ وَقَالُواْ ٱلْحَمْدُ لِلَّهِ ٱلَّذِيٓ أَذْهَبَ عَنَّا ٱلْحَزَنَۖ إِنَّ رَبَّنَا لَغَفُورٌ شَكُورٌ﴾ ترجمہ: ''ہمیشہ رہنے والی جنتیں ہیں جن میں یہ لوگ داخل ہوں گے، وہاں انہیں سونے کے کنگھنوں اور موتیوں سے آراستہ کیا جائے گا، وہاں ان کا لباس ریشم ہوگا۔ اور وہ کہیں گے کہ شکر ہے اُس خدا کا جس نے ہم سے غم دور کر دیا، یقیناً ہمارا رب معاف کرنے والا اور قدر فرمانے والا ہے''۔(سورۂ فاطر:33-34)

اور جنت میں ان کی آخری صدا یہ ہوگی کہ تمام تعریفیں اللہ رب العالمین کے لئے ہیں، جیسے کہ ارشاد ربانی ہے: ﴿دَعْوَىٰهُمْ فِيهَا سُبْحَٰنَكَ ٱللَّهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَٰمٌۚ وَءَاخِرُ دَعْوَىٰهُمْ أَنِ ٱلْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ ٱلْعَٰلَمِينَ﴾ ترجمہ:''وہاں ان کی صدا یہ

ہو گی کہ "پاک ہے تو اے خدا، "اُن کی دعا یہ ہو گی کہ "سلامتی ہو" اور ان کی ہر بات کا خاتمہ اس پر ہو گا کہ "ساری تعریف اللہ رب العالمین ہی کے لئے ہے"۔(سورہ یونس:10)

نبی کریم ﷺ اپنے اصحاب کی تربیت اس انداز سے کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی ان کا مطمحِ نظر بن جائے، تاکہ وہ عظیم جنت میں داخل ہونے کے اہل ہوں، اس لئے اللہ کے رسول ﷺ ان کے سامنے جنت کی منظر کشی منہجِ قرآنی کے مطابق فرماتے تھے، اللہ کے رسول ﷺ جب جنت کی منظر کشی فرماتے تھے تو صحابہ کرام کو ایسا لگتا تھا گویا کہ اس وقت جنت ان کی نگاہوں کے سامنے ہے اور اس کے ذریعہ ان کے جذبات ایسے ہو جاتے تھے کہ گویا کہ وہ عملی طور پر ابھی جنت کا مشاہدہ کر رہے ہوں، اور یہ مستقبل میں پیش آنے والا منظر نہ ہو، یہ قرآن پاک کی معجز بیانی ہے کہ ابھی وقوع پذیر نہ ہونے والی آخرت کا منظر ایسا بن جاتا ہے گویا انسان اس میں زندگی بسر کر رہا ہے، اور عملی طور پر جس حاضر میں انسان زندگی بسر کر رہا ہے وہ ایسا دور دراز ماضی بن جاتا ہے جس کو انسان سے ایک لمبا زمانہ اور طویل فاصلہ الگ کر رہا ہو۔(دیکھیں: دراسۃ قرآنیہ، محمد قطب:81)

جنت کا انوکھا اور عمدہ تصور اور اس کے بارے میں اعتقاد جازم امت کے عروج اور سربلندی کے لئے اہم اور ضروری ہے، جب جنت کا منظر امت کے دلوں میں زندہ شکل میں موجود رہے گا تو رضائے الٰہی کے حصول کے لئے ان کے اندر از خود تحریک پیدا ہو گی، اور اس کے لئے وہ ہر قیمتی اور نفیس چیز پیش کرنے سے دریغ نہیں کریں گے، اور ہر قسم کی کمزوری اور موت کے ڈر سے پاک ہوں گے، اور ان کے اندر ایسی قوت متحرکہ کا سرچشمہ ابل پڑے گا جو ان کے لئے عزیمت واستقامت اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے ہر قربانی دینے کا حوصلہ پیدا کرے گا، امت نے اپنی عظیم تاریخ میں جن فیصلہ کن معرکوں میں عظیم فتوحات حاصل کی ہیں ان کے بنیادی اسباب میں یہ بات تھی کہ قائدین اور فوج سب کے سب اللہ کے راستے میں شہادت کو انتہائی محبوب رکھتے تھے، جنت کا شوق ان کے رگ وپے میں دوڑتا تھا اور فریضۂ جہاد کو عبادت سمجھ کر انجام دیتے تھے، اس کی بہت سی زندہ مثالیں موجود ہیں، جیسے کہ زلّاقہ کا معرکہ جس میں مسلمان یوسف بن تاشقین کی قیادت میں اندلس میں عیسائیوں کے مقابلہ میں کامیاب ہوئے۔ اسی طرح معرکہ حطین میں صلاح الدین اَیوبیؒ کی قیادت میں کامیاب ہوئے، قطز کی قیادت میں عین جالوت میں فتح پائی اور محمد الفاتح کی قیادت میں قسطنطنیہ میں کامیابی حاصل کی۔

5) قرآن کریم میں جہنم کی منظر کشی اور صحابہ کرام پر اس کے اثرات:

صحابہ کرامؓ کے دلوں میں اللہ کا خوف تھا، وہ اس سے ڈرتے تھے اور اسی کی رحمت کے امیدوار تھے، رسول اللہ ﷺ کی تربیت کا ان کے دلوں میں زبردست اثر تھا، اور اللہ کے رسول ﷺ جس منہجِ قرآنی کے مطابق عمل پیرا تھے، اس کے ذریعہ صحابہ کرام کے دلوں میں عجیب وغریب اثرات مرتب ہوتے تھے، اس لئے کہ قرآن کریم نے قیامت کی تمام ہولناکیوں اور ان کی کیفیات کی عجیب منظر کشی کی ہے، جیسے کہ روئے زمین کے نظام کو درہم برہم کرنا، اس کو ریزہ ریزہ کرنا، آسمان کو لپیٹ لینا، پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کرنا، سمندر کا پھٹنا اور ان میں آگ لگ جانا، آسمان پھٹ جانا، سورج اور چاند کا بے نور ہو جانا، ستاروں کا بکھر کر جھڑ جانا۔ اسی طرح قرآن کریم نے کفار کی صورتحال، ان کی ذلت و رسوائی، ان کی حسرت وناامیدی، ان کے اعمال کے اکارت ہونے، عابد ومعبود کے جھگڑنے، گمراہ کن لیڈروں اور ان کے پیروکاروں کے

جھگڑنے، کمزوروں اور طاقتوروں کے جھگڑنے، کفار اور شیاطین کے مباحثہ، اعضائے جسم کے گواہی دینے اور جسم وروح کے مکالمے اور مخاصمے کی زبردست منظر کشی کی ہے، اسی طرح قرآن کریم نے اپنے شفاعت کے بارے میں تفصیلات بیان کی ہیں، اس کی شرائط کو بیان کیا ہے، اور واضح کیا ہے کہ کون سی صفات قابل قبول ہوگی اور کون سی ناقابل قبول ہوگی، اور حساب اور جزاو سزا کی تفصیلات کیا ہیں، حساب و کتاب کا منظر کیسا ہوگا اور کیا کفار سے سوال کیا جائے گا، اور ان سے کیوں سوال کیا جائے گا اور ان تمام سوالات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

قرآن کریم نے اس کو بھی بیان کیا ہے کہ قیامت کے روز مخلوقات کے مابین مظالم کا بدلہ دلایا جائے گا، اور اس بدلہ دلانے کی کیفیات کیا ہوں گی، انسانی جان اور خون کی عظمت واہمیت کو بھی قرآن میں بیان کیا گیا ہے، یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ قیامت کے دن میزان قائم کی جائے گی، جس کے ذریعہ اعمال کا وزن کیا جائے گا، اسی طرح نبی کریم ﷺ نے حوضِ کوثر کے بارے میں تفصیلات بیان کی ہیں اور بیان فرمایا ہے کہ کون لوگ حوضِ کوثر پر آسکیں گے اور کن لوگوں کو وہاں سے دھتکارا جائے گا، قرآنِ کریم نے جہنم کی جانب کفار کو دھکیلنے کا منظر بھی پیش کیا ہے، اسی طرح مؤمنین اور منافقین کے پل صراط پر گزرنے اور اہل ایمان کے کامیاب ہونے کا بھی ذکر کیا ہے۔(دیکھیں: الوسطیۃ فی القرآن الکریم، ص402)

ان تمام تفصیلات اور مناظر کا صحابہ کرام کے دلوں پر بہت زیادہ اثر تھا، قرآنِ کریم نے جب جہنم میں قسم قسم کے عذاب کا تذکرہ کیا تو صحابہ کرام کی حالت یہ ہوتی تھی گویا کہ وہ ان مناظر کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے تھے، قرآن کریم نے جہنم کے جن مناظر کا تذکرہ کیا ہے ان میں سے بعض کا ذکر مندرجہ ذیل سطور میں بیان کیا جارہا ہے:

أ: جہنمیوں کا کھانا پینا اور ان کا لباس:

أ- قرآنِ کریم نے بیان کیا ہے کہ جہنمیوں کا کھانا خاردار گھاس اور زقوم ہوگا اور ان کا پینا کھولتا ہوا پانی، پیپ اور خراب لہو ہوگا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:[لَیْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِیْعٍ ۙ * لَّا یُسْمِنُ وَلَا یُغْنِیْ مِنْ جُوْعٍ] ترجمہ: ”خاردار سوکھی گھاس کے سوا کوئی کھانا اُن کے لئے نہ ہوگا، جو نہ موٹا کرے نہ بھوک مٹائے“۔(سورۃ الغاشیہ: 6-7)۔ جہنمیوں کے لئے اس طرح کا کھانا عذاب کی ایک قسم ہوگی، نہ اس سے کوئی لذت اور مزہ حاصل کرسکیں گے اور نہ ہی ان کے جسموں کو اس سے کوئی فائدہ ہوگا۔ زقوم کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: [اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ۙ * طَعَامُ الْاَثِیْمِ * كَالْمُهْلِ ۚ یَغْلِیْ فِی الْبُطُوْنِ ۙ * كَغَلْیِ الْحَمِیْمِ] ترجمہ: ”زقوم کا درخت، گناہ گار کا کھانا ہوگا، تیل کی تلچھٹ جیسا، پیٹ میں اِس طرح جوش کھائے گا، جیسے کھولتا ہوا پانی جوش کھاتا ہے“۔(سورۂ دخان: 46-43)۔ اللہ تعالیٰ نے زقوم کے درخت کا ایک دوسرے مقام پر بھی ذکر کیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿أَذَٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا أَمْ شَجَرَةُ ٱلزَّقُّومِ ﴿٦٢﴾ إِنَّا جَعَلْنَٰهَا فِتْنَةً لِّلظَّٰلِمِينَ ﴿٦٣﴾ إِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِىٓ أَصْلِ ٱلْجَحِيمِ ﴿٦٤﴾ طَلْعُهَا كَأَنَّهُۥ رُءُوسُ ٱلشَّيَٰطِينِ﴾ ترجمہ: ”بولو، یہ ضیافت اچھی ہے یا زقوم کا درخت؟۔ ہم نے اُس درخت کو ظالموں کے لئے فتنہ بنادیا ہے۔ وہ ایک درخت ہے جو جہنم کی تہ سے نکلتا ہے۔ اُس کے شگوفے ایسے ہیں جیسے شیطانوں کے سر“۔(سورۃ الصافات: 65-62)۔ ایک اور مقام پر اس کا ذکر

یوں ہے: ﴿وَٱلشَّجَرَةَ ٱلْمَلْعُونَةَ فِى ٱلْقُرْءَانِ﴾ ترجمہ:"اور وہ درخت بھی جس پر قرآن کریم میں لعنت کی گئی ہے"۔(سورۃ الاسراء:60) ایک دوسرے مقام پر ہے: ﴿ثُمَّ اِنَّکُمۡ اَیُّهَا الضَّآلُّوۡنَ الۡمُکَذِّبُوۡنَ * لَاٰکِلُوۡنَ مِنۡ شَجَرٍ مِّنۡ زَقُّوۡمٍ * فَمٰلِـُٔوۡنَ مِنۡهَا الۡبُطُوۡنَ * فَشٰرِبُوۡنَ عَلَیۡهِ مِنَ الۡحَمِیۡمِ * فَشٰرِبُوۡنَ شُرۡبَ الۡهِیۡمِ * هٰذَا نُزُلُهُمۡ یَوۡمَ الدِّیۡنِ﴾ ترجمہ :"پھر اے گمراہو اور جھٹلانے والو! تم شجر زقوم کی غذا کھانے والے ہو۔اُسی سے تم پیٹ بھروگے۔اور اوپر سے کھولتا ہوا پانی۔ تونس لگے ہوئے اونٹ کی طرح پیوگے۔یہ ہے بائیں والوں کی ضیافت کا سامان روز جزامیں"۔(سورۃ الواقعہ:55-51)

ان آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ناخوشگوار اور خبیث درخت ہے جس کی جڑیں جہنم کی تہہ تک پہنچتی ہیں اور اس کی شاخیں جہنم میں پھیلی ہوئی ہیں،اس درخت کا پھل انتہائی کریہہ المنظر ہے،اسی لئے اس کو شیطان کے سر سے تشبیہ دی گئی ہے،اس لئے کہ شیطان کے سروں کی بدصورتی ایک بدیہی سی بات ہے،اگرچہ شیطان کو کسی نے دیکھا نہیں ہے،اس درخت کے اس قدر براہونے کے باوجود اہل جہنم کو اتنی بھوک لگے گی کہ اس کو کھانے کے سوا ان کے پاس کوئی اور راستہ نہیں ہوگا،اور اتنا کھائیں گے کہ ان کے پیٹ بھر جائیں گے اور جب ان کے پیٹ بھر جائیں گے تو اس کا کھانا ان کے جسم میں ایسے ابلنا شروع ہوجائے گا جیسے کہ تیل کی تلچھٹ ابلتی ہے،اس کے نتیجے میں ان کو انتہائی درجہ کی تکلیف ہوگی،اس صورتحال کے نتیجے میں وہ کھولتا ہوا پانی پینے کے لئے مجبور ہوجائیں گے،وہ انتہائی گرم پانی ایسے پیئں گے جیسے پیاسے اونٹ پیتے ہیں،وہ پیتے ہی رہیں گے یہاں تک کہ اس گرم پانی کے نتیجے میں ان کی آنتیں کٹ جائیں گی،ارشاد باری تعالی ہے: ﴿کَمَنۡ هُوَخَالِدٌ فِی النَّارِ وَسُقُوۡا مَآءً حَمِیۡمًا فَقَطَّعَ اَمۡعَآءَهُمۡ﴾

ترجمہ:(کیا وہ شخص جس کے حصہ میں یہ جنت آنے والی ہے)اُن لوگوں کی طرح ہوسکتا ہے جو جہنم میں ہمیشہ رہیں گے اور جنہیں ایسا گرم پانی پلایا جائے گا جو ان کی آنتیں تک کاٹ دے گا؟۔(سورۂ محمد:15)

یہی اس عظیم دن میں ان کی ضیافت ہوگی۔(دیکھیں:الیوم الآخر فی الجنۃ والنار،عمر الأشقر،ص88)

جب جہنمی لوگ اس طرح کا خاردار کھانا اور زقوم کھائیں گے تو وہ ان کے گلے میں بھی پھنستا رہے گا،ارشاد ہے:﴿اِنَّ لَدَیۡنَاۤ اَنۡکَالًا وَّجَحِیۡمًا * وَّطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَّعَذَابًا اَلِیۡمًا﴾ ترجمہ:"ہمارے پاس(ان کے لئے)بھاری بیڑیاں ہیں اور بھڑکتی ہوئی آگ۔اور حلق میں پھنسنے والا کھانا اور دردناک عذاب"۔(سورۂ مزمل:13-12)

اہل جہنم کا ایک کھانا غسلین(پیپ اور لہو)ہوگا،اللہ تعالی کا ارشاد ہے : ﴿فَلَيۡسَ لَهُ ٱلۡيَوۡمَ هَٰهُنَا حَمِيمٞ ۝٣٥ وَلَا طَعَامٌ إِلَّا مِنۡ غِسۡلِينٖ ۝٣٦ لَّا يَأۡكُلُهُۥٓ إِلَّا ٱلۡخَٰطِـُٔونَ﴾ ترجمہ:"لہٰذا آج نہ یہاں اِس کا کوئی یار غم خوار ہے۔اور نہ زخموں کے دھوؤں کے سوا اِس کے لئے کوئی کھانا۔جسے خطاکاروں کے سوا کوئی نہیں کھاتا"۔(سورۃ الحاقہ:35-37)

دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿هَٰذَا فَلۡيَذُوقُوهُ حَمِيمٞ وَغَسَّاقٞ﴾ ترجمہ:"یہ ہے اُن کے لئے،پس وہ مزا چکھیں کھولتے ہوئے پانی اور پیپ لہو"۔سورۂ ص:57) غسلین اور غساق ہم معنی الفاظ ہیں،اس سے مراد پیپ اور لہو کی شکل میں سیال مادہ ہے،جو اہل جہنم کی کھالوں سے بہے

گا، یہ بھی منقول ہے کہ اس سے وہ بدبودار سیال مادہ مراد ہے جو بدکار اور زانیہ عورتوں کی شرمگاہوں سے اور کفار کے گوشت اور کھالوں سے بہے گا۔ علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں: اس سے جہنمیوں کا پیپ مراد ہے۔(دیکھیں: یقظۃ أولی الاعتبار مماورد فی ذکر الجنۃ والنار، صدیق حسن، ص: 86)

ب - جہاں تک تعلق ہے ان کے مشروب کا تو وہ کھولتا ہوا پانی، پیپ، پگھلی ہوئی دہات اور خراب خون ہوگا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿كَمَنْ هُوَخَالِدٌ فِي النَّارِ وَسُقُوْا مَآءً حَمِيْمًافَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ﴾ ترجمہ: (کیا وہ شخص جس کے حصہ میں یہ جنت آنے والی ہے) اُن لوگوں کی طرح ہو سکتا ہے جو جہنم میں ہمیشہ رہیں گے اور جنہیں ایسا گرم پانی پلایا جائے گا جو ان کی آنتیں تک کاٹ دے گا؟۔ (سورۂ محمد: 15)

دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿اِنَّا اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًاۙ اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ۚ وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ ۚ بِئْسَ الشَّرَابُ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا﴾ ترجمہ: ”ہم نے (انکار کرنے والے) ظالموں کے لئے ایک آگ تیار کر رکھی ہے جس کی لپٹیں انہیں گھیرے میں لے چکی ہیں، وہاں اگر وہ پانی مانگیں گے تو ایسے پانی سے ان کی تواضع کی جائے گی جو تیل کی تلچھٹ جیسا ہوگا اور ان کا منہ بھون ڈالے گا، بدترین پینے کی چیز اور بہت بری آرامگاہ!“۔(سورۃ الکہف: 29)۔ایک اور مقام پر ہے: ﴿مِّنْ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍۙ ۞ يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ۚ وَمِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ﴾ ترجمہ: ”پھر اس کے بعد آگے اس کے لئے جہنم ہے وہاں اُسے کچ لہو کا سا پانی پینے کو دیا جائے گا، جسے وہ زبردستی حلق سے اتارنے کی کوشش کرے گا اور مشکل ہی سے اتار سکے گا موت ہر طرف سے اس پر چھائی رہے گی مگر وہ مرنے نہ پائے گا اور آگے ایک سخت عذاب اس کی جان کا لاگو رہے گا۔(سورۂ ابراہیم: 17-16) مزید فرمایا: ﴿هٰذَاۙ فَلْيَذُوْقُوْهُ حَمِيْمٌ وَّغَسَّاقٌ﴾ ترجمہ: ”یہ ہے اُن کے لئے، پس وہ مزا چکھیں کھولتے ہوئے پانی اور پیپ لہو“۔(سورۂ ص: 57)

ان آیات میں اہل جہنم کے مشروبات کی چار اقسام ذکر کی گئی ہیں، اور وہ ہیں: "حمیم" ایسا کھولتا ہوا پانی جو انتہائی گرم ہوگا۔ "غساق" پیپ اور لہو۔ غساق کا ذکر جہنمیوں کے کھانے اور پینے دونوں کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔ "صدید" وہ سیال مادہ جو کفار کے گوشت اور جلد سے بہے گا۔ ”مہل“، اور وہ تیل کی تلچھٹ کی طرح ہوگا، جب وہ پینے والے کے چہرے کے قریب کیا جائے گا تو اس کے چہرے کے گوشت کا ٹکڑا اس میں گرے گا۔(دیکھیں: الیوم الآخر فی الجنۃ والنار، ص: 90)

ج- جہنمیوں کا لباس:

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَتَرَى ٱلۡمُجۡرِمِينَ يَوۡمَئِذٖ مُّقَرَّنِينَ فِي ٱلۡأَصۡفَادِ ۝٤٩ سَرَابِيلُهُم مِّن قَطِرَانٖ وَتَغۡشَىٰ وُجُوهَهُمُ ٱلنَّارُ﴾ ترجمہ: ”اس روز تم مجرموں کو دیکھو گے کہ زنجیروں میں ہاتھ پاؤں جکڑے ہوئے ان کے لباس تارکول کے ہوں گے۔ اور ان کے چہرے کو آگ ڈھانپ رہی ہوگی“۔(سورۃ ابراہیم: 49-50) قطران: پگلا یا ہوا تانبہ۔

جہنمیوں کے عذاب کی الگ الگ شکلیں

أ: جہنمیوں کے عذاب میں تفاوت:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ٱلنَّارُ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَعَشِيًّا ۖ وَيَوْمَ تَقُومُ ٱلسَّاعَةُ أَدْخِلُوٓا۟ ءَالَ فِرْعَوْنَ أَشَدَّ ٱلْعَذَابِ﴾ ترجمہ: ”دوزخ کی آگ ہے جس کے سامنے صبح وشام وہ پیش کئے جاتے ہیں، اور جب قیامت کی گھڑی آجائے گی تو حکم ہوگا کہ آل فرعون کو شدید تر عذاب میں داخل کرو“۔(سورۂ غافر:46)

دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ وَصَدُّوا۟ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِ زِدْنَٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ ٱلْعَذَابِ بِمَا كَانُوا۟ يُفْسِدُونَ﴾ ترجمہ: ”جن لوگوں نے خود کفر کی راہ اختیار کی اور دوسروں کو اللہ کی راہ سے روکا انہیں ہم عذاب پر عذاب دیں گے اُس فساد کے بدلے جو وہ دنیا میں برپا کرتے رہے“۔(سورۃ النحل:88)۔ نبی کریم ﷺ نے اس شخص کا تذکرہ فرمایا ہے جس کو قیامت کے دن سب سے کم عذاب ہوگا، آپ ﷺ کا فرمان ہے: ”قیامت کے روز جہنمیوں میں سب سے ہلکے عذاب والا شخص وہ ہوگا جس کے دونوں پیروں کے نیچے ایک انگارہ رکھا جائے گا، جس سے اس کا دماغ کھول رہا ہوگا“۔(صحیح بخاری: 6561،6562، صحیح مسلم: 213)

ب: چہرے کے بل ان کا حشر اور آگ میں ان کا جھلسنا:

جہنمیوں کی تذلیل کی ایک شکل یہ ہوگی کہ ان کو قیامت کے دن ان کے چہروں کے بل اندھے، گونگے اور بہرے ہو کر اٹھایا جائے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَن يَهْدِ ٱللَّهُ فَهُوَ ٱلْمُهْتَدِ ۖ وَمَن يُضْلِلْ فَلَن تَجِدَ لَهُمْ أَوْلِيَآءَ مِن دُونِهِۦ ۖ وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ عُمْيًا وَبُكْمًا وَصُمًّا ۖ مَّأْوَىٰهُمْ جَهَنَّمُ ۖ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنَٰهُمْ سَعِيرًا﴾ ترجمہ: ”جس کو اللہ ہدایت دے وہی ہدایت پانے والا ہے، اور جسے وہ گمراہی میں ڈال دے تو اسکے سوا ایسے لوگوں کے لئے تو کوئی حامی و ناصر نہیں پا سکتا، ان لوگوں کو ہم قیامت کے روز اوندھے منہ کھینچ لائیں گے، اندھے، گونگے اور بہرے اُن کا ٹھکانا جہنم ہے، جب کبھی اس کی آگ دھیمی ہونے لگے گی ہم اسے اور بھڑکا دیں گے“۔(سورۃ الاسراء: 97)

اہل جہنم کو ان کے چہروں کے بل جہنم میں پھینکا جائے گا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَن جَآءَ بِٱلسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوهُهُمْ فِى ٱلنَّارِ هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ﴾ ترجمہ: ”اور جو بُرائی لئے ہوئے آئے گا، ایسے سب لوگ اوندھے منہ آگ میں پھینکے جائیں گے، کیا تم لوگ اس کے سوا کوئی اور جزا پا سکتے ہو کہ جیسا کرو ویسا بھرو؟“۔(سورۃ النمل:90)

پھر آگ بھی ان کے چہروں پر لپٹیں مارے گی اور ان پر ہمیشہ چھائی رہے گی، آگ سے ان کو کوئی چیز نہیں بچا پائے گی، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿تَلْفَحُ وُجُوهَهُمُ ٱلنَّارُ وَهُمْ فِيهَا كَٰلِحُونَ﴾ ترجمہ: ”آگ ان کے چہروں کی کھال چاٹ جائے گی اور اُن کے جبڑے باہر نکل آئیں گے“۔(سورۃ المؤمنون:104)

ج: گھسیٹ کر لے جانا:

عذاب الیم کی ایک شکل یہ ہے کہ کفار کو جہنم میں ان کے چہرے کے بل کھینچ کر لے جایا جائے گا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ ٱلْمُجْرِمِينَ فِى ضَلَٰلٍ وَسُعُرٍ ۝٤٧ يَوْمَ يُسْحَبُونَ فِى ٱلنَّارِ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ ذُوقُوا۟ مَسَّ سَقَرَ﴾ ترجمہ:"یہ مجرم لوگ در حقیقت غلط فہمی میں مبتلا ہیں، اور ان کی عقل ماری گئی ہے۔ جس روز یہ منہ کے بل آگ میں گھسیٹے جائیں گے اُس روز اِن سے کہا جائے گا کہ اب چکھو جہنم کی لپٹ کا مزا"۔(سورہ قمر:48-47)اس کے ساتھ ساتھ مزید یہ چیزان کے لئے باعث تکلیف بنے گی کہ وہ زنجیروں، بیڑیوں اور طوقوں میں جکڑے ہوئے ہوں گے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ٱلَّذِينَ كَذَّبُوا۟ بِٱلْكِتَٰبِ وَبِمَآ أَرْسَلْنَا بِهِۦ رُسُلَنَا ۖ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ۝٧٠ إِذِ ٱلْأَغْلَٰلُ فِىٓ أَعْنَٰقِهِمْ وَٱلسَّلَٰسِلُ يُسْحَبُونَ ۝٧١ فِى ٱلْحَمِيمِ ثُمَّ فِى ٱلنَّارِ يُسْجَرُونَ﴾ ترجمہ: یہ لوگ جو اِس کتاب کو اور اُن ساری کتابوں کو جھٹلاتے ہیں جو ہم نے اپنے رسولوں کے ساتھ بھیجی تھیں، عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا، جب طوق ان کی گردنوں میں ہوں گے، اور زنجیریں، جن سے پکڑ کر وہ کھولتے ہوئے پانی کی طرف کھینچے جائیں گے اور پھر دوزخ کی آگ میں جھونک دیے جائیں گے"۔سورہ غافر:70-72)

د: چہروں کی سیاہی :

آخرت میں اللہ تعالیٰ جہنمیوں کے چہروں کو انتہائی سیاہ کر دے گا، جیسے کہ رات کی تاریکی کی سیاہی ہوتی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَٱلَّذِينَ كَسَبُوا۟ ٱلسَّيِّـَٔاتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍۭ بِمِثْلِهَا وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۖ مَّا لَهُم مِّنَ ٱللَّهِ مِنْ عَاصِمٍ ۖ كَأَنَّمَآ أُغْشِيَتْ وُجُوهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ ٱلَّيْلِ مُظْلِمًا ۚ أُو۟لَٰٓئِكَ أَصْحَٰبُ ٱلنَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَٰلِدُونَ﴾ترجمہ:"اور جن لوگوں نے بُرائیاں کمائیں ان کی بُرائی جیسی ہے ویسا ہی وہ بدلہ پائیں گے، ذلّت ان پر مسلّط ہو گی، کوئی اللہ سے ان کو بچانے والا نہ ہوگا، ان کے چہروں پر ایسی تاریکی چھائی ہوئی ہو گی جیسے رات کے سیاہ پردے ان پر پڑے ہوئے ہوں، وہ دوزخ کے مستحق ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے"۔(سورہ یونس:27)

ھ: آگ کا کفار کو چاروں طرف سے گھیرنا:

ضابطہ الٰہی کے مطابق عمل کا بدلہ عمل کی جنس کے مطابق دیا جائے گا، لہذا جب کفار کے چاروں طرف گناہ ہی گناہ ہوں گے، اس لئے آگ بھی کفار کو ہر طرف سے اپنی لپیٹ میں لے لے گی، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لَهُم مِّن جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَمِن فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِى ٱلظَّٰلِمِينَ﴾ ترجمہ:"ان کے لئے تو جہنم کا بچھونا ہو گا اور جہنم ہی کا اوڑھنا، یہ ہے وہ جزا جو ہم ظالموں کو دیا کرتے ہیں"۔(سورۃ الاعراف:41)

مھاد: وہ فرش جو ان کے نیچے سے ہو گا۔ غواش: وہ چیز جو ان کے اوپر سے گھیرے ہوئے ہو گی۔ مراد یہ ہے کہ آگ ان کو اوپر اور نیچے ہر طرف سے گھیر لے گی، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يَوْمَ يَغْشَىٰهُمُ ٱلْعَذَابُ مِن فَوْقِهِمْ وَمِن تَحْتِ أَرْجُلِهِمْ وَيَقُولُ ذُوقُوا۟ مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ﴾ ترجمہ:"(اور انہیں پتہ چلے گا)اُس روز جبکہ عذاب انہیں اُوپر سے بھی ڈھانک لے گا اور پاؤں کے نیچے سے بھی اور کہے گا کہ

اب چکھو مزا ان کرتوتوں کا جو تم کرتے تھے"۔(سورۃ العنکبوت:55)۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿لَهُم مِّن فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ ٱلنَّارِ وَمِن تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ ۚ ذَٰلِكَ يُخَوِّفُ ٱللَّهُ بِهِۦ عِبَادَهُۥ ۚ يَٰعِبَادِ فَٱتَّقُونِ﴾ ترجمہ:"اُن پر آگ کی چھتریاں اوپر سے بھی چھائی ہوں گی اور نیچے سے بھی، یہ وہ انجام ہے جس سے اللہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے، پس اے میرے بندو، میرے غضب سے بچو"۔(سورۂ زمر:16)

چاروں طرف سے گھیر لینے اور احاطہ کرنے کی صراحت ایک دوسرے مقام پر بھی ہے، اس لئے کہ آگ کی ایک دیوار کفار کو گھیرے ہوئے ہوگی جس کی وجہ سے کفار اس سے بھاگنے اور نکلنے پر قادر نہیں ہوں گے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَقُلِ ٱلْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ ۖ فَمَن شَآءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۚ إِنَّآ أَعْتَدْنَا لِلظَّٰلِمِينَ نَارًا أَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ۚ وَإِن يَسْتَغِيثُوا۟ يُغَاثُوا۟ بِمَآءٍ كَٱلْمُهْلِ يَشْوِى ٱلْوُجُوهَ ۚ بِئْسَ ٱلشَّرَابُ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا﴾ ترجمہ:"صاف کہہ دو کہ یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے، اب جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کر دے، ہم نے (انکار کرنے والے) ظالموں کے لئے ایک آگ تیار کر رکھی ہے جس کی لپٹیں انہیں گھیرے میں لے چکی ہیں، وہاں اگر وہ پانی مانگیں گے تو ایسے پانی سے ان کی تواضع کی جائے گی جو تیل کی تلچھٹ جیسا ہوگا اور ان کا منہ بھون ڈالے گا، بد ترین پینے کی چیز اور بہت بری آرامگاہ!"۔(سورۃ الکھف:29) "سرداق" سے مراد آگ کی دیوار جو آگ کے چاروں طرف ہوگی۔ (دیکھیں: الیوم الآخر فی الجنۃ والنار، ص102)

و: آگ کا دلوں تک پہنچنا:

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿كَلَّا ۖ لَيُنۢبَذَنَّ فِى ٱلْحُطَمَةِ ۝٤ وَمَآ أَدْرَىٰكَ مَا ٱلْحُطَمَةُ ۝٥ نَارُ ٱللَّهِ ٱلْمُوقَدَةُ ۝٦ ٱلَّتِى تَطَّلِعُ عَلَى ٱلْأَفْـِٔدَةِ﴾ ترجمہ: "ہر گز نہیں، وہ ضرور حطمہ میں پھینکا جائے گا، اور آپ کو کیا معلوم حطمہ کیا ہے، وہ اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے جو دلوں تک جا پہنچتی ہے"۔(سورۃ الھمزۃ:7-4)

ز: جہنمیوں کی بیڑیاں ان کے طوق اور زنجیریں:

اللہ تعالیٰ نے جہنمیوں کے لئے بیڑیاں، زنجیریں اور ہتھوڑے تیار کر رکھے ہیں، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿إِنَّآ أَعْتَدْنَا لِلْكَٰفِرِينَ سَلَٰسِلَا۟ وَأَغْلَٰلًا وَسَعِيرًا﴾ ترجمہ:"کفر کرنے والوں کے لئے ہم نے زنجیریں اور طوق اور بھڑکتی ہوئی آگ مہیا کر رکھی ہے"۔ (سورۃ الانسان:4)۔ دوسری جگہ ہے: ﴿إِنَّ لَدَيْنَآ أَنكَالًا وَجَحِيمًا ۝١٢ وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَعَذَابًا أَلِيمًا﴾ ترجمہ:"ہمارے پاس (ان کے لئے) بھاری بیڑیاں ہیں اور بھڑکتی ہوئی آگ، اور حلق میں پھنسنے والا کھانا اور دردناک عذاب"۔(سورۃ المزمل:12-13)۔

یہ طوق گردنوں میں ڈالے جائیں گے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَقَالَ ٱلَّذِينَ ٱسْتُضْعِفُوا۟ لِلَّذِينَ ٱسْتَكْبَرُوا۟ بَلْ مَكْرُ ٱلَّيْلِ وَٱلنَّهَارِ إِذْ تَأْمُرُونَنَآ أَن نَّكْفُرَ بِٱللَّهِ وَنَجْعَلَ لَهُۥٓ أَندَادًا ۚ وَأَسَرُّوا۟ ٱلنَّدَامَةَ لَمَّا رَأَوُا۟ ٱلْعَذَابَ ۚ وَجَعَلْنَا ٱلْأَغْلَٰلَ فِىٓ أَعْنَاقِ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ ۚ هَلْ يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كَانُوا۟ يَعْمَلُونَ﴾ ترجمہ:"وہ دبے ہوئے لوگ ان بڑے بننے والوں سے کہیں گے: "نہیں، بلکہ شب و روز کی مکاری تھی جب تم ہم سے کہتے تھے کہ ہم اللہ سے کفر کریں اور دوسروں کو اس کا ہمسر ٹھیرائیں"۔ آخرکار جب یہ

لوگ عذاب دیکھیں گے تو اپنے دلوں میں پچھتائیں گے اور ہم اِن منکرین کے گلوں میں طوق ڈال دیں گے، کیا لوگوں کو اِس کے سوا اور کوئی بدلہ دیا جاسکتا ہے کہ جیسے اعمال اُن کے تھے ویسی ہی جزا وہ پائیں؟۔(سورۃ سبأ: 33)۔

دوسرے مقام پر ہے: ﴿إِذِ ٱلۡأَغۡلَٰلُ فِيٓ أَعۡنَٰقِهِمۡ وَٱلسَّلَٰسِلُ يُسۡحَبُونَ﴾ ترجمہ: "جب طوق ان کی گردنوں میں ہوں گے، اور زنجیریں، جن سے پکڑ کر ان کو کھینچا جائے گا"۔(سورۃ الغافر: 71)

یہ طوق وسلاسل عذاب کی ایک دوسری قسم ہے جس کے ذریعہ مجرموں کو باندھا جائے گا، جیسے کہ دنیا میں مجرموں کو جکڑا جاتا ہے، قرآنِ کریم نے عذاب کے ایک دوسرے منظر کی تصویر کھینچی ہے: ﴿خُذُوهُ فَغُلُّوهُ ۝٣٠ ثُمَّ ٱلۡجَحِيمَ صَلُّوهُ ۝٣١ ثُمَّ فِي سِلۡسِلَةٖ ذَرۡعُهَا سَبۡعُونَ ذِرَاعٗا فَٱسۡلُكُوهُ﴾ ترجمہ: "(حکم ہوگا) پکڑو اِسے اور اِس کی گردن میں طوق ڈال دو۔ پھر اِسے جہنم میں جھونک دو۔ پھر اِس کو ستر ہاتھ لمبی زنجیر میں جکڑ دو"۔(سورۃ الحاقہ، 30-32)

ح: کفار اور ان کے معبودانِ باطلہ اور شیاطین کو جہنم میں اکٹھا کرنا :

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّكُمۡ وَمَا تَعۡبُدُونَ مِن دُونِ ٱللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ أَنتُمۡ لَهَا وَٰرِدُونَ ۝٩٨ لَوۡ كَانَ هَٰٓؤُلَآءِ ءَالِهَةٗ مَّا وَرَدُوهَاۖ وَكُلّٞ فِيهَا خَٰلِدُونَ﴾ ترجمہ: "بے شک تم اور تمہارے وہ معبود جنہیں تم پوجتے ہو، جہنّم کا ایندھن ہیں، وہیں تم کو جانا ہے۔ اگر یہ واقعی خدا ہوتے تو وہاں نہ جاتے اب سب کو ہمیشہ اسی میں رہنا ہے"۔(سورۃ الأنبیاء: 99-98) دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿وَمَن يَعۡشُ عَن ذِكۡرِ ٱلرَّحۡمَٰنِ نُقَيِّضۡ لَهُۥ شَيۡطَٰنٗا فَهُوَ لَهُۥ قَرِينٞ ۝٣٦ وَإِنَّهُمۡ لَيَصُدُّونَهُمۡ عَنِ ٱلسَّبِيلِ وَيَحۡسَبُونَ أَنَّهُم مُّهۡتَدُونَ ۝٣٧ حَتَّىٰٓ إِذَا جَآءَنَا قَالَ يَٰلَيۡتَ بَيۡنِي وَبَيۡنَكَ بُعۡدَ ٱلۡمَشۡرِقَيۡنِ فَبِئۡسَ ٱلۡقَرِينُ ۝٣٨ وَلَن يَنفَعَكُمُ ٱلۡيَوۡمَ إِذ ظَّلَمۡتُمۡ أَنَّكُمۡ فِي ٱلۡعَذَابِ مُشۡتَرِكُونَ﴾ ترجمہ: "جو شخص رحمان کے ذکر سے تغافل برتتا ہے، ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں، اور وہ اُس کا رفیق بن جاتا ہے۔ یہ شیاطین ایسے لوگوں کو راہ راست پر آنے سے روکتے ہیں، اور وہ اپنی جگہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ٹھیک جا رہے ہیں۔ آخر کار جب یہ شخص ہمارے ہاں پہنچے گا تو اپنے شیطان سے کہے گا: "کاش! میرے اور تیرے درمیان مشرق و مغرب کا بُعد ہوتا، تُو تو بد ترین ساتھی نکلا"۔ اُس وقت اِن لوگوں سے کہا جائے گا کہ جب تم ظلم کر چکے تو آج یہ بات تمہارے لئے کچھ بھی نافع نہیں ہے کہ تم اور تمہارے شیاطین عذاب میں مشترک ہیں"۔(سورۂ زخرف: 39-36)

خ: اہلِ جہنم کی حسرت وندامت اور پکار:

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَوۡ أَنَّ لِكُلِّ نَفۡسٖ ظَلَمَتۡ مَا فِي ٱلۡأَرۡضِ لَٱفۡتَدَتۡ بِهِۦۗ وَأَسَرُّواْ ٱلنَّدَامَةَ لَمَّا رَأَوُاْ ٱلۡعَذَابَۖ وَقُضِيَ بَيۡنَهُم بِٱلۡقِسۡطِ وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُونَ﴾ ترجمہ: "اور اگر ہر ایک نافرمان شخص کے پاس روئے زمین کی تمام چیزیں

ہوں تو (عذاب سے بچنے کے) بدلے میں (سب) دے ڈالے اور جب وہ عذاب کو دیکھیں گے تو (پچھتائیں گے اور) ندامت کو چھپائیں گے۔ اور ان میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا اور (کسی طرح کا) ان پر ظلم نہیں ہو گا۔ (سورہ یونس:54)

جب کافر اپنے نامۂ اعمال کو دیکھے گا تو وہ اپنے کفر وشرک کو دیکھے گا جس کی وجہ سے ان کو جہنم میں ہمیشہ ہمیشہ رہنا پڑے گا، تو وہ اپنے لئے موت اور ہلاکت کی دھائی دے گا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَٰبَهُۥ وَرَآءَ ظَهْرِهِۦ ۝١٠ فَسَوْفَ يَدْعُواْ ثُبُورًا﴾ ترجمہ: "رہا وہ شخص جس کا نامۂ اعمال اُس کی پیٹھ کے پیچھے دیا جائے گا تو وہ موت کو پکارے گا"۔ (سورۂ انشقاق:12-10) اور جب ان کو آگ میں پھینکا جائے گا اور وہ اس کی گرمی میں جھلسیں گے تو دوبارہ ہلاکت اور موت کو پکاریں گے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَإِذَآ أُلْقُواْ مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِينَ دَعَوْاْ هُنَالِكَ ثُبُورًا ۝١٣ لَّا تَدْعُواْ ٱلْيَوْمَ ثُبُورًا وَٰحِدًا وَٱدْعُواْ ثُبُورًا كَثِيرًا﴾ ترجمہ: "اور جب یہ دست و پا بستہ اُس میں ایک تنگ جگہ ٹھونسے جائیں گے تو اپنی موت کو پکارنے لگیں گے۔ (اُس وقت ان سے کہا جائے گا کہ) آج ایک موت کو نہیں بہت سی موتوں کو پکارو"۔ (سورۂ فرقان:14-13)

اس وقت ان کی چیخ وپکار میں اضافہ ہو گا اور انکی آہ وبکا میں شدت آئے گی اور رب کو اس امید کے ساتھ پکاریں گے کہ وہ ان کو جہنم سے نجات دے گا: ﴿وَهُمْ يَصْطَرِخُونَ فِيهَا رَبَّنَآ أَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَٰلِحًا غَيْرَ ٱلَّذِى كُنَّا نَعْمَلُ ۚ أَوَلَمْ نُعَمِّرْكُم مَّا يَتَذَكَّرُ فِيهِ مَن تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ ٱلنَّذِيرُ ۖ فَذُوقُواْ فَمَا لِلظَّٰلِمِينَ مِن نَّصِيرٍ﴾ ترجمہ: "وہ وہاں چیخ چیخ کر کہیں گے کہ "اے ہمارے رب، ہمیں یہاں سے نکال لے تاکہ ہم نیک عمل کریں اُن اعمال سے مختلف جو پہلے کرتے رہے تھے" (انہیں جواب دیا جائے گا) "کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہ دی تھی جس میں کوئی سبق لینا چاہتا تو سبق لے سکتا تھا؟ اور تمہارے پاس متنبہ کرنے والا بھی آ چکا تھا اب مزا چکھو ظالموں کا یہاں کوئی مددگار نہیں ہے"۔ (سورۂ فاطر:37)

اس وقت وہ اپنی گمراہی، کفر اور کم عقلی کا اعتراف کریں گے: ﴿وَقَالُواْ لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِىٓ أَصْحَٰبِ ٱلسَّعِيرِ﴾ ترجمہ: " اور وہ کہیں گے "کاش! ہم سنتے یا سمجھتے تو آج اِس بھڑکتی ہوئی آگ کے سزاواروں میں نہ شامل ہوتے"۔ (سورۂ ملک: 10)

لیکن ان کا مطالبہ سختی کے ساتھ رد کر دیا جائے گا، اور ایسا جواب دیا جائے گا جس کے مستحق جانور ہوا کرتے ہیں: ﴿قَالُواْ رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَآلِّينَ ۝١٠٦ رَبَّنَآ أَخْرِجْنَا مِنْهَا فَإِنْ عُدْنَا فَإِنَّا ظَٰلِمُونَ ۝١٠٧ قَالَ ٱخْسَـُٔواْ فِيهَا وَلَا تُكَلِّمُونِ﴾ ترجمہ: "وہ کہیں گے: "اے ہمارے رب، ہماری بد بختی ہم پر چھا گئی تھی، واقعی ہم گمراہ لوگ تھے۔ اے پروردگار، اب ہمیں یہاں سے نکال دے پھر ہم ایسا قصور کریں تو ظالم ہوں گے"۔ اللہ تعالیٰ جواب دے گا: "دور ہو میرے سامنے سے، پڑے رہو اسی میں اور مجھ سے بات نہ کرو"۔ (سورۃ المؤمنون:108-106)

ان پر اللہ کا وعدہ سچ ثابت ہوگا اور وہ اس انجام سے دوچار ہوں گے جس میں کوئی دعا اور پکار کام نہیں آئے گی، اور نہ ہی اس میں کوئی مطالبہ سنا جائے گا۔

اس کے بعد جہنمی لوگ جہنم کے داروغوں کی طرف متوجہ ہوں گے، اور ان سے سفارش کرنے کی درخواست کریں گے، تاکہ اللہ تعالیٰ ان کے عذاب کو کچھ ہلکا کردے: ﴿وَقَالَ ٱلَّذِينَ فِي ٱلنَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ٱدْعُواْ رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ ٱلْعَذَابِ. قَالُوٓاْ أَوَلَمْ تَكُ تَأْتِيكُمْ رُسُلُكُم بِٱلْبَيِّنَٰتِ ۖ قَالُواْ بَلَىٰ ۚ قَالُواْ فَٱدْعُواْ ۗ وَمَا دُعَٰٓؤُاْ ٱلْكَٰفِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَٰلٍ﴾ ترجمہ: ”پھر یہ دوزخ میں پڑے ہوئے لوگ جہنم کے اہل کاروں سے کہیں گے: "اپنے رب سے دعا کرو کہ ہمارے عذاب میں بس ایک دن کی تخفیف کردے"۔ وہ پوچھیں گے: "کیا تمہارے پاس تمہارے رسول بینات لے کر نہیں آتے رہے تھے؟"۔ وہ کہیں گے: "ہاں" جہنم کے اہل کار بولیں گے: "پھر تو تم ہی دعا کرو، اور کافروں کی دعا اکارت ہی جانے والی ہے"۔ (سورۂ غافر: 50-49)

اس وقت وہ مالک فرشتہ کو پکاریں گے اور اس سے مطالبہ کریں گے کہ ان کی روح قبض کرکے ان کو عذاب سے نجات دے: ﴿وَنَادَوْاْ يَٰمَٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ۖ قَالَ إِنَّكُم مَّٰكِثُونَ ﴿٧٧﴾ لَقَدْ جِئْنَٰكُم بِٱلْحَقِّ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كَٰرِهُونَ﴾ ترجمہ: ”وہ پکاریں گے: "اے مالک، تیرا رب ہمارا کام ہی تمام کردے تو اچھا ہے"۔ وہ جواب دے گا: "تم یوں ہی پڑے رہو گے۔ ہم تمہارے پاس حق لے کر آئے تھے مگر تم میں سے اکثر کو حق ہی ناگوار تھا"۔ (سورۂ زخرف: 78-77)

یقیناً ان ظالموں نے اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو خسارہ میں ڈال دیا جبکہ انہوں نے ایمان کے مقابلہ میں کفر کو پسند کیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿قُلْ إِنَّ ٱلْخَٰسِرِينَ ٱلَّذِينَ خَسِرُوٓاْ أَنفُسَهُمْ وَأَهْلِيهِمْ يَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِ ۗ أَلَا ذَٰلِكَ هُوَ ٱلْخُسْرَانُ ٱلْمُبِينُ﴾ ترجمہ: ”کہو، اصل دیوالئے تو وہی ہیں جنہوں نے قیامت کے روز اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو گھاٹے میں ڈال دیا، خوب سن رکھو، یہی کھلا دیوالہ ہے“۔ (سورۂ زمر: 15)

قرآن کی مکی آیات ایک مسلمان کی اس انداز سے تربیت کرتی تھیں کہ اس کے دل میں اللہ کے عذاب کا خوف پیدا ہوتا تھا، یہ آیات صحابہ کرام کے سامنے اس بات کو واضح کرتی تھیں کہ آخرت کا عذاب حسی بھی ہے اور معنوی بھی۔ صحابہ کرام کے سامنے جب قرآنی آیات کے ذریعہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمودات کے ذریعہ آگ اور جہنم کی حقیقت کو واضح کیا جاتا تھا تو اس کے نتیجہ میں صحابہ کرام کے اندر احکام الٰہی کو ماننے، اور منہیات سے اجتناب کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا تھا، صحابہ کرام اپنے ذہن و دماغ میں جنت اور جہنم کی تصویر اور منظر کو مستحضر کرتے تھے اور لامحالہ آنے والی موت کے لئے تیاری کرتے تھے اور یہ یقین رکھتے تھے کہ ان سے یقیناً اکیلے اور الگ الگ حساب لیا جائے گا، اور وہ سمجھتے تھے کہ قبر یا تو جنت کی کیاریوں میں سے ایک کیاری ہوگی یا پھر آگ کا ایک گھڑا ہوگا، صحابہ کرام یہ سب کچھ دل و دماغ میں مستحضر کر لیتے تھے، تو ان کے دلوں میں اللہ عزوجل کا خوف اور ہر جگہ اللہ کی رقابت و نگرانی کا ڈر پیدا ہوتا تھا، بلکہ وہ مکمل طور پر عمل صالح کے لئے تیار ہوتے تھے، وہ دعوت و جہاد، اللہ کے نظام کو نافذ کرنے اور انسانیت کو ہر قسم کی تباہی و انحراف سے بچانے والی تہذیب کو قائم کرنے کی سعی

وجد میں لگ جاتے تھے، تنہائیوں میں اور خفیہ واعلانیہ اللہ سے دعا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان کو انبیاء وصدیقین، شہداء وصالحین کی صحبت کی نعمت سے سرفراز فرمائے، آخرت اور جنت وجہنم کی حقیقت کے بارے میں اس تصور اور گہرے فہم کا ان لوگوں کی زندگیوں پر گہرا اثر ہوتا ہے، جو امت کی سربلندی کے لئے اور اس کی عزت وکرامت اور عروج کے لئے کام کرتے ہیں، افرادِ امت کے عقیدہ اور صحیح تصور کی تعمیر کے لئے یہ ایک اہم بنیاد ہے، جس کے مطابق حبیب مصطفیٰ ﷺ عمل پیرا رہے، اس لئے ہمارے لئے بھی ضروری ہے کہ ہم بھی اسی راستے میں چلتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھیں۔

6) قضاء وقدر کا مفہوم اور صحابہ کرامؓ کی تربیت میں اس کا اثر:

قرآن کریم نے مکی دور میں تقدیر اور قضا کے مسئلہ پر بھی خاص توجہ دی، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَٰهُ بِقَدَرٍ﴾ ترجمہ: "ہم نے ہر چیز ایک تقدیر کے ساتھ پیدا کی ہے"۔ (سورۃ القمر: 49)۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿ٱلَّذِى لَهُۥ مُلْكُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَلَمْ يَكُن لَّهُۥ شَرِيكٌ فِى ٱلْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُۥ تَقْدِيرًا﴾ ترجمہ: "وہ جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے، جس نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا ہے، جس کے ساتھ بادشاہی میں کوئی شریک نہیں ہے، جس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اس کی ایک تقدیر مقرر کی"۔ (سورۃ الفرقان: 2)۔

اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ بھی صحابہ کرام کے دلوں میں قضاء وقدر کے مفہوم کو جاگزیں کرنے کی کوشش کرتے تھے، اور قرآن کریم کی وساطت سے ان کے سامنے اس کے مراتب بیان فرماتے تھے، ان مراتب کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

ا: پہلا مقام: ہر چیز کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا محیط اور وسیع علم، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَا تَكُونُ فِى شَأْنٍ وَمَا تَتْلُوا۟ مِنْهُ مِن قُرْءَانٍ وَلَا تَعْمَلُونَ مِنْ عَمَلٍ إِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُودًا إِذْ تُفِيضُونَ فِيهِ ۚ وَمَا يَعْزُبُ عَن رَّبِّكَ مِن مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِى ٱلْأَرْضِ وَلَا فِى ٱلسَّمَآءِ وَلَآ أَصْغَرَ مِن ذَٰلِكَ وَلَآ أَكْبَرَ إِلَّا فِى كِتَٰبٍ مُّبِينٍ﴾ ترجمہ: "اے نبیؐ، تم جس حال میں بھی ہوتے ہو اور قرآن میں سے جو کچھ بھی سُناتے ہو، اور لوگو، تم بھی جو کچھ کرتے ہو اُس سب کے دوران میں ہم تم کو دیکھتے رہتے ہیں، کوئی ذرہ برابر چیز آسمان اور زمین میں ایسی نہیں ہے، نہ چھوٹی نہ بڑی، جو تیرے رب کی نظر سے پوشیدہ ہو، اور ایک صاف دفتر میں درج نہ ہو"۔ (سورۂ یونس: 61)

۲: دوسرا مقام: ہر زندہ چیز اور اس کے اعمال کا ریکارڈ: ﴿إِنَّا نَحْنُ نُحْىِ ٱلْمَوْتَىٰ وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوا۟ وَءَاثَٰرَهُمْ ۚ وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَٰهُ فِىٓ إِمَامٍ مُّبِينٍ﴾ ترجمہ: "ہم یقیناً ایک روز مردوں کو زندہ کرنے والے ہیں جو کچھ افعال انہوں نے کیے ہیں وہ سب ہم لکھتے جارہے ہیں، اور جو کچھ آثار انہوں نے پیچھے چھوڑے ہیں وہ بھی ہم ثبت کررہے ہیں، ہر چیز کو ہم نے ایک کھلی کتاب میں درج کر رکھا ہے"۔ (سورۃ یٰسین: 12)

۳: تیسرا مقام: اللہ تعالیٰ کی نافذ ہونے والی مشیت اور اس کی مکمل قدرت۔ ﴿أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَكَانُوا أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۚ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعْجِزَهُ مِن شَيْءٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ ۚ إِنَّهُ كَانَ عَلِيمًا قَدِيرًا﴾ ترجمہ: ”کیا یہ لوگ زمین میں کبھی چلے پھرے نہیں ہیں کہ انہیں اُن لوگوں کا انجام نظر آتا جو اِن سے پہلے گزر چکے ہیں اور ان سے بہت زیادہ طاقت ور تھے؟ اللہ کو کوئی چیز عاجز کرنے والی نہیں ہے، نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں، وہ سب کچھ جانتا ہے اور ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے“۔ (سورۃ فاطر: 44)

۴: چوتھا مقام: اللہ کا ہر چیز کو پیدا کرنا۔ ترجمہ: ﴿ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ ۖ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوهُ ۚ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ﴾ ترجمہ: ”یہ ہے اللہ تمہارا رب، کوئی خدا اس کے سوا نہیں ہے، ہر چیز کا خالق، لہٰذا تم اسی کی بندگی کرو اور وہ ہر چیز کا کفیل ہے“۔ (سورۃ الأنعام: 102)

قضا و قدر کی حقیقت کے بارے میں صحابہ کرام کے صحیح فہم اور راسخ عقیدہ کے مفید اور ثمر آور نتائج سامنے آئے جن کے نتیجے میں دنیا و آخرت کا خیر ان کے قدموں میں سمٹ کر آ گیا، وہ نتائج اور ثمرات مندرجہ ذیل صورتوں میں سامنے آئے:

۱۔ اللہ عزوجل کی عبادت کی ادائیگی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے امت کے لئے تقدیر پر ایمان کو باعثِ عبادت قرار دیا ہے۔

۲۔ تقدیر پر ایمان شرک سے باز رہنے کا ذریعہ ہے، اس لئے کہ صاحبِ ایمان یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ نافع اور ضار، عزت دینے والا اور ذلت دینے والا، بلندی عطا کرنے والا صرف اور صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی کی ذات ہے۔

۳۔ شجاعت و بہادری اور اقدام: قضاء اور تقدیر پر ایمان کے نتیجے میں یہ تصور راسخ ہو جاتا ہے کہ زندگی اور موت اللہ کے اختیار میں ہے اور ہر ذی روح کا ایک وقت مقرر ہے۔

۴۔ صبر و احتساب اور مشکلات کا سامنا کرنا۔

۵ ۔سکونِ قلب اور اطمئنان: قضا و قدر پر ایمان کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان ہر اعتبار سے مطمئن اور پر سکون ہوتا ہے، اور سکون و اطمینان انسان کے لئے ایک مطلوب و مقصود چیز ہے، روئے زمین کا ہر شخص اس کا متلاشی ہوتا ہے، چنانچہ صحابہ کرام سکون و اطمئنان کے اعتبار سے اتنے فارغ البال اور خوشحال تھے جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے، وہ اس اعتبار سے بلند مقام پر فائز تھے۔

۶۔ خودداری، قناعت اور دوسروں کی غلامی سے آزادی:

تقدیر پر ایمان رکھنے والا شخص جانتا ہے کہ اس کا رزق اللہ کے ہاتھ میں ہے، اور اللہ ہی اس کے لئے کافی ہے اور وہی رازق بھی ہے، اور اس وقت تک موت نہیں آسکتی ہے جب تک کہ وہ اپنا رزق مکمل نہ کرے، اور بندوں میں سے کوئی اگر اس کو رزق دینا چاہے یا اس سے روکنا چاہے تو اللہ کی مشیت کے بغیر وہ کچھ نہیں کر سکتے ہیں، اس تصور کے نتیجے میں انسان میں قناعت، خودداری اور حسنِ طلب جیسی صفات پیدا

ہوتی ہیں، اور وہ دنیا پر ٹوٹ پڑنے سے باز رہتا ہے، مخلوقات کی غلامی سے آزاد ہوتا ہے، ان کے پاس موجود چیزوں کے بارے میں بے رغبتی اختیار کرتا ہے اور دل وجان سے رب العالمین کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

قضاء وقدر پر ایمان کے ثمرات واثرات بہت زیادہ ہیں، نمونے کے طور پر چند کا ذکر مندرجہ بالا سطور میں کیا گیا ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ کی اپنے اصحاب کو تربیت صرف چھ ارکانِ ایمان کی تعلیم تک محدود نہ تھی، بلکہ آپ ﷺ نے انسان کے بارے میں، زندگی کے بارے میں، کائنات کے بارے میں اور ان تینوں کے آپسی تعلق کے بارے میں بہت سے مفاہیم وتصورات اور اعتقاد کی تصحیح بھی فرمائی، تاکہ ایک مسلمان اللہ کے عطا کئے ہوئے نور کی رہنمائی میں اپنا سفر جاری رکھے، اور اپنے مقصدِ وجود کا ادراک کر سکے، اور اللہ تعالیٰ نے اس سے جس ذمہ داری کی ادائیگی کا مطالبہ کیا ہے اس کو اَحسن طریقہ سے ادا کر سکے اور ہر قسم کے اوہام وخرافات سے آزاد ہو سکے۔ (دیکھیں: أھمیۃ الجہاد فی نشر الدعوۃ الاسلامیۃ، ص:59)

7: انسان کی حقیقت کے بارے میں صحابہ کی آگہی:

قرآن کریم نے خود انسان کا تعارف کرایا ہے اور اس سے پہلے رب کا اور یومِ آخرت کا تعارف کرایا ہے، اور انسان کے ان فطری سوالات کا جواب دیا ہے کہ انسان کہاں سے آیا؟ اور اس کی منزل کیا ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جو ہر سلیم الفطرت انسان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں، اور بار بار جواب کا مطالبہ کرتے ہیں۔ (دیکھیں: منہج التربیۃ الاسلامیۃ محمد قطب 2/54)

قرآن کریم نے صحابہ کرام کے سامنے انسانیت کی ابتدا کی حقیقت، انسان کی اصل اور ان سے اس دنیا میں مطلوب کیا ہے؟ اور موت کے بعد ان کا انجام کس شکل میں ہوگا؟ ان تمام باتوں کے جوابات واضح طور پر بیان کر دیئے۔ صحابہ کرام نے نبی کریم ﷺ کی وساطت سے اور منہج قرآنی کے ذریعہ انسان کی اصل حقیقت جان لی کہ اس کو مٹی اور پانی کے مخلوط گارے اور ایک حقیر پانی سے وجود بخشا گیا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس کے مقام ومرتبہ اور رب کے نزدیک اس کی عزت کا تعارف کیا کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعہ اس کو سجدہ کرایا، اس نے بنایا اور اس کو معزز ومکرم بنایا اور اس کو تمام مخلوقات پر فضیلت عطا کی اور انسان ان دونوں حدود یعنی اعلی اور ادنی کے درمیان قائم رہے، اپنے مقام وعزت اور کرامت کی وجہ سے اپنے آپ کو صاحبِ عزت سمجھے اور اپنی اصل اور آغاز کو دیکھتے ہوئے عاجزی وانکساری اختیار کرے اور اس ذات ساتھ کی عظمت اس کے رگ وپے میں سرایت کر جائے جس نے اس کو وجود میں لا کر اس بلند مقام پر فائز کیا ہے، اس کے نتیجے میں وہ ہر قسم کے عجب وغرور اور تکبر سے محفوظ رہے گا، اسی طرح اس کی عزت وکرامت اس کو غیر اللہ کے سامنے جھکنے سے اور ذلت اختیار کرنے سے باز رکھے گی، اگر انسان کو اللہ تعالیٰ نے بغیر ہدایت کے رکھا ہوتا تو انسان ہی کے بارے میں وہ بہت سی غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتا، بلکہ بہت سے لوگ اس طرح کی غلط فہمیوں کا شکار ہوئے بھی ہیں، جیسے کہ بعض لوگ اپنے بارے میں خود پسندی اور تکبر کا شکار ہو جاتے ہیں، یا پھر ذلت وتوہین کی دلدل میں پھنس جاتے ہیں۔ (دیکھیں: أسالیب التشویق فی القرآن، د۔ الحسین جلو، ص134)

انسان کا اپنی ذات پر غرور و فکر کرنا، اس کی تربیت میں مؤثر ترین کردار ادا کرتا ہے، جب سے انسان اس روئے زمین پر آیا ہے اس وقت سے ہی وہ اپنے بارے میں غلط فہمیوں کا شکار ہوتا ہے، کبھی تو وہ افراط کا شکار ہو جاتا ہے تو اپنے آپ کو کائنات کی سب سے بڑی اور عظیم مخلوق سمجھنے لگتا ہے، اور وہ پورے غرور و تکبر کے ساتھ اس کا اعلان و اظہار بھی کرنے لگتا ہے، جیسے کہ قوم عاد کا رویہ رہا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَأَمَّا عَادٌ فَٱسْتَكْبَرُواْ فِى ٱلْأَرْضِ بِغَيْرِ ٱلْحَقِّ وَقَالُواْ مَنْ أَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ۖ أَوَلَمْ يَرَوْاْ أَنَّ ٱللَّهَ ٱلَّذِى خَلَقَهُمْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۖ وَكَانُواْ بِـَٔايَـٰتِنَا يَجْحَدُونَ﴾ ترجمہ: ''عاد کا حال یہ تھا کہ وہ زمین میں کسی حق کے بغیر بڑے بن بیٹھے اور کہنے لگے: "کون ہے ہم سے زیادہ زور آور"۔ اُن کو یہ نہ سوجھا کہ جس خدا نے ان کو پیدا کیا ہے وہ ان سے زیادہ زور آور ہے؟ وہ ہماری آیات کا انکار ہی کرتے رہے''۔ (سورۂ فصلت: 15)

اسی طرح فرعون نے بھی اسی طرح کا اعلان کیا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَقَالَ أَنَا۠ رَبُّكُمُ ٱلْأَعْلَىٰ﴾ ترجمہ: "میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں"۔ (سورۃ النازعات: 24)

اور اس طرح کی سوچ سے انسان کسی کے سامنے جوابدہ ہونے کے احساس سے عاری ہو جاتا ہے اور وہ الوہیت کے مقام پر فائز ہو جاتا ہے۔ اور کبھی وہ اس کے برعکس سمت میں چلنا شروع کر دیتا ہے اور تفریط کا شکار ہو جاتا ہے، وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ دنیا کی حقیر اور ذلیل ترین مخلوق ہے، جس کے نتیجے میں شجر و حجر، دریا، پہاڑ، حیوانات ہر چیز کے سامنے اپنا سر جھکانا شروع کر دیتا ہے، اور وہ سورج اور چاند کے سامنے سجدہ ریز ہونے میں عافیت محسوس کرتا ہے۔ (دیکھیں: أصول التربیۃ، نحلاوی، ص 31)

قرآن کریم نے اس بات کو بالکل واضح کر دیا ہے کہ انسان اپنی اصل کے اعتبار سے دو حیثیتوں کا حامل ہے: (۱) اصلِ بعید، یعنی مٹی سے بنائی گئی پہلی تخلیق، جب اللہ تعالیٰ نے اس کو پیدا کر کے ایک مکمل انسان بنایا، اور اس میں روح پھونکی۔

(۲) اصلِ قریب، جو تسلسل کے ساتھ جاری ہے، یعنی نطفہ سے اس کی تخلیق۔ (دیکھیں: أسالیب التشویق والتعزیر، ص 134)

اس ضمن میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ٱلَّذِىٓ أَحْسَنَ كُلَّ شَىْءٍ خَلَقَهُۥ ۖ وَبَدَأَ خَلْقَ ٱلْإِنسَـٰنِ مِن طِينٍ ۝٧ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُۥ مِن سُلَـٰلَةٍ مِّن مَّآءٍ مَّهِينٍ ۝٨ ثُمَّ سَوَّىٰهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِن رُّوحِهِۦ ۖ وَجَعَلَ لَكُمُ ٱلسَّمْعَ وَٱلْأَبْصَـٰرَ وَٱلْأَفْـِٔدَةَ ۚ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ﴾ ترجمہ: ''جو چیز بھی اس نے بنائی خوب ہی بنائی، اُس نے انسان کی تخلیق کی ابتدا گارے سے کی، پھر اُس کی نسل ایک ایسے ست سے چلائی جو حقیر پانی کی طرح کا ہے، پھر اس کو نِک سُک سے درست کیا اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دی، اور تم کو کان دیئے، آنکھیں دیں اور دِل دیئے، تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو''۔ (سورۃ السجدہ: 7-9)

اس موضوع کی آیات قرآن پاک میں کثیر تعداد میں موجود ہیں۔

قرآن کریم میں اس کو بھی وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو کس طرح تکریم و عزت سے سرفراز کیا ہے، اس طرح کی گفتگو کا صحابہ کرام کے قلب و عقل اور نفوس پر گہرا اثر تھا، قرآن کریم نے ان کے سامنے انسانی تکریم کی متعدد صورتیں بیان کی ہیں:

1: اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنے ہاتھ سے پیدا فرمایا:

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَإِذَا سَوَّيْتُهُۥ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِى فَقَعُوا۟ لَهُۥ سَـٰجِدِينَ ۝٧٢ فَسَجَدَ ٱلْمَلَـٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ أَجْمَعُونَ ۝٧٣ إِلَّآ إِبْلِيسَ ٱسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ ٱلْكَـٰفِرِينَ ۝٧٤ قَالَ يَـٰٓإِبْلِيسُ مَا مَنَعَكَ أَن تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَىَّ ۖ أَسْتَكْبَرْتَ أَمْ كُنتَ مِنَ ٱلْعَالِينَ﴾ ترجمہ: "جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک انسان مٹی سے بنانے والا ہوں، پھر جب میں اسے پورے طور پر بنالوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو اس کے لئے سجدہ میں گر پڑنا۔ پھر سب کے سب فرشتوں نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے نہ کیا، تکبر کیا اور کافروں میں سے ہو گیا۔ فرمایا: اے ابلیس! تمہیں اس کے سامنے سجدہ کرنے سے کس نے منع کیا جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا، کیا تو نے تکبر کیا یا تو بڑوں میں سے تھا"۔ (سورۃ ص: 71-75)

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے سامنے اس روح کے بلند مقام کو واضح کیا جو انسان کے اندر ودیعت کی گئی ہے اور یہ بتایا کہ انسان کی عزت و تکریم کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ پوری کائنات نے اس کا استقبال کیا، اور تمام فرشتے اس کے سامنے سر بسجود ہوئے، اللہ تعالیٰ انسان کی تکریم کا اعلان اپنے ان الفاظ کے ذریعہ کرتا ہے: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَـٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَـٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلَـٰٓئِكَةِ ٱسْجُدُوا۟ لِـَٔادَمَ فَسَجَدُوٓا۟ إِلَّآ إِبْلِيسَ لَمْ يَكُن مِّنَ ٱلسَّـٰجِدِينَ﴾ ترجمہ: " ہم نے تمہاری تخلیق کی ابتدا کی، پھر تمہاری صورت بنائی، پھر فرشتوں سے کہا آدمؑ کو سجدہ کرو، اس حکم پر سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا"۔ (سورۃ الأعراف: 11)

2: حسین شکل وصورت اور معتدل قدر و قامت:

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿خَلَقَ ٱلسَّمَـٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضَ بِٱلْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ۖ وَإِلَيْهِ ٱلْمَصِيرُ ۝٣ يَعْلَمُ مَا فِى ٱلسَّمَـٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُسِرُّونَ وَمَا تُعْلِنُونَ ۚ وَٱللَّهُ عَلِيمٌۢ بِذَاتِ ٱلصُّدُورِ﴾ ترجمہ: "اس نے زمین اور آسمانوں کو برحق پیدا کیا ہے، اور تمہاری صورت بنائی اور بڑی عمدہ بنائی ہے، اور اسی کی طرف آخر کار تمہیں پلٹنا ہے"۔ (سورۂ تغابن: 3)

ایک اور مقام پر ہے: ﴿ٱلَّذِى خَلَقَكَ فَسَوَّىٰكَ فَعَدَلَكَ﴾ ترجمہ: "جس نے تجھے پیدا کیا، تجھے نک سک سے درست کیا، تجھے متناسب بنایا"۔ (سورۃ الانفطار: 7)

3: اس کو عقل، قوتِ گویائی اور تمیز کی صلاحیت عطا کی:

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اَلرَّحْمٰنُ ۙ * عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ * خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۙ * عَلَّمَهُ الْبَيَانَ﴾ ترجمہ: "رحمٰن نے اِس قرآن کی تعلیم دی ہے اُسی نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بولنا سکھایا۔ (سورۃ الرحمن: 1-4)

4: اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے زمین وآسمان کی تمام چیزیں مسخر کیں:

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنے کے بعد اس کو بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَءَاتَىٰكُم مِّن كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ ۚ وَإِن تَعُدُّواْ نِعْمَتَ ٱللَّهِ لَا تُحْصُوهَآ ۗ﴾ ترجمہ: ''جس نے وہ سب کچھ تمہیں دیا جو تم نے مانگا، اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو کر نہیں سکتے، حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی بے انصاف اور ناشکرا ہے''۔(سورۂ ابراہیم:34)

اللہ تعالیٰ نے انسان کی عزت وتکریم کے لئے آسمانوں کی مخلوقات کو بھی اس کے لئے مسخر کیا جس میں ستارے، سورج اور چاند بھی شامل ہیں، اور آسمان کے عجیب وغریب نظام میں وہ چیزیں ودیعت کیں جو انسان کے لئے نفع بخش اور مفید ہیں، جیسے کی رات دن کا ایک دوسرے کے بعد آنا، موسموں کا اور درجۂ حرارت کا تبدیل ہوتے رہنا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَسَخَّرَ لَكُمُ ٱلَّيْلَ وَٱلنَّهَارَ وَٱلشَّمْسَ وَٱلْقَمَرَ ۖ وَٱلنُّجُومُ مُسَخَّرَٰتٌۢ بِأَمْرِهِۦٓ ۗ إِنَّ فِى ذَٰلِكَ لَءَايَٰتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ﴾ ترجمہ: ''اُس نے تمہاری بھلائی کے لئے رات اور دن کو اور سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے اور سب تارے بھی اُسی کے حکم سے مسخر ہیں، اِس میں بہت سی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں''۔(سورۃ النحل:12)

دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَا فِى ٱلْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ ۚ إِنَّ فِى ذَٰلِكَ لَءَايَٰتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ﴾ ترجمہ: ''اس نے زمین اور آسمانوں کی ساری ہی چیزوں کو تمہارے لئے مسخر کر دیا، سب کچھ اپنے پاس سے، اِس میں بڑی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لئے جو غور وفکر کرنے والے ہیں''۔(سورۃ الجاثیہ:13)

5: بہت سی مخلوقات کے مقابلہ میں فضیلت کے ذریعہ تکریم:

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِىٓ ءَادَمَ وَحَمَلْنَٰهُمْ فِى ٱلْبَرِّ وَٱلْبَحْرِ وَرَزَقْنَٰهُم مِّنَ ٱلطَّيِّبَٰتِ وَفَضَّلْنَٰهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا﴾ ترجمہ: ''یہ تو ہماری عنایت ہے کہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور انہیں خشکی وتری میں سواریاں عطا کیں اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی''۔(سورۃ الاسراء:70)

6: رسولوں کو بھیج کر انسان کی تکریم:

اللہ تعالیٰ کے ذریعہ انسان کی تکریم کے مظاہر میں سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لئے رسولوں کو مبعوث کیا اور ان کو زندگی بخش نظام زندگی عطا کیا، اور ان کے لئے دنیا وآخرت میں فوز وفلاح کا وعدہ کیا، انسان کی عزت وتکریم کے لئے اس کو عطا کی جانے والی عظیم ترین نعمت ایمان واسلام کی نعمت ہے، جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ہدایت سے سرفراز کیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿قَالَ ٱهْبِطَا مِنْهَا جَمِيعًۢا ۖ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۖ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّى هُدًى فَمَنِ ٱتَّبَعَ هُدَاىَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَىٰ﴾ ترجمہ: ''اور فرمایا: "تم دونوں (فریق، یعنی انسان اور شیطان) یہاں سے اتر جاؤ، تم ایک دُوسرے کے دشمن رہو گے، اب اگر میری طرف سے تمہیں کوئی ہدایت پہنچے تو جو کوئی میری اُس ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ بھٹکے گا نہ بدبختی میں مبتلا ہو گا''۔(سورۂ طہ،

123)۔دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے: ﴿قُلۡ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ إِنِّي رَسُولُ ٱللَّهِ إِلَيۡكُمۡ جَمِيعًا ٱلَّذِي لَهُۥ مُلۡكُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضِۖ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ يُحۡيِۦ وَيُمِيتُۖ فَـَٔامِنُواْ بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِ ٱلنَّبِيِّ ٱلۡأُمِّيِّ ٱلَّذِي يُؤۡمِنُ بِٱللَّهِ وَكَلِمَٰتِهِۦ وَٱتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمۡ تَهۡتَدُونَ﴾ ترجمہ:''اے محمدؐ، کہو کہ "اے انسانو، میں تم سب کی طرف اُس خدا کا پیغمبر ہوں جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے، اُس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے، پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے بھیجے ہوئے نبی اُمی پر، جو اللہ اور اس کے ارشادات کو مانتا ہے، اور پیروی اختیار کرو اُس کی، امید ہے کہ تم راہ راست پالوگے"۔(سورۃ الأعراف:158)

صحابہ کرام کو اس شرف و تکریم کا پورا احساس و شعور تھا، وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ انسان کے لئے باعثِ عزت و شرف ہے کہ وہ صرف ایک اللہ کی عبادت و بندگی کرے اور ہر قسم کی بت پرستی اور شرک سے آزاد ہو، اِرشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَقَدۡ بَعَثۡنَا فِي كُلِّ أُمَّةٖ رَّسُولًا أَنِ ٱعۡبُدُواْ ٱللَّهَ وَٱجۡتَنِبُواْ ٱلطَّـٰغُوتَۖ فَمِنۡهُم مَّنۡ هَدَى ٱللَّهُ وَمِنۡهُم مَّنۡ حَقَّتۡ عَلَيۡهِ ٱلضَّلَٰلَةُۚ فَسِيرُواْ فِي ٱلۡأَرۡضِ فَٱنظُرُواْ كَيۡفَ كَانَ عَٰقِبَةُ ٱلۡمُكَذِّبِينَ﴾ ترجمہ:''ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیج دیا، اور اُس کے ذریعہ سے سب کو خبر دار کر دیا کہ "اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو"۔اس کے بعد ان میں سے کسی کو اللہ نے ہدایت بخشی اور کسی پر ضلالت مسلط ہو گئی، پھر ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہو چکا ہے''۔(سورۃ النحل:36)

7: اللہ تعالیٰ کی انسان سے محبت اور ملأ اعلیٰ میں اس کا ذکر:

انسان کی تکریم کے اہم مظاہر میں سے یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت و رضا کا اہل قرار دیا، اور قرآن کریم میں ایسی چیزوں کی جانب اس کی رہنمائی کی ہے جن کی وجہ سے وہ اس محبت کا اہل بن سکے، جس میں سب سے پہلی چیز اللہ کے رسول ﷺ کی اتباع و پیروی ہے جس کے نتیجے میں وہ دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کر سکیں گے، اور آخرت میں ہمیشہ رہنے والی نعمتوں سے سرفراز ہوں گے، اللہ تعالیٰ نے اس اتباع و پیروی کا ثمرہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ﴿مَنۡ عَمِلَ صَٰلِحٗا مِّن ذَكَرٍ أَوۡ أُنثَىٰ وَهُوَ مُؤۡمِنٞ فَلَنُحۡيِيَنَّهُۥ حَيَوٰةٗ طَيِّبَةٗۖ وَلَنَجۡزِيَنَّهُمۡ أَجۡرَهُم بِأَحۡسَنِ مَا كَانُواْ يَعۡمَلُونَ﴾ ترجمہ:''جو شخص بھی نیک عمل کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہو وہ مؤمن، اسے ہم دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور (آخرت میں) ایسے لوگوں کو ان کے اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق بخشیں گے''۔(سورۃ النحل:97)

8: انسان کی حفاظت و نگہبانی:

انسانی تکریم کے مظاہر میں سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر بُری چیز سے اس کی نگہداشت اور حفاظت کرتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِن كُلُّ نَفۡسٖ لَّمَّا عَلَيۡهَا حَافِظٞ﴾ ترجمہ:''کوئی جان ایسی نہیں ہے جس کے اوپر کوئی نگہبان نہ ہو''۔(سورۃ الطارق:4)۔انسانی تکریم کے اور بہت سے پہلوؤں کو قرآن پاک میں جابجا بیان کیا گیا ہے۔(دیکھیں: موسوعۃ نضرۃ النعیم فی مکارم أخلاق الرسول ﷺ 114، 4/1136)

8: آدمؑ اور شیطان کے واقعہ کے بارے میں صحابہ کرام کا تصور:

اللہ کے رسول ﷺ صحابہ کرام کے سامنے منہج قرآنی کے مطابق آدم علیہ السلام اور شیطان کے واقعات کو بیان فرماتے تھے، اور ان کے سامنے انسان اور اس کے خطرناک دشمن کے درمیان کشمکش کی حقیقت بیان فرماتے تھے، جس دشمن نے ان کے جد امجد آدم علیہ السلام کو گمراہ کرنے کی کوشش کی، اللہ کے رسول ﷺ قرآنی آیات کے ذریعہ اس کی تفصیلات ان کے سامنے بیان فرماتے تھے، جیسے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يَٰبَنِيٓ ءَادَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ ٱلشَّيْطَٰنُ كَمَآ أَخْرَجَ أَبَوَيْكُم مِّنَ ٱلْجَنَّةِ يَنزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْءَٰتِهِمَآ ۗ إِنَّهُۥ يَرَىٰكُمْ هُوَ وَقَبِيلُهُۥ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۗ إِنَّا جَعَلْنَا ٱلشَّيَٰطِينَ أَوْلِيَآءَ لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ﴾ ترجمہ: "اے بنی آدم، ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں پھر اُسی طرح فتنے میں مبتلا کردے جس طرح اس نے تمہارے والدین کو جنت سے نکلوایا تھا اور ان کے لباس ان پر سے اتروا دیئے تھے تاکہ ان کی شرمگاہیں ایک دوسرے کے سامنے کھولے، وہ اور اس کے ساتھی تمہیں ایسی جگہ سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھ سکتے اِن شیاطین کو ہم نے اُن لوگوں کا سرپرست بنا دیا ہے جو ایمان نہیں لاتے"۔(سورۃ الأعراف:27)

دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿قَالَ أَنظِرْنِيٓ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ﴿١٤﴾ قَالَ إِنَّكَ مِنَ ٱلْمُنظَرِينَ ﴿١٥﴾ قَالَ فَبِمَآ أَغْوَيْتَنِي لَأَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَٰطَكَ ٱلْمُسْتَقِيمَ ﴿١٦﴾ ثُمَّ لَءَاتِيَنَّهُم مِّنۢ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ أَيْمَٰنِهِمْ وَعَن شَمَآئِلِهِمْ ۖ وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَٰكِرِينَ﴾ ترجمہ: "بولا: "مجھے اُس دن تک مہلت دے جب کہ یہ سب دوبارہ اٹھائے جائیں گے"۔ فرمایا: "تجھے مہلت ہے"۔ بولا: "اچھا تو جس طرح تو نے مجھے گمراہی میں مبتلا کیا میں بھی اب تیری سیدھی راہ پر ان انسانوں کی گھات میں لگا رہوں گا، آگے اور پیچھے، دائیں اور بائیں، ہر طرف سے اِن کو گھیروں گا اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا"۔(سورۃ الأعراف:17- 14)

صحابہ کرام شیطان کے بارے میں اس طرح کا احساس و تصور رکھتے تھے گویا کہ وہ ان کے سامنے مجسم شکل میں نظر آرہا ہو، جو دائیں سے، بائیں سے، آگے سے اور پیچھے سے آکر گناہ کے بارے میں وسوسہ اندازی کر رہا ہو اور جذبات اور خواہشات کو برانگیختہ کر رہا ہو، اس لئے صحابہ کرام ہمیشہ اپنے اس دشمن سے چوکنا رہتے تھے، اور خیر کے کاموں میں سبقت کرتے تھے کہ تمام شیطانی راستوں کو مسدود اور تنگ کردیں، جس کے بعد شیطان کو ان تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہ مل سکے، اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے بعد انھوں نے یہ درس سیکھ لیا تھا: ﴿فَإِذَا قَرَأْتَ ٱلْقُرْءَانَ فَٱسْتَعِذْ بِٱللَّهِ مِنَ ٱلشَّيْطَٰنِ ٱلرَّجِيمِ ﴿٩٨﴾ إِنَّهُۥ لَيْسَ لَهُۥ سُلْطَٰنٌ عَلَى ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴿٩٩﴾ إِنَّمَا سُلْطَٰنُهُۥ عَلَى ٱلَّذِينَ يَتَوَلَّوْنَهُۥ وَٱلَّذِينَ هُم بِهِۦ مُشْرِكُونَ ﴿١٠٠﴾﴾ ترجمہ: "پھر جب تم قرآن پڑھنے لگو تو شیطان رجیم سے خدا کی پناہ مانگ لیا کرو۔ اُسے اُن لوگوں پر تسلط حاصل نہیں ہوتا جو ایمان لاتے اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اس کا زور تو انہی لوگوں پر چلتا ہے جو اس کو اپنا سرپرست بناتے اور اس کے بہکانے سے شرک کرتے ہیں"۔(سورۃ النحل: 100-98)

قرآن کریم میں آدم علیہ السلام اور شیطان کا قصہ متعدد مقامات پر وارد ہوا ہے، کبھی تو جملہ تفصیلات کے ساتھ مذکور ہے، جیسے کہ سورۃ الاعراف میں اور کبھی بعض تفصیلات کے ساتھ جیسے کہ سورۃ الحجر، سورۃ الاسراء، سورۂ طہ اور سورۂ ص میں، اور کبھی اس واقعہ کی جانب سرسری اشارہ کیا جاتا ہے، اور ایسا قرآن میں بہت سے مقامات پر ہے، اور سورۂ ابراہیم میں صرف قیامت کے دن بنی آدم کے ساتھ ساتھ شیطان کے موقف کا ذکر کیا گیا ہے کہ جن لوگوں نے دنیا میں اس کی اتباع و پیروی کی تھی قیامت کے دن وہ ان سے مکمل طور پر اعلانِ براءت کرے گا، جیسے کہ آیت نمبر بائیس (۲۲) میں مذکور ہے۔ (دیکھیں: دراسات قرآنیہ، ص 112)

اللہ تعالیٰ نے سورۃ الاعراف میں ارشاد فرمایا ہے: ﴿وَيَٰٓـَٔادَمُ ٱسْكُنْ أَنتَ وَزَوْجُكَ ٱلْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هَٰذِهِ ٱلشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ ٱلظَّٰلِمِينَ ۝١٩ فَوَسْوَسَ لَهُمَا ٱلشَّيْطَٰنُ لِيُبْدِىَ لَهُمَا مَا وُۥرِىَ عَنْهُمَا مِن سَوْءَٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهَىٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هَٰذِهِ ٱلشَّجَرَةِ إِلَّآ أَن تَكُونَا مَلَكَيْنِ أَوْ تَكُونَا مِنَ ٱلْخَٰلِدِينَ ۝٢٠ وَقَاسَمَهُمَآ إِنِّى لَكُمَا لَمِنَ ٱلنَّٰصِحِينَ ۝٢١ فَدَلَّىٰهُمَا بِغُرُورٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا ٱلشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْءَٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِن وَرَقِ ٱلْجَنَّةِ ۖ وَنَادَىٰهُمَا رَبُّهُمَآ أَلَمْ أَنْهَكُمَا عَن تِلْكُمَا ٱلشَّجَرَةِ وَأَقُل لَّكُمَآ إِنَّ ٱلشَّيْطَٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۝٢٢ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ ٱلْخَٰسِرِينَ ۝٢٣ قَالَ ٱهْبِطُوا۟ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۖ وَلَكُمْ فِى ٱلْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَٰعٌ إِلَىٰ حِينٍ ۝٢٤ قَالَ فِيهَا تَحْيَوْنَ وَفِيهَا تَمُوتُونَ وَمِنْهَا تُخْرَجُونَ ۝٢٥ يَٰبَنِىٓ ءَادَمَ قَدْ أَنزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُوَٰرِى سَوْءَٰتِكُمْ وَرِيشًا ۖ وَلِبَاسُ ٱلتَّقْوَىٰ ذَٰلِكَ خَيْرٌ ۚ ذَٰلِكَ مِنْ ءَايَٰتِ ٱللَّهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ ۝٢٦ يَٰبَنِىٓ ءَادَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ ٱلشَّيْطَٰنُ كَمَآ أَخْرَجَ أَبَوَيْكُم مِّنَ ٱلْجَنَّةِ يَنزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْءَٰتِهِمَآ ۗ إِنَّهُۥ يَرَىٰكُمْ هُوَ وَقَبِيلُهُۥ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۗ إِنَّا جَعَلْنَا ٱلشَّيَٰطِينَ أَوْلِيَآءَ لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ ۝٢٧﴾ ترجمہ: ”اور اے آدم! تو اور تیری بیوی جنت میں رہو، پھر جہاں سے چاہو کھاؤ اور اس درخت کے پاس نہ جاؤ، ورنہ بے انصافوں میں سے ہو جاؤ گے۔ پھر انہیں شیطان نے بہکایا تاکہ ان کی شرم گاہیں جو ایک دوسرے سے چھپائی گئی تھیں ان کے سامنے کھول دے، اور کہا تمہیں تمہارے رب نے اس درخت سے نہیں روکا مگر اس لئے کہ کہیں تم فرشتے ہو جاؤ یا ہمیشہ رہنے والے ہو جاؤ۔ اور ان کے روبرو قسم کھائی کہ البتہ میں تمہارا خیر اخواہ ہوں۔ پھر انہیں دھوکہ سے مائل کر لیا، پھر جب ان دونوں نے درخت کو چکھا تو ان پر ان کی شرم گاہیں کھل گئیں اور اپنے اوپر بہشت کے پتے جوڑنے لگے، اور انہیں ان کے رب نے پکارا: کیا میں نے تمہیں اس درخت سے منع نہیں کیا تھا اور تمہیں کہہ نہ دیا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے۔ ان دونوں نے کہا: اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا، اور اگر تو ہمیں نہ بخشے گا اور ہم پر رحم نہ کرے گا تو ہم ضرور تباہ ہو جائیں گے۔ فرمایا: یہاں سے اترو، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے، اور تمہارے لئے زمین میں ٹھکانا ہے اور ایک وقت تک نفع اٹھانا ہے۔ فرمایا: تم اسی میں زندہ رہو گے اور اسی میں مرو گے اور اسی سے نکالے جاؤ گے۔ اے آدم کی اولاد! ہم نے تم پر پوشاک اتاری جو تمہاری شرم گاہیں ڈھانکتی ہے اور آرائش کے کپڑے بھی اتارے، اور پرہیزگاری کا

لباس وہ سب سے بہتر ہے، یہ اللہ کی قدرت کی نشانیاں ہیں تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔اے آدم کی اولاد! تمہیں شیطان نہ بہکائے جیسا کہ اس نے تمہارے ماں باپ کو بہشت سے نکال دیا، ان سے ان کے کپڑے اتروائے تاکہ تمہیں ان کی شرمگاہیں دکھائے، وہ اور اس کی قوم تمہیں دیکھتی ہے جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھتے، ہم نے شیطانوں کو ان لوگوں کا دوست بنادیا ہے جو ایمان نہیں لاتے"۔(سورۃ الأعراف: 27-19)

انسان کے لئے یہ بات انتہائی اہم ہے کہ وہ اپنی تاریخ سے واقف ہو، تاکہ اس سے سبق حاصل کرسکے، نہ کہ اس لئے کہ وہ اس کے ذریعہ تسلی حاصل کریں۔ آدم علیہ السلام کے ساتھ شیطان کی روداد کے قرآنی واقعات میں مخصوص مدلولات اور معانی ہیں، یہ واقعہ انسان کے لئے اس کا نقطہ آغاز اور ان کا انجام متعین کرتا ہے، زمین میں اس سے مطلوبہ کردار اور راہ کو واضح کرتا ہے، ان رکاوٹوں کا ذکر کرتا ہے جو ان کو اپنے سفر کے دوران لاحق ہوں گی، اور ان رکاوٹوں سے بچنے اور دور رہنے کا طریقہ بھی بتادیا گیا ہے۔(دراسات قرآنیہ، ص: 114)

جن قرآنی آیات میں آدمؑ کا قصہ اور شیطان کے ساتھ ان کی کشمکش کا ذکر کیا گیا ہے ان آیات نے صحابہ کرام کو اعتقاد وتصور اور اخلاق کے اعتبار سے اہم ترین امور کا درس دیا تھا، ان کا ذکر مندرجہ ذیل سطور میں کیا جاتا ہے:

۱: آدم علیہ السلام تمام انسانوں کی اصل ہیں:

بلاشبہ آدم علیہ السلام تمام انسانوں کی اصل ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو مٹی کے مادہ سے مکمل انسانی صورت میں پیدا کیا، ان کی تخلیق میں ارتقاء کا طریقہ اختیار نہیں کیا گیا کہ ایک مخلوق سے دوسری مخلوق میں یا ایک شکل سے دوسری شکل میں تبدیل ہوتے چلے گئے ہوں، اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا، ان کے بدن میں روح ڈالی جس کے نتیجہ میں وہ گوشت اور پوست سے بنے ہوئے انسانی شکل وصورت میں ایک کامل ومکمل اور صحیح سالم انسان بن گئے۔

۲: اسلام کی اصل روح اللہ کی مطلق اطاعت ہے:

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا حکم دیا تو انہوں نے ان کے سامنے سجدہ کیا، جس میں آدم علیہ السلام کے لئے ادب وتکریم، ان کے فضل کا اعتراف اور رب العالمین کے لئے بغیر کسی اعتراض وتردد کے اطاعت کا جذبہ کارفرما تھا، اگرچہ ان کا شمار ملأ اعلیٰ میں ہوتا ہے اور وہ ہر وقت تسبیح وتقدیس اور رب العالمین کے لئے مستقل عبادت میں سربسجود رہتے ہیں، فرشتے فوراً آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ ریز ہوگئے، اس لئے کہ سجدہ کا حکم ان کو رب العالمین کی طرف سے ملا تھا، اور اللہ تعالیٰ جس چیز کا بھی حکم دے اس کی تعمیل کسی اعتراض، تردد اور توقف کے بغیر ضروری ہے، یہ سمجھتے ہوئے کہ اس حکم میں کوئی نہ کوئی مصلحت اور حکمت پوشیدہ ہوگی، یہی اسلام کا اصل جوہر اور اصل روح ہے، اور مؤمن کی یہی شان ہونی چاہیے کہ رب کی اطاعت وبندگی اور فرمانبرداری کے لئے بلاچوں وچرا سرِ تسلیم خم کرلے، حکم کے سبب یا اس کی حکمت کو جاننے یا اپنی عقل وخواہش کے مطابق ہونے کے ساتھ اس کو مشروط نہ کریں۔

۳: انسان سے غلطی ہونے کا امکان:

آدم علیہ السلام سے لغزش ہونے کے واقعہ کے ذریعہ صحابہ کرام نے یہ بات سیکھ لی کہ انسان کے اندر یہ صلاحیت رکھی گئی ہے کہ اس سے غلطی سرزد ہوسکتی ہے، اور اس صلاحیت کا تعلق انسان کی فطرت سے ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت ایسی بنائی ہے کہ اس سے غلطی کا صدور ہوسکتا ہے، اور یہ اس کی فطرت، جذبات وخواہشات اور رجحانات کا تقاضا ہے، اور یہی انسانی وجود کا کمزور پہلو ہے، اور اسی راستے سے شیطان وسوسہ اندازی کے ذریعہ اور برائی کو خوشنما بنا کر انسان پر حملہ آور ہوتا ہے، انسان فطری طور پر اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کو خلود نصیب ہو، اس کو موت نہ آئے یا اس کو عمرِ دراز نصیب ہو، اسی طرح وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اس کو کم عمر میں لا محدود ملک و سلطنت مل جائے۔ (فی ظلال القرآن: 3/1296)

اسی خواہش اور سوچ کو لے کر ابلیس، آدم علیہ السلام کے پاس آیا، اور ان سے اور ان کی زوجہ سے کہا: ﴿مَا نَهَىٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هَٰذِهِ ٱلشَّجَرَةِ إِلَّآ أَن تَكُونَا مَلَكَيْنِ أَوْ تَكُونَا مِنَ ٱلْخَٰلِدِينَ﴾ ترجمہ: "تمہیں تمہارے رب نے اس درخت سے نہیں روکا مگر اس لئے کہ کہیں تم فرشتے ہو جاؤ یا ہمیشہ رہنے والے ہو جاؤ"۔ (سورۃ الأعراف: 20) اور قسم کھا کر اپنی بات کو تاکیدی بنانے کی کوشش کی اور کہا کہ وہ ان دونوں کا خیر خواہ ہے۔

ہماری بات کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ انسان جذبات وخواہشات کے سامنے سپر ڈال دے، بلکہ ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان جذبات وخواہشات کو کنٹرول میں کرلے، ان کی خودسری پر لگام لگائے، اور ان کو شریعت مطہرہ کے تابع کرے، اس طرح خواہشات و جذبات کا منبع نفس ہوتا ہے اور اکثر یہ خواہشات حدود اللہ سے متجاوز اور بے لگام ہوا کرتی ہیں، ان کو صرف اور صرف احکام شریعت کی لگام کے ذریعہ منضبط کیا جاسکتا ہے، اسی اعتبار سے خواہش کی مذمت وارد ہوئی ہے، اور یہ اس وقت قابلِ مذمت ہے جبکہ خواہش کا تعلق کسی غیر شرعی مذموم چیز سے ہو، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِۦ وَنَهَى ٱلنَّفْسَ عَنِ ٱلْهَوَىٰ ۝٤٠ فَإِنَّ ٱلْجَنَّةَ هِيَ ٱلْمَأْوَىٰ ۝٤١﴾ ترجمہ: "اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا تھا اور نفس کو بری خواہشات سے باز رکھا تھا، جنت اس کا ٹھکانا ہوگی"۔ (سورۃ النازعات: 41-40)

یہاں خواہش کو مطلقاً ذکر کیا گیا ہے اور اس شخص کی مدح وتعریف کی گئی ہے جس نے خواہش سے اپنے نفس کو روک لیا، اس لئے کہ بے لگام چھوڑنے کی صورت میں نفس انسان کو مذموم کام کی طرف کھینچ کر لے جائے گا۔ (دیکھیں: المستفاد من قصص القرآن للدعوۃ والدعاۃ، د۔ عبد الکریم زیدان 1/28)

۴: اپنے رب پر توکل کی اہمیت وضرورت:

آدم علیہ السلام سے لغزش کا سرزد ہونا ظاہر کرتا ہے کہ انسان سے غلطی سرزد ہونا انسانی فطرت میں داخل ہے، اور یہ بات ڈر اور خوف کا باعث بھی ہے، لیکن ایک مسلمان اپنے رب پر اعتماد وتوکل کرتا ہے کہ وہ اس کو شیطانِ مردود کے شر سے محفوظ رکھے، اس کی تفصیل یہ ہے

کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرایا تاکہ ان کے فضل وکمال کا اظہار ہو اور رب کے نزدیک ان کے بلند مقام کا علم ہو، اور ابلیس کو جنت سے باہر نکال دیا، اس لئے کہ اس نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا، اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام اور ان کی زوجہ کو جنت میں بسایا اور ان کو واضح اور صریح حکم دیا کہ ایک متعین درخت کے قریب نہ جانا اور اس درخت کے علاوہ جنت کی تمام نعمتوں کو ان کے لئے جائز قرار دیا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَيَـٰٓـَٔادَمُ ٱسۡكُنۡ أَنتَ وَزَوۡجُكَ ٱلۡجَنَّةَ فَكُلَا مِنۡ حَيۡثُ شِئۡتُمَا وَلَا تَقۡرَبَا هَـٰذِهِ ٱلشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ ٱلظَّـٰلِمِينَ﴾ ترجمہ: "اور اے آدم! تو اور تیری عورت جنت میں رہو، پھر جہاں سے چاہو کھاؤ اور اس درخت کے پاس نہ جاؤ ورنہ بے انصافوں میں سے ہو جاؤ گے"۔(سورۃ الأعراف: 19)

اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو شیطان سے اور اس کے مکر وفریب اور چالبازی سے آگاہ اور چوکنا کر دیا تھا تاکہ وہ ان کو جنت سے نہ نکال پائے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَإِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلَـٰٓئِكَةِ ٱسۡجُدُواْ لِأٓدَمَ فَسَجَدُوٓاْ إِلَّآ إِبۡلِيسَ أَبَىٰ ﴿١١٦﴾ فَقُلۡنَا يَـٰٓـَٔادَمُ إِنَّ هَـٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوۡجِكَ فَلَا يُخۡرِجَنَّكُمَا مِنَ ٱلۡجَنَّةِ فَتَشۡقَىٰٓ ﴿١١٧﴾﴾ ترجمہ: "یاد کرو وہ وقت جبکہ ہم نے فرشتوں سے کہا تھا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو، وہ سب تو سجدہ کر گئے، مگر ایک ابلیس تھا کہ انکار کر بیٹھا۔ اس پر ہم نے آدمؑ سے کہا کہ دیکھو، یہ تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے، ایسا نہ ہو کہ یہ تمہیں جنت سے نکلوا دے اور تم مصیبت میں پڑ جاؤ"۔(سورۂ طہ: 116-117)

لیکن اس کے باوجود شیطان نے ان دونوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کی اور ان کو دھوکہ دیا جس کے نتیجے میں انہوں نے اس درخت کا پھل چکھ لیا اور نافرمانی کے مرتکب ہو گئے، جس کی وجہ سے شیطان ان کو جنت کی عظیم نعمتوں سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔

آدم علیہ السلام کی لغزش کا قصہ سن کر صحابہ کرام کے دلوں میں اس خبیث دشمن کے بارے میں ڈر اور خوف کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی، اور اس کی گمراہ کن کوششوں سے خوف وڈر نے ان کو ہمیشہ اللہ کی پناہ وحفاظت میں رہنے اور اللہ ہی کی ذات پر بھروسہ کرنے کا درس دیا تھا، اسی طرح شیطانِ مردود جس کا مقصد صرف انسان کو گمراہ کرنا اور اس کو گناہ کے راستے پر ڈالنا ہے اس شیطانِ مردود کے مقابلہ میں اللہ کی مدد حاصل کرتے رہنے پر وہ ہر وقت توجہ دیتے تھے، یہی سبق انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس قول سے سیکھا تھا: ﴿إِنَّ عِبَادِي لَيۡسَ لَكَ عَلَيۡهِمۡ سُلۡطَـٰنٌۚ وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ وَكِيلًا﴾ ترجمہ: "بے شک جو میرے بندے ہیں ان پر تیرا غلبہ نہیں ہو سکتا، اور آپ کا رب اپنے بندوں کی کارگزاری کے لئے کافی ہے"۔(سورۃ الاسراء: 65) دوسری جگہ یوں ارشاد ہے: ﴿إِنَّهُۥ لَيۡسَ لَهُۥ سُلۡطَـٰنٌ عَلَى ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَعَلَىٰ رَبِّهِمۡ يَتَوَكَّلُونَ﴾ ترجمہ: "اُسے اُن لوگوں پر تسلط حاصل نہیں ہوتا جو ایمان لاتے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں"۔(سورۃ النحل: 99) لہذا جو اللہ پر ایمان کامل رکھتا ہے اس کو گمراہ کرنے اور اس پر اثراندازی کی شیطان کے اندر کوئی طاقت و صلاحیت نہیں ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے، ان کے اعضاء وجوارح کو اپنی اطاعت کے کاموں میں لگا دیتا ہے، اور ان کا اعتماد وتوکل اپنی ذات پر قائم کرتا ہے، اس لئے شیطان کا ایسے لوگوں پر کوئی بس نہیں چلتا ہے، وہ شیطان کی غلط تمناؤں کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں اور اس کی وسوسہ اندازیوں کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیتے ہیں، اس لئے کہ ایمان باللہ ان کے اندر شیطانی مکر وفریب کو

منکشف کرنے والا نور عطا کرتا ہے، اللہ پر توکل و بھروسہ ان کو خاص طاقت و قوت عطا کرتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شیطان کمزور پڑ جاتا ہے اور ایمان باللہ اور توکل علی اللہ کی قوت کے سامنے ذلیل و خوار ہو جاتا ہے۔(دیکھیں: المستفاد من قصص القرآن 1/71)

۵: توبہ واستغفار کی ضرورت:

صحابہ کرامؓ نے آدمؑ و ابلیس کے قصہ سے یہ سبق سیکھا کہ معصیت اور گناہ سرزد ہونے کی صورت میں استغفار و توبہ ضروری ہے، چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حواؑ سے جب نافرمانی سرزد ہوگئی تو انھوں نے فوراً اپنے رب کریم سے حصولِ مغفرت و رحمت کے لئے دعا کی، ارشاد ربانی ہیں: ﴿فَدَلَّىٰهُمَا بِغُرُورٍۚ فَلَمَّا ذَاقَا ٱلشَّجَرَةَ بَدَتۡ لَهُمَا سَوۡءَٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخۡصِفَانِ عَلَيۡهِمَا مِن وَرَقِ ٱلۡجَنَّةِۖ وَنَادَىٰهُمَا رَبُّهُمَآ أَلَمۡ أَنۡهَكُمَا عَن تِلۡكُمَا ٱلشَّجَرَةِ وَأَقُل لَّكُمَآ إِنَّ ٱلشَّيۡطَٰنَ لَكُمَا عَدُوّٞ مُّبِينٞ ﴿٢٢﴾ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمۡنَآ أَنفُسَنَا وَإِن لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا وَتَرۡحَمۡنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ ٱلۡخَٰسِرِينَ ﴿٢٣﴾﴾ ترجمہ:" پھر انہیں دھوکہ سے مائل کر لیا، پھر جب ان دونوں نے درخت کو چکھا تو ان پر ان کی شرم گاہیں کھل گئیں اور اپنے اوپر بہشت کے پتے جوڑنے لگے، اور انہیں ان کے رب نے پکارا: کیا میں نے تمہیں اس درخت سے منع نہیں کیا تھا اور تمہیں کہہ نہ دیا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے۔ان دونوں نے کہا: اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا، اور اگر تو ہمیں نہ بخشے گا اور ہم پر رحم نہ کرے گا تو ہم تو تباہ ہو جائیں گے"۔ (سورۃ الأعراف:22-23) یہ فوری اعترافِ گناہ ہے جس میں شدید ندامت بھی شامل ہے اور ایسی توبہ ہے جس میں قبولیت کی امید بھی ہے، لہذا جب آدم علیہ السلام اور حضرت حواؑ اپنے مقامِ بلند کے باوجود اللہ کے سامنے توبہ کرنے اور مغفرت طلب کرنے میں بے نیاز نہیں ہیں تو دوسرے لوگ کیسے ہو سکتے ہیں؟! ان کو تو توبہ و مغفرت کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ (المستفاد من قصص القرآن 1/30)

٦: حسد اور تکبر سے اجتناب:

ابلیس جس گناہ میں مبتلا ہوا اس کا بنیادی سبب حسد اور تکبر تھا، معلوم یہ ہوا گناہوں کا آغاز تکبر سے ہوا ہے، ابلیس کو جب اپنے رب کا حکم ہوا کہ آدم علیہ السلام کے سامنے سربسجود ہو جائے تو اس نے رب کا حکم ماننے کے بارے میں تکبر کیا، اسی لئے تکبر کرنے والوں کے لئے سخت وعید وارد ہوئی ہے، اور تکبر سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے، اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے۔"وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہوگا"۔(مسند أحمد، /1 451، 399، سنن ابن ماجہ، 59، صحیح مسلم: 91، سنن ابوداؤد: 4091)

تکبر کا اصل مطلب ہے: حق کا انکار اور لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھنا، یعنی حق کو ٹھکرا دینا اور حق کے سامنے نہ جھکنا، حق کو معمولی اور غیر ضروری سمجھ کر اپنے آپ کو اس سے بالاتر سمجھنا، اسی طرح لوگوں کو حقیر اور کم درجے کا سمجھنا۔ (دیکھیں: المسفتاد من قصص القرآن 1/33)

انکارِ حق کا سب سے بڑا مظہر اللہ کے احکام کا انکار کرنا اور ان کے بارے میں عناد و سرکشی اختیار کرنا ہے، اس لئے کہ اللہ تعالی جس چیز کا بھی حکم دے گا وہ حق ہی ہوگا اور اس حق کے مقابلہ میں سرکشی اختیار کرنا اور اس کو ہٹانے اور مٹانے کی کوشش کرنا تکبر کی دلیل ہے، صحابہ

کرام حسد و تکبر کے جراثیم سے سب سے زیادہ دور اور پاک تھے، قرآنی آیات کے ذریعہ اس بیماری کی خطرناکی کا انہیں اچھی طرح احساس تھا، انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پر گہرائی کے ساتھ غور کیا تھا: ﴿ٱلَّذِينَ يَجۡتَنِبُونَ كَبَٰٓئِرَ ٱلۡإِثۡمِ وَٱلۡفَوَٰحِشَ إِلَّا ٱللَّمَمَۚ إِنَّ رَبَّكَ وَٰسِعُ ٱلۡمَغۡفِرَةِۚ هُوَ أَعۡلَمُ بِكُمۡ إِذۡ أَنشَأَكُم مِّنَ ٱلۡأَرۡضِ وَإِذۡ أَنتُمۡ أَجِنَّةٞ فِي بُطُونِ أُمَّهَٰتِكُمۡۖ فَلَا تُزَكُّوٓاْ أَنفُسَكُمۡۖ هُوَ أَعۡلَمُ بِمَنِ ٱتَّقَىٰٓ ٣٢﴾ ترجمہ:" جو بڑے بڑے گناہوں اور کھلے کھلے قبیح افعال سے پرہیز کرتے ہیں، الا یہ کہ کچھ قصور اُن سے سرزد ہو جائے، بلاشبہ تیرے رب کا دامنِ مغفرت بہت وسیع ہے، وہ تمہیں اُس وقت سے خوب جانتا ہے جب اُس نے زمین سے تمہیں پیدا کیا اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں ابھی جنین ہی تھے، پس اپنے نفس کی پاکی کے دعوے نہ کرو، وہی بہتر جانتا ہے کہ واقعی متقی کون ہے"۔(سورۃ النجم:32) انہوں نے اس بات کو سیکھ لیا تھا کہ مادۂ تخلیق اور حسب و نسب کوئی فخر کی چیز نہیں ہے، بلکہ عزت و کرامت کا اصل معیار تقویٰ، اطاعت اور خیر کے کام ہیں جن کے ذریعہ زمین و آسمان کے رب کی خوشنودی مقصود ہو، اس لئے کہ ابلیس نے اپنے مادۂ تخلیق پر فخر کیا تھا: ﴿خَلَقۡتَنِي مِن نَّارٖ وَخَلَقۡتَهُۥ مِن طِينٖ﴾ ترجمہ:" (اس نے کہا:) میں اس سے بہتر ہوں کہ تو نے مجھے آگ سے بنایا اور اسے مٹی سے بنایا ہے"۔ سورۃ الأعراف:12)

۷: ابلیس؛ آدم و حوا اور اُن کی اولاد کا دشمن:

صحابہ کرام نے مکی قرآن سے یہ سبق سیکھا تھا کہ ابلیس ان کا اولین دشمن ہے، اس لئے کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے محروم کر دیا اور اس کو لعنت کا مستحق قرار دیا، جس کے نتیجے میں وہ آدم علیہ السلام، ان کی زوجہ اور ان کی تمام ذریت کا دشمن بن گیا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿قَالَ أَرَءَيۡتَكَ هَٰذَا ٱلَّذِي كَرَّمۡتَ عَلَيَّ لَئِنۡ أَخَّرۡتَنِ إِلَىٰ يَوۡمِ ٱلۡقِيَٰمَةِ لَأَحۡتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهُۥٓ إِلَّا قَلِيلٗا﴾ ترجمہ:" پھر وہ بولا: "دیکھ تو سہی، کیا یہ اس قابل تھا کہ تو نے اِسے مجھ پر فضیلت دی؟ اگر تو مجھے قیامت کے دن تک مہلت دے تو میں اس کی پوری نسل کی بیخ کنی کر ڈالوں، بس تھوڑے ہی لوگ مجھ سے بچ سکیں گے"۔(سورہ الاسراء: 62)

ابلیس نے اپنے اس عزم مصمم کا اعلان بھی کر دیا تھا کہ وہ بنی آدم کو گمراہ کر کے رہے گا، اور اس نے اللہ تعالیٰ سے قیامت تک کے لئے اس کی مہلت بھی طلب کی تا کہ وہ اپنے منصوبے کے مطابق کام کر سکے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد سے کس قدر دشمنی اور عداوت رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ ابلیس کی اس بات کو بیان فرماتا ہے: ﴿قَالَ رَبِّ فَأَنظِرۡنِيٓ إِلَىٰ يَوۡمِ يُبۡعَثُونَ ٣٦ قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ ٱلۡمُنظَرِينَ ٣٧ إِلَىٰ يَوۡمِ ٱلۡوَقۡتِ ٱلۡمَعۡلُومِ ٣٨ قَالَ رَبِّ بِمَآ أَغۡوَيۡتَنِي لَأُزَيِّنَنَّ لَهُمۡ فِي ٱلۡأَرۡضِ وَلَأُغۡوِيَنَّهُمۡ أَجۡمَعِينَ ٣٩ إِلَّا عِبَادَكَ مِنۡهُمُ ٱلۡمُخۡلَصِينَ ٤٠﴾ ترجمہ:" کہا: اے میرے رب! تو پھر مجھے قیامت کے دن تک مہلت دے۔ فرمایا: بے شک تجھے مہلت ہے۔ وقتِ معلوم کے دن تک۔ کہا: اے میرے رب! جیسا تو نے مجھے گمراہ کیا ہے البتہ ضرور میں زمین میں انہیں ان کے گناہوں کو مرغوب کر کے دکھاؤں گا اور ان سب کو گمراہ کروں گا، سوائے تیرے ان بندوں کے جو ان میں مخلص ہوں گے"۔(سورۃ الحجر: 40-36)

صحابہ کرامؓ کو منہجِ قرآنی کے ذریعہ یقین کامل ہو گیا تھا کہ انسان اور شیطان کا باہمی تعلق عداوت ودشمنی پر قائم ہے، اور اس میں ردوبدل اور تبدیلی کا کوئی امکان نہیں ہے، اور نہ ہی اس عداوت کو ختم کرنے کے لئے کسی طرح کی مصالحت یا مفاہمت کا امکان ہے، اس لئے کہ شیطان کی زندگی کا اصل مقصد، مشن اور نصب العین ہی یہی ہے کہ انسان کو گمراہ کر کے اس کو اللہ تعالیٰ کی معصیت اور نافرمانی پر آمادہ کیا جائے۔ جیسے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَلَوْلَآ إِذْ جَآءَهُم بَأْسُنَا تَضَرَّعُواْ وَلَٰكِن قَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ ٱلشَّيْطَٰنُ مَا كَانُواْ يَعْمَلُونَ ﴿٤٣﴾﴾ ترجمہ: ”پس جب ہماری طرف سے ان پر سختی آئی تو کیوں نہ انہوں نے عاجزی اختیار کی؟ مگر ان کے دل تو اور سخت ہو گئے اور شیطان نے ان کو اطمینان دلایا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو خوب کر رہے ہو“۔(سورۃ الأنعام: 43)

ہدہد نے سلیمان علیہ السلام سے ملکۂ سبأ کے بارے میں جو کچھ کہا تھا اللہ تعالیٰ نے اس کو یوں بیان فرمایا ہے: ﴿وَجَدتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُونَ لِلشَّمْسِ مِن دُونِ ٱللَّهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ ٱلشَّيْطَٰنُ أَعْمَٰلَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ ٱلسَّبِيلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُونَ ﴿٢٤﴾﴾ ترجمہ: ”میں نے دیکھا ہے کہ وہ اور اس کی قوم اللہ کے بجائے سورج کے آگے سجدہ کرتی ہے، شیطان نے ان کے اعمال ان کے لئے خوشنما بنا دیئے اور انہیں شاہراہ سے روک دیا، اس وجہ سے وہ سیدھا راستہ نہیں پاتے“۔(سورۃ النمل: 24)

اسی تزیین اور گناہوں کو دلکش بنانے کے اسلوب سے شیطان بدعات وخرافات میں مبتلا لوگوں کے لئے بدعات کو مزین کرتا رہتا ہے۔ (دیکھیں: المستفاد من قصص القران 1/51)

اسی لئے صحابہ کرام ابلیس کو اپنا سب سے بڑا دشمن تصور کرتے تھے، اور اللہ تعالیٰ کے اس قول کو وہ ہمیشہ مدنظر رکھتے تھے: ﴿إِنَّ ٱلشَّيْطَٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَٱتَّخِذُوهُ عَدُوًّا ۚ إِنَّمَا يَدْعُواْ حِزْبَهُۥ لِيَكُونُواْ مِنْ أَصْحَٰبِ ٱلسَّعِيرِ﴾ ترجمہ: ”درحقیقت شیطان تمہارا دشمن ہے، اس لئے تم بھی اسے اپنا دشمن ہی سمجھو، وہ تو اپنے پیروؤں کو اپنی راہ پر اس لئے بلا رہا ہے کہ وہ دوزخیوں میں شامل ہو جائیں“۔(سورۂ فاطر: 6)

شیطان سے صحابہ کرام عداوت بھی رکھتے تھے، اس کی کوئی بات نہیں مانتے تھے، اس سے چوکنا رہتے تھے اور دوسرے لوگوں کو بھی اس سے ڈراتے تھے۔

۸: صحابہ کرام کے مابین باہمی گفتگو کا بہترین اسلوب:

شیطان کے ساتھ مقابلہ کرنے کے سلسلہ میں صحابہ کرام جن وسائل کا استعمال کرتے تھے ان میں سے ایک یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان پر عمل پیرا ہوتے تھے: ﴿وَقُل لِّعِبَادِى يَقُولُواْ ٱلَّتِى هِىَ أَحْسَنُ ۚ إِنَّ ٱلشَّيْطَٰنَ يَنزَغُ بَيْنَهُمْ ۚ إِنَّ ٱلشَّيْطَٰنَ كَانَ لِلْإِنسَٰنِ عَدُوًّا مُّبِينًا﴾ ترجمہ: ”اور اے محمدؐ، میرے بندوں سے کہہ دو کہ زبان سے وہ بات نکالا کریں جو بہترین ہو، دراصل یہ شیطان ہے جو انسانوں کے درمیان فساد ڈلوانے کی کوشش کرتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے“۔(سورۃ الاسراء: 53) اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو حکم دیا کہ وہ اہل ایمان کو حکم دیں کہ وہ باہمی گفتگو میں اور آپس میں ایک دوسرے کو پکارنے میں

بہترین کلام اور اچھی باتوں کا استعمال کریں، اس لئے کہ اگر انہوں نے ایسا نہیں کیا تو شیطان ان کے درمیان بگاڑ پیدا کرے گا، ان کو آپسی جھگڑے اور منافرت پر آمادہ کرے گا، وہ تو چاہتا ہے کہ انسانوں کے مابین عداوت برقرار رہے۔

لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنے کے سلسلہ میں صحابہ کرام نے اعلی اخلاق اور بہترین اسلوب کا درس اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے حاصل کیا تھا جس میں فرمان الٰہی ہے: ﴿ٱدۡفَعۡ بِٱلَّتِي هِيَ أَحۡسَنُ ٱلسَّيِّئَةَۚ نَحۡنُ أَعۡلَمُ بِمَا يَصِفُونَ ٩٦ وَقُل رَّبِّ أَعُوذُ بِكَ مِنۡ هَمَزَٰتِ ٱلشَّيَٰطِينِ ٩٧ وَأَعُوذُ بِكَ رَبِّ أَن يَحۡضُرُونِ ٩٨﴾ ترجمہ: "اے نبیؐ، برائی کو اس طریقہ سے دفع کرو جو بہترین ہو، جو کچھ باتیں وہ تم پر بناتے ہیں وہ ہمیں خوب معلوم ہیں۔ اور دعا کرو کہ "پروردگار، میں شیاطین کی اکساہٹوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں، بلکہ اے میرے رب، میں تو اس سے بھی تیری پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس آئیں"۔ (سورۃ المؤمنون: 96-98) یہ بھی ارشاد فرمایا: ﴿وَلَا تَسۡتَوِي ٱلۡحَسَنَةُ وَلَا ٱلسَّيِّئَةُۚ ٱدۡفَعۡ بِٱلَّتِي هِيَ أَحۡسَنُ فَإِذَا ٱلَّذِي بَيۡنَكَ وَبَيۡنَهُۥ عَدَٰوَةٞ كَأَنَّهُۥ وَلِيٌّ حَمِيمٞ ٣٤ وَمَا يُلَقَّىٰهَآ إِلَّا ٱلَّذِينَ صَبَرُواْ وَمَا يُلَقَّىٰهَآ إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٖ ٣٥ وَإِمَّا يَنزَغَنَّكَ مِنَ ٱلشَّيۡطَٰنِ نَزۡغٞ فَٱسۡتَعِذۡ بِٱللَّهِۖ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلسَّمِيعُ ٱلۡعَلِيمُ ٣٦﴾ ترجمہ: "اور اے نبیؐ، نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں، تم بدی کو اُس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو تم دیکھو گے کہ تمہارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا ہے۔ یہ صفت نصیب نہیں ہوتی مگر اُن لوگوں کو جو صبر کرتے ہیں، اور یہ مقام حاصل نہیں ہوتا مگر اُن لوگوں کو جو بڑے نصیبے والے ہیں۔ اور اگر تم شیطان کی طرف سے کوئی اکساہٹ محسوس کرو تو اللہ کی پناہ مانگ لو، وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے"۔ (سورۃ فصلت: 34-36)

برائی کا بدلہ اچھائی سے دینے کا حکم ان انسانوں کے بارے میں ہے جو صبر اور برداشت کرنے کی صفت کے حامل ہیں، اور ان کو دنیاوی اور اخروی سعادت کا حصہ وافر ملا ہوا ہو۔ اور جہاں تک تعلق ہے شیطان کا تو حکم خداوندی ہے کہ اس کے مقابلہ میں اللہ کی پناہ میں آنا ضروری ہے، اور اس کی برائی کا بدلہ اچھائی سے دینے کا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا، اس کی خاطر مدارات کا کوئی فائدہ حاصل ہونے والا نہیں ہے، اس لئے کہ اس کے نزدیک اس کے ساتھ اچھائی صرف یہ تصور کی جائے گی کہ آپ اللہ کی نافرمانی کرنے کے سلسلہ میں اس کی اطاعت کریں، اس کے علاوہ وہ اور کسی بھی چیز پر راضی نہیں ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس انسانوں میں سے کوئی دشمن ہو تو اس کے ساتھ جب آپ حسن سلوک کریں گے تو وہ راضی ہو سکتا ہے، اسی لئے شریعت نے ہمیں حکم دیا ہے کہ انسانوں میں سے جب کوئی آپ کے ساتھ برا سلوک کرے تو آپ اس کے ساتھ حسنِ سلوک کریں، شیطان کے مقابلہ میں صرف اللہ کی پناہ اور اس کے شر سے نجات ہی مفید ہو سکتی ہے۔ (دیکھیں: تفسیر ابن کثیر 4/100 -101)

قرآنِ کریم کے منہج نے انسان اور شیطان کے باہمی تعلق کو بالکل واضح کر دیا اور اس کے علاج کے بھی تمام وسائل بیان کر دیئے، اسی طرح انسانوں کو اغوا کرنے کے تمام شیطانی وسائل کو بھی بیان کر دیا، قرآن کریم شیطان کے اس منظر کا بھی ذکر کرتا ہے جب کہ وہ جہنم میں ہوگا اور وہ انسانوں کو گمراہ کرنے سے اعلان براءت کر رہا ہوگا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَبَرَزُواْ لِلَّهِ جَمِيعٗا فَقَالَ ٱلضُّعَفَٰٓؤُاْ لِلَّذِينَ

ٱسۡتَكۡبَرُوٓاْ إِنَّا كُنَّا لَكُمۡ تَبَعٗا فَهَلۡ أَنتُم مُّغۡنُونَ عَنَّا مِنۡ عَذَابِ ٱللَّهِ مِن شَيۡءٖۚ قَالُواْ لَوۡ هَدَىٰنَا ٱللَّهُ لَهَدَيۡنَٰكُمۡۖ سَوَآءٌ عَلَيۡنَآ أَجَزِعۡنَآ أَمۡ صَبَرۡنَا مَا لَنَا مِن مَّحِيصٖ ﴿٢١﴾ وَقَالَ ٱلشَّيۡطَٰنُ لَمَّا قُضِيَ ٱلۡأَمۡرُ إِنَّ ٱللَّهَ وَعَدَكُمۡ وَعۡدَ ٱلۡحَقِّ وَوَعَدتُّكُمۡ فَأَخۡلَفۡتُكُمۡۖ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيۡكُم مِّن سُلۡطَٰنٍ إِلَّآ أَن دَعَوۡتُكُمۡ فَٱسۡتَجَبۡتُمۡ لِيۖ فَلَا تَلُومُونِي وَلُومُوٓاْ أَنفُسَكُمۖ مَّآ أَنَا۠ بِمُصۡرِخِكُمۡ وَمَآ أَنتُم بِمُصۡرِخِيَّ إِنِّي كَفَرۡتُ بِمَآ أَشۡرَكۡتُمُونِ مِن قَبۡلُۗ إِنَّ ٱلظَّٰلِمِينَ لَهُمۡ عَذَابٌ أَلِيمٞ ﴿٢٢﴾﴾ ترجمہ:"اور یہ لوگ جب اکٹھے اللہ کے سامنے بے نقاب ہوں گے تو اُس وقت اِن میں سے جو دنیا میں کمزور تھے وہ اُن لوگوں سے جو بڑے بنے ہوئے تھے، کہیں گے: دنیا میں ہم تمہارے تابع تھے، اب کیا تم اللہ کے عذاب سے ہم کو بچانے کے لئے بھی کچھ کر سکتے ہو؟! وہ جواب دیں گے: اگر اللہ نے ہمیں نجات کی کوئی راہ دکھائی ہوتی تو ہم ضرور تمہیں بھی دکھا دیتے، اب تو یکساں ہے، خواہ ہم جزع فزع کریں یا صبر، بہر حال ہمارے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔اور جب فیصلہ چکا دیا جائے گا تو شیطان کہے گا :"حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے جو وعدے تم سے کیے تھے وہ سب سچے تھے اور میں نے جتنے وعدے کیے ان میں سے کوئی بھی پورا نہ کیا، میرا تم پر کوئی زور تو تھا نہیں، میں نے اِس کے سوا کچھ نہیں کیا کہ اپنے راستے کی طرف تمہیں دعوت دی اور تم نے میری دعوت پر لبیک کہا، اب مجھے ملامت نہ کرو، اپنے آپ ہی کو ملامت کرو، یہاں نہ میں تمہاری فریاد رسی کر سکتا ہوں اور نہ تم میری، اس سے پہلے جو تم نے مجھے خدائی میں شریک بنا رکھا تھا میں اس سے بریٔ الذمہ ہوں، ایسے ظالموں کے لئے دردناک سزا یقینی ہے"۔(سورۃ ابراہیم: 21-22)

یہ ابلیس کی حقیقت کی منظر کشی اور اس ملعون دشمن کے بارے میں صحابہ کرام کے تصور کا ایک مختصر خاکہ تھا۔

۹: کائنات، زندگی اور بعض مخلوقات کے بارے میں صحابہ کرام کا نقطہ نظر:

اللہ کے رسول ﷺ صحابہ کرام کو کتاب اللہ کی تعلیم دیتے رہے، اور عقائد کے بارے میں صحیح تصور اور کائنات اور زندگی کے بارے میں درست نقطۂ نظر کی تربیت قرآنی آیات کے ذریعہ فرماتے رہے، چنانچہ آپ ﷺ نے ان کے سامنے اس کائنات کے نقطہ آغاز اور اس کے انجام کو قرآنی تناظر میں بیان فرمایا، جیسے کی ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَبَرَزُواْ لِلَّهِ جَمِيعٗا فَقَالَ ٱلضُّعَفَٰٓؤُاْ لِلَّذِينَ ٱسۡتَكۡبَرُوٓاْ إِنَّا كُنَّا لَكُمۡ تَبَعٗا فَهَلۡ أَنتُم مُّغۡنُونَ عَنَّا مِنۡ عَذَابِ ٱللَّهِ مِن شَيۡءٖۚ قَالُواْ لَوۡ هَدَىٰنَا ٱللَّهُ لَهَدَيۡنَٰكُمۡۖ سَوَآءٌ عَلَيۡنَآ أَجَزِعۡنَآ أَمۡ صَبَرۡنَا مَا لَنَا مِن مَّحِيصٖ ﴿٢١﴾ وَقَالَ ٱلشَّيۡطَٰنُ لَمَّا قُضِيَ ٱلۡأَمۡرُ إِنَّ ٱللَّهَ وَعَدَكُمۡ وَعۡدَ ٱلۡحَقِّ وَوَعَدتُّكُمۡ فَأَخۡلَفۡتُكُمۡۖ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيۡكُم مِّن سُلۡطَٰنٍ إِلَّآ أَن دَعَوۡتُكُمۡ فَٱسۡتَجَبۡتُمۡ لِيۖ فَلَا تَلُومُونِي وَلُومُوٓاْ أَنفُسَكُمۖ مَّآ أَنَا۠ بِمُصۡرِخِكُمۡ وَمَآ أَنتُم بِمُصۡرِخِيَّ إِنِّي كَفَرۡتُ بِمَآ أَشۡرَكۡتُمُونِ مِن قَبۡلُۗ إِنَّ ٱلظَّٰلِمِينَ لَهُمۡ عَذَابٌ أَلِيمٞ ﴿٢٢﴾﴾ ترجمہ:"اے نبیؐ! اِن سے کہو، کیا تم اُس خدا سے کفر کرتے ہو اور دوسروں کو اُس کا ہمسر ٹھہراتے ہو جس نے زمین کو دو دنوں میں بنا دیا؟ وہی تو سارے جہان والوں کا رب ہے۔ اُس نے (زمین کو وجود میں لانے کے بعد) اوپر سے اس پر پہاڑ جما دیئے اور اس میں برکتیں رکھ دیں اور اس کے اندر سب مانگنے والوں کے لئے ہر ایک کی طلب و حاجت کے مطابق ٹھیک اندازے سے خوراک کا سامان

مہیا کر دیا، یہ سب کام چار دن میں ہو گئے۔ پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جو اُس وقت محض دھواں تھا، اُس نے آسمان اور زمین سے کہا "وجود میں آجاؤ، خواہ تم چاہو یا نہ چاہو" دونوں نے کہا "ہم آگئے فرمانبرداروں کی طرح"۔ تب اُس نے دو دن کے اندر سات آسمان بنا دیئے، اور ہر آسمان میں اُس کا قانون وحی کر دیا اور آسمانِ دنیا کو ہم نے چراغوں سے آراستہ کیا اور اسے خوب محفوظ کر دیا، یہ سب کچھ ایک زبردست علیم ہستی کا منصوبہ ہے"۔(سورۃ فصلت:12-9)

مذکورہ آیات میں تین کائناتی حقائق کی جانب اشارہ کیا گیا ہے:

۱: زمین کی تخلیق اور اس میں غذائی ذخیروں کی تعیین چار ایام میں کی گئی، اس کے بعد آسمانوں کی طرف توجہ کی گئی جو کہ محض دھواں تھا۔

۲: مادی کائنات کا اصل مادہ گیس اور دھواں ہے۔

۳: زمین و آسمان کا تکوینی دورانیہ چھ ایام پر مشتمل ہے۔(المستفاد من قصص القرآن 1/86)

قرآنِ کریم نے ایک اہم حقیقت بیان کی ہے وہ یہ کہ کائنات جب ستاروں، سیاروں اور کہکشاؤں کے مختلف مجموعوں میں تقسیم نہیں ہوئی تھی اس سے پہلے ان کے مواد کی اصل حالت کا تعین کرنا کسی کے لئے ممکن نہیں ہے، اور لوگ اس کے بارے میں صرف اندازہ ہی لگا سکتے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿مَّآ أَشۡهَدتُّهُمۡ خَلۡقَ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضِ وَلَا خَلۡقَ أَنفُسِهِمۡ وَمَا كُنتُ مُتَّخِذَ ٱلۡمُضِلِّينَ عَضُدٗا﴾ ترجمہ: "میں نے آسمان وزمین پیدا کرتے وقت اُن کو نہیں بلایا تھا اور نہ خود اُن کی اپنی تخلیق میں انہیں شریک کیا تھا، میرا یہ کام نہیں ہے کہ گمراہ کرنے والوں کو اپنا مددگار بنایا کروں"۔(سورۃ الکھف:51)

لیکن قرآنِ کریم نے اس اصل مادہ کی حقیقت کی جانب اشارہ کیا ہے اور کائناتی حقائق کو انتہائی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿أَوَلَمۡ يَرَ ٱلَّذِينَ كَفَرُوٓاْ أَنَّ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضَ كَانَتَا رَتۡقٗا فَفَتَقۡنَٰهُمَاۖ وَجَعَلۡنَا مِنَ ٱلۡمَآءِ كُلَّ شَيۡءٍ حَيٍّۚ أَفَلَا يُؤۡمِنُونَ﴾ ترجمہ: "کیا وہ لوگ جنہوں نے (نبیؐ کی بات ماننے سے) انکار کر دیا ہے غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے اِنہیں جدا کیا، اور پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی، کیا وہ (ہماری اس خلاقی کو) نہیں مانتے؟"۔(سورۃ الأنبیاء:30)

صحابہ کرام نے ان آیات سے یہ سمجھا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو پیدا کیا، اس میں برکت کا نزول کیا اور غذائی ذخیروں کو اس میں متعین کیا، اور یہ سب کچھ چار دنوں میں کیا، اور یہ سب کچھ آسمان کی تشکیل اور اس کو سات آسمانوں میں تقسیم کرنے سے پہلے کا مرحلہ ہے، زمین و آسمان کے خالق کی جانب سے کی جانے والی وحی کے ذریعہ صحابہ کرام اس اہم حقیقت تک پہنچے۔(مباحث فی اعجاز القرآن، مصطفیٰ مسلم، ص177)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں: "اللہ تعالیٰ نے دو(۲) دنوں میں زمین پیدا کی، اس کے بعد آسمان کی تخلیق کی، اور پھر آسمانوں کو دو مزید دنوں میں پیدا کیا، اس کے بعد زمین کو ہموار کیا، اور اس کا ہموار کرنا یہ ہے کہ اس سے پانی اور چارہ نکالا، اور پہاڑ، ریت، جمادات ٹیلے اور آسمان وزمین کے درمیان کی چیزیں بنائیں۔ اور زمین اور اس کی تمام چیزوں کو دو دنوں میں پیدا کیا گیا اور آسمانوں کی تخلیق دو دنوں میں کی گئی"۔(صحیح بُخاری تعلیقا 8/714)

قرآن کریم نے صحابہ کرام کے لئے اپنی عظیم آیات کے ذریعہ واضح کر دیا کہ اللہ ہی کی ذات ہے جس نے آسمانوں کو پیدا کیا اور زمین کو پیدا کرنے کے بعد اس میں مضبوط و مستحکم پہاڑ نصب کیے۔ قرآن کریم نے کائناتی حقائق، سورج، چاند اور ستاروں کے بارے میں گفتگو کی ہے اور پہاڑوں کے بارے میں تفصیلات بیان کی ہے اور ان کے فوائد بیان کیے ہیں۔ مختلف مثالوں کے ذریعہ ہر چیز کی توضیح کی ہے، اور ان میں غور وفکر کرنے کی دعوت دی ہے، اور بتادیا ہے کہ اللہ تعالیٰ عنقریب ان پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر دے گا، اسی طرح قرآن کریم نے سمندروں کے بارے میں، ان میں موجود کشتیوں اور جہازوں کے بارے میں اور رزق رسانی کے ذرائع کے بارے میں بھی گفتگو کی ہے، فضائی حقائق جیسے کہ ہواؤں، بادلوں، بارش، بجلی اور گرج کے بارے میں بھی مختلف مقامات پر روشنی ڈالی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ٱللَّهُ ٱلَّذِي يُرۡسِلُ ٱلرِّيَٰحَ فَتُثِيرُ سَحَابٗا فَيَبۡسُطُهُۥ فِي ٱلسَّمَآءِ كَيۡفَ يَشَآءُ وَيَجۡعَلُهُۥ كِسَفٗا فَتَرَى ٱلۡوَدۡقَ يَخۡرُجُ مِنۡ خِلَٰلِهِۦۖ فَإِذَآ أَصَابَ بِهِۦ مَن يَشَآءُ مِنۡ عِبَادِهِۦٓ إِذَا هُمۡ يَسۡتَبۡشِرُونَ﴾ ترجمہ: ''اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے اور وہ بادل اٹھاتی ہیں، پھر وہ اِن بادلوں کو آسمان میں پھیلا دیتا ہے جس طرح چاہتا ہے، اور انہیں ٹکڑیوں میں تقسیم کرتا ہے، پھر تُو دیکھتا ہے کہ بارش کے قطرے بادل سے ٹپکے چلے آتے ہیں، یہ بارش جب وہ اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے برساتا ہے تو وہ خوشخبری حاصل کرتے ہیں''۔ (سورۂ روم: 48)
دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿وَأَرۡسَلۡنَا ٱلرِّيَٰحَ لَوَٰقِحَ فَأَنزَلۡنَا مِنَ ٱلسَّمَآءِ مَآءٗ فَأَسۡقَيۡنَٰكُمُوهُ وَمَآ أَنتُمۡ لَهُۥ بِخَٰزِنِينَ﴾ ترجمہ: ''بار آور ہواؤں کو ہم ہی بھیجتے ہیں، پھر آسمان سے پانی برساتے ہیں، اور اُس پانی سے تمہیں سیر اب کرتے ہیں، اِس دولت کے خزانہ دار تم نہیں ہو''۔ (سورۃ الحجر: 22)

قرآن کریم نے حیوانات کے بارے میں بھی مختلف حقائق بیان کئے ہیں جو اہمیت اور باریک بینی کے اعتبار سے کائناتی اور انسانی زندگی کے حقائق سے کسی بھی اعتبار سے کم تر نہیں ہیں، قرآن کریم جانوروں سے حاصل ہونے والے منافع کی جانب بھی متوجہ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جانوروں کو سواری کے لئے، مال برداری کے لئے، کھانے اور پینے کے لئے، لباس کے لئے اور زیب وزینت کے لئے انسان کے لئے مسخر کر رکھا ہے، وہ انسان کے سامنے سراپا اطاعت بن جاتے ہیں، بعثت سے پہلے انسان کائنات کے بارے میں، زندگی اور سورج، چاند، ستاروں جیسی مخلوقات کے بارے میں غیر واضح اور متضاد نظریات و تصورات رکھتا تھا، اور ان مخلوقات کے بارے میں اللہ کے نظام کو سمجھنے سے وہ قاصر تھا، وہ اس قسم کے تصور سے عاری تھے کہ یہ مخلوقات اللہ کی حمد و تسبیح کرتی ہیں، اور ان کی تخلیق میں بہت سی حکمتیں مضمر ہیں، اس لئے قرآن کریم نے اس کائنات میں اور اس میں موجود مخلوقات میں غور وفکر اور تدبر اور تفکر کرنے کا حکم دیا اور اس بات کو واضح کر دیا کہ اللہ کی عظیم مخلوقات اس کی حمد و تسبیح بیان کرتی ہیں، لیکن آپ ان کی تسبیح کو سمجھنے سے قاصر ہو، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿تُسَبِّحُ لَهُ ٱلسَّمَٰوَٰتُ ٱلسَّبۡعُ وَٱلۡأَرۡضُ وَمَن فِيهِنَّۚ وَإِن مِّن شَيۡءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمۡدِهِۦ وَلَٰكِن لَّا تَفۡقَهُونَ تَسۡبِيحَهُمۡۚ إِنَّهُۥ كَانَ حَلِيمًا غَفُورٗا﴾ ترجمہ: ''اُس کی پاکی تو ساتوں آسمان اور زمین اور وہ ساری چیزیں بیان کر رہی ہیں جو آسمان وزمین میں ہیں کوئی چیز ایسی نہیں جو اس

کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کر رہی ہو، مگر تم ان کی تسبیح سمجھتے نہیں ہو، حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا ہی بردبار اور در گزر کرنے والا ہے"۔(سورۃ الاسراء:44)

قرآن کریم نے اس بات کو بھی واضح کیا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے حیوانات کو کس طرح مسخر اور مطیع وفرماں بردار بنایا ہے اور اس اہم نعمت پر انسان کو اپنے منعم کا شکر گزار ہونا چاہئے جس نے جانوروں کے اندر یہ صفات ودیعت کی ہیں، اگر جانوروں میں یہ صفات نہ ہوتیں تو پھر انسان جانوروں سے استفادہ نہ کر پاتا، اِرشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا خَلَقْنَا لَهُم مِّمَّا عَمِلَتْ أَيْدِينَا أَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مَالِكُونَ ﴿٧١﴾ وَذَلَّلْنَاهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوبُهُمْ وَمِنْهَا يَأْكُلُونَ ﴿٧٢﴾ وَلَهُمْ فِيهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ ۖ أَفَلَا يَشْكُرُونَ ﴿٧٣﴾﴾ ترجمہ: "کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں ہیں کہ ہم نے اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیزوں میں سے اِن کے لئے مویشی پیدا کیے اور اب یہ ان کے مالک ہیں۔ ہم نے اُنہیں اس طرح اِن کے بس میں کر دیا ہے کہ اُن میں سے کسی پر یہ سوار ہوتے ہیں، کسی کا یہ گوشت کھاتے ہیں۔ اور اُن کے اندر اِن کے لئے طرح طرح کے فوائد اور مشروبات ہیں ، پھر کیا یہ شکر گزار نہیں ہوتے؟!"۔(سورۂ یٰسین: 71-73) (دیکھیں: مباحث فی اعجاز القرآن مصطفیٰ مسلم، ص177- 179)

قرآن کریم نے حیوانات کے رزق کے نظام کی جانب بھی توجہ دلائی ہے اور بیان کیا ہے کہ انسان عقل وفکر رکھتا ہے، منصوبہ بندی کرتا ہے، اور اپنے معاش کے حصول کے لئے کوشش کرتا ہے، اور اگر اس کو کسی بھی طریقے سے رزق حاصل ہو جاتا ہے تو وہ اس کو مستقبل کے لئے جمع کرنے اور ذخیرہ اندوزی کرنے کی کوشش میں لگ جاتا ہے، لیکن جہاں تک حیوان کا تعلق ہے تو اس کے پاس اس طرح سوچنے اور منصوبہ بندی کرنے کی صلاحیت نہیں ہے اور نہ ہی اس کی طبیعت وفطرت میں یہ چیز داخل ہے، لیکن حکیم وخبیر ذات نے خود ہی ان کے رزق رسانی کی ذمہ داری بھی لی ہے، اور ان کے لئے اس کو محفوظ اور باقی رکھنے کے طریقے بھی فراہم کیے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَكَأَيِّن مِّن دَابَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اللَّهُ يَرْزُقُهَا وَإِيَّاكُمْ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾ ترجمہ: "کتنے ہی جانور ہیں جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے، اللہ اُن کو رزق دیتا ہے اور تمہارا رازق بھی وہی ہے، وہ سب کچھ سُنتا اور جانتا ہے"۔(سورۃ العنکبوت:60)

الوہیت کی یہی شان ہے، الوہیت کے بنیادی صفات یہ ہیں کہ صحیح علم بھی ہو، قدرت بھی ہو اور تمام حالات میں رزق فراہم کرنے کی ذمہ داری بھی ادا کی جائے، چنانچہ حیوانات کو ہر جگہ رزق ملتا ہے، سمندر کی تہوں میں، جزیروں میں، تپتے صحراؤں میں، منجمد علاقوں میں، چٹانوں کے نیچے اور فضائے بسیط میں، یہ سب رب ذوالجلال کی کتاب میں درج ہے، جو نہ بھولتا ہے، اور نہ چوکتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَا مِن دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۚ كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ﴾ ترجمہ: "زمین میں چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو اور جس کے متعلق وہ نہ جانتا ہو کہ کہاں وہ رہتا ہے اور کہاں وہ سونپا جاتا ہے، سب کچھ ایک صاف دفتر میں درج ہے"۔(سورۂ ھود:6)

قرآن کریم نے مختلف اشکال و حجم اور الگ الگ طریقوں سے چلنے والے اور حرکت کرنے والے جانوروں اور حشرات الارض کی جانب متوجہ کیاہے کہ یہ تمام مخلوقات انسانوں کی طرح امت اور اقسام ہیں، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي ٱلۡأَرۡضِ وَلَا طَٰٓئِرٖ يَطِيرُ بِجَنَاحَيۡهِ إِلَّآ أُمَمٌ أَمۡثَالُكُمۚ مَّا فَرَّطۡنَا فِي ٱلۡكِتَٰبِ مِن شَيۡءٖۚ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمۡ يُحۡشَرُونَ﴾ ترجمہ:"زمین میں چلنے والے کسی جانور اور ہوا میں پروں سے اڑنے والے کسی پرندے کو دیکھ لو، یہ سب تمہاری ہی طرح کی انواع ہیں، ہم نے ان کی تقدیر کے نوشتے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے، پھر یہ سب اپنے رب کی طرف سمیٹے جاتے ہیں"۔(سورۃ الانعام:38) (دیکھیں: مباحث فی اعجاز القرآن، ص214)

اسی طرز واسلوب کے مطابق قرآن کریم صحابہ کرام کے اندر کائنات کے بارے میں، اس میں موجود مختلف مخلوقات کے بارے میں اور اس فانی زندگی کی حقیقت کے بارے میں واضح افکار اور تصورات مرتب انداز میں پیدا کرتا رہا، اور نبی کریم ﷺ بھی اس کائنات اور انسان کے انجام کی حقیقت اور نجات اور کامیابی کے راستے کو مسلسل واضح کرتے رہے، آپ ﷺ کو اس بات کا یقین تھا کہ جو بھی اپنے انجام سے واقف ہوگا اور نجات اور کامیابی کے راستے سے آگاہ ہو جائے گا وہ ضرور اس راستے پر چلنے کے لئے ہر قسم کے وسائل اور صلاحیتوں کو بروئے کارلائے گا، تاکہ کل وہ نجات اور کامیابی سے ہمکنار ہو سکے، نبی کریم ﷺ نے اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل پہلوؤں پر توجہ مرکوز کی:

- یہ دنیا کی زندگی چاہے کتنی ہی طویل ہو جائے اس کا ایک دن خاتمہ یقینی ہے، اور اس کا مال ومتاع چاہے کتنا ہی زیادہ ہو تو وہ حقیر اور کم ہے، اللہ تعالی نے اس حقیقت کو یوں بیان فرمایا ہے: ﴿إِنَّمَا مَثَلُ ٱلۡحَيَوٰةِ ٱلدُّنۡيَا كَمَآءٍ أَنزَلۡنَٰهُ مِنَ ٱلسَّمَآءِ فَٱخۡتَلَطَ بِهِۦ نَبَاتُ ٱلۡأَرۡضِ مِمَّا يَأۡكُلُ ٱلنَّاسُ وَٱلۡأَنۡعَٰمُ حَتَّىٰٓ إِذَآ أَخَذَتِ ٱلۡأَرۡضُ زُخۡرُفَهَا وَٱزَّيَّنَتۡ وَظَنَّ أَهۡلُهَآ أَنَّهُمۡ قَٰدِرُونَ عَلَيۡهَآ أَتَىٰهَآ أَمۡرُنَا لَيۡلًا أَوۡ نَهَارٗا فَجَعَلۡنَٰهَا حَصِيدٗا كَأَن لَّمۡ تَغۡنَ بِٱلۡأَمۡسِۚ كَذَٰلِكَ نُفَصِّلُ ٱلۡأٓيَٰتِ لِقَوۡمٖ يَتَفَكَّرُونَ﴾ ترجمہ:"دنیا کی یہ زندگی (جس کے نشے میں مست ہو کر تم ہماری نشانیوں سے غفلت برت رہے ہو) اس کی مثال ایسی ہے جیسے آسمان سے ہم نے پانی برسایا تو زمین کی پیداوار، جسے آدمی اور جانور سب کھاتے ہیں، خوب گھنی ہو گئی، پھر عین اُس وقت جبکہ زمین اپنی بہار پر تھی اور کھیتیاں بنی سنوری کھڑی تھیں اور ان کے مالک یہ سمجھ رہے تھے کہ اب ہم ان سے فائدہ اُٹھانے پر قادر ہیں، یکایک رات کو یا دن کو ہمارا حکم آ گیا اور ہم نے اسے ایسا غارت کر کے رکھ دیا کہ گویا کل وہاں کچھ تھا ہی نہیں، اس طرح ہم نشانیاں کھول کھول کر پیش کرتے ہیں اُن لوگوں کے لئے جو سوچنے سمجھنے والے ہیں"۔(سورۂ یونس:24)

مذکورہ آیت کریمہ میں الفاظ اور جملوں کی ترتیب کچھ اس طرح سے ہے کہ اگر اس میں سے کوئی لفظ بھی حذف کر دیا جائے تو تشبیہ متاثر ہو جائے گی، اس لئے کہ مقصود یہ ہے کہ دنیا کے جلد اختتام، اس کی نعمتوں کے زوال اور لوگوں کے اس سے دھوکہ کھانے کی حالت کو اس پانی کے ساتھ تشبیہ دی جائے جو آسمان سے نازل ہوا، اس کے ذریعہ مختلف قسم کی نباتات اگ آئیں اور روئے زمین کو اس دلہن کی طرح مزین کر دیا جس نے قیمتی خوبصورت کپڑے زیب تن کیے ہوں، لیکن جیسے ہی اس زمین کے مالکوں کو امید کی کرن نظر آئی اور وہ یہ سوچ رہے تھے

کہ وہ اب ہر قسم کی آفتوں سے محفوظ ہے، تو اچانک اللہ کی طرف سے آفت آجاتی ہے اور اس کی حالت ایسی ہو جاتی ہے گویا کہ وہاں کچھ موجود ہی نہیں تھا۔ (دیکھیں: مباحث فی اعجاز القرآن، ص216)

اللہ کے رسول ﷺ نے انہیں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے بارے میں بھی آگاہ کر دیا جس میں فرمایا گیا ہے: ﴿وَٱضْرِبْ لَهُم مَّثَلَ ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا كَمَآءٍ أَنزَلْنَٰهُ مِنَ ٱلسَّمَآءِ فَٱخْتَلَطَ بِهِۦ نَبَاتُ ٱلْأَرْضِ فَأَصْبَحَ هَشِيمًا تَذْرُوهُ ٱلرِّيَٰحُ ۗ وَكَانَ ٱللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ مُّقْتَدِرًا﴾ ترجمہ: ''اور اے نبیؐ! انہیں حیات دنیا کی حقیقت اِس مثال سے سمجھاؤ کہ آج ہم نے آسمان سے پانی برسا دیا تو زمین کی پَود خوب گھنی ہو گئی، اور کل وہی نباتات بُھس بن کر رہ گئی، جسے ہوائیں اڑائے لئے پھرتی ہیں، اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے''۔ (سورۃ الکہف:45)

ایک دوسرے مقام پر دنیاوی زندگی کی پوری منظر کشی کی گئی ہے: ﴿ٱعْلَمُوٓا۟ أَنَّمَا ٱلْحَيَوٰةُ ٱلدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهْوٌ وَزِينَةٌ وَتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِى ٱلْأَمْوَٰلِ وَٱلْأَوْلَٰدِ ۖ كَمَثَلِ غَيْثٍ أَعْجَبَ ٱلْكُفَّارَ نَبَاتُهُۥ ثُمَّ يَهِيجُ فَتَرَىٰهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُونُ حُطَٰمًا ۖ وَفِى ٱلْءَاخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَمَغْفِرَةٌ مِّنَ ٱللَّهِ وَرِضْوَٰنٌ ۚ وَمَا ٱلْحَيَوٰةُ ٱلدُّنْيَآ إِلَّا مَتَٰعُ ٱلْغُرُورِ﴾ ترجمہ: ''خوب جان لو کہ یہ دنیا کی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک کھیل اور دل لگی اور ظاہری ٹیپ ٹاپ اور تمہارا آپس میں ایک دوسرے پر فخر جتانا اور مال و اولاد میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بارش ہو گئی، تو اس سے پیدا ہونے والی نباتات کو دیکھ کر کاشت کار خوش ہو گئے پھر وہی کھیتی پک جاتی ہے اور تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد ہو گئی پھر وہ بھس بن کر رہ جاتی ہے، اِس کے برعکس آخرت وہ جگہ ہے جہاں سخت عذاب ہے اور اللہ کی مغفرت اور اس کی خوشنودی ہے، دنیا کی زندگی ایک دھوکے کی ٹٹی کے سوا کچھ نہیں''۔ (سورۃ الحدید:20)

ان آیات کریمہ میں جو حقیقت بیان کی گئی ہے دنیا کے تمام مال و متاع، زیب و زینت اور تمام نعمتوں کی اصل حقیقت یہی ہے اور آخرت کے مقابلہ میں ان کی حیثیت بالکل معمولی اور حقیر ہے اور یہ سب ناپائدار اور ختم ہونے والی چیزیں ہیں، صحابہ کرام نے دنیا کی اس حقیقت کو اسی تصور کے ساتھ سمجھ لیا تھا، اللہ کے رسول ﷺ ان کی رہنمائی فرماتے تھے، ان کے کردار اور ذمہ داری کو یاد دلاتے تھے، اور اس روئے زمین پر ان کے پاس موجود پیغامِ حق کے بارے میں اور اللہ کے نزدیک ان کے مقام و مرتبہ کے بارے میں آگاہ کرتے تھے، اللہ کے رسول ﷺ مسلسل ان کی تذکیر و رہنمائی فرماتے رہے یہاں تک کہ ان کے ذہن و دماغ میں یہ بات راسخ ہو گئی کہ اللہ کے پاس ان کے لئے کیا کیا انعامات اور مقام و مرتبہ ہے، اور روئے زمین پر ان کا کام اور ذمہ داری کیا ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ کی بہترین تربیت کے نتیجے میں صحابہ کرام کے اندر عزم و حوصلہ اور جذبہ پیدا ہو گیا تو وہ رات دن اپنی استطاعت اور طاقت کے بقدر بغیر کسی پس و پیش کے جدوجہد کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے، نہ انہوں نے کسی کمزوری اور طاقت کا مظاہرہ کیا، نہ اللہ کے سوا کسی سے خائف ہوئے، نہ کسی چیز کا لالچ و طمع ان کو اپنی طرف مائل کر سکا، وہ صرف اور صرف اس پیغامِ حق کام کو عام کرنے، عملی زندگی

میں اتارنے کے لئے اپنی ذمہ داری ادا کرتے رہے تاکہ دنیا میں بھی کامیاب ہو سکیں اور آخرت میں بھی نجات اور فوز و فلاح سے ہمکنار ہو سکیں۔(دیکھیں: تفسیر القاسمی:11/49)

بلاشبہ دعوتی میدان میں بہت سے کام کرنے والوں کے ذہن و دماغ سے یہ حقیقت پوشیدہ ہو جاتی ہے، اس لئے کہ وہ اس دنیاوی زندگی اور اس کے مال و متاع میں منہمک ہو جاتے ہیں، اور ان کو دنیا کی محبت اپنے جال میں گرفتار کر لیتی ہے جس کے نتیجہ میں وہ دنیا ہی کے لئے خون پسینہ بہاتے ہیں اور اسی کے حصول کو اپنا مطمح نظر بنا لیتے ہیں، جب ان کو دنیا کی کوئی چیز حاصل ہو جاتی ہے تو مزید کے حصول کے لئے تگ و دو کرنے لگتے ہیں، نہ وہ شکم سیر ہوتے ہیں، اور نہ ہی وہ قناعت کرتے ہیں، اس لئے کہ دنیا ہی ان کے لئے سب کچھ بن چکی ہوتی ہے، یہ دعوت اور امت کے عروج و ترقی کی راہ میں ایک عظیم المیہ ہے، البتہ جہاں تک تعلق اس بات کا ہے کہ بقدر ضرورت اور شرعی حدود میں رہتے ہوئے اس دنیا سے لطف اندوز ہونا چاہیے اور آخرت تک پہنچنے کا اس کو ایک ذریعہ سمجھا جائے تو یہ ایک اچھی بات اور امرِ محمود ہے۔

....

چوتھا باب
عہدِ مکی میں عبادت و اخلاق کی تعمیر

ا: مختلف عبادات کے ذریعہ صحابہ کرام کا تزکیہ:

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلرُّوحِ ۖ قُلِ ٱلرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّى وَمَآ أُوتِيتُم مِّنَ ٱلْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا﴾ ترجمہ: "یہ لوگ تم سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں، کہو: یہ روح میرے رب کے حکم سے آتی ہے، مگر تم لوگوں نے علم سے کم ہی بہرہ پایا ہے"۔(سورۃ الاسراء: 85) دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿فَإِذَا سَوَّيْتُهُۥ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِى فَقَعُوا۟ لَهُۥ سَـٰجِدِينَ﴾ ترجمہ: "پھر جب میں اسے پوری طرح بنادوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدے میں گر جاؤ"۔ (سورۃ ص: 72)ایک اور مقام پر ہے: ﴿ثُمَّ سَوَّىٰهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِن رُّوحِهِۦ ۖ وَجَعَلَ لَكُمُ ٱلسَّمْعَ وَٱلْأَبْصَـٰرَ وَٱلْأَفْـِٔدَةَ ۚ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ﴾ ترجمہ: "پھر اس کو نِک سُک سے درست کیا اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دی، اور تم کو کان دیئے، آنکھیں دیں اور دِل دیئے، تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو"۔(سورۂ سجدہ: 9)

اللہ کے رسول ﷺ نے صحابہ کرام کی تربیت ان کی روح کا تزکیہ کرتے ہوئے فرمائی تھی، اور آپ ﷺ ایسے طریقہ کی جانب قرآن کی روشنی میں ان کی رہنمائی فرماتے تھے جس کو اختیار کر کے اس مقصد کا حصول ممکن ہو، اس کے لئے اللہ کے رسول ﷺ مندرجہ ذیل پہلوؤں کی جانب متوجہ فرماتے تھے:

1)اللہ کی کائنات اور اس کی مخلوقات میں اور اللہ تعالیٰ کی کتاب میں غور و فکر اور تدبر، تاکہ ان کو خالق کی عظمت اور اس کی حکمتوں کا احساس ہو، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ رَبَّكُمُ ٱللَّهُ ٱلَّذِى خَلَقَ ٱلسَّمَـٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضَ فِى سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ ٱسْتَوَىٰ عَلَى ٱلْعَرْشِ ۖ يُغْشِى ٱلَّيْلَ ٱلنَّهَارَ يَطْلُبُهُۥ حَثِيثًا وَٱلشَّمْسَ وَٱلْقَمَرَ وَٱلنُّجُومَ مُسَخَّرَٰتٍۭ بِأَمْرِهِۦٓ ۗ أَلَا لَهُ ٱلْخَلْقُ وَٱلْأَمْرُ ۗ تَبَارَكَ ٱللَّهُ رَبُّ ٱلْعَـٰلَمِينَ﴾ ترجمہ: "درحقیقت تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر اپنے تختِ سلطنت پر جلوہ فرما ہوا جو رات کو دن پر ڈھانک دیتا ہے اور پھر دن رات کے پیچھے دوڑا چلا آتا ہے جس نے سورج اور چاند اور تارے پیدا کیے، سب اس کے فرمان کے تابع ہیں خبردار رہو! اُسی کی خلق ہے اور اسی کا امر ہے، بڑا بابرکت ہے اللہ، سارے جہانوں کا مالک و پروردگار"۔ (سورۃ الاعراف: 54)

2)اللہ کے کامل و مکمل علم پر غور و فکر، اور اس پر غور و فکر کہ اللہ کی ذات کائنات کی تمام چیزوں بلکہ غیب و موجود تمام امور کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اس کے ذریعہ قلب و روح اللہ کی عظمت سے لبریز ہو جاتے ہیں اور نفس ہر قسم کے شکوک و امراض سے پاک ہو جاتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَعِندَهُۥ مَفَاتِحُ ٱلْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ إِلَّا هُوَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِى ٱلْبَرِّ وَٱلْبَحْرِ ۚ وَمَا تَسْقُطُ مِن وَرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا

وَلَا حَبَّةٍ فِي ظُلُمَٰتِ ٱلْأَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَلَا يَابِسٍ إِلَّا فِي كِتَٰبٍ مُّبِينٍ ﴿٥٩﴾ وَهُوَ ٱلَّذِي يَتَوَفَّىٰكُم بِٱلَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُم بِٱلنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيهِ لِيُقْضَىٰٓ أَجَلٌ مُّسَمًّى ثُمَّ إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٦٠﴾ ترجمہ: "اُسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنہیں اُس کے سوا کوئی نہیں جانتا، بحر و بر میں جو کچھ ہے سب سے وہ واقف ہے، درخت سے گرنے والا کوئی پتہ ایسا نہیں جس کا اسے علم نہ ہو، زمین کے تاریک پردوں میں کوئی دانہ ایسا نہیں جس سے وہ باخبر نہ ہو، خشک و تر سب کچھ ایک کھلی کتاب میں لکھا ہوا ہے، وہی ہے جو رات کو تمہاری روحیں قبض کرتا ہے اور دن کو جو کچھ تم کرتے ہو اسے جانتا ہے، پھر دوسرے روز وہ تمہیں اِسی کاروبار کے عالم میں واپس بھیج دیتا ہے تاکہ زندگی کی مقرر مدت پوری ہو، آخر کار اسی کی طرف تمہاری واپسی ہے، پھر وہ تمہیں بتادے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو"۔(سورۃ الأنعام: 59- 60)

3) اللہ عزوجل کی عبادت، یہ روح کی تربیت کے لئے اہم ترین اور اعلی ترین ذریعہ ہے، اس لئے کہ عبادت کی اصل ہی یہ ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے لئے انتہائی درجے کا تنزل اور عاجزی وانکساری اختیار کی جائے، اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے سوا اس کا کوئی مستحق نہیں ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوٓاْ إِلَّآ إِيَّاهُ﴾ ترجمہ: "تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو، مگر صرف اُس کی"۔(سورۃ الاسراء: 23)

وہ عبادات جو روح کو بلندی عطا کرتی ہیں اور نفس کی پاکی کا ذریعہ بنتی ہے ان کی دو قسمیں ہیں:

الف: فرض عبادتیں، جیسے کہ نماز، روزہ، زکوۃ، حج وغیرہ

ب: اپنے وسیع معانی کے ساتھ تمام عبادتیں جس میں انسان کے ذریعہ کیا ہوا ہر عمل یا ترک کیا ہوا ہر عمل شامل ہے، بلکہ ہر وہ شعور واحساس جس کو اللہ تعالیٰ کے تقرب کے حصول کے لئے اختیار کیا جاتا ہے یا اللہ ہی کے تقرب کے حصول کے لئے اس سے اجتناب کیا جاتا ہے، بشرطیکہ اس کے ذریعہ انسان کی نیت اللہ کی رضا کا حصول ہو، اس لئے کہ ہر عمل جس میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے تقرب کی نیت ہو وہ ایک ایسی عبادت تصور کی جاتی ہے جس میں صاحبِ عمل کو اجر و ثواب ملتا ہے، اور اس کے ذریعہ اس کی روح کی بھی بہترین تربیت ہوتی ہے۔ (دیکھیں: تفسیر ابنِ کثیر 4/312- 331)

بے شک نماز اور تلاوت قرآن کے ذریعہ، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ذکر و تسبیح کے ذریعہ روح کے تزکیہ کی اسلام میں انتہائی اہمیت ہے، اس لئے کہ نفسِ انسانی اگر آلائشوں سے پاک وصاف نہ ہو اور اسی حالت میں وہ اپنے خالق کا تقرب حاصل کرنے کی کوشش کرے تو وہ ان شرعی ذمہ داریوں کو احسن طریقہ سے ادا نہیں کر سکے گا جو اس کے ذمہ ضروری ہیں، اور عبادت اور اس کی پابندی روح کے لئے ایندھن اور زادِ سفر کا کام کرتی ہے، اور احکام الٰہی کی انجام دہی میں اس کے لئے تحریک کا قوی ترین ذریعہ بنتی ہے، اس کی واضح دلیل نماز، ذکر اور ترتیلِ قرآن کا وہ حکم الٰہی ہے جو اللہ کے رسول ﷺ کو آپ پر نازل ہونے والی تیسری ہی وحی میں ملا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلْمُزَّمِّلُ ﴿١﴾ قُمِ ٱلَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿٢﴾ نِّصْفَهُۥٓ أَوِ ٱنقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا ﴿٣﴾ أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ ٱلْقُرْءَانَ تَرْتِيلًا ﴿٤﴾ إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ

قَوْلًا ثَقِيلًا ۝٥ إِنَّ نَاشِئَةَ ٱلَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْـًٔا وَأَقْوَمُ قِيلًا ۝٦ إِنَّ لَكَ فِى ٱلنَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا ۝٧ وَٱذْكُرِ ٱسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا ۝٨﴾ ترجمہ:''اے چادراوڑھنے والے۔رات کو قیام کر مگر تھوڑاسا حصہ۔آدھی رات یااس میں سے تھوڑا ساحصہ کم کردے۔یااس پر زیادہ کردو،اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کرپڑھاکرو۔ہم عنقریب آپ پر ایک بھاری بات کا(بوجھ)ڈالنے والے ہیں۔بے شک رات کااٹھنانفس کوخوب زیر کرتاہےاور بات بھی صحیح نکلتی ہے۔بے شک دن میں آپ کے لئے بڑاکام ہے۔اوراپنے رب کانام لیا کرواور سب سے الگ ہو کراسی کی طرف آجاؤ۔(سورۂ مزمل:1-8)

بھاری کام اور مشکل ذمہ داریوں کی انجام دہی کی تیاری قیام اللیل کے ذریعہ اور ذکر وتلاوت کی پابندی کے ذریعہ ہی ہوسکتی ہے،اسی لئے اللہ کے رسول ﷺ اپنے رب کے حکم کے مطابق پہلے ہی روز سے صحابہ کرام کے نفوس کی تطہیر وتزکیہ عبادت کے ذریعہ کرنے پر توجہ مرکوز کئے ہوئے تھے۔(دیکھیں: منہج الرسول ﷺ فی غرس الروح الجہادیۃ،ص19-34)

اصحاب رسول ﷺ کوجب نمازاداکرنی ہوتی تھی تووہ مکہ کی گھاٹیوں میں چلے جاتے تھے اور چھپ کر نمازپڑھتے تھے۔اللہ کے رسول ﷺ کوجب آغاز اسلام میں صحابہ کرام کے بارے میں خوف لاحق ہوا،اور آپ ﷺ کو معلوم ہوگیاکہ وہ ان کو اعلانیہ طور پر نماز کی ادائیگی اور تلاوت قرآن سے روکیں گے تو آپ ﷺ ان کو لے کر چلے جاتے اور وہیں پر ان کو نمازپڑھاتے تھے اور اللہ کی کتاب کی تعلیم دیتے تھے، اگر نماز،عبادت اور تلاوتِ قرآن کے ذریعہ روحانی تزکیہ کی اہمیت نہ ہوتی تو یقیناً آپ ﷺ خوف وڈر کی اس حالت میں نماز ترک کرنے کا حکم دے دیتے، یہاں تک کہ قریش کوجب آپ ﷺ اور صحابہ کرام کے نمازپڑھنے کی جگہ کا علم ہواتواس وقت بھی آپ ﷺ نے خوف کی وجہ سے نماز اور تلاوت کو ترک نہیں کیا۔دیکھیں: أھمیۃ الجھاد فی نشر الدعوۃ، ص 69 فقہ الدعوۃ، عبد الحلیم محمود 472،471)

اللہ تعالیٰ نے مکہ میں نازل ہونے والے قرآن میں نماز قائم کرنے کی ترغیب دی ہے اور نماز میں خشوع اختیار کرنے والوں کی تعریف کی ہے،اسی طرح جوراتوں میں ذکراللہ اور نماز کی وجہ سے اپنے بستروں سے دور رہتے ہیں،اللہ کو پکارتے ہیں اور اس کی تسبیح وتحمید کرتے ہیں ان کی بھی تعریف کی ہے، ارشادباری تعالیٰ ہے: ﴿قَدْ أَفْلَحَ ٱلْمُؤْمِنُونَ ۝١ ٱلَّذِينَ هُمْ فِى صَلَاتِهِمْ خَٰشِعُونَ ۝٢ وَٱلَّذِينَ هُمْ عَنِ ٱللَّغْوِ مُعْرِضُونَ ۝٣ وَٱلَّذِينَ هُمْ لِلزَّكَوٰةِ فَٰعِلُونَ ۝٤﴾ ترجمہ:''بے شک ایمان والے کامیاب ہوگئے۔جو اپنی نماز میں عاجزی کرنے والے ہیں۔اور جو بے ہودہ باتوں سے منہ موڑنے والے ہیں۔اور جو زکوۃ دینے والے ہیں''۔(سورۃ المؤمنون:1-4)

دوسرے مقام پرارشاد ہے: ﴿إِنَّمَا يُؤْمِنُ بِـَٔايَٰتِنَا ٱلَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا۟ بِهَا خَرُّوا۟ سُجَّدًا وَسَبَّحُوا۟ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ۩ ۝١٥ تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ ٱلْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا وَمِمَّا رَزَقْنَٰهُمْ يُنفِقُونَ ۝١٦ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ أُخْفِىَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوا۟ يَعْمَلُونَ ۝١٧﴾ ترجمہ:''ہماری آیات پر تو وہ لوگ ایمان لاتے ہیں جنہیں یہ آیات سناکرجب نصیحت کی جاتی ہے تو سجدے میں گرپڑتے ہیں اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے ہیں اور تکبر نہیں

کرتے۔ اُن کی پیٹھیں بستروں سے الگ رہتی ہیں، اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے ہیں، اور جو کچھ رزق ہم نے اُنہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ پھر جیسا کچھ آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ان کے اعمال کی جزا میں ان کے لئے چھپا رکھا گیا ہے اس کی کسی متنفس کو خبر نہیں ہے"۔(سورۃ السجدۃ: 15-17)

ایک اور مقام پر ہے: ﴿وَأَقِمِ ٱلصَّلَوٰةَ طَرَفَيِ ٱلنَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ ٱلَّيۡلِۚ إِنَّ ٱلۡحَسَنَٰتِ يُذۡهِبۡنَ ٱلسَّيِّـَٔاتِۚ ذَٰلِكَ ذِكۡرَىٰ لِلذَّٰكِرِينَ﴾ ترجمہ: "اور دیکھو، نماز قائم کرو دن کے دونوں سروں پر اور کچھ رات گزرنے پر، در حقیقت نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں، یہ ایک یاد دہانی ہے ان لوگوں کے لئے جو خدا کو یاد رکھنے والے ہیں"۔(سورۂ ھود:114)

دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿وَمِنَ ٱلَّيۡلِ فَتَهَجَّدۡ بِهِۦ نَافِلَةً لَّكَ عَسَىٰٓ أَن يَبۡعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحۡمُودًا﴾ ترجمہ: "نماز قائم کرو زوال آفتاب سے لے کر اندھیرے تک اور فجر کے قرآن کا بھی التزام کرو، کیونکہ قرآن فجر مشہود ہوتا ہے۔اور رات کو تہجد پڑھو، یہ تمہارے لئے نفل ہے، بعید نہیں کہ تمہارا رب تمہیں مقام محمود پر فائز کردے"۔(سورۃ الاسراء:78-79)

ایک اور مقام پر ہے: ﴿فَٱصۡبِرۡ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ قَبۡلَ طُلُوعِ ٱلشَّمۡسِ وَقَبۡلَ غُرُوبِهَاۖ وَمِنۡ ءَانَآيِٕ ٱلَّيۡلِ فَسَبِّحۡ وَأَطۡرَافَ ٱلنَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرۡضَىٰ ﴿١٣٠﴾ وَلَا تَمُدَّنَّ عَيۡنَيۡكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعۡنَا بِهِۦٓ أَزۡوَٰجًا مِّنۡهُمۡ زَهۡرَةَ ٱلۡحَيَوٰةِ ٱلدُّنۡيَا لِنَفۡتِنَهُمۡ فِيهِۚ وَرِزۡقُ رَبِّكَ خَيۡرٌ وَأَبۡقَىٰ ﴿١٣١﴾ وَأۡمُرۡ أَهۡلَكَ بِٱلصَّلَوٰةِ وَٱصۡطَبِرۡ عَلَيۡهَاۖ لَا نَسۡـَٔلُكَ رِزۡقًاۖ نَّحۡنُ نَرۡزُقُكَۗ وَٱلۡعَٰقِبَةُ لِلتَّقۡوَىٰ ﴿١٣٢﴾﴾ ترجمہ: "پس اے محمدؐ، جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں اُن پر صبر کرو، اور اپنے رب کی حمد وثنا کے ساتھ اُس کی تسبیح کرو، سورج نکلنے سے پہلے اور غروب ہونے سے پہلے، اور رات کے اوقات میں بھی تسبیح کرو اور دن کے کناروں پر بھی، شاید کہ تم راضی ہو جاؤ۔ اور نگاہ اُٹھا کر بھی نہ دیکھو دُنیوی زندگی کی اُس شان و شوکت کو جو ہم نے اِن میں سے مختلف قسم کے لوگوں کو دے رکھی ہے ، وہ تو ہم نے انہیں آزمائش میں ڈالنے کے لئے دی ہے، اور تیرے رب کا دیا ہوا رزقِ حلال ہی بہتر اور پائندہ تر ہے۔اپنے اہل وعیال کو نماز کی تلقین کرو اور خود بھی اس کے پابند رہو، ہم تم سے کوئی رزق نہیں چاہتے، رزق تو ہم ہی تمہیں دے رہے ہیں اور انجام کی بھلائی تقویٰ ہی کے لئے ہے"۔ سورۂ طٰہٰ:130-132)

مزید ارشاد ہے: ﴿فَٱصۡبِرۡ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ قَبۡلَ طُلُوعِ ٱلشَّمۡسِ وَقَبۡلَ ٱلۡغُرُوبِ ﴿٣٩﴾ وَمِنَ ٱلَّيۡلِ فَسَبِّحۡهُ وَأَدۡبَٰرَ ٱلسُّجُودِ﴾ ترجمہ: "پس اے نبیؐ، جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان پر صبر کرو، اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہو، طلوع آفتاب اور غروب آفتاب سے پہلے اور رات کے وقت پھر اُس کی تسبیح کرو اور سجدہ ریزیوں سے فارغ ہونے کے بعد بھی"۔(سورۃ ق:39-40)

اخیر کی آیات سے پتہ چلتا ہے کہ پریشانی اور سخت حالات کے وقت کا زادِ راہ زیادہ سے زیادہ نماز، ذکر، تلاوت قرآن، رجوع الی اللہ اور اللہ سے دعا و التجا ہے۔(دیکھیں: سبل الھدی والرشاد، صالحی 2/404)

بے شک نماز تمام عبادات میں سر فہرست ہے جس کا ایک مسلمان کی روح کا تزکیہ کرنے میں زبردست اثر ہے، صحابہ کرام پر اس نماز کے جو اثرات تھے ان میں سے اہم ترین مندرجہ ذیل ہیں:

ا: اللہ کے حکم پر لبیک کہنا اور اسی کے لئے عبودیت کا اظہار:

اللہ تعالیٰ نے اپنے ان مومن بندوں کی تعریف کی ہے جو اس کے حکم پر لبیک کہتے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَٱلَّذِينَ ٱسۡتَجَابُواْ لِرَبِّهِمۡ وَأَقَامُواْ ٱلصَّلَوٰةَ وَأَمۡرُهُمۡ شُورَىٰ بَيۡنَهُمۡ وَمِمَّا رَزَقۡنَٰهُمۡ يُنفِقُونَ﴾ ترجمہ: "(اور وہ یہ سب کچھ اس لئے کرتے ہیں) تاکہ اللہ ان کے بہترین اعمال کی جزا اُن کو دے اور مزید اپنے فضل سے نوازے، اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے"۔ (سورۃ النور: 38)

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لئے سچی عبودیت اسی وقت متحقق ہو سکتی ہے جب کہ اس کے ساتھ اخلاص اور للہیت اور اللہ کی طرف مکمل انابت و توجہ پائی جائے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿قُلۡ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحۡيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ ٱلۡعَٰلَمِينَ ۝١٦٢ لَا شَرِيكَ لَهُۥۖ وَبِذَٰلِكَ أُمِرۡتُ وَأَنَا۠ أَوَّلُ ٱلۡمُسۡلِمِينَ﴾ ترجمہ: "کہو، میری نماز، میرے تمام مراسمِ عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنا، سب کچھ اللہ رب العالمین کے لئے ہے۔ جس کا کوئی شریک نہیں اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے سر اطاعت جھکانے والا میں ہوں"۔ (سورۃ الأنعام: 162-163

صحابہ کرام سمجھتے تھے کہ نماز کے تمام اعمال میں عبودیت کا ایک خاص پہلو ہے اور روح کا تزکیہ کرنے میں اور نفس پر اثر انگیزی کے اعتبار سے اس کی مخصوص تاثیر ہے، چنانچہ سورۂ فاتحہ کو تدبر کے ساتھ پڑھنے سے اللہ کی عبودیت و بندگی کا احساس ہوتا ہے، ایک بندہ جب "الحمد لله رب العالمين" پڑھتا ہے تو وہ ہر کمال کو اللہ کے ساتھ خاص کرنے کا اظہار کرتا ہے اور اطاعت کی توفیق ملنے پر اور تمام انعامات پر اللہ کی حمد وستائش کرتا ہے، اور اللہ کی صفات اور اسمائے حسنیٰ کی تعریف کرتا ہے۔ (دیکھیں: أهمية الجهاد في نشر الدعوة، ص: 70)

اسی طرح جب انسان "إياك نعبد وإياك نستعين" تلاوت کرتا ہے تو وہ ایک ہی اللہ کی توحید اور اسی سے استعانت کا اقرار کرتا ہے، کیونکہ اللہ ہی معبود برحق ہے اور وہی استعانت کا اہل و مستحق ہے، اور اللہ کے علاوہ اور کسی کو معین و ناصر سمجھنا انسان کے لئے باعث ذلت و رسوائی ہے۔

جب انسان "اهدنا الصراط المستقيم" کہتا ہے تو یہ بندے کی طرف سے اس بات کا اقرار ہے کہ ہدایت اور راہِ حق پر استقامت و ثابت قدمی کا محتاج ہے اور وہ ہدایت کے نتائج و ثمرات کا اور مزید ہدایت کا بھی محتاج ہے، اسی طرح غضب یافتہ اور گمراہ لوگوں کے راستے سے بچنے اور دور رہنے کا بھی وہ محتاج ہے۔ (دیکھیں: أهمية الجهاد في نشر الدعوة إلى الله، ص 72)

جب بندہ رکوع کے لئے جھکتا ہے تو اپنے رب کو عظیم سمجھتے ہوئے اور اس کی پاکی بیان کرتے ہوئے اس کی کبریائی بیان کرتا ہے، نماز کے اس رکن میں اعضاء و جوارح کے خضوع اور دل کے جھکنے دونوں کا اجتماع ہوتا ہے، اس کے بعد سجدہ کا مرحلہ آتا ہے جس میں بندہ سب سے زیادہ قابلِ قدر و عزت جسم کا حصہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے سامنے انتہائی تذلل کے ساتھ رکھ دیتا ہے، اور ساتھ میں دل کی انکساری اور اس کا

تواضع بھی سجدہ کے ہمساز بن جاتا ہے، اور دل بھی اسی طرح سجدہ ریز ہو جاتا ہے جیسے کہ جسم سجدہ ریز ہوتا ہے۔(دیکھیں: منہج الاسلام فی تزکیۃ النفس، د۔انس احمد کرزون 1/221)

اس حالت میں بندہ اپنے رب کے سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے اور سجدہ کی حالت میں خشوع اور خضوع کی کیفیت جس قدر زیادہ ہوتی ہے اسی اعتبار سے اللہ کا تقرب حاصل ہوتا ہے، جیسے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿كَلَّا لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِب﴾ ترجمہ: ”ہر گز نہیں، اُس کی بات نہ مانو اور سجدہ کرو اور (اپنے رب کا) قرب حاصل کرو“۔(سورۃ العلق: 19)

حدیث نبوی میں ہے: "بندہ اپنے رب کے سب سے زیادہ قریب اس وقت ہوتا ہے جب کہ وہ سجدہ کی حالت میں ہوتا ہے، لہذا (سجدہ کی حالت میں) کثرت سے دعا کیا کرو"۔(الموازنۃ بین ذوق السماع وذوق الصلاۃ والقرآن، ابن قیم الجوزیہ، ص 35-40)

اور جب سجدہ سے اٹھ کر بندہ بیٹھ جاتا ہے تو وہ اپنے رب کے سامنے سراپا عجز و نیاز بن کر بیٹھ جاتا ہے، اپنے آپ کو رب کے در پر ڈال دیتا ہے، اپنے گناہوں کا اعتراف کرتا ہے، اس کی رحمت و مغفرت کا امیدوار ہوتا ہے، اس طرح سے نماز کے تمام ارکان میں اللہ کے لئے عبودیت و بندگی اور رب کی طرف رجوع و انابت کی مختلف حالتیں اور کیفیات ظاہر ہوتی ہیں، رب کی توحید کا مختلف طریقوں سے اقرار و اظہار ہوتا ہے، اور ایمان و ایقان میں اضافہ ہوتا ہے جو کہ تزکیہ کی اصل اُساس اور بنیاد ہے، یہ نماز سے حاصل ہونے والا عظیم ترین ثمرہ ہے، جس کے ذریعہ بندہ کے لئے شاہراہِ حیات روشن ہو جاتی ہے، اس کے دل کو طہارت و پاکیزگی نصیب ہوتی ہے، اور نفس کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ (اَیضاً: ص 46-43، مزید دیکھیں: الخشوع فی الصلاۃ، ابن رجب، ص 20-22)

۲: بندہ کی اپنے رب کے ساتھ مناجات:

اللہ کے رسول ﷺ نے اس مناجات کے مناظر میں سے ایک اہم منظر کا ذکر فرمایا ہے، اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے: "اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں نے نماز اپنے درمیان اور اپنے بندے کے درمیان نماز کو نصف نصف تقسیم کر رکھا ہے اور میرا بندہ جو سوال کرتا ہے اس کو پورا کیا جاتا ہے، جب بندہ "الحمد للہ رب العالمین" کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میرے بندے نے میری تعریف کی۔ اور جب بندہ کہتا ہے "الرحمن الرحیم" اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میرے بندے نے میری ثنا اور توصیف کی، اور جب بندہ کہتا ہے "مالک یوم الدین" تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی، جب بندہ کہتا ہے "ایاک نعبد و ایاک نستعین" تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان کا معاملہ ہے۔ میرا بندہ جو سوال کرے گا وہ اس کو ملے گا۔ پھر جب بندہ پڑھتا ہے: "اھدنا الصراط المستقیم، صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولاالضالین" ۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: یہ میرے بندے کے لئے ہے اور وہ جو کچھ مانگے گا اس کو ملے گا“۔(مسند اُحمد 2/241-242، صحیح مسلم 395 اَبو داؤد: 821، سنن ترمذی: 2953، سنن ابن ماجہ: 3784)

صحابہ کرام نے نبی کریم ﷺ سے سیکھا تھا کہ یہ مناجات تزکیۂ نفس اور ایمان کو تقویت پہنچانے کا اہم ترین سبب ہے، بشرطیکہ انسان اپنے آپ کو اس کے لئے تیار کرے اور انتہائی شوق و رغبت اور توجہ کے ساتھ اس کو ادا کرے، اس تصور کے ساتھ کہ وہ اپنے رب کے سامنے حاضر ہے، اس کے در پر پڑا ہوا ہے، اس کی رحمت و فضل کا منتظر ہے اور تمام امور میں اسی کی ذات سے نصرت و مدد حاصل کرنی ہے۔

۳: قلبی اطمئنان اور راحت:

اللہ کے رسول ﷺ کو جب کوئی پریشانی لاحق ہوتی تھی تو آپؐ نماز ادا کرتے تھے۔(سنن أبوداود: 1319، مسند أحمد: 5/388) آپ ﷺ کو نماز کے ذریعہ آنکھوں کو ٹھنڈک ملتی تھی۔(مسند أحمد: 3/128، 285،199، سنن نسائی: 7/61، مستدرک حاکم: 2/160) اللہ کے رسول ﷺ نے صحابہ کرام کو بہت سے سنن ونوافل سکھائے تھے، تاکہ اپنے رب کے ساتھ ان کا تعلق مستحکم ہو، دلوں کو ان کے ذریعہ اطمینان وسکون ملے اور مختلف فکروں، پریشانیوں اور مشکلات کے حل کے لئے نماز ایک اہم ہتھیار بن جائے۔

۴: نماز گناہوں سے روکنے کا ایک اہم ذریعہ:

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ٱتْلُ مَآ أُوحِىَ إِلَيْكَ مِنَ ٱلْكِتَٰبِ وَأَقِمِ ٱلصَّلَوٰةَ ۖ إِنَّ ٱلصَّلَوٰةَ تَنْهَىٰ عَنِ ٱلْفَحْشَآءِ وَٱلْمُنكَرِ ۗ وَلَذِكْرُ ٱللَّهِ أَكْبَرُ ۗ وَٱللَّهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُونَ﴾ ترجمہ: ''(اے نبیؐ) تلاوت کرو اس کتاب کی جو تمہاری طرف وحی کے ذریعہ سے بھیجی گئی ہے اور نماز قائم کرو، یقیناً نماز فحش اور بُرے کاموں سے روکتی ہے اور اللہ کا ذکر اس سے بھی زیادہ بڑی چیز ہے، اللہ جانتا ہے جو کچھ تم لوگ کرتے ہو''۔(سورۃ العنکبوت: 45)

صحابہ کرام جب نماز ادا کرتے تھے تو اس کے ذریعہ ان کو آرام وسکون ملتا تھا، نماز مزید خیر کے کام کرنے اور برائیوں سے روکنے کے لئے قوتِ محرکہ فراہم کرتی تھی، ان کے دلوں میں اللہ عزوجل کے علیم وخبیر ہونے اور اس کی حدود کا پاس ولحاظ کرنے کا یقین پیدا کرتی تھی، خواہشات پر کنٹرول کرنے اور نفس کے ساتھ مجاہدہ کرنے کی قوت فراہم کرتی تھی، چنانچہ نماز ان کے لئے گناہوں کے ارتکاب سے روکنے کے لئے ایک مضبوط دیوار بن جاتی تھی، اسی طرح صحابہ کرامؓ کو اس بات کا یقین تھا کہ نماز گناہوں کا کفارہ بنتی ہے، اور بلند درجات کا ذریعہ بنتی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَأَقِمِ ٱلصَّلَوٰةَ طَرَفَىِ ٱلنَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ ٱلَّيْلِ ۚ إِنَّ ٱلْحَسَنَٰتِ يُذْهِبْنَ ٱلسَّيِّـَٔاتِ ۚ ذَٰلِكَ ذِكْرَىٰ لِلذَّٰكِرِينَ﴾ ترجمہ: ''اور دیکھو، نماز قائم کرو، دن کے دونوں سروں پر اور کچھ رات گزرنے پر، درحقیقت نیکیاں برائیوں کو دور کردیتی ہیں، یہ ایک یاد دہانی ہے ان لوگوں کے لئے جو خدا کو یاد رکھنے والے ہیں''۔(سورہ ھود: 114)

اس کے علاوہ نماز کے بہت سے تربیتی اور نفسیاتی اثرات ہیں جو نماز پڑھنے والے پر مرتب ہوتے ہیں، اس طرح نماز تزکیۂ نفس اور طہارت وپاکیزگی کے سلسلہ میں اپنا کردار ادا کرتی ہے، اللہ کے رسول ﷺ کا یہ قول متحقق ہوجاتا ہے کہ " نماز نور ہے"۔(صحیح مسلم: 223، ترمذی: 3517، نسائی: 5-5/6، ابن ماجہ: 280، مسند احمد: 5/342، 343، 344)

یقینا نماز ایک ایسا نور ہے جو بندۂ مومن کے لئے راہِ ہدایت منور کرتی ہے اور اس کو معصیت وگناہ سے بچا کر عملِ صالح کی رہنمائی کرتی ہے، نماز بندہ مومن کے لئے ایک ایسا نور ہے جس کے ذریعہ وہ ایمانی حلاوت اور رب کے ساتھ مناجات کی لذت محسوس کرتا ہے۔ وہ ایک ایسا نور ہے جو نفس کے لئے طہارت وتزکیہ اور اطمینان اور راحت کا ذریعہ بنتا ہے اور امن وسکون فراہم کرتا ہے، دنیا میں نماز قائم کرنے کے

لئے وہ چہرہ کا نور بن جاتی ہے، جس کے ذریعہ چہرہ نورانی اور حسین و جمیل بن جاتا ہے، بر خلاف نماز ترک کرنے والے کے لئے، اسی طرح یہ نماز قیامت کے روز بھی نور اور روشنی کا ذریعہ نہیں بنے گی۔ (دیکھیں: منہج الاسلام فی تزکیۃ النفس 1/222- 227)

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يَوْمَ تَرَى ٱلْمُؤْمِنِينَ وَٱلْمُؤْمِنَـٰتِ يَسْعَىٰ نُورُهُم بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَـٰنِهِم بُشْرَىٰكُمُ ٱلْيَوْمَ جَنَّـٰتٌ تَجْرِى مِن تَحْتِهَا ٱلْأَنْهَـٰرُ خَـٰلِدِينَ فِيهَا ۚ ذَٰلِكَ هُوَ ٱلْفَوْزُ ٱلْعَظِيمُ﴾ ترجمہ: ''اُس دن جبکہ تم مومن مردوں اور عورتوں کو دیکھو گے کہ ان کا نور اُن کے آگے آگے اور ان کے دائیں جانب دوڑ رہا ہو گا (ان سے کہا جائے گا کہ) آج بشارت ہے تمہارے لئے جنتیں ہوں گی جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے، یہی ہے بڑی کامیابی''۔ (سورۃ الحدید: 12)

صحابہ کرام کثرت سے ذکر و دعا، تلاوتِ قرآن کریم اور قرآن کو سننے کا اہتمام کرتے تھے، قیام اللیل کے ذریعہ قیمتی ساعتوں کی قدر کرتے تھے، خشوع، تدبر اور حضورِ قلب کے ساتھ نفس کے ساتھ مجاہدہ کرتے تھے، یہ اللہ کے تقرب کا اہم ترین ذریعہ تھا، اور تزکیۂ نفس کے سلسلہ میں روح کو بلندی عطا کرنے میں اور مقاماتِ کمال تک پہنچانے میں اس کے عظیم اثرات ہیں، صحابۂ کرام نے ذکر و دعا اور تلاوت کے ذریعہ جو عظیم فوائد حاصل کئے تھے ان میں سے اہم ترین فائدہ ان کے نزدیک یہ تھا کہ وہ ان اعمال کو اللہ سے مناجات کا ذریعہ سمجھتے تھے اور ان کے ذریعہ وہ عبودیت کے مقامات طے کرتے تھے جو ان کو اللہ تعالیٰ سے قریب تر کرتے تھے۔

اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: میں اپنے بندے کے گمان کے مطابق اس کے ساتھ معاملہ کرتا ہوں، جب وہ مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔ وہ جب اپنے دل میں مجھے یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے اپنے نفس میں یاد کرتا ہوں، اور اگر وہ مجھے کسی گروہ میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے اس سے بہتر گروہ میں یاد کرتا ہوں، اگر وہ مجھ سے ایک بالشت قریب آتا ہے تو میں اس سے ایک ہاتھ قریب آتا ہوں۔ اور اگر وہ مجھ سے ایک ہاتھ قریب آتا ہے تو میں اس سے دو ہاتھ قریب آتا ہوں، اور اگر وہ میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اس کے پاس دوڑ کر آتا ہوں"۔ (صحیح بخاری: 7405، صحیح مسلم: 2675)

ذکر کی اعلیٰ ترین شکل جس کو صحابہ کرام اختیار کرتے تھے وہ قرآن کریم کی تلاوت ہے، ان کے دلوں میں بہت زیادہ اللہ کی محبت تھی اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی خشیت بھی ان کے دلوں میں جاگزیں تھی، قرآن پاک نے ان کے قلبی امراض کو ختم کر دیا تھا اور وہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے مصداق تھے: ﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ ٱلْقُرْءَانِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ۙ وَلَا يَزِيدُ ٱلظَّـٰلِمِينَ إِلَّا خَسَارًا﴾ ترجمہ: ''ہم اِس قرآن کے سلسلۂ تنزیل میں وہ کچھ نازل کر رہے ہیں جو ماننے والوں کے لئے تو شفا اور رحمت ہے، مگر ظالموں کے لئے خسارے کے سوا اور کسی چیز میں اضافہ نہیں کرتا''۔ (سورۃ الاسراء: 82)

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿وَلَوْ جَعَلْنَـٰهُ قُرْءَانًا أَعْجَمِيًّا لَّقَالُوا۟ لَوْلَا فُصِّلَتْ ءَايَـٰتُهُۥٓ ۖ ءَا۬عْجَمِىٌّ وَعَرَبِىٌّ ۗ قُلْ هُوَ لِلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ هُدًى وَشِفَآءٌ ۖ وَٱلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ فِىٓ ءَاذَانِهِمْ وَقْرٌ وَهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ۚ أُو۟لَـٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِن مَّكَانٍۭ بَعِيدٍ﴾ ترجمہ: ''اگر ہم اِس کو عجمی قرآن بنا کر بھیجتے تو یہ لوگ کہتے "کیوں نہ اس کی آیات کھول کر بیان کی گئیں؟ کیا عجیب بات ہے

کہ کلام عجمی ہے اور مخاطب عربی"۔اِن سے کہو یہ قرآن ایمان لانے والوں کے لئے تو ہدایت اور شفا ہے، مگر جو لوگ ایمان نہیں لاتے اُن کے لئے یہ کانوں کی ڈاٹ اور آنکھوں کی پٹی ہے،اُن کا حال تو ایسا ہے جیسے اُن کو دور سے پکارا جا رہا ہو"۔(سورۃ فصلت:44)۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہے: ﴿ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَتَطۡمَئِنُّ قُلُوبُهُم بِذِكۡرِ ٱللَّهِۗ أَلَا بِذِكۡرِ ٱللَّهِ تَطۡمَئِنُّ ٱلۡقُلُوبُ﴾ ترجمہ: "ایسے ہی لوگ ہیں وہ جنہوں نے (اِس نبی کی دعوت کو) مان لیا اور اُن کے دلوں کو اللہ کی یاد سے اطمینان نصیب ہوتا ہے، خبر دار رہو! اللہ کی یاد ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوا کرتا ہے"۔(سورۃ الرعد:28)

صحابہ کرام کی دعا کے سلسلہ میں بھی عجیب و غریب شان تھی، نبی کریم ﷺ نے ان کو تعلیم دی تھی کہ دعا عبودیت اور مناجات کا عظیم اور اہم ترین مظہر ہے، اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے: "دعا ہی اصل عبادت ہے"۔(سنن أبو داود: 1479، سنن ترمذی: 3372، سنن ابن ماجہ:3828، ابنِ حبان:887، مستدرک حاکم 1/491)۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو دعا کا حکم دیا ہے اور تکبر کی وجہ سے دعا ترک کرنے والوں کو وعید سنائی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ٱدۡعُونِيٓ أَسۡتَجِبۡ لَكُمۡۚ إِنَّ ٱلَّذِينَ يَسۡتَكۡبِرُونَ عَنۡ عِبَادَتِي سَيَدۡخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ﴾ ترجمہ:"تمہارا رب کہتا ہے "مجھے پکارو، میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا، جو لوگ گھمنڈ میں آکر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں، ضرور وہ ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے"۔(سورۃ غافر:60)

نبی کریم ﷺ صحابہ کرام کے سامنے اس بات کی وضاحت فرماتے تھے کہ دل کو ذکر و دعا اور تلاوت قرآن کے ذریعہ مسلسل غذا کی ضرورت ہوتی ہے، تاکہ اس کے ذریعہ دل مختلف امراض اور آفتوں سے بھی محفوظ رہ سکے، اسی طرح آپ ﷺ نے یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ ایک مسلمان کو صبح و شام کون سے اذکار اور دعاؤں کا اہتمام کرنا چاہیے، گھر میں داخل ہوتے وقت، نکلتے وقت، بازار میں داخل ہوتے وقت، کھانے پینے کے وقت، لباس پہنتے وقت اور روزانہ کے تمام اعمال میں کن اذکار اور دعاؤں کا اہتمام کرنا چاہیے، تاکہ وہ ہر قسم کی روحانی مرض سے محفوظ رہ سکے اور جب اس کو قلق و اضطراب اور کوئی دوسرا مرض لاحق ہو تو یہ اذکار و دعائیں اس کے لئے ذریعہ شفاء و باعثِ حفاظت بن جائیں۔

اللہ کے رسول ﷺ نے صحابہ کرام کو اس بات کی تعلیم دی تھی کہ سختی اور پریشانی کے وقت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف کیسے رجوع کریں، تاکہ ان کو امن و سکون حاصل ہو سکے اور وہ اس بات پر یقین رکھیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہے، ان کا معین و مددگار اور تائید کرنے والا ہے اور وہی پریشان حال لوگوں کی دعا قبول کرتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿أَمَّن يُجِيبُ ٱلۡمُضۡطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكۡشِفُ ٱلسُّوٓءَ وَيَجۡعَلُكُمۡ خُلَفَآءَ ٱلۡأَرۡضِۗ أَءِلَٰهٞ مَّعَ ٱللَّهِۚ قَلِيلٗا مَّا تَذَكَّرُونَ﴾ ترجمہ:"کون ہے جو بے قرار کی دعا سنتا ہے جبکہ وہ اُسے پکارے اور کون اس کی تکلیف رفع کرتا ہے؟ اور (کون ہے جو) تمہیں زمین کا خلیفہ بناتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی (یہ کام کرنے والا) ہے؟ تم لوگ کم ہی سوچتے ہو"۔(سورۃ النمل:62)

بے شک ذکر و دعا، تلاوت قرآن، قیام اللیل اور ہر قسم کے نوافل کا تزکیۂ نفس، اور روح کو بلندیوں تک لے جانے میں عظیم اثر ہے، جن میں سے چند کا ذکر مندرجہ بالا سطور میں کیا گیا ہے۔

۲: عقل کا تزکیہ:

نبی کریم ﷺ کی تربیت ہر اعتبار سے جامع اور تمام پہلوؤں پر محیط تھی، اس لئے کہ وہ قرآن کریم سے ماخوذ تھی اور قرآن کریم میں انسان کو ایک مکمل انسان کی حیثیت سے مخاطب بنایا ہے جو روح، جسم اور عقل کا مجموعہ ہے، صحابہ کرام کے تیئں نبوی تربیت میں اس کا اہتمام کیا جاتا تھا کہ ان کی فکر و نظر اور تفکر و تدبر کی صلاحیت کو پروان چڑھایا جائے، اس لئے کہ اس کے ذریعہ وہ دعوت الی اللہ کی ذمہ داری کو اٹھانے کے اہل بن سکتے تھے، قرآن نے بھی اس پہلو کی جانب رہنمائی کی ہے، ارشاد ربانی ہے:

﴿قُلِ ٱنظُرُواْ مَاذَا فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضِۚ وَمَا تُغۡنِي ٱلۡأٓيَٰتُ وَٱلنُّذُرُ عَن قَوۡمٖ لَّا يُؤۡمِنُونَ﴾ ترجمہ: اِن سے کہو: زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اسے آنکھیں کھول کر دیکھو، اور جو لوگ ایمان لانا ہی نہیں چاہتے ان کے لئے نشانیاں اور تنبیہات آخر کیا مفید ہو سکتی ہیں؟"۔(سورۃ یونس:101)

مزید دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿قُلۡ سِيرُواْ فِي ٱلۡأَرۡضِ فَٱنظُرُواْ كَيۡفَ بَدَأَ ٱلۡخَلۡقَۚ ثُمَّ ٱللَّهُ يُنشِئُ ٱلنَّشۡأَةَ ٱلۡأٓخِرَةَۚ إِنَّ ٱللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيۡءٖ قَدِيرٞ﴾ ترجمہ: "ان سے کہو کہ زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ اُس نے کس طرح خلق کی ابتدا کی ہے، پھر اللہ دوبارہ بھی زندگی بخشے گا، یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے"۔(سورۃ العنکبوت:20)

ایک اور مقام پر ہے: ﴿كِتَٰبٌ أَنزَلۡنَٰهُ إِلَيۡكَ مُبَٰرَكٞ لِّيَدَّبَّرُوٓاْ ءَايَٰتِهِۦ وَلِيَتَذَكَّرَ أُوْلُواْ ٱلۡأَلۡبَٰبِ﴾ ترجمہ: "یہ ایک بڑی برکت والی کتاب ہے جو (اے محمدؐ) ہم نے تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ یہ لوگ اس کی آیات پر غور کریں اور عقل و فکر رکھنے والے اس سے سبق لیں"۔(سورۃ ص 29)

مزید ایک اور مقام پر ہے: ﴿فَلۡيَنظُرِ ٱلۡإِنسَٰنُ إِلَىٰ طَعَامِهِۦٓ ۝٢٤ أَنَّا صَبَبۡنَا ٱلۡمَآءَ صَبّٗا ۝٢٥ ثُمَّ شَقَقۡنَا ٱلۡأَرۡضَ شَقّٗا ۝٢٦ فَأَنۢبَتۡنَا فِيهَا حَبّٗا ۝٢٧ وَعِنَبٗا وَقَضۡبٗا ۝٢٨ وَزَيۡتُونٗا وَنَخۡلٗا ۝٢٩ وَحَدَآئِقَ غُلۡبٗا ۝٣٠ وَفَٰكِهَةٗ وَأَبّٗا ۝٣١ مَّتَٰعٗا لَّكُمۡ وَلِأَنۡعَٰمِكُمۡ﴾ ترجمہ: " پس انسان کو اپنے کھانے کی طرف غور کرنا چاہیے کہ ہم نے اوپر سے مینہ برسایا۔ پھر ہم نے زمین کو چیر کر پھاڑا۔ پھر ہم نے اس میں اناج اگایا۔ اور انگور اور ترکاریاں۔ اور زیتون اور کھجور۔ اور گھنے باغ۔ اور میوے اور گھاس۔ تمہارے لئے اور تمہارے چوپایوں کے لئے سامانِ حیات"۔(سورۃ عبس:(24-32)

عقل انسانی طاقت وصلاحیت کا ایک اہم سرچشمہ ہے، اسی عقل کو اللہ تعالیٰ نے انسان کو مکلف اور ذمہ دار ٹھہرانے کا سبب قرار دیا ہے، جو شخص پاگل پن یا اور کسی وجہ سے عقل سے محروم ہو تو وہ غیر مکلف ہے اور ذمہ داری اور تکلیف سے وہ مبرّا ہے، اِرشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَا

تَقۡفُ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهِۦ عِلۡمٌۚ إِنَّ ٱلسَّمۡعَ وَٱلۡبَصَرَ وَٱلۡفُؤَادَ كُلُّ أُوْلَٰٓئِكَ كَانَ عَنۡهُ مَسۡـُٔولٗا﴾ ترجمہ: "کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمہیں علم نہ ہو، یقیناً آنکھ، کان اور دل سب ہی کی بازپرس ہونی ہے"۔(سورۃ سورۃ الاسراء: 36)

بے شک عقل اللہ کی عطا کردہ ایک عظیم نعمت ہے جس کے ذریعہ علم کا حصول اور اس کا احاطہ کرنے کی صلاحیت حاصل ہوتی ہے، اسی لئے قرآن کریم نے عقل کی تربیت کے لئے ایک ایسا منہج متعین کیا ہے جس کو اللہ کے رسول ﷺ نے صحابہ کرام کی تربیت کے لئے اختیار کیا تھا، اس کے اہم نکات مندرجہ ذیل ہیں:

1) عقل کو ان تمام چیزوں سے پاک وصاف رکھا جائے جو ظن و تخمین یا دیکھا دیکھی اور اندھی تقلید پر مبنی ہو، چنانچہ قرآن کریم نے اس طرزِ عمل کے بارے میں اس آیت کریمہ میں متنبہ کیا ہے: ﴿وَمَا لَهُم بِهِۦ مِنۡ عِلۡمٍۖ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا ٱلظَّنَّۖ وَإِنَّ ٱلظَّنَّ لَا يُغۡنِي مِنَ ٱلۡحَقِّ شَيۡـٔٗا﴾ ترجمہ: "حالانکہ اس معاملہ کا کوئی علم انہیں حاصل نہیں ہے، وہ محض گمان کی پیروی کررہے ہیں، اور گمان حق کی جگہ کچھ بھی کام نہیں دے سکتا۔(سورۃ النجم: 28)

2) عقل کے لئے کسی بھی چیز کی تحقیق اور ثبوت کو لازمی قرار دیا جائے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِن جَآءَكُمۡ فَاسِقُۢ بِنَبَإٖ فَتَبَيَّنُوٓاْ أَن تُصِيبُواْ قَوۡمَۢا بِجَهَٰلَةٖ فَتُصۡبِحُواْ عَلَىٰ مَا فَعَلۡتُمۡ نَٰدِمِينَ﴾ ترجمہ: "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کرلیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانستہ نقصان پہنچا بیٹھو اور پھر اپنے کئے پر پشیمان ہو"۔(سورۃ الحجرات: 6)

3) عقل کو کائنات کے اصول وضوابط پر غور وفکر اور تدبر کی طرف متوجہ کیا جائے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَا خَلَقۡنَا ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضَ وَمَا بَيۡنَهُمَآ إِلَّا بِٱلۡحَقِّۗ وَإِنَّ ٱلسَّاعَةَ لَأٓتِيَةٞۖ فَٱصۡفَحِ ٱلصَّفۡحَ ٱلۡجَمِيلَ﴾ ترجمہ: "ہم نے زمین اور آسمان کو اور ان کی سب موجودات کو حق کے سوا کسی اور بنیاد پر خلق نہیں کیا ہے، اور فیصلے کی گھڑی یقیناً آنے والی ہے، پس اے محمدؐ، تم (ان لوگوں کی بیہودگیوں پر) شریفانہ درگزر سے کام لو"۔(سورۃ الحجر: 85)

4) اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے جو عبادات، معاملات، اخلاق اور آداب مشروع کئے ہیں ان تمام احکام کی حکمت و مصلحت کے مختلف پہلوؤں پر غور وفکر کرنے کی عقل کو دعوت دی جائے، اس لئے کہ اس کے ذریعہ عقل میں پختگی پیدا ہوتی ہے اور عقلی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے، اور ان حکمتوں سے واقفیت کے نتیجے میں انسان اس پر آمادہ ہو جائے گا کہ وہ اپنی زندگی میں شریعت ربانی کو نافذ کرے اور اس سے سرِمو انحراف نہ کرے، اس لئے کہ اس میں اطمینان وسکون اور کامیابی مضمر ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا لَكُمۡ أَلَّا تَأۡكُلُواْ مِمَّا ذُكِرَ ٱسۡمُ ٱللَّهِ عَلَيۡهِ وَقَدۡ فَصَّلَ لَكُم مَّا حَرَّمَ عَلَيۡكُمۡ إِلَّا مَا ٱضۡطُرِرۡتُمۡ إِلَيۡهِۗ وَإِنَّ كَثِيرٗا لَّيُضِلُّونَ بِأَهۡوَآئِهِم بِغَيۡرِ عِلۡمٍۗ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعۡلَمُ بِٱلۡمُعۡتَدِينَ﴾ ترجمہ: "آخر کیا وجہ ہے کہ تم وہ چیز نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو، حالانکہ جن چیزوں کا استعمال حالت اضطرار کے سوا دوسری تمام حالتوں میں اللہ نے حرام کردیا ہے اُن کی تفصیل وہ

تمہیں بتا چکا ہے، بکثرت لوگوں کا حال یہ ہے کہ علم کے بغیر محض اپنی خواہشات کی بنا پر گمراہ کن باتیں کرتے ہیں، ان حد سے گزرنے والوں کو تمہارا رب خوب جانتا ہے"۔(سورۃ الأنعام:119)

5) عقل کو اس پر غور و فکر کرنے کی دعوت دی جائے کہ انسانی تاریخ میں لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا طریقہ کیا رہا ہے، تاکہ غور و فکر کے نتیجے میں انسان نصیحت و عبرت حاصل کرے اور اقوام و ملل اور حکومتوں کے بارے میں اللہ کے ضوابط کو سمجھنے میں آسانی ہو، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿أَلَمْ يَرَوْاْ كَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَبْلِهِم مِّن قَرْنٍ مَّكَّنَّـٰهُمْ فِى ٱلْأَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّن لَّكُمْ وَأَرْسَلْنَا ٱلسَّمَآءَ عَلَيْهِم مِّدْرَارًا وَجَعَلْنَا ٱلْأَنْهَـٰرَ تَجْرِى مِن تَحْتِهِمْ فَأَهْلَكْنَـٰهُم بِذُنُوبِهِمْ وَأَنشَأْنَا مِنۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا ءَاخَرِينَ﴾ ترجمہ: "کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ ان سے پہلے کتنی ایسی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں جن کا اپنے اپنے زمانہ میں دور دورہ رہا ہے؟ اُن کو ہم نے زمین میں وہ اقتدار بخشا تھا جو تمہیں نہیں بخشا ہے، ان پر ہم نے آسمان سے خوب بارشیں برسائیں اور ان کے نیچے نہریں بہا دیں، (مگر جب انہوں نے کفران نعمت کیا تو) آخر کار ہم نے ان کے گناہوں کی پاداش میں انہیں تباہ کر دیا اور ان کی جگہ دوسرے دور کی قوموں کو اٹھایا"۔(سورۃ الأنعام:6)

دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا ٱلْقُرُونَ مِن قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُواْ وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِٱلْبَيِّنَـٰتِ وَمَا كَانُواْ لِيُؤْمِنُواْ ۚ كَذَٰلِكَ نَجْزِى ٱلْقَوْمَ ٱلْمُجْرِمِينَ ﴿١٣﴾ ثُمَّ جَعَلْنَـٰكُمْ خَلَـٰٓئِفَ فِى ٱلْأَرْضِ مِنۢ بَعْدِهِمْ لِنَنظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ ﴿١٤﴾﴾ ترجمہ: "لوگو، تم سے پہلے کی قوموں کو (جو اپنے اپنے زمانہ میں برسر عروج تھیں) ہم نے ہلاک کر دیا، جب انہوں نے ظلم کی روش اختیار کی اور اُن کے رسُول اُن کے پاس کھُلی کھُلی نشانیاں لے کر آئے اور انہوں نے ایمان لا کر ہی نہ دیا، اس طرح ہم مجرموں کو ان کے جرائم کا بدلہ دیا کرتے ہیں، اب ان کے بعد ہم نے تم کو زمین میں ان کی جگہ دی ہے تاکہ دیکھیں تم کیسے عمل کرتے ہو"۔(سورۃ یونس:13-14)

ایک اور مقام پر ہے: ﴿أَوَلَمْ يَسِيرُواْ فِى ٱلْأَرْضِ فَيَنظُرُواْ كَيْفَ كَانَ عَـٰقِبَةُ ٱلَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ كَانُوٓاْ أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَأَثَارُواْ ٱلْأَرْضَ وَعَمَرُوهَآ أَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوهَا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِٱلْبَيِّنَـٰتِ ۖ فَمَا كَانَ ٱللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَـٰكِن كَانُوٓاْ أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ﴾ ترجمہ: "اور کیا یہ لوگ کبھی زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ اِنہیں اُن لوگوں کا انجام نظر آتا جو اِن سے پہلے گزر چکے ہیں؟ وہ اِن سے زیادہ طاقت رکھتے تھے، اُنہوں نے زمین کو خوب ادھیڑا تھا اور اُسے اتنا آباد کیا تھا جتنا اِنہوں نے نہیں کیا ہے، اُن کے پاس ان کے رسول روشن نشانیاں لے کر آئے پھر اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا، مگر وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے"۔(سورۃ الروم:9)

اس طرح کی آیاتِ کریمہ صحابہ کرام کی رہنمائی اس جانب کرتی تھیں کہ وہ ربانی تصور کے مطابق اپنی عقلوں کا استعمال کریں تاکہ ان کی عقلیں اس طرح بے راہ روی کا شکار نہ ہوں، جیسے کہ بہت سے فلسفی بے راہ روی اور گمراہی کا شکار ہو گئے جنہوں نے عقل کی تقدیس کی اور

اس کے مقام سے زیادہ اس کو مقام دیا۔اس قرآنی تربیت کے عظیم عملی اثرات صحابہ کرام کی زندگیوں میں ظاہر ہوئے۔ (دیکھیں: تفسیر ابن کثیر:4/86)

۳: جسمانی تربیت:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام کی جسمانی تربیت پر بھی خصوصی توجہ دی اور اس تربیت کے اصول وضوابط قرآن کریم سے اخذ کئے تاکہ جسم بھی اپنا کردار بہتر طریقے سے ادا کرے جس کے لئے اس کو تخلیق کیا گیا ہے، نہ اس میں کوئی اسراف وکمی ہو اور نہ ہی افراط وتفریط۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی قرآن میں ان چیزوں کی جانب رہنمائی کی ہے جن کو اس نے ان کے لئے طیبات میں سے حلال کیا ہے اور جن ناپاک چیزوں کو ان کے لئے حرام قرار دیا ہے اور ان لوگوں پر سخت نکیر کی ہے جو اپنے لئے طیبات اور پاکیزہ چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ ٱللَّهِ ٱلَّتِىٓ أَخْرَجَ لِعِبَادِهِۦ وَٱلطَّيِّبَٰتِ مِنَ ٱلرِّزْقِ ۚ قُلْ هِىَ لِلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ فِى ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا خَالِصَةً يَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِ ۗ كَذَٰلِكَ نُفَصِّلُ ٱلْءَايَٰتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ﴾ ترجمہ:"اے محمدؐ،ان سے کہو کس نے اللہ کی اُس زینت کو حرام کر دیا جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لئے نکالا تھا اور کس نے خدا کی بخشی ہوئی پاک چیزیں ممنوع کر دیں؟ کہو، یہ ساری چیزیں دنیا کی زندگی میں بھی ایمان لانے والوں کے لئے ہیں، اور قیامت کے روز تو خالصتاً انہی کے لئے ہوں گی، اِس طرح ہم اپنی باتیں صاف صاف بیان کرتے ہیں، اُن لوگوں کے لئے جو علم رکھنے والے ہیں"۔(سورۃ الاعراف:32)

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انسان جب اپنی جسمانی ضروریات کو پورا کرے گا تو اس کے بعد ہی وہ ان ذمہ داریوں کو ادا کر سکے گا جو اللہ تعالیٰ نے اس پر عائد کی ہیں، وہ اللہ کی عبادت کر سکے گا، زمین میں خلافت کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکے گا، زمین کو بہتر طریقے سے آباد کر سکے گا اور دوسرے لوگوں کے ساتھ نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون کر سکے گا، اسی لئے قرآن کریم نے مندرجہ ذیل اصول وضوابط کے تحت انسانی جسم کی ضروریات کو منضبط کیا ہے:

۱) کھانے پینے کی ضرورت کو اپنے اس فرمان کے ذریعہ منضبط کیا ہے: ﴿يَٰبَنِىٓ ءَادَمَ خُذُوا۟ زِينَتَكُمْ عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَكُلُوا۟ وَٱشْرَبُوا۟ وَلَا تُسْرِفُوٓا۟ ۚ إِنَّهُۥ لَا يُحِبُّ ٱلْمُسْرِفِينَ﴾ ترجمہ:"اے اولاد آدم! ہر عبادت کے موقع پر اپنی زینت سے آراستہ رہو اور کھاؤ اور پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو، بے شک اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے"۔(سورۃ الاعراف:31)

۲) لباس کی ضرورت کو اس طور پر منضبط کیا ہے کہ اس کے لئے اتنا لباس ضروری اور لازم قرار دیا ہے جو اس کی پردہ پوشی کا کام کر سکے اور سردی گرمی کی شدت سے اس کے جسم کی حفاظت کر سکے اور عبادت کے وقت ایسا لباس مستحب اور پسندیدہ قرار دیا ہے جو باعثِ زینت وجمال ہو، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يَٰبَنِىٓ ءَادَمَ خُذُوا۟ زِينَتَكُمْ عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَكُلُوا۟ وَٱشْرَبُوا۟ وَلَا تُسْرِفُوٓا۟ ۚ إِنَّهُۥ لَا يُحِبُّ ٱلْمُسْرِفِينَ﴾ ترجمہ:"اے اولاد آدم! ہر عبادت کے موقع پر اپنی زینت سے آراستہ رہو اور کھاؤ اور پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو، بے شک اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے"۔(سورۃ الاعراف:31)

۳) گھر اور پناہ گاہ کی ضرورت کو منضبط کیا ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَٱللَّهُ جَعَلَ لَكُم مِّنۢ بُيُوتِكُمْ سَكَنًا وَجَعَلَ لَكُم مِّن جُلُودِ ٱلْأَنْعَٰمِ بُيُوتًا تَسْتَخِفُّونَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ إِقَامَتِكُمْ وَمِنْ أَصْوَافِهَا وَأَوْبَارِهَا وَأَشْعَارِهَآ أَثَٰثًا وَمَتَٰعًا إِلَىٰ حِينٍ﴾ ترجمہ: "اور اللہ تعالیٰ نے بنایا تمہارے لئے تمہارے گھروں کو آرام و سکون کی جگہ، اور بنائے تمہارے لئے جانوروں کی کھالوں سے گھر (خیمے)، جنہیں تم ہلکا پھلکا پاتے ہو، سفر کے دن بھی اور قیام کے دن بھی، اور اسی نے بنائے ہیں بھیڑوں کی صوف اور اونٹوں کی اون اور بکریوں کے بالوں سے مختلف گھریلو سامان اور استعمال کی چیزیں ایک وقت مقرر تک"۔(سورۃ النحل: 80)

۴) نکاح کو جائز کر کے، بلکہ بسا اوقات نکاح کو واجب کر کے شادی اور خاندان کی ضرورت کو منضبط کیا ہے، اسی طرح بدکاری، دھوکہ دہی اور لواطت کو حرام قرار دے کر اس کو ہر قسم کی آلودگی سے پاک کیا ہے، اِرشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَٱلَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَٰفِظُونَ ۝ إِلَّا عَلَىٰٓ أَزْوَٰجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَٰنُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ۝ فَمَنِ ٱبْتَغَىٰ وَرَآءَ ذَٰلِكَ فَأُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْعَادُونَ﴾ ترجمہ: "وہ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، بجز اپنی بیویوں اور اپنی کنیزوں کے، سو اس بارے میں ان کو کوئی ملامت نہیں"۔(سورۃ المؤمنون: 5-7)

۵) ملکیت اور سرپرستی کو بھی منضبط کیا ہے، چنانچہ اسلام نے شرائط و ضوابط کے مطابق مال و جائیداد کی ملکیت کو جائز قرار دیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ءَامِنُوا۟ بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ وَأَنفِقُوا۟ مِمَّا جَعَلَكُم مُّسْتَخْلَفِينَ فِيهِ ۖ فَٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ مِنكُمْ وَأَنفَقُوا۟ لَهُمْ أَجْرٌ كَبِيرٌ﴾ ترجمہ: "ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور خرچ کرو اُن چیزوں میں سے جن پر اس نے تم کو خلیفہ بنایا ہے، جو لوگ تم میں سے ایمان لائیں گے اور مال خرچ کریں گے ان کے لئے بڑا اجر ہے"۔(سورۃ الحدید: 7)

۶) ظلم و زیادتی اور دوسروں کی حق تلفی کو حرام کر کے حقوق و اختیارات کو منتخب کیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ ٱفْتَرَىٰ عَلَى ٱللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِـَٔايَٰتِهِۦٓ ۚ إِنَّهُۥ لَا يُفْلِحُ ٱلظَّٰلِمُونَ﴾ ترجمہ: " اور اُس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹا بہتان لگائے، یا اللہ کی نشانیوں کو جھٹلائے؟ یقیناً ایسے ظالم کبھی فلاح نہیں پا سکتے"۔(سورۃ الانعام: 21) دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿وَقَوْمَ نُوحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا۟ ٱلرُّسُلَ أَغْرَقْنَٰهُمْ وَجَعَلْنَٰهُمْ لِلنَّاسِ ءَايَةً ۖ وَأَعْتَدْنَا لِلظَّٰلِمِينَ عَذَابًا أَلِيمًا﴾ ترجمہ: "یہی حال قوم نوحؑ کا ہوا جب انہوں نے رسولوں کی تکذیب کی، ہم نے اُن کو غرق کر دیا اور دنیا بھر کے لوگوں کے لئے ایک نشانِ عبرت بنا دیا اور ان ظالموں کے لئے ایک دردناک عذاب ہم نے مہیا کر رکھا ہے"۔(سورۃ الفرقان: 37) ایک اور مقام پر ہے: ﴿إِنَّ ٱللَّهَ يَأْمُرُ بِٱلْعَدْلِ وَٱلْإِحْسَٰنِ وَإِيتَآئِ ذِى ٱلْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ ٱلْفَحْشَآءِ وَٱلْمُنكَرِ وَٱلْبَغْىِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ﴾ ترجمہ: "بے شک اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے عدل کا، احسان کا اور اہلِ قرابت کو دیتے رہنے کا، اور روکتا ہے بے حیائی، برائی اور سرکشی سے، تو وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم نصیحت قبول کرو"۔(سورۃ النحل: 90)

۷) عمل اور کامیابی کو اس طور پر مضبط کیا ہے کہ عمل کے لئے اس بات کو ضروری قرار دیا ہے کہ وہ شریعت کے مطابق ہو اور کسی کے لئے بھی مضر اور نقصان دہ نہ ہو، اور مسلمانوں کے لئے اس بات کو لازمی قرار دیا ہے کہ وہ اس دنیا میں عملی میدان میں اس قدر جد وجہد کریں جس کے نتیجے میں وہ دعوت اور دین کی ذمہ داری کو احسن طریقہ سے ادا کر سکیں اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے پاس اجر عظیم کے بھی مستحق قرار پا سکیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿قَالُوٓاْ أُوذِينَا مِن قَبۡلِ أَن تَأۡتِيَنَا وَمِنۢ بَعۡدِ مَا جِئۡتَنَاۚ قَالَ عَسَىٰ رَبُّكُمۡ أَن يُهۡلِكَ عَدُوَّكُمۡ وَيَسۡتَخۡلِفَكُمۡ فِي ٱلۡأَرۡضِ فَيَنظُرَ كَيۡفَ تَعۡمَلُونَ﴾ ترجمہ: "اس کی قوم کے لوگوں نے کہا "تیرے آنے سے پہلے بھی ہم ستائے جاتے تھے اور اب تیرے آنے پر بھی ستائے جا رہے ہیں"۔ اس نے جواب دیا "قریب ہے وہ وقت کہ تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور تم کو زمین میں خلیفہ بنائے، پھر دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو"۔ (سورۃ الأعراف: 129)

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کی بہت سی آیات میں علم کو ایمان کے ساتھ مربوط کیا ہے اور عمل میں یہ بنیادی شرط عائد کر دی ہے کہ وہ صالح ہو، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَعَمِلُواْ ٱلصَّٰلِحَٰتِ إِنَّا لَا نُضِيعُ أَجۡرَ مَنۡ أَحۡسَنَ عَمَلًا﴾ ترجمہ: "رہے وہ لوگ جو مان لیں اور نیک عمل کریں، تو یقیناً ہم نیکوکار لوگوں کا اجر ضائع نہیں کیا کرتے"۔ (سورۃ الکھف: 30) اور عمل میں احسان اور حسنِ عمل کا بھی مطالبہ کیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ ٱللَّهَ يَأۡمُرُ بِٱلۡعَدۡلِ وَٱلۡإِحۡسَٰنِ وَإِيتَآيِٕ ذِي ٱلۡقُرۡبَىٰ وَيَنۡهَىٰ عَنِ ٱلۡفَحۡشَآءِ وَٱلۡمُنكَرِ وَٱلۡبَغۡيِۚ يَعِظُكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَذَكَّرُونَ﴾ ترجمہ: "بے شک اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے عدل کا، احسان کا اور اہلِ قرابت کو دیتے رہنے کا، اور روکتا ہے بے حیائی، برائی اور سرکشی سے، تو وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم نصیحت قبول کرو"۔ (سورۃ النحل: 90)

۸) اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے غرور و تکبر اور نعمتوں کے ذریعہ دھوکہ کھانے سے اجتناب کرنے کا حکم دیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَكَمۡ أَهۡلَكۡنَا مِن قَرۡيَةِۭ بَطِرَتۡ مَعِيشَتَهَاۖ فَتِلۡكَ مَسَٰكِنُهُمۡ لَمۡ تُسۡكَن مِّنۢ بَعۡدِهِمۡ إِلَّا قَلِيلٗاۖ وَكُنَّا نَحۡنُ ٱلۡوَٰرِثِينَ﴾ ترجمہ: "اور کتنی ہی ایسی بستیاں ہم تباہ کر چکے ہیں جن کے لوگ اپنی معیشت پر اترا گئے تھے سو دیکھ لو، وہ ان کے مسکن پڑے ہوئے ہیں جن میں ان کے بعد کم ہی کوئی بسا ہے، آخر کار ہم ہی وارث ہو کر رہے"۔ (سورۃ القصص: 58)

یہ وہ بعض اصول و ضوابط ہیں جن کی اساس پر نبی کریم ﷺ صحابہ کرام کی جسمانی تربیت فرمایا کرتے تھے، تاکہ جسم دعوتی جد وجہد، دین کی سربلندی اور زندگی کے مصائب و آلام کے بوجھ کو برداشت کر سکے۔

یقیناً نبی کریم ﷺ ایک منضبط منہج کے مطابق صحابہ کرام کی تربیت فرمایا کرتے تھے، جس میں روح کا تزکیہ بھی ہوتا ہے، عقلوں کو بھی صیقل کیا جاتا ہے اور جسم کی حفاظت و تقویت کے اقدامات بھی کئے جاتے ہیں، تاکہ ایک متوازن ربانی اسلامی شخصیت کی تشکیل و تعمیر کی جا سکے اور یہ بات یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ نبوی تربیت نے اپنے متعین اہداف و مقاصد بحسن و خوبی حاصل کر لئے۔

۴: صحابہ کرام کی اخلاقی تربیت:

بلاشبہ بلند اخلاق عقیدہ کا ایک اہم حصہ ہے، صحیح عقیدہ کا تصور بغیر اخلاق کے ممکن نہیں ہے، اسی لئے اللہ کے رسول ﷺ نے مختلف اسالیب اور طریقوں سے صحابہ کرام کی اخلاقی تربیت فرمائی، آپ ﷺ ان کے سامنے قرآنی آیات کی تلاوت فرماتے تھے اور جب وہ قرآن سنتے تھے تو اس پر تدبر کرتے تھے اور اس کی تعلیمات کے مطابق عمل کرتے تھے۔

مکی دور میں نازل ہونے والی قرآنی آیات میں جو بھی غور کرے گا اس کو محسوس ہوگا کہ اس میں مکارمِ اخلاق اور روح کی صفائی اور پاکیزگی پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے، اور رسول ہدایت ﷺ جو امت کے لئے ایک کامل و مکمل نمونہ اور خیر خواہ مزلی تھے، اخلاق کے اعلیٰ معیار پر فائز تھے، جیسے کہ خود اللہ تعالیٰ سے نے گواہی دی ہے کہ: ﴿وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾ ترجمہ: ”اور بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو“۔ (سورۃ القلم: 4) یعنی: آپ اس اخلاقی مقام پر فائز ہے ہیں جس پر فائز ہونے کا اللہ تعالیٰ نے قرآن میں آپ سے مطالبہ کیا ہے۔ (دیکھیں: فقہ التمکین فی القرآن الکریم، الصلابی، ص354)

حضرت عائشہؓ سے جب اللہ کے رسول ﷺ کے اخلاق کی بابت دریافت کیا گیا تو آپؓ کا جواب تھا: "نبی کریم ﷺ کے اخلاق تو سراپا قرآن تھے"۔ (صحیح مسلم: 746، مسند أحمد: 6/56، سنن أبو داود: 1342)

اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول میں نبی کریم ﷺ کے تمام مکارم اخلاق کو جمع کر دیا ہے: ﴿خُذِ ٱلْعَفْوَ وَأْمُرْ بِٱلْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ ٱلْجَٰهِلِينَ﴾ ترجمہ: ”اے نبیؐ، نرمی و درگزر کا طریقہ اختیار کرو، معروف کی تلقین کئے جاؤ، اور جاہلوں سے نہ الجھو“۔ (سورۃ الأعراف: 199) دوسروں کی بد اخلاقی کا جواب بھی حسنِ اخلاق کے ساتھ دینے کا حکم دیا گیا ہے، جیسے کہ ایمان والوں کی صفات بیان کی گئی ہے: ﴿وَعِبَادُ ٱلرَّحْمَٰنِ ٱلَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى ٱلْأَرْضِ هَوْنًا وَإِذَا خَاطَبَهُمُ ٱلْجَٰهِلُونَ قَالُوا۟ سَلَٰمًا﴾ ترجمہ: ”رحمان کے (اصلی) بندے وہ ہیں جو زمین پر نرم چال چلتے ہیں اور جاہل ان کے منہ کو آئیں تو کہہ دیتے ہیں کہ تم کو سلام ہو“۔ (سورۃ الفرقان: 63)

یقیناً اللہ کے رسول ﷺ سراپا اخلاق تھے، جیسے کہ حدیث میں ہے کہ ”نبی کریم ﷺ لوگوں میں سب سے بہتر اخلاق والے تھے"۔ (صحیح بخاری: 6203، صحیح مسلم: 659)

نبی کریم ﷺ صحابہ کرام کی اخلاقی تربیت فرمایا کرتے تھے اور ان کو حسن اخلاق کی ترغیب دیتے تھے، چنانچہ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: قیامت کے دن مؤمن کی میزان میں حسنِ اخلاق سے بھاری چیز کوئی نہیں ہوگی اور اللہ تعالیٰ فحش گو اور گھٹیا انسان کو ناپسند کرتا ہے"۔ (سنن أبو داؤد: 4799، سنن ترمذی: 2002، ابن حبان: 476)

اللہ کے رسول ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ کون سی چیز ہے جس کی وجہ سے زیادہ تر لوگ جنت میں داخل ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کا تقویٰ اور حسنِ اخلاق۔ اور آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کس چیز کی وجہ سے سب سے زیادہ لوگ جہنم میں داخل ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "منہ اور شرمگاہ"۔ (مسند أحمد: 2/392، سنن ترمذی: 2004، سنن ابن ماجہ: 4246، ابن حبان: 476)

نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام کو حسنِ اخلاق کے عظیم ثواب سے بھی آگاہ فرمایا تھا، آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''بے شک میرے نزدیک تم میں سب سے زیادہ محبوب اور بروزِ قیامت مجلس میں میرے نزدیک وہ شخص ہو گا جو تم میں اخلاق کے اعتبار سے سب سے بہتر ہو گا۔ اور میرے نزدیک تم میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ اور بروز قیامت مجلس میں مجھ سے سب سے زیادہ دور وہ لوگ ہوں گے جو بلاضرورت بولنے والے، منہ پھاڑ پھاڑ کر بولنے والے اور تکبر کرنے والے ہوں گے۔ صحابہ کرام نے پوچھا: اللہ کے رسول! ہم "ثرثارون" اور "متشدقون" کے معنی تو جانتے ہیں۔ "متفیہقون" کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تکبر کرنے والے"۔(سنن ترمذی:2018)

''الثرثار'': بنا کسی دینی فائدہ کے بہت زیادہ باتیں کرنے والا۔

''المتشدق'': ایسا شخص جو اپنی بات اونچی رکھنے کے لئے، اپنی بڑائی جتانے کے لئے تکبر کرتے ہوئے منہ پھاڑ پھاڑ کر باتیں کرے۔

المتفیہق: وہ شخص جو ہر طرح کی باتیں کرتا ہے اور منہ کھول کھول کر بولتا رہے۔(دیکھیں: تہذیب مدارج السالکین 2/653)

نبی کریم ﷺ صحابہ کرام کی اخلاقی تربیت قرآنی منہج کے مطابق کرتے رہے، عبادت وعقائد کے ساتھ ساتھ بیک وقت اخلاقیات کا بھی درس دیا جاتا تھا، اس لئے کہ کتاب اللہ میں اخلاق اور عقائد کا باہمی تعلق بالکل واضح ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ اور تمام مسلمانوں کے سامنے "لا الہ الا اللہ" کے ذریعہ ایمانی اخلاقیات کو واضح کر دیا تھا جن کے ذریعہ ایمان والوں کو آراستہ ہونا چاہیے، اسی طرح ان جاہلی اعمال کو بھی واضح کر دیا تھا جن سے اہل ایمان کو اجتناب کرنا چاہیے، حقیقت یہ ہے کہ جاہلی عادات واطوار کی مذمت پہلے ہی مرحلے میں کی گئی اور ساتھ میں ان کے اعتقادی تصورات کی خرابی کو بھی واضح کیا جاتا رہا اور یہ سلسلہ اخیر تک مسلسل جاری رہا۔

بلاشبہ اخلاقیات کی دینِ اسلام میں کوئی ثانوی حیثیت نہیں ہے اور نہ ہی اخلاق کا تصور کوئی محدود تصور ہے، اخلاق تو دین کی ایک اہم بنیاد ہیں، اخلاق کا تعلق انسان کے پورے طرزِ زندگی کے ساتھ ہے، اسی طرح انسان کے تمام اعمال میں اخلاق کا واضح عکس نظر آتا ہے، اور یہ اخلاق واعمال صحیح ایمان واعتقاد کی عملی دلیل ہوا کرتے ہیں، اس لئے کہ ایمان صرف ضمیر کے اندر پوشیدہ احساسات وجذبات کا نام نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ عملی طرزِ زندگی اور ظاہر ہونے والے اعمال بھی اس کا اہم حصہ ہیں، اس طور پر اگر ہم کسی کی زندگی میں ایمان کے مطابق طرز زندگی کا مشاہدہ نہ کریں، یا ایمان کے بر خلاف کوئی چیز دیکھیں تو ہم یہ سوال کر سکتے ہیں کہ ایمان کہاں ہے؟ اور ایمان کا کیا کردار ہے جب کہ وہ عمل میں تبدیل نہ ہو؟! اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم اخلاق اور عقائد کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کر کے پیش کرتا ہے، اور دونوں کا باہمی گہرا ربط بیان کرتا ہے، اس کی قرآن پاک میں بہت سی مثالیں موجود ہیں، ان میں سے سورۃ المؤمنون کی یہ آیات بھی ہیں:

﴿قَدْ أَفْلَحَ ٱلْمُؤْمِنُونَ ۝١ ٱلَّذِينَ هُمْ فِى صَلَاتِهِمْ خَـٰشِعُونَ ۝٢ وَٱلَّذِينَ هُمْ عَنِ ٱللَّغْوِ مُعْرِضُونَ ۝٣ وَٱلَّذِينَ
هُمْ لِلزَّكَوٰةِ فَـٰعِلُونَ ۝٤ وَٱلَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَـٰفِظُونَ ۝٥ إِلَّا عَلَىٰٓ أَزْوَٰجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَـٰنُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ
مَلُومِينَ ۝٦ فَمَنِ ٱبْتَغَىٰ وَرَآءَ ذَٰلِكَ فَأُو۟لَـٰٓئِكَ هُمُ ٱلْعَادُونَ ۝٧ وَٱلَّذِينَ هُمْ لِأَمَـٰنَـٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَٰعُونَ ۝٨

وَٱلَّذِينَ هُمۡ عَلَىٰ صَلَوَٰتِهِمۡ يُحَافِظُونَ ۝٩ أُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلۡوَٰرِثُونَ ۝١٠ ٱلَّذِينَ يَرِثُونَ ٱلۡفِرۡدَوۡسَ هُمۡ فِيهَا خَٰلِدُونَ ۝١١﴾ ترجمہ: ”بے شک ایمان والے کامیاب ہو گئے۔ جو اپنی نماز میں عاجزی کرنے والے ہیں۔ اور جو بے ہودہ باتوں سے منہ موڑنے والے ہیں۔ اور جو زکوۃ دینے والے ہیں۔ اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ مگر اپنی بیویوں یا لونڈیوں پر اس لئے کہ ان میں کوئی الزام نہیں۔ پس جو شخص اس کے علاوہ طلب گار ہو تو وہی حد سے نکلنے والے ہیں۔ اور جو اپنی امانتوں اور اپنے وعدہ کا لحاظ رکھنے والے ہیں۔ اور جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ وہی وارث ہیں۔ جو جنت الفردوس کے وارث ہوں گے، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے“۔ (سورۃ المؤمنون: 1- 11)

ان آیات کے ذریعہ یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ اخلاقی اوصاف ایمان کا ثمرہ اور نتیجہ ہیں، اور دوسرے اعتبار سے ایمان اصل میں اس طرز زندگی کے ذریعہ ظاہر ہوتا ہے جس کے ذریعہ عقیدہ کی ترجمانی ہوتی ہے، اس کے ذریعہ ہم سمجھ سکتے ہیں کہ صحابہ کرام کا اخلاق کے حوالے سے کیا فہم اور ذوق تھا، وہ قرآن کی روشنی میں یہ سمجھتے تھے کہ اخلاق صحیح عقیدہ کا عکس اور نتیجہ ہے، اور اسی طرح سے ایک زندہ اور شعوری عبادت اور خشوع و خضوع سے لبریز عبادت ایمان کا لازمی تقاضا ہے، قرآن کریم نے صحابہ کرام کے سامنے ایک مؤمن شخصیت کی واضح تصویر پیش کی تھی اور عبادت اس شخصیت کا ایک امتیازی نشان تھی۔

بے شک قرآن کریم کبھی تو عبادت کے پہلو کو نمایاں کرتا ہے اور کبھی اخلاق کے پہلو کو نمایاں مقام دیتا ہے اور ایسا موقع و محل کے اعتبار سے کیا جاتا ہے، سورۃ الذاریات میں متقیوں کے اوصاف بیان کرتے ہوئے عبادت کے پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:
﴿ءَاخِذِينَ مَآ ءَاتَىٰهُمۡ رَبُّهُمۡۚ إِنَّهُمۡ كَانُواْ قَبۡلَ ذَٰلِكَ مُحۡسِنِينَ ۝١٦ كَانُواْ قَلِيلٗا مِّنَ ٱلَّيۡلِ مَا يَهۡجَعُونَ ۝١٧ وَبِٱلۡأَسۡحَارِ هُمۡ يَسۡتَغۡفِرُونَ ۝١٨ وَفِيٓ أَمۡوَٰلِهِمۡ حَقّٞ لِّلسَّآئِلِ وَٱلۡمَحۡرُومِ ۝١٩﴾ ترجمہ: ”جو کچھ اُن کا رب انہیں دے گا اسے خوشی خوشی لے رہے ہوں گے، وہ اُس دن کے آنے سے پہلے نیکوکار تھے۔ راتوں کو کم ہی سوتے تھے۔ پھر وہی رات کے پچھلے پہروں میں معافی مانگتے تھے۔ اور اُن کے مالوں میں حق تھا سائل اور محروم کے لئے“۔ (سورۃ الذاریات 16-19)

جبکہ سورۃ الرعد میں اصحاب عقل و دانش کے اوصاف ذکر کرتے ہوئے اخلاقی پہلو کو نمایاں جگہ دی گئی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:
﴿أَفَمَن يَعۡلَمُ أَنَّمَآ أُنزِلَ إِلَيۡكَ مِن رَّبِّكَ ٱلۡحَقُّ كَمَنۡ هُوَ أَعۡمَىٰٓۚ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُوْلُواْ ٱلۡأَلۡبَٰبِ ۝١٩ ٱلَّذِينَ يُوفُونَ بِعَهۡدِ ٱللَّهِ وَلَا يَنقُضُونَ ٱلۡمِيثَٰقَ ۝٢٠ وَٱلَّذِينَ يَصِلُونَ مَآ أَمَرَ ٱللَّهُ بِهِۦٓ أَن يُوصَلَ وَيَخۡشَوۡنَ رَبَّهُمۡ وَيَخَافُونَ سُوٓءَ ٱلۡحِسَابِ ۝٢١ وَٱلَّذِينَ صَبَرُواْ ٱبۡتِغَآءَ وَجۡهِ رَبِّهِمۡ وَأَقَامُواْ ٱلصَّلَوٰةَ وَأَنفَقُواْ مِمَّا رَزَقۡنَٰهُمۡ سِرّٗا وَعَلَانِيَةٗ وَيَدۡرَءُونَ بِٱلۡحَسَنَةِ ٱلسَّيِّئَةَ أُوْلَٰٓئِكَ لَهُمۡ عُقۡبَى ٱلدَّارِ ۝٢٢﴾ ترجمہ: ”بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ شخص جو تمہارے رب کی اِس کتاب کو جو اس نے تم پر نازل کی ہے حق جانتا ہے، اور وہ شخص جو اس حقیقت کی طرف سے اندھا ہے، دونوں یکساں ہو جائیں؟ نصیحت

تو دانش مند لوگ ہی قبول کیا کرتے ہیں۔ اور اُن کا طرز عمل یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں، اُسے مضبوط باندھنے کے بعد توڑ نہیں ڈالتے۔ اُن کی روش یہ ہوتی ہے کہ اللہ نے جن جن روابط کو برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے انہیں برقرار رکھتے ہیں، اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور اس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ کہیں ان سے بری طرح حساب نہ لیا جائے۔ اُن کا حال یہ ہوتا ہے کہ اپنے رب کی رضا کے لئے صبر سے کام لیتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، ہمارے دیے ہوئے رزق میں سے علانیہ اور پوشیدہ خرچ کرتے ہیں، اور برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں، آخرت کا گھر انہی لوگوں کے لئے ہے"۔ (سورۃ الرعد: 22-19)

اگرچہ اُولو الألباب کی مناسبت سے یہاں پر ذکر کردہ اکثر اوصاف اخلاقیات سے تعلق رکھتے ہیں جیسے کہ: ایفائے عہد، صلہ رحمی، صبر اور انفاق، لیکن اس میں قابل غور بات یہ ہے کہ یہ صرف سماجی اخلاق نہیں ہیں بلکہ یہ ربانی اخلاق ہیں جن میں عبادت و تقوی کا بھی پہلو قابل لحاظ ہے، اس لئے کہ اہل ایمان ایفائے عہد، صلہ رحمی، صبر، انفاق کسی بھی چیز پر عمل یا کسی بھی ممنوع فعل سے اجتناب صرف اس لئے کرتے ہیں کیونکہ وہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں، اور سخت حساب کا اندیشہ رکھتے ہیں، اور وہ ان تمام اعمال اور کیفیات میں رضائے الٰہی اور آخرت میں کامیابی کے امیدوار ہیں۔ (دیکھیں: تہذیب مدارج السالکین 2/657)

صحابہ کرام کی تربیت اس انداز سے ہوئی تھی کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ عبادت اخلاق ہی کی ایک قسم اور اس کا تقاضا ہے، اس لئے کہ یہ اللہ سے کئے ہوئے عہد کو وفا کرنے، اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے، اعتراف کرنے اور اس کی تعظیم و توقیر ہی کی مختلف شکلیں ہیں، اور ان تمام امور کا تعلق مکارم اخلاق سے ہے۔ (دیکھیں: دراسات قرآنیہ محمد قطب، ص 130)

صحابہ کرام کے اخلاق ربانی تھے، جن کی بنیاد ایمان باللہ پر تھی اور ان کے لئے تحریک اور مہمیز کا کام آخرت کی امید کرتی تھی اور رضائے الٰہی اور اس کا اجر و ثواب تھا، یہی وجہ تھی کہ وہ ہمیشہ سچ بولتے تھے، امانت ادا کرتے تھے، عہد و پیمان کا پاس و لحاظ کرتے تھے، مصیبت و پریشانی میں صبر کرتے تھے، پریشان حال اور مظلوم کی مدد کرتے تھے، چھوٹے پر رحم اور بڑے کی توقیر و عزت کرتے تھے، اور اپنے تمام اعمال میں فضائل کی رعایت کرتے تھے اور یہ سب کچھ صرف اللہ کی رضاجوئی کے لئے کرتے تھے، جیسے کہ ارشاد ربانی ہے: ﴿فَوَقَىٰهُمُ ٱللَّهُ شَرَّ ذَٰلِكَ ٱلْيَوْمِ وَلَقَّىٰهُمْ نَضْرَةً وَسُرُورًا ۝١١ وَجَزَىٰهُم بِمَا صَبَرُوا۟ جَنَّةً وَحَرِيرًا﴾ ترجمہ: "پس اللہ تعالیٰ انہیں اُس دن کے شر سے بچالے گا اور انہیں تازگی اور سرور بخشے گا۔ اور اُن کے صبر کے بدلے میں اُنہیں جنت اور ریشمی لباس عطا کرے گا"۔ (سورۃ الانسان: 12-11)

بے شک مؤمن کے تمام اخلاق عبادت میں شمار ہوتے ہیں، اس لئے کہ یہ فضائل و رذائل میں اور مأمورات اور منہیات میں ایک مؤمن کے نزدیک اصل معیار اللہ تعالیٰ کا حکم یا اس کی نہی ہے۔ (دیکھیں: العبادۃ فی الاسلام، القرضاوی، ص 123)

بے شک نبوی تربیت میں اخلاق کا دائرہ انتہائی وسیع تھا جس میں انسان کے تمام اعمال، احساسات، جذبات اور افکار شامل تھے، چنانچہ نماز کے اندر بھی کچھ اخلاقیات ہیں جن میں اہم ترین خشوع ہے، گفتگو کے کچھ اخلاق ہیں جن میں اہم ترین لغویات سے اعراض ہے، خواہشات کے بھی کچھ اخلاقی حدود ہیں جن میں اہم پہلو یہ ہے کہ اللہ کے حدود اور محرمات کا پاس و لحاظ رکھا جائے، دوسروں کے ساتھ حسنِ سلوک کے

بھی کچھ اخلاق ہیں جن میں اہم پہلو یہ ہے کہ بخل اور اسراف کے مابین درمیانی طرزِ عمل اختیار کیا جائے، معاشرتی زندگی کے بعض اخلاقیات ہیں جن میں بنیادی چیز یہ ہے کہ تمام امور میں شورائی نظام قائم کیا جائے، غضب اور ناراضگی کے بھی کچھ اخلاق ہیں وہ یہ ہیں کہ عفو درگزر سے کام لیا جائے، دشمنوں کی طرف سے زیادتی کے موقع پر بھی کچھ اخلاق ہیں جن میں اہم ترین یہ ہے کہ ظلم وزیادتی کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس طرح ایک مسلمان کی زندگی میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی کچھ اخلاقیات اور آداب نہ ہوں اور کوئی بھی چیز ایسی نہیں ہے جس کا کوئی نہ کوئی اخلاقی پہلو نہ ہو۔

اخلاق کا ایک پہلو تو یہی ہے جس کا ذکر کیا گیا، اخلاق کا دوسرا پہلو جو کہ زیادہ اہم ہے، وہ یہ ہے کہ قرآنی مفہوم کے مطابق تمام اخلاق اللہ عزوجل کے لئے ہیں، یعنی سب میں صرف اللہ ہی کی خوشنودی مقصود ہے، نہ کہ کسی انسان کی اور نہ ہی اللہ کے علاوہ اور کسی کی، چنانچہ سچائی اللہ کے لئے ہے، ایفائے عہد بھی اللہ کے لئے ہے، محرمات سے اجتناب بھی اللہ کے لئے ہے، عفوودرگزر اور معافی بھی اللہ کے لئے ہے، ظلم کا بدلہ بھی اللہ ہی کے لئے ہے، کام کو عمدگی کے ساتھ انجام دینا بھی اللہ ہی کے لئے ہے۔ یہ تمام کام اللہ ہی کی عبادت کا حصہ ہیں، اللہ کی بارگاہ میں صرف اس سے خشیت وڈر کی وجہ سے اور اسی کی رضاجوئی کے لئے پیش کئے جائیں، یہ فائدہ یا نقصان کے لئے کیا جانے والا کوئی انسانی معاہدہ نہیں ہے، بلکہ یہ اللہ کے ساتھ کیا جانے والا معاہدہ ہے۔ (دیکھیں: الایمان والحیاۃ، القرضاوی، ص256)

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿قُلۡ تَعَالَوۡاْ أَتۡلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمۡ عَلَيۡكُمۡۖ أَلَّا تُشۡرِكُواْ بِهِۦ شَيۡـٔٗاۖ وَبِٱلۡوَٰلِدَيۡنِ إِحۡسَٰنٗاۖ وَلَا تَقۡتُلُوٓاْ أَوۡلَٰدَكُم مِّنۡ إِمۡلَٰقٖ نَّحۡنُ نَرۡزُقُكُمۡ وَإِيَّاهُمۡۖ وَلَا تَقۡرَبُواْ ٱلۡفَوَٰحِشَ مَا ظَهَرَ مِنۡهَا وَمَا بَطَنَۖ وَلَا تَقۡتُلُواْ ٱلنَّفۡسَ ٱلَّتِي حَرَّمَ ٱللَّهُ إِلَّا بِٱلۡحَقِّۚ ذَٰلِكُمۡ وَصَّىٰكُم بِهِۦ لَعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُونَ ۝١٥١ وَلَا تَقۡرَبُواْ مَالَ ٱلۡيَتِيمِ إِلَّا بِٱلَّتِي هِيَ أَحۡسَنُ حَتَّىٰ يَبۡلُغَ أَشُدَّهُۥۚ وَأَوۡفُواْ ٱلۡكَيۡلَ وَٱلۡمِيزَانَ بِٱلۡقِسۡطِۖ لَا نُكَلِّفُ نَفۡسًا إِلَّا وُسۡعَهَاۖ وَإِذَا قُلۡتُمۡ فَٱعۡدِلُواْ وَلَوۡ كَانَ ذَا قُرۡبَىٰۖ وَبِعَهۡدِ ٱللَّهِ أَوۡفُواْۚ ذَٰلِكُمۡ وَصَّىٰكُم بِهِۦ لَعَلَّكُمۡ تَذَكَّرُونَ ۝١٥٢ وَأَنَّ هَٰذَا صِرَٰطِي مُسۡتَقِيمٗا فَٱتَّبِعُوهُۖ وَلَا تَتَّبِعُواْ ٱلسُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمۡ عَن سَبِيلِهِۦۚ ذَٰلِكُمۡ وَصَّىٰكُم بِهِۦ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُونَ ۝١٥٣﴾ ترجمہ: ”اے محمدؐ! ان سے کہو کہ آؤ میں تمہیں سناؤں تمہارے رب نے تم پر کیا پابندیاں عائد کی ہیں: یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو، اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی دیں گے اور بے شرمی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی اور کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھیرایا ہے ہلاک نہ کرو مگر حق کے ساتھ، یہ باتیں ہیں جن کی ہدایت اس نے تمہیں کی ہے، شاید کہ تم سمجھ بوجھ سے کام لو۔ اور یہ کہ یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر ایسے طریقہ سے جو بہترین ہو، یہاں تک کہ وہ اپنے سنِ رشد کو پہنچ جائے اور ناپ تول میں پورا انصاف کرو، ہم ہر شخص پر ذمہ داری کا اتنا ہی بار رکھتے ہیں جتنا اس کے امکان میں ہے، اور جب بات کہو انصاف کی کہو، خواہ معاملہ اپنے رشتہ دار ہی کا کیوں نہ ہو، اور اللہ کے عہد کو پورا کرو، ان باتوں کی ہدایت اللہ نے تمہیں کی ہے شاید کہ تم نصیحت قبول کرو۔ نیز اس کی ہدایت یہ ہے کہ یہی میرا سیدھا راستہ ہے لہٰذا تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو

کہ وہ اس کے راستے سے ہٹا کر تمہیں پراگندہ کر دیں گے ، یہ ہے وہ ہدایت جو تمہارے رب نے تمہیں کی ہے، شاید کہ تم کج روی سے بچو"۔(سورۃ الأنعام: 151-153)

یہ وہ مکمل اور جامع اخلاقی میثاق ہے جس کا صحابہ کرام نے اور ان کے نقش قدم پر چلنے والوں نے التزام واہتمام کیا تاکہ وہ صراط مستقیم پر گامزن رہیں، اس لحاظ سے اس کا عقیدہ کے ساتھ گہرا تعلق ہے جس سے وہ کسی بھی حال میں جدا نہیں ہو سکتا ہے۔

بے شک اخلاقی اعمال کا زندگی کے تمام پہلوؤں کے ساتھ ربط و تعلق ہے اور وحی الٰہی نے ان کو ایک نمایاں مقام عطا کیا ہے، اس طور پر کہ ان کو دین وعبادت، باعثِ اجر وثواب اور مخالفت کی صورت میں سخت سزا کا باعث قرار دیا ہے۔ (دیکھیں: الوسطیۃ فی القران، ص592)

جب ہم سورۃ الأنعام کی سابقہ آیات پر غور کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ "ضروریات خمسہ" کے ذکر و بیان پر مشتمل ہے، اور وہ ضروریات ایسی ہیں جن کا دینی و دنیاوی مصالح کے قیام کے لئے موجود ہونا انتہائی ضروری ہے، اس لئے کہ اگر ان میں سے کوئی بھی مفقود ہو جائے تو کوئی بھی دنیاوی کام بہتر انداز سے انجام نہیں دیا جا سکتا ہے، بلکہ اس میں بگاڑ، انارکی اور کبھی زندگی سے محرومی کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے، اور پھر کامیابی، انعامات سے محرومی اور واضح خسران اور گھاٹے کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔(دیکھیں: دراسات قرآنیہ، ص139)

بلاشبہ نبی کریم ﷺ کی دعوت کے بنیادی مقاصد میں یہ بات شامل تھی کہ لوگوں کو شریعت کے مقاصد کی طرف متوجہ کیا جائے، جن میں سے ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ ضروریات خمسہ کی حفاظت و رعایت کی جائے، چنانچہ سابقہ آیات انہی ضروریات کی توضیح اور بیان پر مشتمل ہیں اور وہ ضروریات خمسہ مندرجہ ذیل ہیں:

أ) دین کی حفاظت: اللہ تعالی کے اس ارشاد میں دین کی حفاظت کا ذکر کیا گیا ہے: [أَلَّا تُشْرِكُوا۟ بِهِۦ شَيْـًٔا ۖ] ترجمہ: یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو"۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں بھی اس کا ذکر آیا ہے: [وَأَنَّ هَـٰذَا صِرَٰطِى مُسْتَقِيمًا فَٱتَّبِعُوهُ ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا۟ ٱلسُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَن سَبِيلِهِۦ] ترجمہ: "نیز اس کی ہدایت یہ ہے کہ یہی میرا سیدھا راستہ ہے لہٰذا تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اس کے راستے سے ہٹا کر تمہیں پراگندہ کر دیں گے"۔

کیونکہ شرک کے ہوتے ہوئے دین کا صحیح طور پر قائم رہنا ناممکن ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اسی ایک معبود برحق کی عبادت کی جائے اور اسی صراط مستقیم کی اتباع کی جائے جس میں کہیں سے باطل کے اثر انداز ہونے کا امکان نہیں ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے شیطانی راستوں پر چلنے سے منع کیا ہے، اس لئے کہ اس میں سراسر ضلالت و گمراہی کے راستے ہیں، اور ان پر چلنے میں دینِ حق سے اعراض اور خواہشِ نفس اور شیطانی وسوسوں کی پیروی لازم آتی ہے۔ (دیکھیں: الوسطیۃ فی القران الکریم، ص594)

اللہ کے رسول ﷺ نے دین پر عمل کر کے، اس کے لئے جد وجہد کے ذریعہ، اس کی دعوت دے کر، اس کے مطابق نظامِ زندگی اختیار کر کے اور اس کے برعکس ہر چیز کو رد کر کے دین کی حفاظت کی۔(دیکھیں: الموافقات الشاطبی 2/8)

ب) جان کی حفاظت: اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں جان کی حفاظت کا ذکر کیا گیا ہے: [وَلَا تَقْتُلُوٓاْ أَوْلَـٰدَكُم مِّنْ إِمْلَـٰقٍ] ترجمہ: ''اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو''۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں اس کو بیان کیا گیا ہے: [وَلَا تَقْتُلُواْ ٱلنَّفْسَ ٱلَّتِي حَرَّمَ ٱللَّهُ إِلَّا بِٱلْحَقِّ] ترجمہ: اور کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے ہلاک نہ کرو مگر حق کے ساتھ''۔

شریعت نے ان تمام وسائل کو بروئے کار لایا ہے جو انسانی جان کی حفاظت کے کفیل ہیں، ان وسائل میں چند وسائل یہ ہیں: انسانی جان پر زیادتی کو حرام قرار دیا ہے، ان تمام ذرائع پر قدغن لگائی ہے جو قتل کا باعث بن سکتے ہیں جیسے کہ قصاص کی سزا متعین کی ہے، قاتل کو سزا دینے کے لئے بیّنہ اور دلیل کو ضروری قرار دیا ہے، قصاص کے نفاذ میں تاخیر کو ضروری قرار دیا ہے، جبکہ قاتل کے علاوہ کسی اور کو قتل کرنے کا اندیشہ ہو، اسی طرح اضطرار کی صورت میں ممنوع امور کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ (دیکھیں: مقاصد الشریعۃ، د۔ محمد الیوبی، ص188-194)

ج) نسل کی حفاظت: ارشاد باری تعالیٰ ہے: [وَلَا تَقْرَبُواْ ٱلْفَوَٰحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ] ترجمہ: اور بے شرمی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی''۔ اور فواحش میں خطرناک ترین گناہ زنا ہے جس کو ایک خصوصی آیت میں بیان کیا گیا ہے: ﴿وَلَا تَقْرَبُواْ ٱلزِّنَىٰٓ إِنَّهُۥ كَانَ فَـٰحِشَةً وَسَآءَ سَبِيلًا﴾ ترجمہ: ''زنا کے قریب نہ پھٹکو، وہ بہت برا فعل ہے اور بڑا ہی برا راستہ''۔ (سورۃ الاسراء: 32)

بے شک نسل کا محفوظ رہنا زندگی کی اُساسیات سے تعلق رکھتا ہے، اور اسی کے نتیجے میں دنیا آباد رہ سکتی ہے، اور اس کے ذریعہ امت کو افرادی قوت فراہم ہو سکتی ہے، اس کے نتیجے میں وہ باعزت، سر اٹھا کر چلنے والی اور بارعب زندگی گزار سکتی ہے، جو اپنے دین، جان، مال اور عزت وآبرو کی حفاظت کر سکتی ہے، اسی لئے شریعت میں نسل کی حفاظت وحمایت کا بہت زیادہ اہتمام کیا گیا ہے، اور اس چیز کو ممنوع قرار دیا گیا ہے جس سے نسل انسانی متاثر ہو سکتی ہے، اور اس سلسلہ میں اہم شرعی اصول وضوابط وضع کئے گئے ہیں۔ (دیکھیں: الموافقات 4/27)

د) مال کی حفاظت: اللہ کے اس قول میں مال کی حفاظت کا ذکر کیا گیا ہے: [وَلَا تَقْرَبُواْ مَالَ ٱلْيَتِيمِ إِلَّا بِٱلَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُۥ وَأَوْفُواْ ٱلْكَيْلَ وَٱلْمِيزَانَ بِٱلْقِسْطِ] ترجمہ: ''اور یہ کہ یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر ایسے طریقہ سے جو بہترین ہو، یہاں تک کہ وہ اپنے سنِ رشد کو پہنچ جائے اور ناپ تول میں پورا انصاف کرو''۔ شریعت میں مال کی حفاظت کے وسائل میں سے یہ ہے کہ دوسرے کے مال میں زیادتی کو حرام قرار دیا گیا ہے، مال کو ضائع کرنے کو حرام قرار دیا گیا ہے، مدنی دور میں بعض حدود اسی لئے مشروع کی گئی ہیں، جیسے کہ چوری کی حد، لوٹ مال اور ڈاکہ زنی کی حد، تلف کی ہوئی چیزوں کا ضمان، مال کا دفاع کرنے کی مشروعیت، قرضوں کے معاہدے کو تحریر کرنا اور اس پر گواہ قائم کرنا، گری پڑی چیز (لقطہ) کا اعلان کرنا، وغیرہ۔ (دیکھیں: مقاصد الشریعہ، ص: 212)

ھ) عقل کی حفاظت: جہاں تک عقل کی حفاظت کا تعلق ہے تو وہ بھی مطلوب ہے، اس لئے کہ کسی بھی معاملہ کے بارے میں اسی شخص کو مکلف اور ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہے جس کی عقل صحیح سالم ہو، اور کسی بھی کام کو بے عقل یا فاسد العقل انجام نہیں دے سکتا ہے۔ اللہ کے اس

ارشاد "لعلکم تتقون" میں اس کی جانب رہنمائی کی گئی ہے، اسی لئے اسلام نے ہر اس چیز کو حرام قرار دیا ہے جس کی وجہ سے عقل میں بگاڑ پیدا ہونے یا کوئی خلل واقع ہونے کا اندیشہ ہو۔ (دیکھیں: مقاصد الشریعۃ: 257-287)

اسی طرح سے قرآنِ کریم ایک ہی وقت میں صحابہ کرام کی عقائد و اخلاق کے اعتبار سے، عبادات اور مقاصد شریعت کے اعتبار سے، تربیت کرتا تھا، بے شک ربانی اخلاق قرآن کریم کے اس سر چشمے سے پھوٹتے ہیں جس کی تہہ میں توحید اور اللہ کے لئے عبودیت و بندگی موجود ہوتی ہے، اور یہی قرآن کریم کا منہج تربیت ہے۔

قرآن کریم متعدد منفرد آداب پر مشتمل ہے، جن کا تعلق فضائل اور انفرادی و اجتماعی آداب سے ہے، چنانچہ "سورۃ الاسراء" میں اس سلسلہ کی جامع ترین آیات وارد ہوئی ہیں جن میں اخلاق محمودہ کی ترغیب دی گئی ہے اور مذموم اخلاق سے اجتناب کرنے کی تاکید کی گئی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِـدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَـرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّـهُمَا اُفٍّ وَّلَا تَنْـهَرْهُمَا وَقُلْ لَّـهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ﴿23﴾ وَاخْفِضْ لَـهُمَا جَنَاحَ الـذُّلِّ مِنَ الرَّحْـمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَـمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِىْ صَغِيْـرًا ﴿24﴾ رَّبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِىْ نُفُوْسِكُمْ ۚ اِنْ تَكُـوْنُـوْا صَالِحِيْنَ فَاِنَّه كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ﴿25﴾ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّه وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْـرًا ﴿26﴾ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُـوٓا اِخْوَانَ الشَّيَاطِيْنِ ۖ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ﴿27﴾ وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْـهُـمُ ابْتِغَـآءَ رَحْـمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَـرْجُوْهَا فَقُلْ لَّـهُـمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ﴿28﴾ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَـةً اِلٰى عُنُـقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ﴿29﴾ اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاءُ وَيَقْدِرُ ۚ اِنَّه كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْـرًا بَصِيْـرًا ﴿30﴾ وَلَا تَقْتُلُوٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۖ نَّحْنُ نَرْزُقُهُـمْ وَاِيَّاكُمْ ۚ اِنَّ قَتْلَـهُـمْ كَانَ خِطْئًا كَبِيْـرًا ﴿31﴾ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَـآ ۖ اِنَّه كَانَ فَاحِشَةً وَّسَاءَ سَبِيْلًا ﴿32﴾ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِىْ حَرَّمَ اللّـٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۗ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِـوَلِـيِّـهٖ سُلْطَانًا فَلَا يُسْـرِفْ فِّى الْقَتْلِ ۖ اِنَّه كَانَ مَنْصُوْرًا ﴿33﴾ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْـمِ اِلَّا بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ حَتّـٰى يَبْلُـغَ اَشُدَّه ۚ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۖ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا ﴿34﴾ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُـمْ وَزِنُـوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْـمِ ۚ ذٰلِكَ خَيْـرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿35﴾ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۚ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُـوْلًا ﴿36﴾ وَلَا تَمْشِ فِى الْاَرْضِ مَرَحًا ۖ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُـغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ﴿37﴾ كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُه عِنْدَ رَبِّكَ مَكْـرُوْهًا ﴿38﴾﴾

ترجمہ: "اور تیرا رب فیصلہ کر چکا ہے اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو، اور اگر تیرے سامنے ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو انہیں اف بھی نہ کہو، اور نہ انہیں جھڑکو اور ان سے ادب سے بات کرو۔ اور ان کے سامنے شفقت

سے عاجزی کے ساتھ جھکے رہو اور کہو: اے میرے رب جس طرح انہوں نے مجھے بچپن سے پالا ہے اسی طرح تو بھی ان پر رحم فرما۔ جو تمہارے دلوں میں ہے تمہارا رب خوب جانتا ہے، اگر تم نیک ہو گے تو وہ توبہ کرنے والوں کو بخشنے والا ہے۔ اور رشتہ دار اور مسکین اور مسافر کو اس کا حق دے دو، اور مال کو بے جا خرچ نہ کرو۔ بے شک بے جا خرچ کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں، اور شیطان اپنے رب کا ناشکر گزار ہے۔ اور اگر تجھے اپنے رب کے فضل کے انتظار میں کہ جس کی تجھے امید ہے منہ پھیرنا پڑے تو ان سے نرم بات کہہ دے۔ اور اپنا ہاتھ اپنی گردن کے ساتھ بندھا ہوا نہ رکھ اور نہ اسے کھول دے، بالکل ہی کھول دینا پھر تو پشیمان تہی دست ہو کر بیٹھ رہے گا۔ بے شک تیرا رب جس کے لئے چاہے رزق کشادہ کرتا ہے اور تنگ بھی کرتا ہے، بے شک وہ اپنے بندوں کو جاننے والا دیکھنے والا ہے۔ اور اپنی اولاد کو تنگ دستی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم انہیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمہیں بھی، بے شک ان کا قتل کرنا بڑا گناہ ہے۔ اور زنا کے قریب نہ جاؤ، بے شک وہ بے حیائی ہے اور بری راہ ہے۔ اور جس جان کو قتل کرنا اللہ نے حرام کر دیا ہے اسے ناحق قتل نہ کرنا، اور جو کوئی ظلم سے مارا جائے تو ہم نے اس کے ولی کے واسطے اختیار دے دیا ہے، لہٰذا قصاص میں زیادتی نہ کرے، بے شک اس کی مدد کی گئی ہے۔ اور یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ مگر جس طریقہ سے بہتر ہو جب تک وہ اپنی جوانی کو پہنچے، اور عہد کو پورا کرو، بے شک عہد کی بازپرس ہو گی۔ اور ناپ تول کرو تو پورا ناپو اور صحیح ترازو سے تول کر دو، یہ بہتر ہے اور انجام بھی اس کا اچھا ہے۔ اور جس بات کی تجھے خبر نہیں اس کے پیچھے نہ پڑ، بے شک کان اور آنکھ اور دل ہر ایک سے بازپرس ہو گی۔ اور زمین پر اتراتا ہوا نہ چل، بے شک تو نہ زمین کو پھاڑ ڈالے گا اور نہ لمبائی میں پہاڑوں تک پہنچے گا۔ ان میں سے ہر ایک بات تیرے رب کے ہاں ناپسند ہے"۔ (سورۃ الاسراء: 23- 38)

اللہ تعالیٰ نے اس اخلاقی لائحہ عمل میں توحید کو سرفہرست رکھا ہے، اس لئے کہ توحید کا ایک اہم اخلاقی پہلو بھی ہے، اس لئے کہ اس کے نتیجے میں عدل وانصاف اور اپنی ذات کے ساتھ مخلصانہ طرزِ عمل پیدا ہوتا ہے، جبکہ اس سے اعراض کے نتیجے میں انسان سب سے پہلے بداخلاقی کی دلدل میں گر جاتا ہے، جیسے کہ قبولِ حق کے بارے میں تکبر اور رسولوں کی اتباع کے بارے میں غرور اور انانیت اور عصبیت جیسی مذموم چیزیں آڑے آتی ہیں۔ اور یہ تمام خصلتیں ایسی ہیں جو انسانوں کو ہلاک کر دیتی ہیں اور حق واضح ہونے کے باوجود حق کو قبول کرنے میں رکاوٹ بنتی ہیں، اسی طرح دنیا اور آخرت کی کامیابی سے انسان کو دور رکھتی ہیں، حالانکہ انسان کو یہ یقین ہوتا ہے کہ رسولوں کا بتایا ہوا راستہ ہی برحق اور سچا ہے۔

ان آیات میں موجود اخلاقی نصائح کو اللہ تعالیٰ نے حکمت قرار دیا ہے، اور دعوتِ توحید اور شرک سے ممانعت پر پھر سے ان کا اختتام کیا ہے، اس لئے کہ ایمان باللہ ہر خیر کی چابی اور اس کی محافظ و نگہبان ہے اور کفر ہر شرک کی چابی اور اس کا باعث وسبب ہے۔ (دیکھیں: مقاصد الشریعہ، ص236)

یہ تھا وہ طرز و اسلوب جس کے مطابق قرآن کریم ایمان والوں کی تربیت کرتا تھا، جس میں محاسن اخلاق سے آراستہ ہونا اور بداخلاقی سے اجتناب کرنا رکن رکین اور بنیادی اینٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔

۵:   قرآنی واقعات کے ذریعہ مکارم اخلاق کی تربیت:

بلاشبہ قرآنی واقعات مواعظ وحِکم، اصول وعقائد، اخلاقی تعلیمات، تربیتی اسالیب اور اقوام وامم سے عبرت حاصل کرنے کے جملہ پہلوؤں پر مشتمل ہیں، قرآنی واقعات صرف تاریخی قصے نہیں ہیں جن کا فائدہ صرف مؤرخین کو ہو، بلکہ وہ اس سے کہیں افضل واعلیٰ حیثیت رکھتے ہیں، چنانچہ قرآنی واقعات توحید، علم، مکارمِ اخلاق، عقلی دلائل، بصیرت ونصائح اور نادر مقامات سے لبریز ہیں۔

اس کی سب سے بہترین مثال سیدنا یوسف علیہ السلام کا قصہ ہے، اس میں پیش کئے گئے اخلاقی پہلو کے بہترین مناظر پر غور کرنے سے اس کا حسن نمایاں ہوتا ہے۔ علمائے اخلاق اور حکماء کہتے ہیں: "امت کا نظام صرف ان لوگوں کے ذریعہ درست رہ سکتا ہے جو اصلاح کرنے والے ہوں، شاہرہ عدل وانصاف پر قائم رہنے والے اور عملی میدان میں کام کرنے والے ہوں، اور راہ حق کی جانب رہنمائی کرنے والے فضلاء ہوں۔ ان کے اندر کچھ متعین شرائط اور اہم صفات کا پایا جانا ضروری ہے، اگر یہ کام انجام دینے والا نبی ہو تو اس کے لئے علماء نے چالیس صفات ذکر کی ہیں جن کا تعلق آداب وفضائل سے ہے، انہی کے ذریعہ وہ امت کی قیادت ورہنمائی کرے گا، اور اگر وہ کوئی فضل وکمال کا حامل قائد ورئیس ہو تو اس میں چالیس میں سے کچھ ہی شرائط کا پایا جانا ضروری ہے اور سیدنا یوسف۔ علیہ السلام۔ رسولوں کے کمالات اور انبیاء کے حسن وجمال کے جامع تھے، ان کی سیرت میں وہ تمام چیزیں موجود ہیں جن کو امت کے عقلاء اہم ذمہ داریوں پر اہل اور باصلاحیت افراد کی تعیین کے سلسلہ میں نقشِ راہ بناتے ہیں، اس لئے کہ وہ نبوت اور حکومت دونوں کے جامع تھے، اب نبوت کے منصب کو حاصل کرنا کسی کے بس میں نہیں ہے، اس لئے کہ اس کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہے۔ اس لئے ہم یہاں پر معیاری شہر کی قیادت وسیادت کے لئے مطلوبہ صفات کا ذکر کریں گے اور ہم ان بارہ (۱۲) صفات کا ذکر کریں گے جو مثالی شہر کے قائد وسربراہ کے لئے اہم اور مطلوبہ صفات ہیں، تاکہ قرآن کریم میں غور وفکر کرنے والے کے لئے یاددہانی کا ذریعہ اور فضل وکمال کے لئے کوشاں اور سیکھنے والوں کے لئے نقشِ راہ بن سکیں۔ (دیکھیں: المنهاج القرآني في الشريعه، عبدالستار فتح اللہ سعید ص: 425-423)

مثالی شہر کے سربراہ کے لئے اہم مطلوبہ صفات:

1) عفت وپاکدامنی اور شہوات پر کنٹرول کرنے کی صلاحیت، تاکہ وہ اپنے آپ کو استقامت پر قائم رکھ سکے اور اس کی نفسیاتی قوت مضبوط تر ہو: ﴿وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِۦ ۖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ أَن رَّءَا بُرْهَـٰنَ رَبِّهِۦ ۚ كَذَٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ ٱلسُّوٓءَ وَٱلْفَحْشَآءَ ۚ إِنَّهُۥ مِنْ عِبَادِنَا ٱلْمُخْلَصِينَ﴾ ترجمہ: ''وہ اُس کی طرف بڑھی اور یوسفؑ بھی اس کی طرف بڑھتا اگر اپنے رب کی برہان نہ دیکھ لیتا، ایسا ہوا تاکہ ہم اس سے بدی اور بے حیائی کو دور کر دیں، در حقیقت وہ ہمارے چنے ہوئے بندوں میں سے تھا''۔ (سورۃ یوسف: 24)

2) غصہ کے وقت صبر اور بردباری تاکہ وہ ایسی صورتحال میں اپنے اوپر کنٹرول کر سکے: ﴿قَالُوٓا۟ إِن يَسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ أَخٌ لَّهُۥ مِن قَبْلُ ۚ فَأَسَرَّهَا يُوسُفُ فِى نَفْسِهِۦ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ ۚ قَالَ أَنتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۖ وَٱللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا تَصِفُونَ﴾ ترجمہ: ''ان بھائیوں نے کہا: یہ چوری کرے تو کچھ تعجب کی بات بھی نہیں، اس سے پہلے اس کا بھائی (یوسفؑ) بھی چوری کر چکا ہے۔ یوسفؑ ان کی یہ

بات سن کر پی گیا، حقیقت ان پر نہ کھولی بس (زیر لب) اتنا کہہ کر رہ گیا کہ بڑے ہی برے ہو تم لوگ، (میرے منہ در منہ مجھ پر) جو الزام تم لگا رہے ہو اس کی حقیقت خدا خوب جانتا ہے"۔(سورۃ یوسف:77)

3) نرمی کے موقع پر نرمی اور سختی کے موقع پر سختی کرنے کی صلاحیت: ﴿وَلَمَّا جَهَّزَهُم بِجَهَازِهِمْ قَالَ ٱئْتُونِى بِأَخٍ لَّكُم مِّنْ أَبِيكُمْ ۚ أَلَا تَرَوْنَ أَنِّىٓ أُوفِى ٱلْكَيْلَ وَأَنَا۠ خَيْرُ ٱلْمُنزِلِينَ ۝٥٩ فَإِن لَّمْ تَأْتُونِى بِهِۦ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِندِى وَلَا تَقْرَبُونِ ۝٦٠﴾ ترجمہ:" پھر جب اس نے ان کا سامان تیار کروادیا تو چلتے وقت ان سے کہا: "اپنے سوتیلے بھائی کو میرے پاس لانا، دیکھتے نہیں ہو کہ میں کس طرح پیمانہ بھر کر دیتا ہوں اور کیسا اچھا مہمان نواز ہوں۔ اگر تم اسے نہ لاؤ گے تو میرے پاس تمہارے لئے کوئی غلہ نہیں ہے بلکہ تم میرے قریب بھی نہ پھٹکنا"۔ سورۃ یوسف:59-60)

آیت کے آغاز میں نرمی کا ذکر ہے اور اخیر میں شدت و سختی کا ذکر ہے۔

4) اپنے رب پر اعتماد کرتے ہوئے خود اعتمادی؛ ﴿قَالَ ٱجْعَلْنِى عَلَىٰ خَزَآئِنِ ٱلْأَرْضِ ۖ إِنِّى حَفِيظٌ عَلِيمٌ﴾ ترجمہ:"یوسفؑ نے کہا: "ملک کے خزانے میرے سپرد کیجیے، میں حفاظت کرنے والا بھی ہوں اور علم بھی رکھتا ہوں"۔(سورۃ یوسف:55)

5) استحضار اور قوتِ یاداشت، تاکہ ماضی کی تمام چیزیں اس کے ذہن میں مستحضر رہیں اور اسی کے مطابق وہ آئندہ کی حکمتِ عملی اختیار کرے اور ہر شخص کے لئے اس کی صلاحیت کے مطابق ذمہ داری طے کر سکے؛ ﴿وَجَآءَ إِخْوَةُ يُوسُفَ فَدَخَلُوا۟ عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهُۥ مُنكِرُونَ ۝٥٨﴾ ترجمہ:" یوسفؑ کے بھائی مصر آئے اور اس کے ہاں حاضر ہوئے، اس نے انہیں پہچان لیا مگر وہ اس سے ناآشنا تھے"۔(سورۃ یوسف:58)

6) منظر کشی اور خیالی قوت میں عمدگی، تاکہ تمام چیزیں واضح طور پر نمایاں ہوں: ﴿إِذْ قَالَ يُوسُفُ لِأَبِيهِ يَـٰٓأَبَتِ إِنِّى رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَٱلشَّمْسَ وَٱلْقَمَرَ رَأَيْتُهُمْ لِى سَـٰجِدِينَ﴾ ترجمہ:"یہ اُس وقت کا ذکر ہے جب یوسفؑ نے اپنے باپ سے کہا :"ابا جان، میں نے خواب دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے ہیں اور سورج اور چاند ہیں اور وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں"۔(سورۃ یوسف:4)

7) علمی صلاحیت، علم سے محبت و دلچسپی اور اس پر قدرت: ﴿رَبِّ قَدْ ءَاتَيْتَنِى مِنَ ٱلْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِى مِن تَأْوِيلِ ٱلْأَحَادِيثِ ۚ فَاطِرَ ٱلسَّمَـٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ أَنتَ وَلِىِّۦ فِى ٱلدُّنْيَا وَٱلْـَٔاخِرَةِ ۖ تَوَفَّنِى مُسْلِمًا وَأَلْحِقْنِى بِٱلصَّـٰلِحِينَ﴾ ترجمہ:"اے میرے رب، تو نے مجھے حکومت بخشی اور مجھ کو باتوں کی تہ تک پہنچنا سکھایا، زمین و آسمان کے بنانے والے، تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا سرپرست ہے، میرا خاتمہ اسلام پر کر اور انجام کار مجھے صالحین کے ساتھ ملا"۔(سورۃ یوسف:101)

ایک اور مقام پر ہے: ﴿وَٱتَّبَعْتُ مِلَّةَ ءَابَآءِىٓ إِبْرَٰهِيمَ وَإِسْحَـٰقَ وَيَعْقُوبَ ۚ مَا كَانَ لَنَآ أَن نُّشْرِكَ بِٱللَّهِ مِن شَىْءٍ ۚ ذَٰلِكَ مِن فَضْلِ ٱللَّهِ عَلَيْنَا وَعَلَى ٱلنَّاسِ وَلَـٰكِنَّ أَكْثَرَ ٱلنَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ﴾ ترجمہ:"اپنے بزرگوں، ابراہیمؑ، اسحاقؑ اور

یعقوبؑ کا طریقہ اختیار کیا ہے، ہمارا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھیرائیں، درحقیقت یہ اللہ کا فضل ہے ہم پر اور تمام انسانوں پر (کہ اس نے اپنے سوا کسی کا بندہ ہمیں نہیں بنایا) مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے"۔(سورۃ یوسف:38)

8) کمزوروں پر شفقت، جلالتِ شان اور منصب بلند کے باوجود تواضع اور عاجزی، چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام نے دونوجوان قیدیوں کو تواضع اور انکساری کے ساتھ مخاطب کرتے ہوئے کہا: ﴿يَٰصَٰحِبَيِ ٱلسِّجۡنِ ءَأَرۡبَابٞ مُّتَفَرِّقُونَ خَيۡرٌ أَمِ ٱللَّهُ ٱلۡوَٰحِدُ ٱلۡقَهَّارُ﴾ ترجمہ:"اے زنداں کے ساتھیو، تم خود ہی سوچو کہ بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جو سب غالب ہے؟!"۔ (سورۃ یوسف:39) اور دینی اور دنیاوی دونوں طرح کے امور پر ان سے گفتگو کی: ﴿قَالَ لَا يَأۡتِيكُمَا طَعَامٞ تُرۡزَقَانِهِۦٓ إِلَّا نَبَّأۡتُكُمَا بِتَأۡوِيلِهِۦ قَبۡلَ أَن يَأۡتِيَكُمَاۚ ذَٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِي رَبِّيٓۚ إِنِّي تَرَكۡتُ مِلَّةَ قَوۡمٖ لَّا يُؤۡمِنُونَ بِٱللَّهِ وَهُم بِٱلۡأٓخِرَةِ هُمۡ كَٰفِرُونَ﴾ ترجمہ:" یوسفؑ نے کہا: "یہاں جو کھانا تمہیں ملا کرتا ہے اس کے آنے سے پہلے میں تمہیں ان خوابوں کی تعبیر بتادوں گا، یہ علم اُن علوم میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے عطا کیے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ میں نے اُن لوگوں کا طریقہ چھوڑ کر جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں"۔(سورۃ یوسف:37)

دونوں قیدیوں نے بھی بلا تکلف ان کے سامنے اپنی بات رکھی جس کو قرآن نے یوں بیان کیا ہے: ﴿وَدَخَلَ مَعَهُ ٱلسِّجۡنَ فَتَيَانِۖ قَالَ أَحَدُهُمَآ إِنِّيٓ أَرَىٰنِيٓ أَعۡصِرُ خَمۡرٗاۖ وَقَالَ ٱلۡأٓخَرُ إِنِّيٓ أَرَىٰنِيٓ أَحۡمِلُ فَوۡقَ رَأۡسِي خُبۡزٗا تَأۡكُلُ ٱلطَّيۡرُ مِنۡهُۖ نَبِّئۡنَا بِتَأۡوِيلِهِۦٓۖ إِنَّا نَرَىٰكَ مِنَ ٱلۡمُحۡسِنِينَ﴾ ترجمہ:"قید خانہ میں دو غلام اور بھی اس کے ساتھ داخل ہوئے، ایک روز اُن میں سے ایک نے اُن سے کہا: "میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں شراب کشید کر رہا ہوں" دوسرے نے کہا: "میں نے دیکھا کہ میرے سر پر روٹیاں رکھی ہیں اور پرندے ان کو کھا رہے ہیں"۔ دونوں نے کہا: "ہمیں اس کی تعبیر بتایئے، ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ایک نیک آدمی ہیں"۔ (سورۃ یوسف:36)

9) قدرت وطاقت کے وقت معاف کرنا: ﴿قَالَ لَا تَثۡرِيبَ عَلَيۡكُمُ ٱلۡيَوۡمَۖ يَغۡفِرُ ٱللَّهُ لَكُمۡۖ وَهُوَ أَرۡحَمُ ٱلرَّٰحِمِينَ﴾ ترجمہ:"اس نے جواب دیا: "آج تم پر کوئی گرفت نہیں، اللہ تمہیں معاف کرے، وہ سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے"۔ (سورۃ یوسف:92)

10) قرابت داری کا خیال اور صلہ رحمی: ﴿ٱذۡهَبُواْ بِقَمِيصِي هَٰذَا فَأَلۡقُوهُ عَلَىٰ وَجۡهِ أَبِي يَأۡتِ بَصِيرٗا وَأۡتُونِي بِأَهۡلِكُمۡ أَجۡمَعِينَ﴾ ترجمہ:"جاؤ، میری یہ قمیص لے جاؤ اور میرے والد کے منہ پر ڈال دو، اُن کی بینائی پلٹ آئے گی، اور اپنے سب اہل وعیال کو میرے پاس لے آؤ"۔(سورۃ یوسف:93)

11) بادشاہ کے خواب کی تعبیر بیان کرنے میں فصاحت وبیان کی صلاحیت، اسی طرح عام لوگوں، حاکم ومحکوم سب کے دلوں میں جگہ بنانے کی قدرت؛ اور یہ صرف علم وحکمت ہی کے نتیجے میں ہو سکتا ہے: ﴿فَلَمَّا كَلَّمَهُۥ قَالَ إِنَّكَ ٱلۡيَوۡمَ لَدَيۡنَا مَكِينٌ

أَمِينٌ﴾ ترجمہ: ''بادشاہ نے کہا: "اُنہیں میرے پاس لاؤ تاکہ میں ان کو اپنے لئے مخصوص کرلوں"۔ جب یوسفؑ نے اس سے گفتگو کی تو اس نے کہا: "اب آپ ہمارے ہاں قدر و منزلت رکھتے ہیں اور آپ کی امانت پر پورا بھروسا ہے"۔ (سورۃ یوسف: 54)

12) حسن تدبیر: ﴿قَالَ تَزْرَعُونَ سَبْعَ سِنِينَ دَأَبًا فَمَا حَصَدتُّمْ فَذَرُوهُ فِي سُنبُلِهِ إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّا تَأْكُلُونَ﴾ ترجمہ: ''یوسفؑ نے کہا: "سات برس تک لگاتار تم لوگ کھیتی باڑی کرتے رہوگے اس دوران میں جو فصلیں تم کاٹو اُن میں سے بس تھوڑا سا حصہ، جو تمہاری خوراک کے کام آئے، نکالو اور باقی کو اس کی بالوں ہی میں رہنے دو''۔ (سورۃ یوسف: 47)

بے شک قرآنی واقعات کا اخلاق کے ساتھ گہرا تعلق ہے، اس لئے کہ قرآنی واقعات کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اخلاق عالیہ کے بارے میں تذکیر کی جائے، جو فرد و خاندان، جماعت، حکومت، امت اور تہذیب و تمدن سب کے لئے مفید ہو، اسی طرح قرآنی واقعات کے مقاصد میں یہ بھی داخل ہے کہ برے اخلاق سے متنفر کیا جائے جو اقوام و امم کی ہلاکت و زوال کا سبب بنتے ہیں، صحابہ کرام نے نبوی تربیت سے اور آپ ﷺ کے طرز زندگی اور منہج تربیت سے استفادہ کیا، مذکورہ سطور میں قرآنی اور نبوی اخلاق کا ایک اجمالی خاکہ پیش کیا گیا جب کہ سنتِ رسول ﷺ اور آپؐ کی زندگی میں اس کی مکمل تفصیلات موجود ہیں، بے شک اخلاق کے بارے میں ربانی، قرآنی اور نبوی منہج ایک امتیازی شان رکھتا ہے، جس کی اور کہیں کوئی نظیر ملنا مشکل ہے، اس لئے کہ وہ رب العالمین کی طرف سے عطا کردہ ہے۔

نبوی منہجِ تربیت میں دوسرے پر اثر انداز ہونے، بات سمجھانے اور بات منوانے کے متنوع اسالیب اختیار کئے گئے ہیں تاکہ اخلاق نظریاتی دائرہ سے نکل کر عملی اور تطبیقی دائرہ میں داخل ہو جائیں، چاہے ان کا تعلق اعتقاد سے ہو، جیسے کہ اللہ تعالیٰ کی معیت و نگرانی کا تصور، آخرت کا تصور، یا ان کا تعلق عبادات سے ہو جیسے کہ وہ شعائر اللہ جو نفس اور ضمیر کی تربیت میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، نیتوں اور ارادوں کو صیقل کرتے ہیں اور نفس کا تزکیہ کرتے ہیں، اسلامی دعوت میں ترقی کے ساتھ ساتھ، اور اسلامی نظام کے حکومت تک پہنچنے کی وجہ سے بعض ایسے محرکات بھی وجود میں آئے جن کا تعلق خارج سے ہے، وہ محرکات مندرجہ ذیل پہلوؤں میں پائے جاتے ہیں:

۱۔ تشریع اور قانون سازی:

قانون سازی کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اخلاقی اقدار کی حفاظت کی جائے، جیسے کہ حدود، سزاؤں اور قصاص کے بارے میں قانون سازی کے پہلو پر غور کیجئے، اس کے ذریعہ فرد اور سوسائٹی دونوں قتل یا چوری کے ذریعہ دوسروں پر ہونے والی زیادتی سے محفوظ و مامون ہو جاتے ہیں، بدکاری اور تہمت سے عزت محفوظ ہو جاتی ہے، اور شراب نوشی اور مختلف نشہ آور اشیاء کے نتیجے میں ہونے والے جانی نقصان یا عقلی تعطل سے حفاظت ہوتی ہے۔

۲۔ سماجی اور معاشرتی خوف و ڈر اور کنٹرول:

اس معاشرتی خوف و ڈر کی اصل بنیاد اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ اس فریضے پر ہے جس کے بموجب ہر انسان پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ضروری ہے، اسی طرح اہل ایمان کی ایک دوسرے کے ساتھ خیر خواہی اور دیگر ذمہ داریاں بھی اس میں داخل ہیں، اللہ تعالیٰ نے

اس فریضے کو نماز اور زکوۃ کے ساتھ ،اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَيُطِيعُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ أُولَٰئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللَّهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾ ترجمہ:"مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں، بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی رحمت نازل ہو کر رہے گی، یقیناً اللہ سب پر غالب اور حکیم و دانا ہے"۔ (سورۃ التوبہ: 71)

بلکہ اس فریضے کو اللہ تعالیٰ نے اس امت کے افضل اور بہتر ہونے کی بنیاد قرار دیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ۗ وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُم ۚ مِّنْهُمُ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُونَ﴾ ترجمہ:"اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت واصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو، یہ اہل کتاب ایمان لاتے تو انہی کے حق میں بہتر تھا، اگرچہ ان میں کچھ لوگ ایمان دار بھی پائے جاتے ہیں مگر ان کے بیشتر افراد نافرمان ہیں"۔(سورۃ آل عمران:110)

اس طرح کے معاشرتی خوف وڈر اور کنٹرول کا ظہور اور اس کے اثرات مدنی دور میں ظہور پذیر ہوئے۔

۳۔ حکومت کا خوف وڈر:

نظام اور حکومت کی طرف سے خوف بھی اخلاقیات کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے، اسی لئے ایسی حکومت کا قیام واجب ہے جس کی بنیاد مضبوط اخلاقیات پر ہو، اور حکومت کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان اخلاقی اقدار کی حفاظت وحمایت کا کام انجام دے، اور اخلاق کو تمام افراد اور اداروں میں عام کرنے کی کوشش کرتی رہے، اور اس ذمہ داری کو اپنی اہم ذمہ داری اور مقصدِ وجود تصور کرے۔ (دیکھیں: الوسطیۃ فی القرآن الکریم، ص:603)

ان تمام چیزوں کی وجہ سے اسلامی اخلاق اپنے عروج اور کمال تک پہنچ گئے اور ایک عملی اور مثالی اخلاقیات پر مبنی معاشرہ وجود میں آیا جس نے ربانی منہج اور الٰہی طرز زندگی پر سختی کے ساتھ عمل کیا۔

یہ مکی دور کی عقائدی، روحانی اور اخلاقی تربیت کے بعض رہنما خطوط تھے اور اس تربیت کے مفید اور دوررس نتائج سامنے آئے، چنانچہ پچاس سابقین اولین میں سے بیس سے زائد صحابہ کرامؓ عہدِ نبوّت اور اس کے مابعد دعوتی دائرے کی توسیع کے بعد قائدانہ ذمہ داریوں پر فائز تھے، اور امت کے عظیم قائدین میں سرِ فہرست رہے، جبکہ دیگر بیس میں سے اکثر یا تو شہید ہوئے اور اللہ کے رسول ﷺ کے عہد میں ہی انتقال کر گئے، امت کی اس پہلی صف میں علی الاطلاق عظیم ترین شخصیات موجود تھیں، عشرۂ مبشرہ کا تعلق بھی اسی عظیم جماعت سے تھا جو کہ اللہ کے رسول ﷺ کے بعد امت کے افضل ترین لوگ ہیں، اسی گروہ میں وہ عظیم مثالیں اور قابل تقلید نمونے بھی ملتے ہیں جنہوں نے

اپنی عظیم و بے مثال قربانیوں کے ذریعہ عظیم تہذیب کی تعمیر میں نمایاں کردار ادا کیا، جیسے کہ حضرت عمار بن یاسرؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت ابو ذرؓ، حضرت جعفر بن ابی طالبؓ، اسی طرح اس عظیم گروہ کے ہر اول دستہ میں امت کی عظیم و افضل ترین خاتون حضرت خدیجہؓ، حضرت ام الفضل بنت الحارثؓ، حضرت أسماء ذات النطاقین، حضرت أسماء بنت عمیسؓ، جیسے دیگر عظیم نمونے بھی موجود ہیں۔

یقیناً صفِ اول کے اس گروہ کو انسانیت کے عظیم مربی حضرت محمد ﷺ کے ذریعہ عقائدی، روحانی، عقلی اور اخلاقی تربیت حاصل کرنے کا سب سے زیادہ موقع نصیب ہوا، چنانچہ وہی اس کارواں کا ہر اول دستہ اور امت کے رہبر ورہنما بن گئے۔ (دیکھیں: المنہاج القرآنی فی التشریع، ص: 425)

اللہ کے رسول ﷺ ان کا تزکیہ فرماتے تھے، ان کی تربیت کرتے، اور جاہلیت کے میل کچیل سے ان کو صاف کرتے، اگر ایک شخص سعادت و کامیابی کے اعلیٰ مقام پر فائز ہو جاتا ہے جس کو اللہ کے رسول ﷺ کی ایک مرتبہ کی صحبت نصیب ہوئی ہو یا زندگی میں ایک ہی مرتبہ آپ ﷺ کے دیدار سے فیضیاب ہوا ہو اور آپ پر ایمان لے آیا ہو تو اس شخص کا کیا کہنا جو کہ روزانہ آپ کا رفیق و جلیس ہو، آپ سے فیض حاصل کرتا ہو، آپ کے نور سے منور ہوتا ہو، آپ کے کلام سے غذا حاصل کرتا ہو اور آپ کی نگاہوں کے سامنے تربیت حاصل کر رہا ہو۔ (دیکھیں: المنہاج القرآنی فی التشریع، ص:433)

تیسری فصل

اعلانِ دعوت اور مشرکین کے نت نئے حربے

پہلا باب
اعلانِ دعوت

اللہ کے رسول ﷺ نے جب اپنے اصحاب کی صحیح تربیت کرلی اور عقائد، عبادات اور اخلاق کی اعلیٰ بنیادوں پر پہلی منظم مسلمان جماعت تشکیل دے دی تو اس عظیم الشان تیاری کے بعد اب اعلانِ دعوت کا وقت آگیا اور اللہ تعالی کا یہ حکم نازل ہو گیا: ﴿وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ ٱلْأَقْرَبِينَ ﴿٢١٤﴾ وَٱخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ ٱتَّبَعَكَ مِنَ ٱلْمُؤْمِنِينَ ﴿٢١٥﴾ فَإِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ إِنِّي بَرِيٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٢١٦﴾﴾ ترجمہ: ''اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈراؤ۔ اور ایمان لانے والوں میں سے جو لوگ تمہاری پیروی اختیار کریں ان کے ساتھ تواضع سے پیش آؤ۔ لیکن اگر وہ تمہاری نافرمانی کریں تو ان سے کہو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے میں بری الذمہ ہوں''۔(الشعراء: 214:216)

اللہ کے رسول ﷺ نے اپنا قبیلہ اور پورا خاندان جمع کیا، اعلانیہ طور پر ان کو ایک معبود برحق کی دعوت دی، نافرمانی کی صورت میں ان کو سخت عذاب سے ڈرایا، اپنے آپ کو آگ سے بچانے کی تلقین کی اور ہر انسان کی اپنی ذات کے بارے میں ذمہ داری کو ان کے سامنے واضح کر دیا۔(دیکھیں: رسالۃ الأنبیاء، عمر احمد 3/46)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں: جب یہ آیت ﴿وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ ٱلْأَقْرَبِينَ﴾ نازل ہوئی تو اللہ کے رسول ﷺ کوہ صفا پر چڑھے اور آواز دینے لگے: اے بنو فہر! اے بنو عدی! ۔تمام قریش کے قبائل کو پکارا ۔یہاں تک کہ سب جمع ہو گئے اور جو کسی وجہ سے نہیں آسکا اس نے اپنا نمائندہ بھیجا، تاکہ وہ دیکھ لے کہ کیا بات ہے۔ ابولہب اور قریش کے تمام لوگ بھی پہنچ گئے، آپ نے فرمایا: تمہارا کیا خیال ہے اگر میں تم کو یہ اطلاع دوں کہ اس پہاڑ کے دامن میں ایک لشکر کھڑا ہے اور تم پر حملہ کرنا چاہتا ہے تو کیا تم اس بات پر یقین کروگے ؟ان سب نے کہا: ہاں، ہم یقین کریں گے، ہم تو آج تک آپ کے بارے میں سچائی کا تجربہ رکھتے ہیں، یہ جواب سن کر آپؐ نے فرمایا: تو میں تم کو ایک سخت عذاب سے ڈرانے اور آگاہ کرنے آیا ہوں جو بالکل تمہارے سامنے ہے۔ یہ سن کر ابو لہب بول پڑا: سارے دن تمہارے لئے خرابی ہو، صرف یہی کہنے کے لئے تم نے ہمیں بلایا تھا؟ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں: ﴿تَبَّتْ يَدَآ أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ ﴿١﴾ مَآ أَغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُۥ وَمَا كَسَبَ﴾ ترجمہ: ''ٹوٹ گئے ابولہب کے ہاتھ اور نامراد ہو گیا وہ۔ اُس کا مال اور جو کچھ اس نے کمایا وہ اُس کے کسی کام نہ آیا''۔(سورۃ لہب: 1-2)(صحیح بخاری: 4971، صحیح مسلم: 208)

ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ نے ان کے ہر قبیلے کو الگ الگ پکارا اور ہر قبیلے سے فرماتے رہے: ''اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ، اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: اے فاطمہ! اپنے آپ کو جہنم سے بچاؤ..... میں اللہ کے مقابلہ میں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا ہوں، البتہ تم مجھ سے جو قرابت کا تعلق رکھتے ہو اس کو میں جوڑتا رہوں ہوگا''۔(صحیح بخاری: 4771، صحیح مسلم: 204)

قریش کے لوگ حقیقت پسند اور عملی لوگ تھے، جب انہوں نے دیکھا کہ محمد ﷺ جو کہ صادق وامین ہیں، پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہیں، وہ اپنے سامنے بھی دیکھ رہے ہیں اور پہاڑ کی دوسری طرف بھی ان کی نظر ہے، اور سب لوگ صرف وہ دیکھ رہے ہیں جو ان کے سامنے ہے، توان کی ذہانت اور انصاف پسندی نے آپ کی بات کی تصدیق کرنے پر مجبور کر دیا، اس لئے انہوں نے کہا: ہاں، ہم آپ کی بات پر یقین کریں گے۔

اور جب یہ فطری اور ابتدائی مرحلہ طے ہو گیا اور سننے والوں کے اعتماد و یقین کا علم ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: لہذا میں تم کو ایک سخت عذاب سے ڈرانے اور آگاہ کرنے آیا ہوں جو بالکل تمہارے سامنے ہے۔

یہ دراصل منصبِ نبوت کی صحیح تعریف اور نشاندہی تھی، اور غیبی حقائق اور وہبی علوم میں نبوت کو جو خصوصیت وانفرادیت حاصل ہے اس کی بڑی حکمت وبلاغت کے ساتھ ترجمانی تھی، جس کی نظیر ہم کو مذہب اور نبوت کی تاریخ میں نہیں ملتی، واقعہ یہ ہے کہ اس سے مختصر اور آسان راستہ اور اس سے زیادہ قابلِ فہم اور واضح اسلوبِ بیان کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا، یہ سنتے ہی مجمع پر ایک خاموشی چھا گئی، لیکن ابو لہب نے کہا: سارے دن تمہارے لئے خرابی ہو، کیا صرف یہی کہنے کے لئے تم نے ہمیں بلایا تھا؟! (دیکھیں: السیرۃ النبویۃ، أبوالحسن ندوی، ص138)

اس اسلوب کے ذریعہ نبی کریم ﷺ نے امت کے لئے اعلان کا طریقہ بھی متعین فرمادیا، چنانچہ آپ ﷺ نے ایک بلند جگہ کا انتخاب فرمایا تاکہ اس پر کھڑے ہو کر آپ تمام لوگوں کو آواز دے سکیں، اور سب تک آپ کی آواز پہنچ جائے، آج کے جدید دور میں نشریاتی اور ابلاغی ذرائع کا استعمال اسی طریقے سے کیا جاتا ہے تاکہ ابلاغ کا دائرہ وسیع تر ہو سکے، اس کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ نے اپنی دعوت کے لئے ایک مستحکم بنیاد یعنی صدق وسچائی کا انتخاب فرمایا، تاکہ اسی پر اپنی بات کی بنیاد رکھ سکیں، اس کے ذریعہ آپ ﷺ نے دعوت اور میڈیا کے میدان میں کام کرنے والوں کو اس کی تعلیم دی کہ لوگوں کو کوئی خبر دینے یا دعوت دینے کے مقصد سے لوگوں کے ساتھ رابطہ میں سب سے اہم چیز یہ ہے کہ بات کہنے والے اور سننے والے کے درمیان، یا پیغام کے مصدر اور پیغام حاصل کرنے والے لوگوں کے مابین مکمل اعتماد ہونا چاہیے، اسی طرح مضمونِ کلام بھی سچائی پر مبنی ہو جس میں جھوٹ کا کوئی احتمال نہ ہو۔ (دیکھیں: الحرب النفسیۃ ضد الاسلام، د۔ عبد الوھاب کحیل، ص121)

یہ ایک فطری بات تھی کہ اللہ کے رسول ﷺ اپنی اعلانیہ دعوت کا آغاز اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو دعوت دے کر کریں، اس لئے کہ مکہ ایک ایسا شہر تھا جس میں قبائلی روح لوگوں کے رگ وپے میں داخل تھی، اس لئے آپ ﷺ نے اپنے خاندان سے دعوت کا آغاز کیا جو آپ کی نصرت وتائید اور حمایت کر سکتا تھا، اسی طرح مکہ میں دعوت دینے کا ایک خاص اثر ہوتا کیونکہ اس شہر کو اہم دینی مرکزیت حاصل تھی، اس لئے اس کو دائرہ اسلام میں لانے سے دیگر قبائل کافی حد تک متاثر ہوتے، اس لئے کہ اسلام نے قریش میں دعوت کو اپنے عظیم مقصد کے حصول کے لئے پہلے مرحلے کے طور پر اختیار کیا، جیسے کہ قرآن کریم سے بھی ظاہر ہوتا ہے، چنانچہ مکی آیات میں دعوت کی عالمیت وآفاقیت کو واضح کیا گیا ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿تَبَارَكَ ٱلَّذِى نَزَّلَ ٱلْفُرْقَانَ عَلَىٰ عَبْدِهِۦ

﴿لِيَكُونَ لِلْعَٰلَمِينَ نَذِيرًا﴾ ترجمہ:"نہایت متبرک ہے وہ جس نے یہ فرقان اپنے بندے پر نازل کیا تاکہ سارے جہان والوں کے لئے نذیر ہو"۔(سورۃ الفرقان:1)

دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿وَمَآ أَرْسَلْنَٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَٰلَمِينَ﴾ ترجمہ:"اے محمدؐ، ہم نے جو تم کو بھیجا ہے تو یہ دراصل دنیاوالوں کے حق میں ہماری رحمت ہے۔(سورۃ الأنبیاء:107)

ایک اور مقام پر ہے: ﴿وَمَآ أَرْسَلْنَٰكَ إِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ ٱلنَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ﴾ ترجمہ:"اور (اے نبیؐ) ہم نے تم کو تمام ہی انسانوں کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں"۔(سورۃ السبا: 28)

اس مرحلہ کے بعد ایک دوسرا مرحلہ آیا جس میں آپ ﷺ ہر اس شخص کو دعوت دینے لگے جس سے آپ ﷺ کی ملاقات ہونے لگی، چاہے اس کا تعلق کسی بھی قبیلے یا کسی بھی ملک سے ہو، آپؐ لوگوں سے ان کی مجلسوں میں، ان کے اجتماعات میں، ان کی محفلوں میں، حج کے زمانے میں اور مقامات حج میں ملاقات کرتے، اور ہر آزاد، غلام، طاقتور، کمزور، مالدار اور فقیر کو دعوت دیتے۔(دیکھیں: دراسۃ السیرۃ، عماد الدین خلیل، ص66)

یہ طریقہ دعوت آپ ﷺ نے اس وقت اختیار کیا جب اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نازل ہوا: ﴿فَٱصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ ٱلْمُشْرِكِينَ﴾ ترجمہ:"پس اے نبیؐ، جس چیز کا تمہیں حکم دیا جارہاہے، اُسے ہانکے پکارے کہہ دو اور شرک کرنے والوں کی ذرا پروانہ کرو۔ تمہاری طرف سے ہم اُن مذاق اڑانے والوں کی خبر لینے کے لئے کافی ہیں۔ جو اللہ کے ساتھ کسی اور کو بھی خدا قرار دیتے ہیں، عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا۔ ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ تم پر بناتے ہیں ان سے تمہارے دل کو سخت کوفت ہوتی ہے"۔(سورۃ الحجر:94:97)

اس اعلان واظہار کا نتیجہ اور ردّ عمل اعراض، تمسخر واستہزاء، ایذاء، تکذیب، منصوبہ بند سازشوں اور دوسروں کو راہ حق سے روکنے کی شکل میں سامنے آیا، نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کے ساتھ بت پرستی کے لیڈروں اور اس کے علمبرداروں کی کشمکش نے مزید شدت اختیار کرلی اور مکہ میں ہر جگہ یہ کشمکش موضوع بحث بن گئی، ہر شخص اس کشمکش کے واقعات اور خبریں دوسروں سے بیان کرتا اور یہ چیز بذات خود دعوت کے حق میں بہت مفید ثابت ہوئی، اس لئے کہ اس کے ذریعہ دعوت از خود دوسروں تک پہنچ گئی، جس میں کٹر ترین دشمنوں نے اہم کردار ادا کیا کیونکہ وہ دعوت کو تمام قبائل میں منفی حیثیت سے عام کررہے تھے اور ایسا ناممکن تھا کہ سب لوگ کفرو شرک کے علمبرداروں کے دعوؤں اور الزامات کو فوری طور پر بغیر تحقیق کے قبول کرلیتے۔

اس زمانہ میں ابلاغ کا اہم ترین ذریعہ یہی تھا کہ لوگ بالمشافہ خبروں اور واقعات کو ایک دوسرے تک پہنچاتے، اس لئے ہر دور اور قریب رہنے والے شخص تک رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی خبر پہنچ گئی اور یہی عظیم واقعہ لوگوں کی مجلسوں میں، قبائل کی محفلوں میں اور گھروں میں موضوعِ بحث بن گیا۔ (دیکھیں: الغرباءالأولون، ص167)

مشرکین کے اہم اعتراضات:

شرک کے علمبرداروں کے اہم ترین اعتراضات اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے بارے میں، یوم آخرت پر ایمان کے بارے میں، نبی کریم ﷺ کی رسالت کے بارے میں اور رب العالمین کی طرف سے نازل کردہ قرآن کریم کے بارے میں تھے، مندرجہ ذیل سطور میں ان اعتراضات کی بعض تفصیلات اور ان کے جوابات پیش کئے جارہے ہیں:

1)شرک باللہ:

کفارِ مکہ اس کے منکر نہیں تھے کہ اللہ ہی نے ان کو اور ہر چیز کو پیدا کیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَٱصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ وَأَعۡرِضۡ عَنِ ٱلۡمُشۡرِكِينَ﴾ ترجمہ: ”اگر تم ان سے پوچھو کہ زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا ہے، تو یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے، کہو: الحمدللہ، مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں“۔ (سورۃ لقمان: 25) لیکن وہ بتوں کی عبادت کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ وہ ان کو اللہ سے قریب کرتے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿أَلَا لِلَّهِ ٱلدِّينُ ٱلۡخَالِصُۚ وَٱلَّذِينَ ٱتَّخَذُواْ مِن دُونِهِۦٓ أَوۡلِيَآءَ مَا نَعۡبُدُهُمۡ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَآ إِلَى ٱللَّهِ زُلۡفَىٰٓ إِنَّ ٱللَّهَ يَحۡكُمُ بَيۡنَهُمۡ فِي مَا هُمۡ فِيهِ يَخۡتَلِفُونَۗ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يَهۡدِي مَنۡ هُوَ كَٰذِبٞ كَفَّارٞ﴾ ترجمہ: ”خبردار، دین خالص اللہ کا حق ہے، رہے وہ لوگ جنہوں نے اُس کے سوا دوسرے سرپرست بنا رکھے ہیں (اور اپنے اِس فعل کی توجیہہ کرتے ہیں کہ) ہم تو اُن کی عبادت صرف اس لئے کرتے ہیں کہ وہ اللہ تک ہماری رسائی کرادیں، اللہ یقیناً اُن کے درمیان اُن تمام باتوں کا فیصلہ کردے گا جن میں وہ اختلاف کررہے ہیں، اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو جھوٹا اور منکر حق ہو“۔ (سورۃ الزمر: 3)

ان کی پڑوس قوموں کے ذریعہ ان تک بتوں کی عبادت منتقل ہوئی، اسی لئے انہوں نے توحید کی دعوت کا مقابلہ سخت انکار اور انتہائی تعجب کے ذریعہ کیا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَعَجِبُوٓاْ أَن جَآءَهُم مُّنذِرٞ مِّنۡهُمۡۖ وَقَالَ ٱلۡكَٰفِرُونَ هَٰذَا سَٰحِرٞ كَذَّابٌ ۝٤ أَجَعَلَ ٱلۡأٓلِهَةَ إِلَٰهٗا وَٰحِدًاۖ إِنَّ هَٰذَا لَشَيۡءٌ عُجَابٞ ۝٥ وَٱنطَلَقَ ٱلۡمَلَأُ مِنۡهُمۡ أَنِ ٱمۡشُواْ وَٱصۡبِرُواْ عَلَىٰٓ ءَالِهَتِكُمۡۖ إِنَّ هَٰذَا لَشَيۡءٞ يُرَادُ ۝٦ مَا سَمِعۡنَا بِهَٰذَا فِي ٱلۡمِلَّةِ ٱلۡأٓخِرَةِ إِنۡ هَٰذَآ إِلَّا ٱخۡتِلَٰقٌ ۝٧﴾ ترجمہ: ”ان لوگوں کو اس بات پر بڑا تعجب ہوا کہ ایک ڈرانے والا خود انہی میں سے آگیا، منکرین کہنے لگے کہ "یہ ساحر ہے، سخت جھوٹا ہے۔ کیا اِس نے سارے خداؤں کی جگہ بس ایک ہی خدا بناڈالا؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہے"۔ اور سرداران قوم یہ کہتے ہوئے نکل گئے کہ "چلو اور

ڈٹے رہو اپنے معبودوں کی عبادت پر، یہ بات تو کسی اور ہی غرض سے کہی جارہی ہے۔ یہ بات ہم نے زمانہ قریب کی ملت میں کسی سے نہیں سنی یہ کچھ نہیں ہے مگر ایک من گھڑت بات"۔(سورۃ ص،4-7)

ان کا اللہ کی ذات کے بارے میں تصور درست نہیں تھا اور نہ ہی اللہ کی مخلوق کے ساتھ ان کا تعلق درست تھا، اس لئے کہ وہ سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے جنات میں سے بیوی بنارکھی ہے، اور اس نے فرشتوں کو جنا ہے، اور فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔(نعوذ باللہ من ذلک)

اللہ کی طرف سے آیاتِ قرآنیہ نازل ہوتی تھیں جن میں وضاحت کی جاتی تھی کہ اللہ عزوجل نے جنات اور فرشتوں کو پیدا کیا ہے، جیسے کہ انسانوں کو پیدا کیا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے کسی کو اولاد نہیں بنایا ہے، اور نہ ہی اس کی کوئی بیوی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَجَعَلُواْ لِلَّهِ شُرَكَآءَ ٱلْجِنَّ وَخَلَقَهُمْۖ وَخَرَقُواْ لَهُۥ بَنِينَ وَبَنَٰتِۭ بِغَيْرِ عِلْمٍۚ سُبْحَٰنَهُۥ وَتَعَٰلَىٰ عَمَّا يَصِفُونَ ﴿١٠٠﴾ بَدِيعُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِۖ أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُۥ وَلَدٌ وَلَمْ تَكُن لَّهُۥ صَٰحِبَةٌۖ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍۖ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿١٠١﴾﴾ ترجمہ: "اِس پر بھی لوگوں نے جنوں کو اللہ کا شریک ٹھیرا دیا، حالانکہ وہ اُن کا خالق ہے، اور بے جانے بوجھے اس کے لئے بیٹے اور بیٹیاں تصنیف کر دیں، حالانکہ وہ پاک اور بالا تر ہے اُن باتوں سے جو یہ لوگ کہتے ہیں۔ وہ تو آسمانوں اور زمین کا موجد ہے، اس کا کوئی بیٹا کیسے ہو سکتا ہے؟! جبکہ کوئی اس کی شریکِ زندگی ہی نہیں ہے، اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے"۔(سورۃ الأنعام:100-101)

اسی طرح اس کی بھی وضاحت کی جاتی کہ جنات بھی اللہ کی عبودیت کا اقرار کرتے ہیں اور وہ اپنے درمیان اور اللہ کے درمیان کسی نسب یا قرابت کا انکار کرتے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَجَعَلُواْ بَيْنَهُۥ وَبَيْنَ ٱلْجِنَّةِ نَسَبًاۚ وَلَقَدْ عَلِمَتِ ٱلْجِنَّةُ إِنَّهُمْ لَمُحْضَرُونَ﴾ ترجمہ: "اِنہوں نے اللہ اور ملائکہ کے درمیان نسب کا رشتہ بنا رکھا ہے، حالانکہ ملائکہ خوب جانتے ہیں کہ یہ لوگ مجرم کی حیثیت سے پیش ہونے والے ہیں"۔(سورۃ الصافات:158)

اسی طرح مشرکین سے مطالبہ کیا جاتا کہ حق کی اتباع کریں اور ظن واوہام کی بنیاد پر کوئی بات نہ کریں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ ٱلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِٱلْأٓخِرَةِ لَيُسَمُّونَ ٱلْمَلَٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ ٱلْأُنثَىٰ ﴿٢٧﴾ وَمَا لَهُم بِهِۦ مِنْ عِلْمٍۖ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا ٱلظَّنَّۖ وَإِنَّ ٱلظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ ٱلْحَقِّ شَيْـًٔا ﴿٢٨﴾﴾ ترجمہ: "مگر جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے وہ فرشتوں کو دیویوں کے ناموں سے موسوم کرتے ہیں۔ حالانکہ اس معاملہ کا کوئی علم انہیں حاصل نہیں ہے، وہ محض گمان کی پیروی کر رہے ہیں، اور گمان حق کی جگہ کچھ بھی کام نہیں دے سکتا۔(سورۃ النجم:27-28)

یہ واضح کیا جاتا کہ یہ غیر معقول بات ہے کہ اللہ تعالیٰ مشرکین کو تو بیٹے عطا کرے اور اپنے لئے بیٹیاں پسند کرے جبکہ مشرکین کے نزدیک بیٹیاں بیٹوں کے مقابلہ میں کمتر حیثیت رکھتی تھیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿أَفَأَصْفَىٰكُمْ رَبُّكُم بِٱلْبَنِينَ وَٱتَّخَذَ مِنَ ٱلْمَلَٰٓئِكَةِ إِنَٰثًاۚ إِنَّكُمْ لَتَقُولُونَ قَوْلًا عَظِيمًا﴾ ترجمہ: "کیسی عجیب بات ہے کہ تمہارے رب نے

تمہیں تو بیٹوں سے نوازا اور خود اپنے لئے ملائکہ کو بیٹیاں بنالیا؟ بڑی جھوٹی بات ہے جو تم لوگ زبانوں سے نکالتے ہو"۔(سورۃ الاسراء: 40)

مشرکین ہی کو ان کے بے بنیاد اقوال کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے جن کے پیچھے کوئی دلیل نہیں ہے: ﴿وَجَعَلُوا۟ ٱلْمَلَـٰٓئِكَةَ ٱلَّذِينَ هُمْ عِبَـٰدُ ٱلرَّحْمَـٰنِ إِنَـٰثًا ۚ أَشَهِدُوا۟ خَلْقَهُمْ ۚ سَتُكْتَبُ شَهَـٰدَتُهُمْ وَيُسْـَٔلُونَ﴾ ترجمہ:"انہوں نے فرشتوں کو، جو خدائے رحمان کے خاص بندے ہیں، عورتیں قرار دے لیا، کیا اُن کے جسم کی ساخت اِنہوں نے دیکھی ہے؟ اِن کی گواہی لکھ لی جائے گی اور انہیں اس کی جوابدہی کرنی ہو گی"۔(سورۃ الزخرف:19)

2)آخرت کا انکار:

جہاں تک تعلق ہے اس کا کہ رسول اللہ ﷺ نے جب ان کو ایمان بالآخرت کی دعوت دی تو اہل شرک نے تمسخر و مذاق کے ذریعہ اپنا ردعمل دکھایا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَقَالَ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلَىٰ رَجُلٍ يُنَبِّئُكُمْ إِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ إِنَّكُمْ لَفِى خَلْقٍ جَدِيدٍ ۝٧ أَفْتَرَىٰ عَلَى ٱللَّهِ كَذِبًا أَم بِهِۦ جِنَّةٌۢ ۗ بَلِ ٱلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِٱلْـَٔاخِرَةِ فِى ٱلْعَذَابِ وَٱلضَّلَـٰلِ ٱلْبَعِيدِ ۝٨﴾ ترجمہ:" منکرین لوگوں سے کہتے ہیں "ہم بتائیں تمہیں ایسا شخص جو خبر دیتا ہے کہ جب تمہارے جسم کا ذرہ ذرہ منتشر ہو چکا ہو گا، اس وقت تم نئے سرے سے پیدا کر دیے جاؤ گے؟۔نہ معلوم یہ شخص اللہ کے نام سے جھوٹ گھڑتا ہے یا اسے جنون لاحق ہے"۔ نہیں، بلکہ جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے وہ عذاب میں مبتلا ہونے والے ہیں اور وہی بری طرح بہکے ہوئے ہیں"۔(سورۃ سبا:7-8)

مشرکین مردوں کے دوبارہ زندہ کئے جانے (بعث بعد الموت) کا انکار کرتے تھے: ﴿وَقَالُوٓا۟ إِنْ هِىَ إِلَّا حَيَاتُنَا ٱلدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ﴾ ترجمہ:"آج یہ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی جو کچھ بھی ہے بس یہی دنیا کی زندگی ہے اور ہم مرنے کے بعد ہر گز دوبارہ نہ اٹھائے جائیں گے"۔(سورۃ الانعام:29)

اور کڑی قسمیں کھا کر اس کا انکار کرتے تھے: ﴿وَأَقْسَمُوا۟ بِٱللَّهِ جَهْدَ أَيْمَـٰنِهِمْ ۙ لَا يَبْعَثُ ٱللَّهُ مَن يَمُوتُ ۚ بَلَىٰ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَلَـٰكِنَّ أَكْثَرَ ٱلنَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ﴾ ترجمہ:"یہ لوگ اللہ کے نام کی کڑی کڑی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ "اللہ کسی مرنے والے کو پھر سے زندہ کر کے نہ اٹھائے گا"۔اٹھائے گا کیوں نہیں، یہ تو ایک وعدہ ہے جسے پورا کرنا اس نے اپنے اوپر واجب کر لیا ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔اور ایسا ہونا اس لئے ضروری ہے کہ اللہ اِن کے سامنے اُس حقیقت کو کھول دے جس کے بارے میں یہ اختلاف کر رہے ہیں اور منکرین حق کو معلوم ہو جائے کہ وہ جھوٹے تھے"۔(سورۃ النحل:38-39)

وہ یہ سمجھتے تھے کہ دنیا کے علاوہ اور کہیں کسی زندگی کا وجود نہیں ہے، اور وہ مطالبہ کرتے تھے کہ اگر یہ سچ ہے تو پھر ہمارے آباؤ اجداد کو زندہ کیا جائے تا کہ ہم آخرت کو تسلیم کریں۔ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَقَالُوا۟ مَا هِىَ إِلَّا حَيَاتُنَا ٱلدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا

وَمَا يُهۡلِكُنَآ إِلَّا ٱلدَّهۡرُۚ وَمَا لَهُم بِذَٰلِكَ مِنۡ عِلۡمٍۖ إِنۡ هُمۡ إِلَّا يَظُنُّونَ ﴿٢٤﴾ وَإِذَا تُتۡلَىٰ عَلَيۡهِمۡ ءَايَٰتُنَا بَيِّنَٰتٖ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمۡ إِلَّآ أَن قَالُواْ ٱئۡتُواْ بِـَٔابَآئِنَآ إِن كُنتُمۡ صَٰدِقِينَ ﴿٢٥﴾ قُلِ ٱللَّهُ يُحۡيِيكُمۡ ثُمَّ يُمِيتُكُمۡ ثُمَّ يَجۡمَعُكُمۡ إِلَىٰ يَوۡمِ ٱلۡقِيَٰمَةِ لَا رَيۡبَ فِيهِ وَلَٰكِنَّ أَكۡثَرَ ٱلنَّاسِ لَا يَعۡلَمُونَ ﴿٢٦﴾ وَلِلَّهِ مُلۡكُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضِۚ وَيَوۡمَ تَقُومُ ٱلسَّاعَةُ يَوۡمَئِذٖ يَخۡسَرُ ٱلۡمُبۡطِلُونَ ﴿٢٧﴾﴾ ترجمہ: "یہ لوگ کہتے ہیں کہ "زندگی بس یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے، یہیں ہمارا مرنا اور جینا ہے اور گردشِ ایام کے سوا کوئی چیز نہیں جو ہمیں ہلاک کرتی ہو"۔ در حقیقت اِس معاملہ میں اِن کے پاس کوئی علم نہیں ہے، یہ محض گمان کی بناپر یہ باتیں کرتے ہیں۔ اور جب ہماری واضح آیات انہیں سنائی جاتی ہیں تو ان کے پاس کوئی حجت اس کے سوا نہیں ہوتی کہ اٹھالاؤ ہمارے باپ دادا کو اگر تم سچے ہو۔ اے نبیؐ، اِن سے کہو اللہ ہی تمہیں زندگی بخشتا ہے، پھر وہی تمہیں موت دیتا ہے، پھر وہی تم کو اُس قیامت کے دن جمع کرے گا جس کے آنے میں کوئی شک نہیں، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ زمین اور آسمانوں کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے، اور جس روز قیامت کی گھڑی آ کھڑی ہو گی اُس دن باطل پرست خسارے میں پڑ جائیں گے"۔ (سورۃ جاثیہ: 24-27)

وہ یہ بات نہیں سوچ پاتے تھے کہ جس ذات نے ان کو پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے وہ دوبارہ ان کو بروزِ قیامت پیدا کرنے پر بھی قادر ہے۔ مجاہد اور دیگر مفسرین بیان فرماتے ہیں: اللہ کے رسول ﷺ کے پاس اُبی بن خلف آیا (حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں عاص بن وائل کا نام ہے) اور اس کے ہاتھ میں ایک بوسیدہ ہڈی تھی اور وہ اس کو ریزہ ریزہ کر کے ہوا میں اڑا رہا تھا اور کہہ رہا تھا: اے محمد! کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اللہ اس کو دوبارہ زندہ کرے گا؟ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ہاں، اللہ تمہیں موت دے گا، پھر تمہیں دوبارہ زندہ کرے گا اور پھر تم کو وہ جہنم کی طرف گھیر کر لے جائے گا"۔ اسی واقعہ کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئیں: ﴿وَضَرَبَ لَنَا مَثَلٗا وَنَسِيَ خَلۡقَهُۥۖ قَالَ مَن يُحۡيِ ٱلۡعِظَٰمَ وَهِيَ رَمِيمٞ ﴿٧٨﴾ قُلۡ يُحۡيِيهَا ٱلَّذِيٓ أَنشَأَهَآ أَوَّلَ مَرَّةٖۖ وَهُوَ بِكُلِّ خَلۡقٍ عَلِيمٌ﴾ ترجمہ: "کیا انسان دیکھتا نہیں ہے کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا اور پھر وہ صریح جھگڑالو بن کر کھڑا ہو گیا؟۔ اب وہ ہم پر مثالیں چسپاں کرتا ہے اور اپنی پیدائش کو بھول جاتا ہے، کہتا ہے: "کون ان ہڈیوں کو زندہ کرے گا جبکہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہوں؟"۔ اس سے کہو، اِنہیں وہی زندہ کرے گا جس نے پہلے انہیں پیدا کیا تھا، اور وہ تخلیق کا ہر کام جانتا ہے"۔ (سورۃ یس: 77-79)۔ (تفسیر ابن کثیر 3/581، الدر المنثور 7/75)

بعث بعد الموت کو تسلیم کرانے کے بارے میں قرآن کریم نے یہ اسلوب اختیار کیا کہ عقل کو مخاطب کر کے اس کے عقلی دلائل پیش کئے، فطری حقائق کو پیش کیا اور دلوں پر دستک دی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کو یاد دلایا کہ اس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ بندوں کو حساب اور جزا کے لئے دوبارہ زندہ کیا جائے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کو اپنی عبادت کے لئے وجود بخشا ہے۔ اس نے رسول اور کتابیں نازل کیں تاکہ اس طریقہ کو واضح کیا جائے جس کے مطابق وہ اس کی عبادت و اطاعت کریں، اور اس کے احکام کی پیروی

کریں اور اس کے منہیات سے اجتناب کریں، لیکن بندوں میں سے بعض وہ ہیں جنہوں نے اللہ کی اطاعت اختیار کرنے سے انکار کر دیا اور سرکشی اور بغاوت کی راہ اختیار کرلی، کیا عدل وانصاف کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ نیک اور بد کی جب وفات ہو تو صالح اور نیک کو اس کے حسنِ عمل کا انعام دیا جائے، اور برے شخص کو اس کی برائی کی سزا دی جائے: ﴿أَفَنَجۡعَلُ ٱلۡمُسۡلِمِينَ كَٱلۡمُجۡرِمِينَ ۝٣٥ مَا لَكُمۡ كَيۡفَ تَحۡكُمُونَ ۝٣٦ أَمۡ لَكُمۡ كِتَٰبٞ فِيهِ تَدۡرُسُونَ ۝٣٧ إِنَّ لَكُمۡ فِيهِ لَمَا تَخَيَّرُونَ ۝٣٨﴾ ترجمہ: "کیا ہم فرماں برداروں کا حال مجرموں کا سا کر دیں؟۔ تم لوگوں کو کیا ہوگیا ہے، تم کیسے حکم لگاتے ہو؟ کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں تم یہ پڑھتے ہو کہ تمہارے لئے ضرور وہاں وہی کچھ ہے جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہو؟"۔(سورۃ القلم:35-38)

اپنے آپ پر ظلم کرنے والے ملحدین یہ سمجھتے ہیں کہ کائنات کو بے مقصد اور بے کار پیدا کیا گیا ہے جس میں کوئی حکمت و مصلحت نہیں ہے اور ایک اصلاح پسند مومن اور بگڑے ہوئے کافر اور متقی اور فاجر کے انجام میں کوئی فرق نہیں ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿أَمۡ نَجۡعَلُ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَعَمِلُواْ ٱلصَّٰلِحَٰتِ كَٱلۡمُفۡسِدِينَ فِي ٱلۡأَرۡضِ أَمۡ نَجۡعَلُ ٱلۡمُتَّقِينَ كَٱلۡفُجَّارِ﴾ ترجمہ: ''ہم نے اس آسمان اور زمین کو، اور اس دنیا کو جو ان کے درمیان ہے، فضول پیدا نہیں کر دیا ہے، یہ تو اُن لوگوں کا گمان ہے جنہوں نے کفر کیا ہے، اور ایسے کافروں کے لئے بربادی ہے جہنم کی آگ سے۔ کیا ہم اُن لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں اور نیک اعمال کرتے ہیں اور اُن کو جو زمین میں فساد کرنے والے ہیں یکساں کر دیں؟ کیا متقیوں کو ہم فاجروں جیسا کر دیں؟''۔(سورۃ ص:27 – 28)

اللہ تعالیٰ نے زمین کو نباتات کے ذریعہ زندہ کرنے کی مثالیں دے کر انسانوں کو سمجھایا ہے اور واضح کیا ہے کہ جو ذات مردہ زمین کو زندہ کرنے پر قدرت رکھتی ہے وہ اس پر بھی قادر ہے کہ بے جان جسم اور بوسیدہ ہڈیوں میں دوبارہ جان ڈال دے: ﴿فَٱنظُرۡ إِلَىٰٓ ءَاثَٰرِ رَحۡمَتِ ٱللَّهِ كَيۡفَ يُحۡيِ ٱلۡأَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَآۚ إِنَّ ذَٰلِكَ لَمُحۡيِ ٱلۡمَوۡتَىٰۖ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيۡءٖ قَدِيرٞ﴾ ترجمہ: ''دیکھو اللہ کی رحمت کے اثرات کہ مردہ پڑی ہوئی زمین کو وہ کس طرح جلا اٹھاتا ہے، یقیناً وہ مردوں کو زندگی بخشنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے''۔(سورۃ الروم:50)

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بعض ان لوگوں کی مثالیں بھی دی ہیں جن کو وفات دینے کے بعد پھر سے زندگی عطا کی گئی، اللہ تعالیٰ نے اصحابِ کہف کی مثال دی ہے کہ تین سو نو (۳۰۹) سال تک ان کو غار میں سلا دیا گیا اور اس طویل مدت کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو پھر سے زندگی عطا کی، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ثُمَّ بَعَثۡنَٰهُمۡ لِنَعۡلَمَ أَيُّ ٱلۡحِزۡبَيۡنِ أَحۡصَىٰ لِمَا لَبِثُوٓاْ أَمَدٗا﴾ ترجمہ: ''پھر ہم نے انہیں اٹھایا تا کہ دیکھیں اُن کے دو گروہوں میں سے کون اپنی مدت قیام کا ٹھیک شمار کرتا ہے''۔(سورۃ الکھف:12)

اس کے بعد مزید فرمایا: ﴿وَكَذَٰلِكَ بَعَثۡنَٰهُمۡ لِيَتَسَآءَلُواْ بَيۡنَهُمۡۚ قَالَ قَآئِلٞ مِّنۡهُمۡ كَمۡ لَبِثۡتُمۡۖ قَالُواْ لَبِثۡنَا يَوۡمًا أَوۡ بَعۡضَ يَوۡمٖۚ قَالُواْ رَبُّكُمۡ أَعۡلَمُ بِمَا لَبِثۡتُمۡ فَٱبۡعَثُوٓاْ أَحَدَكُم بِوَرِقِكُمۡ هَٰذِهِۦٓ إِلَى ٱلۡمَدِينَةِ فَلۡيَنظُرۡ أَيُّهَآ أَزۡكَىٰ

طَعَامًا فَلْيَأْتِكُم بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ أَحَدًا. وَلَبِثُواْ فِي كَهْفِهِمْ ثَلَٰثَ مِاْئَةٍ سِنِينَ وَٱزْدَادُواْ تِسْعًا﴾ ترجمہ: ''اور اسی عجیب کرشمے سے ہم نے انہیں اٹھا بٹھایا تاکہ ذرا آپس میں پوچھ گچھ کریں ان میں سے ایک نے پوچھا" کہو کتنی دیر اس حال میں رہے؟" دوسروں نے کہا" شاید دن بھر یا اس سے کچھ کم رہے ہوں گے"۔ پھر وہ بولے: "اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ہمارا کتنا وقت اس حالت میں گزرا چلو، اب اپنے میں سے کسی کو چاندی کا یہ سکہ دے کر شہر بھیجیں اور وہ دیکھے کہ سب سے اچھا کھانا کہاں ملتا ہے، وہاں سے وہ کچھ کھانے کے لئے لائے اور چاہیے کہ ذرا ہوشیاری سے کام کرے، ایسا نہ ہو کہ وہ کسی کو ہمارے یہاں ہونے سے خبر دار کر بیٹھے''۔(سورۃ الکھف:19) اور وہ اپنے غار میں تین سو سال رہے، اور (کچھ لوگ مدّت کے شمار میں) سال اور بڑھ گئے ہیں''۔(سورۃ الکھف: 25)

اللہ کے رسول ﷺ نے کفر و شرک کے علمبر داروں کے ساتھ بحث و مناظرہ کرتے ہوئے اس کے علاوہ بھی اور بہت سے دلائل و حقائق کو پیش کیا۔

3) رسول ﷺ کے بارے میں مشرکین کے اعتراضات:

مشرکین نے اللہ کے رسول ﷺ کی شخصیت پر بھی بہت سے اعتراض کئے، ان کا تصور یہ تھا کہ رسول ان کی طرح بشر نہیں ہو سکتا ہے وہ یا تو فرشتہ ہونا چاہیے، یا پھر اس کے ساتھ فرشتے رہتے ہوں، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَمَا مَنَعَ ٱلنَّاسَ أَن يُؤْمِنُوٓاْ إِذْ جَآءَهُمُ ٱلْهُدَىٰٓ إِلَّآ أَن قَالُوٓاْ أَبَعَثَ ٱللَّهُ بَشَرًا رَّسُولًا﴾ ترجمہ: ''لوگوں کے سامنے جب کبھی ہدایت آئی تو اس پر ایمان لانے سے اُن کو کسی چیز نے نہیں روکا مگر اُن کے اِسی قول نے کہ "کیا اللہ نے بشر کو پیغمبر بنا کر بھیج دیا؟"۔(سورۃ الاسراء:94)

ایک اور مقام پر ہے: ﴿وَقَالُواْ لَوْلَآ أُنزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ۖ وَلَوْ أَنزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ ٱلْأَمْرُ ثُمَّ لَا يُنظَرُونَ ۝٨ وَلَوْ جَعَلْنَٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَٰهُ رَجُلًا وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِم مَّا يَلْبِسُونَ ۝٩﴾ ترجمہ: ''کہتے ہیں کہ اس نبی پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا، اگر کہیں ہم نے فرشتہ اتار دیا ہوتا تو اب تک کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا، پھر انہیں کوئی مہلت نہ دی جاتی، اور اگر ہم فرشتے کو اتارتے تب بھی اسے انسانی شکل ہی میں اتارتے اور اس طرح انہیں اُسی شبہ میں مبتلا کر دیتے جس میں اب یہ مبتلا ہیں''۔(سورۃ الأنعام:8-9)

مشرکین ایک ایسے رسول کا مطالبہ کرتے تھے جو نہ کھاتا پیتا ہو اور نہ ہی بازاروں میں چلتا ہو: ﴿وَقَالُواْ مَالِ هَٰذَا ٱلرَّسُولِ يَأْكُلُ ٱلطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي ٱلْأَسْوَاقِ لَوْلَآ أُنزِلَ إِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُونَ مَعَهُۥ نَذِيرًا﴾ ترجمہ: ''اور وہ کہتے ہیں کہ کیا ہے اس رسول کو جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، ایسا کیوں نہ ہوا کہ اتارا جاتا اس کی طرف کوئی فرشتہ اور وہ اس کے ساتھ مل کر لوگوں کو ڈراتا''۔(سورۃ الفرقان:7)

گویا کہ یہ بات ان کے علم میں تھی ہی نہیں کہ سب کے سب رسول کھاتے پیتے تھے، محنت و مشقت اور عمل کرتے تھے: ﴿وَمَآ أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ ٱلْمُرْسَلِينَ إِلَّآ إِنَّهُمْ لَيَأْكُلُونَ ٱلطَّعَامَ وَيَمْشُونَ فِي ٱلْأَسْوَاقِ ۗ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ

فِتۡنَةً أَتَصۡبِرُونَۗ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيرًا﴾ ترجمہ: ”تم سے پہلے جو رسول بھی ہم نے بھیجے ہیں وہ سب بھی کھانا کھانے والے اور بازاروں میں چلنے پھرنے والے لوگ ہی تھے، دراصل ہم نے تم لوگوں کو ایک دوسرے کے لئے آزمائش کا ذریعہ بنادیا ہے کیا تم صبر کرتے ہو؟ تمہارا رب سب کچھ دیکھتا ہے“۔(سورۃ الفرقان:20)

وہ چاہتے تھے کہ رسول بہت مال ودولت والا اور ان کی نگاہوں میں کوئی بڑا شخص ہونا چاہیے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَقَالُواْ لَوۡلَا نُزِّلَ هَٰذَا ٱلۡقُرۡءَانُ عَلَىٰ رَجُلٖ مِّنَ ٱلۡقَرۡيَتَيۡنِ عَظِيمٍ﴾ ترجمہ: ”اور انہوں نے کہا یہ قرآن دونوں شہروں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں نازل کیا گیا“۔(سورۃ الزخرف:31)

دو بستیوں کے بڑے لوگوں سے ان کی مراد یہ تھی کہ یا تو مکہ میں ابن المغیرہ یا طائف سے عمرو بن مسعود ثقفی کو رسول ہونا چاہئے۔(تفسیر ابن کثیر 127-4/126)

انہوں نے اللہ کے رسول ﷺ کی جانب جنون اور پاگل پن کی بھی نسبت کی، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَقَالُواْ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِي نُزِّلَ عَلَيۡهِ ٱلذِّكۡرُ إِنَّكَ لَمَجۡنُونٞ ۝٦ لَّوۡ مَا تَأۡتِينَا بِٱلۡمَلَٰٓئِكَةِ إِن كُنتَ مِنَ ٱلصَّٰدِقِينَ ۝٧﴾ ترجمہ: ”یہ لوگ کہتے ہیں: "اے وہ شخص جس پر ذکر نازل ہوا ہے، تو یقیناً دیوانہ ہے۔ اگر تو سچا ہے تو ہمارے سامنے فرشتوں کو لے کیوں نہیں آتا؟"۔(سورۃ الحجر:6-7)

ایک اور مقام پر ہے: ﴿أَنَّىٰ لَهُمُ ٱلذِّكۡرَىٰ وَقَدۡ جَآءَهُمۡ رَسُولٞ مُّبِينٞ ۝١٣ ثُمَّ تَوَلَّوۡاْ عَنۡهُ وَقَالُواْ مُعَلَّمٞ مَّجۡنُونٌ ۝١٤﴾ ترجمہ: ”اِن کی غفلت کہاں دور ہوتی ہے؟ اِن کا حال تو یہ ہے کہ اِن کے پاس رسول مبین آگیا۔ پھر بھی یہ اُس کی طرف ملتفت نہ ہوئے اور کہا کہ "یہ تو سکھایا پڑھایا باولا ہے"۔(سورۃ الدخان:13-14)

اللہ تعالیٰ نے اپنے اس فرمان کے ذریعہ ان کا جواب دیا: ﴿مَآ أَنتَ بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ بِمَجۡنُونٖ﴾ ترجمہ: ”تم اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہو“۔(سورۃ القلم:2)

اسی طرح کہانت اور شعر وشاعری کی جانب بھی آپ کو منسوب کیا: ﴿فَذَكِّرۡ فَمَآ أَنتَ بِنِعۡمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٖ وَلَا مَجۡنُونٍ ۝٢٩ أَمۡ يَقُولُونَ شَاعِرٞ نَّتَرَبَّصُ بِهِۦ رَيۡبَ ٱلۡمَنُونِ ۝٣٠﴾ ترجمہ: ”پس اے نبیؐ، تم نصیحت کیے جاؤ، اپنے رب کے فضل سے نہ تم کاہن ہو اور نہ مجنون۔ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ شخص شاعر ہے جس کے حق میں ہم گردش ایام کا انتظار کر رہے ہیں؟“۔ (سورۃ الطور:29-30)

حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ آپ ﷺ شعر وشاعری نہیں کرتے ہیں، اور آپ ﷺ عقل کے اعتبار سے سب سے بہتر انسان ہیں، اور آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کا کاہنوں کی خرافات اور جادوگروں کی باتوں سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں ہے۔(دیکھیں: رسالۃ الأنبیاء:3/57)

اسی طرح انہوں نے آپ ﷺ کو سحر و جادو گری اور جھوٹ کی جانب بھی منسوب کیا: ﴿وَعَجِبُوٓاْ أَن جَآءَهُم مُّنذِرٞ مِّنۡهُمۡۖ وَقَالَ ٱلۡكَٰفِرُونَ هَٰذَا سَٰحِرٞ كَذَّابٌ﴾ ترجمہ: ''اِن لوگوں کو اس بات پر بڑا تعجب ہوا کہ ایک ڈرانے والا خود اِنہی میں سے آگیا، منکرین کہنے لگے کہ "یہ ساحر ہے، سخت جھوٹا ہے"۔ (سورۃ ص:4)

ایک اور مقام پر ہے: ﴿نَّحۡنُ أَعۡلَمُ بِمَا يَسۡتَمِعُونَ بِهِۦٓ إِذۡ يَسۡتَمِعُونَ إِلَيۡكَ وَإِذۡ هُمۡ نَجۡوَىٰٓ إِذۡ يَقُولُ ٱلظَّٰلِمُونَ إِن تَتَّبِعُونَ إِلَّا رَجُلٗا مَّسۡحُورًا ﴿٤٧﴾ ٱنظُرۡ كَيۡفَ ضَرَبُواْ لَكَ ٱلۡأَمۡثَالَ فَضَلُّواْ فَلَا يَسۡتَطِيعُونَ سَبِيلٗا ﴿٤٨﴾﴾ ترجمہ: ''ہمیں معلوم ہے کہ جب وہ کان لگا کر تمہاری بات سنتے ہیں تو دراصل کیا سنتے ہیں، اور جب بیٹھ کر باہم سرگوشیاں کرتے ہیں تو کیا کہتے ہیں، یہ ظالم آپس میں کہتے ہیں کہ یہ ایک سحر زدہ آدمی ہے جس کے پیچھے تم لوگ جا رہے ہو۔ دیکھو، کیسی باتیں ہیں جو یہ لوگ تم پر چھانٹتے ہیں، یہ بھٹک گئے ہیں، اِنہیں راستہ نہیں ملتا''۔ (سورۃ الاسراء: 47-48)

اللہ کے رسول ﷺ پر آیات نازل ہوتی تھیں جن کے ذریعہ مشرکین کے تمام دعوؤں کی تردید اور ان کا توڑ کیا جاتا، اور یہ بیان کیا جاتا تھا کہ سابقہ رسولوں کا بھی مذاق اڑایا گیا ہے، اور استہزاء اور مذاق کرنے والوں کا انجام بدعذاب کی شکل میں ظاہر ہوگا: ﴿وَلَقَدِ ٱسۡتُهۡزِئَ بِرُسُلٖ مِّن قَبۡلِكَ فَحَاقَ بِٱلَّذِينَ سَخِرُواْ مِنۡهُم مَّا كَانُواْ بِهِۦ يَسۡتَهۡزِءُونَ﴾ ترجمہ: ''اے محمد ﷺ! تم سے پہلے بھی بہت سے رسولوں کا مذاق اڑایا جا چکا ہے، مگر ان مذاق اڑانے والوں پر آخر کار وہی حقیقت مسلط ہو کر رہی جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ (سورۃ الأنعام: 10)

آیات میں یہ بھی واضح کیا جاتا کہ مشرکین اللہ کے رسول ﷺ کی شخصیت کا انکار نہیں کر رہے ہیں، بلکہ وہ حق کی مخالفت کر رہے ہیں اور اس طرح کی باتوں کے ذریعہ اللہ کی آیات کو ٹھکرا رہے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿قَدۡ نَعۡلَمُ إِنَّهُۥ لَيَحۡزُنُكَ ٱلَّذِي يَقُولُونَۖ فَإِنَّهُمۡ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَٰكِنَّ ٱلظَّٰلِمِينَ بِـَٔايَٰتِ ٱللَّهِ يَجۡحَدُونَ﴾ ترجمہ: ''اے محمد ﷺ! ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان سے تمہیں رنج ہوتا ہے، لیکن یہ لوگ تمہیں نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم دراصل اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہیں''۔ (سورۃ الأنعام: 33)

4) قرآنِ کریم کے بارے میں ان کا موقف:

مشرکین اس بات کو تسلیم نہیں کرتے تھے کہ قرآن کریم اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہے، اور قرآن کو وہ شعر کی ایک قسم تصور کرتے تھے جیسے کے شعراء شعر کہتے ہیں، حالانکہ جو بھی قرآن اور اشعار عرب کے مابین موازنہ کرتا تو اس کے سامنے یہ بات واضح ہو جاتی کہ قرآن اشعار سے کہیں مختلف ہے: ﴿وَمَا عَلَّمۡنَٰهُ ٱلشِّعۡرَ وَمَا يَنۢبَغِي لَهُۥٓۚ إِنۡ هُوَ إِلَّا ذِكۡرٞ وَقُرۡءَانٞ مُّبِينٞ ﴿٦٩﴾ لِّيُنذِرَ مَن كَانَ حَيّٗا وَيَحِقَّ ٱلۡقَوۡلُ عَلَى ٱلۡكَٰفِرِينَ ﴿٧٠﴾﴾ ترجمہ: ''ہم نے اِس (نبی) کو شعر نہیں سکھایا ہے اور نہ شاعری

اس کو زیب ہی دیتی ہے، یہ تو ایک نصیحت ہے اور صاف پڑھی جانے والی کتاب، تاکہ وہ ہر اُس شخص کو خبر دار کر دے جو زندہ ہو اور انکار کرنے والوں پر حجت قائم ہو جائے"۔(سورۃ یس: 69-70)

اور قرآن شعر کیسے ہو سکتا ہے. جبکہ اس میں شعراء کی مذمت بیان کی گئی ہے، اس لئے کہ اکثر شعراء لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں اور خلافِ حقیقت بات کرتے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَٱلشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ ٱلۡغَاوُۥنَ ﴿٢٢٤﴾ أَلَمۡ تَرَ أَنَّهُمۡ فِي كُلِّ وَادٖ يَهِيمُونَ ﴿٢٢٥﴾ وَأَنَّهُمۡ يَقُولُونَ مَا لَا يَفۡعَلُونَ ﴿٢٢٦﴾﴾ ترجمہ: "رہے شعراء، تو ان کے پیچھے بہکے ہوئے لوگ چلا کرتے ہیں۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے ہیں۔ اور ایسی باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں"۔(سورۃ الشعراء: 224-226)

لہٰذا قرآن اللہ کی طرف سے نازل کردہ کلام ہے جو اس نے اپنے رسول ﷺ پر نازل کیا ہے اور یہ کسی بھی اعتبار سے شعراء کے کلام سے اور کاہنوں کی باتوں سے میل نہیں کھاتا ہے: ﴿إِنَّهُۥ لَقَوۡلُ رَسُولٖ كَرِيمٖ ﴿٤٠﴾ وَمَا هُوَ بِقَوۡلِ شَاعِرٖۚ قَلِيلٗا مَّا تُؤۡمِنُونَ ﴿٤١﴾ وَلَا بِقَوۡلِ كَاهِنٖۚ قَلِيلٗا مَّا تَذَكَّرُونَ ﴿٤٢﴾ تَنزِيلٞ مِّن رَّبِّ ٱلۡعَٰلَمِينَ ﴿٤٣﴾﴾ ترجمہ: "بے شک یہ (قرآن) رسول کریم کی زبان سے نکلا ہے۔ اور وہ کسی شاعر کا قول نہیں، تم بہت ہی کم یقین کرتے ہو۔ اور نہ ہی کسی جادو گر کا قول ہے، تم بہت ہی کم غور کرتے ہو۔ وہ پروردگار عالم کا نازل کیا ہوا ہے"۔(سورۃ الحاقہ: 40-43)

شعراء کو بذاتِ خود اس کا ادراک تھا کہ قرآن کریم شعر و شاعری نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود مشرکین عداوت و دشمنی میں اس قدر اندھے ہو گئے تھے کہ وہ کہتے تھے کہ محمد ﷺ کسی عجمی شخص سے قرآن سیکھتے ہیں، اور وہ عجمی شخص کسی قریشی قبیلے کا کوئی غلام تھا، اور وہ کوہِ صفا کے پاس کچھ بیچتا تھا، اور کبھی کبھار اللہ کے رسول ﷺ اس کے پاس بیٹھتے تھے، اور اس سے کچھ باتیں کر لیا کرتے تھے، اور اس کی زبان عربی تھی، وہ صرف اتنی عربی جانتا تھا کہ وہ بات کا ضروری جواب دے سکے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَلَقَدۡ نَعۡلَمُ أَنَّهُمۡ يَقُولُونَ إِنَّمَا يُعَلِّمُهُۥ بَشَرٞۗ لِّسَانُ ٱلَّذِي يُلۡحِدُونَ إِلَيۡهِ أَعۡجَمِيّٞ وَهَٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيّٞ مُّبِينٌ﴾ ترجمہ: "ہمیں معلوم ہے یہ لوگ تمہارے متعلق کہتے ہیں کہ اس شخص کو ایک آدمی سکھاتا پڑھاتا ہے، حالانکہ ان کا اشارہ جس آدمی کی طرف ہے اس کی زبان عجمی ہے اور یہ صاف عربی زبان ہے"۔(سورۃ النحل: 103) لہٰذا ایک عجمی شخص سے ایسا فصیح و بلیغ اور وسیع المعانی جامع کلام کیسے سیکھ سکتے ہیں؟! ایسی بات وہ شخص ہر گز نہیں کر سکتا ہے جس کے پاس ادنی سی بھی عقل ہو!۔(دیکھیں: تفسیر ابنِ کثیر: 2/586)

اسی طرح ان کا ایک اعتراض قرآن پاک کے طریقۂ نزول پر بھی تھا، ان کا مطالبہ یہ تھا کہ قرآن ایک ہی ساتھ یکبارگی نازل ہو، حالانکہ جستہ جستہ قرآن نازل ہونے کے ذریعہ وہ اہل ایمان کے دلوں میں زیادہ راسخ ہو گا، اس کو سمجھنا، یاد کرنا، اور اس پر عمل کرنا، زیادہ آسان ہو گا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَقَالَ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ لَوۡلَا نُزِّلَ عَلَيۡهِ ٱلۡقُرۡءَانُ جُمۡلَةٗ وَٰحِدَةٗۚ كَذَٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهِۦ فُؤَادَكَۖ وَرَتَّلۡنَٰهُ تَرۡتِيلٗا﴾ ترجمہ: "منکرین کہتے ہیں: اِس شخص پر سارا قرآن ایک ہی وقت میں کیوں نہ اتار دیا

گیا؟۔ ہاں، ایسا اس لئے کیا گیا ہے کہ اس کو اچھی طرح ہم تمہارے ذہن نشین کرتے رہیں اور (اسی غرض کے لئے) ہم نے اس کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ الگ الگا اجزاء کی شکل دی ہے"۔ (سورۃ الفرقان: 32)

جب مشرکین نے قرآن کے بارے میں اور آپ ﷺ کے بارے میں اس طرح کے اعتراضات کئے، تو اللہ تعالی نے ان کو یہ چیلنج دیا کہ وہ اس طرح کا کلام پیش کریں، اور اللہ تعالی نے یہ بھی واضح کر دیا کہ تمام انسان اور جنات بھی اگر اس کے لئے جمع ہو جائیں تو وہ ایسا ہر گز نہیں کر سکیں گے: ﴿قُل لَّئِنِ ٱجۡتَمَعَتِ ٱلۡإِنسُ وَٱلۡجِنُّ عَلَىٰٓ أَن يَأۡتُواْ بِمِثۡلِ هَٰذَا ٱلۡقُرۡءَانِ لَا يَأۡتُونَ بِمِثۡلِهِۦ وَلَوۡ كَانَ بَعۡضُهُمۡ لِبَعۡضٖ ظَهِيرٗا﴾ ترجمہ: "کہہ دو کہ اگر انسان اور جن سب کے سب مل کر اس قرآن جیسی کوئی چیز لانے کی کوشش کریں تو نہ لاسکیں گے، چاہے وہ سب ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں"۔ (سورۃ الإسراء: 88)

بلکہ وہ اس جیسی دس سورتیں بھی پیش نہیں کر سکتے ہیں: ﴿أَمۡ يَقُولُونَ ٱفۡتَرَىٰهُۖ قُلۡ فَأۡتُواْ بِعَشۡرِ سُوَرٖ مِّثۡلِهِۦ مُفۡتَرَيَٰتٖ وَٱدۡعُواْ مَنِ ٱسۡتَطَعۡتُم مِّن دُونِ ٱللَّهِ إِن كُنتُمۡ صَٰدِقِينَ ١٣ فَإِلَّمۡ يَسۡتَجِيبُواْ لَكُمۡ فَٱعۡلَمُوٓاْ أَنَّمَآ أُنزِلَ بِعِلۡمِ ٱللَّهِ وَأَن لَّآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَۖ فَهَلۡ أَنتُم مُّسۡلِمُونَ ١٤﴾ ترجمہ: "کیا یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے یہ کتاب خود گھڑ لی ہے؟ کہو: "اچھا یہ بات ہے تو اس جیسی گھڑی ہوئی دس سورتیں تم بنالاؤ اور اللہ کے سوا اور جو جو (تمہارے معبود) ہیں اُن کو مدد کے لئے بلا سکتے ہو تو بلالو، اگر تم (انہیں معبود سمجھنے میں) سچے ہو۔ اب اگر وہ (تمہارے معبود) تمہاری مدد کو نہیں پہنچتے تو جان لو کہ یہ اللہ کے علم سے نازل ہوئی ہے اور یہ کہ اللہ کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں ہے، پھر کیا تم (اس امر حق کے آگے) سر تسلیم خم کرتے ہو؟"۔ (سورۃ ھود: 13-14)

یہاں تک کہ قرآن جیسی ایک سورت بھی پیش کرنے کی صلاحیت وقدرت نہیں رکھتے ہیں: ﴿وَمَا كَانَ هَٰذَا ٱلۡقُرۡءَانُ أَن يُفۡتَرَىٰ مِن دُونِ ٱللَّهِ وَلَٰكِن تَصۡدِيقَ ٱلَّذِي بَيۡنَ يَدَيۡهِ وَتَفۡصِيلَ ٱلۡكِتَٰبِ لَا رَيۡبَ فِيهِ مِن رَّبِّ ٱلۡعَٰلَمِينَ ٣٧ أَمۡ يَقُولُونَ ٱفۡتَرَىٰهُۖ قُلۡ فَأۡتُواْ بِسُورَةٖ مِّثۡلِهِۦ وَٱدۡعُواْ مَنِ ٱسۡتَطَعۡتُم مِّن دُونِ ٱللَّهِ إِن كُنتُمۡ صَٰدِقِينَ ٣٨﴾ ترجمہ: "اور یہ قرآن وہ چیز نہیں ہے جو اللہ کی وحی و تعلیم کے بغیر تصنیف کر لیا جائے، بلکہ یہ تو جو کچھ پہلے آچکا تھا اس کی تصدیق اور الکتاب کی تفصیل ہے، اِس میں کوئی شک نہیں کہ یہ فرمانروائے کائنات کی طرف سے ہے۔ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے اسے خود تصنیف کر لیا ہے؟ کہو: اگر تم اپنے اس الزام میں سچے ہو تو ایک سورۃ اس جیسی تصنیف کر لاؤ، اور ایک خدا کو چھوڑ کر جس جس کو بُلا سکتے ہو مدد کے لئے بُلالو"۔ (سورۃ یونس: 37-38)

حالانکہ فصاحت ان کی فطرت میں داخل تھی اور ان کے اشعار اور معلقات زبان وبیان کی معراج تصور کئے جاتے تھے، لیکن اس کے باوجود ان کا عاجز و بے بس ہونا اس کی دلیل ہے کہ قرآن اللہ تعالی کا کلام ہے جس کی نہ ذات وصفات میں کوئی اس کے مشابہ ہے اور نہ ہی اس کے اقوال وافعال میں کوئی اس کے مثل ہے، اور نہ ہی اس کا کلام کسی مخلوق کے مشابہ ہے۔ (دیکھیں: رسالۃ الانبیاء: 3/66)

5) عہدِ مکی میں دعوت کے انکار کے محرکات:

بعض محققین نے عہد مکی میں اسلام کے انکار کے محرکات کے بارے میں گفتگو کی ہے، ان میں مندرجہ ذیل محرکات بیان کئے ہیں:

ا: جزیرۃ العرب میں نبوت کے اثرات میں ضعف اور کمزوری:

جن عربوں میں نبی کریم ﷺ کی بعثت ہوئی تھی وہ آسمانی مذاہب سے دور تھے، وہ کسی دین پر عمل پیرا نہیں تھے، اور نہ ہی کسی آسمانی کتاب کو پڑھتے تھے، جیسے کہ یہود و نصاری کسی نہ کسی دین کو مانتے تھے اور کسی آسمانی کتاب کو بھی پڑھتے تھے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی بعثت کے بارے میں ان پر حجت قائم کی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَهَٰذَا كِتَٰبٌ أَنزَلْنَٰهُ مُبَارَكٌ فَٱتَّبِعُوهُ وَٱتَّقُواْ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿١٥٥﴾ أَن تَقُولُوٓاْ إِنَّمَآ أُنزِلَ ٱلْكِتَٰبُ عَلَىٰ طَآئِفَتَيْنِ مِن قَبْلِنَا وَإِن كُنَّا عَن دِرَاسَتِهِمْ لَغَٰفِلِينَ ﴿١٥٦﴾ أَوْ تَقُولُواْ لَوْ أَنَّآ أُنزِلَ عَلَيْنَا ٱلْكِتَٰبُ لَكُنَّآ أَهْدَىٰ مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُم بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن كَذَّبَ بِـَٔايَٰتِ ٱللَّهِ وَصَدَفَ عَنْهَا ۗ سَنَجْزِى ٱلَّذِينَ يَصْدِفُونَ عَنْ ءَايَٰتِنَا سُوٓءَ ٱلْعَذَابِ بِمَا كَانُواْ يَصْدِفُونَ ﴿١٥٧﴾﴾ ترجمہ: ''اور اسی طرح یہ کتاب ہم نے نازل کی ہے، ایک برکت والی کتاب، پس تم اِس کی پیروی کرو اور تقویٰ کی روش اختیار کرو، بعید نہیں کہ تم پر رحم کیا جائے، اب تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کتاب تو ہم سے پہلے کے دو گروہوں کو دی گئی تھی، اور ہم کو کچھ خبر نہ تھی کہ وہ کیا پڑھتے پڑھاتے تھے۔ اور اب تم یہ بہانہ بھی نہیں کر سکتے کہ اگر ہم پر کتاب نازل کی گئی ہوتی تو ہم ان سے زیادہ راست رو ثابت ہوتے، تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک دلیل روشن اور ہدایت اور رحمت آگئی ہے، اب اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو اللہ کی آیات کو جھٹلائے اور ان سے منہ موڑے جو لوگ ہماری آیات سے منہ موڑتے ہیں، انہیں اس روگردانی کی پاداش میں ہم بد ترین سزا دے کر رہیں گے''۔ (سورۃ الأنعام: 155-157)

بت پرستانہ اعتقادات کا ان کی زندگی پر، ان کی عقلوں پر اور ان کے افکار پر بہت زیادہ اثر تھا جس کی وجہ سے وہ حق کا سختی کے ساتھ مقابلہ کرتے تھے، اور حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے انکار کرتے تھے، اور یہ حقیقت ہے کہ انسان جب کسی آسمانی دین کو تسلیم کرنے سے دور رہتا ہے تو وہ مادیت اور تجسیم کی جانب مائل ہو جاتا ہے جس کو حواس کے ذریعہ محسوس کیا جا سکتا ہو، اسی لئے بتوں کے پجاری ان بتوں کے لئے اپنی جان و مال اور اولاد قربان کر دیتے ہیں، وہ اس طرح کے لوگوں کا انجام دیکھ چکے ہوتے ہیں، اس سلسلہ میں ان کو مختلف پریشانیاں بھی ہوتی ہیں لیکن ان پریشانیوں کو برداشت کرنا اور ان بتوں کی مدد کرنا اور ان کی عبادت کرنا اپنے لئے باعثِ اجر و ثواب سمجھتے ہیں، اور ان کی محبت و تعظیم میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ (دیکھیں: غایۃ اللھفان من مصائد الشیطان، ابن قیم 2/225)

۲: آباءواجداد کے ورثہ کے بارے میں عصبیت:

سب سے بڑا طاغوت جو انبیاء اور رسولوں کی دعوت کے مدمقابل آتا رہا ہے وہ اندھی تقلید اور رسم و رواج کا طاغوت ہے، اور یہ اللہ کے دین سے روکنے میں سب سے بڑا سبب رہا ہے، ایک انسان کے لئے اس کی مألوفات اور رائج چیزوں سے نکلنا بڑا مشکل ہوتا ہے، بلکہ

جان کا نکل جانا ان مألوفات کو بدلنے سے زیادہ آسان ہوتا ہے، الا یہ کہ انسان کے دل میں یہ بات بیٹھ جائے کہ اس سے نکلنا اور اس کو بدلنا ضروری ہے، قرآن کریم نے سابقہ قوموں کے یہاں غلط چیزوں میں آباء واجداد کی اندھی تقلید کے مرض کی جانب جابجا اشارہ کیا ہے، ابراہیم علیہ السلام اپنی قوم کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں: ﴿إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِۦ مَا تَعْبُدُونَ ۝٧٠ قَالُوا۟ نَعْبُدُ أَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عَـٰكِفِينَ ۝٧١ قَالَ هَلْ يَسْمَعُونَكُمْ إِذْ تَدْعُونَ ۝٧٢ أَوْ يَنفَعُونَكُمْ أَوْ يَضُرُّونَ ۝٧٣ قَالُوا۟ بَلْ وَجَدْنَآ ءَابَآءَنَا كَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ ۝٧٤﴾ ترجمہ: ”جبکہ اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے پوچھا تھا کہ یہ کیا چیزیں ہیں جن کو تم پوجتے ہو؟۔ انہوں نے جواب دیا: کچھ بت ہیں جن کی ہم پوجا کرتے ہیں اور انہی کی سیوا میں ہم لگے رہتے ہیں۔ اس نے پوچھا: کیا یہ تمہاری سنتے ہیں جب تم انہیں پکارتے ہو؟۔ انہوں نے جواب دیا : نہیں، بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے"۔(سورۃ الشعراء:70-74)

یہی ہر زمانہ میں مشرکین اور اللہ کے دین کی مخالفت کرنے والوں کا طرز عمل رہا ہے، اور جب داعیانِ حق اور مصلحین ان کی شہوت پرستی اور خواہشات میں ان کے انہماک کے بارے میں ان پر نکیر کرتے اور ان سے اس سلسلہ میں سوال کرتے تو ان کا جواب ہوتا: ﴿وَجَدْنَا عَلَيْهَآ ءَابَآءَنَا وَٱللَّهُ أَمَرَنَا بِهَا ۗ قُلْ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِٱلْفَحْشَآءِ ۖ أَتَقُولُونَ عَلَى ٱللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾ ترجمہ: ”کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طریقہ پر پایا ہے اور اللہ ہی نے ہمیں ایسا کرنے کا حکم دیا ہے اِن سے کہو: اللہ بے حیائی کا حکم کبھی نہیں دیا کرتا، کیا تم اللہ کا نام لے کر وہ باتیں کہتے ہو جن کے متعلق تمہیں علم نہیں ہے (وہ اللہ کی طرف سے ہیں)؟!“۔(سورۃ الأعراف:28)

ایسا صرف اس لئے ہوتا ہے کیونکہ وہ دلیل اور حجت کے اعتبار سے بالکل کورے ہوتے ہیں، وہ نہ ہی رہنمائی کرنے والی عقل سے کام لیتے ہیں اور نہ ہی کسی کتاب سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں فرمایا ہے: ﴿أَلَمْ تَرَوْا۟ أَنَّ ٱللَّهَ سَخَّرَ لَكُم مَّا فِى ٱلسَّمَـٰوَٰتِ وَمَا فِى ٱلْأَرْضِ وَأَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهُۥ ظَـٰهِرَةً وَبَاطِنَةً ۗ وَمِنَ ٱلنَّاسِ مَن يُجَـٰدِلُ فِى ٱللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا هُدًى وَلَا كِتَـٰبٍ مُّنِيرٍ ۝٢٠ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ ٱتَّبِعُوا۟ مَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ قَالُوا۟ بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ ءَابَآءَنَآ ۚ أَوَلَوْ كَانَ ٱلشَّيْطَـٰنُ يَدْعُوهُمْ إِلَىٰ عَذَابِ ٱلسَّعِيرِ ۝٢١﴾ ترجمہ: ”کیا تم لوگ نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زمین اور آسمانوں کی ساری چیزیں تمہارے لئے مسخر کر رکھی ہیں اور اپنی کھلی اور چھپی نعمتیں تم پر تمام کر دی ہیں؟ اِس پر حال یہ ہے کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ ہیں جو اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی علم ہو، یا ہدایت، یا کوئی روشنی دکھانے والی کتاب۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ پیروی کرو اُس چیز کی جو اللہ نے نازل کی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو اُس چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے، کیا یہ انہی کی پیروی کریں گے خواہ شیطان اُن کو بھڑکتی ہوئی آگ ہی کی طرف کیوں نہ بلاتا رہا ہو؟“۔(سورۃ لقمان:20-21)

اس منحرفانہ تقلید میں کفار کو شیطان نے انسان کی اس فطری کمزوری کا سہارا لے کر ملوث کیا جس کے مطابق انسان آباءواجداد کے ساتھ وفاداری کرنا چاہتا ہے، اور ان کی تاریخ اور ورثہ کے ساتھ مربوط رہنا چاہتا ہے، یہ شیطانی چال کا خطرناک ترین حربہ ہے کہ وہ خواہش، وطن، مال وغیرہ کی فطری محبت کے ذریعہ انسان کو اپنے جال میں پھنساتا ہے،اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے:'' شیطان انسان کے تمام راستوں میں بیٹھا رہتا ہے، سب سے پہلے وہ اس کے سامنے اسلام کے راستے میں بیٹھ جاتا ہے، اور انسان سے کہتا ہے: تم اسلام قبول کررہے ہو اور اپنے آباء واجداد کے دین کو چھوڑ رہے ہو؟ لیکن انسان شیطان کی بات نہیں مانتا ہے اور وہ اسلام قبول کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ ہجرت کے راستے میں بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے: تم ہجرت کررہے ہو اور اپنی زمین اور فضا کو چھوڑ رہے ہو؟ ہجرت کرنے والے کی مثال لمبی رسی میں بندھے گھوڑے کی سی ہے۔ (جو رسی کے دائرے سے باہر کہیں آجا نہیں سکتا) لیکن انسان نے یہاں بھی شیطان کی بات نہیں مانی اور اس نے ہجرت کرلی۔ پھر وہ انسان کو جہاد کے راستے سے بہکانے کے لئے بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے: تم جہاد کروگے اس میں جان اور مال کی قربانی ہے۔ تم قتل کردیئے جاؤگے، اور تمہاری بیوی سے شادی کرلی جائے گی، اور مال تقسیم کردیا جائے گا۔ لیکن یہاں بھی انسان نے اس کی بات نہیں مانی اور اس نے جہاد کیا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: جس نے ایسا کیا اس کا اللہ تعالیٰ پر حق ہے کہ وہ اسے جنت میں داخل کرے، اور جو اس راہ میں شہید ہوگیا اللہ تعالیٰ پر حق ہے کہ وہ اسے جنت میں داخل کرے گا۔ اگر وہ اس راہ میں ڈوب گیا تو اسے بھی جنت میں داخل کرنا اللہ پر حق ہے۔ اور اگر اسے اس کی سواری گرا کر ہلاک کردے تو بھی اللہ تعالیٰ پر اس کا حق ہے کہ اسے بھی جنت میں داخل کرے''۔ (سنن نسائی 6/21، مسند أحمد 3/483، ابن حبان: 4593)

نبی کریم ﷺ کو جب بحیثیتِ نبی مبعوث کیا گیا تو آپ ﷺ پر جو الزامات لگائے گئے اس میں ایک الزام یہ بھی تھا کہ وہ آباء واجداد کے طور طریقوں کے برخلاف دین کی دعوت دیتے ہیں، اسی الزام کو بنیاد بنا کر مخالفین نے عام اور خاص لوگوں کو آپ ﷺ سے متنفر کرنے کی کوشش کی، اور دعوت پر وقتی حصار قائم کرلیا۔ (دیکھیں: الغرباء الأولون، ص 83)

۳: اہلِ کتاب کا بت پرستی کے موافق طرزِ عمل:

عرب کا بت پرستانہ ماحول دعوتِ توحید کا مقابلہ کرنے اور اس کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے بالکل تیار تھا، اس دعوت کو ٹھکرادینے والے اہل کتاب کا طرزِ عمل بھی کشمکش میں مشرکین کے معاون و مددگار تھا، وہ اگرچہ اہلِ تورات وانجیل اور کتب سماویہ کے وارثین تھے، لیکن وہ محمد ﷺ کی دعوت کا انکار کرتے تھے، اس کو ٹھکراتے تھے اور اس کی تکذیب کرتے تھے۔ حالانکہ وہ دین کا سب سے زیادہ علم رکھتے تھے لیکن اس کے باوجود اہلِ شرک کے لئے وہ تقویت، معاونت اور حوصلہ افزائی کا اہم سرچشمہ ثابت ہورہے تھے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَٱنطَلَقَ ٱلۡمَلَأُ مِنۡهُمۡ أَنِ ٱمۡشُواْ وَٱصۡبِرُواْ عَلَىٰٓ ءَالِهَتِكُمۡۖ إِنَّ هَٰذَا لَشَيۡءٞ يُرَادُ ۝٦ مَا سَمِعۡنَا بِهَٰذَا فِي ٱلۡمِلَّةِ ٱلۡأٓخِرَةِ إِنۡ هَٰذَآ إِلَّا ٱخۡتِلَٰقٌ ۝٧﴾ ترجمہ:''اور سرداران قوم یہ کہتے ہوئے نکل گئے کہ "چلو اور ڈٹے رہو اپنے معبودوں کی عبادت پر، یہ بات تو کسی اور ہی غرض سے کہی جارہی ہے، یہ بات ہم نے زمانہ قریب کی ملت میں کسی سے نہیں سنی، یہ کچھ نہیں ہے مگر ایک من گھڑت بات''۔ (سورۃ ص، 6-7)

اس نئی دعوت کا مقابلہ کرتے رہنے میں جو چیز ان کو حوصلہ افزائی کا سبب بنتی تھی وہ یہ تھی کہ انہوں نے دوسری ملت یعنی نصرانیت میں اس کا کوئی ذکر نہیں سنا تھا، جیسے کہ حضرت ابن عباسؓ، محمد بن کعب قرظی، قتادہ اور مجاہد کا قول ہے۔ (تفسیر طبری 23/126 الدر المنثور 7/146)

اللہ کے رسول ﷺ کے خلاف مشرکین کا یہ قول اہلِ کتاب ہی کے کہنے پر مبنی تھا، ورنہ عربوں کو کتبِ سماویہ کے بارے میں اور ان میں موجود حقائق واخبار کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ (دیکھیں: الغرباء الاولون، ص 86)

۴: رسم ورواج اور قبائلی عادتوں کا غلبہ:

عربوں میں قبائلی کشمکش اور سیادت و قیادت میں تنافس و مقابلہ آرائی کی جڑیں کافی مضبوط تھیں، اسی لئے آپ دیکھیں گے کہ دعوت کے معارضین یہ دلیل دیتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کا اپنے قبیلہ میں کوئی قائدانہ مقام نہیں ہے اور نہ ہی آپ کو ان کے درمیان کوئی قبائلی منصب حاصل ہے، جبکہ دیگر قبائل اسلام کا انکار اس لئے کر رہے تھے کیونکہ ان کو اپنی کرسی اور قبیلہ میں اپنے مقام کے ختم ہونے کا اندیشہ تھا، اسی طرح کسی دوسرے قبیلہ کے فرد کی بات ماننے میں تکبر ان کے آڑے آرہا تھا، چنانچہ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے روایت ہے، فرماتے ہیں: ''سب سے پہلا دن جس میں اللہ کے رسول ﷺ کو میں نے پہچانا، وہ دن تھا جبکہ میں اور ابوجہل بن ہشام مکہ کی بعض گلیوں میں تھے کہ اچانک ہماری ملاقات اللہ کے رسول ﷺ سے ہوگئی، آپ ﷺ نے ابوجہل سے فرمایا: اے ابوالحکم! آجاؤ اللہ اور اس کے رسول کی طرف، میں آپ کو اللہ کی طرف بلاتا ہوں، یہ سن کر ابوجہل نے کہا! اے محمد! کیا آپ ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہنا بند کریں گے؟ کیا آپ صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہم اس بات کی گواہی دیں کہ آپ نے (اللہ کا پیغام) پہنچا دیا ہے؟ اللہ کی قسم! اگر میں جان بھی لوں کہ آپ جو کچھ کہتے ہیں وہ حق ہے تب بھی آپ کی اتباع نہیں کروں گا! یہ سن کر اللہ کے رسول ﷺ تشریف لے گئے اور ابوجہل میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا: اللہ کی قسم! بلاشبہ میں جانتا ہوں کہ جو کچھ یہ کہتے ہیں وہ حق ہے، لیکن بنو قصی کہتے ہیں: حجابہ (خانہ کعبہ کی دربانی) ہمارے ذمہ ہے۔ ہم نے کہا: ٹھیک ہے۔ اُنہوں نے کہا: دار الندوہ کے ذمہ دار ہم ہیں، ہم نے کہا: ٹھیک ہے، اُنہوں نے کہا: پرچم برداری ہماری ذمہ داری ہے۔ ہم نے کہا: ٹھیک ہے! انہوں نے کہا: آبِ زمزم پلانے (سقایہ) کی ذمہ داری ہماری ہے۔ ہم نے کہا: ٹھیک ہے۔ پھر اُنہوں نے بھی کھلایا اور ہم نے بھی کھلایا یہاں تک کہ ہم ان کے ہم پلہ اور برابر ہو گئے، اس کے بعد وہ کہنے لگے: ہمارے درمیان ایک نبی ہے! لہذا اللہ کی قسم! میں یہ نہیں مانوں گا''۔ (دلائل النبوۃ للبیہقی، 2/207)

۵: اپنے مفادات اور مقام کی فکر اور عربوں پر ان کی تاثیر:

قریش کے لوگ چاہتے تھے کہ ان کا مقام و مرتبہ اور ان کی قبائلی مجد و بزرگی اور دھاک بدستور باقی رہے اور مکہ کا تقدس بھی تمام قبائل کے نزدیک برقرار رہے، اس لئے کہ وہ سمجھتے تھے کہ اسلام ان سے اس خصوصیت کو سلب کر لے گا اور پھر عرب ان پر حملہ آور ہو جائیں گے اور ان کے بازاروں میں سودا سلف لانا بند کر دیں گے، وہ یہ بھول جاتے تھے کہ اللہ ہی ان کو رزق عطا کرنے والا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَقَالُوٓاْ إِن نَّتَّبِعِ ٱلۡهُدَىٰ مَعَكَ نُتَخَطَّفۡ مِنۡ أَرۡضِنَآۚ أَوَلَمۡ نُمَكِّن لَّهُمۡ حَرَمًا ءَامِنًا يُجۡبَىٰٓ إِلَيۡهِ

ثَمَرَٰتُ كُلِّ شَيۡءٖ رِّزۡقٗا مِّن لَّدُنَّا وَلَٰكِنَّ أَكۡثَرَهُمۡ لَا يَعۡلَمُونَ﴾ ترجمہ:" وہ کہتے ہیں: اگر ہم تمہارے ساتھ اِس ہدایت کی پیروی اختیار کرلیں تواپنی زمین سے اُچک لئے جائیں گے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے ایک پرامن حرم کوان کے لئے جائے قیام بنادیا جس کی طرف ہر طرح کے ثمرات کھچے چلے آتے ہیں، ہماری طرف سے رزق کے طور پر؟ مگران میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں"۔(سورۃالقصص:57)

قریش کے لوگ سمجھتے تھے کہ بتوں کی پوجاپرستش کرنے والے عربوں کوجب علم ہوگاکہ قریش ایک نئے دین کو قبول کرنے والے ہیں اوراپنے آباءواجداد کے دین کو چھوڑنے والے ہیں، تووہ سب کے سب ان پر ٹوٹ پڑیں گے،اور وہاں کے باشندوں کو نکال باہر کردیں گے، بلکہ حج کے دنوں میں ان کو سوداسلف دینا بھی بند کردیں گے، لیکن یہ بہت ہی بے عقلی کی بات اور حقیقت کے برخلاف سوچ تھی، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ہی غالب ہونے والا ہے،ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿أَوَلَمۡ يَرَوۡاْ أَنَّا جَعَلۡنَا حَرَمًا ءَامِنٗا وَيُتَخَطَّفُ ٱلنَّاسُ مِنۡ حَوۡلِهِمۡۚ أَفَبِٱلۡبَٰطِلِ يُؤۡمِنُونَ وَبِنِعۡمَةِ ٱللَّهِ يَكۡفُرُونَ﴾ ترجمہ:"کیا یہ دیکھتے نہیں ہیں کہ ہم نے ایک پرامن حرم بنادیا ہے حالانکہ اِن کے گردوپیش لوگ اُچک لئے جاتے ہیں؟ کیا پھر بھی یہ لوگ باطل کومانتے ہیں اور اللہ کی نعمت کاکفران کرتے ہیں؟"۔ (سورۃالعنکبوت:67)ایک اور مقام پر ہے: ﴿وَلَقَدۡ سَبَقَتۡ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا ٱلۡمُرۡسَلِينَ ١٧١ إِنَّهُمۡ لَهُمُ ٱلۡمَنصُورُونَ ١٧٢ وَإِنَّ جُندَنَا لَهُمُ ٱلۡغَٰلِبُونَ﴾ ترجمہ: اپنے بھیجے ہوئے بندوں سے ہم پہلے ہی وعدہ کرچکے ہیں۔ کہ یقیناًان کی مدد کی جائے گی۔ اور ہمارالشکر ہی غالب ہوکر رہے گا۔(سورۃالصافات:173-171)

....

دوسرا باب

ابتلاء وآزمائش کا قانون

ابتلاء وآزمائش عمومی طور پر اللہ کی ایک اہم سنت اور ضابطہ ہے اور یہ قرآن کریم کے بیانات اور توضیحات سے بالکل واضح ہوتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَهُوَ ٱلَّذِى جَعَلَكُمْ خَلَـٰٓئِفَ ٱلْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَـٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِى مَآ ءَاتَىٰكُمْ ۗ إِنَّ رَبَّكَ سَرِيعُ ٱلْعِقَابِ وَإِنَّهُۥ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌۢ﴾ ترجمہ: ''وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا، اور تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلہ میں زیادہ بلند درجے دیئے، تاکہ جو کچھ تم کو دیا ہے اسی میں تمہاری آزمائش کرے، بے شک تمہارا رب سزا دینے میں بھی بہت تیز ہے اور بہت در گزر کرنے اور رحم فرمانے والا بھی ہے''۔ (سورۃ الأنعام: 165) دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى ٱلْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا﴾ ترجمہ: ''واقعہ یہ ہے کہ یہ جو کچھ سر و سامان بھی زمین پر ہے اس کو ہم نے زمین کی زینت بنایا ہے تاکہ اِن لوگوں کو آزمائیں، اِن میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے''۔ (سورۃ الکھف: 7) ایک اور مقام پر ہے: ﴿إِنَّا خَلَقْنَا ٱلْإِنسَـٰنَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَـٰهُ سَمِيعًۢا بَصِيرًا﴾ ترجمہ: ''ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا، تاکہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کے لئے ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا''۔ (سورۃ الانسان: 2)

ابتلاء وآزمائش کا غلبہ اور اقتدار کے ساتھ بہت گہرا ربط ہے، یہ اللہ کا ضابطہ رہا ہے کہ کسی بھی امت کو اقتدار اور غلبہ اسی وقت ملتا ہے جو مختلف آزمائشی دور سے گزر کر آئی ہوں اور حالات کے تھپیڑوں کے ذریعہ وہ کندن بن چکی ہو، اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ خبیث کو طیب سے الگ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کا یہی ضابطہ امت مسلمہ پر بھی جاری ونافذ العمل ہے جس میں ردّ وبدل نہیں کیا گیا ہے، اس لئے اللہ کی مشیت کا تقاضا ہوا کہ اہل ایمان کو آزمائے تاکہ ان کے ایمان کی تمحیص ہو جائے، اس کے بعد ہی ان کو زمین میں غلبہ اور اقتدار عطا کیا جائے، امام شافعیؒ سے جب کسی شخص نے دریافت کیا کہ انسان کے لئے بہتر کون سی حالت ہے: غلبہ واقتدار کی حالت، یا ابتلاء وآزمائش کی حالت؟ امام شافعیؒ کا جواب تھا: اس وقت تک غلبہ اور اقتدار نہیں مل سکتا ہے جب تک کہ اس کی آزمائش نہ ہو۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ، محمدؐ (صلوات اللہ وسلامہ علیہم أجمعین) سب کو آزمائشی مراحل سے گذرنا پڑا، جب انہوں نے صبر کیا تو اس کے بعد ان کو غلبہ عطا کیا، اس لئے کسی کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ تکلیف وآزمائش سے بالکل محفوظ رہے گا۔ (الفوائد، ابن قیمؒ، ص 283)

اقتدار اور غلبہ سے پہلے اہلِ ایمان کی ابتلاء وآزمائش ایک امرِ ضروری ہے، جس کا مقصد تمحیص اور چھٹائی ہے، تاکہ اس کے بعد وہ مضبوط بنیادوں پر اپنی عمارت قائم کر سکیں، اور اہلِ ایمان کی یہ ابتلاء رحمت پر مبنی ہوتی ہے نہ کہ غضب اور ناراضگی پر، اور اسی آزمائش کی بنیاد پر انتخاب کیا جاتا ہے، اور اس کا مقصد صرف اور صرف آزمائش نہیں ہوتا ہے۔ (دیکھیں: التمکین للأمۃ الاسلامیۃ، محمد سید محمد یوسف، ص: 235)

بے شک ابتلاء وآزمائش تمام دعوتوں میں اللہ کی سنت رہی ہے، اسی طرح یہ جنت تک پہنچنے کا راستہ بھی ہے، کیونکہ "جنت کو ناپسندیدہ چیزوں کے ذریعہ گھیر دیا گیا ہے، اور جہنم کے آس پاس پسندیدہ چیزیں اور خواہشات رکھی گئی ہیں"۔(صحیح مسلم:2822، مسند أحمد:3/153، سنن ترمذی،2559)

ابتلاء کی حکمت اور اس کے فوائد

ابتلاء وآزمائش کی بہت سی حکمتیں اور فوائد ہیں جن میں سے اہم ترین مندرجہ ذیل ہیں:

1) نفس کا تزکیہ اور صفائی:

اللہ تعالیٰ نے ابتلاء وآزمائش کو دلوں کی صفائی اور ان کے تزکیہ کا ایک ذریعہ بنایا ہے اور اس کے ذریعہ ایک سچے مومن اور جھوٹے منافق میں پہچان ہوتی ہے، اس لئے کہ ایک انسان کی اصل حقیقت خوشحالی کی حالت میں ظاہر نہیں ہو پاتی ہے، لیکن مصیبت اور پریشانی کے وقت اس کی اصل حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿أَحَسِبَ ٱلنَّاسُ أَن يُتْرَكُوٓاْ أَن يَقُولُوٓاْ ءَامَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ﴾ ترجمہ: "کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ "ہم ایمان لائے" اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؟۔(سورۃ العنکبوت:2)

2) مسلم جماعت کی تربیت:

اس سلسلہ میں سید قطبؒ فرماتے ہیں: "یہی ایک ایسا راستہ ہے جس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہو سکتا ہے جس کی بنیاد پر ایک ایسی جماعت کی تشکیل عمل میں آسکتی ہے جو اس دعوت کے بارِ گراں کو اٹھا سکتی ہو، اور اس کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکتی ہو، یہی اس جماعت کی تربیت اور اس کے اندر موجود خیر، قوت اور صبر کی پوشیدہ صفات کو جِلا بخشنے کا صحیح طریقہ ہے، اور یہی ذمہ داریوں کو عملی طور پر تقسیم کرنے، لوگوں کی اصل حقیقت معلوم کرنے اور زندگی کی حقیقت سے واقف ہونے کا بہترین طریقہ ہے، تاکہ اس دعوت پر مضبوط ترین لوگ ثابت قدم رہ سکیں، یہی وہ لوگ ہیں جو اس دعوت کے اصل حاملین ہو سکتے ہیں، اس پر جم سکتے ہیں اور یہی اس کے اصل امین بننے کے حقدار ہیں"۔(فی ظلال القرآن:2/180)

3) دلوں میں پوشیدہ چیزوں کا انکشاف:

ابتلاء کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ دلوں میں موجود چھپی ہوئی چیزوں کو منکشف کیا جائے۔اس سلسلہ میں صاحب "الظلال" لکھتے ہیں: "اللہ ابتلاء سے پہلے بھی دلوں کے حالات کو جانتا ہے، لیکن ابتلاء کے ذریعہ وہ چیز عالمِ واقع میں بھی منکشف ہو جاتی ہے جو اللہ کے علم میں پہلے سے منکشف تھی لیکن انسانوں کے علم میں نہیں تھی، اس لئے لوگوں کا حساب ان کے عمل کے مطابق لیا جائے گا، نہ کہ صرف اس بات پر کہ اللہ کے علم میں وہ چیز پہلے سے تھی، لہذا ایک اعتبار سے یہ اللہ کا فضل بھی ہے اور دوسرے اعتبار سے عدل کا تقاضا بھی، اور لوگوں کی تربیت کا ایک اہم ذریعہ بھی، اس لئے لوگوں کا مؤاخذہ صرف اسی پر ہوگا جس کا ان کے عمل کے ذریعہ انکشاف ہوگا اور

جس کو ان کا عمل ثابت کر کے دے گا، لوگوں کو کسی کے دل کی حالت اور کیفیت کا علم اللہ تعالی سے زیادہ نہیں ہو سکتا ہے"۔ (فی ظلال القرآن: 6/387)

4) امانت کی ذمہ داری سنبھالنے کے لئے حقیقی تیاری:

ابتلاء کے ذریعہ اللہ کی طرف سے دی گئی امانت کو سنبھالنے کے حقیقی طور پر تیار کیا جاتا ہے، اس حوالے سے صاحب "الظلال" رقمطراز ہیں: "اہلِ ایمان کو ابتلاء کے ذریعہ تکلیف دے کر اور ان کو آزمائش میں مبتلا کر کے اللہ تعالی کو کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا ہے، بلکہ اس کے ذریعہ امانت کی ذمہ داری سنبھالنے کے لئے حقیقی طور پر تیار کیا جاتا ہے، اس بارِ گراں کو سنبھالنے کے لئے ایک خاص قسم کی تیاری کی ضرورت ہوتی ہے جو اسی صورت میں مکمل ہو سکتی ہے جبکہ عملی طور پر مشقتوں کو برداشت کیا جائے، حقیقی طور پر خواہشات پر قابو حاصل کیا جائے، تکالیف پر حقیقتاً صبر کیا جائے، اور اللہ کی نصرت و ثواب پر حقیقی بھروسہ رکھا جائے، اگرچہ آزمائشی دور طویل تر اور آزمائش سخت جاں ہو جائے، نفس کو شدائد اور مصائب ہی صیقل کرتی ہیں جس کے نتیجے میں اس سے گندگی اور خیانت ختم ہو جاتی ہے، اور خوابیدہ صلاحیتں متحرک ہو جاتی ہیں اور ان کو مزید پروان چڑھنے کا موقع ملتا ہے۔

شدائد کے ذریعہ نفس پر مزید بوجھ پڑتا ہے جس کے ذریعہ وہ مزید سخت جاں ہوتا ہے، اس کو تقویت ملتی ہے اور صیقل ہو جاتا ہے، مصائب و آلام کے ذریعہ جماعت میں اسی طرح کے اثرات اور نتائج مرتب ہوتے ہیں، لہذا جو بھی ثابت قدم رہتا ہے وہ مضبوط و مستحکم ہوتا ہے، مزاج و صلاحیت کے اعتبار سے قوی ہوتا ہے، اللہ کے ساتھ تعلق مضبوط ہوتا ہے، اور اس کو دو بہتر چیزوں: نصرت یا شہادت میں سے جو بھی نصیب ہوتا ہے اس کے بارے میں پُر اعتماد ہوتا ہے، یہی وہ گروہ ہے جن کے ہاتھ میں بالآخر پرچم دیا جاتا ہے، یہ قابلِ اعتماد قرار پاتے ہیں اور یہ سب کچھ اعداد و تیاری اور انتخاب کے بعد عمل میں آتا ہے"۔ (فی ظلال القرآن: 6/389)

5) نفس کی حقیقت کا علم:

ابتلا کے ذریعہ نفس کی اصل حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے اور اس کے ذریعہ نفس کی حقیقت کا علم ہو جاتا ہے، اس حوالے سے صاحب "الظلال" کہتے ہیں: "ابتلاء اس لئے بھی ہوتی ہے تاکہ اصحابِ دعوت اپنی حقیقت سے آگاہ ہو جائیں جبکہ وہ زندگی اور جدوجہد کو عملی اور واقعی دنیا میں برت رہے ہوں، اسی طرح وہ نفسِ انسانی کی حقیقت اور اس کی پوشیدہ چیزوں سے بھی واقف ہوں گے، مختلف جماعتوں اور معاشروں سے بھی آگاہ ہو جائیں گے، وہ مشاہدہ کریں گے کہ کس طرح ان کی دعوت کی مبادیات اور اصول ان کی اپنی اور لوگوں کی خواہشات سے ٹکرائیں گے، اسی طرح دلوں میں اثر اندازی کے لئے شیطان کے چور دروازوں، گمراہ کن راہوں اور گمراہی کی پگڈنڈیوں کو بھی پہچان لیں گے"۔ (فی ظلال القرآن: 2/181)

6) دعوت کی قدر و منزلت اور مقام کی پہچان:

ابتلاء و آزمائش کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعہ دعوت کی اہمیت اور اس کی قدر و منزلت نگاہوں میں بڑھ جائے گی، اس پہلو کو صاحب "الظلال" یوں بیان کرتے ہیں: "ابتلاء اس لئے بھی ضروری ہے تاکہ اہل ایمان کے لئے اس دعوت کی قدر و منزلت بڑھ

جائے اور اس کو جو بھی جہد و مشقت اور آزمائش لاحق ہوگی، یا جو بھی وہ اس راہ میں اہم اور قیمتی چیز قربان کریں گے اسی اعتبار سے اس کی قدر و منزلت بڑھ جائے گی، اس لئے وہ اس کے بعد اس سلسلہ میں کوئی کوتاہی نہیں کریں گے، چاہے حالات کیسے بھی ہوں"۔ (فی ظلال القرآن: 2/180)

7) دعوت اور تشہیر:

اہلِ ایمان کا ابتلاء پر صبر کرتے رہنا بذاتِ خود اس دین کی خاموش دعوت ہے، اسی کے ذریعہ لوگ اللہ کے دین میں داخل ہوتے ہیں، اور اگر اہل ایمان کمزوری اور بزدلی کا شکار ہو جائیں تو کوئی بھی ان کی دعوت پر لبیک نہ کہتا، چنانچہ نبی کریم ﷺ کے پاس کوئی ایک شخص حاضر ہوتا تھا اور اس کے بعد اللہ کے رسول ﷺ اس کو حکم دیتے تھے کہ اپنی قوم کے پاس جاؤ اور ان کو حق کی دعوت دو، اور ان کی ایذاء اور تکذیب پر صبر کرتے رہو، وہ اسی کے مطابق عمل کرتا رہتا تھا، یہاں تک کہ وہ پوری قوم کو لے کر اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا تھا۔ (فقہ السیرۃ النبویہ، ص: 192، 193)

8) بعض طاقتور افراد کا اسلام کی طرف مائل ہونا:

مسلمانوں کے صبر اور ان کی قربانیوں کو دیکھ کر بعض طاقتور افراد کے دلوں میں اس عقیدہ کے تئیں نرم گوشہ پیدا ہوتا ہے، اور ان کے دلوں میں اس کا اشتیاق بڑھ جاتا ہے، ایمانی قوت اور استقامت کی وجہ سے ان شخصیات کے نزدیک اس دعوت اور اس کے حاملین کی قدر و منزلت بڑھ جاتی ہے، جس کے نتیجے میں بغیر کسی تردّد کے وہ اسلام کی جانب دوڑے چلے جاتے ہیں، وہ عظیم شخصیات جن کے ذریعہ اسلام کو قوت حاصل ہوئی وہ اسی طریقے سے اس دین میں داخل ہوئے۔ (أیضاً، ص: 193-194)

9) اللہ کے نزدیک مقامِ بلند کا حصول اور گناہوں کا کفارہ:

اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے: "ایک مومن کو جو بھی کانٹا یا اس سے کمتر یا زیادہ کوئی پریشانی لاحق ہوتی ہے تو اس کے ذریعہ اللہ اس کے مقام کو بلند کرتا ہے، یا اس کے ذریعہ اس کے گناہ کو معاف کر دیتا ہے"۔ (صحیح بخاری: 6540، صحیح مسلم: 2572)

معلوم یہ ہوا کہ بسا اوقات بندے کا اللہ کے نزدیک کوئی مقام ہو سکتا ہے لیکن صرف اپنے عمل کے بل بوتے پر وہاں تک نہیں پہنچ پاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو آزمائش میں مبتلا کرتا ہے تاکہ اس کو مقام بلند مل جائے، اسی طرح ابتلاء و آزمائش ایک مسلمان کے گناہوں کے کفارہ کا ذریعہ بھی ہے۔ (دیکھیں: التمکین للأمۃ الاسلامیہ، ص 224، فقہ الابتلاء، محمد ابو صعیلیک، ص: 8-11)

اسی طرح ابتلاء و آزمائش کے دیگر عظیم فوائد بھی ہیں جیسے کہ: ربوبیت کی عزت و عظمت کی معرفت، عبودیت کی ذلت اور کمزوری کی معرفت، اخلاص، رجوع الی اللہ، تضرع، دعا، صبر، آزمائش کے نتائج اور فوائد پر خوشی، اس پر شکر، آزمائش میں مبتلا شخص پر شفقت اور اس کی مدد کرنے کا موقع، عافیت کی نعمت کی قدر دانی اور اس پر شکر، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے آخرت میں جو اجر و ثواب تیار کر رکھا ہے اس کی امید۔ (مزید تفصیل کیلئے دیکھیں: فقہ الابتلاء، محمد ابو صعلیک، ص 15-28)

اللہ کے رسول ﷺ اور آپؐ کے جانثار صحابہ کرام کو بھی ابتلاء وآزمائش کی مختلف اور متنوع شکلوں کا سامنا کرنا پڑا، جیسے کہ قریش کی یہ کوشیش کہ حضرت ابو طالب کو رسول ﷺ کی نصرت و مدد سے دور رکھا جائے، دعوت کی شبیہ کو بگاڑنے کی کوشش، اللہ کے رسول ﷺ کو مختلف طریقوں سے ایذاء پہنچانے کی کوشش، آپ ﷺ کو اور صحابہ کرام کو لالچ دینے کی کوششیں، دعوت کو ترک کردینے کی شرط پر آپ کے ساتھ کچھ لے دے کی کوشش، صفا پہاڑ کو سونا بنانے کا مطالبہ، رسول اللہ ﷺ سے بحث و مناظرہ کرنے کے لئے یہود سے مدد حاصل کرنا، حج کے زمانہ میں دعوت کے خلاف پروپیگنڈہ مہم، اللہ کے رسول ﷺ کے خلاف اور بنو ہاشم اور بنوالمطلب کے خلاف کفارِ مکہ کی طرف سے معاشی محاصرہ اور بائیکاٹ، جسمانی اذیت، اس کے علاوہ اور بہت سی قسم کی ابتلاءات اور اس سلسلہ میں مشرکین کی جانب سے نوع بنوع اسالیب اور حربے اختیار کئے گئے، جن کو آئندہ صفحات میں بیان کیا جائے گا۔

....

تیسرا باب
دعوت کے مقابلہ میں مشرکین کے اسالیب

تمام مشرکین اُس دعوت سے لڑنے اور مقابلہ کرنے کے لئے جمع ہوگئے جس دعوت نے ان کے جاہلی معاشرہ کو طشت از بام کر دیا، ان کے معبودانِ باطلہ کی پول کھول دی اور ان کو آراء وافکار کو خلافِ عقل قرار دیا، اسی طرح اللہ کے بارے میں، زندگی کے بارے میں، انسان کے بارے میں اور کائنات کے بارے میں ان کے تصورات کو بھی غلط قرار دیا، اس لئے انہوں نے اس دعوت کو روکنے کے لئے، اس کی آواز کو دبانے کے لئے، اس پر لگام کسنے کے لئے اور اس کے پھیلاؤ کو روکنے کے لئے متعدد وسائل وذرائع اور متعدد کوششیں اختیار کیں۔

1) رسول اللہ ﷺ کی نصرت وحمایت سے حضرت ابو طالب کو دور رکھنے کی کوشش:

قریش کے لوگ حضرت ابو طالب کے پاس آئے اور کہنے لگے: آپ کے اس بھتیجے نے ہماری مجلس میں اور ہماری مسجد میں ہمیں تکلیف پہنچائی ہے، لہذا ان کو ہم سے باز رکھیئے، یہ سن کر حضرت ابو طالب نے اللہ کے رسول ﷺ سے کہا: آپ کے ان خاندان والوں کا خیال یہ ہے کہ آپ ان کو ان کی مجلس میں اور ان کی مسجد میں ایذاء پہنچاتے ہیں، لہذا ان کو تکلیف پہنچانے سے باز رہیں، یہ سن کر اللہ کے رسول ﷺ نے آسمان کی جانب اپنی نگاہ دوڑائی اور کہا: آپ اس سورج کو دیکھ رہے ہیں؟ سب نے کہا: ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا: اگر تم میں سے کوئی اس سورج سے آگ کا کوئی شعلہ بھی لے کر آجائے تب بھی میں اس کام کو ترک نہیں کر سکتا ہوں۔ یہ سن کر ابو طالب نے کہا: اللہ کی قسم! میرے بھتیجے نے کبھی جھوٹ نہیں بولا ہے، سیدھے سیدھے واپس چلے جاؤ۔ (التاریخ الکبیر للبجاری: 51/1/4، دلائل النبوۃ للبیہقی، 187/2، صحیح السیرۃ النبویہ، ابراہیم العلی، ص: 78)

قریش نے بار بار رسول اللہ ﷺ پر آپ کے خاندان کے ذریعہ آپ پر دباؤ بنانے کی کوشش کی لیکن ان کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، حضرت ابو طالب کی اپنے بھتیجے کی حمایت ومدد کا معاملہ اور ان کی نصرت ومدد کے لئے ان کا عزمِ مصمم اور تنہا نہ چھوڑنے کا معاملہ مشہور ہوگیا، اس چیز نے قریش کے غم، حسد اور عداوت میں مزید اضافہ کر دیا، اس لئے وہ عمار بن ولید کو لے کر حضرت ابو طالب کے پاس گئے اور کہا: اے ابو طالب! یہ عمار بن ولید ہیں جو قریش کے طاقتور ترین اور حسین ترین نوجوان ہیں، آپ ان کو لے لیں ان کی دیت اور ان کی مکمل نصرت وحمایت آپ کے لئے ہوگی اور ان کو اپنا بیٹا بنالیں، یہ اب آپ ہی کے ہیں، اور اپنے اس بھتیجے کو ہمارے حوالے کر دیجیے، جس نے آپ کی اور آپ کے دین کی مخالفت کی ہے، آپ کی قوم میں انتشار ڈال دیا ہے، اور ہمارے عقلمندوں کو بے وقوف قرار دیا ہے، ہم ان کو قتل کر دیں گے، آپ کو آدمی کے بدلے آدمی مل جائے گا۔ حضرت ابو طالب نے کہا: اللہ کی قسم! بہت ہی برا سودا تم مجھ سے کرنا چاہتے ہو! کیا تم مجھے اپنا بیٹا دے رہے ہو اس کو میں تمہارے لئے کھلاتا پلاتا رہوں، اور میں تمہیں اپنا بیٹا دے دوں اور تم اس کو قتل کر دو گے؟! واللہ! یہ کبھی نہیں ہو سکتا ہے۔ (السیرۃ النبویہ، ابن ہشام 285/1 البدایہ والنہایہ، ابن کثیر 48/3)

حضرت ابو طالب کی اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ مروت ونصرت کو دیکھ کر انسان حیران وپریشان ہو جاتا ہے، کیونکہ حضرت ابو طالب نے اپنا انجام اپنے بھتیجے حضرت محمد ﷺ کے انجام کے ساتھ مربوط کر دیا تھا، بلکہ بنی ہاشم کے سردار ہونے کا یہ فائدہ اٹھایا کہ بنو ہاشم اور بنو المطلب کی نصرت وتائید کرتے ہوئے زندگی یا موت کے معاہدہ میں شامل کیا، جس میں ان کے مسلمان اور مشرکین سب برابر شریک تھے۔ (دیکھیں السیرۃ النبویہ: ص،184) اور حضرت ابو طالب نے اپنے بھتیجے کو غیر مشروط پناہ دے رکھی تھی جس میں کسی طرح کے تردد یا پس وپیش کی کوئی آمیزش نہیں تھی، ان تمام جاہلی روایتوں اور عربی تقالید کو نبی کریم ﷺ اسلام کی خدمت کے لئے مسخر کر رہے تھے، چنانچہ ابو طالب نے جب قریش کو یہ سب کچھ کرتے ہوئے دیکھا تو وہ بنی ہاشم اور بنو المطلب میں کھڑے ہوئے اور ان سب کو اللہ کے رسول ﷺ کی حفاظت اور ان کا ساتھ دینے کا حکم دیا، وہ جب جمع ہو گئے اور ان کی بات مان لی اور سب نے ان کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کر لیا، سوائے اللہ کے دشمن ملعون ابو لہب کے۔

حضرت ابو طالب نے جب اپنی قوم کی طرف سے ان کا تعاون اور شفقت کا معاملہ دیکھا تو اس سے وہ بہت خوش ہوئے اور ان کی تعریف وتوصیف کرنے لگے، اور ان کے ماضی کو یاد کرنے لگے اور اللہ کے رسول ﷺ کے مقام ومرتبہ کو بھی ذکر کرنے لگے تاکہ وہ مزید اس نصرت وحمایت پر قائم رہ سکیں۔ انہوں نے یہ اشعار کہے:

إِذا اجتمعت يوما قُرَيْش لمفخر ... فعبدُ مناف سرها وصميمها
وَإِن حصلت أَشْرَاف عبد منافها ... فَفِي هَاشم أَشْرافها وقديمها
وَإِن فخرت يوما فَإِن مُحَمَّدًا ... هو الْمُصْطفى من سرها وكريمها
تداعت قريش غثها وسمينها ... علينا ولم تظهر وطاشت حلومها
وَكُنَّا قديما لَا نقر ظلامة ... إِذا ما ثنوا صعر الخدود نقيمها

ترجمہ: ”اگر کسی روز قریش کے لوگ اپنے مفاخر کو بیان کرنے کے لئے جمع ہو جائیں تو عبد مناف ان میں سب سے بہتر اور اصل قرار پائیں گے۔ اور اگر تمام شرف وعزت عبد مناف کے حصے میں آ جائے تو ہاشم اس عزت وشرف کا مجمع البحرین قرار پائیں گے۔ اور اگر کسی دن وہ اپنے مفاخر بیان کرنے لگ جائیں تو محمد ﷺ ان مفاخر کی اصل اور سرچشمہ قرار پائیں گے۔ قریش اپنے پورے لاؤ لشکر کے ساتھ ہم پر ٹوٹ پڑے لیکن ان کو کامیابی نصیب نہ ہو سکی اور وہ ششدر وحیران ہو کر رہ گئے۔ ہم تو ماضی سے ہی کسی کے ظلم کو برداشت نہیں کرتے آئے ہیں جب کہ کوئی ہمارے مقابلہ متکبرانہ رویہ اختیار کرتا ہے“۔

اور جب ابو جہل نے حضرت ابو طالب کی دی ہوئی پناہ کے برخلاف قدم اٹھانا چاہا تو حضرت حمزہؓ اس کے مقابلہ میں کھڑے ہو گئے اور اپنی کمان سے اس کو زخمی کر دیا اور کہا: کیا تم محمد ﷺ کو برا بھلا کہہ رہے ہو جبکہ میں ان کے دین پر ہوں! اگر روک سکتے ہو تو روک کر دکھاؤ۔

یہ ایک عجیب واقعہ ہے کہ جاہلیت کے علمبر دار ہی اس شخص کی حمایت میں کھڑے ہو جاتے ہیں جو ان کے معبودوں کو برا بھلا کہتا ہے، ان کے دین کی عیب جوئی کرتا ہے، اور ان کے عقلمندوں کو بیوقوف قرار دیتا ہے، اور وہ ان اقدار و روایات کے نام پر ہر قیمتی چیز قربان کر دیتے ہیں اور اور معرکوں اور جنگوں میں حصہ لیتے ہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کوئی بھی گزند نہیں پہنچ پاتی ہے۔

اور جب حضرت ابو طالب کو عربوں کے لشکرِ جرار کا خوف لاحق ہوا کہ وہ ان کی قوم پر حملہ کر سکتے ہیں، تو اس وقت انہوں نے اپنا مشہور قصیدہ کہا جس میں حرمتِ کعبہ کی پناہ مانگی ہے اور اپنی قوم کے اشراف کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا ہے اور واضح کر دیا ہے کہ وہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کسی بھی صورت میں بے یار و مددگار نہیں چھوڑیں گے، اور نہ کسی کے حوالے کریں گے، الا یہ کہ وہ ان کی حمایت کرتے کرتے جان ہی دے دیں، انہوں نے مندرجہ ذیل اشعار کہے:

فلما رأيت القوم لا ود فيهم ... وقد قطعوا كل العرا والوسائل

وقد صارحونا بالعداوة والأذى ... وقد طاوعوا أمر العدو المزايل

صبرت لهم نفسي بسمراء سمحة ... وأبيض عضب من تراث المقاول

وأحضرت عند البيت أهلي وإخوتي ... وأمسكت من أثوابه بالوصائل

ترجمہ: ''اور جب میں نے قوم کو دیکھا کہ ان میں محبت و رحم نام کی کوئی چیز نہیں ہے اور انہوں نے ہر قسم کے تعلق اور رابطہ کو منقطع کر دیا ہے۔ ہمارے ساتھ دشمنی رکھنے اور تکلیف پہنچانے کا انہوں نے اعلان کر دیا ہے اور کھلے دشمن کی اطاعت کر رکھی ہے، اور ہمارے مقابلہ میں بدگمانی کی وجہ سے ایسی قوم کا انہوں نے ساتھ دیا ہے جو غصہ کی وجہ سے ہم پر انگلہ یاں چبارہے ہیں۔ تو میں بھی اپنا خون آلود نیزہ لے کر اور آبدار تلوار لے کر ان کے مقابلہ میں کھڑا ہو گیا اور خانہ کعبہ کے پاس اس کے پردے پکڑ کر میں اپنی پوری جماعت کو لے کر حاضر ہو گیا''۔

یہ اشعار کہنے کے بعد انہوں نے خانہ کعبہ کی اور اس میں موجود تمام مقدسات کی پناہ حاصل کی اور خانہ کعبہ کی قسم کھائی کہ وہ ہرگز حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کسی کے حوالے نہیں کریں گے اگرچہ خون کی نہریں ہی کیوں نہ بہہ جائیں اور قریش کے مختلف قبیلوں کے ساتھ خون ریز معرکہ ہوتا رہے، انہوں نے یہ اشعار کہے:

كَذبتم وبيت الله نبزى محَمَّدًا ... ولما نطاعن دونه ونناضل

ونسلمه حتَّى نصرع حوله ... ونذهل عَن أَبنَائنَا والحلائل

وينهض قوم في الحديد إليكم ... نهوض الروايا تحت ذات الصلاصل

ترجمہ: ''بیت اللہ کی قسم! تم جھوٹ بولتے ہو کہ جب ہم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دفاع میں نیزوں اور تلواروں سے مقابلہ کریں گے تو ہم محمدؐ کی حفاظت کرنے میں کمزور پڑ جائیں گے اور ان کو تمہارے حوالے کر دیں گے۔ ہم تو ان کی حفاظت کرتے کرتے جان قربان کر دیں گے اور اپنے اہل و عیال کی بھی کوئی پرواہ نہیں کریں گے۔ ان کے دفاع اور حمایت میں ہتھیاروں سے لیس لشکر تمہارے مقابلے کے لئے اس طرح اٹھے گا جیسے کہ پانی سے لدے ہوئے اونٹ مشکیزہ لے کر جاتے ہیں''۔

حضرت ابو طالب نے بنو عبد مناف کے سرداروں کو ان کا نام لے کر عار دلایا کیونکہ انہوں نے اللہ کے رسول ﷺ کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔ عتبہ بن ربیعہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

فعتبة لا تسمع بنا قول كاشح حسود كذوب مبغض ذي دغاول

ترجمہ: "عتبہ! ہمارے بارے میں کسی حسد کرنے والے جھوٹے، بغض رکھنے والے اور سازشیں کرنے والے دشمن کی بات مت سننا"۔

ابو سفیان بن حرب کو مخاطب ہوئے ہوئے کہتے ہیں:

ومر أبو سفيان عني معرضا كما مر قيل من عظام المقاول

ترجمہ: "ابو سفیان ان چہ مہ گوئیوں اور الزامات کے بارے میں مجھ سے ایسے اعراض کرتے ہوئے گزرا جیسے کہ یمن کا کوئی بڑا سردار بغیر التفات کے گزر جاتا ہے۔ وہ نجد اور وہاں کے ٹھنڈے پانی کی جانب بھاگ جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں اس سے غافل ہوں"۔ (دیکھیں: فقہ السیرۃ النبویہ: ص212)

اور بنی نوفل کے سردار مطعم بن عدی کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

أ مطعم لم أخذلك في يوم نجدة ولا معظم عند الأمور الجلائل

أمطعم إن القوم ساموك خطة وإني متى أوكل فلست بوائل

جزى الله عنا عبد شمس ونوفلا عقوبة شر عاجلا غير آجل

ترجمہ: "اے مطعم! میں نے تمہیں اس دن بے یار و مددگار نہیں چھوڑا جس دن تمہیں مدد کی ضرورت تھی، اور نہ ہی سخت ترین حالات کو بھی زیادہ مشکل سمجھا۔ اے مطعم! قوم نے ایک منصوبہ تمہارے حوالے کیا ہے اور جب کوئی کام میرے سپرد کیا جائے تو میں کسی کی پناہ لینے والا نہیں ہوں۔

عبد شمس اور نوفل کو اللہ ہمارے بدلے سخت انجام بد سے دوچار کرے جس میں کوئی مہلت نہ ہو۔ (دیکھیں: الفقہ السیرۃ النبویۃ، ص212)

یقیناً نبی کریم ﷺ کا اپنے چچا کو اپنے دفاع کو حمایت کے لئے تیار کرنا اور اپنی صفوں میں شامل کرنا ایک عظیم کامیابی تھی، اللہ کے رسول ﷺ نے قبائلی روایات کا بھی فائدہ اٹھایا اور قبیلے کی بھرپور حمایت حاصل کی اور ہر قسم کی زیادتی کو بقدرِ استطاعت روکنے کی کوشش کی، جس کے نتیجہ میں آپ ﷺ کو عمل کرنے اور سوچنے کی آزادی مل گئی، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ جس معاشرہ اور سوسائٹی میں رہتے تھے اس کو آپ اچھی طرح جانتے اور سمجھتے تھے، اس میں دعوتی میدان میں کام کرنے والوں کے لئے اہم سبق مضمر ہے کہ ان کو اپنے معاشرہ اور سوسائٹی کے تیئں کس طرح کارد عمل دکھانا چاہئے اور وہاں رائج اصول و قوانین، روایات اور تقالید کو اللہ کے دین کی خدمت کے لئے استعمال کرنا چاہیے۔

2) دعوت کی شبیہ کو بگاڑنے کی کوشش:

تمام مشرکین اللہ کے رسول ﷺ کی طرف سے پیش کی جانے والی دعوت کی شبیہ کو بگاڑنے اور اس کی صورت مسخ کرنے کے لئے یکجٹ ہوگئے،اور قریش نے اس کے خلاف ابلاغی اور میڈیا کی جنگ چھیڑ دی جس کی قیادت ولید بن مغیرہ کر رہا تھا، وہ اپنی قوم کے کچھ افراد کو لے کر ایامِ حج میں کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا: اے قریش کے لوگو! حج کا زمانہ آچکا ہے اور عرب کے وفود آپ کے پاس حاضر ہوں گے اور اُنہوں نے آپ کے ان صاحب کے بارے میں سن رکھا ہے، لہٰذا ان کے بارے میں کسی ایک رائے پر اتفاق کر لو اور آپس میں اختلاف مت کرنا کہ ایک دوسرے کی بات کو جھٹلانا اور ایک دوسرے کی بات کی تردید کرنا شروع کردو،ان سب نے کہا: آپ تو ابو عبد شمس ہیں! لہذا کہیے اور ہمارے لئے کسی ایک رائے کا انتخاب کر لیجئے، ہم اسی کو اختیار کریں گے،اس نے کہا: بلکہ تم اپنی رائے دو میں سنتا ہوں،ان سب نے کہا کہ ہم کہیں گے کہ وہ کاہن ہیں۔اس نے کہا: وہ کاہن تو نہیں ہیں، میں نے کاہنوں کو دیکھا ہے، جیسی باتیں وہ گنگناتے ہیں اور جس طرح کے فقرے وہ جوڑتے ہیں قرآن کو ان سے کوئی دور کی نسبت بھی نہیں،دوسرے لوگوں نے کہا کہ بہتر ہے انہیں مجنون اور دیوانہ کہا جائے۔ولید نے کہا: وہ مجنوں بھی نہیں ہیں، ہم سب جنون اور دیوانگی کو جانتے اور پہچانتے ہیں،فاتر العقل جس طرح کی بہکی بہکی باتیں اور الٹی سیدھی حرکتیں کرتا ہے،اس کا ان سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے، کچھ لوگ بولے ان کو ہم شاعر کہیں گے،ولید نے کہا: وہ شاعر بھی نہیں ہیں، ہم شعر کی تمام اصناف سے واقف ہیں، وہ جو کلام پیش کرتے ہیں اس پر شاعری کا اطلاق نہیں ہوتا ہے۔لوگوں نے کہا: انہیں ساحر اور جادوگر کہنا مناسب ہوگا۔ولید نے کہا: وہ جادوگر بھی نہیں ہیں، جادوگروں کو ہم جانتے ہیں،ان کے دم اور جھاڑ پھونک سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، لوگوں نے کہا: اے ابو عبد شمس پھر ہم کیا کہیں گے؟اس نے کہا: خدا کی قسم! اس کے کلام میں بڑی حلاوت ہے،اس کی جڑ بڑی گہری اور اس کی ڈالیاں بڑی ثمردار ہیں،اور تم ان باتوں میں سے جو بات بھی کہوگے لوگ اس کو نارواالزام سمجھیں گے،قریب ترین بات جو کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ تم ان کو جادوگر کہہ دو،اور کہو کہ وہ ایسا جادوگر ہے جو آدمی کو اس کے باپ،ماں، بھائی،بیوی،بچوں اور سارے خاندان سے جدا کر دیتا ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھیں: السیرۃ والمغازی،ابنِ اسحاق، ص150-151) تہذیب السیرۃ 64/1،65،دلائل النبوۃ للبیہقی: 200/2) سیرت ابن ہشام 289-288/1)

اللہ تعالیٰ نے ولید کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا ۝١١ وَجَعَلْتُ لَهُۥ مَالًا مَّمْدُودًا ۝١٢ وَبَنِينَ شُهُودًا ۝١٣ وَمَهَّدتُّ لَهُۥ تَمْهِيدًا ۝١٤ ثُمَّ يَطْمَعُ أَنْ أَزِيدَ ۝١٥ كَلَّآ إِنَّهُۥ كَانَ لِـَٔايَـٰتِنَا عَنِيدًا ۝١٦ سَأُرْهِقُهُۥ صَعُودًا ۝١٧ إِنَّهُۥ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ۝١٨ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝١٩ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝٢٠ ثُمَّ نَظَرَ ۝٢١ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ۝٢٢ ثُمَّ أَدْبَرَ وَٱسْتَكْبَرَ ۝٢٣ فَقَالَ إِنْ هَـٰذَآ إِلَّا سِحْرٌ يُؤْثَرُ ۝٢٤ إِنْ هَـٰذَآ إِلَّا قَوْلُ ٱلْبَشَرِ ۝٢٥ سَأُصْلِيهِ سَقَرَ ۝٢٦﴾ ترجمہ: ”چھوڑ دیجئے مجھے اور اس کو، جسے میں نے اکیلا پیدا کیا۔ میں نے اس کو بہت زیادہ مال دیا۔اور وہ بیٹے دیئے جو سامنے ہیں۔اور اس کو ہر طرح کا سامان (زندگی) دیا۔پھر بھی وہ اس کی طمع رکھتا ہے کہ میں اور زیادہ دوں۔ہر گز نہیں۔وہ ہماری آیتوں کا دشمن ہے۔میں اسے عنقریب دوزخ

کے پہاڑ پر بجبر چڑھا دوں گا۔اس شخص نے سوچا، پھر ایک بات تجویز کی۔ سو وہ غارت ہو، کیسی بات تجویز کی، پھر غارت ہو کیسی بات تجویز کی۔ پھر دیکھا پھر منہ پھیرا، تیوری چڑھائی، پھر پیٹھ پھیری اور غرور و تکبر اختیار کیا۔ پھر کہا یہ تو نرا منقول جادو ہے۔ یہ تو نرا آدمی ہی کا کلام ہے۔ میں اس کو جلدی ہی دوزخ میں داخل کروں گا"۔ (سورۃ المدثر:11-26)

اس قصہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کے خلاف نفسیاتی جنگ اچانک اور غیر منصوبہ بند نہ تھی، بلکہ سرداران کفار کے ذریعہ بڑی باریک بینی، مضبوطی اور متعین اصول وضوابط پر قائم تھی جن کو دورِ حاضر کی نفسیاتی جنگ کی منصوبہ بندی میں اختیار کیا جاتا ہے، جیسے کہ مناسب وقت کا انتخاب، چنانچہ وہ زمانۂ حج کا انتخاب کرتے ہیں، اسی طرح کسی ایک بات پر اتفاق اور عدمِ انتشار، اور اسی طرح دیگر چیزوں کو بھی ملحوظ رکھا گیا تاکہ ان کی یہ جنگ منظم ہو اور تمام حجاج کرام پر اس کی اثر انگیزی واضح طور پر نمایاں ہو، وقت کے ساتھ ساتھ انہوں نے مناسب جگہ کا بھی انتخاب کیا تاکہ مکہ آنے والے وفود تک ان کی یہ پروپیگنڈہ مہم کامیابی کے ساتھ پہنچ سکے۔(دیکھیں: الحرب النفسیہ ضد الاسلام، د۔عبد الوھاب کحیل، ص: 103)

علاوہ ازیں اس واقعہ کے ذریعہ نبی کریم ﷺ کی عظمت اور سامعین پر قرآن کے ذریعہ آپ ؐ کی اثر انگیزی کی قوت بھی بالکل نمایاں ہو جاتی ہے، ولید بن مغیرہ قریش کا بڑا آدمی اور ان کا بڑا سردار ہے، اور عام طور پر بڑے لوگوں کو تکبر اور بڑا پن آڑے آتا ہے، لیکن اس کے باوجود وہ قرآن سے متاثر ہوتا ہے، اس کی وجہ سے نرم پڑتا ہے، اس کی عظمت کا اعتراف کرتا ہے اور بڑے ہی بلیغ انداز سے قرآن کی منظر کشی کرتا ہے اور وہ عقل کی آواز پر لبیک کہنے کی صورتحال سے دوچار تھا، منظم ابلاغی پروپیگنڈہ مہم رسول ﷺ کی دعوت پر اپنا حصار قائم نہیں کر سکی بلکہ حضرت محمد ﷺ ان دشمنوں کے حصار کو توڑنے میں کامیاب ہو گئے جنہوں نے نہ صرف یہ کہ باشندگان مکہ کو رسول اللہ ﷺ سے متنفر کرنے، دور کرنے اور آپ کی شبیہ کو بگاڑنے کی کوشش کی، بلکہ وہ باہر سے آنے والوں سے ملاقات کرنے لگے تاکہ ان کی فکر و سوچ کو زہر آلود کرلیں اور آپ ﷺ کا کلام سننے اور آپ ؐ کی دعوت سے متاثر ہونے میں رکاوٹیں حائل کریں، چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ کو اپنی دعوت میں عظیم کامیابی حاصل ہوئی، جس کو بھی مخاطب کرتے اس کو متاثر کر لیتے، جو بھی آپ ؐ کے ساتھ بیٹھتا تو اس سے بات کرنے سے پہلے ہی اپنی ہیئت واخلاق اور وقار کے ذریعہ اثر ڈالتے، اور پھر جب گفتگو فرماتے تو اپنی بلیغ گفتگو کے ذریعہ سامع کو اسیر بنا لیتے، جس میں عقلِ سلیم کی بھی نمائندگی ہوتی اور امت کی ہدایت کے تئیں محبت وخلوص اور نیت خالصہ کے بھرپور جذبات بھی ہوتے، اپنی بلیغانہ گفتگو اور اخلاقِ کریمانہ کے ذریعہ اثر انگیزی کی قوت اور زعمائے مکہ کے ذریعہ بنائی گئی آہنی دیوار کو توڑنے کی قدرت کی نمایاں ترین مثالیں حضرت ضماد ازدی، حضرت عمرو بن طفیل دوسی اور حضرت عمرو بن عبسہ۔ رضی اللہ عنہم - کے ساتھ پیش آنے والے واقعات ہیں، مندرجہ ذیل سطور میں اس کی قدرے تفصیل بیان کی جارہی ہے:

1: ضماد الأزدیؓ کا قبول اسلام

حضرت ضماد أزدی مکہ مکرمہ حاضر ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مشرکین کی جانب سے لگائے گئے الزامات سے متاثر ہوئے، یہاں تک کہ ان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ آپ ؐ کو جنون لاحق ہو گیا ہے، جیسے کہ سرداران مکہ الزامات لگاتے تھے اور حضرت ضماد کا تعلق أزد شنوءہ سے تھا اور وہ جنون اور دیوانگی کا علاج کرتے تھے، جب انہوں نے مکہ کے بیوقوفوں کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ محمدؐ ۔ نعوذ باللہ۔ مجنوں ہیں، تو وہ کہنے لگے: اگر میں ان صاحب کو دیکھ لوں شاید کہ اللہ تعالیٰ میرے ذریعہ ان کو شفا عطا فرمائے۔ چنانچہ ان کی آپؐ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا: اے محمد! میں اس مرض کا علاج بذریعہ جھاڑ پھونک کرتا ہوں، اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے میرے ہاتھ سے شفا عطا فرماتا ہے، تو کیا آپ علاج کروانا پسند کریں گے؟ آپؐ نے فرمایا:

"إن الحمد لله، نحمده ونستعينه، من يهده الله فلا مضل له، ومن يضلل فلا هادي له، وأشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له، وأن محمدًا عبده ورسوله، أما بعد". ترجمہ: تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں، ہم اسی کی حمد و ثنا کرتے ہیں اور اسی سے مدد طلب کرتے ہیں، جس کو اللہ ہدایت عطا فرمائے اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں ہے، اور جس کو وہ گمراہ کرے اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں ہے، اور میں گواہی دیتا ہوں اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، وہ تنہا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور محمدؐ اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ اما بعد!"۔

یہ سن کر حضرت ضماد نے کہا: ان کلمات کو ذرا دوبارہ دہرائیں! چنانچہ اللہ کے رسولؐ نے تین مرتبہ ان کلمات کو دھرایا۔ اس نے سن کر کہا: میں نے کاہنوں، جادوگروں اور شعراء کے اقوال سنے ہیں، لیکن میں نے کبھی اس طرح کے کلمات نہیں سنے ہیں۔ ان کلمات کا اثر تو سمندر کی تہوں تک پہنچتا ہے۔ اس کے بعد اس نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا: اپنا ہاتھ بڑھائیے، میں آپ کے ہاتھ پر قبول اسلام کی بیعت کرتا ہوں۔ انہوں نے آپؐ سے بیعت کی، آپؐ نے فرمایا: اپنی قوم کو بھی اس بیعت میں شامل کرو۔ اُنہوں نے کہا: میری قوم بھی اس بیعت میں شامل ہے۔

جب مدینہ منورہ میں اسلامی حکومت کا قیام عمل میں آیا اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مختلف فوجی دستوں کو مختلف علاقوں میں روانہ فرماتے تھے تو ایک دستہ کا گزر حضرت ضماد کی قوم کے پاس سے ہوا، اس دستہ کے کمانڈر نے لشکر والوں سے کہا: کیا آپ نے ان لوگوں سے کچھ حاصل کیا ہے؟ ان میں سے ایک شخص نے کہا: میں نے ان سے وضو کا لوٹا حاصل کیا ہے۔ اس نے حکم دیا کہ اس کو واپس کر دو اس لئے کہ یہ ضماد کی قوم ہے۔ (صحیح مسلم: 868، مسند احمد: 302/1، سنن نسائی: 6/89 - 90، اِبنِ ماجہ: 1893)

اسباق اور فوائد

1)قریش کی پروپیگنڈہ مہم ،رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کی شبیہ بگاڑنے کی کوشش اور آپؐ پر جنون کے الزام نے حضرت ضمادؓ کو رسول اللہ ﷺ کے پاس علاج کے لئے حاضر ہونے پر مجبور کیا،اور اللہ کے رسولؐ کے خلاف مکہ کی یہی ابلاغی جنگ حضرت ضمادؓ اور ان کی قوم کے اسلام لانے کا سبب بنی۔

2)اس واقعہ کے ذریعہ نبی کریم ﷺ کے اندر صبر اور بردباری کی صفات واضح ہوتی ہیں، چنانچہ حضرت ضمادؓ نے اللہ کے رسول ﷺ سے جنون کا علاج کرنے کی پیشکش کی،حالانکہ یہ غصہ دلانے والی بات تھی، لیکن اللہ کے رسولؐ نے اس صورت حال کو سنجیدگی اور بردباری کے ساتھ برداشت کیا جس کی وجہ سے حضرت ضماد رسول اللہ ﷺ سے انتہائی متاثر بھی ہوئے،اور رسول اللہ ﷺ کا احترام ان کے دل میں بیٹھ گیا۔

3)اس واقعہ کے ذریعہ خطبہ کے اس مقدمہ کی اہمیت واضح ہوتی ہے جس کے ذریعہ اللہ کے رسول ﷺ اپنے بعض خطبوں کا آغاز فرماتے تھے، چنانچہ اس میں اللہ کی تعظیم و تمجید اور اسی کے لئے عبادت کو خاص کرنے کا ذکر ہے،اسی لئے اللہ کے رسول اپنے اکثر خطبوں اور مواعظ کے آغاز میں اس کو پڑھا کرتے تھے۔

4)حضرت ضمادؓ اللہ کے رسولؐ کی فصاحت اور قوتِ بیان سے انتہائی متاثر ہوئے،اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ کی بات ایسے دل سے نکلی جو ایمان ویقین اور حکمت سے لبریز تھا،اس لئے آپؐ کی بات دلوں میں جاگزیں ہوتی تھی،اور ایمان کی طرف مائل ہونے کا سبب بنتی تھی۔

5)حضرت ضمادؓ کے فوری طور پر اسلام قبول کرنے سے یہ دلیل ملتی ہے کہ اسلام دینِ فطرت ہے اور دل جب ہر قسم کے داخلی اور خارجی دباؤ سے خالی ہو تو اکثر وبیشتر وہ کوئی مؤثر بات سن کر بہتر طرزِ عمل دیکھ کر متاثر ہوتا ہے اور بات کو تسلیم کرلیتا ہے۔

6)اللہ کے رسول ﷺ کو دعوت کے عام ہونے کی انتہائی فکر تھی، چنانچہ آپ ﷺ نے جب حضرت ضمادؓ کے ایمان میں صداقت،اسلامی جذبہ اور اس پر مکمل اطمئنان محسوس کرلیا تو فوراًان کی قوم کے لئے بیعت لینے کا بھی مطالبہ کیا۔

7)اس واقعہ میں دعوتِ الی اللہ کی اہمیت کا واضح بیان ہے،اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے اس کو ذاتی دینداری کے ایک جزء کی حیثیت سے بیان فرمایا، چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ نے صرف حضرت ضمادؓ کے اسلام لانے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان سے اپنی قوم کو دعوت دینے کا بھی وعدہ لیا۔

8)فضل واحسان اور حُسنِ عمل کرنے والوں کے قرابت داروں اور متعلقین کے ساتھ حُسنِ سلوک کرنے کا بھی اس سے پتہ چلتا ہے،اسی لئے امیرِ لشکر نے حکم دیا کہ ضماد کی قوم سے حاصل کئے ہوئے مالِ غنیمت کو واپس کردو،اس لئے کہ یہ ضماد کی قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔

9)مذکورہ حدیث سے بعض تربیتی وسائل کا بھی علم ہوتا ہے جن کو نبی کریم ﷺ نے حضرت ضمادؓ کے ساتھ استعمال کیا، جیسے کہ گفتگو میں مرحلہ وار تربیت اور براہِ راست گفتگو اور رہنمائی کا اسلوب،اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ کی شخصیت میں بھی یہاں ایک مربی کی حیثیت سے بعض اہم صفات کا اظہار ہوتا ہے، جیسے کہ صبر وبردباری اور زیادہ سے زیادہ خیر کے کام کرنے کا حوصلہ۔

2: حضرت عمرو بن عبسہؓ کا قبولِ اسلام

عمرو بن عبسہ سلمیؓ فرماتے ہیں: میں زمانۂ جاہلیت میں سمجھتا تھا کہ لوگ گمراہی پر ہیں اور وہ درست راستے پر نہیں ہیں کیونکہ وہ بتوں کی عبادت کرتے ہیں، میں نے اسی اثناء میں مکہ میں ایک شخص کے بارے میں سنا جو اہم باتوں کی خبر دیتا ہے، اس لئے میں آپ اپنی سواری پر بیٹھا اور ان کی خدمت میں حاضر ہوا، دیکھتا ہوں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چھپتے چھپاتے دعوتی کام کرتے ہیں اور ان کی قوم ان پر دلیر ہے، میں نے انتہائی رازداری کے ساتھ ان سے ملاقات کی تدبیر بنائی، یہاں تک کہ میں مکہ میں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا، میں نے آپؐ سے دریافت کیا: آپ کیا ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: میں نبی ہوں، میں نے پوچھا: نبی کون ہوتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: مجھے اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے، میں نے پوچھا: آپ کو کیا لے کر بھیجا ہے؟ آپ نے فرمایا: اس نے مجھے صلہ رحمی کا حکم دینے، بتوں کو توڑنے اور اس بات کا پیغام لے کر بھیجا ہے کہ ایک اللہ کی عبادت کی جائے، اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرایا جائے، میں نے پوچھا: اس کام میں آپ کے ساتھ اور کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ایک آزاد شخص اور ایک غلام۔ (راوی کا کہنا ہے) اس وقت آپ کے ساتھ ابو بکرؓ اور بلالؓ تھے۔ میں نے عرض کیا: میں بھی آپ کی اتباع اور پیروی کرنے والا ہوں، آپؐ نے فرمایا: آپ آج ایسا نہیں کر سکتے ہیں۔ کیا آپ میرے اور لوگوں کے حالات نہیں دیکھ رہے ہیں؟! لہذا آپ ابھی اپنے گھر والوں کی طرف لوٹ جاؤ، جب آپ میری بابت سنو کہ میں غالب آگیا ہوں تو پھر میرے پاس آجائیں، فرماتے ہیں: میں اپنے اہلِ خانہ کے بعد واپس آگیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (بالآخر مکہ چھوڑ کر) مدینہ تشریف لے آئے، اور میں اپنے ہی اہلِ خانہ کے ساتھ تھا، میں معلومات حاصل کرتا رہا اور لوگوں سے آپؐ کی بابت اس وقت بھی پوچھتا رہا جب کہ آپؐ مدینہ منورہ تشریف لائے، یہاں تک کہ یثرب کے کچھ لوگ میرے پاس آئے تو میں نے ان سے دریافت کیا: اس شخص کا کیا حال ہے جو مدینہ آیا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ لوگ بہت تیزی کے ساتھ ان کی طرف راغب ہو رہے ہیں، جبکہ ان کی قوم ان کو قتل کرنے کے درپے ہے، لیکن وہ ایسا کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے، لہذا میں مدینہ آگیا اور آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، میں نے پوچھا: اے اللہ کے رسولؐ! کیا آپ مجھے پہچان رہے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں، آپ وہی ہو جو مکہ میں مجھ سے ملے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے باقی حدیث بیان کی، اس میں اس کا بھی ذکر ہے کہ انہوں نے آپؐ سے نماز اور وضو کے بارے میں بھی سوال کیا۔ (بحوالہ صحیح مسلم: 832 مسند أحمد: 112/4، سنن أبو داؤد: 1277، سنن نسائی 279/1-280 سنن ابن ماجہ 1251)

دروس واسباق

۱۔ حضرت عمرو بن عبسہؓ اُن موحدین میں سے تھے جو جاہلیت میں غیر اللہ کی عبادات کے منکر تھے۔

۲۔قریش کی جانب سے شروع کی گئی خطرناک پروپیگنڈہ مہم حضرت عمرو بن عبسہؓ کے رسول اللہ ﷺ کے بارے میں حالات معلوم کرنے کا سبب بنی۔

۳۔ رسول اللہ ﷺ کے خلاف قریش کی جرأت ودلیری کا بھی اس سے پتہ چلتا ہے، چنانچہ عمرو بن عبسہؓ نے آپؐ کو چھپتے چھپاتے دعوتی کام کرتے پایا، جب کہ آپؐ کی قوم آپ پر دلیر اور جری تھی۔

۴۔ اہلِ فضل ومقام کے پاس داخل ہونے کا ادب بھی معلوم ہوتا ہے، اس سلسلہ میں حضرت عمرو بن عبسہؓ فرماتے ہیں: میں نے انتہائی رازداری کے ساتھ آپ کے ساتھ ملاقات کی تدبیر بنائی یہاں تک کہ میں آپ کے پاس حاضر ہو گیا۔

۵۔ رسالت محمدی دو(2) بنیادی ستونوں پر قائم ہے: (1) حقوق اللہ(۲) حقوق العباد۔آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ نے مجھے صلہ رحمی کا حکم دینے اور بتوں کو توڑنے کے لئے بھیجا ہے۔اس میں صلہ رحمی کی اہمیت کی بھی دلیل ہے، اس لئے کہ یہ عظیم اسلامی دعوت کی اُولیات اور ترجیحات میں سے ہے جس کے ساتھ توحید کی دعوت بھی شامل ہے، اس سے بت پرستی کی شدت کے ساتھ تردید کا بھی پتہ چلتا ہے، حالانکہ عربوں کے نزدیک بت پرستی مقدس ترین چیز سمجھی جاتی تھی۔اس سے یہ بھی دلیل ملتی ہے کہ جاہلیت کے آثار ومعالم کو ختم کرنا انتہائی اہم ہے، اور توحید کی دعوت اس وقت تک مستحکم نہیں ہو سکتی ہے اور نہ ہی پھیل سکتی ہے جب تک کہ ان معالم وآثار کو زائل نہ کیا جائے۔

۶۔نبی کریم ﷺ نے ابتدائی مرحلہ میں ہی بتوں کو ختم کرنے کی فکر فرمائی، حالانکہ اس وقت اس پر عمل کرنے کی آپؐ استطاعت نہیں رکھتے تھے، اس کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے کہ دینی امور واحکام کو لوگوں کے سامنے بیان کرنے میں اس لئے تاخیر کرنا جائز نہیں ہے کہ ابھی ان کو نافذ کرنے کی قدرت وطاقت نہیں ہے، جو لوگ اُن مسائل واحکام کو تو لوگوں کے سامنے بیان کر دیتے ہیں جن کا نفاذ وہ امن وسہولت کے ساتھ کر پاتے ہیں اور ان احکامِ دین کو بیان کرنے سے کتراتے ہیں جن کے نفاذ اور عمل میں کچھ کشمکش، محنت اور جدوجہد کی ضرورت پڑتی ہے، تو ایسے لوگوں کی دعوت ناقص ہے اور ایسے لوگ اللہ کے رسول ﷺ کی مکمل اتباع وپیروی کرنے سے کوسوں دور ہیں، اس لئے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ایسے ماحول میں جاہلیت اور اس کے علمبرداروں کا آمنا سامنا کیا جبکہ آپ کے انصار واعوان بھی کم تھے اور آپ کے شہر میں سیادت وقیادت کی باگ ڈور آپؐ کے دشمنوں کے ہاتھوں میں تھی۔(دیکھیں: التاریخ الاسلامی، از: حمیدی 133،131/1 الوحی وتبلیغ الرسالۃ، د۔ یحییٰ الیحییٰ، ص111-113)

۷۔ اللہ کے رسول ﷺ اپنے صحابہ پر انتہائی شفیق تھے، آپؐ ان کو پر امن ماحول فراہم کرنے، ان کو امن واطمئنان کے مواقع عطا کرنے اور پریشان کن حالات سے دور رکھنے کی ہر ممکن کوشش فرماتے تھے، اسی لئے حضرت عمرو بن عبسہؓ سے آپؐ نے فرمایا: "آپ آج ایسا نہیں کر سکتے ہو"۔

۸۔۔۔۔ آپ ﷺ صحابہ کرام کے حالات کو یاد رکھتے تھے اور ان کے واقعات کو بھولتے نہیں تھے، اسی لئے آپؐ نے حضرت عمروؓ سے فرمایا: ’’آپ وہی ہیں جو مکہ میں مجھ سے ملے تھے‘‘۔

۹۔ اللہ کے رسول ﷺ اسلام قبول کرنے والے ہر شخص کو اپنے پیروکاروں کے ناموں کی فہرست نہیں دے سکتے تھے، اس لئے کہ اس میں کسی بھی پوچھنے والے شخص کو نہ کوئی فائدہ حاصل ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس سے تبلیغِ دین کا کوئی تعلق ہے، اسی لئے جب حضرت عمرو بن عبسہؓ نے آپ کی پیروی کرنے والوں کے بارے میں دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا: ایک آزاد اور ایک غلام، علامہ ابن کثیرؒ کے بقول کہ یہ توریہ تھا اور یہ اسمِ جنس ہے جس سے حضرت عمروؓ نے سمجھ لیا کہ اس سے متعین نام مراد ہیں۔ (دیکھیں: التاریخ الاسلامی، از: حمیدی 109/1)

۱۰۔۔۔ اللہ کے رسول ﷺ نے جو فرمایا کہ: ’’آپ ابھی اپنے گھر والوں کی طرف لوٹ جاؤ جب آپ میری بابت سن لیں کہ میں غالب آگیا ہوں تو پھر میرے پاس آجائیں۔" اس کے ذریعہ ہمیں دعوت کے بارے میں ایک اہم سبق ملتا ہے کہ پیروکاروں اور ارکان و رفقاء کو آزمائشوں و ایذاء کے ماحول میں جھونکنا اصل ضابطہ نہیں ہے، اس لئے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے بہت سے اسلام قبول کرنے والوں کو اپنی قوم کی جانب واپس جانے کا حکم دیا، اسی طرح آپؐ نے حبشہ کی جانب دو بار ہجرت کرنے کا حکم دیا، اس کے ذریعہ مسلمانوں کے لئے تخفیف مقصود تھی، اسی طرح ان کو خطرات کے مقام سے دور کرنا، مسلمانوں کی قوت کو محفوظ رکھنا، قائد کو اس طرح کے مسائل سے یکسو کرنا، رازداری کی ضمانت و گارنٹی، جس جگہ اہلِ ایمان کو بھیجا جائے وہاں کے لوگوں کو فائدہ پہنچانا، مستقبل کی تیاری کرنا، مشن کو جاری و ساری رکھنا اور سرے سے ختم ہونے سے محفوظ رکھنا اور دیگر اہم مقاصد حاصل ہوتے ہیں۔(دیکھیں: الوحی و تبلیغ الرسالہ، ص106-109)

اللہ کے رسول ﷺ کے خلاف پروپیگنڈہ مہم کے نتیجے میں اسلام قبول کرنے والوں میں حضرت طفیل بن عمرو دوسیؓ ہیں، ان کا واقعہ کتبِ سیرت میں تفصیل سے مذکور ہے، ڈاکٹر اکرم ضیاء عمری کا خیال ہے کہ اس واقعہ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اللہ کے رسول ﷺ کو قبیلۂ دوس کی حفاظت میں آنے کی دعوت دی، لیکن اللہ کے رسول ﷺ نے اس سے انکار کیا۔(دیکھیں: صحیح مسلم: 116، مسند احمد: 371/3)

صحیح روایات میں یہ بات موجود ہے کہ حضرت طفیلؓ نے اپنی قوم کو اسلام کی دعوت دی اور انہیں ان کی طرف سے انکار و عناد دیکھنے کو ملا، یہاں تک کہ حضرت طفیلؓ نے اللہ کے رسول ﷺ سے ان کے خلاف بد دعا کرنے کی درخواست کی، لیکن اللہ کے رسولؐ نے ان کے لئے ہدایت کی دعا فرمائی، اس وقت اللہ کے رسول ﷺ مدینہ منورہ میں تشریف رکھتے تھے۔(صحیح بخاری:2937، صحیح مسلم: 2524، الأساس فی السنۃ، سعید حوی 126/1)

3: حضرت عمران کے والد حضرت حصین کا قبولِ اسلام:

قریش کے لوگ حضرت حصین کے پاس آئے،(قریش کے لوگ ان کی تعظیم کرتے تھے) انہوں نے حضرت حصین سے کہا: اس شخص کے ساتھ ہمارے بارے میں بات کیجئے، اس لئے کہ وہ ہمارے معبودوں کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کرتا ہے اور اُن کو برا بھلا کہتا ہے، وہ لوگ حضرت حصین کو لے کر آئے یہاں تک کہ وہ نبی کریم ﷺ کے دروازے کے قریب بیٹھ گئے، آپؐ نے فرمایا: شیخ کو جگہ دو، اس

وقت (حضرت حصین کے بیٹے) حضرت عمران اور ان کے ساتھی بھی وہاں موجود تھے، حضرت حصین نے کہا: کیا بات ہے یہ جو ہمیں آپ کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ آپ ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہتے ہیں اور ان کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں، آپ کے والد تو اپنے آباء کے دین پر قائم اور عقلمند اور بہتر تھے؟ آپؐ نے فرمایا: اے حصین! بلاشبہ میرے اور آپ کے والد آگ میں ہیں۔ اے حصین! آپ کتنے معبودوں کی عبادت کرتے ہو؟

انہوں نے کہا: زمین میں سات (معبودوں) کی اور آسمان میں ایک (معبود) کی، آپؐ نے پوچھا: جب تمہیں کوئی مصیبت لاحق ہوتی ہے تو کس کو پکارتے ہو؟ انہوں نے کہا: اس کو پکارتا ہوں جو آسمان میں ہے۔ آپؐ نے دریافت کیا: جب مال ہلاک یا تباہ ہو جائے تو کس کو پکارتے ہو؟ انہوں نے کہا: اسی کو جو آسمان میں ہے۔ آپؐ نے فرمایا: وہ تنہا تمہاری پکار سنتا ہے اور پھر بھی تم اس کے ساتھ ان دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہو! کیا شکر کرتے ہوئے تم اس پر راضی ہو یا آپ کو اس کا اندیشہ ہے کہ وہ مغلوب ہو جائے گا، اس لئے دوسروں کو بھی پکارتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا: ان دونوں میں سے کوئی بات نہیں ہے، کہا: میں جانتا ہوں کے میں نے آسمان کے رب کی طرح اور کسی کو نہیں پکارا، آپؐ نے فرمایا: اے حصین! اسلام قبول کرو محفوظ ہو جاؤ گے، اُنہوں نے کہا: میری قوم اور رشتہ داری کا مسئلہ ہے تو میں کیا کہوں؟ آپؐ نے فرمایا: کہو: اے اللہ! میں تجھ سے ہدایت طلب کرتا ہوں تاکہ میں راہ یاب ہو سکوں اور مجھے ایسا علم عطا فرما جو میرے لئے نفع بخش ہو۔ حضرت حصین نے یہ کلمات پڑھے اور اس وقت تک مجلس سے نہیں اٹھے یہاں تک کہ اسلام قبول کر لیا۔ حضرت عمرانؓ یہ دیکھ کر کھڑے ہو گئے اور (اپنے والد) حضرت حصینؓ کے سر، ہاتھوں اور پیروں کو بوسہ دیا۔ جب نبی کریم ﷺ نے یہ منظر دیکھا تو آپؐ کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں اور فرمایا: مجھے عمران کے طرزِ عمل پر رونا آیا۔ حصینؓ داخل ہوئے تو وہ کافر تھے، اور اس وقت عمرانؓ ان کی جانب نہ کھڑے ہوئے اور نہ ہی ان کی جانب التفات کیا، اور جب انہوں نے اسلام قبول کیا تو انہوں نے ان کا حق ادا کر دیا، اسی وجہ سے مجھ پر رقت طاری ہو گئی۔ جب حضرت حصینؓ نے وہاں سے جانے کا ارادہ کیا تو آپؐ نے اپنے اصحاب سے فرمایا: کھڑے ہو جاؤ اور ان کے گھر تک ان کے ساتھ جاؤ، جب وہ دروازے سے نکلے تو قریش کے لوگوں نے ان کو دیکھا تو کہنے لگے: یہ بے دین ہو گئے! اور وہ سب ان کے پاس سے چلے گئے۔(دیکھیں: النھایۃ 1/234)

حضرت حصینؓ کے لئے اس سرعت کے ساتھ قبولِ اسلام کا جو سبب بنا وہ ان کا سلیم الفطرت ہونا اور ان کے اندر حُسنِ استعداد کا پایا جانا بھی ہے اور دوسرے اعتبار سے اللہ کے رسول ﷺ کی قوتِ استدلال اور راست گفتاری بھی ہے۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت حصینؓ کے ساتھ بات چیت اور گفتگو کا اسلوب اختیار کیا تاکہ ان کے دل میں توحید کے معانی راسخ ہو جائیں اور باطل عقائد کا خاتمہ ہو جائے۔

4: حضرت ابوذرؓ کا قبولِ اسلام

حضرت ابوذرؓ جاہلیت کے طرزِ عمل کے منکر تھے، بت پرستی کا انکار کرتے تھے اور جو بھی اللہ کے ساتھ شرک کرتا تھا اس پر نکیر کرتے تھے اور قبولِ اسلام سے تین سال پہلے سے نماز پڑھتے تھے، البتہ کسی مخصوص قبلہ کی جانب رخ کرکے نماز نہیں پڑھتے تھے، معلوم یہ ہوتا ہے کہ وہ حنیفیت کے طرزِ عمل پر قائم تھے اور جب انہوں نے نبی کریم ﷺ کے بارے میں سنا تو سفر کرکے مکہ آئے اور مناسب نہیں سمجھا کہ آپؐ کے بارے میں کسی سے دریافت کریں، یہاں تک کہ رات کا وقت ہو گیا، وہ لیٹ گئے، حضرت علیؓ نے آپ کو دیکھ لیا اور سمجھ گئے کہ وہ کوئی اجنبی ہیں، اس لئے ان کی میزبانی کی اور ان کو اپنا مہمان بنالیا، اور ان سے کسی چیز کے بارے میں نہیں پوچھا، اور حضرت ابوذرؓ صبح ان کے ہاں سے مسجد حرام چلے گئے، وہ انتظار کرتے رہے یہاں تک کہ شام ہو گئی، حضرت علیؓ نے پھر ان کو دیکھا اور دوسری رات بھی ان کی میزبانی کی، اور تیسری رات بھی اسی طرح ہوا۔ اس کے بعد حضرت علیؓ نے ان کے آنے کی وجہ دریافت کی، جب حضرت ابوذرؓ نے ان کے بارے میں مکمل اطمئنان کر لیا تو ان کو بتادیا کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں، حضرت علیؓ نے ان سے فرمایا: بلاشبہ وہ حق پر ہیں، وہ اللہ کے رسول ہیں، جب صبح ہو گی تو میرے پیچھے پیچھے آنا، اگر میں (راستے میں) کوئی ایسی بات دیکھوں گا جس سے مجھے تمہارے بارے میں خطرہ محسوس ہو تو میں کھڑا ہو جاؤں گا گویا کہ مجھے قضائے حاجت کا تقاضا ہے، اور اگر میں چلتا رہوں تو میرے پیچھے آجانا، وہ ان کے پیچھے پیچھے چلتے رہے یہاں تک کہ اللہ کے رسول ﷺ سے ملاقات کی، اور آپ ﷺ کے کلام کو سنا اور اسلام قبول کر لیا، آپ ﷺ نے فرمایا: اپنی قوم کے پاس واپس چلے جاؤ اور ان کو بھی دعوت دو یہاں تک کہ تمہیں میرے غلبہ کا علم ہو جائے۔ حضرت ابوذرؓ نے عرض کیا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے! میں ان مشرکین کے مجمع میں جاکر کلمۂ توحید کا اعلان کروں گا۔ چنانچہ وہاں سے نکل کر مسجد حرام میں آگئے اور بلند آواز سے کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ یہ سنتے ہی تمام لوگ ان پر ٹوٹ پڑے اور مارتے مارتے ان کو زمین پر لٹا دیا، اتنے میں حضرت عباسؓ بن عبد المطلب آگئے اور اس بات سے ڈرایا کہ قبیلۂ غفار اس کا بدلہ لیں گے اور شام جانے والے تاجروں کو پریشان کریں گے، اس طرح سے ان کو وہاں سے بچالیا۔ (دیکھیں: فقہ الدعوۃ الفردیۃ، سید محمد نوح، ص104)

حضرت ابوذرؓ نے خود آنے سے پہلے اپنے بھائی کو بھیجا تھا تا کہ وہ نبی کریم ﷺ کے متعلق جانکاری حاصل کریں، اور ان کی باتیں سنیں۔ چنانچہ انہوں نے آکر اللہ کے رسول ﷺ کا کلام سنا اور واپس جاکر حضرت ابوذر غفاریؓ سے فرمایا: میں نے ان کو دیکھا تو وہ اچھے اخلاق کا حکم دیتے ہیں، اور ایسا کلام ان سے سنا جو شعر نہیں ہے۔ حضرت ابوذرؓ نے ان کی بات سن کر کہا: میرا جو مقصد تھا اس سلسلہ میں آپ نے مجھے کوئی تشفی بخش جواب نہیں دیا۔ اس لئے انہوں نے بذاتِ خود اللہ کے رسول ﷺ کے پاس جانے کا ارادہ کیا۔ ان کے بھائی نے ان سے کہا: اہلِ مکہ کی طرف سے ہوشیار رہنا، اس لئے کہ انہوں نے آپؐ کے خلاف محاذ قائم کر رکھا ہے، اور ان کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ (صحیح بخاری: 3861، صحیح مسلم: 2474 صحیح السیرۃ النبویہ، ابراہیم العلی، ص: 83)

دروس واسباق اور فوائد

1)اللہ کے رسول ﷺ کا ذکر قبائل میں عام ہو گیا اور اس سلسلہ میں قریش کے مشرکین کا بہت زیادہ کردار رہا ہے، اس لئے کہ انہوں نے اللہ کے رسول ﷺ کے خلاف پروپیگنڈہ مہم چھیڑ رکھی تھی اور ہر ایک کو آپ ﷺ کے بارے میں ڈراتے تھے، یہاں تک کہ آپ ﷺ کا ذکر قبیلہٗ غفار اور تمام قبائل تک پہنچ گیا۔

2)حضرت ابوذرؓ کا یہ طرۂ امتیاز تھا کہ وہ اپنی ایک مستقل رائے رکھتے تھے، اس لئے پروپیگنڈہ مہم کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا ہے، قریش کی پھیلائی ہوئی باتوں کو انہوں نے تسلیم نہیں کیا، بلکہ پروپیگنڈہ مہم کو نظرانداز کر کے اپنے بھائی کو اللہ کے رسول ﷺ کے حالات معلوم کرنے کے لئے بھیجا۔

3)اللہ کے رسول ﷺ کے بارے میں حضرت ابوذرؓ انتہائی اہتمام فرماتے ہیں اور صرف اپنے بھائی انیس کی بتائی ہوئی معلومات پر اکتفا نہیں کرتے ہیں بلکہ بذاتِ خود حقیقت سے آگاہ ہونے کا ارادہ کرتے ہیں، اس لئے کہ تحقیق صرف کسی ایسے شخص کے بارے میں نہیں کی جارہی تھی جو کہ صرف خیر کا حکم دے رہا تھا، بلکہ ایک ایسے شخص کے بارے میں تحقیق کرنی تھی جو نبی ہونے کا دعوی کر رہا تھا، اسی لئے انہوں نے اس سلسلہ میں تکالیف اور مشقتیں برداشت کیں، اہل وعیال اور وطن سے طلبِ حق کی وجہ سے دور رہے اور معمولی توشۂ سفر ساتھ لے کر مکہ مکرمہ پہنچ گئے تاکہ نبوت کے بارے میں خود تحقیق کر لیں۔

4)معلومات حاصل کرنے کے سلسلہ میں سنجیدگی، متانت اور انتظار کا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہئے، حضرت ابوذرؓ نے انتہائی سنجیدگی اور متانت سے کام لیا، اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ قریش کے لوگ ہر اس شخص کو ناپسند کرتے ہیں جو بھی اللہ کے رسول ﷺ سے بات چیت کرتا ہے۔ یہ انتظار اور متانت کا عمل احتیاطی اور حفاظتی تدبیر کے طور پر تھا جو اس وقت کی صورتِ حال کا تقاضا تھا، چنانچہ اگر وہ آپ ﷺ کے بارے میں کسی سے دریافت کر لیتے تو قریش کو اس کا علم ہو جاتا اور پھر ہو سکتا ہے کہ ان کو تکلیف اور ایذاء کا بھی سامنا کرنا پڑتا، اور نتیجتاً وہ اس مقصد کو حاصل کرنے میں ناکام ہو جاتے جس کے لئے انہوں نے مصائب وآلام اور سفر کی مشقت برداشت کی تھی۔

5)معلومات دینے سے پہلے احتیاطی تدابیر اختیار کی جائیں، اسی لئے حضرت علیؓ نے پہلے حضرت ابوذرؓ سے ان کا تعارف اور مکہ آنے کی وجہ دریافت کی، اور تین روز تک ان کی مہمان نوازی کرنے کے باوجود ان کو کسی طرح کی معلومات نہیں دی اور راز رکھنے کی شرط پر ہی ان کو معلومات دیں اور ان کی رہنمائی کی۔

6)پیش قدمی کے لئے حفاظتی اقدامات: حضرت علیؓ اور حضرت ابوذرؓ کے مابین یہ بات طے ہوئی کہ اگر حضرت علیؓ کوئی ناخوشگوار صورتحال دیکھیں گے تو وہ کوئی مخصوص اشارہ یا حرکت کریں گے، جیسے کہ جوتے کو ٹھیک کرنے لگیں گے، یا قضائے حاجت کے لئے بیٹھ جائیں گے، یہ حفاظتی اقدامات اصل مرکز "دارالارقم" کی جانب جانے کے لئے کئے گئے، اس کے ساتھ ساتھ حضرت ابوذرؓ حضرت علیؓ سے کچھ دور مسافت پر چل رہے تھے، تاکہ کسی کو شک نہ ہو کہ ان دونوں کی منزل ایک ہی ہے، یہ سب احتیاطی تدابیر کے طور پر کیا گیا۔

7) یہ تمام حفاظتی تدابیر اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ صحابہ کرامؓ احتیاط و حفاظتی پہلو کے اعتبار سے انتہائی اعلیٰ مقام رکھتے تھے، اور ان کے اندر احتیاطی حس بدرجہ اتم موجود تھی، یہاں تک کہ ان کی خاص اور عام حرکات و سکنات میں ان کی یہ ایک امتیازی پہچان بن چکی تھی، جس کے نتیجہ میں ان کے تمام اقدامات منظم اور متعین پروگرام کے مطابق ہوتے تھے، صحابہ کرام کی اس حس اور صفت کی آج ہمیں کتنی زیادہ ضرورت ہے؟! جب کہ دورِ حاضر میں تہذیبوں کے بقا اور زوال میں سکیورٹی کی بہت زیادہ اہمیت بڑھ گئی ہے، اور اس سلسلہ میں مخصوص اسکولز، اہم ٹیکنیکس، جدید وسائل و اسالیب، مستقل وسائل و ذرائع اور بھاری بجٹ کا انتظام کیا گیا ہے اور عام طور پر معلومات اور بطورِ خاص سکیورٹی سے متعلق معلومات بھاری قیمت پر خریدی اور بیچی جاتی ہیں اور بوقتِ ضرورت ان کے حصول کے لئے جان کی قربانی بھی دی جاتی ہیں۔

ایسی صورتحال میں مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ احتیاطی اور حفاظتی پہلو پر مکمل توجہ مرکوز کریں، تاکہ ہمارے مسائل اعدائے دین کے ہاتھوں میں کھلونا نہ بنیں اور نہ ہی ہمارے راز اور معلومات ان کو باآسانی میسر ہو سکیں۔ (دیکھیں: الوحی و تبلیغ الرسالہ، د۔۔۔ یحییٰ الیحییٰ ص: 91-93، فی السیرۃ النبویۃ قراءۃ لجوانب الحذر والحمایۃ، د۔ ابراہیم علی، ص58، 59)

8) حضرت ابوذرؓ حق کی تلاش میں مخلص اور سچے تھے، ان کی عقلی صلاحیت اور قوتِ فہم انتہائی اعلیٰ تھی، اسی لئے ان کے سامنے اسلام پیش کئے جانے کے فوراً بعد انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔

9) اللہ کے رسول ﷺ صحابہ کرام کی حفاظت و سلامتی کے بارے میں انتہائی فکر مند رہتے تھے، اسی لئے آپ ﷺ نے حضرت ابوذرؓ کو اپنے اہل و عیال کی جانب واپس جانے اور غلبہ حاصل ہونے تک اس کو راز رکھنے کا حکم دیا۔

10) حضرت ابوذرؓ حق گوئی کے سلسلہ میں انتہائی بہادر اور قوی تھے، چنانچہ انہوں نے قریش کی مجلسوں میں اپنے اسلام کا اظہار کیا اور یہ ان کے لئے ایک چیلنج بھی تھا اور حق کے اظہار کا ایک طریقہ بھی، ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے یہ بات سمجھی کہ اللہ کے رسول ﷺ کا راز داری سے کام لینے کا حکم وجوبی نہیں ہے بلکہ ان پر شفقت کی وجہ سے تھا، اسی لئے حضرت ابوذرؓ نے آپ کے سامنے اس کا اظہار کر دیا کہ ان کے اندر اعلان و اظہار کرنے کی طاقت ہے اور نبی کریم ﷺ نے بھی ان کی بات کو تسلیم کر لیا، اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اگر اذیت پہنچنے کا اندیشہ ہو تب بھی حق بات کا اعلان اور اظہار کرنا جائز ہے، اگرچہ سکوت بھی جائز ہے، اس سلسلہ میں اصل بات یہ ہے کہ حالات اور مقاصد کے اعتبار سے اس کا حکم مختلف ہوتا ہے اور اسی اعتبار سے اجر و ثواب متحقق ہوتا ہے۔ (دیکھیں: دروس فی الکمہ تان، محمود شیث خطاب، ص9، الوحی و تبلیغ الرسالہ، ص95)

11) حضرت ابوذرؓ کا موقف دعوت کے لئے مفید تھا اور اس نفسیاتی جنگ کا مقابلہ کرنے میں بھی اس نے اہم کردار ادا کیا جو قریش کے لوگوں نے اللہ کے رسول ﷺ کے خلاف چھیڑ رکھی تھی، یہ ایک معنوی یلغار تھی جس نے کفارِ مکہ کے اندرون تک اپنے اثرات ڈالے، اس لئے کہ حضرت ابوذرؓ نے انتہائی بہادری اور جوانمردی کا مظاہرہ کیا، ان کے جسم سے خون بہتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ دوسری مرتبہ بھی شہادتِ حق کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔

12) حضرت عباسؓ مسلمانوں کی طرف سے دفاع کرتے ہیں اور حضرت ابوذرؓ کو قریش کی ایذار سانی سے بچاتے ہیں، اس میں اس بات کی دلیل موجود ہے کہ حضرت عباسؓ مسلمانوں کے ساتھ شفقت کرتے تھے، اور زیادتی کو روکنے کا ان کا یہ اسلوب بتاتا ہے کہ وہ کفارِ مکہ کی نفسیات سے اچھی طرح واقف تھے، اسی لئے انہوں نے قریش کو ان خطرات سے آگاہ کر دیا جو ان کی تجارت کو قبیلۂ غفار کے ذریعہ لاحق ہو سکتے ہیں۔(فتح الباری، حدیث نمبر: 3861)

13) حضرت ابوذرؓ نے وہ تمام حفاظتی اقدامات اختیار کئے جو اللہ کے رسول ﷺ مکہ میں اختیار فرمایا کرتے تھے، اگرچہ حضرت ابوذرؓ کو اللہ کے رسولؐ کے ساتھ گہرا تعلق، انتہائی محبت اور آپ سے ہر وقت ملاقات کا اشتیاق تھا، لیکن انہوں نے اللہ کے رسول ﷺ کے حکم کی پیروی کرتے ہوئے مکہ کو چھوڑ کر اپنی قوم کی جانب جانے کا فیصلہ کیا، گھر والوں کی اصلاح وہدایت اور ان کو دعوت دینے کی فکر کی اور دعوت کا آغاز اپنے بھائی، والدہ اور اپنی قوم سے کیا۔

14) حضرت ابوذرؓ دعوتی اعتبار سے اپنی قوم میں انتہائی مؤثر ثابت ہوئے، وہ اپنی قوم کو اسلام کے بارے میں مطمئن کرنے اور راہِ ہدایت دکھانے کی صلاحیت رکھتے تھے، لیکن اس کے باوجود وہ قیادت وامارت کے لئے مناسب نہیں تھے، چنانچہ امام مسلمؒ اپنی "صحیح" میں حضرت ابوذرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا آپ مجھے حاکم نہیں بنائیں گے؟ فرماتے ہیں: آپؐ نے اپنا ہاتھ میرے کندھے پر مارا اور پھر فرمایا: اے ابوذر! تم کمزور ہو، یہ امارت ایک امانت ہے، اور قیامت کے دن یہ باعثِ ندامت ورسوائی بنے گی، سوائے اس شخص کے جو اس کو اس کے حق کے ساتھ لے گا، اور اس کا حق ادا کرے گا۔(صحیح مسلم: 1825، مسند أحمد: 5/173-267) لہذا ہر شخص کا ایک میدانِ کار ہوتا ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے اسے تیار کیا ہوتا ہے، دعوتی میدان میں کامیابی کہ مطلب یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ ایسا شخص ہر میدان کے لئے مناسب ہوگا۔

15) حضرت ابوذرؓ نے غفار کے سردار حضرت أیماء بن رحضہ کو امارت وقیادت کی ذمہ داری سونپی، حالانکہ ابوذرؓ کو ان کے مقابلہ میں قبولِ اسلام میں سبقت بھی حاصل تھی اور مقام میں بھی برتر تھے، اس کے ذریعہ تنظیمی مہارت وصلاحیت کا پتہ چلتا ہے کہ تمام کام اور منصب ایک ہی شخصیت کے پاس جمع نہیں ہونے چاہئیں، لوگوں کی صلاحیتوں کا علم ہونا چاہئے اور ان کے مقام ومرتبہ کے مطابق ان کے ساتھ سلوک ہونا چاہیے۔(دیکھیں: الوحی وتبلیغ الرسالۃ، ص، 94-95)

16) دعوتی اعتبار سے حضرت ابوذرؓ کی کامیابی کا بھی اس سے پتہ چلتا ہے، اس لئے کہ قبیلۂ غفار کے نصف لوگوں نے ان کی دعوت کے نتیجہ میں اسلام قبول کیا، اور باقی ماندہ نصف لوگ ہجرت کے بعد حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔(ایضاً، ص: 100)

یقیناً ہر قسم کی مخالفانہ کوششیں، پروپیگنڈہ مہم، ابلاغی جنگ اور کفار کی جانب سے عائد کی جانے والی فکری پابندی کی ہر کوشش ناکام ثابت ہوئی، اس لئے کہ اللہ کے رسول ﷺ کی آواز مخالفین کی آواز کے مقابلہ میں زیادہ طاقتور تھی، آپ کے وسائل ان کے وسائل کے مقابلہ میں زیادہ مؤثر تھے اور عظیم الشان نصب العین پر آپؐ کی ثابت قدمی آپؐ کے دشمنوں کے تصور سے کہیں زیادہ تھی، چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ اپنے گھر کے اندر بیٹھے نہیں رہتے تھے، نہ ہی مسجد حرام کے کسی کونے میں گوشہ نشین ہو گئے تاکہ اپنی دعوت کو مخفی رکھیں اور دشمنوں

کے زہر آلود تیروں سے اپنے آپ کو محفوظ کرلیں، بلکہ آپ ﷺ نے اپنے آپ کو خطرات کے سامنے پیش کیا، چنانچہ آپؐ باہر سے آنے والے اہلِ عرب کے ساتھ مکہ میں ان کے داخل ہونے سے پہلے ملاقات کرلیتے، مسجدِ حرام میں باآواز بلند تلاوتِ قرآن فرماتے، تاکہ ہر زندہ دل اس کو سن لے اور نورِ ہدایت اس کے دل ودماغ کے دریچوں تک پہنچ جائے، انہی لوگوں میں حضرت ضماد ازدیؓ، حضرت عمرو بن عبسہؓ، حضرت ابوذر غفاریؓ، حضرت طفیل بن عمرو دوسیؓ، حضرت عمران کے والد حضرت حصینؓ تھے۔ یہ قریش کی طرف سے شروع کی گئی مخالفت اور پروپیگنڈہ مہم کی ناکامی کی واضح اور قطعی دلیل ہے، اور اس میں ہمارے لئے بہت سے دروس واسباق موجود ہیں۔

3) اللہ کے رسول ﷺ کو پہنچنے والی ایذا اور تکلیف

اللہ کے رسول ﷺ نے جیسے ہی دعوت کا اعلان کیا اس وقت سے لے کر اسلام کے غالب ہونے تک مشرکین نے آپؐ کو ایذا پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور نہ ہی انہوں نے اس میں کوئی نرمی دکھائی، اس انتہائی ایذاء رسانی کی سب سے واضح دلیل وہ بہت سی آیات ہیں جو اس زمانہ میں آپؐ پر نازل ہوتی تھیں اور ان میں آپؐ کو صبر وثبات کی تلقین کی جاتی تھی، صبر کے وسائل وطریقوں کی رہنمائی کی جاتی تھی، حزن وغم سے باز رہنے کی ترغیب دی جاتی تھی اور انبیاء ومرسلین کے ساتھ پیش آئی صورتحال سے مثالیں دی جاتی تھیں، جیسے کہ اِرشاد باری تعالٰی ہے: [وَاصۡبِرۡ عَلٰى مَا يَقُوۡلُوۡنَ وَاهۡجُرۡهُمۡ هَجۡرًا جَمِيۡلًا]

ترجمہ: ''اور جو باتیں لوگ بنا رہے ہیں ان پر صبر کرو اور شرافت کے ساتھ اُن سے الگ ہو جاؤ''۔ (سورہ مزمل: 10)

اسی طرح دوسری جگہ یوں ارشاد ہے: [فَاصۡبِرۡ لِحُكۡمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعۡ مِنۡهُمۡ اٰثِمًا اَوۡ كَفُوۡرًا] ترجمہ: ''لہٰذا تم اپنے رب کے حکم پر صبر کرو، اور اِن میں سے کسی بد عمل یا منکر حق کی بات نہ مانو''۔ (سورۃ الانسان: 24)

ایک اور مقام پر ہے: [وَلَا تَحۡزَنۡ عَلَيۡهِمۡ وَلَا تَكُنۡ فِىۡ ضَيۡقٍ مِّمَّا يَمۡكُرُوۡنَ] ترجمہ: ''اے نبیؐ، اِن کے حال پر رنج نہ کرو اور نہ اِن کی چالوں پر دل تنگ ہو''۔ (سورۃ النمل: 70)

مزید ارشاد ہے: [مَا يُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدۡ قِيۡلَ لِلرُّسُلِ مِنۡ قَبۡلِكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوۡ مَغۡفِرَةٍ وَّذُوۡ عِقَابٍ اَلِيۡمٍ]

ترجمہ: ''اے نبیؐ، تم سے جو کچھ کہا جا رہا ہے اس میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو تم سے پہلے گزرے ہوئے رسولوں سے نہ کہی جا چکی ہو، بے شک تمہارا رب بڑا درگزر کرنے والا ہے، اور اس کے ساتھ بڑی دردناک سزا دینے والا بھی ہے''۔ (سورۃ فصلت: 43)

ایذاء وتکلیف کی بعض مثالیں:

ا۔ ابو جہل نے ایک مرتبہ کہا: کیا محمد تمہارے سامنے اپنا چہرہ زمین پر رکھتے ہیں؟ لوگوں نے کہا: ہاں، ابو جہل نے کہا: لات اور عزی کی قسم! اگر میں ان کو اس حال میں دیکھوں گا (یعنی سجدہ میں) میں اُن کی گردن روندوں گا، یا ان کے چہرہ کو مٹی سے بھر دوں گا، اس کے بعد وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا جبکہ آپؐ نماز ادا کر رہے تھے، اس کا ارادہ یہ تھا کہ آپؐ کی گردن روندے، لوگوں نے دیکھا کہ اچانک ابو جہل

الٹے پاؤں واپس جارہاہے اوراپنے ہاتھ سے اپنے آپ کو کسی چیز سے بچارہاہے۔ لوگوں نے پوچھا: تجھے کیا ہوا؟ وہ بولا: میں نے دیکھا کہ میرے اور محمدؐ کے بیچ میں آگ کی ایک خندق ہے، ہولناک منظر ہے اور بازو ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر وہ میرے نزدیک آتا تو فرشتے اس کی بوٹی بوٹی اور ایک ایک عضو اچک لیتے۔(صحیح مسلم: 2797)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں ہے کہ "نبی کریم ﷺ نماز ادا فرمارہے تھے تو اسی دوران ابوجہل آگیا اور اس نے کہا: کیا میں نے تمہیں اس سے منع نہیں کیا تھا؟ کیا میں نے تمہیں اس سے منع نہیں کیا تھا؟ نبی کریم ﷺ جب نماز سے فارغ ہوئے تو اس کو ڈانٹا۔ ابوجہل نے کہا: تجھے خوب اچھی طرح معلوم ہے کہ مجھ سے زیادہ کسی کے ہم نشین اور ساتھی نہیں ہیں، اس پر اللہ تعالی نے یہ آیت نازل فرمائی:[فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ * سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ] ترجمہ:"وہ بلالے اپنے حامیوں کی ٹولی کو۔ ہم بھی عذاب کے فرشتوں کو بلالیں گے"۔ (سورۃ العلق 17-18) حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں: اگر وہ اپنے ساتھیوں کو بلالیتا تو اللہ کے فرشتے اس کو پکڑ لیتے۔ (سنن ترمذی:3349)

۲- حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ خانہ کعبہ کے پاس کھڑے نماز پڑھ رہے تھے، قریش کا ایک ٹولہ وہیں اپنی مجلس لگائے ہوئے تھا، اتنے میں ان میں سے ایک نے کہا: اس ریاکار کو نہیں دیکھتے؟ کیا کوئی ہے جو فلاں قبیلہ کے ذبح کئے ہوئے اونٹ کا گوبر، خون اور اوجھڑی اٹھالائے؟ پھر انتظار کرتا رہے جب یہ (نبی کریمؐ) سجدہ میں جائیں تو ان کی گردن پر ڈال دے، چنانچہ اس کام کو انجام دینے کے لئے ان میں سے سب سے زیادہ بدبخت شخص اٹھا اور جب آپؐ سجدہ میں گئے تو اس نے آپؐ کی گردن مبارک پر یہ اوجھڑی ڈال دی، نبی کریم ﷺ سجدہ ہی کی حالت میں سر رکھے رہے، مشرکین یہ دیکھ کر ہنسے اور مارے ہنسی کے ایک دوسرے پر لوٹ پوٹ ہونے لگے۔ ایک شخص حضرت فاطمہؓ کے پاس آیا اور حضرت فاطمہؓ ابھی چھوٹی بچی تھیں، آپ دوڑتی ہوئی آئیں، نبی کریم ﷺ ابھی بھی سجدہ ہی میں تھے، حضرت فاطمہؓ نے اس اوجھڑی کو آپؐ کے جسم سے ہٹایا اور مشرکین کو برا بھلا کہا۔ جب نبی کریم ﷺ نے نماز مکمل فرمائی تو فرمایا: اے اللہ! قریش پر عذاب نازل فرما۔ اے اللہ! قریش پر عذاب نازل فرما، اے اللہ! قریش پر عذاب نازل فرما۔ پھر آپ نے نام لے کر کہا: یااللہ! عمرو بن ہشام، عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ولید بن عتبہ، امیہ بن خلف، عقبہ بن اُبی معیط اور عمارہ بن ولید کو ہلاک فرما۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں: اللہ کی قسم! میں نے ان سب کو بدر کے دن مقتول پایا، پھر انہیں گھسیٹ کر بدر کے کنویں میں پھینک دیا گیا، اس کے بعد اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: "ان کنویں والوں پر اللہ کی لعنت ہو"۔ (صحیح بخاری:520 صحیح مسلم: 1794)

دیگر صحیح روایات میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ اوجھڑی ڈالنے والا عقبہ بن ابی معیط تھا اور اس پر ابھارنے والا ابوجہل تھا۔ (صحیح مسلم:1794) مشرکین پر اللہ کے رسول ﷺ کی بددعا کا خوف طاری تھا، اور یہ ان پر انتہائی شاق گزرا، اس لئے کہ وہ سمجھتے تھے کہ مکہ میں کی جانے والی دعا مستجاب ہے۔

۳- ایک روز سردارانِ قریش کعبہ کے صحن میں جمع ہوئے اور اللہ کے رسول ﷺ کا ذکر کرنے لگے اور کہنے لگے: اس شخص کے بارے میں ہم نے جتنا صبر کیا ہے اتنا صبر کبھی کسی چیز پر نہیں کیا ہے۔ اس نے ہمارے عقلمندوں کو بیوقوف قرار دیا ہے، ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہا

ہے، ہم نے ایک بہت بڑے معاملہ کے بارے میں صبر کیا ہے! وہ یہی باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں اللہ کے رسول ﷺ تشریف لائے، سب لوگ آپؐ پر یکبارگی ٹوٹ پڑے اور آپؐ کو چاروں طرف سے گھیر کر کہنے لگے: آپ ہی ہو جو ایسا ایسا کہتے ہو، وہ اپنے معبودوں اور دین کی عیب جوئی کا ذکر کرنے لگے۔ آپؐ فرماتے: ہاں، میں ہی ایسا کہتا ہوں۔ اس کے بعد ان میں سے ایک شخص آپ کو چادر سے بھینچنے لگا تو حضرت ابو بکر صدیقؓ آپؐ کو بچانے کے لئے کھڑے ہوئے اور وہ رو رہے تھے اور کہہ رہے تھے: کیا آپ ایک ایسے شخص کو قتل کر رہے ہو جو کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے؟! (صحیح بخاری: 3687، 3856، 4815، صحیح السیرۃ النبویہ، ابراہیم العلی: ص،96)

۴۔ نبی کریم ﷺ کا چچا ابو لہب آپؐ سے سب سے زیادہ دشمنی کرنے والا شخص تھا، اسی طرح اس کی بیوی اُم جمیل بھی آپؐ سے بہت زیادہ عداوت رکھتی تھی، وہ چغلیاں کر کے لوگوں کے ساتھ آپؐ کے تعلقات خراب کرتی تھی۔ آپؐ کے راستے میں کانٹے بچھاتی تھی، آپؐ کے دروازے پر گندگی ڈالتی تھی، اسی لئے ان دونوں کے بارے میں ایک پوری سورت نازل ہوتی ہے جس میں ارشاد ہے: ﴿تَبَّتْ يَدَآ أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ ۝١ مَآ أَغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُۥ وَمَا كَسَبَ ۝٢ سَيَصْلَىٰ نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝٣ وَٱمْرَأَتُهُۥ حَمَّالَةَ ٱلْحَطَبِ ۝٤ فِي جِيدِهَا حَبْلٌ مِّن مَّسَدٍ ۝٥﴾ ترجمہ: ”ابو لہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ ہلاک ہو گیا۔ اس کا مال اور جو کچھ اس نے کمایا اس کے کام نہ آیا۔ وہ بھڑکتی ہوئی آگ میں پڑے گا۔ اور اس کی عورت بھی جو ایندھن اٹھائے پھرتی تھی۔ اس کی گردن میں مونج کی رسی ہے“۔ (سورۂ لہب: 1-5)

ابو لہب کی بیوی نے اپنے بارے میں اور اپنے شوہر کے بارے میں نازل ہونے والی قرآنی آیات سنیں تو رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور اس وقت آپؐ خانہ کعبہ کے پاس تشریف فرما تھے اور آپؐ کے ساتھ حضرت ابو بکر صدیقؓ بھی تھے۔ اس کے ہاتھ میں پتھر تھے جب وہ آکر ان دونوں کے سامنے کھڑی ہوگئی تو کہنے لگی: اے ابو بکر! کہاں ہیں آپ کے صاحب؟ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ میری ہجو اور برائی کرتے ہیں۔ واللہ! اگر مجھے وہ ملے تو میں ان کے چہرے پر یہ پتھر ماروں گی! یہ بڑبڑا کر واپس چلی گئی۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے فرمایا: اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا اس نے آپ کو دیکھا نہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالی نے مجھے دیکھنے سے اس کی نگاہ سلب کرلی۔ وہ یہ پڑھا کرتی تھی: مذمم (قابل مذمت شخص) کا ہم نے انکار کیا۔ اس کے دین سے ہم نے روگردانی اختیار کی اور اس کے حکم کو ہم نے نہیں مانا۔ اللہ کے رسول ﷺ یہ سن کر خوش ہوتے۔ اس لئے کہ مشرکین قابل مذمت شخص کو برا بھلا کہتے تھے۔ آپ ﷺ فرماتے: کیا آپ کو تعجب نہیں ہوتا ہے کہ اللہ تعالی قریش کی گالیوں اور ملامت سے مجھے کیسے محفوظ رکھتا ہے۔ وہ مذمم (قابلِ مذمت شخص) کو برا بھلا کہتے ہیں، اور میں تو محمد (قابل تعریف) ہوں۔ (صحیح بخاری: 3533)

ابو لہب کی عداوت و دشمنی اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ وہ بازاروں میں، مجلسوں میں اور حج کے زمانہ میں آپ کا پیچھا کرتا تھا اور آپ ﷺ کی تکذیب کرتا تھا۔ (السیرۃ النبویہ، ابو شہبہ، 293/1)

مشرکین کی جانب سے رسول اللہ ﷺ کو پہنچائی جانے والی اذیت کی یہ بعض جھلکیاں تھیں، مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کو اذیت پہنچانے کی آخری کوشش اس وقت کی جب وہ مکی دور کے آخری مرحلہ میں آپؐ کی جان کے درپے ہوگئے، اللہ کے رسول ﷺ قریش کی ایذاؤں کا ذکر فرمایا کرتے تھے جب کہ آپؐ کے متبعین میں سے ابھی کسی کو اس طرح کی سزاؤں کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا، آپؐ فرماتے تھے: "مجھے اللہ عزوجل کی راہ میں اس وقت ڈرایا گیا جبکہ کسی کو نہیں ڈرایا جاتا تھا، مجھے اللہ کی وجہ سے اس وقت اتنی ایذاء پہنچائی گئی جب کہ کسی کو اس قدر ایذاء نہیں پہنچائی گئی، مجھ پر مسلسل ایسے تیس (30) دن رات گزر جاتے کہ نہ ہی میرے لئے اور نہ ہی بلال کے لئے کھانے کی کوئی ایسی چیز نہ ہوتی جس کو کوئی جاندار کھا سکتا، سوائے تھوڑی سی چیز کے جسے بلال اپنی بغل میں چھپا لیتے تھے۔(سنن ترمذی: 2472، اِبنِ ماجہ: 151)

حالانکہ اللہ کے رسول ﷺ ایک عظیم المرتبت شخصیت کے حامل اور شرف وعزت کے کمال پر فائز تھے لیکن اس کے باوجود دعوت کا اعلان کرنے کے اولین روز سے ہی آپؐ کو جدوجہد اور جان توڑ آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا، اللہ کے رسول ﷺ کو قریش کے بیوقوفوں کی طرف سے بہت زیادہ اذیتوں کو برداشت کرنا پڑا، جب آپؐ ان کی مجلسوں اور محفلوں کے پاس سے گزرتے تو وہ آپ کا مذاق اڑاتے تھے، استہزاء کرتے ہوئے کہتے تھے: یہ ابو کبشہ کے صاحبزادے ہیں (یعنی رسول ﷺ کے رضاعی والد) آسمان سے ان کے ساتھ باتیں ہوتی ہیں، ان میں سے کوئی اللہ کے رسولؐ کے پاس سے گزرتے ہوئے مذاق کے انداز میں کہتا: آج آسمان سے آپ کے ساتھ کلام نہیں کیا گیا؟!۔(دیکھیں: الروض الأنف 33/2)

معاملہ صرف استہزاء اور مذاق اور نفسیاتی ایذاء تک محدود نہ رہا، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ جسمانی سزا بھی شروع کی گئی، بلکہ حد یہ ہوگئی کہ اللہ کے دشمن امیہ بن خلف نبی کریم ﷺ کے چہرۂ مبارک پر تھوکتا ہے، یہاں تک کہ ہجرت کے بعد بھی ابتلاء وآزمائش کا سلسلہ موقوف نہیں ہوا، بلکہ نئے دشمنوں کے ذریعہ ابتلاء وآزمائش کا ایک نیا محاذ کھولا گیا، اس سے پہلے عداوت ودشمنی صرف قریشِ مکہ تک محدود تھی، لیکن اب مدینہ کے منافقین، یہود، فارسی، رومی اور ان کے حلیف سب دشمن بن گئے، اسی طرح اس سے پہلے مکہ میں ایذاء رسانی کا اسلوب یہ تھا کہ گالیاں دی جاتیں، مذاق اڑایا جاتا، محاصرہ کیا جاتا اور مارنے کی کوشش کی جاتی، لیکن اب مسلح عسکری جنگ شروع ہوگئی جس میں ہر طرح کے حربے استعمال کئے جاتے، جس میں جانی اور مالی ہر طرح کا نقصان ہوتا، اس طرح آپ ﷺ زندگی بھر طویل آزمائش اور ابتلاء کے مراحل سے گزرتے رہے اور اللہ کی راہ میں پہنچنے والی اس آزمائش میں کبھی آپ نے کمزوری نہیں دکھائی، بلکہ دنیا سے رخصت ہونے تک صبر واحتساب سے کام لیتے رہے۔(دیکھیں: الروض الأنف: 48/2، زاد الیقین، أبو شنب، ص 137، التمکین للأمۃ الاسلامیہ، ص 243)

اللہ کے رسول ﷺ کو اس قدر ابتلاء وآزمائش اور ایذاء کا سامنا کرنا پڑا جس کا تصور بھی محال لگتا ہے اور یہ آزمائشیں آپ کی رسالت کے مقام کے اعتبار سے آتی رہیں، اسی لئے آپ کو مقامِ محمود اور عظیم مقام سے سرفراز کیا گیا، آپؐ نے ان تمام مصائب وآلام پر صبر کیا تاکہ آپؐ کی قوم اس عذابِ خداوندی سے محفوظ رہے جو سابقہ قوموں پر آیا تھا اور تاکہ آپؐ داعیانِ حق اور مصلحین کے لئے نمونہ بن سکیں۔

لہذا اگر سخت ترین ابتلاء اور آزمائش سے اللہ کے رسول ﷺ محفوظ نہ رہ سکے تو پھر ابتلاء و آزمائش سے کوئی بھی بالاتر نہیں ہے، دعوتی راہ میں اللہ کا یہی قانون اور طریقہ ہے، چنانچہ حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! لوگوں میں میں سب سے زیادہ آزمائش کس پر ہوتی ہے؟ آپؐ نے فرمایا: سب سے زیادہ انبیائے کرام پر ہوتی ہے، پھر درجہ بدرجہ ان کے نقشِ قدم پر چلنے والوں پر، آدمی کی آزمائش اس کے دین کے اعتبار سے ہوتی ہے، اگر وہ دین میں مضبوط ہو تو آزمائش بھی سخت ہوتی ہے اور اگر اس کے دین میں کمزوری ہو تو اس کے دین کے اعتبار سے آزمائش ہوتی ہے۔ بندے کے ساتھ یہ آزمائشیں مسلسل رہتی ہیں یہاں تک کہ مصائب پر صبر کی وجہ سے وہ زمین پر اس طرح چلتا ہے کہ اس پر کوئی گناہ نہیں ہوتا ہے۔ (سنن ابن ماجہ: 4024، سنن ترمذی: i239، مسند احمد: 172/1)

4) صحابہ کرام کو پہنچنے والی ایذاء اور تکالیف

ا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کو لاحق ہونے والی تکلیف:

صحابہ کرامؓ کو اس قدر ابتلاءات اور آزمائشوں کو برداشت کرنا پڑا جس کے متحمل بلند اور مضبوط پہاڑ بھی نہیں ہو سکتے ہیں، انہوں نے اللہ کی راہ میں اپنی جانیں اور مال نچھاور کئے اور ان کو ناقابل برداشت مشقت کا سامنا کرنا پڑا اور اس ابتلاء و آزمائش سے اہلِ شرف و اصحابِ فضل مسلمان بھی محفوظ نہ رہ سکے، چنانچہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کو بھی اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا، آپؓ کے سر پر مٹی ڈالی گئی، مسجدِ حرام میں آپؓ کو جوتوں کے ذریعہ اتنا زدو کوب کیا گیا یہاں تک کہ آپ کے چہرے کو پہچاننا مشکل ہو رہا تھا اور ان کو ان کے گھر کپڑے میں اٹھا کر لے جایا گیا اور وہ موت و حیات کی کشمکش میں تھے۔ (دیکھیں: التمکین للأمۃ الاسلامیہ، ص 243)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ کے کچھ اصحاب جمع ہو گئے اور ان کی تعداد اس وقت تراسی (83) افراد پر مشتمل تھی، حضرت ابو بکرؓ نے اللہ کے رسول ﷺ سے اس بات پر اصرار کیا کہ اب لوگوں کے سامنے اعلانیہ طور پر آنا چاہیے، آپؐ نے فرمایا: اے ابو بکر! ہماری تعداد کم ہے، لیکن حضرت ابو بکرؓ مسلسل اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ اللہ کے رسول ﷺ لوگوں کے سامنے آ گئے اور تمام مسلمان مسجد حرام کے الگ الگ حصوں میں پھیل گئے، ہر شخص اپنے خاندان کے ساتھ تھا، حضرت ابو بکرؓ لوگوں میں خطیب کی حیثیت سے کھڑے ہو گئے جب کہ اللہ کے رسول ﷺ بیٹھے ہوئے تھے، چنانچہ حضرت ابو بکرؓ پہلے خطیب ہیں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف دعوت دی۔ یہ دیکھ کر تمام مشرکین حضرت ابو بکرؓ پر اور مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے، مسجد کے اندر ان کو سخت زدو کوب کیا۔ حضرت ابو بکرؓ کو دبوچا گیا اور سخت طریقے سے مارا گیا۔ فاسق عتبہ بن ربیعہ نے قریب آکر آپ کو دوہرے چمڑے کے جوتوں سے مارنا شروع کیا، وہ ان کے ذریعہ آپ کے چہرے کو مارتا تھا، وہ حضرت ابو بکرؓ کے پیٹ پر چڑھ گیا اور ان کو اتنا لہولہان کر دیا کہ ناک کی جگہ ان کا چہرہ پہچان میں نہیں آرہا تھا، بنو تیم کے لوگ دوڑتے ہوئے آئے اور مشرکین کو حضرت ابو بکرؓ سے دور کر دیا اور حضرت ابو بکرؓ کو ایک کپڑے میں اٹھا کر ان کے گھر لے گئے، انہیں ان کی موت کے بارے میں کوئی شک نہیں تھا، لا بنو تیم کے لوگ واپس آکر مسجد میں گئے اور اعلان کر دیا کہ اللہ کی قسم! اگر ابو بکرؓ کا انتقال ہو گیا تو ہم عتبہ بن ربیعہ کو قتل کر دیں گے۔ وہ حضرت ابو بکرؓ کے پاس واپس آئے تو ابو قحافہ

(حضرت ابو بکر کے والد) اور بنو تیم کے لوگ حضرت ابو بکرؓ سے بات کرنے کی کوشش کرنے لگے، یہاں تک کہ انہوں نے ان کی بات کا جواب دیا، اور دن گزرنے کے بعد بات کی تو سب سے پہلے پوچھا: اللہ کے رسول ﷺ کا کیا حال ہے؟ یہ سن کر لوگ ان کو برا بھلا کہنے لگے اور ان کو تنہا چھوڑ دیا اور ان کی والدہ ام الخیر سے کہنے لگے: دیکھو ان کو کچھ کھلانے پلانے کی کوشش کرو۔ جب وہ اکیلی رہ گئیں اور ان سے کچھ کھانے پینے کا اصرار کرنے لگیں تو حضرت ابو بکرؓ یہی دریافت کر رہے تھے: اللہ کے رسول ﷺ کا کیا حال ہے؟ انہوں نے جواب دیا: واللہ مجھے آپ کے دوست کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے فرمایا: ام جمیل بنت خطاب کے پاس جائیں، ان سے دریافت کر لیجئے، وہ نکلیں یہاں تک کہ ام جمیل کے پاس پہنچی اور دریافت کیا: ابو بکر آپ سے محمد بن عبد اللہ کے بارے میں دریافت کر رہے ہیں، انہوں نے کہا: میں نہ ہی ابو بکر کو اور نہ ہی محمد بن عبد اللہ کو جانتی ہوں، اور اگر آپ چاہتی ہیں تو میں آپ کے بیٹے کے پاس خود آتی ہوں، انہوں نے کہا: ٹھیک ہے۔ چنانچہ وہ ان کے ساتھ چلیں اور دیکھا کہ ابو بکر بے ہوشی کی حالت میں گرے ہوئے ہیں۔ ام جمیل ان کے قریب گئیں اور زور سے کہنے لگیں: واللہ! جن لوگوں نے آپ کے ساتھ ایسا کیا ہے یقیناً برے اور اہل کفر ہیں، مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے آپ کی طرف سے انتقام لے گا۔ حضرت ابو بکرؓ نے پوچھا: اللہ کے رسول ﷺ کا کیا حال ہے؟ وہ کہنے لگیں: یہ آپ کی والدہ سن رہی ہیں۔ حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا: کوئی بات نہیں۔ ان سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ حضرت ام جمیل نے کہا: آپ ﷺ صحیح سالم اور ٹھیک ہیں۔ فرمایا: وہ کہاں ہے؟ جواب ملا: دار ارقم میں۔ حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا: اللہ کی قسم! میں اس وقت تک نہ کچھ کھاؤں گا نہ پیوں گا یہاں تک کہ خود رسول اللہ ﷺ کے پاس نہ جاؤں۔ ان دونوں خواتین نے کچھ انتظار کیا یہاں تک کہ لوگوں کی چلت پھرت کم ہو گئی اور سب لوگ مطمئن ہو گئے، وہ دونوں انہیں لے کر نکلیں، آپ ان دونوں کے سہارے چل رہے تھے، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچ گئے، داخل ہوتے ہی رسول اللہ ﷺ نے ان کو چمٹا لیا، آپ ﷺ نے ان کو بوسہ دیا، تمام مسلمانوں نے ان کو گلے لگایا، اللہ کے رسول ﷺ کے دل میں آپ کے تئیں انتہائی رقت طاری ہو گئی، یہ دیکھ کر حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا: میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں! اے اللہ کے رسول! مجھے کوئی بات نہیں ہے صرف اس فاسق نے یہ جو میرے چہرے کا یہ حال کر دیا ہے۔ یہ میری والدہ ہیں یہ اپنے بیٹے پر انتہائی مہربان ہیں، آپ کی ذاتِ اقدس مبارک ہے، ان کو اللہ کی طرف دعوت دیجئے اور ان کے حق میں اللہ سے دعا کریں، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے ذریعہ ان کو جہنم سے نجات دے، چنانچہ آپ ﷺ نے ان کے حق میں دعا فرمائی اور ان کو اللہ کی طرف دعوت دی اور انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویۃ، ابن کثیر 439/1، 441، البدایہ والنہایہ، 30/3)

دروس واسباق اور فوائد

۱۔ حضرت ابو بکرؓ کو کفار کے سامنے اسلام کے اعلان اور اظہار کا اصرار تھا، یہ ان کی قوتِ ایمانی اور شجاعت کی دلیل ہے اور آپؓ نے اس سلسلہ میں بہت زیادہ اذیت بھی برداشت کی، یہاں تک کہ ان کی قوم کو آپؓ کی وفات کا یقین ہو گیا تھا۔

۲۔ اس کے ذریعہ اس انتہائی محبت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جس کو حضرت ابو بکرؓ اللہ کے رسول ﷺ کے تئیں اپنے دل میں رکھتے تھے، چنانچہ وہ اس مشکل ترین حالت میں تھے اور اس وقت بھی آپ ﷺ کے بارے میں دریافت کر رہے تھے اور بار بار اصرار کے ساتھ سوال کر رہے تھے اور پھر

قسم کھاتے ہیں کہ اس وقت تک نہ کچھ کھائیں گے نہ پئیں گے یہاں تک کہ آپ ؐ کو دیکھ نہ لیں، یہ سب کیسے ہو سکتا ہے جبکہ وہ چل نہیں سکتے تھے بلکہ کھڑا ہونے کی طاقت نہیں رکھتے تھے؟! لیکن یہ وہ محبت ہے جو اللہ کے لئے ہوتی ہے اور وہ عزم وہمت ہے جس کے سامنے تمام مشکلات آسان اور مغلوب ہو جاتی ہیں، اور اللہ کی راہ میں اور اس کے رسول کی وجہ سے لاحق ہونے والی ہر مصیبت و گزند معمولی اور ہیچ ہو جاتی ہے۔

۳۔اس دور میں قبائلی عصبیت کا واقعات کو رخ دینے میں اور افراد کے ساتھ معاملہ کرنے میں ایک اہم رول تھا، اگرچہ عقائد میں اختلاف ہی کیوں نہ پایا جاتا ہو، چنانچہ حضرت ابو بکرؓ کا قبیلہ عتبہ کو قتل کرنے کی دھمکی دیتا ہے اگر حضرت ابو بکرؓ کا انتقال ہو جاتا۔

۴۔حضرت ام جمیلؓ نے کئی اعتبار سے حفاظتی اقدامات اور احتیاطی تدابیر اختیار کیں، ان میں سے اہم ترین اقدامات مندرجہ ذیل ہیں:

- شخصیت کو بھی راز میں رکھا اور معلومات فراہم کرنے سے بھی انکار کیا؛ چنانچہ جب ام الخیر نے حضرت ام جمیلؓ سے رسول اللہ ﷺ کی جائے قیام کے بارے میں دریافت کیا، تو اس نے حضرت ابو بکرؓ اور حضرت محمد بن عبداللہ کو جاننے سے ہی انکار کر دیا، یہ ایک احتیاطی اور درست طرز عمل تھا، اس لئے کہ اس وقت ام الخیر مسلمان نہیں تھیں، اور ام جمیل اپنے اسلام کو بھی مخفی رکھے ہوئے تھیں اور چاہتی تھیں کہ ام جمیل کو اس کا علم نہ ہو، اسی طرح انہوں نے اللہ کے رسول ﷺ کی جائے قیام کو بھی مخفی رکھا، اس بات سے ڈرتے ہوئے کہ کہیں یہ قریش کے لئے جاسوسی نہ کر رہی ہو۔ (دیکھیں: محنۃ المسلمین فی العہد المکی، ص 79، فی السیرۃ النبویہ قراءۃ لجوانب الحذر والحمایہ، ص 50)

- معلومات فراہم کرنے کے لئے صورتحال سے فائدہ اٹھانا:

حضرت اُم جمیل چاہتی تھیں کہ بذاتِ خود حضرت ابو بکرؓ تک معلومات پہنچائیں، ساتھ ہی ساتھ انہوں نے رازداری اور احتیاط کے پیشِ نظر ام الخیر کو معلومات فراہم نہیں کیں، انہوں نے صورتحال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا: اگر آپ چاہتیں ہیں تو میں آپ کے بیٹے کے پاس خود آتی ہوں، انہوں نے یہ پیشکش اس انداز سے کی جس سے ذہانت اور حسنِ تصرف کا پتہ چلتا ہے، ان کا یہ کہنا: "اگر آپ چاہتی ہیں"۔ وہ تو حضرت ابو بکرؓ کی ماں تھیں اس لئے ضرور چاہتیں، اسی طرح ان کا یہ کہنا: "آپ کے بیٹے کے پاس" اور انہوں نے ابو بکر کے پاس نہیں کہا، یہ تمام الفاظ ام الخیر کے دل میں ماں کے جذبات واحساسات کو تحریک دے رہے تھے، غالب گمان یہی تھا کہ وہ اس پیشکش کو ضرور مان لیتیں اور عملًا ایسا ہی ہوا اور انہوں نے فوراً حامی بھر لی جس کے نتیجہ میں اُم جمیل بذاتِ خود معلومات پہنچانے میں کامیاب ہو گئیں۔

- حضرت ابو بکرؓ کی والدہ کی محبت وشفقت حاصل کرنے کی کوشش:

ایسا لگتا ہے کہ ام جمیل نے ام الخیر کی شفقت کو حاصل کرنے کی کوشش کی، انہوں نے حضرت ابو بکرؓ کی صورتحال سے فائدہ اٹھایا اور چلاّ کر کہا: واللہ! ''جن لوگوں نے آپ کے ساتھ ایسا کیا ہے یقیناً وہ برے اور اہل کفر ہیں''۔ام جمیل کے اس رد عمل نے ام الخیر کو قدرے اطمینان فراہم کیا ہوگا، وہ پہلے سے ہی ام جمیل کے تئیں محبت کے جذبات رکھتی تھیں، لیکن اس رد عمل کے ذریعہ اُم جمیل نے ام الخیر کی مزید

محبت و شفقت اور ان کے اعتماد کو حاصل کر لیا، اس کے ذریعہ حضرت ابو بکرؓ تک معلومات پہنچانے کی ذمہ داری اور زیادہ آسان ہو گئی۔ (دیکھیں: فی السیرۃ النبویہ قراءۃ فی جوانب الحذر والحمایۃ، ص50)

- **معلومات فراہم کرنے سے پہلے احتیاط اور صبر و تحمل:**

حضرت ام جمیل اس سلسلہ میں انتہائی احتیاط برت رہی تھیں کہ قائد کی جائے قیام کے بارے میں اس اہم معلومات کا راز فاش نہ ہو جائے، وہ ابھی ام الخیر کے بارے میں مطمئن نہیں تھیں، اس لئے کہ وہ اس وقت ابھی مشرکہ تھیں، اس لئے جب حضرت ابو بکرؓ نے رسول اللہ ﷺ کے حال کے بارے میں دریافت کیا تو ان کو بتانے میں کچھ تردد ہوا، اور انہوں نے کہا: یہ آپ کی والدہ سن رہی ہیں! اور جب حضرت ابو بکرؓ نے کہا کہ ان سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس وقت انہوں نے بتادیا کہ آپ ﷺ خیر وعافیت کے ساتھ ہیں، لیکن مزید احتیاط کے پہلو کو مد نظر رکھتے ہوئے پھر بھی آپ ﷺ کی جائے قیام کے بارے میں آگاہ نہیں کیا، اور مزید استفسار کے بعد ہی جگہ کا نام ظاہر کیا۔

- **ملاقات کے لئے مناسب وقت کا انتخاب:**

حضرت ابو بکرؓ نے جب دار ارقم جانے کی پیشکش کی تو حضرت ام جمیل نے فوری طور پر اس کو قبول نہیں کیا، بلکہ اس پر عمل درآمد کرنے کے لئے انتظار کیا، یہاں تک کہ لوگوں کی چلت پھرت رک گئی اور لوگ پر سکون ہو گئے، اس وقت وہ ان کی والدہ کی معیت میں ان کو لے کر نکلیں، یہ اس کام کے لئے مناسب ترین وقت تھا، جب کہ اعدائے دعوت کی طرف سے بالکل اطمینان تھا، اور عملاً ایسا ہی ہوا کہ بغیر کسی رکاوٹ کے وہ دار ارقم میں داخل ہو گئے۔

۵- آزمائش کے بعد انعام کا ضابطہ: حضرت ابو بکرؓ کی والدہ ام الخیر نے اس وقت اسلام قبول کیا جب کہ ابو بکرؓ نے ان کو دائرہ اسلام میں داخل کرنے کی رغبت ظاہر کی، اور اللہ کے رسول ﷺ سے ان کے حق میں دعا کی درخواست کی، اس لئے کہ وہ صدیق اکبر کی انتہائی خیر خواہ تھیں، اور حضرت صدیق اکبرؓ دوسرے لوگوں کی ہدایت کے حریص تھے تو قریب ترین ماں کے بارے میں حریص کیوں نہ ہوتے؟!۔ (دیکھیں: محنۃ المسلمین فی العہد المکی، 679)

۶- اللہ کے رسول ﷺ کے بعد صحابہ کرام میں ابتلاء و آزمائش اور مصائب کا سب سے زیادہ سامنا جس کو کرنا پڑا وہ حضرت ابو بکر صدیقؓ ہیں، کیونکہ آپؓ کو نبی کریم ﷺ کی سب سے زیادہ صحبت نصیب ہوئی اور مصائب و آلام کے مواقع میں آپ کے ساتھ رہے، آپ کی طرف سے دفاع کرتے اور آپؐ پر اپنی جان نچھاور کرتے، جس کے نتیجے میں حضرت صدیق اکبرؓ کو بھی قوم کی طرف سے ایذاء کا سامنا کرنا پڑتا تھا، حالانکہ آپؓ قریش میں عقل و فراست اور حسن سلوک کے اعتبار سے معروف و مشہور تھے۔ (محنۃ المسلمین فی العہد المکی، ص75)

2-حضرت بلال حبشیؓ :

اللہ کے رسول ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے ساتھ مشرکین کی ایذاء رسانی میں اضافہ ہوتا رہا، یہاں تک کہ ظلم و زیادتی اپنی انتہا کو پہنچ گئی، خاص طور پر مسلمانوں میں سے کمزور طبقے کے ساتھ زیادتیوں کا سلسلہ مزید بڑھ گیا، ان کو زیادتی کا نشانہ اس لئے بنایا جاتا رہا تاکہ وہ اپنے عقیدہ سے اور اسلام سے دستبردار ہو جائیں اور ان کو دوسروں کے لئے عبرت بنایا جاسکے اور ظلم و زیادتی کرنے والے اپنی بھڑاس نکال سکیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ: ''سب سے پہلے جن لوگوں نے اسلام کا اظہار کیا سات لوگ ہیں: اللہ کے رسول ﷺ، حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمارؓ، ان کی والدہ حضرت سمیہؓ، حضرت صہیبؓ، حضرت بلالؓ اور حضرت مقدادؓ۔ جہاں تک تعلق ہے رسول اللہ ﷺ کا تو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے چچا ابو طالب کے ذریعہ آپؐ کی حفاظت فرمائی اور حضرت ابو بکرؓ کی ان کی قوم و قبیلہ کے ذریعہ حفاظت فرمائی اور رہے دوسرے حضرات تو مشرکین نے ان کو پکڑا، گرفتار کیا، لوہے کی زرہیں پہنا کر ان کو تپتی دھوپ میں کھڑا رکھتے، ان میں سے ہر ایک نے مجبور ہو کر ان کے مطالبات مان لئے، سوائے حضرت بلالؓ کے، انہوں نے اللہ کے لئے ہر اذیت کو برداشت کیا، قوم کے نزدیک ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی، چنانچہ مشرکین نے ان کو کچھ لونڈوں کے حوالے کر دیا وہ ان کو لے کر مکہ کی گلیوں اور گھاٹیوں میں گھومنے لگے اور وہ کہہ رہے تھے۔ "أحد أحد"۔ (مسند أحمد 404/1، ابن ماجہ: 150، دلائل النبوۃ للبیہقی 281-281/2)

حضرت بلالؓ کے پاس کوئی ایسا شخص نہیں تھا جو ان کی پشت پناہی کرتا، نہ کوئی ایسا خاندان تھا جو ان کی حمایت کرتا، اور نہ ایسی تلواریں تھیں جو ان کا دفاع کرتیں، مکہ کے جاہلی معاشرہ میں اس طرح کا انسان بس ایک گنتی کا انسان تھا، زندگی میں اس کا کام صرف خدمت کرنا اور دوسروں کی اطاعت کرنا تھا، جانوروں کی طرح اس کی خرید و فروخت ہوتی، اس کی اپنی کوئی رائے ہو، یا وہ کوئی صاحبِ فکر، صاحبِ دعوت یا صاحبِ معاملہ ہو تو مکہ کے جاہلی معاشرہ میں یہ ایک خطرناک جرم تھا، جس کے ذریعہ اس معاشرہ کے محل میں زلزلہ آجاتا اور اس کی بنیادیں متزلزل ہو جاتیں، لیکن اس نئی دعوت کی طرف جس طرح نوجوان نسل دوڑ کر آئی اور انہوں نے اپنے بڑے آبا و اجداد کے رسم و رواج اور تقالید کو چیلنج دیا، اس دعوت نے اس بے یار و مددگار اور بھولے بسرے غلام کے دل پر بھی دستک دی اور اس کو دنیا میں ایک نئے انسان کی حیثیت سے وجود بخشا، اس نے جب اس دین پر ایمان لایا تو اس کے اندرون سے ایمان کے معانی پھوٹ پڑے اور وہ محمد ﷺ اور ان کے اصحاب کے عظیم ایمانی قافلے میں شامل ہو گئے اور وہی اب اپنے دین اور عقیدہ کی وجہ سے تعذیب کا نشانہ بن رہے ہیں، رسول اللہ ﷺ کے وزیر و معاون حضرت صدیق اکبرؓ تعذیب خانے کا رخ کرتے ہیں اور امیہ بن خلف سے مذاکرات کرتے ہیں، اس سے فرماتے ہیں: کیا تم اس مسکین کے بارے میں اللہ سے ڈرتے نہیں ہو؟ کب تک یہ کرتے رہو گے؟ اس نے جواب دیا: تم ہی ہو جس نے اس کو خراب کیا ہے، لہٰذا تم ہی اس کو اس حالت سے نکالو! حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا: ہاں میں ایسا کروں گا، میرے پاس ایک کالا غلام ہے جو اس سے زیادہ مضبوط ہے اور تمہارے دین پر مضبوطی سے کاربند ہے، میں اسی کو تمہیں ان کے بدلے دوں گا۔ اس نے کہا: ٹھیک ہے، مجھے قبول ہے! حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا: وہ غلام تمہارا ہو گیا۔ حضرت ابو بکرؓ نے اپنا وہ غلام دے دیا اور حضرت بلالؓ کو اس سے لے کر آزاد کر دیا۔ ایک روایت میں ہے کہ ان کو چالیس اوقیہ سونے کے بدلے خریدا۔ (دیکھیں: التربیۃ القیادیہ 136/1، السیرۃ النبویۃ، ابنِ ہشام 394/1)

حضرت بلالؓ کیا ہی صبر کرنے والے اور جواں مرد تھے! انہوں نے صدقِ دل سے اسلام قبول کیا تھا، اور پاکیزہ دل کے حامل تھے، اسی لئے انہوں نے پہاڑوں جیسی مضبوطی اختیار کی اور ان تمام چیلنجز اور قسم قسم کے عذاب کے سامنے وہ سپر انداز نہیں ہوئے، اور ان کا یہ صبر و ثبات ان کے غصہ، عداوت اور کینے میں مزید اضافہ کرتا تھا، خاص طور پر کمزور مسلمانوں میں سے یہ تنہا تھے جو اسلام پر ثابت قدم رہے اور کفار کے مطالبات کو تسلیم نہیں کیا، اور بآوازِ بلند چیلنج دیتے ہوئے کلمہ توحید کا اعلان کرتے رہے، اللہ کے لئے انہوں نے اپنی ذات کی کوئی پرواہ نہیں کی اور قوم نے بھی ان کو معمولی سمجھ کر پورا غصّہ ان پر اتارا۔(دیکھیں: التربیۃ القیادیۃ 140/1)

ہر آزمائش کے بعد انعام ہوتا ہے، حضرت بلالؓ نے تعذیب وابتلاءات سے آزادی حاصل کر لی اور غلامی کی زنجیروں سے چھٹکارا حاصل کر لیا اور باقی ماندہ زندگی رسول ﷺ کی معیت میں بسر کی، آپؐ نے حضرت بلال سے فرمایا: "میں نے آج رات اپنے آگے آگے جنت میں میں آپ کے جوتوں کی آہٹ سنی"۔ (صحیح بخاری:1149، مسلم: 2458) اور صحابہ کرام کے نزدیک بھی حضرت بلالؓ کا عظیم مقام تھا، حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے: ابو بکر ہمارے سردار ہیں اور ہمارے سید (سردار) کو انہوں نے آزاد کیا ہے، اس سے ان کی مراد حضرت بلالؓ تھے۔(دیکھیں: محنۃ المسلمین فی العہد المکی، ص92)

حضرت صدیقِ اکبرؓ کا کمزور غلاموں کو آزاد کرانے کا یہ طریقہ کار اس منصوبہ عمل کا حصہ بن گیا جو اسلامی قیادت نے تعذیب کا نشانہ بننے والوں کے دفاع اور بچاؤ میں اختیار کیا، حضرت ابو بکرؓ اس دین میں داخل ہونے والے غلاموں کو اپنا مال دے کر آزاد کراتے۔

حضرت ابو بکرؓ نے مدینہ کی جانب ہجرت کرنے سے پہلے حضرت بلالؓ کے ساتھ ساتھ مزید چھ غلاموں کو آزاد کیا، حضرت بلالؓ ساتویں غلام تھے، ان میں سے ایک حضرت عامر بن فہیرہ تھے، وہ بدر اور اُحد میں شریک رہے، بئرِ معونہ کے دن شہید ہو گئے، اسی دن حضرت اُم عبیسؓ اور حضرت زنیرہؓ کو بھی آزاد کیا، حضرت زنیرہؓ کی بصارت چلی گئی تھی تو قریش کے لوگ کہنے لگے: اس کی نگاہ لات وعزی نے چھین لی ہے۔ حضرت زنیرہؓ نے فرمایا: بیت اللہ کی قسم! جھوٹ بولتے ہو، لات اور عزی نہ نفع پہنچانے کی اور نہ نقصان پہنچانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔(دیکھیں: الطبقات الکبری، ابن سعد: 232/3)

اسی طرح حضرت نہدیہ اور ان کی بیٹی کو بھی آزاد کیا، یہ دونوں بنو عبد الدار کی ایک عورت کی ملکیت میں تھیں، حضرت ابو بکرؓ کا گذر ان دونوں کے پاس سے ہوا، ان کی مالکن نے ان دونوں کو آٹا لے کر بھیجا تھا اور وہ کہہ رہی تھی: واللہ! میں تمہیں کبھی آزاد نہیں کروں گی۔ یہ سن کر حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا: اے ام فلاں! اپنی قسم توڑو۔ اس نے کہا: ٹھیک ہے، توڑ دیتی ہوں، آپ ہی نے ان کو خراب کیا ہے، لہذا آپ ہی ان کو آزاد کریں۔ حضرت ابو بکرؓ نے دریافت کیا: ان دونوں کی کتنی قیمت ہے؟ اس نے کہا: اتنے اتنے۔ حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا: میں نے ان کو خرید لیا اور وہ دونوں آزاد ہیں، اس کا آٹا اسے واپس کر دو۔ ان دونوں نے کہا: اے ابو بکر! کیا ہم اس کو مکمل کر لیں اور پھر اس کو واپس کر دیں؟ آپ نے فرمایا: ٹھیک ہے اگر آپ چاہتی ہو۔(دیکھیں: السیرۃ النبویہ، ابن ہشام: 393/1)

یہاں یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ اسلام نے کس طرح حضرت صدیقِ اکبر اور دو باندیوں کو برابر کا مقام عطا کیا، یہاں تک کہ وہ دونوں حضرت ابو بکرؓ سے اس طرح مخاطب ہوتی ہیں جیسے کہ ہم مرتبہ ایک دوسرے سے مخاطب ہوتے ہیں، نہ کہ اس طرح جیسے کہ غلام اپنے آقا

سے مخاطب ہوتا ہے اور حضرت صدیق اکبرؓ نے زمانۂ جاہلیت اور زمانۂ اسلام میں اپنے بلند مقام کے باوجود ان دونوں کی پیشکش کو قبول کر لیا، حالانکہ انہوں نے ان دونوں کو آزاد کر کے ان پر احسان بھی کیا تھا، اسی طرح یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اسلام نے کس طرح دونوں لڑکیوں کی تربیت کی تھی یہاں تک کہ وہ اس طرح کی عظیم صفات اور اخلاق سے آراستہ ہو گئی تھیں، وہ دونوں تو اب آزاد تھیں اور ظلم کی چکی سے نکل چکی تھیں، ان کے لئے یہ بھی ممکن تھا کہ وہ آٹے کو وہیں چھوڑ دیتیں، وہ ضائع ہو جاتا یا اس کو کوئی حیوان یا پرندا کھالیتا، لیکن ان کی اخلاقی حس نے اس بات کی اجازت نہیں دی، بلکہ اس کو ٹھیک کر کے اس کے حوالے کر دیا۔(السیرۃ النبویہ، اُبو شہبہ، 346/1)

اسی طرح حضرت صدیقِ اکبرؓ ایک مرتبہ بنو مؤمل کی ایک باندی کے پاس سے گزرے جو اسلام قبول کر چکی تھی اور عمر بن خطاب اس کو سزا دے رہے تھے تاکہ وہ اسلام سے دستبردار ہو جائے، حضرت عمر اس وقت اسلام نہیں لائے تھے، وہ اس کو مارتے رہے یہاں تک کہ جب مارتے مارتے تھک گئے تو کہنے لگے: میں معذرت خواہ ہوں، مگر میں نے تمہیں اس لئے چھوڑا ہے کیونکہ میں تھک گیا ہوں۔ وہ کہتی: اللہ آپ کے ساتھ بھی ایسا ہی کرے۔ یہ دیکھ کر حضرت ابو بکرؓ نے ان کو خرید لیا اور آزاد کر دیا۔(دیکھیں: السیرۃ النبویۃ، ابن ہشام 393/1)

یہی طرزِ عمل تھا اس عظیم شخصیت کا جو آزادی عطا کرنے والے، غلاموں کو آزاد کرنے والے، اسلام کے پُر وقار اور صاحبِ عزت بزرگ تھے، جو اپنی قوم میں اس بات میں معروف تھے کہ وہ ناداروں کو کما کر دیتے ہیں، صلہ رحمی کرتے ہیں، دوسروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں اور مظلوموں کی مدد کرتے ہیں، زمانۂ جاہلیت میں وہ کسی گناہ میں مبتلا نہیں ہوئے، محبت کرنے والے اور سب کو محبوب تھے، کمزوروں کے حالات دیکھ کر ان کا دل نرم پڑتا، آپؓ نے اپنے مال کا ایک معتدبہ حصہ غلاموں کو خریدنے میں صرف کیا، اور ان کو للہ فی اللہ آزاد کر دیا، اس سے پہلے کہ غلاموں کو آزاد کرنے کے سلسلہ میں احکام الٰہی نازل ہوتے۔(دیکھیں: السیرۃ النبویہ، اُبو شہبہ: 345/1)

مکی معاشرہ میں حضرت ابو بکرؓ جیسے لوگ شاذ و نادر ہی پائے جاتے تھے، جو اپنا سب مال ان کمزوروں کے لئے خرچ کرتے تھے، حضرت ابو بکرؓ کی نگاہ میں یہ دینی بھائی کی حیثیت رکھتے تھے، اور روئے زمین کے تمام اہلِ شرک اور سرکش مل کر بھی ان کے نزدیک ان میں سے کسی ایک کے ہم پلہ نہیں ہو سکتے تھے، انہی افراد کے ذریعہ نظامِ توحید کا قیام عمل میں لایا جانا تھا اور اسلام کی بہترین اور عظیم تہذیب کی بنیاد رکھی جانی تھی۔(دیکھیں: التربیۃ القیادیۃ 342/1)

حضرت ابو بکر صدیقؓ اپنے اس عمل کے ذریعہ نہ کسی تعریف کے طالب تھے نہ کسی جاہ و عزت کے، اور نہ ہی کسی دنیاوی مال و متاع کے، اس کے ذریعہ تو وہ صرف اللہ کی رضا کے طالب تھے، ان کے والد نے ان سے ایک روز کہا: بیٹے میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کمزور لوگوں کو آزاد کر رہے ہیں، اگر آپ کو ایسا کرنا ہی ہے تو مضبوط و طاقتور لوگوں کو آزاد کرو جو آپ کی حفاظت کر سکیں، اور آپ کے دفاع میں کھڑے ہو سکیں! حضرت ابو بکرؓ نے جواب دیا: ابا جان! اس کے ذریعہ تو میں بس اللہ عزوجل کی رضا چاہتا ہوں، لہٰذا اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت صدیقِ اکبر کی شان میں قرآن نازل کیا ہے جس کو قیامت تک پڑھا جاتا رہے گا، اِرشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَأَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ وَٱتَّقَىٰ ۝٥ وَصَدَّقَ بِٱلْحُسْنَىٰ ۝٦ فَسَنُيَسِّرُهُۥ لِلْيُسْرَىٰ ۝٧ وَأَمَّا مَنۢ بَخِلَ وَٱسْتَغْنَىٰ ۝٨ وَكَذَّبَ

بِٱلْحُسْنَىٰ ﴿٩﴾ فَسَنُيَسِّرُهُۥ لِلْعُسْرَىٰ ﴿١٠﴾ وَمَا يُغْنِي عَنْهُ مَالُهُۥٓ إِذَا تَرَدَّىٰٓ ﴿١١﴾ إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ ﴿١٢﴾ وَإِنَّ لَنَا لَلْـَٔاخِرَةَ وَٱلْأُولَىٰ ﴿١٣﴾ فَأَنذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظَّىٰ ﴿١٤﴾ لَا يَصْلَىٰهَآ إِلَّا ٱلْأَشْقَى ﴿١٥﴾ ٱلَّذِى كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ ﴿١٦﴾ وَسَيُجَنَّبُهَا ٱلْأَتْقَى ﴿١٧﴾ ٱلَّذِى يُؤْتِى مَالَهُۥ يَتَزَكَّىٰ ﴿١٨﴾ وَمَا لِأَحَدٍ عِندَهُۥ مِن نِّعْمَةٍ تُجْزَىٰٓ ﴿١٩﴾ إِلَّا ٱبْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ ٱلْأَعْلَىٰ ﴿٢٠﴾ وَلَسَوْفَ يَرْضَىٰ ﴿٢١﴾﴾ ترجمہ: ”پھر جس نے دیا اور پرہیز گاری کی۔ اور نیک بات کی تصدیق کی۔ تو ہم اس کے لئے جنت کی راہیں آسان کر دیں گے۔ اور لیکن جس نے بخل کیا اور بے پروا رہا۔ اور نیک بات کو جھٹلایا۔ تو ہم اس کے لئے جہنم کی راہیں آسان کر دیں گے۔ اور اس کا مال اس کے کچھ بھی کام نہ آئے گا جب کہ وہ گھڑے میں گرے گا۔ بے شک ہمارے ذمے راہ دکھانا ہے۔ اور بے شک ہمارے ہی ہاتھ میں آخرت بھی اور دنیا بھی ہے۔ پس میں نے تمہیں بھڑکتی ہوئی آگ سے ڈرایا ہے۔ جس میں صرف وہی بدبخت داخل ہوگا۔ جس نے جھٹلایا اور منہ موڑا۔ اور اس آگ سے وہ بڑا پرہیزگار دور رہے گا۔ جو اپنا مال دیتا ہے تاکہ وہ پاک ہو جائے۔ اور اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں کہ جس کا بدلہ دیا جائے۔ وہ تو صرف اپنے سب سے برتر رب کی رضامندی کے لئے دیتا ہے۔ اور وہ عنقریب خوش ہو جائے گا“۔ (سورۃ اللیل: 5-21)

اولین اسلامی جماعت کے افراد کے مابین اس طرح کا تکافل خیر و عطا کا عروج تھا، اور اسلام کے زیر سایہ یہ غلام اصحابِ فکر و عقیدہ بن گئے جن کے ساتھ اس سلسلہ میں بحث کی جاتی، وہ اس فکر و عقیدہ کی طرف سے دفاع کرتے اور اس کی راہ میں جہاد کرتے اور حضرت ابو بکر صدیقؓ کا ان کو خریدنا اور پھر ان کو آزاد کرنا اس دین کی عظمت کی دلیل ہے، اور صدیقِ اکبرؓ کے دل میں اس دین کی اہمیت و تاثیر واضح دلیل ہے۔ آج امتِ مسلمہ کو اس عظیم مثال اور بلند احساسات کو از سرِ نو زندہ کرنا چاہیے تاکہ افرادِ امت کے مابین تعاون اور ایک دوسرے کی نصرت و مدد کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکے جبکہ اعدائے دین کے ذریعہ امتِ مسلمہ کی نسل کشی کا سلسلہ جاری ہے!۔

3- حضرت عمار بن یاسر، ان کے والد اور ان کی والدہ:

حضرت عمار بن یاسر کے والد یمنی قبائل میں سے بنو عنس سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اور ان کے دو بھائی حارث اور مالک اپنے ایک بھائی کی تلاش میں آئے اور مالک یمن واپس چلے گئے، جبکہ یاسر نے مکہ میں ہی اقامت اختیار کر لی، اور ابو حذیفہ بن مغیرہ مخزومی کے حلیف بنے، ابو حذیفہ نے اپنی ایک باندی سے ان کا نکاح کیا جس کا نام سمیہ بنت خیاط تھا، جن سے حضرت عمار پیدا ہوئے، ابو حذیفہ نے ان کو آزاد کر دیا اور جلد ہی ان کی وفات ہو گئی، اسلام کا سورج طلوع ہوا اور حضرت یاسر، حضرت سمیہ، حضرت عمار اور ان کے بھائی حضرت عبداللہ بن یاسر سب نے اسلام قبول کر لیا، ان کے موالی بنو مخزوم ان پر بہت غضب ناک ہوئے اور طرح طرح کی سزائیں ان کو دینے لگے، تپتی دوپہر کو انہیں باہر نکالتے اور مکہ کی سخت گرمی میں انہیں تکلیفیں دیتے، ان کو پیٹ کے بل ریت پر لٹا کر رکھتے، اللہ کے رسول ﷺ ان کے پاس سے گزرتے جب کہ وہ انھیں تکلیف دے رہے ہوتے تو آپ ﷺ فرماتے: ”آل یاسر! صبر کرتے رہے تمہارے لئے جنت کا وعدہ ہے“۔ (مستدرک حاکم: 383/3)

ابو جہل حضرت سمیہؓ کے پاس آتاہے اوران سے کہتاہے: تم نے محمدؐ پر صرف اس لئے ایمان لایاہے کیونکہ تم ان کے حسن وجمال کی وجہ سے ان پر فریفتہ ہو! ۔ حضرت سمیہ نے نہایت سختی سے اسے جواب دیاجس کے نتیجہ میں ابو جہل نے ان کے ناف کے نیچے نیزہ مارااوران کو شہید کردیا، وہ اسلام میں پہلی شہید ہونے والی خاتون ہیں۔ رضی اللہ عنہا۔(تفصیل کیلئے دیکھیں: أنساب الأشراف، بلاذری 100/1، 157، السیرۃ النبویۃ، ابن ھشام 68/2 بھجۃ المحافل، العامری 92/1 صحیح السیرۃ النبویۃ، ابراھیم العلی، ص 97-98، محنۃ المسلمین فی العھد المکی، ص99)

اس بہادرانہ موقف کے ذریعہ حضرت سمیہؓ نے اعلیٰ ترین مثال قائم کردی جوایک خاتون اللہ کی راہ میں پیش کرسکتی ہے تاکہ تا قیامِ قیامت ہر مسلم خاتون ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی رہنمائی حاصل کرتی رہے اور وہ اللہ کی راہ میں کسی طرح کی قربانی دینے سے دریغ نہ کرے جبکہ حضرت سمیہ بنت خیاطؓ نے اللہ کے راستے میں اپنی جان قربان کردی۔

حضرت عثمانؓ کی ایک حدیث میں مروی ہے فرماتے ہیں کہ میں اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ آپ کا ہاتھ پکڑے ہوئے آیا ہم بطحاء میں چل رہے تھے، یہاں تک کہ آل عمار بن یاسرؓ کے پاس پہنچے، حضرت ابو عمارؓ نے فرمایا: اے اللہ کے رسول! یہی حال ہمیشہ رہے گا؟! نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "صبر کرتے رہو"۔ پھر آپؐ نے فرمایا: "اے اللہ! آل یاسر کی مغفرت فرمااور یقیناً تونے توانہیں معاف کرہی دیا ہے"۔(مسند أحمد 62/1 صحیح السیرۃ النبویہ ص98) اس کے بعد حضرت یاسر تکلیف سہتے سہتے شہید ہوگئے۔

اس وقت نبی کریم ﷺ فداکاری اور قربانی کے ان جانبازوں آل یاسر کے لئے کسی طرح کی نصرت وحمایت نہیں کرسکتے تھے، وہ غلام نہیں تھے کہ آپؐ انہیں خرید کر آزاد کرلیتے، اس وقت آپؐ کے پاس اتنی قوت نہیں تھی کہ ان کوایذاء وتکلیف سے آزاد کرا سکتے۔ آپؐ یہی کرسکتے تھے کہ ان کو مغفرت اور جنت کی خوشخبری دیتے اوران کو صبر وثبات کی ترغیب دیتے تاکہ بعد میں آنے والی نسلوں کے لئے یہ مبارک گھرانہ نمونہ اور مثال بن جاتااور تاریخِ انسانی میں پیش آنے والے اس طرح کے حالات میں ایسی خوشخبری کو یاد کیا جاتاکہ: "آل یاسر صبر کرتے رہو، تمہارے لئے جنت کا وعدہ ہے"۔(دیکھیں: التربیۃ القیادیۃ 217/1، 218)

جہاں تک حضرت عمارؓ کا تعلق ہے تو وہ ایک عرصۂ دراز تک قسم قسم کے عذاب سہتے رہے، ان کا شماران کمزوروں میں ہوتاہے جن کا مکہ میں نہ کوئی خاندان تھاجوان کی حمایت کرتااور نہ ہی ان کے پاس کوئی طاقت وقوت تھی، قریش کے لوگ انہیں عین دوپہر کے وقت مکہ کی تپتی دھوپ میں اذیتیں دیتے تھے تاکہ وہ دین حق سے دستبردار ہوجائیں اور حضرت عمارؓ کواتنی تکلیف دی جاتی یہاں تک کہ بے ہوشی کی وجہ سے وہ ہوش وحواس کھو بیٹھتے، مشرکین نے ان کو مارنے کے لئے پکڑا، ان کواس وقت تک نہیں چھوڑا یہاں تک کہ وہ نبی کریم ﷺ کو برا بھلا کہنے پر مجبور ہوگئے اوران کے معبودوں کا ذکر اچھے انداز میں کرناپڑا، جب وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پہنچے تو آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: کیا خبر ہے؟ فرمایا: بری خبر ہے، واللہ! مشرکین نے مجھے اس وقت تک نہیں چھوڑا یہاں تک کہ مجھے آپ کو برا بھلا کہناپڑا! اوران کے معبودوں کا ذکر اچھے انداز میں کرناپڑا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: دل میں کیا محسوس کررہے ہو؟ انہوں نے فرمایا: ایمان پر مطمئن ہوں، آپؐ

نے فرمایا: اگر وہ پھر سے ایسا کریں تو پھر ایسا ہی کر لینا۔(مستدرک حاکم، 357/2 نصب الرایہ، زیلعی 158/4 فقہ السیرۃ للغزالی ص 103)

حضرت عمارؓ کے ایمان کی سچائی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے شہادت دی اور قرآن نازل فرمایا، ارشاد باری تعالی ہے: [مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَىِٕنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ] ترجمہ: "جو شخص ایمان لانے کے بعد کفر کرے (وہ اگر) مجبور کیا گیا ہو اور دل اس کا ایمان پر مطمئن ہو (تب تو خیر) مگر جس نے دل کی رضامندی سے کفر کو قبول کر لیا اس پر اللہ کا غضب ہے اور ایسے سب لوگوں کے لئے بڑا عذاب ہے"۔(سورۃ النحل:106)

حضرت عمارؓ اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ تمام اہم مشاہد میں ساتھ رہے۔

حضرت بلالؓ اور حضرت عمارؓ دونوں کے واقعات میں اہم دروس واسباق پنہاں ہیں، جہاں عزیمت ورخصت کے دونوں پہلو دیکھنے کو ملتے ہیں، ضرورت ہے کہ داعیانِ حق ان دونوں پہلوؤں کو اچھی طرح سمجھیں اور بغیر کسی افراط و تفریط کے ان کو صحیح محل اور باریک بینی پر مبنی معیار پر رکھیں۔

4- حضرت سعد بن ابی وقاصؓ:

حضرت سعدؓ کو اپنی کافرہ ماں کی طرف سے آزمائش کا سامنا کرنا پڑا، آپؓ کی ماں نے اس وقت تک کھانے پینے سے انکار کر دیا جب تک کہ وہ اس کے دین کو نہ اختیار کر لیں، طبرانی کی روایت ہے کہ حضرت سعدؓ نے فرمایا: میرے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وَإِن جَٰهَدَاكَ لِتُشۡرِكَ بِي مَا لَيۡسَ لَكَ بِهِۦ عِلۡمٞ فَلَا تُطِعۡهُمَآۚ﴾ ترجمہ: "اور اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تو کسی کو میرا شریک ٹھہرا جس کے بارے میں تجھے کوئی علم نہیں تو ان کی اطاعت نہ کر"۔ (سورۃ العنکبوت: 8)

فرماتے ہیں: میں اپنی والدہ کا فرمانبردار تھا، جب میں نے اسلام قبول کیا تو میری ماں نے کہا: اے سعد! یہ کون سا دین ہے؟ میں دیکھ رہی ہوں کہ تم نے یہ کوئی نیا دین ایجاد کیا ہے، تمہیں اپنے اس دین کو ضرور چھوڑنا ہوگا، ورنہ میں نہ کچھ کھاؤں گی نہ پیوں گی، یہاں تک کہ میں مر نہ جاؤں، اس کی وجہ سے تمہیں میرے بارے میں عار دلایا جائے گا اور کہا جائے گا: اے اپنی ماں کے قاتل! میں نے کہا: اے ماں! ایسا مت کرو، اس لئے کہ میں اپنے دین کو کسی وجہ سے نہیں چھوڑ سکتا ہوں، وہ ایک دن رات بغیر کھائے پیئے رہی، صبح تک نڈھال ہو گئی تھی، پھر ایک اور دن رات کچھ نہیں کھایا، صبح تک اور زیادہ نڈھال ہو گئی تھی، اس کے بعد مزید ایک دن رات بغیر کھائے پیئے رہی، یہاں تک کہ صبح تک اس کی تکلیف شدت کو پہنچ چکی تھی، جب میں نے یہ صورتِ حال دیکھی تو میں نے کہا: امی جان! آپ کو معلوم ہے کہ واللہ! اگر آپ کی سو جانیں بھی ہوتیں اور ایک ایک جان نکلتی جاتی، تب بھی میں اس دین کو کسی وجہ سے ترک نہیں کروں گا، اگر آپ چاہو تو کھا پی لو اور اگر چاہو تو مت کھاؤ! یہ سن کر انہوں نے کھانا کھا لیا۔ (تفسیر ابن کثیر: 446/3)

امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے کہ حضرت سعدؓ کی والدہ نے قسم کھالی کہ وہ ان (حضرت سعدؓ) سے کبھی بات نہیں کرے گی، یہاں تک کہ اپنے دین سے دستبردار نہ ہو جائیں اور نہ ہی وہ کچھ کھائے پیئے گی۔ اس نے کہا: تم تو یہ کہتے ہو کہ اللہ نے والدین کے بارے میں خاص ہدایت کی ہے اور میں تمہاری ماں ہوں، میں تمہیں اس کا حکم دیتی ہوں۔ فرماتے ہیں: وہ تین دن تک بغیر کھائے پیئے رہی یہاں تک کہ مشقت و تکلیف کی وجہ سے بے ہوش ہو گئی، ان کے ایک بیٹے جس کا نام عمارہ تھا، انہوں نے اس کو پانی پلایا تو وہ حضرت سعدؓ کے لئے بددعا دینے لگی، اس پر اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں یہ آیت کریمہ نازل فرمائی: ﴿وَإِن جَٰهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِۦ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَآ﴾ ترجمہ: "اور اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تو کسی کو میرا شریک ٹھہرا جس کے بارے میں تجھے کوئی علم نہیں تو ان کی اطاعت نہ کر"۔ (سورۃ العنکبوت: 8) اسی آیت میں یہ بھی ہے کہ: "اور ان دونوں کے ساتھ دنیا میں اچھے طریقے سے رہو"۔ فرماتے ہیں: جب وہ اسے کھانا کھلانا چاہتے تھے کہ ڈنڈے کے ذریعہ اس کا منہ کھولتے پھر اس میں کھانا ڈالتے۔ (صحیح مسلم: 1748، سنن ترمذی: 3189)

حضرت سعدؓ کی آزمائش بہت بڑی آزمائش تھی، اور ان کے موقف اور ردِ عمل میں ایک نادر موقف ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل میں کس طرح ایمان جاگزیں ہوا تھا اور وہ اس سلسلہ میں کسی طرح کا لالچ یا دباؤ قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھے، چاہے نتیجہ کچھ بھی ہو۔ (دیکھیں: محنۃ المسلمین فی العہد المکی، ص106)

مکی آیات کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان اور اس کے کفار رشتہ داروں کے درمیان اگرچہ ولایت و دوستی منقطع ہو جاتی ہے، لیکن قرآن کریم میں حکم دیا ہے کہ ان کے ساتھ صلہ رحمی اور حسنِ سلوک کو منقطع نہ کیا جائے، البتہ ان کے مابین ولایت کا کوئی تعلق نہیں ہوگا، اس لئے کہ ولایت صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے دین اور ایمان والوں کے ساتھ خاص ہے۔ (دیکھیں: الولاء والبراء، محمد القحطانی، ص174-175)

5- حضرت معصب بن عمیرؓ:

حضرت معصب بن عمیرؓ مکہ کے سب سے زیادہ ناز و نعم میں پلنے والے اور سب سے زیادہ قیمتی پوشاک پہننے والے نوجوان تھے، ان کے والدین ان سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے، ان کی والدہ آسودہ حال اور مالدار خاتون تھیں، وہ حضرت معصبؓ کو حسین ترین اور بہترین کپڑے زیب تن کرتی تھیں، اہلِ مکہ میں سب سے بہتر اور عمدہ عطر کا استعمال فرماتے تھے، اعلیٰ قسم کے حضرمی جوتے پہنتے تھے، ان کی والدہ ان کو اس قدر پُر تکلف انداز سے رکھتیں تھیں یہاں تک کہ رات کو سوتے وقت ان کے سر کے پاس گھی، کھجور، پنیر، اور ستو سے بنا ہوا حلوہ "حیس" موجود ہوتا تھا، جیسے ہی نیند سے بیدار ہوتے تو نوش فرماتے، جب آپؓ کو معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ دار اَرقم بن ابی الاَرقم میں اسلام کی طرف دعوت دے رہے ہیں، دار اَرقم میں داخل ہوئے اور اسلام قبول کر لیا اور آپؐ کی تصدیق کی اور وہاں سے نکل کر اپنی ماں اور اپنی قوم کے ڈر سے اپنے اسلام کو مخفی رکھا، آپ رسول اللہ ﷺ کے پاس چھپ کر آتے تھے، ان کو عثمان بن طلحہ نے نماز پڑھتے ہوئے دیکھ لیا اور ان کی ماں اور قوم کو اس کی خبر دے دی، قوم کے لوگوں نے ان کو پکڑ کر گرفتار کر لیا، وہ اس وقت تک گرفتار رہے یہاں تک کے حبشہ

کی جانب پہلی ہجرت کے موقعہ پر وہ بھی نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔(سیر أعلام النبلاء، للذھبی 12- 12/3، محنۃ المسلمین فی العھد المکی، ص 107 الروض الأنف، 195/2)

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ فرماتے ہیں: میں نے ان کو اس حال میں دیکھا کہ اسلام کی وجہ سے ان کو اس قدر تکلیفیں پہنچائی گئیں یہاں تک کہ میں نے دیکھا ہے کہ ان کی کھال جسم سے ایسے الگ ہوتی تھی جیسے کہ سانپ کی کھال الگ ہوتی ہے۔(السیر والمغازی، ابن اسحاق، ص 193)

اللہ کے رسولؐ جب بھی ان کا ذکر فرماتے تھے تو کہتے تھے: میں نے مکہ میں مصعب بن عمیر سے زیادہ حسین بالوں والا، بہترین لباس والا اور ناز و نعم والا کوئی نہیں دیکھا۔(مستدرک حاکم 200/3، الطبقات الکبری 116/3)

آپؓ کو جس ابتلاء و آزمائش، جسمانی تکالیف اور قریب ترین رشتہ داروں کی طرف سے جور و جفا کا سامنا کرنا پڑا اس کے باوجود آپ نے دیگر صحابہ کرام کی طرح خیر اور جہاد فی سبیل اللہ کے اعلیٰ مقام تک پہنچنے میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کی، یہاں تک کہ جنگ احد میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو شہادت سے سرفراز کر دیا۔(محنۃ المسلمین فی العھد المکی، ص 108)

حضرت مصعبؓ اسلامی تربیت کے اعتبار سے ان تمام نوجوانوں کے لئے اعلیٰ مثال ہیں جو آسودہ حال ہوتے ہیں، خوشحال طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، مال و دولت، جاہ و حشمت اور محلات میں عیش و تنعّم کی زندگی بسر کرتے ہیں، جو اپنی ذات اور شخصیت میں مست ہوتے ہیں، جو لباس و پوشاک اور زیب و زینت میں مبالغہ آرائی کرتے ہیں اور زندگی کے مظاہر کے پیچھے ہی دوڑ دھوپ کرتے ہیں، حضرت مصعبؓ قبولِ اسلام کے بعد یکسر بدل جاتے ہیں اور باہمت اور عزم و استقامت کے پیکر کی حیثیت سے زندگی بسر کرتے ہیں، کسی طرح کی سستی اور کاہلی کا شکار نہیں ہوتے ہیں، نہ ہی پسپائی دکھاتے ہیں اور نہ ہی ان کا نفس اور ان کی خواہشات ان کو اپنے جال میں پھنسا پاتی ہیں۔(دیکھیں: مصعب بن عمیر الداعیۃ المجاہد، محمد بریغش، ص 105)

حضرت مصعبؓ نے اس دینِ حق میں داخل ہونے کے روز اپنے ماضی کی تمام راحتوں، لذتوں اور آسودہ حالی کو خیر باد کہہ دیا، اور بیعت کر کے ایک نئی زندگی کا آغاز کیا، ان کے لئے ضروری تھا کہ ابتلاء و آزمائش کی راہوں سے گزر کر جائیں تا کہ ان کا ایمان صیقل ہو جائے اور ان کا یقین بھی راسخ ہو جائے، حضرت مصعبؓ ہر اعتبار سے مطمئن اور خوش تھے اگرچہ ان کے آس پاس اندیشوں، خوف اور مختلف طاقتوں کا زور تھا، اگرچہ ان کو بدحالی، فقر و فاقہ اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑا، اگرچہ ان کو خوشحالی اور راحت و آرام کے تمام مظاہر سے ہاتھ دھونا پڑا، ان کو فقر و فاقہ کی آزمائش کا بھی سامنا کرنا پڑا، اپنے گھر اور خاندان میں حاصل مقام و مرتبہ کو بھی کھونا پڑا، خویش و اقارب اور خاندان کی طرف سے بھی پریشانیوں اور مصیبتوں کو جھیلنا پڑا، بھوک اور تعذیب کی آزمائش کو بھی سہنا پڑا اور غریب الوطنی کی آزمائش کو بھی برداشت کرنا پڑا، اور بالآخر ان تمام امتحانات اور آزمائشوں سے سرخرو ہو کر اپنے دین اور ایمان کو بچانے میں کامیاب ہوگئے، اطمئنان اور یقین کے اعلیٰ مقام پر فائز ہو کر نکلے اور ثابت قدمی کی مثال بن کر ابھرے، مدنی دور کے ضمن میں ہم مزید ان کا ذکر کریں گے۔(دیکھیں: مصعب بن عمیر الداعیۃ المجاھد، محمد بریغش، ص 105، 107، 126)

6- حضرت خباب بن الارتؓ:

حضرت خبابؓ مکہ میں لوہاری کے پیشے سے منسلک تھے، اللہ تعالی نے ابتدائی مرحلہ میں ہی ہدایت سے سرفراز کرنا چاہا تو وہ دار اُرقم میں رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ تربیتی کام شروع کرنے سے پہلے ہی حلقہ بگوش اسلام ہوئے، ان کا تعلق ان کمزور مسلمانوں سے تھا جن کو مکہ میں اس لئے تعذیب کا نشانہ بنایا گیا تاکہ وہ دین سے دستبردار ہو جائیں، ان پر مصائب و آلام کی اس قدر انتہا کی گئی یہاں تک کہ مشرکین نے ان کی پیٹھ کو زمین پر گرم پتھر پر رکھا اور ان کی کمر کا پانی سوکھ گیا۔ (سیر أعلام النبلاء 479/2، محنۃ المسلمین فی العہد المکی، ص95)

رسول اللہ ﷺ حضرت خبابؓ سے الفت و محبت فرماتے تھے اور ان کے اسلام قبول کرنے کے بعد ان کے پاس آتے جاتے تھے، جب ان کی مالکن کو اس کا علم ہوا جس کا نام اُم انمار خزاعیہ تھا، اس نے لوہے کی ایک سلاخ لی اور اس کو گرم کرکے ان کے سر پر رکھ دیا، اس کی شکایت حضرت خبابؓ نے اللہ کے رسول ﷺ سے کی، آپؐ نے فرمایا: "اے اللہ! خباب کی مدد فرما"۔ اس کے نتیجے میں اس کی مالکن کو سر میں درد شروع ہوا، وہ کتوں کے ساتھ بھونکتی تھی، اس سے کہا گیا: گرم لوہے سے علاج کرو، وہ حضرت خبابؓ کے پاس آئی تاکہ وہی اس کا علاج کریں۔ حضرت خبابؓ لوہے کی ایک گرم سلاخ سے اس کے سر کو داغتے تھے۔ یقیناً اس میں عبرت حاصل کرنے والے کے لئے عبرت ہے، اللہ صبر کرنے والے اپنے مومن بندوں کی نصرت و مدد کرتا ہے، غور کرنے کا مقام ہے کہ کیسے وہ خود حضرت خبابؓ کے پاس علاج کرانے کے لئے آتی ہے۔ (دیکھیں: محنۃ المسلمین فی العہد المکی، ص96)

جب کمزور مسلمانوں پر مشرکین کے دباؤ میں مزید اضافہ ہوا اور ان کی طرف سے مزید مصائب و آلام کے پہاڑ ٹوٹنے لگے تو حضرت خبابؓ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت آپؐ کعبہ کے سائے میں اپنی ایک چادر کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ انہوں نے فرمایا: کیا آپ ہمارے لئے مدد نہیں مانگیں گے؟! کیا آپ ہمارے لئے دعا نہیں کریں گے؟! یہ سن کر رسول اللہ ﷺ بیٹھ گئے اور آپؐ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ آپؐ نے فرمایا: تم سے پہلی امتوں کے لوگوں کا حال یہ تھا کہ ان کے لئے گڑھا کھودا جاتا اور انہیں اس میں ڈال دیا جاتا، پھر اُن کے سر پر آرا رکھ کر ان کے دو ٹکڑے کر دیئے جاتے، پھر بھی وہ اپنے دین سے نہیں پھرتے تھے، لوہے کے کنگھے ان کے گوشت میں پھنسا کر ان کی ہڈیوں اور پٹھوں پر پھیرے جاتے، پھر بھی وہ اپنے ایمان سے دستبردار نہیں ہوتے تھے۔ اللہ کی قسم! یہ دین اپنے عروج کو پہنچ کر رہے گا اور ایک زمانہ آئے گا کہ ایک سوار صنعاء سے حضر موت تک سفر کرے گا، اسے کسی کا ڈر نہیں ہو گا، سوائے اللہ کے، یا پھر بھیڑیے کا خوف ہو گا کہ کہیں اس کی بکریوں پر حملہ آور نہ ہو جائے۔ لیکن تم لوگ جلدی کرتے ہو۔ (صحیح بُخاری: 3612 مسند احمد 109/5، 111، ابو داؤد،: 2649، سنن نسائی 204/8)

شیخ سلمان عودۃ –حفظہ اللہ– اس حدیث کی لطیف تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: سبحان اللہ! ایسا کیا ہوتا ہے یہاں تک کہ محمد مصطفی ﷺ کا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے اور آپ ﷺ سیدھے بیٹھ جاتے ہیں، اور صحابہ کرام کو اتنے مؤثر اور طاقتور اسلوب کے ساتھ مخاطب فرماتے ہیں اور پھر ان کو جلد بازی اختیار کرنے پر سرزنش فرماتے ہیں، اور بات صرف یہ تھی کہ انہوں نے آپ ﷺ سے دعا کا مطالبہ کیا تھا؟! بات وہ نہیں تھی جو بظاہر نظر آرہی ہے جب کہ آپ اپنی اُمت کے بارے میں انتہائی شفیق اور مہربان ہیں۔

صحابہ کرام کی درخواست کا اسلوب اس کے پسِ منظر کا پتہ دیتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ایسے دلوں کی پکار تھی جن کو عذاب و تکلیف نے بے بس کر دیا تھا، جہد و مشقت نے ان کو پریشان کر دیا تھا اور ابتلاء و آزمائش نے ان کو مجبور کر دیا تھا، اس لئے اب وہ فوری نصرت و مدد کے طلبگار تھے اور وہ نصرت کو اپنے سے دور سمجھ رہے تھے، جب کہ اللہ کے رسول ﷺ جانتے تھے کہ ہر کام اپنے اپنے وقت پر ہوں گے اور ہر کام کا سبب بھی ضروری ہے اور نصرت و مدد سے پہلے آزمائش ضروری ہے، چنانچہ رسولوں کو بھی آزمائشی مراحل سے گزارا جاتا ہے اور پھر بہتر انجام انہی کا مقدر ہوتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: [حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْــَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَاۗءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَاۗءُ ۭ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ] ترجمہ: (پہلے پیغمبروں کے ساتھ بھی یہی ہوتا رہا ہے کہ وہ مدتوں نصیحت کرتے رہے اور لوگوں نے سن کر نہ دیا) یہاں تک کہ جب پیغمبر لوگوں سے مایوس ہوگئے اور لوگوں نے بھی سمجھ لیا کہ اُن سے جھوٹ بولا گیا تھا، تو یکایک ہماری مدد پیغمبروں کو پہنچ گئی، پھر جب ایسا موقع آجاتا ہے تو ہمارا قاعدہ یہ ہے کہ جسے ہم چاہتے ہیں بچا لیتے ہیں اور مجرموں پر سے تو ہمارا عذاب ٹالا ہی نہیں جاسکتا"۔ (سورۃ یوسف: 110)

اللہ کے رسول ﷺ اپنے اصحاب کی صورتحال اور منظر نامے سے محسوس کر رہے تھے کہ وہ لاحق ہونے والی پریشانی سے نڈھال ہو چکے تھے، اس کے ذریعہ ان کو دینِ حق سے دستبردار کرنے کی کوشش کی جارہی تھی اور کفار ان پر غالب ہو چکے تھے اور ان میں سے متعدد صحابہ کرام تعذیب کا نشانہ بنتے بنتے شہادت کا جام پی چکے تھے۔

یہ کوئی آسان بات نہیں ہے کہ انسان — صرف اس حدیث کے الفاظ کو پڑھ کر — صحابہ کرام کی اس صورتحال کا ادراک کرے جس سے وہ دوچار تھے، اور انہوں نے اسی صورتحال کے پیشِ نظر اللہ کے رسول ﷺ سے دعا اور نصرت طلب کرنے کا مطالبہ کیا تھا، ایک عام انسان ان احساسات و جذبات کو بھی نہیں سمجھ سکتا ہے جو ان کے دلوں میں ابھر رہے تھے، اس کا ادراک وہی شخص کر سکتا ہے جو ان جیسے حالات سے دوچار ہو اور جس کو اللہ کی راہ میں ان مصائب و آلام کا کچھ حصہ نصیب ہوا ہو۔

اللہ کے رسول ﷺ مندرجہ ذیل امور کے اعتبار سے صحابہ کرام کی تربیت فرماتے تھے:

أ: انبیائے سابقین، گزشتہ رسولوں اور ان کے پیروکاروں کی مثالیں دے کر ان کو اسوہ اختیار کرنے کی تلقین فرماتے تھے۔

ب: اللہ تعالیٰ نے صبر کرنے والے اہلِ ایمان کے لئے جنت میں جو انعامات تیار کر رکھے ہیں ان کی طرف توجہ دلاتے تھے اور اہلِ کفر کے پاس جو بھی دنیا کی زیب و زینت ہے اس سے دھوکہ نہ کھانے کی تلقین فرماتے تھے۔

ج: مستقبل کی طرف متوجہ فرماتے تھے جس میں اللہ تعالیٰ اسی دنیا میں اسلام کو سربلند کرے گا اور اہلِ کفر و طغیان کو ذلیل و خوار کرے گا۔

ایک مزید اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ ان تمام امور کے ساتھ ساتھ اہلِ ایمان سے ظلم و تکالیف کو دور کرنے کے لئے متعدد مادی اسباب بھی اختیار کرتے تھے اور اس سلسلہ میں منصوبہ بندی بھی کرتے تھے، مشرکین کو ایذاء رسانی سے دور رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے اور آپؐ اسلامی نظام کے قیام کے لئے مسلسل کوشاں تھے، جس میں ہر مسلمان کو اپنے رب کی عبادت کرنے کا موقع میسر

ہو گا وہ جہاں بھی عبادت کرنا چاہے کر سکتا ہے اور نظام اسلامی کے قیام کے ذریعہ وہ تمام رکاوٹیں ختم ہو جائیں گی جو دعوت الی اللہ کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔(دیکھیں: الغرباءالأولون،ص146-145)

حضرت خبابؓ نے مشرکین کی جانب سے لاحق ہونے والی ایذاء وتکلیف، بدسلوکی اور حق تلفیوں کا ذکر بھی کیا ہے، فرماتے ہیں: میں ایک لوہار پیشہ شخص تھا اور عاص بن وائل کے ذمہ میرا قرض تھا، میں اس سے قرض کا تقاضا کرنے کے لئے آیا تو وہ مجھ سے کہنے لگا: میں اس وقت تک تمہارا قرض ادا نہیں کروں گا جب تک کہ تم محمدؐ کا انکار نہیں کروگے۔ میں نے کہا: میں ہرگز انکار نہیں کروں گا یہاں تک کہ تم مر جاؤ اور پھر تمہیں دوبارہ زندہ کیا جائے۔ اس نے کہا: کیا مجھے موت کے بعد دوبارہ زندہ کیا جائے گا؟ اگر ایسا ہے تو میں اس وقت تمہارا قرض ادا کروں گا جب میں اپنے مال اور اولاد کی طرف واپس لوٹ آؤں گا، اسی کے بارے میں آیات نازل ہوئیں: [أَفَرَءَيْتَ الَّذِي كَفَرَ بِآيَاتِنَا وَقَالَ لَأُوتَيَنَّ مَالًا وَوَلَدًا ۞ أَطَّلَعَ الْغَيْبَ أَمِ اتَّخَذَ عِندَ الرَّحْمَٰنِ عَهْدًا ۞ كَلَّا ۚ سَنَكْتُبُ مَا يَقُولُ وَنَمُدُّ لَهُ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ۞ وَنَرِثُهُ مَا يَقُولُ وَيَأْتِينَا فَرْدًا ۞] ترجمہ: ”پھر تو نے دیکھا اُس شخص کو جو ہماری آیات کو ماننے سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تو مال اور اولاد سے نوازا ہی جاتا رہوں گا؟ کیا اسے غیب کا پتہ چل گیا ہے یا اس نے رحمان سے کوئی عہد لے رکھا ہے؟۔ ہرگز نہیں، جو کچھ یہ بکتا ہے اسے ہم لکھ لیں گے اور اس کے لئے سزا میں اور زیادہ اضافہ کریں گے۔ جس سروسامان اور لاؤ لشکر کا یہ ذکر کر رہا ہے وہ سب ہمارے پاس رہ جائے گا اور یہ اکیلا ہمارے سامنے حاضر ہو گا“۔ (سورۃ مریم: 77-80) صحیح بُخاری: 2091، صحیح مسلم: 2795)

ذکر کیا جاتا ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے اپنی خلافت کے دوران حضرت خبابؓ سے دریافت کیا کہ اللہ کی ذات کے بارے میں ان کے ساتھ کیا کیا ہوا؟ حضرت خبابؓ نے اپنی پیٹھ سے کپڑا اٹھایا تو وہ بالکل سفید ہو چکی تھی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: میں نے اس طرح کا منظر آج تک نہیں دیکھا ہے۔ حضرت خبابؓ نے کہا: اے امیر ا لمؤمنین! ان مشرکین نے میرے لئے آگ جلائی، اس کے بعد مجھے اس پر لٹایا، پھر ایک شخص نے میرے سینے پر اپنا پاؤں رکھا، زمین میری پیٹھ کے ذریعہ ہی ٹھنڈی ہوئی اور وہ آگ میری چربی کے ذریعہ ہی بجھی۔(الروض الأنف 98/2)

7-حضرت عبداللہ بن مسعودؓ:

اللہ کے رسول ﷺ لوگوں کے ساتھ نہایت حکیمانہ انداز سے معاملہ فرماتے تھے اور اکابر اور قبائل کے سرداروں کے ساتھ شفقت و لطف کے ساتھ معاملہ کرتے تھے، اسی طرح چھوٹے بچوں کے ساتھ بھی مشفقانہ معاملہ فرماتے تھے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اپنی پہلی شفقت بھری ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: میں ایک نوخیز لڑکا تھا، عقبہ بن ابی معیط کی بکریاں چراتا تھا، اللہ کے رسول ﷺ اور ابوبکر صدیقؓ میرے پاس سے گزرے اور فرمایا: اے لڑکے! تمہارے پاس کچھ دودھ ہے؟ میں نے کہا: دودھ تو ہے لیکن میرے پاس یہ دوسرے کی امانت ہے۔ آپؐ نے فرمایا: کیا کوئی ایسی بکری ہے جس نے بچے نہ دیئے ہوں؟ عرض کیا: ہاں! اور میں نے آپ کو ایک بکری پیش کی۔ آپؐ نے اس کے تھن پر ہاتھ پھیرا اور دودھ اترنے لگا، ایک برتن میں اس کو دوہا اور خود دودھ پیا اور ابوبکرؓ کو بھی پلایا، اس کے بعد تھن سے مخاطب ہو کر فرمایا: خشک ہو جا اور وہ اپنی اصلی حالت پر آ گیا۔ فرماتے ہیں: یہ دیکھ کر میں آپؐ کی

خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! مجھے بھی یہ کلام سکھا دیجئے، فرماتے ہیں: آپؐ نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا: اللہ آپ پر رحم فرمائے، آپ تو سیکھے سکھائے بچے ہو۔ (مسند أحمد: 379/1، 462، مسند أبو یعلی: 4985، مسند الطیالسی: 353، البدایۃ والنھایۃ 32/3، سیر أعلام النبلاء: 465/1)

اس طرح سے آپؓ کے اسلام کا آغاز ان دو عظیم کلمات کے ذریعہ ہوا:

۱: انھوں نے اپنے بارے میں فرمایا: میرے پاس یہ دوسرے کی امانت ہے۔

۲: صادق و مصدوق ذاتِ گرامی نے خود فرمایا: آپ تو سیکھے سکھائے بچے ہو۔

یقیناً ان دو کلمات کا آپؓ کی زندگی میں اہم کردار رہا، آپؓ بعد میں اہم علمائے صحابہ میں شمار کئے جانے لگے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ قافلۂ ایمانی میں اس طرح شامل ہوئے کہ وہ بتوں کے قلعہ میں شرک کے سمندر کو چیر رہے تھے۔ آپؓ ان سابقین اولین میں سے تھے جن کی حمد و ستائش اللہ تعالیٰ نے قرآن عظیم میں کی ہے۔ علامہ ابن حجرؒ ان کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: آپؓ سابقینِ اولین میں سے ہیں، بہت پہلے اسلام قبول کیا، دو ہجرتیں کیں، غزوۂ بدر اور اس کے بعد کے تمام معرکوں میں شریک رہے اور مسلسل نبی کریم ﷺ کے ساتھ رہے، اور آپؓ کو آپ ﷺ کے نعلین مبارکین اٹھانے کا شرف حاصل تھا۔ (الاصابۃ 214/6)

سب سے پہلے علانیہ قرآن پڑھنے والے

اگرچہ حضرت ابن مسعودؓ حلیف تھے اور آپؓ کا وہاں کوئی خاندان نہیں تھا، جو آپؓ کی حمایت و حفاظت کرتا ہے، علاوہ ازیں آپ کمزور جسم والے اور باریک پنڈلیوں والے تھے، لیکن اس کے باوجود یہ چیزیں ان کی شجاعت و بہادری اور ذاتی قوت کے ظہور میں رکاوٹ نہ بن سکیں، ان کے اس سلسلہ میں اہم یادگار واقعات ہیں، انہی واقعات میں سے مکی دور کا وہ جذباتی واقعہ بھی ہے جبکہ دعوت کا ابتدائی مرحلہ تھا اور قریش کی عداوت و دشمنی عروج پر تھی، چنانچہ آپ سردارانِ قریش کے سامنے کھڑے ہوگئے اور زور زور سے قرآن سنانے لگے، اس کے ذریعہ ان کی بند سماعتوں کو اور ان کے مقفل دلوں کو دستک دی۔ چنانچہ آپؓ رسول اللہ ﷺ کے بعد پہلے شخص ہیں جنہوں نے مکہ مکرمہ میں علانیہ طور پر قرآن کی تلاوت کی۔

ایک روز صحابہ کرام جمع تھے اور کہنے لگے: واللہ! قریش نے کبھی یہ قرآن اعلانیہ طور پر نہیں سنا ہے، کون ہے جو انہیں قرآن سنادے؟ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے کہا: میں! صحابہ کرام نے کہا: ہمیں آپ کے بارے میں ان کی طرف سے ڈر اور اندیشہ ہے۔ ہم کوئی ایسا شخص چاہتے ہیں جس کی پشت پر کوئی خاندان ہو جو اس کو ناگہانی صورتحال میں ان سے بچا سکے! حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا: مجھے جانے دو، اللہ میری حفاظت کرے گا! فرماتے ہیں: حضرت ابن مسعودؓ گئے یہاں تک کہ چاشت کے وقت مقام ابراہیمی کے پاس پہنچ گئے اور قریش مجلس لگائے بیٹھے تھے، آپؓ مقامِ ابراہیمی کے پاس کھڑے ہوئے اور زور سے پڑھنا شروع کیا: ﴿بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ ٱلرَّحۡمَٰنُ ۝١ عَلَّمَ ٱلۡقُرۡءَانَ ۝٢﴾ اس کے بعد ان آیات کو پڑھتے ہوئے آگے بڑھے۔ وہ ان کو غور سے دیکھنے لگے اور کہنے لگے: ابن ام عبد کیا کہہ

رہا ہے؟ بعض نے کہا: یہ وہی ہے جو محمدؐ لے کر آئے ہیں! یہ سن کر سب ان کی طرف بھڑے اور ان کو چہرے پر مارنا شروع کر دیا، اور آپؓ پڑھتے رہے یہاں تک کہ جتنا پڑھ سکتے تھے پڑھتے رہے۔ اس کے بعد صحابہ کرام کے پاس واپس آئے اور آپؓ کے چہرے پر مارنے کے نشانات پڑ چکے تھے۔ صحابہ کرامؓ نے کہا: اسی سے ہم آپ کے بارے میں ڈر رہے تھے! آپؓ نے فرمایا: اللہ کے یہ دشمن میری نگاہوں میں کبھی اتنے ذلیل اور معمولی نہیں تھے جتنے ابھی ہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں تو میں کل پھر اسی طرح ان کو سنا کر آجاؤں گا۔ صحابہ کرام نے کہا: نہیں، بس اتنا ہی کافی ہے، آپ نے ان کو وہ سنا دیا جس کو وہ ناپسند کرتے ہیں۔ (ابن ہشام 314/1، 315، أسد الغابہ 385/3، 386)

اس طرح حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سب سے پہلے شخص بن گئے جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے بعد مکہ مکرمہ میں اعلانیہ طور پر قرآن سنایا۔ بلاشبہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا یہ اقدام قریش کے لئے ایک عملی چیلنج تھا جو اس چیلنج کو کبھی برداشت نہیں کر سکتے تھے اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی جرأت و بہادری قابل غور ہے، اگرچہ ان کو اس اذیت ناک صورتحال کا سامنا کرنا پڑا۔ (دیکھیں: محنۃ المسلمین فی العہد المکی: ص88)

8- حضرت خالد بن سعید بن العاصؓ:

حضرت خالدؓ کا قبولِ اسلام کا واقعہ ابتدائی زمانہ کا ہے اور اس کا محرک وہ خواب تھا جو انہوں نے نبی کریم ﷺ کے ظہور کے وقت دیکھا تھا، انہوں نے دیکھا کہ وہ آگ کی لگھار پر کھڑے ہیں اور وہاں کوئی شخص ان کو اس میں دھکیل رہا ہے، اور رسول اللہ ﷺ ان کو چمٹا کر رکھتے ہیں تاکہ وہ اس میں گرنے سے بچ جائیں، یہ دیکھ کر وہ گھبراہٹ کے ساتھ نیند سے بیدار ہوتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ خواب سچا ہے، چنانچہ انہوں نے اس خواب کو حضرت ابو بکر صدیقؓ سے بیان کیا تو صدیقِ اکبرؓ نے ان سے فرمایا: آپ کے بارے میں خیر مقدر ہے، یہ ہیں اللہ کے رسول ﷺ، آپ ان کی اتباع کریں۔ وہ آپ ﷺ کی خدمت میں پہنچتے ہیں اور اسلام قبول کرتے ہیں، اور اپنے والد کے ڈر سے اپنے اسلام کو مخفی رکھتے ہیں، لیکن ان کے والد نے جب اکثر و بیشتر ان کو غائب پایا تو اسلام قبول نہ کرنے والے ان کے دوسرے بھائیوں کو ان کی تلاش میں بھیجا، ان کو تلاش کر کے لایا گیا، ان کی سخت سرزنش کی اور ہاتھ میں موجود لاٹھی سے ان کو مارا یہاں تک کہ ان کے سر پر اس کو توڑ دیا۔ پھر مکہ میں ان کو قید کر دیا اور ان کے بھائیوں کو ان کے ساتھ بات چیت کرنے سے منع کر دیا، اور ان کو بھی ان کے طرزِ عمل سے ڈرایا، پھر ان پر مزید سختی کی، ان کو بھوکا رکھا اور تین دن تک ان کو پانی تک نہیں دیا، وہ یہ سب کچھ برداشت کرتے رہے، اس کے بعد ان کے والد نے ان سے کہا: میں تمہاری کھانا پینا بند کر دوں گا۔ حضرت خالدؓ نے کہا: اگر آپ میرا کھانا پینا روک دیں گے تو اللہ تعالیٰ مجھے رزق عطا کرے گا جس سے میں زندہ رہ سکوں گا۔ وہ اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں تشریف لے گئے آپؐ ان کا اکرام فرماتے تھے اور وہ آپؐ کے ساتھ ہی رہنے لگے، اس کے بعد انہوں نے یہی بہتر سمجھا کہ دوسری مرتبہ حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والوں کے ساتھ ہجرت کر لیں۔ (دیکھیں: سیر أعلام النبلاء: 260/1)

9- حضرت عثمان بن مظعونؓ:

جب حضرت عثمان بن مظعونؓ نے اسلام قبول کیا تو ان کی قوم بنو جمح آپ کی دشمن بن گئی، وہ آپؓ کو تکلیف دینے لگے اور سب سے زیادہ اور سخت اذیت امیہ بن خلف دیتا تھا، اسی لئے حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کے بعد اس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

أَأَخْرَجْتَنِي مِنْ بَطْنِ مَكَّةَ آمِنًا ... وَأَسْكَنْتَنِي فِي صَرْحٍ بَيْضَاءَ تَقْذَعُ
تَرِيشُ نِبَالًا لَا يُوَاتِيكَ رِيشُهَا ... وَتَبْرِي نِبَالًا رِيشُهَا لَكَ أَجْمَعُ
وَحَارَبْتَ أَقْوَامًا كِرَامًا أَعِزَّةً ... وَأَهْلَكْتَ أَقْوَامًا بِهِمْ كُنْتَ تَفْزَعُ
سَتَعْلَمُ إِنْ نَابَتْكَ يَوْمًا مُلِمَّةٌ ... وَأَسْلَمَكَ الْأَوْبَاشُ مَا كُنْتَ تَصْنَعُ

ترجمہ: کیا تو نے مجھے مکہ کی سرزمین سے نکالا جہاں میں اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرتا تھا، اور تو نے مجھے ایک کشتی میں بسا دیا جس کو سمندر میں چلایا جا رہا ہے۔ تم نیزوں میں پر لگاتے ہو اور ان کا تمہیں کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا ہے، اور تم تیروں کو ٹھیک کرتے ہو وہ تیر تمہارے ہی خلاف استعمال ہوں گے۔ تم نے باعزت اور شریف لوگوں کے ساتھ جنگ کی ہے اور ایسے لوگوں کو ہلاک کیا ہے جن کے نام سے ہی تم گھبراتے تھے۔ تم عنقریب جان لوگے جب کسی روز تم پر کوئی مصیبت آن پڑے گی اور کمزور و بے بس بھی تم کو حوالے کر دیں گے تم اس وقت کیا کرو گے؟! (دیکھیں: السیرۃ النبویۃ للذھبی، ص112)

حضرت عثمان بن مظعونؓ ایک عرصہ تک حبشہ میں مقیم رہے، لیکن جلد ہی وہاں سے پہلے مرحلہ میں واپس آنے والوں کے ساتھ واپس آگئے، لیکن مکہ میں اسی وقت داخل ہو پائے جبکہ ولید بن مغیرہ نے ان کو اپنی پناہ میں لے لیا، اور ان کی پناہ میں رہتے ہوئے امن واطمئنان کے ساتھ باہر نکلنے لگے، جب انہوں نے دیکھا کہ نبی کریم ﷺ کے اصحاب ابتلاء وآزمائش میں ہیں اور وہ عافیت کی زندگی بسر کر رہے ہیں تو انہیں یہ بات اچھی نہیں لگی اور کہنے لگے: واللہ! میرے صبح وشام ایک مشرک شخص کی پناہ میں رہتے ہوئے امن واطمئنان کے ساتھ بسر ہو رہے ہیں اور میرے رفقاء اور میرے دین کو ماننے والے اللہ کی راہ میں ابتلاء وآزمائش برداشت کر رہے ہیں جس سے میں محفوظ ہوں، یہ یقیناً میری ذات کی کمزوری ہے۔ اس کے بعد وہ ولید بن مغیرہ کے پاس گئے اور اس سے کہا: اے ابو عبد شمس! آپ نے اپنی ذمہ داری اور پناہ کا حق ادا کر دیا، میں آپ کی پناہ کو واپس کرتا ہوں۔ اس نے کہا: اے بھتیجے، ایسا کیوں؟! شاید آپ کو کوئی تکلیف پہنچی ہے یا آپ کے ساتھ کچھ برا ہوا ہے! حضرت عثمانؓ نے کہا: نہیں، میں اللہ تعالیٰ کی پناہ پر خوش ہوں اور میں اس کے علاوہ اور کسی کی پناہ میں نہیں رہنا چاہتا ہوں۔ مغیرہ نے کہا: پھر مسجد حرام چلو، وہاں اعلانیہ طور پر میری پناہ واپس کرو، جیسے کہ میں نے اعلانیہ طور پر آپ کو پناہ دی تھی، وہ دونوں مسجد حرام گئے اور لوگوں کے سامنے ان کے جوار (پناہ) کو واپس کر دیا۔ اس کے بعد حضرت عثمانؓ قریش کی ایک مجلس کے پاس گئے اور ان کے ساتھ بیٹھ گئے، ان کے ساتھ شاعر لبید بن ربیعہ بھی بیٹھا ہوا تھا، جو ان کو اشعار سنا رہا تھا۔ لبید نے کہا: "ألا كل شيء ما خلا الله باطل"- ترجمہ: ''سن لو! اللہ کے سوا ہر چیز باطل اور جھوٹ ہے''۔ حضرت عثمانؓ نے کہا: آپ نے سچ کہا۔ لبید مزید اشعار سناتے رہے، انہوں نے کہا: "وكل نعيم لا محالة زائل"- ترجمہ: ''اور ہر نعمت یقیناً زائل اور ختم ہونے والی ہے''۔ حضرت عثمانؓ نے کہا: آپ نے جھوٹ کہا، جنت کی نعمت

تو نہ ختم ہونے والی ہے!۔ لبید نے کہا: اے قریش کے لوگو! واللہ! تمہارے ہمنشین کو تو ایذاء نہیں پہنچنی چاہیے تھی، تمہارے درمیان کب تک ایسا ہوتا رہے گا؟! ان میں سے ایک شخص نے کہا: یہ بہت سے بیوقوفوں میں سے ایک بیوقوف ہے جنہوں نے ہمارے دین کو چھوڑ دیا ہے، لہذا اس کی باتوں کی وجہ سے آپ رنجیدہ نہ ہوں۔ حضرت عثمانؓ نے بھی اس کی بات کا جواب دیا یہاں تک کہ ان کا معاملہ طول پکڑ گیا، وہ شخص حضرت عثمانؓ کی طرف بڑھا اور ان کی آنکھ پر تھپڑ مار دیا جس کی وجہ سے ان کی آنکھ ہری ہو گئی اور ولید بن مغیرہ یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جو حضرت عثمانؓ کے ساتھ ہو رہا تھا۔ یہ دیکھ کر اس نے کہا: اے بھتیجے! بے شک آپ کی آنکھ اس طرح کی تکلیف سے بے نیاز تھی، آپ ایک مضبوط پناہ میں تھے۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا: اے ابو عبد شمس! واللہ! میری درست آنکھ بھی اس کی محتاج ہے جو اس کی بہن کو اللہ کی راہ میں لاحق ہوا ہے، اور میں تو ایسی ذات کی پناہ میں ہوں جو آپ سے زیادہ عزت والا اور زیادہ قدرت والا ہے۔ ولید نے دوبارہ ان سے پناہ میں آنے کی پیشکش کی لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویۃ، ابن ھشام 120/2، طبقات الشعراء، ابن سلام ص48، 49، السیر والمغازی، ابن اسحاق، ص178، 180)

یہ حضرت عثمانؓ کی قوتِ ایمانی اور اجر و ثواب کے بارے میں ان کے پر امید ہونے کی واضح دلیل ہے، اسی لئے جب آپ کا انتقال ہوا تو اُم العلاء انصاریہؓ نے خواب میں دیکھا کہ ایک چشمہ بہہ رہا ہے۔ وہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور یہ خواب آپ ﷺ کو بتایا، آپ ﷺ نے فرمایا: یہ ان کا عمل ہے۔ (صحیح بُخاری: 7004) واضح رہے کہ حضرت عثمانؓ حضرت اُم العلاء کے حصے میں آئے تھے جب انصار نے مہاجرین کے بارے میں قرعہ اندازی کی تھی۔

مذکورہ صحابہ کرام کے علاوہ اور بہت سے صحابہ تعذیب کا نشانہ بنے، اسی طرح بہت سے ایسے قریشی نوجوان دیکھنے کو ملتے ہیں جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کی طرف متوجہ ہوئے اور اس پر لبیک کہا اور صاحبِ دعوت کے ارد گرد جمع ہو گئے، اگرچہ ان کے آباء، اقارب اور اُن کے متعلقین کا ان کے بارے میں سخت ترین موقف تھا، ان نوجوانوں نے ان تمام امتیازات اور آرام و آسائش کو قربان کر دیا جن کے ذریعہ وہ اسلام قبول کرنے سے پہلے لطف اندوز ہوتے تھے، ان کو ابتلاء و آزمائش میں مبتلا ہونا پڑا، انہوں نے بہت زیادہ اذیتیں برداشت کیں، اور یہ سب کچھ انہوں نے اللہ کی طرف سے اجر و ثواب کی امید میں کیا، ایمان جب دلوں میں جاگزیں ہوتا ہے تو اس کے اثرات اسی طرح مرتب ہوتے ہیں، اس کے بعد صاحبِ ایمان ہر قسم کی پریشانی اور محرومی کو ہیچ سمجھتا ہے اگر اس کے نتیجے میں اللہ کی رضا اور جنت حاصل ہو رہی ہو۔

ایذاء و تعذیب کا یہ سلسلہ صرف مسلمان مردوں تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ اس میں خواتین بھی شانہ بشانہ شامل تھیں اور خواتین نے بھی اپنے اسلام کی وجہ سے ایذاء و پریشانی کا ایک معتدبہ حصہ برداشت کیا ہے، جیسے کہ حضرت سمیہ بنت خیاط، حضرت فاطمہ بنت الخطاب، حضرت لبیبہ جو بنو المؤمل کی باندی تھیں، حضرت زنّیرہ رومیہ نہدیہ اور ان کی بیٹی، حضرت اُم عمیس، حضرت بلال کی والدہ حضرت حمامہ اور ان کے علاوہ بھی اور بہت سی خواتین اس قافلہء ابتلاء و آزمائش کی رہرو ہیں (رضي اللہ عنھن أجمعین)۔(محنۃ المسلمین فی العہد المکی، ص116-117)

5- مکہ مکرمہ میں قتال سے اجتناب اور داخلی تربیت پر توجہ دینے کی حکمت:

مسلمان مکہ مکرمہ میں اپنا دفاع کرنا چاہتے تھے اور بظاہر ایسا لگتا ہے کہ مصالحانہ موقف کی وجہ سے ان میں سے بعض بطور خاص نوجوان ناراض تھے، چنانچہ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ اور ان کے اصحاب نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے: اے اللہ کے نبیؐ! ہم اس وقت طاقت و عزت میں تھے جب ہم مشرک تھے، جب ہم ایمان لے آئے تو ہم کمزوری کا مظاہرہ کر رہے ہیں! آپ ﷺ نے فرمایا: "مجھے عفو در گزر کا حکم دیا گیا ہے لہذا ان لوگوں کے ساتھ جنگ مت کرو"۔(سنن نسائی:3/6،السنن الکبری للبیہقی:11/9، مستدرک حاکم: 66/2-67،307،السیرۃ النبویہ الصحیحۃ1/158)

مکہ مکرمہ میں قتال کے فرض اور مشروع نہ ہونے کی حکمت کو بہت سے محققین نے موضوعِ بحث بنایا ہے،انہی میں استاد سید قطب–رحمہ اللہ–کا نام بھی ہے، وہ فرماتے ہیں: جن نتائج اور حکمتوں کو ہم بظاہر جان رہے ہیں ان کے بارے میں ہم کوئی یقینی بات نہیں کہہ سکتے ہیں،اس لئے کہ اس صورت میں اللہ تعالیٰ کے بارے میں ایسی حکمتوں کی نسبت کرنے کے مرتکب ہوں گے جن کو اس نے ہمارے سامنے واضح انداز میں بیان نہیں کیا ہے،اور ہم ایسے اسباب و علل فرض کر سکتے ہیں جو حقیقی اسباب و علل ہو بھی سکتے ہیں اور نہیں بھی ہو سکتے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ کسی بھی ذمہ داری کے سامنے یا احکامِ شریعت میں سے کسی بھی حکم کے تئیں ایک مومن کا طرزِ عمل مطلقاً تسلیم و رضا ہوا کرتا ہے،اس لئے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی علیم و خبیر ہے اور ہم ان حکمتوں اور اسباب کا ذکر اجتہاد کی بنیاد پر کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ صرف ایک احتمال ہے، اس لئے کہ اصل حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے کسی نصِ صریح کے ذریعہ نہ ان حکمتوں کو ہمارے لئے متعین کیا ہے اور نہ ہی ہمیں ان سے مطلع کیا ہے۔(دیکھیں: فی ظلال القرآن 714/2)

اختصار کے ساتھ چند اسباب و حکم اور علتوں کا مندرجہ ذیل سطور میں ذکر کیا جاتا ہے:

(1) مکہ مکرمہ میں قتال و جنگ سے اجتناب شاید اس لئے ہو کیونکہ مکی دور ایک متعین ماحول میں، مخصوص حالات میں ایک مخصوص قوم کی تربیت اور تیاری کا زمانہ تھا،اور اس کا مقصد یہ بھی تھا کہ عربی شخص کو ایسی چیزوں پر صبر کرنے کی تربیت کی جائے جس پر وہ عام طور پر صبر نہیں کر سکتا تھا، جیسے کہ اس پر یا اس کی پناہ میں آنے والے کسی شخص پر ظلم و زیادتی کی جائے تاکہ اس کی شخصیت میں نکھار آجائے اور وہ اپنی ذاتی انا سے آزاد ہو جائے،اور وہ کسی بھی اثر انداز ہونے والی چیزیں یا برانگیختہ کرنے والے عمل کی وجہ سے جذباتی نہ ہو،اور اس کے ذریعہ اس کی طبیعت اور حرکات میں اعتدال قائم ہو جائے اور پھر اس کی تربیت اس انداز سے ہو جائے کہ وہ ایک نئی قیادت کے ماتحت رہتے ہوئے نئے معاشرہ کے نظام کی اتباع و پیروی کر سکے،اور وہ صرف قیادت کی طرف سے ملنے والے احکام و اوامر کے مطابق عمل کرے،اگرچہ وہ اس کی عادت اور مالوف امور کے بر خلاف ہی کیوں نہ ہوں،اور ایک مسلم معاشرہ کی تشکیل میں ایک مسلمان عربی شخصیت کی تربیت و تیاری میں اصل بنیاد یہی ہے۔

(2) ایک وجہ اور حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ پر امن اور مصالحانہ دعوت قریش کے اس طرح کے ماحول میں زیادہ مؤثر اور نتیجہ خیز ہو سکتی تھی، جہاں کبر و غرور اور شرف و عزت کو ہی اصل معراج سمجھا جاتا تھا،اور اس جیسی صورتحال میں قتال مزید عناد اور خونریز جنگوں کی دلدل

میں دھکیل سکتا تھا، جیسے کہ داحس وغبراء اور بسوس کی جنگیں عربوں کے ہاں معروف ہیں، اور ایسی صورت میں اسلام ایک دعوت کے بجائے ایسی جنگ وجدال میں تبدیل ہو جاتا جس کی وجہ سے اس کی اساسی فکر دب کر رہ جاتی۔

(3) ایک حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہر گھر میں جنگ وجدال کا ماحول پیدا کرنے سے بچا جائے، اس لئے کہ وہاں کوئی ایسی عمومی منظم قوت نہیں تھی جو اہلِ ایمان کو ایذائیں پہنچانے کا کام کر رہی تھی، بلکہ یہ ہر فرد کے سرپرستوں کی مرضی کے مطابق کیا جارہا تھا اور قتال کی اجازت کا مطلب اس جیسے ماحول میں یہ تھا کہ ہر گھر میں معرکہ آرائی شروع ہو جاتی اور پھر یہ کہا جاتا کہ یہ ہے اسلام! اور حالانکہ اسلام قتال سے باز رہنے کی تلقین کر رہا تھا لیکن اس کے باوجود یہ الزام لگایا گیا، چنانچہ زمانۂ حج میں قریش یہ پروپیگنڈہ کرتے تھے کہ محمد ﷺ باپ بیٹے کے درمیان، فرد اور اس کی قوم وخاندان کے درمیان تفریق پیدا کرتے ہیں، اور پھر کیا حال ہوتا جب بیٹے کو باپ سے لڑنے اور غلام کو اس کے آقا سے لڑنے اور قتال کرنے کا حکم دیا جاتا؟!

(4) ایک حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالی کو اس کا علم تھا کہ بہت سے مخالفینِ اسلام جو مسلمانوں کو دین کے بارے میں آزمائش میں مبتلا کر رہے تھے اور ان کو تکلیف پہنچاتے تھے وہ اسلام کے مخلص لوگوں میں شامل ہو جائیں گے، بلکہ اس کے قائدین میں شمار ہوں گے، کیا حضرت عمر بن خطابؓ کا شمار ایسے ہی لوگوں میں نہیں ہوتا ہے؟!

(5) ایک حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ چونکہ قبائلی ماحول میں عربی نخوت اس مظلوم کے حق میں آواز بلند کرنے کے عادی تھی جو اذیت وتکلیف کو برداشت کر رہا ہو اور اپنے موقف سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہ ہو، بطورِ خاص جبکہ ایذاء کا شکار شریف اور معزز لوگ بن رہے ہوں، ایسے متعدد واقعات پیش آئے ہیں جو اس معاشرہ میں اس نظریہ کی صحت کو ثابت کرتے ہیں، چنانچہ ابن الدغنہ نے اس بات کو برداشت نہیں کیا کہ حضرت ابو بکرؓ ہجرت کرکے مکہ کو چھوڑ دیں، انہوں نے اس بات کو عربوں کے لئے باعثِ عار سمجھا اور ان کو اپنا جوار وپناہ اور اپنی حمایت دینے کی پیشکش کی، اسی طرح کا ایک واقعہ اس وقت پیش آیا جب شعب اَبی طالب میں بنی ہاشم کو محصور کیا گیا تھا تو اس دستاویز ہی کو وہاں کے شرفاء نے پھاڑ دیا تھا۔

(6) ایک حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس وقت مسلمانوں کی تعداد کم تھی اور وہ مکہ تک ہی منحصر تھے اور دعوت ابھی جزیرۃ العرب کے دیگر حصوں تک نہیں پہنچ پائی تھی، اور اگر پہنچی بھی تھی تو جزوی طور پر، کیونکہ دیگر قبائل ابھی قریش اور اس کے افراد کی داخلی کشمکش کے بارے میں جانبداری سے کام لے رہے تھے، وہ دیکھ رہے تھے کہ اس موقف کا انجام کیا ہوگا، اور اس صورتحال میں یہ معرکہ اسی پر ختم ہو سکتا ہے کہ اس قلیل ترین مسلم جماعت کو جان سے مار دیا جائے، اگرچہ وہ مدِ مقابل گروہ کے کئی گنا افراد کو مار دیں لیکن شرک بدستور ویسے ہی باقی رہے گا اور اسلامی نظام کا قیام عمل میں نہیں آسکے گا، اور نہ ہی اس کی کوئی واقعی شکل وجود میں آسکے گی، جبکہ وہ ایک ایسا دین ہے جو ایک نظامِ زندگی اور دنیاوی اور اخروی نظام بننے کے لئے آیا ہے۔

(7) ان تمام پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان کو نظرانداز کرنے اور قتال کا حکم دینے کی کوئی اہم ضرورت نہیں تھی، اس لئے کہ اس دعوت کی اصل اساس موجود اور نمو پذیر تھی، اور وہ اُساس تھی دعوت کا وجود، اور اس کے داعی حضرت محمد ﷺ کی شخصیت میں اس کا

وجود۔اور آپ ﷺ کی شخصیت بنو ہاشم کی تلواروں کی حفاظت وحمایت میں تھی، جو بھی ہاتھ غلط ارادہ سے آپ کی طرف اٹھتا تو اس کو قلم کر دیا جاتا،اسی لئے کسی کو یہ جرأت نہیں ہوئی کہ آپ کو دعوت کی تبلیغ سے روکے، کعبہ کے ارد گرد قریش کی محفلوں اور مجلسوں میں، صفا پہاڑی کے اوپر سے اور عمومی اجتماعات میں کسی کو آپ کو روکنے کی جرأت نہیں ہو پائی، نہ کوئی یہ جرأت کر سکا کہ آپ ﷺ کو قید کیا جائے یا آپ کو شہید کیا جائے یا کسی مخصوص بات تک ہی آپ کو محدود کر دیا جائے۔

ہمارے خیال کے مطابق یہ چند اہم پہلو ہیں جن کی وجہ سے اللہ کی حکمت کا تقاضا ہوا کہ مسلمانوں کو اس بات کا حکم دیا جائے کہ وہ اپنے ہاتھوں کو روکے رکھیں، نماز قائم کرتے رہیں اور زکوۃ ادا کرتے رہیں تاکہ ان کی تربیت و تیاری کا کام پائے تکمیل کو پہنچ سکے اور مسلمان مناسب وقت پر قیادت کی طرف سے حکم کا انتظار کرتے رہیں اور وہ اس پوری صورتحال سے اس طرح نکل جائیں کہ ان کا اپنی ذات کے لئے کچھ نہ ہو بلکہ سب کچھ اللہ کے لئے خالص اور اسی کی راہ میں ہو۔(دیکھیں: الولاء والبراء، محمد قحطانی، فی ظلال القرآن سے ان نکات کو اخذ کیا گیا ہے۔ص169، 170، 171 فی ظلال القرآن، 2/714، 715، معالم فی الطریق، ص69، 71)

صحابہ کرامؓ نے قرآن کریم سے فقہ المصالح والمفاسد کو قرآنِ کریم سے اچھی طرح سمجھ لیا تھا اسی طرح انہوں نے عملی صورتحال کے ذریعہ اس فقہ کے ساتھ تعامل وطرزِ عمل کی کیفیت کو بھی سیکھ لیا تھا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَا تَسُبُّواْ ٱلَّذِينَ يَدۡعُونَ مِن دُونِ ٱللَّهِ فَيَسُبُّواْ ٱللَّهَ عَدۡوَۢا بِغَيۡرِ عِلۡمٖۗ كَذَٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلَهُمۡ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِم مَّرۡجِعُهُمۡ فَيُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُواْ يَعۡمَلُونَ﴾ ترجمہ:" اور اللہ کے سوا یہ جن کو پکارتے ہیں ان کو گالی نہ دو، کہ وہ تجاوز کر کے بے خبرانہ اللہ کو گالیاں دینے لگیں، اسی طرح ہم نے ہر گروہ کی نگاہوں میں اس کا عمل مزین کر رکھا ہے، پھر ان کے رب ہی کی طرف، ان سب کا پلٹنا ہے تو وہ انہیں اس سے آگاہ کرے گا، جو وہ کرتے رہے ہیں"۔ (سورۃ الأنعام: 108)

اسی طرح صحابہ کرامؓ نے اس اصول کو بھی سیکھ لیا تھا کہ اگر مصلحت وفائدہ کے نتیجہ میں اس سے بڑا مفسدہ اور نقصان ہو رہا ہو تو اس مصلحت وفائدہ کو ترک کر دیا جائے گا۔

اس میں اخلاقی تربیت بھی ہے، ایمانی بلندی بھی اور اُن بے وقوفوں اور جاہلوں سے اعلانِ براءت وعلٰحید گی بھی جو حقائق سے ناواقف ہوتے ہیں، اور ان کے دل اللہ کی معرفت اور اس کی تقدیس وتکریم سے خالی ہوتے ہیں، علمائے محققین نے ذکر کیا ہے کہ غیر اللہ کو پکارنے والوں کو برا بھلا نہ کہنے کا حکم اب بھی باقی ہے، جب اہلِ کفر طاقت وقوت میں ہوں اور وہ اسلام اور مسلمانوں کے ماتحت نہ ہوں اور یہ اندیشہ ہو کہ اسلام، نبی کریم ﷺ، یا اللہ کی ذات کو برا بھلا کہا جائے گا، تو کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے کہ ان کی صلیب کو یا ان کے دین کو یا ان کے چرچوں کو برا بھلا کہے، اور نہ کوئی ایسا عمل کرے جس سے یہ لازم آتا ہو، اس لئے کہ یہ ایک ایسا عمل ہے جو معصیت وبرائی پر ابھارنے اور برانگیختہ کرنے کے درجہ میں ہے اور یہ ایک طرح کا چیلنج بھی ہے، اس آیت سے سدّ ذرائع کے حکم کا وجوب بھی معلوم ہوتا ہے۔(التفسیر المنیر للزحیلی، 7/325- 326)

مکی دور جو تیرہ سال پر مشتمل تھا، اور وہ مکمل طور پر تربیت، تیاری اور "لا الہ الا اللہ" کے مفاہیم کو دلوں میں جاگزیں کرنے کا مرحلہ تھا، اس مرحلہ پر غور وفکر کرنے والے کے سامنے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس عقیدہ کی فطرت میں جلد بازی نہ کرنے اور وقت سے پہلے کسی کام کو نہ کرنے کی کتنی اہمیت ہے۔ عقیدہ کے لئے یہ بات ضروری ہے کہ اس کو ایک پودے کی طرح لگانے کے بعد مسلسل اس کی حفاظت اور نگرانی اور نمو وترقی کا کام کیا جاتا رہے اور اس میں جلد بازی اور غفلت کا کوئی عمل دخل نہ ہو، داعیانِ حق کو سب سے زیادہ اس کی ضرورت ہے کہ وہ اس پر مسلسل غور وفکر کرتے رہیں کہ نبی مصطفی ﷺ نے اس عقیدہ کے بارے میں اپنے اصحاب کی تربیت کس انداز سے کی اور اسی تربیت کو وہ اپنے لئے قابلِ عمل اور آئیڈیل بنائیں، اس لئے کہ جاہلیت چاہے قدیم ہو یا جدید، یا مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والی، اس کے سامنے صرف وہی جواں مرد ٹک سکتے ہیں جن کے دلوں میں ربانی عقیدہ کا حسن وجمال جاگزیں ہو گیا ہو اور ان کے دلوں میں شجرِ توحید کی جڑیں مضبوط ہو گئی ہوں۔(دیکھیں: الولاء والبراء، ص171)

اللہ کے رسول ﷺ اپنے اصحاب کو ضبطِ نفس اور صبر سے آراستہ ہونے کی تلقین فرماتے تھے، اسی کے مطابق صحابہ کرام کی تربیت فرماتے تھے، اور تعلق مع اللہ کو مضبوط کرنے اور عبادت کے ذریعہ اللہ کا تقرب حاصل کرنے کی ان کو رہنمائی فرماتے تھے، مکی دور میں ہی یہ آیات نازل ہوئیں:[يٰاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ * قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا * نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا * اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا] ترجمہ:"اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے۔ رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر کم۔ آدھی رات یا اس سے کچھ کم کرلو۔ یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دو، اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو"۔(سورۃ المزمل: 1-4)

سورہ مزمل کی ان آیات نے رہنمائی کی کہ داعیانِ حق کو قیام اللیل کی، مسلسل ذکر کی، تمام امور میں توکل علی اللہ کی، خوبصورتی سے نظرانداز کرنے کی اور اعمالِ صالحہ کے بعد استغفار کرنے کی کتنی ضرورت ہے۔

سورۂ مزمل کی ابتدائی آیات میں نبی کریم ﷺ کو حکم تھا کہ رات کے ایک حصہ کو نماز کے لئے خاص کریں، اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو یہ اختیار دیا تھا کہ وہ نصف رات یا اس سے زیادہ یا کم قیام اللیل کریں، اسی کے پیشِ نظر نبی کریم ﷺ اور آپ کے ساتھ صحابہ کرام نے تقریباً ایک سال تک قیام کیا، یہاں تک کہ ان کے پاؤں میں ورم آتا تھا، اس لئے جب اللہ تعالیٰ نے دیکھا کہ وہ اس کی رضاجوئی اور اس کے حکم کی تنفیذ کے لئے انتہائی محنت ومشقت کر رہے ہیں تو ان پر تخفیف کر کے ان پر مزید رحم کر دیا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَىٰ مِن ثُلُثَيِ ٱلَّيْلِ وَنِصْفَهُۥ وَثُلُثَهُۥ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ ٱلَّذِينَ مَعَكَ ۚ وَٱللَّهُ يُقَدِّرُ ٱلَّيْلَ وَٱلنَّهَارَ ۚ عَلِمَ أَن لَّن تُحْصُوهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۖ فَٱقْرَءُوا۟ مَا تَيَسَّرَ مِنَ ٱلْقُرْءَانِ ۚ عَلِمَ أَن سَيَكُونُ مِنكُم مَّرْضَىٰ ۙ وَءَاخَرُونَ يَضْرِبُونَ فِى ٱلْأَرْضِ يَبْتَغُونَ مِن فَضْلِ ٱللَّهِ ۙ وَءَاخَرُونَ يُقَـٰتِلُونَ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ ۖ فَٱقْرَءُوا۟ مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۚ وَأَقِيمُوا۟ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتُوا۟ ٱلزَّكَوٰةَ وَأَقْرِضُوا۟ ٱللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا ۚ وَمَا تُقَدِّمُوا۟ لِأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِندَ ٱللَّهِ هُوَ خَيْرًا وَأَعْظَمَ أَجْرًا ۚ وَٱسْتَغْفِرُوا۟ ٱللَّهَ ۖ إِنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌۢ ﴿٢٠﴾﴾ ترجمہ:"اے نبیؐ، تمہارا رب جانتا ہے کہ تم کبھی دو تہائی رات کے قریب اور کبھی

آدھی رات اور کبھی ایک تہائی رات عبادت میں کھڑے رہتے ہو،اور تمہارے ساتھیوں میں سے بھی ایک گروہ یہ عمل کرتا ہے،اللہ ہی رات اور دن کے اوقات کا حساب رکھتا ہے،اُسے معلوم ہے کہ تم لوگ اوقات کا ٹھیک شمار نہیں کر سکتے، لہٰذا اس نے تم پر مہربانی فرمائی،اب جتنا قرآن آسانی سے پڑھ سکتے ہو پڑھ لیا کرو، اُسے معلوم ہے کہ تم میں کچھ مریض ہوں گے، کچھ دوسرے لوگ اللہ کے فضل کی تلاش میں سفر کرتے ہیں،اور کچھ اور لوگ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں، پس جتنا قرآن بآسانی پڑھا جاسکے پڑھ لیا کرو، نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور اللہ کو اچھا قرض دیتے رہو جو کچھ بھلائی تم اپنے لئے آگے بھیجو گے اسے اللہ کے ہاں موجود پاؤ گے، وہی زیادہ بہتر ہے اور اس کا اجر بہت بڑا ہے،اللہ سے مغفرت مانگتے رہو، بے شک اللہ بڑا غفور ورحیم ہے"۔(سورۃ المزمل: 20)

صحابہ کرام کا امتحان کئی چیزوں میں تھا: نرم بستروں کے بارے میں، نیند اور مرغوباتِ نفس کا مقابلہ کرنے کے بارے میں، تاکہ مجاہدہ کے سلسلہ میں اور خواہشاتِ نفس سے آزاد ہونے کے سلسلہ میں ان کی تربیت ہو سکے،اور یہ سب زمامِ قیادت اور رہبری کا کام سنبھالنے کے لئے تمہید تھی، کیونکہ روحانی اعتبار سے ان کو بہترین انداز سے تیار کرنا ضروری تھا،اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغام کو اٹھانے کی ذمہ داری سنبھالنے کے لئے ان کا انتخاب کیا تھا،ان کو اپنی دعوت کا امین بنایا تھا اور لوگوں کے لئے ان کو گواہ بنایا تھا، چنانچہ اس تاریخی مرحلہ میں دسیوں اہلِ ایمان کے سامنے لوگوں کو توحید کی دعوت دینے کا اور ان کو شرک سے نجات دلانے کا عظیم مشن تھا،اور یہ ایسی عظیم ذمہ داری ہے جس کی تنفیذ پر اور اس سے عہدہ برآ ہونے پر وہی لوگ قادر ہو سکتے ہیں جن کی صفات اللہ تعالیٰ یوں بیان فرماتا ہے:[تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ] ترجمہ:"اُن کے پہلو بستروں سے الگ رہتے ہیں،اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے ہیں،اور جو کچھ رزق ہم نے اُنہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں"۔ (سورۃ السجدہ: 16)

اللہ تعالیٰ نے قیام اللیل کو، رات میں نماز پڑھنے کو اور ترتیل کے ساتھ قرآن پڑھنے کو اپنے اس قول کے ذریعہ بیان کیا ہے[:اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا] ترجمہ:"درحقیقت رات کا اٹھنا نفس پر قابو پانے کے لئے بہت کارگر اور قرآن ٹھیک پڑھنے کے لئے زیادہ موزوں ہے"۔ (سورۃ المزمل:6) سکون کے وقت رات میں قرآن کا دل پر زیادہ اثر ہوتا ہے،اس لئے کہ اس وقت دل پر ہر قسم کے شواغل سے خالی ہوتا ہے،اور دن کی مشغولیات اور دنیاوی تعلقات اور روابط سے دور رہتے ہوئے وہ ذکر و مناجات کے لئے فارغ ہوتا ہے، اور اس طرح سے وحی الٰہی کو حاصل کرنے کے لئے لازمی تیاری متحقق ہو جاتی ہے،اس عظیم تیاری کا اثر ابتدائی مسلمانوں پر ظاہر ہوا اور وہ دعوت و جہاد کا بارِ گراں اٹھانے اور مدینہ منورہ میں اسلامی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے، وہ اسلام کے تئیں انتہائی مخلص تھے اور دنیا میں اسلام کو قائم کرنے اور عام کرنے کے سلسلہ میں قربانیاں رہنے میں بھی وہ انتہائی اخلاص سے سرشار تھے۔(دیکھیں: السیرۃ النبویہ الصحیحۃ: 160/1)

نبی کریم ﷺ داخلی محاذ کو طاقتور اور مضبوط بنانے پر پوری توجہ مرکوز کئے ہوئے تھے اور آپ ﷺ پُرعزم تھے کہ صحابہ کرام کے دلوں میں ایک طاقتور عقیدہ راسخ کیا جائے جو کسی تزلزل اور نرمی کا شکار نہ ہو،اور یہ ایک بلند و قوی معنوی روحانی طاقت کا سرچشمہ تھا جس کے

ذریعہ دفاع کرنااور دعوت کی راہ میں ہر قسم کی اذیت وتکلیف برداشت کرنا آسان ہو جاتا ہے، اولین جماعت مؤاخاۃ کے نتیجہ میں ایک ایسی منظم و مستحکم وحدت بن گئی تھی جس پر دشمن کے کسی طرح کے نفسیاتی حملے اثرانداز نہیں ہوتے تھے، اور نہ ہی ان کو اس جماعت میں گھسنے کی کوئی جگہ ملتی تھی، اسلام میں دینی اخوت کا رابطہ خونی اور نسبی رابطہ پر غالب آنے لگا۔

اہلِ ایمان کے اولین گروہ نے محبت و مودّت اور ایثار واخوت کے عظیم جذبات و معانی کے ساتھ زندگی بسر کی، رسول اللہ ﷺ کی احادیث صحابہ کرام کے دلوں میں اپنے اثرات دکھاتی تھیں، رسول اللہ ﷺ مسلمانوں کو اخوت و ترابط، تعاون اور مصیبت و آلام میں دوسروں کے کام آنے کی ترغیب دیتے تھے، اور یہ سب کام اللہ کی رضاجوئی کے لئے کرنے کی تلقین کرتے تھے، یہی وہ بنیادیں ہیں جو اسلامی اخوت کے استحکام و تسلسل اور اسلامی معاشرہ کی مضبوطی کا اصل راز ہیں، اللہ کے رسول ﷺ نے صحابہ کرام کے سامنے اس حدیث کو بیان فرمایا تھا کہ فرمان الٰہی ہے: "میرے جلال کی وجہ سے آپس میں محبت کرنے والوں کے لئے نور کے ممبر ہوں گے، انبیاء اور شہداء بھی ان پر رشک کریں گے"۔ (سنن ترمذی: 2390، مسند احمد: 239/5، الحرب النفسیۃ ضد الاسلام، د۔عبدالوہاب کحیل، ص128)

اس طرح سے سچی اخوت اعمال کی کسوٹی اور معیار قرار پائی اور اللہ کے لئے محبت افضل ترین عمل قرار پائی، اور اللہ کے نزدیک یہ افضل ترین مقام قرار پایا، رسول ﷺ نے مسلمانوں کو اس بات سے ڈرایا ہے کہ یہ ربط و تعلق کمزور نہ پڑ جائے اور اس کی حفاظت کے لئے ان کو بنیاد فراہم کرتے ہوئے فرمایا: ’’ایک دوسرے سے بغض مت کرو، نہ ہی ایک دوسرے سے حسد کرو، ایک دوسرے سے دشمنی نہ کرو اور اللہ کے بندے اور بھائی بھائی بن کر رہو، کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ قطع تعلق رکھے‘‘۔(صحیح بخاری: 6076، صحیح مسلم: 2559)

نبی کریم ﷺ نے معاشرہ کو اندرونی طور پر مربوط رکھنے کے لئے اور داخلی محاذ کو متحد رکھنے کے لئے معاشرہ کے تمام افراد کے مابین مساوات قائم فرمائی اور ان کو مکمل حریت و آزادی فراہم کی، تاکہ وہ کسی طرح کی بھی نفسیاتی جنگ کا بھرپور مقابلہ کر سکیں، جو بھی شخص اس معاشرہ کا حصہ بنتا تھا تو آزادی کے ساتھ اس کا حصہ بنتا تھا، اور پھر اس کو اس معاشرہ میں کوئی بھی رائے قائم کرنے، اس کے اظہار اور مشورہ کی بھی آزادی ہوتی ہے، نبی کریم ﷺ نے تمام انسانوں کے مابین مساوات کا اصول فراہم کیا، حاکم و محکوم، مالدار اور فقیر اور معاشرہ کے تمام طبقے مساوات کے اصول پر قائم تھے، اور اس عظیم اصول کا نبی ﷺ کے متبعین کے دلوں میں زبردست اثر تھا، آپؐ نے ان کو ایسا بنادیا کہ وہ ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے، ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ و تعلق میں مثال بن گئے، اور اس عظیم ضابطہ کے لئے اپنی جان قربان کرنے لگے، اور اپنے پاس موجود ہر طاقت وصلاحیت کے ذریعہ اس کا دفاع کرنے لگے، نبی کریم ﷺ انسانوں کے مابین ان کی اصل، حسب ونسب، وراثت یا رنگ کی وجہ سے کسی طرح کے فرق کو تسلیم نہیں کرتے تھے، حسب و نسب، قوم اور رنگ کی وجہ سے حقوق و واجبات یا عبادات میں کوئی فرق نہیں ہوتا ہے، بلکہ اللہ کے نزدیک تمام انسان برابر ہیں اور جب مکہ کے سرداروں نے رسول اللہ ﷺ سے مطالبہ کیا کہ ان کے لئے مخصوص مجلس ہو جس میں غلام اور کمزور شامل نہ ہوں اور وہ سب ایک ہی مجلس میں جمع نہ ہوں تو اللہ کے رسول ﷺ نے واضح کردیا کہ وحی وہدایت کے حصول میں تمام انسان برابر ہیں۔

کفارِ مکہ اور وہاں کے سرداروں نے اس وقت غلاموں کے ساتھ اور ان لوگوں کے ساتھ بیٹھنے سے انکار کر دیا جن کو وہ کمزور اور حقیر سمجھتے تھے اور اسی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں: [وَاصۡبِرۡ نَفۡسَكَ مَعَ الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ بِالۡغَدٰوةِ وَالۡعَشِىِّ يُرِيۡدُوۡنَ وَجۡهَهٗ وَلَا تَعۡدُ عَيۡنٰكَ عَنۡهُمۡ ۚ تُرِيۡدُ زِيۡنَةَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۚ وَ لَا تُطِعۡ مَنۡ اَغۡفَلۡنَا قَلۡبَهٗ عَنۡ ذِكۡرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰٮهُ وَكَانَ اَمۡرُهٗ فُرُطًا] ترجمہ: ''اور اپنے دل کو اُن لوگوں کی معیت پر مطمئن کرو جو اپنے رب کی رضا کے طلبگار بن کر صبح و شام اُسے پکارتے ہیں، اور اُن سے ہر گز نگاہ نہ پھیرو کیا تم دنیا کی زینت پسند کرتے ہو؟ کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جس نے اپنی خواہشِ نفس کی پیروی اختیار کر لی ہے اور جس کا طریق کار افراط و تفریط پر مبنی ہے''۔ (سورۃ الکہف: 28) دوسری جگہ ارشاد ہے: [وَلَا تَطۡرُدِ الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ بِالۡغَدٰوةِ وَالۡعَشِىِّ يُرِيۡدُوۡنَ وَجۡهَهٗ ؕ مَا عَلَيۡكَ مِنۡ حِسَابِهِمۡ مِّنۡ شَىۡءٍ وَّمَا مِنۡ حِسَابِكَ عَلَيۡهِمۡ مِّنۡ شَىۡءٍ فَتَطۡرُدَهُمۡ فَتَكُوۡنَ مِنَ الظّٰلِمِيۡنَ ٭ وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعۡضَهُمۡ بِبَعۡضٍ لِّيَـقُوۡلُوۡۤا اَهٰٓؤُلَۤاءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ مِّنۡۢ بَيۡنِنَا ؕ اَلَـيۡسَ اللّٰهُ بِاَعۡلَمَ بِالشّٰكِرِيۡنَ] ترجمہ: ''اور جو لوگ اپنے رب کو رات دن پکارتے رہتے ہیں اور اس کی خوشنودی کی طلب میں لگے ہوئے ہیں انہیں اپنے سے دور نہ پھینکو، اُن کے حساب میں سے کسی چیز کا بار تم پر نہیں ہے اور تمہارے حساب میں سے کسی چیز کا بار اُن پر نہیں، اس پر بھی اگر تم انہیں دور پھینکو گے تو ظالموں میں شمار ہو گے۔ دراصل ہم نے اس طرح ان لوگوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعہ سے آزمائش میں ڈالا ہے تاکہ وہ انہیں دیکھ کر کہیں "کیا یہ ہیں وہ لوگ جن پر ہمارے درمیان اللہ کا فضل و کرم ہوا ہے؟" ہاں! کیا خدا اپنے شکر گزار بندوں کو اِن سے زیادہ نہیں جانتا ہے؟''(سورۃ الانعام: 52-53)

بلکہ نبی کریم ﷺ نے جب نابینا صحابی حضرت ابن ام مکتومؓ سے اعراض فرمایا اور بعض سرداروں کے ساتھ گفتگو فرماتے رہے تو اللہ تعالیٰ نے اس پر سخت سرزنش کی، جیسے کہ سورۂ عبس کی آیات میں ہے: ﴿عَبَسَ وَتَوَلَّىٰٓ ۝١ أَن جَآءَهُ ٱلۡأَعۡمَىٰ ۝٢ وَمَا يُدۡرِيكَ لَعَلَّهُۥ يَزَّكَّىٰٓ ۝٣ أَوۡ يَذَّكَّرُ فَتَنفَعَهُ ٱلذِّكۡرَىٰٓ ۝٤ أَمَّا مَنِ ٱسۡتَغۡنَىٰ ۝٥ فَأَنتَ لَهُۥ تَصَدَّىٰ ۝٦ وَمَا عَلَيۡكَ أَلَّا يَزَّكَّىٰ ۝٧ وَأَمَّا مَن جَآءَكَ يَسۡعَىٰ ۝٨ وَهُوَ يَخۡشَىٰ ۝٩ فَأَنتَ عَنۡهُ تَلَهَّىٰ ۝١٠ كَلَّآ إِنَّهَا تَذۡكِرَةٌ ۝١١ فَمَن شَآءَ ذَكَرَهُۥ ۝١٢﴾ ترجمہ: ''پیغمبر چیں بجیں (ناخوش) ہوئے اور منہ موڑ لیا۔ کہ ان کے پاس ایک نابینا آیا۔ اور آپ کو کیا معلوم کہ شاید وہ پاک ہو جائے۔ یا وہ نصیحت پکڑلے تو اس کو نصیحت نفع دے۔ لیکن وہ جو پروا نہیں کرتا۔ سو آپ کے لئے توجہ کرتے ہیں۔ حالانکہ آپ پر اس کے نہ سدھرنے کا کوئی الزام نہیں۔ اور لیکن جو آپ کے پاس دوڑتا ہوا آیا۔ اور وہ ڈر رہا ہے۔ تو آپ اس سے بے پروائی کرتے ہیں۔ ایسا نہیں چاہیے بے شک یہ تو ایک نصیحت ہے۔ پس جو چاہے اس کو یاد کرے''۔ (سورۃ عبس: 1-12)

اسلامی معاشرہ کو مربوط و متحد رکھنے کے لئے اور داخلی محاذ کو قوی اور مستحکم رکھنے کے لئے نبی کریم ﷺ نے سب سے اہم ترین وسیلہ یہ اختیار کیا کہ مسلمانوں کے مابین مادی اور معنوی تکافل قائم کیا، تاکہ طاقتور کمزور کی مدد کرے اور مالدار فقیر کے ساتھ شفقت کا معاملہ کرے،

نبی کریم ﷺ نے ایک بھی جگہ ایسی نہیں چھوڑی جہاں سے اس پہلی اسلامی صف کے خلاف نفسیاتی جنگ چھیڑی جاسکے اور پہلی اسلامی جماعت ایک عظیم چٹان کی طرح بن گئی جس کے سامنے وہ تمام کوششیں اور منصوبے ناکام ہوگئے جو زعمائے مکہ نے اس دعوت کے خاتمے کے لئے تیار کئے تھے۔(دیکھیں: الحرب النفسیۃ ضد الاسلام، ص،125-140)

6: صحابہ کرام کی نفسیاتی کیفیت کو بلند کرنے میں قرآن کریم کا اثر:

ایک طرف تو قرآن کریم اہلِ ایمان کے حوصلے بلند کرنے میں اہم کردار ادا کر رہا تھا اور دوسری طرف کفار کو عذاب کی دھمکی دینے میں بھی اس کی زبردست اثرانگیزی تھی جس کا ان پر ایٹم بم کا سا اثر ہوتا تھا، صحابہ کرام کی طرف سے قرآنِ کریم کا دفاع دو پہلوؤں پر مرکوز تھا:

ا)اللہ کے رسول ﷺ کو اہلِ ایمان کی رعایت ونگہداشت کرنے،ان کو ہمنشین بنانے اور ان کا استقبال کرنے کی ترغیب دی گئی اور بعض ان مواقف پر آپ ﷺ کی سرزنش بھی کی گئی دعوتی امور میں مشغول ہونے کی وجہ سے جن میں آپ ﷺ بعض صحابہ کرام کی جانب توجہ نہیں دے پاتے تھے۔

۲)صحابہ کرامؓ کو تسلی دی جاتی تھی، ان کے سامنے امم سابقہ اور انبیاء کے واقعات اور مثالیں بیان کی جاتی تھیں اور ان کو لاحق ہونے والے عذاب اور تکلیف کو بھی بیان کیا جاتا تھا، ایسا اس لئے کیا جاتا تھا تاکہ وہ صبر وثبات اختیار کریں اور ابتلاء وآزمائش کو ہلکا سمجھیں،اسی طرح امم سابقہ اور انبیاء کے بعض اعمال ومواقف کی تعریف کی جاتی تھی اور ساتھ میں اجر وثواب اور جنت کی ہمیشہ رہنے والی نعمتوں کا وعدہ کیا جاتا تھا، اسی طرح ان کے اعداء اور دشمنوں کی مذمت کی جاتی تھی جو ان کو آلام وایذاء کا نشانہ بناتے تھے۔(الحرب النفسیۃ ضد الاسلام، ص269)

جہاں تک پہلے پہلو کا تعلق ہے تو نبی کریم ﷺ جب مسجد حرام میں حضرت حضرت خبابؓ، حضرت عمارؓ، صفوان بن امیہ کے غلام ابن فکیہ یسارؓ، حضرت صہیبؓ اور ان جیسے کمزور سمجھے جانے والے صحابہ کرامؓ کے ساتھ بیٹھتے تھے تو قریش کے لوگ ان کا مذاق اڑاتے تھے اور وہ ایک دوسرے سے کہتے تھے: یہ ہیں ان کے اصحاب جن کو تم دیکھ ہی رہے ہو! پھر کہتے تھے: کیا یہی ہیں وہ لوگ جن پر اللہ نے ہمارے مقابلہ میں حق اور ہدایت کی نوازش کی ہے۔ محمدؐ جو کچھ لے کر آئے ہیں اگر وہ بہتر ہوتا تو ہمارے مقابلہ میں یہ لوگ اس کی طرف سبقت نہ کرتے اور نہ ہی اللہ ہمیں چھوڑ کر ان کو چن لیتا۔(أیضاً، ص:270- 271)

اللہ تعالیٰ نے ان کفار کے استہزاء کا رد کیا ہے،اور ان کے سامنے یہ واضح کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا بندوں کی دنیاوی مقام ومرتبہ پر موقوف نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے اس بات کو رسول ﷺ کے لئے بھی اس مفہوم کو واضح کر دیا ہے تاکہ آپ ﷺ کفار کی ان باتوں سے متاثر نہ ہوں اور اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کے مقام ومرتبہ کو بھی بیان کیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: [وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۵۲ وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَاۗءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ۭ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ۝۵۳ وَاِذَا جَاۗءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰي نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْۗءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۵۴] ترجمہ:”اور جو لوگ

صبح وشام اپنے پروردگار سے دعا کرتے ہیں (اور) اس کی ذات کے طالب ہیں ان کو (اپنے پاس سے) مت نکالو۔ ان کے حساب (اعمال) کی جوابدہی تم پر کچھ نہیں اور تمہارے حساب کی جوابدہی ان پر کچھ نہیں (پس ایسا نہ کرنا) اگر ان کو نکالو گے تو ظالموں میں ہو جاؤ گے۔ اور اسی طرح ہم نے بعض لوگوں کی بعض سے آزمائش کی ہے کہ (جو دولتمند ہیں وہ غریبوں کی نسبت) کہتے ہیں کیا یہی لوگ ہیں جن پر خدا نے ہم میں سے فضل کیا ہے (خدا نے فرمایا) بھلا خدا شکر کرنے والوں سے واقف نہیں؟۔ اور جب تمہارے پاس ایسے لوگ آیا کریں جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں تو (ان سے) سلام علیکم کہا کرو، خدا نے اپنی ذات (پاک) پر رحمت کو لازم کر لیا ہے کہ جو کوئی تم میں نادانی سے کوئی بری حرکت کر بیٹھے پھر اس کے بعد توبہ کرلے اور نیکوکار ہو جائے تو وہ بخشنے والا مہربان ہے"۔ (سورۃ الأنعام: 52-54)

اسی طرح سے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کے سامنے صحابہ کرام کا مقام و مرتبہ بیان کیا جس سے کفار یا تو ناواقف تھے یا بتکلف ناواقف بنتے تھے، اور ان کو ایذاء و تکلیف پہنچانے کی کوشش کرتے تھے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو انہیں دور کرنے سے بھی منع کر دیا، اسی طرح ان کو اچھے انداز سے سلام کرنے اور انہیں مغفرت و توبہ کی خوش خبری دینے کا حکم بھی دیا۔

اس روح افزا خوشخبری کے بعد صحابہ کرام کی معنوی و نفسیاتی کیفیت کیسی رہی ہو گی؟ اور وہ کفار کی ایذاء کا احساس کیوں کر سکتے تھے؟! بلکہ وہ اس ایذاء پر خوش ہوں گے جس کی وجہ سے وہ ان عظیم درجات تک پہنچیں گے۔ (دیکھیں: الحرب النفسیۃ ضد الاسلام: ص270- 271)

اس کے بعد ان آیات کو بھی ملاحظہ فرمائیں جن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو سرزنش کی اور ان آیات کی تلاوت تا قیامِ قیامت ہوتی رہے گی، یہ سرزنش صحابہ کرام میں سے ایک نابینا اور غریب صحابی کی وجہ سے کی گئی جن سے اللہ کے رسول ﷺ نے صرف ایک مرتبہ اعراض فرمایا اور اشرافِ مکہ کو دعوت دینے میں مشغول ہونے کی وجہ سے ان کے سوال کا جواب نہ دے سکے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: [عَبَسَ وَتَوَلّٰى (1) اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى (2) وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰى (3) اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى (4) اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى (5) فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى (6) وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى (7) وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى (8) وَهُوَ يَخْشٰى (9) فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى (10)] ترجمہ: "پیغمبر چیں بجبیں (ناخوش) ہوئے اور منہ موڑ لیا۔ کہ ان کے پاس ایک نابینا آیا۔ اور آپ کو کیا معلوم کہ شاید وہ پاک ہو جائے۔ یا وہ نصیحت پکڑ لے تو اس کو نصیحت نفع دے۔ لیکن وہ جو پروا نہیں کرتا۔ سو آپ کے لئے توجہ کرتے ہیں۔ حالانکہ آپ پر اس کے نہ سدھرنے کا کوئی الزام نہیں۔ اور لیکن جو آپ کے پاس دوڑتا ہوا آیا۔ اور وہ ڈر رہا ہے۔ تو آپ اس سے بے پروائی کرتے ہیں"۔ (سورہ عبس: 1- 10)

حق کی دعوت میں حسب و نسب یا مال و جاہ کے امتیازات کی کوئی جگہ نہیں ہے، حق کی دعوت کا مقصد ہی یہ ہے کہ انسان کو اس کے اصل مقام سے اور اصل وحدت سے آگاہ کیا جائے اور مساوات و برابری کا حکم دیا جائے، اس سے یہ بات سمجھی جا سکتی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کے بارے میں اسلوب میں شدت کیوں اختیار کی گئی، اس لئے کہ آپ ﷺ نے حضرت ابن ام مکتوم کے بجائے ابی بن خلف کو زیادہ للائقِ اعتناء سمجھا، حالانکہ حق کی میزان میں حضرت ابن ام مکتوم کا وزن اتنا زیادہ ہے کہ ابی بن خلف جیسے کروڑوں لوگ بھی ان کے ہم پلہ نہیں ہو سکتے ہیں۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویہ الصحیحۃ 167/1)

اس واقعہ میں بہت سے دروس واسباق ہیں جن کو صحابہ کرام اور بعد کے مسلمانوں نے اخذ کیا ہے، ان اسباق میں سے اہم ترین درس یہ ہے کہ اہلِ ایمان کو اپنی توجہ کا سب سے زیادہ مستحق سمجھا جائے، اس لئے کہ داعیوں کی اصل ذمہ داری ابلاغ ہے، کسی کو ہدایت دینا ان کی ذمہ داری نہیں ہے، اسی طرح حضرت عبداللہ بن ام مکتومؓ کے قصہ میں محمد ﷺ کی نبوت کی دلیل بھی ہے، چنانچہ اگر ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول نہ ہوتے تو اس واقعہ کو ضرور چھپا دیتے، اور لوگوں کو اس کے بارے میں آگاہ نہ کرتے، اس لئے کہ اس میں آپؐ کے لئے عتاب ہے، اگر آپؐ وحی میں سے کچھ بھی مخفی رکھتے تو ان آیات اور حضرت زیدؓ اور حضرت زینبؓ کے قصے سے متعلق آیات کو مخفی رکھتے، اس لئے داعیانِ حق کی ذمہ داری ہے کہ اہل خیر و اہلِ ایمان کو مقدم رکھیں۔ (دیکھیں: تفسیر ابن عطیہ 316/15، تفسیر القاسمی: 54/17، المستفاد من قصص القرآن، عبدالکریم زیدان: 89/2)

جہاں تک دوسرے پہلو یعنی قرآن کریم کا صحابہ کرام کی طرف سے دفاع کرنے کا تعلق ہے تو اس کا طریقہ یہ تھا کہ صحابہ کرام کے سامنے ابتلاء و آزمائش کو ایک محبوب چیز بنا کر پیش کیا جاتا تھا، اور یہ واضح کیا جاتا تھا کہ یہ ابتلاء و آزمائش کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے بھی اس سے سخت آزمائشیں آتی رہی ہیں، نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور تمام انبیاء کی زندگیوں کے واقعات بیان کر کے مسلمانوں کو مزید استقامت اختیار کرنے، قربانی کی روح کو پروان چڑھانے اور دین کی وجہ سے صبر اختیار کرنے کی تلقین کی جاتی تھی، سابقہ زمانہ کے بہترین نمونوں کو بیان کیا جاتا تھا، اس لئے کہ قرآنِ کریم کے واقعات بہت سے عبرتوں، نصیحتوں اور حکمتوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔

اسی طرح صحابہ کرام کی طرف سے دفاع کا ایک اسلوب یہ بھی تھا کہ ان کی اور ان کے اعمال کی قرآنِ کریم میں مدح وستائش کی جاتی تھی اور اس مدح و تعریف کو تا قیامِ قیامت لوگ تلاوت کرتے رہیں گے، جیسے کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے جب سات صحابہ کرام کو آزاد کیا اور ان کو ایذاء اور تعذیب سے آزادی دلائی تو قرآن نے ان کی مدح و تعریف کی، اسی طرح امیہ بن خلف کی بھی مذمت کی جو حضرت بلال بن رباحؓ کو سزائیں دیتا تھا، چناچہ قرآنِ کریم نے اخلاقی ضابطہ کے مطابق ثواب وعقاب کے قواعد کو بیان کیا ہے اور مخالفین کو ڈرایا ہے، یہ اسلوبِ بیان اپنے اندر گہرے معانی رکھتا ہے جس نے صحابہ کرام کے لئے راہِ حق کو روشن و منور کر دیا، جبکہ یہی اسلوب اہلِ کفر و نفاق کے لئے باعثِ غم و تکلیف بنتا تھا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: [فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى (14) لَا يَصْلٰىهَآ اِلَّا الْاَشْقَى (15) الَّذِيْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى (16) وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى (17) الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى (18) وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى (19) اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى (20) وَلَسَوْفَ يَرْضٰى (21)]

ترجمہ: "پس میں نے تمہیں بھڑکتی ہوئی آگ سے ڈرایا ہے۔ جس میں صرف وہی بدبخت داخل ہوگا۔ جس نے جھٹلایا اور منہ موڑا۔ اور اس آگ سے وہ بڑا پرہیزگار دور رہے گا۔ جو اپنا مال دیتا ہے تاکہ وہ پاک ہو جائے۔ اور اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں کہ جس کا بدلہ دیا جائے۔ وہ تو صرف اپنے سب سے برتر رب کی رضامندی کے لئے دیتا ہے۔ اور وہ عنقریب خوش ہو جائے گا"۔ (سورۃ الیل: 21-14)

اسی طرح قرآن کریم نے نجران کے عیسائیوں کے وفد کی اسلام پر ثابت قدمی کو جاوداں بنا دیا ہے، حالانکہ کفار ان کا استہزاء کر رہے تھے اور ان کو اسلام سے روکنے کی کوشش کر رہے تھے، اسی لئے ان کے بارے میں قرآن کریم کی بعض آیات نازل ہوئیں، ارشاد باری تعالیٰ

ہے: [اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰہُمُ الۡکِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِہٖ ہُمۡ بِہٖ یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿﴾ وَ اِذَا یُتۡلٰی عَلَیۡہِمۡ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِہٖۤ اِنَّہُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّنَاۤ اِنَّا کُنَّا مِنۡ قَبۡلِہٖ مُسۡلِمِیۡنَ ﴿﴾ اُولٰٓئِکَ یُؤۡتَوۡنَ اَجۡرَہُمۡ مَّرَّتَیۡنِ بِمَا صَبَرُوۡا وَ یَدۡرَءُوۡنَ بِالۡحَسَنَۃِ السَّیِّئَۃَ وَ مِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ ﴿﴾] ترجمہ: ''جن لوگوں کو اس سے پہلے ہم نے کتاب دی تھی وہ اِس (قرآن) پر ایمان لاتے ہیں۔ اور جب یہ اُن کو سُنایا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ "ہم اِس پر ایمان لائے، یہ واقعی حق ہے، ہمارے رب کی طرف سے، ہم تو پہلے ہی سے مسلم ہیں"۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ان کا اجر دو بار دیا جائے گا اُس ثابت قدمی کے بدلے جو انہوں نے دکھائی، وہ بُرائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں اور جو کچھ رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں''۔ (سورۃ القصص: 52-55)

قرآنی آیات صحابہ کرام کو عظیم الشان اجر و ثواب اور جنت کی ہمیشہ رہنے والی نعمتوں کی خوشخبری سناتی تھیں، تاکہ وہ دعوت کے راستے پر گامزن رہیں اور کسی طرح کے استہزاء اور مذاق، ایذاء و تکلیف کی پرواہ نہ کریں، اس لئے کہ نصرت و غلبہ بالآخر انہی کے مقدر میں ہے، اسی طرح قرآنِ کریم اَعدائے دین اور کفارِ مکہ کے انجامِ بد کو بھی بیان کرتا تھا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: [اِنَّا لَنَنۡصُرُ رُسُلَنَا وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ یَوۡمَ یَقُوۡمُ الۡاَشۡہَادُ ﴿﴾ یَوۡمَ لَا یَنۡفَعُ الظّٰلِمِیۡنَ مَعۡذِرَتُہُمۡ وَ لَہُمُ اللَّعۡنَۃُ وَ لَہُمۡ سُوۡٓءُ الدَّارِ ﴿﴾] ترجمہ: '' یقین جانو کہ ہم اپنے رسولوں اور ایمان لانے والوں کی مدد اِس دنیا کی زندگی میں بھی لازماً کرتے ہیں، اور اُس روز بھی کریں گے جب گواہ کھڑے ہوں گے۔ جب ظالموں کو ان کی معذرت کچھ بھی فائدہ نہ دے گی اور اُن پر لعنت پڑے گی اور بدترین ٹھکانا اُن کے حصے میں آئے گا''۔ (سورۃ غافر: 51-52)

اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کے قرآن کریم کو مضبوطی سے تھامنے اور اس پر ایمان لانے کی بھی مداح و ستائش کی ہے، ارشاد ربانی ہے: [اِنَّ الَّذِیۡنَ یَتۡلُوۡنَ کِتٰبَ اللّٰہِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اَنۡفَقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ سِرًّا وَّ عَلَانِیَۃً یَّرۡجُوۡنَ تِجَارَۃً لَّنۡ تَبُوۡرَ ﴿﴾ لِیُوَفِّیَہُمۡ اُجُوۡرَہُمۡ وَ یَزِیۡدَہُمۡ مِّنۡ فَضۡلِہٖ ؕ اِنَّہٗ غَفُوۡرٌ شَکُوۡرٌ ﴿﴾] ترجمہ: ''جو لوگ کتاب اللہ کی تلاوت کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں، اور جو کچھ ہم نے اُنہیں رزق دیا ہے اس میں سے کھلے اور چھپے خرچ کرتے ہیں، یقیناً وہ ایک ایسی تجارت کے متوقع ہیں جس میں ہر گز خسارہ نہ ہوگا۔ (اس تجارت میں انہوں نے اپنا سب کچھ اِس لئے کھپایا ہے) تاکہ اللہ اُن کے اجر پورے کے پورے اُن کو دے اور مزید اپنے فضل سے ان کو عطا فرمائے، بے شک اللہ بخشنے والا اور قدردان ہے''۔ (سورۃ فاطر: 29-30)

اللہ تعالیٰ نے مضبوطی کے ساتھ عبادت کی راہ پر گامزن رہنے کی فضیلت بھی بیان کی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: [اَمَّنۡ ہُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّیۡلِ سَاجِدًا وَّ قَآئِمًا یَّحۡذَرُ الۡاٰخِرَۃَ وَ یَرۡجُوۡا رَحۡمَۃَ رَبِّہٖ ؕ قُلۡ ہَلۡ یَسۡتَوِی الَّذِیۡنَ یَعۡلَمُوۡنَ وَ الَّذِیۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ؕ اِنَّمَا یَتَذَکَّرُ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ﴿﴾ قُلۡ یٰعِبَادِ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوۡا رَبَّکُمۡ ؕ لِلَّذِیۡنَ اَحۡسَنُوۡا فِیۡ ہٰذِہِ الدُّنۡیَا حَسَنَۃٌ ؕ وَ اَرۡضُ اللّٰہِ وَاسِعَۃٌ ؕ اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوۡنَ اَجۡرَہُمۡ بِغَیۡرِ حِسَابٍ ﴿﴾] ترجمہ: ''(کیا اِس شخص کی روش بہتر ہے یا اُس شخص کی) جو مطیع فرمان ہے، رات کی گھڑیوں میں کھڑا رہتا اور سجدے کرتا ہے، آخرت سے ڈرتا اور اپنے رب کی رحمت سے امید لگاتا ہے؟ اِن سے پوچھو، کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے دونوں کبھی یکساں ہو سکتے ہیں؟ نصیحت تو عقل رکھنے والے ہی قبول کرتے ہیں۔ (اے نبیؐ) کہو کہ اے میرے بندو، جو ایمان لائے ہو، اپنے رب سے ڈرو جن لوگوں نے اِس دنیا میں

نیک رویہ اختیار کیا ہے ان کے لئے بھلائی ہے اور خدا کی زمین وسیع ہے، صبر کرنے والوں کو تو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا"۔ (سورۃ الزمر: 9-10)

یہ اسلوب تھا کہ قرآنِ کریم کا جس کے ذریعہ صحابہ کرام کو تسلی دی جاتی ہے، ان کا دفاع کیا جاتا تھا اور نفسیاتی جنگ میں ان کو قوت فراہم کی جاتی تھی، اسی لئے مختلف قسم کے جملوں کا اور تعذیب کے متنوع وسائل کا صحابہ کرام پر کوئی اثر نہیں پڑا، مشرکین کے تمام وسائل و اسالیب صحیح عقیدہ اور بہترین منہج کے سامنے ناکام و نامراد ہوئے۔

7: مذکرات اور ڈائیلاگ کا اسلوب:

ایک روز تمام مشرکین جمع ہوئے اور کہنے لگے: کوئی ایسا شخص دیکھو جو تم میں جادو، کہانت اور شعر و شاعری کا سب سے زیادہ علم رکھتا ہو، وہ اس شخص کے پاس جائے جس نے ہمارے درمیان تفریق کر دی ہے، ہمارے شیرازہ کو بکھیر دیا ہے، اور ہمارے دین کی عیب جوئی کی ہے، وہ اس شخص سے بات کرلے اور دیکھے کہ کیا جواب دیتے ہیں؟ سب نے کہا: عتبہ بن ربیعہ سے بہتر کوئی یہ کام نہیں کر سکتا ہے۔ سب نے کہا: اے ابو لولید! آپ ہی یہ کر سکتے ہیں! عتبہ آپؐ کے پاس آیا اور کہا: اے محمد! آپ بہتر ہو یا عبدالمطلب؟ اللہ کے رسول ﷺ خاموش رہے۔ اس نے کہا: اگر آپ یہ سمجھتے ہو کہ یہ لوگ آپ سے بہتر ہیں تو انہوں نے ان معبودوں کی عبادت کی ہے جن کی آپ نے عیب جوئی کی ہے، اور اگر آپ یہ سمجھتے ہو کہ آپ ان سے بہتر ہو تو اس پر بات کریں تا کہ ہم آپ کی بات سن لیں، واللہ! ہم نے کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا ہے جو قوم کے لئے آپ سے زیادہ باعثِ ننگ و عار ہو! آپ نے ہمارے درمیان تفریق پیدا کر دی ہے، ہمارا شیرازہ پاش پاش کر دیا ہے، آپ نے ہمارے دین کی عیب جوئی کی ہے اور پورے عربوں میں ہمیں رسوا کر دیا ہے، یہاں تک کہ ان میں یہ مشہور ہو گیا ہے کہ قریش میں ایک جادو گر ہے اور ان کے ہاں ایک کاہن ہے، واللہ! اب تو ہمیں کسی آفت ہی کا انتظار ہے کہ ہم ایک دوسرے کے خلاف تلوار اٹھائیں یہاں تک کہ سب ختم ہو جائیں۔

ارے جناب! اگر آپ کو کوئی ضرورت ہے تو ہم آپ کے لئے اپنا مال جمع کریں گے، یہاں تک کہ آپ قریش میں سب سے بڑے مالدار بن جائیں گے، اگر آپ کو نکاح کی ضرورت ہے تو قریش کی جس خاتون سے چاہو ہم آپ کو دس عورتوں سے نکاح کرا دیں گے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: آپ کی بات مکمل ہو گئی؟! اس نے کہا: ہاں! آپ نے فرمایا: [حٰمٓ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝] ترجمہ: "حم۔ یہ خدائے رحمان و رحیم کی طرف سے نازل کردہ چیز ہے۔ ایک ایسی کتاب جس کی آیات خوب کھول کر بیان کی گئی ہیں، عربی زبان کا قرآن، اُن لوگوں کے لئے جو علم رکھتے ہیں"۔ (سورۃ فصلت: 1-3) یہاں تک کہ آپؐ اس آیت پر پہنچے: [فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ ۝] ترجمہ: "اب اگر یہ لوگ منہ موڑتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ میں تم کو اُسی طرح کے ایک اچانک ٹوٹ پڑنے والے عذاب سے ڈراتا ہوں جیسا عاد اور ثمود پر نازل ہوا تھا"۔ (سورۃ فصلت: 13) یہ سن کر عتبہ کہنے لگا: بس کریں! آپ کے پاس اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے؟! آپؐ نے فرمایا: نہیں! یہ سن کر وہ قریش کے پاس واپس گیا، اُنہوں نے پوچھا: کیا ہے آپ کے پاس؟ اس نے کہا: میں نے کوئی ایسی بات نہیں چھوڑی جس کے بارے میں مجھے گمان تھا کہ تم ان سے اس سلسلہ میں

بات کروگے تو میں نے وہ تمام باتیں ان سے کرلیں۔ انہوں نے کہا: کیا انہوں نے آپ کو کوئی جواب دیا؟ کہا: ہاں! جواب دیا۔(ابن ہشام 313/1- 314) السنن الکبری للبیہقی 203/2- 204،البدایہ والنہایہ،اِبنِ کثیر 68/3- 69)

ابن اسحاق کی روایت میں ہے: جب ولید ان کے پاس بیٹھا تو انہوں نے پوچھا: اے ابوالولید! کیا خبر ہے آپ کے پاس؟اس نے کہا: میرے پاس یہ خبر ہے کہ میں نے ایسا کلام سنا ہے کہ اس جیسا کلام میں نے کبھی نہیں سنا ہے۔اللہ کی قسم! نہ تو وہ شعر و شاعری ہے،نہ ہی جادو ہے اور نہ ہی کہانت ہے۔اے قریش کے لوگو! میری بات مانو اور مجھ پر فیصلہ چھوڑ دو،اس شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔اللہ کی قسم! جو کلام میں نے ان سے سنا ہے یقیناً اس کی ایک عظیم شان ہوگی،اگر عرب لوگ ان سے نمٹ لیں گے تو وہی تمہاری طرف سے کافی ہو جائیں گے اور اگر وہ عربوں پر غالب آجاتے ہیں تو ان کی بادشاہت تمہاری بات ہے،ان کی عزت تم لوگوں کی عزت ہے اور تم ان کی وجہ سے سب سے زیادہ خوش قسمت قرار پاؤگے،یہ سن کر سب نے کہا:اے ابوالولید! واللہ! تم پر بھی اس نے اپنی زبان کے ذریعہ جادو کرلیا۔ اس نے کہا: ان کے بارے میں یہی میری رائے ہے اور جو تمہیں اچھا لگے کرلو۔(السیرۃ النبویہ،ابن ہشام،294/1)

دروس واسباق اور فوائد

۱)اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم افضل و بہتر ہیں یا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے باپ دادا،آپؐ اس ثانوی بحث میں نہیں الجھے،اگر آپؐ ایسا کرتے تو بات یہیں ختم ہو جاتی اور عتبہ کو کچھ سننے کا موقع نہیں ملتا۔

۲)اللہ کے رسولؐ دلکش اور جاذبِ نظر پیشکشوں اور آپؐ پر لگائے جانے والے الزامات کی ثانوی بحث میں بھی نہیں الجھے،آپؐ نے یہ سب ایک عظیم ہدف کے پیشِ نظر کیا،اور عتبہ نے جو کچھ کہنا چاہا اس کو کہنے دیا،آپؐ نے بڑی حکمت وادب کے ساتھ فرمایا: اے ابوالولید! آپ کی بات مکمل ہوگئی؟اس نے کہا: ہاں!۔ (دیکھیں: التحالف السیاسی فی الاسلام،منیر غضبان،ص33)

۳)اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جواب دوٹوک اور واضح تھا،آپؐ نے اس موقع کے لئے جن آیاتِ کریمہ کا انتخاب فرمایا اس میں بھی حکمت مضمر ہے،یہ آیاتِ کریمہ اہم بنیادی امور پر مشتمل ہیں جن میں سے اہم ترین امور مندرجہ ذیل ہیں:

قرآنِ کریم اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہے۔ کفار کے موقف اور اُن کے اعراض کو بھی بیان کیا گیا ہے۔اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشن اور ذمہ داری کو بیان کیا گیا ہے،اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بشر ہیں۔یہ واضح کیا گیا ہے کہ خالق ایک ہی ہے اور وہ اللہ کی ذات ہے اور وہی آسمانوں اور زمین کا بھی خالق ہے۔اسی طرح سابقہ اقوام کی تکذیب اور ان کو لاحق ہونے والے عذاب کو بھی بیان کیا گیا ہے اور قریش کو عاد و ثمود جیسے عذاب اور پکڑ سے ڈرایا گیا ہے۔(دیکھیں: معین السیرۃ للشامی،ص75)

۴) مال و جاہ اور عورتیں داعیوں کے لئے انتہائی خطرناک اور مہلک چیزیں ہیں،کتنے داعی ایسے ہیں جو مال و دولت کی چمک دمک دیکھ کر راہ حق سے بچھڑ گئے،کتنے ایسے ہیں جن کو دعوت سے روکنے کے لئے کثیر مال و دولت کی پیشکش کی گئی،جو داعیانِ حق مالی لالچ کے سامنے ثابت قدم رہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصل پیروکار ہیں،جاہ و عزت کا خطرہ بالکل واضح ہے،اس لئے کہ شیطان اس پہلو کو مزین کرتا ہے اور وہ زیادہ خطرناک،مکر و فریب سے پُر اور مہلک طریقوں سے اغواء و گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے،داعیٔ ربانی وہی ہے جو اپنی حرکات و سکنات میں

اور اپنے اقوال وافعال میں رسول اللہ ﷺ کی اقتداء و پیروی کرتا ہے، اور اس ہدف و مقصد سے کبھی غافل نہیں ہوتا ہے جس کے لئے وہ زندہ رہتا ہے اور جس کے لئے وہ موت کو گلے لگاتا ہے، جیسے کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: [قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْيَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝] ترجمہ: ”کہو، میری نماز، میرے تمام مراسم عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنا، سب کچھ اللہ رب العالمین کے لئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں ،اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے سر اطاعت جھکانے والا میں ہوں“۔ (سورۃ الأنعام: 162-163)

اور جہاں تک عورتوں کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے: "میں نے اپنے بعد مردوں کے لئے عورتوں سے زیادہ خطرناک کوئی اور فتنہ نہیں چھوڑا ہے“۔ (صحیح بخاری: 5096، صحیح مسلم: 2740) اس کردار کی حامل کوئی بیوی بھی ہو سکتی ہے جو دعوت وجہاد کے بارے میں شوہر کی حوصلہ شکنی کرتی ہو، یا بعض فاجر و گنہگار عورتیں اس کو اپنے جال میں پھنسانے کی کوشش کرتی ہیں یا پھر ظلم وزیادتی، گناہ اور بے راہ روی کی راہوں کو اس کے لئے ہموار کیا جاتا ہے تاکہ وہ ان راہوں پر چلنے پر مجبور ہو جائے، یہ دین سے روکنے کے خطرناک طریقے ہیں، اسی لئے قریش بھی اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے حسین و جمیل عورتوں کی پیشکش کرتے ہیں، عورت اگر اللہ کے بتائے ہوئے طریقہ پر قائم نہ رہے تو وہ سونتی ہوئی تلوار سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ (دیکھیں: فقہ السیرۃ النبویہ، العضبان، ص 169) اس لئے داعیانِ حق کی ذمہ داری ہے کہ سید الخلائق ﷺ کی اقتداء و پیروی کریں اور ہمیشہ حضرت یوسف علیہ السلام کے اس قول کو یاد رکھیں: [قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَیْهِ ۚ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ ۝ فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَیْدَهُنَّ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝] ترجمہ: ”یوسفؑ نے کہا: اے میرے رب، قید مجھے منظور ہے بہ نسبت اس کے کہ میں وہ کام کروں جو یہ لوگ مجھ سے چاہتے ہیں اور اگر تو نے ان کی چالوں کو مجھ سے دفع نہ کیا تو میں ان کے دام میں پھنس جاؤں گا اور جاہلوں میں شامل ہو کر رہوں گا۔ اس کے رب نے اس کی دعا قبول کی اور اُن عورتوں کی چالیں اس سے دفع کر دیں، بے شک وہی ہے جو سب کی سنتا اور سب کچھ جانتا ہے“۔ (سورۃ یوسف: 33-34)

۵) عتبہ کا نبی کریم ﷺ کے موقف سے متاثر ہونا، اور یہ تاثیر اس قدر واضح تھی کہ اس کے ساتھیوں نے اس اثر پذیری کے بارے میں اس کے بتانے سے پہلے ہی قسم کھالی تھی، یہ دشمنِ دین دعوت کی بنیادیں ڈھانے کا ارادہ رکھتا تھا، مگر اچانک وہ اس کا خود ہی داعی بن جاتا ہے اور قریش کو یہ مشورہ دیتا ہے کہ وہ محمدؐ کو ان کے حال پر چھوڑ دیں اور ان کے ساتھ تعرض نہ کریں۔ (دیکھیں: فی السیرۃ النبویۃ قراءۃ لجوانب الحذر والحمایہ، ص 87)

۶) نبی کریم ﷺ اور عتبہ کے مابین جو کچھ پیش آیا صحابہ کرام نے بغور اس کو سنا اور یہ بھی دیکھا کہ آپ ﷺ نے اس کی تمام دلفریب پیشکشوں کو کیسے ٹھکرا دیا، یہ ان کے لئے ایک تربیتی سبق تھا جس کا اثر ان کے دل ودماغ میں راسخ ہو گیا، اس سے انہوں نے بنیادی نصب العین پر صبر وثبات کا درس سیکھا، عقیدہ کو مضبوطی سے تھامے رکھنے اور ہر قسم کے لالچ کو پاؤں کی نوک پر رکھنے کا سبق سیکھا۔

۷)صحابہ کرامؓ نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حلم و بردباری اور وسعتِ قلبی کا درس بھی حاصل کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عتبہ بن ربیعہ کی فضولیات اور الزامات کو سنتے رہے، اس کی اس طرح کی سب باتیں سنیں کہ: ‘‘قریش میں ایک جادوگر ہے’’۔ "قریش میں ایک کاہن ہے"۔ ‘‘ہم نے کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا ہے جو قوم کے لئے آپ سے زیادہ باعث ننگ وعار ہو"۔ "اور اگر آپ پر آسیب اور جنات کا کوئی اثر ہو"۔ ان سب بے ہودہ باتوں سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعراض کیا اور اس طرح اس کی گالیوں کو ناقابلِ التفات سمجھا اور اس کے ذریعہ آپؐ کی دعوت و تبلیغ پر کوئی اثر نہیں پڑا، چنانچہ آپ کی زبانِ مبارک سے ادا ہونے والا ہر لفظ قابلِ تقلید اصول کی حیثیت سے ادا ہوتا تھا، آپؐ کا ہر تصرف و عمل قابلِ اتباع دین کی حیثیت سے تھا اور آپؐ کا عتبہ کی فضولیات کو نظر انداز کرنا بھی قابلِ اتباع اخلاق کی حیثیت رکھتا تھا۔ (دیکھیں: التربیۃ القیادیۃ 304/1)

بعض کتبِ سیرت میں مذکور ہے کہ مکہ کی پوری قیادت اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مذاکرات کرنے لگ گئی اور آپؐ کو انتہائی دلفریب لالچ دینے کی کوشش کرتے رہے، لیکن اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے باطل کے مقابلہ میں انتہائی واضح اور دوٹوک موقف اختیار کیا، نہ آپ لالچ میں آئے، نہ آپ نے مداہنت اختیار کی، نہ کوئی سیاسی چال آپ کو متاثر کر سکی اور نہ ہی زعمائے قریش کے سامنے آپ نے کسی طرح کی نرمی اختیار کی، اس لئے کہ عقیدہ کا معاملہ بنا کسی مداہنت و تنازل کے وضاحت و صراحت کا متقاضی ہوتا ہے، اسی لئے اللہ کے رسول کا صاف جواب تھا: جو کچھ تم کہہ رہے ہو میں ان تمام چیزوں سے مبرا ہوں، میں جو پیغام حق لے کر آیا ہوں اس کے ذریعہ میں تم سے کسی طرح کے مال و دولت، شرف و عزت یا بادشاہت کا طالب نہیں ہوں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے آپ کی طرف رسول بنا کر بھیجا ہے، میرے اوپر ایک کتاب نازل کی ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ میں آپ کو اچھے اور برے انجام سے آگاہ کروں، لہذا میں نے اپنے رب کا پیغام پہنچا دیا، میں نے آپ کے ساتھ خیر خواہی کی ہے، اگر آپ میرے لائے ہوئے پیغام کو قبول کرتے ہیں تو یہ دنیا اور آخرت میں آپ کی خوش بختی ہوگی اور اگر اس کو ٹھکرا دیتے ہو تو میں اللہ کے حکم کا منتظر رہوں گا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ میرے اور آپ کے درمیان فیصلہ کرے گا۔ (سیرۃ ابنِ ہشام 316/1، التربیۃ القیادۃ، 305/1، الوفود فی العہد المکی، علی الأسطل، ص 37)

اس پر عزم ایمانی موقف کے ذریعہ ان کی یہ تدبیر بھی ناکام ہوگئی اور اسلامی عقیدہ کے بارے میں یہ بات ثابت ہوگئی کہ وہ ہر قسم کے شائبہ سے پاک و صاف ہے، وہ اپنے اصل جوہر کے اعتبار سے بھی خالص ہے اور اپنے وسائل و ذرائع میں بھی صاف و شفاف ہے۔ (تاریخ صدرِ الاسلام، عبدالرحمن الشجاع، ص 39)

مشرکین نے جب مسلمانوں کی ثابت قدمی، ان کا دین میں استحکام اور ہر قسم کے باطل کے مقابلہ میں ان کی عزیمت و بلند ہمتی کو دیکھا تو مسلمانوں کو دین سے واپس پھیرنے کے بارے میں وہ ناامید ہونے لگے اور انہوں نے ایک دوسرا ڈرامہ شروع کیا، انہوں نے اسود بن عبد المطلب، ولید بن مغیرہ، امیہ بن خلف اور عاص بن وائل کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بھیجا، وہ آپؐ سے کہنے لگے: اے محمد! آؤ ہم اس کی عبادت کریں گے جس کی عبادت آپ کرتے ہیں اور آپ بھی اُن معبودوں کی عبادت کیجئے جن کی عبادت ہم کرتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں ہم اور آپ دونوں شریک ہو جائیں گے، اگر ہمارے معبودوں کے مقابلہ میں آپ کا معبود بہتر ہوگا تو ہم اس سے اپنا حصہ لے لیں گے اور اگر

ہمارے معبود آپ کے معبود کے مقابلہ میں بہتر ہوں گے تو آپ ان سے اپنا حصہ وصول کرلیں گے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں: [قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ (1) لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ (2) وَلَا أَنتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ (3) وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدتُّمْ (4) وَلَا أَنتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ (5) لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ (6)] ترجمہ: ''کہہ دو، اے کافرو۔ نہ تو میں تمہارے معبودوں کی عبادت کرتا ہوں۔ اور نہ تم ہی میرے معبود کی عبادت کرتے ہو۔ اور نہ میں تمہارے معبودوں کی عبادت کروں گا۔ اور نہ تم میرے معبود کی عبادت کروگے۔ تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین''۔ (سورۃ الکافرون: 1-6) (سیرت ابن ہشام: 362/1)

اسی سورت کی طرح اور بھی دوسری آیات ہیں جن میں کفر اور اہلِ کفر سے اعلانِ براءت کیا گیا ہے، جیسے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: [وَإِن كَذَّبُوكَ فَقُل لِّي عَمَلِي وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ أَنتُم بَرِيئُونَ مِمَّا أَعْمَلُ وَأَنَا بَرِيءٌ مِّمَّا تَعْمَلُونَ ۞] ترجمہ: ''اگر یہ تجھے جھٹلاتے ہیں تو کہہ دے کہ: میرا عمل میرے لئے ہے اور تمہارا عمل تمہارے لئے، جو کچھ میں کرتا ہوں اس کی ذمہ داری سے تم بری ہو اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس کی ذمہ داری سے میں بری ہوں''۔ (سورۃ یونس: 41) اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ قول: [قُلْ إِنِّي نُهِيتُ أَنْ أَعْبُدَ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ قُل لَّا أَتَّبِعُ أَهْوَاءَكُمْ قَدْ ضَلَلْتُ إِذًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُهْتَدِينَ ۞ قُلْ إِنِّي عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّي وَكَذَّبْتُم بِهِ مَا عِندِي مَا تَسْتَعْجِلُونَ بِهِ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفَاصِلِينَ ۞] ترجمہ: ''اے محمدؐ! اِن سے کہو کہ تم لوگ اللہ کے سوا جن دوسروں کو پکارتے ہو اُن کی بندگی کرنے سے مجھے منع کیا گیا ہے کہو، میں تمہاری خواہشات کی پیروی نہیں کروں گا، اگر میں نے ایسا کیا تو گمراہ ہو گیا، راہ راست پانے والوں میں سے نہ رہا۔ کہو، میں اپنے رب کی طرف سے ایک دلیل روشن پر قائم ہوں اور تم نے اسے جھٹلا دیا ہے، اب میرے اختیار میں وہ چیز ہے نہیں جس کے لئے تم جلدی مچا رہے ہو، فیصلہ کا سارا اختیار اللہ کو ہے، وہی امر حق بیان کرتا ہے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے''۔ (سورۃ الأنعام: 56- 57)

سورۂ کافرون میں واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے کہ حق کا راستہ ایک ہی ہے جو ہر قسم کی ٹیڑھ اور دراڑ سے پاک اور محفوظ ہے، عبادت تو صرف اور صرف ایک اللہ رب العالمین کے لئے خاص ہے، یہ سورت اللہ کے رسول ﷺ پر اس مقصد سے نازل ہوئی تاکہ حقیقی عبادت اور جھوٹی عبادت کے مابین، صحیح منہج اور غلط منہج کے مابین، صحیح تصور اور غلط تصور کے مابین اور صراط مستقیم اور گمراہ کن راستوں کے درمیان حد فاصل قائم کر دی جائے، جی ہاں، ایک نفی کے بعد دوسری نفی اور ایک تاکید کے بعد دوسری تاکید لائی گئی کہ حق و باطل کے مابین ملاپ کا کوئی امکان نہیں ہے اور نہ ہی نور و ظلمت ایک ساتھ جمع ہو سکتے ہیں، دونوں کا اختلاف جوہری اور بنیادی ہے، اس اختلاف کے ہوتے ہوئے راستے میں ملنے کا کوئی امکان نہیں ہے، اس میں کسی طرح کی مداہنت یا نرمی کی صورت نہیں ہے، اس میں نہ کوئی ذاتی مصلحت کام آسکتی ہے اور نہ ہی کوئی عارضی ضرورت، اور نہ ہی شہد میں زہر ملایا جا سکتا ہے، نہ یہ قانون قابل قبول ہو سکتا ہے کہ "دین تو اللہ کے لئے ہو اور وطن سب کے لئے"۔ جیسے کہ معاصر جاہلیت کا تصور ہے اور جیسے کہ منافقین، گمراہوں اور مغضوب علیہم اور اللہ کے دشمنوں اور ملحدوں کی اتباع کرنے والوں کا دعوی ہے۔

اہلِ شرک کے لیڈروں اور زعماء کے سامنے جواب بالکل دوٹوک تھا، جس میں نہ کوئی سودا بازی ہو سکتی ہے، نہ کوئی درمیانی راستہ نکل سکتا ہے اور نہ ہی کسی شخصیت کو خوش کرنے کے لئے کسی چیز سے دستبرداری اختیار کی جاسکتی ہے، اس لئے کہ ہر زمان و مکان میں

'جاہلیت' جاہلیت ہے اور 'اسلام' اسلام ہے، ان دونوں کے مابین بہت بڑا فرق ہے، جیسے کہ سونا اور مٹی ایک نہیں ہو سکتے ہیں، راستہ بس ایک ہی ہے کہ ہر قسم کی جاہلیت سے نکل کر عبادت و قانون کی حیثیت سے مکمل اسلام کو قبول کیا جائے، ورنہ ہر زمان و مکان میں حق و باطل کے مابین مکمل جدائی، اعلان براءت اور صاف علحیدگی ہوگی۔ ''لكم دينكم ولي دين''۔(فی ظلال القرآن: 3991/6)

اس وفد کی ناکامی کے بعد ایک دوسرا وفد آتا ہے، جو عبداللہ بن اَبی امیہ، ولید بن مغیرہ، مکرز بن حفص، عمرو بن عبداللہ بن ابی قیس، اور عاص بن عامر پر مشتمل تھا، یہ وفد ایک اور پیشکش لے کر آیا کہ قرآن کے بعض حصوں سے تنازل اختیار کیا جائے، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے یہ مطالبہ کیا کہ قرآن سے ایسی آیات کو نکال دیا جائے جو ان کے لئے غصہ اور ناراضگی کا سبب بنتی ہیں، خاص طور پر ان کے معبودوں کی مذمت کرنے والی آیات، اللہ تعالیٰ نے اس کا واضح اور دوٹوک جواب نازل فرمایا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: [وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ ۙ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَٰذَا أَوْ بَدِّلْهُ ۚ قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِن تِلْقَاءِ نَفْسِي ۖ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ ۖ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ] ترجمہ: ''جب انہیں ہماری صاف صاف باتیں سُنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ ''اِس کے بجائے کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں کچھ ترمیم کرو"۔اے محمدؐ، ان سے کہو: میرا یہ کام نہیں ہے کہ اپنی طرف سے اس میں کوئی تغیر وتبدل کر لوں، میں تو بس اُس وحی کا پیرو ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب کا ڈر ہے"۔ (سورۃ یونس: 15)

ان وفود اور مذاکرات کے ذریعہ اُس ناکامی و نامرادی کا پتہ چلتا ہے جو مکمل اسلام سے تنازل اختیار کرانے کے سلسلہ میں زعمائے قریش کو ملی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جزوی اسلام سے تنازل اختیار کرنے کا مطالبہ کرنے لگ گئے، یہ بات قابل غور ہے کہ پہلی مرتبہ وہ جس تنازل کا مطالبہ کر رہے تھے وہ دوسری مرتبہ کے مطالبہ سے بڑا مطالبہ تھا، اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا مطالبہ بھی تدریجاً کم ہوتا چلا گیا، اس امید کے ساتھ کہ شاید قائدِ دعوت کی طرف سے کچھ نہ کچھ تسلیم کر لیا جائے، اسی طرح وہ مذاکرات کاروں کو بھی تبدیل کرتے رہے، چنانچہ پہلی مرتبہ جو مذاکراتی ٹیم تھی اس کے افراد سوائے ولید بن مغیرہ کے دوسری مرتبہ کی مذاکراتی ٹیم سے مختلف تھے، ایسا اس لئے کیا گیا تاکہ ایک ہی طرح کے چہرے بار بار سامنے نہ آئیں اور ساتھ ہی ساتھ مختلف صلاحیتوں اور ذہن و دماغ کے افراد کو اس میں استعمال کیا گیا، شاید کہ کوئی نہ کوئی اثر انداز ہو جائے، اس میں قیامت تک کے داعیانِ حق کے لئے سبق ہے کہ اسلام سے کسی طرح کا تنازل اختیار نہ کیا جائے اگرچہ وہ معمولی ہی کیوں نہ ہو، اسلام تو ایک ربانی دعوت ہے جس میں مطلقاً کسی طرح کی سودا بازی کی گنجائش نہیں ہے، چاہے اسباب و محرکات اور ضروریات کچھ بھی ہوں، دورِ حاضر میں بھی داعیان حق پر لازمی ہے کہ اس طرح کی پیشکشوں اور مادی لالچ سے چوکنا رہیں، پیشکش کبھی تو براہِ راست کی جاسکتی ہے اور کبھی بالواسطہ کی جاسکتی ہے، اعلیٰ قسم کی ملازمتیں دے کر، فائدہ مند کام دے کر یا نفع بخش تجارت کے معاہدے کر کے یہ پیشکشیں کی جاسکتی ہیں، اسلام مخالف عالمی تنظیمیں اس کے لئے منصوبہ بندی کرتی ہیں تاکہ داعیان حق کو اور بطور خاص ان کے قائدین کو دعوت سے روکا جاسکے، عالمِ اسلام کو تباہ کرنے کے لئے جو بھی تنظیمیں اور ادارے مختلف مقامات پر کام کر رہے ہیں ان سب کے درمیان

اس سلسلہ میں تعاون بھی ہوتا ہے، وہ ایک دوسرے کو اس سلسلہ کی معلومات بھی فراہم کرتے ہیں۔(دیکھیں: فی السیرۃ النبویۃ قراءۃ لجوانب الحذر والحمایۃ، ص89)

اسلامی بیداری کو روکنے کے لئے اور اس سلسلہ میں معلومات اور رپورٹنگ کرنے کے لئے مشرقِ وسطی میں کام کرنے والے ایک اہم شخص "رچرڈ، ب۔ میچل" نے جو رپورٹ پیش کی ہے اس رپورٹ میں ایک نئے منصوبے کا تصور پیش کیا گیا ہے جس کے ذریعہ اسلامی تحریکات کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے، اس رپورٹ کا ایک اہم حصہ دعوت کے قائدین کو ترغیب و لالچ دینے کے سلسلہ میں تھا اور اس نے اس کے لئے مندرجہ ذیل تجاویز پیش کی ہیں:

۱) ایسی شخصیات کو تلاش کیا جائے جن کو بڑی ملازمتوں کا لالچ دیا جا سکتا ہو، اور ایسے افراد کو اس طرح کے اسلامی منصوبوں میں مشغول رکھا جائے جن کا کوئی خاطر خواہ فائدہ نہ ہو، اسی طرح ان کو دیگر ایسے اعمال میں مصروف رکھا جائے جن میں ان کی قوت و صلاحیت ختم ہو جائے، اس کے ساتھ ساتھ ان کو مادی اور معنوی اعتبار سے بے نیاز کر دیا جائے اور ان کے اعزاء واقرباء کو بھی سہولیات فراہم کی جائیں، اس طرح سے مقامی طور پر ہی ایسے افراد کو استعمال کر لیا جائے گا اور ان کو عوام الناس سے الگ تھلگ کر دیا جائے گا۔

۲) تجارتی اور اقتصادی رجحان رکھنے والے افراد کو اس جانب راغب کرنے پر کام کیا جائے کہ وہ ایسے اہداف والے منصوبوں پر کام کرنے کے لئے تیار ہو جائیں جو عرب سرزمین پر ان کے دشمنوں کے فائدے کے لئے تیار کئے گئے ہیں۔

۳) دولت و ثروت سے مالا مال عرب ممالک میں کام کرنے کے مواقع ایجاد کر کے ان کو ان ممالک میں ملازمتیں دی جائیں، اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ ان کو اسلامی سرگرمیوں سے دور کر دیا جائے گا۔(دیکھیں: فی السیرۃ النبویہ، قراءۃ لجوانب الحذر والحمایۃ، ص89)

مذکورہ تینوں نکات پر غور کرنے والے کے سامنے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ سب مادی لالچ اور ترغیبات کی بالواسطہ شکلیں ہیں اور عالم اسلامی کا بنظر غائر جائزہ لینے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان نکات کو انتہائی غیر محسوس انداز میں نافذ کیا جا رہا ہے، چنانچہ بعض داعیوں کو بڑے مناصب دے کر مشغول کر دیا گیا ہے، بعض عرب ممالک نے داعیوں کے ایک جمِ غفیر کو اپنے ہاں جگہ دے رکھی ہے اور بعض کو تجارت نے غافل کر رکھا ہے۔(ایضاً، ص91)

8- بحث و مباحثہ کا اسلوب اور بے بس کرنے کی کوششیں:

نبی کریم ﷺ نے اپنی دعوت کی صحت پر بہت سے دلائل و براہین قائم کئے، نبی کریم ﷺ اس کے لئے بہترین اوقات اور اہم مواقع و مناسبتوں کا انتخاب فرماتے تھے اور شکوک و شبہات کا رد کیا کرتے تھے چاہے وہ شبہات کسی طرح کے بھی ہوں، آپ ﷺ نے کفار کے ساتھ بحث و مباحثہ کرنے میں بہت سے اسالیب اختیار کئے جن کو آپؐ نے اللہ کی کتاب سے اخذ کیا، آپؐ نے عقلی دلائل بھی دیئے، منطقی دلائل سے بھی کام لیا اور فکر و نظر کو استعمال کرنے کی طرف بھی توجہ دی، آپؐ نے کفارِ مکہ کے ساتھ جو اسالیب استعمال کئے ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

ا)موازنہ کااسلوب :

دو چیزوں کے درمیان موازنہ کااسلوب اس طور پر اختیار کیا جاتا تھا کہ دو چیزوں کو سامع کے سامنے پیش کر کے دونوں کے مابین موازنہ کرنے کا مطالبہ کیا جاتا تھا:

ا-ایک جانب اس خیر کو پیش کیا جاتا جس کی ترغیب دینا مقصود ہوتی تھی۔ ۲- دوسری طرف اس شر کو پیش کیا جاتا جس سے ڈرانا مطلوب ہوتا تھا، اور ان دونوں کو اس طرح پیش کیا جاتا تھا کہ عقل کو ان دونوں چیزوں پر اور ان کے انجام پر غور وفکر کرنے اور دونوں کے مابین موازنہ کرنے اور موازنہ کرنے کے بعد خیر کو بہتر سمجھنے اور اس کی اتباع کرنے پر آمادہ کیا جاتا تھا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: [اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ] ترجمہ:"کیا وہ شخص جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندگی بخشی اور اس کو وہ روشنی عطا کی جس کے اجالے میں وہ لوگوں کے درمیان زندگی کی راہ طے کرتا ہے اُس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہوا ہو اور کسی طرح اُن سے نہ نکلتا ہو؟ کافروں کے لئے تو اسی طرح ان کے اعمال خوشنما بنادیئے گئے ہیں"۔(سورۃ الأنعام: 122)

علامہ ابن کثیرؒ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: "اللہ تعالیٰ نے یہ مثال اس مؤمن کی بیان کی ہے جو مردہ تھا، یعنی: گمراہی میں حیران اور ہلاکت کی راہ پر گامزن تھا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو زندگی عطا کی۔ یعنی: اس کے دل کو ایمان کے ذریعہ زندہ کیا اور اس کو ہدایت عطا کی اور اس کو اپنے رسول کی اتباع کی توفیق عطا کی"۔(تفسیر ابن کثیر 172/2)

1- اثبات وتقریر کا اسلوب:

اس اسلوب کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان عقلی تجزیہ اور محاکمہ کے بعد اس مطلوبہ چیز کا اقرار کرتا ہے جو دعوت کا اصل مضمون ہوتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: [اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخَالِقُوْنَ (35) اَمْ خَلَقُوا السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضَ ۚ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ (36) اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ (37) اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ ۖ فَلْيَاْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطَانٍ مُّبِيْنٍ (38) اَمْ لَهُ الْبَنَاتُ وَلَكُمُ الْبَنُوْنَ (39) اَمْ تَسْاَلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ (40) اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ (41) اَمْ يُرِيْدُوْنَ كَيْدًا ۖ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا هُمُ الْمَكِيْدُوْنَ (42) اَمْ لَهُمْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ ۚ سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (43) وَاِنْ يَّرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا يَّقُوْلُوْا سَحَابٌ مَّرْكُوْمٌ (44) فَذَرْهُمْ حَتّٰى يُلَاقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ فِيْهِ يُصْعَقُوْنَ (45)] ترجمہ:"کیا وہ بغیر کسی خالق کے پیدا ہو گئے ہیں یا وہ خود خالق ہیں۔ یا انہوں نے آسمانوں اور زمین کو بنایا ہے، نہیں، بلکہ وہ یقین ہی نہیں کرتے۔ کیا ان کے پاس آپ کے رب کے خزانے ہیں یا وہ داروغہ ہیں۔ کیا ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے کہ وہ اس پر چڑھ کر سن آتے ہیں، تو لے آئے ان میں سے سننے والا کوئی دلیل واضح۔ کیا اس (اللہ) کے لئے تو بیٹیاں ہیں اور تمہارے لئے بیٹے۔ کیا آپ ان سے کوئی صلہ مانگتے ہیں کہ وہ تاوان سے دبے جا رہے ہیں۔ یا ان کے پاس علم غیب ہے کہ وہ اسے لکھتے رہتے ہیں۔ کیا وہ کوئی داؤ کرنا چاہتے ہیں، پس جو منکر ہیں وہی داؤ میں آئے ہوئے ہیں۔ کیا سوائے اللہ کے ان کا کوئی اور معبود ہے، اللہ اس سے پاک ہے جو وہ شریک

ٹھہراتے ہیں۔ اگر وہ ایک ٹکڑا آسمان سے گرتا ہوا دیکھ لیں تو کہہ دیں کہ تہ بہ تہ جما ہوا بادل ہے۔ پس آپ انہیں چھوڑ دیجیے یہاں تک کہ وہ اپنا وہ دن دیکھ لیں جس میں وہ بے ہوش ہو کر گر پڑیں گے"۔ (سورۃ الطور: 35-45)

علامہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں: "یہ ربوبیت اور توحید الوہیت کو ثابت کرنے کا مقام ہے، اللہ تعالیٰ نے سوال کیا ہے کہ کیا وہ بغیر کسی موجد کے وجود میں آئے ہیں یا ان کو بغیر کسی چیز کے پیدا کیا ہے یا وہی خالق ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ اس میں سے کوئی بھی بات درست نہیں ہے، بلکہ اللہ ہی کی ذات ہے جس نے ان کو پیدا کیا ہے اور ان کو وجود بخشا ہے جبکہ وہ کوئی قابل ذکر چیز نہیں تھے"۔ (تفسیر ابن کثیر: 244/4)

یہ عقلی دلیل و حجت کے اعتبار سے انتہائی طاقتور آیت ہے، اس لئے کہ اس طرح سے ان کا بغیر کسی خالق کے وجود میں آنا ایک ایسی بات ہے جس کا عقل و فطرت دونوں انکار کرتے ہیں اور اس میں کسی طرح کی کم یا زیادہ بحث و مباحثہ کی ضرورت نہیں ہے اور جہاں تک تعلق ہے اس بات کا کہ وہ بذاتِ خود اپنے آپ کے خالق ہوں تو یہ ایک ایسی بات ہے جس کا نہ تو انہوں نے دعوی کیا اور نہ ہی کسی مخلوق نے اس کا دعوی کیا ہے، لہذا جب ان دونوں مفروضوں کو عقل و فطرت قبول کرنے سے قاصر ہیں تو پھر صرف وہی حقیقت باقی رہتی ہے جس کو قرآن بیان کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ سب کے سب ایک اللہ کی تخلیق ہیں جس کے ساتھ کوئی اور شریک نہیں ہے۔ (فی ظلال القرآن: 3399/6)

3- نظر انداز کرنے اور غلط قرار دینے کا اسلوب:

یہ ایک ایسا طاقتور اسلوب ہے جس کے ذریعہ مغرور و متکبر مخالفین کی زبان بند کر دی جاتی ہے، اس طور پر کہ ان کی باتوں پر کوئی دھیان نہ دیا جائے اور ان کے بے بنیاد دلائل کو نا قابل التفات سمجھا جائے اور ایسا اس لئے کیا جاتا ہے تا کہ بحث و مناظرہ کے دروازے کو بند کر دیا جائے اور ان کو کوئی قطعی دلیل دے کر ان کی تمام حجتوں کو زمین بوس کر دیا جائے، فرعون کے ساتھ موسیٰ –علیہ السلام– کے قصہ میں اس اسلوب کا واضح نمونہ موجود ہے، اس لئے کہ فرعون کے پیش کئے ہوئے ہر اعتراض اور الزام سے موسیٰ —علیہ السّلام— اعراض کرتے رہے اور اللہ کی ربوبیت والوہیت کے ظاہری و عقلی دلائل کے ذریعہ فرعون کی الوہیت کے دعوی کی تردید کرتے رہے، سورۃ الشوریٰ کی آیات میں یہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: [قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعَالَمِيْنَ (23) قَالَ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۖ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ (24) قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ (25) قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ (26) قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ (27) قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۖ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ (28) قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ (29)] ترجمہ: "فرعون نے کہا: رب العالمین کیا چیز ہے۔ فرمایا: آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا پروردگار ہے، اگر تمہیں یقین آئے۔ اپنے ارد گرد والوں سے کہا: کیا تم سنتے نہیں ہو۔ فرمایا: تمہارا اور تمہارے پہلے باپ دادا کا رب ہے۔ کہا: بے شک تمہارا رسول جو تمہارے پاس بھیجا گیا ہے ضرور دیوانہ ہے۔ فرمایا: مشرق و مغرب اور جو ان کے درمیان ہے سب کا پروردگار ہے، اگر تم عقل رکھتے ہو۔ کہا: اگر تو نے میرے سوا اور کوئی معبود بنایا تو تمہیں قید میں ڈال دوں گا۔ (سورۃ الشعراء: 23-29)

مشرکین کے ساتھ اللہ کے رسول ﷺ کے بحث ومجادلہ کی بنیاد قرآنِ کریم کے یہی اسالیب تھے، اور جب رسول اللہ ﷺ کے بارے میں مشرکین حیران وپریشان ہوگئے اور وہ آپ ؐ کو اللہ کا رسول ماننے کے لئے تیار نہیں تھے، جیسے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: [قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِىْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۞] ترجمہ: "اے محمد ؐ! ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان سے تمہیں رنج ہوتا ہے، لیکن یہ لوگ تمہیں نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم دراصل اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہیں"۔ (سورۃ الانعام: 33) اس لئے اب ان کی ٹیڑھی سوچ نے ان کو رسول اللہ ﷺ سے ایسے مطالبات کرنے پر مجبور کیا جن کا مقصد نبی کریم ﷺ کی تصدیق کرنا نہیں تھا بلکہ ان کا مقصد آپ کو پریشان اور بے بس کرنا تھا، انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اس طرح کے مطالبات کئے:

۱) یہ کہ آپ ﷺ ان کے لئے زمین سے پانی کے جاری چشمے جاری کریں۔

۲) آپ کے کھجور اور انگور کے باغات ہوں جن کے بیچ میں نہریں بہتی ہوں۔

۳) آسمان کا کوئی ٹکڑا ان پر گرادیا جائے جیسے کہ بروزِ قیامت ہوگا۔

۴) آپ ؐ اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کو ان کے سامنے لے کر آئیں۔

۵) آپ ؐ کا سونے اور جواہرات کا کوئی گھر ہو۔

۶) آپ ؐ سیڑھی لگا کر آسمان کی طرف چڑھ کر بلند ہوں۔

۷) آپ آسمان سے کوئی کتاب لے کر آئیں جس کو وہ خود پڑھ سکیں۔ مجاہد ؒ فرماتے ہیں: یعنی اس کتاب میں ہر ایک کے لئے یہ تحریر ہو کہ یہ اللہ کی طرف سے فلاں بن فلاں کے لئے ہے اور وہ اس کے سر کے پاس رکھی ہوئی ہو۔

۸) انہوں نے آپ ؐ سے مطالبہ کیا کہ وہ دعا کریں تو پہاڑ چلنا شروع کردیں، زمین کے الگ الگ ٹکڑے کر دیے جائیں اور ان کے گزرے ہوئے آباؤ واجداد دوبارہ زندہ ہوجائیں۔(دیکھیں: مقومات الداعیۃ الناجح، د- علی بادحدح، ص59-69 المعوقون للدعوۃ الاسلامیۃ، د- سمیرۃ محمد عمر، 171-172، التربیۃ القیادیۃ 311/1)

بے شک خوراق ومعجزات کا مطالبہ طویل انسانی تاریخ میں گھساپٹا مطالبہ رہا ہے، حالانکہ آپ ؐ اپنی قوم کے ایمان لانے کے لئے بے تاب تھے اور اس سلسلہ میں آپ ؐ جان جوکھم میں ڈالتے تھے، لیکن اس کے باوجود آپ نے ان کے اس طرح کے مطالبات کو ٹھکرادیا، اس لئے کہ آپ ؐ آیاتِ قرآنیہ کی روشنی میں جانتے تھے کہ اگر ان مطالبات کے ماننے کے بعد بھی وہ ایمان نہ لائے تو ان کو سخت ترین عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا اور آپ ؐ نے صاف جواب دیا: مجھے اس لئے تمہارے پاس نہیں بھیجا گیا ہے، بے شک مجھے اللہ تعالیٰ نے تمہارے پاس ایک پیغام لے کر بھیجا ہے، مجھے جو کچھ لے کر تمہارے پاس بھیجا گیا ہے وہ میں نے تم تک پہنچادیا ہے، اگر تم اس کو قبول کرتے ہو تو یہ دنیا اور آخرت میں تمہاری خوش بختی ہوگی اور اگر اس کو ٹھکرادیتے ہو تو میں اللہ کے حکم کا منتظر رہوں گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ میرے اور آپ کے درمیان فیصلہ کردے۔(دیکھیں: سیرت ابن ہشام: 459/1)

اللہ کے رسول ﷺ قوم کے ان مطالبات کو سن کر انتہائی رنجیدہ اور غمگیں ہو کر اپنے اہلِ خانہ کی طرف واپس تشریف لائے، اس لئے کہ قوم کے بلانے پر آپ کو ان کے ایمان لانے کی امید پیدا ہو گئی تھی، لیکن جب آپؐ نے ان کی معاندانہ روش کا مشاہدہ کیا تو آپ کو انتہائی غم لاحق ہو گیا، اللہ تعالیٰ نے ان پریشان کن مطالبات اور ان کا جواب قرآنِ پاک میں یوں دیا ہے: [وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْبُوْعًا (90) اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا (91) اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا (92) اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ؕ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ؕ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (93) وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا (94) قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا (95) قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًا بَصِيْرًا (96)] ترجمہ: ”اور کہا ہم تمہیں ہر گز نہ مانیں گے یہاں تک کہ تو ہمارے لئے زمین میں سے کوئی چشمہ جاری کر دے۔ یا تیرے لئے کھجور اور انگور کا کوئی باغ ہو پھر تو اس باغ میں بہت سی نہریں جاری کر دے۔ یا جیسا تو خیال کرتا ہے ہم پر کوئی آسمان کا ٹکڑا گرا دے یا تو اللہ اور فرشتوں کو روبرو لے آ۔ یا تیرے پاس کوئی سونے کا گھر ہو یا تو آسمان پر چڑھ جائے، اور ہم تو تیرے چڑھنے کا بھی یقین نہیں کریں گے یہاں تک کہ تو ہمارے پاس ایسی کتاب لائے جسے ہم بھی پڑھ سکیں، کہہ دو میرا رب پاک ہے میں تو فقط ایک بھیجا ہوا انسان ہوں۔ اور لوگوں کو ایمان لانے سے جب کہ ان کے پاس ہدایت آگئی صرف اسی چیز نے روکا ہے کہ کہنے لگے کیا اللہ نے آدمی کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔ کہہ دو اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چلتے پھرتے ہوتے تو ہم آسمان سے ان پر فرشتہ ہی رسول بنا کر بھیجتے۔ کہہ دو کہ اللہ میرے اور تمہارے درمیان گواہ کافی ہے، بے شک وہ اپنے بندوں سے خبر دار دیکھنے والا ہے“۔ (سورۃ الاسراء: 90-96)

اسی طرح یہ آیات بھی نازل ہوئیں: [وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ؕ بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا ؕ اَفَلَمْ يَايْئَسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتّٰى يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ] ترجمہ: ”اور کیا ہو جاتا اگر کوئی ایسا قرآن اتار دیا جاتا جس کے زور سے پہاڑ چلنے لگتے، یا زمین شق ہو جاتی، یا مُردے قبروں سے نکل کر بولنے لگتے؟ (اس طرح کی نشانیاں دکھا دینا کچھ مشکل نہیں ہے) بلکہ سارا اختیار ہی اللہ کے ہاتھ میں ہے، پھر کیا اہلِ ایمان (ابھی تک کفار کی طلب کے جواب میں کسی نشانی کے ظہور کی آس لگائے بیٹھے ہیں اور وہ یہ جان کر) مایوس نہیں ہو گئے کہ اگر اللہ چاہتا تو سارے انسانوں کو ہدایت دے دیتا؟ جن لوگوں نے خدا کے ساتھ کفر کا رویہ اختیار کر رکھا ہے اُن پر ان کے کرتوتوں کی وجہ سے کوئی نہ کوئی آفت آتی ہی رہتی ہے، یا ان کے گھر کے قریب کہیں نازل ہوتی ہے یہ سلسلہ چلتا رہے گا یہاں تک کہ اللہ کا وعدہ آن پورا ہو، یقیناً اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا“۔ (سورۃ الرعد: 31)

ان مشرکین کے مطالبات کو نہ ماننے کی حکمت اور وجہ یہ ہے کہ انہوں نے یہ سوالات سنجیدگی کے ساتھ اور برائے طلب ہدایت نہیں کئے تھے، بلکہ انہوں نے یہ سوالات استہزاء کے طور پر اور پریشان کرنے کے لئے کئے تھے اور اللہ تعالیٰ کو اس بات کا علم تھا کہ اگر وہ ان مطلوبہ

چیزوں کا مشاہدہ اور معائنہ بھی کرلیں گے تب بھی ایمان نہیں لائیں گے اور وہ اپنی سرکشی اور گمراہی میں سرگرداں رہیں گے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: [وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَىِٕنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَآ اِذَا جَاۗءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَنُقَلِّبُ اَفْـــِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝ وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰۗىِٕكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ۝] ترجمہ: "یہ لوگ کڑی کڑی قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ اگر کوئی نشانی ہمارے سامنے آجائے تو ہم اس پر ایمان لے آئیں گے، اے محمدؐ! ان سے کہو کہ "نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں" اور تمہیں کیسے سمجھایا جائے کہ اگر نشانیاں آ بھی جائیں تو یہ ایمان لانے والے نہیں۔ ہم اُسی طرح ان کے دلوں اور نگاہوں کو پھیر رہے ہیں جس طرح یہ پہلی مرتبہ اس پر ایمان نہیں لائے تھے، ہم انہیں ان کی سرکشی ہی میں بھٹکنے کے لئے چھوڑے دیتے ہیں۔ اگر ہم فرشتے بھی ان پر نازل کر دیتے اور مردے ان سے باتیں کرتے اور دنیا بھر کی چیزوں کو ہم ان کی آنکھوں کے سامنے جمع کر دیتے تب بھی یہ ایمان لانے والے نہ تھے، الا یہ کہ مشیت الٰہی یہی ہو کہ وہ ایمان لائیں، مگر اکثر لوگ نادانی کی باتیں کرتے ہیں"۔ (سورۃ الأنعام: 109-111)

اسی لئے حکمتِ الٰہی اور رحمتِ ربانی کا تقاضا یہ ہوا کہ ان کے ان مطالبات کو نہ مانا جائے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا قانون وضابطہ یہ ہے کہ کسی قوم کے مطالبات کو ماننے کے بعد بھی اگر وہ ایمان نہ لائیں تو ان پر جڑ سے ختم کرنے والا عذاب نازل کیا جاتا ہے، جیسے کہ عاد وثمود اور قومِ فرعون کے ساتھ کیا گیا۔

اس سے زیادہ پریشان کرنے والی، مذاق اڑانے والی اور رکاوٹیں پیدا کرنے والی غیر سنجیدہ قوم کون ہو سکتی ہے جس کے پاس قرآن ہو جو سب سے بڑا معجزہ اور سب سے بڑی نشانی ہے، اس کو بھی وہ قوم تسلیم نہ کرے، اسی لئے انہوں نے جب اپنے من پسند مطالبات پیش کئے تو اللہ تعالیٰ نے اس طرح ان کا جواب دیا: [وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ شَهِيْدًا ۚ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوْا بِاللّٰهِ ۙ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝] ترجمہ: "یہ لوگ کہتے ہیں کہ "کیوں نہ اتاری گئی اس شخص پر نشانیاں اِس کے رب کی طرف سے؟" کہو: "نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں اور میں صرف خبردار کرنے والا ہوں کھول کھول کر"۔ اور کیا اِن لوگوں کے لئے یہ (نشانی) کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر کتاب نازل کی جو اِنہیں پڑھ کر سُنائی جاتی ہے؟ در حقیقت اِس میں رحمت ہے اور نصیحت ہے اُن لوگوں کے لئے جو ایمان لاتے ہیں۔ (اے نبیؐ) کہو کہ "میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہی کے لئے کافی ہے وہ آسمانوں اور زمین میں سب کچھ جانتا ہے جو لوگ باطل کو مانتے ہیں اور اللہ سے کفر کرتے ہیں وہی خسارے میں رہنے والے ہیں"۔ (سورۃ العنکبوت: 50-52)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ایک روایت منقول ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قریش کے لوگوں نے نبی کریم ﷺ سے فرمایا کہ ہمارے لئے اپنے رب سے دعا کیجیے کہ صفا پہاڑ کو ہمارے لئے سونا بنادے ہم آپ کی دعوت کو تسلیم کرلیں گے، آپ ﷺ نے فرمایا: ایسا کروگے؟ سب نے کہا: ہاں! ہم مان لیں گے، فرماتے ہیں: آپ نے دعا کی تو آپ کے پاس حضرت جبرائیلؑ تشریف لائے اور فرمایا: آپ کے رب کی طرف سے آپ کو سلام عرض ہے، رب کا ارشاد یہ ہے کہ اگر آپ چاہیں تو صفا ان کے لئے سونا بن جائے گا، لیکن اس کے بعد بھی جو ان میں

سے کفر کرے گا تو اس کو میں ایسا عذاب دوں گا کہ دنیا میں ایسا عذاب کسی کو نہیں دیا گیا ہوگا، اور اگر آپ چاہیں تو میں ان کے لئے توبہ اور رحمت کا دروازہ کھول دوں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: توبہ اور رحمت کے دروازہ کا کھلنا زیادہ بہتر ہے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: [وَمَا مَنَعَنَآ اَنۡ نُّرۡسِلَ بِالۡاٰيٰتِ اِلَّاۤ اَنۡ كَذَّبَ بِهَا الۡاَوَّلُوۡنَ‌ؕ وَاٰتَيۡنَا ثَمُوۡدَ النَّاقَةَ مُبۡصِرَةً فَظَلَمُوۡا بِهَا‌ؕ وَمَا نُرۡسِلُ بِالۡاٰيٰتِ اِلَّا تَخۡوِيۡفًا ۝] ترجمہ: ”اور ہم کو نشانیاں بھیجنے سے نہیں روکا مگر اس بات نے کہ اِن سے پہلے کے لوگ اُن کو جھٹلا چکے ہیں (چنانچہ دیکھ لو) ثمود کو ہم نے علانیہ اونٹنی لاکر دی اور اُنھوں نے اس پر ظلم کیا ہم نشانیاں اسی لئے تو بھیجتے ہیں کہ لوگ انہیں دیکھ کر ڈریں“۔(سورۃ الاسراء: 59، مستدرک حاکم 153/1، مسند بزار: 2224 سنن بیہقی 50/7، السیرۃ النبویہ، اُبوشہبہ 321-320)

ان مطالبات کے ذریعہ زعمائے قریش کا مقصد یہ تھا کہ دعوت اور داعی کے خلاف میڈیا اور ذرائع ابلاغ کی جنگ شروع کی جائے اور حق کے خلاف سازشوں کا جال بچھایا جائے تاکہ عرب قبائل آپ ﷺ سے دوری اختیار کریں، اس لئے کہ وہ ایسی چیزوں کا مطالبہ کر رہے تھے جن کے بارے میں وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ اس دعوت کے مزاج سے میل نہیں کھاتی ہیں، اسی لئے ان کو ان مطالبات پر اصرار تھا، بلکہ انہوں نے صاف صاف واضح کر دیا تھا کہ اگر ان مطالبات میں سے کچھ پورا بھی ہوا تو وہ تب بھی اس دعوت پر ایمان نہیں لائیں گے، یہ سب اس بات کی کوشش تھی کہ رسول اللہ ﷺ کی بے بسی کو ظاہر کیا جائے اور اس کو لوگوں کو روکنے کا ذریعہ بنایا جائے۔(صحیح السیرۃ النبویۃ، ص90)

9- مکی دور میں یہود کا کردار اور مشرکینِ مکہ کی ان سے استعانت:

مکی دور میں قرآن کریم نے بہت سی سورتوں میں جن کی تعداد پچاس تک پہنچتی ہے بنی اسرائیل کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، اور مدنی دور میں اللہ کے نور کو بجھانے میں اور دعوت اسلامی اور رسول اللہ ﷺ کی زندگی کا چراغ گل کرنے کے سلسلہ میں یہود کا بدترین کردار رہا ہے، کسی بھی ملک یا قوم کے بارے میں اس قدر تفصیل اور وضاحت کے ساتھ قرآن میں گفتگو نہیں کی گئی ہے جس تفصیل اور وضاحت کے ساتھ یہود کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے، ان کے بارے میں قرآنِ کریم کے تذکرہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں انتہائی باریک بینی اختیار کی گئی ہے جو ان دعوتی مراحل کے عین مطابق ہے جن مراحل سے اسلامی دعوت گزری، قرآن کریم کی بہت سی آیات میں اس بات کے اشارات موجود ہیں کہ مشرکین کی غفلت اور دعوت کو اہمیت نہ دینے کے انسانی تاریخ میں بہت سے نمونے پائے جاتے ہیں جیسے کہ قوم عاد، ثمود، فرعون، بنی اسرائیل، قوم تبع اور اصحاب الرس کا طرزِ عمل رہا ہے۔(الوفود فی العھد المکی، ص40-51)

ان اشارات کو نزولی ترتیب کے اعتبار سے تیسری سورت سورۃ مزمل کی ان آیات میں ملاحظہ فرمائیں: [اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلَيۡكُمۡ رَسُوۡلًا ۙ شَاهِدًا عَلَيۡكُمۡ كَمَاۤ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ رَسُوۡلًا (15) فَعَصٰى فِرۡعَوۡنُ الرَّسُوۡلَ فَاَخَذۡنٰهُ اَخۡذًا وَّبِيۡلًا (16) فَكَيۡفَ تَتَّقُوۡنَ اِنۡ كَفَرۡتُمۡ يَوۡمًا يَّجۡعَلُ الۡوِلۡدَانَ شِيۡبَا (17) اۨلسَّمَآءُ مُنۡفَطِرٌ ۢ بِهٖ‌ ؕ كَانَ وَعۡدُهٗ مَفۡعُوۡلًا (18) اِنَّ هٰذِهٖ تَذۡكِرَةٌ ۚ فَمَنۡ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيۡلًا (19)] ترجمہ: ”ہم نے تمہاری طرف تم پر گواہی دینے والا ایک رسول بھیجا ہے کہ جس طرح فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا تھا۔ پھر فرعون نے اس رسول کی نافرمانی کی تو ہم نے اسے سخت پکڑ سے پکڑ لیا۔ پھر تم کس طرح بچو گے اگر تم نے بھی انکار کیا اس دن جو لڑکوں کو بوڑھا کر دے گا۔ اس دن

آسمان پھٹ جائے گا، اس کا وعدہ ہو کر رہے گا۔ بے شک یہ (قرآن) ایک نصیحت ہے، پھر جو چاہے اپنے رب کی طرف آنے کا راستہ بنالے"۔ (سورۃ مزمل: 15-19)

اسی طرح نزولی ترتیب کے اعتبار سے آٹھویں سورت سورۃ الاعلیٰ میں بھی مذکور ہے، پہلے اللہ تعالیٰ کی صفاتِ جلیلہ کا، اس کی عطا کردہ دنیاوی واخروی نعمتوں کا اور دنیاوی اور اخروی فلاح و کامیابی کا ذکر کیا گیا ہے اور سورت کا اختتام اللہ تعالیٰ کے اس قول کے ذریعہ کیا گیا ہے: [اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۞ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ۞] ترجمہ: "یہی بات پہلے آئے ہوئے صحیفوں میں بھی کہی گئی تھی۔ ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کے صحیفوں میں"۔ (سورۃ الاعلیٰ: 18-19)

اسی طرح سورۃ الفجر میں ہے ﴿أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۞٦ إِرَمَ ذَاتِ ٱلْعِمَادِ ۞٧ ٱلَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي ٱلْبِلَٰدِ ۞٨ وَثَمُودَ ٱلَّذِينَ جَابُوا۟ ٱلصَّخْرَ بِٱلْوَادِ ۞٩ وَفِرْعَوْنَ ذِى ٱلْأَوْتَادِ ۞١٠ ٱلَّذِينَ طَغَوْا۟ فِى ٱلْبِلَٰدِ ۞١١ فَأَكْثَرُوا۟ فِيهَا ٱلْفَسَادَ ۞١٢ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ۞١٣ إِنَّ رَبَّكَ لَبِٱلْمِرْصَادِ ۞١٤﴾ ترجمہ: "کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ آپ کے رب نے عاد کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ جو نسلِ ارم سے ستونوں والے تھے۔ کہ ان جیسا شہروں میں پیدا نہیں کیا گیا۔ اور ثمود کے ساتھ جنہوں نے پتھروں کو وادی میں تراشا تھا۔ اور فرعون میخوں والوں کے ساتھ۔ ان سب نے ملک میں سرکشی کی۔ پھر انہوں نے بہت فساد پھیلایا۔ پھر ان پر تیرے رب نے عذاب کا کوڑا پھینکا۔ بے شک آپ کا رب تاک میں ہے۔ (سورۃ الفجر: 6-14)

سورۃ النجم میں بنی اسرائیل کا ذکر کیا گیا ہے اور اس میں ان انسانی نمونوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کو ابتلاء و آزمائش اور ظلم کا سامنا کرنا پڑا، ان میں سے بعض تو اس ابتلاء میں انحراف کا شکار ہو کر راہ حق سے بچھڑ گئے جبکہ بعض نے استقامت و ثابت قدمی کا ثبوت دیا اور اس ابتلاء میں کامیاب ہو گئے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: [فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا (29) ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ۚ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰى (30) وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى (31) اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبَآئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ۚ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ۚ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهَاتِكُمْ ۖ فَلَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ ۖ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى (32) اَفَرَاَيْتَ الَّذِيْ تَوَلّٰى (33) وَاَعْطٰى قَلِيْلًا وَّاَكْدٰى (34) اَعِنْدَهٗ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرٰى (35) اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِيْ صُحُفِ مُوْسٰى (36) وَاِبْرَاهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰى (37) اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (38) وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (39) وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى (40) ثُمَّ يُجْزَاهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى (41) وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى (42)] ترجمہ: "پھر تم اس کی پروا نہ کرو جس نے ہماری یاد سے منہ پھیر لیا ہے اور صرف دنیا ہی کی زندگی چاہتا ہے۔ ان کی سمجھ کی یہیں تک رسائی ہے، بے شک آپ کا رب اس کو خوب جانتا ہے جو اس کے راستہ سے بہکا اور اس کو بھی خوب جانتا ہے جو راہ پر آیا۔ اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے تاکہ برا کرنے والوں کو ان کا بدلہ دے اور نیکی کرنے والوں کو نیک بدلہ دے۔ وہ جو بڑے گناہوں اور بے حیائی کی باتوں سے بچتے ہیں مگر صغیرہ گناہوں سے (نہیں بچ پاتے)، بے شک آپ کا رب بڑی وسیع بخشش والا ہے، وہ تمہیں خوب جانتا ہے جب کہ تمہیں زمین

سے پیدا کیا تھا اور جب کہ تم اپنی ماں کے پیٹ میں بچے تھے، پس اپنے آپ کو پاک نہ سمجھو، وہ پرہیز گار کو خوب جانتا ہے۔ بھلا آپ نے اس شخص کو دیکھا جس نے منہ پھیر لیا۔ اور تھوڑا سا دیا اور سخت دل ہو گیا۔ کیا اس کے پاس غیب کا علم ہے کہ وہ دیکھ رہا ہے۔ کیا اسے ان باتوں کی خبر نہیں پہنچی جو موسیٰ کے صحیفوں میں ہیں۔ اور ابراھیم کے جس نے (اپنا عہد) پورا کیا۔ وہ یہ کہ کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جو کرتا ہے۔ اور یہ کہ اس کی کوشش جلد دیکھی جائے گی۔ پھر اسے پورا بدلہ دیا جائے گا۔ اور یہ کہ سب کو آپ کے رب ہی کی طرف پہنچنا ہے"۔ (سورۃ النجم: 29-42)

بلاشبہ یہ مبادیات وضوابط بنی اسرائیل کی طرف بھیجے گئے نبی حضرت موسی (علیہ السلام) کے صحیفوں میں بھی موجود تھے، لہذا بنی اسرائیل کو ان کی طرف رجوع کرنا چاہیے، اگر انہیں محمد ﷺ کے بارے میں کچھ شک ہے، اسی طرح ابراہیم (علیہ السلام) کے صحیفوں میں بھی یہ موجود ہیں جن کے بارے میں قریش یہ گمان رکھتے ہیں کہ ان کی نسبت انہی کی جانب ہے اور وہ انہی کے شرائع کی تعظیم کرتے ہیں۔

اسی طرح سورہ ص، یس، مریم اور طہ میں بھی مختلف انبیاء کی ان کی اقوام کے ساتھ پیش آمدہ صورتحال کے نمونے پیش کئے گئے ہیں، ان کو کس ابتلاء و آزمائش کا سامنا کرنا پڑا اور کیسے انہوں نے صبر و ثبات کا ثبوت دیا، اسی طرح حق کی دعوت کا مقابلہ کرنے والوں اور اس کی مخالفت کرنے والوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے قوانین کا بھی ذکر کیا گیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: [جُندٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُومٌ مِّنَ الْأَحْزَابِ (11) كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَعَادٌ وَفِرْعَوْنُ ذُو الْأَوْتَادِ (12) وَثَمُودُ وَقَوْمُ لُوطٍ وَأَصْحَابُ الْأَيْكَةِ ۚ أُولَٰئِكَ الْأَحْزَابُ (13) إِن كُلٌّ إِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ (14) وَمَا يَنظُرُ هَٰؤُلَاءِ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً مَّا لَهَا مِن فَوَاقٍ (15) وَقَالُوا رَبَّنَا عَجِّل لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ (16) اصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوُودَ ذَا الْأَيْدِ ۖ إِنَّهُ أَوَّابٌ (17)] ترجمہ: "وہاں ان کے لشکر شکست پائیں گے۔ ان سے پہلے قوم نوح اور عاد اور میخوں والا فرعون۔ اور ثمود اور لوط کی قوم اور بن والے بھی جھٹلا چکے ہیں، یہی وہ لشکر ہیں۔ ان سب نے رسولوں کو جھٹلایا تھا پس میرا عذاب آموجود ہوا۔ اور یہ ایک ہی چیخ کے منتظر ہیں جسے کچھ دیر نہیں لگے گی۔ اور کہتے ہیں اے رب ہمارے! ہمارا حصہ ہمیں حساب کے دن سے پہلے ہی دے دے۔ ان کی ان باتوں پر صبر کر اور ہمارے بندے داؤد کو یاد کر جو بڑا طاقتور تھا، بے شک وہ رجوع کرنے والا تھا"۔ (سورۃ ص: 11-17)

نبی کریم ﷺ کے اصحاب و متبعین کے لئے اس آیت میں تربیتی پہلوؤں پر مبنی اشارات ہیں جو ان اقوام کے طرزِ عمل سے ماخوذ ہیں، جو دعوتِ حق کے مقابلہ میں یک جٹ ہو گئے، اُنہوں نے انبیاء کو جھٹلایا تو ان پر عذاب کا تازیانہ برسایا گیا اور اہلِ حق ان کے مقابلہ میں غلبہ اور کامیابی سے ہمکنار ہو گئے۔

کوئی بھی نبی قوم کی ایذاء سے محفوظ نہیں رہ پایا ہے، چاہے اس نبی کا اپنے معاشرہ میں کوئی بھی مقام و مرتبہ رہا ہو، اگرچہ نوحؑ، ہودؑ، موسیٰؑ، صالحؑ، لوطؑ اور شعیبؑ کا تعلق عامۃ الناس سے تھا لیکن داؤدؑ کے بارے میں آپ کیا کہیں گے جو صاحبِ قوت و طاقت، صاحبِ اقتدار و بادشاہ تھے، جن کے معجزات ظاہر و باہر اور سب کے مشاہدہ میں تھے، پہاڑ ان کے ساتھ تسبیح خوانی کرتے تھے، ان کی تلاوت و سُر کو سننے کے لئے پرندے جمع ہو کر گوش بر آواز ہوتے تھے! ان کے متعلق بنی اسرائیل نے کیا کیا تبصرے کئے ہیں؟ اور ان کی سیرت کے بارے میں اپنی

کتابوں میں کیا کچھ لکھا ہے؟! انہوں نے کوئی ایسا عیب نہیں چھوڑا ہے جسے ان کتابوں میں ان کی طرف منسوب نہ کیا ہو حالانکہ وہ تو عبادت گزار اور رب کی طرف رجوع کرنے والے نبی تھے، اسی طرح کی باتیں انہوں نے پاکباز حضرت مریم (علیہا السلام) کے بارے میں بھی کہی ہیں، قرآن کریم نے ان کے حمل کا، ان کی ولادت کا اور ان کی خرقِ عادت باتوں اور کرامات کا ذکر کیا ہے، یہاں تک کہ ان کو اور ان کے بیٹے کو تمام جہاں کے لئے آیت بنایا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: [قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ۝] ترجمہ: "فرشتے نے کہا: "ایسا ہی ہوگا، تیرا رب فرماتا ہے کہ ایسا کرنا میرے لئے بہت آسان ہے اور ہم یہ اس لئے کریں گے کہ اُس لڑکے کو لوگوں کے لئے ایک نشانی بنائیں اور اپنی طرف سے ایک رحمت اور یہ کام ہو کر رہنا ہے"۔ (سورۃ مریم: 21)

لہذا اگر بنی اسرائیل کا اپنے انبیاء کے ساتھ یہ طرزِ عمل رہا ہے حالانکہ وہ اہلِ کتاب ہیں اور ان کے پاس توراۃ تھی جو ہدایت و نور کا سرچشمہ تھی، تو پھر اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے کہ قریش کے لوگ دعوتِ حق کے بارے میں ایسی باتیں کہیں جو ان کی ضلالت و گمراہی کی دلیل ہیں، مشرکین اور اہلِ کتاب میں سے تکذیب کرنے والے اور افتراء اندازی کرنے والے اعدائے دین کے ساتھ کشمکش کا ایک مقصد یہ ہے کہ نفس کو حق کے لئے تیار اور اس پر استقامت و ثابت قدمی اختیار کرنے والا بنایا جائے، بنی اسرائیل کا یہ طرزِ عمل صرف ان انبیاء کے ساتھ نہیں تھا جن کی انہوں نے تکذیب کی اور ان پر ایمان لائے بلکہ ان کا انتہائی گھٹیا طرزِ عمل ان کے عظیم ترین نبی کے ساتھ بھی ایسا ہی رہا ہے جن سے نسبت ہونے پر وہ فخر کرتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہی اس کتاب کے وارث ہیں اور وہی ان کی ہدایات و تعلیمات کے حامل ہیں اور وہ نبی ہیں موسیٰ-علیہ السلام-جو تمام بنی اسرائیل کے عظیم ترین نبی ہیں۔

سورۂ طہٰ میں موسیٰ (علیہ السلام) کے حالات کی منظر کشی کی گئی ہے اور بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح موسیٰؑ نے ان کی بے وقوفی، ان کی سرکشی اور نافرمانی کا سامنا کیا، موسیٰؑ رب سے مناجات و ہمکلام ہونے کے وقت جیسے ہی اپنی قوم سے جدا ہوتے ہیں جبکہ ہارون (علیہ السلام) کو ان کے درمیان چھوڑ کر گئے تھے فوراً ہی اُنہوں نے سازش شروع کی اور لوگوں کے زیورات جمع کرنا شروع کر دیا تاکہ سامری ان کے لئے ایک بچھڑا تیار کرلے اور اس کے چاروں طرف عبادت کے لئے طواف کرتے رہیں اور یہ خطرناک بات کہیں: "یہ ہے تمہارا معبود اور موسیٰؑ کا معبود، وہ اس کو بھول گیا ہے: [فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى فَنَسِيَ] ترجمہ: "اور ان کے لئے ایک بچھڑے کی مورت بنا کر نکال لایا جس میں سے بیل کی سی آواز نکلتی تھی، لوگ پکار اٹھے: "یہی ہے تمہارا خدا اور موسیٰؑ کا خدا، موسیٰؑ اسے بھول گیا"۔ (سورۃ طہ: 88) اور جب موسیٰؑ کو اس کا علم ہوا تو سامری کو بلا کر اس بے وقوفانہ عمل کے محرک کے بارے میں سوال کیا تو اس نے جواب دیا: [قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ] ترجمہ: "اس نے جواب دیا: "میں نے وہ چیز دیکھی جو اِن لوگوں کو نظر نہ آئی، پس میں نے رسُول کے نقش قدم سے ایک مٹھی اٹھالی اور اُس کو ڈال دیا میرے نفس نے مجھے کچھ ایسا ہی سجھایا"۔ (سورۃ طٰہٰ: 96)

جس قوم کو ان کی بے عقلی زیغ و ضلال اور فساد کی انتہا تک پہنچا دے کیا ان کے بارے میں اطمینان کیا جا سکتا ہے اور ان سے کسی خیر یا حق کی نصرت کی توقع کی امید کی جا سکتی ہے؟! یقیناً مکہ کے اس ابتدائی مرحلہ میں بنی اسرائیل کے ان واقعات میں اسلامی شخصیت سازی کے

تیئں دور رس اثرات تھے جس کے نتیجہ میں ایک ایسی شخصیت وجود میں آتی ہے جو مذکورہ گروہوں اور قوموں کے مقابلہ میں امتیازی شان رکھتی ہو۔(دیکھیں: معالم قرآنیہ فی الصراع مع الیہود، ص،316)

یہ قرآنِ پاک کے لطائف واسرار اور حسین مناسبات میں سے ہے کہ بنی اسرائیل کے عہد و میثاق کا ذکر کرتے ہوئے اسلامی دعوت کی عالمیت کا ذکر کیا گیا تاکہ وہ نبی اُمی پر ایمان لے آئیں جبکہ وہ ان کے سامنے اس عالمی دعوت کو پیش کریں،اس طرح کا مضمون سورۂ اعراف میں آیا ہے،بنی اسرائیل کے انحرافات کی تفصیلات بیان کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اہلِ ایمان کی ذہن سازی کی جائے کہ وہ یہود کے موقف سے متاثر نہ ہوں،اس لئے کہ ان کا اپنے انبیاء کے ساتھ یہی طرزِ عمل رہا ہے، لہذا اس طرح کی فسادی قوم کی طرف سے اس بات پر تعجب نہیں ہونا چاہیے اگر وہ اسلام سے اعراض کرتے ہیں اور محمد ﷺ کی تکذیب کرتے ہیں حالانکہ آپؐ کے اوصاف ان کی کتابوں میں موجود ہیں !۔ (دیکھیں: معالم قرآنیہ فی الصراع مع الیہود، ص39-40)

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:[وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ ۭ قَالَ عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَاۗءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۭ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۞ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۡ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَـبٰۗىِٕثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۞ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَۨا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُـحْيٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ] ترجمہ: ”اور ہمارے لئے اس دنیا کی بھلائی بھی لکھ دیجیے اور آخرت کی بھی، ہم نے آپ کی طرف رجوع کر لیا۔ جواب میں ارشاد ہوا: سزا تو میں جسے چاہتا ہوں دیتا ہوں، مگر میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے،اور اُسے میں اُن لوگوں کے حق میں لکھوں گا جو نافرمانی سے پرہیز کریں گے، زکٰوۃ دیں گے اور میری آیات پر ایمان لائیں گے۔ (پس آج یہ رحمت اُن لوگوں کا حصہ ہے) جواِس پیغمبر، نبی امی کی پیروی اختیار کریں جس کا ذکر اُنہیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے وہ انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی سے روکتا ہے، ان کے لئے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے،اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو اُن پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے لہٰذا جو لوگ اس پر ایمان لائیں اور اس کی حمایت اور نصرت کریں اور اُس روشنی کی پیروی اختیار کریں جو اس کے ساتھ نازل کی گئی ہے، وہی فلاح پانے والے ہیں۔ اے محمدؐ، کہو کہ "اے انسانو، میں تم سب کی طرف اُس خدا کا پیغمبر ہوں جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے،اُس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے، پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے بھیجے ہوئے نبی اُمی پر جو اللہ اور اس کے ارشادات کو مانتا ہے،اور پیروی اختیار کرو اُس کی، امید ہے کہ تم راہ راست پا لوگے"۔ (سورۃ الاعراف: 156- 158)

جی ہاں، یہ مکہ کے ریگزار، اس کی گھاٹیوں اور اس کے پہاڑوں سے پوری دنیا کی جانب ایک سفر ہے، یہ ایک عظیم روحانی اور نفسیاتی سفر ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ آیات کا سیاق عالمی دعوت کے نقشِ راہ کو اس وقت متعین کر رہا ہے جبکہ وہ مکہ سے عالمی منظر نامہ کی جانب گامزن ہو چکی

ہے، اسی طرح سورۃ اُعراف کی یہ آیات امتِ محمدؐ کے لئے عظیم ترین تربیتی دروس سے لبریز ہیں، بنی اسرائیل کی زندگی کی تاریخ کو دہرا کر، ان کے عظیم واقعات کو شمار کر کے، ان تبصروں کے ذریعہ جو امتِ محمدیہؐ کو قیادتِ عالم کے سلسلہ میں اپنے کردار اور ذمہ داری کی جانب متوجہ کرتے ہیں، اس طرح سے اس کے ذریعہ بہت سے تربیتی دروس دیئے گئے ہیں، ساتھ ہی ساتھ اس بات سے ڈرایا بھی گیا ہے تاکہ ان تمام چیزوں سے اجتناب کیا جائے جن میں بنی اسرائیل ملوث ہوئے، اس کے بعد ان امتوں کا ذکر کیا گیا ہے جو 'اسباط' پر مشتمل تھیں اور ذکر کیا گیا ہے کہ کس طرح ان پر کھانے، پینے اور رزق کی فراوانی کر دی گئی، ان کے لئے چشمے جاری کئے گئے، من وسلویٰ کا ان پر نزول کیا گیا، بادلوں کے ذریعہ ان پر سایہ کیا گیا، لیکن ان سب انعامات کے باوجود کیا انہوں نے ان نعمتوں کا شکر ادا کیا؟ شرعی احکام کے بارے میں ان کا کیا موقف رہا ہے؟ عناد و دشمنی، تحریف، حیلہ بازی اور سرکشی ہمیشہ ان کی طرف سے دیکھنے کو ملی!

بلاشبہ انسان کی انسانیت خالقِ ارض و سماء کی طرف سے نازل کردہ وحیٔ ربانی کی اتباع کے ذریعہ ہی متحقق ہو سکتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی عبودیت ہی انسان کو انسانیت کے کمال تک پہنچا سکتی ہے، اس لئے کہ اسی کے ذریعہ اس مقصد کی تکمیل ہو گی جس کے لئے انسان کی تخلیق کی گئی ہے، اور اس ذمہ داری میں کسی طرح کی غفلت و کوتاہی اور نورِ الٰہی سے کسی طرح کی بھی دوری انسان کو انسانی کمال و بلندی سے دور کر کے جانوروں اور چوپایوں کی صف میں لا کھڑا کرے گی، بلکہ جانوروں سے بھی بدتر بنا دے گی، اس لئے کہ انسان اپنی عقل کو استعمال کر کے مزید انحطاط و پستی اختیار کر سکتا ہے جبکہ جانور مزید انحطاط و پستی اختیار کرنے کے لئے کوئی حیلہ اور تدبیر اختیار نہیں کرے گا، بلکہ اس کی فطرت میں کچھ صفات ہیں جو اس کو متعین اعمال و افعال پر آمادہ کرتی ہیں۔

مکہ میں نازل ہونے والی سورۂ اعراف میں بنی اسرائیل کے واقعات کے ذریعہ تربیتی مناظر پیش کئے گئے ہیں، ربانی تعلیمات بیان کی گئی ہیں اور الٰہی سنن و قوانین کی وضاحت کی گئی ہے۔ (معالم قرآنیہ فی الصراع مع الیہود، 54)

جب قریش نے اپنے آپ کو حق کی دعوت کے سامنے عاجز پایا اور اس عاجزی اور بے بسی کا اظہار نضر بن حارث نے اس وقت کیا جب اس نے صاف الفاظ میں یہ کہا: اے قریش کے لوگو! تم پر ایک ایسی مصیبت آن پڑی ہے جس کا ابھی تمہارے پاس کوئی حیلہ بھی نہیں ہے، لہذا اپنے اس معاملہ کے بارے میں غور کر لو، اس لئے کہ اللہ کی قسم! تمہارے سامنے ایک خطرناک مسئلہ درپیش ہے! اس کے بعد انہوں نے یہ طے کیا کہ نضر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط کو مدینہ میں یہودی علماء کے پاس بھیج کر اس دعوت کی حقیقت کو جاننے کی کوشش کریں، اس لئے نہیں بھیجا کہ وہ اس کی اتباع کریں گے بلکہ اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ یہود ان کو ایسی چیزیں بتائیں گے جن کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ کی عاجزی و بے بسی ظاہر ہو گی اور زعمائے مکہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہود تمام انبیاء اور ہر جگہ کے اہلِ حق کے ساتھ بغض و عناد رکھتے ہیں۔

محمد مصطفی ﷺ کی بعثت یہودیوں کے لئے ایک خطرناک صدمہ تھا، اس لئے کہ وہ جزیرۃ العرب میں طویل عرصہ سے یہ خواب دیکھ رہے تھے کہ اس زمان و مکان میں ایک نجات دہندہ نبی مبعوث کیا جائے گا، وہ اس امید میں تھے کہ وہ نبی انہی میں سے ہو گا اور ان کو امید تھی کہ وہ نبی ان کو ان میں موجود افتراق و انتشار سے آزادی دلائے گا۔ (دیکھیں: معالم قرآنیہ فی الصراع مع الیہود، ص 55-66)

کفر و شرک کے کیمپ کی یہود کے ساتھ قربت اس لئے تھی کیونکہ دونوں کا مشترکہ ہدف اسلامی دعوت کا خاتمہ کرنا تھا، اسی لئے انہوں نے مکی وفد کو بعض سوالات بتادیئے جن کے ذریعہ نبی کریم ﷺ کو بے بس ولاجواب کرنا مقصود تھا۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ قریش نے نضر بن حارث اور عتبہ بن ابی معیط کو مدینہ میں علمائے یہود کے پاس بھیجااور ان سے کہا کہ ان یہود سے محمدؐ کے بارے میں دریافت کریں اور ان کے سامنے آپؐ کی صفات اور آپؐ کے اقوال کا ذکر کریں، کیونکہ وہ اہلِ کتاب ہیں اور ان کے پاس انبیاء کا وہ علم ہے جو ہمارے پاس نہیں ہے، چنانچہ وہ دونوں نکلے یہاں تک کہ مدینہ پہنچے، ان دونوں نے علمائے یہود سے رسول اللہ ﷺ کے بارے میں دریافت کیا، ان کے سامنے آپؐ کے اوصاف اور بعض کلام کا بھی ذکر کیا اور کہا کہ آپ اہل تورات ہیں اور ہم آپ کے پاس اس لئے آئے ہیں تاکہ آپ ہمیں ہمارے ان صاحب کے بارے میں کوئی صحیح رائے دیں۔ علمائے یہود نے ان سے کہا کہ ان سے تین سوالات کرنا، اگر وہ ان کا جواب دیں گے تو وہ نبی مرسل ہیں اور اگر وہ جواب نہیں دے پاتے ہیں تو وہ جھوٹا شخص ہے، اس لئے ان کے بارے میں آپ لوگ کس بات پر اتفاق کرلینا، ان سے ایک سوال ان نوجوانوں کے بارے میں پوچھنا جو قدیم زمانہ میں اپنے شہر سے نکل گئے تھے، معلوم کریں کہ ان کا کیا معاملہ تھا؟ اس لئے کہ ان کا عجیب وغریب قصہ ہے۔ دوسرا سوال اس سے یہ پوچھنا کہ اس شخص کا کیا قصہ ہے جس نے دنیا کے مشرق و مغرب اور تمام زمین کا سفر کیا تھا؟ اور تیسرا سوال ان سے روح کے متعلق کرنا کہ وہ کیا چیز ہے؟ اگر وہ ان سوالات کا جواب دیں گے تو وہ نبی ہیں، اس لئے ان کی اتباع کرلینا، اور اگر وہ ان سوالات کا جواب نہ دے سکیں تو وہ جھوٹا شخص ہے، لہذا ان کے بارے میں جو اچھا لگے فیصلہ کرلینا۔

نضر اور عتبہ یہ سوالات لے کر مکہ واپس آئے اور قریش سے کہا: اے قریش کے لوگو! ہم آپ کے اور محمدؐ کے مابین ایک فیصلہ کن بات لے کر آئے ہیں، علمائے یہود نے مشورہ دیا ہے کہ ہم ان سے چند چیزوں کے بارے میں سوالات کریں، انہوں نے قریش کے سامنے ان سوالات کا ذکر کیا، وہ سب یہ سوالات لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور کہنے لگے: اے محمدؐ! ہمیں ان ان سوالات کا جواب دیجئے۔ انہوں نے یہ تینوں سوالات رسول اللہ ﷺ کے سامنے رکھے، آپؐ نے ان سے کہا کہ میں کل تمہیں ان سوالات کا جواب دوں گا، لیکن آپؐ نے ان شاءاللہ نہیں فرمایا، وہ یہ سوالات کر کے واپس چلے گئے، آپؐ پندرہ روز تک انتظار کرتے رہے، نہ ہی اللہ تعالیٰ نے آپ پر وحی نازل کی اور نہ ہی حضرت جبرئیل (علیہ السلام) آپؐ کے پاس تشریف لائے یہاں تک کہ اہل مکہ پریشان ہوکر چہ مہ گوئیاں کرنے لگے کہ محمدؐ نے ہم سے کل کا وعدہ کیا تھا اور اب پندرہ دن ہو رہے ہیں لیکن وہ اب تک ہمارے سوالات کا جواب نہیں دے رہے ہیں، یہاں تک کہ وحی نہ آنے کی وجہ سے آپ ﷺ بھی غمگیں اور پریشان ہوگئے، آپؐ کے لئے اہلِ مکہ کی یہ باتیں بھی پریشانی کا باعث بن گئیں، اس کے بعد حضرت جبرئیلؑ اللہ کی طرف سے سورۂ کہف لے کر نازل ہوئے جس میں ان سوالات کا جواب بھی تھا اور ہدایات بھی، اسی طرح سورہ اسراء کی یہ آیات بھی نازل ہوئیں: [وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ۝] ترجمہ: ”یہ لوگ تم سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں کہو: یہ روح میرے رب کے حکم سے آتی ہے، مگر تم لوگوں نے علم سے کم ہی بہرہ پایا ہے"۔ (سورۂ اسراء: 85) (سیرت ابن ہشام: 322/1)

جب یہود نے یہ آیت سنی تو کہنے لگے کہ یہ کیسے کہا گیا کہ تمہیں قلیل علم دیا گیا ہے، ہمیں تو کافی علم دیا گیا ہے، جس کو تورات عطا کی گئی تو اس کو خیر کثیر عطا کیا گیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی: [قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ﴿﴾] ترجمہ: ''اے محمدؐ، کہو کہ اگر سمندر میرے رب کی باتیں لکھنے کے لئے روشنائی بن جائے تو وہ ختم ہو جائے مگر میرے رب کی باتیں ختم نہ ہوں، بلکہ اتنی ہی روشنائی ہم اور لے آئیں تو وہ بھی کفایت نہ کرے''۔(سورۃ الکہف: 109)

سورۂ کہف ان کے سوالات کے جوابات پر بھی مشتمل تھی اور اس میں اس جانب بھی اشارہ تھا کہ اللہ کی نصرت و عنایت کی ایک 'غار' عنقریب اصحابِ محمدؐ میں سے اِن کمزوروں کو اپنی پناہ میں لے گی جیسے کہ پہاڑ کی غار نے ان اصحابِ ایمان نوجوانوں کو پناہ دی جنہوں نے اپنے دین کی حفاظت کے لئے اپنے شہر کو خیر باد کہا تھا، اسی طرح یثرب میں اللہ کے دین کے کچھ مددگار اس ایمان واستقامت والی جماعت کے لئے خوشی کا سبب بنیں گے، یہ مدد کرنے والے ان لوگوں کے پڑوسی ہوں گے جنہوں نے قریش کے شکوک وشبہات بڑھانے میں مدد کی تھی اور ان کے ساتھ مل کر نورِ حق کو بجھانے کی کوشش کی تھی، ان کو نبوت کی تحقیق کرنے کے بارے میں بے بس وعاجز کرنے والا طریقہ سکھایا تھا، حالانکہ یہ طرزِ عمل کوئی اچھا طرزِ عمل نہیں ہے، بے بس کرنے والے سوالات رسالت اور صاحبِ رسالت کی صداقت کو پرکھنے کا ذریعہ کیسے ہو سکتے ہیں؟ چناچہ اللہ کے نبی موسیٰ علیہ السلام جو انبیائے بنی اسرائیل میں سے عظیم نبی ہیں، ان کو بھی ان واقعات کی تأویل و تفسیر کا علم نہیں تھا جو ان کے سامنے پیش آئے اور انہوں نے حضرت خضر کے تصرفات پر نکیر کی، حالانکہ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ان سے کوئی سوال نہیں کریں گے، یہاں تک کہ وہ خود ہی ان کو نہ بتا دیں، اس کے باوجود موسی (علیہ السلام) کی نبوت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا، اور نہ ہی بنی اسرائیل نے ان کی نبوت کے بارے میں کسی طرح کا شک کیا، پھر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کی صداقت کو پرکھنے کے لئے اس طرح کے سوالات کو بنیاد کیسے بنایا جا سکتا ہے؟!۔(دیکھیں: مباحث فی التفسیر الموضوعی، مصطفی مسلم، 189)

اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کے ذریعہ اس جانب اشارہ کیا ہے کہ اہلِ ایمان جماعت کے لئے کشادگی اور آسانی کا وقت اب قریب ہے اور ان کو بھی ویسے ہی پناہ گاہ مل جائے گی جیسے اہلِ کہف کو آسانی مل گئی اور اہلِ مدینہ ان کا پرتپاک استقبال کریں گے جیسے کہ اصحابِ کہف کا استقبال کیا گیا، ان کے ساتھ احترام وعزت کا معاملہ کیا گیا اور ان کے ذکر کو تابندہ بنا دیا گیا۔(تأملات فی سورۃ الکہف، الشیخ ابوالحسن ندوی، ص46، معالم قرآنیہ فی الصراع مع الیہود، ص61)

قرآنِ کریم کا نزول اس لئے ہوا تھا تاکہ ایک خیرِ اُمت کی تشکیل عمل میں آئے، چنانچہ مکی دور کے ابتدائی مرحلہ میں سورۂ فاتحہ کا نزول ہوا جس میں یہ دعا کی گئی ہے کہ ایک صاحبِ ایمان کو صراط مستقیم پر چلنے کی ہدایت ملے اور مغضوب علیہم (یعنی یہود) اور گمراہوں (یعنی نصاریٰ) کے راستے سے بچنے کی توفیق ملے، جیسے کہ حضرت عدی بن حاتمؓ کی حدیث میں وارد ہے۔(سنن ترمذی 2954، مسند احمد: 379)

لہذا اس طرزِ عمل کی تعیین اور صراط مستقیم کے بیان کا تقاضا یہ ہے کہ گمراہ کن راستوں اور طریقوں کو بھی بیان کیا جائے تاکہ ان تمام راستوں سے اجتناب کیا جا سکے جو ہلاکت اور برے انجام تک لے جا سکتے ہیں، اس لئے یہود کے عقائد، ان کے انحرافات اور انبیاء کے ساتھ ان کے طرزِ عمل کو ذکر کرنا لازمی تھا تاکہ ممتاز اسلامی شخصیت سازی میں اس کے ذریعہ مدد مل سکے، بلاشبہ یہود کے ساتھ ہماری کشمکش ایک

مستقل اور جاری رہنے والی کشمکش ہے، اس لئے کہ یہ منہج ربانی اور صراط مستقیم کی کشمکش ان تمام جاہلی نظامہائے حیات کے خلاف ہے جنہوں نے اللہ کے کلمات میں تحریفات کیں اور وہ زمین میں فساد و بگاڑ کے لئے مسلسل کوششیں کر رہے ہیں۔ (دیکھیں: معرکۃ الوجود بین القرآن والتلمود، ص78،79، معالم قرآنیہ، مصطفی مسلم، ص29)

10- بعثت کے ساتویں سال کے اخیر میں اقتصادی ومعاشرتی محاصرہ:

مشرکینِ قریش کی ایذاء رسانیوں میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا کیونکہ ایذاء کے مقابلہ میں اللہ کے رسول ﷺ اور مسلمان مسلسل صبر کر رہے تھے اور دعوت الی اللہ کے سلسلہ میں پیچھے مڑنے یا پست ہمتی کا شکار ہونے کا کوئی امکان نظر نہیں آرہا تھا، اسی طرح قبائل میں اسلام مسلسل پھیلتا ہی جارہا تھا، ایذاء رسانیاں اس مادی ومعنوی محاصرہ کے اعتبار سے انتہاؤں کو چھو رہی تھیں، جس کو قریش نے ظلم وزیادتی کرتے ہوئے نبی کریم ﷺ کے خلاف آپؐ کے اصحاب کے خلاف اور ان کے ساتھ ہمدردی رکھنے والوں کے خلاف عائد کر رکھا تھا۔ (دیکھیں: ظاھرۃ الارجاء، سفر الحوالی 50/1)

امام زہری فرماتے ہیں: "اس کے بعد مشرکین مسلمانوں کے مقابلہ میں اتنے سخت ہوگئے جتنا سخت ہونا ان کے لئے ممکن تھا، یہاں تک کہ مسلمان انتہائی پریشان ہوگئے اور ان پر ابتلاء وآزمائش سخت تر ہوتی چلی گئی، قریش نے اعلانیہ طور پر رسول اللہ ﷺ کو شہید کرنے پر اتفاق کر لیا، حضرت ابو طالب نے قوم کی اس دشمنی کو بھانپ لیا اور انہوں نے بنو عبدالمطلب کے سب افراد کو جمع کیا اور ان کو حکم دیا کہ اللہ کے رسولؐ کو اپنی گھاٹی میں داخل کریں اور آپؐ کو شہید کرنے والوں سے آپؐ کی حفاظت کریں، اور اس کے لئے ان کے مسلم وکافر سب متفق ہو گئے، ان میں سے بعض تو حمیت وغیرت کی وجہ سے ایسا کر رہے تھے اور بعض ایمان ویقین کی وجہ سے ایسا کر رہے تھے، جب قریش کو اس کا علم ہوا کہ یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کر رہے ہیں تو انہوں نے یہ طے کیا کہ وہ ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا چھوڑ دیں گے، ان کے ساتھ خرید وفروخت نہیں کریں گے، اور نہ ہی ان کے گھروں میں جائیں گے، یہاں تک کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو قتل کے لئے ان کے حوالہ نہ کریں، اُنہوں نے مکر وعدوات پر مبنی عہد وپیمان اور معاہدے بھی لکھے کہ وہ بنی ہاشم کی طرف سے کسی مصالحت کو قبول نہیں کریں گے اور نہ ہی ان پر کوئی رحم کریں گے یہاں تک کہ آپؐ کو ان کے حوالے نہ کریں۔

ایک دوسری روایت میں ہے: "......اُنہوں نے یہ طے کیا کہ نہ ہی ان کے ہاں کسی کا نکاح کریں گے اور نہ ہی ان کے یہاں سے کسی کو اپنے نکاح میں لائیں گے، نہ ہی ان کو کوئی چیز بیچیں گے اور نہ ہی ان سے کوئی چیز خریدیں گے اور نہ ہی ان تک اسبابِ رزق میں کوئی چیز پہنچنے دیں گے، نہ ان سے کسی طرح کی مصالحت قبول کریں گے اور نہ ہی ان پر کوئی رحم کریں گے، نہ ان کے ساتھ ملیں گے، نہ ان کے ساتھ اٹھیں بیٹھیں گے، نہ ان کے ساتھ بات چیت کریں گے اور نہ ہی ان کو اپنے گھروں میں آنے دیں گے، یہاں تک کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو قتل کرنے کے لئے ان کے حوالے نہ کر دیں، ان باتوں پر عمل درآمد کرنے کے لئے انہوں نے عہد ومیثاق کیا اور پھر اس معاہدہ کو مزید پختگی کے لئے خانہ کعبہ کے اندر آویزاں کر دیا۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویۃ، ابن ہشام 350/1، زاد المعاد 46/2، الکامل فی التاریخ 87/2، دلائل النبوۃ للبیہقی 80/2،85 السیرۃ النبویۃ، ابن کثیر 43/2،72)

بنو ہاشم شعب ابی طالب میں تین سال تک محصور رہے، ان پر ابتلاء و آزمائش اور مشقت سخت تر ہوتی رہی، ان کے لئے خرید و فروخت اور بازار کے تمام راستے مسدود کر دیئے گئے، جو بھی غلہ مکہ لایا جاتا، یا کہیں خرید و فروخت ہوتی تو قریش کے لوگ وہاں پہلے پہنچ جاتے اور خرید لیتے، وہ چاہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کا خون کرنے کے لئے ان پر دباؤ بنائیں۔(دیکھیں: ظاھرۃ الارجاء 51/1)

حضرت ابو طالب یہ تدبیر اختیار کرتے تھے کہ جب سب لوگ رات کو اپنے اپنے بستروں پر چلے جاتے تو وہ رسول اللہ ﷺ کو بھی حکم دیتے کہ وہ بھی اپنے بستر پر تشریف لے جائیں تاکہ ہر وہ شخص آپ ﷺ کو دیکھ لے جو بھی آپؐ کے بارے میں کوئی برا ارادہ رکھتا ہو یا آپؐ پر اچانک حملہ کرنا چاہتا ہو، جب سب لوگ سو جاتے تو حضرت ابو طالب اپنے کسی بیٹے کو یا بھائی کو اور چچا زاد بھائی کو رسول اللہ ﷺ کے بستر پر سلا دیتے اور رسول اللہ ﷺ کو حکم دیتے کہ ان کے بستر پر سو جائیں۔(دیکھیں: فقہ السیرۃ النبویہ، العضبان، ص180)

صحابہ کرام، بنو ہاشم اور بنو المطلب پر محاصرہ اتنا سخت ہوا یہاں تک کہ وہ پتے کھانے پر مجبور ہو گئے، وہ اس قدر تنگ حالی کا شکار ہو گئے یہاں تک کہ ان میں سے کوئی شخص پیشاب کرنے کے لئے نکلتا تو اس کو نیچے سے کسی چیز کو آواز آتی تو دیکھنے سے پتہ چلتا کہ وہ اونٹ کی کھال کا کوئی ٹکڑا ہے، وہ اس کو اٹھا کر دھو لیتا، اس کے بعد اس کو آگ پر پکا کر پیس لیتا اور پھر اس کو کھا لیتا اور اس پر پانی پی لیتا اور تین دن تک اسی پر گزارا کر لیتا، یہاں تک کہ قریش کے لوگ گھاٹی کے باہر سے بھوک کی وجہ سے بچوں کے بلکنے کی آوازیں سنتے تھے۔ (دیکھیں: الغرباء الأولون، ص148)

جب تین سال مکمل ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے قریش کے شرفاء کے دلوں میں اس معاہدہ کو توڑنے کی بات ڈالی، اس معاہدہ کو توڑنے اور داخلی انقلاب کی تحریک کے روح رواں ہشام بن عمرو ہاشمی تھے، وہ زہیر بن ابی امیہ مخزومی کے پاس گئے اور ان کی والدہ عاتکہ بنت عبد المطلب تھیں، ان سے کہا: اے زہیر! کیا آپ کو پسند ہے کہ آپ کھانا کھاتے رہیں، کپڑے پہنیں، اور شادی بیاہ کرتے رہیں اور آپ کے ماموں زاد اس حال میں رہیں، نہ وہ خرید و فروخت کر سکتے ہیں، نہ ہی ان سے کوئی کچھ خرید سکتا ہے، نہ ہی وہ کسی سے شادی کر سکیں اور نہ ان کے ہاں کوئی شادی کر سکتا ہے؟ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں، اگر وہ ابو الحکم بن ہشام کے ماموں زاد ہوتے اور پھر آپ اس سے اس طرح کے معاہدہ میں شریک ہونے کا مطالبہ کرتے جس طرح کے معاہدہ میں اس نے آپ کو شریک کیا ہے وہ کبھی بھی اس طرح کا معاہدہ تسلیم نہ کرتا۔ زہیر نے کہا: ہشام! پھر میں کیا کر سکتا ہوں؟ میں تو تنہا آدمی ہوں، واللہ اگر میرے ساتھ کوئی بھی دوسرا آدمی ہوتا تو میں اس معاہدہ کو توڑ دیتا! ہشام نے اس سے کہا: آپ کو ایک شخص مل گیا، پوچھا: کون ہے وہ؟ کہا: میں ہوں وہ۔ زہیر نے اس سے کہا: اب کوئی تیسرا شخص تلاش کرتے ہیں، چنانچہ وہ مطعم بن عدی کے پاس گئے اور اس سے کہا: کیا آپ اس سے راضی ہیں کہ آپ کے سامنے بنی عبد مناف کے کچھ گھرانے ہلاک ہو جائیں اور آپ اس میں قریش کا ساتھ دیتے رہیں؟ واللہ! اگر آپ لوگ ان کا یوں ہی ساتھ دیتے رہیں گے تو آپ دیکھو گے کہ وہ جلد ان گھرانوں کو ختم کر کے ہی دم لیں گے! مطعم نے کہا: تمہارا بھلا ہو! میں کیا کر سکتا ہوں؟ میں تو تنہا شخص ہوں، ہشام نے کہا: آپ کے ساتھ دوسرا شخص مجھے مل گیا۔ پوچھا کون ہے؟ کہا: میں ہوں، اس نے کہا: اب اپنے ساتھ تیسرا شخص تلاش کرو، ہشام نے کہا: تیسرا بھی تلاش کر لیا، پوچھا کون ہے؟ کہا: زہیر بن ابی امیہ۔ مطعم نے کہا: اب اپنے ساتھ چوتھا تلاش کرو۔ چنانچہ ھشام اس کے بعد ابو البختری بن ہشام کے پاس گئے اور اس سے بھی اسی طرح کی بات کہی جس طرح کی بات مطعم بن عدی سے کہی تھی۔ ابو البختری نے

کہا: تمہارا بھلا ہو، کیا اس سلسلہ میں کوئی بھی ہمارا ساتھ دے گا؟ انہوں نے کہا: ہاں، کیوں نہیں! زہیر بن ابی امیہ، مطعم بن عدی اور میں۔ ابوالبختری نے کہا: اپنے ساتھ پانچویں شخص کو تلاش کرو۔ چنانچہ وہ زمعہ بن اسود بن مطلب بن اسد کے پاس گئے، اس سے بات کی، اور اس کو قرابت داری اور اُن کا حق یاد دلایا، اس نے کہا: کیا جو بات آپ مجھ سے کہہ رہے ہیں اس کا ساتھ دینے کے لئے اور کوئی تیار ہے؟ کہا: جی ہاں، اس کے بعد ان کو ان سب کے نام بتا دیئے۔ اس کے بعد ان سب نے مکہ کے بالائی حصہ میں 'خطم الحجون' مقام پر رات میں جمع ہونے پر اتفاق ہوا اور طے کیا کہ سب اس معاہدہ کے مقابلہ میں اٹھ کھڑے ہوں گے یہاں تک کہ اس کو توڑ کر دم لیں گے۔ زہیر نے کہا: میں اس میں پہل کروں گا، میں سب سے پہلے اس پر بات کروں گا، جب صبح ہوئی تو سب مشرکین کی محفل میں گئے۔ زہیر بن ابی امیہ مخصوص لباس پہن کر نکلے، سب سے پہلے خانہ کعبہ کے سات چکر لگا کر طواف مکمل کیا، اس کے بعد لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا: کیا ہم کھاتے پیتے رہیں، کپڑے پہنتے رہیں اور بنو ہاشم ہلاک ہوتے رہیں، نہ وہ خرید و فروخت کر سکتے ہیں، اور نہ ان سے کچھ خریدا جا سکتا ہے، اللہ کی قسم! میں اس وقت تک نہیں بیٹھوں گا یہاں تک کہ اس ظالمانہ قطع رحمی والے معاہدہ کو چاک نہ کر دیا جائے! ابو جہل جو مسجد حرام کے ایک کونے میں تھا، نے کہا: تم غلط کہہ رہے ہو، واللہ! اس کو کوئی نہیں پھاڑ سکتا ہے۔ زمعہ بن اسود نے کہا: واللہ! تم جھوٹے ہو! ہم تو اس کو لکھنے پر ہی راضی نہیں تھے یہاں تک کہ اس کو لکھ دیا گیا۔ تب تک ابوالبختری نے کہا: زمعہ صحیح کہہ رہے ہیں، جو کچھ اس میں تحریر کیا گیا ہے ہم نہ اس پر راضی ہیں اور نہ اس کو تسلیم کرتے ہیں۔ مطعم نے کہا: ہاں آپ دونوں صحیح کہہ رہے ہیں اور جو اس کے برخلاف کہہ رہا ہے وہ جھوٹ اور غلط کہہ رہا ہے، ہم اللہ کے سامنے اس معاہدہ سے اور اس میں جو کچھ تحریر کیا گیا ہے اس سے اعلان براءت کرتے ہیں، ہشام بن عمرو نے بھی اسی طرح کی بات کہی، یہ سب سن کر ابو جہل نے کہا: یہ سب منصوبہ رات میں بنایا گیا ہے اور کسی اور جگہ یہ مشورہ طے پایا ہے۔ حضرت ابو طالب مسجد کے ایک کونے میں بیٹھے یہ سب دیکھ رہے تھے اور خاموش تھے۔ مطعم بن عدی اس تحریر کی طرف بڑھے تاکہ اس کو پھاڑ دیں تو دیکھا کہ دیمک اس کو کھا چکی ہے سوائے "باسمک اللہم" کے۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویۃ، ابن کثیر 2/43، 50، 67، 69)

ابن ہشام بیان فرماتے ہیں بعض اہلِ علم نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو طالب سے فرمایا تھا: اے چچا جان! میرے رب اللہ نے قریش کی اس تحریر پر دیمک کو مسلط کر دیا ہے۔ اس میں اللہ کے ناموں کے علاوہ کوئی چیز باقی نہیں چھوڑی ہے اور ظلم و قطع رحمی اور بہتان پر مبنی تمام الفاظ کو ختم کر دیا ہے۔ ابو طالب نے کہا: کیا آپ کے رب نے آپ کو اس کی خبر دی ہے؟ آپؐ نے فرمایا: جی ہاں! ابو طالب نے کہا: واللہ! آپ کے پاس تو کوئی آیا بھی نہیں۔ اس کے بعد وہ قریش کے پاس گئے اور کہا: اے قریش کے لوگو: میرے بھتیجے نے مجھ سے ایسے ایسے کہا۔ ذرا اپنی تحریر لاؤ اگر وہ ویسی ہی ہوگی جیسے کہ میرے بھتیجے نے کہا تو پھر ہمارے ساتھ قطع رحمی سے باز آجاؤ، اور اس معاہدہ میں جو کچھ ہے اس سے دستبردار ہو جاؤ، اور اگر یہ جھوٹ ہوگا تو میں اپنے بھتیجے کو تمہارے حوالے کر دوں گا۔ سب نے کہا: یہ بات تسلیم ہے، اور اس پر انہوں نے عہد و پیمان کیا۔ اس کے بعد دیکھا تو دیکھتے ہیں کہ وہ تحریر بالکل ویسی ہی ہے جیسے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا، لیکن اس کے نتیجے میں ان کی عداوت و دشمنی میں مزید اضافہ ہو گیا، اس کے بعد اس معاہدہ کو توڑنے کے لئے بعض شرفاء نے یہ اقدام کیا۔ (سیرت ابن ہشام 1/377)

دروس واسباق اور فوائد

۱) اس معاہدہ کی دفعات پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قریش نے اس کی دفعات کو بڑی باریک بینی سے تیار کیا تھااور اس کی خلاف ورزی کرنے کا کوئی بھی دروازہ کھلا نہیں چھوڑا تھا، جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ معاہدہ وسیع پیمانے پر مشاورت اور لے دے کے بعد ترتیب دیا گیا تھااور اس کی ترتیب میں بڑے بڑے دماغ شامل تھے جس میں ان کے تجربات اور انتہائی ذہانت استعمال کی گئی۔

۲) دونوں طرف سے نکاح و شادی نہ ہونے کا ایک اہم معاشرتی پہلو ہے، نکاح اور شادی کے نتیجہ میں ان کے اہلِ خانہ کے مابین ایک دوسرے کے ساتھ الفت واخوت، شفقت وصلہ رحمی اور ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، اور اس طرح کی چیزوں کی وجہ سے محاصرہ ناکام ہو جائے گا، اسی لئے تحریر میں طرفین کے مابین نکاح وشادی نہ کرنے کی شرط بھی عائد کی گئی تھی تاکہ اس میں سے کوئی چیز وقوع پذیر نہ ہونے پائے۔

۳) ان کے ساتھ خرید وفروخت نہ کرنے میں بھی ایک اہم اقتصادی و معاشی پہلو ہے، اس لئے کہ خرید وفروخت کی معاشی زندگی میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت ہے اور انسانوں کے مابین اس کے نتیجہ میں فوائد و منافع کا تبادلہ ہوتا ہے، لہذا جب یہ عمل ہی معدوم ہو گا تو معیشت کی بنیاد کھوکھلی ہو جائے گی اور معاشی زندگی کو خطرہ لاحق ہو جائے گا جس کے نتیجہ میں انسان سے ضروریاتِ زندگی مفقود ہو جائیں گی اور جس کے پاس وہ ضروریاتِ زندگی ہوں گی انسان اس کا محتاج وتابعِ فرمان بن جائے گا، اور اس کا اثر افراد و جماعت دونوں پر پڑنا لازمی ہے، اسی لئے اس دفعہ کے ذریعہ قریش نے یہ چاہا کہ مسلمانوں کو بھوکا رہنے پر مجبور کیا جائے اور عملاً ایسا ہی ہوا، کیونکہ روایات میں وارد ہے کہ وہ اتنے پریشان ہو گئے یہاں تک کہ وہ درختوں کے پتے اور کھال کھانے پر مجبور ہو گئے۔ (سیرت ابن ہشام 377/1 الرحیق المختوم، ص129)

۴) اقتصادی محاصرہ کو مزید سخت کرنے کے لئے ایک ایسی دفعہ اس معاہدہ میں شامل کی گئی تھی جس کی وجہ سے مسلمانوں کے لئے مکہ کے باہر سے آنے والے تاجروں کے ساتھ خرید وفروخت کرنے کا دروازہ بھی بند ہو جاتا تھااور صحابہ کرام کو کوئی بھی چیز خریدنے کے لئے نہیں مل پاتی تھی اور وہ اپنے بلکتے بچوں کے پاس خالی ہاتھ واپس لوٹتے تھے، یہاں تک کہ بچوں کے رونے اور بلبلانے کی آواز دور سے سنائی دیتی تھی، یہ معاہدہ کی اس دفعہ کا نتیجہ تھا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ: "اور نہ ہی اسباب رزق میں سے کوئی چیز ان تک پہنچنے دیں گے"۔ اس دفعہ کے الفاظ اتنی باریک بینی کے ساتھ ترتیب دیئے گئے تھے کہ اگر کوئی ہدیہ اور تحفہ میں بھی کوئی چیز ان کو دینا چاہتا تو وہ بھی اس کے لئے ممکن نہیں تھا، کسی بھی نام سے کوئی کھانا اور ضرورت ان تک پہنچنے کے تمام راستے مسدود کر دیئے گئے تھے۔ (دیکھیں: سیرت ابن ہشام 377/1، السیرۃ النبویہ، الندوی، ص122، فی السیرۃ النبویہ، قراءۃ لجوانب الحذر والحمایۃ، ص96)

۵) اس کے بعد کی دفعہ کہ "ان کی طرف سے کسی طرح کی مصالحت قبول نہیں کی جائے گی"۔ اس دفعہ کے ذریعہ آپ ﷺ کو ان کے حوالہ کرنے کے علاوہ ہر قسم کے اختیار کا راستہ بند کر دیا گیا، کسی اور حل کی ان کے ہاں کوئی گنجائش نہیں تھی، اور جہاں تک اس دفعہ کا تعلق ہے کہ "ان پر کسی طرح کا رحم نہیں کھائیں گے"۔ اس دفعہ کے ذریعہ جذبات پر بھی قدغن لگائی گئی تاکہ معاہدہ میں شامل تمام افرادِ اہلِ

ایمان کے تئیں کسی طرح کے رحم کے بارے میں سوچ بھی نہ سکیں، اس لئے کہ رحم اور آر کے نتیجہ میں محاصرہ کو ختم کرنے کا راستہ ہموار ہو گا اور پھر قریش کی تمام کوششیں رائیگاں جائیں گی۔

۶) ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے، ملنے جلنے اور بات چیت سے اجتناب کے ذریعہ اس اہم دروازے کو بند کرنا مقصود تھا جہاں سے اس بائیکاٹ اور محاصرہ کو خطرہ ہو سکتا تھا، اس لئے کہ ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے، ملنے جلنے اور بات چیت کے نتیجہ میں اس موضوع پر بھی بات چیت اور تبادلۂ خیال ہو گا اور ہو سکتا ہے کہ معاہدہ میں شامل بعض افراد کو ان کے غلط ہونے پر مسلمان مطمئن کر دیں گے، اس لئے کہ مسلمانوں کے پاس اتنے حقائق اور دلائل ہیں جن کے ذریعہ وہ کسی کو بھی مطمئن کر سکتے ہیں، اسی لئے اس سے روکنے کے لئے اس دروازے کو بند کر دیا گیا تھا۔

۷) دفعہ کی یہ شق کہ "وہ ان کے گھروں میں داخل نہیں ہوں گے" یہ بھی ماقبل کی طرح ایک شق ہے، اس لئے کہ ان کے گھروں میں داخل ہونے سے ان کے اندر انسانی ہمدردی کو تحریک ملے گی، اس لئے کہ انسان جب کسی گھر کو دیکھتا ہے کہ وہاں معمولی ضروریاتِ زندگی بھی مفقود ہیں اور اہلِ خانہ بھوک اور بیماری کا شکار ہیں اور ان کے پاس زیب تن کرنے کے لئے کچھ نہیں ہے، اور ان کا گناہ صرف یہ ہے کہ انہوں نے قریش کے دین کے بجائے اور کوئی دین اختیار کیا ہے، یقیناً ان کے جذبات و ہمدردی کو تحریک ملے گی اور وہ اس ظلم و زیادتی اور بدحالی کو دور کرنے کے لئے سرگرم ہو جائیں گے، اسی لئے اس طرح کی صورتحال سے بچنے کے لئے قریش کی قیادت نے ان کے گھروں میں جانے پر بھی پابندی عائد کر دی۔

۸) اس معاہدہ کی تحریر کو خانہ کعبہ میں آویزاں کرنے سے اس کو ایک قسم کا تقدس فراہم کرنا مقصود تھا، تاکہ اس کی دفعات کو بھی ایسا تقدس حاصل ہو جس کی پابندی اور التزام لازمی قرار پائے گا، کیونکہ تمام عرب خانہ کعبہ کو مقدس سمجھتے تھے اور اس کے لئے احترام اور تقدس کا ایک اہم مقام اپنے دلوں میں رکھتے تھے، اسی لئے قریش نے اس معاہدہ کو خانہ کعبہ میں آویزاں کیا۔ (دیکھیں: فی السیرۃ النبویہ قراءۃ لجوانب الحذر والحمایۃ، ص96- 97)

۹) بنو ہاشم اور بنو المطلب بھی اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑے رہے اور وہ آپ ؐ کی حفاظت کرتے رہے، یہ ان کے قبائلی اور جاہلی عرف اور ضوابط کا ایک حصہ تھا، اس سے اور دیگر دلائل سے یہ ضابطہ اخذ ہوتا کہ مسلمان کے لئے غیروں کے ان قوانین سے استفادہ جائز ہے جو دعوت کے لئے مفید ہوں بشرطیکہ اہلِ فتویٰ کی طرف سے اس کی گنجائش کا فتویٰ اور اجازت ملے۔ (دیکھیں: الأساس فی السنۃ وفقھا، السیرۃ النبویۃ، سعید حوی، 264/1)

۱۰) موجودہ زمانہ میں بہت سے ممالک میں انسانی حقوق سے متعلق قوانین ایک مسلمان کے لئے ضمانت و حفاظت اور دینی آزادی کا ذریعہ ہیں، جن سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اور موجودہ دنیا کے کئی علاقوں کے اکثر قوانین مسلمانوں کو بہت سے مواقع فراہم کرتے ہیں، مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس سے اور دیگر مواقع سے باریک بینی سے جائزہ لے کر فائدہ اٹھائیں۔

۱۱) ایک اہم بات جس کا جاننا ضروری ہے وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے اعزہ واقارب کے ذریعہ آپ ؐ کی حمایت کا مقصد آپ ؐ کے پاس موجود پیغامِ حق کی حمایت نہیں تھا، بلکہ اس کا اصل مقصد آپ ؐ کی شخصیت اور ذات کو غیروں سے محفوظ رکھنا تھا، لہٰذا اس طرح کی حمایت وہمدردی کو اگر مسلمان پیغامِ حق کی تبلیغ وغلبہ اور غیروں کی چالبازیوں اور زیادتیوں سے روکنے کا ذریعہ بنا سکتے ہیں تو یہ ایک قابلِ قدر کوشش اور بہتر طریقہ ہوگا۔(دیکھیں: فقہ السیرۃ للبوطی، ص88)

۱۲) اس ظالمانہ اتحاد کا مقابلہ حضرت ابو طالب ایک طرف صرف سیاسی جنگ لڑنے کے ذریعہ ہی کر سکے اور دوسری طرف اس اتحاد کو منتشر کرنے کی کوشش بھی کرتے رہے، اسی کی منظر کشی کرتے ہوئے انہوں نے اپنا مشہور لامیہ قصیدہ ترتیب دیا جس کے آغاز میں انہوں نے کہا ہے:

وَلَمَّا رَأَيْتُ الْقَوْمَ لَا وُدَّ فيهمْ ... وَقَدْ قَطعَوا كُلَّ الْعُرَى وَالْوَسَائِلِ
وَقَدْ حالَفُوا قوما علَينا أَظِنَّةً ... يعضُّونَ غَيْظًا خَلْفَنَا بالْأَنَامِلِ

ترجمہ: ’’اور جب میں نے قوم کو دیکھا کہ ان میں محبت ورحم نام کی کوئی چیز نہیں ہے اور انہوں نے ہر قسم کے تعلق اور رابطہ کو منقطع کر دیا ہے، اور ہمارے مقابلہ میں بدگمانی کی وجہ سے انہوں نے ایک ایسی قوم کا ساتھ دیا ہے جو غصہ کی وجہ سے ہمارے خلاف انگلیاں چبا رہے ہیں۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویہ، ابن ہشام 245/1)

اس قصیدہ کا خطرناک اثر پڑا، اس نے مکہ کے حالات یکسر بدل دیئے اور اس کے ذریعہ بنو ہاشم کے رشتہ داروں میں چھپی عصبیت کو انگڑائی لینے کا موقع ملا اور وہ خفیہ طور پر باہمی مشاورت کرنے پر مجبور ہو گئے، یہاں تک کہ سب اس معاہدہ کو توڑنے پر تیار ہو گئے۔ (دیکھیں: التحالف السیاسی، العضبان، ص35-37)

۱۳) حضرت ابو طالب اپنے پرزور قصائد کے ذریعہ قریشی معاشرہ پر چڑھائی کرنے میں کامیاب ہو گئے، ان قصیدوں نے اس معاشرہ کی عمارت کو ہلا کر رکھ دیا، اور کچھ لوگ اس معاہدہ کو توڑنے کے لئے حرکت میں آ گئے، یہ وہ پانچ ذی اثر افراد تھے جن کا بنو ہاشم اور بنو المطلب کے ساتھ قرابت داری اور رشتہ داری کا تعلق تھا، وہ اس ظلم وجور کو مسلمانوں سے، اور ان کے انصار ومددگاروں سے دور کرنے میں کامیاب ہو گئے اور اس کے لئے انہوں نے پوری منصوبہ بندی کی۔ اِس موقف اور صورتحال سے اس کا اشارہ ملتا ہے کہ بظاہر جاہلی نظام کے اہم ستون نظر آنے والے بعض افراد کے دلوں میں بھی بسا اوقات ظلم وزیادتی کے خلاف انکار وبغاوت موجود ہوتی ہے اور وہ اس ظلم وزیادتی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے مناسب موقع کی تلاش میں ہوتے ہیں، اس لئے مسلم افراد کی ذمہ داری ہے کہ اس طرح کے لوگوں پر خصوصی توجہ دیں، ان کے قریب جانے کی کوشش کریں اور ان کے سامنے قرآنِ کریم اور سنتِ نبویہ کی حقیقت واضح کریں اور ان کے سامنے اسلام اور یہود ونصاریٰ اور سیکولرزم ولادینیت کے مابین کشمکش کی حقیقت بھی واضح کر دیں، ہو سکتا ہے کہ اس طرح کے افراد سے خدمت دین کا کام لیا جا سکتا ہے۔(دیکھیں: فقہ السیرۃ النبویۃ، العضبان، ص185)

۱۴) ابو لہب کا کردار اور اس کا موقف غور و فکر اور مزید توجہ کا متقاضی ہے، اس لئے کہ اس طرح کا کردار تاریخ اسلامی میں بار بار دیکھنے کو ملتا ہے، بسا اوقات داعیانِ حق کو اپنے قریب ترین لوگوں میں ایسے لوگ دیکھنے کو ملتے ہیں جو ان کی مخالفت کرتے ہیں اور کٹر اور سخت دشمنوں کے مقابلہ میں داعیانِ حق کو ایذاء پہنچانے میں اور ان سے عداوت رکھنے میں تمام حدود پھلانگتے ہیں۔

۱۵) ابتدائی مرحلہ میں مسلم افراد کے لئے اللہ کے رسول ﷺ کی تعلیمات یہ تھیں کہ وہ دشمن کا مواجہہ نہ کریں اور اپنے اعصاب کو کنٹرول میں رکھیں، اور وہ جنگ کی آگ بھڑکانے کی کوشش نہ کریں، اس مرحلہ کی اہم ترین تربیت یہ تھی کہ حضرت حمزہؓ، حضرت عمرؓ، حضرت ابو بکرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ جیسے میدان کے شہسواروں کے ذریعہ مقابلہ آرائی کے بجائے اس ایذاء پر صبر کرایا جائے، چنانچہ ان سب جانباز سپاہیوں نے یہ احکام سنے اور سرِ تسلیم خم کر دیا اور اس ایذاء رسانی، بغض و عداوت اور ظلم کو برداشت کرتے رہے، اپنے ہاتھوں کو روکے رکھا اور کسی ایک واقعہ پر ہی نہیں یا ایک دن نہیں، بلکہ تین سخت جان سالوں تک مسلسل صبر کرتے رہے، ان کے اعصاب انتقامی جذبات سے لبریز تھے، لیکن ان کو ہاتھ اٹھانے یا کوئی تیر چلانے کی اجازت نہیں تھی۔ (دیکھیں: التربیۃ القیادیۃ 371/1)

۱۶) واقعات نے اہلِ ایمان کی عظمت ثابت کر دی، اس لئے کہ وہ اپنے قائد کے احکام و اوامر کے مکمل پابند رہے اور جذباتی تصرفات اور کاموں سے کافی دور رہے، حالانکہ ان کے لئے یہ انتہائی آسان تھا کہ ابو جہل کو اغوا کر کے ختم کر سکتے تھے اور ایک ایسی غیر منظم جنگ کی آگ بھڑکا دیتے جس میں فریقین کی طاقت و قوت کا نہ کوئی تناسب تھا اور نہ ہی اس جنگ کے انجام اور اختتام کا کوئی وقت متعین تھا۔

۱۷) اسلامی دعوت حبشہ میں، نجران میں، ازد شنوءہ میں، دوس میں اور غفار میں شاندار فتوحات حاصل کر رہی تھی اور دعوت واضح خطوط کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی، آئندہ یہ تمام قبائل اسلام اور مسلمانوں کے لئے معاون و مددگار اور قوت کے مراکز ثابت ہوں گے جو فیصلہ کن وقت میں متحرک ہوں گے اور دعوت کے لئے کمک کا کام کریں گے۔

۱۸) یہ تین برس اہلِ ایمان کے لئے تعمیر و تربیت کے اعتبار سے زادِ راہ کا کام کر رہے تھے، اس لئے کہ ان برسوں میں انہوں نے بھوک اور خوف کے آلام کو برداشت کرنا سیکھا، ابتلاء و آزمائش پر صبر کرنا سیکھا، اعصاب کو کنٹرول کرنا سیکھا، نفس اور دل پر دباؤ قبول کرنا سیکھا اور جذبات کو بے لگام ہونے سے روکنا سیکھا۔

۱۹) اہلِ شرک کے خیمہ کی بعض شخصیات کے اندر نبوی تربیت اپنا اثر دکھا رہی تھی اور وہ نبی کریم ﷺ کی شخصیت کی عظمت سے متاثر ہو رہی تھیں اور وہ ان بنیادوں کے مطابق کام کر رہے تھے جن کو دینِ حق پیش کر رہا تھا، لیکن قوم کا غلبہ اور بڑوں کی پکڑ اس عمل، محبت اور تربیت کو ظاہر کرنے میں رکاوٹ بن رہی تھی، اس معاہدہ کے انجام سے اس کی واضح دلیل ملتی ہے۔ (دیکھیں: التربیۃ القیادیۃ، 384/1، 385)

۲۰) واضح اور قطعی دلائل و براہین اور خرقِ عادت معجزات بھی خواہشات اور مفادات کے غلاموں پر کوئی اثر نہیں کر پاتے ہیں، اس لئے کہ وہ اپنی عقل سے کام لینا بند کر دیتے ہیں، اپنے دل و دماغ کے دروازے تدبر کے لئے بند کر دیتے ہیں، حق کو سننے سے اپنے کان بند کر لیتے ہیں اور دلائل کے باوجود دیکھنے اور حق کی راہ اختیار کرنے سے اپنی آنکھیں موہ لیتے ہیں، چنانچہ حضرت عبد المطلب نے قریش کے لوگوں کو رسول اللہ ﷺ کے خبر دینے کے بعد بتا دیا تھا کہ معاہدہ کو دیمک نے کھا لیا ہے اور " باسمک اللھم " کے سوا کوئی حرف اس میں باقی نہیں رہا ہے، اور

یہ سب انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا لیکن اس کے باوجود ان میں سے کسی نے ایمان نہیں لایا، یہ تو خواہش ہی ہے جو حق کو قبول کرنے میں آڑے آتی ہے اور کانوں پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ (السیرۃ النبویہ، ابو فارس، ص 167)

۲۱) اقتصادی اور معاشرتی بائیکاٹ کا واقعہ قبائل عرب کے درمیان دعوت کے عام ہونے اور پھیلنے کا سبب بنا، چنانچہ حج کے دوران عرب قبائل میں یہ خبر عام ہوگئی اور تمام جزیرۃ العرب کی نگاہیں اس دعوت کی طرف متوجہ ہوگئیں جس کی وجہ سے صاحبِ دعوت اور آپؐ کے اصحاب اس پورے عرصے میں بھوک، پیاس اور عزلت نشینی اختیار کرتے رہے، اس کے ذریعہ ان کے سامنے یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ دعوت حق ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو صاحبِ دعوت اور ان کے اصحاب یہ سب اذیتیں اور پریشانیاں برداشت نہ کرتے۔

۲۲) اس محاصرہ اور بائیکاٹ کے آثار و نتائج نے عربوں کو کفارِ مکہ کے بارے میں بد ظن اور ناراض کر دیا، اس لئے کہ وہ بنو ہاشم اور بنو المطلب کے ساتھ سنگدلی کا معاملہ کر رہے تھے، اسی طرح عربوں کے دلوں میں نبی کریم ﷺ اور آپؐ کے اصحاب کے بارے میں شفقت اور نرم گوشہ پیدا ہوا، نتیجتاً جیسے ہی محاصرہ ختم ہوا لوگ اسلام کی طرف متوجہ ہوگئے اور دعوت عام ہوتی چلی گئی اور پورے عرب میں اس کی بازگشت سنائی دینے لگی، اس طرح سے اقتصادی محاصرہ کا ہتھیار اس کو استعمال کرنے والوں کے لئے گلے کی ہڈی بن گیا اور یہ دعوتِ اسلامی کے عام ہونے میں ایک طاقتور محرک بن گیا، حالانکہ زعمائے شرک کا مقصد بالکل اس کے برخلاف تھا۔

۲۳) بنو ہاشم اور بنو المطلب کا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کھڑا ہونا اور آپؐ کے ساتھ معاشی و معاشرتی بائیکاٹ اور محاصرہ کی ایذاء اور تکلیف کو برداشت کرنا، اس کی وجہ سے فقہ اسلامی میں مخصوص احکام مرتب ہوئے، کیونکہ مالِ غنیمت کے خمس میں سے ذوی القربیٰ کا حصہ بنو ہاشم اور بنو المطلب کو دیا جائے گا۔ علامہ ابن کثیرؒ اس حکم کی وضاحت اللہ تعالیٰ کے اس قول کی تفسیر کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں: [وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰي عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ] ترجمہ: ” اور تمہیں معلوم ہو کہ جو کچھ مال غنیمت تم نے حاصل کیا ہے اس کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسولؐ اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے، اگر تم ایمان لائے ہو اللہ پر اور اس چیز پر جو فیصلہ کے روز، یعنی دونوں فوجوں کی مڈبھیڑ کے دن، ہم نے اپنے بندے پر نازل کی تھی، (تو یہ حصہ بخوشی ادا کرو) اللہ ہر چیز پر قادر ہے“۔ (سورۃ الانفال: 41) ابن کثیرؒ فرماتے ہیں: "اور جہاں تک ذوی القربیٰ کے حصہ کا تعلق ہے تو اس کو بنو ہاشم اور بنو المطلب کو دیا جائے گا، اس لئے کہ بنو المطلب نے زمانۂ جاہلیت میں بھی اور دعوتِ اسلامی کے ابتدائی حصہ میں بھی بنو ہاشم کی نصرت و حمایت کی ہے، اور وہ ان کے ساتھ شعب ابی طالب میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اظہارِ یکجہتی کے لئے آپؐ کی حمایت و حفاظت کے لئے محصور رہے، مسلمان تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتے ہوئے ڈٹے رہے، جبکہ ان میں سے ایمان نہ لانے والے خاندانی حمیت و خودداری کی وجہ سے اور رسول اللہ ﷺ کے چچا حضرت ابو طالب کی اطاعت کرتے ہوئے ان کے ہمرکاب رہے، اور جہاں تک بنو عبد شمس اور بنو نوفل کا تعلق ہے اگرچہ وہ ان کے چچازاد بھائی تھے لیکن انہوں نے اس سلسلہ میں ان کا ساتھ نہیں دیا بلکہ ان کے ساتھ دشمنی کی، ان کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا اور رسول اللہ ﷺ کے خلاف قریش کے دیگر خاندانوں کا ساتھ دیا، اسی لئے حضرت ابو طالب کے لامیہ قصیدہ میں ان کی مذمت دوسروں کے مقابلہ

میں زیادہ سخت تھی، اس لئے کہ وہ قرابت ورشتہ داری میں قریب تر تھے......اس حدیث کی بعض روایات میں ہے کہ: "انہوں نے نہ تو جاہلیت میں ہمیں بے یار و مدد گار چھوڑا اور نہ ہی زمانۂ اسلام میں"۔ (سنن ابو داؤد: 2980، سنن نسائی: 130/7، مسند احمد: 81/4)

جمہور علماء کا یہی قول ہے کہ اس سے بنو ہاشم اور بنو المطلب مراد ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر 312/2)

۲۴) جب اللہ تعالی نے اپنے دین کی نصرت فرمائی اور اپنے رسول ؐ کو اعزاز سے نوازا، فتح مکہ اور پھر حجۃ الوداع کا موقع عنایت کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنو کنانہ کی وادی میں قیام کرنے کو ترجیح دیتے تھے، تاکہ ماضی کی تنگی اور مظلومیت کو یاد کر کے اللہ کی سے دی ہوئی عظیم فتح پر اور مکہ میں دوبارہ داخلہ پر اللہ کا شکر ادا کریں، اور حق کے غلبہ اور صبر کرنے والے اہلِ حق کے لئے اللہ کی نصرت وتائید کے معاملہ کی حقانیت کو لوگوں کے سامنے واضح فرمائیں، حضرت اسامہ بن زید ؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ؐ ! کل آپ کہاں قیام فرمائیں گے؟ -حجۃ الوداع کے موقع پر- آپ ؐ نے فرمایا: کیا عقیل نے ہمارے لئے کوئی جگہ چھوڑی بھی ہے؟! پھر آپ ؐ نے فرمایا: ہم کل بنو کنانہ کی وادی المحصّب میں قیام کریں گے، جہاں قریش کے لوگوں نے کفر پر قسمیں کھائی تھیں۔ یعنی بنو کنانہ نے بنو ہاشم کے خلاف قریش کا ساتھ دینے کا معاہدہ کیا تھا کہ نہ وہ ان کے ساتھ خرید وفروخت کریں گے اور نہ ان کو پناہ دیں گے۔ (صحیح بخاری: 3058، صحیح مسلم: 135، مسند احمد: 202/5، سنن ابی داؤد: 2010، سنن ابن ماجہ: 2942)

۲۵) اقامتِ دین اور نفاذ شریعت کے لئے کوشاں ہر قوم اور جماعت کو ہر وقت یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اہلِ باطل کی طرف سے بائیکاٹ، محاصرہ اور گھراؤ کی کوششیں کی جاسکتی ہیں، اس لئے کہ کفر ایک ہی ملت ہے، لہذا امتِ مسلمہ کے قائدین کی ذمہ داری ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنے رفقاء وکارکنان کو اس طرح کے حالات کے لئے تیار رکھیں اور اس طرح کی صورتحال سے نمٹنے کے لئے مناسب حکمتِ عملی وضع کریں، اور مناسب متبادل طریقوں سے اس محاصرہ کا مقابلہ کرنے کے بارے میں منصوبہ بندی کرتے رہیں تاکہ کسی طرح کی بھی صورتحال سے نمٹنے کے لئے امت تیار رہے۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویۃ قراءۃ لجوانب الحذر والحمایۃ، ص98)

چوتھی فصل

ہجرت حبشہ، طائف کی آزمائش اور اسراء و معراج کا تمغہ

پہلا باب

اسباب اختیار کرنے کے ضابطہ کے بارے میں نبی کریم ﷺ کا طرزِ عمل

اللہ تعالیٰ کے ضوابط و قوانین جن کے مطابق نبی کریم ﷺ عمل پیرا تھے ان میں سے ایک اہم ضابطہ اسباب اختیار کرنے کا ضابطہ ہے۔

أسباب: سبب کی جمع ہے۔ اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کے ذریعہ کسی دوسری چیز تک پہنچا جا سکتا ہے، اسباب اختیار کرنے کی سنت اور ضابطہ اللہ تعالیٰ کی کائنات میں واضح شکل میں موجود ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو اپنی قدرت سے پیدا کیا اور اس کو ایسے قوانین و ضوابط کا پابند بنایا جو اس کے بقاء و استمرار کے ضامن ہیں، اور اللہ کی مشیت و ارادہ کے بعد نتائج کو اسباب کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کے عرش کو فرشتے تھامے ہوئے ہیں، زمین کو مضبوط پہاڑوں کے ذریعہ استحکام عطا کیا، نباتات کو پانی کا محتاج بنایا ...... غیرہ وغیرہ۔

اور اگر رب العالمین چاہتا تو ان تمام چیزوں کو صرف اپنی قدرتِ مطلقہ کے ذریعہ وجود میں لاتا اور کسی سبب اور ذریعہ کی ان میں کوئی ضرورت نہ ہوتی، لیکن اللہ کی مشیت اور اس کی حکمت اسی کی متقاضی ہوئی، جس کے ذریعہ وہ اپنی مخلوق کو اس ضابطہ کی رعایت کرنے کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہے تاکہ زندگی کا سفر اسی طریقہ پر قائم رہے جس کو اللہ تعالیٰ نے متعین فرمایا ہے، لہذا اگر اسباب اختیار کرنے کا ضابطہ کائنات میں واضح شکل میں نمایاں ہے تو یہ ضابطہ اسی طرح اللہ کی کتاب میں بھی موجود ہے، اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان بندوں کو اپنے تمام دنیوی واخروی کاموں میں اس ضابطہ کی لازمی طور پر رعایت کا حکم دیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: [وَقُلِ اعْمَلُوا فَسَيَرَى اللهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ وَالْمُؤْمِنُونَ وَسَتُرَدُّونَ إِلَى عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ] ترجمہ: "اور اے نبیؐ، ان لوگوں سے کہدو کہ تم عمل کرو، اللہ اور اس کا رسول اور مؤمنین سب دیکھیں گے کہ تمہارا طرز عمل اب کیا رہتا ہے، پھر تم اُس کی طرف پلٹائے جاؤ گے، جو کھلے اور چھپے سب کو جانتا ہے اور وہ تمہیں بتادے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو"۔ (سورۃ التوبہ: 105) دوسری جگہ ارشاد ہے: [هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُولًا فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا مِنْ رِزْقِهِ وَإِلَيْهِ النُّشُورُ] ترجمہ: "وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو تابع کر رکھا ہے، چلو اُس کی چھاتی پر اور کھاؤ خدا کا رزق، اُسی کے حضور تمہیں دوبارہ زندہ ہو کر جانا ہے"۔ (سورۃ الملک: 15)

قرآنِ کریم واضح کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم (علیہا السلام) سے اس وقت اسباب اختیار کرنے کا حکم دیا جبکہ وہ انتہائی کمزوری کی حالت میں تھیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: [وَهُزِّي إِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسَاقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا] ترجمہ: "اور تو ذرا اِس درخت کے تنے کو ہلا، تیرے اوپر تر و تازہ کھجوریں ٹپک پڑیں گی"۔ (سورۃ مریم: 25)

اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے تمام کاموں میں اسباب اختیار کرنے کی ضرورت کو تاکیدی انداز میں ارشاد فرمایا ہے اور اللہ کے رسول ﷺ تمام لوگوں کے مقابلہ میں اس ضابطہ کو سب سے زیادہ سمجھتے تھے اور اسی کے مطابق عمل فرما رہے تھے، جبکہ آپ ﷺ ایک اسلامی سلطنت کی تعمیر کی بنیاد رکھ رہے تھے، آپؐ ہر وہ سبب اختیار کر رہے تھے جو بھی آپؐ کی وسعت و طاقت میں تھا، اور کسی بھی چیز کو اپنے حال پر نہیں

چھوڑتے تھے، جو کچھ سیرتِ رسولؐ سابقہ صفحات میں گزر چکی ہے اس میں بھی اس پہلو کو واضح انداز میں دیکھ سکتے ہیں اور سیرت کے آئندہ ابواب میں بھی اس کا مطالعہ کریں گے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ اپنے اصحاب کو اپنے دنیوی واخروی تمام کاموں میں اس سنت اور ضابطہ کی رعایت کرنے کا حکم دیتے تھے، امتِ مسلمہ کے ابتدائی روشن وتابناک دور میں یہ احساس بدرجہ اُتم موجود تھا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت مطلقہ، اس کے فیصلوں اور اس کی تقدیر پر ایمان اسباب اختیار کرنے کے ساتھ ہرگز متعارض نہیں ہے، چنانچہ ان کو اس کا ادراک تھا کہ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کے کچھ قوانین وضوابط ہیں جو ناقابلِ تغیر ہیں، اگرچہ اللہ کے کچھ خرقِ عادت قوانین بھی ہیں جن کے مطابق اللہ تعالیٰ کچھ بھی کر سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو کوئی بھی چیز عاجز وبے بس نہیں کر سکتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس کا قانون دنیا کی زندگی میں نافذ العمل رہے اور اس خرقِ عادت قانون کی ایک استثنائی شکل ہو، اور یہ دونوں ضابطے اللہ کی مشیت کے پابند ہوں، اسی لئے دورِاول کے مسلمانوں کو یہ احساس تھا کہ اگر وہ اپنی زندگی میں کسی متعین نتیجہ یا منزل تک پہنچنا چاہتے تھے تو اللہ تعالیٰ کے بے لاگ ضابطوں کے مطابق عمل کرنا لازمی سمجھتے تھے، یعنی ایسے اسباب اختیار کئے جائیں جو کائناتی ضوابط کے مطابق نتائج تک لے جا سکتے ہوں۔ (دیکھیں: التمکین للأمۃ الاسلامیۃ، ص248، 250، مفاهيم ينبغي أن تصحح، محمد قطب، ص: 262)

بلاشبہ آج عالمی قیادت کے قافلہ سے مسلمانوں کا پیچھے رہنا ان پر کسی ظلم کے نتیجہ میں نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی قوم کے ساتھ عدلِ الٰہی ہے جس نے اپنے پیغام کو بھلا دیا ہے، وہ اپنے مقام سے گر گئے ہیں، انہوں نے علم وعمل کی جگہ اوہام وخواہشات کو جگہ دی ہے، ربانی قوانین اور ضوابط سے پہلو تہی اختیار کی ہے اور یہ سمجھ لیا ہے کہ غلبہ واقتدار تمناؤں اور خوابوں کے ذریعہ حاصل ہوگا، لیکن یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے! [ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ] ترجمہ: "یہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے، اللہ اپنے بندوں پر ذرہ برابر ظلم کرنے والا نہیں ہے"۔ (سورۃ آل عمران: 182)

کوئی پوچھنے والا پوچھ سکتا ہے کہ اگر یہ اللہ کی طرف سے نافرمان اہلِ ایمان کے لئے سزا اور عذاب ہے تو پھر اہلِ کفر کے لئے ایسا کیوں نہیں ہوتا ہے جو مسلسل اللہ کی نافرمانی کرتے رہتے ہیں، لیکن اس کے باوجود مادی اور ظاہری اعتبار سے وہ دنیا میں غالب وبرسرِ اقتدار ہیں؟!

اس کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ ان کفار کو یہ غلبہ واقتدار اس لئے نہیں ملا ہے کہ وہ اللہ کے مقرب لوگ یا اللہ کو راضی کرنے والے لوگ ہیں، وہ اس مقام تک کسی جادو یا معجزہ کے ذریعہ نہیں پہنچے، اور نہ ہی وہ کوئی دوسری مخلوق ہیں، اسی طرح ایسا بھی نہیں ہے کہ انہوں نے صنعت وحرفت اور ٹیکنالوجی میں ترقی نہ کی ہو، سمندروں کی تہوں میں نہ اترے ہوں، اور فضاؤں کو چیر کر مسخر نہ کیا ہو، اور ان کا عقیدہ حق ہو یا ان کی فکر صحیح ہو، ایسا ہرگز نہیں ہے، بلکہ وہ اس مقام تک تک اس لئے پہنچے کیونکہ ترقی کے حصول کا راستہ ہر قوم کے لئے کھلا ہوا ہے، چاہے وہ مومن ہو یا کافر، نیک ہو یا بد، ارشاد باری تعالیٰ ہے: [مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ] ترجمہ: "جو لوگ بس اِسی دنیا کی زندگی اور اس کی خوش نمائیوں کے طالب ہوتے ہیں ان کی کارگزاری کا سارا پھل ہم یہیں ان کو دے دیتے ہیں اور اس میں ان کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جاتی"۔ (سورہ ھود: 15)

بے شک اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اقتدار وغلبہ کو لازوال ربانی ضوابط اور ناقابلِ تبدیل قوانین کے مطابق کی جانے والی انسانی جہد و کوشیش اور عمل کے ساتھ مشروط کر رکھا ہے، لہٰذا جو بھی صحیح محنت اور کوشش کرے گا اور زندگی کے ضوابط کے مطابق کام کرے گا وہ اپنی محنت و کوشش، قربانی اور اپنے عمل کے مطابق اپنی منزل تک پہنچے گا۔

بے شک یہ اللہ تعالیٰ کا وہ ضابطہ اور قانون ہے جس کے مطابق اس نے اس دنیا کا نظام مرتب کیا ہے، یہ اللہ کی مشیت و سنت اور اس کا ارادہ ہے جس کے مطابق یہ سب کچھ ہوتا ہے، اور یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ اس تمام ترقی کے نتیجہ میں اہلِ کفر کے لئے جنت کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور نہ ان کو آخرت میں اس کا کوئی فائدہ مل سکے گا، لیکن مسلمانوں کی طرف سے اس میں کوتاہی اور غفلت ایک ایسا گناہ ہے جس پر اس کا محاسبہ ہوگا۔(دیکھیں: لقاءالمؤمنین: 124/2)

اللہ پر توکل اور اسباب اختیار کرنے کے مابین تطبیق:

اللہ پر توکل اور بھروسہ اسباب اختیار کرنے میں مانع نہیں بنتا ہے، ایک صاحبِ ایمان اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان رکھتے ہوئے اور اسباب اختیار کرنے کے سلسلہ میں اللہ ہی کے حکم کی تعمیل واطاعت کرتے ہوئے اسباب اختیار کرتا ہے، لیکن وہ اسباب کو یہ مقام نہیں دیتا ہے کہ وہی نتائج کو وجود میں لانے والے ہیں لہذا انہی پر بھروسہ کرنا ضروری ہے۔

بلکہ جو ذات نتائج کو وجود میں لاتی ہے—جیسے کہ وہی اسباب کو بھی وجود میں لاتا ہے—وہ اللہ کی ذات اور اس کی قدرت ہے، ایک مومن کے شعور کے مطابق سبب اور نتیجہ کے درمیان کوئی تعلق نہیں ہے، سبب اختیار کرنا اطاعتِ رب کی وجہ سے عبادت ہے اور نتیجہ کا وجود میں آنا یہ اللہ کا تقدیری فیصلہ ہے جو سبب کے مقابلہ میں ایک مستقل چیز ہے، جس پر اللہ کے سوا اور کوئی قدرت نہیں رکھتا ہے، اس طرح سے ایک مومن اس بات سے آزاد ہوتا ہے کہ وہ اسباب ہی کی عبادت کرنے لگ جائے اور انہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے، لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ ان اسباب کو مکمل طور پر اختیار کرنے میں بھی کوتاہی نہیں کرتا ہے اور ان کو اختیار کر کے وہ اللہ کی اطاعت کے ذریعہ اجر و ثواب کی نیت رکھتا ہے۔(فی ظلال القرآن: 1476/3)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت سی احادیث میں توکل علی اللہ کے ساتھ ساتھ اسباب اختیار کرنے کی تعلیم دی ہے، اسی طرح آپؐ نے ان دونوں کے درمیان عدم تعارض کی جانب بھی متوجہ فرمایا ہے۔

حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص اپنی اونٹنی پکڑ کر مسجدِ نبوی کے دروازہ پر کھڑا ہوا، اور وہ اندر داخل ہونا چاہتا تھا، اس نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! میں اپنی سواری کو چھوڑ دوں اور توکل کرلوں؟ گویا کہ وہ سمجھ رہا تھا کہ اسباب کو اختیار کرنا توکل علی اللہ کے منافی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے سامنے واضح کر دیا کہ اسباب کو اختیار کرنا ایک مطلوب چیز ہے اور یہ کسی بھی صورت میں توکل کے منافی نہیں ہے، بشرطیکہ اسباب اختیار کرنے کے سلسلہ میں نیت سچی اور درست ہو، آپؐ نے اس سے فرمایا: "نہیں، بلکہ پہلے اس کو باندھو اور پھر توکل کرو"۔ (مستدرک حاکم: 623/3، مجمع الزوائد: 291/10، سنن ترمذی: 2517)

یہ حدیث ان احادیث میں سے ہے جو واضح کر دیتی ہیں کہ توکل اور اسباب اختیار کرنے کے مابین کوئی تعارض نہیں ہے بشرطیکہ اسباب پر یقین واعتماد نہ ہو اور نہ ہی توکل علی اللہ کو طاقِ نسیان میں رکھ دیا جائے۔ حضرت عمر بن خطابؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ ''اگر تم اللہ پر ویسے توکل کرو گے جو اس پر توکل کرنے کا حق ہے تو یقیناً وہ تمہیں وہاں سے رزق دے گا جیسے پرندوں کو رزق دیتا ہے، وہ خالی پیٹ صبح کے وقت نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھر کر واپس لوٹتے ہیں"۔ (مسند أحمد: 1/30- 52، سنن ترمذی: 2344، سنن ابن ماجہ: 4146، مسند ابی یعلی: 247، مستدرک حاکم 318/4)

اس حدیث میں توکل علی اللہ کی ترغیب دی گئی ہے اور اس جانب بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ اسباب کو اختیار کرنا بھی ضروری ہے، اس لئے کہ واضح کیا گیا ہے کہ اللہ کی طرف سے رزق کی ضمانت کے باوجود پرندے صبح وشام باہر نکل کر کوشش کرتے ہیں۔

اس مسئلہ سے متعلق اسلامی نقطۂ نظر کا خلاصہ مندرجہ ذیل نکات میں پیش کیا جا سکتا ہے:

۱) اسباب اختیار کرنے کا ضابطہ اسلام کے بنیادی اصولوں سے تعلق رکھتا ہے، اس لئے کہ اسباب اختیار نہ کرنا شریعت اور دنیاوی فوائد کو معطل کرنے کے مترادف ہے۔

۲) تنہا اسباب پر اعتماد و بھروسہ کرنا اور توکل علی اللہ کو ترک کرنا شرک ہے۔

۳) اسباب اختیار کرنے کو اسلام توحید کے ساتھ مربوط کرتا ہے، اس اعتقاد کے ساتھ کہ اسباب پر مکمل اختیار و کنٹرول اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

۴) اس لئے ایک مسلمان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ توکل علی اللہ کے ساتھ ساتھ اسباب بھی اختیار کرے۔ (دیکھیں: التمکین للأمۃ الاسلامیہ، ص 254)

امتِ مسلمہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کا ادراک کرے کہ عروج وغلبہ تک پہنچنے کے لئے اسباب کو اختیار کرنا انتہائی اہم ہے جس سے کسی بھی صورت میں فرار اختیار کرنا درست نہیں ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کے اٹل اور ناقابلِ تغیر سنت اور ضابطہ سے ثابت ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اس نے مسلمانوں سے ان کی استطاعت وطاقت سے زیادہ اسباب اختیار کرنے کا مطالبہ نہیں کیا ہے، اور نہ ہی ان سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ وہ اتنا سامانِ حرب وضرب تیار کریں جو مدمقابل کی تیاری کے برابر ہو بلکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے: [وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ] ترجمہ: ''اور تم لوگ، جہاں تک تمہارا بس چلے، زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے اُن کے مقابلہ کے لئے مہیا رکھو تاکہ اس کے ذریعہ سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان دُوسرے اعداء کو خوف زدہ کرو جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے، اللہ کی راہ میں جو کچھ تم خرچ کرو گے اس کا پورا پورا بدل تمہاری طرف پلٹایا جائے گا اور تمہارے ساتھ ہر گز ظلم نہ ہو گا''۔ (سورۃ الأنفال: 60)

اللہ تعالیٰ ان کو حکم دیتا ہے کہ جو آپ کی استطاعت وطاقت میں ہو وہ کرو اور اپنے ممکنہ وسائل واسباب کو بروئے کار لاؤ، اگرچہ وہ مد مقابل کے اسباب و وسائل سے کم ہی ہوں، لہذا 'استطاعت' مطلوبہ معیار ہے اور استطاعت سے زائد کا کفیل اللہ تعالیٰ ہے جس کو وہ اپنی لامحدود قدرت کے ذریعہ پورا کرے گا، اس لئے کہ استطاعت کے بقدر کسی کام کو انجام دینا اخلاص کی واضح دلیل ہے اور اللہ کی نصرت و مدد کے لئے یہی مطلوبہ شرط ہے۔(دیکھیں: الاسلام فی خندق، مصطفیٰ محمود، ص64)

بے شک آج امتِ مسلمہ کے تمام افراد سے پکار پکار کر کہا جارہا ہے کہ وہ کمزوری، بے عملی اور بزدلی کے مرحلہ سے نکل کر طاقت و قوت اور عمل کے مرحلہ میں داخل ہوں، ہر قسم کے خوابوں اور تمناؤں کو خیر باد کہیں اور ان تمام اسباب کو اختیار کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں جو اسلامی نظام کے قیام اور رب العالمین تک پہنچانے والی انسانی تہذیب کی تعمیر میں ان کی مدد کرسکیں۔

امتِ مسلمہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان تمام الہٰی قوانین اور ضوابط کی رعایت کریں جو اللہ کی کائنات میں نافذ العمل اور قرآنِ کریم میں بالکل واضح ہیں اور اسی کے ذریعہ امتِ مسلمہ اللہ کے نور کے ذریعہ عروج وترقی کی راہ پر گامزن ہوسکتی ہے۔

بے شک نبی کریم ﷺ بعثت سے لے کر دنیا سے رخصت ہونے تک اللہ تعالیٰ کے ان ضوابط کے مطابق عمل کرتے رہے اور اس سلسلہ میں ذرہ برابر کوتاہی اور غفلت سے کام نہیں لیا، آپ ﷺ نے تمام فطری ضوابط و قوانین کو بروئے کار لایا، افراد کے اندر انقلاب و تبدیلی لانے کا ضابطہ ہو یا باطل کا مقابلہ کرنے کا قانون ہو، جماعت سازی اور پھر حکومت سازی میں تدریج کا ضابطہ ہو یا پھر ابتلاء وآزمائش کی سنت ہو، ہر میدان میں آپ نے اسباب اختیار کرنے میں اپنی طرف سے مکمل کوشش کی، اسی کے نتیجہ میں حبشہ کی جانب دو مرتبہ ہجرت ہوئی، آپؐ طائف تشریف لے گئے، دعوت کی غرض سے قبائل کے سامنے اپنے آپ کو پیش کیا، اس کے بعد مدینہ منورہ کی جانب ہجرت فرمائی، وہاں اسلامی نظام کا قیام عمل میں لایا، اور اس کی حفاظت کرتے رہے، آپؐ کے بعد آپؐ کے جانثار صحابہ کرام بھی آپؐ ہی کے منہج کے مطابق عمل پیرا رہے، انہوں نے بھی مکمل شعور وآگہی اور بصیرت کے ساتھ عمل کیا اور انہوں نے ایک ایسی تہذیب تعمیر کی جس کی مثال آج تک تاریخ انسانی پیش کرنے سے قاصر ہے۔

بے شک امت کی تربیت اور اسلامی نظام کے قیام کے سلسلہ میں نبی کریم ﷺ کی تحریک ایک ایسا نور ہے جس کی روشنی میں چل کر ہی منزل تک پہنچنا ممکن ہے، اور وہ ایک ایسی سنت ہے جس کو گھٹاٹوپ تاریکی میں نوع بنوع نظامہائے حیات میں اور ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندروں کی ہیبت وخوف کے ماحول میں نقشِ راہ بنایا جاسکتا ہے اور یہ کام اس شخص کے لئے انتہائی آسان ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ اس کو آسان کردے۔

....

دوسرا باب
ہجرت حبشہ

ارشاد باری تعالیٰ ہے: [وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ] ترجمہ: "جو لوگ ظلم سہنے کے بعد اللہ کی خاطر ہجرت کر گئے ہیں ان کو ہم دنیا ہی میں اچھا ٹھکانہ دیں گے اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے کاش جان لیں وہ مظلوم"۔(سورۃ النحل: 41)

علامہ قرطبیؒ نے قتادہ کا قول نقل کیا ہے کہ اس سے مراد محمد ﷺ کے اصحاب ہیں، مشرکین نے مکہ مکرمہ میں ان پر ظلم کیا اور ان کو وہاں سے نکلنے پر مجبور کیا یہاں تک کہ ان میں سے کچھ لوگ حبشہ چلے گئے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو دار ہجرت (یعنی مدینہ منورہ) میں پناہ دی اور اہلِ ایمان میں سے ان کے انصار و مددگار بنائے۔(الجامع لأحكام القرآن 107/10)

دوسرے مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے: [قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۭ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۭ وَاَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ۭ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ] ترجمہ: "(اے نبیؐ) کہو کہ اے میرے بندو! جو ایمان لائے ہو، اپنے رب سے ڈرو جن لوگوں نے اِس دنیا میں نیک رویہ اختیار کیا ہے ان کے لئے بھلائی ہے اور خدا کی زمین وسیع ہے، صبر کرنے والوں کو تو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا"۔(سورۃ الزمر: 10)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں: اس سے مراد حضرت جعفر بن ابی طالب اور وہ لوگ ہیں جو ان کے ساتھ حبشہ کی جانب ہجرت کر کے گئے۔(الجامع لاحکام القرآن 107/15)

ایک اور مقام پر ارشاد ہے: [يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ] ترجمہ: "اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو، میری زمین وسیع ہے، پس تم میری بندگی بجالاؤ"۔ (سورۃ العنکبوت:56)

علامہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہلِ ایمان کو حکم ہے کہ اس جگہ سے ہجرت کریں جہاں وہ اقامتِ دین کی استطاعت و قدرت نہیں رکھتے ہیں اور اللہ کی وسیع سرزمین کی طرف چلے جائیں، یہاں تک کہ اقامتِ دین کا فریضہ مکمل کیا جاسکے.....اس کے بعد فرماتے ہیں: اسی لئے جب مکہ میں کمزور اہلِ ایمان کے لئے وہاں رہنا مشکل ہو گیا تو وہ سرزمینِ حبشہ کی جانب ہجرت کر کے نکلے تاکہ وہاں اپنے دین پر اطمینان سے عمل پیرا ہو سکیں، وہاں ان کو بہترین میزبان شاہِ حبشہ اصحمہ نجاشی ــــــ رحمہ اللہ ــــــ مل گیا۔(تفسیر ابن کثیر: 335/5، سورۃ العنکبوت: 56)

ا: سرزمینِ حبشہ کی جانب پہلی ہجرت

ہجرتِ حبشہ کے اسباب:

رسول اللہ ﷺ کے اصحاب پر ابتلاء و آزمائش سخت تر ہوتی چلی گئی، کفار ان کو گرفتار کرنے لگے اور ان کو مار کے ذریعہ، بھوک پیاس کے ذریعہ، مکہ کی تپتی دھوپ کے ذریعہ اور آگ کے ذریعہ سزائیں دینے لگے، تاکہ ان کو ان کے دین سے دستبردار کرنے کے لئے مجبور کریں، بعض مسلمان سخت تکلیف کی وجہ سے ظاہری طور پر دستبردار ہوتے تھے لیکن ان کا دل ایمان پر مطمئن ہوتا تھا، جبکہ بعض دین پر سختی سے کاربند رہتے اور اللہ تعالیٰ ان کو ان سے بچالیتا، جب اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے اصحاب کو اس قدر آزمائش میں مبتلا دیکھا جب کہ آپؐ اللہ کی خاص عنایت اور اپنے چچا ابو طالب کی وجہ سے بہت سی چیزوں سے محفوظ تھے، آپؐ نے یہ دیکھا کہ آپؐ صحابہ کرام کو اس صورتحال سے بچانے پر قادر نہیں ہیں تو آپؐ نے ان سے فرمایا: اگر آپ سرزمین حبشہ کی جانب ہجرت کرلو اس لئے کہ وہاں ایک ایسا بادشاہ ہے جس کے ہاں کسی پر ظلم نہیں کیا جاتا، وہ اچھی سرزمین ہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اس صورتحال سے نکلنے کا کوئی راستہ نکال لے، اس وقت اصحاب رسول ﷺ میں سے بعض مسلمان سرزمینِ حبشہ کی جانب ہجرت کرکے نکلے تاکہ اس آزمائشی صورتحال سے محفوظ رہ سکیں اور اپنے دین کو بھی محفوظ رکھ سکیں، یہ اسلام میں سب سے پہلی ہجرت تھی۔ (الہجرۃ فی القرآن الکریم، اُحزمی سامعون، ص:290)

محققین نے سرزمین حبشہ کی جانب مسلمانوں کی ہجرت کے متعدد اسباب کا ذکر کئے ہیں، ان میں سے بعض وہ ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا، اسی طرح ایک سبب ایمان و اسلام کا ظاہر اور عام ہونا بھی ہے، کیونکہ اسلام میں داخل ہونے والوں کی تعداد زیادہ ہوگئی تھی، ایمان عام ہو گیا اور لوگوں کے ہاں ایمان گفتگو کا موضوع بن گیا تھا، امام زہریؒ ہجرت حبشہ کے بارے میں حضرت عروہ کی حدیث کے ضمن میں فرماتے ہیں: جب مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہوگئی اور ایمان ظاہر و نمایاں ہوگیا اور لوگ اس کے بارے میں گفتگو کرنے لگے تو کفارِ قریش اور مشرکین ان کے قبائل میں سے ایمان لانے والوں کے خلاف آگ بگولہ ہوگئے، ان کو سزائیں دیتے، ان کو گرفتار کرنے اور ان کو دین سے واپس لانے کی کوشش کرتے، جب آپ ﷺ کو اس کا علم ہوا تو آپ نے ایمان لانے والوں سے فرمایا: زمین میں اِدھر اُدھر منتشر ہوجاؤ۔ صحابہ کرام نے پوچھا: اے اللہ کے رسولؐ! ہم کہاں جائیں؟ آپؐ نے فرمایا: "یہاں کی جانب" آپؐ نے سرزمینِ حبشہ کی جانب اشارہ فرمایا۔ (المغازی النبویۃ، الزھری، تحقیق: سہیل زکار، ص:96)

دین کی حفاظت:

ایک اہم سبب ہجرتِ حبشہ کا حفاظتِ دین بھی تھا، ابنِ اسحاق فرماتے ہیں: اس وقت اصحابِ رسول ﷺ سرزمینِ حبشہ کی جانب آزمائش سے بچنے کے لئے اور اپنے دین کی حفاظت کی غرض سے نکلے۔ (سیرت ابن ہشام 398/1)

مکہ کے باہر دعوت کی نشر و اشاعت:

سید قطبؒ فرماتے ہیں: "اسی لئے اللہ کے رسول ﷺ مکہ کے علاوہ ایک دوسرے مرکز کی تلاش میں تھے، ایک ایسا مرکز جو اس عقیدہ کی حفاظت کرسکے، آزادانہ طریقہ سے اس کے پھیلنے کا کفیل ہو اور اس جمود اور محدودیت سے وہاں چھٹکارہ مل سکے جس کا مکہ میں سامنا

کرنا پڑ رہا تھا، وہاں دعوت کی آزادی ہو، اس کو قبول کرنے والے ہر قسم کے ظلم و زیادتی اور ابتلاء و آزمائش سے محفوظ ہوں، میرے خیال میں یہ ہجرت کا اولین اور اہم ترین سبب تھا، چنانچہ ہجرت کی غرض سے سب سے پہلے حبشہ کا رخ کیا گیا جہاں اولین مرحلہ میں بہت سے ایمان لانے والے ہجرت کر گئے، اور یہ کہنا کہ انہوں نے حبشہ کی جانب صرف اپنے آپ کو بچانے کے لئے ہجرت کی اس کے پیچھے زیادہ قوی دلائل نہیں ہیں، اگر ایسا ہوتا تو ہجرت وہ مسلمان کرتے جن کا معاشرہ میں کوئی خاص مقام نہیں تھا، نہ ہی ان کے پاس طاقت و قوت تھی اور نہ ہی حفاظت و حمایت کا کوئی ذریعہ، لیکن معاملہ اس کے بالکل برعکس نظر آتا ہے، چنانچہ کمزور قسم کے غلام جو سب سے زیادہ ظلم و ستم، تعذیب اور ابتلاء و آزمائش کا شکار تھے، انہوں نے ہجرت نہیں کی، بلکہ ہجرت کرنے والے وہ لوگ تھے جو خاندانی پسِ منظر رکھتے تھے، ان کو قبائلی ماحول میں ان کے قبیلہ کی اتنی پُشت پناہی حاصل تھی جو ان کو ایذاء و تکلیف سے محفوظ رکھ سکے اور ابتلاء و آزمائش کا شکار ہونے سے ان کا تحفظ کر سکے، اور ہجرت کرنے والوں میں قریشی افراد کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ (فی ظلال القرآن 29/1)

سید قطبؒ کی اس رائے کی تائید شیخ العضبان بھی کرتے ہیں، وہ رقمطراز ہیں: ''سید قطبؒ کے بیان کردہ اس عظیم نکتہ کی تائید میں سیرت میں بہت سے دلائل موجود ہیں جن سے اس پہلو کو تقویت ملتی ہے، میرے خیال میں اس کی تائید اس عمومی صورت حال سے ہوتی ہے جو حبشہ کی جانب ہجرت کرنے والوں کے حوالہ سے پیش آئی، چنانچہ ہماری معلومات کے مطابق اللہ کے رسولؐ نے مہاجرینِ حبشہ کو اس وقت تک نہیں بلایا یہاں تک کہ ہجرتِ مدینہ، بدر، احد، خندق اور حدیبیہ کے تمام مراحل گزر گئے، اور مدینہ منورہ بھی مسلسل پانچ سال تک قریش کی طرف سے جڑ سے اکھاڑ پھینکنے والے خطرناک قسم کے حملوں کا نشانہ بنتا رہا، ان حملوں میں آخری حملہ غزوۂ خندق کا تھا، اور جب اللہ کے رسول ﷺ کو پورا اطمینان ہو گیا کہ مدینہ مسلمانوں کے لئے ایک پرامن مرکز بن گیا ہے اور مشرکین کی طرف سے تمام خطرات ختم ہو چکے ہیں تو اس وقت آپؐ نے مہاجرینِ حبشہ کو طلب کیا اور پھر اس احتیاطی مرکز کی کوئی ضرورت باقی نہ رہی جس کے بارے میں یہ امکان تھا کہ رسول اللہ ﷺ وہاں پناہ لیتے اگر یثرب (مدینہ) کا دشمن کے ذریعہ سقوط ہو جاتا۔ (المنہج الحرکی للسیرۃ 68،67/1)

استاذ دروزہ کی رائے یہ ہے کہ حبشہ میں دعوتی کام کے لئے راہ ہموار کرنا ہجرتِ حبشہ کا ایک اہم سبب تھا، فرماتے ہیں: "دل میں یہ بات آتی ہے کہ عیسائی مذہب والے حبشہ کو اختیار کرنا اس امید میں تھا کہ وہاں دعوت کے لئے سازگار میدان موجود ہے، اور اسی امید کے ساتھ حضرت جعفرؓ کو وہاں بھیجا گیا تھا۔ (سیرۃ رسول ﷺ 265/1)

یہی رائے ڈاکٹر سلیمان بن حمد العودۃ نے بھی اختیار کی ہے، فرماتے ہیں: ''سرزمین حبشہ میں دینِ جدید کی دعوت کو ہجرت کے اسباب میں سے ایک اہم سبب قرار دینے والی رائے کی تائید نجاشی اور دیگر اہلِ حبشہ کے اسلام قبول کرنے سے بھی ہوتی ہے، ایک اور پہلو بھی ہے کہ اگر حبشہ کی جانب ہجرت کرنے والوں کا وہاں جانا نبی کریم ﷺ کے مشورہ اور آپؐ کے ایماء پر تھا تو حبشہ میں فتح خیبر تک ان کا موجود رہنا بھی نبی کریم ﷺ کے حکم اور آپؐ کے ایماء پر تھا۔ صحیح بخاری میں ہے: حضرت جعفرؓ نے اشعریوں سے کہا جب کہ وہ حبشہ میں ان کے ساتھ جا ملے: ''بے شک رسول اللہ ﷺ نے ہم کو یہاں بھیجا ہے اور ہمیں یہاں قیام کرنے کا حکم دیا ہے، لہذا ہمارے ساتھ قیام کرو"۔ (صحیح بخاری: 4230)

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ وہاں ایک متعین مہم کے لئے گئے تھے اور اللہ کے دین کی دعوت سے بہتر مہم اور کیا ہو سکتی ہے ؟! اور یہ مہم اس وقت مکمل ہو گئی جب مہاجرین کو واپس بلا لیا گیا۔(الہجرۃ الأولی فی الاسلام، د-سلیمان العودہ، ص: 34)

مسلمانوں کے لئے ایک محفوظ جگہ کی تلاش:

ہجرتِ حبشہ کا ایک سبب مسلمانوں کے لئے ایک محفوظ جگہ کی تلاش بھی تھا، رسول اللہ ﷺ کے حفاظتی منصوبہ کا ایک مقصد اہلِ ایمان جماعت کی حفاظت بھی تھا، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے سوچا کہ حبشہ مسلمانوں کے لئے ایک محفوظ و مأمون جگہ ہو سکتی ہے، جب تک کہ اسلام کو غلبہ اور قوت حاصل ہو جائے اور بادِ مخالف تھم جائے، اور مہاجرین کو سرزمینِ حبشہ میں ایسا ماحول مل گیا جس سے وہ مأمون و مطمئن ہو گئے، اس سلسلہ میں حضرت اُم سلمہؓ فرماتی ہیں: جب ہم نے سرزمینِ حبشہ میں قیام کیا تو وہاں ہمیں نجاشی کی شکل میں بہترین پڑوسی ملا، ہم اپنے دین کے بارے میں مأمون تھے، ہم اللہ تعالی کی عبادت کرتے اور ہمیں کسی طرح کی کوئی اذیت نہیں پہنچتی۔ (السیرۃ النبویۃ، ابن ہشام 413/1)

2) نبی کریم ﷺ نے حبشہ کا انتخاب کیوں کیا؟

نبی کریم ﷺ نے سرزمینِ حبشہ کا انتخاب کیوں کیا؟ اس کے متعدد اسباب ہیں ان میں سے چند اسباب مندرجہ ذیل ہیں:

أ: انصاف پرور نجاشی:

نبی کریم ﷺ نے اپنے اصحاب کے سامنے نجاشی کے عدل وانصاف کا تذکرہ یوں فرمایا تھا: "اگر آپ سرزمینِ حبشہ کی جانب جاؤ گے تو وہاں ایک ایسا بادشاہ ہے جس کے ہاں کسی پر ظلم نہیں کیا جاتا ہے"۔ (سیرت ابن ہشام: 413/1)

ب: صالح اور نیک نجاشی:

نبی کریم ﷺ سے شاہِ حبشہ کی تعریف ان الفاظ میں وارد ہے، آپؐ نے فرمایا: "آج حبشہ کے ایک نیک شخص کی وفات ہوئی ہے، لہذا آؤ اور ان کی نماز جنازہ ادا کرو"۔ (صحیح بخاری: 1320، صحیح مسلم: 66/952)

اس نیکی اور صلاح کا اظہار اس کے ذریعہ ہوا جب کہ اس نے مسلمانوں کی حمایت و حفاظت کی اور وہ قرآنِ کریم کے ذریعہ اس وقت انتہائی متاثر ہوا جب اس نے حضرت جعفرؓ سے قرآنِ کریم سنا اور حضرت عیسی-علیہ السلام-کے بارے میں اس کا عقیدہ بھی صحیح تھا۔

ج: حبشہ قریش کی تجارتی منڈی:

بلاشبہ تجارت قریش کی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی تھی اور حبشہ جزیرۃ العرب میں ایک اہم تجارتی مرکز سمجھا جاتا تھا، ہو سکتا ہے کہ بعض مسلمانوں کو اس کے بارے میں اس وقت معلومات ہوئی ہوں گی جبکہ وہ وہاں تجارت کی غرض سے گئے ہوں یا ایسے لوگوں نے ان کے سامنے وہاں کا تذکرہ کیا ہو جو ان سے پہلے وہاں گئے ہوں، حبشہ کی جانب ہجرت کے اسباب کا ذکر کرتے ہوئے علامہ طبریؒ فرماتے ہیں: "اور سرزمینِ حبشہ قریش کی تجارتی منڈی تھی جہاں وہ تجارت کرتے تھے، جہاں رزق کی فراوانی، امن اور اچھی تجارت میسر ہوتی تھی"۔ (مغازی رسول اللہ ﷺ لعروۃ بن الزبیر، ص104)

اسی طرح علامہ ابن عبدالبرؒ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب شعب ابی طالب میں داخل ہوئے تو مکہ میں جو بھی اہلِ ایمان تھے آپ ﷺ نے ان کو حکم دیا کہ سرزمینِ حبشہ کی جانب نکل جائیں اور وہ قریش کی تجارتی منڈی تھی۔ (دیکھیں: الدرر فی اختصار المغازی والسیر، ص 27)

حبشہ کو جائے ہجرت بنانے کے اسباب کے ضمن میں ابنِ حبان رقمطراز ہیں: "وہ گرم علاقہ تھا جس کی جانب قریش کے لوگ جاڑے کا سفر کیا کرتے تھے"۔(السیرۃ النبویۃ و أخبار الخلفاء، ص 72)

د: حبشہ پُرامن ملک کی حیثیت سے:

اس زمانہ میں عرب کے تمام قبائل قریش کے حلیف اور مطیع تھے، اکثر و بیشتر قریش کی بات سنتے تھے اور اطاعت کرتے تھے، اس لئے کہ قریش کا ان قبائل پر اثر و نفوذ تھا، اور تمام قبائل اپنے حج میں، تجارت میں اور مختلف پہلوؤں میں قریش کے محتاج اور زیرِ اثر تھے، علاوہ ازیں وہ سب دعوتِ دین کے ساتھ جنگ میں اور نبی کریم ﷺ کی بات نہ ماننے میں قریش کے شانہ بشانہ کھڑے تھے، ابن اسحاقؒ نے اس قسم کے عربوں کے نمونے ذکر کئے ہیں جنہوں نے آپ ﷺ کی پیشکش اور آپ ﷺ کی دعوت کو ٹھکرا دیا تھا۔(السیر والمغازی، تحقیق: سہیل زکار، ص 232)

لہذا جب اس وقت جزیرۃ العرب کے اندر کی صورت حال اس طرح کی تھی تو اس وقت جزیرۃ العرب کے باہر سرزمینِ حبشہ سے زیادہ پرامن علاقہ کوئی نہیں تھا، اور یہ معلوم ہی ہے کہ حبشہ ایک طرف تو قریش کے کنٹرول اور دسترس سے آزاد تھا اور دوسری طرف وہ دیگر قبائل کی طرح قریش کے تابعِ فرمان بھی نہیں تھا، حبشہ کو جائے ہجرت بنانے کے اسباب کا ذکر ابن اسحاق کی حدیث میں یوں آیا ہے کہ وہ "اچھی سرزمین ہے اور وہاں ایک ایسا بادشاہ ہے جو کسی پر ظلم نہیں کرتا ہے"۔ لہذا اچھی سرزمین ہونا اور انصاف پرور بادشاہ کا ہونا اس پرامن ملک کی اہم خصوصیات تھیں۔(دیکھیں: ہجرۃ الرسول ﷺ و أصحابہ فی القرآن والسنۃ، ص 97، سیرت ابن ہشام 397/1، الہجرۃ الأولی فی الاسلام، ص 46)

ہ: حبشہ سے رسول اللہ ﷺ کی محبت اور اس کے بارے میں آپ ﷺ کی جانکاری:

امام زہری کی حدیث میں ہے کہ سرزمینِ حبشہ رسول اللہ ﷺ کے نزدیک ہجرت کے لئے سب سے زیادہ محبوب ترین سرزمین تھی۔(مغازی الزہری، ص 96) اس محبت کے متعدد اسباب تھے جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

- انصاف پرور اور عادل نجاشی کی حکومت

- حبشیوں کا نصرانیت پر عمل پیرا ہونا، اور نصرانیت (عیسائیت) بت پرستی کے مقابلہ میں اسلام سے قریب تر ہے، اسی لئے بعثت کے آٹھویں سال مکی زمانہ میں اہلِ شرک مجوسیوں کے مقابلہ میں عیسائی رومیوں کی فتح پر مسلمانوں کو کافی خوشی ہوئی، جیسے کہ قرآن پاک میں اس کا ذکر ہے۔ (صحیح السیرۃ النبویۃ: 152/2)

- رسول اللہ ﷺ حبشہ کے بارے میں معلومات رکھتے تھے اور یہ معلومات آپ کو آپ ﷺ کی آیا حضرت ام ایمنؓ کے ذریعہ حاصل ہوئی تھیں، اور حضرت ام ایمنؓ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی روایات کے مطابق حبشیہ تھیں۔(صحیح بخاری: 2630، صحیح مسلم: 1771) ابن شہاب اور سنن ابن ماجہ میں منقول ہے کہ حضرت ام ایمنؓ نبی کریم ﷺ کے لئے کھانا تیار کرتی تھیں، تو آپ ﷺ نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ انہوں نے

جواب دیا: یہ وہ کھانا ہے جو ہم اپنے علاقے میں بناتے ہیں، لہذا میں نے چاہا کہ میں آپ کے لئے اس طرح کی روٹی تیار کروں۔ (سنن ابن ماجہ: 3336)

حضرت ام ایمنؓ اپنے حبشی لہجہ میں بھی تبدیلی نہ لا سکیں، اور رسول اللہ ﷺ نے ان کو ان الفاظ کے بارے میں رخصت دے رکھی تھی جن کو وہ صحیح طریقہ سے ادا نہیں کر پاتی تھیں، اس لئے یہ کوئی بعید از امکان بات نہیں ہے کہ وہ اپنے علاقہ کے بارے میں، اپنے معاشرہ کے بارے میں اور اپنے حکام کے بارے میں نبی کریم ﷺ کے سامنے تفصیلات بیان کریں، اسی طرح نبی کریم ﷺ اپنے دور کے ممالک کے حالات اور اور مزاج سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ (دیکھیں: الھجرۃ الاولی فی الاسلام، ص48)

3: مہاجرین کی روانگی کا وقت، رازداری اور ان کا حبشہ پہنچنا:

رسول اللہ ﷺ کے اصحاب مکہ مکرمہ سے بعثت نبوی کے پانچویں سال ماہ رجب میں روانہ ہوئے، ہجرت کرنے والے افراد دس مردوں اور چار عورتوں پر مشتمل تھے، بعض روایات میں پانچ خواتین کی تعداد منقول ہے، قریش کے لوگوں نے ان کا پیچھا کرنے کی کوشش کی تاکہ ان کو واپس مکہ مکرمہ لے آئیں، پیچھا کرتے کرتے ہوئے ساحل سمندر تک پہنچے لیکن مسلمان ساحل سمندر سے تجارتی جہازوں میں سوار ہو کر حبشہ کی جانب نکل چکے تھے۔ (الھجرۃ فی القران الکریم، أحزمی سامعون، ص:290، 291)

مختلف روایات پر غور کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ مہاجرین حبشہ کا پہلا دستہ انتہائی رازداری کے ساتھ روانہ ہوا، چنانچہ واقدی کی روایت میں ہے: "وہ خفیہ طریقہ سے رازداری کے ساتھ نکلے"۔ (طبقات ابن سعد: 204/1) ہجرت کے سلسلہ میں جن حضرات نے رازداری کا ذکر کیا ہے ان میں ابن سید الناس (عیون الأثر 116/1)، علامہ ابن قیم (زاد المعاد 23/3)، علامہ زرقانی (شرح المواھب 271/1، البدایہ والنہایہ 96/3، 97) ہیں، اور جب مسلمان سرزمینِ حبشہ پہنچے تو نجاشی نے ان کو بہترین جائے قیام فراہم کی، ان کے ساتھ اچھے انداز میں ملاقات کی اور مسلمانوں نے اس کے پاس ایسا اطمئنان اور امن محسوس کیا جیسا ان کو اپنے وطن اور گھر والوں میں بھی حاصل نہیں تھا، حضرت ام سلمہؓ جو کہ ازواج مطہرات میں سے ہیں، سے روایت ہے فرماتی ہے کہ "ہم نے جب سرزمینِ حبشہ میں قیام کیا تو وہاں ہمیں نجاشی کی شکل میں بہترین پڑوسی ملا، ہم اپنے دین کے بارے میں مأمون تھے ہم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے اور ہمیں کسی طرح کی کوئی اذیت نہیں پہنچتی اور نہ ہم کوئی ناپسندیدہ بات سنتے۔ (سیرت ابن ہشام: 413/1)

حبشہ کی جانب پہلی ہجرت کرنے والوں کے اسمائے گرامی:

مرد:

حضرت عثمان بن عفان بن ابی العاص بن امیہ بن عبد شمس، حضرت عبداللہ بن عوف بن عبد الحارث بن زہرہ، حضرت زبیر بن عوام بن خولید بن اسد، حضرت ابو حذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ بن عبد شمس، حضرت مصعب بن عمیر بن ہاشم بن عبد مناف بن عبد الدار، حضرت ابو سلمہ بن عبد الأسد بن ہلال بن عبداللہ بن عمر بن مخزوم، حضرت عثمان بن مظعون بن حبیب بن وہب بن حذافہ بن جمح، حضرت عامر بن ربیعہ

(یہ آل خطاب کے حلیف تھے) حضرت سہیل بن بیضاء (ان کا پورا نام سہیل بن وہب بن ربیعہ بن ہلال بن اُھیب بن ضبّہ بن حارث ہے)حضرت ابو سبرۃ بن اُبی رہم بن عبد العزی بن اُبی قیس عبدوُد بن نصر بن مالک بن حِسل بن عامر۔

یہ وہ دس افراد ہیں جو مسلمانوں میں سب سے پہلے سرزمینِ حبشہ کی جانب ہجرت کے لئے گئے۔

خواتین:

حضرت رقیہؓ جو کہ رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی تھیں، حضرت سہیلہ بنت سہیل بن عمرو، انہوں نے اپنے شوہر حضرت اُبو حذیفہؓ کے ساتھ ہجرت کی اور سرزمینِ حبشہ میں ہی ان کے بطن سے حضرت محمد بن ابی حذیفہ کی ولادت ہوئی، حضرت ام سلمہ بنت ابی امیہ بن مغیرہ بن عبد اللہ بن عمر بن مخزوم، یہ حضرت ابو سلمہؓ کی شریکِ حیات تھیں۔ حضرت لیلی بنت ابی حثمہ بن حذافہ بن غانم (بن عامر) بن عبداللہ بن عوف بن عبید بن عویج بن عدی بن کعب، یہ حضرت عامر بن ربیعہؓ کی شریکِ حیات تھیں، حضرت ام کلثوم بنت سہیل بن عمرو بن عبد شمس، یہ حضرت اُبی سبرہ بن اُبی رہم کی شریکِ حیات تھیں۔(دیکھیں: البدایہ والنہایہ 67/3، الہجرۃ فی القرآن الکریم، ص294 فتح الباری، حدیث نمبر: 3872)

ان تمام مہاجرین میں سے سب سے پہلے ہجرت کرنے والے حضرت عثمان بن عفان اور ان کی زوجہ محترمہ حضرت رقیہ بنت رسول ﷺ ہیں، چنانچہ یعقوب بن سفیان بیان کرتے ہیں: "بے شک حضرت عثمانؓ پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے لوط (علیہ السلام) کے بعد اپنے گھر والوں کے ساتھ ہجرت کی"۔ (أنساب الأشراف للبلاذری 156/1، 198، سیرت ابن ہشام: 392/1، 396)

ان ذکر کردہ ناموں میں غور کرنے والے کو ان میں کسی ایسے غلام کا نام نہیں ملے گا جن کو قریش کی ایذاء رسانیوں اور تکالیف کا زیادہ نشانہ بنایا گیا جیسے کہ حضرت بلالؓ، حضرت خبابؓ، حضرت عمارؓ، بلکہ ان میں اکثریت ان افراد کی ہے جو قریش میں مقام و مرتبہ اور حسب ونسب کے حامل تھے اور یہ افراد مختلف قبائل کی نمائندگی کرتے تھے، یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ ایذاء کا سامنا مقام و مرتبہ اور حسب و نسب کے حامل افراد کو بھی کرنا پڑا لیکن یہ بھی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ ایذاء سب سے زیادہ غلاموں کو برداشت کرنی پڑی، اس لئے کہ سب صورتحال ایسے ماحول میں درپیش تھی جہاں قبیلہ کی ایک اہمیت تھی اور حسب و نسب کا بھی وہاں خیال رکھا جاتا تھا، لہذا اگر ایذاء اور تکالیف سے بھاگنا ہجرت کا تنہا سبب ہوتا تو یہ مظلوم غلام دوسروں کے مقابلہ میں ہجرت کے زیادہ حقدار تھے، اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ابن اسحاق اور دیگر سیرت نگاروں نے کمزوروں پر مشرکین کے ظلم و زیادتی کا ذکر کیا ہے مگر حبشہ کی جانب ان کی ہجرت کرنے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔(دیکھیں: الہجرۃ الأولی فی الاسلام، ص37)

ایک محقق کے سامنے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ ہجرتِ حبشہ کے اسباب میں ایذاء اور تکالیف کے علاوہ اور بھی دوسرے اسباب تھے جن کی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے مخصوص صلاحیتوں کے حامل صحابہ کرام کا انتخاب فرمایا تھا، جو متعدد قبائل کی نمائندگی کرتے تھے، اور ان کا خاص اثر اور کردار ہو سکتا تھا اگر قریش کے لوگ اہلِ حبشہ کو مکہ واپس کرانے میں کامیاب ہو جاتے، اور دوسری طرف ان کے ہجرت کرنے سے قریش کے تمام یا اکثر قبائل میں ایک ہلچل مچ جاتی، چنانچہ مکہ اپنے ہی مکینوں کے لئے تنگ ہو گیا تھا اور اب ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہیں بچا تھا کہ وہ کسی اور جگہ امن تلاش کریں، اسی طرح یہ ہجرت کرنے والے اللہ کے دین کو لے

کر اس کو آفاق میں پھیلانے کا ذریعہ بنے، اور یہ جائے ہجرت دعوتِ الی اللہ کے لئے زیادہ بہتر اور بابرکت جگہ ثابت ہوئی جس کے لئے وہاں کے لوگوں نے اپنے دل ودماغ کے دریچے کھول دیئے جبکہ دوسری جگہوں پر یہ دریچے بند رہے۔ (دیکھیں: الہجرۃ فی القرآن الکریم: ص295)

2: ہجرتِ اولیٰ کے بعد مکہ واپس آنے کے اسباب

ا- قصہ غرانیق کی وجہ سے مہاجرین کی واپسی کا شبہہ:

بعض مؤرخین اور مفسرین نے حبشہ سے مسلمانوں کی مکہ واپسی کا سبب ایک خود ساختہ قصہ بیان کیا ہے جس نے شہرتِ عام حاصل کی اور مستشرقین کی کتابوں میں اس کو کافی جگہ دی گئی، اس کے ذریعہ ان کا مقصد یہ ہے کہ اس واقعہ کو زیادہ سے زیادہ رواج دیا جائے اور اس کو دعوتِ اسلامی کی تاریخ کا ایک حقیقی واقعہ بنا کر پیش کیا جائے۔

جن لوگوں نے اس خود ساختہ قصہ کو بیان کیا ہے انہوں نے مختلف طریقوں سے اس کو بیان کیا ہے، بعض نے اس کا ذکر کیا ہے اور اس کے بعد سکوت اختیار کیا ہے، نہ ہی اس کی نفی کی ہے اور نہ ہی اس کا اثبات کیا ہے، بعض نے اس کے اثبات کی کوشش کی ہے اور بعض نے اس کے باطل ہونے کے دلائل ذکر کئے ہیں۔ (مختصر سیرۃ الرسول ﷺ، محمد بن عبدالوہاب، ص84)

اس خود ساختہ قصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک روز خانہ کعبہ کے پاس تشریف فرما تھے اور آپؐ نے سورۃ النجم تلاوت فرمائی یہاں تک کہ آپؐ اس آیت پر پہنچے: ﴿أَفَرَءَيْتُمُ ٱللَّٰتَ وَٱلْعُزَّىٰ ۝١٩ وَمَنَوٰةَ ٱلثَّالِثَةَ ٱلْأُخْرَىٰٓ ۝٢٠﴾(سورۃ النجم: 19-20) اس کے بعد آپؐ نے یہ الفاظ پڑھے: "تلك الغرانيق العلا، وإن شفاعتهن لترجى"-یعنی: ''یہ بت معظم ومحترم ہیں اور ان کی شفاعت مقبول ہے''۔ یہ سن کر مشرکین کہنے لگے: انہوں نے تو آج سے پہلے ہمارے معبودوں کا کبھی خیر کے ساتھ ذکر نہیں کیا ہے اور ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ رزق دیتا ہے، وہی زندہ کرتا ہے، اور وہی مارتا ہے، لیکن ہمارے معبود اللہ کے ہاں سفارش کرتے ہیں۔ جب آپؐ آیتِ سجدہ کے پاس پہنچے تو آپؐ نے سجدہ کیا اور آپؐ کے ساتھ تمام مسلمانوں اور مشرکین نے سجدہ کیا، سوائے قریش کے ایک شیخ کے، اس نے مٹھی بھر کنکریاں پیشانی کی طرف اٹھائیں اور ان پر سجدہ کیا۔ (فتح القدیر 416/3 فتح الباری 355/8 أسباب النزول للسیوطی علی ہامش الجلالین 16/2، الہجرۃ فی القران الکریم، ص296)

اس کے بعد مشرکین اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ ہمدردی کرنے لگے اور مسلمانوں کو ایذاء پہنچانے سے ہاتھ روک لیا اور یہ بات ہر طرف پھیل گئی، یہاں تک کہ حبشہ میں موجود مسلمانوں کو بھی اس کی خبر ہوگئی، اس لئے مکہ میں اقامت اختیار کرنے اور وہاں امن وسکون کے ساتھ عبادت کرنے کے بارے میں ان کو اطمئنان ہوگیا، اس لئے وہ واپس مکہ لوٹ آئے۔

یہ خلاصہ ہے اس پورے قصہ کا، اور جن لوگوں نے اس قصہ کا ذکر کیا ہے، اگرچہ وہ اس کے بارے میں مختلف نقطہائے نظر رکھتے ہیں، وہ سب کہتے ہیں کہ جب قریش نے اللہ کے رسول ﷺ سے یہ کہا کہ اگر آپ ہمارے معبودوں کو بھی کوئی جگہ دیں گے تو ہم آپ کے ساتھ ہیں، آپؐ کے لئے یہ بات باعثِ تشویش ہوئی اور آپؐ اپنے گھر میں بیٹھ گئے یہاں تک کہ شام کا وقت ہوگیا، اس کے بعد آپ ﷺ

کے پاس حضرت جبرئیل (علیہ السلام) آئے اور آپؐ نے ان کے سامنے سورۃ النجم پڑھی، جبرئیل (علیہ السلام) نے فرمایا: کیا میں یہ دو کلمات آپ کے پاس لے کر آیا تھا؟ اس سے ان کی مراد تھی: "تلك الغرانيق العلا، وإن شفاعتهن لترجى"- رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس پر انتہائی غمگین ہوئے اور آپؐ پر رب کا خوف طاری ہو گیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل کیں: [وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ] ترجمہ: "اور اے محمدؐ، تم سے پہلے ہم نے نہ کوئی رسول ایسا بھیجا ہے نہ نبی (جس کے ساتھ یہ معاملہ نہ پیش آیا ہو کہ) جب اُس نے تمنّا کی، شیطان اس کی تمنّا میں خلل انداز ہو گیا، اِس طرح جو کچھ بھی شیطان خلل اندازیاں کرتا ہے اللہ ان کو مٹا دیتا ہے اور اپنی آیات کو پختہ کر دیتا ہے، اللہ علیم ہے اور حکیم"۔ (سورۃ الحج: 52) اس کے بعد اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پھر سے ان کے معبودوں کی عیب جوئی کرنے لگے، ان کی بے عقلی کو بیان کرنے لگے اور مشرکین بھی دوبارہ سے مسلمانوں کو ایذاء پہنچانے لگے۔ (دیکھیں: الھجرۃ فی القرآن الکریم، ص298)

۲- اس بے بنیاد قصہ کی تردید:

بہت سے علماء اور محدثین نے روایت و درایت کے اعتبار سے اس قصہ کا انکار کیا ہے، اس لئے کہ یہ قصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عصمت کے منافی ہے، بلکہ یہ آپؐ کی نبوت پر ہی تیشہ زنی کرتا ہے، اسی طرح یہ قصہ علمی تحقیق کے سامنے بے بنیاد قرار پاتا ہے، اس کے غلط ہونے کے چند عقلی دلائل مندرجہ ذیل سطور میں ذکر کئے جا رہے ہیں:

أ) قرآنِ کریم نے وضاحت کے ساتھ یہ بیان کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی بھی اعتبار سے اللہ کے مقابلہ میں افتراء اندازی نہیں کر سکتے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: [وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۝ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ] ترجمہ: "اور اگر اس (نبی) نے خود گڑھ کر کوئی بات ہماری طرف منسوب کی ہوتی تو ہم اِس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے، اور اِس کی رگِ گردن کاٹ ڈالتے"۔ (سورۃ الحاقہ: 44-46)

ب) اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی یہ واضح کر دیا ہے کہ وہ قرآنِ پاک کو اس سے محفوظ رکھے گا کہ اس میں کوئی ایسی چیز داخل کی جائے جو اس میں سے نہ ہو، یا اس میں کسی طرح کی کمی کی جائے یا اس میں کسی طرح کی تحریف و تبدیلی کی جائے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: [اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ] ترجمہ: "رہا یہ ذکر، تو اِس کو ہم نے نازل کیا ہے اور ہم خود اِس کے نگہبان ہیں"۔ (سورۃ الحجر: 9)

اور اگر اس کو صحیح مان لیا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن کی تلاوت کے دوران مذکورہ دو جملے ادا کئے تو پھر قرآن میں ایسی چیز داخل کرنا لازم آئے گا جو اس میں سے نہیں ہے، لہذا پھر حفاظت کا وعدہ بھی پورا نہیں ہو گا اور یہ بات قرآنی نص کے بر خلاف ہے۔

ج) ارشاد باری تعالیٰ ہے: [اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ] ترجمہ: "اُسے اُن لوگوں پر تسلط حاصل نہیں ہوتا جو ایمان لاتے اور اپنے رب پر بھروسا کرتے ہیں"۔ (سورۃ النحل: 99) کیا کوئی ایسا انسان ہو سکتا ہے جو انبیاء کے مقابلہ میں اللہ پر زیادہ ایمان رکھنے والا اور توکل رکھنے والا ہو سکتا ہے؟! خاص طور پر خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ؟! اور شیاطین کے سردار نے خود

اس کا اقرار کیا ہے کہ اس کو اللہ کے مخلص و منتخب بندوں پر کوئی اختیار حاصل نہیں ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: [قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ۝ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ] ترجمہ: ''اس نے کہا: تیری عزت کی قسم، میں اِن سب لوگوں کو بہکا کر رہوں گا، بجز تیرے اُن بندوں کے جنھیں تونے خالص کر لیا ہے"۔(سورۂ ص: 82-83)

لہذا انتخاب کا انبیاء سے زیادہ حقدار کون ہو سکتا ہے؟! اور ان سے زیادہ اللہ کے لئے مخلص اور کون ہو سکتا ہے؟! اور ہمارے نبی محمد ﷺ تو منتخب اور بہترین لوگوں میں سرفہرست اور اخلاص پر فائز ہیں۔ قاضی عیاضؒ بیان کرتے ہیں کہ مفسرین اور دیگر لوگوں میں سے جس نے بھی اس واقعہ کا ذکر کیا ہے کسی نے بھی اس کی سند کا ذکر نہیں کیا ہے، اور نہ ہی اس کو کسی راوی کی طرف منسوب کیا ہے، سوائے بزار کی روایت کے، اور بزار نے بھی وضاحت کی ہے کہ اس ذکر کردہ سند کے علاوہ اور کوئی ایسی سند نہیں ہے جس کا ذکر کرنا درست ہو، اور اس سند میں بھی کافی جھول ہے۔(فتح الباری: 4862)

علامہ ابن حجرؒ کی رائے یہ ہے کہ یہ کہنا کہ مشرکین کا سجدہ کرنا اس وجہ سے تھا کیونکہ شیطان نے رسول اللہ ﷺ کی تلاوت کے اندر خلل اندازی کی تھی اور یہ بات عقلاً اور نقلاً (روایتاً اور درایتاً) کسی بھی اعتبار سے نہیں ہے۔

علامہ ابن کثیرؒ اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں: یہاں پر بہت سے مفسرین نے غرانیق کا قصہ ذکر کیا ہے، اسی طرح سرزمینِ حبشہ سے بہت سے مہاجرین کی واپسی کا بھی ذکر کیا ہے، اس لئے کہ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ مشرکینِ قریش نے اسلام قبول کر لیا ہے، لیکن یہ قصہ ایسی سندوں کے ساتھ منقول ہے جو سب کی سب مرسل ہیں، اور مجھے اس کی کوئی بھی صحیح سند نہیں مل پائی۔ واللہ أعلم۔(تفسیر ابن کثیر والبغوی 600/6، الہجرۃ فی القرآن، ص298)

عقل و درایت کے اعتبار سے اس قصہ کا رد:

جہاں تک عقل و درایت کے اعتبار سے اس قصہ کے بے بنیاد اور غلط ہونے کا تعلق ہے تو اس بات کے عقلی دلائل موجود ہیں اور امت کا اس پر اجماع اور اتفاق ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس طرح کی تمام چیزوں سے معصوم ہیں، اس لئے کہ اگر اس طرح کی چیز کا امکان رسول اللہ ﷺ کے لئے درست مانا جائے تو پھر آپؐ کے لئے کذب و جھوٹ بھی درست ماننا ہوگا، اور رسول اللہ ﷺ سے کذب و جھوٹ کا امکان ناممکن و محال ہے، لہذا اس قسم کے قصہ کا صدور رسول اللہ ﷺ سے محال و ناممکن ہے، اور اگر آپؐ نے اس کو عمداً یا سہواً بیان کیا ہو تو پھر عصمت باقی نہیں رہتی ہے، اور ایسا ہونا ناقابل قبول ہے، اسی طرح یہ قصہ عقیدۂ توحید کے برخلاف اور منافی ہے جس کے لئے نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے مبعوث کیا تھا۔

لغوی اعتبار سے اس قصہ کا رد:

اہلِ عرب سے کہیں بھی یہ بات ثابت نہیں ہے کہ انہوں نے اپنے معبودوں کو اپنے اشعار یا نثر میں "غرانیق" کہا ہو۔ لغوی اعتبار سے "غرنوق" پانی میں رہنے والے ایک کالے یا سفید پرندہ کو کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اس کے معانی ہیں: خوبصورت روشن چہرہ جوان۔ (دیکھیں: القاموس المحیط 281/3 مادہ: الغرنوق) اس لفظ کے لغوی معانی میں سے کوئی بھی معنی معبود اور بتوں کے معنی کے ساتھ میل

نہیں کھاتا ہے کہ فصیح عربی میں اس کو معبود اور بتوں کے معنی میں استعمال کیا جاسکے اور پھر اس کو فصاحت و بیان کے ماہرین کے سامنے بھی پیش کیا جاسکے، لہٰذا مشرکین اس کے ذریعہ کیسے خوش ہو سکتے ہیں اور کیسے اپنے معبودوں کے تئیں ذکرِ خیر تصور کر سکتے ہیں۔

بے شک غرانیق کا قصہ روایت و نقل کے اعتبار سے بھی صحیح طریقہ سے ثابت نہیں ہے، یہ قرآنِ کریم کے بھی منافی ہے، عقل و درایت بھی اس کا ساتھ دینے سے قاصر ہے، اور لغت بھی اس کا انکار کرتی ہے، اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ غرانیق والی حدیث جھوٹی ہے جس کو زنادقہ اور دین بیزار لوگوں نے گڑھا ہے جو دین و عقیدہ میں بگاڑ پیدا کرنے کے لئے اور سید الأنبیاء وامام المرسلین ﷺ پر طعن و تشنیع کرنے میں ہر طرح کی کوشش کرتے ہیں۔ (السیرۃ النبویہ فی ضوء القرآن والسنۃ، أبو شہبہ 372/1 الہجرۃ فی القرآن، ص: 298، 299)

۳۔ مسلمانوں کی واپسی کے حقیقی اسباب:

ہجرتِ حبشہ کے آغاز سے تین ماہ تک باقی ماندہ مسلمان مکہ مکرمہ میں رہتے رہے لیکن اس دوران مکہ میں مسلمانوں کی زندگی میں کافی تبدیلیاں رونما ہوئیں، اور ایسے حالات پیدا ہو گئے جو کہ اس سے پہلے نہیں تھے، ان حالات نے مسلمانوں کے اندر مکہ میں دعوت کے نتیجہ خیز اور ثمر آور ہونے کے سلسلہ میں امید کی کرن پیدا کر دی، اس لئے کہ اس زمانہ میں رسول ﷺ کے چچا حضرت حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ نے اپنے بھتیجے کی تائید میں اسلام کو قبول کیا، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے سینے کو باقاعدہ اسلام کے لئے کھول دیا اور وہ اس پر ثابت قدم رہے، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نوجوانانِ قریش میں سب سے زیادہ صاحبِ عزت اور طاقتور نوجوان تھے، جب وہ اسلام میں داخل ہوئے تو قریش کے لوگ سمجھ گئے کہ رسول اللہ ﷺ کو اب حمایت و تائید حاصل ہو گئی ہے اور آپ ﷺ کے چچا اب ان کی حفاظت و حمایت کریں گے، اس لئے وہ آپ ﷺ کو ایذاء و تکلیف پہنچانے سے قدرے باز آ گئے۔ (مختصر سیرۃ الرسول ﷺ، محمد بن عبد الوھاب، ص: 90)

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے اسلام کے بعد حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی حلقہ بگوش اسلام ہو گئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ انتہائی طاقتور تھے، جن کا کوئی بھی مقابلہ نہیں کر پاتا تھا، جب انہوں نے اسلام قبول کیا ان کے ذریعہ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے ذریعہ مسلمان محفوظ ہو گئے یہاں تک کہ وہ قریش پر غالب آنے لگے۔ (سیرۃ ابن ہشام: 294/1)

ان دو عظیم شخصیات کا قبولِ اسلام ہجرتِ حبشہ کے بعد تھا اور ان کے قبولِ اسلام سے مسلمانوں کو عزت حاصل ہوئی اور مشرکین مغلوب ہو گئے اور صحابہ کرام کی اپنے عقیدہ کے اظہار و اعلان کے بارے میں حوصلہ افزائی ہوئی۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "بے شک حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام ایک فتح تھی، ان کی ہجرت نصرت تھی، اور ان کی امارت رحمت تھی، ہم اس وقت تک خانہ کعبہ کے پاس نماز نہیں پڑھ سکتے تھے، یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا تو انہوں نے قریش کا مقابلہ کیا، انہوں نے خانہ کعبہ کے پاس نماز ادا کی اور ہم نے بھی ان کے ساتھ نماز ادا کی۔ (سیرت ابن ہشام: 365/1)

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا تو دریافت کیا: قریش میں کون ایسا شخص ہے جو باتیں پھیلانے میں سب سے زیادہ ماہر ہے؟ ان سے کہا گیا: جمیل بن معمر الجمحی! فرماتے ہیں: وہ ان کے پاس گئے اور میں بھی ان کے ساتھ ان کے پیچھے پیچھے گیا، دیکھتا رہا کہ کیا کرتے ہیں وہ ان کے پاس پہنچے اور ان سے کہا: اے جمیل! کیا تمہیں پتہ ہے کہ میں نے

اسلام قبول کیا ہے اور میں محمدؐ کے دین میں داخل ہو گیا ہوں؟ حضرت عبد اللہؓ فرماتے ہیں: واللہ! وہ ابھی بات ہی کر رہے تھے یہاں تک کہ وہ اپنی چادر گھسیٹتے ہوئے کھڑا ہو گیا اور حضرت عمرؓ بھی اس کے پیچھے چل دیئے اور میں بھی اپنے والد کے پیچھے پیچھے چل دیا، یہاں تک کہ وہ مسجد حرام کے دروازہ پر کھڑا ہوا اور زور سے چلایا: اے قریش کے لوگو! وہ سب کعبہ کے ارد گرد اپنی مجلسوں میں تھے، سن لو، ابن خطاب بے دین ہو گیا ہے۔ فرماتے ہیں: حضرت عمرؓ اس کے پیچھے سے کہنے لگے: اس نے جھوٹ بولا! بلکہ میں نے اسلام قبول کیا ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ سب مشرکین ان پر ٹوٹ پڑے اور وہ مسلسل ان سے لڑتے رہے اور مشرکین بھی ان کا مقابلہ کرتے رہے یہاں تک کہ سورج نکل آیا اور دھوپ ان کے سروں پر پہنچ گئی، حضرت عمرؓ تھک کر بیٹھ گئے اور وہ ان کے سر کے پاس آکر کھڑے ہو گئے، حضرت عمرؓ ان سے کہہ رہے تھے: جو کر سکتے ہو کر لو، میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں: اگر ہم لوگ تین سو کی تعداد میں ہوتے تو پھر مکہ میں یا تم ہی رہتے یا ہم ہی رہتے۔ (سبل الھدیٰ الرشاد، الصالحی 2/498- 499)

لہذا معلوم یہ ہوا کہ مسلمانوں کے حالات ہجرتِ حبشہ سے پہلے کے حالات کے مقابلہ میں تبدیل ہو گئے تھے، وہ حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کے ذریعہ اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے لگے تھے اور خانہ کعبہ کے پاس نماز ادا کرنے پر قادر ہو گئے تھے، جبکہ اس سے پہلے وہ ایسا نہیں کر سکتے تھے، اسی طرح وہ حضرت اَرقم بن ابی الاَرقم کے گھر سے اعلانیہ طور پر نکلے یہاں تک کہ مسجد حرام میں داخل ہو گئے اور قریش کے لوگ اس وحشیانہ طریقہ سے ان کو ایذاء پہنچانے سے باز آگئے جیسے کہ اس سے پہلے ان کو سزائیں دیتے تھے، اس لئے اب مسلمانوں کے لئے صورتحال بدل چکی تھی اور ہجرتِ حبشہ سے پہلے کے مقابلہ میں اب حالات قدرے بہتر ہو گئے تھے، لہذا کیا یہ بات کسی سے مخفی رہ سکتی تھی؟! اور کیا سرزمین حبشہ تک تبدیل شدہ صورت حال کی خبریں نہ پہنچی ہوں گی؟! جدہ کی بندرگاہ سے گزرنے والے مسافروں نے بھی ان حالات کو بیان کیا ہوگا۔

یقیناً یہ سب معلومات ان تک پہنچی ہوں گی اور مسافرت و اجنبیت کے ماحول میں رہنے والے مسلمان اس سے بہت خوش ہوئے ہوں گے اور اس کے بعد وطن کا شوق پیدا ہونا کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے، وطن کا شوق تو تمام مخلوقات کی فطرت میں داخل ہے، یقیناً ان کے دلوں میں وطنِ عزیز ام القری مکہ مکرمہ کی طرف واپسی کا شوق انگڑائیاں لینا شروع ہوا ہوگا، وہاں تو ان کے اہل و عیال اور اہلِ خاندان رہتے تھے، اس لئے وہ ان نئے اور حوصلہ افزا حالات میں دل کی چاہتوں کے ساتھ، اللہ کے حرم اور بیت عتیق کے شوق میں مکہ مکرمہ واپس آگئے۔ (دیکھیں: تأملات فی سیرۃ الرسول، محمد سید الوکیل، ص59 الھجرۃ فی القرآن الکریم، ص: 302)

مہاجرین مکہ مکرمہ واپس آئے، اس لئے کہ ان کو حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کے اسلام کا علم ہو گیا تھا اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ ان دو جلیل القدر صحابہ کرام کے قبولِ اسلام سے مسلمان فخر و اعتزاز محسوس کریں گے اور اس کے ذریعہ وہ طاقتور اور قوی ہو جائیں گے۔

لیکن قریش نے حضرت عمرؓ اور حضرت حمزہ کے قبولِ اسلام کا نئی تدبیروں کے ذریعہ مقابلہ کیا جس میں ایک طرف تو مکر و فریب اور چالاکی ظاہر ہوتی تھی اور دوسری طرف ظلم و زیادتی نمایاں تھی، انہوں نے دہشتگردی میں مزید اضافہ کیا جس کو وہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کے خلاف ایک خطرناک اسلحہ کے طور پر استعمال کرتے تھے، جس میں معاشی بائیکاٹ بھی ایک اہم ہتھیار کے طور پر استعمال کیا

گیا، لیکن از سرِ نو ایذاء رسانیوں کے اس خطرناک حملہ کے نتیجہ میں مسلمان دوبارہ حبشہ لوٹنے پر مجبور ہوگئے اور اس مرتبہ ان مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد بھی ان کے ساتھ شامل ہوگئی جو پہلی مرتبہ ہجرت کے موقع پر ان کے ساتھ شریک نہیں تھی۔ (القول المبین فی سیرۃ سید المرسلین، د۔ محمد النجار، ص 111، الھجرۃ فی القرآن الکریم، ص 302)

۳: حبشہ کی جانب دوبارہ ہجرت:

ابن سعد فرماتے ہیں: جب نبی کریم ﷺ کے اصحاب پہلی ہجرت کے بعد مکہ مکرمہ واپس آئے تو ان کی قوم ان کے لئے مزید سخت ہوگئی، ان کے خاندان بھی ان پر ظلم و ستم ڈھانے لگے اور ان کی طرف سے انہیں سخت قسم کی اذیت و تکلیف کا سامنا کرنا پڑا، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے انہیں دوبارہ حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دے دی، لیکن ان کی دوبارہ ہجرت اور زیادہ پُر مشقت تھی اور قریش کی جانب سے انہیں سخت اذیتوں اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑا، قریش کے لئے یہ بات انتہائی تکلیف دہ تھی کہ نجاشی نے مسلمانوں کے ساتھ بہترین سلوک کیا ہے اور ان کو بہتر جائے قیام فراہم کی ہے، حضرت عثمان بن عفانؓ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! ہم نے پہلی مرتبہ ہجرت کی اور اب دوسری مرتبہ ہجرت کر رہے ہیں اور آپ ہمارے ساتھ نہیں ہیں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: آپ اللہ تعالیٰ کی طرف اور میری طرف ہجرت کرنے والے لوگ ہو اور یہ دونوں ہجرتیں آپ ہی کو کرنی ہیں۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا: تب ٹھیک ہے، اے اللہ کے رسولؐ! (طبقات ابن سعد: 207/1، الھجرۃ فی القرآن: ص، 303)

اس مرتبہ حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والے افراد پہلے سے کہیں زیادہ تھے، ابن اسحاق وغیرہ کے مطابق ان کی تعداد (83) تراسی مردوں پر مشتمل تھی اگر حضرت عمار بن یاسرؓ کو بھی ان میں شامل کیا جائے، اور ان کے بغیر ان کی تعداد (82) بیاسی رہ جاتی ہے۔ سہیلی کہتے ہیں کہ واقدی، ابن عقبہ اور دیگر سیرت نگاروں کے نزدیک یہی صحیح قول ہے۔ اس کے علاوہ ان کے ساتھ اٹھارہ (18) خواتین بھی شامل تھیں، جن میں گیارہ قبیلہ قریش سے اور سات دیگر قبائل سے تعلق رکھتی تھیں، وہ بچے ان کے علاوہ ہیں جو کمسنی میں ان کے ساتھ نکلے یا پھر وہ بچے جن کی ولادت وہیں جا کر ہوئی۔ (دیکھیں: الروض الأنف، السھیلی: 228/3)

ا: نجاشی کے پاس قریش کی سفارت:

جب قریش نے یہ دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب سرزمینِ حبشہ میں امن و اطمئنان سے زندگی بسر کر رہے ہیں اور ان کو وہاں نجاشی کی طرف سے بہترین پڑوس اور جائے قیام مل گئی ہے، وہ اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور کوئی ان کو پریشان نہیں کرتا ہے، اس لئے انہوں نے آپس میں یہ مشورہ کیا کہ نجاشی کے پاس ایک وفد بھیجا جائے تاکہ وہاں سے مسلمانوں کو واپس کرانے کی کوشش کی جائے، اس کے لئے یہ منصوبہ بنایا گیا کہ شاہِ حبشہ اور مسلمانوں کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کی جائیں، لیکن اس وفد نے غیر شعوری طور پر اسلام اور مسلمانوں کی نصرت و حمایت کی، جس کا ان کو پتہ نہ چل پایا، چنانچہ ان کے منصوبہ کے نتیجہ میں نجاشی اور مہاجرین کے درمیان انتہائی سنجیدہ گفتگو ہوئی،

مہاجرین کی طرف سے نمائندگی کے فرائض حضرت جعفر بن ابی طالبؓ نے انجام دیئے اور یہ گفتگو اتنی نتیجہ خیز ثابت ہوئی کہ نجاشی نے اسلام قبول کیا اور اپنے ہاں مسلمان مہاجرین کو امن کے ساتھ رہنے کی اجازت دے دی۔

حضرت ام سلمہ بنت ابی امیہ بن مغیرہ جو کہ نبی کریم ﷺ کی زوجہ مطہرہ ہیں، فرماتی ہیں: جب سرزمینِ حبشہ میں ہم نے قیام کیا کی تو وہاں نجاشی کی شکل میں ہمیں بہترین پڑوسی ملا، ہم دین کے بارے میں مأمون و مطمئن تھے، ہم اللہ کی عبادت کرتے، کوئی ہمیں پریشان نہ کرتا اور نہ ہی کوئی ناپسندیدہ بات سنتے، جب یہ بات قریش کو معلوم ہوئی تو انہوں نے مشورہ کیا کہ ہمارے بارے میں دو قدآور لوگوں کو نجاشی کے پاس بھیجیں اور نجاشی کو مکہ کی بہترین چیزوں میں سے ہدیے اور تحائف بھی دے دیئے جائیں۔ مکہ کی سب سے خاص چیز چمڑہ ہوا کرتا تھا، اس لئے انہوں نے کافی چمڑا جمع کیا اور نجاشی کے کمانڈروں، سپہ سالاروں اور درباریوں میں سے ہر ایک کے لئے کوئی نہ کوئی ہدیہ تیار کیا، اس کے بعد یہ ہدیے اور تحفے لے کر عبداللہ بن ابی ربیعہ بن مغیرہ مخزومی اور عمرو بن عاص بن وائل سہمی کو بھیجا اور ان کو اپنا منصوبہ بتا دیا، اور ان دونوں سے کہا: نجاشی سے ان (مسلمانوں) کے بارے میں بات کرنے سے پہلے اس کے ہر سپہ سالار اور درباری کو اس کا ہدیہ دے دینا اور پھر اس سے درخواست کرنا کہ ان سب مسلمانوں کو تمہارے سپرد کر دے، قبل اس کے کہ وہ ان سے بات کرے۔ حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں: وہ دونوں نکلے اور نجاشی کے پاس پہنچ گئے جبکہ ہم اس کے ہاں ایک اچھی جگہ اور اچھے پڑوس میں تھے، چنانچہ اس کے سپہ سالار اور درباریوں میں سے کوئی نہیں بچا جس کو اُنہوں نے نجاشی سے بات چیت کرنے سے پہلے ہی ہدیہ نہ دیا ہو، اور ہر سردار اور سپہ سالار سے کہا: بادشاہ کے ملک میں ہمارے یہاں کی کچھ نادان لڑکوں نے پناہ لے رکھی ہے، انہوں اپنی قوم کے دین کو چھوڑا ہے اور آپ کے دین کو بھی قبول نہیں کیا ہے اور ایک نیا ہی دین ایجاد کیا ہے، جس کو نہ ہم جانتے ہیں اور نہ ہی آپ، ہمیں آپ کے پاس ان کی قوم کے سربرآوردہ اور ذمہ دار لوگوں نے ــــ جو ان کے باپ، چچا اور قریبی عزیز ہوتے ہیں ــــ بھیجا ہے تاکہ آپ ان کو واپس کر دیں، لہذا جب ہم ان کے بارے میں بادشاہ سے بات کریں تو اس کو مشورہ دیں کہ ان سب کو ہمارے حوالے کر دے اور ان سے کوئی بات چیت نہ کرے، اس لئے کہ ان کی قوم ان کے بارے میں زیادہ باخبر ہے، اور انہوں نے ان کی جو عیب جوئی کی ہے اس کو زیادہ جاننے والے ہیں۔ تمام سپہ سالاروں اور سرداروں نے کہا: ٹھیک ہے، ہم ایسا ہی کریں گے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے لائے ہوئے تحفے نجاشی کو پیش کئے، اس نے ان دونوں سے وہ قبول کر لئے، اس کے بعد ان دونوں نے اس سے گفتگو کی اور کہا: اے بادشاہ! بے شک آپ کے ملک میں ہمارے یہاں کے کچھ نادان لڑکوں نے پناہ لے رکھی ہے، انہوں نے اپنی قوم کے دین کو چھوڑ دیا ہے اور آپ کے دین کو بھی قبول نہیں کیا ہے اور ایک نیا ہی دین لے کر آئے ہیں جس کو نہ ہم جانتے ہیں اور نہ ہی آپ۔ ہمیں آپ کے پاس ان کی قوم کے کچھ سربرآوردہ اور ذمہ دار لوگوں نے ــــ جو ان کے باپ، چچا اور قریبی عزیز ہوتے ہیں ــــ بھیجا ہے تاکہ آپ ان کو واپس کر دیں، اس لئے کہ وہ ان کے بارے میں زیادہ باخبر ہیں اور انہوں نے ان کی جو عیب جوئی کی ہے اور ان کو برا بھلا کہا ہے وہ اس کو زیادہ جاننے والے ہیں۔

حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں: عبداللہ بن اَبی ربیعہ اور عمرو بن العاص کے نزدیک اس سے زیادہ ناپسندیدہ بات اور کوئی نہیں تھی کہ نجاشی ان (مسلمانوں) سے براہِ راست گفتگو کرے، ان دونوں کی گفتگو مکمل ہوتے ہی نجاشی کے ارد گرد بیٹھے اس کے تمام سپہ سالار بول

پڑے: بادشاہ سلامت! یہ دونوں سچ کہہ رہے ہیں، ان کی قوم ان کے بارے میں زیادہ جانتی ہے اور ان کی عیب جوئی کے بارے زیادہ واقف ہے، لہٰذا ان کو ان دونوں کے حوالے کر دیجئے اور یہ دونوں ان سب کو ان کے ملک اور اپنی قوم کو واپس کر دیں گے۔

فرماتی ہیں: یہ سن کر نجاشی غضبناک ہوا اور کہا: نہیں اللہ کی قسم! تب تو میں ان کو ہرگز ان کے حوالے نہیں کروں گا اور نہ ہی ایسے لوگوں کے بارے میں میرے ساتھ کوئی سازش کی جاسکتی ہے جنہوں نے میری پناہ لی ہے، میرے ملک میں قیام کیا ہے اور دوسروں کے مقابلہ میں میرا انتخاب کیا ہے، یہاں تک کہ میں ان کو بلا کر ان سے براہِ راست دریافت نہ کر لوں جو کچھ یہ دونوں ان کے بارے میں کہہ رہے ہیں، اگر وہ ایسے ہی ہوں گے جیسا کہ یہ دونوں کہہ رہے ہیں تو میں انہیں ان کے حوالے کر دوں گا اور ان کی قوم کے پاس واپس کر دوں گا اور اگر وہ اس کے برعکس ہوں گے تو پھر میں ان دونوں سے ان کی حفاظت کروں گا اور ان کے پڑوس اور قیام کو اور بہتر کروں گا کیونکہ انہوں نے میرا پڑوس اختیار کیا ہے۔ (مسند أحمد 290/5، حدیث نمبر: 22498)

۲: حضرت جعفرؓ اور نجاشی کے درمیان گفتگو:

نجاشی نے رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کو پیغام بھجوایا اور ان کو بلایا، جب ان کے پاس نجاشی کا قاصد آیا تو وہ سب جمع ہوئے اور ایک دوسرے سے کہنے لگے: اگر تم اس شخص کے پاس جاؤ گے تو اس سے کیا کہو گے؟ سب نے کہا: واللہ! ہم وہی کہیں گے جو ہمارے نبی نے سکھایا ہے اور جس کا ہمیں حکم دیا ہے، اس سلسلہ میں جو کچھ ہونا ہو گا دیکھا جائے گا۔ جب وہ نجاشی کے پاس آئے اور نجاشی نے اپنے پادریوں کو بھی بلایا تھا، انہوں نے اپنے مصاحف یعنی انجیلیں کھول رکھی تھیں، نجاشی نے مسلمانوں سے سوال کیا: یہ کون سا دین ہے جس کی وجہ سے تم نے اپنی قوم کو چھوڑ دیا ہے اور نہ ہی ان لوگوں کے دین میں داخل ہوئے ہو؟!

فرماتی ہیں: نجاشی کے ساتھ ہم میں سے حضرت جعفر بن ابی طالبؓ نے گفتگو کی، انہوں نے بادشاہ سے کہا: اے بادشاہ سلامت! ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے، بتوں کو پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے، بدکاریاں کرتے تھے، قطع رحمی کرتے تھے، ہمسایوں کو ستاتے تھے، طاقتور کمزوروں کو کھا جاتے تھے، ہم اسی حالت میں تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم ہی میں سے ایک رسول بھیجا جس کے خاندان، صدق و دیانت اور عفت و پاکبازی کے بارے میں ہم پہلے سے واقف تھے، اس نے ہم کو اللہ کی طرف بلایا تاکہ ہم اس کی توحید کا اقرار کریں اور اسی کی عبادت کریں اور ہم اور ہمارے باپ دادا جن پتھروں اور بتوں کو پوجتے تھے اس کو ترک دیں، اس نے ہم کو سچ بولنے، امانت ادا کرنے، رشتہ داری کا خیال کرنے، پڑوسی سے اچھا سلوک کرنے، ناجائز و حرام باتوں اور ناحق خون سے پرہیز کرنے کا حکم دیا، بے حیائی کے کاموں، جھوٹ، فریب، یتیم کا مال کھانے، پاکدامن اور پاکباز عورتوں پر الزام لگانے سے منع کیا، اس نے ہم کو حکم دیا کہ ہم صرف ایک اللہ کی عبادت کریں، اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں، اس نے ہمیں نماز کا، زکوۃ کا اور روزہ کا حکم دیا۔ حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں: اس موقع پر انہوں نے اس طرح کے اور ارکانِ اسلام بیان کئے (اس کے بعد فرمایا): ہم نے ان کی تصدیق کی، ان پر ایمان لائے، اور جو طریقہ اور تعلیم وہ اللہ کی طرف سے لائے ہیں اس کی پیروی کی، ہم نے صرف ایک اللہ کی عبادت کی، اس کے ساتھ کسی اور کو شریک نہیں کیا، اور انہوں نے جس چیز کو حرام بیان کیا اس کو حرام مانا، اور جس چیز کو ہمارے لئے حلال قرار دیا اس کو حلال تسلیم کیا۔ اس جرم پر ہماری قوم ہماری دشمنی پر اتر

آئی، انہوں نے ہم کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائیں اور ہم کو دین سے دور کرنے کے لئے مختلف آزمائشوں میں ڈالا اور اس کی کوشش کی کہ اللہ کی عبادت کو چھوڑ کر ہم پھر بتوں کی عبادت کو اختیار کریں، اور جن گناہوں اور جرائم کو پہلے جائز سمجھتے تھے ان کو پھر سے جائز اور حلال سمجھنے لگیں، جب انھوں نے ہمارے ساتھ بہت زور زبردستی کی، ہم پر ظلم کیا، ہمارا جینا دوبھر کر دیا اور ہمارے دین کے راستے میں دیوار بن کر کھڑے ہوگئے، تو ہم آپ کے ملک میں پناہ لینے کے لئے آ گئے، اور اس کے لئے دوسروں کے مقابلہ میں آپ ہی کا انتخاب کیا، آپ کے جوار اور پناہ کے امیدوار بنے، اے بادشاہ سلامت! ہم یہاں اس امید کے ساتھ آئے ہیں کہ ہم پر کوئی ظلم نہ کیا جائے۔

حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں: یہ تقریر سن کر نجاشی نے کہا: تمہارے نبی اللہ کے پاس سے جو کچھ لائے ہیں اس میں سے کوئی چیز تمہارے پاس ہے؟! حضرت جعفرؓ نے کہا: ہاں ہے! نجاشی نے کہا: مجھے پڑھ کر سناؤ، حضرت جعفرؓ نے جب سورۂ مریم (کھیعص) کی ابتدائی آیات تلاوت کیں تو واللہ! نجاشی رو پڑا، یہاں تک کہ اس کے آنسوؤں سے اس کی داڑھی تر ہوگئی، اور اس کے دربار کے پادریوں پر بھی گریہ طاری ہو گیا اور ان کے مذہبی صحیفے بھی آنسوؤں سے بھیگ گئے جب کہ انہوں نے حضرت جعفرؓ کی تلاوت سنی۔ اس کے بعد نجاشی نے کہا: خدا کی قسم! بلاشبہ یہ کلام اور عیسیٰ علیہ السلام کا لایا ہوا کلام دونوں ایک ہی چراغ کے پرتو اور ایک ہی نور کی کرنیں ہیں۔ یہ کہہ کر سفرائے قریش سے کہا: تم دونوں یہاں سے چلے جاؤ، خدا کی قسم! میں ان کو تمہارے حوالہ کرنے والا نہیں ہوں اور نہ ان کے خلاف کوئی سازش کامیاب ہونے دوں گا۔ (مسند أحمد 202/1، 203)

۳: مہاجرین اور نجاشی کے مابین غلط فہمی پیدا کرنے کی ایک اور کوشش:

حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں: جب یہ دونوں عمرو بن عاص اور عبداللہ بن ابی ربیعہ نجاشی کے دربار سے باہر نکلے تو عمرو بن عاص نے کہا: خدا کی قسم! کل ان لوگوں کے بارے میں نجاشی کو ایک ایسی بات بتاؤں گا جس کے ذریعہ ان کا پتہ ہی کاٹ دوں گا۔ فرماتی ہیں: اس سے عبداللہ بن ربیعہ نے کہا اور وہ ان دونوں میں قدرے خیر خواہ تھے: ایسا مت کرو، اس لئے کہ وہ ہمارے اپنے رشتہ دار ہی تو ہیں، اگرچہ انہوں نے ہماری مخالفت کی ہے۔ انہوں نے کہا: میں ضرور یہ نجاشی کو بتاؤں گا کہ یہ لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ عیسیٰ ابن مریم ایک بندے ہیں۔ فرماتی ہیں: اس کے بعد وہ دوسرے روز نجاشی کے دربار میں رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے اور اس سے کہا: بادشاہ سلامت! یہ لوگ عیسیٰ ابن مریم کے بارے میں ایک خطرناک بات کہتے ہیں۔ لہذا ان کو بلائیں اور ان سے پوچھ لیں کہ وہ ان کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ فرماتی ہیں: نجاشی نے مسلمانوں کو بلایا تا کہ عیسیٰ -علیہ السلام- کے بارے میں ان سے دریافت کرلے۔ فرماتی ہیں: اس جیسی مصیبت اور پریشانی ہم پر کبھی نازل نہیں ہوئی، سب مہاجرین جمع ہو گئے اور ایک دوسرے سے کہنے لگے: اگر نجاشی عیسیٰ -علیہ السلام- کے بارے میں سوال کرے تو ان کے بارے میں اس کو کیا جواب دوگے؟! سب نے کہا: خدا کی قسم! ہم ان کے بارے میں وہی کہیں گے جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اور جو کچھ ہمارے نبی نے فرمایا ہے، کچھ بھی ہو ہمیں سچ بولنا چاہیے۔ جب مسلمان اس کے پاس حاضر ہوئے تو نجاشی نے ان سے پوچھا: تم لوگ حضرت عیسی -علیہ السلام- کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ حضرت جعفر بن أبی طالبؓ نے فرمایا: ہم ان کے بارے میں وہی کہتے ہیں جو ہمارے نبی نے ہمیں تعلیم دی ہے، وہ اللہ کے بندے ہیں، اس کے رسول ہیں، اور اس کی روح اور کلمہ ہیں جو اس نے کنواری پاکباز مریم پر القا کیا ہے۔

فرماتی ہیں: نجاشی نے یہ سن کر اپنا ہاتھ زمین پر مارااور ایک تنکا اٹھا کر کہا: جو کچھ آپ نے بیان کیا ہے حضرت عیسیٰؑ اس سے ایک تنکے کے برابر بھی زیادہ نہیں ہیں۔ یہ سن کر اس کے درباری نہایت برہم ہوئے، نتھنوں سے خرخراہٹ کی آواز نکالنے لگے۔ یہ دیکھ کر نجاشی نے کہا: خدا کی قسم! اگرچہ تمہیں کتنا ہی ناگوار ہو! اور مسلمانوں سے کہا: آپ سب جائیں آپ میری سرزمین میں پرامن ہیں، جو تمہیں برا بھلا کہے گا نقصان اٹھائے گا، جو تمہیں گالی دے گا وہ سزا بھگتے گا، مجھے یہ بات پسند نہیں ہے کہ مجھے ایک پہاڑ کے بقدر سونا مل جائے اور میں تم میں سے کسی ایک شخص کو بھی تکلیف پہنچاؤں۔ درباریوں سے کہا: ان دونوں کو ان کے ہدیے اور تحفے واپس کردو، ہمیں ان کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ خدا کی قسم! اللہ نے اس وقت مجھ سے کوئی رشوت نہیں لی جب اللہ تعالیٰ نے مجھے بادشاہت عطا کی، تو کیا میں اللہ کے لئے رشوت لوں گا؟! اور اللہ نے میرے بارے میں لوگوں کی بات نہیں مانی تو کیا میں اللہ کے بارے میں لوگوں کی بات مانوں گا؟! حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں: وہ دونوں اس کے پاس سے ذلیل وخوار ہو کر نکلے، جو تحفے تحائف لے کر آئے تھے وہ سب ان کو واپس کر دیئے گئے، اور ہم نجاشی کے پاس بہترین جائے قیام میں اور بہترین پڑوس میں قیام پذیر رہے۔ (مسند احمد: 1/202-203، 290-292، سیرت ابن ہشام 1/357-362، دلائل النبوۃ، ابونعیم: 194 الدلائل للبیہقی 2/301-304)

۴: نجاشی کا قبولِ اسلام :

نجاشی نے اسلام قبول کر لیا تھا اور نبی کریم ﷺ کی نبوت کی تصدیق بھی کی تھی، اگرچہ اپنی قوم سے اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھا تھا، اس لئے کہ اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ اس کی قوم باطل پر ڈٹی ہوئی ہے، وہ گمراہی کے حریص ہیں اور منحرفانہ عقائد ان کی گھٹی میں پڑے ہوئے ہیں اگرچہ وہ عقل و نقل کے بالکل برخلاف ہی کیوں نہ ہوں۔ (تفصیل کے لئے دیکھیں: صحیح بخاری: 1245، صحیح مسلم، 63-951/65)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نجاشی کی موت کی خبر دی جس دن ان کا انتقال ہوا، آپؐ عید گاہ کی طرف لوگوں کے ساتھ نکلے، لوگوں کی صف بندی کی اور (نمازِ جنازہ) میں چار تکبیریں کہیں۔ (صحیح مسلم: 2204)

حضرت جابرؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ جب نجاشی کا انتقال ہوا تو اس وقت نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "آج ایک نیک اور صالح شخص کی وفات ہوئی ہے، لہذا اٹھو اور اپنے بھائی اصحمہ کی نماز جنازہ ادا کرو"۔ (صحیح بخاری: 3877)

نجاشی۔ رحمہ اللہ۔ کی وفات اکثر محققین کی رائے کے مطابق سن نو (۹) ہجری میں ہوئی تھی، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کہ فتح مکہ سے پہلے سن آٹھ (۸) ہجری میں ہوئی۔ (أسد الغابہ 1/99، الاصابہ، 1/109)

اسباق ودروس اور فوائد

۱) بے شک اہلِ ایمان کی اپنے عقیدہ پر استقامت اور ثابت قدمی جب کہ شرپسندوں اور گمراہ لوگوں نے ان پر قسم قسم کے ظلم وجور کے پہاڑ توڑے، یہ ان کے ایمان میں صدق وسچائی، اپنے عقیدہ میں اخلاص وللہیت اور روح اور ذات کی بلندی کی واضح دلیل ہے۔ اس لئے کہ وہ سمجھتے تھے کہ ان کو جو اطمئنانِ قلبی اور عقل وضمیر کی راحت حاصل ہے اور اللہ کی جس خوشنودی کے وہ امیدوار ہیں وہ سب کچھ اس ظلم وجور،

محرومی اور عذاب کے مقابلہ میں بہتر اور برتر ہے، کیونکہ سچے اہلِ ایمان اور مخلص داعیانِ حق ہمیشہ اپنے جسم کے بجائے اپنی روح کی پکار پر لبیک کہتے ہیں، وہ اپنی روح کے تقاضوں کو پورا کرنے میں پہل کرتے ہیں، راحت و آرام، بھوک و پیاس اور لذت جیسے جسمانی تقاضوں کی کوئی پرواہ نہیں کرتے ہیں، اسی طریقہ سے دعوتیں اور تحریکیں کامیاب ہوتی ہیں اور لوگ بھی تاریکی اور جہالت سے آزادی حاصل کرتے ہیں۔
(السیرۃ النبویہ، مصطفیٰ سباعی، ص 57)

۲) اس عظیم ہجرت کے ذریعہ یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کے تئیں کتنے شفیق و مہربان تھے اور آپ ﷺ کو اس بات کی کتنی فکر تھی کہ ان کے لئے امن و سکون اور راحت والا ماحول تلاش کیا جائے، اسی لئے آپ ﷺ نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ ایک انصاف پرور بادشاہ کے پاس چلے جائیں جس کے ہاں کسی پر ظلم نہیں ہوتا ہے اور پھر رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق انہوں نے عمل کیا اور وہ دین کے بارے میں مطمئن ہو کر اس کے پاس بہترین جائے قیام میں رہنے لگے، چنانچہ یہ آپ ﷺ ہی تھے جنہوں نے حبشہ کی طرف جانے کہ مشورہ دیا، آپ ﷺ ہی نے اپنی جماعت اور دعوت کے لئے ایک پُرامن جگہ کا انتخاب فرمایا، تاکہ اس کو ضائع ہونے اور ختم ہونے سے محفوظ رکھ سکیں، یہ ہر زمانہ کی مسلم قیادت کے لئے نبوی تربیت ہے کہ جماعت و دعوت کے لئے حکمت کے ساتھ منصوبہ بندی کریں اور دور اندیشی سے کام لیں، اور ایسے مرکز کی تلاش میں رہیں جو اس صورت میں دعوت کے لئے احتیاطی دار السلطنت اور مرکز کا کام دے جب کہ بنیادی اور اصلی مرکز کو کوئی خطرہ لاحق ہو یا اس کے ختم ہونے کا احتمال ہو، اس لئے کہ دعوت کے ارکان و رفقاء یہی اصل سرمایہ ہیں، اور یہی وہ لوگ ہیں جن کی حفاظت و حمایت کے لئے ہر قسم کی کوششیں کی جانی چاہیں اور ان کی جان و مال اور امن کے سلسلہ میں کسی طرح کی کوتاہی نہ کی جائے، دینِ حق اور توحید الٰہی سے عاری روئے زمین کے تمام انسانوں کے مقابلہ میں ایک مسلمان کا مقام بہت بڑا ہے۔
(دیکھیں: الھجرۃ فی القرآن الکریم، ص 312، التربیۃ القیادیۃ، العضبان 1/333)

۳) ہجرت حبشہ کے اہداف و مقاصد متعدد اور مختلف النوع تھے۔ اسی لئے نبی کریم ﷺ نے ان اہداف کے حصول کے لئے متنوع صلاحیتوں کے حامل صحابہ کرام کا انتخاب فرمایا، مثلاً ہجرت کے اہداف تھے: عقیدہ اسلام کی وضاحت، اسلام کے بارے میں قریش کے موقف کی وضاحت، مسلمانوں کی صورتحال کے بارے میں رائے عامہ کو ہموار کرنا، جیسے کہ آج کل جدید حکومتیں اپنے مسائل کی وضاحت کے لئے اور رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لئے سیاسی اعتبار سے مختلف ذرائع اختیار کرتی ہیں، اسی طرح دعوت کے لئے ایک نئی جگہ کو حاصل کرنا، یہی وجہ ہے کہ ابتدائی مرحلہ میں جلیل القدر صحابہ کرام نے ہجرت کی اور اس کے بعد دیگر صحابہ کرام بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے اور قیادت کی ذمہ داری حضرت جعفرؓ کے سپرد کی گئی۔ (أضواء علی الھجرۃ، توفیق محمد سبع، ص 427 التربیۃ القیادیۃ 1/333)

۴) بے شک رسول اللہ ﷺ کے چچازاد بھائی حضرت جعفرؓ، آپؐ کے داماد حضرت عثمانؓ، آپؐ کی صاحبزادی حضرت رقیہؓ کی مہاجرین کے ہر اول دستہ میں موجودگی گہرے معانی اور اہم اسباق پر دلالت کرتی ہے، اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے قائد کے مقرب، اہلِ خانہ اور قرابت داروں کو پیش کرنا چاہیے، اور اگر قائد کے خواص خطرات سے دور اور محفوظ ہوں اور ان کا مقابلہ کرنے کے لئے

دوسروں کو جو کوئی خاص مقام بھی نہ رکھتے ہوں، پیش کیا جائے تو یہ نبی کریم ﷺ کے منہج اور طریقہ کار سے میل نہیں کھاتا ہے۔(الروض الأنف، سہیلی 2/92، الہجرۃ فی القرآن، ص 312)

۵) وطن سے نکلنے کی مشروعیت کا بھی اس سے درس ملتا ہے -اگرچہ وطن افضل ترین جگہ مکہ ہی کیوں نہ ہو- بشرطیکہ یہ نکلنا دین کی حفاظت کی غرض سے ہو اور مقامِ ہجرت کا دارالاسلام ہونا بھی ضروری نہیں ہے، اس لئے کہ اہلِ حبشہ نصاریٰ (عیسائی) تھے، وہ مسیح علیہ السلام کی عبادت کرتے تھے اور ان کو اللہ کا بندہ نہیں مانتے تھے، یہ بات حضرت ام سلمہؓ کی حدیث سے بالکل واضح ہو جاتی ہے، اس کے باوجود صحابہ کرام کو مہاجرین کہا گیا اور یہ وہی دو مرتبہ ہجرت کرنے والے صحابہ کرام ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اولیت اور سبقت کی تعریف کی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَٱلسَّٰبِقُونَ ٱلْأَوَّلُونَ﴾ (سورۃ التوبۃ: 100) تفسیر میں ہے کہ: یہ وہی لوگ ہیں جو بیعتِ رضوان میں شریک تھے۔(تفسیر الطبری 11/6، تفسیر ابنِ کثیر 2/331) لہذا غور کریں کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے اس ہجرت کی وجہ سے ان کی تعریف کی ہے، حالانکہ وہ بیت اللہ اور مسجد حرام سے دار الکفر کی طرف نکلے تھے، اور اس امید میں نکلے تھے کہ ان کو رب کی عبادت کرنے کی آزادی مل سکے اور امن واطمئنان کے ساتھ وہ اس کو یاد کر سکیں، یہ حکم ہر اس جگہ کے لئے ہے جہاں منکر کا غلبہ ہو اور اہلِ ایمان کو حق کی وجہ سے ایذاء اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہو، باطل حق پر غالب ہی ہو رہا ہو اور اہلِ ایمان کو امید ہو کہ کسی دوسری جگہ -چاہیے وہ کوئی بھی جگہ ہو- اس کو دینی آزادی نصیب ہو اور رب کی عبادت اعلانیہ طور پر کی جا سکتی ہو، لہذا اس صورتحال میں ایک صاحبِ ایمان کے لئے اپنے وطن سے نکلنا برحق ہے، اور یہی وہ ہجرت ہی جو قیامت تک کبھی منقطع نہیں ہو گی، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلِلَّهِ ٱلْمَشْرِقُ وَٱلْمَغْرِبُ ۚ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا۟ فَثَمَّ وَجْهُ ٱللَّهِ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ وَٰسِعٌ عَلِيمٌ﴾ ترجمہ: "مشرق اور مغرب سب اللہ کے ہیں جس طرف بھی تم رخ کرو گے، اسی طرف اللہ کا رخ ہے اللہ بڑی وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے"۔(سورۃ البقرہ: 115)(دیکھیں: الروض الأنف، سہیلی 2/92، الہجرۃ فی القرآن الکریم، ص 312)

٦) مسلمانوں کے لئے جائز ہے کہ وہ غیر مسلموں کی حمایت وپناہ میں داخل ہوں، جب کہ ضرورت اس کی متقاضی ہو، چاہے پناہ دینے والے اہلِ کتاب میں سے ہوں جیسے کہ نجاشی، اس لئے کہ وہ اس وقت نصرانی تھا اور بعد میں اس نے اسلام قبول کیا، یا پناہ دینے والا مشرک ہو جیسے کہ بہت سے مسلمان مکہ واپس آ کر مشرکین کی حمایت وپناہ میں داخل ہوئے، جیسے کہ رسول اللہ ﷺ کے چچا حضرت ابو طالب، مطعم بن عدی، رسول اللہ ﷺ طائف سے واپس آنے کے بعد ان کی پناہ میں رہے تھے۔(الہجرۃ فی القرآن الکریم: ص 316)

لیکن اس میں ایک بنیادی شرط یہ ہے کہ اس طرح کی حمایت وپناہ کے نتیجہ میں دعوت کو نقصان نہ پہنچتا ہو، یا بعض احکام میں تبدیلی لازم نہ آتی ہو، یا بعض محرمات کے ارتکاب پر سکوت اختیار کرنا لازم نہ آتا ہو، ایسی صورتحال میں اس طرح کے علاقہ میں جانا جائز نہیں ہے، اس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا وہ موقف ہے جب کہ حضرت ابو طالب نے آپ ﷺ کے سامنے یہ بات رکھی کہ اپنے آپ پر رحم کھائیں اور مجھ پر بھی اتنا بوجھ نہ ڈالیں جس کو میں برداشت نہ کر سکتا ہوں، لہذا مشرکین کے معبودوں کے بارے میں کوئی بری بات نہ کہیں، لیکن

اس وقت آپ ﷺ نے اپنے چچا کی پناہ سے نکلنے کا ارادہ کر لیا تھا اور آپؐ نے کسی بھی ایسی چیز سے سکوت اختیار کرنے سے انکار کر دیا جس کا بیان کرنا اور وضاحت کرنا ضروری ہو۔(فقہ السیرۃ، البوطی، ص126، الہجرۃ فی القرآن الکریم، ص317)

۷) ہجرت کرنے کے لئے حبشہ کا انتخاب کرنا ایک اہم حکمتِ عملی کی جانب اشارہ کرتا ہے، جس کی بنیاد اس پر تھی کہ رسول اللہ ﷺ کو آس پاس کے ممالک اور حکومتوں کے بارے میں مکمل معلومات تھیں، آپ ﷺ اچھی، بُری اور عادل و ظالم حکومتوں کو اچھی طرح جانتے تھے، یہی وہ چیز تھی جو صحابہ کرام کی ہجرت کے لئے ایک پُر امن جگہ کے انتخاب میں معاون بنی، دعوت کے قائدین کو اسی طرح حالات و واقعات سے اور آس پاس کی قوموں اور حکومتوں کی صورتحال سے مطلع اور آگاہ رہنا چاہیے۔ (فی السیرۃ النبویۃ قراءۃ لجوانب الحذر والحمایہ، ص: 101)

۸) پہلی ہجرت کے واقعہ میں اور مکہ مکرمہ سے نکلنے کی کیفیت میں غور کرنے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ صحابہ کرام کے اندر احتیاطی و حفاظتی شعور بدرجۂ اتم موجود تھا، چنانچہ وہ خفیہ طریقہ سے مکہ مکرمہ سے کھسکتے ہوئے نکلتے ہیں تاکہ قریش کو اس کا کسی طرح پتہ نہ چل پائے جس سے یہ پورا منصوبہ ناکام ہو سکتا تھا، اسی طرح ابتدائی مرحلہ میں انتہائی محدود پیمانہ پر لوگ ہجرت کرتے ہیں جن کی تعداد سولہ افراد سے زائد نہیں تھی، اتنے لوگوں کا ایک ایک دو دو کر کے نکلنا کسی کے لئے قابل توجہ نہیں ہو سکتا تھا، اسی طرح کم تعداد کا تیزی کے ساتھ نکل جانا بھی ممکن تھا، اور اس وقت کی صورتحال کا یہی تقاضا تھا، اس لئے کہ اس وقت اس قافلہ کو پکڑنے اور اس کے تعاقب کا کسی بھی وقت امکان تھا، شاید یہی وجہ ہے کہ اس ہجرت میں انتہائی رازداری اور احتیاط نے قریش کو اس کے بارے میں لاعلم رکھا، ان کو کافی دیر سے اس کی خبر ہوئی اور وہ فوراً ہی ان کے تعاقب میں نکل پڑے، لیکن ان کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، اس لئے کہ جب وہ بندرگاہ کے پاس پہنچے تو وہاں ان کو کوئی نہیں مل پایا، مسلمان وہاں سے نکل چکے تھے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک مؤمن کے لئے اپنی تمام دعوتی سرگرمیوں میں احتیاط اور حفاظتی تدبیر انتہائی ضروری ہے، اس کی تمام سرگرمیاں اور حرکات دشمن کے سامنے معلوم اور واضح نہ ہوں جس کے ذریعہ تحریک کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔

9) حبشہ کی جانب مسلمانوں کا نکلنا قریش کے لئے قابل قبول نہیں تھا، قریش اس کے ذریعہ خطرہ محسوس کر رہے تھے جس سے مستقبل میں ان کے مفادات کو نقصان پہنچ سکتا تھا، حبشہ میں جا کر مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہو سکتا تھا جو ایک بڑی قوت بن کر ابھر سکتے تھے، اسی لئے مشرکین نے سنجیدگی کے ساتھ اس کا نوٹس لیا اور مہاجرین کو واپس لانے میں مختلف اسباب اختیار کرنا شروع کئے، ان کا مختلف طریقوں سے تعاقب کرنا شروع کیا، نجاشی اور اس کے درباریوں اور سپہ سالاروں کے لئے ہدیئے اور تحائف تیار کر کے شاطرانہ اور منظم منصوبہ بندی کے ذریعہ مسلمانوں کو اس نئی جگہ سے بے دخل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، یہ منصوبہ مکہ مکرمہ میں تیار کیا گیا، طے کیا گیا کہ ہدایا کو کیسے تقسیم کیا جائے، ہدیہ پیش کرتے ہوئے کس طرح کی بات کی جائے، سفارت کاروں کی صفات کیا ہوں، چنانچہ عمرو چالاکی میں معروف تھے اور نجاشی کے دوستوں میں سے تھے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کتنی اہمیت اور ضرورت ہے کہ دشمن کو ہرگز چھوٹا اور کمتر نہ سمجھا جائے، اس کی تیار کردہ منصوبہ بندیوں اور اسکیموں سے غفلت نہ برتی جائے، اس کا حقیقی حجم مدِ منظر نظر رکھا جائے، اس کی ہر قسم کی حرکات اور

سرگرمیوں کا جائزہ لیا جائے، تاکہ اس کی شاطرانہ منصوبہ بندیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے مکمل تیاری کی جاسکے۔ (دیکھیں: التربیۃ القیادیۃ: 1/317)

۱۰) قریش کا تیار کیا ہوا مکمل منصوبہ پورے طور پر عملایا گیا لیکن وہ ناکام ہوگیا، اس لئے کہ جس نجاشی کی پناہ میں مسلمان تھے اس نے مسلمانوں سے براہِ راست بات سننے سے پہلے ان کو سپرد کرنے سے انکار کردیا، اس کے ذریعہ مسلمانوں کو اپنا قضیہ اور اپنا صحیح دین پیش کرنے کا موقع ملا۔

۱۱) صحابہ کرام کے پاس جب نجاشی کا قاصد آیا وہ سب جمع ہوئے اور صورتحال کا جائزہ لیا، مسلمان اسی شورائی نظام کے ذریعہ اپنے معاملات طے کرتے تھے، اور جو بھی عمل مشاورت کے ذریعہ انجام دیا جائے اس میں کامیابی کا زیادہ امکان ہے، اس لئے کہ اس میں بہت سے دماغ شامل ہوتے ہیں، صحابہ کرام کا اس سلسلہ میں آپس میں اختلاف نہ کرنا بتاتا ہے کہ وہ تربیتی اعتبار سے کتنے بلند تھے، وہ سب ایک ہی رائے پر متفق ہوئے، وہ رائے یہ تھی کہ اسلام کو اسی طرح پیش کیا جائے جس شکل میں اس کو رسول اللہ ﷺ لے کر آئے ہیں، اور اس کا انجام پھر جو بھی ہو، انہوں نے عزت واعتماد کے ساتھ اسلام پیش کرنے کا عزم مصمم کیا اگرچہ اس میں ان کو نقصان ہی اٹھانا پڑے۔ (دیکھیں: التاریخ الاسلامی، الحمیدی 2/92)

۱۲) نبوی قیادت کا فہم حالات کے معیار کے عین مطابق تھا، یہی وجہ ہے کہ حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کو ہجرت کے موقع پر مسلمانوں کا امیر مقرر کیا گیا، اور مہاجر مسلمانوں نے بھی بادشاہ کے سامنے نمائندگی کرنے کے لئے انہی کا انتخاب کیا تاکہ وہ عربوں میں چالاک اور ہوشیار (داھیۃ العرب) عمرو بن العاص کا سامنا کرنے پر قادر ہوں، چنانچہ حضرت جعفرؓ کی شخصیت کئی امور میں ممتاز اور نمایاں تھی، جس کی وجہ سے وہ اس عظیم محاذ پر کھڑے ہونے کے قابل بنے۔ چنانچہ حضرت جعفر بن ابی طالبؓ رسول اللہ ﷺ کے قریب ترین لوگوں میں سے تھے، انہوں نے آپؐ کے ساتھ ایک ہی گھر میں زندگی بسر کی، اس لئے وہ قائدِ دعوت اور سید الأمۃ کے بارے میں حبشہ کے مہاجرین میں سب سے زیادہ واقف تھے۔

علاوہ ازیں نجاشی کے سامنے گفتگو کرنے کے لئے فصاحت وبلاغت ضروری ہے اور بنو ہاشم نسب وفضل کے اعتبار قریش میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے اور حضرت جعفر بنو ہاشم میں بھی ایک ممتاز مقام کے حامل تھے، اللہ تعالیٰ نے کنانہ سے ہاشم کا انتخاب کیا اور بنو ہاشم سے اپنے نبی کو منتخب کیا، اس لئے حضرت جعفرؓ زبان وبیان کے اعتبار سے فصیح ترین شخص تھے اور نسب کے اعتبار سے بھی اعلیٰ مقام رکھتے تھے، حضرت جعفرؓ رسول اللہ ﷺ کے چچازاد بھائی تھے، یہ وہ خصوصیت ہے جس کی وجہ سے نجاشی کو زیادہ اطمئنان واعتماد حاصل ہوگا جو کچھ چچازاد بھائی کی طرف سے پیش کیا جائے گا۔ (التربیۃ القیادیۃ 1/335)

جعفرؓ کے اخلاقِ کریمانہ پر مشکاۃ نبوت کا پرتو تھا اور آپؓ کی شکل وشباہت کے جمال پر بنی ہاشم کا عکس تھا، چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت جعفرؓ سے فرمایا: "آپ میری شکل وشباہت اور اخلاق کے زیادہ قریب اور مشابہ ہو"۔ (صحیح بخاری: 2699، سنن ترمذی: 3765)

نجاشی کے سامنے یہ سفیر ہر زمان و مکان کے سفرائے اسلام کے لئے آئیڈیل اور نمونہ ہیں، اسلامی سفراء کی نمایاں صفات سے وہ متصف تھے، اسلام، اسلامی نسبت و پہچان، فصاحت و بیان، علم، حسنِ اخلاق، صبر، شجاعت، حکمت، ہوشیاری اور پر کشش مظہر جیسی صفات کے جامع تھے۔ (دیکھیں: سفراء النبی ﷺ، محمد شیت خطاب 2/252- 317)

۱۳) حضرت عمرو بن العاصؓ اس مرحلہ میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لئے عداوت رکھتے تھے، وہ ذہانت، چالاکی، ہوشیاری اور تدبیر میں ضرب المثل تھے، نجاشی کے پاس حضرت جعفرؓ کے داخل ہونے اور گفتگو کرنے سے پہلے ہی انہوں نے ہر طرح کے دلائل تیار کر رکھے تھے اور نجاشی کے سامنے ان کو ان نقاط کی شکل میں پیش کر دیا تھا:

انہوں نے حضرت محمد ﷺ کی دعوت کے نتیجہ میں پیدا شدہ مکہ کے غیر یقینی اور خراب حالات اور آپسی بگاڑ و انتشار کے بارے میں گفتگو کر لی تھی، اور یہ کوئی عام انسان نہیں بلکہ نجاشی کے سامنے اہلِ مکہ کے سفیر اور نمائندہ تھے، اس لئے ان کی بات تسلیم کی جائے گی، اس میں شک و شبہ کا کوئی امکان نہیں ہے اور نجاشی کے نزدیک وہ پہلے سے ہی قابلِ اعتماد شخصیت کے حامل تھے۔

اسی طرح انہوں نے حضرت محمد ﷺ کے متبعین اور پیروکاروں کے خطرہ کے بارے میں بھی بات کی، اور واضح کیا کہ ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں نے جس طرح مکہ کے حالات اور ماحول کو خراب کیا ہے وہ نجاشی کی سلطنت و حکومت کے لئے بھی خطرہ بن سکتے ہیں، انہوں نے یہ بھی واضح کیا کہ اگر قریش کے لوگ نجاشی سے محبت نہ کرتے اور اس کے ساتھ ان کی دوستی و تعلقات نہ ہوتے تو اس کی خیر خواہی اور نصیحت کے لئے وہ اس قدر مشقت برداشت نہ کرتے، جیسے کی اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا: آپ ہمارے لئے قابلِ اعتماد اور خیر خواہ شخصیت ہیں، آپ ہمارے خاندان اور قبیلہ کے ساتھ حسنِ سلوک کرتے ہیں، اور ہمارے تاجر آپ کے یہاں اپنے آپ کو مامون و پر امن سمجھتے ہیں، لہٰذا حسنِ سلوک کا کم از کم یہی درجہ ہے کہ اسی طرح کا حسنِ سلوک کیا جائے اور اس خطرناک فتنہ سے آگاہ کیا جائے۔

انہوں نے یہ بھی بتایا کہ مسلمانوں میں جو خطرناک ترین چیز ہے وہ نجاشی کے عقیدہ کے خلاف بغاوت اور اس کا انکار ہے، چنانچہ وہ یہ نہیں مانتے ہیں کہ عیسیٰ ابن مریم الہ و معبود ہیں، لہٰذا وہ نہ تو اپنی قوم کے دین پر ہیں اور نہ ہی آپ کے دین کو تسلیم کرتے ہیں، وہ ایک نیا ہی دین ایجاد کر کے لائے ہیں اور وہ فتنہ پرور لوگ ہیں۔

بادشاہ کو حقیر و کمتر سمجھنے کی دلیل یہ پیش کی کہ بادشاہ کے سامنے سب لوگ سجدہ کرتے ہیں لیکن یہ مسلمان ایسا نہیں کرتے ہیں، لہٰذا ان کو آپ کے یہاں پناہ ملنے کا کیا جواز بنتا ہے؟! اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے دلوں میں بادشاہ کا کوئی احترام نہیں ہے بلکہ وہ بادشاہ کی بادشاہت ہی کو حقیر سمجھتے ہیں، اسی لئے وہ سجدہ بھی نہیں کرتے ہیں!۔

یہ وہ تمام الزامات تھے جو سفیرِ قریش نے مہاجرین حبشہ پر عائد کئے تھے اور تمام الزامات کی تردید اور ان کا جواب دینا حضرت جعفرؓ کی ذمہ داری تھی۔ (التربیۃ القیادیۃ: 1/319، 340)

۱۴) نجاشی کے سوالات کا جواب حضرت جعفرؓ کی طرف سے ان کی ذہانت اور سیاسی، ابلاغی، دعوتی اور عقائدی مہارت پر مبنی تھا، چنانچہ حضرت جعفرؓ نے مندرجہ ذیل نکات کے ذریعہ جواب دیا:

جاہلیت کے تمام عیوب ونقائص شمار کئے اور اس اسلوب کے ساتھ ان کی منظر کشی کی جس کے ذریعہ ایک سامع اس کے بارے میں متنفر ہو جائے، اس کے ذریعہ ان کا مقصد یہ تھا کہ بادشاہ کی نگاہ میں قریش کی شبیہ کو خراب کیا جائے اور حضرت جعفرؓ نے ان مذموم صفات کو بیان کرنے پر توجہ مرکوز کی جن کو صرف نبوت کے ذریعہ ختم کیا جا سکتا ہے۔

اس بگڑے ہوئے اور برائیوں اور رذائل سے بھرے ہوئے معاشرہ میں رسول اللہ ﷺ کی پاکیزہ شخصیت کو پیش کیا اور بیان کیا کہ آپ ﷺ ان تمام برائیوں سے کیسے دور رہے اور آپؐ حسب و نسب، سچائی، امانتداری، عفت و پاکدامنی میں معروف ہیں، لہذا وہ رسالت و نبوت کے اہل ہیں۔

حضرت جعفرؓ نے اسلام کے ان محاسن و اخلاق کو نمایاں طور پر بیان کیا جو تمام انبیاء کی بنیادی دعوت کے عین مطابق ہیں، جیسے کہ بت پرستی سے اجتناب، صدقِ حدیث، امانتداری، صلہ رحمی، پڑوسی کے ساتھ حسنِ سلوک، حرام کاموں اور خونریزی سے اجتناب، نماز قائم کرنا اور زکوۃ ادا کرنا، چونکہ نجاشی اور اس کے پادری اور درباری نصرانیت پر عمل پیرا تھے اس لئے وہ یہ سمجھتے تھے کہ حضرت موسی ــــــ علیہ السلام- اور حضرت عیسیٰ-علیہ السلام- اور تمام انبیا کا اصل پیغام یہی ہے۔

مسلمانوں کے ساتھ قریش کی بدسلوکی کو بیان کرکے قریش کو رسوا کیا اور بدسلوکی کی وجہ بھی بیان کردی کہ انہوں نے بت پرستی کا انکار کیا اور محمد ﷺ پر نازل شدہ آیات پر ایمان لایا اور آپؐ کے اخلاق و اطوار سے آراستہ ہوئے، اس لئے ان کے ساتھ ایسا کیا گیا۔

نجاشی کی ایسی تعریف و توصیف کی جس کا وہ اہل تھا کہ اس کے پاس کسی پر ظلم نہیں کیا جاتا ہے اور وہ اپنی رعایہ کے ساتھ عدل وانصاف کرتا ہے۔

یہ بھی واضح کردیا کہ مسلمانوں نے نجاشی کو تمام لوگوں کو چھوڑ کر ایک پناہ گاہ کے طور پر منتخب کیا ہے اور ان کو پریشان کرنے والوں کے ظلم سے نجات پانے کے لئے اس کی پناہ میں آئے ہیں۔

اس طرح کے واضح اور مدلل نکات کے ذریعہ حضرت جعفرؓ نے عمرو کی فصاحت و بلاغت کو زمین بوس کردیا اور نجاشی کے قلب ودماغ کو متاثر کیا، اسی طرح سپہ سالاروں اور موجود پادریوں کے قلب ودماغ میں بھی اپنی جگہ بنالی۔

اور جب نجاشی نے حضرت محمد ﷺ پر نازل شدہ وحی میں سے کسی حصہ کو پیش کرنے کا مطالبہ کیا تو حضرت جعفرؓ نے سورۂ مریم کی ابتدائی آیات انتہائی خوبصورتی اور متاثر کن اسلوب کے ساتھ پیش کیں، یہاں تک کہ نجاشی اور اس کے تمام درباری رو پڑے، ان کی داڑھیاں اور مصاحف آنسوؤں سے تر ہو گئے، حضرت جعفرؓ کا سورۂ مریم کا انتخاب کرنا مہاجرین کے نمائندہ کی حکمت وذہانت کو واضح طور پر ظاہر کرتا ہے، اس لئے کہ سورۂ مریم میں حضرت مریم اور عیسیٰؑ کا ذکر کیا گیا۔ (دیکھیں: فی السیرۃ النبویۃ قراءۃ لجوانب الحذر والحمایۃ، ص106)

بلاشبہ حضرت جعفرؓ نے جس طرح بہترین موضوع، مناسب وقت، کھلے دل اور جذبات سے لبریز معانی کا انتخاب کیا اس سے ان کی عبقریت واضح ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ ان ہی کا ہو کر رہ گیا۔ (دیکھیں: التربیۃ القیادیۃ 1/337)

حضرت عیسی علیہ السلام کے بارے میں ان کا جواب انتہائی حکیمانہ اور بے مثال ذہانت پر مبنی تھا، انہوں نے واضح کر دیا کہ وہ حضرت عیسیٰ بن مریم کو الٰہ کا درجہ نہیں دیتے ہیں، اور اسی طرح حضرت مریم علیہا السلام کی عفت و پاکدامنی پر ایمان رکھتے ہیں اور دیگر افتراء اندازوں کی طرح ان پر کسی طرح کی تہمت لگانے سے گریز کرتے ہیں، بلکہ عیسی ابن مریم کلمۃ اللہ اور اس کی روح ہیں جس کو اس نے کنواری پاکباز مریم پر القا کیا ہے اور نجاشی کے پاس ایک تنکے کے برابر بھی اس کے علاوہ اور کوئی تصور نہیں تھا۔

وہ نجاشی کو سجدہ نہیں کرتے ہیں، وہ اللہ کے ساتھ کسی کو ہمسر نہیں سمجھتے ہیں اور سجدہ صرف اللہ کو زیب دیتا ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ بادشاہ کو حقیر بھی نہیں سمجھتے ہیں، بلکہ اس کی عزت و توقیر کرتے ہیں اور اس کو اسی انداز سے سلام کرتے ہیں جیسے اپنے نبی کو سلام کرتے ہیں اور اس کے سامنے ویسے آداب بجالاتے ہیں جیسے اہلِ جنت جنت میں آداب بجالائیں گے۔

بالآخر نتیجہ یہ نکلا کہ نجاشی نے مسلمانوں کی سچائی کا اعلان کر دیا اور اس کو یقین ہو گیا کہ یہ اہلِ ایمان اور صدیقین ہیں، اس نے یہ عزم کر لیا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے لئے ایک خادم کی حیثیت سے کام کرے گا جن کے پاس اسی طرح کا فرشتہ حق لے کر آتا ہے جیسے کہ موسی علیہ السلام کے پاس آتا تھا، اور وہ صحابہ کرام کی حمایت و نصرت کو تقرب الی اللہ کا ذریعہ سمجھے گا، اس نے عمرو کے سامنے یہ واضح کر دیا کہ قریش کی تجارت، ان کے مال و دولت اور جاہ و عزت کی اس کو کوئی پرواہ نہیں ہے، اگرچہ قریش اس کے ساتھ تمام تعلقات و روابط منقطع ہی کیوں نہ کرلے۔(التاریخ الاسلامی، الحمیدی 2/105)

۱۵) قریش کو اس محاذ پر سیاسی اعتبار سے، معنوی و نفسیاتی اعتبار سے اور ابلاغی سطح پر مسلمانوں کی طرف سے کامیاب مقابلہ میں اور ان کی مستحکم و مضبوط منصوبہ بندی اور حکمتِ عملی کے سامنے شکستِ فاش کا سامنا کرنا پڑا۔

۱۶) حضرت جعفرؓ اور ان کے ساتھیوں کا موقف رسول ﷺ کے اس فرمان کی عملی مثال تھا کہ "جس نے لوگوں کو ناراض کر کے اللہ کی رضا چاہی اللہ تعالیٰ لوگوں کی طرف سے اس کے لئے کافی ہو جاتا ہے اور جس نے اللہ کو ناراض کر کے لوگوں کو راضی کرنا چاہا اللہ تعالیٰ اس کو لوگوں کے حوالے کرتا ہے"۔(سنن ترمذی: 2414، ابن حبان: 276، کتاب الزہد لابن المبارک: 66) ان صحابہ کرام نے اللہ کی رضا چاہی حالانکہ بظاہر ایسا لگتا تھا کہ اس کے ذریعہ نصاری ناراض ہو جائیں گے جن کی حکومت میں قیام پزیر تھے، لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ نے شاہِ حبشہ کو ان کے لئے مسخر کر دیا، یہاں تک کہ اس نے حق کا اعلان کر دیا جو نبی کی دعوت کے عین مطابق تھا، اگرچہ مسلمان ان کے منحرفانہ عقیدہ کے برخلاف عقیدہ رکھتے تھے اور اسی منحرفانہ عقیدہ پر ان کے ملک کی بنیاد تھی۔

۱۷) بعض نصاری اپنے دین کے بارے میں صحیح عقیدہ رکھتے تھے لیکن وہ اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھتے تھے، اس لئے کہ سیادت و قیادت تحریف شدہ دین کے ماننے والوں کو حاصل تھی، جو لوگ صحیح العقیدہ تھے ان میں شاہِ حبشہ بھی تھا جو اپنی قوم کی مدارات میں اور اپنی ذات و بادشاہت کو بچانے کے لئے اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھے ہوئے تھا، لیکن جب وہ اس آزمائشی مرحلہ میں پھنس گیا تو اس نے اپنے ایمان کا اظہار کر دیا، تاکہ اپنے رب کو راضی کرے، اپنے ضمیر کو اطمئنان فراہم کرے، اور مؤمن گروہ کی نصرت و تائید کرے، چاہے اس کے نتائج کچھ بھی ہوں، اسی موقف کی وجہ سے وہ عظیم شخصیات میں شامل ہو گیا۔

۱۸) ہجرتِ حبشہ کے اسباق میں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی خاص وجہ سے احکام اسلام سے ناواقفیت سے کوئی فرق نہیں پڑے گا، علامہ ابن تیمیہؒ جہالت و ناواقفیت کے عذر کو ثابت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "اور جب مقیم کی نماز میں اضافہ کیا گیا جب کہ نبی کریم ﷺ نے مدینہ منورہ کی جانب ہجرت کی تو جو لوگ آپ سے دور تھے جیسے کہ کچھ لوگ مکہ میں تھے اور کچھ سرزمینِ حبشہ میں تھے، وہ دو رکعت ہی فرض نماز ادا کرتے تھے، اور نبی کریم ﷺ نے ان کو نماز لوٹانے کا حکم نہیں دیا"۔ (فتاویٰ ابنِ تیمیہ 22/43)

امام ذہبیؒ فرماتے ہیں گنہگار کوئی شخص اس وقت ہو گا جب کہ اس کو معلوم ہو اور دلیل و حجت قائم ہو چکی ہو، صحابہ کرام حبشہ میں ہوتے تھے اور نبی کریم ﷺ پر کسی چیز کے وجوب یا حرمت کا حکم نازل ہوتا تھا تو ان کو ایک ماہ کے بعد اس کا علم ہوتا تھا، لہذا وہ ان امور میں لاعلمی اور ناواقفیت کی وجہ سے معذور تھے، یہاں تک کہ ان کو دلیل معلوم ہو جاتی۔(الکبائر، ص،12)

۱۹) ہجرتِ حبشہ سے حاصل ہونے والے دروس میں سے ایک درس یہ ہے کہ ضرورت و حاجت کے اعتبار سے جہاد کا درجہ کم زیادہ ہوتا رہتا ہے، لہذا اگر مدینہ کی جانب ہجرت ایک عظیم جہاد ہے جس کی وجہ سے صحابہ کرام کو ممتاز مقام عطا کیا گیا اور ان کو خاص طور پر ذکر کیا گیا اور ان کو فضیلت عطا کی گئی تو یہ فضیلت حبشہ کی جانب ہجرت کرنے والوں کو بھی حاصل ہے، اگرچہ فتح خیبر تک وہ نبی کریم ﷺ کے پاس مدینہ منورہ نہ جا پائے، اس لئے کہ حبشہ میں ان کا باقی رہنا ضروری تھا، اسی بات کو نبی کریم ﷺ نے أصحاب السفينتين (دو کشتیوں میں ہجرتِ حبشہ کرنے والوں) سے بیان فرمایا ہے، حضرت ابو موسی اشعریؓ سے روایت ہے، فرماتے ہیں: حضرت اسماء بنت عمیسؓ - یہ ہمارے ساتھ ہجرتِ حبشہ میں شامل تھیں- نبی کریم ﷺ کی زوجہ مطہرہ حضرت حفصہؓ سے ملاقات کے لئے حاضر ہوئیں، انہوں نے دوسرے ہجرت کرنے والوں کے ساتھ نجاشی کی جانب ہجرت کی تھی، اسی اثناء میں حضرت عمرؓ حضرت حفصہؓ کے پاس داخل ہوئے جب کہ حضرت أسماء ان کے پاس موجود تھیں، حضرت عمرؓ نے جب حضرت اسماء کو دیکھا تو پوچھا یہ کون ہیں؟ حضرت حفصہؓ نے کہا: یہ اسماء بنت عمیس ہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: حبشیہ ہیں یہ؟ بحری سفر کرنے والی ہیں یہ؟ حضرت أسماء نے جواب دیا: جی ہاں۔ حضرت عمرؓ نے کہا: ہم نے ہجرت کرنے میں آپ سے سبقت کی ہے۔ لہذا ہم رسول اللہ ﷺ پر آپ کے مقابلہ میں زیادہ حق رکھتے ہیں۔ یہ سن کر حضرت أسماء ناراض ہوئیں اور کہا: اللہ کی قسم! ہر گز نہیں، آپ لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے، وہ تم میں سے بھوکے کو کھانا کھلاتے اور ناواقف کو نصیحت کرتے تھے، اور ہم ایک دور دراز اجنبی اور غیروں کے ملک حبشہ میں تھے۔ اور یہ صرف اللہ کے لئے اور اس کے رسولؐ کے لئے تھا۔ قسم اللہ کی! میں نہ کچھ کھاؤں گی اور نہ پانی پیوں گی جب تک آپ کی بات کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے نہ کروں، ہم کو تو حبشہ میں ایذاء ہوتی تھی اور خوف و ڈر کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے، میں اس کا ذکر نبی کریم ﷺ سے کروں گی اور آپ سے دریافت کروں گی۔ اللہ کی قسم! میں نہ جھوٹ بولوں گی، نہ ہی ادھر اُدھر کی باتیں کروں گی اور نہ ہی اس میں کوئی اضافہ کروں گی۔ جب نبی کریم ﷺ تشریف لائے تو انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! عمر نے ایسا ایسا کہا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تو آپ نے انہیں کیا جواب دیا؟ انہوں نے کہا: میں نے ان سے ایسے کہا۔ آپؐ نے فرمایا: وہ تمہارے مقابلہ میں مجھ پر زیادہ حق نہیں رکھتے ہیں، ان کی اور ان کے ساتھیوں کی ایک ہجرت ہے اور تم سب کشتی والوں کی دو ہجرتیں ہیں۔ حضرت أسماء فرماتی ہیں: میں نے حضرت ابو موسیؓ اور کشتی والوں کو دیکھا کہ وہ میرے پاس گروہ در گروہ آتے اور مجھ سے اس

حدیث کے بارے میں دریافت کرتے، دنیا کی کسی بھی چیز کے ملنے کی ان کو اتنی خوشی نہ ہوتی تھی جتنی کے رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان سے ہوتی تھی۔(صحیح بخاری: 4230، صحیح مسلم:2502،2503)

۲۰) حضرت عمرو بن عاص ؓ کے اسلام سے متاثر ہونے کا آغاز سرزمینِ حبشہ سے ہوا، بلاشبہ یہ ہجرتِ حبشہ کے اثرات میں سے ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مہاجرین نے حبشہ میں قیام کے دوران دعوتی اعتبار سے کیا کیا مقاصد حاصل کئے تھے، اگرچہ بہت سی روایات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ حضرت عمرو بن عاص ؓ کے اسلام کا آغاز نجاشی کے ذریعہ ہوا، اور علامہ ابن حجر ؒ کے بقول یہی زیادہ مشہور ہے اور یہ ایک ایسا نکتہ ہے جس کی کوئی دوسری مثال موجود نہیں ہے کہ ایک صحابی تابعی کے ہاتھ پر اسلام قبول کرتا ہے، جیسے کہ علامہ زرقانی ؒ کا قول ہے، بعض دلائل اس کے بھی موجود ہیں کہ حضرت عمرو ؓ نے حضرت جعفر ؓ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ (الہجرۃ الاولی في الاسلام، ص 167، شرح المواھب، 1/271)

۲۱) حضرت اُم حبیبہ ؓ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے نکاح کرنے کا ہجرتِ حبشہ کے ساتھ گہرا تعلق ہے اور نبی کریم ﷺ کا ثابت قدم رہنے والی مہاجرہ خاتون سے نکاح کرنا، اپنے اندر گہرے معانی اور پیغام رکھتا ہے۔ حضرت ام حبیبہ ؓ کے ساتھ عقدِ نکاح اس وقت ہوا جب کہ وہ سرزمینِ حبشہ میں تھیں، کتبِ حدیث اور کتبِ سیرت میں اس کی تفصیلات موجود ہیں، امام ابوداؤد نے اپنی سنن میں صحیح سند کے ساتھ حضرت امِ حبیبہ ؓ سے روایت کیا ہے کہ وہ حضرت عبداللہ بن جحش ؓ کی زوجیت میں تھیں اور ان کا انتقال سرزمینِ حبشہ میں ہوا۔ پھر ان کا نکاح نجاشی نے نبی کریم ﷺ سے کیا اور آپ ﷺ کی طرف سے ان کو چار ہزار مہر ادا کیا گیا اور پھر حضرت شرجیل بن حسنہ ؓ کے ساتھ اُنہیں رسول ﷺ کے پاس بھیجا۔(سنن ابوداؤد: 2107)

اس اہم واقعہ سے ایک محقق یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ مسلسل مہاجرین کے حالات کے بارے میں باخبر رہتے تھے، ان کی آزمائش وتکلیف اور دکھ درد میں ان کے ساتھ شریک رہتے تھے، صبر کرنے والوں کی دلجوئی فرماتے اور ثابت قدمی اختیار کرنے والوں کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے، مہاجر خواتین کے حالات معلوم کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ام حبیبہ ؓ تنہا ایسی خاتون نہیں ہیں جن کے سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ نے خصوصی توجہ دی اور ان کے غم میں ان کی غمخواری کی، بلکہ آپ ﷺ نے ان سے پہلے حضرت سودہ ؓ کے ساتھ بھی ایسا ہی حسنِ سلوک کیا، چنانچہ حضرت سودہ ؓ جب اپنے شوہر کے ساتھ حبشہ سے مکہ مکرمہ واپس آئیں تو ان کے شوہر سکران بن عمرو کی وفات ہوگئی، جب ان کی عدت مکمل ہوگئی تو رسول اللہ ﷺ نے ان کو پیغام نکاح بھیجا تو انہوں نے جواب دیا: اللہ کے رسول ؐ! میرا معاملہ آپ کے سپرد ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اپنی قوم کے کسی شخص کو منتخب کیجئے وہ آپ کے نکاح کرانے کی ذمہ داری سنبھالے گا۔ چنانچہ انہوں نے حضرت حاطب بن عمرو بن عبد شمس بن عبد ود کو حکم دیا تو انہوں نے آپ کا نکاح کروایا، وہ پہلی خاتون تھیں جن کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے حضرت خدیجہ ؓ کے بعد نکاح فرمایا۔ (دیکھیں: الہجرۃ الأولی فی الاسلام ، ص 188 الطبقات 8/3)

یہ دونوں واقعات رسول اللہ ﷺ کی تعددِ ازدواج کی بعض حکمتوں پر دلالت کرتے ہیں، اسی طرح ان دونوں واقعات کے ذریعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ بطورِ خاص مجاہد خواتین پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی، اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ حضرت ام حبیبہؓ کے ساتھ نکاح کرنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ بنو امیہ کی عداوت و دشمنی میں عمومی طور پر اور ان کے لیڈر اور حضرت ام حبیبہؓ کے والد ابو سفیان کی عداوت و دشمنی میں بطور خاص تخفیف کی جائے۔

لہذا اسلام سے قریب کرنے کے لئے تالیف کا حکم سیرتِ نبوی میں وارد او رثابت ہے اور رسول اللہ ﷺ ہر اس وسیلہ کے ذریعہ اپنی قوم کو اسلام کے قریب لانا چاہتے تھے جو اسلام کے بنیادی اصولوں کے منافی نہ ہو۔ (السیرۃ النبویۃ فی ضوء المصادر الأصلیۃ، د۔ مہدی رزق اللہ، ص: 706-707)

۲۲) بعض محققین کا خیال ہے کہ نبی کریم ﷺ حبشہ کی جانب کئی اسباب کی وجہ سے ہجرت نہیں کرنا چاہتے تھے جن میں سے چند اسباب مندرجہ ذیل ہیں:

- روایات سے یہ پتہ چلتا ہے - جیسے کہ آگے اس کی تفصیل آئے گی - کہ نبی کریم ﷺ کو دار الہجرت دکھایا گیا تھا وہ دو حروں کے درمیان کھجور کے باغ والی سرزمین تھی، آپ ﷺ اس کو 'ھجر' یعنی أحساء کا علاقہ سمجھ رہے تھے۔

- حبشہ کی جغرافیائی صورتحال ایسی تھی جس کی وجہ سے دعوت کے پھیلاؤ میں رکاوٹ پیدا ہوتی۔

- جزیرۃالعرب، مکہ اور پھر مدینہ منورہ کا نزولِ وحی اور مرکزِ دین بننے کا انتخاب کوئی اتفاقی معاملہ نہیں تھا بلکہ یہ انتخاب بہت سی خصوصیات کی وجہ سے تھا۔

-حبشہ کا ماحول ایک پناہ گزین دین کو اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ مسیحیت کے بغل میں پروان چڑھے اور دنیا میں مسیحیت پر کنٹرول کرنے والے رومی حبشہ کو اس کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ (دیکھیں: الغرباء الأولون ، ص 169-170، أضواء علی الھجرۃ، ص 156-161، الھجرۃ فی القرآن الکریم، ص 320)

۲۳) ہجرتِ حبشہ کا ایک اہم اثر یہ ظاہر ہوا کہ اس کے ذریعہ تمام عربوں کے نزدیک اہلِ قریش کا مقام ومرتبہ گر گیا اور دعوتِ دین اور حاملینِ دعوت کے بارے میں ان کا موقف طشت از بام ہوگیا، اس لئے کہ عرب معاشرہ میں اجنبی کو پناہ دینا اور پڑوسی کا اکرام کرنا باعثِ فخر سمجھا جاتا تھا اور اس میں ایک دوسرے سے سبقت لینے کوشیش کی جاتی تھی، اور اس کے برعکس طرزِ عمل کو باعثِ ننگ و عار سمجھا جاتا تھا، لیکن اب اس سلسلہ میں اہلِ حبشہ قریش سے سبقت لے جا رہے تھے اور ان کو پناہ دے رہے تھے جن کو اہلِ مکہ اور قریش نے بے گھر کر کے دھتکار دیا تھا اور ان کے ساتھ بدسلوکی کی تھی، حالانکہ یہ سب شریف، کمزور اور غریب الوطن لوگ تھے۔ (دیکھیں: الغرباء الأولون ص 170-171)

....

تیسرا باب
عام الحزن اور طائف کی آزمائش
1) عام الحزن

ا۔ حضرت ابو طالب کی وفات:

شعبِ ابی طالب سے باہر نکلنے کے بعد حضرت ابو طالب کی وفات ہوگئی اور یہ نبوت کے دسویں سال کا واقعہ ہے، حضرت ابوطالب نبی کریم ﷺ کی حمایت و حفاظت کرتے تھے اور آپ کے لئے ناراض ہوتے تھے۔ (فتح الباری: حدیث نمبر: 3883، صحیح بخاری: 3883، صحیح مسلم: 209) قریش کے لوگ ان کا احترام کرتے تھے اور جب ان کی وفات کا وقت قریب آ گیا تو ان کے پاس زعمائے شرک آئے اور ان کو اپنے دین پر جمے رہنے اور اسلام قبول نہ کرنے کی تلقین کرتے رہے اور یہ کہتے رہے کہ کیا عبدالمطلب کی ملت اور ان کےدین سے پھر جائیں گے؟ اللہ کے رسول ﷺ نے اس کے سامنے اسلام پیش کیا اور کہا: کہ "لا الہ الا اللہ" کہہ لیجئے میں اس کی وجہ سے بروزِ قیامت آپ کے لئے گواہی دوں گا۔ ابو طالب نے کہا: اگر قریش کے لوگ مجھے عار نہ دلاتے ، وہ کہیں گے کہ میں ڈر کی وجہ سے ایسا کر رہا ہوں، ورنہ میں کلمہ پڑھ کر ضرور آپ کے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک بن جاتا، اس پر اللہ تعالی نے یہ آیات نازل کی : ﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ ٱللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَآءُ ۚ وَهُوَ أَعْلَمُ بِٱلْمُهْتَدِينَ﴾ ترجمہ: ”اے نبیؐ، تم جسے چاہو اسے ہدایت نہیں دے سکتے، مگر اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے، اور وہ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو ہدایت قبول کرنے والے ہیں“۔(سورۃ القصص.: 56) (صحیح مسلم:25 سنن ترمذی:3188 مسند أحمد: 2/434)

جاہلیت کے افکار ابو طالب کی عقل میں راسخ تھےاور وہ ان کو بدل نہ سکے، وہ عمر دراز بزرگ تھے، ان کے لئے اپنی فکر و سوچ کو اور آباء واجداد سے ملی ہوئی چیزوں کو بدلنا مشکل تھا، ان کے دوست و ہم نشین بھی ان کی موت کے وقت موجود تھے، انہوں نے ان کے اسلام کی خبر کے عام ہونے اور قوم پر اس کے اثرات مرتب ہونے کا خوف دلایا۔ (السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ، العمری 1/184)۔

۲۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی وفات:

جہاں تک تعلق ہے ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا۔ کا تو ان کی وفات ہجرتِ مدینہ سے تین برس قبل اسی سال ہوئی جس سال حضرت ابو طالب کی وفات ہوئی۔ (السیرۃ النبویہ الصحیحۃ، العمری 1/185)

حضرت ابو طالب کی وفات اور اس کے فوراً بعد حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی وفات کے ذریعہ رسول ﷺ کا دکھ اور غم دو چند ہو گیا۔ اس لئے کہ آپ ایسی دو محبوب شخصیات سے محروم ہو گئے جو دعوت کے سخت جان قافلہ میں اہم ستون کی حیثیت رکھتے تھے، حضرت ابوطالب خارجی سہارا تھے جو قوم کو آپ ﷺ سے دور رکھتے تھے، اور حضرت خدیجہؓ داخلی سہارا تھیں جو آپؐ کی آزمائشوں اور

دکھ درد کو ہلکا کرتی تھیں، لیکن اب کفارِ قریش رسول اللہ ﷺ پر جری ہوگئے اور آپ ؐ کو ایسی ایذائیں پہنچائیں جن کے بارے میں وہ حضرت ابو طالب کی زندگی میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے، اب رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں انتہائی مشکل ترین مرحلہ شروع ہوگیا جس میں آپ ؐ کو بہت سی مشکلات و مصائب، آزمائشوں اور فتنوں کا سامنا کرنا پڑا، جبکہ آپ ﷺ میدان میں تنہا رہ گئے، اور اللہ کے سوا کوئی اور آپ کا حامی اور مددگار نہیں تھا، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ اپنے رب کے پیغام کو تمام لوگوں تک پہنچاتے رہے اور اتنی مخالفت اور ایذاء برداشت کی جس سے کتبِ سیرت بھری ہوئی ہیں، آپ نے اتنے مصائب برداشت کئے جن کو اٹھانے سے پہاڑ بھی قاصر ہیں، جب اللہ کے رسول ﷺ پر اپنے ہی وطن میں اور اپنے ہی لوگوں کے درمیان ابتلاء و آزمائشوں کی بوچھاڑ ہو گئی تو آپ ﷺ نے کسی اور جگہ اور اپنی قوم سے دور منتقل ہونے کا ارادہ کیا، تاکہ وہاں جا کر اپنی دعوت پیش کرسکیں اور وہاں سے نصرت و حمایت حاصل ہو سکے، اس امید میں کہ شاید کہ وہ اللہ کی طرف سے آئے ہوئے پیغامِ حق کو قبول کر لیں، اس لئے آپ ﷺ طائف کی طرف نکلے اور یہ مکہ کے قریب ترین شہر تھا۔ (محنۃ المسلمین فی العہد المکی، ص 45-36-34)

۲: طائف کا سفر:

نبی کریم ﷺ ان انبیاء اور مرسلین کے نقشِ قدم پر چل رہے تھے جو دعوت الی اللہ کی راہ میں آپ سے پہلے گزر چکے تھے۔ چناچہ نوح -علیہ السلام- اپنی قوم میں داعی کی حیثیت سے ساڑھے نوسو برس تک موجود رہے اور یہ طویل عرصہ ایک عملِ پیہم اور تکبیرِ مسلسل کی حیثیت سے گزرا، ارشاد باری تعالیٰ: ﴿إِنَّآ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِۦٓ أَنْ أَنذِرْ قَوْمَكَ مِن قَبْلِ أَن يَأْتِيَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝١ قَالَ يَٰقَوْمِ إِنِّى لَكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ ۝٢ أَنِ ٱعْبُدُوا۟ ٱللَّهَ وَٱتَّقُوهُ وَأَطِيعُونِ ۝٣ يَغْفِرْ لَكُم مِّن ذُنُوبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ إِلَىٰٓ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ إِنَّ أَجَلَ ٱللَّهِ إِذَا جَآءَ لَا يُؤَخَّرُ ۖ لَوْ كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝٤ قَالَ رَبِّ إِنِّى دَعَوْتُ قَوْمِى لَيْلًا وَنَهَارًا ۝٥ فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَآءِىٓ إِلَّا فِرَارًا ۝٦ وَإِنِّى كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوٓا۟ أَصَٰبِعَهُمْ فِىٓ ءَاذَانِهِمْ وَٱسْتَغْشَوْا۟ ثِيَابَهُمْ وَأَصَرُّوا۟ وَٱسْتَكْبَرُوا۟ ٱسْتِكْبَارًا ۝٧ ثُمَّ إِنِّى دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۝٨ ثُمَّ إِنِّىٓ أَعْلَنتُ لَهُمْ وَأَسْرَرْتُ لَهُمْ إِسْرَارًا ۝٩﴾ ترجمہ: ”بے شک ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تھا کہ اپنی قوم کو ڈرا اس سے پہلے کہ ان پر دردناک عذاب آپڑے۔ اس نے کہا کہ اے میری قوم! بے شک میں تمہارے لئے کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں۔ کہ اللہ کی عبادت کرو اور اس سے ڈرو اور میرا کہا مانو۔ وہ تمہارے لئے تمہارے گناہ بخش دے گا اور تمہیں ایک وقت مقرر تک مہلت دے گا، بے شک اللہ کا وقت ٹھہرایا ہوا ہے، جب آجائے گا تو اس میں تاخیر نہ ہوگی کاش تم جانتے!۔ کہا اے میرے رب! میں نے اپنی قوم کو رات اور دن بلایا۔ پھر وہ میرے بلانے سے اور بھی زیادہ بھاگتے رہے۔ اور بے شک جب کبھی میں نے انہیں بلایا تاکہ تو انہیں معاف کردے تو انہوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں رکھ لیں اور انہوں نے اپنے کپڑے اوڑھ لئے اور ضد کی اور بہت بڑا تکبر کیا۔ پھر میں نے انہیں کھلم کھلا بھی بلایا۔ پھر میں نے انہیں علانیہ بھی کہا اور مخفی طور پر بھی کہا۔ (سورۂ نوح: 1-9)

طویل عرصہ گزرنے کے باوجود حضرت نوحؑ نے دعوت میں کوئی توقف اختیار نہیں کیا، اور نہ ہی تبلیغ ودعوت کے سلسلہ میں ان کے عزم و ہمت میں کمزوری آئی اور نہ ہی مختلف اوقات واسالیب کے اختیار وانتخاب کرنے میں ان کی بصیرت اور تدبیر میں ضعف آیا۔ (دیکھیں: تفسیر الآلوسی 10/89)۔

نبی کریم ﷺ بھی مختلف ومتنوع اور نئے نئے اسالیبِ دعوت اختیار فرماتے تھے، آپ ﷺ نے خفیہ، اعلانیہ، صلح کی حالت میں اور جنگ کی حالت میں، انفرادی طور پر اور اجتماعی طور پر، سفر میں اور حضر میں، ہر جگہ اور ہر موقع پر دعوت پیش کی، اسی طرح آپ ﷺ نے واقعات بیان کئے، مثالیں دیں، زمین پر نقشہ بنا کر وضاحت و توضیح کے وسائل استعمال کئے، اسی طرح ترغیب، بشارت، ترہیب اور انذار تمام طریقے اپنائے، ہر وقت، ہر حال میں اور ہر مؤثر و فعّال اسلوب کے ذریعہ دعوت دی، آپ ﷺ اب طائف تشریف لے جا رہے ہیں، قبائل کے پاس جاتے ہیں اور انسانوں کو اللہ کی طرف بلاتے ہیں۔ (دیکھیں: مقومات الدعوۃ والداعیۃ، باد حدح، ص 123)

رسول اللہ ﷺ دعوت کے لئے ایک نیا مرکز تلاش کرنے کی کوشش میں تھے، آپؐ نے قبیلۂ ثقیف سے مدد طلب کی، لیکن انہوں نے آپؐ کی ایک بات بھی تسلیم نہیں کی، اُنہوں نے اپنے قبیلہ کے لونڈوں کو اکسایا اور انہوں نے آپؐ پر پتھراؤ کیا، طائف سے واپس لوٹتے ہوئے نصرانیت کے پیروکار عداس سے ملاقات ہوئی اور وہ حلقہ بگوش اسلام ہو جاتا ہے، اس سفر کی تاریخ واقدی نے بعثت کے دسویں سال شوال میں حضرت ابو طالب اور حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد کی بیان کی ہے اور ذکر کیا ہے کہ طائف میں آپ ﷺ کا قیام دس دن رہا۔ (طبقات ابن سعد 1/22، السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ 1/185)

ا) <u>طائف کے انتخاب کی وجہ:</u>

طائف قریش کے لئے ایک اسٹریٹیجک اہمیت کا حامل شہر تھا، بلکہ قریش طائف پر قابض ہونے کے لئے اس پر نظریں لگائے ہوئے تھے، ماضی میں قریش نے کوشش بھی کی تھی کہ طائف کو اپنے ساتھ شامل کرلے اور وادیٔ "وَجّ" پر اس نے حملہ بھی کیا تھا، اس لئے کہ اس میں باغات اور کھیتیاں تھیں، یہاں تک کہ ثقیف کے لوگ ان سے خائف ہو گئے اور انہوں نے قریش کے ساتھ معاہدہ کر لیا اور اپنے ساتھ بنی دوس کو بھی شامل کر لیا، مکہ کے بہت سے مالدار لوگوں کی طائف میں جائیدادیں بھی تھیں اور گرمی کا موسم وہیں جا کر گزارتے تھے، قبیلۂ بنو ہاشم اور عبد شمس طائف کے ساتھ مسلسل رابطہ میں تھے، اسی طرح قبیلۂ مخزوم کے ثقیف کے ساتھ مشترک مالی مفادات وابستہ تھے۔ (دیکھیں: فتح الباری، کتاب الکفالۃ، شرح حدیث نمبر: 2294، اُصول الفکر السیاسی، ص 173)

لہذا اگر رسول اللہ ﷺ طائف کی جانب متوجہ ہوتے ہیں تو یہ ایک سوچا سمجھا اور منصوبہ بند سفر تھا اور اگر آپ وہاں کوئی جگہ اور مددگار جماعت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو یہ چیز قریش کے لئے باعثِ خوف وتشویش ہوگی، اور یہ براہِ راست اس کے امن و سکون اور معاشی مفادات کے لئے چیلنج بنے گا، بلکہ یہ چیز اس کو ہر طرف سے گھیرنے اور باہر کی دنیا سے کاٹنے کا سبب بن سکتی تھی، آپ ﷺ کا یہ دعوتی، سیاسی اور اسٹریٹیجک سفر بتاتا ہے کہ آپؐ ایک مسلمان حکومت یا جدید قوت کے قیام

کے لئے کیسے کیسے اسباب اختیار کرنے کا اہتمام فرماتے تھے، اس لئے کہ حکومت یا آزاد قوت لوگوں تک دعوت الی اللہ پہنچانے کے اہم وسائل میں سے ہے، اور جب نبی کریم ﷺ طائف پہنچتے ہیں تو براہِ راست طائف میں طاقت وقوت کے مرکز اور سیاسی فیصلوں کے طے ہونے کی جگہ تشریف لے جاتے ہیں۔ (دیکھیں: اُصول الفکر السیاسی، ص 174)

۲) طائف کا طاقت و قوت کا مرکز:

بنو مالک اور اُحلاف وہاں کے اولین باشندے ہونے کی وجہ سے طائف پر کنٹرول کرتے تھے، وہاں کی زمامِ قیادت ان ہی کو حاصل تھی، عبادت گاہوں کی دیکھ ریکھ کی وجہ سے وہی دینی قیادت بھی کرتے تھے، لیکن اس عمومی سیاسی قیادت، خارجی تعلقات اور اقتصادی برتری کے باوجود وہ اس حالت میں نہیں تھے کہ سرزمینِ طائف کا دفاع کر سکتے، جو کہ بلادِ عرب میں سب سے زیادہ سر سبز و شاداب اور پر کشش ودلفریب علاقہ تھا، بنو مالک اور ان کے حلفاء قبیلۂ ہوازن سے ڈرتے تھے، قریش سے خوفزدہ تھے اور بنو عامر کا بھی ان پر خوف طاری تھا اور یہ تمام قبائل طاقتور اور حملہ کرنے اور قبضہ کرنے پر قادر تھے، اسی لئے طائف کے زعماء اور لیڈران نے مصالحت کی سیاست کو بہتر سمجھا اور معاہدوں اور مصالحت کے ذریعہ سیاسی اتھل پتھل سے اجتناب کرنے کو ترجیح دی، بعینہ اسی طریقۂ کار کو قریش نے بھی اختیار کیا، اسی لئے بنو مالک قبیلۂ ہوازن کے ساتھ اپنے تعلقات مضبوط کرنے لگے تاکہ ان کی شر پسندی سے محفوظ رہ سکیں اور ان کے حلفاء قریش کے ساتھ تعلقات بڑھانے لگے تاکہ وہ ان سے محفوظ ومامون رہیں۔

رسول اللہ ﷺ جب طائف کی جانب تشریف لے جارہے تھے تو آپؐ تعلقات اور معاہدوں کے اس نیٹ ورک سے بے خبر نہیں تھے، بلکہ آپؐ جانتے تھے کہ طائف میں کنٹرول اور قیادت کا مرکز صرف ایک ہی قبیلہ نہیں ہے بلکہ اندرونی طور پر اتفاق کی وجہ سے عرب کے دو قبائل میں یہ قیادت تقسیم ہے، اور آپؐ اس سے بھی واقف تھے کہ ان میں سے کون سا قبیلہ باہر کے طاقتور قبیلہ کی کشتی میں سوار ہے، لہذا اگر آپؐ ان میں سے کسی ایک کو بھی اپنی طرف مائل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو سیاسی قوتوں کی میزان میں اس کا بڑا اثر ہوگا، اور اگر بطورِ خاص اُحلاف کو اپنی طرف مائل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں جس کا قریش کے ساتھ مصالحت کا معاہدہ ہے تو پھر آپؐ کا منصوبہ یہیں مکمل ہو جائے گا، اور یہ کوئی ناممکن بات بھی نہیں تھی، اس لئے کہ آپؐ جانتے تھے کہ اس کیمپ کی دوستی قریش کے ساتھ مذہبی اور دینی بنیادوں پر قائم نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد قریش کا خوف وڈر ہے، لہذا سیاسی صورتحال کو مدنظر رکھتے ہوئے اللہ کے رسول ﷺ جب طائف میں داخل ہوئے تو براہ راست بنو عمرو بن عمیر کے پاس گئے جو کہ اُحلاف کی قیادت کرتے تھے اور ان کا قریش کے ساتھ بھی ربط و تعلق تھا اور آپؐ بنو مالک کے پاس نہیں گئے جو کہ ہوازن کے حلیف تھے۔ (اُصول الفکر السیاسی فی القران، ص174-175)

ابن ہشام کہتے ہیں: جب رسول اللہ ﷺ طائف پہنچے تو قبیلۂ ثقیف کے چند لوگوں کے پاس تشریف لے گئے وہ لوگ اس وقت قبیلۂ ثقیف کے سردار اور معزز لوگ تھے، اور وہ تین بھائی تھے: عبد یالیل بن عمرو بن عمیر، مسعود بن عمرو بن عمیر اور حبیب بن عمرو بن عمیر بن عقدہ بن غیرہ بن عوف بن ثقیف۔ ان میں سے ایک کی زوجیت میں قریش کے قبیلہ بنی جمح کی ایک عورت تھی۔ البتہ بنو عمرو بہت زیادہ محتاط اور خوف وہراس کے ماحول میں رہنے والے لوگ تھے، انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی دعوت پر لبیک نہیں کہا بلکہ انہوں نے آپؐ کے ساتھ

سفاہت وبد سلوکی کرنے میں حدود سے تجاوز کیا، آپ ﷺ ان کے پاس تشریف لے گئے جب کہ آپؐ قبیلۂ ثقیف سے کسی خیر سے نا امید ہو گئے، آپؐ نے ان سے فرمایا: ''تم نے اگر یہ سب کچھ میرے ساتھ کیا جو کچھ تم نے کیا ہے، بس میرے بارے میں رازداری رکھنا''۔ (سیرۃ ابن ہشام: 2/78)

رسول ﷺ کو یہ بات ناپسند تھی کہ آپؐ کی قوم کو آپ کے بارے میں یہ سب معلوم ہو، اس کے نتیجہ میں وہ آپؐ پر مزید جری ہو جائیں گے، آپؐ یہ چاہتے تھے کہ آپؐ کے یہ روابط رازداری میں رہیں اور آپؐ کی سرگرمیوں کا قریش کو علم نہ ہو آپؐ احتیاط کے تمام پہلوؤں کا اہتمام فرماتے تھے، آپ ﷺ نے مندرجہ ذیل احتیاطی تدابیر اختیار کیں:

ا) آپ ﷺ مکہ مکرمہ سے پیدل نکلے تاکہ قریش کے لوگ یہ نہ سمجھیں کہ آپؐ مکہ مکرمہ سے باہر جانا چاہتے ہیں، اس لئے کہ اگر آپؐ سوار ہو کر نکلتے تو اس کے ذریعہ شکوک وشبہات پیدا ہوتے اور یہ ظاہر ہوتا کہ آپ کسی سمت سفر کی نیت سے نکلے ہیں جس کی وجہ سے مکہ سے نکلنے میں رکاوٹیں پیدا ہو سکتی تھیں۔

ب) رسول اللہ ﷺ کا حضرت زیدؓ کو رفیقِ سفر کے طور پر منتخب کرنے میں حفاظتی واحتیاطی پہلو کار فرما تھا، حضرت زیدؓ اللہ کے رسول ﷺ کے متبنیٰ (منہ بولے بیٹے) تھے، لہٰذا جب کوئی بھی ان کو آپ کے ساتھ دیکھتا تو اس کے ذریعہ کوئی شک وشبہ نہیں ہو سکتا تھا، اس لئے کہ دونوں کے درمیان قریبی تعلق تھا، اسی طرح وہ نبی کریم ﷺ کو بہت قریب سے جانتے تھے، آپؐ ان کے اخلاص، امانت اور صدق وسچائی سے واقف تھے، اس لئے وہ ہر اعتبار سے قابلِ اعتبار تھے، وہ کسی راز کو فاش نہیں کریں گے اور وہ سفر میں بھی ہر طرح سے کام آئیں گے، اس کا ظہور اس وقت ہوا جب سنگ بازی کے وقت وہ اپنے جسم کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کر رہے تھے یہاں تک کہ ان کا سر بھی زخمی ہو گیا تھا۔

ج) جب زعمائے طائف نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ آخری درجہ کی بدسلوکی کی اور آپؐ کے ساتھ استہزاء اور مذاق کا معاملہ کیا تو آپؐ نے یہ سب برداشت کیا، نہ غصہ کا اظہار کیا اور نہ ہی برانگیختہ ہوئے، بلکہ ان سے یہ کہا کہ یہاں میرے آنے کی خبر کو راز میں رکھیں، آپ ﷺ کا یہ عمل انتہائی احتیاط پر مبنی تھا، اس لئے کہ اگر قریش کو اس کے بارے میں علم ہو گا تو وہ صرف آپ ﷺ کا مذاق ہی نہیں اڑاتے بلکہ آپؐ کی ایذاء رسانی میں مزید سختی کرتے اور مکہ کے اندر اور باہر آپؐ کی تمام سرگرمیوں کو محدود کرنے کی کوشش کرتے۔

3: دعا وتضرع:

بنو عمرو کے لوگ کمینے قسم کے لوگ تھے، انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی خبر کو راز میں نہیں رکھا بلکہ اپنے بے وقوفوں اور غلاموں کو آپ کے پیچھے لگا دیا، وہ آپ کو گالیاں دے رہے تھے اور آپؐ کے پیروں پر پتھراؤ کر رہے تھے، یہاں تک کہ آپؐ کی دونوں ایڑھیاں لہولہان ہو گئیں، آپؐ کے نعلین مبارکین خون سے لت پت ہو گئے اور طائف کی سرزمین آپؐ کے پاکیزہ خون سے رنگین ہو گئی، وہ مسلسل آپؐ اور حضرت زید بن حارثہؓ کے ساتھ یہ بدسلوکی کرتے رہے یہاں تک کہ دونوں کو ربیعہ کے دو بیٹوں عتبہ اور ربیعہ کے باغ میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا، عتبہ اور ربیعہ دونوں باغ میں موجود تھے، ثقیف کے یہ بے وقوف اور اوباش وہاں سے واپس چلے گئے، آپ ﷺ انگور کے ایک پیڑ کے

نیچے تشریف لے گئے، آپؐ اپنے رفیقِ سفر زیدؓ کے ساتھ وہیں بیٹھ گئے تاکہ وہیں کچھ دیر تھکن اور ایذاء کے بعد ستالیں، ربیعہ کے دونوں بیٹے اس منظر کو اور آپ ﷺ کو اہلِ طائف کی طرف سے پہنچنے والی ایذاء کو دیکھ رہے تھے، لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے، غم واندوہ، حزن وملال اور نفسیاتی اور جسمانی آلام وتکالیف کی کیفیات کے ساتھ رسول اللہ ﷺ اپنے رب کے سامنے دعا گو ہوئے اور ایسی دعا آپ کی زبانِ مبارک سے نکلی جو ایمان ویقین اور اللہ کی راہ میں لاحق ہونے والی مصیبت وپریشانی پر راضی رہنے اور اللہ کو راضی کرنے والے الفاظ سے لبریز تھی، آپ ﷺ نے یہ دعا فرمائی:

"اللّهمَّ إليكَ أَشْكُو ضعفَ قُوَّتي، وقلَّةَ حيلَتِي، وهواني علَى النَّاسِ، يا أَرْحمَ الرَّاحمين، أَنْتَ ربُّ الْمستضْعفين، وأَنْتَ ربِّي، إلَى منْ تكلُنِي؟ إلَى بعيد يتجهَّمني؟ أَمْ إلَى عدو ملَّكْته أمْري؟ إنْ لَمْ يكُنْ بك علَيَّ غضبٌ فَلا أُبالي، ولكنَّ عافيتكَ هي أَوسعُ لِي، أَعوذُ بنور وجْهكَ الَّذي أَشْرقتْ لَه الظلماتُ، وصلُح عليه أمر الدُّنْيا والْآخرة منْ أَنْ تنزلَ بِي غَضبكَ، أَو يَحلَّ عليَّ سخطُكَ، لَكَ العتبى حتَّى ترْضى، ولَا حولَ ولَا قوة إلَّا بك".

ترجمہ: "اے اللہ! میں تجھ ہی سے اپنی کمزوری اور بے بسی، کم تدبیری اور لوگوں کے نزدیک اپنی بے قدری کا شکوہ کرتا ہوں۔ اے رحم کرنے والوں میں سے سب سے زیادہ رحم کرنے والی ذات! تو ہی کمزوروں اور بے سہاروں کا رب ہے، اور تو ہی میرا رب ہے، تو مجھے کس کے حوالہ کر رہا ہے؟ کیا کسی اجنبی اور بے گانے کے جو میرے ساتھ تندی سے پیش آئے گا یا کسی ایسے دشمن کے جس کو تو نے میری قسمت کا مالک بنادیا ہے؟! اگر تو مجھ پر ناراض نہ ہو تو مجھے ان تکلیفوں کی کوئی پرواہ نہیں، پھر بھی تیری طرف سے عافیت اور سلامتی میرے لئے زیادہ دلکشا ہے، میں تیرے چہرہ کے اس نور کی پناہ چاہتا ہوں جس سے ہر قسم کی تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں اور جس کی وجہ سے دنیا اور آخرت کے تمام معاملات درست ہوجاتے ہیں، اس بات سے پناہ چاہتا ہوں کہ تو مجھ پر اپنا غضب نازل کرے یا تیرا عتاب مجھ پر نازل ہو، تیری رضا مطلوب ہے یہاں تک کہ تو راضی ہوجائے اور تیرے سوا کسی کے پاس نہ کوئی طاقت ہے اور قوت"۔ (سیرت ابن ہشام 2/61-62، تفسیر قرطبی 16/195، المعجم الکبیر للطبرانی 346/25، مجمع الزوائد للہیثمی 6/35)

اس دعا میں یہ پہلو قابلِ غور ہے کہ نبی کریم ﷺ کی توحید میں کتنی گہرائی ہے اور آپؐ للہیت واخلاص کے کس اعلیٰ مقام پر فائز تھے، چنانچہ آپؐ اس غم واندوہ اور مسلسل فکرمندی کا ذکر اس لئے نہیں کرتے ہیں کہ اپنی ذات سے اذیت وتکلیف کو دور کریں یا اپنی ذاتی زندگی کے لئے امن وعافیت حاصل کریں، بلکہ آپؐ یہ سب تکلیف اللہ کی رضا جوئی کے لئے خوشی خوشی سہتے ہیں اور اپنے رب کی ناراضگی اور غضب سے خائف ہیں کہ کہیں دعوتی اعتبار سے کوئی کوتاہی سرزد نہ ہو، اللہ کی رضا رسول اللہ ﷺ کے نزدیک اعلیٰ ہدف ہے اور یہی وہ عظیم مطلوبہ مقصد ہے جس کے لئے ہر چیز کو مسخر کیا گیا ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابتلاء وآزمائش اس لئے ہو کہ وہ اس کے ذریعہ سے راضی ہو اور اس کی ناراضگی اور غضب سے نجات مل جائے تو ایسی ابتلاء وآزمائش کو خوش آمدید! تب تو وہ عظیم نعمت اور خوش بختی ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی اس دعا کو عظیم کلمات کے ذریعہ ختم کیا جس کو آپ ﷺ اکثر وبیشتر دہراتے رہتے تھے، اور اپنے رفقائے کار صحابہ کرام کو بھی اس کی تلقین کرتے تھے، وہ کلمات ہیں: "ولا حول ولا قوة الا بالله" ۔اس لئے کہ بدحالی سے خوشحالی تک لانا اور خوف

کے حالات سے نکال کر پرامن فضا میں لانا، اللہ کے سوا کسی اور کے بس میں نہیں ہے، اور مشکلات کا سامنا کرنا اور مصائب کو برداشت کرنا اللہ عزوجل کی عطا کردہ قوت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ (دیکھیں: التاریخ الاسلامی، الحمیدی 3/20)

بے شک دعا عظیم ترین عبادت ہے اور یہ انسان کی حفاظت و حمایت کے اعتبار سے اور تمناؤں کو بَر لانے کے اعتبار سے ایک فعّال اور کارگر ہتھیار ہے، انسانی عقل چاہے ذہانت و ہوشیاری کی بلند چوٹی تک پہنچ جائے پھر بھی لغزش و کوتاہی سے وہ بچ نہیں پائے گا، ایک مسلمان بسااوقات ایسی صورتحال سے دوچار ہو سکتا ہے جب اس کی فکر و تدبیر مکمل طور پر بے بس ہو جائے گی تو وہاں اللہ کے سوا اور کوئی ماْویٰ اور ملجاً نہیں ہوتا ہے، اور اسی سے دعا کر کے انسان کی کشتی ساحلِ مراد تک پہنچ سکتی ہے، لہذا اللہ کے رسول ﷺ کو اہلِ طائف کی طرف سے جب ایذاء، پریشانی اور استہزاء و مذاق کا سامنا کرنا پڑا اور آپ ﷺ کے سامنے بالکل اندھیرا سا چھا گیا تو آپؐ اللہ کی بارگاہ میں دعا گو ہو گئے اور جیسے ہی آپؐ دعا سے فارغ ہو گئے تو فوراً اللہ کی طرف سے دعا قبول ہو گئی اور جبرئیل امین اور ملک الجبال (پہاڑوں کا فرشتہ) آپ کے پاس حاضر تھے۔ (دیکھیں: فی السیرۃ النبویۃ، قراءۃ لجوانب الحذر والحمایۃ، ص112، 113)

4: نبوی رحمت و شفقت:

اللہ کے رسول ﷺ کی عظیم رحمت و شفقت ہی آپؐ کی عظیم قوت تھی جو اِن سخت جان حالات میں بھی غالب رہتی تھی، جن میں تکلیف و پریشانی اپنی انتہا کو پہنچ جاتی تھی اور آپؐ کا دل و دماغ انتہائی دباؤ کی حالت میں ہوتا تھا لیکن اس کے باوجود آپؐ کا پیمانۂ صبر لبریز نہیں ہوتا تھا، بلکہ آپؐ کے عظیم نفس اور عظیم رحمت و شفقت ہی کا غلبہ رہتا۔ (دیکھیں: مقومات الداعیۃ الناجح، ص76)

نبی کریم ﷺ کی زوجۂ مطہرہ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا: کیا آپ پر کوئی دن اُحد کے دن سے بھی زیادہ سخت گزرا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تمہاری قوم قریش کی طرف سے میں نے کتنی مصیبتیں برداشت کی ہیں لیکن اس پورے عرصہ میں عقبہ کا دن میرے لئے سب سے زیادہ سخت تھا، یہ وہ موقع تھا جب میں نے عبد یالیل بن عبد کلال کے بیٹے کے ہاں اپنے آپ کو پیش کیا تھا لیکن اس نے میری دعوت کو قبول نہیں کیا اور اس کو رد کر دیا، میں وہاں سے انتہائی رنجیدہ ہو کر واپس آیا، مجھے اس وقت ہوش آیا جب میں قرن الثعالب پہنچ گیا، میں نے اپنا سر اٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بادل کا ایک ٹکڑا میرے سر پر سایہ کئے ہوئے ہے اور میں نے دیکھا کہ جبرئیل -علیہ السلام- اس میں موجود ہیں، انہوں نے مجھے آواز دی اور کہا: اللہ تعالیٰ آپ کی قوم کی باتیں سن چکا اور انہوں نے آپ کو جو جواب دیا اس کو بھی سن لیا ہے، آپ کے پاس اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کا فرشتہ بھیجا ہے تاکہ ان کے بارے میں آپ جو چاہیں اس کو حکم دیں، اس کے بعد پہاڑوں کے فرشتے نے مجھے آواز دی، اس نے مجھے سلام کیا اور کہا: اے محمد! آپ جو چاہیں مجھے حکم فرمائیں، اگر آپ چاہیں تو دونوں طرف کے پہاڑ ان پر لا کر ملا دوں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی نسل سے کسی ایسے شخص کو پیدا کرے گا جو ایک اللہ کی عبادت کرے گا اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائے گا۔ (صحیح بُخاری: 3231، صحیح مسلم: 1795)

یقینا اُحد کے روز آپ ﷺ کو پہنچنے والی تکلیف جسمانی اعتبار سے انتہائی سخت تھی لیکن نفسیاتی اعتبار سے طائف کے روز پہنچنے والی تکلیف اس سے کہیں زیادہ تکلیف دہ اور سخت جاں تھی، اس لئے کہ اس تکلیف کی وجہ سے آپؐ اس قدر سخت ذہنی اور قلبی پریشانی کا شکار ہوئے یہاں تک کہ طائف سے قرن الثعالب تک اسی سوچ میں متفکر رہے۔

5: انقلاب اور تبدیلی کا طریقہ کار:

پہاڑوں کے فرشتہ کی طرف سے یہ پیشکش کی گئی تھی کہ وہ دونوں پہاڑوں کو ملا کر ان کی کایا پلٹ دے گا، اور اس کے ذریعہ کسی قوم کو مکمل نیست و نابود کیا جا سکتا ہے، جیسے کہ قوم نوح، عاد، ثمود اور قوم لوط کے بارے میں یہ طریقہ کار اختیار کیا گیا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَكُلًّا أَخَذْنَا بِذَنۢبِهِۦ ۖ فَمِنْهُم مَّنْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا وَمِنْهُم مَّنْ أَخَذَتْهُ ٱلصَّيْحَةُ وَمِنْهُم مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ ٱلْأَرْضَ وَمِنْهُم مَّنْ أَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ ٱللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَـٰكِن كَانُوٓا۟ أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ﴾ ترجمہ: ”آخر کار ہر ایک کو ہم نے اس کے گناہ میں پکڑا، پھر ان میں سے کسی پر ہم نے پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیجی، اور کسی کو ایک زبردست دھماکے نے آلیا، اور کسی کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا، اور کسی کو غرق کر دیا، اللہ اُن پر ظلم کرنے والا نہ تھا، مگر وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے“۔ (سورۃ العنکبوت: 40)

لیکن اس کے برعکس ایک دوسری شکل یہ تھی کہ آپ ﷺ کفر و شرک کے مراکز مکہ اور طائف سے ہجرت کریں اور وہاں سے ترکِ وطن کریں، اس لئے کہ اہلِ مکہ نے آپ ﷺ کو بے گھر کر دیا اور اہل طائف نے آپ ﷺ کو بے یار و مددگار اور بے بس کر دیا۔ حضرت زید بن حارثہؓ نے اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے اس پہلو کا ذکر کیا تھا، ابن قیمؒ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ کو جب طائف میں کوئی ناصر و مددگار نہیں مل پایا، تو آپؐ مکہ مکرمہ کی طرف انتہائی رنجیدہ ہو کر واپس چلے، آپؐ کے ساتھ آپ کے غلام حضرت زید بن حارثہؓ تھے، آپؐ دعا فرما رہے تھے، اس وقت اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپ کے پاس پہاڑوں کے فرشتہ کو بھیجا، وہ آپؐ سے اجازت طلب کر رہا تھا کہ اہلِ مکہ پر دو پہاڑوں کو ملا دے، مکہ ان دو پہاڑوں کے درمیان واقع تھا، آپؐ نے فرمایا: نہیں، بلکہ میں ان کے بارے میں پر امید ہوں کہ شاید اللہ تعالیٰ ان کی نسلوں میں کوئی ایسا پیدا کرے گا جو اس کی عبادت کرے گا اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائے گا۔ آپ ﷺ نے کئی روز تک وہیں نخلہ (کھجور کے باغ) میں قیام کیا، زید بن حارثہؓ نے آپؐ سے فرمایا: آپ کیسے ان کے پاس داخل ہوں گے جبکہ انہوں نے یعنی قریش نے آپ کو شہر سے نکال دیا اور آپ مدد حاصل کرنے کے لئے نکلے تو طائف والوں نے بھی آپ کی مدد نہیں کی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اے زید! بے شک جو کچھ تم دیکھ رہے ہو اللہ تعالیٰ اس سے نکلنے کی راہ اور آسانی پیدا کرنے والا ہے، اللہ یقیناً اپنے دین کی مدد کرنے والا ہے اور اپنے نبی کو غالب کرنے والا ہے۔ (دیکھیں: زاد المعاد: 2/46)

بے شک نبی کریم ﷺ نے جڑ سے ختم کرنے اور نیست و نابود کرنے کے منہج کو ٹھکرا دیا اور گوشہ نشینی یا مسلسل ہجرت کرنے سے بھی انکار کر دیا، اور مستقبل کی جانب نورِ ایمان کے ذریعہ دیکھا تو پھر کفر و شرک میں ڈوبے مکہ میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا، تاکہ اپنے مقدس جہاد کو جاری و ساری رکھیں اور دعوتِ توحید کے تئیں جو کچھ حاصل کر سکتے تھے اس کو حاصل کر لیں، آپ ﷺ نے مذکورہ دونوں مناہج کو اختیار نہیں کیا، بلکہ ایک متبادل منہج کا انتخاب کر کے آگے بڑھے۔ وہ منہج یہ تھا کہ کفر میں ڈوبے مکہ میں داخل ہونا ہے نہ کہ وہاں

سے فرار اختیار کرنا ہے،اس منہج کو اختیار کرنے کی صورت میں ضروری تھا کہ اسی سرزمین پر موجود رہا جائے جس پر اہل کفر موجود ہیں،ان کے اداروں پر محنت کی جائے، ان کے تعلقات وروابط سے فائدہ اٹھایا جائے اوران کے مقاصد کو صحیح رخ دیا جائے تاکہ ان سب چیزوں کے ذریعہ اہلِ ایمان کو غذا فراہم کی جائے جو اسی ماحول سے پیدا ہونے والے تھے، گویا کہ نبی کریم ﷺ اہلِ کفر کی نسل سے ایسے انسانی کار خانے وجود میں لانا چاہ رہے تھے جن سے مسلمان نسلیں پیدا ہوں گی، جو اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لئے کوشاں ہوں گے،اللہ کے رسول ﷺ کی نگاہ دوربین روشن مستقبل کو واضح شکل میں دیکھ رہی تھی، مگر اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا کہ حال سے فرار اختیار کیا جائے۔ (دیکھیں: أصول الفکر السیاسی فی القرآن المکی، ص176)

نبی کریم ﷺ نے مکہ مکرمہ میں دوبارہ داخل ہونے کا عزم مصمم کر لیا تھا، لیکن ظاہری صورتحال یہ بتارہی تھی کہ مکہ میں داخل ہونا کوئی معمولی اور غیر محفوظ فیصلہ نہیں تھا،اس بات کا احتمال تھا کہ قریش کی طرف سے آپ کے ساتھ دھوکہ کیا جائے یا آپ کی جان پر حملہ کیا جائے،قریش کے لوگ اب زیادہ صبر نہیں کر سکتے تھے جب کہ آپ ﷺ نے ان کے خلاف اب بغاوت کر لی تھی اور دیگر قبائل سے مدد طلب کرنے نکلے تھے،اور اگر آپ ﷺ کو ذاتی طور پر کوئی خطرہ نہ بھی ہوتا تو طائف کے منظر کو سامنے رکھتے ہوئے مکہ میں صرف داخلہ کے ذریعہ اہلِ مکہ سمجھیں گے کہ مسلمانوں کو بہت بڑی شکست لاحق ہوئی ہے اور وہ ان پر مزید جری ہو جائیں گے اور سفاہت و بے وقوفی میں مزید بڑھ جائیں گے،اسی لئے اس مرتبہ رسول اللہ ﷺ کی نگاہِ دوررس اس طرف متوجہ ہوئی کہ مکہ کو اندر سے تیار کیا جائے،بجائے اس کے کہ اس کو باہر سے گھیر دیا جائے، گویا کہ آپ ﷺ نے یہ چاہا کہ بذاتِ خود قریش کے اندرون تک پہنچا جائے اور انہی کے درمیان سے حلفاء اور رفقاء تیار کئے جائیں، اور اس کے قلب میں اپنا وجود تیار کیا جائے۔ (دیکھیں:اصول الفکر السیاسی فی القرآن المکی، ص،178، 177)

علامہ ابن قیمؒ اپنی کتاب "زاد المعاد" میں فرماتے ہیں: "اللہ کے رسول ﷺ جب طائف سے واپس آئے اور وہاں کے لوگوں نے آپ ﷺ کی دعوت کو قبول نہیں کیا،نہ آپ کی تصدیق کی اور نہ ہی آپ کی نصرت وتائید کی، تو آپ ﷺ غارِ حرا تشریف لے گئے،اس کے بعد أخنس بن شریق کو پیغام بھجوایا تاکہ وہ آپ کو پناہ دے،اس نے جواب دیا: میں حلیف ہوں اور حلیف پناہ نہیں دیتا ہے۔ پھر آپ ﷺ نے سہیل بن عمرو کے پاس پیغام بھجوایا تو اس نے جواب دیا: بنو عامر کے لوگ بنو کعب کے مقابلہ میں پناہ نہیں دیتے ہیں۔اس کے بعد آپ ﷺ نے قبیلہ بنی نوفل بن عبد مناف کے سردار مطعم بن عدی کو پیغام بھجوایا اور اس کے پاس قبیلۂ خزاعہ ہی کا ایک شخص بھیجا،اس سے کہلوایا: کیا میں تمہاری پناہ (جوار) میں داخل ہو سکتا ہوں؟اس نے جواب دیا: ہاں بالکل!اس نے اپنے بیٹوں اور قوم کے لوگوں کو بلایا اور ان سے کہا: ہتھیاروں سے مسلح ہو جاؤ اور خانہ کعبہ کے چاروں کونوں پر پوزیشن سنبھال لو،اس لئے کہ میں نے محمدؐ کو پناہ دی ہے، چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے اور آپؐ کے ساتھ حضرت زید بن حارثہؓ تھے، یہاں تک کہ مسجد حرام پہنچ گئے، مطعم بن عدی اپنی سواری پر کھڑے ہوئے اور اعلان کیا: اے قریش کے لوگو! میں نے محمدؐ کو پناہ دے دی ہے،لہذا تم میں سے کوئی ان کی جانب میلی آنکھ سے دیکھنے کی کوشش نہ کرے۔اللہ کے رسول ﷺ حجرِ اسود کے پاس پہنچے،استلام کیا، دو رکعتیں پڑھیں اور اپنے گھر اس حال میں تشریف لائے

کہ مطعم بن عدی اور اس کی اولاد ہتھیار بند ہو کر آپ ﷺ کو چاروں طرف سے حصار میں لئے ہوئے تھے، یہاں تک کہ آپؐ اپنے گھر میں داخل ہو گئے۔(زاد المعاد، 2/47)

اَخنس اور سہیل کا جواب قابلِ غور ہے، اس لئے کہ اگر وہ پناہ نہیں دے سکتے تھے تو رسول اللہ ﷺ ان سے پناہ طلب ہی نہ کرتے، آپ اپنی قوم کے عرف اور عادات کو اچھی طرح جانتے تھے، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ پناہ نہیں دے سکتے تھے جبکہ سہیل کے دادا عامر اور کعب بھائی ہیں اور ان دونوں کے والد لؤی ہیں، لہٰذا وہ دونوں مقام و مرتبہ کے اعتبار سے برابر تھے، ان میں سے ایک دوسرے کے مقابلہ میں پناہ دے سکتا تھا! علامہ زرقانی کی یہی رائے ہے۔(محمد رسول اللہ، صادق عرجون، 2/324)

یقیناً رسول اللہ ﷺ کے جدید منہج اور طریقہ کار کی وجہ سے صورتحال میں کافی حد تک تبدیلی آئی تھی، بجائے اس کے کہ رسول اللہ ﷺ مکہ مکرمہ میں شکست خوردہ ہو کر اور چھپتے چھپاتے داخل ہوتے، آپ ﷺ اس حال میں داخل ہوئے کہ سردارانِ قریش میں سے ایک بڑا سردار ہتھیار بند ہو کر علی الاعلان آپ ﷺ کی حفاظت کر رہا تھا۔ قابلِ غور ہے کہ رسول اللہ ﷺ قبیلۂ خزاعہ کے ایک شخص کا انتخاب کرتے ہیں اور اس کو اپنا سفیر و قاصد بنا کر بھیجتے ہیں، اس میں بھی انتہائی حیران کن سیاسی تجربہ، تاریخ پر نظر اور گہری سفارتکاری نظر آتی ہے، اس لئے کہ نوفل جو قبیلۂ بنی نوفل کے جدامجد تھے اور قبیلہ بنو نوفل کی سیادت و قیادت اس وقت مطعم بن عدی کے پاس تھی، یہ نوفل زمانۂ جاہلیت میں رسول اللہ ﷺ کے دادا عبدالمطلب کے حریف تھے، اس نے حضرت عبدالمطلب کے صحنوں اور میدانوں پر حملہ کر کے ان کو ہڑپ کر لیا تھا جس کی وجہ سے عبدالمطلب پریشان ہو گئے، اپنی قوم سے جوابی کارروائی کرنے کا مطالبہ کیا مگر ان میں سے کوئی ٹس سے مس نہیں ہوا، اس لئے انہوں نے قبیلۂ خزرج میں اپنے ماموں زاد بنو نجار کے نام ایک قصیدہ لکھ کر ان سے مدد طلب کی، اس کے نتیجہ میں ایک جمِ غفیر ان کی مدد کے لئے آ گیا، انہوں نے صحنِ کعبہ میں اپنے اونٹ بٹھائے، کمانیں کس لیں، ڈھالیں تیار کر لیں، جب نوفل نے ان کو دیکھا تو کہنے لگا: یہ لوگ کسی بڑے ارادہ سے ہی آئے ہیں، ان سے بات چیت ہوئی تو نوفل ان سے ڈر گئے اور عبدالمطلب کی تمام غصب کردہ چیزیں واپس لوٹا دیں، جب بنو خزرج نے عبدالمطلب کی مدد کی تو خزاعہ کے لوگ کہنے لگے:-جب کے وہ طاقتور اور مضبوط ہو گئے تھے۔ واللہ! ہم نے اس وادی میں ان عبدالمطلب سے زیادہ حسین چہرہ والا، اعلیٰ اخلاق والا اور زیادہ بردبار کسی کو نہیں دیکھا ہے، ان کے ننھیال والوں نے ان کی مدد کی جن کا تعلق قبیلۂ خزرج سے ہے، ہمارا بھی ان کے ساتھ خاندانی تعلق ہے جیسے کہ ان کا ان کے ساتھ خاندانی تعلق ہے، ان کے جدّ امجد سردارِ خزاعہ عبد مناف ہیں، اگر ہم ان کے لئے قربانی دیں گے تو وہ ہماری مدد کریں گے، ہمارا ساتھ دیں گے اور ہم ان سے اور ان کی قوم سے فائدہ اٹھائیں گے اور وہ ہم سے فائدہ اٹھائیں گے، چنانچہ اس کے پاس ان کے معزز لوگ حاضر ہوئے اور کہا: اے ابو الحارث! آپ ہماری اولاد ہیں جیسے کہ بنو النجار کی اولاد ہیں، علاوہ ازیں ہم گھر میں ایک دوسرے کے پڑوسی بھی ہیں، حادثاتِ زمانہ اور حالات نے قریش کے بارے میں ہمارے دلوں کی عداوت کو مٹا دیا ہے، لہٰذا آیئے ہم آپ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا کر آپ کے حلیف بنتے ہیں، عبدالمطلب کو ان کی پیشکش اچھی لگی اور اس کو جلدی سے قبول کر لیا، لیکن بنو نوفل اور عبد شمس میں سے کوئی شخص اس معاہدہ میں شامل نہیں ہوا۔(أنساب الأشراف، بلاذری، تحقیق، محمد حمید اللہ 1/71)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ خزاعہ اور قریش کے مابین قدیم تاریخی کشمکش کی جڑیں کہاں تک پھیلی ہوئی تھیں، جبکہ قصي بن کلاب نے قریش کو مختلف مقامات سے جمع کیا اور ان کو ساتھ لے کر خزاعہ کے ساتھ جنگ کی جن کے پاس خانہ کعبہ کی ذمہ داری اور عربوں کی سیادت و قیادت تھی، قصی نے خزاعہ کو خانہ کعبہ سے بھی بے دخل کر دیا اور مکہ کو قریش کے لوگوں کے درمیان تقسیم کر دیا، اس کی وجہ سے خزاعہ کے لوگ قریش سے مسلسل بغض و عداوت رکھتے رہے اور ان سے نفرت کرتے رہے، اور جب قریش اور عبد المطلب کے مابین تعلقات استوار نہ رہے تو خزاعہ نے عبد المطلب کے ساتھ دوستی کر لی، تاکہ قریش سے بدلہ لیا جائے اور ان کو کمزور بھی کیا جائے، اور یہ بات درست نہیں ہے کہ حادثاتِ زمانہ اور حالات نے قریش کے بارے میں ان کی عداوت کو ختم کر دیا تھا جیسے کہ ان کے وفد نے بیان کیا، بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ دشمنیاں مسلسل برقرار تھیں اور آپس کی کشمکش جاری و ساری تھی، اس کی دلیل یہ ہے کہ بنی نوفل اور بنی عبد شمس اس معاہدہ میں شامل نہیں ہوئے اس لئے کہ یہ معاہدہ ان کے برخلاف تھا۔

لہذا جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبیلۂ خزاعہ کے ایک شخص کو بنو نوفل کے پاس بطور قاصد بھیجا تو اس میں ان تمام مذکورہ تاریخی واقعات کی جانب واضح اشارہ موجود تھا، اسی طرح اس میں بنو نوفل اور عبد شمس کے برخلاف عبد المطلب اور خزاعہ کے مابین ہوئے قدیم معاہدہ کی بھی یاد دہانی تھی، اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر نہیں کر رہے تھے، بلکہ وہی کرنے والے تھے جو ان کے دادا عبد المطلب نے کیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قبیلۂ خزاعہ کے ساتھ دوستی کا ہاتھ بڑھائیں گے یا قبیلۂ خزرج سے مدد طلب کریں گے، چنانچہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فی الحقیقت بنی نوفل کے سردار مطعم بن عدی سے صرف پناہ لینے کی غرض سے حمایت حاصل نہیں کرتے ہیں بلکہ یہ مطعم کے لئے ایک چیلنج بھی تھا، اور اس کے ذریعہ اس کے خوف اور ڈر اور اندیشوں کو تحریک دینا بھی مقصود تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حمایت و مدد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ صرف حسنِ سلوک اور اخلاقی عمل نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ اس کا مفاد وابستہ تھا اور یہ اپنے لئے حمایت کا ایک ذریعہ تھا، اور قریش کے لوگ جب دیکھ رہے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنو نوفل کی پناہ میں داخل ہو رہے ہیں اور حال یہ ہے کہ وہ ہتھیاروں کے ذریعہ آپ کی حفاظت کر رہے ہیں تو قریش کی خاموشی نوفل کے ہتھیاروں کے خوف کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ ان کی خاموشی خزاعہ کے اسلحہ اور خزرج کے تیروں کو دیکھتے ہوئے تھی۔ (اصول الفکر السیاسی فی القرآن المکی، ص 180)

اسی طرح یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ مطعم وہ شخص ہے جو دیگر لوگوں کے ساتھ ظالمانہ معاہدہ کی دستاویز کو پھاڑنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور ابو طالب نے جب ان کو ترغیب دی اور غیرت دلائی تو انہوں نے قابلِ تحسین موقف اختیار کیا تھا، ابو طالب نے اپنے لامیہ قصیدہ میں کہا تھا:

أمطْعمُ لَمْ أخذُلْك في يوم نجدة ... وَلَا مُعظم عندَ الأمور الجَلَائلِ
جَزى الله عنَّا عبدَ شمسٍ ونوفلًا ... عقوبةَ شرٍ عاجلًا غير آجلِ

ترجمہ: ”اے مطعم! میں نے اس روز بھی تمہیں بے یارومددگار نہیں چھوڑا تھا جب نصرت وحمایت کی شدید ضرورت تھی اور نہ ہی بڑے بڑے مسائل کو کوئی اہمیت دی تھی، اللہ ہماری طرف سے عبد شمس اور نوفل کو فوری طور پر سخت سزا دے جس میں کوئی تاخیر نہ ہو“۔ (التحالف السیاسی فی الاسلام، ص36)

اللہ کے رسول ﷺ نے مطعم بن عدی کا یہ کارنامہ یاد رکھا تھا اور اس کو بھی یاد رکھا تھا کہ مطعم نے اپنے لئے، اپنی اولاد کے لئے اور اپنی قوم کے لئے آپ ؐ کی وجہ سے کتنا بڑا خطرہ مول لیا تھا، اسی لئے آپ ﷺ نے بدر کے (ستر) 70 قیدیوں کو گرفتار کرنے کے بعد فرمایا تھا: اگر مطعم بن عدی زندہ ہوتے اور وہ مجھ سے ان بدبودار لوگوں کے بارے میں بات کرتے تو میں ضرور ان کی وجہ سے ان کو چھوڑ دیتا۔ (صحیح بخاری: 4024، سنن ابوداود: 2689، مسند احمد: 4/80)

عقائدی اختلافات کے باوجود رسول اللہ ﷺ ان لوگوں کو اچھی طرح پہچانتے تھے جو اس عقیدہ کے ساتھ دشمنی کرتے ہیں اور اس کے خلاف جنگ کرتے ہیں، اور ان لوگوں سے بھی واقف تھے جو اس عقیدہ کی نصرت وحمایت کرتے ہیں اور اس کے ساتھ مصالحانہ رویہ رکھتے ہیں، لہٰذا یہ لوگ اگرچہ کفار تھے لیکن یہ نبوی صفات کے برخلاف ہے کہ حسنِ سلوک اور اچھے کام کا سرے سے انکار کر دیا جائے۔ (التحالف السیاسی فی الاسلام، ص44)

شاعرِ رسول حضرت حسان بن ثابت ؓ نے بھی مطعم بن عدی کے موقف کی مدح وتعریف کی ہے، انہوں نے اپنے اشعار میں کہا ہے:

فَلَو كَانَ مجدٌ مخلد اليوم وَاحدًا ... منْ النّاس، نَجى مجدُه اليومَ مُطْعَما
أجرت رسولَ الله منهم فأصبَحوا ... عبيدَكَ ما لبى مهل وأحرما
فَلَو سئلت عَنْهُ معدٌّ بأسرها ... وقحطانُ أَو باقي بقية جرهُمْ
لَقَالُوا هو الموفي بخفرة جاره ... وذمته يوماً إذا ما تجشما
وما تطلع الشمس المَنيرةُ فوقهم ... علَى مثله فيهم أعزَّ وأكرما
وآبى إذا يأَبى وألْين شيمةً ... وأنوم عنْ جَارِ إذَا الليل أظْلَما

ترجمہ: ”اگر آج مجد وبزرگی لوگوں میں سے کسی کو دوام وبقاء دے سکتی ہے تو مطعم کو آج اس کی نیکی اور بزرگی بچا لیتی۔ اے مطعم! آپ نے ان (دشمنوں) کے مقابلہ میں اللہ کے رسول ﷺ کو پناہ دی تو وہ سب آپ کے غلام اور مطیع وفرمانبردار بن گئے، جب تک کہ احرام سے باہر شخص تلبیہ کہتا رہا اور احرام باندھتا رہا، اگر ان (مطعم) کے بارے میں قبیلۂ معد کے تمام لوگوں سے قبیلۂ قحطان سے اور جرھم کے باقی لوگوں سے دریافت کیا جائے تو یقیناً وہ سب کہیں گے کہ وہ اپنے پڑوسی کے عہد وپیمان اور ذمہ کو اُس وقت پورا کرتے ہیں جب کہ وہ پناہ طلب کرے۔ روشن وتابناک سورج ان سے بہتر ومعزز شخص پر کبھی طلوع نہیں ہوا ہے، جب وہ کسی چیز کا انکار کریں تو وہ انتہائی خوددار ہیں اور جب رات کی تاریکی چھا جاتی ہے تو پڑوسی کے لئے سب سے زیادہ بے ضرر اور نرم خو ہوتے ہیں“۔ (البدایہ والنہایہ، 3/136)

نبی کریم ﷺ نے مطعم بن عدی کے بارے میں حضرت حسان بن ثابتؓ کی تعریف وستائش کو سراہا اور بذاتِ خود آپ ﷺ نے مطعم کو اس قدر مقام عطا کیا کہ یہاں تک فرمایا کہ: اگر مطعم زندہ ہوتے اور قیدیوں کے بارے میں سفارش کرتے تو ان کی وجہ سے قیدیوں کو آزاد کر دیتے۔ اس میں اس بات کی واضح دلیل موجود ہے کہ یہ اسلامی شریعت کی خصوصیات وامتیازات میں سے ہے کہ اہل فضل اور محسنین کے فضل واحسان کا اعتراف کیا جائے، ان کے حسنِ سلوک کی تعریف کی جائے، اگرچہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہوں!۔

اس طرح سے نبی کریم ﷺ معاشرہ میں موجود عرف وعادات اور تقالید کو اسلامی مصلحت ومفاد کے لئے استعمال کرتے تھے، آپ ﷺ موجود معاشرتی نظام کو اس نظر سے دیکھتے تھے کہ وہ ایک حقیقی اور تاریخی بنیاد رکھتا ہے، اور ایک منکر حق انسان کو معاشرہ سے منقطع شخص کی طرح اور گنتی کا عام انسان نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اس کو اس نظر سے دیکھتے تھے کہ وہ باہم دیگر تعلقات رکھنے والے اور متنوع محرکات کے حامل معاشرتی نیٹ ورک کا ایک اہم فرد ہے، ایک انسان کے پاس اس کا موقع بھی ہوتا ہے اور اس کا امکان بھی کہ وہ بذاتِ خود اپنے اختیار وارادہ سے ایک مؤثر اجتماعی قوت میں تبدیل ہو جائے اور اختیار کردہ اقدار کے مطابق کوئی بھی فیصلہ لینے میں یا کسی فیصلہ کو توڑنے میں اس کا ایک مقام اور وزن ہو، اس اعتبار سے مطعم بن عدی صرف ایک فرد نہیں تھے بلکہ وہ ایک مستقل ادارہ تھے، اور اس ادارہ کا آغاز ان کی ولادت سے نہیں ہوا تھا بلکہ اس کا وجود قدیم تاریخ سے تھا، جس میں توحید وشرک کی اقدار کی کشمکش جاری تھی، اگرچہ اس ادارہ پر اب صرف کفار قابض ہو چکے تھے اور انہی کا غلبہ تھا لیکن اس کا مطلب ہر گز یہ نہیں ہے کہ اس سے استفادہ ناممکن ہو اور ایمان وتوحید کی طرف واپس آنے کے لئے اس کو تیار کرنا محال ہو۔ (دیکھیں: اُصول الفکر السیاسی، ص 181)

6: نصرانی عدّاس اور جنات کے قبولِ اسلام کا واقعہ:

نبی کریم ﷺ کو اس سفر میں اہم دعوتی کامیابیاں بھی حاصل ہوئیں، چنانچہ آپ ﷺ کی دعوت سے نصرانیت کا پیروکار عداس غلام متاثر ہوا اور اس نے اسلام قبول کر لیا، اسی طرح آپ ﷺ کی دعوت جنات تک بھی پہنچی اور انہوں نے بھی اسلام قبول کر لیا اور اس کے بعد اپنی قوم تک یہی دعوت لے کر چلے گئے۔

أ) عدّاس کا واقعہ:

رسول ﷺ کو جب اہلِ طائف کی ایذاء کا سامنا کرنا پڑا تو آپ ﷺ وہاں سے نکل آئے، اُنہوں نے آپ ﷺ کو عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ کے ایک باغ میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا، یہ دونوں اپنے باغ میں موجود تھے، ان دونوں نے آپ ﷺ کو دیکھا تو آپ پر ترس آیا اور اپنے ایک عیسائی غلام کو بلایا جس کہ نام "عدّاس" تھا، اس سے کہا: انگور کا ایک گچھا لو اور اس پلیٹ میں رکھ کر اس شخص کے پاس لے کر جاؤ اور اس سے کھانے کے لئے کہو، عدّاس نے ایسا ہی کیا اور اس کے بعد اس کو لا کر رسول اللہ ﷺ کے سامنے رکھا اور آپؐ سے کھانے کے لئے کہا، جب آپؐ نے کھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو بِسمِ اللہِ کہا اور پھر کھانا شروع کیا، عدّاس نے آپؐ کے چہرہ کی طرف دیکھا اور کہا: اللہ کی قسم! اس طرح کا کلام تو اس علاقہ کے لوگ نہیں کہتے ہیں۔ آپؐ نے اس سے پوچھا کہ آپ کس علاقہ سے تعلق رکھتے ہو؟ اے عداس! اور آپ کس دین کے پیروکار ہو؟! اس نے کہا: میں نصرانی (عیسائی) ہوں اور میں نینویٰ علاقہ سے تعلق رکھتا ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا: نیک و

صالح شخص یونس بن متی کے علاقہ سے، عداس نے آپ ﷺ سے استفسار کیا: آپ یونس بن متی کو کیسے جانتے ہیں؟ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: وہ میرے بھائی ہیں، وہ نبی تھے اور میں بھی نبی ہوں۔ یہ سن کر عداس آپ ؐ کی طرف جھک گیا۔ آپ ؐ کے سر کو، ہاتھوں کو اور پیروں کو چومنے لگا۔ ربیعہ کے بیٹے ایک دوسرے سے کہنے لگے: تمہارے غلام کو اس نے بگاڑ دیا۔ جب عداس ان کے پاس آیا تو دونوں اس سے کہنے لگے: عداس تمہارا برا ہو! اس شخص کے سر، ہاتھ اور پیر کیوں چوم رہے تھے؟ اس نے کہا: اے میرے آقا! روئے زمین پر ان سے بہتر کوئی نہیں ہے۔ انہوں نے مجھے ایک ایسی بات بتائی ہے جس کو نبی کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا ہے۔ ان دونوں نے اس سے کہا: اے عداس! خیال رکھنا، یہ تمہیں اپنے دین سے دور نہ کر دیں، اس لئے کہ تمہارا دین ان کے دین سے بہتر ہے۔ (سیرت ابن ہشام 62-63/2، تفسیر القرطبی 16/195- 196، صحیح السیرۃ النبویہ، ص136-137)

- بے شک کھانے سے پہلے نبی کریم ﷺ کا تسمیہ (بسم اللہ) پڑھنا اسلام کی سنتوں میں سے ایک بنیادی سنت کی عملی تطبیق ہے، اسی کی برکت تھی کہ یہ نصرانی شخص اسلام کی طرف مائل ہوا، جیسے ہی اللہ کے رسول ؐ نے کھانے سے پہلے اللہ تعالیٰ کا نام لیا اس کے ذریعہ اس نصرانی غلام کا پورا جسم ہل گیا اور اس کے احساسات وجذبات میں تحریک پیدا ہوئی اور اس نے اپنے استعجاب کا اظہار نبی کریم ﷺ سے بھی کیا، اس لئے کہ اس ملک کے لوگوں کے ہاں کا اللہ کا نام لینا معروف نہیں تھا۔

- بلاشبہ کھانے سے پہلے تسمیہ (بسم اللہ) پڑھنا دیگر سنتوں کی طرح آس پاس کے دیگر لوگوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کے امتیازات اور تشخصات میں سے ہے، یہ امتیاز غیر مسلموں کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے اور ان کے ذہن میں سوال پیدا کرتا ہے، اور پھر ان کو دینِ اسلام کو سمجھنے اور اس کی طرف مائل ہونے کا ذریعہ بنتا ہے۔

- رسول اللہ ﷺ کی نبوت کے بارے میں عداس کا یقین انتہائی قوی تھا، اس کی دلیل یہ ہے کہ اس کے آقاؤں عتبہ اور شیبہ نے جب جنگ بدر کے لئے نکلنا چاہا اور اس کو بھی اپنے ساتھ لے کر چلنے کا حکم دیا تو اس نے ان دونوں سے کہا: تم اس آدمی کے ساتھ جنگ کرنا چاہتے ہو جس کو میں نے تمہارے باغ میں دیکھا تھا، اللہ کی قسم! اس کے سامنے تو پہاڑ بھی نہیں ٹک سکتے ہیں۔ ان دونوں نے کہا: اے عداس تمہارا برا ہوا! اس نے اپنی زبان سے تم پر جادو کر دیا ہے۔ (دیکھیں: التاریخ الاسلامی، 3/22 سبل الہدیٰ والرشاد، 2/578)

- عداس کا یہ کہنا کہ واللہ! روئے زمین پر اس شخص سے بہتر کوئی شخص نہیں ہے، اس میں زبردست مؤاسات وہمدردی کا پیغام ہے، اگرچہ آپ ﷺ کی قوم نے آپ ؐ کو ایذا پہنچائی لیکن عراق کے علاقہ نینویٰ سے آیا ہوا یہ شخص آپ ؐ کے ہاتھ، پاؤں پر جھک جاتا ہے اور ہاتھ، پیروں کو بوسہ دیتا ہے، اور آپ ﷺ کی رسالت کا اقرار کرتا ہے، یقیناً یہ ربانی فیصلہ ہے کہ نینوی کا ایک شخص اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتا ہے، جب کہ قریب ترین لوگ اس سے اعراض اور پہلو تہی برتتے ہیں۔ (التربیۃ القیادیۃ: 437)

ب) جنات کا قبولِ اسلام:

جب نبی کریم ﷺ طائف سے مکہ کی جانب واپس آئے، جبکہ ثقیف کی طرف سے آپ ؐ ناامید ہو گئے، یہاں تک کہ آپ ؐ نخلہ کے مقام پر تھے تو آدھی رات کے وقت آپ نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہوئے تو آپ ﷺ کے پاس سے جنات کے ایک گروہ کا گزر ہوا، جن کا

ذکر اللہ تعالیٰ نے کیا ہے اور وہ نصیبین کے جنات میں سے سات جنات تھے، انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی تلاوت سنی تو جب آپؐ نماز سے فارغ ہو گئے تو وہ اپنی قوم کو دعوت دینے کے لئے واپس گئے، وہ ایمان لا چکے تھے اور جو کچھ سنا تھا اس پر لبیک کہا تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کے واقعہ کو نبی کریم ﷺ سے بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ﴿وَإِذْ صَرَفْنَآ إِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ ٱلْجِنِّ يَسْتَمِعُونَ ٱلْقُرْءَانَ فَلَمَّا حَضَرُوهُ قَالُوٓاْ أَنصِتُواْ ۖ فَلَمَّا قُضِىَ وَلَّوْاْ إِلَىٰ قَوْمِهِم مُّنذِرِينَ ﴿٢٩﴾ قَالُواْ يَٰقَوْمَنَآ إِنَّا سَمِعْنَا كِتَٰبًا أُنزِلَ مِنۢ بَعْدِ مُوسَىٰ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِىٓ إِلَى ٱلْحَقِّ وَإِلَىٰ طَرِيقٍ مُّسْتَقِيمٍ﴾ ترجمہ: (اور وہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے) جب ہم جنوں کے ایک گروہ کو تمہاری طرف لے آئے تھے تاکہ قرآن سنیں، جب وہ اُس جگہ پہنچے (جہاں تم قرآن پڑھ رہے تھے) تو انہوں نے آپس میں کہا خاموش ہو جاؤ، پھر جب وہ پڑھا جا چکا تو وہ خبردار کرنے والے بن کر اپنی قوم کی طرف پلٹے۔ انہوں نے جا کر کہا: اے ہماری قوم کے لوگو، ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰؑ کے بعد نازل کی گئی ہے، تصدیق کرنے والی ہے اپنے سے پہلے آئی ہوئی کتابوں کی، رہنمائی کرتی ہے حق اور راہ راست کی طرف"۔ (سورۃ الاحقاف: 29-30)

یہ جنات نبی کریم ﷺ کے پاس اس وقت حاضر ہوئے جب کہ آپ ﷺ نخلہ کی وادی میں قرآن پڑھ رہے تھے، جب انہوں نے آپ کی تلاوت سنی تو کہنے لگے: خاموش رہو!

جس دعوت کو طائف کے مشرکین ٹھکرا رہے ہیں وہ ایک دوسرے عالم یعنی عالمِ جن تک پہنچ گئی، اور انہوں نے نبی کریم ﷺ کی دعوت کو قبول کیا اور پیغامِ حق لے کر اپنی قوم کی طرف گئے، جیسے کہ حضرت ابوذر غفاریؓ، حضرت طفیل بن عمرو دوسیؓ اور حضرت ضمادؓ اپنی اپنی قوم کی طرف یہ پیغام لے کر گئے، چنانچہ عالمِ جن میں بھی داعی بن گئے جو اللہ تعالیٰ کے پیغام کو اپنے بھائیوں تک پہنچانے لگے تھے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿يَٰقَوْمَنَآ أَجِيبُواْ دَاعِىَ ٱللَّهِ وَءَامِنُواْ بِهِۦ يَغْفِرْ لَكُم مِّن ذُنُوبِكُمْ وَيُجِرْكُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ﴾ ترجمہ: "اے ہماری قوم کے لوگو، اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت قبول کر لو اور اس پر ایمان لے آؤ، اللہ تمہارے گناہوں سے درگزر فرمائے گا اور تمہیں عذاب الیم سے بچا دے گا"۔ (سورۃ الاحقاف: 31)

اللہ کے رسول ﷺ کے اسم گرامی کی جانب صرف انسانوں ہی کے دل نہیں بلکہ جنات کے دل بھی مائل ہو گئے اور جنات میں سے بھی حواری بن گئے جنہوں نے توحید کا علم بلند کیا اور اپنے آپ کو داعیانِ حق کی صف میں شامل کیا، ان کی شان میں قرآن نازل ہوا جس کو تا قیامِ قیامت پڑھا جاتا رہے گا، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿قُلْ أُوحِىَ إِلَىَّ أَنَّهُ ٱسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ ٱلْجِنِّ فَقَالُوٓاْ إِنَّا سَمِعْنَا قُرْءَانًا عَجَبًا ﴿١﴾ يَهْدِىٓ إِلَى ٱلرُّشْدِ فَـَٔامَنَّا بِهِۦ ۖ وَلَن نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ أَحَدًا ﴿٢﴾ وَأَنَّهُۥ تَعَٰلَىٰ جَدُّ رَبِّنَا مَا ٱتَّخَذَ صَٰحِبَةً وَلَا وَلَدًا ﴿٣﴾ وَأَنَّهُۥ كَانَ يَقُولُ سَفِيهُنَا عَلَى ٱللَّهِ شَطَطًا ﴿٤﴾ وَأَنَّا ظَنَنَّآ أَن لَّن تَقُولَ ٱلْإِنسُ وَٱلْجِنُّ عَلَى ٱللَّهِ كَذِبًا ﴿٥﴾ وَأَنَّهُۥ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ ٱلْإِنسِ يَعُوذُونَ بِرِجَالٍ مِّنَ ٱلْجِنِّ فَزَادُوهُمْ رَهَقًا ﴿٦﴾ وَأَنَّهُمْ ظَنُّواْ كَمَا ظَنَنتُمْ أَن لَّن يَبْعَثَ ٱللَّهُ أَحَدًا ﴿٧﴾ وَأَنَّا لَمَسْنَا ٱلسَّمَآءَ فَوَجَدْنَٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيدًا وَشُهُبًا ﴿٨﴾ وَأَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَٰعِدَ

لِلسَّمۡعِ ۖ فَمَن يَسۡتَمِعِ ٱلۡـَٔانَ يَجِدۡ لَهُۥ شِهَابٗا رَّصَدٗا ۝٩ وَأَنَّا لَا نَدۡرِيٓ أَشَرٌّ أُرِيدَ بِمَن فِي ٱلۡأَرۡضِ أَمۡ أَرَادَ بِهِمۡ رَبُّهُمۡ رَشَدٗا ۝١٠ وَأَنَّا مِنَّا ٱلصَّٰلِحُونَ وَمِنَّا دُونَ ذَٰلِكَ ۖ كُنَّا طَرَآئِقَ قِدَدٗا ۝١١ وَأَنَّا ظَنَنَّآ أَن لَّن نُّعۡجِزَ ٱللَّهَ فِي ٱلۡأَرۡضِ وَلَن نُّعۡجِزَهُۥ هَرَبٗا ۝١٢ وَأَنَّا لَمَّا سَمِعۡنَا ٱلۡهُدَىٰٓ ءَامَنَّا بِهِۦ ۖ فَمَن يُؤۡمِنۢ بِرَبِّهِۦ فَلَا يَخَافُ بَخۡسٗا وَلَا رَهَقٗا ۝١٣ ﴾ ترجمہ: ''کہہ دو کہ مجھے اس بات کی وحی آئی ہے کہ کچھ جن (مجھ سے قرآن پڑھتے ہوئے) سن گئے ہیں، پھر انہوں نے (اپنی قوم سے) جا کر کہہ دیا کہ ہم نے عجیب قرآن سنا ہے۔ جو نیکی کی طرف رہنمائی کرتا ہے سو ہم اس پر ایمان لائے ہیں، اور ہم اپنے رب کا کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں گے۔ اور ہمارے رب کی شان بلند ہے نہ اس کی کوئی بیوی ہے اور نہ بیٹا۔ اور ہم میں سے بعض بے وقوف ہیں جو اللہ پر جھوٹی باتیں بنایا کرتے تھے۔ اور ہمیں خیال تھا کہ انسان اور جن اللہ پر ہر گز جھوٹ نہ بولیں گے۔ اور کچھ آدمی جنوں کے مردوں سے پناہ لیا کرتے تھے سو انہوں نے ان کی سرکشی اور بڑھا دی۔ اور وہ بھی سمجھے ہوئے تھے جیسا کہ تم نے سمجھ رکھا ہے کہ اللہ ہر گز کسی کو (رسول بنا کر) نہ بھیجے گا۔ اور ہم نے آسمان کو ٹٹولا تو ہم نے اسے سخت پہروں اور شعلوں سے بھرا ہوا پایا۔ اور ہم اس کے ٹھکانوں (آسمانوں) میں سننے کے لئے بیٹھا کرتے تھے، پس جو کوئی اب کان دھرتا ہے تو وہ اپنے لئے ایک انگارہ تاک لگائے ہوئے پاتا ہے۔ اور ہم نہیں جانتے کہ زمین والوں کے ساتھ نقصان کا ارادہ کیا گیا ہے یا ان کی نسبت ان کے رب نے راہ راست پر لانے کا ارادہ کیا ہے۔ اور کچھ تو ہم میں سے نیک ہیں اور کچھ اور طرح کے، ہم بھی مختلف طریقوں پر تھے۔ اور بے شک ہم نے سمجھ لیا ہے کہ ہم اللہ کو زمین میں (جا کر) کبھی عاجز نہ کر سکیں گے اور نہ ہی ہم بھاگ کر عاجز کر سکیں گے۔ اور جب ہم نے ہدایت کی بات سنی تو ہم اس پر ایمان لے آئے، پھر جو اپنے رب پر ایمان لے لایا تو نہ اسے نقصان کا ڈر رہے گا اور نہ ظلم کا''۔(سورۃ الجن: 1-13)

دعوتی میدان میں یہ فتح ربانی اس وقت حاصل ہوئی جب کہ رسول اللہ ﷺ نخلہ کی وادی میں تھے اور مکہ میں داخل ہونے سے عاجز تھے، تو کیا مکہ اور طائف کے سرکش ان اہلِ ایمان جنات کو گرفتار کر سکتے تھے؟ اور ان کو طرح طرح کی سزائیں دے سکتے تھے؟ اور جب نبی کریم ﷺ مطعم بن عدی کی پناہ میں مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو آپ ﷺ سورۃ الجن کی تلاوت فرما رہے تھے جس کی وجہ سے صحابہ کرام کے دل دعوتی میدان کی اس شاندار فتح سے متاثر اور خوش تھے، چنانچہ وہ تنہا اس معرکہ کے سپاہی نہیں تھے بلکہ ان کے جنات بھائی بھی شرک و توحید کے اس معرکے میں سرگرم تھے۔

جنات کے پہلے وفد کی رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کے چند ہی ماہ بعد جنات کا دوسرا وفد حبیب مصطفی ﷺ کے دیدار کے شوق میں اور رب العالمین کے کلام کو سننے کے لئے حاضر ہوا، چنانچہ حضرت علقمہؒ سے روایت ہے فرماتے ہیں: میں نے عبداللہ بن مسعودؓ سے دریافت کیا کہ کیا آپ میں سے کوئی لیلۃ الجن میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ موجود تھا؟ انہوں نے کہا: نہیں! البتہ ایک رات ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے تو آپ ﷺ ہم سے گم ہو گئے، ہم نے آپ کو پہاڑ کی وادیوں میں اور گھاٹیوں میں تلاش کیا مگر آپ ﷺ نہیں ملے، ہم کہنے لگے کہ آپ کو جن اڑا کر لے گئے یا آپ کو شہید کر دیا گیا۔ فرماتے ہیں: ہماری یہ رات بہت بُری گزری، جب صبح ہوئی تو دیکھا کہ آپ ﷺ حراء پہاڑ کی

طرف سے آرہے ہیں۔ ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! ہم نے آپ کو رات میں موجود نہیں پایا تو ہم نے آپ کو تلاش کیا، لیکن آپ کہیں نہیں ملے، چنانچہ ہم نے رات بڑی تکلیف میں گزاری۔

آپ ﷺ نے فرمایا: میرے پاس جنوں کا ایک قاصد آیا تھا تو میں اس کے ساتھ گیا اور میں نے جا کر جنوں کو قرآن سنایا۔ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ پھر آپ ﷺ ہمیں اپنے ساتھ لے کر گئے اور ان کے نشان اور انگاروں کے نشان دکھائے، اور جنوں نے آپ ﷺ سے اپنے کھانے کے بارے میں دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: تمہارے لئے بطور غذا ہر اس جانور کی ہڈی ہے جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو وہ تمہارے ہاتھ میں آتے ہی وافر مقدار میں اس پر گوشت چڑھ جائے گا اور ہر مینگنی تمہارے جانوروں کے لئے چارہ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ان دونوں چیزوں سے استنجاء نہ کیا کرو کیونکہ یہ دونوں تمہارے جن بھائیوں کی خوراک ہے۔ (صحیح مسلم: 450، سنن ابی داؤد: 85، سنن ترمذی: 18)

عالمِ جن کی عظیم فتح اور واضح کامیابی عالمِ انس کی عظیم الشان فتوحات وکامیابیوں کی تمہید اور پیشن گوئی تھی، چنانچہ اس واقعہ کے چند ہی مہینے بعد انصار کے وفد سے آپ کی ملاقات ہوئی۔ (التربیۃ القیادیۃ 1/443 - 445)

جنات کے رسول اللہ ﷺ سے قرآن سننے کے ضمن میں ڈاکٹر بوطی لکھتے ہیں: "اس پورے واقعہ کو پڑھنے کے بعد ہمارے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ جنات کے وجود پر ایمان رکھے اور یہ سمجھے کہ وہ زندہ مخلوق ہیں جن کو اللہ عزوجل نے اسی طرح اپنی عبادت کا مکلف بنایا ہے جیسے کہ ہم کو اس کا مکلف ٹھہرایا ہے، ہمارے حواس و مدرکات کو اس کا احساس اس لئے نہیں ہوتا ہے کیونکہ اللہ عزوجل نے ان کے وجود کو اس بصری طاقت کے تابع نہیں رکھا ہے جس کو ہماری آنکھوں میں ودیعت کیا ہے، اور یہ بات تو معلوم ہی ہے کہ ہماری آنکھیں موجودات میں سے متعین چیزیں، متعین مقدار اور متعین شرائط کے ساتھ ہی دیکھ سکتی ہے۔

بلاشبہ ان مخلوقات کا وجود ایسے متواتر اور یقینی دلائل پر مبنی ہے جو دلائل کتاب وسنت میں واضح طور پر موجود ہیں، لہٰذا ان مخلوقات کا وجود دینی اعتبار سے ایک ضروری معلوم چیز بن گئی ہے، اور ان مخلوقات کی تکذیب سے اس صادق و متواتر حکم کی تکذیب لازم آتی ہے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ذریعہ ہم تک تواتر کے ساتھ پہنچا ہے۔

عقل و شعور رکھنے والے کسی شخص کے لئے اس طرح کے غفلت و جہالت پر مبنی تصورات رکھنا درست نہیں ہے کہ وہ صرف انہیں چیزوں پر ایمان رکھے جو سائنس اور مشاہدہ کے مطابق ہو اور پھر وہ اسی کے مطابق جنات کے وجود ہی کا منکر ہو، صرف اس لئے کہ اس نے جنات کو نہیں دیکھا ہے اور نہ ہی ان کو محسوس کیا ہے۔

یہ بدیہی بات ہے کہ اپنے آپ کو پڑھا لکھا سمجھنے والے اس طرح کے جاہل کو بہت سے یقینی موجودات کا انکار اسی ایک سبب کو بنیاد بنا کر کرنا چاہیے اور وہ سبب یہ ہے کہ کسی چیز کو نہ دیکھنے کا امکان، جبکہ مشہور علمی قاعدہ یہ کہتا ہے کہ کسی چیز کو محسوس نہ کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ چیز موجود ہی نہیں ہے۔ (دیکھیں: فقہ السیرۃ النبویۃ، ص105-106)

عالم الثقلین یعنی جن وانس میں نبی کریم ﷺ کو جس عظیم ربانی تکریم سے نوازا گیا اب وقت آگیا ہے کہ بلند عالمِ سماوات، عالمِ ملائکہ اور اللہ عزوجل کی بارگاہ کی جانب آپ ﷺ کے سفرِ مبارک کے بارے میں گفتگو کی جائے، یہاں تک کہ آپ ﷺ کو تمام مخلوقات سے بلند کر کے اللہ نے اپنے پاس بلالیا اور پھر لوگوں کے پاس آپ ﷺ کو واپس بھیجا اور آپؐ نے لوگوں کے سامنے وہ سب کچھ بیان کر دیا جو کچھ اس عظیم اور مبارک سفر میں دیکھا تھا، یہ ایک ایسا سفر تھا جس کی کوئی مثال نہ ماضی میں عالم انسانیت میں ملتی ہے اور نہ ہی تا قیامِ قیامت اس طرح کی مثال مل سکتی ہے۔ (دیکھیں: التربیۃ القیادیۃ 1/446)

....

چوتھا باب

اسراء ومعراج اور عزت وتکریم کا تاج

رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حضرت ابو طالب کا وجود ایک ڈھال کی حیثیت رکھتا تھا، جو آپ ﷺ سے قریش کی ایذاء رسانی کو دور رکھتے تھے، اس لئے کہ قریش حضرت ابو طالب کو ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے، لیکن جب حضرت ابو طالب کی وفات ہوگئی تو یہ ڈھال ٹوٹ گئی اور رسول اللہ ﷺ کو بہت زیادہ جسمانی اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا۔

اسی طرح آپ ﷺ کی زوجہ مطہرہ حضرت خدیجہ ؓ رسول اللہ ﷺ کے لئے مشرکین کی جانب سے لگنے والے نفسیاتی زخموں پر مرہم پٹی کا کام کرتی تھیں، اور جب حضرت خدیجہ ؓ کی وفات ہوگئی تو رسول اللہ ﷺ کا یہ سہارا بھی ٹوٹ گیا۔

اللہ کے رسول ﷺ اس وقت طائف کے لئے نکلے جبکہ قریش کی ایذاء رسانی میں کافی شدت آگئی، اور آپ ﷺ کو ہر طرح سے انہوں نے تنگ کرنا شروع کیا، آپ ﷺ اہلِ طائف سے اس حق کی نصرت وتائید کا مطالبہ کرنے کے لئے تشریف لے گئے تھے جس کے آپ ؐ داعی تھے تاکہ آپ ؐ اللہ کے دین کو دوسروں تک پہنچانے میں کامیاب ہوتے، لیکن اہل طائف نے آپ ﷺ کے ساتھ انتہائی برا سلوک کیا اور اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ قریش کے پاس ایک قاصد کو بھیج کر رسول اللہ ﷺ کے خلاف ان کو مزید برانگیختہ کیا جس کے نتیجہ میں وہ مزید سخت ہوگئے اور ان کی شر انگیزی میں مزید اضافہ ہوا، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ مکہ میں اسی وقت داخل ہو پائے جب کہ ایک غیر مسلم شخص نے آپ ﷺ کو اپنی پناہ میں لیا، قریش سب کے سب آپ ﷺ کے خلاف یکجٹ ہوگئے اور چاروں طرف سے رسول اللہ ﷺ کو گھیر لیا جس کی وجہ سے آپ ﷺ کے حزن وغم اور تکلیف میں اضافہ ہی ہوتا رہا یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کے لئے اس سال کو "عام الحزن" یعنی دکھ کا سال قرار دیا گیا۔ (دیکھیں: دراسۃ تحلیلیۃ لشخصیۃ الرسول ﷺ، ص 128)

اس کے بعد ہی اللہ کے رسول ﷺ کے لئے ایک عظیم معجزہ کا ظہور ہوا اور وہ ہے: اسراء ومعراج کا معجزہ۔ اس معجزہ کے ظہور کے مختلف اہداف تھے جن میں سے چند اہم اہداف مندرجہ ذیل ہیں:

- اللہ عزوجل نے اپنے رسول ﷺ کو اپنی قدرت کے عظیم مظاہر سے واقف کرانا چاہا تاکہ آپ ﷺ کا دل اللہ پر ایمان واعتماد سے لبریز ہو جائے، اور آپ ؐ روئے زمین پر قائم باطل نظام کے مقابلہ کے لئے قوی تر ہو جائیں، جیسے کہ موسی علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا۔ اللہ تعالیٰ نے موسی ؑ کو بھی اپنی قدرت کے عجائبات دکھائے تھے، جیسے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: [وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يَا مُوسَىٰ (17) قَالَ هِيَ عَصَايَ أَتَوَكَّأُ عَلَيْهَا وَأَهُشُّ بِهَا عَلَىٰ غَنَمِي وَلِيَ فِيهَا مَآرِبُ أُخْرَىٰ (18) قَالَ أَلْقِهَا يَا مُوسَىٰ (19) فَأَلْقَاهَا فَإِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعَىٰ (20) قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ ۖ سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْأُولَىٰ (21) وَاضْمُمْ يَدَكَ إِلَىٰ جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ آيَةً أُخْرَىٰ (22)] ترجمہ: "اور اے موسیٰ تیرے دائیں ہاتھ میں کیا ہے۔ کہا یہ میری لاٹھی ہے، اس پر ٹیک لگاتا ہوں اور اس سے اپنی بکریوں پر پتے جھاڑتا ہوں اور اس میں میرے لئے اور بھی فائدے ہیں۔ فرمایا: اے موسیٰ! اسے ڈال دو۔ پھر اسے ڈال دیا تو اسی وقت وہ دوڑتا ہوا سانپ ہوگیا۔ فرمایا: اسے پکڑ لے اور نہ ڈر، ہم

ابھی اسے پہلی حالت پر پھیر دیں گے۔اور اپنا ہاتھ اپنی بغل سے ملا دے بلا عیب سفید ہو کر نکلے گا،یہ دوسری نشانی ہے"۔(سورۃ طہ:17-22)جب ان عظیم آیات و نشانیوں کے ذریعہ ان کا دل تیار ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد فرمایا:[لِنُرِيَكَ مِنْ آيَاتِنَا الْكُبْرَىٰ] ترجمہ: "اس لئے کہ ہم تجھے اپنی بڑی نشانیاں دکھانے والے ہیں"۔ (سورہ طہ:23)

اسراء و معراج کے سفر میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو ان عظیم نشانیوں کا مشاہدہ اس لئے کرایا تاکہ یہ ہجرت کے لئے اور کفر و ضلالت کے ساتھ تاریخ کی عظیم کشمکش کے لئے تمہید بن سکے، اللہ کے رسول ﷺ نے اس سفر میں بہت سی نشانیوں کا مشاہدہ فرمایا، جیسے کہ بیت المقدس کا مشاہدہ، آسمانوں کی سیر،انبیاء و مرسلین اور فرشتوں سے ملاقات، جنت و جہنم اور انعامات و عذاب کے مختلف نمونوں کا مشاہدہ۔

اسراء کے بارے میں قرآنِ کریم نے سورۃ الاسراء میں اور معراج کے بارے میں سورۃ النجم میں ذکر کیا ہے،سورۃ الاسراء میں اسراء کی حکمت ان الفاظ کے ذریعہ بیان کی ہے: ﴿لِنُرِيَهُۥ مِنْ ءَايَٰتِنَآ﴾ ترجمہ: "تاکہ ہم ان کو اپنی بعض نشانیاں دکھائیں"۔(سورۃ الاسراء:1)اسی طرح سورۃ النجم میں ان الفاظ کے ساتھ ذکر کیا ہے: ﴿لَقَدْ رَأَىٰ مِنْ ءَايَٰتِ رَبِّهِ ٱلْكُبْرَىٰٓ﴾ ترجمہ: "اور اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں"۔(سورۃ النجم:18)اسراء و معراج کا سفر عظیم علوم و اسرار، حکمتوں، دروس و اسباق اور عبرتوں پر مشتمل ہے۔

استاذ ابوالحسن ندویؒ فرماتے ہیں: "واقعۂ معراج محض ایک جزئی و ضمنی واقعہ نہ تھا جس میں رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی بڑی نشانیوں کا مشاہدہ کرایا گیا اور آسمان و زمین کی بادشاہت بے پردہ و بے حجاب ہو کر آپؐ کے سامنے آگئی، نبوّت کے اس غیبی و آسمانی سفر میں اس کے علاوہ بھی بہت بلند و لطیف مطالب و معانی پوشیدہ ہیں اور اس میں بہت دور رس اشارات کئے گئے ہیں، یہ دونوں سورتیں سورۃ الاسراء اور سورۃ النجم، جو واقعۂ معراج کے سلسلہ میں نازل ہوئیں، یہ اعلان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ دونوں قبلوں (مسجدِ حرام اور مسجد اقصی) کے نبی اور دونوں سمت مشرق و مغرب کے امام، اور اپنے پیش رو تمام انبیائے کرام کے وارث اور بعد میں آنے والی پوری نسلِ انسانی کے رہبر و رہنما ہیں، آپؐ کی شخصیت اور آپؐ کے سفر معراج میں مکہ بیت المقدس سے اور مسجد حرام مسجد اقصی سے ہم آغوش ہو گئی، آپؐ کی امامت میں تمام انبیاء نے نماز پڑھی ،اور یہ دراصل آپؐ کے پیغام اور دعوت کی عمومیت و آفاقیت، آپؐ کی امامت کی ابدیت، اور ہر طبقۂ انسانی کے لئے آپؐ کی تعلیمات کی ہمہ گیری و صلاحیت کی دلیل و علامت تھی۔

یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کا صحیح تعارف اور اس کی صحیح نشاندہی، آپ کی امامت و قیادت کا بیان، آپ کی اس امت (جس میں آپؐ مبعوث ہوئے) کے اصل مقام و حیثیتِ عرفی کا تعین اور اس پیغام و دعوت اور مخصوص کردار کی پردہ کشائی کرتا ہے جو اس امت کو اس وسیع و عریض دنیا اور عالمی برادری میں انجام دینا ہے"۔(دیکھیں: نبی رحمت، ص190-191)

ا) اسراء و معراج کا واقعہ احادیث کی روشنی میں:

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میرے پاس براق لایا گیا - اور وہ ایک سفید اور طویل جانور ہے، گدھے سے اونچا اور خچر سے چھوٹا، اپنے قدم وہاں رکھتا ہے جہاں تک اس کی نگاہ پہنچتی ہے - آپؐ نے فرمایا: میں اس پر سوار

ہوا یہاں تک کہ بیت المقدس پہنچ گیا، وہاں اس جانور کو اس حلقہ سے باندھ دیا جس سے دوسرے پیغمبر اپنے اپنے جانوروں کو باندھا کرتے تھے، پھر میں مسجد کے اندر داخل ہوا اور دو رکعت نماز ادا کی، بعد میں اس کے باہر نکلا تو جبرئیل - علیہ السلام - دو برتن لے کر آئے، ایک میں شراب تھی اور ایک میں دودھ تھا۔ میں نے دودھ کا انتخاب کیا تو جبرئیلؑ نے کہا: آپ نے فطرت کا انتخاب کیا۔(صحیح بخاری: 162)

حضرت مالک بن صعصعہؓ کی روایت کردہ حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان سے لیلۃ الاسراء کے بارے میں بیان کیا، آپؐ نے فرمایا کہ میں حطیم میں لیٹا ہوا تھا - بعض دفعہ قتادہ نے حطیم کے بجائے 'حجر' بیان کیا - کہ میرے پاس ایک آنے والا آیا (یعنی جبریلؑ) اور میرا سینہ چاک کیا۔ قتادہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت انسؓ سے سنا، وہ بیان کرتے ہیں کہ یہاں سے یہاں تک سینہ چاک کیا۔ میں نے جارود سے جو میرے قریب ہی بیٹھے تھے، پوچھا کہ انسؓ کی اس لفظ سے کیا مراد تھی؟ انہوں نے کہا کہ حلق سے ناف تک چاک کیا۔(قتادہ نے بیان کیا کہ) میں نے حضرت انسؓ سے سنا، انہوں نے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ کے سینے کے اوپر سے ناف تک چاک کیا، پھر میرا دل نکالا اور ایک سونے کا طشت لایا گیا جو ایمان سے بھرا ہوا تھا، اس سے میرا دل دھویا گیا اور پہلے کی طرح رکھ دیا گیا۔ اس کے بعد ایک جانور لایا گیا جو گھوڑے سے چھوٹا اور گدھے سے بڑا تھا اور سفید! جارود نے انسؓ سے پوچھا: ابو حمزہ! کیا وہ براق تھا؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں۔ اس کا ہر قدم اس کے منتہائے نظر پر پڑتا تھا (نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ) مجھے اس پر سوار کیا گیا اور جبرئیلؑ مجھے لے کر چلے آسمان دنیا پر پہنچے تو دروازہ کھلوایا، پوچھا گیا کون صاحب ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ جبرائیل (علیہ السلام) پوچھا گیا اور آپ کے ساتھ کون ہے؟ آپ نے بتایا کہ محمد ﷺ۔ پوچھا گیا: کیا انہیں بلانے کے لیے آپ کو بھیجا گیا تھا؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہاں۔ اس پر آواز آئی (انہیں) خوش آمدید! کیا ہی مبارک آنے والے ہیں وہ! اور دروازہ کھول دیا۔ جب میں اندر گیا تو میں نے وہاں آدم علیہ السلام کو دیکھا، جبرئیلؑ نے فرمایا: یہ آپ کے جد امجد آدم علیہ السلام ہیں، انہیں سلام کیجئے۔ میں نے ان کو سلام کیا اور انہوں نے جواب دیا اور فرمایا: خوش آمدید نیک بیٹے اور نیک نبی! جبرئیلؑ اوپر چڑھے اور دوسرے آسمان پر آئے، وہاں بھی دروازہ کھلوایا آواز آئی: کون صاحب آئے ہیں؟ بتایا کہ جبرائیل (علیہ السلام) پوچھا گیا آپ کے ساتھ اور کوئی صاحب بھی ہیں؟ کہا محمد ﷺ۔ پوچھا گیا: کیا آپ کو انہیں بلانے کے لیے بھیجا گیا تھا؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہاں۔ پھر آواز آئی: انہیں خوش آمدید! کیا ہی اچھے آنے والے ہیں وہ۔ پھر دروازہ کھلا اور میں اندر گیا تو وہاں یحییٰ اور عیسیٰ علیہما السلام موجود تھے۔ یہ دونوں خالہ زاد بھائی ہیں۔ جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا: یہ عیسیٰ اور یحییٰ علیہما السلام ہیں، انہیں سلام کیجئے، میں نے سلام کیا اور ان حضرات نے میرے سلام کا جواب دیا اور فرمایا: خوش آمدید، نیک نبی اور نیک بھائی! یہاں سے جبرئیل علیہ السلام مجھے تیسرے آسمان کی طرف لے کر چڑھے اور دروازہ کھلوایا۔ پوچھا گیا: کون صاحب آئے ہیں؟ جواب دیا کہ جبرئیلؑ۔ پوچھا گیا اور آپ کے ساتھ کون صاحب آئے ہیں؟ جواب دیا کہ محمد ﷺ۔ پوچھا گیا: کیا انہیں لانے کے لیے آپ کو بھیجا گیا تھا؟ جواب دیا کہ ہاں۔ اس پر آواز آئی: انہیں خوش آمدید، کیا ہی اچھے آنے والے ہیں وہ! دروازہ کھلا اور جب میں اندر داخل ہوا تو وہاں یوسف علیہ السلام موجود تھے۔ جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا: یہ یوسف ہیں، انہیں سلام کیجئے، میں نے سلام کیا تو انہوں نے جواب دیا اور فرمایا: خوش آمدید، نیک نبی اور نیک بھائی! پھر جبرئیل علیہ السلام مجھے لے کر اوپر چڑھے اور چوتھے آسمان پر پہنچے، دروازہ کھلوایا تو پوچھا گیا: کون صاحب ہیں؟ بتایا کہ جبرئیل! پوچھا گیا: اور آپ کے ساتھ کون ہے؟ کہا کہ محمد ﷺ۔ پوچھا گیا:

کیا انہیں بلانے کے لیے آپ کو بھیجا گیا تھا؟ جواب دیا کہ ہاں، کہا کہ انہیں خوش آمدید، کیا ہی اچھے آنے والے ہیں وہ! اب دروازہ کھلا جب میں وہاں ادریس علیہ السلام کی خدمت میں پہنچا تو جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا: یہ ادریس علیہ السلام ہیں، انہیں سلام کیجئے، میں نے انہیں سلام کیا اور انہوں نے جواب دیا اور فرمایا: خوش آمدید، پاک بھائی اور نیک نبی!۔ پھر مجھے لے کر پانچویں آسمان پر آئے اور دروازہ کھلوایا پوچھا گیا: کون صاحب ہیں؟ جواب دیا کہ جبرئیل، پوچھا گیا: آپ کے ساتھ کون صاحب آئے ہیں؟ جواب دیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ پوچھا گیا کہ انہیں بلانے کے لیے آپ کو بھیجا گیا تھا؟ جواب دیا کہ ہاں، اب آواز آئی: خوش آمدید، کیا ہی اچھے آنے والے ہیں وہ! یہاں جب میں ہارون علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا تو جبرئیل علیہ السلام نے بتایا کہ یہ ہارون ہیں، انہیں سلام کیجئے، میں نے انہیں سلام کیا، انہوں نے جواب کے بعد فرمایا: خوش آمدید، نیک نبی اور نیک بھائی! یہاں سے لے کر مجھے آگے بڑھے اور چھٹے آسمان پر پہنچے اور دروازہ کھلوایا، پوچھا گیا: کون صاحب آئے ہیں؟ بتایا کہ جبرئیل، پوچھا گیا: آپ کے ساتھ کوئی دوسرے صاحب بھی آئے ہیں؟ جواب دیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ پوچھا گیا: کیا انہیں بلانے کے لیے آپ کو بھیجا گیا تھا؟ جواب دیا کہ ہاں۔ پھر کہا: انہیں خوش آمدید، کیا ہی اچھے آنے والے ہیں وہ!۔ میں جب وہاں موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا تو جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ موسیٰ علیہ السلام ہیں، انہیں سلام کیجئے، میں نے سلام کیا اور انہوں نے جواب کے بعد فرمایا: خوش آمدید، نیک نبی اور نیک بھائی! جب میں آگے بڑھا تو وہ رونے لگے، کسی نے پوچھا: آپ رو کیوں رہے ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا: میں اس پر رو رہا ہوں کہ یہ لڑکا میرے بعد نبی بنا کر بھیجا گیا لیکن جنت میں اس کی امت کے لوگ میری امت سے زیادہ ہوں گے۔ پھر جبرئیل علیہ السلام مجھے لے کر ساتویں آسمان کی طرف گئے اور دروازہ کھلوایا۔ پوچھا گیا: کون صاحب آئے ہیں؟ جواب دیا کہ جبرئیل، پوچھا گیا: اور آپ کے ساتھ کون صاحب آئے ہیں؟ جواب دیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ پوچھا گیا: کیا انہیں بلانے کے لیے آپ کو بھیجا گیا تھا؟ جواب دیا کہ ہاں۔ کہا کہ انہیں خوش آمدید، کیا ہی اچھے آنے والے ہیں وہ! میں جب اندر گیا تو ابراہیم علیہ السلام تشریف رکھتے تھے۔ جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ آپ کے جد امجد ہیں، انہیں سلام کیجئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے ان کو سلام کیا تو انہوں نے جواب دیا اور فرمایا: خوش آمدید، نیک نبی اور نیک بیٹے! پھر سدرۃ المنتہیٰ کو میرے سامنے کر دیا گیا، میں نے دیکھا کہ اس کے پھل مقام حجر کے مٹکوں کی طرح (بڑے بڑے) تھے اور اس کے پتے ہاتھیوں کے کان کی طرح تھے۔ جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ سدرۃ المنتہیٰ ہے۔ وہاں میں نے چار نہریں دیکھیں دو باطنی اور دو ظاہری۔ میں نے پوچھا: اے جبرئیل! یہ کیا ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ جو دو باطنی نہریں ہیں وہ جنت سے تعلق رکھتی ہیں اور دو ظاہری نہریں، نیل اور فرات ہیں۔ پھر میرے سامنے بیت المعمور کو لایا گیا، وہاں میرے سامنے ایک گلاس میں شراب، ایک میں دودھ اور ایک میں شہد لایا گیا، میں نے دودھ کا گلاس لے لیا تو جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا: یہی فطرت ہے اور آپ اس پر قائم ہیں اور آپ کی امت بھی! پھر مجھ پر روزانہ پچاس نمازیں فرض کی گئیں، میں واپس ہوا اور موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گزرا تو انہوں نے پوچھا کس چیز کا آپ کو حکم ہوا؟ میں نے کہا کہ روزانہ پچاس وقت کی نمازوں کا۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: لیکن آپ کی امت میں اتنی طاقت نہیں ہے۔ اس سے پہلے میرا واسطہ لوگوں سے پڑ چکا ہے اور بنی اسرائیل کا مجھے تلخ تجربہ ہے۔ اس لیے آپ اپنے رب کے حضور میں دوبارہ جائیے اور اپنی امت پر تخفیف کے لیے عرض کیجئے۔ چنانچہ میں اللہ تعالیٰ کے دربار میں دوبارہ حاضر ہوا اور تخفیف کے لیے عرض کی تو دس وقت کی

نمازیں کم کردی گئیں۔ پھر میں جب واپسی میں موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گزرا تو انہوں نے پھر وہی سوال کیا، میں دوبارہ بارگاہ رب تعالیٰ میں حاضر ہوا اور اس مرتبہ بھی دس وقت کی نمازیں کم ہوئیں۔ پھر میں موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گزرا تو انہوں نے وہی مطالبہ کیا، میں نے اس مرتبہ بھی بارگاہ رب تعالیٰ میں حاضر ہو کر دس وقت کی نمازیں کم کرائیں۔ موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے پھر گزرا انہوں نے اپنی رائے کا اظہار کیا، پھر بارگاہ الٰہی میں حاضر ہوا تو مجھے دس وقت کی نمازوں کا حکم ہوا میں واپس ہونے لگا تو آپ نے پھر وہی کہا، اب بارگاہ الٰہی میں حاضر ہوا تو روزانہ صرف پانچ وقت کی نمازوں کا حکم باقی رہا۔ موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا تو آپ نے دریافت فرمایا: اب کیا حکم ہوا؟ میں نے موسیٰ علیہ السلام کو بتایا کہ روزانہ پانچ وقت کی نمازوں کا حکم ہوا ہے۔ فرمایا کہ آپ کی امت اس کی بھی طاقت نہیں رکھتی، میرا واسطہ آپ سے پہلے لوگوں سے پڑ چکا ہے اور بنی اسرائیل کا مجھے تلخ تجربہ ہے۔ اپنے رب کے دربار میں پھر حاضر ہو کر تخفیف کے لیے عرض کیجئے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: رب سے میں بہت سوال کر چکا اور اب مجھے شرم آتی ہے۔ اب میں بس اسی پر راضی ہوں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ پھر جب میں وہاں سے گزرنے لگا تو ندا آئی: '' میں نے اپنا فریضہ جاری کر دیا اور اپنے بندوں پر تخفیف کر چکا''۔ (صحیح بخاری: 3887 صحیح مسلم: 164)

اسراء و معراج کا واقعہ ہجرت سے ایک سال پہلے پیش آیا جیسے کہ قاضی عیاض نے "الشفاء" میں وضاحت کی ہے۔ (الشفاء بتعریف حقوق المصطفی 1/108)

جب اللہ کے رسول ﷺ اپنے مبارک سفر سے واپس تشریف لائے تو اپنی قوم کے سامنے اس واقعہ کو بیان کیا، ایک مجلس میں مطعم بن عدی، عمرو بن ہشام اور ولید بن مغیرہ بیٹھے ہوئے تھے، اس مجلس میں آپ ﷺ نے ان سے بیان کیا کہ میں نے عشاء کی نماز اس مسجد میں ادا کی اور اسی مسجد میں صبح کی نماز بھی ادا کی، میں ان دونوں نمازوں کے مابین بیت المقدس آیا، انبیاء کا ایک گروہ میرے پاس لایا گیا جن میں ابراہیم -علیہ السلام- موسی- علیہ السلام- اور عیسی- علیہ السلام - بھی تھے، میں نے ان کو نماز پڑھائی اور ان سے بات چیت کی، یہ سن کر عمرو بن ہشام نے آپ ﷺ کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا: ان کا حلیہ مجھ سے بیان کریں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جہاں تک عیسی علیہ السلام کا تعلق ہے تو وہ قد آدم سے قدرے بلند، البتہ بہت زیادہ لمبے نہیں ہیں، کشادہ سینہ، سرخی مائل رنگ، گھنگریلے گھنے بال، اوپری حصہ قدرے روشن اور سفید، گویا کہ وہ عروہ بن مسعود ثقفی ہیں۔ اور جہاں تک موسی علیہ السلام کا تعلق ہے تو وہ لحیم شحیم انسان ہیں، لمبے قد کے ہیں، وہ شنوءہ کے لوگوں کی طرح ہیں، دانت ایک دوسرے سے بالکل قریب، ہونٹ اس طرح سکڑے ہوئے کہ اندر کے مسوڑھے ظاہر ہو جاتے ہیں۔ پیشانی پر شکنیں پڑی ہوئی ہیں۔ اور جہاں تک ابراہیم علیہ السلام کا تعلق ہے تو اللہ کی قسم! تو وہ شکل و شباہت اور اخلاق کے اعتبار سے لوگوں میں مجھ سے سب سے زیادہ مشابہ ہیں۔ (دیکھیں: التاریخ الاسلامی، الحمیدی 3/37)

مشرکین کہنے لگے: اے محمد! بیت المقدس کے خط و خال ہم سے بیان کریں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں رات میں داخل ہوا اور وہاں سے رات ہی کو نکلا، اسی اثناء میں آپ کے پاس جبرئیل ؑ مسجدِ اقصیٰ کی تصویر اپنے پروں میں لے کر آئے تو آپ ﷺ اس کو دیکھ کر کہنے لگے: اس کا ایک دروازہ فلاں جگہ ایسا ہے، اور اس کا ایک دروازہ فلاں جگہ ایسا ہے۔

اس کے بعد انہوں نے آپ ﷺ سے اپنے قافلوں کے بارے میں دریافت کیا تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: میں مقام روحاء میں فلاں قبیلہ کے قافلہ کے پاس سے گزرا جن کی ایک اونٹنی گم ہوگئی تھی اور وہ اس کی تلاش میں نکلے تھے، میں ان کے پڑاؤ کی جگہ پہنچا تو وہاں ان میں سے کوئی بھی نہیں تھا، اور وہاں پانی کا ایک پیالہ تھا تو میں نے اس میں پانی پیا۔ ان قافلہ والوں سے اس کے بارے میں دریافت کرلینا۔ اُنہوں نے کہا: واللہ! یہ تو نشانی ہے! اس کے بعد میں فلاں قبیلہ کے قافلہ کے پاس پہنچا، میری وجہ سے ان کے اونٹ بدک گئے، ان میں سے ایک سرخ اونٹ بیٹھ گیا جس پر سفید دھاری کی کاٹھی تھی، ان قافلہ والوں سے اس کے بارے میں دریافت کرلینا۔

اس کے بعد میں تنعیم میں فلاں قبیلہ کے قافلہ کے پاس پہنچا جن کے آگے آگے ایک بھورے رنگ کا اونٹ چل رہا تھا، اور وہ گھاٹی سے نمودار ہونے والے ہیں۔ ولید بن مغیرہ نے کہا: یہ جادوگر ہے۔ وہ لوگ وہاں سے نکلے اور دیکھا تو بالکل ویسے ہی پایا جیسے آپ ﷺ نے فرمایا تھا۔ سب نے آپ ﷺ پر سحر و جادو کا الزام لگایا اور کہنے لگے: ولید بن مغیرہ نے سچ کہا۔ (المطالب العالیہ 201-204، مجمع الزوائد 1/76-75، سیرت ابن ہشام: 2/11)

یہ واقعہ بعض ایمان لانے والوں کے لئے باعثِ آزمائش اور فتنہ تھا اور وہ مرتد ہوگئے، بعض لوگ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے پاس گئے اور کہنے لگے: کیا آپ نے سنا اپنے ان صاحب کے بارے میں جو یہ کہتے ہیں کہ ان کو راتوں رات بیت المقدس کا سفر کرایا گیا؟! انہوں نے فرمایا: کیا انہوں نے ایسا ہی کہا ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں! انہوں نے کہا: اگر انہوں نے ایسا کہا ہے تو سچ کہا ہے۔ لوگوں نے کہا: کیا آپ ان کی اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ وہ راتوں رات بیت المقدس گئے اور صبح سے پہلے واپس آگئے؟ حضرت ابو بکرؓ نے کہا: جی ہاں! میں تو آپ ﷺ کی تصدیق اس سے بھی زیادہ حیران کن باتوں میں کرتا ہوں۔ میں اس کی تصدیق کرتا ہوں کہ ان کے پاس صبح و شام آسمان سے وحی آتی ہے، اسی لئے حضرت ابو بکر صدیقؓ کو 'الصدیق' کا لقب دیا گیا۔ (مستدرک حاکم 3/63)

۲: اسباق ودروس اور فوائد و عبرتیں

ا) ہر ابتلاء و آزمائش کے بعد انعام ہوتا ہے، اللہ کے رسول ﷺ کو سخت جان آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا، قریش نے مکہ میں، ثقیف میں اور تمام قبائلِ عرب میں دعوت کے تمام راستے مسدود کردیئے، اور ہر طرف سے دعوت اور داعیانِ حق کے خلاف حصار اور گھیراؤ تنگ کردیا۔ اللہ کے رسول ﷺ کو اپنے سب سے بڑے حامی و مددگار چچا حضرت ابو طالب کی وفات کے بعد سخت خطرات کا سامنا کرنا پڑا، لیکن اس سب کے باوجود اللہ کے رسول ﷺ نے اپنا دعوتی سفر جاری رکھا، اپنے رب کے حکم پر استقامت کے پہاڑ بنے رہے، نہ کسی ملامت گر کی ملامت کا خوف لاحق ہوا، نہ کسی جنگجو کی جنگ سے سہمے اور نہ ہی کسی استہزاء کرنے والے کی چالوں کو آپؐ نے خاطر میں لایا۔ اب ان عظیم قربانیوں پر انعام و اکرام کا وقت آگیا تھا، اسی کے پیش نظر رب العالمین کے فیصلہ کے مطابق اسراء و معراج کا واقعہ پیش آیا، چنانچہ آپ ﷺ کو تمام مخلوقات کے مقابلہ میں آسمانوں کی سیر کرائی جاتی ہے، آپ ﷺ کو آپ کے صبر و جہاد پر اکرام و اعزاز سے نوازا جاتا ہے اور بغیر کسی حجاب و ترجمان کے براہِ راست رب سے ملاقات کا شرف حاصل ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو رازہائے سربستہ سے واقف کراتا ہے اور ایک ہی

جگہ اپنے ہمسفر رسولوں کے ساتھ جمع فرماتا ہے اور آپ ﷺ کو ان کی امامت کے منصب پر فائز کرتا ہے، اس لئے کہ آپ ﷺ خاتم النبیین اور آخری رسول ہیں۔(التربیۃ القیادیۃ 1/447)

۲) بے شک اللہ کے رسول ﷺ ہجرت کے مرحلہ اور اسلامی حکومت کی تشکیل کے ایک نئے مرحلہ کی طرف پیش قدمی کر رہے تھے، اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ اس عمارت کی بنیاد میں استعمال ہونے والی اینٹیں ہر عیب اور کمزوری سے پاک اور مضبوط ہوں، ایک دوسرے سے پیوستہ اور مستحکم ہوں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ابتلاء و آزمائش اور تمحیص و چھٹائی کا یہ طریقہ اختیار کیا تاکہ ضعیف الایمان اور ریب و تذبذب کے شکار لوگوں کو اور دل میں نفاق رکھنے والوں کو چھانٹ کر الگ کیا جائے اور قوی الایمان اور مخلصین کو ثابت قدمی عطا کی جائے جنہوں نے اپنی آنکھوں سے اپنے نبی کے صدق و سچائی کا مشاہدہ کیا اور وہ رب کے پاس ان کی کرامت کا بھی مشاہدہ کر چکے تھے، وہ خوش بختی اور سعادت کے کتنے اعلیٰ مقام پر فائز ہوں گے جب کہ وہ نبی مصطفی ؐ کے شانہ بشانہ رہتے تھے، ان پر ایمان لائے اور اپنی زندگی کو قربان کرنے کے لئے پیش کیا؟! مکہ اور طائف کی سخت جاں صورتحال کے بعد پیش آنے والے اس عظیم واقعہ کی وجہ سے ان کے دلوں میں ایمان کس قدر راسخ ہوا ہوگا؟!۔

۳) بلاشبہ نبی کریم ﷺ کی عظیم شجاعت و بہادری کا اظہار اس کے ذریعہ ہوتا ہے کہ آپؐ نے مشرکین کے سامنے ایک ایسا واقعہ بے باکی اور دلیری کے ساتھ پیش کیا جس کا ان کی عقلیں انکار کر رہی تھیں اور ابتدائی مرحلہ میں ان کا تصور بھی اس کے ادراک سے قاصر تھا، لیکن ان کا سامنا کرنے اور ان کے انکار و استہزاء کا خوف آپؐ کے لئے اس کے اظہار و اعلان میں رکاوٹ نہ بن سکا، اس کے ذریعہ آپؐ نے اپنی امت کے لئے اہلِ باطل کے سامنے حق کا اعلان کرنے کی اعلیٰ مثال قائم کی، اگرچہ تمام لوگ حق کی مخالفت کے لئے یکجٹ ہی کیوں نہ ہو جائیں اور حق کے مقابلہ کے لئے اپنی تمام طاقتیں کیوں نہ جھونک دیں، یہ نبی کریم ﷺ کی طرف سے مشرکین پر حکیمانہ اتمامِ حجت تھا کہ آپؐ نے بیت المقدس کے سفر کو بیان کیا اور اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ایسی علامتوں کا ظہور کیا جن کی وجہ سے مشرکین تصدیق کرنے پر مجبور ہوئے۔ مثلاً چند علامتیں یہ تھیں:

∆ نبی کریم ﷺ نے بیت المقدس کی مکمل منظر کشی فرمائی، ان میں سے بعض شام کا سفر کر چکے تھے اور انہوں نے مسجد اقصیٰ کا مشاہدہ کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کے لئے مسجد اقصیٰ کو روبرو کر دیا یہاں تک کہ آپؐ نے مشرکین کے سامنے اس کی مکمل تصویر کشی کی اور مشرکین کو اس منظر کشی کے سچ ہونے کا اقرار بھی کرنا پڑا کہ حقیقت کے عین مطابق ہے۔

∆ آپؐ نے مقامِ روحاء میں موجود قافلہ کے متعلق خبر دی، گمشدہ اونٹ کے متعلق بتایا اور پیالے سے پانی پینے کا واقعہ بھی بیان فرمایا۔

∆ ایک دوسرے قافلہ کے متعلق خبر دی جن کے اونٹ بدک گئے تھے اور ان کے ایک اونٹ کی آپؐ نے باریک بینی کے ساتھ منظر کشی کی۔

۵ آپؐ نے مقام اَبواء میں موجود ایک تیسرے قافلہ کے متعلق بھی اطلاع دی اور آگے آگے چلنے والے اونٹ کی بھی صفات بیان فرمائیں، اور یہ بھی بتایا کہ وہ اس وقت تنعیم گھاٹی سے چل رہا تھا، مشرکین نے اس کی تحقیق بھی کی پتہ چلا کہ یہ مکمل طور پر صحیح ہے، چنانچہ یہ تمام واضح دلائل ان کا منہ بند کرنے کے لئے کافی تھے اور وہ ان کی وجہ سے نبوت کو متّہم نہ کر سکے۔

یہ عظیم سفر ایک بلند مرتبت ربانی تربیت کا ایک انوکھا اسلوب تھا جس کے نتیجہ میں اللہ کے رسول ﷺ پوری روئے زمین کو اس کی تمام مخلوقات کے بشمول اس وسیع کائنات میں ایک چھوٹے سے نقطہ کی طرح دیکھنے لگے، لہذا اس چھوٹے سے نقطہ میں کفار مکہ کی حیثیت و مقام کیا ہو سکتا ہے؟ وہ تو اس وسیع کائنات میں ایک معمولی جزء کی حیثیت رکھتے ہیں، لہذا وہ اس ذاتِ عالی مرتبت کے خلاف کیا کر سکتے ہیں جس کو اللہ تعالی نے اپنی مخلوق میں منتخب کیا ہو، اور عالم بالا کے اس مبارک سفر سے سرفراز کیا ہو، انبیاء اور فرشتوں کے ساتھ ان کی ملاقات ہوئی ہو، اور ساتوں آسمانوں، سدرۃ المنتہیٰ، بیت معمور کا مشاہدہ کرایا ہو اور اللہ عزوجل سے ہمکلامی کا شرف حاصل ہوا ہو؟ (دیکھیں: التاریخ الاسلامی، الحمیدی، 3/41-42)

۴) اس عظیم الشان واقعہ کے ذریعہ حضرت صدیق اکبرؓ کے ایمانِ قوی کا اظہار ہوتا ہے، چنانچہ کفار نے جیسے ہی ان کو اس واقعہ کی خبر دی تو انہوں نے پُر اعتماد لہجہ میں کہا: اگر آپ ﷺ نے ایسا کہا ہے تو یقیناً سچ کہا ہے، میں اس بات کی بھی تصدیق کرتا ہوں کہ ان کے پاس صبح و شام آسمان سے وحی آتی ہے۔اسی لئے وہ "صدیق" کے لقب کے مستحق قرار پائے، یہ فہم وفراست اور یقین کی انتہا ہے کہ انہوں نے اس واقعہ کے درمیان اور آسمان سے نزولِ وحی کے مابین موازنہ کر کے تصدیق کر دی اور ان کے سامنے یہ واضح کر دیا کہ اگرچہ یہ ایک عام انسان کے لئے تعجب خیز ہے لیکن نبی کریم ﷺ کی نسبت سے یہ یقینی طور پر ممکن ہے۔(التاریخ الاسلامی، الحمیدی، 3/43)

۵) اسراء و معراج کی تیاری کے لئے نبی کریم ﷺ کے شقِ صدر اور قلبِ مبارک کو ایمان و حکمت سے لبریز کرنے میں یہ حکمت بھی پوشیدہ تھی کہ آپ ﷺ کا جسم اطہر شق کرنے سے متاثر نہ ہو، اسی طرح آپ ﷺ کے قلبِ مبارک کو اس لئے نکالا گیا تا کہ ہر قسم کے دوسرے مخاوف سے آپؐ مامون ہو جائیں، اس طرح کے خرقِ عادت تمام امور کے سامنے سرِ تسلیم خم کر لینا ضروری ہے اور ان کو اصل حقیقت سے ہٹا کر مجازی معنی پہنانا بھی درست رویہ نہیں ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور اس کے لئے کوئی بھی چیز ناممکن و محال نہیں ہے۔(دیکھیں السیرۃ النبویہ الصحیحۃ 1/189)

۶) بے شک رسول اللہ ﷺ کو جب دودھ اور شراب کے انتخاب میں اختیار دیا گیا تو آپ ﷺ کا دودھ کو منتخب کرنا اور حضرت جبرئیلؑ علیہ السلام کا یہ بشارت دینا کہ آپ نے فطرت کو اختیار کیا، اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اسلام دینِ فطرت ہے جو فطرتِ انسانی کے ساتھ ہم آہنگ ہے، لہذا جس نے فطرتِ انسانی کو وجود بخشا ہے اسی نے اس کے لئے اس دین کو متعین کیا ہے جو انسانی خواہشات، ضروریات اور تمام تقاضوں کو پورا کرتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ ٱللَّهِ ٱلَّتِي فَطَرَ ٱلنَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ ٱللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ ٱلدِّينُ ٱلْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ ٱلنَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ﴾ ترجمہ:" پس (اے نبیؐ، اور نبیؐ کے

پیروؤ) یکسُو ہو کر اپنا رُخ اِس دین کی سمت میں جما دو، قائم ہو جاؤ اُس فطرت پر جس پر اللہ تعالٰی نے انسانوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جا سکتی، یہی بالکل راست اور درست دین ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں"۔(سورۃ الروم: 30)

۷) اسراء و معراج کا یہ واقعہ حالتِ بیداری میں رسول اللہ ﷺ کے جسم و روح کے ساتھ تھا، سلف و خلف تمام جمہور علماء کا یہی موقف ہے، ان لوگوں کے قول کی کوئی بنیاد نہیں ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اس طرح کے واقعات کا تعلق صرف روح سے ہے اور یہ ایک قسم کا خواب تھا، اگر اس طرح کا واقعہ خواب پر مبنی تھا تو پھر نہ اس میں کوئی نشانی تھی، نہ ہی اس کو معجزہ قرار دیا جا سکتا ہے، نہ ہی مشرکین اس کو ناممکن و محال سمجھتے اور نہ ہی اس کی تکذیب کرتے، اس لئے کہ اس طرح کے خوابوں کا کوئی منکر نہیں ہے، اسی طرح اللہ کے اس قول ﴿سُبۡحَـٰنَ ٱلَّذِیۤ أَسۡرَىٰ بِعَبۡدِهِۦ﴾ میں "عبدہ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور اس سے مقصود سیدنا محمد ﷺ ہیں، اور "عبد" کا لفظ روح و جسد دونوں کے مفہوم پر مشتمل ہے۔(دیکھیں: المستفاد من قصص القرآن للدعوۃ والدعاۃ 2/91، تفسیر ابن کثیر: 3/23، تفسیر القاسمی 10/189)

۸) نبی کریم ﷺ کا تمام انبیاء کو نماز پڑھانا اس بات کی دلیل ہے کہ ان سب نے قیادت و سربراہی آپ ﷺ کے سپرد کر دی اور اسلامی شریعت نے تمام سابقہ شریعتوں کو منسوخ کر دیا، لہذا اب ان انبیاء کے متبعین کے لئے بھی یہی رویہ درست ہے کہ وہ بھی قیادت و سربراہی کی باگ ڈور اسی رسول رحمت ؐ اور اس کے لائے ہوئے پیغامِ حق کے ہاتھ میں دے دیں جس میں کسی طرح کے باطل کے دَر آنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

بے شک جو لوگ تقاربِ ادیان کی کانفرنسیں منعقد کرتے ہیں انہیں اس حقیقت کا ادراک ہونا چاہئے کہ تحریف شدہ ادیان سے اعلانِ براءت ضروری ہے اور صرف رسول رحمت ﷺ پر اور آپ ؐ کے لائے ہوئے پیغامِ حق پر ایمان لایا جائے، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ ان زہر آلود پُرکشش نعروں کی حقیقت کا بھی ادراک کیا جائے جو فی الحقیقت جاہلی نظامہائے حیات کی خدمت کرتے ہیں۔

ایسے تحریف شدہ عقیدہ کو کیسے قبول کیا جا سکتا ہے جس کے مطابق مسیح علیہ السلام کو الوہیت کا مقام دیا جائے اور یہ مانا جائے کہ مسیح علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں اور اللہ کی ذات تین اقانیم کا مجموعہ ہے یا جس کے مطابق حضرت عزیر علیہ السلام کو ابن اللہ قرار دیا جائے اللہ کے کلام میں تحریف کی جائے، جب کہ دوسری طرف یہ عقیدہ ہے کہ اللہ کی ذات تنہا ہے، اس کا کوئی شریک و سہیم نہیں ہے، نہ وہ کسی کا باپ ہے اور نہ اس کی کوئی اولاد ہے، اور نہ ہی اس کی کوئی شریکِ حیات ہے، ان عقائد کے مابین تقارب کیسے ممکن ہے، یہ تو ایک فضول مشق ہے۔(السیرۃ النبویۃ لأبی فارس، ص 213)

۹) بے شک مسجد اقصی اور مسجد حرام کو مربوط کرنے کے پیچھے بہت سی حکمتیں، اشارات اور فوائد ہیں، ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

∆ مسلمانوں کے لئے مسجد اقصیٰ کی اہمیت کو اجاگر کرنا، اس لئے کہ مسجد اقصیٰ کو رسول اللہ ﷺ کے سفرِ اسراء کی منزل اور عالمِ بالا کی جانب سفرِ معراج کا نقطہ آغاز بنایا گیا اور مکمل مکی دور میں وہی مسلمانوں کا قبلہ اولیٰ تھا، اس میں مسلمانوں کے لئے یہ تعلیم اور رہنمائی ہے کہ وہ مسجد اقصیٰ اور ارض فلسطین کو محبوب رکھیں، اس لئے کہ وہ مبارک و مقدس سرزمین ہے۔

∆ اس ربط کے ذریعہ مسلمانوں کو مسجدِ اقصیٰ کے تیئں اور شرک وعقیدۂ تثلیث سے اس کی آزادی کے تیئں ان کی ذمہ داری یاددلائی گئی ہے، جیسے کہ ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ مسجدِ حرام کو شرک اور بت پرستی کی تمام شکلوں سے آزاد کرائیں اسی طرح مسجد اقصی کو ہر قسم کے مشرکانہ تسلط سے آزاد کرانا بھی ان کی ذمہ داری ہے۔

∆ اس ربط کے ذریعہ یہ یاد دلایا گیا ہے کہ مسجد اقصی کو خطرہ کا مطلب مسجد حرام اور اس کے متعلقین کو خطرہ ہے اور مسجد اقصیٰ کو نقصان پہنچانا مسجد حرام کو نقصان پہنچانے کی تمہید ہے، اس لئے کہ مسجدِ اقصی مسجد حرام تک پہنچنے کا دروازہ ہے اور مسجد اقصیٰ کا کنٹرول مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل کر یہودیوں کے ہاتھ میں چلے جانے کا مطلب یہ ہے کہ مسجد حرام اور حجاز کا امن بھی خطرے میں ہے اور اعدائے اسلام اب ان پر قبضہ کرنے کے لئے پر تول رہے ہیں۔

قدیم وجدید تاریخ سے یہ سب کچھ عملی طور پر ثابت ہو جاتا ہے، صلیبی جنگوں کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ سلطنت کرک کے فرمانروا صلیبی "ارناط" نے روضۂ رسول ﷺ پر اور وہاں آپؐ کے جسمِ اطہر پر حملہ کرنے کے لئے حجاز کی جانب فوج روانہ کی، اسی طرح کیتھولک عیسائی پرتغالیوں نے حرمین شریفین تک پہنچنے کی کوشش کی تاکہ وہ اس کی تنفیذ کر سکیں جس سے ان کے اسلاف عاجز رہے، لیکن ممالیک کی طرف سے اسی طرح عثمانیوں کی طرف سے سخت مقابلہ کی وجہ سے ان کا یہ جہنمی منصوبہ پورا نہ ہو سکا۔ 1967 کی جنگ میں جب یہودیوں نے بیت المقدس پر قبضہ کر لیا تو اس جنگ کے بعد ان کے لیڈروں نے اعلان کیا کہ اس کے بعد ان کا ہدف حجاز پر قبضہ کرنا ہے جس میں اولین مرحلہ میں مدینۃ الرسول ﷺ اور خیبر پر قبضہ کیا جائے گا۔

جب یہودی فوج القدس میں داخل ہوئی اس وقت یہودی لیڈر 'ڈیوڈ بن گورین'' مسجد اقصیٰ کے قریب سے یہودی فوج اور نوجوانوں کا جائزہ لینے لگا اور ان کے سامنے نفرت انگیز تقریر کر رہا تھا، اس تقریر کا اختتام اس نے ان الفاظ کے ساتھ کیا: "ہم نے القدس پر قبضہ کر لیا ہے اور اب ہم یثرب (مدینہ) کی طرف گامزن ہیں"۔ (السیرۃ النبویۃ، ابو فارس، ص، 314)

اسرائیلی وزیر اعظم ''گولڈ مائیر'' بیت المقدس پر قبضہ کرنے کے بعد خلیج ایلاٹ پر کھڑے ہو کر کہتی ہے: "مجھے مدینہ اور حجاز سے اپنے اجداد کی بو آرہی ہے، یہ ہمارے شہر ہیں جن کو ہم عنقریب واپس لے لیں گے"۔ (السیرۃ النبویۃ، ابو فارس، ص: 314)

اس کے بعد یہود نے اپنی مجوزہ سلطنت کا نقشہ عام کر دیا جو نیل سے فرات تک کے پورے علاقے پر مشتمل ہے، اس میں جزیرۃ العرب، اردن، شام، عراق، مصر، یمن، کویت، خلیج عربی سب شامل ہیں اور انہوں نے 1967 کی جنگ میں کامیابی کے بعد اپنی حکومت کا یہ نقشہ یورپ میں تقسیم کیا۔ (السیرۃ النبویۃ، ابو فارس، ص 215)

۱۰) سورۃ الاسراء میں ایک قاری کے سامنے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسراء کے واقعہ کا ذکر صرف ایک آیت میں کیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿سُبۡحَـٰنَ ٱلَّذِیٓ أَسۡرَىٰ بِعَبۡدِهِۦ لَیۡلࣰا مِّنَ ٱلۡمَسۡجِدِ ٱلۡحَرَامِ إِلَى ٱلۡمَسۡجِدِ ٱلۡأَقۡصَا ٱلَّذِی بَـٰرَكۡنَا حَوۡلَهُۥ لِنُرِیَهُۥ مِنۡ ءَایَـٰتِنَاۤۚ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلسَّمِیعُ ٱلۡبَصِیرُ﴾ ترجمہ: ''پاک ہے وہ جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے

دور کی اُس مسجد تک جس کے ماحول کو اس نے برکت دی ہے، تاکہ اسے اپنی کچھ نشانیوں کا مشاہدہ کرائے، حقیقت میں وہی ہے سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے"۔(سورۃ الاسراء:1)

اس کے بعد یہود کے جرائم اور بداعمالیوں کا ذکر کیا ہے، اس کے بعد ان کو متنبہ کیا ہے کہ بے شک یہ قرآن انہی لوگوں کے لئے ذریعۂ ہدایت ہے جو درست رویہ کے حامل ہوں، سورۃ الاسراء کی آیات کا نظم قرآنی اور آپسی ربط یہ بتاتا ہے کہ یہود کو جلد ہی انسانی قیادت کے منصب سے معزول کر دیا جائے گا، اس لئے کہ انہوں نے ایسے جرائم کا ارتکاب کیا ہے جن کے ہوتے ہوئے اس منصب پر باقی رہنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی ہے اور یہ منصب اب رسول اللہ ﷺ کو عطا کیا جا رہا ہے اور دعوتِ ابراہیمؑ کے دونوں مراکز اب ان کے حوالے کئے جا رہے ہیں۔ (دیکھیں: الرحیق المختوم، صفی الرحمن مبارکپوری، ص120)

سورۃ الاسراء نے اسرائیلی ظلم واستبداد سے پردہ فاش کیا ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ اس وقت کی سپر پاور طاقتیں فارس اور روم کس طرح ظلم واستبداد کے خونین پنجوں سے ایک دوسرے کو اور دیگر کمزور لوگوں کو نوچ رہی تھیں، اسی لئے رسول اللہ ﷺ کے اس سفرِ اسراء میں آپ ﷺ کو اور آپؐ کی امت کو بعض وہ تاریخی نشانیاں دکھائی گئیں جن کا تعلق مسجدِ اقصی سے تھا اور رومی، فارسی اور اسرائیلی کشمکش کا عکس اس میں نظر آتا تھا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَءَاتَيْنَا مُوسَى ٱلْكِتَٰبَ وَجَعَلْنَٰهُ هُدًى لِّبَنِىٓ إِسْرَٰٓءِيلَ أَلَّا تَتَّخِذُوا۟ مِن دُونِى وَكِيلًا ۝٢ ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ ۚ إِنَّهُۥ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا ۝٣ وَقَضَيْنَآ إِلَىٰ بَنِىٓ إِسْرَٰٓءِيلَ فِى ٱلْكِتَٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِى ٱلْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا ۝٤ فَإِذَا جَآءَ وَعْدُ أُولَىٰهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ أُو۟لِى بَأْسٍ شَدِيدٍ فَجَاسُوا۟ خِلَٰلَ ٱلدِّيَارِ ۚ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُولًا ۝٥ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ ٱلْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَأَمْدَدْنَٰكُم بِأَمْوَٰلٍ وَبَنِينَ وَجَعَلْنَٰكُمْ أَكْثَرَ نَفِيرًا ۝٦ إِنْ أَحْسَنتُمْ أَحْسَنتُمْ لِأَنفُسِكُمْ ۖ وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا ۚ فَإِذَا جَآءَ وَعْدُ ٱلْءَاخِرَةِ لِيَسُۥٓـُٔوا۟ وُجُوهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا۟ ٱلْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوهُ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَلِيُتَبِّرُوا۟ مَا عَلَوْا۟ تَتْبِيرًا ۝٧﴾ ترجمہ: "ہم نے اس سے پہلے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب دی تھی اور اسے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا تھا، اس تاکید کے ساتھ کہ میرے سوا کسی کو اپنا وکیل نہ بنانا۔ تم ان لوگوں کی اولاد ہو جنہیں ہم نے نوح (علیہ السلام) کے ساتھ کشتی پر سوار کیا تھا اور نوح (علیہ السلام) ایک شکر گزار بندہ تھے۔ اور ہم نے اپنی کتاب میں بنی اسرائیل کو اس بات پر متنبہ کر دیا تھا کہ تم دو مرتبہ زمین میں فسادِ عظیم برپا کرو گے اور بڑی سرکشی دکھاؤ گے۔ پھر جب ان میں سے پہلی سرکشی کا موقع آیا تو ہم نے تمہارے مقابلہ پر اپنے ایسے بندے اٹھائے جو نہایت زور آور تھے اور وہ تمہارے ملک میں گھس کر ہر طرف پھیل گئے، یہ ایک وعدہ تھا جسے پورا ہو کر ہی رہنا تھا۔ پھر ہم نے تمہیں ان پر غلبے کا موقع دے دیا اور تمہیں مال اور اولاد سے مدد دی اور تمہاری تعداد پہلے سے بڑھا دی۔ اگر تم نے بھلائی کی تو وہ تمہارے اپنے ہی لیے بھلائی تھی، اور برائی کی تو وہ تمہاری اپنی ذات کے لیے برائی ثابت ہوئی، پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آیا تو ہم نے دوسرے دشمنوں کو تم پر مسلط کر دیا تاکہ وہ

تمہارے چہرے بگاڑ دیں اور مسجد (بیت المقدس) میں اسی طرح گھس جائیں جس طرح پہلے دشمن گھسے تھے اور جس چیز پر ان کا ہاتھ پڑے اسے تباہ کرکے رکھ دیں"۔ (سورۃ الاسراء: 2-7)

علامہ ابن کثیرؒ "البدایہ والنہایہ" میں لکھتے ہیں کہ بخت نصر نے شاہ فارس کے حکم سے یہودی سلطنت کو پاش پاش کر دیا، وہ بستیوں میں اندر تک گھس گیا اور اس کی وجہ سے بنی اسرائیل اِدھر اُدھر منتشر ہوگئے، ان میں سے ایک گروہ حجاز چلا گیا، ایک جماعت یثرب چلی گئی، ایک گروہ وادی القریٰ پہنچ گیا اور ایک ٹکڑی مصر چلی گئی، یہودی سلطنت میں یہ فارسی خون خرابہ چھٹی صدی قبل مسیحی 597ق،م میں پیش آیا۔ (دیکھیں: اصول الفکر السیاسی، 149- 152)

جہاں تک دوسری مرتبہ کے خون خرابہ کا تعلق ہے تو جب یہودی سلطنت کی از سرِ نو تشکیل و تعمیر عمل میں آئی تو اس مرتبہ رومیوں نے یہودی سلطنت کو پاش پاش کیا اور یہ تباہی پہلی صدی مسیحی سن (70م) میں کی گئی، یہ اس وقت ہوا جب رومی قائد "تیتوس" نے یروشلم کا ہیکل منہدم کر دیا اور روم کے سیاسی اور دینی ظلم واستبداد سے تنگ آکر یہودیوں نے راہِ فرار اختیار کی اور وہ مسلسل ہجرت کرتے رہے، ان میں سے بعض جزیرۃ العرب کے جنوب چلے گئے جہاں ان کے پہلے اجداد گئے تھے۔ (مقدمہ ابن خلدون 2/206)

لہذا جزیرۃ العرب کے مختلف علاقوں میں پھیلے ہوئے یہودیوں کے اندر فساد وبگاڑ کے جراثیم مسلسل موجود تھے، اگر اللہ کے رسول ﷺ نے قریش کی اصل حقیقت سے اچھی طرح واقفیت حاصل کرلی تھی اور اس کے لئے تیاری بھی کی تھی تو آپ ﷺ کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ یہودیوں کی اصل حقیقت و شر ست سے بھی اچھی طرح واقف ہوں اور اس کے لئے بھی تیار ی کریں، اس لئے کہ یہود صرف عاد وثمود کی طرح کوئی تاریخی قوم نہیں ہیں جن کے واقعات عبرت ونصیحت کے لئے ذکر کئے گئے ہوں، بلکہ یہ ایک ایسی قوم تھی جو اس عربی معاشرہ میں کثیر تعداد میں موجود تھی جس میں رسول اللہ ﷺ زندگی بسر کر رہے تھے اور اس میں اسلامی نظام کے قیام کے لئے تحریک چلا رہے تھے، یہ اپنے معاشی اور اقتصادی مقام کے ساتھ ساتھ فکری مرکزیت بھی رکھتے تھے، اس لئے کہ ان کے پاس یہودی علماء، مذہبی نصوص اور نبوی وراثت تھی جن کے ذریعہ وہ نبوت کے اوصاف پہچان سکتے تھے، معجزات کا مطالبہ کر سکتے تھے اور رسولوں کی سچائی اور رسالت کی صحت کے لئے شرائط وضع کر سکتے تھے، لہذا اگر قریش کے لوگ اسلام کے خلاف جنگ کرنے کے لئے خانہ کعبہ کو استعمال کرتے تھے تو یہود قرآن کا مقابلہ کرنے کے لئے تورات کا استعمال کرتے تھے اور اگر رسول اللہ ﷺ کو قریش کے ساتھ معرکہ آرائی کا اندیشہ تھا تو آپ ﷺ کے لئے ضروری تھا کہ یہود کے ساتھ معرکہ آرائی کے امکان کو بھی پیش نظر رکھیں۔ (دیکھیں: اُصول الفکر السیاسی، ص 152-153)

سورۂ اسراء نے فارس، روم اور یہودیوں کے مابین عالمی کشمکش کے ایک پہلو کی تصویر کشی کی ہے اور اس کے بعد سورۂ روم نازل ہوئی جس میں بھی اس عالمی کشمکش کے متعلق گفتگو کی گئی ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿الٓمٓ ١ غُلِبَتِ ٱلرُّومُ ٢ فِيٓ أَدۡنَى ٱلۡأَرۡضِ وَهُم مِّنۢ بَعۡدِ غَلَبِهِمۡ سَيَغۡلِبُونَ ٣ فِي بِضۡعِ سِنِينَۗ لِلَّهِ ٱلۡأَمۡرُ مِن قَبۡلُ وَمِنۢ بَعۡدُۚ وَيَوۡمَئِذٖ يَفۡرَحُ ٱلۡمُؤۡمِنُونَ ٤ بِنَصۡرِ ٱللَّهِۚ يَنصُرُ مَن يَشَآءُۖ وَهُوَ ٱلۡعَزِيزُ ٱلرَّحِيمُ ٥﴾وَعۡدَ ٱللَّهِۖ لَا يُخۡلِفُ ٱللَّهُ وَعۡدَهُۥ وَلَٰكِنَّ أَكۡثَرَ ٱلنَّاسِ لَا

يَعۡلَمُونَ ۝٦ يَعۡلَمُونَ ظَٰهِرٗا مِّنَ ٱلۡحَيَوٰةِ ٱلدُّنۡيَا وَهُمۡ عَنِ ٱلۡأٓخِرَةِ هُمۡ غَٰفِلُونَ ۝٧﴾ ترجمہ: "ا ل مۤ۔روم مغلوب ہو گئے۔ نزدیک کے ملک میں اور وہ مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب آجائیں گے۔ چند ہی سال میں، پہلے اور پچھلے سب کام اللہ کے ہاتھ میں ہیں، اور اس دن مسلمان خوش ہوں گے۔ اللہ کی مدد سے، مدد کرتا ہے جس کی چاہتا ہے، اور وہ غالب رحم والا ہے۔ اللہ کا وعدہ ہو چکا، اللہ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرے گا لیکن اکثر آدمی نہیں جانتے۔ دنیا کی زندگی کی ظاہری باتیں جانتے ہیں اور وہ آخرت سے غافل ہی ہیں"۔ (سورۃ روم: 1-7)

قریش کے مشرکین یہ چاہتے تھے کہ رومیوں کے مقابلہ میں اہل فارس کا غلبہ ہو، اس لئے کہ وہ اور اہلِ فارس بت پرست تھے، جبکہ مسلمان یہ چاہتے تھے کہ فارسیوں کے مقابلہ میں رومیوں کو غلبہ ملے، اس لئے کہ وہ اہلِ کتاب تھے۔ مفسرین نے اس سلسلہ کی کافی تفصیلات نقل کی ہیں جن میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ اور بعض مشرکینِ مکہ کے مابین رومی اور فارسی جنگ کے متعلق شرط لگی تھی جس میں قرآن نے رومیوں کے غلبہ اور فارسیوں کی شکست کے متعلق قطعیت کے ساتھ پیشن گوئی کردی تھی۔ (تفسیر طبری: 21/12)

ابن عطیہ نے ایک اور رائے اختیار کی ہے جو قابلِ غور ہے، وہ فرماتے ہیں: زیادہ اقرب یہ ہے کہ مسلمانوں کی خوشی کی یہ توجیہ کی جائے کہ حالات کے پیشِ نظر وہ یہ چاہتے تھے کہ چھوٹا دشمن یعنی روم غالب ہو، اس لئے کہ وہ کم ضرر رساں تھا اور جب بڑا دشمن یعنی فارس غالب ہو گا تو اس میں خوف اور اندیشہ بھی بڑھ جائے گا، لہٰذا اس پہلو پر غور کرنے کی ضرورت ہے، ساتھ ہی ساتھ اللہ کے رسول ﷺ دینِ حق اور شریعتِ الٰہی کے غلبہ کے امیدوار تھے جبکہ کفارِ مکہ یہ چاہتے تھے کہ کسی ایسی سلطنت کے ساتھ آپ ﷺ کو ٹکرایا جائے جو آپؐ کا نام و نشان مٹادے اور ان کو آپ سے نجات دے۔ (تفسیر ابن عطیہ 11/425)

ابن عطیہ کا خیال ہے کہ مسلمانوں کو زیادہ خوشی اس لئے نہیں ہوئی کہ رومی اہلِ کتاب ہیں، یا فارسیوں کے مقابلہ میں ان کا غلبہ قرآن کی صداقت کی ظاہری اور مشاہداتی دلیل ہوگی، بلکہ خوشی کا اصل سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رومی سلطنت کی طاقت کو اُن مسلمانوں کے مفاد کے لئے کام میں لگادیا ہے جن کے پاس ابھی کوئی طاقت و حکومت نہیں ہے، اس لئے کہ جب رومی سلطنت فارسی سلطنت پر غالب آئے گی اور فارسی سلطنت کو پاش پاش کردے گی اور اس کی طاقت کے غرور کو خاک میں ملادے گی تو ایک طرف تو فارسی طاقت کا خاتمہ ہوگا اور دوسری طرف اگرچہ رومی کامیاب و غالب ہوں گے لیکن وہ بھی بہت نقصان اٹھا چکے ہوں گے جس کی وجہ سے وہ بھی پہلے کے مقابلہ میں کمزور ہوں گے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے ذریعہ مسلمانوں کے لئے ان پر غلبہ حاصل کرنے کا راستہ ہموار ہوگا اور اس کے ذریعہ اسلام کے لئے دو شکست خوردہ عالمی طاقتوں کے درمیان ایک نئی عالمی قوت کی حیثیت سے ظاہر ہونے کا راستہ کھل جائے گا۔ (دیکھیں: اصول الفکر السیاسی، ص 158، تفسیر ابنِ کثیر 3/23)

۱۱) نماز کی اہمیت اور اس کا عظیم مقام:

سنتِ نبویہ سے ثابت ہے کہ امتِ مسلمہ پر نماز کی فرضیت معراج کے موقع پر ہوئی ہے، اس سلسلہ میں علامہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں: "نماز کے شرف و مقام اور اس کی عظمت کو نمایاں کرنے کا خصوصی اہتمام کیا گیا ہے، لہٰذا اعیانِ حق کی ذمہ داری ہے کہ وہ نماز کی

اہمیت اوراس کی پابندی پر خاص زور دیں اور دوسرے موضوعات کے ساتھ ساتھ اس کی اہمیت و مقام کو بھی اجاگر کریں، اس لئے کہ اس کی فرضیت لیلۃ المعراج میں ہوئی ہے، اور یہی وہ عمل ہے جس کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے وفات سے پہلے خصوصی وصیت کی تھی۔ (المستفاد من قصص القرآن للدعوۃ والدعاۃ 3/93 تفسیر ابن کثیر: 4/274)

۱۲) اللہ کے رسول ﷺ سے دریافت کیا گیا: کیا آپ نے اپنے رب کو دیکھا؟ تو آپؐ نے فرمایا: وہ تو نور ہی نور ہے، میں اس کو کیسے دیکھ سکتا ؟!۔(مسلم:178، ترمذی: 3278)

۱۳) رسول اللہ ﷺ نے معاشرتی امراض کے خطرات کو بھی بیان فرمایا ہے اور ان کی سزا اور بدانجامی کو بھی اجاگر کیا ہے، جیسے کہ آپ ﷺ نے اسراء و معراج کی رات کو کئی مناظر کا مشاہدہ کیا، ان امراض اور ان کی بدانجامی کا ذکر مختصراً کیا جارہا ہے:

∆ غیبت اور غیبت محبت کرنے والوں کا انجام:

رسول اللہ ﷺ نے کچھ لوگوں کو دیکھا کہ وہ مردار کھارہے ہیں۔، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ کو بتایا کہ "یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے تھے"۔ یعنی غیبت کرتے تھے۔(مسند أحمد:1/257)

∆ یتیموں کا مال کھانے والوں کا انجام:

رسول اللہ ﷺ نے کچھ لوگوں کو دیکھا جن کے ہونٹ اونٹوں کی طرح لمبے تھے، ان کے ہاتھوں میں پتھروں کی طرح آگ کے انگارے تھے جن کو اپنے منہ میں ڈالتے تھے اور وہ ان کی سرین سے نکلتے تھے، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ کو بتایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو ناحق یتیموں کا مال کھاتے تھے۔(سیرت ابنِ ہشام:2/47)

∆ سود کھانے والوں کا انجام:

نبی کریم ﷺ کا گذر ایسے لوگوں کے پاس سے ہوا جن کے پیٹ ایسے گھروں کی طرح بڑے تھے جن کے اندر سانپ اور اژدھے تھے جو ان کے پیٹ کے باہر سے نظر آرہے تھے، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ کو بتایا کہ یہ سود کھانے والے لوگ ہیں۔(مسند أحمد: 2/353، سنن ابن ماجہ:2273)

∆ اسی طرح روایات میں بدکاروں، زکاۃ نہ دینے والوں، فتنہ پرور علماء اور امانتوں میں خیانت کرنے والوں کا انجام بھی بیان کیا گیا ہے۔ (دیکھیں: مسند أحمد:3/120، 231، 239، مسند عبد بن حمید: 1222)

روایات میں جو کچھ سزائیں وارد ہوئی ہیں جن کا رسول اللہ ﷺ نے سفرِ معراج میں مشاہدہ کیا، یہ احادیث حضرت أبو سعید خدریؓ سے مروی ہے جو بعض کتبِ تفسیر میں موجود ہیں، اسی طرح سیرت ابن ہشام میں واقعۂ معراج کے ضمن میں اس کا ذکر کیا گیا ہے، البتہ اس سلسلہ میں کوئی بھی صحیح نص رسول ﷺ سے وارد نہیں ہے اور نہ ہی یہ حدیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں مذکور ہے۔ (واللہ اعلم)

∆ مجاہدین کا ثواب:

لیلۃالاسراء میں رسول اللہ ﷺ کچھ ایسے لوگوں کے پاس سے گزرے جو ایک دن کھیتی لگاتے تھے اور ایک دن فصل کاٹتے تھے، جیسے ہی وہ فصل کاٹتے تو وہ پھر سے ویسے ہی ہو جاتی، جیسے کہ پہلے تھی، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ ﷺ کو بتایا کہ یہ اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والے مجاہدین ہیں جن کی نیکیاں سات سو گنا بڑھ جاتی ہیں اور جو کچھ انہوں نے خرچ کیا ہے اس کا نعم البدل عطا کیا جاتا ہے۔(مسند بزار:55، مجمع الزوائد:1/67- 72الترغیب والترہیب للمنذری: 1129، تفسیر طبری: 15/7)الفتح الربانی 20/257)

∆ مسجد اقصیٰ کی اہمیت کے بارے میں صحابہ کرام کا ادراک:

مسجد اقصی کے بارے میں صحابہ کرامؓ اپنی ذمہ داری سے اچھی طرح واقف تھے، جبکہ وہ رومیوں کے زیرِ تسلط تھی، چنانچہ صحابہ کرام نے اس کو حضرت عمر بن خطابؓ کے دور میں آزاد کرایا اور پھر وہاں مسلسل امن وامان کی فضا برقرار رہی، یہاں تک کہ ہجرتِ نبوی کی پانچ دہائیوں کے بعد صلیبیوں نے وہاں پھر سے فساد برپا کیا اور وہ مسلسل تقریباً ایک صدی تک وہاں کے تقدس کو پامال کرتے رہے، یہاں تک کہ صلاح الدین ایوبیؒ کی قیادت میں اس کو مسلمانوں نے آزاد کیا، اور اب پھر سے وہ یہودی تسلط کا شکار ہو گئی ہے، لہذا اس کی بازیابی کا کیا طریقہ ہوگا؟! اس کی بازیابی کا ایک ہی راستہ ہے کہ صحابہ کرام کے منہج کے مطابق اللہ کے راستہ میں جہاد کیا جائے۔ (دیکھیں: الخصائص الکبریٰ: 1/171، السیرۃ النبویۃ، أبو فارس، ص220)

....

پانچویں فصل

قبائل کو دعوت اور مدینہ کی جانب ہجرتِ صحابہ

پہلا باب
مدد حاصل کرنے کے لئے قبائل سے ملاقات

طائف سے واپس آنے کے بعد اللہ کے رسول ﷺ زمانۂ حج اور زمانۂ تجارت میں مختلف قبائل سے ملاقات کرنے لگے، ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرنے لگے اور ان سے نصرت و مدد اور پناہ کا مطالبہ کرنے لگے تاکہ اللہ عزوجل کا کلام لوگوں تک پہنچا سکیں، اللہ کے رسول ﷺ تجارتی ایام میں اور زمانۂ حج میں مختلف قبائل کے ساتھ ایک واضح اور منصوبہ بند دعوتی وسیاسی حکمتِ عملی کے مطابق ملاقاتیں کرتے، آپؐ کے ساتھ آپ کے رفیقِ کار حضرت ابو بکر صدیقؓ ہوتے، حضرت ابو بکرؓ انسابِ عرب اور ان کی تاریخ کے ماہر تھے، اس لئے دونوں شخصیات اہم افراد اور قبائل کے سرداروں سے خاص طور پر ملاقات کرتے، حضرت ابو بکرؓ قبائل کی اہم شخصیات سے دریافت کرتے کہ تمہاری تعداد کتنی ہے؟ طاقت و قوت کے اعتبار سے آپ کی پوزیشن کیا ہے؟ تمہارے درمیان جنگ کے وقت کی صورتحال کیسی ہوتی ہے؟ یہ تمام سوالات رسول اللہ ﷺ کی گفتگو اور دعوت سے پہلے کئے جاتے تھے۔ (دیکھیں: الأنساب للسمعانی، 1/36)

علامہ المقریزی فرماتے ہیں: "اس کے بعد اللہ کے رسول ﷺ نے مواسم (ایام حج و تجارت) میں اپنے آپ کو قبائل کے سامنے پیش کیا اور ان کو اسلام کی طرف بلایا، اور ان میں یہ قبائل قابل ذکر ہیں: بنو عامر، غسّان، بنو فزارہ، بنو مرہ، بنو حنیفہ، بنو سلیم، بنو عبس، بنو نصر، ثعلبہ بن عکابہ، کندہ، کلب، بنو الحارث بن کعب، بنو عذرہ، قیس بن الخطیم، أبو الیسر انس بن أبی رافع"۔

علامہ واقدی نے ان تمام قبائل میں سے ایک ایک قبیلہ کے واقعات قلم بند کئے ہیں، بیان کیا جاتا ہے کہ آپ ﷺ نے کندہ قبیلہ سے آغاز کیا، ان کو اسلام کی دعوت دی، اس کے بعد قبیلہ کلب کے پاس تشریف لے گئے، اس کے بعد بنو حنیفہ، پھر بنو عامر۔ اور ان سے فرماتے: ''کون ہے ایسا شخص جو مجھے اپنی قوم کے پاس لے کر جائے اور میری حفاظت و حمایت کرے، تاکہ میں اپنے رب کا پیغام پہنچا سکوں، اس لئے کہ قریش نے مجھے اپنے رب کا پیغام پہنچانے سے روک دیا ہے؟''۔ آپ ﷺ اس طرح لوگوں سے مخاطب ہوتے اور ابو لہب آپؐ کے پیچھے پیچھے آتا اور لوگوں سے کہتا: ان کی بات مت سنو، اس لئے کہ یہ کذّاب اور جھوٹا ہے۔ (مسند احمد: 3/492-493، سیرت ابن ہشام 2/64-65، امتاع الأسماء للمقریزی 1/30- 31)

نبی کریم ﷺ کو اس صورتحال میں سخت جاں گداز اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا، امام ترمذیؒ نے حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: "نبی اکرم ﷺ اپنے آپ کو عرفات اور مزدلفہ میں لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے اور فرماتے: ''ہے کوئی ایسا شخص جو مجھے اپنی قوم کے پاس لے کر جائے؟! اس لئے کہ قریش نے مجھے اپنے رب کا کلام پہنچانے سے روک دیا ہے"۔ (سنن أبو داؤد: 4734، سنن ترمذی: 2925، سنن ابن ماجہ: 201، مسند أحمد: 3/390)

نبی کریم ﷺ مسلسل قبائل کے پاس جا کر ان کو دعوت دیتے رہے اور وہ آپؐ کے ساتھ بُرے طریقے سے پیش آتے، آپ ﷺ کو اذیت پہنچاتے اور کہتے: ان کی قوم ان کے بارے میں زیادہ جانتی ہے، جس نے اپنی قوم میں بگاڑ پیدا کیا ہے وہ ہمیں کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے؟ اس لئے قبائل نے آپ کی بات کو ٹھکرا دیا اور قریش جن افواہوں کو عام کرتے تھے حجاج کے درمیان ان ہی کا چرچا ہوتا تھا، جیسے کہ آپ ﷺ کو "صابی" (بے دین) "بنو ہاشم کا لڑکا جو یہ گمان کرتا ہے کہ وہ رسول ہے"۔ اسی طرح کی باتیں عام ہوتی تھیں، بلاشبہ یہ وہ صورتحال تھی جس کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کا کلیجہ منہ کو آجاتا تھا اور تکذیب و عدم قبولیت کی تکلیف میں مزید اضافہ ہوتا تھا۔ (دیکھیں: المحنۃ فی العہد المکی، ص 53)

ایذاء و تکلیف کا یہ سلسلہ اسی پر ختم نہیں ہوا بلکہ اللہ کے رسول ﷺ کو اس سے بھی زیادہ سخت اور مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑا، امام بخاریؒ نے اپنی تاریخ میں اور طبرانی نے المعجم الکبیر میں مدرک ابنِ منیب سے روایت کیا ہے، وہ (مدرک) اپنے والد سے، وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ کو میں نے زمانۂ جاہلیت میں دیکھا، آپؐ فرما رہے تھے: اے لوگو! "لا الہ الا اللہ کہو کامیاب ہو جاؤ گے"۔ لوگوں میں سے بعض آپ کے چہرۂ مبارک پر تھوکتے، بعض آپؐ پر مٹی پھینکتے، بعض آپ ﷺ کو گالی دیتے، یہاں تک کہ آدھا دن گزر گیا تو ایک لڑکی پانی کا ایک پیالہ لے کر آئی اور آپ کے چہرے اور ہاتھوں کو دھویا۔ آپؐ نے فرمایا: اے بیٹی! اپنے ابو کے بارے میں کسی مغلوبیت یا ذلت کا خوف نہ کرو! میں نے دریافت کیا: یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا: یہ رسول اللہ ﷺ کی بیٹی زینب ہے، وہ خوب رو دوشیزہ تھیں۔ (التاریخ الکبیر للبخاری 4/2/14، المعجم الکبیر للطبرانی: 20/342، مجمع الزوائد: 6/21، المحنۃ فی العہد المکی، ص 53)

ابو جہل اور ابو لہب - لعنھما اللہ - باری باری رسول اللہ ﷺ کو اذیت پہنچانے کا کام کرتے تھے جبکہ رسول اللہ ﷺ بازار میں اور حج میں لوگوں کو دعوت دیتے تھے، آپ کو مدعوین کے ساتھ ساتھ ان دونوں کی طرف سے بھی سخت اذیت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ (المحنۃ فی العہد المکی، ص 53)

1) ابو جہل اور مشرکین کی سازشوں کا توڑ کرنے میں نبی کریم ﷺ کی حکمتِ عملی:

❁ رات میں قبائل سے ملاقات:

اللہ کے رسول ﷺ کی حکمتِ عملی یہ تھی کہ آپ ﷺ قبائل سے ملاقات کے لئے رات کی تاریکی میں نکلتے تھے، تاکہ آپؐ کے درمیان اور ان قبائل کے درمیان کوئی مشرک رکاوٹ نہ ڈال سکے، اس حکمتِ عملی کے ذریعہ قریش کا مخالفانہ پروپیگنڈہ ناکام ہو جاتا، اس لئے کہ اللہ کے رسول ﷺ دن میں جب بھی کسی قبیلہ سے ملاقات کرتے تو قریش کے لوگ آپؐ کا پیچھا کرتے، لیکن رات میں ملاقات کی حکمتِ عملی نے ان کو اس اسکیم کو ناکام بنا دیا، اللہ کے رسول ﷺ کی اس نئی حکمتِ عملی کی کامیابی کی دلیل یہ ہے کہ آپؐ نے اوس اور خزرج کے ساتھ رات ہی میں ملاقاتیں کیں اور اسی کے نتیجہ میں بیعتِ عقبہ اُولی اور ثانیہ رات میں ہو سکیں۔ (تاریخ اسلام، نجیب آبادی 1/129، سیرت ابن ہشام، 2/44- 52، فی السیرۃ النبویہ قراءۃ لجوانب الحذر والحمایۃ، 116)

❁ قبائل کے ساتھ ان کی جائے مقام پر ملاقات:

آپ ﷺ نے یہ حکمتِ عملی اختیار کی کہ آپ قبائل کے ساتھ ملاقات ان کی جائے قیام پر کرتے، چنانچہ آپ ﷺ نے قبیلہ کلب، بنو حنیفہ اور بنو عامر سے ان کے پڑاؤ اور قیام کی جگہوں میں ملاقات کی، اس کے ذریعہ آپؐ کا مقصد یہ تھا کہ قریش کے پیچھا کرنے سے محفوظ رہیں اور بغیر کسی تشویش اور قریش کی دخل اندازی کے مناسب طریقہ سے قبائل کے ساتھ گفتگو کرسکیں۔(البدایہ والنہایہ، ابنِ کثیر 3/140)

❁ اعوان ورفقاء کا ساتھ میں رکھنا:

قبائل کے ساتھ بات چیت کرنے کے دوران بعض اوقات حضرت ابو بکرؓ اور حضرت علیؓ رسول اللہ ﷺ کے رفیقِ سفر ہوتے، ممکن ہے کہ ساتھ رکھنے کا مقصد یہ ہوتا کہ مدعو یہ نہ سمجھیں کہ آپ ﷺ تنہا ہیں اور قوم کے شرفاء اور اقارب ورشتہ داروں میں سے کوئی آپ کا حامی نہیں ہے، علاوہ ازیں حضرت ابو بکرؓ انسابِ عرب کے ماہر تھے جس کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کو قبائل کا تعارف حاصل کرنے میں آسانی ہوتی تھی اور پھر آپؐ اسی کے مطابق مناسب قبیلہ کے ساتھ ملاقات کرتے جو دعوت کی ذمہ داری اٹھا سکتا ہو۔

❁ قبیلہ کی حمایت کے بارے میں تیقن:

حفاظتی پہلو کو مد نظر رکھتے ہوئے رسول اللہ ﷺ سب سے پہلے تعارف میں ہی قبائل کے پاس طاقت وقوت کے بارے میں استفسار کرتے تھے، اس کے بعد ہی ان کے سامنے دعوت پیش کرتے تھے اور پھر ان سے حمایت ومدد کا مطالبہ کرتے تھے، اس لئے کہ قبیلہ کی طاقت وقوت ہی وہ ضروری چیز ہے جس کے ذریعہ دعوت کی حمایت ہوسکتی ہے، دعوت کو قبول کرنے والے قبیلہ کو ہر قسم کی باطلانہ اور شر پسند طاقتوں کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا، اس لئے ضروری ہے کہ وہ معنوی اور مادی استعداد کے اعتبار سے اس طرح کی صورتحال سے نمٹنے کے لئے تیار ہو۔ جس کے ذریعہ دشمنانِ اسلام مرعوب رہیں، دعوتِ حق کی حفاظت وحمایت ہو، اور وہ قبیلہ دعوت کی نشرواشاعت کی ذمہ داریوں کو اٹھانے کا متحمل ہوسکے، اور وہ ہر اس رکاوٹ کو راستے سے ہٹادے جو اس کی راہ میں حائل ہو۔

2) بنو عامر کے ساتھ مذاکرات:

اللہ کے رسول ﷺ نے یہ طے کیا کہ بنو عامر کے ساتھ مذاکرات کئے جائیں، اور یہ مذاکرات مکمل جائزہ اور منصوبہ بندی پر مبنی تھے، اللہ کے رسول ﷺ اور آپ کے رفیقِ کار حضرت ابو بکرؓ اچھی طرح جانتے تھے کہ بنو عامر قبیلہ ایک جنگجو قبیلہ ہے جو افرادی قوت بھی رکھتا تھا اور طاقتور بھی تھا، بلکہ وہ ان پانچ قبائل میں سے ایک تھا جن کی عورتوں کو کبھی جنگ میں قید نہیں کیا گیا، نہ ہی وہ کسی بادشاہ کے تابعِ فرمان رہے اور نہ ہی انہوں نے کبھی جزیہ ادا کیا، یہ قبیلہ قریش اور خزاعہ کے ہم پلہ تھا، اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ جانتے تھے کہ بنو عامر اور قبیلہ ثقیف کے درمیان قدیم زمانہ سے باہمی اختلاف اور کشمکش ہے، لہٰذا اگر قبیلہ ثقیف نے اندرون سے آپ ﷺ کی مخالفت کی ہے تو کیوں نہ آپ باہر سے اس کو گھیرنے کی کوشش کریں اور اس سلسلہ میں بنو عامر بن صعصعہ سے مدد لیں! اور اگر آپ ﷺ بنو عامر کے ساتھ کوئی معاہدہ کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں تو یہ قبیلہ ثقیف کے لئے خطرہ کی گھنٹی ہوگی۔(اصول الفکر السیاسی: 182)

سیرت نگار ذکر کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب بنو عامر بن صعصعہ کے پاس آئے توان کو اللہ کی طرف بلایا اور اپنے آپ کو ان کے سامنے پیش کیا، ان میں سے ایک "بیحرہ بن فراس" نامی شخص نے کہا: خدا کی قسم! اگر میں اس نوجوان کو قریش سے لے لوں توان کے ذریعہ تمام عربوں پر قبضہ کر لوں گا، اس کے بعد اس نے آپ ﷺ سے دریافت کیا: اگر ہم آپ کی اتباع کریں گے اور پھر اللہ آپ کو اپنے مخالفین پر غلبہ عطا کرے تو کیا آپ کے بعد اقتدار ہمیں ملے گا؟! آپؐ نے فرمایا: یہ معاملہ اللہ کے اختیار میں ہے وہ اس کو جسے چاہے عطا کرے گا۔ یہ سن کر اس نے آپ ﷺ سے کہا: کیا آپ کے دفاع میں عربوں کے ذریعہ ہماری گردنوں کو ہدف بنایا جائے گا اور پھر جب اللہ آپ کو کامیاب کرے گا تو اقتدار ہمارے علاوہ اور کسی کو ملے گا؟! ہمیں تمہارے دین کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اس کے بعد انہوں نے آپ ﷺ کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔(سیرت ابن ہشام 2/66، الدلائل لأبي نعیم: 215 تاریخ طبری 2/350- 351)

3) بنو شیبان کے ساتھ مذاکرات:

حضرت علی بن ابی طالبؓ کی روایت ہے، فرماتے ہیں: جب اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو حکم دیا کہ اپنے آپ کو قبائل کے سامنے پیش کریں تو آپ ﷺ نکلے اور میں آپ کے ساتھ تھا...... اس کے بعد فرماتے ہیں: اس کے بعد ہم ایک دوسری مجلس میں پہنچے، جہاں سکینت اور وقار کا ماحول تھا، حضرت ابو بکرؓ آگے بڑھے اور سلام کیا، پھر پوچھا: آپ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے کہا: شیبان بن ثعلبہ، یہ سن کر حضرت ابو بکرؓ رسول اللہ ﷺ کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا: میرے ماں باپ آپ پر قربان! یہ بڑے اہم لوگ ہیں، ان کا تعلق ایک معزز قبیلہ سے ہے۔ اس وقت وہاں ان کے درمیان مفروق بھی تھا جو فصاحت و بلاغت اور حسن و جمال میں سب پر فوقیت رکھتا تھا، اس کے لمبے بال دونوں طرف سے اس کے سینے پر لٹک رہے تھے اور وہ حضرت ابو بکرؓ کے سب سے زیادہ قریب بیٹھا تھا، حضرت ابو بکرؓ نے پوچھا: آپ کے پاس کتنی افرادی قوت ہے؟ مفروق نے کہا: ہمارے پاس ایک ہزار سے زائد افرادی قوت ہے اور ایک ہزار افراد قلتِ تعداد کی وجہ سے میدانِ کارزار میں مغلوب نہیں ہوا کرتے ہیں۔ حضرت ابو بکرؓ نے پوچھا: دشمن سے مقابلہ کرتے ہوئے آپ کی صورتحال کیسی ہوتی ہے؟ مفروق نے کہا: دشمن کے مقابلہ میں میدانِ کارزار میں ہمارا غیظ و غضب پورے شباب پر ہوتا ہے اور غیظ و غضب کی حالت میں ہم اور زیادہ جنگجو ہو جاتے ہیں، اور ہم اپنے گھوڑوں کو اپنی اولاد پر زیادہ ترجیح دیتے ہیں اور اسلحہ ہمیں اپنے مال و دولت سے زیادہ عزیز ہے، میدانِ کارزار میں اللہ کی طرف سے کبھی ہمیں غلبہ نصیب ہوتا ہے اور کبھی ہمارے دشمن کا پلڑا بھاری رہتا ہے۔ اس کے بعد اس نے کہا: شاید آپ قریش سے تعلق رکھتے ہیں؟ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے فرمایا: شاید آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ یہ اللہ کے رسول ہیں، ان سے بات کرلیں۔ مفروق نے کہا: اے قریشی بھائی! آپ ہمیں کس چیز کی دعوت دیتے ہو؟ آپ ﷺ نے فرمایا: آپ کے لئے میرا پیغام یہ ہے کہ اس بات کی گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، وہ تنہا ہے، اس کا کوئی شریک و سہیم نہیں ہے اور میں اس کا بندہ اور اس کا رسول ہوں، مجھے آپ سے پوری امید ہے کہ آپ مجھے پناہ دو گے اور میرا ساتھ دو گے، اس لئے کہ قریش کے لوگ اللہ کے خلاف بغاوت پر اتر آئے ہیں، انہوں نے اس کے رسول کی تکذیب کی ہے، حق کو چھوڑ کر باطل پر راضی ہیں اور اللہ کی ذات تو بے نیاز اور سراپا حمد ہے۔ یہ سن کر مفروق نے کہا: اے قریشی بھائی! آپ مزید کس چیز کی دعوت دیتے ہیں؟ خدا کی قسم! میں نے اس سے بہتر کلام نہیں سنا ہے۔ آپ ﷺ نے قرآن مجید کی آیات

تلاوت فرمائیں: ﴿قُلْ تَعَالَوْاْ أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ أَلَّا تُشْرِكُواْ بِهِۦ شَيْـًٔا وَبِٱلْوَٰلِدَيْنِ إِحْسَٰنًا وَلَا تَقْتُلُوٓاْ أَوْلَٰدَكُم مِّنْ إِمْلَٰقٍ نَّحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ وَلَا تَقْرَبُواْ ٱلْفَوَٰحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَلَا تَقْتُلُواْ ٱلنَّفْسَ ٱلَّتِى حَرَّمَ ٱللَّهُ إِلَّا بِٱلْحَقِّ ذَٰلِكُمْ وَصَّىٰكُم بِهِۦ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ﴾ ترجمہ: "اے محمدؐ! ان سے کہو کہ آؤ میں تمہیں سناؤں تمہارے رب نے تم پر کیا پابندیاں عائد کی ہیں: یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو، اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی دیں گے اور بے شرمی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی، اور کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے ہلاک نہ کرو مگر حق کے ساتھ، یہ باتیں ہیں جن کی ہدایت اس نے تمہیں کی ہے، شاید کہ تم سمجھ بوجھ سے کام لو"۔(سورۃ الأنعام:151)

یہ سن کر مفروق نے کہا: واللہ! آپ تو مکارم اخلاق اور بہترین اعمال کی دعوت دیتے ہیں، وہ قوم تباہ و برباد ہو گئی جنہوں نے آپ کو جھٹلایا اور آپ کے خلاف بغاوت کی۔ اس کے بعد اس نے ھانئ بن قبیصہ کو اختیار دیتے ہوئے کہا: یہ ھانئ ہم سب کے شیخ اور ہمارے مذہبی پیشوا ہیں۔ ھانئ نے کہا: اے قریشی بھائی! میں نے آپ کی گفتگو سنی، میرا خیال یہ ہے کہ نہ اس سے پہلے ہماری کوئی مجلس ہوئی ہے اور نہ اس کے بعد ہو گی، صرف ایک ہی مجلس اور میٹنگ کی وجہ سے ہم اپنے دین سے دستبردار ہو جائیں اور آپ کے دین کو اختیار کریں یقیناً یہ رائے کی کمزوری اور انجام پر نظر نہ رکھنے کی دلیل ہے، جلد بازی میں کئے گئے فیصلے نتیجہ خیز نہیں ہوتے ہیں، ان میں غلطی کا امکان ہوتا ہے، مزید برآں یہ بھی اچھا نہیں رہے گا کہ اپنی بقیہ قوم کو اعتماد میں لئے بغیر ہم کوئی معاہدہ کر بیٹھیں، اس لئے ہم واپس جائیں گے آپ بھی تشریف لے جائیں اور ہم غور و فکر کریں گے۔ اس کے بعد ایسا محسوس ہوا کہ وہ مثنہ بن حارثہ کو بھی اپنی رائے میں شریک کرنا چاہتا تھا، اس لئے اس نے کہا: یہ ہمارے شیخ اور ہماری قوم کے شہسوار اور جنگ کے ذمہ دار ہیں۔ مثنی نے کہا (یہ بعد میں اسلام لائے): اے قریشی بھائی! میں نے آپ کی گفتگو سن لی، اپنے دین کو ترک کرنے اور آپ کے دین کو اختیار کرنے کے سلسلہ میں جواب وہی ہے جو ھانئ بن قبیصہ نے دیا، ہم تو دو کشتیوں کے سوار ہیں، ایک ہے: یمامہ اور دوسری: سمامہ۔ آپ ﷺ نے اس سے پوچھا: یہ دو کشتیاں کون سی ہیں؟ اس نے کہا: کسری کی نہریں اور عربوں کے سمندر۔ جہاں تک شاہِ ایران کسری کی نہروں کا سوال ہے تو یہ تو ناقابل معافی جرم ہے اور اس کا عذر بھی ناقابل قبول ہے، ابھی شاہِ ایران کسری کے ساتھ ہمارا معاہدہ ہے کہ ہم کسی نئی تحریک کو قبول نہیں کریں گے اور نہ ہی نئی تحریک برپا کرنے والے کا ساتھ دیں گے۔ اے قریشی بھائی! میں سمجھتا ہوں کہ جس کی آپ دعوت دے رہے ہیں اس کو بادشاہ ناپسند کرتے ہیں، اگر آپ چاہیں تو سرزمینِ عرب پر ہم آپ کی مدد کرنے اور آپ کو پناہ دینے کے لئے تیار ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: بھلا اعترافِ حق کے بعد اس سے انکار کوئی معقول بات ہے؟! اللہ کے دین کی حفاظت اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ ہر اعتبار سے اس کی تمام جزئیات کو تسلیم کیا جائے، تمہارا کیا خیال ہے جب تم بچشمِ خود دیکھو کہ اللہ تعالی بہت جلد تم اہلِ ایمان کو ان کی سرزمین کا وارث بنائے گا، ان کے تمام وسائل آپ کے زیرِ

تصرف ہوں گے اوران کی عورتیں تمہارے ماتحت ہوں گی، کیااس وقت تم اللہ کی تسبیح اور تقدیس نہیں کروگے ؟ یہ سن کر نعمان بن شریک نے کہا: کیاخوب شان ہوگی اس وقت آپ کی !۔ (دلائل النبوۃ لأبی نعیم: 214البدایہ والنہایہ 3/142- 145)

۳: دروس واسباق اور فوائد:

اللہ کے رسول ﷺ جس نصرت و مدد کے لئے کوشش کررہے تھے وہ مخصوص قسم کی نصرت و مدد تھی، جس میں مندرجہ ذیل پہلو پیشِ نظر تھے:

۱) رسول اللہ ﷺ بیرونِ مکہ سے خاص طور پر اس وقت نصرت و مدد طلب کرنے لگے جب کہ آپ کے چچا حضرت ابو طالب کی وفات کے بعد ایذاء رسانیوں میں شدت آگئی، اس لئے کہ حضرت ابو طالب آپؐ کی قریش کے مقابلہ میں حمایت و حفاظت کرتے تھے، کیونکہ جو بھی دعوتی میدان میں سر گرم عمل ہوگا ظلم و زیادتی، دباؤ اور دہشت کے ماحول میں کوئی مؤثر اور نتیجہ خیز تحریک نہیں چلا پائے گا۔

۲) رسول ﷺ کا قبائل کے سامنے جاکر ان سے مدد طلب کرنا صرف اللہ عزوجل کے حکم سے تھا، یہ آپ ﷺ کا اجتہادی عمل نہیں تھا جو آپؐ نے مکہ میں دعوتی صورتحال کو دیکھ کر اختیار کیا ہو۔

۳) رسول اللہ ﷺ نے زعمائے قبائل اور مقام و مرتبہ کے حامل افراد سے ہی مدد طلب کی جن کے پیچھے ان کی اطاعت کرنے والے اور بات سننے والے پیروکار موجود تھے، اس لئے کہ اسی طرح کے لوگ دعوت اور داعی کو حمایت اور مدد فراہم کر سکتے تھے۔

۴) نبی کریم ﷺ کی سیرت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ آپؐ دو مقاصد کے پیشِ نظر مدد طلب کرتے تھے:

۞ آپ ﷺ دینِ حق کی تبلیغ کی حمایت کے لئے نصرت و مدد طلب کرتے تھے، تاکہ آپؐ محفوظ و مأمون ہو کر اور ہر قسم کی بدسلوکی سے دور رہتے ہوئے چل پھر سکیں۔

۞ نبی کریم ﷺ نصرت و مدد اس لئے بھی طلب کرتے تھے تاکہ آپؐ اقتدار و حکومت کی چابیاں اسی دعوت کی اُساس و بنیاد پر حاصل کر سکیں اور یہ ایک طبعی تربیت ہے۔

۵) نصرت و مدد کرنے کے لئے تیار طاقتوں کو نبی کریم ﷺ نے کسی طرح کی ضمانت اور گارنٹی دینے سے صاف انکار کر دیا، مثلاً یہ گارنٹی کہ ان کے لئے اس کے عوض اقتدار و حکومت میں کوئی حصہ ہوگا، یا اس نصرت و تائید کا کوئی بدلہ دیا جائے گا، اس لئے کہ یہ اللہ کی طرف سے دعوت ہے اور جو بھی اس دعوت پر ایمان لاتا ہے اور اس کی نصرت و تائید کے لئے تیار ہوتا ہے تو اس کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ اللہ کے لئے اخلاص اور اس کی رضاجوئی اس کی تمام قربانیوں اور اعمالِ خیر کا مقصود و مطلوب ہو، کوئی بھی دنیاوی لالچ یا کرسی اور اقتدار اس کے پیشِ نظر نہ ہو، اس لئے کہ انسان جس چیز کو اپنا مقصد بناتا ہے اسی کے مطابق پھر اس کی تمام کوششیں ہوا کرتی ہیں، لہٰذا ضروری ہے کہ دین کی نصرت و مدد کے پیچھے جو مقصد کارفرما ہو وہ ہر طرح کے مادی مفاد سے بالاتر ہو، اسی لئے یحیی بن معاذ رازی نے کہا ہے: "وہ شخص فلاح نہیں پا سکتا ہے جس سے اقتدار و ریاست کی بو آتی ہو"۔ (صفۃ الصفوۃ، 4/94، الجہاد والقتال فی السیاسۃ الشرعیۃ، محمد خیر ہیکل، 1/411، وقفات تربویہ من السیرۃ النبویہ، عبدالحمید البلالی، ص72)

٦) رسول اللہ ﷺ زعمائے قبائل سے جب نصرت و مدد طلب کرتے تھے تو اس کی بنیادی شرط یہ تھی کہ نصرت و مدد کرنے والے کسی ایسے معاہدہ کے پابند نہ ہوں جو دعوت کے ساتھ متناقض ہو، اور نہ ہی وہ اس کی خلاف ورزی کر سکتے ہوں۔ اس لئے کہ ایسی صورت حال میں ان طاقتوں کے ذریعہ دعوت کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے جن کے ساتھ ان کا معاہدہ ہو۔

بے شک مشروط یا جزئی حمایت کے ذریعہ مطلوبہ ہدف حاصل نہیں ہو سکتا ہے، مثلاً اگر شاہِ ایران کسری آپ ﷺ کے خلاف کسی طرح کی بھی کاروائی کرنا چاہتا تو بنو شیبان کسریٰ کے خلاف جنگ نہیں کر سکتے تھے اور نہ ہی اس کے مقابلہ میں آ سکتے تھے، اس لئے کہ ان کا اس کے ساتھ معاہدہ تھا، اسی لئے یہ مذاکرات ناکام ہو گئے۔ (الجہاد والقتال فی السیاسۃ الشرعیۃ: 1/412، التحالف السیاسی فی الاسلام، منیر غضبان، ص: 5)

٧) "اللہ کے دین کی حفاظت اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ ہر اعتبار سے اس کی تمام جزئیات کو تسلیم کیا جائے"۔ رسول اللہ ﷺ نے مثنیٰ بن حارثہ کو یہ جواب اس وقت دیا جب کہ اس نے نبی کریم ﷺ کی مشروط حمایت کرنے کی بات کہی کہ سرزمینِ عرب میں تو حفاظت کریں گے نہ کہ ایرانی سرزمین میں، لہٰذا جو بھی سیاسی بصیرت رکھتا ہو اور سیاست کے پیچ و خم سے واقف ہو وہ نبوی اور اسلامی دور اندیشی کو محسوس کر سکتا ہے۔

٨) بنو شیبان کا موقف رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کے موقع پر اطمئنان، اخلاق اور دلیری وبہادری سے متصف تھا، اور ان کے ردّ عمل میں نبی کریم ﷺ کی تعظیم جھلکتی تھی، اسی طرح ان کی باتیں انتہائی واضح تھیں اور جتنی حمایت پر وہ قادر تھے وہ بھی انہوں نے صاف صاف بیان کر دیا، انہوں نے یہ بھی بیان کیا کہ دعوتی تحریک کو بادشاہ ناپسند کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے تقریباً دس سال کے بعد بنو شیبان کے لئے ایسے حالات بنائے جبکہ ان کے دل نورِ اسلام سے منور ہو گئے تو انہوں نے ہی بادشاہوں کا مقابلہ کیا، چنانچہ حضرت مثنیٰ بن حارثہ شیبانی ان کے جنگی سپہ سالار اور کمانڈر تھے جنہوں نے حضرت ابو بکر صدیق ؓ کی خلافت میں سرزمینِ عراق میں فتوحات کی قیادت کی، اسلام قبول کرنے کے بعد وہ اور ان کی قوم فارسیوں کے ساتھ جنگ کرنے میں سب سے زیادہ جرأت اور دلیری کا مظاہرہ کرنے والے تھے، جب کہ زمانۂ جاہلیت میں یہی فارسیوں سے خوفزدہ رہتے تھے اور ان سے جنگ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے، بلکہ اسلام کی حقانیت تسلیم کرنے کے باوجود انہوں نے نبی کریم ﷺ کی دعوت کو صرف اس لئے ٹھکرا دیا تھا کیونکہ اس بات کا احتمال تھا کہ اس کی وجہ سے ان کو فارسیوں کے ساتھ جنگ کرنی پڑ سکتی ہے جس کا وہ اس وقت تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، اس سے اس دین کی عظمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو اس دنیا میں مقام بلند عطا کیا کہ ان کو روئے زمین کا امام و قائد بنا دیا اور آخرت میں بھی ان کے لئے انعام و اکرام کا وعدۂ الٰہی ہے۔ (دیکھیں: التربیۃ القیادیۃ، 2/20، التاریخ الاسلامی، الحمیدی 3/69)

....

دوسرا باب
خیر کے قافلے اور نور کی کرنیں

حضرت جابر بن عبداللہ انصاری ؓ فرماتے ہیں: "رسول اللہ ﷺ مکہ مکرمہ میں (بعثت کے بعد) دس سال رہے، سوقِ عکاظ، مجنّہ میں اور ایامِ حج میں، منیٰ میں، لوگوں کی جائے قیام میں ان سے ملاقات کرتے اور ان سے کہتے: مجھے کون پناہ دے گا؟ کون میری مدد کرے گا؟ تاکہ میں اپنے رب کا پیغام پہنچا سکوں، ایسے شخص کے لئے جنت کا وعدہ ہے۔ یہاں تک کہ یمن سے یا مضر سے کوئی شخص مکہ کی جانب سفر کرنا چاہتا تو اس کی قوم کے لوگ اس کے پاس آتے تھے اور اس سے کہتے تھے: قریش کے اس لڑکے سے بچے رہنا، کہیں وہ تمہیں فتنہ میں مبتلا نہ کردے۔ آپ ﷺ ان کے درمیان سے گزرتے تو لوگ انگلیوں سے آپ کی جانب اشارہ کرتے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو یثرب سے آپ ﷺ کے پاس بھیجا اور ہم نے آپ ؐ کی تصدیق کی، چنانچہ ہم میں سے کوئی شخص آپ ؐ کے پاس جاتا تھا اور وہ آپ ؐ پر ایمان لاتا تھا، آپ ؐ اس کو قرآن پڑھاتے تھے تو وہ شخص اپنے گھر والوں کے پاس واپس آتا تھا تو وہ بھی اس کے اسلام لانے کی وجہ سے اسلام قبول کرتے تھے، یہاں تک کہ انصار کے گھرانوں میں سے کوئی گھر ایسا نہیں بچا جہاں مسلمانوں میں سے چند لوگ موجود نہ ہوں، وہ اعلانیہ طور پر اسلام پر عمل پیرا ہوتے تھے۔(مسند أحمد: 3/322، 323، 339-340)

۱: حج اور عمرہ کے دوران انصار سے پہلا رابطہ:

۞ حضرت سوید بن صامت ؓ کا قبولِ اسلام:

اللہ کے رسول ﷺ جب بھی مکہ آنے والے کسی شخص کے بارے میں سنتے تھے جو شرف و عزت والا اور نامور ہوتا تو آپ ؐ اس سے ملاقات کی کوشش کرتے، اس کو اللہ کی طرف بلاتے اور اس کے سامنے ہدایت و حق کا پیغام پیش کرتے، حضرت سوید بن صامت ؓ جو بنو عمرو بن عوف سے تعلق رکھتے تھے، حج یا عمرہ کی غرض سے مکہ مکرمہ آئے، حضرت سوید ؓ کو ان کی قوم میں ان کی طاقت و قوت کی وجہ سے، ان کی ادبی و شعری صلاحیت کی وجہ سے اور ان کے شرف و مقام اور حسب و نسب کی وجہ سے "الکامل" کہا جاتا تھا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے جب ان کی آمد کی خبر سنی تو آپ ؐ نے ان سے ملاقات کی اور ان کو اللہ کی طرف اور اسلام کی طرف دعوت دی۔ حضرت سوید ؓ نے آپ ؐ کی بات سن کر فرمایا: شاید آپ کے پاس بھی وہی چیز ہے جو میرے پاس ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ان سے دریافت کیا: آپ کے پاس کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: صحیفۂ لقمان ہے۔ آپ ؐ نے ان سے کہا: اس کو ذرا میرے سامنے پیش کریں! انہوں نے جب آپ ؐ کے سامنے اس کو پیش کیا تو آپ ؐ نے فرمایا: بے شک یہ عمدہ کلام ہے! اور جو میرے پاس ہے وہ اس سے بھی افضل ہے! میرے پاس قرآن ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے مجھ پر نازل کیا ہے، اس میں ہدایت اور نور ہے۔ آپ ﷺ نے ان کے سامنے قرآن کی تلاوت فرمائی اور ان کو اسلام کی دعوت دی۔ انہوں نے آپ ؐ سے دوری نہیں اختیار کی بلکہ کہا: یہ تو بہت عمدہ کلام ہے۔ اس کے بعد آپ ؐ ان کے پاس سے واپس آگئے اور وہ اپنی قوم کے

پاس مدینہ منورہ آئے اور کچھ ہی وقت کے بعد خزرج کے لوگوں نے ان کو شہید کر دیا، ان کی قوم کے لوگ کہا کرتے تھے کہ ہمارا خیال یہ ہے کہ ان کو اسی لئے مارا گیا کیونکہ وہ مسلمان تھے، ان کا قتل بُعاث کی جنگ کے موقع پر ہوا۔ (سیرت ابن ہشام 2/67- 69، دلائل النبوۃ للبیہقی 2/418، تاریخ طبری 2/351- 352)

بہر حال اس کے قرائن و دلائل نہیں ملتے ہیں کہ حضرت سوید بن صامت نے اپنی قوم کے درمیان دعوت کا کام کیا ہو۔ (السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ 1/195)۔

۞ حضرت ایاس بن معاذ کا قبولِ اسلام:

جب ابو الحیسر بن رافع مکہ مکرمہ آیا تو اس کے ساتھ بنو عبد الاشہل کے بھی کچھ نوجوان تھے، جن میں ایاس بن معاذؓ بھی تھے، وہ خزرج کے مقابلہ میں قریش کے ساتھ معاہدہ کرنے کی غرض سے آئے تھے، ان کی آمد کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے سنا تو آپ ﷺ ان کے پاس تشریف لائے اور ان کے پاس بیٹھے، آپؐ نے ان سے کہا: آپ لوگ جس مقصد سے آئے ہو کیا میں اس سے بہتر چیز آپ کو بتاؤں؟ انہوں نے کہا: وہ کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: میں اللہ کا رسول ہوں، اس نے مجھے بندوں کے پاس بھیجا ہے تاکہ میں ان کو اس بات کی دعوت دوں کہ وہ اللہ ہی کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور اس نے مجھ پر اپنی کتاب نازل کی ہے۔ پھر آپ ﷺ نے ان کے سامنے اسلام کا ذکر کیا اور ان کو قرآن سنایا۔ یہ سن کر حضرت ایاس بن معاذ نے کہا: -وہ ایک نوعمر لڑکے تھے-: اے قوم، واللہ! یہ اس سے کہیں بہتر ہے جس کے لئے تم یہاں آئے ہو۔ یہ سن کر ابو الحیسر نے مٹھی بھر مٹی اٹھائی اور حضرت ایاس کے منہ پر دے ماری اور کہا: یہ سب رہنے دو، مجھے اپنی زندگی کی قسم! ہم تو اور کسی مقصد سے آئے ہیں! حضرت ایاس نے خاموشی اختیار کی اور رسول اللہ ﷺ ان کے پاس سے تشریف لے گئے، اس کے بعد اوس اور خزرج کے درمیان جنگ بُعاث ہوئی، کچھ عرصہ بعد ہی حضرت ایاس بن معاذ کی وفات ہو گئی، ان کی قوم کے جو لوگ ان کی وفات کے وقت موجود تھے انہوں نے بتایا کہ وہ مسلسل تہلیل و تکبیر اور تحمید و تسبیح میں مشغول رہے، یہاں تک دنیا سے رخصت ہو گئے، لوگوں کو اس بات میں کوئی شک نہیں رہا کہ وہ مسلمان ہونے کی حالت میں فوت ہوئے اور اسلام ان کے دل میں اس وقت گھر گیا تھا جب انہوں نے نبی کریم ﷺ کا کلام سنا تھا۔ (سیرت ابن ہشام: 2/69- 70، مسند احمد: 5/427، المعجم الکبیر للطبرانی: 805، دلائل النبوۃ للبیہقی: 2/420- 421 تاریخ طبری، 352-353، مجمع الزوائد، 6/36، الاصابہ 1/102)

۲: انصار کے اسلام کا آغاز:

منیٰ کی گھاٹی کے پاس زمانۂ حج میں قبیلۂ خزرج کے ایک وفد کے ساتھ انتہائی مفید اور نتیجہ خیز ملاقات کا آغاز ہوا، اللہ کے رسول ﷺ نے ان سے دریافت کیا: آپ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے کہا: ہم خزرج کے لوگ ہیں، آپ ﷺ نے دریافت کیا: کیا آپ یہود کے پڑوس میں رہتے ہیں؟ انہوں نے کہا: ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا: کیا آپ سے بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: کیوں نہیں، ضرور! چنانچہ وہ آپ ﷺ کے ساتھ بیٹھے تو آپؐ نے ان کو اللہ کی طرف بلایا، ان کے سامنے دعوت پیش کی اور ان کو قرآن سنایا۔

جب اللہ کے رسولؐ نے ان سے گفتگو کی اور ان کو اللہ کی طرف بلایا تو وہ ایک دوسرے سے کہنے لگے: اے قوم کے لوگو! واللہ، یہ وہی نبی ہیں، جن کے بارے میں یہود تمہیں ڈراتے ہیں، لہذا کہیں وہ تم سے پہلے ان کی طرف سبقت نہ کر جائیں۔ چنانچہ اُنہوں نے اللہ کے رسول ﷺ کی دعوت پر لبیک کہا، آپ ﷺ کی تصدیق کی اور آپؐ کی پیش کی ہوئی دعوت کو قبول کیا اور کہنے لگے: ہمارے پیچھے اپنی ایسی قوم ہے کہ کسی قوم کے درمیان اتنی عداوت و دشمنی نہیں ہے جتنی کے ان کے درمیان ہے، اس لئے ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو آپ کے ذریعہ جمع فرمادے، ہم ان کے پاس سے جائیں گے، ان کو بھی اس دین کی دعوت دیں گے اور ان کے سامنے بھی وہ دعوت رکھیں گے جس کو ہم نے قبول کیا ہے، اگر اللہ تعالیٰ ان کو آپ کے پاس جمع کر دے گا تو پھر آپ سے زیادہ صاحبِ عزت اور بہتر کوئی شخص نہیں ہوگا، اس کے بعد وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس سے چلے گئے اور اپنے وطن واپس آگئے، وہ ایمان لا چکے تھے اور تصدیق کر چکے تھے، وہ چھ افراد تھے جن کے نام یہ ہیں: حضرت اُبو اُمامہ اُسعد بن زرارہ، حضرت عوف بن حارث، یہ بنو نجار قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے، حضرت رافع بن مالک، حضرت قطبہ بن عامر، حضرت عقبہ بن عامر، حضرت جابر بن عبداللہ بن رئاب۔

جب یہ لوگ مدینہ منورہ اپنی قوم کے پاس پہنچے تو ان کے سامنے رسول اللہ ﷺ کا ذکر کیا اور ان کو بھی اسلام کی دعوت دی، یہاں تک کہ ان کے درمیان اسلام کی دعوت عام ہو گئی اور انصار کے گھروں میں سے کوئی ایسا گھر نہیں بچا جہاں اللہ کے رسول ﷺ کا ذکر نہ ہو۔ (دیکھیں: سیرت ابن ہشام 2/70- 71، طبقات ابن سعد، 1/218- 219، الدلائل للبیہقی: 2/433- 435، المعجم الکبیر للطبرانی: 20/362، مجمع الزوائد 6/40-42، البدایہ والنہایہ 3/148-149، شرح المواہب للزرقانی 1/361)

یہ کاروانِ حق اور قافلۂ خیر کا پہلا دستہ تھا جنہوں نے صرف ایمان پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود ہی اپنے آپ کو اس قابل بنایا کہ وہ اپنی قوم کو بھی ایمان کی دعوت دیں گے اور ان میں سے ہر ایک نے اپنے دین اور اپنے رسول کا پورا پورا حق ادا کر دیا، وہ جب اپنے وطن واپس گئے تو دعوتِ الی اللہ میں جاں فشانی سے کام لیا اور اپنے گھر والوں اور اُعزہ و اقارب کے سامنے کلمۂ ہدایت پیش کیا، یہاں تک کہ مدینہ کے گھرانوں میں سے کوئی ایسا گھر نہیں بچا جس میں رسول اللہ ﷺ کا ذکر اور چرچا نہ ہو، اور ایسا ہی ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے تو فیصلہ کن گھڑی آجاتی ہے، چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ ان لوگوں کی ملاقات بغیر کسی پیشگی وعدہ کے تھی، لیکن یہ ملاقات اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کے مطابق تھی تاکہ یہ تاریخِ انسانی میں مسلسل بہتا ہوا سرچشمۂ خیر، فیصلہ کن نقطۂ انقلاب اور بت پرستی سے آزادی کی گھڑی قرار پائے، بلکہ فی الحقیقت یہ پوری دنیائے انسانیت کے انجام کے لئے اور تاریکیوں سے نور کی طرف زندگی کا رخ موڑنے کے لئے ایک انقلاب آفرین اور فیصلہ کن گھڑی تھی، کیا یہ معقول بات ہے کہ چند لمحات کی ملاقات میں ان کے اندر ایسا انقلاب برپا ہو جائے گا کہ وہ متعصب بت پرستوں کے بجائے دعوت کے پرجوش انصار و مددگار، حق کے مخلص سپاہی اور ہر قسم کے دنیاوی لالچ سے پاک داعیانِ حق بن گئے، وہ اپنی قوم کے پاس اس حال میں جاتے ہیں کہ ان کے دلوں میں نور، ان کے چہروں پر نور، اور وہ خود نور کی راہ پر گامزن ہیں! یہ اللہ تعالیٰ کی عظیم مشیت کا تقاضا تھا کہ اس نے دعوت کے لئے زرخیز سرزمین اور محفوظ و مامون قلعہ مہیا کیا، آپ جس سخت جان اور مشکل ترین مرحلہ سے گزر کر آئے تھے جو مسلسل کشمکش، عملِ پیہم، قبائل سے ملاقات و مذاکرات اور مددگار و انصار کی تلاش میں گزرا تھا، وہ مرحلہ اب اپنی انتہا کو پہنچ رہا تھا، آج

کے بعد اسلام کے پاس زبردست دفاعی اور اقدامی قوت اور جانباز سپاہی ہوں گے، حق باطل کے ساتھ ٹکرائے گا تاکہ اس کے ساتھ ماضی کا حساب برابر کر لیا جائے اور کامیابی اہلِ تقوی کے قدم چومے گی، اور آج سے اب مکہ میں خیر کے قافلوں اور نور و ہدایت کے دستوں کی مسلسل آمد رہے گی جن کے لئے اللہ تعالی نے خیر کو مقدّر کر رکھا ہے تاکہ وہ ہدایت سے سرفراز ہوں، نور و روشنی میں اللہ کی تسبیح کریں، سرچشمۂ خیر سے سیراب ہوں اور اس حال میں یثرب واپس جائیں کہ وہ خیر کے پیغمبر اور نور عام کرنے والے ہوں۔ (أضواء علی الہجرۃ، توفیق محمد سبع، ص 273-274)

قابل ذکر بات یہ ہے کہ عقبہ کے پاس جو یہ پہلی ملاقات ہوئی اور جس میں قبیلۂ خزرج کے بعض لوگ نبی کریم ﷺ سے ملتے ہیں اور آپؐ کے ہاتھ پر اسلام قبول کرتے ہیں، اس ملاقات میں بیعت نہیں ہوئی اس لئے کہ یہ چند ہی افراد تھے اور انہوں نے اپنے قبائل کو اعتماد میں لئے بغیر خود ہی کسی معاہدہ کا اپنے آپ کو پابند بنانا مناسب نہیں سمجھا، البتہ انہوں نے اسلام کے پیغام کی تبلیغ میں مخلصانہ کردار ادا کیا۔ (ہجرۃ الرسول ﷺ وصحابتہ، للجمل، ص 143)

۳: بیعتِ عقبہ اُولی:

عقبہ کے پاس رسول اللہ ﷺ اور اہلِ یثرب کے درمیان پہلی ملاقات کے ایک سال بعد زمانۂ حج میں انصار کے بارہ افراد حاضر ہوئے اور انہوں نے عقبہ میں رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کی اور یہاں پر بیعتِ عقبۂ اُولی منعقد ہوئی، دس افراد کا تعلق قبیلۂ خزرج سے تھا، جبکہ دو قبیلۂ اُوس سے تھے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ پچھلے سال اسلام قبول کرنے والے قبیلۂ خزرج کے وفد نے اگرچہ پہلے مرحلہ میں اپنے قبیلہ میں ہی دعوتی کام کرنے پر توجہ مرکوز کی لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ اُوس کے کچھ افراد کو بھی دعوتی تحریک میں شامل کرنے میں کامیاب ہوگئے، اور یہیں سے دونوں قبیلوں کا اسلام کے پرچم تلے جمع ہونے کا آغاز ہو جاتا ہے۔ (السیرۃ النبویہ الصحیحہ، 1/197)

حضرت عبادہؓ بن صامت خزرجیؓ عقبہ اُولی کی بیعت کے متعلق بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "میں ان لوگوں میں شامل تھا جو عقبۂ اولی میں شریک تھے، ہم بارہ افراد تھے، ہم نے رسول اللہ ﷺ سے عورتوں والی بیعت کی، اور یہ اس وقت کی بات ہے جبکہ ہم پر ابھی جہاد فرض نہیں ہوا تھا، یہ بیعت کی کہ ہم اللہ کے ساتھ شرک نہیں کریں گے، چوری نہیں کریں گے، بدکاری نہیں کریں گے، اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گے اور نہ ہی کوئی بہتان تراشیں گے، کسی امرِ معروف میں آپ کی نافرمانی نہیں کریں گے۔ (آپؐ نے فرمایا:) اگر تم اس پر پورا پورا عمل کرو گے تو تمہارے لئے جنت ہے اور اگر تم اس میں سے کسی چیز میں کوتاہی کرو گے تو آپ کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے، اگر چاہے تو معاف کرے گا اور اگر چاہے سزا دے گا"۔ (صحیح بُخاری: 18- 92- 38- 3999، صحیح مسلم: 1709)

اس بیعت کی دفعات وہی ہیں جن کے مطابق بعد میں اللہ کے رسول ﷺ نے عورتوں سے بیعت لی، اسی لئے یہ "عورتوں والی بیعت" کے نام سے معروف ہوئی، اللہ کے رسول ﷺ نے بیعت کرنے والوں کے ساتھ حضرت مصعب بن عمیرؓ کو بھیجا تاکہ وہ ان کو دین کی تعلیم دیں، اور قرآن پڑھائیں، ان کو مدینہ میں "المقرئ" یعنی قاری کہا جاتا تھا، وہی نماز میں ان کی امامت کرتے تھے، اللہ کے رسول ﷺ نے ان کا انتخاب اس لئے کیا تھا، اس لئے کہ آپؐ ان کی شخصیت کے بارے میں اچھی طرح واقف تھے، اس لئے کہ حضرت مصعبؓ حفظِ قرآن کے

ساتھ ساتھ دور اندیشی، عدمِ جذباتیت، حسنِ اخلاق اور حکمت و دانشمندی جیسی صفات سے آراستہ تھے، اور ایمانی قوت اور دینی جذبہ تو آپؓ کی گھٹی میں شامل تھا، اس لئے چند ہی مہینوں میں وہ اس پر قادر ہوئے کہ مدینہ کے اکثر گھرانوں میں اسلام عام ہو گیا اور انہوں نے حضرت سعد بن معاذؓ اور حضرت اُسید بن حضیر جیسے بڑے زعماء اسلام کے انصار و مددگار کے طور پر حاصل کر لئے، چنانچہ ان دونوں زعماء کی وجہ سے ان کی قوم کے بہت سے افراد حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ (الغرباء الأولون، ص185-187)

یقیناً حضرت مصعب بن عمیرؓ کی سفارت کاری کامیاب ہو گئی، وہ دینی تعلیمات کی وضاحت کرتے، قرآنِ کریم کی تعلیم دیتے، اس کی تفسیر بیان کرتے اور مکہ مکرمہ میں نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کے ساتھ ان کے روابط مضبوط کرتے، تاکہ دعوتی تحریک کے لئے ایک محفوظ مرکز کی بنیاد پڑ سکے۔

حضرت مصعب بن عمیرؓ یثرب میں حضرت اُسعد بن زرارہؓ کے پاس قیام پذیر تھے، مسلمان دعوت الی اللہ کے سلسلہ میں انتہائی سرگرم عمل رہے اور اس تحریک کی قیادت حضرت مصعب بن عمیرؓ کر رہے تھے، انہوں نے اپنی تحریک میں قرآنی منہج و طریقہ کار اختیار کیا، یہی طریقہ کار انہوں نے اپنے استاد گرامی قدر ﷺ سے سیکھا تھا اور بعض مکی قرآنی آیات نے اس منہج کو ہمارے سامنے عملی شکل میں پیش کیا ہے، جیسے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: [اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ] ترجمہ: ''اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلاؤ اور ان سے اس طریقہ سے بحث کرو جو سب سے اچھا ہو، بے شک تمہارا رب اسے خوب جانتا ہے جو اس کی راہ سے گمراہ ہوا اور وہ ہدایت پانے والوں کو بھی خوب جانتا ہے''۔ (سورۃ النحل: 125) (السیرۃ النبویہ فی ضوء القرآن والسنۃ 1/441)

۴: اُسید بن حضیرؓ اور سعد بن معاذؓ کے قبولِ اسلام کا واقعہ:

حضرت سعد بن معاذ اور حضرت اسید بن حضیر، بنو عبد الأشہل میں اپنی قوم کے سردار تھے، یہ دونوں اپنی قوم کی طرح مشرک تھے، جب ان دونوں نے حضرت مصعب بن عمیرؓ کے بارے میں اور ان کی دعوتی سرگرمیوں کے بارے میں سنا تو حضرت سعدؓ نے حضرت اُسید سے کہا: آپ کو کیا ہو گیا ہے! ان دونوں حضرات کے پاس جائیں جو ہمارے گھروں تک پہنچ چکے ہیں تاکہ وہ ہم میں سے کمزور قسم کے لوگوں کو بیوقوف بنائیں، ان کی سرزنش کریں اور ان کو ہمارے گھروں تک آنے سے منع کریں، اگر اُسعد بن زرارہ کے ساتھ میری قرابت داری نہ ہوتی جو کہ آپ جانتے ہیں تو میں یہ کام خود ہی کر لیتا، وہ میرے خالہ زاد بھائی ہیں، میں ان کے ساتھ سختی سے بات نہیں کر سکتا ہوں۔ یہ سن کر اُسید نے اپنا نیزہ لیا اور ان دونوں کے پاس آ گئے، جب حضرت اُسعد بن زرارہؓ نے ان کو دیکھا تو حضرت مصعبؓ سے کہہ دیا کہ یہ اپنی قوم کے سردار ہیں، یہ آپ کے پاس آئے ہیں، صدقِ دل کے ساتھ ان کے ساتھ بات کریں، حضرت مصعبؓ نے کہا: اگر وہ بیٹھیں گے تو میں ان سے بات کروں گا، اُسید ان دونوں کو کھڑے کھڑے ہی برا بھلا کہنے لگے اور کہا: تم یہ کیا لے کر آئے ہو؟ ہمارے کمزوروں کو بے وقوف بنا رہے ہو؟ اگر تمہیں اپنی جان پیاری ہے تو ہم سے دور رہو۔ یہ سن کر حضرت مصعبؓ نے پر سکون اور پر اعتماد مؤمنانہ لہجے میں کہا: کیا آپ

تشریف نہیں رکھیں گے ؟آپ بھی سن لیں! اگر آپ کو یہ بات پسند آئے تو قبول کر لیجئے گا اور اگر پسند نہ آئے تو پھر ہم آپ کو تکلیف پہنچانے سے باز رہیں گے۔

اُسید نے کہا: آپ نے انصاف کی بات کی، اس کے بعد انہوں نے زمین میں اپنا نیزہ گاڑھ لیا اور ان کے پاس بیٹھ گئے، حضرت مصعبؓ نے اسلام کے بارے میں گفتگو کی اور ان کے سامنے قرآن پڑھا، ان دونوں کا کہنا ہے - جیسے کہ ان سے منقول ہے-: واللہ! ہم نے بات کرنے سے پہلے ہی ان کے چہرے اور ان کی نرم روئی سے ان پر اسلام کے آثار محسوس کر لئے تھے، حضرت مصعبؓ کی باتیں اور قرآن کی تلاوت سننے کے بعد انہوں نے کہا: یہ کلام کتنا حسین و جمیل ہے! جب آپ اس دین میں داخل ہونا چاہتے ہیں تو کیا کرتے ہیں؟ دونوں نے ان سے کہا: آپ غسل کریں، پاک ہو جائیں، کپڑوں کو پاک کر لیں، پھر اس کے بعد کلمۂ حق کی گواہی دیں، اور پھر نماز ادا کریں۔ وہ کھڑے ہوئے، غسل کیا، اپنے دونوں کپڑے پاک کئے اور کلمۂ شہادت ادا کر لیا، اس کے بعد کھڑے ہوئے اور دو رکعتیں ادا کر لیں۔ اس کے بعد ان دونوں سے کہا: میرے پیچھے ایک ایسا شخص ہے اگر وہ تمہاری اتباع کر لے گا تو اس کی قوم کا کوئی فرد اس سے پیچھے نہیں رہے گا، میں ابھی اس کو آپ کے پاس بھیجتا ہوں، وہ ہیں: سعد بن معاذؓ۔

اس کے بعد انہوں نے اپنا نیزہ لیا اور حضرت سعدؓ اور ان کی قوم کے پاس گئے، وہ اپنی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے، جب حضرت سعدؓ نے ان کو آتے ہوئے دیکھا تو کہا: اللہ کی قسم! اُسید بن حضیر جس چہرہ کے ساتھ تمہارے پاس سے گئے تھے اب دوسرے ہی چہرہ کے ساتھ تمہارے پاس واپس آ رہے ہیں، جب وہ آکر مجلس کے پاس کھڑے ہو گئے تو سعدؓ نے ان سے کہا: کیا کیا آپ نے؟! انہوں نے کہا: میں نے دونوں حضرات سے بات کی ، واللہ! مجھے ان دونوں میں کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں لگی، میں نے ان کو باز رہنے کی بات بھی کہی تو ان دونوں نے کہا: آپ جیسا کہیں گے ہم تیار ہیں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ بنو حارثہ کے لوگ اُسعد بن زرارہ کو قتل کرنے کے لئے ان کی طرف نکلے ہیں، اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ وہ آپ کے خالہ زاد بھائی ہیں، وہ آپ کے ساتھ بے وفائی کر رہے ہیں۔

بنو حارثہ کے متعلق یہ بات سن کر سعدؓ جلدی جلدی غصہ کی حالت میں کھڑے ہو گئے، انہوں نے اپنے ہاتھ میں نیزہ لیا اور کہا کہ میں نہیں سمجھتا ہوں کہ آپ نے مجھے کچھ فائدہ پہنچایا، اس کے بعد سعدؓ خود ان دونوں حضرات کے پاس گئے اور ان کو دیکھا کہ وہ اطمئنان سے بیٹھے ہیں۔ اس وقت وہ سمجھ گئے کہ حضرت اُسید نے ان سے اس طرح کی بات اس لئے کہی کیونکہ وہ چاہ رہے تھے کہ میں خود ان کا کلام براہِ راست سنوں۔ وہ کھڑے کھڑے ان کو برا بھلا کہنے لگے، اس کے بعد حضرت اُسعد بن زرارہ سے کہا: واللہ! اے ابو اُمامہ! اگر میرے اور تمہارے درمیان قرابت داری نہ ہوتی تو پھر میری طرف سے اور ہی کچھ دیکھتے، کیا آپ ہمارے گھرانوں میں وہ چیز لے کر آئے ہو جس کو ہم ناپسند کرتے ہیں؟! حضرت اُسعدؓ اس سے پہلے ہی حضرت مصعبؓ سے کہہ چکے تھے کہ واللہ! ایک ایسا سردار آیا ہے اس کے پیچھے ایسی قوم ہے کہ اگر یہ آپ کی اتباع کر لیں تو ان میں سے ایک آدمی بھی پیچھے نہیں رہے گا، اس لئے حضرت مصعبؓ نے ان سے کہا: کیا آپ تشریف نہیں رکھیں گے؟! آپ خود سماعت فرمالیں اگر آپ کو یہ بات پسند آئے اور اس میں دلچسپی لیں، تو آپ اس کو قبول کر لیں اور اگر آپ اس کو ناپسند کریں تو ہم اس چیز کو آپ سے دور رکھیں گے جس کو آپ ناپسند کریں گے۔ سعدؓ نے کہا: آپ نے انصاف پر مبنی بات کی ہے۔ اس کے بعد

انہوں نے اپنا نیزہ زمین میں گاڑھا اور بیٹھ گئے۔ حضرت مصعبؓ نے ان کے سامنے اسلام پیش کیا اور قرآن پڑھ کر سنایا، راوی موسی بن عقبہ کہتے ہیں کہ حضرت مصعبؓ نے ان کے سامنے سورۂ زخرف کی ابتدائی آیات تلاوت کیں، ان دونوں حضرات کا کہنا ہے کہ واللہ! ہم نے بات کرنے سے پہلے ہی ان کے چہرے اور ان کی نرم روئی سے ان پر اسلام کے آثار محسوس کر لئے تھے۔ اس کے بعد سعدؓ نے ان دونوں دریافت کیا: جب آپ لوگ اسلام قبول کرتے ہیں تو کیا کرتے ہو؟ اُنہوں نے کہا: آپ غسل کریں، پاک ہو جائیں، کپڑوں کو پاک کریں، اس کے بعد کلمۂ شہادت ادا کریں، اور پھر دو رکعت نماز ادا کریں۔ چنانچہ وہ اٹھے اور غسل کیا، اپنے کپڑے پاک کئے، اس کے بعد کلمۂ شہادت ادا کیا اور دو رکعت نماز ادا کی، اس کے بعد اپنا نیزہ اٹھایا اور واپس اپنی قوم کی مجلس کی جانب رخ کیا، ان کے ساتھ حضرت اُسید بن حضیر بھی تھے، جب ان کی قوم نے ان کو آتے ہوئے دیکھا تو کہنے لگے: اللہ کی قسم! سعد جس چہرہ کے ساتھ تمہارے پاس سے گئے تھے اب دوسرے ہی چہرہ کے ساتھ تمہارے پاس واپس آرہے ہیں، جب وہ ان کے سامنے آکر کھڑے ہوگئے تو کہا: اے بنو عبد الاَشہل! میرا تمہارے درمیان کیسا مقام ہے؟ سب نے کہا: آپ ہمارے سردار و رہنما ہیں، رائے کے اعتبار سے ہم میں سب سے افضل ہیں اور نمائندگی کے لئے سب سے زیادہ بابرکت شخصیت ہیں۔ یہ سن کر حضرت سعدؓ نے فرمایا: اس وقت تک آپ کے تمام مردوں اور عورتوں کے ساتھ میرے لئے بات کرنا حرام ہے یہاں تک کہ آپ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان نہ لے آؤ! فرماتے ہیں: شام تک بنو عبد الاشہل میں کوئی ایسا مرد اور کوئی ایسی عورت نہیں تھی جو مسلمان نہ ہو چکے ہوں۔

اس کے بعد حضرت اُسعدؓ اور حضرت مصعبؓ حضرت اسعد بن زرارہ کے گھر واپس گئے اور حضرت مصعبؓ نے انہیں کے پاس قیام کیا، لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے رہے، یہاں تک کہ انصار کا کوئی گھرانہ ایسا نہ بچا جہاں مسلمان مرد اور خواتین نہ ہوں، سوائے ایک شخص اُصیرم کے جس کا نام عمرو بن ثابت بن وقش تھا، اس نے غزوۂ احد تک اسلام قبول نہیں کیا اور پھر غزوۂ اُحد کے موقع پر اسلام قبول کیا اور غزوۂ احد میں ہی جامِ شہادت نوش کیا، ان کو اللہ کے لئے کوئی ایک سجدہ کرنے کا بھی موقع نہیں ملا اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ وہ اہلِ جنت میں سے ہیں۔ (تاریخ طبری: 2/357- 359، طبقات ابن سعد 20/420، دلائل البیہقی 2/431-432، المعجم الکبیر للطبرانی: 20/362 السیرۃ النبویہ لأبی شہبہ 1/442)

ابن اسحاق نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ وہ کہا کرتے تھے: مجھے کسی ایسے شخص کے بارے میں بتائیں جو جنت میں داخل ہوا اور اس نے کوئی نماز نہیں پڑھی؟ لوگ جب ان کا نام نہ بتا پاتے تو وہ کہتے: وہ ہیں اُصیرم بنی عبد الاشہل۔ (مسند أحمد: 5/428 - 429، مجمع الزوائد 9/364، السیرۃ النبویہ لابی شہبہ: 1/444، صحیح السیرۃ النبویہ، ص 291)

۵: دروس واسباق اور فوائد وعبرتیں:

۱) نبی کریم ﷺ کی منصوبہ بندی بطورِ خاص یثرب پر مرکوز رہی اور اسلام قبول کرنے والے چھ افراد کا اُس سال کے دوران دعوت کو عام کرنے میں انتہائی اہم کردار رہا۔

۲) مدینہ منورہ میں اسلام عام ہونے میں کئی عوامل نے بنیادی کردار ادا کیا جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

أ: اُوس وخزرج کے قبائل کی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے رقت ونرمی اور تکبر وانکارِ حق سے دوری رکھی تھی اور اس کا تعلق خاندانی اور نسلی خصائص سے ہے جن کی جانب رسول اللہ ﷺ نے اس وقت اشارہ فرمایا تھا جبکہ یمن کا ایک وفد آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا تھا: ''تمہارے پاس اہلِ یمن آئے ہیں جو رقیق القلب اور نرم دل ہیں"۔(صحیح بخاری: 4388، صحیح مسلم:52) اور یہ دونوں قبائل اصلاً یمن سے تعلق رکھتے تھے جن کے اجداد قدیم زمانہ میں وہاں سے ترک وطن کر کے یہاں آکر آباد ہوئے تھے، قرآن کریم نے ان کی تعریف کرتے ہوئے بیان کیا ہے:[وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۭ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ] ترجمہ: (اور وہ اُن لوگوں کے لئے بھی ہے) جو اِن مہاجرین کی آمد سے پہلے ہی ایمان لا کر دار الہجرۃ میں مقیم تھے، یہ اُن لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے اِن کے پاس آئے ہیں، اور جو کچھ بھی اُن کو دے دیا جائے اُس کی کوئی حاجت تک یہ اپنے دلوں میں محسوس نہیں کرتے، اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں، حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے دل کی تنگی سے بچا لئے گئے وہی فلاح پانے والے ہیں''۔(سورۃ الحشر:9)

ب: مدینہ منورہ کے ان دو قبائل یعنی اوس اور خزرج میں موجود آپسی عداوت ودشمنی اور آپسی چپقلش پائی جاتی تھی، چنانچہ ان کے مابین بعاث جیسی خونریز جنگیں بھی ہوئیں، اور اس جنگ نے ان کے بڑے بڑے زعماء کو ختم کر دیا جن کی طرح کے زعماء مکہ، طائف اور دوسری جگہوں پر دعوت کی راہ میں اہم رکاوٹ تھے اور اب یہاں مدینہ میں صرف جدید نوجوانوں قیادت باقی بچی تھی جو قبولِ حق کے لئے تیار تھی، علاوہ ازیں ان کے پاس کوئی معروف قائد ورہنما بھی نہیں تھا جس کے سامنے تمام لوگ سرِ تسلیم خم کر لیتے، اس لئے ان کو کسی ایسے قائد کی ضرورت تھی جس کے ارد گرد جمع ہوتے اور اس کے سائے میں ان کا شیرازہ متحد ہوتا، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: ''بعاث کی جنگ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کے مفاد میں پہلے ہی مقدم کر رکھا تھا، چنانچہ آپؐ مدینہ تشریف لائے تو یہ قبائل آپسی انتشار کا شکار ہو چکے تھے اور ان کے کچھ سردار قتل کئے جا چکے تھے اور کچھ زخمی تھے تو اللہ تعالیٰ نے اس جنگ کو آپ سے پہلے اس لئے مقدم کیا تاکہ وہ آپؐ کے آتے ہی اسلام میں داخل ہو جائیں''۔(صحیح بخاری: 3777،3846،3930، مسند احمد:6/61، دلائل النبوۃ للبیہقی: 2/421)

ج: یہود کے پڑوس میں ہونا، جس کی وجہ سے وہ آسمانی مذاہب اور سابق رسولوں کے بارے میں علم وواقفیت رکھتے تھے، ان کو معاشرہ میں اپنی روزانہ کی زندگی میں اس موضوع سے کسی نہ کسی اعتبار سے سابقہ پڑتا تھا، وہ قریش کی طرح نہیں تھے جن کے قریب اہلِ کتاب نہیں

رہتے تھے اور وہ صرف کبھی کبھار رسالت و نبوت اور وحی الہی کے متعلق متفرق باتیں سنتے تھے اور اس مسئلہ سے بار باران کا سابقہ نہیں پڑتا تھا، یہود اوس اور خزرج کو ایک نبی کے بارے میں دھمکی دیتے تھے کہ ایک نبی کی بعثت کا زمانہ قریب آچکا ہے اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ اس نبی کی اتباع کریں گے اور اس کے تعاون سے وہ ان کو عاد وارم کی طرح قتل کریں گے، حالانکہ اوس اور خزرج یہود سے زیادہ تعداد میں تھے۔ اللہ تعالی نے اپنی کتاب میں ان کے متعلق بیان کیا ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَلَمَّا جَآءَهُمۡ كِتَٰبٌ مِّنۡ عِندِ ٱللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمۡ وَكَانُواْ مِن قَبۡلُ يَسۡتَفۡتِحُونَ عَلَى ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ فَلَمَّا جَآءَهُم مَّا عَرَفُواْ كَفَرُواْ بِهِۦۚ فَلَعۡنَةُ ٱللَّهِ عَلَى ٱلۡكَٰفِرِينَ﴾ ترجمہ:"اور اب جو ایک کتاب اللہ کی طرف سے ان کے پاس آئی ہے، اس کے ساتھ ان کا کیا برتاؤ ہے؟ باوجود یہ کہ وہ اس کتاب کی تصدیق کرتی ہے جو ان کے پاس پہلے سے موجود تھی، باوجود یہ کہ اس کی آمد سے پہلے وہ خود کفار کے مقابلہ میں فتح ونصرت کی دعائیں مانگا کرتے تھے، مگر جب وہ چیز آگئی، جسے وہ پہچان بھی گئے تو انہوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا، اللہ کی لعنت اِن منکرین پر"۔ (سورۃ البقرہ:89)

اوس اور خزرج زمانۂ جاہلیت میں یہود پر غالب رہے تھے، وہ اہلِ شرک تھے اور یہود اہلِ کتاب تھے، اس لئے اہلِ کتاب ان سے کہتے تھے کہ ایک نبی کی بعثت کا زمانہ قریب آچکا ہے، ان کے ساتھ مل کر ہم تمہیں عاد وارم کی طرح قتل کریں گے۔ (الغرباءالأولون، ص 183الدر المنثور للسیوطی: 1/216)

اللہ نے اپنے دین کی مدد کا فیصلہ کیا تو نبی کریم ﷺ کی نصرت وحمایت کے لئے اہلِ مدینہ میں سے چھ (۶) افراد کا انتخاب کیا، جن کے ساتھ نبی کریم ﷺ منٰی کی گھاٹی میں ملے، ان کے سامنے اسلام پیش کیا، وہ اس کے ذریعہ خوش ہوئے اور انہوں نے اسلام قبول کیا اور وہ سمجھ گئے کہ یہی وہ نبی ہیں جن کا نام لے کر یہودی ان کو دھمکی دیتے ہیں، چنانچہ وہ مدینہ منورہ واپس آئے تو نبی کریم ﷺ کے ذکر کو اپنے گھروں میں عام کیا اور یہیں سے انصار کے اسلام کا آغاز ہوا جیسے کہ سیرت نگاروں نے بیان کیا ہے۔ (سیرت ابن ہشام: 1/44)

۳) بیعت عقبۂ اولی میں اوس کے دو افراد بھی شریک تھے، یہ اسلامی مفاد کے اعتبار سے انتہائی اہم پیش قدمی تھی، اس لئے کہ بعاث کی خون ریز جنگ کے بعد خزرج کے چھ لوگ اس میں کامیاب ہوگئے کہ داخلی اختلافات وکشمکش کو بالاتر رکھتے ہوئے اپنے ساتھ مزید نئے افراد کو شریکِ بیعت کرلیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ساتھ کئے ہوئے عہد وپیمان کو پورا کرلیا کہ وہ کشمکش کے ماحول کو ختم کرنے کی کوشش کریں گے اور مدینہ میں اوس اور خزرج کو اسلام میں داخل کرنے کے لئے سرگرم عمل رہیں گے اور موجودہ قبائلی جنگوں اور کشمکش سے آگے بڑھ کر کام کریں گے۔

۴) بیعتِ عقبہ کے نتیجہ میں پیدا شدہ یہ نئی پیش رفت اصلاً حضرت مصعب بن عمیر ؓ کی سعیِ جمیل اور کاوش کا ثمرہ تھی جن کو رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا تھا، وہ لوگوں کو قرآن کریم اور اسلامی مبادیات کی تعلیم دیتے تھے اور انہوں نے اپنی حکمت ودانشمندی اور سیاسی شعور کے لئے اسلام کے حق میں عظیم کامیابیاں اور اہم فتوحات حاصل کیں۔ (التحالف السیاسی، ص 71)

۵) رسول اللہ ﷺ کے اس سفیر نے ایک ہی سال میں بہت کچھ کر کے دکھایا اور یہ سب اللہ کی توفیق اور اس عظیم داعی کے اخلاص وصداقت کے نتیجہ میں ممکن ہو سکا، آج کے مسلم ممالک کے سفراء رسول اللہ ﷺ کے اس سفیر کے مقابلہ میں کہاں کھڑے ہیں؟! اس لئے حکام کی ذمہ داری ہے کہ ایک صاحبِ ایمان، باعمل اور باصلاحیت سفیر کا انتخاب کریں جو قول وعمل اور اخلاق و کردار کے اعتبار سے اپنے ملک اور دین کی صحیح نمائندگی کر سکے اور لوگ اسی کی شخصیت کو دیکھ کر اور سن کر اسلام کی تصویر دیکھ سکیں۔

۶) سفیرِ اسلام حضرت مصعبؓ اس میں بھی کامیاب ہوگئے کہ دعوت وحکمت کو ایک نئے مرکز کی طرف منتقل کرنے کے لئے مناسب ماحول تیار کریں، اس لئے کہ انہوں نے اپنے عمل و کردار کے ذریعہ بیعت عقبۂ اولی کی حقیقی روح کی بہترین ترجمانی کی جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ اسلامی نظام کو مکمل طور پر تسلیم کیا جائے۔(دیکھیں: دولۃ الرسول ﷺ من التکوین الی التمکین، ص356)

۷) رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ میں اسلامی تحریک کو مضبوط کرنے کے لئے اپنے پاس موجود تمام اسباب ووسائل بروئے کار لائے اور اس مضبوط مرکز کی تعمیر میں ممکنہ انسانی کوششیں صرف کرنے میں ذرہ برابر کوتاہی نہیں برتی گئی، یہ مرکز نئی حکومت کی بنیاد بننے والا تھا۔ اس سلسلہ میں دعوتی وتنظیمی اعتبار سے مکمل دو سال تک انتہائی جانفشانی سے کام کیا گیا۔

۸) انصار میں سے اسلام قبول کرنے والوں کے دلوں میں ایمان اپنے کمال تک پہنچ گیا اور انصار نے یہ محسوس کر لیا کہ اب نئی حکومت کے قیام کا وقت آ چکا ہے، جیسے کہ حضرت جابرؓ اس وقت کی صورتحال کی منظر کشی کرتے ہوئے بیان فرماتے ہیں: "کب تک ہم رسول اللہ ﷺ کو اسی حال میں چھوڑے رہیں گے کہ آپ مکہ کی پہاڑیوں میں ادھر ادھر گھومتے رہیں گے، آپ کو دھتکارا جاتا رہے گا اور آپ کو خوفزدہ کیا جاتا رہے گا"۔(التحالف السیاسی، ص71)

۹) حضرت مصعبؓ بعثتِ نبوی کے تیرہویں سال زمانۂ حج سے پہلے پہلے مکہ مکرمہ پہنچے اور مدینہ منورہ میں مسلمانوں کی صورتحال، وسائل و ذرائع اور امکانات کی مکمل تصویر رسول اللہ ﷺ کے سامنے بیان کی اور بیان کیا کہ اوس و خزرج کے لوگوں میں اسلام کس طرح عام ہو رہا ہے اور اب وہ قوم ایک نئی بیعت کرنے کے لئے تیار ہیں اور رسول اللہ ﷺ کی حمایت وحفاظت کرنے پر مکمل قدرت رکھتے ہیں۔

۱۰) تاریخ کا دھارا موڑ دینے والی تاریخی ملاقات بعثت کے تیرہویں سال زمانۂ حج میں ہوئی جہاں اہلِ یثرب میں سے ستر (۷۰) سے زائد مسلم نفوس مناسکِ حج کی ادائیگی کے لئے حاضر ہوئے اور جب وہ مکہ مکرمہ پہنچے تو خفیہ اور رازدارانہ طریقہ سے ان کے درمیان اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان رابطہ ہوا جس کے نتیجہ میں فریقین کے مابین اس بات پر اتفاق ہوا کہ ایامِ تشریق کے درمیان منی میں عقبہ کی گھاٹی میں جمرۂ اُولی کے پاس ملاقات ہوگی، اور یہ ملاقات رات کی تاریکی میں انتہائی رازداری کے ساتھ کی جائے گی۔ (التحالف السیاسی، ص37)

....

تیسرا باب

بیعتِ عقبہ ثانیہ

حضرت جابر بن عبداللہ - رضی اللہ عنہ- فرماتے ہیں: "....لہذا ہم نے سوچا کہ کب تک ہم رسول اللہ ﷺ کو اسی حال میں چھوڑے رہیں گے کہ آپ ؐ کو مکہ کی پہاڑیوں میں دھتکارا جاتا رہے گا اور آپ ؐ کو خوفزدہ کیا جاتا رہے گا؟! اس لئے ہم میں سے (70) افراد نے رختِ سفر باندھا یہاں تک کہ وہ آپ ؐ کے پاس زمانۂ حج میں آئے۔ ہم نے آپ ؐ سے عقبہ کی گھاٹی میں ملاقات طے کی، ہم ایک ایک، دو دو آدمی آپ ؐ کے پاس جمع ہوتے رہے، یہاں تک کہ سب جمع ہو گئے، اس کے بعد ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ؐ! کس چیز پر ہم آپ سے بیعت کریں؟ آپ ؐ نے فرمایا: "آپ مجھ سے اس بات پر بیعت کرو کہ پسندیدگی اور نشاط کی حالت میں اور ناپسندیدگی اور سستی کی حالت میں سمع واطاعت کرو گے، خوشحالی اور تنگ حالی میں انفاق کرو گے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو گے، اللہ کے لئے حق کا پیغام پہنچاؤ گے اور کسی ملامت گر کا خوف نہیں کھاؤ گے، میری نصرت و مدد کرو گے، جب میں آپ کے ہاں آؤں تو اسی طرح میری حفاظت کرو گے جس طرح اپنی جان، عورتوں اور اولاد کی حفاظت کرتے ہو، آپ کے لئے جنت کا وعدہ ہے"۔

فرماتے ہیں: ہم اٹھ کر آپ ؐ کی طرف گئے اور آپ ؐ سے بیعت کی، حضرت اُسعد بن زرارہ - جو کہ ان میں سے سب سے زیادہ کمسن تھے - نے آپ ﷺ کا ہاتھ پکڑا اور کہا: اے اہلِ یثرب! ذرا رکو، سوچ سمجھ کر بات کرو! ہم یہ جانتے ہوئے رختِ سفر باندھ کر آئے ہیں کہ یہ اللہ کے رسول ہیں اور یہاں سے ان کے لے کر جانے کا مطلب یہ ہے کہ تمام عربوں سے قطع تعلق کرنا ہوگا، تمہارے معزز لوگوں کو قتل کیا جائے گا، آپ پر تلواروں کے وار کئے جائیں گے، لہذا یا تو آپ لوگوں کو اس پر جمنا ہوگا تو آپ کا اجر اللہ کے ذمہ ہے، اور اگر تمہیں بزدلی کی وجہ سے اپنی جانوں کا خوف ہے تو اس کو ابھی واضح کر دو، اس لئے کہ اس موقع پر صاف بات کرنا اللہ کے نزدیک قابل قبول ہوگا۔

یہ سن کر سب نے کہا: اے اُسعد! چھوڑیں، کیا بات کرتے ہیں آپ! واللہ! ہم اس بات سے دستبردار ہونے والے نہیں ہیں، نہ ہی اس کو ہم ترک کر سکتے ہیں۔ فرماتے ہیں: ہم آپ کے پاس کھڑے ہو گئے اور آپ ؐ سے بیعت کی، آپ ؐ نے ہم سے بیعت لی اور شرائط بھی عائد کیں اور اس پر ہم سے جنت کا وعدہ فرما رہے تھے۔ (السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ 1/199)

اس طرح انصار نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اطاعت، نصرت و مدد اور جنگ کرنے پر بیعت کی، اسی لئے حضرت عبادہ بن صامت ؓ نے اس بیعت کو جنگ کی بیعت قرار دیا ہے۔ (مسند الامام اُحمد: 5/316)

حضرت کعب بن مالک انصاری ؓ - جو عقبۂ ثانیہ میں بیعت کرنے والوں میں شامل تھے - کی روایت میں مزید اہم تفصیلات ہیں، فرماتے ہیں: ہم اپنی مشرک قوم کے حجاج کے ساتھ نکلے، ہم اس سے پہلے نماز پڑھتے تھے اور دین کو سمجھ چکے تھے، اس کے بعد ہی ہم حج کرنے نکلے، اور ہم نے ایام تشریق کے وسط میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عقبہ میں ملاقات کر پروگرام طے کیا، ہمارے ساتھ جو مشرکین تھے ان سے ہم نے اس معاملہ کو راز میں رکھا، ہم اس رات اپنی قوم کے ساتھ اپنی جائے قیام میں سو گئے یہاں تک کہ رات کا تہائی حصہ گزر گیا، اور پھر ہم

رسول اللہ ﷺ سے وقت مقررہ پر ملاقات کے لئے نکلے، کبوتر کے کھسکنے کی طرح چھپتے ہوئے نکلے یہاں تک کہ عقبہ کے پاس گھاٹی میں ہم سب جمع ہو گئے، اور ہم طرح تہتر (73) مرد اور دو خواتین تھیں، وہ خواتین تھیں: حضرت نُسیبہ بنت کعب اور حضرت اُسماء بنت عمرو۔ ہم سب گھاٹی میں جمع ہو گئے اور رسول اللہ ﷺ کا انتظار کرتے رہے یہاں تک کہ آپ ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے اور آپؐ کے ساتھ حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب تھے، وہ اس دن اپنی قوم کے دین پر تھے، مگر انہوں نے چاہا کہ اپنے بھتیجے کے ساتھ ایک اہم فیصلہ میں شریک رہیں اور آپؐ کے تئیں پورا اطمئنان کر لیں، جب وہ تشریف فرما ہوئے تو سب سے پہلے حضرت عباس بن عبدالمطلب نے بات کی، انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ اپنی قوم بنو ہاشم کی حفاظت میں ہے، لیکن آپؐ مدینہ کی جانب ہجرت کرنا چاہتے ہیں، اسی لئے عباس چاہتے ہیں کہ ان کے بارے میں انصار کی حمایت و حفاظت پر اطمئنان حاصل کر لیں، ورنہ پھر ان کو اسی حال میں رہنے دیں۔ انصار نے مطالبہ کیا کہ رسول ﷺ گفتگو کریں اور اپنے لئے اور اپنے رب کے لئے جو چاہیں شرائط عائد کریں۔

آپؐ نے فرمایا: "میں تم سے اس بات پر بیعت لیتا ہوں کہ تم میری اسی طرح حفاظت کرو جس طرح اپنی عورتوں اور اپنے بچوں کی حفاظت کرتے ہو"۔ یہ سنتے ہی حضرت براء بن معرور نے آپؐ کا ہاتھ پکڑا اور کہا: ہاں، بالکل! اس ذات کی قسم جس نے حق کے ساتھ آپ کو مبعوث کیا ہے! ہم اسی طرح کی حفاظت کریں گے جس طرح ہم اپنے آپ کی اور اپنے اہل و عیال کی حفاظت کرتے ہیں۔ اے اللہ کے رسولؐ! آپ ہم سے بیعت کر لیں، واللہ! ہم جنگجو اور ہتھیاروں والے لوگ ہیں اور مقابلہ آرائی اور جنگ کرنا ہمیں وراثت میں ملا ہے۔ ابوالہیثم بن تیہان نے ان کی بات کاٹتے ہوئے دریافت کیا: اے اللہ کے رسولؐ! ہمارے درمیان اور یہودی قوم کے درمیان روابط و تعلقات ہیں اور ہم ان سے تعلقات توڑنے جا رہے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ اگر ہم نے ایسا کر لیا اور پھر اللہ تعالیٰ آپ کو غلبہ عطا کرے تو آپ اپنی قوم کی جانب واپس نہ چلے جائیں اور ہمیں ایسے ہی چھوڑ دیں! یہ سن کر رسول اللہ ﷺ مسکرائے اور فرمایا: نہیں، ایسا نہیں ہو گا! آپ کا خون میرا خون ہے اور آپ کا قتل میرا قتل ہے، میں تم سے ہوں اور تم مجھ سے ہو، میں بھی اس کے ساتھ جنگ کروں گا جس کے ساتھ تم جنگ کرو گے، اور اس سے میں بھی صلح کروں گا جس کے ساتھ تم صلح کرو گے"۔

پھر آپ ﷺ نے فرمایا: اپنے میں سے مجھے بارہ (12) نقیب (نمائندے) منتخب کر کے دے دو تا کہ وہ اپنی قوم کے معاملات میں ان کے امیر اور نمائندے ہوں، چنانچہ انہوں نے بارہ نقیب متعین کئے: نو خزرج میں سے اور تین اُوس میں سے۔

رسول اللہ ﷺ نے ان سے کہا کہ اپنی جائے قیام چلے جائیں، ان لوگوں نے کسی شیطان کو اس کی اطلاع قریش کو دیتے ہوئے سنا تھا، حضرت عباس بن عبادہ بن نضلہ نے کہا: اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے! اگر آپ چاہیں تو ہم سب صبح ہی اہل منیٰ پر اپنی تلواروں سے حملہ کر دیں۔ آپؐ نے فرمایا: ہمیں اس کا حکم نہیں دیا گیا ہے، لیکن آپ لوگ اپنی جائے قیام واپس تشریف لے جائیں"۔ چنانچہ وہ اپنی جائے قیام واپس چلے گئے۔ صبح ہوتے ہی سردارانِ قریش کا ایک گروہ پہنچ جاتا ہے اور ان سے نبی کریم ﷺ کے ساتھ کی گئی بیعت اور ان کے ذریعہ نبی کریم ﷺ کو دی گئی ہجرت کی دعوت کے بارے میں سوالات کرتے ہیں، خزرج اور اُوس کے مشرکین نے قسم کھا کر کہا کہ انہوں نے ایسا نہیں کیا ہے جبکہ مسلمان خاموش دیکھ رہے تھے۔ حضرت کعبؓ فرماتے ہیں: اس کے بعد یہ لوگ چلے تو ان میں

حارث بن ہشام بن مغیرہ مخزومی بھی تھے، وہ بالکل نئے جوتے پہنے ہوئے تھے، میں نے بات کا رخ موڑتے ہوئے ابو جابر سے ایک بات کہی - اوراس کے ذریعہ میں ان لوگوں کو بھی بات میں شریک کروانا چاہتا تھا - (میں نے کہا): اے ابو جابر! آپ تو ہمارے سرداروں میں سے ایک سردار ہیں، کیا آپ قریش کے اس نوجوان جیسے جوتے نہیں پہن سکتے ہیں؟! ان دونوں کی یہ بات حارث نے سن لی، اس نے اپنے پیروں کے جوتے اتار کر میری طرف ڈال دیا اور کہا: اللہ کی قسم! ان کو ضرور پہنا ہے۔ فرماتے ہیں: ابو جابر کہنے لگے: چھوڑیئے! واللہ! آپ نے اس نوجوان کو ناراض کر دیا، ان کے جوتے واپس کر دو۔ فرماتے ہیں: میں نے کہا: نہیں! واللہ! میں واپس نہیں کروں گا، واللہ یہ فال نیک اور اچھا شگون ہے، اگر یہ فال سچ ثابت ہوا تو میں اس نوجوان کو ہی اس کی قوم سے لے لوں گا۔ (مسند أحمد: 3/460- 462، مستدرک حاکم: 2/624-625، تاریخ طبری: 2/360 - 362، السنن الکبری للبیہقی: 9/9، سیرت ابن ہشام: 1/61، السیرۃ النبویہ الصحیحۃ، العمری، 1/201)

دروس واسباق اور فوائد وعبرتیں:

۱) یہ عظیم بیعت اپنے اسباب ومحرکات کے اعتبار سے، اثرات وفوائد کے اعتبار سے اور تاریخی صورتحال کے اعتبار سے سب سے بڑی فتح تھی، اس لئے کہ یہ اسلامی فتوحات کے سلسلہ کی پہلی کڑی تھی جس کے منعقد ہونے کے بعد ہی سے تدریجی شکل میں اس کے نتائج واثرات کے طور پر فتوحات کی مختلف کڑیاں پے بہ پے سامنے آتی رہیں، اس لئے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے اس میں انصار اللہ کے طاقتور ترین ہراول دستہ سے مختلف عہد وپیمان لئے تھے، وہ لوگ اپنے عہد وپیمان کی اہمیت کو سب سے زیادہ جاننے والے لوگ تھے اور اللہ اور رسول ؐ کے ساتھ کئے ہوئے عہد وپیمان کو پورا کرنے میں سب سے زیادہ پابند تھے، چاہے اس کے ایفاء میں جان اور مال کی کتنی ہی قربانیاں دینی پڑیں، یہ بیعت اپنے محرکات کے اعتبار سے حق پر ایمان لانے اور حق کی نصرت ومدد کرنے کی بیعت تھی، یہ اپنے مقتضیات کے اعتبار سے ایک ایسی قوت تھی جس کو راہ میں حائل تمام طاقتوں کے ساتھ نبرد آزما ہونا تھا، جنگ وقتال کے میدان میں اس کی اہمیت اور اس کا وزن ومقام اللہ کے ان انصار کے ذہن سے غائب نہیں تھا، یہ بیعت اصلاً روئے زمین پر ہر متکبر ومغرور کے خلاف اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے جہاد اور قتال کے تمام ممکنہ وسائل کو بروئے کار لانے کی تیاری تھی، تاکہ دین پورے کا پورا اللہ کے لئے ہو جائے، یہ اپنی تاریخی پسِ منظر کے اعتبار سے عدل و صداقت، نصرت وشہادت اور پیغامِ اسلام کی تبلیغ کی بیعت تھی۔ (دیکھیں: محمد رسول اللہ ﷺ، محمد صادق عرجون: 2/400)

۲) بے شک ایمان کی اصل حقیقت اور نفوس کی تربیت میں اس کے اثرات کا ظہور اس وقت ہوتا ہے کہ جب کہ عظیم شخصیات اپنی جانوں کا نذرانہ اللہ کی راہ میں پیش کرنے کے لئے تیار ہو جائیں اور وہ روئے زمین پر کسی مفاد، منصب، قیادت یا لیڈری کے طلبگار نہ ہوں، یہ تو وہ لوگ ہوتے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی کے دسیوں سال اسی زعامت وقیادت کے خلاف کشمکش میں گزار دیئے، یہی صحابہ کرام اور بطورِ خاص انصارِ مدینہ کا طرۂ امتیاز تھا، یہی ایمان باللہ اور اس دین کی اصل حقیقت ہے جبکہ ایمان دلوں کے اندر جاگزیں ہوتا ہے۔ (التربیۃ القیادیۃ 2/103)

۳) بیعتِ عقبہ میں زبردست منصوبہ بندی ظاہر ہوتی ہے، اس لئے کہ یہ بیعت انتہائی مشکل حالات میں تکمیل کو پہنچی اور یہ اس وقت کی مشرکانہ طاقتوں کے لئے ایک خطرناک اور جرأتمندانہ چیلنج تھا، اللہ کے رسول ﷺ کی یہ منصوبہ بندی باریک بینی اور استحکام کے اعتبار سے مندرجہ ذیل پہلوؤں کی وجہ سے کامیابی کے مرحلہ تک پہنچی:

أ: بیعت ہونے والے تمام افراد نے انتہائی رازداری اور خفیہ طریقہ سے کام کیا اور جائے قیام سے بیعت کی جگہ منتقل ہوئے تاکہ اس اہم میٹنگ اور بیعت کا راز فاش نہ ہونے پائے، چنانچہ یثرب سے آنے والا وفد تقریباً پانچ سو افراد پر مشتمل تھا جن میں سے بیعت کرنے والے مسلمانوں کی تعداد ستر مرد اور دو عورتوں پر مشتمل تھی، لہذا ان ستر افراد کی کوئی بھی حرکت اور ان کا وہاں سے منتقل ہونا کوئی آسان کام نہیں تھا، چنانچہ ایام تشریق کا دوسرا دن اور تہائی رات کے بعد کا وقت ملاقات کے لئے طے ہوا، ایک ایسا وقت جو کہ ہر ایک کے سونے اور آرام کا وقت ہے اور اس وقت چہل پہل بھی نہیں ہوتی ہے، اسی طرح گھاٹی کی دائیں سمت کی جگہ ملاقات کے لئے طے پائی تاکہ رات میں اگر کوئی کسی ضرورت سے جاگ بھی جائے تو اس کی نگاہوں سے اوجھل رہیں۔ (دیکھیں: الہجرۃ النبویہ المبارکۃ، عبدالرحمن البر، ص 61)

ب: بیعت کرنے والے تمام افراد وقت مقررہ پر ملاقات کی جگہ پہنچ گئے، اور وہ چھپتے چھپاتے ایک ایک، دو دو آدمی کھسکتے رہے۔

ج: وقتِ مقررہ اور ملاقات کی جگہ کو انتہائی راز میں رکھا گیا، یہاں تک کہ اس کے بارے میں صرف تین افراد کو علم تھا، حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب، جو نبی کریمؐ کے ساتھ اس لئے آئے تھے تاکہ آپ کے بارے میں بات کو پختہ کر کے اطمئنان حاصل کریں، حضرت علی بن ابی طالبؓ، جو گھاٹی کے دہانے پر مسلمانوں کے لئے پہرا دینے کا کام کر رہے تھے، حضرت ابو بکرؓ جو گھاٹی کے دوسرے راستے پر پہرہ دے رہے تھے۔ ان تین افراد کے علاوہ مسلمانوں میں سے کوئی اس معاملہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا، اسی طرح بیعت کرنے والے تمام افراد کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ نہ تو آواز بلند کریں اور نہ ہی طویل گفتگو کریں، تاکہ مشرکین کا کوئی جاسوس ان کی حرکات و سکنات کو محسوس نہ کر سکے۔ (التربیۃ القیادیۃ 2/109، الہجرۃ النبویہ المبارکہ، ص: 62)

د: جب کسی شیطان نے بیعت کے بارے میں راز فاش کر دیا اس وقت بھی اخفاء اور رازداری کے طرزِ عمل کو اختیار کیا جاتا رہا، نبی کریم ﷺ نے ان کو حکم دیا کہ فوراً اپنی قیام گاہ کی طرف واپس جائیں اور کسی طرح کا شور و ہنگامہ نہ کریں اور آپ ﷺ نے کسی طرح کی مسلح کاروائی کے ذریعہ جواب دینے سے انکار کر دیا، اس لئے کہ ابھی اس کے لئے حالات سازگار نہیں تھے، اور جب قریش کے لوگ اس خبر کی تصدیق کرنے کے لئے آئے تو تمام مسلمانوں نے خاموشی اختیار کر کے یا دوسرے موضوع کی باتیں کر کے ان کو اس کی بھنک تک نہ لگنے دی۔

ھ: ایامِ حج کی آخری رات کا انتخاب کیا گیا جو کہ ذی الحجہ کی تیرھویں تاریخ تھی، اس لئے کہ دوسرے دن کی ظہر تک حجاج کرام اپنے اپنے علاقوں کی جانب واپس چلے جائیں گے اور اگر بیعت کے بارے میں راز منکشف بھی ہو جاتا ہے تو قریش کے پاس اتنا وقت ہی نہیں رہے گا کہ وہ کسی طرح سے جانے والوں کی راہ میں رکاوٹ ڈال سکیں، یہ ایک متوقع صورتحال تھی اور ایسی ہی صورتحال پیش بھی آئی۔

۴) بیعت کی پانچوں دفعات اتنی واضح اور قوی تھیں کہ ان میں کسی طرح کے اشتباہ اور ٹال مٹول کی کوئی گنجائش نہیں تھی، وہ دفعات تھیں: نشاط اور عدمِ نشاط میں سمع و طاعت، خوشحالی اور تنگ حالی میں انفاق، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، اللہ کے لئے پیغامِ حق پہنچانا اور کسی ملامت گر کی ملامت کی کوئی پرواہ نہ کرنا، رسول اللہ ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لائیں تو آپؐ کی نصرت و حمایت کرنا۔ (التحالف السیاسی، ص:82)

۵) انصار کے قائد حضرت براء بن معرورؓ نے بغیر کسی تردد کے بہت جلد جواب دیا: ''اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے ہم اسی طرح آپ کی حفاظت کریں گے جس طرح ہم اپنے آپ کی اور اپنے اہل و عیال کی حفاظت کرتے ہیں، اے اللہ کے رسول! آپ ہم سے بیعت کر لیں، واللہ! ہم جنگجو اور ہتھیاروں والے لوگ ہیں اور مقابلہ آرائی اور جنگ کرنا ہمیں وراثت میں ملا ہے''۔ وفد کے قائد نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے اپنی قوم کے امکانات اور صلاحیتوں کو پیش کیا کہ ان کی قوم جنگی صلاحیتوں کی مالک اور اسلحہ سے لیس قوم ہے، حضرت براءؓ کی جس بات کی جانب اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ جب یثرب سے اپنی قوم کے ساتھ آئے تو ان سے کہا: میں نے ایک رائے اختیار کی ہے، واللہ! میں نہیں جانتا کہ آپ اس میں میری موافقت کریں گے یا نہیں؟! اُنہوں نے پوچھا: وہ کیا ہے؟ فرمایا: میں نے یہ سوچا ہے کہ میں اس عمارت - یعنی کعبہ - کو اپنی پیٹھ کے پیچھے نہ رکھوں، بلکہ اسی کی طرف رخ کر کے نماز پڑھوں، ساتھیوں نے ان سے کہا: واللہ! ہمیں تو یہی معلوم ہوا ہے کہ نبی کریم ﷺ شام - بیت المقدس - کی جانب رخ کر کے نماز پڑھتے ہیں اور ہم نہیں چاہتے ہیں کہ ہم ان کی مخالفت کریں، جب نماز کا وقت ہوتا تھا سب لوگ بیت المقدس کی جانب رخ کر کے نماز پڑھتے تھے اور وہ خانہ کعبہ کی جانب نماز پڑھتے تھے، وہ ایسا ہی کرتے رہے یہاں تک کہ وہ مکہ مکرمہ آئے اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تعارف ہوا، جبکہ آپؐ اپنے چچا حضرت عباسؓ کے ساتھ مسجد حرام میں بیٹھے ہوئے تھے، نبی کریم ﷺ نے حضرت عباسؓ سے دریافت کیا: اے ابو الفضل! کیا آپ ان دو لوگوں کو جانتے ہیں؟ انہوں نے کہا: ہاں! یہ براء بن معرور اپنی قوم کے سردار ہیں اور یہ کعب بن مالک ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: شاعر؟ انہوں نے کہا: ہاں، اس کے بعد حضرت براءؓ نے آپ کے سامنے سفر میں کعبہ کی جانب نماز پڑھنے کا قصہ بیان کیا اور پوچھا: اے اللہ کے رسولؐ! آپ کا اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟ آپؐ نے فرمایا: آپ ایک قبلہ کی جانب رخ کرتے تھے اگر اسی پر صبر کر لیں۔ حضرت کعبؓ فرماتے ہیں: اس کے بعد حضرت براءؓ رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے قبلہ کی طرف نماز پڑھنے لگے اور ہمارے ساتھ شام کی جانب رخ کر کے نماز پڑھنے لگے، جب ان کی وفات کا وقت آیا تو انھوں نے اپنے گھر والوں کو وصیت کی کہ ان کا رخ کعبہ کی جانب کریں، ان کا انتقال ماہِ صفر میں رسول اللہ ﷺ کے مدینہ آنے سے ایک ماہ قبل ہوا، انہوں نے نبی کریم ﷺ کے لئے تہائی مال کی وصیت کی تھی اور آپ ﷺ نے اس کو برقرار رکھا اور وصیت کردہ مال کو ان کی اولاد کو دے دیا، یہ سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنے تہائی مال کی وصیت کی۔ (السیرۃ النبویۃ لأبي شہبہ 1/444 - 445)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رسول ﷺ کے احکام واُسوہ کے تئیں کس قدر فکر مند اور پابند تھے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بھی رائے جب رسول اللہ ﷺ کے حکم اور طرزِ عمل کے برخلاف ہو تو وہ ناقابل قبول ہے، چاہے اس کا مصدر کوئی بھی ہو، یہ امور اللہ کے دین میں بنیادی فقہ و سمجھ سے تعلق رکھتے ہیں جو صحابہ کرام کی زندگی میں نمایاں طور پر دیکھنے کو ملتے ہیں جب کہ وہ سفر کے ابتدائی پڑاؤ پر تھے۔

اسی طرح یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت براءؓ اگرچہ اپنی قوم کے سردار تھے، لیکن قبولِ اسلام کے بعد اصل سیادت و قیادت اب رسول اللہ ﷺ کے سوا اور کسی کو حاصل نہیں تھی، اور کسی بھی شخص کی عزت و توقیر اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ وہ رسول

ﷺ کے احکام اور اُوامر کا پابند ہو،اس طرح سے صحابہ کرام کی زندگیوں میں جاہلی افکار اور رسم ورواج ختم ہوگئے اور اس کی جگہ ایمانی اور اسلامی اقدار نے جگہ لے لی، یہی اصل معیار ہے جس کی بنیاد پر لوگوں کے مقام ومرتبہ کو پرکھا جاسکتا ہے۔(دیکھیں: معین السیرۃ النبویۃ، للشامی،ص: 135)

۶) ابوالہیثم بن تیہان نے بالکل دوٹوک اور واضح بات کی جب کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے فرمایا: اے اللہ کے رسولؐ! ہمارے درمیان اور یہودی قوم کے درمیان روابط وتعلقات ہیں اور ہم ان سے تعلقات توڑنے جارہے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ اگر ہم نے ایسا کرلیا اور پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو غلبہ عطا کیا، تو آپ اپنی قوم کی جانب واپس نہ چلے جائیں اور ہمیں ایسے ہی چھوڑ دیں"۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ مسکرادیئے اور فرمایا: نہیں ایسا نہیں ہوگا! بلکہ آپ کا خون میرا خون ہے، آپ کا قتل میرا قتل ہے، میں تم سے ہوں اور تم مجھ سے ہو، میں بھی اس سے جنگ کروں گا جس کے ساتھ تمہاری جنگ ہوگی اور اس سے میں بھی صلح کروں گا جس کے ساتھ تم صلح کروگے"۔

یہ استفسار واضح کرتا ہے کہ اسلام کے ذریعہ مسلمان کس عظیم آزادی سے سرفراز تھے یہاں تک کہ حضرت ابوالہیثم نے دل کی بات مکمل آزادی کے ساتھ بیان کردی،اور سیدالخلق ﷺ کی طرف سے جواب بھی عظیم تھا جس کے ذریعہ آپ ﷺ نے اپنے آپ کو انصار کا ایک جزء اور انصار کو آپ کا جزء قرار دیا۔ (دیکھیں:التربیۃ القیادیۃ 2/67،السیرۃ النبویۃ لأبی فارس،ص: 209)

۷) نقباء(نمائندوں)کے انتخاب سے اہم دروس واسباق حاصل ہوتے ہیں:

أ: رسول اللہ ﷺ نے بذاتِ خود نقباء کی تعیین نہیں فرمائی بلکہ ان کے انتخاب کا حق بیعت ہونے والے افراد کو دیا،اس لئے کہ وہی ان کے ذمہ دار اور کفیل ہوں گے،اور بہتر یہ ہے کہ انسان اس شخص کا انتخاب خود کرے جو اس کا ذمہ دار اور امیر ہوگا،یہ ایک شرعی معاملہ ہے اور رسول اللہ ﷺ نے چاہا کہ صحابہ کرام نقباء کے انتخاب کے ذریعہ عملی طور پر شورائی نظام پر عمل پیرا ہوں۔

ب: انتخاب میں نسبتی نمائندگی کا خیال رکھا گیا،اس لئے کہ بیعت میں شامل ہونے والے افراد میں اُوس کے مقابلہ میں خزرج کے افراد زیادہ تھے،یعنی اُوس کے مقابلہ میں خزرج کے تین گنا افراد زیادہ تھے،اسی لئے نقباء بھی اُوس سے تین اور خزرج سے نو منتخب کئے گئے۔ (السیرۃ النبویۃ، أبو فارس،ص:209)

ج: اللہ کے رسول ﷺ نے نقباء کو یثرب میں دعوتی تحریک کا نگراں مقرر فرمایا جہاں اسلامی مرکز کی بنیاد پڑ چکی تھی،اسلام کو جاننے والے اور اس کو قبول کرنے والے مسلسل بڑھ رہے تھے،اس لئے رسول اللہ ﷺ نے ان کو یہ احساس دلانا چاہا کہ وہ اب اجنبی نہیں ہیں کہ اب ان کے پاس ان کے علاوہ کسی اور کو بھیجا جائے بلکہ وہ اب خود اہلِ اسلام اور اس کے حمایتی وانصار بن چکے ہیں۔(دیکھیں: دراسات فی السیرۃ النبویۃ،د۔عماد الدین خلیل،ص: 132)

۸) زعمائے مکہ نے رسول اللہ ﷺ اور انصار کے مابین ہونے والے معاہدہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی،اس لئے وہ تلاش میں نکلے تو 'أذاخر' کے مقام پر ان کو حضرت سعد بن عبادہؓ اور حضرت منذرؓ بن عمرو ملے، اور یہ دونوں نقیب تھے۔جہاں تک حضرت منذرؓ کا تعلق ہے تو یہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگئے،اور جہاں تک حضرت سعدؓ کا تعلق ہے تو مشرکین نے ان کو گرفتار کرلیا اور ان کے

کجاوے کی رسی سے ان کے ہاتھ ان کی گردن کے ساتھ باندھ دیئے۔اس کے بعد ان کو لے کر مکہ میں داخل ہوئے، وہ ان کو زدوکوب کر رہے تھے اور ان کو ان کے لمبے بالوں سے کھینچ رہے تھے، بالآخر وہ حارث بن حرب بن اُمیہ اور جبیر بن مطعم کے ذریعہ قریش کے چنگل سے آزاد ہونے میں کامیاب ہوگئے، یہ اپنے علاقہ میں ان دونوں کی تجارت کو حفاظت و حمایت فراہم کرتے تھے، اس موقع پر ان کو جاہلی عادات و تقالید آزادی دلانے میں معاون بنیں، جبکہ اس وقت وہاں کے مسلمان ان کا کوئی تعاون نہیں کر سکے اور اس کا ان کو کوئی ملال بھی نہیں تھا، اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ مسلمان مکہ میں خود بے گھر ہیں اور وہ اپنی بھی مدد و حمایت کرنے سے عاجز ہیں۔ (دیکھیں: التاریخ الاسلامی، الحمیدی 3/107،التربیۃ القیادیۃ 2/116)

اسی واقعہ کے بارے میں ہجرت کے متعلق دو اشعار کہے گئے جن کو ضرار بن خطاب بن مرداس نے کہا، اس نے کہا:

تَدَارَكْتَ سعدًا عنوةً فأَخذْته ... وَكَانَ شفَاءِ لَوْ تدَارَكْتَ منْذِرًا
وَلَو نلته طُلَّتْ هناكَ جراحه ... وَكَانتْ حريا أَنْ يهانَ ويهدَرَا

ترجمہ: ”میں نے سعد کو جبراً پکڑ لیا اور اس کو گرفتار کر لیا اور اگر میں منذر کو پکڑ لیتا تو یہ باعثِ تشفی اور قلبی اطمئنان کا باعث ہوتا، اور اگر میں اس کو ہلاک بھی کر دیتا تو وہاں اس کا خون معاف تھا، وہ اس بات کا مستحق تھا کہ اس کی توہین کی جاتی اور اس کا خون معاف ہوتا“۔

حضرت حسان بن ثابتؓ انتظار میں بیٹھے تھے، انہوں نے فوراً اشعار کے ذریعہ جواب دیا اور یہ اشعار مشہور زمانہ ہوگئے:

لَستَ إِلَى سَعْد وَلَا الْمرء منْذر ... إِذَا ما مطَايا الْقوم أَصبحن ضمرا
فَلَا تكُ كَالْوسنَانِ يحلمَ أَنه ... بقرْية كسرى أَوَ بقرية قيصرا
فإنا ومن يهدى القصائد نحونا ... كمَستبضَع تمرا إلى أرض خيبرا

ترجمہ: ”تم نہ ہی سعد اور نہ ہی منذر سے مقابلہ کی صلاحیت رکھتے ہو جب کہ قوم کے گھوڑے جنگ کے لئے تیار ہوں، اس سونے والے کی طرح مت بنو جو یہ خواب دیکھتا ہے کہ وہ کسری یا قیصر کے علاقہ میں ہو۔ بلاشبہ ہم اور وہ لوگ جو ہماری طرف قصائد کا ہدیہ بھیجتا ہے اس شخص کی طرح ہیں جو خیبر کی جانب کھجور لے جا رہا ہو“۔ (سیرت ابن ہشام: 2/65)

۹) حضرت عباس بن عبادہ بن نضلہ کے اس قول: "اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ معبوث کیا ہے! اگر آپ چاہیں تو ہم صبح ہی اپنی تلواروں کے ذریعہ اہلِ منی پر حملہ کر لیں گے“۔ اور رسول اللہ ﷺ کے اس قول: ”ہمیں اس بات کا حکم نہیں دیا گیا ہے بلکہ اپنی جائے قیام کی طرف واپس چلے جاؤ“۔ اس میں انتہائی اہم تربیتی درس ہے، وہ یہ کہ اسلام کا دفاع اور اعدائے دین کے ساتھ کشمکش کا معاملہ دین کے متبعین کے اجتہاد اور فیصلہ پر منحصر نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کے احکام اور اس کی حکیمانہ تشریع کے تابع ہے۔

۱۰) مردوں کی بیعت کا طریقہ یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا، جیسے کہ بیعت ہونے والے صحابہ کرام نے آپ ﷺ سے فرمایا کہ اپنا ہاتھ بڑھائیں تو آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور سب نے آپؐ سے بیعت کی، اور جہاں تک دو خواتین کی بیعت کا تعلق ہے جو اس موقع پر موجود تھیں تو وہ بیعت صرف زبانی تھی۔ آپ ﷺ نے کبھی کسی غیر محرم اور اجنبی عورت سے مصافحہ نہیں کیا ہے، اس

بیعت میں کوئی بھی پیچھے نہیں رہا یہاں تک کہ اس وقت موجود دو خواتین نے بھی جہاد والی بیعت کی، اور انہوں نے بھی اپنے عہد کو پورا کر کے دکھایا، جہاں تک حضرت اُم عمارہ نُسیبہ بنت کعبؓ کا تعلق ہے تو وہ غزوۂ احد میں زخموں سے چور ہو کر گر پڑیں، ان کو بارہ زخم لگے تھے، وہ شوہر نامدار حضرت زید بن عاصم بن کعب ساتھ نکلی تھیں، ان کے پاس مشکیزہ تھا جس سے وہ مسلمانوں کو پانی پلاتی تھیں اور جب مسلمانوں کو کامیابی نہ مل سکی تو وہ اللہ کے رسول ﷺ کے قریب آ گئیں، وہ براہِ راست جنگ کر رہی تھیں اور تلوار کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ کا دفاع کر رہی تھیں، ان کو خطرناک زخم لگے تھے، وہ بیعتِ رضوان میں بھی شریک ہوئیں، مسلیمہ کذاب نے آپؓ کے بیٹے کے ٹکڑے ٹکڑے کئے لیکن نہ وہ کمزور پڑیں اور نہ ہی بزدلی دکھائی، آپؓ جنگ یمامہ میں بھی ارتداد کی جنگ میں حضرت خالد بن ولیدؓ کے ساتھ شریک رہیں، وہ لڑتی رہیں یہاں تک کہ آپؓ کا ہاتھ کاٹا گیا اور بارہ زخم لگے۔

اور جہاں تک حضرت اُسماء بنت عمرو کا تعلق ہے تو وہ بنو سلمہ قبیلہ سے تعلق رکھتی ہیں، کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت معاذ بن جبلؓ کی والدہ ہیں، یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ حضرت معاذ بن جبل کی پھوپھی کی صاحبزادی (پھوپھی زاد بہن) ہیں۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم جمیعاً۔ (المرأة فی العهد النبوی، دکتورة عصمة الدین، ص 108، التحالف السیاسی، ص 87 سیرت ابن ہشام 2/80، اُسد الغابہ 5/395 البدایہ والنهایہ 3/158 -166، المراة فی العهد النبوی، ص108)

۱۱) جب ہم کتبِ سیرت و تراجم میں عقبۂ ثانیہ کے انصار صحابہ کرام کے تراجم و تعارف پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان تہتر (73) صحابہ کرام میں سے تقریباً ایک تہائی صحابہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں اور بعد میں شہید ہوئے، اسی طرح یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے تقریباً نصف صحابہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تمام غزوات میں شریک رہے، ان میں سے تینتیس (33) صحابہ کرام تمام غزوات میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے اور جو غزوۂ بدر میں شریک تھے ان کی تعداد تقریباً ستر ہے۔

یقیناً ان انصار صحابہ کرام نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ کئے ہوئے اپنے عہد و پیمان کو پورا کر کے دکھایا، ان میں سے بعض نے اپنی زندگی کی ساعتیں مکمل کیں اور شہید ہو کر اپنے رب سے جا ملے اور ان میں سے بعض بہت بعد تک سر گرمِ عمل رہے اور رسول ﷺ کی وفات کے بعد بھی اسلامی حکومت کی قیادت و سیادت میں اہم کردار ادا کرتے رہے اور تمام مراحل میں شریکِ سفر رہے، انہی اہم تاریخی کرداروں کے ذریعہ اسلامی حکومت کا قیام عمل میں آیا، یہ ایسے کردار کے حامل افراد تھے جو عطاو بخشش میں پیش پیش رہتے تھے اور اس کا کوئی بدلہ لیتے نہیں تھے، جو ہر نفیس چیز بھی قربان کر دیتے تھے اور جنت کے سوا کسی چیز کے طلبگار نہیں تھے، ہر زمانہ کی تاریخ اس سے قاصر رہی ہے کہ ان جیسے مرد و خواتین کی کوئی اور مثال پیش کر سکے۔ (التربیة القیادیة: 2/140)

....

چوتھا باب

مدینہ منورہ کی جانب ہجرت

۱) ہجرت کی تمہید اور اس کی تیاری:

ہجرتِ مدینہ اچانک پیش آنے والا کوئی اتفاقی واقعہ نہیں ہے، بلکہ ہجرتِ مدینہ سے پہلے نبی کریم ﷺ کی طرف سے اس سلسلہ میں منصوبہ بندی، تیاری اور کچھ تمہیدی کام انجام دیے گئے، اور یہ سب اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور تدبیر کے مطابق ہو رہا تھا، اس تیاری کے دو پہلو تھے:

۱: مہاجرین کی شخصیت سازی۔ ۲: ہجرت کی جگہ میں مختلف اعتبار سے تیاری۔

۱: مہاجرین کی شخصیت سازی:

ہجرت کوئی سیر و تفریح نہیں تھی جس کے ذریعہ انسان اپنے آپ کو خوش کرے، بلکہ ہجرت نام ہے عقیدہ کی حفاظت کے لئے اپنے وطن، اہل و عیال، رشتہ داروں، دوست واحباب اور مال و دولت کے تمام اسباب و وسائل کو ترک کرنا اور ان سے دستبردار ہونا۔ اسی لئے ہجرت کے مرحلہ تک پہنچتے پہنچتے انتہائی محنتِ شاقہ کی ضرورت پڑی یہاں تک کہ تمام مہاجرین مکمل طور پر تیار ہو گئے، ان کو تیار کرنے کے سلسلہ میں جو طریقہ کار اختیار کیا گیا اور اس کے جو اسباب بنے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

- انتہائی عمیق ایمانی تربیت، جس کی تفصیلات ماضی کے صفحات میں گزر چکی ہیں۔
- اہلِ ایمان پر ہونے والا ظلم و ستم اتنا زیادہ ہو گیا یہاں تک کہ وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ کفر کے ساتھ زندگی بسر کرنا ناممکن ہے۔
- قرآن پاک کی مکی آیات میں ہجرت کی اہمیت و ضرورت پر کافی زور دیا گیا اور اس بات کی طرف متوجہ کیا گیا کہ اللہ کی زمین کافی وسیع ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿قُلْ يَـٰعِبَادِ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱتَّقُواْ رَبَّكُمْۚ لِلَّذِينَ أَحْسَنُواْ فِى هَـٰذِهِ ٱلدُّنْيَا حَسَنَةٌۗ وَأَرْضُ ٱللَّهِ وَٰسِعَةٌۗ إِنَّمَا يُوَفَّى ٱلصَّـٰبِرُونَ أَجْرَهُم بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ ترجمہ: "(اے نبیؐ) کہو کہ اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو، اپنے رب سے ڈرو جن لوگوں نے اِس دنیا میں نیک رویہ اختیار کیا ہے ان کے لئے بھلائی ہے اور خدا کی زمین وسیع ہے، صبر کرنے والوں کو تو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا"۔ (سورۃ الزمر: 10)

اس کے بعد سورۃ الکہف کا نزول ہوا جس میں اہلِ ایمان نوجوانوں کے بارے میں اور ان کے ترکِ وطن اور ہجرت کے بارے میں گفتگو کی گئی یہاں تک کہ صحابہ کرام کے دلوں میں ایمان کا یہ پہلو راسخ ہو گیا کہ عقیدہ کی حفاظت کے لئے اہل و عیال اور وطن کو چھوڑنا ضروری ہے۔

اس کے بعد سورۃ النحل کی یہ صریح آیات نازل ہوئیں جن میں ہجرت کے بارے میں صاف صاف گفتگو کی گئی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَٱلَّذِينَ هَاجَرُواْ فِى ٱللَّهِ مِنۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُواْ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِى ٱلدُّنْيَا حَسَنَةًۖ وَلَأَجْرُ ٱلْـَٔاخِرَةِ أَكْبَرُۚ لَوْ كَانُواْ

يَعۡلَمُونَ ﴿٤١﴾ ٱلَّذِينَ صَبَرُواْ وَعَلَىٰ رَبِّهِمۡ يَتَوَكَّلُونَ ﴿٤٢﴾﴾ ترجمہ: ''جو لوگ ظلم سہنے کے بعد اللہ کی خاطر ہجرت کر گئے ہیں ان کو ہم دنیا ہی میں اچھا ٹھکانہ دیں گے اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے، کاش جان لیں وہ مظلوم جنہوں نے صبر کیا ہے اور جو اپنے رب کے بھروسے پر کام کر رہے ہیں (کہ کیسا اچھا انجام اُن کا منتظر ہے)۔(ترجمہ: سورۃ النحل:(41-42)

اور سورت کی آخری آیات میں اسی مفہوم کو مزید مؤکد کیا گیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ هَاجَرُواْ مِنۢ بَعۡدِ مَا فُتِنُواْ ثُمَّ جَٰهَدُواْ وَصَبَرُوٓاْ إِنَّ رَبَّكَ مِنۢ بَعۡدِهَا لَغَفُورٞ رَّحِيمٞ﴾ ترجمہ: ''بخلاف اس کے جن لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب (ایمان لانے کی وجہ سے) وہ ستائے گئے تو اُنہوں نے گھر بار چھوڑ دیئے، ہجرت کی، راہ خدا میں سختیاں جھیلیں اور صبر سے کام لیا، اُن کے لئے یقیناً تیرا رب غفور و رحیم ہے''۔(سورۃ النحل:110)

اور ہجرتِ حبشہ اہل و عیال اور وطن چھوڑنے کی عملی مشق کا ایک حصہ تھا۔ (السیرۃ النبویۃ تربیۃ أمۃ وبناء دولۃ، صالح شامی، ص118)

۲: یثرب میں تیاری:

غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انصار کی طرف ابتدائی مرحلہ میں ہی ہجرت کرنے کی جلد بازی نہیں کی، بلکہ مسلسل دو سال سے زائد تک ہجرت کو مؤخر کرتے رہے، یہاں تک کہ یہ بات یقینی ہوگئی کہ مکہ کی بنسبت ایک مضبوط اور وسیع مرکز وجود میں آچکا ہے، اسی دوران آپ ﷺ قرآنی ماحول میں اس مرکز کو تیار کرتے رہے، خاص طور پر اس وقت جب کہ حضرت مصعبؓ مدینہ منورہ پہنچ گئے۔

آپ ﷺ نے اس بات کو بھی اچھی طرح معلوم کر لیا کہ انصار کے یہاں اب تیاری اپنے کمال کو پہنچ چکی ہے، اس لئے کہ انہوں نے خود رسول اللہ ﷺ سے ہجرت کا مطالبہ کیا، اسی طرح عقبہ ثانیہ میں جو گفتگو ہوئی اس سے بھی ظاہر تھا کہ انصار کی بیعت ایمانِ قوی پر مبنی ہے اور وہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ پختہ عہد و پیمان کر رہے ہیں، وہ تو یہاں تک تیار تھے کہ رسول اللہ ﷺ کو اذیت پہنچانے والوں پر منی میں تلواروں کے ذریعہ حملہ آور ہو جائیں اگر رسول اللہ ﷺ اس کی اجازت مرحمت فرماتے، لیکن آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: ''ہمیں اس بات کا حکم نہیں دیا گیا ہے''۔

اس طرح سے اہلِ یثرب کی تیاری اپنے کمال کو پہنچ گئی تاکہ وہ مہاجرین کا حسن وخوبی کے ساتھ استقبال کر سکیں اور ان تمام تقاضوں کو پورا کر سکیں جن کو پورا کرنا ہجرت کا تقاضا ہوگا۔(السیرۃ النبویۃ تربیۃ أمۃ وبناء دولۃ، صالح الشامی، ص: 118)

۲) سورۃ العنکبوت کی غور طلب بعض آیات:

سورۃ العنکبوت مکی دور کے اواخر میں نازل ہونے والی سورت ہے، اس سورت میں دعوت کے بارے میں اللہ کی سنت اور ابتلاء و آزمائش کے قانون کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿الٓمٓ ﴿١﴾ أَحَسِبَ ٱلنَّاسُ أَن يُتۡرَكُوٓاْ أَن يَقُولُوٓاْ ءَامَنَّا وَهُمۡ لَا يُفۡتَنُونَ ﴿٢﴾ وَلَقَدۡ فَتَنَّا ٱلَّذِينَ مِن قَبۡلِهِمۡۖ فَلَيَعۡلَمَنَّ ٱللَّهُ ٱلَّذِينَ صَدَقُواْ وَلَيَعۡلَمَنَّ ٱلۡكَٰذِبِينَ ﴿٣﴾ أَمۡ حَسِبَ ٱلَّذِينَ

يَعۡمَلُونَ ٱلسَّيِّـَٔاتِ أَن يَسۡبِقُونَاۚ سَآءَ مَا يَحۡكُمُونَ ﴿٤﴾ ترجمہ: ”کیا لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور وہ آزمائے نہیں جائیں گے، حالانکہ ہم ان لوگوں کی بھی آزمائش کر چکے ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں، سواللہ ان لوگوں کی ممیز کرے گا جو سچے ہیں اور جھوٹوں کو بھی ممیز کرے گا، اور کیا وہ لوگ جو بُری حرکتیں کر رہے ہیں وہ گمان رکھتے ہیں کہ ہمارے قابو سے باہر ہو جائیں گے، بڑا غلط فیصلہ ہے جو وہ کر رہے ہیں“۔

سورۃ العنکبوت میں تین اہم امور قابل غور ہیں اور وہ ہیں:

۱- منافقین کے لفظ کا مکرر ذکر، یہ بات معلوم ہے کہ نفاق کا مرض اسی وقت پنپتا ہے جب کہ غلبہ مسلمانوں کو حاصل ہو، اس لئے کہ بعض لوگ اپنے مفادات کے بارے میں خوف واندیشہ کا شکار ہوتے ہیں، لہذا وہ اسلام کا اظہار کرتے ہیں اور کفر کو پوشیدہ رکھتے ہیں، یہ تو معلوم ہی ہے کہ مکہ کا معاشرہ جاہلی معاشرہ تھا اور وہاں طاقت و قوت اور غلبہ اہلِ شرک کو حاصل تھا، لہذا اس سورت میں منافقین کے ذکر کرنے کی کیا مناسبت ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَيَعۡلَمَنَّ ٱللَّهُ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَلَيَعۡلَمَنَّ ٱلۡمُنَٰفِقِينَ﴾ ترجمہ: ”اور اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہی ہے کہ ایمان لانے والے کون ہیں اور منافق کون“۔(سورۃ العنکبوت: 11)

حالانکہ یہ مکی سورت ہے تو کیا اہلِ ایمان کی امیدیں اتنی قوی تھیں کہ نصرت و کامیابی ان کو بالکل قریب اور یقینی نظر آ رہی تھی؟ یا یہ مدنی آیت ہے جس کو مکی سورت میں شامل کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ ابھی نفاق کے سر اٹھانے کا وقت نہیں آیا تھا، جیسے کہ بعض مفسرین کا خیال ہے؟!

۲- اہلِ کتاب کے ساتھ بہتر طریقہ سے بحث ومباحثہ اور مجادلہ کا حکم دیا گیا ہے، یہ گویا کہ آنے والے مرحلہ کے لئے تیار کیا جا رہا ہے جس میں اہلِ کتاب اور مسلمانوں کے درمیان ٹکراؤ ہوگا، لہذا اہلِ ایمان اس میں سختی اور شدت سے پیش نہ آئیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول کے ذریعہ تنبیہ کی ہے: ﴿وَلَا تُجَٰدِلُوٓاْ أَهۡلَ ٱلۡكِتَٰبِ إِلَّا بِٱلَّتِي هِيَ أَحۡسَنُ إِلَّا ٱلَّذِينَ ظَلَمُواْ مِنۡهُمۡۖ وَقُولُوٓاْ ءَامَنَّا بِٱلَّذِيٓ أُنزِلَ إِلَيۡنَا وَأُنزِلَ إِلَيۡكُمۡ وَإِلَٰهُنَا وَإِلَٰهُكُمۡ وَٰحِدٞ وَنَحۡنُ لَهُۥ مُسۡلِمُونَ ﴿٤٦﴾ وَكَذَٰلِكَ أَنزَلۡنَآ إِلَيۡكَ ٱلۡكِتَٰبَۚ فَٱلَّذِينَ ءَاتَيۡنَٰهُمُ ٱلۡكِتَٰبَ يُؤۡمِنُونَ بِهِۦۖ وَمِنۡ هَٰٓؤُلَآءِ مَن يُؤۡمِنُ بِهِۦۚ وَمَا يَجۡحَدُ بِـَٔايَٰتِنَآ إِلَّا ٱلۡكَٰفِرُونَ ﴿٤٧﴾﴾ ترجمہ: ”اور اہلِ کتاب سے بحث نہ کرو مگر عمدہ طریقہ سے، سوائے اُن لوگوں کے جو اُن میں سے ظالم ہوں، اور اُن سے کہو کہ ہم ایمان لائے ہیں اُس چیز پر بھی جو ہماری طرف بھیجی گئی ہے اور اُس چیز پر بھی جو تمہاری طرف بھیجی گئی تھی، ہمارا خدا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے اور ہم اُسی کے مسلم (فرماں بردار) ہیں۔ (اے نبیؐ) ہم نے اِسی طرح تمہاری طرف کتاب نازل کی ہے، اس لئے وہ لوگ جن کو ہم نے پہلے کتاب دی تھی وہ اس پر ایمان لاتے ہیں، اور اِن لوگوں میں سے بھی بہت سے اس پر ایمان لا رہے ہیں، اور ہماری آیات کا انکار صرف کافر ہی کرتے ہیں“۔(سورۃ العنکبوت: 46- 47)

۳- اللہ کی وسیع زمین کی طرف ہجرت کرنے کے لئے اہل ایمان کی ذہن سازی کی جارہی ہے، یہ بھی امکان ہے کہ مدینہ نے عقبہ اولی کے بعد ہی مہاجر اہلِ ایمان کا استقبال کرنا شروع کر دیا ہو، چاہے صورت حال جو بھی ہو تو سورۃ العنکبوت کے نزول کا وقت کیا ہو سکتا ہے؟ چنانچہ ہجرت کے بارے میں اشارہ اور ترغیب بالکل واضح ہے، اس لئے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے کسی بھی سرزمین میں اور کسی بھی وقت رزق کی کفالت کی ذمہ داری لی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يَٰعِبَادِيَ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِنَّ أَرۡضِي وَٰسِعَةٞ فَإِيَّٰيَ فَٱعۡبُدُونِ﴾ ترجمہ: ”اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو، میری زمین وسیع ہے، پس تم میری بندگی بجالاؤ“۔(سورۃ العنکبوت:56)

یہ آیتِ کریمہ ان اہلِ ایمان کو ہجرت کی ترغیب دینے کے لئے نازل ہوئی جو ابھی مکہ مکرمہ میں تھے، ان کو اللہ تعالیٰ نے باخبر کر دیا کہ اس کی زمین وسیع ہے اور کفار کی اذیتوں کے ساتھ کسی علاقہ میں باقی رہنا اچھی بات نہیں ہے، بلکہ بہتر یہ ہے کہ اللہ کی زمین پر ایسی عبادت کی جگہ تلاش کی جائے جہاں اس کے صالح اور نیک بندے موجود ہوں، یعنی یہ کہا جارہا ہے کہ اگر آپ ایمان کے اظہار میں تنگی محسوس کر رہے ہیں تو مدینہ منورہ کی جانب ہجرت کریں، اس لئے کہ وہ سرزمین توحید کے اظہار واعلان کے لئے وسیع ہے، اس کے بعد اللہ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ رزق کسی خاص علاقہ کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ اس کا رزق ہر مخلوق کے لئے عام ہے، چاہے وہ جہاں بھی رہیں، بلکہ مہاجرین کا رزق ہجرت کرنے کی جگہ اور زیادہ فراوانی کے ساتھ میسر ہوا، وہ تو کچھ ہی عرصہ کے بعد حکام اور قائد بن گئے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ﴿وَكَأَيِّن مِّن دَآبَّةٖ لَّا تَحۡمِلُ رِزۡقَهَا ٱللَّهُ يَرۡزُقُهَا وَإِيَّاكُمۡۚ وَهُوَ ٱلسَّمِيعُ ٱلۡعَلِيمُ﴾ ترجمہ: ”کتنے ہی زمین پر چلنے والے ایسے ہیں جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے، اللہ اُن کو رزق دیتا ہے اور تمہارا رازق بھی وہی ہے، وہ سب کچھ سُنتا اور جانتا ہے“۔(سورۃ العنکبوت:60)

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ بھی یاد دلایا کہ ہر ذی روح کو موت کا مزہ چکھنا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿كُلُّ نَفۡسٖ ذَآئِقَةُ ٱلۡمَوۡتِۖ ثُمَّ إِلَيۡنَا تُرۡجَعُونَ﴾ ترجمہ: ”ہر متنفس کو موت کا مزا چکھنا ہے، پھر تم سب ہماری طرف ہی پلٹا کر لائے جاؤ گے“۔ (سورۃ العنکبوت:57)

اس کے ذریعہ بھی ہجرت کی ترغیب دینا مقصود ہے، اس لئے کہ جب انسان کو موت کا یقین ہو جائے گا کہ اس کا آنا برحق ہے تو اس کے لئے اپنے وطن کو چھوڑنا آسان ہو جائے گا۔ (دیکھیں: تفسیر القرطبی 6/5073، تفسیر ابن کثیر 3/360، الکشاف للزمخشری: 3/310، تفسیر أبی السعود 7/45، الأساس فی التفسیر، سعید حوی: 8/4223)

۴) مہاجرین کے ہراول دستے:

جب یثرب سے آئے ہوئے خیر کے قافلوں اور نور کے پروانوں سے نبی کریم ﷺ نے اسلام اور اسلام کا دفاع کرنے پر بیعت کی تو مشرکین آپے سے باہر ہو گئے اور ان کی ایذاء رسانی کا سلسلہ مزید تیز ہو گیا، اس لئے نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کو مدینہ کی جانب ہجرت کرنے کی اجازت دے دی، اور مدینہ منورہ کی جانب ہجرت کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی نظام پر مبنی حکومت قائم کی جائے جو دعوت کی ذمہ

داری ادا کرسکے اور اللہ کی راہ میں حائل ہر رکاوٹ کو دور کرسکے، تاکہ فتنہ اور بگاڑ کا خاتمہ ہو اور دین پورے کا پورا اللہ کے لئے ہو جائے، اور مدینہ منورہ کی جانب ہجرت کرنے کا حکم اللہ کی طرف سے تھا، حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ جب ستر لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس سے واپس ہوئے تو آپ ؐ کا دل مطمئن ہو گیا، اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو نصرت و حمایت اور ایک ایسی قوم عطا کی تھی جو جنگ کرسکتی تھی، سامانِ حرب و ضرب سے لیس اور مددگار تھی، لیکن مشرکین کی جانب سے مسلمانوں پر ابتلاء و آزمائش شدت اختیار کرنے لگی، اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ وہ یہاں سے نکلنے والے ہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے آپ ﷺ کے اصحاب کو تنگ کرنا شروع کیا، وہ ان کو پریشان کرتے اور ان کے ساتھ گالی گلوچ اور ایذاء رسانی کا معاملہ کرنے لگے، اس لئے صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ ﷺ سے اس کی شکایت کی اور ہجرت کے بارے میں آپ سے اجازت طلب کی، آپ ﷺ نے فرمایا: "مجھے تمہاری ہجرت کرنے کی جگہ دکھادی گئی ہے، میں نے ایک کھاری نمکین زمین دیکھی ہے جہاں کھجور کے باغات ہیں اور وہ دو پتھریلے میدانوں کے درمیان ہے"۔ (صحیح بخاری: 2297، الدلائل للبیہقی 2/459)

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کچھ اور روز رکے اور پھر ایک روز صحابہ کرام کی جانب خوشی اور مسرت کے ساتھ نکلے اور فرمایا: "مجھے تمہاری ہجرت کرنے کی جگہ دکھادی گئی ہے اور وہ یثرب ہے، لہٰذا جو نکلنا چاہتا ہے وہ وہاں جاسکتا ہے"۔ اس کے بعد صحابہ کرامؓ مدینہ کا رخ کرنے لگے، ساتھ جانے کا پروگرام بنانے لگے، نکلنے میں ایک دوسرے کی مدد کرنے لگے اور ہجرت کا سلسلہ شروع، اور صحابہ کرامؓ یہ سب کچھ خُفیہ طریقہ سے رازداری کے ساتھ کرنے لگے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب میں مدینہ کی جانب سب سے پہلے ہجرت کرنے والے حضرت ابو سلمہ بن عبدالاَسد تھے، ان کے بعد حضرت عامر بن ربیعہؓ آئے، ان کے ساتھ ان کی شریک حیات حضرت لیلیٰ بنت ابی حشمہ تھیں، وہ مدینہ کی جانب ہجرت کرنے والی پہلی خاتون ہیں، اس کے بعد صحابہ کرام جوق در جوق ہجرت کرنے لگے اور وہ انصار کے گھروں میں قیام کرنے لگے، انصار نے ان کو پناہ دی، ان کی مدد کی اور ان کے ساتھ ہمدردی کا معاملہ کیا، حضرت ابو حذیفہؓ کے غلام حضرت سالمؓ قباء میں مہاجرین کی امامت کرتے تھے جب تک رسول اللہ ﷺ تشریف نہیں لائے تھے، جب مسلمان ہجرت کر کے مدینہ منورہ آنے لگے تو قریش ان پر انتہائی غضبناک ہوئے اور ان کے ساتھ جھگڑنے لگے، اور جو نوجوان نکل چکے تھے ان پر وہ دانت پیس رہے تھے، انصار کے کچھ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عقبہ ثانیہ میں بیعت کی تھی اور پھر وہ مدینہ منورہ چلے گئے، اور جب پہلے صحابی ہجرت کر کے قباء پہنچے تو یہ انصار صحابہ رسول اللہ ﷺ کے پاس مکہ مکرمہ گئے اور پھر وہ صحابہ کرام کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ واپس آئے، یہ صحابہ کرام 'مہاجرین انصار' کہلائے، اس طرح کے صحابہ کرام کے نام ہیں: حضرت ذکوان بن عبد قیس، حضرت عقبہ بن وہب بن کلدہ، حضرت عباس بن عبادہ بن نضلہ، حضرت زیاد بن لبید۔ مسلمان سب کے سب مدینہ منورہ کی جانب ہجرت کر کے چلے گئے اور مکہ میں اللہ کے رسول ﷺ، حضرت ابو بکر صدیقؓ، اور حضرت علیؓ کے علاوہ کوئی نہیں بچا، سوائے اہلِ ایمان میں سے اس شخص کے جو آزمائش کا شکار ہو یا مریض ہو یا اتنا کمزور ہو کہ ہجرت نہ کر سکتا ہو۔ (ابن سعد: 1/325)

۴)ہجرت سے روکنے کے لئے قریش کے حربے اور ہجرت میں عظمت کے چند مناظر:

مکہ مکرمہ میں باقی ماندہ مسلمانوں کو ہجرت سے روکنے کے لئے قریش کی وسعت وبس میں جو کچھ تھا انہوں نے کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی، اور اس سلسلہ میں انہوں نے مختلف اسالیب اور طریقہ کار اختیار کئے، ان میں سے چند اسالیب مندرجہ ذیل تھے:

ا-شوہر، بیوی اور اولاد میں تفریق کا اسلوب:

اُم المؤمنین حضرت اُم سلمہؓ ہند بنت اُبی اُمیہ اپنی اور اپنے شوہر حضرت اُبو سلمہؓ کی ہجرت کا ایمان افروز اور یقین سے لبریز واقعہ بیان کرتی ہیں، فرماتی ہیں: جب اُبو سلمہؓ نے مدینہ کی جانب ہجرت کرنے کا ارادہ کیا تو انہوں نے میرے لئے اپنا اونٹ تیار کیا اور اس کے بعد مجھے اس پر سوار کیا اور میرے ساتھ میرے بیٹے سلمہ بن اُبی سلمہ کو بھی میرے ساتھ سوار کیا، اس کے بعد اپنے اونٹ پر سوار ہو کر میرے اونٹ کی نکیل پکڑے ہوئے نکلے، جب ان کو بنو مغیرہ کے لوگوں نے دیکھا تو وہ ان کے سامنے کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے: جہاں تک آپ کا تعلق ہے تو آپ آزاد ہیں! لیکن جہاں تک ہماری اس لڑکی کا تعلق ہے تو ہم تمہیں ان کو اپنے ساتھ کیسے لے جانے دے سکتے ہیں؟! فرماتی ہیں: انہوں نے ان کے ہاتھ سے اونٹ کی لگام چھین لی اور مجھے ان سے چھین لیا۔ فرماتی ہیں: اس وقت ابو سلمہؓ کے خاندان کے لوگ بنو عبد الأسد آگ بگولہ ہو گئے اور کہنے لگے: نہیں، واللہ! ہم اپنے بچے کو ان کے پاس نہیں رہنے دیں گے، ہمارے خاندان کے فرد سے آپ نے اس کو چھین لیا ہے، فرماتی ہیں: دونوں طرف کے لوگ میرے بیٹے کو کھینچنے لگے یہاں تک کہ ان کا ہاتھ توڑ دیا، بنو عبد الأسد اس کو لے کر چلے گئے، مجھے بنو المغیرہ نے اپنے پاس روک لیا اور میرے شوہر مدینہ منورہ کی جانب ہجرت کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

فرماتی ہیں: میرے درمیان اور میرے شوہر اور میرے بیٹے کے مابین تفریق اور جدائی ڈال دی گئی۔ فرماتی ہیں: میں ہر روز صبح کے وقت گھر سے نکلتی تھی اور اُبطح میں جا کر بیٹھ جاتی تھی اور مسلسل روتی رہتی تھی، یہاں تک کہ شام ہو جاتی تھی، یہی سلسلہ تقریباً ایک سال تک رہا یہاں تک کہ بنو مغیرہ کا ایک شخص ایک روز میرے پاس سے گزرا تو اس نے میری حالت دیکھی اور بنو مغیرہ سے کہا: آپ اس بیچاری کو کیوں جانے نہیں دیتے ہو؟ اس کو اس کے شوہر اور اپنے بیٹے سے جدا کر دیا ہے؟!

فرماتی ہے: اس کے بعد انہوں نے مجھ سے کہا: اگر تم چاہو تو اپنے شوہر کے پاس جا سکتی ہو۔ فرماتی ہیں: میں اپنے اونٹ پر سوار ہوئی اور اپنے بیٹے کو اپنی گود میں رکھا اور مدینہ میں اپنے شوہر کا قصد کئے ہوئے نکل پڑی، اور اللہ کی مخلوق میں سے میرے ساتھ اور کوئی نہیں تھا۔

فرماتی ہیں: میں نے سوچا کہ جو بھی راستے میں ملے گا اس کے ساتھ میں اپنے شوہر کے پاس پہنچ جاؤں گی، یہاں تک کہ میں تنعیم کے مقام پر پہنچ گئی تو وہاں میری ملاقات بنو عبد الدار کے بھائی عثمان بن طلحہ بن ابی طلحہ کے ساتھ ہو گئی۔ انہوں نے مجھ سے کہا: اے ابو امیہ کی بیٹی! کہاں کا ارادہ ہے؟ فرماتی ہیں: میں نے کہا: میں مدینہ میں اپنے شوہر کے پاس جانا چاہتی ہوں۔ انہوں نے کہا: کیا آپ کے ساتھ اور کوئی نہیں ہے؟ فرماتی ہیں: میں نے کہا: نہیں، واللہ! اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے اور میرا یہ بیٹا ہے۔ انہوں نے کہا: نہیں! آپ کو تنہا چھوڑنا مناسب نہیں ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اونٹ کی لگام پکڑی اور میرے ساتھ مدینہ کا رخ کیا۔ اللہ کی قسم! میں عربوں میں کسی اور کو نہیں جانتی

ہوں جوان سے زیادہ شریف ہو، وہ جب کسی منزل پر پہنچتے تو اونٹ کو روک کر بٹھا لیتے، اس کے بعد مجھ سے دور ہٹ جاتے یہاں تک کہ میں اونٹ سے اُتر جاتی اور وہ میرے اونٹ کو پیچھے لے جا کر اس کا کجاوہ اس سے اتار دیتے، اس کے بعد اس کو کسی درخت کے ساتھ باندھ دیتے، اور پھر دور جا کر کسی پیڑ کے نیچے آرام کرتے، جب کوچ کرنے کا وقت آتا تو اونٹ کے پاس جا کر اس کا کجاوہ اس پر رکھتے اور اس کو میرے قریب لا کر کہتے: سوار ہو جائیں! اور خود وہاں سے ہٹ جاتے، جب میں سوار ہو جاتی اور اونٹ پر اچھی طرح بیٹھ جاتی تو میرے اونٹ کی لگام پکڑ کر سفر شروع کر دیتے، یہاں تک کہ پڑاؤ کے وقت مجھے پھر سے اتار لیتے، وہ مسلسل میرے ساتھ اسی طریقہ پر سفر کرتے رہے یہاں تک کہ مجھے مدینہ لے آئے، جب ان کی نظر قباء میں بنو عمرو بن عوف کی بستی پر پڑی تو کہنے لگے: آپ کا شوہر اسی بستی میں ہے- اُبو سلمہؓ وہیں مقیم تھے- لہذا اللہ کا نام لے کر اس بستی میں داخل ہو جائیں اور وہ خود مکہ کی جانب واپس آ گئے۔

حضرت اُم سلمہؓ فرماتی تھیں: اللہ کی قسم! میں کسی گھرانے کو نہیں جانتی ہوں جس کے افراد کو ایسی مصیبتوں کو جھیلنا پڑا ہو جن کو ابو سلمہؓ کے گھرانے کو جھیلنا پڑا، اور میں نے عثمان بن طلحہ سے زیادہ شریف اور معزز اور کسی رفیقِ سفر کو نہیں دیکھا ہے۔(سیرت ابنِ ہشام 2/112 - 113، السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ 1/202 - 203)

یہ ان سخت جان اسالیب اور طریقوں میں سے ایک نمونہ ہے جس کو قریش کے لوگوں نے حضرت ابو سلمہؓ کو ہجرت سے روکنے کے لئے اختیار کیا، ایک شخص اور اس کی شریکِ حیات کے مابین زبردستی تفریق کی جاتی ہے، اس کے جگر گوشے کو اس کی نگاہوں کے سامنے اس سے جدا کر دیا جاتا ہے اور یہ سب کچھ صرف اس لئے کیا جاتا ہے تاکہ ان کو ہجرت سے روکا جا سکے، لیکن جب ایمان دل کے اندر جاگزیں ہو جاتا ہے تو یہ ناممکن ہوتا ہے کہ صاحبِ ایمان کے نزدیک اسلام و ایمان کے مقابلہ میں اور کوئی بھی قابلِ ترجیح ہو، اگرچہ وہ اس کا جگر گوشہ یا شریکِ حیات ہی کیوں نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ حضرت ابو سلمہؓ مدینہ کی جانب ہجرت کرنے میں کامیاب ہوگئے اور کسی چیز کی طرف مڑ کر نہیں دیکھا اور مشرکین کا یہ منصوبہ بھی ناکام ہوگیا۔ اس میں داعیانِ حق کے لئے قابلِ تقلید نمونہ ہے۔(السیرۃ النبویۃ، ڈاکٹر ابراہیم علی محمد، ص: 130-131)

ایمان جب دلوں کے اندر جاگزیں ہوتا ہے تو پھر ایسی مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں، اس گھرانے کے شیرازہ کو منتشر کر دیا گیا، ایک خاتون اپنی مصیبت اور تکلیف کی وجہ سے پریشان ہے اور رو رہی ہے، بچے کا ہاتھ توڑ دیا جاتا ہے اور اس کو اپنے ماں باپ سے محروم اور جدا کر دیا جاتا ہے، اور باپ بہادری اور قربانی کی زریں تاریخ رقم کرتا ہے، اور سرزمینِ ہجرت پر پہنچنے والا سب سے پہلا شخص بن جاتا ہے، اور سب کے سب اجر و ثواب کی نیت کے ساتھ یہ سب کچھ برداشت کرتے رہتے ہیں اور ایمان کے راستے پر عزمِ مصمم کے ساتھ محوِ سفر رہتے ہیں، لہذا ان جیسی عزم و پامردی کی مثالی شخصیات کے ساتھ کفر اور علمبردارانِ کفر کیا کر سکتے ہیں؟!

اور جہاں تک حضرت عثمان بن طلحہؓ کا تعلق ہے تو وہ اس وقت کافر تھے اور فتح مکہ سے پہلے پہلے ایمان لائے لیکن اس کے باوجود حضرت ام سلمہؓ ان کی شرافت و عزت کی گواہی دیتی ہیں، یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ان کی شخصیت پاکیزگی، مروت اور کمزوروں کی حمایت سے عبارت تھی، ان کی مروءت اور عربی اخلاق نے ان کو اس بات پر مجبور کیا کہ ایک شریف خاتون کو اس وحشت ناک ریگستان میں

تنہا نہ جانے دیں، اگرچہ وہ ان کے دین پر نہیں تھیں اور ان کو اس کا علم تھا کہ وہ اپنی ہجرت کے ذریعہ ان کو اور ان جیسے دیگر کفار کو چیلنج دے رہی ہیں۔

آج کی بیسویں صدی کی تہذیب کا اس اخلاق و کردار کے ساتھ موازنہ کیجئے تو زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا، آج تو ایسے اخلاق سوز واقعات دیکھنے کو ملتے ہیں جن کی وجہ سے انسانیت کی نگاہ شرم سے جھک جاتی ہے اور ہر چہار سو اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے!۔

یہ اور اس طرح کے دیگر واقعات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ عربوں کی فطرت اور مزاج میں رذائل کے مقابلہ میں فضائل زیادہ تھے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے خاتم الأنبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو انہی میں مبعوث کیا اور وہ اس پیغامِ حق کو اٹھانے اور تمام لوگوں تک پہنچانے کا استحقاق رکھتے تھے۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویہ فی ضوء القرآن والسنۃ، محمد ابو شہبہ: 1/461)

اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء اور مقرب بندوں کے لئے کس طرح اسباب اور انسانوں کو مسخر کر دیتا ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات نے حضرت عثمانؓ کے دل میں یہ بات ڈالی کہ حضرت اُم سلمہؓ کے ساتھ حسنِ سلوک کیا جائے اور اس کے لئے انہوں نے اپنے وقت اور محنت و جانفشانی کی قربانی دی، اسی طرح یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ سلیم الفطرت تھے جس کی وجہ سے ان کو صلحِ حدیبیہ کے بعد اسلام قبولِ کرنے کی توفیق ملتی ہے، شاید حضرت اُم سلمہؓ کے ساتھ سفر کے دوران ہی ان کے دل میں ایمان کی شمع روشن ہو چکی تھی۔ (التاریخ الاسلامی، الحمیدی، 3/128، السیرۃ النبویہ الصحیحۃ 1/204)

۲- اچانک حملہ کر کے یرغمال بنانے کا اسلوب:

قریش کے لوگوں نے صرف مکہ میں ہی مسلمانوں کو ہجرت سے روکنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ہجرت کر کے مدینہ جانے والوں کو واپس لانے کے لئے بھی ہر ممکن کوششیں کیں، اس سلسلہ میں ہجرت کرنے والوں میں سے ایک صحابی کو واپس لانے کے لئے منصوبہ بندی کی گئی اور یہ کوشش کامیاب بھی ہوگئی، اچانک حملہ کر کے یرغمال بنانے کے اس تاریخی واقعہ کو حضرت عمر بن خطابؓ بیان فرماتے ہوئے کہتے ہیں: میں نے جب مدینہ کی جانب ہجرت کرنے کا ارادہ کیا تو میں نے اور عیاش بن ابی ربیعہ اور ہشام بن عاص بن وائل سہمی نے بنو غفار کے تالاب کے پاس مقام 'سرف' کے اوپر ''تناصب'' کی جگہ ملنے کا پروگرام بنایا اور ہم نے کہا کہ صبح کے وقت جو بھی وہاں نہیں پہنچے گا تو سمجھ لیا جائے گا کہ اس کو گرفتار کر لیا گیا ہے، اس لئے باقی لوگ اپنا سفر شروع کر لیں گے، فرماتے ہیں: میں اور عیاش بن ابی ربیعہ صبح کے وقت تناصب کے مقام پر پہنچ گئے اور ہشام نہیں پہنچ پائے، ان کو گرفتار کر لیا گیا اور آزمائشوں کا نشانہ بنایا گیا، جب ہم مدینہ پہنچ گئے تو ہم نے قباء میں بنو عمرو بن عوف کے یہاں قیام کیا، اسی اثناء میں ابو جہل بن ہشام اور حارث بن ہشام نے حضرت عیاش بن ابی ربیعہ کے پاس آنے کا پروگرام بنایا اور وہ ان کے چچازاد بھائی اور ماں شریکِ بھائی تھے، وہ مدینہ میں ان کے پاس پہنچ گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابھی مکہ مکرمہ میں ہی تھے، انہوں نے حضرت عیاشؓ سے بات کی اور کہا: آپ کی ماں نے قسم کھائی ہے کہ نہ ہی وہ اپنے بالوں کو کنگھی کرے گی اور نہ ہی سائے میں بیٹھے گی جب تک کہ تم کو نہ دیکھ لے۔ حضرت عیاش کو اپنی ماں پر ترس آیا، میں نے ان سے کہا: عیاش! یہ لوگ آپ کو آپ کے دین کے بارے میں فتنہ میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں، لہذا ان سے چوکنا رہو، واللہ! جب آپ کی والدہ کو سر میں جوئیں پریشان کریں گی تو خود کنگھی کر لے گی، اور جب مکہ کی

گرمی ان کو پریشان کرے گی تو خود سایہ میں چلی جائیں گی، انہوں نے کہا: نہیں! میں اپنی ماں کی قسم کی لاج رکھنا چاہتا ہوں اور وہاں پر میرا مال بھی ہے میں وہ بھی لے کر آؤں گا۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں: میں نے کہا: دیکھو! واللہ! میں قریش میں سب سے زیادہ مالدار ہوں، میں آپ کو اپنا نصف مال دے دوں گا، مگر ان دونوں کے ساتھ مت جاؤ۔ فرماتے ہیں: انہوں نے میری بات نہیں مانی اور ان دونوں کے ساتھ جانے کا ارادہ کر لیا، جب انہوں نے میری بات نہیں مانی تو میں نے ان سے کہا: اگر آپ جانا ہی چاہتے ہو تو میری یہ اونٹنی لے لو، یہ تیز رفتار اور فرمانبردار اونٹنی ہے، اسی پر سوار رہنا، اگر ان لوگوں کی طرف سے کوئی مشکوک بات محسوس ہو تو اس پر سوار ہو کر بھاگ جانا، چنانچہ وہ ان دونوں کے ساتھ اس اونٹنی پر سوار ہو کر نکلے، یہاں تک کہ ابھی راستے میں ہی تھے تو ابو جہل نے ان سے کہا: بھائی میں نے اپنے اونٹ پر زیادہ بوجھ ڈال دیا ہے آپ مجھے اپنی اونٹنی پر باری باری سے سوار کرو گے ؟! اُنہوں نے کہا: کیوں نہیں! چنانچہ دونوں نے اپنی اپنی سواری کو بٹھایا اور جب سب زمین پر آگئے تو دونوں نے حضرت عیاش پر حملہ کر دیا اور ان کو یرغمال بنا کر باندھ دیا، اس کے بعد ان کو اسی حالت میں مکہ میں داخل کیا اور ان کو آزمائشوں کا نشانہ بنایا اور وہ بہت پریشان ہوئے۔(السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ، 1/205)

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں: ہم کہا کرتے تھے کہ جو بھی اب فتنہ میں مبتلا ہو گا اللہ تعالیٰ اس کا مال، دولت اور توبہ قبول نہیں کرے گا، ان لوگوں نے پہلے اللہ کو اچھی طرح پہچان لیا اور پھر یہ پریشانیوں کی وجہ سے کفر کی طرف واپس چلے گئے۔ فرماتے ہیں: یہ بات وہ خود بھی اپنے دل میں سوچتے تھے جب اللہ کے رسول ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں اور ہمارے رد عمل کے بارے میں یہ آیات نازل فرمائیں: ﴿قُلْ يَٰعِبَادِىَ ٱلَّذِينَ أَسْرَفُوا۟ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا۟ مِن رَّحْمَةِ ٱللَّهِ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ يَغْفِرُ ٱلذُّنُوبَ جَمِيعًا ۚ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلْغَفُورُ ٱلرَّحِيمُ ﴿٥٣﴾ وَأَنِيبُوٓا۟ إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَأَسْلِمُوا۟ لَهُۥ مِن قَبْلِ أَن يَأْتِيَكُمُ ٱلْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنصَرُونَ ﴿٥٤﴾ وَٱتَّبِعُوٓا۟ أَحْسَنَ مَآ أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُم مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَكُمُ ٱلْعَذَابُ بَغْتَةً وَأَنتُمْ لَا تَشْعُرُونَ ﴿٥٥﴾﴾ ترجمہ: "(اے نبیؐ) کہہ دو کہ اے میرے بندو، جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ، یقیناً اللہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے، وہ تو غفور و رحیم ہے۔ پلٹ آؤ اپنے رب کی طرف اور مطیع بن جاؤ اُس کے قبل اِس کے کہ تم پر عذاب آ جائے اور پھر کہیں سے تمہیں مدد نہ مل سکے۔ اور پیروی اختیار کر لو اپنے رب کی بھیجی ہوئی کتاب کے بہترین پہلو کی، قبل اِس کے کہ تم پر اچانک عذاب آئے اور تم کو خبر بھی نہ ہو"۔(سورۃ الزمر: 53-55)

حضرت عمر بن خطابؓ فرماتے ہیں: میں نے ان آیات کو اپنے ہاتھ سے ایک صحیفہ میں لکھا اور ان کو لکھ کر ہشام بن العاص کے پاس بھیجا۔ فرماتے ہیں ہشام بن عاص اپنے متعلق کہتے ہیں: جب یہ آیات میرے پاس پہنچیں میں ان آیات کو ذی طوی کی وادی میں پڑھنے لگا، میں ان کو پڑھتے پڑھتے کبھی اوپر کی جانب چڑھتا اور کبھی نیچے کی جانب آتا، اور یہ آیات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں، یہاں تک کہ میں نے دعا کی کہ اے اللہ مجھے ان آیات کا فہم عطا فرما دے، فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں یہ بات ڈالی کہ یہ ہمارے بارے میں ہی نازل ہوئی

ہیں۔ فرماتے ہیں: میں اپنے اونٹ کے پاس واپس آیا، اس پر بیٹھا اور رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچ گیا، جب کہ آپ ﷺ مدینہ منورہ میں تھے۔ (البزار: 1746، الدلائل للبیہقی 2/461 -462، مجمع الزوائد 6/61، الہجرۃ النبویۃ المبارکۃ، ص 131)

اس واقعہ کے ذریعہ واضح ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے لئے اور اپنے دونوں ساتھیوں کے لئے کس طرح ہجرت کرنے کا منصوبہ بنایا اور تینوں نے ملنے کی جگہ بھی طے کی جو کہ مکہ سے دور حرم کے باہر مدینہ کے راستے پر تھی، اسی طرح وقت بھی طے کر لیا اور یہ بھی طے کیا کہ اگر کوئی بھی ایک پیچھے رہ گیا تو باقی ساتھی نکل جائیں گے اور پھر انتظار نہیں کریں گے، اس لئے کہ اس کو گرفتار کر لیا گیا ہوگا، اور وہی ہوا جس کا انہیں خوف تھا، چنانچہ ہشام بن العاصؓ کو گرفتار کر لیا گیا، جبکہ حضرت عمرؓ اور حضرت عیاشؓ ہجرت کے سفر پر نکل گئے، اس طریقہ سے ان کا منصوبہ مکمل طور پر کامیاب ہو گیا اور وہ دونوں بحفاظت مدینہ پہنچ گئے۔ (التربیۃ القیادیۃ 2/159)

لیکن قریش نے بھی مہاجرین کا پیچھا کرنے کا عزمِ مصمم کر رکھا تھا اور اس کے لئے انہوں نے ایک خطرناک منصوبہ تیار کیا تھا جس کی تنفیذ کا کام ابو جہل اور حارث نے انجام دیا، یہ دونوں حضرت عیاشؓ کے ماں شریک بھائی تھے جس کی وجہ سے حضرت عیاشؓ کو ان پر اعتماد بھی تھا اور خاص طور پر معاملہ جبکہ ان کی والدہ کا تھا، ابو جہل نے من گھڑت کہانی تیار کر کے اسکیم تیار کی، اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ حضرت عیاشؓ اپنی والدہ سے کس قدر محبت کرتے ہیں، اور واقعتاً ایسا ہی ہوا جبکہ حضرت عیاشؓ ان کے ساتھ واپس آنے کے لئے تیار ہو گئے، اسی طرح اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کس قدر محتاط تھے کہ انہوں نے اپنی فراست کے ذریعہ یہ پہلے ہی سمجھ لیا تھا کہ ان لوگوں کا منصوبہ کیا ہے اور یہ کیا کرنا چاہتے ہیں۔

اس کے ذریعہ اسلامی اخوت کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے یہاں تک کہ حضرت عمرؓ اپنے بھائی کی سلامتی اور حفاظت کے لئے اور ان کو مشرکین کی ایذاء رسانی سے محفوظ رکھنے کے لئے اپنا آدھا مال قربان کرنے کے لئے تیار ہو گئے، لیکن حضرت عیاشؓ پر ان کے جذبات اور والدہ کی محبت و حسنِ سلوک کا غلبہ ہوا جس کی وجہ سے انہوں نے مکہ جانے کا ارادہ کر لیا تاکہ وہاں جا کر اپنی والدہ کے ساتھ حسنِ سلوک بھی کریں اور اپنا مال بھی لے کر آئیں، ان کی خودداری حضرت عمرؓ کا مال لینے میں حائل ہو گئی کیونکہ مکہ میں ان کا اپنا مال موجود تھا، البتہ حضرت عمرؓ کی دور اندیشی کہیں اس سے زیادہ تھی گویا کہ وہ آنکھوں سے اس خطرناک انجام کو دیکھ رہے تھے جس کا سامنا حضرت عیاشؓ کو مکہ واپس جانے کی صورت میں کرنا پڑ سکتا تھا اور جب حضرت عمرؓ ان کو منوانے میں کامیاب نہیں ہوئے تو انہوں نے پھر بھی حضرت عیاشؓ کو اپنی تیز رفتار اونٹنی دے دی تاکہ بوقتِ ضرورت وہ اس سے کام لے سکیں۔ (السیرۃ النبویہ، ص: 134 التربیۃ القیادیۃ: 2/160)

حضرت عمرؓ نے حضرت عیاشؓ کو منوانے کی ہر طرح سے کوشش کی اور حضرت عیاشؓ پھر بھی اپنے ارادہ پر قائم رہے، لیکن حضرت عمر پھر بھی ان سے ناراض نہیں ہوئے کہ اُنہوں نے میری بات نہیں مانی، بلکہ محبت و ہمدردی کا جذبہ مسلسل باقی رہا، یہاں تک کہ جیسے ہی اللہ کی طرف سے آیات نازل ہوئیں تو انہوں نے فوراً ان کو مکہ میں اپنے دونوں بھائیوں حضرت عیاشؓ اور حضرت ھشامؓ کے پاس بھیج دیا تاکہ وہ تحریکِ اسلامی کے رفقاء کے ساتھ ملنے کی از سرِ نو کوشش کریں۔ (التربیۃ القیادیۃ، 2/160)

۳- قید کرنے کا اسلوب:

قریش نے ہجرت سے روکنے کے لئے قید کرنے کا اسلوب بھی اختیار کیا، وہ ہجرت کرنے والے جس شخص کو بھی پکڑنے میں کامیاب ہوتے تو اس کو کسی کے گھر میں اس کے ہاتھ، پیر باندھ کر قید کر دیتے تھے، اور اس کی کڑی نگرانی کرتے تھے تاکہ وہ بھاگ نہ سکے، کبھی کبھی کسی کو بغیر چھت والی چہار دیواری میں بند کر دیتے تھے جیسے کہ حضرت عیاشؓ اور حضرت ہشام بن عاصؓ کے ساتھ کیا گیا، ان دونوں حضرات کو بغیر چھت والے گھر میں قید کیا گیا، اس کے ذریعہ اور زیادہ تکلیف پہنچانی مقصود ہوتی تھی، اس لئے کہ پہاڑی علاقہ میں اس طرح کی جگہ پر وحشت اور تنہائی کا ماحول ہوتا تھا اور مکہ جیسے سخت علاقے کی تپتی دھوپ بھی ناقابل برداشت ہوتی تھی۔

قریش کے لیڈران اس کے ذریعہ دو مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے:

۱: قیدیوں کو ہجرت سے روکنا۔ ۲: ہجرت کے بارے میں سوچنے والے ہر شخص کے لئے درس و عبرت۔

لیکن یہ اسلوب مسلمانوں کو ہجرت سے روکنے میں کارگر ثابت نہ ہو سکا، بعض مسلمان جیسے کہ حضرت عیاش اور حضرت ہشام مکہ میں مقید تھے، لیکن وہ بالآخر باہر نکلنے میں کامیاب ہوگئے اور مدینہ میں جاکر سکونت اختیار کرلی۔(فی السیرۃ النبویۃ، ص132)

ہجرت کرنے کے بعد نبی کریم ﷺ قنوتِ نازلہ کا اہتمام فرماتے تھے اور مکہ میں موجود بے سہارا اہل ایمان کے لئے عمومی طور دعا کرتے تھے، جبکہ بعض کے حق میں خاص طور پر نام لے کر دعا کرتے تھے، حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب آخری رکعت میں (رکوع سے) سر اٹھاتے تھے تو فرماتے تھے: اے اللہ! عیاش بن ابی ربیعہ کو نجات عطا فرما، اے اللہ! سلمہ بن ہشام کو نجات عطا فرما، اے اللہ! ولید بن ولید کو نجات عطا فرما، اے اللہ! بے سہارا اہلِ ایمان کو نجات عطا فرما، اے اللہ! مضر پر شکنجہ سخت فرما، اے اللہ! ان پر یوسف علیہ السلام کے دور کی سی قحط سالی نازل فرما۔(صحیح بُخاری: 1006، مسند احمد: 2/418)

مسلمانوں نے حضرت عیاشؓ کے یرغمال بنانے کے معاملہ کے بارے میں بے اعتنائی نہیں برتی، بلکہ اللہ کے رسول ﷺ نے ایک صحابی کو ان کو آزاد کرانے کی مہم سونپی، اور اُنہوں نے اس مہم کے لئے بہترین منصوبہ بندی کی، اور اس مہم کی کامیابی کے لئے بھرپور تیاری کرنے کے بعد مکہ پہنچے اور پوری ذہانت اور صلاحیت سے کام لیتے ہوئے اس گھر تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے جہاں وہ دونوں (حضرت عیاشؓ اور حضرت ہشامؓ) محبوس تھے، ان کی بیڑیوں کو کھول کر ان کو آزاد کر دیا اور ان دونوں کو لے کر مدینہ منورہ واپس آگئے۔ (فی السیرۃ النبویۃ، ص135)

۴- مال واسباب چھین لینے کہ اسلوب:

حضرت صہیب بن سنان نمری قبیلۂ نمر بن قاسط سے تعلق رکھتے تھے، ان پر رومیوں نے حملہ کر دیا اور ان کو قیدی بنایا گیا جبکہ ابھی وہ کمسن تھے، انہوں نے رومیوں کی زبان سیکھ لی اور غلامی ہی کی حالت میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہے یہاں تک کہ

عبداللہ بن جدعان نے ان کو خرید کر آزاد کر دیا اور وہ اور حضرت عمار بن یاسرؓ ایک ہی دن میں حلقۂ بگوش اسلام ہو گئے۔ (الہجرۃ النبویۃ المبارکۃ، ص:119)

حضرت صہیبؓ کی ہجرت ایک ایسا کارنامہ تھا جس کے ذریعہ ایمانی طاقت اور اللہ کے لئے سب کچھ قربان کر دینے کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے، اس لئے کہ حضرت صہیبؓ نے ہر اس چیز کو اللہ اور اس کے رسول کے لئے قربان کر دیا جو بھی ان کی ملکیت میں تھی اور ایمان و توحید کے قافلہ کے ساتھ جا ملے، چنانچہ حضرت أبی عثمان النہدی سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ مجھے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ صہیبؓ نے جب مدینہ کی جانب ہجرت کرنے کا ارادہ کیا تو ان سے اہل مکہ نے کہا: تم یہاں ہمارے پاس ایک مفلوک الحال غلام کی حیثیت سے آئے تھے، اور ہمارے پاس رہتے ہوئے تم مالدار ہوئے، اب اس مقام تک پہنچے ہو اور اب اپنی جان اور مال کے ساتھ یہاں سے جانا چاہتے ہو، ایسا کبھی نہیں ہو سکتا ہے! حضرت صہیبؓ نے کہا: اگر میں اپنا سارا مال تمہارے لئے چھوڑ دوں تو کیا مجھے جانے دو گے؟ انہوں نے کہا: ہاں! تب ہم جانے دیں گے۔ حضرت صہیبؓ نے اپنا سارا مال ان کو دے دیا۔ یہ بات نبی کریم ﷺ کو معلوم ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''صہیب! تم نے نفع بخش تجارت کی، صہیب! تم نے نفع بخش تجارت کی''۔ (المطالب العالیہ: 4063، سیرت ابن ہشام: 2/121)

حضرت عکرمہؓ فرماتے ہیں کہ جب حضرت صہیبؓ ہجرت کرنے کے لئے نکلے تو اہل مکہ نے ان کا پیچھا کیا، انہوں نے اپنا ترکش کھولا اور اس سے چالیس تیر نکالے اور ان سے کہا: تم مجھ تک نہیں پہنچ سکتے ہو! یہاں تک کہ تم میں سے ہر ایک پر تیر سے وار کروں گا اور پھر تلوار سے وار کرتا رہوں گا۔ آپ لوگ جانتے ہو کہ میں نے مکہ میں دو خزانے چھوڑے ہیں میں وہ تمہیں دینے کے لئے تیار ہوں۔ حضرت عکرمہؓ فرماتے ہیں: انہی کے بارے میں نبی کریم ﷺ پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وَمِنَ ٱلنَّاسِ مَن يَشۡرِي نَفۡسَهُ ٱبۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ ٱللَّهِۚ وَٱللَّهُ رَءُوفُۢ بِٱلۡعِبَادِ﴾ ترجمہ: ''اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ کی رضا جوئی کے لئے اپنے آپ کو بیچ دیتے ہیں، اور اللہ اپنے بندوں پر نہایت مہربان ہے''۔ (سورۃ البقرہ: 207)

جب نبی کریم ﷺ نے حضرت صہیبؓ کو دیکھا تو فرمایا: ابو یحییٰ! تجارت نفع بخش ہوئی! اور آپؐ نے مذکورہ آیت تلاوت فرمائی۔ (مستدرک حاکم: 3/398)

حضرت صہیبؓ نے ان مادہ پرست لوگوں کی سوچ کے بگاڑ پر قطعی دلیل پیش کر دی جو تاریخ کی تمام تحریکات اور واقعات کو مادیت کی میزان سے تولتے ہیں، لہذا حضرت صہیبؓ کو اپنی ہجرت کی وجہ سے کون سا مادی فائدہ مل رہا ہے؟! بلکہ ہجرت کے لئے تو انہوں نے اپنی تمام دولت کو لٹا دیا!۔

کیا نبی کریم ﷺ کی طرف سے ان کو کسی منصب کے ملنے کی امید تھی؟ یا کیا محمد ﷺ نے ان کو اہل یثرب کے پاس آ کر کسی خوشحال زندگی کا وعدہ کیا تھا؟!

یقیناً حضرت صہیب ؓ نے یہ سب کچھ صرف اور صرف اللہ کی رضاجوئی کے لئے کیا، اگرچہ ان کو اس کی کتنی ہی قیمت چکانی پڑی، انہوں نے نوجوانانِ اسلام کے لئے قربانی اور ایثار کی اعلیٰ ترین مثال پیش کی تاکہ وہ بھی انہی کے نقشِ قدم پر چلیں اور انہی کے قافلے میں شامل ہوں۔(الهجرة النبوية المباركة ،ڈاکٹر عبدالرحمن البر، ص121)

ہجرت کے موقع پر پیش آنے والے عظمت وخودداری اور فداکاری کے صرف اتنے ہی واقعات نہیں ہیں بلکہ ہجرت کے عظیم موقع پر عظمت وفداکاری اور قربانی کے بہت سے مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں جو امت کو عزت و سربلندی حاصل کرنے کے سلسلہ میں اہم اسباق ودروس سے بھرے ہوئے ہیں۔

۵- پناہ دینے والے گھرانے اور دلوں میں ان کے اثرات:

انصار کے ایمان، ان کی بیعت اور نصرت ومدد کے عہد وپیمان کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے مسلمانوں کو مدینہ کی جانب ہجرت کرنے کا حکم دے دیا، اسی طرح اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے درمیان تکافل وہمدردی کا عظیم جذبہ بھی سامنے آیا، انصار نے اپنے گھروں اور دلوں کے دروازے مہاجرین کے وفود کے لئے کھول دیئے اور مرد وخواتین سب اُن کو اپنانے اور پناہ دینے کے لئے تیار ہوگئے، ایک ہی گھر میں مہاجر وانصاری صحابہ اور مہاجر خاتون اور انصاری خاتون رہنے لگے، آپس میں مال، جگہ، کھانا اور ذمہ داریوں کو تقسیم کرنے لگے، پناہ دینے والے چند گھرانوں کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

۱) مقام قباء میں حضرت مبشر بن عبدالمنذر بن زَنبر کا گھر۔ اس گھر میں مہاجر مرد وخواتین کے ایک مجموعہ نے قیام کیا، اسی گھر میں حضرت عمر بن خطاب ؓ اور ان کے اہل وعیال کے لوگ، ان کی صاحبزادی حضرت حفصہ ؓ اور ان کے شوہر اور حضرت عیاش بن ابی ربیعہ قیام پذیر تھے۔

۲) مقام سُنح میں حضرت خبیب بن اساف کا گھر۔ یہ بلحارث بن خزرج کے بھائی تھے، اس گھر میں حضرت طلحہ بن عبیداللہ بن عثمان، ان کی والدہ اور حضرت صہیب بن سنان مقیم تھے۔

۳) حضرت اَسعد بن زُرارہ کا گھر۔ یہ بنوالنجار سے تعلق رکھتے تھے، کہا جاتا ہے کہ اس گھر میں حضرت حمزہ بن عبدالمطلب ؓ نے قیام کیا۔

۴) حضرت سعد بن خیثمہ کا گھر۔ یہ بنوالنجار کے بھائی تھے، ان کو 'بیت العزاب' (یعنی: غیر شادی شدہ لوگوں کا گھر) کہا جاتا تھا، اس گھر میں غیر شادی شدہ مہاجرین مقیم تھے۔

۵) قباء میں حضرت عبداللہ بن سلمہ کا گھر۔ یہ بلعجلان کے بھائی تھے، اس گھر پر حضرت عبیدہ بن حارث، ان کی والدہ حضرت سُخیلہ، حضرت مِسطح بن اُثاثہ بن عباد بن مطلب، حضرت طفیل بن حارث، حضرت طُلیب بن عمیر اور حضرت حصین بن حارث مقیم تھے، ان سب مہاجرین نے قباء میں حضرت عبداللہ بن سلمہ کے پاس قیام کیا۔

۶) بنو جَحجَبی کا گھر۔ اس گھر میں پناہ دینے والے حضرت منذر بن محمد بن عقبہ تھے، ان کے پاس حضرت زبیر بن عوام، ان کی زوجہ حضرت اَسماء بنت ابی بکر، حضرت ابو سَبرہ بن ابی رہم اور ان کی زوجہ حضرت اُم کلثوم بنت سہیل مقیم تھے۔

۷)بنو عبد الأشہل کا گھر۔اس گھر میں پناہ دینے والے حضرت سعد بن معاذ بن نعمان تھے جو بنو عبد الأشہل سے تھے،اس گھر میں حضرت مصعب بن عمیر اوران کی زوجہ حضرت حمنہ بنت جحش نے قیام کیا۔

۸)بنو النجار کا گھر۔اس گھر میں پناہ دینے والے حضرت أوس بن ثابت بن المنذر تھے،اس گھر میں حضرت عثمان بن عفان - رضی اللہ عنہ - اوران کی زوجہ حضرت رقیہ بنت رسول اللہ ﷺ مقیم تھے۔ (دیکھیں:المرأۃ فی العہد النبوی،ص116-117،السیرۃ النبویۃ فی ضوء القرآن والسنۃ،أبو شہبہ 1/468- 469)

یہ باہمی تقسیم اور معاشرتی تکافل وہمدردی وہ اہم عناصر تھے جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے لئے اور آپ کے ساتھ مہاجرین صحابہ کے لئے ایسی زندگی گزارنے کی راہ ہموار کی جس میں ایثار وقربانی اور سچی ایمانی اخوت ومحبت کے دلفریب ودلکش مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔

اسی بلند روح،مضبوط ایمان اور معاملات میں صدق وسچائی کی بنیاد پر مؤاخات (بھائی چارہ) کا عمل مکمل ہوااور مہاجرین وانصار کے مابین اتفاق وہم آہنگی پائی گئی،سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کوئی واقعہ کیوں سننے میں نہیں آتا ہے اور کیوں مصادر ومراجع اور سیرت کی کتابوں میں کوئی ایسا واقعہ درج نہیں ہے جس میں یہ ذکر ہو کہ ان گھروں میں کوئی اختلاف اور جھگڑے کا واقعہ پیش آیا ہو؟!اور وہ خواتین کہاں تھیں جو لڑائی جھگڑے میں معروف ہیں؟!

یہ دینِ حق ہے جس نے ہر انسان کے ہر عمل کی أساس اللہ کے تقویٰ کو قرار دیا ہے، یہ اخلاقِ عالیہ ہیں جن کی وجہ سے مسلمانوں کے مابین اخوت وہمدردی اور دعوت کی نصرت ومدد امرِ ضروری قرار پاتا ہے،یہ بیعت اور عہد وپیمان اور دلوں کے اندر اس کے اثرات ہیں،یہ جماعت وقوم کے لئے صدق وعمل کا نتیجہ ہے،یہ اللہ کی سزا،یومِ آخرت کے خوف،ثواب کی امید اور جنت کی طلب کے نتائج واثرات ہیں،یہ نفس وطرزِ عمل کی استقامت،ایمانی جذبہ اور اخلاص وللہیت کا نتیجہ ہے،ہر وہ شخص جس نے اسلام قبول کیا،ہر وہ شخص جس نے بیعت کی اور ہر وہ خاتون جس نے اسلام قبول کیا اور بیعت کی،یہ سب کے سب ان تمام باتوں پر عمل پیرا ہوتے ہیں جن کا ان کو حکم دیا جاتا ہے،اور جو کچھ وہ کہتے ہیں اس میں مخلص ودیانت دار ہوتے ہیں،تنہائی میں اور دوسروں کے سامنے اللہ سے ڈرتے ہیں،ان کے دلوں میں ایمان جاگزیں ہوا تو نصرت کرنے والی خاتون ہجرت کرنے والی خاتون کی پناہ گاہ بن گئی،ان میں سے ہر ایک دوسروں کے مفاد فائدہ کے لئے عمل کرتا ہے،یہ معاشرتی تکافل وہمدردی کی واضح ترین صورت اور مقدس ترین معاشرہ کی تصویر ہے جہاں ہر ایک اجر وثواب کا امیدوار ہے، یہاں تک کہ ان میں سے کسی کو یہ خوف لاحق ہوتا تھا کہ کہیں نصرت کرنے والا ہی سب اجر وثواب نہ لے جائے۔(دیکھیں: التربیۃ القیادیۃ 2/171،172)

بے شک بذل وعطاء اور ایثار وقربانی انتہائی اہم صفات ہیں جن سے آراستہ رہنا ہر وقت انتہائی ضروری ہے،موجودہ دنیا میں اسلامی صفوں میں رہتے ہوئے چند ہی روز کے سفر کے بعد اندر چھپے ہوئے أسرار،عیوب،اور بدگمانیاں ظاہر ہو جاتی ہیں،اصل حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے معاشرہ کی پہلے تعمیر کی جاتی ہے،ابھی رسول اللہ ﷺ بذاتِ خود مدینہ منورہ تشریف نہیں لائے تھے،اس سے پہلے ہی مکہ سے

آنے والے جدید رفقاء کے لئے گھروں کے دروازے کھول دئے جاتے ہیں، یہ صرف کسی ایک فرد کی طرف سے نہیں تھا بلکہ اجتماعی سطح کا طرزِ عمل یہی تھا، مہاجرین کئی ماہ تک انصار کے گھروں میں رہتے ہیں، روزانہ بحسن وخوبی زندگی بسر ہو رہی تھی، اور انصار اپنے آنے والے بھائیوں کے لئے مال، محبت اور خدمات کی بارش کر رہے تھے، ہم ایک ایسے اسلامی معاشرہ کا مشاہدہ کرتے ہیں جو آپسی تعلق واستحکام اور ایثار و قربانی کی بلند ترین چوٹی تک پہنچ چکا تھا، مہاجرین ہی فی الحقیقت انصار کے لئے بذل وعطاء اور ایثار و قربانی کا اصل نمونہ تھے، اس لئے کہ وہ فقراء اور محتاج نہیں تھے، بلکہ وہ مال واسباب کے مالک تھے، ان کے پاس مکانات تھے، مگر ان سب چیزوں سے وہ صرف اللہ کی رضاجوئی کے لئے اللہ کی اطاعت کرتے ہوئے دستبردار ہوئے تھے، جیسے کہ قرآن نے ان کی منظر کشی کی ہے: ﴿لِلْفُقَرَآءِ ٱلْمُهَـٰجِرِينَ ٱلَّذِينَ أُخْرِجُوا۟ مِن دِيَـٰرِهِمْ وَأَمْوَٰلِهِمْ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ ٱللَّهِ وَرِضْوَٰنًا وَيَنصُرُونَ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥٓ ۚ أُو۟لَـٰٓئِكَ هُمُ ٱلصَّـٰدِقُونَ ۝٨ وَٱلَّذِينَ تَبَوَّءُو ٱلدَّارَ وَٱلْإِيمَـٰنَ مِن قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِى صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ أُوتُوا۟ وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِۦ فَأُو۟لَـٰٓئِكَ هُمُ ٱلْمُفْلِحُونَ ۝٩﴾ ترجمہ: (نیز وہ مال) اُن غریب مہاجرین کے لئے ہے جو اپنے گھروں اور جائدادوں سے نکال باہر کیے گئے ہیں، یہ لوگ اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی چاہتے ہیں اور اللہ اور اُس کے رسولؐ کی حمایت پر کمربستہ رہتے ہیں، یہی راستباز لوگ ہیں۔ (اور وہ اُن لوگوں کے لئے بھی ہے) جو اِن مہاجرین کی آمد سے پہلے ہی ایمان لا کر دار الہجرۃ میں مقیم تھے یہ اُن لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے اِن کے پاس آئے ہیں اور جو کچھ بھی اُن کو دے دیا جائے اُس کی کوئی حاجت تک یہ اپنے دلوں میں محسوس نہیں کرتے اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں، خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں، حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے دل کی تنگی سے بچا لئے گئے وہی فلاح پانے والے ہیں"۔ (سورۃ الحشر: 8 -9)

مدینہ کا یہ جدید اسلامی معاشرہ ایمان وتقوی کی صفات کے مطابق تربیت پا رہا تھا، ابھی اللہ کے رسول ﷺ مدینہ تشریف نہیں لائے تھے لیکن ان بارہ نقباء کی سرپرستی میں یہ سب تربیتی مراحل طے ہو رہے تھے جو اپنی قوم کے کفیل اور ذمہ دار تھے، بالکل اسی طرح جیسے عیسٰی علیہ السلام نے حوارین کو ذمہ دار بنایا تھا، اسی طرح عظیم مہاجر قائدین کی سرپرستی میں یہ تربیتی مراحل طے ہو رہے تھے جو پہلے ہی مدینہ آچکے تھے اور وہ نبوی سرچشموں سے سیراب ہو کر آئے تھے اور آپ ﷺ کے طریقۂ زندگی کو انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ (التربیۃ القیادیۃ 2/171 - 172)

اس جدید معاشرہ کی خصوصیات میں سے ایک امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں عصبیت کا عنصر بالکل ختم ہو گیا تھا، چنانچہ مسلمانوں کی امامت کے فرائض حضرت ابو حذیفہ ؓ کے غلام حضرت سالم انجام دے رہے تھے، اس لئے کہ وہ قرآن پاک کو سب سے زیادہ جاننے والے اور یاد رکھنے والے تھے، ایک ایسا معاشرہ جہاں صحابہ کرام میں سے چوٹی کے مہاجر وانصار صحابہ موجود ہیں، جہاں قریش اور خزرج کے عرب سادات اور سردار موجود ہیں، ان کی قیادت وامامت ایک حافظ قرآن کر رہا ہے، اس معاشرہ میں بلند ترین منصب کتاب اللہ

کے قاری و حامل کو سونپا جاتا ہے اور اسلامی معاشرہ میں حاملِ قرآن ہی جنگ میں علمبر دار بھی ہوتا ہے، آج کے دور میں حفاظ و مجاہدین کے مابین جو تقسیم کر دی گئی ہے وہ اس وقت موجود نہیں تھی، چنانچہ جنگ یمامہ میں مہاجرین کے علمبر دار حضرت سالم مولی ابی حذیفہؓ ہی تھے، ان کا شعار تھا: بُرے حاملِ قرآن قرار پاؤ گے اگر فرار اختیار کیا، چنانچہ ان کا دایاں ہاتھ کٹ گیا تو پرچم کو بائیں ہاتھ میں تھام لیا، بایاں ہاتھ بھی کٹ گیا تو پرچم کو سینے سے چمٹا لیا، یہاں تک کہ گر گئے اور اللہ کی راہ میں شہادت کا جام نوش کیا۔(التربیۃ القیادیۃ 2/174)

اس جدید اسلامی معاشرہ کی نمایاں خصوصیت اعلانیہ طور پر دعوت الی اللہ کی آزادی تھی، سب کے نزدیک یہ بات بالکل واضح تھی کہ یثرب کے اکثر سردار اس دین میں داخل ہو چکے ہیں اور نوجوان، خواتین اور مرد سب دعوت الی اللہ میں سر گرم تھے اور مسلسل رسول ﷺ کی آمد کی خوشخبریاں سنائی جا رہی تھیں، حبشہ میں تشکیل پانے والے معاشرہ پر سیاسی پناہ کا پہلو غالب تھا، اسی طرح وہاں کے غیر مسلم مسلمانوں سے زیادہ تھے، وہاں کے باشندے بھی مسلمان نہیں تھے، اسی طرح اگرچہ ان کو وہاں پر عبادت کرنے کی مکمل آزادی تھی لیکن وہ عیسائی معاشرہ سے بالکل الگ تھلگ تھے، وہ اس معاشرہ میں اثر انداز نہیں ہو سکتے تھے، اگرچہ مکہ کے مقابلہ میں حبشہ کا ماحول زیادہ ساز گار تھا، مکہ میں تو عبادت و دعوت کسی چیز کی آزادی نہیں تھی لیکن پھر بھی حبشہ کا معاشرہ اور وہاں کا ماحول مدینہ کے معاشرہ اور ماحول سے بہت سے اعتبارات سے کم تر تھا، اسی لئے حبشہ کے مہاجرین نے جیسے ہی ہجرتِ مدینہ کی خبر سنی تو انہوں نے بھی فوراً مدینہ منورہ کا رخ کیا یا تو براہ راست مدینہ منورہ آ گئے یا پھر براہ مکہ مدینہ آئے، سوائے ان لوگوں کے جن سے قیادت نے وہیں رہنے کا مطالبہ کیا تھا، اب مدینہ منورہ مکمل طور پر مسلمان ہو گیا تھا جب کہ کئی صدیوں سے بت پرستی اور شرک کے ماحول میں جو نجھ رہا تھا۔

اب مدنی معاشرہ مسلم معاشرہ میں تبدیل ہو گیا تھا، اور اس کا آغاز اور عملی تشکیل بیعت اولیٰ کے بعد بارہ صحابہ کے واپس آنے کے بعد سے ہو گئی تھی جن میں سر فہرست صحابی جلیل حضرت اسعد بن زرارہؓ تھے اور اس بیعت کے بموجب صرف دعوتی ذمہ داری عائد ہوتی تھی جبکہ سیاسی وجود ابھی اس سے خارج تھا اور عقبہ ثانیہ کے بعد ستر صحابہ کرام کی واپسی کے بعد اس مدنی معاشرہ کی وسعت اور تعمیر اپنے عروج کو پہنچ گئی تھی، اب معاشرتی اور سیاسی دونوں پہلوؤں پر کام کیا جا رہا تھا، انہوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ ان کا شہر مسلمانوں کا پہلا دار الخلافہ بنے گا، وہ اس خارجی دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے پورے طور پر تیار تھے جو بھی اس سیادت و قیادت کی طرف میلی آنکھ سے دیکھنے کی کوشش کرے گا۔

بے شک جس مضبوط و مستحکم مرکز کی ترتیب و تعمیر میں رسول اللہ ﷺ نے کافی وقت اور محنت صرف کی تھی وہ اب اپنے پھل دینے لگا جبکہ وہ اب مدنی معاشرہ کی پہچان بن چکا تھا اور عقیدہ اور دینی اخوت اس معاشرہ کے رگ وپے میں داخل ہو چکے تھے۔

اللہ کے رسول ﷺ نے افراد کو بہترین انداز سے تیار کیا تھا، ان کو اجتماعی روح کے سانچے میں ڈھالا تھا اور ان کے ذریعہ ایک مضبوط و مستحکم مرکز تشکیل دیا تھا، اور یہ اسلامی معاشرہ جس کی اساس پر حکومت قائم کی جانے والی تھی، بیعتِ جہاد کے بعد ہی قائم ہو سکا تھا، لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی معاشرہ اسی وقت قائم ہو سکا جبکہ زمین پر اس کی حمایت و حفاظت کے لئے مناسب قوت مہیا ہو گئی تھی۔ (التربیۃ القیادیۃ 1/146، 147)

اس طرح سے طاقتور و منظم مسلم جماعت مدینہ کی طرف منتقل ہوئی اور اپنے انصاری برادران کے ساتھ گھل مل گئی اور ایسا مسلم معاشرہ تشکیل پایا جواب اپنے قائد اعلیٰ کا انتظار کر رہا تھا تاکہ وہ اسلامی حکومت کی بنیاد کا اعلان کریں جس کے ذریعہ ایسی تہذیب وجود میں آئی جس کی مثال آج تک تاریخ انسانی پیش کرنے سے قاصر ہے۔

٦- مدینہ منورہ کو اسلامی حکومت کا دار الخلافہ منتخب کرنے کی وجہ:

یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا تھا کہ مدینہ منورہ کو ہجرت کی جگہ اور دعوت کا مرکز بنایا جائے، ایک تو اللہ تعالیٰ اہلِ مدینہ کو اکرام اور خاص مقام عطا کرنا چاہتا تھا، لیکن اس کے علاوہ اس میں ایسے اَسرار اور حکمتیں ہیں جن کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے، البتہ مدینہ منورہ عسکری اعتبار سے قدرتی طور پر قلعہ بند جگہ کی حیثیت رکھتا تھا، پورے جزیرۃ العرب میں اور کوئی ایسی قریبی جگہ نہیں تھی، مغربی سمت میں مدینہ کو حرّۃ الوبرۃ (نوکیلے پتھروں والی زمین) گھیرے ہوئے تھی اور مشرقی سمت سے ہر حرّۃ واقم گھیرے ہوئے تھا، صرف مدینہ کا شمالی حصہ کھلا ہوا تھا، اسی حصہ کو رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ احزاب میں خندق کے ذریعہ محفوظ بنایا تھا، چوتھی سمت کھجور کے درختوں کے ذریعہ گھنی فصلوں کے ذریعہ گھری ہوئی تھی جہاں کسی بھی لشکر کو آنے کے لئے تنگ راستوں سے گزرنا پڑتا تھا جس میں عسکری نظام قائم نہیں رہ سکتا ہے اور نہ ہی فوں کی صف بندی کی جاسکتی ہے۔

مدینہ میں موجود چھوٹی سی فوجی ٹکڑی باہر سے آنے والی بڑی فوج کے نظام کو درہم برہم کرنے کے لئے اور اس کو پیش قدمی سے روکنے کے لئے کافی تھی۔ ابنِ اسحاق فرماتے ہیں: ''مدینہ منورہ کی ایک ہی سمت کھلی تھی جبکہ اس کی تمام سمتیں ان عمارتوں اور کھجور کے درختوں سے گھری ہوئی تھیں جہاں سے دشمن کے داخل ہونے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ (السيرة النبوية، الندوي، ص 157)

شاید نبی کریم ﷺ نے مدینہ کے انتخاب کے سلسلہ میں اسی حکمتِ خداوندی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ہجرت سے پہلے صحابہ کرام سے فرمایا تھا: "مجھے تمہاری ہجرت کی جگہ دکھادی گئی ہے، وہ دو حرّات (پتھریلی زمین) کے درمیان کھجوروں والی زمین ہے''۔ اسی لئے ہجرت کرنے والے تمام افراد نے مدینہ منورہ کا رخ کیا اور جنہوں نے سر زمینِ حبشہ کی جانب ہجرت کی تھی وہ بھی مدینہ واپس لوٹ آئے۔

اسی طرح اوس اور خزرج پر مشتمل اہلِ مدینہ خوددار، بہادر اور طاقتور لوگ تھے، حُریت و آزادی ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی، وہ کسی کے تابع فرمان رہنے کے قائل نہیں تھے، انہوں نے کسی قبیلہ یا حکومت کو کبھی کوئی ٹیکس یا جزیہ نہیں دیا تھا، ابنِ خلدون لکھتے ہیں: ''یثرب پر انہی دو قبیلوں کا غلبہ تھا، ان کا فخر واعتزاز اور حفاظت وحمایت معروفِ زمانہ صفات تھیں، ان کے پڑوس میں مضر کے جو قبائل رہتے تھے وہ بھی انہی کے ماتحت رہتے تھے''۔

بنوعدی بن نجار رسول اللہ ﷺ کے ننہال تھے، حضرت عبد المطلب بن ہاشم بن عدی بن نجار کی والدہ محترمہ انہی کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں، ہاشم نے بنوعدی بن نجار کے ایک شخص عمرو کی بیٹی سلمیٰ سے شادی کی، ان کے بطن سے عبد المطلب پیدا ہوئے اور ہاشم نے عبد المطلب کو انہی کی پرورش میں رکھا یہاں تک کہ وہ نوجوانی کی عمر کو پہنچ گئے، اس کے بعد ان کے چچا مطّلب ان کو مکہ لے کر آئے،

قرابت ورشتہ داری کی عربوں کی معاشرتی زندگی میں کافی اہمیت تھی،اسی خاندان سے حضرت ابوایوب انصاریؓ کا بھی تعلق ہے جن کے گھر میں رسول اللہ ﷺ نے قیام فرمایا۔

اوس اور خزرج کا تعلق قحطان سے تھا، جبکہ مہاجرین اور مکہ میں اسلام قبول کرنے والوں کا تعلق عدنان سے تھا، جب رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ ہجرت کی اور انصار نے آپؐ کی نصرت وحمایت کی تو اس کے ذریعہ عدنان اور قحطان دونوں اسلام کے جھنڈے تلے جمع اور متحد ہوگئے، وہ یک جان دو قالب تھے، وہ ایک جسم کی طرح بن گئے، جبکہ زمانۂ جاہلیت میں ان کے مابین باہمی کشمکش اور مسابقت تھی، اسلامی اخوت واتحاد کی وجہ سے شیطان کے لئے فتنہ پروری اور قحطانی یاعدنانی قبائلی حمیت کو بھڑکانے کے تمام راستے مسدود ہوگئے۔

ان تمام امور کی وجہ سے شہر یثرب رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے اصحاب کی ہجرت کے لئے مناسب ترین جگہ تھی، تاکہ اسلام قوی تر ہوسکے، آگے کی منزل کی طرف اپنا راستہ ہموار کر سکے اور جزیرۃ العرب اور پھر عالمِ متمدن پر اپنی فتوحات کے جھنڈے گاڑھ سکے۔ (الأساس فی السنہ:1/33)

۷- مدینہ منورہ کے چند فضائل:

نبی کریم ﷺ کے مدینہ کی جانب ہجرت کی وجہ سے مدینہ منورہ کے مقام وشرف میں اضافہ ہوا، یہاں تک کہ مکہ مکرمہ کے علاوہ تمام روئے زمین پر اس کو فضیلت عطا ہوئی، مدینہ منورہ کے فضائل بہت زیادہ ہیں، ان میں سے چند فضائل کا ذکر یہاں پر کیا جاتا ہے:

ا) مدینہ کے ناموں کی کثرت:

بلاشبہ ناموں کی کثرت اس چیز یا شخصیت (مسمّٰی) کے شرف وعزت کی دلیل ہوا کرتی ہے، دنیا میں کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جس کے مدینہ منورہ کی طرح بلکہ اس کے نصف یا چوتھائی کے برابر نام ہوں، علماء نے مدینہ منورہ کے تقریباً سو (۱۰۰) نام ذکر کئے ہیں۔ علامہ زرکشیؒ نے "اعلام الساجد بأحکام المساجد" میں، فیروز آبادی نے "القاموس المحیط" میں، نورالدین السمہودی نے "وفاء الوفاء بأخبار دار المصطفیٰ" میں اور محمد بن یوسف الصالحی نے " سبل الھدٰی والرشاد فی سیرۃ خیر العباد" میں ان ناموں کا ذکر کیا ہے۔ (دیکھیں: الہجرۃ المبارکۃ، ص: 155)

ان اسماء میں مشہور ترین نام:

أ) یثرب: ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَإِذۡ قَالَت طَّآئِفَةٞ مِّنۡهُمۡ يَٰٓأَهۡلَ يَثۡرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمۡ فَٱرۡجِعُواْۚ وَيَسۡتَـٔۡذِنُ فَرِيقٞ مِّنۡهُمُ ٱلنَّبِيَّ يَقُولُونَ إِنَّ بُيُوتَنَا عَوۡرَةٞ وَمَا هِيَ بِعَوۡرَةٍۖ إِن يُرِيدُونَ إِلَّا فِرَارٗا﴾ ترجمہ: "جب اُن میں سے ایک گروہ نے کہا کہ "اے یثرب کے لوگو، تمہارے لئے اب ٹھہرنے کا کوئی موقع نہیں ہے، پلٹ چلو"۔ جب ان کا ایک فریق یہ کہہ کر نبیؐ سے رخصت طلب کر رہا تھا کہ "ہمارے گھر خطرے میں ہیں"۔ حالانکہ وہ خطرے میں نہ تھے، دراصل وہ (محاذ جنگ سے) بھاگنا چاہتے تھے"۔ (سورۃ الأحزاب:13)

مدینہ کا یہ نام رکھنے کی ممانعت وارد ہوئی ہے اور جہاں تک قرآن میں "یثرب" کے ذکر کا سوال ہے تو وہ منافقین کے قول کی حکایت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

ب) طابۃ؛ حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو مدینہ کا نام یثرب رکھے اس کو اللہ سے استغفار کرنا چاہیے، اس لئے کہ وہ 'طابۃ' ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ "وہ طابۃ ہے، وہ طابۃ ہے، وہ طابۃ ہے"۔ (مسند أحمد 4/285، فتح القدیر میں علامہ شوکانیؒ نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے۔4/268)

ج) المدینۃ؛ یہ مدینہ منورہ کا سب سے زیادہ معروف و مشہور نام ہے، اور یہ لفظ جب بھی مطلقاً بولا جائے تو اس سے دنیا کے دیگر شہروں کے بجائے مدینہ منورہ مراد لیا جاتا ہے، قرآن پاک کی بہت سی آیات میں یہ نام ذکر کیا گیا ہے، جیسے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمِمَّنْ حَوْلَكُم مِّنَ ٱلْأَعْرَابِ مُنَـٰفِقُونَ ۖ وَمِنْ أَهْلِ ٱلْمَدِينَةِ ۖ مَرَدُوا۟ عَلَى ٱلنِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ ۖ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ۚ سَنُعَذِّبُهُم مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّونَ إِلَىٰ عَذَابٍ عَظِيمٍ﴾ ترجمہ: "تمہارے گرد و پیش جو بدوی رہتے ہیں ان میں بہت سے منافق ہیں اور اسی طرح خود مدینہ کے باشندوں میں بھی منافق موجود ہیں جو نفاق میں طاق ہو گئے ہیں، تم انہیں نہیں جانتے، ہم ان کو جانتے ہیں قریب ہے وہ وقت جب ہم ان کو دوہری سزا دیں گے، پھر وہ زیادہ بڑی سزا کے لئے واپس لائے جائیں گے"۔(سورۂ توبہ:101)

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ قول: ﴿مَا كَانَ لِأَهْلِ ٱلْمَدِينَةِ وَمَنْ حَوْلَهُم مِّنَ ٱلْأَعْرَابِ أَن يَتَخَلَّفُوا۟ عَن رَّسُولِ ٱللَّهِ وَلَا يَرْغَبُوا۟ بِأَنفُسِهِمْ عَن نَّفْسِهِۦ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ لَا يُصِيبُهُمْ ظَمَأٌ وَلَا نَصَبٌ وَلَا مَخْمَصَةٌ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ وَلَا يَطَـُٔونَ مَوْطِئًا يَغِيظُ ٱلْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُونَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا إِلَّا كُتِبَ لَهُم بِهِۦ عَمَلٌ صَـٰلِحٌ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ ٱلْمُحْسِنِينَ﴾ ترجمہ: "مدینہ کے باشندوں اور گرد و نواح کے بدویوں کو یہ ہر گز زیبا نہ تھا کہ اللہ کے رسول کو چھوڑ کر گھر بیٹھے رہتے اور اس کی طرف سے بے پرواہ ہو کر اپنے اپنے نفس کی فکر میں لگ جاتے، اس لئے کہ ایسا کبھی نہ ہو گا کہ اللہ کی راہ میں بھوک پیاس اور جسمانی مشقت کی کوئی تکلیف وہ جھیلیں، اور منکرین حق کو جو راہ ناگوار ہے اُس پر کوئی قدم وہ اٹھائیں، اور کسی دشمن سے (عداوت حق کا) کا کوئی انتقام وہ لیں اور اس کے بدلے ان کے حق میں ایک عمل صالح نہ لکھا جائے، یقیناً اللہ کے ہاں محسنوں کا حق الخدمت مارا نہیں جاتا ہے"۔(سورۂ توبہ:120)

مدینہ کی صفات میں 'مبارکہ' 'منورہ' 'مشرفہ' اور دیگر اہم اوصاف کا ذکر ملتا ہے۔ (دیکھیں: الهجرۃ النبویہ المبارکہ، ص156)

۲) مدینہ منورہ سے رسول اللہ ﷺ کی محبت اور آپ ﷺ کی دعا:

نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا فرمائی ہے: "اے اللہ، ہمارے لئے مدینہ کو محبوب بنا جیسے کہ ہمارے لئے مکہ محبوب ہے یا اس سے بھی زیادہ محبوب بنا دے"۔(ایضاً، ص157)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب کسی سفر سے تشریف لاتے تو مدینہ کی دیواروں پر نظر پڑتی تو اپنی سواری کو ایڑھ لگا کر تیز چلتے، اگر کسی جانور پر ہوتے تو شوق کی وجہ سے اس کو جلدی جلدی چلاتے۔(صحیح بخاری: 1802، 1886)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو حضرت ابو بکرؓ اور حضرت بلالؓ بیمار ہو گئے، حضرت ابو بکرؓ کو جب بخار ہوتا تھا تو فرماتے:

كل امرئ مصبح في أهله ...... والموت أدنى من شراك نعله

ترجمہ: "ہر شخص اپنے اہل و عیال کے ساتھ صبح کرتا ہے اور موت اس کے جوتے کے تسمے کے قریب ہوتی ہے"۔

اور حضرت بلالؓ جب بخار سے صحتیاب ہوتے تھے تو بلند آواز سے کہتے تھے:

"......اے اللہ! شیبہ بن ربیعہ، عتبہ بن ربیعہ، اور امیہ بن خلف پر لعنت ہو، انہوں نے ہمیں ہماری سرزمین سے نکال کر وبا والی زمین کی طرف بھیجا"۔ اللہ کے رسول ﷺ یہ دعا فرماتے تھے: "اے اللہ! ہمارے لئے ہمارے صاع میں اور ہمارے مُد میں برکت عطا فرما، اس شہر کو ہمارے لئے خوشگوار بنا اور اس کے بخار کو جحفہ کی طرف منتقل فرما"۔(صحیح بخاری: 1889، صحیح مسلم: 1376)

۳) مدینہ کے لئے رسول اللہ ﷺ کی برکت کی دعا:

حضرت انسؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: "اے اللہ! جتنی برکت تو نے مکہ کو عطا کی ہے مدینہ کو اس سے دوگنی برکت عطا فرما"۔(صحیح بخاری: 1885، صحیح مسلم: 1369)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں: جب لوگ پہلا پھل دیکھتے تھے تو اس کو نبی کریم ﷺ کے پاس لاتے تھے جب رسول اللہ ﷺ اس کو لیتے تو دعا فرماتے: "اے اللہ! ہمارے پھلوں میں برکت عطا فرما، ہمارے شہر میں برکت عطا فرما، ہمارے صاع میں برکت عطا فرما، ہمارے مُد میں برکت عطا فرما، اے اللہ! بے شک ابراہیم علیہ السلام تیرے بندے، تیرے خلیل اور تیرے نبی ہیں، اور میں بھی تیرا بندہ، تیرا نبی ہوں، انہوں نے مکہ کے لئے تجھ سے دعا کی اور میں مدینہ کے لئے تجھ سے اسی کے مثل دعا کرتا ہوں جو انہوں نے مکہ کے لئے کی ہے اور اس کے ساتھ مزید کی بھی"۔ فرماتے ہیں: اس کے بعد آپؐ سب سے چھوٹے بچے کو بلاتے اور اس کو پھل دے دیتے تھے۔(صحیح مسلم: 1373، سنن ترمذی: 3454، عمل الیوم واللیلۃ للنسائی: 302، سنن ابن ماجہ: 3329)

۴) دجال اور طاعون سے مدینہ کی حفاظت:

مدینہ منورہ کو رسول اللہ ﷺ کی برکت سے دجال اور طاعون سے محفوظ کر دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ نے کچھ فرشتوں کو اس کی حفاظت کے لئے متعین رکھا ہے، اس لئے دجال اس میں داخل نہیں ہو سکے گا۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ نے دعا فرمائی ہے کہ وہاں صحت و عافیت نصیب ہو اور وہاں کوئی وبا داخل نہ ہو، اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہاں طاعون بھی نہ پھیلے، جیسے کہ نبی کریم ﷺ کی معصوم ذات نے اس کی خبر دی ہے۔ (دیکھیں: صحیح بُخاری: 1880، صحیح مسلم: 1379، الھجرۃ النبویہ المبارکہ، ص158)

۵) مدینہ کی شدت وسختی پر صبر کی فضیلت:

نبی کریم ﷺ نے مدینہ منورہ کی شدت وسختی اور وہاں کی تنگ حالی پر صبر کرنے والے کے لئے قیامت کے روز شفاعت کا وعدہ کیا ہے، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا: ''مدینہ ان کے لئے بہتر اور باعثِ خیر ہے کاش وہ یہ بات جان لیتے! جو بھی اس سے بے رغبتی کی وجہ سے اس کو چھوڑ دے گا تو اللہ تعالیٰ اس میں اس کی جگہ کسی ایسے کو لے کر آئے گا جو اس سے بہتر ہوگا، اور جو بھی اس کی سختی اور تنگ حالی پر ثابت قدم رہے گا تو میں قیامت کے دن اس کا سفارشی یا گواہ بنوں گا''۔(صحیح مسلم: 1361)

۶) مدینہ میں موت کی فضیلت:

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کی استطاعت میں ہو کہ اس کی وفات مدینہ میں ہو تو اس کو کوشش کرنی چاہیے کہ اس کی وفات وہیں پر ہو، اس لئے کہ میں اس کی سفارش کروں گا جس کی وفات مدینہ میں ہوگی''۔ (سنن ترمذی: 3917، سنن ابن ماجہ: 3112، ابن حبان: 3733، شعب الایمان للبیہقی: 4184)

حضرت عمر بن خطابؓ یہ دعا کیا کرتے تھے: اے اللہ! مجھے اپنے راستے میں شہادت کی موت عطا فرما اور مجھے اپنے رسول کے شہر میں وفات عطا فرما"۔(صحیح بخاری: 1890) اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر فاروقؓ کی دعا قبول کی اور ان کو رسول اللہ ﷺ کے محراب میں شہید کیا گیا جب کہ نماز فجر میں آپؓ مسلمانوں کی امامت کر رہے تھے۔

۷) مدینہ ایمان کی پناہ گاہ اور ہر بُرے آدمی کو دور کرنے والا:

مدینہ ایمان کے لئے پناہ گاہ ہے، چاہے خیر کے لئے زمین کتنی ہی تنگ ہو جائے اور برائیاں اور شر پسند عناصر کتنے ہی عام ہو جائیں، مدینہ میں شر پسندوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے، وہاں سے جو بھی اس سے بے رغبتی کی وجہ سے نکلے گا تو اللہ تعالیٰ اس سے بہتر سچے مؤمن وہاں اس کی جگہ لے آئے گا، حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول ﷺ نے فرمایا: ''ایمان مدینہ میں اس طرح سمٹ آئے گا جیسے سانپ سمٹ کر اپنے بل میں آجاتا ہے''۔(صحیح بُخاری: 1876، صحیح مسلم: 147)

اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے! جو بھی اس سے بے رغبتی کی وجہ سے یہاں سے نکل جائے گا تو اللہ تعالیٰ اس میں اس کی جگہ کسی ایسے شخص کو لے کر آئے گا جو اس سے بہتر ہوگا۔ آگاہ ہو جاؤ! مدینہ کی مثال بھٹی کی سی ہے جو میل کچیل کو دور کر کے جوہر کو نکھار دیتی ہے، اس وقت تک قیامت نہیں آئے گی جب تک کہ مدینہ وہاں کے بُرے لوگوں کو وہاں سے نکال دے گا جیسے کہ بھٹی خراب لوہے کو دور کر دیتی ہے''۔(صحیح مسلم: 1381، مسند احمد: 2/439)

۸) گناہوں سے پاکی کا ذریعہ:

حضرت زید بن ثابتؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بے شک یہ - یعنی مدینہ - طیبہ ہے، گناہوں سے ایسے ہی پاک کرتا ہے جیسے کہ آگ خراب چاندی کو چھانٹ دیتی ہے"۔(صحیح بخاری: 4589، صحیح مسلم: 1384)

۹)اللہ تعالیٰ کے ذریعہ اس کی حفاظت:

اللہ تعالیٰ نے ہر اس شخص سے مدینہ کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے جو بھی اس کے بارے میں بری نیت رکھے گا، جو بھی اس میں کسی برائی کا ارتکاب کرے گا، یا برائی کا ارتکاب کرنے والے کو پناہ دے گا یا وہاں کے باشندوں کو خوفزدہ کرے گا ایسے شخص کو نبی کریم ﷺ نے اللہ کی طرف سے لعنت، اس کے عذاب اور فوری ہلاکت کی وعید سنائی ہے، حضرت سعد بن ابی وقاص ؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو بھی اہل مدینہ کے بارے میں سازش کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو ویسے ہی مٹا دے گا جیسے پانی میں نمک مٹ جاتا ہے''۔ (صحیح بخاری: 1822، صحیح مسلم: 1387) رسول ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا: ''مدینہ حرم ہے، جو بھی اس میں کسی برائی کا ارتکاب کرے گا یا برائی کرنے والے کو پناہ دے گا تو اس پر اللہ، فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہے، قیامت کے دن اس سے نہ کوئی بدلہ قبول کیا جائے گا اور نہ ہی کوئی عبادت''۔ (صحیح مسلم: 1371)

۱۰)مدینہ منورہ حرم کی حیثیت سے:

اللہ کے رسول ﷺ نے مدینہ منورہ کو اللہ تعالیٰ کی وحی کے ذریعہ حرم قرار دیا، لہذا اس میں نہ خون بہایا جاسکتا ہے، نہ اس میں کسی کے خلاف ہتھیار اٹھایا جائے گا، نہ وہاں کسی کو خوفزدہ کیا جائے گا، نہ وہاں درخت کاٹا جائے گا، وہاں گم شدہ چیز کو اٹھانا کسی کے لئے جائز نہیں ہے سوائے اس کے جو اس کا اعلان کرے، حرم ہونے کے اعتبار سے اس کے علاوہ بھی اس کے مختلف احکام ہیں، اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: بے شک ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرم قرار دیا اور اس کے لئے دعا کی، میں نے مدینہ کو حرم قرار دیا جیسے کہ ابراہیمؑ نے مکہ کو حرم قرار دیا، اور میں نے مدینہ کے مد اور صاع کے لئے اُسی طرح کی دعا کی جیسے کہ ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کے لئے دعا کی''۔ (صحیح بخاری: 2129، صحیح مسلم:1360)

اللہ کے رسول ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا: ''یہ پہاڑ ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں! بے شک ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرم قرار دیا اور میں نے اس کے دونوں پتھریلے میدانوں کے درمیان کے علاقہ کو حرم قرار دیا''۔ (صحیح بُخاری: 4084، صحیح مسلم: 1362) رسول ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا:''اس کی گھاس کو اکھیڑا نہیں جائے گا، وہاں کے شکار کو بھگایا نہیں جائے گا اور وہاں کے 'لقطہ' کو صرف وہی اٹھائے جو اس کا اعلان کرے، کسی آدمی کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہاں قتال کے لئے ہتھیار اُٹھائے، نہ یہ درست ہے کہ وہاں کے درخت کو کاٹا جائے، سوائے اس کے کوئی شخص اپنے اونٹ کے لئے چارہ کاٹے''۔(مسند اُحمد: 1/119)

ان عظیم فضائل کی وجہ سے صحابہ کرام کا مدینہ منورہ کے ساتھ انتہائی گہرا تعلق رہا، وہاں کی جانب ہجرت کرنے اور وہاں قیام کرنے کا شوق دامن گیر رہا، اسی لئے امت کی تمام باصلاحیت شخصیات وہاں جمع ہوئیں اور اس کے بعد شرک وکفر کی تمام انواع واقسام کے خاتمہ کے لئے کوشاں ہوئے اور انہوں نے مشرق ومغرب میں اپنی فتوحات کے جھنڈے گاڑھ دئے۔

....

چھٹی فصل

نبی کریم ﷺ اور صدیقِ اکبر کی ہجرت

پہلا باب

مشرکین کے منصوبہ کی ناکامی اور ہجرت کے لئے عظیم نبوی منصوبہ بندی

ا: نبی کریم ﷺ کو شہید کرنے کے منصوبہ کی ناکامی:

قریش کے لوگ صحابہ کرامؓ کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے سے روکنے میں ناکام ہو گئے، حالانکہ انہوں نے اس سلسلہ میں انتہائی خطرناک گھٹیا قسم کے ہتھکنڈے اختیار کئے تھے، اس وقت قریش نے صورتحال کی خطرناکی کا اندازہ کر لیا اور انہیں اپنے اقتصادی مفادات اور قبائلِ عرب کے مابین ان کو حاصل سماجی مقام کو نقصان پہنچنے کا خوف لاحق ہوا، اس لئے قریش کی قیادت دعوت کے قائد کے خاتمہ کے سلسلہ میں مشاورت کے لئے دار الندوہ میں جمع ہوئے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اللہ تعالیٰ[1] کے اس قول کی تفسیر میں ارشاد فرمایا ہے: ﴿وَإِذۡ يَمۡكُرُ بِكَ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ لِيُثۡبِتُوكَ أَوۡ يَقۡتُلُوكَ أَوۡ يُخۡرِجُوكَۚ وَيَمۡكُرُونَ وَيَمۡكُرُ ٱللَّهُۖ وَٱللَّهُ خَيۡرُ ٱلۡمَٰكِرِينَ﴾ ترجمہ: "وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جبکہ منکرینِ حق تیرے خلاف تدبیریں سوچ رہے تھے کہ تجھے قید کر دیں یا قتل کر ڈالیں یا جلا وطن کر دیں، وہ اپنی چالیں چل رہے تھے اور اللہ اپنی چال چل رہا تھا اور اللہ سب سے بہتر چال چلنے والا ہے"۔ (سورۃ الأنفال:30)

فرماتے ہیں: "قریش کے لوگوں نے مکہ میں ایک رات باہمی مشاورت کی، ان میں سے بعض نے کہا: جب وہ صبح کریں تو ان کو رسیوں سے باندھ دو"۔ (سیرت ابن ہشام:2/124-126) طبقات ابن سعد:1/227 - 228، دلائل النبوۃ للبیہقی 2/466 - 468، الدلائل لأبی نعیم 63 - 64، تاریخ طبری 2/372، مجمع الزوائد للہیثمی 6/52 - 53)

بعض نے کہا: نہیں، ان کو جان سے مار دو۔ بعض نے کہا: نہیں، بلکہ ان کو ملک بدر کر دو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اس پورے منصوبے کی خبر دی اور حضرت علیؓ نے اس رات نبی کریم ﷺ کے بستر پر رات گزاری۔ (مسند أحمد، 10/348، مصنف عبدالرزاق: 5/389)، تاریخ طبری 2/372) مجمع الزوائد 6/52 - 53) اور نبی کریم ﷺ اپنے گھر سے نکل گئے۔ جب ان لوگوں نے صبح کی تو انہوں نے دھاوا بول دیا، مگر جب انہوں نے حضرت علیؓ کو دیکھا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے منصوبے کو ناکام بنا دیا، وہ حضرت علیؓ سے پوچھنے لگے: آپ کے صاحب کہاں ہیں؟ انہوں نے کہا: میں نہیں جانتا ہوں! اس کے بعد انہوں نے آپ ﷺ کے نقشِ پا کو تلاش کرنا شروع کیا، وہ جب پہاڑ کے پاس پہنچے تو وہاں ان کو کچھ پتہ نہیں چل پایا، اس لئے وہ پہاڑ پر چڑھے، وہاں غار کے پاس سے گزرے تو انہوں نے غار کے دھانے پر مکڑی کا جالا دیکھا تو کہنے لگے: اگر وہ یہاں داخل ہوئے ہوتے تو اس کے دھانے پر مکڑی جالا نہیں بُنتی، چنانچہ آپ ﷺ اس غار میں تین روز تک رہے۔ (البدایہ والنہایہ 3/181، فتح الباری: حدیث نمبر:3905، في السيرة النبوية قراءة لجوانب الحذر والحماية، ص135)

سید قطبؒ اُن آیات کی تفسیر میں فرماتے ہیں جن میں مشرکین کی نبی کریم ﷺ کے بارے میں چالبازی کا ذکر ہے: "اس کے ذریعہ مکہ کی ماضی کی صورتحال کے بارے میں تذکیر کی جا رہی ہے جبکہ حالات انتہائی سخت تھے، یقیناً اس کے ذریعہ مستقبل کے بارے میں

اعتماد ویقین حاصل ہوتا ہے، اسی طرح یہ آیت اللہ کے فیصلوں اور اوامر کے بارے میں اس کی قدرت و حکمت کی جانب بھی متوجہ کرتی ہے، جن مسلمانوں کو اس قرآن کے ذریعہ پہلی مرتبہ مخاطب بنایا جارہا تھا وہ ان دونوں قسم کے حالات کو اچھی طرح جانتے تھے جن کا انہیں خود سامنا کرناپڑا، ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ان کا مزہ چکھا، ان کے لئے تو بس اتنی ہی بات کافی تھی کہ ان کو یہ ماضی قریب یاد دلایا جاتا اور زمانۂ حاضر تک پہنچتے پہنچتے جو قلق واضطراب اور پریشانی لاحق ہوئی اور اب جو امن واطمئنان کی کیفیت حاصل ہے اور مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کے بارے میں جو تدبیر اور چالیں اختیار کیں اور رسول اللہ ﷺ کو صرف ان سے نجات ہی نہیں ملی بلکہ ان پر غلبہ اور کامیابی سے ہمکنار بھی ہوئے، ان سب مناظر کو یاد دلایا جاتا۔

وہ یہ منصوبہ بنارہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کو قید کر کے رکھیں یہاں تک کہ آپؐ کی وفات ہو جائے یا آپؐ کو جان سے ہی مار دیں اور آپؐ سے چھٹکارا حاصل کرلیں، یا مکہ سے ان کو نکال کر جلاوطن کر دیں، انہوں نے ان سب چیزوں کے بارے میں مشورہ کیا، پھر اس کے بعد آپ کو جان سے مار دینے والے مشورہ پر اتفاق کیا اور یہ طے کیا کہ اس عملِ شنیع کی ذمہ داری تمام قبائل کے نوجوان لیں گے تاکہ آپ ﷺ کا خون تمام قبائل میں متفرق ہو جائے اور بنو ہاشم تمام عربوں سے قتال کرنے سے عاجز ہو جائیں گے، اس لئے وہ دیت لینے پر راضی ہو جائیں گے اور اس طرح معاملہ ختم ہو جائے گا۔

یہ تصویر ہے: ﴿وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ ٱللَّهُ ۖ وَٱللَّهُ خَيْرُ ٱلْمَٰكِرِينَ﴾ ترجمہ: ''وہ اپنی چالیں چل رہے تھے اور اللہ اپنی چال چل رہا تھا اور اللہ سب سے بہتر چال چلنے والا ہے''۔ (سورۃ الأنفال: 30) یہ خوفناک صورتحال ہے، کہاں ہیں وہ کمزور اور بونے انسان جو قدرتِ قاہرہ کا مقابلہ کرنے چلے تھے، اللہ کی قدرت کا مقابلہ جو جبار ہے، اپنے بندوں پر غالب ہے، اپنے ارادہ کو نافذ کرنے والا ہے اور وہ ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہیں؟!''۔ (فی ظلال القرآن: 3/1501)

۲) ہجرت کے لئے نبوی تربیت:

اُم المؤمنین حضرت عائشہؓ سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ ایسا کبھی نہیں ہوتا تھا کہ رسول ﷺ صبح یا شام کسی وقت حضرت ابو بکر صدیقؓ کے گھر تشریف نہ لاتے ہوں، یہاں تک کہ آپ ﷺ کو اپنی قوم کے درمیان سے مکہ کی طرف نکلنے اور ہجرت کرنے کی اجازت دی گئی تو آپ ﷺ عین دوپہر کے وقت ہمارے پاس تشریف لائے جبکہ آپ اس وقت تشریف نہیں لاتے تھے۔ فرماتی ہیں: جب حضرت ابو بکرؓ نے آپ ﷺ کو دیکھا تو فرمایا: رسول اللہ ﷺ اس وقت کوئی نئی بات پیش آنے کی وجہ سے تشریف لائے ہیں۔ فرماتی ہیں: جب آپ ﷺ گھر میں داخل ہوئے تو حضرت ابو بکر صدیقؓ اپنی چارپائی سے آپؐ کے لئے کھڑے ہوگئے اور رسول اللہ ﷺ بیٹھ گئے، اس وقت حضرت ابو بکرؓ کے پاس میرے اور میری بہن اُسماء بنت ابی بکر کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا، آپ ﷺ نے فرمایا: اس وقت جو لوگ آپ کے پاس ہیں ان کو یہاں سے ہٹادیں، حضرت ابو بکرؓ نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ! یہاں تو صرف میری دو بیٹیاں ہیں، بات کیا ہے بتادیں؟ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں! آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے یہاں سے روانگی اور ہجرت کرنے کی اجازت مل گئی ہے۔ حضرت

عائشہؓ فرماتی ہیں: حضرت ابو بکرؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! رفیقِ سفر بننا چاہتا ہوں! آپؐ نے فرمایا: ٹھیک ہے، آپ رفیقِ سفر ہونگے۔ فرماتی ہیں: اللہ کی قسم! میں نے اس دن سے پہلے کسی کو خوشی کی وجہ سے روتے ہوئے نہیں دیکھا تھا لیکن اس روز میں نے حضرت ابو بکرؓ کو روتے ہوئے دیکھا۔ اس کے بعد حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا: یہ دو سواریاں ہیں ان کو میں نے اسی کے لئے تیار کر رکھا ہے، دونوں حضرات نے بنوالدّیل بن بکر کے ایک شخص عبداللہ بن اُریقط کو اجرت پر لے لیا تاکہ وہ راستے میں ان کی رہنمائی اور رہبری کا کام کر سکے۔ ان کی ماں بنو سہم بن عمرو کی ایک خاتون تھیں اور وہ مشرک تھے، دونوں نے اپنی اپنی سواریاں ان کے حوالے کر دیں، اس کے بعد وہ دونوں سواریاں انہی کے پاس تھیں، وقتِ مقررہ تک وہ دونوں کو چراتے رہے۔ (سیرت ابن ہشام 2/128- 129، السیرۃ النبویۃ، ابنِ کثیر 2/233)

امام بخاریؒ نے حضرت عائشہؓ سے ایک طویل حدیث روایت کی ہے، اس میں ہے: "------ٹھیک دوپہر کے وقت ہم لوگ ابو بکرؓ کے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ کسی کہنے والے نے حضرت ابو بکر سے کہا: یہ رسول اللہ ﷺ سر ڈھانپ کر تشریف لا رہے ہیں، یہ ایسا وقت تھا جس میں آپ ﷺ تشریف نہیں لایا کرتے تھے۔ ابو بکرؓ نے کہا: میرے ماں باپ آپ پر قربان! آپؐ اس وقت کسی اہم معاملہ کی وجہ سے تشریف لائے ہیں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: رسول اللہ نے فرمایا: آپ کے پاس جو لوگ ہیں انہیں ہٹا دیں۔ حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا: بس یہ تو آپ کے اہل خانہ ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: اچھا تو مجھے (ہجرت کے لئے) روانگی کی اجازت مل گئی ہے۔ حضرت ابو بکرؓ نے عرض کیا: میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، ساتھ چلنا چاہتا ہوں! رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہاں۔ حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا: میری ان دو سواریوں میں سے ایک لے لیجئے۔ رسول ﷺ نے فرمایا: قیمتاً۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں: ہم نے جلدی سے تیاری کر لی اور ہم نے چمڑے کے ایک برتن میں ان کے لئے زادِ سفر تیار کیا۔ حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ نے اپنے پٹکے کا ایک ٹکڑا کاٹا، اس کے ذریعہ انہوں نے اس برتن کو باندھا، اسی لئے ان کا لقب ذات النطاقین پڑ گیا، اس کے بعد رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکرؓ جبلِ ثور کی ایک غار میں تشریف لے گئے اور وہاں تین راتوں تک چھپے رہے، اس دوران عبداللہ بن اَبی بکرؓ بھی انہی کے پاس رات گزارتے تھے، وہ گہری سوجھ بوجھ کے مالک، سخن فہم نوجوان تھے، سحر کی تاریکی میں ان دونوں حضرات کے پاس سے چلے جاتے اور مکہ میں قریش کے ساتھ یوں صبح کرتے گویا کہ انہوں نے یہیں رات گزاری ہے، ان دونوں کے خلاف سازش کی جو بھی بات سنتے اسے اچھی طرح یاد کر لیتے اور جب تاریکی گہری ہو جاتی تو اس کی خبر لے کر غار میں پہنچ جاتے، ادھر حضرت ابو بکرؓ کے غلام عامر بن فہیرہ بکریاں چراتے تھے اور جب رات کا ایک حصہ گزر جاتا تو بکریاں لے کر ان کے پاس پہنچ جاتے، اس طرح دونوں حضرات رات کو آسودہ ہو کر دودھ پی لیتے، پھر صبح تڑکے ہی عامر بن فہیرہ بکریاں ہانک کر چل دیتے، ان تینوں راتوں میں وہ ایسا ہی کرتے رہے، رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکرؓ نے بنوالدیل کے ایک شخص کو اجرت پر لے رکھا تھا، اس کا تعلق بنو عبد بن عدی سے تھا، وہ صحرائی اور بیابانی راستوں کا ماہر تھا، وہ آل عاص بن وائل سہمی کے معاہدہ میں شریک تھا اور وہ کفار قریش کے دین پر تھا لیکن دونوں نے اسے قابل بھروسہ اور قابلِ اطمینان سمجھا، دونوں نے اپنی سواریاں اس کے حوالے کر دیں اور اس کے ساتھ طے کیا کہ تین راتیں گزر جانے کے بعد وہ دونوں سواریاں لے کر غار ثور پہنچ جائے گا، دونوں کے ساتھ عامر بن فہیرہ اور دلیلِ راہ شریکِ سفر رہے اور دلیلِ سفر ان کو ساحلی راستے پر لے گیا۔ (دلائل النبوۃ للبیہقی، 2/473- 475، مصنف عبدالرزاق 5/388، تاریخ طبری، 2/375)

۳)رسول اللہ ﷺ کی گھر سے روانگی اور غار تک کا سفر:

جب رسول اللہ ﷺ گھر سے روانہ ہوئے تو سوائے حضرت علی بن ابی طالبؓ، حضرت ابو بکر صدیقؓ اور آل ابو بکرؓ کے کسی کو بھی آپ ﷺ کے نکلنے کا علم نہیں ہوا، جہاں تک حضرت علیؓ کا تعلق ہے تو رسول اللہ ﷺ نے ان کو حکم دیا کہ وہ ابھی مکہ میں ہی رہیں تاکہ رسول اللہ ﷺ کے پاس رکھی ہوئی امانتیں لوگوں کو واپس دے دیں، رسول اللہ ﷺ پر لوگوں کو اتنا اعتماد تھا کہ مکہ میں جس کو بھی کسی چیز کے بارے میں ڈر ہوتا تو وہ اسے آپ ﷺ کے پاس رکھ دیتا تھا، اس لئے کہ سب کو آپ ﷺ کی سچائی اور امانتداری کا اعتراف تھا رسول ﷺ اور حضرت ابو بکرؓ کے درمیان وقت مقرر تھا تو دونوں حضرت ابو بکرؓ کے گھر کے پچھواڑے سے نکلے تاکہ کسی کو نکلنے کا پتہ نہ چلے اور قریش کے لوگ آپ ﷺ کا پیچھا کر کے اس مبارک سفر سے روک نہ دیں، ان کے درمیان پہلے ہی یہ طے ہو چکا تھا کہ عبداللہ بن أریقط ان کے ساتھ غارِ ثور میں تین راتوں کے بعد ملے گا۔ (الھجرۃ فی القرآن الکریم، ص 334، خاتم النبیین، ابو زہرہ 1/659، السیرۃ النبویہ، ابن کثیر، 2/234)

۴)مکہ سے نکلتے وقت رسول اللہ ﷺ کی دعا:

نبی کریم ﷺ جب مکہ مکرمہ سے مدینہ کی جانب روانہ ہوئے، **تو آپ ﷺ یہ دعا پڑھتے ہوئے نکلے:** «الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي خَلَقَنِي وَلَمْ أَكُ شَيْئًا مَذْكُورًا، اللَّهُمَّ أَعِنِّي عَلَى هَوْلِ الدُّنْيَا، وَبَوَائِقِ الدَّهْرِ، وَمَصَائِبِ اللَّيَالِي وَالْأَيَّامِ، اللَّهُمَّ اصْحَبْنِي فِي سَفَرِي، وَاخْلُفْنِي فِي أَهْلِي، وبارك لي فيما رزقتني، وَلَكَ فَذَلِّلْنِي وَعَلَى خُلُقِي فَقَوِّمْنِي، وَإِلَيْكَ رَبِّ فَحَبِّبْنِي، وَإِلَى النَّاسِ فَلَا تَكِلْنِي، رَبَّ الْمُسْتَضْعَفِينَ وَأَنْتَ رَبِّي، أَعُوذُ بِوَجْهِكَ الْكَرِيمِ الَّذِي أَشْرَقَتْ لَهُ نُورُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ، وَكَشَفْت بِهِ الظُّلُمَات، وَصَلُحَ عليه أَمْر الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ، أَنْ تَحلَّ عَلَيَّ غضبكَ، أَوْ تُنْزِلَ بِي سخطكَ، أعوذ بك من زوال نعمتك، وفجاءة نقمتك، وتحول عافيتك، وجميع سخطك، لَكَ الْعُتْبَى عِنْدِي خير مَا اسْتَطَعْتُ، لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِكَ» **ترجمہ:** ''تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے مجھے پیدا کیا حالانکہ میں کچھ بھی نہیں تھا۔ اے اللہ! دنیا کے اہوال، حادثاتِ زمانہ اور روز و شب کے مصائب کے مقابلہ میں میری مدد فرما۔ اے اللہ! میرے سفر میں مجھے اپنی معیت نصیب فرما، اہل و عیال میں میری کمی کو پورا فرما اور جو کچھ تو نے مجھے عطا کیا ہے اس میں برکت عطا فرما، مجھے اپنا ہی تابعِ فرمان بنا، میرے اخلاق کو درست فرما، اے میرے رب! مجھے اپنا ہی محبوب بنا، مجھے لوگوں کے حوالہ نہ کر، اے کمزوروں کے رب! تو ہی میرا رب ہے، میں تیرے چہرہ کے اس نور کی پناہ چاہتا ہوں جس کی وجہ سے زمین اور آسمان منور ہو جاتے ہیں، اس کے ذریعہ تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں اور اس کی وجہ سے اولین اور آخرین کے معاملات درست ہو جاتے ہیں، اس بات سے پناہ چاہتا ہوں کہ مجھ پر تیرا غضب نازل ہو یا تیرا عتاب مجھ پر نازل ہو! میں تیری پناہ چاہتا ہوں تیری نعمت کے زائل ہونے سے، اچانک تیرے انتقام اور سزا سے، تیری عطا کردہ عافیت کے تبدیل ہونے سے اور تیری تمام ناراضگیوں سے، تیری ہی رضامندی میرے نزدیک بہتر چیز ہے جتنی میری استطاعت ہے، تیرے سوا کسی کے پاس نہ کوئی طاقت ہے اور نہ ہی قوت''۔ (مصنف عبد الرزاق: 9234، السیرۃ النبویہ، ابن کثیر: 2/230 - 234)

اللہ کے رسول ﷺ روانگی کے وقت مکہ کے بازار میں مقام حزورۃ کے پاس کھڑے ہوئے اور فرمایا: اللہ کی قسم! یقیناً تو اللہ کی سب سے بہترین سرزمین ہے اور اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب سرزمین ہے اور کاش مجھے یہاں سے نہ نکالا جاتا تو میں ہرگز نہیں نکلتا۔(سنن ترمذی: 3925، مسند احمد: 4/305، سنن ابن ماجہ: 3108)

اس کے بعد اللہ کے رسول ﷺ اور آپؐ کے رفیق اور ساتھی نکل پڑے اور اللہ تعالیٰ نے آپ دونوں کو مشرکین کی پکڑ سے محفوظ رکھا اور مشرکین سے ان کو دور رکھا۔

امام احمدؒ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ "مشرکین رسول اللہ ﷺ کے پاؤں کے نشانات کے مطابق چلتے رہے اور جب وہ پہاڑ - جبل ثور - کے پاس پہنچے تو وہاں ان کو کچھ پتہ نہیں چل پایا، وہ پہاڑ پر چڑھے اور غار کے پاس سے گزرے، انہوں نے غار کے دہانے پر مکڑی کا جالا دیکھا تو کہنے لگے: اگر وہ یہاں داخل ہوئے ہوتے تو اس کے دہانے پر مکڑی کا جالا نہ ہوتا"۔(مسند احمد: 4/348) یہ اللہ تعالیٰ کے وہ لشکر ہیں جن کے ذریعہ وہ باطل کو ذلیل وخوار کر کے حق کی نصرت وتائید کرتا ہے، اس لئے کہ اللہ عزوجل کے لشکر مادی اور معنوی کسی طرح کے بھی ہو سکتے ہیں، اگر وہ مادی بھی ہوں تو ان کی ہولناکی اور خطرناکی کا اندازہ بھی مشکل ہے، ایک چھوٹا سا جرثومہ جس کو آنکھ بھی نہ دیکھ سکے ایک لشکرِ جرار کو تہس نہس کر سکتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ ۚ وَمَا هِيَ إِلَّا ذِكْرَىٰ لِلْبَشَرِ﴾ ترجمہ: ''اور تیرے رب کے لشکروں کو خود اُس کے سوا کوئی نہیں جانتا اور اس دوزخ کا ذکر اس کے سوا کسی غرض کے لئے نہیں کیا گیا ہے کہ لوگوں کو اس سے نصیحت ہو''۔(سورۃ المدثر: 31) یعنی ان کی کثرتِ تعداد کے اعتبار سے اور ان کی انواع واقسام کے اعتبار سے ان کے بارے میں حقیقی علم ذاتِ باری تعالیٰ ہی کو ہے، اس لئے کہ اللہ کی قدرت لامتناہی ہے۔(تفسیر الرازی: 30/208)

اسی طرح یہ کسی کے بس میں نہیں ہے کہ وہ ممکنات کا احاطہ کر سکے اور ان کے حقائق وصفات کو جان سکے، اگرچہ اجمالاً ہی سہی، چہ جائے کہ ان کی کمیت، کیفیت اور نسبت کے تفصیلی احوال کو جان سکے۔

۵) اللہ تعالیٰ کی اپنے رسول ﷺ کے ساتھ عنایت ورعایت:

اگرچہ اللہ کے رسول ﷺ نے تمام ممکنہ اسباب اختیار کئے لیکن پھر بھی آپؐ نے مطلقاً ان پر اعتماد وانحصار نہیں کیا، بلکہ آپ ﷺ کو کامل اعتماد وبھروسہ اللہ کی ذات پر تھا، آپؐ اسی کی نصرت وتائید سے پرامید تھے اور مسلسل اللہ کی سکھائی ہوئی دعا آپ کی زبان پر تھی ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿رَّبِّ أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِي مُخْرَجَ صِدْقٍ وَاجْعَل لِّي مِن لَّدُنكَ سُلْطَانًا نَّصِيرًا﴾ ترجمہ: ''اور دعا کرو کہ پروردگار، مجھ کو جہاں بھی تو لے جا سچائی کے ساتھ لے جا، اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال ،اور اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے''۔(سورۃ الاسراء: 80)

صاحبِ دعوت کو اقتدار اور طاقت وقوت صرف اللہ ہی کی ذات سے حاصل ہو سکتی ہے اور صرف اللہ ہی کی طاقت وقوت سے ہیبت طاری ہو سکتی ہے، صاحبِ دعوت کے لئے یہ روا نہیں ہے کہ وہ کسی صاحبِ اقتدار اور ذی جاہ کا خوشہ چین ہو جو اس کی مدد کر سکے اور اس کی

حفاظت کرسکے، جب تک صاحبِ دعوت کی اصل توجہ کا مرکز و محور پہلے اللہ کی ذات نہ ہو، دعوت کے نتیجہ میں اصحاب اقتدار و حکومت اور اصحابِ جاہ کے دل متوجہ اور متاثر ہو سکتے ہیں جس کی وجہ سے وہ دعوت کے سپاہی اور خادم بن سکتے ہیں اور پھر وہ بھی کامیاب و کامران ہوں گے، لیکن دعوت کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی ہے جب کہ وہ اصحابِ اقتدار کی خوشہ چین اور خدمت گزار ہو، دعوت کا مصدر و سرچشمہ اللہ کی ذات ہے، لہذا دعوت ہر صاحبِ اقتدار اور صاحبِ جاہ سے برتر و بالاتر ہے۔ (فی ظلال القرآن: 4/2247)

جب مشرکین نے غار کا احاطہ کیا اور غار بالکل ان کی نگاہوں کے سامنے تھی تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت صدیق اکبرؓ کو اللہ کی معیت کا اطمئنان دلایا، حضرت ابو بکر صدیقؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے کہا جبکہ میں غار میں تھا: اگر ان میں سے کوئی ذرا جھک کر دیکھے گا تو ضرور ہمیں دیکھ لے گا، آپ ﷺ نے فرمایا: اے ابو بکر! تمہارا ان دونوں کے بارے میں کیا خیال ہے جن کا تیسرا اللہ ہو؟ (صحیح بخاری: 3653، صحیح مسلم: 2381) ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اے ابو بکر! خاموش رہیں، دو کے ساتھ تیسرا اللہ ہے۔(صحیح بخاری: 3922)

اللہ تعالیٰ نے اس منظر کو اپنے اس ارشاد میں تاریخی بنا دیا ہے: ﴿إِلَّا تَنفِرُواْ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوهُ شَيْـًٔا ۗ وَٱللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٣٩﴾ إِلَّا تَنصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ ٱللَّهُ إِذْ أَخْرَجَهُ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ ثَانِيَ ٱثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِى ٱلْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَٰحِبِهِۦ لَا تَحْزَنْ إِنَّ ٱللَّهَ مَعَنَا ۖ فَأَنزَلَ ٱللَّهُ سَكِينَتَهُۥ عَلَيْهِ وَأَيَّدَهُۥ بِجُنُودٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ ٱلسُّفْلَىٰ ۗ وَكَلِمَةُ ٱللَّهِ هِىَ ٱلْعُلْيَا ۗ وَٱللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٤٠﴾﴾ ترجمہ: ”تم نے اگر نبی کی مدد نہ کی تو کچھ پروا نہیں، اللہ اُس کی مدد اس وقت کر چکا ہے جب کافروں نے اسے نکال دیا تھا، جب وہ صرف دو میں کا دوسرا تھا، جب وہ دونوں غار میں تھے، جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ "غم نہ کر، اللہ ہمارے ساتھ ہے"۔ اُس وقت اللہ نے اس پر اپنی طرف سے سکونِ قلب نازل کیا اور اس کی مدد ایسے لشکروں سے کی جو تم کو نظر نہ آتے تھے، اور کافروں کا بول نیچا کر دیا اور اللہ کا کلمہ تو اونچا ہی ہے، اللہ زبردست اور دانا و بینا ہے“۔ (سورۃ توبہ: 40)

صاحبِ ”فی ظلال القرآن“ ان آیات کے ضمن میں رقمطراز ہیں: ”جب قریش کو محمد ﷺ کی وجہ سے کافی پریشانی ہو گئی جیسے کہ باطل طاقتوں کو ہمیشہ کلمۂ حق کے بارے میں پریشانی ہوتی ہے، نہ وہ اس کو ختم کر سکتی ہیں اور نہ ہی اس پر صبر کر سکتی ہیں، اس لئے قریش نے آپ ﷺ کے بارے میں مشاورت کی اور یہ فیصلہ کر لیا کہ آپؐ سے چھٹکارا حاصل کیا جائے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کی اسکیم کے بارے میں مطلع فرمایا اور حکم دیا کی اپنے رفیقِ کار صدیقِ اکبر کے ساتھ تن تنہا نکلیں، نہ کوئی لاؤ لشکر اور نہ ہی اسباب و ہتھیار، جب کہ آپؐ کے دشمن بہت زیادہ تھے اور طاقت و قوت کے تمام وسائل و اسباب انہی کے پاس تھے، لیکن پھر انجام کیا ہوا تمام مادی قوت ایک طرف ہے اور رسول اللہ ﷺ اپنے رفیقِ کار کے ساتھ بے سروسامان ہیں، اللہ کی طرف سے نصرت و مدد ایسے لشکروں کے ذریعہ ہوئی جن کو لوگوں کی نگاہیں

دیکھنے سے قاصر تھیں، اور اہلِ کفر کے حصہ میں ہزیمت و شکست اور ذلت و رسوائی کے سوا کچھ نہیں آیا، اللہ نے ''کافروں کا بول نیچا کر دیا''۔ اور اللہ کا کلمہ اپنے بلند مقام پر کامیاب و فتحیاب، طاقتور اور نافذ العمل ہو کر رہا۔

یہ اللہ کی اپنے رسول اور کلمۂ حق کی نصرت کی واضح مثال ہے، اللہ اس پر قادر ہے کہ وہ کسی دوسری قوم کی بھی اسی طرح نصرت و مدد کرے جو کہ ہر قسم کے مفادات اور نسل مندی سے بالاتر اور آزاد ہو، اگر کسی کو اللہ کے قول اور اس کے وعدے کے بعد کسی دلیل کی ضرورت ہو تو یہ ایک عملی مثال ہے۔(فی ظلال القرآن:3/1656)

۶)سفرِ ہجرت میں حضرت اُم معبد کا خیمہ:

رسول اللہ ﷺ جب غار میں داخل ہوئے وہاں تین راتیں گزارنے کے بعد آپؐ اور آپؐ کے رفیقِ سفر غار سے نکلے، اب آپ کی تلاش ختم ہو چکی تھی اور مشرکین رسول اللہ ﷺ تک پہنچنے سے ناامید ہو چکے تھے، اس کا ذکر ہو چکا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور ابو بکرؓ نے بنوالدیل کے عبداللہ بن اُریقط نامی شخص کو اجرت پر لیا تھا، وہ مشرک تھے لیکن آپؐ اور ابو بکرؓ کے نزدیک قابلِ اطمینان و بھروسہ تھے، دونوں حضرات نے اپنی اپنی سواریاں ان کے حوالے کر دی تھیں اور طے ہوا تھا کہ تین دنوں کے بعد سواریاں لے کر وہ غار کے پاس پہنچ جائیں گے اور واقعتاً وہ وقت مقرر پر پہنچ گئے اور غیر معروف راستے سے ان کو لے کر جاتا ہیں تا کہ کفارِ قریش سے اس معاملہ کو راز رکھا جائے۔ (المستفاد من قصص القرآن:2/101)

مدینہ کے راستے میں نبی کریم ﷺ قبیلہ خزاعہ کے مکانات کے پاس مقامِ قدید میں حضرت اُم معبد(عاتکہ بنت کعب خزاعیہ) کے پاس سے گزرے، وہ حضرت خالد بن خنیس خزاعی کی بہن ہیں جنہوں نے ان کے قصے کو بیان کیا ہے، اس قصہ کو اصحابِ سیرت اور راویوں نے بیان کیا ہے، اس کے متعلق ابن کثیرؒ فرماتے ہیں: ان کا قصہ مشہور و معروف ہے اور متعدد سندوں سے مروی ہے جن کی وجہ سے وہ مقام استناد حاصل کر لیتا ہے۔ (البدایہ والنہایہ 3/188)

صحابیٔ رسولؐ حضرت خالد بن خنیسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب مکہ سے نکلے اور وہاں سے آپؐ، ابو بکرؓ اور ابو بکرؓ کے آزاد کردہ غلام عامر بن فہیرہ اور آپؐ کا لیثی رہبر عبداللہ بن اُریقط بسوئے مدینہ ہجرت کی غرض سے نکلے، ان کا گزر حضرت اُم معبد خزاعیہ کے خیمہ کے پاس سے ہوا، وہ ایک سن رسیدہ، توانا اور عقلمند خاتون تھیں، خیمہ کے صحن میں اکڑوں بیٹھتی تھیں اور پھر لوگوں کی مہمان نوازی کرتی تھیں، ان حضرات نے ان سے گوشت اور کھجوریں خریدنے کا ارادہ کیا لیکن ان کو ان کے پاس ان میں سے کوئی چیز دستیاب نہیں ہوئی کیونکہ اس زمانہ میں لوگ قحط سالی اور بے سروسامانی کا شکار تھے، اتنے میں رسول اللہ ﷺ کی نظر ایک بکری پر پڑی جو خیمہ کی ایک جانب (بندھی) تھی، یہ اپنے دبلے پن کی وجہ سے ریوڑھ سے پیچھے رہ گئی، آپؐ نے پوچھا: کیا یہ دودھ دیتی ہے؟ ام معبد نے کہا: یہ دودھ دینے کے لائق کہاں ہے؟ آپؐ نے کہا: کیا آپ کی اجازت ہے کہ میں اس کو دوہوں؟ ام معبد نے کہا: میرے ماں باپ آپ پر قربان! اگر آپ کو اس میں دودھ معلوم ہوتا ہے تو ضرور دوہ لیں، رسول اللہ ﷺ نے بکری کو منگوایا اور اس کے تھنوں پر اپنا دستِ مبارک پھیرا، بسم اللہ پڑھی اور ام معبد کے لئے ان کی بکری کے تئیں دعا کی، چنانچہ بکری نے دودھ دینے کے لئے اپنے پاؤں آپؐ کے سامنے پھیلا دئے، اور دودھ بہانے

اور جگالی کرنے لگی، آپ ﷺ نے ایک بڑا برتن منگوایا جو ایک جماعت کو شکم سیر کر سکے اور اس برتن میں خوب بہتا ہوا دودھ دوہا یہاں تک کہ دودھ کا جھاگ برتن کے اوپر تک آگیا، اس کے بعد آپ ﷺ نے وہ دودھ پہلے اُم معبد کو پلایا، انہوں نے خوب سیر ہو کر پیا اور پھر اپنے ساتھیوں کو پلایا یہاں تک کہ وہ بھی اچھی طرح شکم سیر ہو گئے اور پھر خود آپ ﷺ نے پیا، اس کے بعد ہر ایک نے پھر سے شکم سیر ہو کر پیا، اس کے بعد دوبارہ اسی برتن میں دوہا یہاں تک کہ وہ برتن دودھ سے لبریز ہو گیا، اور وہ دودھ آپؐ نے ام معبد کے پاس چھوڑ دیا پھر آپؐ نے ام معبد کو بیعت کیا اور ان کے یہاں سے روانہ ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد ان کے شوہر اُبو معبد کمزور سی بکریوں کو جو لاغری کی وجہ سے آہستہ آہستہ چل رہی تھیں اور ان کی ہڈیوں میں تھوڑا سا مغز تھا، کو ہانکتے ہوئے تشریف لے آئے، جب انہوں نے دودھ دیکھا تو حیران رہ گئے اور پوچھا: اے ام معبد! یہ دودھ آپ کے پاس کہاں سے آیا؟ بکریاں تو سب بے دودھ ہیں اور گھر میں دودھ دینے والی کوئی بکری نہیں ہے، وہ فرمانے لگیں: اللہ کی قسم! ہمارے یہاں سے ایک بابرکت آدمی کا گزر ہوا، وہ ایسے ایسے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ان کا حلیہ میرے سامنے بیان کرو۔ اُم معبد نے کہا: میں نے ایک ایسے شخص کو دیکھا جو نہایت حسین و جمیل تھا، اس کا چہرۂ مبارک روشن تھا، وہ جسمانی طور پر حسین تھا، دبلا پتلا اور کمزور نہیں تھا، اس کی کمر پھولی ہوئی نہیں تھی اور نہ پتلی اور کمزور تھی، اس کا سر بھی چھوٹا نہیں تھا، وہ حسنِ ظاہری سے مالا مال تھے، آنکھوں کی پتلیاں سیاہ تھیں اور پلکیں لمبی تھیں، آواز بھاری نہیں تھی، گردن بلند تھی، داڑھی مبارک گھنی تھی، بھویں باریک اور دونوں ملی ہوئی تھیں، خاموش ہوتے تو باوقار لگتے تھے اور گفتگو کرتے تو خوبصورت معلوم ہوتے تھے، پیکرِ حسن و جمال تھے، دور سے دیکھیں تو جمال نمایاں دکھائی دیتا تھا اور قریب سے دیکھیں تو اس کے سراپا سے مٹھاس اور حسن ظاہر ہوتا تھا، بات میں شیرینی تھی، ہر لفظ جدا ادا ہوتا تھا، نہ بات اتنی مختصر ہوتی تھی کہ سمجھ میں نہ آئے اور نہ ضرورت سے زیادہ طویل و دراز۔ ان کی گفتگو موتیوں کی طرح پروئی ہوئی محسوس ہوتی تھی اور الفاظ منہ سے موتیوں کی طرح گرتے ہوئے لگتے تھے، نہ انتہائی دراز قد کے تھے اور نہ ہی انتہائی پست قد، ظاہر نظر میں قد دراز نہیں دکھائی دیتا تھا اور اتنا چھوٹا بھی نہیں کہ آنکھوں کو برا لگے، لگتا تھا دو شاخوں کے درمیان ایک شاخ کی طرح ہیں، آنے والے تینوں اشخاص میں سب سے زیادہ دل پسند نظر آتے تھے اور سب سے زیادہ نرالی شان والے تھے، اس کے ساتھی ایسے تھے جو اس کو ہمہ وقت گھیرے رہتے تھے، اگر گفتگو کرتا تو خاموشی سے سنتے تھے اور اگر وہ انہیں کوئی حکم دیتا تو فوراً تعمیل کر لیتے، وہ شخص مخدوم تھا، اس کے ساتھی ہر وقت کمربستہ تیار رہتے تھے، اس کے چہرہ پر ترش روئی کا ذرہ بھی اثر نہیں تھا اور نہ اس پر بے عقلی اور جہالت کے آثار تھے۔ ابو معبد نے کہا: اللہ کی قسم! یہ تو مکہ کے وہی قریش کے صاحب ہیں جن کے متعلق ہم سے بہت کچھ ذکر کیا گیا ہے، میری خواہش تھی کہ میں ان کے ساتھ جاؤں، میں ضرور ایسا کروں گا اگر اس کا کوئی راستہ نکل جائے۔

اسی دوران مکہ میں ایک زوردار آواز سنی گئی جو لوگوں نے کانوں سے سنی اور یہ معلوم نہ کر سکے کہ یہ آواز کہاں سے آرہی ہے، جو کہہ رہا تھا:

جَزَى اللَّهُ رَبُّ النَّاسِ خَيْرَ جَزَائِهِ ... رَفِيقَيْنِ حَلَّا خَيْمَتَيْ أُمِّ مَعْبَدِ
هُمَا نَزَلَا بِالْبِرِّ ثُمَّ تَرَوَّحَا ... فقد فاز مَنْ أَمْسَى رَفِيقَ مُحَمَّدِ
فَيَا لَقُصَيٍّ مَا زَوَى اللَّهُ عَنْكُمْ ... بِهِ مِنْ فِعَالٍ لَا تجَارَى وَسُؤْدَدِ
لِيَهْنِ بَنِي كَعْبٍ مَكَانُ فَتَاتِهِمْ ... وَمَقْعَدُهَا لِلْمُؤْمِنِيْنِ بِمَرْصَدِ

سَلُوا أُخْتَكُمْ عَنْ شَاتِهَا وَإِنَائِهَا ... فَإِنَّكُمْ إِنْ تَسْأَلُوا الشَّاةَ تَشْهَدِ
دَعَاهَا بِشَاةٍ حَائِلٍ فَتَحَلَّبَتْ ... عَلَيْهِ صَرِيحًا ضَرَّةُ الشَّاةِ مُزْبِدِ
فَغَادَرَهَا رَهْنًا لَدَيْهَا لِحَالِبٍ ... يُرَدِّدُهَا فِي مَصْدَرٍ ثُمَّ مَوْرِدِ

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ جو تمام لوگوں کا رب ہے، ان دو ساتھیوں کو جزائے خیر عطا فرمائے جو سیدہ ام معبد کے خیموں میں قیام پذیر ہوئے۔ وہ نیکی کے ساتھ آئے اور خیر کے ساتھ رخصت ہوئے۔ وہ شخص کامیاب ہو گیا جو محمد ﷺ کا ساتھی بنا۔ اے قصی کی اولاد! تم سے اللہ تعالیٰ نے اتنی بڑی نعمت کو دور کر دیا کہ اخلاق و کردار اور سرداری میں جس سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ اپنی بہن (ام معبد) سے اس کی بکری اور برتن کا حال معلوم کر لو اگر تم بکری سے بھی دریافت کرو گے تو وہ بھی گواہی دے گی۔ انہوں نے بے دودھ بکری کو دودھ کر اس کا دودھ دوھ لیا اور دودھ بھی خالص جھاگ مارتا ہوا۔ اور انہوں نے اس بکری کو انہی کے پاس چھوڑ دیا کہ اس کا دودھ پیتے رہیں جو دوہنے والے کو بار بار دودھ دیتی ہے۔ (المعجم الکبیر للطبرانی: 3605، الاحادیث الطوال: 30، مجمع الزوائد للہیثمی: 6/56-57، الہجرۃ النبویۃ المبارکہ، ص107)

۷) سراقہ بن مالک رسول اللہ ﷺ کا پیچھا کرتا ہے:

قریش نے مکہ کی محفلوں اور مجلسوں میں یہ اعلان کروا دیا کہ جو بھی نبی کریم ﷺ کو زندہ یا مردہ لے کر آئے گا تو اس کو سو اونٹ انعام میں دیئے جائیں گے، اور یہ خبر مکہ کے مضافات میں رہنے والے اُعراب کے قبائل تک بھی پہنچ گئی، سراقہ بن مالک بن جُعشم کو بھی اس بڑے انعام کے حاصل کرنے کا لالچ ہوا جو قریش نے رسول اللہ ﷺ کو گرفتار کر کے لانے والے شخص کے لئے تیار رکھا تھا، سراقہ نے اس کے لئے اپنی طرف سے آخری درجہ کی کوششیں کر ڈالی لیکن اللہ کا ایسا کرنا ہوا کہ بجائے اس کے کہ رسول اللہ ﷺ کو کوئی نقصان پہنچاتا اللہ نے اس کو ہی رسول اللہ ﷺ کی طرف سے دفاع کرنے والا بنا دیا۔

ابن شہاب ؒ فرماتے ہیں کہ مجھ سے عبد الرحمٰن بن مالک مدلجی نے بتایا — یہ سراقہ بن مالک بن جعشم کے بھتیجے ہیں- کہ ان کے والد نے ان کو بتایا کہ انہوں نے سراقہ بن جعشم کو فرماتے ہوئے سنا کہ ہمارے پاس کفارِ قریش کے قاصد جو رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکرؓ کے بارے میں اس امر کا اعلان کر رہے تھے کہ جو شخص انہیں قتل کر دے یا زندہ گرفتار کر کے لائے تو ہر ایک کے بدلے انعام دیا جائے گا، چنانچہ میں اپنی قوم بنی مدلج کی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا کہ ان میں سے ایک شخص آیا اور ہمارے پاس کھڑا ہو گیا جبکہ ہم بیٹھے ہوئے تھے، اس نے کہا: اے سراقہ! میں نے ابھی ساحل پر کچھ لوگوں کو دیکھا ہے میرا خیال ہے کہ وہ محمد اور ان کے ساتھی ہوں گے۔ سراقہ نے کہا: میں سمجھ گیا کہ یہ وہی ہیں، مگر میں نے اس سے ایسے ہی کہہ دیا: یہ وہ لوگ نہیں ہیں، بلکہ تو نے فلاں فلاں کو دیکھا ہو گا جو ابھی ہمارے سامنے سے گئے ہیں۔ اس کے بعد میں تھوڑی دیر تک اس مجلس میں ٹھہرا رہا، اس کے بعد اٹھا اور اپنے گھر جا کر خادمہ سے کہا کہ وہ میرا گھوڑا لے کر باہر جائے اور اس کو ٹیلے کے پیچھے لے کر کھڑی رہے، پھر میں نے اپنا نیزہ لیا اور مکان کی پچھلی جانب سے نکلا، نیزے کی نوک کو زمین پر لگا رہا تھا اور اس کا اوپر والا حصہ نیچے کئے ہوئے تھا، یہاں تک کہ میں اپنے گھوڑے کے پاس آ گیا اور اس پر سوار ہو گیا، پھر اسے سرپٹ دوڑایا تاکہ مجھے جلدی پہنچائے، یہاں تک کہ میں ان کے قریب پہنچ گیا تو میرے گھوڑے نے ایسے ٹھوکر کھائی کہ میں اس سے گر گیا، میں کھڑا ہوا اور ترکش کی

طرف ہاتھ بڑھایا اور اس میں سے تیر نکال کر فال نکالا کہ میں ان کو نقصان پہنچا سکوں گا یا نہیں؟ تو فال میں وہ تیر نکلا جو میری مرضی کے خلاف تھا، مگر میں اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور تیروں کے فال کو نہ مانا، میرا گھوڑا مجھے لے کر اتنا قریب پہنچ گیا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی قراءت سنی، آپ ؐ اِدھر اُدھر متوجہ نہیں ہوتے تھے جبکہ حضرت ابو بکرؓ نے بہت زیادہ اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے، اتنے میں میرے گھوڑے کے اگلے دونوں پاؤں گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے اور میں خود بھی اس کے اوپر سے گر گیا، پھر میں نے گھوڑے کو ڈانٹا تو بڑی مشکل سے اس کے پاؤں نکلے مگر جب وہ سیدھا ہوا تو اس کے اگلے دونوں پاؤں سے دھوئیں کی طرح غبار اڑا جو آسمان تک پھیل گیا، پھر میں نے تیروں کے ذریعہ فال نکالا تو فال میں وہ تیر نکلا جو مجھ کو ناگوار تھا، بالآخر میں نے انہیں امان کی آواز دی تو وہ ٹھہر گئے، پھر میں گھوڑے پر سوار ہو کر ان کے پاس آیا، پھر جب مجھے ان تک پہنچنے میں رکاوٹیں پیش آئیں تو میرے دل میں خیال آیا کہ رسول اللہ ﷺ کا ضرور بول بالا ہوگا، چنانچہ میں نے آپ ﷺ سے عرض کیا: آپ کی قوم نے آپ کے متعلق انعام مقرر کیا ہے، اس کے بعد میں نے آپ ؐ کو وہ سب بتادیا جو وہ لوگ آپ کے ساتھ کرنا چاہتے تھے، میں نے ان کو زادِ راہ اور کچھ سامان پیش کیا لیکن انہوں نے مجھ سے کچھ نہیں لیا اور نہ مجھ سے کچھ مانگا، البتہ یہ کہا کہ ہمارے بارے میں رازداری سے کام لینا، میں نے ان سے درخواست کی کہ میرے لئے پروانۂ امن تحریر کردیں۔ آپ ؐ نے عامر بن فہیرہ کو حکم دیا جس نے مجھے چمڑے کے ایک ٹکڑے پر سند اُمان لکھ دی اور پھر رسول اللہ ﷺ آگے روانہ ہوگئے۔ (صحیح بُخاری: 3906، صحیح مسلم: 91/2009)

اسی طرح سراقہ کے بارے میں مزید یہ بھی مشہور و معروف ہے جس کو علامہ ابن عبد البرؒ، علامہ ابن حجرؒ اور دیگر محققین نے ذکر کیا ہے، چنانچہ علامہ ابنِ عبد البرؒ فرماتے ہیں کہ سفیان بن عیینہ نے ابو موسیٰ سے، انہوں نے حضرت حسن سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سراقہ بن مالک سے فرمایا: سراقہ! اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تم کسریٰ کے دونوں کنگن پہنو گے؟! فرماتے ہیں: جب دورِ فاروقی میں کسریٰ کے کنگن، اس کا تاج اور زیورات حضرت عمرؓ کے سامنے مالِ غنیمت کی شکل میں پیش کئے گئے تو حضرت عمرؓ نے سراقہ بن مالک کو طلب کیا اور سراقہ کو وہ کنگن پہنا دیئے۔ اور سراقہ لمبے اور زیادہ بالوں والے شخص تھے، ان کے بازو پر بھی کافی بال تھے، حضرت عمرؓ نے ان سے کہا: اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ اور فرمایا: ''اللہ اکبر! تمام حمد و ستائش ہے اس ذاتِ الٰہی کے لئے جس نے اپنے آپ کو لوگوں کا رب کہنے والے کسریٰ بن ہرمز کے کنگن اتار کر بنی مدلج کے ایک دیہاتی سراقہ بن مالک بن جعشم کو پہنا دیئے''۔ حضرت عمرؓ نے یہ الفاظ بلند آواز سے کہے۔ (الروض الأنف: 4/218، الہجرۃ فی القران، ص346)

اس کے بعد حضرت عمرؓ نے سراقہ کو سوار کیا اور پورے مدینہ میں ان کو گھمایا، لوگ ان کے ساتھ چل رہے تھے اور وہ حضرت عمر فاروق کے ان الفاظ کو زور زور سے دہرا رہے تھے کہ "اللہ اکبر! تمام حمد و ستائش ہے اس ذاتِ الٰہی کے لئے جس نے کسریٰ بن ہرمز کے کنگن اتار کر بنی مدلج کے ایک دیہاتی سراقہ بن جعشم کو پہنا دیئے۔ (السیرۃ النبویۃ، اُبو شہبہ، 1/495)

۸)مقلب القلوب ذات پاک و برتر ہے:

سراقہ ابتدائی مرحلہ میں یہ چاہتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کو گرفتار کرکے سردارانِ مکہ کے سپرد کردے اور ان سے سو اونٹ بطور انعام حاصل کرلے، لیکن اچانک صورتحال ایسے بدل گئی کہ وہ اب رسول اللہ ﷺ کو تلاش کرنے والوں کو واپس کرنے لگا، جس سے بھی اس کی ملاقات ہوتی تو اس کو یہ کہہ کر واپس کرتا کہ اس طرف سے میں نے تلاش کرلیا ہے، لہذا اس طرف جانے کی ضرورت نہیں ہے، جب اس کو پورا اطمئنان ہوگیا کہ نبی کریم ﷺ مدینہ منورہ پہنچ گئے ہیں تو پھر وہ اور اس کے گھوڑے کے ساتھ جو کچھ پیش آیا تھا لوگوں کے سامنے بیان کرنے لگا اور ان کے یہ واقعات مشہورِ زمانہ ہوگئے اور لوگ ان کو بیان کرنے لگے، یہاں تک کہ مکہ کی مجلسوں کا یہ موضوع بحث بن گئے، اس لئے سردارانِ قریش کو یہ خوف لاحق ہوگیا کہ یہ اہل مکہ کے قبولِ اسلام کا سبب بن جائیں گے اور سراقہ بنی مدلج کے امیر اور رئیس تھے، اس لئے ابوجہل نے ان کو یہ اشعار لکھ کر بھیجے:

بَنِي مُدْلِجٍ إِنِّي أَخَافُ سَفِيهَكُمْ ... سُرَاقَةَ مُسْتَغْوٍ لِنَصْرِ مُحَمَّدِ
عَلَيْكُمْ بِهِ لَا يفرِقَنَّ جُمُوعَكُمْ ... فَتُصْبِحَ شَتى بَعْدَ عِزٍّ وَسُؤْدَدِ

ترجمہ: ''اے بنی مدلج! مجھے تمہارے نادان سراقہ کے بارے میں ڈر لگتا ہے کہ یہ لوگوں کو محمدؐ کی نصرت و مدد پر تیار نہ کردے، اس کو قابو میں کرو کہیں یہ تمہارا شیرازہ بکھیر نہ دے جس کے نتیجہ میں عزت و عروج کے بعد تم انتشار و افتراق کا شکار ہو جاؤگے''۔

یہ اشعار سن کر سراقہ نے ابوجہل کو ان اشعار کے ذریعہ جواب دیا:

أَبَا حَكَمٍ وَاللَّاتِ لَوْ كُنْتَ شَاهِدًا ... لِأَمْرِ جَوَادِي إِذْ تَسِيخُ قَوَائِمُهْ
عَجِبْتَ وَلَمْ تَشْكُكْ بِأَنَّ مُحَمَّدًا ... نَبِيٌّ وَبُرْهَانٌ فَمَنْ ذَا يُقَاوِمُهْ
عَلَيْكَ بِكَفِّ النَّاسِ عَنْهُ فَإِنَّنِي ... أَرَى أَمْرَهُ يَوْمًا سَتَبْدُو مَعَالِمُهْ
بِأَمْرٍ يَوَدُّ النَّصْرَ فِيهِ بِإِلْبِهَا ... لَوَ انَّ جَمِيعَ النَّاسِ طُرًّا تُسَالِمُهْ

اے ابوالحکم! اللہ کی قسم! اگر تو میرے گھوڑے کو دیکھتا جب کہ اس کے پاؤں زمین میں دھنس رہے تھے تو تم حیرت زدہ ہوجاتے اور کوئی شک وشبہ تمہارے ذہن میں نہیں رہتا کہ محمد ﷺ واقعتاً اللہ کے رسول اور اس کی برہان ہیں، لہذا ان کا مقابلہ کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟! تجھے چاہیے کہ تو اپنی قوم کو ان کا مقابلہ کرنے سے روکے۔ اس لئے کہ مجھے یقین ہے کہ وہ دن دور نہیں جب ان کی عزت اور کامیابی کی علامات ظاہر ہوجائیں گے۔ اس وقت تو تمام کے تمام لوگ ان سے صلح کے خواستگار ہوں گے۔

۹)انصار کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ کا استقبال:

جب مدینہ میں مسلمانوں کو پتہ چلا کہ رسول اللہ ﷺ مکہ سے روانہ ہو چکے ہیں تو روزانہ صبح کے وقت حرّہ کی طرف نکلتے اور آپ ﷺ کا انتظار کرتے، یہاں تک کہ دوپہر کی دھوپ تیز ہوتی تو واپس چلے جاتے، یہاں تک کہ ایک روز طویل انتظار کے بعد واپس چلے گئے، جب وہ اپنے گھروں کو واپس چلے گئے تو ایک یہودی شخص کسی کام سے ایک بلند عمارت پر چڑھا، تو اس کو سفید لباس میں ملبوس رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب کا قافلہ نظر آیا، جن کی وجہ سے سراب بھی کافور ہو رہا تھا، یہودی شخص صبر نہ کرسکا اور اس نے وہیں سے بلند

آواز سے پکارنا شروع کیا: اے عرب کے لوگو! یہ رہا تمہارا نصیب، جس کا تم انتظار کر رہے تھے!۔ یہ سنتے ہی مسلمان اسلحہ کی طرف لپکے اور دوڑتے بھاگتے حرّہ کے بالائی علاقہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ملاقات کا شرف حاصل کیا، آپ ﷺ لوگوں کے ساتھ دائیں سمت سے آئے یہاں تک کہ ان کو لے کر بنو عمرو بن عوف میں پہنچ گئے، اور یہ ماہ ربیع الاول پیر کے دن کا واقعہ ہے۔ حضرت ابو بکرؓ لوگوں کا استقبال کرنے لگے اور رسول ﷺ سکون و قار سے بیٹھے رہے، انصار میں سے جن لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کو نہیں دیکھا تھا وہ حضرت ابو بکرؓ کو سلام کرنے لگے، جب دھوپ تیز ہو گئی تو حضرت ابو بکرؓ اٹھ کر رسول اللہ ﷺ کو اپنی چادر سے سایہ کرنے لگے، اس وقت تمام لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کو پہچان لیا، اللہ کے رسول ﷺ نے بنو عمرو بن عوف میں چودہ روز قیام کیا اور اس مسجد کی بنیاد رکھی جس کو تقوی کی بنیاد پر تعمیر کیا گیا، رسول اللہ ﷺ نے اس میں نماز ادا فرمائی، اس کے بعد اپنی سواری پر سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔ (دیکھیں: الہجرۃ فی القرآن الکریم، ص351،352، صحیح بُخاری: 3906)

اللہ کے رسول ﷺ نے کچھ مدت کے لئے قبا میں قیام فرمایا، اس کے بعد جب مدینہ میں داخل ہونے کا ارادہ فرمایا تو انصار کو پیغام بھیجا، تو وہ اللہ کے نبی ﷺ اور حضرت ابو بکرؓ کے پاس آئے اور ان دونوں کو سلام کیا اور کہا: امن واطمئنان کے ساتھ سوار ہو جائیں، ہم سب آپ کے تابعِ فرمان ہیں، اللہ کے رسول ﷺ اور حضرت ابو بکرؓ سوار ہو گئے اور لوگ اسلحہ لے کر دونوں حضرات کو حصار میں لے کر روانہ ہو گئے۔

اور جب رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ پہنچ گئے تو مدینہ میں اس طرح کے استقبالیہ کلمات کہے گئے: اللہ کے نبی تشریف لے آئے، اللہ کے نبی تشریف لے آئے- ﷺ- لوگ بلند مقامات پر کھڑے ہو کر دیدار کرنے لگے اور کہہ رہے تھے: اللہ کے نبی تشریف لے آئے۔(صحیح بُخاری: 394)

وہ فرحت وخوشی کا دن تھا، اہلِ مدینہ نے اس جیسا کوئی دن نہیں دیکھا تھا، لوگوں نے بہترین کپڑے زیب تن کئے ہوئے تھے، گویا کہ وہ عید کا دن تھا، اور یقیناً عید اور خوشی کا دن تھا، اس لئے کہ وہ ایک ایسا دن تھا جس میں اسلام مکہ کی تنگنائیوں سے نکل کر مدینہ کے مبارک وسیع مرکزِ دعوت واشاعت کی طرف منتقل ہوا، اور پھر مدینہ سے روئے زمین کے تمام چپوں تک پہنچ گیا، اہلِ مدینہ کو اس فضل کا بھی احساس تھا جس سے اللہ تعالیٰ نے انہیں نوازا تھا اور اس شرف کا بھی حساس تھا جس کے لئے اللہ تعالیٰ ' نے ان کا انتخاب کیا تھا، ان کا شہر رسول اللہ ﷺ کے لئے اور آپؐ کے مہاجر صحابہ کرام کے لئے وطن اور پناہ گاہ بن گیا اور پھر اسلام کی نصرت وحمایت کا بیس کیمپ بن گیا، اسی لئے اہلِ مدینہ فرحت وانبساط کے ساتھ گنگنا رہے تھے اور کہہ رہے تھے: یارسول اللہ! اے محمد! اے اللہ کے رسول!۔ امام مسلمؒ نے اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ میں داخل ہوئے تو مرد اور خواتین گھروں کے اوپر چڑھے اور نوجوان اور خدام راستوں میں پھیل گئے اور پکار رہے تھے: اے محمدؐ! اے اللہ کے رسولؐ! اے محمدؐ! اے اللہ کے رسولؐ!۔(صحیح مسلم:3014)

تاریخ انسانی کے اس بے نظیر عظیم الشان عوامی استقبال کے بعد رسول اللہ ﷺ آگے بڑھے اور حضرت ابوایوب انصاریؓ کے گھر میں قیام فرمایا، حضرت انسؓ سے ہجرت کے متعلق طویل حدیث میں مروی ہے: "......رسول اللہ ﷺ چلتے چلتے آگے بڑھتے رہے

یہاں تک کہ ابوایوب ؓ کے گھر کے پاس سواری سے اتر گئے، آپ ﷺ اپنے گھر والوں کے ساتھ گفتگو فرمارہے تھے، عبداللہ بن سلام ؓ نے آپ ؐ کے بارے میں سنا، وہ اس وقت اپنے ایک کھجور کے باغ میں کھجور جمع کر رہے تھے، انہوں نے سنتے ہی جمع شدہ کھجوروں کو وہیں رکھنے کے بجائے ساتھ ہی لایا اور جب آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو جمع شدہ کھجوریں ان کے ساتھ ہی تھیں، انہوں نے نبی کریم ﷺ کی باتیں سنیں، اس کے بعد اپنے گھر والوں کے پاس واپس چلے گئے، آپ ؐ نے دریافت کیا: ہمارے (نانہالی) رشتہ داروں میں کس کا گھر یہاں سے زیادہ قریب ہے؟ حضرت ایوب ؓ نے فرمایا: میرا! اے اللہ کے نبی! یہ میرا گھر ہے اور یہ اس کا دروازہ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جائیں اور ہمارے لئے دوپہر میں آرام کی جگہ تیار کریں"۔ (صحیح بخاری: 3911) اس کے بعد رسول اللہ ﷺ حضرت ابوایوب ؓ کے یہاں ٹھہرے یہاں تک کہ مسجد اور حجرات تعمیر کئے۔

اس طرح سے نبی کریم ﷺ اور آپ ؐ کے اصحاب کی ہجرت پائے تکمیل کو پہنچ گئی، لیکن ہجرت اپنے اہداف و مقاصد کے اعتبار سے ابھی مکمل نہیں ہوئی، بلکہ اہداف و مقاصد کے اعتبار سے اُس وقت اس کا اصل آغاز ہوا جب رسول اللہ ﷺ بحفاظت مدینہ منورہ پہنچ گئے، اور اس کے ساتھ ہی مشکلات و مصائب اور چیلنجز کے ایک طویل سفر کا آغاز ہوا، اور ان تمام چیزوں پر اللہ کے رسول ﷺ غالب آگئے تاکہ امت کے اور اسلامی نظام کے روشن مستقبل کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کر سکیں، اسی امت نے عدل و احسان اور تقویٰ و ایمان کی بنیادوں پر عظیم انسانی تہذیب قائم کی اور اس وقت کی دنیا کی دو (۲) سپر پاور طاقتوں روم اور فارس پر اپنی فتوحات کے جھنڈے گاڑھ دیئے۔

۱۰: دروس و اسباق اور فوائد و عبرتیں:

۱: حق و باطل کے درمیان کشمکش قدیم اور مسلسل ہے، اور یہ کشمکش اللہ تعالیٰ کی ایک اٹل سنت کا حصہ ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ٱلَّذِينَ أُخْرِجُواْ مِن دِيَٰرِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّآ أَن يَقُولُواْ رَبُّنَا ٱللَّهُۗ وَلَوْلَا دَفْعُ ٱللَّهِ ٱلنَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَٰمِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَٰتٌ وَمَسَٰجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا ٱسْمُ ٱللَّهِ كَثِيرًاۗ وَلَيَنصُرَنَّ ٱللَّهُ مَن يَنصُرُهُۥٓۚ إِنَّ ٱللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ﴾ ترجمہ: "یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیئے گئے صرف اِس قصور پر کہ وہ کہتے تھے "ہمارا رب اللہ ہے" اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجا اور معبد اور مسجدیں، جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے، سب مسمار کر ڈالی جائیں، اللہ ضرور اُن لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے، اللہ بڑا طاقتور اور زبردست ہے"۔ (سورۃ الحج: 40)

اس کشمکش میں بالآخر کامیابی کس کے مقدر میں ہوگی یہ بھی اللہ کی طرف سے متعین ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿كَتَبَ ٱللَّهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا۠ وَرُسُلِيٓۚ إِنَّ ٱللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ﴾ ترجمہ: "اللہ نے لکھ دیا ہے کہ میں اور میرے رسول غالب ہو کر رہیں گے، فی الواقع اللہ زبردست اور زور آور ہے"۔ (سورۃ المجادلہ: 21)

۲) داعی کے ساتھ مخالفین حق کی دشمنی ایک یقینی اور بار بار پیش آنے والا معاملہ ہے اور اس سلسلہ میں وہ مختلف حربے استعمال کرتے ہیں، کبھی قید وبند، کبھی قتل اور کبھی ملک بدر اور جلاوطن کرکے عداوت کی پیاس بجھائی جاتی ہے، داعی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے رب کی طرف رجوع کرے، اسی پر بھروسہ رکھے اور اسی پر توکل کرے، اور یہ یقین رکھے کہ بُری چالبازیوں اور سازشوں کا نقصان چال بازیاں کرنے والوں کو ہی ہوتا ہے، جیسے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ ۚ وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ ٱللَّهُ ۖ وَٱللَّهُ خَيْرُ ٱلْمَٰكِرِينَ﴾ ترجمہ: ''وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جبکہ منکرینِ حق تیرے خلاف تدبیریں سوچ رہے تھے کہ تجھے قید کردیں یا قتل کرڈالیں یا جلاوطن کردیں، وہ اپنی چالیں چل رہے تھے اور اللہ اپنی چال چل رہا تھا اور اللہ سب سے بہتر چال چلنے والا ہے''۔(سورۃ الأنفال:30)

اہلِ باطل اور دعوت کے مخالفین کے حربوں میں سے ایک حربہ یہ ہے کہ وہ کمزور ایمان والوں کو مال کے ذریعہ لالچ دینے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ دعوت اور داعیانِ حق کا خاتمہ کرسکیں، اسی لئے مشرکینِ مکہ نے بھی اس شخص کے لئے سو اونٹوں کا انعام رکھا جو رسول اللہ ﷺ کو زندہ یا مردہ لے کر آئے گا، اسی لئے لالچی لوگ متحرک ہوگئے جن میں سراقہ بھی تھے جو مادی اعتبار سے (انعام کی شکل میں ملنے والے مال کے) ایک بڑے نقصان کے بعد وافر فائدہ اور پاکیزہ عطاء وبخشش کے ساتھ واپس لوٹے، اور وہ تھا ایمان کا فائدہ اور ایمانی عطا وبخشش۔ اور وہ پھر دیگر کوشش کرنے والوں کو بھی صحیح راستے سے بھٹکانے لگے جو تلاش وجستجو میں انتھک کوشش کررہے تھے، اسی طرح سے اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء اور داعیانِ حق کی طرف سے کافی ہوجاتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ يُنفِقُونَ أَمْوَٰلَهُمْ لِيَصُدُّوا۟ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِ ۚ فَسَيُنفِقُونَهَا ثُمَّ تَكُونُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُونَ ۗ وَٱلَّذِينَ كَفَرُوٓا۟ إِلَىٰ جَهَنَّمَ يُحْشَرُونَ﴾ ترجمہ:''جن لوگوں نے حق کو ماننے سے انکار کیا ہے وہ اپنے مال خدا کے راستے سے روکنے کے لئے صرف کررہے ہیں اور ابھی اور خرچ کرتے رہیں گے مگر آخر کار یہی کوششیں ان کے لئے پچھتاوے کا سبب بنیں گی، پھر وہ مغلوب ہوں گے، پھر یہ کافر جہنم کی طرف گھیر لائے جائیں گے''۔(سورۃ الأنفال:36)

۳) باریک بینی پر مبنی منصوبہ بندی اور اسباب کا استعمال:

بلاشبہ جو بھی واقعۂ ہجرت پر غور کرے گا اور اس میں باریک بینی پر مبنی منصوبہ بندی کو اور از ابتدا تا انتہا اسباب اختیار کرنے میں باریک بینی پر غور کرے گا تو اس کو اس بات کا ادراک ہوجائے گا کہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں منصوبہ بندی مکمل طور پر وحی کی رہنمائی میں کی جاتی تھی اور یہ منصوبہ بندی سنت نبویہ کا بھی ایک اہم جزء ہے اور یہ حکمِ الٰہی کا بھی ایک جزء ہے جس کا ہر مسلمان سے مطالبہ کیا گیا ہے، اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ منصوبہ بندی کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور یہ دلیل دیتے ہیں کہ منصوبہ بندی اور معاملات کے مالہ وماعلیہ پر غور وفکر کرنے کا سنت سے کوئی تعلق نہیں ہے تو یہ غلط سوچ کے حامل لوگ ہیں جو اپنا بھی نقصان کرتے ہیں اور مسلمانوں کا بھی نقصان کرتے ہیں۔(الأساس فی السنۃ، سعید حوی 1/357)

جب نبی کریم ﷺ کے ہجرت کرنے کا وقت ہو گیا اور نبی کریم ﷺ نے عملی اقدامات شروع کئے تو ہمیں مندرجہ ذیل امور دیکھنے کو ملتے ہیں:

∆ ہجرت کے لئے انتہائی باریک بینی سے ترتیب و تنظیم کی گئی، یہاں تک کہ ہجرت اپنی کامیابی کے مراحل تک پہنچ گئی حالانکہ ہجرت کی راہ میں کافی مشکلات اور رکاوٹیں حائل تھی ، ہجرت کے تمام مراحل اور تمام کام منصوبہ بندی پر مبنی تھے جیسے کہ:

۱) اللہ کے رسول ﷺ حضرت ابو بکرؓ کے گھر دوپہر کے وقت انتہائی گرمی میں تشریف لے گئے، جس وقت عام طور پر کوئی باہر نہیں نکلتا ہے، بلکہ آپ ﷺ کی عادت یہ تھی کہ آپؐ اس وقت حضرت ابو بکرؓ کے پاس تشریف نہیں لاتے تھے، ایسا کیوں ہوا؟ تاکہ آپ ﷺ کو کوئی دیکھ نہ سکے۔

۲) آپ ﷺ نے حضرت صدیق اکبرؓ کے پاس آتے ہوئے اپنے آپ کو چھپایا اور چہرہ کو ڈھانپ کر تشریف لائے تاکہ کوئی آپ کو پہچان نہ سکے۔

۳) آپ ﷺ نے حضرت ابو بکرؓ کو حکم دیا کہ وہاں موجود تمام لوگوں کو ہٹادیں اور جب آپس میں گفتگو فرمائی تو صرف ہجرت کی بات کی اور ہجرت کی جگہ کی کوئی تعیین نہیں فرمائی۔

۴) ہجرت کے لئے آپ ﷺ رات میں نکلے اور حضرت ابو بکرؓ کے گھر کے پیچھے کے دروازے سے نکلے۔

۵) اس میں بھی انتہائی احتیاطی پہلو ہے کہ آپ ﷺ نے غیر معروف راستہ اختیار کیا اور ایسے رہبرِ سفر سے مدد لی جو دیہات اور ریگستان کے تمام راستوں سے واقف تھا، اگرچہ وہ مشرک تھا لیکن وہ صاحبِ اخلاق اور سنجیدہ تھا، اس میں اس بات کی دلیل موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ مختلف تجربات سے فائدہ اٹھانے سے گریز نہیں کرتے تھے، چاہے ان کا مصدر اور سرچشمہ کوئی بھی ہو۔ (الہجرۃ فی القرآن الکریم، ص 361)

∆ ہجرت سے متعلق مختلف کاموں کو انجام دینے میں معاونت کے لئے عقلمند افراد کا انتخاب کیا گیا، یہ تمام ایک دوسرے کے ساتھ یا تو قرابت ورشتہ داری کا یا ایک جیسے کام کی وجہ سے مربوط تھے، جس کی وجہ سے مقصد کو حاصل کرنے میں یہ ایک اکائی کی طرح ایک دوسرے کا تعاون کرتے تھے۔

∆ اس گھرانہ کے ہر فرد کو اس کا مناسب کام سونپا گیا جس کو وہ احسن طریقہ سے انجام دے سکتا تھا تاکہ وہ اپنا کردار اور اپنی ذمہ داری بہتر طریقہ سے انجام دے سکے۔

∆ رسول اللہ ﷺ کی جگہ حضرت علی بن ابی طالبؓ کے سونے کا منصوبہ ایک کامیاب منصوبہ تھا جس کی وجہ سے مشرکین دھوکہ کھا گئے اور ان کی توجہ رسول اللہ ﷺ سے ہٹ گئی اور آپؐ رات کے اندھیرے میں اللہ کی حفاظت میں نکل گئے، ان کی نگاہیں رسول اللہ ﷺ کی خواب گاہ پر مرکوز رہیں اور اُن کو پورا یقین تھا کہ رسول ﷺ اپنی چادر اوڑھ کر سو رہے ہیں حالانکہ وہاں پر حضرت علی بن ابی طالبؓ آرام فرما تھے۔

اس مبارک سفر کے اہم کردار مندرجہ ذیل تھے:

۱) حضرت علیؓ؛ وہ رسول اللہ ﷺ کے بستر پر سوتے ہیں تاکہ مشرکین کو دھوکہ میں رکھیں اور تمام امانتیں ان کے مستحقین کو حوالہ کرکے رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچ جائیں۔

۲) حضرت عبداللہ بن أبی بکر؛ یہ خبر رسانی اور دشمن کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھنے کا کردار ادا کر رہے تھے۔

۳) ذات النطاقین حضرت أسماء؛ مکہ سے غار تک زادِ سفر اور ضروریات پہنچانے کا کردار ادا کر رہی تھیں جبکہ مشرکین رسول اللہ ﷺ کی تلاش میں جنون کی حد تک پہنچ چکے تھے۔

۴) حضرت عامر بن فہیرہ؛ سیدھے سادے چرواہے جو غار کے دونوں ساتھیوں کو گوشت اور دودھ فراہم کرتے تھے، اور اپنی بکریوں کے ذریعہ اس تاریخی سفر کے قدموں کے نشانات مٹادیتے ہیں تاکہ کسی کو پتہ نہ چل جائے، یہ امداد، فراہمیٔ ضروریات اور دشمن کی توجہ ہٹانے کا کردار ادا کر رہے تھے۔

۵) حضرت عبداللہ بن أریقط؛ ہجرت کے امین رہبر اور صحرائی راستوں کے جانکار، وہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے سفر کے آغاز کے اشارہ کے منتظر تھے تاکہ قافلہ غار سے یثرب کی جانب سے اپنا سفر شروع کردے۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ انتہائی باریک بینی کے ساتھ بہترین طریقہ سے تمام امور کو ترتیب دیا گیا، حکیمانہ اسلوب کے ساتھ تمام احتیاطی تدابیر اختیار کی گئیں، ہجرت کے دوران ہر شخص کو اس کی مناسب جگہ متعین کیا گیا، ہر خلا کو پُر کیا گیا، سفر کی تمام ضروریات اور تقاضوں کا خیال کیا گیا اور صرف لازمی افراد پر ہی انحصار کیا گیا، یقیناً اللہ کے رسول ﷺ نے معقول اسباب کو استطاعت وطاقت کے بقدر اختیار کیا اور اس کے بعد ہی اللہ تعالی کی طرف سے حفاظت ومدد کی امید رکھی۔(دیکھیں: أضواء علی الہجرۃ، توفیق محمد، ص393-397)

۴)اسباب کو اختیار کرنا ضروری ہے:

بے شک اسباب کو اختیار کرنا ضروری اور واجب ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نتیجہ بھی ہمیشہ حاصل ہوگا، اس لئے کہ اس کا تعلق اللہ تعالی کے حکم اور اس کی مشیت کے ساتھ ہے، اس لئے توکل بھی ضروری ہے اور اس کا تعلق بھی اسباب کے اختیار کرنے سے ہی ہے۔

بے شک رسول اللہ ﷺ نے تمام اسباب وذرائع کے لئے تیاری بھی کی اور تمام وسائل اختیار بھی کئے لیکن ساتھ ہی ساتھ آپؐ اللہ سے دعا بھی فرمارہے تھے اور اس سے نصرت ومدد طلب کررہے تھے کہ آپ کی کوششوں کو کامیاب کرے، اور اللہ تعالی دعا کو قبول فرماتا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہاں مشرکین غار کے دہانے پر کھڑے ہونے کے بعد واپس لوٹ جاتے ہیں اور سراقہ کا گھوڑا زمین میں دھنس جاتا ہے اور آپؐ کامیاب ہو جاتے ہیں۔(دیکھیں: من معین السیرۃ، ص148)

۵)حسّی اور ظاہری معجزات پر ایمان:

نبی کریم ﷺ کی ہجرت کے دوران بعض ظاہری اور حسّی معجزات ظاہر ہوئے اور وہ معجزات اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ اللہ تعالی آپ ﷺ کی حفاظت ونگہبانی کر رہا تھا، جیسے کہ غار کے دہانے پر مکڑی کا جالا بُننا، اُم معبدؓ کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ، سراقہ کا قصہ،

آپ ﷺ کا سراقہ سے وعدہ کرنا کہ وہ کسریٰ کے کنگن پہنیں گے، لہذا داعیانِ حق کی ذمہ داری ہے کہ ان معجزات اور خرقِ عادت واقعات کے ذکر سے گریز نہ کریں بلکہ ان کا ذکر کیا کریں بشر طیکہ یہ سنت نبویہ سے ثابت ہوں، لوگوں کے سامنے اس بات کو واضح کریں کہ یہ سب خوارق ہیں اور یہ آپ ﷺ کی رسالت و نبوت کے دلائل ہیں۔

۶) قابل اعتماد غیر مسلم سے استعانت کا جواز:

داعیانِ حق کے لئے جائز ہے کہ وہ ان لوگوں سے مدد حاصل کر سکتے ہیں جو دعوتِ حق پر ایمان نہ رکھتے ہوں بشر طیکہ وہ قابل اعتماد اور قابل بھروسہ ہوں، ہم دیکھتے ہیں کہ نبی ﷺ اور حضرت ابو بکرؓ نے ایک مشرک کو اجرت پر لیا تا کہ وہ انہیں ہجرت کے راستے کے بارے میں رہنمائی کرے، دونوں نے اس کو اپنی اپنی سواریاں بھی حوالے کر دیں اور اس سے غارِ ثور کے پاس ملنے کا وعدہ کیا، یہ انتہائی نازک اور حسّاس امور تھے جن کے بارے میں اس کو باخبر کیا گیا، بلاشبہ نبی کریم ﷺ اور حضرت ابو بکرؓ نے اس پر اعتماد کیا اور اس کی امانت داری پر بھروسہ کیا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ غیر مسلم، گناہ گار اور دینِ حق کو نہ ماننے والے بعض ایسی صلاحیتوں کے مالک ہو سکتے ہیں جن کی وجہ سے ان پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے، جیسے کہ ان کے ساتھ قرابت و رشتہ داری کا تعلق ہو، یا ان کے ساتھ قدیم تعلقات ہوں، یا پڑوسی ہوں، یا داعی نے ان کے ساتھ کوئی حسنِ سلوک کیا ہو، یا وہ بنیادی اخلاقیات کے حامل ہوں، جیسے کہ امانت داری، خیر کے کاموں سے محبت، بہر حال اس کا تعلق حالات اور صورتحال کے ساتھ ہے جس کا فیصلہ داعی وقت اور ضرورت کے اعتبار سے کر سکتا ہے۔ (المستفاد من قصص القرآن 2/108)

۷) ہجرت میں خواتین کا کردار:

آسمانِ ہجرت پر بہت سے نام روشن ہوئے جن کا ہجرت میں کافی اہم کردار رہا ہے جن میں اہم نام یہ ہیں: حضرت عائشہ بنت ابی بکر صدیق ؓ جنہوں نے ہجرت کے مکمل واقعہ کو محفوظ اور یاد رکھا اور اس کو اُمت تک پہنچایا۔ حضرت اُم سلمہؓ جو انتہائی صبر کرنے والی مہاجر خاتون ہیں۔ ذات النطاقین حضرت اَسماءؓ جنہوں نے رسول ﷺ کو اور آپ کے ساتھی کو غار میں ضروریات، پانی اور غذا فراہم کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور انہوں نے اللہ کی راہ میں کتنی اذیتیں برداشت کیں ہیں اس کے بارے میں بیان کرتی ہیں کہ: "جب رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکرؓ نکلے تو قریش کے کچھ لوگ ہمارے پاس آئے، جن میں ابو جہل بن ہشام بھی تھا اور وہ حضرت ابو بکرؓ کے گھر کے دروازہ پر کھڑے ہو گئے، میں ان کی طرف نکلی تو انہوں نے پوچھا: اے ابو بکر کی صاحبزادی! آپ کے والد کہاں ہیں؟ فرماتی ہیں: میں نے کہا: واللہ مجھے معلوم نہیں کہ میرے والد کہاں ہیں!

فرماتی ہیں: یہ سن کر ابو جہل نے اپنا ہاتھ اٹھایا - وہ بہت بد گو اور خبیث تھا - اور اس نے میرے رخسار پر ایک تھپڑ مارا جس کی وجہ سے میری بالی گر گئی۔ فرماتی ہیں: اس کے بعد وہ چلے گئے۔ (تاریخ طبری 2/379 - 380، سیرت بن ہشام 2/131 - 132، الہجرۃ المبارکہ، ص126)

یہ حضرت اُسماءؓ کی طرف سے تمام مسلمان خواتین کے لئے ایک اہم درس ہے کہ کس طرح انہوں نے اعدائے اسلام سے ایک اہم راز کو پوشیدہ رکھا،اور ظلم وطغیان کی طاقتوں کے سامنے کس طرح صبر وثبات کے ساتھ کھڑی رہتی ہیں۔

ان کی طرف سے دوسرا اہم ترین سبق یہ ہے کہ جب ان کے دادا ابو قحافہ ان کے پاس آتے ہیں جب کہ وہ نابینا تھے، وہ کہتے ہیں: واللہ! مجھے لگتا ہے اپنی ذات کے ساتھ ساتھ اس (ابو بکر) نے اپنی جمع شدہ پونجی بھی ساتھ لے کر تمہیں بھی مشقت میں ڈال دیا ہے، حضرت اسماء نے کہا: دادا جان! نہیں، ایسی بات نہیں ہے، دیکھیں اس مال کو ہاتھ لگائیں۔ فرماتی ہیں: انہوں نے اس پر اپنا ہاتھ رکھا اور کہا: کوئی بات نہیں، اگر اس نے تمہارے لئے یہ چھوڑا ہے تو اچھا کیا ہے، اس میں تمہارا گزر بسر ہو جائے گا۔ حضرت اسماء فرماتی ہیں: حالانکہ واللہ! انہوں نے ہمارے لئے کچھ بھی نہیں چھوڑا تھا لیکن میں نے چاہا کہ شیخ کو اس کے ذریعہ تسلی دوں۔ (سیرت ابنِ ہشام 2/102)

اس ذہانت وحکمت کے ساتھ حضرت اُسماءؓ نے اپنے والد کا دفاع کیا، اور آپ نے جھوٹ بولے بغیر نابینا دادا کو مطمئن کیا، اس لئے کہ ان کے والد نے ان کے لئے واقعتاً کچھ پتھر رکھے تھے جن کو حضرت اُسماء نے باندھ کر رکھا تھا کہ ان کے ذریعہ شیخ کو مطمئن کر سکیں، البتہ حضرت ابو بکرؓ نے اس کے ساتھ ساتھ ان کے پاس ایسا ایمان چھوڑا تھا جس کو نہ پہاڑ ہلا سکتے تھے، نہ تیز وتند آندھیاں اس کو ختم کر سکتی تھیں، اور نہ ہی مال کی قلت وکثرت اس پر اثر انداز ہو سکتی تھی، ان کو لامحدود یقین اور اعتماد سے مالا مال کر رکھا تھا، ان کو عظیم ہمت وحوصلہ عطا کیا تھا جو عظیم مقصد اور نصب العین کے ساتھ مربوط تھا، اور اس کے سامنے چھوٹی چھوٹی چیزیں ہیچ اور معمولی تھیں، ان کو ایک مثالی مسلم گھرانہ بنایا تھا جس کی نظیر اور مثال ملنا مشکل ہے، حضرت اُسماءؓ نے ان مواقف کے ذریعہ خواتین اور مسلم بیٹیوں کے لئے ایسی مثالیں قائم کر دیں جن کی اقتداء وتقلید اور ان پر عمل پیرا ہونا ان کے لئے ضروری ہے۔

حضرت اسماءؓ اپنی بہنوں کے ساتھ مکہ مکرمہ میں زندگی گزارتی رہیں، نہ ان کو کسی تنگی کی شکایت تھی اور نہ ہی کسی کے سامنے کسی ضرورت کا اظہار کرتی تھیں، یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت زید بن حارثہ اور اپنے غلام حضرت ابو رافع کو مکہ بھیجا اور ان کو دو اونٹ اور پانچ سو درہم دئے تو ان دونوں نے آپ ﷺ کی صاحبزادیوں حضرت فاطمہؓ، حضرت ام کلثومؓ اور آپ ﷺ کی زوجہ مطہرہ حضرت سودہ بنت زمعہؓ اور حضرت اسامہ بن زیدؓ اور آپؐ کی رضاعی ماں حضرت برکہ۔ جن کی کنیت اُم ایمن تھی۔ سب کو آپ کے پاس لایا، اور ان کے ساتھ حضرت ابو بکرؓ کے گھر والوں کو لے کر حضرت عبد اللہ بن ابی بکرؓ لے کر آئے جن میں حضرت عائشہؓ اور حضرت اسماءؓ بھی تھیں، یہ سب لوگ مدینہ پہنچے اور ان کو حضرت حارثہ بن نعمانؓ کے گھر میں ٹھہرایا۔ (الہجرۃ النبویہ المبارکہ، ص126)

۸) رسول اللہ ﷺ کے پاس مشرکین کی امانتیں:

مشرکین کا رسول اللہ ﷺ کے پاس اپنی امانتیں رکھنا حالانکہ وہ آپ ﷺ کے خلاف برسرپیکار اور آپؐ کی جان کے درپے تھے، اس میں ان کے عجیب تضاد کی واضح دلیل ہے، ایک طرف تو وہ لوگ آپؐ کی تکذیب کرتے تھے اور آپؐ کو ساحر، مجنون، کذّاب کہتے تھے اور دوسری طرف ان کو اپنے آس پاس آپؐ سے زیادہ امانت دار اور سچا شخص بھی نہیں ملتا تھا، وہ اپنی چیزیں اور اپنا مال آپؐ کے پاس بطورِ امانت رکھتے تھے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا انکار اس لئے نہیں تھا کہ ان کو آپؐ کی صداقت وسچائی کے بارے میں کوئی شک تھا، بلکہ یہ

کفر وانکار ان کے غرور اور تکبر کی وجہ سے اور اپنی لیڈری اور سرکشی کے ختم ہونے کے ڈر سے تھا، اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے: ﴿قَدْ نَعْلَمُ إِنَّهُۥ لَيَحْزُنُكَ ٱلَّذِى يَقُولُونَ ۖ فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَٰكِنَّ ٱلظَّٰلِمِينَ بِـَٔايَٰتِ ٱللَّهِ يَجْحَدُونَ﴾ ترجمہ: ''اے محمدؐ! ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان سے تمہیں رنج ہوتا ہے، لیکن یہ لوگ تمہیں نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم دراصل اللہ کی آیات کا انکار کررہے ہیں''۔(سورۃ الانعام:33) (دیکھیں: فقہ السیرۃ، ڈاکٹر محمد سعید رمضان البوطی، ص193)

اس کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ حضرت علیؓ کو امانتوں کی ادائیگی کی ذمہ داری سونپتے ہیں، حالانکہ حالات انتہائی کشیدہ تھے جن میں کچھ بھی ہو سکتا تھا، اور اس وقت تو ایک ہی فکر دامن گیر تھی کہ ہجرت کے منصوبہ کو کیسے پائے تکمیل تک پہنچایا جائے، لیکن ایسے حالات میں بھی رسول اللہ ﷺ امانتوں کو نہیں بھولتے ہیں بلکہ ان کے مستحقین تک پہنچانے کی پوری منصوبہ بندی کرتے ہیں، حالانکہ حالات ایسے تھے کہ ان میں انسان اپنی ذات سے بھی غافل ہو جاتا ہے۔(الھجرۃ فی القرآن الکریم، ص،364)

۹) قیمت کے بدلے سواری:

رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو بکرؓ سے اس وقت تک سواری کو لینا قبول نہیں کیا یہاں تک کہ قیمتاً اس کو لینے کی بات نہیں ہوئی اور یہ قیمت رسول اللہ ﷺ کے ذمہ قرض اور واجب الاداء رہی، اس میں اس بات کا واضح سبق موجود ہے کہ داعیانِ حق کو کسی بھی وقت کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہیے، بلکہ وہ خود دوسروں کو دینے والے لوگ بنیں، اگر ان کا ہاتھ دینے والا نہ بھی بن سکے تو وہ لینے والا بھی نہیں ہونا چاہیے یہی آپ کا ہجرت کے موقع کا بھی طرز عمل ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس قول کی حقیقی ترجمانی ہے کہ: ﴿وَمَآ أَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۖ إِنْ أَجْرِىَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ ٱلْعَٰلَمِينَ﴾ ترجمہ: ''میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں، میرا اجر تو رب العالمین کے ذمہ ہے''۔(سورۃ الشعراء:109)

بے شک حق کی وہ آواز جو اللہ کے خوف اور اس کی رضاجوئی کے نتیجہ میں نکلے گی وہ اس آواز سے مختلف ہو گی جو اس لئے نکل رہی ہو کہ اس کے ذریعہ کوئی مادی فائدہ درہم و دینار اور پیسے کی شکل میں حاصل ہوگا، جب مادی فائدہ بند ہو جائے گا تو آواز بھی بند ہو جائے گی، پرانی کہاوت ہے کہ: "اجرت پر نوحہ کرنے والی غمزدہ کی طرح نہیں ہو سکتی ہے"۔ یہی وجہ ہے کہ دعوت کا اثر بھی کم ہو رہا ہے اور لوگ راہِ حق سے دور ہو رہے ہیں۔(من معین السیرۃ، ص148 - 149)

۱۰) داعی کی لوگوں کے مال سے بے نیازی:

جب نبی کریم ﷺ نے سراقہ کو معاف کر دیا تو سراقہ نے آپ ﷺ کو مدد کی پیشکش کی، اس نے کہا: یہ میرا ترکش ہے اس میں سے تیر لے لیجئے اور آپ فلاں مقام پر میرے اونٹوں اور بکریوں کے پاس سے گزریں گے تو ان میں سے اپنی ضرورت کے بقدر لے لیجئے، آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔(مسند أحمد:1/3، صحیح مسلم:3014، صحیح بخاری: 3906)

داعی جب لوگوں کے مال ودولت سے بے نیازی اختیار کرتے ہیں تو لوگ ان سے محبت کرتے ہیں، اور جب وہ لوگوں کے مال کا لالچ کرتے ہیں تو لوگ ان سے متنفر اور بیزار ہوتے ہیں، اس میں داعیانِ حق کے لئے اہم سبق موجود ہے۔

۱۱) عظیم سپاہیانہ کردار اور خوشی کا رونا:

حضرت ابو بکر صدیق ؓ اور حضرت علی بن ابی طالب ؓ کے سپاہیانہ کردار میں نبوی تربیت کے اثرات بالکل نمایاں ہیں، حضرت ابو بکر صدیق ؓ نے جب مدینہ کی جانب ہجرت کرنے کا ارادہ کیا اور اللہ کے رسول ﷺ نے ان سے فرمایا کہ جلدی نہ کریں امید ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو کوئی ہمسفر عطا کرے، یہ سنتے ہی حضرت ابو بکر ؓ نے ہجرت کی منصوبہ بندی اور تیاری شروع کر دی، انہوں نے دو سواریاں خریدیں اور گھر میں ان کو چارہ کھلاتے رہے، صحیح بخاری کی روایت میں ہے: "اور وہ اپنے پاس موجود دو سواریوں کو ببول کے پتے چار ماہ تک کھلاتے رہے۔ (صحیح بخاری: 3905، الدلائل للبیہقی: 2/473) حضرت ابو بکر صدیق ؓ اپنی نگاہِ دور رس کے ذریعہ سمجھ رہے تھے کہ ہجرت کا لمحہ انتہائی مشکل لمحہ ہے اور وہ اچانک آسکتا ہے، اسی لئے انہوں نے ہجرت کے اسباب اور ذرائع مہیا کر کے رکھے، نقل وحرکت کی ترتیبات مکمل کیں اور اپنے گھرانے کو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں لگا دیا، اور جب رسول ﷺ تشریف لائے اور آپ ؐ نے انہیں بتایا کہ ہجرت کی اجازت مل گئی ہے تو حضرت ابو بکر ؓ خوشی کے مارے رو پڑے، حضرت عائشہ ؓ اس سلسلہ میں فرماتی ہیں: واللہ! مجھے اس سے پہلے کبھی یہ دیکھنے میں نہیں آیا کہ کوئی شخص خوشی کے مارے رو سکتا ہے یہاں تک کہ میں نے اس روز حضرت ابو بکر ؓ کو روتے ہوئے دیکھا"۔ یہ تو انسان کی خوشی کی انتہا ہے کہ خوشی رونے میں بدل جائے، جیسے کہ ایک شاعر اس منظر کو بیان کرتا ہے:

وَرَدَ الْكِتَابُ مِنْ الْحَبِيبِ بِأَنَّهُ ... سَيَزُورُنِي فَاسْتَعْبَرَتْ أَجْفَانِي
غَلَبَ السُّرُورُ عَلَيّ حَتّى إِنّهُ ... مِنْ فَرْطِ مَا قَدْ سَرّنِي أَبْكَانِي
يَا عَيْنُ صَارَ الدّمْعُ عِنْدَكَ عَادَةً ... تَبْكِينَ فِي فَرَحٍ وَفِي أَحْزَانِ

ترجمہ: ''محبوب کی طرف سے پیغام آیا ہے کہ وہ عنقریب مجھ سے ملاقات کیلئے آئے گا تو میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں۔ میں خوشی کی وجہ سے اتنا بے بس ہو گیا یہاں تک کہ خوشی کے مارے میں رونے لگا۔ اے آنکھ! آنسو بہانا تمہاری عادت بن گئی ہے، تم خوشی کی وجہ سے بھی روتی ہو اور غم کی وجہ سے بھی رو پڑتی ہو''۔

حضرت صدیق اکبر ؓ جانتے تھے کہ اس رفاقت وصحبت کا مطلب یہ ہے کہ ان کو رب العالمین کے رسول کی رفاقت کا شرف حاصل ہونے والا ہے، اور انہی کو یہ شرف بھی حاصل ہو گا کہ وہ اپنی زندگی کے قیمتی ایام اپنے قائد اور حبیب مصطفیٰ ﷺ کی خدمت کے لئے پیش کریں گے، اس دنیا میں اس سے بڑی کامیابی اور اعزاز کیا ہو سکتا ہے کہ پوری روئے زمین کے انسانوں اور تمام صحابہ کرام میں سے تنہا حضرت صدیق اکبر ؓ کو اس مرحلہ میں سید الخلق ﷺ کی رفاقت اور صحبت کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ (التربیۃ القیادیۃ، 2/191 - 192)

حضرت ابو بکر صدیق ؓ کی محبت کے احساسات کا اظہار اس وقت بھی ہوتا ہے جبکہ غار میں ان کو خوف لاحق ہوتا ہے کہ کہیں مشرکین ان دونوں کو دیکھ نہ لیں، اس وقت حضرت ابو بکر ؓ کو اپنی ذات کے بارے میں خوف نہیں تھا، اگر ایسا ہوتا تو وہ پھر اس سفر میں رسول اللہ ﷺ

کے ساتھ نہ ہوتے، اس لئے کہ انہیں ادراک تھا کہ اس ہجرت کی کم سے کم سزا قتل ہے اگر مشرکین ان کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، بلکہ وہ فی الحقیقت رسول اللہ ﷺ کے بارے میں اور اسلام کے مستقبل کے بارے میں خوف زدہ تھے کہ کہیں رسول اللہ ﷺ مشرکین کے ہاتھوں گرفتار نہ ہو جائیں۔(السیرۃ النبویۃ، دروس وعبر، للسباعی، ص 71)

اسی طرح نبی کریم ﷺ کے ساتھ ہجرت کرتے ہوئے حضرت ابو بکرؓ کی حد درجہ کی احتیاط اور رازداری بہت سے مقامات پر ظاہر ہوتی ہے، جیسے کہ جب ایک پوچھنے والے نے ان سے دریافت کیا کہ آپ کے آگے آگے یہ کون شخص ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا: یہ مجھے راستہ دکھانے والا شخص ہے، پوچھنے والا یہ سمجھا کہ صدیقِ اکبر عام راستہ مراد لے رہے ہیں، حالانکہ ان کی مراد خیر کا راستہ تھا۔(صحیح بخاری: 3911) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ توریہ سے کام لے رہے تھے اور اس کے ذریعہ احتیاط و رازداری مطلوب تھی۔

حضرت علی بن ابی طالبؓ کے کردار میں ایک مخلص اور اسلام کے سچے سپاہی کا نمونہ ملتا ہے، انہوں نے اپنے قائد کے لئے اپنی جان پیش کی، اس لئے کہ قائد کی سلامتی میں دعوت کی سلامتی ہے اور قائد کی ہلاکت میں دعوت کا خاتمہ ہے، انہوں نے ہجرت کی رات رسول اللہ ﷺ کے بستر پر سو کر یہی کردار ادا کیا، اس لئے کہ اس بات کا قوی امکان تھا کہ قریش کے جوانوں کی تلواروں کے وار حضرت علیؓ پر ہوتے، لیکن حضرت علیؓ نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی، ان کے لئے یہی بات کافی تھی کہ رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی ہر قسم کی تکلیف سے محفوظ رہے۔(السیرۃ النبویہ، السباعی، ص:68)

۱۲)راستہ میں حضرت بُریدہ اُسلمی کا اپنی قوم کے ساتھ قبولِ اسلام:

وہ مسلمان جس کے رگ وپے میں دعوت رچ بس گئی ہو وہ کسی بھی وقت لوگوں کو اللہ کے دین کی طرف دعوت دینے میں غفلت نہیں برتتا ہے، چاہے حالات کتنے ہی سخت اور ناساز کیوں نہ ہوں، بلکہ وہ ہر موقع کو دعوت الی اللہ کے لئے غنیمت سمجھتا ہے، جیسے کہ اللہ کے نبی یوسف علیہ السلام جیل میں مقید تھے اور وہاں قیدیوں کے ساتھ ملاقات ہوئی تو اس تاریک اور مظلومانہ مرحلہ میں بھی انہوں نے دعوت دینے میں غفلت نہیں برتی، جیسے کہ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿قَالَ لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِهِۦٓ إِلَّا نَبَّأْتُكُمَا بِتَأْوِيلِهِۦ قَبْلَ أَن يَأْتِيَكُمَا ۚ ذَٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِى رَبِّىٓ ۚ إِنِّى تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُونَ بِٱللَّهِ وَهُم بِٱلْءَاخِرَةِ هُمْ كَٰفِرُونَ ﴿٣٧﴾ وَٱتَّبَعْتُ مِلَّةَ ءَابَآءِىٓ إِبْرَٰهِيمَ وَإِسْحَٰقَ وَيَعْقُوبَ ۚ مَا كَانَ لَنَآ أَن نُّشْرِكَ بِٱللَّهِ مِن شَىْءٍ ۚ ذَٰلِكَ مِن فَضْلِ ٱللَّهِ عَلَيْنَا وَعَلَى ٱلنَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ ٱلنَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ﴿٣٨﴾ يَٰصَىٰحِبَىِ ٱلسِّجْنِ ءَأَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ ٱللَّهُ ٱلْوَٰحِدُ ٱلْقَهَّارُ ﴿٣٩﴾ مَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِهِۦٓ إِلَّآ أَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوهَآ أَنتُمْ وَءَابَآؤُكُم مَّآ أَنزَلَ ٱللَّهُ بِهَا مِن سُلْطَٰنٍ ۚ إِنِ ٱلْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۚ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوٓا۟ إِلَّآ إِيَّاهُ ۚ ذَٰلِكَ ٱلدِّينُ ٱلْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ ٱلنَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٤٠﴾﴾ ترجمہ: "یوسفؑ نے کہا: "یہاں جو کھانا تمہیں ملا کرتا ہے اس کے آنے سے پہلے میں تمہیں اِن خوابوں کی تعبیر بتادوں گا یہ علم اُن علوم میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے عطا کئے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ میں نے اُن لوگوں کا طریقہ چھوڑ کر جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور آخرت کا انکار کرتے

ہیں، اپنے بزرگوں، ابراہیمؑ، اسحاقؑ اور یعقوبؑ کا طریقہ اختیار کیا ہے، ہمارا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں، درحقیقت یہ اللہ کا فضل ہے ہم پر اور تمام انسانوں پر (کہ اس نے اپنے سوا کسی کا بندہ ہمیں نہیں بنایا) مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ اے زنداں کے ساتھیو، تم خود ہی سوچو کہ بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے؟۔ اُس کو چھوڑ کر تم جن کی بندگی کر رہے ہو وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ بس چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباء واجداد نے رکھ لئے ہیں، اللہ نے ان کے لئے کوئی سند نازل نہیں کی، فرماں روائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لئے نہیں ہے، اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو، یہی ٹھیٹھ سیدھا طریق زندگی ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں"۔ (سورۂ یوسف: 37 - 40)

سورہ یوسف مکی سورت ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول محمد ﷺ کو اس کے ذریعہ حکم دیا کہ دعوت الی اللہ کے سلسلہ میں انبیاء ومرسلین کی اقتداء کریں، اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت کے دوران بھی اپنی ذمہ داری اور پیغامِ حق سے غافل نہیں ہوتے ہیں، حالانکہ آپ کو جلاوطن کر دیا گیا تھا، مشرکین آپ ﷺ کے خون کے پیاسے تھے، اور آپ کو زندہ یا مردہ لانے والے کے لئے انہوں نے کافی انعام رکھا تھا، چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ کی ملاقات راستے میں ایک شخص کے ساتھ ہوئی جن کا نام بُریدہ بن حُصیب اَسلمی تھا، وہ اپنی قوم کے ایک قافلہ کے ساتھ تھے، آپ ﷺ نے ان کو اسلام کی دعوت دی اور وہ ایمان لائے اور حلقہ بگوش اسلام ہوگئے۔ (دیکھیں: الہجرۃ النبویہ، ابو فارس، ص: 59، شرح المواھب اللدنیۃ 1/405)

علامہ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں کہ مدینہ کی طرف ہجرت کے راستہ میں نبی کریم ﷺ کی ملاقات بُریدہ بن حُصیب بن عبداللہ بن حارث اسلمی کے ساتھ ہوئی، آپ ﷺ نے ان کو اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے اسلام قبول کیا اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سولہ غزوات میں شرکت کی، اور حضرت بریدہؓ اس کے بعد اسلام کے داعی بن گئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی قوم "اَسلم" کے لئے ان کے ذریعہ ہدایت کے دروازے کھول دیئے اور وہ سب اسلام کی طرف مائل ہوئے اور ان کو نبوی تمغہ بھی ملا جس کے ذریعہ ہمیں لوگوں کی شخصیت سمجھنے کا ایک انوکھا منہج سیکھنے کا موقع ملتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: "اَسلم" کو اللہ سلامت رکھے، غفار کی مغفرت فرمائے، یہ میں نے خود نہیں کہا ہے بلکہ یہ اللہ کا قول ہے۔ (صحیح بُخاری: 3514، صحیح مسلم: 2516)

۱۳) ہجرت کے راستہ میں رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ دوڈاکوؤں کا قبولِ اسلام:

مدینہ کے قریب رسول اللہ ﷺ کے ہجرت کے راستہ میں قبیلۂ اَسلم کے دوڈاکو رہتے تھے ان کو "مهانان" (ذلیل ورسوا) کہا جاتا تھا، رسول ﷺ ان کے پاس تشریف لے گئے، ان کے سامنے اسلام پیش کیا تو ان دونوں نے اسلام قبول کر لیا، آپؐ نے ان سے ان کا نام دریافت کیا تو انہوں نے کہا: ہم "مهانان" (ذلیل ورسوا) ہیں۔ یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، بلکہ آپ دونوں" مکرمان" قابل عزت ومکرم ہو۔ آپ ﷺ نے ان دونوں سے فرمایا کہ مدینہ میں آکر آپؐ سے ملاقات کرلیں۔ (مسند احمد: 4/74)

اس روایت کے ذریعہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ دعوت الی اللہ کا کس قدر اہتمام فرماتے تھے، آپ ﷺ نے اپنے سفر کے دوران موقع کو غنیمت سمجھا اور دوڈاکوؤں کو اسلام کی دعوت دی اور وہ دونوں اسلام میں داخل ہوگئے، یہ دوڈاکو لوٹ مار اور پکڑ دھکڑ

والی زندگی گزارتے تھے لیکن اس کے باوجود ان کا اسلام قبول کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ دل حق کی طرف کس قدر جلدی متوجہ ہوتے ہیں بشرطیکہ کوئی صدق واخلاص کے ساتھ حق کو پیش کرنے والا ہو اور سننے والا ہر قسم کی خواہشات اور تعصب سے بالاتر ہو، آپ ﷺ نے ان دونوں کا نام تبدیل کر دیا، اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو دوسروں کے جذبات واحساسات، ان کی نفسیات اور عزت وتکریم کا کس قدر خیال تھا۔

بلاشبہ انسان کی نفسیات اور احساسات کو بلند کرنے کے ذریعہ شخصیت کو ایک قوت حاصل ہوتی ہے، اس کو آگے بڑھنے کا حوصلہ ملتا ہے اور وہ اپنے آپ کو عزت وتکریم کا حامل سمجھتا ہے۔ (دیکھیں: التاریخ الاسلامی، الحمیدی 3/178)

۱۴) حضرت زبیرؓ اور حضرت طلحہؓ کی ہجرت کے راستہ میں رسول ﷺ سے ملاقات:

مدینہ کے راستہ میں ایک واقعہ یہ بھی پیش آیا کہ رسول اللہ ﷺ کی ملاقات حضرت زبیر بن عوامؓ کے ساتھ ہوئی جو مسلمانوں کے ایک تجارتی قافلہ کے ساتھ شام سے واپس آرہے تھے، حضرت زبیرؓ نے رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکرؓ کو سفید کپڑے دیئے۔ (صحیح بخاری: 3906، الدلائل للبیہقی: 2/498، السیرۃ النبویہ، أبو شہبہ، 1/495) اسی طرح سیرت نگاروں نے بیان کیا ہے کہ حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ کی بھی ان دونوں حضرات سے ملاقات ہوئی جب کہ وہ شام سے واپس آرہے تھے اور حضرت طلحہؓ نے ان دونوں کو کچھ کپڑے دیئے۔ (الدلائل للبیہقی 2/498، السیرۃ النبویہ، أبو شہبہ، 1/495، صحیح السیرۃ النبویہ، ص 181)

۱۵) بے شک عداوت ونفرتوں کو ختم کرنے اور قلب وروح کو جوڑنے میں صحیح عقیدہ اور دینِ اسلام کی بہت اہمیت ہے، کسی بھی غلط عقیدہ کے لئے ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ اس طرح کا کردار ادا کر سکے، ہم دیکھتے ہیں کہ عقیدۂ اسلامی نے اوس اور خزرج کو متحد کر دیا، عرصۂ دراز سے ان کے مابین جاری معرکوں اور کشمکش کو ختم کر دیا اور مختصر مدت میں بہت سے مقدموں کی فائل کو بند کر دیا، اسی طرح ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ عقیدہ نے انصار کے دلوں میں کیا انقلاب برپا کر دیا، چنانچہ انہوں نے مہاجرین کا استقبال کھلے دلوں کے ساتھ کیا اور بے مثال طریقہ سے ان کے ساتھ مؤاخات کی جو قیامت تک کے لئے ضرب المثل بن گئی، دنیا میں کوئی ایسی فکر یا کوئی دوسرا شعار نہیں ہے جو اس طرح کا انقلاب پیدا کر سکے جیسے کہ اسلام کے صاف وشفاف عقیدہ نے پیدا کیا۔

اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اعدائے دین اس عقیدہ کو کمزور کرنے اور اس کی اثر انگیزی کو کم کرنے کے لئے مسلسل تگ ودو میں کیوں لگے رہتے ہیں اور صحیح عقیدہ کے متبادل کے طور پر عصبیت، وطنیت اور قومیت جیسے نعروں کو عام کرنے کی کوشش کیوں کرتے ہیں۔ (الہجرۃ النبویۃ المبارکہ، ص 405)

۱۶) نبی کریم ﷺ کی آمد پر مہاجرین وانصار کی خوشی:

یثرب میں موجود انصار ومہاجرین اہلِ ایمان رسول اللہ ﷺ کی بحفاظت آمد پر انتہائی خوش تھے، یہاں تک کہ خواتین اور بچے بھی اپنے گھروں سے باہر آگئے اور مردوں نے اپنے اپنے کام چھوڑ کر آپ ﷺ کا استقبال کیا، مدینہ کے یہود بھی وہاں کے تمام باشندوں کے

ساتھ ظاہری طور پر خوشی میں شریک تھے، لیکن اندرونی طور پر ان کو قیادت سے محرومی پر سخت تکلیف اور پریشانی لاحق تھی، جہاں تک تعلق ہے اہلِ ایمان کی خوشی کا تو یہ کوئی قابل تعجب بات نہیں ہے، اس لئے کہ آپ ﷺ نے ان کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف اور رب کریم کے راستہ کی طرف گامزن کیا، اور جہاں تک تعلق ہے یہود کے موقف کا، تو اس میں بھی کوئی تعجب نہیں ہیں، اس لئے کہ وہ معاشرہ میں چاپلوسی اور نفاق میں معروف رہے ہیں، وہ ہر اس شخص کے ساتھ غیظ وغضب اور بغض وکینہ رکھتے ہیں جو ان سے سیادت وقیادت چھیننے کی کوشش کرتا ہے، اور جو بھی لوگوں کو ان کے کنٹرول سے آزاد کرانے کی کوشش کرتا ہے اس کے خلاف سازشیں اور جان سے مارنے کی منصوبہ بندی کرتے ہیں، یہی ان کا دین اور یہی ان کی فطرت ہے۔(دیکھیں: السیرۃ النبویہ السباعی، ص43، الہجرۃ فی القرآن الکریم، ص367)

مدینہ میں رسول اللہ ﷺ کے استقبال کے ذریعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ امراء اور علماء کا عزت واحترام کے ساتھ استقبال کرنا مشروع ہے، مدینہ میں آپ ﷺ کا استقبال کیا گیا اور یہ عزت وتکریم رسول اللہ ﷺ سے محبت کا نتیجہ تھی، جبکہ موجودہ زمانہ میں زعماء اور حکام کا استقبال خوف اور ڈر کی وجہ سے کیا جاتا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ علم وفضل اور اصحابِ خیر کے اکرام ومیزبانی میں ایک دوسرے سے سبقت لینے کی کوشش کرنا درست ہے، اس لئے کہ ہر قبیلہ رسول اللہ ﷺ کی میزبانی کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس بات کی پیشکش کر رہا تھا کہ اس کے جوان رسول اللہ ﷺ کی حفاظت وحراست کا کام انجام دیں۔(السیرۃ النبویہ ابو فارس، ص، 358-359)

۱۷) ہجرت اور اسراء ومعراج کے درمیان موازنہ:

ہجرتِ نبوی اسی طریقہ پر تکمیل کو پہنچی جیسے کہ سیرت میں اس کا ذکر موجود ہے اور ہر مہاجر جیسے ہجرت کرتا ہے اسی طریقہ سے آپ ﷺ نے بھی ہجرت کی، تاکہ اہلِ ایمان کے لئے اسوہ اور نمونہ قائم ہو سکے اور وہ پھر اسی معروف اور مالوف راستہ پر چل سکیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر 'براق' نہیں بھیجا کہ آپ براق پر ہجرت کرتے، جیسے کہ اسراء کی رات میں ہوا، حالانکہ رسول اللہ ﷺ کو ہجرت کے وقت براق کی سب سے زیادہ ضرورت تھی، اس لئے کہ دشمن آپ ﷺ کی گھات میں لگے ہوئے تھے، جبکہ اسراء کی رات آپ ﷺ کو کوئی خطرہ نہیں تھا، اگر ہجرت کے موقع پر آپ ﷺ مشرکین کے ہاتھ لگ جاتے تو وہ اپنے دل کی آگ بجھالیتے۔

اس میں حکمت یہ ہے کہ -واللہ أعلم- ہجرت دعوتی مراحل کا ایک فطری مرحلہ اور اس کی نشر واشاعت کا ایک اہم وسیلہ تھا، اور ہجرت رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مخصوص نہیں تھی، بلکہ دیگر اہلِ ایمان بھی اس کے مکلف تھے، جبکہ اسلام نے مہاجرین اور ہجرت پر قدرت رکھنے والے غیر مہاجرین کے درمیان ولایت ودوستی کا حکم بیان کیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَهَاجَرُواْ وَجَٰهَدُواْ بِأَمْوَٰلِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ وَٱلَّذِينَ ءَاوَواْ وَّنَصَرُوٓاْ أُوْلَٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَآءُ بَعْضٍۚ وَٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَلَمْ يُهَاجِرُواْ مَا لَكُم مِّن وَلَٰيَتِهِم مِّن شَيْءٍ حَتَّىٰ يُهَاجِرُواْۚ وَإِنِ ٱسْتَنصَرُوكُمْ فِي ٱلدِّينِ فَعَلَيْكُمُ ٱلنَّصْرُ إِلَّا عَلَىٰ قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَٰقٌۗ وَٱللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ﴾ ترجمہ: ''جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنی جانیں لڑائیں اور اپنے مال کھپائے، اور جن لوگوں نے ہجرت کرنے والوں کو جگہ دی اور ان کی مدد کی، وہی دراصل ایک دوسرے

کے ولی ہیں رہے، وہ لوگ جو ایمان تو لے آئے مگر ہجرت کر کے (دار الاسلام میں) آ نہیں گئے تو ان سے تمہارا ولایت کا کوئی تعلق نہیں ہے جب تک کہ وہ ہجرت کر کے نہ آ جائیں، ہاں اگر وہ دین کے معاملہ میں تم سے مدد مانگیں تو ان کی مدد کرنا تم پر فرض ہے، لیکن کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں جس سے تمہارا معاہدہ ہو جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھتا ہے"۔ (سورۃ الأنفال: 72)

اور جہاں تک اسراء و معراج کے سفر کا تعلق ہے تو وہ عزت و تکریم کا سفر تھا، یہ اللہ تعالی کی طرف سے اپنے نبی ﷺ کے لئے اکرام کا ایک طریقہ تھا، تاکہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ کو علم غیب پر مطلع کرلے اور آپ ؐ کو اپنی عظیم نشانیاں دکھائے، یہ سفر اول تا آخر معجزات و خوارق اور غیبی مناظر پر مشتمل تھا، اس لئے اس کا وسیلہ اور ذریعہ بھی اس کے مقصد کے مطابق تھا۔

علاوہ ازیں اسراء کا سفر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مخصوص تھا، لوگوں میں سے کسی کے لئے اس طرح کے سفر کا امکان نہیں تھا اور نہ ہی اس میں ہم سے اقتداء و پیروی کا مطالبہ ہے، اسی لئے اس میں وہی طریقہ اختیار کیا گیا جو اس کے لئے مناسب تھا۔ (تأملات فی سیرت الرسول ﷺ، محمد سید الوکیل، ص 103- 104)

۱۸) تدریج اور مرحلہ وار عمل کرنے کا طریقہ کار:

ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی ملاقات جب انصار کے ابتدائی وفود سے ہوئی تو آپ ؐ نے صرف انہیں اسلام کی ترغیب دی، اور قرآن کریم ان کو پڑھ کر سنایا اور جب وہ دوسرے سال آئے تو آپ ؐ نے ان کے ساتھ خواتین سے بیعت لینے کی طرح صرف عبادات و اخلاق اور فضائل پر عمل کرنے کی بیعت لی، اور پھر جب وہ تیسرے سال آئے تو بیعت عقبہ ثانیہ ہوئی جس میں جہاد، نصرت اور آپ ﷺ کو پناہ دینے کی دفعات شامل کی گئیں۔ (دیکھیں: الھجرۃ النبویہ المبارکہ، ص: 202)

قابل غور بات یہ ہے کہ جہاد کی بیعت مکمل دو سال گزرنے کے بعد کی گئی، یعنی تربیت و تیاری کے مکمل دو سال گزرنے کے بعد، اس طرح اس میں بھی تدریج اور مرحلہ وارانہ طرز عمل کو اختیار کیا گیا، جس کو دعوت کے تربیتی منہج میں پہلے ہی دن سے پیش نظر رکھا گیا۔ (دیکھیں: بناء المجتمع الاسلامی فی عصر النبوۃ، محمد توفیق، ص: 119)

بے شک یہی وہ منہج اور طریقہ کار ہے جس کو اختیار کرنے کا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو پابند بنایا تھا، چنانچہ پہلی بیعت میں ان نو واردانِ اسلام انصار سے رسول اللہ ﷺ نے عقیدہ کی، نظام کی اور تربیت کی بیعت لی، اور دوسری بیعت میں دعوت کی، نصرت و حمایت کرنے اور اسلامی معاشرہ کو اپنانے اور پناہ دینے کی بیعت ہوئی، کیونکہ اسلامی معاشرہ اب ثمر آور درخت کی شکل اختیار کر چکا تھا اور قوت و استحکام کے اعتبار سے اس کی بنیادیں مضبوط ہو رہی تھیں۔

بیعت کی یہ دونوں قسمیں تحریکِ اسلامی کے تربیتی منہج میں ایک دوسرے کے لئے تکمیلی اعمال ہیں، پہلا عمل اصل مضمون اور تصور پر مشتمل ہے جب کہ دوسرا عمل - جہاد کی بیعت - ایک ایسی حفاظتی چہار دیواری ہے جو اس مضمون اور تصور کی حفاظت و حمایت کا کام کرتی ہے۔

یہ بھی قابل غور ہے کہ جہاد کی بیعت اس سے پہلے کسی مسلمان سے نہیں لی گئی، بلکہ یہ اس وقت لی گئی جب دعوت کو اس طرح کے انصار و مددگار مل گئے اور زمین پر ایک مناسب محفوظ جگہ مل گئی جہاں اسلام کے سپاہی مرکزیت کے ساتھ ہر کاروائی انجام دے سکتے تھے جبکہ مکہ میں اس طرح کے حالات ابھی سازگار نہیں تھے۔ (ایضاً، ص: 122-123)

پہلی بیعت ایمان باللہ اور ایمان بالرسول پر مشتمل تھی، جبکہ دوسری بیعت ہجرت و جہاد پر مشتمل تھی، اور ان تینوں عناصر یعنی ایمان باللہ، ہجرت اور جہاد کے ذریعہ ایک اجتماعی معاشرہ میں اسلام کا وجود متحقق ہوتا ہے اور ہجرت اس وقت تک ممکن نہیں تھی جب تک کے پناہ دینے والی ایک تیار جماعت موجود نہ ہوتی، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿إِنَّ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَهَاجَرُواْ وَجَٰهَدُواْ بِأَمۡوَٰلِهِمۡ وَأَنفُسِهِمۡ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ وَٱلَّذِينَ ءَاوَواْ وَّنَصَرُوٓاْ أُوْلَٰٓئِكَ بَعۡضُهُمۡ أَوۡلِيَآءُ بَعۡضٖۚ وَٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَلَمۡ يُهَاجِرُواْ مَا لَكُم مِّن وَلَٰيَتِهِم مِّن شَيۡءٍ حَتَّىٰ يُهَاجِرُواْۚ وَإِنِ ٱسۡتَنصَرُوكُمۡ فِي ٱلدِّينِ فَعَلَيۡكُمُ ٱلنَّصۡرُ إِلَّا عَلَىٰ قَوۡمِۭ بَيۡنَكُمۡ وَبَيۡنَهُم مِّيثَٰقٞۗ وَٱللَّهُ بِمَا تَعۡمَلُونَ بَصِيرٞ﴾

ترجمہ: ”جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنی جانیں لڑائیں اور اپنے مال کھپائے، اور جن لوگوں نے ہجرت کرنے والوں کو جگہ دی اور ان کی مدد کی، وہی دراصل ایک دوسرے کے ولی ہیں رہے، وہ لوگ جو ایمان تو لے آئے مگر ہجرت کر کے (دارالاسلام میں) آنہیں گئے تو ان سے تمہارا ولایت کا کوئی تعلق نہیں ہے جب تک کہ وہ ہجرت کر کے نہ آجائیں ، ہاں اگر وہ دین کے معاملہ میں تم سے مدد مانگیں تو ان کی مدد کرنا تم پر فرض ہے، لیکن کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں جس سے تمہارا معاہدہ ہو جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھتا ہے“۔ (سورۃ الانفال: 72)

دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: ﴿وَٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ مِنۢ بَعۡدُ وَهَاجَرُواْ وَجَٰهَدُواْ مَعَكُمۡ فَأُوْلَٰٓئِكَ مِنكُمۡۚ وَأُوْلُواْ ٱلۡأَرۡحَامِ بَعۡضُهُمۡ أَوۡلَىٰ بِبَعۡضٖ فِي كِتَٰبِ ٱللَّهِۚ إِنَّ ٱللَّهَ بِكُلِّ شَيۡءٍ عَلِيمُۢ﴾ ترجمہ: ”اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور ہجرت کر کے آگئے اور تمہارے ساتھ مل کر جدوجہد کرنے لگے وہ بھی تم ہی میں شامل ہیں ، مگر اللہ کی کتاب میں خون کے رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں، یقیناً اللہ ہر چیز کو جانتا ہے“۔ (سورۃ الانفال: 75)

بیعتِ جہاد مدینہ کی جانب نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کی ہجرت کے لئے ایک تمہیدی مرحلہ تھا، اسی کے نتیجہ میں اسلام کو ایک ایسا وطن مل گیا جہاں سے داعیانِ حق حکمت و موعظت کے ساتھ ہر چہار سو نکل سکتے تھے اور سپاہیانِ حق پہلی مرتبہ وہاں سے نکل کر اعلائے کلمۃ اللہ کا فریضہ انجام دے سکتے تھے اور وہاں اللہ کی شریعت کو نافذ کرنے والی اسلامی حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ (دیکھیں: الغرباء الاولون، ص198- 199)

۱۹)ہجرت اللہ کی راہ میں ایک عظیم قربانی ہے:

نبی کریم ﷺ اور آپ کے اصحاب کی بلد امین کی جانب ہجرت ایک عظیم قربانی ہے جس کو نبی کریم ﷺ نے اپنے اس ارشاد کے ذریعہ واضح فرمایاہے: "اللہ کی قسم! یقیناً تم اللہ کی زمین میں سب سے بہتر جگہ ہو اور اللہ کے نزدیک محبوب ترین سرزمین میں ہو، اور اگر مجھے یہاں سے نہ نکالا جاتا تو میں یہاں سے نہیں نکلتا"۔(مسند احمد:4/305، سنن ترمذی: 3925، سنن ابن ماجہ:3108)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپؐ وہاں اس حال میں تشریف لائے کہ وہاں روئے زمین کے دیگر مقامات کے مقابلہ میں بخار کی وبا سب سے زیادہ عام تھی اور اس کی وادی سے بدمزہ اور بدبودار پانی بہتا تھا، آپ ﷺ کے اصحاب وہاں وبا اور بیماری میں مبتلا ہوگئے، جبکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو اس سے محفوظ رکھا، فرماتی ہیں: ابو بکر صدیقؓ، عامر بن فہیرہؓ اور بلالؓ ایک ہی گھر میں رہتے تھے، وہ سب بخار میں مبتلا ہوگئے، میں نے رسول اللہ ﷺ سے ان کی عیادت کرنے کی اجازت طلب کی تو آپؐ نے اجازت دے دی، میں عیادت کی غرض سے ان کے پاس حاضر ہوئی اور یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ ابھی حجاب کا حکم نازل نہیں ہوا تھا، وہ بخار کی شدت کی وجہ سے انتہائی پریشان تھے جس کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے، میں حضرت ابو بکرؓ کے قریب گئی تو میں نے عرض کیا: ابا جان! کیسا محسوس کررہے ہیں؟ انہوں نے یہ شعر پڑھا:

كُلُّ امرئٍ مصبَّح فِي أَهْلِه ··· والْموت أَدنى من شراك نعله

ترجمہ: "ہر آدمی اپنے گھر والوں کے ساتھ صبح کرتا ہے، حالانکہ اس کی موت اس کے جوتے کے تسمے سے بھی زیادہ قریب ہوتی ہے"۔ فرماتی ہیں: میں نے کہا: میرے والد کو پتہ نہیں چل رہا ہے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ اس کے بعد میں عامر بن فہیرہؓ کے قریب گئی اور میں نے کہا: اے عامر! اپنے آپ کو کیسا محسوس کررہے ہو؟ انہوں نے یہ اشعار پڑھے:

لَقَدْ وجدت الموت قبل ذَوْقه ··· إنَّ الجبانَ حَتفه من فَوْقه

كلُّ امرئٍ مُجاهدٌ بطوقه ··· كالثَّور يحمي جلده بروقه

ترجمہ: "یقیناً موت کا مزہ چکھنے سے پہلے ہی میں نے اس کا مزہ چکھ لیا، بزدل کی موت تو اس کے اوپر سے حملہ آور ہوتی ہے۔ ہر انسان اپنی طاقت اور استطاعت کے بقدر کوشش کرتا رہتا ہے، اس بیل کی طرح جو اپنے سینگ سے اپنی کھال کو گرم کرتا ہے"۔

فرماتی ہیں: میں نے کہا: واللہ عامر کو پتہ نہیں چل رہا ہے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ فرماتی ہیں: اور بلالؓ کا بخار جب اترتا تو وہ گھر کے صحن میں لیٹ جاتے تھے اور بلند آواز سے یہ اشعار پڑھتے تھے:

ألا ليت شعرى هل أبيتن ليلة ... بواد وحولى إذخر وجليل

وهل أردن يوما مياه مجنة ... وهل يبدون لى شامة وطفيل

ترجمہ: "کاش میں ایک رات مکہ کی وادی میں گزار سکتا اور میرے چاروں طرف اذخر اور جلیل (گھاس) ہوتی۔ کاش ایک دن میں مجنّہ کے پانی پر پہنچتا اور کاش میں شامہ اور طفیل (پہاڑوں) کو دیکھ سکتا"۔

فرماتی ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ سب صورت حال بتادی تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے اللہ ہمارے نزدیک مدینہ کو ویسے ہی محبوب بنا جیسے تو نے مکہ کو ہمارے لئے محبوب بنایا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ، یہاں کے بخار کو جحفہ کی طرف منتقل فرما، اے اللہ! ہمارے مد اور صاع میں برکت عطا فرما۔(صحیح بخاری: 1889، صحیح مسلم:1376)

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی دعا کو شرف قبولیت عطا کیا اور اس کے بعد مسلمانوں کو اس وبائی بخار سے عافیت مل گئی اور مدینہ منورہ تمام نوواردوں اور مہاجرین کے لئے ایک منفرد و ممتاز وطن بن گیا۔(التربیۃ القیادیۃ، 2/310)

۲۰) نبی کریم ﷺ کا حضرت اُم معبد کو مکافات وبدلہ:

روایت میں منقول ہے کہ حضرت ام معبدؓ کی بکریاں بڑھ گئیں اور ان میں اضافہ ہوا، یہاں تک کہ وہ ان کا ایک ریوڑھ مدینہ منورہ لے کر آئیں، حضرت ابو بکرؓ گزر رہے تھے تو حضرت اُم معبد کے صاحبزادے نے ان کو دیکھا تو اُن کو پہچان لیا، وہ پکار اٹھا: اے امی جان! یہ وہی شخص ہے جو مبارک شخص کے ساتھ تھا۔ یہ سن کر وہ ان کے پاس گئیں اور کہا: اے اللہ کے بندے! وہ شخص کون تھا جو آپ کے ساتھ تھا؟ انہوں نے جواب دیا: آپ نہیں جانتی ہیں کہ وہ کون ہیں؟! انہوں نے کہا: نہیں! حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا: وہ اللہ کے نبی ہیں۔ اس کے بعد ان کو آپ ﷺ کے پاس لے گئے، آپؐ نے ان کو کھانا کھلایا اور ان کو کھانا ساتھ بھی دیا۔

ایک روایت میں ہے: وہ میرے ساتھ آئیں اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو کچھ پنیر اور دیہات کا کچھ سامان ہدیہ میں دیا، آپؐ نے ان کو کپڑے پہنائے اور اُن کو ہدیہ دیا۔ راوی کہتے ہیں: انہوں نے یہ بھی فرمایا: اور انہوں نے اسلام قبول کیا۔ صاحبِ "الوفاء" نے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے اور ان کے شوہر نے ہجرت کی اور ان کے بھائی خنیس نے اسلام قبول کیا اور فتح مکہ کے روز شہید ہوئے۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویہ، اُبو شھبہ:1/489 - 490)

۲۱) حضرت ابوایوب انصاریؓ اور یادگار واقعات:

حضرت ابوایوب انصاریؓ فرماتے ہیں: جب رسول اللہ ﷺ نے میرے گھر قیام کیا تو آپؐ نے گھر کی نچلی منزل میں قیام فرمایا جبکہ میں اور اُم ایوب اوپر والی منزل میں تھے، میں نے آپؐ سے عرض کیا: اے اللہ کے نبی! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں! مجھے یہ بات ناپسند ہے اور مجھ پر یہ بات گراں گزر رہی ہے کہ میں اوپر کے حصہ میں رہوں اور آپ ہمارے نیچے رہیں، لہذا آپ اوپر والے حصہ میں قیام فرمائیں اور ہم نیچے والے حصہ میں رہیں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اے ابوایوب! ہمارے لئے اور ہمارے پاس آنے جانے والوں کے لئے زیادہ مناسب یہ ہے کہ ہم گھر کے نچلے حصہ میں رہیں۔ حضرت ابوایوبؓ فرماتے ہیں: ہمارا ایک مٹکا ٹوٹ گیا، اس میں پانی تھا تو میں نے اور ام ایوب نے اپنی ایک چادر لی، ہمارے پاس اوڑھنے کے لئے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا، ہم اس کے ذریعہ پانی کو جذب کرنے لگے اس ڈر سے کہ کہیں رسول اللہ ﷺ پر پانی نہ ٹپک جائے جس سے آپ کو اذیت پہنچے گی۔ (سیرت ابن ہشام،2/144،السیرۃ النبویہ الصحیحہ،العمری 1/220)

۲۲)حضرت علیؓ کی ہجرت اور نئے معاشرہ میں اُمر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی:

حضرت علیؓ نے جب رسول اللہ ﷺ کی طرف سے تمام امانتیں لوگوں کو ادا کردیں تو وہ بھی رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچ گئے اور رسول اللہ ﷺ کو قبا پہنچے ہوئے دو یا تین راتیں گزر گئیں تھیں، وہ وہیں آپؐ کے ساتھ جا ملے، حضرت علیؓ نے بھی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ قبا میں قیام کیا، اس کے بعد نبی کریم ﷺ کے ساتھ ہی بروز جمعہ مدینہ تشریف لے گئے۔(السیرۃ النبویہ، اُبو شہبہ: 1/497)

حضرت علیؓ نے قبا کے قیام کے دوران ایک بے شوہر مسلمان خاتون کو دیکھا کہ ایک شخص رات میں اس کے پاس آتا ہے، دروازہ کھٹکھٹاتا ہے، وہ خاتون باہر نکلتی ہے، اور وہ شخص اس کو کچھ دیتا ہے اور یہ عورت اس سے وہ چیز لے لیتی ہے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ مجھے اس کے بارے میں کچھ شک ہو گیا، میں نے اس عورت سے کہا: اے اللہ کی بندی! یہ کون شخص ہے جو ہر رات کو دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اور آپ باہر نکلتی ہو اور وہ تمہیں کچھ دیتا ہے؟ مجھے معلوم نہیں کہ وہ کیا چیز ہے! آپ تو ایک مسلمان خاتون ہیں، آپ کا شوہر بھی نہیں ہے!۔ اس عورت نے جواب دیا: یہ سہل بن حنیف ہیں! ان کو معلوم ہے کہ میں ایسی خاتون ہوں جس کے پاس کام کاج کے لئے کوئی موجود نہیں ہے، جب شام ہوتی ہے تو یہ اپنی قوم کے بتوں کے پاس جاتے ہیں ان کو توڑتے ہیں اور ٹوٹا ہوا حصہ میرے پاس لے کر آتے ہیں اور کہتے ہیں: اس کو ایندھن بنالینا۔ جب حضرت سہلؓ کا عراق میں حضرت علیؓ کے پاس انتقال ہوا تو حضرت علیؓ حضرت سہلؓ کے اس واقعہ کا ذکر کیا کرتے تھے۔ (محمد رسول اللہ ﷺ، محمد صادق عرجون: 2/421)

۲۳)ہجرتِ نبوی تاریخ انسانی کا نقطۂ انقلاب:

مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی جانب ہجرت نبوی ایک عظیم واقعہ اور نقطۂ انقلاب تھا جس نے تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ دیا، زندگی کا سفر اور زندگی گزارنے کے مناہج اور طریقوں کو تبدیل کر دیا، مختلف قوانین، نظامہائے حیات، رسم و رواج، عادات و اخلاق، انفرادی اور اجتماعی طرزِ زندگی، عقائد، عبادات، علوم و معارف، جہالت و گمراہی، ہدایت، عدل و انصاف اور ظلم و زیادتی کی مختلف شکلوں کے ماتحت جو زندگی بسر ہو رہی تھی اس کو یکسر تبدیل کر دیا۔(اُیضا 423/2)

۲۴)ہجرت انبیائے کرام کی عظیم سنت:

بے شک اللہ کے راستے میں ہجرت کرنا ایک قدیم سنت ہے، ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ کی ہجرت کوئی نئی چیز نہیں تھی جو سابق انبیاء کی زندگیوں میں نہ پائی گئی ہو، اگر آپ ﷺ نے اپنے وطن اور جائے پیدائش سے اس لئے ہجرت فرمائی تاکہ دعوت حق کی حفاظت کی جائے اور اس کو قبول کرنے والے ایک مناسب و زرخیز معاشرہ کو تشکیل دیا جائے جو اس کو قبول کر کے اس کی طرف سے دفاع کر سکے تو آپ ﷺ سے پہلے بہت سے انبیائے کرام نے بھی اپنے اپنے وطن سے انہی اسباب و وجوہات کی بنیاد پر ہجرت کی ہے جن کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کو ہجرت کرنی پڑی۔

اس لئے کہ ایک بنجر زمین میں دعوت کا باقی رہنا انتہائی مشکل ہے جہاں دعوت کو سازگار ماحول نہ مل سکے، بلکہ وہاں رکاوٹیں حائل ہوں اور اس کی تحریک کو خطرہ لاحق ہو، وہاں وہ سکڑتے سکڑتے ایک چھوٹے سے دائرہ تک ہی محدود ہو سکتی ہے، قرآن کریم نے ہمارے

سامنے انبیائے کرام اور ان کے پیروکاروں کی ہجرت کے واقعات ذکر کئے ہیں، تاکہ ہمارے سامنے دعوت حق کے سنن و قوانین واضح ہو سکیں، جن کے مطابق بعد کے آنے والے تمام اہلِ ایمان عمل کر سکتے ہیں، جب کہ ان کے ایمان و عزت کو خطرہ لاحق ہو اور اس کے وجود کو ختم کرنے کی کوششیں جاری ہوں، اور اس کی عزت و کرامت پر حملہ کیا جا رہا ہو۔(الہجرۃ فی القرآن الکریم:، ص175)

یہ بعض فوائد و دروس اور عبرتیں ہیں جن کو یہاں ذکر کیا گیا ہے، اس کے علاوہ مزید فوائد و دروس اخذ کئے جا سکتے ہیں جن کو قاری از خود اخذ کر سکتا ہے۔

دوسرا باب

مہاجرین کی تعریف وتوصیف، ان کے لئے وعدے اور پیچھے رہنے والوں کے لئے وعید

مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت نبوی کو دعوت اسلامی کی تاریخ کا ایک عظیم واقعہ سمجھا جاتا ہے، اس لئے کہ وہ مسلمانوں کی تاریخ میں ایک نقطہٴ انقلاب کی حیثیت رکھتا ہے، ہجرت سے پہلے مسلمان ایک امتِ دعوت تھے جو لوگوں تک اللہ کا پیغام پہنچاتے تھے، ان کے پاس کوئی ایسا سیاسی نظام نہیں تھا جو ان کی حفاظت کر سکتا یا ان کے دشمنوں کی ایذاء رسانی کو روک سکتا، لیکن ہجرت کے بعد ایک اسلامی حکومت قائم ہوئی، ایک ایسی حکومت جس نے جزیرۃ العرب کے اندر اور باہر اسلام کی نشر واشاعت کی ذمہ داری اپنے کاندھوں پر لی، وہ داعیوں کو مختلف علاقوں میں بھیجتی، ان کی طرف سے دفاع کی ذمہ داری نبھاتی، کسی بھی ظلم اور زیادتی کے مقابلہ میں ان کی حفاظت و حمایت کا کام انجام دیتی، چاہے اس کے لئے جنگ ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔(دیکھیں: الہجرۃ النبویہ، محمد ابو فارس، ص: 13)

دوسری طرف سے قرآن وحدیث کے فہم میں ہجرتِ نبوی کا ایک اہم مقام ہے، اس لئے کہ علماء نے مکی اور مدنی ادوار کے ذریعہ بہت سے مسائل میں تفریق کی ہے، مکی آیات واحکام وہ ہیں جن کا نزول ہجرت سے پہلے ہوا، اگرچہ مکہ کے علاوہ کہیں اور ہوا ہو۔ اور مدنی آیات واحکام وہ ہیں جن کا نزول ہجرت کے بعد ہوا ہو، اگرچہ مدینہ کے علاوہ اور کہیں ہی ہوا ہو، اس پر بہت سے فوائد مرتب ہوتے ہیں، ان میں سے اہم ترین فوائد مندرجہ ذیل ہیں:

۱: مختلف قرآنی اسالیب کو سمجھنے کا ذوق حاصل ہوتا ہے اور دعوت الی اللہ کے سلسلہ میں ان سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

۲: قرآنی آیات کے ذریعہ سیرتِ نبوی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں واقفیت حاصل ہوتی ہے۔(مباحث فی علوم القرآن، القطان، ص: 59)

ہجرت نبوی کی اہمیت کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ قرآنِ کریم نے مختلف اسالیب اور طریقوں کے ذریعہ اللہ کی راہ میں ہجرت کی ترغیب دی ہے، کبھی تو مہاجرین کے اوصاف حمیدہ بیان کر کے ان کی تعریف وتوصیف کی گئی ہے، کبھی مہاجرین کے حق میں وعدے کئے گئے ہیں اور کبھی ہجرت سے پیچھے رہنے والوں کے بارے میں وعید بیان کی ہے۔(دیکھیں: الہجرۃ فی القرآن الکریم، ص:84)

1) مہاجرین کی تعریف وتوصیف:

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں مہاجرین کی تعریف وتوصیف کی ہے، ان کی ممتاز و نمایاں خوبیوں کو بیان کیا ہے، اس لئے کہ ان کو اپنے گھروں سے اور اپنے مال واسباب سے بے دخل کیا گیا، اور مکہ میں ان کے اعزہ واقارب کی طرف سے ان کو ظلم وزیادتی اور ایذاء رسانی کا سامنا کرنا پڑا، اور ان کو صرف اس لئے جلا وطن کیا گیا کیونکہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے، مہاجرین کی ممتاز اور نمایاں اہم ترین صفات مندرجہ ذیل ہیں:

۱: اخلاص:

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لِلْفُقَرَآءِ ٱلْمُهَٰجِرِينَ ٱلَّذِينَ أُخْرِجُوا۟ مِن دِيَٰرِهِمْ وَأَمْوَٰلِهِمْ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ ٱللَّهِ وَرِضْوَٰنًا وَيَنصُرُونَ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥٓ ۚ أُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلصَّٰدِقُونَ﴾ ترجمہ:"(نیز وہ مال)اُن غریب مہاجرین کے لئے ہے جو اپنے گھروں اور جائدادوں سے نکال باہر کئے گئے ہیں، یہ لوگ اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی چاہتے ہیں اور اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی حمایت پر کمر بستہ رہتے ہیں، یہی راستباز لوگ ہیں"۔(سورۃ الحشر:8)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو ان کے گھروں اور مال واسباب سے صرف اس لئے بے دخل کیا گیا اس لئے کہ وہ مخلص تھے اور اللہ کی رضا کے طالب تھے۔

۲: صبر:

مہاجرین کے اہم اور نمایاں اوصاف واخلاق میں سے اللہ تعالیٰ نے صبر کا ذکر کیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَٱلَّذِينَ هَاجَرُوا۟ فِى ٱللَّهِ مِنۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوا۟ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِى ٱلدُّنْيَا حَسَنَةً ۖ وَلَأَجْرُ ٱلْءَاخِرَةِ أَكْبَرُ ۚ لَوْ كَانُوا۟ يَعْلَمُونَ ﴿٤١﴾ ٱلَّذِينَ صَبَرُوا۟ وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴿٤٢﴾﴾ ترجمہ:"جو لوگ ظلم سہنے کے بعد اللہ کی خاطر ہجرت کر گئے ہیں ان کو ہم دنیا ہی میں اچھا ٹھکانہ دیں گے اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے، کاش جان لیں وہ مظلوم! جنہوں نے صبر کیا ہے اور جو اپنے رب کے بھروسے پر کام کر رہے ہیں (کہ کیسا اچھا انجام اُن کا منتظر ہے)"۔(سورۃ النحل:41-42)

دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ هَاجَرُوا۟ مِنۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوا۟ ثُمَّ جَٰهَدُوا۟ وَصَبَرُوٓا۟ إِنَّ رَبَّكَ مِنۢ بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ ترجمہ:"بخلاف اس کے جن لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب (ایمان لانے کی وجہ سے) وہ ستائے گئے تو اُنہوں نے گھر بار چھوڑ دیئے، ہجرت کی، راہِ خدا میں سختیاں جھیلیں اور صبر سے کام لیا، اُن کے لئے یقیناً تیرا رب غفور ورحیم ہے"۔(سورۃ النحل:110)

۳: صدق وسچائی:

اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کی صدق وسچائی کی صفت کی بھی تعریف کی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لِلْفُقَرَآءِ ٱلْمُهَٰجِرِينَ ٱلَّذِينَ أُخْرِجُوا۟ مِن دِيَٰرِهِمْ وَأَمْوَٰلِهِمْ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ ٱللَّهِ وَرِضْوَٰنًا وَيَنصُرُونَ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥٓ ۚ أُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلصَّٰدِقُونَ﴾ ترجمہ:"(نیز وہ مال)اُن غریب مہاجرین کے لئے ہے جو اپنے گھروں اور جائدادوں سے نکال باہر کئے گئے ہیں، یہ لوگ اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی چاہتے ہیں اور اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی حمایت پر کمر بستہ رہتے ہیں، یہی راستباز لوگ ہیں"۔(سورۃ الحشر:8)

امام بغوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یعنی یہ اپنے ایمان میں سچے ہیں۔ قتادہ فرماتے ہیں: یہ وہ مہاجرین ہیں جنہوں نے اپنے گھر بار، اپنا مال و دولت اور اپنے رشتے دار چھوڑ دیئے اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت میں وطن سے نکلے اور اسلام کو اختیار کیا، حالانکہ اس میں

مشقتیں اور تکالیف برداشت کرنی پڑ رہی تھی، یہاں تک کہ ذکر کیا گیا ہے کہ بھوک کی شدت کی وجہ سے بعض لوگ اپنے پیٹ پر پتھر باندھتے تھے، اور سردیوں میں چٹائی کو ہی اوڑھنا بنا لیتے تھے، اس لئے کہ ان کے پاس اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا تھا۔ (تفسیر البغوی 4/318)

۴: جہاد و قربانی:

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَهَاجَرُواْ وَجَٰهَدُواْ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ بِأَمْوَٰلِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ أَعْظَمُ دَرَجَةً عِندَ ٱللَّهِ ۚ وَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْفَآئِزُونَ﴾ ترجمہ: "اللہ کے ہاں تو انہی لوگوں کا درجہ بڑا ہے جو ایمان لائے اور جنہوں نے اس کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جان و مال سے جہاد کیا وہی کامیاب ہیں"۔ (سورۃ التوبہ: 20)

انبیاء و رسل کی دعوت میں فداکاری و قربانی بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں، اس لئے کہ دعوت کو خطرناک قسم کی عداوت و دشمنی اور تکذیب کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس لئے اس کا مقابلہ کرنے کے لئے ایمانی قوت و استحکام، عقیدہ میں رسوخ اور انفاق انتہائی ضروری ہے، عقیدہ کے زیرِ سایہ زندگی جہاد و قربانی اور جہد مسلسل سے عبارت ہے، دعوت کے آغاز میں ہی جبرئیل امین رسول اللہ ﷺ کے پاس وحی لے کر آئے تھے تو آپ ﷺ کو آگاہ کر دیا گیا تھا کہ آپؐ کی قوم آپ کو ایذاء و تکلیف پہنچائے گی، ورقہ بن نوفل نے بتا دیا تھا کہ یہ وہی فرشتہ ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے پاس آتا تھا، کاش میں اس وقت طاقت ور ہوتا! کاش میں اس وقت زندہ ہوتا جب آپ کی قوم آپ کو نکالے گی!۔ اللہ کے رسولؐ نے دریافت کیا: کیا وہ مجھے نکالیں گے؟ ورقہ نے کہا: ہاں! جو شخص بھی وہ چیز لے کر آیا ہے جو آپ لے کر آئے ہیں اس کے ساتھ دشمنی کی گئی ہے، اگر میں اس وقت تک زندہ رہا تو میں آپ کی بھرپور مدد کروں گا۔ (صحیح بخاری: 3 صحیح مسلم: 160)

ہجرت کے واقعہ میں مختلف قسم کی قربانی، فداکاری اور جانی اور مالی قربانی کے مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ (الہجرۃ فی القرآن الکریم، ص: 104)

اس سلسلہ میں غور و فکر سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ قربانی اور جہاد فی سبیل اللہ لازم و ملزوم ہیں، اس لئے قربانی کے بغیر جہاد کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا ہے۔ (الہجرۃ فی القرآن الکریم، ص: 104 -106)

۵: اللہ اور اس کے رسولؐ کی نصرت و حمایت:

اِرشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿لِلْفُقَرَآءِ ٱلْمُهَٰجِرِينَ ٱلَّذِينَ أُخْرِجُواْ مِن دِيَٰرِهِمْ وَأَمْوَٰلِهِمْ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ ٱللَّهِ وَرِضْوَٰنًا وَيَنصُرُونَ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥٓ ۚ أُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلصَّٰدِقُونَ﴾ ترجمہ: "(نیز وہ مال) اُن غریب مہاجرین کے لئے ہے جو اپنے گھروں اور جائدادوں سے نکال باہر کئے گئے ہیں، یہ لوگ اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی چاہتے ہیں اور اللہ اور اُس کے رسولؐ کی حمایت پر کمر بستہ رہتے ہیں، یہی راستباز لوگ ہیں"۔ (سورۃ الحشر: 8)

اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ کریمہ میں مہاجرین کی یہ تعریف کی ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی نصرت و مدد کرتے ہیں، اس لئے کہ وہ مدینہ کی طرف ہجرت کرکے صرف اللہ اور اس کے رسول کی نصرت و مدد کرنے کی غرض سے گئے، اور اللہ کی نصرت فتح اور کامیابی کے لئے بنیادی شرط ہے: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِن تَنصُرُواْ ٱللَّهَ يَنصُرۡكُمۡ وَيُثَبِّتۡ أَقۡدَامَكُمۡ﴾ ترجمہ: "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر تم اللہ کی مدد کروگے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم مضبوط جمادے گا"۔ (سورۂ محمد: 7)

سید قطبؒ فرماتے ہیں: "اہل ایمان اللہ کی مدد کیسے کریں گے تاکہ وہ شرط کو پورا کریں اور اس کے بعد اللہ کی طرف سے کئے گئے وعدہ کے مستحق قرار پائیں؟

بے شک نفس اور ذات پر اللہ کا یہ حق ہے کہ وہ اس کے لئے مخلص ہو، اس کے ساتھ ظاہری یا باطنی طور پر کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائے، کسی بھی شخص یا چیز کو اللہ کی طرح بقاو دوام کی صفت سے متصف نہ سمجھے، اللہ اس کے نزدیک اپنی ذات سے اور ہر دوسری چیز سے محبوب ہو، اپنی مرغوبات واحساسات، اپنی حرکات وسکنات، اپنے خفیہ اور اعلانیہ امور میں، اپنے اعمال میں اور اپنی تمام پریشانیوں میں اللہ ہی کو اپنا حاکم تسلیم کرے، یہ ذاتی اور انفرادی اعتبار سے اللہ کی نصرت و مدد ہے، اسی کے ساتھ ساتھ اللہ کی ایک شریعت اور نظام زندگی ہے جو کچھ اصول وضوابط اور زندگی اور کائنات کے بارے میں متعین تصور واقدار پر مبنی ہے، اور اللہ کی نصرت اسی وقت ہوگی جب کہ اس کی شریعت و نظام زندگی کی نصرت کی جائے اور بغیر کسی استثناء کے مکمل زندگی میں اس کے نفاذ و قیام کی کوشش کی جائے، یہی عملی زندگی میں اللہ کی نصرت و مدد ہے"۔ (فی ظلال القرآن: 6/3288)

۶: اللہ پر توکل واعتماد:

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَٱلَّذِينَ هَاجَرُواْ فِي ٱللَّهِ مِنۢ بَعۡدِ مَا ظُلِمُواْ لَنُبَوِّئَنَّهُمۡ فِي ٱلدُّنۡيَا حَسَنَةٗۖ وَلَأَجۡرُ ٱلۡأٓخِرَةِ أَكۡبَرُۚ لَوۡ كَانُواْ يَعۡلَمُونَ ۝٤١ ٱلَّذِينَ صَبَرُواْ وَعَلَىٰ رَبِّهِمۡ يَتَوَكَّلُونَ ۝٤٢﴾ ترجمہ: "جو لوگ ظلم سہنے کے بعد اللہ کی خاطر ہجرت کر گئے ہیں ان کو ہم دنیا ہی میں اچھا ٹھکانہ دیں گے اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے، کاش جان لیں وہ مظلوم، جنہوں نے صبر کیا ہے اور جو اپنے رب کے بھروسے پر کام کر رہے ہیں (کہ کیسا اچھا انجام اُن کا منتظر ہے)"۔ (سورۃ النحل: 41 - 42)

اللہ تعالیٰ نے یہاں پر مہاجرین کی یہ صفت بیان کی ہے کہ وہ صرف اللہ پر توکل کرتے ہیں نہ کہ کسی اور پر، توکل علی اللہ ایمان کی خصوصیت اور اس کی علامت ہے، اور یہ اس کا لازمہ ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿قَالَ رَجُلَانِ مِنَ ٱلَّذِينَ يَخَافُونَ أَنۡعَمَ ٱللَّهُ عَلَيۡهِمَا ٱدۡخُلُواْ عَلَيۡهِمُ ٱلۡبَابَ فَإِذَا دَخَلۡتُمُوهُ فَإِنَّكُمۡ غَـٰلِبُونَۚ وَعَلَى ٱللَّهِ فَتَوَكَّلُوٓاْ إِن كُنتُم مُّؤۡمِنِينَ﴾ ترجمہ: "اُن ڈرنے والوں میں دو شخص ایسے بھی تھے جن کو اللہ نے اپنی نعمت سے نوازا تھا اُنہوں نے کہا کہ "ان جباروں کے مقابلہ میں دروازے کے اندر گھس جاؤ، جب تم اندر پہنچ جاؤ گے تو تم ہی غالب رہو گے، اللہ پر بھروسہ رکھو اگر تم مومن ہو"۔ (سورۃ المائدہ: 23) دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿وَقَالَ

مُوسَىٰ يَٰقَوۡمِ إِن كُنتُمۡ ءَامَنتُم بِٱللَّهِ فَعَلَيۡهِ تَوَكَّلُوٓاْ إِن كُنتُم مُّسۡلِمِينَ﴾ ترجمہ: ''موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ لوگو، اگر تم واقعی اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو اسی پر بھروسہ کرو، اگر تم مسلمان ہو''۔(سورۂ یونس: 84) ایک اور مقام پر ہے: ﴿قَالَتۡ لَهُمۡ رُسُلُهُمۡ إِن نَّحۡنُ إِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ وَلَٰكِنَّ ٱللَّهَ يَمُنُّ عَلَىٰ مَن يَشَآءُ مِنۡ عِبَادِهِۦۖ وَمَا كَانَ لَنَآ أَن نَّأۡتِيَكُم بِسُلۡطَٰنٍ إِلَّا بِإِذۡنِ ٱللَّهِۚ وَعَلَى ٱللَّهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ ٱلۡمُؤۡمِنُونَ﴾ ترجمہ: ''ان کے رسولوں نے ان سے کہا "واقعی ہم کچھ نہیں ہیں مگر تم ہی جیسے انسان، لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے نوازتا ہے اور یہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے کہ تمہیں کوئی سند لادیں، سند تو اللہ ہی کے اذن سے آسکتی ہے اور اللہ ہی پر اہل ایمان کو بھروسہ کرنا چاہیے''۔(سورۃ ابراھیم: 11)

رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام نے واقعۂ ہجرت کے ذریعہ عملی زندگی کے لئے توکل کے قابل تقلید نمونے قائم کئے ہیں، اور ان کے بہترین توکل ہی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف و توصیف کی ہے اور ان کو بہترین بدلہ عطا کیا ہے۔ (دیکھیں: الہجرۃ فی القرآن الکریم، ص114 - 117)

۷: رجاء وامید:

مہاجرین کی صفاتِ حمیدہ میں ایک صفت رجاء و امید بھی ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کی مدح و تعریف کی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَٱلَّذِينَ هَاجَرُواْ وَجَٰهَدُواْ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ أُوْلَٰٓئِكَ يَرۡجُونَ رَحۡمَتَ ٱللَّهِۚ وَٱللَّهُ غَفُورٞ رَّحِيمٞ﴾ ترجمہ: ''بخلاف اِس کے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنھوں نے خدا کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا اور جہاد کیا ہے، وہ رحمت الٰہی کے جائز امیدوار ہیں اور اللہ ان کی لغزشوں کو معاف کرنے والا اور اپنی رحمت سے انہیں نوازنے والا ہے''۔(سورۃ البقرہ:218)

۸: رسول اللہ ﷺ کی اتباع و پیروی:

قرآن کریم میں ہجرت کا ایک عظیم مقام ہے، اس کی ایک دلیل یہ ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے مہاجرین اور انصار کی یہ صفت بیان کی ہے کہ وہ رسول ﷺ کی اتباع کرتے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لَّقَد تَّابَ ٱللَّهُ عَلَى ٱلنَّبِيِّ وَٱلۡمُهَٰجِرِينَ وَٱلۡأَنصَارِ ٱلَّذِينَ ٱتَّبَعُوهُ فِي سَاعَةِ ٱلۡعُسۡرَةِ مِنۢ بَعۡدِ مَا كَادَ يَزِيغُ قُلُوبُ فَرِيقٖ مِّنۡهُمۡ ثُمَّ تَابَ عَلَيۡهِمۡۚ إِنَّهُۥ بِهِمۡ رَءُوفٞ رَّحِيمٞ﴾ ترجمہ: ''اللہ نے معاف کر دیا نبیؐ کو اور ان مہاجرین و انصار کو جنھوں نے بڑی تنگی کے وقت میں نبیؐ کا ساتھ دیا، اگرچہ ان میں سے کچھ لوگوں کے دل کجی کی طرف مائل ہو چکے تھے (مگر جب انہوں نے اس کجی کا اتباع نہ کیا بلکہ نبیؐ کا ساتھ ہی دیا تو) اللہ نے انہیں معاف کر دیا، بے شک اُس کا معاملہ اِن لوگوں کے ساتھ شفقت و مہربانی کا ہے''۔ (سورۂ توبہ:117)

یہ آیت غزوۂ تبوک کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اس لئے کہ مسلمان اس غزوہ میں انتہائی سخت حالات میں، قحط سالی میں، سخت گرمی میں اور مالی اعتبار سے تنگی کے حالات میں نکلے تھے۔

رسول ﷺ کی اتباع کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ ٱللَّهَ فَٱتَّبِعُونِى يُحْبِبْكُمُ ٱللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَٱللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٣١﴾ قُلْ أَطِيعُوا۟ ٱللَّهَ وَٱلرَّسُولَ ۖ فَإِن تَوَلَّوْا۟ فَإِنَّ ٱللَّهَ لَا يُحِبُّ ٱلْكَـٰفِرِينَ ﴿٣٢﴾﴾ ترجمہ: ”اے نبیؐ! لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو، تو میری پیروی اختیار کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں سے در گزر فرمائے گا، وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔ اُن سے کہو کہ اللہ اور رسول کی اطاعت قبول کر لو، پھر اگر وہ تمہاری دعوت قبول نہ کریں تو یقیناً یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ ایسے لوگوں سے محبت کرے جو اس کی اور اس کے رسول کی اطاعت سے انکار کرتے ہوں۔ (سورۂ آل عمران: 31 -32)

علامہ ابن کثیرؒ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں: یہ آیتِ کریمہ ہر اس شخص کے بارے میں فیصلہ کن ہے جو اللہ کی محبت کا دعوی کرتا ہو مگر وہ طریقۂ نبوی پر عمل پیرا نہ ہو، ایسا شخص حقیقتاً جھوٹا ہے یہاں تک کہ وہ تمام اقوال و اعمال میں شریعتِ محمدی اور دینِ محمدی کی پیروی نہ کرے، جیسے کہ رسول اللہ ﷺ سے صحیح حدیث میں وارد ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جس نے کوئی ایسا عمل کیا جو ہمارے طریقہ کے مطابق نہ ہو تو وہ قابل رد ہے۔ (صحیح بخاری: 2697، صحیح مسلم: 1718، تفسیر ابن کثیر: 3/466)

۹: ایمان و عمل میں سبقت:

اِرشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَٱلسَّـٰبِقُونَ ٱلْأَوَّلُونَ مِنَ ٱلْمُهَـٰجِرِينَ وَٱلْأَنصَارِ وَٱلَّذِينَ ٱتَّبَعُوهُم بِإِحْسَـٰنٍ رَّضِىَ ٱللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا۟ عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّـٰتٍ تَجْرِى تَحْتَهَا ٱلْأَنْهَـٰرُ خَـٰلِدِينَ فِيهَآ أَبَدًا ۚ ذَٰلِكَ ٱلْفَوْزُ ٱلْعَظِيمُ﴾ ترجمہ: ”وہ مہاجر و انصار جنہوں نے سب سے پہلے دعوتِ ایمان پر لبیک کہنے میں سبقت کی، نیز وہ جو بعد میں راستبازی کے ساتھ پیچھے آئے، اللہ ان سے راضی ہوا، اور وہ اللہ سے راضی ہوئے، اللہ نے ان کے لئے ایسے باغ مہیا کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، یہی عظیم الشان کامیابی ہے“۔ (سورۃ التوبہ: 100)

علامہ رازیؒ فرماتے ہیں: سبقت موجبِ فضیلت ہے، اُن کے اِن افعال کو انجام دینے کے ذریعہ دوسرے بھی ان کی اقتداء و پیروی کریں گے، اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے: ”جس نے اسلام میں کوئی اچھی سنت قائم کی اُس کو اس کا اور قیامت تک اس پر عمل کرنے والے کا اجر و ثواب ملے گا“۔ (مسند أحمد 4/357 - 358، صحیح مسلم، 1017، سنن ترمذی: 3675، سنن نسائی 5/75 - 77، سنن ابن ماجہ: 203)

لوگوں کے اندر عمل کا جذبہ اور محرّک اس وقت قوی تر ہوتا ہے جب وہ اس کا نمونہ پاتے ہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مہاجرین مسلمانوں کے پیشوا اور امام ہیں۔ (تفسیر رازی: 15/208)

اس کے ذریعہ مہاجرین کا مقام و مرتبہ اور فضل و کمال بھی واضح ہوتا ہے، اس لئے کہ انہوں نے اس وقت انفاق اور قتال کیا جبکہ عقیدہ کو سب رد کر رہے تھے اور انصار و مددگار انتہائی کم تھے اور دور دور تک کوئی فائدہ، کوئی طاقت و قوت اور خوشحالی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دوسرا ان کے برابر نہیں ہو سکتا ہے جنہوں نے ان مشکل حالات کے بعد انفاق اور قتال کیا۔

(الهجرة في القرآن الكريم، ص: 124) اِرشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَا لَكُمْ أَلَّا تُنفِقُوا۟ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ وَلِلَّهِ مِيرَٰثُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ ۚ لَا يَسْتَوِى مِنكُم مَّنْ أَنفَقَ مِن قَبْلِ ٱلْفَتْحِ وَقَٰتَلَ ۚ أُو۟لَٰٓئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ ٱلَّذِينَ أَنفَقُوا۟ مِنۢ بَعْدُ وَقَٰتَلُوا۟ ۚ وَكُلًّا وَعَدَ ٱللَّهُ ٱلْحُسْنَىٰ ۚ وَٱللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ﴾ ترجمہ:"آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے حالانکہ زمین اور آسمانوں کی میراث اللہ ہی کے لئے ہے، تم میں سے جو لوگ فتح کے بعد خرچ اور جہاد کریں گے وہ کبھی اُن لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جنہوں نے فتح سے پہلے خرچ اور جہاد کیا ہے، اُن کا درجہ بعد میں خرچ اور جہاد کرنے والوں سے بڑھ کر ہے، اگرچہ اللہ نے دونوں ہی سے اچھے وعدے فرمائے ہیں ، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے"۔(سورۃ الحدید: 10)

۱۰: فوز و فلاح کا وعدہ:

اِرشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَهَاجَرُوا۟ وَجَٰهَدُوا۟ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ بِأَمْوَٰلِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ أَعْظَمُ دَرَجَةً عِندَ ٱللَّهِ ۚ وَأُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْفَآئِزُونَ﴾ ترجمہ:"اللہ کے ہاں تو انہی لوگوں کا درجہ بڑا ہے جو ایمان لائے اور جنہوں نے اس کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جان ومال سے جہاد کیا وہی کامیاب ہیں"۔(سورۃ التوبہ:20)

ابو سعودؒ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں :"... گویا کہ ان کے علاوہ دوسروں کو حاصل ہونے والی فوز وفلاح ان کی فوز و فلاح کو دیکھتے ہوئے کامیابی ہی نہیں ہے"۔(تفسير أبي السعود، 4/53)

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مہاجرین کی تعریف و توصیف ہے کہ وہ عظیم فوز و فلاح کے مستحق ہوں گے، فوز و فلاح اس لئے عظیم ہو گی اس لئے کہ وہ عظمت کے مصدر و سرچشمہ سے حاصل ہو گی،اس فوز و فلاح کے مقابلہ میں اور کون سی کامیابی ہو سکتی ہے؟! اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ آخرت میں کامیاب ہونے والے وہ ہیں جو جنت میں داخل ہوں گے اور جہنم کی آگ سے بچ جائیں گے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ ٱلْمَوْتِ ۗ وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُورَكُمْ يَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِ ۖ فَمَن زُحْزِحَ عَنِ ٱلنَّارِ وَأُدْخِلَ ٱلْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ۗ وَمَا ٱلْحَيَوٰةُ ٱلدُّنْيَآ إِلَّا مَتَٰعُ ٱلْغُرُورِ﴾ ترجمہ:"آخر کار ہر شخص کو مرنا ہے اور تم سب اپنے اپنے پورے اجر قیامت کے روز پانے والے ہو، کامیاب دراصل وہ ہے جو وہاں آتش دوزخ سے بچ جائے اور جنت میں داخل کر دیا جائے، رہی یہ دنیا تو یہ محض ایک ظاہر فریب چیز ہے"۔(سورۃ آل عمران:185)

۱۱: حقیقی ایمان:

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں مہاجرین کے حقیقی ایمان کی بھی تعریف کی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَهَاجَرُوا۟ وَجَٰهَدُوا۟ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ وَٱلَّذِينَ ءَاوَوا۟ وَّنَصَرُوٓا۟ أُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ۚ لَّهُم مَّغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ﴾ ترجمہ:

"جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جد وجہد کی اور جنہوں نے پناہ دی اور مدد کی وہی سچے مومن ہیں ان کے لئے خطاؤں سے در گزر ہے اور بہترین رزق ہے"۔(سورۃ الانفال:74)

یہ علیم وخبیر اللہ کی طرف سے مہاجرین کے حق میں شہادت ہے کہ وہی حقیقی ایمان والے ہیں، مہاجرین ہی حقیقی آئیڈیل اور نمونہ ہیں، جو رسول اللہ ﷺ کے بعد ایمانی اعتبار سے مضبوط ہیں، یہ بعد میں آنے والے لوگوں کے لئے صفاتِ حمیدہ کے حقیقی ترجمان ہیں، اسی لئے وہ ربانی تعریف وتوصیف کے مستحق قرار پائے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّمَا ٱلْمُؤْمِنُونَ ٱلَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ ٱللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ ءَايَٰتُهُۥ زَادَتْهُمْ إِيمَٰنًا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ۝٢ ٱلَّذِينَ يُقِيمُونَ ٱلصَّلَوٰةَ وَمِمَّا رَزَقْنَٰهُمْ يُنفِقُونَ ۝٣ أُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ۚ لَّهُمْ دَرَجَٰتٌ عِندَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ۝٤﴾ ترجمہ: "سچے اہل ایمان تو وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سُن کر لرز جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر اعتماد رکھتے ہیں، جو نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں، ایسے ہی لوگ حقیقی مومن ہیں، ان کے لئے ان کے رب کے پاس بڑے درجے ہیں، قصوروں سے در گزر ہے اور بہترین رزق ہے"۔(سورۃ الانفال:2-4)

ان تمام اوصافِ حمیدہ کا عکس اور پرتو مہاجرین کی زندگیوں میں نظر آتا ہے اور ان صفات سے متصف افراد ہی حقیقی ایمان کے حامل لوگ ہیں۔(الہجرۃ فی القرآن الکریم، ص129)

2) مہاجرین کے لئے وعدے:

اللہ تعالیٰ نے بعض انعامات کا ذکر کیا ہے جن کا مہاجرین کے لئے دنیا اور آخرت میں وعدہ کیا گیا ہے، ان انعامات میں سے بعض مندرجہ ذیل ہیں:

ا: دنیا میں رزق کی وسعت کا وعدہ:

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَن يُهَاجِرْ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ يَجِدْ فِى ٱلْأَرْضِ مُرَٰغَمًا كَثِيرًا وَسَعَةً ۚ وَمَن يَخْرُجْ مِنۢ بَيْتِهِۦ مُهَاجِرًا إِلَى ٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ ثُمَّ يُدْرِكْهُ ٱلْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهُۥ عَلَى ٱللَّهِ ۗ وَكَانَ ٱللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا﴾ ترجمہ: "جو کوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں پناہ لینے کے لئے بہت جگہ اور بسر اوقات کے لئے بڑی گنجائش پائے گا، اور جو اپنے گھر سے اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کے لئے نکلے، پھر راستہ ہی میں اُسے موت آجائے اُس کا اجر اللہ کے ذمے واجب ہوگیا، اللہ بہت بخشش فرمانے والا اور رحیم ہے"۔(سورۃ النساء:100)

دنیا میں ان کے لئے رزق کی وسعت اور فراوانی کا ایک پہلو یہ ہے کہ ان کے لئے فئی اور مالِ غنیمت کا ایک حصہ مقرر کیا گیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لِلْفُقَرَآءِ ٱلْمُهَٰجِرِينَ ٱلَّذِينَ أُخْرِجُوا۟ مِن دِيَٰرِهِمْ وَأَمْوَٰلِهِمْ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ ٱللَّهِ وَرِضْوَٰنًا

وَيَنصُرُونَ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥٓ ۚ أُو۟لَـٰٓئِكَ هُمُ ٱلصَّـٰدِقُونَ﴾ ترجمہ:'' (نیز وہ مال) اُن غریب مہاجرین کے لئے ہے جو اپنے گھروں اور جائدادوں سے نکال باہر کئے گئے ہیں، یہ لوگ اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی چاہتے ہیں اور اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی حمایت پر کمر بستہ رہتے ہیں، یہی راستباز لوگ ہیں''۔(سورۃ الحشر:8)

ان لوگوں کے لئے مال میں یہ حق اس لئے ہے کیونکہ ان کو ان کے گھروں سے نکالا گیا، اس لئے وہ اس سب سے زیادہ حقدار ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر 4/295، تفسیر ابی السعود: 8/228، تفسیر فتح القدیر: 5/200، الہجرۃ فی القرآن الکریم، ص 132)

ان کے لئے رزق میں وسعت کا ایک پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انصار کو نفس کے لالچ سے پاک کر دیا اور ان کے دلوں کو مہاجرین کے لئے وسیع کر دیا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَٱلَّذِينَ تَبَوَّءُو ٱلدَّارَ وَٱلْإِيمَـٰنَ مِن قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِى صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ أُوتُوا۟ وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِۦ فَأُو۟لَـٰٓئِكَ هُمُ ٱلْمُفْلِحُونَ﴾ ترجمہ:'' (اور وہ اُن لوگوں کے لئے بھی ہے) جو اِن مہاجرین کی آمد سے پہلے ہی ایمان لا کر دار الہجرۃ میں مقیم تھے یہ اُن لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے اِن کے پاس آئے ہیں اور جو کچھ بھی اُن کو دے دیا جائے اُس کی کوئی حاجت تک یہ اپنے دلوں میں محسوس نہیں کرتے اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں، حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے دل کی تنگی سے بچا لئے گئے وہی فلاح پانے والے ہیں''۔(سورۃ الحشر:9)

بے شک اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کے لئے دنیا میں جنت کا وعدہ کیا ہے اور یہ وعدہ مکمل بھی ہوا، اللہ تعالیٰ نے ہجرت کے لئے "فی سبیل اللہ" کی شرط لگائی ہے اور یہی ہجرتِ اسلام میں معتبر ہے، ہجرت کا مقصد خوشحالی کا حصول نہ ہو، نہ ہی ہجرت کا مقصد مصائب و مشکلات سے نجات ہو، اور نہ ہی خواہشات و لذتوں کی تکمیل مقصود ہو اور نہ ہی اور کوئی دنیاوی مقصد پیش نظر ہو، جو بھی اللہ کی راہ میں اس کی رضا کے حصول کے لئے ہجرت کرے گا وہ زمین میں وسعت، فراخی اور پناہ حاصل کر لے گا، روئے زمین میں اس کے لئے تنگی نہیں ہو گی، وہ نجات و کامیابی اور رزق سے محروم نہیں ہو گا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اس کا ناصر و حامی ہو گا اور اس کو ہدایت اور استقامت سے سرفراز کرے گا۔

۲: ان کے گناہوں اور لغزشوں کی مغفرت:

جن نعمتوں کا اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کے ساتھ وعدہ کیا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ ان کی سیئات اور گناہوں کی مغفرت کی جائے گی، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَٱسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّى لَآ أُضِيعُ عَمَلَ عَـٰمِلٍ مِّنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ ۖ بَعْضُكُم مِّنۢ بَعْضٍ ۖ فَٱلَّذِينَ هَاجَرُوا۟ وَأُخْرِجُوا۟ مِن دِيَـٰرِهِمْ وَأُوذُوا۟ فِى سَبِيلِى وَقَـٰتَلُوا۟ وَقُتِلُوا۟ لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّـَٔاتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنَّـٰتٍ تَجْرِى مِن تَحْتِهَا ٱلْأَنْهَـٰرُ ثَوَابًا مِّنْ عِندِ ٱللَّهِ ۗ وَٱللَّهُ عِندَهُۥ حُسْنُ ٱلثَّوَابِ﴾ ترجمہ:''جواب میں ان کے رب نے فرمایا: میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں، خواہ مرد ہو یا عورت، تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو،

لہٰذا جن لوگوں نے میری خاطر اپنے وطن چھوڑے اور جو میری راہ میں اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ستائے گئے اور میرے لئے لڑے اور مارے گئے اُن کے سب قصور میں معاف کردوں گا اور انہیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، یہ اُن کی جزا ہے اللہ کے ہاں اور بہترین جزا اللہ ہی کے پاس ہے"۔(سورہ آل عمران:195)

رسول اللہ ﷺ سے بہت سی احادیث وارد ہیں جن میں واضح کیا گیا ہے کہ ہجرت سیأت کے مٹانے اور معاف کرانے کا ایک اہم ترین وسیلہ ہے اور وہ گنہگاروں کے گناہوں کی مغفرت کا ایک اہم سبب ہے، ان میں سے ایک حدیث یہ ہے: حضرت ابن شماستہ المہری سے روایت ہے فرماتے ہیں: "ہم عمرو بن عاصؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے جبکہ وہ سکرات الموت کی حالت میں تھے، وہ بہت دیر تک روئے اور انہوں نے اپنا چہرہ دیوار کی طرف کر لیا، ان کا بیٹا کہنے لگا: اے ابا جان! کیا اللہ کے رسولؐ نے آپ کو یہ یہ خوشخبری نہیں دی ہے؟ کیا اللہ کے رسول ﷺ نے آپ کو اس اس چیز کی خوشخبری نہیں دی ہے؟! فرماتے ہیں: وہ متوجہ ہوئے اور کہا: ہم جس بات کو افضل ترین سمجھتے ہیں وہ اس بات کی گواہی ہے کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ میں تین قسم کے حالات اور ادوار سے گزرا ہوں: ایک حالت یہ تھی کہ میرے نزدیک رسول اللہ ﷺ سے زیادہ ناپسندیدہ اور کوئی شخص نہیں تھا اور میری آرزو یہ تھی کہ کسی طرح قابو پا جاؤں اور آپ ﷺ کو قتل کردوں، اگر میں اس حال میں وفات پاتا تو میں اہلِ جہنم میں سے ہوتا، اور دوسری حالت یہ تھی کہ جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کی محبت میرے دل میں ڈالی تو میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا، میں نے عرض کیا: اپنا دایاں ہاتھ بڑھائیے تاکہ میں آپ سے بیعت کروں، آپؐ نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ فرماتے ہیں: میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا، آپؐ نے فرمایا: اے عمرو، کیا بات ہے؟ فرماتے ہیں: میں نے کہا: میں کچھ شرط رکھنا چاہتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: کیا شرط؟ میں نے کہا: یہ شرط کے میرے گناہ معاف ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا آپ کو معلوم نہیں ہے کہ اسلام قبول کرنے کی وجہ سے پہلے کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں، اور ہجرت کے ذریعہ اس سے پہلے کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور حج کے ذریعہ اس سے پہلے کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد میرے نزدیک رسول اللہ ﷺ سے زیادہ نہ کوئی محبوب تھا اور نہ میرے نزدیک آپ سے زیادہ کوئی بلند مقام کا حامل تھا، میں آپ ﷺ کی عظمت و عزت کی وجہ سے آپ کو جی بھر کر نہیں دیکھ پاتا تھا، اگر کوئی مجھ سے آپؐ کی وصف بیانی کا مطالبہ کرے تو میں بیان نہیں کر سکتا، اس لئے کہ میں آنکھ بھر کر آپؐ کو نہیں دیکھ پاتا تھا، اگر اس حالت میں میرا انتقال ہوتا تو مجھے امید تھی کہ میں اہلِ جنت میں سے ہوتا، اس کے بعد ہمیں کچھ چیزوں کی ذمہ داری دی گئی، مجھے معلوم نہیں ہے کہ ان کے بارے میں میرا حال کیسا تھا، لہذا جب میری وفات ہو تو میرے جنازے کے ساتھ کوئی رونے چلانے والی نہ ہو، نہ ہی آگ ہو، اور جب مجھے دفن کرنا ہو تو مجھ پر مٹی ڈال دینا، اس کے بعد میری قبر کے آس پاس اتنی دیر رہنا جتنی دیر میں اونٹ ذبح کیا جا سکتا ہے اور اس کا گوشت تقسیم کیا جا سکتا ہے، تاکہ تمہارے ذریعہ میں مانوس ہو جاؤں اور دیکھ لوں کہ میں اپنے رب کے فرشتوں کو کیا جواب دیتا ہوں"۔(صحیح مسلم:121)

امام نوویؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کے ذریعہ اسلام، ہجرت اور حج کا عظیم مقام معلوم ہوتا ہے اور یہ کہ ان میں سے ہر ایک کے ذریعہ پہلے کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، اس کے ذریعہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جانکنی کے عالم میں مبتلا شخص کو اللہ تعالیٰ کے بارے میں حسنِ

ظن رکھنے کی تلقین کی جائے، امید ورجاء کی آیات اور عفوودرگزر کی احادیث کا اس کے سامنے ذکر کیا جائے، اور اس کو اللہ کے ہاں اہلِ ایمان کے لئے انعامات کی خوشخبری سنائی جائے اور اس کے اچھے اعمال کا اس کے سامنے ذکر کیا جائے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسنِ ظن رکھے اور یہ بالاتفاق مستحب عمل ہے۔(شرح النووی لصحیح مسلم، الہجرۃ فی القرآن الکریم، ص138)

۳: رب کے نزدیک ان کا بلند مقام ومرتبہ:

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لئے عظیم درجات ومقامات کا وعدہ کررکھا ہے جن کو ایمان وہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ کا اعلیٰ مقام حاصل ہو، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَهَاجَرُواْ وَجَٰهَدُواْ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ بِأَمۡوَٰلِهِمۡ وَأَنفُسِهِمۡ أَعۡظَمُ دَرَجَةً عِندَ ٱللَّهِۚ وَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلۡفَآئِزُونَ﴾ ترجمہ: ”اللہ کے ہاں تو انہی لوگوں کا درجہ بڑا ہے جو ایمان لائے اور جنہوں نے اس کی راہ میں گھربار چھوڑے اور جان ومال سے جہاد کیا وہی کامیاب ہیں“۔(سورۃ التوبہ:20)

امام رازیؒ فرماتے ہیں: بے شک ان چار صفات سے متصف لوگ انتہائی بلند مقام کے حامل لوگ ہیں، اس لئے کہ انسان صرف تین امور کا مجموعہ ہے: روح، بدن، مال۔ جہاں تک روح کا تعلق ہے تو جب کفر اس سے زائل ہوگیا اور وہ ایمان سے سرفراز ہوگئی تو وہ اس کے شایانِ شان مقام پر پہنچ گئی۔ اور جہاں تک بدن اور مال کا تعلق ہے تو ہجرت کی وجہ سے ان دونوں کو نقصان ہوا، جہاد میں مشغولیت کی وجہ سے ان دونوں کو خطرات ونقصان کا سامنا کرنا پڑا، اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جان ومال دونوں انسان کو محبوب ہیں اور انسان ان محبوب چیزوں سے اسی وقت دست بردار ہوسکتا ہے جبکہ وہ اس سے زیادہ محبوب چیز کو حاصل کرنا چاہتا ہو، لہذا اگر اہلِ ایمان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول جان ومال سے زیادہ محبوب نہ ہوتا تو وہ جان ومال کے مقابلہ میں آخرت کو قابل ترجیح نہیں سمجھتے، اور نہ ہی اللہ کی رضا کے حصول کی وجہ سے وہ جان ومال کو خطرہ میں ڈالنے پر راضی ہوتے۔

لہذا اس سے ثابت ہوا کہ ان چار صفات کے حصول کی وجہ سے انسان اعلیٰ ترین بشری مقام پر اور فرشتوں کے ابتدائی مقام پر فائز ہوجاتا ہے، اس کے ذریعہ وہ تمام انسانوں کے مقابلہ میں افضل قرار پاتے ہیں، اس لئے کہ انسان کے لئے ان چار صفات سے زیادہ اعلیٰ اور مکمل سعادت وفضیلت کا تصور نہیں کیا جاسکتا ہے۔(تفسیر رازی 16/13)

لہذا جو ایمان لائے اور اپنے جان ومال کے ذریعہ اللہ کے راستہ میں جہاد کیا، وہ فضل وکمال کے اعلیٰ اور عظیم مقام کے حامل ہیں اور حجاج کی خدمت کرنے والوں اور مسجد حرام کی دربانی کرنے والوں کے مقابلہ میں زیادہ اجر وثواب کے حامل ہوں گے جن کے بارے میں بعض مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے یہ اعمال اسلام لانے کے بعد افضل ترین اعمال ہیں۔

لہذا جن کو نفس ومال دونوں قسم کی ہجرت وجہاد کی فضیلت حاصل ہوگئی وہ ان لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ بلند مقام کے حامل اور زیادہ عزت وکرامت کے حامل ہیں جو ان صفات سے متصف نہ ہوں، چاہے وہ کوئی بھی ہو اور اس میں خادمینِ حجاج اور مسجد حرام کے دربان بھی شامل ہیں۔ (تفسیر المراغی: 10/78)

۴: جنت کا استحقاق اور اس میں خلود و ہمیشگی:

اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کے لئے جن نعمتوں کو تیار کر رکھا ہے ان میں سے ایک نعمت جنت اور اس میں خلود و ہمیشگی کی نعمت ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَهَاجَرُواْ وَجَٰهَدُواْ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ بِأَمْوَٰلِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ أَعْظَمُ دَرَجَةً عِندَ ٱللَّهِۚ وَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْفَآئِزُونَ ۝٢٠ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُم بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَٰنٍ وَجَنَّٰتٍ لَّهُمْ فِيهَا نَعِيمٌ مُّقِيمٌ ۝٢١ خَٰلِدِينَ فِيهَآ أَبَدًاۚ إِنَّ ٱللَّهَ عِندَهُۥٓ أَجْرٌ عَظِيمٌ ۝٢٢﴾ ترجمہ: "اللہ کے ہاں توانہی لوگوں کا درجہ بڑا ہے جو ایمان لائے اور جنہوں نے اس کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جان و مال سے جہاد کیا وہی کامیاب ہیں۔ ان کا رب انہیں اپنی رحمت اور خوشنودی اور ایسی جنتوں کی بشارت دیتا ہے جہاں ان کے لئے پائیدار عیش کے سامان ہیں۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے یقیناً اللہ کے پاس خدمات کا صلہ دینے کو بہت کچھ ہے"۔ (سورۃ التوبہ: 20-22)

یہ ایک ایسی خوشخبری ہے جس سے بڑی خوشخبری اور کوئی نہیں ہو سکتی ہے، جس کا اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان، مرد و خواتین کے لئے وعدہ کر رکھا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَعَدَ ٱللَّهُ ٱلْمُؤْمِنِينَ وَٱلْمُؤْمِنَٰتِ جَنَّٰتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا ٱلْأَنْهَٰرُ خَٰلِدِينَ فِيهَا وَمَسَٰكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنَّٰتِ عَدْنٍۚ وَرِضْوَٰنٌ مِّنَ ٱللَّهِ أَكْبَرُۚ ذَٰلِكَ هُوَ ٱلْفَوْزُ ٱلْعَظِيمُ﴾ ترجمہ: "ان مومن مردوں اور عورتوں سے اللہ کا وعدہ ہے کہ انہیں ایسے باغ دے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، ان سدا بہار باغوں میں ان کے لئے پاکیزہ قیام گاہیں ہوں گی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ کی خوشنودی انہیں حاصل ہوگی، یہی بڑی کامیابی ہے"۔ (سورۃ التوبہ: 72)

۵: عظیم کامیابی اور اللہ کی خوشنودی:

جن نعمتوں کا اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کے ساتھ وعدہ کر رکھا ہے ان میں سے ایک نعمت یہ ہے کہ وہ عظیم کامیابی سے سرفراز ہوں گے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَهَاجَرُواْ وَجَٰهَدُواْ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ بِأَمْوَٰلِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ أَعْظَمُ دَرَجَةً عِندَ ٱللَّهِۚ وَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْفَآئِزُونَ﴾ ترجمہ: "اللہ کے ہاں توانہی لوگوں کا درجہ بڑا ہے جو ایمان لائے اور جنہوں نے اس کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جان و مال سے جہاد کیا وہی کامیاب ہیں"۔ (سورۃ التوبہ: 20)

اللہ تعالیٰ کی رضا ہر نعمت سے بڑی اور عظیم چیز ہے اور اللہ کی طرف سے اعزاز و اکرام کی انتہا عظیم انعام اور کامل ترین جزا ہے، جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول اس بات پر دلالت کرتا ہے: ﴿وَعَدَ ٱللَّهُ ٱلْمُؤْمِنِينَ وَٱلْمُؤْمِنَٰتِ جَنَّٰتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا ٱلْأَنْهَٰرُ خَٰلِدِينَ فِيهَا وَمَسَٰكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنَّٰتِ عَدْنٍۚ وَرِضْوَٰنٌ مِّنَ ٱللَّهِ أَكْبَرُۚ ذَٰلِكَ هُوَ ٱلْفَوْزُ ٱلْعَظِيمُ﴾ ترجمہ: "ان مومن مردوں اور عورتوں سے اللہ کا وعدہ ہے کہ انہیں ایسے باغ دے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، ان سدا

بہار باغوں میں ان کے لئے پاکیزہ قیام گاہیں ہوں گی،اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ کی خوشنودی انہیں حاصل ہوگی،یہی بڑی کامیابی ہے"۔ (سورۃالتوبہ:72)

یہ اجر وثواب کے بعض پہلو ہیں جن کا اللہ تعالی نے مہاجرین کے ساتھ ان کے عظیم جہاد کی وجہ سے وعدہ کیا ہے، بے شک مکہ میں جاہلیت کے ذریعہ دعوت کو ختم کرنے کی ہر کوشش کے مقابلہ میں مہاجرین اپنے راسخ ایمان اور خالص یقین کے ذریعہ آہنی دیوار کی طرح ڈٹے رہے جس کی وجہ سے اہلِ جاہلیت دعوت کو ختم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے، جبکہ انہوں نے نبی پر نازل ہونے والے ہر حکم کو مضبوطی سے تھامے رکھا اور قریش کی حماقتوں کی وجہ سے ان کے استحکام و قوت میں اضافہ ہی ہوتا رہا، اور جب جاہلیت کی ظلم وطغیان کی آندھی حدود سے تجاوز کر گئی اور اللہ تعالیٰ نے صبر وثبات کے حامل ان اہل ایمان کو مکہ سے ہجرت کرنے کا حکم دیا تو وہ اپنے گھروں سے اور مال واسباب سے دستبردار ہو گئے اور مدینہ کا رخ کر لیا، وہ خوفزدہ نہیں تھے اور نہ ہی ان کو دنیا کا لالچ تھا، بلکہ وہ اس کے ذریعہ اللہ کی رحمت کے امیدوار تھے اور اس کی رضا کے طلبگار تھے، اس لئے وہ دنیا میں بھی اللہ کے فضل کے مستحق قرار پائے اور آخرت میں بھی عظیم اجر وثواب کے ذریعہ فائز المرام ہوئے۔(ھجرۃ الرسول ﷺ وصحابتہ فی القرآن والسنۃ، الجمل، ص332 - 333)

3) ہجرت نہ کرنے والوں کے لئے وعید

وعدو وعید کے سلسلہ میں قرآنی اسلوب کا مقصد دلوں میں خشیت وامید پیدا کرنا ہے تاکہ دلوں کو اطاعت واستقامت کے لئے آمادہ کیا جائے اور ان میں ایسی خشیت پیدا کی جائے جو انسان کو معصیت سے روک سکے اور استغفار وتوبہ کی طرف متوجہ کرے، ایک صاحبِ ایمان انتہائی باریک بین ہوتا ہے تاکہ وہ یاس وقنوطیت کا شکار نہ ہو، اور نہ ہی وہ اللہ کی حرام کردہ چیزوں کے ارتکاب یا اللہ کے احکام و اوامر کے بارے میں غفلت اور سستی کا شکار ہو، قرآن کریم نے وعدو وعید کے ان دونوں ذرائع کے ذریعہ فرد کی شخصیت کی بھی حفاظت کی اور جان، مال، عقل، عزت وعفت اور دین کے بارے میں معاشرہ کی بنیادوں کی بھی حفاظت کی، یہی وہ بنیادیں اور کلیات واصول ہیں جن پر بہترین زندگی کی عمارت قائم ہوتی ہے، کارگاہِ حیات میں کئی نسلوں میں اس نور کا مشاہدہ کیا گیا جس کو قرآن نے ترغیب وامید اور وعید وخشیت کے ذریعہ منور کیا، اور جب قرآن سے دوری کی وجہ سے یہ نور مدہم پڑ گیا تو فرد کا اپنی فطرت کے ساتھ اور معاشرہ کا عملی صورتحال کے ساتھ ٹکراؤ ہو گیا، جس کی وجہ سے اقدار میں بھی اضطراب پیدا ہو گیا، اخلاق میں بھی گراوٹ آگئی اور معاملات، نظام زندگی اور تصورات میں بھی بگاڑ پیدا ہو گیا اور حقیقت یہ ہے کہ اس امت کے آخر کی اصلاح اسی چیز سے ہوگی جس کے ذریعہ اس کے اول کی اصلاح ہوئی، وہ صرف اللہ سے ڈرے اور اسی سے پرامید ہو۔(الھجرۃ فی القرآن الکریم، ص151)

ہجرت سے پیچھے رہنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے بدانجامی کی وعید سنائی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ ٱلَّذِينَ تَوَفَّىٰهُمُ ٱلۡمَلَٰٓئِكَةُ ظَالِمِيٓ أَنفُسِهِمۡ قَالُواْ فِيمَ كُنتُمۡۖ قَالُواْ كُنَّا مُسۡتَضۡعَفِينَ فِي ٱلۡأَرۡضِۚ قَالُوٓاْ أَلَمۡ تَكُنۡ أَرۡضُ ٱللَّهِ وَٰسِعَةٗ فَتُهَاجِرُواْ فِيهَاۚ فَأُوْلَٰٓئِكَ مَأۡوَىٰهُمۡ جَهَنَّمُۖ وَسَآءَتۡ مَصِيرًا﴾ ترجمہ: "جو لوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے اُن کی روحیں

جب فرشتوں نے قبض کیں توان سے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں مبتلا تھے ؟انہوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور و مجبور تھے، فرشتوں نے کہا: کیاخدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کاٹھکانہ جہنم ہے اور بڑاہی براٹھکانہ ہے"۔(سورۃالنساء:97)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ کچھ مسلمان مشرکین کے ساتھ رہتے تھے، وہ رسول اللہ ﷺ کے مقابلہ میں مشرکین کی تعداد میں اضافہ کا سبب بنتے، پھر تیر آتااور وہ سامنے پڑجاتے توانہیں لگ جاتااور اس طرح ان کی جان جاتی یا(غلطی سے)انہیں قتل کردیا جاتا، اس پراللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:﴿إِنَّ ٱلَّذِينَ تَوَفَّىٰهُمُ ٱلْمَلَٰٓئِكَةُ ظَالِمِيٓ أَنفُسِهِمْ......﴾ (صحیح بخاری: 4596، 7085)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں: اہلِ مکہ میں سے کچھ لوگوں نے اسلام قبول کیااور وہ اپنے اسلام کو مخفی رکھنے لگے، مشرکین نے ان کو جنگ بدر میں اپنے ساتھ نکالا،ان میں سے بعض کی جان چلی گئی تو مسلمان کہنے لگے: ہمارے یہ اصحاب مسلمان تھے،اوران پر زبردستی کی گئی، وہ ان کے لئے استغفار کرنے لگے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿إِنَّ ٱلَّذِينَ تَوَفَّىٰهُمُ ٱلْمَلَٰٓئِكَةُ ظَالِمِيٓ أَنفُسِهِمْ......﴾ فرماتے ہیں:انہوں نے مکہ میں موجود مسلمانوں کو یہ آیت لکھ کر بھیجی کہ ان کے پاس کوئی عذر نہیں ہے۔فرماتے ہیں: وہ لوگ نکل چکے تھے بس انہیں مشرکین نے جالیااور انہیں فتنہ کا شکار کردیا،ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وَمِنَ ٱلنَّاسِ مَن يَقُولُ ءَامَنَّا بِٱللَّهِ فَإِذَآ أُوذِيَ فِي ٱللَّهِ جَعَلَ فِتْنَةَ ٱلنَّاسِ كَعَذَابِ ٱللَّهِۖ وَلَئِن جَآءَ نَصْرٌ مِّن رَّبِّكَ لَيَقُولُنَّ إِنَّا كُنَّا مَعَكُمْۚ أَوَلَيْسَ ٱللَّهُ بِأَعْلَمَ بِمَا فِي صُدُورِ ٱلْعَٰلَمِينَ﴾ ترجمہ:"لوگوں میں سے کوئی ایساہے جو کہتاہے کہ ہم ایمان لائے اللہ پر، مگر جب وہ اللہ کے معاملہ میں ستایا گیا تواس نے لوگوں کی ڈالی ہوئی آزمائش کو اللہ کے عذاب کی طرح سمجھ لیا،اب اگر تیرے رب کی طرف سے فتح ونصرت آگئی تو یہی شخص کہے گا کہ ہم تو تمہارے ساتھ تھے، کیادنیاوالوں کے دلوں کاحال اللہ کو بخوبی معلوم نہیں ہے؟!"۔(سورہ العنکبوت:10)

مسلمانوں نے یہ آیات ان کے پاس لکھ کر بھیجیں تو وہ نکلے اور ہر خیر سے مایوس ہوگئے،اس کے بعد ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ هَاجَرُواْ مِنۢ بَعْدِ مَا فُتِنُواْ ثُمَّ جَٰهَدُواْ وَصَبَرُوٓاْ إِنَّ رَبَّكَ مِنۢ بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ ترجمہ:"بخلاف اس کے جن لوگوں کاحال یہ ہے کہ جب(ایمان لانے کی وجہ سے)وہ ستائے گئے توانہوں نے گھر بار چھوڑدیئے، ہجرت کی،راہ خدامیں سختیاں جھیلیں اور صبر سے کام لیا،اُن کے لئے یقیناًتیرارب غفورورحیم ہے"۔(سورۃالنحل:110) (زادالمسیر،ابن الجوزی، 2/97، تفسیر القاسمی، 3/399)

اللہ تعالیٰ نے ہجرت سے پیچھے رہنے والوں کے بارے میں بتایاہے کہ وہ اپنے اوپر ظلم کرنے والے ہیں،اوراس آیت میں ظلم سے مراد یہ ہے کہ جن لوگوں نے دارالکفر میں اسلام قبول کیااور پھروہیں باقی رہے اور مدینہ کی جانب ہجرت نہیں کی توہجرت نہ کرنے کی وجہ سے انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا۔

صحابہ کرام نے جب یہ وعیدیں سنی تو وہ اللہ کے احکام پر عمل پیرا ہوئے اور مدینہ کے اسلامی معاشرہ میں شامل ہو گئے، اس وعید کا صحابہ کرام پر بہت زیادہ اثر ہوا، حضرت ضمرہ بن جندبؓ کو جب اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا علم ہوا جس میں کہا گیا ہے: ﴿إِنَّ ٱلَّذِينَ تَوَفَّىٰهُمُ ٱلْمَلَـٰٓئِكَةُ ظَالِمِىٓ أَنفُسِهِمْ......﴾ تو انہوں نے اپنے بیٹوں سے کہا: مجھے اٹھا کر لے جاؤ، اس لئے کہ میں مستضعفین میں سے نہیں ہوں اور میں راستے کو پہچان کر اس پر چل سکتا ہوں، میں مکہ میں رات نہیں گزاروں گا، ان کے بیٹوں نے ان کو چارپائی پر اٹھایا اور مدینہ کا رخ کیا، وہ سن رسیدہ بزرگ تھے، اور ان کا انتقال مقام تنعیم میں ہو گیا، اور جب ان کی وفات کا وقت ہو گیا تو وہ دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھ کر ملانے لگے اور کہنے لگے: اے اللہ یہ تیرے لئے ہے اور یہ تیرے رسول ﷺ کے لئے ہے۔ میں تجھ سے اسی کے مطابق بیعت کرتا ہوں جس کے مطابق تیرے رسول نے بیعت کی، اور جب ان کی وفات کی خبر صحابہ کرام کو پہنچی تو وہ کہنے لگے: کاش ان کی وفات مدینہ میں ہوتی! اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نازل ہوا: ﴿وَمَن يُهَاجِرْ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ يَجِدْ فِى ٱلْأَرْضِ مُرَٰغَمًا كَثِيرًا وَسَعَةً ۚ وَمَن يَخْرُجْ مِنۢ بَيْتِهِۦ مُهَاجِرًا إِلَى ٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ ثُمَّ يُدْرِكْهُ ٱلْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهُۥ عَلَى ٱللَّهِ ۗ وَكَانَ ٱللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا﴾ ترجمہ: ”جو کوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں پناہ لینے کے لئے بہت جگہ اور بسر اوقات کے لئے بڑی گنجائش پائے گا، اور جو اپنے گھر سے اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کے لئے نکلے، پھر راستہ ہی میں اُسے موت آجائے اُس کا اجر اللہ کے ذمہ واجب ہو گیا، اللہ بہت بخشش فرمانے والا اور رحیم ہے“۔(سورۃ النساء:100)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام احکام شریعت پر کس سرعت کے ساتھ عمل کرتے تھے، اور سختی کے ساتھ احکام کی تنفیذ کرتے تھے، چاہے ان کے حالات کیسے بھی ہوں، وہ اپنے لئے عذر نہیں ڈھونڈتے تھے اور نہ ہی رخصتیں تلاش کرتے تھے۔(الھجرۃ النبویہ المبارکہ، ص124)

اللہ تعالیٰ نے جب ہجرت نہ کرنے والوں کے بارے میں وعید نازل کی تو ان لوگوں کو اس وعید سے مستثنیٰ کر دیا جن کے پاس دار الکفر سے نکلنے اور دار الاسلام میں زندگی بسر کرنے کی کوئی تدبیر اور استطاعت نہیں تھی، جیسے کہ بزرگ، کمزور، خواتین، بچے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے واضح عذر کی وجہ سے ان کو اپنے عفو در گزر، مغفرت اور رحمت کی امید دلائی، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِلَّا ٱلْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ ٱلرِّجَالِ وَٱلنِّسَآءِ وَٱلْوِلْدَٰنِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا ﴿٩٨﴾ فَأُو۟لَـٰٓئِكَ عَسَى ٱللَّهُ أَن يَعْفُوَ عَنْهُمْ ۚ وَكَانَ ٱللَّهُ عَفُوًّا غَفُورًا ﴿٩٩﴾﴾ ترجمہ: ”ہاں جو مرد، عورتیں اور بچے واقعی بے بس ہیں اور نکلنے کا کوئی راستہ اور ذریعہ نہیں پاتے، بعید نہیں کہ اللہ انہیں معاف کر دے، اللہ بڑا معاف کرنے والا اور در گزر فرمانے والا ہے“۔(سورۃ النساء: 98 -99)

....

ساتویں فصل

مدینہ میں اسلامی حکومت کے بنیادی ستون

مدینہ میں اسلامی حکومت کے بنیادی ستون

اللہ کے رسول ﷺ مدینہ میں داخل ہونے کے وقت سے ہی نئی حکومت کے ڈھانچے کو مضبوط اور مستحکم بنیادوں پر قائم کرنے کے لئے کوشاں ہوگئے، چنانچہ آپ ﷺ نے پہلے مرحلہ میں امت کے لئے مضبوط بنیادوں کی تعمیر و تشکیل پر پوری توجہ مرکوز کی، جیسے کہ مدینہ میں عظیم مسجد کی تعمیر، اللہ کی محبت کی بنیاد پر انصار و مہاجرین کے درمیان مؤاخات، مدینہ میں موجود تمام قبائل واقوام کے مابین ایک عمومی معاہدہ یا اسلامی دستور پر اتفاق جو مسلمانوں، یہود اور مدینہ کے مشرکین کے مابین تعلقات کو استوار رکھنے میں معاون بنا، حکومت کی حمایت و حفاظت کے لئے ایک فوج کی تشکیل، حکومت کے اہداف و مقاصد کے حصول کے لئے جدوجہد، جدید معاشرہ کی مشکلات کو حل کرنے کی کوشش کی اور زندگی کے تمام معاملات میں ربانی منہج کے مطابق اس نئے معاشرہ کی تربیت.... تعلیمی و تربیتی عمل بھی مسلسل جاری رہا، اسی طرح قرآن کریم بھی اللہ کی عظمت اور کائنات کے حقائق کے بارے میں گفتگو کرتا رہا، جنت کے بارے میں ترغیب اور جہنم کی وعید سناتا رہا، امت کی تربیت کے سلسلہ میں اور اسلامی نظام کے استحکام کے لئے احکام سازی کرتا رہا، اس لئے کہ اسی امت اور حکومت کو تمام انسانوں تک اللہ کا پیغام پہنچانے کا کام انجام دینا تھا۔

اُمت کا تعلیمی و تربیتی سفر بھی دعوتی مراحل اور حکومت و معاشرہ کی تعمیر و ترقی کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا رہا، اللہ کے رسول ﷺ نے ربانی منہج کے مطابق مدینہ منورہ میں خراب معاشی صورتحال کا بھی تدارک کیا، تربیتی عمل بھی جاری رہا، روزہ اور زکوۃ کی فرضیت عمل میں آئی اور معاشرہ ترقی کرتا رہا اور حکومت بھی مضبوط و مستحکم بنیادوں پر طاقتور ہوتی رہی۔

پہلا باب

پہلا ستون: مدینہ میں عظیم مسجد کی تعمیر

اللہ کے رسول ﷺ نے مدینہ منورہ میں سب سے پہلے مسجد کی تعمیر فرمائی تاکہ اس میں ان اسلامی شعائر کا اظہار ہو جن کے بارے میں ابھی تک مزاحمت کی گئی، اور تاکہ اس میں نماز قائم کی جاسکے جو ایک انسان کو رب العالمین کے ساتھ مربوط کرتی ہے اور دل کو مادیت اور دنیاوی زندگی کے میل کچیل سے پاک وصاف کرتی ہے۔ (دیکھیں: فقہ السیرۃ للغزالی، ص 191 فقہ السیرۃ البوطی، ص 151)

امام بخاریؒ نے اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ میں اپنی سواری پر سوار ہو کر داخل ہوئے تو آپؐ کے ساتھ لوگ چلنے لگے یہاں تک کہ آپؐ کی سواری مدینہ میں مسجد نبوی کے پاس بیٹھ گئی، اس جگہ اس وقت کچھ مسلمان نماز پڑھا کرتے تھے، وہ حضرت اسعد بن زرارہؓ کی پرورش میں دو یتیم بچوں سہلؓ اور سہیلؓ کی زمین تھی جہاں کھجور کا کھلیان تھا، جب آپ ﷺ کی سواری بیٹھی تو آپؐ نے فرمایا: یہی ان شاءاللہ قیام کی جگہ ہوگی، اس کے بعد رسولؐ نے دونوں لڑکوں کو بلایا اور ان دونوں کے ساتھ اس کھلیان کے بارے میں بھاؤ تاؤ کیا تاکہ اس کو مسجد بنا سکیں، ان دونوں نے کہا: نہیں، بلکہ ہم اس کو ہبہ کرتے ہیں، اے اللہ کے رسولؐ! آپؐ نے ان سے وہ زمین بغیر قیمت کے لینا قبول نہیں کیا، یہاں تک کہ آپؐ نے ان دونوں سے اس کو قیمتاً خرید لیا۔ (صحیح بخاری: 3906)

حضرت انس بن مالکؓ کی روایت میں ہے کہ اس زمین میں کھجور کے درخت، مشرکین کی قبریں اور کچھ غیر آباد زمین تھی، اللہ کے رسولؐ نے کھجور کے درختوں کے بارے میں حکم دیا تو ان کو کاٹ دیا گیا، مشرکین کی قبروں کو کھودا گیا اور غیر آباد زمین کو برابر کیا گیا۔ فرماتے ہیں کہ کھجور کے درختوں کو قبلہ کی جانب قطاروں میں لگا دیا گیا اور دونوں طرف پتھروں کی دیواریں بنائی گئیں۔ فرماتے ہیں: صحابہ رجزیہ اشعار پڑھ رہے تھے اور آپ ﷺ بھی ان کے ساتھ پڑھ رہے تھے، وہ کہہ رہے تھے:

اللهم! لا خير إلا خير الآخرة .....فانصر الأنصار والمهاجرة

ترجمہ: "اے اللہ! آخرت کے خیر کے سوا کوئی خیر نہیں ہے، لہذا انصار و مہاجرین کی نصرت و مدد فرما"۔ (صحیح بخاری: 428، صحیح مسلم: 524)

اللہ کے رسول ﷺ نے بھی صحابہ کرام کے ساتھ کام کرنا شروع کیا، آپؐ نے بنیاد کھودنے کے لئے پہلی کدال ماری، اس بنیاد کی گہرائی تین ہاتھ تھی، اس کے بعد مسلمان اس بنیاد کو پتھروں سے بھرنے لگے اور دیواروں کو جو کہ قد آدم کے بقدر تھیں اینٹوں کے ذریعہ تعمیر کرنے لگے، ان اینٹوں کو مٹی گارے سے جوڑا جاتا تھا، یہ اینٹیں تعمیر کے لائق پتھروں کی شکل میں بنائی جاتی تھیں، اس کے شمالی حصہ میں کھجور کے تنوں پر کھجور کے پتوں کی ایک چھت بنائی گئی جس کو صفّہ کہا جاتا تھا اور جہاں تک مسجد کے باقی حصوں کا تعلق ہے تو ان کو بغیر چھت کے کھلا چھوڑ دیا گیا۔ (نور الیقین، الخضری، ص 87، 88، وفاء الوفاء للسمھودی 1/321)

جہاں تک مسجد کے دروازوں کا تعلق ہے تو اس کے تین دروازے تھے: ایک دروازہ پچھلی طرف جنوبی سمت میں، دوسرا دروازہ مشرقی سمت میں، یہ دروازہ حضرت عائشہؓ کے حجرہ کے دروازہ کے ساتھ تھا، اس سے رسول اللہ ﷺ داخل ہوتے تھے۔ تیسرا دروازہ مغربی سمت میں تھا جس کو باب الرحمۃ یا باب عاتکہ کہا جاتا تھا۔ (السیرۃ النبویۃ الصحیحہ 1/258)

❁مسجد کے تابع حجرات:

اللہ کے رسول ﷺ کے لئے مسجد نبوی کے آس پاس حجرات تعمیر کئے گئے تاکہ وہ آپؐ کے لئے اور آپؐ کے اہلِ خانہ کے لئے رہنے کی جگہ بن سکیں، وہ حجرے کسریٰ و قیصر اور بادشاہوں کے گھروں کی طرح نہیں تھے بلکہ وہ اس شخصیت کی گھرانے تھے جو دنیا اور اس کی زیب و زینت سے بالاتر ہو اور دارِ آخرت کا طالب ہو، وہ حجرے مسجد نبوی کی طرح اینٹ گارے اور کچھ پتھروں سے تعمیر کئے گئے تھے، ان کی چھت کھجور کے تنوں اور چھالوں پر مشتمل تھی، ان کے صحن چھوٹے تھے اور ان کی اونچائی اتنی کم تھی کہ ایک بلند قامت لڑکا اپنے ہاتھ سے اس کی چھت کو چھو سکتا تھا، حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں جو اپنی والدہ اور حضرت اُم سلمہؓ کی باندی حضرت خیرہ کے ساتھ تھے: میں نبی کریم ﷺ کے حجروں کی چھت کو اپنے ہاتھ سے چھو لیتا تھا۔ (نظام الحکومۃ النبویہ المسمی التراتیب الاداریہ، عبد الحی الکتانی 1/474)

اللہ کے رسول ﷺ کے گھر انتہائی سادہ تھے جبکہ مدینہ عالی شان قلعوں کی وجہ سے مشہور و معروف تھا، جن میں اہلِ ثروت رہا کرتے تھے، حالتِ امن و صلح میں ان کے ذریعہ وہ ایک دوسرے پر فخر کیا کرتے تھے اور جنگی صورتحال میں انہی میں قلعہ بند اور محفوظ ہو جاتے تھے، ان قلعوں پر فخر و مباہات کی وجہ سے وہ ان کے نام بھی رکھتے تھے، جیسے کہ عبداللہ بن ابی ابن سلول کے قلعہ کا نام "مزاحم" تھا، اسی طرح حضرت حسان بن ثابتؓ کے قلعہ کا نام "فارغ" تھا۔

نبی کریم ﷺ نے اپنا گھر اسی متواضع شکل میں بنایا حالانکہ آپؐ اپنے لئے عالی شان محل بنا سکتے تھے، اگر آپؐ اس سلسلہ میں صرف اشارہ بھی فرماتے تو انصار آپؐ کے لئے فوراً عالی شان محل تعمیر کر لیتے، اسی طرح آپ ﷺ کے لئے یہ بھی ممکن تھا کہ حکومت کے عمومی مال ودولت، مالِ غنیمت وغیرہ کے لئے ایک محل تعمیر کرتے لیکن آپؐ نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا تاکہ اپنی امت کے لئے زہد اور تواضع کی اور موت کے بعد کی تیاری کی ایک عظیم مثال قائم فرماتے۔(الفتاویٰ 11/38)

❁ **مدینہ منورہ میں اذان:**

اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے اصحاب کے ساتھ اس سلسلہ میں مشورہ کیا کہ ایک ایسا طریقہ ایجاد کیا جائے جس کے ذریعہ سونے والے کو جگایا جاسکے، غافل کو متنبہ کیا جاسکے اور لوگوں کو نماز کا وقت ہو جانے کی اطلاع دی جاسکے، بعض نے کہا کہ جب نماز کا وقت ہو جائے تو ہم ایک پرچم بلند کیا کریں گے تاکہ لوگ اس کو دیکھ کر سمجھ جائیں کہ نماز کا وقت ہو گیا ہے، اس رائے پر لوگوں نے اعتراض کیا کہ اس سے سونے والے اور غافل کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ دوسروں نے کہا: ہم کسی بلند ٹیلے پر آگ جلایا کریں گے، اس رائے کو بھی قبول نہیں کیا گیا۔ بعض نے مشورہ دیا کہ بوق (سینگ) بجایا جائے جس کو یہودی اپنی عبادت کے لئے استعمال کرتے تھے، اس کو رسول اللہ ﷺ نے ناپسند کیا، اس لئے کہ آپ ﷺ اہلِ کتاب کی مخالفت کرنا پسند فرماتے تھے۔ بعض صحابہ نے ناقوس کے استعمال کا مشورہ دیا جس کو نصاریٰ استعمال کرتے تھے، اس کو بھی رسول ﷺ نے ناپسند فرمایا۔ بعض لوگوں نے آواز لگانے کا مشورہ دیا کہ نماز کا وقت ہو جائے تو کچھ لوگ اعلان کیا کریں، اس رائے کو قبول کیا گیا۔ ندا لگانے والوں میں حضرت عبداللہ بن زید انصاریؓ بھی تھے، ایک روز وہ نیند اور بیداری کی حالت میں تھے کہ اسی اثناء میں ان کے سامنے ایک شخص نمودار ہوا اور کہا: کیا میں آپ کو ایسے کلمات سکھاؤں جن کو آپ نماز کے وقت پکارا کریں؟ انہوں نے کہا: کیوں نہیں، ضرور سکھائیں۔ اس نے کہا: دو مرتبہ اللہ اکبر کہیں۔ دو مرتبہ شہادتیں کہیں۔ اس کے بعد حی علی الصلاۃ دو مرتبہ کہیں۔ پھر حی علی الفلاح دو مرتبہ کہیں۔ پھر دو مرتبہ اپنے رب کی کبریائی بیان کریں، اس کے بعد لاالہ الا اللہ کہیں۔ جب وہ بیدار ہوئے تو رسول اللہ ﷺ کے پاس گئے اور اپنے خواب کا واقعہ آپؐ سے ذکر کیا، آپؐ نے فرمایا: بے شک یہ سچا خواب ہے۔ اس کے بعد ان سے فرمایا: بلال کو یہ کلمات سکھائیں، اس لئے کہ وہ آپ سے زیادہ بلند آواز والے ہیں۔

اسی اثناء میں جبکہ حضرت بلالؓ ان کلمات کے ذریعہ اذان دے رہے تھے حضرت عمر بن خطابؓ جلدی جلدی اپنی چادر گھسیٹتے ہوئے تشریف لائے اور کہا: واللہ! میں نے ایسا ہی خواب دیکھا ہے اے اللہ کے رسولؐ!۔

حضرت بلال بن رباحؓ مدینہ میں آپ ﷺ کے مؤذن تھے جبکہ دوسرے مؤذن حضرت عبداللہ بن ام مکتومؓ تھے، حضرت بلالؓ صبح کی اذان میں ''حی علی الفلاح'' کے بعد ''الصلاۃ خیر من النوم'' دو مرتبہ کہتے تھے اور رسول اللہ ﷺ نے ان کے اس عمل کو برقرار رکھا، وہ 'بداءۃ' میں اونچی جگہ پر اذان دیتے تھے، اس کے بعد منارہ (مئذنہ) ایجاد کیا گیا۔ (مسند احمد: 4/43، سنن ابی داؤد: 499، سنن ترمذی: 189، سنن ابن ماجہ: 706)

۞ مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا خطبہ:

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب مدینہ منورہ میں پہلا خطبہ دیا تو آپ لوگوں کے درمیان کھڑے ہوئے، اللہ کی حمد وثنا بیان فرمائی، اس کے بعد فرمایا: " اَمابعد، اے لوگو! اپنے لئے اعمالِ خیر پیش کرو، آپ کو معلوم ہے کہ اللہ کی قسم! تم میں سے ہر ایک پر بے ہوشی طاری ہو کر موت آنے والی ہے اور وہ اپنی بکریوں کو اس حال میں چھوڑ دے گا کہ کوئی انہیں دیکھ ریکھ کرنے والا نہیں ہوگا۔ اس کے بعد اس کا رب اس سے کہے گا اور اس کے درمیان نہ کوئی ترجمان ہوگا اور نہ ہی کوئی دربان ہوگا جو رب سے اس کو روکے گا: کیا تمہارے پاس میرا رسول نہیں آیا تھا جس نے تم تک پیغام پہنچایا؟! میں نے تم کو مال عطا کیا اور تم پر اپنا فضل کیا تو تم نے اپنے لئے کیا آگے بھیجا ہے؟ وہ دائیں بائیں دیکھے گا تو وہاں کوئی چیز نہیں پائے گا، اس کے بعد اپنے سامنے دیکھے گا تو وہاں اس کو جہنم کے سوا اور کچھ نظر نہیں آئے گا لہذا جو جہنم سے اپنے چہرے کو بچا سکتا ہو اگرچہ کھجور کے ایک ٹکڑے کے ذریعہ ہی تو اس کو ایسا کرنا چاہیے، اور جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو تو کلمہ طیبہ (اچھی بات) کے ذریعہ اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچائے، اس لئے کہ اس کے ذریعہ دس گنا سے سات سو گنا تک نیکیاں ملتی ہیں، والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ"۔ (الدلائل للبیہقی 2/524، سیرت ابن ہشام: 2/146)

اس کے بعد اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک اور مرتبہ خطبہ دیا تو فرمایا: تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں، میں اسی کی حمد بیان کرتا ہوں اور اسی سے مدد طلب کرتا ہوں، اپنے نفس کے شر اور برے اعمال سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں، جس کو اللہ ہدایت عطا کرے، اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں ہے اور جس کو وہ گمراہ کرے اس کو کوئی ہدایت عطا کرنے والا نہیں ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہے، بے شک بہترین کلام اللہ تبارک وتعالیٰ کی کتاب ہے، فلاح پا گیا وہ شخص جس کے دل میں اللہ تعالیٰ نے اس کو مزین کیا اور کفر کے بعد اس کو اسلام کی توفیق عطا کی اور لوگوں کے کلام کے مقابلہ میں اس کو منتخب کیا، بے شک وہ حسین ترین اور بلیغ ترین کلام ہے جس سے اللہ تعالیٰ محبت کرے تم بھی اس سے محبت کرو، اللہ سے پورے دل سے محبت کرو، اللہ کے کلام اور ذکر سے مت اُکتاؤ، اس کے بارے میں تمہارے دل سخت نہ ہوں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ جس چیز کو بھی پیدا کرتا ہے اس میں سے کچھ کو منتخب کرتا ہے اور چن لیتا ہے، اللہ تعالیٰ نے بعض اعمال اور بعض بندوں اور بہترین کلام کا انتخاب کیا ہے، لوگوں کو جو کچھ عطا کیا ہے اس میں حلال اور حرام ہیں، لہذا اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو کو شریک نہ ٹھہراؤ، اس سے ویسے ڈرو جیسے اس سے ڈرنے کا حق ہے، جو کچھ تم اپنے منہ سے بولتے ہو اس میں اللہ کے ساتھ سچائی کا معاملہ کیا کرو، اللہ کی رحمت کی وجہ سے آپس میں محبت کیا کرو، اللہ اس بات سے ناراض ہوتا ہے کہ اس کے عہد کو توڑا جائے۔ والسلام علیکم۔ (الدلائل للبیہقی: 2/524 - 525، سیرت ابن ہشام: 2/146 - 147)

۞ مسجد نبوی کے تابع صفہ:

جب اللہ تعالیٰ کے حکم سے بیت المقدس سے خانہ کعبہ کی طرف قبلہ تبدیل ہوا اور یہ ہجرت نبوی کے سولہ ماہ بعد ہوا تو قبلہ اُولیٰ کی دیوار مسجد نبوی کے پچھلے حصہ میں باقی رہی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے بارے میں حکم دیا تو اس پر چھت ڈالی گئی اور اس کو "صفہ" یا "الظلہ" کہا جانے لگا۔

قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں: صفہ مسجد نبوی کی پچھلی جانب ایک سائبان ہے جو مساکین کی پناہ گاہ تھا، اسی کی جانب اہلِ صفہ کی نسبت کی جاتی ہے۔

ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: صفہ مسجد نبوی کی پچھلی سمت مسجد کے شمال میں واقع ہے۔

علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: صفہ مسجد نبوی کی پچھلی جانب ایک سایہ دار جگہ تھی جس کو اجنبی لوگوں کے لئے تیار کیا گیا تھا جن کے پاس نہ رہنے کے لئے کوئی جگہ تھی اور نہ ہی ان کے گھر والے تھے۔(فتح الباری: 6/738)

ا: اہلِ صفہ:

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں: اہلِ صفہ اسلام کے مہمان ہیں، نہ وہ گھر والوں کے ساتھ رہتے ہیں، نہ ان کے پاس مال و دولت ہے اور نہ ہی کسی کی پناہ میں رہتے ہیں۔(صحیح بخاری: 6452)

اولین مرحلہ میں ہجرت کرنے والے جنہوں نے نبی کریم ﷺ سے پہلے یا آپؐ کے ساتھ یا آپؐ کے بعد غزوۂ بدر سے پہلے تک ہجرت کی، انصارِ مدینہ اپنے اپنے گھروں میں ان کی میزبانی کر رہے تھے، نفقہ میں ان کو شریک کرتے تھے، لیکن جب مہاجرین کی تعداد زیادہ ہوگئی تو پھر ان تمام مہاجرین کی میزبانی اور کفالت انصار کے بس میں نہیں رہی، مہاجرین کی تعداد اس کے بعد یکے بعد دیگرے بھڑتی ہی چلی گئی، اس لئے کہ اسلام پھیلتا رہا اور لوگ اس میں داخل ہوتے رہے اور فقراء، اغنیاء، شادی شدہ اور غیر شادی شدہ سب مدینہ منورہ کی جانب ہجرت کرتے رہے اور ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا، لہذا جس کو پناہ کے لئے کوئی جگہ میسر نہ ہوتی تو وہ مسجد کے اس صفہ میں پناہ لیتا۔(السیرۃ النبویۃ، تربیۃ اُمۃ وبناء دولۃ، الشامی، ص175، الفتاوی، 11/40- 41)

بظاہر ایسا لگتا ہے کہ کوئی بھی مہاجر جب مدینہ منورہ آتا تھا تو رسول ﷺ سے ملاقات کرتا، اس کے بعد آپؐ اس کو کسی شخص کی کفالت میں دے دیتے تھے اور اگر کوئی کفالت کرنے والا نہ ملتا تو وہ شخص کچھ وقت کے لئے صفہ میں رہتا جب تک کہ اس کے لئے کوئی متبادل انتظام ہو جاتا، چنانچہ مسند احمد میں حضرت عبادہ بن صامتؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں: اللہ کے رسول ﷺ صحابہ کرام کو مختلف کام اور ذمہ داریاں سونپ دیتے تھے، جب کوئی مہاجر شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا تو آپؐ اس کو ہم میں سے کسی شخص کے حوالے کر دیتے تھے جو اس کو قرآن کی تعلیم دیتا، اللہ کے رسول ﷺ نے ایک شخص کو میرے حوالہ کیا وہ گھر میں میرے ساتھ رہتا تھا، میں گھر والوں کے کھانے میں اس کو رات کا کھانا کھلاتا تھا، میں اس کو قرآن بھی پڑھاتا تھا۔(مسند احمد: 5/324)

صفہ پر سب سے پہلے قیام کرنے والے مہاجرین تھے، اسی لئے ان کی طرف نسبت کرتے ہوئے اس کو "صُفّۃ المہاجرین" کہا گیا۔(وفاء الوفاء، للسمہودی 1/323، سنن ابی داؤد: 2/361)

اسی طرح وہاں پر باہر سے آنے والے وفود بھی ٹھہرتے تھے جو اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں اسلام قبول کرنے کی غرض سے حاضر ہوتے تھے، اللہ کے رسولؐ کی خدمت میں جب کوئی شخص آتا اور اس کا کوئی جاننے والا ہوتا تو وہ اسی کے پاس ٹھہرتا اور اگر کوئی جاننے والا نہ ہوتا تو اصحابِ صفہ کے ساتھ قیام کر لیتا۔

حضرت ابوہریرہؓ صفہ پر رہنے والوں اور وہاں رات کے وقت آنے والوں کے ذمہ دار اور نمائندہ تھے، چنانچہ نبی کریم ﷺ جب ان کو بلانا چاہتے تھے تو حضرت ابوہریرہؓ کو ذمہ داری دے دیتے تھے اور وہ ان کو دعوت دیتے تھے، اس لئے کہ وہ ان کے بارے میں اور عبادت و مجاہدہ میں ان کے مقام و مرتبہ سے واقف تھے۔(السیرۃ النبویہ الصحیحۃ: 1/258، 259)

بعض انصار نے بھی زہد و مجاہدہ اور قناعت والی زندگی کو پسند کرنے کی وجہ سے صفہ پر قیام کرنے کو ترجیح دی، حالانکہ ان کو اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور مدینہ میں ان کا گھر موجود تھا، جیسے کہ حضرت کعب بن مالک انصاریؓ، حضرت حنظلہ بن ابی عامر انصاریؓ، (غسیل الملائکہ) حضرت حارثہ بن نعمان انصاریؓ، وغیرہ۔(السیرۃ النبویہ الصحیحۃ: 1/259)

۲: اہلِ صفہ کے مصارف اور ان کی کفالت:

نبی کریم ﷺ بذاتِ خود اہلِ صفہ کی دیکھ بھال اور نگرانی کرتے تھے، ان سے ملاقات کرتے، ان کے حالات دریافت فرماتے، ان کے بیماروں کی عیادت کرتے تھے، اسی طرح ان کے ساتھ اکثر اوقات بیٹھتے، ان کی رہنمائی فرماتے، ان کے ساتھ غمخواری کرتے، ان کو تذکیر کرتے، ان کو تعلیم دیتے اور قرآن کریم کی تلاوت و مذاکرہ، ذکر اللہ اور آخرت پر غور و فکر کرنے کی طرف توجہ دلاتے، اسی طرح آپ ﷺ متعدد اور متنوع وسائل کے ذریعہ ان کے مصارف کو بھی پورا کرنے کی کوشش کرتے تھے، جیسے کہ:

1) جب آپ ﷺ کے پاس صدقہ آتا تو وہ ان کے پاس بھیج دیتے اور خود اس میں سے کچھ استعمال نہیں کرتے، اور اگر آپ ﷺ کے پاس کوئی ہدیہ آتا تو اس کو ان کے پاس بھیج دیتے، خود بھی اس میں سے استعمال کرتے اور ان کو بھی اس میں شریک کرتے۔ (صحیح بخاری: 6452)

2) اکثر و بیشتر ان کو امہات المؤمنین میں سے کسی کے گھر کھانا کھانے کے لئے مدعو کرتے تھے اور کبھی بھی ان کے بارے میں غفلت نہیں برتتے تھے، بلکہ ان کے حالات آپ ﷺ کے پیش نظر رہتے، حضرت عبدالرحمن بن ابی بکرؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں: بے شک اصحاب صفہ فقراء لوگ تھے، نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ فرمایا: جس کے پاس دو لوگوں کے بقدر کھانا ہو وہ تیسرے شخص کو اپنے ساتھ لے جائے، جس کے پاس چار افراد کا کھانا ہو تو وہ پانچویں یا چھٹے شخص کو ساتھ لے کر جائے - یا اسی طرح کے الفاظ ارشاد فرمائے - ابو بکرؓ تین لوگوں کو لے کر آئے اور نبی کریم ﷺ دس لوگوں کو لے کر گئے۔(صحیح بخاری: 3581، صحیح مسلم: 2057)

حضرت یعیش بن طخفہ بن قیس غفاریؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں: میرے والد اُصحابِ صفہ میں سے تھے، اللہ کے رسول ﷺ نے ان کے بارے میں حکم دیا تو کوئی شخص ایک آدمی کو لے کر جانے لگا اور کوئی دو کو، یہاں تک کہ ہم پانچ لوگ باقی بچ گئے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: چلو! تو ہم آپ کے ساتھ حضرت عائشہؓ کے گھر تشریف لے گئے۔ (مسند أحمد: 429-430، مسند الطیالسی: 1339)

3) نبی کریم ﷺ لوگوں سے مطالبہ کرتے تھے کہ اپنے صدقات ان اہلِ صفہ کو دیں، مسند احمد میں مروی ہے کہ حضرت فاطمہؓ کے ہاں جب حضرت حسنؓ کی ولادت ہوئی تو آپؐ نے ان سے فرمایا کہ اُن کے سر کا حلق کریں اور ان کے بالوں کے وزن کے بقدر چاندی اہلِ صفہ کو صدقہ دیں۔(مسند احمد 6/390 - 391)

4) نبی کریم ﷺ اہلِ صفہ کی ضروریات کو دوسروں کے مقابلہ میں مقدم رکھتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ آپ ﷺ کے پاس مالِ غنیمت میں کچھ غلام آئے، حضرت فاطمہؓ آپ ﷺ کی خدمت میں ایک خادم کا مطالبہ کرنے کے لئے حاضر ہوئیں، آپؐ نے جواب دیا جیسا کہ مسند احمد میں ہے: "واللہ! میں تمہیں نہیں دے سکتا ہوں جبکہ اہل صفہ کے پیٹ بھوک کی شدت سے کمر کے ساتھ برابر ہو رہے ہیں، میں ان کو کیسے نظر انداز کر سکتا ہوں؟! ان پر خرچ کرنے کے لئے میرے پاس کچھ نہیں ہے، اس لئے میں ان کو بیچوں گا اور ان کی قیمت ان پر خرچ کروں گا"۔(صحیح بُخاری: 3113)

5) نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام کو اہلِ صفہ پر صدقہ کرنے کی خاص ہدایت فرمائی تھی، اس لئے صحابہ کرام استطاعت کے مطابق ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرتے تھے، مالدار صحابہ کرام ان کے پاس کھانا بھیجا کرتے تھے۔ السیرۃ النبویہ الصحیحۃ: 264)

۳: علم وعبادت اور جہاد کے لئے اہلِ صفہ کا اپنے آپ کو فارغ کرنا:

اہلِ صفہ مسجد میں عبادت کی غرض سے اعتکاف کرتے تھے اور فقر وزہد کو خوش دلی سے برداشت کرتے تھے، وہ اپنی خلوتوں میں نماز میں ادا کرتے تھے، قرآنِ کریم کی تلاوت کرتے، اس کی آیات کا مذاکرہ کرتے اور اللہ کا ذکر کرتے، ان میں سے بعض کتابت سیکھتے تھے، یہاں تک کہ ان میں سے ایک صحابی نے حضرت عبادہ بن صامتؓ کو اپنی کمان ہدیہ میں دی، اس لئے کہ وہ ان کو قرآن اور کتابت سکھاتے تھے۔(سنن ابو داؤد: 2/237، سنن ابن ماجہ: 2/730)

ان میں سے بعض مخصوص علم اور حفظِ حدیث میں مشہور و معروف ہوئے، جیسے کہ حضرت ابوہریرہؓ جو کثرتِ احادیث میں معروف ہوئے جبکہ حضرت حذیفہ بن نعمانؓ فتن کے بارے میں احادیث بیان کرنے میں معروف ہوئے۔

اہلِ صفہ جہاد میں بھی شرکت کرتے تھے، بلکہ ان میں سے بعض بدر میں شہید ہوئے، جیسے کہ حضرت صفوان بن بیضاءؓ، حضرت خریم بن فاتک اسدی، حضرت خبیب بن یساف، حضرت سالم بن عمیر، حضرت حارثہ بن نعمان انصاری۔ ان میں سے بعض غزوۂ احد میں شہید ہوئے، جیسے حضرت حنظلہؓ غسیل الملائکہ، ان میں سے بعض حدیبیہ میں شہید ہوئے جیسے کہ حضرت جرہد بن خولید، حضرت ابو سریحہ غفاری، ان میں سے بعض غزوۂ خیبر میں شہید ہوئے جیسے حضرت ثقیف بن عمروؓ، ان میں سے بعض غزوۂ تبوک میں شہید ہوئے جیسے کہ حضرت عبداللہ (ذو البجادین) ان میں سے بعض جنگ یمامہ میں شہید ہوئے جیسے حضرت ابو حذیفہؓ کے غلام حضرت سالمؓ اور حضرت زید بن الخطابؓ۔ اہلِ صفہ رات کے عبادت گزار اور دن کے شہسوار تھے۔(السیرۃ النبویہ الصحیحۃ: 1/264)

بعض صحابہ کرام نے اضطرار اور مجبوری کے بجائے رغبت و شوق کے ساتھ صفہ نبوی میں ٹھہرنے کو ترجیح دی تھی، جیسے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے اپنے لئے پسند کیا کہ ہر وقت رسول اللہ ﷺ کی صحبت ومعیت میں رہیں اور علم وخیر میں سے جو کچھ ان سے فوت ہوا ہے اس کو حاصل کریں، چنانچہ وہ ہجرت کے ساتویں سال فتح خیبر کے بعد مدینہ منورہ آئے اور وہ اس بات کے حریص تھے کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے زیادہ سے زیادہ احادیث سنیں، آپ ﷺ کے حالات سے واقف ہوں اور آپؐ کی خدمت کرکے برکت حاصل کریں اور یہ اسی وقت ہو سکتا تھا جب کہ وہ نبی کریم ﷺ کے گھر کے قریب رہتے، اس لئے صفہ ہی وہ جگہ تھی جہاں ان کو یہ چیز حاصل ہو سکتی تھی، حضرت ابوہریرہؓ

بذاتِ خود اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: آپ لوگ کہتے ہو کہ ابو ہریرہ رسول ﷺ سے بہت زیادہ احادیث بیان کرتے ہیں اور کہتے ہو کہ مہاجرین اور انصار رسول ﷺ سے ابو ہریرہ کی طرح حدیثیں کیوں بیان نہیں کرتے ہیں؟! میرے مہاجر بھائی بازار میں خرید وفروخت میں مشغول رہتے تھے اور میں بھوکے پیٹ رسول اللہ ﷺ کو لازم پکڑتا تھا، وہ جب غائب ہوتے تھے تو میں موجود ہوتا، وہ جب بھولتے تو مجھے یاد ہوتا اور میرے انصاری بھائی اپنے مال کی دیکھ بھال اور کام میں مشغول رہتے تھے اور میں صفہ کے مساکین میں سے ایک مسکین شخص تھا، جب وہ بھول جاتے تو مجھے یاد ہوتا۔(صحیح بخاری: 2047 صحیح مسلم:2492)

حضرت ابوہریرہؓ نے یہ واضح کر دیا ہے کہ انہوں نے یہ سب کچھ رسول اللہ ﷺ کی صحبت و معیت اختیار کرنے کے شوق میں کیا، حضرت ابوہریرہؓ کا مدینہ منورہ میں گھر بھی موجود تھا، جہاں ان کی والدہ بھی رہتی تھیں جن کے متعلق حضرت ابوہریرہؓ نے نبی کریم ﷺ سے درخواست کی تھی کہ ان کی ہدایت کے لئے دعا فرمائیں۔(صحیح مسلم:2491، مسند احمد:2/320)

مزید بر آں حضرت ابوہریرہؓ کوئی نادار و فقیر شخص نہیں تھے، چنانچہ پہلے ہی روز جب کہ وہ نبی کریم ﷺ کے پاس خیبر میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے ان کے لئے مال غنیمت میں حصہ طے فرمایا ،اسی طرح ان کے ساتھ ایک غلام تھا جو ان کی خدمت کرتا تھا- جیسے کہ روایت میں وارد ہے- لہٰذا جس چیز نے ان کو فقر و محتاجی پر مجبور کیا وہ رسول اللہ ﷺ کی صحبت و معیت کو ترجیح دینا اور آپ ﷺ سے احادیث کی سماعت کرنا تھا، اگر وہ چاہتے تو صفہ سے وہ بے نیاز بھی ہو سکتے تھے۔(السیرۃ النبویہ تربیۃ أمۃ وبناء دولۃ، ص: 184)

اہلِ صفہ کی تعداد میں حالات کے اعتبار سے کمی یا زیادتی ہوتی رہتی تھی جیسے کہ کبھی اہل خانہ کے پاس واپس جاتے، یا کسی کی شادی ہو جاتی، یا تنگ دستی کے بعد خوشحالی حاصل ہو جاتی، یا کسی کو اللہ کی راہ میں شہادت نصیب ہو جاتی۔

ان کا فقر کام نہ کرنے اور کسبِ معاش کے بارے میں غفلت کی وجہ سے نہیں تھا، اس لئے کہ علامہ زمحشریؒ نے ذکر کیا ہے کہ وہ دن میں گھٹلیاں کوٹتے تھے، بظاہر ایسا لگتا ہے کہ وہ گھٹلیاں جانوروں کے چارے اور کھانے کے لئے کوٹتے تھے، حالانکہ ان کے پاس جانور نہیں تھے، لہٰذا معلوم یہ ہوا کہ وہ کسبِ معاش کے لئے کام کرتے تھے۔(المدینۃ النبویۃ: فجر الاسلام والعصر الراشدی، شرّاب 1/222)

۴: اہلِ صفہ کی تعداد اور ان کے نام:

اہلِ صفہ کی تعداد حالات اور اوقات کے اعتبار سے مختلف ہوتی رہتی تھی، جب مدینہ میں وفود آتے تھے تو ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا اور جب اجنبی اور باہر سے آنے والوں کی آمد کم ہوتی تھی تو ان کی تعداد میں بھی کمی آتی تھی، البتہ عام حالات میں وہاں قیام کرنے والوں کی تعداد ستر (70) افراد کے آس پاس تھی اور بسا اوقات ان کی تعداد میں کافی اضافہ ہو جاتا تھا، یہاں تک کہ تنہا حضرت سعد بن عبادہؓ ان میں سے اسّی (80) افراد کی میزبانی کرتے تھے اور باقی افراد کو صحابہ کرام آپس میں تقسیم کر لیتے تھے۔(الحلیۃ 1/339)

اہلِ صفہ کے بعض نام:

1) حضرت ابوہریرہؓ: انہوں نے اپنے آپ کو اہلِ صفہ کے ساتھ ہی شامل کر لیا تھا۔

2) حضرت ابوذر غفاریؓ: انہوں نے اپنے آپ کو اہلِ صفہ میں شامل کر لیا تھا۔

3) حضرت واثلہ بن الاسقعؓ　4) حضرت قیس بن طہفہ غفاریؓ؛انہوں نے اپنے آپ کو اہل صفہ کے ساتھ شامل کر لیا تھا۔
5) حضرت کعب بن مالک انصاریؓ　6)حضرت سعید بن عامر بن حذیم الجمحیؓ
7)حضرت سلمان فارسیؓ　8)حضرت اسماء بن حارثہ بن سعید اسلمیؓ
9)حضرت حنظلہ بن ابی عامر انصاریؓ"غسیل الملائکہ"
10)حضرت حازم بن حرملہؓ　11)حضرت حارثہ بن نعمان انصاری نجاریؓ
12)حضرت حذیفہ بن اُسید ابو سریحہ انصاریؓ　13)حضرت حذیفہ بن یمانؓ
14)حضرت جاریہ بن حمیل بن نشبہ بن قرطؓ　15) حضرت جُعیل بن سراقہ ضمریؓ
16) حضرت جرہد بن خولید اُسدیؓ　17) حضرت رفاعہ اُبولبابہ انصاریؓ
18) حضرت عبداللہ ذوالبجادینؓ　19) حضرت دکین بن سعید مزنیؓ
20) حضرت خبیب بن یساف بن عِنَبہ　21) حضرت خریم بن اُوس الطائیؓ
22) حضرت خریم بن فاتک اُسدیؓ　23)حضرت خُنیس بن حذافہ السہمیؓ
24) حضرت خباب بن الارتؓ　25) حضرت الحکم بن عمیر الثمالیؓ
26) حضرت حرملہ بن اُیاسؓ یا حضرت حرملہ بن عبداللہ العنبریؓ
27) حضرت زید بن الخطابؓ　28) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ
29) حضرت الطفاوی الدوسیؓ　30) حضرت طلحہ بن عمرو النضریؓ
31) حضرت صفوان بن بیضاء الفہریؓ　32) حضرت صہیب بن سنان رومیؓ
33) حضرت شداد بن اُسیدؓ　34) حضرت شقرانؓ(نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غلام)
35) حضرت سائب بن خلادؓ　36) حضرت سالم بن عمیر اُوسیؓ
37) حضرت سالم بن عبید الاشجعیؓ　38) حضرت سالمؓ(حضرت حذیفہؓ کے غلام)
39) حضرت سفینہؓ(نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غلام) 40) حضرت ابو رزینؓ
41) حضرت الاغر المزنیؓ　42) حضرت بلال بن رباحؓ
43) حضرت براء بن مالک انصاریؓ　44) حضرت ثوبانؓ(نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غلام)
45) حضرت ثابت بن ودیعہ انصاریؓ　46) حضرت ثقفُ بن عمرو بن سمیط اُسدیؓ
47) حضرت سعد بن مالک ابو سعید الخدریؓ　48) حضرت عرباض بن ساریہؓ
49) حضرت غرفتہ الازدیؓ　50) حضرت عبدالرحمن بن قرطؓ

51) حضرت عبادہ بن خالد الغفاریؓ (دیکھیں: السیرۃ النبویہ الصحیحہ: 1/262-263)

بعض محققین انتہائی فحش غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں، اس لئے کہ انہوں نے بعض منحرف صوفیاء کے مسلک کی مشروعیت کا اہلِ صفہ کی صورتحال کے ذریعہ اس بات پر استدلال کیا ہے کہ عمل کو چھوڑ کر راحت و آرام اختیار کیا جائے اور اہلِ صفہ کی اقتداء کرتے ہوئے خانقاہوں میں گوشہ نشینی اختیار کی جائے، اس لئے کہ حضرت ابوہریرہؓ جو اہل صفہ کے ساتھ سب سے زیادہ مربوط تھے، وہ مسلسل صفہ پر نہیں رہے بلکہ وہ میدانِ عمل میں اترے، بلکہ حضرت عمر بن خطابؓ کے دورِ خلافت میں وہ بحرین کے امیر بھی مقرر ہوئے اور اپنی زندگی میں تقشف اور سختی اختیار کرنے والے نہیں تھے، بلکہ اہلِ صفہ میدانِ جنگ میں مجاہدین فی سبیل اللہ میں شامل تھے، ان میں سے بعض نے جامِ شہادت بھی نوش کیا۔

....

دروس واسباق اور عبرت ونصائح

ا: مسجد معاشرہ کی تعمیر کا ایک اہم ستون:

بلاشبہ مساجد کا قیام اسلامی معاشرہ کی تعمیر میں ایک اہم ستون کی حیثیت رکھتا ہے، اس لئے کہ اسلامی معاشرہ کو اسی وقت استحکام اور رسوخ حاصل ہوتا ہے جب کہ وہ اسلامی نظام اور عقیدہ و آداب کو مضبوطی کے ساتھ تھامے رہے اور یہ سب کچھ مسجد کی روح اور اس کے پیغام کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لَا تَقُمۡ فِيهِ أَبَدٗاۚ لَّمَسۡجِدٌ أُسِّسَ عَلَى ٱلتَّقۡوَىٰ مِنۡ أَوَّلِ يَوۡمٍ أَحَقُّ أَن تَقُومَ فِيهِۚ فِيهِ رِجَالٞ يُحِبُّونَ أَن يَتَطَهَّرُواْۚ وَٱللَّهُ يُحِبُّ ٱلۡمُطَّهِّرِينَ﴾ ترجمہ: "تم ہرگز اس عمارت میں کھڑے نہ ہونا جو مسجد اول روز سے تقویٰ پر قائم کی گئی تھی، وہی اس کے لئے زیادہ موزوں ہے کہ تم اس میں (عبادت کے لئے) کھڑے ہو، اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنا پسند کرتے ہیں اور اللہ کو پاکیزگی اختیار کرنے والے ہی پسند ہیں"۔ (سورۂ توبہ: 108)

دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿فِي بُيُوتٍ أَذِنَ ٱللَّهُ أَن تُرۡفَعَ وَيُذۡكَرَ فِيهَا ٱسۡمُهُۥ يُسَبِّحُ لَهُۥ فِيهَا بِٱلۡغُدُوِّ وَٱلۡأٓصَالِ ٣٦ رِجَالٞ لَّا تُلۡهِيهِمۡ تِجَٰرَةٞ وَلَا بَيۡعٌ عَن ذِكۡرِ ٱللَّهِ وَإِقَامِ ٱلصَّلَوٰةِ وَإِيتَآءِ ٱلزَّكَوٰةِ يَخَافُونَ يَوۡمٗا تَتَقَلَّبُ فِيهِ ٱلۡقُلُوبُ وَٱلۡأَبۡصَٰرُ ٣٧ لِيَجۡزِيَهُمُ ٱللَّهُ أَحۡسَنَ مَا عَمِلُواْ وَيَزِيدَهُم مِّن فَضۡلِهِۦۗ وَٱللَّهُ يَرۡزُقُ مَن يَشَآءُ بِغَيۡرِ حِسَابٖ ٣٨﴾ ترجمہ: "(اُس کے نور کی طرف ہدایت پانے والے) اُن گھروں میں پائے جاتے ہیں جنہیں بلند کرنے کا، اور جن میں اپنے نام کی یاد کا اللہ نے اذن دیا ہے۔ اُن میں ایسے لوگ صبح و شام اُس کی تسبیح کرتے ہیں جنہیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد سے اور اقامت نماز و ادائے زکوٰۃ سے غافل نہیں کر دیتی، وہ اُس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں دل الٹنے اور دیدے پتھرا جانے کی نوبت آجائے گی۔ (اور وہ یہ سب کچھ اس لئے کرتے ہیں) تاکہ اللہ ان کے بہترین اعمال کی جزا اُن کو دے اور مزید اپنے فضل سے نوازے، اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے"۔ (سورۂ نور: 36-38)

۲: مسجد اسلام کی جامعیت کی علامت:

1) مسجد کا قیام اس لئے عمل میں آیا تاکہ وہ اہلِ ایمان کی نماز، ذکر اللہ، تسبیح و تقدیس اور حمد و شکر کے لئے عبادت گاہ بن سکے، جہاں ہر مسلمان داخل ہوتا ہے، نماز ادا کرتا ہے اور عبادت کرتا ہے اور کوئی اس کو نقصان نہیں پہنچا سکتا ہے، جب تک کہ وہ مسجد کے تقدس کی حفاظت کرتا ہے اور اس کا ادب و احترام کرتا ہے۔

2) اسی طرح مسجد کا قیام اس لئے بھی عمل میں آیا تاکہ وہاں پر رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب اور ایمان و ہدایت کے طالبین کے ساتھ ملاقات کر سکیں۔

3) مسجد کا قیام اس لئے عمل میں آیا تاکہ وہ کائناتی، عقلی اور تنزیلی علوم و معارف کی درس گاہ بنے جن علوم و معارف پر غور و فکر کرنے کی قرآن کریم نے ترغیب دی ہے، اسی طرح وہ ایک ایسا مدرسہ ہے جہاں اہلِ ایمان اپنے افکار و نظریات کا مظاہرہ کر سکیں اور طلبائے علوم کے لئے ایک مرکز بنے جہاں آکر وہ تفقہ فی الدین حاصل کر سکیں اور اپنی اپنی قوم کی طرف مبشرین و منذرین اور داعیانِ حق بن کر لوٹیں۔

4) مسجد کا قیام اس لئے عمل میں آیا تاکہ ایک غریب الوطن اور اجنبی کو وہاں ٹھکانہ اور جائے پناہ مل سکے، وہ کسی کا احسان مند نہ ہو، وہاں کے چشمۂ صافی سے سیراب ہو اور اپنی نفسیاتی اور عقلی استعداد و صلاحیت کے اعتبار سے وہاں سے ہدایت کا زادِ راہ حاصل کرے، اس کو کوئی بھی علم و معرفت یا ہدایت کے کسی بھی پہلو کو حاصل کرنے میں روک نہ سکے، کتنے قائدین مسجد کے اس مرکزِ ہدایت سے بن کر نکلے اور ان کی بہادری اور جوانمردی کے جوہر نکھر کر سامنے آئے؟! کتنے علماء نے یہاں کے بحرِ بیکراں سے علم کے موتی سمیٹے اور پھر وہ لوگوں کے لئے علم و معرفت کا سرچشمہ بن گئے اور ان کی علمی پیاس بجھانے لگے؟! کتنے داعیانِ حق نے مسجد کی چہار دیواری میں رہتے ہوئے دعوتِ الی اللہ کے دروس حاصل کئے اور وہ بعد میں آنے والے داعیوں کے لئے ایک اسوہ اور نمونہ بن گئے اور ان کی خوشبو کی عطربیزی کی وجہ سے دل ان کی جانب کھنچتے چلے گئے اور ان کے نور سے منور ہوتے رہتے؟!

کتنے تند مزاج اعرابی جب اس مسجد میں داخل ہوئے حالانکہ وہ سرخ اور پیلے رنگ میں فرق کرنا نہیں جانتے تھے وہ جب مسجد میں رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دیکھا کہ اصحابِ رسول آپ ﷺ کے ارد گرد اس طرح جمع ہو کر آپ کی باتوں پر گوش بر آواز ہیں جیسے کہ ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوئے ہیں، جب انہوں نے بھی آپ ﷺ سے پیغامِ حق سنا اور جہالت کے دبیز پردوں میں چھپی ہوئی عقل سے پردہ چھوٹ گیا اور وہ عقل سے کام لینے لگے تو ان کو بھی دین کا فہم نصیب ہو گیا، وہ بھی اس نور سے منور ہو گئے اور ہدایت سے فیضیاب ہو گئے، اس کے بعد وہ اپنی قوم کی جانب امام و ہادی بن کر گئے، ان کو اللہ کی طرف بلانے لگے، سیکھے ہوئے علم کے ذریعہ ان کی بھی تربیت کرنے لگے اور وہ بھی ان کی دعوت کی وجہ سے ایمان لے آئے اور ہدایت یافتہ ہو گئے اور ان کا ذکر اسلامی تاریخ میں سنہری حروف میں کیا جانے لگا۔

(دیکھیں: محمد رسول اللہ ﷺ، محمد صادق عرجون: 3/34- 35)

5) مسجد کا قیام اس لئے بھی عمل میں آیا تاکہ وہ مجاہدین کے لئے ایک قلعہ اور مرکز بن سکے، وہاں جہاد اور دعوت الی اللہ کا علم بلند کیا جائے اور وہاں سے قائدین کو مختلف و متنوع مقامات اور سمتوں کی جانب روانہ کیا جائے اور یہاں کے روحانی ماحول میں رہتے ہوئے اللہ کی فوج کو نصرت یا شہادت کا انتظار رہے۔

6) مسجد کا قیام اس لئے بھی عمل میں آیا تاکہ اس کے کسی کونے کو جہاد میں زخمی ہونے والوں کے علاج و معالجہ کے لئے کلینک اور ہاسپٹل کے طور پر استعمال کیا جائے اور نبی کریم ﷺ بھی ان کی عیادت کر سکیں، ان کے حالات سے آگاہ ہوتے رہیں اور ان کے علاج و معالجہ کے لئے کوشش کر سکیں، اس لئے کہ ان کا فضل و مقام انتہائی بلند ہے۔

7) مسجد کا قیام اس لئے بھی عمل میں آیا تاکہ وہ مسلمانوں کے لئے پیغام رسانی کے مرکز کا کام کر سکے، جہاں سے خبریں حاصل کی جا سکتی ہوں، وہاں سے پیغامات بھیجے اور لائے جائیں، وہیں سے صلح و جنگ سے متعلق خبریں معلوم ہوں اور نصرت و کامیابی کے پیغامات وہیں سے حاصل ہوں، کمک بھیجنے کی ضرورت وہیں سے معلوم ہو اور میدانِ جہاد میں شرکت کرنے والوں کی شہادت کی خبر بھی وہیں سے موصول ہو۔

8) مسجد کا قیام اس لئے بھی عمل میں آیا تاکہ وہ مسلم معاشرہ کے لئے کمین گاہ کا کام دے سکے جہاں سے دشمن کی مشکوک حرکات پر نگاہ رکھی جا سکے، خاص طور پر ان دشمنوں پر جو اسی شہر میں رہتے تھے، جیسے کہ یہود کے کچھ گروہ، منافقین کا ٹولہ، وہ بت پرست جو شرک کی آلودگیوں میں ملوث تھے، اس کے ذریعہ مسلم معاشرہ ان کی چالوں، بدنیتی اور منصوبوں سے اور ان کی خیانتوں سے محفوظ و مامون رہیں گے۔ (محمد رسول اللہ ﷺ، محمد صادق عرجون: 3/36)

مسجد نبوی کی بنیاد و تعمیر کا آغاز رسول اللہ ﷺ نے دارِ ہجرت مدینہ منورہ آنے کے اولین مرحلہ میں کیا، تاکہ وہ ایک ایسا آئیڈیل مرکز بن جائے جو اپنی ظاہری سادگی اور باطنی گہرائی اور گیرائی میں ایک مثال اور قابل تقلید نمونہ بن سکے، اور اس کے ذریعہ قلیل ترین مصارف اور کم محنت و مشقت میں عظیم اور وسیع تر اہداف و مقاصد حاصل ہوں۔ (محمد رسول اللہ ﷺ، محمد صادق عرجون: 3/33)

۳: عملی نمونے کے ذریعہ تربیت:

یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ نبی کریم ﷺ مسجد نبوی کی تعمیر اور کام میں اپنے اصحاب کے شانہ بشانہ شریک تھے، آپ ﷺ پتھر ڈھوتے تھے، اپنے کندھوں پر اینٹیں اٹھاتے تھے، اور کسی بھی عام انسان کی طرح اپنے ہاتھ سے کھدائی کرتے تھے، آپ ﷺ اس عادل و منصف حاکم کی اعلیٰ مثال تھے، جو حاکم و محکوم، قائد و رعایا، آقا اور غلام اور مالدار و نادار کے مابین کوئی فرق نہیں کرتا ہے، اللہ کی نگاہ میں سب کے سب برابر ہیں اور جہاں ایک مسلمان اور دوسرے مسلمان کے مابین تقویٰ ہی وجہِ امتیاز بنتا ہے، یہی ہے اصل اسلام جس میں ہر چیز میں عدل و مساوات کا خیال کیا گیا ہے اور فضل و کمال اس میں اس شخص کو حاصل ہوتا ہے جو اجتماعی عمل میں دوسروں کے لئے زیادہ مفید ہو اور مصلحت عامہ کو ترجیح دے، اس کے نتیجہ میں اجر و ثواب حاصل ہوتا ہے، اور اللہ کے رسول ﷺ بھی اس سلسلہ میں عام مسلمانوں کی طرح ہیں، وہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجر و ثواب کے طالب ہوتے ہیں، اللہ کے رسول ﷺ مسجد نبوی کی تعمیر میں تمام کام کرنے والے افراد کی طرح شریک تھے اور صرف 'ربن' کاٹنے پر اکتفا نہیں کیا اور نہ ہی پہلی کدالی مار کر بیٹھ گئے، بلکہ مکمل تعمیر کے کام میں شریک رہے، مسلمان

نبی کریم ﷺ کو دیکھ کر پریشان ہوگئے، اس لئے کہ آپ ؐ کا جسم اطہر غبار آلود ہو گیا تھا، اس لئے حضرت اُسید بن حضیر ؓ آگے بڑھے تاکہ رسول اللہ ﷺ کا پتھر وہ اٹھائیں، انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ؐ! یہ مجھے دے دیں، آپ ؐ نے فرمایا: جائیں اور دوسرا پتھر اٹھائیں، اس لئے کہ آپ اللہ کے جتنے محتاج ہیں میں اس سے زیادہ محتاج ہوں۔ (دیکھیں: صور من حیاۃ الرسول ﷺ، اُمین دویدار، ص: 261)

مسلمانوں نے جب نبی کریم ﷺ کی یہ بات سنی توان کے نشاط اور جذبہ میں مزید اضافہ ہوا اور وہ زیادہ متحرک اور سرگرم عمل ہوگئے۔(دیکھیں: التاریخ السیاسی والعسکری، د۔ علی معطی، ص158)

یقیناً یہ اپنی نوعیت کا ایک انوکھا منظر ہے، انسانی تاریخ میں اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی ہے، دنیا کے حکام وزعماء کبھی کبھی کاموں میں اس لئے شریک ہوتے ہیں تاکہ ٹی وی چینلز، اخبارات اور میڈیا میں ان کے کارناموں کا ذکر ہو، اوران کے اخلاق وتواضع کا چرچا ہو، لیکن اللہ کے رسول ﷺ اپنا پتھر دینے سے اس لئے انکار کرتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے زیادہ محتاج ہیں اور اجر وثواب کے زیادہ حریص ہیں۔

صحابہ کرام نے مسجد نبوی کی تعمیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور سرگرم عمل رہے، ساتھ میں یہ اشعار پڑھتے رہتے تھے:

لئن قعدنا والنبي يعمل.....فذاك منا العمل المضلل

ترجمہ: ''اگر ہم بیٹھے رہے اور نبی کریم ﷺ کام کرتے رہے تو یہ ہماری طرف سے ایک گمراہ کن عمل ہوگا۔ (سیرت ابن ہشام: 1/496، فتح الباری، حدیث: 3906)

بے شک اس طرح کی عملی تربیت صرف وعظ ونصیحت اور خوشنما باتوں کے ذریعہ نہیں کی جاسکتی ہے، بلکہ یہ عملِ پیہم مسلسل محنت اور رب العالمین کی طرف سے منتخب کردہ نمونہ کے ذریعہ ہی کی جاسکتی ہے اور اس طرح کی عملی تربیت مکہ کے ماحول میں، ظلم وعدوان اور پکڑ دھکڑ کے ماحول میں نہیں کی جاسکتی تھی، بلکہ یہ ایک آزادانہ جدید معاشرہ میں اور تشکیل پانے والے اسلامی نظام کے زیرِ سایہ ہوسکتی تھی، ایسا لگتا ہے گویا کہ صحابہ کرام کی پوری جماعت ایک آواز اور ایک دل بن گئی تھی اور وہ یہ ترانہ پڑھ رہے تھے:

اللهم إن العيش عيش الآخرة....فانصر الأنصار والمهاجرة

ترجمہ: ''اے اللہ، زندگی تو بس آخرت ہی کی زندگی ہے، لہذا انصار اور مہاجرین پر رحم فرما''۔

اور وہ یہ بھی پڑھ رہے تھے:

لئن قعدنا والنبي يعمل..... فذاك منا العمل المضلل

ترجمہ: ''اگر ہم بیٹھے رہے اور نبی کام کرتے رہے تو یہ ہماری طرف سے گمراہ کن عمل ہوگا''۔

ان کا تیسرا ترانہ یہ تھا: هذي الحمال لا حمال خيبر..... هذا أبر لربنا واطهر

ترجمہ: ''یہ بوجھ خیبر کا بوجھ نہیں ہے، یہ ہمارے رب کو سب سے زیادہ راضی کرنے والا اور پاکیزہ ہے''۔(صحیح بخاری: 3906)

خیبر سے مدینہ کی طرف کھجور اور کشمش کا اٹھا کر لے جانا، اس کی مدینہ کی سوسائٹی میں بہت اہمیت تھی، لیکن مسجد نبوی کے لئے سامان اٹھانے کے سامنے اس کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی، ان کو اس بات کا یقین تھا کہ: ﴿مَا عِندَكُمۡ يَنفَدُ وَمَا عِندَ ٱللَّهِ بَاقٍۗ

﴿وَلَنَجۡزِيَنَّ ٱلَّذِينَ صَبَرُوٓاْ أَجۡرَهُم بِأَحۡسَنِ مَا كَانُواْ يَعۡمَلُونَ﴾ ترجمہ: ”جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ خرچ ہو جانے والا ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہی باقی رہنے والا ہے، اور ہم ضرور صبر سے کام لینے والوں کو اُن کے اجر اُن کے بہترین اعمال کے مطابق دیں گے“۔ (سورۂ نحل:96)

وہ یہ بھی پڑھ رہے تھے:

لَا يَسْتَوِي مَنْ يَعْمُرُ الْمَسَاجِدَا ... يَدْأَبُ فِيهِ قَائِمًا وَقَاعِدًا
وَمَنْ يُرَى عَنْ الْغُبَارِ حَائِدًا

ترجمہ: جو شخص مساجد کو آباد کرتا ہو، کھڑے ہو کر اور بیٹھ کر ان میں سر گرم عمل رہتا ہو اور وہ شخص جو غبار آلود ہونے سے کتراتا ہو دونوں برابر نہیں ہو سکتے ہیں۔ (فتح الباری: 7/314، سیرت ابن ہشام: 2/142، محمد رسول اللہ ﷺ، محمد صادق عرجون: 3/15)

۴: تجربہ کار اور ماہرین پر خصوصی توجہ:

حضرت طلق بن علی یمامی حنفی سے روایت ہے فرماتے ہیں: "میں مسجد نبوی کی تعمیر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ شریک تھا، آپؐ فرماتے تھے: یمامی کو گارے کے قریب کرو، اس لئے کہ وہ تم سب میں گارے کو اچھی طرح ملانے والا ہے"۔ (مجمع الزوائد 2/9)

ایک دوسری روایت میں فرماتے ہیں: میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا جبکہ آپ کے اصحاب مسجد تعمیر کر رہے تھے، ایسا لگا گویا کہ آپؐ کو ان کا کام پسند نہیں آیا، میں نے پھاوڑا (کدال) لیا اور گارا ملایا، آپ ﷺ کو میرا یہ کام پسند آیا تو آپؐ نے فرمایا: ”حنفی کو گارا بنانے دو، اس لئے کہ وہ تم سب سے اچھا گارا بناتا ہے“۔ (المعجم الکبیر للطبرانی: 8258، مجمع الزوائد: 2/9)

ایک دوسری روایت میں حضرت طلق سے روایت ہے فرماتے ہیں: میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا میں بھی سامان اٹھاؤں جیسے کہ وہ سب سامان اٹھا رہے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں! بلکہ ان کو گارا ملا کر دو، اس لئے کہ آپ یہ کام سب سے بہتر جانتے ہو۔ (صحیح ابن حبان: 1122، محمد رسول اللہ ﷺ، محمد الصادق عرجون 3/15)

مدینہ میں آنے والے اس نو وارد پر رسول اللہ ﷺ نے خصوصی توجہ دی، وہ ابتدا میں اسلام قبول کرنے والوں میں سے بھی نہیں تھے، لیکن آپؐ نے ان کی گارا بنانے اور عملی طاقت کی مہارت کو استعمال کیا، اس میں مسلمانوں کے لئے اس بات کا سبق موجود ہے کہ صلاحیتوں کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے اور ان سے استفادہ کرنا چاہئے، ان صلاحیتوں کو کیسے استعمال کیا جائے اس سلسلہ میں بھی نبوی تعلیمات موجود ہیں، اس طرح کے گہرے فہم کی آج سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ (دیکھیں: التربیۃ القیادیۃ: 2/252)

۵: اسلامی حکومت کا شعار:

بے شک نماز کے لئے دی جانے والی اذان پہلی عالمی اسلامی حکومت کا شعار ہے: "اللہ أکبر، اللہ أکبر" اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام سرکشوں اور رکاوٹیں پیدا کرنے والوں سے برتر و بڑا ہے اور وہی غالب ہونے والا ہے۔

"أشهد أن لا اله الا الله "اس کا مطلب یہ ہے کہ حاکمیت وسیادت اور بادشاہت اللہ رب العالمین کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہے۔ " ان الحکم الا للہ "لہٰذا"لا الہ الا اللہ "کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سوانہ کوئی بادشاہ ہے،نہ کوئی حکم دینے والااورنہ ہی کوئی قانون سازہے۔

"أشهد أن محمدًا رسول الله" یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو رسالت وقیادت عطا کی ہے، کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ آپؐ سے اس منصب کو چھین سکے، وہ اس راہ پر چلتے رہیں گے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس دین کو مکمل کر کے رہے گا جو اس نے قرآن وسنت کی شکل میں نازل کیا ہے، اس میں اللہ کے رسول ﷺ کے لئے رسالت اور دنیاوی ودینی سیادت وقیادت اور آپؐ کی سمع واطاعت سب شامل ہے۔ (قراءۃ سیاسیۃ للسیرۃ النبویہ، محمد قلعجی، ص114 دولۃ الرسول ﷺ من التکوین الی التمکین، کامل سلامۃ الدقس، ص438)

"حی علی الصلاۃ" "حی علی الفلاح "اے انسان! آجاؤ! اس نظام کے پرچم تلے جو اللہ کا دیا ہوا نظام ہے جس کے اہداف میں یہ شامل ہے کہ ایک مسلمان اور اس کے خالق کے درمیان اور اہلِ ایمان کے درمیان عظیم اقدار کی بنیاد پر تعلقات کو مضبوط ومستحکم کیا جائے۔

"قد قامت الصلاۃ" اس کے لئے تمام عبادات میں سے نماز کو منتخب کیا گیا ہے، اس لئے کہ وہ پورے دین کا بنیادی ستون ہے اور اس میں رکوع، سجود اور قیام جیسے شعائر ہیں جو عبادت کے وسیع مفہوم کے اعتبار سے عظیم ترین مظاہر عبادت ہیں جو عاجزی وانکساری اور خضوع وتذلل کی کیفیات سے لبریز ہیں، یہ خضوع وتذلل کی انتہا ہے اور خضوع وتذلل کے ساتھ کی جانے والی اللہ کی اطاعت 'عبادت' ہے، اس کے ذریعہ ایک بندہ اپنے آقا کی اطاعت بجالاتا ہے اور اس حال میں اس کے سامنے کھڑا ہوتا ہے کہ اطاعت وتذلل کے ساتھ اپنی ذات کو اس کے حوالہ کردیتا ہے، اِرشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿قُلْ إِنِّي نُهِيتُ أَنْ أَعْبُدَ ٱلَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ ٱللَّهِ لَمَّا جَآءَنِيَ ٱلْبَيِّنَٰتُ مِن رَّبِّي وَأُمِرْتُ أَنْ أُسْلِمَ لِرَبِّ ٱلْعَٰلَمِينَ﴾ ترجمہ: "اے نبیؐ، اِن لوگوں سے کہہ دو کہ مجھے تو اُن ہستیوں کی عبادت سے منع کر دیا گیا ہے جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہو (میں یہ کام کیسے کر سکتا ہوں) جبکہ میرے پاس میرے رب کی طرف سے بینات آچکی ہیں مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں رب العالمین کے آگے سرِ تسلیم خم کر دوں"۔ (سورۃ غافر: 66)

"حی علی الفلاح" اور "قد قامت الصلاۃ" کے ذریعہ اسلامی حکومت کے آفیشل اور سرکاری شعار کو اللہ کی حاکمیت اور شریعت کی سیادت کے ساتھ اور ہر قسم کے طاغوت، اس کے قوانین، نظام اور طرزِ زندگی کے سقوط کے ساتھ مربوط کرنے کے ذریعہ یہ بتانا مقصود ہے کہ نماز کا قیام اور اس کی اقامت کماحقہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ ایک ایسے نظام اسلامی اور حکومت کے زیر سایہ انجام دی جائے جو نماز کی روح پر قائم ہو اور اس کے مطابق عمل پیرا ہو اور اسی مقصد اور مشن کے لئے سرگرم عمل ہو، چنانچہ اسلامی حکومت کے قیام سے پہلے مسلمان خُفیہ طور پر مکہ کی گھاٹیوں میں نماز ادا کرتے تھے لیکن جب انصار کی تلواروں کی حمایت وحفاظت میں اسلامی نظام قائم ہو گیا تو اب اذان اور اقامت کے ذریعہ اعلان کرنا ان کے لئے ضروری قرار پایا اور اس کے بعد رب العالمین کے سامنے ان کا رکوع اور سجود ایک الگ ہی منظر پیش کرتا ہے۔

تاریخ اس کی سب سے بہترین دلیل ہے کہ روئے زمین پر اللہ کی کماحقہ عبادت اسی وقت ممکن ہے جب کہ وہ ایک مضبوط اور طاقتور حکومت کے زیرِ سایہ انجام دی جائے جو حکومت اعدائے دین سے اپنی رعایا کی حفاظت وحمایت کی ذمہ داری احسن طریقہ سے انجام دے سکتی ہو۔

اس کے بعد اذان کے کلمات "اللہ أکبر" "اللہ أکبر" مقرر کئے گئے ہیں تا کہ سابقہ معانی کو مزید مؤکد کیا جا سکے۔ (أیضاً، ص 439)

ضرورت اس بات کی ہے کہ اذان کو صحیح طور پر سمجھا جائے، اس کے معانی کا ادراک کیا جائے اور عملی طور پر اس کی ترجمانی کی کوشش کی جائے تا کہ ہم اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے کما حقہ کوشش کر سکیں، کفر کے نعروں کو ختم کر کے ایمانی نعروں اور شعائر کو بلند کریں اور توحید کا ایسا نظام برپا کریں جس پر اللہ کی شریعت اور اس کے بہترین منہج کی حاکمیت اور بالادستی قائم ہو۔

٦: مضبوط مساجد کی تعمیر اور اُن میں نقش و نگار کا حکم:

جہاں تک مساجد کی تعمیر میں پائیداری کا مسئلہ ہے یعنی مساجد کو اس طرح پتھروں اور سیمنٹ کے ذریعہ مضبوط بنانا جس کے ذریعہ اس میں مزید استحکام پیدا ہو تو عام طور پر علماء نے اس کو جائز اور مستحسن قرار دیا ہے، اس لئے کہ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ نے بھی مسجد نبوی کی از سرِ نو تعمیر کی تھی، اس کے ذریعہ اللہ تعالی کے شعائر کے بارے میں اہتمام و توجہ پائی جاتی ہے، علماء نے اس سلسلہ میں اللہ تعالی کے اس قول کے ذریعہ استدلال کیا ہے: ﴿لَا تَقُمْ فِيهِ أَبَدًاۚ لَّمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى ٱلتَّقْوَىٰ مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَن تَقُومَ فِيهِۚ فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَن يَتَطَهَّرُواْۚ وَٱللَّهُ يُحِبُّ ٱلْمُطَّهِّرِينَ﴾ ترجمہ: "تم ہر گز اس عمارت میں کھڑے نہ ہونا، جو مسجد اول روز سے تقویٰ پر قائم کی گئی تھی وہی اس کے لئے زیادہ موزوں ہے کہ تم اس میں (عبادت کے لئے) کھڑے ہو، اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنا پسند کرتے ہیں اور اللہ کو پاکیزگی اختیار کرنے والے ہی پسند ہیں"۔ (سورۃ التوبہ: 108)

اور جہاں تک نقش و نگار اور تزیین کاری کا تعلق ہے تو اس کے مکروہ ہونے پر علماء کا اجماع ہے، البتہ بعض اس کو حرام اور بعض مکروہ تنزیہی قرار دیتے ہیں، البتہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ وقف شدہ مال کا نقش و نگار اور تزیین کاری میں صرف کرنا حرام ہے۔ (دیکھیں: فقہ السیرۃ النبویہ، للبوطی، ص 145)

سب سے پہلے مساجد میں نقش و نگار اور تزیین کاری کا عمل ولید بن عبد الملک بن مروان نے کیا، اسی روز سے لوگ مساجد کی تعمیر اور اس کی تزیین کاری میں مبالغہ کرنے لگے، یہاں تک کہ بعض مساجد نے میوزیم کی شکل اختیار کی، یہ سب کچھ نبوی طریقہ کے برخلاف ہے، جب سے مساجد کی تزیین کاری اور نقش و نگاری کا کام شروع ہوا اور سادگی وہاں سے خیر باد ہو گئی تو مساجد کی چکا چوند کو دیکھ کر نادار و کمزور لوگوں کے دلوں میں احساسِ کمتری اور حسرت کا احساس پیدا ہونے لگا اور ایمان سے عاری لوگ تزیین کاری میں ایک دوسرے کے ساتھ تنافس اور مقابلہ آرائی کرنے لگے۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویہ لأبی شہبہ: 2/33، محمد رسول اللہ ﷺ، محمد صادق عرجون: 3/39)

بے شک جو لوگ عالیشان مساجد کی تعمیر کا اہتمام کرتے ہیں اور ان کی تمام کوششوں اور جد و جہد کا محور قسم قسم کی تزیین کاری اور نقش و نگاری ہوتا ہے اور وہ مساجد میں چکا چوند کرنے والے مظاہر کا اضافہ کرتے رہتے ہیں، یہ لوگ سخت قسم کی غلطی پر ہیں، یہاں تک کہ ان مساجد میں داخل ہونے والا اللہ تعالی کی عبودیت و تذلل کی کیفیات کے احساس سے محروم ہو جاتا ہے، بلکہ مساجد کی فنِ معماری اور تزیین کاری کی مختلف شکلیں زبانِ حال سے اس کے اندر فخر و مباہات کا احساس پیدا کرتی ہیں۔

فقراء اور ناداروں کو اب کوئی ایسی جگہ نہیں مل پا رہی ہے جہاں وہ دنیاوی زیب وزینت کے مظاہر کے مقابلہ میں پناہ لے سکیں، مساجد وہ جگہیں تھیں جہاں ایک فقیر اور محتاج کو اپنے فقر کے بارے میں تسلی ملتی تھی اور وہاں اس کو دنیا کے ماحول اور اس کی زینت سے نکل کر آخرت کا ماحول میسر ہوتا تھا، لیکن اب حال یہ ہے کہ مساجد میں بھی ان کو دنیا کی زیب وزینت ہی دیکھنے کو ملتی ہے جس سے وہ محروم ہوتے ہیں اور ان کو وہاں جا کر بھی اپنے فقر واحتیاج کا احساس دامن گیر ہو جاتا ہے، مسلمانوں نے اسلام کے حقائق کو ترک کر کے جھوٹے مظاہر میں مشغول ہو کر انتہائی غلط طرزِ عمل اختیار کیا ہے، جو بظاہر دین داری ہے لیکن اندرونی طور پر وہ دنیا اور اس کی خواہشات کی پیروی ہے۔ (فقہ السیرۃ النبویہ للبوطی، ص146)

۷: مسجد نبوی کے فضائل:

نبی کریم ﷺ نے مسجد نبوی کے بہت سے فضائل بیان فرمائے ہیں، اسی لئے صحابہ کرام کا اس کے ساتھ گہرا تعلق تھا، ان میں سے چند فضائل کا خلاصہ مندرجہ ذیل سطور میں تحریر کیا جاتا ہے:

أ) مسجد نبوی کی بنیاد تقویٰ پر:

حضرت ابو سعید خدری ؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا جبکہ آپ ازواجِ مطہرات کے گھر میں سے کسی ایک کے گھر میں تشریف فرما تھے، میں نے دریافت کیا: دونوں مسجدوں میں وہ کون سی مسجد ہے جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے؟ یہ سن کر آپؐ نے مٹھی بھر کنکریاں لیں اور ان کو زمین پر مارا پھر فرمایا: وہ آپ کی یہی مسجد ہے۔ (صحیح مسلم: 1398، سنن ترمذی: 3099، سنن نسائی: 2/36، مسند أحمد: 3/8)

بعض علماء نے ان احادیث کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کی ہے جن میں یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ جس مسجد کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے وہ مسجد نبوی ہے، اور انہوں نے یہ دلیل بھی پیش کی ہے کہ اس طرح کی احادیث اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے معارض ہیں: ﴿لَا تَقُمْ فِيهِ أَبَدًا ۚ لَّمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوَىٰ مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَن تَقُومَ فِيهِ ۚ فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَن يَتَطَهَّرُوا ۚ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِينَ﴾ ترجمہ: "تم ہرگز اس عمارت میں کھڑے نہ ہونا جو مسجد اول روز سے تقویٰ پر قائم کی گئی تھی وہی اس کے لئے زیادہ موزوں ہے کہ تم اس میں (عبادت کے لئے) کھڑے ہو، اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنا پسند کرتے ہیں اور اللہ کو پاکیزگی اختیار کرنے والے ہی پسند ہیں"۔ (سورۃ التوبہ: 108)

مذکورہ آیت میں کون سی مسجد مراد ہے؟ اس سلسلہ میں علماء کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے، بعض کا کہنا یہ ہے کہ اس سے مسجد نبوی مراد ہے، جبکہ بعض کہتے ہیں کہ اس سے مسجد قباء مراد ہے۔ علامہ طبریؒ اپنی تفسیر میں ان سب کے اقوال ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: میرے نزدیک دونوں قسم کے اقوال میں سے صحیح قول ان لوگوں کا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اس سے مسجد نبوی مراد ہے۔ اس لئے کہ اس سلسلہ میں خود رسول اللہ ﷺ سے صحت کے ساتھ صراحت موجود ہے۔ (دیکھیں: تفسیر طبری: 14/476)

آیتِ سابقہ میں اگر مسجد قباء مراد لی جائے تب بھی اس آیت میں اور حدیث میں کوئی تعارض نہیں ہے،اس لئے کہ دونوں مسجدوں کی بنیاد تقوی پر ہے، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: سابقہ آیت مسجد قباء کے بارے میں نازل ہوئی ہے....-اس کے بعد فرماتے ہیں:- لیکن اس حکم کا انطباق مسجد قباء پر ہوتا ہے اور اس مسجد پر بھی ہوتا ہے جو اس سے زیادہ بلند مقام کی حامل ہے اور وہ مدینہ کی مسجد ہے، اس کے ذریعہ نبی کریم ﷺ سے ثابت شدہ صحیح حدیث کی بھی توجیہ ہو جاتی ہے جس میں وارد ہے کہ آپ ﷺ سے تقوی کی بنیاد پر قائم کی گئی مسجد کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا: وہ میری یہی مسجد ہے۔ابن تیمیہؒ ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں: ''........لهذا واضح ہو گیا کہ دونوں مسجدوں کی بنیاد تقوی پر ہے، لیکن مسجد نبوی اس صفت میں زیادہ کامل ہے اور وہ اس نام اور صفت کا زیادہ استحقاق رکھتی ہے، البتہ مسجد قباء اس آیت کے نزول کا سبب تھی''۔(مجموع الفتاوی: 27/406)

ب) <u>مسجدِ نبوی میں نماز پڑھنے کی فضیلت:</u>

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: "میری اس مسجد میں نماز دوسری مسجدوں میں نماز پڑھنے سے ہزار گنا بہتر ہے، سوائے مسجد الحرام کے "۔(صحیح بخاری: 1190، صحیح مسلم:1394/506- 507)

ج) تین مساجد میں سے ایک جن کی طرف شدّ رحال کیا جا سکتا ہے:

حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:''تین مسجدوں کے سوا اور کہیں کے لئے شدِّ رحال نہیں کیا جا سکتا ہے: مسجد حرام، مسجد رسول ﷺ، مسجد اقصی''۔(صحیح بخاری: 1189، صحیح مسلم:1397/511)

د) <u>مسجدِ نبوی میں روضہ:</u>

حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:''میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان جنت کی کیاریوں میں سے ایک کیاری ہے، اور میرا منبر میرے حوض پر ہے''۔

ھ) <u>مسجد نبوی میں تعلیم و تعلم کی فضیلت:</u>

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:''جو ہماری اس مسجد میں اس لئے داخل ہوا کہ وہ خیر سیکھے یا خیر سکھائے وہ مجاہد فی سبیل اللہ کی طرح ہے، اور جو کسی اور مقصد سے اس میں داخل ہوا وہ اس چیز کو دیکھنے والے کی طرح ہے جو اس کی نہ ہو''۔(مسند احمد 2/350، سنن ابن ماجہ:227، مستدرک حاکم:1/91)

<u>۸: اہلِ صفہ اور فقراء مجاہدین کے بارے میں نازل ہونے ولی آیت:</u>

ارشاد باری تعالی ہے: ﴿لِلْفُقَرَآءِ ٱلَّذِينَ أُحْصِرُواْ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي ٱلْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ ٱلْجَاهِلُ أَغْنِيَآءَ مِنَ ٱلتَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُم بِسِيمَٰهُمْ لَا يَسْـَٔلُونَ ٱلنَّاسَ إِلْحَافًاۗ وَمَا تُنفِقُواْ مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ ٱللَّهَ بِهِۦ عَلِيمٌ﴾ ترجمہ: ''خاص طور پر مدد کے مستحق وہ تنگ دست لوگ ہیں جو اللہ کے کام میں ایسے گھر گئے ہیں کہ اپنی ذاتی کسب معاش کے لئے

زمین میں کوئی دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے، ان کی خودداری دیکھ کر ناواقف آدمی گمان کرتا ہے کہ یہ خوش حال ہیں تم ان کے چہروں سے ان کی اندرونی حالت پہچان سکتے ہو مگر وہ ایسے لوگ نہیں ہیں کہ لوگوں کے پیچھے پڑ کر کچھ مانگیں اُن کی اعانت میں جو کچھ مال تم خرچ کرو گے وہ اللہ سے پوشیدہ نہ رہے گا"۔(سورۃ البقرہ: 273)

ابن سعدؒ نے اپنی سند سے ابن کعب القرظی سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: وہ اہل صفہ ہیں۔ (الطبقات الکبریٰ لابن سعد، 1/255)

علامہ طبریؒ نے حضرت مجاہدؒ اور سدیؒ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت کریمہ مہاجرین کے بارے میں نازل ہوئی۔ (تفسیر طبری 5/591، السیرۃ النبویہ الصحیحۃ، العمری، 1/269)

اسلامی معاشرہ کے اس پہلے ستون کے بارے میں واقعات اور اس کے متعلق احکام بہت زیادہ ہیں، جیسے کہ یتیموں کے حقوق کی ضمانت، بوسیدہ قبروں کو کھود کر ان کی جگہ مسجد بنانے کا جواز، اسی طرح دیگر مسائل، البتہ میں طوالت سے بچتے ہوئے اتنے ہی دروس و عبر اور فوائد پر اکتفا کرتا ہوں۔

....

دوسرا باب

مہاجرین وانصار کے مابین مؤاخات

اللہ کے رسول ﷺ نے اُمت و حکومت کے اصلاحی اور تنظیمی پروگرام کے لئے جن بنیادوں پر تعمیر قائم کی وہ بنیادیں تھیں: توحید اور قرآنی منہج کی طرف مسلسل دعوت، مسجد کی تعمیر اور مہاجرین وانصار کے مابین مؤاخات، یہ مؤاخات کا عمل اہمیت کے اعتبار سے مسجد کی تعمیر کی اہمیت سے کسی طرح کم نہیں تھا، مؤاخات کا عمل اس لئے اہم تھا تاکہ مسلم معاشرہ آپس میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح متحد اور الفت و محبت کا آئینہ دار ہو اور اس کی تشکیلِ جدید کے آثار بالکل واضح اور نمایاں ہوں۔(الادارۃ الاسلامیہ فی عصر عمر بن خطاب، د۔ مجد لاوی، ص52-53)

مسلمانوں کے مابین باہمی اخوت کا ضابطہ عہدِ مکی کے ابتدائی مرحلہ سے ہی نافذ العمل تھا، اللہ کے رسول ﷺ نے ہر اس عمل سے منع فرمایا ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں کے مابین آپسی نفرت و عداوت پیدا ہو اور آپؐ نے ارشاد فرمایا: ’’ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو، ایک دوسرے سے حسد نہ کرو، ایک دوسرے کے پیچھے سازشیں نہ کرو، اللہ کے بندے بن کر رہو، کسی مسلمان کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی سے تین دن سے زیادہ ترکِ تعلق رکھے‘‘۔(صحیح بخاری: 6065- 6076، صحیح مسلم: 2559)

آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے: ’’مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ وہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ ہی اس کو بے یار و مددگار چھوڑتا ہے اور جو اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرتا ہے اللہ اس کی ضرورت پوری کرتا ہے اور جس نے کسی مسلمان بھائی سے کوئی مصیبت دور کی اللہ تعالیٰ قیامت کی مصیبتوں میں سے کوئی مصیبت اس سے دور کرے گا اور جس نے مسلمان کی پردہ پوشی کی، اللہ تعالیٰ کی قیامت کے دن اس کے اس کی پردہ پوشی کرے گا‘‘۔(صحیح بخاری: 2442، صحیح مسلم: 2580)

قرآن کریم نے افرادِ امت کے مابین اخوت و محبت کی اہمیت پر زور دیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَٱعۡتَصِمُواْ بِحَبۡلِ ٱللَّهِ جَمِيعٗا وَلَا تَفَرَّقُواْۚ وَٱذۡكُرُواْ نِعۡمَتَ ٱللَّهِ عَلَيۡكُمۡ إِذۡ كُنتُمۡ أَعۡدَآءٗ فَأَلَّفَ بَيۡنَ قُلُوبِكُمۡ فَأَصۡبَحۡتُم بِنِعۡمَتِهِۦٓ إِخۡوَٰنٗا وَكُنتُمۡ عَلَىٰ شَفَا حُفۡرَةٖ مِّنَ ٱلنَّارِ فَأَنقَذَكُم مِّنۡهَاۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ ٱللَّهُ لَكُمۡ ءَايَٰتِهِۦ لَعَلَّكُمۡ تَهۡتَدُونَ﴾ ترجمہ: ’’سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو، اللہ کے اُس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، اُس نے تمہارے دل جوڑ دئے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے، تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے، اللہ نے تم کو اس سے بچالیا، اس طرح اللہ اپنی نشانیاں تمہارے سامنے روشن کرتا ہے، شاید کہ اِن علامتوں سے تمہیں اپنی فلاح کا سیدھا راستہ نظر آجائے‘‘۔(سورۃ آل عمران: 103)

دوسرے مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَأَلَّفَ بَيۡنَ قُلُوبِهِمۡۚ لَوۡ أَنفَقۡتَ مَا فِي ٱلۡأَرۡضِ جَمِيعٗا مَّآ أَلَّفۡتَ بَيۡنَ قُلُوبِهِمۡ وَلَٰكِنَّ ٱللَّهَ أَلَّفَ بَيۡنَهُمۡۚ إِنَّهُۥ عَزِيزٌ حَكِيمٞ﴾ ترجمہ: ’’اور مومنوں کے دل ایک دُوسرے کے ساتھ جوڑ دیے تم روئے زمین

کی ساری دولت بھی خرچ کر ڈالتے تو اِن لوگوں کے دل نہ جوڑ سکتے تھے مگر وہ اللہ ہے جس نے ان لوگوں کے دل جوڑے، یقیناً وہ بڑا زبردست اور دانا ہے"۔(سورۃ الأنفال: 63)

مدینہ منورہ میں جو مؤاخات قائم کی گئی وہ ایک خاص قسم کی مؤاخات تھی جس کو مشروع کیا گیا اور اس کی وجہ سے ایسے حقوق اور واجبات عائد ہوئے جو مسلمانوں کے مابین عمومی حقوق اور واجبات کے مقابلہ میں خاص تھے۔

بعض علماء نے مکہ میں بھی مہاجرین کے مابین مؤاخات کے وجود کا ذکر کیا ہے، بلاذری نے اس جانب اشارہ کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہجرت سے قبل مکہ میں مسلمانوں کے مابین حق اور باہمی ہمدردی کی بنیاد پر مؤاخات قائم کی تھی، چنانچہ آپ ﷺ نے حضرت حمزہؓ اور حضرت زید بن حارثہؓ کے مابین، حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے مابین، حضرت عثمان بن عفانؓ اور حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کے مابین، حضرت زبیر بن عوامؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے مابین، حضرت عبیدہ بن حارثؓ اور حضرت بلال حبشیؓ کے مابین، حضرت مصعب بن عمیرؓ اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے مابین، حضرت ابو عبیدہ بن جراحؓ اور حضرت سالم مولی أبی حذیفہؓ کے مابین، حضرت سعیدؓ بن زید بن عمرو بن نفیل اور حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ کے مابین، اور اپنے اور حضرت علی بن ابی طالبؓ کے مابین مؤاخات قائم کی تھی۔(دیکھیں: أنساب الأشراف، للبلاذری: 1/270، سیرت ابن ہشام: 2/150-152)

علامہ بلاذریؒ (ت 276ھ) سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس مکی مؤاخات کا ذکر کیا ہے، اسی طرح ابن سید الناس نے بھی یہی قول نقل کیا ہے۔(دیکھیں: السیرۃ النبویہ الصحیحۃ: 1/240)

حاکم نے "المستدرک" میں جمیع بن عمیر سے، انہوں نے ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے مابین، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کے مابین، حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ اور حضرت عثمانؓ کے مابین مؤاخات قائم کی۔ (أیضاً: 1/240)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت زبیرؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے مابین مؤاخات قائم کی۔ (فتح الباری: 1/471) علامہ ابنِ قیمؒ اور ابن کثیرؒ کا کہنا یہ ہے کہ مکہ میں مؤاخات کا قیام عمل میں نہیں آیا ہے۔ ابنِ قیمؒ فرماتے ہیں: یہ کہا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے مہاجرین کے مابین آپس میں ایک دوسری مؤاخات قائم کی اور اس میں حضرت علیؓ کو اپنا بھائی بنایا، لیکن ثابت شدہ مؤاخات صرف مدینہ کی مؤاخات ہے، اس لئے کہ مہاجرین کو اسلامی اخوت، وطنی اخوت اور نسبی قرابت کی وجہ سے کسی معاہدۂ مؤاخات کی ضرورت نہیں تھی برخلاف انصار کے ساتھ مہاجرین کی مؤاخات کے۔(زاد المعاد: 2/79)

سیرت کی ابتدائی کتابوں میں مکہ میں مؤاخات کا کوئی ذکر موجود نہیں ہے، اور بلاذری نے بھی "قالوا" (لوگوں کا کہنا ہے) کے ذریعہ بغیر کسی سند کے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے جس سے یہ روایت ضعیف قرار پاتی ہے، اسی طرح ناقدین نے بلاذری کو بذاتِ خود ضعیف قرار دیا ہے اور اگر مکہ کی اس مؤاخات کو درست بھی مانا جائے تو یہ صرف باہمی ہمدردی اور خیر خواہی پر مبنی تھی اور وراثت کے حقوق اس پر مرتب نہیں ہوتے تھے۔(السیرۃ النبویہ الصحیحۃ، 1/241)

1) مدینہ میں مؤاخات:

نظام مؤاخات نے امت کو باہم مربوط کرنے میں اہم کردار ادا کیا، اللہ کے رسول ﷺ نے اس رابطہ کو ان کے درمیان مکمل اخوت کی بنیاد پر قائم کیا، اس اخوت کے نتیجہ میں جاہلیت کی تمام عصبتیں تحلیل ہو جاتی ہیں اور صرف اسلام حمیت وغیرت کا وجود باقی رہتا ہے، اس کے ذریعہ رنگ ونسل اور قوم ووطن کے تمام امتیازات زمین بوس ہو جاتے ہیں اور صرف اور صرف مروءت وتقوی ہی میعار قرار پاتے ہیں۔
اللہ کے رسول ﷺ نے اس اخوت کو ایک نافذ العمل معاہدہ بنایا، یہ کوئی خالی الفاظ نہیں تھے اور نہ ہی یہ کوئی ایسا عمل تھا جس کا تعلق صرف جان ومال کے ساتھ ہو اور نہ ہی یہ کوئی ایسا نعرہ تھا جس کا زمین پر کوئی اثر نہ ہو۔
اس اخوت میں ایثار ومحبت، ہمدردی اور غمخواری اور انسیت کے جذبات کار فرما تھے اور اس نئے معاشرہ میں انوکھی مثالیں قائم ہو رہی تھیں۔

مہاجرین وانصار کے مابین اس اخوت کو تقویت پہنچانے والا بنیادی سبب یہ تھا کہ اس معاشرہ کے افراد ایک اللہ کے دین کی بنیاد پر جمع تھے، ان کے دین نے ان کی تربیت کی تھی، ان کو ایمان وعمل کی تعلیم دی تھی، وہ ان تمام نعروں سے بالاتر اور دور تھے جو صرف زبانوں پر ہوتے ہیں، وہ اللہ کے اس فرمان کی عملی تصویر تھے: ﴿إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ ٱلْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوٓاْ إِلَى ٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَن يَقُولُواْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَاۚ وَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْمُفْلِحُونَ﴾ ترجمہ: "ایمان لانے والوں کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ اللہ اور رسول کی طرف بلائے جائیں تاکہ رسول ان کے مقدمے کا فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی، ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں"۔(سورۃالنور:51)

یہی اخوت مسلمانوں کے استمرار اور بقا کی کفیل بنی اور دعوت کے ہر مرحلہ میں اس نے اپنے اثرات دکھائے، اسی کا اثر تھا جس کی وجہ سے حضرت صدیق اکبرؓ کے خلیفہ بنائے جانے کے وقت مہاجرین وانصار متحد ومتفق رہے، اس اعتبار سے مہاجرین وانصار کے درمیان قائم یہ مؤاخات ایک قسم کی سیاسی پیش قدمی تھی جس کو رسول ﷺ نے مہاجرین وانصار کے مابین محبت ومودّت پیدا کرنے کے لئے اختیار کیا اور انہوں نے اس محبت ومودّت کی حفاظت کے لئے سب کچھ قربان کیا، بلکہ وہ اس مؤاخات کی دفعات کو نافذ کرنے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تھے، خاص طور پر انصار جن کے کردار کو بیان کرنے کے لئے محققین اور لکھنے والوں کے پاس الفاظ کم پڑ جاتے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَٱلَّذِينَ تَبَوَّءُو ٱلدَّارَ وَٱلْإِيمَٰنَ مِن قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ أُوتُواْ وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌۚ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِۦ فَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْمُفْلِحُونَ﴾ ترجمہ:"(اور وہ اُن لوگوں کے لئے بھی ہے) جو اِن مہاجرین کی آمد سے پہلے ہی ایمان لا کر دار الہجرۃ میں مقیم تھے، یہ اُن لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے اِن کے پاس آئے ہیں اور جو کچھ بھی اُن کو دے دیا جائے، اُس کی کوئی حاجت تک یہ اپنے دلوں

میں محسوس نہیں کرتے اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں، حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے دل کی تنگی سے بچالئے گئے وہی فلاح پانے والے ہیں"۔(سورۃ الحشر: 9)

مذکورہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں پانچ چیزوں کی گواہی دی ہے:

۱) انہوں نے پہلے ہی دار الہجرۃ کو ٹھکانہ بنایا تھا اور ایمان کو محکم کرلیا تھا۔

۲) ان لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کرکے ان کی طرف آئے۔

۳) جو کچھ ان کو دیا گیا وہ اپنے دلوں میں اس کی کوئی حاجت محسوس نہیں کرتے۔

۴) اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ ان کو خود نقصان ہو۔

۵) جس کو دل کی تنگی سے بچالیا گیا وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔(التربیۃ القیادیۃ: 2/284)

مہاجرین وانصار کے مابین اخوت پر مبنی یہ محبت ہی وہ بنیاد تھی جس پر اجتماعی مؤاخات کے ستون قائم تھے، یہ مؤاخات سب سے پہلا کام تھا جو رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں آنے کے بعد انجام دیا۔

ظاہر ہے کہ مؤاخات کی ابتدا مسجد میں ہوئی جبکہ اس کی تعمیر ہو رہی تھی، نبی کریم ﷺ مسجد کی تعمیر میں مہاجرین وانصار کے ساتھ مشغول تھے، وہ پاکیزہ جگہ تھی اور اللہ کی رضا کے لئے انجام دیئے جانے والے عملِ مؤاخات کا آغاز کرنے کے لئے موزوں ترین موقع تھا، اس لئے کہ اس میں آپسی تعاون، نصرت، ہمدردی، محبت والفت اور ایمانی اخوت کے جذبات کارفرما تھے، رسول ﷺ نے سب سے پہلے مسجد کی تعمیر کرنے والوں کے مابین مؤاخات فرمائی، اس کے بعد حضرت انسؓ کے گھر میں دوسرے صحابہ کے مابین مؤاخات قائم کی اور یہ عمل رسول ﷺ مسلسل انجام دیتے رہے، یہاں تک کہ مہاجرین وانصار تمام صحابہ کے مابین مؤاخات قائم ہوگئی جن کی تعداد تقریباً سو (۱۰۰) افراد پر مشتمل تھی، ان میں سے نصف مہاجرین تھے اور نصف انصار تھے۔(دیکھیں: محمدؐ رسول اللہ، محمد صادق عرجون: 3/95-100)

مؤاخات کرنے والے بعض مہاجرین وانصار کے اسمائے گرامی:

حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت خارجہ بن زہیرؓ، حضرت عمر بن خطابؓ، حضرت عتبان بن مالکؓ، حضرت ابو عبیدہ بن الجراحؓ، حضرت سعد بن معاذؓ، حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ، حضرت سعد بن الربیعؓ، حضرت زبیر بن عوامؓ، حضرت سلامہ بن وقشؓ، حضرت طلحہ بن عبیداللہؓ، حضرت کعب بن مالکؓ، حضرت سعید بن زیدؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت مصعب بن عمیرؓ، حضرت ابوایوب خالد بن زیدؓ، حضرت ابو حذیفہ بن عتبہ بن ربیعہؓ، حضرت عباد بن بشر بن وقشؓ، حضرت عمار بن یاسرؓ، حضرت حذیفہ بن الیمانؓ، حضرت ابوذر غفاریؓ، حضرت منذر بن عمروؓ، حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ، حضرت عویم بن ساعدہؓ، حضرت سلمان فارسیؓ، حضرت ابو الدرداءؓ، حضرت بلالؓ (مؤذنِ رسولؐ) حضرت أبو رُویحہ عبد اللہ بن عبد الرحمن الخثعمیؓ۔(سیرت ابن ہشام: 2/109-111، سیرت ابن کثیر: 2/324)

۲: دروس واسباق اور فوائد و عبرتیں:

1: عقیدہ ربط و تعلق کی اصل اُساس:

جس مدنی معاشرہ کو اسلام نے قائم کیا تھا وہ عقیدہ پر مبنی معاشرہ تھا، وہ اسلام کے ذریعہ باہم مربوط تھا، وہ صرف اور صرف اللہ کے لئے، اس کے رسول کے لئے اور اہل ایمان کے لئے قلبی محبت اور موالات کا دم بھرتا تھا، اور یہ ارتباط و تعلق کی اعلیٰ ترین قسم ہے، اس لئے کہ اس کا تعلق وحدتِ فکر و عقیدہ اور وحدتِ روح پر مبنی ہوتا ہے۔

اللہ کے لئے، اس کے رسولؐ کے لئے اور اہلِ ایمان کے لئے محبت و موالات ہجرت کے اہم آثار اور نتائج ہیں، قرآن کریم انہی معانی کے مطابق مسلمانوں کی تربیت کرتا ہے، اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا ہے کہ نوحؑ کا بیٹا اگرچہ قرابت کے اعتبار سے ان کے گھر کا ایک فرد تھا لیکن جب اس نے حق ترک کیا، کفر کی راہ اختیار کی اور اللہ کے نبی کی اتباع و پیروی نہیں کی تو اس کے بعد وہ ان کے گھر کا فرد باقی نہیں رہا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَنَادَىٰ نُوحٌ رَّبَّهُۥ فَقَالَ رَبِّ إِنَّ ٱبْنِى مِنْ أَهْلِى وَإِنَّ وَعْدَكَ ٱلْحَقُّ وَأَنتَ أَحْكَمُ ٱلْحَٰكِمِينَ ﴿٤٥﴾ قَالَ يَٰنُوحُ إِنَّهُۥ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ ۖ إِنَّهُۥ عَمَلٌ غَيْرُ صَٰلِحٍ ۖ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِۦ عِلْمٌ ۖ إِنِّىٓ أَعِظُكَ أَن تَكُونَ مِنَ ٱلْجَٰهِلِينَ ﴿٤٦﴾﴾ ترجمہ: ''نوحؑ نے اپنے رب کو پکارا کہا: اے رب، میرا بیٹا میرے گھر والوں میں سے ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب حاکموں سے بڑا اور بہتر حاکم ہے۔ جواب میں ارشاد ہوا: اے نوحؑ، وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں ہے، وہ تو ایک بگڑا ہوا کام ہے، لہٰذا تو اُس بات کی مجھ سے درخواست نہ کر جس کی حقیقت تو نہیں جانتا، میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ اپنے آپ کو جاہلوں کی طرح نہ بنالے"۔ (سورۂ ہود: 45-46)

اسلام نے اخوت و موالات کو صرف اہل ایمان کے مابین تک منحصر کیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّمَا ٱلْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا۟ بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ ۚ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾ ترجمہ: ''مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں، لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو اور اللہ سے ڈرو، امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا''۔ (سورۃ الحجرات: 10) اور اہل کفر مشرکین، یہود اور نصاریٰ کے ساتھ اہل ایمان کی ولایت کو کالعدم اور ناجائز قرار دیا ہے، اگرچہ وہ ان کے باپ، دادا، بھائی اور اولاد ہی کیوں نہ ہوں، قرآن نے ایسا کرنے والوں کو ظالم قرار دیا ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کافروں کے ساتھ اہل ایمان کی موالات کا تعلق عظیم گناہوں سے ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَتَّخِذُوٓا۟ ءَابَآءَكُمْ وَإِخْوَٰنَكُمْ أَوْلِيَآءَ إِنِ ٱسْتَحَبُّوا۟ ٱلْكُفْرَ عَلَى ٱلْإِيمَٰنِ ۚ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَأُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلظَّٰلِمُونَ﴾ ترجمہ: ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنے باپ دادا اور بھائیوں کو بھی اپنا رفیق نہ بناؤ اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیں، تم میں سے جو ان کو رفیق بنائیں گے وہی ظالم ہوں گے''۔ (سورۃ التوبہ: 23) دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَتَّخِذُوا۟ عَدُوِّى وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَآءَ تُلْقُونَ إِلَيْهِم بِٱلْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا۟ بِمَا جَآءَكُم مِّنَ ٱلْحَقِّ يُخْرِجُونَ ٱلرَّسُولَ وَإِيَّاكُمْ أَن تُؤْمِنُوا۟ بِٱللَّهِ رَبِّكُمْ إِن كُنتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَٰدًا

فِي سَبِيلِي وَٱبۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِيۚ تُسِرُّونَ إِلَيۡهِم بِٱلۡمَوَدَّةِ وَأَنَا۠ أَعۡلَمُ بِمَآ أَخۡفَيۡتُمۡ وَمَآ أَعۡلَنتُمۡۚ وَمَن يَفۡعَلۡهُ مِنكُمۡ فَقَدۡ ضَلَّ سَوَآءَ ٱلسَّبِيلِ ١ إِن يَثۡقَفُوكُمۡ يَكُونُواْ لَكُمۡ أَعۡدَآءً وَيَبۡسُطُوٓاْ إِلَيۡكُمۡ أَيۡدِيَهُمۡ وَأَلۡسِنَتَهُم بِٱلسُّوٓءِ وَوَدُّواْ لَوۡ تَكۡفُرُونَ ٢ لَن تَنفَعَكُمۡ أَرۡحَامُكُمۡ وَلَآ أَوۡلَٰدُكُمۡۚ يَوۡمَ ٱلۡقِيَٰمَةِ يَفۡصِلُ بَيۡنَكُمۡۚ وَٱللَّهُ بِمَا تَعۡمَلُونَ بَصِيرٞ ٣﴾ ترجمہ: "اے ایمان والو! میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ کہ ان کے پاس دوستی کے پیغام بھیجتے ہو حالانکہ تمہارے پاس جو سچا دین آیا ہے اس کے یہ منکر ہو چکے ہیں، رسول کو اور تمہیں اس بات پر نکالتے ہیں کہ تم اللہ اپنے رب پر ایمان لائے ہو، اگر تم جہاد کے لئے میری راہ میں اور میری رضاجوئی کے لئے نکلے ہو تو ان کو دوست نہ بناؤ، تم ان کے پاس پوشیدہ دوستی کے پیغام بھیجتے ہو، حالانکہ میں خوب جانتا ہوں جو کچھ تم مخفی اور ظاہر کرتے ہو، اور جس نے تم میں سے یہ کام کیا تو وہ سیدھے راستہ سے بہک گیا۔ اگر وہ تم پر قابو پائیں تو تمہارے دشمن ہو جائیں اور تم پر اپنے ہاتھ اور اپنی زبانیں برائی سے دراز کریں اور چاہتے ہیں کہ کہیں تم کافر ہو جاؤ۔ نہ تمہیں تمہارے رشتے ناطے اور نہ تمہاری اولاد قیامت کے دن نفع دیں گے، وہ (اللہ) تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا، اور جو تم کرتے ہو اللہ اسے خوب دیکھتا ہے"۔ (سورۃ الممتحنۃ: 1-3)

اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیات میں عمومی طور پر کفار کے ساتھ موالات اور جگری دوستی کی شناعت بیان کی ہے، لیکن بہت سی آیات میں خاص طور پر اہلِ کتاب کی اطاعت اور ان کو جگری دوست بنانے اور ان کی طرف مائل ہونے سے سختی کے ساتھ ممانعت کی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَن تَرۡضَىٰ عَنكَ ٱلۡيَهُودُ وَلَا ٱلنَّصَٰرَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمۡۗ قُلۡ إِنَّ هُدَى ٱللَّهِ هُوَ ٱلۡهُدَىٰۗ وَلَئِنِ ٱتَّبَعۡتَ أَهۡوَآءَهُم بَعۡدَ ٱلَّذِي جَآءَكَ مِنَ ٱلۡعِلۡمِ مَا لَكَ مِنَ ٱللَّهِ مِن وَلِيّٖ وَلَا نَصِيرٍ﴾ ترجمہ: "یہودی اور عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے، جب تک تم ان کے طریقہ پر نہ چلنے لگو، صاف کہہ دو کہ راستہ بس وہی ہے جو اللہ نے بتایا ہے ورنہ اگر اُس علم کے بعد جو تمہارے پاس آچکا ہے، تم نے اُن کی خواہشات کی پیروی کی، تو اللہ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی دوست اور مددگار تمہارے لئے نہیں ہے"۔ (سورۃ البقرہ: 120)

دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِن تُطِيعُواْ فَرِيقٗا مِّنَ ٱلَّذِينَ أُوتُواْ ٱلۡكِتَٰبَ يَرُدُّوكُم بَعۡدَ إِيمَٰنِكُمۡ كَٰفِرِينَ﴾ ترجمہ: "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر تم نے اِن اہل کتاب میں سے ایک گروہ کی بات مانی تو یہ تمہیں ایمان سے پھر کفر کی طرف پھیر لے جائیں گے"۔ (سورۃ آل عمران: 100)

اور ایک جگہ ارشاد ہے: ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا تَتَّخِذُواْ ٱلۡيَهُودَ وَٱلنَّصَٰرَىٰٓ أَوۡلِيَآءَۘ بَعۡضُهُمۡ أَوۡلِيَآءُ بَعۡضٖۚ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمۡ فَإِنَّهُۥ مِنۡهُمۡۗ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يَهۡدِي ٱلۡقَوۡمَ ٱلظَّٰلِمِينَ﴾ ترجمہ: "اے لوگو جو ایمان لائے ہو! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ، یہ آپس ہی میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں اور اگر تم میں سے کوئی ان کو اپنا رفیق بناتا ہے تو اس کا شمار بھی پھر انہی میں ہے، یقیناً اللہ ظالموں کو اپنی رہنمائی سے محروم کر دیتا ہے"۔ (سورۃ المائدہ: 51)

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے منافقین کو بھی جگری دوست بنانے سے منع کیا ہے، اس لئے کہ ان کی نمایاں ترین صفت یہ ہے کہ وہ کفر کے ساتھ دوستی رکھتے ہیں اور اللہ کے دین سے نفرت کرتے ہیں، اِرشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿بَشِّرِ ٱلْمُنَـٰفِقِينَ بِأَنَّ لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۝١٣٨ ٱلَّذِينَ يَتَّخِذُونَ ٱلْكَـٰفِرِينَ أَوْلِيَآءَ مِن دُونِ ٱلْمُؤْمِنِينَ ۚ أَيَبْتَغُونَ عِندَهُمُ ٱلْعِزَّةَ فَإِنَّ ٱلْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا﴾ ترجمہ: ''اور جو منافق اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق بناتے ہیں انہیں یہ مثردہ سنادو کہ اُن کے لئے دردناک سزا تیار ہے، کیا یہ لوگ عزت کی طلب میں اُن کے پاس جاتے ہیں؟ حالانکہ عزت تو ساری کی ساری اللہ ہی کے لئے ہے''۔ (سورۃ النساء: 138- 139)

مدینہ میں نازل ہونے والی وحی میں ایسی آیات نازل ہوئیں جن میں اس علحیدگی کی شکلوں کو واضح طور پر بیان کیا گیا، جیسے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ترجمہ: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِىُّ جَـٰهِدِ ٱلْكُفَّارَ وَٱلْمُنَـٰفِقِينَ وَٱغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۚ وَمَأْوَىٰهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ ٱلْمَصِيرُ﴾ ترجمہ: ''اے نبیؐ، کفار اور منافقین دونوں کا پوری قوت سے مقابلہ کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ، آخر کار ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بدترین جائے قرار ہے''۔ (سورۃ التوبہ: 73)

اللہ تعالیٰ نے ان کی نماز جنازہ پڑھنے اور ان کی قبروں پر کھڑے ہونے سے بھی منع کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَا تُصَلِّ عَلَىٰٓ أَحَدٍ مِّنْهُم مَّاتَ أَبَدًا وَلَا تَقُمْ عَلَىٰ قَبْرِهِۦٓ ۖ إِنَّهُمْ كَفَرُوا۟ بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ وَمَاتُوا۟ وَهُمْ فَـٰسِقُونَ﴾ ترجمہ: ''اور آئندہ ان میں سے جو کوئی مرے اس کی نماز جنازہ بھی تم ہر گز نہ پڑھنا اور نہ کبھی اس کی قبر پر کھڑے ہونا کیونکہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ کفر کیا ہے اور وہ مرے ہیں اس حال میں کہ وہ فاسق تھے''۔ (سورۃ التوبہ: 84)

اللہ عزوجل نے اہل ایمان کے لئے ولاء و محبت کی ایک ہی جہت کو متعین کیا ہے جو صفتِ ایمان سے مطابقت رکھتی ہے اور ان لوگوں کے بارے میں بھی وضاحت کر دی ہے جن کے ساتھ وہ ولاء و محبت کا تعلق رکھ سکتے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ ٱللَّهُ وَرَسُولُهُۥ وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱلَّذِينَ يُقِيمُونَ ٱلصَّلَوٰةَ وَيُؤْتُونَ ٱلزَّكَوٰةَ وَهُمْ رَٰكِعُونَ ۝٥٥ وَمَن يَتَوَلَّ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ فَإِنَّ حِزْبَ ٱللَّهِ هُمُ ٱلْغَـٰلِبُونَ﴾ ترجمہ: ''تمہارے رفیق تو حقیقت میں صرف اللہ اور اللہ کا رسول اور وہ اہلِ ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں، اور جو اللہ اور اس کے رسول اور اہلِ ایمان کو اپنا رفیق بنالے اُسے معلوم ہو کہ اللہ کی جماعت ہی غالب رہنے والی ہے''۔ (سورۃ المائدہ: 55-56)

صحابہ کرام نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ ان کی ولاء و محبت صرف ان کی قیادت کے لئے ہے، ان کا اخلاص صرف ان کے عقیدہ کے تئیں ہے، اور ان کا جہاد صرف اعلائے کلمۃ اللہ کی خاطر ہے، اس لئے انہوں نے یہ تمام صفات اپنے اندر پیدا کر لی تھیں اور اس کو اپنی زندگیوں میں نافذ کیا تھا، انہوں نے اپنی ولاء و محبت کو خالص کر کے اس کو اللہ کے لئے، اس کے رسول کے لئے اور اہل ایمان کے لئے خاص کر لیا تھا، اور ان کی تاریخ ان کی ولاء و محبت کے اعتبار سے اعلیٰ مثالوں سے بھری ہوئی ہے جس کے ذریعہ ان کے گہرے فہم کا پتہ چلتا ہے۔

بلاشبہ مہاجرین وانصار کے درمیان ہونے والی مؤاخات ایک عقیدہ پر مبنی تھی جس کی بنیاد پر ان کے آپسی تعلقات قائم ہوئے اور وہ اسی عقیدہ پر ایمان رکھتے تھے، دوایسے شخص جوایک دوسرے کے عقیدہ اور فکر کے بر خلاف فکر وعقیدہ پر ایمان رکھتے ہوں ان کے مابین مؤاخات ناممکن اور محال ہے، بطور خاص جبکہ اس فکر وعقیدہ کے عملی زندگی میں متعین اثرات مرتب ہوتے ہوں، اسی لئے اللہ کے رسول ﷺ اللہ کی طرف سے جواسلامی عقیدہ لے کر آئے تھے وہ اس مؤاخات کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا تھا، اس لئے کہ یہ عقیدہ تمام انسانوں کو اللہ کی عبودیت کی صفت میں کھڑا کرتا ہے جہاں تقویٰ اور عملِ صالح کے علاوہ اور کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا ہے، اس لئے کہ یہ ناممکن ومحال ہے کہ ایسے لوگوں کے درمیان اخوت وتعاون اور ایثار کے جذبات پیدا ہوسکیں جن کو مختلف عقائد وافکار نے منتشر کردیا ہو اور ان میں سے ہر ایک انانیت ومفادات اور خواہشات کا غلام بن گیا ہو۔(دیکھیں: فقہ السیرۃ، البوطی، ص156)

2: مدنی معاشرہ کی بنیاد اللہ کے لئے محبت:

بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے لئے محبت کی بنیاد پر مؤاخات امتِ مسلمہ کی اہم ترین بنیاد ہے، جب یہ کمزوری کا شکار ہو جائے تو پوری عمارت کمزور ہونا شروع ہو جاتی ہے، اسی لئے نبی کریم ﷺ نے اللہ کے لئے محبت کے معانی اور احساسات کو نئے مسلم معاشرہ میں پیوست کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ بروزِ قیامت فرمائے گا: "کہاں ہیں وہ لوگ جو میرے جلال کی وجہ سے ایک دوسرے سے محبت کرنے والے ہیں؟ آج میں ان کو اپنا خاص سایہ عطا کروں گا جس روز میرے سائے کے سوا کوئی سایہ نہیں ہے"۔ (صحیح مسلم:2566مسند احمد:2/237- 535، موطأمالک:2/952)

آپ نے ﷺ یہ بھی فرمایا: "میرے لئے محبت کرنے والوں کے لئے میری محبت واجب ہے، میری وجہ سے آپس میں جڑنے والوں کے لئے میری محبت واجب ہے، میری وجہ سے ایک دوسرے پر خرچ کرنے والوں کے لئے میری محبت واجب ہے، میری وجہ سے ایک دوسرے سے محبت کرنے والے نور کے منبروں پر ہوں گے جن پر انبیاء، صدیقین اور شہداء رشک کریں گے"۔ (مسند أحمد: 5/229-239، ابن حبان: 577، سنن ترمذی: 2390)

نبی کریم ﷺ اپنی تعلیمات کے لئے صحابہ کرام کو محبت وتکافل اور ایک دوسرے کا احترام کرنے کی ترغیب دیتے تھے، اس لئے کوئی مالدار کسی فقیر پر، کوئی حاکم کسی محکوم پر اور کوئی طاقتور کسی کمزور پر غالب نہیں ہوتا تھا، اور اللہ کے لئے محبت کا مدینہ کے جدید معاشرہ میں ایک خاص قسم کا اثر تھا، حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں: حضرت ابو طلحہؓ انصارِ مدینہ میں سب سے زیادہ کھجور کے باغات کے مالک تھے اور ان کے نزدیک ان کا سب سے بہترین مال "بیر حاء" تھا اور وہ مسجد نبوی کے سامنے تھا، اللہ کے رسول ﷺ اس میں داخل ہوتے تھے اور اس کا بہترین پانی پیتے تھے، جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿لَن تَنَالُواْ ٱلۡبِرَّ حَتَّىٰ تُنفِقُواْ مِمَّا تُحِبُّونَۚ وَمَا تُنفِقُواْ مِن شَيۡءٖ فَإِنَّ ٱللَّهَ بِهِۦ عَلِيمٞ﴾ ترجمہ: "تم نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ اپنی وہ چیزیں (خدا کی راہ میں) خرچ نہ کرو جنہیں تم عزیز رکھتے ہو، اور جو کچھ تم خرچ کروگے اللہ اس سے بے خبر نہ ہوگا"۔(سورۃ آل عمران:92)

حضرت ابو طلحہؓ اٹھے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿لَن تَنَالُواْ ٱلۡبِرَّ حَتَّىٰ تُنفِقُواْ مِمَّا تُحِبُّونَۚ﴾ میرے نزدیک میرے مال میں محبوب ترین مال "بیر حاء" ہے، میں اس کو اللہ کی راہ میں صدقہ کرتا ہوں اور میں اللہ کے پاس اس کے اجر و ثواب کا طلبگار ہوں، اے اللہ کے رسولؐ! جہاں اللہ کا حکم ہو اس کو صَرف کیجئے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: یہ نفع بخش مال ہے! یہ نفع بخش مال ہے! آپ کی بات میں نے سن لی، میری رائے یہ ہے کہ آپ اس کو اپنے اقرباء میں تقسیم کر دیں، حضرت ابو طلحہؓ نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ! میں ایسا ہی کروں گا، اس کے بعد حضرت ابو طلحہؓ نے اس کو اپنے اقارب اور چچازاد بھائیوں میں تقسیم کر دیا۔ (صحیح بخاری: 1461، صحیح مسلم: 998)

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ ان عظیم احساسات اور معانی کی ترجمانی کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب ہم مدینہ آئے تو رسول ﷺ نے میرے درمیان اور سعد بن ربیعؓ کے درمیان مؤاخات کرائی، سعد بن ربیعؓ نے کہا: میں انصار میں سب سے زیادہ مال والا ہوں، میں آپ کو اپنا نصف مال تقسیم کر کے دیتا ہوں اور میری جس بیوی کو پسند کریں گے میں اس کے بارے میں آپ کے لئے تنازل اختیار کروں گا، جب اس کی عدت مکمل ہو کر وہ حلال ہو جائے گی تو اس سے نکاح کر لیں، حضرت عبدالرحمٰنؓ نے فرمایا: مجھے اس کی کوئی حاجت نہیں ہے، کیا کوئی بازار ہے جہاں تجارت ہوتی ہے؟! فرمایا: قینقاع کا بازار ہے۔ فرماتے ہیں: جب صبح ہوئی تو حضرت عبدالرحمٰنؓ پنیر اور گھی لے کر گئے۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ پھر وہ تجارت کے لئے بازار آنے جانے لگے، کچھ دنوں کے بعد ہی حضرت عبدالرحمٰنؓ رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان پر زرد رنگ کا نشان تھا، رسول ﷺ نے دریافت کیا: کیا تم نے شادی کر لی ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں! آپؐ نے فرمایا: کس سے؟ کہا! ایک انصاری خاتون سے۔ دریافت فرمایا: کتنا مہر دیا؟ فرمایا: ایک گھٹلی برابر سونا دیا ہے یا (یہ کہا کہ) سونے کی ایک گھٹلی دی ہے۔ پھر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اچھا تو ولیمہ کرو چاہے ایک ہی بکری کیوں نہ ہو"۔ (صحیح بخاری: 2048-3780، صحیح مسلم: 1426)

قابل غور پہلو یہ ہے کہ حضرت سعد بن ربیعؓ کے جود و کرم کے مقابلہ میں حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے خودداری اور عفت کا مظاہرہ کیا، اور یہ صرف حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ ہی کا طرزِ عمل نہیں تھا، بلکہ مہاجرین میں سے بہت سے صحابہ کرام اپنے انصاری بھائیوں کے گھروں میں کم ہی مدت کے لئے ٹھہرے اور انہوں نے خود کام اور کاروبار شروع کیا، اور اپنے لئے گھر خریدے اور خود اپنے مصارف برداشت کرنے لگے، انہی صحابہ میں حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت عثمان اور دیگر صحابہ کرام۔ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ شامل ہیں۔

3: مؤاخات کرنے والوں کے مابین خیر خواہانہ جذبہ:

مؤاخات مسلمانوں کے مابین خیر خواہی کے اعتبار سے انتہائی مؤثر عمل تھا، نبی کریم ﷺ نے جب حضرت سلمانؓ اور حضرت ابو درداءؓ کے مابین مؤاخات کرائی تو حضرت سلمانؓ حضرت ابو درداءؓ سے ملنے گئے، وہاں حضرت اُم درداء کو دیکھا کہ وہ پھٹے پرانے حال میں ہیں، حضرت سلمانؓ نے ان سے دریافت کیا کہ کیا بات ہے، یہ حالت کیوں بنا رکھی ہے؟! انہوں نے جواب دیا کہ تمہارے بھائی ابو درداء کو دنیا کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ اس کے بعد حضرت ابو درداءؓ بھی آگئے، ان کے لئے کھانا تیار کیا اور ان سے کہا: آپ کھائیں اور میں روزہ سے

ہوں۔اس پر حضرت سلمانؓ نے فرمایا: میں بھی اس وقت تک کھانا نہیں کھاؤں گا جب تک آپ بھی نہیں کھائیں گے۔راوی بیان کرتے ہیں: یہ سن کر وہ کھانے میں شریک ہو گئے۔ پھر جب رات ہو گئی تو ابو درداءؓ عبادت کے لئے اٹھے تو حضرت سلمانؓ نے فرمایا: ابھی سو جائیں اور وہ سو گئے، اس کے بعد وہ پھر سے عبادت کے لئے اٹھنے لگے تو حضرت سلمانؓ نے فرمایا: ابھی سو جائیں، پھر جب رات کا آخری پہر ہوا تو سلمانؓ نے فرمایا: اب اٹھ جائیں، چنانچہ دونوں نے نماز پڑھی، اس کے بعد حضرت سلمانؓ نے ان سے فرمایا: بے شک آپ کے رب کا بھی آپ پر حق ہے، جان کا بھی آپ پر حق ہے، آپ کی بیوی کا بھی آپ پر حق ہے، اس لئے ہر حق والے کا حق ادا کرنا چاہیئے، پھر آپؓ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ سے اس کا تذکرہ کیا، آپ ﷺ نے فرمایا: سلمان نے سچ کہا۔(صحیح بخاری: 1968-6139، سنن ترمذی: 2413)

4: انصار کا ایثار و قربانی اور مہاجرین کا اظہارِ تشکر:

انصار نے اپنے مہاجر بھائیوں کے ساتھ ہمدردی کا برتاؤ کیا اور ہر چیز میں اپنے مقابلہ میں ان کو ترجیح دی، یہ ان کی مخلصانہ محبت اور ایمان کی واضح دلیل ہے، انصار کے بارے میں عظیم نمونے اور اعلیٰ مثالیں سامنے آئیں جن کا مہاجرین کے دلوں پر گہرا اثر پڑا، چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں: انصار نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا: ہمارے کھجور کے باغات کو ہمارے درمیان اور ہمارے بھائیوں کے درمیان تقسیم کر لیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں! پھر انہوں نے مہاجرین سے کہا: آپ کام میں ہمارا ہاتھ بٹائیں اور ہم پھلوں میں آپ کو شریک کر لیتے ہیں۔ انہوں نے کہا: یہ بات ہمیں قبول ہے۔(صحیح بُخاری: 2325)

انصار نے مہاجرین کو پھلوں میں شریک کیا اور مہاجرین کام میں ان کا ہاتھ بٹاتے تھے اور ان کی مدد کرتے تھے لیکن زیادہ کام انصار خود ہی کرتے تھے، مہاجرین نے انصار کے طرزِ عمل اور ان کے جذبۂ ایثار و قربانی کو کافی سراہا اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! ہم جس قوم کے پاس بھی گئے ہیں ہم نے اِن سے بہتر کوئی قوم نہیں دیکھی ہے جو کم مائیگی میں بھی ہمدردی کرتے ہوں اور خوشحالی میں بہت زیادہ انفاق کرتے ہوں۔ انہوں نے ہمارے بدلے میں کام کیا اور پھلوں میں ہم کو شریک کیا، یہاں تک کہ ہم سمجھنے لگے کہ وہ سب اجر و ثواب لے گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں! بلکہ جب تک آپ ان کی تعریف کرتے رہو گے اور ان کے لئے اللہ عزوجل سے دعا کرتے رہو گے آپ بھی اجر میں شریک رہو گے۔(مسند احمد: 3/200-201، سنن ترمذی: 2487، مصنف ابن ابی شیبہ: 9/68)

مہاجرین نے اخروی اجر و ثواب کا ذکر کیا، اس سے پتہ چلتا ہے کہ آخرت کی زندگی کے بارے میں ان کا تصور کتنا گہرا تھا اور یہ تصور ان کی فکر اور سوچ پر غالب تھا۔

نبی کریم ﷺ نے چاہا کہ ان عظیم کارناموں کا انصار کو بدلہ دیں، حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے انصار کو بلایا تا کہ بحرین ان کو بطور جاگیر عطا فرمائیں۔ انصار نے کہا کہ جب تک آپ ہمارے مہاجرین بھائیوں کو بھی اسی طرح نہ عطا فرمائیں (ہم اسے قبول نہیں کریں گے)۔ آپؐ نے فرمایا: دیکھو جب آپ آج قبول نہیں کرتے ہو تو پھر میرے بعد بھی صبر کرنا یہاں تک کہ مجھ سے تمہاری ملاقات ہو، اس لئے کہ میرے بعد جلد ہی آپ کے ساتھ حق تلفی ہونے والی ہے۔(صحیح بُخاری: 3794)

بلاشبہ انصار اور مہاجرین کے مابین ہونے والی مؤاخات کے ذریعہ مطلوبہ اہداف اور مقاصد پورے ہوئے، اس کے ذریعہ مہاجرین کے اندر غریب الوطنی اور اجنبیت کا احساس ختم ہوا، اہل و عیال اور خاندان کے فراق و جدائی کے مقابلہ میں انسیت میسر ہوئی اور ایک دوسرے کے ذریعہ ہر ایک کو تقویت ملی، اسی طرح اس کے ذریعہ جدید حکومت کو بھی قوت حاصل ہوئی، اس لئے کہ کوئی بھی حکومت اس وقت تک اپنے پاؤں پر کھڑی نہیں ہوسکتی ہے جب تک کہ اس کو امت کی وحدت اور اس کا تعاون حاصل نہ ہو اور وحدت و تعاون اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ باہمی اخوت و محبت نہ پائی جائے، لہٰذا ہر وہ جماعت جس کے اندر حقیقی محبت و مودّت اور اخوت نہ ہو وہ کسی مقصد کے لئے متحد نہیں ہوسکتی ہے اور جب تک کسی اُمت یا جماعت میں حقیقی اتحاد قائم نہ ہو اس وقت تک اس کے ذریعہ کوئی پائیدار حکومت قائم نہیں ہوسکتی ہے۔ (فی ظلال القرآن: 6/3526)

5: مؤاخات کے ذریعہ توارث:

انصار نے جس طرح سے مہاجرین کا استقبال کیا تاریخ انسانی میں اس طرح کا ایسا اجتماعی واقعہ کہیں نہیں ملتا ہے جب کہ انہوں نے محبت و مودّت کے ذریعہ، فیاضانہ انفاق کے ذریعہ، فعال شرکت کے ذریعہ اور مہاجرین کو پناہ دینے اور ان کی ضروریات پوری کرنے کے ذریعہ ان کا پرتپاک استقبال کیا، صحابہ کرام نے اخوت کو عملی زندگی میں نافذ کرکے دکھایا گیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام کے مابین جو تاریخی معاہدہ کرایا تھا یہ کوئی زبانی شعار نہیں تھا جو صرف زبان سے ادا کرلیا گیا ہو بلکہ یہ ایک عملی حقیقت تھی جس کا عملی زندگی کے ساتھ گہرا تعلق تھا اور اس کے ذریعہ انصار اور مہاجرین کے درمیان گہرے تعلقات قائم ہوئے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس اخوت کے ذریعہ ان بھائیوں کے درمیان ایک حقیقی و عملی ذمہ داری عائد کی اور اس ذمہ داری کو وہ احسن طریقہ سے نبھاتے تھے، اسی لئے اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اس اخوت کی بنیاد پر میراث کا حق بھی عطا کیا تھا، اس قانون سازی کی حکمت یہ تھی کہ مسلمانوں کے اذہان میں اسلامی اخوت ایک محسوس حقیقت کی حیثیت سے ظاہر ہو اور وہ یہ جان لیں کہ مسلمانوں کے مابین پائی جانے والی آپسی اخوت و محبت صرف باتوں تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ ایک عملی وجود رکھتی ہے جس کے نتائج و اثرات معاشرہ میں محسوس کئے جاسکتے ہیں، اس کے نتیجہ میں عادلانہ اجتماعی نظام کی بنیادیں وجود میں آتی ہیں۔

اخوت کی بنیاد پر توارث کے حکم کو بعد میں منسوخ کیا گیا، اس کی حکمت یہ ہے کہ میراث کا جو نظام بعد میں قائم کیا گیا وہ بھی اسلامی اخوت کی بنیاد پر قائم ہے، اس لئے کہ دو مختلف ادیان کے پیروکاروں کے مابین وراثت کے احکام جاری نہیں ہوں گے، صرف ہجرت کے ابتدائی مرحلہ میں انصار و مہاجرین دونوں کو حالات کی وجہ سے ایک دوسرے کے تعاون و نصرت کی اہم ذمہ داری نبھانی پڑی اور اس ذمہ داری کا تقاضا یہ تھا کہ یہ اخوت اپنی حقیقت اور اثرات کے اعتبار سے قرابت و رشتہ داری کی اخوت سے زیادہ قوی اور پائیدار ہو، لہٰذا جب مدینہ میں مہاجرین کے حالات ٹھیک ہوگئے اور وہاں اسلام کو قوت و استحکام مل گیا تو پھر مدینہ کے جدید معاشرہ میں اسلامی روح ہی فطری و طبعی قوت کا محرک باقی رہی۔ (فقہ السیرۃ، البوطی، ص 211، 212)

اور جب مہاجرین مدینہ کے ماحول سے مانوس ہوگئے اور وہاں موجود رزق کے ذرائع سے وہ واقف ہوگئے اور بدر کے مالِ غنیمت سے بھی ان کو حصّہ ملا تو وراثت کا حکم اصلی اور طبعی حالت میں واپس آگیا جس میں صلہ رحمی کو اساس بنایا گیا اور مؤاخات کی بنیاد پر قائم وراثت کا حکم منسوخ ہوگیا اور یہ قرآنی حکم کی بنیاد پر کیا گیا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ مِنۢ بَعۡدُ وَهَاجَرُواْ وَجَٰهَدُواْ مَعَكُمۡ فَأُوْلَٰٓئِكَ مِنكُمۡۚ وَأُوْلُواْ ٱلۡأَرۡحَامِ بَعۡضُهُمۡ أَوۡلَىٰ بِبَعۡضٖ فِي كِتَٰبِ ٱللَّهِۚ إِنَّ ٱللَّهَ بِكُلِّ شَيۡءٍ عَلِيمُۢ﴾ ترجمہ: ''اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور ہجرت کر کے آگئے اور تمہارے ساتھ مل کر جدوجہد کرنے لگے وہ بھی تم ہی میں شامل ہیں، مگر اللہ کی کتاب میں خون کے رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں، یقیناً اللہ ہر چیز کو جانتا ہے''۔(سورۃ الانفال: 75)

اس آیت نے نظام مؤاخات کی بنیاد پر قائم وراثت کے حکم کو منسوخ کردیا، البتہ باہمی نصرت وحمایت اور نصیحت واخوت کا حکم برقرار رہا۔(السیرۃ النبویہ الصحیحۃ: 1/246، التاریخ الاسلامی: 4/25)

6: بے مثال انسانی اقدار اور اعلیٰ اصول وضوابط:

مہاجرین وانصار کو جن مضبوط روابط نے آپس میں جوڑنے کا کام کیا اس کے نتیجہ میں ایسی انسانی معاشرتی اقدار وجود میں آئیں جو کبھی قبائلی معاشرہ میں دیکھنے کو نہیں ملتی تھیں، ایسی اقدار تو کسی متمدّن معاشرہ میں دیکھنے کو ملتی ہیں، ان اقدار میں اہم ترین قدر یہ تھی کہ کسی شریفانہ اور معزز کام کو کسبِ رزق کا وسیلہ اختیار کیا گیا، مہاجرین نے ابتدائی مرحلہ میں تو مہاجرین کی ضیافت کو قبول کیا لیکن بعد میں انہوں نے جب اپنے لئے رزق کے اسباب اور وسائل تلاش کئے تو بغیر محنت والے رزق سے اجتناب کیا اور انصار پر بوجھ نہیں بنے، ان میں سے بعض تجارت میں مشغول ہوئے اور بعض زراعت میں، اور وہ محنت و کوشش کی تکاں سے لذت حاصل کرنے لگے، اس لئے کہ ایمان صاحبِ ایمان کو ایسا باعزت اور خوددار بناتا ہے کہ وہ کسی پر بوجھ بننے پر راضی نہیں ہوتا ہے، اس لئے کہ دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے زیادہ بہتر اور اللہ کے نزدیک محبوب ہوتا ہے، صحابہ کرامؓ نے اسلامی تعلیمات کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ عمل ایک عبادت ہے اور یہ ایک ایسا نقطۂ نظر ہے جہاں تک موجود نظامہائے پہنچنے سے قاصر ہیں، اس اسلامی مفہوم کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اخوت اور عمل دارِ ہجرت کے معاشرہ میں بنیادی اینٹ کی حیثیت رکھتے تھے اور اسی کے نتیجہ میں اسلامی تہذیب کی بنیاد پڑی جس کے اصول و قوانین مدینہ میں وضع کئے گئے، جبکہ پہلی اسلامی حکومت کا قیام عمل میں آیا جس کے سربراہ اعلیٰ نبی کریم ﷺ تھے اور پھر پوری دنیا میں اس کی سایہ دار شاخیں پھیلتی چلی گئیں۔(الہجرۃ فی القرآن الکریم: ص: 411)

7: علاقائی اور قبائلی امتیازات کا خاتمہ:

بلاشبہ جاہلیت زدہ معاشروں میں علاقائی اور قبائلی امتیازات کو ختم کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے جہاں عصبیت ہی کو دین کی حیثیت دی جاتی ہے، جبکہ مؤاخات کے عمل کا مقصد یہ ہے کہ ان امتیازات کو جاہلیت زدہ معاشرہ سے عملی طور پر زائل کردیا جائے۔

موجودہ اسلامی سوسائٹی کے امراض میں سے ایک مرض یہ ہے کہ بعض داعیوں کے اندر علاقائیت اور عصبیت کی روح غالب آگئی ہے، اور اسی طرح کے امراض عروج و غلبہ کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں اور یہ صفوں کو کمزور اور پارہ پارہ کر دیتے ہیں اور اسلامی تحریک اپنے عظیم اہداف و مقاصد سے غافل ہو جاتی ہے اور اس طرح کے امراض قرآن اور سید المرسلین ﷺ کی سنت سے دوری کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہیں۔(دیکھیں: التربیۃ القیادیۃ: 200/286)

آج انصار و مہاجرین کے درمیان ہونے والی مؤاخات جیسی اخوت کی اشد ضرورت ہے، اس لئے کہ یہ ناممکن ہے کہ باعزت و قوی اسلامی زندگی وجود میں آئے جب تک کہ اسلامی معاشرہ اس طرح کے اخلاقِ کریمانہ سے آراستہ نہ ہو اور اس طرح کے بلند ایمانی میعار تک اور اس طرح کی عظیم قربانیوں کے جذبہ سے سرشار نہ ہو اور جہاں تک اخوت کے زبانی اور بے بنیاد مظاہر کا تعلق ہے تو ذرہ برابر کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے ہیں۔

8: مؤاخات غلبہ کا ایک اہم معنوی سبب:

بے شک غلبہ و اقتدار کے معنوی اسباب و وسائل میں سے ایک سبب یہ ہے کہ افراد کی ربانی تربیت کی جائے، ربانی قیادت تیار کی جائے اور افتراق و انتشار کے اسباب کو ختم کر کے اتحاد و اتفاق کے اصول کو اختیار کیا جائے۔

اتحاد و اتفاق کے اہم اصولوں میں ایک اصول یہ ہے کہ عقیدہ میں وحدت ہو، اسلام کے ساتھ نسبت و تعلق میں سچائی ہو، حق کی طلب ہو، اس سلسلہ میں تحقیق و جستجو کا طرزِ عمل ہو اور افرادِ امت کے مابین اخوت و محبت عملی طور پر پائی جاتی ہو۔

باہمی اخوت ایک عظیم اصول ہے جس کے نتیجہ میں وحدتِ صف، آپسی تعلق اور باہمی رابطہ وجود میں آتا ہے، اخوت بے شک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک انعام اور عطیہ ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنے مخلص بندوں کو اور اپنے متقی اور چنیدہ اولیاء کو عطا کرتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَإِن يُرِيدُوٓاْ أَن يَخۡدَعُوكَ فَإِنَّ حَسۡبَكَ ٱللَّهُۚ هُوَ ٱلَّذِيٓ أَيَّدَكَ بِنَصۡرِهِۦ وَبِٱلۡمُؤۡمِنِينَ ۝٦٢ وَأَلَّفَ بَيۡنَ قُلُوبِهِمۡۚ لَوۡ أَنفَقۡتَ مَا فِي ٱلۡأَرۡضِ جَمِيعٗا مَّآ أَلَّفۡتَ بَيۡنَ قُلُوبِهِمۡ وَلَٰكِنَّ ٱللَّهَ أَلَّفَ بَيۡنَهُمۡۚ إِنَّهُۥ عَزِيزٌ حَكِيمٞ ۝٦٣﴾ ترجمہ: ''اور اگر وہ دھوکہ کی نیت رکھتے ہوں تو تمہارے لئے اللہ کافی ہے، وہی تو ہے جس نے اپنی مدد سے اور مومنوں کے ذریعہ سے تمہاری تائید کی۔ اور مومنوں کے دل ایک دُوسرے کے ساتھ جوڑ دئے تم روئے زمین کی ساری دولت بھی خرچ کر ڈالتے تو اِن لوگوں کے دل نہ جوڑ سکتے تھے مگر وہ اللہ ہے جس نے ان لوگوں کے دل جوڑے، یقیناً وہ بڑا زبردست اور دانا ہے''۔(سورۃ الأنفال: 62-63)

اخوت ایک ایسی ایمانی قوت ہے جو انسان کے اندر ہر اس شخص کے تئیں سچے جذبات، محبت و مودّت اور باہمی احترام و اعتماد کا گہرا شعور پیدا کرتا ہے جو بھی عقیدۂ توحید اور اسلامی منہج کی لڑی میں مربوط ہو، اس کے نتیجہ میں آپسی تعاون، ایثار، عفو و رحم، درگذر اور تکافل و نصرت کی صفات پیدا ہوتی ہیں، اخوت ایمان کا لازمی نتیجہ ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّمَا ٱلۡمُؤۡمِنُونَ إِخۡوَةٞ فَأَصۡلِحُواْ بَيۡنَ

أَخَوَيْكُمْ ۚ وَٱتَّقُواْ ٱللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾ ترجمہ: ”مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں، لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو اور اللہ سے ڈرو، امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا“۔(سورۃ الحجرات:10)

وہی شخص ایمانی حلاوت محسوس کر سکتا ہے جس کے رگ وپے میں اخوت کی گھٹی ملی ہوئی ہو، اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے: ”تین صفات ایسی ہیں جس کے اندر بھی وہ موجود ہوں اس کو ایمان کی حلاوت ومٹھاس مل گئی: اول یہ کہ اللہ اور اس کا رسول اس کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب بن جائے۔ دوسرے یہ کہ وہ کسی سے محض اللہ کی رضا کے لئے محبت کرے۔ تیسرے یہ کہ وہ کفر میں واپس جانے کو اتنا برا سمجھے جیسا کہ آگ میں ڈالے جانے کو برا جانتا ہے“۔(صحیح بخاری: 16، صحیح مسلم:43)

قرآن کریم ہمارے سامنے اصحابِ رسول ﷺ کی خوبصورت تصویر کھینچتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿مُّحَمَّدٌ رَّسُولُ ٱللَّهِ ۚ وَٱلَّذِينَ مَعَهُۥٓ أَشِدَّآءُ عَلَى ٱلْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ۖ تَرَىٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ ٱللَّهِ وَرِضْوَٰنًا ۖ سِيمَاهُمْ فِى وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ ٱلسُّجُودِ ۚ ذَٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِى ٱلتَّوْرَىٰةِ ۚ وَمَثَلُهُمْ فِى ٱلْإِنجِيلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْـَٔهُۥ فَـَٔازَرَهُۥ فَٱسْتَغْلَظَ فَٱسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوقِهِۦ يُعْجِبُ ٱلزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ ٱلْكُفَّارَ ۗ وَعَدَ ٱللَّهُ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَعَمِلُواْ ٱلصَّٰلِحَٰتِ مِنْهُم مَّغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًۢا﴾ ترجمہ: ”محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں، تم جب دیکھو گے اُنہیں رکوع وسجود اور اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب میں مشغول پاؤ گے، سجود کے اثرات ان کے چہروں پر موجود ہیں جن سے وہ الگ پہچانے جاتے ہیں، یہ ہے ان کی صفت، توراۃ میں اور انجیل میں اُن کی مثال یوں دی گئی ہے کہ گویا ایک کھیتی ہے جس نے پہلے کونپل نکالی، پھر اس کو تقویت دی، پھر وہ گدرائی، پھر اپنے تنے پر کھڑی ہو گئی کاشت کرنے والوں کو وہ خوش کرتی ہے تاکہ کفار ان کے پھلنے پھولنے پر جلیں اِس گروہ کے لوگ جو ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کئے ہیں اللہ نے ان سے مغفرت اور بڑے اجر کا وعدہ فرمایا ہے“۔(سورۃ الفتح:29)

بلاشبہ اللہ کے لئے اخوت ومحبت ان اہم اسباب میں سے ہے جو مسلمانوں پر نازل ہونے والی سخت ترین ابتلاء وآزمائش کے مقابلہ میں جمنے اور اختیار کرنے میں اہم رول ادا کرتی ہیں، اسی طرح اخوت کے بارے میں صحیح اور کامل فہم اسلامی صفوں کی مضبوطی، استحکام اور غلبہ واقتدار کا اہم ترین سبب ہے۔ (دیکھیں: شرح رسالۃ التعالیم، د۔ محمد عبداللہ الخطیب، ص: 296)

9: انصار کے فضائل:

انصار کو اس نام سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے اس وقت موسوم کیا جبکہ انہوں نے اسلام پر بیعت کی، اہل ایمان کو پناہ دی، اللہ کے دین اور رسول ﷺ کی نصرت وحمایت کی، وہ اس سے پہلے اس نام سے معروف نہیں تھے، حضرت غیلان بن جریرؒ سے روایت ہے فرماتے ہیں: میں نے حضرت انسؓ سے دریافت کیا: آپ کا کیا خیال ہے کہ "انصار" کا نام آپ نے خود رکھا ہے یا اللہ نے یہ نام رکھا ہے؟ انہوں نے فرمایا: بلکہ اللہ نے ہی ہمیں اس نام سے موسوم کیا ہے۔(صحیح بخاری: 3776)

جہاں تک ان کے مناقب و فضائل کا تعلق ہے تو وہ ناقابل شمار ہیں، ان میں سے بعض مناقب و فضائل عمومی ہیں جب کہ بعض مختلف افراد کے ساتھ خاص ہیں، قرآن کریم میں وارد مناقب مندرجہ ذیل ہیں:

اللہ عزوجل نے ان کا وصف بیان کیا ہے کہ وہی حقیقی مومن ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَهَاجَرُواْ وَجَٰهَدُواْ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ وَٱلَّذِينَ ءَاوَواْ وَّنَصَرُوٓاْ أُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْمُؤْمِنُونَ حَقًّاۚ لَّهُم مَّغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ﴾ ترجمہ: ”جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جدوجہد کی اور جنہوں نے پناہ دی اور مدد کی وہی سچے مومن ہیں، ان کے لئے خطاؤں سے درگزر ہے اور بہترین رزق ہے“۔(سورۃ الأنفال:74)

اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی خوشنودی اور رضامندی کی خوشخبری دی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَٱلسَّٰبِقُونَ ٱلْأَوَّلُونَ مِنَ ٱلْمُهَٰجِرِينَ وَٱلْأَنصَارِ وَٱلَّذِينَ ٱتَّبَعُوهُم بِإِحْسَٰنٍ رَّضِيَ ٱللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُواْ عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّٰتٍ تَجْرِي تَحْتَهَا ٱلْأَنْهَٰرُ خَٰلِدِينَ فِيهَآ أَبَدًاۚ ذَٰلِكَ ٱلْفَوْزُ ٱلْعَظِيمُ﴾ ترجمہ: ”وہ مہاجر و انصار جنہوں نے سب سے پہلے دعوتِ ایمان پر لبیک کہنے میں سبقت کی، نیز وہ جو بعد میں راستبازی کے ساتھ پیچھے آئے، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے، اللہ نے ان کے لئے ایسے باغ مہیا کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، یہی عظیم الشان کامیابی ہے“۔ (سورۃ التوبہ:100)

اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں فلاح اور کامیابی کی صفت بیان کی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَٱلَّذِينَ تَبَوَّءُو ٱلدَّارَ وَٱلْإِيمَٰنَ مِن قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ أُوتُواْ وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌۚ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِۦ فَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْمُفْلِحُونَ﴾ ترجمہ: (اور وہ اُن لوگوں کے لئے بھی ہے) جو اِن مہاجرین کی آمد سے پہلے ہی ایمان لا کر دار الہجرۃ میں مقیم تھے، یہ اُن لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے اِن کے پاس آئے ہیں اور جو کچھ بھی اُن کو دے دیا جائے اُس کی کوئی حاجت تک یہ اپنے دلوں میں محسوس نہیں کرتے اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں، حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے دل کی تنگی سے بچا لئے گئے وہی فلاح پانے والے ہیں“۔(سورۃ الحشر:09)

اور جہاں تک انصار کے فضائل پر مشتمل احادیث کا تعلق ہے تو ان میں سے چند احادیث مندرجہ ذیل ہیں:

نبی کریم ﷺ کی انصار سے محبت:

حضرت انسؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے عورتوں اور بچوں کو آتے ہوئے دیکھا۔ راوی کہتے ہیں: میرا خیال ہے کہ انسؓ نے کہا کہ ایک شادی سے آرہے تھے۔ نبی کریم ﷺ احسان شناسی کے طور پر کھڑے ہوئے اور فرمایا: اللہ گواہ ہے تم لوگ مجھے سب لوگوں سے زیادہ محبوب ہو۔ تین بار آپ ﷺ نے ایسا فرمایا۔ (صحیح بخاری: 3785، صحیح مسلم:2508)

انصار سے محبت ایمان کی علامت اور ان سے نفرت نفاق کی علامت:

حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے رسول ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''انصار سے مومن ہی محبت کرے گا اور ان سے نفرت منافق ہی کرے گا، جو ان سے محبت کرے گا اللہ اس سے محبت کرے گا اور جو ان سے نفرت کرے گا اللہ اس سے نفرت کرے گا''۔ (صحیح مسلم: 3783، صحیح بخاری: 75)

انصار سے محبت کرنے والا اللہ کا محبوب اور ان سے نفرت کرنے والا اللہ کے نزدیک مبغوض:

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول ﷺ نے فرمایا: ''جس نے انصار سے محبت کی اللہ اس سے محبت کرے گا اور جو انصار سے نفرت کرے گا وہ اللہ کے نزدیک مبغوض قرار پائے گا''۔ (مسند اُحمد: 2/501- 527، مسند ابویعلی: 7367، مسند بزار: 2792-2793، مجمع الزوائد: 10/39)

انصار کے لئے عفت وصبر کی گواہی:

عفت و پاکدامنی اور صبر دو عظیم صفات ہیں جو ان سے آراستہ شخص کی شرافت، اصیل النسل، مروءت اور مردانگی و بہادری کی دلیل ہے، نبی کریم ﷺ نے انصار کے لئے ان دونوں صفات کی گواہی دی ہے اور اس سے بڑی گواہی اور کیا ہو سکتی ہے؟! آپؐ سے بڑا گواہی دینے والا اور کوئی ہو سکتا ہے؟! حضرت عائشہؓ سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر کوئی خاتون انصار کے گھروں میں یا اپنے والدین کے یہاں مہمان بنے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے''۔ (مسند اُحمد: 6/257، ابن حبان: 7267، مستدرک حاکم: 4/83، مسند البزار: 2806، مجمع الزوائد: 10/40)

رسول ﷺ کی ان کی جانب نسبت کرنے کی چاہت:

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے، وہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر انصار کسی وادی یا گھاٹی میں چلیں تو میں انصار کی وادی میں چلوں گا اور اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں انصار کا ایک فرد ہوتا''۔ (صحیح بخاری: 3779، 7344، مسند اُحمد: 2/410، السنن الکبریٰ للنسائی: 8261)

انصار کے لئے، ان کی اولاد اور اہل وعیال کے لئے نبی کریم ﷺ کی دعائے مغفرت:

اس میں کوشک نہیں ہے کہ رسول ﷺ کی دعا مقبول و مستجاب ہے اور انصار کو رسول ﷺ کی دعا لینے کا اعزاز و شرف حاصل ہے، امام بخاریؒ نے حضرت عبداللہ بن فضل سے روایت کی ہے کہ انہوں نے حضرت انس بن مالکؓ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: حرہ میں جو لوگ شہید کئے گئے ان پر مجھے بڑا رنج ہوا، زید بن اُرقمؓ کو میرے غم کی اطلاع پہنچی تو انہوں نے مجھے لکھا کہ انہوں نے رسول ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: اے اللہ! انصار کی مغفرت فرما اور اُن کے بیٹوں کی بھی مغفرت فرما۔ عبداللہ بن فضل کو اس میں شک تھا کہ آپؐ نے انصار کے بیٹوں کے بیٹوں کا بھی ذکر کیا تھا یا نہیں، انسؓ سے ان کی مجلس کے حاضرین میں سے کسی نے دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ زید بن اُرقمؓ ہی کے بارے میں رسول ﷺ نے فرمایا کہ یہ وہی شخص ہیں جن کے سننے کی اللہ تعالیٰ نے تصدیق کی تھی۔ (صحیح بخاری: 4906، صحیح مسلم: 2506)

ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے اور ان کو ڈرانے سے باز رہنے کی رسول ﷺ کی ہدایت:

انصار نے دین کی راہ میں عظیم جدوجہد کی اور دین کی نشر واشاعت اور اس کے دفاع کے سلسلہ میں ان کا حصہ وافر رہا ہے، اللہ کی راہ میں نکلنے کے سلسلہ میں نہ ہی خوشحالی اور نہ ہی تنگ دستی ان کے لئے رکاوٹ بن سکی، اللہ تعالیٰ نے ان کے اس کردار کو اپنے اس قول میں محفوظ کردیا ہے: ﴿لَّقَد تَّابَ ٱللَّهُ عَلَى ٱلنَّبِيِّ وَٱلْمُهَٰجِرِينَ وَٱلْأَنصَارِ ٱلَّذِينَ ٱتَّبَعُوهُ فِي سَاعَةِ ٱلْعُسْرَةِ مِنۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيغُ قُلُوبُ فَرِيقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ۚ إِنَّهُۥ بِهِمْ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ﴾ ترجمہ: "اللہ نے معاف کردیا نبیؐ کو اور ان مہاجرین وانصار کو جنہوں نے بڑی تنگی کے وقت میں نبیؐ کا ساتھ دیا اگرچہ ان میں سے کچھ لوگوں کے دل کجی کی طرف مائل ہو چکے تھے (مگر جب انہوں نے اس کجی کا اتباع نہ کیا بلکہ نبیؐ کا ساتھ ہی دیا تو) اللہ نے انہیں معاف کردیا، بے شک اُس کا معاملہ اِن لوگوں کے ساتھ شفقت و مہربانی کا ہے"۔ (سورۃ التوبہ: 117)

اسی لئے اللہ کے رسول ﷺ نے انصار کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے کے بارے میں اور ان میں سے کسی سے کوئی غلطی سرزد ہونے والے کو معاف کرنے کی خاص وصیت فرمائی ہے اور ان کو ڈرانے اور خبردار کرنے کے بارے میں تنبیہ کی ہے، حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: "انصار میرے جسم وجاں اور خاص لوگ ہیں، جلد ہی دوسرے لوگ کثرت میں ہو جائیں گے اور انصار کی تعداد کم رہ جائے گی، اس لئے ان کے نیکوکاروں کی پذیرائی کیا کرنا اور ان کے خطاکار سے درگزر کیا کرنا"۔ (صحیح بُخاری: 3801، صحیح مسلم: 2510)

حضرت انسؓ ہی سے ایک اور روایت ہے فرماتے ہیں: اللہ کے رسول ﷺ باہر نکلے اور انصار سے آپؐ کی ملاقات ہوئی تو آپؐ نے ان سے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے! یقیناً میں تم سے محبت کرتا ہوں، بے شک انصار نے اپنی تمام ذمہ داریاں پوری کی ہیں اور اس کا جو بدلہ انہیں ملنا چاہیے تھا وہ ملنا ابھی باقی ہے، اس لئے تم لوگ بھی ان کے نیک لوگوں کی نیکیوں کی قدر کرنا اور ان کے خطاکاروں سے درگزر کرتے رہنا"۔ (مسند احمد: 3/187، السنن الکبریٰ للنسائی: 8270، ابن حبان: 7266-7271، مسند ابو یعلیٰ: 3770)

حضرت ابو قتادہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں: میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو ممبر پر انصار کے بارے میں فرماتے ہوئے سنا: جس کو انصار کے بارے میں ذمہ داری ملے تو اس کو چاہیئے کہ ان کے نیک لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کرے اور ان کے خطاکاروں سے درگزر کرے، اور جس نے ان کو خوفزدہ کیا اور ڈرایا اس نے اِس کو خوفزدہ کیا، آپ ﷺ نے اپنے آپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ بات ارشاد فرمائی۔ (دیکھیں: الھجرۃ النبوۃ المبارکہ، ص 151)

....

تیسرا باب

میثاقِ مدینہ

نبی کریم ﷺ نے اہلِ مدینہ کے مابین تعلقات کو منظم کیا اور اس سلسلہ میں ایک تحریر لکھی جس کو تاریخی مصادر نے نقل کیا ہے، اس معاہدہ کا مقصد یہ تھا کہ مدینہ میں رہنے والی تمام قوموں پر عائد ذمہ داریوں کو واضح کیا جائے، حقوق و فرائض کو متعین کیا جائے، قدیم مصادر میں اس تحریر کو "الکتاب" اور الصحیفہ" کہا گیا ہے جبکہ جدید تحقیقات اور کتابوں میں اس کو دستور کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری نے اپنی کتاب "السیرۃ النبویہ الصحیحہ" میں اس معاہدہ کے طرق اور سند پر تحقیقی بحث کی ہے، وہ رقمطراز ہیں:

"یہ مجموعی اعتبار سے احادیثِ صحیحہ کے مقام تک پہنچ جاتا ہے"۔ وہ مزید بیان کرتے ہیں کہ اس معاہدہ کے اسلوب سے اس کے اصل ہونے کا پتہ چلتا ہے، چنانچہ اس کے نصوص ایسے کلمات اور تعبیرات پر مشتمل ہیں جو دورِ نبوی میں مألوف اور مروج تھے اور پھر بعد میں ان کا استعمال کم ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ وہ اس دور کے بارے میں ناواقف لوگوں کے لئے مشکل ہوگئے، اس معاہدہ میں ایسی کوئی نص نہیں ہے جس کے ذریعہ کسی فرد یا جماعت کی تعریف یا تنقیص کی گئی ہو یا کسی مخصوص شخص کو اہمیت دی گئی ہو یا کسی کی مذمت کی گئی ہو، اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ معاہدہ اصلی ہے جو کسی قسم تزویر اور جھوٹ سے پاک ہے۔ (السیرۃ النبویہ الصحیحہ، العمری 1/275، تنظیمات الرسول ﷺ الاداریۃ فی المدینہ، صالح العلی، ص: 4-5)

اسی طرح اس معاہدہ کے اسلوب اور نبی کریم ﷺ کے خطوط کے اسلوب کے مابین کافی حد تک مشابہت پائی جاتی ہے جو اس کے اصلی ہونے کی ایک اور دلیل ہے۔

ا: مہاجرین وانصار اور یہود کے مابین معاہدہ

معاہدہ کی دفعات:

ا: یہ اللہ کے رسول اور نبی محمد ﷺ کی طرف سے ایک معاہدہ ہے جو مسلمانانِ قریش اور اہلِ یثرب اور ان لوگوں کے مابین ہے جو ان کے تابع ہوں اور ان کے ساتھ شامل ہوجائیں اور ان کے ہمراہ جنگ میں حصہ لیں۔

۲: مسلمان دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں ایک امت ہیں۔

۳: قریش سے ہجرت کر کے آنے والے اپنے قبیلہ کے (ذمہ دار) ہوں گے اور اپنے خون بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائیں گے تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

۴: اور بنی عوف اپنے قبیلہ کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خون بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گے تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

۵: اور بنی الحارث بن خزرج اپنے قبیلہ کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خون بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گے تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

٦: اور بنی ساعدہ اپنے قبیلہ کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خون بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گے تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

۷: اور بنی جشم اپنے قبیلہ کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خون بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گے تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

۸: اور بنی النجار اپنے قبیلہ کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خون بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گے تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

۹: اور بنی عمرو بن عوف اپنے قبیلہ کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خون بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گے تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

۱۰: اور بنی النبیت اپنے قبیلہ کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خون بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گے تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

۱۱: اور بنی الاوس اپنے قبیلہ کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خون بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گے تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

۱۲: اور ایمان والے کسی قرض کے بوجھ سے دبے ہوئے کو مدد دیئے بغیر نہیں چھوڑیں گے تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

۱۳: اور یہ کہ کوئی مومن کسی دوسرے مومن کے مولی سے خود معاہدہ برادری نہیں پیدا کرے گا۔

۱۴: اور متقی ایمان والوں کے ہاتھ ہر اس شخص کے خلاف اٹھیں گے جو ان میں سرکشی کرے یا استحصال بالجبر کرنا چاہے یا گناہ یا تعدی کا ارتکاب کرے یا ایمان والوں میں فساد پھیلانا چاہے اور ان کے ہاتھ سب مل کر ایسے شخص کے خلاف اٹھیں گے خواہ وہ ان میں سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

۱۵: اور کوئی ایمان والا کسی ایمان والے کو کسی کافر کے بدلے قتل نہ کرے گا اور نہ کسی فرد کی کسی ایمان والے کے خلاف مدد کرے گا۔

۱۶: اور خدا کا ذمہ ایک ہی ہے۔ ان کا ادنی ترین فرد بھی کسی کو پناہ دے کر سب پر پابندی عائد کر سکے گا اور ایمان والے دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں باہم بھائی بھائی ہیں۔

۱۷: اور یہ کہ یہودیوں میں سے جو ہماری اتباع کرے گا تو اسے مدد اور مساوات حاصل ہو گی، نہ ان پر ظلم کیا جائے اور نہ ان کے خلاف کسی کو مدد دی جائے گی۔

۱۸: اور ایمان والوں کی صلح ایک ہی ہو گی، اللہ کی راہ میں لڑائی ہو تو کوئی ایمان والا کسی دوسرے ایمان والے کو چھوڑ کر دشمن سے صلح نہیں کرے گا جب تک کہ یہ صلح ان سب کے لئے برابر اور یکساں نہ ہو۔

۱۹: اور ان تمام ٹکڑیوں کو جو ہمارے ہمراہ جنگ کریں باہم نوبت بہ نوبت چھٹی دلائی جائے گی۔

۲۰: اور ایمان والے باہم اس چیز کا انتقام لیں گے جو خدا کی راہ میں ان کی جان کو پہنچے۔

۲۱: اور بلاشبہ متقی ایمان والے سب سے اچھے اور سب سے سیدھے راستے پر ہیں۔

۲۲: اور یہ کہ کوئی مشرک قریش کی جان اور مال کو کوئی پناہ نہ دے گا اور نہ اس سلسلہ میں کسی مومن کے آڑے آئے گا۔

۲۳: اور جو شخص کسی مومن کو عمداً قتل کرے اور ثبوت پیش ہو تو اس سے قصاص لیا جائے گا بجز اس کے کہ مقتول کا ولی خون بہا پر راضی ہو جائے اور تمام ایمان والے اس کی تعمیل کے لیے اٹھیں گے اور اس کے سوائے انہیں کوئی اور چیز جائز نہ ہو گی۔

۲۴: اور کسی ایسے ایمان والے کے لیے جو اس دستور العمل کے مندرجات کا اقرار کر چکا اور خدا اور یوم آخرت پر ایمان لا چکا ہو، یہ بات جائز نہ ہو گی کہ کسی قاتل کو مدد یا پناہ دے، اور جو اسے مدد یا پناہ دے گا تو قیامت کے دن اس پر خدا کی لعنت اور غضب نازل ہوں گے اور اس سے کوئی رقم یا معاوضہ قبول نہ ہو گا۔

۲۵: اور یہ کہ جب کبھی تم میں کسی چیز کے متعلق اختلاف ہو تو اسے خدا اور محمد ﷺ سے رجوع کیا جائے گا۔

۲۶: اور یہودی اس وقت تک مومنین کے ساتھ اخراجات برداشت کرتے رہیں گے جب تک وہ مل کر جنگ کرتے رہیں۔

۲۷: اور بنی عوف کے یہودی، مؤمنین کے ساتھ، ایک سیاسی وحدت تسلیم کیے جاتے ہیں، یہودیوں کے لئے ان کا دین اور مسلمانوں کے لئے ان کا دین ہو گا، وہ ان کے موالی ہوں گے، ہاں جو ظلم یا عہد شکنی کا ارتکاب کرے تو اس کی ذات یا گھرانے کے سوا کوئی مصیبت میں نہیں پڑے گا۔

۲۸: اور بنی النجار کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

۲۹: اور بنی الحارث کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

۳۰: اور بنی ساعدہ کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

۳۱: اور بنی جُشَم کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

۳۲: اور بنی الاوس کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

۳۳: اور بنی ثعلبہ کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو، ہاں جو ظلم یا عہد شکنی کا ارتکاب کرے تو خود اس کی ذات یا گھرانے کے سوائے کوئی مصیبت میں نہیں پڑے گا۔

۳۴: اور جفنہ جو ثعلبہ کی ایک شاخ ہے، اس بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اصل کو۔

۳۴: اور بنی الشطیبہ کو بھی وہی حقوق ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔ اور وفاشعاری ہو نہ کہ عہد شکنی۔

۳۵: اور ثعلبہ کے موالی کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اصل کو۔

۳۶: اور یہودیوں کی ذیلی شاخوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اصل کو۔

۳۷: اور یہ کہ ان میں کوئی بھی محمد ﷺ کی اجازت کے بغیر نہیں نکلے گا۔

۳۸: اور یہودی خود اپنے مصارف برداشت کریں گے اور مسلمان خود اپنے مصارف کے ذمہ دار ہوں گے۔

۳۹: اور جو کوئی اس دستور والوں سے جنگ کرے تو ان میں باہم امداد عمل میں آئے گی، اور ان میں باہم مشاورت اور بہی خواہی ہوگی اور وفا شعاری ہوگی، نہ کہ عہد شکنی۔

۴۰: اور یہودی اس وقت تک مومنین کے ساتھ اخراجات برداشت کرتے رہیں گے جب تک وہ مل کر جنگ کرتے رہیں۔

۴۱: اور یثرب کا جوف (یعنی میدان جو پہاڑوں سے گھرا ہوا ہو) اس دستور والوں کے لیے ایک حرم ہوگا۔

۴۲: پناہ گزیں سے وہی برتاؤ ہو گا جو اصل کے ساتھ، نہ اس کو ضرر پہنچایا جائے اور نہ خود وہ عہد شکنی کرے گا۔

۴۳: اور کسی پناہ گاہ میں وہاں والوں کی اجازت کے بغیر کسی کو پناہ نہیں دی جائے گی۔

۴۴: اور یہ کہ اس دستور والوں میں جو کوئی قتل یا جھگڑا رونما ہو جس سے فساد کا اندیشہ ہو تو اس کے بارے میں اللہ اور اس کے رسول محمد ﷺ کے حکم کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا، اور اللہ اس شخص کے ساتھ ہے جو اس دستور کے مندرجات کی زیادہ سے زیادہ احتیاط اور زیادہ سے زیادہ وفاشعاری کے ساتھ تعمیل کرے۔

۴۵: اور قریش کو کوئی پناہ نہیں دی جائے گی اور نہ اس کو جو انہیں مدد دے۔

۴۶: اور ان (یہودیوں اور مسلمانوں) میں باہم نصرت و مدد ہو گی اگر کوئی یثرب پر حملہ آور ہو جائے۔

۴۷: اور اگر ان میں کو کسی صلح میں مدعو کیا جائے تو وہ بھی صلح کریں گے اور اس میں شریک رہیں گے اور اگر وہ کسی ایسے ہی معاملہ کے لئے بلائیں تو مومنین کی بھی ذمہ داری ہو گی کہ اس کے ساتھ ایسا ہی کریں بجز اس کے کہ کوئی دینی جنگ کرے، ہر گروہ کے حصہ میں اسی جہت کی (مدافعت) آئے گی جو اس کے بالمقابل ہو۔

۴۸: اور اُوس کے یہودیوں کو، موالی ہوں یا اصل، وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اس دستور والوں کو، اور وہ بھی اس دستور والوں کے ساتھ خالص وفاشعاری کا برتاؤ کریں گے، اور وفاشعاری ہو گی نہ عہد شکنی، جو جیسا کرے گا ویسا خود ہی بھرے گا، اور خدا اس کے اس شخص کے ساتھ ہے جو اس دستور کے مندرجات کی زیادہ سے زیادہ احتیاط اور زیادہ سے زیادہ وفاشعاری کے ساتھ تعمیل کرے۔

۴۹: اور یہ کہ یہ معاہدہ کسی ظالم یا عہد شکن کے آڑے نہ آئے گا، اور جو جنگ کو نکلے تو بھی امن کا مستحق ہو گا اور جو مدینہ میں بیٹھا رہے تو بھی امن کا مستحق ہو گا، اور نہ ظلم ہو گا اور نہ عہد شکنی ہو گی، اور اللہ اس کا نگہبان ہے جو وفاشعاری اور احتیاط کرے اور اللہ کے رسول محمد ﷺ بھی۔ (دیکھیں: التاریخ السیاسی والعسکری، د۔ علی معطی، ص: 169)

۲: میثاقِ مدینہ سے مستفاد دروس واسباق اور فوائد:

1: اُمت کے مفہوم کی تعیین:

یہ دستور ایسے عمومی اصول و قوانین پر مشتمل ہے جن کی بنیاد پر موجودہ حکومتوں نے اپنے دستور و قوانین وضع کئے ہیں، ان دفعات میں پہلی دفعہ امت کے مفہوم کی تعیین ہے، اس میثاق کے مطابق امت میں تمام مسلمان شامل ہیں، چاہے وہ مہاجرین و انصار ہوں یا ان کے ساتھ شامل ہونے والے اور ان کے ہمراہ جنگ میں حصہ لینے والے ہوں، سب کے سب مسلمان تمام لوگوں کے مقابلہ میں ایک امت ہیں۔

یہ جزیرۃ العرب کی سیاسی تاریخ میں ایک بالکل ہی نئی چیز تھی، اس لئے کہ رسول ﷺ نے اس قوم کو قبائلی اور خاندانی شعار کے بجائے ایک امت کے شعار میں تبدیل کر دیا جس میں ہر وہ شخص شامل ہوگا جو بھی اس دینِ جدید میں داخل ہوگا، ان سب کو اس دستور میں امت واحدہ قرار دیا گیا ہے، قرآنِ کریم نے بھی تمام اہلِ ایمان کو امت کی لڑی میں پرو دیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ هَٰذِهِۦٓ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَٰحِدَةً وَأَنَا۠ رَبُّكُمْ فَٱعْبُدُونِ﴾ ترجمہ: ”یہ تمہاری امّت حقیقت میں ایک ہی امّت ہے اور میں تمہارا رب ہوں، پس تم میری عبادت کرو“۔(سورۃ الأنبیاء: 92)

اس امت کی وسطیت کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ﴿وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَٰكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا۟ شُهَدَآءَ عَلَى ٱلنَّاسِ وَيَكُونَ ٱلرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا﴾ ترجمہ:”اوراسی طرح تو ہم نے تمہیں ایک "امت وسط" بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو“(سورۃ البقرہ:110)

اللہ تعالیٰ نے یہ واضح کر دیا ہے کہ یہ ایک ایجابی امت ہے جو وقت کے حالات سے بے پرواہ اور غافل ہو کر زندگی نہیں گزارتی ہے بلکہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتی ہے، وہ فضائل اور اچھے کاموں کی دعوت دیتی ہے اور رذائل اور برائیوں سے ڈرانے کا کام کرتی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِٱلْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ ٱلْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِٱللَّهِ ۗ وَلَوْ ءَامَنَ أَهْلُ ٱلْكِتَٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُم ۚ مِّنْهُمُ ٱلْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ ٱلْفَٰسِقُونَ﴾ ترجمہ: ”اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت واصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو، یہ اہلِ کتاب ایمان لاتے تو انہی کے حق میں بہتر تھا اگرچہ ان میں کچھ لوگ ایمان دار بھی پائے جاتے ہیں مگر ان کے بیشتر افراد نافرمان ہیں“۔ (سورۃ آل عمران:110)

اہلِ ایمان اور تمام مسلمانوں کے لئے متعین کردہ اسی نظام کے تحت تمام مسلمان مختلف قبائل سے تعلق رکھنے کے باوجود اس جماعت میں ضم ہوتے چلے گئے جن کو اسلامی رابطہ آپس میں مربوط کرنے کا کام کرتا تھا، وہ ایک دوسرے کی کفالت کرتے تھے، ظالم کے مقابلہ میں مظلوم کی نصرت و مدد کرتے تھے، قرابت و محبت اور پڑوسی کے حقوق کی رعایت کرتے تھے، اولین مرحلہ میں اَوس و خزرج دونوں قبائل انصار کی صف میں شامل ہوگئے اور پھر انصار و مہاجرین مسلم جماعت میں ضم ہوگئے اور سب کے سب ایک امت بن گئے، جس

کے افراد عقیدۃ کے رابطہ میں مربوط تھے اور خونی وخاندانی رابطہ کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہی،ان کے شعور میں،ان کے افکار میں،ان کے قبلہ میں،ان کے رخ میں اوران کے اخلاص وللہیت میں اور شریعت کے مطابق فیصلے کرنے میں اتحاد واتفاق تھا،وہ تمام لوگوں کے مقابلہ میں اسی کے ذریعہ ممتاز ونمایاں تھے،یہ رابطہ مسلمانوں کے ساتھ خاص تھااوراس میں یہود اور دیگر حلفاء شامل نہیں تھے،بلاشبہ اس دینی جماعت کو ممتاز کرنا ایک امرِ مطلوب تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ اس کے اندر مزید استحکام پیدا ہو اور اس کو اپنی ذات پر فخر ہو،خانہ کعبہ کی طرف رخ کرنے اور قبلہ تبدیل کرنے کے ذریعہ بھی اس کو یہی امتیازی شان عطا کی گئی،سولہ (۱۶) یا سترہ(۱۷) ماہ تک بیت المقدس کی جانب رخ کرنے کے بعد اس امت کے لئے خانہ کعبہ کو قبلہ متعین کیا گیا۔ (دیکھیں: دستور للأمۃ،د۔ عبدالناصر العطار،ص: 9 التاریخ السیاسی والحضاری، د۔ السید عبدالعزیز سالم،ص100،قیادۃ الرسول ﷺ السیاسیۃ والعسکریۃ، أحمد راتب،ص93،السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ 1/293)

نبی کریم ﷺ اپنے پیروکاروں کو دوسروں کے مقابلہ میں بہت سے امور کے ذریعہ ممتاز ونمایاں کرتے رہے اور یہ واضح کرتے رہے کہ اس کے ذریعہ آپؐ کا مقصد یہود کی مخالفت کرنا ہے، جیسے کہ یہود "خف" (چمڑے کے موزوں) میں نماز نہیں پڑھتے تھے تو آپ ﷺ نے اپنے اصحاب کو "خف" میں نماز پڑھنے کی اجازت دی۔یہود سفید بالوں پر مہندی نہیں لگاتے تھے تو مسلمان اپنے بالوں کو مہندی اور دیگر چیزوں کا خضاب لگانے لگے۔یہود عاشورہ (دس محرم) کا روزہ رکھتے تھے اور نبی کریم ﷺ بھی دس محرم کا روزہ رکھتے تھے، لیکن آپؐ نے آخری عمر میں یہ ارادہ فرمایا تھا کہ دسویں کے ساتھ ساتھ نویں محرم کا روزہ بھی رکھیں گے تاکہ یہود کی مخالفت ہو سکے۔

اس کے بعد آپ ﷺ نے غیروں کی مخالفت کرنے اور ان کے مقابلہ میں ممتاز ونمایاں رہنے کا بنیادی اصول متعین کیا اور فرمایا:

"جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی وہ انہی میں سے ہے"۔ (مسند أحمد: 1/165، سنن نسائی: 8/137، مسند ابو یعلی: 681)

اس سلسلہ کی احادیث کثرت سے موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان دوسروں کے مقابلہ میں ایک ممتاز اور نمایاں مقام رکھتے ہیں،اس میں کوئی شک نہیں کہ دوسروں کی مشابہت اختیار کرنا اور ان کی نقل کرنا عزتِ نفس اور خودداری کے منافی ہے، لیکن یہ امتیاز اور مقامِ بلند مسلمانوں اور دوسروں میں کسی طرح کی رکاوٹ نہیں بنتا ہے،اس لئے کہ اسلامی جماعت کا دروازہ ہر ایک کے لئے کھلا ہوا ہے اور اس میں توسیع کی کافی گنجائش ہے اور جو بھی اس کے عقیدہ کو قبول کرے وہ اس میں شامل ہو سکتا ہے۔(دیکھیں: السیرۃ النبویہ الصحیحۃ: 1/293)

اس معاہدہ میں یہود کو اسلامی ریاست کا ایک جزء اور ایک اہم عنصر قرار دیا گیا،اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام نے اسلامی ریاست میں رہنے والے اہلِ کتاب کو ہم وطن قرار دیا ہے اور وہ اہل ایمان کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑے ہیں جب تک کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو نبھاتے رہیں،لہٰذا اس دستور کے مطابق دین کا اختلاف شہریت سے محرومی کا سبب نہیں ہو سکتا ہے۔ (دیکھیں: نظام الحکم، ظافر القاسمی: 1/37)

2: اللہ اور اس کے رسول ﷺ اصل مرجع کی حیثیت سے:

اس میثاق نے مدینہ کے تمام امور میں اصل مرجع اللہ اور اس کے رسول کو قرار دیا،اس میثاق میں تمام اختلافی امور کے بارے میں واضح کر دیا گیا ہے کہ "جس چیز میں بھی اختلاف ہوگا اس میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف رجوع کیا جائے گا،اس میثاق کے بموجب ایک ہی دینی قیادت ہوگی جو مدینہ کو کنٹرول کرے گی اور ہر قسم کے اختلافات میں فیصلہ کرے گی تاکہ ہر طرح کے داخلی انتشار کو فرو کیا جا سکے،

ساتھ ہی اس میں ضمناً اُس کی بھی تاکید کر دی گئی ہے کہ ریاست میں رسول ﷺ کی قیادت وسیادت قائم ہو گی، اس میثاق نے قیادت کے تشریعی، قضائی اور تنفیذی تینوں سرچشموں کی تعیین کر دی، اللہ کے رسول ﷺ جدید ریاست کے ذریعہ یہ چاہتے تھے کہ یہاں اللہ کے اوامر واحکام کا نفاذ ہو، اس لئے کہ امت پر اللہ کی حاکمیت کا نفاذ خالص اللہ کی عبودیت وبندگی ہے، اسی کے ذریعہ توحید قائم ہو گی اور اسی کے ذریعہ دین قائم ہوگا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنِ ٱلْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوٓا۟ إِلَّآ إِيَّاهُ ذَٰلِكَ ٱلدِّينُ ٱلْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ ٱلنَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ﴾ ترجمہ: ''فرماں روائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لئے نہیں ہے، اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو یہی ٹھیٹھ سیدھا طریق زندگی ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں''۔(سورۃ یوسف: 40)

قرآن کریم اللہ کی حاکمیت اور عبودیت کو ثابت کرنے کے لئے نازل ہوا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلْكِتَٰبَ بِٱلْحَقِّ فَٱعْبُدِ ٱللَّهَ مُخْلِصًا لَّهُ ٱلدِّينَ ۝ أَلَا لِلَّهِ ٱلدِّينُ ٱلْخَالِصُ وَٱلَّذِينَ ٱتَّخَذُوا۟ مِن دُونِهِۦٓ أَوْلِيَآءَ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَآ إِلَى ٱللَّهِ زُلْفَىٰٓ إِنَّ ٱللَّهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِى مَا هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يَهْدِى مَنْ هُوَ كَٰذِبٌ كَفَّارٌ﴾ ترجمہ: (اے محمدؐ) یہ کتاب ہم نے تمہاری طرف برحق نازل کی ہے، لہٰذا تم اللہ ہی کی بندگی کرو، دین کو اُسی کے لئے خالص کرتے ہوئے، خبردار! دین خالص اللہ کا حق ہے، رہے وہ لوگ جنہوں نے اُس کے سوا دوسرے سرپرست بنا رکھے ہیں (اور اپنے اِس فعل کی توجیہ یہ کرتے ہیں کہ) ہم تو اُن کی عبادت صرف اس لئے کرتے ہیں کہ وہ اللہ تک ہماری رسائی کرا دیں، اللہ یقیناً اُن کے درمیان اُن تمام باتوں کا فیصلہ کر دے گا جن میں وہ اختلاف کر رہے ہیں، اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو جھوٹا اور منکر حق ہو''۔ (سورۃ الزمر: 2-3)

دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلْكِتَٰبَ بِٱلْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ ٱلنَّاسِ بِمَآ أَرَىٰكَ ٱللَّهُ وَلَا تَكُن لِّلْخَآئِنِينَ خَصِيمًا﴾ ترجمہ: ''اے نبیؐ! ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ جو راہ راست اللہ نے تمہیں دکھائی ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو، تم بد دیانت لوگوں کی طرف سے جھگڑنے والے نہ بنو''۔(سورۃ النساء: 105)

لہذا جس طرح عبودیت کو ثابت کرنا قرآن کے نزول کا مقصد ہے اسی طرح حاکمیت کا نفاذ بھی نزولِ قرآن کا مقصد ہے، اسی طرح جیسے وحیِ منزّل کی روشنی میں ہی عبادت کی جاسکتی ہے اسی طرح یہ بھی مناسب نہیں ہے کہ شریعتِ منزّلہ کے بغیر ہی کسی چیز کا فیصلہ کیا جائے۔(الحکم والتحاکم فی کتاب الوحی: 1/433)

حاکمیت کے نفاذ کے نتیجہ میں ہی عبودیت متحقق ہو سکتی ہے اور وہ مقصد پورا ہو سکتا ہے جس کی وجہ سے جن وانس کی تخلیق ہوئی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَا خَلَقْتُ ٱلْجِنَّ وَٱلْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ ترجمہ: ''میں نے جن اور انسانوں کو اِس کے سوا کسی کام کے لئے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں''۔(سورۃ الذاریات: 56)

اس میثاق کے مطابق یہود نے ایک سپریم عدالتی اتھارٹی کے وجود کا اعتراف کیا جس کی جانب تمام اہلِ مدینہ رجوع کرتے تھے، لیکن یہود نے کبھی بھی اسلامی فیصلوں کو نہیں مانا سوائے اس کے جبکہ ان کے مابین اور مسلمانوں کے مابین کوئی اختلاف ہو جاتا، جہاں تک ان کے

مخصوص مسائل کا تعلق ہے تو وہ تورات کے مطابق فیصلہ کرتے تھے اور اُن کے رِبّی اور علماء ان کے مابین فیصلہ کرتے تھے، لیکن اگر وہ چاہتے تو وہ نبی کریم ﷺ کو بھی حکم بنا سکتے تھے، قرآن کریم نے نبی کریم ﷺ کو اس کا اختیار دیا تھا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿سَمَّٰعُونَ لِلۡكَذِبِ أَكَّٰلُونَ لِلسُّحۡتِۚ فَإِن جَآءُوكَ فَٱحۡكُم بَيۡنَهُمۡ أَوۡ أَعۡرِضۡ عَنۡهُمۡۖ وَإِن تُعۡرِضۡ عَنۡهُمۡ فَلَن يَضُرُّوكَ شَيۡـٔٗاۖ وَإِنۡ حَكَمۡتَ فَٱحۡكُم بَيۡنَهُم بِٱلۡقِسۡطِۚ إِنَّ ٱللَّهَ يُحِبُّ ٱلۡمُقۡسِطِينَ﴾ ترجمہ: ”یہ جھوٹ سننے والے اور حرام مال کھانے والے ہیں، لہٰذا اگر یہ تمہارے پاس (اپنے مقدمات لے کر) آئیں تو تمہیں اختیار دیا جاتا ہے کہ چاہو ان کا فیصلہ کرو، ورنہ انکار کر دو، اگر تم ان سے اعراض کرو گے تو یہ تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے، اور فیصلہ کرو تو پھر ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ کرو کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے“۔ (سورۃ المائدہ: 42)

اس دستور کے ذریعہ رسول ﷺ کو مرکزی عدالتی اتھارٹی حاصل ہوگئی جس کی جانب سب کے لئے رجوع کرنا لازمی تھا، اسی طرح آپ ﷺ کو تنفیذی قوت بھی حاصل تھی، اس لئے کہ اللہ کے احکام و اوامر واجب الاطاعت اور واجب التنفیذ ہیں اور رسول ﷺ کے اوامر اللہ کی طرف سے ہیں جن کی اطاعت واجب ہے۔

اسی طرح رسول ﷺ ریاست کے سربراہ بن گئے، ساتھ ہی ساتھ آپ ﷺ عدالتی، تنفیذی اور تشریعی امور کے بھی سربراہ تھے، رسول ﷺ ان شعبوں کے ذمہ دار بحیثیتِ رسول تھے، رسول ﷺ نے میثاقِ مدینہ کی دفعات کے مطابق اور مدینہ میں موجود مختلف گروہوں کے اتفاق سے ریاست کی سربراہی سنبھالی، اس دستور میں رسول ﷺ کے نام کے علاوہ کسی بھی شخص کا نام نہیں آیا ہے۔ (دیکھیں: دولۃ الرسول ﷺ من التکوین الی التمکین، ص: 418)

3: ریاست کا جغرافیہ اور حدودِ اربعہ:

میثاقِ مدینہ میں مذکور ہے: ”بے شک یثرب کا اندرون اس میثاق والوں کے لئے حرم ہے“۔ حرم ہونے کا حکم یہ ہے کہ نہ وہاں کے درختوں کو کاٹا جائے اور نہ ہی وہاں کے پرندوں کو مارا جائے، لہٰذا اگر درختوں اور پرندوں کا یہ حکم ہے تو پھر جان اور مال کو نقصان پہنچانا کیسے جائز ہو سکتا ہے؟! اس دستور نے ریاست کے نشانِ راہ متعین کئے: امتِ واحدہ، ریاستِ مدینہ، ایک فیصلہ کن قوت جس کی جانب سب کے لئے رجوع کرنا ضروری ہے اور وہ اللہ کی نازل کردہ شریعت کے مطابق فیصلہ کرے گی۔

بلاشبہ مدینہ منورہ اسلامی حکومت کا نقطہ آغاز اور ایک ایسا مرکز تھا جہاں سے ریاست روز افزوں وسعت اختیار کر رہی تھی، اور ہر قسم کے اضطرابات اور انتشار کے مقابلہ میں یہ ڈھال کا کام کر رہی تھی تاکہ ہر طرف امن و آشتی اور سلامتی عام ہو۔

نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام کی ایک ٹیم کو بھیجا تاکہ وہ ہر سمت سے حرمِ مدینہ کی حدود پر نشانِ راہ متعین کر دیں، مدینہ کے حدود اربعہ یہ تھے: مشرق و مغرب میں مدینہ کی پتھریلی زمین کا درمیانی علاقہ، شمال میں جبلِ ثور سے لے کر جنوب میں جبل عیر تک۔ [اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے کہ: مدینہ منورہ جبل عیر سے جبل ثور تک حرم ہے جو شخص ان حدود کے اندر غلط کام کرے یا غلط کار کو پناہ دے اس پر اللہ کی، فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے اور اللہ اس کی کوئی نفلی یا فرض عبادت قبول نہیں کرے گا۔ (صحیح مسلم: 1370، صحیح بخاری: 6755)]

اس کے بعد فتوحات کی وسعت کے ساتھ ساتھ اور مفتوحہ علاقوں کی اقوام کے حلقہ بگوش اسلام ہونے کے ساتھ ساتھ یہ ریاست وسیع تر ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ بری، بحری اور فضائی اعتبار سے اس کی حدود میں وسیع رقبہ داخل ہو گیا، مغرب میں بحر اٹلانٹک جنوبی اور مغربی یورپ کے وسیع علاقے، مغربی اور جنوبی ایشیا کے دور دراز علاقے، مشرق میں چین اور روس کے علاقے اور شمالی اور وسطی افریقہ کے تمام علاقے اس ریاست کی حدود میں داخل ہو گئے۔

بے شک اس ریاست کا علاقہ ہر ایک کے لئے کھلا ہوا تھا، جس میں جغرافیائی یا سیاسی کسی طرح کی حد بندی نہیں تھی، اس کا آغاز اس ریاست کے دار السلطنت مدینہ سے ہوتا تھا اور وسیع ہوتے ہوتے پوری روئے زمین اس میں شامل تھی۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ ٱسْتَعِينُوا۟ بِٱللَّهِ وَٱصْبِرُوٓا۟ ۖ إِنَّ ٱلْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَن يَشَآءُ مِنْ عِبَادِهِۦ ۖ وَٱلْعَـٰقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ﴾ ترجمہ: ''موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا: اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو، زمین اللہ کی ہے، اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے، اور آخری کامیابی انہی کے لئے ہے جو اس سے ڈرتے ہوئے کام کریں''۔(سورۃ الاعراف:128)

اسی طرح امت کا مفہوم بھی عام ہے جس سے کوئی بھی گروہ خارج نہیں ہو سکتا ہے، بلکہ یہ اتنا وسیع لفظ ہے کہ اس میں پوری انسانیت شامل ہو سکتی ہے، بشرطیکہ وہ اللہ کے دین کو قبول کرلے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کے لئے اور تمام بنی نوع انسانی کے لئے متعین اور پسند کیا ہے، لہذا اسلامی ریاست ایک عالمی پیغام کی حامل ریاست ہے، روئے زمین کا ہر فرد اس میں شریک و سہیم ہے اور دعوت وجہاد کے ذریعہ اس ریاست میں توسیع ہوتی رہتی ہے۔ (دیکھیں: دولۃ الرسول ﷺ من التکوین الی التمکین، ص 411، 421)

<u>4: آزادی اور انسانی حقوق:</u>

میثاقِ مدینہ کی دفعات سے رسول ﷺ کی عبقریت نمایاں طور پر واضح ہوتی ہے کہ کس طرح آپؐ نے اس کی دفعات کے مواد کو ترتیب دیا اور تمام قوموں کے تعلقات کو بھی متعین کیا، اس کا مواد ایک دوسرے سے مربوط اور جامع ومانع تھا اور اس وقت مدینہ کی صورتحال اور حالات کے اعتبار سے انتہائی موزوں اور مناسب تھا، اس میں ایسے اصول وضوابط درج تھے جو تمام انسانوں کے مابین مساوات اور عدل و انصاف کے ضامن تھے اور رنگ، نسل، دین اور زبان کے اختلاف کے باوجود تمام انسانوں کو ہر قسم کی آزادی اور حقوق مہیا ہوتے تھے، استاد محمد سلیم العوّا فرماتے ہیں: ''یہ دستور جن اصول وضوابط پر مشتمل تھا اب تک مسلسل ان اصول وضوابط کے مطابق عمل جاری ہے اور آج تک مختلف معروف، نظامہائے حکومت میں وہ زیادہ تر رائج اور نافذ العمل ہیں...... لوگ اُن اصول وضوابط تک صدیوں بعد پہنچے حالانکہ ان کو رسول ﷺ نے اولین سیاسی دستاویز میں مدوّن فرمایا تھا۔(النظام السیاسی فی الاسلام، اَبو فارس، ص، 65)

صحیفہ میں واضح طور پر یہ درج تھا کہ ہر قسم کی آزادی کی حفاظت کی جائے گی، جیسے کہ عقیدہ کی آزادی، عبادت کی آزادی، امن کی آزادی.... لہٰذا دینی ومذہبی آزادی بھی محفوظ تھی: "مسلمانوں کے لئے ان کا دین اور یہود کے لئے ان کا دین"۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لَآ إِكْرَاهَ فِى ٱلدِّينِ ۖ قَد تَّبَيَّنَ ٱلرُّشْدُ مِنَ ٱلْغَىِّ ۚ فَمَن يَكْفُرْ بِٱلطَّـٰغُوتِ وَيُؤْمِنۢ بِٱللَّهِ فَقَدِ ٱسْتَمْسَكَ بِٱلْعُرْوَةِ ٱلْوُثْقَىٰ

لَا ٱنفِصَامَ لَهَاۗ وَٱللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾ ترجمہ: ”دین کے معاملہ میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے، صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے، اب جو کوئی طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آیا، اُس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا، جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں، اور اللہ (جس کا سہارا اس نے لیا ہے) سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے“۔ (سورۃ البقرہ:256)

اس صحیفہ میں اس اصول کی خلاف ورزی کرنے والوں یا اس کو توڑنے والوں کے خلاف کارروائی اور سزا کی بات کہی گئی تھی۔

اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کے مابین عدل وانصاف قائم کرے اور ہر انسان کو اپنا حق حاصل کرنے کی ہر ممکن سہولت مہیا کرے اور اس کو بغیر تاخیر کے اپنا حق حاصل کرنے کا راستہ دے، اس کو اپنا حق حاصل کرنے میں کسی طرح کی مالی یا جانی مشقت برداشت نہ کرنی پڑے، اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر اس ذریعہ اور وسیلہ پر قدغن لگائے جو صاحبِ حق کے لئے اپنا حق حاصل کرنے میں رکاوٹ بنتا ہو۔ (دیکھیں: النظام السیاسی فی الاسلام، اُبو فارس، ص: 58)

اسلام نے حکام پر ضروری قرار دیا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان عدل قائم کریں اور اس سلسلہ میں زبان، قوم، وطن اور معاشرتی حالات کی وجہ سے ان کے مابین کوئی امتیاز نہ کریں، اسلام فریقین کے مابین عدل کرنے کا ضامن ہے اور فیصلہ ہر حال میں حق کے مطابق کرنا ہے، فریقین میں سے چاہے کوئی دوست ہو یا دشمن، مالدار ہو یا فقیر، مزدور اور کام کرنے والا ہو یا مالک، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ كُونُواْ قَوَّٰمِينَ لِلَّهِ شُهَدَآءَ بِٱلْقِسْطِۖ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَـَٔانُ قَوْمٍ عَلَىٰٓ أَلَّا تَعْدِلُواْۚ ٱعْدِلُواْ هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰۖ وَٱتَّقُواْ ٱللَّهَۚ إِنَّ ٱللَّهَ خَبِيرٌۢ بِمَا تَعْمَلُونَ﴾ ترجمہ: ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو، کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کردے کہ انصاف سے پھر جاؤ، عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے، اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُس سے پوری طرح باخبر ہے“۔ (سورۃ المائدہ:8)

استاذ ابو الاعلیٰ مودودیؒ سورۃ الشوریٰ: آیت نمبر: 15 کی تفسیر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں، آیت کریمہ کے الفاظ یہ ہیں: ﴿فَلِذَٰلِكَ فَٱدْعُۖ وَٱسْتَقِمْ كَمَآ أُمِرْتَۖ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَآءَهُمْۖ وَقُلْ ءَامَنتُ بِمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ مِن كِتَـٰبٍۖ وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُۖ ٱللَّهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْۖ لَنَآ أَعْمَـٰلُنَا وَلَكُمْ أَعْمَـٰلُكُمْۖ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُۖ ٱللَّهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَاۖ وَإِلَيْهِ ٱلْمَصِيرُ﴾ ترجمہ: ”چونکہ یہ حالت پیدا ہو چکی ہے اس لئے اے محمدؐ، اب تم اُسی دین کی طرف دعوت دو، اور جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے اُس پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جاؤ، اور اِن لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو، اور اِن سے کہہ دو کہ اللہ نے جو کتاب بھی نازل کی ہے میں اُس پر ایمان لایا، مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں، اللہ ہی ہمارا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی، ہمارے اعمال ہمارے لئے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لئے، ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی حجت نہیں، اللہ ایک روز ہم سب کو جمع کرے گا اور اُسی کی طرف سب کو جانا ہے“۔ (سورۃ الشوریٰ: 15)

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے مولانا مودودیؒ رقمطراز ہیں: ''میں ان ساری گروہ بندیوں سے الگ رہ کر بے لاگ انصاف پسندی اختیار کرنے پر مامور ہوں، میرا کام یہ نہیں ہے کہ کسی گروہ کے حق میں اور کسی کے خلاف تعصب برتوں، میرا سب انسانوں سے یکساں تعلق ہے اور وہ ہے سراسر عدل وانصاف کا تعلق، جس کی جو بات حق ہے میں اس کا ساتھی ہوں، خواہ وہ غیروں کا غیر ہی کیوں نہ ہو اور جس کی جو بات حق کے خلاف ہے میں اس کا مخالف ہوں، خواہ وہ میرے قریب ترین رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو، میں جس حق کو تمہارے سامنے پیش کرنے پر مامور ہوں اس میں کسی کے لئے بھی کوئی امتیاز نہیں ہے، بلکہ وہ سب کے لئے یکساں ہے، اس میں اپنے اور غیر، بڑے اور چھوٹے، غریب اور امیر، شریف اور کمینہ کے لئے الگ الگ حقوق نہیں ہیں، بلکہ جو کچھ ہے وہ سب کے لئے حق ہے، جو گناہ ہے وہ سب کے لئے گناہ ہے، جو حرام ہے وہ سب کے لئے حرام ہے، اور جو جرم ہے وہ سب کے لئے جرم ہے، اس بے لاگ ضابطے میں میری اپنی ذات کے لئے بھی کوئی استثناء نہیں''۔ (الحکومۃ الاسلامیہ، ص202)

بلاشبہ مسلم معاشرہ کی تربیت اور انسانی قیادت کے لئے اس کو تیار کرنے کے منہج میں عدل کی مشروعیت اور فرد و جماعت اور اقوام و شعوب میں اس کو قائم کرنے کا مکمل اہتمام کیا گیا ہے، اس لئے کہ تمام انسانوں کے مابین عدل کا قیام باتوفیق قیادت کے لئے بنیادی ستون کی رکھتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ كُونُواْ قَوَّٰمِينَ بِٱلۡقِسۡطِ شُهَدَآءَ لِلَّهِ وَلَوۡ عَلَىٰٓ أَنفُسِكُمۡ أَوِ ٱلۡوَٰلِدَيۡنِ وَٱلۡأَقۡرَبِينَۚ إِن يَكُنۡ غَنِيًّا أَوۡ فَقِيرٗا فَٱللَّهُ أَوۡلَىٰ بِهِمَاۖ فَلَا تَتَّبِعُواْ ٱلۡهَوَىٰٓ أَن تَعۡدِلُواْۚ وَإِن تَلۡوُۥٓاْ أَوۡ تُعۡرِضُواْ فَإِنَّ ٱللَّهَ كَانَ بِمَا تَعۡمَلُونَ خَبِيرٗا﴾ ترجمہ: ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، انصاف کے علمبردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو، اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو، فریق معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب، اللہ تم سے زیادہ اُن کا خیر خواہ ہے، لہٰذا اپنی خواہشِ نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے''۔(سورۃ النساء:135)

یہ قرآن پاک کی صریح نص ہے جس میں مسلم قیادت کو مکمل طور پر عدل قائم کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔

بے شک قرآن کریم-جو مسلم معاشرہ کے لئے دستورِ حیات ہے- ایسا اسلوب اختیار کرتا ہے جس میں وہ عدل کا حکم دیتے ہوئے عملی زندگی سے کنارہ کشی اختیار نہیں کرتا ہے بلکہ وہ انسانی ضمیر کی تہہ میں اتر کر بات کرتا ہے اور اس بات کو ناپسند کرتا ہے کہ عدل قائم کرتے ہوئے ایسے جذبہ سے متاثر ہوا جائے جہاں مالدار کی مالداری کا لحاظ کیا جائے، یا فقیر پر اس کے فقر کی وجہ سے رحم کیا جائے، اور عدل وانصاف کی اسے ہوا تک نہ لگ پائے اور ظلم وجور پر کسی کے غنی یا فقر کی چادر ڈال دی جائے۔

قرآن کریم مسلم معاشرہ کے لئے اس کو قبول نہیں کرتا ہے کہ کسی غنی کی مالداری کی وجہ سے اس کے ساتھ عدل نہ کیا جائے اور کوئی غریب و نادار اس کے ظلم کا شکار ہوتا رہے، اسی طرح یہ بھی ناقابلِ قبول ہے کہ کسی نادار و غریب پر رحم کر کے غنی اور مالدار کو اس کے ظلم کا شکار بنایا جائے۔

قرآن کریم اپنے معاشرہ کے لئے اس کو قبول نہیں کرتا ہے کہ وہ خواہش کی پیروی کرتا رہے اور جذبات کے تابع فرمان رہے اور عدل وانصاف سے منہ موڑلے۔

اسی اسلوب کی دوسری آیت میں عدل کی اور زیادہ واضح اور مکمل تصویر کھینچی گئی ہے جس میں ثابت کیا گیا ہے کہ عدل کی میزان میں محبوب ومبغوض، قریب وبعید اور دوست ودشمن سب برابر ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ كُونُوا۟ قَوَّٰمِينَ لِلَّهِ شُهَدَآءَ بِٱلْقِسْطِ ۖ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَـَٔانُ قَوْمٍ عَلَىٰٓ أَلَّا تَعْدِلُوا۟ ۚ ٱعْدِلُوا۟ هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۖ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ خَبِيرٌۢ بِمَا تَعْمَلُونَ﴾ ترجمہ: "اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو، کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کردے کہ انصاف سے پھر جاؤ، عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے، اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُس سے پوری طرح باخبر ہے"۔ (سورۃ المائدہ: 8)

دونوں آیات میں مسلم معاشرہ کو واضح اور صاف حکم دیا گیا ہے کہ وہ عدل وانصاف کا علمبردار ہو، لوگوں میں عدل قائم کرنے والا ہو، وہ انسانوں کی قیادت اسی بنیاد پر کرے، کسی کی محبت یا کسی سے بغض ونفرت اس کے لئے قیام عدل میں مانع نہ بنے، حق کو قائم کیا جائے، مظلوم کو انصاف دیا جائے اور کمزور کی مدد کی جائے۔ (محمد رسول اللہ ﷺ: 3/145)

جہاں تک مساوات کے اصول کا تعلق ہے تو میثاقِ مدینہ میں اس کے متعلق صریح نصوص موجود ہیں اور مساوات کا اصول اسلام کے عام اصولوں میں سے ایک اہم اصول ہے اور اس کا تعلق ان اصولوں سے ہے جو مسلم معاشرہ کی تعمیر میں معاون بنتے ہیں، موجودہ زمانہ میں بھی اس اصول کو برقرار رکھا گیا ہے اور اس کے بارے میں قوانین مرتب کئے گئے ہیں، قرآن کریم میں مساوات کے بارے میں تاکیدی اسلوب اختیار کیا گیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَـٰكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَـٰكُمْ شُعُوبًا وَقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوٓا۟ ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ ٱللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ﴾ ترجمہ: "لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنادیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے، یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے"۔ (سورۃ الحجرات: 13)

رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اے لوگو! آگاہ ہو جاؤ، بے شک تمہارا رب ایک ہے، تم ایک باپ کی اولاد ہو، سن لو کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی گورے کو کسی کالے پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر، سوائے تقویٰ کے کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے، کیا میں نے پیغام پہنچادیا؟"۔ (مسند أحمد: 5/411)

یہ اصول ان اہم اصولوں میں سے ہے جس نے بہت سی اقوام کو اسلام کی طرف مائل کیا، اس لئے یہ اصول اولین مسلمانوں کی قوت کا ایک اہم مصدر وسرچشمہ تھا۔

البتہ یہ بات قابلِ غور ہے کہ مساوات سے یہاں تمام لوگوں کے مابین زندگی کے تمام امور میں مساوات عامہ مقصود نہیں ہے، جیسے کہ بہت سے فریب خوردہ لوگوں کا یہی نعرہ ہے اور وہ اسی کو عدل و مساوات قرار دیتے ہیں، چنانچہ مواہب وصلاحیتوں میں اور مختلف درجات میں تفاوت واختلافات فطری تقاضہ ہے، لیکن شریعتِ اسلامی میں جس مساوات کا حکم دیا گیا ہے وہ ان تمام امور کے ساتھ مقید ہے جن میں مساوات ضروری ہے، نہ کہ تمام حالات میں مساوات اختیار کی جائے، مساوات کا تعلق اس سے ہے کہ تمام لوگ شریعت میں، قضاء اور فیصلہ میں، تمام اسلامی احکام میں اور حقوقِ عامہ میں برابر کے شریک اور مکلف ہیں، ان کے مابین رنگ، نسل، حسب ونسب، مال و دولت، جاہ و عزت اور دیگر چیزوں کی وجہ سے تفریق نہ کی جائے۔(دیکھیں: مبادئ نظام الحکم فی الاسلام، عبدالحمید متولّی، ص385،الاخلاق الاسلامیہ وأسسہا، المیدانی 1/624 فلسفۃ التربیۃ الاسلامیہ، ماجد الکیلانی، ص179، مبادئ علم الادارۃ، محمد نورالدین، ص116)

بے شک اسلام کی نگاہ میں تمام انسان برابر ہیں، حاکم ہو یا محکوم، مرد ہو یا عورت، عرب ہو یا عجم، گورے ہوں یا کالے، اسلام نے لوگوں کے درمیان رنگ ونسل، خاندان اور طبقاتی تقسیم کے تمام امتیازات کو کالعدم قرار دیا، شریعت کی نگاہ میں حکام اور محکوم سب برابر ہیں، اسی لئے پہلی اسلامی ریاست لوگوں کے مابین اس اصول کو نافذ کرنے کے لئے کوشاں تھی اور اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل امور کی رعایت کرتی تھی:

۱- بلاشبہ مساوات کا اصول ایک تعبّدی معاملہ ہے جس میں خالق کی طرف سے اجر وثواب ملے گا۔

۲- طبقاتی، عُرفی، قبائلی، عنصری، قومی، وطنی، علاقائی اور انسانی مساوات کو ختم کرنے والے تمام نعروں کو کالعدم قرار دیا اور اس کی جگہ افضلیت کا الٰہی میعار یعنی تقویٰ متعین کیا گیا۔

۳- تمام لوگوں کے لئے برابر مواقع فراہم کئے جائیں، کسی کی جاہ وعزت کی وجہ سے، اقتدار کی وجہ سے یا حسب ونسب کی وجہ سے اس کو امتیازی مقام نہ دیا جائے، بلکہ مواقع سب کے لئے میسر ہوں اور ہر ایک کے ساتھ اس کی صلاحیتوں، طاقت و قوت اور عمل کے اعتبار سے معاملہ کیا جائے۔

۴- اسلامی ریاست کی رعایہ کے مابین مساوات قائم کرنے کے نتیجہ میں ان کی صفوں کو تقویت ملتی ہے، اس کے اندر اتفاق واتحاد پیدا ہوتا ہے اور اس کے ذریعہ ایک مستحکم و رحمدل معاشرہ وجود میں آتا ہے جو یکساں عقیدہ، منہج اور اصول و قانون کے لئے زندگی بسر کرتا ہے۔ (دیکھیں: فقہ التمکین، ص: 466)

میثاقِ مدینہ کی یہ دستاویز ان تمام چیزوں پر مشتمل ہے جن کی ایک ریاست کو ضرورت پڑ سکتی ہے، اس میں دستوری و قانونی اور انتظامی تمام بنیادی امور موجود تھے اور ریاست کے ساتھ افراد کے تعلقات کی کیفیت کو بھی بیان کیا گیا تھا، دس برس تک مدینہ منورہ میں قرآن کریم نازل ہوتا رہا اور وہ مسلمانوں کے لئے زندگی کے مناہج کو متعین کرتا رہا اور حکومت وسیاست کے اصول وضوابط، معاشرتی امور، حلال وحرام کے احکام، نظامِ قضا کی بنیادیں، عدل وانصاف کے قواعد اور اندرون وبیرون ریاست کے قوانین کو مستحکم کرتا رہا، اور قرآن کے ساتھ ساتھ سنت بھی ان تمام چیزوں کو مضبوط و مستحکم کرتی رہی اور پوری وضاحت کے ساتھ ان کو بیان کرتی رہی، چنانچہ اس دستاویز نے

قانونی اور دستوری اعتبار سے دور تک نشانِ راہ متعین کئے، اس میثاق کو تمام معاہدوں میں اعلیٰ ترین معاہدہ شمار کیا جاتا ہے، جس کے ذریعہ ساتھ رہنے والے غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کی تعیین کی گئی ہے جن میں عدل و مساوات اور تسامح کا بھی خیال کیا گیا ہے، خاص طور پر جب کہ یہ بات پیش نظر رہے کہ یہ پہلی اسلامی دستاویز تھی جس کو ضبطِ تحریر میں لایا گیا، اور ایسی اقوام پر اس کا نفاذ کیا گیا جو قریبی عہد میں اور اسلام سے پہلے قبائلی عصبیت کا شکار تھیں اور ان کو اپنے وجود کا اسی وقت احساس ہوتا تھا جب کہ وہ دوسروں پر تسلط و غلبہ حاصل کرتے تھے اور ان کے حقوق اور چیزوں پر حملہ کرتے تھے۔

اس دستاویز میں تہذیب و تمدن اور دورِ حاضر کے حقوق انسانی کا ایک معتد بہ حصہ شامل تھا اور معاہدہ کرنے والے فریقوں کے لئے ضروری تھا کہ اس کی دفعات کی پابندی کرتے، لیکن کیا اس پابندی کا التزام واہتمام کیا گیا؟ یہ ایک اہم سوال ہے!

(دیکھیں: صور وعبر من الجهاد النبوی فی المدینہ، د۔ محمد فوزی فیض اللہ، ص: 29-30، ہجرۃ الرسول وصحابتہ، ص 261)

3: مدینہ میں یہود کا موقف اور ان کی سازشیں:

رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی صداقت کے بارے میں یہود کے سامنے قطعی دلائل اور واضح ثبوت موجود تھے لیکن رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اور اہلِ ایمان کے تئیں ان کی عداوت ودشمنی، غرور وتکبر اور حسد میں اضافہ ہی ہوتا رہا، حضرت صفیہ بنت حُیی بن اخطب سے روایت ہے فرماتی ہیں: میں اپنے والد اور چچا ابو یاسر کی نگاہ میں اپنے والد کی سب سے چہیتی اولاد تھی، میں چچا اور والد سے جب کبھی ان کی کسی بھی اولاد کے ساتھ ملتی تو وہ اس کے بجائے مجھے ہی اٹھاتے، جب رسول ﷺ تشریف لائے تو آپؐ نے قبا میں بنو عمرو بن عوف کے یہاں قیام فرمایا، میرے والد حُیی بن اخطب اور میرے چچا ابو یاسر آپؐ کی خدمت میں صبح تڑکے حاضر ہوئے اور غروبِ آفتاب کے وقت واپس آئے، بالکل تھکے ماندے، گرتے پڑتے، لڑکھڑاتی چال چلتے ہوئے۔ میں نے حسبِ معمول چہک کر ان کی طرف دوڑ لگائی لیکن انہیں اس قدر غم تھا کہ واللہ! دونوں میں سے کسی نے بھی میری طرف التفات نہ کیا اور میں نے اپنے چچا کو سنا کہ وہ میرے والد حُیی بن اخطب سے کہہ رہے تھے: کیا یہ وہی ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں! اللہ کی قسم! چچا نے کہا: آپ انہیں ٹھیک ٹھیک پہچان رہے ہیں؟ والد نے کہا: ہاں! چچا نے کہا: تو آپ کے دل میں ان کے متعلق کیا ارادہ ہے؟ والد نے کہا: عداوت ودشمنی، اللہ کی قسم! جب تک زندہ رہوں گا۔ (سیرت ابن ہشام: 1/518)

یہود نے رسول ﷺ اور اہلِ ایمان کے خلاف ذرائع ابلاغ اور میڈیا کے ذریعہ ایک خطرناک جنگ چھیڑ رکھی تھی، تاکہ اس کے ذریعہ اللہ کے رسول ﷺ کی شبیہ کو خراب کیا جائے، لوگوں کو آپؐ سے متنفر کیا جائے اور آپؐ کے بارے میں لوگوں کے اعتماد کو ختم کر دیا جائے، یہود کو اس بات کا مکمل احساس ہو گیا تھا کہ یہ دین ان کے مفادات کے لئے خطرہ ہے اور ان کے منحرف و کمزور اور لوگوں کی تحقیر اور اپنی بڑائی پر مبنی عقیدہ کے خلاف اعلانِ جنگ ہے، یہ دین عقیدۂ توحید کا علمبردار تھا، جب کہ وہ کہتے تھے: عزیر اللہ کے بیٹے ہیں، یہ دین تمام بنی نوع انسان کے مابین مساوات کا داعی ہے اور وہ یہ کہتا ہے کہ کسی قوم کو دوسری قوم کے مقابلہ میں اور کسی گروہ کو دوسرے گروہ کے مقابلہ میں کوئی برتری حاصل نہیں ہے، جبکہ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ اللہ کی منتخب قوم ہیں جو دوسری اقوام کے مقابلہ میں برتر ہیں اور دوسروں کو وہ

کمتر وحقیر سمجھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے میثاقِ مدینہ کی دفعات کی پاسداری اور پابندی نہیں کی اور وہ رسول ﷺ کی نبوت ورسالت کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنے میں لگ گئے،اور آپؐ کو پریشان کرنے کے لئے کثرت سے سوال کرنے لگے،اہل ایمان کو دھوکا دینے لگے،اوران کے ساتھ جھوٹ اور اور تدلیس سے کام لینے لگے اور اسی طرح دیگر خبیثانہ چالیں اور ہتھکنڈے اختیار کرنے لگے تھے۔ (دیکھیں:الصراع مع الیہود، محمد ابو فارس: 1/31)

یہود کی ناپاک کوششیں

ا) یہود کے ذریعہ داخلی انتشار کی کوششیں:

اسلام کے خلاف جنگ چھیڑنے کے بعد یہود کے خبیثانہ وسائل یہ تھے کہ وہ مسلم صف کو توڑنے کے لئے اور مسلمانوں کے مابین محبت کی بنیادوں کو منہدم کرنے کے لئے مسلسل کوششیں کرتے رہے،اس کے لئے وہ داخلی فتنوں کی آگ سلگاتے رہے، جاہلی، علاقائی، قومی اور قبائلی نعرے بلند کرتے رہے، باہمی محبت و مودّت اور اُلفت واخوت سے سرشار بھائیوں کے مابین دراڑیں پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے،حالانکہ اہلِ ایمان تواپنی محبت والفت اور شفقت ورحم کے اعتبار سے جسدِ واحد کی حیثیت رکھتے تھے،اگر کوئی فرد تکلیف کا شکار ہوتاتو تمام مسلم معاشرہ اس کی وجہ سے بے چینی کا شکار ہو جاتا۔ (دیکھیں:الصراع مع الیہود،1/44)

یہودیوں کے ایک عمر رسیدہ بوڑھے کے ذہن میں ایک شیطانی تدبیر سوجھی جس کے ذریعہ وہ انصار کی وحدت کو پارہ پارہ کرنا چاہتا تھا،اس نے ان کے مابین قبائلی عصبیت کی آگ کو بھڑکانے کی کوشش کی تاکہ وہ پھر سے جاہلیت کے ماحول میں پہنچ جائیں اور وہ پھر سے آپس میں جنگ وجدال کا شکار ہو جائیں اور اس کے ذریعہ نبی کریم ﷺ اپنے قوی ترین انصار ومددگاروں سے ہاتھ دھو بیٹھیں،اس واقعہ کو محمد بن اسحاق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: شاس بن قیس -جو ایک عمر دراز بوڑھا ہونے کے باوجود کفر وانکار میں کٹر، مسلمانوں سے سخت نفرت و دشمنی رکھنے والا،اوران سے انتہائی حسد رکھنے والا تھا- اُوس وخزرج پر مشتمل اصحابِ رسول ﷺ کی ایک جماعت کے پاس سے گزرا،وہ سب ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے بات چیت کر رہے تھے، وہ ان کی الفت ومحبت اور اجتماعیت دیکھ کر اور اسلام لانے کے بعد ان کے آپسی تعلقات کو دیکھ کر حسد کی آگ میں جل بھن گیا اور کہنے لگا: قبلہ (اوس وخزرج کی ماں) کی اولاد اس علاقہ میں متحد ومجتمع ہے، نہیں، واللہ! ان کا اتحاد واتفاق دیکھ کر ہم چین سے نہیں بیٹھ سکتے ہیں،اس نے ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے ایک یہودی نوجوان کو حکم دیا کہ ان کے پاس جاکر بیٹھو اور پھر یومِ بُعاث اور اس سے پہلے کی صورتحال کا ذکر چھیڑ دینا اور اس وقت وہ جو اشعار اس جنگ کے بارے میں پڑھا کرتے تھے وہ اشعار سنا لینا۔

یوم بُعاث میں اوس وخزرج کی آپس میں جنگ ہوئی تھی، خزرج کے مقابلہ میں اُوس کو کامیابی ملی تھی اور اس وقت اُوس کا سردار حضیر بن سماک اُشہلی ابو اُسید بن حضیر تھا، جبکہ خزرج کا سردار عمرو بن نعمان البیاضي تھا، یہ دونوں اس جنگ میں مارے گئے تھے۔

ابن اسحاق کہتے ہیں: اس یہودی نوجوان نے ایسا ہی کیا جس کے نتیجہ میں وہاں موجود لوگوں کے مابین یہی موضوعِ گفتگو بن گیا،ان کے مابین باہمی نزاع پیدا ہو گیا اور وہ ایک دوسرے پر فخر کرنے لگے یہاں تک کہ دونوں قبیلوں میں سے دو شخص گھٹنوں کے بل کھڑے ہو

گئے، قبیلہ اُوس میں سے بنو حارثہ بن حارث کا ایک شخص اوس بن قیظی اور قبیلہ خزرج میں سے بنو سلمہ کا جبار بن صخر، ان کی آپس میں کافی بحث ہوئی، یہاں تک کہ ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا: اگر آپ چاہو تو دوبارہ جنگ کی آگ بھڑکا دیتے ہیں، دونوں فریق آگ بگولہ ہو گئے اور کہنے لگے: ٹھیک ہے، الظاہرہ یعنی حرّہ کے مقام پر ملتے ہیں، لے آؤ ہتھیار، لے آؤ ہتھیار اور سب الظاہرہ کی طرف چل پڑے۔

اللہ کے رسول ﷺ کو اس کا علم ہوا تو آپ مہاجرین صحابہ کے ساتھ ان کے پاس آئے اور فرمایا: اے مسلمانو! اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو، کیا پھر سے جاہلی دعویٰ جبکہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اسلام کی راہ دکھائی، اس کے ذریعہ آپ کو عزت عطا کی اور جاہلی رسم ورواج سے آزادی عطا کی، آپ کو کفر کی دلدل سے نکالا اور تمہارے دلوں کے درمیان الفت پیدا کی!۔

اس کے ذریعہ سب سمجھ گئے کہ یہ شیطانی وسوسہ اور دشمن کی چال ہے، اس احساس کے بعد سب رو پڑے، اوس وخزرج کے لوگ ایک دوسرے کو گلے لگانے لگے اور رسول ﷺ کے ساتھ مطیع وفرمانبردار ہو کر واپس چلے گئے، اللہ تعالیٰ نے شاس بن قیس دشمنِ خدا کی چال کو ناکام کر دیا، اللہ تعالیٰ نے شاس بن قیس کے بارے میں اور اس کے کرتوت کے بارے میں آیات نازل کیں: ﴿قُلْ يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ لِمَ تَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِ مَنْ ءَامَنَ تَبْغُونَهَا عِوَجًا وَأَنتُمْ شُهَدَآءُ ۗ وَمَا ٱللَّهُ بِغَٰفِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ﴾ ترجمہ: ”کہو، اے اہل کتاب! تم کیوں اللہ کی باتیں ماننے سے انکار کرتے ہو؟ جو حرکتیں تم کر رہے ہو اللہ سب کچھ دیکھ رہا ہے، کہو، اے اہل کتاب! یہ تمہاری کیا روش ہے کہ جو اللہ کی بات مانتا ہے اُسے بھی تم اللہ کے راستہ سے روکتے ہو اور چاہتے ہو کہ وہ ٹیڑھی راہ چلے، حالانکہ تم خود (اس کے راہ راست ہونے پر) گواہ ہو، تمہاری حرکتوں سے اللہ غافل نہیں ہے“۔ (سورۃ آل عمران: 98-99)

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اُوس بن قیظی اور جبار بن صخر اور ان کا ساتھ دینے والوں کے بارے میں یہ آیات نازل کیں: ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِن تُطِيعُوا۟ فَرِيقًا مِّنَ ٱلَّذِينَ أُوتُوا۟ ٱلْكِتَٰبَ يَرُدُّوكُم بَعْدَ إِيمَٰنِكُمْ كَٰفِرِينَ ﴿١٠٠﴾ وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَأَنتُمْ تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ ءَايَٰتُ ٱللَّهِ وَفِيكُمْ رَسُولُهُۥ ۗ وَمَن يَعْتَصِم بِٱللَّهِ فَقَدْ هُدِىَ إِلَىٰ صِرَٰطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿١٠١﴾ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِۦ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ ﴿١٠٢﴾ وَٱعْتَصِمُوا۟ بِحَبْلِ ٱللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا۟ ۚ وَٱذْكُرُوا۟ نِعْمَتَ ٱللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنتُمْ أَعْدَآءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِۦٓ إِخْوَٰنًا وَكُنتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ ٱلنَّارِ فَأَنقَذَكُم مِّنْهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ ٱللَّهُ لَكُمْ ءَايَٰتِهِۦ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿١٠٣﴾ وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى ٱلْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِٱلْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ ٱلْمُنكَرِ ۚ وَأُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْمُفْلِحُونَ ﴿١٠٤﴾ وَلَا تَكُونُوا۟ كَٱلَّذِينَ تَفَرَّقُوا۟ وَٱخْتَلَفُوا۟ مِنۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ ٱلْبَيِّنَٰتُ ۚ وَأُو۟لَٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١٠٥﴾﴾ ترجمہ: ”اے ایمان والو! اگر تم اہلِ کتاب کی کسی جماعت کا بھی کہا مانو گے تو وہ تمہیں ایمان لانے کے بعد کافر کر دیں گے۔ اور تم کس طرح کافر ہو گے حالانکہ تم پر اللہ کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں اور اس کا رسول تم میں موجود ہے، اور جو شخص اللہ کو مضبوط پکڑے گا تو اسے ہی سیدھے راستے کی ہدایت کی جائے گی۔ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو جیسا اس سے ڈرنا چاہیے اور نہ مرو مگر ایسے حال میں کہ تم

مسلمان ہو۔ اور سب مل کر اللہ کی رسی مضبوط پکڑو اور پھوٹ نہ ڈالو، اور اللہ کا احسان اپنے اوپر یاد کرو جب کہ تم آپس میں دشمن تھے پھر تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی پھر تم اس کے فضل سے بھائی بھائی ہو گئے، اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے پھر تم کو اس سے نجات دی، اس طرح تم پر اللہ اپنی نشانیاں بیان کرتا ہے تاکہ تم ہدایت پاؤ۔ اور چاہیے کہ تم میں سے ایک جماعت ایسی ہو جو نیک کام کی طرف بلاتی رہے اور اچھے کاموں کا حکم کرتی رہے اور برے کاموں سے روکتی رہے، اور وہی لوگ نجات پانے والے ہیں۔ ان لوگوں کی طرح مت ہو جو متفرق ہو گئے بعد اس کے کہ ان کے پاس واضح احکام آئے انہوں نے اختلاف کیا، اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔ (سورۃ آل عمران: 105-100)

اس واقعہ کے ذریعہ واضح ہو جاتا ہے کہ نبوی قیادت نے کس طرح یہودی منصوبے کو ناکام بنا دیا، اور نبی کریم ﷺ مسلمانوں کے معاملات اور حالات کے بارے میں کس قدر فکر مند رہتے تھے، ان کے ساتھ شفقت کا معاملہ کرتے تھے اور ان کو لاحق ہونے والے مصائب اور فتنوں کی وجہ سے کس قدر پریشان ہوتے تھے، نبی کریم ﷺ نے اس فتنہ کو فرو کرنے میں پس و پیش سے کام نہیں لیا، آپ ﷺ کے کلمات اور فرمودات کا ان پر فوری اثر ہوا اور ان کے اندر ایک نئی روح اور نئی تحریک پیدا ہو گئی جس کے ذریعہ جاہلیت کے تمام آثار محو ہو گئے اور ان کو اس کا احساس ہو گیا کہ یہ صورتحال شیطانی وسوسہ اور یہودیوں کی عداوت و دشمنی کا نتیجہ ہے، اس لئے وہ احساسِ ندامت سے سرشار ہو کر ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔ (دیکھیں: سیرت ابن ہشام، 2/211- 214، التاریخ الاسلامی، 4/41-42)

۲) ذاتِ الٰہی پر حملہ:

متعدد سیرت نگاروں اور مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ بیت المدراس (وہ جگہ جہاں تورات کی تلاوت کی جاتی ہے) میں یہود کے پاس گئے تو آپؓ نے دیکھا کہ ان میں سے بہت سے لوگ 'فنحاص' نامی ایک شخص کے پاس جمع ہیں، وہ ان کے علماء و احبار میں سے تھا، اس کے ساتھ 'اُشیع' نامی ایک دوسرا یہودی عالم بھی تھا، حضرت ابو بکرؓ نے فنحاص سے کہا: تیرا بُرا ہو! اللہ سے ڈرو اور اسلام قبول کر لو، اللہ کی قسم! تم جانتے ہو کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور وہ اللہ کی طرف سے تمہارے پاس حق لے کر آئے ہیں، آپ ان کو تورات وانجیل میں اپنے پاس تحریر پاتے ہو، یہ سن کر فنحاص نے ابو بکرؓ سے کہا: واللہ! اے ابو بکر! ہم اللہ کے محتاج نہیں ہیں اور وہی ہمارا محتاج ہے، نہ ہی ہم اس کے سامنے گڑگڑاتے ہیں جیسے کہ وہ ہمارے سامنے گڑگڑاتا ہے، ہم تو اس سے بے نیاز ہیں اور وہ ہم سے بے نیاز نہیں ہے، اور اگر وہ ہم سے بے نیاز ہوتا تو ہم سے ہمارے مال بطور قرض نہ مانگتا، جیسے کہ تمہارے صاحب کا دعوی ہے، تم کو سود سے منع کرتا ہے اور ہمیں سود دیتا ہے، اور اگر وہ ہم سے بے نیاز ہوتا تو ہمیں سود نہ دیتا، یہ سن کر حضرت ابو بکر صدیقؓ غضبناک ہوئے اور فنحاص کے چہرے پر زور سے مارا اور کہا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے! اگر ہمارے اور تمہارے درمیان معاہدہ نہ ہوتا تو اللہ کے دشمن! میں تمہارا سر قلم کر دیتا، اس کے بعد 'فنحاص' رسول ﷺ کے پاس گیا اور کہا: اے محمدؐ! دیکھو، آپ کے ساتھی نے میرے ساتھ کیا کیا؟! رسول ﷺ نے ابو بکرؓ سے فرمایا: آپ کو ایسا کرنے پر کس چیز نے مجبور کیا؟ ابو بکرؓ نے فرمایا: اللہ کے اس دشمن نے بڑی خطرناک بات کہی، اس کا دعوی ہے کہ اللہ فقیر ہے اور یہ مالدار ہیں، جب اس نے یہ بات کہی تو اس کی اس بات سے مجھے اللہ کے لئے غصہ آیا اور میں نے اس کے چہرہ پر مارا، فنحاص نے انکار

کیااور کہا: میں نے ایسی بات نہیں کی ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں وحی نازل کی جس کے ذریعہ اس کارد کیا گیا اور ابو بکرؓ کی تصدیق کی گئی: ﴿لَّقَدْ سَمِعَ ٱللَّهُ قَوْلَ ٱلَّذِينَ قَالُوٓاْ إِنَّ ٱللَّهَ فَقِيرٌ وَنَحْنُ أَغْنِيَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُواْ وَقَتْلَهُمُ ٱلْأَنۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَنَقُولُ ذُوقُواْ عَذَابَ ٱلْحَرِيقِ﴾ ترجمہ: ”اللہ نے اُن لوگوں کا قول سنا جو کہتے ہیں کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں، ان کی یہ باتیں بھی ہم لکھ لیں گے، اور اس سے پہلے جو وہ پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے رہے ہیں وہ بھی ان کے نامۂ اعمال میں ثبت ہے (جب فیصلہ کا وقت آئے گا اُس وقت) ہم ان سے کہیں گے کہ لو، اب عذاب جہنم کا مزہ چکھو“۔ (سورۃ آل عمران: 181)

اور حضرت ابو بکر صدیقؓ کے بارے میں اور ان کے غصہ ہونے کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: ﴿لَتُبْلَوُنَّ فِىٓ أَمْوَٰلِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ ٱلَّذِينَ أُوتُواْ ٱلْكِتَٰبَ مِن قَبْلِكُمْ وَمِنَ ٱلَّذِينَ أَشْرَكُوٓاْ أَذًى كَثِيرًا ۚ وَإِن تَصْبِرُواْ وَتَتَّقُواْ فَإِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ ٱلْأُمُورِ﴾ ترجمہ: ”مسلمانو! تمہیں مال اور جان دونوں کی آزمائشیں پیش آکر رہیں گی، اور تم اہلِ کتاب اور مشرکین سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے، اگر ان سب حالات میں تم صبر اور خدا ترسی کی روش پر قائم رہو تو یہ بڑے حوصلہ کا کام ہے“۔ (سورۃ آل عمران: 186)

قرآن کریم نے کئی مقامات پر اللہ تعالیٰ کے تئیں ان کی بے ادبی اور ان کی بے سر وپا اور جاہلانہ باتوں کا ذکر کیا ہے، انہی آیات میں سے ایک آیت یہ ہے: ﴿وَقَالَتِ ٱلْيَهُودُ يَدُ ٱللَّهِ مَغْلُولَةٌ ۚ غُلَّتْ أَيْدِيهِمْ وَلُعِنُواْ بِمَا قَالُواْ ۘ بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ يُنفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ ۚ وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُم مَّآ أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ طُغْيَٰنًا وَكُفْرًا ۚ وَأَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ ٱلْعَدَٰوَةَ وَٱلْبَغْضَآءَ إِلَىٰ يَوْمِ ٱلْقِيَٰمَةِ ۚ كُلَّمَآ أَوْقَدُواْ نَارًا لِّلْحَرْبِ أَطْفَأَهَا ٱللَّهُ ۚ وَيَسْعَوْنَ فِى ٱلْأَرْضِ فَسَادًا ۚ وَٱللَّهُ لَا يُحِبُّ ٱلْمُفْسِدِينَ﴾ ترجمہ: ”یہودی کہتے ہیں: اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں، باندھے گئے ان کے ہاتھ، اور لعنت پڑی اِن پر اُس بکواس کی بدولت جو یہ کرتے ہیں، اللہ کے ہاتھ تو کشادہ ہیں جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ جو کلام تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے وہ ان میں سے اکثر لوگوں کی سرکشی و باطل پرستی میں الٹے اضافہ کا موجب بن گیا ہے، اور (اس کی پاداش میں) ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کے لئے عداوت اور دشمنی ڈال دی ہے جب کبھی یہ جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں اللہ اُس کو ٹھنڈا کر دیتا ہے، یہ زمین میں فساد پھیلانے کی سعی کر رہے ہیں مگر اللہ فساد برپا کرنے والوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا“۔ (سورۃ المائدہ: 64)

آیت کے مضمون سے بظاہر ایسا لگتا ہے کہ یہود نے اس طرح کا موقف اس لئے اختیار کیا کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ نبی کریم ﷺ کو استحکام حاصل ہو رہا تھا اور آپ ﷺ کی دعوت عام ہو رہی تھی جس کی وجہ سے وہ حسد کی آگ میں جل بھن رہے تھے، مزید ان کے غصہ اور حسد کی ایک وجہ کا ایک احتمال یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے بائیکاٹ کی وجہ سے ان کی اقتصادیات بری طرح متاثر ہو رہی تھی جس کی وجہ سے وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ بے ادبی کر رہے تھے، اس کے بعد والی آیات سے اس احتمال کی تائید ہوتی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ ءَامَنُواْ وَٱتَّقَوْاْ لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّـَٔاتِهِمْ وَلَأَدْخَلْنَٰهُمْ جَنَّٰتِ ٱلنَّعِيمِ ﴿٦٥﴾

وَلَوۡ أَنَّهُمۡ أَقَامُواْ ٱلتَّوۡرَىٰةَ وَٱلۡإِنجِيلَ وَمَآ أُنزِلَ إِلَيۡهِم مِّن رَّبِّهِمۡ لَأَكَلُواْ مِن فَوۡقِهِمۡ وَمِن تَحۡتِ أَرۡجُلِهِمۚ مِّنۡهُمۡ أُمَّةٞ مُّقۡتَصِدَةٞۖ وَكَثِيرٞ مِّنۡهُمۡ سَآءَ مَا يَعۡمَلُونَ﴾ ترجمہ: " اگر(اس سرکشی کے بجائے) یہ اہلِ کتاب ایمان لے آتے اور خداترسی کی روش اختیار کرتے تو ہم اِن کی برائیاں اِن سے دور کر دیتے اور ان کو نعمت بھری جنتوں میں پہنچاتے۔ کاش انہوں نے توراۃ اور انجیل اور اُن دوسری کتابوں کو قائم کیا ہوتا جو اِن کے رب کی طرف سے اِن کے پاس بھیجی گئی تھیں ایسا کرتے تو ان کے لئے اوپر سے رزق برستا اور نیچے سے ابلتا اگرچہ اِن میں کچھ لوگ راست رو بھی ہیں لیکن ان کی اکثریت سخت بد عمل ہے"۔(سورۃ المائدہ: 65-66)

۳) رسول ﷺ، انبیائے کرام اور قرآن کریم کے ساتھ ان کی بے ادبی:

یہود رسول ﷺ کی موجودگی میں اور آپ کو مخاطب کرتے وقت آپؐ کے ساتھ بے ادبی کیا کرتے تھے، آپؐ پر طعن و تشنیع کرتے اور آپؐ کو ایسے سلام کرتے جس کے ذریعہ آپؐ کو تکلیف ہوتی، آپؐ کے ساتھ بد اخلاقی سے پیش آتے، حضرت عائشہؓ سے روایت ہے فرماتی ہیں: کچھ یہودی لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور کہا: "السام علیک" اے ابو القاسم! میں نے جواب میں کہا: تمہارے اوپر سام (موت) ہو۔ اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو تم پر! رسولؐ نے فرمایا: اے عائشہ! صبر کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ فحش اور بد کلامی کو پسند نہیں کرتا ہے۔ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! آپ دیکھ رہے ہیں وہ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا آپ نہیں دیکھ رہی ہو کہ میں ان کی بد دعا انہی پر لوٹا رہا ہوں اور میں کہہ رہا ہوں: اور تم پر ہو۔ فرماتی ہیں: اسی کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ (صحیح بخاری: 2935، صحیح مسلم: 2165/11)

اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی: ﴿أَلَمۡ تَرَ إِلَى ٱلَّذِينَ نُهُواْ عَنِ ٱلنَّجۡوَىٰ ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا نُهُواْ عَنۡهُ وَيَتَنَٰجَوۡنَ بِٱلۡإِثۡمِ وَٱلۡعُدۡوَٰنِ وَمَعۡصِيَتِ ٱلرَّسُولِۖ وَإِذَا جَآءُوكَ حَيَّوۡكَ بِمَا لَمۡ يُحَيِّكَ بِهِ ٱللَّهُ وَيَقُولُونَ فِيٓ أَنفُسِهِمۡ لَوۡلَا يُعَذِّبُنَا ٱللَّهُ بِمَا نَقُولُۚ حَسۡبُهُمۡ جَهَنَّمُ يَصۡلَوۡنَهَاۖ فَبِئۡسَ ٱلۡمَصِيرُ﴾ ترجمہ:" کیا تم نے دیکھا نہیں اُن لوگوں کو جنہیں سرگوشیاں کرنے سے منع کر دیا گیا تھا پھر بھی وہ وہی حرکت کئے جاتے ہیں جس سے انہیں منع کیا گیا تھا؟ یہ لوگ چھپ چھپ کر آپس میں گناہ اور زیادتی اور رسول کی نافرمانی کی باتیں کرتے ہیں، اور جب تمہارے پاس آتے ہیں تو تمہیں اُس طریقے سے سلام کرتے ہیں جس طرح اللہ نے تم پر سلام نہیں کیا ہے اور اپنے دلوں میں کہتے ہیں کہ ہماری اِن باتوں پر اللہ ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا، اُن کے لئے جہنم ہی کافی ہے اُسی کا وہ ایندھن بنیں گے، بڑا ہی برا انجام ہے اُن کا"۔ (سورۃ المجادلہ: 8) (دیکھیں: زاد المسیر فی علم التفسیر: 8/189)

جہاں تک دیگر انبیاء کے ساتھ ان کی گستاخی کرنے کا تعلق ہے تو رسول ﷺ کے پاس یہود کے کچھ لوگ آئے، ان میں ابو یاسر ابن أخطب، نافع بن ابی نافع، عازر بن أبی عازر اور دوسرے لوگ تھے، انہوں نے رسول ﷺ سے سوال کیا کہ وہ کون کون سے رسولوں کو مانتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ ہم پر نازل کیا گیا اور جو کچھ ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور أسباط پر نازل کیا گیا اور جو کچھ موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو عطا کیا گیا اور جو کچھ انبیاء کو ان کے رب کی طرف سے عطا کیا گیا، سب پر ایمان رکھتے ہیں، ان میں سے

کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے ہیں اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں، جب آپ ﷺ نے حضرت عیسی ابن مریم -علیہا السلام- کا ذکر کیا تو انہوں نے ان کی نبوت کا انکار کیا اور کہا: ہم نہ ہی عیسٰی ابن مریم پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ ہی ان کو مانتے ہیں جن پر وہ ایمان رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں یہ آیت نازل کی: ﴿قُلْ يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ هَلْ تَنقِمُونَ مِنَّآ إِلَّآ أَنْ ءَامَنَّا بِٱللَّهِ وَمَآ أُنزِلَ إِلَيْنَا وَمَآ أُنزِلَ مِن قَبْلُ وَأَنَّ أَكْثَرَكُمْ فَٰسِقُونَ﴾ ترجمہ: ''اِن سے کہو: اے اہل کتاب! تم جس بات پر ہم سے بگڑے ہو وہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ ہم اللہ پر اور دین کی اُس تعلیم پر ایمان لے آئے ہیں جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور ہم سے پہلے بھی نازل ہوئی تھی اور تم میں سے اکثر لوگ فاسق ہیں؟''۔(سورۃ المائدہ: 59) (دیکھیں: سیرت ابن ہشام: 1/567، تفسیر ابن جریر: 1/442)

اسی طرح وہ سوالات اور بحث و مباحثہ کے ذریعہ قرآن کریم پر بھی تنقید کرتے تھے، حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں: جب اللہ کے رسول ﷺ مدینہ تشریف لائے تو علمائے یہود نے کہا: آپ کے اس قول: [وَمَآ أُوتِيتُم مِّنَ ٱلْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا] ترجمہ: ''تم لوگوں کو علم کا معمولی حصہ ملا ہے''۔(سورۃ الاسراء: 85) کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟ اس سے آپ ہمیں مراد لیتے ہیں یا اپنی قوم کو؟ آپؐ نے فرمایا: سب کو! انہوں نے کہا: آپ تو خود ہی نازل شدہ قرآن میں پڑھتے ہیں کہ ہمیں تورات عطا کی گئی ہے، اس میں ہر چیز کا بیان ہے۔ رسول ﷺ نے فرمایا: اللہ کے علم کے مطابق یہ قلیل ہے اور آپ کے پاس اتنا کچھ ہے جو آپ کے لئے کافی ہے، اگر آپ اس کو قائم کروگے۔ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ ' نے اس سلسلہ میں یہ آیت نازل کی: [وَلَوْ أَنَّ مَا فِي ٱلْأَرْضِ مِن شَجَرَةٍ أَقْلَٰمٌ وَٱلْبَحْرُ يَمُدُّهُۥ مِنۢ بَعْدِهِۦ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمَٰتُ ٱللَّهِ إِنَّ ٱللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ] ترجمہ: ''زمین میں جتنے درخت ہیں اگر وہ سب کے سب قلم بن جائیں اور سمندر (دوات بن جائے) جسے سات مزید سمندر روشنائی مہیا کریں تب بھی اللہ کی باتیں (لکھنے سے) ختم نہ ہوں گی، بے شک اللہ زبردست اور حکیم ہے''۔(سورۃ لقمان: 27) (دیکھیں: الیہود فی السنۃ المطہرۃ 1/241، تفسیر ابن کثیر، سورۃ الاسراء: 85)

۴) منافقین کا تعاون اور اُن کے ساتھ مل کر سازشیں:

قرآن کریم نے واضح طور پر اس حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ منافقین کی فکری قیادت یہود کیا کرتے تھے، وہی اصلاً منافقین کے شیاطین تھے، وہ ان کو منصوبے بنا کر دیتے تھے، ان کی رہنمائی کرتے تھے اور مکر و فریب، دھوکہ، چال بازی اور فتنہ پروری کے نت نئے اسالیب اور طریقے ان کو بتاتے تھے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: [وَإِذَا لَقُوا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا قَالُوٓا ءَامَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَٰطِينِهِمْ قَالُوٓا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُونَ] ترجمہ: ''جب یہ اہلِ ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اور جب علیحدگی میں اپنے شیطانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اصل میں تو ہم تمہارے ساتھ ہیں اور ان لوگوں سے محض مذاق کر رہے ہیں''۔(سورۃ البقرۃ: 14)

علامہ نسفیؒ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''ان کے شیاطین سے یہود مراد ہیں، جو اصل شیاطین کے ساتھ اپنے تمرد و سرکشی کے اعتبار سے مماثلت رکھتے تھے''۔(تفسیر النسفی: 1/21)

یہود مدینہ منورہ میں منافقین کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف سازشیں کیا کرتے تھے،ان سازشوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:[بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَھُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا] ترجمہ: ”اور جو منافق اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کواپنا رفیق بناتے ہیں انہیں یہ مژدہ سنادو کہ اُن کے لئے دردناک سزا تیار ہے، کیا یہ لوگ عزت کی طلب میں اُن کے پاس جاتے ہیں؟ حالانکہ عزت تو ساری کی ساری اللہ ہی کے لئے ہے“۔ (سورۃ النساء:138-139)

استاذ محمد دَروزہ فرماتے ہیں: جمہور مفسرین کا قول یہ ہے کہ یہاں کافروں سے یہود مراد ہیں اور آیت میں اس کا قرینہ موجود ہے،اور اس کے بعد آنے والی آیت میں ایک اور قرینہ موجود ہے،اور یہ بات واضح ہے کہ منافقین کا یہود کو دوست بنانا اور ان کے ساتھ ان کا گٹھ جوڑ، یہ دعوت اور اسلامی قوتوں کے خلاف یہود اور منافقین کا متحدہ ایجنڈا تھا۔(دیکھیں: سیرت الرسول ﷺ: 2/179 - 180)

ایک دوسری آیت میں ارشاد ہے:[اِنَّ الَّذِيْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰٓي اَدْبَارِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى الشَّيْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ ۭ وَاَمْلٰى لَهُمْ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِيْعُكُمْ فِيْ بَعْضِ الْاَمْرِ ښ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ]ترجمہ: ”حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ہدایت واضح ہو جانے کے بعد اُس سے پھر گئے اُن کے لئے شیطان نے اِس روش کو سہل بنادیا ہے اور جھوٹی توقعات کا سلسلہ اُن کے لئے دراز کر رکھا ہے۔ اِسی لئے انہوں نے اللہ کے نازل کردہ دین کو ناپسند کرنے والوں سے کہہ دیا کہ بعض معاملات میں ہم تمہاری مانیں گے، اللہ اُن کی یہ خفیہ باتیں خوب جانتا ہے“۔(سورۃ محمد:25-26)

جمہور کا قول یہ ہے کہ پہلی آیت میں منافقین کی شناعت بیان کی گئی ہے اور جو اللہ کی طرف سے نازل کردہ وحی کو ناپسند کرتے تھے وہ یہود ہیں، اسی طرح دوسری آیت میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف فریقین کی سازشوں کا ایک منظر پیش کیا گیا ہے، قابل غور یہ ہے کہ دوسری آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ منافقین یہود سے وعدہ کیا کرتے تھے کہ وہ ان کی اطاعت کرتے رہیں گے اور ان کے بنائے ہوئے منصوبے کے مطابق چلتے رہیں گے،اس سے معلوم ہوتا تھا کہ یہود کس طرح منافقین کے افعال و حرکات میں رہنمائی اور تاثیر کا کام کرتے تھے۔(سیرۃ رسول ﷺ: 2/180)

ایک اور آیت میں ہے: [اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۭ مَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلَا مِنْهُمْ ۙ وَيَحْلِفُوْنَ عَلَي الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۭ اِنَّهُمْ سَاۗءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ] ترجمہ: ”کیا تم نے دیکھا نہیں اُن لوگوں کو جنہوں نے دوست بنایا ہے ایک ایسے گروہ کو جو اللہ کا مغضوب ہے؟ وہ نہ تمہارے ہیں نہ اُن کے، اور وہ جان بوجھ کر جھوٹی بات پر قسمیں کھاتے ہیں، اللہ نے ان کے لئے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے، بڑے ہی برے کرتوت ہیں جو وہ کر رہے ہیں، اُنہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے جس کی آڑ میں وہ اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہیں، اِس پر ان کے لئے ذلت کا عذاب ہے“۔(سورۃ المجادلہ:14-16)

ماوردیؒ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: اس سے مراد منافقین ہیں جو ایک ایسی قوم سے دوستی کرتے تھے جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا، اور وہ یہود ہیں۔ (النکت والعیون، الماوردی 4/203)

یہود ہی نے منافقین کو رسول ﷺ کے خلاف جنگ چھیڑنے میں اصل تحریک کا کام کیا، حضرت اسامہ بن زیدؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول ﷺ ایک گدھے کی پشت پر فدک کی بنی ہوئی ایک موٹی چادر رکھنے کے بعد سوار ہوئے اور اسامہ بن زیدؓ کو اپنے پیچھے بٹھایا، آپ ﷺ بنو حارث بن خزرج میں سعد بن عبادہؓ کی مزاج پرسی کے لئے تشریف لے جا رہے تھے، یہ جنگ بدر سے پہلے کا واقعہ ہے، راستہ میں ایک مجلس سے آپ گزرے جس میں عبداللہ بن ابی ابن سلول (منافق) بھی موجود تھا، یہ عبداللہ بن ابی کے ظاہری اسلام لانے سے بھی پہلے کا قصہ ہے، مجلس میں مسلمان اور مشرکین یعنی بت پرست اور یہودی سب ہی طرح کے لوگ تھے، انہیں میں عبداللہ بن رواحہؓ بھی تھے، سواری کی (ٹاپوں سے گرد اڑی اور) مجلس والوں پر پڑی تو عبداللہ بن ابی نے چادر سے اپنی ناک بند کر لی اور بطور تحقیر کہنے لگا کہ ہم پر گرد نہ اڑاؤ، اتنے میں رسول ﷺ بھی قریب پہنچ گئے اور انہیں سلام کیا، پھر آپ سواری سے اتر گئے اور مجلس والوں کو اللہ کی طرف بلایا اور قرآن کی آیتیں پڑھ کر سنائیں، اس پر عبداللہ بن ابی ابن سلول کہنے لگا، جو کلام آپ نے پڑھ کر سنایا ہے، اس سے عمدہ کوئی کلام نہیں ہو سکتا، اگرچہ یہ کلام بہت اچھا، پھر بھی ہماری مجلسوں میں آ آ کر آپ ہمیں تکلیف نہ دیا کریں، اپنے گھر بیٹھیں، اگر کوئی آپ کے پاس جائے تو اسے اپنی باتیں سنایا کریں۔ (یہ سن کر) عبداللہ بن رواحہؓ نے کہا: ضرور یا رسول اللہ! آپ ہماری مجلسوں میں تشریف لایا کریں، ہم اسی کو پسند کرتے ہیں، اس کے بعد مسلمان، مشرکین اور یہودی آپس میں ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے لگے اور قریب تھا کہ فساد اور لڑائی تک کی نوبت پہنچ جاتی لیکن آپؐ نے انہیں خاموش اور ٹھنڈا کر دیا اور آخر سب لوگ خاموش ہو گئے، پھر آپ ﷺ اپنی سواری پر سوار ہو کر وہاں سے چلے آئے اور سعد بن عبادہؓ کے یہاں تشریف لے گئے، حضور ﷺ نے سعد بن عبادہؓ سے بھی اس کا ذکر کیا کہ سعد! تم نے نہیں سنا، ابو حباب، آپ کی مراد عبداللہ بن ابی ابن سلول سے تھی، کیا کہہ رہا تھا؟ اس نے اس طرح کی باتیں کی ہیں، سعد بن عبادہؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ اسے معاف فرما دیں اور اس سے درگزر کر دیں، اس ذات کی قسم! جس نے آپ پر کتاب نازل کی ہے اللہ نے آپ کے ذریعہ وہ حق بھیجا ہے جو اس نے آپ پر نازل کیا ہے، اس شہر (مدینہ) کے لوگ (پہلے) اس پر متفق ہو چکے تھے کہ اس (عبداللہ بن ابی) کو تاج پہنا دیں اور (شاہی) عمامہ اس کے سر پر باندھ دیں لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اس حق کے ذریعہ جو آپ کو اس نے عطا کیا ہے، اس باطل کو روک دیا تو اب وہ چڑ گیا ہے اور اس وجہ سے وہ معاملہ اس نے آپ کے ساتھ کیا جو آپ نے ملاحظہ فرمایا ہے، اس کے بعد آپؐ نے اسے معاف کر دیا۔ (صحیح بخاری: 4566)

۵) یہودی عالم حضرت عبداللہ بن سلامؓ کے بارے میں یہود کی طعن و تشنیع:

حضرت عبداللہ بن سلامؓ کو جب رسول اللہ ﷺ کے مدینہ تشریف لانے کی خبر ملی تو وہ آپ کی خدمت میں آئے اور کہا کہ میں آپ سے تین چیزوں کے بارے میں پوچھوں گا جنہیں نبی کے سوا اور کوئی نہیں جانتا: قیامت کی سب سے پہلی علامت کیا ہے؟ وہ کون سا کھانا ہے جو سب سے پہلے جنتیوں کو کھانے کے لئے دیا جائے گا؟ اور کس چیز کی وجہ سے بچہ اپنے باپ کے مشابہ ہوتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جبرئیل (علیہ السلام) نے ابھی ابھی مجھے آکر اس کی خبر دی ہے۔ اس پر عبداللہ نے کہا کہ ملائکہ میں یہی تو یہودیوں کے دشمن ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: قیامت کی سب سے پہلی علامت ایک آگ کی صورت میں ظاہر ہو گی جو لوگوں کو مشرق سے مغرب کی طرف ہانک کر لے جائے

گی، سب سے پہلا کھانا جو اہل جنت کی دعوت کے لئے پیش کیا جائے گا، وہ مچھلی کی کلیجی پر جو ٹکڑا اٹکا رہتا ہے وہ ہوگا، اور بچے کی مشابہت کا جہاں تک تعلق ہے تو جب مرد عورت کے قریب جاتا ہے اس وقت اگر مرد کی منی پہل کر جاتی ہے تو بچہ اسی کی شکل وصورت پر ہوتا ہے، اگر عورت کی منی پہل کر جاتی ہے تو پھر بچہ عورت کی شکل وصورت پر ہوتا ہے۔(یہ سن کر) عبداللہ بن سلامؓ بول اٹھے: میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ پھر عرض کیا: یارسول اللہ! یہود انتہا کی جھوٹی قوم ہے، اگر آپ کے دریافت کرنے سے پہلے میرے اسلام قبول کرنے کے بارے میں انہیں علم ہوگیا تو آپ کے سامنے مجھ پر ہر طرح کی تہمتیں دھرنی شروع کر دیں گے، چنانچہ کچھ یہودی آئے اور عبداللہؓ گھر کے اندر چھپ کر بیٹھ گئے، نبی کریم ﷺ نے ان سے پوچھا: تم لوگوں میں عبداللہ بن سلام کون صاحب ہیں؟ سارے یہودی کہنے لگے: وہ ہم میں سب سے بڑے عالم اور سب سے بڑے عالم کے صاحبزادے ہیں، ہم میں سب سے زیادہ بہتر اور ہم میں سب سے بہتر کے صاحبزادے ہیں۔ آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: اگر عبداللہ مسلمان ہو جائیں تو پھر تمہارا کیا خیال ہوگا؟ انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ انہیں اس سے محفوظ رکھے۔ اتنے میں عبداللہؓ باہر تشریف لائے اور کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے سچے رسول ہیں۔ اب وہ سب ان کے متعلق کہنے لگے کہ ہم میں سب سے بدترین اور سب سے بدترین کا بیٹا ہے، وہیں وہ ان کی برائی کرنے لگے"۔(صحیح بخاری: 3329)

یہود کے علماء واحبار میں سے جو ایمان لاتا تھا ان کو بھی وہ ایذاء رسانی کا نشانہ بناتے تھے اور اُن کے متعلق شکوک وشبہات پیدا کرتے تھے اور ان پر سخت الزامات لگاتے تھے، قرآن کریم نے اس قسم کے طرزِ عمل کے بارے میں وضاحت کی ہے اور اہل ایمان کی طرف سے دفاع کیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: [لَيْسُوْا سَوَآءً ۗ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ۞ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۞ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ] ترجمہ: "مگر سارے اہل کتاب یکساں نہیں ہیں، ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو راہ راست پر قائم ہیں، راتوں کو اللہ کی آیات پڑھتے ہیں اور اس کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں، اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں، برائیوں سے روکتے ہیں اور بھلائی کے کاموں میں سرگرم رہتے ہیں، یہ صالح لوگ ہیں اور جو نیکی بھی یہ کریں گے اس کی ناقدری نہ کی جائے گی، اللہ پرہیزگار لوگوں کو خوب جانتا ہے"۔(سورۃ آل عمران: 113-115)

علامہ واحدی: "اسباب النزول" میں فرماتے ہیں: حضرت ابنِ عباس اور مقاتل فرماتے ہیں کہ جب عبداللہ بن سلام، ثعلبہ بن سعید، اُسید بن سعیہ، اَسد بن عبید اور دیگر یہود کے افراد نے اسلام قبول کیا تو یہود کے علماء کہنے لگے: محمد پر صرف ہمارے شریر لوگوں نے ایمان لایا، اگر وہ ہمارے اچھے افراد میں سے ہوتے تو اپنے باپ دادا کے دین کو نہیں چھوڑتے، انہوں نے ان سے کہا: تم نے اپنا دین چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کیا تو تم نے خیانت کی، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی: [لَيْسُوْا سَوَآءً...] (اَسباب النزول، الواحدی، ص114)

۶) نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کے بارے میں افواہیں عام کرنا:

یہود مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لئے اور ان کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے لئے موقع کی تلاش میں رہتے تھے، اسی میں سے ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ یہود نے ابتدائی مہینوں میں رسول ﷺ کے ساتھ عقبہ میں بیعت کرنے والے نقباء میں سے ایک نقیب کی وفات کے بارے میں یہ پروپیگنڈہ مہم شروع کی، وفات پانے والے صحابی کا نام ابو امامہ اُسعد بن زرارہ انصاری خزرجی ؓ تھا، ان کو ایسی بیماری لاحق ہوگئی جس سے چہرہ اور جسم سرخ ہو جاتا ہے، اللہ کے رسول ﷺ ان کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے تو آپ ؐ کی حالت دیکھ کر فرمایا: کہیں ان کی وفات یہود کی خوشی کا موجب نہ ہو- یہ آپ ؐ نے دو مرتبہ فرمایا- اب یہودیوں کو کہنے کا موقع ملے گا کہ دیکھو یہ کیسا نبی ہے، اپنے ساتھی کو بھی نہیں بچا سکا، بلکہ ظاہر ہے کہ میں ان کو نہ کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہوں اور نہ ہی نقصان، البتہ میں ان کے لئے ضرور علاج کا کوئی سبب اختیار کروں گا، اس زمانہ کے دستور کے مطابق آپ ﷺ نے ان کے بارے میں مشورہ دیا تو ان کے سر کو داغا گیا مگر حضرت اُسعد بیماری سے وفات پا گئے۔(مسند احمد 4/138، مستدرک حاکم: 4/214، مجمع الزوائد: 5/98)

حضرت ابو اُمامہ ؓ کا واقعہ تنہا ایسا واقعہ نہیں ہے جس کے ذریعہ مسلمانوں کے خلاف یہود کی عداوت ودشمنی ظاہر ہوئی بلکہ انہوں نے ہجرت کے ابتدائی دنوں میں یہ مشہور کر دیا تھا کہ انہوں نے مسلمانوں پر جادو کر لیا ہے جس کی وجہ سے ان کے ہاں اولاد نہیں ہو پائے گی اور اُنہوں نے اس لئے یہ شوشہ چھوڑا تاکہ مسلمانوں کو پریشان کریں اور ان کی نئی زندگی کو بے چین بنا دیں۔

مسلمانوں کے مابین اس شوشہ کا کافی اثر ہوا تھا، یہی وجہ ہے کہ جب مہاجرین کے ہاں مدینہ آنے کے بعد پہلے بچے عبداللہ بن زبیر کی ولادت ہوئی تو مسلمانوں کی خوشی کی انتہا نہیں رہی، چنانچہ حضرت اسماء بنت ابی بکر ؓ سے روایت ہے کہ عبداللہ بن زبیر مکہ میں ان کے بطن میں تھے، فرماتی ہیں: جب میں ہجرت کے لئے نکلی تو وقتِ ولادت قریب تھا، میں مدینہ پہنچی تو میں نے قباء میں قیام کیا اور قباء میں ہی ولادت ہوگئی، میں رسول ﷺ کی خدمت میں بچے کو لے کر حاضر ہوئی اور اسے آپ ﷺ کی گود میں رکھ دیا، نبی کریم ﷺ نے کھجور طلب کی، اسے چبایا اور بچے کے منہ میں اپنا لعابِ دہن ڈالا، چنانچہ پہلی چیز جو اس بچے کے پیٹ میں گئی وہ نبی کریم ﷺ کا لعاب تھا، پھر آپ ؐ نے کھجور سے تحنیک کی اور ان کے لئے برکت کی دعا فرمائی۔

یہ ہجرت کے بعد مدینہ میں پہلا بچہ مسلمانوں کے یہاں پیدا ہوا، صحابہ کرام اس سے بہت خوش ہوئے، اس لئے کہ یہ افواہ پھیلائی گئی تھی کہ یہودیوں نے تم (مسلمانوں) پر جادو کر دیا ہے، اس لئے تمہارے یہاں اب کوئی بچہ پیدا نہیں ہوگا۔(صحیح بخاری: 5469، صحیح مسلم: 2146/26) ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے ان کا نام عبداللہ رکھا اور بعد میں وہ آپ ﷺ کی خدمت میں اس وقت بیعت کے لئے حاضر ہوئے جبکہ وہ سات یا آٹھ سال کے تھے، حضرت زبیر ؓ نے انہیں اس کا حکم دیا تھا، نبی کریم ﷺ نے جب اُن کو آتے ہوئے دیکھا تو آپ ؐ مسکرائے اور ان کو بیعت کر لیا۔(صحیح مسلم (2146/25) جب حضرت عبداللہ کی ولادت ہوئی تو صحابہ کرام نے نعرہ تکبیر بلند کیا۔(مستدرک حاکم: 3/548)

۷) تحویل قبلہ کے بارے میں ان کا موقف:

ایسا لگتا ہے کہ بیت المقدس سے کعبۂ مشرفہ کی جانب تحویلِ قبلہ کا واقعہ یہود کی طرف سے نوخیز اسلامی ریاست کو کمزور کرنے کے لئے کلامی جنگ، سازشوں اور عملی دخل اندازی کا نقطۂ آغاز بنا، چنانچہ حضرت براء بن عازب ؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ مدینہ تشریف لائے تو انصار کے یہاں اپنے اجداد - یا فرمایا: نانہال - میں قیام فرمایا، آپ ﷺ نے سولہ یا سترہ ماہ تک بیت المقدس کی جانب رخ کر کے نماز پڑھی، البتہ آپ چاہتے تھے کہ آپ کا قبلہ بیت اللہ (کعبہ) کی جانب ہو، جب بیت اللہ کی طرف نماز پڑھنے کا حکم ہو گیا تو سب سے پہلی نماز جو آپ ؐ نے بیت اللہ کی جانب پڑھی وہ عصر کی نماز تھی، وہاں آپ ؐ کے ساتھ لوگوں نے نماز پڑھی، پھر آپ ؐ کے ساتھ نماز پڑھنے والوں میں سے ایک آدمی نکلا اور اس کا مسجد (بنی حارثہ) کی طرف گزر ہوا تو وہ لوگ رکوع میں تھے، اس نے کہا: میں اللہ کی گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول ﷺ کے ساتھ مکہ کی طرف نماز پڑھی ہے، یہ سن کر وہ لوگ اسی حالت میں بیت اللہ کی جانب ہو گئے اور جب رسول ﷺ بیت المقدس کی جانب رخ کر کے نماز پڑھتے تھے تو اہلِ کتاب بطور خاص یہود خوش ہوتے تھے، مگر جب آپ ؐ نے بیت اللہ کی جانب رخ کر کے لیا تو انہیں یہ بات ناگوار گزری۔ (صحیح بخاری: 40، صحیح مسلم:525)

اس واقعہ کے بارے میں بہت سی اہم آیات نازل ہوئی ہیں جن میں امت مسلمہ کے لئے اہم اسباق و دروس اور عبرتیں موجود ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِن رَّبِّكَ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿١٤٩﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿١٥٠﴾ كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴿١٥١﴾ فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ ﴿١٥٢﴾﴾ ترجمہ: ’’تمہارا گزر جس مقام سے بھی ہو، وہیں اپنا رُخ (نماز کے وقت) مسجد حرام کی طرف پھیر دو، کیونکہ یہ تمہارے رب کا بالکل حق فیصلہ ہے اور اللہ تم لوگوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے، اور جہاں سے بھی تمہارا گزر ہو، اپنا رُخ مسجد حرام کی طرف پھیرا کرو، اور جہاں بھی تم ہو، اُسی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھو تاکہ لوگوں کو تمہارے خلاف کوئی حجت نہ ملے، ہاں جو ظالم ہیں اُن کی زبان کسی حال میں بند نہ ہو گی تو اُن سے تم نہ ڈرو، بلکہ مجھ سے ڈرو، اور اس لئے کہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کر دوں اور اس توقع پر کہ میرے اس حکم کی پیروی سے تم اسی طرح فلاح کا راستہ پاؤ گے۔ جس طرح (تمہیں اِس چیز سے فلاح نصیب ہوئی کہ) میں نے تمہارے درمیان خود تم میں سے ایک رسول بھیجا جو تمہیں میری آیات سناتا ہے، تمہاری زندگیوں کو سنوارتا ہے، تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، اور تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہ جانتے تھے۔ لہٰذا تم مجھے یاد رکھو، میں تمہیں یاد رکھوں گا اور میرا شکر ادا کرو، کفرانِ نعمت نہ کرو‘‘۔ (سورۃ البقرۃ: 149-152)

۞یہود کی جانب سے ہونے والے تبصرے کی پیشن گوئی کرتے ہوئے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿سَيَقُولُ ٱلسُّفَهَآءُ مِنَ ٱلنَّاسِ مَا وَلَّىٰهُمۡ عَن قِبۡلَتِهِمُ ٱلَّتِي كَانُواْ عَلَيۡهَاۚ قُل لِّلَّهِ ٱلۡمَشۡرِقُ وَٱلۡمَغۡرِبُۚ يَهۡدِي مَن يَشَآءُ إِلَىٰ صِرَٰطٖ مُّسۡتَقِيمٖ﴾ ترجمہ: ''نادان لوگ ضرور کہیں گے: اِنہیں کیا ہوا کہ پہلے یہ جس قبلہ کی طرف رخ کرکے نماز پڑھتے تھے اس سے یکایک پھر گئے؟ اے نبی، ان سے کہو: "مشرق اور مغرب سب اللہ کے ہیں، اللہ جسے چاہتا ہے سیدھی راہ دکھا دیتا ہے''۔(سورۃ البقرہ: 142)

اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعہ آگاہ کردیا ہے کہ تحویلِ قبلہ کی وجہ سے یہود کیا کچھ تبصرے کریں گے اور یہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی بتا دیا تھا، اس میں نبوت محمدی ؐ کی واضح دلیل موجود ہے، اس لئے کہ یہ خبر غیب سے متعلق تھی جو بالفعل بعد میں واقع ہوئی، جس سے واضح ہو گیا کہ محمد ﷺ نبی اور رسول ہیں جن کو بذریعۂ وحی واقع ہونے والے امور کے متعلق آگاہ کیا جاتا ہے۔

اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مشکلات پیدا ہونے سے پہلے ہی ان کا علاج کیا گیا، تاکہ مسلمان ان مشکلات پر غالب ہونے کے لئے اور ان کو دور کرنے کے لئے تیاری کریں، اس لئے کہ اگر اچانک ایسی صورت حال پیش آتی ہے تو نفس پر یہ شاق گزرتا، لیکن جب پہلے سے وہ اس کے بارے میں آپس میں بات چیت کریں گے تو اس گفتگو کے ذریعہ وہ نفسیاتی طور پر تیار رہیں گے اور مشکلات کا سامنا کرنے کے لئے وہ تیار رہیں گے، اللہ تعالیٰ نے یہاں پر یہود کو بیوقوف قرار دیا ہے، اس لئے کہ انہوں نے تحویلِ قبلہ پر اعتراض کیا اور رسول ﷺ کے خلاف سازشوں کا جال بچھایا۔ ابوسعود ؒ فرماتے ہیں: سفہاء اور بیوقوف وہ ہیں جن کی کم عقلی نمایاں ہو اور دوسروں کی تقلید کے ذریعہ اپنی عقل سے کام نہ لیتے ہوں، اور غور و فکر اور تدبر سے اعراض کرتے ہوں، سفہاء سے یہاں یہود مراد ہیں۔(تفسیر أبي السعود: 1/170)

۞ایک دوسرے مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَكَذَٰلِكَ جَعَلۡنَٰكُمۡ أُمَّةٗ وَسَطٗا لِّتَكُونُواْ شُهَدَآءَ عَلَى ٱلنَّاسِ وَيَكُونَ ٱلرَّسُولُ عَلَيۡكُمۡ شَهِيدٗاۗ وَمَا جَعَلۡنَا ٱلۡقِبۡلَةَ ٱلَّتِي كُنتَ عَلَيۡهَآ إِلَّا لِنَعۡلَمَ مَن يَتَّبِعُ ٱلرَّسُولَ مِمَّن يَنقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيۡهِۚ وَإِن كَانَتۡ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى ٱلَّذِينَ هَدَى ٱللَّهُۗ وَمَا كَانَ ٱللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَٰنَكُمۡۚ إِنَّ ٱللَّهَ بِٱلنَّاسِ لَرَءُوفٞ رَّحِيمٞ﴾ ترجمہ: ''اور اِسی طرح تو ہم نے تمہیں ایک "امت وسط" بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو پہلے جس طرف تم رخ کرتے تھے، اس کو تو ہم نے صرف یہ دیکھنے کے لئے قبلہ مقرر کیا تھا کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون الٹا پھر جاتا ہے، یہ معاملہ تھا تو بڑا سخت، مگر اُن لوگوں کے لئے کچھ بھی سخت نہ ثابت ہوا جو اللہ کی ہدایت سے فیضیاب تھے، اللہ تمہارے اس ایمان کو ہرگز ضائع نہ کرے گا، یقین جانو کہ وہ لوگوں کے حق میں نہایت شفیق و رحیم ہے''۔(سورۃ البقرہ: 143)

اس آیت کے ذریعہ تذکیر کی جارہی ہے کہ بیت المقدس کی جانب رخ کرکے نماز پڑھنا ایک آزمائش تھی اور بیت المقدس کے بعد خانہ کعبہ کی جانب رخ کرنا بھی ایک امتحان تھا، علامہ بیضاوی ؒ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں: "ہم نے بیت المقدس کو آپ کا قبلہ اس لئے بنایا تاکہ ہم جان لیں کہ کون رسول کی اتباع کرتا ہے اور کون الٹے پاؤں بھاگتا ہے، اس کے ذریعہ لوگوں کو پرکھنا اور جانچنا مقصود تھا کہ کون اس کی

طرف رخ کرکے آپ کی اتباع کرتا ہے اور کون اپنے آباء کے قبلہ کو اختیار کرکے آپ کے دین سے اعراض کرتا ہے۔(تفسیر بیضاوی، بحوالہ: الصراع مع الیہود: 1/101)

ابتدا میں خانہ کعبہ کی طرف رخ کرکے نماز پڑھنا، اس کے بعد بیت المقدس کی طرف رخ کرنا اور پھر دوبارہ خانہ کعبہ کی طرف رخ کرنا اور پھر اسی پر برقرار رہنا، اس میں بنیادی طور پر اللہ سبحانہ وتعالی کا حکم اصل حیثیت رکھتا ہے، ہر حالت میں اللہ کے حکم کے مطابق رخ کرنا عبادت ہے اور لوگوں کا کام یہ ہے کہ وہ اللہ کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کریں اور جو رسول کی اتباع کرتے ہوئے قبلہ کے بارے میں آپؐ کے حکم کو مانتا ہے تو وہ امتحان اور آزمائش میں کامیاب وکامران ہے اور جو شخص احکامِ شریعت میں سے کسی حکم کی مخالفت کرتا ہے وہ ہلاکت کی دلدل میں گر گیا، حقیقی ایمان وہ ہے جو صاحبِ ایمان کو اتباع اور خواہش نفس کی مخالفت پر آمادہ کرے۔ (دیکھیں: الصراع مع الیہود: 1/101)

تحویل قبلہ کے موقع پر صحابہ کرام نے ثابت قدمی دکھائی اور اللہ تعالی کے احکام واوامر پر لبیک کہا، حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ لوگ مسجد قباء میں فجر کی نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ نبی کریم ﷺ پر قرآن نازل ہوا ہے اور آپؐ کو کعبہ کی جانب رخ کرکے نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے، لہذا آپ بھی اسی کی طرف رخ کرکے نماز پڑھیں، یہ سن کر وہ سب کعبہ کی طرف مڑ گئے۔(دیکھیں: تفسیر ابن کثیر: 1/337)

مذکورہ آیت کریمہ سے واضح ہوتا ہے کہ اہل ایمان اپنے بھائیوں کے تئیں کتنے خیر خواہ تھے، اس لئے کہ جب تحویل قبلہ سے متعلق آیات نازل ہوئیں تو اہل ایمان اپنے ان بھائیوں کے بارے میں سوال کرنے لگے جن کا انتقال ہو گیا تھا اور انہوں نے بیت المقدس کی جانب رخ کرکے نماز پڑھی تھی، اللہ تعالی نے واضح کر دیا کہ ان کی نماز قبول ہے، حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں: جب نبی کریم ﷺ کو کعبہ کی جانب رخ کرنے کا حکم دیا گیا تو صحابہ کرام نے عرض کیا: ہمارے ان بھائیوں کا کیا ہوگا جن کا انتقال ہو گیا ہے اور وہ بیت المقدس کی جانب نماز پڑھتے رہے؟ اس پر اللہ تعالی نے یہ آیت نازل کی: ﴿وَمَا كَانَ ٱللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَـٰنَكُمْۚ إِنَّ ٱللَّهَ بِٱلنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ﴾ ترجمہ: "اللہ تمہارے اس ایمان کو ہرگز ضائع نہ کرے گا، یقین جانو کہ وہ لوگوں کے حق میں نہایت شفیق ورحیم ہے"۔(سورۃ البقرہ: 143) (سنن ابوداؤد: 4680، سنن ترمذی: 2964، مسند احمد: 1/295، 304، 322، 347)

اس کے ذریعہ اہل ایمان کو مطمئن کیا گیا اور ان کے قلق اور اضطراب کو دور کر دیا گیا۔

❁ اسی ضمن میں ارشاد ہے: ﴿قَدْ نَرَىٰ تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي ٱلسَّمَآءِۖ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَىٰهَاۚ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ ٱلْمَسْجِدِ ٱلْحَرَامِۚ وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّوا۟ وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُۥۗ وَإِنَّ ٱلَّذِينَ أُوتُوا۟ ٱلْكِتَـٰبَ لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ ٱلْحَقُّ مِن رَّبِّهِمْۗ وَمَا ٱللَّهُ بِغَـٰفِلٍ عَمَّا يَعْمَلُونَ ﴿١٤٤﴾ وَلَئِنْ أَتَيْتَ ٱلَّذِينَ أُوتُوا۟ ٱلْكِتَـٰبَ بِكُلِّ ءَايَةٍ مَّا تَبِعُوا۟ قِبْلَتَكَۚ وَمَآ أَنتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْۚ وَمَا بَعْضُهُم بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍۚ وَلَئِنِ ٱتَّبَعْتَ أَهْوَآءَهُم مِّنۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ ٱلْعِلْمِ إِنَّكَ إِذًا لَّمِنَ

ٱلظَّـٰلِمِينَ ﴿١٤٥﴾ ٱلَّذِينَ ءَاتَيۡنَـٰهُمُ ٱلۡكِتَـٰبَ يَعۡرِفُونَهُۥ كَمَا يَعۡرِفُونَ أَبۡنَآءَهُمۡۖ وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنۡهُمۡ لَيَكۡتُمُونَ ٱلۡحَقَّ وَهُمۡ
يَعۡلَمُونَ ﴿١٤٦﴾ ٱلۡحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ ٱلۡمُمۡتَرِينَ ﴿١٤٧﴾ وَلِكُلٍّ وِجۡهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَاۖ فَٱسۡتَبِقُواْ ٱلۡخَيۡرَٰتِۚ أَيۡنَ
مَا تَكُونُواْ يَأۡتِ بِكُمُ ٱللَّهُ جَمِيعًاۚ إِنَّ ٱللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيۡءٖ قَدِيرٞ ﴿١٤٨﴾ ترجمہ: ”یہ تمہارے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا ہم دیکھ رہے ہیں لو، ہم اُسی قبلے کی طرف تمہیں پھیرے دیتے ہیں جسے تم پسند کرتے ہو، مسجد حرام کی طرف رُخ پھیر دو، اب جہاں کہیں تم ہو اُسی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرو، یہ لوگ جنہیں کتاب دی گئی تھی خوب جانتے ہیں کہ (تحویلِ قبلہ کا) یہ حکم ان کے رب ہی کی طرف سے ہے اور برحق ہے مگر اس کے باوجود جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔ تم ان اہل کتاب کے پاس خواہ کوئی نشانی لے آؤ، ممکن نہیں کہ یہ تمہارے قبلہ کی پیروی کرنے لگیں، اور نہ تمہارے لئے یہ ممکن ہے کہ ان کے قبلے کی پیروی کرو، اور ان میں سے کوئی گروہ بھی دوسرے کے قبلے کی پیروی کے لئے تیار نہیں ہے، اور اگر تم نے اس علم کے بعد جو تمہارے پاس آچکا ہے، ان کی خواہشات کی پیروی کی تو یقیناً تمہارا شمار ظالموں میں ہوگا، جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اِس مقام کو (جسے قبلہ بنایا گیا ہے) ایسا پہچانتے ہیں جیسا اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں مگر ان میں سے ایک گروہ جانتے بوجھتے حق کو چھپا رہا ہے۔ یہ قطعی ایک امرِ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے، لہٰذا اس کے متعلق تم ہرگز کسی شک میں نہ پڑو۔ ہر ایک کے لئے ایک رُخ ہے جس کی طرف وہ مڑتا ہے پس بھلائیوں کی طرف سبقت کرو، جہاں بھی تم ہوگے اللہ تمہیں پالے گا، اُس کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں“۔ (سورۃ البقرہ: 144-148)

رسول ﷺ کی خواہش تھی کہ آپ اپنے جدِ امجد حضرت ابراہیم -علیہ السلام- کے قبلہ کی جانب رخ کر کے نماز پڑھیں، آپؐ اس کے سب سے زیادہ اہل تھے، اس لئے کہ آپؐ حضرت ابراہیمؑ کی دعا کا ثمرہ اور پیغامِ توحید کے حامل و علمبردار تھے، آپؐ چاہتے تھے کہ آپؐ ان ادیانِ سابقہ کے ماننے والوں سے ممتاز و مستقل ہوتے جنہوں نے تحریف و تبدیلی اور ردّوبدل سے کام لیا، جیسے کہ یہود و نصاریٰ کا رویہ رہا ہے، اسی لئے آپ ﷺ ان کی تقلید اور ان سے مشابہت سے منع فرماتے تھے، بلکہ آپؐ ان کی مخالفت کا حکم دیتے تھے اور انہی کی طرح انحرافات اور غلطیوں کا شکار ہونے کے بارے میں ڈراتے تھے، اسی خواہش کے تقاضے کے مطابق آپؐ چاہتے تھے کہ اُبوالانبیاء کے قبلہ کی جانب دائمی طور پر رخ کر کے نماز پڑھیں، اور یہی لوگوں کی عبادت کے لئے وضع کیا گیا پہلا گھر ہے۔

بے شک تحویلِ قبلہ کے واقعہ کے بہت سے پہلو ہیں جن میں سیاسی، عسکری، دینی اور تاریخی تمام پہلو شامل ہیں، اس کا سیاسی پہلو یہ ہے کہ اس نے جزیرۃ العرب کو بڑے واقعات کا مرکز و محور بنا دیا۔ اس کا تاریخی پہلو یہ ہے کہ اس نے اس علاقہ کو ابراہیمؑ کی عربی میراث کے ساتھ مربوط کر دیا۔ اس کا عسکری پہلو یہ ہے کہ اس نے فتح مکہ کے لئے اور مسجد حرام کی افسوسناک صورتحال کو تبدیل کرنے کا راستہ ہموار کیا، اس لئے کہ مرکزِ توحید خانہ کعبہ بت پرستی کا مرکز بن چکا تھا۔ اور اس کا دینی اور مذہبی پہلو یہ ہے کہ اس واقعہ نے قلب و ضمیر کو حنیفیت کے ساتھ مربوط کر دیا اور امت مسلمہ کو دیگر اقوام سے اور اسلامی عبادت کو بقیہ ادیان کی عبادت کے مقابلہ میں امتیازی مقام عطا کیا۔

اس کے بعد ارشاد ہے: ﴿وَمِنۡ حَيۡثُ خَرَجۡتَ فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ ٱلۡمَسۡجِدِ ٱلۡحَرَامِۖ وَإِنَّهُۥ لَلۡحَقُّ مِن رَّبِّكَۗ وَمَا ٱللَّهُ بِغَٰفِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُونَ ۝١٤٩ وَمِنۡ حَيۡثُ خَرَجۡتَ فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ ٱلۡمَسۡجِدِ ٱلۡحَرَامِۚ وَحَيۡثُ مَا كُنتُمۡ فَوَلُّواْ وُجُوهَكُمۡ شَطۡرَهُۥ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيۡكُمۡ حُجَّةٌ إِلَّا ٱلَّذِينَ ظَلَمُواْ مِنۡهُمۡ فَلَا تَخۡشَوۡهُمۡ وَٱخۡشَوۡنِي وَلِأُتِمَّ نِعۡمَتِي عَلَيۡكُمۡ وَلَعَلَّكُمۡ تَهۡتَدُونَ ۝١٥٠ كَمَآ أَرۡسَلۡنَا فِيكُمۡ رَسُولٗا مِّنكُمۡ يَتۡلُواْ عَلَيۡكُمۡ ءَايَٰتِنَا وَيُزَكِّيكُمۡ وَيُعَلِّمُكُمُ ٱلۡكِتَٰبَ وَٱلۡحِكۡمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمۡ تَكُونُواْ تَعۡلَمُونَ ۝١٥١ فَٱذۡكُرُونِيٓ أَذۡكُرۡكُمۡ وَٱشۡكُرُواْ لِي وَلَا تَكۡفُرُونِ ۝١٥٢﴾ ترجمہ: ”تمہارا گزر جس مقام سے بھی ہو، وہیں اپنا رُخ (نماز کے وقت) مسجد حرام کی طرف پھیر دو، کیونکہ یہ تمہارے رب کا بالکل حق فیصلہ ہے اور اللہ تم لوگوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے، اور جہاں سے بھی تمہارا گزر ہو، اپنا رُخ مسجد حرام کی طرف پھیرا کرو، اور جہاں بھی تم ہو، اُسی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھو تاکہ لوگوں کو تمہارے خلاف کوئی حجت نہ ملے، ہاں جو ظالم ہیں اُن کی زبان کسی حال میں بند نہ ہوگی تو اُن سے تم نہ ڈرو، بلکہ مجھ سے ڈرو، اور اس لئے کہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کر دوں اور اس توقع پر کہ میرے اس حکم کی پیروی سے تم اسی طرح فلاح کا راستہ پاؤ گے۔ جس طرح (تمہیں اِس چیز سے فلاح نصیب ہوئی کہ) میں نے تمہارے درمیان خود تم میں سے ایک رسول بھیجا جو تمہیں میری آیات سناتا ہے، تمہاری زندگیوں کو سنوارتا ہے، تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، اور تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہ جانتے تھے۔ لہٰذا تم مجھے یاد رکھو، میں تمہیں یاد رکھوں گا اور میرا شکر ادا کرو، کفرانِ نعمت نہ کرو“۔ (سورۃ البقرۃ: 149-152)

ان آیات کے ذریعہ بتایا گیا کہ بلاشبہ تمہارے اصل قبلہ کی جانب آپ کو متوجہ کرنا اور آپ کو امتیازی مقام دینا، آپ پر اللہ کی ایک اہم نعمت ہے، اس سے پہلے تم پر اللہ کی بہت سی نعمتوں کا نزول ہو چکا ہے جن میں چند نعمتیں مندرجہ ذیل ہیں:

۞ ﴿كَمَآ أَرۡسَلۡنَا فِيكُمۡ رَسُولٗا منكم﴾: مربیوں اور داعیوں کے امام رسول ﷺ کی شخصیت کا وجود اس قائدانہ جماعت کی خصوصیت ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے یہ اعزاز عطا کیا ہے کہ اس کی تربیت کی ذمہ داری آپ ﷺ کو دی گئی جو نفس کی باریکیوں کو سمجھنے والے، دلوں کے طبیب اور ذہن و دماغ کے لئے نور ہیں آپؐ نور و برہان اور حجت ہیں۔

۞﴿يَتۡلُواْ عَلَيۡكُمۡ ءَايَٰتِنَا﴾: تعمیر و تربیت کا بنیادی نصاب کلام الٰہی ہے اور ابتدائی مرحلہ میں تازہ بتازہ اس کے نزول کی وجہ سے ایک تحریک مل جاتی تھی جس کی وجہ سے تاریخ انسانی کی ایک ممتاز اور نمایاں نسل تیار ہو گئی۔

۞﴿وَيُزَكِّيكُمۡ﴾: معلم و مربی رسول ﷺ تربیت کے ذمہ دار تھے، آپؐ کی ذات گرامی اخلاقِ کریمانہ اور احکام قرآنی کی تطبیق و نفاذ کے اعتبار سے اس مقام پر فائز تھی کہ اللہ تعالیٰ نے بذاتِ خود آپ ﷺ کے بارے میں گواہی دی کہ [وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيۡمٍ] ترجمہ: ”اور بے شک آپ اخلاق کے بڑے مقام پر فائز ہو“۔ (سورۃ القلم: 4)

کسی نبی کے بارے میں کوئی فردِ بشر جو اعلیٰ ترین منظر کشی اور وصف بیانی کر سکتا ہے وہ حضرت عائشہؓ نے آپ ﷺ کے بارے میں کی ہے، فرماتی ہیں کہ ''اللہ کے نبی ﷺ کے اخلاق سراپا قرآن تھے''۔(دیکھیں: الادب المفرد للبخاری: 308، مسند احمد: 6/91، سنن نسائی: 11287)

چنانچہ صحابہ کرام رسول ﷺ کی زبانی قرآن پاک کی تلاوت سنتے تھے اور نبی کریم ﷺ کے اخلاق میں قرآن کی عملی تصویر روئے زمین پر چلتی پھرتی قرآنی شخصیت میں دیکھتے تھے۔

❁ ﴿وَيُعَلِّمُكُمُ ٱلۡكِتَٰبَ وَٱلۡحِكۡمَةَ﴾: یہ ہے مشن اور ذمہ داری کہ صحابہ کرام کو کتاب وحکمت کی تعلیم دی جائے، امت میں قرآن کے مؤثر ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ایک ایسا ربّانی مربی ہو جو نفوس کا تزکیہ کرے اور دلوں کو پاک وصاف کرے اور قرآن کریم اور سید المرسلین کی سنت کے ذریعہ امت کو اللہ کی شریعت کی تعلیم دے، رسول ﷺ اپنے اصحاب کو تعلیم دیتے تھے اور ان کی تربیت کرتے تھے تاکہ وہ بھی ربانی منہج کے مطابق لوگوں کی تعلیم وتربیت کا کام انجام دیں، صحابہ کرام نے رسول ﷺ سے تعلیم وتربیت اور دعوت کا منہج سیکھا، اسی طرح امت کی قیادت کا طریقہ کار سیکھا، اس کے ذریعہ رسول ﷺ ایک نسل کو مکمل طور پر تیار کرنے میں اور قیادت کی اہل جماعت تیار کرنے میں کامیاب ہوگئے اور آپ ﷺ کے بعد صحابہ کرام اسی قرآنی اور نبوی تربیت کو لے کر ہر جگہ پہنچے اور شہادتِ حق کا فریضہ انجام دیتے رہے۔

❁ ﴿وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمۡ تَكُونُواْ تَعۡلَمُونَ﴾: صحابہ کرامؓ وحی اور رسالت سے پہلے کیا تھے اور وحی اور رسالت کے بعد وہ کیا بن گئے؟! ان کی زندگی جنگوں میں، باہمی کشمکش اور تاریک جاہلیت میں بسر ہو رہی تھی، لیکن اس کے بعد اللہ کے فضل واحسان کے نتیجہ میں وہ ایک ایسی عظیم امت بن گئے جس کے پاس زندگی میں ایک پیغام اور مقصد ہے، ان کو صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رضا کے حصول کی فکر دامن گیر ہوتی ہے، صحابہ کرام نے ایک اللہ کی عبودیت اور اس کی اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کو عملی زندگی میں اختیار کیا اور انفرادیت وانانیت کے طرزِ زندگی سے نکل کر اجتماعی نظامِ زندگی کی تعمیر، امت وریاست کی تشکیل اور ایک اعلی تہذیب کو بنانے کی فکر سے وابستہ ہوگئے اور وہ اللہ کے فضل وکرم سے دنیا کی عظیم ترین امت بن گئے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿كُنتُمۡ خَيۡرَ أُمَّةٍ أُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ تَأۡمُرُونَ بِٱلۡمَعۡرُوفِ وَتَنۡهَوۡنَ عَنِ ٱلۡمُنكَرِ وَتُؤۡمِنُونَ بِٱللَّهِۗ﴾ ترجمہ: ''اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت واصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو''۔(سورۃ آل عمران: 110)

ایک اور جگہ ارشاد ہے: ﴿وَكَذَٰلِكَ جَعَلۡنَٰكُمۡ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُواْ شُهَدَآءَ عَلَى ٱلنَّاسِ وَيَكُونَ ٱلرَّسُولُ عَلَيۡكُمۡ شَهِيدًاۗ﴾ ترجمہ: ''اور اسی طرح تو ہم نے تمہیں ایک "امت وسط" بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو''۔ (سورۃ البقرہ: 143)

۞﴿فَٱذۡكُرُونِيٓ أَذۡكُرۡكُمۡ وَٱشۡكُرُواْ لِي وَلَا تَكۡفُرُونِ﴾: یہ احسانات وانعامات اور یہ عطا اور خیر اس بات کی متقاضی ہیں کہ صبح و شام اللہ کے ذکر اور شکر سے زبانیں تر ہوں، اللہ ہی کے فضل و کرم کے نتیجہ میں ملأ اعلیٰ میں ان کا ذکر کیا جاتا ہے حالانکہ اس سے پہلے وہ ریگستانوں میں سر گرداں تھے اور صحراؤں میں ضائع ہو رہے تھے، اس لئے ان نعمتوں پر شکر گزاری ضروری ہے۔ (دیکھیں: التربیۃ القیادیۃ: 2/438- 442)

اس طرح سے قرآنی آیات عظیم واقعات کے ذریعہ صحابہ کرام کی تربیت کرتی تھیں اور ایک طاقتور مسلم شخصیت تیار کرتی تھیں جو اسلام ہی کو بحیثیتِ دین اختیار کرنے میں عزت محسوس کرتی تھی، قرآن کریم کے ذریعہ وہ یہود کی فطرت وطبیعت سے آگاہ ہوتے تھے اور ان کی اصل فطرت کو گہرائی کے ساتھ سمجھتے رہے یہاں تک کہ قرآنِ کریم اور نبوی تربیت کے نتیجہ میں وہ اسلامی شخصیت کے اعلیٰ مقام پر پہنچ گئے، اِرشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَن تَرۡضَىٰ عَنكَ ٱلۡيَهُودُ وَلَا ٱلنَّصَٰرَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمۡۗ قُلۡ إِنَّ هُدَى ٱللَّهِ هُوَ ٱلۡهُدَىٰۗ وَلَئِنِ ٱتَّبَعۡتَ أَهۡوَآءَهُم بَعۡدَ ٱلَّذِي جَآءَكَ مِنَ ٱلۡعِلۡمِ مَا لَكَ مِنَ ٱللَّهِ مِن وَلِيّٖ وَلَا نَصِيرٍ﴾ ترجمہ: ”یہودی اور عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کے طریقہ پر نہ چلنے لگو، صاف کہہ دو کہ راستہ بس وہی ہے جو اللہ نے بتایا ہے، ورنہ اگر اُس علم کے بعد جو تمہارے پاس آ چکا ہے، تم نے اُن کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی دوست اور مددگار تمہارے لئے نہیں ہے“۔ (سورۃ البقرہ:120)

۸) قرآنِ کریم میں مذکور یہود کی صفات:

یہودیوں کی تاریخ پر اور نبی مصطفی ﷺ کے ساتھ ان کے طرزِ عمل پر نظر رکھنے والا اُن بُرے افعال اور گھٹیا اخلاق کا مشاہدہ کر سکتا ہے جن سے یہ قوم متصف تھی، اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس طرح کے اخلاق رذیلہ ہر اس انسان کی فطرتِ ثانیہ بن جاتے ہیں جو صحیح دین اور صحیح عقیدہ سے آزاد ہو جاتا ہے۔

رسول ﷺ کو اور مسلمان کو یہود کی طرف سے سخت المناک مسائل اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا، قرآنِ کریم نے ان میں سے بعض سے پردہ اٹھایا ہے اور کتبِ حدیث، تاریخ اور سیرت یہود کے جرائم و واقعات سے بھری ہوئی ہیں، قرآن کریم نے اور سنت نبوی نے ان کی بُری صفات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، جیسے کہ نفاق، اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ بے ادبی، مکر و چالبازی، دھوکہ، مداہنت، علم سے فائدہ حاصل نہ کرنا، حسد و کینہ، نفرت، حسد، لالچ، بخل، احسان فراموشی، بے شرمی، غرور، تکبر، شہرت و ناموری کی خواہش، عبادت میں شرک، انبیاء وصالحین کے ساتھ جنگ و مقابلہ آرائی، اندھی تقلید، کتمانِ علم، معلومات میں تحریف، محرمات کے ارتکاب میں حیلہ، احکام کی تنفیذ میں طبقاتی تقسیم، رشوت خوری، جھوٹ، اور حرام خوری وغیرہ بُری صفات ان کے اندر پائی جاتی تھیں۔ (دیکھیں: الیہود فی السنۃ المطہرۃ: 2/507)

مندرجہ ذیل سطور میں ان میں سے بعض مذموم صفات کا ذکر کیا جا رہا ہے جو قرآنِ کریم میں مذکور ہیں:

۱: عبادت میں شرک:

یہود کی عبادت شرک پر مبنی اور باطل عبادت ہے، اس لئے کہ وہ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اللہ کی اولاد ہے اور وہ اللہ کے ساتھ عبادت میں دوسروں کو بھی شریک ٹھہراتے ہیں، قرآنِ کریم نے ان کے بعض مظاہرِ شرک کو واضح کیا ہے، اِرشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَقَالَتِ ٱلْيَهُودُ عُزَيْرٌ ٱبْنُ ٱللَّهِ وَقَالَتِ ٱلنَّصَٰرَى ٱلْمَسِيحُ ٱبْنُ ٱللَّهِ ۖ ذَٰلِكَ قَوْلُهُم بِأَفْوَٰهِهِمْ ۖ يُضَٰهِـُٔونَ قَوْلَ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ مِن قَبْلُ ۚ قَٰتَلَهُمُ ٱللَّهُ ۚ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ﴿٣٠﴾ ٱتَّخَذُوٓا۟ أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَٰنَهُمْ أَرْبَابًا مِّن دُونِ ٱللَّهِ وَٱلْمَسِيحَ ٱبْنَ مَرْيَمَ وَمَآ أُمِرُوٓا۟ إِلَّا لِيَعْبُدُوٓا۟ إِلَٰهًا وَٰحِدًا ۖ لَّآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ سُبْحَٰنَهُۥ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿٣١﴾﴾ ترجمہ: ”یہودی کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے، اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے، یہ بے حقیقت باتیں ہیں جو وہ اپنی زبانوں سے نکالتے ہیں اُن لوگوں کی دیکھا دیکھی میں جو ان سے پہلے کفر میں مبتلا ہوئے تھے، خدا کی مار ان پر، یہ کہاں سے دھوکہ کھا رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا ہے اور اسی طرح مسیح ابن مریم کو بھی، حالانکہ ان کو ایک معبود کے سوا کسی کی بندگی کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا، وہ جس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں، پاک ہے وہ ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں“۔ (سورۃ التوبہ: 30-31)

انہوں نے صرف زبانی شرک پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انہوں نے اپنے انبیاء اور صالحین کی عبادت بھی کی، ان کی قبروں کو سجدہ گاہ بنایا اور اللہ کے مقابلہ میں ان کو معبود بنایا، اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”اللہ تعالیٰ یہود کو غارت کرے انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنایا“۔ (صحیح البخاری: 437، صحیح مسلم: 530)

۲: انبیاء وصالحین کے ساتھ جنگ:

ایک طرف ہم یہود کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے احبار و رہبان کو معبودوں کے مقام تک پہنچا دیتے ہیں تو دوسری طرف ہم کو یہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہ وہ انبیاء وصالحین کے ساتھ جنگ اور مقابلہ آرائی کے مرتکب ہوتے ہیں، قسم قسم کے حربے اور وسائل اختیار کر کے ان پر حملے کرتے ہیں اور کسی بھی جرم کے ارتکاب سے کتراتے نہیں ہیں، یہاں تک کہ انہوں نے انبیاء کو قتل تک کر دیا، جیسے کہ انہوں نے حضرت زکریاؑ اور حضرت یحییٰؑ کے ساتھ کیا۔ (ایضاً: 2/509)

قرآن کریم نے اس طرح کے جرائم کا ذکر کیا ہے اور ان پر نازل ہونے والے قسم قسم کے عذاب کا بھی ذکر کیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ ٱلذِّلَّةُ وَٱلْمَسْكَنَةُ وَبَآءُو بِغَضَبٍ مِّنَ ٱللَّهِ ۗ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا۟ يَكْفُرُونَ بِـَٔايَٰتِ ٱللَّهِ وَيَقْتُلُونَ ٱلنَّبِيِّـۧنَ بِغَيْرِ ٱلْحَقِّ ۗ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوا۟ وَّكَانُوا۟ يَعْتَدُونَ﴾ ترجمہ: ”آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ ذلت و خواری اور پستی و بدحالی اُن پر مسلط ہو گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے، یہ نتیجہ تھا اس کا کہ وہ اللہ کی آیات سے کفر کرنے لگے اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرنے لگے، یہ نتیجہ تھا ان کی نافرمانیوں کا اور اس بات کا کہ وہ حدود شرع سے نکل نکل جاتے تھے“۔ (سورۃ البقرۃ: 61)

۳: کتمانِ علم اور حقائق میں تحریف:

بلاشبہ کتمانِ علم اور حقائق میں تحریف قدیم زمانہ سے ہی یہود کی لازمی صفات رہی ہیں، حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”بنی اسرائیل سے کہا گیا کہ: ﴿وَٱدۡخُلُواْ ٱلۡبَابَ سُجَّدٗا وَقُولُواْ حِطَّةٞ﴾ (ترجمہ: ”اور داخل ہو بستی کے دروازے میں سر جھکائے ہوئے اور کہتے جاؤ: حطۃ(یعنی: بخشش بخشش)“۔ مگر انہوں نے تبدیلی کر دی اور وہ اپنی سرینوں کے بل گھسٹتے ہوئے داخل ہوئے اور وہ کہنے لگے: "حبة في شعرة" یعنی: دانہ بال کے اندر ہونا چاہئے“۔(صحیح بخاری: 3403 صحیح مسلم: 3015)

سب سے اہم اور ضروری علم جس کو یہودی علماء اور احبار نے چھپایا اور اس کی حقیقت کو مخفی رکھنے کی کوشش کی وہ محمد ﷺ کی نبوت کا علم تھا، حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول ﷺ کے پاس رافع بن حارثہ، سلام بن مشکم، مالک بن الصیف اور رافع بن حُریملہ آئے اور کہنے لگے: اے محمدؐ! کیا آپ کا دعوی یہ نہیں ہے کہ آپ ابراہیم-علیہ السلام- کی ملت اور ان کے دین پر ہیں؟! اور ہمارے پاس جو تورات موجود ہے اس پر ایمان رکھتے ہیں اور گواہی دیتے ہیں کہ وہ اللہ کی طرف سے برحق ہے؟! اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: کیوں نہیں، میں یہ سب مانتا ہوں لیکن آپ نے اس میں نئی چیزیں داخل کر دی ہیں اور اس میں جو کچھ ہے اس کا انکار کرتے ہو، جس کا اللہ تعالیٰ نے تم سے عہد وپیمان لیا ہے اور اس میں سے وہ چیزیں چھپالی ہیں جن کے بارے میں تمہیں حکم تھا کہ ان کو لوگوں کے سامنے بیان کرو، لہذا میں تمہارے اس جرم سے اعلان براءت کرتا ہوں۔ وہ کہنے لگے: ہم اس پر عمل پیرا ہیں جو ہمارے پاس ہے، ہم ہدایت اور حق کی راہ پر ہیں، ہم نہ ہی آپ پر ایمان لاتے ہیں اور نہ ہی آپ کی اتباع کرتے ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں یہ آیات نازل فرمائیں: ﴿قُلۡ يَٰٓأَهۡلَ ٱلۡكِتَٰبِ لَسۡتُمۡ عَلَىٰ شَيۡءٍ حَتَّىٰ تُقِيمُواْ ٱلتَّوۡرَىٰةَ وَٱلۡإِنجِيلَ وَمَآ أُنزِلَ إِلَيۡكُم مِّن رَّبِّكُمۡۗ وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرٗا مِّنۡهُم مَّآ أُنزِلَ إِلَيۡكَ مِن رَّبِّكَ طُغۡيَٰنٗا وَكُفۡرٗاۖ فَلَا تَأۡسَ عَلَى ٱلۡقَوۡمِ ٱلۡكَٰفِرِينَ﴾ ترجمہ: ”صاف کہہ دو کہ اے اہل کتاب! تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو جب تک کہ توراۃ اور انجیل اور اُن دوسری کتابوں کو قائم نہ کرو جو تمہارے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہیں، یقیناً یہ فرمان جو تم پر نازل کیا گیا ہے ان میں سے اکثر کی سرکشی اور انکار کو اور زیادہ بڑھادے گا مگر انکار کرنے والوں کے حال پر کچھ افسوس نہ کرو“۔(سورۃ المائدہ: 68) (دیکھیں: سیرت ابن ہشام: 2/217، تفسیر ابن جریر: 6/310)

۴: آپسی افتراق وانتشار:

یہود ہمیشہ سے فکری اختلافات کا شکار رہے ہیں، احکام میں انتشار کا شکار رہے ہیں، آپ ان کو متحد و متفق سمجھتے ہو حالانکہ ان کے دل متفرق ومنتشر ہیں جیسے کہ اللہ-عزوجل-نے اپنے اس فرمان میں ارشاد فرمایا ہے: ﴿لَا يُقَٰتِلُونَكُمۡ جَمِيعًا إِلَّا فِي قُرٗى مُّحَصَّنَةٍ أَوۡ مِن وَرَآءِ جُدُرِۭۚ بَأۡسُهُم بَيۡنَهُمۡ شَدِيدٞۚ تَحۡسَبُهُمۡ جَمِيعٗا وَقُلُوبُهُمۡ شَتَّىٰۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمۡ قَوۡمٞ لَّا يَعۡقِلُونَ﴾ ترجمہ: ”یہ کبھی اکٹھے ہو کر (کھلے میدان میں) تمہارا مقابلہ نہ کریں گے، لڑیں گے بھی تو قلعہ بند بستیوں میں بیٹھ کر یا دیواروں کے پیچھے چھپ کر، یہ

آپس کی مخالفت میں بڑے سخت ہیں، تم انہیں اکٹھا سمجھتے ہو مگر ان کے دل ایک دوسرے سے پھٹے ہوئے ہیں، اِن کا یہ حال اِس لئے ہے کہ یہ بے عقل لوگ ہیں"۔(سورۃ الحشر:14)

۵: رشوت خوری:

یہود کی اپنے معاشرہ میں یہ پہچان ہے کہ وہ اپنے مفادات کے حصول کے لئے کہیں تک بھی جا سکتے ہیں اور اس سلسلہ میں مختلف طریقے اور وسائل اختیار کرتے ہیں، اگرچہ ان کو اپنی شریعت کی مخالفت ہی کیوں نہ کرنی پڑے، جیسے رشوت اور مالِ حرام کالین دین اور حرام خوری ان کی فطرتِ ثانیہ ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کی اس فطرت کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ﴿سَمَّٰعُونَ لِلۡكَذِبِ أَكَّٰلُونَ لِلسُّحۡتِۚ فَإِن جَآءُوكَ فَٱحۡكُم بَيۡنَهُمۡ أَوۡ أَعۡرِضۡ عَنۡهُمۡۖ وَإِن تُعۡرِضۡ عَنۡهُمۡ فَلَن يَضُرُّوكَ شَيۡـٔٗاۖ وَإِنۡ حَكَمۡتَ فَٱحۡكُم بَيۡنَهُم بِٱلۡقِسۡطِۚ إِنَّ ٱللَّهَ يُحِبُّ ٱلۡمُقۡسِطِينَ﴾ ترجمہ: "یہ جھوٹ سننے والے اور حرام مال کھانے والے ہیں، لہٰذا اگر یہ تمہارے پاس (اپنے مقدمات لے کر) آئیں تو تمہیں اختیار دیا جاتا ہے کہ چاہو ان کا فیصلہ کرو، ورنہ انکار کردو، انکار کردو تو یہ تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے، اور فیصلہ کرو تو پھر ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ کرو کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے"۔(سورۃ المائدہ:42)

۶: نفاق:

جب مدینہ منورہ میں مسلمانوں کو طاقت و قوت حاصل ہوگئی تو بعض زعمائے یہود نے بظاہر اسلام قبول کیا اور دل میں نفاق چھپا کر رکھا، اللہ تعالیٰ نے ان کی اس حرکت کا اپنے اس فرمان میں نوٹس لیا ہے: ﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمۡ ءَامِنُواْ كَمَآ ءَامَنَ ٱلنَّاسُ قَالُوٓاْ أَنُؤۡمِنُ كَمَآ ءَامَنَ ٱلسُّفَهَآءُۗ أَلَآ إِنَّهُمۡ هُمُ ٱلسُّفَهَآءُ وَلَٰكِن لَّا يَعۡلَمُونَ ۝١٣ وَإِذَا لَقُواْ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ قَالُوٓاْ ءَامَنَّا وَإِذَا خَلَوۡاْ إِلَىٰ شَيَٰطِينِهِمۡ قَالُوٓاْ إِنَّا مَعَكُمۡ إِنَّمَا نَحۡنُ مُسۡتَهۡزِءُونَ ۝١٤﴾ ترجمہ: "اور جب ان سے کہا گیا جس طرح دوسرے لوگ ایمان لائے ہیں اسی طرح تم بھی ایمان لاؤ تو انہوں نے یہی جواب دیا: کیا ہم بیوقوفوں کی طرح ایمان لائیں؟ خبردار! حقیقت میں تو یہ خود بیوقوف ہیں، مگر یہ جانتے نہیں ہیں۔ جب یہ اہلِ ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اور جب علیحدگی میں اپنے شیطانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اصل میں تو ہم تمہارے ساتھ ہیں اور ان لوگوں سے محض مذاق کر رہے ہیں"۔(سورۃ البقرۃ: 13-14)

۷: مداہنت اور برائیوں پر خاموشی:

یہود کی فطرت یہ ہے کہ وہ حالات اور ماحول کے اعتبار سے چلتے ہیں، جدھر ہوا کا رخ ہوتا ہے ادھر ہی چلنا شروع کر دیتے ہیں، وہ منکر اور برائیوں پر نکیر نہیں کرتے تھے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کی ہے اور اپنی کتاب عزیز میں ان پر لعنت کو لکھ دیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لُعِنَ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ مِنۢ بَنِيٓ إِسۡرَٰٓءِيلَ عَلَىٰ لِسَانِ دَاوُۥدَ وَعِيسَى ٱبۡنِ مَرۡيَمَۚ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَواْ وَّكَانُواْ يَعۡتَدُونَ ۝٧٨ كَانُواْ لَا يَتَنَاهَوۡنَ عَن مُّنكَرٖ فَعَلُوهُۚ لَبِئۡسَ مَا كَانُواْ يَفۡعَلُونَ ۝٧٩﴾ ترجمہ: "بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی اُن پر داؤدؑ اور عیسیٰ ابن مریمؑ کی زبان سے لعنت کی گئی کیونکہ وہ سرکش ہوگئے تھے اور زیادتیاں کرنے لگے

تھے۔اُنھوں نے ایک دوسرے کو بُرے افعال کے ارتکاب سے روکنا چھوڑ دیا تھا، بُرا طرزِ عمل تھا جو اُنھوں نے اختیار کیا"۔(سورۃ المائدہ: 78-79)

۸: علم سے فائدہ نہ اٹھانا:

اللہ تعالیٰ نے ان کی اس شرست کے بارے میں باخبر کیا ہے اور ان کی اس صفت کی باریک بینی کے ساتھ منظر کشی کی ہے،اِرشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿مَثَلُ ٱلَّذِينَ حُمِّلُواْ ٱلتَّوْرَىٰةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوهَا كَمَثَلِ ٱلْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًۢا ۚ بِئْسَ مَثَلُ ٱلْقَوْمِ ٱلَّذِينَ كَذَّبُواْ بِـَٔايَـٰتِ ٱللَّهِ ۚ وَٱللَّهُ لَا يَهْدِى ٱلْقَوْمَ ٱلظَّـٰلِمِينَ﴾ ترجمہ: "جن لوگوں کو توراۃ کا حامل بنایا گیا تھا مگر انہوں نے اس کا بار نہ اٹھایا،اُن کی مثال اُس گدھے کی سی ہے جس پر کتابیں لدی ہوئی ہوں،اِس سے بھی زیادہ بُری مثال ہے اُن لوگوں کی ہے جنھوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلا دیا ہے ایسے ظالموں کو اللہ ہدایت نہیں دیا کرتا"۔ (سورۃ الجمعہ: 5)

۹: نفرت و کینہ:

یہود کے دلوں میں جو روغ سب سے زیادہ پایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ ہر اس چیز کو ناپسند کرتے ہیں جس کا تعلق ان سے نہ ہو اور ہر اس شخص سے نفرت کرتے ہیں جو یہودی نہ ہو، چاہے اس کی نوع اور مصدر کچھ بھی ہو، خاص طور پر اگر اس کا کسی طرح کا بھی تعلق رسول ﷺ سے ہو تو وہ اس کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، جیسے کہ قبلہ کے معاملہ میں اور شراب کی حرمت کے معاملہ میں ہوا، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں: جب شراب کی حرمت سے متعلق آیت نازل ہوئی تو یہود کہنے لگے: آپ کے وہ بھائی جن کا انتقال ہو گیا کیا وہ شراب نہیں پیتے تھے؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿لَيْسَ عَلَى ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَعَمِلُواْ ٱلصَّـٰلِحَـٰتِ جُنَاحٌ فِيمَا طَعِمُوٓاْ إِذَا مَا ٱتَّقَواْ وَّءَامَنُواْ وَعَمِلُواْ ٱلصَّـٰلِحَـٰتِ ثُمَّ ٱتَّقَواْ وَّءَامَنُواْ ثُمَّ ٱتَّقَواْ وَّأَحْسَنُواْ ۗ وَٱللَّهُ يُحِبُّ ٱلْمُحْسِنِينَ﴾ ترجمہ:" جو لوگ ایمان لے آئے اور نیک عمل کرنے لگے انہوں نے پہلے جو کچھ کھایا پیا تھا اس پر کوئی گرفت نہ ہو گی، بشرطیکہ وہ آئندہ اُن چیزوں سے بچے رہیں جو حرام کی گئی ہیں اور ایمان پر ثابت قدم رہیں اور اچھے کام کریں، پھر جس جس چیز سے روکا جائے اس سے رکیں اور جو فرمانِ الٰہی ہو اُسے مانیں، پھر خدا ترسی کے ساتھ نیک رویہ رکھیں، اللہ نیک کردار لوگوں کو پسند کرتا ہے"۔(سورۃ المائدہ: 93 مستدرک حاکم: 4/143 - 144)

۱۰: حسد:

یہود نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ رسالت و نبوت کے بارے میں حسد کیا، اس لئے کہ وہ سمجھتے تھے کہ جس رسول کی بعثت ہونے والی ہے وہ انہیں میں سے ہو گا، وہ اس کے ارد گرد جمع ہو کر اپنے دشمنوں کے ساتھ لڑیں گے، لیکن جب رسول ﷺ کی بعثت ہوئی تو ان کا جنون آپے سے باہر ہو گیا اور انہوں نے اچھے بُرے کی تمیز کھو دی اور وہ آپ ﷺ کے ساتھ سخت ترین عداوت و دشمنی پر اتر آئے، اسی طرح ایمان و ہدایت کے بارے میں صحابہ کرام سے حسد کرنے لگے، اللہ نے اس سلسلہ میں ارشاد فرمایا: ﴿وَمِن شَرِّ ٱلنَّفَّـٰثَـٰتِ فِى

ٱلۡعُقَدِ ۝٤ وَمِن شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ ۝٥﴾ ترجمہ: ”اور گرہوں میں پھونکنے والیوں کے شر سے۔اور حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرے“۔(سورۃ الفلق:4-5)

اور جب یہود نے رسول ﷺ پر جادو کیا تو آپ ﷺ نے سورۃ الفلق اور سورۃ الناس کے ذریعہ حفاظتی اقدامات اختیار کئے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿وَدَّ كَثِيرٌ مِّنۡ أَهۡلِ ٱلۡكِتَٰبِ لَوۡ يَرُدُّونَكُم مِّنۢ بَعۡدِ إِيمَٰنِكُمۡ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنۡ عِندِ أَنفُسِهِم مِّنۢ بَعۡدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ ٱلۡحَقُّۖ فَٱعۡفُواْ وَٱصۡفَحُواْ حَتَّىٰ يَأۡتِيَ ٱللَّهُ بِأَمۡرِهِۦٓۗ إِنَّ ٱللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيۡءٍ قَدِيرٌ﴾ ترجمہ:”اہل کتاب میں سے اکثر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح تمہیں ایمان سے پھیر کر پھر کفر کی طرف پلٹالے جائیں اگرچہ حق ان پر ظاہر ہو چکا ہے، مگر اپنے نفس کے حسد کی بنا پر تمہارے لئے ان کی یہ خواہش ہے،اس کے جواب میں تم عفو و در گزر سے کام لو یہاں تک کہ اللہ خود ہی اپنا فیصلہ نافذ کردے،مطمئن رہو کہ اللہ تعالیٰ ' ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے“۔(سورۃ البقرۃ: 109)

۱۱: غرور و تکبر:

یہودی قدیم زمانہ سے ہی غرور و تکبر کا شکار رہے ہیں، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ تمام لوگوں سے بلند اور افضل ہیں، وہ یہ تصور رکھتے ہیں کہ وہ اللہ کی منتخب اور چنیدہ قوم ہیں اور جنت تو صرف یہودیوں کے لئے خاص ہے،اور یہودیت کا راستہ ہی ہدایت کا راستہ ہے اور اس کے سوا سب گمراہی ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ان کی اس مذموم خصلت کا ذکر کیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿وَقَالُواْ لَن يَدۡخُلَ ٱلۡجَنَّةَ إِلَّا مَن كَانَ هُودًا أَوۡ نَصَٰرَىٰۗ تِلۡكَ أَمَانِيُّهُمۡۗ قُلۡ هَاتُواْ بُرۡهَٰنَكُمۡ إِن كُنتُمۡ صَٰدِقِينَ﴾ ترجمہ: ”ان کا کہنا ہے کہ کوئی شخص جنت میں نہ جائے گا جب تک کہ وہ یہودی نہ ہو (یا عیسائیوں کے خیال کے مطابق) عیسائی نہ ہو، یہ ان کی تمنائیں ہیں، ان سے کہو: اپنی دلیل پیش کرو اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو“۔(سورۃ البقرۃ: 111)

رسول ﷺ کے مقابلہ میں مختلف طریقوں سے انہوں نے اپنے غرور و تکبر کا اظہار کیا، جیسے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول ﷺ کے پاس نعمان بن اُضاء، بحری بن عمرو اور شأس بن عدی آئے اور آپ ﷺ سے گفتگو کی اور آپؐ نے بھی ان کے ساتھ گفتگو کی اور ان کو اللہ کی طرف بلایا اور اس کے عذاب سے ڈرایا، وہ کہنے لگے: اے محمد! آپ ہمیں کس چیز سے ڈراتے ہو؟ ہم تو اللہ کی اولاد اور اس کے چہیتے ہیں- جیسے کہ عیسائی کہتے ہیں- ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی: ﴿وَقَالَتِ ٱلۡيَهُودُ وَٱلنَّصَٰرَىٰ نَحۡنُ أَبۡنَٰٓؤُاْ ٱللَّهِ وَأَحِبَّٰٓؤُهُۥۚ قُلۡ فَلِمَ يُعَذِّبُكُم بِذُنُوبِكُمۖ بَلۡ أَنتُم بَشَرٌ مِّمَّنۡ خَلَقَۚ يَغۡفِرُ لِمَن يَشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَآءُۚ وَلِلَّهِ مُلۡكُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضِ وَمَا بَيۡنَهُمَاۖ وَإِلَيۡهِ ٱلۡمَصِيرُ﴾ ترجمہ: ”یہود اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں، ان سے پوچھو: پھر وہ تمہارے گناہوں پر تمہیں سزا کیوں دیتا ہے؟ در حقیقت تم بھی ویسے ہی انسان ہو جیسے اور انسان خدا نے پیدا کئے ہیں، وہ جسے چاہتا ہے معاف کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے سزا دیتا ہے، زمین اور آسمان اور ان کی ساری موجودات اس کی ملک ہیں اور اسی کی طرف سب کو جانا ہے“۔(سورۃ المائدہ:18)

۱۲: بخل:

یہود کی پرانی صفت یہ رہی ہے کہ وہ مال میں بخل اور کنجوسی سے کام لیتے ہیں اور خیر کی راہوں میں خرچ نہیں کرتے ہیں، وہ انصار کے لوگوں کے پاس آتے تھے اور ان سے کہتے تھے: اپنا مال خرچ مت کرو، ہمیں ڈر ہے کہ مال ختم ہونے کی وجہ سے آپ محتاج نہ ہو جاؤ اور خرچ کرنے میں جلدی مت کرو، اس لئے کہ آپ کو معلوم نہیں ہے کہ بعد میں کہاں خرچ کرنا پڑے گا، اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ٱلَّذِينَ يَبۡخَلُونَ وَيَأۡمُرُونَ ٱلنَّاسَ بِٱلۡبُخۡلِ وَيَكۡتُمُونَ مَآ ءَاتَىٰهُمُ ٱللَّهُ مِن فَضۡلِهِۦۗ وَأَعۡتَدۡنَا لِلۡكَٰفِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا﴾ ترجمہ: ''اور ایسے لوگ بھی اللہ کو پسند نہیں ہیں جو کنجوسی کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی کنجوسی کی ہدایت کرتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے اسے چھپاتے ہیں، ایسے کافر نعمت لوگوں کے لئے ہم نے رسوا کن عذاب مہیا کر رکھا ہے''۔(سورۃ النساء: 37)

اسی طرح یہ بھی فرمایا: ﴿وَمَاذَا عَلَيۡهِمۡ لَوۡ ءَامَنُواْ بِٱللَّهِ وَٱلۡيَوۡمِ ٱلۡأٓخِرِ وَأَنفَقُواْ مِمَّا رَزَقَهُمُ ٱللَّهُۚ وَكَانَ ٱللَّهُ بِهِمۡ عَلِيمًا﴾ ترجمہ: ''آخر ان لوگوں پر کیا آفت آجاتی اگر یہ اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے اور جو کچھ اللہ نے دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے، اگر یہ ایسا کرتے تو اللہ سے ان کی نیکی کا حال چھپا نہ رہ جاتا''۔(سورۃ النساء: 39)

۱۳: عناد و دشمنی:

حضرت محمد ﷺ کی رسالت و نبوت کی صداقت پر دلائل و براہین واضح ہونے کے باوجود یہود نے اپنے عناد و دشمنی کی وجہ سے ایمان لانے سے انکار کیا اور وہ کفر و تکذیب میں منہمک رہے، اس لئے کہ عناد عقلوں پر خواہشات کا پردہ ڈال کر عقل کو مقفل کر دیتا ہے، اللہ عزوجل نے اپنے اس قول میں اس طرح کے طرزِ عمل کا ذکر کیا ہے: ﴿وَلَئِنۡ أَتَيۡتَ ٱلَّذِينَ أُوتُواْ ٱلۡكِتَٰبَ بِكُلِّ ءَايَةٖ مَّا تَبِعُواْ قِبۡلَتَكَۚ وَمَآ أَنتَ بِتَابِعٖ قِبۡلَتَهُمۡۚ وَمَا بَعۡضُهُم بِتَابِعٖ قِبۡلَةَ بَعۡضٖۚ وَلَئِنِ ٱتَّبَعۡتَ أَهۡوَآءَهُم مِّنۢ بَعۡدِ مَا جَآءَكَ مِنَ ٱلۡعِلۡمِ إِنَّكَ إِذٗا لَّمِنَ ٱلظَّٰلِمِينَ﴾ ترجمہ: ''تم ان اہلِ کتاب کے پاس خواہ کوئی نشانی لے آؤ، ممکن نہیں کہ یہ تمہارے قبلے کی پیروی کرنے لگیں اور نہ تمہارے لئے یہ ممکن ہے کہ ان کے قبلے کی پیروی کرو، اور ان میں سے کوئی گروہ بھی دوسرے کے قبلے کی پیروی کے لئے تیار نہیں ہے، اور اگر تم نے اس علم کے بعد جو تمہارے پاس آچکا ہے، ان کی خواہشات کی پیروی کی تو یقیناً تمہارا شمار ظالموں میں ہوگا''۔ (سورۃ البقرۃ: 145)

ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ قول بھی صادق آتا ہے: ﴿قُلِ ٱنظُرُواْ مَاذَا فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضِۚ وَمَا تُغۡنِي ٱلۡأٓيَٰتُ وَٱلنُّذُرُ عَن قَوۡمٖ لَّا يُؤۡمِنُونَ﴾ ترجمہ: ''اے پیغمبر! ان سے کہیے کہ دیکھو کہ کیا ہے آسمانوں اور زمین میں؟ اور نہیں کام آتیں نشانیاں اور ڈراوے ان لوگوں کو جو ایمان لانا نہیں چاہتے''۔ (سورۃ یونس: 101)

یہ بعض صفات اور کردار ہیں جو یہود کے اندر موجود ہیں اور جن کی جانب قرآن کریم نے اشارہ کیا ہے تاکہ ہم یہود کی حقیقت سے آگاہ ہو جائیں اور مسلمان کسی بھی وقت اور کسی زمان و مکان میں ان کے ذریعہ دھوکہ نہ کھائیں۔ (دیکھیں: دراسات فی السیرۃ، ص151)

۴: مفسدین کا عمل نا قابل اصلاح:

میثاقِ مدینہ کی دستاویز نے اس عادلانہ نظام کو بالکل واضح کر دیا جس کو بنیاد بنا کر نبی کریم ﷺ نے یہود کے ساتھ معاہدہ کیا اور اس میثاق نے ریاست کے تمام باشندوں کو مذہبی آزادی کا حقیقی مفہوم عطا کیا اور تعصب کو پسِ دیوار ڈال دیا، اور یہ کوئی مختصر مدتی حکمتِ عملی نہیں تھی کہ جب تک اللہ کے رسول ﷺ کے باہر کے دشمنوں کا تصفیہ ہو جائے اور اس کے بعد ان لوگوں کا تصفیہ شروع کیا جائے جن سے معاہدہ کیا گیا..... حاشا و کلا! ایسا بالکل بھی نہیں تھا، بلکہ یہ موقف شریعت ربانی سے مأخوذ اسلامی سیاست اور حکمتِ عملی کے عین مطابق اختیار کیا گیا تھا۔ (دیکھیں: العہد ولمیثاق فی القرآن الکریم، د-ناصر العمر، ص: 121)

رسول ﷺ نے یہود کے ساتھ ایسے معاہدے کئے جن کی وجہ سے اسلامی حکومت میں رہتے ہوئے ان کے لئے باعزت زندگی کی ضمانت ملتی تھی، اس لئے کہ وہ اہلِ کتاب اور ذمی لوگ تھے، لیکن یہود کی شرست میں غدر و خیانت اور بد عہدی شامل تھی اور وہ ان مذموم خصلتوں سے الگ نہ ہو سکے جس کی وجہ سے انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کئے ہوئے معاہدہ کو توڑ کر عہد شکنی کی، اور پھر ان کا انجام ان کے جرائم کے مطابق سامنے آیا کہ رسول اللہ ﷺ نے بنو قینقاع اور بنو نضیر کو جلا وطن کر دیا اور بنو قریظہ کے لوگوں کو قتل کیا، اس کا تفصیلی ذکر اسی کتاب میں آگے آرہا ہے، قرآنِ کریم نے یہود کی عہد شکنی کے مزاج سے پردہ اٹھایا ہے اور کہا ہے: ﴿ٱلَّذِينَ عَٰهَدتَّ مِنۡهُمۡ ثُمَّ يَنقُضُونَ عَهۡدَهُمۡ فِي كُلِّ مَرَّةٖ وَهُمۡ لَا يَتَّقُونَ﴾ ترجمہ: ”(خصوصاً) ان میں سے وہ لوگ جن کے ساتھ تو نے معاہدہ کیا پھر وہ ہر موقع پر اس کو توڑتے ہیں اور ذرہ برابر خدا کا خوف نہیں کرتے“۔ (سورۃ الأنفال: 56)

یہود نے رسول اللہ ﷺ اور اہلِ ایمان کے خلاف سازشیں کرنے اور مقابلہ کرنے کے لئے متنوع و متعدد وسائل اختیار کئے، لیکن یہ وسائل کامیاب نہ ہو سکے اور نہ ہی ان کے ذریعہ ان کو کچھ فائدہ حاصل ہو سکا، ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلم جماعت کا، ان کی حکومت کا اور ان کے سیاسی نظام کا خاتمہ کیا جائے، لیکن یہود کی کوششیں بار آور کیوں نہ ہو سکیں؟ اس کی بنیادی وجہ وہ بہترین نبوی تربیت ہے جس نے دلوں میں ایمان کے معانی کو پیوست کر دیا، اللہ کے لئے خالص عبودیت کو عملی جامہ پہنایا، شرک کی تمام شکلوں کا مقابلہ کیا اور صحابہ کرام کو عروج و سربلندی اور مادی و معنوی اسباب اختیار کرنے کی تعلیم دی، نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام کی تربیت اس طرح کی کہ ان کے اندر عزت و خوداری، شجاعت و بہادری، ظلم و زیادتی کے خلاف مقابلہ آرائی اور یہود کی سازشوں کے سامنے سپر انداز ہونے کی صفات پیدا ہوئیں، انہوں نے صبر و ثبات سے کام لیا یہاں تک کہ اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں فتح یاب ہو گئے۔ (دیکھیں: الصراع مع الیہود: 1/80)

یہود کی سازشیں انتہائی خطرناک اور شر پسندی پر مبنی تھیں کہ پہاڑ بھی ان کی وجہ سے دہل جاتے، لیکن نبوی قیادت کی وجہ سے اور منہج ربانی کی وجہ سے صحابہ کرام پر مشتمل پہلی جماعت کے مقابلہ میں وہ سازشیں کامیاب نہ ہو سکیں۔

آج مسلمان یہودی سازشوں اور منصوبوں کے سامنے سپر انداز ہو رہے ہیں، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ اصل تربیت اور یہود کے ساتھ تعامل کے سلسلہ میں نبوی منہج سے دور ہیں، امت کو آج ایسی ربانی قیادت کی شدید ضرورت ہے جو حکمت ودانائی اور بیدار مغزی سے کام لے، اللہ کی تائید وتوفیق اس کے ساتھ ہو اور وہ یہود کے اخلاق اور صفات سے واقف وباخبر ہو اور وہ ان کے ساتھ بیدار مغزی کے ساتھ ان اصول وضوابط کے مطابق معاملہ کر سکے جو نبوی سیاست سے مأخوذ ہوں، جیسے کہ آپ ﷺ نے اس منحرف انسانی گروہ کے ساتھ معاملہ فرمایا۔

موجودہ زمانہ میں زندگی کے متعدد شعبے اور حکومتیں یہود کے ناپاک اثرات سے متاثر ہوئے ہیں، ان کی ناپاک سازشوں اور منصوبوں کا ایک متعین مقصد ہے اور وہ ہے زمین میں فساد وبگاڑ پیدا کرنا، قرآن نے یہی تعبیر استعمال کی ہے: ﴿وَيَسْعَوْنَ فِي ٱلْأَرْضِ فَسَادًا﴾ ترجمہ: "یہ زمین میں فساد پھیلانے کی سعی کر رہے ہیں"۔(سورۃ المائدۃ: 64)

قرآنی تعبیر میں فعل مضارع کا استعمال کیا گیا ہے جو تجدّد واستمرار پر دلالت کرتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی طرف سے فساد وبگاڑ کی کوششیں کسی مخصوص تاریخی مرحلہ تک محدود نہیں ہیں بلکہ وہ قیامت تک فساد وبگاڑ کی اسی تگ ودو میں لگے رہیں گے، یہود اپنے منصوبہ بند مکروفریب اور سازشوں کے ذریعہ اقوام واُمم کے ایک معتدبہ سرمایہ پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں جبکہ ان کی سازشوں کو ناکام بنانے اور ان کے کھیل کو طشت ازبام کرنے پر قادر اسلامی وجود بھی ان کے مقابلہ سے غائب ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہود تخریب کاری اور بگاڑ میں اپنی مثال آپ ہیں، وہ حالات وواقعات سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور انہیں اپنی مصلحت اور فائدہ کے لئے استعمال کرتے ہیں، یہود کا بڑی بڑی حکومتوں میں اقتصادی، سیاسی اور صحافت اعتبار سے زبردست مؤثر وجود پایا جاتا ہے، وہ دو بین الاقوامی نظاموں: سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی نظام میں بھی غائب اور کنارہ کش نہیں تھے، اور نہ ہی دنیا میں پائے جانے والے بڑے انقلابات اور بغاوتوں سے وہ الگ تھلگ اور کنارہ کش تھے، اس وقت عالمی سطح پر کئی تنظیمیں موجود ہیں جو یہودی مقاصد کے حصول کے لئے پورے زور وشور سے لگی ہیں، جن میں نمایاں ترین ماسونیت، لائنز Lions Club روتاری Rotary اور "شہود یہوہ" Jehovah's Witnesses وغیرہ تنظیمیں ہیں۔

ایک واقف کار محقق کا یہ احساس ہے کہ اس سلسلہ میں شعوری یا غیر شعوری مبالغہ پایا جاتا ہے، بہت سے لوگوں کے ذہن ودماغ میں یہ تصویر رچ بس گئی ہے کہ یہود کا ہی پوری دنیا پر کنڑول ہے، وہی دنیا کے سیاسی اور فکری رہنما ہیں اور غیر یہودی شخصیات صرف شطرنج کے مہرے اور کٹھ پتلیاں ہیں جیسے کہ ولیم گائے کار کا کہنا ہے۔(دیکھیں: قضایا فی المنہج، سلمان العودۃ، ص،84-85)

کثیر تعداد میں بڑی بڑی کتابیں ہیں جو یہود کے بارے میں اور ان کے عالمی رول کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں، یہ کتابیں بھی یہود کے حق میں ماحول سازگار بنانے میں معاون بنتی ہیں اور امت کو لاحق ہونے والی تہذیبی وعسکری ناکامیوں کی تیار شدہ تفسیر فراہم کرتی ہیں۔

یہ احساس کہ ہر چیز یہود اور ان کی تنظیموں کے منصوبوں، سازشوں اور چالوں کے نتیجہ میں وجود میں آتی ہے، یہ احساس لوگوں کو مقابلہ آرائی اور کشمکش سے دور کر دیتا ہے، جو کچھ یہود کے بارے میں کہا جاتا ہے یہی کچھ ہر ایسے دشمن کے بارے میں کہا جا سکتا ہے جو فکری وعسکری دہشت گردی کی سیاست اختیار کرتا ہے۔ اس طرح کی تنظیموں اور افراد کے منصوبوں اور خرابیوں کے بارے میں بعض لوگ لکھتے اور بیان کرتے ہیں اور

اس کو بڑھاچڑھا کر اہمیت کے ساتھ بیان کرتے ہیں مگر جو بھی اس طرح کی منحرف اور نقصان دہ تنظیموں کے بارے میں گفتگو کرتا ہے، لکھتا ہے، یا خطاب کرتا ہے اس کی ملازمت، تجارت اور زندگی خطرات کا شکار ہو جاتی ہے، اس لئے بہت سے لوگ خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔

بلاشبہ اعدائے اسلام یہود و نصاریٰ کو اس طرح بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی کوئی میدانی حقیقت نہیں ہے، اس لئے کہ شیطانی کارندوں کی چالیں اور کوششیں چاہے کتنی بھی خطرناک اور بڑی ہوں وہ انتہائی کمزور ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ يُقَٰتِلُونَ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِۖ وَٱلَّذِينَ كَفَرُواْ يُقَٰتِلُونَ فِى سَبِيلِ ٱلطَّٰغُوتِ فَقَٰتِلُوٓاْ أَوۡلِيَآءَ ٱلشَّيۡطَٰنِۖ إِنَّ كَيۡدَ ٱلشَّيۡطَٰنِ كَانَ ضَعِيفًا﴾ ترجمہ: ’’جن لوگوں نے ایمان کا راستہ اختیار کیا ہے، وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور جنہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا ہے، وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں، پس شیطان کے ساتھیوں سے لڑو اور یقین جانو کہ شیطان کی چالیں حقیقت میں نہایت کمزور ہیں‘‘۔(سورۃ النساء:76)

اصل مسئلہ یہ ہے کہ ان کی قوت کا راز ہمارے ایمان کی کمزوری اور منہج ربانی سے ہماری دوری ہے، اس لئے کہ صحیح ایمان کے سامنے تمام سازشیں زمین بوس اور تمام منصوبے ناکام ہو جاتے ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ خوف کے عنصر کو ختم کیا جائے جس نے عزائم اور ہمتوں کا خون کیا ہے اور بہت سے اعمال کو رائیگاں کر دیا ہے۔

جب صبر و ثبات کی حامل صاحبِ ایمان جماعت کا وجود ہو گا تو تمام چالیں اور سازشیں ناکام ہو جائیں گی، چاہے یہود کی طرف سے ہوں یا کسی اور کی طرف سے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِن تَمۡسَسۡكُمۡ حَسَنَةٞ تَسُؤۡهُمۡ وَإِن تُصِبۡكُمۡ سَيِّئَةٞ يَفۡرَحُواْ بِهَاۖ وَإِن تَصۡبِرُواْ وَتَتَّقُواْ لَا يَضُرُّكُمۡ كَيۡدُهُمۡ شَيۡـًٔاۗ إِنَّ ٱللَّهَ بِمَا يَعۡمَلُونَ مُحِيطٞ﴾ ترجمہ: ’’تمہارا بھلا ہوتا ہے تو ان کو برا معلوم ہوتا ہے، اور تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ خوش ہوتے ہیں، مگر ان کی کوئی تدبیر تمہارے خلاف کارگر نہیں ہو سکتی بشرطیکہ تم صبر سے کام لو اور اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو، جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اُس پر حاوی ہے‘‘۔(سورۃ آل عمران:120)

لیکن اس کا ہر گز یہ مطلب نہیں ہے کہ دشمن کی طاقت و قوت سے غفلت برتی جائے یا اس کو ہلکا سمجھا جائے، چاہے دشمن کتنا ہی کمتر کیوں نہ ہو، چہ جائے کہ دشمن ہر قسم کے اسلحہ سے لیس ہو! ہم سے مطالبہ یہ ہے کہ ہم مد مقابل کے سلسلہ میں اعتدال کا راستہ اختیار کریں، نہ ہی اس میں مبالغہ کیا جائے اور نہ ہی اس کے بارے میں غفلت برتی جائے اور -ان شاءاللہ- یہود اور دیگر اعدائے دین کے بارے میں اللہ کا قانون نافذ ہو کر رہے گا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ ٱللَّهَ لَا يُصۡلِحُ عَمَلَ ٱلۡمُفۡسِدِينَ﴾ ترجمہ: ’’مفسدوں کے کام کو اللہ سدھرنے نہیں دیتا‘‘۔(سورۃ یونس: 81)

چوتھا باب
باطل طاقتوں کی سرکوبی کا قانون اور جہادی تحریک

ا: باطل طاقتوں کی سرکوبی کی قانون

باطل طاقتوں کے سلسلہ میں نبی کریم ﷺ نے ان کی سرکوبی کا طریقہ کار اختیار کیا تھا، جس کو قرآن کریم 'تدافع کا قانون' قرار دیتا ہے، مدنی دور میں یہ طریقہ کار بالکل واضح اور نمایاں طور پر نظر آتا ہے جبکہ نبی کریم ﷺ نے مشرکین کے خلاف سرایا اور دستے روانہ کرنا شروع کئے اور بنفس نفیس غزوات میں شریک رہے، اس سنت اور طریقہ کار کا اس دین کے غلبہ اور تمکین کے ساتھ انتہائی گہرا تعلق ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اس کی جانب اشارہ کیا ہے، اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں اس کی صراحت موجود ہے: ﴿وَلَوۡلَا دَفۡعُ ٱللَّهِ ٱلنَّاسَ بَعۡضَهُم بِبَعۡضٖ لَّفَسَدَتِ ٱلۡأَرۡضُ وَلَٰكِنَّ ٱللَّهَ ذُو فَضۡلٍ عَلَى ٱلۡعَٰلَمِينَ﴾ ترجمہ: ''اگر اس طرح اللہ انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعہ ہٹاتا نہ رہتا تو زمین کا نظام بگڑ جاتا، لیکن دنیا کے لوگوں پر اللہ کا بڑا فضل ہے (کہ وہ اِس طرح دفع فساد کا انتظام کرتا رہتا ہے)''۔ (سورۃ البقرہ: 251)

اسی طرح ارشاد ہے: ﴿ٱلَّذِينَ أُخۡرِجُواْ مِن دِيَٰرِهِم بِغَيۡرِ حَقٍّ إِلَّآ أَن يَقُولُواْ رَبُّنَا ٱللَّهُۗ وَلَوۡلَا دَفۡعُ ٱللَّهِ ٱلنَّاسَ بَعۡضَهُم بِبَعۡضٖ لَّهُدِّمَتۡ صَوَٰمِعُ وَبِيَعٞ وَصَلَوَٰتٞ وَمَسَٰجِدُ يُذۡكَرُ فِيهَا ٱسۡمُ ٱللَّهِ كَثِيرٗاۗ وَلَيَنصُرَنَّ ٱللَّهُ مَن يَنصُرُهُۥٓۚ إِنَّ ٱللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ﴾ ترجمہ: ''یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیئے گئے صرف اِس قصور پر کہ وہ کہتے تھے "ہمارا رب اللہ ہے"۔ اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجا اور معبد اور مسجدیں، جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے، سب مسمار کر ڈالی جائیں، اللہ ضرور اُن لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے، اللہ بڑا طاقتور اور زبردست ہے''۔ (سورۃ الحج: 40)

سورۃ البقرۃ کی مذکورہ آیت میں یہ بات قابل غور ہے کہ اس سے پہلے حق و باطل کے مابین کشمکش کے عملی نمونے کا ذکر کیا گیا ہے جس کے کردار طالوت اور اس کے ساتھ اہل ایمان کا لشکر بمقابلہ جالوت اور اس کے لشکر کی شکل میں نظر آتا ہے اور اللہ تعالیٰ آیت کا اختتام ان الفاظ کے ذریعہ کرتا ہے: ﴿وَلَٰكِنَّ ٱللَّهَ ذُو فَضۡلٍ عَلَى ٱلۡعَٰلَمِينَ﴾ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس طریقہ سے فساد و بگاڑ کا خاتمہ ایک انعام ہے جو تمام لوگوں کے لئے عام ہے۔ (مفاتیح الغیب للرازی: 3/514)

اسی طرح سورۂ حج کی آیت اللہ تعالیٰ کے اس اعلان کے بعد آئی ہے کہ وہ اپنے اہلِ ایمان اولیاء کی طرف سے دفاع کرے گا اور ان کو اپنے دشمن کے ساتھ قتال کی اجازت دی گئی ہے اور آیت کا اختتام ایک بنیادی قانون کے ذریعہ ہوتا ہے کہ ﴿وَلَيَنصُرَنَّ ٱللَّهُ مَن يَنصُرُهُۥٓۚ إِنَّ ٱللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ﴾۔

صحابہ کرام کو اس سنت کا اچھی طرح ادراک تھا اور وہ جانتے تھے کہ باطل کے خاتمہ اور زوال کے لئے ایک ایسی امت کی تشکیل ضروری ہے جس کے پاس قیادت اور ایک منہج و نظام ہو اور اس کے پاس ایسی قوت ہو جو باطل کو زیر کرنے اور ختم کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو، اور ان کو اس بات کا یقین تھا کہ حق کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ ایسے عزائم ہوں جو اس کو بلندی کی طرف لے جاسکیں، ایسے بازو ہوں جو اس کو اٹھا کر آگے لے جاسکیں، ایسے دل ہوں جو اس سے محبت و عقیدت رکھتے ہوں اور ایسے اعصاب ہوں جو اس کے ساتھ مربوط ہوں، ان کو نبی کریم ﷺ نے تعلیم دی تھی کہ اس سنت و قانون کے ساتھ کس طرح کا تعامل اختیار کریں، اس لئے ان کو جب اللہ تعالیٰ نے جہاد فی سبیل اللہ کا حکم دیا تو انہوں نے حکمِ الٰہی پر لبیک کہا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لئے جہاد مشروع کیا ہے اور اس کو قیامت تک کے لئے جاری رہنے والا فریضہ قرار دیا ہے جس کو کسی ظالم کا ظلم یا عادل کا عدل ختم نہیں کرسکتا ہے اور جس قوم نے بھی اس کو ترک کیا اللہ تعالیٰ نے ان کو ذلیل و خوار کردیا اور ان پر ان کے دشمن کو مسلط کردیا، اللہ تعالیٰ نے مختلف مراحل میں جہاد کو مشروع کیا تاکہ اس کے ذریعہ نفس کی تربیت ہو، وہ انسانی طبیعت کے موافق ہو اور دعوتی تحریک کے بھی عین مطابق ہو۔ (الہجرۃ فی القرآن الکریم، ص: 438)

قتال کی مشروعیت مندرجہ ذیل مراحل میں ہوئی:

پہلا مرحلہ: قتال ممنوع تھا، یہ وہ مرحلہ تھا جب کہ مسلمان مکہ میں تھے اور وہ نبی کریم ﷺ سے قتال کی اجازت طلب کررہے تھے تو نبی کریم ﷺ نے ان کو جواب دیا: صبر کرو، اس لئے کہ ابھی مجھے قتال کی اجازت نہیں ملی ہے۔ (تفسیر الکشاف، 4/199، تفسیر الآلوسی، 6/108)

دوسرا مرحلہ: بغیر وجوب کے صرف اجازت؛ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَٰتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُواْۚ وَإِنَّ ٱللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ﴾ ترجمہ: ''اجازت دے دی گئی اُن لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جارہی ہے، کیونکہ وہ مظلوم ہیں، اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے''۔ (سورۃ الحج: 39)

تیسرا مرحلہ: قتال کرنے والوں کے ساتھ قتال کا وجوب؛ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَقَٰتِلُواْ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ ٱلَّذِينَ يُقَٰتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوٓاْۚ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يُحِبُّ ٱلْمُعْتَدِينَ﴾ ترجمہ: ''اور تم اللہ کی راہ میں اُن لوگوں سے لڑو، جو تم سے لڑتے ہیں، مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا''۔ (سورۃ البقرۃ: 190)

چوتھا مرحلہ: اہلِ کفر کے ساتھ عمومی قتال؛ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَقَٰتِلُواْ ٱلْمُشْرِكِينَ كَآفَّةً كَمَا يُقَٰتِلُونَكُمْ كَآفَّةًۚ وَٱعْلَمُوٓاْ أَنَّ ٱللَّهَ مَعَ ٱلْمُتَّقِينَ﴾ ترجمہ: ''اور مشرکوں سے سب مل کر لڑو جس طرح وہ سب مل کر تم سے لڑتے ہیں اور جان رکھو کہ اللہ متقیوں ہی کے ساتھ ہے''۔ (سورۃ التوبہ: 36)

قتال کے حکم کے سلسلہ میں یہ تدریج اس لئے اختیار کی گئی کیونکہ نئی ابھرنے والی اسلامی حکومت اسی کی متقاضی تھی اور اسلامی فوج کی صورتحال بھی اسی تدریج کا تقاضا کرتی تھی کیونکہ وہ ابھی تعداد و تیاری کے اعتبار سے تشکیل کے مرحلہ سے گزر رہی تھی، اس لئے ضروری

تھا کہ جو کفارِ قریش اور اعدائے دعوت مسلمانوں کو ایذاء پہنچا رہے تھے اور ان کو ان کے گھروں سے نکلنے پر مجبور کر رہے تھے ان کے ساتھ تعرض اور مقابلہ ایک مرحلہ تک لزوم واجبار کے بجائے اختیاری ہوتا، جب تک کہ اسلامی حکومت اسلامی حکومت مضبوط و مستحکم ہو جائے اور اس کو طاقت و قوت مل جائے اور پھر وہ جزیرۃ العرب کی کفر کی طاقتوں کا مقابلہ کر سکے، اور اس وقت قتال واجب ہو جب کہ اسلامی حکومت اور اسلامی فوج کی صورتحال ایسی ہو کہ وہ کسی بھی ممکنہ حملہ کا مقابلہ کر سکے، اسی لئے ابتدائی مرحلہ میں صرف اجازت پر اکتفا کیا گیا۔

اور جہاں تک تعلق ہے اس صورتحال کا جبکہ مسلمان مدینہ میں ایک ریاست کے ماتحت رہتے تھے اور ان کو دشمن کے حملوں کا سامنا کرنا پڑا تو اس وقت قتال کی فرضیت کا حکم نازل ہوا، اس وقت یہ اختیاری معاملہ نہیں رہا اور نہ ہی ایسی صورتحال میں صرف اجازت کی حد تک محدود رہا، اس لئے کہ بیعتِ عقبہ ثانیہ میں بیعت حرب (جنگ کی بیعت) لی گئی تھی، جس کے بموجب انصار پر دعوتِ اسلامی، صاحبِ دعوت اور اہلِ ایمان کی طرف سے دفاع لازمی اور ضروری قرار پاتا تھا۔ (دیکھیں: القتال والجہاد، محمد خیر ہیکل 1/463 - 464)

قتال کی اجازت کا حکم نازل ہوتے ہی رسول ﷺ نے اپنے اصحاب کو قتال و جنگ کے فنون کی تربیت دینا شروع کی اور جنگی مشقوں میں، مڈ بھیڑوں میں اور معرکوں میں بنفس نفیس ان کے ساتھ شریک رہے اور اس طرح کی جدوجہد اور محنت کو اجر و ثواب اور عظیم عبادت کے طور پر انجام دیا، نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالی کے اس فرمان کو عملی جامہ پہنایا: ﴿وَأَعِدُّواْ لَهُم مَّا ٱسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ ٱلْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِۦ عَدُوَّ ٱللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَءَاخَرِينَ مِن دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ ٱللَّهُ يَعْلَمُهُمْ ۚ وَمَا تُنفِقُواْ مِن شَيْءٍ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لَا تُظْلَمُونَ﴾ ترجمہ: "اور تم لوگ، جہاں تک تمہارا بس چلے، زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے اُن کے مقابلہ کے لئے مہیا رکھو، تاکہ اس کے ذریعہ سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان دُوسرے اعداء کو خوف زدہ کرو جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے، اللہ کی راہ میں جو کچھ تم خرچ کرو گے اس کا پورا پورا بدل تمہاری طرف پلٹایا جائے گا اور تمہارے ساتھ ہر گز ظلم نہ ہو گا"۔ (سورۃ الانفال: 60)

نبی کریم ﷺ نے ایک مسلم سپاہی کو تیار کرنے میں دو متوازن منہج اختیار کئے: ۱) معنوی توجیہہ اور رہنمائی ۲) عملی مشق اور ٹریننگ۔

ا: معنوی رہنمائی:

اللہ کے رسول ﷺ مجاہدین کے مورال اور حوصلوں کو بلند رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے، ان کے اندر فتح و کامیابی اور حصولِ جنت کی امید پیدا کرتے، اور پھر یہی امید ایک مسلم سپاہی کے لئے میدانِ جنگ میں تحریک کا کام کرتی اور معرکوں میں فتح و کامیابی کے لئے یا پھر تلواروں کے سائے میں جامِ شہادت نوش کرنے کے لئے یہی امید ہر طرح کی نفسیاتی، فکری، جسمانی اور فنی صلاحیتیں قربان کرنے کے لئے مہمیز کا کام کرتی، جہاد کی ترغیب کے سلسلہ میں آپ ﷺ کے بہت سے اقوال وارد ہیں جیسے کہ: "اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے! اگر بعض اہل ایمان کے لئے یہ بات باعثِ رنج نہ ہوتی کہ میں ان کو چھوڑ کر جہاد کے لئے نکل جاؤں اور میرے پاس اتنی سواریاں میسر نہیں ہیں کہ ان سب کو سوار کر کے اپنے ساتھ لے جا سکوں تو میں کسی چھوٹے سے چھوٹے لشکر کے ساتھ جانے سے بھی نہ رکتا

جو اللہ کے راستہ میں غزوہ کے لئے جارہا ہو، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے! میری تو آرزو ہے کہ میں اللہ کے راستے میں شہید کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں، پھر شہید کیا جاؤں اور پھر زندہ کیا جاؤں، اور پھر شہید کیا جاؤں اور پھر زندہ کیا جاؤں، اور پھر شہید کر دیا جاؤں"۔(صحیح بخاری: 2797، سنن نسائی: 6/8)

اسی طرح آپ ﷺ کا فرمان ہے: "کوئی بھی شخص ایسا نہیں ہوگا جو جنت میں داخل ہونے کے بعد دنیا میں دوبارہ آنا پسند کرے گا، خواہ اسے ساری دنیا مل جائے، سوائے شہید کے، جب وہ جنت میں اعزاز واکرام دیکھے گا تو وہ یہ تمنا کرے گا کہ دنیا میں دوبارہ واپس آکر دس مرتبہ اور شہید ہو"۔(صحیح بُخاری: 2817، صحیح مسلم:107/1877)

۲: عملی مشق:

نبی کریم ﷺ نے امت کی تمام طاقتوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی کوشش کی، جو بھی کسی طرح کی خدمت انجام دے سکتا تھا اس سے وہ خدمت لی، چاہے مرد ہو یا عورت، بچے ہوں یا جوان یا بزرگ، اسی طرح جہاد میں مطلوب ہر فن اور مہارت کی ٹریننگ کرائی، جیسے کہ نیزہ بازی، تلوار بازی، تیر اندازی، گھوڑ سواری۔ نبی کریم ﷺ عسکری تربیت کے دونوں پہلوؤں: نظری رہنمائی اور عملی مشق پر توازن کے ساتھ توجہ مرکوز فرماتے تھے، فتح وکامیابی کی امید دلاتے تھے، میدانِ جنگ میں ہر ممکن قربانی دینے کی ترغیب دیتے تھے اور مسلمانوں کو تیر اندازی کے فنون میں مہارت حاصل کرنے پر ابھارتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جس نے تیر اندازی سیکھی اس کے بعد اس کو ترک کر دیا تو وہ ہم میں سے نہیں ہے، یا فرمایا: اس نے نافرمانی کی"۔ (صحیح مسلم:1919، مسند احمد:4/148، سنن ابن ماجہ:2814)

یہ تمام امت کے لئے عمومی دعوت ہے، یہاں تک کہ ان کے لئے بھی جو بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ چکے ہوں کہ نشانہ بازی، تیز رفتاری اور فنی مہارت میں مشق کریں، بے شک اسلام تمام امت کی صلاحیتوں پر توجہ مرکوز کرتا ہے اور بلند ہمتی اور عزیمت کی جانب ان کی رہنمائی کرتا ہے۔

نبی کریم ﷺ حالات اور مواقع کے اعتبار سے دشمنوں کے بارے میں باخبر رہتے تھے، اور ہر اس ذریعہ کو اختیار کرنے کی ترغیب دیتے تھے جس کو مسلمان اختیار کر سکتے تھے، نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "اور ان کے مقابلہ کے لئے جس قدر ہو سکے قوت تیار رکھو، آگاہ ہو جاؤ: قوت تیر اندازی میں ہے، آگاہ ہو جاؤ: قوت تیر اندازی میں ہے، آگاہ ہو جاؤ: قوت تیر اندازی میں ہے"۔ (صحیح مسلم:1917، سنن ابوداؤد:1514، سنن ترمذی: 3083، سنن ابن ماجہ:2883)

قرآن کریم اور سنت نبویہ مسلمانوں کو معنوی اور مادی تمام میدانوں میں تیاری کرنے اور احتیاطی اور حفاظتی تدابیر اختیار کرنے کی تعلیم دیتے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ خُذُواْ حِذْرَكُمْ فَٱنفِرُواْ ثُبَاتٍ أَوِ ٱنفِرُواْ جَمِيعًا﴾ ترجمہ: "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، مقابلہ کے لئے ہر وقت تیار رہو، پھر جیسا موقع ہو الگ الگ دستوں کی شکل میں نکلو یا اکٹھے ہو کر"۔(سورۃ النساء:71)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دشمنوں کی چالوں سے محفوظ رہنے کے لئے احتیاطی تدابیر اختیار کرنا اور اسباب اختیار کرنا واجب اور ضروری ہے اور اس میں اعداد و تیاری کی تمام قسمیں شامل ہیں جن کا تعلق جسمانی تربیت، افواج کی ٹریننگ، مدمقابل کا مقابلہ کرنے کے لئے رہنمائی اور دشمن کی چالوں سے محفوظ رہنے کی تربیت اور اس طرح کی تمام چیزوں سے ہے، اللہ تعالیٰ نے بھی مطلقاً اعداد و تیاری کا اور احتیاطی اور حفاظتی تدابیر اختیار کرنے کا حکم دیا ہے اور اس میں کسی خاص قسم یا خاص حالت کی تعیین نہیں کی ہے، اس لئے کہ حالات و وقت اور مدمقابل کے اعتبار سے اس کی تیاری کی ضرورت ہوگی۔

صحابہ کرامؓ کے نزدیک جہاد کی حیثیت ایک عظیم تربیت گاہ کی سی تھی جس کے ذریعہ نفس کا تزکیہ ہوتا تھا اور ان کو اس بات کا یقین تھا کہ جہاد سے مطلوبہ فوائد و ثمرات حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ جہاد میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے لئے اخلاص اختیار کیا جائے، اور ایمان کے مطابق عمل بھی کیا جائے، انہوں نے دوسرے لوگوں کو بھی اس کی طرف توجہ دلائی، نبی کریم ﷺ نے ان کو ریاکاری کے خطرات سے آگاہ کر دیا تھا، نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے: "قیامت کے دن سب سے پہلے تین قسم کے افراد کا فیصلہ کیا جائے گا: سب سے پہلے شہید ہونے والے شخص کو لایا جائے گا، اللہ اس کو اپنی نعمتیں یاد دلائے گا وہ ان نعمتوں کو پہچان لے گا، اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا: تو نے ان نعمتوں کے بدلے میں کیا عمل کیا ہے؟ وہ کہے گا: میں نے تیرے لئے جہاد کیا یہاں تک کہ مجھے شہید کیا گیا۔ اللہ فرمائے گا: تو جھوٹ بول رہا ہے! تو نے اس لئے جہاد کیا تا کہ تجھے بہادر کہا جائے اور وہ کہا گیا، پھر اس کے بارے میں حکم دیا جائے گا اور اسے چہرے کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ دوسرا شخص وہ ہوگا جس نے خود علم سیکھا ہوگا اور دوسروں کو سکھایا ہوگا اور قرآن پڑھا ہوگا، اسے لایا جائے گا، اللہ تعالیٰ اس کو اپنی نعمتیں یاد دلائے گا، وہ ان کو پہچان لے گا، اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا: تو نے ان نعمتوں کے بدلے میں کیا عمل کیا ہے؟ وہ کہے گا: میں نے علم سیکھا اور دوسروں کو بھی سکھایا اور میں نے تیری خاطر قرآن پڑھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو جھوٹ بولتا ہے! تو نے علم اس لئے سیکھا تا کہ تجھے عالم کہا جائے اور قرآن اس لئے پڑھا تا کہ تجھے قاری کہا جائے، سو وہ کہا گیا۔ اس کے بعد اس کے بارے میں حکم دیا جائے گا اور اسے چہرے کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ تیسرا شخص وہ ہوگا جس کو اللہ تعالیٰ نے وسعت اور خوشحالی عطا کی ہوگی اور اسے مال کی تمام اقسام عطا کی ہوں گی، اس کو لایا جائے گا اس کو اللہ تعالیٰ اپنی عطا کردہ نعمتیں یاد دلائے گا اور وہ ان کو پہچان لے گا، اللہ اس سے پوچھے گا: ان نعمتوں کا حق کیسے ادا کیا؟ وہ کہے گا: جن مصارف اور راستوں میں خرچ کرنا تجھے پسند تھا میں نے ان تمام راستوں میں تیرے لئے خرچ کیا۔ اللہ فرمائے گا: تو جھوٹ بول رہا ہے! بلکہ تیرے خرچ کرنے کا مقصد یہ تھا کہ تجھے سخی کہا جائے اور وہ کہہ دیا گیا۔ اس کے بعد اس کے بارے میں حکم دیا جائے گا اور اس کو چہرے کے بل گھسیٹ کر جنم میں ڈال دیا جائے گا"۔ (صحیح مسلم: 1905، مسند احمد: 2/322، سنن نسائی: 6/23)

اسی لئے صحابہ کرام اپنے جہاد میں اخلاص وللہیت سے آراستہ تھے، اللہ کی طرف سے اجر و ثواب کے امیدوار اور اس کی سزا اور عقاب سے خائف تھے، ان کی گفتگو بھی اللہ ہی کے لئے ہوتی تھی، انہوں نے اپنے مال اللہ کی رضا کے لئے خرچ کئے، انہوں نے اللہ کے دین کا دفاع کرتے ہوئے اور اعلائے کلمۃ اللہ کی خاطر اپنی جانیں قربان کیں، اسی لئے صحابہ کرام کے جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعہ تزکیۂ نفوس کے سلسلہ میں عظیم آثار و فوائد حاصل ہوئے، جن میں سے چند اہم پہلو درج ذیل ہیں:

أ: زندگی کی محبت سے آزادی:

جہاد فی سبیل اللہ دنیا کے بارے میں زہد اختیار کرنے، آخرت کو ترجیح دینے اور جنت کے انعامات کا شوق پیدا کرنے کی عملی تربیت اور مشق ہے، اسلامی منہج کے اعتبار سے تزکیہ نفس کا یہ اہم ترین مقصد ہے، چنانچہ ایک مجاہد اللہ کی رضا کے لئے اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دیتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی جان و مال عطا کرنے والا اور ان کا مالک حقیقی ہے، وہ اپنے مجاہد بندوں کو یہ اعزاز بخشتا ہے کہ ان سے اپنی عطا کردہ چیز خریدتا ہے جب کہ وہ اس کی راہ میں اس کو قربان کرنا چاہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ ٱللَّهَ ٱشْتَرَىٰ مِنَ ٱلْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَٰلَهُم بِأَنَّ لَهُمُ ٱلْجَنَّةَ ۚ يُقَٰتِلُونَ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ ۖ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِى ٱلتَّوْرَىٰةِ وَٱلْإِنجِيلِ وَٱلْقُرْءَانِ ۚ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِۦ مِنَ ٱللَّهِ ۚ فَٱسْتَبْشِرُوا۟ بِبَيْعِكُمُ ٱلَّذِى بَايَعْتُم بِهِۦ ۚ وَذَٰلِكَ هُوَ ٱلْفَوْزُ ٱلْعَظِيمُ ۞ ٱلتَّٰٓئِبُونَ ٱلْعَٰبِدُونَ ٱلْحَٰمِدُونَ ٱلسَّٰٓئِحُونَ ٱلرَّٰكِعُونَ ٱلسَّٰجِدُونَ ٱلْءَامِرُونَ بِٱلْمَعْرُوفِ وَٱلنَّاهُونَ عَنِ ٱلْمُنكَرِ وَٱلْحَٰفِظُونَ لِحُدُودِ ٱللَّهِ ۗ وَبَشِّرِ ٱلْمُؤْمِنِينَ﴾ ترجمہ: ”حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لئے ہیں، وہ اللہ کی راہ میں لڑتے اور مارتے اور مرتے ہیں، ان سے (جنت کا وعدہ) اللہ کے ذمے ایک پختہ وعدہ ہے، توراۃ اور انجیل اور قرآن میں، اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کا پورا کرنے والا ہو؟ پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے خدا سے چکا لیا ہے، یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ اللہ کی طرف بار بار پلٹنے والے، اُس کے بندگی بجالانے والے، اُس کی تعریف کے گن گانے والے، اُس کی خاطر زمین میں گردش کرنے والے، اُس کے آگے رکوع اور سجدے کرنے والے، نیکی کا حکم دینے والے، بدی سے روکنے والے، اور اللہ کے حدود کی حفاظت کرنے والے، (اس شان کے ہوتے ہیں وہ مومن جو اللہ سے خرید و فروخت کا یہ معاملہ طے کرتے ہیں) اور اے نبیؐ ان مومنوں کو خوش خبری دے دو“۔ (سورۃ التوبہ: 111-112)

ب: نفس کی صفائی اور صبر و فداکاری کی تربیت:

نبوی تربیت کے نتیجہ میں صحابہ کرام کو اس بات کا یقین تھا کہ جنت ناپسندیدہ چیزوں کے ذریعہ گھری ہوئی ہے اور آرام طلبی کے ذریعہ جنت کا حصول ممکن نہیں ہے، اس لئے نفس کو مشکلات اور مشقتوں کا عادی بنانا ضروری ہے تاکہ وہ ہر قسم کی سختیاں جھیل سکے، مشکلات و مصائب کے مقابلہ میں صبر و ثبات اختیار کر سکے اور ہر قسم کی سستی، کاہلی اور آرام طلبی کو ترک کر سکے، صحابہ کرام نے قرآن کریم سے سیکھا تھا کہ اللہ کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ نفوس کو تمحیص اور چھٹائی کے مرحلے سے گزارا جائے تاکہ ان کے ذریعہ صبر و ثبات اور استقامت کا اظہار ہو سکے اور میدانِ جہاد اس تمحیص کا سب سے بڑا میدان ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِن يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ ٱلْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهُۥ ۚ وَتِلْكَ ٱلْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ ٱلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ ٱللَّهُ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَيَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَآءَ ۗ وَٱللَّهُ لَا يُحِبُّ ٱلظَّٰلِمِينَ ﴿١٤٠﴾ وَلِيُمَحِّصَ ٱللَّهُ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَيَمْحَقَ ٱلْكَٰفِرِينَ ﴿١٤١﴾ أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُوا۟ ٱلْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ ٱللَّهُ ٱلَّذِينَ جَٰهَدُوا۟ مِنكُمْ وَيَعْلَمَ ٱلصَّٰبِرِينَ ﴿١٤٢﴾ وَلَقَدْ كُنتُمْ تَمَنَّوْنَ ٱلْمَوْتَ مِن قَبْلِ أَن تَلْقَوْهُ فَقَدْ

رَأَيْتُمُوهُ وَأَنتُمْ تَنظُرُونَ ﴿١٤٣﴾ ترجمہ: ”اِس وقت اگر تمہیں چوٹ لگی ہے تو اس سے پہلے ایسی ہی چوٹ تمہارے مخالف فریق کو بھی لگ چکی ہے، یہ تو زمانہ کے نشیب و فراز ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں، تم پر یہ وقت اس لئے لایا گیا کہ اللہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم میں سچے مومن کون ہیں اور ان لوگوں کو چھانٹ لینا چاہتا تھا جو واقعی (راستی کے) گواہ ہوں کیونکہ ظالم لوگ اللہ کو پسند نہیں ہیں، اور وہ اس آزمائش کے ذریعہ سے مومنوں کو الگ چھانٹ کر کافروں کی سرکوبی کر دینا چاہتا تھا، کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں کون وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور اس کی خاطر صبر کرنے والے ہیں، تم تو موت کی تمنائیں کر رہے تھے، مگر یہ اُس وقت کی بات تھی جب موت سامنے نہ آئی تھی، لو اب وہ تمہارے سامنے آگئی اور تم نے اُسے آنکھوں دیکھ لیا“۔ (سورۃ البقرۃ: 140-143) (دیکھیں: منہج الاسلام فی تزکیۃ النفوس، د۔ انس احمد کرزون: 1/293)

ج: جہاد؛ نفس کی عزت اور قوت کا ذریعہ:

صحابہ کرامؓ نے نبوی تعلیمات کے ذریعہ سیکھا تھا کہ جہاد فی سبیل اللہ ایک مسلمان کے اندر عزت کو پروان چڑھانے کا اور اس کو ذلت و اہانت سے پاک کرنے کا ایک عظیم اور اہم ذریعہ ہے، قرآن کریم نے اپنی کتاب عزیز میں یہ بات واضح کر دی ہے کہ ایک مومن خود دار اور باعزت ہوتا ہے، اس لئے کہ وہ اپنے رب پر ایمان کے ذریعہ اور دین پر مضبوطی سے عمل پیرا ہو کر عزت حاصل کرتا ہے، اِرشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلِلَّهِ ٱلْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِۦ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَلَٰكِنَّ ٱلْمُنَٰفِقِينَ لَا يَعْلَمُونَ﴾ ترجمہ: ”عزت تو اللہ اور اس کے رسولؐ اور مومنین کے لئے ہے، مگر یہ منافق جانتے نہیں ہیں“۔ (سورۃ المنافقون: 8)

لہذا جب ایک مسلمان جہاد سے دستبردار اور کنارہ کش ہو جاتا ہے اور آخرت کے بجائے دنیا میں مشغول ہو جاتا ہے تو اس کا نفس ذلت و رسوائی اور کمزوری پر راضی ہو جاتا ہے، اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے: "جب تم 'بیع عینہ' کرنے لگو گے، گائے بیلوں کی دُم تھام لو گے، کھیتی باڑی میں مست و مگن رہو گے اور جہاد کو چھوڑ دو گے تو اللہ تعالیٰ تم پر ایسی ذلت مسلط کر دے گا جس سے تم اس وقت تک نجات نہ پا سکو گے جب تک کہ اپنے دین کی طرف لوٹ نہ آؤ“۔ (سنن ابوداؤد: 3462، مسند احمد: 2/42- 84)

جو شخص دنیا ہی کو اپنے افکار و اعمال کا مرکز و محور اور مقصد بنا لے اور اس کے علم کا مبلغ و مقصود بھی دنیا ہی ہو تو ایسے شخص کے بارے میں ڈر ہے کہ وہ کہیں اللہ تعالیٰ کی وعید میں شامل نہ ہو جائے، اِرشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ ٱلَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَآءَنَا وَرَضُوا۟ بِٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا وَٱطْمَأَنُّوا۟ بِهَا وَٱلَّذِينَ هُمْ عَنْ ءَايَٰتِنَا غَٰفِلُونَ ﴿٧﴾ أُو۟لَٰٓئِكَ مَأْوَىٰهُمُ ٱلنَّارُ بِمَا كَانُوا۟ يَكْسِبُونَ﴾ ترجمہ: ”حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے اور دنیا کی زندگی ہی پر راضی اور مطمئن ہو گئے ہیں، اور جو لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہیں، اُن کا آخری ٹھکانہ جہنم ہو گا، اُن برائیوں کی پاداش میں جن کا اکتساب وہ (اپنے اس غلط عقیدے اور غلط طرز عمل کی وجہ سے) کرتے رہے“۔ (سورۃ یونس: 7-8)

اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے: "جس کا انتقال اس حال میں ہوا کہ نہ اس نے جہاد کیا اور نہ ہی کبھی اس کے بارے میں اس کے دل میں خیال آیا تو ایسا شخص نفاق کی حالت میں مرا"۔ (صحیح مسلم: 1910، مسند احمد: 2/374، سنن ابو داؤد: 2502، سنن نسائی: 6/8)

صحابہ کرام نے ہر قسم کے جہاد کا فریضہ انجام دیا، اسی لئے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عظیم بشارت کے مستحق اور اہل قرار پائے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَٱلَّذِينَ جَٰهَدُواْ فِينَا لَنَهۡدِيَنَّهُمۡ سُبُلَنَاۚ وَإِنَّ ٱللَّهَ لَمَعَ ٱلۡمُحۡسِنِينَ﴾ ترجمہ: "جو لوگ ہماری خاطر مجاہدہ کریں گے انہیں ہم اپنے راستے دکھائیں گے، اور یقیناً اللہ نیکو کاروں ہی کے ساتھ ہے"۔ (سورۃ العنکبوت: 69)

۲: جہاد فی سبیل اللہ کے اہداف و مقاصد

أ: عقیدہ کی آزادی کی حفاظت:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَقَٰتِلُوهُمۡ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتۡنَةٌ وَيَكُونَ ٱلدِّينُ كُلُّهُۥ لِلَّهِۚ فَإِنِ ٱنتَهَوۡاْ فَإِنَّ ٱللَّهَ بِمَا يَعۡمَلُونَ بَصِيرٌ ٣٩ وَإِن تَوَلَّوۡاْ فَٱعۡلَمُوٓاْ أَنَّ ٱللَّهَ مَوۡلَىٰكُمۡۚ نِعۡمَ ٱلۡمَوۡلَىٰ وَنِعۡمَ ٱلنَّصِيرُ ٤٠﴾ ترجمہ: "اے ایمان لانے والو، ان کافروں سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا اللہ کے لئے ہو جائے پھر اگر وہ فتنہ سے رُک جائیں تو ان کے اعمال کا دیکھنے والا اللہ ہے۔ اور اگر وہ نہ مانیں تو جان رکھو کہ اللہ تمہارا سرپرست ہے اور وہ بہترین حامی و مددگار ہے"۔ (سورۃ الانفال: 39-40)

صاحب "فی ظلال القرآن" سید قطب شہیدؒ فرماتے ہیں: "مسلم جماعت کی ایک اور ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ہر اس طاقت اور نظام کو دور کر دے جو دعوت کی راہ میں اور آزادانہ طریقہ سے اس کو لوگوں تک پہنچانے کی راہ میں رکاوٹ بن رہا ہو، یا وہ کسی بھی عقیدہ کو اختیار کرنے کی آزادی کے لئے خطرہ بن رہا ہو اور لوگوں کو آزادی کے ساتھ کوئی عقیدہ اختیار کرنے میں رکاوٹ بن رہا ہو، اور یہ مسلم جماعت مسلسل جدوجہد کرتی رہے یہاں تک کہ روئے زمین پر کسی بھی نظام کے لئے یہ ناممکن ہو جائے کہ وہ اہل ایمان کو اللہ سے دور کر سکے اور دین خالص اللہ کے لئے ہو جائے، اس آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کیا جائے بلکہ مطلب یہ ہے کہ زمین پر اللہ کا دین اس طرح غالب ہو جائے کہ اسلام کے نظریۂ حیات کے مخالف کسی نظریہ کی پشت پر کوئی ایسی مادی قوت نہ ہو جو عوام کو متاثر کر رہی ہو، اور جو لوگ اسلامی نظریۂ حیات کو قبول کرنا بھی چاہیں تو خوف اور ڈر سے ایسا نہ کر سکتے ہوں، صورتحال یہ ہو کہ روئے زمین پر کوئی ایسا نظام نہ ہو جو اللہ کے نور اور ہدایت کو لوگوں سے دور رکھے، اور کسی بھی طریقہ سے یا کوئی بھی ذریعہ اختیار کر کے لوگوں کو راہِ حق سے ہٹا کر گمراہی کی دلدل میں دھکیل دے، انہی اصول و ضوابط کے حدود میں رہتے ہوئے اسلامی جہاد مشروع کیا گیا، بے شک اس جہاد کا مقصد عقیدہ کی آزادی فراہم کرنا ہے، عقیدہ کو ہر قسم کے حصار اور رکاوٹ سے محفوظ رکھا جائے، اس کے منہج اور شریعت کی حفاظت کی جائے، اس کے پرچم کو زمین میں ایسا مضبوط و مستحکم کیا جائے کہ اس کی طرف میلی آنکھ اٹھانے والے پر ہیبت طاری ہو اور اس کے سائے تلے آنے والے کو اس کی پناہ و

حفاظت بآسانی میسر ہو،اس کو زمین پر کسی دوسری طاقت کا ڈر نہ ہو جو اس کی راہ میں رکاوٹ بن سکے یا اس کو قبولِ حق سے روک سکے یا اس کو آزمائشوں کا نشانہ بنا سکے۔

یہی وہ جہاد ہے جس کا اسلام حکم دیتا ہے،اسی کی تائید اور حوصلہ افزائی کرتا ہے اور اس راہ میں کام آنے والوں کو شہداء قرار دیتا ہے اور اس کے علمبرداروں کو اولیاء قرار دیتا ہے"۔(فی ظلال القرآن:1/187)

ب:شعائر اور عبادات کی حفاظت:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ ٱللَّهَ يُدَٰفِعُ عَنِ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْۗ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٖ كَفُورٍ ٣٨ أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَٰتَلُونَ بِأَنَّهُمۡ ظُلِمُواْۚ وَإِنَّ ٱللَّهَ عَلَىٰ نَصۡرِهِمۡ لَقَدِيرٌ ٣٩ ٱلَّذِينَ أُخۡرِجُواْ مِن دِيَٰرِهِم بِغَيۡرِ حَقٍّ إِلَّآ أَن يَقُولُواْ رَبُّنَا ٱللَّهُۗ وَلَوۡلَا دَفۡعُ ٱللَّهِ ٱلنَّاسَ بَعۡضَهُم بِبَعۡضٖ لَّهُدِّمَتۡ صَوَٰمِعُ وَبِيَعٞ وَصَلَوَٰتٞ وَمَسَٰجِدُ يُذۡكَرُ فِيهَا ٱسۡمُ ٱللَّهِ كَثِيرٗاۗ وَلَيَنصُرَنَّ ٱللَّهُ مَن يَنصُرُهُۥٓۚ إِنَّ ٱللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ٤٠ ٱلَّذِينَ إِن مَّكَّنَّٰهُمۡ فِي ٱلۡأَرۡضِ أَقَامُواْ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتَوُاْ ٱلزَّكَوٰةَ وَأَمَرُواْ بِٱلۡمَعۡرُوفِ وَنَهَوۡاْ عَنِ ٱلۡمُنكَرِۗ وَلِلَّهِ عَٰقِبَةُ ٱلۡأُمُورِ ٤١﴾ ترجمہ: "یقیناً اللہ مدافعت کرتا ہے اُن لوگوں کی طرف سے جو ایمان لائے ہیں،یقیناً اللہ کسی خائن کافرِ نعمت کو پسند نہیں کرتا۔ اجازت دے دی گئی اُن لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے کیونکہ وہ مظلوم ہیں،اور اللہ یقیناً اُن کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیئے گئے صرف اِس قصور پر کہ وہ کہتے تھے "ہمارا رب اللہ ہے" اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجا اور معبد اور مسجدیں، جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے، سب مسمار کر ڈالی جائیں،اللہ ضرور اُن لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے،اللہ بڑا طاقتور اور زبردست ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے منع کریں گے اور تمام معاملات کا انجامِ کار اللہ کے ہاتھ میں ہے"۔(سورۃ الحج:38-41)

امام نسفیؒ فرماتے ہیں: "اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر جدوجہد کے ذریعہ اہلِ کفر کے مقابلہ میں مسلمانوں کو فتح وغلبہ حاصل نہ ہو تو مختلف ملتوں پر اپنے اپنے زمانہ میں اور ان کی عبادت گاہوں میں اہلِ شرک غالب ہو جائیں گے اور وہ ان کی عبادت گاہوں کو منہدم کر دیں گے، وہ نہ ہی عیسائیوں کے کسی گرجا گھر کو چھوڑیں گے، نہ ہی راہبوں کی کسی خانقاہ اور صومعے کو رہنے دیں گے، نہ ہی یہود کے کسی بیعہ اور عبادت گاہ کو باقی رہنے دیں گے اور نہ ہی مسلمانوں کی کسی مسجد کو چھوڑیں گے، یا اس کا مطلب یہ ہے کہ امت محمدیہ ﷺ میں مشرکین مسلمانوں پر اور مسلمانوں کے ماتحت اہلِ ذمہ اہلِ کتاب پر غالب آجائیں گے اور فریقین (اہل کتاب اور مسلمانوں) کی عبادت گاہوں کو ڈھا دیں گے، مسجدوں کے مقابلہ میں دوسری عبادت گاہوں کو اس لئے مقدم کیا کیونکہ مسجدوں سے پہلے ان کا وجود تھا، یا اس لئے کیونکہ اہلِ شرک کے لئے ان کو منہدم کرنا زیادہ آسان اور قریب تھا"۔ (دیکھیں: تفسیر النسفی: 3/106، تفسیر الکشاف:3/16، تفسیر المراغی: 6/119)

ج: زمین سے فساد و بگاڑ دور کرنا:

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَمَّا بَرَزُواْ لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِۦ قَالُواْ رَبَّنَآ أَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرٗا وَثَبِّتۡ أَقۡدَامَنَا وَٱنصُرۡنَا عَلَى ٱلۡقَوۡمِ ٱلۡكَٰفِرِينَ ﴿٢٥٠﴾ فَهَزَمُوهُم بِإِذۡنِ ٱللَّهِ وَقَتَلَ دَاوُۥدُ جَالُوتَ وَءَاتَىٰهُ ٱللَّهُ ٱلۡمُلۡكَ وَٱلۡحِكۡمَةَ وَعَلَّمَهُۥ مِمَّا يَشَآءُۗ وَلَوۡلَا دَفۡعُ ٱللَّهِ ٱلنَّاسَ بَعۡضَهُم بِبَعۡضٖ لَّفَسَدَتِ ٱلۡأَرۡضُ وَلَٰكِنَّ ٱللَّهَ ذُو فَضۡلٍ عَلَى ٱلۡعَٰلَمِينَ ﴿٢٥١﴾ تِلۡكَ ءَايَٰتُ ٱللَّهِ نَتۡلُوهَا عَلَيۡكَ بِٱلۡحَقِّۚ وَإِنَّكَ لَمِنَ ٱلۡمُرۡسَلِينَ ﴿٢٥٢﴾﴾ ترجمہ: ’’اور جب وہ جالوت اور اس کے لشکروں کے مقابلہ پر نکلے تو انہوں نے دعا کی: "اے ہمارے رب، ہم پر صبر کا فیضان کر، ہمارے قدم جمادے اور اس کافر گروہ پر ہمیں فتح نصیب کر"۔ آخر کار اللہ کے اذن سے اُنہوں نے کافروں کو مار بھگایا اور داوٗدؑ نے جالوت کو قتل کر دیا اور اللہ نے اسے سلطنت اور حکمت سے نوازا، اور جن جن چیزوں کا چاہا اس کو علم دیا ، اگر اس طرح اللہ انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعہ ہٹاتا نہ رہتا تو زمین کا نظام بگڑ جاتا، لیکن دنیا کے لوگوں پر اللہ کا بڑا فضل ہے (کہ وہ اس طرح دفعِ فساد کا انتظام کرتا رہتا ہے)۔ یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم ٹھیک ٹھیک تم کو سنا رہے ہیں اور تم یقیناً ان لوگوں میں سے ہو جو رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں‘‘۔(سورۃ البقرۃ: 250-252)

علامہ ابنِ کثیرؒ اللہ کے اس قول: ﴿وَلَوۡلَا دَفۡعُ ٱللَّهِ ٱلنَّاسَ بَعۡضَهُم بِبَعۡضٖ لَّفَسَدَتِ ٱلۡأَرۡضُ﴾ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: یعنی اگر اللہ تعالیٰ ایک قوم کے ذریعہ دوسری قوم کو نہ ہٹاتا تو وہ ہلاک ہو جاتے، جیسے کہ طالوت کے قتال کے ذریعہ اور حضرت داوٗدؑ کی شجاعت کے ذریعہ بنی اسرائیل کی طرف سے دفاع کیا۔(تفسیر ابنِ کثیر: 1/262)

صاحبِ کشاف اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ’’اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ نہ ہٹاتا اور ان کے ذریعہ ان کے فساد و بگاڑ کو نہ روکتا تو مفسدین غالب ہو جاتے، زمین بگاڑ کا شکار ہو جاتی، ان کے منافع باطل ہو جاتے، اور کھیتی، نسل اور زمین کی آبادکاری کے تمام منافع معطل ہو جاتے‘‘۔(تفسیر الکشاف: 1/382، تفسیر ابی السعود: 1/245)

شیخ عبد الرحمن السعدی اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں: ’’بے شک اس آیت میں امت کے لئے کافی اسباق و دروس ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں: اللہ کی راہ میں جہاد کی فضیلت، اس کے فوائد و ثمرات، اور یہی دین وطن، بدن اور مال کی حفاظت کا واحد سبب ہے، اور اگرچہ ان کو مشقتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں لیکن ان کا انجام مفید اور قابلِ تعریف ہے، اسی طرح دشمنی کرنے والوں کو اگرچہ کچھ وقت کے لئے راحت و آرام ملے مگر وہ طویل وقت تک بے چینی اور بے آرامی کا شکار رہیں گے‘‘۔(تفسیر السعدی: 1/309)

د: ابتلاء اور تربیت و اصلاح:

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَإِذَا لَقِيتُمُ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ فَضَرۡبَ ٱلرِّقَابِ حَتَّىٰٓ إِذَآ أَثۡخَنتُمُوهُمۡ فَشُدُّواْ ٱلۡوَثَاقَ فَإِمَّا مَنَّۢا بَعۡدُ وَإِمَّا فِدَآءً حَتَّىٰ تَضَعَ ٱلۡحَرۡبُ أَوۡزَارَهَاۚ ذَٰلِكَۖ وَلَوۡ يَشَآءُ ٱللَّهُ لَٱنتَصَرَ مِنۡهُمۡ وَلَٰكِن لِّيَبۡلُوَاْ بَعۡضَكُم بِبَعۡضٖۗ وَٱلَّذِينَ قُتِلُواْ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ فَلَن يُضِلَّ أَعۡمَٰلَهُمۡ ﴿٤﴾ سَيَهۡدِيهِمۡ وَيُصۡلِحُ بَالَهُمۡ ﴿٥﴾ وَيُدۡخِلُهُمُ ٱلۡجَنَّةَ

عَرَّفَهَا لَهُمْ ﴿٦﴾ ترجمہ: "پس جب اِن کافروں سے تمہاری مڈبھیڑ ہو تو پہلا کام گردنیں مارنا ہے، یہاں تک کہ جب تم ان کو اچھی طرح کچل دو تب قیدیوں کو مضبوط باندھو، اس کے بعد (تمہیں اختیار ہے) احسان کرو یا فدیے کا معاملہ کرلو، تا آنکہ لڑائی اپنے ہتھیار ڈال دے، یہ ہے تمہارے کرنے کا کام، اللہ چاہتا تو خود ہی اُن سے نمٹ لیتا، مگر (یہ طریقہ اُس نے اس لئے اختیار کیا ہے) تاکہ تم لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ سے آزمائے اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں گے اللہ ان کے اعمال کو ہر گز ضائع نہ کرے گا۔ وہ ان کی رہنمائی فرمائے گا، ان کا حال درست کردے گا۔ اور ان کو اس جنت میں داخل کرے گا جس سے وہ ان کو واقف کرا چکا ہے"۔ (سورۃ محمد: 4-6)

علامہ ابن کثیرؒ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے اعداء کے ساتھ قتال مشروع کیا ہے تاکہ تمہاری آزمائش کرے اور تمہارے حالات کو جانچ لے، جیسے کہ سورۃ آل عمران اور سورہ براءۃ میں جہاد کی مشروعیت کی حکمت کا ذکر کیا گیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُواْ ٱلْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ ٱللَّهُ ٱلَّذِينَ جَٰهَدُواْ مِنكُمْ وَيَعْلَمَ ٱلصَّٰبِرِينَ﴾ ترجمہ: "کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں کون وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور اس کی خاطر صبر کرنے والے ہیں"۔ (سورۃ آل عمران: 142) (تفسیر ابن کثیر: 4/154)

صاحبِ "فی ظلال القرآن" فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ جب اہلِ ایمان کو حکم دیتا ہے کہ ان دشمنانِ اسلام کی گردنیں مارو اور اُن کو کمزور کرکے رکھ دو، تو یہ احکام اس لئے دیئے گئے ہیں کہ مومنین دستِ قدرت کے لئے آلہ اور پردہ بن جائیں، اگر اللہ چاہتا تو براہِ راست اور اعلانیہ کافروں سے انتقام لے لیتا جس طرح اللہ نے بعض اقوام کو دیگر اسباب اور طریقوں سے تباہ کیا، اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اہلِ ایمان بندوں کے لئے خیر اور بھلائی چاہتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ ٱلْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰٓ أَن تَكْرَهُواْ شَيْـًٔا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰٓ أَن تُحِبُّواْ شَيْـًٔا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَٱللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ ترجمہ: "تمہیں جنگ کا حکم دیا گیا ہے اور وہ تمہیں ناگوار ہے، ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناگوار ہو اور وہی تمہارے لئے بہتر ہو، اور ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند ہو اور وہی تمہارے لئے بری ہو، اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے"۔ (سورۃ البقرۃ: 216) اللہ مومنین کو آزماتا ہے، اُن کی تربیت کرتا ہے، ان کی اصلاح کرتا ہے اور ان کے لئے نیکیوں کے اسباب فراہم کرتا ہے:

ا) اللہ اہلِ ایمان کی آزمائش کرنا چاہتا ہے: اس آزمائش کے ذریعہ مومنین کے دلوں میں بہترین جذبات، صلاحیتیں اور افکار پیدا کرتا ہے، اور اس سے اچھا جذبہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ کسی انسان کے لئے وہ عقیدہ اس کی جان سے زیادہ عزیز ہو جائے جس پر وہ ایمان لایا ہے اور وہ اس عزیز عقیدہ کے لئے جہاد کرے، دوسروں کو مارے اور خود شہید ہو جائے، اور وہ دین کے معاملہ میں مصالحت اور رواداری نہ برتے، وہ اس عقیدہ کے بغیر زندہ نہ رہ سکے اور اس دین کے سوا کسی اور طریقہ کے مطابق زندگی نہ گزار سکے۔

۲) اللہ ان کی تربیت کرنا چاہتا ہے: وہ اس طور پر کہ ان کے دلوں سے اس فانی دنیا کی تمام خواہشات اور تمام رغبتیں نکال دیتا ہے، حالانکہ انسان کے لئے ایسی خواہشات کو دل سے نکال دینا بڑا مشکل ہوتا ہے، اس طرح ان کے دلوں سے کمزوری دور ہو جاتی ہے، نفس میں کمال پیدا ہوتا ہے، ہر قسم کا کھوٹ نکل جاتا ہے، یہاں تک کہ اگر ان کی تمام خواہشات ترازو کے ایک پلڑے میں ہوں اور دوسرے پلڑے میں صرف دعوت، جہاد اور اللہ کی رضامندی کی طلب ہو تو اللہ کی رضامندی اور جہاد کا پلڑا بھاری ہو گا، اللہ اس بات کو ظاہر کر دیتا ہے کہ ان نفوس کو اختیار دیا گیا تو انہوں نے دین کو اختیار کیا، ان کو تربیت دی گئی تو انہوں نے حق کو جان لیا، وہ بغیر سوچے سمجھے کوئی قدم نہیں اٹھاتے ہیں بلکہ خوب سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتے ہیں۔

۳) اللہ ان کی اصلاح کرنا چاہتا ہے: اللہ کی راہ میں جہاد کی تکالیف اور موت سے بار بار آنکھیں ملانے کی وجہ سے ان کے دل سے موت کا خوف ختم ہو جاتا ہے، حالانکہ موت سے بچنے کے لئے لوگوں کو اپنی جانیں، اخلاق، اقدار اور بہت کچھ قربان کر دینا پڑتا ہے، لیکن جو شخص ہر وقت موت سے آنکھ ملاتا رہتا ہے اور وہ اس کا عادی ہوتا ہے تو موت اس کے لئے آسان اور معمولی بن جاتی ہے، چاہے پھر وہ موت سے دوچار ہو بھی جائے یا پھر بچ جائے، اور اللہ کی راہ میں قربان ہونے کی بار بار فکر کرنا، ارادہ کرنا خصوصاً شدید خطرات کے لمحات میں، انسانی جسم کے اندر بجلی کی ایک لہر دوڑا دیتا ہے اور ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد انسان ایک جدید روح اور پاک وصاف شخصیت کے ساتھ تازہ ہو جاتا ہے۔

پھر یہ پوری انسانی جماعت کی اصلاح کے ظاہری اسباب ہیں، جب کہ انسانوں کی قیادت ان مجاہدین کے ہاتھ میں آتی ہے جن کے نفوس تمام دنیاوی آلائشوں اور آلودگیوں سے پاک ہوتے ہیں اور جن کی نگاہوں میں دنیا کی چمک دمک اور تمام دنیاوی مال ومتاع ہیچ بن جاتے ہیں، بلکہ وہ دنیا کی زندگی کو بھی ہیچ سمجھتے ہیں جب کہ وہ موت کے کنویں میں کود جاتے ہیں اور دنیا کی کوئی بھی چیز، کوئی دلفریبی بھی ان کی نظروں کو اپنی طرف مائل نہیں کر پاتی ہے اور وہ صرف رضائے الٰہی کے طالب ہوتے ہیں، جب دنیا کی قیادت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہو تو لوگوں کی اصلاح بھی ہو جاتی ہے اور دنیا کی بھی، اور شر وفساد ختم ہو کر دنیا امن وامان کے دامن میں پناہ لیتی ہے، یہ بلند مقام اپنے خون اور جان کی قیمت دے کر حاصل کئے ہیں، اور ذاتی مفادات کے لئے نہیں بلکہ رضائے الٰہی کے لئے حاصل کئے جاتے ہیں"۔ (فی ظلال القرآن: (6/3286

<u>ھ: دشمنانِ اسلام پر ہیبت طاری کرنا، ان کو ذلیل ورسوا کرنا اور اُن کی تدبیروں کو کمزور کرنا:</u>

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَأَعِدُّواْ لَهُم مَّا ٱسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ ٱلْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِۦ عَدُوَّ ٱللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَءَاخَرِينَ مِن دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ ٱللَّهُ يَعْلَمُهُمْ ۚ وَمَا تُنفِقُواْ مِن شَىْءٍ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لَا تُظْلَمُونَ﴾ ترجمہ: "اور تم لوگ جہاں تک تمہارا بس چلے، زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے اُن کے مقابلہ کے لئے مہیا رکھو، تاکہ اس کے ذریعہ سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان دُوسرے اعداء کو خوف زدہ کرو جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے، اللہ کی راہ میں جو کچھ تم خرچ کرو گے اس کا پورا پورا بدل تمہاری طرف پلٹایا جائے گا اور تمہارے ساتھ ہر گز ظلم نہ ہو گا"۔ (سورۃ الأنفال:60)

دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿قَٰتِلُوهُمْ يُعَذِّبْهُمُ ٱللَّهُ بِأَيْدِيكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِينَ ﴿١٤﴾ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوبِهِمْ ۗ وَيَتُوبُ ٱللَّهُ عَلَىٰ مَن يَشَآءُ ۗ وَٱللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾ ترجمہ: ”ان سے لڑو، اللہ تمہارے ہاتھوں سے ان کو سزا دلوائے گا اور انہیں ذلیل وخوار کرے گا اور ان کے مقابلہ میں تمہاری مدد کرے گا اور بہت سے مومنوں کے دل ٹھنڈے کرے گا اور ان کے قلوب کی جلن مٹادے گا اور جسے چاہے گا توبہ کی توفیق بھی دے گا، اللہ سب کچھ جاننے والا اور دانا ہے“۔ (سورۃ التوبہ:14-15)

ایک اور مقام پر ہے: ﴿فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَٰكِنَّ ٱللَّهَ قَتَلَهُمْ ۚ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ ٱللَّهَ رَمَىٰ ۚ وَلِيُبْلِيَ ٱلْمُؤْمِنِينَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ۚ إِنَّ ٱللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿١٧﴾ ذَٰلِكُمْ وَأَنَّ ٱللَّهَ مُوهِنُ كَيْدِ ٱلْكَٰفِرِينَ ﴿١٨﴾﴾ ترجمہ: ”پس حقیقت یہ ہے کہ تم نے انہیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو قتل کیا اور تو نے نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا (اور مومنوں کے ہاتھ جو اس کام میں استعمال کئے گئے) تو یہ اس لئے تھا کہ اللہ مومنوں کو ایک بہترین آزمائش سے کامیابی کے ساتھ گزار دے، یقیناً اللہ سُننے والا اور جاننے والا ہے، یہ معاملہ تو تمہارے ساتھ ہے اور کافروں کے ساتھ معاملہ یہ ہے کہ اللہ ان کی چالوں کو کمزور کرنے والا ہے“۔ (سورۃ الأنفال:17-18)

ھ: منافقین کو الگ اور نمایاں کرنا:

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿مَّا كَانَ ٱللَّهُ لِيَذَرَ ٱلْمُؤْمِنِينَ عَلَىٰ مَآ أَنتُمْ عَلَيْهِ حَتَّىٰ يَمِيزَ ٱلْخَبِيثَ مِنَ ٱلطَّيِّبِ ۗ وَمَا كَانَ ٱللَّهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى ٱلْغَيْبِ وَلَٰكِنَّ ٱللَّهَ يَجْتَبِي مِن رُّسُلِهِۦ مَن يَشَآءُ ۖ فَـَٔامِنُوا۟ بِٱللَّهِ وَرُسُلِهِۦ ۚ وَإِن تُؤْمِنُوا۟ وَتَتَّقُوا۟ فَلَكُمْ أَجْرٌ عَظِيمٌ﴾ ترجمہ: ”اللہ مومنوں کو اس حالت میں ہرگز نہ رہنے دے گا جس میں تم اس وقت پائے جاتے ہو، وہ پاک لوگوں کو ناپاک لوگوں سے الگ کر کے رہے گا، مگر اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ تم کو غیب پر مطلع کر دے، غیب کی باتیں بتانے کے لئے تو وہ اپنے رسولوں میں جس کو چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے، لہٰذا (امور غیب کے بارے میں) اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھو، اگر تم ایمان اور خدا ترسی کی روش پر چلوگے تو تم کو بڑا اجر ملے گا“۔ (سورۃ آل عمران:179)

ابن کثیرؒ فرماتے ہیں: اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی ایسے آزمائشی سبب اور ذریعہ کو اختیار کرنا ضروری ہے جس کے ذریعہ اللہ کا ولی اور محبوب نمایاں ہو جائے اور اللہ کا دشمن بھی الگ اور رسوا ہو جائے، اس کے ذریعہ صابر وثابت قدم رہنے والا مومن پہچان لیا جائے اور گناہگار فاجر کا بھی پتہ چل جائے۔ اس کے ذریعہ خاص طور پر یوم احد مراد ہے جس کے ذریعہ مومنین کا امتحان لیا گیا تو ان کا ایمان، صبر، استحکام، ثابت قدمی اور اللہ اور اس کے رسولؐ کے لئے ان کی اطاعت ظاہر ونمایاں ہو گئی، جبکہ منافقین کا پردہ بھی فاش ہو گیا، ان کی مخالفت ونافرمانی بھی کھل کر سامنے آگئی، جہاد سے ان کی روگردانی بھی واضح ہو گئی اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے تئیں ان کی خیانت سے بھی پردہ اٹھ گیا۔ (تفسیر ابن کثیر: 1/371)

و: روئے زمین پر اللہ کے نظام اور اس کے قانون کا نفاذ:

بے شک روئے زمین پر اللہ کے قانون کا نفاذ جہاد کا ایک اہم مقصد ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّآ أَنزَلۡنَآ إِلَيۡكَ ٱلۡكِتَٰبَ بِٱلۡحَقِّ لِتَحۡكُمَ بَيۡنَ ٱلنَّاسِ بِمَآ أَرَىٰكَ ٱللَّهُۚ وَلَا تَكُن لِّلۡخَآئِنِينَ خَصِيمٗا﴾ ترجمہ: ''اے نبیؐ! ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ جو راہ راست اللہ نے تمہیں دکھائی ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو، تم بد دیانت لوگوں کی طرف سے جھگڑنے والے نہ بنو''۔ (سورۃ النساء: 105)

ز: ظالموں کی زیادتی کو دور کرنا:

اسلامی جہاد کے اہداف میں سے ایک اہم ہدف یہ ہے کہ ظالموں کے ظلم و عدوان کو دور کیا جائے، اس ظلم و زیادتی کی کئی قسمیں ہیں:

ا) کفار اپنی ہی سرزمین میں کسی کمزور مومن گروہ پر ظلم و زیادتی کریں، اور اہل ایمان وہاں سے کسی ایسی سرزمین میں جانے کی استطاعت نہ رکھتے ہوں تو اس وقت اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان زیادتی کرنے والے کفار کے ساتھ مقابلہ کرے یہاں تک کہ اہل ایمان کو ان پر ہونے والے ظلم و عدوان سے آزاد کرالیں، اِرشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿فَلۡيُقَٰتِلۡ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ ٱلَّذِينَ يَشۡرُونَ ٱلۡحَيَوٰةَ ٱلدُّنۡيَا بِٱلۡأٓخِرَةِۚ وَمَن يُقَٰتِلۡ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ فَيُقۡتَلۡ أَوۡ يَغۡلِبۡ فَسَوۡفَ نُؤۡتِيهِ أَجۡرًا عَظِيمٗا ﴿٧٤﴾ وَمَا لَكُمۡ لَا تُقَٰتِلُونَ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ وَٱلۡمُسۡتَضۡعَفِينَ مِنَ ٱلرِّجَالِ وَٱلنِّسَآءِ وَٱلۡوِلۡدَٰنِ ٱلَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَآ أَخۡرِجۡنَا مِنۡ هَٰذِهِ ٱلۡقَرۡيَةِ ٱلظَّالِمِ أَهۡلُهَا وَٱجۡعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ وَلِيّٗا وَٱجۡعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ نَصِيرًا ﴿٧٥﴾﴾ ترجمہ: ''(ایسے لوگوں کو معلوم ہو کہ) اللہ کی راہ میں لڑنا چاہیے اُن لوگوں کو جو آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی کو فروخت کر دیں، پھر جو اللہ کی راہ میں لڑے گا اور مارا جائے گا یا غالب رہے گا اُسے ضرور ہم اجر عظیم عطا کریں گے، آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اُن بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پاکر دبا لئے گئے ہیں اور فریاد کررہے ہیں کہ خدایا ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کردے''۔ (سورۃ النساء: 74-75)

علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں: اس کے ذریعہ جہاد کی ترغیب دی گئی ہے جس میں یہ بھی شامل ہے کہ کمزوروں کو ان مشرک کفار سے آزاد کیا جائے جو ان کو تکلیفیں پہنچاتے ہیں اور دین کی وجہ سے ان کو پریشان کرتے ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے جہاد واجب کیا ہے تاکہ اس کا کلمہ بلند ہو، اس کا دین غالب ہو اور اس کے بندوں میں سے کمزور سمجھے جانے والے اہل ایمان کو ظلم و زیادتی سے آزادی ملے، اگرچہ اس میں جانی نقصان ہی کیوں نہ ہو۔ اسی طرح (بے گناہ) قیدیوں کو رہائی دلانا مسلم جماعت پر واجب ہے، یا تو قتال کے ذریعہ یا مال کے ذریعہ، اور مال کے ذریعہ رہائی دلانے کا وجوب اور زیادہ تاکیدی ہے، اس لئے کہ اس میں جانی قربانی نہیں ہے اور وہ جانی قربان سے کمتر ہے۔ (تفسیر القرطبی: 5/279)

۲) زیادتی کی ایک شکل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کفار مسلمانوں کی سر زمین پر حملہ کر لیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَقَـٰتِلُوا۟ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ ٱلَّذِينَ يُقَـٰتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوٓا۟ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يُحِبُّ ٱلْمُعْتَدِينَ ﴿١٩٠﴾ وَٱقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُم مِّنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ ۚ وَٱلْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ ٱلْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقَـٰتِلُوهُمْ عِندَ ٱلْمَسْجِدِ ٱلْحَرَامِ حَتَّىٰ يُقَـٰتِلُوكُمْ فِيهِ ۖ فَإِن قَـٰتَلُوكُمْ فَٱقْتُلُوهُمْ ۗ كَذَٰلِكَ جَزَآءُ ٱلْكَـٰفِرِينَ ﴿١٩١﴾ فَإِنِ ٱنتَهَوْا۟ فَإِنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٩٢﴾﴾ ترجمہ: "اور تم اللہ کی راہ میں اُن لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں، مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ان سے لڑو جہاں بھی تمہارا اُن سے مقابلہ پیش آئے اور انہیں نکالو جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا ہے، اس لئے کہ قتل اگرچہ برا ہے مگر فتنہ اس سے بھی زیادہ برا ہے اور مسجد حرام کے قریب جب تک وہ تم سے نہ لڑیں تم بھی نہ لڑو، مگر جب وہ وہاں لڑنے سے نہ چوکیں تو تم بھی بے تکلف انہیں مارو کہ ایسے کافروں کی یہی سزا ہے۔ پھر اگر وہ باز آ جائیں تو جان لو کہ اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے"۔(سورۃ البقرۃ: 190-192)

فقہاء نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ جب کفار مسلمانوں کی سر زمین پر حملہ آور ہو جائیں تو مسلمانوں کی سر زمین کا دفاع کرنا ضروری ہو جاتا ہے، اس لئے کہ دشمن جب اس پر قابض ہو جائیں گے تو وہ مسلمانوں کو پریشان کریں گے، وہاں کفر کا قانون لاگو کریں گے، وہاں کے لوگوں کو اپنی اطاعت و فرمانبرداری پر مجبور کریں گے اور وہ دار الاسلام کے بعد دار الکفر میں تبدیل ہو جائے گا۔

ابنِ قدامہؒ فرماتے ہیں: "تین مقامات پر جہاد لازمی ہوتا ہے: ......ان میں سے دوسری جگہ وہ ہے جبکہ کفار کسی متعین ملک یا علاقہ پر چڑھائی کر لیں تو ان کفار سے قتال کرنا اور ان کو وہاں سے نکالنا ضروری ہے"۔(المغنی 9/279)

بعض علماء حنفیہ کہتے ہیں: "خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہر وہ جگہ جہاں دشمن کے حملہ آور ہونے کا خوف ہو تو امام المسلمین کے لئے یا اس علاقہ کے باشندوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس علاقہ کی حفاظت کریں، اور اگر وہ قدرت و طاقت نہ رکھتے ہوں تو ان سے قریب رہنے والوں کے لئے ان کی اعانت و مدد کرنا اور دشمن کا مقابلہ کرنا ضروری ہے"۔(حاشیہ ابن عابدین: 4/124)

۳) زیادتی کی ایک شکل یہ ہے کہ دشمن اپنی رعایہ پر ظلم کر رہا ہو، اگرچہ اس کی رعایہ اہلِ کفر ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر ظلم کو حرام قرار دیا ہے اور تمام لوگوں کے ساتھ عدل و انصاف کرنا واجب اور ضروری ہے، اور اگر مسلمان مظلوموں سے ظلم کو دور نہیں کریں گے تو وہ گنہگار ہوں گے، اس لئے کہ ان پر ذمہ داری ہے کہ وہ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے لئے اور عدل و انصاف کو عام کرنے اور ظلم کے خاتمہ کے لئے جہاد کا فریضہ انجام دیں اور اسی کے ذریعہ وہ کامیاب ہو سکتے ہیں، یہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اعلیٰ شکل ہے اور اسی وجہ سے ان کو بہترین امت کا لقب عطا کیا گیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِٱلْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ ٱلْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِٱللَّهِ ۗ﴾ ترجمہ: "اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو"۔(سورۃ آل عمران: 110)

دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ كُونُوا۟ قَوَّٰمِينَ لِلَّهِ شُهَدَآءَ بِٱلْقِسْطِ ۖ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَـَٔانُ قَوْمٍ عَلَىٰٓ أَلَّا تَعْدِلُوا۟ ۚ ٱعْدِلُوا۟ هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۖ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ خَبِيرٌۢ بِمَا تَعْمَلُونَ﴾ ترجمہ: ’’اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو، کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ، عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے، اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُس سے پوری طرح باخبر ہے‘‘۔ (سورۃ المائدہ: 8)

عدل کا تقاضا یہ بھی ہے کہ مظلوم کافر سے بھی ظلم کو دور کیا جائے حالانکہ ایک مسلمان کو کفر سے نفرت ہوتی ہے، علامہ سرخسیؒ فرماتے ہیں: "اور اگر- کوئی اہلِ حرب پر حکومت کرنے والا بادشاہ- اس بات کا مطالبہ کرے کہ اس کو آزادی دی جائے کہ وہ جس طرح چاہے اپنی سلطنت میں حکومت کرے اور قتل، مار دھاڑ اور ایسی چیزیں کرنا شروع کر دے جو دار الاسلام میں بھی جائز نہیں ہیں تو اس کو ایسا کرنے نہیں دیا جائے گا، اس لئے کہ ظلم کو روکنے کی قدرت رکھنے کے باوجود ظلم پر خاموش رہنا حرام ہے"۔ (المبسوط للسرخی: 10/85)

۴) زیادتی کی ایک شکل یہ ہے کہ داعیانِ حق کا دائرہ تنگ کیا جائے اور ان کو پیغامِ حق کی تبلیغ سے روکا جائے، بے شک اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں پر یہ ذمہ داری عائد ہے کہ وہ تمام انسانوں تک اللہ کا پیغام پہنچائیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى ٱلْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِٱلْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ ٱلْمُنكَرِ ۚ وَأُو۟لَـٰٓئِكَ هُمُ ٱلْمُفْلِحُونَ﴾ ترجمہ: ’’تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی رہنے چاہییں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں، جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے‘‘۔ (سورۃ آل عمران: 104)

بندوں تک دعوتِ حق پہنچانے کے سلسلہ میں اللہ کے دشمن اہلِ حق کے سامنے رکاوٹ ڈالتے ہیں اور ان کو لوگوں تک پہنچنے کا راستہ نہیں دیتے ہیں، وہ دعوت کی راہ میں رکاوٹیں، پریشانیاں اور مصیبتیں حائل کرتے ہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ہر اس شخص کے خلاف جہاد مشروع کیا ہے جو اللہ کی راہ سے روکتا ہے۔ (دیکھیں: فقہ التمکین فی القرآن الکریم، الصلابی، ص488)

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ وَصَدُّوا۟ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِ أَضَلَّ أَعْمَـٰلَهُمْ ۝١ وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَعَمِلُوا۟ ٱلصَّـٰلِحَـٰتِ وَءَامَنُوا۟ بِمَا نُزِّلَ عَلَىٰ مُحَمَّدٍ وَهُوَ ٱلْحَقُّ مِن رَّبِّهِمْ ۙ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّـَٔاتِهِمْ وَأَصْلَحَ بَالَهُمْ ۝٢ ذَٰلِكَ بِأَنَّ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ ٱتَّبَعُوا۟ ٱلْبَـٰطِلَ وَأَنَّ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱتَّبَعُوا۟ ٱلْحَقَّ مِن رَّبِّهِمْ ۚ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ ٱللَّهُ لِلنَّاسِ أَمْثَـٰلَهُمْ ۝٣ فَإِذَا لَقِيتُمُ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ فَضَرْبَ ٱلرِّقَابِ حَتَّىٰٓ إِذَآ أَثْخَنتُمُوهُمْ فَشُدُّوا۟ ٱلْوَثَاقَ فَإِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَآءً حَتَّىٰ تَضَعَ ٱلْحَرْبُ أَوْزَارَهَا ۚ ذَٰلِكَ ۖ وَلَوْ يَشَآءُ ٱللَّهُ لَٱنتَصَرَ مِنْهُمْ وَلَـٰكِن لِّيَبْلُوَا۟ بَعْضَكُم بِبَعْضٍ ۗ وَٱلَّذِينَ قُتِلُوا۟ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ فَلَن يُضِلَّ أَعْمَـٰلَهُمْ ۝٤﴾ ترجمہ: ’’وہ لوگ جو منکر ہوئے اور انہوں نے لوگوں کو بھی اللہ کے راستہ سے روکا تو اللہ نے ان کے اعمال برباد کر دئے۔ اور وہ جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے اور جو کچھ محمد پر نازل کیا گیا اس پر بھی ایمان لائے

حالانکہ وہ ان کے رب کی طرف سے برحق بھی ہے، تو اللہ ان کی برائیوں کو مٹادے گا اور ان کا حال درست کرے گا۔ یہ اس لئے کہ جو لوگ منکر ہیں انہوں نے جھوٹ کی پیروی کی اور جو لوگ ایمان لائے انہوں نے اپنے رب کی طرف سے حق کی پیروی کی، اسی طرح اللہ لوگوں کے لئے ان کی مثالیں بیان کرتا ہے۔ پس جب تم ان کے مقابل ہو جو کافر ہیں تو ان کی گردنیں مارو، یہاں تک کہ جب تم ان کو خوب مغلوب کر لو تو ان کی مشکیں کس لو، پھر یا تو اس کے بعد احسان کر و یا تاوان لے لو یہاں تک کہ لڑائی والے اپنے ہتھیار ڈال دیں، یہی (حکم) ہے، اور اگر اللہ چاہتا تو ان سے خود ہی بدلہ لے لیتا لیکن وہ تمہارا ایک دوسرے کے ساتھ امتحان کرنا چاہتا ہے، اور جو اللہ کی راہ میں مارے گئے ہیں اللہ ان کے اعمال برباد نہیں کرے گا"۔ (سورۃ محمدؐ: 1-4)

مذکورہ تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جہاد کے بلند مقاصد و اہداف، اہم مصلحتیں اور عظیم فوائد ہیں جن سے مسلمان اور دوسرے سب فائدہ اٹھاتے ہیں، اور جہاد ہجرت کے اہم آثار و نتائج میں سے ہے، اس کا تعلق ان بنیادوں سے ہے جن کو رسول ﷺ نے اسلامی حکومت کی تعمیر کے لئے اور ارکانِ اسلام کے استحکام کے لئے قائم فرمایا، اس لئے کہ ایک طاقتور فوج کے بغیر امت ضیاع اور خاتمہ کا شکار ہو گی، کیونکہ اس کے دشمن اس کو زیر کریں گے اور ان کو کسی قوت کا خوف نہیں ہو گا، اور جب مسلمانوں کے پاس ایک طاقتور لشکر ہو گا تو دشمن ان کے بات کا احترام کرے گا اور اس پر زیادتی کرنے کا اس کے ذہن میں خیال تک نہیں آئے گا، اس کے نتیجہ میں امن وسلامتی کی فضا عام ہو گی۔ (الہجرۃ فی القرآن الکریم، ص 453، الحرکات العسکریہ للرسول الاعظم ﷺ کفتی المیزان، سیف الدین، ص 62)

۳: غزوۂ بدر سے قبل کے اہم سرایا اور عسکری مشن:

اللہ کے رسول ﷺ کی قیادت میں جب مدینہ منورہ میں مسلمانوں کو پر امن ماحول حاصل ہو گیا اور نئے معاشرہ میں ایک مومن جماعت کی تشکیل عمل میں آئی تو اب ضروری تھا کہ مسلمان اور ان کی قیادت آس پاس کی صورتحال اور اعدائے دین کے منصوبوں کے بارے میں آگاہ رہیں، اور یہ بھی ضروری تھا کہ اسلامی دعوت اس مقصد اور منزل تک پہنچ جاتی جس کو لے کر حضرت محمد ﷺ کو بھیجا تھا، جس کی وجہ سے آپ ﷺ نے اور صحابہ کرام نے بہت سی مشقتیں برداشت کی تھیں۔

مدینہ کی قیادت کے لئے جن مسائل پر سب سے زیادہ توجہ مرکوز کرنا اور حل کرنا ضروری تھا وہ مکہ کے قریش کا موقف تھا، اس لئے کہ اہل مکہ اس بات سے خوش نہیں تھے کہ اسلامی نظام کا قیام عمل میں آئے اگرچہ مدینہ میں ہی کیوں نہ ہو، اس لئے کہ یہ ان کے نظام کے لئے ایک چیلنج تھا، وہ جانتے تھے کہ اسلامی نظام کے قیام کا مطلب ہے: جاہلیت اور آباء واجداد کے رسم ورواج کا خاتمہ، اس لئے اس کا مقابلہ کرنا ان کے لئے ناگزیر تھا۔

اہلِ مکہ نے نبی کریم ﷺ کو مدینہ منورہ پہنچنے سے روکنے کے لئے بہت سی کوششیں کیں، انہوں نے اسلام کو مٹانے کے لئے اور مسلمانوں کا خاتمہ کرنے کے لئے دشمنانہ موقف اختیار کئے اور یہ عداوت و دشمنی نبی کریم ﷺ کی ہجرت کے بعد بھی جاری رہی، اس کی سب سے بڑی دلیل وہ واقعہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے حضرت سعد بن معاذؓ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: وہ امیہ بن خلف کے دوست تھے اور امیہ جب مدینہ سے گزرتا تھا تو حضرت سعدؓ کے پاس ٹھہرتا تھا اور جب سعدؓ مکہ سے گزرتے تو امیہ کے پاس

ٹھہرتے تھے، جب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو سعدؓ عمرہ کرنے کے لئے نکلے اور مکہ میں امیہ کے پاس قیام کیا، انہوں نے امیہ سے کہا: میرے لئے کوئی تنہائی کا وقت بتاؤ تا کہ میں بیت اللہ کا طواف کروں، چنانچہ امیہ انہیں دوپہر کے وقت ساتھ لے کر نکلا، راستہ میں ان سے ابوجہل کی ملاقات ہوئی، اس نے پوچھا: ابو صفوان! یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟ میں نے کہا: کہ یہ سعد بن معاذؓ ہیں، ابوجہل نے کہا: میں تمہیں مکہ میں امن کے ساتھ طواف کرتا ہوا نہیں دیکھ سکتا ہوں، تم نے بے دینوں کو پناہ دے رکھی ہے اور اس خیال میں ہو کہ تم لوگ ان کی نصرت و مدد کر رہے ہو، خدا کی قسم! اگر تم ابو صفوان کے ساتھ نہ ہوتے تو اپنے گھر صحیح سالم واپس نہ لوٹتے، اس پر سعدؓ نے کہا- اس وقت ان کی آواز بلند ہو گئی تھی-: سن لو! اللہ کی قسم! اگر تم مجھے اس سے روکو گے تو میں بھی مدینہ کی طرف سے تمہارا راستہ بند کر دوں گا اور یہ تمہارے لئے زیادہ مشکلات کا باعث بنے گا۔ (صحیح بخاری: 395)

بیہقی کی روایت میں ہے: "خدا کی قسم! اگر تم مجھے خانہ کعبہ کا طواف کرنے سے روکو گے تو میں شام کی جانب تمہاری تجارت کا راستہ بند کر دوں گا"۔ (دلائل النبوۃ للبیہقی: 3/25)

اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کی ابوجہل حضرت سعد بن معاذؓ کو قریش کے مقابلہ میں حربی سمجھتا ہے اور اگر وہ سرداران مکہ میں سے ایک سردار کی امان میں مکہ میں داخل نہ ہوئے ہوتے تو وہ ان کی جان کے درپے ہو جاتا، یہ اہل مدینہ کے بارے میں سرداران مکہ کا ایک نیا ہی موقف تھا جو اسلامی نظام کے قیام سے پہلے نہیں پایا جاتا تھا، اس سے پہلے اہلِ مدینہ کو مکہ میں داخل ہونے کے لئے کسی کی امان اور عہد کی ضرورت نہیں پڑتی تھی بلکہ اس صورتحال سے پہلے قریش سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کے درمیان اور اہل مدینہ کے درمیان کوئی جنگی صورتحال پیدا ہو سکتی ہے اور اس سلسلہ میں اہل مدینہ کو مخاطب کرتے ہوئے وہ کہتے تھے: "واللہ! تمہارے مقابلہ میں عربوں کا کوئی قبیلہ ایسا نہیں ہے جس سے جنگ کرنا ہمارے لئے انتہائی ناگوار ہو"۔ (سیرت ابن ہشام (الروض الانف: 2/192)

جیسے کہ اس واقعہ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ اس صورتحال سے پہلے قریش کے تجارتی قافلے شام کی طرف جاتے ہوئے مدینہ کے راستے میں پر امن ہوتے تھے اور اسلامی حکومت کی طرف سے ان کو کوئی بھی ناگوار صورتحال کا سامنا نہیں کرنا پڑا، اور اسلامی حکومت نے بھی اب تک اہل مکہ کے ساتھ اہلِ حرب کا معاملہ نہیں کیا تھا، نہ ان کے خلاف اقتصادی و معاشی بائیکاٹ کیا، اور نہ ہی ان کے کسی قافلہ کے ساتھ تعرض کیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ مکہ کے لیڈروں ہی کی طرف سے مدینہ کی اسلامی حکومت کے خلاف اعلان جنگ کا آغاز ہوا اور انہوں نے ہی مسلمانوں کو اہلِ حرب شمار کیا، جن کو مکہ میں داخلہ کی اجازت اسی وقت مل سکتی تھی جبکہ ان کو کسی کی امان حاصل ہو۔ (الجہاد والقتال: 1/476)

مدینہ کی اسلامی حکومت کے خلاف روسائے مکہ کی جانب سے اعلان جنگ کرنے میں پہل کرنے کی دلیل وہ واقعہ بھی ہے جو سنن ابی داؤد میں مذکور ہے، حضرت عبدالرحمن بن کعب بن مالک سے روایت ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب میں سے ایک شخص سے روایت کرتے ہیں کہ کفار قریش نے ابن اُبی اور اس کے ساتھ اَوس اور خزرج میں سے بتوں کی عبادت کرنے والوں کے نام ایک خط لکھا، جبکہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ میں تھے اور یہ جنگ بدر سے پہلے کا واقعہ ہے، (انہوں نے لکھا کہ) آپ لوگوں نے ہمارے صاحب کو پناہ دے رکھی ہے، ہم اللہ

کی قسم کھاتے ہیں کہ آپ لوگوں کے لئے ضروری ہے کہ آپ ان سے جنگ کرواوران کو وہاں سے نکال دو، ورنہ پھر ہم سب تم پر چڑھائی کر لیں گے اور تمہارے جنگجوؤں کو قتل کر دیں گے اور تمہاری عورتوں کو گرفتار کر کے لونڈیاں بنالیں گے، جب عبداللہ بن اُبی اوراس کے ساتھ بتوں کی عبادت کرنے والوں کو یہ پیغام ملاتو وہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ قتال کرنے کے لئے جمع ہوئے، جب نبی کریم ﷺ کو اس بات کا علم ہواتو آپؐ نے ان سے ملاقات کی اور فرمایا: قریش کی دھمکی کا تم پر اتنا اثر ہوا ہے؟ وہ تمہیں اتنا نقصان نہیں پہنچا سکتے ہیں جتنا تم خود اپنے آپ کو نقصان پہنچانا چاہ رہے ہو، آپ اپنے بیٹوں اور بھائیوں کے ساتھ جنگ کرناچاہتے ہو! جب انہوں نے نبی کریم ﷺ کی یہ بات سنی تو وہ الگ الگ ہو گئے۔(سنن ابی داؤد:3004، مصنف عبدالرزاق: 9733،دلائل النبوۃ للبیہقی: 3/179)

اس واقعہ کے ذریعہ نبوت کی عظمت اور قائد ومربی ﷺ کی عظمت ظاہر ہوتی ہے،اس لئے آپ ﷺ نے اس فتنہ کو اس کے گھر میں ہی دفن کر دیا اور قبائلی نخوت کی رگ پر ہاتھ رکھ کر اس کا علاج کر لیا، نبی کریم ﷺ انسانی فطرت کی گہرائیوں سے واقف تھے،اسی لئے مشرکینِ یثرب کے دلوں میں آپ کے خطاب کا انتہائی اثر ہوا، آج بھی اس طرح کی حکمتِ عملی کی شدید ضرورت ہے جس کے ذریعہ ان تمام کوششوں کو ناکام بنایا جاسکتا ہو جن کوششوں کا مقصد اسلامی تحریک کو ختم کرنااور اس کو داخلی طور پر کمزور بنانا ہے۔

جب قریش نے مدینہ کی اسلامی حکومت کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی مسلمانوں کو قتال کی اجازت مل گئی تو پھر یہ فطری بات تھی کہ مدینہ کی اسلامی حکومت بھی قریش کے ساتھ جنگی صورتحال کا سامعاملہ کرتی،اسی لئے اللہ کے رسول ﷺ اسلامی حکومت کو استحکام عطا کرنے میں مزید سرگرم ہوگئے اور قریش کے اعلانِ جنگ کا بھی جواب دینے لگے، آپؐ چھوٹے چھوٹے فوجی دستوں کو مختلف علاقوں میں روانہ فرمانے لگے اور بنفس نفیس غزوات میں تشریف لے جانے لگے اور یہ سب سرایااور غزوات غزوہ بدر سے پہلے بھیجے گئے۔ (الجہاد والقتال:1/477)

اہم سرایااور غزوات

۱: غزوۂ اَبواء:

سب سے پہلا غزوہ جس میں نبی کریم ﷺ شریک ہوئے غزوۂ اَبواء ہے، اس کو غزوۂ ودّان بھی کہا جاتا ہے، اَبواءاور ودّان دونوں ایک دوسرے کے قریبی مقامات ہیں جن کے درمیان چھ یا آٹھ میل کا فاصلہ تھا، اس غزوہ میں جنگ کی نوبت نہیں آئی، بلکہ قبیلۂ بنی کنانہ کی شاخ بنو ضمرہ کے ساتھ معاہدہ طے پایا، اور یہ غزوہ ماہ صفر سن دو ہجری میں ہوا، اس غزوہ میں پیدل اور سوار مسلمانوں کی تعداد دو سو(۲۰۰) تھی۔ (دیکھیں: جیش النبي ﷺ، محمود دشیت خطاب، ص: 54)

۲: سریہ عبیدہ بن الحارث:

یہ دوسرا سریہ ہے جسے رسول ﷺ نے وادی رابغ کی جانب روانہ فرمایا اور ان کو پرچم دے کر روانہ فرمایا، اس سریہ میں ساٹھ مہاجرین شریک تھے، جبکہ مدّمقابل قریش کے لشکر کی تعداد دو سو(۲۰۰) سوار اور پیدل افراد پر مشتمل تھی، مشرکین کی قیادت ابوسفیان بن حرب کر رہے تھے، ان کے مابین وادی رابغ کے چشمہ کے پاس معمولی مڈبھیڑ ہوئی، اس میں حضرت سعد بن ابی وقاص ؓ نے پہلا تیر مارا، اور یہ اسلام میں مارا جانے والا پہلا تیر تھا، یہ سریہ ابواء سے واپس آنے کے بعد بھیجا گیا۔ (حدیث القران عن غزوات الرسول ﷺ، د۔ محمد بکر العباد 1/40)

۳: سریہ عبیدہ بن الحارث:

ابنِ اسحاق کہتے ہیں: نبی کریم ﷺ نے اسی وقت -یعنی جب آپ ؑ غزوۂ ابواء کے بعد مدینہ پہنچے- حضرت حمزہ بن عبد المطلب کو عیص کی جانب سے ساحلِ سمندر (سیف البحر) کی جانب تیس مہاجرین کا دستہ لے کر بھیجا، اس ساحل پر ان کو ابوجہل بن ہشام اہل مکہ کے تین سو سواروں کے ساتھ ملا، فریقین کے مابین مجدی بن عمرو جہنی نے بیچ بچاؤ کرایا، اس کا فریقین کے ساتھ معاہدہ تھا، جس کے نتیجہ میں وہ واپس چلے گئے اور ان کے مابین جنگ نہیں ہوئی۔ (سیرت ابن ہشام: 1/595)

۴: غزوۂ بُواط:

غزوہ بُواط ہجرت کے دوسرے سال ربیع الاول کے مہینہ میں پیش آیا، آپ ﷺ دو سو (۲۰۰) صحابہ کے ساتھ نکلے، آپ ؐ کا مقصد قریش کے تجارتی قافلہ کا راستہ روکنا تھا، اس قافلہ کا سردار امیہ بن خلف تھا، اور اس مقابلہ میں ایک سو افراد اور ڈھائی ہزار اونٹ تھے مگر کہیں بھی اُس قافلہ کا سامنا نہیں ہوا، اس لئے آپ ﷺ بغیر کسی جنگ کے مدینہ واپس تشریف لائے۔

۵: غزوۂ عشیرہ:

اس غزوہ میں رسول ﷺ قریش کے ایک قافلہ کے ساتھ تعرض کرنے نکلے اور حضرت ابوسلمہ بن عبد الأسد کو مدینہ میں امیر مقرر فرمایا، اس غزوہ کو ''غزوۃ العشیرہ'' کہا جاتا ہے، آپ ﷺ جمادی الاولی اور جمادی الثانیہ کی کچھ راتوں کو وہاں ٹھہرے، وہاں بنی مدلج اور

اُن کے حلفاء بنوضمرہ کے ساتھ معاہدہ کیا، اس کے بعد مدینہ منورہ واپس آگئے اور جنگ کی نوبت نہیں آئی، اس لئے کہ آپ ﷺ جس تجارتی قافلہ کا راستہ روکنے کے لئے نکلے تھے وہ کچھ روز پہلے ہی شام کی طرف نکل چکا تھا، اور اس نے ساحلی راستہ اختیار کیا تھا، قریش کو اس کے متعلق علم ہوا تو وہ اس کی حفاظت کے لئے نکلے اور ان کی مڈ بھیڑ رسول ﷺ کے ساتھ ہو گئی جس کے نتیجہ میں جنگ بدر کا معرکہ پیش آیا۔

۶: سریہ سعد بن ابی وقاصؓ:

غزوۂ عشیرہ کے بعد نبی کریم ﷺ نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو ایک فوجی دستہ (سریہ) لے کر روانہ کیا جو آٹھ مہاجرین پر مشتمل تھا، وہ نکلے یہاں تک کہ سرزمینِ حجاز کے مقامِ ''الخرار'' پہنچے، اس کے بعد وہ واپس آئے اور کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔(سیرت ابن ہشام: 600/2)

۷: پہلا غزوۂ بدر:

اس غزوہ کا سبب یہ تھا کہ کُرز بن جابر فہری نے مدینہ کی چراگاہ پر حملہ کیا اور کچھ اونٹ اور جانور لوٹ کر چلا گیا، رسول ﷺ اس کے تعاقب میں نکلے یہاں تک کہ بدر کے ایک کنارے پر صفوان نامی وادی پہنچے، مگر کُرز بن جابر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا، اس لئے رسول اللہ ﷺ مدینہ واپس آگئے۔(سیرت ابن ہشام: 2/601)

۸: نخلہ کی جانب سریہ عبداللہ بن جحش الاسدی:

نبی کریم ﷺ نے حضرت عبداللہ بن جحشؓ کو رجب کے آخری دن مکہ کے جنوب میں واقع مقام نخلہ کی جانب آٹھ مہاجرین کے دستہ کے ساتھ روانہ کیا، تاکہ قریش کی نقل وحرکت اور حالات معلوم کریں، لیکن ان کی مڈ بھیڑ قریش کے ایک تجارتی قافلہ کے ساتھ ہوئی اور اس کے امیر عمرو بن حضرمی کو قتل کر دیا اور دو لوگوں کو گرفتار کر لیا جن کا نام عثمان بن عبداللہ اور حکم بن کیسان تھا، ان کو لے کر مدینہ واپس آئے، نبی کریم ﷺ نے ان کے مال غنیمت کے بارے میں توقف اختیار کیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلشَّهْرِ ٱلْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ ۖ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ ۖ وَصَدٌّ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِ وَكُفْرٌۢ بِهِۦ وَٱلْمَسْجِدِ ٱلْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِۦ مِنْهُ أَكْبَرُ عِندَ ٱللَّهِ ۚ وَٱلْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ ٱلْقَتْلِ﴾ ترجمہ: ''لوگ پوچھتے ہیں ماہ حرام میں لڑنا کیسا ہے؟ کہو: اِس میں لڑنا بہت برا ہے، مگر راہِ خدا سے لوگوں کو روکنا اور اللہ سے کفر کرنا اور مسجد حرام کا راستہ خدا پرستوں پر بند کرنا اور حرم کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اِس سے بھی زیادہ برا ہے اور فتنہ خونریزی سے شدید تر ہے''۔(سورۃ البقرۃ: 217)

جب قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے مالِ غنیمت اور دونوں قیدیوں کو لے لیا، سریہ عبداللہ بن جحش میں مسلمانوں کو پہلا مال غنیمت حاصل ہوا اور عمرو بن حضرمی پہلا شخص ہے جس کو مسلمانوں نے قتل کیا، اور عثمان بن عبداللہ اور حکم بن کیسان مسلمانوں کے ذریعہ قید کئے جانے والے پہلے قیدی ہیں۔(دیکھیں: حدیث القرآن الکریم عن غزوات الرسول ﷺ 1/43)

یہ سریّہ ماہِ رجب میں پیش آیا اور ماہ رجب اشہرِ حرم میں سے ہے، رجب کے آخری روز قافلہ کے ساتھ ان کی مڈ بھیڑ ہوئی، انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ ہم رجب کے آخری دن میں ہیں، اگر ہم ان کے ساتھ قتال کریں گے تو ہم محترم مہینہ کے تقدس کو پامال کریں گے اور اگر رات تک ہم نے چھوڑ دیا تو وہ حرم میں داخل ہو جائیں گے، بالآخر ان سب کا اتفاق ہوا کہ جنگ کی جائے، انہوں نے ان کے سردار کو قتل بھی کیا اور دو کو گرفتار بھی کر لیا، البتہ اللہ کے رسول ﷺ نے ان کے اس عمل کو ناپسند کیا اور فرمایا: میں نے آپ کو ماہِ حرام میں قتال کرنے کا حکم نہیں دیا تھا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

۴: اسباق ودروس اور فوائد:

۱: جہاد کب مشروع ہوا؟:

ڈاکٹر محمد ابو شہبہ کی رائے یہ ہے کہ جہاد ہجرت کے دوسرے سال کے آغاز میں مشروع ہوا، وہ اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ہجرت کے پہلے سال مسلمان دیگر دینی اور دنیاوی امور کی تنظیم و تربیت میں مشغول تھے، جیسے کہ مسجد نبوی کی تعمیر، معاشی امور اور کسبِ معاش کے ذرائع کی ترتیب، اسی طرح سیاسی امور کی تنظیم جیسے کہ آپس میں مؤاخات، مدینہ میں رہنے والے یہود کے ساتھ معاہدہ تاکہ مسلمان ان کے شر سے محفوظ ومامون رہیں۔(دیکھیں: السیرۃ النبویہ، ابو شہبہ، 1/75)

استاذ صالح الشامی کی رائے یہ ہے کہ جہاد کی اجازت ہجرت کے پہلے سال کے اواخر میں دی گئی۔ (دیکھیں: من معین السیرۃ، ص175)

۲: سریہ اور غزوۃ میں فرق:

سیرت نگار عام طور پر غزوہ کا اطلاق مسلمانوں کے اس گروہ پر کرتے ہیں جس کو لے کر نبی کریم ﷺ خود دشمن سے مقابلہ کے لئے نکلے ہوں، چاہے جنگ ہوئی ہو یا جنگ کی نوبت نہ آئی ہو، اسی طرح چاہے تعداد کم ہو یا زیادہ۔ اور مسلمانوں کا وہ گروہ جس کو نبی کریم ﷺ دشمن کا سامنا کرنے کے لئے روانہ فرمائیں، اس کو سریہ یا "بعث" (فوجی دستہ) کہتے ہیں، اس میں جنگ ہوتی ہے اور کبھی جنگ کی نوبت نہیں آتی ہے، بسا اوقات سریہ کا مقصد صرف دشمن کی خبریں معلوم کرنا یا اور کچھ بھی ہو سکتا ہے، البتہ عام طور پر ان کی تعداد کم ہوتی ہے، اس لئے کہ ان کا مشن محدود ہوتا تھا، جیسے کہ دشمن پر حملہ کرنا، اس کو خوفزدہ کرنا، یا اس کو کمزور کرنا۔ رسول ﷺ نے ستائیس (۲۷) غزوات کی خود قیادت فرمائی اور تقریباً اڑتیس (۳۸) سرایا روانہ فرمائے۔ آپ ﷺ نے انتہائی مختصر مدت میں ان تمام غزوات اور سرایا کی منصوبہ بندی فرمائی جو اقوام کی تاریخ میں سب سے کم مدت ہے، یہ مدت صرف دس سالوں پر مشتمل ہے۔ (فی ظلال السیرۃ، غزوۃ بدر، أبو فارس، ص:12)

۳: مدینہ کے باشندوں کی تعداد اور سرایا کے ساتھ اس تعداد کا تعلق:

نبی کریم ﷺ نے ہجرت کے پہلے سال اور مؤاخات کے متصلاً بعد مردم شماری کرنے کا حکم دیا، اور آپؐ کے حکم کے مطابق یہ مردم شماری صرف مسلمانوں کی تھی، آپؐ نے فرمایا تھا: "لوگوں میں سے جس نے اسلام قبول کیا ہے ان کے نام مجھے لکھ کر دو"۔ ان میں سے جنگ کرنے کی صلاحیت رکھنے والوں کی تعداد پندرہ سو تھی۔ (الوثائق السیاسیۃ، حمید اللہ، ص: 65)

اس مردم شماری کے بعد مسلمان تعجب سے ایک دوسرے کو کہنے لگے: ہماری تعداد پندرہ سو ہے، پھر بھی ہمیں ڈرایا دھمکایا جائے گا؟! اس لئے کہ اس سے پہلے وہ جب بھی سوتے تھے تو خوف اور ڈر کی وجہ سے اسلحہ کے بغیر نہیں رہتے تھے، رسول ﷺ رات میں تنہا نکلنے سے ان کو منع فرماتے تھے تاکہ وہ ہر قسم کی تکلیف سے محفوظ رہیں، اس مردم شماری کے بعد سرایا اور غزوات کا سلسلہ شروع ہو گیا، اس مردم شماری کا تعلق ان تنظیمی امور سے ہے جو نئی اُبھرتی ہوئی حکومت کی تشکیل و تنظیم کے لئے اختیار کئے جا رہے تھے۔ (دیکھیں: الروض الأنف 5/43، دراسات فی عہد النبوۃ، الشجاع، ص 163)

۴: صحابہ کرام کے ذریعہ نبی کریم ﷺ کی حفاظت اور پہرہ:

صحابہ کرام نبی کریم ﷺ کی شخصی حفاظت کیا کرتے تھے، ام المومنین حضرت عائشہؓ سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ ایک رات نبی کریم ﷺ کو نیند نہیں آئی، اس لئے آپؐ نے فرمایا: کاش میرے صحابہ میں سے کوئی صالح شخص میرے لئے آج رات پہرہ دیتا! اتنے میں ہم نے ہتھیاروں کی آواز سنی، نبی کریم ﷺ نے پوچھا: کون صاحب ہیں؟ بتایا: سعد ہوں، اللہ کے رسولؐ! میں آپ کے لئے پہرہ دینے آیا ہوں، اس کے بعد نبی کریم ﷺ سو گئے یہاں تک کہ ہم نے آپ کے خراٹے کی آواز سنی۔ (صحیح بخاری: 2885، 7231 صحیح مسلم: 2410)

یہ واقعہ غزوہ بدر سے پہلے پیش آیا، حضرت عائشہؓ کی مذکورہ حدیث سے معلوم ہوا کہ دشمن سے بچنے کی کوشش کرنا، احتیاطی تدابیر اختیار کرنا اور احتیاط کے وقت غفلت ولاپرواہی سے اجتناب کرنا شریعت کا حکم ہے، اسی طرح لوگوں کے لئے ضروری ہے کہ دشمن کے ڈر سے اپنے سربراہ کی حفاظت کریں، اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو اپنی خوشی سے کوئی کار خیر انجام دے اس کی تعریف اور حوصلہ افزائی ہونی چاہیے، نبی کریم ﷺ نے احتیاطی اور حفاظتی تدبیر اس لئے اختیار کی تاکہ اس کی مشروعیت اور جواز کا علم لوگوں کو ہو جائے، حالانکہ آپ ﷺ سب سے زیادہ اللہ پر توکل اور بھروسہ رکھتے تھے۔ (ولایۃ الشرطۃ فی الاسلام، ڈاکٹر عمر محمد حمیدانی، ص 63)

۵: بنو ضمرہ کے ساتھ معاہدہ کی دستاویز کا متن اور اس پر تبصرہ:

معاہدہ کا متن یہ تھا: بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ یہ بنو ضمرہ بن بکر بن عبد بن مناۃ بن کنانہ کے لئے محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف سے تحریر ہے کہ یہ لوگ اپنی جان اور مال کے بارے میں مامون و محفوظ رہیں گے اور جو ان پر حملہ آور ہوگا اس کے خلاف ان کی مدد کی جائے گی، الّا یہ کہ یہ خود اللہ کے دین کے خلاف جنگ کریں، یہ معاہدہ ہمیشہ کے لئے ہے اور جب نبی ﷺ ان کو مدد کے لئے پکاریں تو انہیں آنا ہوگا، اس سلسلہ میں ان کے لئے اللہ کا ذمہ اور اس کے رسولؐ کا ذمہ ہے، اور ان میں سے جو عہد پر قائم رہے گا اور غلط کاموں سے بچتا رہے گا اس کی مدد کی جائے گی۔ (الوثائق السیاسیۃ، محمد حمید اللہ، ص: 220)

نبی کریم ﷺ نے غزوۂ ابواء کو ایک زریں موقع سمجھا، اسی لئے آپ ﷺ نے بنو ضمرہ کے سردار کے ساتھ عسکری معاہدہ کیا کیونکہ اس علاقہ کا جائے وقوع عسکری اعتبار سے انتہائی اہم تھا جس کی ابھرتی ہوئی اسلامی حکومت اور قریش کے درمیان جنگی صورتحال کے

اعتبار سے کافی اہمیت تھی۔ اللہ کے رسول ﷺ نے مدینہ اور اہل مکہ کے مابین مسلح جنگ ہونے کی صورت میں ان سے مخالفانہ طرزِ عمل اختیار نہ کرنے کی ضمانت لی، جنگ بدر تک آپ ﷺ کا منصوبہ یہ تھا کہ مہاجرین کے چھوٹے چھوٹے دستے بھیج کر قریش کے قافلوں سے تعرض کیا جائے، ان قافلوں کے ساتھ کوئی حفاظتی فوج بھی نہیں ہوتی تھی اور اس طرح کی صورتحال کے بارے میں قریش نے ابھی تک سوچا بھی نہیں تھا۔ (دیکھیں: نشأۃ الدولۃ الاسلامیۃ، د۔ عون الشریف، ص: 43)

بنو ضمرہ اور ان کے حلفاء مدینہ سے انتہائی قریب تھے اور مدینہ ان کا بازار اور ان کے رزق کا سرچشمہ تھا، مدینہ سے قریب ہونے کی وجہ سے ان کے لئے ابھرتی اسلامی حکومت کے ساتھ معاہدہ کرنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا، دورِ حاضر کے اعتبار سے یہ ان کے ساتھ نا جنگ معاہدہ تھا۔ (دیکھیں: الفقہ السیاسی، خالد سلیمان الفہداوی، ص: 119)

اس معاہدہ سے معلوم ہوا کہ شرعی اور سیاسی ضرورت و تقاضے کے پیشِ نظر مسلمانوں کو کسی بھی گروہ کے ساتھ عسکری، اقتصادی یا تجارتی معاہدہ کرنا پڑ سکتا ہے، اور سیاسی معاہدہ کی شریعت میں اصل موجود ہے، اور یہ ایک ایسی ضرورت ہے جس کو ہونے والے یا متوقع نقصان کو دور کرنے کے مقصد سے پورا کیا جاسکتا ہے، اس طرح کا معاہدہ ضرر دور کرنے اور مصلحتِ مشترکہ کے اصول پر مبنی ہے، اس لئے یہ ضروری ہے کہ اس طرح کے معاہدہ کا معلوم و متعین شرعی مقصد ہو اور اس میں تمام مسلمانوں کا فیصلہ اور رائے شامل ہو اور اگر فیصلہ کرنے والے دوسرے ہی ہوں اور مسلمان ان کے تابع فرمان اور فیصلہ کو صرف نافذ کرنے والے ہوں۔ جیسے کہ دورِ حاضر کے معاہدوں میں ہوتا ہے۔ تو اس طرح کے معاہدوں پر شرعی اصول منطبق نہیں ہوتا ہے، اُمت کے قائدین کے لئے ضروری ہے کہ سیاسی اعتبار سے نبی کریم ﷺ کے طرزِ عمل کو اچھی طرح سمجھ لیں، اور اس اصول کو بھی سمجھ لیں کہ "لا ضرر ولا ضرار" یعنی: نہ ابتداء میں کسی کو نقصان پہنچانا جائز ہے اور نہ بدلے کے طور پر نقصان پہنچایا جائے گا۔ (سنن ابن ماجہ: 2341، مسند احمد: 1/313، المعجم الاوسط للطبرانی: 3789)

اس معاہدہ کے ذریعہ واضح ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت کے لئے کسی دوسری حکومت کے ساتھ دفاعی معاہدہ کرنا جائز ہے جبکہ مسلمانوں کی کوئی مصلحت اس کی متقاضی ہو، اور اس معاہدہ کے نتیجے میں کوئی نقصان نہ ہو رہا ہو، اس حالت میں اسلامی حکومت کے لئے ضروری ہے کہ وہ حلیف حکومت کی نصرت و مدد کرے، جبکہ زیادتی کرنے والے کفار کے خلاف وہ مدد کا مطالبہ کریں، اسی طرح اسلامی حکومت کے لئے جائز ہے کہ وہ بھی حلیف حکومت سے اسلحہ اور افراد کی مدد طلب کرے تاکہ وہ اسلامی حکومت کے جھنڈے تلے دشمنوں کا مقابلہ کرے۔ (الجہاد والقتال فی السیاسۃ الشرعیۃ، د۔ محمد خیر ہیکل: 1/479)

نبی کریم ﷺ نے بنو ضمرہ پر یہ شرط عائد کر دی کہ وہ اللہ کے دین کے خلاف جنگ نہ کریں تاکہ ان کو زیادتی کرنے والے کے خلاف مسلمانوں کی طرف سے نصرت و مدد مل سکے۔

اس معاہدہ کے ذریعہ ان رکاوٹوں کو دور کیا گیا جو دعوت کی راہ میں حائل ہو سکتی تھیں، اس معاہدہ کو مسلمانوں کے لئے ایک سیاسی اور عسکری فتح سمجھا جاتا ہے۔

۶: اللہ کی راہ میں پہلا تیر چلانے والے:

سرایا کی تاریخ میں سریہ عبیدہ بن حارث سب سے پہلا سریہ ہے جس میں مسلمانوں کا مشرکین کے ساتھ عسکری طور پر آمنا سامنا ہوا، نوبت یہاں تک پہنچی کہ فریقین نے ایک دوسرے کے ساتھ تیروں کا تبادلہ کیا، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ عربوں میں پہلے شخص تھے جنہوں نے اللہ کی راہ میں تیر چلایا، اور یہ جنگ زیادہ دیر جاری نہیں رہی، اس لئے کہ فریقین نے میدان جنگ سے نکلنے پر اتفاق کیا، مسلمانوں کا میدانِ جنگ سے نکلنا منظم تھا اور اس کے ہیرو حضرت سعد بن ابی وقاصؓ تھے، دشمن کی طرف سے کسی بھی متوقع حملہ کو روکنے میں انہوں نے بنیادی کردار ادا کیا، کیونکہ انہوں نے دشمنوں کی طرف تیروں کی بوچھاڑ کر دی جس نے دشمن کو پریشان کر کے رکھ دیا اور مسلمانوں کو بھی منظم طریقہ سے میدانِ جنگ سے نکلنے کا راستہ ہموار کیا، اس دن عتبہ بن غزوانؓ اور مقداد بن اُسودؓ مسلمانوں کے خیمے میں بھاگ کر آگئے، وہ اس سے پہلے ہی اسلام قبول کر چکے تھے، اس سریہ میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے ایک اسلامی عسکری فتح درج کرائی جس کو ان عظیم کارناموں میں زریں حروف سے تحریر کیا گیا، اس سریہ نے رسول ﷺ کی اس سیاسی حکمتِ عملی کو بھی یقینی بنایا جس کے مطابق رسول ﷺ بدر تک کے ابتدائی غزوات و سرایا میں صرف مہاجرین کو ہی عسکری و جنگی محاذ پر استعمال کر رہے تھے اور یہ بیعتِ عقبہ ثانیہ کے معاہدہ کی عملی تنفیذ تھی۔ (دیکھیں: السرایا والبعوث النبویۃ، د۔ بریک عمری، ص91 السرایا والبعوث النبویہ، ص: 92)

۷: قبیلۂ جہینہ کے ساتھ ہوئے معاہدہ کا متن اور اس پر تبصرہ:

"وہ اپنے جان و مال کے بارے میں محفوظ و مامون ہیں، جو ان پر ظلم کرے گا یا ان کے ساتھ جنگ کرے گا تو ان کی مدد کی جائے گی، الّا یہ کہ یہ دین کے خلاف جنگ کریں گے، ان کے اہل بادیہ میں سے جو عہد پر قائم رہے گا اور غلط کاموں سے بچتا رہے گا اس کے لئے بھی وہی حقوق ہیں جو ان کے شہریوں کے ہیں"۔ (دیکھیں: مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ، محمد حمید اللہ، ص: 62)

اس معاہدہ کا اثر اس وقت ظاہر ہوا جبکہ مجدی بن عمرو جہنی نے حضرت حمزہ بن عبد المطلب کے فوجی دستہ اور ابو جہل کے زیرِ قیادت قریشی قافلہ کے درمیان وساطت اور مصالحت کی کوشش کی، قریشی تجارتی قافلہ کی حفاظت کے لئے قریش کے تین سو شہسوار مامور تھے، جہینہ کے زیرِ اثر علاقہ 'العیص' کے کنارے پر فریقین کا آمنا سامنا ہوا، انہوں نے جنگ کے لئے صف بندی بھی کر لی لیکن جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی جہینہ کے ایک سردار مجدی بن عمرو نے ان کے درمیان صلح کرانے کے لئے سفارتی کوششیں کی اور وہ فریقین کے مابین مصالحت کرانے میں کامیاب ہو گیا، مجدی بن عمرو ضمری فریقین میں سے ہر ایک کا حلیف تھا، اس لئے انہوں نے اس کی مخالفت نہیں کی اور دونوں گروہ اپنے اپنے علاقوں کی طرف واپس چلے گئے اور جنگ کی نوبت نہیں آئی۔ (دیکھیں: المواھب اللدنیۃ 1/75، طبقات ابن سعد 2/6، السرایا والبعوث، ص: 85)

اس معاہدہ سے پتہ چلتا ہے کہ عسکری تحریک شروع ہونے سے پہلے ہی اسلامی ریاست اور پڑوس کے قبائل کے مابین معاہدے ہو چکے تھے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ قریش کے خلاف ابتدائی سرایا اور حملوں کی تحریک سے پہلے ہی اسلامی حکومت اور بحر احمر کے ساحل پر مقیم قبیلہ جہینہ کے درمیان امن معاہدہ ہو چکا تھا۔

اس معاہدہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت اور دوسری حکومت کے مابین امن معاہدہ کا انعقاد جائز ہے، اور اس کے بعد وہ حکومت اسلامی حکومت کے مخالفین کے ساتھ بھی امن معاہدہ کر سکتی ہے بشر طیکہ معاہدہ میں یہ دفعہ شامل نہ ہو کہ وہ مسلمانوں کے مقابلہ میں دشمنوں کی مدد کرے، اور اسلامی حکومت کے لئے بھی جائز ہے کہ وہ اپنے مد مقابل کے ساتھ جنگ کرنا بند کر دے جب کہ وہ اس کے لئے تیار ہو اور کوئی مصالحت کی کوشش کر رہا ہو، بشر طیکہ اس میں مسلمانوں کو کوئی ضرر اور نقصان لاحق نہ ہو۔ (دیکھیں: الجہاد والقتال فی السیاسۃ الشرعیۃ: 1/478- 479)

حضرت حمزہؓ کی فوجی کارروائی کے بت پرست خیمہ پر انتہائی خطرناک اثرات مرتب ہوئے جس نے قریش کو متزلزل کر کے رکھ دیا اور ان کے دلوں میں خوف اور ڈر پیدا کر دیا، اور ان کو پتہ چل گیا کہ ان پر خطرات کے بادل منڈلا رہے ہیں اور اب ان کے تجارتی راستے اور ان کی اقتصادی قوت کو بھی چیلنج کا سامنا ہے۔ (دیکھیں: السرایا والبعوث النبوی، ص:86)

ابو جہل جب حضرت حمزہؓ سے بچ کر مکہ واپس پہنچا تو اس نے اس وقت قریش کو نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا: اے قریش کے لوگو! بے شک محمدؐ یثرب میں مقیم ہو چکے ہیں اور اس نے اپنے دستے بھیج دیئے ہیں، وہ تمہیں نقصان پہنچانے کے درپے ہے، لہذا اس کے راستے سے چلنے سے اور اس کے قریب جانے سے بچو، وہ بپھرے ہوئے شیر کی طرح ہے، وہ تم پر غصہ کی وجہ سے دانت پیس رہا ہے، اس لئے کہ تم نے اسے اس طرح ملک بدر کیا ہے جس طرح اونٹ اپنے کھروں سے کاٹنے والے کیڑوں کو دور کرتے ہیں، اللہ کی قسم! اس کے پاس جادوگر ہیں، میں نے جب بھی اسے یا اس کے کسی ساتھی کو دیکھا تو میں نے ان کے ساتھ شیاطین کو دیکھا اور تم تو اوس اور خزرج کی عداوت و دشمنی سے اچھی طرح واقف ہو، وہ دشمن ہیں اور اس نے دشمن سے مدد حاصل کی ہے۔ (سیرت ابن ہشام: 1/218-219)

۸: سریہ عبداللہ بن جحش اور اس میں موجود اسباق و دروس:

بلا شبہ سریہ عبداللہ بن جحش کے ذریعہ اہم نتائج مرتب ہوئے، اس میں بہت سے دروس و اسباق اور اہم فوائد اور رہنمائی ہے جن میں سے چند اہم اسباق مندرجہ ذیل ہیں:

أ: اس سریہ کی تفصیلات میں وارد ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس سریہ کے امیر کے نام ایک تحریر لکھی اور ان کو حکم دیا کہ اس کو اس وقت تک نہ دیکھیں یہاں تک کہ دو دن کی مسافت طے نہ کر لیں۔ یہ جنگی اصول و ضوابط میں سے ایک اہم اصول اور حکمتِ عملی ہے، وہ یہ ہے کہ جنگ کے منصوبے کو پوشیدہ رکھا جائے، اسی طرح فوجی نقل و حرکت کی سمت کو بھی مخفی رکھا جائے یہاں تک کہ فوج دشمنوں کی ہر قسم کی چال اور سازشوں سے محفوظ ہو سکے، چنانچہ مدینہ منورہ میں اس وقت یہود اور بت پرست بھی آباد تھے، اس بات کا امکان تھا کہ یہ لوگ اہل مکہ کو ان کے خلاف بھیجے گئے سریہ کی سمت اور نقل و حرکت سے مطلع کرتے، اس لئے جب یہ دستہ مدینہ سے اس حال میں نکلا کہ اس کو خود اپنی اصل جہت اور منزل کا علم نہیں ہے تو نبی کریم ﷺ مطمئن ہو گئے کہ اس سریہ کا مقصد و مشن کسی کے سامنے منکشف نہیں ہو گا۔ (التاریخ الاسلامی؛ مواقف و عبر 4/71)

ایک محقق و باحث اس سریہ میں نبوی تربیت کا اثر اچھی طرح دیکھ سکتا ہے، ان سب نے آپ ﷺ کی بات سنی اور مکمل طور پر اطاعت کی اور وہ دشمن کے علاقہ تک پہنچ گئے اور اس علاقہ میں آگے بڑھ کر دشمن کو پیچھے سے گھیر لیا، یہ صحابہ کرام کی قوتِ ایمانی اور اللہ کی راہ میں اپنی جانوں کی پرواہ نہ کرنے کی واضح دلیل ہے۔ (ایضاً)

ب: اس سریہ کے افراد کی طرف سے شہرِ حرام میں قتال کا جو واقعہ پیش آیا قریش نے اس سے فائدہ اٹھانا چاہا اور ایک پروپیگنڈہ مہم اور میڈیا کے ذریعہ جنگ چھیڑ دی جس میں مسلمانوں کے خلاف طرح طرح کے الزامات لگائے گئے، اس سلسلہ میں ابراہیمی تعلیمات کا استعمال کیا گیا جس کے بعض آثار اس وقت تک جاہلی معاشرہ میں موجود تھے، جیسے کہ اَشہر حرم (محترم مہینوں) میں قتال کی حرمت اور دیگر احکام۔ قریش نے محمد ﷺ اور مسلمانوں کی تشہیر کرنے کے لئے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور ان کی شبیہ کو اس ظلم و زیادتی کرنے والے کی طرح پیش کیا جو حرمات کی پاسداری نہ کرتا ہو، قریش نے ہر جگہ یہ چرچا کر دیا کہ محمدؐ اور اس کے اصحاب نے محترم مہینے کے تقدس کو پامال کر دیا، اس میں خونریزی کی، مال لوٹا اور گرفتاریاں کیں۔ (السنن الکبریٰ للبیہقی: 9/59، الدلائل 3/19، سیرت ابن ہشام: 2/254، مکۃ والمدینۃ فی الجاہلیۃ و عہد الرسول ﷺ، استاد احمد شریف، ص: 445، السرایا والبعوث النبویۃ، ص 100)

بظاہر قریش اپنے منصوبے میں کامیاب ہو گئے، اس لئے کہ ان کی پروپیگنڈہ مہم کے دور تک اثرات پڑے، یہاں تک کہ مدینہ میں بھی اس کا واضح اثر ظاہر ہوا، چنانچہ مسلمانوں کے درمیان بھی اس سلسلہ میں بحث و سوالات شروع ہوئے اور وہ بھی سریہ کے افراد کو شہر حرام میں قتال کرنے کی وجہ سے تنقید کا نشانہ بنانے لگے، حالات کشیدہ ہو گئے اور یہود بھی جلتی میں تیل کا کام کرنے لگے، انہوں نے یہ عام کرنا شروع کر دیا کہ مسلمانوں اور قریش کے درمیان اب ضرور جنگ ہو کر رہے گی، بلکہ اب سب عرب اس جنگ کا حصہ بنیں گے، اس لئے کہ مسلمانوں نے شہر حرام کے تقدس کو پامال کیا ہے، وہ اس کی تشہیر کرنے لگے کہ عمرو بن حضرمی کو واقد بن عبد اللہ نے قتل کیا، عمرو: جنگ آباد ہو گئی۔ حضرمی: جنگ حاضر ہو گئی۔ واقد: جنگ کی آگ بھڑک گئی۔ یہود کی طرف سے اس طرح کی باتیں ان کے دلوں میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف چھپے ہوئے کینہ اور عداوت کا پتہ دیتی ہیں۔ (سیرت ابن ہشام: 1/603 - 604، التاریخ الاسلامی: 4/72)

جب سریہ کے افراد کو بھی یہ احساس ہو گیا کہ وہ تو ہلاک ہو گئے، وہ نادم و شرمسار بھی ہوئے تو اللہ کی طرف سے مسکت جواب آ گیا جس کے ذریعہ مشرکین کی زبانیں بند ہو گئیں، جو حرمات کو ڈھال بنا کر مسلمانوں کو نشانہ بنا رہے تھے اور اپنے جرائم پر پردہ ڈال رہے تھے، اس لئے قرآن نے ان مجرموں کو ننگا کر دیا، ان کے دلائل کا رد کیا اور شہر حرام میں قتال کرنے کے سلسلہ میں ان کی نکیر کا بھی جواب دیا، قرآن نے واضح کر دیا کہ اللہ کے راستہ سے روکنا اور اللہ کا انکار کرنا شہر حرام اور مسجد حرام میں قتال کرنے سے کہیں خطرناک جرم ہے اور مسجد حرام سے وہاں کے باشندوں کو نکالنا شہر حرام میں قتال کرنے سے کہیں خطرناک جرم ہے۔

اسی طرح ایک شخص کو دین کے بارے میں پریشان کرنا شہر حرام میں قتل کرنے سے زیادہ خطرناک جرم ہے، قریش نے ان سب جرائم اور کبائر کا ارتکاب کیا ہے، لیکن وہ بھول گئے اور ان جرائم کو معمولی سمجھ کر طاقِ نسیان میں ڈال دیا اور ان کو صرف مہینوں کی حرمت یاد رہی، جس کو انہوں نے اسلام اور اسلامی ریاست کے خلاف خطرناک قسم کی جنگ چھیڑنے کا ذریعہ بنایا تاکہ بت پرست و مشرک قبائل ان پر

چاروں طرف سے حملہ آور ہوں اور عام لوگوں کو اس دین کے بارے میں متنفر کر دیا جائے، یہاں تک کہ اس صورت حال کی وجہ سے رسول ﷺ بھی انتہائی مغموم اور فکر مند ہو گئے اور آپ ﷺ نے امیرِ سریہ اور ان کے ساتھیوں کی سرزنش کی، اس لئے آیات بیانات کے ذریعہ قریش کے پروپیگنڈہ کا منہ توڑ جواب دیا گیا اور واضح کیا گیا کہ اگرچہ شہر حرام میں قتال کرنا جائز نہیں ہے لیکن اللہ کے نزدیک اس شخص کی حرمت نہیں ہے جو حرمات کو پامال کرے اور اللہ کے راستے سے دوسروں کو روکے۔ (السرایا والبعوث النبویۃ، ص:100)

ج: قائدِ رسول ﷺ کو اپنی فوج کی سلامتی کی سب سے زیادہ فکر رہتی تھی، چنانچہ جب حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور حضرت عتبہ بن غزوان اس سریہ میں پیچھے رہ گئے، اس لئے کہ ان کا ایک اونٹ گم ہو گیا تھا اور وہ اس کو تلاش کر رہے تھے، اسی اثناء میں قریش کے لوگ اپنے دو قیدیوں کو چھڑانے کے لئے فدیہ لے کر پہنچ گئے لیکن رسول ﷺ نے قیدیوں کو دینے سے انکار کر دیا اور فرمایا: "مجھے اندیشہ ہے کہ تم نے سعد بن مالک (یعنی ابی وقاص) اور عتبہ بن غزوان کوں شہید کر دیا ہے"۔ آپ نے ان دونوں قیدیوں کو اس وقت تک نہیں چھوڑا یہاں تک کہ حضرت سعد اور حضرت عتبہ واپس نہیں آئے، جب وہ صحیح سالم پہنچ گئے تو اس کے بعد ہی ان قیدیوں کو آزاد کیا گیا، حکم بن کیسان نے اسلام قبول کیا اور انہوں رسول ﷺ کے پاس ہی قیام کیا اور عثمان بن عبداللہ بن مغیرہ حالت کفر میں ہی واپس گیا۔ (السرایا والبعوث النبویہ، ص: 100)

نبوی طرزِ عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ قائد کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی فوج کی حفاظت و سلامتی کے بارے میں فکر مند ہو، اس لئے کہ وہی اللہ کے دین کی نصرت و مدد اور اسلامی حکومت کے قیام کے لئے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔

عصر حاضر کی عسکری تربیت گاہوں میں اس اصول پر خاص زور دیا جاتا ہے کہ جب ایک فوجی یا سپاہی محسوس کرتا ہے کہ قیادت کو اور اس کے امن و سلامتی کی فکر ہے تو پھر اس کو کوئی بھی قربانی دینے میں پس و پیش اور تردد نہیں ہوتا ہے۔ (دیکھیں: غزوۃ البدر الکبریٰ، محمد ابو فارس، ص23)

د) اس سریہ کے ذریعہ عملی میدان میں حفاظتی واحتیاطی تربیت کا پہلو نمایاں ہوتا ہے، چنانچہ سریہ عبداللہ بن جحش نے مکمل طور پر اپنے اہداف و مقاصد پورے کر لئے، وہ قریش کے زیر اثر علاقہ میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے جس سے قریش کے لوگ اور زیادہ پریشان ہو گئے اور باریک بینی کے ساتھ انجام دی جانے والی اس کارروائی نے ان کی پریشانی میں مزید اضافہ کر دیا یہاں تک کہ قریش کے جاسوس بھی اس نقل و حرکت اور سمت کے بارے میں مطلع نہ ہو سکے اور یہی رسول اللہ ﷺ کا مقصد بھی تھا، آپ ﷺ نے تحریر کے ایک نئے اسلوب کو اختیار کر کے منصوبہ بندی کی تھی، تاکہ رازداری سے کام لیا جائے اور دشمن کو مسلمانوں کی نقل و حرکت سے متعلق ہر قسم کی معلومات سے محروم رکھا جائے، کتمان و رازداری اچانک حملہ آور ہونے کا ایک بنیادی ضابطہ ہے اور یہ ایک اہم جنگی اصول ہے۔ (الرسول القائد، خطاب، ص: 94)

اس سریہ نے واضح طور پر یہ ثابت کر دیا کہ نبی کریم ﷺ کے سرایا انتہائی قوی اور مستحکم تھے، جو مشکل ترین ذمہ داری اور مہم سر انجام دے سکتے تھے، وہ جنگی صلاحیتوں سے لیس تھے اور مکمل صلاحیتوں کے ساتھ کسی بھی منصوبہ پر عمل کرنے کی قدرت رکھتے تھے جس سے ان کے بلند حوصلہ اور مورال کا پتہ چلتا ہے۔

نبوی تربیت کے اثرات اس عظیم فوجی ڈسپلن کے ذریعہ ظاہر ہوتے ہیں جو سریہ کے امیر و قائد میں نظر آتا ہے، امیر نے نبوی احکام کی بغیر کسی تردّد اور چوں وچرا کے اطاعت کی، انہوں نے جیسے ہی تحریر پڑھی فوراً ہی اس میں موجود حکم پر مکمل طور پر عمل کیا، اپنے سپاہیوں کے لئے اپنے آپ کو آئیڈیل اور نمونہ کے طور پر پیش کیا، اور ان کے اندر بھی جوش وجذبہ پیدا کرتے ہوئے کہا: تم میں سے جو شہادت چاہتا ہو اور اس کی رغبت رکھتا ہو تو وہ آگے بڑھے اور جو شہادت کو ناپسند کرتا ہو وہ یہیں سے لوٹ جائے، جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں رسول اللہ ﷺ کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر رہا ہوں۔ (دیکھیں: سیرت ابن ہشام: 2/602)

۹: سرایا کے اہداف ومقاصد:

جب ہم رسول اللہ ﷺ کی قیادت میں ہوئے سرایا اور غزوات کہ باریک بینی، گہرائی اور تحلیل وتجزیہ کے ساتھ مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ان کے بہت سے اہداف ومقاصد دیکھنے کو ملتے ہیں اور ان کے ذریعہ بہت سے دروس وفوائد کا ادراک ہوتا ہے، بدر سے پہلے سرایا کی تحریک پر غور سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان میں شامل افراد سب کے سب مہاجرین تھے اور ان میں انصار کا کوئی بھی فرد شریک نہیں تھا۔ ابن سعد فرماتے ہیں: اس پر سب کا اجماع واتفاق ہے کہ وہ سب کے سب مہاجرین تھے اور رسول اللہ ﷺ نے انصار میں سے کسی کو بھی غزوۂ بدر وقوع پذیر ہونے سے پہلے تک کسی عسکری مہم پر نہیں بھیجا۔ (دیکھیں: الطبقات الکبریٰ، ابن سعد: 2/6)

یہ ایک طے شدہ اور منصوبہ بند حکمت عملی تھی جس کے کچھ اہداف ومقاصد تھے، ان میں سے چند مقاصد یہ تھے: مہاجرین کے قضیہ کا اندرونی سطح پر بھی اور بیرونی سطح پر بھی احیاء کیا جائے، قریش کی معیشت کو کمزور کیا جائے اور اس کو محدود کیا جائے، سلب کئے گئے حقوق واپس کئے جائیں، قریش کو عسکری طور پر کمزور کیا جائے، صحابہ کرام کو جنگی فنون کی ٹریننگ دی جائے، قریش کی نقل وحرکت پر نظر رکھی جائے، مدینہ میں موجود اور آس پاس کے داخلی دشمن کو مرعوب کیا جائے اور دشمن کی طاقت کا اندازہ لگایا جائے۔ (دیکھیں: غزوۃ بدر الکبریٰ، ابوفارس، ص14-24)

ان سرایا کے ذریعہ جو مطلوبہ مقاصد پورے ہوئے ان میں سے چند اہم اہداف کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

<u>أ: اندرون اور خارج میں حکومت کا رعب اور ڈر عام کرنا:</u>

ان سرایا اور غزوات کا یہ فائدہ ہوا کہ ان کے ذریعہ دعوت اور اسلامی حکومت کے دشمن مسلمانوں کی طاقت وقوت سے واقف ہوگئے اور ان کے سامنے یہ واضح ہوگیا کہ مسلمان کسی بھی مخالف تحریک کو کچلنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں، چاہے وہ کوئی داخلی تحریک ہو یا خارجی، تاکہ کوئی بھی اس اسلامی حکومت پر حملہ کرنے کے بارے میں سوچ نہ سکے جس کی فوج دن رات کسی وقت آرام نہیں کرتی ہے، اس نے یہودی اژدھوں کو اور مدینہ کے ارد گرد بت پرست قبائل کو خوفزدہ کرکے رکھ دیا ہے اور ہر ایک کی حالت یہ بنادی کی مدینہ پر حملہ کرنے یا مسلمانوں کے دشمنوں کی مدد کرنے سے پہلے ہزار بار سوچنا پڑتا۔

سرایا کی تحریک میں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ان غزوات وسرایا کی عددی قوت میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا اور زمانی اعتبار سے بغیر کسی توقف کے وہ پے بہ پے جاری رہے، ابھی ایک دستہ کسی سریہ یا غزوۃ سے واپس آیا ہی ہوتا یہاں تک کہ دوسرا روانہ ہو چکا ہوتا، اس کا ایک

اثر یہ بھی پڑا کے قریش کو اپنی حفاظت کے لئے محافظین کی تعداد میں اضافہ کرنا پڑا، سامان کی قیمتوں میں بھی اضافہ کرنا پڑا اور قریشی قافلے اور مکہ کے تاجر لوگ پہلے ہی خوف وڈر کی کیفیت سے دوچار ہو چکے تھے۔(دیکھیں: دولۃ الرسول ﷺ من التکوین الی التمکین، ص 532)

ب: بعض قبائل کے ساتھ مصالحت اور اُعراب کو زیر کرنے کی حکمتِ عملی:

رسول اللہ ﷺ نے قبیلہ جُہینہ کے ساتھ معاہدہ کیا اور اس کو اپنا حلیف بنایا، اسی طرح اس علاقہ کے بعض نقصان دہ قبائل کے ساتھ بھی معاہدے کئے تاکہ وہ مکہ اور مدینہ کے مابین جاری کشمش میں غیر جانبدار رہیں اور ان کو اس کشمش میں اپنے مفاد کے لئے استعمال کیا جائے، اس لئے کہ اصلاً یہ قبائل قریش کے طرفدار تھے اور انہی کا تعاون کرتے تھے، اس لئے کہ ان کے مابین تاریخی معاہدے تھے، جن کو قرآن نے "ایلاف" قرار دیا ہے جن کے ذریعہ قریش نے شام ویمن کے ساتھ اپنی تجارت کو مأمون و محفوظ بنا لیا تھا۔(دیکھیں: سورۃ قریش، المجتمع المدنی، ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری، ص 27)

نبی کریم ﷺ نے اُعراب کے رول اور اثر ونفوذ کو بھی کم کرنے کی کوششیں کیں تاکہ تجارتی راستوں پر ان کا کوئی وجود باقی نہ رہے، اس لئے کہ اُعراب تجارتی قافلوں کے لئے ایک خطرناک طاقت بن چکے تھے اور ان کے اثر ونفوذ کے علاقوں سے جو بھی گزرتا تھا اس کو ٹیکس اور تاوان دینا پڑتا تھا، مگر جب اسلامی حکومت کا قیام عمل میں آیا تو پھر ان کو کچھ نہیں ملنے لگا اور انہوں نے اسلامی حکومت پر حملہ کرنے کا تجربہ بھی کیا اور کُرز الفہری نے اس سلسلہ میں کوششیں بھی کیں مگر اس نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے مدینہ سے تقریبا ڈیڑھ سو کلومیٹر دور بدر کے قریب سفوان کی طرف بھاگنے پر مجبور کر دیا، سیرت نگاروں نے اس عسکری مہم کو 'چھوٹا غزوۂ بدر' کا نام دیا ہے، یہ غزوہ تمام اُعراب کے لئے ایک سبق تھا، اس کے بعد کسی اُعرابی کو یہ ہمت نہیں ہوئی کہ وہ مدینہ پر حملہ کرنے کے بارے میں سوچے، اس کے بعد پھر امت مسلمہ کو ڈاکوؤں کو ٹیکس اور تاوان دینے کی نوبت نہیں آئی، بلکہ امت مسلمہ نے انہیں پسپائی اور مسلمانوں کے ساتھ معاہدے کرنے پر مجبور کر دیا، جس کے نتیجہ میں وہ ان کے شر اور شرارتوں سے محفوظ ومأمون ہو گئے۔(دیکھیں: دراسات فی عہد النبوۃ، د-عبد الرحمن الشجاع، ص 131)

ج: اسلامی فتوحات کے ساتھ ان سرایا کا تعلق:

سرایا اور فوجی وعسکری مہموں کی تحریک کا سلسلہ مسلسل جاری رہا اور اس تحریک کی حیثیت اسلامی فوج کے لئے عسکری تربیت اور عملی مشق کی سی تھی، ابتدائی اسلامی فوج کی طرف سے پے بہ پے یہ ان حملوں کی تحریک سے یہ واضح دلیل ملتی ہے کہ نبی قائد ﷺ کی قیادت میں قائم مدینہ کی اسلامی ریاست شہد کی مکھیوں کے چھتے کی مانند تھی جو مسلسل سرگرم عمل رہتی ہے اور تھکاوٹ اور اکتاہٹ اس کے قریب بھی نہیں جاتی ہے، نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں سرایا اور غزوات کی تحریک پر غور وفکر کرنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ صحابہ کرام امیر ومأمور اور قائد وسپاہی کی حیثیت سے ان مہموں میں شریک ہونے کے لئے کتنے سنجیدہ اور سرگرم تھے، اللہ کے رسول ﷺ ان کو تیار کر رہے تھے تاکہ حکومت کے بنیادی ستون مضبوط ہوں اور مستقبل کی متوقع فتوحات کے لئے تیاری کی جائے جن کے متعلق رسول ﷺ اپنے اصحاب کو صلح وجنگ اور امن وخوف کے مختلف اوقات میں خوشخبری دیتے رہتے تھے۔

ان سرایا اور فوجی دستوں کے قائدین اور سپاہیوں پر سرسری نگاہ ڈالنے سے وہ نام اور کردار سامنے آتے ہیں جو بعد کی اسلامی فتوحات کی تاریخ میں نمایاں اور ممتاز رہے ہیں، جیسے کہ شام کی فتوحات کے قائد، امت کے امین حضرت ابو عبیدہ بن الجراحؓ، جنگ قادسیہ کے قائد اور فاتحِ مدائن حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، جنگ یرموک میں رومیوں کو شکست دینے والے، سیف اللہ سے ملقب حضرت خالد بن ولیدؓ، اور فاتح مصر و لیبیا حضرت عمرو بن العاصؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ کے نام نظر آتے ہیں، حضرت خالدؓ اور حضرت عمروؓ بھی سرایا کی تحریک میں شامل ہو گئے اور اسلام قبول کرنے کے بعد قائدانہ رول ادا کیا، حبیب مصطفی ﷺ نے اپنی زندگی میں جن سرایا اور غزوات کی سرپرستی فرمائی ان کی حیثیت ایک زندہ، عملی اور میدانی تدریب و ٹریننگ کی سی تھی، بلکہ ان کو بعد کے مشرق و مغرب کے فاتحین و قائدین کے لئے مخصوص 'ٹریننگ کورسز' قرار دیا جا سکتا ہے۔

صحابہ کرام کے چوبیس گھنٹے کی زندگی مسلسل تدریب و ٹریننگ پر مشتمل تھی، روزانہ کا منظم پروگرام صبح سویرے نماز فجر سے شروع ہوتا تھا، نماز فجر اپنے قائد و سربراہِ اعلیٰ کے ساتھ جماعت کے ساتھ ادا کرتے تھے، آپ ﷺ ان کو اپنے وقت پر جماعت کے ساتھ نماز فجر کی ادائیگی پر زور دیتے تھے اور آپؐ نے ان کے لئے اور امت کے لئے اس کو واضح فرمایا ہے کہ نماز فجر جد و جہد اور سرگرمیوں سے لبریز دن کے لئے لازمی اور عجیب چابی ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب آدمی سو جاتا ہے تو شیطان اس کی گدی پر تین گرہیں لگاتا ہے، ہر گرہ پر دم کرتے ہوئے کہتا ہے: (بے فکر ہو کر) سو جاؤ۔ پھر اگر آدمی جاگتا ہے اور اللہ کو یاد کرتا ہے تو ایک گرہ کھل جاتی ہے، اور وہ جب وضو کرتا ہے تو دوسری گرہ کھل جاتی ہے، اور جب نماز پڑھ لیتا ہے تو تمام گرہیں کھل جاتی ہیں اور آدمی خوش مزاج اور نشاط کی حالت میں صبح کرتا ہے، ورنہ سست اور خراب مزاج (موڈ) میں رہتا ہے''۔ (صحیح بخاری: 1142، صحیح مسلم: 776)

اس کے بعد ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے کام کے لئے نکل جاتا اور درمیان میں بقیہ نمازوں کے اوقات اور وقفے آتے رہتے، یہاں تک کہ وہ نماز عشاء ادا کر لیتے تو سو جاتے، اور جب ابتدائی رات تک نیند کا وافر حصہ مکمل کر لیتے تو ان میں سے اکثر نماز تہجد کے لئے اٹھتے تھے، جس سے ان کے دل روحانیت سے لبریز ہو جاتے اور یہ ایک ایسا وقت ہے جس میں قلب و دماغ اور جسم تینوں پُر سکون ہوتے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ اسلامی ریاست کے تقاضوں کے مطابق مسلسل تیاری اور اہم سرگرمیوں میں مشغول رہتے تھے، وہ مختلف و متنوع تربیتی و مشقی سرگرمیاں انجام دیتے تھے جن میں گھوڑ سواری، دوڑ اور تیر اندازی بھی شامل تھی اور نبی کریم ﷺ ان کو اس کی ترغیب دیتے تھے، بلکہ ان کے ساتھ شرکت بھی کرتے تھے، آپ ﷺ ان کے لئے اس میں ایک آئیڈیل اور نمونہ تھے، نبی کریم ﷺ تیر اندازی سیکھنے کا کافی اہتمام فرماتے تھے اور واضح فرماتے تھے کہ تیر اندازی کفار کے مقابلہ میں استعداد و قوت کا اہم ترین ذریعہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام کو جنگی فنون سیکھنے کی ترغیب بھی دیتے تھے جس میں تیر بنانے کا فن اس وقت زیادہ رائج تھا، آپ ﷺ ان کو بتاتے تھے کہ اجر و ثواب جس کا مقصد حصولِ جنت ہے وہ تین لوگوں کو ملے گا: تیر بنانے والے صنعتکار کو، تیر فراہم کرنے والے کو اور تیر چلانے والے کو۔ چنانچہ حضرت عقبہ رسول ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ایک تیر کی وجہ سے تین لوگوں کو جنت میں داخل کرے گا: اللہ کی راہ میں تیر بنانے والے کو، تیر فراہم کرنے والے کو، اور تیر چلانے والے کو۔ تیر اندازی اور سواری

کرو، تیر اندازی سواری سے زیادہ پسندیدہ عمل ہے، (مباح و مندوب) لہو اور تفریح تو صرف تین چیزوں میں ہے: اپنے گھوڑے کو سدھانے میں، اپنی بیوی کے ساتھ ملاعبت میں، اپنی کمان اور تیر سے تیر اندازی کرنے میں۔اور جو شخص تیر اندازی سیکھنے کے بعد اسے چھوڑ دے تو اس نے ایک نعمت کی ناشکری کی۔ (سنن ابوداؤد: 2513 سنن ترمذی: 1637، سنن نسائی: 6/222 – 223 مستدرک حاکم: 2/95، شعب الایمان للبیہقی: 4301)

کیا ہی بہتر تھا وہ زمانہ جس میں صحابہ کرام قرآنی و ربانی تعلیمات پر عمل پیرا رہے، ان کو مضبوطی سے تھامے رہے اور حرف بحرف ان کو اپنی زندگی میں نافذ کرتے رہے اور وہ مشرق و مغرب میں اپنی قلتِ تعداد اور سادگی کے باوجود غالب ہوگئے! اور جب مسلمان ان تعلیمات سے دور ہوگئے اور ان کو پسِ پشت ڈال دیا تو ذلت و رسوائی ان پر مسلط ہوگئی اور ہر چہار جانب سے قومیں ان پر ٹوٹ پڑیں اور وہ سمندر کے جھاگ کی مانند بے حیثیت و بے قیمت ہوگئے۔

سرایا اور فوجی دستے جن اہداف و مقاصد کے لئے کام کرتے تھے وہ حالات کے اعتبار سے مختلف النوع ہوتے تھے، چنانچہ اکثر ابتدائی سرایا اور مہمات کا مقصد حالات سے آگہی، حصولِ معلومات اور دشمن کی نقل و حرکت پر نظر رکھنا تھا، اس وقت ان کی حیثیت گشتی دستوں کی سی تھی، اس کے بعد یہی دستے طلایہ گردی کے لئے استعمال کئے گئے جو قریش کے گزرنے والے قافلوں میں خوف اور ڈر پیدا کرتے تھے، یہ سب غزوۂ بدر سے پہلے کی حکمت عملی تھی اور جب مسلمانوں کی طاقت و قوت میں مزید استحکام پیدا ہوا تو بعض دستوں اور مہمات کا مشن یہ قرار پایا کہ ان افراد سے زمین کو پاک کر دیا جائے جو اسلامی ریاست کے سخت ترین دشمن اور مسلسل اس کو نقصان پہنچانے کے لئے کوشاں تھے جیسے کہ کعب بن اشرف، عصماء بنت مروان، اُبو عفک، چنانچہ کعب بن اشرف کے قتل کے ذریعہ یہودیوں کو سبق دینا مقصود تھا، عصماء اور ابو عفک کے قتل کے ذریعہ مشرکین کو اور منافقین مدینہ کو سبق دینا مقصود تھا۔

اور جب جنگ احد کے بعد حالات نے ایک نیا رخ اختیار کیا تو اُعراب مدینہ کی جانب میلی آنکھ سے دیکھنے لگے اور وہ مسلمانوں کو اس قدر کم تر سمجھنے لگے یہاں تک کہ انہوں نے بعض تعلیمی وفود کے ساتھ غداری اور دھوکہ کیا، جیسے کہ رجیع اور بئر معونہ میں ہوا، اس صورتحال کے پیشِ نظر رسول ﷺ نے عسکری حکمتِ عملی تبدیل کر دی اور آپ ﷺ نے سرایا اور فوجی دستوں کا رخ قریش کے بجائے اعراب کی جانب موڑ دیا تا کہ ان کو اچانک اور فوری طور پر واضح انداز میں سبق سکھایا جائے اور ان سرایا اور فوجی کاروائیوں کی اہم بات یہ تھی کہ ان کے ذریعہ اُعراب پر اس سے پہلے ہی خوف و ہراس پیدا کرنے کے لئے حملہ کیا گیا جبکہ وہ ابھی مسلمانوں پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہے تھے اور اس کے لئے جمع ہو رہے تھے۔

نبوی سرایا اور فوجی دستے اپنا کام مسلسل کرتے رہے اور دعوتی اہداف کے حصول کے لئے اپنی مخصوص ذمہ داری انجام دیتے رہے، ان میں سے بعض عسکری دستے تھے، بعض حالات سے آگہی اور نقل و حرکت پر نظر رکھنے کا کام کرتے تھے اور بعض کا کام دشمن کو دھوکہ میں رکھنا تھا، یہاں تک کہ فتح مکہ کے بعد جب مسلمانوں کے لئے حالات سازگار اور مستحکم ہوگئے تو پھر نبی کریم ﷺ نے ہر اُس چیز کو ختم کرنے پر توجہ مرکوز کی جس کا کسی بھی اعتبار سے بت پرستی کے ساتھ تعلق تھا، چنانچہ آپ ﷺ نے مکہ سے مختلف سرایا اور دستے اس لئے

روانہ فرمائے تاکہ شرک وبت پرستی کے باقی ماندہ رموز ونشانات کو مٹادیا جائے، اسی پسِ منظر میں عزیٰ، مناۃ، لات، سواع، ذوالخلصہ اور دیگر اصنام اور وثنیت وبت پرستی کے طواغیت کو ختم کرنے کے لئے مختلف دستے روانہ کئے گئے۔ (دیکھیں: السرایا والبعوث النبویۃ، ص61-65)

اس کے بعد جزیرۃ العرب کے چپے چپے میں اسلام کی دعوت پھیل گئی اور لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہونے لگے اور پھر رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد اسلامی جیوش جزیرۃ العرب کے باہر نکل پڑے تاکہ روئے زمین میں اللہ کے دین کو عام کیا جائے اور دعوت کی راہ میں حائل ہونے والی ہر طاقت اور رکاوٹ کو زائل کیا جائے۔

اسلامی فتوحات کی تحریک کے جو فوری اور مثبت نتائج سامنے آئے انہوں نے مختلف ادیان وافکار اور مشارب کے حامل تجزیہ نگاروں اور محققین کی حیرت اس وقت ختم ہو جاتی ہے جبکہ وہ اُن نبوی تعلیمات اور ہدایات کا مطالعہ کرتے ہیں جو آپ ﷺ ان سرایا اور دستوں کے امراء و قائدین اور افواج کو دیتے تھے اور یہی ہدایات و تعلیمات اسلامی فتوحات کی تحریک کی اصل بنیاد ہیں، اور یہی تعلیمات بعد میں خلفاء اور اسلامی افواج کے امراء و قائدین کی زبانی سننے کو ملتی ہیں اور ان کے طرزِ عمل میں انہی کا ظہور ہوتا ہے۔ (دیکھیں: السرایا والبعوث النبویۃ، ص65-66)

حضرت انسؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ جب کسی لشکر کو روانہ فرماتے تو یہ ہدایات دیتے تھے: ''اللہ کا نام لے کر نکلو، سن رسیدہ بوڑھے کو قتل مت کرنا، نہ ہی کسی چھوٹے بچے کو، نہ کسی عورت کو اور مالِ غنیمت میں خیانت مت کرنا، بلکہ مالِ غنیمت کو جمع کرنا اور اپنے احوال کی اصلاح کرنا اور بھلائی کرنا، بے شک اللہ نیکی اور بھلائی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے''۔(سنن ابوداؤد: 2614، السنن الکبری للبیہقی: 9/90، مصنف عبدالرزاق: 9430)

حضرت ابوموسیٰؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب اپنے اصحاب میں سے کسی کو کسی مہم پر روانہ کرتے تھے تو فرماتے: ''خوشخبری اور بشارت دینا، نفرت مت پیدا کرنا، آسانی کرنا اور سختی مت کرنا''۔(صحیح مسلم: 1732، سنن ابوداؤد: 4835، مسند أحمد: 4/399)

....

پانچواں باب

تربیتی اور علمی عمل میں استمرار و تسلسل

عہدِ مدنی میں قرآنِ کریم کا جو ابتدائی حصہ نازل ہوا اس میں سورۂ بقرۃ تمہیدی آیات بھی تھیں جن میں اہلِ ایمان، اہلِ کفر اور اہلِ نفاق کی صفات کا تذکرہ کیا گیا ہے، اس کے بعد اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ کے بارے میں اشارات کئے گئے ہیں اور یہود کی حقیقت اور ان کی شرست کو بیان کرنے پر بطورِ خاص توجہ مرکوز کی گئی ہے، اس لئے کہ جس روز مدینہ میں دعوتِ اسلامی داخل ہوئی اسی روز سے انہوں نے اس کی مخالفت شروع کی، اسی لئے سورۂ بقرہ میں یہود کی صفات اور ان کی طبیعت و مزاج کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔(دیکھیں: فی ظلال القرآن: 1/27اور اس کے بعد کے صفحات)

قابلِ غور بات یہ ہے کہ عہدِ مدنی کے ابتدائی مرحلہ میں نازل ہونے والی سورۂ بقرہ میں تمام انسانوں کو دعوت دی گئی ہے کہ اللہ کے دین میں داخل ہو جائیں اور اللہ ہی کی عبادت کریں، ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ ٱعۡبُدُواْ رَبَّكُمُ ٱلَّذِي خَلَقَكُمۡ وَٱلَّذِينَ مِن قَبۡلِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُونَ ۝٢١ ٱلَّذِي جَعَلَ لَكُمُ ٱلۡأَرۡضَ فِرَٰشٗا وَٱلسَّمَآءَ بِنَآءٗ وَأَنزَلَ مِنَ ٱلسَّمَآءِ مَآءٗ فَأَخۡرَجَ بِهِۦ مِنَ ٱلثَّمَرَٰتِ رِزۡقٗا لَّكُمۡۖ فَلَا تَجۡعَلُواْ لِلَّهِ أَندَادٗا وَأَنتُمۡ تَعۡلَمُونَ ۝٢٢﴾ ترجمہ: ”لوگو! بندگی اختیار کرو اپنے اُس رب کی جو تمہارا اور تم سے پہلے جو لوگ ہو گزرے ہیں اُن سب کا خالق ہے، تمہارے بچنے کی توقع اِسی صورت ہو سکتی ہے۔ وہی تو ہے جِس نے تمہارے لئے زمین کا فرش بچھایا، آسمان کی چھت بنائی، اوپر سے پانی برسایا اور اس کے ذریعہ سے ہر طرح کی پیداوار نکال کر تمہارے لئے رزق بہم پہنچایا، پس جب تم یہ جانتے ہو تو دوسروں کو اللہ کا مدمقابل نہ ٹھہراؤ“۔(سورۃ البقرۃ: 21-22)

مدنی دور کی قرآنی آیات مسلمانوں کو منافقین کی صفات اختیار کرنے سے ڈراتیں تھیں اور واضح کرتی تھیں کہ نئے معاشرہ اور نئی حکومت کے لئے منافقین کتنے خطرناک ہیں، معاشرہ اور اسلامی ریاست کے مخالف نفاق کا ٹولہ مدنی دور میں ہی ظاہر ہوا، اس لئے کہ مکہ میں مسلمان طاقت و قوت اور اثر و رسوخ کی ایسی حالت میں نہیں تھے جس کی وجہ سے لوگوں کا کوئی ایسا گروہ وجود میں آتا جو ان سے خوفزدہ ہوتا یا ان سے کسی خیر کا امیدوار ہوتا، ان کے ساتھ تملّق اختیار کرتا، ظاہری طور پر ان کے قریب ہونے کی کوشش کرتا اور اندرونی طور پر ان کے خلاف سازشیں کرتا اور ان کے خلاف منصوبے بناتا، جیسے کہ عام طور منافقین کا طرزِ عمل ہوتا ہے، مکی دور میں جس کو مسلمانوں کے خلاف مخالفت کرنی ہوتی وہ کھلم کھلا اور اعلانیہ مخالفت کرتا تھا، اس لئے مدنی آیات میں منافقین کی صفات، ان کے خیالات اور ان کے کردار کو بیان کیا گیا ہے اور ان پر سخت تنقید کی گئی ہے، یہاں تک کہ کوئی بھی مدنی سورت بطورِ خاص طویل اور متوسط سورتیں اس طرح کے مضامین سے خالی نہیں ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ نفاق کی تحریک تقریباً پورے مدنی دور میں موجود رہی اگرچہ نصف اول کے بعد یہ کمزور ہوتی رہی۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویۃ، دَرُوزَہ، 2/73-76، دراسات فی عہد النبوۃ، د۔عبد الرحمن الشجاع، ص 172)

مدنی دور میں نازل ہونے والی قرآنی آیات میں اللہ تعالی کی عظمت، کائنات کی حقیقت، جنت کی ترغیب اور جہنم سے تخویف جیسے مضامین بیان کئے جاتے رہے، اسی طرح اُمت کی تربیت کے لئے اور اسلامی ریاست کے لئے احکام سازی ہوتی رہی، جس اُمت اور ریاست کی ذمہ داری یہ تھی کہ اس کو اب تمام انسانوں کے درمیان حق کی دعوت کو عام کرنا تھا اور اللہ کے راستے میں جدوجہد کرنی تھی، امت کا علمی کاروان بھی دعوتی مراحل کے ساتھ ساتھ اور معاشرہ کی تعمیر اور اسلامی ریاست کی تاسیس وتشکیل کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا رہا، قرآن کریم نے علم اور علم حاصل کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کی ہے اور اس سلسلہ کی بہت سی احادیث بھی مروی ہیں جن سے رسول ﷺ کے نزدیک علم کی اہمیت وقدردانی کا پتہ چلتا ہے، اور کتب احادیث میں علم سے متعلق مستقل ابواب موجود ہیں۔

امت کو اس بات کا یقین تھا کہ علم عروج وغلبہ کا ایک اہم ذریعہ اور سبب ہے، اس لئے کہ یہ ناممکن ہے کہ اللہ تعالی ایک جاہل اور علمی کاروان سے پیچھے رہنے والی اُمت کو عروج وغلبہ عطا کرے، قرآن کریم پر غور کرنے والے کے سامنے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن میں ایسی آیات کثرت سے موجود ہیں جن میں علم کا بلند مقام بیان کیا گیا ہے اور علم کی طلب وتحصیل کی ترغیب دی گئی ہے، قرآن کریم نے علم کو کفر کے بالمقابل پیش کیا ہے، اس لئے کہ کفر اصلاً جہالت وگمراہی کا نتیجہ ہے، ارشادِ باری تعالی ہے: ﴿أَمَّنْ هُوَ قَـٰنِتٌ ءَانَآءَ ٱلَّيْلِ سَاجِدًا وَقَآئِمًا يَحْذَرُ ٱلْـَٔاخِرَةَ وَيَرْجُواْ رَحْمَةَ رَبِّهِۦ ۗ قُلْ هَلْ يَسْتَوِى ٱلَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَٱلَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۗ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُوْلُواْ ٱلْأَلْبَـٰبِ﴾ ترجمہ: "(کیا اِس شخص کی روش بہتر ہے یا اُس شخص کی) جو مطیع فرمان ہے، رات کی گھڑیوں میں کھڑا رہتا اور سجدے کرتا ہے، آخرت سے ڈرتا اور اپنے رب کی رحمت سے امید لگاتا ہے؟ اِن سے پوچھو: کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے دونوں کبھی یکساں ہو سکتے ہیں؟ نصیحت تو عقل رکھنے والے ہی قبول کرتے ہیں"۔ (سورۃ الزمر: 9)

علم ہی ایک ایسی چیز ہے جس کے بارے میں اللہ تعالی نے اپنے رسول ﷺ کو مزید طلب کرنے کا حکم دیا ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَقُل رَّبِّ زِدْنِى عِلْمًا﴾ ترجمہ: "اور دُعا کرو کہ اے پروردگار، مجھے مزید علم عطا کر"۔ (سورۃ طہ: 114) اسی طرح یہی وہ امتیازی خصوصیت ہے جو اللہ تعالی نے آدم ؑ کو عطا کی تھی، ارشادِ باری تعالی ہے: ﴿وَعَلَّمَ ءَادَمَ ٱلْأَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى ٱلْمَلَـٰٓئِكَةِ فَقَالَ أَنۢبِـُٔونِى بِأَسْمَآءِ هَـٰٓؤُلَآءِ إِن كُنتُمْ صَـٰدِقِينَ﴾ ترجمہ: "اس کے بعد اللہ نے آدم ؑ کو ساری چیزوں کے نام سکھائے، پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا: اگر تمہارا خیال صحیح ہے (کہ کسی خلیفہ کے تقرر سے انتظام بگڑ جائے گا) تو ذرا ان چیزوں کے نام بتاؤ"۔ (سورۃ البقرۃ: 31)

نبی کریم ﷺ نے اپنا تربیتی منہج مسلسل جاری رکھا، آپ ﷺ اپنے اصحاب کو تعلیم دیتے، اللہ کے بارے میں تذکیر کرتے، ان کو مکارم اخلاق کی ترغیب دیتے اور ان کے سامنے شریعت کی باریکیاں اور احکام واضح کرتے، اللہ کے رسول ﷺ کبھی انفرادی طور پر ان کی تربیت فرماتے اور کبھی اجتماعی تربیت کرتے، آپ ﷺ نے ہمارے لئے تعلیم اور تدریس کے تربیتی وسائل کا ایک بڑا ذخیرہ مہیا کیا ہے، آپ ؐ نے ہمارے

تعلیم اور تدریس کے تربیتی وسائل کی مکمل رعایت کی ہے جو حصولِ علم میں معاون و مددگار ہوتے تھے اور صحابہ کرام کے قلوب واذہان میں علم جاگزیں ہوتا تھا، عہدِ مکی اور عہد مدنی میں جو مفید وسائل اور اصول وضوابط اختیار کئے گئے ہیں ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

۱) اہم تربیتی اصولِ تعلیم وتربیت:

۱: تکرار واعادہ:

کسی بات کے اعادہ اور تکرار سے حفظ و یاداشت میں، سمجھنے میں، اس کے استیعاب میں اور اس کے معانی کو محفوظ رکھنے میں اس کو معانی کو محفوظ رکھنے میں آسانی ہوتی ہے، اسی لئے اللہ کے رسول ﷺ اکثر وبیشتر اپنے کلام کا اعادہ اور تکرار فرماتے تھے، چنانچہ حضرت انس بن مالکؓ نبی کریم ﷺ کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ جب آپ ﷺ گفتگو فرماتے تھے تو تین مرتبہ اس کا اعادہ فرماتے تھے تاکہ اس کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے اور جب آپؐ لوگوں کے پاس تشریف لاتے اور ان کو سلام کرتے تو تین مرتبہ ان کو سلام کرتے"۔ (صحیح البخاری: 95)

۲: ٹھہر ٹھہر کر گفتگو اور الفاظ میں فصل:

اللہ کے رسول ﷺ گفتگو میں متانت اور سنجیدگی اختیار فرماتے تھے اور عجلت اور جلد بازی سے کام نہیں لیتے تھے، بلکہ الفاظ کو الگ الگ بیان فرماتے تھے تاکہ ان کو یادرکھنا آسان ہو اور دوسروں کے سامنے بیان کرتے ہوئے اس میں کوئی تحریف و تبدیلی نہ ہو، اللہ کے رسول ﷺ کا اس قدر اہتمام فرماتے تھے یہاں تک کہ آپ کی گفتگو سننے والا اگر چاہتا تو آپ کے کلمات کو شمار کر سکتا تھا، حضرت عائشہؓ سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب کوئی گفتگو فرماتے تھے تو اگر شمار کرنے والا شمار کرنا چاہتا تو اس کو شمار کر سکتا تھا۔ (صحیح بخاری: 3567)

حضرت عروہ بن زبیر روایت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا: کیا آپ کو ابو فلاں (ابو ہریرہ) پر تعجب نہیں ہوا؟ وہ آئے اور میرے حجرے کے ایک کونے میں بیٹھ کر رسول اللہ ﷺ کی احادیث مجھے سنانے کے لئے بیان کرنے لگے، میں اس وقت نماز پڑھ رہی تھی، پھر وہ میری نماز ختم ہونے سے پہلے ہی اٹھ کر چلے گئے اور اگر وہ مجھے مل جاتے تو میں ان کو بتاتی کہ رسول اللہ ﷺ تمہاری طرح جلدی جلدی گفتگو نہیں کرتے تھے۔ (صحیح البخاری: 3568)

۳: اعتدال، عدمِ طوالت اور مناسب وقت کا انتخاب:

اللہ کے رسول ﷺ تعلیم میں میانہ روی اور اعتدال اختیار کرتے تھے، تعلیم کی مقدار میں، اس کی نوع میں اور اوقات میں اعتدال کا خیال فرماتے تھے تاکہ صحابہ کرامؓ اکتا نہ جائیں، وہ اس کو یاد کرنے کے لئے آمادہ رہیں اور ان کی عقل اور ان کے فہم کے لئے وہ آسان ہو، حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں: اللہ کے رسول ﷺ موعظت و نصیحت کرنے میں ہمارے اوقاتِ فرصت کا خیال رکھتے تھے کہ کہیں ہم کبیدہ خاطر نہ ہو جائیں۔ (صحیح بُخاری: 68)

۴: مثالوں کے ذریعہ تفہیم:

مثالوں کا قلب وذہن تک معانی پہنچانے کا اہم کردار ہوتا ہے، اس لئے کہ مثال ایک معنوی حقیقت کو حسی صورت میں پیش کرتی ہے اور اس کو اصل صورتحال کے ساتھ مربوط کرکے ذہن کے قریب کرتی ہے، علاوہ ازیں مثالوں میں مختلف صورتوں میں ایسی بلاغت ہوتی

ہے جو دلوں کو چھو لیتی ہے اور عقل کو اپیل کرتی ہے، خاص طور پر اہلِ بلاغت کے ذہن و دماغ میں اپنا ایک خاص اثر چھوڑتی ہے، اسی لئے قرآن پاک نے بھی کثرت سے مثالیں بیان کی ہیں اور بہت سی آیات میں اس کی حکمت بھی بیان کی ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَتِلْكَ ٱلْأَمْثَٰلُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۖ وَمَا يَعْقِلُهَآ إِلَّا ٱلْعَٰلِمُونَ﴾ ترجمہ: ''یہ مثالیں ہم لوگوں کی فہمائش کے لئے دیتے ہیں، مگر ان کو وہی لوگ سمجھتے ہیں جو علم رکھنے والے ہیں''۔ (سورۃ العنکبوت: 43)

مزید دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿لَوْ أَنزَلْنَا هَٰذَا ٱلْقُرْءَانَ عَلَىٰ جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهُۥ خَٰشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ ٱللَّهِ ۚ وَتِلْكَ ٱلْأَمْثَٰلُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ﴾ ترجمہ: ''اگر ہم نے یہ قرآن کسی پہاڑ پر بھی اتار دیا ہوتا تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے دبا جارہا ہے اور پھٹا پڑتا ہے، یہ مثالیں ہم لوگوں کے سامنے اس لئے بیان کرتے ہیں کہ وہ (اپنی حالت پر) غور کریں''۔ (سورۃ الحشر: 21)

اس کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات ہیں اور اسی نہج کو نبی کریم ﷺ نے بھی اختیار کیا اور کثرت سے مثالوں کے ذریعہ مختلف مفاہیم کو سمجھایا، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہزار مثالیں یاد کیں۔ (مناہج وآداب الصحابۃ، ص: 65)

حدیث نبوی میں امثال کے موضوع پر متعدد کتابیں تالیف کی گئی ہیں جن میں قدیم ترین قاضی ابو محمد الحسن بن عبدالرحمن بن خلاد الرامہرمزی (متوفی 360ھ) کی کتاب "أمثال الحدیث" ہے۔

۵: استفسار اور سوالات کے ذریعہ تعلیم:

استفسار اور سوالات اہم تربیتی وسائل میں سے ہے، اس کے ذریعہ سائل اور مسؤول کے مابین قوی ربط و تعلق پیدا ہوتا ہے، مسؤول کا ذہن کھلتا ہے، جواب پر اس کی توجہ مرکوز ہوتی ہے اور ذہن کے اندر مکمل آمادگی اور دلچسپی پیدا ہوتی ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام کو تعلیم دیتے ہوئے متنوع شکلوں میں سوال و استفسار کا طریقہ اختیار کرتے تھے، یہ طریقہ حسنِ فہم اور یاد کرنے میں انتہائی مؤثر طریقہ ہوتا تھا، بسا اوقات نبی کریم ﷺ سوال و استفسار صرف اس لئے کرتے تھے تاکہ مخاطب کے اندر شوق، دلچسپی اور توجہ کی کیفیت پیدا کریں، اس وقت آپ ﷺ کا سوال "ألا" کے ذریعہ ہوتا تھا، حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ''کیا میں تم کو وہ چیز بتادوں جس کے ذریعہ اللہ تعالی گناہوں کو مٹادیتا ہے اور درجات بلند کرتا ہے؟ صحابہ نے کہا: کیوں نہیں، اے اللہ کے رسولؐ! آپ ﷺ نے فرمایا: ناگوار حالات میں مکمل وضو کرنا، مسجد کی جانب کثرت سے جانا اور ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا، یہی "رباط" ہے۔ (یعنی عبادت کے لئے نفس کو روکنا یا وہ "رباط" جو سرحدوں کی حفاظت کے لئے ہوتا ہے''۔ (صحیح مسلم: 251، موطأ مالک: 1/161، سنن ترمذی: 51، سنن نسائی: 1/89، سنن ابن ماجہ: 428)

کبھی آپ ﷺ صحابہ کرام سے ایسی چیز کے بارے میں دریافت کرتے تھے جس کے بارے میں آپؐ کو معلوم ہوتا تھا کہ اس چیز کا ان کو کوئی علم نہیں ہے اور وہ یہی کہیں گے کہ اللہ اور اس کے رسول زیادہ جانتے ہیں، لیکن پھر بھی آپ ﷺ ان سے اس لئے سوال کرتے تھے تاکہ موضوع کی جانب ان کی توجہ مبذول کریں، اور ان کے اندر دلچسپی اور شوق پیدا کریں، حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے

فرمایا: ''کیا آپ جانتے ہو مفلس کون ہے؟ صحابہ کرام نے عرض کیا: ہمارے درمیان مفلس وہ ہے جس کے پاس نہ درہم اور نہ ہی کوئی اور مال و متاع ہو، یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا: بے شک میری امت کا مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن نماز، روزہ اور زکوۃ لے کر اس حال میں آئے گا کہ کسی کو برا بھلا کہا ہوگا، کسی پر تہمت لگائی ہوگی، کسی کا مال کھایا ہوگا، کسی کا خون بہایا ہوگا اور کسی کو مارا ہوگا، اس لئے ان کو اس کی نیکیاں دی جائیں گی اور اگر برابر ہونے سے پہلے ہی اس کی نیکیاں ختم ہو جائیں گی تو پھر ان کے گناہ لے کر اس پر لاد دیئے جائیں گے اور پھر اس کو جہنم میں پھینک دیا جائے گا''۔ (صحیح مسلم: 2581، سنن ترمذی: 2418)

بسا اوقات آپ ﷺ صحابہ کرام سے سوال کرتے تھے اور ان میں کوئی بہتر جواب دے دیتا تو آپؐ اس کی حوصلہ افزائی کے لئے اور دوسروں کو ترغیب دینے کے لئے اس کی تعریف فرماتے، جیسے کہ ایک مرتبہ حضرت اُبی بن کعبؓ کے ساتھ ایسا ہی ہوا، فرماتے ہیں: اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: اے ابو المنذر! کیا آپ جانتے ہیں کہ آپ کے پاس موجود کتاب اللہ کی آیات میں سے کون سی آیت عظیم تر ہے؟ فرماتے ہیں: میں نے جواب دیا: ﴿ٱللَّهُ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ٱلۡحَيُّ ٱلۡقَيُّومُۚ﴾ (سورۃ البقرہ: 255) فرماتے ہیں: یہ سُن کر آپ نے میرے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا: ابو المنذر، واللہ! آپ کو علم مبارک ہو۔ (صحیح مسلم: 810، سنن أبو داؤد: 1460، مسند أحمد: 5/142)

اس طرح کی حوصلہ افزائی اور شاباشی سے متعلم وطالب علم کے اندر اطمئنان وسکون اور خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے اور مزید طلبِ علم اور حفظ کا داعیہ پیدا ہوتا ہے۔ (دیکھیں: مناہج وآداب الصحابۃ، ص: 69)

٦: غیر معروف بات بیان کر کے استفسار وتوجہ پر آمادہ کرنا:

اللہ کے رسول ﷺ بسا اوقات کوئی غیر معروف لفظ یا بات ارشاد فرماتے تھے تاکہ سامعین متوجہ ہوں اور ان کے اندر استفسار اور سوال کا داعیہ پیدا ہو، اس کی خوبصورت اور لطیف مثال وہ روایت ہے جس کو حضرت جابر بن عبد اللہؓ نے روایت کیا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کا گزر بازار سے ہوا آپؐ عوالی (مدینہ کی بلندی والے علاقے) سے داخل ہو رہے تھے اور لوگ آپؐ کے ایک جانب تھے، آپ ﷺ کا گزر ایک چھوٹے کانوں والے بھیڑ کے مردہ بچے کے پاس سے ہوا، آپ ﷺ نے اس کا کان پکڑا اور فرمایا: تم میں سے کون اس کو ایک درہم کے بدلے لینا پسند کرے گا؟ لوگوں نے عرض کیا: ہم اس کو کسی بھی چیز کے عوض لینا پسند نہیں کریں گے اور ہم اس کو کریں گے بھی کیا! آپؐ نے فرمایا: کیا تمہیں یہ پسند ہے کہ تمہیں یہ ایسے ہی مفت میں مل جائے؟ لوگوں نے کہا: اللہ کی قسم! اگر یہ زندہ ہوتا تب بھی اس میں عیب تھا کہ کان اس کے چھوٹے ہیں، پھر مردہ ہونے کے بعد اس کو کون لے گا؟! اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کی قسم! اللہ کے نزدیک دنیا اس سے بھی زیادہ ذلیل اور کمتر ہے جتنا کہ یہ تمہارے نزدیک حقیر ہے۔ (صحیح مسلم: 2957)

٧: وضاحتی وسائل کا استعمال:

نبی کریم ﷺ توضیحی وسائل کا استعمال کرتے تھے تاکہ سامعین کے قلوب واذہان میں مفہوم کو راسخ کیا جائے، ان کے تمام حواس کو موضوع کے ساتھ مشغول کیا جائے اور ان کی توجہ مبذول کی جائے جس کے ذریعہ اس کو سمجھنے اور یاد رکھنے میں آسانی ہو، آپ ﷺ مندرجہ ذیل توضیحی وسائل استعمال فرماتے تھے:

أ: ہاتھوں کو حرکت دے کر وضاحت:

آپ ﷺ مفہوم کو واضح کرنے کے لئے بسا اوقات اپنے ہاتھوں کو حرکت دیتے تھے، جیسے کہ آپؐ اپنی انگلیوں کو ایک دوسرے میں داخل فرماتے ہیں جبکہ آپؐ ایک مومن کے اپنے بھائی کے ساتھ تعلق کی وضاحت فرما رہے تھے، چنانچہ حضرت ابو موسی اشعریؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ایک مومن دوسرے مومن کے لئے ایک عمارت کی طرح ہے جس کا ایک حصہ دوسرے حصہ کو مضبوط کرتا ہے اور آپ ﷺ نے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں داخل کیا۔ (صحیح البخاری: 2446، صحیح مسلم: 2585)

ب: نقشہ کے ذریعہ وضاحت:

اللہ کے رسول ﷺ وضاحت کے لئے زمین پر توضیحی نقشہ بناتے تھے، اس کے ذریعہ آپ ﷺ صحابہ کرام کو متوجہ فرماتے اور پھر اس نقشے کا مقصد اور اس کی جزئیات کی وضاحت کرتے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں: اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے ہاتھ سے ایک لکیر کھینچی اور فرمایا: "یہ اللہ کا سیدھا راستہ ہے"۔ پھر آپؐ نے اس کے دائیں بائیں کچھ لکیریں کھینچیں اور فرمایا: یہ متفرق راستے ہیں، ان میں سے ہر راستے پر ایک شیطان ہے جو اس راہ کی طرف بلاتا ہے، پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿وَأَنَّ هَٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَن سَبِيلِهِ ۚ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُم بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ ترجمہ: "نیز اس کی ہدایت یہ ہے کہ یہی میرا سیدھا راستہ ہے، لہٰذا تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اس کے راستے سے ہٹا کر تمہیں پراگندہ کر دیں گے، یہ ہے وہ ہدایت جو تمہارے رب نے تمہیں کی ہے، شاید کہ تم کج روی سے بچو"۔ (سورۃ الأنعام: 153) مسند احمد: 1/435، مسند الطیالسی: 244، سنن الدارمی: 208، ابن حبان: 6-7)

ج: وضاحت کے لئے کسی چیز کو نمایاں کرنا:

آپ ﷺ کسی بات کی وضاحت کے لئے متعلقہ چیز کو نمایاں کر کے دکھاتے تھے، جیسے کہ آپؐ نے ریشم اور سونے کے حکم کو بیان کرتے ہوئے کیا، حضرت علی بن ابی طالبؓ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ اللہ کے نبی ﷺ نے ریشم لیا اور اس کے دائیں طرف رکھا اور پھر سونا لیا اور اس کو اپنے بائیں جانب رکھا، اس کے بعد فرمایا: بے شک یہ دونوں میری امت کے مردوں پر حرام ہے۔ (سنن ابوداؤد: 4057، سنن نسائی: 8/160) اور ایک دوسری روایت میں یہ اضافہ ہے کہ "امت کی عورتوں کے لئے حلال اور جائز ہے"۔

اللہ کے رسول ﷺ نے زبان سے بھی حکم بیان فرمایا اور سونے اور ریشم کو عملی طور پر دکھا کر ظاہر کیا تاکہ صحابہ کرام اچھی طرح سن بھی لیں اور مشاہدہ بھی کر لیں، اور یہ ان کے لئے زیادہ واضح اور حفظ میں معاون بنے گا۔

د: عملی تعلیم:

بسا اوقات اللہ کے رسول ﷺ لوگوں کے سامنے کسی چیز کو عملی طور پر کر کے تعلیم دیتے تھے، جیسے کہ آپ ﷺ ایک مرتبہ منبر پر چڑھے اور ایسی جگہ نماز پڑھی جہاں سب لوگ آپ کو دیکھ رہے تھے، حضرت سہل بن سعد ساعدیؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں

نے اللہ کے رسول ﷺ کو دیکھا کہ آپ منبر پر چڑھے، قبلہ کی جانب اپنا رخ کیا، پھر تکبیر کہی اور لوگ آپؐ کے پیچھے کھڑے ہوگئے، آپ ﷺ نے قراءت کی اور رکوع کیا، اور لوگوں نے بھی آپؐ کے پیچھے رکوع کیا، پھر آپ ﷺ نے اپنا سر اٹھایا اور آپؐ اسی حالت میں پیچھے آئے اور زمین پر سجدہ کیا، پھر آپؐ دوبارہ منبر پر تشریف لے گئے، پھر قراءت کی، پھر رکوع کیا، اس کے بعد رکوع سے کھڑے ہوئے اور پھر اسی حالت میں پیچھے کی طرف آئے اور زمین پر سجدہ کیا، پھر دوبارہ منبر پر تشریف لے گئے، قراءت کی، رکوع کیا اور رکوع سے سر اٹھایا اور اسی حالت میں پیچھے آئے، یہاں تک کہ زمین پر سجدہ کیا، جب آپؐ فارغ ہوگئے تو لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: اے لوگو! میں نے ایسا اس لئے کیا تاکہ آپ میری اقتداء کرو اور مجھ سے نماز سیکھو۔ (صحیح البخاری: 377)

۸: لطیف اور محبت آمیز عبارتوں اور الفاظ کا استعمال:

بے شک لطیف اندازِ تخاطب اور محبت آمیز الفاظ دلوں کے اندر الفت و محبت کا سبب بنتے ہیں، اس کے ذریعہ وہ حق کی طرف مائل ہوتے ہیں اور سامعین کے لئے فہم و حفظ میں معاون بنتے ہیں، اسی لئے اللہ کے رسول ﷺ اپنی گفتگو سے پہلے لطیف اور محبت آمیز بعض تمہیدی کلمات ارشاد فرماتے تھے، خاص طور پر جب کہ آپؐ کسی ایسی چیز کی تعلیم دینا چاہتے جس کے ذکر میں شرم و حیا حائل ہوتی ہے، جیسے کہ آپ ﷺ نے قضائے حاجت کے لئے بیٹھنے کے آداب کی تعلیم کے موقع پر کیا، چنانچہ آپ ﷺ نے پہلے یہ تمہیدی بات ارشاد فرمائی کہ آپؐ اہلِ ایمان کے لئے ایک والد کی مانند ہیں، اس لئے آپؐ ان پر شفقت کرتے ہوئے ان کو تعلیم دیتے ہیں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "بلاشبہ میں تمہارے لئے والد کے درجہ میں ہوں، لہذا جب تم میں سے کوئی قضائے حاجت کے لئے جائے تو نہ قبلہ کی طرف منہ کر کے بیٹھے اور نہ پیٹھ کر کے بیٹھے اور نہ دائیں ہاتھ سے استنجا کرے"۔ (سنن ابوداؤد: 8)

معلم اول ﷺ نے تعلیم و تربیت کے تمام اصول و ضوابط کی رعایت کی ہے، آپؐ اخلاق کی بلندی اور عقلی کمال کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے، چنانچہ بعض صحابہ کرام کے ذریعہ جو بھی عمل صادر ہوتا تھا آپؐ اس پر کوئی مثبت تبصرہ فرماتے تھے، جس کی وجہ سے وہ بات ان کے دِلوں میں اچھی طرح جاگزیں ہوتی تھی اور وہ ان کی نگاہوں کے سامنے موجود رہتی تھی، اس لئے کہ آپ ﷺ اس کے ساتھ تربیتی معانی و مفاہیم کو مربوط کرتے تھے، مندرجہ ذیل سطور میں ان بعض عظیم اصول و ضوابط کا ذکر کیا جارہا ہے جن کو نبی کریم ﷺ نے استعمال کیا ہے:

اَ: اچھا کام کرنے والے کی حوصلہ افزائی اور اس کی تعریف:

اللہ کے رسول ﷺ اچھا کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی اور ان کی تعریف و توصیف کرتے تھے، تاکہ وہ علم و عمل کے لئے مزید متحرک اور نشیط ہو جائیں، جیسے کہ آپ ﷺ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے ساتھ کیا جبکہ آپؐ نے ان کی قراءت اور حسنِ صورت کی تعریف کی، حضرت ابو موسیٰؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا: "کاش تم دیکھتے جب میں کل رات تمہاری قراءت سن رہا تھا، بے شک تمہیں لحنِ آلِ داؤد سے نوازا گیا ہے"۔ (صحیح البخاری: 5048، صحیح مسلم: 793)

ب: خطاکار کے ساتھ شفقت اور اس کو سرزنش نہ کرنا:

اللہ کے رسول ﷺ لوگوں کے حالات کا اندازہ کرکے ان کی رعایت کرتے تھے، ان کی ناواقفیت کی وجہ سے ان کو معذور سمجھتے تھے اور ان کی خطاؤں اور غلطیوں کی تصحیح نہایت لطیف انداز سے فرماتے تھے اور صحیح رہنمائی کرنے کے لئے ان کے ساتھ شفقت کا معاملہ کرتے تھے، یقیناً اس کے ذریعہ سامع اور مخاطب کے دل میں عالم اور معلم کی محبت پیدا ہوگی اور وہ علم کو محفوظ رکھنے اور اس کو دوسروں تک پہنچانے کا حریص ہوگا، اسی طرح حاضرین کے دلوں میں بھی اس طرزِ عمل کے ذریعہ اس واقعہ کو مکمل جزئیات کے ساتھ یاد رکھنا آسان ہو جاتا ہے، جیسے کہ حضرت معاویہ بن حکم سُلمیؓ روایت کرتے ہیں فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا کہ اسی اثنا میں ایک شخص کو چھینک آئی تو میں نے (حالتِ نماز میں) ''یرحمك الله'' کہا، اس پر لوگ مجھے گھورنے لگے، میں نے اپنے دل میں کہا: تمہارا بھلا ہو! کیا بات ہے؟ آپ مجھے کیوں دیکھ رہے ہو؟! اس پر وہ اپنے ہاتھ اپنی رانوں پر مارنے لگے، جب میں نے سمجھ لیا کہ وہ مجھے خاموش کرا رہے ہیں تو میں خاموش ہو گیا، جب اللہ کے رسول ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں! میں نے نہ آپؐ سے پہلے اور نہ آپؐ کے بعد آپؐ سے بہتر تعلیم دینے والا کوئی معلم دیکھا ہے، اللہ کی قسم! آپؐ نے نہ ہی مجھے ڈانٹا، نہ مارا اور نہ ہی برا بھلا کہا، صرف اتنا فرمایا: نماز میں اس طرح بات چیت درست نہیں ہے، یہ تو بس تسبیح و تکبیر اور قرآن کی تلاوت ہے۔ (صحیح مسلم: 537، سنن ابوداؤد: 930، 931، سنن نسائی: 3/14-18، مسند أحمد: 5/447)

دیکھیں تعلیم میں آپ ﷺ کس قدر نرمی اور شفقت اختیار فرماتے ہیں اور اس نرمی اور شفقت کا حضرت معاویہ بن حکمؓ کی شخصیت پر کس قدر اثر پڑا، اور آپ ﷺ کی بہترین تعلیم کے ذریعہ وہ کس قدر متاثر ہوئے۔

ج: غلطی کرنے والے کو لوگوں کے سامنے رسوانہ کرنا:

اللہ کے رسول ﷺ غلطی کرنے والے شخص کی صراحت لوگوں کے سامنے نہیں کرتے تھے اور صرف اشارات و کنایات پر ہی اکتفا کرتے تھے، اس لئے کہ اس میں غلطی کرنے والے کے احساس و شعور کی رعایت ہے اور اس کو راہِ راست پر لانے کے لئے یہ اہم طریقہ ہے، اس کی مثال وہ واقعہ ہے جب کہ اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت عبداللہ بن اللّتبیّہ -رضی اللہ عنہ- کو بنو سلیم سے صدقات وصول کرنے کا ذمہ دار بنایا اور ان کو صدقہ دینے والوں نے کچھ ہدایا اور تحائف بھی دیئے جو انہوں نے قبول کر لئے، حضرت ابو حمید الساعدیؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ایک شخص کو بنو سلیم کے صدقہ کی وصول یابی کے لئے عامل بنایا، اس شخص کو ابن اللّتبیّہ کہا جاتا تھا، جب وہ (واپس) آئے تو آپؐ نے ان سے حساب طلب فرمایا، تو انہوں نے کہا: یہ تو آپ کا مال ہے اور یہ ہدیہ ہے، اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اگر تم سچے ہو تو پھر تم اپنے ماں باپ کے گھر ہی کیوں نہ بیٹھے رہے تو وہاں بھی تمہارے پاس ہدیہ آتا؟! اس کے بعد آپ ﷺ نے خطبہ دیا، اللہ کی حمد و ثنا بیان کی اور فرمایا: أما بعد! میں کچھ لوگوں کو بعض ان کاموں کے لئے عامل بناتا ہوں جس کا اللہ تعالیٰ نے مجھے ذمہ دار بنایا ہے، پھر تم میں سے کوئی آتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ مال تمہارا ہے اور یہ ہدیہ ہے جو مجھے دیا گیا ہے، اگر وہ سچا ہے تو پھر کیوں نہ اپنے ماں باپ کے گھر میں بیٹھا رہا تا کہ وہیں اس کا ہدیہ پہنچ جاتا؟! اللہ کی قسم! تم میں سے کوئی بھی بنا حق کے کوئی چیز لے گا تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ

اسے اس طرح لائے گا کہ وہ اس چیز کو اٹھائے ہوئے ہو گا، یقیناً میں تم میں سے کسی کو پہچان لوں گا جب کہ وہ اللہ کے دربار میں اس حال میں حاضر ہو گا کہ وہ اونٹ اٹھائے ہوئے ہو گا جو آواز نکال رہا ہو گا، یا گائے جو آواز نکال رہی ہو گی، یا بکری جو مے مے کر رہی ہو گی۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ اٹھائے یہاں تک کہ آپ ؐ کی بغل کی سفیدی نظر آئی، آپ ﷺ فرما رہے تھے: اے اللہ! کیا میں نے پہنچا دیا ؟! یہ فرماتے ہوئے نبی کریم ﷺ کو میری آنکھوں نے دیکھا اور کانوں نے سنا۔ (صحیح بخاری: 6979 صحیح مسلم: 1832/27)

د: بوقتِ ضرورت اظہار ناراضگی اور سرزنش:

بسا اوقات بوقتِ ضرورت ناراضگی کا اظہار کیا جاتا تھا اور سرزنش بھی کی جاتی تھی، ایسا طرزِ تعلیم اس موقع پر اختیار کیا جاتا تھا جبکہ خاص مقام و مرتبہ کے حامل اشخاص سے کوئی شرعی غلطی سرزد ہو جاتی یا انفرادی اور جزئی حدود سے غلطی تجاوز کر لیتی اور وہ کسی فتنہ یا منہج سے انحراف کا سبب بن رہی ہوتی، البتہ یہ اظہارِ ناراضگی اور غصہ تربیت کی غرض سے ہوتا تھا جس میں کسی طرح کا اسراف اور زیادتی نہیں ہوتی تھی، بلکہ بقدرِ ضرورت ہی غصہ اور ناراضگی کا اظہار کیا جاتا تھا، جیسے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؓ کے پاس تورات کا ایک نسخہ تھا اور اس لئے لے کر آئے تھے تا کہ آپ ؐ کو پڑھ کر سناتے، حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ عمر بن خطابؓ اللہ کے رسول ﷺ کے پاس تورات کا ایک نسخہ لے کر آئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! یہ تورات کا نسخہ ہے، آپؐ خاموش رہے۔ اس کے بعد وہ اس کو پڑھنے لگے اور رسول اللہ ﷺ کا چہرہ متغیر ہو رہا تھا، یہ دیکھ کر حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا: رونے والی عورتیں آپ پر روئیں! کیا آپ رسول ﷺ کے چہرے کو نہیں دیکھ رہے ہیں؟ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ انور کی طرف دیکھا اور فرمایا: میں اللہ کے غضب اور اس کے رسول کے غضب سے پناہ مانگتا ہوں، ہم راضی ہوئے اللہ کو بحیثیتِ رب، اسلام کو بحیثیتِ دین اور محمد ﷺ کو بحیثیتِ نبی ماننے اور تسلیم کرنے پر، پھر رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں محمدؐ کی جان ہے! اگر آج موسیٰ ؑ بھی آجائیں اور تم میرے بجائے ان کی اتباع کرو تو سیدھی راہ سے گمراہ ہو جاؤ گے، اور اگر موسیٰ ؑ زندہ ہوتے اور میری نبوت کا زمانہ پاتے تو وہ بھی میری اتباع کرتے۔ (مسند احمد: 3/338- 387، مسند بزار: 124)

اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ نے اس وقت بھی ناراضگی کا اظہار فرمایا جب کہ بعض صحابہ کرام نے طویل نماز پڑھائی اور وہ امامت کے منصب پر فائز تھے اور اللہ کے رسول ﷺ نے اس طرح کے طرزِ عمل سے منع فرمایا تھا، اس لئے کہ اس میں تکلیف اور مشقت تھی اور یہ بعض کمزوروں، معذوروں اور کام کرنے والوں کے لئے آزمائش کا سبب بنتا تھا۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! میں نماز میں شریک نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ فلاں ہمیں لمبی نماز پڑھاتے ہیں۔ (حضرت ابو مسعودؓ فرماتے ہیں) اس دن سے زیادہ میں نے کبھی رسول اللہ ﷺ کو وعظ کرنے کے دوران غضبناک نہیں دیکھا، آپؐ نے فرمایا: اے لوگو! تم نفرت دلانے لگے ہو، لہذا جو شخص لوگوں کو نماز پڑھائے تو وہ ہلکی نماز پڑھائے، اس لئے کہ ان میں بیمار، کمزور اور ضرورت مند ہوتے ہیں۔ (صحیح بخاری: 90 صحیح مسلم: 466)

اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ نے اس وقت بھی ناراضگی کا اظہار فرمایا جب کہ وہ آپس میں تقدیر کے سلسلہ میں بحث و مباحثہ کرنے لگے، حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ اپنے اصحاب کے پاس تشریف لائے اور دیکھا کہ وہ تقدیر کے بارے میں بحث کر رہے تھے، آپ ﷺ یہ دیکھ کر اس قدر غضبناک ہوئے کہ معلوم ہوتا تھا گویا آپؐ کے چہرے پر انار کے دانے نچوڑ دیئے گئے ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تمہیں اسی کا حکم دیا گیا ہے؟ یا تمہیں اسی کام کے لئے پیدا کیا گیا ہے؟ اللہ کے قرآن کی بعض آیات کو بعض کے ساتھ ٹکراتے ہو؟! اسی وجہ سے تم سے پہلی امتیں ہلاک ہو گئیں۔ (سنن ابن ماجہ:85)

اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ نے اس وقت بھی ناراضگی کا اظہار فرمایا جبکہ بعض لوگوں نے دین کے بارے میں غلو کا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہا اور اپنے اوپر سختی کی، اس احساس کے ساتھ یہ طرزِ عمل زیادہ بہتر اور اللہ کے تقرب کا ذریعہ ہے، حضرت عائشہؓ سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ جب لوگوں کو کوئی حکم دیتے تھے تو وہ ایسا کام ہوتا تھا جس کی وہ استطاعت و طاقت رکھتے تھے، صحابہ کرام نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! ہم لوگ تو آپ جیسے نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ نے تو آپ کے اگلے پچھلے سب گناہ معاف کر دیئے ہیں! یہ سن کر آپ ﷺ انتہائی غضبناک ہوئے یہاں تک کہ خفگی آپ ﷺ کے چہرۂ مبارک سے ظاہر ہونے لگی، پھر آپؐ نے فرمایا: "بے شک میں تم میں سے سب سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں اور تم سب سے زیادہ اللہ کے بارے میں علم رکھتا ہوں"۔ (صحیح بخاری: 20)

ان تمام واقعات میں نبی کریم ﷺ کی ناراضگی اور خفگی تعلیمی اور تربیتی مقصد کے لئے تھی تاکہ صحابہ کرام کو احتیاط اختیار کرنے کی ترغیب ملے اور غلطیوں اور لغزشوں سے ان کو آگاہ کیا جائے، ایک واعظ کی شان یہ ہے کہ وہ سنجیدہ اور باوقار طریقہ سے رہے، اس لئے کہ اس کا مقام تقاضا کرتا ہے کہ وہ ناراضگی اور خفگی کا اظہار کرے، وہ انذار کا فریضہ انجام دینے والا ہے، اسی طرح ایک معلم جب ایک متعلم کی کسی غلط سوچ یا طرزِ عمل کی اصلاح کرنا چاہے اس کو بھی ناراضگی کا اظہار کرنا چاہیے، اس لئے کہ یہ طرزِ عمل بات قبول کرنے کے لئے زیادہ مؤثر ہوتا ہے، البتہ یہ ہر ایک کے حق میں لازمی اور ضروری نہیں ہے بلکہ متعلمین کے حالات کے اعتبار سے یہ مختلف ہو سکتا ہے۔ (دیکھیں: فتح الباری: 187/1)

ھ: بعض واقعات کو ذریعۂ تعلیم بنانا:

اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے کبھی کچھ مخصوص واقعات پیش آتے تھے، تو آپؐ ان واقعات کو صحابہ کرام کی تعلیمات کا ذریعہ بناتے تھے تاکہ بات اچھی طرح ذہن و دماغ میں بیٹھ جائے، جیسے کہ حضرت عمر بن خطابؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں کچھ قیدی لائے گئے، قیدیوں میں ایک عورت بھی تھی جس کے پستان دودھ سے بھرے ہوئے تھے، وہ کسی بچے کو تلاش کر رہی تھی، اتنے میں اس کو قیدیوں میں ایک بچہ ملا، اس نے اس کو لیا اور اس کو اپنی چھاتی سے لگالیا اور اس کو دودھ پلانے لگی، نبی کریم ﷺ نے یہ دیکھ کر فرمایا: کیا خیال ہے کیا یہ عورت اپنے بچے کو آگ میں ڈال سکتی ہے؟! ہم نے عرض کیا: نہیں! جب تک اس کو قدرت ہو گی یہ اپنے بچے کو آگ میں نہیں ڈال سکتی ہے، یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا: یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اس سے زیادہ رحم کرنے والا ہے جتنا یہ عورت اپنے بچے پر مہربان ہو سکتی ہے۔ (صحیح بخاری: 5999، صحیح مسلم:2754)

اللہ کے رسول ﷺ نے اس مخصوص واقعہ کو صحابہ کرام کو اللہ کے رحیم ہونے کے معانی سمجھانے کا ذریعہ بنایا، تاکہ لوگوں کے دلوں میں اپنے رب کے رحیم ہونے کے معانی راسخ ہو جائیں۔ (الرسول المعلم، عبدالفتاح ابو غدہؒ، ص: 160

۲) نبی کریم ﷺ سے علم حاصل کرتے وقت صحابہ کرامؓ کا طرزِ عمل

صحابہ کرامؓ اصول وآداب کا انتہائی اہتمام کیا کرتے تھے، جس کا یاد کرنے میں، محفوظ رکھنے میں اور لوگوں تک دعوت پہنچانے میں خاص اثر ہوتا ہے، مندرجہ ذیل سطور میں ان اصول وآداب کا ذکر کیا جا رہا ہے:

۱: مکمل خاموشی اور غور سے سننا:

اللہ کے رسول ﷺ کا مقام ومرتبہ صحابہ کرام کے دلوں میں انتہائی عظیم اور بلند تھا، ایسا ناممکن تھا کہ آپؐ جب گفتگو فرماتے تو وہ لہو ولعب میں مشغول ہوتے، یا آپؐ کی طرف متوجہ نہ ہوتے، یا آپؐ کی موجودگی میں آوازیں بلند کرتے، بلکہ وہ تو دل کے کانوں سے آپ ﷺ کی بات سنتے تھے، اپنے قلب ودماغ کو حاضر رکھتے اور اپنی قوتِ یاداشت کو کام میں لاتے، اپنے ہمنشینوں میں آپ ﷺ کی سیرت و اخلاق کا ذکر کرتے ہوئے حضرت علی بن ابی طالبؓ فرماتے ہیں: "اور جب آپ ﷺ گفتگو فرماتے تو آپؐ کے ہم نشین سر جھکا لیتے گویا کہ ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں، اور جب آپ ﷺ خاموش ہو جاتے تو پھر وہ گفتگو کرتے"۔(الشمائل للترمذی: 352)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے صحابہ کرام انتہائی عزت واحترام کے ساتھ بیٹھتے تھے، اور سکون اور خاموشی کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو اور احادیث سنتے تھے۔(دیکھیں: مناھج وآداب الصحابہ، ص77)

۲: گفتگو کرنے والے کی بات نہ کاٹنا:

جب اللہ کے رسول ﷺ گفتگو فرماتے تھے تو صحابہ کرامؓ خاموشی سے سنتے تھے اور دورانِ گفتگو آپؐ کی بات نہیں کاٹتے تھے، اس کا تعلق مجلس کے آداب سے ہے جس کی وجہ سے تمام اہلِ مجلس پُر سکون رہتے ہیں، ہر ایک متوجہ رہتا ہے اور اس سے بات سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے، حضرت علیؓ کی سابقہ حدیث میں آپ ﷺ کی مجلس کی منظر کشی کی گئی ہے، حضرت علیؓ فرماتے ہیں: "....رسول اللہ ﷺ کے پاس وہ کسی بات پر جھگڑا نہ کرتے، جو آپؐ کے پاس گفتگو کرتا تو اہلِ مجلس خاموشی سے اس کی گفتگو سنتے حتی کہ وہ اپنی بات سے فارغ ہو جاتا، آپ ﷺ کے پاس صحابہ کرام کی گفتگو ایسی ہوتی جیسا کہ ابھی پہلے شخص کی گفتگو ہے"۔ (الشمائل للترمذی: 352)

۳: اشکال کی صورت میں رسول ﷺ کی طرف رجوع:

ایک طرف صحابہ کرام کے دلوں میں رسول ﷺ کی انتہائی درجہ میں عظمت تھی اور آپ ﷺ کے رعب اور ہیبت کی وجہ سے ان کی کیفیت ہی دگرگوں ہو جاتی تھی لیکن اس کے باوجود جب کبھی ان کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آتی تھی تو وضاحت واستفسار کی غرض سے فوراً رسول ﷺ کی طرف رجوع کرتے تھے تاکہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجائے اور اس کو حفظ کرنا ان کے لئے آسان ہو، جیسے کہ حضرت حفصہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: مجھے امید ہے کہ جو لوگ بھی بدر میں شریک ہوئے اللہ تعالی ان کو جہنم میں داخل نہیں کرے گا"۔(حضرت حفصہؓ) فرماتی ہیں: میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! کیا اللہ تعالی نے یہ بات نہیں فرمائی ہے: ﴿وَإِن مِّنكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا﴾ ترجمہ: "تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو جہنم پر وارد نہ ہو، یہ تو ایک طے شدہ بات

ہے جسے پُورا کرنا تیرے رب کا ذمہ ہے"۔(سورۂ مریم: 71) آپ ﷺ نے فرمایا: کیا آپ نے اللہ کا یہ فرمان نہیں سنا ہے: ﴿ثُمَّ نُنَجِّي ٱلَّذِينَ ٱتَّقَواْ وَّنَذَرُ ٱلظَّٰلِمِينَ فِيهَا جِثِيًّا﴾ ترجمہ:" پھر ہم اُن لوگوں کو بچالیں گے جو (دنیا میں) متقی تھے اور ظالموں کو اُسی میں گراہُوا چھوڑ دیں گے"۔ (سورۂ مریم: 72) (مسند احمد: 6/285، سنن ابن ماجہ: 281)

اسی طرح حضرت جابر بن عبداللہؓ کی روایت ہےؓ، وہ عبداللہ بن اُنیسؓ سے روایت کرتے ہیں، حضرت جابر نے حضرت عبداللہ بن اُنیس کی جانب اس حدیث کی سماعت کے لئے سفر کیا تھا، ابن انیسؓ نے فرمایا: میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: اللہ تعالیٰ بندوں کو۔ یا فرمایا: لوگوں کو۔ برہنہ، غیر مختون اور "بہم" اٹھائے گا، فرماتے ہیں: ہم نے پوچھا: "بہما" کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ان کے پاس کوئی چیز نہیں ہوگی، اس کے بعد ان کو ایسی آواز سے پکارا جائے گا جس کو دور والا بھی اسی طرح سنے گا جیسے کہ نزدیک والا سنے گا: میں ہی بادشاہ ہوں، میں ہی بدلہ دینے والا ہوں، اہلِ جنت میں سے کوئی جنت میں داخل نہیں ہوسکے گا اور نہ ہی اہلِ جہنم میں سے کوئی جہنم میں داخل ہوگا جب تک کہ اس کے ذمہ کسی کے حق کا بدلہ اس سے نہ لوں گا یہاں تک کہ طمانچہ کا بدلہ بھی لوں گا۔ فرماتے ہیں: ہم نے دریافت کیا: اس وقت کیسا لگے گا جب کہ ہم اللہ کے سامنے غیر مختون اور خالی ہاتھ حاضر ہوں گے؟ اللہ کے رسول ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿ٱلْيَوْمَ تُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ ۚ لَا ظُلْمَ ٱلْيَوْمَ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ سَرِيعُ ٱلْحِسَابِ﴾ ترجمہ:"(کہا جائے گا) آج ہر متنفس کو اُس کمائی کا بدلہ دیا جائے گا جو اس نے کی تھی آج کسی پر کوئی ظلم نہ ہوگا اور اللہ حساب لینے میں بہت تیز ہے"۔(سورۃ غافر: 17) (الأدب المفرد للبخاری: 970، مسند احمد: 3/495، مستدرک حاکم: 2/437-438، مجمع الزوائد: 1/133)

اس طرح سے صحابہ کرام نبی کریم ﷺ سے ایسی چیزوں کے بارے میں استفسار و سوال کیا کرتے تھے جو ان کو سمجھ میں نہیں آتی تھیں، اس طرح کے سوالات و جوابات اور مذاکرہ کا فہم و یادداشت پر اہم اثر ہوتا ہے۔(دیکھیں: مناہج و آداب الصحابہ، ص: 80)

۴: حدیث کا مذاکرہ:

صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم) جب نبی کریم ﷺ سے کوئی بات سنتے تھے اور آپؐ سے کوئی علم اخذ کرتے تھے، تو وہ جمع ہو کر آپس میں اس کا مذاکرہ کرتے تھے، اور اپنی زبان سے اس کو دہراتے تھے تاکہ وہ اچھی طرح یاد ہو جائے، اس کا استیعاب ہو جائے اور اس پر اچھی طرح یقین کر کے اس پر عمل کر سکیں، حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں: ہم نبی کریم ﷺ کے پاس ہوتے تھے تو جب ہم آپؐ سے کوئی حدیث سنتے تھے تو جب ہم مجلس سے اٹھتے تو ہم آپس میں مذاکرہ کرتے تھے تاکہ ہم اس کو اچھی طرح یاد کر لیں۔(الجامع للخطیب 1/363 - 364)

مذاکرہ کا یہ طریقہ اللہ کے رسول ﷺ کی وفات کے بعد بھی صحابہ کرام کے مابین باقی اور برقرار رہا، حضرت ابونضرہ منذر بن مالک بن قطعہؒ بیان کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ کے اصحاب جمع ہوتے تھے تو آپس میں علم کا مذاکرہ کرتے تھے اور سورتیں پڑھتے تھے۔ (الجامع للخطیب 2/86 (1229) أدب الاملاء والاستملاء، ص: 48)

۵: علم و عمل کی غرض سے سوال:

صحابہ کرام کے سوالات علم و عمل کے مقصد سے ہوتے تھے، وہ فضول اور لایعنی سوالات سے اجتناب کرتے تھے، اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ نبی کریم ﷺ لایعنی سوالات کو ناپسند فرماتے ہیں، جن کی کوئی ضرورت نہ ہو، انہوں نے رسول ﷺ سے زیادہ سوالات کرنے سے اجتناب کرنے کی تعلیم حاصل کی تھی، حضرت سہل بن سعد الساعدیؓ سے روایت ہے، فرماتے ہیں: اللہ کے رسول ﷺ نے سوالات کو ناپسند کیا اور اس کو برا سمجھا۔ (کتاب العلم لابی خیثمہ زہیر بن حرب، ص: 20 نمبر: 77)

امام نوویؒ فرماتے ہیں: اس سے مراد ایسے سوالات کی ناپسندیدگی ہے جن کی کوئی حاجت اور ضرورت نہ ہو، خاص طور پر ایسے سوالات جن کے ذریعہ کسی مسلمان کا پردہ فاش کرنا، کسی بُرے کام کی تشہیر یا کسی مسلمان مرد یا عورت کی بے عزتی لازم آتی ہو، علماء فرماتے ہیں: جہاں تک تعلق ہے ایسے سوالات کا جن کی دینی امور میں ضرورت ہو تو ایسے سوالات کرنا ثابت ہے اور ان میں کوئی کراہت نہیں ہے۔ (شرح النووي علی مسلم: 3/741)

٦: نون میں نقطہ نکالنے اور تشابہ کے بارے میں سوالات سے اجتناب:

صحابہ کرام نون میں نقطہ نکالنے اور تشابہ کے بارے میں سوالات کرنے سے اجتناب کرتے تھے، اس لئے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے اس طرح کے طرزِ عمل سے بچنے کی تاکید کی ہے، اور نون میں نقطہ نکالنے سے ڈرایا ہے اور ان سے دور رہنے کی تاکید کی ہے، حضرت عائشہؓ سے روایت ہے فرماتی ہیں: اللہ کے رسول ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿هُوَ ٱلَّذِيٓ أَنزَلَ عَلَيۡكَ ٱلۡكِتَٰبَ مِنۡهُ ءَايَٰتٞ مُّحۡكَمَٰتٌ هُنَّ أُمُّ ٱلۡكِتَٰبِ وَأُخَرُ مُتَشَٰبِهَٰتٞۖ فَأَمَّا ٱلَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمۡ زَيۡغٞ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَٰبَهَ مِنۡهُ ٱبۡتِغَآءَ ٱلۡفِتۡنَةِ وَٱبۡتِغَآءَ تَأۡوِيلِهِۦۖ وَمَا يَعۡلَمُ تَأۡوِيلَهُۥٓ إِلَّا ٱللَّهُۗ وَٱلرَّٰسِخُونَ فِي ٱلۡعِلۡمِ يَقُولُونَ ءَامَنَّا بِهِۦ كُلّٞ مِّنۡ عِندِ رَبِّنَاۗ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّآ أُوْلُواْ ٱلۡأَلۡبَٰبِ﴾ ترجمہ: ”وہی خدا ہے جس نے یہ کتاب تم پر نازل کی ہے، اِس کتاب میں دو طرح کی آیات ہیں: ایک محکمات، جو کتاب کی اصل بنیاد ہیں اور دوسری متشابہات، جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے وہ فتنے کی تلاش میں ہمیشہ متشابہات ہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور اُن کو معنی پہنانے کی کوشش کیا کرتے ہیں، حالانکہ ان کا حقیقی مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، بخلاف اِس کے جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں، وہ کہتے ہیں کہ "ہمارا اُن پر ایمان ہے، یہ سب ہمارے رب ہی کی طرف سے ہیں" اور سچ یہ ہے کہ کسی چیز سے صحیح سبق صرف دانشمند لوگ ہی حاصل کرتے ہیں“۔ (سورۃ آل عمران: 7)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: جب آپ ان لوگوں کو دیکھو جو قرآن کی تشابہ آیات کی اتباع کرتے ہیں تو یہی وہ لوگ ہیں جن کا اللہ تعالی نے ذکر کیا ہے، لہٰذا ایسے لوگوں سے بچنا! (صحیح البخاری: 4547، صحیح مسلم: 2665)

۷: شارع نے جس چیز کے بارے میں سکوت اختیار کیا ہے اس کے بارے میں سوال کرنے سے اجتناب:

صحابہ کرامؓ اس اصول اور ادب کی سختی سے پابندی کرتے تھے کہ اگر شارع نے کسی چیز کے بارے میں سکوت اختیار کیا ہے تو اس کے بارے میں سوال کرنے سے اجتناب کرتے تھے تاکہ اس طرح کے سوالات کے نتیجے میں کوئی ایسی چیز نہ واجب ہو جائے جو ابھی تک واجب نہیں ہے یا کوئی چیز حرام و ممنوع نہ ہو جائے جس کو اللہ تعالیٰ نے ممنوع قرار نہیں دیا ہے، اس کی وجہ سے مسلمانوں پر سختی اور تنگی ہو سکتی ہے، جیسے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا تَسۡـَٔلُواْ عَنۡ أَشۡيَآءَ إِن تُبۡدَ لَكُمۡ تَسُؤۡكُمۡ وَإِن تَسۡـَٔلُواْ عَنۡهَا حِينَ يُنَزَّلُ ٱلۡقُرۡءَانُ تُبۡدَ لَكُمۡ عَفَا ٱللَّهُ عَنۡهَاۗ وَٱللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٞ ۝١٠١ قَدۡ سَأَلَهَا قَوۡمٞ مِّن قَبۡلِكُمۡ ثُمَّ أَصۡبَحُواْ بِهَا كَٰفِرِينَ﴾ ترجمہ: ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، ایسی باتیں نہ پوچھا کرو جو تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں ناگوار ہوں، لیکن اگر تم انہیں ایسے وقت پوچھو گے جب کہ قرآن نازل ہو رہا ہو تو وہ تم پر کھول دی جائیں گی، اب تک جو کچھ تم نے کیا اُسے اللہ نے معاف کر دیا، وہ در گزر کرنے والا اور بردبار ہے۔ تم سے پہلے ایک گروہ نے اِسی قسم کے سوالات کئے تھے، پھر وہ لوگ انہی باتوں کی وجہ سے کفر میں مبتلا ہو گئے''۔ (سورۃ المائدہ: 101-102)

اللہ کے رسول ﷺ نے اس طرح کے طرزِ عمل کے بارے میں سختی سے ڈرایا ہے، چنانچہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جرم کے اعتبار سے سب سے زیادہ خطرناک وہ شخص ہے جو کسی چیز کے بارے میں سوال کرے جو کہ حرام نہ ہو اور اس کے سوال کرنے کی وجہ سے حرام قرار دی جائے''۔ (صحیح بخاری: 7289، صحیح مسلم: 2358)

۸: رسول اللہ ﷺ کی تنہائی کے اوقات کو غنیمت سمجھنا اور اوقات کی رعایت کرنا:

صحابہ کرامؓ سوال کے لئے مناسب وقت کی رعایت کرتے تھے اور رسول اللہ ﷺ کی خلوت و تنہائی کے اوقات سے فائدہ اٹھاتے تھے تاکہ سوال کرنے کی وجہ سے کوئی مشقت اور پریشانی نہ ہو، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب فجر کی نماز ادا کرتے تھے تو ہم آپ کے قریب جاتے تھے، ہم میں سے کوئی آپ سے قرآن کے بارے میں سوال کرتا، کوئی فرائض (میراث) کے بارے میں سوال کرتا اور کوئی خواب کے بارے میں سوال کرتا۔ (مجمع الزوائد: 159)

۹: رسول اللہ ﷺ کے حالات کی رعایت اور سوال میں عدمِ اصرار:

صحابہ کرام رسول ﷺ کے حالات کی بھی رعایت اور لحاظ کرتے تھے اور سوال کرنے میں اصرار نہیں کرتے تھے، خاص طور پر جب کہ زیادہ سوالات کی ممانعت کی گئی ہے، اسی لئے وہ رسول اللہ ﷺ سے سوال کرنے کے لئے اُعراب کو آگے کرتے تھے اور وہ موقع کی تلاش میں رہتے تھے اور انتظار کرتے رہتے تھے کہ اُعراب میں سے کوئی عقلمند آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو تاکہ وہ رسول اللہ ﷺ سے سوال کرے، اور صحابہ کرام صرف سنتے رہیں، حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ہمیں اس بات سے منع کیا گیا کہ ہم رسول اللہ ﷺ سے کسی چیز کے بارے میں سوال کریں، اس لئے کہ ہمیں یہ بات پسند تھی کہ دیہات سے کوئی عقلمند شخص آجائے اور وہ آپ ﷺ سے سوال کرے اور ہم سنتے رہیں، چنانچہ ایک مرتبہ دیہات سے ایک شخص آیا اس نے کہا: اے محمدؐ! ہمارے پاس آپ کا ایک قاصد آیا، اس

نے ہم سے یہ کہا کہ آپ کہتے ہیں کہ اللہ تعالی نے آپ کو بھیجا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: اس نے سچ کہا۔ (صحیح مسلم: 92، سنن ابو داؤد: 487، سنن ترمذی: 619، سنن نسائی: 4 /121- 122، مسند احمد: 3/143 - 193)

اس طرح سے نئی اسلامی سوسائٹی میں واضح عملی کرداروں کے ذریعہ تربیتی عمل جاری رہا، اس تربیتی عمل کے ذریعہ مسلم معاشرہ کے افراد کے مابین تعلیم و تعلم کی ضرورت و فرضیت کا احساس بھی پیدا کیا جاتا رہا، یہ تعلیمات ایک فرد مسلم، امت مسلمہ اور رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ قائم کی گئی اسلامی ریاست کی تیاری میں اہم کردار ادا کر رہی تھی، یہاں پر اختصار کے ساتھ چند پہلوؤں کی جانب اشارات کئے گئے ہیں جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ امت مسلمہ میں تربیتی اور علمی عمل کا جاری و ساری رہنا کتنا اہم ہے اور یہ اہمیت صرف دور نبوی کے وقت نہیں تھی بلکہ دور نبوی اور اسلامی حکومت کے قیام کے بعد بھی اس کی اہمیت باقی رہتی ہے۔

....

چھٹا باب

نئی صورتحال اور تشریع و قانون سازی

ا: اقتصادی بحران کا علاج:

مدینہ کی جانب مسلمانوں کی ہجرت کی وجہ سے جدید ابھرتی ہوئی ریاست پر مزید اقتصادی بوجھ پڑ گیا، قائدِ اعلیٰ ﷺ نے متعدد طریقوں اور متنوع اسالیب کے ذریعہ اس بحران کا حل نکالنا شروع کیا، چنانچہ مہاجرین وانصار کے مابین مؤاخات کا نظام اور مسجد نبوی سے متصل صفہ کی تعمیر کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ فقرائے مہاجرین کی زیادہ سے زیادہ تعداد کے لئے قیام کا انتظام کیا جائے، اللہ کے رسول ﷺ نے مدینہ میں اقتصادی صورتحال کا جائزہ لینا شروع کیا تو آپؐ نے دیکھا کہ اقتصادیات کا پورا نظام اور قوت یہودیوں کے ہاتھ میں ہے اور مدینہ کی مارکیٹ اور وہاں کے مال و دولت پر ان کا کنٹرول ہے، وہی اشیاء کی قیمتوں اور چیزوں کے بارے میں فیصلہ کرتے ہیں، ذخیرہ اندوزی کر کے لوگوں کی ضرورت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں، اس لئے ضروری تھا کہ مسلمانوں کی ایک مستقل مارکیٹ بنائی جائے تاکہ وہ مال و دولت کے مصادر وذرائع اور مدینہ کی معیشت میں یہود کا مقابلہ کر سکیں اور اس مارکیٹ میں اسلامی آداب واصول اور تجارتی میدان کے اعلیٰ اخلاق عملی شکل میں نظر آئیں، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے مسجد نبوی کی مغربی سمت میں مارکیٹ کی ایک جگہ متعین فرمائی اور اپنے قدمِ مبارک سے اس جگہ پر نشانات لگا کر فرمایا: یہ آپ کا بازار ہے، اس میں نہ مال کم دیا جائے گا اور نہ اس میں کوئی محصول (ٹیکس) عائد کیا جائے گا۔ (سنن ابن ماجہ: 2333)

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ایک وسیع مارکیٹ کا قیام عمل میں آیا اور یہ مارکیٹ رسول اللہ ﷺ کی خصوصی توجہ اور اہتمام کا مرکز بنی رہی، آپ ﷺ پابندی کے ساتھ اس کی نگرانی فرماتے تھے، آپؐ نے اس کے لئے اصول وضوابط متعین فرمائے اور غبن اور دھوکہ پر مبنی جاہلیت کے بہت سے خرید وفروخت کے طریقوں سے اس کو پاک کیا، اسی طرح آپ ﷺ نے اس میں آزادانہ طریقے سے خرید وفروخت کے مواقع فراہم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ (دیکھیں: أحکام السوق فی الاسلام، أحمد الدرویش، ص 35- 36)

اللہ کے رسول ﷺ نے مدینہ کی مارکیٹ کے لئے بہت سے اصول وآداب مشروع کئے اور متعدد چیزوں کو ممنوع قرار دیا تاکہ وہ ہر اعتبار سے محفوظ ہو جہاں اصول وضوابط کو پامال نہ کیا جاتا ہو اور نہ ہی کوئی اس کو معمولی سمجھے بلکہ وہ ہر دور کے بازاروں میں امت کے بازاروں کے لئے ایک آئیڈیل اور نمونہ بن سکے، آپ ﷺ کی سیرت طیبہ سے ہم بہت سے اصول وآداب کا استنباط کر سکتے ہیں جن کے بارے میں آپؐ بازار میں داخل ہونے کے وقت حکم دیتے تھے، یا بعض چیزوں سے منع کرتے تھے، آپؐ وہاں خرید وفروخت کے معاملات کی نگرانی فرماتے تھے، اللہ کے رسول ﷺ جب بھی کوئی خلافِ شریعت عمل دیکھتے تھے تو اس سے منع فرماتے تھے اور اس کو کالعدم قرار دیتے تھے اور جب معروف اور اچھی بات دیکھتے تو اس کی تائید فرماتے تھے اور اس پر عمل کرنے کی ترغیب دیتے تھے، آپ ﷺ ان تمام اصول وضوابط کا

استنباط اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی تعلیمات اور فرامین سے کرتے تھے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَا يَنطِقُ عَنِ ٱلْهَوَىٰٓ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۝﴾ ترجمہ: ''وہ اپنی خواہشِ نفس سے نہیں بولتا۔ یہ تو ایک وحی ہے جو اُس پر نازل کی جاتی ہے''۔ (سورۃ النجم: 3-4)

مندرجہ ذیل سطور میں چند آداب کا ذکر کیا جا رہا ہے:

۱) بازار میں داخل ہونے والے کے لئے مسنون ہے کہ وہ داخل ہوتے وقت اللہ کا ذکر کرے اور اس کی حمد و ثنا کرے، اس لئے کہ رسول ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو بازار میں داخل ہوا اور اس نے یہ کلمات کہے: [لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ، لَہُ الْمُلْکُ، وَلَہُ الْحَمْدُ، یُحْیِی وَیُمِیْتُ وَھُوَ حَیٌّ لَّا یَمُوْتُ اَبَدًا اَبَدًا ذُو الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ بِیَدِہِ الْخَیْرُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ] اللہ تعالیٰ اس کے لئے ہزار نیکیاں لکھتا ہے اور اس کی ہزاروں غلطیوں کو مٹا دیتا ہے، اور اس کے ہزار درجات بلند کرتا ہے اور اس کے لئے جنت میں ایک گھر بناتا ہے''۔ (سنن ترمذی: 3428، سنن ابن ماجہ: 2235، مستدرک حاکم: 1/538)

بازار میں ذکر کرنے کے بطور خاص اس لئے تاکید و ترغیب دی گئی ہے اس لئے کہ وہ غفلت اور تجارت میں مشغولیت کی جگہ ہے، وہاں شیطان کا کنٹرول ہوتا ہے اور اس کے کارندے سرگرم عمل ہوتے ہیں، اس لئے ذکر شیطان کے مقابلہ میں ایک ڈھال ہے جس کے ذریعہ اس کے کارندوں کو شکست دی جا سکتی ہے، لہذا جو بھی یہ کلمات کہے گا تو وہ مذکورہ ثواب کا مستحق قرار پائے گا۔ (تحفۃ الأحوذی: 9/386)

۲) بازار میں داخل ہونے والے کے لئے مکروہ ہے کہ وہ لڑائی جھگڑے کی وجہ سے اپنی آواز بلند کرے، چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ کی صفات میں مذکور ہے کہ "آپ ؐ نہ تند خو تھے اور نہ ہی تند مزاج، اور نہ ہی بازاروں میں شور وغل کرنے والے تھے، برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے تھے، بلکہ عفو در گزر سے کام لیتے تھے''۔ (صحیح بخاری: 2125)

شور وغل اور ہنگامہ تو نفسہ مذموم و ناپسندیدہ ہے، اس کی ناپسندیدگی اور زیادہ بڑھ جاتی ہے جبکہ وہ بازار میں ہو، جہاں ہر جنس کے لوگ موجود ہوتے ہیں۔ (احکام السوق فی الاسلام، ص 41)

۳) بازار کو صاف ستھرا رکھنا اور ہر قسم کی گندگی سے پاک رکھنا ضروری ہے تاکہ وہاں چلنے والوں کو کسی طرح کی اذیت نہ پہنچے اور نہ ہی بدبو کے ذریعہ ان کو کوئی تکلیف پہنچے، نبی کریم ﷺ نے نظافت اور پاکی کی ترغیب دی ہے، خاص طور پر راستوں اور بازاروں کو گندگی اور تکلیف دہ چیزوں سے پاک رکھنے کی تلقین کی ہے، اس لئے کہ اس میں دوسروں کو ایذا اور تکلیف پہنچتی ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: لعنت کا ذریعہ بننے والے دو کاموں سے بچو! صحابہ کرام نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ؐ! وہ لعنت کے دو کام کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا: ایک تو لوگوں کے راستے میں قضائے حاجت کرنا، دوسرے سایہ دار جگہ قضائے حاجت کرنا۔ (صحیح مسلم: 269، سنن ابوداؤد: 25)

۴) بازار میں اسلحہ اٹھانے سے اجتناب کرنا؛ نبی کریم ﷺ سے یہ ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی ہماری مسجد یا ہمارے بازار سے گزرے اور اس کے پاس تیر ہوں تو اسے چاہیے کہ اس کی نوک تھام کے رکھے کہ کہیں کسی مسلمان کو اس سے تکلیف نہ پہنچے۔ (صحیح البخاری: 7075 صحیح مسلم: 2615)

اسی پر ہر قسم کے ہتھیاروں اور اسلحہ کو قیاس کیا جائے گا اس لئے کہ اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی صورت میں اس سے خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔(دیکھیں: أحکام السوق، ص44)

۵) عہد وپیمان اور ہر قسم کے اصول وضوابط کی پابندی کرنا اور دھوکہ دہی اور عہد شکنی سے اجتناب کرنا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَأَوْفُوا بِعَهْدِ اللَّهِ إِذَا عَاهَدتُّمْ وَلَا تَنقُضُوا الْأَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللَّهَ عَلَيْكُمْ كَفِيلًا ۚ إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُونَ﴾ ترجمہ: ''اللہ کے عہد کو پورا کرو جبکہ تم نے اس سے کوئی عہد باندھا ہو، اور اپنی قسمیں پختہ کرنے کے بعد توڑ نہ ڈالو جبکہ تم اللہ کو اپنے اوپر گواہ بنا چکے ہو، اللہ تمہارے سب افعال سے باخبر ہے''۔(سورۃ النحل:91)

۶) خرید وفروخت اور ہر قسم کی تجارت میں آسانی اور سہولت کا طرزِ عمل اختیار کرنا: اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے: ''اللہ تعالیٰ ایسے شخص پر رحم کرے جو بیچتے وقت، خریدتے وقت اور تقاضا کرتے وقت فیاضی اور نرمی سے کام لیتا ہے''۔ (صحیح بخاری:2076، سنن ترمذی:1320 ابن ماجہ:2203)

۷) صدق وسچائی، وضاحت وبیان اور کتمان سے اجتناب، یہ وہ آداب ہیں جن کا التزام وپابندی لوگوں کے معاملات میں ضروری ہے، اللہ کے رسول ؐ نے اس تاجر کی تعریف بیان فرمائی ہے جو معاملات میں صدق وسچائی اختیار کرتا ہے اور لین دین میں امانت داری سے کام لیتا ہے، اور امانت دار تاجر کو انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ (سنن ترمذی: 1209، سنن ابن ماجہ:2139)

۸) جھوٹی قسموں سے اجتناب کرنا: اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''قسم سامان کے لئے تشہیر اور ظاہری فائدہ کا ذریعہ ہے، لیکن اس کے ذریعہ حقیقی فائدہ اور برکت ختم ہو جاتی ہے''۔(صحیح بخاری:2087، صحیح مسلم:1606) اللہ کے رسول ﷺ کا یہ بھی ارشاد ہے: ''خرید وفروخت میں زیادہ قسمیں کھانے سے بچو، اس لئے کہ اس سے ظاہری فائدہ ہوتا ہے پھر نقصان اور بے برکتی ہوتی ہے''۔(صحیح مسلم:1607، سنن نسائی:7/246، سنن ابن ماجہ:2209)

چنانچہ قسمیں کھانے والا اپنے سامان کی تشہیر کرتا ہے اور اس کی زیادہ قیمت وصول کرتا ہے، مگر یہ تشہیر اور فائدہ ظاہری ہوتا ہے، اس کے نتیجہ میں بے برکتی ہوتی ہے اور مال میں ایسی صورتحال پیش آتی ہے کہ یا تو وہ فضولیات اور اسراف میں خرچ ہوتا ہے، یا جل جاتا ہے، یا سیلاب کی نذر ہو جاتا ہے، یا لوٹ مار اور چوری کا نشانہ بنتا ہے، یا بیماری یا دیگر عوارض میں صرف ہو جاتا ہے۔ (شرح السیوطی علی سنن النسائی: 7/246)

یہ بعض اصول وآداب اور نبوی تعلیمات کا مختصر خاکہ تھا جن کا تعلق اسلامی مارکیٹ میں ایک دوسرے کے ساتھ معاملہ کرنے سے ہے، ان تعلیمات کا مسلمانوں کی مارکیٹ کو بنانے اور پروان چڑھانے میں اور یہود کے بازاروں کو کمزور بنانے میں اہم کردار رہا ہے اور انہی اصولوں اور تعلیمات کی وجہ سے مسلمان مدینہ کی معیشت واقتصادیات پر کنٹرول کر سکے اور انہیں کی وجہ سے وہ یہود کو ان کے میدانِ اختصاص میں مات دینے پر قادر ہو سکے۔ (فی ظلال السیرۃ النبویہ، الہجرۃ النبویہ، ابو فارس، ص70)

اسلامی ریاست کی توسیع اور احکام سازی اور تشریع کے ساتھ ساتھ ان اصول وضوابط اور آداب میں بھی روز افزوں ترقی ہوئی، اور تجارت کے لئے مستقل علم، احکام ومسائل اور قوانین کی ترتیب وتشریع عمل میں آئی، اس لئے حضرت عمرؓ نے فرمایا: "ہمارے بازار میں وہی خرید وفروخت کرے گا جو دینی سمجھ بوجھ رکھتا ہو"۔ (احکام السوق فی الاسلام، ص53)

اسلام میں بازار اور مارکیٹ کا بلند مقام اور اہم کردار ہے، اس لئے کہ انسانی زندگی میں اس کی مالی اور اقتصادی اہمیت ہے، یہی وہ جگہ ہے جہاں لوگ ایک دوسرے کے ساتھ معاملات اور لین دین کرتے ہیں اور یہی وہ جگہ ہے جہاں ہر انسان کو اپنے معاشی امور، اپنی ضروریات زندگی اور خصوصی وعمومی لوازمات حاصل ہوتے ہیں، اسی لئے اسلامی بازار کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے خصوصی تعلیمات دی ہیں۔ (أحکام السوق فی الاسلام، ص585-586)

قرآن کریم نے ایک خطرناک اقتصادی اور معاشرتی مرض کے بارے میں آگاہ کیا ہے جس نے انسانوں کے دین اور دنیا پر مضر اثرات ڈالے ہیں، یہ ناپ تول میں کمی کی بیماری ہے، اس طرح کا طرزِ عمل اللہ کے نازل کردہ منہج کے برخلاف اور متضاد تھا، اللہ کے منہج میں تو ہر چیز میں عدل وانصاف ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ٱللَّهُ ٱلَّذِىٓ أَنزَلَ ٱلْكِتَـٰبَ بِٱلْحَقِّ وَٱلْمِيزَانَ ۗ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّ ٱلسَّاعَةَ قَرِيبٌ﴾ ترجمہ: "وہ اللہ ہی ہے جس نے حق کے ساتھ یہ کتاب اور میزان نازل کی ہے اور تمہیں کیا خبر، شاید کہ فیصلے کی گھڑی قریب ہی آلگی ہو"۔ (سورۃ الشوری: 17)

ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿وَلَا تَقْرَبُوا۟ مَالَ ٱلْيَتِيمِ إِلَّا بِٱلَّتِى هِىَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُۥ ۖ وَأَوْفُوا۟ ٱلْكَيْلَ وَٱلْمِيزَانَ بِٱلْقِسْطِ ۖ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ۖ وَإِذَا قُلْتُمْ فَٱعْدِلُوا۟ وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ۖ وَبِعَهْدِ ٱللَّهِ أَوْفُوا۟ ۚ ذَٰلِكُمْ وَصَّىٰكُم بِهِۦ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ﴾ ترجمہ: "اور یہ کہ یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر ایسے طریقہ سے جو بہترین ہو، یہاں تک کہ وہ اپنے سن رشد کو پہنچ جائے اور ناپ تول میں پورا انصاف کرو، ہم ہر شخص پر ذمہ داری کا اتنا ہی بار رکھتے ہیں جتنا اس کے امکان میں ہے، اور جب بات کہو انصاف کی کہو خواہ معاملہ اپنے رشتہ دار ہی کا کیوں نہ ہو، اور اللہ کے عہد کو پورا کرو، ان باتوں کی ہدایت اللہ نے تمہیں کی ہے شاید کہ تم نصیحت قبول کرو"۔ (سورۃ الأنعام:152) مزید فرمایا: ﴿وَأَوْفُوا۟ ٱلْكَيْلَ إِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوا۟ بِٱلْقِسْطَاسِ ٱلْمُسْتَقِيمِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا﴾ ترجمہ: "پیمانے سے دو تو پورا بھر کر دو، اور تولو تو ٹھیک ترازو سے تولو، یہ اچھا طریقہ ہے اور بلحاظ انجام بھی یہی بہتر ہے"۔ (سورۃ الاسراء:35)

اللہ تعالیٰ نے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کو ویل اور تباہی کی وعید سنائی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ ① ٱلَّذِينَ إِذَا ٱكْتَالُوا۟ عَلَى ٱلنَّاسِ يَسْتَوْفُونَ ② وَإِذَا كَالُوهُمْ أَو وَّزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ ③ أَلَا يَظُنُّ أُو۟لَـٰٓئِكَ أَنَّهُم مَّبْعُوثُونَ ④﴾ ترجمہ: "کم تولنے والوں کے لئے تباہی ہے، وہ لوگ کہ جب لوگوں سے ناپ کر لیں تو پورا کریں، اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیں تو گھٹا کر دیں، کیا وہ خیال نہیں کرتے کہ وہ اٹھائے جائیں گے"۔ (سورۃ المطففین: 1-4)

صحابہ کرامؓ نے قوم شعیب ؑ کے قصہ سے سیکھا کہ ناپ تول میں کمی کے نتیجے میں منہج الٰہی معطل ہو جاتا ہے، ربانی احکام کی مخالفت لازم آتی ہے اور عزیز و جبار رب کی ناراضگی اور دنیا و آخرت میں اس کے عذاب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اس طرح کے طرزِ عمل کے دنیاوی اعتبار سے بھی نقصانات ہیں، اس لئے کہ اس کے نتیجے میں خوشحالی کے بجائے تنگ حالی اور مشکلات پیدا ہوتی ہے، قیمتوں میں کمی کے بجائے مہنگائی ہوتی ہے اور لوگوں کی زندگی میں ضرر اور نقصان ہوتا ہے، اسی لئے مدینہ میں اسلامی ریاست نے اس طرزِ عمل کے خلاف اعلانِ جنگ کر رکھا تھا۔ (دیکھیں: أسباب ہلاک الامم السالفۃ، سعید محمد، ص: 446)

بلاشبہ ناپ تول میں کمی کا تعلق ان اسباب سے ہے جس کی وجہ سے قوم شعیب ہلاک ہو گئی، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿كَأَن لَّمْ يَغْنَوْاْ فِيهَآ أَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُودُ﴾ ترجمہ: ”گویا وہ کبھی وہاں رہے بسے ہی نہ تھے سنو! مدین والے بھی دور پھینک دیئے گئے جس طرح ثمود پھینکے گئے تھے“۔ (سورۂ ہود: 95)

نبی کریم ﷺ جس نصاب کے مطابق صحابہ کرام کی تربیت فرماتے تھے قوم شعیب کا قصہ بھی اس نبوی نصاب کا حصہ تھا اور صحابہ کرام نے یہ بات اچھی طرح سمجھ لی تھی کہ منہجِ ربانی سے انحراف کا مطلب ہلاکت و تباہی ہے اور دینِ اسلام زندگی کے تمام شعبہائے حیات میں رہنمائی کرتا ہے۔

بلاشبہ ربانی منہج نے قصص قرآنی کے ذریعہ اقتصادی و معاشی مشکلات کا علاج کیا تاکہ لوگ ان واقعات کے ذریعہ نصیحت حاصل کریں اور سابقہ اقوام سے عبرت حاصل کریں، اسی طرح تشریعی و تعبدی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا، جس کا تنظیمی و تربیتی تعمیر میں خاص اثر پڑتا ہے، اللہ تعالیٰ اس اُمت کو تربیتی مراحل سے گزار رہا تھا تاکہ وہ امانت اٹھانے کے لئے اور رسالت کا پیغام پہنچانے کے لئے اہل اور تیار ہو سکیں، چھوٹے بڑے تمام امور میں امت کو تیار کیا جا رہا تھا، اس لئے کہ وہ سب اس کو بلند کرنے اور آندھیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کر رہے تھے، ہجرت کے ابتدائی دو سالوں کے دوران جو تعبدی شعائر فرض کئے گئے ان میں زکوۃ، صدقۂ فطر اور روزہ بطور خاص قابل ذکر ہیں، قابلِ غور یہ امر ہے کہ مسلم معاشرہ کی تعمیر میں تدریج کے قانون کا اور لوگوں کی صورتحال کا لحاظ کیا گیا ہے، بغیر کسی عجلت و جلد بازی کے لوگوں کو افضل اور بہتر مقام کی طرف منتقل کیا جا رہا تھا اور ہر چیز اپنے وقت پر انجام دی جا رہی تھی۔ (دراسات فی عصر النبوۃ، الشجاع، ص 166، 168)

۲: بعض تشریعات واحکام:

ا: فریضۂ صیام کی مشروعیت:

سن دو ہجری ماہ شعبان میں اللہ تعالی نے روزہ فرض کیا اور اس کو اسلام کے ارکان میں سے ایک اہم رکن قرار دیا، اسی طرح روزہ اُمم سابقہ پر بھی فرض تھا، اس کے ذریعہ اِس عظیم عبادت کی اہمیت اور مقام و مرتبہ کا پتہ چلتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ ٱلصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى ٱلَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ ترجمہ: "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تم پر روزے فرض کر دیئے گئے، جس طرح تم سے پہلے انبیا کے پیروؤں پر فرض کئے گئے تھے، اس سے توقع ہے کہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہوگی"۔ (سورۃ البقرۃ: 183)

اللہ تعالی نے ماہِ صیام کی تعریف کی ہے اور تمام مہینوں کے مقابلہ میں نزولِ قرآن کے ذریعہ اس کو خصوصی مقام عطا کیا ہے، اِرشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ ٱلَّذِىٓ أُنزِلَ فِيهِ ٱلْقُرْءَانُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَـٰتٍ مِّنَ ٱلْهُدَىٰ وَٱلْفُرْقَانِ ۚ فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ ٱلشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۗ يُرِيدُ ٱللَّهُ بِكُمُ ٱلْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ ٱلْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُواْ ٱلْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُواْ ٱللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَىٰكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾ ترجمہ: " رمضان وہ مہینہ ہے، جس میں قرآن نازل کیا گیا جو انسانوں کے لئے سراسر ہدایت ہے اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے، جو راہ راست دکھانے والی اور حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں، لہٰذا اب سے جو شخص اس مہینے کو پائے، اُس کو لازم ہے کہ اِس پورے مہینے کے روزے رکھے اور جو کوئی مریض ہو یا سفر پر ہو، تو وہ دوسرے دنوں میں روزوں کی تعداد پوری کرے اللہ تمہارے ساتھ نرمی کرنا چاہتا ہے، سختی کرنا نہیں چاہتا ،اس لئے یہ طریقہ تمہیں بتایا جارہا ہے تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری کر سکو اور جس ہدایت سے اللہ نے تمہیں سرفراز کیا ہے، اُس پر اللہ کی کبریائی کا اظہار واعتراف کرو اور شکر گزار بنو"۔ (سورۃ البقرۃ: 185)

پہلی آیت کریمہ میں مخلص روزہ داروں کو حاصل ہونے والے عظیم فائدہ کی وضاحت کی گئی ہے کہ وہ تقوی کے مقام پر فائز ہوتے ہیں، چنانچہ روزہ امت کے حق میں ایک انوکھا مدرسہ اور طہارتِ نفس کے لئے ایک تربیتی کورس ہے تاکہ وہ ہر قسم کی آفات اور امراض سے پاک و صاف ہو جائیں اور فضائل و اعلیٰ صفات سے آراستہ ہو اور تقویٰ اور اصلاح و نیکی کے اعلیٰ مدارج اور مقام پر فائز ہو۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویہ، ابو شہبہ 2/106، منہج الاسلام فی تزکیۃ النفس 1/251-252)

مسلم معاشرہ کی تربیت میں روزہ کی اہمیت و کردار کی وجہ سے ہی نبی کریم ﷺ نے روزہ کے خاص ایام کی خصوصی اہمیت بیان فرمائی ہے، اور ان ایام میں روزہ رکھنے کی ترغیب دی ہے، اور اللہ کی طرف سے اجر و ثواب کا وعدہ کیا ہے، اس طرح سے ماہِ صیام کے ساتھ ساتھ روزہ کے مدرسہ کے دروازے پورے سال کھلے رہتے ہیں تاکہ جب بھی ایک مسلمان کو اپنے دل میں قساوت و سختی محسوس ہو اور وہ نفس کو لگام دینے اور مزید اجر و ثواب اور فضلِ الٰہی کی طلب محسوس کرے تو وہ روزہ کی تربیت گاہ میں داخل ہو جائے، حضرت ابو سعید خدری ؓ

سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جس نے اللہ کے راستہ میں جہاد کرتے ہوئے ایک دن بھی روزہ رکھا اللہ تعالیٰ اسے جہنم سے ستر (۷۰) سال کی مسافت کی دوری تک دور کرے گا۔(صحیح البخاری: 2840، صحیح مسلم:1153)

۲) صدقۂ فطر کی مشروعیت:

سن دو ہجری کے رمضان میں ہی اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے صدقۂ فطر مشروع کیا جس کی ادائیگی ہر آزاد، غلام، مرد، عورت اور چھوٹے بڑے (صاحبِ نصاب) مسلمان پر ضروری ہے، اس صدقہ کی فرضیت اور لزوم کی حکمت ظاہر اور واضح ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ "رسول اللہ ﷺ نے صدقہ فطر روزہ دار کو لغو اور بیہودہ باتوں سے پاک کرنے کے لئے اور مسکینوں کے کھانے کے لئے فرض کیا ہے، لہذا جو اسے عید کی نماز سے پہلے ادا کرے گا تو یہ مقبول صدقہ ہو گا، اور جو اس کو نماز کے بعد ادا کرے گا تو وہ عام صدقات میں سے ایک صدقہ ہو گا"۔ (سنن ابوداؤد:1609 سنن ابن ماجہ:1827، مستدرک حاکم:1/409)

اس حدیث میں صدقۂ فطر کی دو حکمتوں کی صراحت کی گئی ہے:

اُ) پہلی حکمت کا تعلق ماہِ رمضان کے روزہ کے ساتھ ہے، اس لئے کہ انسان کی فطرت میں لغزش و خطا داخل ہے، اسی طرح وہ بے فائدہ اور لغو گفتگو یا ضرر رساں کلام میں ملوث ہو جاتا ہے، اس لئے ماہِ صیام کے اختتام پر صدقۂ فطر ضروری قرار دیا گیا تا کہ روزہ دار کے روزہ کو ہر طرح کی آلائش اور کمیوں سے پاک کیا جائے۔

ب) دوسری حکمت کا تعلق محتاج و ضرورت مند سے ہے، وہ یہ ہے کہ محتاج کی ضرورت کو پورا کر کے اس کو بے نیاز کیا جائے، اس لئے کہ اس دن میں پورا معاشرہ خوشی اور مسرت میں ہوتا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ اس خوشی میں سب کے سب افراد شامل ہوں جس کے لئے صدقہ فطر کو مشروع کیا گیا تاکہ ضرورت مندوں کو دستِ سوال دراز کرنے اور لوگوں کے سامنے ذلیل ہونے سے محفوظ رکھا جائے، اسی لئے صدقۂ فطر فقراء اور مساکین کو ہی دیا جا سکتا ہے، اسی لئے اللہ کے رسول ﷺ نے اس کی مقدار اتنی زیادہ نہیں رکھی ہے جس کو اکثر لوگ دینے سے قاصر رہیں، بلکہ تھوڑی مقدار کو واجب قرار دیا جس کا دینا لوگوں کے لئے آسان ہو اور اس کے ذریعہ تمام ضرورت مندوں کی ضرورت پوری ہو، اندازہ کیجئے کہ یہ دین کتنا عظیم ہے؟! (دیکھیں: منہج الاسلام فی تزکیۃ النفس: 1/268 - 269، المال فی القرآن الکریم، سلیمان الحصین، ص: 334)

۳) نمازِ عید:

اسی سال سن دو ہجری میں نبی کریم ﷺ نے نماز عید ادا فرمائی اور یہ سب سے پہلی نماز عید تھی، اللہ کے رسول ﷺ لوگوں کو لے کر عید گاہ کی جانب تشریف لے کر گئے تمام لوگ تہلیل و تکبیر اور اللہ کی عظمت بیان کر رہے تھے تاکہ اللہ تعالیٰ کی پے بہ پے نعمتوں پر شکر ادا کیا جا سکے، بے شک عید نیکی اور خیر کے کام کرنے اور ایک دوسرے کے ساتھ شفقت و محبت کا معاملہ کرنے کا موسم ہے، اللہ کے رسول ﷺ کا طرزِ عمل یہ تھا کہ جب آپ ﷺ عید کی نماز ادا فرماتے تو لوگوں کو تذکیر کرتے ان کو اچھے کاموں کی ترغیب دیتے، اور بُرے

اعمال اور بُرے انجام سے ڈراتے تھے جس کی وجہ سے مرد وخواتین اور چھوٹے بڑے سب عمل وعطا اور انفاق میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے۔

۴) **زکوۃ کی مشروعیت:**

سن دو ہجری میں اللہ تعالیٰ نے زکوۃ مشروع کی، زکوۃ ارکان اسلام میں سے ایک اہم رکن ہے، زکوۃ کی مشروعیت ماہِ رمضان کے بعد ہوئی، اس لئے کہ عمومی زکوۃ کی مشروعیت صدقۂ فطر کی مشروعیت کے بعد عمل میں آئی اور صدقۂ فطر کی مشروعیت رمضان کے روزوں کی مشروعیت کے بعد عمل میں آئی، اس کی دلیل وہ حدیث ہے جو امام احمد، ابن خزیمہ، نسائی، ابن ماجہ اور حاکم نے حضرت قیس بن سعد بن عبادہؓ سے روایت کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں صدقۂ فطر کا حکم زکوۃ کے حکم کے نزول سے پہلے دیا، زکوۃ کا حکم اس کے بعد نازل ہوا، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں نہ ہی صدقہ فطر کا حکم دیا اور نہ ہی اس سے منع کیا اور ہم صدقۂ فطر ادا کرتے رہے"۔ (صحیح سنن نسائی، الالبانی، کتاب الزکاۃ: 2506)

جمہور علمائے سلف وخلف کا اس پر اتفاق ہے کہ زکوۃ کی مشروعیت سن دو ہجری میں مدینہ منورہ میں ہوئی۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویہ، ابو شہبہ: 2/111)

عہدِ مکی میں زکوۃ ہر قسم کی حدود وقیود سے آزاد تھی اور افراد کے ایمان اور ضمیر پر اس کا انحصار تھا، جب ان کو اپنے اہلِ ایمان بھائیوں کے تئیں کسی ضرورت کا احساس ہوتا تھا تو وہ ان پر انفاق کرتے تھے جس میں کم مقدار کا مال بھی کافی ہوتا تھا اور جب کہ بسا اوقات کثیر مقدار میں مال خرچ کرنے کی ضرورت پڑتی تھی۔ (فقہ الزکوۃ، القرضاوی 1/77)

مکی آیات میں تربیت ورہنمائی پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی اور ان میں متنوع اسالیب کے ساتھ فقراء اور مساکین کا خیال کرنے کی ترغیب دی جاتی تھی، جیسے کہ کہا گیا کہ مسکینوں کو کھلانا ایمان کے لوازمات میں سے ہے، ابتدائی مرحلہ میں نازل ہونے والے قرآن میں سورۂ مدثر شامل ہے، اس سورت میں آخرت کے مناظر میں سے ایک منظر پیش کیا گیا ہے، اہلِ ایمان اُصحاب الیمین کا منظر، جو جنت میں اہلِ کفر مجرمین کے بارے میں ایک دوسرے سے سوال کر رہے ہوں گے، ان مجرموں پر چاروں طرف سے آگ ہی آگ ہوگی، اہل ایمان ان کے بارے میں پوچھ رہے ہوں گے کہ کس عمل کی پاداش میں ان کو یہ عذاب دیا جا رہا ہے؟ تو ان اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہوگا کہ وہ مسکین کے حقوق کے بارے میں غفلت وبے توجہی برتتے تھے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿كُلُّ نَفۡسِۭ بِمَا كَسَبَتۡ رَهِينَةٌ ﴿٣٨﴾ إِلَّآ أَصۡحَٰبَ ٱلۡيَمِينِ ﴿٣٩﴾ فِي جَنَّٰتٍ يَتَسَآءَلُونَ ﴿٤٠﴾ عَنِ ٱلۡمُجۡرِمِينَ ﴿٤١﴾ مَا سَلَكَكُمۡ فِي سَقَرَ ﴿٤٢﴾ قَالُواْ لَمۡ نَكُ مِنَ ٱلۡمُصَلِّينَ ﴿٤٣﴾ وَلَمۡ نَكُ نُطۡعِمُ ٱلۡمِسۡكِينَ ﴿٤٤﴾ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ ٱلۡخَآئِضِينَ ﴿٤٥﴾ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوۡمِ ٱلدِّينِ ﴿٤٦﴾﴾ ترجمہ: "ہر شخص اپنے اعمال کے سبب گروی ہے مگر داہنے والے، باغوں میں ہوں گے، ایک دوسرے سے پوچھیں گے، گناہگاروں

کی نسبت، کس چیز نے تمہیں دوزخ میں ڈالا؟ وہ کہیں گے کہ ہم نمازی نہ تھے، اور نہ ہم مسکینوں کو کھانا کھلاتے تھے۔ اور ہم بکواس کرنے والوں کے ساتھ بکواس کیا کرتے تھے۔ اور ہم انصاف کے دن کو جھٹلایا کرتے تھے"۔ (سورۃ المدثر: 38-46)

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ایک باغ والوں کا قصہ بھی بیان کیا ہے جنہوں نے آپس میں مسکینوں پر خرچ نہ کرنے کا معاہدہ کیا تھا اور اس کے نتیجے میں ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فوری طور پر عذاب نازل ہوا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّن رَّبِّكَ وَهُمْ نَآئِمُونَ ﴿١٩﴾ فَأَصْبَحَتْ كَالصَّرِيمِ ﴿٢٠﴾ فَتَنَادَوْا۟ مُصْبِحِينَ ﴿٢١﴾ أَنِ ٱغْدُوا۟ عَلَىٰ حَرْثِكُمْ إِن كُنتُمْ صَٰرِمِينَ ﴿٢٢﴾ فَٱنطَلَقُوا۟ وَهُمْ يَتَخَٰفَتُونَ ﴿٢٣﴾ أَن لَّا يَدْخُلَنَّهَا ٱلْيَوْمَ عَلَيْكُم مِّسْكِينٌ ﴿٢٤﴾ وَغَدَوْا۟ عَلَىٰ حَرْدٍ قَٰدِرِينَ ﴿٢٥﴾ فَلَمَّا رَأَوْهَا قَالُوٓا۟ إِنَّا لَضَآلُّونَ ﴿٢٦﴾ بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ ﴿٢٧﴾ قَالَ أَوْسَطُهُمْ أَلَمْ أَقُل لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُونَ ﴿٢٨﴾ قَالُوا۟ سُبْحَٰنَ رَبِّنَآ إِنَّا كُنَّا ظَٰلِمِينَ ﴿٢٩﴾ فَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَلَٰوَمُونَ ﴿٣٠﴾ قَالُوا۟ يَٰوَيْلَنَآ إِنَّا كُنَّا طَٰغِينَ ﴿٣١﴾ عَسَىٰ رَبُّنَآ أَن يُبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَآ إِنَّآ إِلَىٰ رَبِّنَا رَٰغِبُونَ ﴿٣٢﴾ كَذَٰلِكَ ٱلْعَذَابُ ۖ وَلَعَذَابُ ٱلْءَاخِرَةِ أَكْبَرُ ۚ لَوْ كَانُوا۟ يَعْلَمُونَ ﴿٣٣﴾﴾ ترجمہ: "پھر تو اس پر رات ہی میں آپ کے رب کی طرف سے ایک جھونکا چل گیا اس حال میں کہ وہ سوئے ہوئے تھے۔ پھر وہ کٹی ہوئی کھیتی کی طرح ہو گیا۔ پھر وہ صبح کو پکارنے لگے۔ کہ اپنے کھیت پر سویرے چلو اگر تم نے پھل توڑنا ہے۔ پھر وہ آپس میں چپکے چپکے یہ کہتے ہوئے چلے۔ کہ تمہارے باغ میں آج کوئی محتاج نہ آنے پائے۔ اور وہ سویرے ہی بڑے اہتمام سے پھل توڑنے کی قدرت کا خیال کر کے چل پڑے۔ پس جب انہوں نے اسے دیکھا تو کہنے لگے کہ ہم تو راہ بھول گئے ہیں۔ بلکہ ہم تو بد نصیب ہیں۔ پھر ان میں سے اچھے آدمی نے کہا: کیا میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ تم کیوں تسبیح نہیں کرتے ہو؟۔ انہوں نے کہا ہمارا رب پاک ہے، بے شک ہم ظالم تھے۔ پھر ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر آپس میں ملامت کرنے لگے۔ انہوں نے کہا ہائے افسوس! بے شک ہم سرکش تھے۔ شاید ہمارا رب ہمارے لئے اس سے بہتر باغ بدل دے، بے شک ہم اپنے رب کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔ عذاب یونہی ہوا کرتا ہے اور البتہ آخرت کا عذاب تو کہیں بڑھ کر ہے، کاش وہ جانتے"۔ (سورۃ القلم: 19-33)

مکی آیات میں جہاں ہر مومن فرد کو مسکین کا خیال رکھنے اور اس کو کھلانے کی ترغیب دی ہے اور اس کے بارے میں بے توجہی اور غفلت برتنے پر وعید سنائی ہے، وہیں ہر مومن پر یہ ذمہ داری بھی عائد کی ہے کہ وہ دوسروں کو بھی مسکین کو کھانا کھلانے اور اس کا خیال رکھنے پر آمادہ کرے اور اس عمل کو ترک کرنا اللہ کے ساتھ کفر کرنے کے مترادف اور اللہ کی ناراضگی اور عذاب کا سبب قرار دیا، اصحاب الشمال کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿خُذُوهُ فَغُلُّوهُ ﴿٣٠﴾ ثُمَّ ٱلْجَحِيمَ صَلُّوهُ ﴿٣١﴾ ثُمَّ فِى سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُونَ ذِرَاعًا فَٱسْلُكُوهُ ﴿٣٢﴾﴾ ترجمہ: "(حکم ہوگا) پکڑو اسے اور اس کی گردن میں طوق ڈال دو۔ پھر اسے جہنم میں جھونک دو۔ پھر اس کو ستر ہاتھ لمبی زنجیر میں جکڑ دو۔ یہ نہ اللہ بزرگ و برتر پر ایمان لاتا تھا۔ اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتا تھا"۔ (سورۃ الحاقہ: 30-34)

یہ آیات دلوں کو ہلا کر رکھ دینے والی ہیں اور عذاب کے بارے میں عجیب اسلوب کے ساتھ ڈرا رہی ہیں، یہاں تک کہ ان آیات کی وجہ سے حضرت ابوالدرداءؓ اپنی زوجہ سے کہنے لگے: بے شک اللہ کے پاس ایسی زنجیریں ہیں جن کو آگ کی ہانڈیوں میں اس وقت سے مسلسل گرم کیا جارہا ہے جس دن سے اللہ تعالیٰ نے جہنم کو بنایا ہے، اس وقت تک ان کو گرم کیا جاتا رہے گا یہاں تک کہ ان کو لوگوں کی گردنوں میں ڈالا جائے گا، اللہ تعالیٰ نے ہمیں عظیم و برتر اللہ پر ایمان لانے کی وجہ سے ان کے نصف سے نجات دے دی ہے، لہذا اے ام درداء! اب مسکین کو کھلانے کی ترغیب دیتی رہو۔ (الاموال، ص 55، بحوالہ: فقہ الزکاۃ: 1/70)

جہاں تک تعلق ہے مدینہ میں نازل ہونے والے قرآن کا تو اس کا نزول اس وقت ہوا جب کہ مسلمانوں کی ایک اجتماعیت وجود میں آئی، ان کے پاس نظام اور اپنا کنٹرول تھا، اسی لئے اسلامی احکام نے بھی ایک جدید شکل اختیار کی جو اس نئی صورتحال کے عین مطابق تھی، اب ان میں اطلاق و عمومیت کے بعد تعیین و تخصیص کی شکل اختیار کی گئی اور عمومی ہدایات کے بعد لازمی قوانین و احکام کی شکل اختیار کی گئی اور اب ضمیر و ایمان کے ساتھ ساتھ نظام و قوت کے ذریعہ بھی ان کا نفاذ عمل میں آیا، یہی صورتحال زکوۃ میں پیش آئی، اس کے شارع نے ان اموال کی تحدید و تعیین کردی جن میں زکوۃ واجب ہونے کی شرائط، واجبی نصاب اور مصارف کی تعیین کی گئی اور جو لوگ اس کی وصولیابی اور اس کی تنظیم و ترتیب کا کام انجام دیں گے، ان کے بارے میں بھی وضاحت کی گئی۔ (فقہ الزکاۃ: 1/78)

نبی کریم ﷺ نے مدینہ میں فریضۂ زکوۃ کو تاکیدی انداز میں بیان فرمایا اور دین میں اس کی اہمیت و مقام کو بیان فرمایا اور واضح کیا کہ زکوۃ اس دین کے بنیادی ارکان میں سے ایک اہم رکن ہے، آپؐ نے اس کی ترغیب دی اور مختلف اسالیب کے ذریعہ زکوۃ نہ دینے والے کو وعید سنائی۔

اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی احادیث میں اس بات کو واضح کیا کہ اسلام کے ارکان پانچ ہیں، جن میں پہلے نمبر پر شہادتین ہے، دوسرے نمبر پر نماز، تیسرے نمبر پر زکوۃ ہے، زکوۃ کا ذکر احادیث میں اور اسی طرح قرآن میں اسلام کے تیسرے رکن کے طور پر کیا گیا ہے جس پر اسلام کی عمارت قائم ہوتی ہے، اور جب مسلمانوں نے اس رکن کو اللہ کے حکم اور رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق عملی طور پر اپنایا تو معاشرہ میں اس کے عظیم نتائج سامنے آئے اور انفرادی و اجتماعی زندگی میں اس کے آثار نمایاں طور پر مرتب ہوئے، ایک فرد پر زکوۃ کے جو اثرات مرتب ہوئے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

أ) لالچ سے حفاظت:

اِرشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَالَّذِينَ تَبَوَّءُو الدَّارَ وَالْإِيمَنَ مِن قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ ترجمہ: ”(اور وہ اُن لوگوں کے لئے بھی ہے) جو اِن مہاجرین کی آمد سے پہلے ہی ایمان لا کر دار الہجرۃ میں مقیم تھے، یہ اُن لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے اِن کے پاس آئے ہیں اور جو کچھ بھی اُن کو دے دیا جائے اُس کی کوئی حاجت تک یہ اپنے دلوں میں محسوس

نہیں کرتے ہیں اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں، حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے دل کی تنگی سے بچا لئے گئے وہی فلاح پانے والے ہیں"۔ (سورۃ الحشر: 9)

ب) مال میں افزائش اور زیادتی:

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿قُلْ إِنَّ رَبِّي يَبْسُطُ ٱلرِّزْقَ لِمَن يَشَآءُ مِنْ عِبَادِهِۦ وَيَقْدِرُ لَهُۥ ۚ وَمَآ أَنفَقْتُم مِّن شَىْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُۥ ۖ وَهُوَ خَيْرُ ٱلرَّٰزِقِينَ﴾ ترجمہ: "اے نبیؐ، ان سے کہو: "میرا رب اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے کھلا رزق دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تلا دیتا ہے، جو کچھ تم خرچ کر دیتے ہو اُس کی جگہ وہی تم کو اور دیتا ہے، وہ سب رازقوں سے بہتر رازق ہے"۔ (سورۃ سبأ: 39)

مزید دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ ۖ وَلَئِن كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِى لَشَدِيدٌ﴾ ترجمہ: "اور یاد رکھو، تمہارے رب نے خبردار کر دیا تھا کہ اگر شکر گزار بنو گے تو میں تم کو اور زیادہ نوازوں گا اور اگر کفرانِ نعمت کرو گے تو میری سزا بہت سخت ہے"۔ (سورۃ ابراہیم: 7)

ایک اور مقام پر ہے: ﴿يَمْحَقُ ٱللَّهُ ٱلرِّبَوٰا۟ وَيُرْبِى ٱلصَّدَقَٰتِ ۗ وَٱللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ﴾ ترجمہ: "اللہ سود کا مٹھ مار دیتا ہے اور صدقات کو نشو و نما دیتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے بد عمل انسان کو پسند نہیں کرتا"۔ (سورۃ البقرۃ: 276)

اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے: "صدقہ کی وجہ سے مال میں کمی نہیں ہوتی ہے"۔ (صحیح مسلم: 2588، سنن ترمذی: 2029، موطأ مالک: 2/100)

اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: "ہر روز صبح کے وقت دو فرشتے نازل ہوتے ہیں ان میں سے ایک کہتا ہے: اے اللہ! انفاق و خرچ کرنے والے کو بدل عطا فرما، اور دوسرا کہتا ہے: اے اللہ! خرچ نہ کرنے والے کو ہلاک و تباہ فرما"۔ (صحیح بخاری: 1442، صحیح مسلم: 1010)

اس طرح سے زکوۃ و انفاق کے ذریعہ ایک مسلمان کا نفس ہر قسم کے بخل اور لالچ کے مرض سے پاک و صاف ہو جاتا ہے اور وہ انفاق کے لئے سبقت کرتا ہے، اس کو اللہ کے فضل و عطا اور اس کے وعدوں پر پورا ایمان و یقین ہوتا ہے۔ (دیکھیں: منہج الاسلام فی تزکیۃ النفس: 1/249)

ج) دنیا اور آخرت میں حصولِ امن:

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ٱلَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَٰلَهُم بِٱلَّيْلِ وَٱلنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ ترجمہ: "جو لوگ اپنے مال شب و روز کھلے اور چھپے خرچ کرتے ہیں ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور اُن کے لئے کسی خوف اور رنج کا مقام نہیں"۔ (سورۃ البقرۃ: 274)

زکوۃ ادا کرنے والے امن و سعادت اور سکون میں ہوں گے، اس لئے کہ انہوں نے اللہ کے حکم پر عمل کرتے ہوئے انفاق کیا ہوگا، اور اللہ کے منع کئے ہوئے اعمال سے اجتناب کیا ہوگا۔

د) محبت ومودّت کا حصول:

معاشرہ پر زکوۃ کے آثار میں سے یہ بھی ہے کہ اغنیاء اور فقراء کے مابین محبت و مودّت پیدا ہوتی ہے اور امن واطمئنان کا ماحول پیدا ہوتا ہے، اور ان کے درمیان یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ وہ ایک جسم کی طرح ہیں، جیسے کہ آپ ﷺ نے اہل ایمان کو جسد واحد کی طرح قرار دیا ہے۔(دیکھیں: صحیح مسلم: 2586، مسند احمد: 4/270) اسی طرح زکوۃ کے ذریعہ معاشرہ میں اجتماعی و معاشرتی توازن بھی برقرار رہتا ہے۔

جب ابتدائی دور میں ہر صاحبِ نصاب سے زکوۃ وصول کر کے اس کو حقیقی مصارف میں استعمال کیا جاتا تھا تو اسلامی معاشرہ خوشحال اور آسودہ معاشرہ تھا اور الفت و محبت اور اخوت کا ماحول قائم تھا، راویوں نے روایت کیا ہے کہ پانچویں خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے زمانہ میں لوگ اتنے آسودہ اور خوشحال تھے کہ انہوں نے کسی مستحق کو صدقہ وزکوۃ دینے کے لئے تلاش کیا لیکن کوئی نہیں مل پایا، بالآخر انہوں نے اس مال کے ذریعہ غلام خریدے اور ان سے کچھ لئے بغیر ان کو آزاد کر دیا، اس طرح سے اسلام اپنے ابتدائی دور میں زندگی کے اس اعلیٰ معیار تک پہنچ گیا جہاں تک اور کوئی قوم نہ پہنچ سکی اور یہ زکوۃ کے صحیح نظام کی وجہ سے ہو پایا۔(السیرۃ النبویہ، ابو شہبہ: 2/115)

۵: اللہ کے رسول ﷺ کا حضرت عائشہؓ کے ساتھ عقدِ نکاح:

اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ حضرت عائشہؓ کا عقدِ نکاح مکہ میں حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد اور ہجرت سے پہلے ہوا، اس وقت حضرت عائشہؓ کی عمر چھ سال تھی اور رخصتی مدینہ منورہ میں ہوئی جبکہ حضرت عائشہؓ نو برس کی تھیں اور یہ ہجرت کے پہلے سال ماہ شوال میں ہوا۔(من معین السیرۃ، ص: 168)

دعوت وجہاد، تربیت اور اسلامی ریاست کی تعمیر کی تحریک جاری وساری تھی، رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں اور صحابہ کرام کی زندگی میں شادی اور نکاح کی وجہ سے کوئی تعطل واقع نہیں ہوتا تھا، بلکہ شادی یا تعدد ازدواج ان کی زندگیوں میں کھانے پینے کی طرح بالکل عام بات تھی، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام دینِ فطرت اور حقیقت پر مبنی دین ہے اور نکاح اور شادی مسلم معاشرہ کی تعمیر کا ایک اہم جزء ہے۔(دیکھیں: الأساس فی السنۃ: 1/420)

اللہ کے رسول ﷺ جب حضرت عائشہ صدیقہؓ کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے اس وقت آپؐ کی عمر مبارک چون برس تھی، اتنی عمر سے بظاہر ایسا لگتا ہے کہ آپ ﷺ اس وقت کمزوری اور بڑھاپے کی عمر کو پہنچ گئے ہوں گے، آپ ﷺ کے بال سفید ہوں گے، اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ برس اور سال عام طور پر لوگوں کی عمریں جاننے کا معیار ہوتا ہے، لیکن اصل معیار انسان کی زندگی، اس کا نشاط اور عمل کی قدرت واستطاعت ہے، کبھی کبھار کوئی تیس سال کا انسان اپنے جسم اور نفسیات کے اعتبار سے پچاس برس کے شخص کی ذمہ داریاں سنبھالتا ہے اور کبھی اس کے برعکس پچاس برس کا شخص تیس سال کا ظاہر ہوتا ہے، اللہ کے رسول ﷺ کی شخصیت اس میدان میں بالکل نمایاں اور یکتا ہے، آپ ﷺ پچاس سال کی عمر میں اپنے عزم وہمت اور بہادری وجواں مردی کے اعتبار سے عنفوانِ شباب میں تھے، اس میں آپ ﷺ کا ہمسر کوئی انسان نہیں تھا اور اس کے واضح دلائل موجود ہیں جن میں سے چند دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

أ) جب اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے آپ کو قبائل کے سامنے پیش کیا تو آپ کا گزر بنو عامر بن صعصعہ کے پاس سے ہوا، آپ ﷺ نے ان کے سامنے اپنی دعوت پیش کی تو بَیحرہ بن فراس نے کہا: اللہ کی قسم! اگر اس نوجوان کو میں قریش سے لے لوں تو اس کے ذریعہ میں پورے عرب کو زیر کر لوں گا۔ (دیکھیں: سیرت ابن ہشام: 1/424) بیحرہ نے اپنے قول میں آپ ؐ کو "الفتی" (نوجوان) کہا جو ایسے نوجوان کے لئے بولا جاتا ہے جو اپنی عمر کے شباب پر ہو اور زندگی اور نشاط سے لبریز ہو۔

اس کا یہ کہنا کہ "میں ان کے ذریعہ عربوں کو زیر کر لوں گا" اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بیحرہ نے بھی آپ ﷺ کو دیکھ کر آپ ؐ کے اندر زندگی اور عزم وہمت کو بھانپ لیا جس کے سامنے کوئی عرب ٹِک نہیں سکتا تھا حالانکہ اس وقت اللہ کے رسول ﷺ اپنی عمر کے پچاس برس مکمل کر چکے تھے اور آپ ؐ اپنی شکل وشباہت، نفسیات اور عزم وہمت کے اعتبار سے جوان لگ رہے تھے۔ (من معین السیرۃ، ص171)

ب) ہجرت کی روداد پر مشتمل حدیث امام بخاریؒ نے حضرت انسؓ سے روایت کی ہے، فرماتے ہیں: "اللہ کے نبی ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے اور حضرت ابو بکرؓ آپ کی سواری پر پیچھے بیٹھے ہوئے تھے، ابو بکرؓ سن رسیدہ تھے اور ان کو لوگ پہچانتے بھی تھے لیکن نبی کریم ﷺ ابھی جوان معلوم ہوتے تھے اور آپ ؐ کو لوگ عام طور پر پہچانتے بھی نہ تھے، فرماتے ہیں کہ اگر راستہ میں کوئی ملتا اور پوچھتا کہ اے ابو بکر! یہ آپ کے ساتھ کون صاحب ہیں؟ تو آپؓ جواب دیتے کہ یہ میرے ہادی ہیں، مجھے راستہ دکھاتے ہیں، پوچھنے والا یہ سمجھتا کہ مدینہ کا راستہ بتلانے والا ہے اور ابو بکرؓ کا مطلب اس کلام سے یہ تھا کہ آپ ؐ دین وایمان کا راستہ بتلاتے ہیں۔ (صحیح البخاری: 3911، مسند احمد 2/211) حالانکہ اللہ کے رسول ﷺ حضرت ابو بکرؓ سے زیادہ سن رسیدہ تھے۔

معلوم یہ ہوا کہ اللہ کے رسول ﷺ کی عمر مبارک اور حضرت عائشہؓ کی عمر میں بظاہر فرق نظر آتا ہے لیکن عملی اعتبار سے بہت زیادہ فرق نہیں تھا، اللہ کے رسول ﷺ حضرت عائشہؓ کے ساتھ دوڑ کا مقابلہ کرتے ہیں تو ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ آپ سے سبقت کر جاتی ہیں اور دوسری مرتبہ آپ ﷺ حضرت عائشہؓ سے سبقت لے جاتے ہیں اور آپ ﷺ فرماتے ہیں: "یہ اس کا بدلہ ہے"۔ (مسند أحمد: 6/264، سنن ابوداؤد: 2578، سنن ابن ماجہ: 1979، ابن حبان: 4691)

ہر صاحبِ نظر بخوبی اس عظیم حکمت کا ادراک کر سکتا ہے جو حضرت عائشہؓ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے عقدِ نکاح میں پائی جاتی تھی، چنانچہ یہ مقدس شادی مدینہ کے ابتدائی مرحلہ میں اور تشریع واحکام سازی کے آغاز کے مرحلہ میں انجام پاتی ہے، اور یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ انسان اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ اپنے گھر، اپنے اہل وعیال اور خاندان کے ساتھ بسر کرتا ہے، اس لئے ضروری تھا کہ رسول کریم ﷺ کے خانگی طرزِ عمل کو دوسروں تک منتقل کیا جائے تاکہ لوگ آپ ﷺ کا اسوہ اختیار کر سکیں اور یہ ذمہ داری بالخصوص سیدہ عائشہؓ اور بقیہ امہات المومنین -رضی اللہ عنہن- کی تھی، اور سیدہ عائشہؓ نے یہ ذمہ داری احسن طریقہ سے انجام دی، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ذہانت و فطانت اور فہم وفراست سے نوازا تھا، کتبِ سیرت کی کسی بھی کتاب پر ایک سرسری نگاہ سے یہ بات بالکل واضح اور مبرہن ہو جاتی ہے، اس سلسلہ میں ان کے لئے یہ بات مزید ممد ومعاون بنی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عائشہؓ کو رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد تقریباً پچاس سال کی مزید زندگی عطا کی، اس عرصہ میں انہوں نے وہ تمام احکام واحادیث دوسروں تک پہنچا دیئے جو انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے محفوظ کئے تھے۔ (دیکھیں: من معین السیرۃ، ص172)

آٹھویں فصل

غزوۂ بدر

پہلا باب

معرکہ سے پہلے کا مرحلہ

مسلمانوں کو شام سے آنے والے ایک بڑے تجارتی قافلہ کے بارے میں خبر ملی، اس قافلہ میں قریش کا کافی مال تھا (جس کی قیمت کا اندازہ تقریباً پچاس ہزار دینار لگایا گیا ہے) اس کی قیادت ابو سفیان کر رہا تھا اور اس کی حفاظت پر تیس سے چالیس افراد مأمور تھے، اللہ کے رسول ﷺ نے بَسبَس بن عمروؓ کو قافلہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے بھیجا۔ (صحیح مسلم میں "بُسَیسہ" کا نام آیا ہے، امام نوویؒ فرماتے ہیں: تمام نسخوں میں یہی نام مذکور ہے، جبکہ کتبِ سیرت میں 'بسبس' نام آیا ہے، ممکن ہے کہ ان میں سے ایک ان کا نام ہو اور دوسرا اُن کا لقب)۔

جب حضرت بَسبَس نے قافلہ کے بارے میں یقینی خبر لائی تو رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کو کوچ کرنے کا حکم دیا، اور ان سے فرمایا: یہ قریش کا قافلہ آرہا ہے جس میں ان کا مال ہے، لہذا ان کی جانب نکلو، شاید اللہ تعالیٰ اسے تمہیں مالِ غنیمت کے طور پر عطا کرے گا۔ (سیرت ابن ہشام: 2/61)

اللہ کے رسول ﷺ مدینہ منورہ سے سن دو ہجری کے ماہ رمضان کی بارہ تاریخ کو نکلے، یہ یقینی بات ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ جب مدینہ منورہ سے نکلے تو اس وقت آپ کی نیت قتال اور جنگ کی نہیں تھی، بلکہ آپ ﷺ کا مقصد و ہدف قافلہ قریش تھا، اور اس وقت مسلمانوں اور کفارِ مکہ کے مابین جنگی صورتحال تھی اور جنگی صورتحال میں دشمن کا مال اور خون مباح اور جائز ہوتا ہے، اس قافلہ میں موجود مال کا ایک حصہ مسلمان مہاجرین کا تھا جس پر مشرکین نے ظلم و زیادتی کر کے قبضہ کر لیا تھا۔ (حدیث القرآن عن غزوات الرسول، د۔ محمد العابد: 1/43)

اللہ کے رسول ﷺ نے مدینہ میں لوگوں کو نماز پڑھانے کی ذمہ داری حضرت عبداللہ بن اُم مکتومؓ کو دی۔ (البدایہ والنہایہ: 3/260، المستدرک للحاکم: 3/632)

نبی کریم ﷺ نے دو صحابہ کرام (حضرت عدی بن أبی الزغباء اور حضرت بسبس بن عمرو) کو بدر کی جانب سے ہراول دستہ کے طور پر بھیجا تاکہ وہ قافلہ کے بارے میں معلومات حاصل کریں، دونوں نے آپ ﷺ کو اس کے بارے میں معلومات فراہم کیں، اس غزوہ میں بدر کی جانب جو صحابہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ نکلے ان کے بارے میں اختلاف ہے، امام بخاریؒ نے ان کی تعداد تین سو تیرے (۳۱۳) ذکر کی ہے۔ (صحیح بخاری: 3957، 3958) امام مسلمؒ نے ذکر کیا ہے کہ ان کی تعداد تین سو انیس تھی۔ (صحیح مسلم: 1763) اور کتب سیرت میں بدری صحابہ کے نام تین سو چالیس تحریر کئے گئے ہیں۔ (دیکھیں: البدایہ والنہایہ: 3/314)

بدر میں مسلمانوں کا لشکر اسلامی حکومت کی عظیم عسکری قوت کا عشر عشیر بھی نہیں تھا، اس لئے کہ وہ قریش کے تجارتی قافلہ سے تعرض کرنے کے لئے نکلے تھے، وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ ان کو قریش اور ان کے حلفاء پر مشتمل فوج کا سامنا کرنا پڑے گا جو جنگ کے لئے جمع

ہوئے ہیں، جن کی تعداد ایک ہزار افراد پر مشتمل ہے، مشرک فوج کے ساتھ دو سو گھوڑے تھے، ان کو اپنے اونٹوں کے ساتھ ساتھ چلا رہے تھے، اور ان کے ساتھ گانے والی عورتیں تھیں جو دف بجا رہی تھیں اور وہ نبی کریم ﷺ اور آپؐ کے اصحاب کی ہجو پر مشتمل گانے گا رہی تھیں جبکہ اسلامی فوج کے ساتھ صرف دو گھوڑے تھے اور سواری کے لئے ستر گھوڑے تھے جن پر وہ باری باری سوار ہوتے تھے۔ (المعجم الکبیر للطبرانی: 12105، مجمع الزوائد للہیثمی: 6/69)

ا: بدر کی جانب دورانِ سفر کے بعض واقعات:

نبی کریم ﷺ اور آپؐ کے اصحاب جب بدر کی جانب سفر کر رہے تھے اس دوران بعض واقعات پیش آئے جن میں بہت سے اسباق و دروس اور عبرتیں اور نصیحتیں ہیں، ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

ا: حضرت براء بن عازبؓ اور حضرت ابن عمرؓ کا کم سنی کی وجہ سے واپس بھیجنا:

نبی کریم ﷺ اور آپؐ کے اصحاب جب مدینہ سے نکلے اور وہ مدینہ کے باہر "بیوت السقیا" تک پہنچے، وہاں نبی کریم ﷺ نے پڑاؤ ڈالا اور آپؐ کے ساتھ جو لوگ نکلے تھے ان کا جائزہ لیا، آپؐ نے ان لوگوں کو وہاں سے واپس کیا جو مسلمانوں کے لشکر کے ساتھ نکلنے اور جنگ میں شریک ہونے کی طاقت و صلاحیت نہیں رکھتے تھے، اسی بنیاد پر آپؐ نے حضرت براء بن عازبؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو ان کی کم سنی کی وجہ سے واپس بھیجا حالانکہ یہ دونوں کمسن صحابہ کرام نبی ﷺ کے ساتھ جہاد میں شریک ہونے کے لئے بڑے شوق و رغبت کے ساتھ نکلے تھے۔ (صحیح البخاری: 3955،3956)

۲: "واپس جاؤ میں کسی مشرک سے مدد نہیں لیتا ہوں":

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے فرماتی ہیں: اللہ کے رسول ﷺ بدر کی جانب نکلے، جب آپ ﷺ حرّۃ الوبرہ (الوبرہ کی پتھریلی زمین) پر پہنچے تو ایک شخص آپ ﷺ کے پاس آیا جس کی جرأت و بہادری کے چرچے تھے، اس کو دیکھ کر رسول اللہ ﷺ کے اصحاب خوش ہو گئے، جب آپؐ سے اس کی ملاقات ہوئی تو اس نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: میں اس لئے آیا ہوں تاکہ آپ کے ساتھ شریکِ جنگ ہوں اور آپ کے ساتھ مالِ غنیمت حاصل کروں، اس سے اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: کیا تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہو؟ اس نے کہا: نہیں! آپؐ نے فرمایا: واپس جاؤ، میں کسی مشرک سے مدد نہیں لیتا ہوں۔ اس کے بعد وہ چلا گیا یہاں تک کہ ہم ایک درخت کے پاس تھے تو وہ شخص آپ کے پاس آیا اور وہی بات کہی جو اس نے پہلی مرتبہ کہی تھی اور آپ ﷺ نے بھی پہلی مرتبہ کی طرح اسے جواب دیا، اس کے بعد وہ واپس چلا گیا اور مقام بیداء میں آپ کے پاس آیا اور آپؐ سے وہی بات کہی جو پہلی مرتبہ کہی تھی، آپؐ نے اس سے پوچھا: کیا تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہو؟ اس نے کہا: ہاں! یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اب چلو۔ (صحیح مسلم: 1817، سنن ابو داؤد: 2732، سنن ترمذی: 1558، مسند احمد: 3/148)

۳: نبی کریم ﷺ کی اپنے اصحاب کے ساتھ مشکلات و مصائب میں شرکت:

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں: بدر کے دن ہم تین آدمی ایک اونٹ پر سوار ہوئے تھے، حضرت ابولبابہؓ اور حضرت علی بن ابی طالبؓ رسول اللہ ﷺ کے رفیقِ سفر تھے۔ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ کی (چلنے کی) باری آئی تو دونوں نے آپ ﷺ سے عرض کیا: آپ کے بجائے ہم چلیں گے! یہ سن کر آپؐ نے فرمایا: ''نہ ہی آپ دونوں مجھ سے زیادہ طاقتور ہو اور نہ ہی میں تم دونوں کے مقابلہ میں اجر و ثواب سے بے نیاز ہوں''۔ (مسند احمد: 1/411، ابن حبان: 4733، مسند اُبو یعلی: 5359، مسند البزار: 1759، مجمع الزوائد: 6/69)

۴: بدر میں مسلمانوں کے ساتھ مڈ بھیڑ کا عزم:

ابو سفیان کو یہ خبر ملی کہ نبی کریم ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ مدینہ منورہ سے اس کے قافلہ کے ساتھ تعرض کرنے کے لئے نکلے ہیں، اس لئے اس نے جلدی سے قافلہ کا رخ ساحلِ سمندر کے راستے کی طرف موڑ دیا، اسی دوران اس نے ضمضم بن عمرو غفاری کو قریش کے پاس بھیجا تا کہ وہ قافلہ اور تجارتی مال کو بچانے کے لئے قریش کو آمادہ کرے۔ (دیکھیں: موسوعۃ نضرۃ النعیم: 1/287) ابو سفیان بہت بیدار مغز اور محتاط تھا، مسلمانوں کے بارے میں خبریں معلوم کرتا تھا اور ان کی نقل و حرکت کے بارے میں دریافت کرتا رہتا تھا، بلکہ بذاتِ خود ان کی خبریں معلوم کرتا تھا، وہ بدر کی جانب خود آگے بڑھا اور وہاں موجود لوگوں سے دریافت کیا: کیا آپ لوگوں نے یہاں کسی کو دیکھا؟ انہوں نے کہا: نہیں! سوائے دو لوگوں کے اور کسی کو نہیں دیکھا۔ اس نے کہا: مجھے ان کی سواریوں کے بیٹھنے کی جگہ دکھاؤ، انہوں نے اسے جگہ دکھائی، اس نے مینگنی اٹھائی اور اس کو توڑا تو اس میں کھجور کی گھٹلی نکلی، یہ دیکھ کر اس نے کہا: اللہ کی قسم! یہ یثرب کا چارہ ہے۔ (السیرۃ النبویہ، ابن ہشام: 2/230)

وہ اپنے دشمن کی حرکات اور نقل و حرکت پہچان گیا یہاں تک کہ جانوروں کی غذا کے ذریعہ خبر رساں دستے کی معلومات بھی حاصل کر لی، اس نے اونٹ کی مینگنی سے یہ معلوم کر لیا کہ یہ دونوں آدمی مدینہ کے مسلمان ہیں، اس لئے اس کا قافلہ خطرہ میں ہے، اسی کے پیشِ نظر اس نے ضمضم بن عمرو کو قریش کے پاس روانہ کر دیا اور قافلہ کا راستہ تبدیل کر کے ساحلِ سمندر کی جانب مڑ گیا۔ (غزوۃ بدر الکبری، ابو فارس، ص 34)

قافلۂ تجارت کے بارے میں اس خبر کا اثر قریش پر اتنا شدید تھا کہ اس کی وجہ سے سردارانِ قریش غصہ کی وجہ سے بپھر گئے، کیونکہ وہ اس کو اپنی عزت پر حملہ سمجھ رہے تھے اور اس کی وجہ سے ان کے تمام اقتصادی مفادات خطرے میں پڑ گئے تھے، علاوہ ازیں اس کے نتیجہ میں تمام دیگر عرب قبائل میں قریش کا مقام و مرتبہ زمین بوس ہونے والا تھا، اس لئے انہوں نے اپنی تمام جنگی طاقتوں کو داؤ پر لگا کر اس صورتحال کا مقابلہ کرنے کے لئے نکلنے کی ہر ممکن کوشش شروع کر دی۔ (موسوعۃ نضرۃ النعیم: 1/287)

ضمضم بن عمرو غفاری ان کے پاس انتہائی برانگیختہ کرنے والی حالت میں پہنچا جس کو دیکھ کر یا سن کر کوئی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا، وہ ان کے پاس اس حال میں آیا کہ اس نے اپنا کجاوہ الٹ دیا، اپنے اونٹ کی ناک کاٹ دی اور آگے اور پیچھے سے اپنی قمیص پھاڑ دی اور مکہ میں

روایتی "نذیر عریاں" کی طرح اس حال میں داخل ہوا کہ وہ زور زور سے پکار رہا تھا، اے قریش کے لوگو! اپنے قافلہ کو محمدؐ سے بچانے کے لئے نکلو، تمہارا سب مال ابوسفیان کے ساتھ ہے اور محمدؐ نے اپنے اصحاب کے ساتھ اس پر چڑھائی کر دی ہے، کہیں تمہارے پہنچنے سے پہلے اس کا خاتمہ نہ ہو جائے، مدد! مدد!۔(سیرت ابن ہشام: 2/221)

جب ابوسفیان کو قافلہ کے محفوظ ہونے اور صحیح سلامت نکل جانے کا اطمئنان ہو گیا تو اس نے مقام جحفہ پہنچ کر زعمائے قریش کو ایک پیغام بھیجا جس کے ذریعہ اس نے انہیں اپنے بارے میں اور قافلہ کے بارے میں بحفاظت بچ جانے کی اطلاع دی اور ان سے مکہ واپس جانے کو کہا، اس کی وجہ سے زعمائے قریش کے مابین سخت اختلاف رائے ہو گیا، ان میں سے اکثر نے بدر کی جانب پیش قدمی جاری رکھنے پر اصرار کیا تاکہ مسلمانوں کو سبق سکھایا جا سکے، قریش کے تجارتی راستہ کو محفوظ بنایا جا سکے اور دیگر عرب قبائل کو قریش کی طاقت و قوت اور ان کی دسترس کا احساس کرایا جا سکے، بنو زہرہ لشکر سے الگ ہو گئے (اَخنس بن شریک نے انہیں اس کے لئے آمادہ کیا۔ سیرت ابن ہشام: 2/231) بنو عدی بھی لشکر سے پیچھے رہ گئے، بنو زہرہ مکہ واپس لوٹ گئے اور افواجِ قریش اور ان کے حلفاء کی اکثریت نے پیش قدمی جاری رکھی یہاں تک کہ بدر پہنچ گئے۔(دیکھیں: موسوعۃ نضرۃ النعیم: 1/287)

۳: نبی کریم ﷺ کی صحابہ کرام کے ساتھ مشاورت:

جب نبی کریم ﷺ کو یہ اطلاع ملی کہ قافلہ بچ کر نکل گیا ہے اور زعمائے مکہ جنگ کرنے پر تُلے ہوئے ہیں تو رسول اللہ ﷺ نے اس سلسلہ میں اپنے اصحاب سے مشورہ کیا، بعض صحابہ کرام نے قریش کے ساتھ جنگ کرنے کے سلسلہ میں اپنے عدم انشراح و عدمِ اطمئنان کا اظہار کیا، اس لئے کہ نہ ہی ان کو قریش کے ساتھ جنگ کرنے کی توقع تھی اور نہ ہی انہوں نے اس سلسلہ میں تیاری کی تھی، انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو اپنے نقطۂ نظر کے بارے میں مطمئن کرنے کی کوشش کی، قرآن کریم نے ان کے موقف اور عام اہلِ ایمان کی صورتحال کی اپنے اس قول میں منظر کشی کی ہے: ﴿كَمَآ أَخۡرَجَكَ رَبُّكَ مِنۢ بَيۡتِكَ بِٱلۡحَقِّ وَإِنَّ فَرِيقٗا مِّنَ ٱلۡمُؤۡمِنِينَ لَكَٰرِهُونَ ۝٥ يُجَٰدِلُونَكَ فِي ٱلۡحَقِّ بَعۡدَ مَا تَبَيَّنَ كَأَنَّمَا يُسَاقُونَ إِلَى ٱلۡمَوۡتِ وَهُمۡ يَنظُرُونَ ۝٦ وَإِذۡ يَعِدُكُمُ ٱللَّهُ إِحۡدَى ٱلطَّآئِفَتَيۡنِ أَنَّهَا لَكُمۡ وَتَوَدُّونَ أَنَّ غَيۡرَ ذَاتِ ٱلشَّوۡكَةِ تَكُونُ لَكُمۡ وَيُرِيدُ ٱللَّهُ أَن يُحِقَّ ٱلۡحَقَّ بِكَلِمَٰتِهِۦ وَيَقۡطَعَ دَابِرَ ٱلۡكَٰفِرِينَ ۝٧ لِيُحِقَّ ٱلۡحَقَّ وَيُبۡطِلَ ٱلۡبَٰطِلَ وَلَوۡ كَرِهَ ٱلۡمُجۡرِمُونَ ۝٨﴾ ترجمہ: "(اِس مالِ غنیمت کے معاملہ میں بھی ویسی ہی صورت پیش آ رہی ہے جیسی اُس وقت پیش آئی تھی جبکہ) تیرا رب تجھے حق کے ساتھ تیرے گھر سے نکال لایا تھا اور مؤمنوں میں سے ایک گروہ کو یہ سخت ناگوار تھا، وہ اس حق کے معاملہ میں تجھ سے جھگڑ رہے تھے درحالانکہ وہ صاف صاف نمایاں ہو چکا تھا، ان کا حال یہ تھا کہ گویا وہ آنکھوں دیکھے موت کی طرف ہانکے جا رہے ہیں۔ یاد کرو وہ موقع جب کہ اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دونوں گروہوں میں سے ایک تمہیں مل جائے گا، تم چاہتے تھے کہ کمزور گروہ تمہیں ملے مگر اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ اپنے ارشادات سے حق کو حق کر دکھائے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے تاکہ حق حق ہو کر رہے اور باطل باطل ہو جائے، خواہ مجرموں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو"۔(سورۂ انفال: 5-8)

مہاجر قائدین کا دشمن کی طرف پیش قدمی کرنے کی رائے کے ساتھ اتفاق تھا، حضرت مقداد بن اسودؓ کا اس سلسلہ میں نمایاں موقف تھا، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اس سلسلہ میں فرمایا ہے: میں مقداد بن اسود کے ساتھ ایک ایسے موقع پر موجود تھا اگر میں اس موقع کا کردار ہوتا تو میرے نزدیک یہ زیادہ محبوب تھا، چاہے اس کے بدلہ کچھ بھی قربان کرنا پڑے، وہ اللہ کے نبی ﷺ کے پاس اس وقت آئے جب کہ آپ مشرکین پر بددعا کر رہے تھے، انہوں نے آپ ﷺ سے عرض کیا: ہم اس طرح نہیں کہیں گے جیسے کہ موسیٰؑ کی قوم نے کہا تھا: ”آپ اور آپ کا رب جائیں آپ دونوں قتال کریں“۔ لیکن ہم آپ کے دائیں، بائیں، آگے اور پیچھے رہ کر لڑیں گے، میں نے دیکھا کہ یہ سن کر نبی کریم ﷺ کا چہرہ روشن ہو گیا اور آپؐ کو (حضرت مقدادؓ کی بات نے) خوش کر دیا۔ (صحیح البخاری: 3952)

ایک روایت میں ہے کہ حضرت مقدادؓ نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ! ہم آپ سے اس طرح کی بات نہیں کہیں گے جیسے کہ بنی اسرائیل نے موسیٰ -علیہ السلام- سے کہا تھا کہ: "آپ اور آپ کا رب جائیں، آپ دونوں لڑیں ہم یہیں بیٹھے ہیں“۔ بلکہ آپ آگے بڑھیں، یہ سن کر ایسا لگا جیسے کہ رسول اللہ ﷺ کو انتہائی خوشی ہوئی ہو۔ (صحیح البخاری: 4609)

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے دوبارہ لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: اے لوگو! مجھے مشورہ دو! آپؐ کا اشارہ انصار کی جانب تھا، اس لئے کہ لشکرِ اسلام کی اکثریت انہی پر مشتمل تھی اور بیعتِ عقبہ ثانیہ میں بظاہر ایسی کوئی دفعہ نہیں تھی جس کی وجہ سے مدینہ سے باہر ان کی حمایت و حفاظت لازمی قرار پاتی، صحابی جلیل حضرت سعد بن معاذؓ رسول ﷺ کا اشارہ سمجھ گئے - یہ انصار کے علمبردار بھی تھے - وہ یہ کہتے ہوئے کھڑے ہو گئے: شاید آپ کا روئے سخن ہماری طرف ہے، آپؐ نے فرمایا: ہاں۔ حضرت سعد بن عبادہؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! ہم آپ پر ایمان لائے ہیں، ہم نے آپ کی تصدیق کی ہے اور گواہی دی ہے کہ جو کتاب آپ لے کر آئے ہیں وہ برحق ہے اور ہم نے آپ کی اطاعت و فرماں برداری کا عہد کیا ہے، یارسول اللہ! جس طرف مرضی ہو تشریف لے چلئے۔ قسم ہے اس ذات کی جس نے حق کے ساتھ آپ کو مبعوث کیا! اگر آپ ہم کو سمندر میں کودنے کا حکم دیں گے تو ہم اس میں بھی کود جائیں گے اور ہم میں سے ایک شخص بھی پیچھے نہیں رہے گا، نہ ہم دشمن کا مقابلہ کرنے میں کوئی تاخیر کریں گے، ہم لڑائی کے میدان میں صابر اور مقابلہ کے موقع پر ثابت قدم رہیں گے، امید ہے کہ ہماری وجہ سے اللہ تعالیٰ آپ کے دل کو ٹھنڈا رکھے، اللہ کا نام لے کر آپ آگے بڑھیں۔ (سیرت ابن ہشام: 2/267، صحیح مسلم: 1179)

حضرت سعد بن معاذؓ کی تقریر سے نبی کریم ﷺ خوشی سے دمک اٹھے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اب یہاں سے کوچ کرو، اللہ کی طرف سے فتح کی بشارت ہے، اللہ تعالیٰ نے مجھ سے دو گروہوں میں سے ایک کا وعدہ کیا ہے، واللہ! بخدا میں ایک ایک کا مقتل اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ (دلائل النبوۃ للبیہقی 3/34، سیرت ابن ہشام: 2/267)

حضرت سعدؓ کے کلمات رسول اللہ ﷺ کے لئے انتہائی حوصلہ افزاء اور صحابہ کرام کے جذبات و احساسات کو چنگاری دینے والے تھے، ان کے ذریعہ صحابہ کرام کو معنوی اعتبار سے حوصلہ ملا اور وہ قتال کے لئے تیار ہو گئے۔

اللہ کے رسول ﷺ کا غزوات میں صحابہ کرام کے ساتھ مشورہ کرنا بتاتا ہے کہ جنگوں میں مشاورت کی کتنی زیادہ اہمیت ہے، اس لئے کہ جنگوں کے ذریعہ قوموں کا انجام متعین ہوتا ہے، یا تو کسی کو عروج و بلندی نصیب ہوتی ہے یا پھر کوئی زوال و پستی کا شکار ہو جاتا ہے۔ (دیکھیں غزوۃ بدر الکبریٰ، ابو فارس، ص: 37)

۴: دشمن کی طرف کوچ اور معلومات جمع کرنا:

نبی کریم ﷺ نے جب صحابہ کرام کی طرف سے اطاعت وبہادری اور قتال کے بارے میں عزمِ مصمم دیکھ لیا تو آپ ؐ نے اپنا لشکر منظم کیا، جنرل کمان کا سفید علم تیار کر کے حضرت مصعب بن عمیرؓ کے حوالے کر دیا اور دو سیاہ پرچم حضرت سعد بن معاذؓ اور حضرت علی بن ابی طالبؓ کے سپرد کئے، اور ساقہ کی کمان پر حضرت قیس بن أبی صعصہؓ کو متعین کیا۔ (زاد المعاد: 3/172)

اللہ کے رسول ﷺ اور آپ ؐ کے ساتھ حضرت ابو بکرؓ مشرکین کے لشکر کے حالات معلوم کرنے نکلے، دونوں اس علاقہ کا جائزہ لے رہے تھے کہ ایک عرب شیخ سے ملاقات ہوئی، اللہ کے رسول ﷺ نے قریش کے لشکر اور محمدؐ اور آپ ؐ کے اصحاب کے بارے میں دریافت کیا، شیخ نے کہا: میں آپ دونوں کو اس وقت تک نہیں بتاؤں گا جب تک کہ آپ دونوں مجھے یہ نہ بتادو کہ آپ کون ہیں؟ رسول اللہ ﷺ نے اس سے فرمایا: اگر آپ ہمیں بتائیں گے تو ہم بھی آپ کو بتائیں گے۔اس نے کہا: کیا یہ اِس کا بدلہ ہے؟ آپ ؐ نے فرمایا: ہاں! شیخ نے کہا: مجھے معلوم ہوا ہے کہ محمدؐ اور اس کے اصحاب فلاں فلاں دن نکلے ہیں، مجھے جس نے خبر دی ہے اگر وہ سچا ہے تو وہ آج فلاں جگہ میں ہوں گے۔اس نے وہی جگہ بتائی جہاں مسلمانوں کا لشکر موجود تھا۔اور مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ قریش فلاں دن نکلے ہیں، مجھے خبر دینے والا اگر سچا ہے تو وہ آج فلاں جگہ پر ہیں۔اس نے وہی جگہ بتائی جہاں مشرکین کا لشکر موجود تھا۔اس کے بعد شیخ نے کہا: میں نے تو آپ کی مطلوبہ بات بتادی اب آپ بتادیں کہ آپ دونوں کون ہیں؟ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''ہم پانی سے ہیں''۔ پھر نبی کریم ﷺ اور حضرت ابو بکرؓ واپس تشریف لائے اور شیخ کہتا رہا: ''پانی سے'' کیا مراد ہے؟ کیا عراق کا پانی ہے؟! (سیرت ابن ہشام: 2/267-268)

اسی دن شام کو اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت علی بن ابی طالبؓ، حضرت زبیر بن عوامؓ اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو اپنے اصحاب کی ایک جماعت کے ساتھ بدر کے چشمہ کی طرف بھیجا تاکہ وہ قریش کے لشکر کے بارے میں معلومات حاصل کر لیں، انہوں نے دو لڑکوں کو دیکھا جو مشرکین کے لشکر کے لئے پانی بھر رہے تھے، یہ حضرات ان دونوں کو لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس لے کر آئے تو آپ ﷺ نے ان دونوں سے دریافت کیا: مجھے قریش کے لشکر کے بارے میں بتاؤ۔ان دونوں نے کہا: واللہ! وہ اس ٹیلے کے پیچھے ہیں جو دور کے کنارے سے نظر آتا ہے۔آپ ﷺ نے ان سے پوچھا: ان کی تعداد کتنی ہے؟ انہوں نے کہا: بہت زیادہ۔آپ ؐ نے پوچھا: کتنی تعداد ہے ان کی؟ انہوں نے جواب دیا: ہم نہیں جانتے ہیں۔رسول اللہ ﷺ نے دریافت کیا: روزانہ کتنے اونٹ ذبح کرتے ہیں؟ انہوں نے کہا: ایک روز نو اور ایک روز دس۔یہ سن کر آپ ؐ نے فرمایا: ان کی تعداد نو سو سے ہزار تک کی ہے۔اس کے بعد آپ ﷺ نے ان سے پوچھا: اَشرافِ قریش میں سے ان کے ساتھ کون ہے؟ انہوں نے ربیعہ کے دونوں بیٹوں عتبہ اور شیبہ، ابو جہل، اُمیہ بن خلف اور دیگر سردارانِ قریش کے بیٹوں کے نام ذکر کئے، یہ سن کر رسول اللہ ﷺ یہ کہتے ہوئے اپنے اصحاب کی طرف متوجہ ہوئے: مکہ نے تمہارے سامنے اپنے جگر گوشے ڈال دیئے ہیں۔(سیرت ابن ہشام: 2/269)

نبی کریم ﷺ کا طریقہ کار یہ تھا کہ آپ ؐ دشمن کے لشکر اور اس کے اہداف ومقاصد کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے، اس لئے کہ اس کے ذریعہ دشمن کا مقابلہ کرنے اور اس کو روکنے کے لئے مناسب جنگی حکمتِ عملی اختیار کرنے اور

منصوبہ بندی کرنے میں مدد ملتی ہے، غزوۂ بدر میں بھی آپ کبھی بذاتِ خود اور کبھی دوسروں کے ذریعہ معلومات حاصل کرتے تھے، اسی طرح آپ ﷺ جنگوں میں کتمان و رازداری کے اصول پر عمل پیرا رہتے تھے، قرآن کریم نے اس اہم اصول کی اہمیت کی جانب رہنمائی کی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ ۖ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنبِطُونَهُ مِنْهُمْ ۗ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ إِلَّا قَلِيلًا﴾ ترجمہ: "یہ لوگ جہاں کوئی اطمئنان بخش یا خوفناک خبر سن پاتے ہیں اُسے لے کر پھیلا دیتے ہیں، حالانکہ اگر یہ اُسے رسول اور اپنی جماعت کے ذمہ دار اصحاب تک پہنچائیں تو وہ ایسے لوگوں کے علم میں آجائے جو اِن کے درمیان اس بات کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ اس سے صحیح نتیجہ اخذ کر سکیں، تم لوگوں پر اللہ کی مہربانی اور رحمت نہ ہوتی تو (تمہاری کمزوریاں ایسی تھیں کہ) معدودے چند کے سوا تم سب شیطان کے پیچھے لگ گئے ہوتے"۔ (سورۃ النساء: 83)

اللہ کے رسول ﷺ تمام غزوات میں کتمان و رازداری سے کام لیتے تھے، چنانچہ حضرت کعب بن مالکؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں: اللہ کے رسول ﷺ جب بھی کسی غزوہ کا ارادہ فرماتے تھے تو کسی دوسری بات کے ذریعہ توریہ فرماتے تھے۔ (صحیح بخاری: 2947)۔

غزوہ بدر میں کتمان اور رازداری کا پہلو کئی مقام پر ظاہر ہوتا ہے جیسے کہ:

أ: اللہ کے رسول ﷺ کا عربی شیخ سے سوال کرنا، جو آپ کو بدر میں ملا اور آپؐ نے اس سے حضرت محمدؐ اور آپؐ کے لشکر کے بارے میں اور قریش اور اس کے لشکر کے بارے میں دریافت کیا۔

ب: شیخ کے سوال کے جواب میں بھی آپ ﷺ نے توریہ اور اشارات کی زبان استعمال کی، اس نے دریافت کیا تھا: آپ دونوں کون ہیں؟ اور آپؐ نے جواب دیا تھا: "ہم پانی سے ہیں"۔ بظاہر اس جواب سے جائے وقوع کا پتہ چل رہا ہے، مگر اللہ کے رسول ﷺ نے مسلمان لشکر کی معلومات کو قریش سے مخفی رکھنا چاہا۔

ج: جواب دینے کے بعد فوراً آپ ﷺ کے واپس چلے جانے میں بھی کتمان و رازداری ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ رسول اللہ ﷺ کس طرح حکمت سے کام کرتے تھے، اگر شیخ کو جواب دینے کے بعد آپ ﷺ اسی کے پاس کھڑے رہتے تو شیخ آپؐ سے مزید وضاحت طلب کر لیتا۔ (دیکھیں: التاریخ الاسلامی، الحمیدی: 4/110)

د: جنگ بدر کے موقع پر آپ ﷺ نے اونٹوں کی گھنٹیاں کاٹنے کا حکم دیا، حضرت عائشہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بدر کے دن اونٹوں کی گردنوں سے گھنٹیاں کاٹنے کا حکم دیا۔ (مسند احمد 6/150، ابن حبان: 4699، مجمع الزوائد: 5/174)

ھ: اللہ کے رسول ﷺ نے سمتِ سفر کو بھی راز میں رکھا، جب آپ ﷺ نے بدر کی جانب نکلنے کا ارادہ فرمایا تھا آپؐ نے فرمایا تھا: "ہمیں کچھ تلاش کرنا ہے، لہذا جس کی سواری موجود ہو وہ ہمارے ساتھ سوار ہو جائے"۔ (صحیح مسلم: 1901)

امام نوویؒ فرماتے ہیں: اس سے معلوم ہوا کہ توریہ کا استعمال حالتِ جنگ میں مستحب ہے، اسی طرح امام و قائد کے لئے یہ مستحب ہے کہ وہ حملہ کرنے کی سمت کو ظاہر نہ کرے تاکہ دشمن کو اس کا علم نہ ہو۔ (دیکھیں: التربیۃ القیادیۃ: 3/21)

ہم دیکھتے ہیں کہ منہجِ نبوی میں حفاظتی اور احتیاطی تربیت مکہ کے خفیہ اور اعلانیہ دعوتی مرحلہ سے ہی جاری تھی اور ریاست کی تعمیر و تشکیل کے بعد بھی اس میں انقطاع نہیں آیا بلکہ روز بروز اس میں ترقی ہوتی رہی، خاص طور پر غزوات میں اس کا خاص اہتمام کیا گیا۔

٥: حضرت حباب بن منذرؓ کا مشورہ:

جب اللہ کے رسول ﷺ نے قریش کے لشکر کے بارے میں دقیق معلومات حاصل کر لیں تو آپؐ اپنے اصحاب کو لے کر تیزی کے ساتھ بدر کی جانب بڑھے تاکہ مشرکین سے پہلے بدر کے پانی پر پہنچ جائیں اور مشرکین کو اس پر کنٹرول حاصل کرنے کا موقع نہ دیں، آپ ﷺ نے میدانِ بدر کے قریب ترین چشمہ پر پڑاؤ ڈالا، حضرت حباب بن منذرؓ کھڑے ہوئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! اس منزل کا انتخاب آپ نے وحی کی رو سے کیا ہے جس سے پس و پیش ہمارے لئے روا نہیں ہے، یا یہ جنگی تدبیر اور حکمتِ عملی ہے؟ یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، یہ اجتہادی رائے، جنگی تدبیر اور حکمتِ عملی ہے، انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! یہ قیام کے لئے مناسب منزل نہیں ہے۔ اے اللہ کے رسولؐ! لوگوں کو لے کر چلیں، یہاں تک کہ مشرکین کے قریب ترین چشمہ پر قبضہ کریں، اور وہیں پڑاؤ ڈال کر آس پاس کے کنوؤں کا پانی ختم یا خراب کر دیں اور ایک حوض میں سارا پانی بھر لیں، اس کے بعد جنگ کا آغاز کریں، ہمیں پانی کی سہولت میسر ہو گی اور وہ پانی سے محروم رہیں گے، یہ سن کر رسول ﷺ نے ان کی رائے کو اختیار کیا اور لشکر کو لے کر دشمن سے قریب ترین چشمہ کی طرف تشریف لے گئے، اور وہیں قیام کیا، اس کے بعد حوض بنائے اور دوسرے تمام کنوؤں کا پانی ختم کر دیا۔ (سیرت ابن ہشام: 2/272، دلائل النبوۃ للبیہقی: 3/25)

اس کے ذریعہ اپنے اصحاب کے ساتھ رسول ﷺ کے طرزِ عمل کی عکاسی ہوتی ہے، اس معاشرہ کا کوئی بھی فرد اپنی رائے دیتا تھا یہاں تک کہ حسّاس ترین معاملات میں بھی وہ رائے دینے سے ہچکچاتے نہیں تھے، ان کو اس کا کوئی خوف اور اندیشہ نہیں ہوتا تھا کہ قائدِ اعلیٰ اس کی وجہ سے ناراض ہوں گے اور ناراضگی کے بعد کے نتائج و اثرات کا بھی انہیں کوئی ڈر نہیں ہوتا تھا، جیسے کہ قائد کی رائے کے برخلاف مشورہ دینے والا بدنام ہو گا، یا اس کو اس کے مقام و منصب سے ہٹا دیا جائے گا، یا مالی یا ذاتی نقصان ہو سکتا ہے۔

جس حریت و آزادی کو بنیاد بنا کر اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے اصحاب کی تربیت فرمائی تھی اس تربیت کی وجہ سے معاشرہ کے تمام صحیح رائے رکھنے والوں کی آراء اور مشوروں سے استفادہ کیا جاتا تھا، ان میں سے کوئی بھی قائد واضح طور پر کامیابی حاصل کرتا تھا، اگرچہ وہ کمسن ہی کیوں نہ ہو، اس لئے کہ وہ صرف اپنی رائے یا اس پر حاوی چند لوگوں کی آراء کے ذریعہ فیصلہ نہیں کرتا ہے، بلکہ اپنے لشکر کے تمام افراد کی رائے کو بنیاد بنا کر فیصلہ کیا جاتا ہے، کبھی کبھی کسی غیر معروف یا قائد کے نزدیک کمتر مقام کے حامل شخص کی رائے درست اور مفید ہو سکتی ہے، اس لئے کہ قائد تک اپنی رائے پہنچانے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی تھی۔

اس کے ذریعہ نبوی تربیت کی عظمت کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے جس کا اظہار حضرت حُباب بن منذر کی شخصیت کے ذریعہ ہوتا ہے، اسی تربیت کا اثر تھا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ انتہائی ادب کا اظہار کرتے ہیں اور اپنی رائے پیش کرتے ہیں حالانکہ ان سے رائے طلب نہیں کی گئی تھی، انہوں نے اپنی رائے کا اظہار اس لئے کیا تاکہ وہ اپنے منصوبہ کو رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کریں، لیکن اس منصوبہ کو پیش کرنے سے پہلے انہوں میں ایک عظیم سوال کیا اور فرمایا: اے اللہ کے رسولؐ! اس منزل کا انتخاب آپ نے وحی کی رو سے کیا ہے جس سے پس و پیش ہمارے لئے روا نہیں ہے، یا یہ جنگی تدبیر اور حکمتِ عملی ہے؟

اس سوال کے ذریعہ اس نابغۂ روزگار قائدانہ صلاحیت کی عظمت ظاہر ہوتی ہے جس کو اچھی طرح معلوم ہے کہ بات کہاں اور کب کی جائے! چنانچہ اگر وحی کے ذریعہ اس منزل کا انتخاب ہوا ہے تو پھر ایک قدم بھی اس سے آگے بڑھنے یا چوں وچرا کرنے کے مقابلہ میں گردن کٹا دینا زیادہ محبوب و پسندیدہ ہے اور اگر اس کا تعلق انسانی رائے اور اجتہاد کے ساتھ ہے تو پھر ان کے پاس ایک نیا مکمل منصوبہ موجود تھا۔

بلا شبہ نبوی تربیت کے نتیجہ میں صحابہ کرام کا ایسا عظیم مزاج بنا تھا کہ انہیں مشورہ کے اصول و آداب اور اظہارِ رائے کے اصول وضوابط کا اچھی طرح علم تھا اور انہیں سمع وطاعت اور بحث ومباحثہ کا مفہوم بھی اچھی طرح معلوم تھا، اسی طرح انہیں سید ولدِ آدم ﷺ کی رائے کے برخلاف رائے پیش کرنے کا طریقہ بھی معلوم تھا۔

اسی طرح نبی کریم ﷺ کی عظمت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ کس طرح آپؐ ایک نئے منصوبے اور حکمتِ عملی کو بغور سماعت فرماتے ہیں اور ایک سپاہی کی طرف سے پیش کئے گئے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں کسی طرح کے تردّد کا شکار نہیں ہوتے ہیں۔

۶: مشرکین کے کوچ کرنے کی قرآنی منظر کشی:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَا تَكُونُواْ كَٱلَّذِينَ خَرَجُواْ مِن دِيَٰرِهِم بَطَرًا وَرِئَآءَ ٱلنَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِۚ وَٱللَّهُ بِمَا يَعۡمَلُونَ مُحِيطٌ﴾ ترجمہ: "اور اُن لوگوں کے سے رنگ ڈھنگ نہ اختیار کرو جو اپنے گھروں سے اِتراتے اور لوگوں کو اپنی شان دکھاتے ہوئے نکلے اور جن کی روش یہ ہے کہ اللہ کے راستے سے روکتے ہیں، جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہ اللہ کی گرفت سے باہر نہیں ہے"۔ (سورۃ الأنفال: 47)

اللہ تعالیٰ اس آیت میں اہلِ ایمان کو کفار کی مشابہت اختیار کرنے سے منع کرتا ہے جو اپنے گھروں سے غرور و تکبر اور لوگوں کو دکھاتے ہوئے نکلے، اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں کفار کی تین صفات کا ذکر کیا ہے: ۱- غرور و تکبر ۲- ریاء ۳- اللہ کے راستے سے روکنا۔

قابلِ غور یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے غرور و تکبر کو ایسے صیغے کے ذریعہ بیان کیا ہے جو پائیداری اور قوت پر دلالت کرتا ہے، یعنی وہ ان کی شرست کا حصہ بن چکا ہے جبکہ اللہ کے راستے سے روکنے کو فعل کے صیغہ کے ساتھ تعبیر کیا ہے جو تجدد اور بار بار پیدا ہونے کو بتاتا ہے، یعنی نت نئے طریقوں سے وہ مسلسل اللہ کے راستے سے روکنے کا کام کرتے رہتے ہیں۔ (دیکھیں: حدیث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ: 1/65 - 66)

امام رازیؒ فرماتے ہیں: غرور و تکبر، فخر ومباہات اور خود پسندی جیسی ناپسندیدہ صفات ابو جہل، اس کے گروہ اور اس کی جماعت کی شرست میں داخل تھیں اور جہاں تک تعلق ہے اللہ کے راستے سے روکنے کا تو یہ طرزِ عمل انہوں نے اس وقت اختیار کیا جب اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو نبوت سے سرفراز کیا، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے غرور و تکبر اور ریاکاری کو اسم کے صیغہ کے ساتھ ذکر کیا ہے اور اللہ کے راستہ سے روکنے کو فعل کے صیغہ کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ واللہ اعلم! (دیکھیں: تفسیر الرازی: 15/173)

علامہ قرطبیؒ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: آیت کا مقصود یہ ہے کہ ابو جہل اور اس کے ساتھ قافلہ کی نصرت کے لئے نکلنے والے اس کے اصحاب، بدر کے دن گانے بجانے والی عورتوں اور گانے بجانے کے آلات کے ساتھ نکلے جب وہ مقام جحفہ پر پہنچے تو خُفاف الکنانی -جو کہ ابو جہل کا دوست تھا- نے اپنے بیٹے کو ابو جہل کے پاس ہدیے و تحائف لے کر بھیجا اور کہا: اگر تم چاہو تو میں لوگوں کے ذریعہ تمہاری مدد کر سکتا ہوں اور اگر چاہو تو خود قوم کے خاص اور اہم لوگوں کے ساتھ مل کر تمہاری مدد کروں گا، ابو جہل نے جواب دیا: اگر ہم اللہ کے ساتھ جنگ کر رہے ہیں جیسے کہ محمدؐ کا گمان ہے تو بخدا اللہ کے مقابلہ میں ہمارے پاس کوئی طاقت نہیں ہے، اور اگر ہم لوگوں کے ساتھ جنگ کر رہے ہیں تو واللہ! لوگوں کے مقابلہ میں ہمارے پاس زبردست طاقت و قوت ہے، واللہ! ہم محمدؐ سے جنگ کئے بغیر واپس نہیں جائیں گے یہاں تک کہ ہم بدر کے مقام تک نہ پہنچ جائیں، ہم وہاں پہنچ کر شراب پئیں گے، گانے بجانے والی عورتیں اپنے فن کا مظاہرہ کریں گی، بدر تو عربوں کے میلوں کی ایک اہم جگہ اور ان کا اہم بازار ہے یہاں تک کہ عرب ہمارے بارے میں سن لیں گے تو ہمیشہ ہمیش کے لئے ہمارا خوف اور ڈر ان کے اندر بیٹھ جائے گا، اس لئے وہ بدر کے مقام تک آئے اور ان کو ہلاکت کا سامنا کرنا پڑا۔ (تفسیر القرطبی: 8/25)

۷: بدر پہنچ کر مشرکین کی صورتحال:

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مشرکین کے موقف کو بیان کیا ہے جب کہ وہ مقامِ بدر پہنچے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِن تَسۡتَفۡتِحُواْ فَقَدۡ جَآءَكُمُ ٱلۡفَتۡحُۖ وَإِن تَنتَهُواْ فَهُوَ خَيۡرٞ لَّكُمۡۖ وَإِن تَعُودُواْ نَعُدۡ وَلَن تُغۡنِيَ عَنكُمۡ فِئَتُكُمۡ شَيۡـٔٗا وَلَوۡ كَثُرَتۡ وَأَنَّ ٱللَّهَ مَعَ ٱلۡمُؤۡمِنِينَ﴾ ترجمہ: ”(ان کافروں سے کہہ دو): اگر تم فیصلہ چاہتے تھے تو لو، فیصلہ تمہارے سامنے آگیا، اگر باز آجاؤ تو تمہارے ہی لئے بہتر ہے، ورنہ پھر پلٹ کر اسی حماقت کا اعادہ کروگے تو ہم بھی اسی سزا کا اعادہ کریں گے اور تمہاری جمعیت، خواہ وہ کتنی ہی زیادہ ہو، تمہارے کچھ کام نہ آسکے گی، اللہ مؤمنوں کے ساتھ ہے“۔ (سورۃ الانفال: 19)

امام احمدؒ نے حضرت عبداللہ بن ثعلبہ کی روایت نقل کی ہے کہ جب بدر میں دونوں لشکر آمنے سامنے آگئے تو ابو جہل نے کہا: اے اللہ! جو ہم میں سب سے زیادہ قطع رحمی کرنے والا ہو اور نئی اور غیر معروف چیز لانے والا ہو، اس کو صبح ہلاک کردے، لہذا وہی یہ فیصلہ طلب کرنے والا تھا۔ (مسند أحمد: 5/431، سیرت ابن ہشام: 2/280، الدلائل للبیہقی: 3/74)

جب مکہ کا لشکر مقامِ بدر پہنچا تو ان کے مابین اختلاف ہو گیا اور ان کی داخلی صفوں میں انتشار پیدا ہوا، حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں: جب مسلمانوں نے صف بندی کی اور مشرکین بھی آگئے تو اللہ کے رسول ﷺ نے عتبہ بن ربیعہ کو دیکھا، وہ ایک سرخ

اونٹ پر سوار تھا، آپ ﷺ نے فرمایا: ان لوگوں میں سے اگر کسی کے پاس کوئی خیر ہے تو وہ اس سرخ اونٹ والے کے پاس ہے، اگر یہ لوگ اس کی بات مان گئے تو فائدہ میں رہیں گے، عتبہ ان سے کہہ رہا تھا: اے میری قوم! ان لوگوں کے بارے میں میری بات مان لو، اگر تم نے ان کے ساتھ جنگ کر لی تو اس کے اثرات مسلسل تمہارے دلوں میں رہیں گے، ہر شخص اپنے بھائی کے قاتل کو اور اپنے باپ کے قاتل کو دیکھے گا، لہذا اس بات کو مجھ پر چھوڑ دو اور واپس چلے جاؤ، ابو جہل نے کہا: واللہ! اس پر جادو چل گیا جب اس نے محمدؐ اور اس کے اصحاب کو دیکھا، اگر محمدؐ اور اس کے اصحاب کی ہم سے مڈ بھیڑ ہو گئی تو ہم ان کو ناکوں چنے چبائیں گے۔ یہ سن کر عتبہ نے کہا: عنقریب جان لو گے کہ بزدل اور اپنی قوم کو تباہ کرنے والا کون ہے، واللہ! میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ لوگ مار مار کے زیر کرنے والے ہیں، کیا آپ دیکھتے نہیں ہو ان کے سر جیسے کہ اژدھے ہیں اور ان کے چہرے تلواروں کی مانند ہیں۔ (مسند بزار: 1762، مجمع الزوائد: 6/76)

حضرت حکیم بن حزامؓ جنگِ بدر کے بارے میں بیان کرتے ہیں۔ وہ قبولِ اسلام سے پہلے مشرکین کی صفوں میں تھے۔ فرماتے ہیں: ہم نکلے یہاں تک کہ ہم "العدوۃ" پہنچے جس کا اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے، میں عتبہ بن ربیعہ کے پاس آیا اور میں نے کہا: اے ابو الولید! کیا آپ چاہتے ہو کہ جب تک زندہ رہو اس دن کا شرف اپنے لئے حاصل کر لو؟ اس نے کہا: ٹھیک ہے، کیا ہے وہ؟ میں نے کہا: آپ لوگ محمدؐ سے ابن الحضرمی کے خون کا مطالبہ کر رہے ہو؟ (ابن الحضرمی: عمرو بن حضرمی ہے جس کو واقد بن عبداللہ نے شہرِ حرام میں سریہ عبداللہ بن جحش میں مارا تھا) اور وہ تمہارا حلیف ہے، آپ اس کی دیت دے دو اور لوگوں کو لے کر واپس چلے جاؤ، یہ سن کر اس نے کہا: آپ جیسا کہیں میں اس کی دیت ادا کروں گا، اور آپ ابن الحنظلیہ۔ یعنی ابو جہل۔ کے پاس جاؤ اور اس سے کہو: کیا آپ اپنے لوگوں کے ساتھ اپنے بھتیجے کا مقابلہ کئے بغیر واپس جائیں گے؟ میں اس کے پاس آیا تو دیکھا کہ وہ ایک جماعت کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے اور لوگ اس کے آگے پیچھے ہیں اور حضرمی کا بیٹا (عمیر کا بھائی عامر) اس کے سر کے پاس کھڑا ہے اور وہ کہہ رہا ہے: میں نے عبد شمس کے ساتھ اپنا معاہدہ توڑ دیا اور اب میرا معاہدہ بنو مخزوم کے ساتھ ہے، میں نے ابو جہل سے کہا کہ عتبہ بن ربیعہ نے آپ کو یہ کہلوایا ہے کہ کیا آپ آج اپنے بھتیجے کے ساتھ مقابلہ کئے بغیر اپنے لوگوں کو لے کر واپس جائیں گے؟ اس نے کہا: کیا اسے تمہارے بغیر اور کوئی قاصد نہیں ملا؟ میں نے کہا: نہیں! میں اور کسی کا قاصد بن بھی نہیں سکتا تھا۔ حضرت حکیمؓ فرماتے ہیں: میں جلدی جلدی عتبہ کی جانب نکلا تا کہ اس واقعہ میں سے کچھ بھی مجھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ (سیرت ابن ہشام: 2/274-275) الدلائل للبیہقی: 3/65-66)

عتبہ بن ربیعہ، جس کا تعلق قریش کی قیادت سے تھا وہ بھی سمجھتا تھا کہ محمد ﷺ سے قتال کرنے کا کوئی داعیہ اور سبب بھی نہیں ہے اور اس نے قریش کے لوگوں سے کہا تھا کہ محمد ﷺ کو ان کے حال پر چھوڑ دو، اگر وہ سچے ہوں گے تو ان کی عزت قریش کی عزت ہے اور ان کی بادشاہت قریش کی بادشاہت ہے اور ان کی وجہ سے سب سے زیادہ قریش ہی کو خوشی اور سعادت حاصل ہو گی، اور اگر وہ جھوٹے ہوں گے تو وہ عربوں میں نمک کی طرح پگھل کر ختم ہو جائیں گے۔

مگر ہر زمان و مکان میں ہمیشہ جاہلیت کا غرور و تکبر حق کو اس حال میں نہیں دیکھنا چاہتا ہے کہ وہ کوئی حرکت کر سکے، اس لئے کہ اس کو اچھی طرح اس بات کا علم ہے کہ حق کے غلبہ اور کامیابی کا مطلب یہ ہے کہ جاہلیت زائل اور ختم ہو جائے اور اس کی جگہ حق کو ملے گی۔

اسی طرح عمیر بن وہب جُمحی کو قریش کے لوگ بھیجتے ہیں تا کہ وہ ان کے لئے اصحاب محمدؐ کی تعداد کا اندازہ کر لیں، اس نے کیمپ کے ارد گرد چکر لگایا، اس کے بعد ان کے پاس واپس آ کر کہا: کم و بیش تین سو افراد ہیں، لیکن مجھے مہلت دو میں دیکھتا ہوں کہ کیا ان لوگوں کے پاس کوئی پناہ گاہ یا کمک ہے؟ کہتے ہیں: وہ وادی میں گیا یہاں تک کہ دور تک گیا اور اس کو کوئی چیز نظر نہیں آئی، بالآخر وہ ان کے پاس واپس آیا اور کہا: مجھے کوئی چیز نہیں ملی، لیکن اے قریش کے لوگو! میں نے دیکھا کہ قبروں پر باندھی جانے والی اونٹیاں اپنے ساتھ موت لائی ہیں اور یثرب کے اونٹ اپنے اوپر دائمی موت لے کر آئے ہیں، یہ ایسے لوگ ہیں جن کے پاس ان کی تلواروں کے سوا نہ کوئی حفاظتی ذریعہ ہے اور نہ ہی کوئی پناہ۔ واللہ! میں سمجھتا ہوں کہ ان میں سے جس کسی کو بھی قتل کیا جائے گا وہ تمہارا ایک آدمی مار کر ہی مارا جائے گا، اگر انہوں نے اپنی تعداد کے بقدر بھی تمہارے افراد مار دیئے تو پھر اس کے بعد زندہ رہنے کا کیا مزہ رہے گا، اس لئے اچھی طرح سوچ لو!۔(البدایۃ والنہایۃ: 3/269)

امیہ بن خلف نے تو شروع میں ہی موت سے ڈر کر مکہ سے نکلنے سے انکار کیا تھا، ابو جہل اس کے پاس آیا اور کہا: اے اُبو صفوان! جب لوگ تمہیں دیکھیں گے کہ تم پیچھے رہ رہے ہو اور تم تو اہل وادی کے سردار ہو، تو وہ بھی تمہارے ساتھ پیچھے رہیں گے، ابو جہل مسلسل اس کو اصرار کرتا رہا یہاں تک کہ مجبور ہو کر امیہ نے کہا: جب نہیں مانتا تو اللہ کی قسم! میں مکہ کا سب سے بہترین اونٹ خریدوں گا، پھر امیہ نے کہا: اے ام صفوان! میرا سامان تیار کرو، اس نے کہا: اے ابو صفوان! کیا آپ بھول گئے کہ آپ کے یثربی بھائی نے آپ سے کیا کہا تھا؟! ان کی مراد سعد بن معاذؓ تھے، جب انہوں نے ان سے کہا تھا: میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے: بے شک وہ تمہیں قتل کرنے والے ہیں، اس نے کہا: نہیں، بھولا نہیں ہوں، ان کے ساتھ تھوڑی دور تک جاؤں گا۔ جب امیہ نکلا تو راستہ میں جس منزل پر بھی ٹھہرتا تو اپنا اونٹ قریب ہی باندھے رکھتا، وہ برابر ایسے ہی احتیاط کرتا رہا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بدر میں ہلاک کر دیا۔(صحیح بخاری:3950، الدلائل للبیہقی:3/25- 27)

ابو جہل- لعنہ اللہ-نے یہ چالا کی کی کہ عقبہ بن اُبی معیط کو امیہ بن خلف کے پیچھے لگا دیا، چنانچہ عقبہ اس کے پاس ایک خوشبو جلانے والی انگیٹھی لے کر گیا جس میں آگ اور خوشبو کی لکڑی تھی، اس کو اس کے سامنے رکھا اور پھر اس سے کہا: سونگ لو خوشبو، تم تو عورتوں کی جنس سے ہو۔ اس نے کہا: تمہیں اللہ غارت کرے اور جو لے کر آئے ہو اس کو بھی غارت کرے۔ اس کے بعد اس نے تیاری کی اور لوگوں کے ساتھ نکلا۔(سیرت ابن ہشام)

یقیناً مکہ کے لشکر کی معنوی قوت اندرونی طور پر متزلزل تھی، اگرچہ ظاہری طور پر طاقت و قوت اور عزم و ثبات کا مظاہرہ کیا جا رہا تھا، لیکن ان کی باتوں سے بھی خوف و بزدلی اور پس و پیش کا اظہار ہو رہا تھا۔

اہلِ مکہ کی معنویات اور نفسیات پر حضرت عاتکہ بنت عبد المطلب کے خواب کا بھی بہت اثر تھا، چنانچہ انہوں نے خواب میں دیکھا تھا کہ ایک شخص نے قریش کو جنگ کے لئے نکالا اور مکہ کے اُبو قبیس پہاڑ کی چوٹی سے ایک چٹان گرائی جو چور چور ہو کر قریش کے ہر گھر میں داخل ہو گئی، اس خواب کی وجہ سے عباسؓ اور ابو جہل کے مابین اختلاف ہو گیا، یہاں تک کہ ضمضم آیا اور اس نے ان کو قافلہ کے بارے میں باخبر کیا اور اس کی وجہ سے اہلِ مکہ پُر سکون ہو گئے اور خواب کی یہی تعبیر سمجھ لی گئی۔(المجتمع المدنی فی عصر النبوۃ، العمری، ص:138)

اسی طرح جہیم بن الصلت بن المطلب بن عبد مناف نے بھی ایک خواب دیکھا جبکہ قریش کے لشکر نے جحفہ میں پڑاوُڈالا کہ ایک شخص ایک گھوڑے پر سوار ہو کر آتا ہے اور آ کر کھڑا ہوتا ہے، اس کے ساتھ اس کا اونٹ بھی ہے، اس کے بعد وہ کہتا ہے: عتبہ بن ربیعہ مارا گیا، شیبہ بن ربیعہ مارا گیا، ابوالحکم بن ہشام مارا گیا، امیہ بن خلف اور فلاں فلاں مارے گئے، اس نے ان تمام اُشراف قریش کے نام شمار کرائے جو جنگ بدر میں مارے گئے، اس کے بعد میں نے دیکھا کہ اس نے اپنے اونٹ کے گلے پر مارا اور پھر اس کو لشکر میں چھوڑ دیا، لشکر کے خیموں میں سے کوئی ایسا خیمہ نہیں بچا جس پر اس کے خون کی چھینٹیں نہ پڑی ہوں، جب ابوجہل کو یہ خواب معلوم ہوا تو اس نے کہا: یہ بھی بنوالمطلب کا دوسرا نبی ہے، کل معلوم ہو جائے گا کہ اگر ہماری مڈبھیڑ ہو جاتی ہے تو مقتول کون ہو گا۔ (سیرت ابن ہشام)

ان خوابوں نے اللہ کی توفیق وتائید کے ذریعہ قریش کی مشرکانہ نفسیات کو کمزور کرنے میں اہم رول ادا کیا۔

۸- میدانِ جنگ میں اہلِ ایمان اور مشرکین کے جائے وقوع کی قرآنی منظر کشی:

ارشاد باری تعالیٰ ہے :﴿إِذۡ أَنتُم بِٱلۡعُدۡوَةِ ٱلدُّنۡيَا وَهُم بِٱلۡعُدۡوَةِ ٱلۡقُصۡوَىٰ وَٱلرَّكۡبُ أَسۡفَلَ مِنكُمۡۚ وَلَوۡ تَوَاعَدتُّمۡ لَٱخۡتَلَفۡتُمۡ فِي ٱلۡمِيعَٰدِ وَلَٰكِن لِّيَقۡضِيَ ٱللَّهُ أَمۡرٗا كَانَ مَفۡعُولٗا لِّيَهۡلِكَ مَنۡ هَلَكَ عَنۢ بَيِّنَةٖ وَيَحۡيَىٰ مَنۡ حَيَّ عَنۢ بَيِّنَةٖۗ وَإِنَّ ٱللَّهَ لَسَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾ ترجمہ: "یاد کرو وہ وقت جبکہ تم وادی کے اِس جانب تھے اور وہ دُوسری جانب پڑاوُڈالے ہوئے تھے اور قافلہ تم سے نیچے (ساحل) کی طرف تھا، اگر کہیں پہلے سے تمہارے اور ان کے درمیان مقابلہ کی قرارداد ہو چکی ہوتی تو تم ضرور اس موقع پر پہلو تہی کر جاتے، لیکن جو کچھ پیش آیا وہ اس لئے تھا کہ جس بات کا فیصلہ اللہ کر چکا تھا اسے ظہور میں لے آئے تاکہ جسے ہلاک ہونا ہے وہ دلیل روشن کے ساتھ ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے وہ دلیل روشن کے ساتھ زندہ رہے، یقیناً خدا سُننے والا اور جاننے والا ہے"۔ (سورۃ الانفال:42)

یہ آیت کریمہ غزوۂ بدر میں اہلِ ایمان اور مشرکین کے جائے وقوع کی وضاحت کرتی ہے اور اُس صورتحال کی بھی منظر کشی کرتی ہے جس سے دونوں لشکر جنگ کے وقت دوچار تھے، مسلمان وادی کے ایک جانب تھے اور اس کا کنارہ مدینہ کے قریب تھا اور اس کی سرزمین نرم تھی، جس میں پاؤں اچھی طرح ٹھہرتے تھے اور اس میں پانی نہیں تھا، جبکہ کفار وادی کی دوسری جانب تھے جو مدینہ سے دور تھا اور اس کی زمین سخت تھی اور اس میں پانی تھا، اور ابوسفیان جس قافلۂ تجارت کو لے کر جا رہا تھا وہ ساحلِ سمندر کے قریب تھا۔

اللہ تعالیٰ نے غزوۂ بدر کے بارے میں جو تدبیر کی تھی اس آیت میں اس کی منظر کشی کی گئی ہے، یہ تدبیر اس لئے کی گئی تھی تاکہ اللہ کا فیصلہ نافذ العمل ہو جائے، اس طور پر کہ اس کا دین سربلند ہو، اللہ تعالیٰ نے ایسے اسباب فراہم کئے کہ جنگی صورتحال پیدا ہو گئی اور اہلِ ایمان کو فتح ونصرت مل گئی۔

دوسرا باب

نبی کریم ﷺ اور اہلِ ایمان معرکہ کارزار میں

۱: مرکزِ قیادت کی تعمیر:

جب نبی کریم ﷺ اور آپ ؐ کے اصحاب مشرکین کے پڑاؤ سے قریب ترین چشمہ پر ٹھہرے تو حضرت سعد بن معاذ ؓ نے رسول ﷺ کو مرکزِ قیادت کے طور پر اپنے لئے ایک چھپر بنانے کی تجویز دی، جو قیادت کا مرکز بھی ہوگا اور وہ دشمن سے حفاظت کا ذریعہ بھی بنے گا، حضرت سعد ؓ نے اپنی تجویز اس طرح پیش کی: ''اے اللہ کے نبی ؐ! کیوں نہ ہم آپ کے لئے ایک چھپر تعمیر کریں جس میں آپ تشریف رکھیں گے اور ہم آپ کے پاس آپ کی سواریاں بھی مہیار کھیں گے، اس کے بعد دشمن سے مقابلہ کریں گے، اگر اللہ نے ہمیں کامیاب کر کے عزت بخشی اور دشمن پر غلبہ عطا فرمایا تو یہی ہماری مطلوب و پسندیدہ چیز ہے، اور اگر دوسری صورت پیش آگئی تو آپ سوار ہو کر ہماری قوم کے ان لوگوں کے پاس جائیں گے جو ہمارے پیچھے رہ گئے ہیں، اے اللہ کے نبی ؐ! پیچھے رہنے والے لوگ ایسے ہیں کہ ہم آپ سے محبت کرنے اور چاہنے میں ان سے بڑھ کر نہیں ہیں، اگر انہیں یہ اندازہ ہوتا کہ آپ جنگ سے دوچار ہوں گے تو وہ ہرگز پیچھے نہ رہتے، اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ آپ کی حفاظت کرتا، وہ آپ کے ساتھ خیر خواہی کرتے اور آپ کے ساتھ جہاد کرتے۔ یہ سن کر اللہ کے رسول ﷺ نے ان کی تعریف فرمائی اور ان کے لئے دعائے خیر کی۔ اس کے بعد مسلمانوں نے رسول ﷺ کے لئے ایک اونچے ٹیلے پر چھپر بنایا جہاں سے پورا میدانِ جنگ نظر آتا تھا، اس میں آپ ؐ کے ساتھ حضرت ابو بکر ؓ اور نوجوانانِ انصار کا ایک دستہ حضرت سعد بن معاذ ؓ کی قیادت میں حفاظت اور نگرانی پر مامور تھا۔ (سیرت ابن ہشام: 2/272، الدلائل للبیہقی: 3/44)

مرکزِ قیادت کے لئے چھپر تعمیر کرنے سے مندرجہ ذیل اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں:

۱- یہ بات ضروری ہے کہ مرکزِ قیادت ایک ایسی جگہ ہو جہاں سے میدانِ جنگ نظر آتا ہو اور قائد و امیر معرکہ پر پوری نظر رکھ سکتا ہو اور احکام و اوامر دے سکتا ہو۔

۲- ضروری ہے کہ مرکز قیادت پُر امن اور محفوظ ہو اور وہاں حفاظت و نگرانی کا اچھا اہتمام کیا گیا ہو۔

۳- قائد کی زندگی کے بارے میں خیال رکھنا اور اس کو کسی بھی قسم کے خطرہ سے محفوظ رکھنا ضروری ہے۔

۴- ضروری ہے کہ قائد کے پاس ایک دوسری احتیاطی قوت بھی ہو جو معرکہ میں ہونے والے نقصانات کی تلافی کر سکتی ہو۔ (دیکھیں: تفسیر الآلوسی: 10/7)

۲: معرکہ سے پہلے مسلمانوں پر اللہ کے انعامات:

جنگ بدر کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے اپنے اہل ایمان بندوں پر جو انعامات کئے ان میں ایک انعام یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے دشمن سے مڈبھیڑ سے پہلے ان کے سکون و اطمئنان کے لئے ان پر نیند طاری کر دی اور بارش نازل کی، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِذْ يُغَشِّيكُمُ

ٱلنُّعَاسَ أَمَنَةً مِّنۡهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيۡكُم مِّنَ ٱلسَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُم بِهِۦ وَيُذۡهِبَ عَنكُمۡ رِجۡزَ ٱلشَّيۡطَٰنِ وَلِيَرۡبِطَ عَلَىٰ قُلُوبِكُمۡ وَيُثَبِّتَ بِهِ ٱلۡأَقۡدَامَ﴾ ترجمہ: ''اور وہ وقت جبکہ اللہ اپنی طرف سے غنودگی کی شکل میں تم پر اطمئنان و بے خوفی کی کیفیت طاری کر رہا تھا اور آسمان سے تمہارے اوپر پانی برسا رہا تھا، تاکہ تمہیں پاک کرے اور تم سے شیطان کی ڈالی ہوئی نجاست دُور کرے اور تمہاری ہمت بندھائے اور اس کے ذریعہ سے تمہارے قدم جمادے''۔(سورۃ الانفال: 11)

علامہ قرطبی فرماتے ہیں: یہ نیند اس رات میں آئی جس کی صبح جنگ ہونی تھی، یہ نیند عجیب معجزہ تھی، حالانکہ ان کے سامنے ایک اہم مہم تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں اطمئنان اور سکون پیدا کیا۔

حضرت علیؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں: جنگ بدر میں ہمارے درمیان کوئی شہسوار نہیں تھا سوائے مقدادؓ کے جو ایک چتکبرے گھوڑے پر سوار تھے، میں نے دیکھا کہ ہم میں ہر شخص سویا ہوا تھا سوائے رسول اللہ ﷺ کے۔ آپؐ ایک درخت کے نیچے نماز پڑھ رہے تھے اور رو رہے تھے، یہاں تک کہ صبح ہوگئی، اس رات میں اللہ کی طرف سے نیند کا انعام ملنے میں دو حکمتیں پوشیدہ ہیں:

۱: اس کے ذریعہ ان کے قویٰ دوسرے دن جنگ کرنے کے لئے آرام و راحت پائیں گے۔

۲: اللہ تعالیٰ نے نیند کے ذریعہ ان کے دلوں سے دشمنوں کا رعب اور خوف ختم کر کے امن عطا کیا، جیسے کہ معروف ہے کہ: "امن باعثِ نیند اور راحت ہے اور خوف بے خوابی کا ذریعہ ہے''۔(تفسیر القرطبی: 7/327)

اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ اس نے اہلِ ایمان پر ایسے وقت میں بارش نازل کر کے کرم کیا جس وقت عام طور پر بارش نہیں ہوتی تھی، یہ اللہ کی طرف سے خصوصی فضل و احسان تھا۔

امام رازیؒ فرماتے ہیں: ''طرزِ عمل سے یہ بات معلوم ہے کہ ایک صاحبِ ایمان جب ناپاکی کی حالت میں ہوتا ہے تو وہ گھن محسوس کرتا ہے، اور اس کو اگر غسل کرنے پر قدرت حاصل نہ ہو تو وہ مغموم ہوتا ہے، اور اس کی وجہ سے اس کا دل پریشان ہوتا ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو طہارت و پاکی پر قادر بنانے کو اپنے انعامات میں شمار کرایا ہے''۔(تفسیر رازی: 15/133)

"وَيُذۡهِبَ عَنكُمۡ رِجۡزَ ٱلشَّيۡطَٰنِ" کے ضمن میں امام جریرؒ نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ وہ فرماتے ہیں: جب آپ ﷺ بدر کی جانب نکلے تو آپؐ اور مسلمان ایسی جگہ ٹھہرے کہ ان کے درمیان اور پانی کے درمیان کافی ریت جمع تھی، مسلمانوں کو سخت کمزوری لاحق ہوئی اور شیطان نے ان کے دلوں کو پریشان کر دیا اور ان کے اندر یہ وسوسہ ڈالا کہ تم سمجھتے ہو کہ تم اللہ کے ولی ہو اور تمہارے درمیان اس کا رسول ہے، لیکن مشرکین نے تمہارے مقابلہ میں پانی پر قبضہ کر لیا ہے اور آپ لوگ حالتِ جنابت میں نماز پڑھ رہے ہو، اللہ تعالیٰ نے جب اچھی خاصی بارش نازل کی تو مسلمانوں نے پانی پیا اور پاکی بھی حاصل کی، اور ان سے شیطانی گندگی اور ناپاکی کو دور کر دیا اور ریت پر جب بارش پڑی تو وہ جم گئی اور لوگ اور جانور اس پر چلنے لگے اور پھر وہ دشمن کی طرف آگے بڑھے۔(تفسیر طبری: 9/195)

اللہ کے رسول ﷺ نے جنگ بدر میں اعدائے دین کے ساتھ جنگ کرنے کے سلسلہ میں ایک نیا طریقہ متعارف کرایا جو کہ اس سے پہلے معروف نہیں تھا، اللہ کے رسول ﷺ نے صف بندی کا نظام بنا کر قتال کیا، اس اسلوب کی جانب قرآن کریم نے اپنے اس قول میں

اشارہ کیا ہے: ﴿إِنَّ ٱللَّهَ يُحِبُّ ٱلَّذِينَ يُقَٰتِلُونَ فِي سَبِيلِهِۦ صَفًّا كَأَنَّهُم بُنۡيَٰنٌ مَّرۡصُوصٌ﴾ ترجمہ: "اللہ کو تو پسند وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں اس طرح صف بستہ ہو کر لڑتے ہیں گویا کہ وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں"۔(سورۃ الصف:4)

صفوں کے اس طریقہ کے مطابق مقاتلین نماز کی صفوں کی ہیئت پر کھڑے ہوں گے، یہ صفیں مقاتلین کی تعداد کے اعتبار سے کم زیادہ ہو سکتی ہیں، پہلی صفوں میں تیر انداز کھڑے ہوں گے تاکہ وہ مدّمقابل گھوڑ سواروں کے حملوں کو روک سکیں گے،اس کے بعد کی صفوں میں نیزے چلانے والے ہوں گے تاکہ وہ دشمنوں پر حملہ کرنے والوں کے لئے کمک کا کام کر سکیں، غزوۂ بدر میں اس اسلوب اور طریقہ کار کے مندرجہ ذیل فوائد حاصل ہوئے:

ا: دشمنوں پر رعب اور خوف بیٹھ گیا اور یہ معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے یہاں مرتب و منظم نظام ہے۔

۲: اس کے ذریعہ قائدِ اعلیٰ کے پاس احتیاطی قوت بھی رہی جس کے ذریعہ آپؐ نے اچانک پلٹ کر وار کرنے اور غیر متوقع کمک کو روکنے کا کام کیا،اسی طرح اس کے ذریعہ آپؐ نے پیدل اور شہسواروں کے خطرہ سے اپنے دستوں کو محفوظ کرنے کا کام کر لیا، غزوۂ بدر میں پہلی مرتبہ اس طرح کے اسلوب کو اختیار کر کے آپ ﷺ نے عسکری اعتبار سے سبقت حاصل کر لی، چودہ صدیوں سے اسلامی عسکری ادارہ کو دوسروں کے مقابلہ میں خصوصی طور پر یہ امتیاز حاصل ہے۔(دیکھیں: القیادت العسکریۃ، د-محمد الرشید، ص:401)

سیرتِ نبوی کا مطالعہ کرنے والے کے سامنے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنے مد مقابل کے سامنے بعض جدید جنگی اسالیب اچانک استعمال کرتے تھے، خاص طور پر کوئی ایسا طریقہ کار جو عربوں کے ہاں اس سے پہلے معروف نہ رہا ہو، جیسے کہ آپ ﷺ نے جنگِ بدر اور اُحد اور دیگر غزوات میں متنوع طریقے اختیار کئے۔

عربوں کے ہاں "کرّ وفرّ" پلٹ وار کا جنگی طریقہ رائج تھا، میجر جنرل محمود شیت خطاب نے جنگ کے دونوں طریقوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:"بے شک 'کرّ وفرّ' پلٹ وار اسلوب کے ذریعہ جنگ کا طریقہ یہ ہے کہ مقاتلین اپنی پوری قوت کے ساتھ دشمن پر حملہ آور ہوں، تیر انداز، تلواروں سے لڑنے والے، نیزہ باز، پیدل اور شہسوار سب یکبارگی حملہ کریں گے،اگر دشمن جما رہا، یا انہوں نے خود اپنے اندر کمزوری محسوس کی تو وہ پیچھے ہٹ جاتے ہیں،اس کے بعد پھر سے منظم ہو کر از سر نو پلٹ کر وار کرتے ہیں اور وہ اسی طرح گوریلا جنگ کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ یا تو کامیاب ہو جاتے ہیں یا پھر ناکام۔

صف بندی کے اسلوب کو اختیار کر کے جنگ کرنے کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ مقاتلین اپنی تعداد کے اعتبار سے دو تین یا زیادہ صفوں میں کھڑے ہوں گے، مسلمانوں کی اگلی صفوں میں مسلح تیر انداز ہوں گے تاکہ وہ شہسواروں کے حملوں کو روک سکیں،اس کے بعد کی دوسری صفوں میں نیزہ باز ہوں گے جو حملہ آور دشمن پر نیزوں سے وار کریں گے، تمام صفیں اپنے قائد کی قیادت و کنٹرول میں رہیں گی یہاں تک کہ گوریلا حملے کرنے والوں کی شدت و سختی ختم ہو جائے،اس کے بعد تمام صفیں دشمن پر حملہ کرنے کے لئے اور اس کو پیچھے ہٹانے کے لئے متحد و باہم متقارب ہو جائیں گی۔

میجر جنرل خطاب کا خیال ہے کہ صف بندی کا اسلوب کرّوفرّ (گوریلا) اسلوب سے اس اعتبار سے ممتاز و نمایاں ہے کہ اس میں ترتیب و تنظیم برقرار رہتی ہے اور ہمیشہ قائد کے پاس ایک احتیاطی قوت باقی رہتی ہے جس کے ذریعہ وہ غیر متوقع صورتحال کا مقابلہ کرتا ہے، جیسے کہ دشمن کے اچانک حملہ کو روکتا ہے یا کسی غیر متوقع کمک کا مقابلہ کرتا ہے، یا اپنے دستوں کو دشمن کے شہسواروں یا پیادہ حملہ آوروں سے بچاتا ہے اور پھر بوقتِ ضرورت اس احتیاطی قوت کے ذریعہ فتح و کامیابی حاصل کرلیتا ہے۔ (دیکھیں: غزوۃ بدر الکبری الحاسمۃ، محمود خطاب، ص: 23-24)

ابن خلدون نے جدید جنگی اسالیب کے بارے میں گفتگو کی ہے جن کو اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے معرکوں میں اختیار کیا اور جو عربوں کے ہاں معروف و رائج نہیں تھے، ابن خلدون اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ابتدائے اسلام میں دوبدو جنگ کا اسلوب اختیار کیا گیا اور عرب صرف کرّوفر (گوریلا) جنگ کے اسلوب سے واقف تھے۔ (مقدمہ ابن خلدون، ص: 273)

نبی کریم ﷺ کے ذریعہ متعارف کئے گئے اسالیب کے افضل و بہتر ہونے کو وہ اس طرح بیان کرتے ہیں: دو بدو قتال کا طریقہ کرّوفر (گوریلا) کے طریقہ سے زیادہ بہتر اور مفید ہے، اس لئے کہ دو بدو جنگ میں صفیں مرتب کی جاتی ہیں اور تیر کی طرح یا نماز کی صفوں کی طرح جنگ کی صفیں درست کی جاتی ہیں، وہ اپنی صفوں کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے دشمنوں کی طرف چلتے ہیں، اس لئے قتال کے وقت وہ زیادہ ثابت قدمی کا باعث ہوں گی، قتال میں مخلصانہ طرزِ عمل اختیار کرنے کا ذریعہ بنیں گی اور دشمنوں کے لئے باعثِ رعب بنے گی، اس لئے کہ وہ ایک پھیلی ہوئی دیوار کی طرح یا مضبوط قلعہ کی مانند ہوتی ہے جس کو زائل کرنے کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا ہے۔ (مقدمہ ابن خلدون، ص: 271)

عسکری نقطۂ نظر سے یہ اسالیب اور طریقہائے کار رسول اللہ ﷺ کی شخصیت اور آپؐ کی عسکری فنی مہارت کو تسلیم کرنے کی دلیل فراہم کرتے ہیں، اس لئے کہ اللہ کے رسول ﷺ عسکری اعتبار سے جو بھی ہدایات دیتے تھے وہ مکمل طور پر اسلحہ کے استعمال کے جدید اصولوں کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ (المدخل الی العقیدۃ والاستراتیجیۃ العسکریۃ، محمد محفوظ، ص: 121)

اس کی تفصیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے دفاعی اسلوب اختیار کیا اور آپؐ نے قریش کی قوت پر حملہ نہیں کیا اور آپ ﷺ کی جن ہدایات کو آپؐ کے سپاہیوں نے پوری باریک بینی کے ساتھ نافذ کیا وہ دشمن کے مرکز کو اور ان کو نفسیاتی طور پر کمزور کرنے کا سبب بنتی تھیں، اس طرح سے اللہ کی توفیق و مدد سے آپ ﷺ نے اپنے دشمن کے مقابلہ میں واضح کامیابی حاصل کی، حالانکہ آپؐ کا دشمن ۱-۳ کی نسبت سے آپ کے مقابلہ میں فائق و بہتر تھا، اللہ کے رسول ﷺ ہر موقع پر اس وقت کے تقاضے اور مصلحت کے اعتبار سے عمل کرتے تھے، اس لئے کہ ہر جگہ اور ہر وقت کے تقاضے اور حالات مختلف ہوتے ہیں، اللہ کے رسول ﷺ نے عسکری اعتبار سے توجیہی قیادت کا اسلوب صحیح طریقہ سے منطبق کیا، جہاں تک تعلق ہے بدر میں اقناعی (مطمئن کرنے کے) اسلوب کے اختیار کرنے کا تو یہ اسلوب واضح طور پر ان تمام مقامات میں نظر آتا ہے جن میں آپ ﷺ نے دوسروں سے مشورہ لینے کا طریقہ اختیار کیا، اس لئے کہ آپ ﷺ صرف طاقت و قوت کا استعمال کرکے اپنے لشکر کی قیادت نہیں کرتے تھے بلکہ آپؐ صلاحیت و اعتماد کی بنیاد پر قیادت کرتے تھے، اسی طرح آپؐ اپنی رائے کو ہی

حرف آخر نہیں سمجھتے تھے بلکہ شوریٰ کے اصول پر عمل کرتے تھے اور اس رائے کو اختیار فرماتے تھے جو بہتر معلوم ہوتی تھی، اللہ کے رسول ﷺ نے غزوۂ بدر میں توجیہی قیادت کا اسلوب اختیار فرمایا جس کا اظہار کئی امور میں ہوتا ہے، ان میں سے چند امور مندرجہ ذیل ہیں:

۱: آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو حکم دیا کہ دشمنوں پر اس وقت تیر چلائیں جب وہ ان سے قریب ہوں، اس لئے کہ اس حالت میں تیر کے نشانہ پر لگنے کا زیادہ امکان ہے، آپ ﷺ نے فرمایا تھا: ''اگر یہ لوگ آپ کے قریب آئیں تو ان کو تیر سے زخمی کرو''۔ (سیرت ابن ہشام: 2/278، الدلائل للبیہقی: 3/81)

۲: آپ ﷺ نے تلواروں کو اس وقت تک نیام سے باہر نکالنے سے منع فرمایا یہاں تک کہ صفیں ایک دوسرے سے مل نہ جائیں، آپؐ نے فرمایا: ''اس وقت تک تلواروں کو نیام سے باہر مت نکالنا یہاں تک کہ وہ تمہارے بالکل قریب نہ آجائیں''۔ (سنن ابوداؤد: 2664)

۳: آپ ﷺ نے تیر اندازی میں میانہ روی اختیار کرنے کا حکم دیا تھا، آپؐ نے فرمایا: ''اپنے تیروں کو بچانے کی کوشش کرنا''۔ (صحیح بخاری: 3984، 3985، سنن ابوداؤد: 2663)

جب ان جنگی ہدایات کا موازنہ موجودہ دفاعی اصولوں کے ساتھ کیا جاتا ہے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے بہت پہلے ان پر عمل کیا ہے، حالانکہ آپؐ نے اس سلسلہ میں کسی کے سامنے زانوئے تلمذ اختیار نہیں کیا تھا اور نہ ہی کسی ملٹری اکیڈمی میں داخلہ لیا تھا۔

جنگ کے دوران فطری ماحول سے استفادہ:

اللہ کے رسول ﷺ نے دشمن سے جنگ کے دوران فطری ماحول سے فائدہ اٹھانے میں پس و پیش سے کام نہیں لیا، بلکہ آپؐ میدانِ جنگ کے تمام حالات، ماحول اور چیزوں کو اپنے لشکر کی مصلحت کے لئے استعمال کرتے تھے، اس کی واضح مثال بدر کے دن قتال شروع ہونے سے پہلے کا طرزِ عمل ہے، مقریزی فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ قریش کے پہنچنے سے پہلے ہی صبح کے وقت بدر پہنچ گئے تو سورج اس حال میں طلوع ہوا جبکہ آپؐ مسلمانوں کی صف بندی کر رہے تھے، آپؐ نے مغرب کی جانب اپنا رخ کیا اور سورج کو اپنے پیچھے رکھا اور سورج مشرکین کے سامنے رہا۔ (دیکھیں: القیادۃ العسکریۃ، ص: 453)

اس طرزِ عمل سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کس طرح بہتر انداز سے تدبیر فرماتے تھے اور ہر چیز سے استفادہ کرتے تھے، یہاں تک کہ فطری ماحول کو بھی اپنے حق میں استعمال کرتے تھے، اللہ کے رسول ﷺ نے بدر کے دن جو کچھ کیا اس میں اس بات کا اشارہ موجود ہے کہ سورج، ہوا، جغرافیائی نشیب و فراز جیسی فطری چیزوں کا معرکوں میں فتح و شکست کے حوالے سے عظیم اثر ہے، یہ وہ اسباب ہیں جن کو اختیار کرنے کا اللہ تعالیٰ نے ہم سے مطالبہ کیا ہے تاکہ نصرت و مدد کا حصول ہو سکے۔

حضرت سوّاد بن غزیہ صفوں میں:

اللہ کے رسول ﷺ بدر میں صفیں درست فرما رہے تھے تاکہ وہ سیدھی اور ایک دوسرے سے ملی ہوئی رہیں، آپؐ کے ہاتھ میں ایک تیر تھا جس میں آگے کا پھل نہیں تھا، اس کے ذریعہ آپؐ صفیں درست فرما رہے تھے، آپ ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا جن کا نام سواد

بن غزیہ تھا، وہ صف سے کچھ آگے نکلے ہوئے تھے، آپؐ نے ان کے پیٹ پر تیر سے ہلکے سے مارتے ہوئے فرمایا: اے سواد! سیدھے ہو جاؤ! انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ! آپ نے مجھے تکلیف پہنچائی ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو حق اور عدل کے ساتھ بھیجا ہے لہذا مجھے بدلہ لینے دیجئے، آپ ﷺ نے اپنا پیٹ کھولا اور فرمایا: بدلہ لے لو! فوراً حضرت سوادؓ آپؐ سے چمٹ گئے اور آپؐ کے پیٹ کو چومنے لگے، آپؐ نے پوچھا: اے سواد! آپ نے ایسا کیوں کیا؟ انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ! جو کچھ درپیش ہے آپ دیکھ ہی رہے ہیں، اس لئے میں نے چاہا کہ آپ کے ساتھ آخری ملاقات اس طرح ہو کہ میری جلد آپ کی جلد کے ساتھ مس ہو، اس پر رسول اللہ ﷺ نے ان کے حق میں دعائے خیر فرمائی۔ (سیرت ابن ہشام: 2/278-279)

حضرت سوادؓ کے واقعہ سے چند اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

۱: اسلام میں نظام کی کتنی اہمیت ہے۔

۲: مطلق عدل وانصاف؛ چنانچہ آپ ﷺ نے اپنی ذات سے بدلہ لینے کا حق اور اختیار دیا۔

۳: ایک سپاہی کو اپنے قائد سے کس قدر محبت تھی۔

۴: موت اور شہادت کو یاد کرنا۔

۵: اللہ کے رسول ﷺ کا جسدِ اطہر مبارک ہے اور اس کو مس کرنا باعثِ برکت ہے، اسی لئے حضرت سوادؓ کو اس کا شوق تھا۔

۶: مرد کا پیٹ ستر نہیں ہے، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے پیٹ کو کھولا، اگر وہ ستر ہوتا تو کبھی نہ کھولتے۔ (دیکھیں: غزوۃ بدر الکبریٰ، اُبو فارس، ص: 52)

<u>نبی کریم ﷺ کا صحابہ کرام کو قتال کی ترغیب دینا:</u>

اللہ کے رسول ﷺ اپنے اصحاب کی تربیت اس انداز سے کرتے تھے کہ وہ ایسے عزم وارادہ کے حامل بن جائیں جو پہاڑوں کی طرح مضبوط و مستحکم، قوی اور راسخ ہو، آپ ﷺ ان کے دلوں کو شجاعت و بہادری، جرأت اور دشمنوں کے مقابلہ میں نصرت وفتح کے جذبات سے بھر دیتے تھے، اس قوی عزم وارادہ کی تشکیل میں آپ ﷺ ترغیب وترہیب کا اسلوب اختیار کرتے تھے، صبر وثبات کے حامل مجاہدین کو اجر وثواب کی ترغیب دیتے تھے اور میدانِ جنگ سے فرار اختیار کرنے سے ڈراتے تھے، اسی طرح آپ ﷺ ان کے سامنے نصرت وفتح کے عوامل واسباب بیان فرماتے تھے تاکہ وہ ان کو اختیار کریں اور ان کا اہتمام کریں، اور آپؐ ان کو شکست وہزیمت کے اسباب وعوامل سے ڈراتے تھے تاکہ وہ ان سے اجتناب کریں۔ (دیکھیں: المدرسۃ النبویۃ العسکریۃ، ابو فارس، ص: 140)

اللہ کے رسول ﷺ اپنے اصحاب کو قتال کی ترغیب دیتے تھے اور اس پر ان کو ابھارتے تھے، اللہ تعالیٰ کے اس قول پر عمل کرتے تھے: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِيُّ حَرِّضِ ٱلْمُؤْمِنِينَ عَلَى ٱلْقِتَالِ﴾ ترجمہ: ''اے نبیؐ، مومنوں کو جنگ پر اُبھارو''۔ (سورۃ الانفال: 65) اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿فَقَـٰتِلْ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ لَا تُكَلَّفُ إِلَّا نَفْسَكَ ۚ وَحَرِّضِ ٱلْمُؤْمِنِينَ ۖ عَسَى ٱللَّهُ أَن يَكُفَّ

بَأْسَ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ ۚ وَٱللَّهُ أَشَدُّ بَأْسًا وَأَشَدُّ تَنكِيلًا﴾ ترجمہ: ''پس اے نبیؐ! تم اللہ کی راہ میں لڑو، تم اپنی ذات کے سوا کسی اور کے لئے ذمہ دار نہیں ہو، البتہ اہلِ ایمان کو لڑنے کے لئے ابھارو، بعید نہیں کہ اللہ کافروں کا زور توڑ دے، اللہ کا زور سب سے زیادہ زبردست اوراس کی سزا سب سے زیادہ سخت ہے''۔(سورۃ النساء:84)

غزوۂ بدر میں اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے اصحاب سے فرمایا: اٹھو ایک ایسی جنت کی طرف جس کی وسعت آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔ یہ سن کر حضرت عمیر بن حمام انصاریؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! ایسی جنت جس کی وسعت آسمانوں اور زمین کے برابر ہے؟! آپؐ نے فرمایا: ہاں! انہوں نے کہا: بخ بخ! (واہ کیا بات ہے! کیا کہنے ؟!) آپ ﷺ نے فرمایا: یہ ''بخ بخ'' آپ نے کیوں کہا؟ انہوں نے عرض کیا: کوئی خاص بات نہیں! اے اللہ کے رسولؐ! میں نے صرف اس امید میں کہا کہ میں بھی اہلِ جنت میں سے ہو جاؤں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: آپ اہلِ جنت میں سے ہو۔ یہ سن کر انہوں نے اپنے ترکش سے چند کھجوریں نکالی اور کھانے لگے، پھر کہنے لگے: اگر میں یہ کھجوریں کھانے تک زندہ رہا تو یہ تو بہت لمبی زندگی ہو گی، انہوں نے باقی ماندہ کھجوریں پھینک دیں اور لڑتے رہے، یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔ (صحیح مسلم:1901)

ایک اور روایت میں ہے حضرت انسؓ فرماتے ہیں: انہوں نے اپنے پاس موجود کھجوریں پھینک دیں اور لڑنا شروع کیا اور وہ کہہ رہے تھے:

رَكْضًا إِلَى اللّٰهِ بِغَيْرِ زَادِ ... إِلَّا التُّقَى وَعَمَلِ الْمَعَادِ

وَالصَّبْرِ فِي اللّٰهِ عَلَى الْجِهَادِ ... وَكُلُّ زَادٍ عُرْضَةُ النَّفَادِ

غَيْرَ التُّقَى وَالْبِرِّ وَالرَّشَادِ

ترجمہ: ''تقویٰ اور عملِ آخرت کے علاوہ ہر زادِ راہ سے آزاد ہو کر اللہ کی طرف بڑھے چلو! اور اللہ کے راستے میں جہاد کرتے ہوئے صبر کا زادِ راہ اختیار کرو، تقویٰ، نیکی اور بھلائی کے سوا ہر زادِ راہ ختم ہونے والا ہے''۔

یہ اشعار پڑھ کر انہوں نے قتال کیا یہاں تک کہ شہادت سے سرفراز ہو گئے۔ (دیکھیں: صفۃ الصفوۃ 488/1، زاد المعاد: 3/182)

معنوی اور نفسیاتی طور پر صحابہ کرام کے حوصلوں کو بلند کرنے کے لئے آپ ﷺ ان کو مشرک سرداروں کے قتل ہونے کی خوشخبری سناتے تھے اور ان کے مزید اطمئنان قلبی کے لئے ان میں سے ہر ایک کے قتل ہونے کی جگہ کی بھی تعیین فرماتے، اسی طرح اہلِ ایمان کو قتال شروع ہونے سے پہلے ہی نصرت و کامیابی کی خوشخبری سناتے ہیں، آپ ﷺ نے حضرت ابو بکرؓ سے فرمایا: ابو بکر! خوشخبری حاصل کرو! اللہ کے رسول ﷺ صحابہ کرام سے فرمانے لگے: اس ذات کی قسم! جس کے قبضہ میں محمدؐ کی جان ہے! جو بھی آج ان کے ساتھ قتال کرے گا اور پھر شہید کیا جائے گا اس حال میں کہ وہ صبر واحتساب کی نیت سے لڑے، پیش قدمی کرتا رہے، پشت نہ دکھائے، تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل کرے گا۔ (سیرت ابن ہشام: 2/279)

اللہ کے رسول ﷺ مسلمانوں سے اس بات کا مطالبہ کرتے تھے کہ ان میں سے کوئی اس وقت تک پیش قدمی نہ کرے جب تک کہ آپؐ اس کے ساتھ نہ ہوں، حضرت انسؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں :.......اللہ کے رسول ﷺ اور آپؐ کے اصحاب نکلے یہاں تک کہ مشرکین سے پہلے بدر پہنچ گئے اور مشرکین اس کے بعد آئے، آپؐ نے فرمایا: تم میں سے کوئی اس وقت تک کسی بھی چیز کے لئے آگے نہ بڑھے یہاں تک کہ میں اس کے ساتھ نہ ہوں، چنانچہ مشرکین جب قریب آگئے تو اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''اٹھو ایک ایسی جنت کی طرف جس کی وسعت آسمانوں اور زمین کے برابر ہے''۔(صحیح مسلم: 1901)

اس معنوی اور نفسیاتی حوصلہ افزائی کا صحابہ کرام اور بعد میں آنے والے تمام مخلص اہلِ ایمان پر اہم اور مفید اثرات مرتب ہوئے۔ (دیکھیں: المدرسۃ العسکریۃ الاسلامیہ، ابو فارس، ص 143)

آپؐ کی دعا اور آہ وزاری:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿إِذۡ تَسۡتَغِيثُونَ رَبَّكُمۡ فَٱسۡتَجَابَ لَكُمۡ أَنِّي مُمِدُّكُم بِأَلۡفٖ مِّنَ ٱلۡمَلَٰٓئِكَةِ مُرۡدِفِينَ﴾ ترجمہ: ''اور وہ موقع یاد کرو جبکہ تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے، جواب میں اس نے فرمایا کہ میں تمہاری مدد کے لئے پے در پے ایک ہزار فرشتے بھیج رہا ہوں''۔(سورۃ الانفال: 9)

جب اللہ کے رسول ﷺ نے اسلامی لشکر کی صفیں منظم کیں اور ان کو ہدایات و تعلیمات اور قتال و جہاد کی ترغیب دی تو آپ ﷺ مرکزِ قیادت کے لئے بنائے گئے چھپر کی طرف واپس گئے، آپ ﷺ کے ساتھ آپؐ کے رفیق حضرت ابو بکرؓ بھی تھے، اور حضرت سعد بن معاذؓ پہرہ کے لئے چھپر کے دروازہ پر تھے، انہوں نے اپنی تلوار بے نیام کی ہوئی تھی، اللہ کے رسول ﷺ اپنے رب کی طرف متوجہ ہوئے، اللہ سے دعا کر رہے تھے اور نصرت کے لئے پکار رہے تھے، اپنی دعا میں آپ ﷺ فرما رہے تھے: اے اللہ: تونے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے اس کو پورا فرما۔ اے اللہ! مجھے عطا فرما جو تونے مجھ سے وعدہ کیا ہے۔ اے اللہ! اہلِ اسلام پر مشتمل اس جماعت کو اگر تونے ہلاک کر دیا تو زمین میں پھر تیری عبادت نہیں کی جائے گی۔ آپ ﷺ مسلسل اپنے رب کو پکارتے رہے، آپؐ قبلہ کی جانب متوجہ ہو کر اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے تھے یہاں تک کہ آپؐ کے شانوں سے آپؐ کی چادر گر گئی، آپؐ کے پاس حضرت ابو بکرؓ آئے، انہوں نے آپؐ کی چادر پکڑی اور اس کو آپؐ کے کندھوں پر ڈال دیا، اور آپؐ کو پیچھے سے چمٹا کر فرمایا: اے اللہ کے نبیؐ! رب کے سامنے آہ وزاری اور پکار اب کافی ہے، یقیناً وہ آپ سے کئے ہوئے وعدہ کو پورا کرے گا۔(صحیح مسلم: 1763، سنن ابوداؤد: 2690، سنن ترمذی: 3081، مسند احمد: 1/30) اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل کیں: ﴿إِذۡ تَسۡتَغِيثُونَ رَبَّكُمۡ فَٱسۡتَجَابَ لَكُمۡ﴾

حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بدر کے دن فرمایا: اے اللہ! میں آپ کو آپ کے عہد اور وعدہ کا واسطہ دیتا ہوں، اے اللہ! اگر تو چاہے تو پھر تیری عبادت نہ ہو، یہ سن کر حضرت ابو بکرؓ نے آپ ﷺ کا دستِ مبارک پکڑ کر کہا: آپ کے لئے اب

کافی ہے، اس کے بعد رسول اللہ ﷺ باہر تشریف لائے اور آپ یہ آیت تلاوت فرما رہے تھے: ﴿سَيُهْزَمُ ٱلْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ ٱلدُّبُرَ﴾ (مسند أحمد: 1/329، الدلائل للبيهقي: 3/50)

ابن اسحاقؒ نے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اے اللہ! یہ قریش کے لوگ اپنے غرور و تکبر اور فخر کے ساتھ تجھ سے جنگ کرنے کے لئے آئے ہیں، وہ تیرے رسول کی تکذیب کرتے ہیں، اے اللہ! تجھ سے مدد کی درخواست ہے جس کا تو نے مجھ سے وعدہ کیا ہے، اے اللہ! کل صبح ان کو ہلاک کر دے۔ (سیرت ابن ہشام: 2/273، الدلائل للبیہقی: 3/110)

یہ ہر قائد، حاکم، لیڈر اور ہر فرد کے لئے ایک اہم ربانی درس ہے کہ وہ نفس کو ہر قسم کی آلائش اور ذاتی مفاد سے خالص کر کے صرف ایک اللہ کی طرف رجوع کرے، اسی کے سامنے سجدہ ریز ہو کر اسی کے سامنے اپنی جبینِ نیاز جھکائے، تاکہ اللہ کی طرف سے نصرت و مدد کا نزول ہو، اللہ کے رسول ﷺ کا یہ منظر اس کے قلب و وجدان میں مستحضر رہے، جبکہ آپ ﷺ اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے ہیں، آپؐ کے شانوں سے چادر اتر جاتی ہے اور آپ ﷺ اللہ سے استغاثہ کر رہے ہیں، ایک قائد و رہبر بھی اسی طرزِ عمل کو اس طرح کے حالات اور اس طرح کے مقامات پر اختیار کرے جبکہ اس کو کوئی ذمہ داری سونپی جائے اور اس پر قیادت کا بوجھ ڈالا جائے۔ (دیکھیں: التربیۃ القیادیۃ: 3/36)

<u>﴿وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ ٱللَّهَ رَمَىٰ﴾:</u>

جب اللہ کے رسول ﷺ نے چھپر میں رب سے دعا و استغاثہ کیا تو اس کے بعد آپ ﷺ چھپر سے باہر تشریف لے آئے، آپؐ نے مٹھی بھر مٹی لی اور اس کو مشرکین کے چہرے کی طرف پھینکا اور آپؐ نے فرمایا: "شاهت الوجوه" (چہرے بگڑ جائیں)۔
اس کے بعد آپؐ نے اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ اس کے فوراً بعد حملہ کر دیں، انہوں نے ایسا ہی کیا، اللہ تعالیٰ نے اس مٹی کو مشرکین کی آنکھوں تک پہنچایا، ان میں سے ہر ایک کو وہ مٹی آنکھوں میں داخل ہوئی، جس کی وجہ سے وہ آس پاس کے ماحول سے بے خبر ہو گیا، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ ٱللَّهَ رَمَىٰ﴾ ترجمہ: "پس حقیقت یہ ہے کہ تم نے نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا"۔ (سورۃ الانفال: 17)

قابلِ غور بات یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے مادی اور معنوی تمام اسباب اختیار کئے اور اللہ پر توکل و بھروسہ کیا جس کی وجہ سے اللہ کی طرف سے نصرت و تائید حاصل ہو گئی، چنانچہ بدر میں ممکنہ استطاعت کے بقدر اسباب اختیار کرنے کے ساتھ ربانی توفیق بھی شامل رہی، جس کی وجہ سے نصرت کے تمام اسباب مکمل طور پر فراہم ہو گئے اور ساتھ ہی ساتھ خرقِ عادت اور غیبی ربانی تائید بھی ہمرکاب رہی، اسبابِ دنیا کے اعتبار سے جغرافیائی حالات، موسم اور ماحول کا جائزہ، قیادت کی موجودگی اور اس پر مکمل اعتماد و بھروسہ اور معنوی روح عسکری فیصلہ لینے میں اہم رول ادا کرتے ہیں، بدر کی سرزمین مسلمانوں کے حق میں سازگار تھی، موسم بھی معرکہ کے لئے مناسب و موزوں تھا، اعلیٰ قیادت بنفس نفیس موجود تھی، قیادت پر مکمل اعتماد اور بھروسہ تھا، معنوی روح انتہائی بلند تھی، ان میں سے بعض چیزیں براہِ راست من

جانب اللہ تھیں، جبکہ بعض رسول اللہ ﷺ کی حکمتِ عملی کا نتیجہ تھیں، لہذا ظاہری اسباب کے ساتھ ساتھ اللہ کی توفیق بھی شامل ہوگئی اور اس پر مستزاد یہ بھی ہوا کہ اللہ کی طرف سے غیبی اور خرقِ عادت تائید حاصل ہوتی رہی، جس کی وجہ سے نصرت و کامیابی اور فتح و کامرانی اہلِ ایمان کا مقدر بن گئی، یہ رہتی دنیا تک ایک نمونہ ہے کہ جب فوج اور قیادت کی نیتوں میں اخلاص ہو، اللہ کے حکم پر استقامت پائی جائے اور ظاہری اور معنوی اسباب اختیار کئے جائیں تو پھر اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کو اپنے فضل سے نوازتا ہے۔(دیکھیں: الأساس فی السنۃ وفقہ ھا، ال سیرۃ النبویۃ، سعید حوی: 1/474)

....

تیسرا باب
معرکہ آرائی اور مشرکین کی شکست

مسلمانوں اور مشرکین کے مابین فرداً فرداً مبارزت کے ذریعہ معرکہ آرائی کا آغاز ہوا، مشرکین کے کیمپ سے عتبہ بن ربیعہ، اس کا بھائی شیبہ بن ربیعہ اور اس کا بیٹا ولید نکلا، انہوں نے دعوتِ مبارزت دی تو ان کے مقابلہ کے لئے تین انصار صحابہ نکلے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے ان تینوں کو واپس کیا، اس لئے کہ آپؐ نے چاہا کہ ان کا مقابلہ آپؐ کے گھرانے کے افراد اور قرابت دار کریں، اسی لئے آپؐ نے فرمایا: اے عبیدہ بن حارثؓ! اٹھو! اے حمزہؓ! اٹھو! اور اے علیؓ! آپ اٹھو! حضرت حمزہؓ نے شیبہ سے مقابلہ کیا تو اس کو قتل کر دیا، حضرت علیؓ نے ولید سے مقابلہ کیا اور اس کو تہہ تیغ کر دیا اور حضرت عبیدہ بن حارثؓ نے عتبہ سے مقابلہ کیا تو ان میں سے ہر ایک نے ایک دوسرے پر قاتلانہ وار کیا اور حضرت حمزہؓ اور حضرت علیؓ نے بھی پلٹ کر عتبہ پر حملہ کیا اور دونوں نے اس کو واصل جہنم کر دیا۔ اس کے بعد وہ دونوں حضرت عبیدہؓ کو لے کر رسول ﷺ کے پاس آئے لیکن جلد ہی وہ زخموں کی تاب نہ لائے اور جامِ شہادت نوش کیا۔ (دیکھیں: سنن ابو داؤد: 2665، المستفاد من قصص القرآن: 2/126)

انہی چھ افراد کے بارے میں اللہ تعالی نے یہ آیت نازل کی ہے: ﴿هَٰذَانِ خَصْمَانِ ٱخْتَصَمُوا۟ فِى رَبِّهِمْ ۖ فَٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّن نَّارٍ يُصَبُّ مِن فَوْقِ رُءُوسِهِمُ ٱلْحَمِيمُ ﴿١٩﴾ يُصْهَرُ بِهِۦ مَا فِى بُطُونِهِمْ وَٱلْجُلُودُ ﴿٢٠﴾ وَلَهُم مَّقَٰمِعُ مِنْ حَدِيدٍ ﴿٢١﴾ كُلَّمَآ أَرَادُوٓا۟ أَن يَخْرُجُوا۟ مِنْهَا مِنْ غَمٍّ أُعِيدُوا۟ فِيهَا وَذُوقُوا۟ عَذَابَ ٱلْحَرِيقِ ﴿٢٢﴾ إِنَّ ٱللَّهَ يُدْخِلُ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَعَمِلُوا۟ ٱلصَّٰلِحَٰتِ جَنَّٰتٍ تَجْرِى مِن تَحْتِهَا ٱلْأَنْهَٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِن ذَهَبٍ وَلُؤْلُؤًا ۖ وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ ﴿٢٣﴾ وَهُدُوٓا۟ إِلَى ٱلطَّيِّبِ مِنَ ٱلْقَوْلِ وَهُدُوٓا۟ إِلَىٰ صِرَٰطِ ٱلْحَمِيدِ ﴿٢٤﴾﴾ ترجمہ: "یہ دو فریق ہیں جو اپنے رب کے معاملہ میں جھگڑتے ہیں، پھر جو منکر ہیں ان کے لئے آگ کے کپڑے قطع کئے گئے ہیں، ان کے سروں پر کھولتا ہوا پانی ڈالا جائے گا جس سے جو کچھ ان کے پیٹ میں ہے اور کھالیں جھلس دی جائیں گی، اور ان پر لوہے کے گرز پڑیں گے، جب گھبرا کر وہاں سے نکلنا چاہیں گے تو اسی میں لوٹا دیئے جائیں گے، اور دوزخ کا عذاب چکھتے رہو۔ بے شک اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہاں انہیں سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے، اور وہاں ان کا لباس ریشمی ہوگا اور انہوں نے عمدہ بات کی راہ پائی، اور تعریف والے اللہ کی راہ پائی"۔ (سورۃ الحج: 19-24)

جب مشرکین نے دیکھا کہ مبارزت کے لئے نکلنے والے تینوں تہہ تیغ ہو چکے ہیں تو وہ غصہ کی وجہ سے بپھر گئے اور انہوں نے مسلمانوں پر عمومی حملہ کر دیا جس کے سامنے مسلمان ڈٹے رہے، صبر وثبات کے کوہِ گراں بن کر رہے، اور اپنی دفاعی پوزیشن پر برقرار رہے، وہ ان پر تیر اندازی کر رہے تھے، جیسے کہ نبی کریم ﷺ نے ان کو حکم دیا تھا، اس وقت مسلمانوں کا شعار (کوڈورڈ) "أحد أحد" تھا، اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے ان کو بھی پلٹ کر وار کرنے کا حکم دے دیا، آپ ﷺ ان کو قتال پر ابھار رہے تھے اور فرما رہے تھے: ٹوٹ پڑو

ان پر" اور جو صبر واحتساب کے ساتھ شہید ہوتا تو اس کے لئے جنت کا وعدہ کرتے، مسلمانوں کے نشاط و سرگرمی اور جنگ کے لئے آمادہ ہونے میں اللہ کے رسول ﷺ کے اس فرمان نے کلیدی کردار ادا کیا: ﴿سَيُهۡزَمُ ٱلۡجَمۡعُ وَيُوَلُّونَ ٱلدُّبُرَ﴾ ترجمہ: "عنقریب یہ جتھا شکست کھا جائے گا اور یہ سب پیٹھ پھیر کر بھاگتے نظر آئیں گے"۔ (سورۃ القمر: 45) اسی طرح ان کو اس بات کا یقین واحساس تھا کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کے ذریعہ ان کی مدد کرے گا، مشرکین کی تعداد مسلمانوں کی نگاہوں میں قلیل معلوم ہو رہی تھی، اللہ کے رسول ﷺ کو وہ دیکھ رہے تھے کہ آپ ذرہ پہن کر پیش پیش ہیں اور مشرکین سے زیادہ قریب آپ کے مقابلہ میں اور کوئی نہیں تھا، آپ فرما رہے تھے: ﴿سَيُهۡزَمُ ٱلۡجَمۡعُ وَيُوَلُّونَ ٱلدُّبُرَ﴾ (دیکھیں: الرحیق المختوم، ص: 116،118)

اللہ کے رسول ﷺ نے جنگ بدر کی رات میں خواب میں دیکھا تھا کہ مشرکین کی تعداد قلیل ہے اور آپؐ نے اس خواب کا ذکر صحابہ کرام سے بھی کیا تھا جس سے انہوں نے خوشخبری حاصل کی تھی، اِرشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَإِذۡ يُرِيكُمُوهُمۡ إِذِ ٱلۡتَقَيۡتُمۡ فِيٓ أَعۡيُنِكُمۡ قَلِيلٗا وَيُقَلِّلُكُمۡ فِيٓ أَعۡيُنِهِمۡ لِيَقۡضِيَ ٱللَّهُ أَمۡرٗا كَانَ مَفۡعُولٗاۗ وَإِلَى ٱللَّهِ تُرۡجَعُ ٱلۡأُمُورُ﴾ ترجمہ: "اور یاد کرو وہ وقت جبکہ اے نبیؐ، خدا اُن کو تمہارے خواب میں تھوڑا دکھا رہا تھا، اگر کہیں وہ تمہیں اُن کی تعداد زیادہ دکھا دیتا تو ضرور تم لوگ ہمت ہار جاتے اور لڑائی کے معاملہ میں جھگڑا شروع کر دیتے، لیکن اللہ ہی نے اِس سے تمہیں بچایا، یقیناً وہ سینوں کا حال تک جانتا ہے۔ اور یاد کرو جب کہ مقابلہ کے وقت خدا نے تم لوگوں کی نگاہوں میں دشمنوں کو تھوڑا دکھایا اور ان کی نگاہوں میں تمہیں کم کر کے پیش کیا، تاکہ جو بات ہونی تھی اُسے اللہ ظہور میں لے آئے، اور آخر کار سارے معاملات اللہ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں"۔ (سورۃ الانفال: 44)

اس میں حکمت کا پہلو یہ ہے کہ اس کے ذریعہ مسلمانوں کے اندر مزید ثابت قدمی اور نشاط و سرگرمی پیدا ہوگئی، مشرکین کے ساتھ قتال کرنے کے لئے ان کا حوصلہ مزید بڑھ گیا اور ان کے دلوں سے دشمن کا خوف ختم ہوگیا، اسی طرح مشرکین کی نگاہوں میں مسلمانوں کی تعداد قلیل دکھانے میں یہ حکمت ہے کہ جب وہ ان کو کم تعداد میں دیکھیں گے تو وہ ان کے ساتھ قتال کرنے کے لئے آگے بڑھیں گے، نہ ان کے اندر خوف ہوگا اور نہ ہی ان کو کوئی پرواہ اور نہ ہی ان کے بارے میں احتیاط برتیں گے، اس لئے وہ تیاری کے ساتھ اور سنجیدگی کے ساتھ قتال نہیں کریں گے اور جب عملی طور پر ان کو جنگ میں سامنا کرنا پڑے گا تو اچانک وہ ان کو زیادہ تعداد میں دیکھیں گے تو حیران و پریشان ہو جائیں گے اور ان کی ساری طاقت و قوت ڈھیر ہو جائے گی، جب وہ خلافِ توقع ان کی تعداد دیکھیں گے تو یہی چیز ان کی ناکامی اور مسلمانوں کی فتح و کامیابی کا سبب بنے گی۔ (دیکھیں: تفسیر زمخشری: 2/225، تفسیر ابن کثیر: 2/315)

ا: فرشتوں کے ذریعہ مسلمانوں کی مدد:

قران کریم کے نصوص اور سنت نبویہ اور متعدد بدری صحابہ کی روایات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کے دلوں میں رعب ڈال دیا تھا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِذۡ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى ٱلۡمَلَٰٓئِكَةِ أَنِّي مَعَكُمۡ فَثَبِّتُواْ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْۚ سَأُلۡقِي فِي قُلُوبِ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ ٱلرُّعۡبَ فَٱضۡرِبُواْ فَوۡقَ ٱلۡأَعۡنَاقِ وَٱضۡرِبُواْ مِنۡهُمۡ كُلَّ بَنَانٖ﴾ ترجمہ: "اور وہ وقت جبکہ تمہارا رب

فرشتوں کو اشارہ کر رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، تم اہلِ ایمان کو ثابت قدم رکھو، میں ابھی ان کافروں کے دلوں میں رُعب ڈالے دیتا ہوں، پس تم ان کی گردنوں پر ضرب اور جوڑ جوڑ پر چوٹ لگاؤ"۔ (سورۃ الانفال: 12)

دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ ٱللَّهُ بِبَدْرٍ وَأَنتُمْ أَذِلَّةٌ ۖ فَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿١٢٣﴾ إِذْ تَقُولُ لِلْمُؤْمِنِينَ أَلَن يَكْفِيَكُمْ أَن يُمِدَّكُمْ رَبُّكُم بِثَلَٰثَةِ ءَالَٰفٍ مِّنَ ٱلْمَلَٰٓئِكَةِ مُنزَلِينَ ﴿١٢٤﴾ بَلَىٰٓ ۚ إِن تَصْبِرُوا۟ وَتَتَّقُوا۟ وَيَأْتُوكُم مِّن فَوْرِهِمْ هَٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُم بِخَمْسَةِ ءَالَٰفٍ مِّنَ ٱلْمَلَٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِينَ ﴿١٢٥﴾ وَمَا جَعَلَهُ ٱللَّهُ إِلَّا بُشْرَىٰ لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوبُكُم بِهِۦ ۗ وَمَا ٱلنَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِندِ ٱللَّهِ ٱلْعَزِيزِ ٱلْحَكِيمِ ﴿١٢٦﴾﴾ ترجمہ: "اور اللہ بدر کی لڑائی میں تمہاری مدد کر چکا ہے حالانکہ تم کمزور تھے، پس اللہ سے ڈرو تاکہ تم شکر کرو، جب تو مسلمانوں کو کہتا تھا کیا تمہیں یہ کافی نہیں کہ تمہارا رب تمہاری مدد کے لئے تین ہزار فرشتے آسمان سے اترنے والے بھیجے۔ بلکہ اگر تم صبر کرو اور پرہیزگاری کرو اور وہ تم پر ایک دم سے آ پہنچیں تو تمہارا رب پانچ ہزار فرشتے نشان دار گھوڑوں پر مدد کے لئے بھیجے گا۔ اور اس چیز کو اللہ نے تمہارے دل کی خوشی کے لئے کیا ہے اور تاکہ تمہارے دلوں کو اس سے اطمئنان ہو، اور مدد تو صرف اللہ ہی کی طرف سے ہے جو زبردست حکمت والا ہے"۔ (سورۃ آل عمران: 126-123)

امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور دیگر ائمہ نے متعدد صحیح احادیث ذکر کی ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ معرکۂ بدر میں فرشتے شریک تھے، وہ مشرکین کو مار رہے تھے اور ان کو قتل کر رہے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں: اس دن مسلمانوں میں سے ایک شخص مشرکین میں سے ایک شخص کے پیچھے دوڑ رہا تھا، اچانک انہوں نے اپنے اوپر ایک کوڑے کی آواز سنی، اور ایک گھوڑ سوار کی آواز جو کہہ رہا تھا: حَیزوم (گھوڑے کا نام) آگے بڑھو، انہوں نے مشرک کو اپنے سامنے دیکھا تو وہ چت گر گیا اور دیکھا کہ اچانک اس کی ناک زخمی ہو گئی ہے اور اس کا چہرہ اسی طرح پھٹ گیا ہے جیسے کہ کوڑے کی مار سے پھٹتا ہے اور اس کی وجہ سے اس کا پورا چہرہ نیلا ہو گیا ہے، یہ انصاری آئے اور اس کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے کیا، یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا: آپ نے سچ کہا، یہ تیسرے آسمان سے آئی ہوئی مدد ہے۔ (صحیح مسلم: 1763)

حضرت ابن عباسؓ ہی کی ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بدر کے دن ارشاد فرمایا: یہ جبرئیلؑ اپنے گھوڑے کا سر پکڑے ہوئے ہیں اور ان کے پاس جنگ کا سامان تھا۔ (صحیح بخاری: 3995)

حضرت علی ابن ابی طالبؓ کی روایت ہے فرماتے ہیں: انصار میں سے ایک پست قد شخص عباس بن عبدالمطلبؓ کو قیدی بنا کر لایا، عباسؓ نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ! بے شک واللہ! اس نے مجھے قید نہیں کیا ہے بلکہ مجھے ایک کم بالوں والے شخص نے قید کیا ہے جس کا چہرہ انتہائی خوبصورت تھا، وہ ایک چتکبرے گھوڑے پر سوار تھا، اور مجھے وہ شخص لوگوں میں نظر نہیں آرہا ہے، انصاری نے کہا: اے اللہ کے

رسولؐ! میں نے ان کو قید کیا ہے، آپؐ نے فرمایا: خاموش رہو! اللہ تعالیٰ نے ایک معزز فرشتے کے ذریعہ آپ کی مدد کی ہے۔(مسند أحمد: 1/117)

حضرت ابوداؤد المازنی کی حدیث ہے فرماتے ہیں کہ میں مشرکین میں سے ایک شخص کا پیچھا کر رہا تھا کہ میں اس کو ماروں تو اچانک اس کا سر گر جاتا ہے، اس سے پہلے کہ میری تلوار اس تک پہنچتی، میں سمجھ گیا کہ اس کو میرے علاوہ اور کسی نے قتل کیا ہے۔(مسند احمد: 5/450، سیرت ابن ہشام:2/286)

بے شک فرشتوں کے ذریعہ اہلِ ایمان کی نصرت و مدد ایک ثابت شدہ اور قطعی معاملہ ہے جس میں کسی طرح کا کوئی شک نہیں ہے، اس نصرت و مدد کی حکمت یہ ہے کہ ان تمام چیزوں کو فراہم کیا جائے جو مسلمانوں کی کامیابی کا سبب بن سکیں، اور فرشتوں کے نزول کے ذریعہ یہ چیز حاصل ہوگئی، چنانچہ فرشتوں نے ہر وہ کام کیا جو مسلمانوں کی نصرت کا سبب بن سکے، انہوں نے مسلمانوں کو نصرت کی خوشخبری دی، ان کے دلوں میں ایسا احساس پیدا کیا جو ان کی ثابت قدمی کا ذریعہ بنا، ان کے اندر نصرت کی امید پیدا کی، ان کے ساتھ قتال میں سر گرم رہے، ان کے سامنے یہ بات ظاہر کی کہ اللہ کی طرف سے ان کی مدد کی جارہی ہے اور عملی طور پر بعض فرشتے ان کے ساتھ جنگ میں شریک ہوئے، یقیناً قتال میں اس عملی شرکت نے ان کے دلوں کو مضبوط کیا اور قتال میں ان کو ثابت قدم بنایا، قرآنی آیات اس پر دلالت کرتی ہیں اور احادیث نبویہ میں اس کی صراحت کی گئی ہے۔(المستفاد من قصص القرآن: 2/131-132)

کوئی یہ سوال کر سکتا ہے کہ فرشتوں کے ذریعہ مسلمانوں کی مدد کرنے میں کیا حکمت ہے، حالانکہ ایک فرشتہ بھی اللہ کی توفیق سے کفار کو نیست و نابود کرنے پر قادر ہے؟

استاد عبدالکریم زیدان اس سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں: اللہ کی یہ سنت ہمیشہ سے رہی ہے کہ حق اور اہلِ حق کی باطل اور اہلِ باطل کے ساتھ کشمکش اور مقابلہ جاری رہے اور فتح و کامیابی اور غلبہ کے بارے میں اللہ کے متعین کردہ اصول و ضوابط کے مطابق ہی غلبہ حاصل ہوتا ہے، یہ کشمکش حق و باطل دونوں کے مابین ہوتی ہے، حق کو مضبوطی سے تھامنے اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے ثمرات اور نتائج میں سے یہ ہے کہ ان کو مختلف شکلوں میں اللہ کی طرف سے نصرت و تائید حاصل ہو، البتہ کشمکش کے نتائج اہلِ حق اور اہلِ باطل کے حق میں یا ان کے خلاف اللہ تعالیٰ کے اصول و قوانین کے مطابق سامنے آتے ہیں، لہذا قوت کے لازمی امور کے اعتبار سے جو زیادہ طاقتور ہوگا وہی غالب ہوگا، لہذا فرشتوں کے ذریعہ مدد بھی جہاد کرنے والی اس جماعت کے ایمان کے بعض ثمرات اور نتائج ہیں، اس مدد کے ذریعہ وہ چیزیں متحقق ہوگئیں جن کے ذریعہ دشمن پر غلبہ نصیب ہوتا ہے، لیکن غلبہ ان تمام قربانیوں پر موقوف رہا جو ان اہل ایمان نے پیش کیں، انہوں نے قتال کیا، جہاد و قتال سے متعلق مختلف کام انجام دیئے، جان کی قربانی کے لئے تیار رہے، جنگ میں صبر و ثبات کا مظاہرہ کیا اور مسلسل اللہ پر اعتماد اور توکل کرتے رہے، یہ وہ چیزیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے اصول و قوانین کے مطابق دیگر مادی اسباب کے ساتھ ساتھ فتح و نصرت کے اسباب بنایا ہے، دیگر مادی اسباب میں سامانِ حرب و ضرب، افرادی قوت، جنگ کی تیاری اور جنگی فنون میں مہارت وغیرہ شامل ہیں، اسی لئے اسلام مسلمانوں سے اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ وہ بذاتِ خود باطل کو زیر کرنے اور باطل پرست طاقتوں سے قتال کرنے کا فریضہ انجام

دیں اور غلبہ اور فتح ونصرت کے لئے مادی اور ایمانی اسباب اختیار کریں، ان شاءاللہ انہی کے ہاتھوں سے اہلِ باطل کو وہ سزا ملے گی جس کے وہ مستحق ہیں۔(دیکھیں: المستفاد من قصص القرآن: 131/2-132)

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿قَٰتِلُوهُمۡ يُعَذِّبۡهُمُ ٱللَّهُ بِأَيۡدِيكُمۡ وَيُخۡزِهِمۡ وَيَنصُرۡكُمۡ عَلَيۡهِمۡ وَيَشۡفِ صُدُورَ قَوۡمٍ مُّؤۡمِنِينَ ۝١٤ وَيُذۡهِبۡ غَيۡظَ قُلُوبِهِمۡۗ وَيَتُوبُ ٱللَّهُ عَلَىٰ مَن يَشَآءُۗ وَٱللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾ ترجمہ:''ان سے لڑو، اللہ تمہارے ہاتھوں سے ان کو سزا دلوائے گا اور انہیں ذلیل وخوار کرے گا اور ان کے مقابلہ میں تمہاری مدد کرے گا اور بہت سے مؤمنوں کے دل ٹھنڈے کرے گا اور ان کے قلوب کی جلن مٹادے گا، اور جسے چاہے گا توبہ کی توفیق بھی دے گا، اللہ سب کچھ جاننے والا اور دانا ہے''۔(سورۃ التوبہ: 14-15)

یقیناً اہلِ ایمان کی مدد کے لئے بلند و بالا آسمانوں سے زمین پر فرشتوں کا نزول ایک عظیم اور غیر معمولی واقعہ ہے، یہ اہلِ ایمان کے لئے عظیم قوت اور صبر و ثبات کا ذریعہ ہے، ان کو اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ وہ میدان میں تنہا نہیں ہیں اور وہ جب بھی نصرت کے اسباب پورے کریں گے اور نصرت کے موانع اور رکاوٹوں سے اجتناب کریں گے تو وہ اس کے اہل قرار پائیں گے کہ آسمان سے ان کی مدد کی جائے گی، اس احساس و شعور کے نتیجے میں ان کے اندر دشمن سے مقابلہ کی جرأت پیدا ہوتی ہے، اگرچہ ان کو اس سلسلہ میں خطرہ بھی مول لینا پڑے، جیسے کہ لشکرِ کفار افرادی قوت اور تیاری کے اعتبار سے برتر ہو اور اہلِ ایمان کے لشکر کے پاس افرادی قوت اور تیاری کم ہو۔

ساتھ ہی ساتھ فرشتوں کا نزول کفار کو معنوی اور نفسیاتی طور پر کمزور کرنے اور ان کے اعتماد ویقین کو متزلزل کرنے کا ایک قوی محرک ہے، اس لئے کہ جب ان کی صفوں میں فرشتوں کے نازل ہونے کی خبر پھیلے گی جن کو بعض کفار نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تو وہ مسلمانوں کی طاقت و قوت اور تعداد کا جو بھی اندازہ لگائیں گے تو ان کے وجدان میں تزلزل پیدا کرنے والا رعب باقی رہے گا کہ کچھ غیر مرئی طاقتیں شریکِ جنگ ہو سکتی ہیں، نہ وہ ان کی تعداد کا اندازہ کر سکتے ہیں اور نہ ہی ان کی طاقت و قوت کا، اہلِ ایمان جن جنگوں میں بھی شریک رہے ہیں یہ احساس و شعور ان کے دل ودماغ میں برقرار رہا، چاہے وہ عہدِ نبوی ہو یا خلفائے راشدین کا عہد ہو، اسی طرح بعد کے ادوار میں بھی یہ احساس اہلِ ایمان میں موجود رہا، اور یہ احساس دشمنوں کے مقابلہ میں ان کی مسلسل فتح و کامیابی کا ایک قوی سبب بنتا رہا۔ (دیکھیں: التاریخ الاسلامی، الحمیدی 4/145)

۲: اہلِ ایمان کی فتح اور اہلِ قلیب کے بارے میں رسول ﷺ کی گفتگو:

معرکۂ بدر مشرکین کے مقابلہ میں مسلمانوں کی فتح کے ذریعہ اختتام پذیر ہوا، مشرکین کے مقتولین کی تعداد ستر تھی اور ستر کو قید کیا گیا، ان میں سے اکثر قریش کے زعماء اور قائدین تھے، جبکہ مسلمانوں میں سے چودہ صحابہ کرام نے جامِ شہادت نوش کیا، ان میں سے چھ کا تعلق مہاجرین سے تھا اور آٹھ کا تعلق انصار سے تھا، جب مکمل طور پر فتح ہوگئی اور مشرکین شکست کھا گئے تو اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت عبداللہ بن رواحہؓ اور حضرت زید بن حارثہؓ کو روانہ کیا تاکہ وہ مدینہ میں مسلمانوں کو اہلِ ایمان کی نصرت و کامیابی اور مشرکین کی شکست کی خبر دیں۔(المستفاد من قصص القرآن: 2/133)

اللہ کے رسول ﷺ تین روز تک مزید بدر میں ٹھہرے رہے، حضرت انس بن مالکؓ نے حضرت ابو طلحہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم ﷺ جب کسی قوم پر فتح حاصل کرتے تھے تو تین راتوں تک اسی سرزمین میں قیام فرماتے تھے۔ (صحیح بخاری: 3976)

شاید اس کی مندرجہ ذیل حکمتیں ہوں:

۱) شکست خوردہ اور ناامیدی کے شکار دشمن کو اور از سرِ نو اٹھنے والی ہر تحریک کو کچل دیا جائے، اس لئے کہ فرار اختیار کرنے والے شکست خوردہ دشمن کی طرف سے ایسا امکان ہو سکتا ہے۔

۲) اسلامی فوج میں سے شہید ہونے والوں کی تدفین کی جائے، اس لئے کہ ہر معرکہ میں کچھ نہ کچھ افراد شہید ہوتے ہیں، اللہ کے رسول ﷺ نے میدانِ جنگ کی سرزمین پر ہی شہداء کو دفن کیا، کوئی ایسی روایت موجود نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے ان کی نمازِ جنازہ ادا فرمائی ہو اور ان میں سے کسی کو بدر کے باہر دفن نہیں کیا گیا۔

۳) مالِ غنیمت کو جمع کرنا، اس کی حفاظت کرنا اور اس کی حفاظت کے لئے مختلف افراد کو ذمہ داری، تاکہ اس کو مکمل طور پر مستحقین میں تقسیم کیا جائے، جنگِ بدر میں حاصل ہونے والے مالِ غنیمت کو حضرت عبداللہ بن کعب انصاریؓ کے حوالہ کیا گیا جن کا تعلق قبیلۂ مازن سے تھا۔

4) کامیاب ہونے والے لشکر کو نفسیاتی اور بدنی مشقت و تکلیف کے بعد آرام کا موقع دیا جائے، زخمیوں کے زخموں کا علاج کیا جائے اور فتح و کامیابی کی نعمت پر اللہ کا شکر ادا کیا جائے، کیونکہ اس فتح و کامیابی کا حصول کوئی آسان کام نہیں تھا، اسی طرح اسلامی لشکر کے افراد اس موقع پر پیش آنے والے ان واقعات کا آپس میں مذاکرہ کریں جن واقعات کا فتح و نصرت کے حصول میں اہم کردار رہا اور ہر ایک نے جو شجاعت و فداکاری کے جوہر دکھائے اس کا بھی ذکر کیا جائے، معرکہ میں جو عملی دروس و اسباق حاصل ہوئے اور قیادت کی طرف سے جو منصوبہ بندی کی گئی اور اس کو کس طرح عملی طور پر نافذ کیا گیا، ان سب کا ذکر کیا جائے تاکہ بعد میں آنے والے اس کو اپنے لئے مشعلِ راہ بنا سکیں۔

5) دشمنوں کے مقتولین کی لاشوں کو بھی دفن کیا جائے، ان کی پہچان کی جائے، اپنی قوم میں ان کے مقام و مرتبہ کا پتہ لگایا جائے اور ان میں سے جو زخمی ہوں ان کا بھی پتہ لگایا جائے، جیسے کہ اس اُمت کے فرعون ابو جہل اور کفر کے سرغنہ امیہ بن خلف اور ان جیسے کفار کے ساتھ کیا گیا، چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ نے ان خبیثوں کو بدر کے ایک تاریک اور گندے کویں میں پھینکنے کا حکم دیا۔ (صحیح البخاری: 3976) اس کے بعد آپ ﷺ کنویں کے کنارے پر کھڑے ہوئے، ان مقتولین سے مخاطب ہوئے اور فرمایا: ’’تم اپنے نبی کے خاندان کے بہت بُرے لوگ ہو، تم نے میری تکذیب کی اور لوگوں نے میری تصدیق کی، تم نے مجھے بے یار و مددگار چھوڑا اور لوگوں نے میری مدد کی، تم نے مجھے نکالا اور لوگوں نے مجھے پناہ دی‘‘۔ (سیرت ابن ہشام: 2/292-293) اس کے بعد آپ ﷺ نے ان کے بارے میں حکم دیا تو ان کو کنویں میں گھسیٹ کر پھینکا گیا اور پھر آپ ﷺ نے نام بنام ان کو پکار کر فرمایا: اے عتبہ بن ربیعہ! اے شیبہ بن ربیعہ! اے امیہ بن حلف! اے ابو جہل بن ہشام! اے فلاں! اے فلاں! کیا تمہارے رب نے تم سے جو عذاب کا وعدہ کیا ہے وہ برحق پایا؟ مجھ سے میرے رب نے جو وعدہ کیا تھا میں نے اسے برحق پایا۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولﷺ! آپ ان لاشوں سے کیوں خطاب کر رہے ہیں جن میں کوئی

جان نہیں ہے ؟آپؐ نے فرمایا: اس ذات کی قسم، جس کے قبضہ میں محمدؐ کی جان ہے، جو کچھ میں کہہ رہا ہوں تم بھی اتنا نہیں سن رہے ہو جتنا یہ لوگ سن رہے ہیں، البتہ یہ لوگ کچھ جواب نہیں دے سکتے ہیں۔(صحیح بخاری: 3976، صحیح مسلم: 3873،2874)

حضرت قتادہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے اُس وقت ان کو زندہ کیا تاکہ نبی کریم ﷺ ان کی توبیخ، ذلت، نامرادی اور حسرت وندامت کے لئے ان کو اپنی بات سنادیں۔(صحیح بخاری: 3976)

رسول اللہ ﷺ کا مقتولینِ قریش کو پکارنے نے ایک عظیم حقیقت واضح کردی وہ یہ کہ انہوں نے ایک نئی مخصوص برزخی زندگی کا آغاز کیا، وہ اس میں زندہ لوگوں کی گفتگو سنتے ہیں لیکن وہ ان کو جواب نہیں دیتے ہیں اور نہ ہی گفتگو کر سکتے ہیں، اس زندگی پر ایمان لانا مسلمانوں کے عقائد میں شامل ہے، اور قبر کا انعام اور عذاب صحیح احادیث سے ثابت ہے، یہاں تک کہ اللہ کے رسول ﷺ دو قبروں کے پاس سے گزرے اور فرمایا: ان دونوں پر عذاب ہو رہا ہے اور کسی بڑے گناہ کی وجہ سے ان پر عذاب نہیں ہو رہا ہے۔(صحیح بخاری: 218، صحیح مسلم: 292)

ذکر کیا گیا ہے کہ ان پر عذاب کا سبب لوگوں کی چغلی کرنا اور پیشاب کی چھینٹوں سے نہ بچنا تھا، لہذا ان غیبی حقائق کو تسلیم کرنا ضروری ہے، اس لئے کہ ان کے بارے میں صادق ومصدوق ﷺ نے خبر دی ہے اور قرآن کریم نے بھی آلِ فرعون پر عذاب ہونے کا ذکر قطعیت کے ساتھ کیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ٱلنَّارُ يُعۡرَضُونَ عَلَيۡهَا غُدُوّٗا وَعَشِيّٗاۚ وَيَوۡمَ تَقُومُ ٱلسَّاعَةُ أَدۡخِلُوٓاْ ءَالَ فِرۡعَوۡنَ أَشَدَّ ٱلۡعَذَابِ﴾ ترجمہ: ''دوزخ کی آگ ہے جس کے سامنے صبح وشام وہ پیش کئے جاتے ہیں اور جب قیامت کی گھڑی آجائے گی تو حکم ہوگا کہ آلِ فرعون کو شدید تر عذاب میں داخل کرو''۔(سورۃ الغافر: 46)

اور جہاں تک شہداء کا تعلق ہے تو ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَلَا تَحۡسَبَنَّ ٱلَّذِينَ قُتِلُواْ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ أَمۡوَٰتَۢاۚ بَلۡ أَحۡيَآءٌ عِندَ رَبِّهِمۡ يُرۡزَقُونَ﴾ ترجمہ: ''جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں انہیں مردہ نہ سمجھو، وہ تو حقیقت میں زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس رزق پا رہے ہیں''۔(سورۃ آل عمران: 169)

....

چوتھا باب

معرکہ کے چند اہم مناظر اور واقعات

ا: سرغنوں کا قتل:

اَ: ابو جہل بن ہشام مخزومی کا قتل:

حضرت عبد الرحمن بن عوفؓ فرماتے ہیں: میں بدر کے دن صف میں کھڑا تھا تو میں نے اسی اثناء میں دیکھا کہ میرے دونوں طرف قبیلہ اَنصار کے دو نو عمر لڑکے تھے، میں نے تمنا کی کہ کاش میں ان دونوں سے زیادہ طاقتور لوگوں کے درمیان ہوتا، ان میں سے ایک نے میری طرف اشارہ کیا اور پوچھا: چچا جان! کیا آپ ابو جہل کو پہچانتے ہیں؟ میں نے کہا: ہاں! لیکن بھتیجے، آپ کو اس سے کیا کام ہے؟ اس نے کہا: مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو گالیاں دیتا ہے، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے! اگر میں نے اسے دیکھ لیا تو اس وقت تک میں اس کو نہیں چھوڑوں گا جب تک ہم میں سے جس کی قسمت میں پہلے موت لکھی ہو گی مر نہ جائے، مجھے اُس پر بڑی حیرت ہوئی، پھر دوسرے نے اشارہ کیا اور وہی باتیں اس نے بھی کیں۔

تھوڑا ہی وقت گزرا تھا کہ مجھے ابو جہل دکھائی دیا جو لوگوں میں گھومتا پھر رہا تھا، میں نے کہا: سنو! جس کے متعلق تم سوال کر رہے تھے یہ ہے تمہارا مطلوبہ آدمی۔ دونوں نے جلدی سے اپنی تلواریں سنبھالیں اور اس پر جھپٹ پڑے، یہاں تک کہ اس کو قتل کر دیا، اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ ؐ کو اس کی اطلاع دی، نبی کریم ﷺ نے پوچھا: تم میں سے کس نے اسے قتل کیا ہے؟ ان میں سے ہر ایک نے کہا: میں نے اسے قتل کیا ہے، آپ ؐ نے ان سے پوچھا: کیا تم نے اپنی تلواریں صاف کر لی ہیں؟ انہوں نے عرض کیا: نہیں! آپ ؐ نے دونوں کی تلواروں کو دیکھا اور فرمایا: "تم دونوں نے ہی اسے مارا ہے، اس کا سامان معاذ بن عمرو بن جموح کو ملے گا"۔ اور وہ دونوں معاذ بن عفراءؓ اور معاذ بن عمرو بن جموحؓ تھے۔ (صحیح بخاری: 3141، صحیح مسلم: 1752)

حضرت انسؓ کی حدیث ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بدر کے دن فرمایا: کوئی ہے جو معلوم کرے کہ ابو جہل کا کیا حشر ہوا؟ حضرت ابن مسعودؓ صورتحال معلوم کرنے آئے تو دیکھا کہ عفراء کے بیٹوں (معاذؓ اور معوذؓ) نے اسے قتل کر دیا ہے اور وہ حالتِ نزع میں ہے، حضرت ابن مسعودؓ نے اس کی داڑھی پکڑی اور کہا: تو ہی ابو جہل ہے؟! کہا: ابو جہل نے کہا: کیا اس سے بھی کوئی بڑا آدمی ہو گا جس کو اس کی قوم نے آج قتل کیا ہے؟ یا اس نے کہا: تم نے اسے قتل کیا ہے۔ (صحیح بخاری: 3962، صحیح مسلم: 1800/11)

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی حدیث میں ہے فرماتے ہیں: میں نے بدر کے دن ابو جہل کو گرا ہوا دیکھا تو میں نے کہا: اے اللہ کے دشمن، اللہ نے تجھے رسوا کر دیا۔ اس نے کہا: کیسے مجھے رسوا کیا؟ کیا مجھ سے بھی کوئی بڑا آدمی ہے جس کو اس کی قوم نے قتل کیا؟! میرے پاس اپنی تلوار تھی، میں اس کو مارنے لگا اس پر اس کا اثر نہیں ہو رہا تھا، اس کے ساتھ اس کی بہترین تلوار تھی میں نے اس کے ہاتھ پر مارا تو تلوار اس کے ہاتھ سے گر گئی، میں نے اس کی تلوار لی پھر اس کے سر سے کھود اُتاری، اور پھر میں نے اس کی گردن ماری، اس کے بعد میں نبی کریم

ﷺ کی خدمت میں آیااور میں نے آپ کواس کی خبر دی تو آپؐ نے فرمایا: اللہ کی ذات وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے! میں نے بھی کہا: اللہ کی ذات وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ آپؐ نے فرمایا: جاؤ، اس کے بارے میں پورا اطمئنان کر لو۔ میں گیا اور میں ایک پرندے کی طرح چل رہا تھا، اس کے بعد میں واپس آیا اور میں ایک پرندے کی طرح چل رہا تھا، مجھے ہنسی آرہی تھی، میں نے آپ ﷺ کو اس کی اطلاع دی تو آپؐ نے فرمایا: چلو، میں آپؐ کے ساتھ چلا، میں نے آپؐ کو اسے دکھایا، جب آپؐ اس کے سامنے کھڑے ہو گئے تو فرمایا: یہ اس امت کا فرعون ہے۔ (مسند أحمد: 1/403-444، سنن أبو داؤد: 2709)

دونوعمر انصاری لڑکوں کے لئے ابوجہل کو قتل کرنے کا محرک یہ تھا کیونکہ انہوں نے سنا تھا کہ وہ اللہ کے رسول ﷺ کو گالیاں دیتا ہے، اس طرح سے انصار کے نوجوانوں کی رسول ﷺ سے محبت اس حد تک پہنچتی ہے یہاں تک کہ وہ رسول ﷺ کو ایذاء وتکلیف پہنچانے والے سے انتقام لینے کے لئے جان تک قربان کرنے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ابوجہل کے مابین جو گفتگو ہوئی وہ اس وقت ہوئی جبکہ وہ اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا، اس میں زبردست عبرت کا سامان موجود ہے، یہ طاغی اور سرکش جو مکہ میں مسلمانوں کو سخت اذیت پہنچاتا تھا وہ اُن لوگوں کے سامنے گرا ہوا ہے جن کو وہ ایذاء پہنچاتا تھا۔

اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہوئی کہ اس کی زندگی کی آخری سانس کا خاتمہ جسمانی اعتبار سے ایک کمزور اور ناتواں صحابی کے ذریعہ کروایا، ابوجہل ایک متکبر اور ظالم شخص تھا، یہاں تک کہ وہ سکرات الموت کی کیفیت میں مبتلا تھا، اس وقت بھی متکبرانہ رویہ اختیار کر رہا تھا، ابن اسحاق نے روایت نقل کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے جب اس کے سر کو تن سے جدا کرنا چاہا تو اس وقت اس نے حضرت ابن مسعودؓ سے کہا تھا: او بکریوں کے ذلیل چرواہے! تو بڑی دشوار گزار جگہ پر چڑھا ہے۔ (سیرت ابن ہشام: 2/289)

اللہ تعالیٰ نے اس خبیث ابوجہل کا انصار کے ننھے جانبازوں کے واروں کے ذریعہ ہی خاتمہ نہیں کیا بلکہ اس کو ادراک وشعور اور زخمی حالت میں پڑا ہوا باقی رکھا، حالانکہ اس سے پہلے اس پر ایسے وار کئے گئے تھے جن سے وہ ابدی موت کے قریب پہنچ چکا تھا، ایسا اس لئے ہوا تاکہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنی آنکھوں سے اس کی ذلت ورسوائی اور اہانت دکھا دے، جو ایسے شخص کے ذریعہ ہو رہی تھی جس کو وہ مکہ میں کمزور سمجھتا تھا، ایذاء پہنچاتا تھا اور مکہ میں ان پر ظلم کے پہاڑ توڑتا تھا، جو اولین ایمان لانے والوں میں شامل تھے اور رحمۃ للعالمین کی لائی ہوئی شریعت کے سامنے سر تسلیم خم کر چکے تھے، اور وہ تھے: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، وہ اس کے سینہ پر چڑھتے ہیں، اس کو اپنے پیروں سے روندتے ہیں اور اس کی تحقیر وتوہین کے لئے اس کو داڑھی سے پکڑتے ہیں اور اس کو ایسے ڈانٹتے ہیں جو اس کے غرور وتکبر کو خاک میں ملا دیتا ہے، اس کی تلوار اس سے چھین کر اس کو دبوچتے ہیں اور اس کو واصلِ جہنم کر دیتے ہیں، اور اس کو غصہ اور عار دلاتے ہوئے اس کو بتاتے ہیں کہ اللہ کی نصرت و مدد اللہ کے لشکر اور اسلامی فوج کا مقدر بن چکی ہے اور شرمناک شکست وناکامی اور ذلت ورسوائی کھلے غرور کے حامل فوج کا مقدر بن چکی ہے جس کی قیادت یہ خبیث کافر کر رہا تھا۔ (التاریخ الاسلامی، الحمیدی 158/4، محمد رسول اللہ ﷺ، صادق عرجون: 3/431، 432)

ب: امیہ بن خلف کا قتل:

حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''میں نے اُمیہ بن خلف سے یہ معاہدہ اپنے اور اس کے درمیان لکھوایا کہ وہ مکہ میں موجود میرے بال بچوں اور میری جائیداد کی حفاظت کرے اور میں مدینہ میں اس کی جائیداد کی حفاظت کروں، جب میں نے اپنا نام لکھتے وقت 'رحمن' کا ذکر کیا تو اس نے کہا: میں 'رحمن' کو نہیں جانتا ہوں، تم اپنا وہی نام لکھواؤ جو زمانۂ جاہلیت میں تھا، چنانچہ میں نے 'عبد عمرو' لکھوایا، جب غزوۂ بدر ہوا تو میں ایک پہاڑ کی طرف گیا تاکہ لوگ جب سو جائیں تو میں اس کی حفاظت کروں، لیکن اس کو بلال رضی اللہ عنہ نے دیکھ لیا اور وہ فوراً ہی انصار کی ایک مجلس میں آئے، انہوں نے مجلس والوں سے کہا کہ یہ دیکھو امیہ بن خلف! اگر اُمیہ بچ نکلا تو میں نہیں بچ پاؤں گا، چنانچہ ان کے ساتھ انصار کی ایک جماعت ہمارے پیچھے ہولی، جب مجھے خوف ہوا کہ اب یہ لوگ ہمیں پکڑلیں گے تو میں نے اس کے لڑکے کو آگے کر دیا تاکہ میں ان کو اس کے ساتھ مشغول کر دوں لیکن لوگوں نے اسے قتل کر دیا، اور پھر وہ ہماری ہی طرف بڑھنے لگے - امیہ بہت بھاری جسم کا تھا- آخر جب جماعت انصار نے ہمیں پکڑ لیا تو میں نے اس سے کہا: زمین پر لیٹ جاؤ، جب وہ زمین پر لیٹ گیا تو میں نے اپنا جسم اس کے اوپر ڈال دیا تاکہ اس کو بچا سکوں لیکن لوگوں نے میرے جسم کے نیچے سے اس کے جسم پر تلوار کے وار کئے اور اسے قتل کر کے ہی چھوڑا، ایک صحابی نے اپنی تلوار سے میرے پاؤں کو بھی زخمی کر دیا تھا، عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ اس کا نشان اپنے قدم کے اوپر ہمیں دکھایا کرتے تھے۔ (صحیح بخاری: 2301-3971)

حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کی ایک دوسری روایت ہے فرماتے ہیں: امیہ بن خلف مکہ میں میرا دوست تھا اور میرا نام عبد عمرو تھا، جب میں نے اسلام قبول کیا جبکہ ہم مکہ میں ہی تھے تو میں نے 'عبدالرحمن' نام رکھا، وہ مکہ میں میرے ساتھ ملتا تھا اور کہتا تھا: اے عبد عمرو! کیا باپ کے رکھے ہوئے نام کو تم نے چھوڑ دیا؟ میں کہتا: ہاں! تو وہ کہتا: میں رحمن کو نہیں جانتا ہوں لہذا میرے اور اپنے درمیان کوئی ایسا نام تجویز کر لو جس کے ذریعہ میں تمہیں پکارا کروں گا، کیونکہ تم پہلے نام کے ذریعہ مجھے جواب نہیں دیتے ہو اور میں تم کو ایسے نام سے نہیں پکاروں گا جس کو میں نہیں جانتا ہوں!

فرماتے ہیں: وہ جب مجھے پکارتا تھا تو کہتا تھا: اے عبد عمرو! تو میں جواب نہیں دیتا تھا۔ فرماتے ہیں: میں نے اس سے کہا: اے ابو علی! جو چاہو نام رکھ لو۔ اس نے کہا: تو پھر آپ کا نام عبدالالٰہ ہے۔ فرماتے ہیں: میں نے کہا: ٹھیک ہے! فرماتے ہیں: جب میں اس کے پاس سے گزرتا تھا تو وہ کہتا: اے عبدالالہ! میں اسے جواب دیتا تھا اور اس کے ساتھ بات چیت کرتا تھا، یہاں تک کہ بدر کا دن آیا تو میں اس کے پاس گزرا اور وہ اپنے بیٹے علی کے ساتھ کھڑا تھا، یعنی علی بن امیہ، وہ اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا۔ میں نے کچھ زرہیں اٹھا رکھی تھیں، جب اس نے مجھے دیکھا تو کہنے لگا: اے عبد عمرو! میں نے اسے جواب نہیں دیا، پھر اس نے کہا: اے عبدالالہ! میں نے جواب دیتے ہوئے کہا: ہاں! کیا بات ہے؟ اس نے کہا: کیا تمہیں مجھ سے کچھ دلچسپی ہے؟ میں تمہارے لئے ان زرہوں سے بہتر ہوں جو تمہارے پاس ہیں؟ میں نے کہا: ہاں، بات بالکل اسی طرح ہے۔ اللہ کی قسم! فرماتے ہیں: میں نے وہ زرہیں اپنے ہاتھ سے پھینک دیں اور اس کا اور اس کے بیٹے علی کا ہاتھ پکڑ لیا، امیہ کہہ رہا تھا کہ آج جیسا دن میں نے کبھی نہیں دیکھا، کیا آپ کو دودھ کی ضرورت نہیں ہے؟ فرماتے ہیں: پھر میں نے ان دونوں کو اپنے ساتھ لے کر

آگے نکل گیا۔ ابن ہشام کہتے ہیں: دودھ سے اس کی مراد یہ تھی کہ جس نے مجھے قید کیا ہے میں اس کو آزادی کے بدلے میں دودھ دینے والی بہت سی اونٹیاں دوں گا۔ (سیرت ابن ہشام: 2/283-284)

سابقہ روایات سے مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:

۱: حضرت بلالؓ نے جب اپنا کٹر دشمن اُمیہ بن خلف حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کے ہاتھ میں قید ہو کر دیکھا جو حضرت بلالؓ کو مکہ میں قسم قسم کی سخت سزائیں دیتا تھا تو وہ بلند آواز سے پکار اٹھے: اگر یہ بچ گیا تو پھر میں نہیں بچ پاؤں گا۔

اللہ کے دشمنوں اور بڑے کفار وفجار سے دنیاوی زندگی میں اطمئنان وسکون پانے کی یہ ایک ایسی نعمت ہے جو اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان مظلوموں کو عطا کرتا ہے، جنہوں نے ان فجار و سرکشوں کے ذریعہ قسم قسم کی ایذائیں اور تکلیفیں سہی ہوتی ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿قَٰتِلُوهُمۡ يُعَذِّبۡهُمُ ٱللَّهُ بِأَيۡدِيكُمۡ وَيُخۡزِهِمۡ وَيَنصُرۡكُمۡ عَلَيۡهِمۡ وَيَشۡفِ صُدُورَ قَوۡمٖ مُّؤۡمِنِينَ ۝١٤ وَيُذۡهِبۡ غَيۡظَ قُلُوبِهِمۡۗ وَيَتُوبُ ٱللَّهُ عَلَىٰ مَن يَشَآءُۗ وَٱللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾ ترجمہ: ''ان سے لڑو، اللہ تمہارے ہاتھوں سے ان کو سزا دلوائے گا اور انہیں ذلیل وخوار کرے گا اور ان کے مقابلہ میں تمہاری مدد کرے گا اور بہت سے مؤمنوں کے دل ٹھنڈے کرے گا، اور ان کے قلوب کی جلن مٹادے گا، اور جسے چاہے گا توبہ کی توفیق بھی دے گا، اللہ سب کچھ جاننے والا اور دانا ہے''۔ (سورۃ التوبہ: 14-15)

۲: بے شک اُمیہ بن خلف کی جو المناک موت ہوئی اس میں تکبر کرنے والے تمام سرکشوں اور عبرت حاصل کرنے والوں کے لئے بلیغ سبق اور عبرت ہے جن کو اپنی طاقت و قوت کا غرّہ ہوتا ہے، وہ اپنی عزت اور مقام و مرتبہ کی وجہ سے دھوکہ کھاتے ہیں اور کمزوروں پر ظلم و زیادتی کرتے ہیں، ان کے حقوق سلب کرتے ہیں، لہذا ان کو آخرت میں بُرے اور ذلت آمیز انجام کا سامنا کرنا ہی پڑے گا، البتہ بسا اوقات اللہ تعالیٰ آخرت سے پہلے دنیا میں ہی کمزور سمجھے جانے والوں کو ان پر قدرت عطا کرتا ہے، جیسے کہ امیہ بن خلف اور اس جیسے کفر کے سرغنوں کے ساتھ ہوا، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَنُرِيدُ أَن نَّمُنَّ عَلَى ٱلَّذِينَ ٱسۡتُضۡعِفُواْ فِي ٱلۡأَرۡضِ وَنَجۡعَلَهُمۡ أَئِمَّةٗ وَنَجۡعَلَهُمُ ٱلۡوَٰرِثِينَ﴾ ترجمہ: ''اور ہم یہ ارادہ رکھتے تھے کہ مہربانی کریں ان لوگوں پر جو زمین میں ذلیل کر کے رکھے گئے تھے اور انہیں پیشوا بنادیں اور انہی کو وارث بنائیں''۔ (سورۃ القصص: 5)

۳: حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے فرمایا تھا: اللہ تعالیٰ بلال پر رحم فرمائے! میری زرہیں بھی گئیں اور انہوں نے اچانک میرے قیدیوں کو مجھ سے بھی لے لیا۔ (سیرت ابن ہشام: 2/244) حضرت بلالؓ نے انصار کی مدد سے ان دونوں قیدیوں کو لے لیا تھا اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ صحابہ کرام کے مابین اخوت کا تعلق کتنا مضبوط و مستحکم تھا۔

۴: امیہ بن خلف کی زوجہ اُم صفوان بن اُمیہ کا موقف:

اُم صفوان بن امیہ سے ان کے قبولِ اسلام کے بعد کہا گیا، جبکہ انہوں نے مکہ میں حضرت حُباب بن منذرؓ کو دیکھا: یہی وہ شخص ہے جنہوں نے بدر میں علی بن اُمیہ کا پاؤں کاٹا تھا، انہوں نے کہا: جو شرک کی حالت میں مارے گئے ان کا ذکر ہمارے سامنے مت کرو! اللہ تعالیٰ

نے علی کو حُباب بن منذر کی مار کے ذریعہ ذلیل کیا اور علی کو مارنے کی وجہ سے حُباب کو عزت عطا کی، وہ جب یہاں سے نکلا تھا تو حالتِ اسلام میں نکلا تھا اور اسلام کے علاوہ دوسری حالت میں مارا گیا۔(التاریخ الاسلامی، للحمیدی: 4/153)

اس موقف سے ان کی قوتِ ایمانی کا اور ان کے راسخ یقین کا پتہ چلتا ہے، ان کے سامنے ولاء اور براء کا عقیدہ بالکل واضح تھا جس کی وجہ سے وہ اہلِ ایمان اور مسلمانوں سے محبت کرنے لگیں، اگرچہ وہ ان کے خاندان سے نہ ہوں اور وہ اہلِ کفر کو ناپسند کرنے لگیں، اگرچہ وہ ان کی اولاد ہی کیوں نہ ہوں۔

ان کا اپنے بیٹے علی کے بارے میں یہ کہنا کہ "وہ جب یہاں سے نکلا تھا تو حالت اسلام میں نکلا تھا اور اسلام کے علاوہ دوسری حالت میں مارا گیا"۔ اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ وہ مکہ میں ان لوگوں میں شمار ہوتا تھا جن کا اسلام معروف تھا اور بدر کے دن وہ اپنی قوم کے ساتھ نہ چاہتے ہوئے نکلے، جب دونوں لشکروں میں مڈ بھیڑ ہوئی اور انہوں نے مسلمانوں کی تعداد کم دیکھی تو وہ فتنہ میں مبتلا ہو گئے، اور کہنے لگے: ان لوگوں (مسلمانوں) کو ان کے دین نے دھوکہ میں ڈالا ہے، انہی کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ قول نازل ہوا: ﴿إِذْ يَقُولُ ٱلْمُنَٰفِقُونَ وَٱلَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ غَرَّ هَٰٓؤُلَآءِ دِينُهُمْ ۗ وَمَن يَتَوَكَّلْ عَلَى ٱللَّهِ فَإِنَّ ٱللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾ ترجمہ: "جب کہ منافقین اور وہ سب لوگ جن کے دلوں کو روگ لگا ہوا ہے کہہ رہے تھے کہ ان لوگوں کو تو اِن کے دین نے خبط میں مبتلا کر رکھا ہے، حالانکہ اگر کوئی اللہ پر بھروسہ کرے تو یقیناً اللہ بڑا زبردست اور دانا ہے"۔(سورۃ الأنفال:49)

<u>ج: حضرت زبیرؓ کے ہاتھوں عبیدہ بن سعید بن عاص کا قتل:</u>

حضرت زبیر بن عوامؓ فرماتے ہیں: جنگ بدر میں میری مڈ بھیڑ عبیدہ بن سعید بن العاص سے ہوئی، اس کا پورا جسم لوہے اور ہتھیاروں سے لیس تھا، صرف اس کی دو آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں، اس کی کنیت ابوذات الکرش تھی، اس نے کہا: میں ابوذات الکرش ہوں، میں نے برچھے سے اس پر حملہ کیا اور اس کی آنکھ ہی کو نشانہ بنایا، چنانچہ وہ اس سے مر گیا۔ ہشام کہتے ہیں: مجھے بتایا گیا کہ زبیرؓ نے کہا: کہ پھر میں نے اس پر اپنا پاؤں رکھا اور میں نے پورا زور لگایا اور بڑی مشکل سے وہ برچھا اس کی آنکھ سے نکالا، اس کے دونوں کنارے مڑ گئے تھے۔

عروہ کہتے ہیں اس کے بعد رسول ﷺ نے زبیرؓ کا وہ برچھا طلب کیا تو انہوں نے وہ پیش کیا، پھر جب اللہ کے رسول ﷺ اس دنیا سے رخصت ہو گئے تو انہوں نے اس برچھے کو واپس لے لیا، پھر ابو بکرؓ نے اس برچھے کو منگوایا تو حضرت زبیرؓ نے ان کو دے دیا، اور جب ابو بکرؓ کی وفات ہوئی تو حضرت عمرؓ نے اسے منگوایا، حضرت زبیرؓ نے انہیں بھی دے دیا، پھر جب حضرت عمرؓ کی شہادت ہوئی تو حضرت زبیرؓ نے وہ واپس لے لیا، اور پھر عثمانؓ نے ان سے وہ طلب کیا اور انہوں نے انہیں بھی دے دیا، جب حضرت عثمانؓ کی شہادت ہوئی تو وہ آلِ علی کے پاس پہنچ گیا اور پھر حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے اسے لے لیا اور انہی کے پاس رہا یہاں تک کہ وہ شہید ہو گئے۔(صحیح بخاری: 3998)

اس روایت سے حضرت زبیر بن عوامؓ کی نشانہ میں مہارت کی منظر کشی ہوتی ہے، اس لئے کہ اگرچہ عبیدہ کی صرف آنکھ کا حصہ کھلا ہوا تھا اور وہ جگہ بھی انتہائی تنگ تھی، لیکن پھر بھی انہوں نے اس شخص کی آنکھ پر صحیح جگہ نشانہ لگایا اور بیک وقت اس پر حملہ بھی کیا اور اپنا دفاع بھی کیا، اس شخص پر نشانہ لگانا مشکل تھا، اس لئے کہ اس نے اپنا پورا جسم لوہے میں بند کر رکھا تھا لیکن حضرت زبیرؓ نے پھر بھی اس کی

آنکھ پر نشانہ لگایا اور یہی اس کی موت کا سبب بن گیا، یہ نشانہ انتہائی باریک بینی سے لگایا گیا تھا، اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت زبیرؓ جسمانی اعتبار سے کس قدر طاقتور تھے اور ساتھ ہی ساتھ نشانہ بازی میں بھی کتنی مہارت اور باریک بینی رکھتے تھے۔(دیکھیں: التاریخ الاسلامی، للحمیدی: 4/154)

د: اسود مخزومی کا قتل:

ابن اسحاق کہتے ہیں: مبارزت کے لئے اسود مخزومی نکلا، یہ شخص بڑا اڑیل اور بد خُلق تھا، وہ یہ کہتے ہوئے میدان میں نکلا کہ: میں اللہ سے عہد کرتا ہوں کہ میں ان کے حوض کا پانی پی کر آؤں گا، ورنہ اسے ڈھا دوں گا، یا اس کے لئے جان دوں گا، جب یہ مبارزت کے لئے نکلا تو اُدھر سے حمزہ بن عبد المطلبؓ نکلے، دونوں میں حوض سے پَرے ہی مڈ بھیڑ ہوئی، حضرت حمزہؓ نے ایسی تلوار ماری کہ اس کا پاؤں نصف پنڈلی سے کٹ کر اڑ گیا اور وہ پیٹھ کے بل گر گیا، اس کے پاؤں سے خون کا پھوارا نکل رہا تھا جس کا رخ اس کے ساتھیوں کی طرف تھا، لیکن وہ گھٹنوں کے بل گھسٹ کر حوض کی طرف بڑھا اور اس میں داخل ہوا ہی چاہتا تھا تاکہ اپنی قسم پوری کر لے اتنے میں حضرت حمزہؓ نے دوسری ضرب لگائی اور وہ حوض کے اندر ہی ڈھیر ہو گیا۔(سیرت ابن ہشام: 2/237)

امیہ بن خلف نے حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ سے پوچھا تھا کہ وہ شخص کون تھا جس کے سینے پر شتر مرغ کے پَر کا بنا ہوا الباس تھا؟ حضرت عبدالرحمنؓ نے جواب دیا: وہ حمزہ بن عبدالمطلب تھے۔ اُمیہ نے کہا: یہ وہی ہیں جنہوں نے ہمارے ساتھ ایسا ایسا کیا تھا؟ یہ زعمائے کفر میں سے ایک کی گواہی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت حمزہؓ نے دشمنوں کے لشکر کو اس دن بہت نقصان پہنچایا تھا۔(التاریخ الاسلامی، الحمیدی: 151-152)

مشرکین میں سے قتل ہونے والا یہ پہلا شخص تھا جو اللہ کے شیر حضرت حمزہ بن عبدالمطلبؓ کے ہاتھوں قتل ہوا، یہ کمینہ اڑیل مسلمانوں کو چیلنج دیتا ہوا آیا تو بطلِ اسلام حضرت حمزہؓ اس کے مقابلہ پر ڈٹ گئے اور اس کا کام تمام کر دیا اور اس جیسے کینہ پرور متکبرین کو بہترین سبق سکھایا۔

۲: عظمت وعزیمت کے چند مناظر

أ: حضرت حارثہ بن سراقہؓ کی شہادت:

حضرت انس ؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں: حارثہؓ بدر کی جنگ میں شہید ہوئے، وہ اس وقت نو عمر تھے، ان کی والدہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آئیں اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول ؐ! آپ جانتے ہیں کہ حارثہ کا میرے نزدیک کیا مقام تھا لہذا اگر وہ جنت میں ہے تو میں صبر کروں گی اور اجر وثواب کی نیت رکھوں گی، اور اگر کوئی اور بات ہے تو آپ دیکھیں گے کہ میں اس کے لئے کیا کرتی ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا: افسوس ہے تم پر! کیا تم پاگل ہوگئی ہو؟ کیا جنت ایک ہی ہے؟! جنتیں تو بہت سی ہیں اور وہ تو جنت الفردوس میں ہے۔(صحیح بخاری: 3982) ایک دوسری روایت میں ہے: اے اُم حارثہ! جنت میں تو بہت سی جنتیں ہیں اور آپ کے بیٹے کو جنت الفردوس کا مقام ملا ہے۔(دیکھیں: الأساس في السنة وفقهها، السیرۃ النبویہ، سعید حوی: 1/475)

ب: حضرت عوف بن حارثؓ کی شہادت:

ابن اسحاق کہتے ہیں: مجھ سے عاصم بن عمرو بن قتادہ نے بیان کیا کہ عوف بن حارث جو کہ عفراء کے بیٹے ہیں (عفراء: عبید بن ثعلبہ النجاریہ کی بیٹی ہیں، ان کے ساتوں بیٹے غزوہ بدر میں شریک ہوئے) نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ؐ! رب اپنے بندے کی کس بات پر خوش ہوتا ہے؟ آپ ؐ نے فرمایا: اس بات سے کہ اس کا ہاتھ جنگ میں مشغول ہو اور وہ زرہ کے بغیر (بے خوف) لڑ رہا ہو، یہ سن کر انہوں نے اپنی زرہ اتاری اور اس کو پھینک دیا، پھر تلوار لی اور دشمن سے لڑنا شروع کر دیا یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔(دیکھیں: صحیح السیرۃ النبویۃ، 245، الاصابہ لابن حجر: 6107)

اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ صحابہ کرام کا آخرت کے ساتھ تعلق کس قدر مضبوط تھا اور وہ کس قدر اللہ کی رضا کے طالب تھے، اسی لئے حضرت عوف بن حارثؓ تیر کی طرح تیزی سے آگے بڑھے اور ان کے جسم پر کوئی حفاظتی سامان نہیں تھا، انہوں نے زرہ پھینک دی اور دشمنوں سے مقابلہ کرتے رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالی نے ان کو شہادت سے سرفراز کیا، یقیناً اس نئے معاشرہ کے مفاہیم ہی تبدیل ہو گئے اور انہوں نے آخرت کو اپنا مقصود ومطلوب بنالیا اور وہ اللہ کی رضا کے طالب بن گئے، جبکہ اس سے پہلے ان کو سب سے زیادہ اس کی فکر ہوتی تھی کہ عورتیں ان کی بہادری کے چرچے کریں اور قبیلہ کا سردار اُن سے خوش ہو جائے اور ان کی شجاعت پر اشعار کہے جائیں۔(دیکھیں: التربیۃ القیادیۃ: 2/31)

ج: حضرت سعد بن خیثمہؓ اور ان کے والد کی شہادت:

علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ موسی بن عقبہ نے ابن شہاب سے نقل کرتے ہوئے کہا: جنگ بدر کے موقع پر حضرت سعد بن خیثمہؓ اور ان کے والد نے قرعہ اندازی کی، قرعہ حضرت سعدؓ کے حق میں نکلا، ان کے والد نے ان سے کہا: اے میرے بیٹے! آج اپنے اوپر مجھے ترجیح

دو اور مجھے جہاد میں شریک ہونے کا موقع دو۔ حضرت سعدؓ نے کہا: اباجان! اگر جنت کے علاوہ اور کوئی چیز ہوتی تو میں ضرور ایسا کرتا!۔ چنانچہ حضرت سعدؓ بدر کی جانب نکلے اور شہادت کا جام نوش کیا اور ان کے والد خیثمہؓ احد کے دن شہید ہو گئے۔ (الاصابہ: 2/23، 24/3118)

اس واقعہ کے ذریعہ صحابہ کرام کے گھرانوں کی روشن تصویر سامنے آتی ہے کہ اللہ کے راستے میں جہاد کرنے کے سلسلہ میں ان کے درمیان کس قدر تنافس اور مسابقہ ہوتا تھا، چنانچہ حضرت سعد بن خیثمہؓ اور ان کے والد ایک ساتھ جہاد کے لئے نہیں جا سکتے تھے، اس لئے کہ گھر میں ان میں سے ایک کا رہنا ضروری تھا، لیکن شہادت کے شوق کی وجہ سے کوئی بھی جہاد سے پیچھے نہیں رہنا چاہتا تھا، اس لئے مجبوراً ان کو قرعہ اندازی کرنی پڑی اور قرعہ اندازی میں قرعہ حضرت سعدؓ کے حق میں نکلا اور بیٹا بھی اپنے والد کے ساتھ انتہائی ادب کے ساتھ پیش آتا تھا، لیکن ان کو بھی جنت کا اشتیاق تھا، اس لئے انہوں نے یہ بلیغ جواب دیا کہ: اباجان! اگر جنت کے علاوہ اور کوئی چیز ہوتی تو میں ضرور آپ کو ترجیح دیتا۔ (التاریخ الاسلامی، الحمیدی 4/87)

د: حضرت ابوحذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ کے حق میں نبی کریم ﷺ کی دعا:

معرکہ بدر کے بعد قریش کے مقتولین کو کنویں میں ڈالنے کے واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: جب ان کے بارے میں حکم دیا گیا تو ان کو گھسیٹا گیا، حضرت ابوحذیفہ بن عتبہ کے چہرے پر ناگواری کا اثر ظاہر ہوا جبکہ ان کے والد کو کنویں کی طرف لے جایا جارہا تھا، یہ دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے ابوحذیفہ! واللہ، ایسا لگ رہا ہے جیسے کہ آپ کو اپنے والد کے ساتھ ہونے والا سلوک بُرا لگا ہے۔ انہوں نے جواب دیا: واللہ! اللہ کے رسول ﷺ! مجھے نہ ہی اللہ کے بارے میں کوئی شک ہے اور نہ ہی رسول اللہ ﷺ کے بارے میں، لیکن اگر وہ (والد) بردبار، درست اور صاحب رائے تھے تو مجھے امید تھی کہ اس وقت تک ان کو موت نہیں آتی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ان کو اسلام کی ہدایت دے دیتا، جب میں نے دیکھا کہ ان کو یہ سب کچھ حاصل نہیں ہو سکا اور ان کا انجام وہ ہو گیا جو ہوا، تو اس کی وجہ سے مجھے تکلیف ہوئی۔ فرماتے ہیں: یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے ان کے حق میں خیر کی دعا فرمائی۔ (مستدرک حاکم: 3/224)

اس موقف کے ذریعہ واضح ہوتا ہے کہ پہاڑوں کی بلندی جیسے ایمان اور نبوی محبت و وفاداری سے سرشار انسانی جذبات کے درمیان کس قدر جذب وانجذاب کی قوت پائی جاتی ہے، چنانچہ ایمان انسانی احساسات وجذبات کو ختم نہیں کرتا ہے بلکہ وہ ان کو پاکیزہ اور درست بناتا ہے اور ان کو جاہلی عصبیت کے بجائے ایسی وفاداری میں تبدیل کر دیتا ہے جس کو عملانے میں ربانی منہج انکار نہیں کرتا ہے، چنانچہ حضرت ابو حذیفہؓ کا ایمان ایسا ہے جس کو حادثاتِ زمانہ کے پیچ وخم اور زلزلے بھی نہیں ہلا سکتے ہیں، وہ جب اپنے والد کو اُشراف قریش کے ساتھ کفر کی حالت میں قتل ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں اور اس کو ان کے ساتھ بدر کے کنویں میں پھینکا جاتا ہے تو بشری جذبات واحساسات اور والد کے ساتھ وفاداری کے تقاضے کے مطابق ان کو افسوس ہوتا ہے، مگر ابوحذیفہؓ مضبوط پہاڑوں کی استقامت کی طرح اپنے ایمان کے ساتھ چمٹے رہتے ہیں، ان کو صرف اس بات کا افسوس ہوتا ہے کہ ان کے والد کو ہدایت نصیب نہ ہو پائی، اسی لئے ان کے اس افسوس اور رنج کے پیشِ نظر اللہ کے رسول ﷺ نے ان کے لئے خیر کی دعا فرمائی۔ (دیکھیں: محمد رسول اللہ ﷺ، 3/446 التاریخ الاسلامی، الحمیدی: 4/174)

ھ: حضرت عمیر بن اَبی و قاص رضی اللہ عنہ:

جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بدر کی جانب نکلے اور آپ ؐ کے سامنے لشکر کو پیش کیا گیا تو آپ ؐ نے حضرت عمیر بن اَبی و قاص رضی اللہ عنہ کو واپس کر دیا، اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ رو پڑے، ان کی یہ کیفیت دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو اجازت دے دی اور آپ ؐ نے خود اپنے دستِ مبارک سے آپ کی تلوار باندھی، حضرت عمیر رضی اللہ عنہ چھپ رہے تھے تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کو نہ دیکھ لیں، حضرت سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے اپنے بھائی عمیر بن ابی و قاص رضی اللہ عنہ کو بدر کے دن چھپتے ہوئے دیکھا، اس سے پہلے کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارا جائزہ لیتے، میں نے کہا: میرے بھائی کیا بات ہے؟! انہوں نے کہا: مجھے ڈر ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے دیکھ لیں گے اور کم سنی کی وجہ سے مجھے واپس کر دیں گے، اور میں جہاد میں نکلنا چاہتا ہوں، اس امید میں کہ شاید اللہ تعالیٰ مجھے شہادت عطا کرے گا اور حقیقتاً اُن کو شہادت نصیب ہو گئی۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویہ، ابو فارس، ص: 317، صفۃ الصفوۃ 1/294، مستدرک حاکم: 3/188، الاصابہ 3/35)

....

پانچواں باب

مالِ غنیمت اور قیدیوں کے بارے میں اختلافات

ا: مالِ غنیمت کے بارے میں اختلاف:

حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں: ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ نکلے، میں آپؐ کے ساتھ بدر میں شریک ہوا، دونوں لشکروں میں مڈ بھیڑ ہوئی تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے دشمن کو شکست دی، اس کے بعد ایک گروہ دشمن کے تعاقب میں نکلا، وہ ان کو پسپا اور قتل کر رہے تھے، کچھ لوگ کفار کے چھوڑے ہوئے اموالِ غنیمت جمع کرنے میں لگ گئے، اور کچھ لوگ رسول اکرم ﷺ کے ارد گرد اس لئے جمع رہے کہ کہیں کسی طرف سے اچانک دشمن حملہ نہ کردے، یہاں تک کہ جب رات ہوگئی اور ہر شخص اپنے ٹھکانے پر پہنچا تو جن لوگوں نے مالِ غنیمت جمع کیا تھا وہ کہنے لگے: یہ مال تو ہم نے جمع کیا ہے، اس لئے اس میں ہمارے سوا کسی کا حصہ نہیں ہے، اور جو لوگ دشمن کے تعاقب میں گئے تھے ان لوگوں نے کہا کہ تم ہم سے زیادہ اس کے حقدار نہیں ہو، کیونکہ ہم نے دشمن کو پسپا کیا اور ان کو ہم نے شکست دی، اور جو لوگ رسول اللہ ﷺ کے ارد گرد آپؐ کی حفاظت کے لئے جمع رہے، انہوں نے کہا کہ تم اس کے ہم سے زیادہ حقدار نہیں ہو! ہم نے رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کی اور ہمیں اندیشہ تھا کہ کہیں دشمن اچانک آپؐ پر حملہ نہ کردے، اور ہم اسی میں مشغول رہے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلْأَنفَالِ ۖ قُلِ ٱلْأَنفَالُ لِلَّهِ وَٱلرَّسُولِ ۖ فَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَأَصْلِحُوا۟ ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۖ وَأَطِيعُوا۟ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥٓ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ﴾ ترجمہ: "وہ تم سے اَنفال کے متعلق پوچھتے ہیں، کہہ دیجئے: اَنفال اللہ اور رسول کے لئے ہے، پس تم اللہ سے ڈرو اور باہمی تعلقات کی اصلاح کرو اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اگر تم مومن ہو"۔ (سورۃ الأنفال:1) اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اس مالِ غنیمت کو سب مسلمانوں کے درمیان مساوی طور پر تقسیم فرمایا۔ (مسند أحمد: 5/324)

ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عبادہ بن صامتؓ سے جب سورۂ انفال میں مذکور 'اَنفال' کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ آیت تو ہمارے یعنی اصحابِ بدر کے بارے میں نازل ہوئی، جس کا واقعہ یہ تھا کہ مالِ غنیمت کے بارے میں ہمارے درمیان کچھ اختلاف پیدا ہوا جس نے ہمارے اخلاق کو متاثر کیا، اللہ تعالیٰ نے مالِ غنیمت کو ہمارے ہاتھوں سے لے کر رسول ﷺ کے سپرد کردیا اور رسول اللہ ﷺ نے ہمارے درمیان اس کو مساوی طور پر تقسیم فرمایا۔ (مسند أحمد: 5/322)

اللہ تعالیٰ نے سورہ اَنفال میں غزوۂ بدر کے واقعات کو ذکر کرکے ان کو دوام بخشا ہے اور اس کے واقعات، اسباب اور نتائج کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، آیات میں نفسِ انسانی کا علاج اور ایمانِ عمیق کے حامل نفس کی تربیت پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے، سورت کا آغاز جہاد کے اہم نتیجہ یعنی مالِ غنیمت کے حکم کے متعلق بیان ہوتا ہے، اس سورت میں واضح کیا گیا ہے کہ مالِ غنیمت اللہ اور اس کے رسولؐ کے لئے ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا مالک ہے اور اس کے رسول ﷺ اس کے خلیفہ ہیں، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو تین احکام دیئے ہیں:

۱) تقوی اختیار کریں۔ ۲) آپسی معاملات درست کریں۔ ۳) اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں۔

یہ تینوں جہاد کے حوالے سے انتہائی اہم احکام ہیں، اس لئے کہ اگر جہاد کی بنیاد تقوی پر نہ ہو تو وہ جہاد نہیں ہے، اور جہاد میں اتحاد واتفاق اور وحدتِ صف کی ضرورت ہوتی ہے، اس لئے آپسی معاملات کی درستگی بھی ضروری ہے، اور انضباط و پابندی جہاد کی اساس وبنیاد ہے، اس لئے کہ انضباط اور پابندی کے بغیر جہاد ناممکن ہے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ بیان کیا ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت ایمان کی علامت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حقیقی اہلِ ایمان کی صفات کی بھی تعیین کی ہے، ان صفات کی تعیین جہادِ اسلامی میں اہمیت کی حامل ہے، اس لئے کہ حقیقی ایمان کے ذریعہ ہی اسلامی جہاد انجام پاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کی صفات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ان کے سامنے جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل لرزہ براندام ہو جاتے ہیں، ان پر خوف اور رقت طاری ہوتی ہے، اور جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے تو ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔

اسی طرح اہلِ ایمان کی صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ اللہ پر توکل کرتے ہیں، وہ اللہ کے سوا اور کسی سے امید نہیں رکھتے ہیں، اللہ کے علاوہ اور کسی کو مقصود نہیں سمجھتے ہیں اور اللہ کے علاوہ اور کسی کی پناہ نہیں لیتے ہیں، اور اسی سے حاجات وضروریات طلب کرتے ہیں، اور وہ جانتے ہیں کہ اللہ جو چاہے گا وہ ہوگا اور جو وہ نہیں چاہے گا نہیں ہوگا، اور وہی مخلوق میں متصرف ہے، وہ تنہا ہے، اس کا کوئی شریک وسہیم نہیں ہے، اور نہ ہی کوئی اس کے حکم کو ٹالنے والا ہے، وہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔

ایک اور صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ نماز قائم کرتے ہیں، اس کے اوقات، وضو، رکوع اور سجود کی حفاظت واہتمام کرتے ہیں، اسی طرح مکمل طور پر طہارت حاصل کرنا، مکمل رکوع اور سجود کرنا، اس میں قرآن کی تلاوت کرنا، تشہد اور نبی کریم ﷺ کے لئے دعا کرنا، ان سب کا تعلق نماز قائم کرنے سے ہے۔

مزید ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ اللہ کے عطا کردہ مال میں سے انفاق کرتے ہیں جس میں زکوۃ اور واجب ومستحب صدقہ بھی داخل ہے، اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ تمام انسان اللہ کے بندے ہیں اور اللہ کے نزدیک ان میں سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کی مخلوق کے لئے سب سے زیادہ نفع بخش اور مفید ہو، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے کہ ان صفات سے متصف افراد ہی حقیقی ایمان والے ہیں اور ان کے لئے اللہ کے پاس بلند مقام ومرتبہ ہے، اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو معاف کرے گا اور اچھائیوں کا بدلہ عطا کرے گا، اس طرح سے اس سورہ کی تمہید مکمل ہو جاتی ہے، ان تمہیدی آیات میں جہاد کے لوازمات کے لئے حوصلے بلند کئے گئے ہیں، ناکامی کے تمام عوامل واسباب کو واضح کیا گیا ہے اور اطاعت وفرمانبرداری اور ایمانِ کامل کے مقامِ بلند پر فائز ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔ (دیکھیں: الاساس فی التفسیر 2113/4، 2114)

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلْأَنفَالِ ۖ قُلِ ٱلْأَنفَالُ لِلَّهِ وَٱلرَّسُولِ ۖ فَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَأَصْلِحُوا۟ ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۖ وَأَطِيعُوا۟ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥٓ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝١ إِنَّمَا ٱلْمُؤْمِنُونَ ٱلَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ ٱللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ ءَايَٰتُهُۥ زَادَتْهُمْ إِيمَٰنًا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ۝٢ ٱلَّذِينَ يُقِيمُونَ ٱلصَّلَوٰةَ وَمِمَّا رَزَقْنَٰهُمْ يُنفِقُونَ ۝٣

أُوْلَـٰٓئِكَ هُمُ ٱلْمُؤْمِنُونَ حَقًّاۚ لَّهُمْ دَرَجَـٰتٌ عِندَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ﴿٤﴾ ترجمہ: ''وہ تم سے اَنفال کے متعلق پوچھتے ہیں، کہہ دیجئے: اَنفال اللہ اور رسول کے لئے ہے، پس تم اللہ سے ڈرو اور باہمی تعلقات کی اصلاح کرو اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اگر تم مومن ہو، ایمان والے وہی ہیں کہ جب اللہ کا نام آئے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب اس کی آیتیں ان پر پڑھی جائیں تو ان کا ایمان زیادہ ہو جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ وہ جو نماز قائم کرتے ہیں اور جو ہم نے انہیں رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ یہی سچے ایمان والے ہیں، ان کے رب کے ہاں ان کے لئے درجے ہیں اور بخشش ہے اور عزت کا رزق ہے''۔ (سورۃ الأنفال: 1-4)

استاد محمد امین مصری رقمطراز ہیں: ان آیات میں بدر میں اہلِ ایمان کے اعمال کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا ہے، بلکہ انتہائی سخت اور مؤثر عتاب و سرزنش کا ذکر کیا گیا ہے، ایسا عتاب جو اہلِ ایمان کو اپنے نفوس کا جائزہ لینے اور اپنے رب سے شرم کرنے پر آمادہ کرتا ہے، بعض پہلو ایسے ہیں جن پر آیات نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور ان میں کمزوری کے نقاط کو طاقتور اسلوب میں واضح طور پر بیان کیا ہے اور نفوس کے اندر پائی جانے والی کمزوریوں کی باریک بینی کے ساتھ بہترین تصویر کھینچی ہے، اس منظر کشی سے گویا کہ وہ آنکھ کے لئے ایک قابل دید چیز بن جاتی ہیں۔

اس طرح کے اسلوب کا تقاضا یہ ہے کہ یہ ایک مؤمن کے ضمیر کو جھنجوڑ کر رکھ دے تاکہ وہ اپنے درمیان اور ایمان کے ان درجات کے درمیان پائی جانے والی مسافت اور دوری کو محسوس کر سکے جن درجات تک پہنچنے کے لئے اس کا دل تڑپتا ہے، یہ آیات حکیم و علیم ذات کے ذریعہ کی جانے والی تربیت کا حصہ ہیں، ان میں ذوقِ سلیم محسوس کرتا ہے کہ عام عتاب و سرزنش کے بغیر ہی عتاب کا بہترین اسلوب اختیار کیا گیا ہے، لیکن اس اسلوب میں نفوس کے اندر پائے جانے والی کیفیات اور کمزوریوں کی منظر کشی اس انداز سے کی گئی ہے کہ عام انسان کو بھی یقین ہو جاتا ہے کہ ایک صحیح الایمان شخص کے لئے بھی یہ درست نہیں ہے کہ اس کے اندر یہ کمزوریاں پائی جائیں، اسی لئے ان آیات میں سب سے پہلے ان بلند ایمانی خصائص اور خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے جو ایک مؤمن اور غیر مؤمن کے مابین طویل مسافت و دوری کی منظر کشی کرتی ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ إِنَّمَا ٱلْمُؤْمِنُونَ ٱلَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ ٱللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ ءَايَـٰتُهُۥ زَادَتْهُمْ إِيمَـٰنًا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴿٢﴾ ٱلَّذِينَ يُقِيمُونَ ٱلصَّلَوٰةَ وَمِمَّا رَزَقْنَـٰهُمْ يُنفِقُونَ ﴿٣﴾ أُوْلَـٰٓئِكَ هُمُ ٱلْمُؤْمِنُونَ حَقًّاۚ لَّهُمْ دَرَجَـٰتٌ عِندَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ﴿٤﴾ ترجمہ: ''ایمان والے وہی ہیں کہ جب اللہ کا نام آئے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب اس کی آیتیں ان پر پڑھی جائیں تو ان کا ایمان زیادہ ہو جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ وہ جو نماز قائم کرتے ہیں اور جو ہم نے انہیں رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ یہی سچے ایمان والے ہیں، ان کے رب کے ہاں ان کے لئے درجے ہیں اور بخشش ہے اور عزت کا رزق ہے''۔ (سورۃ الأنفال: 2-4)

ان آیات میں عتاب کا ذکر نہیں کیا گیا ہے، لیکن حقیقی صورتحال کا ذکر کیا گیا ہے اور اصل صورتحال کا ذکر کرنا عتاب سے زیادہ بلیغ ہے، اسی طرح مدینہ سے ان کے نکلنے کی کیفیت اور حقیقت کو بھی بیان کیا گیا ہے کہ بعض لوگ ایسے بھی تھے گویا کہ ان کو موت کی طرف ہانک کر لے جایا جا رہا ہو، اور وہ موت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں۔

سورت کا آغاز أنفال اور مالِ غنیمت کے موضوع سے، اس کی تقسیم اور ان کے سوال کے ذریعہ کیا گیا ہے اور اس کے فوراً بعد چار آیات میں اہلِ ایمان کے نفوس کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان کو حبِ مال اور مادیت پسندی کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے اختلاف سے پاک کیا گیا ہے۔

اہلِ ایمان کی زندگی میں اہمیت کے پیشِ نظر أنفال اور مالِ غنیمت کے ذریعہ اس سورت کا آغاز کیا گیا ہے، اگرچہ مالِ غنیمت کی تقسیم کے سلسلہ میں اختلاف بعد میں ہوا تھا اور بدر کی طرف نکلنے اور قتال کے سلسلہ میں اختلاف پہلے ہوا تھا، لیکن مالِ غنیمت کے سلسلہ میں ہونے والے اختلاف کا ذکر پہلے کیا گیا ہے، یہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ایک اسلوب اور طریقہ ہے کہ قصص و واقعات کا ذکر وقوع پذیر ہونے کی ترتیب کے اعتبار سے نہیں کیا جاتا ہے۔ (من ھدی سورۃ الأنفال، د۔ محمد المصری، ص: 67،68،95،96)

یہ ربانی توضیح مشرکین پر فتح و کامیابی سے بڑی حقیقت کو بیان کرتی ہے، وہ یہ کہ آپسی معاملات کی درستگی اور نفسانی کمزوریوں اور قلبی امراض پر حقیقی فتح اللہ کی میزان میں زیادہ اہم اور بڑی چیز ہے، اور ایسی فتح و کامیابی کا کوئی فائدہ نہیں ہے جس کے بعد صفوں میں کشمکش اور دلوں میں اختلاف پیدا ہو۔

آیات اس بات کو بھی واضح کرتی ہیں کہ تقوی اور ایمان کا تعلق ایک مسلمان کی زندگی کے تمام امور سے ہے اور ان سے ہی زندگی میں حرکت اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے جہاد کے سوتے پھوٹتے ہیں۔

اللہ کے رسول ﷺ نے مالِ غنیمت کی تقسیم میں عدل سے کام لیتے ہوئے ایسے افراد کے لئے حصہ متعین فرمایا جو کسی ذمہ داری کی وجہ سے رسول ﷺ کے ساتھ شریک نہیں ہوئے تھے، اللہ کے رسول ﷺ ہر شخص کے حالات کی رعایت فرماتے تھے، غزوۂ بدر میں نبی کریم ﷺ نے بعض صحابہ کرام کو غزوہ میں شرکت نہ کرنے کے بارے میں رخصت دی، اس لئے کہ ان کے گھریلو حالات ان سے تقاضا کرتے تھے کہ وہ گھر پر ہی رہیں، جیسے کہ آپ ﷺ نے حضرت عثمانؓ کو غزوۂ بدر میں شریک ہونے کے بارے میں رخصت دی، اس لئے کہ ان کی شریکِ حیات حضرت رقیہ بیمار تھیں اور ان کو کسی ایسے شخص کی ضرورت تھی جو ان کی دیکھ ریکھ کر سکے، امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں روایت بیان کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضرت عثمانؓ کی عدمِ شرکت کا سبب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اور جہاں تک تعلق ہے بدر میں ان کی عدمِ شرکت کا تو ان کی زوجیت میں اللہ کے رسول ﷺ کی بیٹی تھی اور وہ بیمار تھیں، اس لئے اللہ کے رسول ﷺ نے ان سے فرمایا: آپ کے لئے اس شخص کا سا اجر ہے جو بدر میں شریک ہوا، اور آپ کے لئے مالِ غنیمت کا حصہ بھی ہے۔ (صحیح البخاری: 3699)

اسی طرح آپ ﷺ نے حضرت ابو امامہؓ کو اپنی والدہ کے پاس رہنے کا حکم دیا، اس لئے کہ ان کی والدہ بیمار تھیں اور ان کو بھی حضرت امامہؓ کی ضرورت تھی، حضرت ابو امامہ بن ثعلبہؓ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے ان کو بدر کی طرف نکلنے کہ حکم دیا اور انہوں نے

بھی آپ ؐ کے ساتھ نکلنے کا پختہ ارادہ کیا، ان کے ماموں حضرت ابو بردہ بن نیّار نے ان سے کہا: اے بھانجے! اپنی والدہ کے پاس رہو، انہوں میں اس کا ذکر نبی کریم ﷺ سے کیا تو آپ ﷺ نے ابو امامہ ؓ کو اپنی والدہ کے ساتھ رہنے کا حکم دیا اور ابو بردہ ؓ کو ساتھ لے کر گئے، نبی کریم ﷺ جب واپس تشریف لائے تو ان کا انتقال ہو چکا تھا، آپ ﷺ نے ان کی نماز جنازہ ادا فرمائی۔ (المعجم الکبیر للطبرانی: 792، مجمع الزوائد للہیثمی: 3/31-32)

ان بلند اخلاق کے ذریعہ اور اپنے لشکر کے احساسات اور گھریلو حالات کی رعایت کے نتیجہ میں قیادت اور لشکر کے درمیان ربط و تعلق میں قوت و استحکام پیدا ہوتا ہے۔

وہ صحابہ کرام جو مخصوص ذمہ داریوں کی انجام دہی پر متعین تھے، یا وہ راستے میں زخمی ہو گئے اور رسول اللہ ﷺ نے ان کو واپس کر دیا، ان کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

۱) ابو لبابہ ؓ: آپ ؓ کو نبی کریم ﷺ نے مدینہ میں جانشین مقرر فرمایا تھا۔

۲) عاصم بن عدی ؓ: آپ ﷺ نے ان کو مدینہ کے عالیہ کے باشندوں کے یہاں ایک مشن پر روانہ کیا تھا۔

۳) حارث بن حاطب ؓ: اللہ کے رسول ﷺ نے ان کو بنو عمرو بن عوف کے یہاں ایک مشن پر روانہ کیا تھا۔

۴) حارث بن صمّہ: آپ ؓ راستے میں گر پڑے اور زخمی ہوئے، اس لئے آپ ﷺ نے انہیں واپس کر دیا۔

۵) خوات بن جبیر ؓ: آپ ؓ کو راستے میں پنڈلی پر ایک پتھر لگا، اس لئے آپ ﷺ نے انہیں مقام صفراء سے واپس کیا۔ (دیکھیں: من معین السیرۃ، ص: 215)

اسی طرح آپ ﷺ نے شہداء کے وارثین اور ان کے رشتہ داروں کو مالِ غنیمت میں سے حصہ دیا، اس طرح اسلام کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اسلام نے ہی سب سے پہلے شہداء کو مختلف اعتبار سے نوازا اور ان کی اولاد اور اہلِ خانہ کا خیال کیا۔

۲: قیدی:

حضرت عبداللہ بن عباس ؓ فرماتے ہیں: جب انہوں نے قیدیوں کو گرفتار کیا تو اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت ابو بکر ؓ اور حضرت عمر ؓ سے فرمایا: ان قیدیوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ حضرت ابو بکر ؓ نے فرمایا: اے اللہ کے نبی! یہ ہمارے چچازاد اور خاندان کے لوگ ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ آپ ان سے فدیہ لے کر چھوڑ دیں، جس سے ہمیں کفار کے مقابلہ میں قوت حاصل ہو گی اور شاید اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو اسلام کی طرف ہدایت عطا فرمائے۔ اس کے بعد اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: اے خطاب کے بیٹے! آپ کی کیا رائے ہے؟ انہوں نے کہا: نہیں، اللہ کے رسول ﷺ! میری رائے وہ نہیں ہے جو ابو بکر ؓ کی ہے بلکہ میری رائے یہ ہے کہ آپ ان کو ہمارے حوالے کر دیں اور ہم ان کی گردنیں ماریں، عقیل کو علی ؓ کے حوالہ کیجئے، وہ ان کی گردن ماریں، اور مجھے میرا فلاں عزیز دیجئے، میں اس کی گردن ماروں کیونکہ یہ کفر کے مہرے اور سرغنے ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کو حضرت ابو بکر ؓ کی رائے پسند آئی اور میری رائے پسند نہیں آئی، دوسرے دن میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ اور ابو بکر ؓ بیٹھے ہوئے رو رہے ہیں، میں نے عرض کیا: اے اللہ کے

رسولؐ! مجھے بتائیں آپ اور آپ کے ساتھی کیوں رو رہے ہیں؟ اگر مجھے بھی رونا آئے تو میں بھی روؤں گا، ورنہ رونے کی صورت بناؤں گا، اللہ کے رسول ﷺ نے میرے سامنے فدیہ لینے کی رائے پیش کی، ان کا عذاب اس درخت سے بھی زیادہ نزدیک میرے سامنے پیش کیا گیا، آپؐ نے اپنے قریب ایک درخت کی طرف اشارہ فرمایا، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی: ﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَن يَكُونَ لَهُۥٓ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي ٱلْأَرْضِ ....فَكُلُواْ مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلَٰلًا طَيِّبًا﴾ (سورہ الانفال: 67-69) اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے مالِ غنیمت کو حلال کر دیا۔ (صحیح مسلم: 1763، سنن ابوداؤد: 2690، سنن ترمذی: 3081)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے فرماتے ہیں: جب غزوۂ بدر ہو چکا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ان قیدیوں کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا: اے اللہ کے رسولؐ! یہ آپ کی قوم اور گھرانے کے لوگ ہیں، انہیں زندہ رہنے دیں اور ان سے مانوس ہونے کی کوشش کریں، شاید اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرمالے، حضرت عمرؓ نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ! ان لوگوں نے آپ کو وطن سے نکالا، آپ کی تکذیب کی، ان کی گردنیں اتار دیں۔ حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے فرمایا: اے اللہ کے رسولؐ! کوئی ایسی وادی تلاش کیجئے جہاں لکڑیاں زیادہ ہوں، انہیں اس وادی میں جمع کر کے ان لکڑیوں کو آگ لگادیں، اس پر عباسؓ کہنے لگے: تم نے قرابت ورشتہ داری کو ختم کر دیا! نبی کریم ﷺ کوئی جواب دیئے بغیر اندر تشریف لے گئے، کچھ لوگ کہنے لگے کہ نبی کریم ﷺ ابو بکرؓ کی رائے پر عمل کریں گے، کچھ لوگوں نے کہا: عمرؓ کی رائے کو اختیار کریں گے، اور کچھ لوگ کہنے لگے کہ آپؐ عبداللہ بن رواحہؓ کی رائے کو ترجیح دیں گے، اس کے بعد اللہ کے رسول ﷺ باہر تشریف لائے اور فرمایا: اللہ تعالیٰ اپنے معاملہ میں بعض لوگوں کے دلوں کو اتنا نرم کر دیتے ہیں یہاں تک کہ وہ دودھ سے بھی زیادہ نرم ہو جاتے ہیں اور بعض لوگوں کے دلوں کو اتنا سخت کر دیتے ہیں یہاں تک کہ وہ پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو جاتے ہیں، ابو بکر آپ کی مثال ابراہیم -علیہ السلام- کی سی ہے جنہوں نے فرمایا تھا: ﴿فَمَن تَبِعَنِي فَإِنَّهُۥ مِنِّي ۖ وَمَنْ عَصَانِي فَإِنَّكَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ ترجمہ: "لہٰذا جو میرے طریقے پر چلے وہ میرا ہے اور جو میرے خلاف طریقہ اختیار کرے تو یقیناً تو درگزر کرنے والا مہربان ہے"۔ (سورۃ ابراھیم: 36) اے ابو بکر! آپ کی مثال عیسٰی -علیہ السلام- کی سی ہے جنہوں نے فرمایا تھا: ﴿رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى ٱلْأَرْضِ مِنَ ٱلْكَٰفِرِينَ دَيَّارًا﴾ ترجمہ: "میرے رب، اِن کافروں میں سے کوئی زمین پر بسنے والا نہ چھوڑ"۔ (سورۂ نوح: 26)

اور اے عمر! آپ کی مثال موسی -علیہ السلام- جیسی ہے جنہوں نے فرمایا تھا: ﴿رَبَّنَا ٱطْمِسْ عَلَىٰٓ أَمْوَٰلِهِمْ وَٱشْدُدْ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُواْ حَتَّىٰ يَرَوُاْ ٱلْعَذَابَ ٱلْأَلِيمَ﴾ ترجمہ: "اے رب، ان کے مال غارت کر دے اور ان کے دلوں پر ایسی مہر کر دے کہ ایمان نہ لائیں جب تک دردناک عذاب نہ دیکھ لیں"۔ (سورۂ یونس: 88)

اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: تم لوگ ضرورت مند ہو، اور ان میں سے کوئی شخص فدیہ یا قتل کے بغیر واپس نہیں جائے گا۔

سیدنا ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! سوائے سہیل بن بیضاء کے! کیونکہ میں نے انہیں اسلام کا ذکر کرتے ہوئے سنا ہے، اس پر نبی کریم ﷺ خاموش ہو گئے۔ فرماتے ہیں: مجھے اس دن سے زیادہ کبھی اس بات کا خوف محسوس نہیں ہوا

کہ کہیں آسمان سے مجھ پر کوئی پتھر نہ گر پڑے، یہاں تک کہ خود نبی کریم ﷺ نے بھی فرمادیا: سوائے سہیل بن بیضاء کے۔اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَن يَكُونَ لَهُۥٓ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي ٱلْأَرْضِ .....الخ﴾ ترجمہ: ”کسی نبی کے لئے یہ زیبا نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک کہ وہ زمین میں دشمنوں کو اچھی طرح کچل نہ دے.......الخ“۔(سورۃ الانفال: 67-68) (مسند احمد:3632،مسند ابو یعلی:5187،سنن ترمذی: 1714،3085،مستدرک حاکم:3/21-22)

یہ آیت اسلامی ریاست کی تعمیر کے سلسلہ میں ایک اہم قاعدہ وضع کرتی ہے جبکہ وہ تشکیل اور اعداد و تیاری کے مرحلہ میں ہو اور واضح کرتی ہے کہ اس مرحلہ میں ریاست نرمی کا اظہار نہ کرے تاکہ اس کے دشمنوں کو اس کی طرف میلی آنکھ سے دیکھنے کی ہمت نہ ہو،اس قاعدہ کے پیشِ نظر جزئیات کا اعتبار نہیں کیا جائے گا،اگرچہ ان جزئیات پر عمل کرنے کی ضرورت ہی کیوں نہ ہو۔(دیکھیں: من معین السیرۃ،ص: 209)

حضرت سعد بن معاذؓ نے اس بات کو ناپسند کیا تھا جبکہ صحابہ کرام نے مشرکین کو قید کرنا شروع کیا تھا اور اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت سعدؓ کے چہرہ پر ناگواری کے آثار محسوس کئے تھے،یہ دیکھ کر اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا تھا: واللہ،اے سعد! ایسا لگ رہا ہے گویا کہ لوگ جو کچھ کر رہے ہیں آپ اس کو ناپسند کر رہے ہیں؟انہوں نے کہا: جی ہاں! واللہ،اے اللہ کے رسولؐ! یہ پہلی جنگ تھی جس میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے ساتھ دو دو ہاتھ ہونے کا موقع دیا تھا،اس لئے کسی شخص کو باقی رکھنے کے مقابلہ میں میرے نزدیک قتل کر دینا زیادہ پسندیدہ تھا۔(سیرت ابن ہشام:2/280-281،التربیۃ الجہادیۃ،العضبان،1/141)

قیدیوں کے ساتھ نبی کریم ﷺ کا معاملہ رحم، عدل، دور اندیشی اور دعوتی مقاصد پر مبنی تھا، اسی لئے آپ ﷺ نے مختلف اسالیب اور متنوع طریقے اختیار کئے، بعض کو آپ ﷺ نے قتل کیا، بعض سے فدیہ قبول کیا، بعض پر بغیر کچھ لئے ہوئے احسان کیا، جبکہ بعض کی آزادی کو اس بات کے ساتھ مشروط کیا کہ وہ مسلمانوں کے دس بچوں کو تعلیم دے۔

أ: مطعم بن عدی کے جوار کی حفاظت ورعایت:

اللہ کے رسول ﷺ نے بدر کے قیدیوں کے متعلق فرمایا: اگر مطعم بن عدی زندہ ہوتے اور ان پلید قیدیوں کے لئے سفارش کرتے تو میں ان کے کہنے پر ان کو چھوڑ دیتا۔(صحیح بخاری:4024،سنن ابوداؤد:2689)

اس حدیث سے وفاداری اور احسان شناسی کی بہترین تصویر سامنے آتی ہے۔چنانچہ مطعم کے بہترین قابل ذکر احسانات اور کارنامے تھے،یہ وہی شخص ہے جن کی پناہ اور جوار میں رسول اللہ ﷺ اس وقت داخل ہوئے جب آپؐ طائف سے واپس تشریف لائے،اسی طرح معاشرتی بائیکاٹ پر مشتمل معاہدہ کو توڑنے میں یہ پیش پیش تھے،اس سے پتہ چلتا ہے کہ دوسروں کے احسانات اور کارناموں کا کس طریقہ سے بدلہ دینا چاہیے اگرچہ وہ مشرکین ہی کیوں نہ ہو۔ (من معین السیرۃ،ص208،التربیۃ القیادیۃ: 3/54)

ب: عقبہ بن اُبی معیط اور نضر بن حارث کا قتل:

اگر مطعم بن عدی جیسے شخص کے ساتھ وفاداری اور احسان شناسی ضروری ہے تو دوسری طرف عقبہ بن اُبی معیط اور نضر بن حارث جیسے جنگی مجرموں اور فتنہ پروروں کے ساتھ سخت موقف اختیار کرنا بھی ضروری ہے، یہ دونوں اسلام کے خلاف جنگ بھڑکانے والے اہم سرغنوں میں تھے اور مسلمانوں کے لئے مصائب و آلام کے ہر وقت منتظر رہتے تھے، ان دونوں کا باقی رہنا اسلام کے لئے ایک بہت بڑا خطرہ تھا، خاص طور پر ان فیصلہ کن حالات میں جن سے تحریکِ اسلامی گزر رہی تھی، اس لئے اگر ان دونوں کو آزاد کر دیا جاتا تو یہ دونوں اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لئے کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے، اس لئے ان حالات میں ان دونوں کو قتل کرنا مصلحتِ عامہ کے پیشِ نظر ضرورت کا تقاضا تھا، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ان کو قتل کرنے کا حکم دیا، جب کہ آپ ﷺ مدینہ کی طرف واپس آتے ہوئے مقام صفراء پہنچے، جب عقبہ بن اُبی معیط نے اپنے قتل کے حکم کے بارے میں سنا تو اس نے کہا: ہائے افسوس! اے قریش کے لوگو، مجھے یہاں پر کیوں قتل کیا جا رہا ہے؟ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ تمہاری عداوت کی وجہ سے''۔ اس نے کہا: اے محمد! آپ کا احسان کرنا میرے لئے زیادہ بہتر ہے، لہذا میرے ساتھ اپنی قوم کے افراد جیسا معاملہ کریں، اگر آپ ان کو قتل کرتے ہیں تو مجھے بھی قتل کیجئے اور اگر آپ ان پر احسان کرتے ہیں تو مجھ پر بھی احسان کیجئے، اور اگر آپ ان سے فدیہ لیتے ہیں تو میں بھی انہی کی طرف فدیہ دوں گا، اے محمدؐ! میرے بچوں کو کون سنبھالے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جہنم کی آگ، اے عاصم! اس کو آگے لاؤ اور اس کی گردن اڑا دو۔ (مستدرک حاکم: 2/124، مجمع الزوائد: 6/89)

اس کے بعد حضرت عاصمؓ نے اس کو آگے بڑھایا اور اس کی گردن مار دی۔ (دیکھیں: التربیۃ القیادیۃ: 3/60)

اور جہاں تک نضر بن حارث کا تعلق ہے تو وہ قریش کے شیاطین میں سے تھا اور رسول اللہ ﷺ کو ایذاء پہنچاتا تھا اور آپ ﷺ کے ساتھ عداوت و دشمنی کرتا تھا، وہ حیرہ گیا تھا اور وہاں فارسی بادشاہوں کی کہانیاں اور رستم اور اسفندیار کے قصے سیکھ کر آیا تھا، جب رسول اللہ ﷺ کسی مجلس میں بیٹھ کر اللہ کے بارے میں تذکیر فرماتے تھے اور اپنی قوم کو سابقہ اقوام کے لاحق ہونے والے عذاب سے ڈراتے تھے تو وہ آپؐ کی مجلس میں آکر کہتا تھا: اے قریش کے لوگو، واللہ! میں ان سے بہتر گفتگو کرتا ہوں، لہذا میرے پاس آؤ، میں آپ کو ان کی باتوں سے بہتر باتیں سناتا ہوں، اس کے بعد وہ انہیں فارسی بادشاہوں اور رستم و اسفندیار کے قصے کہانیاں سناتا تھا، اس کے بعد وہ کہتا: محمد کس طرح مجھ سے بہتر گفتگو کرنے والا ہے؟۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویہ، ابن ہشام: 1/439، 440)

اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں تکبر اختیار کرنے والا اور اللہ کو چیلنج دینے والا یہ شخص، جو یہ سمجھتا تھا کہ وہ اللہ کے کلام سے بہتر کلام نازل کر سکتا ہے اور وہ محمدؐ سے بہتر حدیثیں سنا سکتا ہے، اس طرح کے کردار کے حامل شخص کے لئے ضروری تھا کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے لئے اس سے بدلہ لیا جائے، جبکہ وہ رب العالمین کی طرف سے مبعوث کئے گئے رسول کے سامنے آچکا تھا، اسی لئے اللہ کے رسول ﷺ نے اس کے بارے میں مشورہ بھی نہیں کیا، بلکہ اس کے قتل کے بارے میں حکم دے دیا اور اس کو حضرت علی بن ابی طالبؓ نے قتل کیا۔ (دیکھیں: سیرۃ ابن ہشام: 2/255، التربیۃ القیادیۃ: 3/57)

ان دو مجرموں کے قتل کے ذریعہ مسلمانوں کو یہ سبق سیکھنے کو ملا کہ عداوت رکھنے والے بعض سرکش مجرموں کے ساتھ نرمی برتنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اس لئے کہ وہ شر کے سرغنے اور گمراہی کی جڑ ہیں، اس لئے ان کے ساتھ نرمی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا ہے، اس لئے کہ وہ عفو و درگزر اور معافی کی حدود سے تجاوز کر چکے ہیں، یہ دونوں مجرم بھی بدترین کٹر کافر، سخت عداوت و دشمنی اور حسد کرنے والے اور اسلام اور مسلمانوں کی توہین کرنے والے تھے۔(التربیۃ القیادیۃ، 3/60، البدایہ والنہایہ: 3/306)

ج: قیدیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کا نبوی منہج:

جب اللہ کے رسول ﷺ مدینہ منورہ واپس تشریف لائے تو آپ ؐ نے صحابہ کرام کے درمیان قیدیوں کو تقسیم کیا، اور ان سے فرمایا: میں تمہیں ان کی بارے میں خیر کی وصیت کرتا ہوں، ان کا خاص خیال رکھنا، اس نبوی وصیت کے ذریعہ اللہ تعالی کے اس فرمان کو عملی شکل میں نافذ کیا جا رہا تھا: ﴿وَيُطْعِمُونَ ٱلطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِۦ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا﴾ ترجمہ: ’’اور اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں‘‘۔(سورۃ الانسان: 8)

حضرت مصعب بن عمیرؓ کے بھائی ابو عزیز بن عمیر اپنا مشاہدہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: میں بھی بدر کے قیدیوں میں تھا، رسول اللہ ﷺ نے ہدایت فرمائی کہ قیدیوں کے ساتھ خیر کا معاملہ کرنے کی میں تمہیں وصیت کرتا ہوں، میں انصار کے کچھ لوگوں کے ساتھ رہتا تھا، جب وہ دوپہر اور رات کا کھانا لگاتے تھے تو وہ خود کھجور کھاتے تھے اور مجھے گیہوں کے آٹے کی روٹی کھلاتے تھے، اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے حسنِ سلوک کی وصیت فرمائی تھی۔ (المعجم الصغیر للطبرانی: 401، المعجم الکبیر للطبرانی: 22/393، تاریخ طبری: 2/460، مجمع الزوائد: 6/86)

ابو العاص بن ربیع بیان کرتے ہیں کہ میں انصار کی ایک جماعت کے ساتھ رہتا تھا، اللہ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے، ہم جب شام کا یا دوپہر کا کھانا کھاتے تھے تو وہ مجھے روٹی دے کر مجھے ترجیح دیتے تھے اور خود کھجور کھا لیتے تھے، روٹی ان کے پاس کم ہوتی تھی جبکہ کھجور ان کے لئے زادِ راہ تھی یہاں تک کہ اگر کسی شخص کے ہاتھ کوئی روٹی کا ٹکڑا الگ جاتا تھا تو وہ اسے مجھے دے دیتا اور ولید بن مغیرہ بھی اسی طرح کی بات کہتے تھے۔ وہ مزید یہ بھی فرماتے تھے کہ وہ ہمیں دیتے تھے اور خود چلے جاتے تھے۔(المغازی للواقدی: 1/119)

یہ اخلاقِ کریمانہ جن کی اساس قرآن کریم نے رکھی ہے اور جن کی ہدایت و نصیحت نبی کریم ﷺ نے اصحاب کو فرمائی تھی، ان اخلاقِ کریمانہ کو صحابہ کرام نے اپنے اخلاق و کردار اور فطرت میں شامل کر کے اپنی فطرت ثانیہ بنا لیا تھا، انہی اخلاقِ کریمانہ نے متعدد معزز قیدیوں کو اس قدر متاثر کیا کہ وہ حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے، چنانچہ اُبو عزیز بدر کے فوراً بعد اسلام لاتے ہیں، جبکہ قیدی مدینہ منورہ پہنچتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کی وصیت کو نافذ کیا جاتا ہے، ان کے ساتھ سائب بن عبید بھی اسلام لے آتے ہیں جبکہ انہوں نے اپنا فدیہ ادا کر دیا، اسلام کی دعوت ان کے دلوں میں اثر انداز ہو گئی اور اسلام نے ان کے دلوں کو پاک و صاف کر دیا، اور قیدی اپنے وطن اور اہل و عیال کے پاس واپس اس حال میں پہنچے کہ وہ حضرت محمد ﷺ کے بارے میں آپ کے اخلاق، محبت، دعوت، نیکی، تقوی اور اصلاح و خیر کے بارے میں ترجمانی اور گفتگو کرتے تھے۔

بلاشبہ قیدیوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور بہترین معاملہ اسلام کے اخلاقی پہلو کی عظمت وبلندی پر شاہدِ عدل ہے، اس لئے کہ اعدائے اسلام کے ساتھ صحابہ کرام نے حسنِ اخلاق اور عزت واکرام کا اور اعلی درجہ کا سلوک کیا ہے جس میں ایثار و ترجیح واضح طور پر نمایاں ہوتا ہے۔ (دیکھیں: محمد رسول اللہ ﷺ، العرجون 3/474، التاریخ الاسلامی: 4/175)

د: نبی کریم ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ کا فدیہ:

قریش نے رسول اللہ ﷺ کو یہ پیغام بھیجوایا کہ ان کے قیدیوں کو فدیہ لے کر رہا کر دیا جائے، ہر قبیلہ نے اپنے اپنے قیدیوں کا فدیہ ادا کیا، حضرت عباسؓ نے فرمایا: اے اللہ کے رسولؐ! میں تو مسلمان تھا، اللہ کے رسولؐ نے فرمایا: اللہ آپ کے اسلام کے بارے میں زیادہ جانتا ہے، اگر ایسا ہی ہے جیسے کہ آپ کہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ آپ کو اس کی جزادے گا، اور جہاں تک آپ کے ظاہر کا تعلق ہے تو وہ ہمارے خلاف تھا، اس لئے آپ اپنی طرف سے اور اپنے بھتیجوں نوفل بن حارث بن عبد المطلب اور عقیل بن ابی طالب بن عبد المطلب کی طرف سے اور اپنے حلیف عتبہ بن عمرو بن حارث بن فہر کی طرف سے فدیہ ادا کریں، انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ! میرے پاس اتنا مال نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے دریافت کیا: وہ مال کہاں ہے جو آپ نے اور اُم الفضل نے دفن کر کے رکھا تھا اور آپ نے ان سے کہا تھا کہ اگر میں اس سفر میں مارا جاؤں تو یہ مال جو میں نے دفن کیا ہے بنو الفضل، عبد اللہ اور قثم کے لئے ہے؟ انہوں نے کہا: اللہ کی قسم! اے اللہ کے رسولؐ! بے شک میں تسلیم کرتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، اس چیز کا علم تو میرے اور اُم الفضل کے سوا کسی کو نہیں تھا، اے اللہ کے رسولؐ! آپ نے مجھ سے جو بیس اوقیہ مال (مالِ غنیمت کے طور پر) حاصل کیا ہے جو میرے ساتھ تھا، اس کو میرے فدیہ کے بدل کے طور پر قبول کر لیجئے، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: یہ چیز تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں آپ سے مالِ غنیمت کے طور پر عطا کی ہے، لہذا انہوں نے اپنا اور اپنے دونوں بھتیجوں اور اپنے حلیف کا فدیہ ادا کیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِيُّ قُل لِّمَن فِيٓ أَيۡدِيكُم مِّنَ ٱلۡأَسۡرَىٰٓ إِن يَعۡلَمِ ٱللَّهُ فِي قُلُوبِكُمۡ خَيۡرٗا يُؤۡتِكُمۡ خَيۡرٗا مِّمَّآ أُخِذَ مِنكُمۡ وَيَغۡفِرۡ لَكُمۡۚ وَٱللَّهُ غَفُورٞ رَّحِيمٞ ٧٠ وَإِن يُرِيدُواْ خِيَانَتَكَ فَقَدۡ خَانُواْ ٱللَّهَ مِن قَبۡلُ فَأَمۡكَنَ مِنۡهُمۡۗ وَٱللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ٧١﴾ ترجمہ: "اے نبیؐ، تم لوگوں کے قبضہ میں جو قیدی ہیں ان سے کہو: اگر اللہ کو معلوم ہوا کہ تمہارے دلوں میں کچھ خیر ہے تو وہ تمہیں اُس سے بڑھ چڑھ کر دے گا جو تم سے لیا گیا ہے اور تمہاری خطائیں معاف کرے گا، اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ لیکن اگر وہ تیرے ساتھ خیانت کا ارادہ رکھتے ہیں تو اس سے پہلے وہ اللہ کے ساتھ خیانت کر چکے ہیں، چنانچہ اسی کی سزا اللہ نے انہیں دی کہ وہ تیرے قابو میں آگئے، اللہ سب کچھ جانتا اور حکیم ہے"۔ (سورۃ الأنفال: 70-71)

حضرت عباسؓ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے مجھے بیس اوقیہ کے بدلے بیس ایسے غلام عطا کئے جن میں سے ہر ایک کی قیمت بیس اوقیہ تھی، مزید اللہ تعالیٰ سے میں مغفرت کی امید رکھتا ہوں۔ (الدلائل للبیہقی: 3/142)

چونکہ اصول یہ ہے کہ اعتبار لفظ کے عموم کا ہوتا ہے، نہ کہ مخصوص سبب کا، اس لئے یہ آیتِ کریمہ اگرچہ حضرت عباسؓ کے بارے میں نازل ہوئی ہے مگر تمام قیدیوں پر اس کا انطباق ہوتا ہے، بعض انصار نے رسول اللہ ﷺ سے اجازت طلب کی اور کہا کہ ہمیں اجازت دیں تاکہ ہم اپنے بھانجے عباس کا فدیہ معاف کر دیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: واللہ! ان سے ایک درہم بھی مت چھوڑنا۔ (صحیح بخاری: 4018-1/2537)

اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ انہوں نے انتہائی ادب کا معاملہ کیا جبکہ انہوں نے یہ کہا کہ "ہمارے بھانجے" تاکہ ان کی رہائی کا احسان ان پر ہو، اور اگر وہ کہتے کہ "آپ کے چاچا" تو پھر احسان اللہ کے رسول ﷺ پر ہوتا، یہ ان کی ذہانت اور حسنِ ادب کا نتیجہ تھا، اور اللہ کے رسول ﷺ نے ان کی بات ماننے سے اس لئے انکار کیا تاکہ دین میں کسی طرح کی طرفداری کا امکان باقی نہ رہے۔ (دیکھیں: سبل الھدی والرشاد، الصالحی: 4/135، السیرۃ النبویۃ، ابو شہبہ: 2/176)

حضرت عباسؓ مکہ واپس آگئے جبکہ انہوں نے اپنا اور اپنے دونوں بھتیجوں کا فدیہ ادا کیا، انہوں نے اپنے اسلام کو مخفی رکھا اور مکہ میں اسلامی ریاست کے انٹیلی جنس (مخابراتی) نظام کی قیادت انتہائی مہارت اور صلاحیت کے ساتھ کرنے لگے، یہاں تک کہ ان کا یہ مشن فتح مکہ کے وقت مکمل ہو گیا اور انہوں نے فتح مکہ سے کچھ ہی وقت پہلے اپنے اسلام کا اعلان کر دیا۔ (التربیۃ القیادیۃ: 3/68)

ھ: اللہ کے رسول ﷺ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کے شوہر ابو العاص بن ربیع:

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: جب اہل مکہ نے اپنے قیدیوں کا فدیہ بھیجا تو رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ نے ابو العاص بن ربیع کے فدیہ کے طور پر کچھ مال بھیجا اور اس میں اپنا ہار بھی بھیجا، جو حضرت خدیجہؓ نے اُس وقت انہیں دیا تھا جب انہیں ابو العاص کے پاس بطورِ دلہن بھیجا، فرماتی ہیں کہ جب اللہ کے رسول ﷺ نے اس ہار کو دیکھا تو آپؐ پر عجیب رقت طاری ہو گئی اور فرمایا: اگر تم مناسب سمجھو کہ اس (زینب) کے قیدی کو رہا کر دو، اور جو مال اس نے بھیجا ہے اس کو واپس کر لو، صحابہ کرام نے عرض کیا: جی ہاں! اس کے بعد انہوں نے ان کو رہا کر دیا اور جو کچھ مال حضرت زینبؓ کا تھا اس کو واپس کر دیا۔ (سنن ابو داؤد: 2692، مسند احمد: 6/276، الدلائل للبیہقی: 3/154، المعجم الکبیر للطبرانی: 22/428، مجمع الزوائد: 9/214، صحیح السیرۃ النبویۃ، ص 261)

اللہ کے رسول ﷺ نے ان سے وعدہ لیا تھا کہ وہ حضرت زینبؓ کو آپؐ کے پاس آنے دیں، اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت زید بن حارثہؓ اور انصار کے ایک شخص کو بھیجا اور ان سے فرمایا: "وادی یاجج" میں انتظار کرنا یہاں تک کہ زینب تمہارے پاس سے گزریں اور پھر آپ ان کے ساتھ رہنا، یہاں تک کہ انہیں میرے پاس لے کر آجاؤ۔ (ایضاً)

بے شک رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کے شوہر ابو العاص بن ربیع کے بارے میں کہیں سے کوئی عندیہ نہیں ملتا ہے کہ انہوں نے کسی بھی طرح سے اسلامی تحریک کے خلاف کوئی موقف اختیار کیا ہو، انہوں نے اپنی زبان اور ہاتھوں کو رسول اللہ ﷺ کو ایذاء و تکلیف پہنچانے سے دور رکھا تھا، وہ اپنے مال اور تجارت میں مشغولیت کی وجہ سے اور رسول اللہ ﷺ سے حیا کی وجہ سے تحریکِ اسلامی کے سلسلہ میں قریش کی طرف سے اختیار کئے گئے طرزِ عمل اور اعمال سے بالکل الگ تھلگ تھے، بدر میں بھی رسول اللہ ﷺ کے داماد ان

قیدیوں کے زمرے میں شامل تھے جن کی اس معرکہ میں نہ کوئی آواز سنائی دی گئی، نہ ان کی کوئی رائے سامنے آئی اور نہ ہی قتال میں ان کی کوئی سرگرمی دیکھنے کو ملی، اور جب قریش نے اپنے قیدیوں کو رہا کرانا شروع کیا تو رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی اور ابوالعاص کی شریکِ حیات سیدہ زینب ﷺ نے بھی بطورِ فدیہ مال بھیجا، اس مال میں وہ ہار بھی شامل تھا جو ان کی والدہ سیدہ خدیجہؓ نے انہیں بطورِ ہدیہ اس وقت عنایت کیا تھا جبکہ انہیں اپنے شوہر کے پاس بطور دلہن بھیجا تھا۔

جب اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی صاحبزادی کا ہار دیکھا تو اس کی وجہ سے آپ ﷺ پر شدید رقت طاری ہوگئی، اس لئے کہ اس بہترین ہار کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ کی پدری یادیں، ازدواجی یادیں، خاندانی یادیں اور شفقت وجذبات سے متعلق تمام یادیں تازہ ہوگئیں، اس لئے کہ نبی کریم ﷺ ایک والد بھی تھے، آپؐ کے اندر پدری جذبات واحساسات انسانی اخلاقیات کی تاریخ میں بلند ترین مقام پر تھے، آپؐ کے نفسِ کریمانہ میں رحمت کے اعلیٰ ترین جذبات تہہ بتہہ موجود تھے، آپؐ کے قلبِ مبارک میں محبت واشتیاق کے احساسات خون کی طرح گردش کرتے تھے، اس لئے آپؐ اپنے اصحاب کی طرف انتہائی عاجزی کے ساتھ متوجہ ہوتے ہیں اور ان سے ایک باعزت و مکرم شخص کی طرح درخواست کرتے ہیں، درخواست اس ادا کے ساتھ کی جو ان کو تسلیم ورضا کی بھی تحریک دے رہی تھی اور ان کو فدیہ لینے کا حق بھی دے رہی تھی، فدیہ لینے کا حق بھی ان کے پاس محفوظ تھا جس کا وہ خود فیصلہ کرسکتے تھے، آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: "اگر آپ مناسب سمجھو کہ ان (زینب) کے قیدی کو رہا کردو اور جو مال اس نے بھیجا ہے اس کو واپس کردو"۔

اس موقف میں ایک طرف رسول اللہ ﷺ کی اپنی صاحبزادی کے تئیں رحمت و شفقت کا پہلو نظر آتا ہے مگر دوسری طرف اس میں ایک دوسرا پہلو بھی مضمر ہے، وہ یہ کہ آپ ﷺ اس کے ذریعہ اپنے داماد کو اسلام کی طرف راغب کررہے تھے، اس لئے کہ وہ سلیم الفطرت عقل اور صحیح رائے کی وجہ سے معروف تھے اور اللہ کے رسول ﷺ اس وقت ان کے حسنِ کردار کی تعریف کرتے تھے جبکہ وہ حالتِ شرک میں تھے۔(محمد رسول اللہ، العرجون، 3/480، التاریخ الاسلامی، الحمیدی: 4/184)

و: أبو عزّہ عمرو بن عبداللہ الجمحی نبوی رحمت وسختی کے درمیان:

ابوعزّہ ایک محتاج وضرورت منداور بچیوں والا شخص تھا، اس نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ جانتے ہیں کہ میرے پاس مال نہیں ہے اور میں ایک ضرورت منداور عیال والا شخص ہوں، اس لئے مجھ پر احسان کردیجئے۔ آپ ﷺ نے اس پر احسان کرکے رہا کردیا اور اس سے یہ وعدہ لیا کہ آپؐ کے خلاف کسی کا تعاون نہیں کرے گا، ابوعزّہ اس احسان پر رسول ﷺ کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے:

مَنْ مُبَلِّغٌ عَنّي الرَّسولَ مُحَمَّدًا ... بِأَنَّكَ حَقٌّ والْمَلِيكُ حَمِيدُ
وأَنتَ امْرُؤٌ بُوئتَ فِينا مَبَاءَةً ... لَهَا دَرَجاتٌ سَهْلَةٌ وصَعُودُ
فَإِنَّكَ مَن حارَبْتَه لَمُحارَبٌ ... شَقِيٌّ ومَن سالَمْتَه لَسَعِيدُ
ولَكِن إذا ذُكِّرْتُ بَدْرًا وأَهْلَهُ ... تَأَوَّبَ ما بِي حَسْرَةٌ وقُعُودُ

ترجمہ: ”میری طرف سے رسول اللہ ﷺ کو کون یہ پیغام پہنچائے گا کہ آپ برحق اور سچے ہیں اور مالکِ کون وسماء سراپا حمد و تعریف ہے۔ آپ ایک ایسے شخص ہیں جن کو ہمارے درمیان ایک مقام بلند عطا کیا گیا ہے۔ جس مقام بلند کے بہترین درجے اور مقامات ہیں۔ بلاشبہ آپ جس کے ساتھ جنگ کریں وہ بدبخت سب کا دشمن ہے اور جس سے آپ صلح کریں گے یقیناً وہ خوش قسمت ہے۔ لیکن مجھے جب بدر اور اہلِ بدر کی یاد دلائی جاتی ہے تو حسرت وافسوس کی کیفیات تازہ ہو جاتی ہیں“۔

ابن کثیرؒ فرماتے ہیں: اس کے بعد ابو عزّہ نے رسول اللہ ﷺ سے کئے ہوئے عہد کو توڑ دیا، مشرکین نے اس کو اپنا ہمنوا بنالیا اور وہ ان کے کیمپ میں شامل ہو گیا، اور جب احد کی جنگ ہوئی تو اس دن بھی اسے قیدی بنایا گیا اور اس نے پھر سے نبی کریم ﷺ سے احسان کرنے کی درخواست کی، لیکن نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”میں تمہیں اس حال میں نہیں چھوڑ سکتا ہوں کہ تو مکہ میں اپنے رخساروں پر ہاتھ پھیرتا رہے اور کہتا رہے: میں نے دو مرتبہ محمدؐ کو دھوکہ دیا“۔ اس کے بعد اس کے بارے میں حکم دیا گیا اور اس کی گردن ماری گئی۔ (الدلائل للبیھقی: 3/280، سیرت ابن ہشام: 3/110، البدایہ والنہایہ: 3/313)

نبی کریم ﷺ نے پہلی مرتبہ اس کے ساتھ رحم کا معاملہ فرمایا، اس کو معاف کر دیا اور بغیر فدیہ لئے ہوئے اس کو رہا کر دیا، اس لئے کہ اس نے اپنی محتاجی اور اپنی بچیوں کا حوالہ دیا تھا، لیکن جب اس نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کئے ہوئے عہد کو پورا نہیں کیا اور آپ ﷺ کے خلاف بغاوت نہ کرنے کے وعدے پر برقرار نہ رہا تو معرکہ اُحد میں دوبارہ قید کیا گیا اور اس وقت رسول اللہ ﷺ نے اس کے بارے میں سخت موقف اختیار فرمایا اور اس کو قتل کرنے کا حکم صادر فرمایا۔

ز: سہیل بن عمرو کی اُسیری اور حضرت سودہؓ کا قول:

عبدالرحمن بن اُسعد بن زرارہؓ فرماتے ہیں: جب بدر کے قیدیوں کو مدینہ منورہ لایا گیا اس وقت نبی کریم ﷺ کی زوجہ مطہرہ حضرت سودہ بنت زمعہؓ آلِ عفراء کے پاس تھیں جبکہ وہ عفراء کے دو بیٹوں عوف اور معوذ کے بارے میں تعزیت میں موجود تھیں اور یہ حجاب کا حکم نازل ہونے سے پہلے کی بات ہے، حضرت سودہؓ فرماتی ہیں: واللہ! میں ان کے ہاں موجود تھی کہ اچانک ہمارے پاس یہ خبر آئی کہ قیدیوں کو لایا گیا ہے، اس لئے میں اپنے گھر واپس گئی، اللہ کے رسول ﷺ وہاں موجود تھے اور دیکھتی ہوں کہ ابو یزید سہیل بن عمرو، حجرہ کے ایک کونے میں ہیں اور ان کے دونوں ہاتھ ایک رسی کے ساتھ ان کی گردن میں بندھے ہوئے ہیں، واللہ! میں نے جیسے ہی ابو یزید کو اس حالت میں دیکھا تو میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا: ابو یزید! تم گرفتار ہو گئے؟ آپ شریفوں کی طرح جان نہیں دے سکتے تھے؟ فرماتی ہیں: میں اس وقت متنبہ ہوئی جبکہ گھر سے رسول اللہ ﷺ نے آواز دی: اے سودہ! کیا اللہ اور اس کے رسول کے مقابلہ میں اشتعال دلا رہی ہو؟! میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے جب میں نے یہ ابو یزید کو دیکھا کہ اس کے ہاتھ رسی کے ذریعہ گردن کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں تو میں اپنے اوپر قابو نہ کر پائی یہاں تک کہ میری زبان سے یہ جملے بے ساختہ نکل گئے۔ (السنن الکبری للبیھقی: 9/89، مستدرک حاکم: 3/22، مصنف ابن ابی شیبہ: 14/369، تاریخ طبری: 2/460، السیرۃ النبویۃ، محمد الصویانی: 2/200)

مکرز بن حفص بن الاخیف جب سہیل بن عمرو کی رہائی کے لئے آئے اور اس نے مسلمانوں کے ساتھ بات چیت کی اور ان کو رہائی کے لئے راضی کر لیا تو مسلمانوں نے اس سے کہا: کہ زرِ فدیہ دے دو، مکرز بن حفص نے کہا: اس کی جگہ میرے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دو اور اس کو رہا کر دو، یہاں تک کہ وہ تمہارے پاس اپنا فدیہ بھیج دے، مسلمانوں نے سہیل کو رہا کر دیا اور مکرز کو اپنے پاس ضمانت کے طور پر بند کر دیا۔

ایک مرسل حدیث میں ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے رسول اللہ ﷺ سے ارشاد فرمایا: مجھے اجازت دے دیجئے، میں سہیل بن عمرو کے اگلے دو دانت نکال دوں، اس کی زبان (بولتے وقت) پھسل جایا کرے گی، پھر یہ کسی دوسری جگہ آپ کے خلاف تقریر نہیں کر پائے گا، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: میں ان کے مثلہ کی اجازت نہیں دے سکتا، مجھے ڈر ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میرا مثلہ نہ کر دے، اگرچہ میں نبی ہوں۔(مصنف ابن ابی شیبہ: 14/387)

اس کے بعد اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا: ہو سکتا ہے کہ کل وہ کسی ایسی جگہ کھڑا ہو گا جس کو آپ بُرا نہیں سمجھو گے۔(دیکھیں: البدایہ والنہایہ: 3/311)

علامہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں: سہیل بعد میں جس مقام پر کھڑے ہوئے وہ مکہ میں وہ مقام تھا جبکہ اللہ کے رسول ﷺ اس دنیا سے رخصت ہوئے اور عرب مرتد ہو گئے اور مدینہ اور دیگر مقامات پر نفاق کا ظہور ہوا، وہ مکہ میں کھڑے ہوئے اور انہوں نے لوگوں کے درمیان خطاب کیا اور ان کو دینِ حنیف پر ثابت قدم رہنے کی تلقین کی، انہوں نے لوگوں سے کہا: اے قریش کے لوگو! ایسے مت بنو کہ لوگوں میں سب سے پہلے تم ہی اسلام لاؤ اور تم ہی سب سے پہلے مرتد ہو جاؤ، جس کے بارے میں ہمیں کوئی شک ہو گا ہم اس کی گردن مار دیں گے۔ (دیکھیں: التاریخ الاسلامی، الحمیدی: 4/181)

اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت سہیلؓ کے اگلے دو دانت نکالنے کی اجازت نہیں دی اور آپؐ نے اس کو مثلہ اور خلقتِ انسانی میں تبدیلی کے مترادف تصور کیا اور حضرت عمرؓ سے فرمایا: میں مثلہ کی اجازت نہیں دے سکتا، کہیں اللہ میرا مثلہ نہ کر دے، اگرچہ میں نبی ہوں۔ یہ اللہ کے رسول ﷺ کی رسالت کا بہترین نمونہ ہے جس کو آپ ﷺ نے اعدائے اسلام کے مقابلہ میں فتح و کامیابی کے لئے وضع فرمایا ہے۔(محمد رسول اللہ، العرجون: 3/474)

ح: فدیہ کے بدلہ میں تعلیم:

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: اسیرانِ بدر میں بعض لوگ ایسے تھے جن کے پاس فدیہ ادا کرنے کے لئے کچھ نہیں تھا، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے ان کا فدیہ یہ متعین فرمایا کہ وہ انصار کے بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں، ان قیدیوں نے مدینہ کے بچوں کو لکھانا پڑھانا شروع کیا اور جو بھی دس بچوں کو پڑھاتا یہی اس کا فدیہ تصور کیا جاتا۔(صحیح السیرۃ النبویۃ، ص 261، التربیۃ القیادیۃ: 3/74)

نبی کریم ﷺ کا تعلیم کو بدلِ فدیہ کے طور پر قبول کرنا ہمیں یہ دکھاتا ہے کہ اسلام کا علم و معرفت کے بارے میں اور جہالت کو ختم کرنے کے سلسلہ میں نظریہ کتنا بلند ہے، حالانکہ اُس وقت مسلمانوں کو مال کی سخت ترین ضرورت تھی، اس دین میں یہ کوئی قابل تعجب

اور انوکھی بات نہیں ہے جس کی ابتدائی آیات علم کے بارے میں ہی نازل ہوئی ہیں، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿ٱقۡرَأۡ بِٱسۡمِ رَبِّكَ ٱلَّذِی خَلَقَ ۝١ خَلَقَ ٱلۡإِنسَـٰنَ مِنۡ عَلَقٍ ۝٢ ٱقۡرَأۡ وَرَبُّكَ ٱلۡأَكۡرَمُ ۝٣ ٱلَّذِی عَلَّمَ بِٱلۡقَلَمِ ۝٤﴾ ترجمہ: ''اپنے رب کے نام سے پڑھیے جس نے سب کو پیدا کیا۔ انسان کو خون بستہ سے پیدا کیا۔ پڑھیے اور آپ کا رب سب سے بڑھ کر کرم والا ہے۔ جس نے قلم سے سکھایا''۔(سورۃ العلق: 1-4)

اور علم کی ترغیب کے بارے میں اور علماء کے مقام و مرتبہ کی وضاحت کے بارے میں قرآن و سنت میں بہت سے نصوص موجود ہیں، اس عظیم پہلو کے اعتبار سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے جہالت کے خاتمہ اور قراءت و کتابت کو عام کرنے کی بنیاد ڈالی ہے اور اس میں سبقت اسلام ہی کو حاصل ہے۔(دیکھیں السیرۃ النبویہ، أبو شہبہ: 2/146)

ط: قیدیوں کے بارے میں حکم:

قیدیوں کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار امام المسلمین کو حاصل ہے، وہ چار احکام میں سے کوئی بھی ایک حکم نافذ کر سکتا ہے، امام کے لئے ضروری ہے کہ وہ مسلمانوں کی مصلحتِ عامہ کی رعایت کرے، چار احکام مندرجہ ذیل ہیں:

۱) قتل؛ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عقبہ بن أبی معیط اور نضر بن حارث کو قتل کروایا۔

۲) احسان؛ احسان کا مطلب یہ ہے کہ قیدی کو بغیر کسی عوض کے رہا کر دیا جائے، ایسا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابو عزّہ جمحی کے ساتھ کیا۔

۳) فدیہ؛ یعنی قیدی کو مال کے عوض آزاد کر دینا، جیسے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ، نوفل بن حارث، عقیل بن ابی طالب اور دیگر لوگوں کے ساتھ کیا گیا۔

۴) غلام بنانا؛ حضرت سعد بن معاذؓ نے یہود بنی قریظہ کے بارے میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ ان کے جنگجوؤں کو قتل کیا جائے، مال کو تقسیم کیا جائے اور بچوں اور عورتوں کو غلام بنایا جائے۔(دیکھیں: غزوۃ بدر الکبری، ص: 101)

....

چھٹا باب

غزوۂ بدر کے نتائج اور نبی کریم ﷺ کو شہید کرنے کی کوشش

ا: غزوۂ بدر کے نتائج:

ا: غزوۂ بدر کے نتائج واثرات سامنے آئے تو مسلمانوں کا رعب ودبدبہ اور مزید بڑھ گیا، اور مدینہ میں اور آس پاس کے علاقوں میں وہ ایک ابھرتی ہوئی طاقت کے طور پر سامنے آ گئے، اور جو بھی مدینہ پر حملہ کرنے کے بارے میں سوچتا یا مسلمانوں کو کوئی نقصان پہنچانے کے بارے میں ارادہ رکھتا، اس کو اقدام سے پہلے ہزار بار سوچنا پڑتا، رسول اللہ ﷺ کا مقام ومرتبہ مدینہ میں مضبوط و مستحکم ہو گیا اور اسلام کا سورج وہاں بلند تر ہو گیا، مدینہ کے مشرکین اور دعوت کے بارے میں شکوک وشبہات میں مبتلا لوگوں کو اپنے کفر کے اظہار اور کھلم کھلا اسلام کے ساتھ عداوت رکھنے کی جرأت باقی نہیں رہی، اس لئے نفاق، خفیہ سازشوں اور دھوکہ کا دور شروع ہوا، انہوں نے نبی کریم ﷺ اور آپ کے اصحاب کے سامنے بظاہر اسلام کا آغاز کیا اور مسلمانوں کی صفوں میں شامل ہو گئے جبکہ باطنی طور پر اپنے کفر اور عداوت پر برقرار رہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿مُّذَبۡذَبِينَ بَيۡنَ ذَٰلِكَ لَآ إِلَىٰ هَٰٓؤُلَآءِ وَلَآ إِلَىٰ هَٰٓؤُلَآءِۚ وَمَن يُضۡلِلِ ٱللَّهُ فَلَن تَجِدَ لَهُۥ سَبِيلٗا﴾ ترجمہ: "کفر وایمان کے درمیان ڈانوا ڈول ہیں، نہ پورے اِس طرف ہیں نہ پورے اُس طرف، جسے اللہ نے بھٹکا دیا ہو اس کے لئے تم کوئی راستہ نہیں پا سکتے"۔(سورۃ النساء: 143)

اسی تذبذب اور شکوک وشبہات والے موقف کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کی شناعت بیان کی ہے، بہت سی آیات میں ان کی قلعی کھولی ہے اور ان کے لئے سخت ترین عذاب کا وعدہ کیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ ٱلۡمُنَٰفِقِينَ فِي ٱلدَّرۡكِ ٱلۡأَسۡفَلِ مِنَ ٱلنَّارِ وَلَن تَجِدَ لَهُمۡ نَصِيرًا﴾ ترجمہ: "یقین جانو کہ منافق جہنم کے سب سے نیچے طبقے میں جائیں گے اور تم کسی کو اُن کا مددگار نہ پاؤ گے"۔ (سورۃ النساء: 145)

غزوۂ بدر کے نتائج واثرات یہ بھی سامنے آئے کہ مسلمانوں کا اعتماد اور یقین اللہ تعالیٰ کی ذات پر اور رسول اللہ ﷺ کی شخصیت پر اور زیادہ مستحکم ہوا، ان کی طاقت وقوت میں اضافہ ہوا اور قریش کے مشرکین کی ایک بڑی تعداد اسلام میں داخل ہو گئی، اسی طرح کمزور مسلمان بھی نفسیاتی اعتبار سے مضبوط ہو گئے جو ابھی مکہ میں ہی موجود تھے، وہ بھی اللہ کی نصرت ومدد پر رشک کرنے لگے، اور ان کے دل مطمئن ہو گئے کہ فتح ونصرت اور غلبہ کے ایام قریب ہیں، اس لئے ان کے ایمان اور ثبات واستقامت میں مزید اضافہ ہو گیا۔

ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں نے جنگ کے جدید اسالیب اور طریقے سیکھے، عسکری مہارت حاصل کی اور جزیرۃ العرب کے اندر اور باہر بڑے پیمانے پر شہرت حاصل کی، اس لئے کہ وہ ایک ایسی قوت ابھر کر سامنے آئی جس کا بلادِ عرب میں ایک وزن اور مقام تھا، یہ قوت اب صرف قریش کی لیڈر شپ ہی کے لئے نہیں بلکہ مختلف مقامات پر موجود تمام عرب قبائل کے لیڈروں کے لئے ایک چیلنج بن گئی، اسی طرح جدید اسلامی ریاست کے لئے مالِ غنیمت آمدنی کا ایک ذریعہ بن گیا جس کی وجہ سے مسلمانوں کی مادی اور اقتصادی حالت بھی تبدیل ہو گئی،

جبکہ اس سے پہلے وہ انیس ماہ تک فقر و بدحالی کی صورتحال سے دوچار تھے اور اب اللہ تعالیٰ نے ان کو مالِ غنیمت کا ایک ذریعہ عطا کیا۔ (دیکھیں: التاریخ السیاسی والعسکری، د۔ علی معطی، ص274-275)

۲: جہاں تک قریش کا تعلق ہے تو اس کو ناقابلِ تلافی نقصان سے دوچار ہونا پڑا، ایک طرف تو ابو جہل بن ہشام، امیہ بن خلف، عتبہ بن ربیعہ اور دوسرے زعمائے کفر مارے گئے جو قریش میں شجاعت و بہادری اور طاقت و قوت کے اعتبار سے مضبوط ترین لوگ تھے، اس کے ذریعہ قریش کو صرف جنگی خسارہ نہیں ہوا بلکہ یہ ان کے لئے ایک معنوی اور نفسیاتی خسارہ بھی تھا، اس لئے کہ اب مدینہ صرف ان کی تجارت کے لئے ہی چیلنج نہیں تھا بلکہ اب وہ پورے حجاز میں ان کی سیادت و قیادت اور اثر و نفوس کے لئے ایک چیلنج تھا۔ (اَیضاً، ص375، 376)

اہلِ مکہ کے لئے شکست و ہزیمت کی خبر بجلی بن کر گری، ابتدائی مرحلہ میں ان کو اس پر یقین ہی نہیں آرہا تھا، ابن اسحاقؒ فرماتے ہیں: سب سے پہلا شخص جس نے قریش کی شکست کی خبر اہلِ مکہ کو دی وہ حَیسُمان بن عبداللہ الخزاعی تھا، لوگوں نے اس سے دریافت کیا: تم کیا خبر لائے ہو؟ اس نے کہا: عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ابوالحکم بن ہشام، امیہ بن خلف، زمعہ بن اَسود، حجاج کے دونوں بیٹے نُبیہ اور مُنبّہ، ابو البختری بن ہشام مارے گئے، جب وہ قریش کے بڑے بڑے لوگوں کا نام لینے لگا تو صفوان بن امیہ نے کہا: واللہ! اگر یہ ہوش میں ہے تو اس کو ذرا میرے بارے میں پوچھو! لوگوں نے اس سے پوچھا: صفوان بن امیہ کا کیا ہوا؟ اس نے کہا: وہ وہاں مقامِ حِجر میں بیٹھا ہوا ہے، واللہ! میں نے اس کے باپ اور بھائی کو دیکھا جب وہ دونوں مارے گئے۔ (دیکھیں: صحیح السیرۃ النبویہ، ص: 257)

قریش کی شکست کی خبر کے اثرات ابو لہب پر کیا پڑے؟ اس کو بیان کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے غلام حضرت ابو رافعؓ فرماتے ہیں: میں حضرت عباس بن عبدالمطلب کا غلام تھا، ہمارے گھر میں اسلام داخل ہو چکا تھا، ام الفضلؓ مسلمان ہو چکی تھیں، میں بھی مسلمان ہو چکا تھا، اور حضرت عباسؓ اپنی قوم سے ڈرتے تھے اور ان کی مخالفت نہیں کرنا چاہتے تھے، انہوں نے اپنا اسلام پوشیدہ رکھا تھا، وہ مالِ کثیر کے مالک تھے اور وہ مال قوم کے افراد کے پاس تھا، اللہ کا دشمن ابو لہب جنگِ بدر میں شریک نہیں ہوا تھا، اس نے اپنی جگہ عاص بن ہشام بن مغیرہ کو بھیجا تھا، جب اسے قریش کے لوگوں کی بدر میں شکست اور مارے جانے کی خبر ملی تو اس پر ذلت و سیاہی چھا گئی، اللہ نے اس کو رسوا کیا اور ہمیں اپنے اندر قوت و عزت محسوس ہوئی۔

فرماتے ہیں: میں کمزور شخص تھا، میں تیر بنایا کرتا تھا اور زمزم کے حجرہ میں تیر کے دستے چھیلتا رہتا تھا، واللہ! اس وقت میں حجرہ میں بیٹھا تیر چھیل رہا تھا، میرے پاس حضرت عباس بن عبدالمطلب کی زوجہ حضرت ام الفضلؓ بیٹھی ہوئی تھیں، ہمیں فتح کی خبر سن کر خوشی اور شادمانی ہوئی تھی کہ اتنے میں ابو لہب اپنے دونوں پاؤں گھسیٹتے ہوئے بُرے ارادہ کے ساتھ آیا اور حجرہ کے کنارے پر بیٹھ گیا، اس کی پیٹھ میری پیٹھ کی طرف تھی، ابھی وہ بیٹھا ہی تھا کہ اچانک لوگوں نے کہنا شروع کیا: یہ ابو سفیان بن حارث بن عبدالمطلب آ گئے۔ ابو لہب نے کہا: میرے پاس آؤ، میری زندگی کی قسم! تمہارے پاس صحیح خبر ہے! فرماتے ہیں: وہ ابو لہب کے پاس بیٹھ گئے اور لوگ ان کے پاس کھڑے تھے۔ ابو لہب نے کہا: بھتیجے بتاؤ! لوگوں کا کیا حال رہا؟ انہوں نے کہا: ہوا یہ کہ جب ان لوگوں کے ساتھ ہماری مڈ بھیڑ ہوئی تو ہم نے اپنے کندھے ان کے حوالے کر دیئے، وہ ہمیں جیسے چاہتے تھے قتل کرتے تھے اور جیسے چاہتے گرفتار کرتے تھے، اور اللہ کی قسم! میں اس کے

باوجود لوگوں کو ملامت نہیں کر سکتا تھا، دراصل ہماری مڈ بھیڑ ایسے گورے چٹے لوگوں سے ہوئی تھی جو زمین وآسمان کے درمیان چتکبرے گھوڑوں پر سوار تھے، اللہ کی قسم! نہ وہ کسی چیز کو چھوڑتے تھے اور نہ کوئی چیز ان کے مقابلہ پر ٹک سکتی تھی۔ ابورافعؓ فرماتے ہیں: میں نے اپنے ہاتھ سے خیمہ کا کنارہ اٹھایا، پھر کہا: اللہ کی قسم! وہ فرشتے تھے۔

فرماتے ہیں: ابولہب نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور میرے چہرہ پر زوردار طمانچہ مارا۔ فرماتے ہیں: میں بھی اس پر جھپٹ پڑا لیکن اس نے مجھے اٹھا کر زمین پر پٹک دیا، اور پھر میرے اوپر گھٹنے کے بل بیٹھ کر مجھے مارنے لگا،- میں کمزور جو ٹھہرا!- لیکن اتنے میں ام الفضل نے اٹھ کر خیمہ کا ایک بڑا ڈنڈا لیا اور اسے ایسی ضرب ماری کہ سر میں بُری طرح چوٹ آگئی، اور ساتھ ہی بولیں: اس کا مالک موجود نہیں ہے، اس لئے اسے کمزور سمجھ رکھا ہے؟ ابولہب رسوا ہو کر اٹھا اور چلا گیا، اس کے بعد صرف سات راتیں گزری تھیں کہ اللہ نے اسے عدسہ (ایک قسم کے طاعون) میں مبتلا کر دیا اور اس کا خاتمہ کر دیا۔ (سیرت ابن ہشام: 2/258)

غزوۂ بدر نے مشرک اہلِ مکہ کے نفوس میں، ان کی شکست کی وجہ سے مقتولین اور اُسیروں کی وجہ سے آلام واُحزان اور پریشانی کے دُوررَس اثرات چھوڑے، ابولہب جلد ہی ایک مرض کا شکار ہو کر مر گیا، ابوسفیان کا ایک بیٹا مارا گیا اور دوسرا بیٹا گرفتار کیا گیا، مکہ کا کوئی گھر ایسا نہیں تھا جہاں ماتم نہ ہو، یا تو کسی کا عزیز یا رشتہ دار قتل کیا گیا، یا کوئی گرفتار کیا گیا، اس لئے اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ انہوں نے بدلہ لینے کا پختہ ارادہ کر لیا یہاں تک کہ ان میں سے بعض نے اپنے اوپر غسل کرنا حرام قرار دیا تھا، جیسے کہ ابوسفیان بن حرب نے نذر مانی تھی کہ اس کے سر کو جنابت کا پانی اس وقت تک نہیں چھوئے گا جب تک کہ وہ مسلمانوں پر حملہ نہ کرے اور ان لوگوں سے بدلہ نہ لے جنہوں نے ان کو ذلیل ورسوا کیا ہے، ان کے اُشراف اور سرداروں کو قتل کیا ہے اور وہ مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے اور ان سے بدلہ لینے کا موقع تلاش کرتے رہے اور یہ موقع انہیں غزوۂ احد میں مل پایا۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویہ، ابوشہبہ 2/171)

۳: جہاں تک یہود کا تعلق ہے تو ان کو اس بات سے خوف ورعب لاحق ہو گیا کہ مسلمانوں کو بدر میں کامیابی مل گئی اور اس کی وجہ سے مسلمانوں کی طاقت وقوت میں اضافہ ہو گیا اور اسلام کو عزت وسربلندی مل گئی اور اب اسلام ان کے دین پر غالب آجائے گا، اور رسول ﷺ کو اب ان کے مقابلہ میں بلند مقام ومرتبہ ملے گا، اس لئے انہوں نے اس عہد کو توڑنے کا عزم کر لیا جو انہوں نے نبی کریم ﷺ کے سامنے آپؐ کی مدینہ منورہ آمد کے موقع پر کیا تھا، اب انہوں نے اس عداوت کا اظہار کرنا شروع کر دیا جو ان کے دلوں میں پوشیدہ تھی اور اپنی گفتگو میں اس کا اظہار واعلان کرنے لگے اور پھر اسلام اور رسول ﷺ کے خلاف سازشیں کرنے لگے اور ہر قسم کے وسائل کے ذریعہ اس کو دبانے، کچلنے اور ختم کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگانے لگے۔ انہوں نے نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کو پریشان کرنا شروع کیا، نبی کریم ﷺ سے ان کی کوئی بھی سازش اور منصوبہ بندی مخفی نہیں رہ سکتی تھی، بلکہ اللہ کے رسول ﷺ بیدار مغزی اور احتیاط کے ساتھ ان پر نظر رکھے ہوئے تھے، یہاں تک کہ انہوں نے اخلاقی اقدار اور حرمت کا بھی پاس ولحاظ نہیں کیا اور عداوت ودشمنی کا بگل بجا دیا، اس لئے اب ان کے ساتھ جنگ کرنے اور ان کو مدینہ سے جلاوطن کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا، جیسے کہ آئندہ مباحث میں اس کی تفصیلات آرہی ہیں۔

(دیکھیں: التاریخ السیاسی والعسکری، ص: 274، السیرۃ النبویہ، ابوشہبہ: 2/171)

۲: نبی کریم ﷺ کو شہید کرنے کی کوششیں اور عمیر بن وہبؓ کا قبولِ اسلام

حضرت عروہ بن زبیرؓ فرماتے ہیں: عمیر بن وہب غزوۂ بدر کے چند ہی دنوں بعد صفوان بن اُمیہ کے ساتھ حطیم میں بیٹھے ہوئے تھے، عمیر قریش کے انتہائی خبیث طینت انسانوں میں سے تھے، اس نے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کو بے حد اذیتیں پہنچائی تھیں اور مکہ کے قیام کے زمانہ میں اس کی وجہ سے مسلمانوں کو کافی تکالیف اور مشقتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا، اس کا بیٹا وہب بن عمیر بدر کے قیدیوں میں گرفتار ہوا تھا، یہ آپس میں جنگ بدر میں کنویں میں ڈالے جانے والے مقتولین اور نقصانات کا ذکر کر رہے تھے کہ اسی اثناء میں صفوان نے کہا: اللہ کی قسم! ان مقتولین کے بعد اب زندگی بڑی تلخ ہے، عمیر نے کہا: بے شک تم سچ کہتے ہو! اگر مجھ پر قرضہ نہ ہوتا جس کی ادائیگی کا ابھی میرے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے، نیز اپنے پیچھے بال بچوں کے ضائع ہونے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں ابھی سوار ہو کر محمدؐ کے پاس جاتا اور اس کو (نعوذ باللہ) قتل کر دیتا، میری تو وہاں جانے کی ایک معقول وجہ ہے، وہ یہ کہ میرا بیٹا ان کے ہاں قید ہے۔

صفوان نے اس موقع کو غنیمت جانا اور کہا: تمہارے قرضہ کی ادائیگی میرے ذمہ رہی، میں تمہاری طرف سے اس کو ادا کروں گا، اور تمہارے بال بچوں کی پرورش میں اپنے بچوں کے ساتھ کروں گا جب تک وہ زندہ ہیں، میرے پاس جو بھی چیز ہوگی میں اس میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑوں گا۔ عمیر نے کہا: اچھا، اس بات کو میرے اور اپنے درمیان راز رکھنا۔ صفوان نے کہا: ٹھیک ہے! اس کے بعد عمیر نے اپنی تلوار کے بارے میں حکم دیا کہ اس کو تیز کیا جائے اور اس کو زہر آلود کیا جائے، چنانچہ وہ تیز کی گئی اور زہر آلود کی گئی اور وہ چل پڑا، یہاں تک کہ مدینہ پہنچ گیا، وہاں حضرت عمر بن خطابؓ چند مسلمانوں میں بیٹھے ہوئے غزوۂ بدر کا تذکرہ کر رہے تھے اور اللہ تعالیٰ کی نوازش اور کرم فرمائیوں کا اور اپنے دشمنوں پر فتحیابی کا ذکر کر رہے تھے کہ اچانک سیدنا عمرؓ کی نظر عمیر بن وہب پر پڑی کہ اس نے مسجد نبوی کے دروازہ کے سامنے اپنی اونٹنی بٹھائی ہے اور وہ تلوار لٹکائے ہوئے تھا، یہ دیکھ کر حضرت عمرؓ نے کہا: یہ کتا، اللہ کا دشمن عمیر بن وھب، واللہ! ضرور کسی شر کے ارادہ سے آیا ہے، یہ وہی ہے جس نے یومِ بدر میں لڑائی کی آگ بھڑکائی تھی اور ہمارے خلاف قوم کو جمع کیا تھا۔ سیدنا عمرؓ اسی وقت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: اے اللہ کے نبی! یہ اللہ کا دشمن عمیر بن وہب تلوار لٹکائے ہوئے آگیا ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا: اس کو میرے پاس لے آؤ، چنانچہ سیدنا عمرؓ آگے بڑھے اور عمیر کی تلوار کے پرتلے کو اس کی گردن میں دے کر پکڑا، اور انصار کے جو لوگ ان کے ساتھ وہاں موجود تھے ان سے کہا: رسول اللہ ﷺ کے پاس چل کر بیٹھ جاؤ اور اس خبیث سے رسول اللہ ﷺ کی پوری حفاظت کرو، اس لئے کہ اس کے بارے میں کوئی اطمئنان نہیں ہے، اس کے بعد وہ عمیر کو رسول اللہ ﷺ کے پاس لے کر گئے، جب رسول اللہ ﷺ نے دیکھا کہ سیدنا عمرؓ اس کی تلوار کا پرتلہ گردن کے پاس سے پکڑے ہوئے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے عمر! اسے چھوڑ دو، اور عمیر سے کہا: قریب آکر بیٹھو، چنانچہ وہ قریب بیٹھا اور کہا: "انعموا صباحا" یعنی: صبح بخیر - یہ زمانۂ جاہلیت کا سلام تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس سے بہتر سلام سے نوازا ہے جو تمہارے سلام سے بہتر ہے اور وہ اہلِ جنت کا سلام ہے۔ عمیر نے کہا: اللہ کی قسم! اے محمد، میرے لئے تو یہ ایک نئی بات ہے، اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: عمیر کس غرض سے آنا ہوا؟ عمیر نے کہا: میں تو اپنے اس قیدی کے لئے آیا ہوں جو آپ کے یہاں گرفتار ہے!۔ اس کے بارے میں احسان اور کرم فرمائیں۔ آپ ﷺ نے

دریافت کیا: پھر یہ تلوار گلے میں کیوں لٹک رہی ہے؟اس نے کہا: اللہ ان تلواروں کا بُرا کرے، انہوں نے ہمیں کیا فائدہ پہنچایا ہے؟!۔ آپ ﷺ نے فرمایا: مجھ سے سچ بولو کہ کس ارادہ سے آنا ہوا؟ اس نے کہا: محض یہی غرض تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم اور صفوان بن امیہ نے حطیم میں بیٹھ کر قریش کے ان آدمیوں کا جو بدر کے کنویں میں ڈالے گئے تھے، ذکر کیا تھا۔ اس کے بعد تم نے کہا تھا: اگر مجھ پر قرضہ اور بال بچوں کی فکر نہ ہوتی تو میں یہاں سے جا کر محمدؐ کو قتل کر دیتا۔ صفوان بن امیہ نے تمہارے قرضہ اور بال بچوں کی ذمہ داری لی ہے اس شرط پر کہ تم مجھے قتل کروگے، لیکن اللہ تعالیٰ تمہارے اور اس ارادہ کے درمیان حائل ہے۔

یہ سنتے ہی عمیر نے کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں! اے اللہ کے رسولؐ! آپ جو آسمان کی خبریں ہمارے پاس لاتے تھے اور آپ پر جو وحی نازل ہوتی تھی اس کے بارے میں ہم آپ کی تکذیب کیا کرتے تھے، اور یہ تو ایک ایسا قصہ ہے جس میں سوائے میرے اور صفوان کے کوئی موجود نہیں تھا، پس اللہ کی قسم! مجھے یقین ہو گیا کہ اس بات کی اطلاع دینے والا اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے، لہذا حمد و ستائش اس اللہ کی ہے جس نے مجھے اسلام کی ہدایت عطا کی اور مجھے راستے پر لگا دیا۔ اس کے بعد اس نے سچے دل سے حق کی شہادت دی، رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام سے فرمایا: اپنے بھائی کو دین کی باتیں سمجھاؤ، ان کو قرآن پڑھاؤ اور ان کے قیدی کو چھوڑ دو۔ چنانچہ صحابہ کرام نے ایسا ہی کیا، اس کے بعد عمیرؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! میں نے اللہ کے نور کو بجھانے میں ہر ممکن کوشش کی اور جو اللہ کے دین پر تھے ان کو میں کافی تکلیفیں پہنچاتا تھا، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے اجازت دیں کہ میں مکہ جا کر لوگوں کو اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف دعوت دوں اور اسلام کی طرف بلاؤں، شاید اللہ تعالیٰ اہلِ مکہ کو ہدایت دے، اور اگر انہوں نے میری بات نہ مانی تو میں ان کے دین کے بارے میں ایذاء رسانی میں کوئی کسر نہیں چھوڑوں گا جس طرح کہ میں نے آپ کے اصحاب کو ان کے دین کے بارے میں تکلیفیں پہنچائیں، رسول اللہ ﷺ نے انہیں اجازت دے دی اور وہ مکہ پہنچ گئے۔

ادھر صفوان نے ان کے مکہ سے نکلنے کے بعد ہی کہنا شروع کیا کہ چند ہی دنوں میں تمہارے پاس ایک ایسی خوشخبری آنے والی ہے جو تمہیں بدر کی تمام مصیبتیں بھلا دے گی اور صفوان آنے والے مسافروں سے عمیر کے بارے میں پوچھتا رہتا تھا، یہاں تک کہ ایک مسافر آیا اور اس نے آکر عمیر کے قبولِ اسلام کی خبر سنائی، یہ سن کر صفوان نے قسم کھالی کہ زندگی بھر عمیر سے بات نہیں کروں گا اور کبھی عمیر کو میری طرف سے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ (المعجم الکبیر للطبرانی 17/58، مجمع الزوائد 2868، الاصابہ 3/37، صحیح السیرۃ النبویہ، ص 260، سیرت ابن ہشام، اسلام عمیر بن وھب)

اس واقعہ میں متعدد اسباق ودروس اور عبرتیں موجود ہیں جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

ا: مشرکین داعیانِ حق کی جان لینے کے درپے تھے، اسی لئے صفوان بن امیہ اور عمیر بن وھب نے نبی کریم ﷺ کو شہید کرنے کا منصوبہ بنایا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اعدائے دعوت صرف دعوت کے انکار اس کے خلاف سازشیں کرنے اور لوگوں کو اس سے دور رکھنے پر اکتفا نہیں کریں گے بلکہ داعیانِ حق کی جان لینے اور ان کے قتل کی سازشیں رچنے کی بھی بھرپور کوشش کر سکتے ہیں، اور اس گھٹیا مقصد کو حاصل کرنے کے لئے وہ جرائم پیشہ افراد کو لالچ دے کر استعمال کر سکتے ہیں، خوشحال ومالدار اَعدائے دعوت فقراء کی حاجت وفکر کا فائدہ اٹھا کر، ان کو

مالی لالچ دے کر ان کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کر سکتے ہیں، اگرچہ ان کو اس سلسلہ میں جان کی قربانی بھی دینی پڑے، چنانچہ صفوان نے عمیر کے فقر و احتیاج اور اس کی قرض داری کا فائدہ اٹھایا اور اس کی جان کو خطرہ میں ڈال کر اپنے مقصد کے لئے بھیجا۔ (دیکھیں: غزوۃ بدر الکبری، ابو فارس، ص: 82)

۲: صحابہ کرام کے ہاں انتہائی درجہ کی احتیاطی اور حفاظتی حس موجود تھی، چنانچہ حضرت عمر بن خطابؓ اسی وقت متنبہ ہو گئے تھے جیسے ہی انہوں نے عمیر بن وھب کو آتے ہوئے دیکھا تھا، اور انہوں نے اس کے بارے میں اندیشہ کا اظہار بھی کر دیا تھا اور انہوں نے اعلان کر دیا کہ وہ شیطان ہے، وہ کسی بُرے ارادہ سے ہی آیا ہے، چنانچہ اس کی تاریخ حضرت عمرؓ کے نزدیک معروف تھی، وہ مکہ میں مسلمانوں کو ایذاء پہنچاتا تھا، اسی نے بدر میں مسلمانوں سے جنگ کرنے کے لئے مشرکین کو آمادہ کیا تھا اور مسلمانوں کی تعداد کے بارے میں معلومات جمع کرنے کی کوشش کی تھی، اسی لئے سیدنا عمرؓ نے رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کے لئے اقدامات کرنا شروع کئے، ایک طرف تو انہوں نے عمیر کی گردن میں پڑے پرتلے کو سختی سے پکڑا اور اس کو رسول اللہ ﷺ پر اپنی تلوار سے وار کرنے کے لئے بالکل بے بس کر دیا اور ساتھ ہی انہوں نے صحابہ کرام کو نبی کریم ﷺ کی حفاظت پر بھی مامور کر دیا۔

۳: اسلامی تعلیمات پر فخر و اعتزاز ؛ چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ نے جاہلی سلام کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور عمیر کے سلام کا اس وقت جواب نہیں دیا جبکہ اس نے "انعم صباحا" کہا تھا۔ آپ ﷺ نے اس کے سامنے واضح کر دیا کہ آپؐ اہلِ جاہلیت کا سا سلام نہیں کرتے ہیں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اہلِ جنت کے سلام سے نوازا ہے۔

۴: نبی کریم ﷺ کے بلند اخلاق کا بھی اس کے ذریعہ اظہار ہوتا ہے، چنانچہ انہوں نے عمیرؓ کے ساتھ احسان کا معاملہ فرمایا، اس کے ساتھ عفو و درگزر کا معاملہ فرمایا، حالانکہ وہ آپ ﷺ کو قتل کرنے کے ارادہ سے آیا تھا، لیکن آپ ﷺ نے اس کے ساتھ حسنِ سلوک کے ساتھ ساتھ اس کے قیدی بیٹے کو بھی رہا کر دیا، جبکہ عمیر نے اسلام قبول کیا اور آپ ﷺ نے اپنے اصحاب سے فرمایا: اپنے بھائی کو دین سمجھاؤ، اس کو قرآن پڑھاؤ اور اس کے لئے اس کا قیدی چھوڑ دو۔ (صحیح السیرۃ النبویۃ، ص260)

۵: اس کے ذریعہ عمیرؓ کی ایمانی قوت کا بھی اظہار ہوتا ہے، چنانچہ انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ پورے مکہ میں وہ اسلام عام کریں گے اور رسول اللہ ﷺ نے بھی ان کو اس کی اجازت مرحمت فرمائی، اور عملاً انہوں نے ایسا ہی کیا، انہوں نے ہر رکاوٹ کا سامنا کیا، چیلنج دیا اور پھر مدینہ منورہ واپس آئے جبکہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد ان کے ہاتھ پر اسلام لا چکی تھی، حضرت عمرؓ کے نزدیک ان کا وزن ایک ہزار لوگوں کے برابر تھا، چار افراد جن میں سے ہر ایک کو حضرت عمرؓ ایک ایک ہزار افراد کے برابر سمجھتے تھے ان میں سے ایک حضرت عمیرؓ بھی تھے، اسی طرح حضرت عمرو بن العاصؓ کا شمار بھی انہی افراد میں ہوتا تھا جو ایک ہزار افراد کے برابر تھے۔ (التربیۃ القیادیۃ: 3/73)

....

ساتواں باب

غزوۂ بدر سے مستفاد بعض اسباق ودروس اور فوائد:

ا: حقیقی نصرت ومدد اللہ کی طرف سے:

بلاشبہ بدر میں حقیقی نصرت ومدد اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھی، اللہ تعالیٰ نے اس بات کو واضح کیا ہے کہ نصرت ومدد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَا جَعَلَهُ ٱللَّهُ إِلَّا بُشْرَىٰ لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوبُكُم بِهِۦ ۗ وَمَا ٱلنَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِندِ ٱللَّهِ ٱلْعَزِيزِ ٱلْحَكِيمِ﴾ ترجمہ: "یہ بات اللہ نے تمہیں اس لئے بتادی ہے کہ تم خوش ہو جاؤ اور تمہارے دل مطمئن ہو جائیں، فتح ونصرت جو کچھ بھی ہے اللہ کی طرف سے ہے، جو بڑی قوت والا اور دانا وبینا ہے"۔(سورۃ آل عمران:126)

دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے: ﴿وَمَا جَعَلَهُ ٱللَّهُ إِلَّا بُشْرَىٰ وَلِتَطْمَئِنَّ بِهِۦ قُلُوبُكُمْ ۚ وَمَا ٱلنَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِندِ ٱللَّهِ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾ ترجمہ: "یہ بات اللہ نے تمہیں صرف اس لئے بتادی کہ تمہیں خوشخبری ہو اور تمہارے دل اس سے مطمئن ہو جائیں، ورنہ مدد تو جب بھی ہوتی ہے اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے، یقیناً اللہ زبردست اور دانا ہے"۔(سورۃ الانفال:10)

ان دونوں آیتوں میں اہلِ ایمان کو اس بات کی تعلیم دی گئی ہے کہ وہ صرف اللہ پر اعتماد وبھروسہ کریں اور اپنے تمام امور کو اسی کے سپرد کریں، مزید یہ تاکید کی گئی ہے کہ نصرت ومدد صرف اللہ کی طرف سے ہے، نہ کہ ملائکہ یا کسی اور کی طرف سے، اسباب کا اختیار کرنا مسلمانوں کے لئے ضروری ہے، لیکن ساتھ میں یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ان کے ذریعہ دھوکہ نہ کھائیں، اس لئے وہ اسباب کے خالق پر اعتماد اور بھروسہ کریں تاکہ اللہ تعالیٰ اپنی نصرت وتوفیق کے ذریعہ ان کی تائید کرے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان پر اپنے فضل کے مظاہر کا ذکر کیا ہے، اور بیان کیا ہے کہ بدر میں حاصل ہونے والی فتح وکامیابی، مشرکین کو قتل کرنا اور نبی کریم ﷺ کا مشرکین پر مٹی پھینکنا، سب فی الحقیقت اللہ کی توفیق، اس کے فضل اور اس کی نصرت وتائید کا نتیجہ ہے۔

اس آیتِ کریمہ کے ذریعہ قرآن کریم مسلمانوں کی تربیت کرتا ہے اور ان کو اللہ پر اعتماد کرنے کی تعلیم دیتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَٰكِنَّ ٱللَّهَ قَتَلَهُمْ ۚ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ ٱللَّهَ رَمَىٰ وَلِيُبْلِيَ ٱلْمُؤْمِنِينَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ۚ إِنَّ ٱللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾ ترجمہ: "پس حقیقت یہ ہے کہ تم نے انہیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو قتل کیا اور تو نے نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا (اور مومنوں کے ہاتھ جو اس کام میں استعمال کئے گئے) تو یہ اس لئے تھا کہ اللہ مومنوں کو ایک بہترین آزمائش سے کامیابی کے ساتھ گزار دے، یقیناً اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے"۔(سورۃ الانفال:17)

جب اللہ تعالیٰ نے یہ واضح کردیا کہ نصرت اسی کی طرف سے ہے، ساتھ ہی ساتھ اس نصرت کی بعض حکمتوں کی بھی وضاحت کی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ ٱلَّذِينَ كَفَرُوٓا۟ أَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنقَلِبُوا۟ خَآئِبِينَ ﴿١٢٧﴾ لَيْسَ لَكَ مِنَ

ﭐلۡأَمۡرِ شَیۡءٌ أَوۡ یَتُوبَ عَلَیۡهِمۡ أَوۡ یُعَذِّبَهُمۡ فَإِنَّهُمۡ ظَـٰلِمُونَ﴾ ترجمہ: ''(اور یہ مدد وہ تمہیں اس لئے دے گا) تاکہ کفر کی راہ چلنے والوں کا ایک بازو کاٹ دے، یا ان کو ایسی ذلیل شکست دے کہ وہ نامرادی کے ساتھ پسپا ہو جائیں۔ (اے پیغمبرؐ) فیصلہ کے اختیارات میں تمہارا کوئی حصہ نہیں، اللہ کو اختیار ہے چاہے انہیں معاف کرے چاہے سزا دے، کیونکہ وہ ظالم ہیں''۔ (سورۃ آل عمران: 127-128)

اور اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو حکم دیا ہے کہ وہ ہمیشہ بدر میں فتح و نصرت کی عظیم نعمت کو یاد کیا کریں اور یہ نہ بھولیں کہ فتح سے پہلے ان کی حالت کیسی تھی، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَٱذۡكُرُوٓاْ إِذۡ أَنتُمۡ قَلِیلٌ مُّسۡتَضۡعَفُونَ فِی ٱلۡأَرۡضِ تَخَافُونَ أَن یَتَخَطَّفَكُمُ ٱلنَّاسُ فَـَٔاوَىٰكُمۡ وَأَیَّدَكُم بِنَصۡرِهِۦ وَرَزَقَكُم مِّنَ ٱلطَّیِّبَـٰتِ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُونَ﴾ ترجمہ: ''یاد کرو وہ وقت جبکہ تم تھوڑے تھے، زمین میں تم کو بے زور سمجھا جاتا تھا، تم ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں لوگ تمہیں مٹا نہ دیں، پھر اللہ نے تم کو جائے پناہ مہیا کر دی، اپنی مدد سے تمہارے ہاتھ مضبوط کئے اور تمہیں اچھا رزق پہنچایا، شاید کہ تم شکر گزار بنو''۔ (سورۃ الأنفال: 26)

۲: یوم الفرقان:

یوم بدر کو ''یوم الفرقان'' کا نام دیا گیا ہے، اس نام کی مسلمانوں کی زندگی میں عظیم اہمیت ہے، استاد سید قطب شہیدؒ نے سورۃ أنفال آیت: ۴۱ میں یوم بدر کو 'یوم الفرقان' کا نام دینے کے متعلق گفتگو کی ہے، وہ فرماتے ہیں: ''حقیقت یہ ہے کہ بدر کا دن فی الواقع ایک فیصلہ کن دن تھا، اس غزوہ کا آغاز اور اختتام اللہ تعالیٰ کی تدبیر، اس کی رہنمائی اور اس کی نصرت و مدد کے مطابق ہوا، یہ دن حق و باطل کے مابین فیصلہ کن دن تھا، جیسے کہ مفسرین نے یہی بات اجمالاً کہی ہے، یہ دن وسیع معنی میں فیصلہ کا دن تھا، اس لئے کہ اس کے نتائج نہایت گہرے، دور رس اور ہمہ گیر تھے۔

یہ دن عملاً حق و باطل کے درمیان فیصلہ کا دن تھا، لیکن اس دن فیصلہ اس حقیقی سچائی اور باطل کے درمیان تھا جس پر زمین و آسمان عملاً قائم ہیں، اس سچائی پر تمام اشیاء اور تمام زندہ مخلوقات کی فطرت استوار ہوئی ہے، وہ سچائی جو اللہ کی ذات کو وحدہ تسلیم کرتی ہے، اللہ ہی کو بادشاہ تسلیم کرتی ہے، اور اسے اس کائنات کا مدبر و متصرف تسلیم کرتی ہے، اور وہ سچائی جو یہ سکھاتی ہے کہ یہ پوری کائنات اللہ کی مطیع فرمانبردار ہے، اس کائنات کے زمین و آسمان، اس کی اشیاء اور اس کی زندہ مخلوقات سب میں اللہ وحدہ متصرف ہے، اور یہ سب چیزیں اللہ کی الوہیت، اس کی بادشاہت، اور اس کی تکوینی حکومت کے ماتحت ہے اور کوئی اس سے سرتابی نہیں کر سکتا ہے اور باطل تو بے حقیقت اور وقتی چیز ہے جس نے اس وقت کرۂ ارضی کے اوپر ایسی طاغوتی طاقتیں پیدا کر دی تھیں جو لوگوں کی زندگی کے معاملات میں جس طرح چاہتی تھیں فیصلے کرتی تھیں، اس نظامِ باطل میں یہ لوگوں کی خواہشات ہی تھیں جو اشیاء اور لوگوں کی قسمتوں کے فیصلے کرتی تھیں۔

یہ تھا وہ عظیم فیصلہ کا دن جو بدر کے دن تمام ہوا جس دن عظیم سچائی اور سرکش باطل کے درمیان فیصلہ کن معرکہ پیش آیا، اس دن نے حق و باطل کے درمیان ایسا فیصلہ اور فاصلہ پیدا کر دیا کہ آئندہ کبھی ان کے درمیان کوئی التباس اور اشتراک کا امکان باقی نہ رہا۔

یہ دن حق و باطل کے درمیان نہایت وسیع اور گہرے معنوں میں ایک فیصلہ کن دن تھا، نہایت ہی دقیق اور لطیف معنوں میں انسان کے خمیر کی گہرائیوں میں حق و باطل کے درمیان فیصلہ تھا، انسانی تصورات اور شعور کے میدان میں وحدانیت اور شرک کے درمیان یہ فرقان تھا، انسانی اخلاق اور طرزِ عمل میں حق و باطل کے درمیان فیصلہ کن دن تھا، اللہ کی عبادت اور بندگی میں حق و باطل کے درمیان یہ فیصلہ کن معرکہ تھا، چاہے اس کا تعلق اشخاص سے ہو، اقدار سے ہو، رسم و رواج اور عادات سے ہو، یا کسی اور شکل سے ہو، اور ظاہری واقعہ کے اعتبار سے بھی اس حق اور اس باطل کے درمیان یہ فیصلہ کن دن تھا، اس دن خواہشات اور اشخاص کی بندگی اور اقدار اور تہذیب کے درمیان جنگ تھی، ایک طرف ذاتی اغراض تھیں اور دوسری طرف الٰہی قوانین تھے، ایک طرف صرف اللہ وحدہ کی حاکمیت، الوہیت اور اقتدار اعلیٰ کے نظریات تھے اور دوسری طرف انسان پر انسانوں کی برتری تھی، چنانچہ یہ ثابت ہو گیا کہ اللہ کے سوا کوئی نفع و نقصان پہنچانے والا نہیں ہے، اس کے سوا کوئی حاکم نہیں ہے، اس کے سوا کوئی قانون ساز نہیں ہے، اب لوگوں کے سر بلند ہو گئے، اب وہ کسی غیر کے سامنے نہ جھکتے تھے، لوگ سب کے سب باہم مساوی قرار پائے، ان پر اگر کوئی برتری تھی تو اللہ اور اس کے قانون کی تھی، غول در غول انسانی حریت و آزادی سے سرفراز ہو گئے، جو ظالموں اور سرکشوں کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔

یہ دن تحریکِ اسلامی کی تاریخ میں دو (۲) ادوار کے درمیان حدِ فاصل تھا، تحریک پہلے مرحلہ میں صبر اور برداشت کے اصولوں پر عمل پیرا تھی، وہ اپنی قوتوں کو مجتمع کر رہی تھی، اب تحریکِ اسلامی کی قوت، آغازِ کار اور ترقی کا دور شروع ہوا، اسلام نے پوری زندگی کے لئے ایک جدید تصور دیا، انسانی معاملات کے طے کرنے کے لئے ایک جدید نظام دیا، ایک جدید اجتماعی نظام پیش کیا گیا، حکومت کے لئے ایک نیا سیاسی نظام اور دستور تجویز ہوا، اور یہ اعلان کر دیا کہ اب کوئی انسان دوسرے انسان کا غلام نہ ہوگا، سب کے سب صرف اللہ رب العالمین کے غلام ہوں گے اور اب ان طاغوتی قوتوں کو زندہ رہنے کے لئے کوئی جواز نہیں ہے، جنہوں نے اللہ کے حقِ حاکمیت کو غصب کر لیا ہے.......

آخر میں کہتا ہوں کہ جنگِ بدر ایک دوسرے زاویہ کے اعتبار سے بھی حق و باطل کے درمیان 'فرقان' تھا، اور اس پہلو کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا: ﴿وَإِذۡ يَعِدُكُمُ ٱللَّهُ إِحۡدَى ٱلطَّآئِفَتَيۡنِ أَنَّهَا لَكُمۡ وَتَوَدُّونَ أَنَّ غَيۡرَ ذَاتِ ٱلشَّوۡكَةِ تَكُونُ لَكُمۡ وَيُرِيدُ ٱللَّهُ أَن يُحِقَّ ٱلۡحَقَّ بِكَلِمَٰتِهِۦ وَيَقۡطَعَ دَابِرَ ٱلۡكَٰفِرِينَ ۞ لِيُحِقَّ ٱلۡحَقَّ وَيُبۡطِلَ ٱلۡبَٰطِلَ وَلَوۡ كَرِهَ ٱلۡمُجۡرِمُونَ ۞﴾ ترجمہ: "یاد کرو وہ موقع جب کہ اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دونوں گروہوں میں سے ایک تمہیں مل جائے گا تم چاہتے تھے کہ کمزور گروہ تمہیں ملے مگر اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ اپنے ارشادات سے حق کو حق کر دکھائے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے، تاکہ حق حق ہو کر رہے اور باطل باطل ہو جائے، خواہ مجرموں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو"۔ (سورۃ الانفال: 7-8)

جو لوگ بدر کے لئے نکلے تھے وہ صرف اس ارادہ سے نکلے تھے کہ ابوسفیان کے قافلے کے ساتھ تعرض کریں اور قافلہ سے مالِ غنیمت حاصل کر لیں، لیکن اللہ نے ان کی آواز کو پورا نہ کیا، اللہ نے ابوسفیان کے قافلہ کو بچ کر نکل جانے کا موقع دیا اور اہلِ اسلام کو ابوجہل کے پُر شوکت لشکر سے ٹکرا دیا، اور اس کے نتیجہ میں جنگ ہوئی، مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی اور کفار قید ہوئے اور قتل ہوئے، اور یہ نہ ہو سکا

کہ مسلمان بطورِ تفریح نکلیں اور قافلہ پر قبضہ کرکے آسان طریقہ سے مالِ غنیمت حاصل کرلیں،اور یہ کام اللہ نے اس لئے کیا ’’تاکہ حق، حق ہوجائے اور باطل، باطل‘‘۔اس میں اللہ تعالیٰ یہ بتانا چاہتے تھے کہ اللہ کی اسکیم کے مطابق احقاقِ حق کا طریقہ کیا ہے۔

بے شک محض وعظ و تبلیغ اور نظریاتی اور حکیمانہ تبلیغ ہی سے احقاقِ حق نہیں ہوتا اور نہ نظریاتی بحث و جدال کے نتیجہ میں احقاقِ حق ہوتا ہے کہ کوئی دلائل سے یہ ثابت کرے کہ حق یہ ہے اور باطل یہ ہے، حق اس وقت تک عملی شکل اختیار نہیں کرتا ہے اور باطل لوگوں کی عملی زندگی سے اس وقت تک خارج نہیں ہوتا ہے جب تک باطل کی قوت اور اقتدار کو ختم نہ کردیا جائے اور اس کی جگہ حق کا اقتدار اعلیٰ قائم نہ کردیا جائے،اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہوتا جب تک حق کی فوج کو نصرت و فتح مندی نصیب نہ ہو اور باطل کو شکست نہ ہوجائے اور وہ پسپائی کا شکار ہوجائے، غرض یہ دین ایک تحریکی منہاج ہے، محض نظریہ نہیں ہے، محض علمی بحث وجدال نہیں ہے اور نہ ہی محض منفی اعتقاد ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں ہے، بلکہ اس کا مثبت پہلو بھی ہے۔

بلاشبہ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل میدانِ کارزار میں ہوا،اور عملاً حق کو نصرت نصیب ہوئی جو اس اعتبار سے فی الحقیقت حق و باطل کے درمیان فرقان تھی،اور اس آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اس معرکہ کے ذریعہ ارادہ اور مقصد کیا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گھر سے حق کے ساتھ نکالنے کے پیچھے کیا مقصد تھا اور غیر مسلح قافلہ کے چلے جانے اور سامانِ حرب و ضرب سے لیس لشکر کے ساتھ مڈبھیڑ ہونے کے پیچھے کیا مقصد تھا۔

یہ تھی اس دین اور اس دین کی فرقانی حیثیت، جس سے اس دین کی حقیقت،اس کا مزاج واضح ہوتا ہے اور اہلِ ایمان کے احساس وشعور کا حصہ بن جاتا ہے، یہ ایسی فرقانیت ہے جس کی ضرورت آج محسوس کی جاتی ہے،اس لئے کہ مسلمانوں کے احساس وشعور کے اندر آج اسلام کے صحیح تصور میں انحراف اور لچک پیدا ہوگئی ہے اور یہ لچک اس قدر پھیل گئی ہے کہ بعض لوگ دعوت و دین اور تبلیغ دین کا دعوی کرتے ہیں، لیکن احقاقِ حق کے اس منہاج کو وہ نہیں پاسکے،اس طرح سے یوم بدر کی حیثیت وہ تھی جس کے بارے میں کہا گیا کہ وہ ’’یوم الفرقان‘‘اور ’’یوم التقی الجمعان‘‘ ہے، جس کے اندر معنوی گہرائی و گیرائی ہے۔’’واللہ علی کل شی قدیر‘‘ اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے، اس دن میں اللہ کی قدرت کی ایسی مثال پائی جاتی ہے جس کی دنیا میں اور کوئی نظیر نہیں ہے اور نہ اس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش ہے، یہ ایک عملی اور مشاہداتی مثال ہے جس کی تفسیر اس کے سوا کچھ نہیں ہوسکتی ہے کہ یہ اللہ کی قدرت کے نتیجہ میں وقوع پذیر ہوا اور یہ کہ حقیقتاً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔(دیکھیں: فی ظلال القرآن: 3/1521)

۳: ولاء اور براء ایک ایمانی تقاضا:

غزوۂ بدر نے امت کی نسلوں کے لئے ولاء و براء (اللہ اور دین کے ساتھ اخلاص و عقیدت اور ہر غیر اللہ سے اعلان براءت) کے روشن نمونے قائم کئے اور حق و باطل کے درمیان ایک خطّ فاصل قائم کردیا،اس لئے یہ غزوہ نفسیاتی اعتبار سے،مادی اعتبار سے فرقان تھا،اور اسلام و کفر کے درمیان مکمل علحیدگی اور دوری کرنے والا تھا،اس غزوہ میں یہ معنی اور مفاہیم عملی اور محسوس شکل میں دیکھنے کو ملے اور صحابہ

کرام نے واقعی و عملی طور پر مادی ونفسیاتی طور پر ان معانی کو اپنی عملی زندگی میں نافذ کر کے دکھایا، اور اس غزوہ میں تمام جاہلی اقدار زمین بوس ہو کر رہ گئیں اور بیٹا اپنے باپ کے مقابلہ میں اور بھائی اپنے ہی بھائی کے مقابلہ میں میدانِ کارزار میں کھڑا تھا:

۱: حضرت ابو حذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ مسلمانوں کی صف میں تھے جبکہ ان کا باپ عتبہ، ان کا بھائی ولید اور ان کا چچا شیبہ مشرکین کی صف میں تھے، اور یہ سب کے سب مشرکین پہلی ہی مبارزت میں مارے گئے۔

۲: حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ مسلمانوں کی صف میں تھے اور آپ رضی اللہ عنہ کا بیٹا عبد الرحمن مشرکین کی صف میں تھا۔

۳: حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے علم بردار تھے اور ان کا بھائی ابو عزیز بن عمیر مشرکین کی صف میں تھا، اور پھر وہ ایک انصاری صحابی کے ذریعہ گرفتار ہو کر قیدی بنا، حضرت مصعب رضی اللہ عنہ نے انصاری صحابی سے کہا: اس کو زور سے پکڑو، اس لئے کہ اس کی ماں مال و متاع والی ہے۔ یہ سن کر ابو عزیز نے کہا: اے میرے بھائی! یہ ہے میرے بارے میں تمہاری وصیت؟! حضرت مصعب رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''تمہارے بجائے یہ انصاری میرا بھائی ہے''۔ یہ حقائق تھے نہ کہ صرف الفاظ و کلمات، یہ اقدار اور بنیادیں تھیں تاکہ ان کی اساس پر انسانیت قائم ہو سکے، اب عقیدہ ہی نسب و قرابت کو مربوط کرنے والا بن گیا اور وہی معاشرتی و سماجی رابطہ کا ذریعہ بن گیا۔ (دیکھیں: (البدایہ والنہایہ: 3/307 من معین السیرۃ، ص213)

۴: بدر میں مسلمانوں کا شعار (کوڈ ورڈ) "أحد أحد" تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ جہاد ایک ایسے عقیدہ کے لئے تھا جو ایک معبود کی عبودیت و بندگی کی نمائندگی کرتا ہے، اس میں عصبیت، قبائلی نظام، ذاتی دشمنی، عداوت اور انتقام کی کوئی گنجائش نہیں ہے، یہی عقیدہ اس جہاد کے لئے اصل محرک و بنیاد ہے اور اس عقیدہ کی بنیاد ایک اللہ پر ایمان لانا ہے، اس اعتبار سے ایمان کی الگ الگ و متنوع شکلیں اور مظاہر سامنے آئے، لیکن یہ سب اپنے مضمون و مفاہیم کے اعتبار سے ایک تھے۔

ایمان ایک عظیم فقہ و فہم کا تقاضا کرتا ہے، اس فقہ و فہم کی ایک شکل اس وقت سامنے آئی جبکہ اللہ کے رسول ﷺ نے مدینہ کی جانب ہجرت فرمائی، آپ ﷺ کے ساتھ مکہ سے ہر اس مسلمان نے ہجرت کی جو ہجرت کی استطاعت رکھتا تھا، اور جو مظلوم و کمزور تھا اس کو ہجرت سے روک دیا گیا اور وہ افراد ہجرت نہ کر سکے، اور جب غزوۂ بدر ہوا تو ان میں سے بعض مشرکین کی صف میں تھے، ان میں: عبد اللہ بن سہیل بن عمرو، حارث بن زمعہ بن أسود، أبو قیس بن الفاکہ، أبو قیس بن ولید بن مغیرہ، علی بن أمیہ بن خلف اور عاص بن منبّہ شامل تھے۔

جہاں تک تعلق ہے عبد اللہ بن سہیل بن عمرو کا تو وہ مشرکین کی صف سے نکل کر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ شامل ہو گئے اور معرکۂ کارزار میں پہنچ گئے، وہ ان صحابہ میں سے ایک تھے جن کو یہ عظیم شرف حاصل ہوا، ان کے علاوہ دوسرے لوگوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ معرکہ میں مشرکین کی صفوں میں شریک ہو کر قتال کیا اور سب کے سب مارے گئے اور وہ کفر کے جھنڈے تلے مارے گئے، انہی کے بارے میں اللہ تعالی کا یہ قول نازل ہوا: ﴿إِنَّ ٱلَّذِينَ تَوَفَّىٰهُمُ ٱلۡمَلَـٰٓئِكَةُ ظَالِمِيٓ أَنفُسِهِمۡ قَالُواْ فِيمَ كُنتُمۡۖ قَالُواْ كُنَّا مُسۡتَضۡعَفِينَ فِي ٱلۡأَرۡضِۚ قَالُوٓاْ أَلَمۡ تَكُنۡ أَرۡضُ ٱللَّهِ وَٰسِعَةً فَتُهَاجِرُواْ فِيهَاۚ فَأُوْلَـٰٓئِكَ مَأۡوَىٰهُمۡ جَهَنَّمُۖ وَسَآءَتۡ

مَصِيرًا﴾ ترجمہ: ''جو لوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے اُن کی روحیں جب فرشتوں نے قبض کیں تو ان سے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں مبتلا تھے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور و مجبور تھے، فرشتوں نے کہا: کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور بڑا ہی بُرا ٹھکانا ہے''۔ (سورۃ النساء: 97) (صحیح البخاری: 4596، من معین السیرۃ: 213-217، سیرۃ ابن ہشام: 2/253)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں: مسلمانوں میں سے کچھ لوگ مکہ میں ہی مقیم رہے، وہ اپنے اسلام کو پوشیدہ رکھے ہوئے تھے اور ہمارے یہ اصحاب بھی مسلمان تھے، ان کو وہاں سے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا گیا، اسی پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿إِنَّ ٱلَّذِينَ تَوَفَّىٰهُمُ ٱلْمَلَـٰٓئِكَةُ﴾ بے شک وہ معذور نہیں تھے جبکہ مومنین کی صف میں شامل ہونے کے لئے امکانات اور وسائل ان کے پاس موجود تھے، اور دونوں صفوں کے درمیان دوری بھی بہت زیادہ نہیں تھی، اور اگر وہ چاہتے تو ان کے پاس رسول اللہ ﷺ کی طرف منتقل ہونے کا موقع بھی تھا، جیسے کہ عبداللہ بن سہیلؓ نے کیا۔ (دیکھیں: من معین السیرۃ، ص: 217)

بلا شبہ ایمان کے کچھ تقاضے اور لوازمات ہیں، جو ایمان کی قوت اور اس کے حقیقی ہونے پر دلالت کرتے ہیں، انہی تقاضوں میں سے ایک تقاضہ یہ بھی ہے کہ وہ ایمانی اور اسلامی اقدار کے علاوہ ہر قسم کی اقدار پر غالب و حاوی ہو، جب ایسا ہوگا تو ایسے صاحبِ ایمان کا حق کی تعمیر میں متاثر کن کردار اور مؤثر طاقت ہو گی، ایمان کردار کو اپنے رنگ میں رنگتا ہے جس کا اظہار پھر عمل اور حرکت کے ذریعہ، محنت و جد و جہد کے ذریعہ، الفاظ و کلمات کے ذریعہ، مسکراہٹ کے ذریعہ اور شکل و شباہت اور تاثرات کے ذریعہ ہوتا ہے، اسی لئے مشرکین کی صف میں رہنے والوں کو معذور نہیں سمجھا گیا، اس لئے کہ جس ایمان کا انہوں نے دعوی کیا تھا انہوں نے اس کے تقاضے اور لوازمات پورے نہیں کئے اور اس کا اثر بھی ظاہر نہیں ہوا۔ (من معین السیرۃ: 218)

اسی وسیع و عمیق ایمانی فہم و فقہ کی وجہ سے صحابہ کرامؓ نے بدر میں صداقتِ ایمانی کی ایسی اعلیٰ مثالیں قائم کیں جو اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ انہوں نے ماں باپ، اولاد، اہل و عیال اور خاندان کے مقابلہ میں اللہ اور اس کے رسول کی رضا جوئی اور خوشنودی کو ترجیح دی، اسی لئے جب اللہ تعالیٰ ان کی تعریف و توصیف بیان کرتا ہے تو کسی مسلمان کے لئے یہ کوئی قابلِ تعجب بات نہیں ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿لَّا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِٱللَّهِ وَٱلْيَوْمِ ٱلْـَٔاخِرِ يُوَآدُّونَ مَنْ حَآدَّ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ وَلَوْ كَانُوٓا۟ ءَابَآءَهُمْ أَوْ أَبْنَآءَهُمْ أَوْ إِخْوَٰنَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ ۚ أُو۟لَـٰٓئِكَ كَتَبَ فِى قُلُوبِهِمُ ٱلْإِيمَـٰنَ وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِّنْهُ ۖ وَيُدْخِلُهُمْ جَنَّـٰتٍ تَجْرِى مِن تَحْتِهَا ٱلْأَنْهَـٰرُ خَـٰلِدِينَ فِيهَا ۚ رَضِىَ ٱللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا۟ عَنْهُ ۚ أُو۟لَـٰٓئِكَ حِزْبُ ٱللَّهِ ۚ أَلَآ إِنَّ حِزْبَ ٱللَّهِ هُمُ ٱلْمُفْلِحُونَ﴾ ترجمہ: ''تم کبھی یہ نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں وہ اُن لوگوں سے محبت کرتے ہوں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی ہے، خواہ وہ اُن کے باپ ہوں، یا اُن کے بیٹے، یا اُن کے بھائی یا اُن کے اہلِ خاندان یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت کر دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک روح عطا کر کے ان کو قوت بخشی ہے، وہ ان کو ایسی جنتوں میں داخل

کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے، وہ اللہ کی پارٹی کے لوگ ہیں، خبردار رہو، اللہ کی پارٹی والے ہی فلاح پانے والے ہیں"۔(سورۃ المجادلہ:22)

۴: غزوۂ بدر کے موقع پر ظہور پذیر ہونے والے معجزات:

اللہ کے رسول ﷺ کے ذریعہ بدر کے موقع پر جو معجزات ظاہر ہوئے ان میں سے ایک معجزہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے بعض غیبی چیزوں کے بارے میں اطلاع دی، اور یہ بات تو معلوم ہی ہے کہ غیب کا علم اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہے، علمِ غیب کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابِ عزیز میں متعدد آیات میں اپنی ذات کے ساتھ مختص کیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿قُل لَّا يَعْلَمُ مَن فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ ٱلْغَيْبَ إِلَّا ٱللَّهُ ۚ وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ﴾ ترجمہ:"اِن سے کہو: اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں کوئی غیب کا علم نہیں رکھتا، اور وہ نہیں جانتے کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے"۔(سورۃ النمل:65)

دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿وَعِندَهُۥ مَفَاتِحُ ٱلْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ إِلَّا هُوَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي ٱلْبَرِّ وَٱلْبَحْرِ ۚ وَمَا تَسْقُطُ مِن وَرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِي ظُلُمَٰتِ ٱلْأَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَلَا يَابِسٍ إِلَّا فِي كِتَٰبٍ مُّبِينٍ﴾ ترجمہ: "اُسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنہیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا، بحر و بر میں جو کچھ ہے سب سے وہ واقف ہے، درخت سے گرنے والا کوئی پتہ ایسا نہیں جس کا اسے علم نہ ہو، زمین کے تاریک پردوں میں کوئی دانہ ایسا نہیں جس سے وہ باخبر نہ ہو، خشک و تر سب کچھ ایک کھلی کتاب میں لکھا ہوا ہے"۔(سورۃ الانعام:59)

یہ بھی معلوم ہی ہے کہ انبیاء -علیہم السلام- غیب کا علم نہیں رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿قُل لَّآ أَقُولُ لَكُمْ عِندِي خَزَآئِنُ ٱللَّهِ وَلَآ أَعْلَمُ ٱلْغَيْبَ وَلَآ أَقُولُ لَكُمْ إِنِّي مَلَكٌ ۖ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰٓ إِلَيَّ ۚ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي ٱلْأَعْمَىٰ وَٱلْبَصِيرُ ۚ أَفَلَا تَتَفَكَّرُونَ﴾ ترجمہ: "اے محمدؐ! ان سے کہو: میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، نہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں، اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں، میں تو صرف اُس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر نازل کی جاتی ہے، پھر ان سے پوچھو: کیا اندھا اور آنکھوں والا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا تم غور نہیں کرتے؟"۔(سورۃ الانعام:50)

اس کے بہت سے دلائل موجود ہیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی ذات کو علمِ غیب کے ساتھ خاص کیا ہے اور تمام مخلوقات کے مقابلہ میں غیب کا علم اللہ ہی کے پاس ہے، اس کے بھی دلائل موجود ہیں جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات میں سے کسی رسول کو خاص کر کے وحی کے ذریعہ ان کو غیب کا علم دیا ہے، اور یہ ان کے حق میں معجزہ قرار دیا گیا ہے، اور یہ ان کی نبوت کے سچ ہونے کی واضح دلیل ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿مَّا كَانَ ٱللَّهُ لِيَذَرَ ٱلْمُؤْمِنِينَ عَلَىٰ مَآ أَنتُمْ عَلَيْهِ حَتَّىٰ يَمِيزَ ٱلْخَبِيثَ مِنَ ٱلطَّيِّبِ ۗ وَمَا كَانَ ٱللَّهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى ٱلْغَيْبِ وَلَٰكِنَّ ٱللَّهَ يَجْتَبِي مِن رُّسُلِهِۦ مَن يَشَآءُ ۖ فَـَٔامِنُوا۟ بِٱللَّهِ وَرُسُلِهِۦ ۚ وَإِن تُؤْمِنُوا۟ وَتَتَّقُوا۟ فَلَكُمْ أَجْرٌ عَظِيمٌ﴾ ترجمہ: "اللہ مومنوں کو اس حالت میں ہرگز نہ رہنے دے گا جس میں تم اس وقت

پائے جاتے ہو، وہ پاک لوگوں کو ناپاک لوگوں سے الگ کر کے رہے گا، مگر اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ تم کو غیب پر مطلع کر دے، غیب کی باتیں بتانے کے لئے تو وہ اپنے رسولوں میں جس کو چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے، لہٰذا (امور غیب کے بارے میں) اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھو، اگر تم ایمان اور خدا ترسی کی روش پر چلوگے تو تم کو بڑا اجر ملے گا"۔(سورۃ آل عمران:179)

دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿عَٰلِمُ ٱلۡغَيۡبِ فَلَا يُظۡهِرُ عَلَىٰ غَيۡبِهِۦٓ أَحَدًا ۝٢٦ إِلَّا مَنِ ٱرۡتَضَىٰ مِن رَّسُولٖ فَإِنَّهُۥ يَسۡلُكُ مِنۢ بَيۡنِ يَدَيۡهِ وَمِنۡ خَلۡفِهِۦ رَصَدٗا﴾ ترجمہ: "وہ عالم الغیب ہے، اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا، سوائے اُس رسول کے جسے اُس نے (غیب کا کوئی علم دینے کے لئے) پسند کر لیا ہو، تو اُس کے آگے اور پیچھے وہ محافظ لگا دیتا ہے"۔(سورۃ الجن:26-27)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی زبانی جن غیبی امور کی اطلاع دی گئی وہ اللہ تعالیٰ کے ذریعہ کی گئی، یہ وحی کا نتیجہ تھا، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو اس کی اطلاع اس لئے دی تاکہ یہ آپؐ کی نبوت و رسالت کے صحیح ہونے پر دلیل بن سکے، یہ بات تو آپ ﷺ کے بارے میں معروف و مشہور تھی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو غیبی امور کے بارے میں باخبر کیا ہے، غزوۂ بدر کے واقعات میں ان غیبی معجزات کا ایک بڑا حصہ دیکھنے کو ملتا ہے، ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

أ: اُمیہ بن خلف کا قتل:

حضرت عبداللہ بن مسعود -رضی اللہ عنہ- سے روایت ہے فرماتے ہیں: سعد بن معاذؓ عمرہ کی نیت سے (مکہ) آئے اور ابو صفوان امیہ بن خلف کے یہاں ٹھہرے۔ امیہ بھی شام جاتے ہوئے (تجارت وغیرہ کے لئے) جب مدینہ سے گزرتا تو سعد بن معاذؓ کے یہاں قیام کیا کرتا تھا۔ امیہ نے سعدؓ سے کہا: ابھی ٹھہرو، جب دوپہر کا وقت ہو جائے اور لوگ غافل ہو جائیں (تب طواف کرنا کیونکہ مکہ کے مشرک مسلمانوں کے دشمن تھے) سعدؓ کہتے ہیں: چنانچہ میں نے جا کر طواف شروع کر دیا۔ سعدؓ ابھی طواف کر ہی رہے تھے کہ ابو جہل آ گیا اور کہنے لگا؛ یہ کعبہ کا طواف کون کر رہا ہے؟ سعدؓ بولے کہ میں سعد ہوں۔ ابو جہل بولا: تم کعبہ کا طواف خوب امن سے کر رہے ہو حالانکہ تم لوگوں نے محمدؐ اور اس کے ساتھیوں کو پناہ دے رکھی ہے، سعدؓ نے کہا: ہاں ٹھیک ہے۔ اس طرح دونوں میں بات بڑھ گئی۔ پھر امیہ نے سعدؓ سے کہا: ابوالحکم (ابو جہل) کے سامنے اونچی آواز سے نہ بولو۔ وہ اس وادی کا سردار ہے۔ اس پر سعدؓ نے کہا: اللہ کی قسم، اگر تم نے مجھے بیت اللہ کے طواف سے روکا تو میں بھی تمہاری شام کی تجارت خاک میں ملا دوں گا، بیان کیا کہ امیہ برابر سعدؓ سے یہی کہتا رہا کہ اپنی آواز بلند نہ کرو اور انہیں (مقابلہ سے) روکتا رہا، آخر سعدؓ کو اس پر غصہ آ گیا اور انہوں نے امیہ سے کہا: چل پرے ہٹ، میں نے محمد ﷺ سے تیرے متعلق سنا ہے، آپؐ نے فرمایا تھا کہ تجھ کو ابو جہل ہی قتل کرائے گا۔ امیہ نے پوچھا: مجھے؟ سعدؓ نے کہا: ہاں تجھ کو۔ تب امیہ کہنے لگا: اللہ کی قسم، محمدؐ جب کوئی بات کہتے ہیں تو وہ غلط نہیں ہوتی ہے، پھر وہ اپنی بیوی کے پاس آیا اور اس نے اس سے کہا: تمہیں معلوم نہیں، میرے یثربی بھائی نے مجھے کیا بات بتائی ہے؟ اس نے پوچھا: انہوں نے کیا کہا؟ امیہ نے بتایا کہ محمدؐ کہہ چکے ہیں کہ ابو جہل مجھ کو قتل کرائے گا۔ وہ کہنے لگی: اللہ کی قسم، محمد ﷺ غلط بات زبان سے نہیں نکالتے۔ پھر ایسا ہوا کہ اہلِ مکہ بدر کی لڑائی کے لئے روانہ ہونے لگے اور امیہ کو بھی بلانے والا آیا تو امیہ سے اس کی بیوی نے کہا: تمہیں یاد نہیں رہا، تمہارا یثربی بھائی تمہیں کیا خبر دے گیا تھا؟! بیان کیا کہ اس یاد دہانی پر امیہ نے چاہا کہ اس جنگ

میں شرکت نہ کرے لیکن ابو جہل نے کہا: تم وادیٔ مکہ کے رئیس ہو، اس لئے کم از کم ایک یا دو دن کے لئے ہی تمہیں چلنا پڑے گا، اس طرح وہ ان کے ساتھ جنگ میں شرکت کے لئے نکلا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو قتل کرا دیا۔ (صحیح البخاری: 3632)

ب: سرکشوں کی ہلاکت:

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں: ہم عمرؓ کے ہمراہ مکہ اور مدینہ کے درمیان تھے تو ہم نے پہلی کا چاند دیکھنے کی کوشش کی، میں تیز نگاہ والا تھا، میں نے چاند دیکھ لیا، میرے علاوہ اور کوئی نہیں تھا، جس کا خیال ہو کہ اس نے چاند دیکھ لیا ہو، فرماتے ہیں: پھر میں عمرؓ سے کہنے لگا: کیا آپ نہیں دیکھ رہے؟ چنانچہ انہوں نے اسے دیکھنا چھوڑ دیا۔ فرماتے ہیں: عمرؓ کہنے لگے: میں اسے دیکھ لوں گا جب کہ میں اپنے بستر پر لیٹا ہوں گا، پھر وہ ہم سے اہل بدر کا واقعہ بیان کرنے لگے، انہوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ ایک دن پہلے ہمیں بدر میں قتل ہونے والوں کے گرنے کی جگہیں دکھا رہے تھے، آپ ﷺ فرما رہے تھے: ان شاء اللہ کل فلاں کے قتل ہونے کی جگہ یہ ہوگی۔ فرماتے ہیں: حضرت عمرؓ نے کہا: اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے وہ لوگ ان حدود سے ذرہ بھی اِدھر اُدھر قتل نہیں ہوئے جن کی نشاندہی رسول اللہ ﷺ نے کی تھی۔ حضرت عمرؓ نے کہا: پھر ان کی لاشوں کو ایک دوسرے کے اوپر کنویں میں ڈال دیا گیا۔ (صحیح مسلم: 2873،7222)

ج: حضرت عباس بن عبد المطلب کو دفن کئے ہوئے مال کی خبر دینا اور عمر بن وہب کو ان کے درمیان اور صفوان کے درمیان ہونے والی گفتگو کی خبر دینا:

جن غیبی امور کی اطلاع رسول ﷺ نے دی ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے چچا سے فدیہ ادا کرنے کا مطالبہ کیا اور حضرت عباسؓ نے جواب دیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! میرے پاس فدیہ نہیں ہے، آپؐ نے ان سے فرمایا: وہ مال کہاں ہے جو آپ نے اور اُم الفضل نے دفن کیا ہے اور آپ نے ام الفضل سے کہا تھا: اگر میں اس سفر میں مارا جاؤں تو یہ مال جو میں نے دفن کیا ہے بنو الفضل عبد اللہ اور قثم کے لئے ہے؟ حضرت عباسؓ نے فرمایا: اے اللہ کے رسولؐ، واللہ! مجھے یقین ہو گیا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، اس لئے کہ یہ ایک ایسی بات ہے جس کو میرے اور اُم الفضل کے علاوہ کوئی نہیں جانتا ہے۔

اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ نے عمیر بن وہب کو صفوان بن امیہ کے ساتھ کئے گئے معاہدہ کے متعلق بتا دیا تھا جبکہ وہ بظاہر اپنے بیٹے کی رہائی کے لئے آئے تھے حالانکہ وہ نبی کریم ﷺ کو شہید کرنا چاہتے تھے، آپؐ نے انہیں پوری سازش کی حقیقت سے آگاہ کر دیا اور وہی پھر ان کے اسلام لانے کا سبب بنا اور وہ مخلصانہ طور پر ایمان لے آئے۔

چند مزید معجزات:

علامہ ابن قیمؒ "زاد المعاد" میں فرماتے ہیں: ایک روز حضرت عکاشہ بن محصنؓ کی تلوار ٹوٹ گئی، اللہ کے رسول ﷺ نے ان کو لکڑی کا ایک ڈنڈا دیا اور فرمایا: یہ پکڑو، جب عکاشہؓ نے اسے پکڑا اور اسے ہلایا تو وہ ان کے ہاتھ میں ایک مضبوط لمبی سفید رنگ کی تلوار بن گئی۔

حضرت عکاشہؓ مسلسل اسی تلوار سے قتال کرتے رہے یہاں تک کہ دورِ صدیقی میں ارتداد کی جنگوں کے دوران شہید ہو گئے۔(دیکھیں: زاد المعاد:3/186)

حضرت رفاعہ بن رافع فرماتے ہیں: مجھے جنگ بدر میں ایک تیر لگا اور میری آنکھ زخمی ہو گئی، اللہ کے رسول ﷺ نے اس میں اپنا لعابِ دہن ڈالا اور میرے لئے دعا فرمائی، مجھے اس سے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔(دیکھیں: زاد المعاد:3/186)

ڈاکٹر ابو شہبہ لکھتے ہیں: یہ مناسب نہیں ہے کہ کوئی یہ سمجھے کہ حسّی معجزات کی قرآن کے بعد کوئی ضرورت نہیں ہے، اس طرح کے معجزات کے اثرات تو اس قدر واضح اور نمایاں ہوئے جو بعض لوگوں کے ایمان لانے کا سبب بن گئے اور بعض کے ایمان ویقین میں تقویت کا ذریعہ بنے اور ان کے ذریعہ یہ ثابت ہو گیا کہ آپ ﷺ ایسے نبی ہیں جن کی جانب وحی کی جاتی ہے، چنانچہ آپؐ نے ایسے غیبی امور کے بارے میں خبر دی جن کے بارے میں سائنس ہر طرح کے ظاہری احتمال کی نفی کرتی ہے اور اس کے سوا کوئی امکان باقی نہیں رہتا ہے کہ اس کا تعلق آسمانی وحی سے ہی ہو سکتا ہے، اور یہ بھی کوئی مخفی چیز نہیں ہے کہ ایک لکڑی ہاتھ میں ایک مضبوط تلوار بن جاتی ہے اور اس کے ذریعہ ایمان ویقین میں اضافہ ہوتا ہے اور پھر اس تلوار کے ذریعہ مسلسل جہاد کیا جاتا ہے جس میں پس وپیش اور تردّد یا پسپائی کا ادنی سا شائبہ نظر نہیں آتا ہے، اور اس تلوار کو لے کر معرکوں پر معرکے سر کئے جاتے ہیں، ایک ایسی تلوار جو خرقِ عادت تھی اور اولین وآخرین کے لئے ایک مثال اور نمونہ بن گئی۔(دیکھیں: السیرۃ النبویہ، ابو شہبہ:2/178)

٥: مشرک سے استعانت کا حکم:

غزوۂ بدر میں اور اس سے پہلے کے واقعات میں ایک مشرک نے چاہا کہ مسلمانوں کے لشکر میں شامل ہو جائے اور اس نے نبی کریم ﷺ سے مطالبہ کیا کہ اس کو ان کے ساتھ شامل ہونے کی اجازت دے دیں، آپ ﷺ نے اس سے فرمایا: ''واپس جاؤ، میں ہرگز کسی مشرک سے مدد نہیں لے سکتا''۔(مسند أحمد:6/149، صحیح مسلم:1817، سنن أبوداؤد:2732، سنن ترمذی: 1558، سنن ابن ماجہ:2832)

اس حدیث سے واضح ہو جاتا ہے کہ اصل اصول اور قاعدہ یہ ہے کہ عمومی امور میں غیر مسلم سے مدد نہ حاصل کی جائے، البتہ اس قاعدہ کے کچھ استثناءات ہیں اور بعض شرائط کے ساتھ غیر مسلم سے مدد حاصل کرنے کا جواز ہے، جیسے کہ اس مدد کے ذریعہ عمومی فائدہ حاصل ہونا یقینی ہو یا اس کا غالب گمان ہو، اس مدد کا دعوت اور اس کے متعلقات پر کوئی ضرر اور نقصان نہ ہو، جس سے مدد لی جا رہی ہے اس پر مکمل اعتماد واطمئنان ہو، وہ اسلامی قیادت کے تابع ہو، اس کو امیر وقائد نہ بنایا جائے، اس استعانت کی اور اس شخص کی جس سے مدد حاصل کی جا رہی ہے، حقیقی حاجت وضرورت ہو، اگر یہ شرائط پوری ہو رہی ہوں تو استثناء کے طور پر استعانت جائز اور درست ہے، اور اگر ان شرائط کا تحقّق نہ ہو تو پھر استعانت جائز نہیں ہے، اسی قاعدہ کی رو سے اللہ کے رسول ﷺ نے مشرک کو مسلمانوں کے ساتھ شریک کرنے سے انکار کر دیا، اس لئے کہ یہاں اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

البتہ استثناء کی روشنی میں اور شرائط کے تحقّق کے وقت نبی کریم ﷺ نے مشرک شخص عبداللہ بن اُریقط کی مدد حاصل کی، جس کو نبی کریم ﷺ اور ابو بکرؓ نے مدینہ کی طرف ہجرت کے موقع پر اجرت پر لیا تھا تاکہ وہ انہیں مدینہ کا راستہ دکھائے، اسی استثناء کے پیشِ نظر اور شرائط کے تحقّق کی وجہ سے آپ ﷺ نے اپنے چچا ابو طالب کی حمایت حاصل کی، اسی طرح طائف سے واپسی کے وقت مطعم بن عدی کے جِوار اور پناہ کو قبول کیا، اسی طرح صحابہ کرامؓ نے بھی پناہ دینے والے بعض مشرکین کا جِوار قبول کیا تاکہ وہ ان کو مصائب و تکالیف سے دور رکھ سکیں، البتہ عملی زندگی میں اس قاعدہ کی استثنائی شرائط کو سمجھتے ہوئے منطبق کرنے کے لئے گہرے فقہ و فہم اور قوی ایمان کی ضرورت ہے۔(المستفاد من قصص القرآن 2/144)

۶: حضرت حذیفہ بن یمانؓ اور حضرت اُسید بن حضیرؓ

أ: حضرت حذیفہ بن یمان اور ان کے والد:

حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں: بدر میں شریک ہونے سے ہمارے لئے صرف یہ رکاوٹ بنی کہ میں اور میرے والد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ملنے کے ارادہ سے آئے تو ہمیں کفارِ قریش نے پکڑ لیا اور کہا: آپ لوگ محمدؐ سے ملنے کا ارادہ رکھتے ہو؟ ہم نے کہا: ہم ان سے ملنے کا ارادہ نہیں رکھتے ہیں، بلکہ ہم مدینہ جانا چاہتے ہیں، انہوں نے ہم سے عہد وپیمان لیا کہ آپ لوگ صرف مدینہ جاؤگے اور محمدؐ کے ساتھ مل کر نہیں لڑوگے، جب ہم ان سے آگے بڑھے تو ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ہم نے آپؐ سے اس کا ذکر کیا کہ انہوں نے ہم سے کیا کہا اور ہم نے ان سے کیا کہا، اس لئے آپ کی کیا رائے ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہم ان کے مقابلہ میں اللہ سے مدد حاصل کریں گے اور ان کے عہد کو بھی پورا کریں گے، اس لئے ہم مدینہ کی طرف چل دیئے، یہی وہ بات تھی جس کی وجہ سے ہم بدر میں شریک نہ ہو سکے۔(مستدرک حاکم: 3/201)

یہ اس بات کی ایک روشن تصویر ہے کہ نبی کریم ﷺ عہد وپیمان کے ایفاء کے کس قدر پابند تھے اور عظیم مکارم اخلاق پر عمل کرنے کے لئے آپ ﷺ صحابہ کرام کی تربیت کرتے تھے، اگرچہ اس میں مسلمانوں کا نقصان ہی کیوں نہ ہو اور بعض افراد کے چھوٹ جانے کا خوف ہی کیوں نہ ہو۔

ب: حضرت اُسید بن حضیر:

جب رسول اللہ ﷺ بدر سے واپس مدینہ کی طرف تشریف لائے تو مقام روحاء میں سربرآوردہ لوگ آپؐ سے ملنے آئے اور آپ ﷺ کو فتح وکامیابی کی مبارک باد دینے لگے، حضرت اُسید بن حضیرؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! تمام تعریفیں اور شکر اس اللہ کے لئے ہے جس نے آپ کو فتح سے سرفراز کیا اور آپ کی آنکھوں کو ٹھنڈا کیا۔ واللہ، اے اللہ کے رسولؐ! میں بدر میں صرف اس لئے شریک نہیں ہو پایا اس لئے کہ میں نہیں سمجھتا تھا کہ آپ کی دشمن کے ساتھ مڈبھیڑ ہوگی، بلکہ میں سمجھتا تھا کہ آپ کے پیشِ نظر قافلۂ تجارت ہے، اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ کا سامنا دشمن سے ہے تو میں پیچھے نہ رہتا، یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''آپ نے سچ کہا''۔

۷: بدر میں میڈیا کی جنگ:

جنگ بدر کے موقع پر شعراء کا اہم رول رہا، میڈیا کی جنگ جاری تھی، حضرت حسان بن ثابتؓ نے مندرجہ ذیل اشعار کہے:

فما نخشى بحولِ اللّهِ قوماً   وإنْ كثروا وأجمعت الزحوفُ
إذا ما ألّبوا جمْعاً علينا   كفانا حدَّهم ربٌّ رءوف
سمونا يوم بدر بالعوالي   سراعًا ما تضعضعنا الحتوفُ
فلم تر عصبةً في النّاسِ أنكى   لمن عادوا إذا لقحت كشوف
ولكنّا توكّلنا وقلنا   مآثرنا ومعقلنا السيوفُ
لقيناهم بها لمّا سمونا   ونحن عصابةٌ وهم ألوفَ

ترجمہ: ”اللہ کی طاقت و نصرت پر اعتماد کرتے ہوئے ہم کسی قوم سے نہیں ڈرتے ہیں، اگرچہ ان کی تعداد زیادہ ہو اور انہوں نے حملہ کرنے کے لئے اپنے ساتھ ہم نوا شامل کر لئے ہوں۔ جب وہ ہمارے خلاف دوسرے لشکروں کو بھی جنگ کرنے کے لئے جمع کریں گے تو ان کی طاقت و قوت کے مقابلہ میں رؤف رب ہمارے لئے کافی ہو جائے گا۔ بدر کے دن تیز نیزوں کے ذریعہ ہم نے بہت جلد ان پر برتری حاصل کر لی، موت کا سامنا کرنے نے ہمارے عزائم کو متزلزل نہ کیا۔ لوگوں میں آج تک ان جیسی نقصان پہنچانے والی کوئی ایسی فوج نہیں دیکھی گئی ہے جو اپنے دشمنوں کو سب سے زیادہ نقصان پہنچاتی ہو جبکہ وہ میدانِ کارزار میں دوبدو ہو جائیں۔ لیکن ہم نے اللہ پر توکل و بھروسہ کر لیا اور ہم نے کہا کہ ہمارے کارہائے نمایاں اور ہماری پناہ ہماری تلواریں ہیں۔ جب ہم غالب ہوئے تو ہم نے انہی تلواروں کے ذریعہ ان پر وار کئے، ہم تو چند لوگ تھے جب کہ وہ ایک لشکرِ جرار تھے“۔

حضرت کعب بن مالکؓ نے فرمایا:

لَمَا حَامَتْ فَوَارِسُكُمْ بِبَدْرٍ   وَلَا صَبَرُوا بِهِ عِنْدَ اللِّقَاءِ
وَرَدْنَاهُ بِنُورِ اللّهِ يَجْلُو   دُجَى الظَّلْمَاءِ عَنَّا وَالْغِطَاءِ
رَسُولُ اللّهِ يَقْدُمُنَا بِأَمْرٍ   مِنْ أَمْرِ اللّهِ أُحْكِمَ بِالْقَضَاءِ
فَمَا ظَفَرَتْ فَوَارِسُكُمْ بِبَدْرٍ   وَمَا رَجَعُوا إِلَيْكُمْ بِالسَّوَاءِ
فَلَا تَعْجَلْ أَبَا سُفْيَانَ وَارْقُبْ   جِيَادَ الْخَيْلِ تَطْلُعُ مِنْ كَدَاءِ
بِنَصْرِ اللّهِ رُوحُ الْقُدْسِ فِيهَا   وَمِيكَالُ، فَيَا طِيبَ الْمَلَاءِ

ترجمہ: ”بدر میں تمہارے شہسوار مڈبھیڑ اور مقابلہ کے وقت نہ ہی اپنے جوہر دکھا پائے اور نہ ہی وہ ڈٹ کر مقابلہ کر سکے، ہم وہاں اللہ کے نور کے ساتھ وارد ہوئے، وہ نور ہم سے تاریکیوں اور پردوں کو ہٹا رہا تھا۔ اللہ کے رسول ﷺ کے ایک حکم کو نافذ کرنے کے لئے ہماری رہنمائی اور قیادت فرما رہے تھے، اس حکم کے بارے میں حتمی فیصلہ کر دیا گیا تھا۔ بدر میں نہ ہی تمہارے شہسواروں کو کامیابی مل سکی اور نہ ہی وہ تمہاری طرف اس حال میں واپس آسکے کہ مقابلہ برابر کا رہا ہو۔ لہذا اے ابو سفیان! جلدی مت کرو اور عالی نسل کے گھوڑوں

کا انتظار کرتے رہو جو کداء سے نمودار ہونے والے ہیں۔اس جنگ میں روح القدس حضرت جبرئیلؑ اور حضرت میکائیل اللہ کی مدد کے ساتھ شریک تھے، کیا کہنے اس لشکر کے جس کی قیادت ونصرت فرشتے کرتے کر رہے ہوں"۔(دیکھیں: سیرت ابن ہشام: 3/30)

نبی کریم ﷺ مسلمان شعراء کو مسلمانوں کی طرف سے دفاع کی ذمہ داری نبھانے اور اپنے اشعار کے ذریعہ اعداء کو خوفزدہ کرنے کی ترغیب دیتے تھے، عرب دنیا میں اس وقت اشعار کے ذریعہ میڈیا کی مؤثر جنگ کا طریقہ رائج تھا، اشعار کسی قوم کو عروج عطا کرتے تھے اور کسی کو زوال وپستی تک پہنچا دیتے تھے اور یہ جنگیں بھڑکانے اور ختم کرنے کا کام کرتے تھے۔(دیکھیں: التاریخ الاسلامی للحمیدی، 4/199)

میڈیا کی جنگ کا آغاز تو ہجرت کے وقت سے ہی ہو گیا تھا، البتہ اس کا پر زور اظہار بدر سے پہلے سرایا کی تحریک کے بعد سے ہوا، اور بدر کے بعد تو میڈیا کی جنگ کا پورا لاوا ہی پھوٹ پڑا، اس لئے کہ قریبی قبائل کو مرعوب کرنا فریقین کے اہداف میں سے ایک اہم ہدف تھا اور یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یثرب ومکہ کے درمیان شعری قصائد بہت جلد پھیل جاتے تھے اور مدّمقابل کی طرف سے بھی بہت جلد جواب آجاتا تھا، اور فتح وکامیابی کے وقت فاتح فریق کی طرف سے اشعار کی بھرمار کی جاتی تھی، جبکہ فریقِ ثانی کی طرف سے مرثیوں کی کثرت ہوتی تھی، اسلامی صف میں ماہرِ فن اور باکمال شعراء شامل تھے، جیسے حضرت کعب بن مالکؓ، حضرت عبداللہ بن رواحہؓ اور کفار کے لئے حضرت حسانؓ کے اشعار تیغ بُراں کا کام کرتے تھے۔(دیکھیں: المنہج الحرکی للسیرۃ النبویہ، ص: 354-355)

....

آٹھواں باب

غزوۂ بدر اور غزوۂ احد کے مابین واقع ہونے والے اہم واقعات

غزوۂ بدر کے فوراً بعد مسلمانوں کی عسکری ہیبت نے اپنا وسیع اور دوررس اثر دکھانا شروع کیا اور اس کا دائرہ پورے جزیرۃ العرب میں پھیل گیا، کمزور مشرکین نے خطرہ محسوس کرنا شروع کیا جبکہ طاقتور مشرکین کو اسلامی غلبہ اور انقلاب کا احساس ہو چلا، بہت سے لوگ اہلِ ایمان کی صف میں شامل ہونا شروع ہو گئے جس کی وجہ سے اسلام میں داخل ہونے والوں کا دائرہ وسیع تر ہوتا چلا گیا، بہت سے لوگوں نے یہ سوچا کہ وہ نفاق اور دھوکہ کے ساتھ اسلام میں داخل ہوں گے، اس طرح سے جدید ریاست کے سامنے مکر وفریب اور معاہدوں کی ایک نئی صورتحال پیدا ہو گئی لیکن اللہ کی تائید و نصرت کے ذریعہ بیدار مغز اسلامی افواج نے اعدائے اسلام کے ہر منصوبے کو ناکام بنا کر رکھ دیا۔ (دیکھیں: الاساس فی السنہ وفقہا، السیرۃ النبویہ، 1/512)

ا: بدر کے بعد اور اُحد سے پہلے رسول اللہ ﷺ کی قیادت میں ہونے والے غزوات:

ا: بنو سلیم میں غزوۂ ماء الکدر:

غزوۂ بدر سے مدینہ منورہ واپسی کے سات دنوں بعد نبی کریم ﷺ ایک عسکری مہم پر نکلے اور بنو سلیم کے علاقہ میں ''الکدر'' چشمہ کے پاس پہنچے، آپ ﷺ کا مقصد بنو سلیم پر حملہ کرنا تھا، البتہ وہاں پہنچنے کے بعد جنگ کی نوبت نہیں آئی، آپؐ نے تین راتوں تک وہاں قیام فرمایا اور اس کے بعد واپس مدینہ تشریف لے آئے، اس غزوہ کا سبب یہ تھا کہ بنو سلیم کے افراد جنگ بدر کے فوراً بعد مسلمانوں سے لڑنے اور ان پر حملہ کرنے کے لئے جمع ہوئے تھے، لیکن اللہ کے رسول ﷺ نے اچانک ان پر غیر متوقع ہنگامی حملہ کر دیا، جس کے نتیجہ میں بنو سلیم نے فرار کی راہ اختیار کر کے پہاڑوں کی چوٹیوں میں پناہ لے لی، اور ان کے اونٹ ایک چرواہے کے ساتھ وہیں رہ گئے، اس چرواہے کا نام 'یسار' تھا، اللہ کے رسولؐ نے چرواہے سمیت تمام اونٹوں کو اپنے ساتھ لے لیا اور مدینہ سے تین میل کے فاصلے پر مقام 'صرار' پر نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام کے درمیان اونٹ تقسیم کر دیئے جن کی تعداد پانچ سو تھی، ہر ایک کے حصے میں دو دو اونٹ آئے اور نبی کریم ﷺ کو ان کا خمس (پانچواں حصہ) ملا، اور 'یسار' بھی آپؐ ہی کے حصہ میں آیا لیکن آپؐ نے اس کو بعد میں آزاد کر دیا۔ (دیکھیں: التاریخ السیاسی والعسکری، ص277)

۲: غزوۂ سویق:

ابو سفیان مکہ سے دو سو جنگجو لے کر آیا اور اس نے بالائی راستہ اختیار کیا، یہاں تک کہ رات میں بنو نضیر کے علاقہ میں آکر پڑاؤ ڈالا، بنو نضیر کے سردار سلام بن مشکم نے ان کا استقبال کیا، ان کو کھلایا پلایا اور ان کو مسلمانوں کے اسرار سے واقف کرایا اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لئے حکمتِ عملی پر غور وخوض کیا، اس کے بعد ابو سفیان نے مدینہ کے اطراف میں 'حرّۂ واقم' کے قریب العریض وادی کے ایک حصہ پر حملہ کر دیا، وہاں دو لوگوں کو قتل کیا، کھجوروں کے باغات کو آگ لگا دی اور مکہ کی طرف نکل کر بھاگ گیا، اللہ کے رسول ﷺ نے مہاجرین وانصار کے دو سو افراد کے ساتھ اس کا تعاقب کیا، لیکن آپؐ کو وہ ہاتھ نہیں لگے، اس لئے کہ ابو سفیان اور اس کے لوگوں نے بھاگنے

میں بہت جلدی کی اور اپنا بوجھ ہلکا کرتے چلے گئے، اوران کے ساتھ بطور توشہ جو ستو تھا اس کو پھینکتے چلے گئے، مسلمان ستو کے ان تھیلوں کے پاس سے گزرتے تو ان کو اٹھا لیتے، یہاں تک کہ بہت سا ستو لے کر وہ واپس پہنچے، اسی لئے اس غزوہ کو غزوۂ سویق کہا گیا۔ (عربی میں ستو کو سویق کہتے ہیں) اور اللہ کے رسول ﷺ مدینہ منورہ واپس تشریف لے آئے جبکہ پانچ دن آپؐ مدینہ سے باہر رہے اور جنگ کی نوبت نہیں آئی۔ (سیرت ابن ہشام: 3/51، التاریخ السیاسی والعسکری، ص278-279)

۳: غزوۂ ذی اُمر:

اسلامی انٹیلیجنس کے لوگوں کی طرف سے خبریں موصول ہوئیں کہ قبیلہ ثعلبہ اور قبیلہ محارب کے لوگ 'ذی اُمر' میں دعثور بن حارث المحاربی کی قیادت میں جمع ہوئے ہیں، وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جنگ اور مدینہ منورہ پر حملہ کرنا چاہتے ہیں، لہذا نبی کریم ﷺ نے مدینہ میں حضرت عثمان بن عفانؓ کو امیر مقرر فرمایا اور ساڑھے چار سو سوار اور پیدل مسلمانوں کے ساتھ عسکری مہم پر نکل پڑے، مقام 'ذی القصہ' میں ان کی ملاقات ایک شخص کے ساتھ ہوئی جس کا نام 'جُبار' تھا اور اس کا تعلق بنو ثعلبہ سے تھا۔ اس کے پاس اپنی قوم سے متعلق معلومات تھیں اور وہ معلومات اس نے رسول اللہ ﷺ کی کو دیں، اس نے اسلام قبول کیا اور حضرت بلالؓ کے ساتھ رہا تا کہ وہ دین میں تفقہ حاصل کرے۔ (دیکھیں: البدایہ والنہایہ 4/3 التاریخ السیاسی والعسکری، ص:279)

بنو ثعلبہ قبیلہ ٔ محارب کے مشرکین جلد ہی پہاڑوں کی چوٹیوں پر بھاگ گئے جب انہوں نے سنا کہ مسلمان مدینہ سے نکل چکے ہیں، اللہ کے رسول ﷺ نجد میں تقریبا ایک ماہ رہے اور اس مدت میں کسی طرف سے مڈھیڑ کی نوبت نہیں آئی اور اس کے بعد آپؐ مدینہ واپس تشریف لے آئے۔ (دیکھیں: التاریخ السیاسی والعسکری: 279)

اس غزوہ میں دعثور بن حارث نے اسلام قبول کیا جو کہ ایک قابل اطاعت سردار تھا، اس کے سامنے رسول ﷺ کے ذریعہ ایک معجزہ کا ظہور ہوا، چنانچہ اس غزوہ میں بہت زیادہ بارش ہوئی جس کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کے کپڑے بھیگ گئے، اس لئے آپؐ ایک درخت کے نیچے ٹھہرے، آپؐ نے اپنے کپڑے سکھانے کے لئے پھیلائے، اسی دوران دعثور نے رسول اللہ ﷺ کو تنہا پا کر اپنی تلوار سے آپؐ پر وار کرنا چاہا اور اس نے کہا: اے محمد! آج آپ کو مجھ سے کون بچائے گا؟ آپؐ نے فرمایا: اللہ! حضرت جبرئیلؑ نے اس کو سینے سے دھکیلا اور اس کے ہاتھ سے تلوار گر گئی اور تلوار رسول اللہ ﷺ نے پکڑ لی، آپ ﷺ نے پوچھا: تمہیں مجھ سے کون بچائے گا؟ اس نے کہا: کوئی نہیں! میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اللہ کی قسم! میں آپ کے خلاف کبھی صف آرائی نہیں کروں گا، اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اس کو تلوار دے دی، جب وہ اپنے ساتھیوں کے پاس واپس گیا تو انہوں نے کہا: تمہارا بُرا ہو! تمہیں کیا ہو گیا؟ اس نے کہا: میں نے ایک لمبے انسان کو دیکھا، اس نے مجھے سینے سے دھکیلا اور میں پیٹھ کے بَل گر پڑا، مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ فرشتہ ہے اور میں نے گواہی دی کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، اللہ کی قسم! میں کبھی ان کے خلاف صف آرائی نہیں کروں گا۔ اس کے بعد وہ اپنی قوم کو اسلام کی دعوت دینے لگے۔ (الدلائل للبیہقی: 3/168-169، البدایہ والنہایہ: 4/3)

اسی واقعہ کے پسِ منظر میں اللہ تعالیٰ کا یہ قول نازل ہوا: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱذْكُرُوا۟ نِعْمَتَ ٱللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ هَمَّ قَوْمٌ أَن يَبْسُطُوٓا۟ إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنكُمْ ۖ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ ۚ وَعَلَى ٱللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ ٱلْمُؤْمِنُونَ﴾ ترجمہ:" اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کے اُس احسان کو یاد کرو جو اُس نے (ابھی حال میں) تم پر کیا ہے، جبکہ ایک گروہ نے تم پر دست درازی کا ارادہ کر لیا تھا مگر اللہ نے اُن کے ہاتھ تم پر اٹھنے سے روک دیئے، اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو، ایمان رکھنے والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے"۔(سورۃ المائدہ: 11)

۴: غزوۂ بُحران:

یہ غزوہ سن تین ہجری کے ماہ جمادی الاولیٰ میں پیش آیا، نبی کریم ﷺ تین سو مسلمانوں کے ساتھ نکلے یہاں تک کہ مکہ اور مدینہ کے درمیان 'بُحران' کے مقام تک پہنچ گئے، آپ ﷺ کا ارادہ بنو سلیم کے ساتھ قتال کرنے کا تھا، آپ ؐ نے دیکھا کہ وہ سب اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے ہیں، اس لئے آپ ﷺ وہاں سے واپس تشریف لے آئے، آپ ؐ نے دس راتیں مدینہ سے باہر گزاریں اور اس کے بعد مدینہ واپس آ گئے۔(دیکھیں: المجتمع المدنی، للعمری، ص: 61التاریخ السیاسی والعسکری، ص: 280)

ان غزوات میں قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ اسلامی قیادت کے اندر دشمن کی حرکات پر نظر رکھنے کی طاقت، منصوبوں اور امکانات ووسائل کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کس قدر قدرت تھی، اور ان سب چیزوں کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی ریاست کے خلاف صف آرا ہونے والی ان مخالف طاقتوں کا قلع قمع کیا جائے، قبل اس کے کہ ان مخالف قبائل کی کوششیں مزید تیز ہو جائیں اور وہ مدینہ کے لئے ایک خطرہ بن جائیں، یہ غزوات ان دور دراز صحراؤں میں صحابہ کرام کے لئے تربیتی ٹریننگ کورسز کی طرح تھے اور صحابہ کرام کے دستوں کو نبی کریم ﷺ کی قیادت کا شرف حاصل تھا، یہ عملی تربیت اور جہادی کورسز مسلسل جاری تھے اور وہ پانچ دنوں سے ایک ماہ تک جاری رہتے تھے، ان میں اجتماعی طور پر زندگی گزاری جاتی تھی اور اسلامی فوج کی سمع وطاعت کے بارے میں اور عسکری تربیت ہوتی تھی اور ان کو جدید تجربات حاصل ہوتے رہتے تھے جو باطل کا خاتمہ کرنے اور حق کو قوی بنانے میں ان کے لئے معاون بنتے تھے۔

یقیناً منہجِ نبوی کے ذریعہ میدانِ جہاد کے لئے صحابہ کرام کی تربیت کا اہتمام کیا جاتا تھا، ساتھ ہی ساتھ مسجد نبوی میں بھی نفوس کو صیقل کرنے، عقلوں کو منور کرنے اور اخلاق کو مہذب بنانے کا کام انجام دیا جاتا تھا، اس لئے کہ ایک عظیم مربی ﷺ وہاں موجود تھا، جس کی تعلیمات پوری سوسائٹی میں عام ہو رہی تھیں، منہجِ نبوی میں مسجد کے تربیتی پروگرام اور مسلسل عسکری تربیت کے کورسز دونوں شامل تھے تاکہ جدید معاشرہ قوی تر ہو سکے، اس کی صفوں میں اتحاد پیدا ہو اور نئے تجربات حاصل کر کے اسلام کی نشر واشاعت کا کام ہر چہار سو انجام دیا جائے۔(دیکھیں: التربیۃ القیادیۃ: 3/118)

۵: القَرَدَہ کی جانب سریہ زید بن حارثہ:

بدر میں ہزیمت کے بعد مشرکینِ مکہ تجارتی غرض سے شام جانے کے لئے دوسرے راستے تلاش کرنے لگے، بعض نے مشورہ دیا کہ عراق کا راستہ اختیار کیا جائے اور عملاً انہوں نے اسی راستے کو اختیار کیا، کئی تاجر اس تجارتی قافلے میں نکلے، ان میں ابو سفیان بن حرب، صفوان

بن امیہ اور حویطب بن عبد العزی تھے، ان کے ساتھ چاندی اور دیگر سامانِ تجارت تھا جس کی قیمت ایک لاکھ درہم کے بقدر تھی، اللہ کے رسول ﷺ کو اسلامی انٹیلیجنس کے ایک فرد جن کا نام سُلیط بن نعمانؓ تھا کے ذریعہ اس کی اطلاع مل گئی، آپ ﷺ نے حضرت زید بن حارثہؓ کی قیادت میں سو شہسوار قافلہ کے ساتھ تعرض کرنے کے لئے روانہ کئے، حضرت زیدؓ نے ان کو ایک چشمہ کے پاس آلیا، اس چشمہ کا نام ' القردہ ' تھا، اس قافلہ کے تمام افراد ڈر کر بھاگ گئے اور مسلمانوں کو قافلہ کا پورا سامان مل گیا اور ان کے رہبر فرات بن 'حیان ' کو گرفتار کر لیا جس نے نبی کریم ﷺ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا، اسلامی لشکر مدینہ منورہ واپس آگیا، اللہ کے رسول ﷺ نے اس کا خُمس نکال کر باقی مال غنیمت کو اس سریہ میں شامل صحابہ کرام کے مابین تقسیم کر دیا۔ (دیکھیں: سیرت ابن ہشام: 3/56)

۲: غزوۂ بنو قینقاع:

امام زہریؒ نے ذکر کیا ہے کہ یہ غزوہ سن دو ہجری میں ہوا، واقدی اور ابن سعد کا کہنا یہ ہے کہ وہ سن دو ہجری کے ماہ شوال کے نصف میں ہفتہ کے روز پیش آیا، مغازیٔ رسول ﷺ اور سیرت لکھنے والوں کی اکثریت کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ غزوۂ بدر کے بعد اس وقت پیش آیا جب کہ بنو قینقاع کے یہود نے اس معاہدہ کی پابندی نہیں کی جو رسول اللہ ﷺ نے ان کے ساتھ طے کیا تھا، انہوں نے اس میں ذکر کردہ دفعات کی پاسداری نہیں کی اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف معاندانہ اور مخالفانہ رویہ اختیار کیا، جب بدر میں مسلمانوں کو فتح و نصرت ملی تو انہوں نے غصہ، ناراضگی اور حسد کا اظہار کیا اور اعلانیہ طور پر مسلمانوں کے ساتھ عداوت و دشمنی شروع کی۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویہ الصحیحۃ 1/299، موسوعۃ نضرۃ النعیم: 1/269)

نبی کریم ﷺ نے ان کو مدینہ میں ان کے بازار میں جمع کیا اور ان کو نصیحت کی، ان کو اسلام کی دعوت دی اور ان کو ڈرایا کہ کہیں ان کو بھی اسی انجام کا سامنا نہ کرنا پڑے جس کا سامنا قریش کو بدر میں کرنا پڑا، لیکن انہوں نے رسول ﷺ کو چیلنج اور دھمکی کے ذریعہ جواب دیا، حالانکہ معاہدہ کے مطابق ان کے لئے رسول ﷺ کے ماتحت رہتے ہوئے سمع و طاعت کرنا ضروری تھا، انہوں نے اس طرح کی دھمکی آمیز باتیں کیں کہ: اے محمدؐ! آپ کو اپنے بارے میں یہ دھوکہ نہ ہو کہ آپ نے قریش کے چند لونڈوں کو قتل کیا جو ناتجربہ کار اور اناڑی تھے اور وہ قتال سے ناواقف تھے، اگر آپ ہمارے ساتھ جنگ کروگے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ہم ہی میدانِ کارزار کے لوگ ہیں اور آپ کا ہماری جیسی کسی قوم کے ساتھ پالا نہیں پڑا ہے۔ (دیکھیں: الیہود فی السنۃ المطہرہ: 1/276)

اس طرح سے صورتحال بگڑتی ہی چلی گئی اور ان کے جواب سے کہیں بھی ایسا نہیں لگتا تھا کہ وہ معاہدہ کی پابندی اور احترام کریں گے بلکہ معاملہ بالکل اس کے برعکس تھا، انہوں نے معاندانہ اور مخالفانہ رویہ اختیار کیا، چیلنج اور دھمکی آمیز لہجہ اختیار کیا اور جنگ و جدال کے لئے تیاری کا اظہار کیا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں یہ آیات نازل فرمائیں: ﴿قُل لِّلَّذِينَ كَفَرُواْ سَتُغۡلَبُونَ وَتُحۡشَرُونَ إِلَىٰ جَهَنَّمَۖ وَبِئۡسَ ٱلۡمِهَادُ ۝١٢ قَدۡ كَانَ لَكُمۡ ءَايَةٞ فِي فِئَتَيۡنِ ٱلۡتَقَتَاۖ فِئَةٞ تُقَٰتِلُ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ وَأُخۡرَىٰ كَافِرَةٞ يَرَوۡنَهُم مِّثۡلَيۡهِمۡ رَأۡيَ ٱلۡعَيۡنِۚ وَٱللَّهُ يُؤَيِّدُ بِنَصۡرِهِۦ مَن يَشَآءُۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبۡرَةٗ لِّأُوْلِي ٱلۡأَبۡصَٰرِ﴾ ترجمہ: "پس اے محمدؐ! جن

لوگوں نے تمہاری دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے، اُن سے کہہ دو کہ قریب ہے وہ وقت، جب تم مغلوب ہو جاؤ گے اور جہنم کی طرف ہانکے جاؤ گے اور جہنم بڑا ہی برا ٹھکانا ہے۔ تمہارے لئے اُن دو گروہوں میں ایک نشان عبرت تھا، جو (بدر میں) ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئے، ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا گروہ کافر تھا، دیکھنے والے بچشم سر دیکھ رہے تھے کہ کافر گروہ مومن گروہ سے دوچند ہے مگر (نتیجے نے ثابت کر دیا کہ) اللہ اپنی فتح و نصرت سے جس کو چاہتا ہے، مدد دیتا ہے، دیدۂ بینا رکھنے والوں کے لئے اس میں بڑا سبق پوشیدہ ہے"۔ (سورۃ آل عمران: 12-13)

ا: غزوۂ بنو قینقاع کے اصل اسباب:

بدر میں جب مسلمانوں کو فتح ملی اور رسول اللہ ﷺ نے یہود کو سمجھایا - جیسے کہ اوپر گزر چکا ہے - تو بنو قینقاع نے اندر اندر سے یہ بات طے کر لی کہ مسلمانوں کے ساتھ کئے ہوئے معاہدہ کو توڑنا ہے اور وہ مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لئے موقع تلاش کرتے رہے، یہاں تک کہ انہوں نے ایک حقیر حرکت کو اپنے حسد کی آگ بجھانے کے لئے استعمال کیا، ہوا یہ کہ ایک عرب خاتون اپنا سامانِ تجارت لے کر آئی اور بنو قینقاع کے بازار میں اس کو بیچا، وہ ایک یہودی سنار کے پاس بیٹھی ہوئی تھی، وہاں بیٹھے ہوئے یہودی اس سے چہرے سے نقاب اٹھانے کا مطالبہ کرنے لگے لیکن اس نے ایسا کرنے سے انکار کیا، اس سنار نے اس کی چادر کے کنارے کو کسی چیز سے باندھ دیا اور جب وہ وہاں سے اٹھی تو اس کا نقاب اتر گیا، وہاں بیٹھے سب ٹھٹھا مارنے لگے، وہ چیخی تو وہاں موجود ایک مسلمان شخص نے سنار پر حملہ کر کے اس کو مار دیا، وہ سنار یہودی تھا، یہود نے مسلمان پر حملہ کر دیا اور اس کو شہید کر دیا، اس مسلمان کے گھر والوں نے مسلمان سے یہود کے مقابلہ میں استغاثہ کیا، سب مسلمان اس کی وجہ سے برانگیختہ ہوئے اور ان کے درمیان اور بنو قینقاع کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ (دیکھیں: سیرت ابن ہشام: 3/54)

جب اللہ کے رسول ﷺ کو اس کا علم ہوا تو آپؐ مہاجرین و انصار پر مشتمل ایک لشکر لے کر ان کی جانب روانہ ہوئے اور یہ سَن دو (۲) ہجری ماہِ شوال کے نصف بروز ہفتہ کی بات ہے، مسلمانوں کا پرچم اس دن حضرت حمزہ بن عبد المطلبؓ کے پاس تھا، آپ ﷺ نے مدینہ میں اپنا جانشین حضرت اُبولبابہ بن عبد المنذر العمری کو بنایا، ان کا نام بشیر تھا، جب اللہ کے رسول ﷺ ان کے پاس گئے تو ان کے ساتھ کئے ہوئے معاہدہ کو کالعدم کر دیا جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اس کا حکم دیا تھا: ﴿وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِن قَوْمٍ خِيَانَةً فَانۢبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَآءٍ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يُحِبُّ ٱلْخَآئِنِينَ﴾ ترجمہ: "اور اگر کبھی تمہیں کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو تو اس کے معاہدہ کو علانیہ اس کے آگے پھینک دو، یقیناً اللہ خائنوں کو پسند نہیں کرتا"۔ (سورۃ الانفال: 58)

۲: بنو قینقاع کا محاصرہ:

جب یہود کو آپ ﷺ کی آمد کا علم ہوا تو وہ اپنے قلعوں میں محفوظ ہو گئے، آپؐ نے پندرہ راتوں تک ان کا محاصرہ جاری رکھا، جیسے کہ ابن ہشام نے ذکر کیا ہے، محاصرہ اس وقت تک جاری رہا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈالا اور وہ رسول اللہ ﷺ کا فیصلہ ماننے کے لئے مجبور ہو گئے، اللہ کے رسول ﷺ نے اچانک ان کا محاصرہ کر کے ان کو حیران و پریشان کر دیا، ان سے ہر قسم کی امداد کے

ذرائع منقطع کر دیئے، ان کی نقل و حرکت کو معطل کر دیا اور وہ ایک جیل میں بند ہو کر زندگی گزارنے لگے، جس کی وجہ سے وہ بالآخر مقابلہ آرائی کے بارے میں بھی ناامید ہو گئے اور ان کا پیمانۂ صبر بھی لبریز ہو گیا، وہی لوگ رسول اللہ ﷺ کو دھمکی دے رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ وہ مشرکین قریش سے زیادہ طاقتور اور سخت جان لوگ ہیں، یہی لوگ اب رسول اللہ ﷺ کا فیصلہ ماننے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں، اللہ کے رسول ﷺ نے ان کو باندھنے کا حکم دیا، ان کے ہاتھ پیچھے کی طرف باندھے دیئے گئے اور رسول اللہ ﷺ نے ان کو باندھنے کی ذمہ داری حضرت منذر بن قدامی سلمی اُوسی کو دی۔ (دیکھیں: الصراع مع الیہود، ابو فارس 1/14، الیہود فی السنۃ المطہرۃ: 1/280)

۳: بنو قینقاع کے یہود کا انجام:

رئیس المنافقین ابن سلول نے کوشش کی کہ اپنے حلفاء کو رہا کرائے، وہ جب ان کے پاس سے گزرا تو اس نے کہا: ان کو کھول دو! منذرؓ نے کہا: کیا تم ایسے لوگوں کو کھولو گے جن کو رسول اللہ ﷺ نے باندھا ہے؟! اللہ کی قسم! جو بھی ان کو کھولے گا میں اس کی گردن تن سے جدا کر دوں گا۔ اس لئے عبداللہ بن اُبی بن سلول مجبور ہوا کہ نبی کریم ﷺ سے ان قیدیوں کی رہائی کا حکم جاری کروائے، وہ اللہ کے رسول ﷺ کے پاس آیا اور کہا: اے محمد! میرے حلفاء کے ساتھ حسنِ سلوک کیجئے، وہ خزرج کے حلیف تھے، اللہ کے رسول ﷺ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے کہا: اے محمدؐ! میرے حلفاء کے ساتھ حسنِ سلوک کیجئے۔ آپ ﷺ نے پھر اس سے اعراض کیا۔ ابن اُبی نے اپنا ہاتھ رسول اللہ ﷺ کی ذرہ کی جیب میں ڈالا، رسول اللہ ﷺ نے اس سے کہا: مجھے چھوڑ دو! اللہ کے رسول ﷺ غضبناک ہو گئے یہاں تک کہ صحابہ کرام نے آپؐ کے چہرے پر غصہ کے آثار دیکھے، اس کے بعد آپؐ نے فرمایا: تمہارا برُا ہو! مجھے چھوڑ دو! اس نے کہا: نہیں، واللہ! میں آپ کو اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا یہاں تک کہ آپ میرے حلفاء کے ساتھ حسنِ سلوک نہ کریں، چار سو بغیر ذرہ کے اور تین سو ذرہ پوش افراد نے مجھے ہر دشمن سے بچایا اور آپ ان سب کو ایک ہی صبح میں فصل کی طرح کاٹ کے رکھ دیں گے۔ واللہ! میں ایک ایسا شخص ہوں مجھے خطرات کا ڈر ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: جاؤ، وہ تمہاری وجہ سے آزاد ہیں۔ (دیکھیں: التاریخ الاسلامی للحمیدی: 5/32، تاریخ طبری: 2/480، مغازی للواقدی: 1/177، الدلائل للبیہقی: 3/174، سیرت ابن ہشام: 3/51، الیہود فی السنۃ المطہرۃ: 1/281)

اللہ کے رسول ﷺ نے ان کو چھوڑ دیا، اور اس کے بعد ان کو جلا وطن کرنے کا حکم دیا، ان کے پاس جو کچھ مال تھا وہ رسول اللہ ﷺ کو اور مسلمانوں کو بطورِ مالِ غنیمت حاصل ہوا اور محمد بن مسلمہؓ کو ان کا مال جمع کرنے اور اس کو شمار کرنے کی ذمہ داری دی گئی، ابن اُبی بن سلول نے کوشش کی کہ یہود بنو قینقاع کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے بات کرے تاکہ آپؐ ان کو انہی کے گھروں میں رہنے دیں، اس نے رسول اللہ ﷺ کے دروازہ پر حضرت عُویم بن ساعدہ انصاری اُوسی کو پایا، عویمؓ نے اسے واپس کر دیا اور کہا: آپ اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتے ہو جب تک کہ رسول اللہ ﷺ آپ کو اجازت نہ دے دیں، ابن اُبی نے انہیں دھکا دیا، حضرت عویمؓ نے اس کو سختی سے دبوچا یہاں تک کہ ابن اُبی کے چہرے کو دیوار سے ایسی رگڑ لگی کہ خون بہنے لگا۔ (التاریخ الاسلامی، الحمیدی: 5/30)

اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ابن سلول کے ساتھ سیاسی اعتبار سے کیسے فقہ و بصیرت کے ساتھ معاملہ کیا، آپ ﷺ نے اس کے مطالبے کو تسلیم کرلیا کہ شاید یہ موقف اس کے دل کی کدورت کو صاف کردے، اس پر پڑے پردوں کو ہٹادے اور اس کو ہدایت نصیب ہو جائے اور پھر اس کے پیروکار بھی اس کی وجہ سے ہدایت حاصل کرلیں جس کی وجہ سے اسلامی صف مضبوط و مستحکم ہو جائے گی اور اعدائے اسلام کی سازشوں کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہوگا۔(دیکھیں: المنہج الحرکی للسیرۃ النبویہ، الغضبان، ص: 247)

اس کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے وہ یہ کہ رسول ﷺ نے اہلِ ایمان میں پیدا ہونے والے ایک متوقع فتنہ کو دبادیا، اس لئے کہ بعض انصار نئے نئے مسلمان ہوئے تھے اور رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی اپنی شہرت کی وجہ سے ان کو متاثر کر سکتا تھا، اس لئے اللہ کے رسول ﷺ نے اس کے ساتھ مدارات کا طرزِ عمل اختیار فرمایا، اس کی بدسلوکی کو برداشت کیا تاکہ انتشار اور فتنہ کو ختم کیا جائے، اور اس کے طرزِ عمل اور تصرفات کے ذریعہ اس کی حقیقت بھی بے نقاب ہو جائے اور اس طرح سے لوگ اس سے دور ہوں گے اور اس کے لئے نرم گوشہ نہیں رکھیں گے، اس طرزِ عمل اور اسلوب کے ذریعہ زبردست کامیابی ملی، چنانچہ تمام لوگوں کے سامنے ابن سلول کی حقیقت واضح ہو گئی، یہاں تک کہ اس کے قریب ترین بیٹے عبداللہ کے سامنے بھی وہ بے نقاب ہو گیا، چنانچہ اس کے بعد جب وہ بات کرتا تھا تو صحابہ اس کو خاموش کردیتے تھے اور اس کی گفتگو کو پسند نہیں کرتے تھے، بلکہ اس کی جان کے درپے ہو گئے، جیسے کہ آئندہ صفات میں اس کی تفصیل آرہی ہے۔(دیکھیں: الصراع مع الیہود، ابوفارس: 1/148)

۴: حضرت عبادہ بن صامتؓ کا یہود سے اعلانِ براءت:

جب بنو قینقاع نے عہد شکنی کی تو بنو عوف سے تعلق رکھنے والے حضرت عبادہ بن صامتؓ رسول اللہ ﷺ کے پاس تشریف لے گئے، وہ بنو قینقاع کے اسی طرح حلیف تھے جس طرح عبداللہ بن اُبی ان کا حلیف تھا، حضرت عبادہؓ نے آپ ﷺ کے سامنے ان (بنو قینقاع) سے براءت کا اعلان کردیا اور ان کے عہد کے بجائے اللہ اور اس کے رسول کو ترجیح دی اور فرمایا: اے اللہ کے رسولؐ! میں اللہ، اس کے رسول اور اہلِ ایمان کے ساتھ ولایت و تعلق رکھتا ہوں اور ان کفار کے معاہدہ اور ان کی ولایت سے براءت کا اعلان کرتا ہوں۔

جب بنو قینقاع کو جلاوطن کرنا طے ہو گیا تو اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت عبادہ بن صامتؓ کو انہیں جلاوطن کرنے کا حکم دیا، بنو قینقاع ان سے کہنے لگے: اے اُبوالولید! اُوس اور خزرج کی آپسی صورتحال کے باوجود آپ نے ہمارے ساتھ ایسا کیا جبکہ ہم آپ کے حلیف ہیں! حضرت عبادہؓ نے ان سے کہا: جب تم نے جنگ کی تو میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! میں ان سے اور ان کے عہد سے اعلانِ براءت کرتا ہوں۔ ابن اُبی اور عبادہ بن صامتؓ حلیف ہونے کے اعتبار سے ایک ہی مقام و مرتبہ رکھتے تھے، عبداللہ بن اُبی کہنے لگا: تم نے اپنے حلیفوں کے معاہدہ سے علیحدگی اختیار کرلی؟ تم پر ان کے احسانات کا یہ بدلہ نہیں ہے، وہ ان کے کارنامے شمار کرانے لگا، حضرت عبادہؓ نے کہا: اے ابوالحُباب: اب دل بدل گئے ہیں اور اسلام نے ماضی کے عہد وپیمان ختم کردیئے ہیں، واللہ! تم نے ایک ایسا سہارا اختیار کیا ہے جس کا انجام کل دیکھ لوگے، قینقاع کے لوگوں نے کہا: اے محمدؐ! ہمارا لوگوں کے پاس قرض ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جلدی کرو اور باقی چھوڑدو۔ حضرت عبادہؓ نے ان کو جلاوطن اور نکالنا شروع کردیا، انہوں نے مہلت کا مطالبہ کیا تو

حضرت عبادہؓ نے کہا: دن کی ایک گھڑی کی بھی مہلت نہیں ملے گی، آپ کے پاس تین دن ہیں، اس پر مزید کچھ اضافہ نہیں ہوگا، یہ رسول اللہ ﷺ کا حکم ہے اور اگر اختیار میرے پاس ہوتا تو میں تمہیں ذرہ برابر مہلت نہ دیتا۔ جب تین دن گزر گئے تو وہ ان کے پیچھے پیچھے نکلے یہاں تک کہ انہوں نے شام کی راہ لی اور وہ ان سے کہہ رہے تھے: دور دراز علاقہ میں دور چلے جاؤ، دور چلے جاؤ، وہ مقام 'ذُباب' کے پیچھے تک گئے، اس کے بعد واپس آگئے اور بنو قینقاع شامی علاقے 'اَذرعات' چلے گئے۔ (الیہود السنۃ المطہرۃ: 1/282)

اس طرح سے بنو قینقاع مدینہ منورہ سے ذلیل و خوار ہو کر نکلے، ان کو اپنا اسلحہ وہیں چھوڑنا پڑا اور اپنا مال بھی وہیں چھوڑنا پڑا جو مسلمانوں کے لئے مالِ غنیمت بن گیا حالانکہ وہ مدینہ کے یہود میں سب سے زیادہ بہادر، سب سے زیادہ طاقتور، اور سب سے زیادہ اسباب و وسائل اور افرادی قوت رکھتے تھے، اسی لئے دیگر یہودی قبائل نے بھی اس عبرت ناک انجام کے بعد ایک عرصہ تک خاموش اور پر سکون رہنے میں عافیت سمجھی اور ان کے دلوں پر رعب طاری ہو گیا اور ان کی طاقت و قوت کی تلوار کند ہو کر رہ گئی۔ (الصراع مع الیہود، ابو فارس، 1/149)

۵: یہود کے ساتھ ابن سلول کی دوستی اور حضرت عبادہ بن صامتؓ کے اعلانِ براءت کے بارے میں آیات:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَتَّخِذُوا۟ ٱلْيَهُودَ وَٱلنَّصَـٰرَىٰٓ أَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَإِنَّهُۥ مِنْهُمْ ۗ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يَهْدِى ٱلْقَوْمَ ٱلظَّـٰلِمِينَ ﴿٥١﴾ فَتَرَى ٱلَّذِينَ فِى قُلُوبِهِم مَّرَضٌ يُسَـٰرِعُونَ فِيهِمْ يَقُولُونَ نَخْشَىٰٓ أَن تُصِيبَنَا دَآئِرَةٌ ۚ فَعَسَى ٱللَّهُ أَن يَأْتِىَ بِٱلْفَتْحِ أَوْ أَمْرٍ مِّنْ عِندِهِۦ فَيُصْبِحُوا۟ عَلَىٰ مَآ أَسَرُّوا۟ فِىٓ أَنفُسِهِمْ نَـٰدِمِينَ ﴿٥٢﴾ وَيَقُولُ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ أَهَـٰٓؤُلَآءِ ٱلَّذِينَ أَقْسَمُوا۟ بِٱللَّهِ جَهْدَ أَيْمَـٰنِهِمْ ۙ إِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ۚ حَبِطَتْ أَعْمَـٰلُهُمْ فَأَصْبَحُوا۟ خَـٰسِرِينَ ﴿٥٣﴾ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ مَن يَرْتَدَّ مِنكُمْ عَن دِينِهِۦ فَسَوْفَ يَأْتِى ٱللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُۥٓ أَذِلَّةٍ عَلَى ٱلْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى ٱلْكَـٰفِرِينَ يُجَـٰهِدُونَ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ۚ ذَٰلِكَ فَضْلُ ٱللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَآءُ ۚ وَٱللَّهُ وَٰسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٥٤﴾ إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ ٱللَّهُ وَرَسُولُهُۥ وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱلَّذِينَ يُقِيمُونَ ٱلصَّلَوٰةَ وَيُؤْتُونَ ٱلزَّكَوٰةَ وَهُمْ رَٰكِعُونَ ﴿٥٥﴾ وَمَن يَتَوَلَّ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ فَإِنَّ حِزْبَ ٱللَّهِ هُمُ ٱلْغَـٰلِبُونَ ﴿٥٦﴾﴾ ترجمہ: "اے ایمان والو! یہود اور نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ، وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں، اور جو کوئی تم میں سے ان کے ساتھ دوستی کرے تو وہ انہیں سے ہے، اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں کرتا، پھر تو ان لوگوں کو دیکھے گا جن کے دلوں میں بیماری ہے کہ ان (مخالفین) میں دوڑ کر جا ملتے ہیں، یہ کہتے ہوئے کہ ہمیں ڈر ہے کہ ہم پر زمانے کی گردش نہ آجائے، سو قریب ہے کہ اللہ جلدی فتح ظاہر فرمادے یا کوئی اور حکم اپنے ہاں سے ظاہر کرے پھر یہ اپنے دل کی چھپی ہوئی بات پر شرمندہ ہوں گے۔ اور مسلمان کہتے ہیں کہ کیا یہ وہی لوگ ہیں جو اللہ کے نام کی پکی قسمیں کھاتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں، ان کے اعمال برباد ہو گئے پھر وہ نقصان اٹھانے والے ہو گئے۔

اے ایمان والو! جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا تو عنقریب اللہ ایسی قوم کو لائے گا کہ جن کو اللہ چاہتا ہے اور وہ اس کو چاہتے ہیں، مسلمانوں پر نرم دل ہوں گے اور کافروں پر زبردست، اللہ کی راہ میں لڑیں گے اور کسی کی ملامت سے نہیں ڈریں گے، یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہے دیتا ہے، اور اللہ کشائش والا جاننے والا ہے۔ تمہارا دوست تو اللہ ہے اور اس کا رسول ہے اور ایمان دار لوگ ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوۃ دیتے ہیں اور وہ عاجزی کرنے والے ہیں۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول اور ایمان داروں کو دوست رکھے تو (مطمئن رہے کہ) اللہ کی جو جماعت ہے وہی غالب ہونے والی ہے"۔ (سورۃ المائدۃ: 51-56)

ان آیات کی تفسیر کرتے ہوئے ابن عطیہؒ فرماتے ہیں: جب غزوۂ بدر اپنے اختتام کو پہنچ گیا اور بنوقینقاع کا معاملہ پیش آیا تو رسول اللہ ﷺ نے ان کو قتل کرنے کا ارادہ فرمایا، لیکن ان کے دفاع میں عبداللہ بن ابی بن سلول جو ان کا حلیف تھا کھڑا ہو گیا، حضرت عبادہ بن صامتؓ بھی اسی طرح ان کے حلیف تھے جس طرح کہ عبداللہ ان کا حلیف تھا، لیکن جب حضرت عبادہؓ نے رسول اللہ ﷺ کا موقف اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ یہود کی مخالفت وعداوت کا طرزِ عمل دیکھا تو وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! میں اللہ کے لئے یہود اور ان کی ولاء ودوستی سے اعلانِ براءت کرتا ہوں، اور میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے سوا کسی کے ساتھ دوستی نہیں رکھوں گا، عبداللہ بن اُبَی نے کہا: جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں یہود سے دوستی نہیں چھوڑ سکتا ہوں، اس لئے کہ میرے لئے ان کا ہونا ضروری ہے، میں ایک ایسا شخص ہوں جسے خطرات کا اندیشہ ہے۔ (المحرر الوجیز، ابنِ عطیہ: 1/477)

بلاشبہ فرق بالکل واضح ہے، ایک کردار ابن سلول کا ہے جو نفاق میں ڈوبا ہوا تھا، جب کہ دوسرا کردار حضرت عبادہ بن صامتؓ کا ہے جنہوں نے منہجِ نبوی کے مطابق تربیت پائی تھی جس کے نتیجہ میں ان کا نفس پاک اور صاف ہو گیا تھا، ان کا قلب پاکیزہ ہو گیا تھا، ان کا ایمان مضبوط و مستحکم ہو گیا تھا، ان کی عقل روشن ومنور ہو گئی تھی اور وہ جاہلی عصبیت، خواہشاتِ نفس اور ذاتی مفادات کے ہر طرح کے اثرات سے پاک وصاف ہو گئے تھے اور ہر مصلحت ومفاد کے مقابلہ میں انہوں نے اسلامی مصلحت کو مقدم رکھا تھا اور وہ ایک سچے اور مخلص مسلمان کی جیتی جاگتی مثال بن گئے تھے۔ (السیرۃ النبویہ الصحیحہ: 1/302)

۳: اسلامی ریاست کے خلاف اکسانے والوں کا تصفیہ اور کعب بن اشرف کا قتل

بلا شبہ فتنہ اور بغاوت پر اکسانے والوں کا خطرہ تیغ وسنان کے ساتھ میدانِ جنگ میں اترنے والوں کے خطرہ سے کسی طرح کم نہیں ہوتا ہے، اس لئے کہ اگر یہ اکسانے والے نہ ہوں تو فتنہ اور بغاوت کا ظہور ہی نہ ہو، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ان اکسانے والوں کو تلاش کرنا اور ان کا صفایا کرنا شروع کر دیا تاکہ بغاوت وفتنہ کی آگ کو بجھا دیا جائے اور حق کو غالب کیا جائے، جنگ بدر کے بعد اس طرح کے کئی افراد مارے گئے، ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

أ: عصماء بنت مروان:

عصماء بنت مروان لوگوں کو نبی کریم ﷺ کے خلاف اشعار سنا کر بھڑکایا کرتی تھی اور اسلام پر طعن وتشنیع کرتی تھی، حضرت عمیر بن عدی الخطمیؓ نے ان کو قتل کرنے کا کام انجام دیا، اور جب انہوں نے اس کے بعد نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا کہ کیا انہیں اس کی کوئی سزا بھگتنی ہوگی؟ آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: اے عمیر! آپ نے اللہ اور اس کے رسول کی نصرت کی ہے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: اس میں کسی کا کوئی اختلاف اور دورائے نہیں ہوسکتی ہیں۔ اس کے نتیجہ میں بنو خطمہ کے بہت سے لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوگئے اور ان لوگوں نے بھی اپنے اسلام کا اظہار کیا جو ابھی تک اپنے اسلام کو مخفی رکھے ہوئے تھے۔ (تاریخ خطیب بغدادی: 13/99، کشف الخفا: 3137، نضرۃ النعیم فی مکارم أخلاق الرسول الکریم، 1/295)

ب: ابو عفک یہودی کا قتل:

ابو عفک ایک بوڑھا شخص تھا، اس کا تعلق بنو عمرو بن عوف سے تھا، وہ ایک یہودی شاعر تھا اور رسول اللہ ﷺ کے خلاف اپنے اشعار کے ذریعہ اکسانے اور بھڑکانے کا کام کرتا تھا، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: کون میرے لئے اس خبیث سے بدلہ لے گا؟ یہ سن کر صحابی رسول حضرت سالم بن عمیرؓ نکلے اور اس کو قتل کر دیا۔ (نضرۃ النعیم فی مکارم أخلاق الرسول الکریم، 1/296)

ج: کعب بن اشرف کا قتل:

اسلامی ریاست کے خلاف اکسانے والوں کے تصفیہ کا سب سے اہم ترین واقعہ کعب بن اشرف کا قتل ہے جو بدر واُحد کے درمیان پیش آیا۔

کعب بن اشرف کا تعلق قبیلہ طیٔ کے بنو نبہان کے ساتھ تھا، اس کے باپ نے زمانۂ جاہلیت میں خون کیا تھا، اس لئے مدینہ آگیا تھا اور بنو نضیر کے یہود کا حلیف بن گیا تھا، اس نے عقیلہ بنت أبی الحقیق کے ساتھ شادی کی اور اس کے بطن سے کعب پیدا ہوا، وہ شاعر تھا اور اسلام کے خلاف عداوت ودشمنی میں پیش پیش تھا، معرکۂ بدر میں قریش کے مقابلہ میں مسلمانوں کی فتح وکامیابی نے اس کے حسد کی آگ کو مزید بھڑکا دیا، اس لئے اس نے مکہ کا سفر کیا اور نبی کریم ﷺ کی ہجو اور مذمت بیان کرنے لگا، اور قریش کو اپنے مقتولین کا بدلہ لینے پر برانگیختہ کرنے لگا، یہ ان مقتولین کے بارے میں مرثیے کہتا، اپنے اشعار کے ذریعہ ان کو رلاتا اور رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کا خاتمہ کرنے کے لئے اکساتا۔ (سیرت ابن ہشام: 3/58، نضرۃ النعیم فی مکارم أخلاق الرسول الکریم، 1/298)

بدر کے مشرک مقتولین کے بارے میں کعب نے مندرجہ ذیل اشعار کہے ہیں:

طَحَنَتْ رَحَى بَدْرٍ لِمَهْلِكِ أَهْلِهِ ... وَلِمِثْلِ بَدْرٍ تَسْتَهِلُّ وَتَدْمَعُ
قُتِلَتْ سَرَاةُ النَّاسِ حَوْلَ حِيَاضِهِ ... لَا تَبْعَدُوا إِنَّ الْمُلُوكَ تُصَرَّعُ
كَمْ قَدْ أُصِيبَ بِهَا مِنْ أَبْيَضَ مَاجِدٍ ... ذِي بَهْجَةٍ يَأْوِي إِلَيْهِ الضُّيَّعُ
صَدَقُوا فَلَيْتَ الْأَرْضَ سَاعَةَ قُتِّلُوا ... ظَلَّتْ تَسِيخُ بِأَهْلِهَا وَتَصَدَّعُ
نُبِّئْتُ أَنَّ بَنِي الْمُغِيرَةِ كُلَّهُمْ ... خَشَعُوا لِقَتْلِ أَبِي الْحَكِيمِ وَجُدِّعُوا

ترجمہ: ''بدر کی جنگ کی چکی نے جنگ کرنے والوں کو پیس کر رکھ دیا، بدر جیسے دلدوز واقعہ پر آنکھیں پُر نم ہو جاتی ہیں اور آنسو بہہ پڑتے ہیں۔ بہترین لوگ اس کے حوض کے ارد گرد قتل کر دیئے گئے، یہ کوئی بعید از امکان بات نہیں ہے، اس لئے کہ بادشاہوں کو ہی گرایا جاتا ہے۔ کتنے حسین و جمیل اور خوبصورت چہروں والے وہاں پر مارے گئے جو محتاجوں اور ضرورت مندوں کی پناہ گاہ ہوتے تھے۔ انہوں نے اخلاص و سچائی کا ثبوت دیا جب وہ قتل کئے گئے، کاش اس وقت زمین اپنے لوگوں کو لے کر دھنس جاتی اور پھٹ جاتی۔ مجھے بتایا گیا کہ بنو کنانہ کے تمام لوگ ابو لید کی بات کی وجہ سے خوفزدہ ہو گئے اور ان کے اعضائے جسم کاٹ دیئے گئے۔ (دیکھیں: تاریخ الاسلام للذھبی، ص 158، سیرت ابن ہشام: 3/57)

کعب بن اشرف مسلسل رسول اللہ ﷺ کو اپنی ہجو کے ذریعہ ایذاء پہنچاتا رہا اور قریش کو مسلمانوں سے لڑنے کے لئے برانگیختہ کرتا رہا، ان کو رسول اللہ ﷺ کے خلاف بھڑکاتا رہا، ابو سفیان نے اس سے کہا: میں تمہیں اللہ کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں: کیا اللہ کے نزدیک ہمارا دین زیادہ پسندیدہ ہے یا محمد کا دین؟ اس نے کہا: آپ لوگ ان کے مقابلہ میں زیادہ ہدایت یافتہ ہو، اس کے بعد وہ اس حال میں نکلا جبکہ اس نے مشرکین کو رسول اللہ ﷺ کے خلاف جنگ کرنے کے لئے تیار کر لیا تھا اور وہ آپ ﷺ کے ساتھ عداوت و دشمنی اور ہجو کا اعلان کر رہا تھا۔

جب وہ مدینہ منورہ آیا تو اس نے نبی کریم ﷺ سے عداوت و دشمنی کا اعلان کر دیا اور آپ ﷺ کی ہجو یہاں پر آ کر بھی شروع کر دی، اس نے بدتمیزی اور غرور و تکبر کی حد کر دی یہاں تک کہ وہ مسلمان خواتین کے بارے میں زبان درازی کرنے لگا اور اس نے نبی کریم ﷺ کے عمِّ مکرم حضرت عباسؓ کی زوجہ حضرت اُم الفضل بنت حارثؓ کے بارے میں بھی بیہودہ اشعار کہے جس کے بعد اللہ کے رسول ﷺ نے اس کے خلاف کاروائی کرنے کا حکم صادر فرمایا۔

ا: حضرت حسان بن ثابتؓ؛ ابن الأشرف کی گھات میں:

اللہ کے رسول ﷺ حضرت حسانؓ کو کعب بن اشرف کا جواب دینے پر ابھارتے تھے اور حسانؓ کو باخبر کرتے رہتے تھے کہ ابن الاشرف مکہ میں کہاں قیام کرتا ہے، جب وہ مطلب بن أبي وَداعہ بن ضبیرہ سہمی اور ان کی زوجہ عاتکہ بنت اُسید بنت بن أبي العیص کے ہاں ٹھہرا تو آپ ﷺ نے حضرت حسان بن ثابتؓ کو اس کی خبر دی، حضرت حسانؓ نے ابن الاشرف کو اپنے ہاں ٹھہرانے پر ان کی ہجو کی، جب

عاتکہ بنت اُسید کو حسانؓ کی ہجو کا علم ہوا تو انہوں نے کعب بن الاشرف یہودی کا سامان پھینک دیا اور اپنے شوہر سے کہا: اس یہودی سے کیا لینا دینا؟ کیا آپ دیکھتے نہیں ہو کہ حسان ہمارے ساتھ کیا کر رہا ہے؟! (دیکھیں: الصراع مع الیہود، ابو فارس 1/111)

اس کے بعد کعب دوسرے لوگوں کے ہاں چلا گیا اور وہ جب بھی کسی کے ہاں پہنچتا تو رسول اللہ ﷺ حضرت حسانؓ کو بلاتے اور بتا دیتے کہ ابن الاشرف کہاں ٹھہرا ہے، حضرت حسانؓ اُس کو ٹھہرانے والوں کی ہجو کرتے تو وہ اس کو نکال دیتے، حضرت حسانؓ مسلسل اس کا پیچھا کرتے رہے، یہاں تک کہ وہاں ہر شخص نے اسے نکال دیا اور وہ نہ چاہتے ہوئے مدینہ واپس آگیا، یہاں تک کہ اس کے سامنے تمام دروازے مسدود ہوگئے اور عبرت ناک انجام اور اس کی سزا اس کی منتظر تھی۔

حضرت حسانؓ نے کعب بن اشرف کے خلاف میڈیا کی جو جنگ چھیڑ رکھی تھی اس کے اہداف و مقاصد پورے ہوگئے، مندرجہ ذیل سطور میں بعض اشعار کا ذکر کیا جا رہا ہے جو حضرت حسانؓ نے کعب بن اشرف کے رد میں کہے ہیں:

أَبَكَى لِكَعْبٍ ثُمَّ عَلَّ بِعَبْرَةٍ ... مِنْهُ وَعَاشَ مُجَدَّعًا لَا يَسْمَعُ؟
وَلَقَدْ رَأَيْتُ بِبَطْنِ بَدْرٍ مِنْهُمُ ... قَتْلَى تَسُحُّ لَهَا الْعُيُونُ وَتَدْمَعُ
فَابْكِ فَقَدْ أَبْكَيْتَ عَبْدًا رَاضِعًا ... شِبْهَ الْكُلَيْبِ إِلَى الْكُلَيْبَةِ يَتْبَعُ
وَلَقَدْ شَفَى الرَّحْمَنُ مِنَّا سَيِّدًا ... وَأَهَانَ قَوْمًا قَاتَلُوهُ وَصُرِّعُوا
وَنَجَا وَأُفْلِتَ مِنْهُمُ مَنْ قَلْبُهُ ... شَغِفٌ يَظَلُّ لِخَوْفِهِ يَتَصَدَّعُ

ترجمہ: "کیا وہ کعب کے لئے رویا؟ پھر روتے روتے اس کی آنکھیں تر ہو گئیں، اس نے تو اس حال میں زندگی گزاری کہ اس کے ناک، کان کٹے ہوئے تھے، اور وہ کچھ سنتا ہی نہیں تھا۔ میں نے بدر میں ان کے مقتولین دیکھے ہیں جن کے لئے آنکھیں روتی ہیں اور آنسو بہاتی ہیں لہذا روتے رہو تم نے کمسن غلام کو رلایا ہے، بالکل اسی طرح جیسے کہ کتے کا بچہ کتیا کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ یقیناً رحمن نے ہمارے آقا سردار کے دل کو ٹھنڈا کر دیا اور اس قوم کو ذلیل و خوار کر دیا جنہوں نے آپؐ سے جنگ کی اور وہ مارے گئے۔ ان میں سے جو لوگ بچ نکلے ان کے دل غم سے نڈھال ہیں اور آپؐ کے خوف و ڈر سے لرزہ براندام ہیں"۔ (سیرت ابن ہشام: 3/59)

۲: ابن الاشرف کا انجام:

ابن الاشرف یہودی نے بہت سے جرائم کئے، بد عہدیاں اور خیانتیں کیں اور رسول اللہ ﷺ کے حق میں اور مسلمان مردوں اور مسلمان پاکباز خواتین کے حق میں بار بار بد سلوکی اور نازیبا حرکتیں کیں، ان جرائم میں سے ہر جرم عہد شکنی تصور کیا جاتا ہے اور قتل کی سزا کا موجب ہے، لہذا اگر یہ سب جرائم ایک ساتھ کعب بن اشرف جیسے شریر یہودی میں جمع ہو جائیں تو پھر اس کی سزا کتنی سخت ہونی چاہیے؟! (دیکھیں: الصراع مع الیہود: 1/111)

بے شک ابن الاشرف نے نبی کریم ﷺ کی ہجو کے ذریعہ، اعدائے اسلام کے ساتھ اظہار تعاطف کے ذریعہ، ان کے مقتولین کے لئے مرثیے کہہ کر اور مسلمانوں کے خلاف دشمنوں کو اکسانے کے ذریعہ عہد شکنی کا ارتکاب کیا اور اس کی حیثیت اب حربی کی ہو گئی جو واجب

القتل ہے، اسی لئے نبی کریم ﷺ نے اس کے قتل کا حکم صادر فرمایا، چنانچہ امام بخاریؒ نے اس کے قتل کے واقعہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے، امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں حضرت جابر بن عبداللہؓ کی روایت نقل کی ہے، فرماتے ہیں کہ حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے، انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کون کعب بن اشرف کی خبر لے گا؟ کیونکہ اس نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو بہت تکلیف دی ہے''۔ حضرت محمد بن مسلمہؓ کھڑے ہوئے اور کہا: اللہ کے رسولؐ! کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں اس کا کام تمام کر دوں؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں''۔ انہوں نے عرض کیا: پھر آپ مجھے اجازت دیں کہ میں جو مناسب سمجھوں اس سے کہوں۔ آپؐ نے فرمایا: ''تجھے اجازت ہے''۔ چنانچہ حضرت محمد بن مسلمہؓ اس کے پاس آئے اور کہنے لگے: یہ صاحب ہم سے صدقہ مانگتے ہیں اور اس نے ہمیں بڑی مصیبت میں مبتلا کر رکھا ہے، لہذا میں آپ سے کچھ قرض لینے آیا ہوں۔ کعب بولا: اللہ کی قسم! ابھی تو تم اس سے اور زیادہ پریشان ہو گے۔ حضرت محمد بن مسلمہؓ نے کہا: اب تو ہم نے اس کی اتباع کر لی ہے، ہم اسے چھوڑنا نہیں چاہتے، جب تک دیکھ نہ لیں کہ آگے کیا ہوتا ہے، اس وقت تو میں آپ کے پاس اس غرض سے آیا ہوں کہ ایک یا دو وسق قرض لوں۔ کعب بن اشرف نے کہا: اچھا، تو میرے پاس کوئی چیز گروی رکھو۔ انہوں نے کہا: آپ کیا چاہتے ہیں؟ کعب نے کہا: اپنی عورتیں رہن رکھ دو۔ انہوں نے کہا: ہم اپنی عورتیں آپ کے پاس کیسے رہن رکھ دیں جبکہ آپ عرب میں بہت خوبصورت آدمی ہیں؟ کعب بولا: تو پھر اپنے بیٹے میرے پاس گروی رکھ دو۔ انہوں نے کہا: یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے بیٹے آپ کے پاس گروی رکھ دیں، انہیں کل گالی دی جائے اور کہا جائے گا کہ انہیں ایک یا دو وسق کے عوض گروی رکھا گیا تھا، اور یہ بات ہمارے لئے باعث شرم و عار ہے، البتہ ہم اپنے ہتھیار آپ کے پاس گروی رکھ سکتے ہیں، بہر حال انہوں نے اس سے ہتھیار لے کر آنے کا وعدہ کر لیا، پھر رات کے وقت کعب کے رضاعی بھائی ابو نائلہؓ کو لے کر آئے، کعب نے ان کو قلعے کے ایک طرف بلایا، پھر خود ان کے پاس آنے لگا تو اس کی بیوی نے کہا: تو اس وقت کہاں جا رہا ہے؟ کعب نے جواب دیا: یہ تو صرف محمد بن مسلمہ اور میرا رضاعی بھائی ابو نائلہ ہے۔ کعب کی بیوی نے کہا: میں تو ایسی آواز سنتی ہوں جس سے خون ٹپکتا ہے۔ کعب نے کہا: (خطرہ کی کوئی بات نہیں، وہاں پر) میرا دوست محمد بن مسلمہ اور میرا رضاعی بھائی ابو نائلہ ہے۔ شریف انسان اگر رات کے وقت نیزہ زنی کے لئے بلایا جائے تو اس دعوت کو قبول کر لیتا ہے۔ ادھر محمد بن مسلمہؓ اپنے ساتھ دو اور آدمی لے کر آئے تھے اور انہوں نے (اپنے ان دونوں ساتھیوں سے) کہا کہ جب کعب یہاں آئے گا تو میں اس کے بال پکڑ کر سونگھوں گا، جب تم دیکھو کہ میں نے اپنی گرفت مضبوط کر لی ہے اور اس کے سر کو تھام لیا ہے تو تم نے جلدی سے اس کا کام تمام کر دینا ہے۔ الغرض وہ (کعب) ان کے پاس چادر لپیٹے ہوئے آیا جبکہ اس سے خوشبو کی مہک اٹھ رہی تھی، تب حضرت محمد بن مسلمہؓ نے کہا: میں نے آج کی طرح خوشبو کبھی نہیں سونگھی۔ پھر محمد بن مسلمہ نے کہا: کیا تو مجھے اپنا سر سونگھنے کی اجازت دیتا ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ تب انہوں نے خود بھی سونگھا اور اپنے ساتھیوں کو بھی سونگھایا۔ پھر انہوں نے کہا: کیا مجھے دوبارہ سونگھنے کی اجازت ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ پھر جب حضرت محمد بن مسلمہؓ نے اسے مضبوط پکڑ لیا تو اپنے ساتھیوں سے کہا: ادھر آؤ اور اس کا کام تمام کر دو، چنانچہ انہوں نے اسے قتل کر دیا۔ پھر وہ نبی ﷺ کے پاس آئے اور آپ کو اس کے قتل کی خوشخبری سنائی۔ (صحیح البخاری: 4037، صحیح مسلم: 1801)

سیرت ابن ہشام میں مذکور ہے کہ محمد بن سلمہؓ جب کعب بن اشرف کے قتل کے لئے تیار ہو گئے، اس کے بعد تین دن تک اس حال میں رہے کہ کچھ کھاتے پیتے نہ تھے، سوائے اس قدر جس سے ان کی جان بچ سکے، اس کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے کیا گیا تو آپ ؐ نے انہیں بلایا اور ان سے دریافت کیا: آپ نے کھانا پینا کیوں چھوڑ دیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! میں نے آپ سے ایک ایسی بات کا وعدہ کیا ہے معلوم نہیں میں اسے پورا بھی کر پاؤں گا یا نہیں! آپ ﷺ نے فرمایا: آپ کے ذمہ کوشش کرنا ہے۔ انہوں نے عرض کیا: ہمیں کوئی بات تو کہنی پڑے گی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں کہہ سکتے ہو جو آپ مناسب سمجھو۔ (سیرت ابن ہشام: 3/58)

ابن اسحاقؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ ان کے ساتھ بقیع الغرغد تک ساتھ تشریف لے گئے، اس کے بعد ان کو روانہ فرمایا اور کہا: اللہ کا نام لے کر روانہ ہو جاؤ، اے اللہ! ان کی مدد فرما۔ (سیرت ابن ہشام: 3/59)

دروس واسباق اور فوائد

۞ بے شک کعب بن اشرف کے قتل کرنے میں بہت سے دروس و اسباق اور فوائد موجود ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ اسلام دشمن طاقتوں اور اسلامی ریاست کے مخالفوں کے ساتھ کس طرح کا طرزِ عمل اختیار کرتے تھے، اس واقعہ سے یہ واضح ہو گیا کہ عہد شکنی کرنے والے کی سزا قتل ہے، اسی کا نبی کریم ﷺ نے فیصلہ صادر فرمایا، اسی طرح وہ معاہد وذمی جو رسول ﷺ پر سبّ و شتم کرے اور آپ ؐ کو ایذاء پہنچائے اس کی سزا بھی قتل ہے، اور یہی سزا ابن اشرف کو دی گئی، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شاتمِ رسول ؐ چاہے معاہد ہو یا کوئی اور ہو سزاءً اس کی گردن ماری جائے گی، شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ نے ان احکام کو تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب "الصارم المسلول علی شاتم الرسول" میں بیان کیا ہے۔

ابن الاشرف یہودی کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کے حکم کی تنفیذ کے طریقہ سے یہ حکم اَخذ ہوتا ہے کہ کبھی کبھی مصلحتِ عامہ کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ حکم کا نفاذ خفیہ طریقہ سے رازداری کے ساتھ کیا جائے، اور اس طریقہ کا اختیار کرنا اس وقت ضروری ہو جاتا ہے جبکہ اعلانیہ طور پر حکم کے نفاذ میں کسی فتنہ یا خطرہ کا اندیشہ ہو اور مسلمانوں کو اس کی وجہ سے نقصان اٹھانا پڑ سکتا ہو۔

اس واقعہ سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اعدائے اسلام اور اسلامی ریاست کے خلاف برسرپیکار کفار کا مقابلہ صرف میدانِ جنگ تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ان کا مقابلہ ہر اس جگہ اور ہر طریقہ سے کیا جائے گا جس کے ذریعہ ان کو نقصان پہنچ سکتا ہو، جب تک کہ اس میں کوئی گناہ نہ ہو، بسا اوقات کسی شخص کا کام تمام کرنے میں بہت زیادہ کوششوں کی ضرورت پڑ سکتی ہے اور نقصانات برداشت کرنے پڑ سکتے ہیں، یہ اس بات کے ساتھ مشروط ہے کہ فتنہ وفساد کا اندیشہ نہ ہو اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ مسلمانوں کو طاقت و قوت اور اقتدار حاصل ہو اور اس عمل کے نتیجہ میں مسلمانوں کو نقصان پہنچنے، داعیانِ حق کو ملک بدر کرنے اور ان کی سوسائٹی میں بگاڑ پیدا کرنے کا اندیشہ نہ ہو، بعض مسلمانوں نے عالم اسلامی میں یہ غلطی کی کہ مسلح کشمکش کی شروعات میں عجلت سے کام لیا اور اس سلسلہ میں اس طرح کے واقعات سے استدلال کیا، حالانکہ اس طرح کے واقعات میں اس کی کوئی دلیل نہیں ہے، یہ قیاس مع الفارق ہے، اس لئے کہ اس واقعہ کا تعلق مدینہ سے ہے، جبکہ مسلمانوں کے پاس طاقت و قوت بھی تھی اور وہ اصحابِ اقتدار و حکومت بھی تھے، اور یہاں نہ ہی طاقت و قوت ہے اور نہ ہی اقتدار و

حکومت ،اور دورِ نبوی کے اس طرح کے واقعات دین کی سربلندی اور اہلِ کفر کو مرعوب کرنے کے لئے تھے،اور ان میں ایسے مصالح تھے جن میں کوئی مفسدہ اور نقصان نہیں تھا، لیکن جہاں تک تعلق ہے دورِ زوال واد بار اور محکومیت و مغلوبیت کے واقعات کا تو ان کے نتائج شر وفساد، مسلمانوں کی خونریزی اور ان کی عزت وآبرو اور مال وجائیداد پر حملوں اور ان کے ساتھ نارواسلوک کرنے کی شکل میں سامنے آتے ہیں جو کہ کسی بھی صاحبِ عقل وبصیرت سے مخفی نہیں ہے۔(دیکھیں:التاریخ الاسلامی 54/5 وقفات تربویۃ مع السیرۃ النبویۃ، ص:205)

بلاشبہ نبی کریم ﷺ نے مکہ مکرمہ میں کسی بھی مشرک کے ساتھ تعرض کرنے یاان کے خلاف صف آرائی کی کوئی کوشش نہیں کی، حالانکہ ابوجہل، اُمیہ بن خلف اور عتبہ جیسے زعمائے شرک اور فساد کے سرغنوں کو قتل کرنے کے مواقع حاصل تھے، اگر آپ ﷺ حضرت حمزہؓ یا حضرت عمرؓ کو یا اور کسی اور صحابی کو اشارہ بھی دیتے تو وہ اس کی تنفیذ میں ذرہ برابر دیر نہ کرتے، لیکن نبوی طریقہ کار ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ زعمائے کفر کو ختم کرنے کے لئے طاقت و قوت کا ہونا ضروری ہے، اسی طرح اس سلسلہ میں اہل اور باصلاحیت علماء کی طرف سے صحیح فتوی کا ہونا اور تمام مصالح و مفاسد کا استیعاب واحاطہ کرنا بھی ضروری ہے، اس کے لئے علمائے راسخین کی از حد ضرورت ہے، اس لئے کہ عصرِ حاضر میں مصالح خلط ملط ہوگئے ہیں اور رائے عامہ کا حکومتی فیصلوں میں اہم کردار ہوتا ہے اور نقصانات و مفاسد کے احتمالات زیادہ ہیں۔(دیکھیں: الاساس فی السنۃ وفقہا السیرۃ النبویہ: 2/537)

۞ یہ بات قابلِ غور ہے کہ صحابہ کرام کے نزدیک عہد وپیمان، وعدہ اور زبان سے نکلی ہوئی بات کی کتنی اہمیت تھی، حضرت محمد بن مسلمہؓ کے موقف سے اس کا اظہار ہوتا ہے، انہوں نے جب رسول ﷺ سے ایک بات کہہ دی جس میں ابن الاشرف کو قتل کرنے کا وعدہ کیا تھا، اور جس چیز کا انہوں نے وعدہ کر لیا تھا اس کی تکمیل میں رکاوٹوں اور مشکلات کی وجہ سے ان سے اس کام میں تاخیر ہوتی رہی، جس کی وجہ سے انہوں نے کھانا، پینا چھوڑ دیا اور وہ بہت زیادہ فکر مند اور غمگیں ہوگئے، اس لئے کہ انہوں نے ایک بات کہہ دی تھی جس کے بارے میں ان کو اندیشہ تھا کہ کہیں وہ اس کو پورا نہ کر سکیں، لیکن اس کے برعکس ہم اپنی سوسائٹی میں اس کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ بہت سے لوگ عہد وپیمان اور وعدہ کرتے ہیں، وہ اس کی اہمیت و قیمت کا اندازہ نہیں کر پاتے ہیں، اس لئے وہ عہد شکنی کرتے ہیں اور اپنے عہد وپیمان اور وعدوں کی پاسداری نہیں کرتے ہیں اور ان کی حیثیت کاغذ پر روشنائی سے زیادہ نہیں ہوتی ہے، لہذا اس طرح کے لوگ دین دار اور اصول وضوابط کے پابند نہیں ہو سکتے ہیں، بلکہ اس طرح کے لوگ مفاد پرست ہوتے ہیں، ان کے پیشِ نظر اپنے مصالح ومنافع ہوتے ہیں، ڈر لگتا ہے کہ کہیں اللہ کے مقابلہ میں وہ انہی کو معبود نہ بنالیں۔

بلاشبہ اصحابِ دعوت ودین تو اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ ان کی گردنیں تن سے جدا کر دی جائیں، ان کے جسم کے ٹکڑے کر دیئے جائیں اور ان کی جان لے لی جائے، لیکن وہ اپنی بات سے، اپنے عہد وپیمان اور وعدوں سے دست بردار نہیں ہو سکتے ہیں، وہ اپنے عقیدہ اور اسلام کی راہ میں لاحق ہونے والی تکالیف اور موت کو باعثِ لذت وسکون سمجھتے ہیں۔(الصراع مع الیہود: 1/119)

اللہ کے رسول ﷺ کا یہ فرمانا کہ "آپ کے ذمہ کوشش کرنا ہے"۔اس کے ذریعہ نبی کریم ﷺ کی طرف سے یہ رہنمائی کی گئی ہے کہ نصرت و مدد اسی وقت آتی ہے جبکہ انسان کوشش کرے اور آزمائش کے وقت صبر کا دامن نہ چھوڑے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿تِلْكَ مِنْ أَنبَآءِ ٱلْغَيْبِ نُوحِيهَآ إِلَيْكَ ۖ مَا كُنتَ تَعْلَمُهَآ أَنتَ وَلَا قَوْمُكَ مِن قَبْلِ هَٰذَا ۖ فَٱصْبِرْ ۖ إِنَّ ٱلْعَٰقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ﴾ ترجمہ: "اے محمدؐ، یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تمہاری طرف وحی کر رہے ہیں، اس سے پہلے نہ تم ان کو جانتے تھے اور نہ تمہاری قوم، پس صبر کرو، انجام کار متقیوں ہی کے حق میں ہے"۔ (سورۂ ہود: 49)

ایک مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ مقصد کے حصول کے لئے ہر قسم کی فکری اور جسمانی طاقت وصلاحیت کو بروئے کار لائے جو اس کی وسعت وطاقت میں ہو، اور اس کے بعد نتائج کے سلسلہ میں اللہ کی ذات پر توکل اور بھروسہ کرے۔

آپ ﷺ کا یہ فرمانا کہ "جو مناسب سمجھو جو کہہ سکتے ہو"۔ یہ قول فقہ نبوی کا غماز ہے، چنانچہ صحابہ کرام کو اس موقع پر ایسی گفتگو کرنی پڑی جو عام حالات میں گناہ ہے، اس سے معلوم ہوا کہ عسکری کاروائیوں کی انجام دہی میں گفتگو اور کلام کو متعین اور محدود نہیں کیا جاسکتا ہے، بلکہ حالات کے مطابق گفتگو کا جو تقاضا ہو ویسی گفتگو کی جاسکتی ہے، لیکن ایک دوسرا مسئلہ ہے وہ یہ کہ اگر عسکری کاروائیوں کی کامیابی بعض ناجائز افعال یا کسی فرض کو ترک کرنے کی متقاضی ہو تو پھر کیا کیا جائے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات طے ہے کہ کفر وشرک سے بڑا اور کوئی گناہ نہیں ہے، لہٰذا اگر اس مقصد کے لئے کفر کا اظہار کرنا جائز ہے تو دیگر گناہ بدرجۂ اولیٰ جائز ہوں گے، بشرطیکہ ہدف ومقصد کا حصول یقینی ہو، یا اس کا غالب گمان ہو اور صرف اسی حد پر اکتفا کیا جائے کہ جتنا کہ ضروری ہو، چاہے فرض کو مؤخر کیا جارہا ہو یا کسی ناجائز کام کا ارتکاب کیا جارہا ہو، بقدرِ ضرورت ہی اکتفا کیا جائے گا، البتہ اس صورتحال میں اہل وباصلاحیت علماء کی طرف سے فتوی ضروری ہے، لیکن بعض ناجائز کام ایسے ہیں جن کا ارتکاب کسی بھی حال میں درست نہیں ہے، جیسے کہ زنا یا لواطت وغیرہ۔ (دیکھیں: الاساس فی السنۃ وفقہا السیرۃ النبویہ: 2/537)

بعض مسائل ایسے ہیں جن کے بارے میں فتوی دینے کے لئے اہلیت وصلاحیت کے حامل اہلِ فتوی کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے، خاص طور پر استثنائی اور اضطراری حالات میں اور سیاسی اور عسکری محاذ پر، اس لئے کہ اس طرح کے مواقع پر صورتحال کا جائزہ لینے اور استثنائی فتاوی کے گہرے مطالعہ کی ضرورت پڑتی ہے جو کہ ہر انسان کے بس کی بات نہیں ہے، اس لئے کہ اصل اور عمومی احکام کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں، البتہ استثنائی حالات جن استثنائی احکام کا تقاضا کرتے ہیں ان کے حل کے لئے ایسے علمائے ربانیین اور فقہائے راسخین کی ضرورت ہوتی ہے جو مقاصدِ شریعت اور میدانی صورتحال کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

آپ ﷺ کا یہ فرمانا کہ "جو مناسب سمجھو کہہ سکتے ہو" اس سے یہ پہلو بھی واضح ہوتا ہے جیسے کہ آپ ﷺ کا فرمان ہے: "الحرب خدعة" یعنی: جنگ دھوکہ اور چال ہے۔ (صحیح بخاری: 3029، صحیح مسلم: 1740)

❁ آپ ﷺ کا یہ فرمانا: "اللہ کا نام لے کر روانہ ہو جاؤ، اے اللہ! ان کی مدد فرما"۔ اس کے ذریعہ اللہ کے رسول ﷺ نے ان کو جہاد میں اخلاص کی تذکیر کی، ان کے لئے نصرت وتوفیق کی دعا فرمائی، یہ تمام باتیں صبر وثبات پیدا کرنے والی اور ان کو معنوی اور نفسیاتی طور پر بلند

کرنے والی تھیں، اس لئے انہوں نے ابن الاشرف اور اس کے آس پاس کے لوگوں کی طاقت و قوت کی کوئی پرواہ نہیں کی، کیونکہ ان کے اندر اللہ تعالیٰ کی معیت اور رسول اللہ ﷺ کی دعا کا احساس موجزن تھا۔

منہجِ نبوی میں یہ بات دیکھنے کے قابل ہے کہ آپ ﷺ تمام مادی اسباب اختیار فرماتے تھے اور صحیح منصوبہ بندی کرتے تھے اور پھر دعا بھی فرماتے تھے، صحابہ کرام مقصد تک پہنچانے والے تمام اسباب کو اختیار کرنے میں کوتاہی اور غفلت نہیں برتتے تھے، اس لئے کہ ایک مسلمان اس بات کا مکلف ہے کہ وہ اللہ پر توکل و بھروسہ بھی کرے اور مشروع اسباب کو بھی اختیار کرے، اس اعتبار سے حضرت محمد بن مسلمہ ؓ کا منصوبہ انتہائی مستحکم تھا اور انہوں نے نہایت مہارت کے ساتھ تمام اسباب اختیار کر لئے تھے، اس منصوبہ کی تکمیل میں جو اسباب معاون بنے مندرجہ ذیل ہیں:

- ابو نائلہ ان کے رضائی بھائی تھے، اُنہیں ان پر پورا اطمئنان تھا اور انہیں ان کی طرف سے کوئی خوف اور ڈر نہیں تھا۔
- بعض روایات میں ہے کہ ابو نائلہ نے کعب بن اشرف کو اطمئنان دلایا اور اپنی ضرورت بیان کرنے سے پہلے اس کے بالوں اور خوشبو کی تعریف کرکے اس کے دل میں جگہ بنالی۔
- اپنی ضرورت اس وقت تک بیان نہیں کی جب تک کہ کعب کو اس کے قلعہ سے باہر نہ نکالا، وہ کچھ دیر بات چیت کرتے رہے یہاں تک کہ انہیں اطمئنان ہو گیا، یہ بھی ان کی کامیابی کا ایک اہم سبب بنا، اگر وہ کعب کی جائے قیام پر ہی رہتے تو ہو سکتا تھا کہ راز فاش ہو جاتا، اس لئے تنہائی میں اس کے ساتھ گفتگو کرنا بھی ان کے مشن کی کامیابی کا ایک اہم سبب بنا۔
- رسول اللہ ﷺ کے بارے میں انتقامی سوچ، بے زاری اور ظلم سے پریشانی کے اظہار نے کعب بن اشرف کو مزید اطمئنان دلایا۔
- اسلحہ رہن رکھنے کی سوچ بھی انتہائی اہم اور باتوفیق تھی تاکہ ان کا اسلحہ ساتھ میں لے جانا غیر مشکوک بن جائے اور اس میں کسی طرح کا اندیشہ اور خوف باقی نہ رہے، اس لئے کہ انہوں نے وہ اسلحہ ساتھ میں لایا تھا جو انہیں کعب کے پاس بطور رہن رکھنا تھا اور ساتھ ہی ساتھ وہ اسی اسلحہ کو بوقتِ ضرورت استعمال کر سکتے تھے۔
- کعب بن اشرف سے مخصوص وقت لینے نے منصوبہ کو تکمیل تک پہنچانے میں بھی اہم کردار ادا کیا، اس لئے کہ اس کے ذریعہ ان کے لئے رات میں کسی بھی وقت آنا ممکن ہو گیا، بغیر اس کے کہ کوئی ان پر شک کرتا۔
- ابو نائلہ ؓ اور محمد بن مسلمہ ؓ کے بارے میں ابن الاشرف کے پورے طور پر مطمئن ہونے کی وجہ سے وہ ایسے وقت میں نکلنے کے لئے تیار ہو گیا، جبکہ عام طور پر انسان ایسے وقت میں اپنے گھر سے باہر نہیں نکلتا ہے، اس لئے کہ ایسے وقت میں دشمن کے اچانک حملہ آور ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔(دیکھیں الصراع مع الیہود: 1/122)
- بے شک ابن الاشرف کو اپنے گھر سے دور کرکے ایسی جگہ لے جانا جہاں اس کا کوئی پہرہ دار یا مددگار نہ ہو، یہ منصوبہ بھی انتہائی اہم اور کارگر تھا۔

- ابو نائلہ کا ابن الاشرف کو مہلت دینا، اس کے سر کی خوشبو سونگھنا، اس کے بالوں کو سونگنے کے لئے پکڑنا، یہ سب نہایت ہی مفید منصوبہ بندی تھی اور اس خبیث کے سر کو پکڑنے اور اس پر کنڑول حاصل کرنے کی تمہید اور مقدمہ تھا، تاکہ اس ملعون یہودی پر اللہ کا حکم نافذ کرنے کا اچھی طرح موقع مل جائے۔

- اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ صحابہ کرام کس قدر رازداری سے کام لیتے تھے، اس پورے منصوبہ کو راز میں رکھا گیا حالانکہ مدینہ میں یہود اور منافقین کی کثرت تھی، اس کی تنفیذ و تکمیل میں تاخیر بھی ہوئی اور رسول اللہ ﷺ نے اس معاملہ کو صحابہ کرام کی موجودگی میں ذکر کیا تھا اور اس سلسلہ میں مشورہ بھی ہوا لیکن اس کے باوجود یہ پورا منصوبہ راز ہی رہا، یہ صحابہ کرام کی قوتِ ایمانی اور دین کے لئے اخلاص کی واضح دلیل ہے۔(دیکھیں: الصراع مع الیہود 1/122، التاریخ الاسلامی للحمیدی 5/56)

ان جانبازوں نے مضبوط و مستحکم منصوبہ کی تنفیذ میں اپنا اپنا کردار ادا کیا جس پر ان کا اتفاق ہوا تھا، اور انہوں نے اپنا عظیم ہدف حاصل کر لیا اور رسول اللہ ﷺ بھی اپنے احساس و شعور کے ساتھ ان کے ساتھ تھے، چنانچہ وہ اس کاروائی کا نفاذ اپنی ذہن و دماغ اور جسموں کے ذریعہ کر رہے تھے اور رسول اللہ ﷺ ان کے لئے نصرت و اعانت کی دعا کے ذریعہ اور تعلق مع اللہ کے ذریعہ ان کی قیادت فرما رہے تھے۔(التاریخ الاسلامی للحمیدی 5/57)

۳: یہود پر ابن الاشرف یہودی کے قتل کا اثر:

پورے مدینہ میں ابن الاشرف کے قتل کی خبر پھیل گئی اور یہودیوں کا وفد فوراً رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچ گیا، وہ اصحاب رسول کی رسول اللہ ﷺ سے شکایت کر رہے تھے، اللہ کے رسول ﷺ نے ان کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی، بلکہ اس کے قتل کو درست قرار دیا جو اس کے معاندانہ اور معادیانہ طرزِ عمل کا حتمی نتیجہ تھا، اس واقعہ نے تمام یہودیوں کے دلوں میں رعب ڈال دیا، بلکہ ان کے بڑے لوگوں میں سے کوئی بھی اپنے قلعہ سے باہر نکلنے کی جرأت نہیں کرتا تھا، اسی طرح یہودِ مدینہ میں سے ہر ایک کو مسلمانوں کی طرف سے خوف وڈر محسوس ہونے لگا، یہود مجبور ہو گئے کہ معاہدہ کی از سرِ نو تجدید کریں، کعب بن اشرف کے مارنے کا ان کے دلوں پر گہرا اثر تھا، وہ اسلام کے خلاف مزید سازشوں کا جال بُننے لگے۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کعب بن الاشرف کے جرائم کا مؤاخذہ بنو نضیر سے نہیں کیا، بلکہ اس کی عہد شکنی، بغاوت اور غدر کی سزا صرف اسی کو دی اور بنو نضیر کے ساتھ معاہدہ کی تجدید فرمادی۔

یہود کے ساتھ معاملہ کرنے کے سلسلہ میں نبوی منہج سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہود کا بہترین علاج یہ ہے کہ ان کو ڈرا کر رکھا جائے، ان کے فتنہ پروروں کو سخت سزا دی جائے، اس لئے کہ وہی اصل فتنہ باز اور شر پسند ہیں جو اپنی شر پسندی سے باز نہیں آسکتے ہیں۔(السیرۃ النبویہ الصحیحۃ: 1/304، الصراع مع الیہود: 1/126)

....

۴: بعض سماجی واقعات

أ: حضرت حفصہ بنت عمرؓ کے ساتھ نبی کریم ﷺ کا نکاح:

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب حفصہ بنت عمرؓ کے شوہر خنیس بن حذافہ سہمیؓ کی وفات ہوئی -وہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب میں سے تھے اور مدینہ میں ان کی وفات ہوئی- عمرؓ فرماتے ہیں کہ ''میں عثمان بن عفانؓ کے پاس آیا اور میں نے ان کے سامنے حفصہ بنت عمرؓ کو پیش کیا، انہوں نے جواب دیا: میں اس معاملہ پر غور کرتا ہوں، میں نے کچھ دنوں تک انتظار کیا، پھر میں نے ابو بکرؓ سے ملاقات کی اور میں نے عرض کیا: اگر آپ چاہیں تو میں آپ کا نکاح حفصہ سے کر دوں۔ ابو بکرؓ خاموش رہے اور مجھے کوئی جواب نہیں دیا۔ ان کی اس بے رخی سے مجھے عثمانؓ سے بھی زیادہ غصہ اور رنج ہوا۔ کچھ دنوں تک میں انتظار کرتا رہا، اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے خود حفصہؓ کے لئے نکاح کا پیغام بھیجا، اور میں نے نبی کریم ﷺ سے ان کی شادی کر دی، اس کے بعد ابو بکرؓ مجھ سے ملے اور کہنے لگے: جب آپ نے حفصہؓ کا معاملہ میرے سامنے رکھا تو اس پر میرے خاموش رہنے سے آپ کو تکلیف ہوئی ہوگی کہ میں نے آپ کو کوئی جواب نہیں دیا، حضرت عمرؓ نے کہا: ہاں واقعی تکلیف تو ہوئی تھی، حضرت ابو بکرؓ نے کہا: آپ نے میرے سامنے جو پیشکش رکھی تھی اس کا جواب میں نے صرف اس لئے نہیں دیا تھا کیونکہ میرے علم میں تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے خود حفصہؓ کا ذکر کیا ہے اور میں نبی کریم ﷺ کے راز کو فاش نہیں کرنا چاہتا تھا، اگر نبی کریم ﷺ ان سے نکاح نہ کرتے تو میں ان سے نکاح کرنا قبول کر لیتا۔ (صحیح بخاری: 5122، الدلائل للبیہقی: 3/158)

ب: حضرت فاطمہؓ کے ساتھ حضرت علیؓ کا نکاح:

حضرت علی بن أبی طالبؓ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کے پاس حضرت فاطمہؓ کے بارے میں پیغامِ نکاح آیا تو مجھ سے آزاد کردہ باندی نے کہا: آپ کو معلوم ہے کہ فاطمہؓ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کے پاس پیغامِ نکاح آیا ہے؟ میں نے کہا: نہیں! مجھے علم نہیں ہے۔ اس نے کہا: ہاں، اس کے بارے میں پیغامِ نکاح آچکا ہے، آپ کیوں رسول اللہ ﷺ کے پاس نہیں جاتے ہیں، وہ آپ سے ان کا نکاح کر دیں گے۔ میں نے کہا: میرے پاس کچھ ہے بھی جس کے ذریعہ میں ان سے نکاح کروں؟! اس نے کہا: اگر آپ رسول اللہ ﷺ کے پاس جائیں گے تو وہ آپ کا نکاح کر دیں گے۔ فرماتے ہیں: وہ مسلسل مجھے امید دلاتی رہی یہاں تک کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گیا، جیسے ہی میں آپ ﷺ کے سامنے بیٹھا میری زبان بند ہوگئی، واللہ! میں آپؐ کے جلال وہیبت کی وجہ سے کوئی بات نہیں کر سکا، اللہ کے رسول ﷺ نے دریافت کیا: کیوں آئے ہو؟ کیا کوئی ضرورت ہے؟! میں خاموش رہا، آپؐ نے فرمایا: شاید آپ فاطمہ کا پیغامِ نکاح لے کر آئے ہو؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں! آپؐ نے پوچھا: کیا آپ کے پاس نکاح کرنے کے لئے کچھ ہے؟ میں نے کہا: نہیں! واللہ، اللہ کے رسولؐ! آپؐ نے فرمایا: اس زِرہ کا کیا ہوا جو میں نے آپ کو دی تھی؟ میں نے کہا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں علی کی جان ہے وہ حُطمی زِرہ تھی جس کی قیمت چار درہم ہوگی۔ میں نے کہا: وہ میرے پاس ہے، آپؐ نے فرمایا: میں نے فاطمہؓ کو آپ کے عقد میں دے دیا، اس زِرہ کو ان کے پاس بھیج دو اور اسی کو ان کے لئے مہر بنا دو۔ وہی فاطمہ بنت رسول ﷺ کا مہر تھا۔ (الدلائل للبیہقی: 3/160)

اللہ کے رسول ﷺ نے رخصتی کے وقت حضرت فاطمہ ؓ کو ایک چادر، مشکیزہ، چمڑے کا تکیہ عطا فرمایا، تکیہ کے اندر اِذ خر کی گھاس بھری ہوئی تھی۔(دیکھیں: صحیح السیرۃ النبویہ، ص:267)

اس طرح ان کی زندگی انتہائی سادگی کے ساتھ بسر ہوتی تھی، وہ ہر قسم کی پیچیدگی اور تکلف سے پاک تھے اور ان کی زندگی خوشحالی کے بجائے سختی اور مشقت سے بھری ہوئی تھی، آگے آنے والا واقعہ ہمارے سامنے سیدہ فاطمہ ؓ کے حال کی اور ان کی سخت جانی کی صحیح منظر کشی کرتا ہے جبکہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے ایک خادم کا مطالبہ کیا تھا، چنانچہ مسند اُحمد میں منقول ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہ ؓ سے ایک روز فرمایا: اللہ کی قسم! کنویں سے پانی کھینچ کھینچ کر میرے تو سینے میں درد شروع ہو گیا ہے اور آپ کے والد محترم کے پاس کچھ قیدی آئے ہوئے ہیں، ان کے پاس جا کر کسی خادم کی درخواست کیجئے۔ حضرت فاطمہ ؓ نے فرمایا: واللہ چکی چلا چلا کر میرے ہاتھوں میں بھی گٹے پڑ گئے ہیں، اس لئے میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی تو آپؐ نے فرمایا: اے میری بیٹی! کیوں آئی ہو؟ انہوں نے عرض کیا: میں آپ کو سلام عرض کرنے کی غرض سے آئی ہوں، انہیں نبی کریم ﷺ کے سامنے درخواست پیش کرتے ہوئے شرم محسوس ہوئی اور وہ واپس لوٹ آئیں، حضرت علیؓ نے پوچھا: کیا ہوا؟ فرمایا: مجھے تو آپؐ سے کچھ مانگتے ہوئے شرم آئی، اس کے بعد ہم دونوں ایک ساتھ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت علیؓ نے عرض کیا: اللہ کے رسولؐ! واللہ، کنویں سے پانی کھینچ کھینچ کر میرے سینے میں درد شروع ہو گیا ہے، اور حضرت فاطمہ ؓ نے عرض کیا: چکی چلا چلا کر میرے ہاتھوں میں بھی گٹے پڑ گئے ہیں، آپ کے پاس کچھ قیدی آئے ہیں، ان میں سے کوئی ایک بطورِ خادم ہمیں بھی عنایت فرمادیں، یہ سن کر اللہ کے رسول ﷺ نے عرض کیا: واللہ! میں اہلِ صفّہ کو چھوڑ کر۔ جن کے پیٹ چپکے پڑے ہوئے ہیں اور ان پر خرچ کرنے کے لئے میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ تمہیں کوئی خادم نہیں دے سکتا بلکہ میں انہیں بیچ کر ان کی قیمت اہلِ صفّہ پر خرچ کروں گا، یہ سن کر وہ دونوں واپس آگئے، نبی کریم ﷺ ان کے گھر تشریف لے گئے، جبکہ ان دونوں نے اپنی ایک چادر اوڑھ رکھی تھی، وہ اتنی چھوٹی تھی کہ اگر سر ڈھکتے تھے تو پاؤں کھل جاتے تھے اور اگر پاؤں ڈھکتے تھے تو سر کھل جاتا تھا، نبی کریم ﷺ کو دیکھ کر دونوں وہاں سے اٹھنے لگے لیکن نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اپنی جگہ رہو۔ اس کے بعد فرمایا: کیا میں تمہیں اس سے بہتر چیز بتادوں جو آپ مانگ رہے تھے؟! دونوں نے کہا: کیوں نہیں! آپؐ نے فرمایا: کچھ کلمات ہیں جو مجھے جبرئیل۔علیہ السلام۔ نے سکھائے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ہر نماز کے بعد دس مرتبہ: سبحان اللہ، دس مرتبہ: الحمد للہ، اور دس مرتبہ: اللہ اُکبر کہا کرو اور جب بستر پر جاؤ تو تنتیس (۳۳) مرتبہ: سبحان اللہ، تنتیس (۳۳) مرتبہ: الحمد للہ اور چونتیس (۳۴) مرتبہ: اللہ اُکبر کہا کرو۔ (مسند اُحمد: 1/106-107، الفتح الربانی: 90، صحیح البخاری: 3113)

یہ تھا اہلِ خانہ اور اقارب کی تربیت کے سلسلہ میں نبوی طریقہ کار، سیدہ عائشہ ؓ اور سیدنا علیؓ کی خادم کے حصول کے سلسلہ میں تمام کوششیں بَر نہ آسکیں، اس لئے کہ غلاموں کو بیچ کر رسول اللہ ﷺ ان کی قیمت اہلِ صفّہ پر صَرف کرنا چاہتے تھے جو بھوک کی وجہ سے نڈھال تھے اور وہ بھی حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہ ؓ کی طرح رسول اللہ ﷺ کے خاص لوگ ہیں، اور خدمت کے مقابلہ میں کھانا مقدم اور اہم ہے، حضرت علیؓ اس نبوی تربیت سے متاثر ہوتے ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے رکھتے حضرت علیؓ خلیفۃ

المسلمین کے منصب پر فائز ہوتے ہیں اور اسی تربیت کا نتیجہ تھا کہ وہ دنیا اور دنیاوی زیب وزینت سے بلند ہو جاتے ہیں، حالانکہ ان کے ہاتھ میں زمین کے خزانے اور خیر کے ذخیرے تھے، اس لئے کہ اللہ کے ذکر سے ان کا دل اور ان کا وجود معمور تھا، انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی وصیت کی پابندی کی، انہوں نے اس وصیت کا ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ: اللہ کی قسم! جب سے رسول اللہ ﷺ نے یہ کلمات مجھے سکھائے ہیں میں نے انہیں کبھی ترک نہیں کیا ہے، ان کے ایک ساتھی نے دریافت کیا: کیا صفین کی رات میں بھی نہیں؟ انہوں نے کہا: ہاں، صفین کی رات میں بھی نہیں۔(الاصابہ فی تمیز الصحابہ: 8/159، التربیۃ القیادیۃ: 3/100)

ان کے اوصافِ حمیدہ بالکل ویسے ہی تھے جیسے کہ ضرار بن ضمرہ نے معاویہؓ کی مجلس میں بیان کیا: "......ان کو دنیا سے اور دنیاوی زیب وزینت سے وحشت ہوتی ہے، وہ رات اور اس کی تاریکی سے مانوس ہوتے ہیں، واللہ! آپؓ بہت زیادہ آنسوں بہانے والے تھے، طویل غور وفکر کرنے والے تھے، اپنی ہتھیلی الٹ کر اپنے نفس سے مخاطب ہوتے، ان کو چھوٹا لباس پسند اور کھانے میں موٹا جھوٹا پسند تھا۔(دیکھیں: صفۃ الصفوۃ، ابن الجوزی: 1/84)

....

نویں فصل

غزوۂ احد

پہلا باب

معرکہ سے پہلے کے واقعات

ا: غزوہ کے اسباب:

غزوہ اُحد کے متعدد اسباب تھے، ان میں سے بعض دینی و معاشرتی اسباب تھے جبکہ بعض اقتصادی اور سیاسی اسباب تھے، چند اسباب مندرجہ ذیل ہیں:

ا: دینی اسباب:

اللہ -عزوجل- نے بتایا ہے کہ مشرکین اللہ کے راستہ سے روکنے کے لئے، دعوتِ اسلامی کے سامنے رکاوٹیں حائل کرنے کے لئے، لوگوں کو اسلام میں داخل ہونے سے روکنے کے لئے اور اسلام، مسلمانوں اور ان کی ابھرتی ہوئی ریاست کو ختم کرنے کے لئے اپنا مال خرچ کرتے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ يُنفِقُونَ أَمْوَٰلَهُمْ لِيَصُدُّواْ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِۚ فَسَيُنفِقُونَهَا ثُمَّ تَكُونُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُونَۗ وَٱلَّذِينَ كَفَرُوٓاْ إِلَىٰ جَهَنَّمَ يُحْشَرُونَ﴾ ترجمہ: ”جن لوگوں نے حق کو ماننے سے انکار کیا ہے وہ اپنے مال خدا کے راستے سے روکنے کے لئے صَرف کر رہے ہیں اور ابھی اور خرچ کرتے رہیں گے مگر آخر کار یہی کوششیں ان کے لئے پچھتاوے کا سبب بنیں گی، پھر وہ مغلوب ہوں گے، پھر یہ کافر جہنم کی طرف گھیر لائے جائیں گے“۔(سورۃ الانفال:36)

امام طبریؒ فرماتے ہیں: ”وہ اپنے مال خرچ کرتے ہیں تاکہ لوگوں کو اسلام میں داخل ہونے سے روکیں“۔ علامہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے کہ کفار اپنے مال اس لئے خرچ کرتے ہیں تاکہ لوگوں کو حق کے راستے کی اتباع سے روکیں۔

علامہ شوکانیؒ فرماتے ہیں: اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اپنا مال خرچ کر کے ان کفار کا مقصد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جنگ کر کے اور لشکر جمع کر کے لوگوں کو حق کے راستے سے روکا جائے۔(دیکھیں: تفسیر طبری، تفسیر ابن کثیر، تفسیر فتح القدیر، غزوۃ اُحد دراسۃ دعویۃ، ص: 71)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ غزوہ احد کے اسباب میں سے اہم ترین سبب دینی تھا اور وہ یہ تھا کہ لوگوں کو اللہ کے راستے سے اور حق کی اتباع سے روکا جائے، لوگوں کو اسلام میں داخل ہونے سے روکا جائے، رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جنگ کی جائے اور دعوتِ اسلامی کا خاتمہ کیا جائے۔(دیکھیں: غزوۃ اُحد دراسۃ دعویۃ، ص:71)

۲: معاشرتی اسباب:

بدر کی شکست فاش کا اور قریش کے سرداروں کے قتل کا مشرکین کی معاشرتی اور سماجی زندگی پر بُرا اثر پڑا، اس کی وجہ سے ان کو ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑا اور وہ خود بھی ذلت اور شکست خوردگی کا احساس لئے ہوئے زندگی گزارنے لگے، اس لئے انہوں نے اس ذلت و توہین کے داغ کو دھونے کے لئے ہر ممکن جدوجہد کی اور بدر سے واپسی کے فوراً بعد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ پھر سے جنگ کرنے کے لئے مال و اسباب جمع کرنا شروع کر دیئے۔

ابن اسحاقؒ فرماتے ہیں: جب بدر کے دن کفارِ قریش میں سے اصحاب القلیب (کنویں میں پھینکے جانے والے) مارے گئے اور ان کا شکست خوردہ باقی ماندہ لشکر مکہ واپس آگیا اور ابوسفیان اپنے تجارتی قافلہ کے ساتھ پہنچ گیا تو اس نے اس قافلہ کو دار الندوہ کے پاس روکا- اور وہ ایسا ہی کرتے تھے- اس نے نہ ہی اس کو جانے دیا اور نہ ہی اس کو تقسیم کیا، ان کے سر آردہ لوگ یہ چاہتے تھے کہ اس کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ سے قتال کے لئے ایک لشکر تیار کریں، عبداللہ بن أبی ربیعہ، عکرمہ بن ابی جہل، حارث بن ہشام، حویطب بن عبدالعزی اور صفوان بن امیہ قریش کے ان لوگوں کے ساتھ ابوسفیان کے پاس گئے جن کے باپ، دادا، بیٹے اور بھائی بدر کی جنگ میں مارے گئے تھے، انہوں نے ابوسفیان بن حرب سے اور قریش کے ان تمام لوگوں سے بات کی جن کا بھی اس قافلہ میں تجارتی مال تھا اور کہا کہ اے قریش کے لوگو! بے شک محمدؐ نے تمہارے پیاروں کو ختم کرکے تمہیں سخت نقصان پہنچایا ہے اور تمہارے بہترین لوگوں کو قتل کیا ہے، لہذا اس کے ساتھ جنگ کرنے کے سلسلہ میں اس مال کے ذریعہ ہماری مدد کرو تاکہ ہم اس سے ان لوگوں کا بدلہ لے سکیں جن کو اس نے ہم سے چھین لیا ہے۔ یہ سن کر ابوسفیان نے کہا: میں پہلا شخص ہوں جو اس بات کے لئے تیار ہے۔ (سیرت ابن ہشام: 3/68)

جبیر بن مطعم نے اپنے ایک حبشی غلام کو بلایا جس کو وحشی کہا جاتا تھا اور حبشیوں کی طرح نیزہ ایسے نشانہ پر لگاتا تھا جو کم ہی خطا کرتا تھا، اس نے اس سے کہا: ان لوگوں کے ساتھ نکلو اگر تم نے محمد کے چچا حمزہ کو میرے چچا طعیمہ بن عدی کے بدلے میں قتل کر دیا تو تم آزاد ہو۔ (دیکھیں: سیرت ابن ہشام: 3/79)

۳: اقتصادی اور معاشی سبب:

اسلامی ریاست کے ذریعہ شروع کی گئی سرایا اور عسکری مہموں کی تحریک نے قریش کی معیشت کو بُری طرح متاثر کر رکھا تھا، اور ان کے خلاف ایک طاقتور معاشی محاصرہ قائم کر رکھا تھا، مکہ کی معیشت کا پورا انحصار و دارومدار سردی اور گرمی کے تجارتی اسفار پر تھا، سرما میں یمن کی جانب سفر ہوتا تھا اور شام کی مصنوعات اور وہاں کی چیزیں یمن پہنچائی جاتی تھیں، جبکہ گرما میں شام کی جانب سفر ہوتا تھا اور یمن کی مصنوعات اور وہاں کی چیزیں شام پہنچائی جاتی تھیں، ان دونوں میں سے کسی ایک کے متاثر ہونے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ دوسرا بھی اس سے متاثر ہو، اس لئے کہ شام کی جانب ان کی تجارت یمن کے سامان پر قائم تھی اور یمن کی جانب ان کی تجارت شام کے سامان پر منحصر تھی۔ (دیکھیں: غزوۃ أحد دراسۃ دعویۃ، ص: 74)

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿لِإِيلَٰفِ قُرَيۡشٍ ۝١ إِۦلَٰفِهِمۡ رِحۡلَةَ ٱلشِّتَآءِ وَٱلصَّيۡفِ ۝٢ فَلۡيَعۡبُدُواْ رَبَّ هَٰذَا ٱلۡبَيۡتِ ۝٣ ٱلَّذِيٓ أَطۡعَمَهُم مِّن جُوعٖ وَءَامَنَهُم مِّنۡ خَوۡفِۭ ۝٤﴾ ترجمہ: "اس لئے کہ قریش کو مانوس کر دیا- ان کو جاڑے اور گرمی کے سفر سے مانوس کرنے کے باعث۔ ان کو اس گھر کے مالک کی عبادت کرنی چاہیے۔ جس نے ان کو بھوک میں کھلایا اور ان کو خوف سے امن دیا"۔ (سورۃ قریش: 1-4)

اس کی مزید وضاحت صفوان بن امیہ کے قول سے ہوتی ہے، وہ کہتا ہے: بے شک محمد اور اس کے اصحاب نے ہماری تجارت گاہوں اور منڈیوں کو نقصان پہنچایا ہے، سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ اس کے اصحاب کے ساتھ ہم کیا کریں، وہ مسلسل ساحل پر موجود رہتے ہیں، اس نے ان ساتھ مصالحت کر رکھی ہے اور ان کے عامۃ الناس اس کے ساتھ شامل ہو گئے ہیں، اب ہمیں سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ہم کہاں جائیں، اگر ہم بیٹھے رہیں تو ہم اپنا سب رأس المال (اصل سرمایہ) کھالیں گے، ہم اس سر زمین میں رہتے ہیں تو اس پر ہمارا گزارا نہیں ہو سکتا ہے، ہمارے یہاں رہنے کا انحصار تو صرف اس پر ہے کہ ہم گرمی میں شام کو اپنی تجارت کا مرکز بنائیں اور سردی میں حبشہ کو تجارتی مرکز بنائیں۔ (المغازی للواقدی: 1/195)

۴: سیاسی سبب:

غزوۂ بدر کے بعد قریش کی سیادت و قیادت کا سورج بھی روز بروز غروب ہوتا چلا گیا، قبائل میں بحیثیتِ قائد و زعیم ان کی مرکزیت بھی متزلزل اور کمزور ہو گئی، اس لئے ضروری تھا کہ وہ اپنی قیادت کو بحال کریں اور اس کی حفاظت کرتے رہیں، چاہے اس کے لئے انہیں کتنی ہی قربانیاں دینی پڑیں، کتنا ہی مال صرف کرنا پڑے اور کتنی بھی جدوجہد اور کوششیں کرنی پڑیں۔

یہ وہ اہم ترین اسباب تھے جن کی وجہ سے قریش نے مدینہ کی اسلامی ریاست کے خلاف عسکری طور پر ٹکر لینے کے لئے کوشش تیز تر کر دیں۔

۲: قریش کا مکہ سے مدینہ کی جانب کوچ:

قریش نے سن تین ہجری کے ماہ شوال میں ہفتہ کے روز اپنی تیاری مکمل کر لی، انہوں نے اپنا لشکر تیار کر لیا جو تین ہزار (۳۰۰۰) جنگجوؤں پر مشتمل تھا، انہوں نے عورتوں اور غلاموں کو اور آس پاس کے عربی قبائل کو اپنے ساتھ لیا، قریش اپنے پورے لاؤ لشکر اور اپنے حامیوں کے ساتھ اور کنانہ اور اہلِ تہامہ کو اپنے ساتھ لے کر نکلے، پردہ نشین خواتین کو بھی انہوں نے اپنے ساتھ لیا تاکہ حرمت و ناموس کی حفاظت کا احساس جانثاری کے ساتھ لڑنے کا سبب بنے اور وہ ہر اعتبار سے یکسو ہو جائیں، اور فرار کے لئے کوئی سبب باقی نہ رہے۔

قائدِ لشکر ابو سفیان ہند بنت عتبہ بن ربیعہ کو لے کر نکلا، صفوان بن امیہ بن خلف نے برزہ بنت مسعود ثقفیہ کو اپنے ہمراہ لیا، عکرمہ بن ابی جہل نے ام حکیم بنت الحارث بن ہشام بن مغیرہ کو اپنے ساتھ لیا اور حارث بن ہشام بن مغیرہ فاطمہ بنت ولید بن مغیرہ کو لے کر نکلا، وہ جنگ کا بگل بجاتے ہوئے آگے بڑھے یہاں تک کہ مدینہ کے قریب وادیٔ قناۃ کے کنارے ایک بنجر زمین پر آکر پڑاؤ ڈال دیا۔ (دیکھیں: الاصابۃ 8/346، سیرت ابن ہشام: 3/70، غزوۃ أحد دراسۃ دعویۃ، ص: 78)

تیاری اور کوچ کرنے سے پہلے قریش کی طرف سے میڈیا کے ذریعہ زبردست پروپیگنڈہ مہم شروع کی گئی تھی جس میں ابو عزہ عمرو بن عبد اللہ جمحی، عمرو بن عاص، ھبیرہ مخزومی اور ابن الزبعری نے بنیادی کردار ادا کیا اور اس کے زبردست نتائج بھی نکلے، قریش کے لشکرِ جرار پر کئے جانے والے جنگی مصارف تقریباً پچاس ہزار سونے کے درہم تک پہنچ گئے۔ (دیکھیں: غزوۃ أحد، ابو فارس، ص: 17)

۳: نبوی انٹیلیجنس کی دشمن کی نقل و حرکت پر مسلسل نظر:

حضرت عباسؓ قریش کی اس ساری نقل و حرکت اور جنگی تیاریوں کا بڑی چابکدستی اور گہرائی سے مطالعہ کر رہے تھے، چنانچہ جیسے ہی یہ لشکر روانہ ہوا حضرت عباسؓ نے اس کی ساری تفصیلات پر مشتمل ایک خط فوراً نبی ﷺ کی خدمت میں روانہ فرمادیا۔

حضرت عباسؓ کا قاصد پیغام رسانی میں نہایت پھرتیلا ثابت ہوا، اس نے مکہ سے مدینہ تک تقریباً پانچ سو کلومیٹر کی مسافت صرف تین دن میں طے کی اور حضرت عباسؓ کا خط نبی کریم ﷺ کے حوالے کر دیا، اس وقت آپؐ مسجد قبا میں تشریف فرما تھے۔ (دیکھیں: الرحیق المختوم، مبارک پوری، ص: 250)

نبی کریم ﷺ اپنے چچا حضرت عباسؓ کی وساطت سے بڑی باریک بینی کے ساتھ قریش کی خبروں پر نظر رکھے ہوئے تھے، ابن عبدالبرؒ فرماتے ہیں: آپؓ مشرکین سے متعلق اطلاعات و معلومات تحریری شکل میں رسول اللہ ﷺ کو لکھ کر بھیجتے تھے، مکہ میں ان کی موجودگی سے مسلمانوں کو قوت ملتی تھی، خود تو وہ یہ چاہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس تشریف لے جائیں، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے ان کو یہ پیغام لکھ کر بھیجا کہ آپ کا مکہ میں موجود رہنا زیادہ بہتر ہے۔ (الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب: 2/812)

حضرت عباسؓ نے رسول اللہ ﷺ کو جو معلومات فراہم کی تھیں وہ انتہائی باریک بینی پر مبنی تھیں، ان کے خط میں یہ مضمون تحریر تھا: "بے شک قریش نے آپ کی جانب کوچ کرنے کا عزمِ مصمم کر رکھا ہے، اگر وہ آپ پر حملہ آور ہوں تو آپ جو کچھ کر سکتے ہیں کر لیں، وہ آپ کی طرف نکل چکے ہیں، ان کی تعداد تین ہزار ہے، ان کے ساتھ دو سو گھوڑے ہیں، سات سو زِرہ پوش ہیں اور تین ہزار اونٹ ہیں، انہوں نے اپنا تمام اسلحہ ساتھ لیا ہے۔ (مغازی الواقدی: 1/204)

یہ خط اہم ترین امور پر مشتمل تھا، اس میں مدینہ کی جانب مشرکین کے لشکر کی نقل و حرکت کی تاکیدی اور یقینی معلومات ہیں، اسی طرح لشکر کی تعداد اور اس کی عسکری صلاحیت کا بھی ذکر کیا گیا ہے، اس کے ذریعہ اس لشکر کا مقابلہ کرنے کے لئے منصوبہ بندی کرنے میں مدد ملے گی۔

اللہ کے رسول ﷺ نے صرف مکی انٹیلجنس کی معلومات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ آپؐ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس دشمن کے بارے میں مختلف ذرائع سے معلومات حاصل کرتے رہتے تھے، اس میں مسلم قائدین کے لئے رہنمائی موجود ہے کہ خبروں پر مسلسل نظر رکھنا ضروری ہے جس کے نتیجہ میں مفید منصوبہ بندی اور حکمتِ عملی تیار کی جاسکتی ہے، اسی لئے آپؐ نے حضرت حباب بن منذر بن جموح کو قریش کی جانب معلومات حاصل کرنے کے لئے بھیجا، وہ مکہ کے لشکر کے بیچ میں پہنچ گئے اور ان کی تعداد اور اسباب و وسائل کا اندازہ کر کے واپس آئے، اللہ کے رسول ﷺ نے ان سے دریافت کیا: کیا دیکھا آپ نے؟ انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! میں نے ایک لشکر دیکھا جس کی تعداد کا اندازہ کم و بیش تین ہزار تک ہے، گھوڑے دو سو ہیں، اور میں نے زرہیں دیکھیں جن کی تعداد کا اندازہ سات سو تک کا ہے، آپؐ نے دریافت فرمایا: کیا آپ نے خواتین کو بھی دیکھا؟ انہوں نے کہا: میں نے خواتین کو دیکھا جن کے پاس دف اور ڈھول تھے۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عورتیں ان کو جوش دلائیں گی اور بدر کے مقتولین کو انہیں یاد دلائیں گی، دیگر ذرائع سے مجھے اسی طرح کی معلومات

ملی ہیں، ان کے بارے میں کسی سے ایک بات بھی ذکر مت کرنا، اللہ ہمارے لئے کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے، اے اللہ! تیرے ہی سہارے میں حرکت کرتا ہوں اور تیری ہی مدد سے میں مقابلہ کرتا ہوں۔(دیکھیں: مغازی الواقدی: 1/207)

اسی طرح آپ ﷺ نے فضالہؓ کے دو بیٹوں: انسؓ اور مونسؓ کو قریش کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے بھیجا، انہوں نے اپنے گھوڑوں اور اونٹوں کو یثرب کی قریبی چراہگاہوں میں چرنے کے لئے بھیجا تھا، انہوں نے واپس آکر لشکر کے بارے میں معلومات فراہم کردیں۔(دیکھیں: السیرۃ النبویہ، ابوشہبہ: 2/187)

اللہ کے رسول ﷺ نے جب اچھی طرح تمام معلومات حاصل کرلیں تو آپؐ نے ان معلومات کو صرف قیادت تک محدود رکھنے کا اہتمام کیا تاکہ ان خبروں کا اثر مسلمانوں کی نفسیات پر نہ پڑے، اسی لئے جب حضرت اُبی بن کعبؓ نے حضرت عباسؓ کا خط پڑھا تو آپ ﷺ نے ان کو اس کے بارے میں رازداری برتنے کی تاکید فرمائی، آپؐ فوری طور پر مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور مہاجرین وانصار قائدین کے ساتھ اس صورتحال کا مقابلہ کرنے کے سلسلہ میں تبادلۂ خیال اور مشورہ کیا، آپؐ نے انصار کے سردار حضرت سعد بن ربیعہؓ کو بھی حضرت عباسؓ کے خط کے بارے میں آگاہ فرمایا اور ان سے فرمایا: واللہ! مجھے امید ہے کہ سب بہتر ہی ہوگا، اس خبر کو راز میں رکھنا، جب رسول اللہ ﷺ حضرت سعدؓ کے پاس سے نکلے تو ان کی بیوی نے ان سے کہا: رسول اللہ ﷺ نے آپ سے کیا کہا؟ انہوں نے جواب دیا: تمہارا بُرا ہو! آپ کو اس سے کیا مطلب؟ انہوں نے کہا: میں نے سن لیا ہے جو کچھ انہوں نے آپ سے کہا، انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے بتائی ہوئی سب باتیں بتادیں، حضرت سعدؓ نے تلافی کی کوشش کی اور فرمایا: اے اللہ کے رسولؐ! مجھے ڈر ہے کہ کہیں راز فاش نہ ہو جائے اور آپ یہ سوچیں کہ میں نے ہی راز فاش کیا ہے، حالانکہ آپ نے مجھ سے راز رکھنے کی بات کہی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔(دیکھیں: السیرۃ الحلبیۃ: 2/489)

اس واقعہ میں افواج کے لئے اہم سبق ہے اور ان کو اس بات پر متنبہ کیا گیا ہے کہ اپنی ازواج سے عسکری رازوں کو، ان کے منصوبوں، حکمتِ عملی اور اوامر کو راز میں رکھیں اور اس طرح کے رازوں کے افشاء سے احتیاط برتیں، اس لئے کہ ان کے افشاء سے امت کو اور اس کے مستقبل کو نقصان ہو سکتا ہے۔

اقوام وامم کی قدیم اور جدید تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی اقوام پر ہزیمت وشکست اور آلام ومصائب اس لئے آئے ہیں کیونکہ دشمنوں تک ان کی افواج کے اسرار خیانت کرنے والی زوجہ یا دوست یا رشتہ دار کے بھیس میں پائے جانے والے دشمن کے ذریعہ پہنچے۔(دیکھیں: غزوۃ اُحد، ابوفارس، ص: 22)

۴: آپ ﷺ کی اپنے اصحاب کے ساتھ مشاورت:

اللہ کے رسول ﷺ نے جب کفارِ قریش کے بارے میں مکمل معلومات جمع کرلیں تو آپ ﷺ نے اپنے اصحاب کو جمع فرمایا اور ان کے ساتھ مشورہ کیا کہ کیا مدینہ میں موجود رہتے ہوئے قلعہ بند ہو کر مقابلہ کیا جائے یا پھر مدینہ سے باہر نکل کر مشرکین کے ساتھ جنگ کی جائے؟ نبی کریم ﷺ کی رائے مدینہ میں رہ کر مقابلہ کرنے کی تھی، آپؐ نے فرمایا کہ ہم ایک محفوظ مقام پر ہیں، اگر آپ مناسب سمجھو تو

یہیں مقیم رہو اور انہوں نے جہاں پڑاؤ ڈالا ہے ان کو وہیں ان کے حال پر چھوڑ دو، اگر وہ وہیں پر مقیم رہیں گے تو خراب جگہ مقیم رہیں گے اور اگر وہ ہم پر حملہ آور ہوتے ہیں تو ہم ان کے ساتھ یہیں پر لڑیں گے۔(دیکھیں: تاریخ طبری 2/60)

عبداللہ بن اُبی کی رائے بھی وہی تھی جو رسول اللہ ﷺ کی رائے تھی مگر مسلمانوں میں سے کچھ لوگ جو بدر میں شرکت سے محروم رہے تھے انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ! ہمیں ہمارے دشمنوں کی طرف لے کر نکلیں۔(غزوۃ أحد دراسة دعوية، ص: 82)

ابن کثیرؒ فرماتے ہیں: اکثر لوگوں کی رائے یہی تھی کہ دشمن کی طرف نکل کر مقابلہ کیا جائے اور وہ رسول اللہ ﷺ کے قول اور آپؐ کی رائے کو نہیں سمجھ پائے اور اگر وہ اس رائے پر متفق ہو جاتے تو اسی پر فیصلہ ہو جاتا لیکن قضاو قدر کا فیصلہ غالب آگیا اور جن لوگوں نے مدینہ سے باہر نکل کر مقابلہ کرنے کی رائے دی تھی ان میں سے اکثریت ان لوگوں کی تھی جو بدر میں شریک نہیں ہو سکے تھے، ان کو اہل بدر کے فضائل کا علم ہو چکا تھا۔(دیکھیں: البدایہ والنہایہ: 4/14)

ابن اسحاقؒ فرماتے ہیں: جو لوگ دشمن سے مقابلہ کرنے کے جذبات سے سرشار تھے وہ مسلسل آپ ﷺ سے اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ اپنے گھر میں تشریف لے گئے، آپؐ نے اپنی زرہ زیب تن فرمائی تو باہر صحابہ کرام ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے اور کہنے لگے: نبی کریم ﷺ نے ایک رائے کا اظہار فرمایا اور آپ لوگوں نے دوسری رائے دی، اے حمزہ! آپ جائیں اور نبی کریم ﷺ سے عرض کریں کہ ہم آپ کے فیصلہ کے تابعِ فرمان ہیں۔ حضرت حمزہؓ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور آپؐ سے عرض کیا: اے اللہ کے نبیؐ! لوگ آپس میں ایک دوسرے کو ملامت کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ ہم آپ کے تابعِ فرمان ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: پیغمبر کو زیبا نہیں دیتا کہ قتال کئے بغیر ہتھیار پہن کر اتار دے۔(مسند احمد: 3/351، مصنف عبدالرزاق: 5/364، ابن سعد: 2/38، الدلائل للبیہقی: 3/208، مجمع الزوائد: 6/107، سیرت ابن ہشام: 3/71)

جو حضرات مدینہ سے باہر نکل کر مقابلہ کرنا چاہتے تھے ان کی رائے چند امور پر مبنی تھی:

۱) بیت عقبۂ ثانیہ میں انصار نے یہ معاہدہ کیا تھا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی نصرت کریں گے، اس لئے ان کی اکثریت یہ سمجھتی تھی کہ مدینہ میں رہ کر مقابلہ کرنا اس معاہدہ کی خلاف ورزی ہے۔

۲) بعض مہاجرین یہ سمجھتے تھے کہ وہ مدینہ کا دفاع کرنے، قریش کے ساتھ مقابلہ کرنے اور انصار کی زمینوں سے ان کو دور رکھنے کا زیادہ حق رکھتے ہیں۔

۳) جو لوگ غزوۂ بدر میں شریک نہیں ہو سکے تھے وہ دشمن کا آمنا سامنا کرنے کے جذبات سے سرشار تھے اور اللہ کی راہ میں شہادت حاصل کرنے کے شوق سے ان کا پیمانۂ صبر لبریز ہو رہا تھا۔

۴) لوگوں کی اکثریت یہ سمجھ رہی تھی کہ اگر قریش نے مدینہ کا محاصرہ کیا تو یہ ان کی ایسی کامیابی ہو گی جس کا خواب دیکھنے کا انہیں موقع نہیں دیا جانا چاہئے، اسی طرح ان کو اس کا بھی اندیشہ تھا کہ محاصرہ کی مدت طویل ہو سکتی ہے، اس لئے جب باہر سے ضروریاتِ زندگی کے تمام وسائل منقطع ہو جائیں گے یہ مسلمانوں کے لئے ایک چیلنج بن جائے گا۔(دیکھیں: غزوۃ أحد، احمد عزالدین، ص: 51-52)

جہاں تک تعلق ہے ان لوگوں کا جو مدینہ میں رہ کر مقابلہ کرنے کی رائے رکھتے تھے، ان کی رائے مندرجہ ذیل جنگی منصوبہ بندی اور حکمتِ عملی پر مبنی تھی:

۱) مکی لشکر کسی ایک یونٹ پر مشتمل نہیں تھا، بلکہ وہ مختلف قبائل اور مختلف افکار و مقاصد کے حامل افراد پر مشتمل تھا، اس لئے اس لشکر کے لئے زیادہ وقت تک متحد رہنا ناممکن تھا اور ان کے درمیان اختلاف ہونا ضروری تھا، چاہے جلدی ہوتا یا دیر سے۔

۲) ان شہروں پر حملہ کرنا نہایت مشکل کام تھا جن کے باشندے اپنے وطن، قلعوں اور باشندوں کی طرف سے دفاع کرنے کے لئے پُرعزم تھے، خاص طور پر اس وقت جب کہ دونوں افواج کے پاس موجود اسلحہ ایک جیسا اور ملتا جلتا ہو، چنانچہ اُحد کے دن فریقین کے ہتھیار ایک جیسے تھے۔

۳) دفاع کرنے والے جب اپنے اہلِ خانہ کے مابین ہوں گے تو وہ اپنی اولاد کی طرف سے دفاع کرنے میں اور اپنی خواتین، بیٹیوں اور عزت و عفت کی حفاظت وحمایت کرنے میں جوانمردی اور بہادری دکھائیں گے۔

۴) خواتین اور بچے بھی جنگ میں شریک ہوں گے اور اس طرح لڑنے والوں کی تعداد دوچند ہو جائے گی۔

۵) دفاع کرنے والے اس اسلحہ اور وسائل کا بھی استعمال کر سکیں گے جس کا دشمن کی صفوں میں اثر پڑے گا جیسے کہ پتھر وغیرہ، اسی طرح حملہ کرنے والوں کا نشانہ بھی ان کے کنٹرول میں ہوگا۔ (دیکھیں: القیادۃ العسکریۃ، الرشید، ص: 374)

یہ بات واضح ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحاب کی تربیت اس انداز سے کی تھی کہ مشاورت کے وقت وہ اپنی آراء کو صراحت کے ساتھ بیان کریں، یہاں تک کہ اگرچہ ان کی رائے رسول اللہ ﷺ کی رائے کے مخالف ہی کیوں نہ ہو، آپ ﷺ صحابہ کرام سے ایسے امور کے بارے میں مشاورت فرماتے تھے جن کے بارے میں کوئی نص موجود نہ ہوتی تاکہ ان کو اس بات کا عادی بنایا جائے کہ وہ عمومی امور کے بارے میں غور و فکر کریں اور امت کی مشکلات کا علاج کریں، اس لئے کہ اس مشورہ کا کوئی فائدہ نہیں ہے جس میں اظہارِ رائے کی آزادی نہ ہو، ایسا کبھی نہیں ہوا کہ رسول ﷺ نے کسی کو ملامت کی ہو جبکہ اس سے اجتہاد کرنے میں غلطی ہوئی ہو اور اس کی رائے درست نہ ہو، اسی طرح شوریٰ کے فیصلہ پر عمل کرنا، امیر اور امام کے لئے ضروری ہے، اس لئے ضروری تھا کہ رسول ﷺ قرآنی حکم کو عملی جامہ پہناتے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ ٱللَّهِ لِنتَ لَهُمْ ۖ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ ٱلْقَلْبِ لَٱنفَضُّوا۟ مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَٱعْفُ عَنْهُمْ وَٱسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِى ٱلْأَمْرِ ۖ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى ٱللَّهِ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ يُحِبُّ ٱلْمُتَوَكِّلِينَ﴾ ترجمہ: ”(اے پیغمبرؐ) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم اِن لوگوں کے لئے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو، ورنہ اگر کہیں تم تند خو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمہارے گردوپیش سے چھٹ جاتے، اِن کے قصور معاف کر دو، اِن کے حق میں دعائے مغفرت کرو، اور دین کے کام میں ان کو بھی شریک مشورہ رکھو، پھر جب تمہارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسہ کرو، اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اُسی کے بھروسہ پر کام کرتے ہیں“۔ (سورۃ آل عمران: 159)

اس طرح کا حکم اس لئے دیا گیا تاکہ امت بھی مشاورت پر عمل کرنے کی عادی ہو جائے،اس کے ذریعہ صحابہ کرام کی سیاسی بصیرت کا بھی اندازہ ہوتا ہے اگرچہ ان کو اظہارِ رائے کی آزادی تھی لیکن ان کے لئے یہ درست نہیں تھا کہ وہ اپنی رائے کو قائد پر تھوپیں،ان کے لئے صرف اپنی رائے کا اظہار کافی تھا اور قائد کو کوئی بھی رائے اختیار کرنے کا حق تھا،جب انہوں نے محسوس کیا کہ انہوں نے مدینہ سے باہر نکلنے پر اصرار کیا ہے اور رسول ﷺ نے ان کے اصرار کی وجہ سے نکلنے کا ارادہ کیا ہے تو انہوں نے واپس آکر معذرت کر دی، لیکن رسول ﷺ نے ان کو ایک دوسرا سبق سکھایا اور یہ کامیاب قیادت کی اہم صفات میں سے ہے،وہ سبق یہ تھا کہ کسی بھی کام کو شروع کرنے اور عزم مصمم کرنے کے بعد اس میں تردّد اور پس و پیش سے کام نہ لیا جائے،اس لئے کہ اس کے ذریعہ اس کام کے بارے میں اعتماد ختم ہو جائے گا اور رفقاء کے مابین انتشار کی کیفیت پیدا ہو گی۔(دیکھیں:السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ : 2/380)

نبی کریم ﷺ نے مدینہ سے نکلنے کا عزم مصمم کر لیا تھا،آپؐ نے عمومی ایمرجنسی کا اعلان کر لیا تھا اور سب لوگوں نے قتال کی تیاری کر لی تھی،انہوں نے رات مکمل احتیاط اور حفاظتی انتظامات کے ساتھ گزاری،ہر ایک ہتھیار بند تھا اور سونے کی حالت میں بھی اسلحہ ساتھ تھا، آپ ﷺ نے مدینہ کی حفاظت کرنے کے احکامات جاری کئے، آپؐ نے مسلمانوں میں سے پچاس بہادر جنگجو افراد کا انتخاب کیا،اور محمد بن مسلمہؓ کی قیادت میں ان کو پہرہ پر متعین فرمایا، صحابہ کرامؓ نے رسول ﷺ کی حفاظت کا اہتمام کیا،حضرت سعد بن معاذؓ،حضرت اُسید بن حضیرؓ،حضرت سعد بن عبادہؓ نے دیگر صحابہ کرام کے ساتھ جمعہ کی رات اس حال میں گزاری کہ وہ مسجد نبوی کے دروازہ پر رسول ﷺ کی حفاظت کی غرض سے اسلحہ سے لیس تھے۔(دیکھیں: غزوۃ اُحد،ابو فارس،ص: 34-35)

۵:احد کی جانب مسلم فوج کی روانگی:

اُ: اللہ کے رسول ﷺ نے دشمن کی طرف کوچ کرنے کے وقت جو اہم حکمتِ عملی اختیار کی تھی وہ یہ تھی کہ آپؐ نے روانگی کے لئے مناسب وقت اور مناسب راستہ اختیار کیا جو آپؐ کے تیار کردہ منصوبے کے عین مطابق تھا، چنانچہ آپؐ نے آدھی رات گزرنے کے بعد کوچ کیا جبکہ ماحول پُر سکون ہوتا ہے اور لوگوں کی نقل و حرکت کم ہوتی ہے،اس وقت عام طور پر دشمن گہری نیند میں ہوتا ہے،اس لئے کہ تھکاوٹ اور سفر کی مشقت کی وجہ سے وہ نڈھال ہو چکے ہوتے ہیں۔

اور یہ بات معروف ہے کہ جو تھکاوٹ کے بعد سوتا ہے تو اس کی نیند گہری ہوتی ہے اور وہ بلند آوازوں اور نقل و حرکت کو محسوس نہیں کرتا ہے،امام واقدیؒ فرماتے ہیں: رسول ﷺ سو گئے یہاں تک کہ تاریکی بڑھ گئی اور جب وقتِ سحر ہوا تو آپؐ نے دریافت کیا: رہبر کہاں ہیں؟(المغازی للواقدی: 1/217)

اللہ کے رسول ﷺ نے لشکر کے کوچ کے لئے مناسب راستہ کا انتخاب فرمایا جس کے ذریعہ براہِ راست معرکہ کے مقام تک پہنچتے، آپؐ نے اس راستہ کی صفات کا ذکر بھی کیا جن میں سے اہم ترین صفت رازداری تھی تاکہ مسلمان لشکر کی خبر دشمنوں سے پوشیدہ رہے، آپؐ نے صحابہ کرام سے فرمایا: کون ہے جو ہمیں ان لوگوں تک قریب ترین راستے سے اس طرح لے کر جائے کہ وہ راستہ براہِ راست ان تک نہ

پہنچتا ہو؟ یہ سن کر حضرت ابو خیثمہؓ نے اپنی خدمات کو پیش کرتے ہوئے فرمایا: میں کر سکتا ہوں، اے اللہ کے رسولؐ! وہ لشکر کو بنو حارثہ کے حرّہ اور کھیتوں کے راستے سے لے کر گئے، اس راستے سے گزرتے ہوئے ان کا گزر ربعی بن قیظی - ابن ہشام کی روایت کے مطابق مربع بن قیظی - کے باغ سے ہوا، یہ شخص منافق اور نابینا تھا، اس نے اس لشکر کی آمد محسوس کی تو مسلمانوں کے چہروں پر دھول پھینکنے لگا اور کہنے لگا: اگر آپ اللہ کے رسول ہیں تو آپ کو میرے باغ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔

بعض روایات میں مذکور ہے کہ اس نے مٹھی بھر مٹی ہاتھ میں لی اور کہا: واللہ! اگر میں اس طرح نشانہ لگا سکتا کہ آپ کے علاوہ کسی اور کو یہ مٹی نہ لگتی تو میں اسے آپ کے چہرے پر پھینکتا، صحابہ کرام اسے قتل کرنے کے لئے آگے بڑھے لیکن آپ ﷺ نے فرمایا: اسے قتل نہ کرو، یہ دل اور آنکھ دونوں کا اندھا ہے، رسول ﷺ کے منع کرنے سے پہلے ہی انصار کے بنو عبد الاشہل کے بھائی حضرت سعد بن زیدؓ نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر کمان سے مارا اور اس کو زخمی کر دیا۔ (المغازی للواقدی1/218، تاریخ طبری:2/506، سیرت ابن ہشام:3/69)

بے شک اللہ کے رسول ﷺ کا درختوں اور باغات کے درمیان سے گزرنا اس پر دلالت کرتا ہے کہ آپؐ نے دورانِ سفر مناسب حفاظتی احتیاط اختیار کرنے کا خاص اہتمام کیا، اس لئے کہ عمومی راستہ اختیار کرنے کی صورت میں دشمن کے سامنے مسلمانوں کی تعداد ظاہر ہو سکتی ہے جو کہ ایک نقصان دہ چیز ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے امت کو زمان و مکان ہر اعتبار سے رازداری اختیار کرنے کی تعلیم دی ہے تاکہ دشمن کو ان کی فوج اور اسباب و وسائل کے بارے میں صحیح اندازہ نہ ہونے پائے، ورنہ وہ اسی اعتبار سے اپنی منصوبہ بندی کریں گے اور مسلمان فوج کی تمام تیاری اور حکمتِ عملی رائیگاں جائے گی۔

اس واقعہ کے ذریعہ ایک اور قاعدہ معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ مصلحتِ خاصہ کے مقابلہ میں مصلحتِ عامہ کو ترجیح دی جائے گی جبکہ دونوں مصلحتوں میں تضاد ہو، چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ جب مربع بن قیظی منافق کی زمین کے پاس سے لشکر لے کر نکلے، اس کے نتیجہ میں اس کی کھیتی کا نقصان ہوا، آپ ﷺ گزر گئے اور اس کی کوئی پرواہ نہیں کی، اس لئے کہ اس میں اُحد کی جانب قریب ترین راستہ اختیار کرنے کی عمومی مصلحت پیشِ نظر تھی، اس عمل کے ذریعہ آپؐ نے یہ واضح فرما دیا کہ ہر وہ چیز جس میں دینی مصلحت ہو وہ دوسری تمام مصلحتوں پر مقدم اور قابل ترجیح ہے، یہاں پر دو مصلحتوں میں تعارض ہوا، ایک طرف عمومی مصلحت تھی اور دوسری طرف خصوصی مصلحت تھی، اس موقع پر دینی مصلحت عمومی مصلحت تھی اور وہ خصوصی مصلحت یعنی مالی مصلحت پر مقدم اور قابل ترجیح ہے۔ (غزوۃ اُحد، دراسۃ دعویۃ، ص:168، ضوابط المصلحۃ، محمد سعید رمضان البوطی، ص: 23، المقاصد العامۃ للشریعۃ، یوسف حامد العالم، ص:166)

ب: منافق ابن سلول کی تہائی لشکر کے ساتھ علحیدگی اور سرکشی:

جب لشکر مقام "شوط" پہنچا تو منافق ابن سلول تین سو منافقین کو لے کر کھسک گیا اور اس نے بغاوت کر دی، وہ یہ دلیل دے رہے تھے کہ مشرکین کے ساتھ قتال کی نوبت نہیں آئے گی اور اس بات پر احتجاج کیا کہ اس کی بات نہیں مانی گئی اور مدینہ سے باہر نکل کر لڑنے کی رائے کے مطابق فیصلہ کیا گیا، وہ کہہ رہا تھا کہ آپؐ نے لونڈوں کی بات مان لی جن کی رائے کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور میری رائے کو ٹھکرا

دیا، ہم کیوں خوامخواہ اپنی جانیں دیں؟! اس موقع پر بغاوت کر کے اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اسلامی لشکر میں اضطراب وانتشار اور کھلبلی پیدا ہوتا کہ ان کے حوصلے ٹوٹ جائیں اور دشمن کے حوصلے بلند ہوں، اس کی یہ بغاوت اسلام اور مسلمانوں کے تئیں خطرناک قسم کی خیانت اور عداوت تھی مگر اللہ تعالی کی حکمت کا تقاضا تھا کہ لشکرِ اسلامی کی تمحیص ہو تاکہ کھرا کھوٹا الگ ہو جائے اور مومن ومنافق اور مخلص ومفاد پرست الگ الگ ہو جائیں۔ (غزوۃ اُحد، دراسۃ دعویۃ، ص: 84)

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿مَّا كَانَ ٱللَّهُ لِيَذَرَ ٱلْمُؤْمِنِينَ عَلَىٰ مَآ أَنتُمْ عَلَيْهِ حَتَّىٰ يَمِيزَ ٱلْخَبِيثَ مِنَ ٱلطَّيِّبِ ۗ وَمَا كَانَ ٱللَّهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى ٱلْغَيْبِ﴾ ترجمہ: ''اللہ مومنوں کو اس حالت میں ہرگز نہ رہنے دے گا جس میں تم اس وقت پائے جاتے ہو وہ پاک لوگوں کو ناپاک لوگوں سے الگ کر کے رہے گا مگر اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ تم کو غیب پر مطلع کر دے''۔ (سورۃ آل عمران: 179)

فی الحقیقت بزدلی، خوف اور پسپائی وہ اسباب تھے جنہوں نے منافقین کی پول کھول دی، لہذا اس سے پہلے کہ قرآن ان کی حقیقت بیان کرتا وہ خود ہی اپنے سامنے اور لوگوں کے سامنے رسوا ہو گئے۔ (دیکھیں: مرویات غزوۃ اُحد، حسین احمد، ص: 71)

ج: منافقین کی سرکشی کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن حرامؓ کا موقف:

حضرت عبداللہ بن حرامؓ نے منافقین کو قائل کرنے کی کوشش کی، لیکن انہوں نے ان کی ہر بات کو ٹھکرا دیا، حضرت عبداللہ بن حرامؓ نے ان سے کہا تھا: اے میری قوم! میں تمہیں اللہ کا واسطہ دیتا ہوں کہ تم اپنی قوم کو اور اپنے نبی کو بے یار ومددگار مت چھوڑو، جبکہ ان کا دشمن سامنے موجود ہے۔ انہوں نے کہا: اگر ہمیں یقین ہوتا کہ آپ لوگ قتال کرو گے تو ہم آپ کو تنہا نہ چھوڑتے لیکن ہم نہیں سمجھتے ہیں کہ جنگ ہوگی، جب انہوں نے ان کی ایک نہ سنی اور واپس جانے پر ہی اڑے رہے تو حضرت عبداللہ نے کہا: اللہ کے دشمنو! اللہ تم کو دور ہی کر دے، اللہ آپ کی طرف سے اپنے نبی کو بے نیاز کرے گا۔ (دیکھیں: صحیح السیرۃ النبویہ: 277)

سرکشی اور بغاوت کرنے والے ان منافقین کے بارے میں اللہ تعالی نے یہ آیات نازل فرمائیں: ﴿وَمَآ أَصَٰبَكُمْ يَوْمَ ٱلْتَقَى ٱلْجَمْعَانِ فَبِإِذْنِ ٱللَّهِ وَلِيَعْلَمَ ٱلْمُؤْمِنِينَ ﴿١٦٦﴾ وَلِيَعْلَمَ ٱلَّذِينَ نَافَقُوا۟ ۚ وَقِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا۟ قَٰتِلُوا۟ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ أَوِ ٱدْفَعُوا۟ ۖ قَالُوا۟ لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّٱتَّبَعْنَٰكُمْ ۗ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَٰنِ ۚ يَقُولُونَ بِأَفْوَٰهِهِم مَّا لَيْسَ فِى قُلُوبِهِمْ ۗ وَٱللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُونَ﴾ ترجمہ: ''جو نقصان لڑائی کے دن تمہیں پہنچا وہ اللہ کے اذن سے تھا اور اس لئے تھا کہ اللہ دیکھ لے تم میں سے مومن کون ہیں اور منافق کون، وہ منافق کہ جب اُن سے کہا گیا آؤ اللہ کی راہ میں جنگ کرو یا کم از کم (اپنے شہر کی) مدافعت ہی کرو، تو کہنے لگے اگر ہمیں علم ہوتا کہ آج جنگ ہوگی تو ہم ضرور ساتھ چلتے، یہ بات جب وہ کہہ رہے تھے اُس وقت وہ ایمان کی نسبت کفر سے زیادہ قریب تھے، وہ اپنی زبانوں سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتیں، اور جو کچھ وہ دلوں میں چھپاتے ہیں اللہ اسے خوب جانتا ہے''۔ (سورۃ آل عمران: 166-167)

د: بنو سلمہ اور بنو حارثہ:

جب رئیس المنافقین ابن اُبی بن سلول اور اس کے اصحاب واپس آئے تو بنو سلمہ اور بنو حارثہ نے بھی واپس لوٹنے کے بارے میں سوچا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان دونوں قبیلوں کو ثابت قدمی کی دولت سے سرفراز کیا اور ان کو فرار سے بچالیا، اسی سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نازل ہوا: ﴿إِذْ هَمَّت طَّآئِفَتَانِ مِنكُمْ أَن تَفْشَلَا وَٱللَّهُ وَلِيُّهُمَا ۗ وَعَلَى ٱللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ ٱلْمُؤْمِنُونَ﴾ ترجمہ: "یاد کرو جب تم میں سے دو گروہ بزدلی دکھانے پر آمادہ ہوگئے تھے، حالانکہ اللہ ان کی مدد پر موجود تھا اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے"۔ (سورہ آل عمران:122)

حضرت جابر بن عبداللہؓ فرماتے ہیں: یہ آیت ہمارے بنو سلمہ اور بنو حارثہ کے بارے میں نازل ہوئی اور مجھے یہ بات پسند نہیں ہے کہ یہ نازل نہ ہوتیں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَٱللَّهُ وَلِيُّهُمَا﴾ (اللہ ان دونوں کا ولی ہے)۔ (صحیح بخاری:4051)

منافقین کے موقف نے دو مسلمان گروہوں پر بھی اثر ڈالا اور وہ بھی مدینہ واپس لوٹنے کے بارے میں سوچنے لگے لیکن وہ اپنی کمزوری پر غالب آگئے اور وہ اپنے آپ پر فتح پاگئے جبکہ اللہ تعالیٰ نے ان کا ساتھ دیا اور ان سے بزدلی اور خوف کو دور کردیا جس کے نتیجہ میں وہ اہلِ ایمان کے ساتھ ثابت قدم رہے۔

ابن سلول کے طرزِ عمل کے سلسلہ میں صحابہ کے مابین دو قسم کی آراء سامنے آئیں:

۱: بعض صحابہ کی رائے یہ تھی کہ ان منافقین کو قتل کیا جائے جنہوں نے فرار اختیار کرکے مسلمانوں کو تنہا چھوڑ دیا۔

۲: دیگر صحابہ کی رائے یہ تھی کہ ان کو قتل نہ کیا جائے۔

قرآن کریم نے فریقین کے موقف کو اس آیت میں بیان کیا ہے: ﴿فَمَا لَكُمْ فِى ٱلْمُنَٰفِقِينَ فِئَتَيْنِ وَٱللَّهُ أَرْكَسَهُم بِمَا كَسَبُوٓا۟ ۚ أَتُرِيدُونَ أَن تَهْدُوا۟ مَنْ أَضَلَّ ٱللَّهُ ۖ وَمَن يُضْلِلِ ٱللَّهُ فَلَن تَجِدَ لَهُۥ سَبِيلًا﴾ ترجمہ: "پھر یہ تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ منافقین کے بارے میں تمہارے درمیان دو (۲) رائیں پائی جاتی ہیں، حالانکہ جو برائیاں اُنہوں نے کمائی ہیں اُن کی بدولت اللہ انہیں الٹا پھیر چکا ہے، کیا تم چاہتے ہو کہ جسے اللہ نے ہدایت نہیں بخشی اُسے تم ہدایت بخش دو؟ حالانکہ جس کو اللہ نے راستہ سے ہٹادیا اُس کے لئے تم کوئی راستہ نہیں پاسکتے"۔ (سورۃ النساء:88)

ھ: غیر مسلموں سے استعانت کا مسئلہ:

جب اللہ کے رسول ﷺ "شیخین" کے مقام پر پہنچے تو آپؐ نے ایک لشکر دیکھا جس کی آوازیں اور شور سنائی دے رہا تھا، آپ ﷺ نے دریافت کیا: یہ کیا ہے؟ بتلایا گیا کہ عبداللہ بن اُبی بن سلول کے یہودی حلیف ہیں، آپؐ نے فرمایا: ہم اہلِ شرک کے مقابلہ میں اہلِ شرک سے مدد نہیں لیتے ہیں۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویہ الصحیحۃ 3/382)

یہ وہ ضابطہ اور قاعدہ ہے جس کو رسول ﷺ نے اعدائے اسلام سے مدد نہ لینے کے سلسلہ میں واضح فرمایا ہے۔

و: کم سنی کی وجہ سے بعض صحابہ کی واپسی:

مقامِ شیخین میں لشکر کا معائنہ کرتے وقت اللہ کے رسول ﷺ نے چند نوجوانوں کو ان کی کمسنی کی وجہ سے واپس کر دیا، اس لئے کہ وہ ابھی چودہ سال یا اس سے کم عمر کے تھے، ان کے نام یہ ہیں: عبداللہ بن عمرؓ، زید بن ثابتؓ، اسامہ بن زیدؓ، زید بن ارقمؓ، براء بن عازبؓ، ابو سعید خدریؓ، یہ چودہ بچے تھے، یہ ثابت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی ان میں شامل تھے لیکن جب آپ ﷺ کو بتایا گیا کہ رافع بن خدیجؓ تیر انداز ہیں تو آپ ﷺ نے ان کو کم سنی کے باوجود اجازت دے دی، اس بات کا علم حضرت رافع بن جندبؓ کو ہو گیا، وہ حضرت ابو سعید خدریؓ کے چچا اور اپنی والدہ کے شوہر مرّی بن سنان بن ثعلبہ کے پاس گئے اور انہوں نے ہی سمرہؓ کی پرورش کی تھی، یہ ان کے پاس روتے ہوئے گئے اور کہا: ابا جان! رسول ﷺ نے رافع کو تو اجازت دے دی اور مجھے واپس کر دیا حالانکہ میں رافع کو پچھاڑ دیتا ہوں، ان کی والدہ کے شوہر (سوتیلے والد) نبی کریم ﷺ کے پاس گئے اور آپ ﷺ کو ان کے بارے میں بتایا تو نبی کریم ﷺ رافعؓ اور سمرہؓ کی جانب متوجہ ہوئے اور فرمایا: کشتی کرو! چنانچہ حضرت سمرہؓ نے حضرت رافعؓ کو پچھاڑ دیا، یہ دیکھ کر آپؐ نے ان کو بھی اجازت دے دی، جیسے کہ رافعؓ کو اجازت دی تھی اور ان دونوں کو اپنے لشکر کا حصہ بنایا، آپ ﷺ نے الگ الگ دستے تشکیل دیئے جن میں سے ہر دستہ کا مخصوص میدانِ کار اور مخصوص ذمہ داری تھی۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ: 2/383، محمد رسول اللہ 3/571)

قابلِ غور یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت رافعؓ اور حضرت سمرہؓ کو عسکری میدان میں نمایاں کارکردگی کی بنیاد پر ان کے دیگر ساتھیوں کے مقابلہ میں شریکِ جہاد ہونے کی اجازت دے دی جبکہ دیگر کمسن بچوں کو واپس بھیج دیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ جب تلواریں چلیں گی، تیر برسیں گے، نیزے مارے جائیں گے اور گھمسان کی جنگ شروع ہو جائے گی تو وہ صبر نہ کر سکیں اور معرکہ سے فرار اختیار کر لیں گے جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کی صفوں میں انتشار اور خلفشار پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔

دوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ کے جوان، بزرگ یہاں تک کہ کمسن بچے حرکت و عمل سے سرشار تھے، حصول شہادت کے لئے کوشاں اور موت کا سامنا خندہ پیشانی کے ساتھ کر رہے تھے، یہ بات انتہائی حیران کن اور قابلِ تعجب ہے حالانکہ ان کو اس کے لئے کوئی ملکی قانون زور زبردستی نہیں کرتا ہے، نہ ہی قیادت ان کو میدان جنگ میں دھکیلنے کی کوشش کرتی ہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ منہجِ نبوی کے مطابق امت کے مختلف النوع طبقوں کی کتنی بہترین تربیت کی گئی تھی جن کے لئے آخرت محبوب ترین چیز بن جاتی ہے اور وہ دنیا کی تمام زیب و زینت اور آرائش سے بالاتر ہو جاتے ہیں۔

۶: کفارِ مکہ کے مقابلہ میں رسول ﷺ کا منصوبہ اور حکمتِ عملی:

أ: اللہ کے رسول ﷺ نے مشرکینِ قریش کا مواجہہ اور مقابلہ کرنے کے لئے مضبوط و مستحکم حکمتِ عملی تیار کی، آپ ﷺ نے مناسب جگہ کا انتخاب فرمایا اور قتال کے لئے اہل اور باصلاحیت افراد کا انتخاب کیا، اور جس کی جہاد میں شرکت مناسب نہیں تھی اس کو واپس کر دیا، مجاہدین میں سے پچاس کو تیر اندازی کے لئے متعین فرمایا اور ان کو اس سلسلہ میں سخت ہدایات دیں، آپؐ نے لشکر کو تین دستوں میں تقسیم کیا اور ہر دستے کا پرچم اس کے ایک فرد کو عطا کیا۔

۱) مہاجرین کا دستہ: اس کا پرچم حضرت مصعب بن عمیرؓ کو عطا کیا۔

۲) قبیلہ اُوس (انصار) کا دستہ: اس کا علم حضرت اُسید بن حضیرؓ کو عطا کیا۔

۳) قبیلہ خزرج (انصار) کا دستہ: اس کا علم حضرت حباب بن منذر کو عطا کیا۔ (دیکھیں: غزوۃ أحد دراسۃ دعویۃ، ص: 89)

اللہ کے رسول ﷺ کا طریقہ کار یہ تھا کہ آپؐ اپنے اصحاب کو دشمن کا مقابلہ کرنے پر آمادہ کرتے تھے، میدانِ جنگ میں صبر و ثبات کی صفات سے آراستہ ہونے کی ترغیب دیتے تھے تاکہ وہ معنوی اور نفسیاتی اعتبار سے طاقتور ہوں اور دشمن سے مقابلہ کے وقت ثابت قدم رہیں، ایسا ہی آپ ﷺ نے غزوۂ اُحد کے موقع پر بھی کیا، اس سلسلہ میں واقدی رقمطراز ہیں: ''اس کے بعد اللہ کے رسول ﷺ کھڑے ہوئے اور لوگوں میں خطاب فرمایا: اے لوگو! میں آپ کو اس چیز کی وصیت کرتا ہوں جس کی اللہ تعالی نے اپنی کتاب میں وصیت کی ہے، وہ یہ کہ اس کی اطاعت کی جائے اور اس کے محارم سے اجتناب کیا جائے، آپ آج اس شخص کے مقام پر فائز ہو جس کے لئے اجر و ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے اور جس نے اپنے آپ کو صبر و ثبات، یقین، جد وجہد اور عمل کا پابند بنایا، اس لئے کہ دشمن سے جہاد ایک سخت جان عمل ہے، کم ہی لوگ اس پر صبر کر پاتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ عزم و حوصلہ کی نعمت سے سرفراز فرمائے، اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو اس کی اطاعت کرتے ہیں اور شیطان اس کے ساتھ ہوتا ہے جو اللہ کی نافرمانی کرتا ہے، لہذا اپنے اعمال کا آغاز جہاد پر صبر کے ذریعہ کرو اور اس کے ذریعہ اللہ کے کئے ہوئے وعدہ کے طالب رہو، جن چیزوں کا اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے ان کی پابندی کرو، میں آپ کے لئے رشد و ہدایت کا حریص ہوں، اختلاف، آپسی نزاع، حوصلہ شکنی، کمزوری اور عاجزی کی دلیل ہے جس کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا ہے اور ان چیزوں کے ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ نصرت و فتح سے ہمکنار نہیں کرتا ہے۔
(دیکھیں: مغازی الواقدی: 1/221)

اللہ کے رسول ﷺ نے جس مبارک طرزِ عمل کو اختیار فرمایا یہ ہمیں بعض اہم حقائق کی تعلیم دیتا ہے: وہ یہ کہ لشکر چاہے کتنا ہی مسلح اور منظم ہو اس کا اس وقت تک کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا ہے جب تک کہ اس لشکر کے سپاہی ایسے طاقتور اور قوی نفوس کے حامل نہ ہوں جن کو زندگی کے مقابلہ میں موت زیادہ عزیز ہو، اور یہ جذبہ افراد کے اندر اس وقت پیدا ہو سکتا ہے جبکہ وعظ و نصیحت اور تذکیر کے ذریعہ ان کی ذہن سازی کی جائے اور ان کے دلوں میں جہاد اور شہادت کی محبت پیدا کی جائے۔

ج: اللہ کے رسول ﷺ کو جبل اُحد کی اہمیت کا بخوبی ادراک تھا کہ یہ مسلمانوں کے لئے ایک ڈھال کا کام کر سکتا ہے، چنانچہ آپ ﷺ جب مسلمانوں کے لشکر کو لے کر جبل اُحد کے پاس پہنچے تو آپؐ نے ان کی پشت کو پہاڑ کی جانب رکھا اور ان کا رُخ مدینہ کی جانب رکھا اور حضرت

عبداللہ بن جبیرؓ کی امارت میں پچاس تیر اندازوں کا انتخاب فرمایا اور ان کو جبل اُحد کے بالمقابل جبلِ عینین کے اوپر متعین فرمایا، اور ان کو سخت احکامات دیئے، آپؐ نے فرمایا: "اگر تم لوگ دیکھو کہ ہمیں پرندے اچک رہے ہیں تو بھی اپنی جگہ نہ چھوڑنا یہاں تک کہ میں آپ کو نہ بلاؤں اور اگر تم دیکھو کہ ہم نے قوم کو شکست دے دی ہے اور انہیں کچل دیا ہے تو بھی اپنی جگہ نہ چھوڑنا یہاں تک کہ میں تمہیں بلاوا نہ بھیجوں"۔ (صحیح بخاری: 3039، مسند أحمد: 4/293، سنن أبو داؤد: 2662)

آپ ﷺ نے لشکر سے فرمایا: "مسلسل اسی جگہ پر رہنا جب تک کہ میں اجازت نہ دوں"۔ اور فرمایا: "تم میں سے کوئی اس وقت تک جنگ شروع نہ کرے یہاں تک کہ میں اسے قتال کا حکم نہ دوں"۔

تیر اندازوں کے امیر سے آپ ﷺ نے فرمایا: گھوڑ سواروں کو تیروں کے ذریعہ ہم سے دور رکھنا، وہ ہمارے پیچھے سے حملہ نہ کر سکیں، اپنی جگہ ثابت قدم رہنا، چاہے فیصلہ ہمارے حق میں ہو یا ہمارے خلاف۔ (تاریخ طبری: 2/507، المغازی للواقدی: 1/225، الدلائل للبیہقی: 3/227، سیرت ابن ہشام: 3/70)

آپ ﷺ نے تیر اندازوں کو مخاطب کر کے فرمایا: "اپنی جگہ مت چھوڑنا، یہیں پر جمے رہنا، اگر آپ دیکھو کہ ہم نے ان کو شکست دے دی ہے یہاں تک کہ ہم ان کے کیمپ میں داخل ہو چکے ہیں تب بھی اپنی جگہ مت چھوڑنا، اگر آپ دیکھو کہ ہمیں قتل کیا جا رہا ہے تب بھی ہماری مدد کے لئے نہ آنا اور نہ ہی ہماری طرف سے دفاع کرنا، ان پر تیروں کی بارش کرنا، اس لئے کہ گھوڑے تیروں کا مقابلہ نہیں کر پاتے ہیں، ہم اس وقت تک غالب و فتح مند ہیں جب تک کہ آپ لوگ اپنی جگہ برقرار رہیں گے، اے اللہ! میں تجھے ان لوگوں پر گواہ بناتا ہوں"۔ (دیکھیں: السیرۃ الحلبیۃ: 2/496، الرحیق المختوم (دفاعی منصوبہ) تاریخ طبری: 2/507، فتح الباری شرح حدیث نمبر: 4043)

مسلمانوں نے اونچی اور بالائی جگہوں پر اپنا کنٹرول کر لیا اور نشیبی وادی کو مکی لشکر کے لئے چھوڑ دیا تاکہ ان کے سامنے اُحد پہاڑ ہو اور ان کی پشت مدینہ کی جانب ہو، تیر اندازوں کی ذمہ داری یہ طے کی گئی کہ وہ جگہ پر کنٹرول رکھیں گے، پشت سے مسلمانوں کی حمایت و حفاظت کریں گے اور مسلمانوں سے گھوڑ سواروں کو دور رکھیں گے۔ (دیکھیں: غزوۃ أحد دراسۃ دعویۃ، ص: 90)

د: صف بندی اور لشکر کی تنظیم:

اللہ کے رسول ﷺ اپنے اصحاب سے آگے بڑھے اور نماز کی صفوں کی طرح ان کی صف بندی کی، اللہ کے رسول ﷺ صفوں کے درمیان پیدل چلنے لگے اور ان کی صفوں کو درست فرمانے لگے، اپنے اصحاب کو پوزیشنوں پر متعین فرماتے اور کہتے: اے فلاں! آگے بڑھو! اے فلاں! پیچھے نکلو! آپؐ ان کو درست فرما رہے تھے یہاں تک کہ تمام صفیں درست ہو گئیں، آپؐ نے اگلی صفوں میں منتخب و بہادر افراد کو متعین فرمایا جن کی جانبازی اور دلیری معروف تھی، آپؐ نے یہی حکمتِ عملی اختیار فرمائی جو دشمن کو زیر کرنے کے لئے انتہائی مؤثر حکمتِ عملی تھی۔ (دیکھیں العبقریۃ العسکریۃ فی غزوات الرسولؐ، محمد فرج، ص 355-356)

ھ: آپ ﷺ نے قائد کے حکم کے بغیر قتال نہ کرنے کی تاکید فرمائی تاکہ قیادت و ذمہ داری کا مرکز ایک ہی رہے اور انتشار کی کیفیت پیدا نہ ہو۔

....

دوسرا باب

میدانِ کارزار کے مناظر

۱: جنگ کا آغاز، گھمسان کی لڑائی اور مسلمانوں کی فتح کا آغاز:

جنگ کے آغاز میں ابوسفیان نے مسلمانوں کی مضبوط صفوں میں انتشار پیدا کرنے اور دراڑ ڈالنے کی کوشش کی، اس نے انصار کو یہ پیغام بھجوایا: "ہمارے اور ہمارے چچازاد بھائی کے درمیان سے ہٹ جاؤ، ہم واپس چلے جائیں گے، ہمیں تم سے لڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے"۔ انصار نے اس کو سخت جواب دیا جو اس کو ناگوار گزرا۔ (دیکھیں: امتاع الأسماع، المقریزی، 1/120)

جب پہلی کوشش ناکام ہوگئی تو قریش نے ایک دوسری کوشش کی اور یہ کوشش اہلِ مدینہ میں سے ایک خائن مخبر أبو عامر الراهب کے ذریعہ تھی، اس نے بعض انصار کو گمراہ کرنے کی کوشش کی اور کہا: اے اوس کے لوگو! میں ابو عامر ہوں۔ انہوں نے جواب دیا: اے فاسق! اللہ تمہارے ذریعہ کسی آنکھ کو ٹھنڈا نہ کرے۔ جب اس نے ان کا جواب سن لیا تو کہا: میرے بعد میری قوم کو شر لاحق ہوگیا ہے۔ اس کے بعد اس نے ان کے ساتھ سخت جنگ کی اور ان پر سنگ باری کی۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویۃ، ابوشہبہ 2/192، سیرت ابن ہشام)

جنگ کا آغاز حضرت علی بن ابی طالبؓ اور مشرکین کے علمبردار طلحہ بن عثمان کے مابین مبارزت کے ذریعہ ہوا۔ "السیرۃ الحلبیۃ" کے مصنف لکھتے ہیں: طلحہ بن عثمان نکلا اور اس کے ہاتھ میں مشرکین کا علَم تھا، اس نے کئی مرتبہ مبارزت طلب کی لیکن اس کی طرف کوئی نہیں نکلا، اس کے بعد اس نے کہا: اے اصحاب محمدؐ! آپ سمجھتے ہو کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بہت جلد آپ کی تلواروں کے ذریعہ جہنم رسید کرے گا اور آپ کو ہماری تلواروں کے ذریعہ جنت تک پہنچائے گا، کیا تم میں سے کوئی ہے جو مجھے اپنی تلوار کے ذریعہ جہنم رسید کرے گا یا میں اس کو اپنی تلوار کے ذریعہ جنت تک پہنچاؤں گا؟ یہ سن کر حضرت علی بن أبی طالبؓ اس کی طرف نکلے اور اس سے کہا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے! میں تمہیں اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک کہ اللہ تعالیٰ میری تلوار کے ذریعہ تجھے واصلِ جہنم نہیں کرے گا، یا پھر مجھے تیری تلوار کے ذریعہ جنت عطا کرے گا۔ حضرت علیؓ نے اس پر وار کیا اور اس کا پاؤں کاٹ دیا جس کی وجہ سے وہ زمین پر گر گیا اور اس کا ستر کھل گیا۔ اس نے کہا: اے چچازاد بھائی! میں آپ کو اللہ اور قرابت کا واسطہ دیتا ہوں، یہ سن کر حضرت علیؓ پیچھے ہٹ گئے اور اس کو قتل نہیں کیا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے نعرہ تکبیر بلند کیا، بعض صحابہ نے حضرت علیؓ سے کہا: آپ نے اسے قتل کیوں نہیں کیا؟ انہوں نے جواب دیا: میرے چچازاد نے مجھے رحم و قرابت کا واسطہ دیا، جب اس کا ستر کھل گیا تو مجھے اس سے شرم آئی۔ (دیکھیں: السیرۃ الحلبیۃ: 2/497، تفسیر طبری: 7/218)

اس کے بعد معرکۂ عام شروع ہوا اور گھمسان کی جنگ شروع ہوئی، اللہ کے رسول ﷺ اپنے اصحاب کے حوصلوں کو بلند کرنے لگے اور ان کو معنوی اور نفسیاتی اعتبار سے حوصلہ دینے لگے، آپ ﷺ نے تلوار لی اور فرمایا: کون اس کو مجھ سے لے گا؟ سب نے اپنے ہاتھ آگے بڑھائے، ہر ایک کہہ رہا تھا: میں، میں۔ آپ ﷺ نے دریافت کیا: کون اس کو اس کے حق کے ساتھ لے گا؟ یہ سن کر صحابہ پس و پیش

کا شکار ہوگئے اور سماک بن خرشہ ابو دجانہؓ نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ! اس کا حق کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اس کے ذریعہ دشمن پر ایسا وار کرو کہ یہ ٹیڑھی ہو جائے، انہوں نے کہا: میں اس کو اس کے حق کے ساتھ لوں گا۔ آپؐ نے یہ تلوار ان کو عطا کر دی، وہ ایک بہادر و جانباز شخص تھے، جنگ میں پُر اعتماد طریقہ سے اکڑ کر چلتے تھے، جب اللہ کے رسول ﷺ نے ان کو صفوں کے درمیان اکڑ کر چلتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: "یہ چال اگرچہ اللہ کو ناپسند ہے لیکن ایسے موقع پر کوئی حرج نہیں"۔ انہوں نے تلوار لی اور اس کے ذریعہ مشرکین کی کھوپڑیاں الگ کرنے لگے۔ (مسند أحمد: 3/123، صحیح مسلم: 2470، مستدرک حاکم: 3/556، الدلائل للبیہقی: 3/232)

حضرت زبیر بن عوامؓ غزوۂ احد میں حضرت ابو دجانہؓ کی بہادری کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: مجھے بڑا دکھ ہوا جب میں نے رسول ﷺ سے تلوار مانگی تو آپؐ نے وہ تلوار ابو دجانہؓ کو عنایت فرمائی اور مجھے منع فرمایا۔ میں نے کہا کہ میں ان کی پھوپھی صفیہ کا بیٹا ہوں اور میرا تعلق قریش سے ہے، میں آپ ﷺ کے پاس گیا اور ان سے پہلے ہی میں نے تلوار مانگی لیکن پھر بھی آپؐ نے وہ ابو دجانہ کو عنایت فرمائی اور مجھے نظر انداز کر دیا۔ واللہ! میں ضرور دیکھوں گا کہ وہ کیا جوہر دکھائیں گے۔ اس لئے میں ان کے پیچھے پیچھے نکلا، چنانچہ انہوں نے اپنی ایک سرخ پٹی نکالی اور اس کو اپنے سر پر باندھ لیا، انصار کے لوگ کہنے لگے: ابو دجانہ نے موت کی سرخ پٹی (دستارِ موت) نکال لی، جب ابو دجانہؓ وہ پٹی باندھتے تھے تو لوگ ایسا ہی کہتے تھے، وہ یہ پٹی باندھ کر رجزیہ اشعار پڑھتے ہوئے نکلے، وہ کہہ رہے تھے:

أَنَا الَّذي عَاهَدَني خَلِيلي ··· وَنَحْنُ بِالسَّفْحِ لَدَى النَّخِيلِ
أَلَّا أَقُومَ الدَّهْرَ فِي الْكَيُّولِ ··· أَضْرِبْ بِسَيْفِ اللهِ وَالرَّسُولِ

ترجمہ: "میں وہ شخص ہوں مجھ سے میرے خلیل نے وعدہ لیا ہے جبکہ ہم نخلستان میں مقام سفح میں تھے کہ میں کبھی بھی پچھلی صفوں میں کھڑا نہیں رہوں گا اور میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی تلوار کے ذریعہ وار کرتا رہوں گا"۔

اس لئے جو بھی ان کے سامنے آتا تھا وہ اس کو قتل کر دیتے تھے، مشرکین میں ایک ایسا شخص تھا جو کسی بھی زخمی کو دیکھتا تو وہ اس پر حملہ آور ہو جاتا تھا، یہ دونوں ایک دوسرے کے مدّمقابل آنے لگے تو میں نے اللہ سے دعا کی کہ اللہ ان کا آمنا سامنا کرا ہی دے، چنانچہ ان کی مڈ بھیڑ ہو گئی، دونوں نے تلوار سے ایک دوسرے پر وار کئے، مشرک نے جب ابو دجانہؓ پر وار کیا تو انہوں نے اپنی ڈھال کے ذریعہ اس کا دفاع کیا اور پھر حضرت ابو دجانہؓ نے اس پر وار کیا اور اس کا کام تمام کر دیا، اس کے بعد میں نے دیکھا کہ انہوں نے ہند بنت عتبہ کی مانگ کی جانب تلوار اٹھائی اور اس کے بعد ہٹالی، میں نے کہا کہ اس کے بارے میں اللہ اور اس کے رسول ہی زیادہ بہتر جانتے ہیں۔

ابن اسحاق کہتے ہیں: حضرت ابو دجانہؓ نے فرمایا: میں نے ایک انسان کو دیکھا کہ وہ لوگوں کو جنگ کے لئے بہت زیادہ برانگیختہ کر رہا ہے، میں اس کو نشانہ بنانے کے لئے اس کی طرف بڑھا، جب میں نے اس پر تلوار اٹھائی تو اس نے چیخ و پکار شروع کر دی، دیکھتا ہوں کہ وہ ایک عورت ہے، میں نے اسے قتل کرنے سے چشم پوشی کر لی اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ کی شمشیر اس سے زیادہ معزز ہے کہ کسی عورت کے سر پر چلے۔ (دیکھیں: البدایۃ والنہایۃ 4/1، سیرت ابن ہشام: 3/73، الدلائل للبیہقی 3/233)

۲: تیر اندازوں کی خطرناک غلطی:

مسلمانوں نے مشرکین کے ساتھ جنگ کرنے میں انتہائی جوانمردی اور بہادری سے کام لیا، اور ان کا شعار (کوڈ ورڈ) ”أَمِتْ، أَمِتْ“ تھا، انہوں نے خون ریز اور سخت جان جنگ میں شجاعت و بہادری کے جوہر دکھائے جس میں اسلام کے سپاہیوں نے شجاعت و جوانمردی کی اعلیٰ مثال قائم کی، تاریخ نے حضرت حمزہ بن عبد المطلبؓ، حضرت مصعب بن عمیرؓ، حضرت ابودجانہؓ، حضرت ابو طلحہؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور ان جیسے دیگر صحابہ کرامؓ کی بہادری اور جوانمردی کے اعلیٰ نمونے محفوظ کر لئے ہیں اور معرکہ کے ابتدائی مرحلہ میں ہی مسلمانوں نے فتح و کامیابی کا تمغہ اپنے نام کر لیا۔ (دیکھیں: نضرۃ النعیم فی مکارم أخلاق الرسول الکریم: 1/303)

اسی کی منظر کشی کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ اپنی کتاب عزیز میں فرماتا ہے: ﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ ٱللَّهُ وَعْدَهُۥٓ إِذْ تَحُسُّونَهُم بِإِذْنِهِۦ ۖ حَتَّىٰٓ إِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَٰزَعْتُمْ فِى ٱلْأَمْرِ وَعَصَيْتُم مِّنۢ بَعْدِ مَآ أَرَىٰكُم مَّا تُحِبُّونَ ۚ مِنكُم مَّن يُرِيدُ ٱلدُّنْيَا وَمِنكُم مَّن يُرِيدُ ٱلْءَاخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۖ وَلَقَدْ عَفَا عَنكُمْ ۗ وَٱللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَلَى ٱلْمُؤْمِنِينَ﴾ ترجمہ: ”اللہ نے (تائید و نصرت کا) جو وعدہ تم سے کیا تھا وہ تو اُس نے پورا کر دیا، ابتدا میں اُس کے حکم سے تم ہی اُن کو قتل کر رہے تھے مگر جب تم نے کمزوری دکھائی اور اپنے کام میں باہم اختلاف کیا، اور جونہی کہ وہ چیز اللہ نے تمہیں دکھائی جس کی محبت میں تم گرفتار تھے (یعنی مال غنیمت) تم اپنے سردار کے حکم کی خلاف ورزی کر بیٹھے، تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے، تب اللہ نے تمہیں کافروں کے مقابلہ میں پسپا کر دیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے، اور حق یہ ہے کہ اللہ نے پھر بھی تمہیں معاف ہی کر دیا کیونکہ مؤمنوں پر اللہ بڑی نظر عنایت رکھتا ہے“۔ (سورۃ آل عمران: 152)

تیر اندازوں نے جب قریش کو لاحق ہونے والی شکست دیکھ لی اور دیکھا کہ میدانِ جنگ میں مالِ غنیمت پڑا ہوا ہے اس کی وجہ سے انہوں نے یہ سوچ کر اپنی جگہ چھوڑ دی کہ معرکہ تو اب ختم ہو چکا ہے، اس لئے وہ کہنے لگے: اے لوگو! مال غنیمت! مال غنیمت! آپ کے ساتھی غالب آچکے ہیں، اب آپ کس چیز کا انتظار کر رہے ہو؟ حضرت عبد اللہ بن جبیرؓ نے کہا: کیا رسول اللہ ﷺ کی ہدایت بھول گئے؟ انہوں نے کہا: واللہ! ہم لوگوں کے پاس ضرور جائیں گے اور ہم بھی مالِ غنیمت حاصل کریں گے۔ (صحیح بخاری: 3039)

اس کے بعد وہ مالِ غنیمت جمع کرنے کے لئے چل پڑے اور انہوں نے اپنے امیر کی بات کی کوئی پرواہ نہیں کی، حضرت ابن عباسؓ اس وقت تیر اندازوں کی صورتحال کی منظر کشی کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ”جب نبی کریم ﷺ کو مالِ غنیمت حاصل ہوا اور مشرکین کے کیمپ اور سامانِ حرب و ضرب پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا تو تمام تیر انداز بھی ٹوٹ پڑے اور مشرکین کے کیمپ میں مالِ غنیمت جمع کرنے لگ گئے، رسول ﷺ کے اصحاب کی صفیں ایک دوسرے میں مل گئیں وہ اس طرح ہو گئے۔ حضرت ابن عباسؓ نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں ملا لیں۔ لہذا جب تیر اندازوں نے اس درے کو خالی کر دیا جس میں ان کو رکھا گیا تھا تو گھوڑ سواروں کا دستہ اس جانب

سے داخل ہو کر اصحاب رسولؐ پر حملہ آور ہو گیا اور وہ ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے یہاں تک کہ بہت سے مسلمان شہید ہو گئے"۔(مسند أحمد:1/287)

حضرت خالد بن ولید جو مشرکین کے گھوڑ سواروں کے قائد تھے، نے مسلمانوں پر پلٹ وار کرنے کا اچھا موقع دیکھ لیا اور جب مشرکین نے ان کو حملہ کرتے ہوئے دیکھا تو وہ بھی از سرِ نو میدانِ جنگ میں آ گئے اور دو طرف سے مسلمانوں کو گھیر لیا، مسلمان اپنی پہلی پوزیشن چھوڑ چکے تھے اور اب وہ بغیر کسی تنظیم و منصوبہ بندی کے لڑنے لگے، اس لئے ہر ایک اپنے اعتبار سے الگ لڑنے لگا، نہ ان کے اندر نظام تھا اور نہ ہی اتحاد، بلکہ وہ اپنے مسلمان مجاہدین کو بھی پہچاننے سے قاصر تھے، چنانچہ انہوں نے غلطی سے حضرت حذیفہؓ کے والد حضرت یمانؓ کو شہید کر دیا۔(صحیح بخاری: 4065، سیرت ابن ہشام:3/129)

مسلمان میدانِ کارزار میں شہید ہوتے چلے گئے اور رسول ﷺ سے بھی ان کا رابطہ منقطع ہو گیا اور یہ افواہ عام ہو گئی کہ آپ ﷺ بھی شہید ہو گئے ہیں، تمام امور خلط ملط ہو گئے، جنگ نے شدت اختیار کی، مشرکین کو جو بھی ملنے لگا اس کو شہید کرنے لگے، وہ نبی کریم ﷺ کے قریب تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اور انہوں نے آپ پر سنگ باری کی جس کی وجہ سے آپؐ کی ناک زخمی ہو گئی اور آپؐ کے اگلے دندانِ مبارک شہید ہو گئے، آپؐ کا چہرہ زخمی ہو گیا اور آپؐ کے جسمِ اطہر سے خون بہنے لگا۔(دیکھیں: فقہ السیرۃ للغزالی، ص: 294، غزوۃ أحد دراسۃ دعویۃ، ص:98)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ اُحد کے دن رسول ﷺ کے اگلے دانت شہید ہو گئے اور آپ کا سر زخمی ہو گیا، آپؐ اپنے جسم سے خون صاف کرنے لگے اور فرما رہے تھے: وہ قوم کیسے فلاح پا سکتی ہے جنہوں نے اپنے نبی کو زخمی کیا اور اس کے دانت شہید کئے جب کہ وہ ان کو اللہ کی طرف بلا رہا تھا؟!۔(صحیح بخاری:8/112، صحیح مسلم:1791)

اسی پسِ منظر میں اللہ تعالی نے یہ آیت نازل کی: ﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ﴾ ترجمہ: "(اے پیغمبرؐ) فیصلہ کے اختیارات میں تمہارا کوئی حصہ نہیں، اللہ کو اختیار ہے چاہے انہیں معاف کرے، چاہے سزا دے کیونکہ وہ ظالم ہیں"۔(سورۃ آل عمران:128)

ابن قَمِئَہ نے حضرت مصعب بن عمیرؓ پر حملہ کیا اور حضرت مصعبؓ رسول ﷺ سے شکل و شباہت میں ملتے جلتے تھے، اس نے آپؓ کو شہید کر دیا تو اس نے قریش سے کہہ دیا کہ میں نے محمدؐ کو مار دیا ہے۔

جب یہ افواہ پھیل گئی کہ محمد ﷺ شہید ہو گئے ہیں تو مسلمان منتشر ہو گئے، بعض مدینہ میں داخل ہو گئے جب کہ ان میں سے کچھ لوگ پہاڑ کے اوپر چلے گئے اور صحابہ کے سامنے صورتحال خلط ملط ہو گئی، ان کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس اچانک مصیبت کا مقابلہ کیسے کریں، جب یہ خبر عام ہو گئی کہ رسول ﷺ شہید ہو گئے ہیں تو مسلمانوں کا ایک گروہ میدانِ جنگ سے چلا گیا، بعض میدانِ جنگ کے ایک کنارہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ گئے جبکہ دیگر صحابہ نے شہادت کو ترجیح دی، انہی صحابہ میں حضرت انس بن نضرؓ بھی تھے، جن کو بدر میں شریک نہ ہونے کا افسوس تھا اور انہوں نے کہا تھا کہ "واللہ! اگر مجھے اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ کسی معرکہ میں اللہ نے شریک ہونے کا موقع دیا تو اللہ دیکھ

لے گا کہ میں کیا کرتا ہوں"۔ انہوں نے اپنا وعدہ سچ کر کے دکھایا، اُحد کے دن ان کا گزر کچھ ایسے لوگوں کے پاس سے ہوا جن کو اس افواہ نے دم بخود کر دیا تھا اور انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے تھے، حضرت انسؓ نے دریافت کیا: کیوں بیٹھے ہو؟ انہوں نے کہا: رسول ﷺ شہید ہو گئے ہیں، یہ سن کر انہوں نے کہا: اے لوگو! اگر محمدؐ شہید ہو گئے ہیں تو محمدؐ کا رب تو زندہ ہے اور آپ بھی اسی چیز کے لئے جان دے دو جس کے لئے محمدؐ نے جان دی ہے، وہ کہنے لگے: اے اللہ! یہ لوگ جو کہہ رہے ہیں میں اس سے معذرت خواہ ہوں، اور مشرکین نے جو کچھ کیا ہے میں اس کے بارے میں اعلانِ براءت کرتا ہوں، اس کے بعد ان کی ملاقات حضرت سعد بن معاذؓ کے ساتھ ہوئی اور کہا: اے سعد! میں اُحد پہاڑ کی طرف سے جنت کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں۔ اس کے بعد وہ معرکہ کارزار میں گھس گئے اور مسلسل لڑتے رہے یہاں تک کہ شہید ہو گئے، ان کے جسم پر اسی (۸۰) سے زائد تلواروں کے وار، نیزے اور تیر کے زخم پائے گئے، ان کو ان کی بہن کے علاوہ اور کوئی نہیں پہچان سکا، انہوں نے بھی ان کی انگلیوں کے پورے سے پہچانا۔ (صحیح بخاری: 4048، سیرت ابن ہشام: 3/88)

انہی کے بارے میں اور اس طرح کے دیگر افراد کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ قول نازل ہوا: ﴿مِّنَ ٱلْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا۟ مَا عَـٰهَدُوا۟ ٱللَّهَ عَلَيْهِ ۖ فَمِنْهُم مَّن قَضَىٰ نَحْبَهُۥ وَمِنْهُم مَّن يَنتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوا۟ تَبْدِيلًا﴾ ترجمہ: "ایمان لانے والوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے اللہ سے کئے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا ہے، ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی وقت آنے کا منتظر ہے، انہوں نے اپنے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں کی"۔ (سورۃ الاحزاب: 23)

اور جہاں تک تعلق ہے ان لوگوں کا جو بھاگے جا رہے تھے اور کسی چیز کی طرف متوجہ نہیں ہو رہے تھے حالانکہ نبی کریم ﷺ بھی ان کو صبر و ثبات کی دعوت دے رہے تھے، ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ قول نازل کیا: ﴿إِذْ تُصْعِدُونَ وَلَا تَلْوُۥنَ عَلَىٰٓ أَحَدٍ وَٱلرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِىٓ أُخْرَىٰكُمْ فَأَثَـٰبَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوا۟ عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ أَصَـٰبَكُمْ ۗ وَٱللَّهُ خَبِيرٌۢ بِمَا تَعْمَلُونَ﴾ ترجمہ: "یاد کرو جب تم بھاگے چلے جا رہے تھے، کسی کی طرف پلٹ کر دیکھنے تک کا ہوش تمہیں نہ تھا اور رسولؐ تمہارے پیچھے تم کو پکار رہا تھا، اُس وقت تمہاری اس روش کا بدلہ اللہ نے تمہیں یہ دیا کہ تم کو رنج پر رنج دیئے تاکہ آئندہ کے لئے تمہیں یہ سبق ملے کہ جو کچھ تمہارے ہاتھ سے جائے یا جو مصیبت تم پر نازل ہو اس پر ملول نہ ہو، اللہ تمہارے سب اعمال سے باخبر ہے"۔ (سورۃ آل عمران: 153)

قرآن کریم نے صحابہ کرام میں سے ان افراد کا ذکر کیا ہے جو نبی کریم ﷺ کی شہادت کی خبر ملنے کے بعد میدان سے جا رہے تھے، سب سے پہلے صحابی جن کو صحت و سلامتی کے ساتھ رسول ﷺ کے زندہ ہونے کا علم ہوا حضرت کعب بن مالک تھے، انہوں نے باآواز بلند لوگوں کو یہ خوشخبری سنانے کی کوشش کی، لیکن نبی کریم ﷺ نے انہیں سکوت اختیار کرنے کا حکم دیا تاکہ مشرکین کو اس کا علم نہ ہونے پائے۔ (المعجم الاوسط للطبرانی: 1108، المعجم الکبیر للطبرانی: 19/100، مجمع الزوائد: 6/112)

قرآن کریم نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ جو لوگ اس دن میدان چھوڑ کر چلے گئے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف کر دیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ ٱلَّذِينَ تَوَلَّوْاْ مِنكُمْ يَوْمَ ٱلْتَقَى ٱلْجَمْعَانِ إِنَّمَا ٱسْتَزَلَّهُمُ ٱلشَّيْطَٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُواْ وَلَقَدْ عَفَا ٱللَّهُ عَنْهُمْ إِنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ﴾ ترجمہ: ''تم میں سے جو لوگ مقابلہ کے دن پیٹھ پھیر گئے تھے اُن کی اِس لغزش کا سبب یہ تھا کہ ان کی بعض کمزوریوں کی وجہ سے شیطان نے اُن کے قدم ڈگمگا دیئے تھے، اللہ نے انہیں معاف کر دیا، اللہ بہت درگزر کرنے والا اور بُردبار ہے''۔(سورۃ آل عمران: 155)

۳: منتشر لشکر کو متحد کرنے کے لئے رسول ﷺ کا منصوبہ:

جب مشرکین کی جانب سے پیچھے سے پلٹ وار شروع ہوا اور اس حملہ کا بنیادی ہدف نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی تھی، آپ ﷺ اپنی پوزیشن سے ذرہ برابر نہ ہلے، صحابہ کرام یکے بعد دیگرے آپ ﷺ کے سامنے شہید ہو کر گرتے جا رہے تھے، مشرکین کے بیچوں بیچ رسول ﷺ محاصرہ میں آ گئے، آپؐ کے ساتھ صرف آپؐ کے نو(۹) اصحاب تھے، جن میں سے سات(۷) انصار صحابہ تھے۔

اس وقت مسلمانوں کا ہدف یہ تھا کہ مشرکین کا محاصرہ توڑ کر پہاڑ پر چڑھا جائے، انصار صحابہ نے رسول ﷺ کا دفاع کرنے میں انتہائی جانبازی اور بہادری کا مظاہرہ کیا اور یکے بعد دیگرے جامِ شہادت نوش کرتے رہے، حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ نے آپ ﷺ کی طرف سے دفاع کیا یہاں تک کہ وہ زخموں سے چور ہو گئے اور ان کو ایک تیر لگ گیا جس نے ان کے دائیں ہاتھ کو شَل کر دیا، نبی کریم ﷺ چٹان پر چڑھنا چاہتے تھے مگر آپ چٹان پر نہیں چڑھ سکے، اس لئے حضرت طلحہؓ آپؐ کے نیچے بیٹھ کر آپ کو سہارا دینے لگے یہاں تک کہ آپؐ چٹان پر چڑھ گئے، حضرت زبیرؓ فرماتے ہیں: میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ''طلحہ نے واجب کر لی''۔(یعنی: جنت)۔(مسند احمد: 1/165، سنن ترمذی: 1692، صحیح السیرۃ النبویہ، ص: 296)

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے رسول ﷺ کے سامنے جانبازی سے قتال کیا، آپ ﷺ ان کو تیر اٹھا کر دے رہے تھے اور فرما رہے تھے: اے سعد! تیر اندازی کرو، میرے ماں باپ تم پر قربان ہوں۔(مسند احمد: 1/137، صحیح بخاری: 4055، صحیح مسلم: 2412)

اسی طرح حضرت ابو طلحہ انصاریؓ نے بھی آپؐ کے سامنے قتال کیا، وہ ماہر ترین تیر انداز تھے، ان کے متعلق نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''لشکر میں ابو طلحہ کی آواز مشرکین پر ایک بڑی جماعت سے زیادہ سخت اور گراں گزرتی ہے''۔(مسند احمد: 3/203، مسند عبد بن حمید: 1384)

حضرت ابو طلحہؓ اپنی ڈھال کے ذریعہ رسول ﷺ کے لئے سپر کا کام کر رہے تھے، وہ ماہر ترین تیر انداز تھے، اس دن انہوں نے دو یا تین کمانیں تیر اندازی کرتے کرتے توڑ دیں، ان کے پاس سے جو بھی شخص ترکش لے کر نکلتا تو رسول ﷺ فرماتے: اس کے تیر ابو طلحہ کے سامنے ڈال دو، آپ ﷺ اوپر اٹھتے تو حضرت ابو طلحہؓ فرماتے: اے اللہ کے نبی! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، آپ اوپر نہ اٹھیں، آپ کو دشمن کا کوئی تیر نہ لگ جائے، میری گردن آپ کی گردن کے لئے قربان ہے۔(صحیح بخاری: 4064)

حضرت نسیبہ بنت کعبؓ تلوار کے ذریعہ رسول ﷺ کا دفاع کرنے کے لئے ڈٹ گئیں، وہ تیر اندازی کر رہی تھیں اور ان کو بہت زخم لگے، حضرت ابو دجانہؓ نے اپنے آپ کو رسول ﷺ کے سامنے ڈھال بنالیا، تیر ان کی پیٹھ پر برس رہے تھے اور وہ رسول ﷺ پر جھکے ہوئے تھے یہاں تک کہ ان کا جسم تیروں سے چھلنی ہو گیا۔(دیکھیں: البدایۃ والنہایۃ: 4/35-36)

اس سخت جان مرحلہ پر رسول ﷺ کو حضرت ابو بکرؓ اور حضرت ابو عبیدہؓ نے گھیر رکھا تھا، حضرت ابو عبیدہؓ نبی کریم ﷺ کے چہرہ سے اپنے دانتوں سے تیر نکال رہے تھے، اس کے بعد مسلمان جانبازوں کا ایک گروہ پہنچ گیا جن کی تعداد تیس افراد تک تھی، وہ رسول ﷺ کی طرف سے دفاع کر رہے تھے، ان میں حضرت قتادہؓ، حضرت ثابت بن دحداحؓ، حضرت سہیل بن حنیفؓ، حضرت عمر بن خطابؓ، حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ اور حضرت زبیر بن عوامؓ شامل تھے۔

حضرت عمر بن خطابؓ پہاڑ کے بالائی حصہ سے دشمن کے پلٹ وار کو روکنے میں کامیاب ہوگئے جس کی قیادت خالد بن ولید کر رہے تھے، حضرت عمرؓ کے ساتھ جو صحابہ کرام تھے انہوں نے اس سخت حملہ کو روکنے میں جانبازی اور بہادری کے جوہر دکھائے، مسلمان پھر سے واپس آگئے اور انہوں نے از سرِ نو میدانِ کارزار پر کنٹرول حاصل کر لیا، مشرکین کسی نتیجہ خیز فتح کے ذریعہ معرکہ کو ختم کرنے کے بارے میں مایوس ہوگئے اور مسلمانوں کی استقامت اور معرکہ کی طوالت سے وہ تھک ہار گئے، نبی کریم ﷺ اور آپؐ کے ساتھ تمام صحابہ جبلِ اُحد کی ایک گھاٹی کی طرف نکل گئے، رسول ﷺ کے ساتھ پیش آمدہ صورتحال کی وجہ سے اور مشرکین کی طرف سے لاحق ہونے والے نقصان کی وجہ سے مسلمان غم و اَلم اور خوف کی حالت میں تھے، اللہ تعالیٰ نے ان پر اونگھ طاری کر دی جس کی وجہ سے وہ تھوڑی دیر کے لئے سو گئے اور دوبارہ اَمن و اطمینان کی کیفیت کے ساتھ بیدار ہوئے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ثُمَّ أَنزَلَ عَلَيۡكُم مِّنۢ بَعۡدِ ٱلۡغَمِّ أَمَنَةً نُّعَاسًا يَغۡشَىٰ طَآئِفَةً مِّنكُمۡۖ وَطَآئِفَةٌ قَدۡ أَهَمَّتۡهُمۡ أَنفُسُهُمۡ يَظُنُّونَ بِٱللَّهِ غَيۡرَ ٱلۡحَقِّ ظَنَّ ٱلۡجَٰهِلِيَّةِۖ يَقُولُونَ هَل لَّنَا مِنَ ٱلۡأَمۡرِ مِن شَيۡءٍۗ قُلۡ إِنَّ ٱلۡأَمۡرَ كُلَّهُۥ لِلَّهِۗ يُخۡفُونَ فِيٓ أَنفُسِهِم مَّا لَا يُبۡدُونَ لَكَۖ يَقُولُونَ لَوۡ كَانَ لَنَا مِنَ ٱلۡأَمۡرِ شَيۡءٌ مَّا قُتِلۡنَا هَٰهُنَاۗ قُل لَّوۡ كُنتُمۡ فِي بُيُوتِكُمۡ لَبَرَزَ ٱلَّذِينَ كُتِبَ عَلَيۡهِمُ ٱلۡقَتۡلُ إِلَىٰ مَضَاجِعِهِمۡۖ وَلِيَبۡتَلِيَ ٱللَّهُ مَا فِي صُدُورِكُمۡ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمۡۚ وَٱللَّهُ عَلِيمُۢ بِذَاتِ ٱلصُّدُورِ﴾ ترجمہ: ”اس غم کے بعد پھر اللہ نے تم میں سے کچھ لوگوں پر ایسی اطمئنان کی سی حالت طاری کر دی کہ وہ اونگھنے لگے مگر ایک دوسرا گروہ، جس کے لئے ساری اہمیت بس اپنے مفاد ہی کی تھی، اللہ کے متعلق طرح طرح کے جاہلانہ گمان کرنے لگا جو سراسر خلافِ حق تھے، یہ لوگ اب کہتے ہیں کہ اس کام کے چلانے میں ہمارا بھی کوئی حصہ ہے؟۔ان سے کہو (کسی کا کوئی حصہ نہیں) اِس کام کے سارے اختیارات اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ دراصل یہ لوگ اپنے دلوں میں جو بات چھپائے ہوئے ہیں اُسے تم پر ظاہر نہیں کرتے، ان کا اصل مطلب یہ ہے کہ اگر (قیادت کے) اختیارات میں ہمارا کچھ حصہ ہوتا تو یہاں ہم نہ مارے جاتے، ان سے کہہ دو کہ اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن لوگوں کی موت لکھی ہوئی تھی وہ خود اپنی قتل

گاہوں کی طرف نکل آتے، اور یہ معاملہ جو پیش آیا یہ تو اس لئے تھا کہ جو کچھ تمہارے سینوں میں پوشیدہ ہے اللہ اُسے آزمالے اور جو کھوٹ تمہارے دلوں میں ہے اُسے چھانٹ دے، اللہ دلوں کا حال خوب جانتا ہے"۔ (سورۃ آل عمران: 154)

مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ گروہ جس کو اپنی جانوں کی فکر لاحق تھی وہ منافقین کا گروہ تھا۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویۃ، منیر عضبان، 468-470، نضرۃ النعیم: 1/305)

جہاں تک قریش کا تعلق ہے تو وہ کسی فیصلہ کن فتح کو حاصل کرنے کے سلسلہ میں مایوسی کا شکار ہو گئے اور معرکہ کے دراز ہونے اور مسلمانوں کے صبر واستقامت اور جانبازی کی وجہ سے وہ پریشان ہو کر رہ گئے، خاص طور پر اس وقت جب کہ مسلمان از سرِ نو سنبھل گئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو اطمینان واستقامت عطا کی اور وہ رسول ﷺ کے ارد گرد جمع ہو گئے، اس لئے مشرکین مسلمانوں کو مزید نقصان پہنچانے اور ان میں انتشار پیدا کرنے سے باز رہے۔ (نضرۃ نعیم: 1/306)

۴: شہدائے اُحد:

أ: سید الشہداء اور حضرت حمزہ بن عبد المطلبؓ:

شیرِ خدا حضرت حمزہؓ نے غزوۂ اُحد میں خون ریز جنگ لڑی، مشرکین کو قتل کر کے کافی نقصان پہنچایا، بنو عبد الدار میں سے مشرکین پرچم برداروں میں سے معتدد لوگوں کو تہہ تیغ کیا، وہ شجاعت و بہادری اور جواں مردی کے جوہر دکھا رہے تھے اور اقدامی پوزیشن میں تھے، اسی اثناء میں وحشی ان کے لئے گھات میں بیٹھ کر چھپ گیا یہاں تک کہ اس نے آپؓ کو نشانہ پر لیا اور اپنے نیزہ سے ان کو نشانہ بنایا، جس کے نتیجہ میں حضرت حمزہؓ کو شہید کر دیا، وحشی بعد میں حلقہ بگوش اسلام ہوئے اور وہ خود ہی اس المناک منظر کو بیان کرتے ہیں، وحشی کہتے ہیں:

"حمزہؓ نے بدر کے دن طُعیمہ بن عدی بن خیار کو مار ڈالا تھا (جو عبید اللہ کے باپ کا چچا تھا) جبیر بن مطعم نے جو میرے مالک تھے، مجھ سے یہ کہا: اگر تم حمزہؓ کو میرے چچا (طعیمہ) کے بدلے میں مار دو تو تم آزاد ہو، اس لئے جب قریش کے لوگ لڑنے کے لئے نکلے، میں بھی قریش کے ساتھ لڑنے گیا، جب لوگوں نے جنگ کے لئے صف بندی کی تو قریش کی طرف سے ایک شخص سباع بن عبد العزی میدان میں نکلا اور کہا: مجھ سے کون لڑنے کو آتا ہے؟ یہ سنتے ہی حمزہؓ بن عبد المطلب نکلے اور اس کو اشتعال دلانے کی غرض سے حقارت سے کہنے لگے: ارے سباع! ارے ام انمار کے بیٹے! تیری ماں ختنے کرتی تھی اور تو اللہ اور رسولؐ سے مقابلہ کرتا ہے۔ یہ کہہ کر حمزہؓ نے اس پر حملہ کیا، اس کو کل کے دن کی مانند مٹا کر رکھ دیا۔ وحشی نے کہا: میں ایک پتھر کی آڑ میں حمزہ کو مارنے کے لئے چھپ کر بیٹھا رہا، جب میرے قریب آئے تو میں نے اپنا نیزہ ان پر پھینک مارا، وہ ان کے پیٹ کے نچلے حصے میں لگا اور پشت کی جانب سے جسم کے پار ہو گیا، حمزہؓ اسی وقت شہید ہو گئے، جب جنگ کے بعد لوگ واپس آئے میں بھی ان کے ساتھ واپس آیا اور مکہ ہی میں ٹھہرا رہا یہاں تک کہ اسلام وہاں تک پھیل گیا، اس وقت یعنی فتح مکہ کے بعد میں طائف چلا گیا، طائف کے لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کے پاس کچھ سفیر بھیجے، لوگوں نے کہا تھا کہ آپؐ سفیروں کو تکلیف نہیں دیتے ہیں، میں بھی ان سفیروں کے ساتھ مکہ چلا گیا، جب رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچا اور آپؐ نے مجھ کو دیکھا تو فرمایا: کیا وحشی

ہے؟میں نے عرض کیا: جی ہاں۔آپؐ نے فرمایا: حمزہ کو تونے ہی شہید کیا تھا؟میں نے کہا: آپ کو تومکمل واقعہ کا علم ہے کہ حمزہ کو میں نے کیوں مارا؟آپؐ نے فرمایا: مگر کیاتم ایسا کر سکتے ہو کہ میرے سامنے نہ آیا کرو۔ یہ سن کر میں آپؐ کے پاس سے آگیا، جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہو گئی اور مسیلمہ کذاب نامی جھوٹا نبی (یمامہ میں) ظاہر ہوا تو میں نے ارادہ کر لیا کہ میں ضرور جا کر مسیلمہ کو ماروں گا، شاید کہ اس طرح حمزہؓ کے قتل کے گناہ کا کفارہ ہو سکے، پھر میں مسلمانوں کے لشکر کے ساتھ نکلا، مسیلمہ کے لوگوں نے بہت سے صحابہ کو قتل کیا، میں نے دیکھا کہ خود مسیلمہ کذّاب ایک دیوار کی روزن میں کھڑا ہے، سر کے بال بکھرے ہوئے ہیں، راکھ کے رنگ کے اونٹ جیسا شخص ہے، میں نے وہی نیزہ جس سے حمزہؓ کو شہید کیا تھا اس کے سینے کے درمیان میں دے مارا، وہ اس کے دونوں کندھوں سے ہوتا ہوا جسم کے پار نکل گیا، اتنے میں ایک انصاری کود کر آ گیا اور اس کی کھوپڑی پر تلوار کا وار کر دیا"۔

اس حدیث کے ساتھ ہی امام بخاریؒ نے ایک دوسری روایت درج کی ہے کہ اس حدیث کے راویوں میں سے ایک عبداللہ بن فضل کہتے ہیں مجھ کو سلیمان بن یسار نے بتایا انہوں نے عبداللہ بن عمرؓ سے سنا وہ کہتے تھے: "جب مسیلمہ کذاب قتل ہوا تو ایک لونڈی گھر کی چھت پر چڑھ کر یوں کہنے لگی: ہائے امیر المؤمنین یعنی مسیلمہ کو ایک کالے غلام نے مار ڈالا"۔ (دیکھیں: صحیح بخاری: 4072، الدلائل للبیہقی: 3/241، تاریخ طبری: 2/516)

ا: حضرت حمزہؓ کی شہادت کے بارے میں نبی کریم ﷺ کا استفسار:

جب معرکہ تمام ہوا تو رسول ﷺ نے اپنے اصحاب سے دریافت فرمایا: حمزہؓ کی جائے شہادت کسی نے دیکھی ہے؟ایک شخص نے کہا: میں نے ان کی شہادت کی جگہ دیکھی ہے۔آپؐ نے فرمایا: چلو ہمیں دکھاؤ، رسول ﷺ نکلے اور حضرت حمزہؓ کے سامنے کھڑے ہو گئے، آپؐ نے دیکھا کہ ان کا پیٹ چاک کر دیا گیا ہے اور ان کا مثلہ کیا گیا ہے۔اس صحابی نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ! واللہ! ان کا تو مثلہ کر دیا گیا ہے!۔(المعجم الکبیر للطبرانی: 19/82، مجمع الزوائد: 6/119، صحیح السیرۃ النبویہ، ص: 283)

ایک اور روایت میں ہے: جب نبی کریم ﷺ کو حضرت حمزہؓ کی شہادت کی خبر ملی اور آپؐ کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں، جب آپ ﷺ نے ان کو دیکھا تو آپؐ کی ہچکی بندھ گئی، آپ ﷺ شہداء کے درمیان کھڑے ہو کر کہنے لگے: میں ان شہداء پر گواہ ہوں، ان کے خون کے ساتھ ہی ان کی تکفین کرو، اس لئے کہ جو بھی زخم اللہ کی راہ میں لگا ہو گا وہ قیامت کے روز بہتا ہوا آئے گا، اس کا رنگ خون کا رنگ ہو گا، اور اس کی خوشبو مشک کی خوشبو کی طرح ہو گی، ان میں سے جس کو سب سے زیادہ قرآن یاد ہے، اس کو (قبر میں) پہلے رکھو اور ان کو لحدی قبر میں دفن کرو۔(صحیح بخاری: 2079، سنن ابوداؤد: 3138، سنن ترمذی: 1036، سنن نسائی: 1954، سنن ابن ماجہ: 1514)

غزوۂ اُحد میں حضرت حمزہؓ اور اصحاب رسول ﷺ کی شہادت کے ذریعہ آپؐ کا خواب بر حق ثابت ہوا، اس لئے کہ آپؐ نے اُحد کی جانب روانگی سے قبل صحابہ کرام کو ایک خواب کے بارے میں باخبر کیا تھا، آپؐ نے فرمایا تھا: میں نے اپنی تلوار 'ذوالفقار' کی دھار ٹوٹی ہوئی دیکھی، اس کی تعبیر میں نے یہ کی کہ دھار کا ٹوٹنا آپ کو نقصان پہنچنے کا اشارہ ہے۔ میں نے دیکھا کہ میں ایک مینڈھے پر سوار ہوں، اس کی تعبیر لشکر کے مینڈھے سے کی، میں نے دیکھا کہ میں ایک محفوظ زرہ میں ہوں، اس کی تعبیر میں نے مدینہ سے کی، میں نے ایک گائے کو ذبح ہوتے

ہوئے دیکھا تو واللہ! گائے خیر کا اشارہ ہے، واللہ! گائے خیر کا اشارہ ہے، آپ ﷺ نے جیسا فرمایا تھا عین اسی کے مطابق صورتحال پیدا ہوئی۔ (مسند احمد: 1/271، سنن ترمذی: 1561)

۲: حضرت حمزہؓ کی شہادت پر ان کی بہن صفیہ بنت عبد المطلب کا صبر:

حضرت زبیرؓ فرماتے ہیں: سیدنا زبیرؓ سے مروی ہے کہ غزوۂ اُحد کے دن اختتام پر ایک عورت سامنے سے بڑی تیزی کے ساتھ آتی ہوئی دکھائی دی، قریب تھا کہ وہ شہداء کی لاشیں دیکھ لیتی، نبی ﷺ اس چیز کو اچھا نہیں سمجھتے تھے کہ وہ خاتون انہیں دیکھ سکے، اس لئے فرمایا کہ ''اس عورت کو روکو، اس عورت کو روکو''۔ سیدنا زبیرؓ فرماتے ہیں کہ مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ میری والدہ سیدہ صفیہ ؓ ہیں، چنانچہ میں ان کی طرف دوڑتا ہوا گیا اور شہداء کی لاشوں تک ان کے پہنچنے سے قبل ہی میں نے انہیں پکڑ لیا، انہوں نے مجھے دیکھ کر میرے سینے پر دو ہتڑ مار کر مجھے پیچھے کو دھکیل دیا، وہ ایک مضبوط خاتون تھیں اور کہنے لگیں کہ پرے ہٹو، میں تم سے نہیں بولتی، میں نے عرض کیا کہ نبی ﷺ نے آپ کو قسم دلائی ہے کہ ان لاشوں کو مت دیکھیں، یہ سنتے ہی وہ رک گئیں اور اپنے پاس موجود دو (۲) کپڑے نکال کر فرمایا: یہ دو کپڑے ہیں جو میں اپنے بھائی حمزہؓ کے لئے لائی ہوں، کیونکہ مجھے ان کی شہادت کی خبر مل چکی ہے، تم انہیں ان کپڑوں میں کفن دے دینا۔ جب ہم سیدنا حمزہؓ کو ان دو کپڑوں میں کفن دینے لگے تو دیکھا کہ ان کے پہلو میں ایک انصاری شہید ہوئے پڑے ہیں، ان کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا گیا تھا جو سیدنا حمزہؓ کے ساتھ کیا گیا تھا، ہمیں اس بات پر شرم محسوس ہوئی کہ سیدنا حمزہؓ کو دو کپڑوں میں کفن دے دیں اور اس انصاری کو کفن کا ایک کپڑا بھی میسر نہ ہو، اس لئے ہم نے یہ طے کیا کہ ایک کپڑے میں سیدنا حمزہؓ کو اور دوسرے میں اس انصاری صحابیؓ کو کفن دیں گے، اندازہ کرنے پر ہمیں معلوم ہوا کہ ان دونوں حضرات میں سے ایک زیادہ لمبے قد کے تھے، ہم نے قرعہ اندازی کی اور جس کے نام جو کپڑا نکل آیا اسے اسی کپڑے میں کفن دے دیا۔ (مسند أحمد: 1/165، مسند بزار: 1797، مسند ابو یعلی: 686، الدلائل للبیہقی: 3/290، مجمع الزوائد: 6/118، صحیح السیرۃ النبویہ، ص: 285)

۳: حضرت حمزہؓ کے بارے میں حضرت صفیہؓ کا مرثیہ:

أَسَائِلَةٌ أَصْحَابَ أُحُدٍ مَخَافَةً ⋯ بَنَاتُ أَبِي مِنْ أَعْجَمٍ وَخَبِيرِ
فَقَالَ الْخَبِيرُ إِنَّ حَمْزَةَ قَدْ ثَوَى ⋯ وَزِيرُ رَسُولِ اللَّهِ خَيْرُ وَزِيرِ
دَعَاهُ إِلَهُ الْحَقِّ ذُو الْعَرْشِ دَعْوَةً ⋯ إِلَى جَنَّةٍ يَحْيَا بِهَا وَسُرُورِ
فَذَلِكَ مَا كُنَّا نُرَجِّي وَنَرْتَجِي ⋯ لِحَمْزَةَ يَوْمَ الْحَشْرِ خَيْرُ مَصِيرِ
فَوَاللَّهِ لَا أَنْسَاكَ مَا هَبَّتِ الصَّبَا ⋯ بُكَاءً وَحُزْنًا مَحْضَرِي وَمَسِيرِي
عَلَى أَسَدِ اللَّهِ الَّذِي كَانَ مِدْرَهًا ⋯ يَذُودُ عَنِ الْإِسْلَامِ كُلَّ كَفُورِ
فَيَا لَيْتَ شِلْوِي عِنْدَ ذَاكَ وَأَعْظُمِي ⋯ لَدَى أَضْبُعٍ تَعْتَادُنِي وَنُسُورِ
أَقُولُ وَقَدْ أَعْلَى النَّعِيَّ عَشِيرَتِي ⋯ جَزَى اللَّهُ خَيْرًا مِنْ أَخٍ وَنَصِيرِ

ترجمہ: ''کیامیرے والد کی بیٹیاں ہر باخبر اور بے خبر سے خوف واندیشوں کے ساتھ اصحاب اُحد کے بارے میں سوال کرتی ہیں۔ایک باخبر اور جانکار شخص نے بتایا کہ حمزہ تو دنیا کو خیر باد کہہ چکے ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے بہترین وزیر تھے،ان کو معبودِ برحق ذوالعرش نے ایسی جنت کی طرف بلایا جہاں وہ حیاتِ جاوداں کے ساتھ خوش رہیں گے۔یہی وہ چیز ہے جس کے ہم امیدوار تھے اور ہم بروزِ حشر حمزہؓ کے لئے بہترین انجام کے امیدوار ہیں۔اللہ کی قسم! جب تک بادِ صبا چلتی رہے گی میں آپ کو بھول نہیں پاؤں گی۔حالتِ حضر اور حالتِ سفر میں آپ کے لئے غم کی وجہ سے اشک بہاتی رہوں گی۔اس شیر خوار پر جو آپ ﷺ کے لئے ڈھال کی طرح تھے،وہ اسلام کے دفاع میں ہر منکر حق کا مقابلہ کرتے تھے۔میں یہ اشعار اس وقت تک کہہ رہی ہوں جب کہ میرے پورے خاندان کو ان کی موت کی خبر دی جارہی ہے۔اللہ تعالیٰ میرے مددگار بھائی کو بہترین بدلہ عطا فرمائے۔(دیکھیں: سیرت ابن ہشام: 3/185)

۴: حمزہؓ کے لئے کوئی رونے والا نہیں:

جب اللہ کے رسول ﷺ اُحد سے واپس آئے تو آپ ؐ نے انصار کی عورتوں کو روتے ہوئے دیکھا، یہ دیکھ کر آپ ﷺ نے فرمایا: مگر حمزہؓ کے لئے کوئی رونے والا نہیں ہے۔اس بات کا علم جب انصار کی عورتوں کو ہوا تو وہ حمزہؓ کے لئے رونے لگیں،اللہ کے رسول ﷺ سو گئے،اس کے بعد جب بیدار ہوئے تو وہ رو رہی تھیں۔آپ ﷺ نے فرمایا: عجیب بات ہے! وہ پورے دن سے رو رہی ہیں،ان کو خاموش ہو جانا چاہیے اور آج کے بعد کسی وفات پانے والے شخص پر نہ روئیں۔(مسند احمد: 2/40،84،92، سنن ابن ماجہ: 1591، المعجم الکبیر للطبرانی: 2943،مسند ابو یعلی: 3576،مجمع الزوائد: 6/120)

اس کے ذریعہ وفات پانے والے کے لئے نوحہ کرنا حرام ہو گیا اور کچھ وقت کے بعد وحی کا نزول بھی ہوا جس میں شدت کے ساتھ میت پر نوحہ خوانی کی حرمت نازل ہوئی اور اس کو گناہ کبیرہ قرار دیا گیا،اس کا تعلق جاہلیت کے آثار واعمال سے ہے جس کی جگہ اسلامی تعلیمات کا بیج بویا گیا ہے۔(دیکھیں: السیرۃ النبویہ للصویانی: 3/90)

آپ ﷺ کا فرمان ہے: نوحہ (ماتم) کرنا جاہلی اعمال میں سے ہے،اور اگر نوحہ (ماتم) کرنے والی عورت بغیر توبہ کے مر گئی تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے تارکول کے کپڑے اور آگ کے شعلے کی قمیص بنائے گا۔(سنن ابن ماجہ: 1582)

آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: لوگوں میں دو باتیں موجود ہیں اور وہ کفر ہیں: ایک نسب میں طعن و تشنیع کرنا، دوسرا میت پر نوحہ (ماتم) کرنا۔(مسند احمد: 2/496، صحیح مسلم: 67) اسلام میں نوحہ اور ماتم کو ختم کیا گیا،البتہ آنسو بہانے کی اجازت دی گئی۔

۵: ایک انصاری لڑکے کو حمزہؓ کے نام سے موسوم کرنا:

حضرت جابر بن عبداللہؓ فرماتے ہیں: ہم میں ایک شخص کے ہاں ایک لڑکے کی پیدائش ہوئی تو لوگ کہنے لگے: ہم اس کا نام کیا رکھیں؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اس کا نام وہ رکھو جو میرے نزدیک سب سے زیادہ محبوب ہے۔یعنی: حمزہ بن عبد المطلب''۔(مستدرک حاکم: 3/196)

چنانچہ حمزہؓ میں ان کی یادیں بسی ہوئی تھیں لیکن اللہ تعالیٰ نے بعد میں اپنے نبی پر اللہ کے نزدیک محبوب ترین ناموں کے بارے میں وحی نازل کی تو آپ ﷺ نے صحابہ کرام سے فرمایا: بے شک اللہ کے نزدیک تمہارے ناموں میں محبوب ترین نام عبداللہ اور عبدالرحمن ہیں۔(صحیح مسلم:2132، سنن ابوداؤد:4949، سنن ترمذی: 2833، سنن ابن ماجہ:3728)

٦: وحشی کو رسول اللہ ﷺ کی ہدایت:

"کیا تم اپنا چہرہ مجھ سے غائب رکھ سکتے ہو؟"۔ (صحیح بخاری: 4072، مسند احمد:5073)

نبی کریم ﷺ کی اس نصیحت وہدایت میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے پتہ چلتا ہو کہ آپؐ نے وحشی کا مؤاخذہ کیا ہو یا گناہ گار قرار دیا ہو، بلکہ اس کے ذریعہ آپ ﷺ نے اس کو اس بات کی تذکیر فرمائی کہ اس کو دیکھ کر آپ ﷺ کے اندر ایک نفسیاتی تکلیف اور احساس پیدا ہوتا ہے اور واقعۂ قتل اور آپؐ کے چچا کی لاش کا مُثلہ کرنے کی المناک صورتحال کی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں اور اس کے نتیجہ میں بشری جذبات امنڈ آتے ہیں جن پر کنٹرول کرنا آسانی سے مشکل ہو سکتا ہے اور اس کے ذریعہ نبی کریم ﷺ مغموم وپریشان ہو سکتے ہیں، اس لئے آپؐ نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ آپؐ کے سامنے نہ آیا کریں، تاکہ اس مصیبت کو یاد دلانے والا ذریعہ ہی بند ہو جائے، صحیح روایت میں ہے کہ وحشی کہتے ہیں: میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: وحشی! میں نے عرض کیا: جی ہاں! آپؐ نے فرمایا: تم نے حمزہ کو شہید کیا؟ میں نے کہا: جی ہاں! اللہ کا شکر ہے جس نے ان کو میرے ہاتھ سے (شہادت کا) اعزاز عطا کیا اور مجھے ان کے ہاتھ کے ذریعہ ذلیل نہیں کیا۔ قریش کے لوگ آپؐ سے کہنے لگے: کیا آپ اس سے محبت کرتے ہیں حالانکہ وہ حمزہ کا قاتل ہے؟ یہ سن کر میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! میرے لئے استغفار کیجئے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے تین مرتبہ دم کرتے ہوئے زمین کی جانب تھوکا اور تین مرتبہ میرے سینے کو دبایا اور فرمایا: وحشی! جاؤ، اللہ کے راستے میں لڑو جیسے تم نے اللہ کے راستے سے روکنے کے لئے قتال کیا۔(المعجم الکبیر للطبرانی: 22/139، مجمع الزوائد:6/127)

اس کے ذریعہ نبی کریم ﷺ نے رہنمائی فرمائی ہے کہ کفر اور اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ دشمنی وبغاوت جیسے گناہوں کا کفارہ کیا ہے، یہاں پر قتال فی سبیل اللہ کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے تاکہ کفارہ کے لئے مناسب ترین عمل کو بیان کیا جائے، اس کے ذریعہ نبی کریم ﷺ نے پرچمِ جہاد کو بلند کرنے کی بھی ترغیب دی ہے، شاید یمامہ کی جانب وحشی کا نکلنا اور پھر مسیلمہ کذاب کو قتل کرنا، اسی نبوی ہدایت ورہنمائی کا اثر تھا اور وحشی نے اس ہدف کو حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی، چنانچہ جب اس نے مسیلمہ کذاب کو قتل کیا تو اس وقت اس نے کہا: میں نے بہترین شخص یعنی سید الشہداء حمزہ بن عبدالمطلب کو شہید کیا اور بدترین شخص مسیلمہ کذاب کو بھی قتل کیا۔(دیکھیں: محمد رسول اللہ، صادق عرجون: 3/602، صحیح البخاری: 4072)

ب: حضرت مصعب بن عمیرؓ:

حضرت خباب بن الارتؓ فرماتے ہیں: ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اللہ کی راہ میں ہجرت کی تو ہم اللہ کی رضا کے طلبگار تھے اور اللہ کے ذمہ ہمارے اس عمل کا اجر وثواب واجب ہو گیا، ہم میں سے بعض لوگ اپنی زندگی پوری کر چکے مگر انہوں نے اس دنیا میں اپنے اس اجر (مالِ غنیمت) سے کوئی چیز نہیں کھائی، مصعبؓ انہی لوگوں میں شامل ہیں، وہ یوم اُحد میں شہید ہوئے تو انہیں کفن دینے کے لئے

ایک چادر کے سوا کچھ نہ تھا، ہم اس چادر سے ان کا سر ڈھانپتے تو پاؤں ننگے ہو جاتے اور پاؤں ڈھانپتے تو سر ننگا ہو جاتا، رسول اللہ ﷺ نے یہ دیکھ کر فرمایا: چادر کو ان کے سر کی جانب سے اوپر ڈال دو اور قدموں پر اذخر گھاس ڈال دو، اور ہم میں سے بعض وہ ہیں جن کے لئے ان کا پھل پک کر تیار ہو گیا ہے اور وہ اس پھل سے اب فائدہ اٹھا رہے ہیں۔(صحیح بخاری: 3897، 1276)

حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کی حدیث میں ہے کہ ان کے پاس کھانا لایا گیا، وہ روزہ سے تھے کہنے لگے: مصعب بن عمیرؓ کو شہید کیا گیا، وہ مجھ سے بہتر تھے مگر ان کے کفن کے لئے سوائے ایک چادر کے اور کچھ میسر نہ آسکا، حمزہؓ - یا کسی اور شخص کا ذکر کیا- کو شہید کیا گیا وہ مجھ سے بہتر تھے، ان کے لئے بھی سوائے چادر کے کچھ میسر نہ آسکا، مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں ہمارے لئے طیبات کو ہماری دنیاوی زندگی میں ہی جلدی عطا نہ کر دیا گیا ہو، اس کے بعد وہ رونے لگے یہاں تک کہ کھانا چھوڑ دیا۔(صحیح البخاری: 1274، 1275، 4045)

حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث ہے فرماتے ہیں: جب اللہ کے رسول ﷺ اُحد سے واپس آئے تو آپ کا گزر مصعب بن عمیرؓ کے پاس سے ہوا، وہ اس جگہ شہید ہوئے تھے جہاں سے آپ کا راستہ تھا، آپؐ ان کے پاس کھڑے ہوئے اور ان کے لئے دعا کی، اس کے بعد یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿مِّنَ ٱلۡمُؤۡمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُواْ مَا عَٰهَدُواْ ٱللَّهَ عَلَيۡهِۖ فَمِنۡهُم مَّن قَضَىٰ نَحۡبَهُۥ وَمِنۡهُم مَّن يَنتَظِرُۖ وَمَا بَدَّلُواْ تَبۡدِيلًا﴾ ترجمہ: ”ایمان لانے والوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے اللہ سے کئے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا ہے ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی وقت آنے کا منتظر ہے انہوں نے اپنے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں کی“۔(سورۃ الاحزاب: 23)

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ اللہ کے نزدیک بروزِ قیامت شہداء ہیں، لہذا اِن کے پاس آیا کرو، ان کی زیارت کیا کرو، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے جو بھی قیامت تک ان کو سلام کرے گا یہ اس کا جواب دیں گے۔ (مستدرک حاکم: 3/200، الدلائل للبیہقی: 3/284)

ج: حضرت سعد بن ربیعؓ:

یہی وہ صحابیٔ رسول ہیں جن سے رسول ﷺ نے قریش کے نکلنے کی خبر کو راز میں رکھنے کے لئے کہا تھا، اللہ کے رسول ﷺ ان سے کافی محبت کرتے تھے، جب معرکۂ اُحد اپنے اختتام کو پہنچا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کون شخص دیکھے گا کہ سعد بن ربیعؓ کا کیا حال ہے، وہ زندوں میں ہیں یا شہداء میں؟! اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے ان کی طرف بہت نیزے جاتے ہوئے دیکھے تھے، حضرت اُبَی بن کعبؓ نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ! میں انہیں دیکھتا ہوں، آپؐ نے ان سے فرمایا: اگر آپ سعد بن ربیعؓ کو دیکھو تو ان کو میری طرف سے سلام کہنا اور ان سے کہنا: اللہ کے رسول ﷺ آپ سے دریافت کر رہے ہیں کہ اپنے آپ کو کیسا پا رہے ہیں؟ حضرت اُبَیؓ نے ان کو تلاش کیا تو دیکھا کہ وہ زخمی ہیں اور زندگی کی کچھ رمق ابھی باقی ہے۔ ان سے عرض کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں دیکھوں کہ آپ زندوں میں ہیں یا شہداء میں؟! انہوں نے کہا کہ مجھ پر نیزے کے بارہ وار کئے گئے، میں نے بھی اپنے مدِّ مقابل لڑنے والے کا کام تمام کر دیا۔(السیرۃ الحلبیۃ 2/532)

ایک دوسری صحیح روایت میں ہے کہ انہوں نے جواب دیااور کہا: اللہ کے رسول ﷺ پر اور آپ پر بھی سلام ہو۔ان سے عرض کرنا: اے اللہ کے رسولؐ! میں جنت کی خوشبو محسوس کر رہاہوں اور میری قوم انصار سے کہنا: اگر رسول اللہ ﷺ کو کوئی گزند پہنچی اور تمہارے درمیان ایک آنکھ بھی حرکت کر رہی ہو تو تمہارے پاس کوئی عذر نہیں ہوگا۔ فرماتے ہیں: اس کے بعد ان کی روح پرواز کر گئی۔ (مستدرک حاکم: 3/201،الدلائل للبیہقی: 3/285، صحیح السیرۃ النبویہ، ص294)

سکرات الموت اور جانکنی کے عالم میں بھی اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ خیر خواہی اور اخلاص بتاتا ہے کہ ان کے اندر ایمان کتنا مضبوط و مستحکم تھااور بیعت کے تقاضوں کو پورا کرنے کا کس قدر اہتمام تھا جس کو نہ ہی موت اور نہ ہی زخموں کی تکلیف متاثر کر سکی۔

د: حضرت عبداللہ بن جحشؓ:

حضرت سعد بن أبي وقاصؓ فرماتے ہیں: عبداللہ بن جحشؓ نے ان سے غزوۂ اُحد کے موقع پر کہا: کیا ہم مل کر اللہ سے دعا نہ کریں؟! دونوں ایک طرف کونے میں ہو کر خلوت میں ہو گئے۔ حضرت سعدؓ نے دعا کی اور فرمایا: اے رب! جب دشمن کے ساتھ میری مڈ بھیڑ ہو تو میرے مدمقابل ایسے جنگجو لانا جو بہت غصے والا ہو، میں اس سے لڑوں اور وہ مجھ سے لڑے، پھر مجھے اس پر فتح عطا کرنا یہاں تک کہ میں اس کا کام تمام کر دوں اور اس کے مال واسباب پر قبضہ کر لوں۔ حضرت عبداللہ بن جحشؓ نے ان کی دعا پر آمین کہا۔اس کے بعد انہوں نے دعا کی اور کہا: اے اللہ! میرے مقابلہ میں ایسے شخص کو لانا جو تند خو اور انتہائی طاقتور ہو، میں تیری راہ میں اس سے قتال کروں اور وہ میرے ساتھ قتال کرے،اس کے بعد وہ مجھ پر قابو پالے اور میری ناک اور کان کاٹ دے، کل جب میری تجھ سے ملاقات ہو اور تو پوچھے گا کہ تمہارے ناک اور کان کس نے کاٹے؟ میں کہوں گا: یہ تیری اور تیرے رسول کی راہ میں ہوا ہے اور تو کہے: تو نے سچ کہا! حضرت سعدؓ کہتے ہیں: اے میرے بیٹو! عبداللہ بن جحشؓ کی دعا میری دعا سے بہتر تھی، میں نے دن گزرنے کے بعد ان کو دیکھا کہ ان کے کان اور ناک ایک رسی سے لٹکے ہوئے ہیں۔(صحیح السیرۃ النبویہ، ص: 293)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ اللہ کی راہ میں شہید ہونے کی دعا کرنااور اس کی تمنا کرنا جائز ہے،اس کا تعلق عام موت کی تمنا کرنے سے نہیں ہے جس کے بارے میں ممانعت کی گئی ہے۔(زاد المعاد: 3/212)

ھ: غسیل الملائکہ حضرت حنظلہ بن أبي عامرؓ:

جب مشرکین کے ساتھ گھمسان کی جنگ شروع ہوئی تو حضرت حنظلہؓ نے ابوسفیان بن حرب کے گھوڑے پر وار کیا جس کی وجہ سے ابوسفیان نیچے آ گرااور چیخنے چلانے لگا، حنظلہؓ اس کو ذبح کرنا چاہتے تھے تب تک اس کی مدد کے لئے شداد بن الاسود آ گیا، اس کو ابن شعوب کہا جاتا تھا،اس نے حنظلہؓ پر نیزے سے وار کیااور اس کا نشانہ صحیح لگ گیا۔ حضرت حنظلہؓ نے بھی نیزہ کے ذریعہ اس پر حملہ کیا مگر اس وقت تک اس نے دوسرا وار کر کے ان کو شہید کر دیا۔اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے اس کا ذکر کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا: میں نے فرشتوں کو دیکھا کہ وہ انہیں ایک چاندی کی طشت میں بادل کے پانی سے غسل دے رہے ہیں، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ ان کے گھر والوں سے دریافت کرو کہ

ان کے ساتھ کیا خاص بات تھی؟ان کی شریکِ حیات سے ان کے بارے میں دریافت کیا گیا توانہوں نے کہا کہ جب انہوں نے جہاد کی منادی سنی تو وہ اس وقت حالتِ جنابت میں تھے اور وہ اسی حالت میں جہاد کے لئے نکل گئے۔اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: اسی لئے فرشتے ان کو غسل دے رہے تھے۔(مستدرک حاکم: 3/204،السنن الکبری للبیہقی: 4/15،المعجم الکبیر للطبرانی: 12094،مجمع الزوائد: 3/23، صحیح السیرۃالنبویہ ص،289،فتح الباری: 1346)

واقدی کی روایت میں ہے کہ حنظلہ بن أبی عامر نے جمیلہ بنت عبداللہ بن أبی بن سلول سے شادی کی،ان کی رخصتی اس رات میں ہوئی جس کی صبح غزوۂ احد تھا،انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اجازت حاصل کر لی تھی کہ وہ رات گھر میں گزاریں گے،آپؐ نے انہیں اجازت دے دی،جب انہوں نے صبح کی نماز ادا کی تو وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس جانے کے لئے نکلے تو جمیلہ بھی ساتھ ہو لیں،اس لئے وہ واپس آئے اور ان کے ساتھ کچھ وقت گزارااوراُن پر غسل واجب ہو گیا،اس کے بعد انہوں میں نکلنے کہ ارادہ کیا تواس سے پہلے جمیلہ نے اپنی قوم کے چار افراد کو بلا کر گواہ بنایا کہ انہوں نے ان کے ساتھ تعلق قائم کیا تھا،بعد میں ان سے پوچھا گیا: آپ نے اس پر گواہ کیوں رکھے؟ انہوں نے کہا: میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ گویا کہ آسمان میں ایک شگاف ہو گیا اور اس میں حنظلہؓ داخل ہو گئے،اس کے بعد اس کو بند کر دیا گیا،اس کی تعبیر میں نے شہادت سے نکالی تھی،اس لئے میں نے گواہ رکھے،اور ان کے بطن سے عبداللہ بن حنظلہ پیدا ہوئے،اس کے بعد اُن کے ساتھ حضرت ثابت بن قیس نے نکاح کر لیا اور ان سے محمد بن ثابت بن قیس پیدا ہوئے۔(المغازی للواقدی: 1/273)

<u>اس واقعہ سے کئی اہم مواقف اور دروس معلوم ہوتے ہیں:</u>

۱: حضرت جمیلہ بنت عبداللہ بن أبی نے جب ایسا خواب دیکھا جس کی تعبیر انہوں میں شہادت سے کی، لیکن اس کے باوجود وہ حضرت حنظلہ بن ابی عامر سے ملیں،اس طرح کی صورتحال میں غالب گمان یہ تھا کہ وہ ان سے دور رہتیں تاکہ وہ ان سے حاملہ نہ ہوتیں تاکہ بعد میں پیغامِ نکاح دینے والوں کے لئے اس میں پس وپیش اور تردد نہ ہوتا۔

لیکن اس کے باوجود وہ ان سے ملیں اس اُمید میں کہ وہ ان سے حاملہ ہوں گی اور ایسی اولاد پیدا ہو جس کی نسبت اس شہید کی جانب ہو،جو زندگی میں نیکی اور صلاح کے اعلیٰ مقام پر فائز ہو اور پھر شہادت کے منصب پر فائز ہونے کے امیدوار بنے،اور حضرت جمیلہؓ نے جس بات کی تمنا کی تھی ان کی وہ تمنا پوری ہوئی،وہ امید سے ہو جاتی ہیں اور ایک لڑکے کی ولادت ہوتی ہے جس کا نام عبداللہ رکھا گیا اور وہ حضرت حنظلہؓ کی یاد اور ذکر کا ذریعہ بنے اور وہ فخر واعتزاز کے ساتھ کہا کرتے تھے: میں غسیل الملائکہ کا بیٹا ہوں۔

۲: جانباز و بہادر حنظلہؓ دشمنانِ دین کے ساتھ ٹکر لینے اور مقابلہ کرنے کے جذبات سے سرشار تھے جس کا اظہار اس سے ہوتا ہے کہ وہ اتنی سرعت کے ساتھ میدانِ جہاد کی طرف نکلے کہ ان کو غسل جنابت کا بھی موقع نہیں مل پایا۔

۳: وہ شجاعت و بہادری میں اعلیٰ مقام پر فائز تھے، جس کی دلیل یہ ہے کہ وہ مشرکین کے قائد ابوسفیان کے درپے ہوتے ہیں اور عام طور پر قائد کے ارد گرد اس کے محافظین ہوتے ہیں اور ابوسفیان گھوڑے پر سوار تھے جبکہ حنظلہؓ پیادہ تھے۔

۴: حضرت حنظلہؓ کو عظیم وبلند ربانی اعزاز عطا کیا گیا کہ ایک چاندی کی طشت میں بادل کے پانی سے ان کو غسل دیا گیا۔

۵: ایک نبوی معجزہ کا اظہار ہوا کہ آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو فرشتوں کے غسل دینے کے بارے میں باخبر کیا، اس لئے کہ آپؐ نے فرشتوں کو غسل کرتے ہوئے دیکھا جبکہ صحابہ کرام نے اس کو نہیں دیکھا۔(التاریخ الاسلامی للحمیدی: 5/129)

٦: اگر شہید حالتِ جنابت میں ہو تو اس کو غسل دیا جائے گا جیسے کہ فرشتوں نے حنظلہؓ کو غسل دیا۔(دیکھیں: زاد المعاد: 3/214)

و: حضرت عبداللہ بن عمرو بن حرامؓ:

حضرت عبداللہ بن عمرو بن حرامؓ نے غزوہ احد میں نکلنے کے لئے اصرار کیا، انہوں نے اپنے بیٹے حضرت جابرؓ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: اے جابر! آپ پر کوئی حرج نہیں ہے کہ آپ بھی دیگر اہلِ مدینہ کی طرح دیکھتے رہیں کہ ہمارا انجام کیا ہوتا ہے، اگر میرے پیچھے میری بیٹیاں نہ ہوتیں تو میں یہ چاہتا کہ تمہیں میرے سامنے شہید کیا جاتا۔(مسند احمد: 3/397، مجمع الزوائد: 4/135)

انہوں نے اپنے بیٹے سے یہ بھی کہا کہ میرا دل کہہ رہا ہے کہ میں ہی اصحابِ نبی میں سب سے پہلے شہادت سے سرفراز ہوں گا، رسول اللہ ﷺ کے بعد تم سے زیادہ میرا کوئی پیارا نہیں ہے اور میرے ذمہ قرض ہے، لہذا میرا قرض ادا کرنا اور اپنی بہنوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔(صحیح بخاری: 1351)

حضرت عبداللہ بن عمروؓ مسلمانوں کے ساتھ جہاد میں نکلے اور اللہ کی راہ میں شہادت کے تمغے سے سرفراز ہو گئے، حضرت جابرؓ اس کے بارے میں بیان کرتے ہیں: جب اُحد کے دن میرے والد شہید کئے گئے تو میں ان کے چہرے سے کپڑا ہٹا کر رونے لگا، اصحابِ رسول ﷺ مجھے رونے سے منع کرنے لگے جبکہ آپؐ مجھے منع نہیں کر رہے تھے اور میری پھوپھی بھی آپؐ پر رونے لگیں، یہ دیکھ کر آپ ﷺ نے فرمایا: تم روؤ یا نہ روؤ جب تک جنازہ رکھا ہے فرشتے مسلسل اپنے پَروں سے ان پر سایہ فگن ہیں۔(صحیح بخاری: 1244، صحیح مسلم: 2471/130)

اللہ کے رسول ﷺ نے جابرؓ سے فرمایا: اے جابر! کیا بات ہے مغموم نظر آ رہے ہو؟! انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ! میرے والد شہید ہوئے اور اپنے پیچھے عیال اور قرض چھوڑ کر گئے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: کیا میں تمہیں خوشخبری سنا دوں کہ اللہ تعالیٰ نے کس انداز سے آپ کے والد کا استقبال کیا ہے؟! انہوں نے عرض کیا: کیوں نہیں! اے اللہ کے رسول ﷺ! آپؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ جس کسی سے بھی ہم کلام ہوا ہے تو پردہ کے پیچھے سے ہی کلام کیا ہے جبکہ آپ کے والد کے ساتھ آمنے سامنے ہمکلام ہوا ہے۔اے جابر! کیا آپ کو معلوم نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے والد کو زندہ کیا اور کہا: اے میرے بندے! تمنا کرو میں عطا کروں گا۔انہوں نے کہا: اے میرے رب! مجھے آپ زندہ کریں اور پھر میں دوبارہ آپ کی راہ میں شہید کیا جاؤں۔اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا: میری طرف سے یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ انسانوں کو دوبارہ دنیا میں واپس نہیں بھیجا جائے گا۔انہوں نے کہا: اے رب! میں اپنے پیچھے رہ جانے والوں کو یہ بات بتا دوں۔اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل کیں: ﴿وَلَا تَحۡسَبَنَّ ٱلَّذِينَ قُتِلُواْ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ أَمۡوَٰتَۢاۚ بَلۡ أَحۡيَآءٌ عِندَ رَبِّهِمۡ يُرۡزَقُونَ﴾ ترجمہ: ”جو

لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں انہیں مردہ نہ سمجھو، وہ تو حقیقت میں زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس رزق پا رہے ہیں"۔(سورۃ آل عمران: 169) (سنن ترمذی: 3010، سنن ابن ماجہ: 190-280)

حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے اُحد سے پہلے ایک خواب دیکھا، فرماتے ہیں: میں نے اُحد سے پہلے مبشر بن عبدالمنذر کو دیکھا وہ مجھ سے کہہ رہے تھے: آپ کچھ ہی دنوں میں ہمارے پاس آنے والے ہیں۔ میں نے کہا: آپ کہاں ہیں؟ انہوں نے کہا: ہم جنت میں ہیں! ہم اس میں جیسے چاہتے ہیں مزے سے گھومتے ہیں۔ میں نے ان سے کہا: کیا آپ بدر میں شہید نہیں ہوئے تھے؟ انہوں نے کہا: کیوں نہیں! ہمیں پھر زندہ کیا گیا۔ انہوں نے اس خواب کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے کیا تو آپؐ نے فرمایا: اے ابو جابر! یہ شہادت ہے۔(مستدرک حاکم: 3/204، الدلائل للبیہقی: 3/249، زاد المعاد: 3/208)

اللہ کے فضل واحسان اور قدرت سے یہ خواب بحرف ثابت ہو گیا۔

ز: حضرت خیثمہ ابو سعدؓ:

حضرت خیثمہ ابو سعدؓ فرماتے ہیں: ان کے بیٹے بدر میں شہید ہوئے تھے، میں غزوۂ بدر میں شریک نہیں ہو سکا جبکہ مجھے اس میں شرکت کا انتہائی شوق تھا، یہاں تک کہ میں نے اپنے بیٹے کے ساتھ نکلنے کے بارے میں قرعہ اندازی بھی کی لیکن قرعہ انہی کے نام نکلا اور وہ شہادت سے سرفراز ہو گیا، میں نے کل رات اپنے بیٹے کو بہترین شکل وصورت میں دیکھا، وہ جنت کے پھلوں میں اور نہروں میں مزے کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا: ہمارے ساتھ شامل ہو جائیں، جنت میں آپ ہمارے ساتھ رہیں گے، میرے رب نے میرے ساتھ جو وعدہ کیا تھا میں نے اسے برحق پایا، اے اللہ کے رسولؐ! واللہ، میں جنت میں اس کے ساتھ رہنے کا مشتاق ہو گیا ہوں، میری عمر بھی دراز ہو گئی ہے، میری ہڈیاں بھی کمزور ہو گئی ہیں اور مجھے اپنے رب سے ملاقات کا شوق ہے، لہذا اے اللہ کے رسولؐ! اللہ سے دعا فرمالیں کہ مجھے شہادت سے سرفراز فرمائے اور جنت میں سعد کا ساتھ نصیب فرمائے، اللہ کے رسول ﷺ نے ان کے لئے دعا فرمائی اور اُحد کے دن اُن کو شہید کیا گیا۔(الدلائل للبیہقی: 3/249، زاد المعاد: 3/208)

ح: حضرت وہب مزنیؓ اور ان کے بھائی:

حضرت وہب بن قابوس المزنی اپنے بھتیجے حارث بن عقبہ بن قابوس کے ساتھ جبل مزینہ سے اپنی بکریاں لے کر مدینہ آئے تو دیکھا کہ مدینہ بالکل خالی ہے، انہوں نے معلوم کیا کہ لوگ کہاں ہیں؟ معلوم ہوا کہ وہ کوہِ اُحد پر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مشرکین قریش کے ساتھ مقابلہ کے لئے گئے ہیں، انہوں نے کہا: اب ہمیں اور کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے، وہ دونوں نکلے یہاں تک کہ اُحد کی رزمگاہ میں نبی کریم ﷺ کے پاس پہنچے، انہوں نے دیکھا کہ میدانِ کارزار گرم ہے اور رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کا پلڑا بھاری ہے، یہ دونوں بھی مسلمانوں کے ساتھ مل کر حملہ آور ہوئے، اسی دوران میں مشرکین میں سے خالد بن ولید اور عکرمہ بن ابی جہل پشت کی جانب سے نمودار ہوئے اور انہوں نے نہایت جم کر مقابلہ کیا، ابھی یہ مقابلہ جاری تھا کہ مشرکین کا ایک اور جتھا نظر آیا، آنحضور ﷺ نے فرمایا: اس

سے کون نپٹے گا؟ وہبؓ نے عرض کیا: میں، یارسول اللہ! یہ کہہ کر اس قدر تیر باری کی کہ جتھا واپس جانے پر مجبور ہو گیا، مگر ایک دوسرا جتھا نمودار ہو گیا، آنحضور ﷺ نے فرمایا: اس کے مقابلہ میں کون آئے گا؟ وہبؓ نے پھر اپنے کو پیش کیا، اور اس زور وشور سے حملہ آور ہوئے کہ اس جتھے کا بھی منہ پھیر دیا، اس سے فارغ ہوئے تھے کہ تیسرا جتھا دکھائی دیا، آنحضور ﷺ نے پھر فرمایا: اس کے مقابلہ کے لئے کون اٹھتا ہے؟ اس مرتبہ بھی اس سوال کے جواب میں وہبؓ ہی کی آواز آئی، آنحضور ﷺ نے بشارت دی جاؤ، جاکر جنت کی خوشخبری سن لو، یہ مژدہ سن کر شاداں وفرحاں یہ کہتے ہوئے کہ: ''نہ کسی کو چھوڑوں گا اور نہ اپنے بچاؤ کی کوشش کروں گا'' مشرکین کے جم غفیر میں گھس گئے اور تلوار چمکاتے ہوئے اس پار سے اس پار نکل گئے، مسلمان یہ جرأت اور بہادری دیکھ کر عش عش کرتے تھے، آنحضور ﷺ دعا فرما رہے تھے کہ ''خدایا! اس پر رحم فرما''۔ وہبؓ دیر تک حیرت انگیز شجاعت کے ساتھ لڑتے رہے، آخر میں مشرکین چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے اور ہر طرف سے نرغہ میں لیکر تیروں اور تلواروں کی بارش شروع کر دی، تنِ تنہا اس ہجوم کا کب تک مقابلہ کرتے، بالآخر سینکڑوں زخم کھا کر خلعتِ شہادت سے سرفراز ہو گئے۔ شہادت کے بعد شمار کیا گیا تو بیس زخم ایسے کاری تھے کہ ان میں سے ہر ایک زخم شہادت کے لئے کافی تھا، شہید کرنے کے بعد مشرکین نے نہایت بُری طرح مُثلہ کیا تھا، ان کے بھتیجے حارثؓ یہ المناک منظر دیکھ کر بے قابو ہو گئے اور بے تابانہ اٹھ کر اسی بہادری اور بے جگری سے لڑ کر جامِ شہادت پیا، آنحضور ﷺ پر وہبؓ کی شہادت کا نہایت سخت اثر ہوا، چچا بھتیجے دونوں کی لاشوں پر کھڑے ہو کر فرمایا کہ میں تم سے راضی ہوں، مشرکوں نے وہب کی لاش کا اس بُری طرح مُثلہ کیا تھا کہ قریب جاکر نظر ڈالنے کی ہمت نہ پڑتی تھی، آنحضور ﷺ خود تشریف لے گئے اور دفن تک ان کے پیروں کی سمت کھڑے رہے اور قبر میں رکھنے کے بعد اپنے ہاتھوں سے سرخ بوٹوں کی چادر کھینچ کر اڑھائی، چادر چھوٹی تھی، پاؤں کھلے رہ گئے تھے، آنحضور ﷺ نے ان پر حرملہ قسم کی گھاس ڈلوائی اور اپنے ہاتھوں سے سپرد خاک کر کے واپس ہوئے، اس حیثیت سے وہبؓ کی شہادت بڑی قابل رشک تھی کہ قبولِ اسلام کے بعد ان کا ایک لمحہ بھی دنیا سے ملوث نہ ہوا اور سیدھے جنت الفردوس کی جانب کوچ کیا، اس طیب وطاہر زندگی اور اس شہادت پر بڑے بڑے صحابہ رشک کرتے تھے، حضرت عمرؓ اور حضرت سعدؓ کہتے تھے کہ کاش مزنی کی شہادت ہم کو نصیب ہوئی ہوتی۔ (بحوالہ: المغازی للواقدی: 1/275، طبقات ابن سعد: 2/181)

حضرت بلال بن حارث مزنی بیان کیا کرتے تھے کہ ہم حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے ساتھ جنگ قادسیہ میں شریک تھے، جب اللہ تعالیٰ نے ہمیں فتح عطا کی اور ہمارے درمیان مالِ غنیمت تقسیم کیا گیا اور میرے ساتھ مزینہ کے آلِ قبوس کا ایک نوجوان تھا، میں حضرت سعدؓ کے پاس حاضر ہوا جب کہ وہ سو کر اٹھے تو مجھے دیکھ کر کہنے لگے: بلال؟! میں نے کہا: ہاں، بلال! فرمایا: آپ کو خوش آمدید! یہ آپ کے ساتھ کون ہے؟ میں نے کہا: میری قوم آلِ قابوس کے ایک شخص ہیں، حضرت سعدؓ نے کہا: کیا آپ اسی مزنی کے خاندان کے نوجوان ہو جو اُحد کے دن شہید ہوئے تھے؟ فرمایا: میں ان کا بھتیجا ہوں، حضرت سعدؓ نے کہا: مرحبا، خوش آمدید! اللہ آپ کے ذریعہ آنکھوں کو ٹھنڈا کرے، وہ شخص ایسا تھا کہ اُحد کے دن میں نے ان کا ایسا کردار اور منظر دیکھا ہے جو اور کسی کا نہیں دیکھا، میں نے دیکھا کہ مشرکین نے ہمیں ہر طرف سے گھیر لیا تھا اور رسول اللہ ﷺ ہمارے درمیان تھے اور دستے ہر جانب سے نمودار ہو رہے تھے اور رسول اللہ ﷺ لوگوں میں اپنی نگاہ

دوڑا رہے تھے تاکہ ان کو پہچان سکیں اور آپؐ فرما رہے تھے: اس دستہ سے کون نپٹے گا؟ پھر ہر مرتبہ مزنی بھائی کہتے تھے کہ میں، اے اللہ کے رسولؐ! میں وہ وقت بھول نہیں سکتا ہوں جبکہ آخری مرتبہ آپ ﷺ نے سوال کیا تو مزنی نے کہا: میں! اللہ کے رسولؐ۔ یہ سن کر آپؐ نے فرمایا: کھڑے ہو جاؤ! اور جنت کی خوشخبری لے لو، حضرت سعدؓ فرماتے ہیں: میں بھی ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا، اللہ جانتا ہے کہ میں بھی اس روز اسی طرح شہادت کا طالب تھا جیسے کہ وہ شہادت کے طالب تھے، ہم نے ان کے بیچ میں جا کر جنگ کی یہاں تک کہ جب ہم نے دوبارہ ان پر حملہ کیا تو انہوں نے ان کو نشانہ بنا لیا، اللہ کی قسم! میری تمنا تھی کہ کاش اس دن میں شہید ہوا ہوتا، لیکن میری موت کا وقت مؤخر ہوا، اس کے بعد حضرت سعدؓ نے اسی وقت مالِ غنیمت کا اپنا حصہ منگوایا اور وہ انہیں دے دیا، اور مزید بھی دیا اور فرمایا: آپ کو اختیار ہے چاہے ہمارے پاس قیام کریں یا اپنے اہل وعیال کی طرف واپس جائیں۔ حضرت بلالؓ نے کہا: بہتر یہی ہے کہ ہم واپس چلے جائیں، اس لئے ہم واپس آ گئے۔

حضرت سعدؓ فرماتے ہیں: میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو ان کے پاس کھڑے ہو کر فرماتے ہوئے دیکھا جب کہ وہ شہید ہو گئے تھے: اللہ آپ سے راضی ہو، یقیناً میں بھی آپ سے راضی ہوں۔ اس کے بعد میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپؐ اپنے قدموں پر کھڑے تھے، حالانکہ آپؐ زخمی تھے، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپؐ کے لئے ان کی قبر پر کھڑا ہونا دشوار ہو رہا تھا، مگر آپؐ اس وقت تک کھڑے رہے یہاں تک کہ ان کو لحد میں اتارا گیا، آپؐ کے جسمِ اطہر پر ہرے بوٹوں والی چادر تھی، اللہ کے رسول ﷺ نے اس چادر کو ان کے سر پر ڈال دیا، اس سے سر کو ڈھانپ کر نیچے کی طرف کھینچا جو ان کی آدھی پنڈلی تک پہنچ گئی اور ہمیں حکم دیا کہ حرمل نامی گھاس جمع کرو، ہم نے جمع کر کے ان کے پاؤں پر ڈال دی جبکہ وہ لحد میں تھے، اس کے بعد آپ ﷺ واپس تشریف لے گئے، جس حالت میں مذنی کی وفات ہوئی میرے نزدیک اس سے بہتر حالت اور کوئی نہیں ہے جس کے ساتھ میں اللہ تعالیٰ سے ملوں۔ (المغازی، الواقدی: 1/277)

ایمان اسی طرح سے اصحابِ ایمان پر اپنے اثرات دکھاتا ہے، حضرت وہب مزنی اور ان کے بھتیجے مدینہ میں اپنی بکریاں چھوڑ دیتے ہیں اور مسلمانوں کی صفوں میں شامل ہو جاتے ہیں، وہ شہادت سے سرفراز ہونے کے متمنی تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو شہادت سے سرفراز کیا، اُحد کے میدانِ کارزار میں حضرت مزنیؓ نے جو بہترین کردار ادا کیا تھا وہ صحابہ کرام کے ذہن و دماغ میں تازہ تھا، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ تقریباً تیرہ سال گزرنے کے بعد بھی اس کو اس وقت یاد کرتے ہیں جب کہ وہ حضرت مزنیؓ کے خاندان کے ایک فرد کا نام سنتے ہیں اور تمنا کرتے ہیں کہ کاش مزنیؓ ہی کی طرح وہ بھی اللہ تعالیٰ سے جا ملیں!۔

ط: حضرت عمرو بن جموحؓ:

حضرت عمرو بن جموحؓ کے پیروں میں لنگڑاہٹ تھی اور لنگڑاہٹ بھی بہت زیادہ تھی، ان کے چار بیٹے تھے جو شیر کی طرح بہادر تھے، وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مختلف جنگوں میں شریک ہوتے تھے، ان کے نام تھے: خلاد، معوذ، معاذ اور ابوایمن۔ غزوۂ اُحد کے موقع پر ان کے بیٹوں نے انہیں روکنا چاہا اور انہوں نے کہا کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے آپ سے جہاد معاف رکھا ہے، وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ میرے بیٹے مجھے اس عمل سے اور آپ کے ساتھ نکلنے سے روکنا چاہتے ہیں، واللہ! میری تمنا ہے کہ میں اپنے

اس لنگڑے پن کے ساتھ جنت میں چلوں گا، یہ سن کر اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: جہاں تک آپ کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک آپ کو معذور ہیں، اس لئے آپ کے لئے جہاد ضروری نہیں ہے اور آپ ﷺ نے ان کے بیٹوں سے کہا: آپ ان کو منع نہ کریں، شاید اللہ تعالیٰ ان کو شہادت سے سرفراز کردے، وہ اس حال میں نکلے کہ وہ قبلہ رو ہو کر دعا کر رہے تھے: اے اللہ! مجھے اپنے گھر والوں کی طرف ناکام و ناامید ہو کر واپس نہ کرنا، بالآخر وہ میدانِ کارزار میں شہید ہو کر اللہ سے جا ملے۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عمرو بن جموحؓ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمایا: اے اللہ کے رسولؐ! آپ کا کیا خیال ہے اگر میں اللہ کی راہ میں قتال کرتے کرتے شہید ہوا، تو کیا میں اپنے اس پاؤں کے ساتھ جنت میں چلوں گا؟! -اور ان کے پاؤں میں لنگڑاہٹ تھی- اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ہاں بالکل! چنانچہ وہ، ان کے بھتیجے اور ان کے آزاد کردہ غلام نے اُحد کے دن شہادت کا جام نوش کیا، اللہ کے رسول ﷺ ان کے پاس سے گزرے تو ان کو ایک ہی قبر میں دفن کیا گیا۔(مسند أحمد: 5/299، الدلائل للبیہقی: 3/246، المغازی للواقدی: 1/246، سیرت ابن ہشام: 3/96، مجمع الزوائد: 9/315)

اس واقعہ میں اس بات کی دلیل موجود ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ کسی مرض یا جسمانی معذوری کی وجہ سے جہاد کے بارے میں معذور بنایا ہو اس کے باوجود اس کے لئے جہاد میں نکلنا جائز ہے، اگرچہ اس پر نکلنا واجب نہ ہو، جیسے کہ حضرت عمرو بن جموحؓ عذر کے باوجود نکلے۔

اس واقعہ سے حضرت عمرو بن جموحؓ کی شجاعت، شہادت کی طلب اور ان کے اخلاص کا بھی پتہ چلتا ہے، اللہ تعالیٰ نے بالآخر ان کو شہادت کی دولت سے سرفراز کرلیا۔

ی: حضرت اُبو حذیفہ بن یمانؓ اور حضرت ثابت بن وقشؓ:

جب اللہ کے رسول ﷺ اُحد کی جانب نکلے تو حضرت حُسَیل بن جابرؓ -جن کی کنیت اُبو حذیفہ ابن الیمان تھی- اور حضرت ثابت بن وقشؓ کو خواتین اور بچوں کے ساتھ محفوظ مقام پر رکھا گیا تو ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا- اور وہ دونوں سن رسیدہ بزرگ تھے- : آپ کا بُرا ہو! کس چیز کا انتظار کر رہے ہو؟ اللہ کی قسم! ہم میں سے ہر ایک کی اتنی ہی عمر باقی بچی ہے جتنی دیر میں ایک گدھا ایک گھونٹ پانی پیے، ہم تو آج یا کل مر جائیں گے، ہم کیوں نہ اپنی تلواریں لیں اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جا ملیں، شاید کہ اللہ تعالیٰ ہمیں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ شہادت عطا کرے؟!

اس لئے ان دونوں نے اپنی اپنی تلواریں لیں اور نکل گئے، یہاں تک کہ مسلمانوں کے ساتھ شامل ہو گئے اور کسی کو ان کے بارے میں علم نہیں تھا، جہاں تک ثابت بن قیسؓ کا تعلق ہے تو مشرکین نے ان کو شہید کردیا اور حُسیل بن جابرؓ پر مسلمانوں کی تلواروں نے ہی وار کردیا جبکہ بھگدڑ مچ گئی تھی، ان کو لاعلمی میں شہید کردیا گیا، ان کے بیٹے حذیفہؓ نے کہا بھی: یہ میرے والد ہیں! لیکن مسلمانوں نے کہا: واللہ! ہم نے ان کو نہیں پہچانا۔ حضرت حذیفہؓ نے کہا: اللہ آپ لوگوں کو معاف فرمائے، اور وہ سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ان کی دیت ادا کرنا چاہی لیکن حذیفہؓ نے ان کی دیت مسلمانوں پر صدقہ کردی جس کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کے نزدیک وہ مزید بلند مقام کے حامل بن گئے۔(سیرت ابن ہشام)

اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ سن رسیدہ بزرگوں کے دلوں میں ایمان کے کس قدر اثرات تھے، ان کو اللہ تعالیٰ نے جہاد سے مستثنیٰ کررکھا تھا، لیکن انہوں نے محفوظ قلعوں کو چھوڑ کر شہادت کی طلب میں میدانِ کارزار کو ترجیح دی، حضرت حذیفہؓ کی طرف سے بھی عظیم موقف کا اظہار ہوا، اس لئے کہ انہوں نے اپنے والد کی دیت کو مسلمانوں پر صدقہ کردیا اور ان کے لئے مغفرت کی دعا کی، اس لئے کہ انہوں نے غلطی سے ان کے والد کو قتل کیا تھا، اس سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہوگیا کہ مسلمان جب کسی کو کافر سمجھ کر غلطی سے قتل کردیں تو امام کے لئے ضروری ہے کہ وہ بیت المال سے اس کی دیت ادا کرے، اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت یمانؓ کی دیت ادا کرنے کا ارادہ فرمایا لیکن انہوں نے دیت لینے سے منع کیا اور اس کو مسلمانوں کے لئے صدقہ کردیا۔ (دیکھیں: زادالمعاد: 3/218)

ک: اعمال کا اعتبار اختتام پر:

یقیناً اعمال کا اعتبار ان کے اختتام پر ہے اور غزوۂ اُحد میں اس کی ایک عملی مثال ظاہر ہوئی جس کے ذریعہ یہ اہم قاعدہ ثابت ہوتا ہے، اس موقع پر دو ایسے واقعات پیش آئے جن کے ذریعہ اس کی مزید تاکید ہوتی ہے اور ان میں نصیحت و عبرت حاصل کرنے والے کے لئے عبرت و نصیحت موجود ہے، وہ دو (۲) واقعات مندرجہ ذیل ہیں:

ا: حضرت اُصیرمؓ کا واقعہ:

ان کا نام عمرو بن ثابت بن وقشؓ ہے، ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی گئی مگر انہوں نے اسلام قبول نہیں کیا، حضرت ابوہریرہؓ ان کا قصہ بیان کرتے ہیں اور فرماتے ہیں: اُصیرم اسلام کی دعوت قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے، ایک مرتبہ وہ آئے جبکہ رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے اصحاب اُحد میں تھے تو انہوں نے دریافت کیا: سعد بن معاذ کہاں ہیں؟ ان سے کہا گیا: اُحد میں ہیں، انہوں نے پوچھا: ان کے بھتیجے کہاں ہیں؟ کہا گیا: اُحد میں، انہوں نے اپنی قوم کے لوگوں کے بارے میں پوچھا تو کہا گیا کہ سب اُحد میں ہیں، یہ صورتحال دیکھ کر ان کے اندر اسلام کی طلب پیدا ہوئی اور انہوں نے اسلام قبول کرلیا، اس کے بعد انہوں نے اپنی تلوار، اپنا نیزہ اور اپنی زرہ لی اور گھوڑے پر سوار ہوکر تیز رفتاری کے ساتھ میدانِ کارزار میں پہنچ گئے یہاں تک کہ لوگوں کے بیچوں بیچ پہنچ گئے، جب مسلمانوں نے ان کو دیکھا تو انہوں نے کہا: اے عمرو، ہم سے دور رہو! انہوں نے کہا: میں تو ایمان لاچکا ہوں! وہ لڑتے رہے یہاں تک کہ زخموں سے چور ہوگئے، جب بنوعبدالاشہل کے لوگ معرکہ میں کام آئے، وہ اپنے مقتولین کو تلاش کررہے تھے تو اچانک ان کی نظر ان پر پڑ گئی، انہوں نے کہا: یہ تو یقیناً اُصیرم ہی ہیں! یہ کیوں آئے ہیں؟! ہم نے تو ان کو اس حال میں چھوڑا تھا کہ یہ اِس کلام کے منکر تھے، اس لئے انہوں نے ان سے دریافت کیا: کیا اپنی قوم پر رحم کرتے ہوئے یا اسلام کی چاہت میں؟ انہوں نے کہا: نہیں! بلکہ اسلام کی چاہت میں۔ میں اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لایا ہوں اور میں نے اسلام قبول کیا، اس کے بعد میں نے اپنی تلوار لی اور رسول ﷺ کے ساتھ شامل ہوگیا اور پھر لڑتا رہا یہاں تک کہ مجھے یہ صورتحال لاحق ہوگئی، اگر میری وفات ہو جاتی ہے تو میرا مال محمد ﷺ کے حوالے ہے اور وہ اس کو جہاں چاہیں استعمال کرسکتے ہیں، اللہ کے رسول ﷺ سے اس کا ذکر کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا: یقیناً وہ اہلِ جنت میں سے ہیں۔ (سیرت ابن ہشام: 3/95، الدلائل للبیہقی: 3/247)

ان کے بارے میں منقول ہے کہ ان کا انتقال ہوا اور وہ جنت میں داخل ہو گئے حالانکہ انہوں نے ایک بھی نماز نہیں پڑھی، آپ ﷺ نے فرمایا: انہوں نے معمولی عمل کیا اور بہت زیادہ اجر کے مستحق ہوئے۔ (صحیح بخاری: 2808، صحیح مسلم: 1900)

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے تھے: مجھے ایسے شخص کا نام بتاؤ جو جنت میں داخل ہوا حالانکہ اس نے ایک نماز بھی نہیں پڑھی؟ جب لوگ اس کا جواب نہ دے پاتے تو انہی سے دریافت کرتے کہ کون ہے وہ شخص؟ آپؓ فرماتے: وہ اُصیرم بن عبد الاشہل ہیں۔ (دیکھیں: سیرت ابن ہشام: 3/100، فتح الباری، حدیث نمبر: 2808)

۲: مخیریق کا واقعہ:

جب اُحد کی جنگ ہوئی اور رسول اللہ ﷺ مشرکین سے جنگ کرنے کے لئے نکلے تو مخیریق نے اپنی قوم یہود کو جمع کیا اور ان سے کہا: اے یہود کے لوگو، اللہ کی قسم! آپ جانتے ہو کہ محمدؐ کی مدد کرنا تم پر ضروری ہے، انہوں نے کہا: آج سنیچر کا دن ہے۔ مخیریق نے کہا: تمہارے لئے کوئی سبت (سنیچر) نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی تلوار اور سامان لیا اور کہا: اگر میں مارا گیا تو میرا مال محمدؐ کے سپرد ہے، وہ اس میں جو چاہیں کر سکتے ہیں، اس کے بعد وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ شریکِ جنگ ہوئے، آپؐ کی معیت میں قتال کیا یہاں تک کہ شہید ہوئے، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''مخیریق بہترین یہودی ہیں''۔ (طبقات ابن سعد: 1/501، الدلائل لابی نعیم، ص 18، تاریخ طبری: 2/531، المغازی للواقدی: 263/1)

ان کے اسلام لانے کے بارے میں مختلف آراء ہیں، علامہ ذہبیؒ نے ''التجرید'' میں اور علامہ ابن حجرؒ نے ''الاصابہ'' میں واقدیؒ سے نقل کیا ہے کہ مخیریق کی وفات حالتِ اسلام میں ہوئی۔ سہیلیؒ نے ''الروض الأنف'' میں ذکر کیا ہے کہ وہ مسلمان تھے۔ انہوں نے ابن اسحاقؒ کی ذکر کردہ روایت کہ آپؐ نے فرمایا: ''مخیریق بہترین یہودی ہیں''۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مخیریق مسلمان ہیں اور کسی مسلمان کے بارے میں یہ کہنا مناسب نہیں ہے کہ وہ بہترین عیسائی یا بہترین یہودی ہے۔ ڈاکٹر عبد اللہ الشقاری نے اپنی کتاب ''الیہود فی السنۃ المطہرۃ'' میں اس مسئلہ کی مکمل تحقیق کی ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مخیریق نے اسلام قبول کیا اور یہی چیز ان کے لئے مسلمانوں کے ساتھ لڑنے اور اپنا مالِ کثیر صدقہ کرنے کے لئے محرک بنی جبکہ یہود تو مال کی محبت میں انتہائی بخیل واقع ہوئے ہیں۔ (دیکھیں: الروض الأنف، السہیلی: 408/409، 4)

ل: اعمال کا دار و مدار نیتوں پر:

اُحد کے دن مسلمانوں کے ساتھ شریک ہو کر جن لوگوں نے قتال کیا ان میں ایک شخص تھا جس کو 'قُزمان' کہا جاتا تھا، وہ شجاعت و بہادری میں معروف تھا، جب اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے اس کا ذکر کیا جاتا تھا تو آپؐ فرماتے تھے کہ ''بے شک وہ اہلِ نار میں سے ہے''۔ وہ اُحد کے دن جہاد سے پیچھے رہا تو بنو ظفر کی عورتوں نے اس کو عار دلایا جس کی وجہ سے وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جہاد میں اس وقت شامل ہوا جبکہ آپؐ صفیں درست کر رہے تھے، وہ آکر پہلی صف میں شامل ہو گیا اور وہی مسلمانوں میں سے پہلا شخص تھا جس نے تیر چلایا، وہ نیزہ

ایسا چلانے لگا گویا کہ وہ تیر تھا، اور اونٹ کی سی آواز نکالتا تھا، اور پھر اس نے تلوار سے حیران کن وار کئے، یہاں تک کہ اس نے سات یا نو مشرکین کو مار ڈالا، وہ خود زخمی ہوا تو زمین پر گر پڑا، حضرت قتادہ بن نعمانؓ نے اسے پکارا: اے ابو الغَیداق! آپ کو شہادت مبارک ہو! مسلمانوں میں سے کچھ لوگ اس سے کہنے لگے: واللہ! اے قزمان، آج تو آپ نے اپنی شجاعت و بہادری کے جوہر دکھائے، لہذا خوشخبری حاصل کر لو۔ اس نے کہا: خوشخبری کس چیز کی وجہ سے؟ واللہ! میں نے تو اپنی قوم کی حمیت و دفاع میں قتال کیا ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو میں قتال نہ کرتا۔ اس کا ذکر اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا: بے شک وہ اہلِ نار میں سے ہے، بے شک اللہ تعالیٰ اس دین کی تائید ایک فاجر و گنہگار شخص کے ذریعہ کرتا ہے۔ (صحیح بخاری: 4203، صحیح مسلم: 111-112، سیرت ابن ہشام: 3/99، غزوۃ أحد، دراسۃ دعویۃ، ص: 113)

اس واقعہ میں اس بات کو واضح کر دیا گیا ہے کہ جہاد میں نیت کا کتنا بلند مقام ہے جس نے اپنی قوم کی حمیت میں یا بہادر کہلانے کے لئے جہاد کیا ہو اور اس کا عمل اللہ کے لئے نہ ہو تو اللہ اس کے عمل کو شرفِ قبولیت عطا نہیں کرتا ہے۔

۵: نبوت کے بعض دلائل

ا: حضرت قتادہ بن نعمانؓ کی آنکھ کا صحتیاب ہونا:

حضرت قتادہؓ کی آنکھ کو نشانہ بنایا گیا یہاں تک کہ اس کا ڈھیلا گر کر رخسار پر آ گیا، اللہ کے رسول ﷺ نے اس کو اس کی جگہ پر واپس لوٹا دیا جس کی وجہ سے ان کی وہ آنکھ دونوں آنکھوں میں سب سے خوبصورت اور تیز نظر والی آنکھ تھی۔ (مستدرک حاکم: 3/295، المعجم الکبیر للطبرانی: 19/8، الدلائل للبیہقی: 3/251، مجمع الزوائد: 6/113)

اور جب حضرت قتادہؓ کی دوسری آنکھ میں درد ہوتا تو اس والی آنکھ میں درد بھی نہیں ہوتا تھا، ان کی اولاد میں سے ایک شخص حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے پوچھا: آپ کون ہیں؟ تو اس نے ارتجالی طور پر یہ اشعار پڑھے:

أَنا ابنُ الّذي سالَت علَى الخَدِّ عينه ... فَردت بكَفِّ الْمصطَفَى أَحسن الردّ
فَعادت كَما كَانَتْ لأَوّل أَمرِهَا ... فيا حسنَها عينا ويا حسن ما رد

ترجمہ: "میں اس شخصیت کا بیٹا ہوں جن کی آنکھ گر کر ان کے رخسار پر آ کر گری تھی، تو مصطفی ﷺ کے دست مبارک سے ان کو بہترین طریقہ سے اپنی جگہ لوٹا دیا۔ وہ آنکھ بالکل ویسی ہی ہو گئی جیسے کہ پہلی حالت میں تھی، کیا ہی خوبصورت آنکھ ہے اور کیا ہی بہترین انداز سے اس کو درست کیا گیا!"۔

یہ اشعار سن کر حضرت عمرؒ نے بھی جواب میں اشعار کہے اور اس کو انعام سے بھی نوازا۔

(دیکھیں البدایہ والنہایہ 4/35، أسد الغابہ: 4/389)

۲: ابی بن خلف کا قتل:

ابی بن خلف مکہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ملتا تھا تو کہتا: اے محمدؐ! میرے پاس 'عَوذ' نامی ایک گھوڑا ہے، میں اسے روزانہ تین صاع (ساڑھے سات کلو) غلّہ کھلاتا ہوں، اس پر بیٹھ کر میں تمہیں قتل کروں گا۔ جواب میں رسول اللہ ﷺ فرماتے: بلکہ میں ان شاءاللہ تمہیں قتل کروں گا۔ پھر جب اُحد کی جنگ ہوئی اور رسول اللہ ﷺ گھاٹی میں تشریف لے آئے تو اُبی بن خلف یہ کہتا ہوا آیا کہ محمدؐ کہاں ہے؟ یا تو میں رہوں گا یا وہ رہے گا۔ صحابہ کرام -رضوان اللہ علیہم- نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ! ہم میں سے کوئی اس پر حملہ کرے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اسے آنے دو۔ جب وہ قریب آیا تو رسول اللہ ﷺ نے حارث بن صمہؓ سے ایک چھوٹا سا نیزہ لیا اور لینے کے بعد جھٹکا دیا تو اس طرح لوگ ادھر ادھر اڑ گئے جیسے اونٹ اپنے بدن کو جھٹکا دیتا ہے تو مکھیاں اڑ جاتی ہیں۔ اس کے بعد آپؐ اس کے سامنے آ پہنچے، اس کی خود اور زرہ کے درمیان حلق کے پاس تھوڑی سی جگہ کھلی دکھائی پڑی۔ آپ ﷺ نے اسی پر ٹکا کر ایسا نیزہ مارا کہ وہ گھوڑے سے کئی بار لڑھک گیا، جب قریش کے پاس گیا، حالانکہ گردن میں کوئی بڑی خراش نہ تھی البتہ خون بند تھا اور بہتا نہ تھا، تو کہنے لگا: مجھے واللہ، محمدؐ نے قتل کر دیا۔ لوگوں نے کہا: خدا کی قسم، تم نے دل چھوڑ دیا ہے، ورنہ تمہیں واللہ، کوئی خاص چوٹ نہیں ہے، اس نے کہا! وہ مکہ میں مجھ سے کہہ چکا تھا کہ میں تمہیں قتل کروں گا۔

اس لئے خدا کی قسم! اگر وہ مجھ پر تھوک دیتا تو بھی میری جان چلی جاتی، بالآخر اللہ کا یہ دشمن مکہ واپس ہوتے ہوئے مقام 'سَرِف' پہنچ کر مر گیا۔ (تاریخ طبری: 818-2/518-519، المغازی للواقدی: 1/251، طبقات ابن سعد: 2/46، الدلائل للبیہقی: 3/211- 258، سیرت ابن ہشام: 3/94)

اس واقعہ میں رسول اللہ ﷺ کی شجاعت و بہادری کا اعلیٰ نمونہ موجود ہے، اُبی بن خلف اسلحہ سے لیس تھا، مضبوط زرہ زیب تن کئے ہوئے تھا لیکن اس کے باوجود اللہ کے رسول ﷺ نے ایک معمولی سی جگہ ملتے ہی اس پر نشانہ مار دیا، اس سے اللہ کے رسول ﷺ کی جنگی مہارت، نشانہ بازی اور ماہرانہ قدرت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، اس میں اللہ کے رسول ﷺ کے معجزہ کا بھی اظہار ہے، چنانچہ آپؐ نے پہلے ہی اس کو بتا دیا تھا کہ اللہ کی مشیت سے آپؐ ہی اس کو قتل کریں گے اور ایسا ہی ہوا۔

اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین کو بھی رسول اللہ ﷺ کی صداقت پر یقین تھا کہ آپؐ جب کوئی بات ارشاد فرمائیں گے تو وہ ہو کر رہے گی، اُبی بن خلف کو بھی اس کا پورا یقین تھا کہ وہ اس زخم کی وجہ سے مر جائے گا لیکن اس کے باوجود اس نے عناد و ہٹ دھرمی اور خواہش نفس کی پیروی کرتے ہوئے اسلام قبول نہیں کیا۔

حضرت حسان بن ثابتؓ نے اس واقعہ کو اپنے شعر میں بیان کر کے اس کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا ہے، وہ کہتے ہیں:

لَقَدْ ورِثَ الضّلَالَةَ عَنْ أَبيه ... أُبي يوم بارزه الرسولُ

أَتَيت إِلَيه تَحْمل رِمّ عَظْمٍ ... وتُوعِدُهُ وأَنْتَ به جَهولُ

ترجمہ: ''جس دن رَسُولُ اللّٰہ ﷺ نے اُبی کا قتل کیا اس دن بھی اس نے اپنے باپ سے ضلالت و گمراہی کو وراثت میں پایا۔ تم آپ ﷺ کے پاس ایک بوسیدہ ہڈی کی طرح آئے اور آپ کو دھمکی دے رہے تھے حالانکہ تو آپ ﷺ کی ذات کے بارے میں جاہل تھا''۔ (التاریخ الاسلامی للحمیدی: 5/169، سیرت ابن ہشام: 3/94)

تیسرا باب
معرکہ کے بعد کے واقعات

۱: رسول ﷺ اور صحابہ کرام کے ساتھ ابو سفیان کی گفتگو:

حضرت براءؓ فرماتے ہیں: ''(جب جنگ ختم ہو گئی تو ایک پہاڑ پر کھڑے ہو کر) ابو سفیان نے کہا: کیا محمدؐ اپنی قوم کے ساتھ موجود ہیں؟ تین مرتبہ انہوں نے یہی پوچھا، لیکن نبی کریم ﷺ نے جواب دینے سے منع فرما دیا تھا، پھر انہوں نے پوچھا: کیا ابن ابی قحافہ (ابو بکرؓ) اپنی قوم میں موجود ہیں؟ یہ سوال بھی تین مرتبہ کیا، پھر پوچھا: ابن خطاب (عمرؓ) اپنی قوم میں موجود ہیں؟ یہ بھی تین مرتبہ پوچھا، پھر اپنے ساتھیوں کی طرف مڑ کر کہنے لگے کہ یہ تینوں قتل ہو چکے ہیں ،اس پر عمرؓ سے نہ رہا گیا اور آپ بول پڑے کہ اے اللہ کے دشمن! اللہ گواہ ہے کہ تو جھوٹ بول رہا ہے، جن کے تو نے ابھی نام لئے تھے وہ سب زندہ ہیں اور ابھی تیرا بُرا دن آنے والا ہے۔ ابو سفیان نے کہا: اچھا! آج کا دن بدر کا بدلہ ہے اور لڑائی بھی ایک ڈول کی طرح ہے (کبھی اِدھر کبھی اُدھر) تم لوگوں کو اپنی قوم کے بعض لوگ مُثلہ کئے ہوئے ملیں گے۔ میں نے اس طرح کا کوئی حکم (اپنے آدمیوں کو) نہیں دیا تھا، لیکن مجھے ان کا یہ عمل بُرا بھی نہیں معلوم ہوا۔ اس کے بعد وہ فخریہ رجز پڑھنے لگا: ہبل (بت کا نام) بلند رہے، آپ ﷺ نے فرمایا: تم لوگ اس کا جواب کیوں نہیں دیتے؟! صحابہؓ نے پوچھا: ہم اس کے جواب میں کیا کہیں؟ یا رسول اللہ! آپؐ نے فرمایا: کہو کہ اللہ سب سے بلند اور سب سے بڑا بزرگ و برتر ہے۔ ابو سفیان نے کہا: ہمارا مددگار عزیٰ (بت) ہے اور تمہارا کوئی عزیٰ بھی نہیں، آپؐ نے فرمایا: جواب کیوں نہیں دیتے؟ صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اس کا جواب کیا دیا جائے؟ آپؐ نے فرمایا: کہو کہ اللہ ہمارا حامی ہے اور تمہارا حامی کوئی نہیں۔ (صحیح البخاری: 4043، الدلائل للبیھقی: 3/268)

ایک اور روایت میں ہے: حضرت عمرؓ نے فرمایا: نہیں برابر نہیں، ہمارے شہداء جنت میں ہیں اور تمہارے مقتولین جہنم میں ہیں۔ (مسند أحمد: 1/463، مجمع الزوائد: 6/110، السیرۃ النبویہ الصحیحۃ: 2/392)

ابو سفیان نے رسول اللہ ﷺ کے بارے میں اور حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ کے بارے میں دریافت کیا، اس سے پتہ چلتا ہے کہ مشرکین کی ان تین شخصیات پر خصوصی نظر تھی اور ان تینوں شخصیات کو وہ اہمیت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اس لئے کہ ان کو معلوم تھا کہ وہ اسلام کے لئے بنیادی ستون ہیں اور انہی کے ذریعہ اسلام کا محل تعمیر ہوا، اسلامی حکومت اور اسلامی نظام کے بنیادی ستون انہی پر قائم ہیں اور مشرکین سمجھتے تھے کہ ان کی وفات کے ذریعہ ان کے بعد اسلام دوبارہ قائم نہیں ہو سکتا ہے۔

ابتدائی مرحلہ میں اس کو جواب نہ دینا، اس کو اہمیت نہ دینے اور لائقِ التفاف نہ سمجھنے کی وجہ سے تھا، لیکن جب وہ غرور و تکبر کا مظاہرہ کرنے لگا اور آپے سے باہر ہو گیا تو صحابہؓ نے اس کو حقیقت سے آگاہ کر دیا اور شجاعت و بہادری کے ساتھ اس کو جواب دیا گیا۔ (السیرۃ النبویہ الصحیحۃ: 2/392 سیرت ابن ہشام، زاد المعاد: 3/202)

۲: رسول اللہ ﷺ کا شہداء کو تلاش کرنا:

جب ابوسفیان میدانِ جنگ سے کھسک گیا تو اللہ کے رسول ﷺ اپنے اصحاب کو تلاش کرنے لگے، آپ ﷺ کا گزر بعض شہداء کے پاس سے ہوا جن میں حضرت حمزہ بن عبدالمطلب، حضرت مصعب بن عمیر، حضرت حنظلہ بن اَبی عامر، حضرت سعد بن ربیع، حضرت اُصیرم اور دیگر صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم اَجمعین) تھے، جب اللہ کے رسول ﷺ ان کے سامنے کھڑے ہوئے تو آپؐ نے فرمایا: میں ان شہداء پر گواہ ہوں، جو بھی زخم کسی زخمی کو اللہ کی راہ میں لگا ہو گا وہ قیامت کے روز خون بہتا ہوا آئے گا، اس کا رنگ خون کا رنگ ہو گا اور اس کی خوشبو مشک کی خوشبو ہو گی، ان میں سے جس کو سب سے زیادہ قرآن یاد ہے اس کو قبر میں پہلے رکھو۔ (صحیح بخاری: 2079، سنن ابوداؤد: 3138، سنن ترمذی: 1036)

حضرت جابر بن عبداللہؓ کی ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ شہدائے اُحد میں سے دو دو لوگوں کو ایک کپڑے میں جمع فرماتے تھے اور پھر فرماتے: ان میں سب سے زیادہ قرآن کس کو یاد ہے؟ جب کسی کے بارے میں بتایا جاتا تو لحد میں اس کو پہلے رکھا جاتا، اور آپ ﷺ نے فرمایا: میں بروزِ قیامت ان کے بارے میں گواہ ہوں۔ آپؐ نے ان کے بارے میں حکم دیا کہ ان کو ان کے خون کے ساتھ ہی دفن کیا جائے، ان کی نہ ہی نمازِ جنازہ پڑھی اور نہ ہی ان کو غسل دیا گیا۔ (صحیح بخاری: 4079، سنن ابو داؤد: 3138، سنن ترمذی: 1036، سنن نسائی: 4/62، سنن ابن ماجہ: 1514)

اللہ کے رسول ﷺ نے حکم دیا کہ وہ جہاں شہید ہوئے ہیں وہیں ان کو دفن کیا جائے اور جس کو مدینہ میں تدفین کے لئے لے جایا جا رہا تھا ان کو بھی واپس لایا گیا۔ (سنن نسائی: 4/79)

جب اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت حمزہ بن عبدالمطلبؓ کو دیکھا جبکہ ان کا مُثلہ کیا گیا تھا تو آپ ﷺ انتہائی غمگیں ہوئے اور اتنا روئے یہاں تک کہ روتے روتے آپ کی ہچکی بندھ گئی اور آپؐ نے فرمایا: اگر صفیہ غمگیں اور پریشان نہ ہوتی اور میرے بعد یہ سنت نہ بن جاتی تو میں ان کو اسی حال میں چھوڑتا یہاں تک کہ وہ پرندوں اور درندوں کی غذا بن جاتے، اور اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے کسی موقع پر قریش پر غلبہ عطا کیا تو میں ان کے تیس لوگوں کا مُثلہ کروں گا، جب مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ کا ان لوگوں پر غم و غصہ دیکھا جنھوں نے آپؐ کے چچا کے ساتھ یہ سلوک کیا تھا تو وہ کہنے لگے: اللہ کی قسم! اگر اللہ تعالیٰ نے کسی روز ہمیں ان پر غلبہ عطا کیا تو ہم ان کا ایسا مُثلہ کریں گے جیسا عربوں میں سے کسی نے نہ کیا ہو۔ (مسند احمد: 3/128، سنن ابوداؤد: 3136، سنن ترمذی: 1016، مستدرک حاکم: 3/196 ابن ابی شیبہ: 14/391، سیرت ابن ہشام: 3/106)

اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُواْ بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُم بِهِۦ ۖ وَلَئِن صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصَّـٰبِرِينَ﴾ ترجمہ: ''اور اگر تم لوگ بدلہ لو تو بس اسی قدر لے لو جس قدر تم پر زیادتی کی گئی ہو، لیکن اگر تم صبر کرو تو یقیناً یہ صبر کرنے والوں ہی کے حق میں بہتر ہے''۔ (سورۃ النحل: 126)

مشرکین نے وحشت و درندگی کی مختلف شکلیں اختیار کیں، انہوں نے مسلمان شہداء کا مُثلہ کیا، بہت سے شہداء کے پیٹ چیرے، ان کے ناک اور کان کاٹ دیئے، بعض کی شرمگاہیں کاٹ دیں، لیکن اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے اصحاب نے صبر کیا اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا، عفو و درگزر سے کام لیا، صبر کیا اور قسم کا کفارہ ادا کیا اور مثلہ کرنے سے منع فرمایا۔

ابن اسحاقؒ حضرت سمرہ بن جندبؓ سے روایت نقل کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں: اللہ کے رسول ﷺ جب بھی کسی جگہ کھڑے ہوئے تو اس جگہ کو چھوڑنے سے پہلے ہمیں صدقہ کرنے کا حکم دیتے اور مثلہ کرنے سے منع فرماتے۔(سیرت ابن ہشام: 3/102، غزوۃ أحد، ابو فارس، ص: 104)

۳: أحد کے دن رسول اللہ ﷺ کی دعا:

اللہ کے رسول ﷺ نے صحابہ کرام کو ظہر کی نماز بیٹھ کر پڑھائی، اس لئے کہ آپؐ کے جسمِ اطہر سے بہت زیادہ خون بہہ گیا تھا، مسلمانوں نے بھی آپؐ کے پیچھے بیٹھ کر ہی نماز ادا کی، نماز کے بعد نبی کریم ﷺ اللہ کی حمد و ثنا اور دعا و استغاثہ کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوئے، آپ ﷺ نے اپنے اصحاب سے فرمایا: صفیں بنا کر بیٹھ جاؤ تاکہ میں اپنے رب کی حمد و ثنا بیان کروں، صحابہ کرام آپؐ کے پیچھے صفوں میں بیٹھ گئے، اس کے بعد آپؐ نے ان کلمات کے ذریعہ دعا فرمائی جو آپ ﷺ کے ایمانِ راسخ پر دلالت کرتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ”اللهمَّ لكَ الحمدُ كلُّه، اللهمَّ لا قابضَ لما بسطْتَ، ولا باسطَ لما قبضْتَ، ولا هاديَ لما أضْلَلْتَ، ولا مضلَّ لمنْ هديتَ، ولا معطيَ لما منعتَ، ولا مانعَ لما أعطيْتَ، ولا مقرّبَ لما باعدْتَ، ولا مباعدَ لما قرّبتَ، اللهمَّ ابسطْ علينا منْ بركاتكَ ورحمتكَ وفضلكَ ورزقكَ، اللهمَّ إنّي أسألُكَ النّعيمَ المقيمَ الّذي لا يحولُ ولا يزولُ، اللهمَّ إنّي أسألُكَ النّعيمَ يومَ العيلةِ، والأمنَ يومَ الخوفِ، اللهمَّ إنّي عائذٌ بكَ من شرِّ ما أعطيتَنا وشرِّ ما منعتَ، اللهمَّ حبّبْ إلينا الإيمانَ، وزيّنه في قلوبنا، وكرّهْ إلينا الكفرَ والفسوقَ والعصيانَ، واجعلْنا من الرّاشدينَ، اللهمَّ توفَّنا مسلمينَ، وأحينا مسلمينَ، وألحقْنا بالصّالحينَ غيرَ خزايا ولا مفتونينَ، اللهمَّ قاتلِ الكفرةَ الّذين يكذّبونَ رسلَكَ، ويصدّونَ عن سبيلِكَ، واجعلْ عليهم رجزَكَ وعذابَكَ، اللهمَّ قاتلِ الكفرةَ الّذينَ أوتوا الكتابَ، إلهَ الحقّ“۔

ترجمہ: ”اے اللہ! تمام حمد و ستائش تیرے ہی لئے ہے، جس چیز میں تو کشادگی پیدا فرمادے اس کو کوئی تنگ کرنے والا نہیں ہے اور جس چیز کو تو تنگ کر دے اس کو کوئی کشادہ کرنے والا نہیں ہے، جس کو تو گمراہ کر دے اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں ہے اور جس کو تو گمراہ کر دے اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں ہے، جس کو تو نہ دے اس کو کوئی عطا کرنے والا نہیں ہے اور جس کو تو عطا کر دے اس کو کوئی روکنے والا نہیں ہے، جس کو تو دور کر دے اس کو کوئی قریب کرنے والا نہیں ہے اور جس کو تو قریب کر دے اس کو کوئی دور کرنے والا نہیں ہے۔

اے اللہ! ہمارے لئے اپنی برکتیں، رحمت اور اپنا فضل وسیع فرما، اے اللہ! میں تجھ سے نعمتِ جاوداں کا سوال کرتا ہوں جو نہ ختم ہو اور نہ ہی تبدیل ہو۔ اے اللہ! میں تجھ سے فتح و غلبہ کے دن انعام کا اور خوف کے دن امن کا طالب ہوں۔ اے اللہ! جو کچھ تو نے مجھے عطا کیا ہے اس کے شر سے میں تیری پناہ مانگتا ہوں اور جو کچھ تو نے ہم کو عطا نہیں کیا ہے اس کے شر سے بھی میں تیری پناہ مانگتا ہوں۔ اے اللہ!

ایمان کو ہمارے نزدیک محبوب و پسندیدہ بنادے۔ اس کو ہمارے دلوں میں مزین فرما، اور ہمارے نزدیک کفر و فسق اور نافرمانی کو ناپسندیدہ اور مبغوض بنادے اور ہمیں ہدایت یافتہ لوگوں میں شامل فرما۔ اے اللہ! ہمیں اسلام کی حالت میں وفات دینا، اسلام ہی کی حالت میں زندہ رکھنا اور نیک لوگوں میں ہمیں شامل فرما، نہ ہی ہمیں رسوائی کا سامنا کرنا پڑے، نہ ہی ندامت و شرمندگی کا، اور نہ ہی ہمیں فتنہ و آزمائش میں مبتلا فرما۔ اے اللہ! ان کفار کو ہلاک فرما جو تیرے رسول کی تکذیب کرتے ہیں اور تیرے راستے سے روکتے ہیں، ان پر اپنا عذاب اور اپنی پکڑ نازل فرما۔ اے اللہ! ان کفار کو ہلاک فرما جن کو کتاب عطا کی گئی ہے۔ اے معبود برحق! (مسند احمد: 3/424، مسند بزار: 1800، المعجم للطبرانی: 4549، الادب المفرد للبخاری: 699، مجمع الزوائد: 6/121)

اس کے بعد آپ ﷺ اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے اور مدینہ واپس تشریف لے آئے۔

یہ ایک عظیم عمل ہے جس کو رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کے لئے مشروع کیا تاکہ وہ رب العالمین ہی سے نصرت و توفیق طلب کریں، مزید آپؐ نے اپنی امت کے لئے یہ واضح کیا کہ نصرت و فتح کے وقت بھی دعا مطلوب ہے اور ہزیمت و ناکامی کے وقت بھی۔ اس لئے کہ دعا عبادت کی روح اور جان ہے، اسی طرح دعا دفعِ مکروہ و وبلاء اور حصولِ مطلوب کے لئے قوی ترین سبب ہے، اور دعا دلوں کو خالق کے ساتھ مربوط کردیتی ہے جس کے نتیجہ میں سکینت و ثبات اور اطمئنان کا نزول ہوتا ہے، عظیم روحانی قوت ملتی ہے اور افکار و معنویات بلند ہوتے ہیں اور اللہ کے پاس جو کچھ ہے انسان اسی کو مقصود و مطلوب بنالیتا ہے۔

معرکہ کے بعد نبی کریم ﷺ از سرِ نو تیاری کرتے ہیں، مسلمانوں کی صف بندی کرکے ان کو منظم کرتے ہیں تاکہ اپنے رب کی حمد و ثنا بیان کریں، یقیناً یہ ایک عظیم موقف ہے جو ایمانِ راسخ کا پتہ دیتا ہے اور رب العالمین کے لئے عبودیتِ مطلقہ سے پردہ اٹھاتا ہے جو 'فعّال لما یرید' ہے۔ وہی قابض و باسط ہے، وہی معطی و مانع ہے۔ اس کے حکم اور فیصلہ کو کوئی ٹالنے والا اور تبدیل کرنے والا نہیں ہے۔

یہ عبودیت کے ان عظیم مواقف میں سے ہے جو عبادت گزاروں کو بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے، اور معبود کے لئے اجلال و اکرام اور حمد و ثنا کا ذریعہ بنتا ہے۔ (دیکھیں: صور و عبر من الجهاد النبوي في المدينة، ڈاکٹر محمد فیض اللہ، ص: 132-133)

۴: دشمن کی سمت کا علم:

جب میدانِ جنگ سے مشرکین کا لشکر کھسک گیا تو رسول اللہ ﷺ نے جنگ کے فوراً بعد حضرت علیؓ کو بھیجا تاکہ وہ دشمن کی سمت کا پتہ چلائیں، آپؐ نے ان سے فرمایا: دشمن کے تعاقب میں نکلو اور دیکھو وہ کیا کررہے ہیں اور ان کا ارادہ کیا ہے؟ اگر وہ گھوڑوں سے اتر گئے ہوں اور اونٹوں پر سوار ہوگئے ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مکہ جانے کا ارادہ رکھتے ہیں اور اگر وہ گھوڑوں پر سوار ہوں اور اونٹوں کو چلارہے ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مدینہ کا ارادہ رکھتے ہیں، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے! اگر انہوں نے مدینہ کا رخ کیا تو میں ان کی طرف نکل کر ان کے ساتھ مقابلہ کروں گا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا: میں ان کے پیچھے پیچھے نکلا تاکہ میں دیکھ لوں کہ وہ کیا کرتے ہیں، میں نے دیکھا کہ وہ گھوڑوں سے اتر کر اونٹوں پر سوار ہیں اور مکہ کی جانب متوجہ ہیں۔ (دیکھیں: المغازی للواقدی: 1/298، تاریخ طبری: 2/527، الدلائل للبیہقی: 3/282، البدایہ والنہایہ: 4/41)

یہ دیکھ کر حضرت علیؓ واپس آئے اور رسول اللہ ﷺ کو ان کے بارے میں اطلاع دی۔

اس واقعہ میں متعدد دروس واسباق ہیں: جیسے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ دشمن کی نقل و حرکت پر پوری نظر رکھے ہوئے تھے اور باریک بینی کے ساتھ اس کا جائزہ لے رہے تھے اور معنوی اور نفسیاتی اعتبار سے آپ ﷺ کا حوصلہ انتہائی بلند تھا، اس کا اظہار اس سے ہوتا ہے کہ اگر مشرکین مدینہ کا رخ کرتے تو آپ ﷺ ان کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لئے پوری طرح تیار تھے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ حضرت علیؓ پر اعتماد کرتے تھے اور ہر ایک کی صلاحیت واستعداد سے اچھی طرح واقف تھے۔ اس کے ذریعہ حضرت علیؓ کی شجاعت و بہادری کا بھی علم ہوتا ہے، اس لئے کہ اگر مشرکین کا لشکر ان کو دیکھ لیتا تو ان کو پکڑنے اور جان سے ختم کرنے میں پس و پیش سے کام نہ لیتا۔ (دیکھیں: غزوۃ اُحد، اُبوفارس، ص: 95،96)

قابل غور یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے معرکہ ختم ہونے کے بعد اطمئنان کے ساتھ معرکہ کی سرزمین میں قیام کیا، اس دوران زخمیوں اور شہداء کا جائزہ لیا، ان کی تجہیز وتدفین کرائی، رب سے دعا کی، اللہ کی حمد وثنا بیان کی اور حضرت علیؓ کو دشمن کے تعاقب میں بھیجا، یہ سب کچھ اس نصرت و کامیابی کی حفاظت کے لئے کیا جو غزوۂ اُحد میں مسلمانوں نے حاصل کی تھی، اس کا تعلق جنگوں اور معرکوں میں سنن الہیہ اور ضوابطِ خداوندی سے ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فتح و نصرت کے اور ہزیمت وشکست کے اسباب متعین کئے ہیں، جو فتح و نصرت کے اسباب اختیار کرے گا اور اللہ تعالیٰ پر حقیقی توکل کرے گا تو اللہ کے حکم سے اس کو نصرت و فتح حاصل ہوگی، جیسے کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿سُنَّةَ ٱللَّهِ ٱلَّتِي قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلُ ۖ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ ٱللَّهِ تَبْدِيلًا﴾ ترجمہ: ”یہ اللہ کی سنت ہے جو پہلے سے چلی آرہی ہے اور تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤگے“۔ (سورۃ الفتح: 23)

اسی طرح غزوۂ حمراء الاسد میں بھی اللہ کے رسول ﷺ نے اسباب اختیار کرنے کے ضابطے پر عمل کیا۔

۵: غزوۂ حمراء الاسد:

بعض روایات میں وارد ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے بعض افراد کے ذریعہ مشرکین کے بارے میں معلومات حاصل کیں، یہاں تک کہ ان کے مکہ واپس آنے کے بعد بھی ان کے بارے میں دریافت کرتے رہے، آپ ﷺ کو ابوسفیان کے بارے میں یہ بھی معلوم ہوا کہ اس نے اپنے لشکر کی سرزنش اور ملامت کی، اس لئے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکے، حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ جب ابوسفیان اور مشرکین اُحد سے واپس آئے اور مقام روحاء (یہ مدینہ سے 73 کلو میٹر دور ہے اور مکہ کے راستے میں آتا ہے) پہنچے، ابوسفیان نے کہا: نہ ہی تم نے محمد ﷺ کو قتل کیا اور نہ ہی دوشیزاؤں کو اپنے ساتھ لاسکے، تم نے بہت برا کیا ہے! ۔ اس بات کا علم رسول اللہ ﷺ کو بھی ہوگیا۔ (المعجم الکبیر للطبرانی: 11632، مجمع الزوائد: 6/121)

اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے دشمنوں کے بارے میں یہاں تک کہ معرکہ ختم ہونے کے بعد بھی، اطلاعات حاصل کرتے رہتے ہیں، تاکہ ان کی طرف سے کسی بھی اچانک کاروائی کے بارے میں مطمئن رہیں۔

اور جب آپ ﷺ کو یہ معلوم ہوا کہ قریش کے لوگ مدینہ کی جانب واپس آنے کا سوچ رہے ہیں تو آپ ﷺ غزوۂ اُحد میں شریک صحابہ کرام کو لے کر حمراء الاسد کی جانب نکل پڑے۔

ابن اسحاقؒ کہتے ہیں: غزوۂ اُحد سنیچر کے دن نصف شوال کو پیش آیا اور جب سولہ (۱۶) شوال اتوار کا دن ہوا تو اللہ کے رسول ﷺ کے منادی نے لوگوں میں اعلان کیا کہ دشمن کا تعاقب کرنا ہے، اور یہ بھی اعلان کیا کہ اس غزوہ میں صرف وہی مجاہدین شامل ہوں گے جو کل غزوۂ اُحد میں شریک تھے، حضرت جابر بن عبداللہؓ نے بھی اس غزوہ میں نکلنے کی اجازت طلب کی تو آپ ﷺ نے ان کو اجازت دے دی، اللہ کے رسول ﷺ اس غزوہ میں اس مقصد سے نکلے تھے تاکہ دشمن کو خوفزدہ کیا جائے اور ان پر یہ واضح کیا جائے کہ مسلمانوں کو جو نقصان ہوا ہے اس کی وجہ سے وہ دشمن کا مقابلہ کرنے کے سلسلہ میں کمزور اور پست نہیں ہوئے ہیں۔ (سیرت ابن ہشام: 3/107، الدلائل للبیہقی: 3/314، البدایہ والنہایہ: 4/50)

صحابہ کرام نے ندائے جہاد پر لبیک کہا، یہاں تک کہ ان لوگوں نے بھی جو زخموں سے چور تھے، بنو عبدالاشہل میں سے ایک شخص کہتا ہے: میں اور میرا بھائی اُحد میں شریک ہوئے تو ہم زخمی حالت میں واپس آئے، جب اللہ کے رسول ﷺ کے منادی نے دشمن کا تعاقب کرنے کا اعلان کیا تو میں نے اپنے بھائی سے کہا- یا اس نے مجھ سے کہا-: کیا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ غزوہ میں شریک ہونے سے ہم پیچھے رہ جائیں گے؟ واللہ! ہمارے پاس کوئی سواری بھی نہیں ہے جس پر ہم سوار ہو سکیں اور ہم میں سے ہر ایک زخمی اور نڈھال ہے، لیکن اس کے باوجود ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نکلے اور میں ان کی بنسبت کم زخمی تھا، جب وہ تھک جاتے تو میں کچھ دیر کے لئے ان کو اٹھاتا اور کچھ وقت کے لئے وہ پیدل چلتے، یہاں تک کہ ہم بھی اس مقام تک پہنچ گئے جہاں تک سب مسلمان پہنچے تھے۔ (ایضاً)

اللہ کے رسول ﷺ حمراء الاسد کی جانب نکلے اور اپنا لشکر لے کر مشرکین کے لشکر کے قریب پہنچے، وہاں آپ ﷺ نے تین دن تک قیام کیا، مشرکین کو چیلنج دیتے رہے، لیکن وہ مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہ کر سکے، اللہ کے رسول ﷺ نے راتوں کو زیادہ آگ جلانے کا حکم دیا تھا، یہاں تک کہ ایک ہی وقت میں پانچ سو مقامات پر آگ جلائی جاتی تھی۔ (دیکھیں: غزوۃ اُحد، ابو فارس، الطبقات الکبری لابن سعد: 2/43)

اسی اثناء میں معبد بن أبی معبد خزاعی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام قبول کیا، آپ ﷺ نے انہیں حکم دیا کہ جا کر ابوسفیان کے ساتھ ملیں اور اس کو مدینہ پر حملہ کرنے سے باز رکھیں، وہ مقامِ روحاء میں اس کے ساتھ جا ملے، ابوسفیان کو ان کے اسلام لانے کا علم نہیں تھا، ابوسفیان نے ان سے پوچھا: اے معبد! کیا خبر ہے آپ کے پاس؟ انہوں نے کہا: محمدؐ اور اس کے اصحاب آپ لوگوں کے خلاف جل بھن رہے ہیں اور اتنی فوج لے کر نکلے ہیں کہ میں نے اس جیسی تعداد کبھی نہیں دیکھی ہے، اور ان کے اصحاب میں سے جو پیچھے رہ گئے ہیں ان کو شرکت نہ کرنے پر بہت افسوس ہے۔ ابوسفیان نے پوچھا: تمہاری کیا رائے ہے؟ انہوں نے کہا: میری رائے یہ ہے کہ آپ یہاں سے کوچ کر لیں اس سے پہلے کہ ان کے لشکر کا ہراول دستہ اس ٹیلے کے پیچھے سے نمودار ہو۔ ابوسفیان نے کہا: اللہ کی قسم! ہم

نے ان پر حملہ کرنے کے لئے عزمِ مصمم کر رکھا ہے تاکہ ان کو جڑ ہی سے ختم کر دیں۔ معبد نے کہا: میں آپ کو اس سے منع کرتا ہوں۔ واللہ! جو کچھ میں نے دیکھا اس کو دیکھ کر میں کچھ اشعار کہنے پر مجبور ہو گیا، پوچھا: آپ نے کیا اشعار کہے ہیں؟ جواب دیا: میں نے کہا ہے:

كَادَتْ تَهُدُّ مِنَ الْأَصْوَاتِ رَاحِلَتِي ... إِذْ سَالَتِ الْأَرْضُ بِالْجُرْدِ الْأَبَابِيلِ
تَرْدِي بِأُسْدٍ كِرَامٍ لَا تَنَابِلَةٍ ... عِنْدَ اللِّقَاءِ وَلَا مِيلٍ مَعَازِيلِ
فَظَلْتُ عَدْوًا أَظُنُّ الْأَرْضَ مَائِلَةً ... لَمَّا سَمَوْا بِرَئِيسٍ غَيْرِ مَخْذُولِ
فَقُلْتُ: وَيْلُ ابْنِ حَرْبٍ مِنْ لِقَائِكُمُ ... إِذَا تَغَطْمَطَتِ الْبَطْحَاءُ بِالْجِيلِ
إِنِّي نَذِيرٌ لِأَهْلِ الْبَسْلِ ضَاحِيَةً ... لِكُلِّ ذِي إِرْبَةٍ مِنْهُمْ وَمَعْقُولِ
مِنْ جَيْشِ أَحْمَدَ لَا وَخْشٍ تَنَابِلَةٍ ... وَلَيْسَ يُوصَفُ مَا أَنْذَرْتُ بِالْقِيلِ

ترجمہ: "قریب تھا کہ لشکر کی آوازوں کی وجہ سے میری سواری گر پڑی جب کہ زمین پر کم بالوں والے گھوڑوں کے جھنڈ کے جھنڈ سیلاب کی طرح اُمڈ آئے تھے، اس سرزمین پر باکمال بہادر چل رہے تھے، مقابلہ کے وقت جن کو نہ ہی چھوٹا ہونے کا احساس ہوتا ہے، اور نہ ہی وہ بزدل وڈرپوک اور بغیر ہتھیاروں کے ہیں۔ میں مسلسل دوڑتا بھاگتا رہا، میں سمجھ رہا تھا کہ کہیں زمین ہی الٹ نہ جائے، جبکہ وہ ایسے رئیس و امیر کی قیادت میں دشمن کی جانب بڑھ رہے تھے جس کو وہ تنہا کبھی نہیں چھوڑ سکتے ہیں۔

میں نے کہا کہ تباہی اور ہلاکت ہے ان لوگوں کے لئے جو ان سے مقابلہ کریں گے جبکہ بطحاء کی سرزمین گھوڑوں کے ذریعہ گونج رہی تھی۔ میں قابلِ احترام اہلِ مکہ کو اعلانیہ طور پر آگاہ کرنے والا ہوں، ہر اس شخص کو جو ان میں سے عقل و بصیرت کا حامل ہو۔ احمد کے اس لشکر کے بارے میں آگاہ کرتا ہوں جو نہ تو ناکارہ اور معمولی ہے، اور نہ ہی اس کی منظر کشی الفاظ کے ذریعہ کی جاسکتی ہے۔ (البدایہ والنہایہ: 4/51، سیرت ابن ہشام: 3/46)

اس نے ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کو واپس جانے پر مجبور کر دیا لیکن ابوسفیان نے اپنی اس پسپائی پر پردہ ڈالنے کے لئے مسلمانوں کے خلاف نفسیاتی جنگ کا آغاز کر دیا تاکہ اس کے ذریعہ وہ مسلمانوں کو مرعوب اور خوفزدہ کر سکے، اس نے مدینہ کی طرف جانے والے عبدالقیس کے قافلہ کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ کے پاس پیغام بھجوایا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ابوسفیان اور اس کے لشکر نے آپؐ کی جانب اور آپؐ کے اصحاب کی جانب کوچ کرنے کا عزم کر رکھا ہے تاکہ ان کے وجود کو ہی ختم کر دیں۔ ابوسفیان نے اس قافلہ کو کشمش دینے کا وعدہ کیا جبکہ وہ سوقِ عکاظ میں اس کے پاس آئیں گے۔ یہ قافلہ رسول اللہ ﷺ کے پاس سے گزرا جب کہ آپؐ حمراء الاسد میں تھے، قافلہ والوں نے آپؐ تک ابوسفیان کا پیغام پہنچایا، وہ سن کر آپؐ نے اور تمام مسلمانوں نے کہا: حسبنا اللہ ونعم الوکیل۔ (تاریخ الاسلام للذھبی، والمغازی، ص226)

مسلمان اپنے پڑاؤ کی جگہ پر مسلسل موجود رہے، قریش نے سلامتی اور واپسی میں ہی اپنی خیریت سمجھی، اس لئے وہ مکہ واپس آ گئے، اس کے بعد مسلمان بھی مدینہ کی جانب قوی روح اور بلند حوصلوں کے ساتھ واپس آئے، ہزیمت و شکست کا عار ختم ہو چکا تھا اور ناکامی کے نتائج سے بھی محفوظ ہو گئے تھے، اس لئے وہ باعزت طریقہ سے مدینہ منورہ میں داخل ہوئے جبکہ مشرکین کی ظاہری فتح و کامیابی کو انہوں نے

بے اثر اور ملیامیٹ کر دیا تھا، ان کو اعصابی کمزوری کا شکار بنا دیا اور مدینہ کے یہود اور منافقین کی خوشی کو بھی غم میں تبدیل کر دیا، قرآن کریم نے اس سرد جنگ کی منظر کشی کی ہے اور اس کے حقائق کو محفوظ کرتے ہوئے بیان کیا ہے: ﴿ٱلَّذِينَ ٱسۡتَجَابُواْ لِلَّهِ وَٱلرَّسُولِ مِنۢ بَعۡدِ مَآ أَصَابَهُمُ ٱلۡقَرۡحُۚ لِلَّذِينَ أَحۡسَنُواْ مِنۡهُمۡ وَٱتَّقَوۡاْ أَجۡرٌ عَظِيمٌ ﴿١٧٢﴾ ٱلَّذِينَ قَالَ لَهُمُ ٱلنَّاسُ إِنَّ ٱلنَّاسَ قَدۡ جَمَعُواْ لَكُمۡ فَٱخۡشَوۡهُمۡ فَزَادَهُمۡ إِيمَٰنًا وَقَالُواْ حَسۡبُنَا ٱللَّهُ وَنِعۡمَ ٱلۡوَكِيلُ ﴿١٧٣﴾ فَٱنقَلَبُواْ بِنِعۡمَةٍ مِّنَ ٱللَّهِ وَفَضۡلٍ لَّمۡ يَمۡسَسۡهُمۡ سُوٓءٌ وَٱتَّبَعُواْ رِضۡوَٰنَ ٱللَّهِۗ وَٱللَّهُ ذُو فَضۡلٍ عَظِيمٍ ﴿١٧٤﴾ إِنَّمَا ذَٰلِكُمُ ٱلشَّيۡطَٰنُ يُخَوِّفُ أَوۡلِيَآءَهُۥ فَلَا تَخَافُوهُمۡ وَخَافُونِ إِن كُنتُم مُّؤۡمِنِينَ ﴿١٧٥﴾﴾ ترجمہ: ”جن لوگوں نے زخم کھانے کے بعد بھی اللہ اور رسول کی پکار پر لبیک کہا اُن میں جو اشخاص نیکوکار اور پرہیزگار ہیں اُن کے لئے بڑا اجر ہے۔ اور وہ جن سے لوگوں نے کہا کہ "تمہارے خلاف بڑی فوجیں جمع ہوئی ہیں، اُن سے ڈرو" تو یہ سن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور اُنہوں نے جواب دیا کہ ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔ آخر کار وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اور فضل کے ساتھ پلٹ آئے، ان کو کسی قسم کا ضرر بھی نہ پہنچا اور اللہ کی رضا پر چلنے کا شرف بھی انہیں حاصل ہو گیا، اللہ بڑا فضل فرمانے والا ہے۔ اب تمہیں معلوم ہو گیا کہ وہ دراصل شیطان تھا جو اپنے دوستوں سے خواہ مخواہ ڈرا رہا تھا لہٰذا آئندہ تم انسانوں سے نہ ڈرنا، مجھ سے ڈرنا اگر تم حقیقت میں صاحب ایمان ہو“۔ (سورۃ آل عمران: 172-175)

مدینہ واپس آنے سے پہلے نبی کریم ﷺ کے پاس شاعر ابو عزہ الجمحی قید ہو کر لایا گیا اور اس کو قتل کر دیا گیا، اس لئے کہ اس نے رسول اللہ ﷺ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ کبھی آپ ﷺ کے خلاف جنگ نہیں کرے گا اور اس پر بدر میں احسان کرتے ہوئے چھوڑ دیا گیا تھا، لیکن اس کے باوجود اس نے وعدہ کی خلاف ورزی کی اور اُحد کی جنگ میں مشرکین کی طرف سے لڑا، ابو عزہ نے قتل سے بچنے کی کوشش کی اور آپ ﷺ سے کہا: مجھے معاف کر دیجئے۔ آپ ﷺ نے اس سے کہا: اب یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ تم مکہ جا کر اپنے رخسار پر ہاتھ پھیرو اور کہو کہ میں نے محمد ﷺ کو دو مرتبہ دھوکہ دیا۔ زبیر اس کی گردن مار دو۔ (طبقات ابن سعد: 2/43، السنن الکبری للبیہقی: 9/65، دلائل النبوۃ: 3/280)

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے اس کی گردن مار دی اور نبی کریم ﷺ نے اس وقت فرمایا: مؤمن ایک ہی سوراخ سے دو بار نہیں ڈسا جاتا ہے۔ (صحیح بخاری: 6133، صحیح مسلم: 2998) اس کے بعد یہ محاورہ ضرب المثل بن گیا: "لا يلدغ المؤمن من جحر واحد مرتين"۔

اس کا تعلق سیاستِ شرعیہ اور حکمتِ عملی سے ہے، اس لئے کہ یہ شاعر زمین میں فتنہ و فساد کا داعی اور فتنہ پرور شخص تھا اور اس پر دوبارہ احسان کرنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ دوبارہ مسلمانوں کے خلاف جنگ چھیڑ دے گا، اس دن مشرکین میں سے جمحی کے علاوہ کسی اور کو گرفتار نہیں کیا گیا۔ (البدایہ والنہایہ: 4/53)

جہاں تک تعلق ہے غزوہ احد میں شہداء کی تعداد کا تو معرکہ ختم ہونے تک ان کی تعداد ستر تک پہنچ گئی تھی، قرآن پاک کی اس آیت کی تفسیر سے اس کی مزید وضاحت ہوتی ہے: ﴿أَوَلَمَّآ أَصَٰبَتۡكُم مُّصِيبَةٌ قَدۡ أَصَبۡتُم مِّثۡلَيۡهَا قُلۡتُمۡ أَنَّىٰ هَٰذَاۖ قُلۡ هُوَ مِنۡ عِندِ أَنفُسِكُمۡۗ إِنَّ ٱللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيۡءٍ قَدِيرٌ﴾ ترجمہ: ”اور یہ تمہارا کیا حال ہے کہ جب تم پر مصیبت آپڑی تو تم کہنے لگے: یہ

کہاں سے آئی؟ حالانکہ (جنگ بدر میں) اس سے دوگنی مصیبت تمہارے ہاتھوں (فریق مخالف پر) پڑ چکی ہے۔ اے نبیؐ! اِن سے کہو: یہ مصیبت تمہاری اپنی لائی ہوئی ہے، اللہ ہر چیز پر قادر ہے"۔ (سورۃ آل عمران: 165)

یہ آیت ان اصحاب کی تسلی کے لئے نازل ہوئی جن کے اعزہ اور متعلقین اُحد کے دن شہید ہوئے، ابن عطیہؒ فرماتے ہیں: مشرکین نے ان میں سے ستر افراد کو شہید کیا اور مسلمانوں نے مشرکین میں سے ستر افراد کو بدر میں مارا تھا اور ستر کو گرفتار کیا تھا۔ (تفسیر ابن عطیہ، المحرر الوجیز: 3/411)

اور جہاں تک تعلق ہے مشرکین کے مقتولین کا تو ان کی تعداد بائیس تھی۔ (دیکھیں: مرویات غزوۃ اُحد، للباکری، ص: 367-369)

غزوۂ حمراء الاسد میں مشرکین کے تعاقب میں رسول اللہ ﷺ کے نکلنے کے کئی اہم مقاصد تھے، جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

۱) جو صحابہ کرام غزوۂ اُحد میں آپؐ کے ساتھ شریکِ جہاد تھے ان کا آخری احساس ہزیمت و شکست کا نہ ہو۔

۲) ان کو یہ پیغام دینا کہ جب بھی دشمن ان کو کمزور سمجھے تو دشمنوں پر پلٹ وار کرنا ان کے لئے ضروری ہے۔

۳) صحابہ کرام کو اعدائے دین کا مقابلہ کرنے کے لئے جری اور باہمت بنانا۔

۴) ان کو یہ پیغام دینا کہ اس دن ان کو جو بھی نقصان ہوا تو وہ اللہ کی حکمت اور ارادہ کے تقاضے کے مطابق ایک ابتلاء و آزمائش تھی، اور وہ طاقتور ہیں جبکہ بظاہر غالب ہونے والے ان کے مدمقابل کمزور و بے سہارا ہیں۔ (فی ظلال القرآن: 1/519)

اسی طرح حمراء الاسد کی جانب نکلنے میں اس بات کا نبوی اشارہ موجود ہے کہ مدّمقابل کی نفسیات و معنویات پر اثر انداز ہونے کے لئے نفسیاتی جنگ کی اپنی جگہ اہمیت ہے، اللہ کے رسول ﷺ اپنی افواج کے ساتھ حمراء الاسد کی جانب نکلے اور وہاں تین روز تک مقیم رہے، آپ ﷺ نے آگ جلانے کا حکم دیا، یہ آگ دور سے نظر آتی تھی اور آس پاس کا ماحول اس کی روشنی سے منور ہو رہا تھا، یہاں تک کہ قریش کے لوگ یہ سمجھنے لگے کہ یہ مسلمانوں کا لشکر بہت بڑی تعداد میں ہے اور ان کا مقابلہ کرنے کی ان میں کوئی طاقت نہیں ہے، اس لئے وہ واپس لوٹ گئے جب کہ ان کے دلوں میں مسلمانوں کا خوف بیٹھ گیا تھا۔ (دیکھیں: غزوۃ اُحد، اُبو فارس، ص: 51)

ابن سعدؒ فرماتے ہیں: "اللہ کے رسول ﷺ اپنے اصحاب کو لے کر نکلے یہاں تک کہ حمراء الاسد میں انہوں نے پڑاؤ ڈالا، مسلمان ان راتوں میں پانچ سو مقامات پر آگ جلاتے تھے یہاں تک کہ وہ آگ دور سے دکھائی پڑتی تھی اور ان کے لشکر کی آواز اور آگ کی روشنی ہر چہار جانب پھیل گئی، اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعہ ان کے دشمنوں کو ذلیل و خوار کر دیا۔ (طبقات ابن سعد: 2/49)

۶: معرکۂ اُحد میں مسلم خواتین کی شرکت:

غزوۂ اُحد سب سے پہلا معرکہ تھا جس میں مسلمان خواتین نے شرکت کی، اس غزوہ میں خواتین نے بھی بہادری اور جوانمردی کے جوہر دکھائے، انہوں نے اپنے مخلصانہ ایمان کا ثبوت پیش کیا، وہ اس لئے شریکِ جہاد ہوئیں تھیں تاکہ پیاسوں کو پانی پلائیں، زخمیوں کا علاج کریں، ان میں سے بعض خواتین نے مشرکین کی جانب سے رسول اللہ ﷺ پر کئے جانے والے حملوں کو روکا، جو خواتین غزوۂ اُحد میں

شریک ہوئیں ان میں سے چند نام یہ ہیں: ام المومنین حضرت عائشہ بنت ابی بکر صدیقؓ، حضرت ام عمارہؓ، حضرت حمنہ بنت جحش الاسدیہؓ، حضرت ام سَلیطؓ، حضرت ام سلیمؓ اور انصار کی بعض خواتین بھی شامل تھیں۔(صحیح مسلم:1809-1810-1811)

حضرت ثعلبہ بن ابی مالکؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ عمر بن خطابؓ نے اہلِ مدینہ کی بعض خواتین کے مابین کچھ چادریں تقسیم کیں، اخیر میں ایک بہترین چادر باقی بچی تو بعض حاضرین نے کہا: اے امیر المؤمنین ! یہ چادر رسول اللہ ﷺ کی نواسی کو دے دیں جو آپ کے نکاح میں ہیں- ان کا اشارہ ام کلثوم بنت علیؓ کی جانب تھا- حضرت عمرؓ نے فرمایا: اُم سَلیط اس کی زیادہ مستحق ہیں، ام سلیط انصار کی ان خواتین میں سے ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ سے بیعت کی تھی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: وہ ہمیں غزوۂ احد میں پانی کے مشکیزے بھر بھر کر لا رہی تھیں۔(صحیح البخاری: 2881،4071)

أ: مجاہدین کو پانی پلانا:

حضرت انسؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ جب اُحد کے دن لوگ نبی کریم ﷺ سے بچھڑ گئے تو میں نے عائشہ بنت ابی بکرؓ اور ام سلیمؓ کو دیکھا کہ وہ اپنے ازار سمیٹے ہوئے تھیں اور تیز چلنے کی وجہ سے پانی کے مشکیزے چھلکتی ہوئی لے جا رہی تھیں، دوسرے راوی نے کہا کہ مشکیزے کو اپنی پشت پر ادھر سے ادھر جلدی لئے پھر رہی تھیں اور پھر لوگوں کو اس میں سے پانی پلاتی تھیں اور وہ پھر واپس آتی تھیں اور مشکیزوں کو بھر کر لے جاتی تھیں اور لوگوں کو پھر سے پانی پلاتی تھیں۔(صحیح بخاری: 2880)

حضرت کعب بن مالکؓ فرماتے ہیں : میں نے ام سلیم بنت ملحانؓ اور عائشہؓ کو دیکھا کہ وہ احد کے دن اپنی پشت پر مشکیزے اٹھائے ہوئے تھیں اور حمنہ بنت جحشؓ پیاسوں کو پانی پلاتی تھیں اور زخمیوں کا علاج کرتی تھیں اور اُم اَیمنؓ زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں۔

ب: زخمیوں کا علاج معالجہ اور پریشان حال افراد کے ساتھ غمخواری:

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ جب کسی غزوہ میں تشریف لے جاتے تو آپؐ کے ساتھ ام سلیمؓ اور انصار کی بعض خواتین بھی نکلتیں، وہ پانی پلانے کا کام کرتی تھیں اور زخمیوں کا علاج کرتی تھیں۔(صحیح مسلم:1810)

عبدالرزاق نے زہری سے نقل کیا ہے کہ خواتین نبی کریم ﷺ کے ساتھ مختلف مواقع پر شریک ہوتی تھیں، مجاہدین کو پانی پلاتی تھیں اور زخمیوں کا علاج معالجہ کرتی تھیں۔(فتح الباری:2880)

حضرت رُبیع بنت معوذؓ سے روایت ہے فرماتی ہیں: ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ لوگوں کو پانی پلاتی تھیں، زخمیوں کا علاج کرتی تھیں اور شہداء کو مدینہ واپس لاتی تھیں۔(صحیح بخاری: 2882) ایک اور روایت میں ہے: ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ غزوات میں شریک ہوتی تھیں، ہم لوگوں کو پانی پلاتی تھیں، ان کی خدمت کرتی تھیں اور زخمیوں اور شہداء کو مدینہ واپس لاتی تھیں۔(صحیح البخاری: 2883)

حضرت ابو حازم سے روایت ہے کہ انہوں نے سہل بن سعدؓ سے سنا جب کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے زخم کے بارے میں دریافت کر رہے تھے تو انہوں نے کہا: واللہ! میں جانتا ہوں کہ اللہ کے رسول ﷺ کے زخم کو کون دھوتا تھا اور کون اس پر پانی ڈالتا تھا، اور کس چیز کے

ذریعہ آپؐ کا علاج کیا گیا۔ فرمایا: فاطمہؓ بنت رسول اللہ ﷺ اس کو دھوتی تھیں، علیؓ اس پر مشکیزہ سے پانی ڈالتے تھے اور جب فاطمہؓ نے دیکھا کہ پانی ڈالنے سے خون میں مزید اضافہ ہو رہا ہے تو انہوں نے چٹائی کا ایک ٹکڑا لیا اور اس کو جلا کر اس پر چپکا دیا اور پھر خون بند ہو گیا۔ (صحیح بخاری: 4075، صحیح مسلم: 1790)

ج: تلوار کے ذریعہ اسلام اور رسول اللہ ﷺ کا دفاع:

غزوۂ اُحد کے موقع پر حضرت اُم عمارہ نُسیبہ مازنیہؓ کے علاوہ کسی اور خاتون نے مشرکین کے ساتھ قتال نہیں کیا، حضرت ضمرہ بن سعید اپنی دادی کے بارے میں بیان کرتی ہیں اور وہ اُحد میں شریک تھیں، کہ وہ مجاہدین کو پانی پلاتی تھیں، فرماتی ہیں: میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: آج نُسیبہ بنت کعب نے فلاں اور فلاں سے بہتر بہادری اور استقامت دکھائی، آپ ﷺ ان کو دیکھ رہے تھے کہ وہ اس دن سخت مقابلہ کر رہی تھیں، انہوں نے اپنی کمر پر اپنا کپڑا باندھ رکھا تھا یہاں تک کہ ان کو تیرہ زخم لگے، جب ان کی وفات کا وقت آیا تو میں بھی ان کو غسل دینے والی خواتین میں شامل تھی، میں نے ان کا ایک ایک زخم شمار کیا تو ان کی تعداد تیرہ تھی، وہ کہا کرتی تھیں: میں ابن قمیئہ کو دیکھ رہی تھی جبکہ وہ ان کے کندھے پر مار رہا تھا۔ وہ ان کے جسم پر سب سے گہرا زخم تھا، ایک سال تک وہ اس زخم کا علاج کرتی رہیں۔ اس کے بعد نبی کریم ﷺ کے منادی نے حمراء الاسد کی جانب کوچ کرنے کا اعلان کیا، انہوں نے اس پر اپنا کپڑا باندھا، لیکن زخم سے خون بہنے کی وجہ سے وہ اس غزوہ میں شریک نہیں ہو سکیں، ہم رات بھر زخموں کا علاج کرتے رہے یہاں تک کہ صبح ہو گئی، جب اللہ کے رسول ﷺ حمراء الاسد سے واپس آئے تو جیسے ہی اپنے گھر پہنچے تو آپ ﷺ نے فوری طور پر عبداللہ بن کعب مازنیؓ - اُم عمارہ کے بھائی - کو ان کا حال معلوم کرنے کے لئے بھیجا، انہوں نے واپس آ کر رسول اللہ ﷺ کو ان کے بخیر ہونے کی خبر دی تو نبی کریم ﷺ کو اس کے ذریعہ انتہائی خوشی ہوئی۔ (سیر أعلام النبلاء، للذہبی 2/278، المغازی للواقدی: 1/269)

استاذ حسین الباکری نے حضرت نُسیبہ بنت کعب کی قتال میں شرکت کے بارے میں گفتگو کی ہے وہ لکھتے ہیں: مردوں کے ساتھ عورتوں کا قتال کے لئے نکلنا کہیں سے ثابت نہیں ہے، سوائے نُسیبہؓ کے قصہ کے، اور نُسیبہؓ کا قتال بھی اضطراری تھا، اس لئے کہ انہوں نے دیکھا کہ لوگ آپ ﷺ سے بچھڑ گئے اور آپؐ خطرہ میں ہیں تو اُم عمارہؓ کے ساتھ اس وقت ایسی صورتحال درپیش تھی جہاں اسلحہ اٹھانا قدرت و استطاعت رکھنے والے کے لئے واجب اور ضروری ہو گیا تھا، چاہے مرد ہوتا یا کوئی عورت۔ (دیکھیں: مرویات غزوۃ اُحد، ص:254)

ڈاکٹر اکرم ضیاء عمری ان اقوال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں جو غزوۂ اُحد میں خواتین کی شرکت پر دلالت کرتے ہیں: "اور یہ اقوال دلالت کرتے ہیں کہ بوقتِ ضرورت زخمیوں کے علاج و معالجہ اور ان کی خدمت کے لئے خواتین سے فائدہ اٹھانے کا جواز ہے جبکہ ان کے ذریعہ فتنہ کا اندیشہ نہ ہو اور وہ ستر و حفاظت کا اہتمام کرتی ہوں، اور اگر دشمن ان کے ساتھ تعرّض کرے تو ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ

لڑ کر اپنی طرف سے دفاع کریں، حالانکہ جہاد صرف مردوں پر فرض ہے، مگر جب دشمن اچانک مسلم علاقہ میں حملہ آور ہو جائے تو اس وقت تمام مردوزن کے لئے اس سے لڑنا ضروری ہو جاتا ہے۔(السیرۃ النبویہ الصحیحۃ: 2/391)

استاد محمد احمد باشمیل اس حوالہ سے رقمطراز ہیں : ''معرکہ ٔ اُحد پہلا اسلامی معرکہ ہے جس میں مسلم خواتین نے مشرکین کے ساتھ قتال کیا، یہ ثابت ہے کہ اس معرکہ میں صرف ایک خاتون نے قتال میں شرکت کی، جبکہ وہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے دفاع کر رہی تھیں، اسی طرح یہ بھی ثابت ہے کہ جس خاتون نے معرکہ ٔاحد کے قتال میں شرکت کی وہ لڑنے کی نیت سے نہیں نکلی تھی، وہ اس میں مردوں کی طرح فوج میں شامل نہیں تھیں، بلکہ وہ یہ دیکھنے نکلی تھیں کہ لوگ کیا کرتے ہیں تاکہ وہ مسلمانوں کے لئے کوئی ممکن مدد فراہم کر سکے، جیسے کہ زخمیوں کو پانی پلانا اور اسی طرح کے دوسرے کام، مزید یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جو خاتون معرکہ ٔاحد میں شامل ہوئی وہ ایسی خاتون تھیں جو جوانی کے مرحلہ سے گزر چکی تھیں، اسی طرح معرکہ میں ان کے ساتھ ان کا شوہر اور دو بیٹے بھی تھے جو معرکہ میں لڑنے والے لشکر میں شامل تھے، ان تمام چیزوں کے ساتھ ساتھ وہ ہر اعتبار سے اخلاق کردار اور دینی تربیت سے آراستہ تھیں، اس لئے اس جلیل القدر صحابیہ پر دورِ حاضر کی خواتین فوج کو قیاس نہیں کیا جا سکتا ہے جو پُرکشش اور چست لباس پہنتی ہیں اور ان کی خاص پہچان فتنہ اور کشش ہے جس کو مردوں کے سامنے ظاہر کرنا ان کی قلبی خواہش ہوتی ہے، لہذا کہاں ثری اور کہاں ثریا؟!

اسی طرح اُس وقت کے مردوں پر دورِ حاضر کے مردوں کو بھی قیاس نہیں کیا جا سکتا ہے، خودداری اور استقامت کے اعتبار سے بھی اور عفت و مردانگی کے اعتبار سے بھی، تمام مجاہدین جن کے ساتھ وہ خاتون معرکہ ٔاحد میں شریک ہوئیں وہ امتِ مسلمہ کے سب سے زیادہ پاکباز و چنیدہ افراد تھے، وہ امت کی شرافت و بزرگی کی پہچان تھے اور امت کی مردانگی اور استقامت کا عنوان تھے، اس لئے معرکہ ٔاحد میں شامل ہونے والی خاتون کی شرکت کو شرعی اعتبار سے ایسا قاعدہ نہیں بنایا جا سکتا ہے جس کی بنیاد پر دورِ حاضر کی عورت کو فوج میں شامل کرنے کا جواز فراہم کیا جائے تاکہ وہ ایک اہم عنصر کی حیثیت سے مرد کے شانہ بشانہ لڑے، اس صورت میں یہ قیاس مع الفارق ہوگا اور یہ قیاس قطعی طور پر باطل ہے۔(دیکھیں: غزوۃ اُحد، محمد باشمیل، ص: 171-173)

۷: صحابیات کے صبر واستقامت میں اُمت کے لئے دروس واسباق:

أ: حضرت صفیہ بنت عبد المطلبؓ:

جب حضرت صفیہ بنت عبدالمطلبؓ کے بھائی حضرت حمزہ بن عبدالمطلبؓ کی شہادت ہوئی اور حضرت صفیہؓ اُن کو دیکھنے کے لئے آئیں جبکہ مشرکین نے حضرت حمزہؓ کا مثلہ کیا تھا، ان کی ناک اور کان کاٹ ڈالے تھے اور ان کا پیٹ چاک کر دیا تھا تو اللہ کے رسول ﷺ نے ان کے بیٹے حضرت زبیر بن عوامؓ سے فرمایا: ان کے ساتھ جا کر ملو اور ان کو واپس لوٹا دو، وہ اپنے بھائی کی حالت نہ دیکھ پائیں، حضرت زبیرؓ نے ان سے کہا: اے امی جان! اللہ کے رسول ﷺ آپ کو حکم دے رہے ہیں کہ آپ واپس لوٹ جائیں۔ انہوں نے کہا: ایسا کیوں؟! مجھے پہلے ہی معلوم ہو گیا ہے کہ میرے بھائی کا مُثلہ کیا گیا ہے اور یہ سب کچھ اللہ کے لئے ہے، ہمارے لئے تو یہ سب سے زیادہ باعثِ خوشی و سعادت

ہے، میں اجر و ثواب کی نیت رکھوں گی اور میں ان شاءاللہ ضرور صبر کروں گی، جب زبیر بن عوامؓ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ کو پوری بات بتادی تو آپؐ نے فرمایا: ان کو آنے دو۔ وہ حضرت حمزہؓ کے پاس آئیں، ان کو دیکھا، ان کے لئے دعا کی، إنا للہ وإنا إلیہ راجعون پڑھا اور ان کے لئے استغفار کیا۔ (سیرت ابن ہشام: 3/108)

ب: حضرت حمنہ بنت جحشؓ:

جب اللہ کے رسول ﷺ صحابہ کرام کی تدفین سے فارغ ہوئے تو آپؐ اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے اور مسلمان بھی آپؐ کے ساتھ مدینہ کی جانب واپس جانے کے لئے جمع ہوگئے، اسی اثناء میں آپ ﷺ کے ساتھ حمنہ بنت جحشؓ کی ملاقات ہوئی، اللہ کے رسول ﷺ نے ان سے فرمایا: اے حمنہ، اجر و ثواب کی نیت رکھو! انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! کس کے بارے میں؟ آپؐ نے فرمایا: آپ کے بھائی عبداللہ بن جحش کے بارے میں۔ یہ سن کر انہوں نے إنا للہ وإنا إلیہ راجعون پڑھا اور ان کے لئے مغفرت کی دعا کی۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: اجر و ثواب کی نیت رکھو! انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ کس کے بارے میں؟ آپؐ نے فرمایا: آپ کے ماموں حمزہ بن عبدالمطلبؓ کے بارے میں۔ انہوں نے کہا: إنا للہ وإنا إلیہ راجعون، اللہ ان کی مغفرت فرمائے، ان کو شہادت مبارک ہو۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: اجر و ثواب کی نیت رکھو! انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! کس کے بارے میں؟ آپؐ نے فرمایا: آپ کے شوہر مصعب بن عمیرؓ کے بارے میں۔ انہوں نے کہا: ہائے افسوس! اور ان کی چیخ نکل گئی اور رونے لگیں۔ یہ دیکھ کر اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: بے شک عورت کے نزدیک شوہر کے لئے خاص اہمیت و مقام ہے۔ آپؐ نے دیکھا کہ بھائی اور ماموں کی خبر سن کر وہ ثابت قدمی اور صبر کا مظاہرہ کرتی رہیں اور شوہر کی خبر سن کر تڑپ گئیں۔ (سنن ابن ماجہ: 1590، تاریخ طبری: 2/532، الدلائل للبیہقی: 3/301، سیرت ابن ہشام: 3/104)

اس کے بعد آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: آپ نے ایسا کیوں کیا؟ انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! مجھے ان کی اولاد کی یتیمی یاد آئی، اس کی وجہ سے میں پریشان ہوگئی۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ان کے لئے اور ان کی اولاد کے لئے دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ ان کو نعم البدل عطا فرمائے، چنانچہ اس کے بعد انہوں نے حضرت طلحہ بن عبداللہؓ سے نکاح کیا اور ان سے محمد اور عمران کی پیدائش ہوئی اور محمد بن طلحہ ان کے بچوں کے ساتھ سب سے زیادہ حسنِ سلوک اور صلہ رحمی کرنے والے تھے۔ (دیکھیں: البدایہ والنہایہ: 4/47، الاصابہ: 8/88، غزوۂ اُحد، ابو فارس، ص: 109)

ج: بنو دینار کی ایک خاتون:

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ بنو دینار کی ایک خاتون کے پاس سے گزرے، ان کے شوہر، بھائی اور والد غزوۂ احد میں شہید ہوئے تھے، جب ان کو ان سب کی شہادت کی خبر دی گئی تو کہنے لگیں: رسول اللہ ﷺ کا کیا حال ہے؟ صحابہؓ نے کہا: اے اُم فلاں! آپ ﷺ خیریت سے ہیں، اللہ کے فضل سے آپؐ ویسے ہی ہیں جیسا کہ آپ چاہتی ہیں، پھر کہنے لگیں: مجھے آپ ﷺ کا

دیدار کرائیے تاکہ میں آپؐ کو دیکھ لوں۔ آپؐ کی جانب اشارہ کرکے ان کو بتایا گیا، جب انہوں نے آپ ﷺ کو دیکھ لیا تو کہا: آپ کے بعد ہر مصیبت ہیچ ہے۔(تاریخ طبری: 2/533، الدلائل للبیہقی: 2/302، سیرت ابن ہشام: 3/105، البدایہ والنہایہ: 4/48)

د: ام سعد بن معاذ:

حضرت اُم سعد بن معاذؓ کا نام کبشہ بنت عبید الخزرجیہؓ ہے، آپؓ اللہ رسول ﷺ کی جانب دوڑتے ہوئے نکلیں جبکہ رسول اللہ ﷺ اپنے گھوڑے پر سوار تھے اور سعد بن معاذؓ آپؐ کے گھوڑے کی لگام پکڑے ہوئے تھے، حضرت سعدؓ نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ! یہ میری والدہ ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ان کو خوش آمدید! وہ قریب ہوئیں اور رسول اللہ ﷺ کو غور سے دیکھ کر کہا: آپ کو خیریت کے ساتھ دیکھنے کے بعد ہر مصیبت ہیچ ہوگئی۔ اس کے بعد اللہ کے رسول ﷺ نے ان کے ساتھ ان کے بیٹے عمرو بن معاذؓ کے بارے میں تعزیت کی، اس کے بعد فرمایا: اے اُم سعد! خوشخبری حاصل کرو، اور ان کے گھر والوں کو بھی خوشخبری سنادو کہ ان کے تمام شہداء نے جنت میں اپنا مقام حاصل کرلیا ہے-ان کی تعداد بارہ تھی-اور ان کی سفارش ان کے گھر والوں کے بارے میں قبول کرلی گئی، اُم سعدؓ نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ، ہم اس پر راضی اور مطمئن ہیں، اِس کے بعد بھی ان پر کون روئے گا؟!۔ اس کے بعد انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! پسماندگان کے لئے دعا فرمائیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: اے اللہ! ان کے دلوں کے غم کو دور فرما، ان کی مصیبت کو دور فرما، ان کو بہترین بدل عطا فرما اور پسماندگان کو نعم البدل عدل عطا فرما۔(مغازی الواقدی: 1/315)

....

چوتھا باب

غزوۂ احد؛ بعض دروس واسباق اور فوائد وعبرتیں

قرآنِ کریم نے غزوۂ اُحد کی انتہائی دقیق منظر کشی کی ہے، غزوہ کی قرآنی تصویر اور منظر کشی غزوہ کے سلسلہ میں وارد روایات کے مقابلہ میں زیادہ واضح اور حیات بخش ہے، اسی طرح سے اطمئنان دلانے والی، خوشخبری دینے والی، سکون فراہم کرنے والی، نصیحت کرنے والی اور موزوں ومناسب آیات کا اسلوب بھی بہترین اور طاقتور ہے، قرآن کریم نے نبوی لشکر کے قلوب ونفوس کی منظر کشی کی ہے اور یہ کتبِ سیرت میں موجود واقعات اور مناظر کے مقابلہ میں قرآنی گفتگو کا امتیاز ہے، قرآن کریم نے دل کی مخفی باتوں پر بھی روشنی ڈالی ہے جن کے بارے میں مسلمان خود اچھی طرح نہیں جانتے تھے کہ وہ ان کے دلوں میں پوشیدہ ہیں، غزوۂ احد پر تبصرہ کرنے کے سلسلہ میں قرآنی منہج پر غور کرنے والا محسوس کرتا ہے کہ اس منہج میں دقت و باریک بینی گہرائی وگیرائی اور جامعیت پائی جاتی ہے، سید قطب شہید ؒ فرماتے ہیں: ''ہر موقف، ہر حرکت اور ہر فکر وسوچ کو بیان کرنے میں باریک بینی اختیار کی گئی ہے اور نفس کی تہوں میں اترنے اور پوشیدہ احساسات تک پہنچنے میں گہرائی اختیار کی گئی ہے اور نفس اور واقعہ کے مختلف پہلوؤں کے سلسلہ میں وسعت وجامعیت اختیار کی گئی ہے۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ منظر کشی میں، اثر انداز ہونے میں اور پیغام رسانی کے سلسلہ میں حرکیت اور حیویت وزندگی کا منہج اختیار کیا گیا ہے، یہاں تک کہ تعبیر وتصویر کے ساتھ احساس وشعور میں ایک عمیق اور تیز طلاطم پیدا ہوتا ہے اور آپ اس وصف بیانی اور تبصرہ کے سامنے جامد وغیر متحرک کھڑے نہیں رہ سکتے ہیں، وہ ایک زندہ اور متحرک وصف بیانی ہے، تمام مناظر اس طرح مستحضر ہو جاتے ہیں جیسے کہ وہ حرکت کر رہے ہوں اور ساتھ ہی ساتھ مؤثر نشاط، روشن کر دینے والی کرنیں اور تحریک دینے والا پیغام بھی پایا جاتا ہے۔(دیکھیں: فی ظلال القرآن:1/532)

بے شک امت کی تربیت کے لئے، قیامِ حکومت کے لئے اور اللہ کے دین کے قیام کے لئے نبی کریم ﷺ کی برپا کی ہوئی تحریک زندگی میں قرآن کریم کے ان مفاہیم کا عکس اور پَرتو ہے جو آپ ﷺ کے مشاعر وافکار اور احساسات میں خون کی طرح گردش کرتے تھے، اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ احد میں ہزیمت وشکست کے اثرات کا علاج کرنے کے لئے نبی کریم ﷺ نے قرآنی منہج کو اختیار کیا، مندرجہ ذیل سطور میں اس منہج کے بعض اہم نکات پر روشنی ڈالی جارہی ہے:

ا: اہلِ ایمان کو قوانین الہیہ کے بارے میں تذکیر اور ان کو ایمانی اعتبار سے بلند ہونے کی دعوت:

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ﴿١٣٧﴾ هَٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ ﴿١٣٨﴾ وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿١٣٩﴾﴾ ترجمہ: ''تم سے پہلے بہت سے دور گزر چکے ہیں، زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ اُن لوگوں کا کیا انجام ہوا جنہوں نے (اللہ کے احکام و

ہدایات کو) جھٹلایا۔ یہ لوگوں کے لئے ایک صاف اور صریح تنبیہ ہے اور جو اللہ سے ڈرتے ہوں اُن کے لئے ہدایت اور نصیحت ہے۔ دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو"۔(سورۃ آل عمران: 137-139)

ان آیات پر غور وفکر کرنے والے کے سامنے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو غزوۂ احد کے موقع پر شیطانی وساوس کے حوالہ نہیں کیا، بلکہ ان آیات کے ذریعہ ان کو مخاطب کر کے ان کے دلوں میں امید پیدا کی اور ایسی چیز کی جانب ان کی رہنمائی کی جس کے ذریعہ ان کو تقویت ملے گی اور ثابت قدمی اور استقامت حاصل ہو گی، اللہ تعالیٰ نے اپنی ان ہدایات کے ذریعہ ان کے آنسوں پونچھے اور ان کے دکھ اور غم کو ہلکا کیا۔(دیکھیں: حدیث القرآن الکریم عن غزوات الرسول ﷺ: 1/190)

ان آیات میں اُممِ سابقہ کے انجام پر بھی غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے جنہوں نے اللہ کی دعوت کو ٹھکرایا اور وہ ضابطہ الٰہی کے مطابق اپنے کفر وظلم اور نافرمانی کی وجہ سے ہلاکت کے انجام سے دوچار ہوئیں۔

۲: اہلِ ایمان کو تسلی اور حکمتوں کی وضاحت:

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِن يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ ٱلْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهُۥ ۚ وَتِلْكَ ٱلْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ ٱلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ ٱللَّهُ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَيَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَآءَ ۗ وَٱللَّهُ لَا يُحِبُّ ٱلظَّٰلِمِينَ ﴿١٤٠﴾ وَلِيُمَحِّصَ ٱللَّهُ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَيَمْحَقَ ٱلْكَٰفِرِينَ ﴿١٤١﴾ أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُوا۟ ٱلْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ ٱللَّهُ ٱلَّذِينَ جَٰهَدُوا۟ مِنكُمْ وَيَعْلَمَ ٱلصَّٰبِرِينَ ﴿١٤٢﴾ وَلَقَدْ كُنتُمْ تَمَنَّوْنَ ٱلْمَوْتَ مِن قَبْلِ أَن تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَأَيْتُمُوهُ وَأَنتُمْ تَنظُرُونَ ﴿١٤٣﴾﴾ ترجمہ: "اِس وقت اگر تمہیں چوٹ لگی ہے تو اس سے پہلے ایسی ہی چوٹ تمہارے مخالف فریق کو بھی لگ چکی ہے، یہ تو زمانہ کے نشیب وفراز ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں، تم پر یہ وقت اس لئے لایا گیا کہ اللہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم میں سچے مومن کون ہیں، اور ان لوگوں کو چھانٹ لینا چاہتا تھا جو واقعی (راستی کے) گواہ ہوں کیونکہ ظالم لوگ اللہ کو پسند نہیں ہیں۔ اور وہ اس آزمائش کے ذریعہ سے مومنوں کو الگ چھانٹ کر کافروں کی سرکوبی کر دینا چاہتا تھا۔ کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں کون وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور اس کی خاطر صبر کرنے والے ہیں۔ تم تو موت کی تمنائیں کر رہے تھے! مگر یہ اُس وقت کی بات تھی جب موت سامنے نہ آئی تھی، لو اب وہ تمہارے سامنے آگئی اور تم نے اُسے آنکھوں دیکھ لیا"۔(سورۂ آل عمران:140-143)

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں واضح کیا ہے کہ زخموں اور شہادتوں کا اثر دشمن کے ساتھ جہاد اور مقابلہ پر نہیں پڑنا چاہیے، اس لئے کہ جس طرح سے مسلمانوں کو نقصان ہوا ہے اسی طرح ان کے دشمن کو بھی اس سے پہلے نقصان اٹھانا پڑا ہے، لہذا اگر وہ باطل پر ہونے کے باوجود اور بُرے انجام سے دوچار ہونے کے باوجود جنگ ومقابلہ کرنے میں کمزور نہیں پڑتے ہیں تو مسلمان تو بدرجہ اولی اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ ان کو کمزوری لاحق نہ ہو جبکہ وہ حق پر قائم ہیں اور ان کا انجام بھی بہترین ہو گا۔(تفسیر رازی : 9/14)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ بلاشبہ یومِ اُحد یومِ بدر کا بدلہ تھا، احد کے دن اہلِ ایمان شہید ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے ان میں سے شہداء کا انتخاب کیا، جبکہ بدر کے دن رسول اللہ ﷺ مشرکین پر غالب آئے اور مشرکین کے مقابلہ میں اہلِ ایمان کو فتح ہوئی۔(تفسیر رازی: 4/105)

غزوۂ احد میں اہلِ ایمان کے ساتھ جو کچھ ہوا اللہ تعالیٰ نے اس کی چار حکمتیں بیان کی ہیں اور وہ ہیں: (۱) اللہ تعالیٰ کا علم متحقق ہو اور اہل ایمان کے سامنے اس کا اظہار ہو۔(۲) بعض اہلِ ایمان کو شہادت کے بلند مقام پر فائز کیا جائے۔(۳) اہلِ ایمان کی تطہیر ہو اور ان کو گناہوں سے اور منافقین سے پاک کیا جائے۔ (۴) آہستہ آہستہ کفار کو ختم کیا جائے۔(دیکھیں: حدیث القرآن الکریم عن غزوات الرسول ﷺ: 1/199)

۳: غلطیوں کا علاج کرنے کا طریقہ:

قرآن کریم جب غزوۂ احد میں مسلمانوں کو لاحق ہونے والے مصائب پر تبصرہ کر رہا ہے تو قرآن نے نرم لہجہ اختیار کیا ہے، بر خلاف اس کے جبکہ غزوۂ بدر کے سلسلہ میں آیات کا نزول ہوا، فاتح و کامیاب کی لغزشوں کے بارے میں محاسبہ کرتے ہوئے قرآن کا اسلوب زیادہ سخت ہے، جبکہ شکست خوردہ کا محاسبہ کرتے ہوئے اسلوب میں نرمی اختیار کی گئی ہے، غزوۂ بدر کے سلسلہ میں قرآن کا اسلوب یہ ہے: ﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَن يَكُونَ لَهُۥٓ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي ٱلْأَرْضِ ۚ تُرِيدُونَ عَرَضَ ٱلدُّنْيَا وَٱللَّهُ يُرِيدُ ٱلْـَٔاخِرَةَ ۗ وَٱللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٦٧﴾ لَّوْلَا كِتَٰبٌ مِّنَ ٱللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَآ أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٦٨﴾﴾ ترجمہ: ”کسی نبی کے لئے یہ زیبا نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک کہ وہ زمین میں دشمنوں کو اچھی طرح کچل نہ دے، تم لوگ دنیا کے فائدے چاہتے ہو، حالانکہ اللہ کے پیشِ نظر آخرت ہے اور اللہ غالب اور حکیم ہے۔ اگر اللہ کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا تو جو کچھ تم لوگوں نے لیا ہے اس کی پاداش میں تم کو بڑی سزا دی جاتی“۔(سورۃ الانفال: 67-68)

جبکہ غزوۂ احد کے بارے میں یہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے: ﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ ٱللَّهُ وَعْدَهُۥٓ إِذْ تَحُسُّونَهُم بِإِذْنِهِۦ ۖ حَتَّىٰٓ إِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَٰزَعْتُمْ فِي ٱلْأَمْرِ وَعَصَيْتُم مِّنۢ بَعْدِ مَآ أَرَىٰكُم مَّا تُحِبُّونَ ۚ مِنكُم مَّن يُرِيدُ ٱلدُّنْيَا وَمِنكُم مَّن يُرِيدُ ٱلْـَٔاخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۖ وَلَقَدْ عَفَا عَنكُمْ ۗ وَٱللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَلَى ٱلْمُؤْمِنِينَ﴾ ترجمہ: ”اللہ نے (تائید و نصرت کا) جو وعدہ تم سے کیا تھا وہ تو اُس نے پورا کر دیا، ابتدا میں اُس کے حکم سے تم ہی اُن کو قتل کر رہے تھے مگر جب تم نے کمزوری دکھائی اور اپنے کام میں باہم اختلاف کیا اور جو نہی کہ وہ چیز اللہ نے تمہیں دکھائی جس کی محبت میں تم گرفتار تھے (یعنی مال غنیمت) تم اپنے سردار کے حکم کی خلاف ورزی کر بیٹھے، اس لئے کہ تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے، تب اللہ نے تمہیں کافروں کے مقابلہ میں پسپا کر دیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے، اور حق یہ ہے کہ اللہ نے پھر بھی تمہیں معاف ہی کر دیا کیونکہ مومنوں پر اللہ بڑی نظر عنایت رکھتا ہے“۔(سورۂ آل عمران: 152)

اس میں عملی حکمت اور قرآنی تربیت بالکل واضح ہے، اہل تربیت اور توجیہ و ارشاد کی مسندوں پر بیٹھنے والوں کو اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔

۴: سابقہ مجاہدین کی مثال اور نمونہ:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿وَكَأَيِّن مِّن نَّبِيٍّ قَٰتَلَ مَعَهُۥ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُواْ لِمَآ أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ وَمَا ضَعُفُواْ وَمَا ٱسْتَكَانُواْۗ وَٱللَّهُ يُحِبُّ ٱلصَّٰبِرِينَ ۝١٤٦ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ إِلَّآ أَن قَالُواْ رَبَّنَا ٱغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِيٓ أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَٱنصُرْنَا عَلَى ٱلْقَوْمِ ٱلْكَٰفِرِينَ ۝١٤٧ فَـَٔاتَىٰهُمُ ٱللَّهُ ثَوَابَ ٱلدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ ٱلْـَٔاخِرَةِۗ وَٱللَّهُ يُحِبُّ ٱلْمُحْسِنِينَ ۝١٤٨﴾ ترجمہ: ”اِس سے پہلے کتنے ہی نبی ایسے گزر چکے ہیں جن کے ساتھ مل کر بہت سے خداپرستوں نے جنگ کی، اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں اُن پر پڑیں ان سے وہ دل شکستہ نہیں ہوئے، انہوں نے کمزوری نہیں دکھائی، وہ (باطل کے آگے) سرنگوں نہیں ہوئے، ایسے ہی صابروں کو اللہ پسند کرتا ہے، ان کی دعا بس یہ تھی کہ ”اے ہمارے رب! ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرما، ہمارے کام میں تیرے حدود سے جو کچھ تجاوز ہو گیا ہو اُسے معاف کردے، ہمارے قدم جمادے اور کافروں کے مقابلہ میں ہماری مدد کر“۔ آخر کار اللہ نے ان کو دنیا کا ثواب بھی دیا اور اس سے بہتر ثوابِ آخرت بھی عطا کیا، اللہ کو ایسے ہی نیک عمل لوگ پسند ہیں“۔ (سورۃ آل عمران: 146-148)

ابن کثیرؒ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے ان آیات اور اس سے پہلے والی آیات کے ذریعہ ان لوگوں کی سرزنش کی ہے جن کے حوصلے اُحد کے دن پست ہو گئے، اور انہوں نے قتال کرنا چھوڑ دیا جبکہ انہوں نے کسی کہنے والے کو سنا کہ محمدؐ شہید ہو گئے ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے فرار کی وجہ سے قتال ترک کرنے کی وجہ سے ان کی ملامت کی ہے۔

اور ان کے سامنے ان کے سابق مجاہد بھائیوں کی مثال بیان کی ہے جو بہت سے گروہوں کی شکل میں گزر چکے ہیں، وہ اپنے انبیاء کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ کے راستے پر چلتے رہے، اور اللہ کی راہ میں ان کو جس چیز کا بھی سامنا کرنا پڑا اس کی وجہ سے نہ ہی ان کے حوصلے پست ہوئے اور نہ ہی وہ اس کے بعد جہاد کے بارے میں کمزور پڑے، اور نہ ہی وہ دشمنوں کے سامنے جھکے، بلکہ وہ اپنے جہاد کی راہ میں صبر وثبات کے ساتھ گامزن رہے، انہی مجاہدین کی مثال دے کر اہلِ ایمان کو ثابت قدمی کی تلقین کی گئی ہے۔ (دیکھیں: تفسیر ابنِ کثیر: 1/410)

۵: امیر کی مخالفت ناکامی کا سبب:

امیر اور ولیٔ امر کی مخالفت فوج کی ناکامی کا اہم ترین سبب ہے، اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ غزوۂ احد کے موقع پر تیر اندازوں نے جب نبی کریم ﷺ کے حکم کی مخالفت کی اور وہ خطرناک غلطی کے مرتکب ہوئے تو اس کی وجہ سے جنگ کا پانسہ ہی پلٹ گیا اور مسلمانوں کو اس کی وجہ سے ناقابلِ تصور نقصانات کا سامنا کرنا پڑا، ولی الأمر اور امیر کی اطاعت کا اندازہ اس سے بخوبی کیا جاسکتا ہے کہ عبد اللہ بن اُبی اور اس کے ساتھ دیگر منافقین کے الگ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں پر کوئی اثر نہیں پڑا، جبکہ تیر اندازوں نے جب غلطی کا ارتکاب کیا جن کی رسول اللہ ﷺ نے بہترین تربیت کی تھی اور ان میں سے ہر ایک کو مخصوص ذمہ داری دی تھی، اور پھر انہوں نے آپ ﷺ کے حکم کی مخالفت کی تو اس کا ضرر اور نقصان سب مسلمانوں کو اٹھانا پڑا، اللہ تعالیٰ نے ان کے دشمن کو ان پر مسلط کر دیا، وہ پریشان ہو گئے اور ان کا اتحاد پارہ پارہ ہو گیا اور قریب تھا کہ تحریکِ اسلامی کا اس کے مرکز میں ہی خاتمہ کر دیا جاتا۔

غزوۂ احد کے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ ابتدائی مرحلہ میں مسلمانوں کو غلبہ نصیب ہوا، جبکہ تیر اندازوں نے رسول اللہ ﷺ کے اُوامر کی پیروی کی، انہوں نے اپنے قائد کی تعلیمات پر عمل کیا اور ان کے امیر عبداللہ بن جبیرؓ متعین کئے گئے تھے، لیکن جب انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے حکم کی مخالفت کی اور تیر انداز مالِ غنیمت جمع کرنے کے لئے پہاڑ سے اتر گئے تو غلبہ کے بعد ان کو ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِذْ تُصْعِدُونَ وَلَا تَلْوُونَ عَلَىٰٓ أَحَدٍ وَٱلرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِىٓ أُخْرَىٰكُمْ فَأَثَٰبَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوا۟ عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ أَصَٰبَكُمْ ۗ وَٱللَّهُ خَبِيرٌۢ بِمَا تَعْمَلُونَ﴾ ترجمہ: ''یاد کرو جب تم بھاگے چلے جا رہے تھے، کسی کی طرف پلٹ کر دیکھنے تک کا ہوش تمہیں نہ تھا اور رسولؐ تمہارے پیچھے تم کو پکار رہا تھا، اُس وقت تمہاری اس روش کا بدلہ اللہ نے تمہیں یہ دیا کہ تم کو رنج پر رنج دیئے تاکہ آئندہ کے لئے تمہیں یہ سبق ملے کہ جو کچھ تمہارے ہاتھ سے جائے یا جو مصیبت تم پر نازل ہو اس پر ملول نہ ہو، اللہ تمہارے سب اعمال سے باخبر ہے''۔(سورۃ آل عمران: 153) (دیکھیں: المستفاد من قصص القرآن: 2/204)

شیخ محمد بن عثیمینؒ فرماتے ہیں: عدم اطاعت کے آثار میں سے یہ ہے کہ بعض صحابہ کرامؓ سے نبی کریم ﷺ کی نافرمانی ہوگئی جبکہ وہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے جہاد فی سبیل اللہ کر رہے تھے اور اس کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ غلبہ اہلِ ایمان کو حاصل تھا اور جب بعض تیر اندازوں نے دیکھا کہ مشرکین کو شکست ہوئی تو انہوں نے اس جگہ کو چھوڑ دیا جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے تاکید کی تھی کہ اس کو کسی بھی حال میں نہ چھوڑیں، انہوں نے اس جگہ کو چھوڑ کر مالِ غنیمت کو جمع کرنا شروع کر دیا اور نتیجتاً پیچھے سے دشمن نے پلٹ وار کر حملہ کر دیا جس کی وجہ سے مسلمانوں کو ایک نئی آزمائش کا سامنا کرنا پڑا، اللہ تعالیٰ نے اس سبب کی جانب اپنے اس قول میں اشارہ کیا ہے: ﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ ٱللَّهُ وَعْدَهُۥٓ إِذْ تَحُسُّونَهُم بِإِذْنِهِۦ ۖ حَتَّىٰٓ إِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَٰزَعْتُمْ فِى ٱلْأَمْرِ وَعَصَيْتُم مِّنۢ بَعْدِ مَآ أَرَىٰكُم مَّا تُحِبُّونَ ۚ مِنكُم مَّن يُرِيدُ ٱلدُّنْيَا وَمِنكُم مَّن يُرِيدُ ٱلْءَاخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۖ وَلَقَدْ عَفَا عَنكُمْ ۗ وَٱللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَلَى ٱلْمُؤْمِنِينَ﴾ ترجمہ: ''اللہ نے (تائید و نصرت کا) جو وعدہ تم سے کیا تھا وہ تو اُس نے پورا کر دیا، ابتدا میں اُس کے حکم سے تم ہی اُن کو قتل کر رہے تھے مگر جب تم نے کمزوری دکھائی اور اپنے کام میں باہم اختلاف کیا، اور جونہی کہ وہ چیز اللہ نے تمہیں دکھائی جس کی محبت میں تم گرفتار تھے (یعنی مالِ غنیمت) تم اپنے امیر کے حکم کی خلاف ورزی کر بیٹھے، اس لئے کہ تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے، تب اللہ نے تمہیں کافروں کے مقابلہ میں پسپا کر دیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے اور حق یہ ہے کہ اللہ نے پھر بھی تمہیں معاف ہی کر دیا کیونکہ مومنوں پر اللہ بڑی نظر عنایت رکھتا ہے''۔(سورۃ آل عمران: 152)

یہ ایک ایسی مصیبت تھی جس کی وجہ سے اس فتح سے ہاتھ دھونا پڑا جس کے اسباب موجود تھے اور اس فتح کا ابتدائی مرحلہ طے بھی ہو گیا تھا، یہ ایک ہی غلطی تھی جبکہ رسول اللہ ﷺ ان کے درمیان موجود تھے، لیکن جب ایک کے بجائے بہت سی مصیبتیں ہوں تو پھر اس کے عواقب و اثرات کتنے خطرناک ہوں گے؟! اسی بنیاد پر ہم کہتے ہیں کہ معاصی کے آثار میں سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بداعمالیوں کی وجہ سے ظالموں کو مسلط کر دیتا ہے اور ظلم و معصیت کے بقدر عزت اور نصرت کے اسباب چھین لیتا ہے۔(غزوۃ أحد دراسۃ دعویۃ: 207-209)

بلاشبہ ولی الامر اور امیر کی اطاعت ضروری ہے، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے بعد اسی کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ أَطِيعُواْ ٱللَّهَ وَأَطِيعُواْ ٱلرَّسُولَ وَأُوْلِي ٱلۡأَمۡرِ مِنكُمۡۖ فَإِن تَنَـٰزَعۡتُمۡ فِي شَيۡءٖ فَرُدُّوهُ إِلَى ٱللَّهِ وَٱلرَّسُولِ إِن كُنتُمۡ تُؤۡمِنُونَ بِٱللَّهِ وَٱلۡيَوۡمِ ٱلۡأٓخِرِۚ ذَٰلِكَ خَيۡرٞ وَأَحۡسَنُ تَأۡوِيلًا﴾ ترجمہ: "اے لوگو جو ایمان لائے ہوئے، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اُن لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں، پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو، اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو، یہی ایک صحیح طریقِ کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے"۔(سورۃ النساء: 59)

علماء کہتے ہیں کہ یہ آیت فوج اور دیگر عام رعایا کے بارے میں نازل ہوئی، ان کے لئے ضروری ہے کہ اُولوالأمر کی اطاعت کریں، مالِ غنیمت کی تقسیم میں، اپنے فیصلوں میں اور جہاد میں اور دیگر امور میں ان کی اطاعت کرتے رہیں۔(دیکھیں: الطاعۃ والمعصیۃ وأثرھما فی المجتمع، محمد بن عثیمین، بحوالہ: غزوۃ أحد، ص: 211)

بے شک ولی الامر کی اطاعت دینی امور میں ایک اہم بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے یہاں تک کہ ائمہ نے اس کو ایمانی عقائد کی فہرست میں شامل کیا ہے۔(دیکھیں مجموع الفتاوی: 28/246)

امت کی تربیت میں اور اسلامی ریاست کے قیام میں اطاعت کی خاص اہمیت ہے، اطاعت کی اہمیت کا خلاصہ مندرجہ ذیل نکات کی شکل میں پیش کیا جا سکتا ہے:

ا) اس کے ذریعہ اللہ عز و جل کے حکم کو عملی زندگی میں نافذ کیا جاتا ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی اُولی الامر کی اطاعت کا حکم دیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ أَطِيعُواْ ٱللَّهَ وَأَطِيعُواْ ٱلرَّسُولَ وَأُوْلِي ٱلۡأَمۡرِ مِنكُمۡۖ فَإِن تَنَـٰزَعۡتُمۡ فِي شَيۡءٖ فَرُدُّوهُ إِلَى ٱللَّهِ وَٱلرَّسُولِ إِن كُنتُمۡ تُؤۡمِنُونَ بِٱللَّهِ وَٱلۡيَوۡمِ ٱلۡأٓخِرِۚ ذَٰلِكَ خَيۡرٞ وَأَحۡسَنُ تَأۡوِيلًا﴾ ترجمہ: "اے لوگو جو ایمان لائے ہوئے، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اُن لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں، پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو، اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو، یہی ایک صحیح طریقِ کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے"۔(سورۃ النساء: 59)

2) ولی أمر کی اطاعت ایک وسیلہ اور ذریعہ ہے اور یہ غایت اور مقصد نہیں ہے، یہ زمین میں اللہ کی شریعت کو قائم کرنے، حق کو ثابت کرنے اور أمر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے کا ایک ذریعہ اور وسیلہ ہے تاکہ اس امت کا خیرِ امت ہونا، اعلائے کلمۃ التوحید اور ایک اللہ کی عبودیت ثابت ہو جائے۔

3) اس کے ذریعہ مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق قائم ہوگا، اس لئے کہ اختلاف کی صورت میں ان کے حالات میں اور دین و دنیا میں بگاڑ پیدا ہوگا۔

4) یہ چیز ان کے لئے دین کو غالب کرنے اور رب کی اطاعت کرنے میں معاون بنے گی۔

5) اس میں ان کے لئے دنیاوی سعادت وکامیابی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اہلِ سنت والجماعت کے اصول میں سے یہ ہے کہ ہم ائمہ اور اُولی الامر کے خلاف خروج کو درست نہیں سمجھتے ہیں، اگرچہ وہ زیادتی ہی کیوں نہ کریں، نہ ہی ہم ان کے خلاف بددعا کریں گے اور نہ ہی ان کی اطاعت سے دستبردار ہوں گے اور ان کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا تقاضا سمجھتے ہیں جب تک کہ وہ کسی معصیت کا حکم نہ دیں اور ان کے لئے صلاح وعافیت کی دعا کرتے رہیں۔(دیکھیں: بدائع السالک فی طبائع الممالک، ابن الأزرق، 1/77، غزوۃ أحد دراسۃ دعویۃ، ص:200)

٦: آخرت کے مقابلہ میں دنیا کو ترجیح دینے کے نقصانات:

متعدد آیات واحادیث کے نصوص وارد ہیں جو اللہ کے نزدیک دنیا کے مقام ومرتبہ کی وضاحت کرتے ہیں، اس کی دلفریبیوں کو بیان کرتے ہیں اور انسان پر ان کے اثرات کو واضح کرتے ہیں، اسی طرح دنیا کا حریص بننے کے بارے میں متنبہ کرتے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ ٱلشَّهَوَٰتِ مِنَ ٱلنِّسَآءِ وَٱلۡبَنِينَ وَٱلۡقَنَٰطِيرِ ٱلۡمُقَنطَرَةِ مِنَ ٱلذَّهَبِ وَٱلۡفِضَّةِ وَٱلۡخَيۡلِ ٱلۡمُسَوَّمَةِ وَٱلۡأَنۡعَٰمِ وَٱلۡحَرۡثِۗ ذَٰلِكَ مَتَٰعُ ٱلۡحَيَوٰةِ ٱلدُّنۡيَاۖ وَٱللَّهُ عِندَهُۥ حُسۡنُ ٱلۡمَـَٔابِ﴾ ترجمہ: "لوگوں کے لئے مرغوباتِ نفس، عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، چیدہ گھوڑے، مویشی اور زرعی زمینیں بڑی خوش آئند بنادی گئی ہیں، مگر یہ سب دنیا کی چندروزہ زندگی کے سامان ہیں، حقیقت میں جو بہتر ٹھکانا ہے وہ تو اللہ کے پاس ہے"۔(سورۃ آل عمران:14)

اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ ٱلۡحَيَوٰةُ ٱلدُّنۡيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُم بِٱللَّهِ ٱلۡغَرُورُ﴾ ترجمہ: "پس یہ دنیا کی زندگی تمہیں دھوکے میں نہ ڈالے اور نہ دھوکہ باز تم کو اللہ کے معاملہ میں دھوکہ دینے پائے"۔(سورۃ لقمان: 33)

اللہ کے رسول ﷺ نے بھی دنیا کے بارے میں دھوکہ کھانے اور اس کا حریص بننے کے بارے میں کئی مقامات پر متنبہ کیا ہے، اس لئے کہ اس حرص کے امت پر بُرے اثرات مرتب ہوتے ہیں، بطور خاص ان افراد پر جو دعوت کے علمبردار ہوتے ہیں۔

حضرت ابو سعید خدریؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: "بے شک دنیا شیریں اور سرسبز وشاداب ہے اور اللہ تعالیٰ آپ کو اس میں خلیفہ بنانے والا ہے، پھر وہ دیکھے گا کہ آپ کیسے عمل کرتے ہو، لہذا دنیا کے بارے میں محتاط رہو اور عورتوں کے بارے میں محتاط رہو، اس لئے کہ بنی اسرائیل میں سب سے پہلا فتنہ عورتوں کے بارے میں تھا"۔(صحیح مسلم: 2742، مسند أحمد: 3/22، ابن حبان: 3221)

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: جب غزوۂ احد میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کو شکست سے دوچار کیا تو تیر انداز کہنے لگے: لوگوں کے ساتھ اور اللہ کے نبی کے ساتھ شامل ہو جاؤ، وہ تم سے پہلے ہی مالِ غنیمت تک نہ پہنچ جائیں اور تمہارے بجائے وہ اس پر قابض ہو جائیں گے، ان میں سے بعض نے کہا: ہم اس وقت تک اپنی جگہ نہیں چھوڑیں گے جب تک کہ نبی کریم ﷺ ہمیں حکم نہ دیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿مِنكُم مَّن يُرِيدُ ٱلدُّنْيَا وَمِنكُم مَّن يُرِيدُ ٱلْـَٔاخِرَةَ﴾ ترجمہ: ”تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے“۔(سورۃ آل عمران:152)(شرح العقیدہ الطحاویۃ، ابن ابی العز الحنفی، تحقیق، د۔عبداللہ ترکی: 2/540، تفسیر الطبری: 3/474)

بلاشبہ اُحد میں جو کچھ ہوا اس میں داعیانِ حق کے لئے عبرت بھی ہے اور اس بات کی تعلیم بھی ہے کہ بسا اوقات دنیا کی محبت اہلِ ایمان کے دلوں میں سرایت کر سکتی ہے اور ان کو اس کا پتہ بھی نہیں چلے گا جس کی وجہ سے وہ دنیا اور دنیاوی مال و متاع کو آخرت اور اس کی نعمتوں پر ترجیح دیں گے اور شریعت کے صریح اوامر واحکام کی مخالفت کے مرتکب ہو جائیں گے، یہ سب کچھ ایک مومن سے ہو سکتا ہے حالانکہ وہ اس کے پوشیدہ محرکات سے غافل ہو گا، اس لئے داعیانِ حق کو اپنے نفوس کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے اور دنیا کی محبت کو اس سے کھرچ پھینکنا چاہیے، تاکہ وہ ان کے درمیان اور احکام شریعت کے درمیان حائل نہ ہو پائے۔(ایضاً)

۷: دین کے ساتھ ربط و تعلق:

ابن کثیرؒ فرماتے ہیں: جب مسلمانوں میں سے بعض پسپا ہو گئے اور بعض ان میں سے شہید ہو گئے تو شیطان نے آواز دی کہ سن لو! محمدؐ (نعوذ باللہ) مارے گئے ہیں۔ ابن قمیئۃ بھی مشرکین کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ میں نے محمدؐ کو مار دیا ہے۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سر پر وار کر کے زخمی کیا تھا اور بہت سے لوگ سمجھ بیٹھے کہ واقعتاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہید ہو گئے ہیں، اس کی وجہ سے قتال میں کمزوری، خوف اور پس و پیش کی صورتحال پیدا ہو گئی، اسی سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں: ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ ٱلرُّسُلُ ۚ أَفَإِيْن مَّاتَ أَوْ قُتِلَ ٱنقَلَبْتُمْ عَلَىٰٓ أَعْقَـٰبِكُمْ ۚ وَمَن يَنقَلِبْ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ فَلَن يَضُرَّ ٱللَّهَ شَيْـًٔا ۗ وَسَيَجْزِى ٱللَّهُ ٱلشَّـٰكِرِينَ﴾ ترجمہ: ”محمدؐ اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں، اُن سے پہلے اور رسول بھی گزر چکے ہیں، پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ یاد رکھو! جو الٹا پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نقصان نہ کرے گا، البتہ جو اللہ کے شکر گزار بندے بن کر رہیں گے انہیں وہ اس کی جزا دے گا“۔(سورہ آل عمران:144)

غزوۂ اُحد میں مسلمان جس ابتلاء و آزمائش میں مبتلا ہوئے اس کا ایک پہلو یہ تھا کہ انہوں نے اپنے ایمان، عقیدہ اور دعوت الی اللہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت کے ساتھ مربوط کر رکھا تھا، اللہ کی ذات پر معبودِ برحق کی حیثیت سے ایمان رکھنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت کو اپنے درمیان ہمیشہ باقی رہنے کا تصور قائم رکھا تھا اور اس میں جذباتی محبت کا بھی غلبہ تھا، انہوں نے ہمیشہ رہنے والی رسالت اور رسول بشر دونوں کو مربوط کر رکھا تھا، حالانکہ بشر کو ہمیشگی اور دوام نہیں ہو سکتا ہے، اسی وجہ سے صحابہ کرامؓ کو حیرانی، تعجب اور انتشار کی صورتحال سے دوچار ہونا پڑا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہر عمل کو دیکھتے رہنا آپؐ کا اسوہ اختیار کرنے کی اُساس و بنیاد ہے جس کے ذریعہ مصائب و مشکلات پر صبر اختیار کرنے کا نمونہ بھی ملتا ہے اور رسالت کی ادائیگی، دعوت و تبلیغ اور نصرتِ حق کے سلسلہ میں تحریک بھی ملتی ہے۔(دیکھیں: المستفاد من قصص القرآن: 2/200)

ابن قیمؒ فرماتے ہیں: بے شک غزوہ اُحد رسول اللہ ﷺ کی وفات سے پہلے اس کا مقدمہ اور تمہید تھا جس کے ذریعہ صحابہ کرام کے ذہن تیار کئے گئے اور اگر فی الحقیقت رسول اللہ ﷺ وفات پا جاتے ہیں یا شہید کئے جاتے ہیں تو اس وقت ایڑھیوں کے بل پھرنے پر ان کی سرزنش کی گئی ہے، اور واضح کیا گیا ہے کہ ان کے لئے ضروری ہے کہ ان کے لائے ہوئے دین پر اور توحید پر ثابت قدم رہیں اور اس پر رہتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوں، اس لئے کہ وہ محمدؐ کے رب کی عبادت کرتے ہیں جو زندہ ہے اور اس کو موت لاحق نہیں ہوتی ہے، لہذا اگر محمد ﷺ کی وفات ہوتی ہے یا وہ شہید ہوتے ہیں تو ان کے لئے درست نہیں ہے کہ یہ چیز ان کے لئے دین سے دستبردار ہونے کا سبب بنے، اس لئے کہ ہر ذی روح کو موت کا مزہ چکھنا ہے اور محمد ﷺ کو اس لئے مبعوث نہیں کیا گیا ہے کہ وہ ہمیشہ رہیں گے، نہ ہی آپ ﷺ اور نہ ہی صحابہ کرام ہمیشہ رہ سکتے ہیں، بلکہ ان کی وفات اسلام اور توحید کی حالت میں ہونی چاہیے، اس لئے کہ موت کا آنا ضروری ہے، اسی لئے شیطان نے جب یہ افواہ پھیلائی کہ محمد ﷺ وفات پا چکے ہیں تو ان میں سے دین کے بارے میں پس وپیش کا شکار ہونے والوں کی سرزنش کی گئی، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ ٱلرُّسُلُ ۚ أَفَإِيْن مَّاتَ أَوْ قُتِلَ ٱنقَلَبْتُمْ عَلَىٰٓ أَعْقَـٰبِكُمْ ۚ وَمَن يَنقَلِبْ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ فَلَن يَضُرَّ ٱللَّهَ شَيْـًٔا ۗ وَسَيَجْزِى ٱللَّهُ ٱلشَّـٰكِرِينَ﴾ ترجمہ: "محمدؐ اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں، اُن سے پہلے اور رسول بھی گزر چکے ہیں، پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ یاد رکھو! جو الٹا پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نقصان نہ کرے گا، البتہ جو اللہ کے شکر گزار بندے بن کر رہیں گے انہیں وہ اس کی جزا دے گا"۔ (سورہ آل عمران: 144) (دیکھیں: زاد المعاد: 3/224، محمد رسول اللہ ﷺ، صادق عرجون: 3/616)

غزوہ اُحد میں عتاب وسرزنش کے ذریعہ تشریع اور احکام سازی کی گئی اور پھر رسول اللہ ﷺ کی وفات کے وقت اس کی تطبیق و تنفیذ عمل میں آئی، اس طور پر کہ جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی تو حضرت ابو بکر صدیقؓ مقامِ 'سنح' میں واقع اپنی قیام گاہ سے گھوڑے پر آئے، یہاں تک کہ گھوڑے سے اتر کر مسجد میں داخل ہوئے، کسی سے آپؓ نے کوئی بات نہیں کی، یہاں تک کہ آپ حضرت عائشہؓ کے پاس تشریف لے گئے اور حضور ﷺ کے پاس تشریف لے گئے، آپ ﷺ کا جسدِ مبارک ایک یمنی چادر سے ڈھکا ہوا تھا، آپؓ نے چہرہ کھولا اور جھک کر چہرہ مبارک کو بوسہ دیا اور رونے لگے، اس کے بعد کہا: میرے ماں باپ آپ پر قربان! خدا کی قسم، اللہ تعالیٰ آپ پر دو مرتبہ موت طاری نہیں کرے گا، جو ایک موت آپ کے مقدر میں تھی وہ آپ پر طاری ہو چکی ہے۔ (دیکھیں: مرض النبي ﷺ ووفاته وأثر ذلك على الأمة، خالد ابو صالح، ص: 20، غزوة أحد دراسة دعوية، ص: 191)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں: ابو بکرؓ باہر تشریف لائے جبکہ عمرؓ لوگوں کے سامنے خطاب کر رہے تھے، حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا: اے عمر! بیٹھ جائیں، حضرت عمرؓ نہیں بیٹھے، اس کے بعد لوگ ابو بکرؓ کے پاس آگئے اور حضرت عمرؓ کو چھوڑ دیا، حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا: اَمّا بعد! تم میں سے جو محمدؐ کی عبادت کرتا تھا، محمدؐ تو وفات پا چکے ہیں اور تم میں سے جو اللہ کی عبادت کرتا تھا تو اللہ زندہ ہے، اس پر موت طاری نہیں ہوتی ہے، اللہ کا فرمان ہے: ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ ٱلرُّسُلُ ۚ أَفَإِيْن مَّاتَ أَوْ قُتِلَ

ٱنقَلَبۡتُمۡ عَلَىٰٓ أَعۡقَـٰبِكُمۡۚ وَمَن يَنقَلِبۡ عَلَىٰ عَقِبَيۡهِ فَلَن يَضُرَّ ٱللَّهَ شَيۡـًٔاۗ وَسَيَجۡزِي ٱللَّهُ ٱلشَّـٰكِرِينَ﴾ ترجمہ: ”محمد اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں، اُن سے پہلے اور رسول بھی گزر چکے ہیں، پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ یاد رکھو! جو الٹا پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نقصان نہ کرے گا، البتہ جو اللہ کے شکر گزار بندے بن کر رہیں گے انہیں وہ اس کی جزا دے گا“۔(سورہ آل عمران:144)

ابن عباسؓ فرماتے ہیں: واللہ! ایسا لگ رہا تھا جیسے کہ لوگوں کو اس کا علم نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی ہے، یہاں تک کہ ابو بکرؓ نے اس آیت کی تلاوت کی تو پھر سب لوگوں نے ان سے یہ آیت لی، میں جس کو بھی دیکھتا تھا تو وہ اس آیت کی تلاوت کرتا تھا، مجھے سعید بن المسیبؒ نے بتایا کہ عمرؓ نے فرمایا: واللہ! میں نے اس آیت کو حضرت ابو بکرؓ سے ہی تلاوت کرتے ہوئے سنا، میں اتنا حیران و پریشان ہو گیا یہاں تک کہ میرے پیر میرا ساتھ نہیں دے رہے تھے، حالت یہ ہوگئی کہ میں زمین پر گرنے لگا جب میں نے انہیں اس آیت کو تلاوت کرتے ہوئے سنا اور مجھے یقین ہو گیا کہ نبی کریم ﷺ وفات پا چکے ہیں۔(صحیح بخاری: 4454)

۸: تیر اندازوں اور منافقین کے ساتھ نبی کریم ﷺ کا معاملہ:

اُ) تیر انداز:

جن تیر اندازوں سے غزوہ اُحد میں اجتہادی غلطی سرزد ہوگئی تھی ان کو رسول اللہ ﷺ نے اسلامی صف سے باہر نہیں کیا اور نہ ہی ان سے فرمایا کہ تم لوگوں سے کمزوری اور کوتاہی کا تجربہ ہونے کے بعد آپ اس مقصد کے لئے موزوں اور مناسب نہیں ہو، بلکہ آپ ﷺ نے رحم و شفقت اور معافی کا معاملہ کرتے ہوئے ان کی کمزوری اور غلطی کو برداشت کیا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ ساتھ اس غزوہ میں شریک تمام اہلِ ایمان کے لئے بھی عفو و درگزر اور معافی کا اعلان کیا، حالانکہ ان میں سے بعض سے ہی غلطی کا صدور ہوا تھا اور اس کے نتیجہ میں سخت نقصانات اٹھانے پڑے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے سب کی خطاؤں اور لغزشوں کو معافی کا صاف اعلان فرما دیا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَقَدۡ صَدَقَكُمُ ٱللَّهُ وَعۡدَهُۥٓ إِذۡ تَحُسُّونَهُم بِإِذۡنِهِۦۖ حَتَّىٰٓ إِذَا فَشِلۡتُمۡ وَتَنَـٰزَعۡتُمۡ فِي ٱلۡأَمۡرِ وَعَصَيۡتُم مِّنۢ بَعۡدِ مَآ أَرَىٰكُم مَّا تُحِبُّونَۚ مِنكُم مَّن يُرِيدُ ٱلدُّنۡيَا وَمِنكُم مَّن يُرِيدُ ٱلۡأٓخِرَةَۚ ثُمَّ صَرَفَكُمۡ عَنۡهُمۡ لِيَبۡتَلِيَكُمۡۖ وَلَقَدۡ عَفَا عَنكُمۡۗ وَٱللَّهُ ذُو فَضۡلٍ عَلَى ٱلۡمُؤۡمِنِينَ﴾ ترجمہ: ”اللہ نے (تائید و نصرت کا) جو وعدہ تم سے کیا تھا وہ تو اُس نے پورا کر دیا، ابتدا میں اُس کے حکم سے تم ہی اُن کو قتل کر رہے تھے مگر جب تم نے کمزوری دکھائی اور اپنے کام میں باہم اختلاف کیا، اور جو نہی کہ وہ چیز اللہ نے تمہیں دکھائی جس کی محبت میں تم گرفتار تھے (یعنی مالِ غنیمت) تم اپنے امیر کے حکم کی خلاف ورزی کر بیٹھے، اس لئے کہ تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے، تب اللہ نے تمہیں کافروں کے مقابلہ میں پسپا کر دیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے اور حق یہ ہے کہ اللہ نے پھر بھی تمہیں معاف ہی کر دیا کیونکہ مومنوں پر اللہ بڑی نظر عنایت رکھتا ہے“۔(سورۃ آل عمران:152)

اس عفو و درگزر کے ساتھ ایک اہم بات جڑی ہوئی ہے جس کا صحابہ کرام کے دلوں پر اثر ہو سکتا تھا، وہ بات یہ تھی کہ ان سے سرزد ہونے والی غلطی کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا کیا موقف رہتا؟! ان کو اس بات کا احساس تھا کہ اس غلطی کا خمیازہ تنہا رسول اللہ ﷺ کو اٹھانا پڑا، اس لئے ضروری ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے بھی معافی کا اعلان ہو جس کے ذریعہ ان کے دل مطمئن ہوں گے اور ان پر اللہ کے انعام کی تکمیل ہوگی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو بھی حکم دیا کہ وہ بھی ان کو معاف فرمائیں اور ان کے لئے استغفار کرنے کی رسول اللہ ﷺ کو ترغیب دی گئی، اسی طرح آپ ﷺ کو یہ بھی حکم دیا گیا کہ ان سے رائے اور مشورہ طلب کریں، اور ان کے تجربات اور مشوروں سے استفادہ کرنے کے بارے میں پس و پیش کا شکار نہ ہوں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ ٱللَّهِ لِنتَ لَهُمْ ۖ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ ٱلْقَلْبِ لَٱنفَضُّوا۟ مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَٱعْفُ عَنْهُمْ وَٱسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِى ٱلْأَمْرِ ۖ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى ٱللَّهِ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ يُحِبُّ ٱلْمُتَوَكِّلِينَ﴾ ترجمہ: "(اے پیغمبرؐ) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم اِن لوگوں کے لئے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو، ورنہ اگر کہیں تم تند خو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمہارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے، اِن کے قصور معاف کر دو، اِن کے حق میں دعائے مغفرت کرو، اور دین کے کام میں ان کو بھی شریکِ مشورہ رکھو، پھر جب تمہارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسہ کرو، اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اُسی کے بھروسے پر کام کرتے ہیں"۔ (سورۃ آل عمران: 159) (دیکھیں: غزوة أحد دراسة دعوية، ص: 218)

ب) منافق ابن سلول کی علیحدگی:

تین سو منافقین کو لے کر الگ ہونے کا عبداللہ بن سلول کا مقصد یہ تھا کہ ان کے ذریعہ اسلامی لشکر میں انتشار و اضطراب کی کیفیت پیدا کرے تاکہ معنوی اور نفسیاتی طور پر مسلمانوں کے حوصلے پست ہو جائیں اور دشمن کا مورال بلند ہو، اس کا یہ عمل اسلام کے مستقبل کے ساتھ توہین اور سخت حالات میں غداری اور دھوکہ پر مبنی ہے، عبداللہ بن حرام نے اس کو اس عمل سے باز رکھنے کی کوشش کی، مگر انہوں نے ان کی پیشکش کو ٹھکرا دیا، انہی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں: ﴿وَمَآ أَصَٰبَكُمْ يَوْمَ ٱلْتَقَى ٱلْجَمْعَانِ فَبِإِذْنِ ٱللَّهِ وَلِيَعْلَمَ ٱلْمُؤْمِنِينَ ﴿١٦٦﴾ وَلِيَعْلَمَ ٱلَّذِينَ نَافَقُوا۟ ۚ وَقِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا۟ قَٰتِلُوا۟ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ أَوِ ٱدْفَعُوا۟ ۖ قَالُوا۟ لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّٱتَّبَعْنَٰكُمْ ۗ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَٰنِ ۚ يَقُولُونَ بِأَفْوَٰهِهِم مَّا لَيْسَ فِى قُلُوبِهِمْ ۗ وَٱللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُونَ ﴿١٦٧﴾﴾ ترجمہ: "جو نقصان لڑائی کے دن تمہیں پہنچا وہ اللہ کے اذن سے تھا اور اس لئے تھا کہ اللہ دیکھ لے تم میں سے مومن کون ہیں اور منافق کون، وہ منافق کہ جب اُن سے کہا گیا آؤ اللہ کی راہ میں جنگ کرو یا کم از کم (اپنے شہر کی) مدافعت ہی کرو، تو کہنے لگے: اگر ہمیں علم ہوتا کہ آج جنگ ہوگی تو ہم ضرور ساتھ چلتے، یہ بات جب وہ کہہ رہے تھے اُس وقت وہ ایمان کی نسبت کفر سے زیادہ قریب تھے، وہ اپنی زبانوں سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتیں، اور جو کچھ وہ دلوں میں چھپاتے ہیں اللہ اسے خوب جانتا ہے"۔ (سورۃ آل عمران: 166-167)

صورتحال انتہائی خطرناک تھی، مسلمانوں کو اپنی قلتِ تعداد اور قریش کی کثرت کی وجہ سے ان کی سخت ضرورت تھی، لیکن اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے ان منافقین کو ان کے حال پر چھوڑ دیا، اور ان پر کوئی خاص توجہ نہیں دی، البتہ لوگوں کے سامنے ان کو ننگا کر دیا اور اس اسلوب اور طرزِ عمل نے ابن سلول کی تذلیل و توبیخ میں اہم کردار ادا کیا، چنانچہ جب رسول اللہ ﷺ غزوۂ حمراء الاسد سے واپس تشریف لائے تو ابن سلول اپنی عادت کے مطابق لوگوں کو رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرنے کی ترغیب دینے لگا، امام زہریؒ فرماتے ہیں: عبداللہ بن اُبی ہر جمعہ کو وعظ و نصیحت کرتا تھا، اس کو اپنی قوم میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، جب نبی کریم ﷺ جمعہ کے دن خطبہ کے لئے منبر پر بیٹھتے تھے تو یہ کھڑا ہو جاتا تھا اور کہتا تھا: لوگو! یہ ہیں اللہ کے رسول، جو تم میں موجود ہیں جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تمہارا اکرام کیا اور تمہیں عزت دی، اب تم پر فرض ہے کہ تم نبی ﷺ کی مدد کرو اور آپ کی عزت و تکریم کرو، آپ کا فرمان سنو اور جو فرمائیں بجالاؤ، یہ کہہ کر بیٹھ جایا کرتا تھا۔

اُحد کے میدان میں اس کا نفاق کھل گیا اور یہ وہاں سے نبی کریم ﷺ کی کھلی نافرمانی کرکے تہائی لشکر کو لے کر مدینہ واپس لوٹ آیا، جب رسول اللہ ﷺ غزوہ اُحد سے فارغ ہوئے اور مدینہ تشریف لے آئے، جمعہ کا دن آیا اور آپ ﷺ منبر پر چڑھے تو حسبِ عادت وہ آج بھی کھڑا ہوا اور کچھ کہنا چاہتا ہی تھا کہ بعض صحابہؓ ادھر ادھر سے کھڑے ہوگئے اور اس کے کپڑے پکڑ کر کہنے لگے: اے اللہ کے دشمن! بیٹھ جا، تو اب یہ کہنے کا منہ نہیں رکھتا، تو نے جو کچھ کیا وہ کسی سے مخفی نہیں، اب تو اس کا اہل نہیں کہ زبان سے جو جی میں آئے بک دے۔

یہ ناراض ہو کر لوگوں کی گردنیں پھلانگتا ہوا باہر نکل گیا اور کہہ رہا تھا کہ گویا میں کوئی بُری بات کہنے کے لئے کھڑا ہوا تھا، میں تو اس کا کام اور مضبوط کرنے کے لئے کھڑا ہوا تھا، انصار کے کچھ لوگ مسجد کے دروازے پر اس کو ملے تو انہوں نے پوچھا: کیا ہوا؟ اس نے کہا کہ میں تو اس کا کام مضبوط کرنے کے لئے کھڑا ہوا تھا تو ان کے کچھ اصحاب مجھ پر اچھل کر آگئے، مجھے گھسیٹنے لگے اور ڈانٹ ڈپٹ کرنے لگے گویا کہ میں کوئی بُری بات کہنے کے لئے کھڑا ہوا تھا، حالانکہ میری نیت یہ تھی کہ میں آپؐ کی باتوں کی تائید کروں، انہوں نے کہا: خیر، اب تم واپس چلو، آپ ﷺ تمہارے لئے اللہ سے مغفرت طلب کریں گے، اس نے کہا: مجھے کوئی ضرورت نہیں۔[البدایۃ والنہایۃ 53/4 سیرۃ ابن ہشام: 3/69]

۹: جبلِ احد سے محبت:

''احد ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں''۔

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے سامنے احد پہاڑ آیا تو آپؐ نے فرمایا: ''یہ پہاڑ ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں''۔(صحیح بخاری: 4084، صحیح مسلم: 1365)

اس کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ کے لطیف احساس و شعور کا پتہ چلتا ہے، مسلمانوں کو اس پہاڑ کے ذریعہ جو حفاظت اور پناہ ملی اور اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر جو صلاحیت ودیعت کی تھی، آپؐ نے ان دونوں کے مابین موازنہ کیا اور اس کو ربط و تعلق کی اعلیٰ ترین صفت کے ساتھ

متصف کیا اور وہ صفت محبت کی صفت ہے، کیا زندگی سے لبریز یہ وجدان اور یہ لطیف احساس وفاداری کی اعلیٰ مثال نہیں ہے؟ بے شک جو بے جان پتھروں کے فضل کا اعتراف کرے اور ان کے ساتھ اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کرے، یقیناً وہ اس کا اہل اور مستحق ہے کہ وہ بنی نوع انسان کے ادنیٰ ترین فضل کا اعتراف کرے اور اگر جمادات کے ساتھ آپ ﷺ کی وفاداری اس حد تک پائی گئی یہاں تک کہ ان کے لئے آپ ؐ کی زبان مبارک سے اعلیٰ ترین الفاظ وکلمات ادا ہوئے تو وفادار انسانوں کا کیا کہنا؟! ان کو تو آپ ؐ کی طرف سے اس سے بہتر حصہ وافر نصیب ہوگا۔ چہ جائے کہ وہ لوگ جو اُخوت فی اللہ کی وجہ سے آپ کے ساتھ مربوط ہوں۔(دیکھیں: التاریخ الاسلامی 5/198)

اس حدیث نبوی میں بہت سے معانی اور نکات پائے جاتے ہیں ان میں سے بعض کا ذکر حمیدی نے کیا ہے، بعض کا ذکر استاد صالح شامی نے کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: انسان اکثر مصیبت کو اس کے زمان و مکان کے ساتھ مربوط کر کے دیکھتا ہے، لہذا اسلام کی آمد کے بعد اس عادت اور اس طرزِ فکر کو ختم کرنے کے لئے آپ ؐ کا یہ فرمان حق کا بیان بھی تھا اور ہر قسم کی بد شگونی، بد فالی اور طرزِ فکر سے دور کرنے کا ذریعہ بھی تھا، جس کے نفسِ انسانی پر بُرے اثرات مرتب ہوتے ہیں، بلاشبہ مسلمان اس کے بعد جبلِ اُحد پر چڑھیں گے، اس کو بار ہا دیکھیں گے اور وہ پیش آئے ہوئے معرکہ کو یاد کریں گے، لہذا منفی معنی ان کے ذہن و دماغ میں نہ آئیں، اس لئے آپ ؐ نے ان کے سامنے واضح کیا کہ زمان و مکان اللہ کی مخلوقات ہیں، ان میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات میں ان کا نہ کوئی رول نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی اثر، بلکہ تمام امور اللہ کے اختیار میں ہوتے ہیں، اور اللہ کی راہ میں شہادت انسان کے لئے مصیبت نہیں بلکہ کرامت و عزت ہے، اس طرح سے ایمانی دائرہ میں مفاہیم درست ہو جاتے ہیں اور ''جبل اُحد'' کو اس نبوی قول کی روشنی میں عزت و محبت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور وہ کیونکر جائے عزت و کرامت نہ ہو جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس کا انتخاب کیا کہ وہاں پر حضرت حمزہؓ اور آپ ﷺ کے دیگر صحابہ کرام مدفون ہوں جن کا اللہ تعالیٰ نے اس روز انتخاب فرمایا اور انہوں نے اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لئے اپنی جانیں قربان کردیں۔(دیکھیں: من معین السیرۃ، ص:427)

۱۰: احد میں فرشتے:

حضرت سعد بن اَبی وقاصؓ فرماتے ہیں: میں نے اُحد کے روز رسول اللہ ﷺ کے دائیں اور بائیں دو لوگوں کو دیکھا جو سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے، آپ ؐ کے دفاع میں سخت قتال کر رہے تھے، میں نے ان کو نہ ہی اس سے پہلے دیکھا تھا اور نہ ہی بعد میں، یعنی جبرئیل اور میکائیل علیہما السلام۔(صحیح بخاری: 4054، صحیح مسلم:2306)

یہ نبی کریم ﷺ کے دفاع اور حفاظت کے ساتھ خاص ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں سے آپ ؐ کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے اور یہ بات درست نہیں ہے کہ فرشتوں نے اس قتال کے علاوہ اُحد میں قتال کیا ہو۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کے ذریعہ مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدہ کو تین امور کے ساتھ مشروط و معلق کیا تھا: صبر، تقویٰ اور دشنوں کا یکبارگی حملہ کرنا۔ مگر یہ امور متحقق نہیں ہوئے، اس لئے فرشتوں کے ذریعہ مدد کا وعدہ بھی پورا نہیں ہوا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِذْ تَقُولُ لِلْمُؤْمِنِينَ أَلَن يَكْفِيَكُمْ أَن يُمِدَّكُمْ رَبُّكُم بِثَلَٰثَةِ ءَالَٰفٍ مِّنَ ٱلْمَلَٰٓئِكَةِ مُنزَلِينَ ﴿١٢٤﴾ بَلَىٰٓ ۚ إِن تَصْبِرُوا۟

وَتَتَّقُواْ وَيَأۡتُوكُم مِّن فَوۡرِهِمۡ هَٰذَا يُمۡدِدۡكُمۡ رَبُّكُم بِخَمۡسَةِ ءَالَٰفٖ مِّنَ ٱلۡمَلَٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِينَ﴿١٢٥﴾ ترجمہ: "یاد کرو جب تم مؤمنوں سے کہہ رہے تھے: "کیا تمہارے لئے یہ بات کافی نہیں کہ اللہ تین ہزار فرشتے اتار کر تمہاری مدد کرے؟"۔ بے شک، اگر تم صبر کرو اور خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرو تو جس آن دشمن تمہارے اوپر چڑھ کر آئیں گے اُسی آن تمہارا رب (تین ہزار نہیں) پانچ ہزار صاحب نشان فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا"۔(سورۃ آل عمران:124-125)

۱۱: نصرت وہزیمت کے قوانین؛سورۂ اَنفال اور سورۂ آل عمران کی روشنی میں:

سورۂ اَنفال میں غزوۂ بدر کے بارے میں قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے، اور سورۂ آل عمران میں غزوۂ احد کے بارے میں بات کی گئی ہے، تاکہ امت ان بہت سے معانی اور مفاہیم کو اچھی طرح جان لے جن کا تعلق قضاوقدر، موت وحیات، نصرت وہزیمت، رنج و خسارہ، ایمان ونفاق اور آزمائش وعذاب کے مفاہیم کے ساتھ ہے، صحابہ کرام نے سورۂ اَنفال اور سورۂ آل عمران کی روشنی میں غزوۂ بدر و اُحد کے واقعات کے ذریعہ جو مفاہیم سیکھے تھے ان میں نصرت وہزیمت کے قوانین بھی شامل ہیں، ان قوانین کو مختلف آیات میں واضح کیا گیا ہے جن کا خلاصہ مندرجہ ذیل الفاظ کی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے:

۱) اول تا آخر نصرت اللہ عزوجل کے اختیار میں ہے، یہ مخلوقات میں سے کسی کے اختیار میں نہیں ہے، اللہ جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور جس سے چاہتا ہے اس کو دور رکھتا ہے، یہ رزق، عمر اور عمل کی طرح ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَا جَعَلَهُ ٱللَّهُ إِلَّا بُشۡرَىٰ لَكُمۡ وَلِتَطۡمَئِنَّ قُلُوبُكُم بِهِۦۗ وَمَا ٱلنَّصۡرُ إِلَّا مِنۡ عِندِ ٱللَّهِ ٱلۡعَزِيزِ ٱلۡحَكِيمِ﴾ ترجمہ: "یہ بات اللہ نے تمہیں صرف اس لئے بتادی کہ تمہیں خوشخبری ہو اور تمہارے دل اس سے مطمئن ہو جائیں، ورنہ مدد تو جب بھی ہوتی ہے اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے، یقیناً اللہ زبردست اور دانا ہے"۔(سورۃ الانفال:10)

۲) جب اللہ تعالیٰ کسی کے لئے نصرت وفتح کو مقدر کرتا ہے تو روئے زمین کی تمام طاقتیں اس کو روک نہیں سکتی ہیں اور جب اللہ تعالیٰ ہزیمت کو مقدر کرتا ہے تو روئے زمین کی تمام طاقتیں اس سے کسی کو بچا نہیں سکتی ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِن يَنصُرۡكُمُ ٱللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمۡۖ وَإِن يَخۡذُلۡكُمۡ فَمَن ذَا ٱلَّذِي يَنصُرُكُم مِّنۢ بَعۡدِهِۦۗ وَعَلَى ٱللَّهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ ٱلۡمُؤۡمِنُونَ﴾ ترجمہ: "اللہ تمہاری مدد پر ہو تو کوئی طاقت تم پر غالب آنے والی نہیں، اور وہ تمہیں چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کر سکتا ہو؟ پس جو سچے مومن ہیں ان کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے"۔(سورۃ آل عمران:160)

۳) نصرت وفتح کے اللہ کے نزدیک ثابت شدہ اور متعین اصول وضوابط ہیں جن کو سمجھنا انتہائی ضروری ہے، اس لئے ضروری ہے کہ جو اللہ کی فوج کی نمائندگی کر رہے ہوں ان کے پاس موجود جھنڈا خالص اللہ کے لئے ہو، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِن تَنصُرُواْ ٱللَّهَ يَنصُرۡكُمۡ وَيُثَبِّتۡ أَقۡدَامَكُمۡ﴾ ترجمہ: "اے لوگو، جو ایمان لائے ہو، اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم مضبوط جمادے گا"۔(سورۂ محمد:7)

اللہ کی نصرت و مدد اسی وقت حاصل ہوتی ہے جبکہ اللہ کے احکام کی بجاآوری کی جائے، اس کے منہج پر استقامت اختیار کی جائے اور اس کی راہ میں جہاد کیا جائے۔

4) صفوں میں اتحاد اور آپسی اتفاق فتح و نصرت کی اساس ہے، جبکہ اختلاف ہلاکت و ہزیمت کا پیش خیمہ ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَأَطِيعُواْ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ وَلَا تَنَٰزَعُواْ فَتَفۡشَلُواْ وَتَذۡهَبَ رِيحُكُمۡۖ وَٱصۡبِرُوٓاْۚ إِنَّ ٱللَّهَ مَعَ ٱلصَّٰبِرِينَ﴾ ترجمہ: ”اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑو نہیں، ورنہ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی، صبر سے کام لو، یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے“۔ (سورۃ الانفال:46)

5) اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت بھی فتح و نصرت کی اساس ہے اور جہاں تک معصیت کا تعلق ہے تو وہ ہزیمت و شکست تک لے جاتی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَأَطِيعُواْ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ وَلَا تَنَٰزَعُواْ فَتَفۡشَلُواْ وَتَذۡهَبَ رِيحُكُمۡۖ وَٱصۡبِرُوٓاْۚ إِنَّ ٱللَّهَ مَعَ ٱلصَّٰبِرِينَ﴾ ترجمہ: ”اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑو نہیں، ورنہ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی، صبر سے کام لو، یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے“۔ (سورۃ الانفال:46)

6) دنیا کی محبت اور دنیا پر ٹوٹ پڑنے سے امت اللہ تعالیٰ کی نصرت و مدد سے محروم ہو جاتی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿حَتَّىٰٓ إِذَا فَشِلۡتُمۡ وَتَنَٰزَعۡتُمۡ فِي ٱلۡأَمۡرِ وَعَصَيۡتُم مِّنۢ بَعۡدِ مَآ أَرَىٰكُم مَّا تُحِبُّونَۚ مِنكُم مَّن يُرِيدُ ٱلدُّنۡيَا وَمِنكُم مَّن يُرِيدُ ٱلۡأٓخِرَةَۚ﴾ ترجمہ: ”مگر جب تم نے کمزوری دکھائی اور اپنے کام میں باہم اختلاف کیا، اور جونہی کہ وہ چیز اللہ نے تمہیں دکھائی جس کی محبت میں تم گرفتار تھے (یعنی مالِ غنیمت) تم اپنے امیر کے حکم کی خلاف ورزی کر بیٹھے، اس لئے کہ تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے۔ (سورۃ آل عمران:152)

7) قلتِ تعداد اور قلتِ اسباب ہزیمت و شکست کا سبب نہیں ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَقَدۡ نَصَرَكُمُ ٱللَّهُ بِبَدۡرٖ وَأَنتُمۡ أَذِلَّةٞۖ فَٱتَّقُواْ ٱللَّهَ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُونَ﴾ ترجمہ: ”آخر اس سے پہلے جنگ بدر میں اللہ تمہاری مدد کر چکا تھا، حالانکہ اس وقت تم بہت کمزور تھے، لہٰذا تم کو چاہیے کہ اللہ کی ناشکری سے بچو، امید ہے کہ اب تم شکر گزار بنو گے“۔ (سورۃ آل عمران:123)

8) البتہ دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے مادی اور معنوی تیاری ضروری ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَأَعِدُّواْ لَهُم مَّا ٱسۡتَطَعۡتُم مِّن قُوَّةٖ وَمِن رِّبَاطِ ٱلۡخَيۡلِ تُرۡهِبُونَ بِهِۦ عَدُوَّ ٱللَّهِ وَعَدُوَّكُمۡ وَءَاخَرِينَ مِن دُونِهِمۡ لَا تَعۡلَمُونَهُمُ ٱللَّهُ يَعۡلَمُهُمۡۚ وَمَا تُنفِقُواْ مِن شَيۡءٖ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ يُوَفَّ إِلَيۡكُمۡ وَأَنتُمۡ لَا تُظۡلَمُونَ﴾ ترجمہ: ”اور تم لوگ، جہاں تک تمہارا بس چلے، زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے اُن کے مقابلہ کے لئے مہیا رکھو، تاکہ اس کے ذریعہ سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان دُوسرے اعداء کو خوف زدہ کرو جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے، اللہ کی راہ میں جو کچھ تم خرچ کرو گے اس کا پورا پورا بدل تمہاری طرف پلٹایا جائے گا اور تمہارے ساتھ ہرگز ظلم نہ ہوگا“۔ (سورۃ انفال:60)

9) مقابلہ کے وقت ثابت قدمی اور صبر نصرت کے بنیادی عوامل میں سے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَٱثْبُتُواْ وَٱذْكُرُواْ ٱللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ ترجمہ: ''اے ایمان لانے والو، جب کسی گروہ سے تمہارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو، توقع ہے کہ تمہیں کامیابی نصیب ہو گی''۔(سورۃ الانفال: 45) دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِذَا لَقِيتُمُ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوهُمُ ٱلْأَدْبَارَ﴾ ترجمہ: ''اے ایمان لانے والو، جب تم ایک لشکر کی صورت میں کفار سے دوچار ہو تو ان کے مقابلہ میں پیٹھ نہ پھیرو''۔ (سورۃ الانفال: 15)

10) دشمن سے مقابلہ کے وقت صبر وثبات اختیار کرنے میں سب سے زیادہ معاون چیز یہ ہے کہ نصرت عطا کرنے والی تنہا اللہ کی ذات کی طرف دل سے رجوع کر کے اس کا بہت زیادہ ذکر کیا جائے، اسی سے نصرت و مدد طلب کی جائے، اس پر توکل کیا جائے، کثرتِ تعداد، اسباب ووسائل یا کسی دوسری ذات پر بھروسہ نہ کیا جائے اور ہر قسم کی دوسری طاقت وقوت سے اعلان براءت کیا جائے، یہ نصرت کے بنیادی عوامل میں سے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَٱثْبُتُواْ وَٱذْكُرُواْ ٱللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ ترجمہ: ''اے ایمان لانے والو، جب کسی گروہ سے تمہارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو، توقع ہے کہ تمہیں کامیابی نصیب ہو گی''۔(سورۃ الانفال: 45) (دیکھیں: فقہ السیرۃ النبویہ، للغضبان ص: 461-463)

12) شہداء کی فضیلت اور ان کا انعام واکرام:

اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: جب تمہارے بھائی اُحد میں شہید ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی روحوں کو سبز پرندوں کے قالب عطا کئے، وہ جنت کی نہروں کی سیر کرتے ہیں، جنت کے پھل کھاتے ہیں، طلائی قندیلیں جو زیرِ عرش معلق ہیں ان میں رہتے ہیں، جب انہوں نے کھانے، پینے، رہنے کے پاکیزہ عیش پائے تو کہا کہ کاش ہمارے بھائیوں کو معلوم ہو جاتا کہ اللہ نے ہمارے ساتھ کیا اکرام کا معاملہ کیا ہے، تاکہ وہ جہاد کے بارے میں بے رغبتی نہ اختیار کرتے اور نہ ہی جنگ سے پیچھے ہٹیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں انہیں تمہاری خبر پہنچاؤں گا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں: ﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ ٱلَّذِينَ قُتِلُواْ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ أَمْوَٰتًۢا ۚ بَلْ أَحْيَآءٌ عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ ﴿١٦٩﴾ فَرِحِينَ بِمَآ ءَاتَىٰهُمُ ٱللَّهُ مِن فَضْلِهِۦ وَيَسْتَبْشِرُونَ بِٱلَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُواْ بِهِم مِّنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿١٧٠﴾ ۞ يَسْتَبْشِرُونَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ ٱللَّهِ وَفَضْلٍ وَأَنَّ ٱللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ ٱلْمُؤْمِنِينَ ﴿١٧١﴾﴾ ترجمہ: ''جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں انہیں مردہ نہ سمجھو، وہ تو حقیقت میں زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس رزق پا رہے ہیں، جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے اُس پر خوش وخرم ہیں اور مطمئن ہیں کہ جو اہل ایمان ان کے پیچھے دنیا میں رہ گئے ہیں اور ابھی وہاں نہیں پہنچے ہیں ان کے لئے بھی کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔ وہ اللہ کے انعام اور اس کے فضل پر شاداں وفرحاں ہیں اور ان کو معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ مومنوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا''۔(سورۃ آل عمران: 169-171) (مسند أحمد: 1/266، سنن أبو داؤد: 2520، مسند أبو یعلی: 2331، تفسیر طبری: 4/170)

ان آیات کی تفسیر کے سلسلہ میں واحدی نے سعید بن جبیرؒ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: جب اُحد کے دن حمزہ بن عبدالمطلبؓ اور مصعب بن عمیرؓ شہید ہوئے اور انہوں نے اس اکرام و خیر کا مشاہدہ کیا جو ان کو عطا کیا تو وہ کہنے لگے: کاش! ہمارے بھائی اس اکرام وانعام کے بارے میں واقف ہو جاتے جس سے ہم کو نوازا گیا ہے، تاکہ ان کے اندر جہاد کی مزید رغبت پیدا ہو، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں تمہارے بارے میں ان کو باخبر کرتا ہوں، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی: ﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ ٱلَّذِينَ قُتِلُوا۟.......وَأَنَّ ٱللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ ٱلْمُؤْمِنِينَ ﴿١٧١﴾﴾ (أسباب النزول للواحدی، ص: 125، تفسیر طبری: 4/269)

امام مسلمؒ نے اپنی سند سے مسروق سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں کہ ہم نے عبداللہ بن مسعودؓ سے اس آیت کے بارے میں دریافت کیا: ﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ ٱلَّذِينَ قُتِلُوا۟ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ أَمْوَٰتًۢا ۚ بَلْ أَحْيَآءٌ عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ﴾ (سورۃ آل عمران: 169)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا: ہم نے بھی اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ان کی روحیں سبز پرندوں کے قالب میں ہیں، ان کے لئے عرش کے پاس قندیلیں معلق ہیں، وہ جنت میں جہاں چاہتی ہیں سیر کرتی ہے، اور اس کے بعد ان قندیلوں میں رہتی ہیں، ان کے رب نے ان کو اپنا جلوہ دکھایا اور کہا: کیا آپ کو کسی چیز کی چاہت ہے؟ انہوں نے کہا: اب ہمیں کون سی چیز چاہیے جبکہ ہم جنت میں جہاں چاہتے ہیں سیر کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تین مرتبہ ان سے یہی سوال کیا تو جب انہوں نے دیکھا کہ ان سے اس وقت تک پوچھا ہی جاتا رہے گا جب تک کہ وہ جواب نہیں دیں گے اس لئے انہوں نے کہا: اے ہمارے رب! ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہماری روحیں ہمارے جسم میں واپس لوٹا دی جائیں تاکہ ہم کو تیری راہ میں ایک بار پھر شہید کیا جائے۔ جب اللہ تعالیٰ نے دیکھا کہ اس کے علاوہ ان کی کوئی حاجت نہیں ہے تو پھر ان سے سوال نہیں کیا گیا۔ (صحیح مسلم: 1887)

۱۳: مشرکین پر ذرائع ابلاغ اور میڈیا کا حملہ:

عہد نبوی میں ذرائع ابلاغ اور میڈیا کا پورا دارو مدار شعر و شاعری پر تھا، بدر میں مشرکین کے شعراء دفاعی پوزیشن میں تھے اور مرثیہ خوانی کر رہے تھے، لیکن اُحد میں شعرائے قریش نے کوشش کی کہ وہ اس نصرت و کامیابی کو بڑھا چڑھا کر پیش کریں، انہوں نے رائی کا پہاڑ بنا دیا، اس مصنوعی غرور و تکبر کے سامنے حسان بن ثابتؓ، کعب بن مالکؓ اور عبداللہ بن رواحہؓ ڈٹ گئے تاکہ وہ مشرکین کے ابلاغی حملوں کا جواب دیں، جن کی قیادت ہبیرہ بن أبی وہب، عبداللہ بن زبعری، ضرار بن الخطاب اور عمرو بن العاص جیسے ان کے شعراء کر رہے تھے۔ (دیکھیں: من معین السیرۃ، ص252-253)

حضرت حسانؓ کے قصیدے مشرکین کے لئے ایٹم بم کا کام کرتے تھے، حضرت حسانؓ نے مسلمانوں کو دادِ شجاعت دی اور واضح کیا کہ مسلمانوں نے مشرکین کے علمبردار کو مار گرایا، حضرت حسانؓ نے اس پر مشرکین کو پھٹکار سنائی اور ان کو بزدلی اور ڈرپوک قرار دیا، اس لئے کہ وہ اپنے جھنڈے کی حفاظت نہیں کر پائے، یہاں تک کہ آخر میں وہ ایک عورت کے ہاتھ میں تھا، ان کے اشراف اور معزز لوگ اس کو

چھوڑ کر بھاگ گئے،اس ہجو کے ذریعہ مشرکین کو ذلت و بزدلی کے وہ مناظر بھی یاد دلائے گئے جن کا سامنا ان کو معرکہ کے آغاز میں کرنا پڑا تاکہ وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی وجہ سے دھوکہ میں نہ رہیں۔

حضرت حسانؓ نے مشرکین پر صحیح نشانہ لگایا، جبکہ انہوں نے انہیں جھنڈے سے دستبرداری اختیار کرنے اور عورت کے ذریعہ جھنڈے کو سنبھالنے کا عار دلایا،اس کے ذریعہ ان کو شدید ترین بزدلی کے اوصاف سے یاد کیا گیا، یہاں تک کہ ایک عورت کو وہ ذمہ داری سنبھالنی پڑی جس کو وہ ادا نہ کر سکے۔(دیکھیں: سیرت ابن ہشام 164/3 التاریخ الاسلامی 5/21 من معین السیرۃ، ص:252)

....

دسویں فصل

غزوۂ احد اور خندق کے مابین کے اہم واقعات

پہلا باب

اسلامی ریاست کو متزلزل کرنے کے لئے مشرکین کی کوششیں

غزوۂ احد کے ذریعہ اسلامی ریاست کے دشمنوں کے حوصلے بلند ہو گئے، مشرکینِ اُعراب کو یہ احساس ہو چلا کہ مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنااوران پر غلبہ حاصل کرنا ممکن ہے، اعراب میں سے مشرکین مدینہ پر چڑھائی کرنے، مسلمانوں کو جڑ سے اکھیڑنے اوران کی طاقت کو کچلنے کے لئے سر اٹھانے لگے، بنو اُسد اسلامی ریاست کے بارے میں پُر امید ہو گئے، خالد بن سفیان الھذلی نے فوج کو جمع کرنا شروع کیاتا کہ وہ مدینہ پر حملہ کریں، عضل اور قارہ مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لئے جری ہو گئے، عامر بن طفیل نے پُرامن داعی قرّاء کو شہید کیا، بنو نضیر کے یہود نے رسول اللہ ﷺ کو جان سے ختم کرنے کی کوشش کی، اس لئے حبیب مصطفی ﷺ نے انتہائی شجاعت وبہادری، ماہرانہ سیاست، مستحکم منصوبہ بندی اور باریک بینی پر مبنی تنفیذ کے ذریعہ ان ماکرانہ اور شاطرانہ کوششوں کا مقابلہ کیا۔

ا: اسلامی ریاست کے بارے میں بنو اُسد کا لالچ

نبی کریم ﷺ کو جزیرۃ العرب میں اپنے پھیلے ہوئے جاسوسوں کے ذریعہ یہ خبریں معلوم ہوئیں کہ بنو اُسد بن خزیمہ نے طلیحہ الاسدی کی قیادت میں مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاری شروع کر دی ہے، وہ مدینہ کی خیرات پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں، اپنے نظام شرک کی مدد کرنا چاہتے تھے اور مسلمانوں کے خلاف قریش کے ظلم وجور کا ساتھ دینا چاہتے تھے، اس لئے نبی کریم ﷺ نے فوری طور پر ایک سریہ تشکیل دیا، جو ڈیڑھ سو مہاجرین وانصار پر مشتمل تھا، ان کا سپہ سالار ابو سلمہ بن عبد الاسد مخزومی کو متعین کیا۔ آپ ﷺ نے ان کو ایک پرچم دیا اور ان سے فرمایا: چلتے رہو یہاں تک کہ بنو اُسد کے علاقہ تک پہنچ جاؤ، ان پر حملہ کرو قبل اس کے کہ ان کے دستے آپ پر حملہ آور ہوں، حضرت ابو سلمہؓ نے ماہِ محرم میں ان کی جانب کوچ کیا اوران کے جانوروں پر حملہ کر دیا، اس کے نتیجے میں انہوں نے فرار کی راہ اختیار کی، وہ ان کے جانوروں کو لے گئے، اعدائے اسلام کو منتشر کرنے اور بھگانے میں ان کو کسی طرح کی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا، اور وہ مدینہ کی طرف فتحیاب ہو کر واپس آ گئے، حضرت ابو سلمہؓ کو سابقین اولین میں شمار کیا جاتا ہے اور وہ ابتدائی دور کے بہترین لوگوں میں سے ہیں، وہ اس غزوہ سے تھک ہار کر واپس پہنچے کیونکہ غزوۂ احد میں لگا ہوا زخم مزید بڑھ گیا اور وہ جلد ہی اس دنیا سے چل بسے۔ (دیکھیں: نضرۃ النعیم: 3/313، قراءۃ سیاسیۃ للسیرۃ النبویۃ ص162-163، زاد المعاد: 3/243)

اس سریہ میں چند امور خاص طور پر قابل غور ہیں، جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں؛

اللہ کے رسول ﷺ جنگی منصوبہ بندی میں انتہائی باریک بینی سے کام لیتے تھے، چنانچہ آپؐ نے اپنے دشمنوں کو جمع ہونے سے پہلے ہی منتشر کر دیا، وہ ابو سلمہؓ کا دستہ دیکھ کر ششدر رہ گئے، حالانکہ وہ سمجھ رہے تھے کہ انہوں نے مسلمانوں کو جنگ احد میں کمزور کر کے رکھ دیا ہے اوران کو اپنے آپ سے بھی غافل کر دیا، لیکن اس اچانک کاروائی کی وجہ سے مشرکین مسلمانوں سے مزید مرعوب ہو گئے، ان کے عزائم کند پڑ گئے اور مدینہ پر حملہ کرنے کے بجائے وہ اپنے آپ کے بارے میں ہی فکر مند ہو گئے۔

اسی طرح اس کے ذریعہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان جنگی محاذ میں کتنی باریک بینی سے کام لیتے تھے اور کس طرح انہوں نے مناسب وقت اور صحیح راستے کا انتخاب کیا، یہاں تک کہ وہ دشمنوں تک پہنچ گئے قبل اس کے کہ ان کو ان کے بارے میں کوئی علم ہو پاتا، حالانکہ مسافت بھی دور تھی، یہی رازداری مسلمانوں کی کامیابی کے اہم ترین عوامل میں سے تھی، اس رازداری کے دشمن کے دلوں پر مؤثر اثرات مرتب ہوئے، ان کو یہ احساس ہو گیا کہ مسلمان چھپنے کی اور اچانک حملہ کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کے اندر مسلمانوں کا رعب پیدا ہو گیا اور وہ کسی بھی وقت حملہ ہونے کے خوف کی حالت میں زندگی بسر کرنے لگے، اس احساس نے ان کو مسلمانوں کی طاقت و قوت کا اعتراف کرنے اور ان کے ساتھ صلح کرنے پر مجبور کر دیا۔(التاریخ الاسلامی للحمیدی: 6/23)

۲: عبداللہ بن اُنیسؓ بمقابلہ خالد بن سفیان ہذلی

خالد بن سفیان ہذلی قبیلۂ ہذیل اور دیگر قبائل کے جنگجوؤں کو عرفات میں جمع کرنے لگا اور وہ مدینہ میں مسلمانوں پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہا تھا، اس کے ذریعہ وہ قریش کی مدد کرنا چاہتا تھا، ان کا قرب حاصل کرنا چاہتا تھا اور ان کے باطل عقائد کا دفاع کرنا چاہتا تھا، اور ساتھ ہی ساتھ مدینہ کی خیرات پر قبضہ کرنے کا لالچ بھی رکھتا تھا، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے صحابی جلیل حضرت عبداللہ بن اُنیس جہنیؓ کو اس کا مقابلہ کرنے کے لئے روانہ فرمایا اور اس کو قتل کرنے کا مشن بھی ان کو دیا۔(دیکھیں: نضرۃ النعیم: 1/313)

حضرت عبداللہ بن اُنیس خود ہی اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے بیان فرماتے ہیں کہ مجھے اللہ کے رسول ﷺ نے بلایا اور فرمایا: "مجھے یہ خبر ملی ہے کہ خالد بن سفیان بن نبیح میرے خلاف لوگوں کو جمع کر رہا ہے تاکہ وہ مجھ پر حملہ کریں، وہ مقام عرنہ میں ہے، لہٰذا اس کے پاس جا کر اس کا کام تمام کر دو۔ فرماتے ہیں: میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! مجھے اس کا حلیہ بتا دیں تاکہ میں اس کو پہچان سکوں۔ آپؐ نے فرمایا: جب تم اس کو دیکھو گے تو اس کے جسم پر رعشہ (کپکپی) دیکھو گے۔ فرماتے ہیں: میں اپنی تلوار لٹکائے ہوئے نکلا یہاں تک کہ میں مقام عرنہ میں عصر کے وقت اس کے پاس پہنچ گیا، وہ اپنی عورتوں کے ساتھ گھر میں موجود تھا، جب میں نے اس کو دیکھا تو میں نے اس کے جسم پر رعشہ دیکھا، جیسے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا تھا، میں اس کی طرف گیا، مجھے اندیشہ تھا کہ میرے اور اس کے درمیان کوئی ایسی صورتحال نہ پیدا ہو جس کی وجہ سے میری نماز مؤخر ہو جائے گی، اس لئے میں نے اس کی جانب چلتے چلتے ہی نماز ادا کر لی، میں اشارہ سے رکوع اور سجدے ادا کر رہا تھا، جب میں اس کے پاس پہنچا تو اس نے کہا: آپ کا تعارف؟ میں نے کہا: میں ایک عربی شخص ہوں۔ میں نے آپ کے بارے میں اور آپ کی فوج کے بارے میں سنا ہے جو آپ اس شخص کے خلاف جمع کر رہے ہیں، اس لئے میں بھی اسی مقصد کے لئے حاضر ہوا۔ اس نے کہا: ہاں، میں اسی مہم میں لگا ہوں۔ فرماتے ہیں: میں اس کے ساتھ تھوڑی دیر چلتا رہا یہاں تک کہ اس نے مجھے موقع دے دیا تو میں نے تلوار کے ذریعہ اس پر حملہ کر دیا یہاں تک کہ میں نے اس کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد میں نکلا اور اس کی عورتوں کو اس حال میں چھوڑا کہ وہ سب اس کے ارد گرد جمع تھیں، جب میں اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپؐ نے مجھے دیکھا، آپؐ نے فرمایا: یہ چہرہ کامیاب ہو گیا۔ فرماتے ہیں: میں نے آپؐ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! میں نے اس کا کام تمام کر دیا۔ آپؐ نے فرمایا: آپ نے سچ کہا۔ فرماتے ہیں: اس کے بعد رسول اللہ ﷺ میرے ساتھ چلے اور اپنے گھر میں داخل ہوئے، آپؐ نے مجھے اپنا عصا عنایت کیا اور فرمایا:

اے عبداللہ بن اُنیس! یہ اپنے پاس رکھ لو۔ فرماتے ہیں: میں وہ عصالے کر لوگوں کے پاس نکلا تو لوگوں نے کہا: یہ کیسا عصا ہے؟ میں نے کہا: مجھے رسول اللہ ﷺ نے عطا کیا ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ میں اس کو اپنے پاس رکھوں۔ لوگوں نے کہا: آپ رسول اللہ ﷺ کے پاس کیوں نہیں جاتے اور اس کے بارے میں دریافت کریں۔ فرماتے ہیں: میں رسول اللہ ﷺ کے پاس واپس آیا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! آپ نے مجھے یہ عصا کیوں عنایت فرمایا۔ آپؐ نے فرمایا: یہ بروزِ قیامت میرے اور تمہارے درمیان نشانی ہوگی، لوگوں میں بہت کم لوگ بروز قیامت ٹیک لگائے ہوئے ہوں گے۔ عبداللہؓ نے اس عصا کو اپنی تلوار کے ساتھ لگا دیا اور وہ مسلسل انہی کے پاس رہا یہاں تک کہ جب ان کی وفات ہوئی تو انہوں نے اس کے بارے میں وصیت کی اور وہ انہی کے ساتھ کفن میں رکھا گیا اور ساتھ ہی دفن کر دیا گیا۔ (مسند اُحمد: 3/496، مسند اُبویعلی: 905، مجمع الزوائد: 6/203، سنن ابوداؤد: 1249)

اس واقعہ میں کئی فوائد و دروس ہیں، جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

۱: جنگی حکمتِ عملی میں باریک بینی:

اللہ کے رسول ﷺ حفاظتی اور احتیاطی پہلو پر خصوصی توجہ دیتے تھے، اسی لئے آپ ﷺ دشمن کی نقل و حرکت پر پوری نظر رکھتے تھے اور مشکلات اور چیلنجز کے لئے بروقت مناسب حل نکالتے تھے، یہی وجہ ہے کہ آپؐ نے خالد بن سفیان کو اتنی بھی مہلت نہیں دی کہ وہ مزید افراد کو جمع کر کے اور زیادہ طاقتور ہو جاتا، بلکہ آپؐ نے اس فتنہ کو کچلنے کے لئے پوری دور اندیشی کے ساتھ منصوبہ بندی کی اور اس کے ذریعہ امت کے لئے بہت سے فوائد حاصل کئے اور خالد بن سفیان کے ذریعہ پہنچنے والے متوقع نقصانات سے امت کو محفوظ رکھا، اس طرح کی منصوبہ بندی اور تدبیر کے لئے جنگی حکمت عملی میں باریک بینی اور جلدی فیصلہ لینے کی صلاحیت درکار ہوتی ہے۔

۲: افراد کے انتخاب میں نبی کریم ﷺ کی فراست:

اللہ کے رسول ﷺ افراد کے انتخاب میں اور مختلف صلاحیتوں کے حامل افراد کو پہچاننے میں انتہائی فراست سے کام لیتے تھے، چنانچہ آپؐ ہر مہم اور کام کے لئے مناسب شخص کا انتخاب فرماتے تھے، قیادت کے لئے آپؐ ایسے شخص کا انتخاب فرماتے تھے جو صحیح رائے، حسنِ تصرف اور شجاعت و بہادری کا جامع ہو، دعوت و تعلیم کے لئے ایسے شخص کا انتخاب فرماتے تھے جو علمی صلاحیت، حسنِ اخلاق اور لوگوں کے اندر رغبت اور کشش پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، بادشاہوں اور امراء کے پاس بطورِ وفد اور قاصد بھیجنے کے لئے ایسے شخص کا انتخاب فرماتے تھے جو حسنِ مظہر، زبان و کلام میں فصاحت اور حاضر جوابی جیسے اوصاف سے متصف ہو، فدائی مہموں کے لئے ایسے افراد کا انتخاب فرماتے تھے جو زبردست شجاعت و بہادری، بے خوفی اور جذبات پر قابو پانے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ (دیکھیں: التاریخ الاسلامی للحمیدی: 6/27)

حضرت عبداللہ بن اُنیس الجہنی دل کے مضبوط، بلند حوصلہ رکھنے والے اور ایمان و یقین میں رسوخ رکھنے والی شخصیت کے مالک تھے، ان عظیم صفات کے ساتھ ساتھ ایک دوسرا سبب بھی پایا جاتا تھا جس نے ان کو اس اہم مہم کو سر کرنے کا اہل بنایا، وہ یہ تھا کہ وہ ان تمام قبائل کے رہنے کی جگہوں کے بارے میں اچھی طرح واقف تھے، اس لئے کہ وہ قبائل قبیلہ جُہینہ کے آس پاس کے علاقوں میں آباد تھے۔ (محمد رسول اللہ، صادق عرجون 4/50)

۳: اس عمل کا اُخروی بدلہ:

اس عظیم اور جرأتمندانہ عمل کا بدلہ مادی اور دنیاوی نہیں تھا، جیسے کہ بہت سے ایسے لوگ مادی اور دنیاوی بدلہ کی طلب اور تمنا دلوں میں رکھتے ہیں جو قدیم اور جدید زمانہ میں مشکل مہموں کو انجام دیتے ہیں، بلکہ اس عمل کا بدلہ اس سے کہیں زیادہ عظیم اور بلند تھا اور وہ تھا: اُخروی تمغۂ امتیاز جو بہت کم لوگوں کو حاصل ہو پاتا ہے، صحابہ کرام اور تمام اہلِ تقوی کسی بھی دنیاوی بدلہ کے منتظر نہیں رہے ہیں اور اگر ان کو دنیاوی مال ومتاع حاصل ہو بھی جائے تو اس کی ان کے نزدیک کوئی بہت زیادہ اہمیت نہیں ہوتی ہے، بلکہ وہ اخروی جزا کے منتظر اور طالب ہوتے ہیں، اسی لئے حضرت عبداللہ بن اُنیسؓ کا بدلہ اور انعام وہ عصا تھا جو ان کے درمیان اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان بروزِ قیامت ایک علامت اور نشانی بنے گا، اس سے پتہ چلتا ہے کہ آخرت میں ان کا مقام کس قدر بلند ہوگا۔ (دیکھیں: السرایا والبعوث النبویہ، ص: 159-160، التاریخ الاسلامی، الحمیدی 6/29)

۴: بعض فقہی احکام:

اس واقعہ کے ذریعہ بعض مسائل واحکام معلوم ہوتے ہیں، ان میں سے ایک مسئلہ چلتے چلتے نماز ادا کرنے کا ہے۔ امام خطابیؒ فرماتے ہیں: اگر کوئی شخص کسی کی طلب وتلاش میں ہے تو طالب کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، عام اہلِ علم کہتے ہیں: اگر کوئی شخص مطلوب ہے تو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ اشاروں کے ذریعہ نماز ادا کرے، اور اگر وہ طالب ہے تو اگر وہ سوار ہے تو اتر کر زمین پر رکوع اور سجود کی ادائیگی کے ساتھ نماز ادا کرے گا۔ ابن المنذرؒ کا بھی یہی قول ہے۔ امام شافعیؒ نے اس کے لئے ایسی شرط لگائی ہے جو اور کسی نے نہیں لگائی ہے، وہ فرماتے ہیں: اگر طالبین کی تعداد مطلوبین سے کم ہے اور طالبین اپنے دیگر ساتھیوں سے منقطع ہو چکے ہوں اور انہیں اندیشہ ہو کہ مطلوبین پلٹ کر ان پر حملہ کر سکتے ہیں تو اس صورت میں ان کے لئے جائز ہے کہ وہ اشاروں کے ذریعہ نماز ادا کریں۔

امام خطابیؒ فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن انیسؓ کے قصہ میں یہ احکام ومفاہیم موجود ہیں۔ (دیکھیں: السرایا والبعوث النبویہ، ص: 160، معالم السنن، الخطابی، 2/42)

علامہ عینیؒ نے "عمدۃ القاری" میں اس سلسلہ میں فقہاء کے مختلف نقطہائے نظر کا ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اگر کوئی شخص مطلوب ہو تو اس کے لئے چلتے چلتے نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور اگر وہ طالب ہو تو اس صورت میں جائز نہیں ہے۔ امام مالکؒ اور دیگر اصحاب فرماتے ہیں: طالب ومطلوب دونوں برابر ہیں، ان میں سے ہر ایک اپنی سواری پر نماز ادا کر سکتا ہے۔

امام اوزاعیؒ اور امام شافعیؒ اور دیگر اصحاب نے امام ابو حنیفہؒ جیسا قول اختیار کیا ہے، یہی عطارؒ، حسنؒ، ثوریؒ، احمدؒ اور ابو ثورؒ کا بھی قول ہے اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں: اگر طالب کو مطلوب کے فوت ہونے کا خوف ہو تو وہ اشارۃً نماز ادا کرے گا ورنہ نہیں۔ (عمدۃ القاری، شرح صحیح البخاری: 6/263)

۵: زمانہ نبوت میں اجتہاد کا جواز:

نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں اجتہاد کرنا جائز تھا، چنانچہ عبداللہ بن انیس ؓ اجتہاد کے ذریعہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس طریقہ سے نماز ادا کریں اور رسول اللہ ﷺ نے بھی ان پر کوئی نکیر نہیں کی، جس سے پتہ چلتا ہے کہ سخت خوف کی حالت میں اشارہ کے ذریعہ نماز پڑھنا جائز ہے، یہ استدلال بھی صحیح ہے اور اس لئے کہ عبداللہ بن انیس ؓ نے ایسا نبی کریم ﷺ کی حیات میں کیا اور وہ وحی کا زمانہ تھا اور یہ بات ناممکن ہے کہ نبی کریم ﷺ کو اس کی اطلاع نہ ملی ہو۔ (دیکھیں: السرایا والبعوث، ص: 161، عون المعبود للعظیم آبادی: 4/129)

٦: نبوت کی ایک اہم دلیل:

اللہ کے رسول ﷺ نے خالد بن سفیان ہذلی کا حلیہ حضرت عبداللہ بن انیس ؓ کے سامنے بغیر دیکھے ہوئے انتہائی باریک بینی کے ساتھ بیان کیا، یہاں تک کہ عبداللہ بن انیس ؓ نے رسول اللہ ﷺ کو تعجب کے انداز میں جواب دیا- جیسے کہ واقدی کی روایت میں ہے-: اے اللہ کے رسول ﷺ! میں کبھی بھی کسی چیز سے خوفزدہ نہیں ہوا ہوں۔ آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: اس کی نشانی یہ ہے کہ جب آپ اسے دیکھو گے تو اس کے جسم پر رعشہ (کپکپی) دیکھو گے، اور عبداللہ بن انیس ؓ نے خالد الہذلی کو بالکل اسی حلیہ کے ساتھ دیکھا، جیسے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا تھا، فرماتے ہیں: جب میں نے اس کو دیکھا تو میں اس سے گھبرایا اور ڈرا لیکن میں نے کہا: اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے سچ فرمایا۔ (دیکھیں: دلائل النبوۃ للبیہقی: 4/41)

۳: قبیلہ عضل اور قارہ کی غداری اور واقعہ رجیع

نبی کریم ﷺ نے غزوۂ رجیع کے لئے سریہ روانہ فرمایا، اس سریہ کے بھیجنے کا بنیادی سبب کیا تھا؟ اس سلسلہ میں مختلف روایات پائی جاتی ہیں، امام بخاری ؒ نے اس طرح کی روایات نقل کی ہیں جن کے ذریعہ یہ پتہ چلتا ہے کہ آپ ﷺ نے دشمن کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے جاسوس بھیجے تھے۔ (صحیح بخاری: 4086) جبکہ صحیح اسانید کے ساتھ دیگر روایات میں یہ بات وارد ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس مدینہ منورہ میں قبیلہ مضر کے عضل اور القارہ کے لوگ آئے اور کہنے لگے: بے شک ہمارے لوگ اسلام لا چکے ہیں، اس لئے ہمارے ساتھ اپنے اصحاب میں سے کچھ افراد کو بھیج دیں تاکہ وہ ہمیں تعلیم دیں، ہمیں قرآن پڑھائیں اور ہمیں اسلامی احکام سکھائیں۔ (المغازی للواقدی: 1/354)

بظاہر ایسا لگتا ہے کہ قبیلہ ہذیل نے مسلمانوں سے خالد بن سفیان ہذلی کا بدلہ لینے کی کوشش کی، اور اس کے لئے انہوں نے دھوکہ اور غداری کا سہارا لیا۔ واقدی ؒ نے یقین کے ساتھ یہ بات کہی ہے کہ بنیادی سبب یہ تھا کہ بنو لحیان- جو کہ قبیلہ ہذیل کی ایک شاخ تھی- کے لوگ عضل اور القارہ کے لوگوں کے پاس گئے اور ان کو کچھ انعام اور معاوضہ دینے کا وعدہ کیا تاکہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس جائیں اور آپ ﷺ سے اس بات کا مطالبہ کریں کہ ان کے ساتھ کسی ایسے شخص کو بھیج دیں جو انہیں اسلام کی دعوت دے اور ان کو دین کی تعلیم دے، اور یہ

لوگ ان کے لئے گھات میں بیٹھ جائیں گے، ان کو گرفتار کرلیں گے اور مکہ میں ان کو بیچ کر ان کی قیمت حاصل کریں گے۔ (دیکھیں: المغازی للواقدی: 1/354، نضرۃ النعیم: 1/314)

اس طرح رسول اللہ ﷺ نے یہ سریہ روانہ فرمایا جو دس صحابہ کرام پر مشتمل تھا (صحیح بخاری: 398) آپ ﷺ نے حضرت عاصمؓ بن ثابت بن اَبی الاَقلح کو ان کا امیر مقرر فرمایا، یہاں تک کہ جب وہ عُسفان و مکہ کے درمیان کے علاقہ میں پہنچے تو دو سو جنگجوؤں پر مشتمل بنو لحیان کے لوگوں نے ان پر حملہ کیا اور چاروں طرف سے ان کا محاصرہ کرکے ان کو ایک بلند ٹیلے پر چڑھنے کے لئے مجبور کیا، اس کے بعد ان کو قتل سے امان دینے کی بات کہی بشرطیکہ وہ اپنے آپ کو ان کے حوالے کردیں، لیکن سریہ کے قائد و امیر نے اپنے آپ کو کسی کافر کے حوالہ کرنے سے انکار کردیا، حضرت عاصم بن ثابتؓ نے فرمایا: میں نے یہ نذر مانی ہے کہ میں کبھی بھی کسی مشرک کے جِوار کو قبول نہیں کروں گا، اس لئے حضرت عاصمؓ ان سے لڑنے لگے اور وہ یہ اشعار کہہ رہے تھے:

ما علّتي وأنا جلْدٌ نابلٌ ... النبل والْقوس لها بلابل

تزلّ عن صفْحتها الْمعابل ... الْموت حق والْحياة باطل

وكُل ما حم الْإلَه نازلُ ... بالْمرء والْمرء إلَيه آئل

إنَ لم أقاتلكم فأمي هابلَ

ترجمہ: ''ہم کمزوری کا اظہار کیوں کریں جبکہ میں بہادر تیر انداز ہوں؟! ہم مضبوط تیر اور کمان رکھتے ہوں۔ اس کے اوپر سے بڑے بڑے تیر نکلتے ہیں، آج کے دن مرنا حق اور جینا باطل ہے۔ اللہ کا جو فیصلہ ہے وہ ہو کر رہے گا، بندہ اس فیصلہ سے بچ نہیں سکتا ہے، اگر آج میں تمہارے مقابلہ میں نہ لڑوں تو میری ماں روئے''۔

اس کے بعد انہوں نے ان پر تیر برسانا شروع کردیئے یہاں تک کہ ان کے تیر ختم ہوگئے، اس کے بعد ان کے ساتھ نیزہ کے ذریعہ مقابلہ کیا یہاں تک کہ ان کا نیزہ بھی ٹوٹ گیا اور صرف تلوار باقی بچی، انہوں نے دعا کی کہ اے اللہ! میں نے دن کے ابتدائی حصے میں تیرے دین کی حفاظت کی لہذا دن کے آخری حصے میں میرے جسم کی حفاظت فرما۔ ان کے جو بھی ساتھی شہید ہوتے تھے تو دشمن ان کے ہتھیار لے لیتے تھے، اس لئے انہوں نے اپنی تلوار کی میان بھی توڑ دی اور اس کے بعد لڑتے رہے یہاں تک کہ شہید ہوگئے، انہوں نے دشمنوں کے دو لوگوں کو زخمی اور ایک کو مار دیا، وہ لڑتے ہوئے یہ شعر پڑھ رہے تھے:

أبو سلَيمانَ ومثلي رامي ... وكَانَ قومي معشرًا كراما

ترجمہ: ''میں ابو سلیمان ہوں اور میں تیر انداز ہوں اور میری قوم ایک معزز قوم ہے۔

اس کے بعد دشمنوں نے ان کو نیزوں سے چھلنی کردیا یہاں تک کہ وہ شہید ہوگئے، سُلافہ بنت سعد بن الشُّہید کا شوہر اور اس کے چار بیٹے بدر میں مارے گئے تھے، حضرت عاصمؓ نے اس کے دو بیٹوں مسافع اور حارث کو مارا تھا، اس عورت نے نذر مانی تھی کہ اگر موقع ملا تو عاصمؓ کی کھوپڑی میں شراب پیوں گی، عاصمؓ کا سر لانے والے کے لئے اس نے سو اونٹ بطورِ انعام رکھے تھے، عرب کے تمام لوگوں میں یہ بات

مشہور ہو چکی تھی، بنو لحیان کو بھی اس کا علم تھا، اس لئے انہوں نے حضرت عاصمؓ کے سر کو جسم سے کاٹنا چاہا تاکہ اسے لے کر سلافہ بنت سعد کے پاس لے جا کر اس سے سو اونٹ حاصل کر لیں لیکن اللہ تعالیٰ نے بھڑوں کے ایک بڑے جھنڈ کو ان کی حفاظت کے لئے بھیج دیا جس نے چاروں طرف سے ان کی لاش کو گھیر لیا اور جو بھی ان کی لاش کے قریب جانے کی کوشش کرتا تو اس کے چہرے کو کاٹنا شروع کر دیتی، کوئی بھی ان بھڑوں کا مقابلہ نہ کر سکا، اس لئے انہوں نے یہ طے کیا کہ رات تک انتظار کرو، جب یہ بڑھیں چلی جائیں گی تو اس کے بعد ان کے سر کو کاٹ کر لے جائیں گے لیکن جب رات ہوئی تو بارش ہوئی اور سیلاب میں لاش بہہ کر نامعلوم جگہ چلی گئی اور کفار کو ہاتھ نہ لگ سکی، حالانکہ بارش ہونے سے پہلے کسی طرف آسمان پر بادل کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔(الدلائل للبیہقی: 3/328، سیرت ابن ہشام: 3/180، المغازی للواقدی: 1/356)

حضرت عاصمؓ کو سریہ کے سات افراد کے ساتھ نیزوں کے ذریعہ شہید کیا گیا، اس کے بعد اعراب نے بقیہ تین صحابہ کرام کو پھر سے امان کی پیشکش کی، انہوں نے اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دیا، لیکن جیسے ہی انہوں نے ان پر کنڑول حاصل کر لیا جلد ہی انہوں نے ان کے ساتھ غداری کی، عبداللہ بن طارقؓ نے ان کا مقابلہ کیا تو انہوں نے انہیں شہید کر دیا اور باقی دو صحابہ کو مکہ لے کر گئے اور وہ تھے: حضرت خبیبؓ اور حضرت زید بن دثنہؓ، دونوں کو قریش کے ہاتھوں بیچ دیا، اور یہ صفر سن چار ہجری کا واقعہ ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھیں: صحیح البخاری، کتاب المغازی، 4086، جوامع السیرۃ، ابن حزم ص:176)

جہاں تک خبیبؓ کا تعلق ہے تو ان کو بنو الحارث بن عامر بن نوفل نے خرید لیا تاکہ حارث کے بدلے ان کو قتل کرے جس کو خبیبؓ نے بدر کے دن مارا تھا، حضرت خبیبؓ ان کے پاس اس وقت تک قیدی بن کر رہے یہاں تک کہ انہوں نے خبیبؓ کو شہید کرنے پر اتفاق کر لیا، خبیبؓ نے ایک مرتبہ حارث کی ایک لڑکی سے استرا مانگا تاکہ اس کے ذریعہ اپنے بال سنواریں، اس نے ان کو استرا دے دیا، اسی اثنا میں اس کا ایک بچہ آ کر خبیبؓ کی ٹانگ پر بیٹھ گیا، وہ عورت ڈر گئی کہ کہیں انتقام میں خبیبؓ بچے کو مار نہ دیں، خبیبؓ نے کہا: کیا آپ کو ڈر لگ رہا ہے کہ میں اس کو قتل کر دوں گا؟ ان شاءاللہ میں ایسا نہیں کروں گا۔ بعد میں وہ عورت کہا کرتی تھی: میں نے خبیبؓ سے بہتر کوئی قیدی نہیں دیکھا ہے، میں نے ان کو اس وقت انگور کھاتے ہوئے دیکھا ہے جبکہ مکہ میں کہیں انگور نہیں تھے، حالانکہ وہ بیڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے، وہ تو اللہ کی طرف سے عطا کردہ رزق تھا، وہ ان کو قتل کرنے کے لئے حرم سے باہر لے کر آئے، انہوں نے کہا کہ پہلے مجھے دو رکعت نماز ادا کرنے دیں، نماز ادا کرنے کے بعد وہ ان کے پاس گئے اور کہا: اگر آپ لوگ یہ نہ کہتے کہ میں موت سے گھبرایا ہوا ہوں تو میں مزید نماز پڑھتا، خبیبؓ پہلے شخص ہیں جنہوں نے قتل کے وقت دو رکعت ادا کرنے کا طریقہ شروع کیا۔(السیرۃ النبویہ الصحیحۃ 1/399)

اس کے بعد انہوں نے کہا: اے اللہ! ان میں سے ایک ایک کو گن لے، ان کو الگ الگ ایک ایک کر کے موت کے گھاٹ اتار دے اور ان میں سے کسی کو باقی نہیں رکھنا۔(صحیح بخاری: 3989، الدلائل للبیہقی: 3/25-324، سیرت ابن ہشام: 3/181)

اس کے بعد یہ اشعار پڑھنے لگے:

لَقَدْ أَجْمعَ الْأَحزابُ حولِي وأَلَّبوا ... قبائلَهم واستجمعُوا كُلَّ مَجْمعِ

وَكُلُّهم مبدي الْعَداوَة جاهِدٌ ··· عليَّ لأَنِّي في وثاق بمَضيَع
وقد قرَّبوا أَبناءهم ونساءهم ··· وقُربتَ من جذْعٍ طَويلٍ ممَنَّعِ
إِلَى اللَّه أَشْكُو غربتي بعد كربتي ··· وما أَرصد الأَحزاب لي عند مصرعي
فَذا الْعَرش صبرني على ما يراد بي ··· فقد بضَّعوا لحمي وقد ياس مطْمعي
وقد خيَّروني الْكُفْر، والْموت دونه ··· فقد ذرفت عيناي من غير مجزع
وما بي حذَار الْموت إِني لَميت ··· وإِنَّ إِلَى ربي إِيابي ومرجعي
ولست أُبالي حين أُقتل مسلما ··· على أَي شق كان في اللَّه مضجعي
وذلك في ذات الإِلَه وإِنْ يشأْ ··· يبارك على أَوصال شلْو ممزَّع
فلست بمبد للْعدو تخشُّعا ··· ولا جزعا إِني إِلَى اللَّه مرجعي

ترجمہ: ''تمام لوگ میرے ارد گرد جمع ہو گئے، انہوں نے تمام قبائل کو اس کے لئے آمادہ اور تیار کیا اور ہر طرح کے وسائل واسباب انہوں نے جمع کر لئے۔ وہ سب کے سب میرے خلاف عداوت ودشمنی ظاہر کررہے ہیں، اس لئے کہ میں بیڑیوں میں جکڑا ہوا ہوں۔ انہوں نے اپنے بیٹوں اور عورتوں کو بھی وہاں جمع کیا، اور مجھے ایک لمبی مضبوط لکڑی کے قریب کھڑا کیا ہے۔ میں اللہ ہی کی ذات سے اجنبیت و غریب الوطنی کا شکوہ کرتا ہوں، جبکہ مجھ پر مصائب وآلام کے پہاڑ توڑے گئے۔ اور موت کے وقت تمام لوگوں نے میرے ساتھ جو کچھ کیا اس کا شکوہ بھی اللہ ہی کے حضور پیش کرتا ہوں۔ عرش والی ذات ہی نے مجھے اس پر صبر عطا کیا جو کچھ میرے ساتھ کرنے کا یہ ارادہ رکھتے ہیں، انہوں نے میرا گوشت نوچ لیا اور میری تمام اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔

انہوں نے مجھے کفر اختیار کرنے یا جامِ شہادت پینے کا اختیار دیا، بغیر کسی خوف کے میری آنکھیں خوشی کے مارے اشکبار ہو گئیں۔ مجھے موت کا کوئی ڈر اور خوف نہیں ہے، مجھے تو ایک دن مرنا ہی ہے اور مجھے اپنے ہی رب کی طرف لوٹنا ہے۔

اگر مجھے مسلمان ہونے کی حالت میں قتل کیا جارہا ہے تو مجھے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں ہے کہ مجھے اللہ کی راہ میں کسی پہلو کے بل قتل کیا جائے۔ یہ تو اللہ کی ذات کے لئے ہے اور اگر وہ چاہے تو جدا جدا کئے ہوئے اعضائے جسم کے ٹکڑوں میں بھی برکت عطا فرمائے۔ میں دشمن کے لئے کسی خوف اور ڈر کا اظہار کرنے والا نہیں ہوں، بے شک میں تو اللہ ہی کی طرف لوٹ رہا ہوں۔ (زاد المعاد: 3/245، فتح الباری: 4086)

اس کے بعد ان سے ابو سفیان نے دریافت کیا: کیا آپ کو یہ بات پسند ہے کہ محمدؐ ہمارے پاس ہوں اور ان کی گردن ماری جائے اور آپ اپنے گھر والوں کے ساتھ ہوں؟ خبیبؓ نے جواب دیا: واللہ! مجھے تو یہ بھی گوارا نہیں ہے کہ میں اپنے گھر والوں کے ساتھ رہوں اور محمد ﷺ کو اپنی ہی جگہ پر کوئی کانٹا بھی لگے اور آپ کو کوئی تکلیف پہنچے، اس کے بعد ان کو شہید کر دیا گیا اور ان کی لاش کو لٹکایا گیا اور اس کی نگرانی کے لئے کچھ افراد کو متعین کیا گیا، چنانچہ عمرو بن اُمیہ ضمری آئے اور وہ رات میں ان کی لاش کو اٹھا کر لے گئے اور ان کو دفن کر دیا۔ (اَیضاً: 3/246)

اور جہاں تک زید بن دثنہؓ کا تعلق ہے تو صفوان بن امیہ نے ان کو خریدا اور ان کو اپنے باپ امیہ بن خلف کے بدلے میں شہید کر دیا جو بدر میں مارا گیا تھا، ابو سفیان نے ان کو شہید کرنے سے پہلے ان سے پوچھا: اے زید! میں تمہیں اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں: کیا تمہیں یہ پسند ہے کہ اس وقت محمدؐ کو تیری جگہ قتل کیا جائے اور تم اپنے گھر والوں کے ساتھ رہو؟ انہوں نے جواب دیا: اللہ کی قسم! مجھے تو یہ بھی گوارا نہیں ہے کہ محمد ﷺ کو اس جگہ ایک کانٹا بھی لگے جس جگہ وہ موجود ہیں اور میں اپنے گھر والوں کے ساتھ بیٹھا رہوں۔ ابو سفیان نے یہ سن کر کہا: میں نے کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا ہے جو کسی سے اتنی محبت کرتا ہو جتنی محبت محمدؐ کے اصحاب محمدؐ سے کرتے ہیں۔ (السیرۃ النبویہ الصحیحۃ: 2/400، سیرت ابن ہشام)

یہ المناک واقعہ رجیع کے واقعہ کے نام سے معروف ہے، اس لئے کہ رجیع چشمہ کے پاس یہ واقعہ پیش آیا۔

اس واقعہ میں متعدد دروس واسباق اور فوائد وعبرتیں پائی جاتی ہیں، ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

ا: ابن حجرؒ نے مندرجہ ذیل فوائد ونکات کا ذکر کیا ہے:

فرماتے ہیں: "حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ قیدی کے لئے جائز ہے کہ وہ امان قبول کرنے سے اجتناب کرے اور اپنے آپ کو کسی کے حوالے نہ کرے، اگرچہ اس کو قتل ہی کیوں نہ کیا جائے، وہ خودداری اور غیرت کا مظاہرہ کرے تاکہ اس پر کسی کافر کا حکم نہ چلے، یہ اس صورت میں ہے جبکہ وہ عزیمت پر عمل کرنا چاہے، لیکن اگر وہ رخصت پر عمل کرے تو اس کے لئے امان وپناہ لینا درست ہے۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں: اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں: میں اس کو ناپسند کرتا ہوں۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین کے ساتھ کئے ہوئے عہد کو پورا کیا جائے، ان کی اولاد کو قتل کرنے سے اجتناب کیا جائے، جس کو قتل کیا جا رہا ہو اس کے ساتھ نرمی کا معاملہ کیا جائے۔ اس حدیث سے اولیاء کی کرامت کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ مشرکین کے خلاف عمومی بددعا بھی کی جا سکتی ہے۔ قتل کے وقت نماز پڑھنے کا ثبوت ملتا ہے، شعر گوئی اور قتل کے وقت اشعار پڑھنے کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ اس کے ذریعہ خبیبؓ کے ایمان ویقین کی قوت اور دین میں استحکام وشدت کا بھی پتہ چلتا ہے۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندے کو جیسے چاہے آزماتا ہے، جیسے کہ اللہ کے سابق علم میں موجود ہوتا ہے کہ وہ اس کو ثابت کر کے ظہور میں لے آئے، اور اگر اللہ چاہتا تو اہلِ باطل ایسا کر ہی نہیں سکتے تھے۔

اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان کی دعا قبول ہوتی ہے اور زندگی اور موت کی حالت میں اس کو عزت واکرام سے نوازا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ بھی دیگر فوائد ہیں جو غور وفکر سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خبیبؓ کی دعا قبول کی کہ ان کے جسم کو مشرکین سے محفوظ رکھا، لیکن ان کو قتل ہونے سے نہیں بچایا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ان کو شہادت سے سرفراز کرنا چاہتا تھا اور یہ ان کا اعزاز واکرام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے جسم کو بے حرمتی سے محفوظ رکھا۔ (دیکھیں: فتح الباری: 4086)

۲: خود سپردگی یا موت تک قتال کا مسئلہ:

سابقہ واقعہ کے ذریعہ یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ قیدی کے لئے جائز ہے کہ دشمن کی طرف سے دی جانے والی امان کو قبول نہ کرے اور اپنے آپ کو حوالے نہ کرے، اگرچہ اس کو قتل ہی کیوں نہ کیا جائے، تاکہ اس پر کوئی کافر اپنی مرضی کے مطابق حکم نہ چلا سکے، جیسے کہ حضرت عاصمؓ نے کیا، لیکن اگر وہ رخصت پر عمل کرنا چاہے تو اس کے لئے پناہ لینے کی گنجائش ہے، اس امید میں کہ اس کو رہائی کا موقع ملے گا، جیسے کہ حضرت خبیبؓ اور زیدؓ نے کیا، لیکن اگر قیدی کو بھاگنے کا موقع ملے تو اس کے لئے صحیح قول کے مطابق ایسا کرنا لازمی ہے، اگرچہ اس کو ان کے درمیان اپنے دین کی اشاعت و تبلیغ کا موقع بھی مل رہا ہو، اس لئے کہ کفار کے ہاتھوں میں قیدی مغلوب اور ذلیل ہوتا ہے، اس لئے قید اور اسیری کی ذلت سے اپنے آپ کو آزاد کرنا واجب اور ضروری ہے۔(دیکھیں: فقہ السیرۃ، البوطی، ص: 188-189)

اس واقعہ کے ذریعہ مسلمانوں کے سامنے صورتحال کے مطابق عمل کرنے کا ایک وسیع دروازہ کھلتا ہے، وہ چاہیں تو قید ہونے کو اختیار کریں جبکہ وہ مظلومیت کی حالت میں ہوں اور اگر چاہیں تو موت تک مقابلہ کرنے کو ترجیح دیں جبکہ ان کو گرفتار کرنے والا عدل کے تقاضوں کو پورا نہ کر رہا ہو اور حکومت غیر اسلامی ہو۔(دیکھیں: الاساس فی السنۃ، سعید حوی 2/622)

۳: سنت نبوی کی تعظیم:

حدیث سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ صحابہ کرام سنت نبوی کی کس قدر تعظیم کرتے تھے، خبیبؓ مشرکین کے کنٹرول میں تھے اور وہ جانتے تھے کہ ان کو کسی بھی وقت شہید کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ بال سنوارنے کی سنت پر عمل کرنے کا اہتمام کرتے ہیں اور اس کے لئے استرا عاریۃً لیتے ہیں۔ اس میں ان بہت سے لوگوں کے لئے تذکیر اور سبق ہے جو بہت سی سنتوں بلکہ واجبات کو یہ کہہ کر نظر انداز کر دیتے ہیں کہ اُمت جن حالات سے گذر رہی ہے ان میں مسلمانوں کے لئے اس طرح کی چیزوں میں مشغول ہونا مناسب نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ سنت کی تعظیم کرنا اور مکمل طور پر اسلامی شریعت میں داخل ہونے کے مابین کوئی تضاد نہیں ہے۔(دیکھیں: وقفات تربویۃ مع السیرۃ النبویۃ، احمد فرید، ص:234)

۴: اسلام دھوکہ دہی اور کینہ کو ختم کرتا ہے:

جب خبیبؓ نے حارث کی ایک بیٹی سے استرا مانگا تاکہ وہ اس کے ذریعہ اپنے بال سنواریں، اس نے ان کو استرا دے دیا، وہ کہتی ہیں: میں اپنے ایک بچے کے بارے میں غافل ہو گئی وہ اوپر چڑھ کر ان کے پاس پہنچ گئی، اس کو انہوں نے اپنی گود میں بٹھایا جب میں نے اسے دیکھا تو میں اس سے بہت گھبرا گئی، میری گھبراہٹ کو خبیبؓ نے محسوس کر لیا، ان کے ہاتھ میں استرا تھا، انہوں نے کہا: کیا آپ کو ڈر ہے کہ میں اس کو قتل کر دوں گا؟ میں ان شاء اللہ ایسا ہرگز نہیں کر سکتا ہوں۔(صحیح بخاری: 4086، صحیح السیرۃ النبویۃ، ص:320)

بلاشبہ یہ ایک عظیم اور خوشگوار موقف ہے جو روح کی بلندی، نفس کی پاکیزگی اور اسلامی منہج کے التزام و پابندی پر دلالت کرتا ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ﴾ ترجمہ: ''کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا''۔(سورۃ الاسراء:15)

اس وفاداری کا سبق لوگ اس شخص سے سیکھتے ہیں جس کے ساتھ انہوں نے بدعہدی اور بے وفائی کی ہے، اس لئے کہ استقامت ہی ایک مسلمان کا مزاج اور طرزِ عمل بن جانا چاہیے، خوشحالی کی حالت میں ہو یا بدحالی کی حالت میں ہو۔(دیکھیں: من معین السیرۃ، ص:259)

۵: صحابہ کرامؓ کی نبی کریم ﷺ سے محبت:

بلاشبہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ صحابہ کرامؓ کی محبت کامل و مکمل تھی، اس لئے کہ محبت معرفت کا ثمرہ اور نتیجہ ہے، صحابہ کرام نبی کریم ﷺ کی قدر و منزلت کے بارے میں دوسروں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ علم و معرفت رکھتے ہیں، اس لئے صحابہ کرام کی نبی کریم ﷺ سے محبت بھی سب سے زیادہ تھی۔(دیکھیں: حقوق النبی ﷺ علی أمتہ، د۔محمد التمیمی: 1/314)

واقعہ رَجیع میں اس محبت کا اظہار ابوسفیان اور زید بن دثنہؓ کے درمیان ہونے والی گفتگو کے ذریعہ ہوتا ہے، جبکہ ابوسفیان نے زیدؓ سے کہا تھا: کیا تمہیں یہ بات پسند ہے کہ اس وقت محمدؐ کو تیری جگہ قتل کیا جائے اور تم اپنے گھر والوں کے ساتھ رہو؟ حضرت زیدؓ نے جواب دیا: واللہ! مجھے تو یہ بھی گوارا نہیں کہ محمد ﷺ کو اس جگہ ایک کانٹا بھی لگے جس جگہ وہ موجود ہیں اور میں اپنے گھر والوں کے ساتھ بیٹھا رہوں۔(دیکھیں: صور و عبر من الجہاد النبوی فی المدینہ، ص: 154)

اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے: ”تین باتیں ایسی ہیں جس کے اندر وہ موجود ہوں گی وہ ایمان کی حلاوت محسوس کرے گا: (۱) جس کے نزدیک اللہ اور اس کے رسول ان دونوں کے علاوہ ہر چیز سے سب سے زیادہ محبوب ہوں۔ (۲) جو کسی شخص سے صرف اللہ کے لئے محبت کرتا ہو۔ (۳) اور جس کو اللہ تعالیٰ نے کفر سے نکالا ہو وہ کفر کی طرف لوٹنے کو اسی طرح ناپسند کرتا ہو جیسے کہ آگ میں ڈالے جانے کو ناپسند کرتا ہو“۔(صحیح بخاری:21، صحیح مسلم:43)

۶: حضرت حسانؓ کی بنو لحیان کے بارے میں مذمت:

مسلمان رجیع میں شہید ہونے والے اصحاب کی شہادت کے ذریعہ بہت زیادہ متاثر ہوئے، حضرت حسانؓ اپنے اشعار کے ذریعہ مسلمانوں کی صورتحال کی منظر کشی کرتے تھے، جو ہجو اور مذمت کا مستحق ہوتا تھا اس کی مذمت کرتے تھے اور جو مدح و توصیف کا مستحق ہوتا تھا تو وہ اس کی تعریف و مداح سرائی کرتے۔ اسی سلسلہ میں انہوں نے بنو لحیان کے بارے میں ہجو پر مبنی اشعار کہے جن میں انہوں نے کہا:

إِنْ سَرَّكَ الْغَدْرُ صِرْفًا لَا مِزَاجَ لَهُ ... فَأْتِ الرَّجِيعَ فَسَلْ عَنْ دَارِ لِحْيَانَ
قَوْمٌ تَوَاصَوْا بِأَكْلِ الْجَارِ بَيْنَهُمُ ... فَالْكَلْبُ وَالْقِرْدُ وَالْإِنْسَانُ مِثْلَانِ
لَوْ يَنْطِقُ التَّيْسُ يَوْمًا قَامَ يَخْطُبُهُمْ ... وَكَانَ ذَا شَرَفٍ فِيهِمْ وَذَا شَانِ

یعنی: اگر آپ کو بَدعہدی اور غداری پسند ہے تو رجیع چلے جاؤ اور دار لحیَانَ کے بارے میں دریافت کرلو۔ وہ ایسے لوگ ہیں جو ایک دوسرے کو پڑوسیوں کو کھانے کی وصیت کرتے ہیں، لہٰذا کتا، بندر اور انسان ایک جیسے بن جاتے ہیں، اگر کسی روز سانڈ بولنے کے لئے کھڑا ہو جائے تو وہ ان میں صاحبِ عزت اور بلند مقام کا حامل ہو گا۔(دیکھیں: البدایہ والنہایہ: 4/70)

۴: عامر بن طفیل کا لالچ اور بئرِ معونہ کا المناک واقعہ (سن چار ہجری):

عامر بن طفیل بنو عامر کا ایک لیڈر تھا، وہ انتہائی متکبر اور مغرور تھا، ملک و حکومت کا حریص تھا، وہ سمجھتا تھا کہ بہت جلد نبی کریم ﷺ کو پورے جزیرۃ العرب میں غلبہ حاصل ہونے والا ہے، اس لئے یہ مشرک نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور آپؐ سے کہا: میں آپ کو تین چیزوں کا اختیار دیتا ہوں: نشیبی اور میدانی علاقوں کے لوگ آپ کے ماتحت اور زیرِ حکومت رہیں گے اور پہاڑی علاقوں کے لوگ میرے ماتحت رہیں گے۔ یا میں آپ کا خلیفہ اور جانشین رہوں گا۔ ورنہ میں اہلِ غطفان کو لے کر ایک ہزار گھوڑوں اور ایک ہزار گھوڑیوں سمیت آپ پر چڑھائی کروں گا۔ (صحیح بخاری: 4091) اللہ کے رسول ﷺ نے اس کے ان مطالبات کو ٹھکرا دیا۔

اسی طرح بنو عامر کا سردار عامر بن طفیل کا چچا ملاعب الأسنہ (برچھیوں کے ساتھ کھیلنے والا) مدینہ منورہ آیا، اس نے نبی کریم ﷺ کو ہدیہ پیش کیا، آپؐ نے اس کے سامنے اسلام پیش کیا، لیکن اس نے نہ ہی اسلام قبول کیا اور اسلام سے دوری بھی اختیار نہیں کی اور کہا: اے محمدؐ! اگر آپ اہلِ نجد کی جانب اپنے کچھ اصحاب بھیج دیں مجھے امید ہے کہ وہ آپ کی دعوت کو قبول کر لیں گے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: مجھے اہلِ نجد کی طرف سے صحابہ کے بارے میں اطمئنان نہیں ہے۔ ملاعب الأسنہ (أبو براء) نے کہا: میں ان کو پناہ دیتا ہوں، آپ جس کو چاہیں اہل نجد کی طرف بھیج دیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ان کی جانب صحابہ کرام کی ایک جماعت بھیج دی جن میں منذر بن عمروؓ بھی تھے، یہ وہی صحابی ہیں جن کو "مُعنق الموت" (موت کو گلے لگانے والا) کہا جاتا ہے، عامر بن طفیل نے بنو عامر کو ان کے خلاف برانگیختہ کرنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے اس کی بات ماننے سے انکار کیا اور ملاعب الأسنہ کے ساتھ بد عہدی کرنے سے انکار کر دیا، اس کے بعد عامر نے بنو سلیم کو ان کے خلاف ابھارا، انہوں نے اس کا ساتھ دیا اور تقریباً سو تیر اندازوں کو لے کر بئرِ معونہ کے پاس ان تمام صحابہ کرام پر حملہ کیا اور سوائے عمرو بن امیہؓ کے سب کو شہید کر دیا۔ (دیکھیں: صحیح السیرۃ النبویۃ، ص: 322، صحیح بخاری: 4086تا4096، سیرت ابن ہشام، واقعہ رُجیع)

حضرت انسؓ کی حدیث ہے فرماتے ہیں کہ کچھ لوگ نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور کہنے لگے: ہمارے ساتھ کچھ لوگوں کو بھیج دیں، جو ہمیں قرآن وسنت کی تعلیم دیں، آپ ﷺ نے ان کے ساتھ ستر (۷۰) انصاری صحابہ بھیجے جن کو قراء کہا جاتا تھا، ان میں میرے ماموں حرامؓ بھی تھے، وہ قرآن پڑھتے تھے اور رات کو مذاکرہ کرتے اور سیکھتے تھے، اور دن کو پانی لاتے تھے اور اس کو مسجد میں رکھتے تھے، لکڑیاں جمع کر کے ان کو بیچتے تھے اور ان کے ذریعہ اصحابِ صفّہ اور فقراء کے لئے کھانا خریدتے تھے، انہی صحابہؓ کو نبی کریم ﷺ نے ان کے ساتھ بھیجا، لیکن انہوں نے راستے میں ہی ان کے ساتھ تعرض کیا اور ان کو شہید کر دیا، اس سے پہلے کہ وہ اپنی منزل تک پہنچتے صحابہ کرامؓ نے اس وقت کہا: اے اللہ! ہماری طرف سے ہمارے نبی کو یہ پیغام پہنچا دے کہ ہم نے آپ سے ملاقات کی اور ہم آپ سے راضی ہوئے اور آپ بھی ہم سے راضی ہوئے۔ فرماتے ہیں: ایک شخص انسؓ کے ماموں حرامؓ کے پیچھے سے آیا اور ان کو نیزے سے مارا یہاں تک کہ وہ جسم کے دوسری طرف سے نکل گیا، حضرت حرامؓ نے کہا: رب کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہو گیا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے اصحاب سے فرمایا: آپ کے

بھائیوں کو شہید کیا گیا ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ: اے اللہ! ہماری طرف سے ہمارے نبی کو پیغام پہنچادے کہ ہم نے آپ سے ملاقات کی اور ہم آپ سے راضی ہوئے اور آپ بھی ہم سے راضی ہوئے۔(مسند أحمد:1/416، صحیح مسلم:677،الدلائل للبیہقی: 3/344)

اس دردناک اور المناک واقعہ میں بہت سے دروس واسباق اور فوائد وعبرتیں ہیں جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

ا: دعوت کے لئے قربانیاں ضروری ہیں:

ہم نے دیکھا کہ کس طرح ہذیل کے حلفاء نے قراء اصحاب الرجیع کے ساتھ غداری اور دھوکہ دہی کا معاملہ کیا جن کو نبی کریم ﷺ نے غزوۃ الرجیع کے موقع پر بحیثیتِ معلم وفقیہ بھیجا تھا، لیکن عامر بن طفیل ستر قراء کے ساتھ غداری اور دھوکہ کا معاملہ کرتا ہے، حالانکہ ان کو دعوت الی اللہ کے لئے اور دینی تعلیم کے لئے بلایا گیا تھا، مگر ان کا ایک ہولناک اور بزدلانہ قتل عام کیا گیا اور یہ بئر معونہ کے دن پیش آیا۔

ان مصائب وآلام کے رسول اللہ ﷺ کے نفس پر انتہائی گہرے اور دوررس اثرات پڑے، یہاں تک کہ آپ ﷺ مسلسل ایک ماہ تک نماز فجر میں قنوتِ نازلہ کا اہتمام فرماتے رہے جس میں آپؐ قبائل سلیم کے لئے بددعا کرتے رہے جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی تھی۔(دیکھیں: صور وعبر من الجہاد النبوی فی المدینۃ، ص:151)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مسلسل ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور نمازِ فجر میں ہر نماز کے بعد قنوتِ نازلہ کا اہتمام کرتے رہے، جب آپ ﷺ آخری رکعت میں "سمع اللہ لمن حمدہ" کہتے تو اس کے بعد بنو سلیم کے تمام قبائل رعل، زکوان اور عصیہ کے لئے بددعا کرتے اور آپؐ کے پیچھے موجود لوگ آمین کہتے۔(مسند احمد:301-302، سنن ابوداؤد:443، ابن خزیمہ: 618)

لیکن اس کے ذریعہ مسلمانوں کی طاقت وقوت میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی، نہ ہی دعوت الی اللہ کے سلسلہ میں ان کی حمیت اور جوش میں کوئی کمی آئی اور نہ ہی ان کے عزائم پست ہوئے، اس لئے کہ دعوتی مصلحت جان اور خون سے کہیں بالاتر ہے، بلکہ دعوت کے لئے اس وقت تک نصرت وکامیابی مقدر نہیں ہوسکتی ہے جب تک کہ اس کی راہ میں جانی قربانی نہ دی جائے اور سخت صورتحال میں استقامت کے ذریعہ ہی روئے زمین پر دعوت مستحکم ہوسکتی ہے۔

کشمکش اور قربانیوں کے بغیر دعوت کی حیثیت خیالات اور فلسفوں سے زیادہ نہیں رہتی ہے جن کو کتابوں میں محفوظ کیا جاتا ہے، اور واقعات اور قصوں کی شکل میں ان کو بیان کیا جاتا ہے اور پھر زمانہ کے ساتھ وہ ختم ہوجاتے ہیں۔

رجیع اور بئر معونہ کے دونوں واقعات اللہ کے دین اور دعوت اللہ کے سلسلہ میں ہمیں عظیم ذمہ داری کا احساس دلاتے ہیں، ان کے ذریعہ ہمارے سامنے عظیم قربانیوں کے نمونے سامنے آتے ہیں جو صحابہ کرام نے اپنے دین، عقیدہ اور رب کی رضا کی خاطر پیش کیں۔

بلاشبہ سعادت و کامیابی کی ایک قیمت ہے، راحت کی بھی ایک قیمت ہے، عزت واقتدار کی بھی ایک قیمت ہے، اور اس دعوت کی قیمت وہ پاکیزہ خون ہے جو اللہ کی راہ میں بہایا جائے تاکہ اللہ کی شریعت اور اس کے نظام کو برپا کیا جائے اور روئے زمین پر اس کے دین کے معالم کو مضبوط و مستحکم کیا جائے۔(دیکھیں: صور و عبر من الجهاد النبوی فی المدینة، ص152)

۲: ربِّ کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہو گیا:

یہ بات کہنے والے حرام بن ملحانؓ ہیں، چنانچہ جب نیزہ ان کی پیٹھ میں داخل ہو کر ان کے سینے سے نکل گیا اور وہ اپنے ہاتھ سے خون صاف کرنے لگے، اس خون کو وہ اپنے سر اور چہرہ پر ملنے لگے، اس وقت انہوں نے کہا: رب کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہو گیا۔(صحیح البخاری: 4092)

بلاشبہ یہ منظر سخت ترین اور چھوٹے دلوں کو متاثر کرتا ہے اور ان عظماء کے سامنے اپنی ذات ہیچ معلوم ہوتی ہے جن کے چہروں پر موت کا کوئی خوف اور ڈر ظاہر نہیں ہوتا ہے بلکہ مسرت و خوشی ان کے چہروں پر ظاہر ہوتی ہے اور سکینت و اطمینان ان پر جلوہ گر ہوتی ہے۔

ایمان سے عاری انسانی عقل اس عمدہ اور خوشگوار منظر کا تصور بھی نہیں کر سکتی ہے، اسی منظر نے حرام بن ملحانؓ کو نیزہ مارنے والے جبار بن سلمی کو حرامؓ کے اس قول کے بارے میں سوال کرنے پر مجبور کر دیا جبکہ انہوں نے کہا تھا: رب کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہو گیا۔ جبار بذاتِ خود بیان کرتے ہیں کہ میرے اسلام لانے کے لئے جو چیز محرک بنی وہ یہ تھی کہ میں نے ان میں سے ایک شخص کو اس دن کندھوں کے درمیان نیزہ مارا، میں نے نیزہ کا پھل دیکھا کہ وہ ان کے سینے سے پار ہو گیا تو میں نے انہیں کہتے ہوئے سنا: رب کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے اپنے دل میں کہا: کیا کامیاب ہوا؟ کیا میں نے اس شخص کو ہلاک نہیں کیا؟! یہاں تک کہ میں نے اس قول کے بارے میں دریافت کیا، لوگوں نے کہا: شہادت کی وجہ سے یہ کہہ رہے ہیں۔ میں نے کہا: اللہ کی قسم! یقیناً وہ کامیاب ہو گیا، اور یہی قول ان کے اسلام لانے کا سبب بنا۔(الدلائل للبیہقی: 3/353، سیرت ابن ہشام، بئر معونہ کا واقعہ، فتح الباری: 4091-4092)

اس خرقِ عادت واقعہ کے ذریعہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے: وہ یہ کہ کیا شہید کو موت کی تکلیف ہوتی ہے؟

اس کا تشفی بخش جواب رسول اللہ ﷺ اپنے اس قول میں دیتے ہیں کہ شہید کو قتل کے وار سے بس اتنی تکلیف محسوس ہوتی ہے جتنی تم میں سے کسی کو چیونٹی کے کاٹنے سے محسوس ہوتی ہے۔(سنن ترمذی: 1668، سنن نسائی: 6/36، سنن ابن ماجہ: 2802)

شہید کا اللہ کے نزدیک ایک خاص مقام ہے، وہ اللہ کے راستے میں اپنی جان قربان کر کے جو قیمت ادا کرتا ہے عدل وانصاف والی ذات اس کا بدلہ دینے میں کوئی کمی نہیں کرتی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے چھ انعامات کا بدلہ رکھا ہے جن میں سے ہر ایک دنیا ومافیہا سے بہتر ہے۔ حضرت مقدام بن معد یکربؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: شہید کے لئے اللہ کے ہاں چھ خصوصی امتیازات ہیں: خون کا پہلا قطرہ گرتے ہی اس کی مغفرت کی جاتی ہے، وہ جنت میں اپنا مقام دیکھ لیتا ہے، عذاب قبر سے اس کو نجات ملتی ہے، وہ فزع اکبر (بڑی ہولناکی) سے محفوظ رہے گا، اس کو ایمان کا لباس پہنایا جائے گا، اس کا نکاح حور عین کے ساتھ کیا جائے گا اور ستر

رشتہ داروں کے حق میں اس کی شفاعت قبول کی جائے گی۔(سنن ترمذی: 1663، سنن ابن ماجہ: 2799، الجامع لأحکام القرآن، آیت: 171 سورۃ آل عمران)

اس کے ساتھ ساتھ اس کو امتیازی تمغہ سے نوازا جائے گا جس کو لے کر وہ بروز قیامت آئے گا، اور وہ یہ ہے کہ اس کا زخم بالکل اسی طرح تازہ ہوگا جیسے کہ زخم لگنے والے دن تھا، اس کا رنگ خون کا سا ہوگا اور خوشبو مشک کی سی ہوگی۔(سنن ترمذی: 1656)

اسی طرح شہداء کی زندگی ان کی موت پر ہی ختم نہیں ہوتی ہے بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے رب کے پاس ان کو رزق ملتا ہے اور وہ خوشحال زندگی گزارتے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ ٱلَّذِينَ قُتِلُوا۟ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ أَمْوَٰتًۢا ۚ بَلْ أَحْيَآءٌ عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ﴾ ترجمہ: ”جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں انہیں مردہ نہ سمجھو، وہ تو حقیقت میں زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس رزق پا رہے ہیں“۔(سورۃ آل عمران: 169)(دیکھیں: السرایا والبعوث النبویۃ، ص245)

۳: نبی کریم ﷺ کے علمِ غیب کی نفی:

بے شک بئر معونہ اور اس کے علاوہ دیگر واقعات کے ذریعہ پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ غیب کا علم نہیں رکھتے تھے، جیسے کہ اس پر دوسرے بہت سے دلائل بھی دلالت کرتے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿قُل لَّآ أَمْلِكُ لِنَفْسِى نَفْعًا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَآءَ ٱللَّهُ ۚ وَلَوْ كُنتُ أَعْلَمُ ٱلْغَيْبَ لَٱسْتَكْثَرْتُ مِنَ ٱلْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِىَ ٱلسُّوٓءُ ۚ إِنْ أَنَا۠ إِلَّا نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ﴾ ترجمہ: ”اے محمدؐ، ان سے کہو "میں اپنی ذات کے لئے کسی نفع اور نقصان کا اختیار نہیں رکھتا، اللہ ہی جو کچھ چاہتا ہے وہ ہوتا ہے، اور اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو میں بہت سے فائدے اپنے لئے حاصل کر لیتا اور مجھے کبھی کوئی نقصان نہ پہنچتا، میں تو محض ایک خبر دار کرنے والا اور خوش خبری سنانے والا ہوں اُن لوگوں کے لئے جو میری بات مانیں“۔(سورۃ الاعراف: 188)

چنانچہ اللہ عزوجل تنہا عالم الغیب ہے اور رسول اور فرشتے غیب کا اتنا ہی علم رکھتے ہیں جو اللہ تعالیٰ ان کو بتا دیتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿عَٰلِمُ ٱلْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِۦٓ أَحَدًا ﴿٢٦﴾ إِلَّا مَنِ ٱرْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ فَإِنَّهُۥ يَسْلُكُ مِنۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِۦ رَصَدًا﴾ ترجمہ: ”وہ عالم الغیب ہے، اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا، سوائے اُس رسول کے جسے اُس نے (غیب کا کوئی علم دینے کے لئے) پسند کر لیا ہو، تو اُس کے آگے اور پیچھے وہ محافظ لگا دیتا ہے“۔(سورۃ الجن: 26-27)

۴: ایفائے عہد:

حضرت عمرو بن امیہ ضمری کو بئر معونہ کے موقع پر گرفتار کیا گیا اور جب عامر بن طفیل کو اس کا علم ہوا کہ وہ قبیلۂ مضر سے تعلق رکھتے ہیں تو اس نے ان کو رہا کر دیا، ان کی پیشانی کے بال کاٹ دیئے اور ان کو ایک غلام کے بدلہ میں آزاد کر دیا جو کہ ان کی ماں کے ذمہ واجب تھا، جب عمروؓ نے مدینہ کی جانب رختِ سفر باندھا تو راستے میں ایک سایہ میں پڑاؤ ڈالا اور وہاں بنو عامر کے دو لوگوں کے ساتھ ان کی ملاقات ہوئی، ان دو لوگوں کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا معاہدہ تھا اور ان کو آپؐ نے پناہ دے رکھی تھی جس کے بارے میں عمرو بن امیہؓ کو علم نہیں

تھا،ان سے ملاقات کے وقت انہوں نے دریافت بھی کیا تھا کہ آپ دونوں کون ہو؟انہوں نے جواب دیا: ہم بنو عامر سے ہیں۔انہوں نے ان کے ساتھ کوئی تعرض نہیں کیا یہاں تک کہ وہ دونوں سوگئے تو اس وقت ان دونوں پر حملہ کرکے ان کو قتل کردیا۔ عمروؓ سمجھ رہے تھے کہ ان دونوں کو قتل کرکے انہوں نے بنو عامر سے انتقام لے لیا ہے،اس لئے کہ انہوں نے صحابہ کرام کو شہید کیا تھا لیکن جب عمرو بن اُمیہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ کو اس واقعہ کی اطلاع دی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: آپ نے دو لوگوں کا قتل کیا ہے، میں ضرور ان کی دیت ادا کروں گا۔(سیرت ابن ہشام: 3/206)

یہ ایک عظیم الشان موقف ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے بنو عامر کے ان دونوں مقتولین کی دیت ادا فرمائی جن کو عمرو بن امیہ ضمریؓ نے قتل کیا تھا، اس لئے کہ ان کا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ معاہدہ تھا، آپؐ نے ان سے ان کی قوم کا انتقام نہیں لیا، یہ ایفائے عہد کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔

نبی کریم ﷺ عمرو بن اُمیہ کے عمل کو انتقامی کاروائی تصور کر سکتے تھے جس کا سامنا مجرموں کو کرنا تھا لیکن ان بے گناہوں کا کیا جرم تھا کہ ان سے ان کی قوم کا انتقام لیا جاتا؟!

بلا شبہ اسلامی تعلیمات نے مسلمانوں کو اور ان کے نبی ﷺ کو اخلاقی بلندی پر فائز کیا ہے جس کی دنیائے انسانیت میں کوئی نظیر ملنا مشکل ہے۔(التاریخ الاسلامی للحمیدی: 6/50)

۵: صحابیٔ جلیل عامر بن فہیرہؓ:

جب صحابہ کرام کو بئر معونہ میں شہید کیا گیا اور عمرو بن امیہ ضمریؓ کو گرفتار کیا گیا تو عامر بن طفیل نے ان سے دریافت کیا: یہ کون ہے؟-اور ایک شہید کی جانب اشارہ کیا- عمرو بن اُمیہؓ نے اس سے کہا: یہ عامر بن فہیرہ ہے۔اس نے کہا: جب ان کو شہید کیا گیا تو میں نے دیکھا کہ ان کو آسمان کی طرف اٹھایا گیا، میں نے اوپر نظر اٹھائی تو لاش زمین وآسمان کے درمیان لٹک رہی تھی، پھر وہ زمین پر رکھی گئی۔(صحیح بخاری: 4096)

٦: حسان بن ثابتؓ؛عامر بن طفیل کے قتل پر ابھارتے ہیں:

حضرت حسان بن ثابتؓ میڈیا کی ٹیم کے ایک اہم فرد تھے، وہ دشمنوں کے خلاف نفسیاتی جنگ کرتے تھے، ان کے ساتھ کعب بن مالکؓ اور عبداللہ بن رواحہؓ شانہ بشانہ کھڑے تھے، سیرت کا کوئی ایسا واقعہ نہیں ہے جس کے بارے میں انہوں نے شعر نہ کہے ہوں اور کافروں کے ہر قصیدہ کا جواب کئی قصائد کے ذریعہ دیتے تھے، یہ بات معروف ہے کہ کعب بن اشرف یہودی کو ہر طرف سے بے آسرا اور بے یار و مددگار کرنے میں حضرت حسانؓ کے اشعار نے کیا کردار ادا کیا، حضرت حسانؓ اسلامی ریاست کے شعراء کو جہاد کے اس میدان میں اترنے کے لئے ابھارتے اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے،اس لئے موجودہ زمانہ کے مسلم قائدین، زعماء، علماء، فقہاء اور جماعتوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے شعراء کی حوصلہ افزائی کریں اور اس جہادِ عظیم میں شرکت کے لئے ان کو ترغیب دیں۔

جب حضرت حسانؓ کو بئر معونہ میں شہید ہونے والے صحابہ کرام کی خبر معلوم ہوئی تو انہوں نے اس سلسلہ میں اشعار کہے جو ہر چہار سو پھیل گئے، ان اشعار میں انہوں نے ملاعب الآسنہ ربیعہ بن عامر بن مالک کو ابھارا اور عامر بن طفیل کے بارے میں اس کو غیرت دلائی کہ اس نے ان کے باپ ابو براء کی دی ہوئی امان اور پناہ کا کوئی پاس ولحاظ نہیں کیا اور جب ربیعہ بن ابو براء کو یہ اشعار پہنچے - اور اشعار ان کے ہاں نیزوں سے زیادہ تکلیف دہ، تلواروں سے زیادہ کاری زخم لگانے والے اور تیروں سے زیادہ اثر رکھتے تھے - اشعار سنتے ہی ربیعہ اپنے والد کا بدلہ لینے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور عامر بن طفیل پر ایسا کاری وار کیا کہ وہ زخمی ہو گیا اور مرتے مرتے بچ گیا، اس کی قوم ان پر ٹوٹ پڑی اور عامر سے کہا: بدلہ لے لو! لیکن اس نے کہا: میں نے معاف کر دیا اور اگر میں زندہ رہا تو میں اس کے بارے میں سوچوں گا۔ (فتح الباری:4096)

۷: عامر بن طفیل عامری کا انجام:

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی دعا قبول کی، اللہ کے رسول ﷺ نے عامر بن طفیل کے لئے بددعا فرمائی کہ "اے اللہ! مجھے طرف سے عامر کے لئے کافی ہو جا، اس سے نمٹ لے"۔ (المعجم الکبیر للطبرانی: 5724، مجمع الزوائد: 6/125)

یہ سرکش ایک جان لیوا مرض میں مبتلا ہوا جس کو اللہ کے رسول ﷺ نے ان الفاظ کے ساتھ بیان فرمایا ہے: "اونٹ کے غدود کی طرح کا غدود" اور اس مرض کو آپ ﷺ نے "طاعون" کا نام دیا ہے۔ اس طاعون میں درجہ حرارت بڑھ جاتا ہے، بغل کے نیچے کے حصے میں گانٹھیں بڑھ جاتی ہیں، اسی طرح تلی میں ورم پیدا ہوتا ہے، اسی مرض میں عامر بن طفیل مبتلا ہوا یہاں تک کہ اپنی قوم کی ایک عورت کے گھر میں بند ہو کر رہ گیا۔

عامر بن طفیل اس طرح کے جان لیوا مرض کا شکار ہو گیا، جزیرۃ العرب پر حکومت کرنے یا نبی کریم ﷺ کا خلیفہ بننے کے اس کے تمام خواب زمین بوس ہو گئے، اور جن لشکروں کے بارے میں اس نے نبی کریم ﷺ کو دھمکی دی تھی، وہ لشکر ایسے آلام اور امراض میں تبدیل ہو گئے جن کی وجہ سے وہ ایک عورت کے گھر میں محبوس ہو کر رہ گیا، لوگوں نے اس سے ملنا جلنا چھوڑ دیا اور اس سے سب بھاگنے لگے کہ کہیں اس کا مرض ان کو بھی نہ لگ جائے، وہ حواس باختہ ہو گیا، آس پاس کے لوگوں کو پکار پکار کر کہنے لگا: آہ، اونٹ کی گلٹی جیسی گلٹی، اور بنو آل فلاں کی ایک عورت کے گھر میں! میرا گھوڑا میرے پاس لاؤ، پھر وہ سوار ہوا اور اپنے گھوڑے کی پیٹھ پر مر گیا۔ (صحیح بخاری: 4091) وہ ظالم و سرکش ایک پاگل کی طرح ہلاک ہوا جبکہ تمام لوگ اس کے پاس سے بھاگ گئے، اس ڈر سے کہ کہیں ان کو بھی یہ بیماری نہ لگ جائے۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویہ، للصویانی، ص: 131)

دوسرا باب

اُم المساکینؓ اور اُم سلمہؓ کے ساتھ نبی کریم ﷺ کا نکاح اور متفرق واقعات

۱: اُم المساکین حضرت زینب بنت خزیمہؓ:

آپؓ کا نام زینب بنت خزیمہ بن حارث ہلالیہ ہے، آپؓ بنو عبد مناف بن ہلال بن عامر بن صعصعہ سے تعلق رکھتی ہیں، زمانۂ جاہلیت میں آپؓ کو اُم المساکین کہا جاتا تھا، اس لئے کہ وہ مسکینوں کو کھانا کھلایا کرتی تھیں، اللہ کے رسول ﷺ نے آپؓ سے ماہِ رمضان میں ہجرت کے اکیسویں ماہ کے آغاز میں نکاح کیا، آپ ﷺ کی زوجیت میں وہ آٹھ ماہ رہیں اور آپؐ ہی کی حیات میں ہجرت کے انیسویں ماہ کے آغاز میں وفات پائی اور مدینۃ الرسول ﷺ میں ان کی تدفین کی گئی۔(دیکھیں: تفسیر القرطبی: 4/166)

حضرت زینب بنت خزیمہؓ اس سے پہلے حضرت عبداللہ بن جحش بن رئاب کی زوجیت میں تھیں جن کو معرکۂ اُحد میں شہید کیا گیا، اس لئے اللہ کے رسول ﷺ نے ان کو اعزاز واکرام بخشتے ہوئے ان سے نکاح فرمایا، جبکہ ان کو معرکہ احد میں اپنے شوہر کی شہادت کے غم سے دوچار ہونا پڑا، اللہ کے رسول ﷺ نے ان کو تنہا نہیں چھوڑا، بلکہ آپؐ نے ان کو اپنے شوہر کی شہادت کا بدلہ عطا فرمایا۔(دیکھیں: المفصل فی أحکام المرأۃ، عبدالکریم زیدان: 11/469)

۲: ام سلمہؓ کے ساتھ نبی کریم ﷺ کا نکاح:

آپؓ کا نام ہند بنت ابی امیہ حذافہ بن مغیرہ قرشیہ مخزومیہ ہے۔ آپؓ اپنے چچازاد بھائی ابو عبداللہ بن عبد الاسد کی زوجیت میں تھیں اور آپؓ کے شوہر رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی برّہ بنت عبد المطلب کے بیٹے یعنی آپؐ کے پھوپھی زاد بھائی تھے، وہ آپؐ کے رضاعی بھائی بھی تھے، حضرت اُم سلمہؓ اور ان کے شوہر ابو سلمہؓ نے مشرکین کے ظلم سے بچنے کے لئے اور اپنے دین کی حفاظت کے لئے حبشہ کی جانب ہجرت کی تھی، اس کے بعد جب رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں نے مدینہ کی جانب ہجرت کی تو یہ دونوں حبشہ سے واپس مکہ آئے اور مدینہ کی جانب ہجرت کی۔(دیکھیں: سیر أعلام النبلاء 2/202)

أ: ام سلمہؓ اور ابو سلمہؓ کی گفتگو:

حضرت ام سلمہؓ نے حضرت ابو سلمہؓ سے کہا: مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ جس عورت کا شوہر وفات پا جائے اور وہ اہلِ جنت میں سے ہو اور وہ عورت اس کے بعد کسی اور سے شادی نہ کرے تو اللہ تعالیٰ ان دونوں کو جنت میں جمع کرے گا۔ اس لئے آؤ ہم ایک دوسرے کے ساتھ عہد کریں کہ نہ ہی آپ میرے بعد کسی سے نکاح کریں گے اور نہ ہی میں آپ کے بعد کسی سے نکاح کروں گی۔ ابو سلمہؓ نے کہا: کیا آپ میری بات مانو گی۔ انہوں نے جواب دیا: جی ہاں! انہوں نے کہا: جب میری وفات ہو تو آپ نکاح کر لینا۔ اے اللہ! میرے بعد ام سلمہ کو ایسا شخص عطا کرنا جو مجھ سے بہتر ہو، جو نہ ان کو غمگیں کرے اور نہ ہی پریشان کرے۔ جب ابو سلمہؓ کی وفات ہوئی تو میں سوچنے لگی ابو سلمہؓ سے بہتر کون ہوگا؟! جلد ہی رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور دروازے پر کھڑے ہوئے اور ام سلمہؓ کے بھتیجے یا بیٹے کے ذریعہ پیغامِ نکاح دیا۔ میں نے

کہا: یا تو میں رسول اللہ ﷺ کے پیغام کو ٹھکرا دوں گی یا اپنے بچوں کے ساتھ آپؐ کے پاس جاؤں گی۔ اس کے بعد دوسرے دن آپؐ نے پیغامِ نکاح دے دیا۔(سیر أعلام النبلاء: 2/203)

ب: شوہر کی وفات کے وقت اُم سلمہؓ کی دعا:

جب آپؓ کے شوہر ابو سلمہؓ کی وفات ان زخموں کے نتیجے میں ہوئی جو مشرکین کے ساتھ لڑتے لڑتے آپ کے جسم پر لگے تھے، آپؓ ان سے انتہائی محبت کرتی تھیں اور ان کی عزت کرتی تھیں، وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! بے شک ابو سلمہؓ کی وفات ہو چکی ہے، آپؐ نے فرمایا: کہو: اے اللہ! میری اور ان کی مغفرت فرما اور مجھے ان کا نعم البدل عطا فرما۔ فرماتی ہیں: میں نے ایسا ہی کیا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے ان سے بہتر شخص محمدؐ کے ذریعہ نوازا۔(مسند احمد: 306اور 6/291، صحیح مسلم: 914، سنن ابوداؤد: 3115، سنن نسائی: 4/4، سنن ابن ماجہ: 1447)

ج: پیغامِ نکاح کے وقت ام سلمہؓ سے رسول اللہ ﷺ کی گفتگو:

حضرت عمر بن ابی سلمہؓ فرماتے ہیں: حضرت اُم سلمہؓ نے جب اپنی عدت مکمل کی تو ابو بکرؓ نے ان کو پیغام نکاح دیا، انہوں نے اس کو قبول نہیں کیا، اس کے بعد عمرؓ نے ان کو پیغامِ نکاح دیا، اس کو بھی قبول نہیں کیا، اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ان کو پیغامِ نکاح بھجوایا تو انہوں نے قاصد سے کہا: مرحبا، خوش آمدید! رسول اللہ ﷺ کو بتانا کہ میں بہت زیادہ غیرت منداور صاحبِ عیال ہوں اور میرے اولیاء میں سے اور کوئی موجود نہیں ہے۔

آپ ﷺ نے ان کو کہلوایا کہ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ آپ صاحبِ عیال ہیں تو اللہ تعالیٰ آپ کے بچوں کے لئے کوئی انتظام کرلے گا، اور آپ کا یہ کہنا کہ میں بہت زیادہ غیرت مند ہوں تو میں اللہ تعالیٰ سے دعا کروں گا اللہ تعالیٰ آپ کی زیادہ غیرت کو ختم کرے گا، اور جہاں تک آپ کے اولیاء کا تعلق ہے تو ان میں سے ہر ایک میرے بارے میں رضامندی کا اظہار کرے گا۔(مسند احمد: 6/313، سنن نسائی: 6/81، سیر أعلام النبلاء: 2/203)

ایک دوسری روایت میں ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں ایک عمر دراز عورت ہوں، آپ ﷺ نے اس کا جواب دیا: جہاں تک عمر کا تعلق ہے تو میں آپ سے بڑا ہوں۔ (طبقات ابن سعد: 8/90) اس طرح سے آپ ﷺ نے ان کو ہر سوال کا بہترین جواب دیا اور آپ ﷺ تو سراپا محسن تھے۔(دیکھیں: المفصل فی أحکام المرأة: 11/470)

د: ام سلمہؓ کے گھر کے لئے رسول اللہ ﷺ کی طرف سے فرنیچر کا انتظام اور ان کے ساتھ معاملہ:

جب ام سلمہؓ نے نکاح کے لئے آمادگی کا اظہار کیا تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: میں نے جو کچھ فلاں کو دیا ہے تمہیں بھی اس سے کم نہیں دوں گا؛ دو(۲) چکیاں، دو(۲) مشکیزے اور چمڑے کا ایک تکیہ جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی ہے۔(مسند أحمد: 6/291-306)

حضرت ام سلمہؓ کی پہلے شوہر ابو سلمہؓ سے ایک بیٹی تھی جس کی ولادت ابو سلمہؓ کی وفات کے بعد ہوئی تھی، جب اللہ کے رسول ﷺ نے ان سے نکاح کیا تو آپؐ ان کے پاس آنے لگے، جب آپؐ تشریف لائے تو وہ اپنی بچی زینب کو دودھ پلانے کے لئے اپنی گود میں رکھ لیتیں، اللہ کے رسول ﷺ بہت زیادہ شرم وحیا والے اور کریم تھے، آپ ﷺ واپس تشریف لے جاتے، کئی مرتبہ ایسا ہی ہوا، حضرت عمار بن یاسرؓ اس بات کو سمجھ گئے، حضرت عمارؓ حضرت ام سلمہؓ کے ماں شریک بھائی تھے، ان کی والدہ شہیدہ حضرت سمیہؓ تھی جن کو ابو جہل نے شہید کیا تھا۔ حضرت عمارؓ اپنی بہن ام سلمہؓ کے گھر گئے اور اپنی بھانجی کو لے کر آئے تاکہ اس کو اپنے گھر میں یا کسی اور عورت کے ہاں دودھ پلائیں، اللہ کے رسول ﷺ تشریف لائے تو دریافت کیا: زینب کہاں ہیں؟ ایک خاتون نے کہا: ان کو عمار بن یاسرؓ نے لیا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: میں آج رات آپ کے پاس آؤں گا۔ حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں: میں نے فرش بچھایا اور میرے مٹکے میں جو کے دانے تھے وہ نکالے اور کچھ چربی نکالی، اس کے بعد اس کو ملا کر پکایا۔ آپ ﷺ نے ہمارے ہاں رات گزاری، جب آپ ﷺ نے صبح کی تو فرمایا: آپ میرے نزدیک صاحبِ عزت وکرامت ہو اس لئے اگر آپ چاہو تو میں آپ کے ہاں سات دن گزاروں، اگر آپ کے ہاں سات دن رہوں گا تو باقی ازواج کے ہاں بھی سات دن رہوں گا۔ (صحیح مسلم: 1460، سنن ابوداؤد: 2122) اور اگر آپ چاہو تو میں تین دن گزاروں اور پھر باقی ازواج کے پاس بھی اتنے ہی دن گزاروں۔ اُم سلمہؓ نے فرمایا: تین روز قیام فرمائیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ان کے یہاں تین روز قیام فرمایا۔ اس کے بعد فرمایا: باکرہ (غیر شوہر دیدہ) کے لئے سات دن اور ثیّبہ (شوہر دیدہ) کے لئے تین دن۔ (صحیح مسلم: 1460/42) اللہ کے رسول ﷺ نے ام سلمہؓ کے ہاں تین مبارک ایام گزارے، اس کے بعد بقیہ ازواج کی طرح ان کے لئے بھی ایک دن متعین فرمایا۔

ھ: برّہ بنت اَبی سلمہؓ کے نام کی تبدیلی:

وہ یتیم بچی کہتی ہے: نبی کریم ﷺ اُم سلمہؓ کے پاس تشریف لائے جب کہ آپ ﷺ نے ان سے نکاح کیا تو میرا نام برّہ تھا، آپ ﷺ نے انہیں مجھے برّہ پکارتے ہوئے سنا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اپنے نفس کی پاکی کے دعوے نہ کرو، بے شک اللہ تم میں سے نیک اور بد کے بارے میں زیادہ جاننے والا ہے، ان کا نام زینب رکھو، یہ سن کر ام سلمہؓ نے کہا: اب ان کا نام زینب ہے۔ (صحیح مسلم: 19/2142، الأدب المفرد للبخاری: 821)

یہ نبی کریم ﷺ کا طریقہ کار تھا، آپ ﷺ خوبصورت نام پسند فرماتے تھے، آپ ﷺ صرف بچوں کے نام تبدیل نہیں کرتے تھے، بلکہ مردوں، عورتوں اور سن رسیدہ بزرگوں کو بھی اس عظیم نبوی ذوق کا حصہ وافر ملتا تھا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک شخص کا ذکر کیا گیا جس کا نام 'شہاب' تھا، آپؐ نے فرمایا: نہیں، بلکہ آپ ہشام ہو۔ (الادب المفرد للبخاری: 825، مسند احمد: 6/76، مجمع الزوائد: 8/51)

اللہ کے رسول ﷺ کے پاس جب کوئی شخص آتا اور اس کا کوئی ایسا نام ہوتا جس کو آپؐ پسند نہیں کرتے تھے تو آپؐ اس کا نام تبدیل کردیتے تھے۔ (المعجم الکبیر للطبرانی: 17/119، مجمع الزوائد: 8/51)

آپؐ اس نام کے مقابلہ میں کوئی زیادہ خوبصورت اور لطیف نام رکھتے تھے، آپؐ ایسا ہی سن رسیدہ خواتین کے ساتھ بھی کیا کرتے تھے، چنانچہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: ایک بزرگ خاتون نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں جبکہ آپؐ میرے پاس تھے، آپؐ نے

اس سے دریافت کیا: آپ کون ہیں؟اس نے کہا: جثّامۃ المزنیّہ۔ آپؐ نے فرمایا: بلکہ آپ حسّانۃ المزنیّہ ہو! آپ کیسے ہو؟آپ کا کیا حال ہے؟ ہمارے بعد آپ کیسے رہے؟اس نے جواب دیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، ہم خیریت سے ہیں۔ جب وہ چلی گئیں تو میں نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ! آپ اس بڑھیا پر اس قدر توجہ دے رہے تھے؟! آپ ﷺ نے فرمایا: یہ خدیجہؓ کے زمانہ میں ہمارے پاس آتی تھیں اور حسنِ سلوک کرنا اور خیال رکھنا ایمان کا حصہ ہے۔ (شعب الایمان للبیہقی: 9122، مستدرک حاکم: 1/16،الاحادیث الصحیحہ للألبانی: 216)

ھ:ام سلمہؓ سے نکاح کی حکمت:

صاحب تفسیر المنار اس نکاح کی حکمت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "یہ نکاح صرف جائز تمتع اور لطف اندوزی کے لئے نہیں تھا، بلکہ یہ ام سلمہؓ کے فضل وکمال کی وجہ سے تھا جس کا ادراک ہر اس شخص کو ہو سکتا ہے جو صلح حدیبیہ کے موقع پر ان کے ذریعہ دی جانے والی رائے پر غور وفکر کرے گا، اسی طرح اس کے ذریعہ ان کے شوہر کی وفات پر ان کی تعزیت بھی مقصود تھی۔(دیکھیں: تفسیر المنار:4/372)

اسی طرح یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ام سلمہؓ کا تعلق بنو مخزوم سے تھا جو قبیلہ قریش کا معزز ترین خاندان تھا، انہی کے پاس رسول اللہ ﷺ کے خلاف جنگ اور مقابلہ آرائی میں کمانڈ ہوتی تھی اور وہی جنگ میں علم بردار ہوتے تھے، لہذا اس نکاح کے ذریعہ اس قبیلہ کی عداوت ودشمنی کو فرو کرنا، اس کے افراد کو قریب کرنا اور ان کو قبول اسلام کے لئے تیار کرنا مقصود تھا، اس لئے کہ اب وہ رسول اللہ ﷺ کے رشتہ دار بن چکے تھے۔(دیکھیں:التربیۃ القیادیۃ: 3/356)

اس نکاح کے ذریعہ پتہ چلتا ہے کہ نبی کریم ﷺ امت کی داخلی صورتحال کی تعمیر کا بہترین تجربہ رکھتے تھے، شہداء کے حق کو ادا کرتے ہوئے ان کی ازواج کے ساتھ حسنِ سلوک کرتے تھے، ان ازواج کا حق یہ ہے کہ وہ نورِ نبوت کی کرنوں سے فیضیاب ہوں تاکہ وہ اللہ کے رسول ﷺ کی طرف سے پیغام رسالت کو دوسروں تک پہنچا سکیں۔(ایضاً: 3/357)

حضرت ام سلمہؓ امہات المومنین میں سے سب سے اخیر میں وفات پانے والی خاتون تھیں، آپؓ کی وفات سن 61ھ میں ہوئی۔ آپؓ نے رسول اللہ ﷺ سے بہت سی احادیث روایت کی ہیں جن کی تعداد 388 تک پہنچتی ہے، ان میں سے تیرہ احادیث امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کے نزدیک متفق علیہ ہیں، جبکہ تین احادیث صرف امام بخاریؒ نے نقل کی ہیں اور تیرہ (۱۳) احادیث صرف امام مسلمؒ نے نقل کی ہیں۔(سیر اعلام النبلاء:2/210)

حضرت ام سلمہؓ نے رسول اللہ ﷺ کے علم وحکمت کو عام کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور ان کی وفات کے ذریعہ امہات المومنین کا آخری چراغ بھی بجھ گیا جس نے علم وہدایت اور نور کی شعائیں پھیلانے کا کام ایک مدت تک انجام دیا۔ اللہ ان سے راضی ہو۔(دیکھیں: السیرۃ النبویۃ،ابوشہبہ: 2/248)

۳: حسن بن علیؓ کی ولادت:

امام قرطبیؒ فرماتے ہیں: حضرت حسنؓ کی ولادت سن چار ہجری کے ماہِ شعبان میں ہوئی، اس اعتبار سے حضرت حسینؓ کی ولادت حضرت حسنؓ کی ولادت سے پورے ایک سال پہلے ہوئی۔ واقدی ؒ کے قول سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، اسی طرح امام نوویؒ نے ''التہذیب'' میں قطعیت کے ساتھ یہ بات کہی ہے کہ حسنؓ کی ولادت پانچ شعبان سن چار ہجری میں ہوئی۔ (دیکھیں: شذرات الذھب، ابن العماد الحنبلی: 1/10)

حضرت علی بن ابی طالبؓ فرماتے ہیں: جب حسنؓ کی ولادت ہوئی تو میں نے ان کا نام حرب (جنگ) رکھا، اللہ کے رسول ﷺ تشریف لائے تو فرمایا: مجھے میرا بیٹا دکھاؤ، آپ نے اس کا نام کیا رکھا؟ میں نے عرض کیا: حرب! آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، بلکہ وہ حسن ہیں۔ (مسند أحمد: 118/98، 1، ابن حبان: 6958، الادب المفرد للبخاری: 823، المعجم الکبیر للطبرانی: 2773، مستدرک حاکم: 3/180، البزار: 1997 مجمع الزوائد: 8/52)

آپ ﷺ نے شدت اور سختی پر دلالت کرنے والے نام کو ایک خوبصورت نام میں تبدیل کر دیا جو دلوں کے لئے فرحت بخش اور باعثِ سرور ہے۔

اب اس نومولود بچے کا نیا خوبصورت نام رکھا گیا، آپ ﷺ نے اس کو اپنی گود میں اٹھایا اور بوسہ دیا، حضرت ابو رافعؓ رسول اللہ ﷺ کے طرزِ عمل کی منظر کشی کرتے ہوئے بیان فرماتے ہیں: میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا جب حضرت فاطمہؓ کے بطن سے حسنؓ کی ولادت ہوئی تو آپؐ نے ان کے دونوں کانوں میں نماز میں دی جانے والی اذان دی۔ (مسند أحمد: 6/9، سنن ابوداؤد: 5105، سنن ترمذی: 1514)

حضرت ابو رافعؓ حضرت حسنؓ کے عقیقہ کے بارے میں بیان فرماتے ہیں کہ جب حضرت فاطمہؓ کے بطن سے حضرت حسنؓ کی ولادت ہوئی تو فاطمہؓ نے فرمایا: کیا میں اپنے بیٹے کی طرف سے دو مینڈھے ذبح کرکے عقیقہ نہ کروں؟ آپؐ نے فرمایا: نہیں! بلکہ آپ اس کا سر مونڈھو اور ان کے بالوں کے بقدر مساکین اور 'اوفاض' پر صدقہ کرو، اوفاض رسول اللہ ﷺ کے وہ اصحاب تھے جو مسجد یا صفّہ میں ضرورت مند ہوا کرتے تھے، حضرت فاطمہؓ نے ایسا ہی کیا۔ (مسند احمد: 390-391)

رسول اللہ ﷺ نے یہ چاہا کہ خود حضرت حسنؓ کا عقیقہ کریں، اس لئے آپ ﷺ نے دو مینڈھے ذبح کرکے آپؓ کا عقیقہ کیا۔ (سنن نسائی: 166/7)

عقیقہ کے بارے میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ہر بچہ اپنے عقیقہ کے ذریعہ رہن ہوتا ہے، اس کی ولادت کے ساتویں دن اس کی طرف سے ذبح کیا جائے گا، اس کا سر مونڈھا جائے گا اور اس کا نام رکھا جائے گا''۔ (مسند احمد: 5/7-22، 17، 12، 8، سنن ابوداؤد: 2837، 2838، سنن ترمذی: 1522، سنن نسائی: 7/166، سنن ابن ماجہ: 3165)

۴: سن 4ھ میں حضرت زید بن ثابتؓ یہود کی زبان سیکھتے ہیں:

اسی سال یعنی سن چار ہجری میں حضرت زید بن ثابتؓ نے یہود کی زبان اور ان کے ساتھ خط وکتابت کا فن سیکھ لیا، حضرت خارجہ بن زید بن ثابت؛ حضرت زید بن ثابتؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو حکم دیا کہ یہود کی زبان اور ان سے کتابت کا فن سیکھ لیں تاکہ جب یہود رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خط وکتابت کریں تو وہ رسول اللہ ﷺ کو پڑھ کر سنائیں۔ (صحیح بخاری: 7195) اس لئے انہوں نے یہ زبان پندرہ دن میں سیکھ لی۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو زیدؓ کو رسول اللہ ﷺ کے پاس لے جایا گیا اور لوگوں نے آپؐ سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ! یہ بنو نجار کا لڑکا ہے، آپ پر اللہ تعالیٰ نے جو وحی نازل کی ہے اس میں سے ان کو دس سے زائد سورتیں یاد ہیں، اللہ کے رسول ﷺ کے لئے یہ بات حیران کن تھی، اس لئے آپ ﷺ نے فرمایا: اے زید! میرے لئے یہود کی زبان سیکھ لو، اس لئے کہ مجھے یہود کی کسی تحریر پر اطمینان نہیں ہے۔ حضرت زیدؓ فرماتے ہیں: میں نے آپؐ کے لئے ان کی زبان سیکھ لی، ابھی پندرہ دن بھی نہیں گزرے تھے یہاں تک کہ میں نے اس میں مہارت حاصل کرلی، میں آپؐ کو ان کی تحریریں پڑھ کر سناتا تھا اور جب آپؐ جواب دیتے تو میں ہی آپؐ کی طرف سے تحریر لکھتا۔ (مسند احمد: 5/186، سنن ابوداؤد: 3645، سنن ترمذی: 2715، سیر أعلام النبلاء: 2/429)

اس روایت کے ذریعہ یہ واضح ہوتا ہے کہ کسی بھی حکومت میں ترجمان کا ایک خاص مقام ہوتا ہے، اس لئے کہ وہ حکومت کے رازوں سے واقف ہوتا ہے اور حکومت کو جو بھی مراسلے آتے ہیں یا حکومت جو خطوط دوسروں کو بھیجتی ہے ان کے بارے میں ترجمان کو واقفیت ہوتی ہے، اور یہ بات درست نہیں ہے کہ ہر شخص آنے والی یا جانے والی تحریروں سے واقف ہو تاکہ انتشار کی کیفیت پیدا نہ ہو، اور حکومت کے راز افشانہ ہوں، اسی لئے اللہ کے رسول ﷺ نے زید بن ثابتؓ کو یہود کی زبان سیکھنے کا حکم دیا۔ (دیکھیں: زید بن ثابت کاتب الوحی وجامع القرآن، صفوان داؤدی، ص: 80-81)

حضرت زید بن ثابتؓ نے یہود کی زبان پندرہ دنوں میں سیکھ لی جس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت زیدؓ کس قدر ذہانت اور قوتِ حافظہ کے مالک تھے، آپؓ کا تعلق ان صحابہ کرام سے ہے جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ہی مکمل قرآن حفظ کرلیا تھا، آپؓ مشہور ترین کاتبینِ وحی میں سے ہیں۔ عہد صدیقی میں تدوین وجمعِ قرانی کی ذمہ داری آپؓ نے ہی سنبھالی، اسی طرح حضرت عثمانؓ کے عہد میں قرآن کریم کو ایک مصحف کے مطابق لکھنے اور جمع کرنے کی ذمہ داری بھی آپؓ نے ہی سنبھالی، رسول اللہ ﷺ کا زیدؓ کو یہود کی زبان سیکھنے اور ان کے ساتھ خط وکتابت کا فن سیکھنے کا حکم دینا، اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اسلام ایک مسلمان کو اس بات کی ترغیب دیتا ہے کہ وہ دوسروں کی زبانوں کو اور ان کے ساتھ خط وکتابت کے فن کو سیکھے، اور ان کے علوم و معارف سے بھی واقف ہو، بطور خاص اس وقت جبکہ ضرورت بھی اس کی متقاضی ہو۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویہ ابوشہبہ: 2/249)

....

تیسرا باب
یہودِ بنو نضیر کی جلاوطنی

کعب بن اشرف کے قتل اور معرکہ اُحد کے درمیان کے پورے عرصہ میں مدینہ کے یہود پر خوف وہراس اور مرعوبیت کی کیفیت طاری رہی، معرکہ اُحد سن تین ہجری ماہ شوال میں پیش آیا، لیکن معرکہ اُحد میں مسلمانوں کو لاحق ہونے والی ظاہری شکست نے مشرکین و منافقین کے دلوں میں اپنے اغراض ومقاصد حاصل کرنے کی ایک نئی امید پیدا کی اور یہود کے دلوں سے خوف اور رعب کو زائل کر دیا، رجیع اور بئر معونہ کے واقعات نے ان کے خوف وہراس کو دور کرنے میں مزید اہم رول ادا کیا، اس لئے ان کا یہ خوف لمبے عرصہ تک جاری نہ رہ سکا بلکہ انہوں نے مکر وفریب، چالبازی اور سازشوں کا طرزِ عمل پھر سے شروع کیا، انہوں نے اپنے قلعوں میں اسلحہ جمع کرنا شروع کر دیا، وہ مسلمانوں کو ختم کرنے کے لئے تیاری کرنے لگے اور پھر انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو دھوکہ دینے اور جان سے مار دینے کا بھی مکمل منصوبہ بنادیا۔(دیکھیں: التاریخ السیاسی والعسکری، ص: 188-189)

ا: غزوۂ بنی نضیر کی تاریخ اور اس کے اسباب

اَ: غزوہ کی تاریخ:

محقق مؤرخین کا خیال یہ ہے کہ غزوہ بنی نضیر غزوۂ اُحد کے بعد سن چار ہجری کے ماہ ربیع الاول میں پیش آیا، ابن قیمؒ نے ان لوگوں کا رد کیا ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ غزوۂ بنی نضیر غزوۂ بدر کے چھ ماہ بعد پیش آیا۔(صحیح بخاری تعلیقاً: 7/418) ابن قیمؒ فرماتے ہیں: محمد بن شہاب زہریؒ کا کہنا یہ ہے کہ غزوۂ بنی نضیر غزوۂ بدر کے چھ ماہ بعد پیش آیا، یہ ان کی غلط فہمی یا غلطی ہے، بلکہ اصل بات یہ ہے جس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ غزوۂ بنی نضیر غزوۂ احد کے بعد پیش آیا، اور غزوۂ بدر کے چھ ماہ بعد جو غزوہ پیش آیا وہ غزوۂ بنی قینقاع تھا، جبکہ غزوہ بنی قریظہ، غزوۂ خندق کے بعد اور غزوۂ خیبر حدیبیہ کے بعد پیش آیا۔(زاد المعاد: 3/249)

ابن العربیؒ اس ضمن میں کہتے ہیں: صحیح قول یہ ہے کہ غزوۂ بنی نضیر اُحد کے بعد پیش آیا۔(أحکام القرآن، ابن العربی: 4/1765)

یہی رائے ابن کثیرؒ نے بھی اختیار کی ہے۔(حدیث القرآن عن غزوات الرسول: 1/254)

ب: غزوہ کے اسباب:

اس غزوہ کے متعدد اسباب پائے جاتے ہیں جن کی وجہ سے نبی کریم ﷺ کو غزوۂ بنی نضیر کا اور پھر بنو نضیر کو جلا وطن کرنے کا اقدام کرنا پڑا، جن میں سے اہم ترین اسباب مندرجہ ذیل ہیں:

ا: بنو نضیر کی عہد شکنی:

بنو نضیر نے ان تمام معاہدوں کو توڑ دیا جن کی وجہ سے وہ اس بات کے پابند تھے کہ وہ مسلمانوں کے دشمن کو پناہ نہیں دیں گے، انہوں نے صرف عہد شکنی پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ دشمنوں کو مدینہ کی کمزوریوں سے بھی آگاہ کر دیا۔

غزوۂ سویق کے موقع پر ایسا ہوا کہ ابو سفیان بن حرب نے غزوہ بدر کے بعد مکہ واپس آنے پر یہ نذر مانی کہ وہ اس وقت تک غسل جنابت نہیں کرے گا جب تک کہ مدینہ پر حملہ نہ کر دے، جب وہ دو سو سوار جنگجوؤں کے ساتھ مدینہ کا قصد کئے ہوئے نکلا تو بنو نضیر کا سردار سلام بن مشکم اس کے شانہ بشانہ کھڑا رہا، اس نے اس کی ضیافت کی اور اس کو وہاں کے حالات سے باخبر کر دیا لیکن مدینہ کی خبر رساں ایجنسیاں بھی اس سے غافل اور بے خبر نہیں تھیں۔ (دیکھیں: تاریخ الطبری: 2/284)

صاحب المغازی موسی بن عقبہ کہتے ہیں: بنو نضیر نے قریش کے ساتھ مل کر سازشیں کی تھیں اور ان کو رسول اللہ ﷺ کے خلاف قتال کرنے پر ابھارا اور ان کو وہاں کے رازوں سے واقف کرایا۔ (دیکھیں: فتح الباری، کتاب المغازی: 7/332)

۲: نبی کریم ﷺ کو شہید کرنے کی کوشش:

نبی کریم ﷺ صحابہ کرام کے ساتھ قبا کے راستے سے بنو نضیر کے علاقہ میں تشریف لے گئے، آپ ﷺ کے وہاں جانے کا مقصد یہ تھا کہ بنو عامر کے ان دو مقتولین کی دیت کے بارے میں ان سے ان کا حصہ حاصل کریں جن کو حضرت عمرو بن امیہ ضمریؓ نے انجانے میں مار دیا تھا حالانکہ وہ دونوں رسول اللہ ﷺ کی پناہ حاصل کر چکے تھے، آپ ﷺ ان کے علاقہ میں اس لئے تشریف لے گئے تاکہ دیت کے سلسلہ میں بنو نضیر کے ساتھ کئے گئے معاہدہ کو بروئے کار لائیں اور ساتھ ہی ساتھ بنو نضیر اور بنو عامر کے درمیان بھی حلیفانہ معاہدہ تھا۔

بنو نضیر کے لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کا استقبال انتہائی خندہ پیشانی اور چالاکی کے ساتھ کیا، اس کے بعد ان میں سے بعض علٰحیدہ ہو کر آپ کو شہید کرنے اور آپ کو دھوکہ دینے کی سازش کرنے لگے، اور ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے اس پر اتفاق کیا کہ آپ جس جگہ بیٹھے ہوئے تھے وہاں آپ پر اوپر سے ایک پتھر گرادیں، لیکن اللہ کے رسول ﷺ کو اللہ تعالی کی حفاظت و رعایت حاصل تھی، اس لئے آپ نے بنو نضیر کے مقاصد کا ادراک کر لیا اور آپ کو بذریعہ وحی ان کے بُرے ارادہ سے آگاہ کر لیا، اس لئے آپ ﷺ وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور تیزی کے ساتھ مدینہ تشریف لے آئے اور تھوڑی دیر بعد ہی صحابہ کرام بھی وہاں سے چلے آئے۔ (الواقدی: 1/365، التاریخ السیاسی والعسکری، ص: 190)

بنو نضیر کی جس سازش کو اللہ تعالی نے ناکام و نامراد بنا دیا اس کا ہدف صرف رسول اللہ ﷺ ہی کی ذات نہیں تھی بلکہ اس کا ہدف ریاستِ مدینہ اور پوری دعوتِ اسلامی تھی، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے بنو نضیر کے خلاف کاروائی کرنے کا عزم مصمم کر لیا جنہوں نے عہد شکنی کی تھی، لہذا آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو ان کے خلاف قتال کرنے کی تیاری کرنے اور ان کی طرف پیش قدمی کرنے کا حکم دے دیا۔

یہ اور ان کے علاوہ بعض دیگر اسباب کی وجہ سے غزوۂ بنو نضیر پیش آیا، قرآن کریم نے اہل ایمان کو اس عظیم نعمت کے بارے میں تذکیر کی ہے اور یاد دلایا ہے کہ اللہ تعالی نے کس طرح اپنے نبی کو بنو نضیر کے مکر و فریب سے محفوظ رکھا، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱذْكُرُواْ نِعْمَتَ ٱللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ هَمَّ قَوْمٌ أَن يَبْسُطُوٓاْ إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنكُمْ ۖ وَٱتَّقُواْ ٱللَّهَ ۚ وَعَلَى ٱللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ ٱلْمُؤْمِنُونَ﴾ ترجمہ: "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کے اُس احسان کو یاد کرو جو اُس نے (ابھی

حال میں) تم پر کیا ہے جبکہ ایک گروہ نے تم پر دست درازی کا ارادہ کر لیا تھا مگر اللہ نے اُن کے ہاتھ تم پر اٹھنے سے روک دیئے، اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو، ایمان رکھنے والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے"۔(سورۃ المائدہ: 11)

مفسرین کرام نے اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں متعدد روایات نقل کی ہیں:

امام طبریؒ نے ابو زیاد سے نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ بنو نضیر کے ہاں اپنے اصحاب کی دیت کے سلسلہ میں تشریف لائے تاکہ ان سے اس سلسلہ میں مدد حاصل کریں، آپ ﷺ کے ساتھ ابو بکرؓ، عمرؓ اور علیؓ بھی تھے، آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: ہم پر جو دیت عائد ہوتی ہے اس کے بارے میں ہماری مدد کرو۔ انہوں نے جواب دیا: جی ہاں، ٹھیک ہے، اے ابو القاسم! آپ کو ہمارے ہاں آنے کا اور ضرورت کے بارے میں سوال کرنے کا موقع مل ہی گیا ہے اس لئے تشریف رکھیں تاکہ ہم آپ کو کچھ کھلائیں پلائیں اور آپ کو مطلوبہ دیت بھی آپ کو دے دیں۔ اللہ کے رسول ﷺ اور آپؐ کے اصحاب انتظار میں بیٹھ گئے، سردارِ قوم آیا اور رسول اللہ ﷺ سے اسی نے سابقہ گفتگو کی تھی، اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا: اس سے بہتر موقع تمہیں نہیں ملے گا، ان پر ایک پتھر گراؤ اور ان کا کام تمام کر دو اور پھر تمہیں اس کے بعد کوئی بُری چیز دیکھنے کو نہیں ملے گی، وہ ایک بڑا چکی کا پاٹ لے کر آئے تاکہ آپؐ پر اس کو گرا دیں لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں اس کے اٹھانے سے بے بس کر دیا یہاں تک کہ جبرئیل-علیہ السلام- تشریف لائے اور ان کو وہاں سے اٹھایا، اسی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے آیات نازل کیں: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱذْكُرُوا۟ نِعْمَتَ ٱللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ هَمَّ قَوْمٌ أَن يَبْسُطُوٓا۟ إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنكُمْ ۖ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ ۚ وَعَلَى ٱللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ ٱلْمُؤْمِنُونَ﴾ ترجمہ: "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کے اُس احسان کو یاد کرو جو اُس نے (ابھی حال میں) تم پر کیا ہے، جبکہ ایک گروہ نے تم پر دست درازی کا ارادہ کر لیا تھا مگر اللہ نے اُن کے ہاتھ تم پر اٹھنے سے روک دیئے، اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو، ایمان رکھنے والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔(سورۃ المائدہ: 11)(دیکھیں: تفسیر ابن جریر طبری: 6/144)

اس کے علاوہ بھی متعدد روایات حذف واضافوں کے ساتھ اس واقعہ کے ضمن میں وارد ہوئی ہیں۔

۲: بنو نضیر کو جلاوطنی کی آگاہی اور ان کا محاصرہ:

اَ: بنو نضیر کو آگاہی:

اکثر سیرت نبویہ کی کتابوں میں اس واقعہ کا ذکر ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بنو نضیر کو دس دنوں کے اندر اندر وہاں سے نکل جانے کا اعلان کرا دیا، آپؐ نے محمد بن مسلمہؓ کو ان کے پاس بھیجا اور ان سے فرمایا: بنو نضیر کے یہود کے پاس جاؤ اور ان سے کہو: مجھے آپ کے پاس رسول اللہ ﷺ نے یہ نوٹس لے کر بھیجا ہے کہ میرے علاقہ سے نکل جاؤ، تم لوگوں نے مجھ سے کئے ہوئے معاہدہ کو توڑ دیا ہے، اس لئے کہ تم نے دھوکہ دہی اور غداری کا معاملہ کیا ہے، میں تمہیں دس روز کی مہلت دیتا ہوں، اس کے بعد تم میں سے جو یہاں نظر آئے گا اس کی گردن ماری جائے گی۔(دیکھیں: طبقات ابن سعد الکبری: 2/57، المغازی للواقدی: 1/363)

اس کے جواب میں ان کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں تھا، سوائے اس کے کہ انہوں نے محمد بن مسلمہؓ سے کہا: اے محمد بن مسلمہ، ہمیں یہ توقع نہیں تھی کہ اُوس کا کوئی شخص یہ پیغام لے کر ہمارے پاس آتا، محمدؓ نے کہا: اب دل بدل گئے ہیں اور اسلام نے تمام سابقہ معاہدوں کو ختم کر دیا ہے۔ انہوں نے کہا: ٹھیک ہے البتہ ہم کچھ زادِ سفر ساتھ لے کر جائیں گے، پھر وہ کچھ دنوں تک کوچ کرنے کے لئے تیاری کرتے رہے۔(تاریخ طبری: 2/552)

اسی دوران عبداللہ بن اُبی بن سلول نے ان کے پاس ایک شخص یہ پیغام لے کر بھیجوایا کہ ثابت قدم رہو اور حفاظتی اقدامات کرو، اس لئے کہ ہم آپ کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑیں گے اور اگر آپ کے ساتھ جنگ کی جائے گی تو ہم تمہارے ساتھ مل کر لڑیں گے اور اگر تم کو جلاوطن کیا جائے گا تو ہم بھی تمہارے ساتھ نکلیں گے، اور نکلنا نہیں، اس لئے کہ میرے ساتھ عرب اور میری قوم کے دو ہزار لوگ ہیں، اس لئے آپ قیام کرو، میرے حامی تمہارے ساتھ قلعوں میں داخل ہوں گے اور مسلمانوں کو تم تک پہنچنے سے پہلے وہ آخری دم تک لڑتے رہیں گے۔(دیکھیں: سیرت ابن ہشام: 3/212، تاریخ طبری: 2/553)

یہ سن کر یہود کے حوصلے بلند ہو گئے اور ان کے سردار حیی بن اَخطب کا دل بڑا ہو گیا، اس نے نبی کریم ﷺ کے پاس جُدی بن اَخطب کو یہ پیغام لے کر بھیجا کہ ہم اپنے علاقے کو نہیں چھوڑ سکتے ہیں، آپ کو جو کرنا ہے کر لیں! اللہ کے رسول ﷺ نے تکبیر کہی اور آپ کے ساتھ تمام مسلمانوں نے بھی تکبیر کہی اور آپ ﷺ نے فرمایا: ہم یہود کے ساتھ جنگ کریں گے۔(سیرت ابن کثیر: 3/143)

ب: محاصرہ اور جلاوطنی:

دس روز گزرنے کے باوجود وہ اپنے علاقہ سے نہیں نکلے، اس لئے مسلم افواج ان کی جانب نکل پڑیں اور انہوں نے پندرہ دنوں تک ان کا محاصرہ کیا، آپ ﷺ نے ان کے کھجور کے باغات میں آگ لگانے کا حکم دے دیا اور اس طرح کا فیصلہ اس لئے فرمایا تاکہ وہ اپنے مال اور فصلوں کے بارے میں ناامید ہو جائیں، ان درختوں کے ذریعہ وہ سپر اور ڈھال کا کام لیتے تھے جس کی وجہ سے ان کا جنگی جوش کمزور پڑ گیا، وہ گھبرا گئے اور چیخنے چلانے لگے: اے محمدؐ! آپ تو فساد سے روکتے تھے اور فساد برپا کرنے والے پر تنقید کرتے تھے تو کھجور کے باغ کو کاٹنا اور اس کو خراب کرنا یہ سب کیا ہے؟!

اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا اور بنو نضیر کو اس بات کا ادراک ہو گیا کہ جلاوطنی سے بچنے کا اب کوئی امکان نہیں ہے، ان کے دلوں میں ناامیدی چھا گئی، خاص طور پر جبکہ ابن اُبی نے بھی ان کے ساتھ وعدہ خلافی کی اور ان کے بھائی بند بھی ان کی مدد کرنے یا ان کو بچانے سے عاجز ہو گئے، اس لئے انہوں نے نبی کریم ﷺ کے پاس پیغام بھیجوایا کہ ان کو اتنی مہلت دے دیں جتنی دیر میں وہ اپنے گھروں سے نکل جائیں، نبی کریم ﷺ نے ان کی اس بات کو مان لیا اور ان سے فرمایا: یہاں سے نکل جاؤ تمہیں تمہاری جانوں کی امان دی جاتی ہے اور اونٹ ہتھیاروں کے علاوہ جتنا ساز و سامان اٹھا سکتے ہیں وہ بھی لے سکتے ہو۔

وہ اس پر راضی ہو گئے اور ہتھیار ڈال دیئے، وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے گھروں کی چھتیں، ستون اور دیواریں اجاڑ رہے تھے تاکہ مسلمان ان سے فائدہ نہ اٹھا پائیں۔

وہ اپنے ساتھ سونے اور چاندی کی اچھی خاصی مقدار لے گئے یہاں تک کہ صرف سلّام بن اَبی الحقیق نے اتنا سونا اور چاندی لیا جتنا بیل کی کھال میں آسکتا تھا اور وہ کہتا تھا: یہ وہ مال ہے جو ہم نے زمین کو اوپر نیچے کر دینے کے لئے تیار کیا ہے اور اگر ہم نے کھجور کے باغ چھوڑ دیئے ہیں تو خیبر میں بھی کھجور کے باغات ہیں۔(السیرۃ الحلبیہ: 2/566)

انہوں نے اپنا ساز و سامان چھ سو اونٹوں پر لادا، وہ اس حال میں نکلے کہ ان کے ساتھ دف، موسیقی اور گانے بجانے والی عورتیں تھیں جو ان کے قافلہ کے پیچھے گانے بجانے کا کام کر رہی تھیں تا کہ وہ مسلمانوں کو یہ احساس دلائیں کہ وہ غمگین نہیں ہیں اور مسلمان ان کو دیکھ کر خوش نہ ہوں، ان میں سے بعض نے خیبر کا رخ کیا جبکہ بعض شامی علاقوں میں چلے گئے۔

مدینہ سے ان کے نکالنے کی ذمہ داری محمد بن مسلمہؓ نے رسول اللہ ﷺ کے حکم سے انجام دی۔(دیکھیں: السیرۃ الحلبیہ: 2/565، حدیث القرآن الکریم: 1/257)

خیبر کی جانب جانے والے ان کے اکابر میں سلّام بن اَبی الحقیق، حیی بن اَخطب اور کنانہ بن ربیعہ بن اَبی الحقیق شامل تھے۔ جب وہ وہاں پہنچے تو وہاں کے باشندوں نے ان کی ماتحتی قبول کر لی۔(سیرت ابن ہشام: 3/212)

۳: اس غزوہ سے متعلق اسباق و دروس اور عبرتیں

قرآن کریم نے غزوۂ بنی نضیر کا ایک مکمل سورت میں ذکر کیا ہے اور وہ سورت ہے سورۃ الحشر، حبر الامۃ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے سورۃ الحشر کا نام سورۂ بنی نضیر بیان کیا ہے، صحیح بخاری میں سعید بن جبیرؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے ابن عباسؓ سے کہا: سورۃ الحشر؛ انہوں نے کہا: سورۂ بنی نضیر کہو۔(صحیح بخاری: 4029)

اس سورت نے اس غزوہ سے متعلق تمام امور و مسائل کو بیان کیا ہے، اس کے بارے میں تفصیلات اور فیئ اور مالِ غنیمت کے احکام بیان کئے ہیں، اسی طرح یہود کے بارے میں منافقین کے موقف پر سے پردہ اٹھایا ہے، اسی طرح یہود کی نفسیات کے بارے میں حقائق بیان کئے ہیں اور منافقین اور یہود کے باہمی تعلقات کے بارے میں مثالیں دی ہیں، اس غزوہ کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو بھی مخاطب بنایا ہے اور ان کو تقویٰ اختیار کرنے کی تلقین کی ہے اور معصیت و نافرمانی کے بارے میں ان کو ڈرایا ہے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے بارے میں اور اس کے مقام بلند کے بارے میں گفتگو کی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی بعض صفات جلیلہ کا بھی ذکر کیا ہے، اس طرح سے مختلف واقعات کے ذریعہ مسلم معاشرہ کی تربیت کی جاتی ہے، توحید، نظامِ الٰہی کی تعظیم اور یومِ آخرت کی تیاری جیسے تصورات اذہان و قلوب میں راسخ کئے جاتے ہیں، اس سورت پر غور و فکر کے ذریعہ بعض دروس و اسباق مستنبط کئے جا سکتے ہیں جن میں سے اہم ترین مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ اس سورت کا آغاز اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا سے ہوتا ہے اور بیان کیا گیا ہے کہ کائنات اور اس کی تمام مخلوقات بشمول انسان، حیوان، نباتات اور جمادات اللہ کی تنزیہ و تمجید بیان کرتے ہیں اور اس کی وحدانیت و قدرت اور ان کی عظمت کی گواہی دیتی ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿سَبَّحَ

لِلَّهِ مَا فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَا فِي ٱلۡأَرۡضِۖ وَهُوَ ٱلۡعَزِيزُ ٱلۡحَكِيمُ﴾ ترجمہ: ”اللہ ہی کی تسبیح کی ہے ہر اُس چیز نے جو آسمانوں اور زمین میں ہے، اور وہی غالب اور حکیم ہے“۔(سورۃ الحشر: 1)

۲- رعب؛ اللہ کے لشکروں میں سے ایک لشکر:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿هُوَ ٱلَّذِيٓ أَخۡرَجَ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ مِنۡ أَهۡلِ ٱلۡكِتَٰبِ مِن دِيَٰرِهِمۡ لِأَوَّلِ ٱلۡحَشۡرِۚ مَا ظَنَنتُمۡ أَن يَخۡرُجُواْۖ وَظَنُّوٓاْ أَنَّهُم مَّانِعَتُهُمۡ حُصُونُهُم مِّنَ ٱللَّهِ فَأَتَىٰهُمُ ٱللَّهُ مِنۡ حَيۡثُ لَمۡ يَحۡتَسِبُواْۖ وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ ٱلرُّعۡبَۚ يُخۡرِبُونَ بُيُوتَهُم بِأَيۡدِيهِمۡ وَأَيۡدِي ٱلۡمُؤۡمِنِينَ فَٱعۡتَبِرُواْ يَٰٓأُوْلِي ٱلۡأَبۡصَٰرِ ٢ وَلَوۡلَآ أَن كَتَبَ ٱللَّهُ عَلَيۡهِمُ ٱلۡجَلَآءَ لَعَذَّبَهُمۡ فِي ٱلدُّنۡيَاۖ وَلَهُمۡ فِي ٱلۡأٓخِرَةِ عَذَابُ ٱلنَّارِ ٣ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمۡ شَآقُّواْ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥۖ وَمَن يُشَآقِّ ٱللَّهَ فَإِنَّ ٱللَّهَ شَدِيدُ ٱلۡعِقَابِ ٤﴾ ترجمہ: ”وہی ہے جس نے اہلِ کتاب کافروں کو پہلے ہی حملے میں اُن کے گھروں سے نکال باہر کیا تمہیں ہر گز یہ گمان نہ تھا کہ وہ نکل جائیں گے، ان کا گمان بھی یہ تھا کہ ان کے قلعے انہیں اللہ کی پکڑ سے بچالیں گے، مگر اللہ ایسے رخ سے اُن پر آیا جدھر اُن کا خیال بھی نہ گیا تھا، اُس نے اُن کے دلوں میں رعب ڈال دیا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے بھی اپنے گھروں کو برباد کر رہے تھے اور مومنوں کے ہاتھوں بھی برباد کروا رہے تھے، پس عبرت حاصل کرو، اے دیدہ بینا رکھنے والو!۔ اگر اللہ نے اُن کے حق میں جلاوطنی نہ لکھ دی ہوتی تو دنیا ہی میں وہ انہیں عذاب دے ڈالتا اور آخرت میں تو ان کے لئے دوزخ کا عذاب ہے ہی۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کا مقابلہ کیا، اور جو بھی اللہ کا مقابلہ کرے اللہ اس کو سزا دینے میں بہت سخت ہے“۔(سورۃ الحشر: 2-4)

ان آیات پر غور و فکر کرنے والے کے سامنے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ ہی کی ذات نے بنو نضیر کے یہود کو ان کے علاقہ سے شام کی طرف نکالا، حالانکہ تمام مادی اسباب ان کے پاس تھے اور وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ کوئی ان کو ان کے مضبوط و مستحکم قلعوں سے نہیں نکال سکتا ہے، لیکن ان تمام مادی اسباب کے باوصف ایسی جگہ سے ہزیمت و شکست کا منہ دیکھنا پڑا جو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا اور وہ ان کے دل ہیں جن میں رعب اور خوف کی کیفیت پیدا ہو گئی، اس لئے ہر انسان کو اس غزوہ سے عبرت حاصل کرنی چاہیے اور سمجھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہی تمام امور میں تصرف کرنے والا ہے اور اس کی عظیم قدرت کے سامنے تمام مادی اسباب ڈھیر ہو جاتے ہیں۔

اس غزوہ میں ہر دور کی امت کے لئے یہ سبق موجود ہے کہ فتح و نصرت کا راستہ انتہائی قریب ہے اور وہ راستہ ہے اللہ پر اعتماد، اس کی طرف رجوع، اس کی شریعت کے سامنے سر تسلیم خم کرنا اور اللہ کی ذات کے بارے میں صحیح معرفت اور اس کی قدر، جب اہلِ ایمان اس معیار پر فائز ہوں گے تو اللہ ان کی نصرت و مدد کرے گا، اگرچہ ان کا دشمن کتنا ہی طاقتور اور زیادہ تعداد والا ہو گا، اس لئے اللہ تعالیٰ کو کوئی بھی چیز بے بس نہیں کر سکتی ہے اور اس کی عملی دلیل بنو نضیر کی جلاوطنی ہے۔

۳- دشمنوں کے مال و جائیداد کی تباہی:

جب اللہ کے رسول ﷺ اپنے لشکر کے ساتھ بنی نضیر کے علاقے میں پہنچے اور آپؐ نے ان کا محاصرہ کیا تو بنو نضیر کے لوگ اپنے قلعوں میں قلعہ بند ہو گئے، اللہ کے رسول ﷺ نے کھجور کے درخت کاٹنے اور ان میں آگ لگانے کا حکم دیا، وہ پکارنے لگے: اے محمد! آپ تو فساد سے

روکتے تھے اور فساد برپا کرنے والے پر تنقید کرتے تھے تو کھجور کے باغ کو کاٹنا اور اس کو خراب کرنا یہ سب کیا ہے؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل کیں: ﴿مَا قَطَعْتُم مِّن لِّينَةٍ أَوْ تَرَكْتُمُوهَا قَآئِمَةً عَلَىٰٓ أُصُولِهَا فَبِإِذْنِ ٱللَّهِ وَلِيُخْزِىَ ٱلْفَٰسِقِينَ﴾ ترجمہ: ''تم لوگوں نے کھجوروں کے جو درخت کاٹے یا جن کو اپنی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا، یہ سب اللہ ہی کے اذن سے تھا اور (اللہ نے یہ اذن اس لئے دیا) تاکہ فاسقوں کو ذلیل وخوار کرے''۔(سورۃ الحشر:5، تفسیر طبری: 28/34)

شیخ محمد ابو زہرہؒ نے اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے کافی تفصیل بیان کی ہے، فقہاء کی آراء نقل کرنے کے بعد انہوں نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

جنگ میں تعمیرات کو منہدم کرنے، آگ لگانے اور تخریب کے سلسلہ میں ہم جس نتیجہ پر پہنچے ہیں وہ یہ کہ مصادرِ شریعت سے اور جنگ میں نبی کریم ﷺ کے طرزِ عمل سے یہ اخذ ہوتا ہے:

۱: اصل یہ ہے کہ درختوں کو نہ کاٹا جائے اور تعمیرات کو منہدم نہ کیا جائے، اس لئے کہ جنگ کا مقصد رعایہ کو اذیت پہنچانا نہیں ہے بلکہ جنگ کا مقصد ظالم قائد ورہنما کی ایذاء کو دور کرنا ہے اور اس سلسلہ میں متعدد روایات موجود ہیں۔

۲: جب یہ واضح ہو جائے کہ درختوں کو کاٹنا اور تعمیرات منہدم کرنا جنگی ضرورت اور تقاضا ہے جس کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے، جیسے کہ دشمن ان کے پیچھے چھپ کر پناہ لیتا ہو اور مسلمانوں کو ایذا رسانی کا انہیں ذریعہ بناتا ہو تو اس صورت میں ان درختوں کو کاٹے بغیر اور تعمیرات کو منہدم کئے بغیر کوئی دوسری صورت نہیں ہے، اس لئے کہ یہ جنگ کی ایک اہم ضرورت اور تقاضا ہے، جیسے کہ نبی کریم ﷺ نے یہاں پر اور ثقیف کے قلعہ میں کیا۔

۳: جن فقہاء کے کلام میں اس کی اجازت دی گئی ہے ضروری ہے کہ ان کے کلام کو اسی ضرورت پر محمول کیا جائے، نہ کہ یہ سمجھا جائے کہ ان کے کلام کو دشمن کی ایذاء رسانی اور مجرد فساد و تخریب پر محمول کیا جائے، اس لئے کہ اصل دشمن قوم نہیں بلکہ اصل دشمن وہ لوگ ہیں جو لڑنے کے لئے ہتھیار اٹھاتے ہیں۔(دیکھیں: خاتم النبیین، شیخ ابو زہرہ: 2/265)

۴: اسلامی ریاست کے مالی امور کی تنظیم وترتیب:

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس مال کا حکم بیان کیا ہے جو مسلمانوں نے بنی نضیر کو جلاوطن کرنے کے بعد ان سے حاصل کیا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَآ أَفَآءَ ٱللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِۦ مِنْهُمْ فَمَآ أَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَلَا رِكَابٍ وَلَٰكِنَّ ٱللَّهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهُۥ عَلَىٰ مَن يَشَآءُ ۚ وَٱللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ قَدِيرٌ﴾ ترجمہ: ''اور جو مال اللہ نے اُن کے قبضہ سے نکال کر اپنے رسول کی طرف پلٹا دیئے، وہ ایسے مال نہیں ہیں جن پر تم نے اپنے گھوڑے اور اونٹ دوڑائے ہوں، بلکہ اللہ اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے تسلط عطا فرما دیتا ہے، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے''۔(سورۃ الحشر:6)

اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ مسلمانوں کو جو مال بنی نضیر کی طرف سے حاصل ہوا وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فضل ہے جو ان کو بغیر قتال کئے ہوئے حاصل ہوا، اس لئے کہ مسلمان صرف دشمن کی طرف چل کر گئے، نہ وہ گھوڑوں پر سوار ہوئے، نہ اونٹوں پر، اور رسول اللہ ﷺ نے علاقہ کو صلح کے ذریعہ فتح کیا، وہاں کے یہود کو جلا وطن کر دیا اور ان کا مال حاصل کر کے ان کو وہاں صرف کیا جہاں اللہ نے حکم دیا تھا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے عام کفار کے علاقوں سے حاصل ہونے والے فئی (مالِ غنیمت) کے احکام بیان کئے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿مَّآ أَفَآءَ ٱللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِۦ مِنۡ أَهۡلِ ٱلۡقُرَىٰ فَلِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِى ٱلۡقُرۡبَىٰ وَٱلۡيَتَـٰمَىٰ وَٱلۡمَسَـٰكِينِ وَٱبۡنِ ٱلسَّبِيلِ﴾ ترجمہ: ''جو کچھ بھی اللہ ان بستیوں کے لوگوں سے اپنے رسول کی طرف پلٹادے وہ اللہ اور رسول اور رشتہ داروں اور یتامیٰ اور مساکین اور مسافروں کے لئے ہے''۔ (سورۃ الحشر: 7)

اس لئے بنی نضیر سے حاصل ہونے والا مالِ غنیمت خالص رسول اللہ ﷺ کا حق تھا، لہذا آپؐ نے اس میں جیسے چاہا تصرف کیا، اور اس کو مسلمانوں کے مصالح اور خیر کے کاموں میں صرف کیا، جب اللہ کے رسولؐ کو بنی نضیر کی طرف سے مالِ غنیمت حاصل ہوا تو آپؐ نے حضرت ثابت بن قیسؓ کو بلایا اور فرمایا: اپنی قوم کو میرے پاس بلا کر لاؤ۔ ثابتؓ نے دریافت کیا: خزرج کو؟ آپؐ نے فرمایا: تمام انصار کو۔ لہذا انہوں نے اوس اور خزرج سب کو بلایا۔ آپؐ نے اللہ کے شایانِ شان اس کی حمد و ثنا بیان کی، اس کے بعد انصار کا ذکر کیا اور مہاجرین کے ساتھ ان کے حسنِ سلوک کا، ان کو اپنے گھروں میں ٹھہرانے کا اور اپنے مقابلہ میں ان کو ترجیح دینے کا ذکر کیا، اس کے بعد فرمایا: اگر آپ چاہو تو میں بنی نضیر کی طرف سے ملنے والے مالِ غنیمت کو تمہارے درمیان اور مہاجرین کے درمیان تقسیم کروں اور مہاجرین تمہارے گھروں اور زمین پر ویسے ہی برقرار رہیں گے جیسے کہ وہ ہیں، اور اگر تم چاہو تو میں ان کو یہ مالِ غنیمت دے دوں اور وہ تمہارے گھروں سے دستبردار ہو جائیں۔ (الاکلیل للحاکم کمافی فتح الباری: 7/422)

حضرت سعد بن عبادہؓ اور حضرت سعد بن معاذؓ نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ، نہیں! آپ مہاجرین کے درمیان تقسیم فرمائیں اور وہ ہمارے گھروں میں ویسے ہی رہیں گے جیسے رہ رہے ہیں۔ تمام انصار نے کہا: ہم اس پر راضی ہیں اور ہم تسلیم کرتے ہیں، اے اللہ کے رسولؐ!

آپ ﷺ نے مال فئی مہاجرین کے مابین تقسیم کر دیا اور انصار میں سے کسی کو کچھ نہیں دیا، سوائے ابو دجانہؓ اور سہل بن حنیفؓ کے، اس لئے کہ وہ دونوں ضرورت مند تھے۔ (سیرت ابن ہشام: 3/201، شرح الزرقانی علی المواہب اللدنیۃ: 2/86)

حالانکہ آپ ﷺ جانتے تھے کہ فئی آپ ﷺ کا خصوصی حق ہے، لیکن آپؐ نے اس کے باوجود انصار کو جمع کیا اور ان سے مال کی تقسیم کے بارے میں مشورہ لیا تاکہ ان کی دلجوئی ہو، یہ مختلف امور کی انجام دہی میں نبوی طرزِ عمل تھا۔

اس تقسیم کے ذریعہ ایک مقصد یہ بھی تھا کہ انصار کے بوجھ کو ہلکا کیا جائے، اس طرح سے مہاجرین بنی نضیر کے گھروں میں داخل ہوئے اور انصار کے گھر اصل مالکوں کے حوالے کر دیئے گئے، بعض مہاجرین اس کے ذریعہ مستغنی اور بے نیاز ہو گئے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ آزمائشی مرحلہ اب ختم ہونا شروع ہو گیا۔

بنی نضیر کی طرف سے حاصل ہونے والے مال کی تقسیم کے ذریعہ اسلامی ریاست کی مالی صورتحال میں ایک جدید تبدیلی رونما ہوئی، چنانچہ اس غزوہ سے پہلے جنگ میں حاصل ہونے والا مالِ غنیمت شرکائے جہاد میں تقسیم کیا جاتا تھا، پہلے اسلامی ریاست اس کا پانچواں حصہ (خمس) لے کر قرآن کریم کے ذریعہ متعین کردہ مدوں میں صرف کرتی تھی اور بقیہ حصہ شرکائے جہاد میں تقسیم کیا جاتا تھا، لیکن غزوۂ بنی نضیر کے بعد غنائم سے متعلق نئی احکام سازی ہوئی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ نئی احکام سازی کے مطابق مالِ غنیمت کی دو قسمیں ہو گئیں:

۱: وہ مالِ غنیمت جو مجاہدین کو بزورِ شمشیر حاصل ہوا ہو، اس مالِ غنیمت میں سے ریاست پانچواں حصہ (خمس) نکال کر بقیہ کو مجاہدین کے مابین تقسیم کرے گی اور پانچویں حصے کو مخصوص مصارف میں صرف کرے گی۔

۲: وہ مالِ غنیمت جو مجاہدین کو قتال کے بغیر ہی حاصل ہوا ہو، اس طرح کے مالِ غنیمت میں اسلامی ریاست کے قائد و امیر کو تصرف کا حق ہو گا جہاں مصلحت کا تقاضا ہو گا وہاں اس کو خرچ کیا جائے گا۔ (دیکھیں: فتح الباری: 4030، الرحیق المختوم، قراءۃ سیاسیۃ للسیرۃ النبویۃ، محمد قلعجی، ص:169)

۵: مہاجرین وانصار اور تابعین کے فضائل:

مہاجرین کی فضیلت:

سورۂ حشر کی آیات میں دیگر اہلِ ایمان کے مقابلہ میں مہاجرین کی فضیلت بیان کی گئی ہے، ان کا پہلا درجہ ہے، آیات میں ان کے اوصافِ جمیلہ کا ذکر کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی صداقت کی گواہی دی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لِلْفُقَرَآءِ ٱلْمُهَٰجِرِينَ ٱلَّذِينَ أُخْرِجُوا۟ مِن دِيَٰرِهِمْ وَأَمْوَٰلِهِمْ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ ٱللَّهِ وَرِضْوَٰنًا وَيَنصُرُونَ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥٓ ۚ أُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلصَّٰدِقُونَ﴾ ترجمہ: "(نیز وہ مال) اُن غریب مہاجرین کے لئے ہے جو اپنے گھروں اور جائدادوں سے نکال باہر کئے گئے ہیں، یہ لوگ اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی چاہتے ہیں اور اللہ اور اُس کے رسول ؐ کی حمایت پر کمربستہ رہتے ہیں، یہی راستباز لوگ ہیں"۔ (سورۃ الحشر: 8)

انصار کی فضیلت:

سورۂ حشر کی آیات میں انصار کی بھی فضیلت بیان کی گئی ہے، اللہ تعالیٰ نے ان صفات کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَٱلَّذِينَ تَبَوَّءُو ٱلدَّارَ وَٱلْإِيمَٰنَ مِن قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِى صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ أُوتُوا۟ وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِۦ فَأُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْمُفْلِحُونَ﴾ ترجمہ: "(اور وہ اُن لوگوں کے لئے بھی ہے) جو اِن مہاجرین کی آمد سے پہلے ہی ایمان لا کر دارالہجرۃ میں مقیم تھے، یہ اُن لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے اِن کے پاس آئے ہیں اور جو کچھ بھی اُن کو دے دیا جائے اُس کی کوئی حاجت تک یہ اپنے دلوں میں محسوس نہیں کرتے اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں، حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے دل کی تنگی سے بچا لئے گئے وہی فلاح پانے والے ہیں"۔ (سورۃ الحشر: 9)

تابعین کی فضیلت:

تابعین سے مراد وہ اہل ایمان ہیں جو انصار و مہاجرین کے نقشِ قدم پر چلتے رہے، ان کے اوصافِ جمیلہ کو اختیار کرتے رہے اور اپنے سے پہلے اہلِ ایمان کے لئے تنہائی میں اور علانیہ دعا کرتے رہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَٱلَّذِينَ جَآءُو مِنۢ بَعۡدِهِمۡ يَقُولُونَ رَبَّنَا ٱغۡفِرۡ لَنَا وَلِإِخۡوَٰنِنَا ٱلَّذِينَ سَبَقُونَا بِٱلۡإِيمَٰنِ وَلَا تَجۡعَلۡ فِي قُلُوبِنَا غِلّٗا لِّلَّذِينَ ءَامَنُواْ رَبَّنَآ إِنَّكَ رَءُوفٞ رَّحِيمٌ﴾ ترجمہ: ”(اور وہ اُن لوگوں کے لئے بھی ہے) جو اِن اگلوں کے بعد آئے ہیں، جو کہتے ہیں کہ: اے ہمارے رب، ہمیں اور ہمارے اُن سب بھائیوں کو بخش دے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں اور ہمارے دلوں میں اہلِ ایمان کے لئے کوئی بغض نہ رکھ، اے ہمارے رب، تو بڑا مہربان اور رحیم ہے“۔(سورۃ الحشر:10)

اس طرح سے اس سورت میں مہاجرین وانصار اور تابعین کے کردار اور تصویر کو اچھوتے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

۶: مدینہ کے منافقین کا موقف:

سورۃ الحشر کی آیات میں منافقین کی صورتحال کو بھی واضح کیا گیا ہے، ان کے موقف کو اور یہود کے ساتھ ان کی دوستی کو بیان کیا گیا ہے اور مسلمانوں کے تئیں ان کے موقف اور طرزِ عمل سے بھی پردہ اٹھایا گیا ہے اور یہود کی صورتحال اور ان کی نفسیات کو بھی بیان کیا گیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿أَلَمۡ تَرَ إِلَى ٱلَّذِينَ نَافَقُواْ يَقُولُونَ لِإِخۡوَٰنِهِمُ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ مِنۡ أَهۡلِ ٱلۡكِتَٰبِ لَئِنۡ أُخۡرِجۡتُمۡ لَنَخۡرُجَنَّ مَعَكُمۡ وَلَا نُطِيعُ فِيكُمۡ أَحَدًا أَبَدٗا وَإِن قُوتِلۡتُمۡ لَنَنصُرَنَّكُمۡ وَٱللَّهُ يَشۡهَدُ إِنَّهُمۡ لَكَٰذِبُونَ ۝١١ لَئِنۡ أُخۡرِجُواْ لَا يَخۡرُجُونَ مَعَهُمۡ وَلَئِن قُوتِلُواْ لَا يَنصُرُونَهُمۡ وَلَئِن نَّصَرُوهُمۡ لَيُوَلُّنَّ ٱلۡأَدۡبَٰرَ ثُمَّ لَا يُنصَرُونَ ۝١٢ لَأَنتُمۡ أَشَدُّ رَهۡبَةٗ فِي صُدُورِهِم مِّنَ ٱللَّهِۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمۡ قَوۡمٞ لَّا يَفۡقَهُونَ ۝١٣ لَا يُقَٰتِلُونَكُمۡ جَمِيعًا إِلَّا فِي قُرٗى مُّحَصَّنَةٍ أَوۡ مِن وَرَآءِ جُدُرِۭۚ بَأۡسُهُم بَيۡنَهُمۡ شَدِيدٞۚ تَحۡسَبُهُمۡ جَمِيعٗا وَقُلُوبُهُمۡ شَتَّىٰۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمۡ قَوۡمٞ لَّا يَعۡقِلُونَ ۝١٤ كَمَثَلِ ٱلَّذِينَ مِن قَبۡلِهِمۡ قَرِيبٗاۖ ذَاقُواْ وَبَالَ أَمۡرِهِمۡ وَلَهُمۡ عَذَابٌ أَلِيمٞ ۝١٥ كَمَثَلِ ٱلشَّيۡطَٰنِ إِذۡ قَالَ لِلۡإِنسَٰنِ ٱكۡفُرۡ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ إِنِّي بَرِيٓءٞ مِّنكَ إِنِّيٓ أَخَافُ ٱللَّهَ رَبَّ ٱلۡعَٰلَمِينَ ۝١٦ فَكَانَ عَٰقِبَتَهُمَآ أَنَّهُمَا فِي ٱلنَّارِ خَٰلِدَيۡنِ فِيهَاۚ وَذَٰلِكَ جَزَٰٓؤُاْ ٱلظَّٰلِمِينَ ۝١٧﴾ ترجمہ: ”کیا آپ نے منافقوں کو نہیں دیکھا جو اپنے اہلِ کتاب کے کافر بھائیوں سے کہتے ہیں کہ اگر تم نکالے گئے تو ضرور ہم بھی تمہارے ساتھ نکلیں گے اور تمہارے معاملہ میں کبھی کسی کی بات نہ مانیں گے، اور اگر تم سے لڑائی ہوگی تو ہم تمہاری مدد کریں گے، اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ سراسر جھوٹے ہیں۔ اگر وہ نکالے گئے تو یہ ان کے ساتھ نہ نکلیں گے، اور اگر ان سے لڑائی ہوئی تو یہ ان کی مدد بھی نہ کریں گے، اور اگر ان کی مدد کریں گے تو پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے، پھر ان کو مدد نہ دی جائے گی۔ البتہ تمہارا خوف ان کے دلوں میں اللہ (کے خوف) سے زیادہ ہے، یہ اس لئے کہ وہ لوگ سمجھتے نہیں۔ وہ تم سے سب مل کر بھی نہیں لڑ سکتے مگر محفوظ بستیوں میں یا دیواروں کی آڑ میں، ان کی لڑائی تو آپس میں سخت ہے، آپ ان کو متفق سمجھتے ہیں حالانکہ ان کے دل الگ الگ ہیں، یہ

اس لئے کہ وہ لوگ عقل نہیں رکھتے۔ ان کا حال تو پہلوں جیسا ہے کہ جنہوں نے ابھی اپنے کام کی سزا پائی ہے، اور ان کے لئے (آخرت میں) دردناک عذاب ہے۔ (اور) مثال شیطان کی سی ہے کہ وہ آدمی سے کہتا ہے کہ تو منکر ہو جا، پھر جب وہ منکر ہو جاتا ہے تو کہتا ہے بے شک میں تم سے بَری ہوں کیونکہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں جو سارے جہاں کا رب ہے۔ پس ان دونوں کا انجام یہ ہوا ہے کہ وہ دونوں دوزخ میں ہوں گے، اس میں ہمیشہ رہیں گے، اور یہی ظالموں کی سزا ہے"۔ (سورۃ الحشر: 11-17)

۷: اہلِ ایمان کو تذکیر:

سورۃ الحشر میں اہلِ ایمان کو بھی نصیحت اور تذکیر کی گئی ہے، ان کو یومِ آخرت کی یاد دہانی کرائی گئی ہے اور اصحابِ جنت اور اصحابِ جہنم کے واضح فرق کو بیان کیا گیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱتَّقُواْ ٱللَّهَ وَلۡتَنظُرۡ نَفۡسٞ مَّا قَدَّمَتۡ لِغَدٖۖ وَٱتَّقُواْ ٱللَّهَۚ إِنَّ ٱللَّهَ خَبِيرُۢ بِمَا تَعۡمَلُونَ ﴿١٨﴾ وَلَا تَكُونُواْ كَٱلَّذِينَ نَسُواْ ٱللَّهَ فَأَنسَىٰهُمۡ أَنفُسَهُمۡۚ أُوْلَـٰٓئِكَ هُمُ ٱلۡفَـٰسِقُونَ ﴿١٩﴾ لَا يَسۡتَوِيٓ أَصۡحَـٰبُ ٱلنَّارِ وَأَصۡحَـٰبُ ٱلۡجَنَّةِۚ أَصۡحَـٰبُ ٱلۡجَنَّةِ هُمُ ٱلۡفَآئِزُونَ ﴿٢٠﴾﴾ ترجمہ: "اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور ہر شخص کو دیکھنا چاہیے کہ اس نے کل کے لئے کیا آگے بھیجا ہے، اور اللہ سے ڈرو، کیونکہ اللہ تمہارے کاموں سے خبردار ہے۔ اور ان کی طرح نہ ہوں جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا پھر اللہ نے بھی ان کو (ایسا کر دیا) کہ وہ اپنے آپ ہی کو بھول گئے، یہی لوگ نافرمان ہیں، دوزخی اور جنتی برابر نہیں ہو سکتے، جنتی ہی بامراد ہیں"۔ (سورۃ الحشر: 18-20)

یہ آیات کریمہ محاسبۂ نفس کے سلسلہ میں اصل بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں اور واضح کرتی ہیں کہ نفس کا جائزہ لیتے رہنا ضروری ہے۔

ایک طرف قرآن کریم ان عظیم فتوحات کا ذکر کرتا ہے جو بنی نضیر کے یہود کو جلاوطن کر کے مسلمانوں کو حاصل ہوئیں اور صحابہ کرام کو بھی اس کے ذریعہ اقتصادی اعتبار سے وسعت حاصل ہوئی اور ریاست کو بھی ایک نیا ذریعہ آمدنی مل گیا، لیکن ساتھ ہی ساتھ پہلو بہ پہلو قرآن کریم اس واقعہ کے ضمن میں عقائد کے مفاہیم اور اصول بھی بیان کرتا ہے، یومِ آخرت کی تذکیر اور اس کے لئے استعداد و تیاری کی تلقین کرتا ہے، اللہ -عزوجل- مسلم معاشرہ کے افراد کو ان چیزوں کا حکم دیتا ہے جن کا تقاضا ایمان کرتا ہے اور آخرت کو مقصود و مطلوب بنانے کا مطالبہ کرتا ہے اور ان کو غفلت اختیار کرنے والوں کے سے طرزِ عمل سے ڈراتا ہے اور واضح کرتا ہے کہ اہلِ جنت ہی کامیاب و کامران ہونے والے ہیں۔

۸: قرآنِ کریم کی عظمت وبلندی اور اللہ تعالیٰ کی بعض صفات جلیلہ:

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کی عظمت وبلندی کا ذکر کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی بعض عظیم صفات کا بھی ذکر کیا گیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لَوۡ أَنزَلۡنَا هَـٰذَا ٱلۡقُرۡءَانَ عَلَىٰ جَبَلٖ لَّرَأَيۡتَهُۥ خَـٰشِعٗا مُّتَصَدِّعٗا مِّنۡ خَشۡيَةِ ٱللَّهِۚ وَتِلۡكَ ٱلۡأَمۡثَـٰلُ نَضۡرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمۡ يَتَفَكَّرُونَ﴾ ترجمہ: "اگر ہم نے یہ قرآن کسی پہاڑ پر بھی اتار دیا ہوتا تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے دبا جا رہا ہے اور پھٹا پڑتا ہے، یہ مثالیں ہم لوگوں کے سامنے اس لئے بیان کرتے ہیں کہ وہ (اپنی حالت پر) غور کریں"۔ (سورۃ الحشر: 21)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے کہ اگر ہم پہاڑوں کو عقل دیتے جیسے کہ تم لوگوں کو عقل سے نوازا گیا ہے اور ہم پہاڑوں پر قرآن نازل کرتے تو پہاڑ بھی لرزہ براندام ہو جاتے اور اللہ کی خشیت کی وجہ سے ریزہ ریزہ ہو جاتے، یہ قرآن کی عظمت و بلندی کی بہترین تمثیل ہے۔ اس آیت میں انسان کو قرآن کریم کی تلاوت کے وقت اس کی قساوتِ قلبی اور قلتِ خوف پر سرزنش کی گئی ہے حالانکہ اس کی وجہ سے مضبوط و مستحکم پہاڑ لرز جاتے ہیں لیکن انسان پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا ہے۔ (دیکھیں: تفسیر المراغی: 28/57، تفسیر السعدی: 7/344)

سورۃ الحشر کے اختتام پر اللہ تعالیٰ کے بعض اسمائے حسنیٰ کا اور اس کی عظیم صفات کا ذکر کیا گیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ هُوَ ٱللَّهُ ٱلَّذِى لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ عَٰلِمُ ٱلْغَيْبِ وَٱلشَّهَٰدَةِ ۖ هُوَ ٱلرَّحْمَٰنُ ٱلرَّحِيمُ ﴿٢٢﴾ هُوَ ٱللَّهُ ٱلَّذِى لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ٱلْمَلِكُ ٱلْقُدُّوسُ ٱلسَّلَٰمُ ٱلْمُؤْمِنُ ٱلْمُهَيْمِنُ ٱلْعَزِيزُ ٱلْجَبَّارُ ٱلْمُتَكَبِّرُ ۚ سُبْحَٰنَ ٱللَّهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿٢٣﴾ هُوَ ٱللَّهُ ٱلْخَٰلِقُ ٱلْبَارِئُ ٱلْمُصَوِّرُ ۖ لَهُ ٱلْأَسْمَآءُ ٱلْحُسْنَىٰ ۚ يُسَبِّحُ لَهُۥ مَا فِى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ ۖ وَهُوَ ٱلْعَزِيزُ ٱلْحَكِيمُ ﴿٢٤﴾﴾ ترجمہ: "وہی اللہ ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، سب چھپی اور کھلی باتوں کا جاننے والا ہے، وہ بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ وہی اللہ ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ بادشاہ، پاک ذات، سلامتی والا، امن دینے والا، نگہبان، غالب، زبردست، بڑی عظمت والا ہے، اللہ پاک ہے اس سے جو اس کے شریک ٹھہراتے ہیں۔ وہی اللہ ہے پیدا کرنے والا، ٹھیک ٹھیک بنانے والا، صورت دینے والا، اس کے اچھے اچھے نام ہیں، سب چیزیں اسی کی تسبیح کرتی ہیں جو آسمانوں میں اور زمین میں ہیں، اور وہی زبردست حکمت والا ہے"۔ (سورۃ الحشر: 22-24)

اس طرح سے اس سورت کا اختتام اللہ تعالیٰ کی عظیم صفات کے ذریعہ کیا گیا ہے تاکہ مسلم معاشرہ کی تربیت اس طرح ہو کہ اس میں اللہ کی عبودیت و بندگی متحقق ہو اور اللہ کے اسمائے حسنیٰ کے ذریعہ اور اس کی عظیم صفات کے ذریعہ اللہ کی معرفت حاصل ہو اور واضح ہو جائے کہ اللہ کے علاوہ ہر معبود باطل ہے جو ذرہ برابر بھی عبادت کا مستحق نہیں ہو سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے مذکورہ اسماء خلق و تدبیر اور تقدیر سے متعلق ہیں جن میں اللہ کی ذات منفرد و تنہا ہے اور ان میں اللہ کا کوئی شریک و سہیم نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اور اس کی عظیم صفات توحید کی تینوں قسموں پر مشتمل ہیں: توحیدِ ربوبیت، توحیدِ الوہیت اور توحیدِ اسماء و صفات۔ اور صحابہ کرام کی تربیت اس طور پر ہوئی تھی کہ ان کو ان اسماء و صفات کی معرفت بھی حاصل تھی اور وہ ان کے تقاضوں کے مطابق عمل بھی کیا کرتے تھے، توحید کی یہ انواع ایمان کی اصل روح اور بنیاد ہیں اور یہی ایمان کی غایت بھی ہیں، ایک بندہ کو اللہ کے اسماء و صفات میں جس قدر معرفت نصیب ہو گی اسی اعتبار سے اس کے ایمان و یقین میں بھی اضافہ ہو گا، یہ علم صحابہ کرام کے دلوں میں راسخ ہو گیا تھا جس کی وجہ سے ان کے دلوں میں خشیت بھی پائی جاتی تھی اور اللہ کی حقیقی معرفت بھی ان کو نصیب تھی اور پھر وہ اس کے مطابق عمل بھی کرتے تھے۔ (دیکھیں: الوسطیۃ فی القرآن الکریم، الصلابی، ص: 228)

۹: شراب کی حرمت:

شراب کی حرمت کا حکم ہجرت نبوی کے چوتھے سال ماہ ربیع الاول میں بنی نضیر کے محاصرہ کے دوران نازل ہوا۔(حدیث القرآن الکریم عن غزوات الرسول ﷺ 253/1، تفسیر القرطبی: 18/10)

شراب کو حرام قرار دینے میں تدریج کا طریقہ اختیار کیا گیا، اسلامی قانون سازی کی تاریخ میں شراب کی حرمت کے سلسلہ میں مختلف مراحل ذکر کئے گئے ہیں یہاں تک کہ آخری اور فیصلہ کن حتمی آیات شراب کے بارے میں سورہ مائدہ میں نازل ہوئیں جن کے اختتام پریوں خطاب کیا گیا ہے: ﴿فَهَلۡ أَنتُم مُّنتَهُونَ﴾ ترجمہ: ''کیا تم ان چیزوں سے باز رہو گے ؟''۔(سورۃ المائدہ: 91)

یہ سن کر اہلِ ایمان نے پوری قوت اور عزمِ مصمم کے ساتھ کہا: اے رب! ہم رک گئے۔(دیکھیں: الخصائص العامۃ للاسلام، القرضاوی، ص:181)

شراب کے بارے میں سورۂ بقرۃ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يَسۡـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلۡخَمۡرِ وَٱلۡمَيۡسِرِۖ قُلۡ فِيهِمَآ إِثۡمٞ كَبِيرٞ وَمَنَٰفِعُ لِلنَّاسِ وَإِثۡمُهُمَآ أَكۡبَرُ مِن نَّفۡعِهِمَاۗ وَيَسۡـَٔلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَۖ قُلِ ٱلۡعَفۡوَۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ ٱللَّهُ لَكُمُ ٱلۡأٓيَٰتِ لَعَلَّكُمۡ تَتَفَكَّرُونَ﴾ ترجمہ: ''پوچھتے ہیں: شراب اور جوئے کا کیا حکم ہے ؟ کہو: ان دونوں چیزوں میں بڑی خرابی ہے اگرچہ ان میں لوگوں کے لئے کچھ منافع بھی ہیں، مگر ان کا گناہ اُن کے فائدے سے بہت زیادہ ہے، پوچھتے ہیں: ہم راہِ خدا میں کیا خرچ کریں؟ کہو: جو کچھ تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو، اس طرح اللہ تمہارے لئے صاف صاف احکام بیان کرتا ہے، شاید کہ تم دنیا اور آخرت دونوں کی فکر کرو''۔(سورۃ البقرۃ: 219)

اس آیت کے ضمن میں سید قطبؒ فرماتے ہیں:

''آیت زیرِ بحث تحریم کے سلسلہ کی پہلی کڑی ہے، یہ پہلا قدم ہے، یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی چیز یا فعل بذاتِ خود شر ہی شر ہو، ہو سکتا ہے کہ شر میں خیر کا بھی کوئی پہلو موجود ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ خیر اور بھلائی میں بھی شر کا پہلو ہو، لیکن جائز، حلال و حرام اور امر و نہی کا دار و مدار دراصل غالب خیر یا غالب شر کے لحاظ سے ہوتا ہے، جوئے اور شراب میں شر کا پہلو چونکہ غالب ہے اس لئے یہ ان چیزوں کی حرمت کے لئے علت بن جائے گا اگرچہ یہاں ان اشیاء کی حرمت کی صراحت نہیں کی گئی ہے۔

یہاں اسلامی نظامِ تربیت اور قرآنی منہجِ تعمیر اور ربانی طرزِ تعلیم کا ایک انداز کھل کر سامنے آتا ہے، یہ نہایت ہی حکیمانہ اندازِ تربیت ہے، اسلام کی اکثر ہدایات و فرائض اور قانون سازی میں تتبع اور استقراء سے معلوم ہو گا کہ بہت سے احکام و فرائض اور تعلیمات میں یہی منہج اختیار کیا گیا ہے، شراب اور جوئے کے بارے میں اس ہدایت کی مناسبت سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نظام تربیت کے ایک اصول کی طرف یہاں اشارہ کر دیں:

۱) اگر کسی امر و نہی کا تعلق کسی ایسے اصول سے ہو جس کا تعلق اسلام کے نظریات و عقائد سے ہو تو اسلام پہلی فرصت میں اس کا قطعی اور اٹل فیصلہ کر دیتا ہے۔

۲) اور اگر امر و نہی کا تعلق کسی ایسے معاملہ سے ہو جو بطورِ عادت معمول بہ ہو یا بطورِ رسم چلا آتا ہو تو اسلام اس کے بارے میں اصلاحی قدم اٹھانے سے پہلے انتظار کرتا ہے، تدریج، نرمی اور سہولت سے اس میں کوئی قدم اٹھاتا ہے اور اقدام سے پہلے ایسے حالات تیار کرتا ہے جن میں نفاذِ قانون اور نفاذِ حکم کے لئے راہ اچھی طرح ہموار ہو جاتی ہے۔

مثلاً مسئلہ توحید اور مسئلہ شرک کے بارے میں اسلام نے پہلی فرصت میں فیصلہ کن بات کر دی، عقائد شرکیہ پر فیصلہ کن حملہ کیا، بغیر کسی تردد کے، بغیر کسی جھجک کے، بغیر کسی رکھ رکھاؤ کے، بغیر کسی سودے بازی کے، بغیر 'کچھ لو اور کچھ دو' پالیسی کے، پہلے ہی مرحلہ میں ایسا وار کیا کہ شرک کا تانہ بانہ ادھیڑ کر رکھ دیا کیونکہ یہ مسئلہ اسلامی نظریۂ حیات کا اساسی مسئلہ تھا، اس کے بغیر ایمان مکمل ہو ہی نہیں سکتا تھا، اس کی صفائی کئے بغیر اپنی جگہ پر قائم ہی نہیں رہ سکتا تھا۔

اور جہاں تک تعلق ہے شراب اور جوئے کا تو یہ ایسے معاملات تھے جن کا تعلق عادت (custom) سے تھا، عادتِ بد ایک ایسی بیماری ہے جس کا علاج معالجہ ضروری ہے، اس لئے اس کے علاج کے لئے قرآن کریم نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ان چیزوں کے خلاف دینی شعور بیدار کیا گیا، مسلمانوں کے دماغ میں قانون سازی کرنے کے لئے وہ دلائل بٹھائے گئے جن کی وجہ سے ان چیزوں کو حرام قرار دیا جا سکتا ہے، مثلاً یہ کہ جوئے اور شراب میں جو نقصانات اور قباحتیں ہیں وہ ان فائدوں سے کہیں زیادہ ہیں جو ان میں ہیں، اس منطقی دلیل میں اسی طرف اشارہ تھا کہ ان چیزوں سے پرہیز کرنا زیادہ بہتر و مناسب ہے۔

اس کے بعد دوسرا اقدام سورۂ نساء کے ذریعہ کیا گیا، فرمایا گیا: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا تَقۡرَبُواْ ٱلصَّلَوٰةَ وَأَنتُمۡ سُكَـٰرَىٰ حَتَّىٰ تَعۡلَمُواْ مَا تَقُولُونَ﴾ ترجمہ: "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم نشے کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ، نماز اُس وقت پڑھنی چاہیے جب تم جانو کہ کیا کہہ رہے ہو"۔ (سورۃ النساء: 43)

اب نماز کے پانچ اوقات ہیں اور اکثر اوقات ایک دوسرے کے بہت ہی قریب ہیں، ان کے مابین اتنا وقت نہیں ہوتا کہ ایک شخص شراب پئے، نشہ کی حالت میں ہو اور پھر اسے افاقہ ہو جائے، یوں عملاً اس کے اوقات میں کمی کر دی گئی، یوں نشے کے مخصوص اوقات میں نفس میں جو اشتیاق پیدا ہوتا ہے اسے توڑ دیا گیا، یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ نشے کے عادی نشے کے اوقات میں طلب محسوس کرتے ہیں، یعنی جن اوقات میں وہ عام طور پر نشہ کرتے ہیں اگر کوشش کر کے کسی طرح وہ وقت گزار دیا جائے تو پھر نشہ کی حدّتِ طلب ختم ہو جاتی ہے اور اگر مسلسل اس طرح کیا جائے تو اس پر غلبہ پایا جا سکتا ہے، جب یہ دو مرحلے طے ہو گئے تو پھر آخری اور قطعی حکم نازل ہوا اور شراب اور جوئے کو قطعاً حرام قرار دیا گیا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّمَا يُرِيدُ ٱلشَّيۡطَـٰنُ أَن يُوقِعَ بَيۡنَكُمُ ٱلۡعَدَٰوَةَ وَٱلۡبَغۡضَآءَ فِى ٱلۡخَمۡرِ وَٱلۡمَيۡسِرِ وَيَصُدَّكُمۡ عَن ذِكۡرِ ٱللَّهِ وَعَنِ ٱلصَّلَوٰةِۖ فَهَلۡ أَنتُم مُّنتَهُونَ ۝٩١ وَأَطِيعُواْ ٱللَّهَ وَأَطِيعُواْ ٱلرَّسُولَ

وَٱحۡذَرُواْۚ فَإِن تَوَلَّيۡتُمۡ فَٱعۡلَمُوٓاْ أَنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا ٱلۡبَلَٰغُ ٱلۡمُبِينُ ﴿٩٢﴾ ترجمہ: ”شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ سے تمہارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے اور تمہیں خدا کی یاد سے اور نماز سے روک دے، پھر کیا تم ان چیزوں سے باز رہو گے؟ اللہ اور اُس کے رسول کی بات مانو اور باز آجاؤ، لیکن اگر تم نے حکم عدولی کی تو جان لو کہ ہمارے رسول پر بس صاف صاف حکم پہنچا دینے کی ذمہ داری تھی“۔(سورۃ المائدہ: 91-92 فی ظلال القرآن: 1/229)

۱۰: بُری چال کا وبال بُری چال چلنے والے پر:

رسول اللہ ﷺ کے خلاف اور اسلامی ریاست کے خلاف یہود کی چالبازیاں اور سازشیں انتہائی گھٹیا اور کمینہ پن پر مبنی تھیں، وہ ان چالبازیوں اور مکاریوں کے ذریعہ عزت وبلندی اور غلبہ چاہتے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو آڑے ہاتھ لے لیا، اور اپنے رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو ان کے مکر وفریب سے محفوظ رکھا، یہود کو ذلیل وخوار کر کے رکھ دیا، ان کی عزت خاک میں مل گئی، ان کے غلبہ کو زوال وپستی میں تبدیل کر دیا اور ان کے گھروں کو ویران کر کے ان کو بے گھر اور ملک بدر کر دیا، اس میں مسلمانوں کو کوئی مسلح ٹکراؤ یا خون ریز جنگ نہیں کرنی پڑی، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں خوف اور رعب ڈال دیا اور ان کو انتہائی ذلت ورسوائی کے ساتھ اپنی جانوں کی امان مانگنی پڑی اور اپنے پیچھے اپنا مال واسباب اور جائیداد چھوڑ دینی پڑی جس کو مسلمانوں نے آسان مالِ غنیمت کے طور پر حاصل کر لیا، اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے: ﴿هُوَ ٱلَّذِيٓ أَخۡرَجَ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ مِنۡ أَهۡلِ ٱلۡكِتَٰبِ مِن دِيَٰرِهِمۡ لِأَوَّلِ ٱلۡحَشۡرِۚ مَا ظَنَنتُمۡ أَن يَخۡرُجُواْۖ وَظَنُّوٓاْ أَنَّهُم مَّانِعَتُهُمۡ حُصُونُهُم مِّنَ ٱللَّهِ فَأَتَىٰهُمُ ٱللَّهُ مِنۡ حَيۡثُ لَمۡ يَحۡتَسِبُواْۖ وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ ٱلرُّعۡبَۚ يُخۡرِبُونَ بُيُوتَهُم بِأَيۡدِيهِمۡ وَأَيۡدِي ٱلۡمُؤۡمِنِينَ فَٱعۡتَبِرُواْ يَٰٓأُوْلِي ٱلۡأَبۡصَٰرِ﴾ ترجمہ: ”وہی ہے جس نے اہلِ کتاب کافروں کو پہلے ہی حملے میں اُن کے گھروں سے نکال باہر کیا، تمہیں ہرگز یہ گمان نہ تھا کہ وہ نکل جائیں گے اور وہ بھی یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ اُن کے قلعے انہیں اللہ سے بچالیں گی مگر اللہ ایسے رخ سے اُن پر آیا جدھر اُن کا خیال بھی نہ گیا تھا، اُس نے اُن کے دلوں میں رعب ڈال دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے بھی اپنے گھروں کو برباد کر رہے تھے اور مومنوں کے ہاتھوں بھی برباد کروا رہے تھے، پس عبرت حاصل کرو، اے دیدہ بینا رکھنے والو!۔(سورۃ الحشر: 2)

بُری چال اور گھٹیا مکر وفریب اور غداری کا یہی انجام ہوتا ہے، دیکھیے اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ سے عبرت حاصل کرنے کے لئے کس طرح اشارہ کیا ہے اور کس طرح اس وعید کی طرف توجہ دلائی ہے جس کا اعلان اللہ تعالیٰ نے ہر اس شخص کے لئے کیا ہے جو بھی حقیر چالبازی اور ظالمانہ عداوت ودشمنی کا راستہ اختیار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿فَٱعۡتَبِرُواْ يَٰٓأُوْلِي ٱلۡأَبۡصَٰرِ﴾ ترجمہ: ”پس عبرت حاصل کرو، اے دیدہ بینا رکھنے والو!“۔(سورۃ الحشر: 2)

اس آیت سے عبرت حاصل کرنے کے کئی پہلو ظاہر ہوتے ہیں:

۱) جو بھی حق کے مقابلہ میں حائل رہتا ہے اور لوگوں کو اس سے روکتا ہے اور داعیانِ حق کو دھتکارتا ہے، اس کو یقیناً شکست و ریخت کا سامنا کرنا پڑے گا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿قُل لِّلَّذِينَ كَفَرُواْ سَتُغْلَبُونَ وَتُحْشَرُونَ إِلَىٰ جَهَنَّمَ وَبِئْسَ ٱلْمِهَادُ﴾ ترجمہ: "پس اے محمد ﷺ! جن لوگوں نے تمہاری دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے، اُن سے کہہ دو کہ قریب ہے وہ وقت جب تم مغلوب ہو جاؤ گے اور جہنم کی طرف ہانکے جاؤ گے اور جہنم بڑا ہی برا ٹھکانا ہے"۔ (سورۃ آل عمران: 12)

۲) حق اور باطل کے درمیان کشمکش نہ ختم ہونے والا معاملہ ہے جو قیامت تک باقی رہے گی اور باطل کو بھی غلبہ اور عروج ملتا رہے گا اور حق کو بھی عروج و زوال کے مختلف مراحل سے گزرنا پڑے گا لیکن بالآخر انجام اہلِ حق ہی کے حق میں ہوگا۔

۳) عبرت حاصل کرنے کا اصل فائدہ اس وقت ہوگا جبکہ غداری اور خیانت جیسے اُن تمام افعال سے اجتناب کیا جائے جن کا ارتکاب یہود نے کیا تاکہ اُس بدانجامی کا شکار نہ ہونا پڑے جس کا شکار یہود کو ہونا پڑا۔ (دیکھیں: الصراع مع الیہود، اُبوفارس، ص: 179)

۱۱: دین میں کوئی جبر نہیں:

بنی نضیر میں بعض ایسے لوگ تھے جو انصار کے قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے اور یہود کے ساتھ رہنے کی وجہ سے ان کی تربیت میں رہتے ہوئے وہ بھی یہودی بن گئے تھے، اس لئے ان کے مسلمان خاندان والوں نے ان کو یہود کے ساتھ کوچ کرنے سے منع کیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل کیں: ﴿لَآ إِكْرَاهَ فِي ٱلدِّينِۖ قَد تَّبَيَّنَ ٱلرُّشْدُ مِنَ ٱلْغَيِّۚ فَمَن يَكْفُرْ بِٱلطَّٰغُوتِ وَيُؤْمِنۢ بِٱللَّهِ فَقَدِ ٱسْتَمْسَكَ بِٱلْعُرْوَةِ ٱلْوُثْقَىٰ لَا ٱنفِصَامَ لَهَاۗ وَٱللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾ ترجمہ: "دین کے معاملہ میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے، صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے، اب جو کوئی طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آیا، اُس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا، جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں، اور اللہ (جس کا سہارا اس نے لیا ہے) سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے"۔ (سورہ البقرہ: 256)

امام ابوداؤدؒ نے اپنی سنن میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں: بعض عورتیں ایسی ہوتی تھیں جن کی اولاد زندہ نہیں رہ پاتی تھی، اس لئے وہ یہ نذر مانتی تھیں کہ اگر اس کا بچہ زندہ رہے گا تو وہ اسے یہودی بنادے گی، اور جب بنی نضیر کو جلاوطن کیا گیا تو ان میں بعض انصار کے لوگ بھی تھے، وہ کہنے لگے: ہم اپنے بچوں کو جانے نہیں دیں گے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل کیں: ﴿لَآ إِكْرَاهَ فِي ٱلدِّينِۖ قَد تَّبَيَّنَ ٱلرُّشْدُ مِنَ ٱلْغَيِّۚ﴾ ترجمہ: "دین کے معاملہ میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے، صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے"۔ (سورہ البقرہ: 256 سنن ابوداؤد: 2682، السنن الکبریٰ للنسائی: 10982، 10983)

....

چوتھا باب

غزوۂ ذات الرقاع

ا: تاریخ، اسباب اور وجہِ تسمیہ:

اس غزوہ کی تاریخ کے بارے میں سیرت نگاروں اور اہلِ مغازی کا اختلاف ہے، امام بخاری کی رائے یہ ہے کہ یہ غزوۂ خیبر کے بعد پیش آیا۔ ابن اسحاقؒ کی رائے یہ ہے کہ یہ غزوۂ بنی نضیر کے بعد پیش آیا۔ یہ قول بھی ہے کہ یہ غزوۂ خندق کے چار سال بعد پیش آیا۔ واقدی اور ابن سعد کے مطابق یہ سن پانچ ہجری ماہِ محرم میں پیش آیا۔ ابن عمرؓ کے نزدیک بھی وہی قول راجح ہے جو امام بخاریؒ نے بیان کیا ہے، اس لئے کہ حضرت ابو موسی اشعریؓ اس میں شریک تھے اور وہ حبشہ سے فتح خیبر کے فوراً بعد ہی واپس آئے۔ اسی طرح اس میں حضرت ابو ہریرہؓ بھی شریک رہے اور انہوں نے فتح خیبر کے وقت اسلام قبول کیا، اور اس میں رسول اللہ ﷺ نے صلوۃ الخوف پڑھی جبکہ وہ خندق میں مشروع نہیں ہوئی تھی، بلکہ اس کی مشروعیت حدیبیہ کے دنوں میں عسفان کے مقام پر ہوئی اور حدیبیہ کا واقعہ سن چھ ہجری میں پیش آیا۔ (سیرت ابن ہشام 3/225 المغازی للواقدی: 1/395، طبقات ابن سعد: 2/61)

ڈاکٹر بوطیؒ نے جزم ویقین کے ساتھ یہ بات کہی ہے کہ یہ غزوۂ خندق سے پہلے پیش آیا، انہوں نے ایک صحیح حدیث سے استدلال کیا ہے کہ جابرؓ نے رسول اللہ ﷺ سے غزوۂ خندق میں اجازت طلب کی اور انہوں نے اپنی زوجہ کو رسول اللہ ﷺ کی بھوک کی شدت کی خبر دی، اسی حدیث میں اس کھانے کا بھی ذکر ہے جس کے لئے انہوں نے نبی کریم ﷺ کو مدعو کیا، اور پھر پورا لشکر کھانے کے لئے آ گیا۔ اسی طرح حضرت جابرؓ کے تیار کئے ہوئے کھانے میں معجزہ کے ظہور کا بھی ذکر ہے اور اس حدیث میں یہ بھی ذکر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت جابرؓ کی شریکِ حیات سے فرمایا تھا: اس میں سے خود کھاؤ اور باقی ہدیہ کرو، اس لئے کہ لوگوں کو قحط سالی لاحق ہوئی ہے۔ (صحیح بخاری: 4101)

صحیحین (بخاری: 2079، مسلم: 715/73، مسند احمد: 3/375) میں یہ بھی روایت مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جابرؓ سے غزوۂ ذات الرقاع میں دریافت کیا کہ کیا انہوں نے شادی کر لی ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا: ہاں! اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو ان کی شادی کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ ابن حجرؒ نے چونکہ اس غزوہ کے خیبر کے بعد پیش آنے کے دلائل دیئے ہیں، ان دلائل کا رد کرتے ہوئے شیخ بوطیؒ فرماتے ہیں: "حافظ ابن حجرؒ نے جو یہ استدلال کیا ہے کہ آپؐ نے غزوۂ احزاب میں صلاۃ الخوف نہیں پڑھی تھی، بلکہ اس کی قضا ادا کی تھی، اس کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ اس وقت نماز کو مؤخر کرنے کا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں اور مشرکین کے مابین مسلسل تیر اندازی جاری تھی، اس طور پر کہ نماز کے لئے وقت ہی نہیں مل پایا، یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دشمن جہتِ قبلہ میں ہو، یا اس لئے مؤخر کیا تا کہ چھوٹ جانے والی نماز کی قضا کی کیفیت اور طریقے کو بیان کرنا مقصود ہو۔

شیخ بوطیؒ نے ذکر کیا ہے کہ اس غزوہ کی تاریخ سن چار ہجری ہے، جبکہ بنو نضیر کو جلا وطن کئے ہوئے تقریباً ڈیڑھ ماہ گزر گیا تھا، وہ فرماتے ہیں کہ یہی رائے اکثر علمائے سیرت و مغازی نے اختیار کی ہے۔(دیکھیں: فقہ السیرۃ النبویہ، ص:194)

اور جہاں تک تعلق ہے اس غزوہ کے سبب کا تو وہ یہ تھا کہ نجد کے بہت سے قبائل کی طرف سے مسلمانوں کے ساتھ غداری اور عہد شکنی کا ظہور ہوا، اس غداری کا ظہور ان ستر داعیوں کو شہید کرنے کے ذریعہ ہوا جو دعوتی مہم کے لئے نکلے تھے، اس لئے اللہ کے رسول ﷺ محارب و بنو ثعلبہ کے قبائل کی تأدیب کے لئے نکلے۔(فقہ السیرۃ النبویہ، ص:194-195)

ڈاکٹر محمد ابو فارس نے ذکر کیا ہے کہ ایک آنے والا مدینہ منورہ آیا اور اس نے مسلمانوں کو اطلاع دی کہ قبیلۂ غطفان کی دو شاخیں بنی محارب اور بنی ثعلبہ رسول اللہ ﷺ کے خلاف جنگ کرنے کے لئے فوج جمع کر رہے ہیں، اس لئے اللہ کے رسول ﷺ نے فوری طور پر چار سو مجاہدین یا دوسری روایت کے مطابق سات سو مجاہدین کی معیت میں ان کے علاقوں کی جانب رختِ سفر باندھا اور جب رسول اللہ ﷺ ان کے علاقے میں پہنچے تو وہ ڈر گئے اور خوفزدہ ہو کر پہاڑوں کی چوٹیوں پر بھاگ گئے، اپنی عورتوں کو، بچوں کو اور اپنا مال سب وہیں چھوڑ دیا، اسی اثناء میں نماز کا وقت ہو گیا تو مسلمانوں کو اس بات کا ڈر تھا کہ کہیں وہ پلٹ کر حملہ نہ کریں، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے اس موقع پر صلوۃ الخوف (حالت جنگ والی نماز پڑھائی) اور اس کے بعد مدینہ منورہ واپس تشریف لے آئے۔(دیکھیں: غزوۃ الاحزب، ابو فارس، ص:14)

اس عسکری حملے نے اپنے اغراض و مقاصد حاصل کر لئے اور اس کے ذریعہ وہ تمام فوجیں منتشر ہو گئیں جن کو قبیلۂ غطفاں نے مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے جمع کیا تھا، اللہ کے رسول ﷺ نے ان تمام قبائل کو خوفزدہ اور مرعوب کر دیا اور ان کو یہ سبق دے دیا کہ مسلمان جس طرح اس پر قدرت رکھتے ہیں کہ مدینہ کی طرف میلی نگاہ اٹھانے والوں کے خلاف مدینہ میں رہتے ہوئے کاروائی کریں اسی طرح وہ اس پر بھی قادر ہیں کہ جنگ اور معرکہ کو دشمن کی سرزمین پر منتقل کر کے ان کے گھر میں جا کر ان کو ماریں۔(دیکھیں: غزوۃ الاحزاب، محمد احمد باشمیل، ص77-78)

اس غزوہ کو غزوہ ذات الرقاع کا نام اس لئے دیا گیا اس لئے کہ صحابہ کرام گرمی سے بچنے کے لئے اپنے پیروں پر پٹیاں بھاندتے تھے۔ وجہ تسمیہ کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اپنے جھنڈوں پر پٹیاں باندھتے تھے۔ یہ بھی کہا گیا کہ وہاں ایک درخت تھا جس کا نام ذات الرقاع تھا۔ یہ قول بھی ہے کہ مسلمان ایسی سرزمین میں ٹھہرے جہاں مختلف سفید اور سیاہ الگ الگ حصے تھے۔ اسی لئے اس کا نام یہ پڑ گیا۔ (دیکھیں: حدیث القرآن الکریم عن غزوات الرسول ﷺ 1/309، صور و عبر من الجہاد النبوی فی المدینہ، ص: 170)

صحیح بات یہ ہے کہ اس غزوہ کا نام ذات الرقاع اس لئے پڑا اس لئے کہ وہ اپنے پیروں پر پٹیاں باندھتے تھے، شیخین نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابو موسی اشعریؓ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں: ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ ایک غزوہ میں نکلے، ہم چھ آدمی تھے اور ایک ہی اونٹ تھا جس پر باری باری سوار ہوتے تھے، ہمارے پاؤں چھلنی ہو گئے، میرے بھی دونوں پاؤں زخمی ہو گئے اور میرے ناخن جھڑ گئے، ہم اپنے پاؤں پر پٹیاں لپیٹتے تھے، اسی لئے اس کا نام غزوۂ ذات الرقاع (پٹیوں والا غزوہ) پڑ گیا کیونکہ ہم اس غزوہ میں اپنے پاؤں پر چیتھڑے اور پٹیاں باندھتے تھے۔ (صحیح مسلم:1816، صحیح بخاری: 4128)

۲: صلاۃ الخوف اور سرحدوں کی حفاظت:

ا: صلوۃ الخوف:

اس غزوہ میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ پر صلوۃ الخوف سے متعلق آیات نازل کیں اور دشمن کے سامنے نماز کی کیفیت کو بیان کیا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَإِذَا كُنتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ ٱلصَّلَوٰةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُم مَّعَكَ وَلْيَأْخُذُوٓاْ أَسْلِحَتَهُمْ فَإِذَا سَجَدُواْ فَلْيَكُونُواْ مِن وَرَآئِكُمْ وَلْتَأْتِ طَآئِفَةٌ أُخْرَىٰ لَمْ يُصَلُّواْ فَلْيُصَلُّواْ مَعَكَ وَلْيَأْخُذُواْ حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ وَدَّ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ لَوْ تَغْفُلُونَ عَنْ أَسْلِحَتِكُمْ وَأَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيلُونَ عَلَيْكُم مَّيْلَةً وَٰحِدَةً وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِن كَانَ بِكُمْ أَذًى مِّن مَّطَرٍ أَوْ كُنتُم مَّرْضَىٰٓ أَن تَضَعُوٓاْ أَسْلِحَتَكُمْ وَخُذُواْ حِذْرَكُمْ إِنَّ ٱللَّهَ أَعَدَّ لِلْكَٰفِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا﴾ ترجمہ: ”اور اے نبیؐ! جب تم مسلمانوں کے درمیان ہو اور (حالتِ جنگ میں) انہیں نماز پڑھانے کھڑے ہو تو چاہیے کہ ان میں سے ایک گروہ تمہارے ساتھ کھڑا ہو اور اسلحہ لئے رہے، پھر جب وہ سجدہ کرلے تو پیچھے چلا جائے اور دوسرا گروہ جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی ہے آکر تمہارے ساتھ پڑھے اور وہ بھی چوکنا رہے اور اپنے اسلحہ لئے رہے، کیوں کہ کفار اس تاک میں ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامان کی طرف سے ذرا غافل ہو تو وہ تم پر یکبار گی ٹوٹ پڑیں، البتہ اگر تم بارش کی وجہ سے تکلیف محسوس کرو یا بیمار ہو تو اسلحہ رکھ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں، مگر پھر بھی چوکنے رہو، یقین رکھو کہ اللہ نے کافروں کے لئے رسوا کن عذاب مہیا کر رکھا ہے“۔(سورۃ النساء:102)

اللہ کے رسول ﷺ نے مسلمانوں کو صلوۃ الخوف پڑھائی اور اس نماز کی کیفیت یہ تھی کہ ایک جماعت نے آپ ﷺ کے ساتھ صف بندی کی اور دوسری جماعت دشمن کے مقابلہ میں رہی، آپ ﷺ کے ساتھ جو لوگ تھے آپ نے ان کو ایک رکعت پڑھائی اس کے بعد آپ ﷺ قیام کی حالت میں برقرار رہے، اور آپ کے پیچھے لوگوں نے اپنی نماز مکمل کی، اس کے بعد وہ چلے گئے اور دشمن کے سامنے کھڑے رہے اور دوسری جماعت آئی اور آپ ﷺ نے ان کو ایک رکعت پڑھائی جو آپؐ کی باقی رہ گئی تھی، اس کے بعد آپؐ بیٹھے رہے اور انہوں نے اپنی دوسری رکعت مکمل کی، اس کے بعد آپؐ نے ان کے ساتھ سلام پھیرا۔(صحیح مسلم:842، صحیح بخاری: 4129، السیرۃ النبویہ فی ضوء المصادر الاصلیہ، ص:425)

ایک دوسری روایت میں ہے آپ ﷺ نے ایک جماعت کو دو رکعتیں پڑھائیں، اس کے بعد وہ پیچھے ہٹ گئے اور دوسری جماعت کو بھی دو رکعتیں پڑھائیں، اللہ کے رسول ﷺ کی چار رکعتیں ہوئیں اور صحابہ کرام کی (جماعت کے ساتھ) دو دو رکعتیں ہوئیں۔(صحیح بخاری: 4136، صحیح مسلم:311/843، مسند احمد:3/364)

ڈاکٹر بوطی ؒ کہتے ہیں: دونوں حدیثوں کے مابین تطبیق کی صورت یہ ہے کہ آپ -علیہ الصلاۃ والسلام- نے صحابہ کرام کو ایک سے زائد مرتبہ صلاۃ الخوف پڑھائی، اس لئے ایک مرتبہ پہلے طریقہ کے مطابق نماز پڑھائی اور دوسری مرتبہ دوسرے طریقہ کے مطابق پڑھائی۔

یہ نماز مقام نخل میں تھی جو مدینہ منورہ سے دو دن کی مسافت پر تھا۔(دیکھیں: فقہ السیرۃ النبویۃ للبوطی، ص:207)

صلاۃ الخوف کی مشروعیت سے نماز کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، یہاں تک کہ میدانِ کارزار میں بھی اس کے بارے میں تساہل نہیں برتا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی بھی صورتحال میں اس کو ترک کرنا ممکن ہے، چاہے حالات کیسے بھی ہوں، اس طریقہ سے نماز اور دیگر عبادات جہاد کے ساتھ منہاج نبوی کے مطابق شامل ہو جاتی ہیں اور آپ ؐ نے اسی منہاج کے مطابق امت کی تربیت کی ہے جو کتاب اللہ سے ماخوذ و مستنبط ہے، لہذا عبادات اور جہاد کے درمیان انفصال وجدائی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔(دیکھیں: التربیۃ القیادیۃ: 3/303)

۲: سرحدوں کی حفاظت:

جب اسلامی لشکر غزوۂ ذات الرقاع سے واپس آیا تو انہوں نے ایک مشرک عورت کو گرفتار کر لیا، اس کی وجہ سے اس کے شوہر نے نذر مانی کہ وہ اس وقت تک واپس نہیں آئے گا جب تک کہ اصحاب محمدؐ میں سے کسی کا خون نہیں کرے گا، چنانچہ وہ رات کے وقت آیا رسول اللہ ﷺ نے دشمن سے مسلمانوں کی حفاظت کے لئے دو آدمیوں کو پہرہ پر مأمور کیا تھا اور وہ صحابہ تھے: عباد بن بشرؓ اور عمار بن یاسرؓ۔ جس وقت وہ آیا حضرت عبادؓ نماز پڑھ رہے تھے، اس نے اسی حالت میں ان کو تیر مارا، انہوں نے نماز توڑے بغیر تیر نکال دیا یہاں تک کہ اس نے لگاتار تین تیر مارے، لیکن انہوں نے نماز نہیں توڑی اور سلام پھیر کر ہی نماز سے فارغ ہوئے، اس کے بعد اپنے ساتھی کو جگایا، ساتھی نے کہا: سبحان اللہ! آپ نے مجھے جگایا کیوں نہیں؟ انہوں نے کہا: میں ایک سورت پڑھ رہا تھا گوارا نہ ہوا کہ اسے پورا کئے بغیر منقطع کروں، جب اس نے مجھ پر لگاتار تیر اندازی کی تو میں نے رکعت پوری کر کے نماز مکمل کر دی اور آپ کو جگایا۔ اللہ کی قسم! اگر یہ خدشہ نہ ہوتا کہ رسول اللہ ﷺ کے مقرر کردہ پہرہ میں کوتاہی ہو جائے گی تو میں کبھی درمیان میں سورت نہ چھوڑتا چاہے اس میں میری جان ہی چلی جاتی۔

(مسند أحمد: 3/343، سنن ابو داؤد: 198، ابن خزیمہ: 36، السیرۃ النبویۃ فی ضوء المصادر الأصلیۃ، ص: 427)

اس واقعہ سے متعدد دروس واسباق حاصل ہوتے ہیں جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

أ: نبی کریم ﷺ لشکر کی حفاظت کا اہتمام فرماتے تھے، اسی لئے آپؐ نے خیار صحابہ میں سے دو لوگوں کا انتخاب کر کے ان کو رات میں لشکر کے پہرہ پر مأمور کیا۔

ب: پہرہ میں باری کا اہتمام: معلوم ہوتا ہے کہ جن دو صحابہ کے ذمہ حراست و پہرہ کا کام سونپا گیا تھا، انہوں نے رات کو نصف نصف تقسیم کر لیا تھا، آدھی رات آرام کے لئے اور آدھی رات پہرہ کے لئے۔ اس لئے کہ فوجی کے لئے ضروری ہے کہ وہ کچھ وقت جسم کو آرام بھی دے۔

ج: قرآن کریم سے شغف اور تعلق اور اس کی تلاوت کی محبت، چنانچہ تلاوت کی محبت وشغف نے ان کو تیروں کی تکلیف والم سے غافل کر دیا، حالانکہ تیر ان کے جسم پر لگ رہے تھے اور تیزی کے ساتھ خون بہہ رہا تھا۔(غزوۃ الأحزاب، ابو فارس، ص: 30-31)

د: پہرہ داری کی ذمہ داری کا احساس:

حضرت عبادؓ نے الم اور تکلیف کے احساس کی وجہ سے اپنی نماز نہیں توڑی بلکہ انہوں نے پہرہ کی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے نماز توڑی، اس میں عبادت وجہاد کا صحیح فہم معلوم ہوتا ہے۔(دیکھیں: السیرۃ النبویۃ فی ضوء المصادر الاصلیۃ، ص:428)

ھ: پہرہ کی جگہ اسٹریٹجک تھی:

نبی کریم ﷺ نے گھاٹی کے دہانے کو پہرہ کی جگہ کے طور پر متعین کیا اور اس جگہ کا انتخاب آپ ﷺ نے انتہائی دانشمندی کے ساتھ کیا تھا، اس لئے کہ وہ جگہ ایسی تھی جہاں سے دشمن کے حملہ کا اندیشہ تھا۔

و: آرام کی جگہ محافظ کے قریب ہو:

اسی لئے حفاظت پر مامور صحابی اپنے سوئے ہوئے بھائی کو جگا سکے اور اگر آرام کی جگہ دور ہوتی تو وہ اپنے بھائی کو جگا نہیں پاتے، اور پھر وہ کچھ ہو سکتا تھا جو اچھا نہیں ہوتا۔ (دیکھیں: غزوۃ الاحزاب، أبو فارس، ص:32)

۳: رسول ﷺ کی شجاعت اور حضرت جابرؓ کے ساتھ آپ ؐ کا معاملہ:

ا: رسول ﷺ کی شجاعت:

رسول اللہ ﷺ جب غزوۂ ذات الرقاع سے واپس آرہے تھے تو قیلولہ کا وقت ایک ایسی وادی میں ہوا جس میں کانٹوں والے درخت کثیر تعداد میں تھے، اللہ کے رسول ﷺ نے پڑاؤ ڈالا اور لوگ درخت کا سایہ حاصل کرنے کے لئے ادھر ادھر بکھر گئے، رسول اللہ ﷺ بھی ایک درخت کے سائے میں اترے اور درخت سے تلوار لٹکا دی، جابر بن عبد اللہؓ فرماتے ہیں: ہمیں بس ایک نیند کا جھونکا آیا تھا کہ اتنے میں رسول اللہ ﷺ ہمیں پکارنے لگے، ہم آپ ؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو دیکھتے ہیں کہ آپ ؐ کے پاس ایک اعرابی بیٹھا ہوا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس نے میری تلوار سونت لی جبکہ میں سویا ہوا تھا، میں جاگا تو اس کے ہاتھ میں سونتی ہوئی بے نیام تھی، اس نے مجھ سے کہا: آپ کو مجھ سے کون بچائے گا؟ میں نے اس سے کہا: اللہ! تو یہ اب بیٹھا ہوا ہے، اس کو رسول اللہ ﷺ نے کوئی سزا نہیں دی، اس اعرابی کا نام غَورث بن حارث تھا۔ (صحیح بخاری: 2913، 2910، 4135، 4136، صحیح مسلم: 843، مسند احمد: 3/311)

غورث نے رسول اللہ ﷺ سے وعدہ کیا کہ وہ آپ ؐ کے ساتھ اب قتال نہیں کرے گا اور نہ ہی ایسے لوگوں کا ساتھ دے گا جو آپ کے ساتھ قتال کرتے ہوں، آپ ﷺ نے اس کی راہ چھوڑ دی، اس کے بعد وہ اپنے ساتھیوں کے پاس آیا اور کہا: میں تمہارے پاس سب سے بہتر انسان کے پاس سے آرہا ہوں۔ (فتح الباری: 4136)

اس حدیث میں محمد ﷺ کی نبوت کی دلیل ہے، اسی طرح آپ ؐ کی شجاعت و بہادری، آپ ؐ کے یقین کی قوت، ایذاء پر صبر و ثبات اور جاہلوں کے مقابلہ میں آپ ؐ کے حلم و بُردباری کی بھی دلیل ہے، اس واقعہ کے ذریعہ اس کا جواز بھی معلوم ہوتا ہے کہ پڑاؤ کے وقت لشکر کے افراد ادھر ادھر متفرق ہو کر آرام کر سکتے ہیں بشرطیکہ وہاں کسی کے حملہ کا کوئی اندیشہ نہ ہو۔ (ایضاً)

یہ واقعہ ثابت شدہ اور صحیح ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ —عزوجل— نے اپنے نبی کی کس قدر رعایت و حفاظت کی ہے، علاوہ ازیں اس کے ذریعہ خوارق و معجزات کے بارے میں آپ کے یقین میں مزید اضافہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے لئے کس طرح ان کو آسان بنا دیا تھا، اس مشرک کے لئے یہ بہت آسان تھا جبکہ تلوار اس کے ہاتھ میں تھی اور نبی کریم ﷺ کے سر پر سونتی ہوئی تھی اور آپ ﷺ غیر مسلح اور نیند کی حالت میں تھے، وہ آسانی سے آپ ﷺ پر حملہ کر سکتا تھا اور آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس مشرک کو اپنے

اوپر کتنا اعتماد تھا اور وہ اپنے لئے ایک زریں موقع سمجھ رہا تھا، وہ کہہ رہا تھا: آپ کو مجھ سے کون بچا سکتا ہے؟ لہذا اس کے باوجود کون سی ایسی چیز تھی کہ وہ حملہ کرنے سے باز رہا۔ (دیکھیں: فقہ السیرۃ للبوطی، ص:200)

اس کی تفسیر وتوجیہ یہی کی جاسکتی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت و حفاظت اور اعجاز الٰہی ہے جو عام قوانین اور ضابطوں سے بالاتر ہے اور انسانی طاقت سے بھی بالاتر ہے جس کے ذریعہ اللہ اپنے نبی کی نصرت و مدد کرتا ہے اور دعوت کا دفاع کرتا ہے، یہ اللہ کی عنایت وتوجہ ہی تھی جس کی وجہ سے مشرک کے دل میں رعب پیدا ہوا اور اس کے ہاتھ لرز گئے، یہاں تک کہ اس کے ہاتھ سے تلوار گرجاتی ہے اور اس کے بعد وہ سر جھکائے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے سامنے باادب بیٹھتا ہے، جو کچھ پیش آیا یہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے اس وعدہ کا مصداق تھا جیسے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلرَّسُولُ بَلِّغْ مَآ أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ ۖ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُۥ ۚ وَٱللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ ٱلنَّاسِ ۗ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يَهْدِى ٱلْقَوْمَ ٱلْكَـٰفِرِينَ﴾ ترجمہ: ''اے پیغمبرؐ! جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچادو، اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا، اللہ تم کو لوگوں کے شر سے بچانے والا ہے، یقین رکھو کہ وہ کافروں کو (تمہارے مقابلہ میں) کامیابی کی راہ ہرگز نہ دکھائے گا۔ (سورۃ المائدہ:67)

مذکورہ آیت میں عصمت سے مراد یہ نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو کوئی بھی تکلیف نہیں پہنچے گی، یا قوم کی طرف سے کسی آزمائش کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ضابطہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کو آزمائش میں مبتلا کرتا ہے، بلکہ عصمت سے مراد یہ ہے کہ آپ تک کوئی ایسا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا ہے جو آپ کو جان سے مارنے کی کوشش کررہا ہو، اس لئے کہ اس کے نتیجہ میں وہ دعوت ہی ختم ہوجائے گی جس کے لئے آپ کو مبعوث کیا گیا تھا۔ (فقہ السیرۃ للبوطی، ص:200)

۲: جابر بن عبد اللہؓ کے ساتھ آپؐ کا معاملہ:

حضرت جابر بن عبد اللہؓ فرماتے ہیں کہ میں ایک کمزور سے اونٹ پر بیٹھ کر غزوہ میں شرکت کے لئے روانہ ہوا، پھر جب آپؐ واپس تشریف لا رہے تھے تب بھی میرے پاس یہی اونٹ تھا، میرے تمام ساتھی آگے نکلتے چلے جارہے تھے اور میں پیچھے ہوتا جارہا تھا، اتنے میں رسول اللہ ﷺ میرے قریب تشریف لائے، آپؐ اپنی ناقہ پر سوار تھے۔ آپؐ نے مجھ سے فرمایا: اے جابر تمہیں کیا ہوا؟ میں نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! اس اونٹ نے مجھے پیچھے کر دیا ہے۔ فرمایا: اپنے اونٹ کو بٹھاؤ، میں نے حکم کی تعمیل کی، آپؐ نے بھی اپنی اونٹنی کو نیچے بٹھایا، پھر فرمایا: یا تو یہ لکڑی جو تمہارے ہاتھ میں ہے مجھے دو، یا کسی درخت سے کوئی ٹہنی توڑ کر لاؤ۔ میں نے لکڑی پیش کردی، آپؐ نے وہ لکڑی میرے اونٹ کی کوکھ میں چند بار چبھوئی اور فرمایا: اب اس پر بیٹھو۔ میں اس پر بیٹھ کر روانہ ہوگیا، خدا کی قسم! اب میرا اونٹ آپؐ کی اونٹنی کے برابر چل رہا تھا۔

حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ میں آپؐ سے باتیں کرتا ہوا چلا جارہا تھا، آپؐ نے فرمایا: اے جابر! کیا تم اپنے اونٹ کو میرے ہاتھ فروخت کرسکتے ہو؟ میں نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! میں فروخت نہیں کرتا بلکہ اسے آپؐ کو ہبہ کرتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: نہیں، ہبہ نہیں،

بلکہ مجھے بیچ دو۔ میں نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! پھر آپؐ اس کے دام لگائیں۔آپؐ نے فرمایا: ایک درہم۔ میں نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! اس طرح تو میں گھاٹے میں رہوں گا!۔آپؐ نے فرمایا: تب دو درہم بہت ہیں۔ میں انکار کرتا رہا، آپؐ قیمت بڑھاتے رہے، یہاں تک کہ آپؐ نے ایک اوقیہ یعنی چالیس درہم تک قیمت لگادی۔ میں نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! کیاآپؐ اس قیمت پر راضی ہیں؟آپؐ نے فرمایا: ہاں! میں نے عرض کیا: تب یہ اونٹ آپؐ کا ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں نے لے لیا۔

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا: اے جابر! کیا تم نے شادی کرلی ہے؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں! یارسولؐ اللہ! میں نے شادی کرلی ہے۔ آپؐ نے دریافت فرمایا: کنواری سے یا شادی شدہ سے؟ میں نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! میں نے شادی شدہ سے نکاح کیا ہے۔آپؐ نے فرمایا: کسی کنواری لڑکی سے شادی کیوں نہیں کی، تم اس کے ساتھ دل لگی کرتے اور وہ تمہارے ساتھ دل لگی کرتی؟ میں نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! میرے والد جنگ اُحد میں شہید ہوگئے تھے، انہوں نے سات لڑکیاں چھوڑی ہیں، جو ابھی کم عمر ہیں، میں نے ایک ایسی تجربہ کار عورت سے شادی کی ہے جو ان سب کا خیال رکھتی ہے۔آپؐ نے فرمایا: ان شاءاللہ! تمہارا فیصلہ بہتر ثابت ہوگا۔

حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ آپؐ مجھ سے گفتگو فرماتے رہے، آپؐ نے یہ بھی فرمایا: اے جابر! جب ہم 'صِرار' پہنچیں گے تو ایک اونٹ ذبح کرنے کے لئے کہیں گے، تمہاری بیوی ہماری آمد کی خبر سنے گی تو تکئے وغیرہ جھاڑے گی، یعنی ہماری ضیافت کی تیاری کرے گی، میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہمارے گھر میں تکیے نہیں ہیں، آپ نے فرمایا: ہوجائیں گے۔ راوی کہتے ہیں کہ ہم ایک دن 'صرار' پہنچ گئے، یہ جگہ مدینے سے تین میل کے فاصلے پر ہے، وہاں پہنچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اونٹ ذبح کرنے کے لئے فرمایا: چنانچہ اونٹ ذبح کردئے گئے، ہم وہاں ایک دن رکے، رات میں آپؐ مسجد میں تشریف لے گئے، میں اپنے گھر چلا گیا، گھر پہنچ کر میں نے اپنی بیوی کو تمام باتیں بتلائیں، میری بیوی نے کہا: تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے سمع وطاعت کا مظاہرہ کرنا چاہئے۔ صبح ہوئی تو میں نے اونٹ کی لگام تھامی اور مسجد پہنچا، مسجد کے دروازے پر اونٹ کو بٹھا کر میں الگ جاکر بیٹھ گیا، اتنے میں آپؐ باہر تشریف لائے، آپؐ نے پوچھا یہ کیا ہے؟ لوگوں نے عرض کیا: یہ اونٹ جابر لے کر آئے ہیں۔آپؐ نے فرمایا: جابر کہاں ہیں؟ آپؐ کے حکم پر مجھے پکارا گیا، میں حاضر خدمت ہوا، آپؐ نے فرمایا: بھتیجے، اپنے اونٹ کی رسی پکڑو، یہ اونٹ تمہارا ہے، پھر حضرت بلالؓ کو حکم دیا کہ وہ مجھے ایک اوقیہ چاندی دے دیں، چنانچہ مجھے ایک اوقیہ بلکہ اس سے کچھ زائد چاندی دے دی گئی، یہ قیمتی عطیہ میرے پاس رہا، اور اس میں برکت ہوتی رہی، اور اس کی ہمارے گھر میں خاص اہمیت تھی۔ (صحیح البخاري: 2097 صحیح مسلم: 1599 مسند أحمد: 375/3)

اس قصہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اپنے اصحاب کے ساتھ طرزِ عمل اور اخلاق کریمانہ کی خوبصورت اور اعلیٰ ترین تصویر ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کرام کے ساتھ پُر لطف گفتگو، انتہائی درجہ کا تواضع، بے تکلف بات چیت اور شدید محبت کا معاملہ کرتے تھے، ان کے حالات سے واقف رہتے تھے اور ان کی مادی اور معنوی سماجی مشکلات کا حل تلاش کرتے تھے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ محسوس کیا کہ جابرؓ کے پیچھے رہنے کا سبب ان کے اونٹ کی کمزوری ہے اور ان کے پاس اس کے سوا اور کوئی سواری نہیں ہے، وہ فقر و تنگدستی سے دوچار ہیں اور ان کے والد اُحد میں شہید ہوچکے تھے اور اپنے پیچھے بیٹے اور بیٹیاں چھوڑ کر گئے تھے، اور ان کی کفالت حضرت جابرؓ کے ذمہ تھی، ان کے پاس

رزق کے اسباب قلیل تھے، اس لئے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے ساتھ مواسات و غمخواری کے لئے اس موقع کو غنیمت جانا اور ان کے لئے اپنے بابرکت مال میں سے جو پیش کر سکتے تھے پیش کیا۔(فقہ السیرۃ، البوطی، ص: 212-213،السیرۃ النبویۃ فی ضوء المصادر الاصلیہ، ص:429)

کیا کہنے اس لطف و کرم کے؟! کیا کہنے اس مواسات و غمخواری کے؟! کیا ہی اطمینانی کیفیات اور بہترین صحبت ہے! غزوہ سے واپسی کا موقع ہے، نہ کوئی تکلف اور نہ کوئی سابقہ استعداد و تیاری، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے اونٹ کو ایک خرقِ عادت عمل اور نظر آنے والے معجزہ کے ذریعہ درست اور توانا کر دیا، اور پھر اس کو خرید کر اس کی قیمت ادا کرنے کے بعد انہی کو ہبہ کر دیا اور ان کا پورا خیال رکھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کو حکم دیا تو انہوں نے اونٹ ذبح کئے تاکہ وہ ان کی بیوی ان کا استقبال کرنے کی تیاری کرے اور اس کے بعد ان کے لئے خوشحال اور بہترین مستقبل کی پیشن گوئی کر کے ان کو اطمینان دلایا۔

یہ اخلاقِ نبوی کے نمونوں میں سے ایک بہترین نمونہ ہے جس کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آراستہ تھے اور رب نے ان کو ان اخلاق سے آراستہ کیا تھا تاکہ آپ مکارمِ اخلاق کی تکمیل کریں اور اس اعلیٰ، بہترین اور مشفقانہ اسلوب کے ذریعہ ربانیین بھی حسنِ سلوک، اخوت میں سچائی اور دوستی اور محبت میں اخلاص کا طرزِ عمل سیکھتے ہیں۔(دیکھیں: صور و عبر من الجہاد النبوی فی المدینہ، ص:181)

....

پانچواں باب
غزوۂ بدر دوم اور غزوۂ دومۃ الجندل

ا: غزوۂ بدر دوم:

معرکہ اُحد کے بعد ابو سفیان نے پھر سے بدر میں معرکہ کارزار میں آمنے سامنے آنے کی بات کہی تھی، اسی وعدہ کے مطابق رسول اللہ ﷺ ذوالقعدہ سن چار ہجری میں مدینہ منورہ سے ڈیڑھ ہزار مجاہدین صحابہ کرام کی جمعیت لے کر نکلے جن میں دس گھوڑ سوار بھی تھے اور لشکر کا علم حضرت علی بن ابی طالب ؓ کے سپرد کیا گیا، اور بدر پہنچ کر مشرکین کے انتظار میں خیمہ زن ہو گئے، مسلمانوں نے وہاں پر آٹھ دن تک انتظار کیا اور ابو سفیان کی قیادت میں نکلے ہوئے مشرکین قریش کے لشکر کے پہنچنے کا انتظار کرتے رہے، اس لئے کہ فریقین کے مابین پہلے ہی طے ہو چکا تھا، لیکن مشرکین میں سے کوئی بھی بدر نہیں آیا، ابو سفیان نے قریش اور ان کے حلفاء کی ایک جمعیت تیار کی تھی جو دو ہزار جنگجوؤں پر مشتمل تھی جن میں پچاس گھوڑے شامل تھے، جب وہ مرّ الظہران پہنچے اور مکہ سے چالیس میل کی دوری پر 'مجنّہ' نام کے مشہور چشمہ پر خیمہ زن ہوئے، اس کے بعد ابو سفیان ان کو لے کر واپس آ گیا، اس نے اپنے ساتھیوں سے یہ خطاب کیا: ایک قریش کے لوگو! جنگ اس وقت موزوں ہوتی ہے جب شادابی اور ہریالی ہو، جانور بھی چر سکیں اور تم بھی دودھ پی سکو، اس وقت خشک سالی ہے۔ لہذا میں واپس جا رہا ہوں تم بھی واپس چلو۔ (دیکھیں: موسوعۃ نضرۃ النعیم، غزوۃ الاحزاب، محمد اُحمد باشمیل، ص: 88)

مَخشی بن عمرو ضمری بھی یہاں پر حاضر ہوا اور یہ وہی شخص تھا جس نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ غزوہ ودّان میں بنو ضمرہ کی طرف سے معاہدہ کیا تھا، اس نے بدر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ملاقات کی اور کہا: اے محمد! کیا آپ اس چشمہ کے پاس قریش کے ساتھ لڑنے آئے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! اے بنو ضمرہ کے بھائی، اور اگر تم چاہو تو ہم ہمارے اور تمہارے درمیان طے شدہ معاہدہ کو ختم کر دیں، اس کے بعد تمہارے ساتھ مقابلہ کریں گے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ کر دے گا، اس نے کہا: نہیں، اللہ کی قسم! اے محمد! ہمیں آپ کی طرف سے اس کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ (سیرت ابن ہشام: 3/220)

اس ملاقات میں رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کی طاقت و قوت کے عظیم معانی کی تاکید فرمائی اور واضح فرمایا کہ فریقین کے درمیان طے شدہ معاہدہ مسلمانوں کی طاقت و قوت کی بنیاد پر ہوا ہے، نہ کہ ان کی کمزوری کی وجہ سے، اور فریقِ ثانی کے مطالبہ پر طے ہوا ہے، اس کے ذریعہ مسلمانوں کی قوت کا اظہار بھی تھا اور ان کے دشمنوں کو مرعوب کرنا بھی مقصود تھا۔ (دیکھیں: من معین السیرۃ للشامی، ص: 264-265)

مدینہ منورہ سے بدر کی جانب اسلامی افواج کی پیش قدمی ایک کامیاب اور خوشگوار مہم تھی جس کے ذریعہ انہوں نے اپنے وجود کو بھی تسلیم کرایا اور مدینہ کے اندر اور باہر اعدائے اسلام کو واضح پیغام دے دیا کہ وہ اپنے پورے جزیرۃ العرب میں سب سے بڑی قوت بن چکے ہیں، اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ مکہ کا لشکرِ جرّار بھی اسلامی لشکر سے خوفزدہ ہو کر بھاگ گیا حالانکہ وہ کثرتِ تعداد، تنظیمی طاقت اور جدید

ترین اسلحہ کے اعتبار سے جزیرۃ العرب کی سب سے بڑی فوج تھی، یہی فوج پوری تیاری کے باوجود اور طے شدہ وعدہ کے باوجود آدھا راستہ طے کرنے کے بعد واپس ہونے پر مجبور ہوا۔(غزوۃ الاحزاب، باشمیل، ص:88-89)

اُحد کے موقع پر مشرکین نے جو پروپیگنڈہ مہم چلائی تھی اور اپنی کامیابی اور جنگی تفوق و عظمت کا ڈنڈھورا پیٹا تھا، وہ ان کے لئے وبالِ جان اور گلے کی ہڈی بن گیا، اب عرب ان کا مذاق اڑانے لگے اور لوگوں کے سامنے یہ بات واضح ہوگئی کہ احد میں مسلمانوں کو جس ناخوشگوار صورتحال کا سامنا کرناپڑا اور ان کے افراد شہید ہوئے، اس کا مطلب ہر گز یہ نہیں ہے کہ ان کو شکست کا سامنا کرنا پڑا، یا وہ عسکری اعتبار سے کمزور ہیں۔(التاریخ الاسلامی للحمیدی: 6/66)اس غزوہ نے مسلمانوں کی عسکری شہرت کی حفاظت کرنے کا کام کیا، اور انہوں نے اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں بغیر کسی قتال کے عظیم معنوی فتح حاصل کی، اور بدر کے تجارتی میلے میں بھی شرکت کی، اور ان کو تجارتی اعتبار سے بھی اچھا خاصا نفع حاصل ہوا، قریش نے جب وعدہ کی خلاف ورزی کی تو اس نے مسلمانوں کے مقام و مرتبہ کو تقویت پہنچانے میں اور ان کی ہیبت و ڈر کو برقرار رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔(دیکھیں: المجتمع المدنی فی عہد النبوۃ، العمری، ص:91، دراسات فی عہد النبوۃ والخلافۃ الراشدہ، الشجاع، ص: 144)

۲: غزوۂ دومۃ الجندل:

غزوۂ دومۃ الجندل اسلامی ریاست کو مضبوط و مستحکم کرنے کی تحریک کی ایک کڑی تھی، غزوۂ بدر دوم کے بعد اسلامی افواج رسول اللہ ﷺ کی قیادت میں قضاعہ کی جانب نکلے جو قبائل اسد و غطفان کے شمال میں غساسنہ کی حدود میں رہتے تھے جبکہ غساسنہ رومی (بیزنطینی) سلطنت کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھتے تھے، قبیلہ قزاعہ ہی دومتہ الجندل کے مشہور بازار پر سرپرستی اور نگرانی کرتے تھے جو مدینہ کے شمال میں 450 کلومیٹر کی دوری پر تھا، یہ پہلا قبیلہ تھا جس کے ساتھ مسلمانوں کی کشمکش ہوئی، اللہ کے رسول ﷺ نے غزوۂ دومۃ الجندل کے نام سے معروف یہ غزوہ ربیع الاول سن پانچ ہجری، اگست 626 عیسوی میں کیا۔(التربیۃ القیادیۃ 3/463)

مدینہ منورہ یہ اطلاعات پہنچیں کہ دومۃ الجندل کے پاس بعض قبائل جمع ہو کر وہاں سے گزرنے والے قبائل پر حملہ کرکے ڈاکے ڈال رہے ہیں اور ان پر ظلم و زیادتی کر رہے ہیں، اسی طرح یہ بھی معلوم ہوا کہ انہوں نے مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے منصوبہ بندی کرنا شروع کر دی ہے۔(دیکھیں: تأملات فی سیرۃ الرسول ﷺ، محمد الوکیل، ص:169)

دومۃ الجندل مدینہ منورہ کے اعتبار سے ایک دور دراز علاقہ تھا، اس لئے کہ وہ حجاز اور شام کی حدود اور بحر احمر اور خلیج عربی کے درمیانی راستہ پر واقع تھا، مدینہ منورہ سے سولہ راتوں کی مسافت پر تھا، اگر مسلمان وہاں کی صورتحال سے غافل رہتے تو کوئی ان پر ملامت نہیں کرتا اور فی الحال ابھی ان قبائل کے ذریعہ ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا، لیکن دور اندیشی پر مبنی سیاسی نظر اور بے نظیر عسکری فکر نے مسلمانوں کو اس پر مجبور کر دیا کہ وہ اس بھیڑ اور فوج کو منتشر کریں اور اس کے طاقتور ہونے سے پہلے اس کا خاتمہ کریں جس کے مندرجہ ذیل اہداف و مقاصد مقصود تھے:

۱: اس لئے کہ اس طرح کے اجتماع واتحاد کے بارے میں سکوت اور خاموشی کا نتیجہ یقیناً یہ نکل سکتا تھا کہ وہ مزید مستحکم ومضبوط اور بڑا ہوتا رہے گا اور اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کی طاقت وقوت میں کمزوری آتی رہے گی اور ان کی ہیبت کم سے کم ہوتی جائے گی اور اسی کے لئے دشمنانِ اسلام کوشاں تھے۔

۲: شام کی طرف جانے والے راستے میں اس طریقہ کی صورتحال مسلمانوں کی معاشی صورتحال کو بھی متاثر کر سکتی تھی، اگر مسلمان اس کے بارے میں بے اعتنائی اختیار کرتے تو ان کے قافلوں کو یا ان کے دوست قبائل کو لوٹ مار کا سامنا کرنا پڑتا جس کے نتیجہ میں معیشت کمزور ہو جاتی اور انتشار واضطراب کی صورتحال پیدا ہو جاتی۔

۳: ان دونوں امور سے زیادہ اہم معاملہ یہ تھا کہ اس کاروائی کے ذریعہ یہ پیغام دینا مقصود تھا کہ مسلمانوں کا اس پورے علاقہ میں اثر ونفوذ ہے، اور وہاں کے باشندوں کے لئے یہ باور کرانا ضروری تھا کہ وہ ان کی حمایت وحفاظت اور ذمہ داری میں ہیں، لہذا وہی ان کے راستوں کو پُرامن بناتے ہیں، ان کی تجارت کے محافظ ہیں اور ہر اس دہشت گردانہ کاروائی کے خلاف جنگ کریں گے جس کا مقصد ان کو پریشان کرنا اور خطرہ میں ڈالنا ہو۔(دیکھیں: تاملات فی سیرۃ الرسول ﷺ، محمد الوکیل، ص:169)

۴: قریش کو ہر تجارتی حلیف سے محروم کیا جائے جو ان کی مالی مدد کر سکتا تھا اور ان کو اس اہم تجارتی علاقہ کے بارے میں نااُمید کر دیا جائے، اس لئے کہ اس قوت کے ساتھ اسلامی ریاست کا ظہور اس کے اولین دشمن قریش کی نفسیات پر بھی اثرانداز ہو گا اور ان کو مسلمانوں کی طرف سے اپنی تجارت کے بارے میں خوف لاحق رہے گا۔(دیکھیں: دراسات فی عہد النبوۃ، الشجاع، ص:144،145)

۵: عربوں کے اندر موجود نفسیاتی خوف کو زائل کیا جائے، جو روم کا مواجہہ اور سامنا کرنے کا کبھی خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے اور عملی طور پر اس بات کو ثابت کیا جائے کہ ان کا پیغام عالمی ہے جو صرف عربوں تک محدود نہیں ہے، ذہبی، واقدی، محمد احمد باشمیل اور ان جیسے دیگر مؤرخین کی رائے یہ ہے کہ اس غزوہ کا ایک ہدف رومیوں کو مرعوب کرنا بھی تھا جن کی حدود پر اور ان کے دارالحکومت سے پانچ راتوں کے فاصلہ پر وہ علاقہ موجود تھا۔(غزوۃ الاحزاب، باشمیل، ص: 93 تاریخ المغازی، الذھبی ص:258)

ان مقاصد کے حصول کے پیشِ نظر رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو اس غزوہ کے لئے نکلنے کا حکم دیا اور آپؐ ایک ہزار مجاہدین کی جمعیت لے کر نکلے، آپؐ رات میں سفر فرماتے اور دن میں چھپے رہتے تھے، تاکہ آپؐ اپنے سفر کو پوشیدہ رکھیں اور اس کی خبر عام نہ ہو، اور نہ ہی آپؐ کے اسرار دوسروں تک منتقل ہوں اور دشمن کے جاسوسوں کو بھی اس کی خبر نہ ملے۔(غزوۃ الاحزاب، ابوفارس، ص40)

آپ ﷺ نے بنو عذرہ کا ایک شخص رہبری اور راستہ بتانے کے لئے ساتھ لیا، اس کا نام 'مذکور' تھا، آپ ﷺ مسلسل سفر کرتے رہے، یہاں تک کہ دشمن کے بالکل قریب پہنچ گئے، قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ ادھر ادھر بھاگ گئے ہیں، اور ان میں سے کوئی بھی رسول اللہ ﷺ کے مقابلہ کے لئے نہیں آیا، بلکہ اپنے مویشیوں اور جانوروں کو مسلمانوں کے لئے سہل الحصول مالِ غنیمت کے طور پر چھوڑ کر بھاگ گئے، مسلمانوں نے ان میں سے ایک شخص کو گرفتار کیا اور اس کو لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ ﷺ نے اس سے ان کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے کہا: جب انہوں نے سنا کہ آپ نے ان کے مویشیوں پر قبضہ کر لیا ہے تو وہ بھاگ گئے، اللہ کے

رسول ﷺ نے اس کو اسلام کی دعوت دی اور اس نے اسلام قبول کر لیا، آپ ؐ نے ان کے علاقہ میں چند دن قیام کیا، ادھر ادھر متعدد دستے روانہ کئے، لیکن کوئی بھی ہاتھ نہیں آیا، بالآخر مسلمان مدینہ واپس پلٹ آئے، واپسی کے دوران رسول اللہ ﷺ نے عیینہ بن حصن فزاری کے ساتھ مصالحت کی، عیینہ نے رسول اللہ ﷺ سے اس بات کی اجازت مانگی کہ وہ مدینہ کے قریب 36 میل کی دوری پر واقع زمین میں اپنے اونٹ اور بکریاں چرائے گا۔

دومتہ الجندل تک مسلم افواج کا پہنچنا، جو کہ مدینہ سے کافی دور ہے، اسی طرح عیینہ بن حصن کا مسلمانوں کے ساتھ مصالحت کرنا، اور مدینہ سے 36 میل۔ تقریباً 65 کلومیٹر - دور سرزمین میں اپنے مویشیوں کو چرانے کی اجازت طلب کرنا، اس بات کی واضح دلیل ہے کہ مسلمان طاقت و قوت کے اعتبار سے کس مقام پر پہنچ چکے تھے، اور وہ کس قدر ذمہ داری محسوس کر رہے تھے کہ اس علاقہ میں لوگوں کی زندگی کو محفوظ و پُرامن بنایا جائے، یہ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ یہ دور دراز علاقے اسلامی ریاست کے ماتحت تھے اور اسلامی ریاست اب مضبوط و مستحکم بن چکی تھی، اس پر حملہ کرنا اب کسی کے بس میں نہیں تھا اور اگر ایسا کرنا کسی کے بس میں ہوتا تو سب سے پہلے ایسا عیینہ بن حصن کرتا جس کی طرف سے بدلہ لینے کے لئے 10 ہزار نوجوان تیار رہتے تھے۔(تأملات فی سیرۃ الرسول ﷺ، ص:170)

غزوۂ دومۃ الجندل شام کی جہت میں مدینہ سے دور دراز علاقہ میں پیش آیا، وہاں سے دمشق تقریبا پانچ راتوں کی مسافت پر تھا، یہ غزوہ شمالی دیہاتوں اور جنوبی شام کے علاقوں کے باشندوں کے لئے ایک طرح سے اسلامی دعوت کا اعلان تھا، وہاں کے باشندوں کو اسلامی قوت و قدرت کا احساس ہو گیا، اسی طرح یہ قیصر اور اس کی افواج کے لئے بھی ایک واضح پیغام تھا، ساتھ ہی ساتھ اس کے ذریعہ اسلامی فوج کے لئے دور دراز علاقوں کی طرف سفر کرنے کی تربیت و ٹریننگ بھی تھی، یہی وجہ ہے کہ اس غزوہ کو ایشیائی وافریقی ممالک کی عظیم فتوحات کا نقطہ آغاز سمجھا جاتا ہے۔(دیکھیں: السیرۃ النبویہ، أبو شہبہ: 2/251)

اس غزوہ میں رسول اللہ ﷺ کے منصوبہ کے متعدد اہداف و مقاصد تھے، وہ معلومات حاصل کرنے کے لئے ایک جائزاتی جنگ بھی تھی جس کے ذریعہ جزیرۃ العرب کے مراکزِ قوت کے بارے میں واقفیت حاصل کرنا مقصود تھا، وہ ایک اعلامی اور میڈیا کی جنگ بھی تھی جو غزوۂ بدر دوم کے بعد پیش آرہی تھی، اور اس کے ذریعہ اپنی فتوحات سے فائدہ اٹھانا مقصود تھا، یہ ایک عسکری اور فوجی کاروائی بھی تھی جس کا مقصد مسلمانوں کے خلاف متوقع حملہ کو روکنا تھا، اس لئے کہ بہت سے عرب مدینہ کے بارے میں بُرے ارادہ سے جمع ہو رہے تھے، یہ ایک سیاسی جنگ بھی تھی جس کے ذریعہ ان تمام قبائل کی تحریک کو کچلنا مقصود تھا جو غزوۂ احد کی خبروں کے بعد مدینہ کو نرم نوالہ سمجھ رہے تھے۔(دیکھیں: التربیۃ القیادیۃ، 3/372)

یہ غزوہ ایک سخت جان، جامع اور بہترین تربیتی کورس تھا جس کی قیادت رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے جبکہ آپ ﷺ کے ماتحت اور زیر سرپرستی ایک ہزار صحابہ کرام سفر کر رہے تھے، اس سفر کے دوران ہر لحظہ میں وہ اطاعت وانضباط کے بارے میں دروس حاصل کرتے تھے، جسمانی اور عسکری تربیت کے سلسلہ میں اور زندگی کی مشکلات اور صعوبتیں برداشت کرنے کے سلسلہ میں مختلف دروس سیکھ رہے تھے، حلال و حرام کے سلسلہ میں احکام و مسائل سمجھ اور سیکھ رہے تھے، گھر اور قبیلہ سے باہر رہ کر اسلامی لشکر میں ضم ہونے اور گھل مل

جانے کے عمل سے گزر رہے تھے، اس لئے کہ اب مدینہ منورہ کی جانب پڑوس قبائل سے بہت سے عناصر آنا شروع ہو گئے تھے اور قبائلی دائروں اور عصبیتوں سے نکل کر امت واحدہ کی صف میں شامل ہو رہے تھے۔

سب سے اہم پہلو اس کا یہ تھا کہ اس غزوہ کے ذریعہ بدر میں شریک قائدانہ نسل کو نو واردانِ اسلام کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری ادا کرنے کا موقع مل رہا تھا، اسی طرح اس کے ذریعہ کمزور نفوس کے حامل افراد کا پتہ لگانے اور نفاق کے کیمپ کے ساتھ تعلق رکھنے والوں کو معلوم کرنے کا بھی موقع مل رہا تھا، اس طور پر کہ ان کے طرزِ عمل اور حرکات و سکنات سے اس طویل سفر میں خود بخود اس کا ظہور ہو جاتا، اس لئے کہ یہ چند ساعتوں اور گھنٹوں یا چند دنوں کا مسئلہ نہیں تھا، بلکہ یہ تقریبا ایک ماہ کا سفر تھا جس میں ہر قسم کی طبیعتیں، مزاج اور طرزِ عمل کھل کر سامنے آجائیں گی اور پھر رسول اللہ ﷺ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان کی اصلاح کر لیں گے اور صاحبِ قیادت نسل کو قیادت کے فن اور سیاست کی عظمت کی تعلیم دیں گے۔

یہ ایک خاموش اور پُر سکون معرکہ تھا، لشکر اسلامی اپنے قائد کے ساتھ اس صحرائی سرزمین میں تقریبا ایک ہزار میل کی مسافت طے کرتا ہے، وہ تربیت حاصل کر رہا تھا، مختلف فنون کی مشق کر رہا تھا، اس کو آزمائشی مرحلہ سے گزارا جا رہا تھا اور آنے والے معرکوں کی تیاری کے لئے اس کی اصلاح کی جا رہی تھی۔

اللہ کے رسول ﷺ نے غزوۂ دومۃ الجندل میں نکلتے ہوئے اپنی عدم موجودگی میں سباع بن عرفطہ غفاری ؓ کو مدینہ میں اپنا جانشین مقرر فرمایا اور یہ ایک نیا تجربہ تھا، وہ نہ ہی اوس سے تعلق رکھتے تھے، نہ ہی خزرج سے اور نہ ہی قریش سے، بلکہ وہ قبیلۂ غفار سے تعلق رکھتے تھے اور قبیلۂ غفار عربوں میں رہزنوں اور ڈاکوؤں کی حیثیت سے معروف رہے تھے، اس لئے اب اس نئی نسل کے لئے ضروری تھا کہ امیر کی اطاعت و فرمانبرداری کے بارے میں اس کی تربیت کی جائے، چاہے امیر جو بھی ہو اور اس کی حیثیت سابق میں جو بھی رہی ہو۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امت کی تربیت اور ارتقاء کے بارے میں منہجِ نبوی کتنا عظیم تھا اور یہ نبوی قیادت کی عظمت اور اپنے پیروکاروں میں موجود فراست و اعتماد اور ان کی صلاحیتوں کے بارے میں واقفیت کی بھی ایک اہم دلیل ہے، چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ حضرت سباع بن عرفطہ غفاری ؓ کی صلاحیت اور ان کی عبقریت اور قیادت کی قدرت و صلاحیت سے اچھی طرح واقف تھے، اللہ کے رسول ﷺ مدینہ سے باہر بھی اپنے اصحاب کی تربیت جاری رکھتے تھے تا کہ رب العالمین کا نظام مسلمانوں کے رگ و پے میں رچ بس جائے اور اس کے ذریعہ ایک مطیع و فرمانبردار امت پیدا ہو۔ (دیکھیں: التربیۃ القیادیۃ 3/374)

....

چھٹا باب

غزوۂ بنی المصطلق

ا: بنوالمصطلق کون ہیں ؟ یہ غزوہ کب پیش آیا؟اوراس کے اسباب کیاہیں ؟

ا: بنوالمصطلق:

یہ قبیلۂ خزاعہ کی ایک شاخ ہے اور مصطلق ان کے داداہیں،ان کا نام جذیمہ بن سعد بن عمرو بن ربیعہ بن حارثہ بن عمرو بن عامر ماء السماءہے۔(حدیث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ 1/311)

خزاعہ کے بارے میں مختلف اقوال ہیں، بعض کا کہنا یہ ہے کہ وہ ایک عدنانی قبیلہ ہے، جبکہ بعض کا قول یہ ہے کہ وہ ایک قحطانی یمنی قبیلہ ہے،راجح یہ ہے- جیسے کہ اکثر علماء کا قول ہے- کہ وہ ایک قحطانی یمنی قبیلہ ہے۔(دیکھیں: مرویات غزوۃ بنی المصطلق،ص:45-51)

۲: غزوہ کی تاریخ:

اس غزوہ کی تاریخ کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے،ان سب اقوال کے جائزہ سے تین آراء سامنے آتی ہیں: بعض کا کہنا ہے کہ وہ سن چھ ہجری میں ہوا۔امام المغازی ابن اسحاق نے یہ قول بیان کیاہےاور یہی قول خلیفہ بن خیاط،ابن جریر طبری،ابن حزم،ابن عبدالبر،ابن العربی،ابن الاثیر اور ابن خلدون نے اختیار کیاہے،ان میں سے ہر ایک نے صراحت کی ہے کہ غزوۂ بنی المصطلق سن چھ ہجری کے ماہِ شعبان میں پیش آیا۔(دیکھیں: صحیح السیرۃ النبویۃ،ص:329،حدیث القرآن الکریم: 1/312)

بعض کا قول یہ ہے کہ یہ غزوہ ماہِ شعبان سن چار ہجری میں پیش آیا،یہ قول مسعودی،ابن العربی،مالکی وغیرہ نے اختیار کیاہے۔ایک گروہ کا کہنا یہ ہے کہ وہ ماہِ شعبان سن پانچ ہجری میں پیش آیا،ان علماء میں یہ نام شامل ہیں: موسی بن عقبہ،ابن سعد،ابن قتیبہ،بلاذری،ذہبی، ابن قیم،ابن حجر عسقلانی،ابن کثیر-رحمھم اللہ-جدید علماء میں اس قول کواختیار کرنے والے یہ لوگ ہیں: خضری بک،غزالی،بوطی،ابوشہبہ، شیخ ساعاتی،محمد ابوزہرہ،سید قطب، حسن مشّاط،محمد علی صابونی،محمد بکر آل عابد،مہدی رزق اللہ احمد۔(حدیث القرآن الکریم 1/312)

میرے خیال کے مطابق یہ قول چند اسباب کی بنیاد پر زیادہ راجح ہے،ان میں سے چند اسباب مندرجہ ذیل ہیں:

أ: یہی قول جمہور اصحاب سیرت ومغازی نے اختیار کیاہے،اسی طرح معاصرین میں سے جن حضرات نے سیرت پر قلم اٹھایاہے انہوں نے بھی یہی قول اختیار کیاہے۔

ب: سن چار ہجری کے ماہِ شعبان میں غزوۂ بدر دوم پیش آیا،اس لئے یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ غزوۂ بنی المصطلق اور کسی موقع پر پیش آیا۔

ج: اس قول کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کیونکہ اس غزوہ میں حضرت سعد بن معاذؓ موجود تھے،ان کا ذکر حدیث افک میں آیاہے اور واقعۂ افک غزوۂ بنی المصطلق کے ساتھ ہی پیش آیا،امام بخاریؒ نے افک والی حدیث کو بیان کیاہے، اس میں ہے:''حضرت سعد بن معاذ انصاریؓ

کھڑے ہوئے اور کہا: اے اللہ کے رسولؐ! میں آپ کی مدد کروں گا، اگر وہ شخص قبیلہ ٔاوس کا ہوگا تو میں اس کی گردن ماردوں گا، اور اگر وہ ہمارے قبیلہ کا ہوا تو آپ اس کے متعلق جو بھی حکم دیں گے ہم بجالائیں گے"۔ (صحیح بخاری: 4750، صحیح مسلم:2770)

اور حضرت سعد بن معاذؓ کی وفات غزوۂ بنی قریظہ کے ساتھ ساتھ ہی ہوئی، اور غزوۂ بنی قریظہ ماہ ذیقعدہ سن پانچ ہجری میں راجح قول کے مطابق پیش آیا، اس لئے یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ غزوہ بنی المصطلق اس سے پہلے پیش آیا۔ (مزید تفصیل کے لئے دیکھیں: مرویات غزوۃ بنی المصطلق، ص: 97)

۳: غزوۂ بنی المصطلق کے اسباب:

اس غزوہ کے اہم اسباب مندرجہ ذیل ہیں:

أ: بنی المصطلق قبیلہ نے معرکہ ٔاحد میں قریش کی تائید کی اور ان کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف شریک رہا۔

ب: مکہ جانے والے بنیادی اور مرکزی راستہ پر اس قبیلہ کا کنڑول تھا، اس لئے وہ مکہ پر اثر انداز ہونے کے لئے مسلمانوں کے لئے ایک اہم رکاوٹ تھا۔

ج: رسول اللہ ﷺ کو یہ اطلاعات ملیں کہ بنی المصطلق آپؐ کے خلاف جمع ہو رہے ہیں اور ان کی قیادت حارث بن أبي ضرار کر رہا تھا جو ان کو منظم کر رہا تھا، جب آپؐ نے ان کے بارے میں یہ خبر سنی تو آپؐ ان کی طرف نکلے، یہاں تک کہ ان کے ایک چشمہ کے پاس ان کے ساتھ مڈبھیڑ ہوئی، اس چشمہ کا نام 'مریسیع' تھا اور ساحل کی جانب قُدید کے ایک طرف تھا، آپؐ نے ان کو بُری طرح شکست دی۔ (حدیث القرآن الکریم عن غزوات الرسول 1/315)

۴: غزوۂ بنی المصطلق کے واقعات:

جب رسول اللہ ﷺ کو بنو المصطلق کی مشکوک نقل و حرکت کی اطلاع ملی تو آپؐ نے اس سلسلہ میں تحقیق کے لئے بریدہ بن حصیب اسلمیؓ کو بھیجا، بریدہؓ نے ان کے سامنے یہ ظاہر کیا کہ وہ ان کی مدد کے لئے آئے ہیں، انہوں نے ان کے قصد وارادہ کو معلوم کر لیا اور پھر رسول اللہ ﷺ کو اس کے بارے میں باخبر کر دیا، سن پانچ ہجری کے ماہِ شعبان کی دو (۲) تاریخ کو رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ سے سات سو مجاہدین اور تیس گھوڑ سواروں کے ساتھ بنو المصطلق کی طرف نکلے، بنو المصطلق کے لوگ وہ تھے جن تک اسلام کی دعوت پہنچ چکی تھی اور وہ غزوۂ احد میں کفار کے ساتھ شریک رہے تھے اور وہ مسلمانوں کے خلاف لشکر کشی کے لئے فوج جمع کر رہے تھے، امام بخاریؒ (2541) اور امام مسلمؒ (1730) نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان پر اس حال میں حملہ کیا جبکہ وہ غافل تھے اور ان کے چوپائیوں اور جانوروں کو چشمہ پر پانی پلایا جا رہا تھا، آپؐ نے ان کے جنگجوؤں کو قتل کیا، ان کے بچوں کو گرفتار کیا، اسی دن آپؐ نے جویریہ بنت حارث بن أبي ضرار کو حاصل کیا۔ (السیرۃ النبویۃ فی ضوء المصادر الاصلیۃ، ص: 433)

۲: حضرت جویریہ بنت حارث کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا نکاح:

اللہ کے رسول ﷺ نے بنو المصطلق کے قیدیوں کو تقسیم کیا، ان قیدیوں میں جویریہ بنت حارثؓ بھی تھیں اور وہ اپنی قوم کے لئے برکت کا باعث بنیں، ان کا قصہ ہم سیدہ عائشہؓ کی زبانی سنتے ہیں، وہ فرماتی ہیں: جب رسول اللہ ﷺ نے بنو المصطلق کے قیدیوں کو تقسیم فرمایا توثابت بن قیس بن شماس یا ان کے چچازاد بھائی کے حصہ میں حضرت جویریہ بنت حارثؓ آئیں، انہوں نے ان کے ساتھ مکاتبت کر لی۔ (مکاتبت: یعنی اپنے آقا کو مال دے کر آزاد ہو جانا) اور وہ شیریں، ملیح اور صاحبِ حسن و جمال خاتون تھیں جو بھی ان کو دیکھتا تو متاثر ہو جاتا، وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تا کہ آپؐ سے اپنی کتابت (مال کی ادائیگی) کے سلسلہ میں مدد حاصل کریں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: اللہ کی قسم! جیسے ہی میں نے ان کو اپنے حجرے کے دروازے پر دیکھا تو میں نے ان کو ناپسند کیا اور میں جان گئی کہ آپؐ اب ان کو دیکھ لیں گے۔ چنانچہ وہ آپ ﷺ کی بارگاہ میں داخل ہو گئیں اور عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! میں سردارِ قوم حارث بن اَبی ضرار کی بیٹی جویریہ ہوں، میں ایسی آزمائش میں مبتلا ہوں جو آپ پر مخفی نہیں ہے، اب میں ثابت بن قیس بن شماس- یا کہا ان کے چچازاد بھائی- کے حصہ میں آئی ہوں، میں نے ان کے ساتھ اپنے بارے میں مکاتبت کر لی ہے، اس لئے اب میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں تا کہ اپنے بدلِ کتابت کے بارے میں آپ سے مدد حاصل کروں۔ آپؐ نے فرمایا: کیا آپ اس سے بہتر بات پسند کرتی ہیں؟ انہوں نے دریافت کیا: اس سے بہتر کیا ہوگا؟ اے اللہ کے رسولؐ! آپؐ نے فرمایا: میں آپ کی طرف سے بدلِ کتابت ادا کروں گا اور آپ کو اپنی زوجیت کا شرف عطا کروں گا۔ انہوں نے جواب دیا: ٹھیک ہے، اے اللہ کے رسولؐ! میں اس کے لئے تیار ہوں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: یہ خبر لوگوں تک پہنچ گئی کہ رسول اللہ ﷺ نے جویریہؓ بنت حارث سے نکاح فرمایا ہے۔ لوگوں نے کہا: یہ تو رسول اللہ ﷺ کے اصہار (سسرالی رشتہ دار) ہیں۔ اس لئے انہوں نے سب کو آزاد کر دیا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: ان کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے نکاح کرنے کی وجہ سے بنو المصطلق کے سو گھرانے آزاد کئے گئے، مجھے کسی ایسی عورت کا علم نہیں ہے جو اپنی قوم کے حق میں ان سے زیادہ بابرکت ہو۔ (مسند أحمد: 6/277، سنن ابو داؤد: 3931، ابن حبان: 4054، 4055 سیرت ابن ہشام: 3/307، البدایہ والنہایہ 4/160)

اس غزوہ کے بعد حارث بن اَبی ضرار اپنی بیٹی کو آزاد کرانے کے لئے مدینہ آئے تو نبی کریم ﷺ نے اس کو اسلام کی دعوت دی اور انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ (حدیث القرآن الکریم عن غزوات الرسول ﷺ 1/317)

غزوۂ بنی المصطلق کا شمار ان منفرد و مبارک غزوات میں ہوتا ہے جس کے بعد ایک پورے قبیلہ نے اسلام قبول کیا، جس واقعہ کی وجہ سے پورے قبیلہ نے اسلام قبول کیا وہ یہ تھا کہ صحابہ کرام نے تمام قیدیوں کو آزاد کر دیا، اور ان کو اپنے اقرباء اور رشتہ داروں کے پاس واپس بھیج دیا، حالانکہ ان کو وہ مالِ غنیمت میں حاصل ہوئے تھے، انہوں نے اس بات کو مناسب نہیں سمجھا کہ اپنے نبی کے اصہار کو اپنے ماتحت اور ملکیت میں رکھیں اور اس اجتماعی آزادی کے بدلہ میں اور اس منفرد اور بے مثال حسنِ سلوک کی وجہ سے پورا قبیلہ اللہ کے دین میں داخل ہوا۔

یقیناً اس تاریخی واقعہ کی بنیاد اور بنیادی سبب نبی کریم ﷺ کے ساتھ صحابہ کرام کی محبت و تکریم اور آپؐ کی عظیم شخصیت کی تعظیم ہے، اس طرح سے محبتِ نبوی یہ پاکیزہ پھل دیتی ہے اور تاریخ میں اس طرح کے کارہائے نمایاں انجام دینے کا سبب بنتی ہے۔

بلا شبہ حضرت جویریہؓ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے نکاح کے بہترین نتائج سامنے آئے اور یہ بہترین نتائج ان کی قوم کے حلقہ بگوش اسلام میں داخل ہونے کے ذریعہ سامنے آئے، اس نکاح کا مقصد یہ بھی تھا کہ ان کی قوم اسلام میں داخل ہو اور اس کے ذریعہ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوگا اور اسلام کو عزت و سربلندی ملے گی، اور یہ ایک دور رس نتائج کی حامل اور اسلامی مصلحت تھی، اللہ تعالیٰ نے اس نکاح کو آسان بنایا، اس کو بابرکت بنایا، اور اس کے ذریعہ پیشِ نظر مقصد کو پورا کیا اور حضرت جویریہؓ کے قبولِ اسلام کی وجہ سے پورا قبیلہ حلقہ بگوش اسلام ہوا۔

اس کے نتیجہ میں یہ نکاح مسلمانوں کے لئے برکت و قوت اور مادی اور معنوی مدد کا ذریعہ بنا، اسلام کے لئے بھی اور مسلمانوں کے لئے بھی۔ (دیکھیں: صور وعبر من الجهاد النبوی فی المدینہ، ص: 199-200)

حضرت جویریہؓ بنت حارث سید المرسلین کی شریکِ حیات اور زوجہ کے شرف سے سرفراز ہوئیں اور تمام اہلِ ایمان کے لئے ماں (اُم المؤمنین) کے مقام پر فائز ہوئیں، چنانچہ آپؓ جو کچھ زبانِ نبوت سے سنتی تھیں اس کی عالمہ، اور جو کچھ جانتی تھیں اس پر عمل کرنے والی تھیں، آپؓ فقیہہ، عابدہ، متقی و پرہیزگار، صاف دل، روشن دماغ، پاکیزہ روح کی حامل تھیں، اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت کرتی تھیں اور مسلمانوں کے لئے خیر کو پسند کرتی تھیں۔

حضرت جویریہؓ رسول اللہ ﷺ کی احادیث روایت کرتی تھیں، رسول اللہ ﷺ پر جو علمِ نبوت نازل ہوتا تھا اس خزانہ سے دینی حقائق کو نقل کرتی تھیں اور پھر ان سے علمائے صحابہؓ میں سے جبالِ علم روایت کرتے تھے تاکہ مسلم معاشرہ میں علم و عمل کو عام کریں اور عمومی معاشرہ میں دعوت وہدایت کو پھیلائیں۔ (دیکھیں: محمد رسول اللہ ﷺ، محمد صادق عرجون: 4/250)

ان سے روایت کرنے والوں میں ابن عباسؓ، عبید بن السباق، ابن عباسؓ کے غلام کریب، مجاہد اور ابو ایوب یحیی بن مالک اُزدی شامل ہیں، بقی بن مخلد کی کتاب میں ان کی مسند کی احادیث کی تعداد سات ہے۔ (دیکھیں: دور المرأة فی خدمة الحدیث، آمال قرادش، ص: 88)

ان میں سے چار احادیث کتب ستہ میں ہیں، صحیح بخاری میں ایک حدیث اور صحیح مسلم میں دو حدیثیں ہیں، سات احادیث کی وجہ سے اُم المؤمنین جویریہ بنت حارثؓ نے عالمِ روایت میں اپنا نام جاوداں بنا دیا۔ (أیضاً: 88-89)

اُم المؤمنین حضرت جویریہ بنت حارثؓ بہت زیادہ اللہ کا ذکر کرنے والی، پرہیزگار، صبر و ثبات کی حامل، اللہ کی حمد و تسبیح اور مناجات کرنے والی تھیں، اُم المؤمنین حضرت جویریہؓ بذات خود بیان کرتی ہیں اور فرماتی ہیں: نبی کریم ﷺ صبح کے وقت ان کے ہاں سے اس وقت نکلے جب آپؐ نے صبح کی نماز ادا کی جبکہ وہ اپنی نماز پڑھنے کی جگہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ سورج طلوع ہونے کے بعد واپس تشریف لائے اور وہ اسی حال میں بیٹھی ہوئی تھیں، آپؐ نے فرمایا: آپ ابھی تک اسی حالت میں بیٹھی ہوئی ہو جیسے کہ میں چھوڑ کر گیا تھا؟ انہوں نے جواب دیا: جی ہاں! نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میں نے یہاں سے جانے کے بعد چار کلمات تین مرتبہ کہے ہیں، اگر ان کا وزن اور اُس کا وزن کیا جائے جو کچھ آپ نے آج کہا تو میرے کہے ہوئے کلمات کا پلڑا بھاری نکلے گا: " سُبْحَانَ اللَّهِ وَبِحَمْدِهِ عَدَدَ خَلْقِهِ، وَرِضَى

نَفْسه، وَزِنَةَ عَرْشه، وَمِدَادَ كَلِمَاته"۔ (مسند احمد: 1/258، صحیح مسلم: 2726، سنن ابو داؤد: 1503، السنن الکبری للنسائی: 1277-9912)

حضرت جویریہؓ کی وفات سن پچاس (۵۰) ہجری میں ہوئی، یہ بھی کہا گیا ہے کہ سن چھپن (۵۶) میں آپؓ کی وفات ہوئی۔ (طبقات ابن سعد: 8/121، تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص234)

۳: منافقین کے ذریعہ مہاجرین وانصار کے مابین فتنہ پروری کی کوشش:

غزوہ بنی المصطلق میں مسلمانوں کے ساتھ منافقین کی ایک بڑی تعداد نکلی، ان میں سے اکثریت ان لوگوں کی تھی جو سابقہ غزوات میں پیچھے رہنے والوں میں شامل تھے، لیکن انہوں نے جب پے درپے مسلمانوں کی نصرت وفتوحات کا مشاہدہ کیا، وہ مالِ غنیمت کے لالچ میں نکل پڑے۔ (حدیث القرآن الکریم: 1/318)

مریسیع چشمہ کے پاس منافقین نے اس کینہ اور عداوت کا اظہار کر دیا جس کو وہ اسلام اور مسلمانوں کے تئیں پوشیدہ رکھے ہوئے تھے، اسلام کو جب بھی کوئی نئی فتح ملتی تو ان کے غیظ وحسد میں مزید اضافہ ہوتا، وہ اس دن کو دیکھنے کے لئے تڑپ رہے تھے جبکہ مسلمانوں کو شکست ہو جاتی، لہذا جب مریسیع میں مسلمانوں کو فتح وکامیابی ملی تو منافقین نے مہاجرین وانصار کے مابین عصبیت کو بھڑکانے کی کوشش کی، لیکن جب ان کی یہ کوشش ناکام ہوئی تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی اور آپؐ کے اہلِ بیت کو ایذاء رسانی کا نشانہ بنانے کی کوشش کی، انہوں نے خود ساختہ واقعہ افک کے ذریعہ ایک المناک نفسیاتی جنگ چھیڑ دی، صحابی جلیل زید بن اَرقمؓ جو اس واقعہ کے عینی شاہد اور شریک ہیں وہ اس کی تفصیل بیان کرتے ہیں فرماتے ہیں: میں ایک غزوہ میں تھا تو میں نے عبداللہ بن اُبَی کو کہتے ہوئے سنا: جو لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس ہیں ان پر خرچ مت کرو تاکہ وہ ان کے پاس سے بھاگ جائیں، اور اگر ہم اب مدینہ واپس جائیں گے تو عزت والا وہاں سے ذلت والوں کو نکال باہر کرے گا۔ میں نے اس کا ذکر اپنے چچا سعد بن عبادہؓ جو کہ خزرج کے سردار تھے، سے کیا، انہوں نے اس کا ذکر نبی کریم ﷺ سے کیا، نبی کریم ﷺ نے مجھے بلایا، میں نے تمام باتیں آپؐ کو بتا دیں۔ نبی کریم ﷺ نے عبداللہ بن اُبَی اور اس کے ساتھیوں کو بلایا۔ انہوں نے قسم کھالی کہ انہوں نے اس طرح کی کوئی بات نہیں کہی ہے، اس پر نبی کریم ﷺ نے مجھ کو جھوٹا سمجھا اور عبداللہ کو سچا سمجھا، مجھے اس کا اتنا صدمہ ہوا کہ ایسا صدمہ کبھی نہ ہوا تھا، پھر میں گھر میں بیٹھ گیا، میرے چچا نے مجھ سے کہا: میرا خیال نہیں تھا کہ نبی کریم ﷺ تمہاری تکذیب کریں گے اور تم پر ناراض ہوں گے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل کیں: ﴿إِذَا جَآءَكَ ٱلْمُنَٰفِقُونَ قَالُوا۟ نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُولُ ٱللَّهِ ۗ وَٱللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُولُهُۥ وَٱللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّ ٱلْمُنَٰفِقِينَ لَكَٰذِبُونَ﴾ ترجمہ: "اے نبیؐ، جب یہ منافق تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں۔ ہاں، اللہ جانتا ہے کہ تم ضرور اُس کے رسول ہو، مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق قطعی جھوٹے ہیں"۔ (سورۃ المنافقون: 1)

اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے مجھے بلوایا اور اس سورت کی تلاوت کی اور فرمایا کہ: اے زید! اللہ تعالیٰ نے تم کو سچا کر دیا ہے۔(صحیح بخاری: 4900، صحیح مسلم: 2772، السیرۃ النبویہ الصحیحہ: 2/408)

اور عینی شاہد حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ بھی اس واقعہ کو بیان کرتے ہیں جو کہ مریسیع چشمہ کے پاس پیش آیا، اور اس کے نتیجہ میں منافقین نے عصبیت کو بھڑکانے والی گفتگو کی اور مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کی۔ فرماتے ہیں: ہم ایک غزوہ میں تھے، مہاجرین میں سے ایک آدمی نے انصار کے ایک شخص کو لات ماری۔ انصاری نے کہا: اے انصار کے لوگو! اور مہاجر نے کہا: اے مہاجرو! رسول اللہ ﷺ نے بھی یہ باتیں سن لیں اور فرمایا: یہ جاہلیت کی پکار کیسی ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ اے اللہ کے رسولؐ! ایک مہاجر نے ایک انصاری کو لات ماری۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اس طرح کی جاہلیت کی پکار کو ترک کر دو، اس لئے کہ یہ انتہائی بدبودار ہے۔ عبداللہ بن اُبی نے بھی یہ بات سنی تو کہا: اچھا اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے؟! خدا کی قسم! جب ہم مدینہ لوٹیں گے تو ہم سے عزت والا ذلیلوں کو نکال باہر کر دے گا۔ اس کی خبر نبی کریم ﷺ کو پہنچ گئی تو عمرؓ کھڑے ہوئے اور کہا: اے اللہ کے رسولؐ! مجھے اجازت دیں میں اس منافق کی گردن اڑا دوں گا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: رہنے دو! لوگ یہ نہ کہیں کہ محمدؐ اپنے ہی ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں۔(صحیح بخاری: 3518، صحیح مسلم: 2584)

ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے کہا: اس کے بارے میں عباد بن بشر کو حکم دے دیں وہ اس کو قتل کر دیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے عمر! اس وقت کیا ہوگا جب لوگ کہیں گے کہ محمدؐ اپنے ہی ساتھیوں کو قتل کرتا ہے، نہیں! بلکہ یہاں سے کوچ کرنے کا اعلان کر دو۔ یہ ایسا وقت تھا جس میں رسول اللہ ﷺ کوچ نہیں کرتے تھے، اس کے بعد وہاں سے لوگوں نے کوچ کر لیا۔ (تفسیر طبری: 28/115، سیرت ابن ہشام: 3/303)

عبداللہ بن اُبی بن سلول کو جب یہ معلوم ہوا کہ زید بن اَرقمؓ نے رسول اللہ ﷺ کو وہ بات بتلا دی ہے جو انہوں نے اس سے سنی تو وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس گیا اور اللہ کی قسم کھا کر کہنے لگا کہ اس نے ایسا کچھ نہیں کہا ہے اور نہ ہی اس نے اس کے بارے میں کوئی بات کی ہے! رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں موجود بعض انصار صحابہ نے کہا کہ اے اللہ کے رسولؐ! ہو سکتا ہے کہ اس لڑکے کو اس کی بات سننے میں وہم ہو گیا ہو۔

جب رسول اللہ ﷺ نے وہاں سے کوچ کیا تو اُسید بن حضیرؓ سے آپ ﷺ کی ملاقات ہوئی، انہوں نے آپؐ کو نبوت کا سلام کیا اور پھر کہا: اے اللہ کے نبیؐ! آپ نامناسب وقت میں سفر کر رہے ہیں، اس طرح کے وقت میں آپ سفر نہیں کرتے تھے! رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: آپ کو معلوم نہیں آپ کے صاحب نے کیا کہا ہے؟ انہوں نے دریافت کیا: اے اللہ کے رسولؐ! کون صاحب؟ آپؐ نے فرمایا: عبداللہ بن اُبی۔ انہوں نے پوچھا: اس نے کیا کہا؟ آپؐ نے فرمایا: اس کا خیال یہ ہے کہ اگر وہ مدینہ واپس لوٹے گا تو عزت والا ذلیل کو وہاں سے نکال دے گا۔ انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! اگر آپ چاہیں گے تو آپ اس کو وہاں سے نکالیں گے، وہ ذلیل ہے اور آپ عزت والے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ! اس کے ساتھ نرمی کا معاملہ فرمائیں۔ اللہ کی قسم! اللہ نے آپ کو ہمارے

پاس بھیجا جب کہ اس کی قوم اس کی تاج پوسی کے لئے مونگوں کا تاج تیار کر رہی تھی، اس لئے وہ سمجھتا ہے کہ آپ نے اس کی بادشاہت کو سلب کیا ہے۔

اس کے بعد اللہ کے رسول ﷺ اس روز لوگوں کو لے کر چلتے ہی رہے یہاں تک کہ شام ہو گئی اور پھر رات بھر چلتے رہے یہاں تک کہ صبح ہو گئی اور دوسرے روز کے ابتدائی حصہ میں بھی چلتے رہے یہاں تک کہ دھوپ سے ان کو تکلیف ہونے لگی، اس کے بعد آپؐ نے اور تمام لوگوں نے پڑاؤ ڈالا جیسے ہی وہ زمین پر بیٹھے تو فوراً ان کو نیند آگئی۔ ایسا اللہ کے رسول ﷺ نے اس لئے کیا تاکہ لوگوں کو پہلے روز کی باتوں کے بارے میں مشغول رکھیں، اس کے بعد وہ سورت نازل ہوئی جس میں ابن اُبی کے ذکر کے ساتھ منافقین کا ذکر کیا گیا ہے، جب یہ سورت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے زید بن اُرقمؓ کا کان پکڑا اور فرمایا: یہ وہ شخص ہیں جن کے سننے کی اللہ نے تصدیق کی ہے۔ (تفسیر طبری: 28/116، سیرت ابن ہشام: 3/305، السیرۃ النبویہ الصحیحۃ: 2/409)

سیرت نبویہ کے اس واقعہ میں بہت سے دروس واسباق اور فوائد وعبرتیں موجود ہیں، ان میں سے اہم ترین مندرجہ ذیل ہیں:

ا: سیاسی مقام اور داخلی صف کی وحدت کی حفاظت:

یہ اہم ترین نکتہ اللہ کے رسول ﷺ کے اس قول سے ظاہر ہوتا ہے: "اے عمرؓ! اس وقت کیا ہو گا جب لوگ کہیں گے کہ محمدؐ اپنے ہی ساتھیوں کو قتل کرتا ہے؟!"۔

یہ سیاسی مقام کی مکمل حفاظت کی واضح دلیل ہے، ایک پہلو تو یہ ہے کہ لوگ یہ باتیں کریں کہ محمد ﷺ کے ساتھ اصحاب محمدؐ کتنی محبت کرتے ہیں، اور اس کی تاکید وتائید ان کے بڑے قائد ابوسفیان کی زبانی ہو کہ وہ کہنے پر مجبور ہو کہ میں نے کسی کو کسی سے اس طرح محبت کرتے ہوئے نہیں دیکھا ہے جیسے کہ محمدؐ کے اصحاب محمدؐ سے محبت کرتے ہیں۔ جبکہ دوسرا پہلو یہ ہے کہ لوگ یہ باتیں کریں کہ محمد ﷺ اپنے اصحاب کو قتل کرتے ہیں۔ ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ (التربیۃ القیادیۃ: 3/463)

یقیناً اس کے پس پردہ خطرناک کوششیں جاری تھیں جن کے ذریعہ دشمن کوشش کرتا تھا کہ مدینہ میں داخلی صفوں میں داخل ہوں، لیکن اس محبت کے سامنے اور ان عظیم قربانیوں کے سامنے وہ اس طرح کے مقاصد حاصل کرنے کے بارے میں ناامید ہو چکے تھے۔

نبی کریم ﷺ نے اس سازش کے حوالہ سے سلبی موقف اختیار نہیں کیا جس کی قیادت ابن سلول کر رہا تھا تاکہ وہ اس سازش کے ذریعہ مسلم صف میں انتشار پیدا کرے اور مسلم سوسائٹی میں جاہلی نعروں کو پھر سے زندہ کرے، بلکہ اللہ کے رسول ﷺ نے اس کے مقابلہ میں مندرجہ ذیل ایجابی اقدامات کئے:

أ: اللہ کے رسول ﷺ اس روز لوگوں کو لے کر چلتے رہے یہاں تک کہ شام ہو گئی اور رات بھر چلتے رہے یہاں تک کہ صبح ہو گئی اور دوسرے روز کے ابتدائی حصہ میں بھی چلتے رہے یہاں تک کہ دھوپ کی وجہ سے ان کو تکلیف ہونے لگی، اس کے بعد پڑاؤ ڈالا، جیسے ہی لوگ زمین پر بیٹھے تو فوراً ہی ان کو نیند آگئی۔ (السیرۃ النبویۃ، ابوشہبہ: 2/225)

اس طرح سے انتہائی دانشمندانہ حکمتِ عملی کے ذریعہ آپ ﷺ نے اس فتنہ کو کلی طور پر دفن کر دیا اور ابن اُبی نے جو کچھ کہا تھا اس پر تبصرہ کرنے کا موقع ہی فراہم نہیں کیا۔

ب: نبی کریم ﷺ نے ابن سلول اور اس کی سازش کا مقابلہ طاقت کے ذریعہ اور اسلحہ کا استعمال کر کے نہیں کیا تاکہ مسلم صف کا اتحاد پارہ پارہ نہ ہو، اس لئے کہ ابن اُبی کے بعض مسلمانوں میں سے ہی فریب خوردہ پیروکار اور چاہنے والے لوگ تھے، اگر آپ ﷺ اس کے ساتھ تعرض کرتے تو اس کے دفاع میں اس کے پیروکار ناک بھوں چڑھالیتے اور جذباتی لوگ اس کے دفاع میں اٹھ کھڑے ہوتے، وہ جذبات میں مسلم صف کے اتحاد کو پارہ پارہ کر سکتے تھے، اس میں مسلمانوں کا یا اسلام کا کوئی فائدہ نہیں تھا، نبی کریم ﷺ نے جو حکمتِ عملی اختیار کی، یقیناً یہ سخت حالات میں دانشمندی اور دوراندیشی کے ساتھ اعصاب پر کنٹرول رکھتے ہوئے حکیمانہ شرعی سیاست ہے، حکمت و دانشمندی، سیاست اور مختلف امور کی تدبیر وانجام دہی کا تعلق آپؐ کے نبی اور رسول ہونے سے ہے تاکہ امت بھی آپ کے عظیم طرزِ عمل کو اپنے لئے اُسوہ اور نمونہ بنا سکے۔

رئیس المنافقین کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے تسامح اور بُردباری کے بعد میں دوررس نتائج سامنے آئے، چنانچہ ابن اُبی بن سلول جب بھی کوئی حرکت کرتا تھا تو اس کی قوم کے لوگ اس کی سرزنش کرتے تھے اور اس کو برا بھلا کہتے تھے، اور اس کو قتل کرنے کی پیشکش بار بار نبی کریم ﷺ کے سامنے کرتے تھے، اللہ کے رسول ﷺ اس کو منظور نہیں فرماتے تھے اور عفو و درگذر سے کام لیتے تھے۔ اسی لئے اللہ کے رسول ﷺ حق کی تلوار (عمرؓ) کے سامنے اپنی حکیمانہ سیاست کے آثار و نتائج کی وضاحت فرماتے ہوئے کہتے ہیں: اے عمر، تمہارا کیا خیال ہے؟ اللہ کی قسم! جس روز آپ نے اسے قتل کرنے کی بات کہی تھی اگر میں نے اسے اس دن قتل کیا ہوتا تو لوگوں نے اپنی ناک بھوئیں چڑھائی ہوتیں، اگر آج آپ وہ مشورہ دیتے تو میں اس کو قتل کرتا۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے کہا: واللہ! میں جان گیا کہ رسول اللہ ﷺ کا فیصلہ میرے مشورہ کے مقابلہ میں زیادہ باعثِ برکت تھا۔ (تفسیر طبری: 28/116، السیرۃ النبویۃ، ابوشہبہ: 2/257، سیرت ابن ہشام: 3/305)

۲: اُبی بن سلول کے ساتھ نرمی کا معاملہ:

اُبی بن سلول کا ایک صاحبِ ایمان اور مخلص بیٹا تھا جس کا نام عبداللہ بن عبداللہ بن ابی بن سلول تھا، جب ان کو ان واقعات کا علم ہوا اور اس سلسلہ میں سورت نازل ہوئی تو وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور آپؐ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ آپ میرے باپ ابن سلول کو ان باتوں کی وجہ سے قتل کرنا چاہتے ہیں جو کچھ آپ کو اس کے بارے میں معلوم ہوئی ہیں۔ اگر آپ ایسا کرنے والے ہیں تو مجھے ہی اس کے بارے میں حکم دیں میں آپ کے پاس اس کا سر لے کر آؤں گا، واللہ! خزرج کے لوگوں کو معلوم ہے کہ اس پورے قبیلہ میں مجھ سے زیادہ اپنے والد کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے والا کوئی نہیں ہے، جب آپ میرے علاوہ کسی اور شخص کو اسے قتل کرنے کا حکم دیں گے تو مجھے اندیشہ ہے کہ میں اپنے والد کے قاتل کو لوگوں کے مابین چلتے ہوئے نہیں دیکھ پاؤں گا، جس کی وجہ سے میں اسے قتل کر دوں گا، اور میں ایک مؤمن شخص کو کافر کے بدلہ قتل کرنے کا مرتکب ہو جاؤں گا، نتیجتاً میں جہنم میں داخل ہوں گا، یہ سن کر اللہ کے

رسول ﷺ نے فرمایا: ”نہیں! بلکہ ہم اس کے ساتھ نرمی کا معاملہ کریں گے اور جب تک وہ ہمارے ساتھ رہے گا اس کے ساتھ اچھی طرح پیش آئیں گے“۔(تفسیر طبری: 28/116، سیرت ابن ہشام: 3/305، البزار: 2708، المعجم الاوسط للطبرانی: 231، مجمع الزوائد: 9/318)

جب مسلمان مدینہ کے قریب پہنچے تو حضرت عبد اللہ اپنے والد عبد اللہ بن اُبی کے سامنے کھڑے ہوئے اور اس سے کہا: رکو، واللہ! آپ اس وقت تک مدینہ میں داخل نہیں ہو سکتے ہیں جب تک کہ رسول اللہ ﷺ اس کی اجازت نہ دے دیں، جب رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو انہوں نے اس سلسلہ میں اجازت طلب کی تو آپؐ نے اس کو اجازت دے دی۔(الولاء والبراء في الاسلام، القحطانی، ص: 209)

۳: ایمان کا اعلیٰ ترین نمونہ:

حضرت عبد اللہ بن عبد اللہ بن اُبی ابن سلول نے ایمان کا اعلیٰ ترین نمونہ اور اعلیٰ ترین مثال عملی شکل میں پیش کی جبکہ انہوں نے اپنے والد کے بارے میں ایمانی اور غیرت مندانہ موقف اختیار کیا، اللہ اور اس کے رسولؐ کے لئے اخلاص کا ثبوت فراہم کیا اور باپ کی محبت اور رضامندی کے مقابلہ میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت کو مقدم رکھا، یقیناً بیٹے نے ایمان وایثار اور قرابت کے جذبات کو قربان کر کے بے نظیر اور عمدہ مثال پیش کی، اس لئے بڑے دل کی حامل اور اعلیٰ اخلاق سے آراستہ شخصیت نے بھی عفو ودر گذر اور حسنِ سلوک کا معاملہ کیا اور فرمایا: ”نہیں! بلکہ ہم اس کے ساتھ نرمی کا معاملہ کریں گے اور جب تک وہ ہمارے ساتھ رہے گا اس کے ساتھ اچھی طرح پیش آئیں گے“۔

عفو ودر گذر کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے؟! عظمتِ نبوی کے کیا کہنے! نبی کریم ﷺ نے اس عظیم صحابی کے ساتھ لطف وکرم کا معاملہ فرمایا، ان کے اندیشوں اور خوف کو دور کیا اور ان کو لاحق پریشانی کو بھی دور کیا۔(دیکھیں: محمد رسول اللہ ﷺ، محمد صادق عرجون: 3/163، السیرۃ النبویۃ، ابو شہبہ: 2/257)

۴: جاہلی عصبیت کے خلاف جنگ:

ناپسندیدہ عصبیت جس کو ہم جاہلیت بھی کہتے ہیں وہ صرف قبائلی عصبیت تک ہی محدود نہیں ہے، یعنی ایک نسب اور قبیلہ میں اشتراک جس کی طرف وہ نسبت کرتے ہیں، بلکہ اس میں وہ معنوی اور فکری اور صفاتی اشتراک بھی شامل ہے جس کی بنیاد پر مشرکین حق وناحق باہم ایک دوسرے کا تعاون ونصرت کرتے ہیں اور اسی بنیاد پر ان کی دوستی قائم ہوتی ہے، چنانچہ جب مہاجرین میں سے ایک شخص نے ایک انصاری شخص کو لات ماری تو انصاری نے کہا: اے انصار کے لوگو! اور مہاجرین نے کہا: اے مہاجرین! جب نبی کریم ﷺ نے یہ سنا تو فرمایا: یہ کیسی جاہلیت کی پکار ہے؟! لوگوں نے کہا: ایک مہاجر نے ایک انصاری شخص کو لات ماری، یہ سن کر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اس طرح کی جاہلیت کی پکار کو ترک کر دو، اس لئے کہ یہ انتہائی بدبودار ہے۔(دیکھیں: السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ: 2/209)

نبی کریم ﷺ نے اس پکار کو ناپسند فرمایا، اس لئے کہ اس میں عصبیت کی بو آرہی تھی، حالانکہ پکارنے والے شخص نے ایسا لفظ استعمال کیا تھا جس کو قرآن نے استعمال کیا ہے، یعنی مہاجرین وانصار۔ چنانچہ مہاجر شخص نے مہاجرین کو نصرت ومدد کے لئے پکارا حالانکہ اسی

نے لات ماری تھی، گویا کہ وہ اپنی اس پکار کے ذریعہ ان سے مدد چاہ رہا تھا، اس لئے کہ ان میں اور اس مہاجر شخص میں ہجرت کی صفت میں اشتراک پایا جاتا تھا، اسی طرح انصاری شخص نے انصار کو مدد کے لئے پکارا، اس لئے کہ اس کا تعلق انہی سے تھا، اور ان میں اور اس میں انصار کی صفت کے اعتبار سے اشتراک پایا جاتا تھا، اس لئے کہ دونوں کو اگر کسی اور کو مدد کے لئے پکارنا ضروری تھا تو ان کو اسلام کی صفت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے تمام مسلمانوں کو مدد کے لئے پکارنا چاہیے تھا، لہذا داعیانِ حق سے مطلوب یہ ہے کہ عصبیت کی تمام انواع واقسام کو ترک کر دیں، چاہے یہ عصبیت قبائلی بنیادوں پر قائم ہو یا کسی دوسری اساس پر، جیسے کہ ملک، مذہب، جماعت، نسل، رنگ، خون یا جنس۔ اور دوستی اور نصرت صرف اخوت اسلامی کی بنیاد پر قائم ہو جیسے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "إنما المؤمنون إخوة" اسی طرح سے ان کے مابین ایک دوسرے کی نصرت حق کی بنیاد پر ہو نہ کہ باطل کی بنیاد پر، یعنی صاحبِ حق کی مدد کریں اور اسی کا ساتھ دیں نہ کہ زیادتی کرنے والے کا ساتھ دیں۔ (المستفاد من قصص القرآن للدعوة والدعاة: 2/301)

اللہ کے رسول ﷺ نے یہ واضح کر دیا کہ عصبیت کا تعلق جاہلیت سے ہے، اسی طرح آپ ؐ نے یہ فرمایا کہ "اپنے بھائی کی مدد کرو، چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم"۔ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: جب وہ مظلوم ہو تو میں اس کی مدد کروں گا لیکن جب وہ ظالم ہو تو میں اس کی مدد کیسے کروں گا؟ آپ ؐ نے فرمایا: اس کو ظلم سے روکو یہی اس کی مدد ہے۔ (صحیح بخاری: 6952، سنن ترمذی: 2255، مسند أحمد: 3/201)

لہذا آپ ﷺ نے ایک دوسرے کی نصرت و مدد کی بنیاد حق و انصاف پر قائم کی ہے اور جاہلیت کے تمام مفاہیم اور دعوؤں کو باطل قرار دیا ہے، بلاشبہ داعیانِ حق اور طالبینِ علوم نبوت اور فقہاء کی ذمہ داری ہے کہ ہر قسم کی عصبیت سے آزاد ہوں، اسی طرح تمام مسلمانوں کو بھی اس پہلو کی جانب متوجہ کریں، اگرچہ یہ مشکل ہے لیکن ناممکن و محال بھی نہیں ہے، اسی پہلو کی اہمیت کے پیشِ نظر ہمیں اپنی طرف سے حق المقدور کوشش کرنی چاہیے اور اس جاہلی عصبیت کی جڑوں کو اکھاڑ پھینکنا چاہیے۔ (دیکھیں: السيرة النبوية الصحيحة: 2/209، المستفاد من قصص القرآن للدعوة والدعاة: 2/302)

۴: غزوۂ بنی المصطلق کے بعد مسلم معاشرہ کے لئے قرآنی تعلیمات:

غزوہ بنی المصطلق کے بعد سورۃ "المنافقون" نازل ہوئی، جبکہ مسلمان مدینہ کی طرف واپس آرہے تھے، امام ترمذیؒ نے جو روایت نقل کی ہے اس سے اس کے نزول کے وقت کا پتہ چلتا ہے، اس روایت میں ہے: "جب ہم نے صبح کی تو رسول اللہ ﷺ نے سورۃ 'المنافقون' کی تلاوت کی"۔ (سنن ترمذی: 3313)

اس سورت میں منافقین کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کی ہے، بعض حوادث و اقوال کی جانب بھی اشارہ کیا گیا ہے جو منافقین کی طرف سے ظہور پذیر ہوئے، اسی طرح ان کے جھوٹے دعوؤں کی بھی قلعی کھول دی، البتہ اخیر میں اہلِ ایمان کو دنیاوی زیب و زینت میں مشغول رہنے سے ڈرایا گیا ہے اور انفاق پر ابھارا گیا ہے، اس سورت کا مطالعہ کرنے والے کے سامنے چند اہم پہلو سامنے آتے ہیں جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

۱: اس سورت کریمہ کے آغاز میں منافقین کے اعمال اور طرزِ زندگی کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے، اور ان کے جھوٹ اور طرزِ عمل سے پردہ اٹھایا گیا ہے، آغاز میں ہی منافقین کے جھوٹے ایمانی دعوؤں، ان کی جھوٹی قسموں، ان کی بزدلی، ان کی کمزوری، نبی کریم ﷺ اور اہلِ ایمان کے خلاف سازشوں اور اللہ کے دین سے لوگوں کو روکنے کے بارے میں وضاحت کی گئی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِذَا جَآءَكَ ٱلْمُنَٰفِقُونَ قَالُواْ نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُولُ ٱللَّهِ ۗ وَٱللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُولُهُۥ وَٱللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّ ٱلْمُنَٰفِقِينَ لَكَٰذِبُونَ ﴿١﴾ ٱتَّخَذُوٓاْ أَيْمَٰنَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّواْ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِ ۚ إِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُواْ يَعْمَلُونَ ﴿٢﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ ءَامَنُواْ ثُمَّ كَفَرُواْ فَطُبِعَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُونَ ﴿٣﴾ * وَإِذَا رَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ ۖ وَإِن يَقُولُواْ تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ۖ كَأَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ۖ يَحْسَبُونَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ۚ هُمُ ٱلْعَدُوُّ فَٱحْذَرْهُمْ ۚ قَٰتَلَهُمُ ٱللَّهُ ۖ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ﴿٤﴾﴾ ترجمہ: ”اے نبیؐ، جب یہ منافق تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں۔ ہاں، اللہ جانتا ہے کہ تم ضرور اُس کے رسول ہو، مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق قطعی جھوٹے ہیں۔ انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے اور اس طرح یہ اللہ کے راستے سے خود رکتے اور دنیا کو روکتے ہیں، کیسی بُری حرکتیں ہیں جو یہ لوگ کر رہے ہیں، یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ ان لوگوں نے ایمان لا کر پھر کفر کیا، اس لئے ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی، اب یہ کچھ نہیں سمجھتے۔ اِنہیں دیکھو تو اِن کے جسم تمہیں بڑے شاندار نظر آئیں، بولیں تو تم ان کی باتیں سنتے رہ جاؤ، مگر اصل میں یہ گویا لکڑی کے کندے ہیں جو دیوار کے ساتھ چن کر رکھ دیئے گئے ہوں، ہر زور کی آواز کو یہ اپنے خلاف سمجھتے ہیں، یہ پکے دشمن ہیں، ان سے بچ کر رہو، اللہ کی مار ان پر، یہ کدھر الٹے پھرائے جا رہے ہیں“۔ (سورۃ المنافقون: 1-4)

۲: اس کے بعد آیات نے ان کے عناد و دشمنی، باطل کے بارے میں ان کی ہٹ دھرمی اور ان کو حق کی دعوت دینے والے کی مخالفت کا ذکر کیا ہے اور تفصیل کے ساتھ ان کے مذموم اقوال کا ذکر کیا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْاْ يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُولُ ٱللَّهِ لَوَّوْاْ رُءُوسَهُمْ وَرَأَيْتَهُمْ يَصُدُّونَ وَهُم مُّسْتَكْبِرُونَ ﴿٥﴾ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ أَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ أَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ لَن يَغْفِرَ ٱللَّهُ لَهُمْ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يَهْدِى ٱلْقَوْمَ ٱلْفَٰسِقِينَ ﴿٦﴾ هُمُ ٱلَّذِينَ يَقُولُونَ لَا تُنفِقُواْ عَلَىٰ مَنْ عِندَ رَسُولِ ٱللَّهِ حَتَّىٰ يَنفَضُّواْ ۗ وَلِلَّهِ خَزَآئِنُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ وَلَٰكِنَّ ٱلْمُنَٰفِقِينَ لَا يَفْقَهُونَ ﴿٧﴾ يَقُولُونَ لَئِن رَّجَعْنَآ إِلَى ٱلْمَدِينَةِ لَيُخْرِجَنَّ ٱلْأَعَزُّ مِنْهَا ٱلْأَذَلَّ ۚ وَلِلَّهِ ٱلْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِۦ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَلَٰكِنَّ ٱلْمُنَٰفِقِينَ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٨﴾﴾ ترجمہ: ”اور جب اِن سے کہا جاتا ہے کہ آؤ تاکہ اللہ کا رسول تمہارے لئے مغفرت کی دعا کرے، تو سر جھٹکتے ہیں، اور تم دیکھتے ہو کہ وہ بڑے گھمنڈ کے ساتھ آنے سے رکتے ہیں۔ اے نبیؐ، تم چاہے ان کے لئے مغفرت کی دعا کرو یا نہ کرو، ان کے لئے یکساں ہے، اللہ ہر گز انہیں معاف نہ کرے گا، اللہ فاسق لوگوں کو ہر گز ہدایت نہیں دیتا۔ یہ وہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ رسول کے ساتھیوں پر خرچ کرنا بند کر دو تاکہ یہ منتشر ہو جائیں حالانکہ زمین اور آسمانوں کے خزانوں کا مالک اللہ ہی ہے، مگر یہ منافق سمجھتے نہیں ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ ہم مدینہ واپس پہنچ جائیں

تو جو عزت والا ہے وہ ذلیل کو وہاں سے نکال باہر کرے گا حالانکہ عزت تو اللہ اور اس کے رسولؐ اور مومنین کے لئے ہے، مگر یہ منافق جانتے نہیں ہیں"۔(سورۃ المنافقون:5-8)

۴: اس کے بعد اختتام سورت میں اہلِ ایمان کو دنیاوی زیب وزینت میں مشغول رہنے سے اور منافقین کی مشابہت اختیار کرنے سے ڈرایا گیا ہے،ان کو انفاق وصدقہ کی ترغیب دی گئی ہے، جو یوم آخرت پر ایمان کی واضح دلیل ہے۔ منافقین نے مال کی محبت اور لالچ کی وجہ سے ہی یہ کہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رہنے والوں پر انفاق مت کرو اور جو بھی مال واولاد میں مشغول رہے گا تو وہی لوگ خسارے میں ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَٰلُكُمْ وَلَآ أَوْلَـٰدُكُمْ عَن ذِكْرِ ٱللَّهِ ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَأُو۟لَـٰٓئِكَ هُمُ ٱلْخَـٰسِرُونَ ۞ وَأَنفِقُوا۟ مِن مَّا رَزَقْنَـٰكُم مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِىَ أَحَدَكُمُ ٱلْمَوْتُ فَيَقُولَ رَبِّ لَوْلَآ أَخَّرْتَنِىٓ إِلَىٰٓ أَجَلٍ قَرِيبٍ فَأَصَّدَّقَ وَأَكُن مِّنَ ٱلصَّـٰلِحِينَ ۞ وَلَن يُؤَخِّرَ ٱللَّهُ نَفْسًا إِذَا جَآءَ أَجَلُهَا ۚ وَٱللَّهُ خَبِيرٌۢ بِمَا تَعْمَلُونَ ۞﴾ ترجمہ: "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تمہارے مال اور تمہاری اولادیں تم کو اللہ کی یاد سے غافل نہ کردیں، جو لوگ ایسا کریں وہی خسارے میں رہنے والے ہیں۔ جو رزق ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرو قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کی موت کا وقت آجائے اور اُس وقت وہ کہے کہ اے میرے رب، کیوں نہ تو نے مجھے تھوڑی سی مہلت اور دے دی کہ میں صدقہ دیتا اور صالح لوگوں میں شامل ہو جاتا۔ حالانکہ جب کسی کی مہلتِ عمل پوری ہونے کا وقت آجاتا ہے تو اللہ اُس کو ہرگز مزید مہلت نہیں دیتا، اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے"۔(سورۃ المنافقون:9-11) (دیکھیں: التفسیر المنیر: 28/230)

اس طرح سے مدنی معاشرہ اس طرح کے واقعات کے ذریعہ تربیت حاصل کر رہا تھا اور قرآن کریم توجیہہ وتعلیم کا کام کر رہا تھا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی نگرانی فرما رہے تھے۔

۵: منافقین کے ذریعہ نبی کریمؐ کی عزت پر حملہ:

منافقین نے حضرت عائشہ صدیقہؓ پر افترا اندازی کرکے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عزت پر حملہ کرنے کی کوشش کی، یہ واقعہ اُفک کے نام سے معروف ہے، جب جاہلی نعرہ کے ذریعہ منافقین کی پہلی سازش ناکام ہوگئی تو انہوں نے واقعہ اُفک کے ذریعہ نبوی گھرانے پر حملہ کیا جس کے ذریعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اور آپؐ کے پاکیزہ اہلِ بیت کو پریشان کرنا مقصود تھا۔

تمام اہلِ سیرت ومغازی کا اس پر اتفاق ہے کہ واقعہ اُفک غزوہ بنی المصطلق کے بعد پیش آیا اور مفسرین ومحدثین نے بھی یہی قول اختیار کیا ہے۔ امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے واقعہ اُفک کو بیان کیا ہے۔ صحیح البخاری میں یہ واقعہ یوں ذکر کیا گیا ہے:

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادتِ مبارکہ تھی کہ جب آپ سفر کا ارادہ کرتے تو اپنی ازواج مطہرات کے درمیان قرعہ اندازی کرتے، جس بیوی کا قرعہ نکل آتا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے اپنے ساتھ سفر میں لے جاتے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک غزوہ جو آپ نے لڑا، اس میں ہمارے درمیان قرعہ اندازی فرمائی تو میرا نام نکل آیا۔ میں رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ روانہ ہوئی، یہ واقعہ پردے کے احکام نزل ہونے کے بعد کا ہے، چنانچہ مجھے ہودج سمیت اٹھا کر سوار کر دیا جاتا اور اسی کے ساتھ اتارا جاتا تھا۔

اس طرح ہم روانہ ہوئے، پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس غزوہ سے فارغ ہو گئے تو واپس ہوئے۔ واپسی پر ہم مدینہ طیبہ کے قریب تھے (اور ایک جگہ ہمارا پڑاؤ تھا) ایک رات آپ نے کوچ کا اعلان فرمایا۔ جب لوگوں نے کوچ کی تیاری کی تو میں اٹھی اور تھوڑی دور چل کر لشکر کی حدود سے باہر نکل گئی، پھر قضائے حاجت سے فارغ ہو کر میں اپنی سواری کے پاس پہنچی۔ وہاں پہنچ کر میں نے اپنا سینہ ٹٹولا تو ظفار کے مونگوں کا بنا ہوا میرا ہار گم تھا، اب میں واپس ہوئی اور اپنا ہار تلاش کرنے لگی، اس تلاش میں کچھ دیر ہو گئی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: جو لوگ میرا ہودج اٹھاتے تھے اور مجھے سوار کیا کرتے تھے، انہوں نے میرے ہودج کو اٹھا کر اونٹ پر رکھ دیا جس پر میں سوار ہوا کرتی تھی۔ انہوں نے یہ خیال کیا کہ میں ہودج کے اندر ہی ہوں۔ دراصل ان دنوں عورتیں بہت ہلکی پھلکی تھیں، بھاری بھر کم نہ ہوا کرتی تھیں اور نہ ان پر کوئی گوشت ہی ہوتا تھا کیونکہ انہیں معمولی خوراک ملتی تھی، اس لئے اٹھانے والوں نے جب ہودج اٹھایا تو اس کے ہلکے پن میں انہیں کوئی فرق محسوس نہ ہوا، یوں بھی میں اس وقت کم عمر لڑکی تھی، الغرض انہوں نے اونٹ کو اٹھایا اور روانہ ہو گئے، لشکر کے چلے جانے کے بعد مجھے ہار بھی مل گیا، جب میں وہاں آئی تو کوئی بھی نہیں تھا، نہ پکارنے والا اور نہ جواب دینے والا، اس لئے میں وہاں آئی جہاں پڑاؤ تھا، مجھے یقین تھا کہ میرے نہ ہونے کا جب انہیں علم ہو گا تو جلد ہی مجھے لینے کے لئے واپس آئیں گے، اس دوران بیٹھے بیٹھے میری آنکھ لگ گئی اور میں سو گئی۔ حضرت صفوان بن معطل سلمی ذکوانی رضی اللہ عنہ لشکر کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے، وہ میرے ٹھکانے پر آئے تو دور سے انہیں کوئی سویا شخص دکھائی دیا۔ جب قریب آکر مجھے دیکھا تو پہچان لیا کیونکہ پردے کے احکام اترنے سے پہلے وہ مجھے دیکھ چکے تھے۔ جب انہوں نے مجھے پہچان لیا تو إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ پڑھنا شروع کر دیا۔ میں ان کی آواز سن کر بیدار ہوئی اور فوراً اپنی چادر سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ اللہ کی قسم! ہم نے کوئی گفتگو نہیں کی اور إِنَّا لِلّٰهِ کے سوا میں نے ان سے کوئی لفظ نہیں سنا۔ وہ اپنے اونٹ سے اترے، اسے بٹھایا اور اس کی اگلی ٹانگ کو اپنے پاؤں سے دبائے رکھا۔ اس دوران میں اٹھی اور اس پر سوار ہو گئی، اب وہ سواری کو آگے سے پکڑے ہوئے لے کر چلے، جب ہم لشکر کے قریب پہنچے تو ٹھیک دوپہر کا وقت تھا اور لشکر بھی پڑاؤ کئے ہوئے تھا۔ حضرت اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ پھر جسے ہلاک ہونا تھا وہ ہلاک ہوا اور جس نے بہتان کا بیڑا اٹھایا تھا وہ عبداللہ بن اُبی بن سلول تھا۔ حضرت عروہ نے بیان کیا: مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ اس تہمت کا چرچا کرتا، اس کے ہاں اس کا تذکرہ ہوتا اور وہ اس کی تصدیق کرتا، خوب غور اور توجہ سے سنتا اور اسے آگے پھیلانے کے لئے خوب کھود کرید کرتا۔ حضرت عروہ نے یہ بھی کہا کہ حسان بن ثابت، مسطح بن اثاثہ اور حمنہ بنت جحش کے علاوہ مجھے کسی شخص کا نام معلوم نہیں ہو سکا جو تہمت لگانے والوں میں شریک تھے، اگرچہ اس میں شریک ہونے والے بہت سے تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد سے معلوم ہوتا ہے لیکن اس معاملہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والا عبداللہ بن ابی ابن سلول (رئیس المنافقین) تھا، حضرت عروہ نے کہا کہ اُم المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس بات کو اچھا نہیں خیال کرتی تھیں کہ ان کے پاس حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہا جائے اور فرمایا کرتی تھیں کہ یہ شعر حسان ہی نے کہا ہے: میرا باپ دادا اور میری عزت و ناموس، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عزت (کی حفاظت) کے لئے تمہارے سامنے ڈھال بنی رہیں گی۔

مدینہ میں افواہوں کا عام ہونا:

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: پھر ہم مدینہ طیبہ پہنچ گئے اور وہاں پہنچتے ہی میں جو بیمار ہوئی تو مہینہ بھر بیمار ہی رہی۔ اس دوران میں تہمت لگانے والوں کی افواہوں کا لوگوں میں بہت چرچا رہا لیکن اس کے متعلق مجھے کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ بیماری کی حالت میں مجھے یہ شک ضرور گزرتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ سے وہ لطف اور مہربانی نہ دیکھتی تھی جو آپ سے بیماری کی حالت میں پہلے دیکھا کرتی تھی، آپ میرے پاس تشریف لاتے، سلام کرتے اور دریافت فرماتے: ''تم کیسی ہو؟'' (تمہاری طبیعت کیسی ہے؟) صرف اتنا پوچھ کر واپس تشریف لے جاتے۔ آپ ﷺ کے اس طرزِ عمل سے مجھے شبہ ہوتا تھا لیکن مجھے اس شر کا شعور تک نہ تھا (جو پھیل چکا تھا) حتی کہ جب مجھے بیماری سے کچھ افاقہ ہوا تو میں اُم مسطح کے ساتھ مناصع کی طرف گئی اور مناصع ہمارے لئے قضائے حاجت کی جگہ تھی، ہم وہاں صرف رات کے وقت جاتے تھے اور یہ ہمارے گھر میں بیت الخلاء بنانے سے پہلے کی بات ہے۔ میدان میں جا کر رفع حاجت کرنے میں ہمارا دستور پہلے عربوں جیسا تھا۔ ہم اپنے گھروں میں بیت الخلاء بنانے کو باعثِ تکلیف خیال کرتے تھے۔ ام المومنین (حضرت عائشہؓ) نے فرمایا: میں اور حضرت مسطحؓ کی والدہ باہر نکلیں اور وہ ابو رہم بن مطلب بن عبد مناف کی بیٹی تھیں، اور ان کی ماں صخر بن عمر کی بیٹی تھیں جو حضرت ابو بکرؓ کی خالہ تھیں اور اس کا بیٹا مسطح بن اثاثہ بن عباد بن مطلب ہے۔ الغرض میں اور ام مسطح حاجت سے فارغ ہو کر اپنے گھر کی طرف واپس آ رہی تھیں کہ ام مسطح اپنی چادر میں الجھ کر گر پڑیں اور کہنے لگی: مسطح ذلیل ہو۔ میں نے کہا: آپ نے بُری بات زبان سے نکالی ہے، کیا آپ ایک ایسے شخص کو بُرا کہہ رہی ہیں جو غزوۂ بدر میں شریک ہو چکا ہے؟ اس نے کہا: اے بھولی بی بی! کیا تو نے اس کی باتیں نہیں سنیں؟ میں نے پوچھا: اس نے کیا کہا ہے؟ انہوں نے بہتان لگانے والوں کا واقعہ ذکر کیا، اُم المؤمنین نے کہا: ان باتوں کو سن کر میری بیماری اور زیادہ ہو گئی۔ جب میں اپنے گھر آئی تو رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف لائے۔ آپ نے سلام کیا اور پوچھا تمہارا کیا حال ہے؟ میں نے عرض کیا: آپ مجھے میرے والدین کے ہاں جانے کی اجازت دیتے ہیں؟ میرا ارادہ یہ تھا کہ میں اپنے والدین سے اس خبر کی تصدیق کروں گی۔ بہر حال رسول اللہ ﷺ نے مجھے اجازت دے دی۔ میں نے اپنی والدہ سے (گھر جا کر) پوچھا: اماں جان! لوگوں میں جو افواہیں گردش کر رہی ان کی کیا حقیقت ہے؟ انہوں نے کہا: پیاری بیٹی! ایسی باتوں پر توجہ نہ دو۔ اللہ کی قسم! ایسا شاید ہی کہیں ہوا ہو کہ ایک خوبصورت عورت کسی ایسے شوہر کے ساتھ ہو جو اس سے محبت بھی رکھتا ہو اور اس کی سوکنیں بھی ہوں تو وہ اس سے حسد نہ کرتی ہوں۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا: سبحان اللہ! کیا ان باتوں کا عام لوگوں میں چرچا ہے؟! میں ساری رات روتی رہی۔ میرے آنسو نہیں رکتے تھے اور نہ مجھے نیند ہی آتی تھی۔ پھر میں صبح کو بھی روتی رہی۔

بعض صحابہؓ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی مشاورت:

فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی بن ابی طالبؓ اور حضرت اسامہ بن زیدؓ کو بلایا تا کہ اپنی بیوی کے فراق کے متعلق ان سے مشورہ کریں کیونکہ اس سلسلہ میں ابھی تک آپؐ پر کوئی وحی نازل نہیں ہوئی تھی۔ حضرت اسامہؓ نے تو رسول اللہ ﷺ کو وہ مشورہ دیا جو وہ آپ کی بیوی کی پاکدامنی کے متعلق جانتے تھے اور جو وہ اہلِ خانہ کی اپنے دل میں محبت رکھتے تھے، چنانچہ انہوں نے کہا: وہ آپ کی بیوی ہیں،

مجھے ان میں خیر و بھلائی کے علاوہ اور کچھ معلوم نہیں۔ لیکن حضرت علیؓ نے کہا: اللہ کے رسولؐ! اللہ تعالیٰ نے آپ پر کوئی تنگی نہیں رکھی اور عورتیں بھی ان کے علاوہ بہت ہیں۔ آپ حضرت بریرہؓ سے پوچھ لیں، وہ بھی صحیح صورت حال سے آپ کو آگاہ کردے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت بریرہؓ کو بلایا اور ان سے دریافت فرمایا: ''بریرہ! کیا تم نے کوئی ایسی بات دیکھی ہے جس سے تمہیں اس پر کوئی شبہ ہو؟'' حضرت بریرہؓ نے عرض کیا: اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے؟ میں نے عائشہؓ میں کچھ نہیں دیکھا، البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ وہ ایک نوعمر لڑکی ہیں، آٹا گوندھ کر سو جاتی ہیں اور بکری آکر اسے کھا جاتی ہے۔ اُم المؤمنین نے فرمایا: پھر اس دن رسول اللہ ﷺ نے منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ دیا اور عبداللہ بن اُبی کے متعلق عدل وانصاف کا مطالبہ کیا۔ آپؐ نے فرمایا: ''اے گروہ مسلمین! اس شخص کے بارے میں میری مدد کون کرے گا جس نے مجھے میری بیوی کے متعلق اذیت پہنچائی ہے؟ اللہ کی قسم! میں نے اپنی بیوی میں بھلائی کے علاوہ کچھ نہیں دیکھا، اور انہوں نے ایک ایسے شخص کا نام لیا ہے جس کے بارے میں بھی مجھے بھلائی کے علاوہ کچھ معلوم نہیں، وہ جب بھی میرے گھر آئے میرے ساتھ ہی آئے''۔ یہ سن کر حضرت سعد بن معاذؓ کھڑے ہوئے۔ ان کا تعلق بنو عبدالاشہل قبیلہ سے تھا۔ انہوں نے کہا: اللہ کے رسولؐ! میں آپ کی مدد کروں گا، اگر وہ شخص قبیلۂ اوس کا ہو تو میں اس کی گردن ماروں گا اور اگر وہ ہمارے بھائی قبیلہ خزرج کا ہو تو اس کے متعلق آپ کا جو بھی حکم ہو گا ہم اسے بجالائیں گے۔

واقعۂ اُفک کے ذریعہ پیدا شدہ صورتحال کے آثار:

یہ سن کر سعد بن عبادہ کھڑے ہوئے جو قبیلہ خزرج کے سردار تھے۔ اس سے پہلے وہ نیک سیرت تھے لیکن قبیلہ کی بے جا حمیت ان پر غالب آگئی۔ انہوں نے حضرت سعد بن معاذؓ سے کہا: تم خلافِ واقعہ بات کرتے ہو، تم اسے قتل نہیں کر سکتے اور نہ تمہارے اندر اتنی طاقت ہی ہے، اگر وہ تمہارے قبیلہ کا ہوتا تو تم اس کے قتل کا نام نہ لیتے۔ اس کے بعد حضرت سعد بن معاذؓ کے چچازاد بھائی حضرت اسید بن حضیرؓ کھڑے ہوئے اور حضرت سعد بن عبادہؓ کو مخاطب کر کے کہا: اللہ کی قسم! ہم اسے ضرور قتل کریں گے، اب اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تم منافقوں کا کردار ادا کرتے ہو اور ان کے دفاع میں زور بیان صرف کرتے ہو۔ اتنے میں انصار کے دونوں قبیلے اُوس اور خزرج بھڑک اٹھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپس میں لڑ پڑیں گے۔ رسول اللہ ﷺ ابھی منبر پر ہی تشریف فرما تھے اور آپ انہیں مسلسل خاموش کراتے رہے حتیٰ کہ وہ سب چپ ہو گئے اور آپ ﷺ خود بھی خاموش ہو گئے۔ اُم المؤمنین (حضرت عائشہؓ) نے فرمایا: میں اس دن بھی روتی رہی، نہ میرے آنسو تھمتے تھے اور نہ میری آنکھ ہی لگتی تھی، صبح کے وقت میرے والدین میرے پاس آئے تو میری حالت یہ تھی کہ دو راتیں اور ایک دن میرا روتے ہوئے گزر گیا تھا، اس پورے عرصے میں نہ میرے آنسو رُکے اور نہ مجھے نیند ہی آئی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ روتے روتے میرا کلیجہ پھٹ جائے گا، ابھی میرے والدین میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور میں مسلسل روئے جا رہی تھی کہ قبیلہ انصار کی ایک خاتون نے اندر آنے کی اجازت طلب کی، میں نے اسے اجازت دے دی تو وہ میرے ساتھ بیٹھ کر رونے لگی۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: ابھی ہم اسی حالت میں تھے کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے، آپؐ نے سلام کیا اور بیٹھ گئے۔ فرماتی ہیں: جب سے یہ واقعہ ہوا تھا آپ ﷺ اس وقت سے آج تک میرے پاس نہیں بیٹھے تھے۔

حضرت عائشہؓ کے ساتھ رسول ﷺ کی گفتگو:

مہینہ بھر انتظار کے باوجود میرے متعلق کوئی وحی آپؐ پر نازل نہیں ہوئی تھی، بیٹھنے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے خطبہ پڑھا، پھر فرمایا: ’’ اَمابعد! اے عائشہ! مجھے تمہارے بارے میں اس اس طرح کی اطلاعات ملی ہیں، اگر تم واقعی اس معاملہ میں پاک صاف ہو تو اللہ تعالیٰ خود تمہاری بے گناہی بیان کردے گا اور اگر تم نے گناہ کر ہی لیا ہے تو اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرو اور اس کی طرف رجوع کرو کیونکہ بندہ جب اپنے گناہ کا اعتراف کر کے توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کرلیتا ہے‘‘۔ اُم المؤمنین (حضرت عائشہؓ) نے فرمایا: جب رسول اللہ ﷺ اپنی بات پوری کر چکے تو میرے آنسو تھم گئے یہاں تک کہ مجھے ایک قطرہ بھی محسوس نہیں ہوتا تھا۔ میں نے پہلے اپنے والد گرامی سے عرض کیا: آپ رسول اللہ ﷺ کو ان کی گفتگو کا جواب دیں، انہوں نے فرمایا: اللہ کی قسم! میں کچھ نہیں جانتا کہ مجھے رسول اللہ ﷺ سے کیا کہنا ہے؟ پھر میں نے اپنی والدہ سے کہا: آپ اس بارے میں رسول اللہ ﷺ کو مطمئن کریں۔ میری والدہ نے کہا: اللہ کی قسم! میں نہیں جانتی کہ رسول اللہ ﷺ کو کیا جواب دوں؟ اس بنا پر میں خود گویا ہوئی حالانکہ میں بہت کم عمر اور نوخیز لڑکی تھی اور میں نے قرآن مجید بھی بہت زیادہ نہیں پڑھا تھا۔ میں نے کہا: اللہ کی قسم! مجھے معلوم ہے کہ آپ لوگوں نے اس طرح کی افواہوں پر کان دھرا اور میرے خلاف باتیں آپ لوگوں کے دلوں میں اتر گئی ہیں اور آپ لوگوں نے انہیں سچا سمجھ لی ہے، اب اگر میں آپ لوگوں سے کہوں کہ میں پاک دامن ہوں تو آپ میری تصدیق نہیں کریں گے اور اگر میں اس گناہ کا اقرار کرلوں حالانکہ اللہ خوب جانتا ہے کہ میں اس سے بَری ہوں تو آپ میری تصدیق کرنے لگیں گے۔ اللہ کی قسم! میری اور آپ لوگوں کی مثال حضرت یوسفؑ کے والد جیسی ہے جب انہوں نے کہا تھا: صبر ہی اچھا ہے اور جو کچھ تم کہہ رہے ہو اس کے متعلق اللہ ہی کی مدد درکار ہے۔ پھر میں منہ پھیر کر اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ اللہ خوب جانتا تھا کہ میں اس معاملہ میں قطعی طور پر پاک دامن تھی اور اللہ تعالیٰ خود میری براءت نازل کرے گا۔ اللہ کی قسم! مجھے یہ گمان نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ میرے بارے میں وحی نازل فرمائے گا جو قیامت تک تلاوت کی جاتی رہے گی کیونکہ میں خود کو اس سے بہت کمتر خیال کرتی تھی کہ اللہ تعالیٰ میرے بارے میں کوئی کلام فرمائے گا۔ مجھے تو صرف اتنی امید تھی کہ رسول اللہ ﷺ کوئی خواب دیکھیں گے جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ میری براءت فرمادے گا۔

حضرت عائشہؓ کی براءت کے بارے میں نزول قرآن:

فرماتی ہیں: اللہ کی قسم! ابھی رسول اللہ ﷺ اس مجلس سے اٹھے بھی نہیں تھے اور نہ کوئی گھر کا فرد ہی باہر گیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ پر وحی نازل ہونا شروع ہوگئی اور آپ پر وہ کیفیت طاری ہوئی جو شدت وحی کے موقع پر طاری ہوتی تھی، موتیوں کی طرح پسینے کے قطرے آپ کے چہرۂ مبارک پر گرنے لگے، حالانکہ سردی کا موسم تھا۔ یہ کیفیت اس وحی کی وجہ سے تھی جو آپ پر نازل ہو رہی تھی۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: پھر جب یہ کیفیت ختم ہوئی تو آپؐ مسکرا رہے تھے، سب سے پہلا حکم جو آپ کی زبانِ اطہر سے نکلا وہ یہ تھا: ’’اے عائشہ! اللہ تعالیٰ نے تمہاری براءت نازل فر دی ہے‘‘۔ میری والدہ نے مجھے کہا: رسول اللہ ﷺ کی طرف اٹھو اور آپ کا شکریہ ادا کرو۔ میں نے کہا: اللہ کی قسم! میں آپ (کے شکریہ) کے لئے نہیں اٹھوں گی۔ میں تو صرف اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کروں گی (جس نے میری براءت نازل فرمائی ہے) چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں: ’’بے شک جن لوگوں نے بہتان

گڑھا وہ تم ہی میں سے ایک ٹولہ ہے..... سے لے کر دس آیات تک۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے صراحت کے ساتھ میری براءت نازل فرمائی۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے کہا۔ جو رشتہ داری اور تنگ دستی کی وجہ سے حضرت مسطح بن اثاثہ پر خرچ کرتے تھے۔ اللہ کی قسم! میں اب مسطح پر کچھ بھی خرچ نہیں کروں گا کیونکہ اس نے حضرت عائشہؓ کے متعلق تہمت تراشی میں حصہ لیا ہے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں: ''اور تم میں سے صاحبِ فضل اور آسودہ حال لوگوں کو یہ قسم نہیں کھانی چاہئے کہ وہ رشتہ داروں، مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں پر خرچ نہ کریں..... اللہ تعالیٰ بے حد بخشنے والا نہایت مہربان ہے''۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے کہا: اللہ کی قسم! کیوں نہیں، میں تو اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے معاف کر دے، چنانچہ حضرت ابو بکرؓ نے حضرت مسطحؓ کو خرچہ دینا شروع کر دیا جو پہلے دیا کرتے تھے، نیز فرمایا کہ اللہ کی قسم! آئندہ میں اس وظیفے کو کبھی بند نہیں کروں گا۔

عائشہؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے میرے معاملہ کے بارے میں حضرت زینب بنت جحشؓ سے بھی دریافت کیا، آپ نے ان سے فرمایا: ''عائشہ کے متعلق تمہیں کیا معلومات ہیں؟ یا ان میں تم نے کیا بات دیکھی ہے؟'' انہوں نے کہا: اللہ کے رسول! میں اپنے کانوں اور آنکھوں کو محفوظ رکھتی ہوں۔ اللہ کی قسم! میں ان کے متعلق خیر کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتی۔ حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں: یہی زینب تھی جو نبی ﷺ کی ازواج مطہرات میں سے میرا مقابلہ کیا کرتی تھیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی پرہیزگاری کی وجہ سے انہیں بچا لیا، البتہ ان کی ہمشیرہ حمنہؓ نے غلط راستہ اختیار کیا اور ہلاک ہونے والوں کے ساتھ وہ بھی ہلاک ہوئی تھیں۔ (صحیح بخاری: 4141، صحیح مسلم: 2770)

واقعۂ افک ایذاء و آزمائشی سلسلہ کی ایک کڑی تھی جو اعدائے دین کی طرف سے اختیار کی گئی تھی لیکن یہ اپنے نبی کے ساتھ اور اہلِ ایمان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم تھا کہ اللہ تعالیٰ نے افترا اندازی پر مبنی اس قصہ کے بے بنیاد اور جھوٹے ہونے کی یوں پول کھول دی، تاریخ نے صحیح روایات کی بنیاد پر اس افترا اندازی کے تئیں اہلِ ایمان کے موقف کو محفوظ کیا ہے، خاص طور پر حضرت ابو ایوبؓ اور حضرت ام ایوبؓ کے موقف کو تاریخ نے سنہری حروف میں لکھ کر دوسروں کے لئے نقشِ راہ بنا دیا ہے، یہ ایسے موقف ہیں جن کے ذریعہ اہلِ ایمان رہنمائی حاصل کرتے ہیں، جبکہ ان کو اس طرح کی اس افترا اندازی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اگرچہ وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہے لیکن دروس و اسباق باقی ہیں جو قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے عبرت و رہنمائی کا ذریعہ بنیں گے۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویہ فی ضوء المصادر الاصلیۃ، ص: 440)

۶: واقعۂ افک سے متعلق آیات سے ماخوذ اہم آداب و احکام:

جو آیات واقعۂ افک سے متعلق نازل ہوئی ہیں، ان سے علماء نے اہم احکام و آداب اخذ کئے ہیں جن میں سے چند اہم احکام و آداب مندرجہ ذیل ہیں:

ا: حضرت عائشہؓ کی براءت کا اعلان قرآن پاک کی آیات کے ذریعہ کیا گیا ہے جس کی تلاوت تا قیامِ قیامت کی جاتی رہے گی، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ ٱلَّذِينَ جَآءُو بِٱلۡإِفۡكِ عُصۡبَةٞ مِّنكُمۡۚ لَا تَحۡسَبُوهُ شَرّٗا لَّكُمۖ بَلۡ هُوَ خَيۡرٞ لَّكُمۡۚ لِكُلِّ ٱمۡرِيٕٖ مِّنۡهُم مَّا

ٱكۡتَسَبَ مِنَ ٱلۡإِثۡمِۚ وَٱلَّذِي تَوَلَّىٰ كِبۡرَهُۥ مِنۡهُمۡ لَهُۥ عَذَابٌ عَظِيمٞ﴾ ترجمہ: ''جو لوگ یہ بہتان گڑھ لائے ہیں وہ تمہارے ہی اندر کا ایک ٹولہ ہیں، اس واقعہ کو اپنے حق میں شر نہ سمجھو بلکہ یہ بھی تمہارے لئے خیر ہی ہے جس نے اس میں جتنا حصہ لیا اس نے اتنا ہی گناہ سمیٹا اور جس شخص نے اِس کی ذمہ داری کا بڑا حصہ اپنے سر لیا اس کے لئے تو عذاب عظیم ہے''۔(سورۃ النور: 11)

۲: اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ شر کے اندر سے خیر کے پہلو پیدا فرمائے، چنانچہ واقعہ اَفک کے ذریعہ ابو بکر صدیقؓ کے گھرانے کی ابتلاء و آزمائش ان کے حق میں باعثِ خیر تھی، اس لئے کہ ان کے صبر اور قوتِ ایمانی کی وجہ سے ان کے لئے اجر عظیم لکھا گیا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لَا تَحۡسَبُوهُ شَرّٗا لَّكُمۖ بَلۡ هُوَ خَيۡرٞ لَّكُمۡۚ﴾ ترجمہ: ''اس واقعہ کو اپنے حق میں شر نہ سمجھو بلکہ یہ بھی تمہارے لئے خیر ہی ہے''۔(سورۃ النور: 11)

۳: اہلِ ایمان کے کردار اور عزت کی حفاظت ضروری ہے، اسی طرح ان کے ساتھ حسنِ ظن رکھنا بھی لازمی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لَّوۡلَآ إِذۡ سَمِعۡتُمُوهُ ظَنَّ ٱلۡمُؤۡمِنُونَ وَٱلۡمُؤۡمِنَٰتُ بِأَنفُسِهِمۡ خَيۡرٗا وَقَالُواْ هَٰذَآ إِفۡكٞ مُّبِينٞ﴾ ترجمہ: ''جس وقت تم لوگوں نے اسے سنا تھا اُسی وقت کیوں نہ مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنے آپ سے نیک گمان کیا اور کیوں نہ کہہ دیا کہ یہ صریح بہتان ہے؟''۔(سورۃ النور: 12)

۴: آیات کے ذریعہ افتراء اندازی کرنے والوں کی تکذیب کی گئی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لَّوۡلَا جَآءُو عَلَيۡهِ بِأَرۡبَعَةِ شُهَدَآءَۚ فَإِذۡ لَمۡ يَأۡتُواْ بِٱلشُّهَدَآءِ فَأُوْلَٰٓئِكَ عِندَ ٱللَّهِ هُمُ ٱلۡكَٰذِبُونَ﴾ ترجمہ: '' وہ لوگ (اپنے الزام کے ثبوت میں) چار گواہ کیوں نہ لائے؟ اب کہ وہ گواہ نہیں لائے ہیں، اللہ کے نزدیک وہی جھوٹے ہیں''۔(سورۃ النور: 13)

۵: آیات میں بیان کیا گیا ہے کہ اہلِ ایمان پر اللہ تعالیٰ کا فضل واحسان ہے، اور ان پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَوۡلَا فَضۡلُ ٱللَّهِ عَلَيۡكُمۡ وَرَحۡمَتُهُۥ فِي ٱلدُّنۡيَا وَٱلۡأٓخِرَةِ﴾ ترجمہ: ''اگر تم لوگوں پر دنیا اور آخرت میں اللہ کا فضل اور رحم و کرم نہ ہوتا تو جن باتوں میں تم پڑ گئے تھے ان کی پاداش میں بڑا عذاب تمہیں آلیتا''۔(سورۃ النور: 14)

۶: بات کو نشر کرنے اور عام کرنے سے پہلے اس کی بارے میں تحقیق کرنا اور اس کی صحت کو معلوم کرنا ضروری ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَوۡلَآ إِذۡ سَمِعۡتُمُوهُ قُلۡتُم مَّا يَكُونُ لَنَآ أَن نَّتَكَلَّمَ بِهَٰذَا سُبۡحَٰنَكَ هَٰذَا بُهۡتَٰنٌ عَظِيمٞ﴾ ترجمہ: ''کیوں نہ اُسے سنتے ہی تم نے کہہ دیا کہ ہمیں ایسی بات زبان سے نکالنا زیب نہیں دیتا، سبحان اللہ، یہ تو ایک بہتان عظیم ہے''۔(سورۃ النور: 16)

۷: اس طرح کے خطرناک گناہ کے دوبارہ ارتکاب سے منع کیا گیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يَعِظُكُمُ ٱللَّهُ أَن تَعُودُواْ لِمِثۡلِهِۦٓ أَبَدًا إِن كُنتُم مُّؤۡمِنِينَ ۝١٧ وَيُبَيِّنُ ٱللَّهُ لَكُمُ ٱلۡأٓيَٰتِۚ وَٱللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾ ترجمہ: ''اللہ تم کو نصیحت کرتا ہے کہ آئندہ کبھی ایسی حرکت نہ کرنا اگر تم مومن ہو۔ اللہ تمہیں صاف صاف ہدایات دیتا ہے اور وہ علیم و حکیم ہے''۔(سورۃ النور: 17-18)

۸: اہلِ ایمان کے مابین فواحش کو عام کرنے سے منع کیا گیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ ٱلَّذِينَ يُحِبُّونَ أَن تَشِيعَ ٱلۡفَـٰحِشَةُ فِى ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَهُمۡ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِى ٱلدُّنۡيَا وَٱلۡأَخِرَةِۚ وَٱللَّهُ يَعۡلَمُ وَأَنتُمۡ لَا تَعۡلَمُونَ﴾ ترجمہ: ”جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں کے گروہ میں فحش پھیلے وہ دنیا اور آخرت میں دردناک سزا کے مستحق ہیں، اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے“۔(سورۃ النور: 19)

۹: شیطان کے نقشِ قدم پر چلنے سے منع کیا گیا ہے، اس لئے کہ یہ ہلاکت کا ذریعہ ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا تَتَّبِعُواْ خُطُوَٰتِ ٱلشَّيۡطَـٰنِۚ وَمَن يَتَّبِعۡ خُطُوَٰتِ ٱلشَّيۡطَـٰنِ فَإِنَّهُۥ يَأۡمُرُ بِٱلۡفَحۡشَآءِ وَٱلۡمُنكَرِۚ وَلَوۡلَا فَضۡلُ ٱللَّهِ عَلَيۡكُمۡ وَرَحۡمَتُهُۥ مَا زَكَىٰ مِنكُم مِّنۡ أَحَدٍ أَبَدًا وَلَـٰكِنَّ ٱللَّهَ يُزَكِّى مَن يَشَآءُۗ وَٱللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾ ترجمہ: ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو، شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو، اس کی پیروی کوئی کرے گا تو وہ اسے فحش اور بدی ہی کا حکم دے گا، اگر اللہ کا فضل اور اس کا رحم و کرم تم پر نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی شخص پاک نہ ہو سکتا، مگر اللہ ہی جسے چاہتا ہے پاک کر دیتا ہے، اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے“۔(سورۃ النور: 21)

۱۰: أعزہ و اقارب اگرچہ بُرا ہی کریں تب بھی ان پر انفاق کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَا يَأۡتَلِ أُوْلُواْ ٱلۡفَضۡلِ مِنكُمۡ وَٱلسَّعَةِ أَن يُؤۡتُوٓاْ أُوْلِى ٱلۡقُرۡبَىٰ وَٱلۡمَسَـٰكِينَ وَٱلۡمُهَـٰجِرِينَ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِۖ وَلۡيَعۡفُواْ وَلۡيَصۡفَحُوٓاْۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغۡفِرَ ٱللَّهُ لَكُمۡۚ وَٱللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ ترجمہ: ”تم میں سے جو لوگ صاحبِ فضل اور صاحبِ مقدرت ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھا بیٹھیں کہ اپنے رشتہ دار، مسکین اور مہاجر فی سبیل اللہ لوگوں کی مدد نہ کریں گے، انہیں معاف کر دینا چاہیے اور درگزر کرنا چاہیے، کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہیں معاف کرے؟ اور اللہ کی صفت یہ ہے کہ وہ غفور اور رحیم ہے“۔(سورۃ النور: 22)

۱۱: اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان اور سچے بندوں کی طرف سے دفاع کرتا ہے اور جو اُن کے بارے میں بہتان اور افترا اندازی کرتا ہے ان کو دنیا اور آخرت میں لعنت کی وعید سناتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ ٱلَّذِينَ يَرۡمُونَ ٱلۡمُحۡصَنَـٰتِ ٱلۡغَـٰفِلَـٰتِ ٱلۡمُؤۡمِنَـٰتِ لُعِنُواْ فِى ٱلدُّنۡيَا وَٱلۡأَخِرَةِ وَلَهُمۡ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٢٣﴾ يَوۡمَ تَشۡهَدُ عَلَيۡهِمۡ أَلۡسِنَتُهُمۡ وَأَيۡدِيهِمۡ وَأَرۡجُلُهُم بِمَا كَانُواْ يَعۡمَلُونَ ﴿٢٤﴾ يَوۡمَئِذٍ يُوَفِّيهِمُ ٱللَّهُ دِينَهُمُ ٱلۡحَقَّ وَيَعۡلَمُونَ أَنَّ ٱللَّهَ هُوَ ٱلۡحَقُّ ٱلۡمُبِينُ ﴿٢٥﴾﴾ ترجمہ: ”جو لوگ پاک دامن، بے خبر، مومن عورتوں پر تہمتیں لگاتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی گئی اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔ وہ اس دن کو بھول نہ جائیں جبکہ ان کی اپنی زبانیں اور ان کے اپنے ہاتھ پاؤں ان کے کرتوتوں کی گواہی دیں گے۔ اس دن اللہ وہ بدلہ انہیں بھرپور دے گا جس کے وہ مستحق ہیں اور انہیں معلوم ہو جائے گا کہ اللہ ہی حق ہے، سچ کو سچ کر دکھانے والا“۔(سورۃ النور: 23-25)

صاحبِ کشاف ان آیات کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: اگر آپ پورے قرآن پر غور کریں گے اور نافرمانوں کو سنائی جانے والی وعید پر غور کریں گے تو آپ دیکھیں گے کہ حضرت عائشہؓ پر افترا اندازی کرنے والوں کے بارے میں جو شدت اختیار کی گئی ہے، اور کسی چیز

کے بارے میں اتنی شدت کہیں اختیار نہیں کی گئی ہے، ان کے بارے میں ایسی آیات نازل کی ہیں جن میں سخت وعید، شدید عتاب اور مؤثر ڈانٹ کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے، جس عمل کا ارتکاب کیا ہے اس کا سخت نوٹس لیا گیا ہے اور جس چیز کا اقدام کیا گیا ہے اس کی شناعت اور گھناؤنے پن کو بیان کیا گیا ہے، مختلف طریقوں اور اسالیب کے ذریعہ اس کو بیان کیا گیا ہے، ان میں سے ہر اسلوب اپنے باب میں بے نظیر اور کافی ہے اور اگر ان تین آیات کے سوا اللہ تعالیٰ اور کچھ نازل نہ کرتا تو کافی ہوتا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے تہمت لگانے والوں کو دونوں جہاں میں ملعون قرار دیا اور آخرت میں ان کے لئے عذابِ عظیم کی وعید سنائی اور واضح کر دیا کہ ان کی زبانیں، ان کے ہاتھ پاؤں ان کے خلاف گواہی دیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کو ایسی سزا دے گا جس کے وہ اہل ہیں۔ (تفسیر الکشاف: 3/223)

۱۲: اللہ تعالیٰ نے کائنات میں جاری ایک ضابطے کو بیان کیا ہے کہ پاکیزہ مردوں کو پاکیزہ عورتیں نصیب ہوتی ہیں اور پاکیزہ عورتوں کو پاکیزہ مرد نصیب ہوتے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ٱلْخَبِيثَٰتُ لِلْخَبِيثِينَ وَٱلْخَبِيثُونَ لِلْخَبِيثَٰتِ ۖ وَٱلطَّيِّبَٰتُ لِلطَّيِّبِينَ وَٱلطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبَٰتِ ۚ أُو۟لَٰٓئِكَ مُبَرَّءُونَ مِمَّا يَقُولُونَ ۖ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ﴾ ترجمہ: ''خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لئے ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لئے، پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لئے ہیں اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لئے، ان کا دامن پاک ہے اُن باتوں سے جو بنانے والے بناتے ہیں، ان کے لئے مغفرت ہے اور رزق کریم''۔ (سورۃ النور: 26)

۱۳: حضرت عائشہ صدیقہ بنت صدیق -رضي الله عنهما- پر جب تہمت لگائی گئی تو لوگ چار قسموں میں منقسم ہوئے، فضیلۃ الشیخ عبد القادر شیبۃ الحمد واقعۂ افک سے متعلق حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: حضرت عائشہ صدیقہ بنت صدیقؓ پر جب افترا اندازی کی گئی تو لوگ چار قسموں میں منقسم تھے:

- ایک قسم وہ تھی -اور اکثر لوگ اسی قسم سے تعلق رکھتے تھے- جنہوں نے اپنے کانوں کو اور زبانوں کو محفوظ رکھا، انہوں نے خاموشی اختیار کی اور خیر کے سوا زبان سے اور کچھ نہیں نکالا، نہ ہی تصدیق کی اور نہ ہی تکذیب۔
- دوسری قسم وہ تھی جنہوں نے اس تہمت اور افترا اندازی کی تکذیب کی، ان میں حضرت ابو ایوب انصاریؓ اور حضرت اُم ایوبؓ سرِ فہرست ہیں، انہوں نے جیسے ہی یہ بات سنی تو انہوں نے کہا کہ یہ افترا اور جھوٹ ہے، اور انہوں نے فوری طور پر حضرت عائشہؓ کی براءت کا اعلان کیا۔
- جہاں تک تیسری قسم کا تعلق ہے تو وہ مسلمانوں ہی کا ایک طبقہ تھا، انہوں نے نہ ہی تصدیق کی اور نہ ہی تکذیب کی اور نہ ہی نفی کی، لیکن اہل افک نے جو کچھ افتراء اندازی کی تھی اس کے بارے میں وہ آپس میں گفتگو کرنے لگے اور وہ سمجھ رہے تھے کہ اس کے بارے میں گفتگو کرنا ایک معمولی معاملہ ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی طرح کی سزا کا سامنا نہیں ہوگا، اس لئے کہ 'نقلِ کفر کفر نہ باشد' اور افتراء و تہمت کو بیان کرنے والا تہمت لگانے والا نہیں ہے، ان حضرات میں یہ لوگ شامل تھے: حمنہ بنت جحشؓ، حسان بن ثابتؓ اور مسطح بن اثاثہؓ۔

- جہاں تک چوتھی قسم کا تعلق ہے تو وہ لوگ تھے جو افتراء اور جھوٹ گڑھ کر لائے تھے، ان میں سرِ فہرست دشمنِ خدا عبداللہ بن اُبی بن سلول تھا، جو رئیس المنافقین بھی تھا اور اسی نے اس میں بنیادی رول ادا کیا تھا۔ اللہ کی لعنت ہو اس پر!

اللہ تعالیٰ نے ان قسموں میں سے دوسری قسم کی تعریف کی ہے اور بیان کیا ہے کہ تمام مسلمانوں کے لئے یہی موقف اختیار کرنا مناسب تھا ،ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لَّوْلَآ إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ ٱلْمُؤْمِنُونَ وَٱلْمُؤْمِنَٰتُ بِأَنفُسِهِمْ خَيْرًا وَقَالُوا۟ هَٰذَآ إِفْكٌ مُّبِينٌ﴾ ترجمہ: ''جس وقت تم لوگوں نے اسے سنا تھا اُسی وقت کیوں نہ مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنے آپ سے نیک گمان کیا اور کیوں نہ کہہ دیا کہ یہ صریح بہتان ہے؟''۔(سورۃ النور:12)

تیسری قسم کے بارے میں اللہ عزوجل نے اس جانب اشارہ کیا ہے کہ ان کے لئے اس طرح کی باتوں کو موضوعِ گفتگو بنانا مناسب نہیں تھا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَوْلَآ إِذْ سَمِعْتُمُوهُ قُلْتُم مَّا يَكُونُ لَنَآ أَن نَّتَكَلَّمَ بِهَٰذَا سُبْحَٰنَكَ هَٰذَا بُهْتَٰنٌ عَظِيمٌ﴾ ترجمہ: ''کیوں نہ اُسے سنتے ہی تم نے کہہ دیا کہ ہمیں ایسی بات زبان سے نکالنا زیب نہیں دیتا، سبحان اللہ، یہ تو ایک بہتان عظیم ہے''۔(سورۃ النور:16)

اللہ تعالیٰ نے اس گروہ کے ان فضائل کا بھی ذکر کیا ہے جو ان کو اپنے عظیم اعمال کی وجہ سے حاصل تھے جیسے کہ حضرت مسطحؓ کی ہجرت اور ان کے ایمان کا حوالہ دیا ہے جبکہ حضرت ابو بکرؓ نے اس بات کی قسم کھالی تھی کہ وہ اب مسطحؓ پر نہ ہی خرچ کریں گے اور نہ ہی ان کو صدقہ دیں گے، وہ ان کے اہلِ قرابت میں سے تھے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَا يَأْتَلِ أُو۟لُوا۟ ٱلْفَضْلِ مِنكُمْ وَٱلسَّعَةِ أَن يُؤْتُوٓا۟ أُو۟لِى ٱلْقُرْبَىٰ وَٱلْمَسَٰكِينَ وَٱلْمُهَٰجِرِينَ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ ۖ وَلْيَعْفُوا۟ وَلْيَصْفَحُوٓا۟ ۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ ٱللَّهُ لَكُمْ ۗ وَٱللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ ترجمہ: ''تم میں سے جو لوگ صاحبِ فضل اور صاحبِ مقدرت ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھا بیٹھیں کہ اپنے رشتہ دار، مسکین اور مہاجر فی سبیل اللہ لوگوں کی مدد نہ کریں گے، انہیں معاف کر دینا چاہیے اور در گزر کرنا چاہیے، کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہیں معاف کرے؟ اور اللہ کی صفت یہ ہے کہ وہ غفور اور رحیم ہے''۔(سورۃ النور:22)

جہاں تک چوتھی قسم کا تعلق ہے اور وہ عبداللہ بن اُبی اور اس کی جماعت ہے جو اس تہمت کو گڑھ کر لائے اور اس جھوٹ کے بارے میں انہوں نے افتراء اندازی کی، اللہ تعالیٰ نے اس جانب اشارہ کیا ہے کہ وہ کفر کی حالت میں ہی مریں گے، اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول نہیں کرے گا اور وہ دنیا اور آخرت میں اللہ کی لعنت کے مستحق قرار پائے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ ٱلَّذِينَ يَرْمُونَ ٱلْمُحْصَنَٰتِ ٱلْغَٰفِلَٰتِ ٱلْمُؤْمِنَٰتِ لُعِنُوا۟ فِى ٱلدُّنْيَا وَٱلْءَاخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٢٣﴾ يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُم بِمَا كَانُوا۟ يَعْمَلُونَ ﴿٢٤﴾ يَوْمَئِذٍ يُوَفِّيهِمُ ٱللَّهُ دِينَهُمُ ٱلْحَقَّ وَيَعْلَمُونَ أَنَّ ٱللَّهَ هُوَ ٱلْحَقُّ ٱلْمُبِينُ ﴿٢٥﴾﴾ ترجمہ: ''جو لوگ پاک دامن، بے خبر، مومن عورتوں پر تہمتیں لگاتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی گئی اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔ وہ اس دن کو بھول نہ جائیں جبکہ ان کی اپنی زبانیں اور ان کے اپنے ہاتھ پاؤں ان کے کرتوتوں کی گواہی دیں گے۔ اس دن اللہ وہ بدلہ

انہیں بھر پور دے گا جس کے وہ مستحق ہیں اور انہیں معلوم ہو جائے گا کہ اللہ ہی حق ہے، سچ کو سچ کر دکھانے والا"۔(سورۃ النور: 23-25)
(دیکھیں: فقہ الاسلام شرح بلوغ المرام، فضیلۃ الشیخ، عبد القادر شیبۃ الحمد: 9/5)

۷: واقعۂ اُفک اور غزوۂ بنی المصطلق سے حاصل ہونے والے دروس واسباق

ا: رسول ﷺ کی بشریت:

واقعۂ اُفک کے ضمن میں بہت سی الٰہی حکمتیں پوشیدہ تھیں جن کا مقصد رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کو ہر دوسری چیز سے صاف وشفاف اور نمایاں طور پر واضح کرنا تھا، اگر وحی کوئی ذاتی معاملہ ہوتی اور رسول اللہ ﷺ کی شخصیت سے وہ کوئی جداگانہ اور علیحدہ چیز ہوتی تو آپ ﷺ مکمل ایک ماہ تک اس سخت جان آزمائشی دور سے نہ گزرتے، لیکن اس آزمائش کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ کی بشریت اور نبوت کی حقیقت لوگوں کے سامنے بالکل واضح ہوگئی، چنانچہ جب وحی نے حضرت عائشہؓ سے متعلق ان تمام بیہودگیوں کے بارے میں فیصلہ کن بات کہہ دی تو رسول اللہ ﷺ اور حضرت عائشہؓ کے مابین تعلقات ویسے ہی ساز گار ہو گئے جیسے کہ پہلے تھے، اور اس سخت جان آزمائش کے بعد تمام اہل ایمان اس نتیجہ سے مطمئن اور خوش ہو گئے، اس کے ذریعہ وحی کی حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر وحی کا تعلق اللہ کی ذات سے نہ ہوتا تو اس آزمائش کے اثرات رسول اللہ ﷺ کے نفس میں برقرار رہتے، اور اپنی زوجہ حضرت عائشہؓ کے ساتھ تعلقات پر اس کا اثر پڑتا، لیکن اللہ کی مشیت یہ ہوئی کہ یہ آزمائش نبوت محمدی پر واضح دلیل بن جائے۔(دیکھیں: السیرۃ النبویہ فی ضوء المصادر الاصلیہ، ص: 441)

۲: حدِّ قذف اور عزت وعفت کی حفاظت میں اس کی اہمیت:

مختلف واقعات کے ذریعہ اسلامی معاشرہ کی تربیت کا عمل جاری تھا، چنانچہ جب واقعۂ اُفک پیش آیا تو اللہ عزوجل نے چاہا کہ بعض ایسے احکام مشروع کئے جائیں جو اہلِ ایمان کی عزت وآبرو کی حفاظت میں اہم رول ادا کرتے ہیں، اسی لئے سورۃ النور نازل ہوئی جس میں زانی اور زانیہ کے حکم کے بارے میں اور بدکاری کی برائی کے بارے میں گفتگو کی ہے، اسی طرح زوجین میں سے جب کوئی دوسرے پر الزام لگائے تو حاکم کی ذمہ داری کیا ہے، اور پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے والوں کی سزا کیا ہے، اس طرح کے احکام کو بھی بیان کیا ہے۔(دیکھیں: حدیث القرآن الکریم: 1/357)

بلا شبہ اسلام نے زنا اور بدکاری کو حرام قرار دیا ہے اور بدکاری کرنے والے کے لئے سزا متعین کی ہے، اسی طرح اس کا ذریعہ اور سبب بننے والی تمام اشیاء اور راستوں کو بھی حرام قرار دیا ہے، یہاں تک کہ اس سے متعلق الفاظ وکلمات کو بھی ممنوع قرار دیا ہے، تاکہ معاشرہ اس طرح کے الفاظ اور گفتگو سے پاک وصاف رہے، اس لئے کہ بدکاری کے بارے میں گفتگو اور آسانی کے ساتھ اس کے متعلق ہر وقت بات چیت کے ذریعہ سننے والا اس کو معمولی سمجھ بیٹھے گا، اور کمزور نفوس کے حامل اس کے ارتکاب کے سلسلہ میں جری ہو جائیں گے، اسی لئے شریعت اسلامیہ نے زنا کی تہمت لگانے کو بھی حرام قرار دیا ہے اور جو بھی کسی پاکدامن اور بے گناہ مرد یا عورت پر تہمت لگائے گا تو شریعت

نے اس کے لئے حدّ قذف واجب کی ہے اور حد قذف یہ ہے کہ اس کو اسّی (۸۰) کوڑے لگائے جائیں گے اور اس کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی، الا یہ کہ وہ سچی پکی توبہ کرلے۔(دیکھیں: آثار تطبیق الشریعہ، ڈاکٹر محمد الزاحم، ص:117)

اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت مسطحؓ، حضرت حسانؓ اور حضرت حمنہؓ پر حدّ قذف جاری فرمائی، محمد بن اسحاق اور دیگر سیرت نگاروں نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے واقعہ اُفک کے سلسلہ میں دو مردوں اور ایک عورت پر کوڑے لگا کر حد جاری کی: حضرت مسطحؓ، حضرت حسانؓ اور حضرت حمنہؓ۔ امام ترمذی نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔(سنن ترمذی: 3181)البتہ امام ترمذیؒ نے ناموں کا ذکر نہیں کیا ہے۔ امام ابوداؤد نے ناموں کا ذکر کیا ہے: 4475)

امام قرطبیؒ فرماتے ہیں: روایات میں اور علماء کے نزدیک مشہور یہ ہے کہ جن پر حد جاری کی گئی وہ تھے: حضرت حسانؓ، حضرت مسطحؓ اور حضرت حمنہؓ۔ عبداللہ بن اُبی پر حد لگانے کے سلسلہ میں کوئی صحیح روایت وارد نہیں ہے، بعض ضعیف روایات وارد ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ عبداللہ بن اُبی پر حد جاری کی گئی، لیکن یہ سب کی سب ضعیف روایات ہیں جن پر کوئی دلیل قائم نہیں ہوتی ہے۔(تفسیر القرطبی: 12/197، مرویات غزوۃ بنی المصطلق، ص:242)

عبداللہ بن اُبی پر حد جاری نہ کرنے کے سلسلہ میں ابن قیمؒ نے متعدد حکمتیں ذکر کی ہیں جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

۱) ایک مصلحت یہ بیان کی گئی ہے کہ حدود لوگوں کے حق میں تخفیف اور کفارہ ہوتی ہیں اور یہ خبیث اس کا اہل نہیں تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے آخرت میں عذاب الیم کا وعدہ کیا ہے۔

۲) یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ باتوں کی ٹوہ میں لگتا تھا، ان کو جمع کرتا تھا اور پھر بیان کرتا تھا اور ان کو ایسے لوگوں کی طرف منسوب کرکے بیان کرتا تھا۔

۳) یہ بھی کہا گیا ہے کہ حد یا تو بیّنہ (دلیل) یا اقرار کے ذریعہ ثابت ہوتی ہے، اور اس نے نہ ہی اقرار کیا اور نہ ہی کسی نے اس کے خلاف گواہی دی، وہ اس کا تذکرہ اپنے اصحاب کے درمیان کرتا تھا اور انہوں نے اس کے خلاف گواہی نہیں دی، وہ اہلِ ایمان کے درمیان اس کا تذکرہ نہیں کرتا تھا۔

۴) ایک قول یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ نے ایک بڑی مصلحت کے پیشِ نظر اس پر حد جاری کرنے کو ترک کیا، جیسے کہ اس کے نفاق کے ظہور کے باوجود اور بار بار موجبِ قتل کلام کرنے کے باوجود اس کو قتل نہیں کیا، اور وہ مصلحت یہ تھی کہ اس کی قوم کی تالیفِ قلب ہو اور ان کو اسلام کے بارے میں متنفر نہ کیا جائے۔

ابن قیمؒ ان تمام نکات کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: شاید آپ ﷺ نے اس پر حد حذف ان تمام امور کی وجہ سے جاری نہیں فرمائی۔(زاد المعاد: 3/263)

روایات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جو بھی واقعہ اُفک میں ملوث تھا ان سب نے توبہ کرلی، سوائے ابن اُبی کے، حضرت حسانؓ نے اس عمل سے معذرت کرلی، انہوں نے حضرت عائشہؓ کی تعریف ان اوصاف کے ذریعہ کی ہے جن کی وہ اہل ہیں، فرماتے ہیں:

رَأَيْتُكَ وَلْيَغْفِرْ لَكَ اللهُ حُرَّةً ... مِنَ الْمُحْصَنَاتِ غَيْرَ ذَاتِ غَوَائِلِ
حَصَانٌ رَزَانٌ مَا تُزَنُّ بِرِيبَةٍ ... وَتُصْبِحُ غَرْثَى مِنْ لُحُومِ الْغَوَافِلِ
وَإِنَّ الَّذِي قَدْ قِيلَ لَيْسَ بِلَائِطٍ ... بِكَ الدَّهْرَ بَلْ قِيلُ امْرِئٍ مُتَمَاحِلِ
فَإِنْ كُنْتُ أَهْجُوكُمْ كَمَا بَلَّغُوكُمْ ... فَلَا رَجَعَتْ سَوْطِي إِلَيَّ أَنَامِلِي
فَكَيْفَ وَوُدِّي مَا حَيِيتُ وَنُصْرَتِي ... لِآلِ رَسُولِ اللهِ زَيْنَ الْمَحَافِلِ
وَإِنَّ لَهُمْ عِزًّا يُرَى النَّاسُ دُونَهُ ... قِصَارًا وَطَالَ الْعِزُّ كُلَّ التَّطَاوُلِ

ترجمہ: میں نے آپ کو-اللہ آپ کو معاف فرمائے-ایک آزاد، پاکدامن اور پاکباز اور شر وفساد سے دور رہنے والی خاتون کے طور پر دیکھا ہے۔ آپ سنجیدہ، عقلمند اور پاکدامن ہیں جن پر کبھی تہمت نہیں لگائی جاسکتی ہے اور نہ ہی شک وشبہ کیا جاسکتا ہے۔ وہ ہر صبح بھوکی ہو کر نادان بہنوں کا گوشت نہیں کھاتی۔ آپ کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ کبھی بھی آپ کے لائق اور شایان شان نہیں ہے۔ بلکہ وہ کسی افترا اندازی کرنے والے کا قول ہے۔ اگر میں نے آپ کی ہجو بیان کی ہو جیسے کہ آپ تک اس کی خبر پہنچائی گئی ہے تو پھر میری انگلیاں کبھی میرا کوڑا نہ اٹھا پائیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے جب تک میں زندہ ہوں تو آل رسولؐ کے لئے میری محبت ومودت محفلوں کی زینت ہے۔ بلاشبہ ان آل رسول کو عزت و بلندی کا مقام بلند حاصل ہو جس کے مقابلہ میں لوگ بولنے لگتے ہیں اور عزت کی چوٹی پر پہنچنا ہر کوشش کرنے والے سے بلند و بالا ہے۔ (دیکھیں: تاریخ الاسلام، الذھبی، المغازی، ص: 281)

۴: غزوہ بنی المصطلق سے مستنبط ہونے والے احکام:

- جس قوم تک اسلام کی دعوت پہنچ چکی ہو ان پر بغیر پیشگی اطلاع اور انذار کے حملہ کرنے کا جواز معلوم ہوتا ہے۔
- آزاد کرنے کو مہر بنایا جانا درست ہے جیسے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت جویریہ بنت حارثؓ کے ساتھ اس غزوہ میں کیا۔
- سفر کے وقت بیویوں کے مابین قرعہ اندازی کرنے کی مشروعیت کا پتہ چلتا ہے، اسی طرح عربوں کو غلام بنانا جائز ہے جیسے کہ اس غزوہ میں کیا گیا، یہی جمہور علماء کا قول ہے۔ (دیکھیں: کتاب الأم للشافعی: 4/186)
- اسی طرح تمام علماء کا اس پر اجماع واتفاق ہے کہ جس نے بھی حضرت عائشہؓ کو برا بھلا کہا جبکہ نص قرآنی کی بنیاد پر ان کے بارے میں قطعی براءت کا اعلان کیا گیا ہے، ایسا شخص کافر اور خارج از اسلام ہے، اس لئے کہ وہ قرآن کا منکر ہے۔ (شرح صحیح مسلم للنبوی: 5/643)
- اس غزوہ میں عورتوں سے عزل کرنے کا حکم بھی معلوم ہوا، اس لئے کہ اسی غزوہ میں صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ سے عزل کے بارے میں دریافت کیا تو آپؐ نے اس کی اجازت دی۔ (صحیح بخاری: 5210، صحیح مسلم: 1438/125، مسند احمد: 3/68، السیرۃ النبویہ الصحیحۃ للعمری: 2/415)

جمہور علماء اس طرف گئے ہیں کہ آزاد زوجہ سے اس کی اجازت کے ساتھ عزل کرنا جائز ہے۔ (نیل الاوطار للشوکانی: 6/222)

- اسی غزوہ میں آیتِ تیمم بھی نازل ہوئی، اس کے ذریعہ واضح کیا گیا کہ نماز کا مقام و مرتبہ کتنا بلند ہے اور وہ کس قدر اہمیت کی حامل ہے، اور پانی کی عدم موجودگی بھی اس کی ادائیگی میں رکاوٹ نہیں بن سکتی ہے، حالانکہ پانی طہارت کا وسیلہ اور ذریعہ ہے اور طہارت نماز کی اہم ترین شرط ہے، اسی طرح خوف کا پایا جانا اور امن کا مفقود ہونا بھی نماز قائم کرنے میں رکاوٹ نہیں بن سکتا ہے۔ (دیکھیں: صور و عبر من الجہاد النبوی فی المدینۃ، ص: 210-211)

گیارھویں فصل

غزوۂ اُحزاب (5ھ)

پہلا باب

غزوہ کی تاریخ، اسباب اور واقعات

ا: غزوہ کی تاریخ اور اسباب:

جمہور اہلِ سیرت و مغازی کا قول یہ ہے کہ غزوۂ احزاب سن پانچ ہجری کے ماہ شوال میں پیش آیا۔(السیرۃ النبویۃ فی ضوء المصادر الاصلیہ، ص:433)

واقدی کہتے ہیں: یہ بروز بدھ آٹھ ذی القعدہ سن پانچ ہجری میں پیش آیا۔(المغازی: 2/440)ابن سعدؒ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی دعا کو قبول فرمایا اور تمام فوجوں کو بدھ کے روز ماہِ ذی قعدہ سن پانچ ہجری میں شکست دی، انہوں نے زہری، مالک بن انس اور موسی بن عقبہ سے نقل کیا ہے کہ یہ غزوہ سن چار ہجری میں پیش آیا۔(الطبقات 2/65) البدایہ والنہایہ: 4/105)

جمہور نے جو قول اختیار کیا ہے-اور یہی میرے نزدیک راجح ہے- اسی کو ابن قیمؒ نے بھی اختیار کیا ہے وہ فرماتے ہیں: یہ غزوہ سن پانچ ہجری ماہِ شوال میں صحیح ترین قول کے مطابق پیش آیا، اس لئے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ غزوۂ احد ماہِ شوال سن تین ہجری میں پیش آیا اور مشرکین نے رسول اللہ ﷺ سے آئندہ سال پھر سے جنگ کرنے کا وعدہ کیا اور اگلا سال سن چار ہجری تھا، لیکن اس سال قحط سالی ہونے کی وجہ سے وہ جنگ کرنے نہیں آئے اور جب سن پانچ ہجری ہوئی تو وہ جنگ کرنے کے لئے آگئے۔(دیکھیں: زاد المعاد: 2/288)

۲: غزوۂ خندق کے اسباب:

بنو نضیر کے یہود جب مدینہ منورہ سے خیبر کی جانب نکلے تو اس حال میں نکلے کہ ان کے دلوں میں مسلمانوں کے تئیں عداوت و دشمنی اور کینہ بھرا ہوا تھا، خیبر میں جیسے ہی انہوں نے قرار پکڑا تو وہ مسلمانوں سے انتقام لینے کے لئے منصوبہ بندی اور سازشیں کرنے لگے، انہوں نے اس پر اتفاق کیا کہ وہ مختلف عرب قبائل کے پاس جائیں گے اور ان کو مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے پر آمادہ کریں گے، اس خبیث مقصد کے لئے انہوں نے ایک وفد تشکیل دیا جس میں یہ افراد شامل تھے: سلام بن ابی الحقیق، حیی بن اخطب، کنانہ بن الربیع بن ابی الحقیق، ہوذہ بن قیس الوائلی، ابو عمار۔(سیرت ابن ہشام: 3/237)

اس وفد کو اپنے مقصد میں بہت بڑی کامیابی ملی، اس لئے کہ قریش نے بھی اس پر اتفاق کر لیا جن کو مسلمانوں کی طرف سے اقتصادی محاصرہ کی تنگی اور سختی کا احساس تھا، اسی طرح غطفان نے بھی اس پر اتفاق کیا جن کو مدینہ کی خیرات اور لوٹ مار کا لالچ تھا، اسی طرح دیگر قبائل نے بھی ان کی حامی بھر لی۔

یہود کے وفد نے مشرکینِ مکہ سے کہا کہ بے شک تمہارا دین محمدؐ کے دین سے بہتر ہے اور آپ ان کے مقابلہ میں حق کے زیادہ مستحق ہو۔(دیکھیں: التاریخ السیاسی والعسکری، د- علی معطی، ص: 310)

اسی کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى ٱلَّذِينَ أُوتُواْ نَصِيبًا مِّنَ ٱلْكِتَٰبِ يُؤْمِنُونَ بِٱلْجِبْتِ وَٱلطَّٰغُوتِ وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ كَفَرُواْ هَٰٓؤُلَآءِ أَهْدَىٰ مِنَ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ سَبِيلًا﴾ ترجمہ: "کیا تم نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کے علم میں سے کچھ حصہ دیا گیا ہے اور اُن کا حال یہ ہے کہ جِبت اور طاغوت کو مانتے ہیں اور کافروں کے متعلق کہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں سے تو یہی زیادہ صحیح راستے پر ہیں۔ ایسے ہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے اور جس پر اللہ لعنت کر دے پھر تم اُس کا کوئی مددگار نہیں پاؤ گے"۔ (سورۃ النساء: 51-52)

اسی قول کی وجہ سے استاد ویلفنسن wolfensohn نے اس بڑی غلطی کی جانب اشارہ کیا ہے جس میں یہ یہود مبتلا ہوئے تھے، اس لئے کہ انہوں نے دینِ اسلام کے مقابلہ میں قریش کے بت پرستی پر مبنی دین کو افضل قرار دیا تھا، حالانکہ اسلام ایک معبود کی عبادت کی دعوت دیتا ہے، وہ رقمطراز ہیں: "یہود اور مسلمانوں میں سے ایک الٰہ پر ایمان رکھنے والے ہر شخص کے لئے وہ گفتگو باعثِ تکلیف ہے جو یہودی وفد اور بت پرست قریشیوں کے درمیان ہوئی، اس لئے کہ یہود کے اس وفد نے قریش کے دین کو اسلامی پیغام کے حامل دین کے مقابلہ میں افضل قرار دیا"۔ (دیکھیں: تاریخ الیہود فی بلاد العرب، ولفنسن، ص: 142)

یقیناً قریش کو اپنے دین کی تعریف سن کر خوشی ہوئی، اس لئے وہ مزید جذباتی ہو گئے اور مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے میں پُر عزم ہو گئے یہاں تک کہ انہوں نے اس پکار پر لبیک کہا اور مدینہ پر حملہ کرنے کی تحریک میں شریک ہونے کے لئے تیار ہو گئے اور اس کے لئے ایک وقت بھی طے کر لیا۔ (ایضاً: ص: 310)

یہودی وفد نے قبیلۂ غطفان کے زعماء کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف ایک "یہود و مشرکین عربی عسکری اتحاد (ایلائنس)" بنانے کا معاہدہ کیا، اس معاہدہ کی اہم دفعات مندرجہ ذیل تھیں:

اَ: اس متحدہ فوج میں غطفان کے چھ ہزار جنگجو شامل ہوں گے۔

ب: اس کے بدلہ میں یہود غطفان کے قبائل کو ایک سال کی خیبر کی تمام کھجوریں دیں گے۔ (دیکھیں: غزوۃ الاحزاب، محمد احمد باشمیل، ص: 141)

یہود کا وفد اپنی مہم میں کامیاب ہو کر واپس آیا اور وہ مدینہ اس حال میں واپس آیا کہ اس کے ساتھ دس ہزار جنگجو تھے، چار ہزار قریش اور اس کے حلفاء کے، اور چھ ہزار غطفان اور ان کے حلفاء کے، جنگجوؤں کی اس بڑی تعداد نے مدینہ منورہ کے قریب آ کر پڑاؤ ڈالا۔

۳: احزاب پر مسلمانوں کی نظر:

اسلامی ریاست کی انٹیلیجنس اپنے دشمنوں کے بارے میں مکمل طور پر چوکنا تھی، وہ ان افواج کی تمام خبروں پر نظر رکھے ہوئے تھی، ان کی نقل و حرکت کو نوٹ کر رہی تھی، اسی طرح یہودی وفد جب سے خیبر سے مکہ کی جانب روانہ ہوا تھا اسی وقت سے ان کی نقل و حرکت پر بھی نظر رکھے ہوئے تھی، یہودی وفد اور قریش کے درمیان اور پھر غطفان کے ساتھ کئے ہوئے معاہدہ کا ان کو مکمل طور پر علم تھا۔

دشمن کے بارے میں ان معلومات کے حصول کے ساتھ ہی رسول اللہ ﷺ نے لازمی دفاعی کاروائیوں کا آغاز کر دیا اور ایک ہنگامی میٹنگ طلب کی جس میں مہاجرین و انصار میں سے مسلمان فوج کے بڑے قائدین نے شرکت کی، اس میٹنگ میں آپ ﷺ نے صحابہ کرام کے ساتھ یہود کی ناپاک کوششوں کے نتیجہ میں پیدا شدہ اس خطرناک صورتحال کا جائزہ لیا، حضرت سلمان فارسیؓ نے بھی اپنی رائے کا اظہار کیا، وہ یہ تھی کہ ایک بڑی خندق کھودی جائے تاکہ دشمن کو اس کے ذریعہ روکا جاسکے، نبی کریم ﷺ کو یہ رائے پسند آئی۔ واقدی فرماتے ہیں: حضرت سلمانؓ نے فرمایا: اے اللہ کے رسولؐ! جب ہم اُرض فارس (ایران) میں تھے اور ہمیں کسی دشمن کا خوف ہوتا تھا تو ہم ان کے مقابلہ میں خندق کھودتے تھے، اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا آپ بھی خندق کھودنا پسند فرمائیں گے؟ حضرت سلمانؓ کی یہ رائے مسلمانوں کو پسند آئی۔ (دیکھیں: غزوۃ الاحزاب، محمد احمد باشمیل، ص144-145، مغازی الواقدی: 2/444، الطبقات الکبری: 2/6)

مشاورت کے بعد خندق کی کھدائی کے بارے میں جب سب کا اتفاق ہو گیا تو نبی کریم ﷺ اور بعض صحابہ کرام اس جگہ کی تعیین کے لئے تشریف لے گئے، آپ ﷺ نے ایسی جگہ کا انتخاب فرمایا جس کے ذریعہ مسلمانوں کی حمایت و حفاظت ممکن تھی، واقدی نے ذکر کیا ہے: رسول اللہ ﷺ اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے اور آپؐ کے ساتھ مہاجرین و انصار صحابہ کرام کا ایک وفد تھا، اللہ کے رسولؐ ایک جگہ تشریف لے گئے جہاں آپؐ اکثر جایا کرتے تھے، آپؐ کے نزدیک سب سے بہترین جگہ یہ تھی کہ 'سَلع' پہاڑ کو پشت رکھ کر سامنے کے علاقہ میں خندق کھودیں، اور اس کی کھدائی کا آغاز 'مذاد' سے ہو اور یہ سلسلہ کوہ ذباب سے کوہ راتج تک چلا جائے، جبل سَلع کی قدرتی فصیل کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے اس پہاڑ کے ذریعہ صحابہ کرام کی حمایت و حفاظت کا کام لیا۔

ان تمام مقامات کا انتخاب بالکل درست اور فوجی حکمتِ عملی کے عین مطابق تھا، اس لئے کہ مدینہ کی شمالی سمت دشمن کے لئے بالکل کھلی سمت تھی جہاں سے مدینہ میں داخل ہونے اور اس پر حملہ کرنے کا امکان تھا، اور جہاں تک دوسری سمتوں کا تعلق ہے تو وہ محفوظ اور قلع بند تھیں جو حملہ آور ہونے والے کسی بھی دشمن کے سامنے سدّ آہنی کا کام کرتی تھیں، اسی طرح مکانات بھی جنوبی سمت میں ایک دوسرے سے بالکل متصل اور مضبوط چہار دیواری کی طرح بلند تھے، حرّہ واقم مشرقی سمت اور حرۃ الوبرہ مغربی سمت واقع تھے جو ایک فطری قلعہ کا کام کرتے تھے۔ جنوب مشرقی سمت میں بنی قریظہ کی پہاڑیاں مسلمانوں کو پشت سے محفوظ رکھنے کا کام کرتی تھیں اور رسول اللہ ﷺ اور بنی قریظہ کے درمیان معاہدہ تھا کہ وہ آپؐ کے خلاف کسی کا ساتھ نہیں دیں گے، اور نہ ہی آپؐ کے خلاف کسی دشمن کی مدد کریں گے۔ (دیکھیں: العبقریۃ العسکریہ فی غزوات الرسول ﷺ ص: 442)

رسول اللہ ﷺ کا اس موقع پر لشکر کے پڑاؤ کے لئے مناسب جگہ تلاش کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ لشکر کے پڑاؤ کے لئے مناسب جگہ کس قدر اہم ہے اور اس میں ایک بنیادی شرط کا پایا جانا ضروری ہے اور وہ ہے لشکر کی مکمل حفاظت۔ اس لئے کہ اس کا معرکہ کی رفتار اور اس کے نتائج پر واضح اثر پڑتا ہے۔

خندق میں رسول اللہ ﷺ کا منصوبہ نیا، انوکھا اور ترقی یافتہ تھا، اس لئے کہ آپؐ نے جنگ کے جدید اسالیب کو اختیار کیا، عربوں کے ہاں خندق کھودنا معروف نہیں تھا، بلکہ اس طرح کا اسلوب ان کے لئے ایک نئی ہی چیز تھا، اس اعتبار سے رسول اللہ ﷺ پہلے شخص ہیں

جنہوں نے عرب اور مسلمانوں کی تاریخ میں جنگ میں خندق کھودنے کا طریقہ اختیار کیا، چنانچہ یہ خندق اعدائے اسلام کے لئے ایک حیران کن مسئلہ تھا، آپ ﷺ نے ان کے بتائے ہوئے منصوبے کو خاک میں ملا دیا، اس حیران کن کام کی کامیابی کے اسباب میں سے ایک سبب یہ تھا کہ مسلمانوں نے انتہائی رازداری کے ساتھ اور فوری طور پر اس منصوبہ کو پائے تکمیل تک پہنچایا، جنگ کے اس نئے طریقہ کار کا تمام افواج کو معنوی طور پر کمزور کرنے اور ان کو منتشر کرنے میں اہم کردار رہا۔

۴: داخلی محاذ کے بارے میں نبی کریم ﷺ کا اہتمام:

۱: جب نبی کریم ﷺ کو اس متحدہ فوج کی آمد کا علم ہوا اور آپؐ نے خندق کی جانب نکلنے کا ارادہ فرمایا تو آپؐ نے مسلمان بچوں اور خواتین کو بنو خارثہ کے قلعہ میں رکھنے کا حکم دیا، تاکہ وہ دشمنوں کے خطرہ سے محفوظ رہیں، اس لئے کہ خواتین اور بچوں کے محفوظ رہنے کا جنگ کرنے والوں کی نفسیات پر گہرا اثر پڑتا ہے کیونکہ ایک فوجی جب اپنی بیوی اور بچوں کے بارے میں مطمئن ہوگا تو وہ قلبی اور اعصابی اعتبار سے پُرسکون ہوگا، کسی اور معاملہ کی وجہ سے اس کا ذہن مشغول نہیں ہوگا، وہ اپنے تمام وسائل و ذرائع اور فکری اور جسمانی صلاحیتیں دشمن کو زیر کرنے میں لگا دے گا، لیکن جب صورتحال اس کے برعکس ہو تو وہ پریشان اور ذہنی انتشار کا شکار ہوگا اور وہ نفسیاتی اعتبار سے بھی کمزور ہوگا جس کی وجہ سے وہ میدانِ جنگ میں پسپائی کا شکار ہو سکتا ہے اور اس کے بُرے نتائج سب کو بھگتنے پڑ سکتے ہیں۔ (دیکھیں: غزوۃ الاحزاب، ڈاکٹر محمد عبدالقادر، ابو فارس، ص:98)

۲: جس چیز نے داخلی محاذ کو مضبوط و مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کیا وہ اسلامی فوج کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی بنفس نفیس شرکت تھی، رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام کے ساتھ خندق کھودنے کے مشکل کام میں شریک رہے اور اپنے مبارک ہاتھوں سے کام کرتے رہے، چنانچہ ابن اسحاق سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے براءؓ کو بیان کرتے ہوئے سنا کہ جب غزوۂ احزاب تھا تو رسول اللہ ﷺ خود خندق کھود رہے تھے، میں نے آپؐ کو دیکھا کہ آپؐ خندق کی مٹی اٹھا رہے تھے یہاں تک کہ آپؐ کے پیٹ کی جلد مٹی سے اَٹ گئی تھی اور آپؐ کے جسم مبارک پر بہت گھنے بال تھے۔ (صحیح بخاری: 4106، صحیح مسلم: 1803)

اللہ کے رسول ﷺ نے صحابہ کرام کے ساتھ بلند ہمتی اور حوصلہ مندی کے ساتھ کام کیا جس کی وجہ سے آپؐ صحابہ کرام کے لئے عملی نمونہ بن گئے اور انہوں نے بھی پھر خندق کی کھدائی میں انتہائی جانفشانی کا ثبوت دیا۔

۳: اللہ کے رسول ﷺ صحابہ کرام کے دکھ درد اور امیدوں اور تمناؤں میں شریک رہتے تھے، بلکہ ان کے مقابلہ میں خود تکلیف اور مشقت برداشت کرتے تھے، غزوۂ احزاب میں ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ﷺ صحابہ کرام کی طرح بلکہ ان سے زیادہ بھوک کی شدت اور تکلیف برداشت کر رہے تھے، یہاں تک کہ آپؐ نے سخت بھوک کی وجہ سے اپنے مبارک پیٹ پر پتھر باندھ رکھے تھے اور پھر جب سدّرمق کے بقدر تین دن کے بعد کھانا نصیب ہوتا ہے تو اس کھانے کو صرف اپنے لئے مخصوص نہیں رکھتے ہیں بلکہ صحابہ کرام کو بھی اس میں شریک کرتے ہیں، اس کی تفصیل حضرت جابر بن عبداللہؓ کی دعوت سے متعلق روایت میں آرہی ہے۔

۵: مجاہدین کے حوصلوں کو بلند کرنا اور ان کو خوشی فراہم کرنا:

خندق کی کھدائی کے دوران بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، چنانچہ موسم ٹھنڈا تھا، ہوا تیز تھی، معاشی حالت بھی پریشان کن تھی، دشمن کے حملہ آور ہونے کا بھی خوف طاری تھا، ساتھ ہی ساتھ صحابہ کرام پُر مشقت کام بھی کر رہے تھے، وہ اپنے ہاتھوں سے کھدائی کر رہے تھے، اور اپنی پیٹھ پر مٹی ڈھو رہے تھے، یقیناً یہ صورتحال فطری طور پر عقلمندی، دوراندیشی اور سنجیدگی کی متقاضی تھی لیکن اس صورتحال میں بھی نبی کریم ﷺ یہ نہیں بھولے کہ یہ مجاہدین بھی دوسروں کی طرح بشر ہیں، ان کو محنت و مشقت کے بعد راحت و آرام کی ضرورت ہے، اسی طرح ان کو کسی ایسے شخص کی بھی ضرورت ہے جو ان کو خوشی فراہم کرے تاکہ وہ دکھ اور تکلیف کو بھول جائیں، اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ مٹی اٹھاتے ہوئے ابن رواحہؓ کے اشعار پڑھ رہے تھے:

اللهم لَولَا أنت ما اهتدينا... ولَا تصدَّقنا ولَا صلَّينا

فَأَنزلَن سكينة علينا... وثبت الأَقدام إن لاقينا

إنَّ الأُلَى قد بغوا علينا... وإن أرادوا فتنة أبينا

ترجمہ: ''اے اللہ! اگر تیری ذات نہ ہوتی تو ہم نہ ہدایت پاتے، نہ ہم صدقہ کرتے اور نہ ہی نماز پڑھتے، لہذا ہم پر سکینت نازل فرما۔ اگر ان کے ساتھ ہماری مڈبھیڑ ہو تو ہمیں ثابت قدمی عطا فرما۔ بلاشبہ ان دشمنوں نے ہمارے اوپر زیادتی کی ہے جب بھی وہ ہم کو فتنہ فساد میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں تو ہم انکار کرتے ہیں''۔

آپ ﷺ یہ شعر بلند آواز سے پڑھتے تھے۔ (صحیح بخاری: 4106)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ اصحاب محمد ﷺ خندق کے دوران یہ اشعار پڑھ رہے تھے:

نحن الذين بايعوا محمدا على الإسلام ما بقينا أبدا

ترجمہ: ''ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے محمد سے اسلام پر بیعت کی ہے جب تک کہ ہم زندہ رہیں گے۔ یا وہ 'اسلام' کی جگہ 'جہاد' بولتے تھے۔

اور نبی کریم ﷺ فرماتے تھے:

اللهم إن الخير خير الآخرة فاغفر للأنصار والمهاجرة

ترجمہ: ''اے اللہ! بے شک خیر تو بس آخرت ہی کا خیر ہے، لہذا انصار اور مہاجرین کی مغفرت فرما''۔ (صحیح بخاری: 2834، صحیح مسلم: 1805)

یقیناً اس بے تکلف ماحول اور انبساط کا ایسی صورتحال میں ایک خاص اثر تھا جس کے ذریعہ اس سخت جان صورتحال میں صحابہ کرامؓ کی مشقت و پریشانی میں تخفیف ہو رہی تھی، اسی طرح ہمت و عزائم کو بلند کرنے، نشاط پیدا کرنے اور دشمن کے پہنچنے سے پہلے اپنے کام کو مکمل کرنے کے حوالہ سے بھی اس کا ایک خاص اثر تھا۔ (دیکھیں: القيادة العسكرية في عهد الرسول ﷺ، ص: 482)

۶: مجاہدین کے حالات کا خیال رکھنا اور بوقتِ ضرورت ان کو جانے کی اجازت دینا:

صحابہ کرامؓ نبی کریم ﷺ کے ساتھ انتہائی ادب کا معاملہ کرتے تھے، جب ان کو کوئی ضرورت ہوتی تھی تو رسول اللہ ﷺ سے اجازت طلب کرتے تھے اور پھر اپنی ضرورت پوری کرنے کے بعد پھر سے واپس آجاتے تھے، وہ خیر کے طالب تھے اور احتساب اور اجر و ثواب کی نیت سے

عمل کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں یہ آیات نازل فرمائیں: ﴿إِنَّمَا ٱلْمُؤْمِنُونَ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ وَإِذَا كَانُوا۟ مَعَهُۥ عَلَىٰٓ أَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوا۟ حَتَّىٰ يَسْتَـْٔذِنُوهُ ۚ إِنَّ ٱلَّذِينَ يَسْتَـْٔذِنُونَكَ أُو۟لَـٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ ۚ فَإِذَا ٱسْتَـْٔذَنُوكَ لِبَعْضِ شَأْنِهِمْ فَأْذَن لِّمَن شِئْتَ مِنْهُمْ وَٱسْتَغْفِرْ لَهُمُ ٱللَّهَ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ ترجمہ: "مومن تو اصل میں وہی ہیں جو اللہ اور اُس کے رسول کو دل سے مانیں اور جب کسی اجتماعی کام کے موقع پر رسولؐ کے ساتھ ہوں تو اُس سے اجازت لئے بغیر نہ جائیں، جو لوگ تم سے اجازت مانگتے ہیں وہی اللہ اور رسول کے ماننے والے ہیں، پس جب وہ اپنے کسی کام سے اجازت مانگیں تو جسے تم چاہو اجازت دے دیا کرو اور ایسے لوگوں کے حق میں اللہ سے دعائے مغفرت کیا کرو، اللہ یقیناً غفور و رحیم ہے"۔ (سورۃ النور: 62)

اللہ کے رسول ﷺ کو اختیار دیا گیا کہ اگر آپ چاہیں تو اجازت دے دیں جبکہ اس میں کوئی مصلحت ہو اور اجتماعی نقصان نہ ہو اور اگر چاہیں تو اجازت نہ دیں جبکہ صورتحال اس کی اجازت نہ دیتی ہو۔

۷: حفاظت کے لئے صحابہ کرام کی باری مقرر کرنا:

اللہ کے رسول ﷺ نے صحابہ کرام کو مختلف ٹکڑیوں میں تقسیم کر رکھا تھا کہ وہ حفاظت اور پہرہ کا کام کرتے رہیں اور ہر اس شخص کا مقابلہ کریں جو بھی خندق کو پار کرنے کی کوشش کرے، صحابہ کرام نے خندق پر بھی پہرہ دیا اور نبی کریم ﷺ کی بھی حفاظت کرتے رہے اور مشرکین کی طرف سے حملہ کا مقابلہ کرتے رہے، تمام مسلمان مکمل طور پر تیار تھے یہاں تک کہ ایک روز وہ صبح سحری کے وقت سے لے کر آدھی رات تک مسلسل مشغول رہے اور مسلمانوں کی چار نمازیں قضا ہو گئیں اور پھر انہوں نے ان نمازوں کو بعد میں ادا کیا، اس لئے کہ مسلسل دشمن کا مقابلہ کرتے رہے اور تھوڑے وقت کے لئے بھی موقع نہیں مل پایا، حضرت علی بن ابی طالبؓ نے صحابہ کرام کی ایک جماعت کے ساتھ عکرمہ بن ابی جہل کی طرف سے حملہ کی کوشش کو ناکام بنا دیا بلکہ حضرت علیؓ نے تو قریش کے ہیرو عمرو بن عبد وُد کا مقابلہ کیا اور اس کو قتل کرنے میں کامیابی حاصل کر لی، انصار میں سے ایک گروہ ہر رات رسول اللہ ﷺ کی حفاظت اور پہرہ کا کام انجام دیتا تھا جن کی قیادت حضرت عباد بن بشرؓ کر رہے تھے اور اللہ کے رسول ﷺ ہی اصلا اس پورے معرکہ کی قیادت فرما رہے تھے، آپ ﷺ کی نگرانی میں تمام کام ہو رہے تھے، آپؐ ہی ہر قسم کی منصوبہ بندی کر رہے تھے اور پھر ان کی تنفیذ کی نگرانی بھی کرتے رہے، چنانچہ آپؐ نے ہی مندرجہ ذیل تمام امور انجام دیئے:

أ: مشاورت کے بعد آپؐ نے ہی خندق کھودنے کا حکم دیا، اس کے لئے آپؐ نے مناسب جگہ کا انتخاب فرمایا۔

ب: صحابہ کرام کے مابین خندق کی کھدائی کا کام تقسیم کیا، چالیس چالیس گز دس دس صحابہ کرام کے مابین تقسیم کیا۔

ج: آپؐ پورے کام کی نگرانی فرما رہے تھے اور آپؐ کی اجازت کے بغیر کوئی اپنا کام چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔

د: خندق کے ہر حصہ پر رات دن مسلسل پہرہ کے لئے افراد کو متعین کیا اور پھر آپ ﷺ بنفس نفیس ہر کام کی نگرانی بھی کر رہے تھے، اور صحابہؓ کرام کی حوصلہ افزائی بھی کر رہے تھے۔

ھ: آپؐ نے اپنی سیاسی اور عسکری مہارت کی وجہ سے مسلمانوں کو اس خطرناک صورتحال سے نکالا جبکہ تمام مخالفین جمع ہو کر مدینہ تک پہنچ گئے تھے اور یہ صورتحال مدینہ کے لئے ایک چیلنج بن گئی تھی، آپ ﷺ کی قیادت و رہنمائی میں مسلمانوں کی تمام قیادت متحد رہی اور یہی اس معرکہ کو سر کرنے اور کامیابی سے ہمکنار ہونے کا بنیادی سبب تھا۔ (دیکھیں: القیادۃ العسکریۃ فی عصر الرسول، ص: 11)

دوسرا باب

مسلمانوں کی آزمائش میں شدّت

اگرچہ مسلمانوں نے داخلی محاذ کو محفوظ بنانے اور اسلام اور مدینہ کی طرف سے دفاع کرنے کے سلسلہ میں تمام احتیاطی اور لازمی تدابیر اختیار کی تھیں لیکن اللہ کی سنت یہ ہے کہ نصرت و مدد شدّت و آزمائش کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے اور آزمائش و امتحان کے بعد ہی انعام ملتا ہے، اور نصرت جس قدر قریب ہوتی ہے اسی اعتبار سے ابتلاء و آزمائش بھی بڑھ جاتی ہے، اسی لئے غزوۂ خندق کے موقع پر بھی مسلمانوں کو سخت آزمائشی مراحل سے گزرنا پڑا۔

ا: بنو قریظہ کی عہد شکنی اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش:

مسلمانوں کو بنو قریظہ کے یہود کی طرف سے غداری اور عہد شکنی کا اندیشہ تھا جو کہ مدینہ کے جنوب میں رہتے تھے، اس کی وجہ سے مسلمانوں کو دوطرفہ لڑائی کا سامنا کرنا پڑا، پیچھے سے یہود اور سامنے سے کثیر تعداد میں متحدہ فوج۔ بنو نضیر کا یہودی لیڈر بنو قریظہ کے لیڈر کعب بن اُسد کو اس بات پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہوگیا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف متحدہ فوج کے ساتھ شامل ہوجائے۔

مسلمانوں کے درمیان یہ افواہ عام ہوگئی کہ بنو قریظہ نے ان کے ساتھ کئے ہوئے معاہدہ کو توڑ دیا ہے اور رسول اللہ ﷺ کو اس بات کا اندیشہ تھا کہ بنو قریظہ عہد شکنی کریں گے، اس لئے کہ یہود ایک ایسی قوم ہے جو عہد و پیمان کا پاس و لحاظ نہیں کرتے ہیں، اس لئے نبی کریم ﷺ نے (مشکل مہموں کو سر کرنے والے) حضرت زبیر بن عوامؓ کو حکم دیا کہ وہ ان کے بارے میں معلومات لے کر آئیں۔ چنانچہ زبیرؓ گئے اور واپس آکر رسول اللہ ﷺ سے فرمایا: اے اللہ کے رسولؐ! میں نے ان کو دیکھا کہ وہ اپنے قلعوں کو ٹھیک کررہے ہیں اور اپنے راستوں کو درست کررہے ہیں اور انہوں نے اپنے جانوروں کو جمع کررکھا ہے۔ (دیکھیں: مغازی الواقدی: 2/457)

بنو قریظہ کی عہد شکنی کے بارے میں جب تمام دلائل جمع ہوگئے تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت سعد بن معاذؓ، حضرت سعد بن عبادہؓ، حضرت عبداللہ بن رواحہؓ اور حضرت خوّات بن جبیرؓ کو روانہ فرمایا اور ان سے کہا: جاکر دیکھ لو، اور معلوم کرلو کہ ان لوگوں کے بارے میں ہمیں جو کچھ معلومات ملی ہیں وہ صحیح ہیں یا غلط؟ اگر وہ صحیح ہوں تو مجھے اشارات و کنایات میں اطلاع دے دینا، میں سمجھ جاؤں گا، اور لوگوں کے درمیان اس بات کو عام مت کرنا، اور اگر وہ معاہدہ پر قائم ہوں تو لوگوں کے سامنے اس کا اعلان کرنا۔ (سیرت ابن ہشام: 3/232، دلائل النبوۃ للبیہقی: 3/429، السیرۃ النبویہ، ابن کثیر: 3/119)

صحابہ کرام کا یہ دستہ روانہ ہوگیا یہاں تک کہ ان کے پاس آکر دیکھا کہ انہوں نے عہد شکنی کی ہے، اس لئے وہ واپس آگئے اور نبی کریم ﷺ کو سلام کیا اور کہا: عضل اور قارہ۔ (یعنی قبیلۂ ہذیل کے دو قبیلے جنہوں نے غزوہ ذات الرجیع کے موقع پر عہد شکنی کی تھی) نبی کریم ﷺ ان کی مراد سمجھ گئے۔ (دیکھیں: البدایہ والنہایہ: 4/95)

نبی کریم ﷺ نے بنو قریظہ کی عہد شکنی پر صبر وثبات، زیرکی اور دور اندیشی کے ساتھ ردّ عمل دکھایا اور ان تمام وسائل کو اختیار کیا جو اہلِ ایمان کی روح اور نفسیات کو تقویت پہنچاتے ہیں اور زیادتی کرنے والوں کو بھاگنے پر مجبور کرتے ہیں، نبی کریم ﷺ نے اسی وقت حضرت سلمہ بن اسلمؓ کو دو سو افراد کے ساتھ اور حضرت زید بن حارثہؓ کو تین سو افراد کے ساتھ روانہ فرمایا، یہ سب صحابہ کرام مدینہ منورہ کی حفاظت کرتے رہے، زور زور سے تکبیر کہہ رہے تھے تاکہ بنو قریظہ کو دہشت زدہ کر دیں، اسی اثناء میں بنو قریظہ نے متحدہ افواج کے ساتھ شرکت کی تیاری کر لی اور انہوں نے ان کو بیس اونٹ مہیا کئے جن پر ان کی امداد کے لئے کھجور، جو، اور انجیر لدی ہوئی تھی، لیکن بعد میں ان اونٹوں کو حاصل کرنے میں مسلمانوں نے کامیابی حاصل کر لی اور وہ مسلمانوں کے لئے مالِ غنیمت بن گئے، ان کو لے کر وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔(السیرۃ الحلبیۃ 2/323)

۲: محاصرہ کی شدت، منافقین کی علحیدگی اور افواہوں کا عام ہونا:

بنو قریظہ کی شرکت کے بعد متحدہ افواج نے مسلمانوں کے محاصرہ میں مزید شدت پیدا کی جس کی وجہ سے مسلمانوں کی آزمائش اور پریشانی میں مزید اضافہ ہوا اور صورتحال مزید سخت ہوگئی، قرآن کریم نے اس سخت اور پریشان کن صورتحال کے بارے میں منظر کشی کی ہے اور مسلمانوں کے خوف اور ڈر کی کیفیت کو بہترین انداز سے بیان کیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِذۡ جَآءُوكُم مِّن فَوۡقِكُمۡ وَمِنۡ أَسۡفَلَ مِنكُمۡ وَإِذۡ زَاغَتِ ٱلۡأَبۡصَٰرُ وَبَلَغَتِ ٱلۡقُلُوبُ ٱلۡحَنَاجِرَ وَتَظُنُّونَ بِٱللَّهِ ٱلظُّنُونَا۠ ﴿١٠﴾ هُنَالِكَ ٱبۡتُلِيَ ٱلۡمُؤۡمِنُونَ وَزُلۡزِلُواْ زِلۡزَالٗا شَدِيدٗا ﴿١١﴾﴾ ترجمہ: ''جب وہ اُوپر سے اور نیچے سے تم پر چڑھ آئے جب خوف کے مارے آنکھیں پتھرا گئیں، کلیجے منہ کو آ گئے اور تم لوگ اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے، اُس وقت ایمان لانے والے خوب آزمائے گئے اور بُری طرح ہلا مارے گئے''۔(سورۃ الاحزاب:10-11)

اللہ تعالیٰ کی ذات پر مسلمانوں کا ایمان ویقین انتہائی قوی تھا، قرآن کریم نے اپنے اس قول کے ذریعہ بیان کیا ہے: ﴿وَلَمَّا رَءَا ٱلۡمُؤۡمِنُونَ ٱلۡأَحۡزَابَ قَالُواْ هَٰذَا مَا وَعَدَنَا ٱللَّهُ وَرَسُولُهُۥ وَصَدَقَ ٱللَّهُ وَرَسُولُهُۥۚ وَمَا زَادَهُمۡ إِلَّآ إِيمَٰنٗا وَتَسۡلِيمٗا﴾ ترجمہ: ''اور سچے مومنوں (کا حال اُس وقت یہ تھا کہ) جب انہوں نے حملہ آور لشکروں کو دیکھا تو پکار اٹھے کہ یہ وہی چیز ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا، اللہ اور اُس کے رسولؐ کی بات بالکل سچّی تھی۔اِس واقعہ نے اُن کے ایمان اور ان کی سپردگی کو اور زیادہ بڑھا دیا''۔(سورہ الأحزاب:22)

اور جہاں تک منافقین کا تعلق ہے تو وہ اسلامی لشکر سے علحیدہ ہو کر فرار ہو گئے، ان کی خوف وڈر کی حالت یہ ہو گئی کہ بنو عمرو بن عوف کے بھائی معتّب بن قُشیر کہنے لگا: محمدؐ تو ہم سے وعدہ کرتے تھے کہ ہم کسریٰ اور قیصر کے خزانوں کے مالک بن جائیں گے لیکن حال یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص امن واطمئنان کے ساتھ قضائے حاجت کے لئے بھی نہیں جا رہا ہے، بعض نے رسول اللہ ﷺ سے یہ کہہ کر گھر جانے کی اجازت طلب کی کہ ان کے گھر غیر محفوظ ہیں، ان کے اندر بزدلی پائی جاتی تھی، افواہیں پھیلا رہے تھے اور اہلِ ایمان کو بے یار و

مددگار چھوڑ رہے تھے، ان کے تمسخر واستہزاء اور منافقانہ طرزِ عمل کے بارے میں بعض ضعیف روایات وارد ہیں۔(دیکھیں: المعجم الکبیر للطبرانی: 11/376، مجمع الزوائد: 6/131)

لیکن قرآن کریم انتہائی باریک بینی کے ساتھ ان کے طرزِ عمل کی منظر کشی کرتا ہے، اس سلسلہ کی آیات یہ ہیں:

﴿وَإِذْ قَالَت طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يَـٰٓأَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَٱرْجِعُوا۟ ۚ وَيَسْتَـْٔذِنُ فَرِيقٌ مِّنْهُمُ ٱلنَّبِىَّ يَقُولُونَ إِنَّ بُيُوتَنَا عَوْرَةٌ وَمَا هِىَ بِعَوْرَةٍ ۖ إِن يُرِيدُونَ إِلَّا فِرَارًا ﴿١٣﴾ وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِم مِّنْ أَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا۟ ٱلْفِتْنَةَ لَـَٔاتَوْهَا وَمَا تَلَبَّثُوا۟ بِهَآ إِلَّا يَسِيرًا ﴿١٤﴾ وَلَقَدْ كَانُوا۟ عَـٰهَدُوا۟ ٱللَّهَ مِن قَبْلُ لَا يُوَلُّونَ ٱلْأَدْبَـٰرَ ۚ وَكَانَ عَهْدُ ٱللَّهِ مَسْـُٔولًا ﴿١٥﴾ قُل لَّن يَنفَعَكُمُ ٱلْفِرَارُ إِن فَرَرْتُم مِّنَ ٱلْمَوْتِ أَوِ ٱلْقَتْلِ وَإِذًا لَّا تُمَتَّعُونَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿١٦﴾ قُلْ مَن ذَا ٱلَّذِى يَعْصِمُكُم مِّنَ ٱللَّهِ إِنْ أَرَادَ بِكُمْ سُوٓءًا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً ۚ وَلَا يَجِدُونَ لَهُم مِّن دُونِ ٱللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ﴿١٧﴾ ۞ قَدْ يَعْلَمُ ٱللَّهُ ٱلْمُعَوِّقِينَ مِنكُمْ وَٱلْقَآئِلِينَ لِإِخْوَٰنِهِمْ هَلُمَّ إِلَيْنَا ۖ وَلَا يَأْتُونَ ٱلْبَأْسَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿١٨﴾ أَشِحَّةً عَلَيْكُمْ ۖ فَإِذَا جَآءَ ٱلْخَوْفُ رَأَيْتَهُمْ يَنظُرُونَ إِلَيْكَ تَدُورُ أَعْيُنُهُمْ كَٱلَّذِى يُغْشَىٰ عَلَيْهِ مِنَ ٱلْمَوْتِ ۖ فَإِذَا ذَهَبَ ٱلْخَوْفُ سَلَقُوكُم بِأَلْسِنَةٍ حِدَادٍ أَشِحَّةً عَلَى ٱلْخَيْرِ ۚ أُو۟لَـٰٓئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوا۟ فَأَحْبَطَ ٱللَّهُ أَعْمَـٰلَهُمْ ۚ وَكَانَ ذَٰلِكَ عَلَى ٱللَّهِ يَسِيرًا ﴿١٩﴾ يَحْسَبُونَ ٱلْأَحْزَابَ لَمْ يَذْهَبُوا۟ ۖ وَإِن يَأْتِ ٱلْأَحْزَابُ يَوَدُّوا۟ لَوْ أَنَّهُم بَادُونَ فِى ٱلْأَعْرَابِ يَسْـَٔلُونَ عَنْ أَنۢبَآئِكُمْ ۖ وَلَوْ كَانُوا۟ فِيكُم مَّا قَـٰتَلُوٓا۟ إِلَّا قَلِيلًا ﴿٢٠﴾﴾ ترجمہ: ”اور جب کہ ان میں سے ایک جماعت کہنے لگی، اے مدینہ والو! تمہارے لئے ٹھہرنے کا موقع نہیں سو لوٹ چلو، اور ان میں سے کچھ لوگ نبی سے رخصت مانگنے لگے، کہنے لگے کہ ہمارے گھر اکیلے ہیں اور حالانکہ وہ اکیلے نہ تھے، وہ صرف بھاگنا چاہتے تھے۔ اور اگر کسی طرف سے کوئی ان پر گھس آتا پھر ان سے فساد کی درخواست کی جاتی تو فساد پر آمادہ ہو جاتے اور دیر نہ کرتے مگر بہت ہی کم۔ حالانکہ اس سے پہلے اللہ سے عہد کر چکے تھے کہ پیٹھ نہ پھیریں گے، اور اللہ سے عہد کرنے کی باز پرس ہوگی۔ کہہ دو اگر تم موت یا قتل سے بھاگو گے تو تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور اس وقت سوائے تھوڑے دنوں کے نفع نہیں اٹھاؤ گے۔ کہہ دو کون ہے جو تمہیں اللہ سے بچا سکے اگر وہ تمہارے ساتھ برائی کرنا چاہے یا تم پر مہربانی کرنا چاہے، اور اللہ کے سوا نہ کوئی اپنا حمایتی پائیں گے اور نہ کوئی مددگار۔ تحقیق اللہ تم میں سے روکنے والوں کو جانتا ہے اور جو اپنے بھائیوں سے کہتے ہیں کہ ہمارے پاس آ جاؤ، اور لڑائی میں بہت ہی کم آتے ہیں۔ تم سے ہمدردی کرتے ہوئے، پھر جب ڈر کا وقت آ جائے تو تُو انہیں دیکھے گا کہ تیری طرف دیکھتے ہیں ان کی آنکھیں پھرتی ہیں جیسے کسی پر موت کی بے ہوشی آئے، پھر جب ڈر جاتا رہے تو تمہیں تیز زبانوں سے طعنہ دیتے ہیں مال کے لالچی ہیں، یہ لوگ ایمان نہیں لائے تو اللہ نے ان کے تمام اعمال ضائع کر دیئے، اور یہ بات اللہ پر بالکل آسان ہے۔ خیال کرتے ہیں کہ فوجیں نہیں گئیں، اور اگر فوجیں آ جائیں تو آرزو کریں کہ کاش ہم باہر گاؤں میں جا رہیں تمہاری خبریں پوچھا کریں، اور اگر تم میں بھی رہیں تو بہت ہی کم لڑیں“۔(سورۃ الاحزاب: 13-20)

سابقہ آیات نفاق کی جانب اشارہ کرتی ہیں اور نفاق کے نتیجہ میں نفوس میں جو قلق واضطراب، دلوں میں بزدلی، سخت حالات میں اللہ کے بارے میں بے اعتمادی اور ابتلاو آزمائش کے وقت رجوع الی اللہ کے بجائے اللہ کے مقابلہ میں جرأت جیسی صفات پیدا ہوتی ہیں، ان کا ذکر کیا گیا ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ معاملہ صرف اعتقاد تک ہی محدود نہیں رہتا ہے بلکہ اس کے بعد رسوا کن عمل کا بھی ارتکاب ہوتا ہے، منافقین رسول اللہ ﷺ سے میدانِ عمل اور قتال سے فرار اختیار کرنے کے لئے بے بنیاد دلائل اور اعذار پیش کر کے اجازت طلب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کے گھر دشمنوں کی طرف سے محفوظ نہیں ہیں، وہ اصلاً اپنے کمزور عقیدہ کی وجہ سے اور خوف کی وجہ سے موت سے فرار اختیار کرنا چاہتے ہیں اور دوسروں کو بھی محاذ چھوڑنے کی ترغیب دیتے ہیں، وہ ایمان واسلام کی بنیاد پر کئے ہوئے عہد وپیمان کا پاس ولحاظ نہیں کرتے ہیں۔(السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ 2/425)

خندق کو پار کرنے کی مشرکین کی کوششیں مسلسل تیز ہوتی رہیں اور مشرکین کے گھوڑ سوار بڑی تعداد میں ہر رات صبح تک خندق کے ارد گرد گھومتے رہتے، خالد بن ولیدؓ نے قریش کے چند شہ سواروں کے ساتھ ایک تنگ جگہ سے خندق کو پار کرنے کی کوشش کی، لیکن اُسید بن حضیرؓ دو سو صحابہ کی جمعیت کے ساتھ ان کی نقل وحرکت پر نظر رکھے ہوئے تھے، ان کے درمیان بعض مڈ بھیڑیں بھی ہوئیں، اس دوران حضرت طفیل بن نعمانؓ شہید ہو گئے اور ان کو حضرت حمزہؓ کے قاتل وحشی نے قتل کیا، خندق کے پار سے ان پر ایک نیزہ مارا جس کی وجہ سے وہ شہید ہو گئے۔(دیکھیں: حدیث القرآن الکریم عن غزوات الرسول ﷺ 2/424)

مشرکین میں سے حِبان بن العَرِقہ نے حضرت سعد بن معاذؓ پر ایک تیر سے وار کیا اور مارتے ہوئے کہا: یہ لو، میں ابن العرقہ ہوں۔

حضرت سعد بن معاذؓ کو جب یہ تیر لگا تو دعا کی: اے اللہ! اگر تونے قریش کی جنگ میں سے کچھ باقی رکھا ہے تو مجھے اس کے لئے باقی رکھنا، اس لئے کہ مجھے سب سے زیادہ یہ بات پسند ہے کہ میں ایسی قوم کے مقابلہ میں جہاد کروں جنہوں نے تیرے رسول کو ایذاء پہنچائی ہے، ان کی تکذیب کی ہے اور ان کو جلاوطن کیا ہے۔

اے اللہ! اگر ہمارے اور ان کے درمیان جنگ اب ختم ہو گئی ہے تو اس وار کو میرے لئے باعثِ شہادت بنا اور مجھے اس وقت تک موت نہیں دینا یہاں تک کہ بنو قریظہ کی طرف سے میری آنکھیں ٹھنڈی نہ ہوں۔(مسند احمد 6/141، ابن حبان: 7028)

اللہ تعالیٰ نے اس نیک بندے کی دعا قبول کی اور بعد میں ان کو یہ موقع ملا کہ ان کے درمیان حَکم کی حیثیت سے فیصلہ کریں، اس کے بعد مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کی جائے قیام کی جانب ایک مضبوط دستہ بھیجا، مسلمان ان کے ساتھ دن بھر اور رات تک لڑتے رہے، جب عصر کی نماز کا وقت ہوا تو وہ دستہ اور زیادہ قریب آگیا، نبی کریم ﷺ اور آپؐ کے ساتھ صحابہ کرام نماز عصر ادا نہیں کر پائے، اور یہ دستہ رات ہونے کے بعد واپس گیا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ان کے گھروں اور قبروں کو آگ سے بھر دے جیسے کہ انہوں نے ہمیں درمیانی نماز سے مشغول کر دیا یہاں تک کہ سورج بھی غروب ہو گیا۔(صحیح بخاری: 2931، صحیح مسلم: 627)

۳: قبیلۂ غطفان کے ساتھ صلح کا معاہدہ اور دشمنوں کی صفوں میں افواہیں پھیلانے کا کام

ا: قبیلۂ غطفان کے ساتھ بات چیت میں نبوی حکمت عملی:

اللہ کے رسول ﷺ کی سیاسی بصیرت اور مہارت و دور اندیشی اس وقت ظاہر ہوئی جبکہ آپؐ نے صرف قبیلۂ غطفان کے ساتھ صلح کا معاہدہ کرنے کا فیصلہ کیا، آپ ﷺ نے ان کے ساتھ مال کے عوض میں مصالحت کی، آپ ﷺ ان کو اس شرط کے ساتھ مال دیں گے کہ وہ آپؐ کے ساتھ جنگ کا ارادہ ترک کر کے اپنے وطن واپس چلے جائیں، آپؐ جانتے تھے کہ قبیلۂ غطفان اور اس کے لیڈروں کا اس جنگ میں شرکت کے ذریعہ کوئی سیاسی ہدف نہیں تھا اور نہ ہی اس کے پیچھے کوئی عقیدہ کارفرما تھا جس کی وجہ سے وہ جنگ کر رہے ہوں بلکہ ان کا پہلا اور آخری مقصد مدینہ پر قبضہ کر کے اس کے مال واسباب کو حاصل کرنا تھا، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حیی بن اُخطب اور کنانہ بن ربیع جیسے یہودی گروہوں کے قائدین کے ساتھ یا ابوسفیان بن حرب جیسے قریش کے قائدین کے ساتھ رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی، اس لئے کہ ان کا ہدف سیاسی اور دینی تھا جس کو پورا کرنا اس پر منحصر تھا کہ اسلامی نظام کی عمارت کو بنیاد سے ہی اکھاڑ پھینکا جائے، اسی لئے آپ ﷺ نے صرف غطفان کی قیادت کے ساتھ رابطہ کیا جنھوں نے عملی طور پر نبی کریم ﷺ کی طرف سے کی گئی پیشکش کو قبول کرنے میں کسی طرح کے پس وپیش سے کام نہیں لیا، قبیلۂ غطفان کے دونوں قائدین عیینہ بن حصن اور حارث بن عوف نے رسول اللہ ﷺ کی پیشکش کو قبول کیا اور ان دونوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ نبی کریم ﷺ کی قیادت کے ساتھ ملاقات کی، خندق کے پیچھے چھپ کر وہ آپؐ کے ساتھ ملتے ہیں اور کسی کو کانوں کان اس کی خبر نہیں ہوئی، رسول اللہ ﷺ نے ان کے ساتھ بات چیت شروع کی، رسول اللہ ﷺ نے ان کے سامنے یہ پیشکش رکھی کہ آپؐ کے درمیان اور قبیلۂ غطفان کے درمیان صلح کا معاہدہ کیا جائے، اس مجوّزہ معاہدہ کی اہم دفعات مندرجہ ذیل تھیں:

أ: مسلمانوں کے مابین اور غزوہ احزاب میں شریک قبیلۂ غطفان کے مابین ایک علیحدہ صلح کا معاہدہ کیا جائے گا۔

ب: غطفان مسلمانوں کے ساتھ اس معاہدۂ صلح پر پابند رہنے کے مکلف ہوں گے اور مسلمانوں کے خلاف کسی بھی جنگی مہم کا حصہ نہیں بنیں گے۔ (بطور خاص اس زمانہ میں)۔

ج: قبیلۂ غطفان مدینہ سے محاصرہ کو ختم کریں گے اور اپنی فوج کو اپنے وطن واپس لے جائیں گے۔

د: مسلمان قبیلۂ غطفان کو اس کے بالمقابل پورے مدینہ کے مختلف اقسام کے تہائی پھل دیں گے، بظاہر ایسا لگتا ہے کہ یہ پھل دینے کی دفعہ ایک سال کے لئے تھی۔ (دیکھیں: غزوۃ الأحزاب، محمد باشمیل، ص: 201-202)

واقدی نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غطفان کے سردار سے کہا: آپ کا کیا خیال ہے اگر میں تمہیں مدینہ کے تہائی پھل دوں گا اور آپ اپنے آدمیوں کو لے کر واپس جائیں گے اور اُعراب کو بھی بھاگنے پر آمادہ کریں گے۔ ان دونوں نے جواب دیا: آپ ہمیں مدینہ کے آدھے (نصف) پھل دیں، لیکن رسول اللہ ﷺ نے تہائی سے زیادہ دینے سے انکار کر دیا اور بالآخر وہ تہائی پر ہی راضی ہو گئے۔ (دیکھیں: المغازی للواقدی: 2/477، الجامع لأحکام القرآن للقرطبی، آیت: 61)

غطفان کے قائدین کا رسول اللہ ﷺ کی پیشکش کو قبول کرنا عسکری نقطۂ نگاہ سے واضح کرتا ہے کہ ان کے اس غزوہ میں شریک ہونے کا بنیادی مقصد کیا تھا اور یقیناً ان کے نکل جانے کی وجہ سے مد مقابل کی تہائی تعداد میدانِ جنگ سے فرار کی راہ اختیار کرلے گی اور اس کے ذریعہ نفسیاتی اعتبار سے وہ کمزور ہو جائیں گے اور ان کے اندر پھوٹ پڑ جائے گی۔ (القیادیۃ العسکریۃ فی عہد الرسول، ص: 413)

اس بات چیت کے ذریعہ نبوی منہج کا ایک اہم پہلو ظاہر ہوتا ہے کہ سخت مشکل حالات اور آزمائش کے موقع پر کیا طرزِ عمل اختیار کیا جائے، تاکہ آنے والی نسلیں ایسے مواقع کے لئے رہنمائی حاصل کر سکیں، قبیلۂ غطفان کے ساتھ صلح کا معاہدہ کرنے سے پہلے اللہ کے رسول ﷺ نے اس سلسلہ میں صحابہ کرام کے ساتھ مشورہ کیا، ان کی رائے یہ تھی کہ غطفان کو مدینہ کی پیداوار میں سے کچھ نہ دیا جائے، سعدین: سعد بن معاذؓ اور سعد بن عبادہؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! کیا یہ کوئی ایسا حکم ہے جس کو آپ پسند فرما رہے ہیں اور ہمیں اس پر عمل کرنا ہے؟ یا یہ کوئی ایسا حکم ہے جو آپ کو اللہ کی طرف سے ملا ہے اور ہمارا اس پر عمل کرنا ضروری ہے یا پھر آپ یہ ہماری مصلحت میں کر رہے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: نہیں، بلکہ یہ فیصلہ میں آپ کی مصلحت میں کر رہا ہوں۔ واللہ! میں یہ صرف اس لئے کر رہا ہوں کیونکہ میں نے دیکھا کہ تمام عربوں نے ایک کمان سے آپ کو الگ تھلگ کر دیا ہے اور ہر جانب سے آپ پر سختی کر لی ہے، اس لئے میں نے چاہا کہ تم سے ان کی طاقت کو کچھ حد تک کم کر دوں۔ یہ سن کر سعد بن معاذؓ نے فرمایا: اے اللہ کے رسولؐ! ہم اور یہ لوگ اللہ کے ساتھ شرک میں مبتلا تھے، بتوں کی پوجا کرتے تھے، نہ ہی اللہ کی عبادت کرتے تھے اور نہ ہی اس کو پہچانتے تھے، اس وقت وہ مدینہ کی پیداوار میں سے ایک پھل بھی نہیں کھا سکتے تھے، سوائے مہمان کی حیثیت سے یا خرید کر۔ تو کیا اب جب کہ اللہ نے ہم کو اسلام کی دولت سے نوازا ہے، ہمیں اس کی ہدایت دی ہے اور آپ کے ذریعہ اور اسلام کے ذریعہ ہمیں عزت عطا کی ہے، تو کیا اب ہم ان کو اپنا مال دیں گے؟ ہمیں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ واللہ! ہم ان کو تلوار کے سوا کچھ نہیں دیں گے، یہاں تک کہ اللہ ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ کر دے گا، یہ سن کر نبی ﷺ نے فرمایا: پھر آپ جیسے چاہیں کر لیں۔ اس کے بعد سعد بن معاذؓ نے وہ تحریر لی اور اس میں لکھی ہوئی دفعات مٹا دیں، اس کے بعد کہا: اب ہم پر وہ سختی کر کے دیکھیں۔ (سیرت ابن ہشام: 3/234، البدایہ والنہایہ: 4/104)

انصار کے زعماء سعد بن معاذؓ اور سعد بن عبادہؓ کا جواب اللہ کے سامنے سرِ اطاعت خم کرنے اور نبی کریم ﷺ کے ساتھ ادب اور اطاعت پر مبنی تھا، انہوں نے غطفان کے ساتھ بات چیت کو تین قسموں میں تقسیم کیا:

۱) یا تو یہ اللہ کا حکم ہوگا جس میں اپنی رائے شامل کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے بلکہ اس کو تسلیم کیا جائے اور اس پر رضامندی ظاہر کی جائے۔

۲) یا پھر وہ رسول اللہ ﷺ کا پسند کیا ہوا حکم ہوگا، اس اعتبار سے کہ وہ آپؐ کی ذاتی رائے ہو اور آپؐ کی رائے مقدم ہے اور آپؐ کی اطاعت کرنا ضروری ہے۔

۳) یا یہ ایسا حکم ہوگا جس کو رسول ﷺ نے مسلمانوں کے ساتھ شفقت و رحم کا معاملہ کرتے ہوئے ان کی مصلحت میں پسند فرمایا ہو، لہذا اس میں رائے دینے کی گنجائش تھی۔

جب سعدین کے سامنے رسول اللہ ﷺ کے جواب کے ذریعہ واضح ہو گیا کہ آپ ؐ کی مراد تیسری قسم ہے تو سعد بن معاذؓ نے نہایت قوی جواب دیا جس کے ذریعہ انہوں نے غطفان کے زعماء کی بولتی بند کر دی، اس لئے کہ انہوں نے واضح کر دیا کہ انصار ان ظالموں کے سامنے جاہلیت میں نہیں جھکے تو اب ان کے سامنے کیسے جھک سکتے ہیں، جبکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اسلام کے ذریعہ عزت عطا کی ہے؟! نبی کریم ﷺ سعدؓ کے جواب کے ذریعہ خوش ہوئے اور اس کے ذریعہ آپ ؐ کے سامنے واضح ہو گیا کہ انصار کے حوصلے کس قدر بلند ہیں، اس لئے آپ ؐ نے غطفان کے ساتھ جس معاہدۂ صلح کا آغاز کیا تھا آپ ؐ نے اس کو کالعدم قرار دیا۔(دیکھیں: التاریخ الاسلامی للحمیدی: 6/125)

"اللہ کے رسول ﷺ کا یہ فرمانا کہ میں نے دیکھا کہ تمام عربوں نے ایک کمان سے آپ کو الگ تھلگ کر دیا ہے"۔ اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ اپنے اس عمل کے ذریعہ یہ ہدف حاصل کرنا چاہتے تھے کہ تمام دشمن آپ کے خلاف یک صف نہ ہو جائیں، اس کے ذریعہ مسلمانوں کو چند امور کی رہنمائی ملتی ہے جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

۱) مسلمانوں کو مخالف طاقتوں کی کمزوریوں کو تلاش کرتے رہنا چاہیے۔

۲) مسلم قیادت کی حکمتِ عملی کا ہدف یہ ہو کہ جس کو وہ مخالفین کی صف سے نکال کر الگ کر سکتے ہوں تو اس کو الگ کریں اور اس سلسلہ میں فتوی، شوری، مصلحتِ عامہ اور اسلام کے مستقبل کو ہر گز نظر انداز نہ کیا جائے۔(الأساس فی السنة: 2/687)

صحابہ کرام کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی مشاورت کے ذریعہ ہمارے سامنے یہ واضح ہوتا ہے کہ قیادت کے سلسلہ میں آپ ؐ کا طرزِ عمل کیا تھا اور کس طرح آپ ؐ نے ہر عسکری معاملہ میں شورائی نظام کو ضروری قرار دیا ہے، اسلام کی بنیاد شوریٰ پر ہے اور کوئی فرد اس میں اپنی کوئی ذاتی رائے نہیں رکھ سکتا ہے اگرچہ وہ فرد اللہ کا رسول ہی کیوں نہ ہو، جب کہ اس کا تعلق اجتہاد سے ہو اور اس کے بارے میں وحی کا نزول نہ ہوا ہو۔(دیکھیں: العبقریة العسکریة فی غزوات الرسول ﷺ، ص:414)

رسول اللہ ﷺ کا اس صلح کے قبول نہ کرنے کے سلسلہ میں صحابہ کرام کی رائے کو قبول کرنا یہ واضح کرتا ہے کہ کامیاب قائد وہی ہے جو اپنے درمیان اور اپنی فوج اور رعایہ کے درمیان اعتماد کو بحال رکھتا ہے، وہ بھی ان کے مقام و مرتبہ کا ادراک کرتا ہو اور وہ بھی اس کے مقام و مرتبہ کا ادراک رکھتے ہوں، وہ ان کی رائے کا احترام کرے اور وہ اس کی رائے کا احترام کریں، غطفان کے قائدین کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا مصالحت کرنا؛ اس کا تعلق اس سیاستِ شرعیہ اور حکمتِ عملی سے ہے جس میں ان مصالح و مفاسد کی رعایت کی جاتی ہے جن کو بہترین قیادت امت کے حق میں مناسب سمجھے۔(دیکھیں: القیادة العسکریة فی عہد الرسول ﷺ، ص: 414)

۲: دشمنوں کی صفوں میں افواہیں پھیلانے کا اہتمام:

اللہ کے رسول ﷺ نے اعدائے دین کی افواج کے مابین پھوٹ ڈالنے کے لئے ان کے درمیان شکوک و شبہات پیدا کرنے اور غلط فہمیاں پیدا کرنے کا ہتھیار استعمال کیا، آپ ؐ کو اس کا علم تھا کہ مخالفین کی صفوں میں کچھ دراڑیں پائی جاتی ہیں، اس لئے آپ ؐ نے ان دراڑوں کو وسیع کرنے اور اپنے حق میں استعمال کرنے کی کوشش کی، اس سے پہلے آپ ؐ نے غطفان کو لالچ دے کر ان کے عزائم کو توڑ دیا تھا اور اب اللہ عزوجل نے نعیم بن مسعود غطفانی کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کی توفیق دی تاکہ وہ اپنے اسلام کا اعلان کریں، وہ رسول اللہ

ﷺ سے فرماتے ہیں: اے اللہ کے رسولؐ! بے شک میری قوم کو میرے اسلام لانے کا علم نہیں ہے، لہذا مجھے آپ جو چاہیں حکم دے دیں۔ رسول ﷺ نے ان سے فرمایا: تم صرف ایک آدمی ہو، لہذا کوئی فوجی اقدام تو نہیں کر سکتے ہو، البتہ جس قدر ممکن ہو ان میں پھوٹ ڈالو اور ان کی حوصلہ شکنی کرو، اس لئے کہ جنگ تو چالبازی کا نام ہے۔ (سیرت ابن ہشام: 3/240، دلائل النبوۃ للبیہقی: 3/445، البدایہ والنہایہ: 4/113)

اس کے بعد حضرت نعیمؓ مخالف گروہوں کے مابین رسول اللہ ﷺ کے حکم سے شکوک وشبہات پیدا کرتے رہے، انہوں نے یہود کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ قریش سے کچھ ضمانت اور رہن طلب کریں تا کہ قریش محاصرہ ختم کر کے ان کو چھوڑ کر واپس نہ چلے جائیں اور انہوں نے قریش سے یہ کہا کہ یہود آپ لوگوں سے کچھ یرغمال حاصل کر کے ان کو مسلمانوں کے حوالے کر دیں گے اور پھر محمدؐ کے ساتھ صلح کر کے اپنا معاملہ استوار کر لیں گے، حضرت نعیم بن مسعودؓ کا یہ واقعہ اس اعتبار سے مشہور ہے کہ یہ شرعی سیاست کے قواعد وضوابط کے منافی نہیں ہے، اس لئے کہ جنگ تو چالبازی کا نام ہے۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویہ الصحیحۃ: 2/430)

حضرت نعیم بن مسعودؓ کی مہم انتہائی کامیاب رہی، اس کے ذریعہ انہوں نے مخالفین کی قیادت کے دلوں میں شکوک وشبہات کے بیج بو دیئے، جس کے نتیجہ میں ان کی قوت منتشر ہو گئی اور ان کے عزائم اور حوصلے پست ہو گئے، حضرت نعیمؓ کی مہم کی کامیابی مندرجہ ذیل بنیادوں پر قائم تھی:

۱) انہوں نے تمام لوگوں اور گروہوں سے اپنے اسلام کو پوشیدہ رکھا جس کی وجہ سے ہر ایک نے ان کی نصیحت اور مشوروں پر پورا اعتماد کیا۔

۲) انہوں نے بنو قریظہ کو بنو قینقاع اور بنو نضیر کا انجام یاد دلایا اور ان کے سامنے واضح کر دیا کہ اگر وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جنگ کرنے کے رویے پر برقرار رہے تو ان کا مستقبل کیا ہو گا، اس کے ذریعہ ان کی سوچ اور ظالمانہ منصوبے یکسر تبدیل ہو گئے۔

۳) وہ ہر گروہ کو اس پر راضی کرنے پر بھی کامیاب ہوئے کہ نعیمؓ نے اس سے جو کچھ کہا ہے وہ اس کو راز رکھیں، اور اس کو راز میں رکھنے میں ان کی مہم کی کامیابی مضمر تھی، اگر کسی بھی گروہ کے ہاں ان کا یہ راز منکشف ہو جاتا تو ان کی یہ مہم ناکام ہو جاتی، اس طرح سے حضرت نعیم بن مسعودؓ نے غزوۂ احزاب میں انتہائی اہم کردار ادا کیا۔ (دیکھیں: القیادۃ العسکریۃ فی عہد الرسول ﷺ، ص: 477)

....

تیسرا باب

اللہ کی نصرت اور غزوۂ احزاب کے بارے میں قرآنی منظر کشی

ا: رسول اللہ ﷺ کا تضرع اور دعا کا اہتمام اور نصرت کا نزول:

اللہ کے رسول ﷺ اللہ کے سامنے انتہائی دعا و تضرع اختیار کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ ہی سے مدد مانگتے تھے، خاص طور پر غزوات کے موقع پر جب مسلمانوں پر آزمائشی مرحلہ پہلے سے زیادہ شدت اختیار کر گیا، یہاں تک کہ کلیجے منہ کو آ گئے اور ان کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا گیا، اس صورتحال میں مسلمان فوراً ہی رسول اللہ ﷺ کی طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے: اے اللہ کے رسولؐ! کیا کوئی ایسی چیز ہے جو ہم اس موقع پر کہیں؟ اس لئے کہ سخت حالات کی وجہ سے کلیجے منہ کو آ گئے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: "ہاں! اے اللہ، ہمارے عیوب اور کمزوریوں کی پردہ پوشی فرما، اور ہمارے خوف کو امن میں تبدیل فرما"۔ (مسند احمد: 3/3، بزار: 3119، : مجمع الزوائد: 10/136)

صحیحین میں حضرت عبداللہ بن ابی اوفیؓ کی حدیث ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مخالف افواج کے خلاف بددعا فرمائی اور کہا: اے اللہ، اے کتاب نازل کرنے والے، جلد حساب لینے والے، لشکروں کو شکست دینے والے، اے اللہ! ان کو شکست سے دوچار فرما اور ان کو ہلا کر رکھ دے۔ (صحیح بخاری: 2933، صحیح مسلم: 1742/20)

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی دعا قبول کی اور فتح و نصرت کی بادِ نسیم چلنا شروع ہو گئی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی طاقت و قوت کے ذریعہ ان کو وہاں سے دور کر دیا، ان کے دلوں میں اور جسموں میں خوف پیدا کر دیا اور اختلاف کے ذریعہ ان کے شیرازہ کو منتشر کر دیا، اس کے بعد ان پر سخت سرد آندھی چلا دی، ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا اور اپنی طرف سے مخصوص لشکر بھیج دیئے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱذْكُرُوا۟ نِعْمَةَ ٱللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُودٌ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا وَجُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا ۚ وَكَانَ ٱللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا﴾ ترجمہ: "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، یاد کرو اللہ کے احسان کو جو اُس نے تم پر کیا ہے جب لشکر تم پر چڑھ آئے تو ہم نے اُن پر ایک سخت آندھی بھیج دی اور ایسی فوجیں روانہ کیں جو تم کو نظر نہ آتی تھیں، اللہ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جو تم لوگ اس وقت کر رہے تھے"۔ (سورۃ الاحزاب: 9)

علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں: یہ ہوا اور آندھی نبی کریم ﷺ کے لئے ایک معجزہ تھی، اس لئے کہ نبی کریم ﷺ اور مسلمان اس سے قریب تھے، ان کے درمیان اور اس کے درمیان صرف خندق حائل تھی لیکن وہ آندھی سے بالکل محفوظ تھے اور ان پر اس کا کوئی اثر نہیں تھا، اللہ تعالیٰ نے مشرکین کی جانب فرشتے بھیجے انہوں نے خیموں کی میخیں اکھاڑ پھینکیں اور ان کی قناتیں کاٹ ڈالیں، آگ کو بجھا دیا، ہانڈیاں الٹا دیں، گھوڑے ادھر ادھر گردش کرنے لگے اور اللہ تعالیٰ نے ان پر خوف اور رعب طاری کر دیا، لشکروں کے آس پاس فرشتوں کی تکبیروں سے فضا گونجنے لگی، یہاں تک کہ ہر خیمہ کا سردار کہنے لگا: اے بنو فلاں! میرے پاس آؤ اور جب وہ سب جمع ہو گئے تو اس نے ان سے کہا: جائے پناہ! جائے پناہ! اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر رعب طاری کیا تھا۔ (تفسیر القرطبی: 14/114)

اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے رفقاء، صحابہ کرام اور تمام روئے زمین کے مسلمانوں کو یہ واضح پیغام دیا کہ دس ہزار جنگجوؤں پر مشتمل یہ لشکر صرف مسلمانوں کے قتال کی وجہ سے اور جواں مردی اور عبقریت کے ساتھ مقابلہ کرنے کی وجہ سے شکست سے دوچار نہیں ہوا، اگرچہ صحابہ کرام نے بہت سی قربانیاں دیں بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ ان کو شکست دینے والی ذات صرف اور صرف اللہ ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱذْكُرُوا۟ نِعْمَةَ ٱللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُودٌ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا وَجُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا ۚ وَكَانَ ٱللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا﴾ ترجمہ: ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، یاد کرو اللہ کے احسان کو جو اُس نے تم پر کیا ہے جب لشکر تم پر چڑھ آئے تو ہم نے اُن پر ایک سخت آندھی بھیج دی اور ایسی فوجیں روانہ کیں جو تم کو نظر نہ آتی تھیں، اللہ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جو تم لوگ اس وقت کر رہے تھے''۔(سورۃ الاحزاب: 9)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے: اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، وہ تنہا ہے، اس نے اپنے لشکر کو سربلند کیا، اپنے بندے کی مدد کی اور تنہا تمام لشکروں کو غالب کیا، پس اس کے بعد کسی اور کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔(صحیح بخاری: 4114، صحیح مسلم: 2724)

رسول اللہ ﷺ کا اپنے رب سے دعا کرنا اور تنہا اسی پر اعتماد کرنا، یہ نصرت و مدد کے بشری اسباب اختیار کرنے کے ہرگز منافی نہیں ہے، چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ نے اس غزوہ میں اسباب اختیار کرنے کی سنت پر بھی عمل کیا، آپؐ نے مخالفین کو منتشر کرنے، حصار توڑنے اور دیگر امور کے لئے اسباب اختیار کئے۔(فقہ السیرۃ، الغضبان، ص: 503)

رسول اللہ ﷺ ہمیں اس بات کی تعلیم دیتے ہیں کہ اسباب اختیار کرنے کی سنت پر عمل کرنا بھی ضروری ہے اور اللہ کی طرف رجوع کرنا اور مخلصانہ طریقہ سے اس کی بندگی کرنا بھی ضروری ہے، اس لئے کہ قوت کے تمام وسائل کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے ہیں جب تک کہ تضرع الی اللہ اور کثرت کے ساتھ اللہ کی ذات سے دعا و استغاثہ کا وسیلہ نہ پایا جائے گا، چنانچہ دعا اور تضرع الی اللہ ان مسلسل اور مکرر اعمال میں سے ہے جن پر رسول ﷺ اپنی پوری زندگی میں عمل پیرا رہتے تھے۔(فقہ السیرۃ، البوطی، ص: 222)

۲: لشکروں کی واپسی پر مسلسل نظر:

اللہ کے رسول ﷺ مخالف افواج کی واپسی پر مسلسل نظر رکھے ہوئے تھے اور آپؐ قریب سے صورتحال کو جاننا چاہتے تھے، اس لئے آپؐ نے فرمایا: ''ہے کوئی ایسا شخص جو قوم کی خبر ہم تک لے کر آئے؟ اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن میری معیت عطا کرے گا''۔(صحیح مسلم: 1788)

آپؐ نے ترغیب کا اسلوب اختیار کیا اور تین مرتبہ اس کو دہرایا، جب اس اسلوب کا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا تو پھر آپؐ نے جزم و تاکید کا اسلوب اختیار کیا اور آپؐ نے خود ایک صحابی کو اس کام کے لئے متعین کیا اور فرمایا: ''اے حذیفہ! اٹھو، ہمارے پاس قوم کی خبر لے کر آؤ، ان کو میرے خلاف برانگیختہ نہیں کرنا''۔(صحیح مسلم: 1788)

اس میں تربیتی رہنمائی موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ کامیاب قیادت وہی ہے جو اپنے کارکنوں کو ترغیب اور حوصلہ افزائی کے ذریعہ اہداف و مقاصد کی طرف متوجہ کرے اور بوقتِ ضرورت ہی براہِ راست حکم دینے کا اسلوب اختیار کرے۔

حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں: میں نکلا تو ایسا لگ رہا تھا جیسے کہ میں کسی حمام میں چل رہا ہوں، دیکھتا ہوں کہ ابو سفیان اپنی کمر کو آگ کے ذریعہ گرم کر رہا ہے، یہ دیکھ کر میں نے کمان میں ایک تیر رکھا اور اس کو مارنے کا ارادہ کیا تو میں نے رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان یاد کیا: ''ان کو میرے خلاف برانگیختہ نہیں کرنا'' اور اگر میں اس کو نشانہ مارتا تو اس کو نشانہ پر لے لیتا۔ میں واپس آیا تو مجھے لگ رہا تھا کہ گویا کہ میں حمام میں چل رہا ہوں۔ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، جب میں واپس آیا تو مجھے ٹھنڈک کا احساس ہونے لگا، میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو ان لوگوں کے بارے میں تمام تفصیلات بتا دیں، آپؐ نے مجھے اپنی عبا کا بچا ہوا حصہ اوڑھا دیا جو آپؐ کے جسم پر تھی، آپؐ اس میں نماز پڑھ رہے تھے، میں مسلسل سوتا رہا یہاں تک کہ صبح ہو گئی، جب صبح ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے خوب سونے والے، اٹھ جاؤ! (صحیح مسلم: 1788)

حضرت حذیفہؓ کے قصہ سے حاصل ہونے والے دروس و اسباق:

۱) اللہ کے رسول ﷺ تمام لوگوں کی صلاحیتوں اور مزاج سے واقف تھے، اسی لئے آپؐ نے حضرت حذیفہؓ کا انتخاب کیا تا کہ وہ مخالف فوج میں جا کر جاسوسی کر سکیں، حضرت حذیفہؓ اپنی اصل کے اعتبار سے انتہائی بہادر تھے اور یہ اہم ذمہ داری وہی انجام دے سکتا ہے جو بے مثال بہادر ہو، اس کے ساتھ ساتھ وہ انتہائی عقلمند، ذہین، ہلکے قدم والے اور سخت صورتحال سے نکلنے کے فن سے آگاہ تھے۔

۲) حضرت حذیفہؓ فوجی قوانین و ضوابط کی پابندی کی صفت سے آراستہ تھے، چنانچہ ان کو ایک بہترین موقع ملا کہ مخالف لشکر کے قائد کو قتل کر دیں، اور انہوں نے اس کا ارادہ بھی کر لیا لیکن ان کو جیسے ہی رسول اللہ ﷺ کا حکم یاد آیا کہ 'ان کو برانگیختہ نہیں کرنا' اور یہ کہ ان کے اس مشن میں صرف یہ ہے کہ ان کے بارے میں معلومات لے کر آئیں، اس لئے انہوں نے فوراً اپنی کمان سے تیر کھینچ لیا۔ (دیکھیں: فقہ السیرۃ النبویۃ، العضبان، ص: 505، السیرۃ النبویہ، ابو فارس، ص: 367)

۳) اولیاء کی کرامات: بلاشبہ حضرت حذیفہ بن یمانؓ کے ساتھ جو صورتحال پیش آئی جبکہ وانتہائی ٹھنڈے، بارش والے اور سخت ہوا والے موسم میں مشرکین کے لشکر کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے چل رہے تھے، لیکن ان کو اس سخت ٹھنڈک کا کوئی احساس نہیں ہوتا ہے اور وہ ایسے چل رہے ہیں گویا کہ وہ حمام میں چل رہے ہوں اور ان کے ساتھ یہی کیفیت اس وقت تک رہی جب تک کہ وہ اپنے مشن پر رہے اور رسول اللہ ﷺ کے پاس واپس جانے تک وہ اسی حالت میں رہے، یقیناً یہ کرامت ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے نوازتا ہے۔ (السیرۃ النبویۃ، ابو فارس، ص: 367)

۴) حضرت حذیفہؓ کے واپس آنے کے بعد ان کے ساتھ نبی کریم ﷺ کی شفقت و محبت بھی اس واقعہ کے ذریعہ معلوم ہوتی ہے، اللہ کے رسول ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ شفقت و نرمی کے ساتھ پیش آتے تھے، اگرچہ اللہ کے رسول ﷺ تہجد اور مناجات کی حلاوت سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور اس میں مشغول تھے لیکن اس کے باوجود آپؐ نے حضرت حذیفہؓ کے ساتھ شفقت و محبت اور اکرام کا معاملہ فرمایا،

اس لئے کہ وہ اہم ترین معلومات اور سچی خبریں لے کر آئے تھے، آپؐ نے ان کو اپنی اس چادر میں شامل کر دیا جس میں آپؐ نماز فرما رہے تھے تا کہ ان کو سردی سے محفوظ رکھ سکیں اور وہ اس چادر کو اس وقت تک اوڑھے رہے جب تک کہ آپؐ نے اپنی نماز مکمل فرمائی، لیکن جب فرض نماز کا وقت ہو گیا تو آرام سے اور نرمی کے ساتھ ان کو بیدار کیا اور مذاق کے انداز میں ان سے فرمایا: اے خوب سونے والے! اٹھ جاؤ! یہ ایسا مذاق تھا جس میں حلاوت و مٹھاس تھی اور محبت و نرمی اس میں شامل تھی، یقیناً یہ رأفت و رحمت کی عملی تصویر ہے جس کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قلبِ مبارک آراستہ تھا اور صحابہ کرام کے ساتھ اس کو عملی طور پر نافذ کیا جا رہا تھا، اللہ تعالیٰ نے اپنے اس فرمان میں بجا فرمایا ہے:

﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِٱلْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ﴾ ترجمہ: "دیکھو! تم لوگوں کے پاس ایک رسول آیا ہے جو خود تم ہی میں سے ہے، تمہارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق ہے، تمہاری فلاح کا وہ حریص ہے، ایمان لانے والوں کے لئے وہ شفیق اور رحیم ہے"۔ (سورۃ التوبہ: 128)

۵) صحابی جلیل حضرت حذیفہؓ کی حاضر دماغی قابل توجہ ہے، چنانچہ وہ مشرکین کے درمیان پہنچے - جیسے کہ زرقانیؒ کی روایت میں ہے - اور اسی اثناء میں ابوسفیان نے کہا: تم میں سے ہر شخص اپنے ہمنشین ساتھی کا ہاتھ پکڑ لے۔ حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں: جو شخص میرے دائیں طرف تھا میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیا اور پوچھا آپ کون؟ اس نے کہا: معاویہ بن أبی سفیان۔ اس کے بعد میں نے اپنے بائیں جانے والے شخص کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیا اور پوچھا: آپ کون؟ اس نے کہا: عمرو بن العاص۔ (دیکھیں: شرح الزرقانی: 2/120)

اس طرح سے حضرت حذیفہؓ نے ان سے سوال کرنے میں پہل کی تا کہ انہیں پوچھنے کا موقع نہ مل پائے، اس طرح سے وہ اس سخت مشکل صورتحال سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے جہاں ان کی جان کو خطرہ لاحق تھا۔ (دیکھیں: من معین السیرۃ، ص: 293)

۳: غزوۂ احزاب اور اس کے نتائج کے بارے میں قرآنی منظر کشی:

قرآن کریم نے غزوۂ احزاب کے بارے میں گفتگو کی ہے اور کامیابی کے ہر پہلو کو اللہ کی طرف سے منسوب کیا ہے، قرآن کریم نے غزوۂ احزاب اور غزوۂ بنی قریظہ کو خاص جگہ دی ہے، قرآن کریم اپنے اسلوب کے مطابق ان ہمیشہ رہنے والی چیزوں کو محفوظ کرتا ہے جو ہر زمان و مکان میں کام آسکتی ہیں، اس لئے کہ مسلمانوں کو ہمیشہ ایسی صورتحال کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے جبکہ ان پر ان کے گھر اور وطن میں حملہ ہو سکتا ہے، ان کو اس کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے کہ ہر چہار جانب سے دشمن اُن پر ٹوٹ پڑیں، لہذا اگر قرآن کریم نے غزوۂ احزاب اور غزوۂ بنی قریظہ کے واقعات کا ذکر کیا ہے تو ایسی صورتحال ہر زمان و مکان میں پیش آسکتی ہے، اس لئے مسلمان ان واقعات کے ذریعہ اسباق و دروس اور رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں، جو بھی غزوہ احزاب کے بارے میں قرآنی مباحث پر غور و تدبر کرے گا وہ دیکھے گا کہ قرآن کریم نے چند امور کو بیان کرنے کا اہتمام کیا ہے جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

۱) اہلِ ایمان کو اللہ کے انعامات اور نصرت و مدد کے بارے میں تذکیر کی گئی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱذْكُرُواْ نِعْمَةَ ٱللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُودٌ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا وَجُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا ۚ وَكَانَ ٱللَّهُ بِمَا

تَعۡمَلُونَ بَصِيرًا﴾ ترجمہ: ''اے لوگو، جو ایمان لائے ہو، یاد کرو اللہ کے احسان کو جو اُس نے تم پر کیا ہے جب لشکر تم پر چڑھ آئے تو ہم نے اُن پر ایک سخت آندھی بھیج دی اور ایسی فوجیں روانہ کیں جو تم کو نظر نہ آتی تھیں، اللہ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جو تم لوگ اس وقت کر رہے تھے''۔(سورۂ احزاب:9)

۲) تمام مخالف افواج نے جب پورے مدینہ منورہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا اس وقت مسلمان جس پریشان کن صورتحال سے گزر رہے تھے قرآن کریم نے اس صورتحال کی بہترین اور انوکھی منظر کشی کی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِذۡ جَآءُوكُم مِّن فَوۡقِكُمۡ وَمِنۡ أَسۡفَلَ مِنكُمۡ وَإِذۡ زَاغَتِ ٱلۡأَبۡصَٰرُ وَبَلَغَتِ ٱلۡقُلُوبُ ٱلۡحَنَاجِرَ وَتَظُنُّونَ بِٱللَّهِ ٱلظُّنُونَا۠﴾ ترجمہ: ''جب وہ اُوپر سے اور نیچے سے تم پر چڑھ آئے جب خوف کے مارے آنکھیں پتھرا گئیں، کلیجے منہ کو آ گئے اور تم لوگ اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے''۔(سورۂ احزاب:10)

۳) منافقین کی بُری نیتوں، ارادوں ان کے مذموم اخلاق، ان کی بزدلی، ان کے بے بنیاد اعذار اور عہد شکنیوں پر سے پردہ اٹھایا گیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿وَإِذۡ يَقُولُ ٱلۡمُنَٰفِقُونَ وَٱلَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا ٱللَّهُ وَرَسُولُهُۥٓ إِلَّا غُرُورًا﴾ ترجمہ: ''یاد کرو وہ وقت جب منافقین اور وہ سب لوگ جن کے دلوں میں روگ تھا صاف صاف کہہ رہے تھے کہ اللہ اور اُس کے رسولؐ نے جو وعدے ہم سے کئے تھے وہ فریب کے سوا کچھ نہ تھے''۔(سورۂ احزاب:12)

۴) اہلِ ایمان کو ترغیب دی گئی ہے کہ ہر زمان و مکان میں رسول ﷺ کے اقوال و افعال اور جہاد کے ذریعہ آپؐ سے رہنمائی حاصل کی جائے تاکہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کو عملی جامہ پہنایا جا سکے:﴿لَّقَدۡ كَانَ لَكُمۡ فِي رَسُولِ ٱللَّهِ أُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرۡجُواْ ٱللَّهَ وَٱلۡيَوۡمَ ٱلۡأٓخِرَ وَذَكَرَ ٱللَّهَ كَثِيرًا﴾ ترجمہ: ''درحقیقت تم لوگوں کے لئے اللہ کے رسولؐ میں ایک بہترین نمونہ تھا، ہر اُس شخص کے لئے جو اللہ اور یوم آخر کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے''۔(سورۂ احزاب:21)

۵) اہلِ ایمان کے عظیم کردار اور مواقف کی تعریف کی گئی جبکہ وہ مخالف افواج کا سچے ایمان اور وفاداری کے ساتھ مقابلہ کر رہے تھے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:﴿مِّنَ ٱلۡمُؤۡمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُواْ مَا عَٰهَدُواْ ٱللَّهَ عَلَيۡهِۖ فَمِنۡهُم مَّن قَضَىٰ نَحۡبَهُۥ وَمِنۡهُم مَّن يَنتَظِرُۖ وَمَا بَدَّلُواْ تَبۡدِيلًا﴾ ترجمہ: ''ایمان لانے والوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے اللہ سے کئے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا ہے، ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی وقت آنے کا منتظر ہے، انہوں نے اپنے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں کی''۔(سورۂ احزاب:23)

۶) اللہ تعالیٰ کی تبدیل نہ ہونے والی سنت وضابطہ کو بیان کیا گیا کہ انجام کار اہلِ ایمان کے لئے ہے جبکہ ہزیمت وشکست ان کے دشمنوں کا مقدر ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَرَدَّ ٱللَّهُ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ بِغَيۡظِهِمۡ لَمۡ يَنَالُواْ خَيۡرًاۚ وَكَفَى ٱللَّهُ ٱلۡمُؤۡمِنِينَ ٱلۡقِتَالَۚ وَكَانَ ٱللَّهُ قَوِيًّا عَزِيزًا﴾ ترجمہ: ''اللہ نے کفار کا منہ پھیر دیا، وہ کوئی فائدہ حاصل کئے بغیر اپنے دل کی جلن لئے یونہی پلٹ گئے، اور مومنین کی طرف سے اللہ ہی لڑنے کے لئے کافی ہو گیا، اللہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے''۔(سورۂ احزاب:25)

۷)اللہ تعالیٰ نے اپنے اہلِ ایمان بندوں کو اپنے احسانات یاد دلائے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بنو قریظہ کے مقابلہ میں ان کی مدد کی جب کہ وہ اپنے مضبوط و محفوظ قلعوں میں تھے اور ان کو کوئی خاص جنگ بھی نہیں کرنی پڑی، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب اور خوف ڈال دیا جس کی وجہ سے انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَأَنزَلَ ٱلَّذِينَ ظَٰهَرُوهُم مِّنْ أَهْلِ ٱلْكِتَٰبِ مِن صَيَاصِيهِمْ وَقَذَفَ فِى قُلُوبِهِمُ ٱلرُّعْبَ فَرِيقًا تَقْتُلُونَ وَتَأْسِرُونَ فَرِيقًا ﴿٢٦﴾ وَأَوْرَثَكُمْ أَرْضَهُمْ وَدِيَٰرَهُمْ وَأَمْوَٰلَهُمْ وَأَرْضًا لَّمْ تَطَـُٔوهَا ۚ وَكَانَ ٱللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ قَدِيرًا ﴿٢٧﴾﴾ ترجمہ: "پھر اہلِ کتاب میں سے جن لوگوں نے ان حملہ آوروں کا ساتھ دیا تھا، اللہ ان کے قلعوں سے انہیں اتار لایا اور اُن کے دلوں میں اُس نے ایسا رعب ڈال دیا کہ آج ان میں سے ایک گروہ کو تم قتل کر رہے ہو اور دوسرے گروہ کو قید کر رہے ہو۔ اس نے تم کو ان کی زمین اور ان کے گھروں اور ان کے اموال کا وارث بنا دیا اور وہ علاقہ تمہیں دیا جسے تم نے کبھی پامال نہ کیا تھا، اللہ ہر چیز پر قادر ہے"۔(سورۃ الاحزاب: 26-27) (دیکھیں: الاساس فی السنۃ 2/662، حدیث القرآن الکریم عن غزوات الرسول ﷺ: 2/490)

غزوۂ احزاب ان اہم غزوات میں سے ہے جن میں مسلمانوں نے دشمنوں کا مقابلہ کیا اور اس غزوہ میں انہوں نے اہم نتائج حاصل کئے جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

- مسلمانوں کو اس غزوہ میں فتح و کامیابی ملی، جبکہ ان کے دشمنوں کو شکست و ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا، وہ انتشار و افتراق کا شکار ہوئے اور غیظ و غضب کے ساتھ رسوا ہو کر واپس ہوئے اور ان کی تمام امیدوں اور تمناؤں پر پانی پھر گیا۔
- مسلمانوں کے حق میں صورتحال یکسر تبدیل ہوئی، وہ دفاعی پوزیشن سے اقدامی پوزیشن میں آگئے، اس کی جانب نبی کریم ﷺ نے اشارہ فرمایا جبکہ آپؐ نے فرمایا: "اب ہم ان پر حملہ کریں گے، وہ ہم پر حملہ نہیں کریں گے، ہم ان کی طرف پیش قدمی کریں گے"۔ (صحیح بخاری: 4110، مسند أحمد: 4/264-6/394)
- اس غزوہ نے بنو قریظہ کے یہود سے پردہ اٹھا کر ان کی اصل حقیقت واضح کر دی اور ظاہر کر دیا کہ وہ مسلمانوں سے کس قدر دشمنی اور حسد رکھتے ہیں، اور وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے مواقع تلاش کرتے ہیں، انہوں نے سخت ترین صورتحال میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ کئے ہوئے معاہدہ کو توڑ دیا۔
- غزوۂ احزاب نے مسلمانوں کے صدقِ ایمانی کی حقیقت، منافقین کی اصل اور بنو قریظہ کے یہود کی حقیقت کو واضح کر دیا، غزوۂ احزاب میں آزمائش کے ذریعہ مسلمانوں کی تمحیص اور منافقین اور یہود کی حقیقت نکھر سامنے آگئی۔
- غزوۂ بنی قریظہ غزوۂ احزاب کے اہم نتائج میں سے تھا جس کے ذریعہ بنو قریظہ کے یہود کا محاسبہ کیا گیا جنہوں نے سخت ترین حالات میں نبی کریم ﷺ سے کئے ہوئے عہد و پیمان کو توڑ دیا تھا۔

۴: بنو قریظہ سے چھٹکارااوران کا محاسبہ:

نبی کریم ﷺ خندق سے واپس تشریف لائے اور ابھی ہتھیار رکھے ہی تھے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو بنو قریظہ کے ساتھ قتال کا حکم دیا، حبیب مصطفی ﷺ نے صحابہ کرام کو ان کی جانب کوچ کرنے کا حکم دیا اور آپ ﷺ نے ان کو بتلا دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے جبرئیل -علیہ السلام- کو بھیجا ہے جو ان کے قلعوں کو ہلا کر رکھ دیں گے اور ان کے دلوں میں خوف اور رعب ڈال دیں گے، آپ ﷺ نے ان کو وصیت کی کہ کوئی عصر کی نماز نہ پڑھے مگر بنو قریظہ میں جا کر ہی۔(صحیح بخاری:4119، صحیح مسلم:1770)

مسلمانوں نے بنو قریظہ کا پچیس(۲۵) دنوں تک محاصرہ جاری رکھا۔(صحیح السیرۃ النبویۃ، ص:373)اور جب محاصرہ سخت ہوا اور بنو قریظہ پریشان ہو گئے تو وہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوئے اور اس پر تیار ہو گئے کہ رسول اللہ ﷺ ان کے بارے میں حضرت سعد بن معاذؓ کو فیصلہ کرنے کا اختیار دیں، انہوں نے سوچا کہ وہ ان کے ساتھ نرمی کا معاملہ کریں گے، اس لئے کہ ان کے مابین اور ان کی قوم اُوس کے مابین معاہدہ تھا، چنانچہ حضرت سعدؓ کو اٹھا کر لایا گیا، اس لئے کہ غزوۂ خندق کے موقع پر ان کے ہاتھ میں تیر لگا تھا، انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ جنگ کرنے والوں کو قتل کیا جائے، عورتوں اور بچوں کو گرفتار کیا جائے اور ان کے مال کو تقسیم کیا جائے، آپ ﷺ نے ان کے کئے ہوئے فیصلہ کی تائید فرمائی اور کہا: آپ نے اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ کیا۔ (بخاری: 3043-4122، مسلم:1768)

مدینہ کے بازار میں چار سو افراد پر قتل کرنے کا حکم نافذ کیا گیا، خندقیں کھود کر گروہوں کی شکل میں ان کو خندقوں میں قتل کیا گیا، چند ہی لوگ بچنے میں کامیاب ہوئے، اس لئے کہ انہوں نے عہد وپیمان کی پاسداری کی اور وہ اسلام میں داخل ہو گئے، ان کے مال اور بچوں کو مسلمانوں میں تقسیم کیا گیا۔

یہ ان لوگوں کے حق میں مبنی بر عدل سزا تھی جنہوں نے مسلمانوں کے ساتھ غداری اور خیانت کی تھی، ان کو ان کے عمل کے اعتبار سے ویسا ہی بدلہ دیا گیا، اس لئے کہ انہوں نے اپنی خیانت اور غداری کے ذریعہ مسلمانوں کی جانوں کو قتل کرنے، ان کے مال و دولت کو لوٹنے اور ان کی عورتوں اور بچوں کو قید کرنے کا موقع فراہم کرنے کی کوشش کی، اس لئے ان کو اسی کے مطابق بدلہ دیا گیا۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویہ الصحیحۃ:1/315-317)

بنو قریظہ کی عورتوں میں سے صرف ایک عورت کو قتل کیا گیا، اس نے حضرت خلاد بن سویدؓ پر چکی کا پاٹ پھینک کر انہیں قتل کر دیا تھا، حضرت سیدہ عائشہؓ اس کا قصہ یوں بیان کرتی ہیں فرماتی ہیں: ان کی عورتوں میں سے صرف ایک عورت کو قتل کیا گیا، فرماتی ہیں: واللہ! وہ میرے پاس تھی میرے ساتھ باتیں کر رہی تھی اور خوشی خوشی کھلکھلا کے ہنس رہی تھی اور رسول اللہ ﷺ بازار میں اس کے قبیلہ کے لوگوں کو قتل کر رہے تھے، اچانک ایک پکارنے والے نے اس کا نام لیا: فلاں کہاں ہے؟ اس نے کہا: میں ہوں، اللہ کی قسم!۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: میں نے اس سے کہا: تمہارا بُرا ہو! تمہارا کیا مسئلہ ہے؟ اس نے کہا: مجھے قتل کیا جائے گا۔ میں نے پوچھا: کیوں؟! اس نے کہا: میں نے ایک حرکت کی ہے۔ فرماتی ہیں: وہ پکارنے والا ان کو لے کر گیا اور اس کی گردن مار دی گئی۔ حضرت عائشہؓ فرمایا کرتی تھیں: اللہ کی قسم!

اس کے اطمینان اور زیادہ ہنسنے کو میں بھول نہیں پاتی ہوں، حالانکہ اس کو معلوم تھا کہ اس کو قتل کیا جائے گا۔(مسند أحمد 6/277،ابو داؤد: 2671 صحیح السیرۃالنبویہ، ص:377، مختصر سیرت ابن ہشام:2/30)

بنو قریظہ کے خاتمہ سے مدینہ مکمل طور پر یہودیوں کے وجود سے خالی ہو گیا اور وہ مسلمانوں کے لئے خالص ہو گیا اور داخلی محاذ ایک خطرناک قسم کے خطرہ سے خالی ہو گیا، یہ سازشیں کرنے، چالیں چلنے اور مکر وفریب اختیار کرنے میں مشغول رہتے تھے، قریش کا خواب بھی چکنا چور ہو گیا، اس لئے کہ ان کی ساری امیدیں یہود سے وابستہ تھیں، یہود کا یہ خطرہ اب دور ہو گیا جو منافقین کو بھی مختلف طریقوں سے مسلمانوں کے خلاف برانگیختہ کرتے رہتے تھے۔

بلاشبہ اسلامی ریاست کے داخلی محاذ کو ناپاک عزائم رکھنے والوں سے پاک کرنا نبوی طریقہ کار ہے جس کو حبیب مصطفی ﷺ نے امتِ مسلمہ کے لئے وضع کیا ہے۔(دیکھیں: سیرت الرسول ﷺ، دروزہ:2/76، دراسات فی عہد النبوۃ، الشجاع، ص:153)

....

چوتھا باب

اسباق ودروس اور فوائد وعبرتیں

ا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حسّی معجزات:

خندق کی کھدائی کے دوران نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حسّی معجزات کا ظہور ہوا، ان میں سے ایک معجزہ ہے: "کھانے کا زیادہ ہونا" جس کو حضرت جابر بن عبداللہؓ نے تیار کیا تھا، چنانچہ حضرت جابرؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں: "ہم غزوۂ خندق کے موقع پر خندق کھود رہے تھے کہ ایک بہت سخت قسم کی چٹان نکلی (جس پر کدال اور پھاوڑے کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا اس لئے خندق کی کھدائی میں رکاوٹ پیدا ہو گئی) صحابہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ سے عرض کیا کہ خندق میں ایک چٹان ظاہر ہو گئی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں اندر اترتا ہوں۔ چناچہ آپؐ کھڑے ہوئے اور اس وقت (بھوک کی شدت کی وجہ سے) آپ کا پیٹ پتھر سے بندھا ہوا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کدال اپنے ہاتھ میں لی اور چٹان پر اس سے مارا۔ چٹان (ایک ہی ضرب میں) بالو کے ڈھیر کی طرح بہہ گئی۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے گھر جانے کی اجازت دیجئے۔ (گھر آکر) میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ آج میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو (فاقوں کی وجہ سے) اس حالت میں دیکھا کہ صبر نہ ہو سکا۔ کیا تمہارے پاس (کھانے کی) کوئی چیز ہے؟ انہوں نے بتایا کہ ہاں کچھ جو ہیں اور ایک بکری کا بچہ۔ میں نے بکری کے بچہ کو ذبح کیا اور میری بیوی نے جو پیسے۔ پھر گوشت کو ہم نے چولھے پر ہانڈی میں رکھا اور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، آٹا گوندھا جاچکا تھا اور گوشت چولھے پر پکنے کے قریب تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے میں نے عرض کیا: گھر میں کھانے کے لئے مختصر کھانا تیار ہے۔ یارسول اللہ! آپ اپنے ساتھ ایک دو آدمیوں کو لے کر تشریف لے چلیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ کتنا ہے؟ میں نے آپؐ کو سب کچھ بتادیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ یہ تو بہت ہے اور نہایت عمدہ وطیب ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اپنی بیوی سے کہہ دو کہ چولھے سے ہانڈی نہ اتاریں اور نہ تنور سے روٹی نکالیں، میں ابھی آرہا ہوں۔ پھر صحابہؓ سے فرمایا کہ سب لوگ چلیں، چنانچہ تمام انصار ومہاجرین تیار ہو گئے۔ جب جابرؓ گھر پہنچے تو اپنی بیوی سے انہوں نے کہا: اب کیا ہوگا؟! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو تمام مہاجرین وانصار کو ساتھ لے کر تشریف لارہے ہیں۔ انہوں نے پوچھا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ سے کچھ پوچھا بھی تھا؟! جابرؓ نے کہا کہ ہاں۔ آپؐ نے صحابہ سے فرمایا کہ اندر داخل ہو جاؤ لیکن اژدہام نہ ہونے پائے۔ اس کے بعد آپؐ روٹی کا چورا کرنے لگے اور گوشت اس پر ڈالنے لگے۔ ہانڈی اور تنور دونوں ڈھکے ہوئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے لیا اور صحابہ کے قریب کر دیا۔ پھر آپؐ نے گوشت اور روٹی نکالی۔ اس طرح آپؐ برابر روٹی چورا کرتے جاتے اور گوشت اس میں ڈالتے جاتے یہاں تک کہ تمام صحابہ شکم سیر ہو گئے اور کھانا بچ بھی گیا۔ آخر میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جابرؓ کی بیوی سے فرمایا کہ اب یہ کھانا تم خود کھاؤ اور لوگوں کے یہاں ہدیہ میں بھیجو کیونکہ لوگ آج کل فاقہ میں مبتلا ہیں۔ (صحیح البخاری: 4101، دلائل النبوۃ للبیہقی: 3/423)

اسی طرح ایک دوسرا معجزہ پیش آیا وہ یہ کہ ایک انصاری صحابی بشیر بن سعدؓ کی بیٹی کو اس کی والدہ عمرہ بنت رواحہ نے بلایا، ماں کے دونوں ہاتھوں میں کھجوریں ہیں، بیٹی کے دامن میں ڈال کر کہنے لگیں: بیٹی! یہ ناشتہ اپنے والد اور اپنے ماموں عبداللہ بن رواحہ -رضي الله

عنہما- کو پہنچادو۔ جب وہ کھجوریں لے کر خندق کی جگہ پر پہنچیں اور اپنے والد اور ماموں کو تلاش کرنے لگیں تو اس دوران ان کا گزر اللہ کے رسول ﷺ کے قریب سے ہوا۔ کہتی ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے مجھے دیکھا تو فرمایا: ’’تعالي يا بنية! ما هذا معك؟‘‘ ’’پیاری بیٹی، ادھر آؤ، تم کیا لے کر آئی ہو؟‘‘ میں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! یہ کچھ کھجوریں ہیں، میری ماں نے مجھے دی ہیں کہ میرے والد بشیر بن سعد اور ماموں عبداللہ بن رواحہ ان سے ناشتہ کر لیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’انھیں یہاں لاؤ‘‘۔ میں نے کھجوریں آپ ﷺ کے ہاتھوں میں ڈال دیں، کھجوریں بس اتنی سی تھیں کہ آپ ﷺ کے دونوں ہاتھ بھی نہ بھرے۔ آپؐ نے حکم دیا کہ ایک کپڑا لایا جائے، کپڑا لایا گیا تو اسے زمین پر بچھا دیا گیا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے کھجوریں اس کپڑے پر ڈال دیں، کھجوریں سارے کپڑے پر بکھر گئیں۔ آپؐ نے قریب بیٹھے ہوئے شخص سے فرمایا: ’’اُصْرُخْ فِي أَهْلِ الْخَنْدَقِ: أَنْ هَلُمُّوا إِلَى الْغَدَاء‘‘ ’’خندق کھودنے والوں کو آواز دو کہ وہ آ کر کھانا کھالیں‘‘۔ تمام اہلِ خندق آپ ﷺ کے پاس جمع ہو گئے، وہ کھجوریں کھانے لگے، کھجوریں برابر بڑھتی چلی جا رہی تھیں، تمام اہل خندق سیر ہو کر چلے گئے، ادھر کھجوریں تھیں کہ کپڑے کے اطراف میں گرتی جا رہی تھیں۔ (سیرت بن ہشام 228/3 دلائل النبوۃ البیھقي 427/3)

ان دونوں واقعات میں رسول اللہ ﷺ کے حسّی معجزات بالکل واضح ہیں، اسی طرح ان کے ذریعہ واضح ہوتا ہے کہ ایک مسلمان عورت کا مسلمانوں کے جہاد میں کس قدر اہم رول رہا ہے، چنانچہ جب مسلمان خندق کی کھدائی میں مشغول تھے تو انہوں نے اپنے کام چھوڑ دیئے اور ان کے کھانے پینے کے اسباب ان سے دور ہو گئے، لوگوں کو بھوک اور پیاس کا سامنا کرنا پڑا یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام اپنے پیٹ پر پتھر باندھنے پر مجبور ہو گئے، ایسے حالات میں ایک مسلمان خاتون مسلمانوں کی اس طرح مدد کرتی تھی کہ وہ اپنی استطاعت کے بقدر ان کے لئے کھانے پینے کا انتظام کرتی تھی۔ (دیکھیں: المرأة في العهد النبوي، ص: 175)

خندق کی کھدائی کے درمیان نبوی دلائل میں سے ایک دلیل یہ بھی ظاہر ہوئی کہ آپؐ نے حضرت عمار بن یاسرؓ کو جب کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ خندق کھود رہے تھے، یہ بتایا کہ ان کو ایک باغی گروہ شہید کرے گا۔ (صحیح بخاری: 447، صحیح مسلم: 2915) چنانچہ وہ جنگ صفین میں شہید ہو گئے جب کہ وہ حضرت علیؓ کے لشکر میں شامل تھے۔ (دیکھیں: السيرة النبوية في ضوء المصادر الاصلية: 448)

اور جب خندق کی کھدائی کے دوران صحابہ کرام کے سامنے ایک چٹان آئی تو رسول اللہ ﷺ نے اس پر تین ضربیں ماریں اور وہ چور چور ہو گئی، پہلی ضرب کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ اکبر! مجھے شام کی کنجیاں دی گئیں۔ واللہ! میں وہاں کے سرخ محل ابھی دیکھ رہا ہوں۔ اس کے بعد دوسری ضرب لگائی اور فرمایا: اللہ اکبر! مجھے فارس کی کنجیاں عطا کی گئیں۔ واللہ! میں مدائن کے سفید محل دیکھ رہا ہوں۔ اس کے بعد آپؐ نے تیسری ضرب ماری اور فرمایا: اللہ اکبر! مجھے یمن کی کنجیاں عطا کی گئیں۔ واللہ! میں ابھی اس جگہ سے صنعاء کے دروازے دیکھ رہا ہوں۔ (مسند أحمد: 4/303، مسند أبو یعلی: 1685، دلائل النبوة للبيهقي: 3/421، مجمع الزوائد: 6/130)

یہ پیشن گوئی حرف بحرف ثابت ہوئی جس میں اسلامی فتوحات کی وسعت کے بارے میں خبر دی گئی تھی اور اس وقت یہ پیشن گوئی کی گئی تھی جبکہ مسلمان مدینہ میں محصور تھے اور ابتلا و آزمائش، خوف، بھوک اور سخت سردی کا سامنا کر رہے تھے۔ (دیکھیں: نضرۃ النعیم: 1/325)

۲: تصور اور واقع کے درمیان فرق:

اہلِ کوفہ میں سے ایک شخص نے حضرت حذیفہ بن یمانؓ سے فرمایا: اے ابو عبد اللہ! کیا آپ نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا اور آپ ان کے ساتھ رہے؟ انہوں نے کہا: ہاں، اے بھتیجے! اس نے کہا: تو آپ لوگ کیا کرتے تھے؟ انہوں نے کہا: واللہ! ہم بہت محنت و مشقت کرتے تھے، اس نے کہا: واللہ! اگر ہم آپ ﷺ کو پاتے تو ہم آپؐ کو زمین پر چلنے نہ دیتے اور ہم آپ کو اپنے سروں پر اٹھاتے۔ حضرت حذیفہؓ نے فرمایا: اے بھتیجے، اللہ کی قسم! ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خندق میں شریک تھے...... اس کے بعد انہوں نے اس واقعہ کا ذکر کیا جس میں رسول اللہ ﷺ نے انہیں مشرکین کے کیمپ میں جانے کی ذمہ داری سونپی تھی۔

یہ تابعی صحابی رسولؐ حضرت حذیفہؓ سے ملتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اگر وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ موجود ہوتے تو وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ وہ کچھ کرتے جو صحابہ کرام نہیں کر پائے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ خیال ایک چیز ہے اور واقع اور عملی صورتحال ایک دوسری چیز ہے۔ صحابہ کرامؓ بشر اور انسان ہیں، ان کے اندر بشری طاقتیں اور صلاحیتیں ہیں اور انہوں نے اپنی استطاعت کے بقدر ہر طرح کی قربانی دی، انہوں نے مال اور جہد و مشقت کے ساتھ ساتھ اپنی جانوں کی بھی قربانیاں دیں، اور اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے اس قول کے ذریعہ صحیح منظر کشی فرمائی ہے کہ: "سب سے بہتر زمانہ میرا زمانہ ہے"۔ (صحیح بخاری: 6429، صحیح مسلم: 2533) اس کے ذریعہ آپؐ نے واضح کر دیا کہ ان کے عمل کے برابر کسی کا عمل نہیں ہو سکتا ہے۔

بلاشبہ جو لوگ ان کے بعد آئے انہوں نے ہر سُو اسلامی سلطنت کا پھریرا لہراتا ہوا دیکھا اور وہ عدل و امن اور خوشحالی کے سائے میں زندگی بسر کرتے رہے، ان کو ابتلا و آزمائش اور فتنوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا، ان کے لئے ضروری ہے کہ اس وقت کی صورتحال کو سمجھنے کے لئے ماضی کی ان فضاؤں اور ماحول کا احساس کریں جس کے ذریعہ وہ اس وقت کی ضلالت و گمراہی اور کفر کی صورتحال کو سمجھ سکیں، اس کے بعد ہی وہ صحابہ کرام کے ذریعہ دی گئی قربانیوں کا صحیح ادراک کر سکتے ہیں جن کی وجہ روئے زمین پر اسلامی نظام قائم ہو سکا۔ (دیکھیں: من معین السیرۃ، الشامی، ص: 291)

۳: سلمانؓ ہم اہلِ بیت میں سے ہیں:

خندق کے روز مہاجرین کہنے لگے: سلمان ہم میں سے ہیں، انصار کہنے لگے: سلمان ہم میں سے ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: "سلمان ہم اہل بیت میں سے ہیں"۔ (مستدرک حاکم: 3/598، سیرت ابن ہشام: المعجم الکبیر للطبرانی: 6/261، سیرت ابن ہشام: 3/235، مجمع الزوائد: 6/130)

حضرت سلمانؓ کو عطا کیا جانے والا یہ دائمی تمغۂ نبوی واضح کرتا ہے کہ حضرت سلمانؓ کا تعلق مہاجرین سے ہے، اس لئے کہ اہلِ بیت مہاجرین میں سے ہیں۔(سیرت ابن ہشام: 3/247، التاریخ الاسلامی للحمیدی: 6/108)

۴: درمیانی نماز (صلاۃ وسطی):

اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''اللہ ان کے گھروں اور قبروں کو آگ سے بھر دے جیسے کہ انہوں نے ہمیں درمیانی نماز (صلوۃ وسطی) سے روک دیا، یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا''۔

اس حدیث کے ذریعہ علماء کے ایک طبقہ نے استدلال کیا ہے کہ صلاۃ وسطی سے عصر کی نماز مراد ہے، جیسے کہ اس کی صراحت بھی کی گئی ہے، قاضی ماوردیؒ نے حدیث کے صحیح ہونے کی وجہ سے امام شافعیؒ کا بھی یہی قول قرار دیا ہے، اسی طرح علماء کے ایک طبقہ نے اس عمل کے ذریعہ نماز کو مؤخر کرنے کے جواز پر استدلال کیا ہے جبکہ قتال کا عذر موجود ہو، جیسے کہ مکحول اور اوزاعی کا مسلک ہے۔ (دیکھیں: الأساس فی السنۃ: 2/682)

ڈاکٹر بوطی کہتے ہیں: نبی کریم ﷺ سے عصر کی نماز فوت ہو گئی جیسے کہ آپ نے اس جنگ میں دیکھا کہ آپؐ انتہائی مشغول تھے یہاں تک کہ آپ ﷺ نے نمازِ عصر کی قضا کی جبکہ سورج غروب ہو گیا تھا۔ صحیحین کے علاوہ دیگر روایات میں ہے کہ آپ ﷺ سے ایک سے زائد نمازیں فوت ہوئیں، جن کو آپؐ نے بعد میں ترتیب کے ساتھ ادا فرمایا، جبکہ ان کا وقت نکل چکا تھا اور آپ ﷺ ان کی ادائیگی کے لئے فارغ ہوئے تھے، اس سے چھوٹ جانے والی نمازوں کی قضا کی مشروعیت کی دلیل ملتی ہے۔ بعض علماء کا یہ کہنا ہے کہ اس طرح کی مشغولیت کی وجہ سے نماز کو مؤخر کرنا، اس وقت جائز تھا لیکن بعد میں یہ حکم منسوخ ہو گیا جبکہ مسلمانوں کے لئے سخت جنگ کے وقت کھڑے کھڑے اور سوار صلاۃ الخوف مشروع کی گئی۔ لیکن یہ کہنا درست نہیں ہے کہ قضا کی مشروعیت منسوخ ہوئی بلکہ نماز کو مشغولیت کی وجہ سے مؤخر کرنا منسوخ ہوا، اس لئے کہ قضا کی مشروعیت ثابت ہے اور بعد کے حکم میں اس کے بارے میں سکوت اختیار کیا گیا ہے، لہذا قضا کی مشروعیت سابقہ حکم پر باقی رہی۔(فقہ السیرۃ النبویۃ، ص: 223)

۵: حلال و حرام:

قریش نے مطالبہ کیا کہ وہ عمرو بن عبد ود کی لاش کے بدلہ میں فدیہ دیں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ان کو اس کی مردہ لاش دے دو، اس لئے کہ وہ خبیث لاش ہے اور اس کی دیت بھی خبیث ہے۔ آپ ﷺ نے ان سے کوئی چیز قبول نہیں کی۔(مسند أحمد: 1/248، سیرت ابن ہشام: 3/265)

یہ اس وقت کا واقعہ ہے جبکہ مسلمان سخت تنگدستی، تقشف سے پُر زندگی بسر کر رہے تھے لیکن اس کے باوجود حلال حلال ہی ہے اور حرام حرام ہے، حلال و حرام کے سلسلہ میں اسلام کا معیار یہی ہے، لہذا اس طرزِ عمل کے مقابلہ میں ان لوگوں کا یہ رویہ درست کیسے ہو سکتا ہے جو سود اور اس طرح کی دیگر حرام اشیاء کو حلال کرنے کے بہانے اور راستے تلاش کرتے رہتے ہیں۔ (دیکھیں: من معین السیرۃ، ص: 294)

۶: رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی حضرت صفیہؓ کی شجاعت:

غزوۂ احزاب کے موقع پر خواتین اور بچوں کو ایک خالی قلعہ میں رکھا گیا تھا تاکہ وہ کسی بھی قسم کی اذیت سے محفوظ رہ سکیں، اس لئے کہ مسلمان ان کی حمایت و حفاظت کرنے سے اس وقت قاصر تھے، اس لئے کہ وہ دشمن کا مقابلہ کر رہے تھے، لہذا جب بنو قریظہ کے یہود نے رسول اللہ ﷺ سے کئے ہوئے عہد کو توڑ دیا تو انہوں نے ایک یہودی کو بھیجا تاکہ وہ اس قلعہ کی صورتحال کا جائزہ لے کر آئے جس میں مسلمان خواتین اور بچے تھے، اس کو رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی حضرت صفیہؓ بنت عبد المطلب نے دیکھ لیا۔ انہوں نے ایک بڑی لکڑی لی اور قلعہ سے نیچے اتر کر اس کو اس لکڑی سے مارا یہاں تک کہ وہ مر گیا، حضرت صفیہؓ کی طرف سے یہ فعل یہود کے لئے ایک عبرتناک سبق تھا کہ اس قلعہ کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنا ممکن نہیں ہے، بنو قریظہ کے یہود سمجھ گئے کہ اسلامی لشکر کی طرف سے اس قلعہ کی حفاظت کی جارہی ہے یا کم از کم اس میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اس کا دفاع کر رہے ہیں۔ (دیکھیں: الرحیق المختوم، ص283-284)

اس واقعہ میں اس بات کی دلیل موجود ہے کہ عورت اپنا دفاع کر سکتی ہے جبکہ اس کی طرف سے کوئی دوسرا دفاع کرنے والا نہ ہو۔ (المستفاد من قصص القرآن للدعوۃ والدعاۃ: 2/246)

۷: حضرت حسانؓ کی بزدلی کے بارے میں ایک ضعیف روایت کی حقیقت:

رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی حضرت صفیہؓ کے یہودی کو قتل کرنے کے ضمن میں ایک ضعیف روایت مروی ہے کہ حضرت صفیہؓ نے حضرت حسان بن ثابتؓ سے کہا: یہ یہودی قلعہ کے ارد گرد چکر لگا رہا ہے جیسے کہ آپ دیکھ ہی رہے ہیں، مجھے اندیشہ ہے کہ یہ باقی یہود کو ہمارے رازوں کے بارے میں بتائے گا اور کیونکہ رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے اصحاب مشغول ہیں لہذا جائیں اور اس کو قتل کر دیں۔ حضرت حسانؓ نے کہا: اے عبد المطلب کی بیٹی! اللہ آپ کو معاف کرے! آپ کو معلوم ہے کہ میں اس میدان کا آدمی نہیں ہوں۔ حضرت صفیہؓ فرماتی ہیں: جب انہوں نے ایسا کہا تو میں نے ایک لکڑی لی، اس کے بعد قلعہ سے اتر کر اس کی طرف گئی اور اس کو اس لکڑی سے مارا یہاں تک کہ اس کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد میں قلعہ میں واپس آگئی اور حسانؓ سے کہا: اے حسان! اتر کر جاؤ اور اس کا مالِ غنیمت لے لو۔ میں اس کو چھیننے سے اس لئے قاصر ہوں کیونکہ وہ ایک مرد ہے۔ انہوں نے کہا: اے عبد المطلب کی بیٹی! مجھے اس کے مالِ غنیمت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ (سیرت ابن ہشام: 3/239، دلائل النبوۃ للبیہقی: 3/442، صحیح السیرۃ النبویۃ، ص365)

<u>یہ روایت چند وجوہات کی بنیاد پر درست نہیں ہے:</u>

- سند کے اعتبار سے؛ اس لئے کہ یہ خبر مسند نہیں ہے بلکہ یہ ساقط ہے، جو صحیح نہیں ہے، اس کو روایت کرنا بھی درست نہیں ہے، اس کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ میں سے ایک ایسے صحابی کی تنقیص لازم آتی ہے، جو پوری عمر دعوت اور رسول اللہ ﷺ کی طرف سے دفاع کرتے رہے۔

- اگر حضرت حسان بن ثابتؓ بزدلی میں معروف ہوتے توان کے دشمن اور مخالفین اس مذموم صفت کے ذریعہ ان کی مذمت کرتے، خاص طور پر جبکہ حضرت حسانؓ اُن کی ہجو کرتے تھے اور زعمائے جاہلیت میں سے کوئی بھی ان کی ہجو سے محفوظ نہ رہ سکا اور رسول اللہ ﷺ ان کی تائید فرماتے تھے، ان کے لئے دعا کرتے تھے اور مشرکین کی ہجو کرنے پر ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔(دیکھیں: غزوۃ الاحزاب، ڈاکٹر ابو فارس)

۸: پہلا اسلامی فوجی ہسپتال:

غزوۂ احزاب کے موقع پر مسلمانوں نے پہلا اسلامی فوجی ہسپتال قائم کیا، رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ میں مسجد نبوی میں ایک خیمہ لگوایا جبکہ افواج کے مابین میدانِ کارزار گرم ہوا، آپ ﷺ نے حکم دیا کہ حضرت رفیدہ اُسلمیہؓ اس کی سربراہ رہیں گی، اس طریقہ سے وہ اسلام میں سب سے پہلی فوجی نرس بن گئیں۔ (دیکھیں: المستشفیات الاسلامیہ، ڈاکٹر عبداللہ السعید، ص: 43)

سیرت ابن ہشام میں ہے: آپ ﷺ نے حضرت سعد بن معاذؓ کو اپنی مسجد میں قبیلہ اُسلم کی ایک خاتون کے خیمہ میں رکھا، اس خاتون کا نام رفیدہ تھا، وہ زخمیوں کا علاج معالجہ کرتی تھیں، مسلمانوں کی خدمت اور ان کی تکالیف کے ازالہ کا کام وہ بغیر کسی معاوضہ کے محض اللہ سے اجر ملنے کی امید میں کرتی تھیں، آپ ﷺ نے حضرت سعدؓ کی قوم سے فرمایا جبکہ خندق کے موقع پر ان کو تیر لگا: ان کو رفیدہ کے خیمہ میں رکھو تاکہ میں قریب سے ان کی عیادت کرسکوں۔ (سیرت ابن ہشام: 3/250، تفسیر طبری: 21/152)

اس نص سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مسلمانوں میں سے جو زخمی ہوتا تھا اگر اس کے اہلِ خانہ ہوتے تو وہ اس کی دیکھ ریکھ کرتے تھے اور اگر اس کے اہلِ خانہ نہیں ہوتے تھے تو اس کو مسجد لایا جاتا جہاں خیمہ لگایا گیا تھا، جب اللہ کے رسول ﷺ نے چاہا کہ حضرت سعد بن معاذ اُوسیؓ کے بارے میں مسلسل اطمینان حاصل کریں تو ان کو اس خیمہ میں رکھوایا، یہ صحابہ رسول اللہ ﷺ کی رعایت و نگرانی میں تھے، اسی لئے یہ خیمہ مسجد نبوی میں لگوایا گیا ورنہ وہ کسی بھی دوسری جگہ لگایا جاسکتا تھا۔

حضرت سعد بن معاذؓ کو ان کے کارہائے نمایاں اور اللہ کی راہ میں دی گئی قربانیوں کی وجہ سے یہ اعزاز و اکرام عطا کیا جاتا ہے، ان کو اس طرح تکریم سے نوازا جاتا ہے کہ ان کو ایک مخصوص خیمہ میں رکھا جاتا ہے، مخلصانہ طریقہ سے قربانیاں پیش کرنے والے گمنام اور بے لوث افراد کو اسی طرح اعزاز سے نوازا جاتا ہے کہ وہ براہِ راست رسول اللہ ﷺ کی رعایت و نگرانی میں رہنے کا شرف حاصل کرتے ہیں، یہی عظیم نبوی منہج ہے جو ہر زمانہ کے مسلمانوں کے لئے ایک دستور و قانون بن جاتا ہے۔ (دیکھیں: من معین السیرۃ، ص: 294)

۹: گناہ سرزد ہونے کے بعد فوری توبہ:

بنو قریظہ نے حضرت ابو لبابہ بن عبد المنذرؓ کو پیغام بھجوایا اور وہ ان کے حلفاء میں سے تھے، انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے سلسلہ میں مشورہ کیا۔ ابو لبابہؓ نے کہا: ہاں، ڈال دو، اور ساتھ ہی انہوں نے اپنے گلے کی طرف اشارہ کیا، گویا کہ انہیں اشارہ سے یہ بتلادیا کہ تم ہتھیار ڈال دو لیکن لگتا ہے کہ ذبح کردیئے جاؤ گے۔ فوراً ہی ان کو اس پر سخت ندامت کا احساس ہوا اور وہ وہیں سے مسجد نبوی

کی طرف متوجہ ہوئے، اپنے آپ کو وہاں باندھ دیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی توبہ قبول ہو گئی، وہ مسجد میں چھ راتوں تک مسلسل ستون کے ساتھ بندھے رہے، ان کی زوجہ ہر نماز کے وقت ان کے پاس آتی تھی اور نماز کے لئے ان کو کھول دیتی تھی، اس کے بعد وہ پھر سے ستون کے ساتھ اپنے آپ کو باندھ دیتے تھے۔ (دیکھیں: المستفاد من قصص القرآن: 2/286)

حضرت ابو لبابہؓ نے کہا تھا کہ میں اس وقت تک اسی جگہ رہوں گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ میرے جرم کے بارے میں توبہ قبول نہیں کرے گا۔ حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو سحر کے وقت ہنستے ہوئے دیکھا، میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! آپ کیوں ہنس رہے ہیں؟ اللہ آپ کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے!۔ آپؐ نے فرمایا: لبابہ کی توبہ قبول ہو گئی۔ فرماتی ہیں: میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! کیا میں ان کو خوشخبری سنادوں؟ آپؐ نے فرمایا: کیوں نہیں! اگر آپ چاہیں۔ چنانچہ وہ اپنے حجرے کے دروازے پر کھڑی ہوئیں، یہ حجاب کا حکم نازل ہونے سے پہلے کی بات ہے۔ انہوں نے فرمایا: اے لبابہ! خوشخبری حاصل کرو، اللہ نے آپ کی توبہ قبول کی ہے۔ فرماتی ہیں: لوگ ان کو کھولنے کے لئے امنڈ پڑے تو انہوں نے کہا: نہیں، واللہ! رسول اللہ ﷺ ہی مجھے اپنے ہاتھ سے کھولیں گے پھر جب رسول اللہ ﷺ صبح کی نماز کے لئے نکلتے ہوئے ان کے پاس سے گزرے تو آپؐ نے ان کو کھول دیا۔ (سیرت ابن ہشام: 3/247، دلائل النبوۃ للبیہقی: 4/16-17، التاریخ الاسلامی للحمیدی: 6/165)

اس واقعہ میں عبرت کا پہلو یہ ہے کہ حضرت ابو لبابہؓ سے جب یہ غلطی سرزد ہو گئی جس میں انہوں نے ایک اہم جنگی راز کا افشا کیا تو حضرت ابو لبابہؓ نے اس عمل کو چھپانے کی کوشش نہیں کی اور رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے سامنے اپنے آپ کو ایسے پیش نہیں کیا جیسے کہ انہوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ اپنی ذمہ داری ادا کر دی ہو اور ان سے کوئی نافرمانی سرزد نہ ہوئی ہو۔ وہ اس معاملہ کو چھپا سکتے تھے، اس لئے کہ مسلمانوں میں سے کسی کو اس کا علم نہیں تھا اور یہود سے وہ اس کو راز میں رکھنے کی بات کر سکتے تھے، لیکن ان کو اللہ تعالیٰ کے رقیب و علیم ہونے کا یقین تھا، اسی طرح ان کو اس بات کا بھی استحضار تھا کہ رسول اللہ ﷺ کا بھی ان پر حق ہے جنہوں نے انہیں اس راز کا امین بنایا ہے، اس لئے وہ اس لغزش کی وجہ سے بہت زیادہ گھبرا گئے، انہوں نے اپنے گناہ کا اعتراف کیا اور خود ہی سزا حاصل کرنے کے لئے پہل کی، بغیر اس کے کہ وہ تحقیق کا انتظار کرتے اور اس جرم پر عائد ہونے والی لازمی سزا کی تعیین کا انتظار کرتے، یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی عملی تطبیق و تنفیذ ہے: ﴿إِنَّمَا ٱلتَّوْبَةُ عَلَى ٱللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ ٱلسُّوٓءَ بِجَهَٰلَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ فَأُوْلَٰٓئِكَ يَتُوبُ ٱللَّهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ ٱللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا﴾ ترجمہ: ''ہاں یہ جان لو کہ اللہ پر توبہ کی قبولیت کا حق اُنہی لوگوں کے لئے ہے جو نادانی کی وجہ سے کوئی برا فعل کر گزرتے ہیں اور اس کے بعد جلدی ہی توبہ کر لیتے ہیں، ایسے لوگوں پر اللہ اپنی نظرِ عنایت سے پھر متوجہ ہو جاتا ہے، اور اللہ ساری باتوں کی خبر رکھنے والا اور حکیم و دانا ہے''۔ (سورۃ النساء: 17)

انسان کا بذات خود اپنے آپ کو سزا دینے کی یہ منفرد و بے نظیر مثال ہے اور صاحبِ ایمان کے سوا اور کسی سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی ہے اور یہ ایمان راسخ کا اثر اور نتیجہ ہے جس کے ساتھ انسان کسی گناہ یا نافرمانی کو پسند نہیں کرتا ہے۔

حضرت ابولبابہؓ کی توبہ قبول ہونے کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کو انتہائی خوشی ہوئی، وہ ان کو مبارکباد دینے کے لئے ایک دوسرے سے سبقت لینے لگے، یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ کی زوجہ حضرت ام سلمہؓ نے اجازت حاصل کرنے کے بعد مبارکباد دینے میں پہل کردی اور انہوں نے ہی انہیں قبولیتِ توبہ کی خوشخبری سنائی۔ (دیکھیں: صور وعبر من الجہاد النبوی فی المدینہ، ص:261)

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابولبابہؓ کے بارے میں یہ آیات نازل فرمائیں: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا تَخُونُواْ ٱللَّهَ وَٱلرَّسُولَ وَتَخُونُوٓاْ أَمَـٰنَـٰتِكُمْ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ ترجمہ: ''اے ایمان لانے والو، جانتے بُوجھتے اللہ اور اس کے رسُولؐ کے ساتھ خیانت نہ کرو، اپنی امانتوں میں غداری کے مرتکب نہ ہو''۔ (سورۃ الانفال:27)

اور ان کی توبہ کی قبولیت کے بارے میں یہ آیت نازل کی: ﴿وَءَاخَرُونَ ٱعْتَرَفُواْ بِذُنُوبِهِمْ خَلَطُواْ عَمَلًا صَـٰلِحًا وَءَاخَرَ سَيِّئًا عَسَى ٱللَّهُ أَن يَتُوبَ عَلَيْهِمْ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ ترجمہ: ''کچھ اور لوگ ہیں جنہوں نے اپنے قصوروں کا اعتراف کر لیا ہے، ان کا عمل مخلوط ہے، کچھ نیک ہے اور کچھ بد، بعید نہیں کہ اللہ ان پر پھر مہربان ہو جائے کیونکہ وہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے''۔ (سورۃ التوبہ:102 سیرت ابن ہشام:3/263)

۱۰: حضرت سعد بن معاذؓ کے فضائل:

اس غزوہ میں حضرت سعد بن معاذؓ کے بہت سے فضائل ظاہر ہوئے جو اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک ان کے فضل و مقام پر دلالت کرتے ہیں، ان میں سے چند فضائل مندرجہ ذیل ہیں:

اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول کی جبکہ انہوں نے کہا تھا کہ: ''اے اللہ! اگر تو نے قریش کی جنگ میں سے کچھ باقی رکھا ہے تو مجھے اس کے لئے زندہ اور باقی رکھنا، اس لئے کہ مجھے یہ بات سب سے زیادہ پسند ہے کہ میں ایسی قوم کے مقابلہ میں جہاد کروں جنہوں نے تیرے رسول کو ایذاء پہنچائی ہے، ان کی تکذیب کی اور ان کو جلاوطن کیا''۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول کی اور ان کا زخم کم ہوا اور وہ روبصحت ہوئے۔ (دیکھیں: فقہ السیرۃ للبوطی، ص: 228) یہاں تک کہ غزوۂ بنو قریظہ ہوا اور رسول اللہ ﷺ نے ان کے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق ان کو دیا، انہوں نے حق کے ساتھ فیصلہ کیا اور کسی ملامت گر کی ملامت کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا دل اللہ تعالیٰ کے لئے مخلص اور بے غبار تھا۔ (دیکھیں: التاریخ الاسلامی للحمیدی: 6/170)

اللہ کے رسول ﷺ نے بھی ان کو خاص اعزاز و اکرام سے نوازا جب کہ آپؐ نے انصار سے فرمایا جبکہ حضرت سعدؓ بنو قریظہ کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لئے آئے: ''اپنے سردار کے لئے کھڑے ہو جاؤ''۔ (صحیح بخاری: 3043، 4122، صحیح مسلم: 1768، سیرت ابن ہشام: 3/263)

یہ حضرت سعدؓ کے لئے عزت و تکریم اور آپؓ کی شجاعت و بہادری کی شہادت ہے، اس لئے کہ آپ ﷺ نے ان کو سید (سردار) کا نام دیا اور ان کے لئے کھڑے ہونے کا حکم دیا۔

اور جب حضرت سعدؓ نے بنو قریظہ کے یہود کے بارے میں اللہ کا حکم نافذ کیا تو حضرت سعدؓ نے دوبارہ اللہ سے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور فرمایا: "اے اللہ! میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے اور اُن - یعنی مسلمانوں اور مشرکین - کے مابین تو نے اب جنگ کا سلسلہ ختم کر دیا ہے، لہذا اگر تو نے ہمارے اور ان کے درمیان جنگ ختم کر دی ہے تو میرے زخم کو تازہ کر دے اور اسی میں مجھے موت دے"۔ (سیرت ابن ہشام: 3/275) چنانچہ ان کی دعا قبول ہو گئی اور اسی رات ان کا زخم پھٹ پڑا اور وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ (فقہ السیرۃ للبوطی: 228)

حضرت سعدؓ کی پہلی اور دوسری دعا میں ہم اس عجیب اور عظماء کی دعا کا یہ پہلو بطور خاص دیکھ سکتے ہیں کہ عظیم لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی میں ان کا کام اور مشن صرف شہادت کا حصول نہیں ہے بلکہ آخری سانس تک جدوجہد کو جاری رکھنا ان کا مشن ہے، وہ اپنی قوم اور امت میں اسلام کی نصرت و مدد کے ذمہ دار ہیں۔ (التربیۃ القیادیۃ: 3/70)

ہم ان کی سیرت میں یہ بھی دیکھتے ہیں کہ وہ اللہ کے نام کی اگر قسم کھاتے تو اللہ ان کی قسم پوری کرتا اور ان کی قسم کی لاج رکھتا۔ وہ آسمانوں میں بھی اور زمین میں بھی مقام بلند کے حامل ہیں، اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہوئی کہ بنو قریظہ کے بارے میں فیصلہ کا حق ان کو مل جائے اور بنو قریظہ خود ہی یہ مطالبہ کریں کہ ان کے متعلق فیصلہ کا حق سعد بن معاذؓ کو دیا جائے۔

جہاد ختم ہونے کے بعد ذمہ داری کی ادائیگی کے بعد اور اپنی قوم کی قیادت کے سلسلہ میں ان پر عائد ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے بعد انہیں زندہ رہنے کی چاہت نہیں تھی، جب جنگ اپنے اختتام کو پہنچ گئی اور بنو قریظہ کے متعلق فیصلہ کر کے انہوں نے اطمینان و سکون کی سانس لی اور اسلام کے لئے انہوں نے ثمرات حاصل کرنا شروع کر دیئے، اب ان کے نزدیک شہادت سے زیادہ لذیذ پھل اور کوئی نہیں تھا، اس لئے وہ دعا کرتے ہیں: "میرے زخم کو تازہ کر دے اور اسی میں مجھے وفات دے"۔ (دیکھیں: التربیۃ القیادیۃ: 4/71)

ان کی تمام امیدیں بَر آئیں، انہوں نے بنو قریظہ کے بارے میں اپنا فیصلہ صادر کر دیا اور کل کے حلفاء اور دوست اور آج کے اعداء کی موت کا انہوں نے مشاہدہ کیا اور اب ان کا زخم پھوٹ پڑا۔

اور جب ان کا زخم پھوٹ پڑا تو ان کی قوم نے ان کو منتقل کیا اور ان کو بنو عبد الاشہل کی بستی کی طرف اٹھا کر لے گئے اور رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور فرمایا: چلو! آپ ﷺ خود بھی نکلے اور آپؐ کے ساتھ صحابہ کرام بھی نکلے۔ آپؐ اتنی تیزی کے ساتھ نکلے یہاں تک کہ تیز چلنے کی وجہ سے ان کے جوتوں کے تسمے ٹوٹ گئے اور ان کی چادریں گر گئیں۔ آپ ﷺ کے اصحاب نے آپؐ سے مشقت کا اظہار بھی کیا، نبی کریم ﷺ نے جواب دیا: مجھے اس بات کا ڈر ہے کہ کہیں فرشتے ہم سے سبقت نہ لے جائیں اور وہ ان کو غسل دے دیں، جیسے کہ حنظلہؓ کو انہوں نے غسل دیا۔ آپ ﷺ ان کے گھر پہنچے جبکہ ان کو غسل دیا جا رہا تھا اور ان کی والدہ ان پر رو رہی تھیں۔ آپؐ نے فرمایا: ہر نوحہ کرنے والی جھوٹی ہوتی ہے سوائے اُم سعد کے۔ اس کے بعد آپؐ ان کو لے کر نکلے، صحابہ کرام کہہ رہے تھے: اے اللہ کے رسولؐ! ہم نے ان سے زیادہ ہلکی میت کسی کی نہیں اٹھائی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ان کی میت ہلکی کیوں نہیں ہو گی جبکہ اتنے اتنے فرشتے آسمان سے اترے ہیں، اس سے پہلے کبھی اتنے فرشتے نہیں اترے ہیں اور وہ آپ کے ساتھ انہیں اٹھائے ہوئے ہیں۔ (سیرت ابن ہشام: 3/264، سیر أعلام النبلاء: 1/287)

سنن نسائی میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے ان فرشتوں کی تعداد مذکور ہے جو حضرت سعدؓ کے جنازے میں شریک ہوئے، چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے: ''یہ وہ صالح بندہ ہے جس کے لئے عرش ہل گیا، اس کے لئے آسمان کے دروازے کھول دئے گئے، اور ان کے جنازے میں ستر ہزار فرشتے موجود تھے، اس سے پہلے وہ فرشتے کبھی زمین پر نازل نہیں ہوئے، ان کی قبر تنگ ہوگئی، اس کے بعد ان کے لئے کشادہ کر دی گئی''۔ (سنن نسائی: 4/101، سیرت أعلام النبلاء: 1/295)

اللہ کے رسول ﷺ حضرت سعدؓ کو الوداع کرتے ہیں، جیسے کہ حضرت عبداللہ بن شدادؓ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس وقت ان کے پاس داخل ہوئے جبکہ وہ آخری سانسیں لے رہے تھے اور فرمایا: ''اللہ تعالی قوم کے اس سردار کو بہترین جزا عطا فرمائے۔ اے سعد! آپ نے اپنا وعدہ پورا کر کے دکھایا، اللہ بھی آپ کے ساتھ اپنا وعدہ پورا کرے گا''۔ (مصنف ابن أبی شیبہ: 5/322، 12/145، سیر أعلام النبلاء: 1/288)

نبی کریم ﷺ نے اس صالح بندے کی وفات کے بعد صحابہ کے سامنے ان کی کافی تعریف کی تاکہ صحابہ کرام ان کے صالح اعمال کے بارے میں واقف ہو جائیں اور پھر ان کے نقشِ قدم پر چلتے رہیں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''سعد بن معاذ کی موت کی وجہ سے رحمن کا عرش ہل گیا''۔ (صحیح بخاری: 3803، صحیح مسلم: 2466)

حضرت براء بن عازبؓ کی حدیث میں ہے فرماتے ہیں: اللہ کے رسول ﷺ کو ایک ریشمی جوڑا ہدیہ دیا گیا، آپؐ کے اصحاب اس کو چھونے لگے اور اس کے ملائم ہونے پر تعجب کرنے لگے تو آپؐ نے فرمایا کہ ''کیا آپ کو اس کے ملائم ہونے پر تعجب ہو رہا ہے؟ جنت میں سعد بن معاذ کے رومال اس سے بھی زیادہ بہتر اور ملائم ہیں''۔ (صحیح بخاری: 3802، صحیح مسلم: 2468/126)

ان تمام مآثر و محاسن اور اعمالِ جلیلہ کے باوجود ان کو قبر کی تنگی کا سامنا کرنا پڑا، جب سب لوگ سعدؓ کی قبر کے پاس پہنچے تو اس میں چار لوگ اترے، حارث بن أوسؓ، أسید بن حضیرؓ، أبو نائلہ سلکان اور سلمہ بن سلامہ بن وقش۔ اور رسول اللہ ﷺ وہیں کھڑے تھے، جب ان کو قبر میں اتارا گیا تو رسول اللہ ﷺ کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ آپؐ نے تین مرتبہ تسبیح پڑھی اور مسلمانوں نے بھی تسبیح پڑھی، یہاں تک کہ بقیع گونج اٹھا، اس کے بعد آپ ﷺ نے تین مرتبہ تکبیر کہی اور مسلمانوں نے بھی تکبیر کہی۔ آپ ﷺ سے اس کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا: آپ کے ان صاحب پر قبر تنگ ہو گئی اور ان کو دبوچا گیا، اگر اس سے کوئی نجات پاتا تو یہ نجات پاتے، اس کے بعد ان کے لئے اس کو کشادہ کر دیا گیا۔ (دیکھیں: التربیۃ القیادیۃ: 4/77، مسند الامام أحمد: 6/141)

بلاشبہ یہ جلیل القدر صحابی اس وقت شہادت سے سرفراز ہوئے جبکہ وہ جوانی کی بہاریں گزار رہے تھے، چنانچہ وفات کے وقت ان کی عمر سنتیس (۳۷) سال تھی، اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے اپنی قوم کو اسلام کی دعوت اس وقت دی جبکہ ان کی عمر تیس (۳۰) سال تھی، تیس سال کی عمر تک پہنچنے سے قبل ہی انہوں نے سیادت و قیادت کی زمامِ کار سنبھالی، جبکہ عام طور پر چالیس سال کے بعد ہی پوشیدہ صلاحیتیں اور طاقتیں نکھر کر باہر آتی ہیں، چالیس سال جوانی کی غایت و انتہا ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَوَصَّيْنَا ٱلْإِنسَـٰنَ بِوَٰلِدَيْهِ إِحْسَـٰنًا ۖ حَمَلَتْهُ أُمُّهُۥ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا ۖ وَحَمْلُهُۥ وَفِصَـٰلُهُۥ ثَلَـٰثُونَ شَهْرًا ۚ حَتَّىٰٓ إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُۥ وَبَلَغَ أَرْبَعِينَ

سَنَةً قَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِيٓ أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ ٱلَّتِيٓ أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَٰلِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَٰلِحًا تَرْضَىٰهُ وَأَصْلِحْ لِي فِي ذُرِّيَّتِيٓ ۖ إِنِّي تُبْتُ إِلَيْكَ وَإِنِّي مِنَ ٱلْمُسْلِمِينَ﴾ ترجمہ: ''ہم نے انسان کو ہدایت کی کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ نیک برتاؤ کرے، اُس کی ماں نے مشقت اٹھا کر اسے پیٹ میں رکھا اور مشقت اٹھا کر ہی اس کو جنا، اور اس کے حمل اور دودھ چھڑانے میں تیس مہینے لگ گئے یہاں تک کہ جب وہ اپنی پوری طاقت کو پہنچا اور چالیس سال کا ہو گیا تو اس نے کہا: اے میرے رب، مجھے توفیق دے کہ میں تیری اُن نعمتوں کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھے اور میرے والدین کو عطا فرمائیں، اور ایسا نیک عمل کروں جس سے تو راضی ہو، اور میری اولاد کو بھی نیک بنا کر مجھے سکھ دے، میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور تابع فرمان (مسلم) بندوں میں سے ہوں''۔ (سورۃ الأحقاف: 15)

لہذا یہ کس طرز کی شخصیت ہے جن کے مآثر و کارناموں سے تاریخ بھری ہے اور آسمان والوں نے ان کی آمد کے ذریعہ خوشیاں منائیں، ان کی وفات پر رحمن کا عرش جھوم گیا۔ حضرت سعد بن معاذؓ روشن سراپا، دراز قد، خوبصورت و حسین چہرے، بڑی آنکھوں اور خوبصورت داڑھی والی شخصیت کے مالک تھے۔ اللہ کی رحمت ہو آپؓ پر، اللہ آپ سے راضی ہو۔ (دیکھیں: القیادۃ الربانیۃ: 4/87، سیر أعلام النبلاء: 1/290)

۱۱: حیی بن أخطب اور کعب بن أسد کا قتل

۱: حیی بن أخطب نضری کا قتل:

عبدالرزاق نے اپنی مصنف میں اپنی سند سے حضرت سعید بن مسیّب سے غزوۂ احزاب اور غزوۂ بنی قریظہ کے بعض واقعات ذکر کئے ہیں، اس کے ضمن میں فرماتے ہیں:

جب اللہ تعالی نے تمام لشکروں کو منتشر کر دیا تو وہ (حیی) چلا یہاں تک کہ وہ مقام روحا پہنچا، وہاں اس نے اس عہد و پیمان کو یاد کیا جو اس نے ان (مشرکین) کے ساتھ کیا تھا، وہ واپس آ گیا یہاں تک کہ ان کے ساتھ شامل ہو گیا، جب بنو قریظہ آئے تو اس کو اس حال میں لایا گیا کہ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے، حیی نے نبی کریم ﷺ سے فرمایا: اللہ کی قسم! آپ سے عداوت و دشمنی کرنے میں مجھے کوئی افسوس نہیں ہے، لیکن جب اللہ کسی کو ذلیل و خوار کرنا چاہے وہ ذلیل و خوار ہو جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس کے بارے میں حکم دیا اور اس کی گردن ماردی گئی۔ (مصنف عبدالرزاق: 9737، سیرت ابن ہشام: 3/252، دلائل النبوۃ للبیہقی: 4/23)

قتل کا حکم نافذ ہونے سے پہلے وہ لوگوں کی طرف متوجہ ہوا اور کہا: ''اے لوگو! اللہ کے فیصلہ کے بارے میں کوئی حرج نہیں ہے، یہ مقدر اور نوشتۂ تقدیر ہے اور یہ وہ جنگ ہے جس کو اللہ نے بنی اسرائیل کے لئے لکھ دیا ہے''۔ اس کے بعد وہ بیٹھ گیا اور اس کی گردن ماردی گئی۔ (الصراع مع الیہود، ابو فارس: 2/112)

حیی بن اُخطب کے قتل میں دروس واسباق

اَ: بُری چال چلنے والوں کا انجام:

جو بھی بُری چال چلتا ہے تو اس کا وبال اور انجام اسے ہی بھگتنا پڑتا ہے۔ چنانچہ حیی نے عرب اور یہودی قبائل کو اسلام اور نبی کریم ﷺ کے خلاف جنگ کرنے پر آمادہ کیا اور بنو قریظہ کو اس پر آمادہ کیا کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کئے ہوئے عہد و پیمان کو توڑنا ضروری ہے، اس نے پسِ پردہ سازشوں کا جال بچھایا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی چال کو خاک میں ملا دیا اور اس کو ذلیل و رسوا کیا، اور اخیر میں اس کی تمام کوششوں نے اس کو موت کے انجام تک پہنچا دیا۔

بلاشبہ اللہ تعالیٰ ظالموں کو یوں ہی نہیں چھوڑتا ہے، البتہ ان کو مہلت اور ڈھیل دیتا ہے یہاں تک کہ جب وہ ان کی پکڑ کرتا ہے تو عزیز مقتدر کی طرح ان کی پکڑ کرتا ہے اور اس کی پکڑ بڑی سخت ہوتی ہے، اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے: ''بے شک اللہ تعالیٰ ظالم کو مہلت دیتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ اس کی پکڑ کرتا ہے تو پھر اس کو چھوڑتا نہیں ہے''۔ (صحیح بخاری: 4686، الصراع مع الیہود، ابو فارس: 2/112) اس کے بعد آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا یہ قول تلاوت کیا: ﴿وَكَذَٰلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ إِذَآ أَخَذَ ٱلْقُرَىٰ وَهِيَ ظَٰلِمَةٌ ۚ إِنَّ أَخْذَهُۥٓ أَلِيمٌ شَدِيدٌ﴾ ترجمہ: ''اور تیرا رب جب کسی ظالم بستی کو پکڑتا ہے تو پھر اس کی پکڑ ایسی ہی ہوا کرتی ہے، فی الواقع اس کی پکڑ بڑی سخت اور دردناک ہوتی ہے''۔ (سورۃ ھود: 102)

ب: موت کے وقت بھی غرور و تکبر:

حیی کی جب گردن ماری جارہی تھی وہ اس وقت بھی اکڑ دکھا رہا تھا، تاکہ کوئی خوش ہونے والا اس پر خوش نہ ہو، وہ جانتا تھا کہ وہ باطل پر ہے، اپنے اوپر ظلم کر رہا تھا، وہ ہلاکت کے گڑھے میں پہنچ چکا تھا، لیکن اس کے باوجود وہ اسی باطل پر مرتا ہے اور گناہ کے بارے میں اس کا غرور و تکبر اس کو جہنم تک پہنچا دیتا ہے، اس لئے کہ وہ اپنی خواہش کی عبادت کرتا تھا اور رب کی عبادت سے روگردانی اختیار کرتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿أَفَرَءَيْتَ مَنِ ٱتَّخَذَ إِلَٰهَهُۥ هَوَىٰهُ وَأَضَلَّهُ ٱللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ وَخَتَمَ عَلَىٰ سَمْعِهِۦ وَقَلْبِهِۦ وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِۦ غِشَٰوَةً فَمَن يَهْدِيهِ مِنۢ بَعْدِ ٱللَّهِ ۚ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ﴾ ترجمہ: ''پھر کیا تم نے کبھی اُس شخص کے حال پر بھی غور کیا جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا خدا بنا لیا اور اللہ نے علم کے باوجود اُسے گمراہی میں پھینک دیا اور اُس کے دل اور کانوں پر مہر لگا دی اور اُس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا؟ اللہ کے بعد اب اور کون ہے جو اُسے ہدایت دے؟ کیا تم لوگ کوئی سبق نہیں لیتے؟''۔ (سورۃ الجاثیہ: 23)

ج: جس کو اللہ رسوا کرے وہ ذلیل و خوار ہو جاتا ہے:

بلاشبہ اللہ تعالیٰ جب کسی کو ذلیل و خوار کرتا ہے تو پھر اس کا کوئی حامی اور مددگار نہیں ہو سکتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِن يَنصُرْكُمُ ٱللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۖ وَإِن يَخْذُلْكُمْ فَمَن ذَا ٱلَّذِى يَنصُرُكُم مِّنۢ بَعْدِهِۦ ۗ وَعَلَى ٱللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ

﴿ٱلۡمُؤۡمِنُونَ﴾ ترجمہ: ''اللہ تمہاری مدد پر ہو تو کوئی طاقت تم پر غالب آنے والی نہیں، اور وہ تمہیں چھوڑ دے، تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کر سکتا ہو؟ پس جو سچے مومن ہیں ان کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے''۔(سورۃ آل عمران:160)

رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حیی کی عداوت و دشمنی کا سبب حسد اور کینہ تھا، اسی لئے حیی نے صراحتاً یہ کہہ دیا کہ اللہ تعالیٰ کبھی بھی اس کے ساتھ نہیں تھا، بلکہ وہ شیطان کی صف میں شامل تھا اور رحمن کے اولیاء کا دشمن تھا، وہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ دشمنی رکھتا تھا، اس لئے اللہ نے بھی اس کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا اور اس کو ہلاکت و اذیت کے لئے تنہا چھوڑ دیا، زمین و آسمان میں کوئی طاقت اس کو اس کے انجام بد سے بچانے والی نہیں تھی، اس لئے کہ اللہ کا ارادہ نافذ ہونے والا ہے، اس کے فیصلہ کو کوئی ٹالنے والا نہیں ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَإِن يَمۡسَسۡكَ ٱللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُۥٓ إِلَّا هُوَۖ وَإِن يَمۡسَسۡكَ بِخَيۡرٍ فَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيۡءٍ قَدِيرٌ﴾ ترجمہ: ''اگر اللہ تمہیں کسی قسم کا نقصان پہنچائے تو اس کے سوا کوئی نہیں جو تمہیں اس نقصان سے بچا سکے، اور اگر وہ تمہیں کسی بھلائی سے بہرہ مند کرے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے''۔(سورۃ الانعام:17)

۲: کعب بن اسد قرظی کا قتل:

اس کے بعد بنو قریظہ کے سردار کعب بن اُسد کو لایا گیا قبل اس کے کہ رسول اللہ ﷺ اس کی گردن مارنے کا حکم دیتے، آپ ﷺ کے درمیان اور اس کے درمیان مندرجہ ذیل گفتگو ہوئی:

اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: کعب بن اسد؟

کعب بن اُسد نے کہا: جی ہاں، اے ابو القاسم!

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم لوگوں نے ابن خراش کی نصیحت پر عمل نہیں کیا، وہ میری تصدیق کرتا تھا، کیا اس نے تم لوگوں کو میری اتباع کرنے کا حکم نہیں دیا تھا اور جب تم مجھے دیکھتے تھے تو تم مجھے اس کی طرف سے سلام پہنچاتے تھے!

کعب نے کہا: اے ابو القاسم! کیوں نہیں! تورات کی قسم! (اس نے تو نصیحت کی) اگر یہود مجھے تلوار سے ڈرنے کا عار نہ دلاتے تو میں ضرور آپ کی اتباع کرتا لیکن میں یہود کے دین پر ہوں۔

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اس کی گردن مارنے کا حکم دیا اور اس کی گردن مار دی گئی۔(الیہود فی السنۃ المطہرہ:1/368)

کتب سیرت میں بنو قریظہ کے یہود کے بارے میں جو روایات موجود ہیں ان میں ذکر ہے کہ وہ ایک گروہ کے بعد دوسرے گروہ کو بھیجتے تھے تاکہ ان کی گردنیں ماری جائیں۔ انہوں نے اپنے لیڈر کعب بن اُسد سے دریافت کیا کہ اے کعب، آپ کا کیا خیال ہے، ہمارے ساتھ کیا کیا جائے گا؟ اس نے کہا: کیا تم لوگ کسی بھی جگہ سمجھ بوجھ نہیں رکھتے؟ دیکھتے نہیں کہ پکارنے والا رک نہیں رہا ہے اور جانے والا پلٹ نہیں رہا ہے، یہ اللہ کی قسم! قتل ہے۔(سیرت ابن ہشام:3/252، دلائل النبوۃ للبیہقی: 4/23، الیہود فی السنۃ المطہرۃ: 1/368)

کعب بن اُسد کے قتل کے واقعہ میں یہ بات قابل غور ہے کہ وہ یہودیت کے لئے متعصب تھا، حالانکہ وہ جانتا تھا کہ وہ غلط ہے، اس کو رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا بھی پورا علم اور یقین تھا لیکن وہ ایمان نہیں لایا اور نہ ہی اسلام میں داخل ہوا، اس کو ڈر تھا کہ یہود اس کو یہ عار نہ دلائیں کہ وہ تلوار سے ڈر گیا، لہذا ایمان نہ لانا اور کفر پر باقی رہنا اس کی ریاکاری کا نتیجہ تھا، وہ مدح و تعریف کو پسند کرتا تھا، مذمت اور عار سے ڈرتا تھا، یہ اس کے بیوقوف اور احمق ہونے کی واضح دلیل ہے اور اللہ تعالیٰ نے بھی اس دھوکہ باز یہودی کو بے یار و مددگار چھوڑ کر رسوا کر دیا۔ (الصراع مع الیہود: 2/15)

۱۲: زبیر بن باطا اور رفاعہ بن سموءل کے بارے میں سفارش

۱: حضرت ثابت بن قیسؓ کی سفارش زبیر بن باطا کے بارے میں:

غزوۂ بنی قریظہ میں حضرت ثابت بن قیسؓ کے ساتھ ایک دلچسپ قصہ پیش آیا، ہوا یہ کہ وہ یہودی جو گرفتار کر لئے گئے تھے اور انہیں قتل کا حکم سنا دیا گیا تھا، ان میں سے ایک یہودی زبیر بن باطا بھی تھا۔ زبیر نے جنگ بغاث (جو کہ زمانۂ جاہلیت میں وقوع پذیر ہوئی تھی) میں حضرت ثابتؓ بن قیس بن شماس پر ایک احسان کیا تھا۔ جنگ کے دوران زبیر نے ثابتؓ بن قیس کو قابو کر لیا تھا، لیکن پیشانی کے بال کاٹ کر چھوڑ دیا تھا، مزید اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا، معرکہ قریظہ میں وہ بہت بوڑھا ہو چکا تھا۔ حضرت ثابتؓ نے کہا: ”اے ابو عبدالرحمن کیا تو مجھے پہچانتا ہے؟“

اس نے کہا: ”میرے جیسا آدمی کیا آپ جیسے آدمی کو بھول سکتا ہے؟“

حضرت ثابتؓ نے کہا: ”میں جنگ بغاث میں مجھ پر کئے گئے تیرے احسان کا بدلہ چکانا چاہتا ہوں“۔

اس نے کہا: ”اے ابو محمد، عزت والے ہی عزت والوں کو بدلہ دیا کرتے ہیں“۔ ابو محمد حضرت ثابت بن قیسؓ کی کنیت تھی۔

پھر ثابت بن قیسؓ رسول اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ عرض کیا: ”حضور! زبیر کو میرے سپرد کر دیں، اس کا مجھ پر ایک احسان ہے، میں چاہتا ہوں کہ اس کا بدلہ دوں“۔

رسول اقدس ﷺ نے فرمایا: ”ٹھیک ہے وہ تمہارے سپرد کیا جاتا ہے۔ جو چاہو اس سے سلوک کرو“۔

پھر حضرت ثابتؓ زبیر کے پاس آئے۔ اسے بتایا: ”رسول اقدس ﷺ نے تجھے میرے سپرد کر دیا ہے۔ جاؤ! میں نے تجھے معاف کیا“۔

بڑے بوڑھے زبیر نے کہا: ”نہ میری بیوی میرے پاس رہی اور نہ اولاد، میں زندہ رہ کر کیا کروں گا؟“

حضرت ثابتؓ رسول اکرم ﷺ کے پاس آئے اور زبیر کے اہل و عیال عنایت کر دینے کا مطالبہ کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اس کے اہل و عیال بھی تمہارے سپرد کئے جاتے ہیں“۔

حضرت ثابتؓ نے زبیر کے پاس آکر کہا: ”مجھے رسول اکرم ﷺ نے تیرے اہل و عیال سپرد کر دیئے ہیں اور وہ میں تیرے سپرد کرتا ہوں“۔

زبیر نے کہا: ”کیا حجاز میں کوئی ایسا گھرانہ ہے، جس کے پاس مال نہ ہو، بغیر مال و دولت کے اہل و عیال کی گزران کیسے ہو گی؟“

حضرت ثابتؓ رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ''حضور! زبیر کے مال کا کیا بنے گا؟''

آپؐ نے فرمایا: ''اس کا مال بھی تیرے سپرد کیا جاتا ہے''۔

حضرت ثابتؓ زبیر کے پاس آئے اور اسے بتایا: ''رسول اکرمؐ نے تیرا مال بھی میرے اختیار میں دے دیا ہے۔ وہ مال بھی میں تیرے سپرد کرتا ہوں''۔

زبیر بن باطا یہودی نے پوچھا: ''چینی آئینے جیسے صاف ستھرے چہرے والے یہودیوں کے بادشاہ کعب بن سعد کا کیا بنا؟''

حضرت ثابتؓ نے فرمایا: ''وہ دیگر مقتولین کے ساتھ ہی قتل کر دیا گیا''۔

زبیر نے پوچھا: ''شہری اور دیہاتی آبادی کے سردار حیی بن اخطب کا کیا بنا؟''

حضرت ثابتؓ نے کہا: ''اسے بھی قتل کر دیا گیا ہے''۔

زبیر نے پوچھا: ''ہمارے پیش رو اور حامی و ناصر عذال بن شمویل کا کیا بنا؟ جب ہم کسی پر یلغار کرتے یا حملہ آور ہوتے تو وہ ہمارے پیش پیش ہوا کرتا تھا''۔

آپؓ نے فرمایا: ''وہ بھی قتل کر دیا گیا ہے''۔

زبیر نے پوچھا: ''بنو کعب بن قریظہ اور بنو عمرو بن قریظہ کا کیا بنا؟''

حضرت ثابتؓ نے تلخ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا: ''وہ سب جہنم رسید ہوئے، قتل کر دیئے گئے ہیں۔ تجھے خدا ہدایت دے''۔

زبیر نے کہا: ''اے ثابت میں تجھے خدا اور اس احسان کا واسطہ دے کر کہتا ہوں، جو میں نے تجھ پر کیا، آپ مجھے بھی اپنی قوم کے پاس پہنچا دیں۔ خدا کی قسم میں ان کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد خود زندہ رہنے میں کوئی بہتری نہیں سمجھتا۔ میں تو اپنے جگری دوستوں کو ملے بغیر اتنی دیر بھی نہیں رہ سکتا، جتنی دیر کنویں سے نکالے گئے ڈول واپس کنویں میں دوبارہ گرانے میں لگتی ہے''۔

حضرت ثابتؓ نے زبیر بن باطا کی بات رسول اقدسؐ کو بتائی۔ آپؐ نے فرمایا: ''ٹھیک ہے، اس کی خواہش پوری کر دو''۔

لہٰذا ثابت بن قیسؓ نے اس کی گردن پر تلوار کا وار کیا اور اس کا کام تمام کر دیا۔ (سیرت ابن ہشام: 3/253-254 دلائل النبوۃ للبیہقی 4/23-24)

۲: سلمہ بنت قیس کی سفارش رفاعہ بن سموءل قرظی کے بارے میں

سلمہ بنت قیس جن کی کنیت ام المنذر تھی وہ حضرت سلیط بن قیس کی بہن تھیں اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خالہ بھی تھیں۔ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ قبلۂ اولی اور قبلہ ثانیہ دونوں کی جانب نماز پڑھی اور انہوں نے آپؐ کے ساتھ عورتوں والی بیعت کی، انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے رفاعہ بن سموءل القرظی کا مطالبہ کیا اور کہا: اے اللہ کے نبیؐ! میرے ماں باپ آپ پر قربان! مجھے رفاعہ کو دے دیجئے۔ اس لئے کہ وہ کہتا ہے کہ وہ اب نماز پڑھے گا اور اونٹ کا گوشت کھائے گا۔ آپؐ نے رفاعہ کو انہیں دے دیا۔ (سیرت ابن ہشام: 3/255، الیہود فی السنۃ المطہرۃ: 1/373)

اس واقعہ میں اس بات کی دلیل موجود ہے کہ اسلام ایک خاتون کو عزت واکرام کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اس کی سفارش کا اعتبار کرتا ہے اور خیر کا کام کرنے کے سلسلہ میں اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ (فقہ السیرۃ، البوطی، ص:226)

۱۳: اختلاف کے آداب:

اللہ کے رسول ﷺ نے جب یہ فرمایا کہ ''تم میں سے ہر ایک عصر کی نماز بنی قریظہ میں ہی پڑھے''۔ رسول اللہ ﷺ کے اس کلام کو سمجھنے میں صحابہ کرام کے مابین اختلاف ہوا۔ بعض نے اس سے یہ سمجھا کہ آپ ؐ کی مراد یہ ہے کہ نکلنے میں جلدی کرو۔ اس لئے انہوں نے عصر کی نماز اس وقت ادا کی جب عصر کا وقت ہوگیا۔ جب کہ بعض نے اس کے ظاہر پر عمل کیا اور انہوں نے عصر کی نماز بنو قریظہ میں جا کر ہی پڑھی۔ نبی کریم ﷺ نے ان میں سے کسی کو نہ غلط قرار دیا اور نہ ہی کسی کی سرزنش کی۔ اس میں شریعت کے ایک اہم اور عظیم اصول کی رہنمائی موجود ہے وہ یہ کہ فروعی مسائل میں اختلاف کے ضابطہ کا اعتبار کیا جائے گا اور اختلاف کرنے والوں کو معذور اور ماجور سمجھا جائے گا، اسی طرح اس میں شرعی احکام کے سلسلہ میں اجتہاد کے ضابطہ کا بھی ثبوت موجود ہے۔ (الصراع مع الیہود: 2/116)

فروعی مسائل میں اختلافات کو ختم کرنے کی کوشش شریعت کے بارے میں حکمتِ ربانی اور تدبیر الٰہی کے برخلاف ہے، علاوہ ازیں یہ ایک بے سود اور بے کار عمل ہے، اس لئے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایسے مسئلہ میں اختلاف کو سرے سے ختم کردیا جائے جس کی دلیل ظنی اور مختلف پہلوؤں کی حامل ہو، اگر اس کا امکان ہوتا کہ ایسے مسائل میں اختلافات کو سرے سے ختم کردیا جائے تو ایسا رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ہونا چاہیے تھا اور اگر کسی کے ہاں اختلاف نہ ہوتا تو صحابہ کرام کے ہاں اختلاف نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے مابین اختلاف ہوا۔

مذکورہ حدیث سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ جس نے کسی حدیثِ نبوی اور کتاب اللہ کی کسی آیت کے ظاہر کو اختیار کیا وہ قابلِ ملامت نہیں ہے، اسی طرح وہ شخص بھی قابل ملامت نہیں ہے جو کسی نص سے کوئی مخصوص معنی مستنبط کرے، اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ فروع میں اختلاف کرنے والے مجتہدین اور ان میں سے کسی سے اجتہاد کرنے میں غلطی ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے، چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے: ''جب کوئی فیصلہ کرنے والا کوئی فیصلہ کرے اور وہ اس میں اجتہاد کرے اور اس نے درست اجتہاد کیا تو اس کو دہرا اجر ملے گا، اور اگر اس نے فیصلہ کیا اور اجتہاد کیا اور اجتہاد کرنے میں غلطی کی تو اس کو ایک اجر ملے گا''۔ (صحیح بخاری: 7352، صحیح مسلم: 1716)

مذکورہ واقعہ میں بعض صحابہ کرام نے نبی کریم ﷺ کی طرف سے کی گئی ممانعت کو حقیقت پر معمول کیا اور نماز کا وقت نکل جانے کی کوئی پرواہ نہیں کی اور اس کو تاخیر صلاۃ کے بارے میں ایک استثنائی صورت سمجھا۔ (دیکھیں: فقہ السیرۃ، البوطی، ص:226)

علامہ ابن حجرؒ اس واقعہ پر تعلیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اس قصہ سے یہ استدلال کہ ہر مجتہد مطلقاً درست اور صحیح ہے یہ اس سے واضح نہیں ہوتا ہے، بلکہ اس میں صرف یہ بات ہے کہ جو بھی اجتہاد کرنے میں اپنی استطاعت کے بقدر کوشش کرے وہ قابل ملامت نہیں ہے، اس سے اس کے گناہگار نہ ہونے کی بات معلوم ہوتی ہے۔ اس قصہ میں جو کچھ ہوا وہ یہ ہے کہ بعض صحابہ کرام نے نص کو اس کے ظاہری مفہوم پر

محمول کیا اور نماز کا وقت نکلنے کی انہوں نے کوئی پرواہ نہیں کی۔ دوسری نہی کو انہوں نے پہلی نہی پر ترجیح دی۔ پہلی نہی سے مراد نماز کو اپنے وقت سے مؤخر کرنا ہے۔ انہوں نے نماز کو مؤخر کرنے کے سلسلہ میں یہ استدلال کیا کہ جو شخص اس طرح جنگی صورتحال سے دوچار ہو جیسے کہ خندق کے موقع پر صورتحال پیش آئی، اس کے لئے نماز کو مؤخر کرنا جائز ہے۔ جبکہ دوسرے گروہ نے اس کے ظاہری معنی کے بجائے اس پر محمول کیا کہ اس سے مراد بنو قریظہ کی طرف نکلنے میں جلدی کرنا اور ترغیب دینا ہے۔ جمہور علماء نے اس کے ذریعہ یہ استدلال کیا ہے کہ اجتہاد کرنے والا غلط اجتہاد کرنے کی صورت میں گنہگار نہیں ہوتا ہے۔ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے دونوں گروہوں میں سے کسی کی سرزنش نہیں کی، اگر اس میں گناہ ہوتا تو آپ گنہگار کی ضرور سرزنش کرتے۔ (دیکھیں: فتح الباری: 7/473، حدیث نمبر: 4119)

۱۴: بنو قریظہ کے مالِ غنیمت کی تقسیم اور حضرت ریحانہ بنت عمرو کا قبولِ اسلام:

ا: بنو قریظہ کے مالِ غنیمت کی تقسیم:

بنو قریظہ نے جو مالِ غنیمت پیچھے چھوڑا صحابہ کرام نے اسے جمع کیا، مالِ غنیمت کی تفصیل یہ ہے: پندرہ سو تلواریں، دو ہزار تیر، تین سو زرہیں، پندرہ سو ڈھالیں۔ اسی طرح بکریوں اور اونٹوں کی ایک بڑی تعداد، اور بہت سارا فرنیچر اور برتن۔ اسی طرح مسلمانوں کو وہاں پر شراب کے بہت سارے مٹکے بھی ملے۔ مالِ غنیمت یعنی اموالِ منقولہ، اسلحہ، فرنیچر وغیرہ کو ان انصار و مہاجر صحابہ میں تقسیم کیا گیا جو اس غزوہ میں شریک ہوئے۔ خُمس نکال کر بقیہ چار حصوں کو ان کے درمیان تقسیم کیا گیا؛ شہسوار کو تین حصے اور پیدل کو ایک حصہ دیا گیا۔ شہسوار کے لئے ایک حصہ اس کا اپنا اور دو حصے گھوڑوں کا۔ باقی پانچواں حصہ خمس اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لئے تھا، جیسے کہ کتاب اللہ میں متعین کیا گیا ہے۔

بنو قریظہ میں جو شراب ملی اس کو بہا کر ضائع کر دیا گیا، مسلمانوں میں سے کسی نے اس میں سے کچھ نہیں لیا اور نہ ہی اس سے کوئی فائدہ اٹھایا، رسول اللہ ﷺ نے حضرت سوید بن خلادؓ کے لئے بھی حصہ مقرر فرمایا جن کو ایک یہودی عورت نے چکی کے پاٹ کے ذریعہ شہید کیا تھا، ان کا حصہ ان کے وارثین کو دیا گیا۔ اور دوسرے صحابی کے لئے بھی حصہ متعین کیا جو بنو قریظہ کے محاصرہ کے دوران شہید ہوئے تھے۔ (دیکھیں: الیہود فی السنۃ المطہرہ: 1/375)

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے ان عورتوں کا بھی خیال رکھا جو اس غزوہ میں شریک تھیں، البتہ آپ ﷺ نے مالِ غنیمت میں ان کے لئے کوئی حصہ متعین نہیں کیا، وہ خواتین تھیں: حضرت صفیہ بنت عبد المطلب، حضرت اُم عمارہ، حضرت ام سلیط، حضرت ام العلاء، حضرت سمیراء بنت قیس، حضرت ام سعد بن معاذ۔ (دیکھیں: الصراع مع الیہود: 2/98)

اور جہاں تک تعلق ہے اموالِ غیر منقولہ کا جیسے اراضی، مکانات، رسول اللہ ﷺ نے اس طرح کے اموال انصار کے بجائے مہاجرین کو دیئے اور مہاجرین کو حکم دیا کہ انصار سے انہوں نے جو کھجور کے باغات اور زمینیں لی ہیں وہ ان کو واپس کر دیں، یہ باغات اور زمینیں ان کے پاس عاریۃً تھیں، ان کے پھلوں اور فصلوں سے وہ فائدہ اٹھاتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان اراضی اور مکانات کے بارے میں ارشاد فرمایا

ہے: ﴿وَأَوۡرَثَكُمۡ أَرۡضَهُمۡ وَدِيَٰرَهُمۡ وَأَمۡوَٰلَهُمۡ وَأَرۡضٗا لَّمۡ تَطَـُٔوهَاۚ وَكَانَ ٱللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيۡءٖ قَدِيرٗا﴾ ترجمہ: "اس نے تم کوان کی زمین اوران کے گھروں اوران کے اموال کاوارث بنادیااور وہ علاقہ تمہیں دیا جسے تم نے کبھی پامال نہ کیا تھا، اللہ ہر چیز پر قادر ہے"۔(سورۃالاحزاب:27)

خمس میں سے جو بچے اور عورتیں تھیں ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت سعد بن عبادہؓ کی نگرانی میں شام بھیج کران کے عوض ہتھیار اور گھوڑے خریدے تاکہ مسلمان ان کے ذریعہ اگلے معرکوں میں مدد حاصل کریں، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت سعد بن زیدؓ کو نجد کی جانب بھیجا، انہوں نے قیدیوں کو بیچ کر ہتھیار خرید لئے۔(دیکھیں الصراع مع الیہود: 2/98)

۲: حضرت ریحانہؓ کا قبولِ اسلام:

قیدیوں میں ایک خاتون ریحانہ بنت عمرو بن خناقہ تھیں جن کا تعلق بنو قریظہ کے قبیلہ بنو عمرو سے تھا، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چاہا کہ اگر وہ اسلام کو قبول کرتی ہیں تو آپؐ ان کے ساتھ نکاح کرلیں گے، لیکن وہ پس وپیش کا شکار ہوئیں اور کچھ وقت تک اپنے ہی دین پر برقرار رہیں، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کے سینہ کو اسلام کے لئے کھول دیااور انہوں نے اسلام قبول کرلیا۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو حضرت اُم منذر بنت قیس کے گھر بھیج دیا یہاں تک کہ وہ ماہواری کے بعد پاک ہوگئیں جس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے پاس تشریف لے گئے اوران کو اختیار دے دیا کہ یاتوان کو آزاد کرکے ان سے نکاح کریں گے یاپھر وہ آپؐ کی ملکیت میں رہیں گی۔انہوں نے اپنے لئے یہ پسند کیا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ملکیت میں رہیں گی۔(الصراع مع الیہود: 2/98)

۱۵: غزوۂ احزاب میں اسلامی میڈیا

غزوۂ احزاب کے موقع پر شعراء صحابہ کرام نے اپنا جہادی کردار ادا کیا، انہوں نے بہترین قصائد کہے جس میں انہوں نے مسلمانوں کے موقف کو واضح کیا، ان قصیدوں میں سے چند اشعار پیش کئے جارہے ہیں، حضرت کعب بن مالکؓ نے یہ اشعار کہے:

وَسائلَة تُسائل ما لَقِينا ··· ولَو شهدت رَأَتْنا صابرينا
صبرنَا لَا نرَى لله عَدْلًا ... على مَا نابنا متَوكّلينا
وَكَانَ لَنَا النَّبِيُّ وزير صدْق ··· به نَعْلُو الْبَرِيَّة أَجْمعينا
نقاتل معشرا ظَلموا وعقُّوا ··· وَكَانُوا بالْعداوة مرصدينا

ترجمہ: "ہمیں لاحق ہونے والی آزمائش کے بارے میں ایک پوچھنے والی دریافت کرتی ہے اوراگر وہ میدانِ کارزار میں موجود ہوتی تو ہمارے صبر کرنے والوں کا مشاہدہ کرتی۔ ہم نے لاحق ہونے والی تکلیف ومصیبت میں اللہ پر توکل اور بھروسہ کرتے ہوئے صبر کیا۔ ہم اللہ کے مقابلہ میں کسی اور کو ہمسر ومدمقابل نہیں سمجھتے ہیں۔ نبی ہمارے لئے بہترین اور سچے مددگار ومعاون تھے۔انہی کے ذریعہ ہم تمام دنیا پر سربلند ہوتے ہیں۔ ہم ایسے گروہ کے ساتھ جنگ کرتے ہیں جنہوں نے ظلم وزیادتی کی اور رشتوں اور قرابت کو پامال کیا اور وہ ہمارے ساتھ عداوت ودشمنی کرنے میں گھات میں لگے ہوئے تھے۔

اس کے بعد کہتے ہیں:

لَنَنْصُرُ أَحمدًا واللّه حتّى ··· نَكُونَ عِبَادَ صِدْقٍ مُخْلِصِينَا
وَيَعْلَمَ أَهْلُ مَكَّةَ حِينَ سَارُوا ··· وَأَحْزَابٌ أَتَوْا مُتَحَزِّبِينَا
بِأَنَّ اللّهَ لَيسَ لَهُ شَرِيكٌ ··· وأَنَّ اللّهَ مولَى الْمؤمنينا
فإمَّا تقتلوا سعدًا سفاهًا ··· فإنَّ اللّه خير الْقادرينا
سيدخله جنانًا طيبات ··· تكون مقامة للصَّالحينا
كما قد ردَّكم فلًّا شريدًا ··· بغيظكم خزايا خائبينا
خزايا لم تنالوا ثمَّ خيرًا ··· وكدتم أن تكونوا دامرينا
بريحٍ عاصف هبَّت عليكم ··· فكنتم تحتها متكمهينا

ترجمہ: ”ہم اللہ اور احمد ﷺ کی نصرت و مدد کریں گے یہاں تک کہ ہم سچے اور مخلص بندے بن جائیں۔ اہل مکہ اور وہ تمام گروہ اور لشکر جانتے ہیں جب کہ وہ یکجا ہو کر ہمارے خلاف صف آرا ہو گئے کہ اللہ کا کوئی شریک و سہیم نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کا مولی اور کارساز ہے۔ اگر تم نے سعدؓ کو بیوقوفی میں شہید کر دیا ہے تو اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے۔ وہ ان کو بہترین باغات اور جنتوں میں داخل کرے گا جو صالح اور نیک لوگوں کا مقام ہے۔

جیسے کہ اس نے تم کو منتشر کر کے بھاگنے پر مجبور کر دیا، اس حال میں کہ تم غصے سے دانت پیس رہے تھے اور رسوا اور نامراد ہو کر واپس جا رہے تھے۔ تم ذلیل و خوار ہوئے وہاں تم کو کوئی خیر نصیب نہ ہو سکا، حالانکہ تم نے یہ منصوبہ بندی کی تھی کہ تم ہم کو نیست و نابود کر دو گے۔ لیکن رب نے تم کو ایسی آندھی لا کر بھاگنے پر مجبور کر دیا جس کی وجہ سے تم کو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا اور تم اندھے بن گئے تھے“۔

حضرت کعب بن مالکؓ نے ایک طویل قصیدہ کہا ہے جس میں انہوں نے عبداللہ زبعری کو جواب دیا ہے، اس میں فرماتے ہیں:

جاءت سخينة كي تغالب ربَّها ··· فليغلبنَّ مغالب الْغلَّاب

ترجمہ: ”قریش کے لوگ اپنے رب کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لئے آئے، غالب ہونے والی ذات سے مقابلہ کرنے والا مغلوب ہو کر رہے گا“۔

ابن ہشام کہتے ہیں: مجھ سے اس شخص نے بیان کیا جس پر مجھے اعتماد اور بھروسہ ہے، وہ فرماتے ہیں: مجھ سے عبدالملک بن یحیی بن عباد بن عبداللہ بن زبیرؓ نے بیان کیا، فرماتے ہیں: جب کعب بن مالکؓ نے یہ شعر کہا:

جاءت سخينة كي تغالب ربَّها ··· فليغلبنَّ مغالب الْغلَّاب

ترجمہ: ”قریش کے لوگ اپنے رب کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لئے آئے، غالب ہونے والی ذات سے مقابلہ کرنے والا مغلوب ہو کر رہے گا“۔

یہ سن کر اُن سے رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا: اے کعب! اللہ کو آپ کا یہ قول بہت پسند آیا۔ (سیرت ابن ہشام: 3/273)

....

بارہویں فصل

غزوۂ احزاب اور صلح حدیبیہ کے مابین کے اہم واقعات

پہلا باب

حضرت زینب بنت جحشؓ کے ساتھ نبی کریم ﷺ کا نکاح

عسکری تحریک اور ریاست کی تعمیر کے ساتھ ساتھ اور جزیرۃ العرب میں اس کے اثر و نفوذ کو بڑھانے کے ساتھ ساتھ امت مسلمہ کے لئے تشریعی (قانون سازی) اور معاشرتی تعمیر کی تحریک بھی اپنی تکمیل کو پہنچ رہی تھی، تبنّی (منہ بولا بیٹا) بنانے کا نظام ختم کیا جاتا ہے، حجاب فرض ہوتا ہے، ولیموں اور دعوتوں کے آداب مقرر کئے جاتے ہیں، اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کے لزوم اور وجوب کو مؤکد کیا جاتا ہے اور شریعت کے معارض رسم و رواج کے خلاف جنگ چھیڑی جاتی ہے، چنانچہ سیدہ زینب بنت جحشؓ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے نکاح میں بہت سی حکمتیں اور دروس پوشیدہ ہیں جو مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ ہمیشہ باقی رہیں گے، مندرجہ ذیل سطور میں ام المؤمنین حضرت زینب بنت جحشؓ کے حالات و واقعات ذکر کئے جاتے ہیں:

ا: نام اور نسب:

آپؓ حضرت عبداللہؓ بن جحش اور حضرت حمنہؓ بنت جحش کی بہن ہیں، آپؓ کا نام زینب بنت جحش بن رئاب بن یعمر اسدیہ ہے۔

آپؓ کی والدہ اُمیمہ بنت عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی اور حضرت حمزہ بن عبدالمطلبؓ کی بہن ہیں۔(دیکھیں: الاستیعاب فی معرفۃ الأصحاب، ابن عبدالبر: 1/372)

بیان کیا جاتا ہے کہ آپؓ کا نام برّہ تھا اور آپ ﷺ نے پھر ان کا نام زینب رکھا، ان کی کنیت ام الحکم ہے۔(أیضاً: 4/1849)

حضرت زینبؓ ہجرت کرنے والی اولین خواتین میں سے ہیں، انتہائی پاک باز، روزہ دار، تہجد گزار اور بہت زیادہ صدقہ کرنے والی اور خیر کے کام کرنے والی خاتون تھیں، ام المؤمنین حضرت عائشہؓ سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں مجھ سے سب سے زیادہ جلدی وہ ملے گی جس کا ہاتھ لمبا ہوگا۔ فرماتی ہیں: وہ سب مقابلہ کرتی تھیں کہ ان میں سے کون سی سب سے زیادہ لمبے ہاتھوں والی ہے۔ فرماتی ہیں: ہم میں سب سے زیادہ لمبے ہاتھوں والی زینب تھیں۔ وہ اپنے ہاتھ سے کام کرتی تھیں اور صدقہ کرتی تھیں۔(صحیح بخاری: 1420، صحیح مسلم: 2452)

سیدہ عائشہؓ نے ان کی بہت تعریف کی ہے، ان کے حق میں انہوں نے کہا ہے: میں نے کوئی عورت زینب سے زیادہ دیندار، زیادہ پرہیزگار، زیادہ راست گفتار، زیادہ صلہ رحمی کرنے والی، زیادہ فیاض، مخیر اور خدا کی رضاجوئی میں زیادہ سرگرم نہیں دیکھی، صرف مزاج میں تیزی تھی جس پر ان کو بہت زیادہ ندامت ہوتی تھی۔ (صحیح مسلم: 2442، سنن نسائی: 7/64-66، قضایا نساء النبی والمؤمنات، حفصہ بنت عثمان الخلیفی، ص: 205)

۲: حضرت زید بن حارثہؓ کے ساتھ آپؓ کا نکاح:

اللہ کے رسول ﷺ نے یہ چاہا کہ امتِ مسلمہ میں موروثی و طبقاتی اور تمام جاہلی عادات اور فوارق کو ختم کر دیں، تاکہ تمام انسان کنگھے کے دانتوں کی طرح برابر ہو جائیں اور تقویٰ کے سوا کسی اور چیز کی بنیاد پر کسی کو کسی پر کوئی فضیلت نہ ہو، اس زمانہ میں غلاموں کو

سرداروں کے طبقہ کے مقابلہ میں کمتر طبقہ سمجھا جاتا ہے، انہی غلاموں میں رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہؓ بھی تھے جن کو آپؐ نے متبنّیٰ (منہ بولا بیٹا) بنالیا تھا، اللہ کے رسول ﷺ نے مناسب سمجھا کہ حضرت زیدؓ کا نکاح بنو اُسد کی ایک معزز خاتون کے ساتھ کر دیں اور وہ تھی آپؐ کی پھوپھی زاد بہن زینب بنت جحشؓ۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ بذاتِ خود اپنے خاندان کے طبقاتی فوارق کو کالعدم قرار دیں، یہ رسم و رواج اور فوارق اتنے گہرے اور سخت تھے کہ ان کو رسول اللہ ﷺ کی طرف سے عملی اقدام ہی ختم کر سکتا تھا تاکہ امتِ مسلمہ اس کے ذریعہ آپؐ کا اسوہ اختیار کر سکے اور پوری انسانیت اسی راستے پر چل کر آگے کا سفر جاری رکھ سکے، شاید اس نکاح کی ایک حکمت یہ بھی تھی کہ یہ ایک دوسرے قانون اور ضابطہ کی تمہید بن سکے جو معاشرہ کو متوازن بنانے اور خاندان کو محفوظ رکھنے میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے، اگرچہ ابتدائی مرحلہ میں اس حکمت کا ظہور نہیں ہوا۔ (دیکھیں: قضایا نساء النبی والمؤمنات، حفصہ بنت عثمان الخلیفی، ص: 205)

اللہ کے رسول ﷺ تشریف لے گئے تاکہ زید بن حارثہؓ کے بارے میں ان کو پیغامِ نکاح دیں، چنانچہ آپ ﷺ زینب بنت جحش اُسدیہؓ کے پاس داخل ہوئے، آپؐ نے ان کو پیغامِ نکاح دیا تو انہوں نے فرمایا: میں ان کے ساتھ نکاح نہیں کر سکتی، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: کیوں نہیں؟ ان سے نکاح کر لو، انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ! کیا میں اپنے بارے میں مشورہ کروں؟ اسی دوران کہ یہ گفتگو جاری تھی اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی: ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى ٱللَّهُ وَرَسُولُهُۥٓ أَمْرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ ٱلْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ۗ وَمَن يَعْصِ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَٰلًا مُّبِينًا﴾ ترجمہ: ''کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسولؐ کسی معاملہ کا فیصلہ کر دے تو پھر اسے اپنے اُس معاملہ ہمیں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے تو وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا''۔ (سورۂ اُحزاب: 36)

ان آیات کے نزول کے بعد انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! کیا آپ انہیں میرے لئے شوہر کی حیثیت سے پسند کرتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں، انہوں نے کہا: میں رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی نہیں کر سکتی ہوں۔ میں نے اپنے آپ کو ان کی زوجیت میں دے دیا۔ (تفسیر طبری: 22/11، الدر المنثور: 5/609)

حضرت زید بن حارثہؓ کو اس وقت تک زید بن محمدؐ ہی کہا جاتا تھا۔ حضرت زیدؓ نے حضرت زینبؓ کے ساتھ نکاح کر لیا اور نکاح میں مہر کے طور پر یہ چیزیں دیں: دس دینار، ساٹھ درہم، ایک چادر، لحاف، زرہ، پچاس مد غلّہ، دس مد کھجور۔ (تفسیر ابن کثیر 3/489)

۳: حضرت زینبؓ کو زیدؓ کی طلاق:

اللہ کی مشیت کا تقاضا یہ ہوا کہ حضرت زیدؓ اور حضرت زینبؓ کے ازدواجی تعلق میں ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکی اور زوجین کی زندگی برداشت سے باہر ہو گئی، یہاں تک کہ زیدؓ نے اپنی شریکِ حیات زینبؓ کو طلاق دینے کا پختہ ارادہ کر لیا، اس سے پہلے وہ رسول اللہ ﷺ سے زینبؓ کے ساتھ زندگی نہ گزار سکنے کی شکایت کر چکے تھے لیکن رسول اللہ ﷺ ان کو یہ حکم دے چکے تھے کہ ان کے بارے میں اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور ان کو اپنی زوجیت میں رکھو، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے طلاق کی اجازت دے دی اور حضرت زیدؓ نے طلاق دے دی اور تقریباً

ایک سال کی مدت ایک ساتھ گزارنے کے بعدان کے مابین جدائی ہو گئی۔ابن کثیرؒ فرماتے ہیں: وہ ان کے پاس تقریباً ایک سال یا اس سے زائد مدت تک رہیں، اس کے بعد ان کے مابین اختلاف ہو گیا اور زیدؓ رسول اللہ ﷺ کے پاس شکایت لے کر آئے اور رسول اللہ ﷺ ان سے فرماتے رہے اپنی زوجہ کو اپنی زوجیت میں رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔(مسند أحمد: 3/150، سنن ترمذی: 3212)

زیدؓ کو زینبؓ کے ساتھ ازدواجی تعلقات برقرار رکھنے کی کوئی رغبت باقی نہیں رہی، اس لئے کہ وہ شریف النفس تھے، ان کو یہ بات پسند نہیں تھی کہ دوسروں کو پریشان کر کے اور ان کو نقصان پہنچا کر اپنی خوشیوں کی عمارت تعمیر کریں، اس لئے انہوں نے جدائی اختیار کرنے اور ان کو پریشان نہ کرنے کا عزم مصمّم کیا، اس لئے کہ زینبؓ قلق واضطراب اور پریشانی کے ساتھ زندگی کے روز و شب گزار رہی تھیں، حضرت زید بن حارثہؓ اور حضرت زینب بنت جحشؓ کے ازدواجی تعلقات اس صورتحال تک پہنچ گئے، لیکن اس میں کسی بھی خارجی عامل کا کوئی عمل دخل نہیں تھا، اور یہ طلاق صرف ان کے اپنے اختیار اور ارادہ کی بنیاد پر ہوئی، رسول ﷺ ان کو اس سے منع فرماتے تھے اور اپنی زوجہ کو اپنی زوجیت میں رکھنے اور ان کے بارے میں اللہ کا تقوی اختیار کرنے کا مشورہ دے چکے تھے۔(دیکھیں: قضایا نساء النبی والمؤمنات، ص:209)

ابن کثیرؒ اس سب کا ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں: ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے بعض سلف سے کچھ آثار واقوال نقل کئے ہیں، ہم نے مناسب سمجھا کہ ہم ان سے صرفِ نظر کریں، اس لئے کہ وہ صحیح نہیں ہیں، اس لئے ان کو نقل کرنے سے ہم گریز کرتے ہیں۔(تفسیر ابن کثیر: 3/491)

۴: حضرت زینبؓ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے نکاح کرنے کی حکمت:

لوگوں کے دلوں میں متبنّی بنانے کی عادت رچی بسی ہوئی تھی اور اس پر کنٹرول حاصل کرنا اور لوگوں کے دلوں سے اس کو نکالنا کوئی آسان کام نہیں تھا، اسی طرح اس پر مرتب ہونے والے اثرات ونتائج کو کالعدم قرار دینا بھی کوئی آسان بات نہیں تھی، اسلام کے ابتدائی دور میں مکہ مکرمہ میں اور پھر مدینہ کی جانب ہجرت کرنے کے بعد ابتدائی مرحلہ میں یہ عادت رائج تھی، اس کے بعد اللہ کی مشیت یہ ہوئی کہ ایسی آیات نازل ہوئیں جن کے ذریعہ اس بات کی نفی کی گئی کہ منہ بولے بیٹے دعوی کرنے والوں کے حقیقی بیٹے اور اولاد نہیں ہو سکتے ہیں اور دعوی سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے، اور اس کے ذریعہ اصل حقیقت میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿مَّا جَعَلَ ٱللَّهُ لِرَجُلٍ مِّن قَلْبَيْنِ فِي جَوْفِهِۦۚ وَمَا جَعَلَ أَزْوَٰجَكُمُ ٱلَّٰٓـِٔي تُظَٰهِرُونَ مِنْهُنَّ أُمَّهَٰتِكُمْۚ وَمَا جَعَلَ أَدْعِيَآءَكُمْ أَبْنَآءَكُمْۚ ذَٰلِكُمْ قَوْلُكُم بِأَفْوَٰهِكُمْۖ وَٱللَّهُ يَقُولُ ٱلْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي ٱلسَّبِيلَ﴾ ترجمہ:"اللہ نے کسی شخص کے دھڑ میں دو دِل نہیں رکھے ہیں، نہ اس نے تم لوگوں کی اُن بیویوں کو جن سے تم ظہار کرتے ہو تمہاری ماں بنا دیا ہے، اور نہ اس نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا حقیقی بیٹا بنایا ہے، یہ تو وہ باتیں ہیں جو تم لوگ اپنے منہ سے نکال دیتے ہو، مگر اللہ وہ بات کہتا ہے جو مبنی بر حقیقت ہے اور وہی صحیح طریقہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے"۔(سورۃ الأحزاب: 4)

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ان کو حقیقی آباء کی طرف منسوب کیا جائے، یہی عدل وانصاف اور نیکی کا تقاضا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ٱدۡعُوهُمۡ لِأٓبَآئِهِمۡ هُوَ أَقۡسَطُ عِندَ ٱللَّهِۚ فَإِن لَّمۡ تَعۡلَمُوٓاْ ءَابَآءَهُمۡ فَإِخۡوَٰنُكُمۡ فِي ٱلدِّينِ وَمَوَٰلِيكُمۡۚ وَلَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٞ فِيمَآ أَخۡطَأۡتُم بِهِۦ وَلَٰكِن مَّا تَعَمَّدَتۡ قُلُوبُكُمۡۚ وَكَانَ ٱللَّهُ غَفُورٗا رَّحِيمًا﴾ ترجمہ: ”منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو، یہ اللہ کے نزدیک زیادہ منصفانہ بات ہے اور اگر تمہیں معلوم نہ ہو کہ ان کے باپ کون ہیں تو وہ تمہارے دینی بھائی اور رفیق ہیں، نادانستہ جو بات تم کہو اس کے لئے تم پر کوئی گرفت نہیں ہے، لیکن اُس بات پر ضرور گرفت ہے جس کا تم دل سے ارادہ کرو، اللہ در گزر کرنے والا اور رحیم ہے“۔(سورۃ الأحزاب: 5)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہؓ کو ہم زید بن محمدؐ ہی کے نام سے پکارتے تھے یہاں تک کہ قرآن کا یہ حکم نازل ہوا: ﴿ٱدۡعُوهُمۡ لِأٓبَآئِهِمۡ هُوَ أَقۡسَطُ عِندَ ٱللَّهِ﴾(سنن ترمذی: 3209)

اگر ان کے حقیقی ماں باپ کا علم نہ ہو تب بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو متبنّٰی بنانے کو جائز قرار نہیں دیا، بلکہ اس حالت میں بھی متبنّٰی بنانے کو حرام قرار دیا اور واضح کر دیا کہ وہ ان کے بھائی اور موالی ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ٱدۡعُوهُمۡ لِأٓبَآئِهِمۡ هُوَ أَقۡسَطُ عِندَ ٱللَّهِۚ فَإِن لَّمۡ تَعۡلَمُوٓاْ ءَابَآءَهُمۡ فَإِخۡوَٰنُكُمۡ فِي ٱلدِّينِ وَمَوَٰلِيكُمۡۚ وَلَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٞ فِيمَآ أَخۡطَأۡتُم بِهِۦ وَلَٰكِن مَّا تَعَمَّدَتۡ قُلُوبُكُمۡۚ وَكَانَ ٱللَّهُ غَفُورٗا رَّحِيمًا﴾ ترجمہ: ”منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو، یہ اللہ کے نزدیک زیادہ منصفانہ بات ہے اور اگر تمہیں معلوم نہ ہو کہ ان کے باپ کون ہیں تو وہ تمہارے دینی بھائی اور رفیق ہیں، نادانستہ جو بات تم کہو اس کے لئے تم پر کوئی گرفت نہیں ہے، لیکن اُس بات پر ضرور گرفت ہے جس کا تم دل سے ارادہ کرو، اللہ در گزر کرنے والا اور رحیم ہے“۔ (سورۃ الأحزاب: 5)

اس اخوت اور موالات کی بہت زیادہ اہمیت ہے، یہ ان کے حق میں بھی ثابت ہے جن کے آباء معروف ہیں، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے زید بن حارثہؓ سے فرمایا: تم ہمارے بھائی اور ہمارے مولیٰ ہو۔(مسند أحمد: 1/98، 115، صحیح بخاری: 2699) جیسے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّمَا ٱلۡمُؤۡمِنُونَ إِخۡوَةٞ فَأَصۡلِحُواْ بَيۡنَ أَخَوَيۡكُمۡۚ وَٱتَّقُواْ ٱللَّهَ لَعَلَّكُمۡ تُرۡحَمُونَ﴾ ترجمہ: ”مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں، لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو اور اللہ سے ڈرو، امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا“۔(سورۃ الحجرات: 10)

بعض دوسرے نصوص و دلائل میں اس معاملہ کا دوسرے پہلو کے اعتبار سے علاج کیا گیا ہے اور وہ ہے اولاد کی طرف سے نسبت کا مسئلہ، چنانچہ حقیقی باپ کے علاوہ اور کسی کی جانب نسبت کرنے کو حرام قرار دیا گیا ہے اور یہ قطعی طور پر حرام ہے جس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔(دیکھیں: قضایا نساء النبي والمؤمنات، ص: 189)

آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس نے اپنے باپ کے علاوہ کسی اور کا بیٹا ہونے کا دعوی کیا یا اپنے موالی کے علاوہ کسی اور کی جانب نسبت کی تو اس پر اللہ کی، فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے، اللہ تعالیٰ اس کے کسی فرض یا نفل کو قبول نہیں کرے گا''۔ (صحیح بخاری: 1870، صحیح مسلم: 1370)

شارع نے نسب کے وجود میں آنے کا ایک واضح سبب متعین کیا ہے اور وہ ہے نکاح کے بعد عورت کے ساتھ ازدواجی تعلق یا پھر ملکِ یمین۔ اور اس کے علاوہ بدکاری اور زنا کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی اولاد کو کسی کی طرح منسوب کرنے کو باطل اور کالعدم قرار دیا، جیسے کہ زمانۂ جاہلیت میں رائج تھا۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''بچہ اسی کا ہوتا ہے جو جائز شوہر یا مالک ہو، جس کے بستر پر وہ پیدا ہوا ہو، اور حرام کار کے حصہ میں پتھروں کی سزا ہے''۔ (صحیح بخاری: 6818 صحیح مسلم: 1458)

متبنّٰی بنانے کی رسم لوگوں کے دلوں میں مستحکم اور پیوست تھی اور مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اس کی جڑیں مضبوط تر ہو گئیں تھیں، اس لئے سیدہ زینبؓ کے ساتھ نبی کریم ﷺ کا نکاح اس کو صرف ذہنی اور تصوراتی طور پر کالعدم قرار دینا نہیں تھا بلکہ عملی طور پر اس کا نمونہ پیش کر کے اس کو کالعدم قرار دیا گیا۔ (من معین السیرۃ: ص: 31)

سیدہ زینبؓ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے نکاح کرنے میں جو حکمت تھی وہ بالکل واضح اور ظاہر تھی جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں بیان کیا ہے: ﴿لِكَيْ لَا يَكُونَ عَلَى ٱلْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِيٓ أَزْوَٰجِ أَدْعِيَآئِهِمْ إِذَا قَضَوْاْ مِنْهُنَّ وَطَرًاۚ﴾ ترجمہ: ''تاکہ مؤمنوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے معاملہ میں کوئی تنگی نہ رہے جبکہ وہ ان سے اپنی حاجت پوری کر چکے ہوں''۔ (سورۃ الاحزاب: 37)

اہلِ باطل کفار، ان کے دیئے ہوئے انڈے بچوں اور مقلدین نے بے سروپا باتیں ذکر کی ہیں اور جاہل لوگ بعض جھوٹی روایات کو بیان کرتے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے- جیسے کہ وہ افتراء اندازی کرتے ہیں-: نبی کریم ﷺ کو زینب بنت جحشؓ سے محبت ہو گئی جبکہ ان کی شادی زید بن حارثہؓ سے ہو گئی، جب زیدؓ کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے ان کو طلاق دینے کا ارادہ کیا تاکہ نبی ﷺ ان سے نکاح کر لیں۔ یہ سراسر باطل اور بے بنیاد قول ہے۔ (دیکھیں: المفصل فی أحکام المرأۃ، عبدالکریم زیدان: 11/474)

امام ابن العربیؒ نے اس قول کو جڑوں سے ہی اکھاڑ پھینکا ہے، وہ رقمطراز ہیں: تمہارا یہ قول کہ ''نبی ﷺ نے ان -یعنی زینب بنت جحشؓ- کو دیکھا تو آپ ﷺ کے دل میں ان کی محبت پیدا ہو گئی''۔ یہ قول باطل اور بے بنیاد ہے، اس لئے کہ آپ ﷺ ہر وقت اور ہر جگہ ان کے ساتھ ہوتے تھے اور اس وقت حجاب کا بھی حکم نہیں تھا، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ آپؐ کے ساتھ رہتے ہوئے پروان چڑھیں اور آپؐ ان کے ساتھ رہتے ہیں، ہر وقت آپؐ ان کو دیکھتے رہیں اور اس وقت آپؐ کے دل میں ان کی محبت پیدا ہو جبکہ ان کا شوہر موجود ہو؟! اس پاکیزہ قلب مبارک میں اس طرح کے غلط جذبات کے بارے میں حاشا وکلا، اللہ کی پناہ! حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِۦٓ أَزْوَٰجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِۚ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ﴾ ترجمہ: ''اور نگاہ اٹھا کر

بھی نہ دیکھو دُنیوی زندگی کی اُس شان و شوکت کو جو ہم نے اِن میں سے مختلف قسم کے لوگوں کو دے رکھی ہے، وہ تو ہم نے انہیں آزمائش میں ڈالنے کے لئے دی ہے، اور تیرے رب کا دیا ہوا رزق حلال ہی بہتر اور پائندہ تر ہے"۔ (سورۂ طٰہٰ: 131)

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا یہ قول: ﴿وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا ٱللَّهُ مُبْدِيهِ﴾ اس سے نکاح مراد ہے اور اسی کا اللہ تعالیٰ نے اظہار کیا ہے، اس کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے، لہذا رسول اللہ ﷺ جس چیز کو مخفی رکھے ہوئے تھے اگر وہ زینبؓ کی محبت ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس کو ضرور ظاہر کرتا، اس لئے یہ بات یقینی ہے کہ رسول اللہ ﷺ زینبؓ کے بارے میں جو چیز مخفی رکھے ہوئے تھے وہ نکاح کی بات تھی، نہ کہ وہ جس کا اہلِ باطل دعوی کرتے ہیں۔ (أحکام القرآن، ابن العربی: 1531:1532)

شریعت مطہرہ نے متبنّی بنانے کے نظام کو کالعدم قرار دیا، اس کے تمام نتائج واثرات کو باطل قرار دیا اور اس نظام کے خاتمہ کو دلوں کے اندر راسخ کر دیا اور عملی تنفیذ و تطبیق اور عملی نمونہ کے ذریعہ اس پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی، یہی وہ چیز ہے جس کو رسول اللہ ﷺ نے اللہ کے حکم سے حضرت زینبؓ کے ساتھ نکاح کر کے عملی طور پر کر کے دکھایا۔ (دیکھیں: المفصل فی أحکام المرأة: 11/476)

۵: رسول اللہ ﷺ کے ساتھ زینبؓ کا نکاح اور اس میں موجود اسباق و دروس:

جب حضرت زینبؓ کی عدت پوری ہو گئی تو رسول اللہ ﷺ نے زیدؓ سے فرمایا: جاؤ اور ان کو میرا پیغامِ نکاح دے دو! حضرت زیدؓ ان کے پاس پہنچے تو وہ آٹا گوندنے میں مصروف تھیں۔ فرماتے ہیں: جب میں نے ان کو دیکھا تو میرے دل میں ان کی اس قدر عظمت بیٹھ گئی یہاں تک کہ میں ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ نہیں سکتا تھا، اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کا ذکر کیا تھا، اس لئے میں نے ان کی جانب اپنی پیٹھ کی اور الٹے پاؤں چلنے لگا اور میں نے کہا: اے زینب! خوشخبری سن لیں، رسول اللہ ﷺ کا پیغامِ نکاح لایا ہوں۔ حضرت زینبؓ نے جواب دیا: میں اپنے رب کے ساتھ مشورہ کئے بغیر کوئی رائے قائم نہیں کر سکتی ہوں۔ یہ کہہ کر مصلی پر کھڑی ہو گئیں، اس کے بعد اس سلسلہ میں قرآن نازل ہوا اور رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور بغیر اجازت کے حضرت زینبؓ کے گھر اندر چلے گئے۔ (مسند احمد: 3/195، صحیح مسلم: 1428، سنن نسائی: 6/79)

آپ ﷺ نے چار سو درہم بطور مہر ان کو ادا کئے، مشہور قول کے مطابق آپ ﷺ کا نکاح حضرت زینبؓ کے ساتھ سن پانچ ہجری میں ہوا۔ حافظ بیہقیؒ فرماتے ہیں: غزوۂ بنی قریظہ کے بعد آپ ﷺ نے ان کے ساتھ نکاح کیا۔ (دیکھیں: البدایہ والنہایہ: 4/147)

اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت زینبؓ کے ساتھ شادی کے موقع پر ایک بڑا ولیمہ کیا جس میں ایک بکری ذبح کی اور اس ولیمہ میں ہر اس شخص کو دعوت دی گئی جو بھی حضرت انسؓ کو ملا، اس لئے کہ آپ ﷺ نے ان کو دعوت دینے کے لئے بھیجا تھا۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو اپنی ازواج میں سے کسی کے لئے ایسا ولیمہ کرتے ہوئے نہیں دیکھا جیسا کہ حضرت زینبؓ کا ولیمہ کیا، آپؐ نے ایک بکری کا ولیمہ کیا۔ (صحیح بخاری: 5168، صحیح مسلم: 1428)

اس طرح سے رسول اللہ ﷺ نے اپنے رب کے حکم سے حضرت زینبؓ کے ساتھ حضرت زیدؓ کے طلاق دینے اور عدت مکمل ہونے کے بعد نکاح فرمایا۔ حضرت زینبؓ کے ساتھ آپ ﷺ کے نکاح کرنے میں اور اس سلسلہ میں نازل ہونے والے قرآن اور اس سے متعلق واقعات میں اسباق و دروس اور عبرتیں موجود ہیں، ان میں سے بعض مندرجہ ذیل سطور میں ذکر کی جاتی ہیں:

ا: حضرت زینبؓ کو رسول اللہ ﷺ کا پیغام نکاح دینے والے ان کے پہلے شوہر زید بن حارثہؓ تھے۔ حضرت زیدؓ کا انتخاب رسول اللہ ﷺ کے نزدیک مقصود بالذات تھا تاکہ اس کے ذریعہ باتیں کرنے والوں کی زبانوں کو بند کر دیا جائے جو یہ سمجھتے تھے کہ انہوں نے اپنے اختیار سے طلاق نہیں دی ہے اور ان کے دل میں حضرت زینبؓ کے ساتھ رہنے کی رغبت و چاہت موجود تھی، اس سلسلہ میں ابن حجرؒ فرماتے ہیں: "یہ سب سے زیادہ مؤثر اور نتیجہ خیز عمل تھا کہ ان کے پہلے شوہر ہی نکاح کا پیغام دینے والے ہوں، تاکہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ ان کی رضامندی کے بغیر زبردستی ہوا، اس کے ذریعہ ان کا امتحان بھی مقصود تھا کہ آیا ان کے دل میں اس سلسلہ میں کیا ہے"۔ (فتح الباری، ابن حجر: 8/524)

اس میں یہ سبق بھی موجود ہے کہ زوجین کے مابین اگر نفرت واختلاف پیدا ہو اور پھر طلاق کی نوبت بھی آجائے تو یہ بات درست نہیں ہے کہ یہ چیز زوجین کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ خیر خواہی کرنے میں مانع بن جائے اور وہ اخوت ایمانی کے تقاضے پورے کرنے سے گریز کریں۔ حضرت زیدؓ اور حضرت زینبؓ کے مابین جو کچھ صورتحال پیش آئی، اگرچہ اس میں اصل سبب حضرت زینبؓ تھیں لیکن اس کے باوجود حضرت زیدؓ ان کے پاس پیغام نکاح لے کر جاتے ہیں، بلکہ ان سے کہتے ہیں: اے زینب! خوشخبری سن لو!

اس نکاح کے سلسلہ میں جو آیت نازل ہوئی اس میں نبی کریم ﷺ کو رب کی طرف سے عتاب کیا گیا ہے، اس لئے کہ آپ ﷺ کے پاس جب حضرت زیدؓ حضرت زینبؓ کی شکایت لے کر آتے تھے اور ان کے طرزِ عمل کی بات کہتے تھے اور طلاق دینے کی بات کرتے تھے تو آپ ﷺ فرماتے تھے: اپنی زوجہ کو نہ چھوڑو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں: حضرت زید بن حارثہؓ شکایت کرتے ہوئے آئے تو رسول اللہ ﷺ فرمانے لگے: اللہ سے ڈرو اور اپنی زوجہ کو نہ چھوڑو۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں: اگر رسول اللہ ﷺ وحی میں سے کچھ چھپاتے تو اس آیت کو چھپاتے۔ (صحیح بخاری: 7420)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے فرماتی ہیں: اگر محمد ﷺ اس میں سے کچھ چھپاتے جو آپ پر نازل کیا گیا تو اس آیت کو چھپاتے: ﴿وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِيٓ أَنۡعَمَ ٱللَّهُ عَلَيۡهِ وَأَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِ أَمۡسِكۡ عَلَيۡكَ زَوۡجَكَ وَٱتَّقِ ٱللَّهَ وَتُخۡفِي فِي نَفۡسِكَ مَا ٱللَّهُ مُبۡدِيهِ وَتَخۡشَى ٱلنَّاسَ وَٱللَّهُ أَحَقُّ أَن تَخۡشَىٰهُۖ﴾ ترجمہ: " اے نبیؐ، یاد کرو وہ موقع جب تم اس شخص سے کہہ رہے تھے جس پر اللہ نے اور تم نے احسان کیا تھا کہ "اپنی بیوی کو نہ چھوڑ اور اللہ سے ڈر" اُس وقت تم اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جسے اللہ کھولنا چاہتا تھا، تم لوگوں سے ڈر رہے تھے، حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حقدار ہے کہ تم اس سے ڈرو"۔ (سورۃ الاحزاب: 37) (مسند أحمد: 6/241، صحیح مسلم: 177/288، سنن ترمذی: 3208)

۳: اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں: ﴿وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِىٓ أَنْعَمَ ٱللَّهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَٱتَّقِ ٱللَّهَ وَتُخْفِى فِى نَفْسِكَ مَا ٱللَّهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى ٱلنَّاسَ وَٱللَّهُ أَحَقُّ أَن تَخْشَىٰهُ فَلَمَّا قَضَىٰ زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنَٰكَهَا لِكَىْ لَا يَكُونَ عَلَى ٱلْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِىٓ أَزْوَٰجِ أَدْعِيَآئِهِمْ إِذَا قَضَوْا۟ مِنْهُنَّ وَطَرًا ۚ وَكَانَ أَمْرُ ٱللَّهِ مَفْعُولًا﴾ ترجمہ: ”اے نبیؐ، یاد کرو وہ موقع جب تم اس شخص سے کہہ رہے تھے جس پر اللہ نے اور تم نے احسان کیا تھا کہ "اپنی بیوی کو نہ چھوڑ اور اللہ سے ڈر" اُس وقت تم اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جسے اللہ کھولنا چاہتا تھا، تم لوگوں سے ڈر رہے تھے، حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حقدار ہے کہ تم اس سے ڈرو پھر جب زیدؓ اس سے اپنی حاجت پوری کر چکا تو ہم نے اس (مطلقہ خاتون) کا تم سے نکاح کر دیا تاکہ مؤمنوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے معاملہ میں کوئی تنگی نہ رہے جبکہ وہ ان سے اپنی حاجت پوری کر چکے ہوں اور اللہ کا حکم تو عمل میں آنا ہی چاہیے تھا“۔ (سورۃ الاحزاب: 37) حضرت زید بن حارثہؓ کی زبردست منقبت وتعریف کی گئی ہے جس میں وہ منفرد ہیں، اس لئے کہ قرآن پاک میں آپؐ کے علاوہ کسی اور صحابی کا نام ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ سہیلیؒ فرماتے ہیں: ان کو زید بن محمد کہا جاتا تھا یہاں تک کہ حکم نازل ہوا تو وہ کہنے لگے: میں زید بن حارثہ ہوں۔ انہوں نے زید بن محمد کہنے کو حرام قرار دیا۔ جب ان سے یہ شرف اور یہ اعزاز لے لیا گیا اور اللہ تعالیٰ کو یہ معلوم ہو گیا کہ وہ اس کی وجہ سے پریشان ہو گئے ہیں تو ان کو ایک ایسے شرف سے نوازا جو کسی اور صحابی کو حاصل نہیں تھا، وہ یہ کہ ان کا نام قرآن پاک میں ذکر کر کے جاوداں کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَلَمَّا قَضَىٰ زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا﴾ الذکر الحکیم میں ان کا نام ذکر کرنے کی وجہ سے ان کا نام قرآن کا حصہ بن گیا جس کو محرابوں میں تلاوت کیا جاتا ہے، اس کے ذریعہ ان کو اطمینان فراہم کیا گیا اور محمد ﷺ کے والد ہونے کے فخر واعزاز کے عوض میں ان کو یہ اعزاز عطا کیا گیا۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ حضرت اُبی بن کعبؓ سے جب نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں آپ کے سامنے فلاں سورت پڑھوں۔ (صحیح بخاری: 3809، صحیح مسلم: 799) یہ سن کر وہ رو پڑے اور کہا: میں؟! وہاں میرا ذکر کیا گیا؟! وہ خوشی کے مارے رو پڑے جب ان کو بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر کیا ہے، پھر ذرا غور کریں اس شخص کی کیفیت کیا ہو گی جس کا نام قرآن کا حصہ بن کر تا قیامِ قیامت جاوداں بن گیا، دنیا کے انسان جب بھی قرآن کی تلاوت کریں گے تو ان کے نام کی بھی تلاوت کریں گے اور اہلِ جنت تو ہمیشہ ہمیش اس کی تلاوت کرتے رہیں گے، اہل ایمان کی زبانیں مسلسل اس نام سے تر رہیں گی، اسی طرح رب العالمین کے پاس بھی اس نام کا ذکر کیا جاتا رہے گا، اس لئے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے جو ابدی اور سرمدی ہے، لہٰذا زیدؓ کا نام مکرم وبلند اور پاک صحیفوں میں موجود ہے، معزز فرشتے بھی اس کی تلاوت کرتے ہیں، یہ شرف انبیاء کے علاوہ کسی صاحبِ ایمان کو سوائے حضرت زید بن حارثہؓ کے حاصل نہیں ہے اور یہ اس شرف کا عوض اور بدل ہے جو ان سے واپس لے لیا گیا۔ (تفسیر طبری: 4/194)

۴: حضرت زینب بنت جحشؓ کے ساتھ نبی کریم ﷺ کا نکاح رب کے حکم سے ہوا تھا، اللہ تعالیٰ نے ہی آپ ﷺ کے ساتھ ان کا نکاح کرنے کا حکم دیا تھا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِىٓ أَنْعَمَ ٱللَّهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَٱتَّقِ ٱللَّهَ وَتُخْفِى فِى نَفْسِكَ مَا ٱللَّهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى ٱلنَّاسَ وَٱللَّهُ أَحَقُّ أَن تَخْشَىٰهُ فَلَمَّا قَضَىٰ زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنَٰكَهَا

لِكَيْ لَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِي أَزْوَاجِ أَدْعِيَائِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ۚ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا﴾ ترجمہ:
''اے نبیؐ، یاد کرو وہ موقع جب تم اس شخص سے کہہ رہے تھے جس پر اللہ نے اور تم نے احسان کیا تھا کہ "اپنی بیوی کو نہ چھوڑ اور اللہ سے ڈر" اُس وقت تم اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جسے اللہ کھولنا چاہتا تھا، تم لوگوں سے ڈر رہے تھے، حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حقدار ہے کہ تم اس سے ڈرو پھر جب زیدؓ اس سے اپنی حاجت پوری کر چکا تو ہم نے اس (مطلقہ خاتون) کا تم سے نکاح کر دیا تاکہ مومنوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے معاملہ میں کوئی تنگی نہ رہے جبکہ وہ ان سے اپنی حاجت پوری کر چکے ہوں اور اللہ کا حکم تو عمل میں آنا ہی چاہیے تھا''۔ (سورۃ الاحزاب:37)

اس میں حضرت زینبؓ کے لئے عظیم شرف واعزاز اور تعریف وتوصیف ہے جس پر وہ فخر بھی کیا کرتی تھیں اور ان کو اس کا حق بھی تھا، حضرت انسؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں: زینبؓ دیگر ازواجِ مطہرات پر فخر کیا کرتی تھیں اور کہتی تھیں: آپ کا نکاح آپ کے گھر والوں نے کیا ہے اور میرا نکاح سات آسمانوں کے اوپر سے اللہ نے کیا ہے۔ایک دوسری روایت میں ہے وہ نبی کریم ﷺ کی ازواج پر فخر کیا کرتی تھیں اور کہتی تھیں: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے میرا نکاح آسمان سے کیا ہے۔(صحیح بخاری: 7421،7420)

شاید یہ اعزاز وشرف حضرت زینبؓ کو رسول اللہ ﷺ کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے اور آپؐ کی بات مان لینے کے بدلے میں عطا کیا گیا، جبکہ آپؐ نے ان کو اپنے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہؓ کے ساتھ نکاح کرنے کا حکم دیا تھا اور وہ اس کو ناپسند کر رہی تھیں اور پھر جب ان کو اس کا علم ہوا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا حکم ہے تو فوراً اس کو قبول کر لیا۔(دیکھیں: قضایا نساء النبی والمؤمنات، ص:218)

۵: رسول اللہ ﷺ نے جب حضرت زینبؓ کا ولیمہ کیا تو اس میں آپ ﷺ کی نبوت کی علامتوں میں سے ایک علامت اور دلیل کا ظہور ہوا اور وہ تھا کھانے کا تمام لوگوں کے لئے کافی ہو جانا۔اسی ولیمے میں ازواجِ مطہرات کے لئے آیتِ حجاب کا نزول ہوا اور ضیافت کے آداب کی بھی تشریع عمل میں آئی۔(أیضاً)

سیدنا انسؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ جب سیدہ زینبؓ کے لئے دولہا بنے تو مجھے (میری والدہ) ام سلیمؓ نے کہا: اس وقت ہم رسول اللہ ﷺ کو کوئی تحفہ بھیجیں تو بہتر ہے۔میں نے کہا: ٹھیک ہے، ضرور بھیجیں، چنانچہ انہوں نے کھجور، گھی، اور پنیر ملا کر ایک ہانڈی میں حلوہ بنایا اور مجھے دے کر آپ ﷺ کے پاس روانہ کیا۔جب وہاں پہنچا تو آپؐ نے فرمایا: ''اسے رکھ دو''۔پھر حکم دیا: ''فلاں فلاں لوگوں کو میرے پاس لاؤ''۔آپؐ نے ان کا نام لیا، اور جو بھی آدمی تجھے راستے میں ملے اسے میری طرف سے دعوت دے دو''۔چنانچہ مجھے آپؐ نے جو حکم دیا تھا میں نے اس کی تعمیل کی، جب میں واپس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ لوگوں سے گھر بھرا ہوا ہے، میں نے نبی ﷺ دیکھا کہ آپؐ نے دونوں ہاتھ اس حلوے پر رکھ دیئے اور جو اللہ کو منظور تھا وہ اپنی زبان سے پڑھا، اس کے بعد دس دس آدمیوں کو کھانے کے لئے بلانا شروع کیا۔آپؐ ان سے فرماتے تھے: ''اللہ کا نام لے کر ہر آدمی اپنے آگے سے کھائے''۔بہر حال سب لوگ کھا کر گھر سے باہر چل دئے، البتہ تین آدمی گھر میں بیٹھے باتیں کرتے رہے اور مجھے ان کے نہ جانے سے رنج پیدا ہوا، آخر کار نبی ﷺ اپنی بیویوں کے حجروں کی طرف گئے، میں بھی آپ کے پیچھے پیچھے گیا، میں نے (آپ سے ﷺ سے) کہا: لوگ اپنے گھروں کو چلے گئے ہیں، اس وقت آپ واپس آکر گھر میں داخل

ہوئے اور پردہ لٹکا دیا۔ میں ابھی حجرے ہی میں تھا، آپؐ (سورۂ احزاب) کی یہ آیات پڑھ رہے تھے: ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا تَدۡخُلُواْ بُيُوتَ ٱلنَّبِيِّ إِلَّآ أَن يُؤۡذَنَ لَكُمۡ إِلَىٰ طَعَامٍ غَيۡرَ نَٰظِرِينَ إِنَىٰهُ وَلَٰكِنۡ إِذَا دُعِيتُمۡ فَٱدۡخُلُواْ فَإِذَا طَعِمۡتُمۡ فَٱنتَشِرُواْ وَلَا مُسۡتَـٔۡنِسِينَ لِحَدِيثٍۚ إِنَّ ذَٰلِكُمۡ كَانَ يُؤۡذِي ٱلنَّبِيَّ فَيَسۡتَحۡيِۦ مِنكُمۡۖ وَٱللَّهُ لَا يَسۡتَحۡيِۦ مِنَ ٱلۡحَقِّۚ وَإِذَا سَأَلۡتُمُوهُنَّ مَتَٰعٗا فَسۡـَٔلُوهُنَّ مِن وَرَآءِ حِجَابٖۚ ذَٰلِكُمۡ أَطۡهَرُ لِقُلُوبِكُمۡ وَقُلُوبِهِنَّۚ وَمَا كَانَ لَكُمۡ أَن تُؤۡذُواْ رَسُولَ ٱللَّهِ وَلَآ أَن تَنكِحُوٓاْ أَزۡوَٰجَهُۥ مِنۢ بَعۡدِهِۦٓ أَبَدًاۚ إِنَّ ذَٰلِكُمۡ كَانَ عِندَ ٱللَّهِ عَظِيمًا﴾ ترجمہ: ''اے ایمان والو! نبی کے گھروں میں نہ جایا کرو مگر جب کھانے کے لئے اندر آنے کی اجازت دی جائے، وہاں بیٹھ کر کھانا پکنے کا انتظار نہ کرو، البتہ جب تمہیں بلایا جائے تو اندر جاؤ اور کھانے سے فارغ ہوتے ہی واپس چلے آؤ، باتوں میں لگ کر وہاں بیٹھے نہ رہو، یہ بات نبی کو تکلیف دیتی ہے اور وہ تم سے شرم کرتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ حق بات کہنے سے نہیں شرماتا''۔ (صحيح البخاري:5163 صحیح مسلم:1428)

ان آیات کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اپنی ازواج کو حجاب کا حکم دیا اور آیتِ حجاب کا نزول حضرت عمرؓ کے موافقات میں سے تھا۔ امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں کہ عمرؓ نے فرمایا: میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ پر نیک، بد سب داخل ہوتے ہیں، اگر آپ امہات المؤمنین کو حجاب کا حکم دے دیں، اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت حجاب نازل کی۔ (صحیح بخاری: 4790)

اسی طرح ازواجِ مطہرات کے سلسلہ میں یہ احکام بھی نازل ہوئے کہ گھروں میں رہنے اور مخاطب کرنے کے آداب کیا ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يَٰنِسَآءَ ٱلنَّبِيِّ لَسۡتُنَّ كَأَحَدٖ مِّنَ ٱلنِّسَآءِ إِنِ ٱتَّقَيۡتُنَّۚ فَلَا تَخۡضَعۡنَ بِٱلۡقَوۡلِ فَيَطۡمَعَ ٱلَّذِي فِي قَلۡبِهِۦ مَرَضٞ وَقُلۡنَ قَوۡلٗا مَّعۡرُوفٗا ۝٣٢ وَقَرۡنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجۡنَ تَبَرُّجَ ٱلۡجَٰهِلِيَّةِ ٱلۡأُولَىٰۖ وَأَقِمۡنَ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتِينَ ٱلزَّكَوٰةَ وَأَطِعۡنَ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥٓۚ إِنَّمَا يُرِيدُ ٱللَّهُ لِيُذۡهِبَ عَنكُمُ ٱلرِّجۡسَ أَهۡلَ ٱلۡبَيۡتِ وَيُطَهِّرَكُمۡ تَطۡهِيرٗا ۝٣٣﴾ ترجمہ: ''نبیؐ کی بیویو، تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو، اگر تم اللہ سے ڈرنے والی ہو تو دبی زبان سے بات نہ کیا کرو کہ دل کی خرابی کا مبتلا کوئی شخص لالچ میں پڑ جائے، بلکہ صاف سیدھی بات کرو۔ اپنے گھروں میں ٹِک کر رہو اور سابق دورِ جاہلیت کی سی سج دھج نہ دکھاتی پھرو، نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور اللہ اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت کرو، اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ اہلِ بیتِ نبیؐ سے گندگی کو دور کرے اور تمہیں پوری طرح پاک کر دے''۔ (سورۃ الاحزاب:32-33)

جمہور مفسرین کی رائے یہ ہے کہ ان آیات میں اگرچہ خطاب ازواج مطہرات کو کیا گیا ہے لیکن ان کا حکم تمام امت کی خواتین کے لئے عام ہے، ازواجِ مطہرات کو ان کے مقام و مرتبہ اور فضل و کمال کی وجہ سے بطور خاص ذکر کیا گیا ہے۔

یہ بعض دروس واسباق ہیں جو حضرت زینبؓ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے نکاح کے قصہ سے مستنبط ہوتے ہیں اور اس واقعہ کے ضمن میں حجاب کے جو احکام اور ضیافت واستئذان کے آداب ذکر کئے گئے ہیں، یہ ان کا اجمالی ذکر تھا۔

حضرت زینب بنت جحشؓ کی وفات سن ۲۰ ہجری میں ہوئی، اس وقت آپ ﷺ کی عمر ترپن (۵۳) برس کی تھی جیسے کہ نبی کریم ﷺ نے پیشنگوئی فرمائی تھی کہ وہ ازواج مطہرات میں سب سے پہلے نبی کریم ﷺ کے ساتھ ملنے والی ہوں گی اور عملی طور پر ایسا ہی ہوا۔(دیکھیں: صحیح بخاری: 1420، صحیح مسلم: 2452،الطبقات الکبری: 8/115)

نبی کریم ﷺ سے روایت کردہ ان کی احادیث کی تعداد بقی بن مخلد کی کتاب کے مطابق گیارہ احادیث ہیں۔(دیکھیں: تلقیح الفھوم، ابن الجوزی، ص: 370) صحاح ستہ میں ان سے روایت کردہ پانچ احادیث موجود ہیں، جن میں سے دو حدیث متفق علیہ ہیں۔(دیکھیں: سیر أعلام النبلاء: 2/121) آپؓ نے امتِ مسلمہ کی تاریخ میں اپنے پیچھے بہترین تذکرہ چھوڑا ہے۔ (دور المرأۃ فی خدمۃ الحدیث، ص:85)

....

دوسرا باب

دفاعی مرحلہ کے بعد اقدامی مرحلہ کا آغاز

''اب ہم ان پر چڑھائی کریں گے، وہ ہم پر چڑھائی نہیں کر سکیں گے''۔

(صحیح بخاری:4110، مسند احمد:4/262)

اللہ کے رسول ﷺ آس پاس اور پڑوس کی تمام طاقتوں کا صحیح اندازہ رکھتے تھے اور ان میں سے کسی بھی قوت سے غافل نہیں تھے، غزوۂ خندق کے بعد آپ ﷺ نے یہ واضح کر دیا کہ آئندہ کا منصوبہ اب قریش پر حملہ کرنے کا ہے، اس لئے کہ اب طاقتوں کا معیار اور توازن تبدیل ہو گیا تھا، مسلمانوں کے پاس پہلے کے مقابلہ میں اب حملہ کرنے کی صلاحیت کہیں زیادہ بڑھ چکی تھی، اس لئے آپ ﷺ نے مدینہ کے آس پاس کی باقی ماندہ طاقتوں پر اسلامی ریاست کا کنٹرول مستحکم کرنے کی کوششیں شروع کر دی، اس لئے کہ اس کا بعد کے مرحلہ میں قریش پر حملہ کرنے کے سلسلہ میں کی جانے والی تیاری کے ساتھ براہِ راست تعلق تھا، چنانچہ ایک ہی سال -یعنی چھ ہجری میں- آپ ﷺ نے دو غزوے کئے اور چودہ سریے روانہ فرمائے، علاوہ ازیں سن پانچ ہجری کے اختتام پر آپ ﷺ نے الگ سے ایک کاروائی کی، ان تمام اقدامات اور مہموں کے ذریعہ آپ ؐ کا مقصد یہ تھا کہ قریش پر محاصرہ تنگ کر کے اور اس کے حلفاء میں سے ہر طاقت کو کمزور کر کے ان کی قوت کو کمزور کر دیا جائے۔(دیکھیں: دراسات فی عہد النبوہ، الشجاع:139)

اللہ کے رسول ﷺ اور آپ ؐ کے اصحاب نے حاصل شدہ کامیابیوں کے ذریعہ خوب فائدہ اٹھایا، جیسے کہ غزوۂ احزاب میں تمام افواج کو پسپائی پر مجبور کر دیا، ان کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیا تھا اور بنو قریظہ کی سازش کا رخ انہی کی طرف موڑ دیا تھا، ان تمام کامیابیوں کو آپ ﷺ نے اسلامی کاز کے لئے استعمال کیا، اس لئے اب آپ ﷺ اور صحابہ کرام نے اپنے دشمنوں کے خلاف ہر محاذ پر کوششیں تیز کر دیں، قریش پر از سرِ نو اقتصادی شکنجہ کسنا شروع کر دیا، مشرکین کو سزا دینے کے لئے سرایا کی تحریک کو بھی متحرک کر دیا، اسی طرح ان قبائل سے بدلہ لینا شروع کر دیا جنہوں نے داعیانِ حق کے ساتھ غداری کی تھی یا اسلام کے خلاف عداوت و دشمنی رکھے ہوئے تھے، اس مرحلہ میں اسلامی عسکری تحریک مندرجہ ذیل خطوط پر آگے بڑھتی رہی:

ا: بنو القرطاء کی جانب سریہ محمد بن سلمہ:

بُت پرست بدوی عناصر میں نجدی قبائل مسلمانوں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ جری تھے، اس لئے کہ ان نجدی قبائل کے پاس طاقت و قوت بھی تھی اور وسائل کے ساتھ ساتھ افرادی قوت بھی تھی، اس بات کا ہم مشاہدہ کر چکے ہیں کہ غزوۂ احزاب کے موقع پر خونخوار افواج کے لئے ریڑھ کی ہڈی کا کام انہی نجدی قبائل نے کیا، اس لئے کہ اس لشکرِ جرّار کا غالب حصہ انہی قبائل کے افراد پر مشتمل تھا، قبیلۂ غطفان، اَشجع، اَسلم، فزارہ اور قبیلۂ اَسد کے چھ ہزار جنگجو اس جنگ میں شریک تھے جس کی قیادت ابو سفیان کر رہا تھا۔

اس لئے نبی کریم ﷺ نے غزوۂ احزاب کے بعد اپنے دشمنوں کو سبق سکھانے کے لئے جو سب سے پہلا عسکری حملہ کیا وہ بنو بکر بن کلاب کے انہی نجدی قبائل کے لئے مختص تھا جو مدینہ سے سات راتوں کی مسافت پر "ضریہ" کے کنارے 'القرطاء' میں آباد تھے، سن پانچ ہجری کے ماہ محرم کے اوائل میں اور یہود بنو قریظہ کے خاتمہ کے فوراً بعد رسول اللہ ﷺ نے تیس صحابہ کرام پر مشتمل ایک سریہ قبیلۂ بکر بن کلاب کے بنو القرطاء پر حملہ کرنے کے لئے روانہ فرمایا، یہ سن چھ ہجری کے دس محرم کا واقعہ ہے۔ (دیکھیں: صلح الحدیبیہ، باشمیل، ص:24،تاریخ الاسلام للذہبی،المغازی، ص:351)

صحابہ کرام نے اچانک ان پر حملہ کر دیا، ان میں سے دس افراد کو قتل کر دیا جبکہ باقی راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے، مسلمانوں نے ان کے اونٹوں اور جانوروں کو مالِ غنیمت کے طور پر لے لیا، واپس آتے ہوئے صحابہ کرام نے بنو حنیفہ کے سردار ثمامہ بن اثال حنفی کو گرفتار کر لیا، صحابہ کرام ان کو نہیں پہچانتے تھے، وہ ان کو لے کر مدینہ منورہ لے کر آئے اور مسجد نبوی کے ایک ستون کے ساتھ ان کو باندھ دیا، نبی کریم ﷺ ان کے پاس سے نکلے اور فرمایا: ثمامہ کیا ہے آپ کے پاس؟ انہوں نے جواب دیا: اے محمدؐ! میرے پاس خیر ہے، اگر آپ مجھے قتل کریں گے تو قتل کے مستحق کو قتل کریں گے اور اگر انعام کریں گے تو ایک شکر گزار پر انعام کریں گے، اور اگر آپ مال چاہتے ہیں تو آپ جو چاہیں مطالبہ کر لیں۔ نبی کریم ﷺ وہاں سے چلے آئے۔

دوسرے دن آپؐ نے پھر پوچھا: ثمامہ کیا ہے تمہارے پاس؟ انہوں نے کہا: وہی جو میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اگر آپ نے احسان کیا تو ایک ایسے شخص پر احسان کریں گے جو شکر ادا کرتا ہے۔ نبی کریم ﷺ پھر چلے گئے۔ تیسرے دن پھر آپؐ نے ان سے پوچھا: کیا ہے تمہارے پاس اے ثمامہ؟ انہوں نے کہا کہ وہی جو میں آپ سے پہلے کہہ چکا ہوں۔ نبی کریم ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ ثمامہ کو چھوڑ دو (رسی کھول دی گئی) تو وہ مسجد نبوی سے قریب ایک باغ میں گئے اور غسل کر کے مسجد نبوی میں حاضر ہوئے اور پڑھا: "أشهد أن لا إله إلا الله وأشهد أن محمدا رسول الله"۔ اور کہا: اے محمدؐ! اللہ کی قسم روئے زمین پر کوئی چہرہ آپ کے چہرے سے زیادہ میرے لئے بُرا نہیں تھا لیکن آج آپ کے چہرے سے زیادہ کوئی چہرہ میرے لئے محبوب نہیں ہے۔ اللہ کی قسم کوئی دین آپ کے دین سے زیادہ مجھے برا نہیں لگتا تھا لیکن آج آپ کا دین مجھے سب سے زیادہ پسندیدہ اور عزیز ہے۔ اللہ کی قسم! کوئی شہر آپ کے شہر سے زیادہ برا مجھے نہیں لگتا تھا لیکن آج آپ کا شہر میرا سب سے زیادہ محبوب شہر ہے۔ آپ کے سواروں نے مجھے پکڑا تو میں عمرہ کا ارادہ کر چکا تھا۔ اب آپ کا کیا حکم ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے انہیں بشارت دی اور عمرہ ادا کرنے کا حکم دیا۔ جب وہ مکہ پہنچے تو کسی نے کہا کہ تم بے دین ہو گئے ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ نہیں، بلکہ میں محمد ﷺ کے ساتھ ایمان لے آیا ہوں، اور اللہ کی قسم! اب تمہارے یہاں یمامہ سے گیہوں کا ایک دانہ بھی اس وقت تک نہیں آئے گا جب تک نبی کریم ﷺ اجازت نہ دے دیں۔ (صحيح البخاري: 4372 صحیح مسلم: 1764 مزید تفصیل کے لئے دیکھیں: نضرۃ النعیم: 1/330)

حضرت ثمامہؓ نے اپنی قسم کو پورا کیا جس کی وجہ سے مکہ کے سردار اس بات پر مجبور ہو گئے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو خط لکھ کر آپؐ سے اپنے رشتوں کا واسطہ دے کر آپؐ سے مطالبہ کریں کہ آپؐ حضرت ثمامہ کو لکھیں کہ وہ ان کو وہاں سے غلّہ لے جانے کی اجازت دیں۔

نبی کریم ﷺ نے ان کی درخواست قبول کی، حالانکہ آپؐ ان کے ساتھ حالتِ جنگ میں تھے۔ آپؐ نے بنو حنیفہ کے سردار حضرت ثمامہؓ کو لکھا: ''میری قوم کو غلّہ لانے میں جو رکاوٹیں حائل ہیں ان رکاوٹوں کو ختم کر دیں''۔ حضرت ثمامہؓ نے نبی کریم ﷺ کے حکم کی تابعداری کی اور بنو حنیفہ کے لوگوں کو از سر نو مکہ کی جانب غلہ لے جانے کی اجازت دے دی جس کی وجہ سے قحط سالی کا مرحلہ ختم ہو گیا۔(دیکھیں: السیرۃ الحلبیہ: 2/298، الاستیعاب، ابن عبدالبر)

اس قصہ میں بہت سے دروس واسباق اور عبرتیں ہیں جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

۱: کافر کو مسجد میں باندھنے کا جواز۔

۲: کافر قیدی پر احسان کرنے کا جواز اور مجرم کو معاف کرنے کی عظمت واہمیت، اس لئے کہ حضرت ثمامہؓ نے قسم کھا کر بتایا کہ ان کی نفرت چند ہی لمحات میں محبت میں بدل گئی ہے، اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے بغیر کسی عوض کے ان کے ساتھ عفو و درگذر اور احسان کا معاملہ کیا۔

۳: قبولِ اسلام کے وقت غسل کرنا؛ جیسے کہ حضرت ثمامہؓ نے اسلام قبول کرنے کے وقت کیا۔

۴: احسان؛ بغض و نفرت کو ختم کرتا ہے اور محبت پیدا کرتا ہے۔

۵: کافر جب کسی عملِ خیر کا ارادہ کرے اور اس کے بعد اسلام قبول کرے تو اس کے لئے یہ بات مشروع ہے کہ اس عملِ خیر کو مسلسل کرتا رہے۔

۶: قیدیوں میں سے جس کے بارے میں اسلام قبول کرنے کی امید ہو اس کے ساتھ نرمی کا معاملہ کیا جائے، جبکہ اس میں اسلام کی مصلحت ہو، خاص طور پر اگر وہ کوئی ایسا شخص ہو جس کے اسلام لانے کی وجہ سے اس کی قوم کی ایک بڑی تعداد حلقہ بگوش اسلام ہونے کی توقع ہو۔ (صحیح السیرۃ النبویہ، ص:386-387)

۷: اسلام مؤمن کے طرزِ عمل کو یکسر بدل دیتا ہے جبکہ ایک مسلمان اپنی صلاحیتوں کو اسلام اور مسلمانوں کے مفاد میں استعمال کرے جیسے کہ حضرت ثمامہؓ نے اہلِ مکہ کے لئے اسی وقت غلّہ بھیجنے کی اجازت دی، جبکہ رسول اللہ ﷺ نے اس کی اجازت دی۔

۸: مومن کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو ایمان کی دہلیز پر ڈال دے اور کفر اختیار کرنے کی صورت میں اپنے سابقہ تمام تعلقات کو خیر باد کہہ دے اور ایمان کے بعد رب العالمین کے اُوامر کی پابندی کرے۔

۲: سیف البحر کی جانب سریہ أبی عبیدہ بن الجراح:

سیف البحر کی جانب سریہ ابو عبیدہ بن الجراح نبی کریم ﷺ کی اس عسکری حکمتِ عملی کا تسلسل تھا جس کا مقصد قریش کو کمزور کرنا اور طویل عرصہ تک اس کا اقتصادی محاصرہ کرنا تھا، اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت ابو عبیدہ بن الجراح کو ساحلِ سمندر کی جانب تین سو سواروں کے ساتھ روانہ کیا، تاکہ وہ قافلہ قریش کی گھات میں رہیں، ابھی وہ راستے میں ہی تھے کہ ان کا زادِ سفر ختم ہو گیا، حضرت ابو عبیدہؓ نے حکم دیا کہ لشکر میں موجود زادِ سفر کو جمع کیا جائے، اس کو جمع کیا گیا، وہ کھجور کے ایک بورے کے بقدر تھا، وہ ان کو اس میں سے تھوڑا تھوڑا دیتے

تھے یہاں تک کہ آخر میں ان میں سے ہر ایک کے حصے میں ایک ایک کھجور آئی، لشکر کو سخت صورتحال کا سامنا کرنا پڑا اور انہوں نے اس صورتحال کو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کیا، بلکہ انہوں نے اپنے امیر و قائد کے سخت جاں منصوبہ کو عملانے میں اہم کردار ادا کیا، وہ زیادہ سے زیادہ وقت تک ایک کھجور پر گزارا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔(دیکھیں:السرایا والبعوث النبویہ، ص:118)

اس سریہ میں شریک حضرت جابرؓ فرماتے ہیں:''ہم اس کھجور کو ایسے چوستے تھے جیسے بچہ چوستا تھا، اس کے بعد اس پر پانی پیتے تھے اور وہ پورے دن رات تک ہمارے لئے کافی ہوتی تھی''۔(مسلم شرح النووی: 13/84)

وھب بن کیسان نے جابرؓ سے دریافت کیا کہ ایک کھجور سے آپ کا کیا گزارا ہوتا تھا؟ انہوں نے جواب دیا: جب وہ ختم ہو گئیں تو اس وقت ہمیں ان کے نہ ہونے کا احساس ہوا۔(صحیح بخاری: 4360، صحیح مسلم:1935)

کھانے پینے کی چیزوں کی عدم دستیابی کی وجہ سے یہ لشکر درختوں کے پتے کھانے پر مجبور ہو گیا، جابرؓ فرماتے ہیں: ہم اپنی لاٹھیوں سے پتے گراتے تھے، اس کے بعد ان کو پانی میں تر کرتے تھے اور پھر ان کو کھاتے تھے۔(شرح النووی: 31/84) اسی لئے اس لشکر کو پتوں والا لشکر بھی کہا جاتا ہے۔(صحیح بخاری:4361)

اس موقف اور صورتحال کی وجہ سے اس سریہ کے ایک بہادر سپاہی حضرت قیس بن سعد بن عبادہ بہت متاثر ہوئے، ان کا تعلق ایسے گھرانے اور خاندان سے تھا جو کرم و سخاوت میں معروف تھا، انہوں نے لشکر کے لئے تین اونٹ ذبح کئے، اس کے بعد پھر سے تین اونٹ ذبح کئے، اس کے بعد مزید تین اونٹ ذبح کئے، اس کے بعد حضرت ابو عبیدہؓ نے ان کو ایسا کرنے سے منع کر دیا۔(صحیح بخاری:4361، صحیح مسلم:1935)

وہ اسی صورتحال سے دوچار تھے کہ اچانک سمندر میں ایک طلاطم پیدا ہوا جس میں اللہ تعالیٰ نے ایک ضخیم مچھلی مہیا کی اور اس کو سمندر نے ساحل پر پھینک دیا، اس عجیب مچھلی کی ضخامت کی مقدار کے بارے میں حضرت جابر بن عبد اللہؓ منظر کشی کرتے ہیں اور فرماتے ہیں: ہم ساحلِ سمندر کی جانب چلے، ہمیں ساحلِ سمندر پر ایک ضخیم ریت کے ٹیلے کی طرح کوئی چیز نظر آئی، ہم اس کے پاس پہنچے تو دیکھتے ہیں کہ وہ ایک جانور ہے جس کو عنبر مچھلی کہا جاتا ہے، فرماتے ہیں: ابو عبیدہؓ نے کہا: یہ مردہ ہے۔ اس کے بعد کہا: نہیں، بلکہ ہم اللہ کے رسولؐ کے بھیجے ہوئے ہیں اور اللہ کے راستے میں ہیں اور آپ اضطراری صورتحال سے دوچار ہو، اس لئے کھالو۔ فرماتے ہیں: ہم ایک ماہ تک اس میں سے کھاتے رہے، ہم تین سو افراد تھے یہاں تک کہ ہم موٹے تازے ہو گئے۔ فرماتے ہیں: میں نے خود دیکھا ہے کہ ہم اس کی آنکھوں کے کھول میں مٹکوں کے ذریعہ تیل بھرتے تھے اور بیل کے بقدر گوشت کے ٹکڑے کاٹتے تھے۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے ہم میں سے تیرہ لوگوں کو بلایا اور ان کو اس کی آنکھوں کے کھول میں بٹھایا اور اس کی پسلیوں میں سے ایک پسلی لی اور اس کو کھڑا کیا، اس کے بعد ہمارا سب سے بڑا اونٹ کجاوے اور ساز و سامان کے ساتھ اس کے نیچے سے گزرا، ہم نے اس کے گوشت کا کچھ حصہ زادِ سفر کے طور پر لیا، جب ہم مدینہ پہنچے تو ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے، آپؐ نے دریافت کیا: آپ لوگوں کو تاخیر کیوں ہوئی؟ ہم نے عرض کیا: ہم قریش کے تجارتی قافلوں کا پیچھا کر رہے تھے۔ اس کے بعد ہم نے آپ ﷺ سے اس جانور (مچھلی) کے معاملہ کا بھی ذکر کیا تو آپؐ نے فرمایا: یہ رزق ہے جو اللہ تعالیٰ نے

آپ کو مہیا کیا ہے، کیا آپ کے پاس اس کے گوشت میں سے کچھ ہے؟ ہمیں بھی اس میں سے کھلاؤ۔ فرماتے ہیں: ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس اس میں سے بھیجا تو آپ ؐ نے اس میں سے کھایا۔(صحیح بخاری: 4362، صحیح مسلم: 1435، شرح النووی: 13/87)

راجح قول کے مطابق یہ سریہ صلح حدیبیہ سے پہلے پیش آیا، نہ کہ سن آٹھ ہجری کے ماہِ رجب میں؛ جیسے کہ ابن سعدؒ نے ذکر کیا ہے۔ (دیکھیں: طبقات ابن سعد: 3/132، المغازی للذہبی، ص: 519)

ابن سعد اور واقدی نے ذکر کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو قبیلہ جہینہ کے ایک قبیلہ کی جانب بھیجا، ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ان دونوں اقوال میں کوئی تضاد نہیں ہے، اس لئے کہ ان دونوں کے مابین تطبیق ممکن ہے، وہ یہ کہ ہو سکتا ہے کہ وہ قریش کے تجارتی قافلہ کا تعاقب بھی کر رہے ہوں اور جہینہ کے قبیلہ کا تعاقب بھی کر رہے ہوں، یہ بھی احتمال ہے کہ وہ قافلہ کے ساتھ جنگ کے لئے نہ نکلے ہوں بلکہ قبیلہ جہینہ سے ان کو محفوظ رکھنے کے لئے۔ صحیح مسلم میں یہ صراحت موجود ہے کہ اس دستہ کو سرزمین جہینہ کی طرف بھیجا گیا تھا۔(صحیح مسلم: 1935، السیرۃ النبویہ فی ضوء المصادر الاصلیہ، ص: 480)

اس قصہ میں مندرجہ ذیل دروس واسباق موجود ہیں:

۱: حضرت ابو عبیدہ کی حکمتِ عملی: انہوں نے موجود تمام زادِ سفر کو جمع کیا اور مجاہدین کے مابین مساویانہ تقسیم کیا، تاکہ پیش آمدہ صورتحال سے اچھی طرح نمٹ سکیں، یہ سبق انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عملی طور پر بارہا سیکھا تھا۔

۲: حضرت قیس بن سعد بن عبادہؓ کی سخت صورتحال میں فیاضی اور سخاوت: ان کے پاس اس روز کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس کے ذریعہ وہ دوسروں کی پریشانی دور کرتے۔ واقدی کی روایت میں ہے کہ قیس بن سعدؓ نے یہ اونٹنیاں ایک جہنی شخص سے قرض کے طور پر لیں اور حضرت ابو عبیدہؓ نے ان کو یہ کہہ کر منع کیا کہ آپ وعدہ خلافی کرنا چاہتے ہیں جبکہ آپ کے پاس کوئی مال نہیں ہے، اس لئے حضرت ابو عبیدہؓ نے ان کے ساتھ مشفقانہ معاملہ کرنا چاہا۔(دیکھیں: السرایا والبعوث النبویۃ: 119)

حضرت قیس بن سعدؓ نے اونٹنیوں کو ذبح کرنا شروع کیا اور وہ مسلسل ذبح کرتے رہے یہاں تک کہ ابو عبیدہؓ نے ان کو منع کر دیا۔ حضرت قیس بن سعدؓ نے ان سے کہا: اے ابو عبیدہ! کیا آپ دیکھتے نہیں ہیں کہ ابو ثابت لوگوں کا قرض ادا کرتے ہیں، لوگوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، قحط سالی میں لوگوں کو کھانا کھلاتے ہیں، کیا وہ میری طرف سے کھجوریں ادا نہیں کریں گے، ایسے لوگوں کی خاطر جو اللہ کے راستے میں جہاد کر رہے ہیں۔(دیکھیں: من معین السیرۃ، ص323، شرح الزرقانی: 2/282)

حضرت قیسؓ نے حضرت ابو عبیدہؓ سے یہ بات اس لئے کہی، اس لئے کہ قبیلہ جہینہ کے ایک شخص کے ساتھ اس بات کا اتفاق ہوا تھا کہ وہ ان سے اونٹنیاں خرید کر لشکر کے لئے ذبح کریں گے اور اس کے بدلہ میں ان کو مدینہ میں کھجوریں دیں گے اور جہنی نے اس بات سے اتفاق کیا تھا اور جب حضرت سعد بن عبادہؓ کو اس بات کا علم ہوا کہ ابو عبیدہؓ نے قیس کو یہ دلیل دے کر منع کیا ہے کہ ان کے پاس کوئی مال نہیں ہے، بلکہ مال ان کے والد کا ہے تو انہوں نے اپنے بیٹے کو چار باغات دئے جن میں سے سب سے چھوٹا باغ وہ تھا جس سے پچاس وسق کھجوریں نکلتی تھیں۔(ایضاً)

۳: حلال وحرام:

اس سریہ میں مسلمانوں کو کھانے پینے کے سلسلہ میں سخت صورتحال کا سامنا کرنا پڑا، بھوک اپنی انتہا کو پہنچ گئی، سفر کے دوران پورے ایک دن کے کھانے کے بدلہ ایک کھجور پر گزارا کیا جاتا تھا، وہ اسی صورتحال سے دوچار تھے کہ کھجوریں بھی ختم ہو گئیں اور وہ پتے کھانے پر مجبور ہو گئے، اسی دوران وہ اس جہنی شخص کے پاس سے گزرے جس سے حضرت قیس ؓ نے اونٹنیاں خریدیں، ان کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں آئی کہ وہ ان پر حملہ کر کے ان سے کھانے پینے کی اشیاء چھین لیں گے، جیسے کہ زمانۂ جاہلیت میں ہوا کرتا تھا، اس لئے کہ وہ آج اللہ کے اس دین کی سربلندی کے لئے نکلے تھے جو لوگوں کی تمام چیزوں کی حفاظت کی ضمانت دیتا ہے، وہ آج حلال وحرام کے درمیان تفریق کر رہے ہیں جس کو انہوں نے رب العالمین کے منہج سے سیکھا ہے۔

۴: سمندر کا مردہ جانور کھانے کا جواز:

اس قصہ سے یہ حکم معلوم ہوتا ہے کہ سمندر کا مردہ جانور کھانے کا جواز ہے اور یہ اللہ عزوجل کے اس حکم میں داخل نہیں ہے: ﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ ٱلْمَيْتَةُ وَٱلدَّمُ وَلَحْمُ ٱلْخِنزِيرِ وَمَآ أُهِلَّ لِغَيْرِ ٱللَّهِ بِهِۦ وَٱلْمُنْخَنِقَةُ وَٱلْمَوْقُوذَةُ وَٱلْمُتَرَدِّيَةُ وَٱلنَّطِيحَةُ وَمَآ أَكَلَ ٱلسَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى ٱلنُّصُبِ وَأَن تَسْتَقْسِمُوا۟ بِٱلْأَزْلَٰمِ ۚ ذَٰلِكُمْ فِسْقٌ ۗ ٱلْيَوْمَ يَئِسَ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ مِن دِينِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَٱخْشَوْنِ ۚ ٱلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِى وَرَضِيتُ لَكُمُ ٱلْإِسْلَٰمَ دِينًا ۚ فَمَنِ ٱضْطُرَّ فِى مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّإِثْمٍ ۙ فَإِنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ ترجمہ: ”تم پر حرام کیا گیا مردار، خون، سُور کا گوشت، وہ جانور جو خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو، وہ جو گلا گھٹ کر، یا چوٹ کھا کر، یا بلندی سے گر کر، یا ٹکر کھا کر مرا ہو، یا جسے کسی درندے نے پھاڑا ہو سوائے اس کے جسے تم نے زندہ پا کر ذبح کر لیا اور وہ جو کسی آستانے پر ذبح کیا گیا ہو نیز یہ بھی تمہارے لئے ناجائز ہے کہ پانسوں کے ذریعہ سے اپنی قسمت معلوم کرو یہ سب افعال فسق ہیں، آج کافروں کو تمہارے دین کی طرف سے پوری مایوسی ہو چکی ہے، لہٰذا تم اُن سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو، آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے (لہٰذا حرام و حلال کی جو قیود تم پر عائد کر دی گئی ہیں اُن کی پابندی کرو) البتہ جو شخص بھوک سے مجبور ہو کر اُن میں سے کوئی چیز کھا لے، بغیر اس کے کہ گناہ کی طرف اس کا میلان ہو تو بے شک اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے“۔ (سورۃ المائدہ: 3)

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ﴿أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ ٱلْبَحْرِ وَطَعَامُهُۥ مَتَٰعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ ۖ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ ٱلْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ۗ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ ٱلَّذِىٓ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ﴾ ترجمہ: ”تمہارے لئے سمندر کا شکار اور اس کا کھانا حلال کر دیا گیا، جہاں تم ٹھہرو وہاں بھی اُسے کھا سکتے ہو اور قافلہ کے لئے زادِ راہ بھی بنا سکتے ہو، البتہ خشکی کا شکار جب تک احرام کی حالت میں ہو، تم پر حرام کیا گیا ہے، پس بچو اُس خدا کی نافرمانی سے جس کی پیشی میں تم سب کو گھیر کر حاضر کیا جائے گا“۔ (سورۃ المائدہ: 96)

حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور دیگر صحابہؓ کے ایک گروہ سے صحت کے ساتھ یہ مروی ہے کہ سمندر کے 'شکار' سے مراد وہ ہے جو اس سے شکار کیا جائے، اور اس کے 'کھانے' سے مراد جو اس میں مر جائے۔

کتب سنن میں حضرت ابن عمرؓ سے مرفوعاً اور موقوفاً مروی ہے کہ "ہمارے لئے دو قسم کے مردار اور دو قسم کے خون حلال ہیں: جہاں تک تعلق ہے دو قسم کے مردار کا تو وہ ہے: مچھلی اور ٹڈی۔ اور جہاں تک تعلق ہے دو قسم کے خون کا تو وہ ہے: جگر، (کلیجی) اور تلی"۔ (مسند أحمد: 2/97، سنن ابن ماجہ: 3218، سنن دار قطنی: 4/271)

یہ موقوف حدیث مرفوع کے حکم میں ہے، اس لئے کہ صحابی کا یہ کہنا: "ہمارے لئے یہ چیز حلال کی گئی ہے اور ہمارے لئے یہ حرام کیا گیا ہے"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ حلال و حرام کا حکم رسول ﷺ سے منقول ہے۔ (دیکھیں: السرایا والبعوث النبویۃ، ص: 123)

اسی طرح جس مچھلی سے مسلمانوں نے ایک طویل مدت تک غذا حاصل کی اس سے رسول ﷺ کا کھانا سمندر کے مردہ جانور کے کھانے کی مشروعیت کی دلیل ہے۔ اسی طرح مفتی کے لئے مستحق و مستحب ہے کہ جن مباح اشیاء کے بارے میں فتوی اور مسئلہ پوچھنے والے کو شک ہو ان میں گنجائش کی صورت پیدا کرے، جبکہ اس میں مشقت نہ ہو اور مستفتی کے لئے اطمئنان ہو۔ امام نوویؒ نے یہی بیان کیا ہے۔ (شرح النووی علی مسلم: 13/86)

۵: بعض احکام جن کا امام نوویؒ نے ذکر کیا ہے:

امام نوویؒ فرماتے ہیں: اس حدیث میں اس بات کا جواز موجود ہے کہ اہل حرب کے خلاف کاروائی کی جاسکتی ہے، ان کے راستہ کو روکنا، ان پر حملہ کرنا اور ان کا مال حاصل کرنا جائز ہے، اور اسی طرح یہ معلوم ہوا کہ لشکر کے لئے کسی امیر کا ہونا ضروری ہے جو ان پر کنٹرول کرے اور وہ اس کے اوامر و نواہی کے پابندی کریں، مناسب یہ ہے کہ ان میں سے جو افضل ہو وہ ان کا امیر ہو، لوگ سب جماعت کی شکل میں ہوں، اگرچہ کم ہی کیوں نہ ہوں۔ ان کے لئے مستحب یہ ہے کہ وہ کسی کو اپنا امیر متعین کریں اور سب اس کی اطاعت کریں۔ اسی طرح علماء کا کہنا ہے کہ مسافر رفقاء کے لئے مستحب یہ ہے کہ وہ اپنے زادِ سفر کو جمع کریں تاکہ وہ زیادہ بابرکت ہو اور آپسی رفاقت و محبت کا ذریعہ بنے۔ اسی طرح یہ مناسب نہیں ہے کہ ان میں سے بعض دوسروں کو نظر انداز کر کے مخصوص کھانا کھائیں۔ واللہ اعلم۔ (أیضاً: 13/86)

۳: دومۃ الجندل کی جانب سریہ عبدالرحمن بن عوف:

اس سریہ کو سب سے زیادہ دور دراز علاقہ کی جانب روانہ کیا گیا جہاں تک جزیرۃ العرب میں نبوی افواج پہنچ سکتی تھیں، دومتہ الجندل شام کے سرحدی علاقہ کے قریب تھا، دمشق مدینہ سے جتنا دور ہے وہ تین گنا زیادہ اس سے دور ہے، وہ صحرائے عرب کے بیچ میں واقع ہے، جو اُرض شام میں رومیوں اور جزیرۃ العرب میں عربوں کے مابین رابطہ کا کام کرتا تھا، اس کے باشندے قبیلہ کلب پر مشتمل تھے، روم کے عیسائیوں کے پڑوس میں رہنے اور ان سے متاثر ہونے کی وجہ سے وہ عیسائیت میں داخل ہوئے تھے، اس سریہ کا تعلق رسول اللہ ﷺ کے اس نبوی منصوبے سے تھا جس کا مقصد رومن امپائر کا مقابلہ کرنا تھا۔

اور جہاں تک تعلق ہے اس سریہ کے امیر کا تو وہ تھے: حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ۔ وہ عشرہ مبشرہ میں سے تھے اور سابقین اولین میں سے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے ہاتھ پر ایمان لانے کے بعد سے ہی وہ تحریکِ اسلامی کے اہم اور بنیادی رکن اور ستون کی حیثیت سے سرگرم عمل تھے، اس سریہ کی مہم کے دو پہلو تھے: دعوتی مہم اور عسکری مہم۔ اسی لئے اس کے لئے حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کا انتخاب کیا گیا جن کی تربیت ابتدائی دنوں سے ہی اسی انداز سے ہوئی تھی۔ (التربیۃ القیادیہ: 4/167)

اس سریہ کے متعلق حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے عبدالرحمن بن عوفؓ سے فرمایا: "تیاری کرلو! میں آپ کو آج ہی یا کل ان شاءاللہ ایک سریہ (فوجی مہم) پر بھیجنے والا ہوں"۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں: میں نے یہ بات سن لی تو میں نے ارادہ کیا کہ میں بھی آؤں گا اور نبی کریم ﷺ کے ساتھ صبح کی نماز ادا کروں گا اور آپ ﷺ عبدالرحمن بن عوفؓ کو جو وصیت کریں گے میں بھی ضرور سنوں گا۔ فرماتے ہیں: میں دوسرے دن آیا اور میں نے نماز ادا کی، دیکھتا ہوں کہ ابو بکرؓ، عمرؓ اور مہاجرین کے کچھ افراد موجود ہیں جن میں عبدالرحمن بن عوفؓ بھی ہیں اور رسول اللہ ﷺ نے ان کو حکم دیا تھا کہ وہ رات ہی کو دومۃ الجندل کی طرف نکل جائیں اور ان کو اسلام کی دعوت دیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے عبدالرحمنؓ سے فرمایا: آپ اپنے ساتھیوں سے پیچھے کیوں رہ گئے؟ ابن عمرؓ فرماتے ہیں: ان کے ساتھی سحر کے وقت ہی نکل چکے تھے اور مقام جرف میں انہوں نے پڑاؤ ڈالا تھا اور وہ سات سو افراد تھے۔ حضرت عبدالرحمنؓ نے جواب دیا: اے اللہ کے رسولؐ! میں نے چاہا کہ سب سے اخیر میں آپ سے ملاقات کروں، جبکہ میرے جسم پر سفر کے کپڑے ہوں۔ فرماتے ہیں: حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کے سر پر عمامہ تھا جس کو انہوں نے اپنے سر پر لپیٹ رکھا تھا۔ ابن عمرؓ فرماتے ہیں: نبی کریم ﷺ نے ان کو بلایا اور اپنے سامنے بٹھایا، اپنے ہاتھ سے عمامہ کھولا، اس کے بعد ان کے سر پر ایک سیاہ عمامہ باندھا جس کا ایک حصہ ان کے کندھوں کے نیچے لٹکایا۔ اس کے بعد فرمایا: اے ابن عوف: اس طرح عمامہ باندھا کرو! فرماتے ہیں: ابن عوف ایک تلوار لٹکائے ہوئے تھے۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: اللہ کا نام لے کر اور اللہ کے راستے میں جنگ کرنا، جو اللہ کے ساتھ کفر کرے ان کے ساتھ لڑنا، مالِ غنیمت میں خیانت مت کرنا، دھوکہ اور غدر مت کرنا اور نہ ہی کسی بچے کو قتل کرنا۔ ابن عمرؓ فرماتے ہیں: اس کے بعد اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور فرمایا: اے لوگو! پانچ چیزوں سے بچو اس سے پہلے کہ تم پر وہ آن پڑیں: جو قوم بھی ناپ تول میں کمی کرتی ہے اللہ تعالیٰ اس کو قحط سالی اور پھلوں میں کمی کے ذریعہ پکڑ لیتا ہے تاکہ وہ رجوع کریں۔ اور جو قوم بھی عہد شکنی کرتی ہے اللہ تعالیٰ ان پر ان کے دشمنوں کو مسلط کر دیتا ہے۔ اور جو قوم زکوۃ دینا بند کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ ان پر بارشیں بند کر دیتا ہے، اور اگر جانور نہ ہوتے تو بارش ہی نہیں ہوتی، اور جس قوم میں

بھی بدکاری ظاہر ہوتی ہے اللہ تعالیٰ ان پر طاعون مسلط کر دیتا ہے۔ اور جو قوم بھی آیاتِ قرآنیہ کے علاوہ اور کسی چیز کے ذریعہ فیصلہ کرتی ہے اللہ تعالیٰ ان کو ٹکڑوں میں بانٹ دیتا ہے اور ان کو آپس میں برسرِ پیکار کر دیتا ہے۔ (نصب الرایۃ للزیلعی، کتاب الصلح، کنز العمال للمتقی الھندی (بعث عبد الرحمن)

(ابن عمرؓ) فرماتے ہیں: اس کے بعد عبد الرحمن بن عوفؓ نکلے یہاں تک کہ اپنے ساتھیوں سے جا ملے، وہ چلتے رہے یہاں تک کہ دومتہ الجندل پہنچ گئے، جب وہاں پڑاؤ ڈالا تو ان کو اسلام کی دعوت دی، تین روز تک ان کو اسلام کی دعوت دیتے رہے، پہلے دن وہ صرف جنگ کی بات کر رہے تھے لیکن جب تیسرا دن ہوا تو اُصبغ بن عمرو کلبی نے اسلام قبول کر لیا، وہ نصرانی (عیسائی) تھا اور وہ ان کا سردار تھا۔ عبد الرحمنؓ نے نبی کریم ﷺ کو مکتوب لکھا جس میں آپؐ کو اس بات کی اطلاع دی اور جہینہ کے ایک شخص کو یہ مکتوب لے کر بھیجا جس کا نام رافع بن مکیث تھا۔ نبی کریم ﷺ کو یہ بھی لکھ بھیجا کہ وہ وہاں شادی کرنا چاہتے ہیں، نبی کریم ﷺ نے ان کو جواب میں لکھا کہ اُصبغ کی بیٹی تماضر سے شادی کر لیں۔ چنانچہ عبد الرحمنؓ نے ان سے نکاح کر لیا۔ اس کے بعد ان کو اپنے ساتھ لے کر آئے اور وہی حضرت ابو سلمہ بن عبد الرحمن بن عوف کی والدہ ہیں۔ واقدی نے ذکر کیا ہے کہ یہ سریہ سن چھ، ماہِ شعبان میں پیش آیا۔ (دلائل النبوۃ للبیہقی: 4/85، مغازی الواقدی: 2/560)

اس سریہ کے ذریعہ مندرجہ ذیل دروس و اُسباق حاصل ہوتے ہیں:

۱: نبی کریم ﷺ اپنے اصحاب کے لئے تواضع اختیار فرماتے تھے اور ان کے ساتھ مشفقانہ معاملہ کرتے تھے، چنانچہ آپؐ نے اپنے دستِ مبارک سے عبد الرحمن بن عوفؓ کو عمامہ باندھا، آپؐ کے اس تواضع کے ذریعہ صحابہ کرام کے حوصلے معنوی اعتبار سے بلند ہوتے تھے اور اس دین کی خدمت اور سربلندی کی خاطر مزید صلاحیتیں استعمال کرنے کے سلسلہ میں مزید متحرک و سرگرم ہوتے تھے، اس لئے کہ قائد اور متبعین کے مابین محبت و مودت اور آپسی تعلق کامیابی اور حصولِ ہدف کا ایک اہم عامل ہے۔ (دیکھیں: التاریخ الاسلامی، الحمیدی: 6/184)

۲: حضرت عبد الرحمنؓ کا لشکر مبادیات اور عقیدہ کا حامل لشکر تھا، اس لئے وہ اس دور دراز صحرا میں اللہ کی شریعت اور رسول اللہ ﷺ کی طرف سے دیئے ہوئے نظامِ زندگی کو لے کر نکلے تھے جہاد کے مقاصد اور اس کے احکام کا انہیں اچھی طرح استیعاب تھا، جہاد محمد ﷺ کے نام پر نہیں ہوگا وہ تو اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، اس کائنات میں لہرانے والے اس پرچم کے سائے میں کسی لیڈر، کسی قوم، کسی قبیلہ، کسی جھنڈے، وطن، فوج یا قومیت کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا پرچم ہے، اس لئے آپ ﷺ نے حکم دیا: "اللہ کے نام پر جنگ کرو"۔ اللہ ہی کی جماعت اس پیاسے صحرا کو خالص عقیدۂ توحید کی بارش کے ذریعہ زندہ کر سکتی ہے، اس تحریک کا ہدف صرف ایک اللہ کے راستے میں جہاد کرنا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝١٦٢ لَا شَرِيكَ لَهُ ۖ وَبِذَٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ﴾ ترجمہ: ''کہو، میری نماز، میرے تمام مراسمِ عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنا، سب کچھ اللہ رب العالمین کے لئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں، اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے سرِ اطاعت جھکانے والا میں ہوں''۔ (سورۃ الانعام: 162-163)

ان کی یہ جنگ ان لوگوں کے خلاف ہے جنہوں نے اللہ کے ساتھ کفر کیا ہے، ان کا یہ قتال جاہلی قانون کے مطابق نہیں ہے جس کے متعلق ایک شاعر یوں کہتا ہے:

وأحيانا على بكر أخينا إذا ما لم نجد إلا أخانا

ترجمہ: "کبھی ہم اپنے ہی بھائی پر حملہ کر دیتے ہیں جبکہ ہمیں اپنے بھائی کے سوا اور کوئی نہیں ملتا ہے"۔

لیکن جہاں تک تعلق ہے اس خوددار و طاقتور لشکر کا تو وہ روئے زمین پر آگے بڑھتا رہتا ہے تاکہ ان لوگوں کے ساتھ جنگ کرے جنہوں نے اللہ کے ساتھ کفر کیا ہے۔

۳: اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبدالرحمن بن عوف ؓ کو مالِ غنیمت میں خیانت کرنے سے منع کیا، بدعہدی اور بچوں کو قتل کرنے سے منع کیا، یہ جہاد کے اسلامی آداب کا ایک نمونہ ہے، عام طور پر جنگ ظلم وزیادتی کی ایک قسم ہے لیکن مسلمانوں کی نسبت سے، جن کو اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی نفرت اور حسد سے پاک کر دیا ہے، احقاقِ حق، ابطالِ باطل اور اہلِ حق کی حمایت کے لئے ایک عارضی اور وقتی معاملہ ہے، جنگ ان کے دلوں کی آواز نہیں ہے بلکہ ان کو مجبوراً اس آگ میں اترنا پڑتا ہے، اسی لئے اس کے لئے اعلیٰ آداب واصول متعین کئے گئے ہیں جن کی وجہ سے انسان طاقت وقوت اور رحمت وشفقت کا جامع بن جاتا ہے۔(التاریخ الاسلامی للحمیدی: 6/184)

۴: حضرت عبدالرحمن بن عوف ؓ اس امت کے قائدین میں سے ایک اہم قائد تھے، امت کے داعیانِ حق میں سے ایک اہم داعی تھے، ان کے پاس حکمت وبُردباری، علم وثقافت، عبقریت وتجربہ، اسلام میں اولیت اور اسلامی خدمات کا اتنا بڑا ذخیرہ تھا جو کسی اور کے پاس نہیں تھا، اسی لئے انہوں نے پہلے بنیادی مقصد یعنی اسلام میں داخل ہونے کے لئے اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لایا، وہ دوراندیش، سنجیدہ اور انسانوں اور ان کے دلوں کے بارے میں اچھی طرح واقف تھے، اس لئے انہوں نے اپنی تمام فکری اور تحریکی صلاحیتوں کو اس عظیم مشن کی کامیابی کے لئے بروئے کار لایا، اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان کا یہ عمل عظیم کامیابی کے ذریعہ ہمکنار ہوا، خاص طور پر ان کی کوششوں کے نتیجہ میں مصطفی ﷺ کی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے قبیلہ کا سردار اسلام قبول کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔

۵: دومتہ الجندل میں بنو کلب کے سردار اَصبغ بن عمرو کا حضرت عبدالرحمن بن عوف ؓ کے ہاتھ پر اسلام قبول کرنا ہمیں حضرت جعفر بن ابی طالب ؓ کو یاد دلاتا ہے جن کے ہاتھ پر شاہِ حبشہ نجاشی نے اسلام قبول کیا، اسی طرح یہ واقعہ حضرت مصعب بن عمیر ؓ کی یاد کو بھی تازہ کرتا ہے جن کی دعوت پر مدینہ میں اوس وخزرج کے سردار اور لیڈر حلقہ بگوش اسلام ہوئے، یہ تینوں عظیم شخصیات مکہ مکرمہ کے اسلامی اسکول کے اولین رہنماؤں اور بانیوں میں سے ہیں۔

یہی حضرت عبدالرحمن بن عوف ؓ جن کو غزوۂ احد میں اکیس زخم لگے، جن میں سے بعض کی شدت کی وجہ سے ان کی ٹانگ بھی متاثر ہو گئی تھی، آپ ؓ اپنے کامیاب لشکر کے ذریعہ جزیرۃ العرب کے شمال میں عقیدۂ اسلامی کی بنیادیں قائم کرتے ہیں اور ایک بڑی تعداد حلقہ بگوش اسلام ہو جاتی ہے، اس کے نتیجے میں دومتہ الجندل اس دور دراز علاقہ میں اسلامی مراکز میں سے ایک نیا مرکز بن جاتا ہے، لہذا مسلمان اس اہم

قلعہ کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے اور نہ ہی اس اہم جائے وقوع کو مستقبل قریب میں اسلام مخالف عربوں کے ساتھ اور رومیوں کے ساتھ جنگ کرنے کے سلسلہ میں نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔(دیکھیں: التربیۃ القیادیہ: 4/174)

یہ پہلا موقع تھا جب کہ اسلام اپنی حدود سے باہر قدم رکھتا ہے اور وہاں اسلامی نظام کا نفاذ ہوتا ہے اور مسلمان اور عیسائی ایک ہی ریاست کے ماتحت زندگی بسر کرتے ہیں، جو اسلام قبول کرتے ہیں ان پر اسلامی احکام کا نفاذ ہوتا ہے اور جو عیسائیت پر بدستور قائم رہے ان سے جزیہ وصول کیا جاتا ہے، اس طرح کی نئی سوسائٹی کے بارے میں یہ وسعت اور انفتاح صحابہ کرام کے لئے ایک نئی تربیت تھی جس سوسائٹی کی طرف بعد میں صحابہ کرام کو منتقل ہونا تھا اور ان کو عراق میں، شام میں، فارس (ایران) اور روم کے وسط میں رہنا تھا تاکہ وہ لوگوں کو اس کی تعلیم دیں کہ عقیدہ بات چیت کے ذریعہ بنتا ہے نہ کہ تلوار کے ذریعہ، اور یہ کہ اسلامی مبادیات کے اندر ذاتی قوت ہے جس کی روشنی سے وہ معاشرے منور ہو جاتے ہیں جو گھٹاٹوپ تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔(دیکھیں: التربیۃ القیادیہ: 4/174)

۶: دومۃ الجندل کے لیڈر بنی کلب کے سردار کی بیٹی کے ساتھ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کے نکاح کے ذریعہ دومۃ الجندل کے جدید مسلمان رہنما کے مابین اور مدینہ کی اسلامی ریاست کے مابین روابط میں مزید استحکام پیدا ہوگا اور وہ اپنے مقصد کو اسلامی ریاست کے مقصد کے ساتھ ہم آہنگ کرے گا جبکہ وہ محسوس کرے گا کہ اس کے جگر کا ٹکڑا اس کی صاحبزادی اسلامی پناہ گاہ میں محفوظ ہے جس کی محبت اب اس کے دل میں اسی طرح پیدا ہوگئی ہے جیسے کہ اپنی سرزمین اور اپنے وطن کی محبت اس کے دل میں جاگزیں تھی۔

اللہ کے رسول ﷺ کی حکمتِ عملی یہ تھی کہ آپ ﷺ اور آپؐ کے قائدین صحابہ قبائل کے سرداروں کی بیٹیوں کے ساتھ نکاح کریں، اس لئے کہ یہ تحریکِ اسلامی کے مفاد میں تھا، کیونکہ رشتہ داری اور مصاہرت نزدیکی پیدا کرنے اور عداوت و دشمنی ختم کرنے کا اور پھر اسلام میں داخل ہونے کا ذریعہ ہے۔(التاریخ الاسلامی للحمیدی 6/186)

۴: غداروں کے خلاف تادیبی کاروائی؛ غزوۂ بنی لحیان، غزوۃ الغابہ اور دیگر غزوات:

غزوۂ احزاب سے تمام افواج کے کوچ کرنے کے بعد سے ہی مسلمان دفاعی مرحلہ سے اقدامی مرحلہ میں داخل ہو گئے، اور اب ان کے پاس کوئی بھی فیصلہ لینے کی صلاحیت موجود تھی، اب وقت آگیا کہ بنی لحیان کے خلاف تادیبی کاروائی کی جائے جنہوں نے حضرت خبیبؓ اور ان کے اصحاب کے ساتھ یوم الرجیع کے موقع پر غداری اور دھوکہ دہی کا معاملہ کیا تھا، اب ان شہداء کا بدلہ لینے کا وقت آگیا، اس لئے آپؐ ان کی جانب ماہ ربیع الاول میں یا جمادی الاولی میں سن چھ ہجری میں دو سو صحابہ کے ساتھ روانہ ہوئے۔(السیرۃ النبویۃ فی ضوء المصادر الأصلیہ، ص:468)

أ: دشمن کو بے خبر اور دھوکہ میں رکھنا:

قبیلۂ ہذیل کی شاخ بنی لحیان کی سرزمین مدینہ منورہ سے دو سو میل سے زیادہ دوری کی مسافت پر تھی اور یہ ایک طویل مسافت تھی جو بھی اس کو طے کرنا چاہتا تھا اس کو سخت مشکلات اور مشقت کا سامنا کرنا پڑتا تھا، لیکن نبی کریم ﷺ ان صحابہ کرام کا بدلہ لینا چاہتے تھے جن کو ان خونخوار قبائل نے دھوکہ سے شہید کر دیا تھا، ان کے نزدیک عہد و پیمان کی کوئی قیمت نہیں تھی۔

جیسے کہ نبی کریم ﷺ کی عادتِ مبارکہ تھی کہ دشمن کو بے خبر اور دھوکہ میں رکھتے تھے جس پر حملہ آور ہونا چاہتے تھے، آپؐ اپنے لشکر کو لے کر شمال کی جانب متوجہ ہوئے جبکہ بنو لحیان کے مکانات اقصائے جنوب میں واقع تھے، شمال کی جانب روانہ ہونے سے قبل نبی کریم ﷺ نے اعلان کیا کہ آپؐ شام پر حملہ آور ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں، یہاں تک کہ آپؐ کے اصحاب بھی نہیں جانتے تھے کہ آپؐ بنو لحیان پر حملہ کرنا چاہتے ہیں، ان کو اس وقت اس بات کا علم ہوا جبکہ آپؐ ان کو لے کر جنوب کی جانب مڑے، جبکہ اس سے پہلے آپؐ تقریباً بیس میل شمال کی جانب چلتے رہے، یہ دشمن کو بے خبر اور دھوکہ میں رکھنے کی بہترین حکمتِ عملی تھی، شمال سے جنوب کی جانب سمتِ سفر تبدیل کرنے کی جگہ "بتراء" تھی، اس جگہ سے آپ ﷺ لشکر کو لے کر مغرب کی جانب مڑے، یہاں تک کہ چلتے چلتے جنوبی سمت کے اصل راستہ پر پہنچ گئے۔ (دیکھیں: صلح الحدیبیہ، باشمیل، ص:34-35)

ب: نبی کریم ﷺ کے پہنچنے سے پہلے لحیانیوں کا فرار:

بنو لحیان انتہائی چوکنا اور بیدار مغز تھے، انہوں نے راستوں میں جاسوس اور خبر رسانوں کو پھیلا دیا تھا تاکہ وہ پل پل کی خبریں ان تک پہنچائیں، نبی کریم ﷺ جیسے ہی اپنے لشکر کو لے کر ان کے گھروں کے قریب پہنچے انہوں نے وہاں سے فرار کی راہ اختیار کی اور پہاڑوں کی چوٹیوں کی طرف بھاگ گئے، اس لئے کہ ان کے جاسوسوں نے ان تک خبر پہنچا دی تھی کہ مسلمان ان کے گھروں کے قریب پہنچ چکے ہیں۔

نبی کریم ﷺ جب وہاں پہنچ گئے تو آپؐ نے ان کے علاقہ میں پڑاؤ ڈالا، اس کے بعد چھوٹے چھوٹے دستوں کو روانہ کیا تاکہ وہ ان غداروں کا تعاقب کریں اور جس کو گرفتار کر کے لا سکیں اس کو لے کر آئیں، ان نبوی عسکری دستوں نے مسلسل دو دن تک تلاش و تعاقب کی مہم جاری رکھی لیکن ان کو ان قبائل کے کوئی آثار نہیں ملے، اس لئے کہ وہ بلند پہاڑوں کی چوٹیوں کی طرف بھاگ گئے تھے، آپ ﷺ دو (۲) روز تک ان کے علاقہ میں مقیم رہے تاکہ ان کو خوفزدہ کیا جائے، ان کو چیلنج دیا جائے اور دشمنوں کو یہ باور کرایا جائے کہ مسلمان کس قدر طاقت و قوت کے مالک ہیں اور وہ اپنے بارے میں کس قدر پُراعتماد ہیں اور وہ کہیں بھی جا کر حملہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں یہاں تک کہ دشمن کے علاقہ میں جا کر بھی جب چاہیں حملہ کر سکتے ہیں۔ (ایضاً، ص:36)

ج: مکہ کے مشرکین کو خوفزدہ کرنا:

نبی کریم ﷺ نے مناسب سمجھا کہ مکہ کے قریب ہونے کا فائدہ اٹھایا جائے، آپؐ نے طے کیا کہ ایک عسکری مشن بھیجیں جس کے ذریعہ مکہ کے مشرکین کو مرعوب اور خوب زدہ کریں، آپؐ اپنا لشکر لے کر روانہ ہوئے یہاں تک کہ وادی عسفان میں پڑاؤ ڈالا، وہاں آپ ﷺ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کو بلایا اور ان کو دس صحابہ کرام پر مشتمل شہسواروں کا دستہ فراہم کیا، اور ان کو حکم دیا کہ ان کو لے کر مکہ

کی طرف روانہ ہو جائیں تا کہ ان کے دلوں میں خوف اور ڈر پیدا کریں۔ صدیق اکبرؓ دس شہسواروں کو لے کر مکہ کی جانب نکلے یہاں تک کہ ان کو لے کر "کُراع الغمیم" پہنچے، یہ مکہ سے انتہائی قریبی جگہ تھی، قریش نے ان کے بارے میں سنا تو وہ یہ سمجھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان پر حملہ آور ہونا چاہتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے دلوں میں خوف اور ڈر پیدا ہو گیا، اس مشن کے ذریعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقصد بھی یہی تھا جس کی ذمہ داری حضرت ابو بکر صدیقؓ کو دی گئی تھی۔

ابو بکر صدیقؓ اور آپ کے ساتھ موجود دس شہسوار جب "کراع الغمیم" پہنچے اور ان کو معلوم ہو گیا کہ انہوں نے اہل مکہ کے دلوں میں خوف اور ڈار پیدا کر دیا ہے تو وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس صحیح سالم واپس آ گئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے لشکر کو لے کر مدینہ کی جانب روانہ ہو گئے۔ (الواقدی: 2/535، ابنِ سعد: 2/78، تاریخ طبری: 2/595، صلح الحدیبیہ، ص: 37)

د: شہداء کے لئے دعا:

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم "غُران" کی وادی میں پہنچے جہاں قبیلۂ ہذیل کے غداروں کے ذریعہ صحابہ کرام کو شہید کیا گیا تھا، وہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان شہداء کے حق میں کلماتِ خیر ادا فرمائے اور ان کے حق میں دعا کی۔ (دیکھیں: صلح الحدیبیہ، ص: 38)

۲: غزوۃ الغابہ:

غزوۂ بنی لحیان سے واپسی کو ابھی چند ہی روز گزرے تھے یہاں تک کہ عیینہ بن حصن فزاری نے غطفان کی چالیس گھوڑ سواروں پر مشتمل ایک جماعت کے ساتھ مقام غابہ میں موجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی (دودھ دینے والی حاملہ) اونٹنیوں پر حملہ کر دیا (الغابہ مدینہ کے قریب شام کی جانب ایک جگہ تھی جہاں اہلِ مدینہ کے مال مویشی ہوتے تھے) اور انہوں نے ذر بن اَبی ذر غفاریؓ کو شہید کر دیا اور ان کی بیوی لیلی کو گرفتار کر کے لے گئے، وہ اونٹنیوں کو ہانک کر لے گئے جن کی تعداد بیس تھی، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عیینہ کی اس حرکت کا علم ہوا تو آپؐ پانچ سو صحابہ کرام کے ساتھ ان کے تعاقب میں نکلے اور اپنے پیچھے حضرت سعد بن عبادہؓ کو ان کی قوم کے تین سو افراد کے ساتھ اپنا نائب بنایا جو مدینہ کی حفاظت کر رہے تھے۔ (دیکھیں: عیون الأثر، ابن سید الناس: 2/12)

'ذو قَرَد' چشمہ کے پہاڑ کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دشمن کو پکڑ لیا، ان کے بعض افراد کو قتل کر دیا اور ان سے اونٹ چھین لئے۔ (دیکھیں: التاریخ السیاسی العسکری، ص: 327)

حضرت سلمہ بن اکوع نے اس معرکہ میں بے نظیر بہادری کے جوہر دکھائے، خاص طور پر نبوی شہسواروں کے پہنچنے سے پہلے، اس لئے کہ وہ بھی 'غابہ' میں اونٹ چرانے والوں کے ساتھ تھے، وہ تنہا حملہ آوروں کا مقابلہ کرتے رہے اور ان پر تیر اندازی کرتے رہے، وہ اپنے زمانہ کے ماہر تیر انداز تھے، شہسواروں کے پہنچنے سے پہلے ہی انہوں نے غصب شدہ کچھ اونٹوں کو حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ (صلح الحدیبیہ، ص: 43)

جہاں تک تعلق ہے گرفتار شدہ خاتون کا، وہ حضرت ابوذر غفاری ؓ کے صاحبزادہ کی زوجہ تھیں، ان کے شوہر کو مشرکین نے غابہ میں ہی حملہ کے دوران شہید کر دیا تھا، وہ خاتون رسول اللہ ﷺ کی ایک اونٹنی پر سوار ہو کر ان لوگوں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئی اور بحفاظت صحیح سالم مدینہ واپس آگئیں، انہوں نے نذر مانی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ان کو بچا لیا تو وہ اس اونٹنی کو ذبح کریں گی، جب انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو اپنی نذر کے بارے میں بتایا تو آپ ؐ نے تبسم فرمایا اور کہا: اس کو تم نے کتنا بُرا بدلہ دیا! یعنی: اس نے آپ کو سوار کیا اور آپ کو دشمن سے بچایا تو اس کا بدلہ ذبح کرنا ٹھہرا؟! اس کے بعد آپ ؐ نے ان سے فرمایا: اللہ کی معصیت و نافرمانی کے بارے میں کوئی نذر نہیں ہے اور نہ ہی اس چیز کی نذر مانی جا سکتی ہے جو آپ کی ملکیت نہیں ہے۔ (مسند احمد: 4/430، صحیح مسلم: 1641، سنن ابو داؤد: 3316، صلح الحدیبیہ، ص: 45)

اس کے بعد اللہ کے رسول ﷺ مدینہ منورہ تشریف لے آئے جبکہ پانچ راتیں مدینہ سے باہر گزاریں۔

یہ غزوہ ان تادیبی غزوات میں سب سے بڑا غزوہ سمجھا جاتا ہے جن کی قیادت غزوۂ احزاب اور غزوۂ بنی قریظہ کے بعد اور غزوۂ خیبر سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے خود کی، مشرکین کی تادیب کے لئے 'غزوۂ قرد' کے بعد رسول اللہ ﷺ مسلسل فوجی مہمات (سرایا) بھیجتے رہے، بعض فوجی مہمات کامیاب ہوئیں جبکہ بعض میں مسلمانوں کو نقصان اٹھانا پڑا، ان میں نمایاں ترین سریہ (فوجی مہم) حضرت عکاشہ بن محصن اُسدی کا سریہ تھا جو 'سریۃ الغمر' کے نام سے معروف ہے، اس سریہ کو رسول اللہ ﷺ نے سن چھ ہجری کے ماہ ربیع الاول میں بنو اسد کی جانب روانہ فرمایا، یہ سریہ جب مقام غمر میں پہنچا تو دیکھا کہ بنو اُسد سب کے سب بھاگ گئے ہیں اور پہاڑوں میں پناہ گزیں ہو گئے ہیں، حضرت عکاشہ ؓ اور ان کے ساتھیوں نے ان کے جانوروں پر حملہ کر دیا اور ان کے دو سو اونٹ لے کر آگئے اور مدینہ منورہ واپس آگئے۔ (دیکھیں: تاریخ طبری: 2/640)

ان میں ایک دوسرا نمایاں سریہ ذو القصہ کی جانب سریہ محمد بن مسلمہ انصاری ہے جس کو بنو ثعلبہ اور عُوال کو خوفزدہ کرنے کے لئے اور مدینہ کی چراگاہوں پر حملہ کرنے سے روکنے کے لئے بھیجا گیا۔ سن چھ ہجری کے ماہِ ربیع الاول میں حضرت محمد بن مسلمہ ؓ دس صحابہ کرام کی جماعت کے ساتھ روانہ ہو گئے یہاں تک کہ رات کے وقت ان کے علاقہ میں پہنچ گئے، وہ لوگ چاروں طرف سے ان کے لئے گھات لگا کر بیٹھ گئے، وہ تعداد میں دو سو تھے، رات کے کچھ حصہ تک تیر اندازی کا تبادلہ ہوتا رہا، لیکن اس کے بعد اعراب نے نیزوں کے ذریعہ ان پر حملہ کیا اور ان تمام صحابہ کو شہید کر دیا اور حضرت محمد بن مسلمہ ؓ زخمی ہو کر گر گئے، وہ وہاں سے واپس نہیں آسکے اور جب ایک مسلمان شخص کا وہاں سے گزر ہوا تو اس نے انہیں اٹھا کر مدینہ منورہ پہنچا دیا۔ (دیکھیں: التاریخ السیاسی والعسکری، ص: 328)

اس کے فوراً بعد رسول اللہ ﷺ نے ان کے تعاقب میں حضرت ابو عبیدہ ؓ کی قیادت میں چالیس صحابہ کرام کو روانہ فرمایا، وہ ان کے گھروں تک پہنچ گئے لیکن وہاں کسی کو نہیں پایا، مسلمانوں نے ان کے مویشیوں کو مالِ غنیمت کے طور پر حاصل کر لیا اور ان کو ہانک کر مدینہ منورہ لے کر آگئے۔ (دیکھیں: الواقدی: 1/555)

سن چھ ہجری کے ماہِ جمادی الاولی میں ہی العیص کی جانب دوسرے سریہ زید بن حارثہؓ کوایک سوستر گھوڑ سواروں کے ساتھ روانہ کیا گیا، شام سے قریش کاایک تجارتی قافلہ آرہاتھا،اس کے تعاقب میں اس سریہ کو بھیجا گیا، مسلمانوں نے اس قافلہ کو پکڑ لیااور قافلہ کے بعض افراد کو گرفتار کرلیااور اس میں موجود سامان پر قبضہ کرلیا، گرفتار شدہ افراد میں یہ لوگ بھی تھے: ابوالعاص بن ربیع (جو رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی زینبؓ کے شوہر تھے،ان کی والدہ حضرت ہالہ بنت خولیدؓ جو رسول اللہ ﷺ کی زوجہ مطہرہ حضرت خدیجہؓ کی بہن تھیں)اور حضرت مغیرہ بن معاویہ بن أبی العاص۔(دیکھیں: محمد رسول اللہ، محمد رضا، ص: 245-246)

سن چھ ہجری کے ماہِ شعبان میں ایک سریہ حضرت علی بن ابی طالب ﷺ کی قیادت میں بنوسعد بن بکر کی تأدیب کے لئے روانہ ہوا، بنوسعد نے یہود خیبر کی مدد کے لئے لوگوں کو جمع کیا تھا، رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ کو سوافراد پر مشتمل صحابہ کرام کی جماعت کے ساتھ روانہ فرمایااور آپ نے ان پر حملہ کیااور ان کے بعض مویشیوں کومال غنیمت کے طور پر حاصل کرلیااور ان کو لے کر مدینہ منورہ آگئے۔ (التاریخ السیاسی والعسکری، ص330)

یہ سریہ ہراس شخص کے لئے ایک سبق، آگاہی اور تنبیہ تھا جس کے دل میں بھی یہود کی معاونت کرنے کا خیال آسکتا تھا،اس سریہ کے ذریعہ تمام قبائل کو اچھی طرح معلوم ہوگیا کہ مدینہ ہر اعتبار سے بیدار ہے اور آس پاس کی صورتحال پر پوری نگاہ رکھے ہوئے ہے اور ہر نقل وحرکت کو نوٹ کیا جارہاہے،اسلامی ریاست اپنے دشمنوں پر نظر رکھنے میں امتیازی حیثیت رکھتی تھی، جنگی منصوبہ بندی اسی طریقہ سے ہوتی ہے کہ مخالفین کو بڑی تعداد میں جمع ہونے کا کوئی موقع فراہم نہ کیا جائے۔

سرایااور فوجی مہمات کی تحریک جس کی قیادت رسول اللہ ﷺ بنفس نفیس فرمارہے تھے،اس کے ذریعہ یہ رہنمائی ملتی ہے کہ اعدائے دین کے بارے میں پل پل کی خبریں رکھنے اور ان کے بارے میں معلومات رکھنے کی کتنی اہمیت ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے پاس متعدد مصادر کے ذریعہ معلومات جمع ہوتی تھیں، جیسے کہ خبر رساں دستے، وہ لوگ جن کا اسلام ابھی مخفی تھا، وہ لوگ جو مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے، وہ لوگ جن کے ساتھ مسلمانوں کا معاہدہ تھا، اسی طرح فراست وذہانت سے کام لے کر بین الطور سے نتائج اخذ کئے جاتے تھے۔ خلاصہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ کو کسی داخلی سازش یا خارجی چیلنج کو اچانک نہیں سننا پڑتا تھا۔ یہ وہ چیز ہے جس کے بارے میں دورِ حاضر میں سب سے زیادہ ضرورت ہے کہ مسلمان شرعی ضوابط کا خیال کرتے ہوئے اس پر اپنی پوری توجہ مرکوز کریں۔(دیکھیں: تفسیر القرآن العظیم: 3/491، تفسیر السعدی: 4/136، قضایانساء النبی والمؤمنات، ص: 189)

۵: قبیلۂ عرینہ کی جانب سریہ کرز بن جابر الفہری:

سن چھ ہجری کے ماہِ شوال میں عکل اور عرینہ کے چند افراد رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور انہوں نے اسلام کا اظہار کیااور کہنے لگے: اے اللہ کے نبیؐ! ہم مال مویشی والے دیہات کے لوگ ہیں، ہمیں شہری زندگی سے سابقہ نہیں پڑاہے۔ان کو مدینہ کی آب وہوار اس نہ آئی، نبی کریم ﷺ نے ان کو چند اونٹوں کے ساتھ چراگاہ بھیج دیااور حکم دیا کہ اونٹوں کا دودھ اور پیشاب پییں، جب یہ لوگ تندرست ہوگئے تو رسول اللہ ﷺ کے راعی (چرواہے) کو قتل کردیا، اونٹوں کو ہانک کرلے گئے اور اظہارِ اسلام کے بعد اب پھر کفر اختیار کیا، لہٰذا رسول اللہ

ﷺ نے ان کی تلاش کے لئے کُرز بن جابر فہری کو بیس صحابہ کی معیت میں روانہ فرمایا، چنانچہ وہ پکڑ لئے گئے اور انہوں نے مسلمان چرواہوں کے ساتھ جو کچھ کیا تھا اس کے قصاص اور بدلہ کے طور پر ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے گئے، آنکھیں داغ دی گئیں اور انھیں حرّہ کے ایک گوشے میں چھوڑ دیا گیا جہاں وہ زمین کریدتے کریدتے اپنے کیفرِ کردار کو پہنچ گئے۔ حدیث کے راوی حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ ہمیں یہ معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ اس کے بعد صدقہ کرنے کی ترغیب دیتے تھے اور مثلہ کرنے سے منع فرماتے تھے۔(صحیح بخاری: 4192)

ابو قلابہ اپنی حدیث میں کہتے ہیں: یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے چوری کی تھی، قتل کا ارتکاب کیا تھا اور ایمان کے بعد کفر اختیار کیا تھا اور اللہ اور اس کے رسول کے خلاف اعلان جنگ کیا تھا۔(دیکھیں: السیرۃ النبویۃ فی ضوء المصادر الاصلیہ، ص:478)

جمہور کہتے ہیں: یہ آیت انہی عرنیوں کے بارے میں نازل ہوئی: ﴿إِنَّمَا جَزَٰٓؤُاْ ٱلَّذِينَ يُحَارِبُونَ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ وَيَسۡعَوۡنَ فِي ٱلۡأَرۡضِ فَسَادًا أَن يُقَتَّلُوٓاْ أَوۡ يُصَلَّبُوٓاْ أَوۡ تُقَطَّعَ أَيۡدِيهِمۡ وَأَرۡجُلُهُم مِّنۡ خِلَٰفٍ أَوۡ يُنفَوۡاْ مِنَ ٱلۡأَرۡضِۚ ذَٰلِكَ لَهُمۡ خِزۡيٞ فِي ٱلدُّنۡيَاۖ وَلَهُمۡ فِي ٱلۡأٓخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ ترجمہ: ”جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں اس لیے تگ ودو کرتے پھرتے ہیں کہ فساد برپا کریں اُن کی سزا یہ ہے کہ قتل کیے جائیں، یا سولی پر چڑھائے جائیں، یا اُن کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں، یا وہ جلا وطن کر دیئے جائیں، یہ ذلت ورسوائی تو اُن کے لیے دنیا میں ہے اور آخرت میں اُن کے لیے اس سے بڑی سزا ہے“۔(سورۃ المائدہ: 33) اس آیت کے نزول کے دیگر اسباب بھی بیان کئے گئے ہیں۔(دیکھیں: سبل الھدیٰ والرشاد، الشامی: 6/181، تفسیر طبری: 10/242)

بہر حال سببِ نزول جو بھی رہا ہو اصل اعتبار الفاظ کے عموم کا ہوتا ہے نہ کہ مخصوص سبب کا، اور یہ حکم آج تک باقی ہے، اس کی سب سے واضح دلیل یہ ہے جس پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے کہ اسلام میں فساد برپا کرنے والوں پر حد جاری کرنے کا حکم موجود ہے چاہے یہ آیت کفار کے بارے میں نازل ہوئی ہو یا مسلمانوں کے بارے میں۔ صحیح بخاری کی روایت کے مطابق یہ آیت مشرکین کے بارے میں نازل ہوئی ہے، معلوم یہ ہوا کہ اصل اعتبار الفاظ کے عموم کا ہے نہ کہ مخصوص اسباب کا۔

یہ کہنا کہ مثلہ کا حکم منسوخ ہے یا اس کو ممنوع قرار دیا گیا اور عرنیین کی آنکھوں کو داغے جانے کو دلیل نہیں بنایا جا سکتا ہے، اس لئے کہ عرنیوں نے چرواہوں کی آنکھوں کو داغا تھا اور نبی کریم ﷺ کا ان کی آنکھوں کو داغنا قصاص کے طور پر تھا نہ کہ مثلہ کے طور پر۔ (دیکھیں: علاج القرآن، للجریمۃ، د، عبد اللہ شنقیطی، ص:297-298)

واقعہ عرنیین کے ذریعہ فساد برپا کرنے والوں پر حد جاری کرنے کا حکم معلوم ہوتا ہے اور اس کے بارے میں آیات بینات کا نزول ہوا، اللہ عزوجل نے فساد برپا کرنے والوں کی سزا کو چار امور میں منحصر کیا ہے اور اس کو تاکیدی الفاظ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور ساتھ ہی اللہ تعالی نے فساد برپا کرنے والوں کو ایسے اوصاف کے ساتھ ذکر کیا ہے جن کو سن کر ہر عاقل کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، اس لئے کہ سب سے پہلے ان کے متعلق یہ بیان کیا ہے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ کی ہے، پھر بیان کیا ہے کہ وہ زمین پر بسنے والوں کو خوفزدہ کر کے ان کو بُری طرح قتل کر کے اور ظلم وزیادتی کر کے ان کے مال وجائیداد کو لوٹ کر زمین میں فساد برپا کرتے ہیں، ان کا مقصد ومحرک صرف فساد

پھیلانا اور ظلم و زیادتی کرنا ہے، اس لئے مہربان اللہ تعالی کی رحمت ان کے بارے میں اور اس طرح کے دوسرے لوگوں کے بارے میں متقاضی ہوئی کہ ان کو چار قسموں میں سے کوئی ایک طرح کی سزادی جائے: قتل کیا جائے، سولی پر لٹکایا جائے، ان کے ہاتھ پاؤں مخالف سمت سے کاٹے جائیں، یا ان کو جلاوطن کر دیا جائے، تاکہ وہ دوبارہ اس طرح کے جرائم کے ارتکاب کی ہمت نہ کر پائیں اور دوسرے لوگ ان کے ذریعہ عبرت و سبق حاصل کریں اور اگر وہ توبہ کرکے راہ راست پر آتے ہیں تو اس حد کے ذریعہ وہ پاک وصاف ہو جائیں۔

اس کے بعد ان کے لئے مسلمانوں کو ایذاء پہنچانے کی وجہ سے ذلت ورسوائی ہے، اور یہ ذلت ورسوائی دنیا کے ساتھ ساتھ آخرت میں ان کے ساتھ باقی رہے گی، البتہ اللہ تعالی نے ان سے ان لوگوں کو مستثنی کیا ہے جس نے اللہ کی طرف رجوع کیا اور ان کے حق میں عفو در گزر کا اعلان کیا، اور عفو در گزر کو اس کے ساتھ مشروط کیا ہے کہ ان پر قابو پانے سے پہلے ہی وہ تائب ہو گئے ہوں۔

خلاصہ کلام یہ کہ آیاتِ قرآنیہ نے اسلامی معاشرہ میں فساد برپا کرنے والوں کا ایسا علاج کیا ہے جس سے بہتر علاج کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے، اس علاج کا خلاصہ مندرجہ ذیل نکات میں پیش کیا جا سکتا ہے:

۱) فساد برپا کرنے والے کو اللہ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ کرنے والا قرار دیا گیا ہے۔

۲) فساد برپا کرنے کی سخت ترین سزا متعین کی گئی ہے، چاہے پھر فساد برپا کرنے والا کوئی بھی ہو۔

۳) اگر اس نے توبہ نہیں کی تو دنیا اور آخرت میں اس کے لئے ذلت آمیز انجام بیان کیا گیا ہے۔

۴) اس سخت ترین جرم کا قرآن نے اس طرح بھی علاج کیا ہے کہ ایسے شخص کے لئے توبہ کا دروازہ کھول دیا ہے تاکہ توبہ کا دروازہ بند ہونے کی وجہ سے وہ مزید سرکشی کی راہ اختیار نہ کرتا رہے۔ (دیکھیں: علاج القرآن الکریم للجریمہ، ص: 313-315)

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّمَا جَزَٰٓؤُاْ ٱلَّذِينَ يُحَارِبُونَ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ وَيَسۡعَوۡنَ فِي ٱلۡأَرۡضِ فَسَادًا أَن يُقَتَّلُوٓاْ أَوۡ يُصَلَّبُوٓاْ أَوۡ تُقَطَّعَ أَيۡدِيهِمۡ وَأَرۡجُلُهُم مِّنۡ خِلَٰفٍ أَوۡ يُنفَوۡاْ مِنَ ٱلۡأَرۡضِۚ ذَٰلِكَ لَهُمۡ خِزۡيٞ فِي ٱلدُّنۡيَاۖ وَلَهُمۡ فِي ٱلۡأٓخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝٣٣ إِلَّا ٱلَّذِينَ تَابُواْ مِن قَبۡلِ أَن تَقۡدِرُواْ عَلَيۡهِمۡۖ فَٱعۡلَمُوٓاْ أَنَّ ٱللَّهَ غَفُورٞ رَّحِيمٞ ۝٣٤﴾ ترجمہ: ”جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں اس لیے تگ ودو کرتے پھرتے ہیں کہ فساد برپا کریں اُن کی سزا یہ ہے کہ قتل کیے جائیں، یا سولی پر چڑھائے جائیں، یا اُن کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں، یا وہ جلاوطن کر دیئے جائیں، یہ ذلت ورسوائی تو اُن کے لیے دنیا میں ہے اور آخرت میں اُن کے لیے اس سے بڑی سزا ہے۔ مگر جو لوگ تمہارے قابو پانے سے پہلے ہی توبہ کر لیں تو سمجھ لو کہ اللہ مغفرت فرمانے والا اور مہربان ہے“۔ (سورۃ المائدۃ: 33-34)

اس طرح سے معاشرہ کی تعمیر و تشکیل میں اور اسلامی ریاست کے قیام میں عسکری، سیاسی، معاشرتی، اخلاقی اور اقتصادی تمام پہلوؤں کو پہلو بپہلو تکمیل کی جانب بڑھایا جا رہا تھا۔

....

تیسرا باب

ریاست کے خلاف بغاوت پر ابھارنے والوں کا تصفیہ

ا: سلام بن اُبی الحقیق کا قتل کرنے کے لئے سریہ عبداللہ بن عتیک:

ابورافع سلام بن اُبی الحقیق کا تعلق بنو نضیر کے یہود سے تھا، وہ اسلامی ریاست کے خلاف مسلسل بغاوت پر ابھارتا رہتا تھا، یہاں تک کہ اس نے غطفان اور ان کے آس پاس کے مشرکین عرب قبائل کے لئے اس بات پر بہت زیادہ انعام رکھا تھا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے خلاف جنگ کریں، ابورافع کی یہ بات معروف اور عام ہو گئی، یہ ان لوگوں میں سے تھا جنہوں نے غزوۂ احزاب کے موقع پر تمام قبائل اور گروہوں کو رسول اللہ ﷺ کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا تھا، اسلامی ریاست کے خلاف اس کی یہ عداوت و دشمنی ایک خطرہ اور چیلنج بن گئی تھی جس پر قدغن لگانا اب ضروری ہو گیا تھا۔ (دیکھیں: قراءة سیاسیة للسیرة النبویة، محمد قلعجی، ص: 212)

خیبر کی جانب سریہ کی روانگی:

اللہ کے رسول ﷺ نے ابورافع یہودی کی جانب انصار کے کچھ لوگوں کو بھیجا اور حضرت عبداللہ بن عتیکؓ کو ان کا امیر مقرر کیا۔ ابو رافع اپنے قلعہ میں تھا، جب قریب پہنچے تو سورج غروب ہو چکا تھا اور لوگ اپنے جانور لے کر واپس ہو چکے تھے، عبداللہ بن عتیک نے کہا: تم لوگ یہیں ٹھہرو، میں جاتا ہوں اور دروازہ کے پہرے دار کے ساتھ کوئی لطیف حیلہ اختیار کرتا ہوں، ممکن ہے اندر داخل ہو جاؤں، اس کے بعد وہ تشریف لے گئے اور دروازے کے قریب جا کر سر پر کپڑا ڈال کر یوں بیٹھ گئے گویا قضائے حاجت کر رہے ہیں، پہرے دار نے زور سے پکار کر کہا: او، اے اللہ کے بندے! اگر اندر آنا ہے تو آجاؤ ورنہ میں دروازہ بند کرنے جا رہا ہوں۔

عبداللہ بن عتیک کہتے ہیں کہ میں اندر گھس گیا اور چھپ گیا، جب سب لوگ اندر آ گئے تو پہرے دار نے دروازہ بند کر کے ایک کھونٹی پر چابیاں لٹکا دیں۔ (کچھ دیر بعد جب ہر طرف سکون ہو گیا تو) میں نے اٹھ کر چابیاں لیں اور دروازہ کھول دیا۔ ابورافع بالا خانے میں رہتا تھا اور وہاں مجلس ہوا کرتی تھی، جب اہلِ مجلس چلے گئے تو میں اس کے بالا خانے کی طرف چڑھا، میں جو کوئی دروازہ بھی کھولتا تھا اسے اندر کی جانب سے بند کر لیتا تھا، میں نے سوچا کہ اگر لوگوں کو میرا پتہ لگ بھی گیا تو اپنے پاس ان کے پہنچنے سے پہلے پہلے ابورافع کو قتل کر لوں گا، اس طرح میں اس کے پاس پہنچ تو گیا، (لیکن) وہ اپنے بال بچوں کے درمیان ایک تاریک کمرے میں تھا اور مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ اس کمرے میں کس جگہ ہے، اس لئے میں نے کہا: ابورافع! اس نے کہا: یہ کون ہے؟ میں نے جھٹ آواز کی طرف لپک کر اس پر تلوار کی ایک ضرب لگائی لیکن میں اس وقت ہڑبڑایا ہوا تھا، اس لئے کچھ نہ کر سکا، ادھر اس نے زور کی چیخ ماری۔ لہٰذا میں جھٹ کمرے سے باہر نکل گیا اور ذرا دور ٹھہر کر پھر آ گیا۔ اور (آواز بدل کر) بولا: ابورافع! یہ کیسی آواز تھی؟ اس نے کہا: تیری ماں برباد ہو۔ ایک آدمی نے ابھی مجھے اس کمرے میں تلوار ماری

ہے۔ عبداللہ بن عتیک کہتے ہیں کہ اب میں نے ایک زوردار ضرب لگائی جس سے وہ خون میں لت پت ہو گیا لیکن اب بھی میں اسے قتل نہ کر سکا تھا، اس لیے میں نے تلوار کی نوک اس کے پیٹ پر رکھ کر دبا دیا اور وہ اس کی پیٹھ تک چلی گئی، میں سمجھ گیا کہ میں نے اسے قتل کر لیا ہے۔ اس لئے اب میں ایک ایک دروازہ کھولتا ہوا واپس ہوا اور ایک سیڑھی کے پاس پہنچ کر یہ سمجھتے ہوئے کہ زمین تک پہنچ چکا ہوں، پاؤں رکھا تو نیچے گر پڑا، چاندنی رات تھی، پنڈلی سرک گئی، میں نے پگڑی سے اسے کس کر باندھا اور دروازے پر آکر بیٹھ گیا اور جی ہی جی میں کہا کہ آج جب تک کہ یہ معلوم نہ ہو جائے کہ میں نے اسے قتل کر لیا ہے یہاں سے نہیں نکلوں گا، چنانچہ جب مرغ نے بانگ دی تو موت کی خبر دینے والا قلعہ کی فصیل پر چڑھا اور بلند آواز سے پکارا کہ میں اہلِ حجاز کے تاجر ابو رافع کی موت کی اطلاع دے رہا ہوں۔ اب میں اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچا اور کہا: بھاگ چلو، اللہ نے ابو رافع کو کیفرِ کردار تک پہنچا دیا۔ چنانچہ میں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپؐ سے واقعہ بیان کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اپنا پاؤں پھیلاؤ، میں نے اپنا پاؤں پھیلایا، آپ ﷺ نے اس پر اپنا دستِ مُبارک پھیرا اور ایسا لگا گویا کوئی تکلیف تھی ہی نہیں۔ (صحیح البخاري:4039،4040)

کتب سیرت میں یہ مذکور ہے کہ ابو رافع پر جب تلوار سے وار کیا گیا تو اس کی بیوی چیخ پڑی، حضرت عبداللہ بن ابی عتیکؓ نے اس کو قتل کرنے کا ارادہ کیا لیکن اس کے بعد ایسا کرنے سے باز رہے، اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے سے منع کیا تھا، حضرت عبداللہ بن عتیک یہود کی زبان بولتے تھے اور ابو رافع یہودی کی بیوی اور اس کے گھر والوں کے ساتھ انہوں نے انہی کی زبان میں بات کی۔

کتبِ سیرت میں یہ بات بھی مذکور ہے کہ سیریہ ابن عتیک کے تمام افراد ابو رافع کو قتل کرنے میں شریک رہے اور ان میں سے ہر ایک کا دعوی تھا کہ اسی کے وار سے ابو رافع کا کام تمام ہوا، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: اپنی اپنی تلواریں جلدی سے لاؤ! وہ سب اپنی اپنی تلواریں لے کر آئے، آپؐ نے ان کو دیکھا اور فرمایا: اس تلوار نے اس کو قتل کیا ہے، اور وہ عبداللہ بن انیسؓ کی تلوار تھی، عبداللہ بن انیسؓ کی اس تلوار میں کھانے کے اثرات موجود ہیں۔ (دیکھیں: صحیح بخاری: 4039،4040، ابن سعد: 2/91، السنن الکبری للبیہقی: 10/9-81 مصنف عبدالرزاق: 5/407-410، سیرت ابن ہشام: 3/286-288)

بظاہر ایسا لگتا ہے کہ صحیح بخاری اور دیگر کتبِ سیرت کی روایتوں میں تناقض اور تضاد ہے کہ کام تمام کرنے والا وار کس کا تھا، حضرت عبداللہ بن عتیکؓ اپنے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے ہی اس کا قتل کیا ہے اور انہوں نے ابو رافع کو قتل کرنے کے سلسلہ میں اپنے کردار کو بیان بھی کیا ہے۔ اس کا مطلب ہر گز یہ نہیں ہے کہ ان کے علاوہ اور کوئی اس کے قتل کرنے میں شریک نہیں تھا، اس لئے کہ انہوں نے اس کی کہیں بھی نفی نہیں کی ہے کہ اور کسی نے اس کے قتل کرنے میں شرکت نہ کی ہو۔ یہ روایات تو ایک دوسرے کی وضاحت کرتی ہیں اور واضح کرتی ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کا دعوی یہی تھا کہ اسی کے وار سے اس کا کام تمام ہو گیا، اللہ کے رسول ﷺ نے ان کی تلواروں کا جائزہ لیا اور اس کے بعد یہ فیصلہ سنایا کہ کام تمام کرنے والا وار حضرت عبداللہ بن انیسؓ کی تلوار کے ذریعہ تھا، اس لئے کہ اس پر کھانے کے

اثرات موجود تھے، یعنی یہ تلوار ابو رافع کے پیٹ میں داخل ہوئی تھی اور اس کی انتڑیوں کو چیر دیا تھا۔ (دیکھیں: الصراع مع الیہود: 1/189)

کتب سیرت میں اس سریہ میں حضرت عبداللہ بن عتیکؓ کے علاوہ دیگر شریک صحابہ کرام کے نام بھی مذکور ہیں اور وہ ہیں: حضرت مسعود بن سنان، حضرت عبداللہ بن انیس، حضرت ابو قتادہ حارث بن ربعی اور خزاعہ بن اسود (رضی اللہ عنہم اجمعین)۔ (دیکھیں: صلح الحدیبیہ، باشمیل، ص 91)

اس سریہ میں بہت سے اسباق ودروس اور عبرتیں موجود ہیں جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

ا: اس سریہ میں شریک تمام افراد قبیلۂ خزرج سے تعلق رکھتے تھے، ان کی تمنا تھی کہ وہ اپنے اوسی بھائیوں کے ساتھ تنافس کریں جنہوں نے کعب بن اشرف کو قتل کیا تھا، یہ خیر کے کام میں مسابقہ، تنافس اور مقابلہ کرنے والے گھوڑوں کی طرح آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تھے، وہ مال ومنصب اور مظاہرِ دنیا کو حاصل کرنے کے لئے مقابلہ آرائی نہیں کرتے تھے، بلکہ اللہ کی رضا اور اخروی سعادت کے حصول کے لئے اور نبی کریم ﷺ کو راضی کرنے کے لئے ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔ (دیکھیں: التاریخ الاسلامی: 6/177)

۲: دشمن کی زبان سیکھنے کا فائدہ:

حضرت عبداللہ بن عتیکؓ ابو رافع کے قلعہ میں پہنچنے میں کامیاب ہوگئے، انہوں نے اس کی بیوی سے بات بھی کی اور اطمئنان کے ساتھ اس کے گھر میں داخل ہوئے، اس لئے کہ اس وقت انہوں نے اس کے ساتھ یہود کی زبان میں بات کی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلموں کی زبان سیکھنا مستحب ہے، خاص طور پر اعدائے دین کی زبان سیکھنا ضروری ہے اور ان لوگوں کے لئے سیکھنا ضروری ہے جو خبر رسانی کے مشن پر جانے کا کام کرتے ہیں، دشمن کے بارے میں خبریں اور معلومات جمع کرتے ہیں اور قیادت کو وہ تمام معلومات فراہم کرتے ہیں اور قیادت بھی ان معلومات کے مطابق منصوبہ بندی کرتی ہے۔(دیکھیں: الصراع مع الیہود: 1/191)

۳: حضرت ابن عتیکؓ کے منصوبہ کی کامیابی کے عناصر:

ان کا اکیلے جانا؛ انہوں نے یہ طے کیا کہ وہ قلعہ کی جانب اکیلے جائیں گے اور اس میں داخل ہونے کی کوشش کریں گے اور وہاں سے جائزہ لیں گے کہ کس طرح اپنے دستہ کے دیگر افراد کو اس میں داخل کریں گے۔ اسی طرح ان کی نقل وحرکت ایک عام انسان کی سی تھی جس کی وجہ سے پہرہ داروں میں سے کسی نے بھی ان کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ پہرہ دار کو بھی انہوں نے دھوکہ اور وہم میں رکھا اور اس کو یہ باور کرایا کہ وہ قضائے حاجت کے لئے بیٹھے ہیں، اس کی وجہ سے پہرہ دار نے ان کو بغور دیکھنے، ان کے بارے میں چھان بین کرنے اور ان

کے چہرہ کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ قلعہ میں داخل ہونے کے بعد اور اس کو بند کرنے کے بعد انہوں نے پہرہ دار کی نقل و حرکت کا باریک بینی سے جائزہ لیا، وہ ایسی جگہ چھپ گئے جہاں سے پہرہ دار ان کو نہیں دیکھ پا رہا تھا، وہ پہرہ دار کو بغور دیکھتے رہے یہاں تک کہ اس نے متعینہ جگہ پر قلعہ کی چابی رکھی اور وہ اس کو دیکھتے رہے یہاں تک کہ وہ واپس چلا گیا۔ اس کے بعد انہوں نے خود چابی لی اور چابی کا جیسے چاہا استعمال کیا۔(دیکھیں: الصراع مع الیہود: 1/192)

۴: اہلِ ایمان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نصرت و مدد:

یہ جلیل القدر صحابی اللہ تعالیٰ کی مدد سے چلتے رہے اور اپنی طرف سے پوری کوشش کرتے رہے، یہاں تک کہ جب ان کا پیر زخمی بھی ہو گیا لیکن ان کو ایسا لگ رہا تھا کہ ان کو کوئی بیماری ہے ہی نہیں، اور جب انہوں نے اپنا مشن مکمل کر لیا اور اب مزید جد وجہد کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی تو اس وقت ان کو پھر سے تکلیف ہونے لگی، اس کے بعد ان کے ساتھی ان کو اٹھا کر لے گئے، جب نبی کریم ﷺ سے انہوں نے اپنی صورت حال بیان کی تو آپؐ نے ان سے فرمایا: اپنا پیر پھیلاؤ! کہتے ہیں: میں نے اپنا پیر پھیلایا، آپؐ نے اس پر اپنا ہاتھ پھیرا، ایسا لگا جیسے کہ اس میں کبھی کوئی تکلیف تھی ہی نہیں۔(صحیح بخاری: 4039)

۵: ابن حجرؒ نے اس سے مندرجہ ذیل فوائد اور اسباق اخذ کئے ہیں، فرماتے ہیں: اس حدیث میں یہ احکام و فوائد معلوم ہوتے ہیں: اس مشرک کو قتل کرنا جائز ہے جس کو دعوت پہنچ گئی ہو لیکن وہ بغاوت پر مصر ہو، اور اس شخص کو قتل کرنا جائز ہے جس نے رسول اللہ ﷺ کے خلاف اپنے ہاتھ کے ذریعہ یا مال یا زبان کے ذریعہ مدد کی ہو، اہلِ حرب کے بارے میں تجسس کرنا، ان پر اچانک حملہ کرنا اور مشرکین سے جنگ کرنے میں شدت اختیار کرنا جائز ہے۔ اسی طرح مصلحت کے طور پر کسی بات کو مبہم رکھنا جائز ہے، مسلمانوں کی کم تعداد کا زیادہ مشرکین سے تعرض کرنا جائز ہے، دلیل اور علامت کے ذریعہ کوئی حکم معلوم کرنا، اس لئے کہ ابن عتیکؓ نے ابو رافع کو اس کی آواز کے ذریعہ پہچانا اور موت کا اعلان کرنے والے کے ذریعہ اس کے مرنے کا یقین کر لیا۔ واللہ أعلم۔(فتح الباری: 7/400)

۶: اس سریہ میں حضرت عبداللہ بن انیسؓ کا ایک سپاہی کی حیثیت سے شریک ہونا، وہ اس سریہ میں امیر نہیں تھے؛ اس کے ذریعہ تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں اہم پہلو سامنے آتا ہے، حضرت عبداللہ بن انیسؓ عقبی اور بدری صحابی ہیں، قبلتین کی جانب نماز پڑھنے والے ہیں، وہ سابقین اولین انصار میں سے ہیں اور عبداللہ بن انیسؓ جہاد و فتوحات اور کارہائے نمایاں انجام دینے میں کوئی نئے اور اجنبی نہیں ہیں، اس کا ذکر ضروری ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو تنہا سفیان بن خالد ہذلی کو مکہ کے مضافات میں قتل کرنے کے لئے عسکری مہم پر بھیجا تھا، جو مدینہ پر حملہ آور ہونے کی بھرپور تیاری کر رہا تھا اور حضرت عبداللہؓ نے اس مہم میں بہترین کامیابی حاصل کی اور اس کو اس کے خیمہ میں اس کے بستر پر قتل کیا اور اس کی قوم ان کو پکڑنے میں بے بس رہی اور کامیاب اور فاتح ہو کر صحیح سالم واپس آگئے، ان کی سیرت کارہائے نمایاں سے لبریز ہے لیکن اس کے باوجود وہ اس دستے کے امیر نہیں تھے بلکہ اس کے ایک سپاہی کی حیثیت سے شریک تھے۔

اس میں اہم تربیتی سبق موجود ہے جس کو صحابہ کرام اچھی طرح سمجھتے تھے،اس طرح کی تربیت کی عالمِ ارضی میں کوئی نظیر نہیں ملتی ہے، عام افواج میں یہ ہوتا ہے کہ منصب بڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ سینیئر و متقدم جونیئر اور نئے آنے والے پر آرڈر چلاتا ہے اور جونیئر کے پاس سمع و طاعت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا ہے اگرچہ سینیئر جونیئر کا یہ فرق چند ماہ اور چند دنوں کا ہی کا کیوں نہ ہو۔ اس اصول اور ضابطہ کے اعتبار سے حضرت عبداللہ بن انیسؓ سے کوئی آگے نہیں بڑھ سکتا تھا، لیکن یہ عظیم نبوی تربیت ہے جس کا اظہار سیرت میں کئی مقامات پر ہوتا ہے تاکہ امت مسلمہ کے افراد اپنے اسلاف سے سیکھتے رہیں، اللہ کے رسول ﷺ نے بارہا ایسے فوجی دستے روانہ فرمائے جن میں ابو بکرؓ اور عمرؓ لشکر میں ایک عام سپاہی کی حیثیت سے شریک تھے۔(التربیۃ القیادیۃ: 4/148)

۲: یُسَیر بن رِزَام یہودی کی جانب سریہ عبداللہ بن رواحہؓ:

اللہ کے رسول ﷺ کو یہ اطلاع ملی کہ سلام بن ابی الحقیق کے بعد خیبر میں یُسَیر بن رِزام نے شمال کے یہود کو جمع کرنا شروع کیا ہے اور وہ ان کو رسول اللہ ﷺ کے خلاف بغاوت کرنے پر آمادہ کر رہا ہے، اس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ وہ غفار کے قبائل کو بھی جمع کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور ان کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے تیار کر رہا ہے۔ جب اللہ کے رسول ﷺ کو یہود کے اس مکر و فریب اور خفیہ سازش کا علم ہوا تو آپؐ نے مناسب سمجھا کہ کوئی اقدام کرنے سے پہلے اس کے بارے میں اچھی طرح تحقیق کر لیں، اس لئے آپؐ نے حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کو صحابہ کرام کی ایک جماعت کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ اس کی تحقیق کریں کہ یہود اور ان کا ساتھ دینے والے مشرکین کیا تانا بانا بُن رہے ہیں۔(الیہود فی السنۃ المطہرۃ: 1/388)

نبوی انٹیلیجنس نے یُسَیر بن رِزام کے بارے میں چھان بین اور تحقیق کر کے اس کے بارے میں یقین حاصل کر لیا، اس لئے اللہ کے رسول ﷺ نے تیس شہسواروں پر مشتمل ایک دستہ بھیجا، ان کا امیر حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کو مقرر کیا، اس سریہ میں حضرت عبداللہ بن انیسؓ بھی شریک تھے، یہ تمام صحابہ کرام اس کے پاس پہنچے اور اس سے کہا: ہمیں تمہارے پاس رسول اللہ ﷺ نے بھیجا ہے تاکہ وہ آپ کو خیبر کا گورنر مقرر کر دیں، وہ مسلسل اس کو تیار کرتے رہے یہاں تک کہ وہ تیس آدمیوں کو لے کر ان کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گیا، ان میں سے ہر ایک کے ساتھ مسلمانوں کا ایک شخص بیٹھا تھا اور وہ عبداللہ بن انیسؓ کے ساتھ ان کے اونٹ پر بیٹھا تھا، یہاں تک کہ جب وہ خیبر سے چھ میل کی دوری پر "قرقرہ ثیار" پہنچے تو یُسَیر کو رسول اللہ ﷺ کی طرف نکلنے پر ندامت کا احساس ہوا، اس نے اپنے ردیف ابن انیسؓ کی تلوار کی طرف اپنا ہاتھ بڑھانے کی کوشش کی لیکن حضرت عبداللہؓ سمجھ گئے، اس کو پکڑا اور تلوار سے اس پر وار کیا اور اس کی ایک ٹانگ کاٹ ڈالی، یُسَیر نے اپنی لاٹھی سے ان پر وار کیا اور حضرت عبداللہ کے چہرے پر اس کو مارا، جس سے ان کا سر زخمی ہو گیا، اس کے بعد ہر مسلمان اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے یہودی پر ٹوٹ پڑا اور سب کو قتل کر دیا، سوائے ایک شخص کے جو بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ جب ابن انیسؓ رسول اللہ

ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے ان کے زخم پر اپنا لعابِ دہن لگایا، اس کے بعد نہ ہی اس میں خون نکلا اور نہ ہی تکلیف ہوئی۔ (سیرت ابن ہشام: 3/266، السیرۃ النبویۃ فی ضوء المصادر الاصلیہ، ص 477، البدایہ والنہایہ، سن 11ھ)

یہ سریہ سن چھ ہجری ماہ شوال میں ہوا۔

اس سریہ سے حاصل ہونے والے دروس واسباق مندرجہ ذیل ہیں:

۱: نبوی منصوبہ یہ تھا کہ یہود اور مسلمانوں کے مابین بہنے والی خون کی ندی کو بند کر دیں اور حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کا کردار اس اعتبار سے سب سے زیادہ اہم تھا، لیکن یہود کے دلوں میں موجود نفرت وحسد اور مسلمانوں کے خلاف ان کے اندر موجود زہر نے اس منصوبہ پر پانی پھیر دیا اور یہ منصوبہ ناکام ہو گیا، انہوں نے ہر مرتبہ مسلمانوں کے ساتھ دھوکہ دہی اور بدعہدی کی کوشش کی اور ہر مرتبہ ان کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

۲: حالتِ جنگ میں اگر طاقت وقوت مضبوط اور فیصلہ کن نہ ہو تو دشمن کے ساتھ مقابلہ نتیجہ خیز نہیں ہوتا ہے اور پھر جنگ میں تمام وسائل و اسباب اور صلاحیتیں ختم ہو کر رہ جائیں گی، اس لئے ضروری ہے کہ دشمن کے دل میں دھاک اور خوف پیدا کر کے اس کو مرعوب کر دیا جائے اور جب بات چیت اور گفتگو سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہو تو پھر اس کے ساتھ سختی اختیار کرنا ضروری ہے اور اس کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جائے جس کے ذریعہ اس کو اچھی طرح یہ محسوس ہو جائے کہ اس کا مدمقابل کسی ملامت گر کا خوف نہیں کھاتا ہے۔

۳: سن چھ ہجری میں دشمن کے مقابلہ میں سخت فیصلہ کن کاروائیاں دیکھنے کو ملتی ہیں، ہر ماہ میں ایک یا دو سریے اور فوجی مہمات ہوتی ہیں جن کو صحرا میں بھیجا جاتا ہے، کبھی وہ کسی جمعیت کو منتشر کرتے ہیں، یا کسی دشمن کو پاش پاش کرتے ہیں، یا پھر کسی طاغوت اور سرکش کا خاتمہ کرتے ہیں۔ چنانچہ اس مرحلہ کا شعار تھا: "اب ہم ان پر حملہ آور ہوں گے وہ ہم پر حملہ آور نہیں ہو سکتے ہیں"۔ اسی لئے اللہ کا یہ گروہ اللہ کا نام لے کر آفاق میں نکل جاتا تھا، ان کے پاس بلند اقدار اور ہمیشہ رہنے والا ضابطۂ حیات تھا جس کو وہ تمام مخلوق کے سامنے پیش کرتے تھے اور اس نظامِ حیات کی راہ میں رکاوٹ بننے والے ہر طاغوت کو ہٹانے کا کام کرتے تھے۔ ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ اللہ کی اس جماعت کے تمام افراد جنہوں نے اخلاقی، فکری، عسکری اور سیاسی ہر اعتبار سے اعلیٰ تربیت حاصل کی تھی کس طرح اس نظام حیات کو نافذ کرتے ہیں، اور ان کا طرزِ عمل اور کردار ان کے پیش کئے ہوئے ضابطۂ حیات کی عملی ترجمانی کرتا تھا اور وہ مسلسل پیش قدمی کر رہے تھے تاکہ ایک نئے مرحلہ کی باگ ڈور اور قیادت ان کے ہاتھ میں آجائے جس کے آثار وعلامات اور نشانِ راہ صلح حدیبیہ کے ساتھ ہی شروع ہو رہے تھے۔ (دیکھیں: التربیۃ القیادیۃ: 4/189)

....

تیرہویں فصل

فتح مبین "صلح حدیبیہ"

پہلا باب

تاریخ، اسباب اور مکہ کی جانب رسول اللہ ﷺ کا خروج

ا: تاریخ واسباب:

سن چھ ہجری کے ماہِ ذی قعدہ کی پہلی تاریخ بروز پیر رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ سے مکہ کی جانب اپنے اصحاب کے ساتھ روانہ ہوئے، تاکہ عمرہ کی ادائیگی کر سکیں۔ اس غزوہ کا سبب یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ میں ایک خواب دیکھا تھا، جس خواب کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ مکہ میں اپنے مسلمان اصحاب کے ساتھ حالتِ احرام میں عمرہ کی ادائیگی کے لئے داخل ہوتے ہیں اور آپؐ خانہ کعبہ کی تعظیم و تقدیس کرتے ہوئے اپنے ساتھ ہدی (قربانی کا جانور) بھی لائے تھے۔ اس کی خوشخبری نبی کریم ﷺ نے اپنے اصحاب کو بھی دی جس کی وجہ سے وہ بہت زیادہ خوش ہوئے، اس لئے کہ مکہ گئے ہوئے اور خانہ کعبہ کی زیارت کئے ہوئے کافی عرصہ ہو گیا تھا۔ خانہ کعبہ کی محبت ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی، وہ اس کی عظمت کے سامنے جھک جاتے تھے، اسلام نے ان کے اس ارتباط و تعلق اور محبت و شوق میں مزید اضافہ کر دیا تھا، خانہ کعبہ کا طواف کرنے کے لئے ان کے دل تڑپتے تھے اور اس موقع کے لئے انتظار کر رہے تھے، مہاجرین کو مکہ جانے کا سب سے زیادہ اشتیاق تھا، اس لئے کہ ان کی پیدائش اور نشو نما اسی کے سائے میں ہوئی تھی اور ان کو اس سے شدید محبت تھی لیکن ان کو خانہ کعبہ کی زیارت سے روک دیا گیا تھا، جب اللہ کے رسول ﷺ نے ان کو اس بات کی اطلاع دی تو انہوں نے اس عظیم سفرِ زیارت کے لئے تیاری شروع کر دی۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویۃ للندوی، ص: 273)

اللہ کے رسول ﷺ نے مدینہ کے آس پاس کی آبادیوں میں رہنے والے اہلِ دیہات اور اعراب سب کو ساتھ چلنے کا اعلان فرما دیا، اس لئے کہ آپ ﷺ کو اس بات کا اندیشہ تھا کہ قریش کے لوگ آپؐ کو بیت حرام سے روک دیں گے، مدینہ کی انٹیلیجنس کو اس بات کا علم ہو چکا تھا کہ قریش نے مدینہ منورہ کے جنوب اور شمال میں خیبر کے باشندوں کے ساتھ عسکری معاہدہ کر لیا ہے اور اس اتحاد اور معاہدہ کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی ریاست کو دونوں طرف سے گھیر کر اس کے اسلامی وجود کو ہی وہاں سے ختم کر دیا جائے، اس لئے اس اتحاد کو سیاسی طور پر توڑنا ضروری تھا، چنانچہ خانہ کعبہ تمام عربوں کے نزدیک صرف قریش کی ملکیت نہیں تھا بلکہ وہ ان کے جد امجد اسماعیل-علیہ السلام- کا ورثہ تھا، اس لئے قریش کو کسی طرح یہ حق نہیں تھا کہ وہ جس کو چاہیں اس کی زیارت سے روک دیں اور جس کو چاہیں اس کی اجازت دے دیں، اس لئے محمد ﷺ اور آپؐ کے اصحاب کو بھی خانہ کعبہ کی زیارت کا حق تھا۔ (دیکھیں: قراءۃ سیاسیۃ للسیرۃ النبویہ، ص: 213-214)

قبائل عرب کے درمیان رسول اللہ ﷺ کی روانگی کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور اس خبر کے عام ہونے کا رائے عامہ پر بڑا اثر تھا، خاص طور پر جبکہ رسول اللہ ﷺ نے یہ تاکید فرمائی تھی کہ آپؐ جنگ کا ارادہ نہیں رکھتے ہیں بلکہ آپؐ عمرہ ادا کرنا چاہتے ہیں اور اللہ

کے شعائر کی تعظیم کرنا چاہتے ہیں، اس عظیم عمل کے ذریعہ رائے عامہ کو ہموار بنانے کے بہت زیادہ فوائد حاصل ہوئے، اس لئے کہ نبی کریم ﷺ کا ہدف بالکل واضح اور اعلانیہ تھا اور وہ تھا: عمرہ کی ادائیگی کی غرض سے بیت اللہ کی زیارت۔ اس لئے آپ ﷺ اور آپؐ کے اصحاب نے سلے ہوئے کپڑے اتار دیئے اور احرام کا لباس زیب تن کر لیا اور ہدی کو قلادہ پہنانے اور اس کا اشعار (قربانی کے جانور کا نشان) کر کے 'ذوالحلیفہ' سے عمرہ کا احرام باندھ لیا۔ (دیکھیں: مرویات الحدیبیہ، ص: 55)

اللہ کے رسول ﷺ اس سلسلہ میں انتہائی محتاط اور چوکنا بھی تھے، چنانچہ آپؐ نے حضرت بشر بن سفیان خزاعیؓ کو خبر رسانی کے لئے پہلے ہی بھیج دیا تھا اور خود نکلنے سے پہلے ہی بیس افراد پر مشتمل ایک ہر اول دستہ بھی روانہ کر دیا تھا، اس سلسلہ میں واقدی کہتے ہیں:

"اللہ کے رسول ﷺ نے عباد بن بشرؓ کو بلایا اور ان کو بیس شہسواروں کے ساتھ ہر اول دستہ کے طور پر پہلے ہی روانہ کر دیا، اس دستہ میں مہاجرین وانصار کے لوگ شامل تھے۔ (مغازی الواقدی: 2/974) اس کے ذریعہ اللہ کے رسول ﷺ کا مقصد یہ تھا کہ اچانک پیش آنے والی کسی متوقع صورتحال کے لئے پیشگی تیاری کر لیں، اسی طرح اس ہر اول دستہ کی ایک ذمہ داری یہ بھی تھی کہ دشمن کے متعلق معلومات حاصل کریں۔ (صلح حدیبیہ، محمد باشمیل، ص: 309)

اللہ کے رسول ﷺ نے ذو الحلیفہ میں حضرت عمرؓ کے مشورہ پر عمل کیا، انہوں نے کہا تھا کہ آپ ایسے لوگوں کے پاس بغیر ہتھیار اور بغیر ساز وسامان کے جارہے ہیں جو آپ کے خلاف بر سر پیکار ہیں، اس لئے اللہ کے رسول ﷺ نے کچھ لوگوں کو مدینہ بھیجا جو وہاں سے ہتھیار اور ساز وسامان لے کر آئیں، اس کے ذریعہ آپ ﷺ کا مقصد یہ تھا کہ ان اعدائے دین کے مقابلہ میں تیار رہیں جو مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لئے مکمل طور پر تیار تھے، اسباب کو اختیار کرنے کے اس ضابطہ پر عمل کرنا نبی کریم ﷺ کا طرزِ عمل ہے جس کو آپ ﷺ نے اختیار کر کے امت کے لئے اسوہ اور نمونہ کا کام کیا، اس لئے کہ اس میں بہت سے فوائد ومصالح ہیں اور اس کے ذریعہ اعدائے دین کی سازشوں کو ناکام بنایا جاسکتا ہے جو ہر وقت مسلمانوں کے درپے رہتے ہیں۔ (دیکھیں: القیادۃ العسکریۃ في عہد الرسول ﷺ، ص: 489)

۲: نبی کریم ﷺ کا عُسفان پہنچنا:

جب اللہ کے رسول ﷺ عُسفان پہنچے تو بشر بن سفیان الکعبی الخزاعی سے آپ ﷺ کی ملاقات ہوئی، انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! قریش نے آپؐ کے کوچ کرنے کے بارے میں سنا تو وہ مقابلہ کے لئے تیار ہیں ان کا حال یہ ہے کہ ان کے ہمراہ عورتیں اور بچے بھی ہیں، انہوں نے چیتے کی کھالیں پہن رکھی ہیں، وہ اللہ کی قسمیں کھا رہے ہیں کہ آپ طاقت کے بل پر ان پر ہرگز داخل نہیں ہو سکتے ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ہائے قریش کی بربادی! ان کو جنگوں نے ختم کر کے رکھ دیا، ان کا کیا نقصان تھا اگر وہ میرے اور لوگوں کے درمیان سے ہٹ جاتے، ؟! اگر وہ مجھے نقصان پہنچانے میں کامیاب ہوں گے تو ان کی مراد پوری ہو جائے گی اور اگر اللہ مجھے ان پر غالب کر دے گا تو وہ اسلام میں داخل ہو جائیں اور ان کا کوئی نقصان نہیں ہوا ہوگا۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو پھر جنگ کرتے اور اس حال میں جنگ

کرتے کہ ان کے پاس طاقت و قوت ہو، لہذا قریش کے لوگ کیا سمجھتے ہیں؟ اللہ کی قسم! میں اس دین کی خاطر ان کے ساتھ مسلسل جہاد کرتا رہوں گا جس کو لے کر اللہ نے مجھے بھیجا ہے یہاں تک کہ یہ گردن تن سے جدا ہو جائے۔ (سیرت ابن ہشام، محمد ﷺ، محمد رضا)

جب اللہ کے رسول ﷺ کو قریش کے بارے میں خبر ملی کہ وہ آپ ؐ کو بیت اللہ سے روکنے کے لئے تیاری کر رہے ہیں تو آپ ؐ نے صحابہ کرام کے ساتھ مشورہ کیا اور آپ ؐ نے اس سلسلہ میں ان کے سامنے دو آراء پیش کیں، جن کے ذریعہ عزم و حوصلہ کا اظہار ہوتا تھا:

۱: جو لوگ قریش کی اعانت پر کمر بستہ ہیں ہم ان کے اہل و عیال پر ٹوٹ پڑیں۔

۲: بیت اللہ کا رخ کریں اور جو اس سے روکنے کی کوشش کرے گا اس کے ساتھ لڑیں، تاکہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکیں، جب آپ ﷺ نے اس سلسلہ میں صحابہ کرام سے مشورہ لیا تو حضرت ابو بکر صدیق ؓ نے اپنی رائے پیش کی اور ان کی یہ رائے دلیل کے ساتھ تھی۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو مشورہ دیا کہ ان سے قتال نہ کیا جائے اور عمرہ کی ادائیگی کے جس مقصد سے نکلے ہیں اسی ارادہ کے ساتھ آگے بڑھتے رہیں، یہاں تک کہ اگر جنگ ہو بھی تو آغاز انہی کی طرف سے ہو، نبی کریم ﷺ نے اس رائے کو پسند فرمایا اور اسی پر عمل کرتے ہوئے لوگوں کو آگے بڑھنے کا حکم دیا، اور جب مشرکین کا لشکر مسلمانوں کے قریب آگیا تو نبی کریم ﷺ نے مقام عُسفان میں صحابہ کرام کو صلاۃ الخوف پڑھائی۔ (دیکھیں: ملامح الشوریٰ فی الدعوۃ الاسلامیہ، شیخ عدنان النحوی، ص:160)

۳: رسول اللہ ﷺ کا راستہ بدلنا اور حدیبیہ میں قیام کرنا:

اور جب رسول اللہ ﷺ کو اس بات کی اطلاع ملی کہ قریش آپ کا راستہ روکنے کے لئے نکلے ہیں اور آپ ﷺ کے لئے اور آپ ؐ کے اصحاب کے لئے خالد بن ولید کی قیادت میں گھات میں بیٹھے ہوئے ہیں، آپ ؐ ان کے ساتھ تکرار کرنا نہیں چاہتے تھے، اس لئے آپ ﷺ نے مناسب سمجھا کہ اسلامی لشکر کے راستے کو تبدیل کر لیں تاکہ مشرکین کے ساتھ ٹکراؤ کی نوبت نہ آئے، آپ ﷺ نے دریافت کیا: کون شخص ہے جو ہمیں کسی دوسرے راستے سے لے کر جائے گا؟ قبیلۂ اسلم میں سے ایک شخص نے کہا: میں، اے اللہ کے رسول ؐ! وہ مسلمانوں کو ایک پُر پیچ راستے سے لے کر گیا جو گھاٹیوں کے درمیان سے ہو کر گزرتا تھا اور مسلمانوں کے لئے اس میں چلنا بڑا دشوار گزرا یہاں تک کہ ایک میدانی سرزمین میں وادی کے کنارے پر پہنچ گئے، اس وقت اللہ کے رسول ﷺ نے لوگوں سے کہا: کہو، ہم اللہ سے مغفرت طلب کرتے ہیں اور اس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ لوگوں نے ایسا ہی کہا: آپ ﷺ نے فرمایا: واللہ! ''یہ وہی حِطّۃ (استغفار) ہے جس کو بنی اسرائیل کے سامنے پیش کیا گیا تھا لیکن انہوں نے اس کو زبان سے ادا نہیں کیا تھا''۔ (سیرت ابن ہشام: 3/338)

اس کے بعد اللہ کے رسول ﷺ نے لوگوں کو حکم دیا کہ 'حَمش' کے درمیان گزرتے ہوئے دائیں جانب کترا کر ایسے راستہ پر چلیں جو ثنیۃ المرار' پر نکلتا تھا، آپ ؐ مکہ کے زیریں علاقہ میں حدیبیہ میں اترے، لشکر اس راستہ پر آہستہ آہستہ بنا شور اور ہنگامے کے چلتا رہا، کسی کو اس کا احساس بھی نہیں ہوا۔ خالد بن ولید ؓ کو اس وقت پتہ چلتا ہے جب وہ دیکھتے ہیں کہ اسلامی لشکر کی وجہ سے غبار اٹھ رہا ہے، انہوں نے تیزی کے

ساتھ گھوڑے کو ایڑھ لگائی اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ مکہ کا رخ کیا تاکہ قریش کو اس نئی صورتحال کے خطرہ سے آگاہ کریں اور ان کو اس اچانک پیش آنے والی صورتحال کے بارے میں تیاری کرنے کا حکم دیں۔ مشرکین خوف وہراس کی صورتحال سے دوچار ہو گئے اور ان کو اچانک پتہ چلا کہ اسلامی لشکر حدیبیہ میں پڑاؤ ڈال چکا ہے اور مکہ اب خطرہ میں ہے اور اب اس کو مسلمانوں کی طرف سے براہِ راست چیلنج کا سامنا ہے۔(السیرۃ النبویہ، لأبی فارس، ص:374)

میجر جنرل محمود شیت خطاب اس ضمن میں رقمطراز ہیں: مسلمانوں کا اس راستہ کو اختیار کرنا مخالف لشکر کے خوف کی وجہ سے نہیں تھا، اس لئے کہ جو اپنے دشمن سے ڈرتا ہے وہ اس کے اصلی مرکز کے قریب نہیں جاتا ہے، بلکہ وہ دشمن کے اصلی مرکز سے دور رہنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ دشمن کے سفر کے راستہ کو طویل تر کر دے، اور اس کے ذریعہ اس کی مشکلات اور پریشانیوں میں اضافہ ہوتا ہے اور اصل مرکز سے قریب ہونے کے بجائے دور رہتے ہوئے کامیابی کے مواقع کم ہو جاتے ہیں۔(دیکھیں: الرسول القائد، محمد شیت خطاب، ص:186-187)

کتاب "اقتباس النظم العسکریۃ فی عہد الرسول ﷺ" میں بیان کیا گیا ہے جس سے راستہ کی تبدیلی کی حکمت کی وضاحت ہوتی ہے، ذکر کیا گیا ہے کہ: "راستہ میں رہنمائی کرنے والوں کے انتخاب اور پُرامن راستوں کو اختیار کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بیدار مغز اور صاحبِ بصیرت قیادت اپنے لشکر کے چلنے کے لئے ایسے راستے اختیار کرتی ہے جو خطرات اور مشکلات سے دور ہوں، اور ایسے راستوں کو اختیار کرنے سے گریز کرتی ہے جن کی وجہ سے لشکر دشمن کے حملوں کا نشانہ بنتا ہے۔(دیکھیں: السیرۃ النبویۃ، لابی فارس، ص:374، اقتباس النظم العسکریہ، ص: 258)

۴: قصواء کا بیٹھ جانا:

"قصواء اڑی نہیں ہے اور نہ ہی یہ اس کی عادت ہے، بلکہ اس کو ہاتھی کو روکنے والے نے روکا ہے"۔

جب اللہ کے رسول ﷺ حدیبیہ کے قریب پہنچے تو آپؐ کی القصواء نامی اونٹنی بیٹھ گئی، صحابہ کرام کہنے لگے: قصواء اڑ گئی، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "قصواء اڑی نہیں ہے اور نہ ہی یہ اس کی عادت ہے، بلکہ اس کو ہاتھی کو روکنے والے نے روکا ہے"۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے! یہ لوگ جس معاملہ کا بھی مطالبہ کریں گے جس میں اللہ کی حرمتوں کی تعظیم ہوتی ہو تو میں ضرور تسلیم کر لوں گا۔(السیرۃ النبویۃ فی ضوء المصادر الاصلیہ، ص:484)

اس کے بعد آپ ﷺ نے اس اونٹنی کو ڈانٹا تو وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی، پھر آپؐ نے راستہ میں تبدیلی کی اور اقصائے حدیبیہ میں ایک کم پانی والے کنویں کے پاس قیام کیا، جلد ہی لوگوں نے اس کا تمام پانی ختم کر دیا، اس کے بعد رسول اللہ ﷺ سے پیاس کی شکایت کی، آپؐ نے ترکش سے ایک تیر نکالا اور حکم دیا کہ اس کو کنویں میں ڈال دو، اس کے بعد کنویں سے مسلسل پانی ابلتا رہا یہاں تک کہ تمام لوگ سیراب ہو گئے۔(ایضاً، ص:484)

ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کنویں کے کنارے پر بیٹھ گئے، اس کے بعد آپؐ نے پانی منگوایا اور کلی کر کے اس کنویں کے میں ڈال دیا۔ (فتح الباری، حدیث نمبر: 3577)

دونوں کے درمیان تطبیق کی صورت یہ ہے کہ دونوں چیزیں ایک ساتھ پیش آئی ہوں، جیسے کہ ابن حجرؒ نے ذکر کیا ہے، واقدی اور عروہ نے جو کچھ ذکر کیا ہے اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، انہوں نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک ڈول میں کلی کی اور اس کو کنویں میں تھوکا اور اپنے ترکش سے ایک تیر نکالا اور اس کو اس میں ڈال کر دعا کی جس کے بعد وہ اُبل پڑا۔ (السیرۃ النبویۃ فی ضوء المصادر الاصلیہ، ص: 484)

رسول اللہ ﷺ کی اونٹنی کے بیٹھنے اور اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کے قسم کھانے میں اسباق و دروس ہیں جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

۱: اس کائنات میں ہر چیز اللہ کے حکم اور اس کی مشیت کے ساتھ چلتی ہے اور کوئی چیز اللہ کی مشیت وارادہ سے باہر نہیں نکل سکتی ہے، غور کیجئے رسول اللہ ﷺ کی اونٹنی کہاں بیٹھتی ہے اور کس طرح صحابہ کرام اس کے بیٹھنے کو ناپسند کرتے ہیں اور اس کو اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ وہ بدستور چلتی رہے اور پھر وہ بیت حرام کی طرف اپنے سفر کو جاری رکھ سکیں، چاہے نتائج جو بھی ہوں لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ہی کچھ تھی۔ (صلح الحدیبیہ، لأبی فارس، ص: 43)

۲: ابن حجر عسقلانیؒ نے رسول اللہ ﷺ کے اس قول "لیکن اس کو اونٹ کو روکنے والے نے روکا ہے" سے اہم ایک فائدہ مستنبط کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: "اس قصہ میں کسی چیز کے عمومی پہلو کو مد نظر رکھتے ہوئے تشبیہ دینے کا جواز ملتا ہے اگرچہ مخصوص پہلو مختلف ہی کیوں نہ ہو، اس لئے کہ اصحاب الفیل محض باطل پر تھے جبکہ ان اونٹنی والے محض حق پر تھے، لیکن تشبیہ اس پہلو کے اعتبار سے دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ تھی کہ حرم کی حفاظت کی جائے۔ (فتح الباری، ابن حجر: 6/61)

۳: اس سے حاصل ہونے والے فوائد واسباق میں سے ایک سبق یہ بھی ہے کہ اہلِ بدعت وفجور اور باغی اور ظالم جب کسی ایسے معاملہ کا مطالبہ کریں جس کے ذریعہ اللہ کی محرمات کی تعظیم چاہتے ہوں تو ان کے اس مطالبہ کو تسلیم کیا جائے گا اور مطالبہ پورا کر کے اس کی معاونت بھی کی جائے گی، اگرچہ دوسری چیزوں کو وہ تسلیم نہ کریں، اس لئے ایسی چیز میں ان کی معاونت کی جائے گی جس میں اللہ کی حرمت کی تعظیم ہو، نہ کہ ان کے کفر اور ظلم وزیادتی پر۔ (دیکھیں: صلح الحدیبیہ، لأبی فارس، ص: 47)

۴: اللہ عزوجل نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اس غزوہ میں مسلمانوں اور اہل مکہ مشرکین کے مابین قتال اور ٹکراؤ نہ ہو، اس کی حکمتیں بعد میں ظاہر ہوئیں جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

أ: مسلمانوں کے بزورِ بازو اور طاقت کے ذریعہ داخل ہونے کا مطلب یہ تھا کہ وہاں قتل عام ہوتا اور بہت سی جانیں تلف ہوتیں اور فریقین کا خون ہوتا اور اللہ تعالیٰ نے ایسی صورتحال پیدا ہونے کے اسباب ہی ختم کر دیئے اور اس میں اہلِ ایمان اور مشرکین دونوں کی مصلحت تھی۔

ب: اس بات کا احتمال تھا کہ مؤمنین کے ہاتھوں مکہ میں موجود ان کے بعض کمزور مسلمانوں کو بھی ایذا و تکلیف اور قتل و جلاوطنی کا سامنا کرنا پڑتا، اس لئے کہ وہ مشرکین سے اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھے ہوئے تھے، اس طرح کا نقصان پہنچنا کسی مسلمان کی طرف سے زیب نہیں دیتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿هُمُ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ وَصَدُّوكُمْ عَنِ ٱلْمَسْجِدِ ٱلْحَرَامِ وَٱلْهَدْىَ مَعْكُوفًا أَن يَبْلُغَ مَحِلَّهُۥ ۚ وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُونَ وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنَٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوهُمْ أَن تَطَـُٔوهُمْ فَتُصِيبَكُم مِّنْهُم مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ لِّيُدْخِلَ ٱللَّهُ فِى رَحْمَتِهِۦ مَن يَشَآءُ ۚ لَوْ تَزَيَّلُواْ لَعَذَّبْنَا ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا﴾ ترجمہ: ”وہی لوگ تو ہیں جنہوں نے کفر کیا اور تم کو مسجد حرام سے روکا اور ہدی کے اونٹوں کو اُن کی قربانی کی جگہ نہ پہنچنے دیا اگر (مکہ میں) ایسے مومن مرد و عورت موجود نہ ہوتے جنہیں تم نہیں جانتے، اور یہ خطرہ نہ ہوتا کہ نادانستگی میں تم انہیں پامال کر دو گے اور اس سے تم پر حرف آئے گا (تو جنگ نہ روکی جاتی، روکی وہ اس لئے گئی) تاکہ اللہ اپنی رحمت میں جس کو چاہے داخل کر لے، وہ مومن الگ ہو گئے ہوتے تو (اہل مکہ میں سے) جو کافر تھے ان کو ہم ضرور سخت سزا دیتے“۔ (سورۃ الفتح: 25)

ج: اللہ کے علمِ ازلی میں یہ بات تھی کہ یہی لوگ جو آج رسول اللہ ﷺ اور آپ ؐ کے اصحاب کو مسجد حرام سے روک رہے ہیں، عنقریب اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کو اسلام کے لئے کھول دے گا اور ان کے ذریعہ بہت سے علاقے فتح ہوں گے، جبکہ یہ لوگوں کے سامنے پیغامِ حق لے کر جائیں گے اور تاریکی میں پھنسے ہوئے لوگوں کے لئے تاریک راہوں کو روشن کرنے کا کام کریں گے۔ (دیکھیں: صلح الحدیبیہ، لابی فارس، ص: 45)

۵: رسول اللہ ﷺ اور قریش کے مابین سفارت کاری:

اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی استطاعت کے بقدر انتہائی کوشش کی کہ قریش کو یہ سمجھایا جائے کہ آپ ؐ ان کے ساتھ جنگ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے ہیں، بلکہ آپ بیت اللہ کی زیارت اور اس کی تعظیم کی غرض سے آئے ہیں اور یہ اسی طرح مسلمانوں کا حق ہے جیسے کہ دوسروں کا حق ہے، جب یہ بات قریش کے نزدیک یقینی ہو گئی تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے پاس ایسے شخص کو بھیجا جو آپ ؐ کے ساتھ بات چیت کرے اور مسلمانوں کی طاقت و قوت کا اندازہ کرے اور اگر قتال کی نوبت آئے تو ان کے عزائم اور حوصلوں کو پرکھے، اور ایک مقصد یہ بھی تھا کہ پُر امن طریقوں سے ہی مسلمانوں کا کو خانہ کعبہ کی زیارت سے روک دیا جائے۔

بُدیل بن ورقاء کی قیادت میں خزاعہ کا وفد:

بُدیل بن ورقاء خزاعہ کے کچھ لوگوں کے ساتھ آئے اور خزاعہ کے لوگ اہلِ تہامہ میں سے رسول اللہ ﷺ کے خاص محرم راز اور خیر خواہ لوگ تھے، انہوں نے واضح کر دیا کہ قریش مسلمانوں کو مکہ میں داخل ہونے سے روکنے کے لئے پُر عزم ہیں، اللہ کے رسول ﷺ نے ان کے سامنے اپنی آمد کا سبب واضح کیا اور ان کو بتا دیا کہ جنگ جاری رکھنے کی صورت میں قریش کو کتنا نقصان اٹھانا پڑے گا۔ آپ ﷺ نے ان کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ ایک متعینہ مدت تک اُن کے مابین صلح اور ناجنگ معاہدہ ہو جائے، یہاں تک کہ ان کے سامنے صورتحال واضح ہو جائے اور اگر

وہ یہ تجویز ماننے سے انکار کرتے ہیں تو پھر جنگ کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے اگرچہ اس میں جان بھی گنوانی پڑے، انہوں نے قریش کو یہ تمام باتیں بتا دیں اور ان سے کہا: اے قریش کے لوگو! آپ لوگ محمدؐ کے بارے میں جلد بازی سے کام لے رہے ہو۔ محمدؐ جنگ کی غرض سے نہیں آئے ہیں، بلکہ وہ خانہ کعبہ کی زیارت کی غرض سے آئے ہیں، قریش نے ان کو بھی موردِ الزام ٹھہرایا اور ان کے لئے ناپسندیدہ الفاظ کہے اور کہنے لگے: اگر محمد ﷺ اسی غرض سے آئے ہیں تو اللہ کی قسم! وہ زبردستی داخل نہیں ہو سکتے ہیں اور نہ ہم عربوں کو اس کے متعلق باتیں کرنے کا موقع دیں گے۔ (سیرت ابن ہشام: 3/340، البدایہ والنہایہ (غزوۃ الحدیبیہ)

اللہ کے رسول ﷺ نے جب مشرکین مکہ کے سامنے صلح اور ناجنگ معاہدہ کی تجویز پیش کی اس کے ذریعہ نبی کریم ﷺ کی سیاسی بصیرت کا اظہار ہوتا ہے، اس لئے کہ اس میں بہت سے فوائد ہیں جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

أ: صلح کے ذریعہ قریش کے غیر جانبدار رہنے کی ضمانت تھی اور وہ جزیرۃ العرب میں پیش آنے والی کسی بھی کشمکش سے دور رہیں گے، چاہے یہ کشمکش دیگر عرب قبائل کے ساتھ ہو یا یہود کے ساتھ، یہود وہ غدار اور کمینہ دشمن تھے جو مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے مواقع تلاش کرتے رہتے تھے۔

ب: اللہ کے رسول ﷺ یہ چاہتے تھے کہ آپؐ کے درمیان اور قریش کے درمیان رابطہ کا دروازہ کھلا رہے تاکہ آپؐ بھی ان کی بات سن سکیں اور وہ بھی سفراء اور قاصدوں کے ذریعے آپؐ کی بات سن سکیں، یہ آپسی قربت پیدا کرنے، جنگی ماحول کو ٹھنڈا کرنے اور ان کے جنگی جوش کو ختم کرنے کا ذریعہ بنے گا۔

ج: آپ ﷺ یہ چاہتے تھے کہ بدیل کی قیادت میں آئے ہوئے خزاعہ کے لوگ اور ان کے ساتھ آیا ہوا پورا وفد اس کا ادراک کرلے کہ ان کا حلیف طاقتور ہے، اس کے ذریعہ ان کا اعتماد و بھروسہ مزید مستحکم ہوگا اور آپؐ کے ساتھ اور بنی ہاشم کے ساتھ ان کے معاہدہ میں مزید قوت پیدا ہوگی، اس لئے کہ یہ معاہدہ ابھی باقی تھا اور صلح حدیبیہ کے موقع پر یہ مزید مستحکم ہوا۔

د: عقلمند لوگ جو اپنی عقل سے کام لیتے ہیں جب وہ رسول اللہ ﷺ کے کلام کو سنیں گے اور جان لیں گے کہ آپؐ خانہ کعبہ کی زیارت و تعظیم کی غرض سے آئے ہیں اور مشرکین آپ کو روک رہے ہیں تو یہ عقلاء آپ ﷺ کے ساتھ کھڑے ہو جائیں گے اور آپ کے ساتھ شفقت و ہمدردی کریں گے جس کی وجہ سے آپؐ کا مرکز طاقتور ہوگا اور قریش کا اعلامی اور دینی مرکز کمزور ہو جائے گا۔

ھ: مشرکینِ مکہ بدیل کی باتوں سے مطمئن نہیں ہوئے جو اس نے رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ان کو بتائیں، اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ خزاعہ رسول اللہ ﷺ کے محرم راز اور خیر خواہ لوگ ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ خزاعہ کے لوگ رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی رکھتے ہیں۔ (صلح الحدیبیہ، لأبی فارس، ص: 67)

عروہ بن مسعود ثقفی کی سفارت کاری:

بدیل بن ورقاء نے جب رسول اللہ ﷺ کی طرف سے قریش کو پیغام دیا کہ آپؐ خانہ کعبہ کی زیارت کی غرض سے آئے ہیں اور قتال کی غرض سے نہیں آئے ہیں تو قریش نے اس بات کو تسلیم نہیں کیا، بلکہ انہیں کو موردِ الزام ٹھہرایا اور ان کو ناپسندیدہ باتیں کہیں، اس

لئے عروہ بن مسعود ثقفی نے ان کے سامنے یہ پیشکش کی کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کریں گے اور ان سے براہِ راست بات کر کے یقینی خبر لے کر آئیں گے۔امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں اس کی تفصیل بیان کی ہے، وہ روایت کرتے ہیں کہ "...... عروہ بن مسعود کھڑے ہوئے اور انہوں نے کہا: اے قوم کے لوگو! کیا تم مجھ پر باپ کی طرح شفقت نہیں رکھتے ؟! سب نے کہا: کیوں نہیں! ضرور رکھتے ہیں۔ عروہ نے پھر کہا: کیا میں بیٹے کی طرح تمہارا خیر خواہ نہیں ہوں ؟ انہوں نے کہا: کیوں نہیں!۔ عروہ نے پھر کہا: تم لوگ مجھ پر کسی قسم کی تہمت لگا سکتے ہو ؟ انہوں نے کہا: نہیں۔انہوں نے پوچھا: کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ میں نے عکاظ والوں کو تمہاری مدد کے لئے کہا تھا اور جب انہوں نے انکار کیا تو میں نے اپنے گھرانے، اولاد اور ان تمام لوگوں کو تمہارے پاس لا کر کھڑا کر دیا تھا جنہوں نے میرا کہنا مانا تھا؟ قریش نے کہا: کیوں نہیں (آپ کی باتیں درست ہیں)۔اس کے بعد انہوں نے کہا: دیکھو اب اس شخص (نبی کریم ﷺ) نے تمہارے سامنے ایک اچھی تجویز رکھی ہے، اسے تم قبول کر لو اور مجھے اس کے پاس (گفتگو) کے لئے جانے دو، سب نے کہا: آپ ضرور جائیے، چنانچہ عروہ بن مسعودؓ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ سے گفتگو شروع کی۔آپؐ نے ان سے بھی وہی باتیں کہیں جو آپؐ بدیل سے کہہ چکے تھے، عروہؓ نے اس وقت کہا؛اے محمدؐ! بتاؤ، اگر آپؐ نے اپنی قوم کو تباہ کر دیا تو کیا اپنے سے پہلے کسی بھی عرب کے متعلق سنا ہے کہ اس نے اپنے خاندان کا نام ونشان مٹا دیا ہو ؟! لیکن اگر دوسری بات واقع ہوئی (یعنی ہم آپؐ پر غالب ہوئے) تو میں خدا کی قسم! تمہارے ساتھیوں کا منہ دیکھتا ہوں، یہ پنج میل لوگ یہی کریں گے، اس وقت یہ سب لوگ بھاگ جائیں گے اور آپ کو تنہا چھوڑ دیں گے۔ اس پر ابو بکرؓ بولے: امصص بظر اللات (ابے جا! لات بت کی شرمگاہ چوس لے) کیا ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس سے بھاگ جائیں گے اور آپؐ کو تنہا چھوڑ دیں گے ؟! عروہ نے پوچھا: کون صاحب ہیں؟ لوگوں نے بتایا کہ ابو بکرؓ ہیں۔ عروہ نے کہا: اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر تمہارا مجھ پر ایک احسان نہ ہوتا جس کا اب تک میں بدلہ نہیں دے سکا ہوں تو تمہیں ضرور جواب دیتا۔(صحیح البخاري: 2731)

عروہ بن زبیر نے کوشش کی کہ مسلمانوں کو ایک نفسیاتی جنگ میں مبتلا کر دیں تاکہ معنوی اعتبار سے ان کو شکست دے دیں، اس لئے انہوں نے افواہ اور پروپیگنڈہ کا اسلوب اختیار کیا، اس کا اظہار اس سے ہوتا ہے جبکہ انہوں نے قریش کی عسکری قوت کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا اور صورتحال کے بارے میں مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہوئے ایسی منظر کشی کی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ صورتحال لامحالہ قریش کے حق میں سازگار ہونے والی ہے اور مسلمانوں کی صفوں میں اختلاف وانتشار پیدا ہوگا، اس نے کوشش کی کہ قائد اور اس کے سپاہیوں کے مابین اعتماد و بھروسہ کو کمزور کرے، اسی لئے اس نے کہا تھا کہ میں ایسے چہرے دیکھ رہا ہوں جو پنج میل لوگ ہیں، یہ سب آپ کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے اور آپ کو تنہا چھوڑ دیں گے، ایسا اس نے اس لئے کیا تاکہ مسلمانوں کی نفسیات پر اثر انداز ہو اور قریش کے عسکری اور اعلامی اہداف بھی پورے ہوں۔اس نے مزید یہ بھی کوشش کی کہ نبی کریم ﷺ اور آپؐ کے اصحاب کے مابین ایک بڑی عسکری خلیج پیدا کرے تاکہ وہ ان کی نفسیات پر اثر انداز ہو اور ان کے عزائم اور حوصلوں کو توڑ دے۔یہ خطرناک نفسیاتی جنگ کا اسلوب تھا جس کو اس بات چیت کے دوران مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا گیا، عروہ نے کوشش کی کہ مسلمانوں کو قریش کی طاقت و قوت کے بارے میں خوفزدہ کر کے ان کو مرعوب کرے اور معرکہ کی ایسی منظر کشی کی جیسے کہ وہ ان کے حق اور مفاد میں نہیں ہے، عروہ بن مسعود نے اپنی اس بات چیت میں نفسیاتی جنگ کے تمام

عناصر استعمال کئے، جیسے کہ افواہ اور پروپیگنڈہ، مصنوعی صورتحال کی منظر کشی اور رعب اور خوف وہراس پیدا کرنے کی کوشش، لیکن یہ تمام عناصر اور یہ تمام اسالیب گہرے ایمان، باریک بینی پر مبنی افراد سازی اور سیسہ پلائی ہوئی اسلامی صفوں کے سامنے زمین بوس اور ناکام ہو کر رہ گئے۔(دیکھیں: منہج الاعلام الاسلامی فی صلح الحدیبیہ، سلیم حجازی، ص131-132)

عروہ بن مسعود کے ساتھ بات چیت کے دوران جو عجیب وغریب صورتحال پیش آئی اوراس کے ذریعہ اس ایمانی قوت کی واضح اور قطعی دلیل ملتی ہے جس سے صحابہ کرام سرشار تھے اوراس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس دینِ حق کے اندر کتنی زبردست صلاحیت ہے کہ ایک سرکش انسان کوایک فاضل اور بہترین انسان میں تبدیل کر دیتا ہے۔ چنانچہ جب آپ ﷺ کے ساتھ عروہ بن مسعود بات چیت کر رہے تھے اس وقت حراست اور پہرہ کی ذمہ داری مغیرہ بن شعبہؓ ادا کر رہے تھے۔ حضرت مغیرہؓ نے حدیبیہ سے پہلے اسلام قبول کیا، حدیبیہ میں موجود تھے، بیعت رضوان میں موجود تھے، جنگ یرموک میں آپؓ کی آنکھ زخمی ہوئی اور سعد بن ابی وقاصؓ کی طرف سے رستم کے پاس آپ کو قاصد کی حیثیت سے بھیجا گیا۔(دیکھیں: الاصابۃ: 3/453)

یہ عروہ بن مسعود کے بھتیجے تھے اور اسلام قبول کرنے سے پہلے حضرت مغیرہؓ ایک لڑاکو، نشیلے اور ڈاکو قسم کے انسان تھے، لیکن اسلام میں داخل ہونے سے اسلام نے ان کو ایک دوسرے انسان میں تبدیل کر دیا، اللہ کے فضل سے وہ اہل ایمان کی ممتاز صف میں شامل ہو گئے، ایسی صورتحال میں جبکہ جنگ کے بادل منڈلا رہے تھے۔ ان کا انتخاب ایسی صورتحال میں نبی کریم ﷺ کی حراست وپہرداری کے لئے کیا گیا، بات چیت کے دوران جاہلی طریقہ یہ تھا کہ بات کرنے والا گفتگو کے دوران اس شخص کی داڑھی پکڑتا تھا جس کو وہ اپنا ہم پلہ اور ہمسر سمجھتا تھا، اسی قاعدہ کے مطابق عروہ بن مسعود رسول اللہ ﷺ کی داڑھی بات چیت کے دوران پکڑ رہا تھا، جس کی وجہ سے مغیرہ بن شعبہؓ ناراض ہو گئے، جو رسول اللہ ﷺ کے پاس تلوار لے کر آپ کی حفاظت کر رہے تھے اوران کے چہرہ پر خود تھی۔ انہوں نے اپنے چچا کو ڈانٹا اوران کے ہاتھ پر تلوار کا دستہ مار کر ان سے کہا: رسول اللہ ﷺ کی داڑھی سے اپنا ہاتھ پیچھے کر لو اور نبی کریم ﷺ مشرک عروہ اوران کے مؤمن بھتیجے کے درمیان ہونے والی گفتگو پر مسکرا رہے تھے۔

چونکہ مغیرہ بن شعبہ اپنے جنگی لباس کے ساتھ تلوار لٹکائے ہوئے اور زرہ پہنے ہوئے کھڑے تھے اوران کے چہرے پر خود تھی، اس لئے ان کے چچا عروہ کے لئے ان کو پہچاننا ممکن نہیں تھا، اس لئے ان کے چچا نے نبی کریم ﷺ سے انتہائی غصہ کی حالت میں کہا: میں کیوں نہیں سمجھ رہا ہوں، اے محمد! یہ کون ہے جس کو میں تمہارے ان ساتھیوں میں سے آپ کے ساتھ دیکھ رہا ہوں؟ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: یہ آپ کے بھتیجے مغیرہ بن شعبہ ہیں، ان کے چچا نے ان سے کہا: اے دغاباز! تو ہے! تم نے ہمارے درمیان ہمیشہ ہمیش کے لئے عداوت ودشمنی کی داڑیں ڈال دی ہیں۔ واللہ! میں نے تمہاری دغابازی کے داغ کل ہی دھوئے ہیں، حضرت مغیرہؓ زمانۂ جاہلیت میں کچھ لوگوں کے ساتھ رہے تھے، ان کو قتل کر دیا تھا اوران کا مال لے لیا تھا، اس کے بعد انہوں نے آکر اسلام قبول کیا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا: جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو اس کو میں قبول کرتا ہوں اور جہاں تک مال کا تعلق ہے تو اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

عروہ کی سفارت کاری ناکام ہو گئی اور بالآخر وہ واپس آگیا اور قریش کو آگاہ کر دیا کہ کہیں نبی کریم ﷺ کے ساتھ مسلح کشمکش میں پھنس نہ جائیں اور ان سے کہا: اللہ کی قسم! میں دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں کے پاس گیا ہوں، میں نے قیصر وکسری اور نجاشی کا دربار بھی دیکھا ہے، بخدا! میں نے کسی بادشاہ کو نہیں دیکھا کہ اس کے مصاحبین اس کی تعظیم وتوقیر کرتے ہیں جتنی صحابہ کرام آپؐ کی تعظیم وتوقیر کرتے ہیں، قسم بخدا! جب وہ ناک صاف کرتے ہیں تو اس کی ریزش صحابہ کرام اپنی ہتھیلی میں لے لیتے ہیں، اور اس کو اپنے چہرہ پر مل لیتے ہیں، جب وہ کوئی حکم دیتے ہیں تو وہ لوگ اس کی تعمیل میں دوڑ پڑتے ہیں، جب وہ وضو کرتے ہیں تو وضو کا پانی لینے کے لئے ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑتے ہیں، جب وہ کچھ کہنے لگتے ہیں تو ان کی آوازیں پست ہو جاتی ہیں، آپؐ کی تعظیم میں وہ نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے ہیں۔(صحیح البخاري: 2731)

اس نے مزید کہا: اچھی طرح جان لو کہ اگر تم جنگ کرتے ہو تو وہ بھی تمہارے خلاف جنگ کریں گے، میں نے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جن کو اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے کہ ان کا انجام کیا ہو گا، جب کہ وہ اپنے صاحب کی حفاظت کرنے کے لئے ڈٹ جائیں گے۔ واللہ! میں نے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو کبھی بھی کسی حال میں ان کو تمہارے حوالے نہیں کر سکتے ہیں، اس لئے دیکھ لو کیا کرنا ہے، ہاں کمزور رائے اختیار کرنے سے باز رہنا، اے میری قوم! ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھالو اور اس نے جو تجویز رکھی ہے اس کو مان لو، میں تمہارا خیر خواہ ہوں، وہ شخص اس گھر کی تعظیم کے لیے آیا ہے اور اس کے ساتھ ہدی بھی ہے، وہ اس کو قربان کر کے واپس چلا جائے گا۔ یہ سن کر قریش کے لوگوں نے کہا: اے ابو یعفور! (عروہ بن مسعود کی کنیت) یہ باتیں مت کرو، اگر تمہارے علاوہ اور کوئی ایسی باتیں کرتا تو ہم اس کی ملامت کرتے، لیکن اس سال ہم اس کو خانہ کعبہ آنے نہیں دیں گے اور وہ آئندہ سال آسکتے ہیں۔ (مغازی الواقدی: 2/598)

نفسیاتی جنگ اور اس کے اثرات مسلمانوں کی صفوں کے بجائے قریش کی صفوں میں منتقل ہوئے، عروہ نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اس کی منظر کشی بالکل سچی اور حقیقت کے عین مطابق تھی، اس نے قریش کے سامنے حدیبیہ میں مسلمانوں کی صورتحال کی عکاسی کی کہ وہ اپنے نبی کی انتہائی اطاعت کرتے ہیں، ان سے محبت کرتے ہیں اور ان کا دفاع کرنے کے لئے مر مٹتے ہیں اور ان کے حوصلے انتہائی بلند ہیں، وہ عسکری اور نفسیاتی طور پر ناقابل تصور حد تک تیار ہیں، یہ قریش کے لئے ایک عملی تنبیہ اور آگہی تھی کہ فیصلہ کرنے میں جلدی نہ کرنا، اور نبی کریم ﷺ اور ان کے اصحاب کے ساتھ جنگ کرنے کی غلطی نہ کرنا، اس لئے کہ اس کے نتائج مسلمانوں کے حق میں ہوں گے، اس کی وجہ سے قریش کے زعماء کے ہوش اڑ گئے اور یہ سب کچھ قریش کی توقعات سے باہر تھا۔

سردار ثقیف کی ہر بات زعمائے قریش کے کانوں پر بجلی بن کر گری، اللہ تعالیٰ نے ان سے بہت بڑا کام لیا، یہ سب کچھ من جانب اللہ تھا، اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی وجہ سے قریش کے کیمپ میں انتشار اور اختلاف پیدا ہونا شروع ہو گیا اور قریش کی قوت مستحکم حق کے سامنے تحلیل ہونا شروع ہو گئی، اور نبی کریم ﷺ کے خلاف عربوں کو جمع کرنے کے بارے میں قریش کے تمام دلائل ریت کا ڈھیر ثابت ہوئے۔

نبی کریم ﷺ کو اپنی حکمت وذہانت کی وجہ سے عظیم کامیابی ملی، آپ ﷺ نے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے مختلف اعلامی اور ڈپلومیٹک اسالیب اور طریقے اختیار کئے اور قریش کے داخلی محاذ کو منتشر کر دیا، ان کو شکست خوردگی کی نفسیات سے دوچار کر دیا اور ان کے حلفاء کو ان سے دور کر دیا، یقیناً یہ عظیم الشان کامیابی تھی جس کو رسول اللہ ﷺ نے سیاسی، اعلامی اور عسکری اعتبار سے حاصل کیا۔ (دیکھیں: منہج الاعلام الاسلامی فی صلح الحدیبیہ، ص: 145)

حُلیس بن علقمہ کی سفارت کاری:

اس کے بعد قریش نے احابیش کے سردار حُلیس بن علقمہ کنانی کو سفارت کاری کے لئے بھیجا، جب اللہ کے رسول ﷺ نے اسے دیکھا تو فرمایا: یہ شخص ایک ایسی قوم سے تعلق رکھتا ہے جو ہدی کی جانوروں کی تعظیم کرتے ہیں، لہذا اس کے سامنے ہدی کے جانور بھیجو تا کہ وہ ان کو دیکھ لے اور آپ ﷺ نے زور زور سے تلبیہ پڑھنے کا حکم دیا، جب حُلیس نے دیکھا کہ وادی سے ہدی کے جانور آرہے ہیں اور ان کے گلے میں قلادے پڑے ہوئے ہیں تو وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچنے سے پہلے ہی قریش کے پاس واپس لوٹ گیا اور ہدی کے جانوروں کی تعظیم میں اس نے ایسا کیا۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویہ فی ضوء المصادر الاصلیہ، ص: 488)

چنانچہ یہ وادی سوکھی اور قحط زدہ تھی، اس میں کہیں پانی نہیں تھا اور نہ ہی کہیں چارہ تھا، ہدی کے جانور طویل قیام کی وجہ سے اپنی مینگنیاں کھانے پر مجبور ہو گئے تھے اور اس نے مسلمانوں کو دیکھا جو اس کے سامنے بلند آواز سے تلبیہ پڑھ رہے تھے، وہ حالتِ احرام میں تھے اور طویل عرصے سے احرام کی حالت میں ہونے کی وجہ سے وہ پراگندہ حال ہو چکے تھے، اس لئے اس نے سختی کے ساتھ قریش کے طرزِ عمل کو ناپسند کیا اور بنو کنانہ کا یہ سردار جہاں سے آیا تھا نبی کریم ﷺ سے گفتگو کئے بغیر ہی واپس چلا گیا، حالانکہ وہ گفت وشنید کے لئے آیا تھا، اس نے قریش کے طرزِ عمل کو بیت اللہ کے زائرین کے حق میں ظلم وزیادتی تصور کیا اور کسی کے لئے اس کی تائید کرنا یا اس سلسلہ میں قریش کی مدد کرنا درست نہیں تھا، اس لئے وہ قریش کے خلاف سراپا احتجاج بن کر واپس گیا اور قریش نے حُلیس کے صاف صاف موقف کی وجہ سے اس کے تئیں ناراضگی کا اظہار کیا اور انہوں نے کوشش کی کہ اس صورتحال کا تدارک کیا جائے جو قریش کے عسکری اعتبار سے بکھرنے کے لیے ایک خطرہ اور چیلنج بن گئی تھی، اسی طرح اس کے ذریعہ قریش اور احابیش کے مابین حلیفانہ معاہدہ کو بھی خطرہ لاحق تھا، انہوں نے احابیش کے سردار سے کہا: جو کچھ آپ نے دیکھا ہے یہ محمدؐ اور اس کے اصحاب کی ایک چال ہے، لہذا خاموش رہو یہاں تک کہ ہم اپنے لئے جو فیصلہ کرنا چاہیں وہ ہم خود کر لیں۔ (دیکھیں: منہج الاعلام الاسلامی فی صلح الحدیبیہ، ص108، المغازی للواقدي: 2/600)

نبی کریم ﷺ حُلیس کی شخصیت اور اس کی نفسیات کو اچھی طرح جانتے تھے، اسی لئے آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ "یہ ایک ایسی قوم کا شخص ہے جو ہدی کے جانوروں کی تعظیم کرتے ہیں"۔ اس کے ذریعہ پتہ چلتا ہے کہ نبی کریم ﷺ اس شخص کے بارے میں مکمل معرفت رکھتے تھے اور اسی معرفت کی بنیاد پر آپ ﷺ نے اس کی شخصیت کا موضوعی جائزہ لیا تھا اور معلوم کر لیا تھا کہ یہ حرمات اور مقدسات کی تعظیم اور محبت سے سرشار قوم ہے، لہذا اس کے اس پہلو سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، اس لئے آپ ﷺ نے ایک مناسب و مستحکم منصوبہ بندی کی جس کے ذریعہ تمام حقائق کو اس شخص کے سامنے پیش کرنا اور مسلمانوں کے موقف اور صورتحال کو دکھانا ممکن تھا جس کی وجہ سے کم از کم وہ اس کشمکش میں غیر جانبداری اختیار کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔

قابل ذکر یہ ہے کہ حُلیس تمام عربوں میں ایک اچھی شخصیت اور شہرت کے ذریعہ معروف تھا، اس لئے کہ وہ عقل و دانش کی حیثیت سے اور احابیش کی فوج کے لیڈر اور قائد کی حیثیت سے امتیازی مقام رکھتا تھا، اسی طرح نبی کریم ﷺ کی طرف سے بھی اور قریش کی

طرف سے بھی اس کو برابر عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، لہذا اگر اس کے سامنے مسلمانوں کی طرف سے حق اور عدل واضح ہو جائے گا تو فریقین کے مابین صلح کرانے میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے، قریش کی سرکشی کو کم کرنے، مسلمانوں کے خلاف دشمنانہ موقف کو ختم کرانے اور مسجد حرام سے ان کو روکنے کے طرزِ عمل کو تبدیل کرا سکتا تھا، اس اعتبار سے نبی کریم ﷺ کے ذریعہ اس کی شخصیت کا جائزہ مکمل طور پر اس کے تصورات اور افکار کے بالکل عین مطابق تھا، اسی لئے اس منصوبہ بندی کے نتائج واثرات بھی مکمل طور پر مثبت اور نتیجہ خیز تھے۔

اس طرح سے نبی کریم ﷺ عروہ بن مسعود اور حُلیس بن علقمہ دونوں پر اثر انداز ہونے میں کامیاب ہو گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشرکینِ مکہ کی صفوں میں دراڑیں پیدا ہونا شروع ہو گئیں۔ (منہج الاعلام الاسلامی فی صلح الحدیبیہ، ص: 111، عبقریۃ محمد ﷺ، العقاد، ص: 49)

مکرَز بن حفص کی سفارت کاری:

قریش کے سفراء میں ایک سفیر حدیبیہ کے دن مکرز بن حفص بھی تھا، امام بخاریؒ نے اس سلسلہ میں تفصیلی روایت بیان کی ہے، فرماتے ہیں: ".....ان میں سے ایک شخص کھڑا ہوا جس کو مکرز بن حفص کہا جاتا تھا، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: یہ مکرز ہے اور وہ ایک فاجر شخص ہے، وہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ بات چیت کرنے لگا، اسی درمیان کہ وہ بات کر رہا تھا تب تک سہیل بن عمرو آگئے۔ معمر (راوی) کہتے ہیں: مجھ سے ایوب نے عکرمہ کے حوالے سے بیان کیا کہ جب سہیل بن عمرو آئے تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "اب تمہارے لئے تمہارا معاملہ آسان ہو گیا"۔ سہیل کے بارے میں تفصیلات آگے آ رہی ہیں۔

٦: قریش کی جانب نبوی وفود اور مسلمانوں کے ذریعہ بعض گرفتاریاں:

نبی کریم ﷺ نے مناسب سمجھا کہ قریش کی جانب کسی خاص قاصد کو بھیجنا ضروری ہے جو ان کو مسلمانوں کے مثبت اور اچھے ارادوں کے بارے میں باخبر کرے کہ وہ قتال اور جنگ نہیں چاہتے ہیں، بلکہ وہ مقدسات کا احترام کرتے ہیں اور وہ مناسکِ عمرہ ادا کر کے مدینہ واپس جانے کا ارادہ رکھتے ہیں، لہذا اس سلسلہ میں نگاہِ انتخاب خِراش بن امیہ خزاعی پڑی کہ وہ قریش کی جانب رسول اللہ ﷺ کے سفیر اور قاصد ہوں۔ وہ "ثعلب" نامی اونٹ پر سوار ہو کر گئے، جب وہ مکہ میں داخل ہوئے تو قریش نے ان کے اونٹ کو ذبح کر دیا اور خِراش کو بھی قتل کرنا چاہا لیکن احابیش نے ان کو ایسا کرنے سے منع کر دیا، خراش بن امیہ رسول اللہ ﷺ کے پاس واپس آگئے اور قریش نے جو کچھ کہا اس کے بارے میں آپ ﷺ کو آگاہ کر دیا، اللہ کے رسول ﷺ نے چاہا کہ ایک دوسرے سفیر کو بھیجیں جو قریش تک رسول اللہ ﷺ کا پیغام پہنچائے، ابتدائی مرحلہ میں رسول اللہ ﷺ کی نگاہِ انتخاب حضرت عمر بن خطابؓ کی جانب گئی لیکن انہوں نے قریش کے پاس جانے سے معذرت کر لی اور رسول اللہ ﷺ کو مشورہ دیا کہ حضرت عثمانؓ کو ان کی جگہ بھیجیں۔ (دیکھیں: غزوۃ الحدیبیہ، لأبی فارس، ص: 83، المغازی للواقدي: 2/600)

حضرت عمرؓ نے اپنی رائے واضح دلیل کے ساتھ پیش کی اور بتایا کہ جو بھی ان دشمنوں کے پاس جائے گا اس کو حمایت و تحفظ حاصل ہونا ضروری ہے اور حضرت عمرؓ اس حیثیت سے موزوں نہیں تھے، اس لئے انہوں نے مشورہ دیا کہ حضرت عثمانؓ کو ان کی جگہ بھیجا جائے، اس لئے کہ ان کا قبیلہ اور خاندان وہاں ان کو مشرکین کی ایذاء سے بچائے گا اور وہ رسول اللہ ﷺ کا پیغام اچھی طرح پہنچا سکیں گے، حضرت عمرؓ نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا: مجھے اپنے بارے میں قریش کی طرف سے اندیشہ ہے، وہ جانتے ہیں کہ میں ان کے ساتھ کس قدر عداوت رکھتا ہوں، اور وہاں بنو عدی میں سے کوئی نہیں ہے جو میری حفاظت کر سکے اور اگر آپ چاہیں، اے اللہ کے رسولؐ! میں ان کے پاس جاؤں گا، اس پر اللہ کے رسول ﷺ نے کچھ بھی نہیں فرمایا، حضرت عمرؓ نے فرمایا: اے اللہ کے رسولؐ! البتہ میں آپ کو ایک ایسا شخص بتاتا ہوں جو مکہ میں مجھ سے زیادہ صاحبِ عزت اور مقام و مرتبہ کا حامل ہے اور اس کا خاندان بھی بڑا اور مضبوط ہے، وہ ہیں: عثمان بن عفانؓ!

اللہ کے رسول ﷺ نے عثمانؓ کو بلایا اور کہا: آپ قریش کے پاس جائیں اور ان کو بتادیں کہ ہم کسی سے لڑنے نہیں آئے ہیں، بلکہ ہم اس گھر کی زیارت کرنے آئے ہیں، ہم اس کی تعظیم کرتے ہیں، ہمارے ساتھ ہدی ہے، ہم ان قربانی کے جانوروں کو ذبح کر کے واپس چلے جائیں گے، حضرت عثمان بن عفانؓ نکل پڑے یہاں تک کے مقام 'بلدح' پہنچے اور قریش کے لوگوں سے وہیں ملاقات ہو گئی، انہوں نے پوچھا: کہاں کا ارادہ ہے؟ حضرت عثمانؓ نے جواب دیا: مجھے رسول اللہ ﷺ نے آپ کے پاس بھیجا ہے، وہ آپ کو اللہ کی طرف اور اسلام کی طرف بلاتے ہیں۔ آپ سب لوگ دین میں داخل ہو جائیں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کو غالب کرنے والا اور اپنے نبی کو سربلند کرنے والا ہے، اور دوسری بات یہ ہے کہ آپ لوگ اپنے اس طرزِ عمل سے باز آجائیں، اور یہ طرزِ عمل تمہارے علاوہ اور کوئی اختیار کرے، اگر وہ محمدؐ کو شکست دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو یہی وہ چیز ہے جو تم چاہتے ہو اور اگر محمدؐ کامیاب ہوتے ہیں تو آپ کو اختیار ہو گا کہ آپ بھی اسی دین میں داخل ہو جاؤ جس میں لوگ داخل ہوئے ہوں اور یا پھر قتال کرو، اس حال میں کہ آپ کے پاس طاقت و قوت ہو گی اور آپ تازہ دم ہوں گے، بلاشبہ جنگ نے آپ کو کمزور اور نڈھال کر کے رکھ دیا ہے اور آپ کے نامور لوگوں کو ختم کر دیا ہے......... حضرت عثمانؓ ان کے ساتھ بات چیت کر رہے تھے اور ان کو ایسی باتیں سنا رہے تھے جو وہ نہیں چاہتے تھے اور وہ کہہ رہے تھے: جو آپ کہہ رہے ہو ہم نے یہ سن لیا اور ایسا کبھی نہیں ہو سکتا ہے اور نہ ہی وہ زبردستی ہمارے ہاں داخل ہو سکتے ہیں، لہٰذا اپنے صاحب کے پاس واپس جاؤ اور ان کو بتادو کہ وہ ہم تک نہیں پہنچ سکتے ہیں۔ اسی اثناء میں حضرت عثمانؓ کی طرف اَبان بن سعید بن العاص اٹھ کر آگئے اور ان کا استقبال کیا اور ان کو پناہ دے دی اور ان سے کہا: اپنی ضرورت کی تکمیل میں کوتاہی مت کرو، اس کے بعد وہ اپنے گھوڑے سے نیچے اترے اور حضرت عثمانؓ کو سوار کر کے اپنے پیچھے بٹھایا۔ حضرت عثمانؓ مکہ میں داخل ہوئے اور وہ وہاں کے ایک ایک لیڈر کے پاس گئے جن میں ابوسفیان بن حرب، صفوان بن امیہ اور دیگر سردار شامل تھے۔ ان میں سے بعض کے ساتھ بلدح میں ملاقات ہوئی اور بعض کے ساتھ مکہ میں ملاقات ہوئی اور وہ سب یہی جواب دینے لگے کہ محمدؐ ہمارے ہوتے ہوئے مکہ میں ہرگز داخل نہیں ہو سکتے ہیں۔ (دیکھیں: زاد المعاد: 3/290، سیرت ابن ہشام: 3/344)

مشرکین نے حضرت عثمانؓ کے سامنے یہ پیشکش رکھی کہ وہ خانہ کعبہ کا طواف کر لیں لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ حضرت عثمانؓ نے مکہ کے مستضعفین (کمزور) لوگوں تک رسول اللہ ﷺ کا پیغام پہنچایا اور ان کو خوشخبری سنائی کہ بہت جلد حالات ٹھیک ہونے والے ہیں اور

فتح ونصرت بہت قریب ہے اور ان سے رسول اللہ ﷺ کے نام ایک زبانی پیغام لیا جس میں انہوں نے کہا تھا: اللہ کے رسول ﷺ کو ہماری طرف سے سلام پہنچادیں، بے شک جس ذات نے ان کو حدیبیہ میں آنے کا موقع دیا وہ اس پر بھی قادر ہے کہ ان کو مکہ کی وادی میں داخل کرے۔(دیکھیں: سیرت ابن ہشام: 3/344، زاد المعاد: 3/290، غزوۃ الحدیبیہ، لابی فارس، ص: 85)

صلح کے معاملہ میں مسلمانوں کی مشرکین کے ساتھ تُو تُو میں میں بھی ہوئی، فریقین میں سے ایک شخص نے دوسرے فریق کے شخص کو مارا اور باہمی لڑائی شروع ہوگئی، ایک دوسرے کو تیر اور پتھر مارنے لگے، دونوں فریق چیخنے چلانے لگے، قرآن کریم نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے: ﴿وَهُوَ ٱلَّذِى كَفَّ أَيۡدِيَهُمۡ عَنكُمۡ وَأَيۡدِيَكُمۡ عَنۡهُم بِبَطۡنِ مَكَّةَ مِنۢ بَعۡدِ أَنۡ أَظۡفَرَكُمۡ عَلَيۡهِمۡۚ وَكَانَ ٱللَّهُ بِمَا تَعۡمَلُونَ بَصِيرًا﴾ ترجمہ: ”وہی ہے جس نے مکہ کی وادی میں اُن کے ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ اُن سے روک دئے، حالانکہ وہ اُن پر تمہیں غلبہ عطا کر چکا تھا اور جو کچھ تم کر رہے تھے اللہ اسے دیکھ رہا تھا“۔(سورۃ الفتح: 24)

امام مسلمؒ نے سابقہ آیت کے نزول کے بارے میں روایت کیا ہے: اہلِ مکہ میں سے اسّی لوگ تنعیم پہاڑ سے مسلح ہو کر رسول اللہ ﷺ کی طرف آئے۔ وہ نبی کریم ﷺ اور آپؐ کے اصحاب پر اچانک حملہ کرنا چاہتے تھے، آپؐ نے ان سے ہتھیار ڈلوائے اور ان کو زندہ رکھا، اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت پر نازل فرمائی۔(صحیح مسلم: 1808، مسند احمد: 3/122، سنن ابوداؤد: 2688، سنن ترمذی: 3264)

حضرت سلمہ بن الاکوع اس وقت کی صورتحال بیان کرتے ہیں، فرماتے ہیں: ”.....پھر مشرکین نے ہمارے ساتھ صلح کے پیغاموں کا تبادلہ کیا حتی کہ ہم چل کر ایک دوسرے کے پاس گئے اور ہم نے صلح کرلی۔ کہا: میں طلحہ بن عبید اللہؓ کے تابع (ان کا خادم) تھا، میں ان کے گھوڑے کو پانی پلاتا، اس پر کھریرا پھیرتا تھا، ان کی خدمت کرتا تھا، کھانا بھی ان کے ہاں کھاتا تھا، میں نے اپنا گھر بار اور مال و دولت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف ہجرت کرتے ہوئے چھوڑ دیا تھا۔ کہا: جب ہم نے اور اہل مکہ نے باہم صلح کرلی اور ہم ایک دوسرے سے ملنے جلنے لگے تو میں ایک درخت کے پاس گیا، اس کے (زمین پر گرے ہوئے) کانٹے صاف کئے اور اس کے تنے (کے ساتھ والی جگہ) میں لیٹ گیا، میرے پاس اہلِ مکہ کے چار مشرک آئے اور رسول اللہ ﷺ کے خلاف باتیں کرنے لگے، مجھے ان سے شدید نفرت ہوئی اور میں ایک اور درخت کی طرف چلا گیا، انھوں نے اپنا اسلحہ لٹکایا اور لیٹ گئے، وہ اسی حالت میں تھے کہ کسی آواز دینے والے نے وادی کے نشیب سے آواز دی: اے مہاجرین! خبردار! ابن زُنیم کو قتل کر دیا گیا ہے۔(یہ سن کر) میں نے اپنی تلوار میان سے نکال لی، پھر ان چاروں پر نیند کی حالت میں دھاوا بول دیا، میں نے ان کا اسلحہ چھین لیا اور اس کا گٹھا بنا کر ہاتھ میں لے لیا، پھر میں ان سے نے کہا: اس ذات کی قسم جس نے محمد ﷺ کے چہرہ کو عزت بخشی ہے! تم میں جو بھی اپنا سر اٹھائے گا میں اس کا وہ حصہ تلوار سے اڑادوں گا جس میں اس کی دونوں آنکھیں ہیں۔ (اس کی کھوپڑی اڑادوں گا) پھر میں انھیں ہانکتا ہوا رسول اللہ ﷺ کے پاس لے آیا۔ کہا: میرے چچا عامر بھی ’عبلات‘ (کے گھرانے میں) سے ایک آدمی کو، جسے مکرز کہا جاتا تھا، کھینچتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی طرف لے آئے، جو ستر مشرکوں کے درمیان ایسے گھوڑے پر سوار تھا جس پر زرہ جیسا نمدہ ڈالا ہوا تھا (سوار کے علاوہ گھوڑا بھی جنگ کے لئے مسلح تھا) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”انھیں چھوڑ دو تاکہ بدعہدی کی ابتداء بھی انہی کی طرف سے اور دوسری بار بھی انہی کی طرف سے ہو“۔ رسول اللہ ﷺ نے انھیں معاف فرمادیا۔(اس موقع پر) اللہ نے یہ

آیت نازل فرمائی: ﴿وَهُوَ ٱلَّذِى كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُم بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنۢ بَعْدِ أَنْ أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ۚ وَكَانَ ٱللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا﴾ ''اور وہی ہے جس نے مکہ کی وادی میں تمہیں ان پر غالب کر دینے کے بعد، ان کے ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ ان سے روک دئے، حالانکہ وہ اُن پر تمہیں غلبہ عطا کر چکا تھا اور جو کچھ تم کر رہے تھے اللہ اسے دیکھ رہا تھا''۔(سورۃ الفتح:24) (صحیح مسلم:1807)

جمہور مفسرین نے آیت میں مذکور "بطن مکہ" کو حدیبیہ پر محمول کیا ہے، اس لئے کہ بطن کا اطلاق نچلی جگہ کے لئے ہوتا ہے اور حدیبیہ مکہ سے قریب ہے اور وہ حِل کا حصہ ہے جبکہ اس کی بعض زمین حرم ہے، وہ مکہ اور جدہ کے مابین راستہ پر ہے۔(دیکھیں: التحریر والتنویر:26/184)

۷: بیعتِ رضوان:

جب نبی کریم ﷺ کو یہ خبر معلوم ہوئی کہ حضرت عثمانؓ کو شہید کیا گیا ہے تو آپؐ نے صحابہ کرام کو مشرکین کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے بیعت کے لئے بلایا۔ صحابہ کرام نے آپؐ کی بات پر لبیک کہا اور آپؐ کے ہاتھ پر موت پر بیعت کی۔(صحیح بخاری:4169، صحیح مسلم:1860) سوائے جدّ بن قیس کے، اس نے اپنے نفاق کی وجہ سے بیعت نہیں کی۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ یہ بیعت صبر اختیار کرنے کے بارے میں تھی۔ اور ایک اور روایت میں ہے کہ فرار اختیار نہ کرنے کے بارے میں تھی۔(صحیح مسلم:1856، مسند احمد: 3/396، سنن ترمذی:1594، نسائی:7/140)

ان تمام روایتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے، اس لئے کہ موت پر بیعت کا مطلب ہے: صبر کرنا، جمنا اور فرار اختیار نہ کرنا۔

سب سے پہلے بیعت کرنے والے ابو سفیان عبداللہ بن وہاب اَسدی تھے، اس کے بعد تمام صحابہ کرام نے انہی کی بیعت کے مطابق بیعت کی، حضرت سلمہ بن الاکوع نے تین مرتبہ بیعت کی، ابتدا میں، پھر درمیان میں اور سب سے اخیر میں۔ نبی کریم ﷺ نے دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھ کر فرمایا: یہ عثمان کی طرف سے ہے۔(صحیح بخاری:3698، سنن ترمذی:3706، مسند احمد:1/101، زاد المعاد:3/291)

جن صحابہ کرام سے رسول اللہ ﷺ نے درخت کے نیچے بیعت لی ان کی تعداد چودہ سو تھی۔(دیکھیں: السیرۃ النبویہ فی ضوء المصادر الاصلیہ، ص482)

قرآن کریم نے بیعت رضوان کرنے والوں کا ذکر کیا ہے اور ان کی فضیلت کے بارے میں قرآن کریم اور حدیث میں بہت سے نصوص وارد ہیں، ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ ٱلَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ ٱللَّهَ يَدُ ٱللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ ۚ فَمَن نَّكَثَ فَإِنَّمَا يَنكُثُ عَلَىٰ نَفْسِهِۦ ۖ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِمَا عَٰهَدَ عَلَيْهُ ٱللَّهَ فَسَيُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا﴾ ترجمہ: ''اے نبیؐ، جو لوگ تم سے بیعت

کر رہے تھے وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے تھے، ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا، اب جو اس عہد کو توڑے گا اُس کی عہد شکنی کا وبال اس کی اپنی ہی ذات پر ہوگا، اور جو اُس عہد کو وفا کرے گا جو اس نے اللہ سے کیا ہے، اللہ عنقریب اس کو بڑا اجر عطا فرمائے گا"۔(سورۃ الفتح:10)

اس آیت میں اہلِ بیعت رضوان کی عظیم مدح و تعریف ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ سے بیعت کرنے کو اللہ سے بیعت کرنا قرار دیا ہے اور اس میں صحابہ کرام کے لئے انتہائی اعزاز و تشریف اور تکریم ہے۔

۲: اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں اپنی رضا مندی کا اظہار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے: ﴿لَّقَدْ رَضِيَ ٱللَّهُ عَنِ ٱلْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ ٱلشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنزَلَ ٱلسَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَٰبَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا ۝١٨ وَمَغَانِمَ كَثِيرَةً يَأْخُذُونَهَا ۗ وَكَانَ ٱللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ۝١٩﴾ ترجمہ: "اللہ مومنوں سے خوش ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے، ان کے دلوں کا حال اُس کو معلوم تھا، اس لئے اس نے ان پر سکینت نازل فرمائی، ان کو انعام میں قریبی فتح بخشی اور بہت سامالِ غنیمت انہیں عطا کر دیا جسے وہ (عنقریب) حاصل کریں گے، اللہ زبردست اور حکیم ہے"۔(سورۃ الفتح:18-19)

۳: اللہ تعالیٰ نے بیعتِ رضوان میں شریک صحابہ کے بارے میں بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے کلمۂ تقوی لازم کر دیا ہے جو کہ کلمۂ توحید ہے اور وہ اس کے سب سے زیادہ حقدار اور اہل ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِذْ جَعَلَ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ فِي قُلُوبِهِمُ ٱلْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ ٱلْجَٰهِلِيَّةِ فَأَنزَلَ ٱللَّهُ سَكِينَتَهُۥ عَلَىٰ رَسُولِهِۦ وَعَلَى ٱلْمُؤْمِنِينَ وَأَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ ٱلتَّقْوَىٰ وَكَانُوٓا۟ أَحَقَّ بِهَا وَأَهْلَهَا ۚ وَكَانَ ٱللَّهُ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيمًا﴾ ترجمہ: "(یہی وجہ ہے کہ) جب ان کافروں نے اپنے دلوں میں جاہلانہ حمیت بٹھالی تو اللہ نے اپنے رسول اور مومنوں پر سکینت نازل فرمائی اور مومنوں کو تقویٰ کی بات کا پابند رکھا کہ وہی اُس کے زیادہ حق دار اور اُس کے اہل تھے، اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے"۔(سورۃ الفتح:26)

قرآن کریم میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ حدیبیہ میں بیعت رضوان میں شریک صحابہ کرام کے بارے میں انہی اوصاف کے ساتھ تعریف و توصیف کی گئی ہے، سنت مطہرہ میں بہت سی احادیث میں بھی ان کی ثناء و تعریف وارد ہے، ان میں سے چند احادیث مندرجہ ذیل ہیں:

أ: حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں: ہم سے رسول اللہ ﷺ نے حدیبیہ کے دن فرمایا: "آپ روئے زمین پر سب سے بہتر لوگ ہو"۔ اور ہم چودہ سو لوگ تھے اور اگر میں دیکھ پاتا تو آپ کو اس درخت کی جگہ دکھاتا۔ (صحیح بخاری: 4154، صحیح مسلم: 1856)

یہ حدیث بیعتِ رضوان میں شریک صحابہ کرام کی فضیلت کے بارے میں صریح ہے، چنانچہ اس وقت مسلمان مکہ میں بھی تھے، مدینہ میں بھی اور دیگر مقامات پر بھی۔ اس حدیث کے ذریعہ بعض شیعہ حضرات نے یہ دلیل قائم کی ہے کہ حضرت عثمانؓ کے مقابلہ میں حضرت علیؓ افضل ہیں۔ اس لئے کہ علیؓ ان لوگوں میں شامل تھے جن کو خطاب کیا گیا اور جنہوں نے درخت کے نیچے بیعت کی اور حضرت

عثمانؓ اس وقت غائب تھے، لیکن اس طرح دلیل قائم کرنا باطل اور غلط ہے۔ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت عثمانؓ کی طرف سے بیعت کی تھی۔ اس لئے دونوں اصحاب اس اعتبار سے برابر ہیں اور حدیث میں ان کی ایک دوسرے کے مقابلہ میں فضیلت بیان کرنا مقصود نہیں ہے۔(فتح الباری: 7/443)

ب: جابرؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ مجھ سے اُم مبشر نے بیان کیا کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو حضرت حفصہؓ کے پاس بیان کرتے ہوئے سنا: -ان شاءاللہ- جہنم میں درخت والوں میں سے کوئی بھی داخل نہیں ہوگا جنہوں نے اس درخت کے نیچے بیعت کی۔(صحیح مسلم: 2496، مسند احمد: 6/285، سنن ابن ماجہ: 4281)

ج: امام مسلمؒ نے اپنی سند سے حضرت جعفر بن عبداللہ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کون ہے جو اس گھاٹی (یعنی) مرار کی گھاٹی پر چڑھے گا؟! بے شک اس کے گناہ بھی اسی طرح جھڑ جائیں گے جس طرح بنی اسرائیل کے گناہ جھڑ گئے تھے''۔(حضرت جابرؓ نے) کہا: سب سے پہلے جو اس گھاٹی پر چڑھے وہ ہمارے بنو خزرج کے گھوڑے تھے، پھر لوگوں کا تانتا بندھ گیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم سب وہ ہو جن کے گناہ بخش دیئے گئے، سوائے سرخ اونٹ والے شخص کے''۔ہم اس کے پاس آئے اور (اس سے) کہا: آؤ رسول اللہ ﷺ تمہارے لئے بھی استغفار فرمائیں۔اس نے کہا: اللہ کی قسم! اگر میں اپنی گم شدہ چیز پالوں تو یہ بات مجھے اس کی نسبت زیادہ پسند ہے کہ تمہارا صاحب میرے لئے مغفرت کی دعا کرے۔(حضرت جابرؓ نے) کہا: وہ آدمی اس وقت اپنی گم شدہ چیز کو ڈھونڈنے کے لئے آوازیں لگا رہا تھا۔(صحیح مسلم: 2780)

اس حدیث میں اصحاب حدیبیہ کی عظیم فضیلت بیان کی گئی ہے کہ ان سب کو مغفرت کا پروانہ عطا کیا گیا ہے، اس لئے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی اور ان کی بات پر لبیک کہا۔(دیکھیں: عقیدۃ أہل السنۃ والجماعۃ: 1/212)

بلاشبہ حدیبیہ میں شریک صحابہ کرام کی جماعت کی بعض امتیازی خصوصیات ہیں، جیسے کہ صحیح نصوص میں وارد ہے، چنانچہ وہ روئے زمین کے سب سے بہتر لوگ ہیں، اللہ نے ان کی مغفرت کر دی ہے اور ان میں سے کوئی بھی جہنم میں داخل نہیں ہوگا، یہ جماعت مہاجرین و انصار سابقین اولین پر مشتمل تھی، یہ اہلِ بدر تھے، انہوں نے دونوں قبلوں کی جانب نماز ادا کی۔

جب ہم اس بے نظیر جماعت کا اہلِ بدر کے ساتھ موازنہ کرتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ مہاجرین کی تعداد نصف لشکر تک پہنچ جاتی ہے، بدر میں مہاجرین کی تعداد تراسی تھی اور حدیبیہ میں مہاجرین کی تعداد آٹھ سو تک پہنچ جاتی ہے، مہاجرین کی تعداد میں قابل قدر اضافہ ہوتا ہے اور ان میں اکثریت پڑوس عرب قبائل کی تھی اور بڑے قبائل کے مقابلہ میں یہ چھوٹے قبائل تھے، لیکن ان کے نوجوان مدینہ جاتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کے پرچم تلے شامل ہوتے ہیں، وہ مسجد نبوی میں روزانہ تربیت حاصل کرتے تھے، معرکوں میں عملی تربیت حاصل کرتے تھے، وہاں عسکری اور فوجی تربیت حاصل کرتے تھے اور رب العالمین کی طرف سے بھیجے ہوئے رسول سے براہِ راست دین سمجھتے تھے، مہاجر و انصار سابقین اولین کے اعلی نمونوں کے نقشِ قدم پر چلتے تھے اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے بارے میں ایک دوسرے سے تنافس کرتے تھے، اس لئے دیگر قبائل کے مقابلہ میں ان کو اعزاز و شرف حاصل ہوا، قبیلۂ اسلم اور غفار ان اسلام قبول کرنے

والے قبائل میں سرفہرست تھے اور اس میں حضرت ابوذر غفاریؓ کا کردار سب سے زیادہ بنیادی اور اہم تھا، جو مکہ کے سابقین اولین میں سے تھے اور اس کے بعد اپنی قوم میں بحیثیت داعی کام کرتے رہے، یہاں تک کہ قبیلہ غفار کے ستر گھرانے ان کے ذریعے اسلام سے فیضیاب ہوتے ہیں اور غزوۂ احد کے بعد ان کو مدینہ لے کر آتے ہیں۔ اسی طرح قبیلہ اسلم کو اسلام سے قریب کرنے میں کلیدی کردار حضرت بریدہ بن الحصیب اسلمی کا رہا ہے جو رسول اللہ ﷺ کے مدینہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی آپؐ سے ملے اور اسلام قبول کیا اور آپؓ کے بھی اپنی قوم کے ستر گھرانے تھے۔ (دیکھیں: التربیۃ القیادیۃ: 4/214)

جہاں تک دیگر قبائل کا تعلق ہے جن میں مزینہ، جہینہ، أشجع اور خزاعہ قابل ذکر ہیں تو ان کے نوجوان بھی مدینہ کا رخ کرنے لگے، لیکن ان کی تعداد کم تھی، ان قبائل کی اکثریت شرک پر ہی برقرار رہی، جبکہ مدینہ کے اندر بھی بعض أعراب عظیم تربیتی مرکز سے دور رہے اور ان کو نبوت کے چشمہ صافی سے سیراب اور فیضیاب ہونے کی توفیق نہیں مل پائی، اس لئے پیچھے رہنے والے أعراب کے بارے میں نازل ہونے والی آیات ان پر بجلی کی طرح گرتی تھیں، اس لئے کہ وہ حدیبیہ کی جانب جانے والے اسلامی لشکر سے پیچھے رہ گئے تھے۔ (التربیۃ القیادیۃ: 4/216)

....

دوسرا باب

صلح حدیبیہ اور اس پر مرتب ہونے والے واقعات

➢ سہیل بن عمرو کی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بات چیت:

جب قریش کو بیعت رضوان کے متعلق خبر پہنچی اور ان کے زعماء کو یہ ادراک ہو گیا کہ رسول اللہ ﷺ قتال کے بارے میں پُر عزم ہیں تو انہوں نے سہیل بن عمرو کو اپنے کچھ لوگوں کے ساتھ نبی کریم ﷺ کے ساتھ بات چیت اور مذاکرات کرنے کے لئے بھیجا اور جب اللہ کے رسول ﷺ نے سہیل کو دیکھا تو فرمایا: یہ قوم اب صلح کرنا چاہتی ہے، اس لئے کہ انہوں نے اس شخص کو بھیجا ہے۔ (التاریخ السیاسی والعسکری، ص: 339-340، مغازی الواقدی: 2/602)

سہیل بن عمرو قریش کے ان ممتاز زعماء میں سے ایک اہم لیڈر تھا جو سیاسی تجربہ اور ذہانت اور چالاکی میں معروف تھا، وہ ایک ماہر خطیب بھی تھا، عقل و بصیرت، دور اندیشی اور پختہ رائے رکھتا تھا۔

فریقین نے صلح کی دفعات کے بارے میں بات چیت شروع کی اور یہ اس کے بعد ہوا جبکہ حضرت عثمان بن عفان ؓ واپس آ گئے، فریقین نے ان نکات کا جائزہ لیا جن کا اس صلح نامہ میں شامل ہونا ضروری تھا۔ انہوں نے ان مختلف مسائل کا بھی جائزہ لیا جو ان دونوں کے مابین اختلاف کا سبب تھے، ابتدائی طور پر فریقین بعض نکات پر متفق ہو گئے جبکہ بعض میں اختلاف رہا، ان دفعات کے بارے میں طویل بحث اور لے دے ہوتی رہی، کافی طویل مذاکرات کے بعد فریقین کے نقطہائے نظر میں ہم آہنگی پیدا ہو گئی، معاہدہ کو آخری اور حتمی شکل دینے کے آغاز میں اور اس کو دستاویزی شکل دینے اور آفیشل ڈاکومنٹ بناتے ہوئے بھی فریقین کے مابین بعض نکات پر اختلاف ہوا جس کی وجہ سے معاہدہ کا عمل رکنے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا، چنانچہ جب نبی کریم ﷺ نے متفق علیہ معاہدہ کی تحریر املا کرنا شروع کی تو آپ ﷺ نے حضرت علی بن ابی طالب ؓ -جو یہ معاہدہ تحریر کر رہے تھے- سے فرمایا کہ اس معاہدہ کا آغاز "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کے کلمے سے کریں۔ اس پر قریشی وفد کے سربراہ سہیل بن عمرو کہنے لگا: میں 'رحمن' کو نہیں جانتا ہوں، "باسمک اللھم" لکھیں، صحابہ کرام اس اعتراض پر یک زبان ہو کر کہنے لگے: وہ رحمٰن ہے اور ہم رحمٰن کے سوا کچھ نہیں لکھ سکتے ہیں، لیکن نبی کریم ﷺ نے سیاسی حکمت و بصیرت اور نرمی اور بردباری سے کام لیتے ہوئے کاتب سے فرمایا: لکھو: باسمک اللھم! (دیکھیں: مغازی الواقدی: 2/610)

آپ ﷺ نے اس معاہدہ کو املاء کرانے کے عمل کو جاری رکھتے ہوئے کاتب سے فرمایا کہ لکھو: "یہ وہ معاہدہ ہے جس پر رسول اللہ ﷺ نے مصالحت کی ہے"۔ جملہ مکمل کرنے سے پہلے ہی قریشی وفد کا سربراہ "رسول اللہ" کے الفاظ کے بارے میں اعتراض کرنے لگا اور کہنے لگا: اگر میں جانتا اور مانتا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں تو میں آپ کی مخالفت نہیں کرتا، اور میں آپ کی اتباع کرتا، کیا آپ اپنا اور اپنے والد کا نام "محمد بن عبد اللہ" کو چھوڑ کر اس کے بارے میں بے رغبتی برت رہے ہو؟ اپنا اور اپنے والد کا نام لکھیں۔ (مغازی الواقدی: 2/610)

مسلمانوں نے اس پر اعتراض کیا، لیکن رسول اللہ ﷺ نے اپنی حکمت، تسامح اور دور اندیشی کے ذریعہ اس اختلاف کو بھی ختم کر دیا، اور کاتب کو "رسول اللہ" کا کلمہ مٹانے کا حکم دے دیا جس کی وجہ سے صحابہ کرام نے خاموشی اور سکون اختیار کیا۔

نبی کریم ﷺ نے مشرکین کی بات مان لی کہ "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کی جگہ "باسمک اللھم" لکھ لیا جائے۔ اسی طرح 'رسول اللہ' کے بجائے 'محمد بن عبداللہ' لکھنے کو بھی تسلیم کر لیا۔ مزید اس کو بھی مان لیا کہ "مسلمانوں کے پاس ان کی طرف سے جو بھی آئے گا اس کو مسلمان واپس کریں گے، جبکہ مسلمانوں میں سے جو مشرکین کے پاس جائے گا اس کو وہ واپس نہیں کریں گے"۔ ان تمام امور کو اللہ کے رسول ﷺ نے صلح کی عمومی مصلحت کے پیشِ نظر تسلیم کر لیا اور ان امور میں کوئی نقصان بھی نہیں تھا۔ جہاں تک 'بسم اللہ' اور 'باسمک اللھم' کا تعلق ہے تو ان دونوں کے معنی ایک ہی ہیں۔ اسی طرح 'محمد بن عبداللہ' ہی اللہ کے رسول بھی ہیں، اسی طرح یہاں پر اللہ تعالیٰ کی صفات 'رحمان اور رحیم' کو نہ لکھنے کی وجہ سے ان کی نفی بھی لازم نہیں آتی ہے اور نہ ہی 'رسول اللہ' نہ لکھنے کی وجہ سے آپ ؐ کی رسالت پر کوئی حرف آتا ہے اور ان کے ان مطالبات میں کوئی ضرر اور مفسدہ نہیں ہے۔ مفسدہ اس صورت میں ہوتا جبکہ وہ کسی ایسی چیز کا لکھنے کا مطالبہ کرتے جو جائز نہ ہوتی جیسے کہ ان کے معبودوں کی تعظیم یا اس طرح کی دیگر چیزیں۔

جہاں تک تعلق ہے اس شرط کا کہ "ان کی طرف سے آنے والے شخص کو واپس کیا جائے گا اور مسلمانوں میں سے ان کی طرف جانے والے کسی شخص کو واپس نہیں کیا جائے گا"۔ نبی کریم ﷺ نے اس کی وجہ بھی بیان فرمائی اور اس کی حکمت آپ ؐ نے ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے: "ہم میں سے جو بھی ان کی جانب جائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو دور کر دے، اور ان میں سے جو ہمارے پاس آئے گا اللہ عنقریب اس کے لئے کوئی راستہ اور کشادگی پیدا کرے گا"۔ اور پھر ایسا ہی ہوا جیسے کہ آپ ﷺ نے پیشن گوئی کی تھی۔ (المستفاد من قصص القرآن للدعوۃ والدعاۃ 2/342)

اس کے بعد یہ معاہدہ فریقین کے مابین طے پایا اور یہ دس دفعات پر مشتمل تھا جس میں مندرجہ ذیل نکات تھے:

۱: "باسمک اللھم"۔ ۲: اس معاہدہ پر محمد بن عبداللہ نے سہیل بن عمرو کے ساتھ مصالحت کی۔

۳: اس پر مصالحت کی کہ دس سال تک فریقین جنگ بندی رکھیں گے، اس عرصہ میں لوگ مامون رہیں گے، کسی پر کوئی ہاتھ نہیں اٹھائے گا۔

۴: جو بھی اصحاب محمد ؐ میں سے مکہ میں حج یا عمرہ کرنے کی غرض سے یا تجارت کی غرض سے داخل ہوگا تو اس کی جان ومال مامون ہوں گے، اور جو بھی قریش میں سے مصر یا شام جانے کے لئے مدینہ سے گزرے تو وہ اس کی جان ومال بھی محفوظ ومامون ہوں گے۔

۵: قریش کا جو بھی شخص اپنے ولی کی اجازت کے بغیر محمد ؐ کے پاس آئے گا تو آپ ؐ اس کو واپس کریں گے، اور جو قریش کے پاس محمد ؐ کے لوگوں میں سے آئے گا تو وہ اس کو واپس نہیں کریں گے۔

٦: ہمارے درمیان جان ومال محفوظ ومامون ہوں گے، نہ کوئی خیانت کرے گا اور نہ ہی کسی کا مال چھینا جائے گا۔

۷: جو بھی محمدؐ کے ساتھ معاہدہ کرنا چاہے یا ان کے عقد میں شامل ہونا چاہے وہ آزاد ہے، اور جو قریش کے ساتھ معاہدہ کرنا چاہے یا ان کے عقد میں شامل ہونا چاہے تو وہ اس امر میں آزاد ہے۔ (خزاعہ کے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے: ہم محمد کے عقد اور معاہدہ میں شامل ہیں اور بنو بکر کے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے: ہم قریش کے عقد اور معاہدہ میں شامل ہیں)۔

۸: اس سال آپؐ مکہ میں داخل ہوئے بغیر واپس چلے جائیں گے اور جب اگلا سال آئے گا تو ہم یہاں سے نکل جائیں گے اور آپ اپنے اصحاب کے ساتھ مکہ میں داخل ہوں گے۔ مکہ میں تین دن قیام کریں گے، غیر مسلح ہوں گے، صرف وہ ہتھیار ساتھ ہوں گے جو مسافر اپنے ساتھ رکھتے ہیں، تلواریں میانوں میں ہوں گی۔

۹: یہ ہدی (قربانی) کے جانور جو آپ لے کر آئے ہیں ان کو ہمارے پاس لے کر نہیں آئیں گے۔

۱۰: اس صلح پر مسلمانوں میں سے کچھ لوگ اور مشرکین میں سے کچھ لوگ گواہ ہیں، مسلمانوں میں سے یہ لوگ بطور گواہ تھے: ابو بکر صدیق، عمر بن الخطاب، عبدالرحمن بن عوف، عبداللہ بن سہیل بن عمرو، سعد بن ابی وقاص، محمد بن سلمہ اور اس معاہدہ کے کاتب: علی بن ابی طالب- رضی اللہ تعالی عنہم اجمعین-

مشرکین میں سے یہ لوگ گواہ تھے: مکرز بن حفص اور سہیل بن عمرو۔ (دیکھیں: المعاہدات فی الشریعۃ الاسلامیہ والقانون الدولی، د- محمد الدیک، ص:270-271)

اس معاہدہ کو اسلامی معاہدوں کے لئے ایک بنیاد کی حیثیت سے حاصل ہوئی اور یہ عالمی معاہدوں کے لئے ایک بے نظیر نمونہ بن گیا، اس سے پہلے مذاکرات کئے گئے، اس میں شرائط متعین کی گئیں اور اس میں نبی کریم ﷺ کے اخلاقِ کریمانہ سامنے آگئے کہ آپؐ نے فریقِ ثانی کے مطالبات کو تسلیم کر لیا۔ یہ معاہدہ اس وقت کیا گیا جبکہ مسلمان غالب و طاقتور تھے، وہ کمزور نہیں تھے، ان کے لئے ممکن تھا کہ وہ مشرکین کی شرائط کو تسلیم نہ کریں جن کی وجہ سے بہت سے صحابہ کرام برانگیختہ بھی ہو رہے تھے، لیکن وہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت سے باہر بھی نہیں نکل سکتے تھے، قریش کے سفیر اور قاصد نے مذاکرات کے دوران بعض مواقع پر زیادتی بھی کی اور وہ مسلمانوں کے لشکر کے درمیان گھرا ہوا تھا لیکن اس کو کوئی گزند اور تکلیف نہیں پہنچی، اور نہ ہی مسلمانوں نے اس کو قتل کرنے کی کوشش کی، اس لئے کہ ''سفراء کو قتل نہیں کیا جاتا ہے''۔ لیکن اللہ کے رسول ﷺ اس کو مناتے رہے اور اس کے ساتھ نرمی اور بردباری کے ساتھ پیش آئے یہاں تک کہ آپ ﷺ اس کو مطلوبہ ہدف تک پہنچانے میں کامیاب ہوگئے، اور آپؐ کا مقصد یہ تھا کہ خونریزی سے اجتناب کیا جائے، امن کی فضا قائم کی جائے اور امید تھی کہ شاید قوم حق کو سمجھ جائے، اپنے طرزِ عمل کا جائزہ لے اور اللہ کا کلام سن لے اور اسلامی دعوت ایک نئے مرحلہ میں داخل ہو۔

جب ہم حدیبیہ میں کئے جانے والے معاہدہ کے نصوص پر غور کرتے ہیں تو مندرجہ ذیل نکات اس سے اخذ ہوتے ہیں:

۱: اسلامی معاہدوں کا دیباچہ "بسم اللہ" یا "باسمک اللہم" کے ذریعہ شروع ہوتا ہے جبکہ معاہدوں کے صیغے کے بارے میں عالمی قانون یہ کہتا ہے کہ ''معاہدوں کی تحریر کا آغاز ایسے دیباچے کے ذریعہ کیا جائے گا جس پر فریقین متفق ہوں''۔

قابل غور یہ ہے کہ اسلام میں معاہدوں کی بنیاد اللہ کی ذات پر ہوتی ہے جس کا آغاز اللہ کے نام سے ہوتا ہے، اس لئے کہ وہی دلوں کی نیتوں پر رقیب و حسیب ہے، اور اللہ کا نام ہر اُس دل میں مقدس ہوتا ہے جو اس پر ایمان رکھتا ہے یہاں تک کہ ان لوگوں کے دلوں میں بھی جن کے عقائد بگڑ گئے ہوں، اس لئے کہ وہ اللہ کی ذات کے منکر نہیں ہوتے ہیں بلکہ انہوں نے اللہ کی ذات کے بارے میں اپنے تصورات میں بگاڑ پیدا کیا ہوتا ہے، بعض لوگ کھوکھلے نعروں کے ذریعہ عام لوگوں کے دلوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اللہ کے نام کے بجائے قوم کا یا امت کا نام لے کر آغاز کرتے ہیں اور اس کو مقدس سمجھتے ہوئے ایسا کرتے ہیں لیکن جو بھی اللہ پر ایمان رکھتا ہے وہ اللہ کی قدسیت سے کبھی منحرف نہیں ہو سکتا ہے، اسی لیے اس معاہدہ میں "باسمک اللھم" کے ذریعہ" آغاز کیا گیا۔

۲: دیباچہ میں معاہدوں کے فریقین کا ذکر کیا گیا ہے جیسے کہ عالمی قانون میں ذکر کیا گیا ہے کہ " دیباچہ کے بعد نمائندوں کے نام یا حکومتوں کے نام ذکر کئے جائیں گے جو معاہدہ میں شامل ہیں"۔

۳: معاہدہ کے محرکات واسباب: اس معاہدہ کے آغاز میں اس کا ذکر آیا ہے کہ دس سال تک لوگوں کو جنگ سے دور رکھنے کے لئے صلح کی جائے گی، عالمی قانون کے مطابق بھی اسی طرح اسباب و محرکات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۴: معاہدے کے اصل مضمون اور شرائط کا ذکر: اللہ کے رسول ﷺ نے بھی اس کے بعد اس معاہدہ میں اصل مضمون اور ان شرائط کا ذکر کیا ہے جن پر طرفین کے مابین اتفاق ہوا۔ یہی عالمی قانون میں بھی رائج ہے۔

۵: صلح حدیبیہ کے معاہدہ سے اس بات کا جواز معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست کا سربراہ یا امام دشمن سے صلح کے مطالبہ کا آغاز کر سکتا ہے جبکہ اس میں مسلمانوں کی مصلحت ہو، یہ ضروری نہیں ہے کہ صلح کے مطالبہ کا آغاز فریقِ مخالف کی طرف سے ہی ہو۔

۶: مشرکین کے ساتھ بعض ایسی چیزوں میں مصالحت جن میں مسلمانوں کے حق میں زیادتی ہو، یہ راجح مصلحت کے پیشِ نظر جائز ہے اور اس کے ذریعہ اس سے بڑی مضرت کا دور کرنا مقصود ہو، لہذا اس کے ذریعہ دو مضرتوں میں سے کم نقصان دہ مضرت کو برداشت کرنا مقصود تھا۔

۷: صلح حدیبیہ کو اللہ تعالیٰ نے فتح قرار دیا ہے، اس لئے کہ لغوی اعتبار سے فتح کے معنی: بند چیز کو کھولنا ہے۔ اور حدیبیہ میں مشرکین کے ساتھ جو صلح ہوئی یہ ایک بند اور مسدود چیز تھی جس کو اللہ تعالیٰ نے کھول دیا اور صلح کے ذریعہ بند اور مقفل دل فریقِ ثانی کے لئے کھل جاتے ہیں۔

حدیبیہ کی شرائط میں بظاہر ایسا لگ رہا تھا کہ مسلمانوں پر زیادتی ہو رہی ہے لیکن اس کے پسِ پردہ عزت و سربلندی اور فتح تھی، اس لئے کہ اللہ کے رسول ﷺ معاہدہ کے پسِ منظر میں پردہ کے پیچھے سے عظیم فتح کا مشاہدہ کر رہے تھے اور مشرکین کی ہر اس شرط کو تسلیم کر رہے تھے جس کو اکثر صحابہ برداشت نہیں کر پا رہے تھے، جبکہ اللہ کے رسول ﷺ اس ناپسندیدہ صورتحال کے تہہ منظر میں ایک محبوب چیز فتح کی شکل میں دیکھ رہے تھے۔

۸: معاہدہ میں اگر اور کوئی فریق یا ملک شامل ہونا چاہے وہ شامل ہو سکتا ہے جیسے کہ عالمی قانون میں بھی اس چیز کی اجازت موجود ہے، اسی لئے قبیلۂ خزاعہ اور کنانہ بھی اس صلح میں شامل ہو گئے جس نے ان دونوں قبائل کے مابین سالہا سال سے جاری جنگ کا خاتمہ کیا۔

۹: معاہدہ پر فریقین کے دستخط ہونا بھی ضروری ہے، اسی طرح اس پر گواہ رکھنا بھی ضروری ہے، رسول اللہ ﷺ کے دستخط اور صحابہ کرام کی گواہی معاہدہ پر دستخط کے ساتھ ساتھ اس کی تصدیق بھی تھے۔

۱۰: معاہدہ میں اس بات کی گنجائش ہے کہ رابطہ کار غیر جانبدار فریق ہو اور فریقین کو قریب کرنے والا ہو، جیسے کہ قریش کے حلیف احابیش کے سردار حُلیس بن علقمہ نے رابطہ کاری کا کام کیا اور قریش نے اس سے مطالبہ کیا کہ وہ ان کے مابین اور مسلمانوں کے مابین سفارت کاری اور رابطہ کاری کا کام کرے اور وہ عقل و بصیرت والا اور قابل اطاعت سردار تھا اور رسول اللہ ﷺ اس کو جانتے تھے، اور یہ بھی جانتے تھے کہ وہ مذہبی اور حرم کی تعظیم کرنے والا شخص ہے اور جب قریش نے سفارت کاری کے لئے اس کا انتخاب کیا تو ان کو امید تھی کہ عربوں میں امتیازی مقام کی وجہ سے اور نبی کریم ﷺ کے نزدیک اس کی عزت و مرتبہ کی وجہ سے وہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام پر اثر انداز ہوگا۔

عالمی قانون میں بھی اسی چیز کا خیال رکھا گیا ہے کہ معاہدہ کسی ایسی حکومت کی وساطت سے کیا جائے جو اختلاف و نزاع میں فریق نہ ہو۔

۱۱: معاہدہ پر اور اس کی شرائط پر جیسے ہی اتفاق ہو جائے وہ فوراً نافذ العمل ہو جاتا ہے یہاں تک کہ اگر اس کو لکھا نہ بھی جائے اور اس پر فریقین نے دستخط نہ کئے ہوں، جیسے کہ ابو جندل بن سہیل بن عمرو کے ساتھ پیش آیا جن کو رسول اللہ ﷺ نے واپس کر دیا، اس لئے کہ آپؐ نے اس وقت تک معاہدہ کی پانچویں دفعہ تسلیم کر لی تھی کہ جو بھی قریش کی طرف سے محمدؐ کے پاس اپنے ولی کی اجازت کے بغیر آئے گا، آپ ﷺ اس کو واپس کر دیں گے..... لہذا جیسے ہی اللہ کے رسول ﷺ نے اس شرط کو تسلیم کر لیا آپؐ نے خود ہی فوری طور پر اس کی پابندی بھی کی، حالانکہ ابھی معاہدہ تحریر نہیں کیا گیا تھا اور نہ ہی فریقین نے اس پر دستخط کئے تھے۔

۱۲: معاہدہ کے دو نسخے تیار کئے جائیں گے اور ہر فریق معاہدہ کی اصل کاپی لے گا، اسی لئے حدیبیہ میں جیسے ہی صلح کی تمام کاروائی مکمل ہو گئی تو ہر فریق نے تاریخی صلح کی دستاویز کا ایک نسخہ لیا اور قریش کا وفد مکہ کی جانب واپس لوٹ گیا۔ (دیکھیں: زاد المعاد، ابن القیم: 3/306، المعاہدات فی الشریعۃ الاسلامیہ، ص: 272، صلح الحدیبیہ، باشمیل، ص: 280-199-200)

➢ ابو جندلؓ کا موقف اور ایفائے عہد:

صلح حدیبیہ کے اہم ترین دروس واسباق میں یہ سبق ہے کہ عہد کو پورا کیا جائے اور انسان کی زبان سے نکلنے والے ہر لفظ کے شرف اور اہمیت کا خیال کرتے ہوئے ان تمام چیزوں کی پابندی کی جائے جن کو انسان اپنے اوپر عائد کرتا ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی ذات کے ذریعہ تاریخ انسانی میں اعلیٰ ترین مثال پیش کی ہے کہ اس کلمہ کا بھی احترام کیا جو ابھی ضبطِ تحریر میں نہ آیا ہو اور اس کلمہ کا بھی احترام کیا جائے جو ضبطِ تحریر میں آچکا ہو، عہد و پیمان میں سنجیدگی دکھائی اور صاف گوئی، صراحت اور واقعیت کو پسند فرمایا اور حیلہ گری، پیچ و خم اور سازشی رویہ کو ناپسند کیا، اس کی عملی مثال اس وقت سامنے آئی جب آپؐ حدیبیہ میں سہیل بن عمرو سے مذاکرات کر رہے تھے، اسی اثناء میں سہیل کے بیٹے ابو جندل بیڑیوں میں جکڑے ہوئے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے، وہ مشرکین مکہ کے پاس سے بھاگ کر آئے تھے اور ان کے والد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مذاکرات کر رہے تھے، ان کے بیٹے ابو جندل اسلام لا چکے تھے اور مسلمانوں سے مدد حاصل کرنے کے لئے آئے تھے۔ جب سہیل نے اپنے بیٹے کو دیکھا تو وہ ان کی طرف اٹھ کر گئے اور ان کو گریبان سے پکڑ کر کہا: اے محمدؐ! میرے اور آپ کے درمیان

اس کے آنے سے پہلے معاہدہ طے پاچکا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ یہ سن کر ابو جندل نے کہا: اے مسلمانو! کیا مجھے مشرکین کے پاس واپس کیا جائے گا؟! وہ مجھے میرے دین کی وجہ سے پریشان کرتے رہیں گے، ان کی فریاد کا کوئی فائدہ نہیں ہوا اور رسول اللہ ﷺ نے ان کو واپس کر دیا اور ان سے فرمایا: ہم نے ان لوگوں کے ساتھ معاہدہ کر لیا ہے، ہم نے بھی ان کے ساتھ عہد وپیمان کر لیا ہے اور انہوں نے بھی ہمارے ساتھ عہد وپیمان کر لیا ہے اور اب ہم ان کے ساتھ بد عہدی اور غداری نہیں کر سکتے ہیں۔ البتہ معاہدہ کی وجہ سے حضرت ابو جندل کو جس المناک صورتحال کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا، نبی کریم ﷺ نے ان کو اطمینان دلایا اور ان کو خوشخبری سنائی کہ بہت جلد صورتحال بدلنے والی ہے اور اللہ تعالیٰ ان کے لئے اور ان جیسے کمزور بے بس مسلمانوں کے لئے کوئی نہ کوئی راہ نکالے گا۔ آپ ﷺ نے ان کے ساتھ ہمدردی کرتے ہوئے فرمایا: اے ابو جندل! صبر کرتے رہو اور اجر وثواب کی نیت رکھو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ آپ کے لئے اور آپ جیسے کمزوروں کے لئے کوئی نہ کوئی راستہ نکالنے والا ہے۔ (سیرت ابن ہشام: 3/347)

اللہ کے رسول ﷺ کے ان عظیم اور روشن کلمات میں یہ دلیل موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایفائے عہد کے کتنے پابند تھے، چاہے اس کے نتائج کچھ بھی ہوں۔

حضرت ابو جندل ؓ کی صورتحال ایفائے عہد کے بارے میں ایک سخت اور پُر خطر امتحان تھا جس کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام نے اپنے جذبات اور احساسات پر کنٹرول کرنے میں عظیم کامیابی کا ثبوت دیا، انہوں نے اپنے بھائی ابو جندل کے منظر کا مشاہدہ کرنے کے باوجود صبر کا مظاہرہ کیا، وہ اس منظر کو دیکھ کر انتہائی متاثر بھی ہوئے، جبکہ ان کے والد ان کو ان کے گریبان سے کھینچ رہے تھے اور ان کے جسم سے خون بہہ رہا تھا، جس نے ان کو مزید دکھ اور تکلیف میں مبتلا کر دیا، یہاں تک کہ بہت سے صحابہ اس منظر کو دیکھ کر آبدیدہ ہو گئے، جبکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کا مشرک باپ ان کو مشرکانہ درشتی کے ساتھ کھینچ رہا تھا تاکہ ان کو پھر سے مکہ کے خوفناک جیل خانہ میں واپس لے کر جائے۔

لیکن ابو جندل ﷺ نے صبر وثبات کا مظاہرہ کیا اور دین وعقیدہ کی راہ میں لاحق ہونے والی ہر آزمائش اور تکلیف کو اجر وثواب کی نیت سے برداشت کرتے رہے اور ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ پورا ہو کر رہا: ﴿وَمَن يَتَّقِ ٱللَّهَ يَجۡعَل لَّهُۥ مَخۡرَجٗا ۝٢ وَيَرۡزُقۡهُ مِنۡ حَيۡثُ لَا يَحۡتَسِبُۚ وَمَن يَتَوَكَّلۡ عَلَى ٱللَّهِ فَهُوَ حَسۡبُهُۥٓۚ إِنَّ ٱللَّهَ بَٰلِغُ أَمۡرِهِۦۚ قَدۡ جَعَلَ ٱللَّهُ لِكُلِّ شَيۡءٖ قَدۡرٗا﴾ ترجمہ: ”جو کوئی اللہ سے ڈرتے ہوئے کام کرے گا اللہ اُس کے لئے مشکلات سے نکلنے کا کوئی راستہ پیدا کر دے گا۔ اور اسے ایسے راستے سے رزق دے گا جدھر اُس کا گمان بھی نہ جاتا ہو، جو اللہ پر بھروسہ کرے اس کے لئے وہ کافی ہے، اللہ اپنا کام پورا کر کے رہتا ہے، اللہ نے ہر چیز کے لئے ایک تقدیر مقرر کر رکھی ہے“۔ (سورۃ الطلاق: 2-3)

چنانچہ ابھی سال بھی نہیں گزر پایا تھا یہاں تک کہ وہ اپنے کمزور وبے بس مسلمان بھائیوں کے ساتھ مکہ کے قید خانوں سے بھاگنے میں کامیاب ہو گئے، اور وہ ایسی طاقت بن گئے جن سے کفار مکہ بھی خوف محسوس کرنے لگے، جبکہ وہ حضرت ابو بصیر ؓ کے ساتھ شامل ہو گئے اور شام سے آنے والے مشرکین کے قافلوں کے راستوں پر انہوں نے کنٹرول حاصل کر لیا، اس کی تفصیلات آئندہ صفات میں آ رہی ہیں۔ (دیکھیں: صلح الحدیبیہ، باشمیل، ص: 322، محمد رسول اللہ، محمد صادق عرجون: 4/275)

➢ مخلصانہ اپوزیشن کا احترام:

صلح کے معاہدہ پر اتفاق کے بعد اور اس کی دفعات کو تحریری شکل دینے سے پہلے مسلمانوں کے مابین اس معاہدہ کے بارے میں سخت اور شدید بحث و مناقشہ ہوا، خاص طور پر ان دو دفعات کے بارے میں جن کے بموجب رسول اللہ ﷺ اس کے پابند تھے کہ قریش کی طرف سے آنے والے شخص کو واپس کیا جائے گا، جبکہ قریش کے پاس جانے والے شخص کو واپس کرنا قریش کے لئے ضروری نہیں تھا۔ اسی طرح یہ دفعہ بھی صحابہ کے لئے انتہائی تکلیف دہ تھی کہ مسلمان اس سال مکہ میں داخل ہوئے بغیر ہی حدیبیہ سے واپس جائیں گے، اس معاہدہ پر سب سے زیادہ اعتراض اور تنقید کرنے والوں میں عمر بن خطاب، اوس کے سردار اُسید بن حضیر اور خزرج کے سردار سعد بن عبادہ۔ رضی اللہ عنہم۔ تھے۔

مؤرخین نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ رسول اللہ ﷺ کے پاس اس معاہدہ کے بارے میں اپنے اعتراض واختلاف کا اعلان کرتے ہوئے حاضر ہوئے اور رسول اللہ ﷺ سے فرمایا: کیا آپ اللہ کے رسول نہیں ہیں؟! آپ نے فرمایا: کیوں نہیں! پھر پوچھا: کیا ہم مسلمان نہیں ہیں؟! آپؐ نے فرمایا: کیوں نہیں! پھر پوچھا: کیا وہ مشرک نہیں ہیں؟! آپؐ نے فرمایا: کیوں نہیں! پھر کہا: تو پھر ہم اپنے دین کے بارے میں کیوں دبیں، آپؐ نے فرمایا: بلاشبہ میں اللہ کا رسول ہوں اور میں اس کی نافرمانی نہیں کرتا ہوں۔ (دیکھیں: صحیح البخاری: 3182، من معین السیرۃ، ص 333)

ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں، میں اس کے حکم کی ہرگز مخالفت نہیں کروں گا اور وہ مجھے ہرگز ضائع نہیں کرے گا۔ (دیکھیں: تاریخ طبری: 2/634)

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں: میں نے عرض کیا: کیا آپ ہم سے یہ بیان نہیں کرتے تھے کہ ہم خانہ کعبہ جائیں گے اور اس کا طواف کریں گے؟! آپؐ نے فرمایا: کیا میں نے یہ کہا تھا کہ ہم اسی سال جائیں گے؟ میں نے عرض کیا: نہیں! آپؐ نے فرمایا: یقیناً آپ خانہ کعبہ جاؤ گے اور اس کا طواف کرو گے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں: اس کے بعد میں ابو بکرؓ کے پاس آیا، میں نے ان سے کہا: اے ابو بکر! کیا آپ ﷺ اللہ کے رسول نہیں ہیں؟! انہوں نے کہا: کیوں نہیں! کہا: کیا ہم مسلمان نہیں ہیں؟! انہوں نے کہا: کیوں نہیں! حضرت عمرؓ نے کہا: کیا وہ مشرک نہیں ہیں؟ جواب دیا: کیوں نہیں! میں نے کہا: تو پھر ہم اپنے دین کے بارے میں کیوں دبیں؟ حضرت ابو بکرؓ نے حضرت عمرؓ کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ احتجاج اور اعتراض کرنا بند کردیں۔ کہا: ان کی اطاعت کو لازم پکڑو، میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں اور حق وہی ہے جس کا انہوں نے حکم دیا ہے اور وہ ہرگز اللہ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کریں گے، اور اللہ تعالیٰ ہرگز ان کو ضائع نہیں کرے گا۔ (سیرت ابن ہشام: 3/346)

حضرت ابو جندلؓ کے المناک اور متاثر کن حادثہ کے بعد جب صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے اعتراض اور اپنے تحفظات کا اظہار کیا تو نبی کریم ﷺ نے صبر وحکمت، بردباری اور دلائل کے ذریعہ اعتراض کرنے والوں کو صلح کے درست ہونے کے بارے میں مطمئن کیا اور واضح کیا کہ یہ مسلمانوں کے مفاد میں ہے اور اس میں ان کی نصرت وفتح مضمر ہے، اور اللہ تعالیٰ بہت جلد ابو جندل اور ان جیسے کمزور مسلمانوں کے لئے کوئی راہ نکالے گا اور بعد میں ایسا ہی ہوا جیسے کہ آپ ﷺ نے پیشن گوئی کی تھی۔

اس کے ذریعہ یہ واضح ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مخلصانہ اپوزیشن کے احترام کا قاعدہ اور ضابطہ بھی واضح فرمایا جس کو آپ ﷺ نے اپنے فرمان اور عمل کے ذریعہ واضح کر دیا، اللہ کے رسول ﷺ نے اس عمل کے ذریعہ اپنے بعد آنے والے قائدین کے لئے یہ نشانِ راہ چھوڑے کہ اپنے رفقاء اور کارکنان کی طرف سے ہونے والی مخلصانہ اپوزیشن اور آراء کا احترام کیا جائے اور ان کی آراء کی حوصلہ افزائی کی جائے جو مصلحت عامہ کے مفاد میں ہوں۔ (دیکھیں: القیادیۃ العسکریۃ فی عہد الرسول، ص:495)

نبی کریم ﷺ کے اس طرزِ عمل سے واضح ہو گیا کہ اسلامی معاشرہ میں اظہار رائے کی آزادی کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اور اسلامی معاشرہ میں ایک فرد کو آزادی کے ساتھ اپنی رائے پیش کرنے کا مکمل اختیار ہے، اگرچہ اس رائے کے ذریعہ حاکمِ وقت پر تنقید ہی کیوں نہ لازم آتی ہو، ایک فرد مسلم کا یہ حق ہے کہ وہ فساد وانتشار کا ماحول بنائے بغیر امن وامان کی فضا میں اپنے نقطۂ نظر کو بیان کرے، ایسا کرنا بالکل درست نہیں ہے کہ حریتِ فکر ورائے کا گلا ہی گھونٹ کر رکھ دیا جائے، رسول اللہ ﷺ کے سامنے حضرت عمرؓ کے بے باکانہ انداز سے اپنی رائے پیش کرنے سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آتی ہے کہ ریاست کے سربراہ کی کسی رائے سے اختلاف کرنا کوئی ایسا جرم نہیں ہے کہ جس پر سزا دی جائے یا صاحبِ رائے کو پسِ زنداں کر کے غائب ہی کر دیا جائے۔ (دیکھیں: غزوۃ الحدیبیہ، ابو فارس، ص134-135)

➢ **احرام کی پابندیوں سے حلال ہونا اور حضرت ام سلمہؓ کا مشورہ:**

جب اللہ کے رسول ﷺ صلح کی دستاویز تحریر کرنے سے فارغ ہو گئے تو آپؐ نے اپنے اصحاب سے فرمایا: اٹھو قربانی کرو، اس کے بعد حلق کرو۔ یہاں تک کہ آپؐ نے یہ بات تین مرتبہ ارشاد فرمائی، جب ان میں سے کوئی نہیں اٹھا تو آپؐ حضرت ام سلمہؓ کے پاس تشریف لے گئے اور ان کے سامنے لوگوں کے ردّ عمل کا ذکر کیا، حضرت ام سلمہؓ نے فرمایا: اے اللہ کے رسولؐ! کیا آپ چاہتے ہیں کہ لوگ ایسا ہی کریں، آپ نکلیں، اس کے بعد ان میں سے کسی سے کوئی بات نہ کریں یہاں تک کہ اپنی قربانی کر لیں، اور حلق کرنے والے کو طلب کریں، وہ آپ کا حلق کر لے گا، چنانچہ آپؐ نکلے اور کسی سے کوئی بات نہیں کی، یہاں تک کہ قربانی کر لی اور حلق کرنے والے کو بلا کر حلق کر لیا، جب صحابہ کرام نے آپؐ کو ایسا کرتے ہوئے دیکھا تو سب کھڑے ہوئے اور قربانیاں کیں اور ایک دوسرے کو حلق کرنے لگے، یہاں تک کہ غم کے مارے قریب تھا کہ وہ ایک دوسرے کو ہی قتل نہ کر دیں۔

حدیبیہ میں بعض لوگوں نے حلق کیا اور بعض نے قصر کیا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: حلق کرانے والوں پر اللہ کی رحمت ہو۔ لوگوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! اور قصر کرنے والے؟ آپؐ نے فرمایا: حلق کرانے والوں پر اللہ کی رحمت ہو۔ لوگوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! اور قصر کرانے والے؟ آپؐ نے فرمایا: حلق کرانے والوں پر اللہ کی رحمت ہو۔ لوگوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! اور قصر کرانے والے؟ آپؐ نے فرمایا: اور قصر کرانے والوں پر بھی۔ (صحیح بخاری 1727، صحیح مسلم: 2101، مسند احمد: 1/216، سیرت ابن ہشام: 3/348)

نبی کریم ﷺ کے ہدی (قربانی) کے جانوروں میں ابو جہل کا ایک اونٹ بھی تھا، اس کے سر میں چاندی کی نکیل لگی ہوئی تھی، اس کے ذریعہ مشرکین کو چِڑانا مقصود تھا۔ (مسند احمد: 1/234، سنن ابو داؤد: 1749، سنن ابن ماجہ: 3076، المعجم الکبیر للطبرانی: 11147، سیرت ابن ہشام: 3/349)

اس واقعہ میں ہمارے لئے چند امور قابل غور ہیں، جن میں دروس واسباق موجود ہیں:

ا: حضرت ام سلمہؓ کی رائے بالکل درست اور مبارک تھی، اس لئے کہ انہوں نے صحابہ کے بارے میں سمجھا کہ وہ سوچ رہے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ان کو احرام سے باہر آنے کا حکم دیا ہے اور یہ ان کے حق میں رخصت کے طور پر ہے، جبکہ نبی کریم ﷺ عزیمت پر عمل کرتے ہوئے خود حالتِ احرام میں ہی رہیں گے، اس لئے حضرت ام سلمہؓ نے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا کہ آپ خود احرام سے باہر آجائیں تاکہ ان کے ذہنوں سے یہ احتمال ختم ہو جائے، اور نبی کریم ﷺ نے بھی ان کے مشورہ کو درست سمجھا، اس لئے آپ ﷺ نے اس پر عمل کیا، جب صحابہ کرام نے یہ دیکھ لیا تو رسول اللہ ﷺ کے دیئے ہوئے حکم پر عمل کرنے میں وہ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے لگے اور اس کے بعد انتظار کے لئے کوئی اور احتمال باقی نہیں رہا، اس لئے یہ ایک درست رائے اور مبارک مشورہ تھا۔ اس واقعہ کے ذریعہ اس بات کی دلیل ملتی ہے کہ فاضل خاتون سے مشورہ کرنا مستحسن ہے، بشرطیکہ وہ صحیح فکر وسوچ اور درست رائے کی حامل اور اہل ہو۔ (دیکھیں: ملامح الشوریٰ فی الدعوۃ الاسلامیۃ، ص: 161)

اسی طرح یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اسلام کی نگاہ میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے کہ مشورہ کسی مرد کی طرف سے آئے یا خاتون کی طرف سے، اس کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں عورت کی بھی کتنی تکریم کی گئی ہے جس کے متعلق اعدائے اسلام یہ پروپگنڈہ کرتے کرتے نہیں تھکتے ہیں کہ اسلام نے عورت کے حقوق مارے ہیں اور اس کے وجود کو نظرانداز کردیا ہے، لیکن نبی مرسلؐ کی طرف سے یہ واضح ثبوت فراہم کیا گیا ہے کہ اسلام میں ایک خاتون کی رائے کا کس قدر اعتراف واحترام کیا گیا ہے، یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ ایک ایسی صورتحال میں ایک خاتون کے مشورے پر عمل کرتے ہیں جبکہ آپؐ پریشان اور غصہ کی حالت میں تھے۔ (دیکھیں: المعاھدات فی الشریعۃ الاسلامیۃ، ص: 273)

۲: عملی نمونہ کی اہمیت:

اللہ کے رسول ﷺ نے ایک کام کرنے کا حکم دیا اور تین مرتبہ اس کو دہرایا، اس وقت وہاں کبار صحابہ اور بزرگ صحابہ موجود تھے، لیکن اس کے باوجود کسی نے آپؐ کی پکار پر لبیک نہیں کہا، لیکن جب رسول اللہ ﷺ نے عملی نمونہ پیش کیا جس کا مشورہ حضرت ام سلمہؓ نے دیا تھا تو مقصد حاصل ہو گیا، لہذا معلوم یہ ہوا کہ اس طرح کی صورتحال میں عملی نمونہ زیادہ مفید اور کارگر ہوتا ہے۔ (دیکھیں: تأملات فی السیرۃ النبویۃ، محمد السید الوکیل، ص: 211)

۳: عمرہ اور حج میں احصار کا حکم:

صلح کے معاہدہ سے فارغ ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ کا قربانی، حلق اور احرام سے باہر آنے کے اعمال انجام دینا؛ اس سے دلیل ملتی ہے کہ محصر (جس کو عمرہ یا حج سے روک دیا جائے) کے لئے جائز ہے کہ وہ احرام سے باہر آجائے، اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ جہاں اس کو روک دیا جائے وہ وہیں قربانی کرلے، پھر حلق کرے اور اس کے بعد احرام سے باہر آنے کی نیت کرلے، چاہے اس نے حج کا احرام باندھا ہو یا

عمرہ کا، اسی طرح اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ احرام سے باہر آنے والے کے لئے اس حج یا عمرہ کی قضا لازم نہیں ہے جبکہ وہ نفلی حج یا عمرہ کر رہا ہو، البتہ احناف کا اس میں اختلاف پایا جاتا ہے، وہ یہ کہتے ہیں کہ شروع کرنے کے بعد قضا کرنا ضروری ہے، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ تمام صحابہ کرام جو صلح حدیبیہ کے موقع پر آپؐ کے ساتھ نکلے تھے، وہ عمرۃ القضاء میں بھی آپؐ کے ساتھ نکلے تھے، سوائے ان لوگوں کے جن کی وفات ہوگئی یا غزوۂ خیبر میں شہادت سے سرفراز ہوگئے۔ (دیکھیں: فقہ السیرۃ للبوطی، ص 343)

➤ مدینہ کی جانب واپسی اور سورۃ الفتح کا نزول:

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ حدیبیہ سے مدینہ کا قصد کرتے ہوئے واپس آگئے، یہاں تک کہ جب آپؐ مکہ اور مدینہ کے درمیان تھے تو سورۃ الفتح نازل ہوئی، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿سَيَقُولُ لَكَ ٱلْمُخَلَّفُونَ مِنَ ٱلْأَعْرَابِ شَغَلَتْنَآ أَمْوَٰلُنَا وَأَهْلُونَا فَٱسْتَغْفِرْ لَنَا ۚ يَقُولُونَ بِأَلْسِنَتِهِم مَّا لَيْسَ فِى قُلُوبِهِمْ ۚ قُلْ فَمَن يَمْلِكُ لَكُم مِّنَ ٱللَّهِ شَيْـًٔا إِنْ أَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ نَفْعًۢا ۚ بَلْ كَانَ ٱللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا﴾ ترجمہ: "اے نبیؐ، بدوی عربوں میں سے جو لوگ پیچھے چھوڑ دیئے گئے تھے اب وہ آکر ضرور تم سے کہیں گے کہ "ہمیں اپنے اموال اور بال بچوں کی فکر نے مشغول کر رکھا تھا، آپ ہمارے لئے مغفرت کی دعا فرمائیں" یہ لوگ اپنی زبانوں سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتیں، ان سے کہہ دو کہ "اچھا، یہی بات ہے تو کون تمہارے معاملہ میں اللہ کے فیصلہ کو روک دینے کا کچھ بھی اختیار رکھتا ہے، اگر وہ تمہیں کوئی نقصان پہنچانا چاہے یا نفع بخشنا چاہے؟ تمہارے اعمال سے تو اللہ ہی باخبر ہے"۔ (سورۃ الفتح: 11)

اس کے نزول کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے اپنی عظیم خوشی کا اظہار فرمایا اور فرمایا: آج رات مجھ پر ایسی سورت نازل ہوئی ہے، یقیناً وہ میرے نزدیک ان تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہے جن پر سورج طلوع ہوا۔ (صحیح بخاری: 4177، صحیح مسلم: 1786) اس کے بعد آپؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا﴾ اصحاب رسول ﷺ کہنے لگے: کیا ہی بہترین اور عمدہ! ہمارے لئے اس میں کیا ہے؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿لِّيُدْخِلَ ٱلْمُؤْمِنِينَ وَٱلْمُؤْمِنَٰتِ جَنَّٰتٍ تَجْرِى مِن تَحْتِهَا ٱلْأَنْهَٰرُ خَٰلِدِينَ فِيهَا وَيُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّـَٔاتِهِمْ ۚ وَكَانَ ذَٰلِكَ عِندَ ٱللَّهِ فَوْزًا عَظِيمًا﴾ ترجمہ: "(اُس نے یہ کام اِس لئے کیا ہے) تاکہ مومن مردوں اور عورتوں کو ہمیشہ رہنے کے لئے ایسی جنتوں میں داخل فرمائے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی، اور اُن کی برائیاں اُن سے دور کردے، اللہ کے نزدیک یہ بڑی کامیابی ہے"۔ (سورۃ الفتح: 5 صحیح بخاری: 4172)

لوگ جلدی سے رسول اللہ ﷺ کے پاس گئے اور آپؐ 'کراع الغمیم' میں اپنی سواری پر تھے، آپؐ نے ان کے سامنے ﴿إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا﴾ پڑھا، یہ سن کر ایک شخص نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ! کیا یہ فتح ہے؟! آپؐ نے فرمایا: ہاں، اس ذات کی قسم! جس کے قبضہ میں میری جان ہے، بلاشبہ یہ فتح ہے۔ (سنن ابوداؤد: 2736، مستدرک حاکم: 2/131)

اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کی کوفت اور ان کا حزن و غم فرحت وانبساط میں بدل گیا اور ان کو اس بات کا ادراک ہو گیا کہ تمام اسباب ونتائج کا جان لینا ان کے بس میں نہیں ہے، اور اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر لینے میں ہی ان کے لئے اور تحریکِ اسلامی کے لئے خیر ہے۔ (السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ: 2/449)

قرآن کریم نے اس عظیم واقعہ کے بارے میں سورۃ الفتح میں گفتگو کی ہے اور غزوہ حدیبیہ کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کریم کا ایک امتیازی منہج رہا ہے، اس غزوہ کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ فریقین کے مابین ہونے والی صلح کو جنگ نہ ہونے کے باوجود 'فتح مبین' قرار دیا ہے۔

اسباب نزول میں غور و فکر کے نتیجہ میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ سورۃ الفتح اس وقت نازل ہوئی جبکہ نبی کریم ﷺ معاہدۂ صلح سے فارغ ہو گئے اور نبی کریم ﷺ مدینۃ النبی کی طرف واپس آ رہے تھے اور اس سے پہلے نبی کریم ﷺ اور مؤمنین کو اہم تجربات اور مراحل سے گزرنا پڑا، ان کو عمرہ کی ادائیگی کی امید تھی، مشرکین کے سامنے کشمکش کا اندیشہ تھا، بیعت رضوان ہوئی، صلح ہوئی، جس کے متعلق بعض صحابہ کرام خوش نہیں تھے اور ان عظیم واقعات کے بارے میں ان کے دلوں میں بہت سے افکار و خیالات آتے رہے۔

قرآن کریم نازل ہوتا ہے اور مسلمانوں کے سامنے اس بات کو واضح کرتا ہے کہ یہ صلح 'فتح مبین' ہے اور اس بات کو واضح کرتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے مطالبہ کو قبول کرنے کے سلسلہ میں راہِ صواب پر تھے تاکہ اس کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں اہلِ ایمان کے اعتماد و بھروسہ میں اضافہ ہو، جبکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو تمام انسانوں کے سامنے یہ خوشخبری دی کہ صلح کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عظیم فتح سے نوازا ہے اور واضح کیا گیا کہ جو کچھ انہوں نے کیا ہے وہ حق ہے اور اہلِ ایمان کو بھی اللہ تعالیٰ نے صبر کی توفیق عطا فرمائی، اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں سکینت طاری کی اور یہاں تک کہ جو لوگ صلح کی بعض شرائط پر راضی نہیں تھے وہ بھی بالآخر راضی ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿هُوَ ٱلَّذِيٓ أَنزَلَ ٱلسَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ ٱلۡمُؤۡمِنِينَ لِيَزۡدَادُوٓاْ إِيمَٰنٗا مَّعَ إِيمَٰنِهِمۡۗ وَلِلَّهِ جُنُودُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضِۚ وَكَانَ ٱللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمٗا﴾ ترجمہ: "وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں سکینت نازل فرمائی تاکہ اپنے ایمان کے ساتھ وہ ایک ایمان اور بڑھا لیں، زمین اور آسمانوں کے سب لشکر اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہیں اور وہ علیم و حکیم ہے"۔ (سورۃ الفتح: 4)

قرآن کریم نے بیعت رضوان کا بھی ذکر کیا ہے جس میں صحابہ کرام نے نبی کریم ﷺ سے موت پر بیعت کی اور اللہ تعالیٰ نے اس بیعت کی تعریف کی اور قرآن میں اس کا ذکر کر کے اس کو خلود عطا کیا اور واضح کیا کہ یہ اللہ کے ساتھ بیعت ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ ٱلَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ ٱللَّهَ يَدُ ٱللَّهِ فَوۡقَ أَيۡدِيهِمۡۚ فَمَن نَّكَثَ فَإِنَّمَا يَنكُثُ عَلَىٰ نَفۡسِهِۦۖ وَمَنۡ أَوۡفَىٰ بِمَا عَٰهَدَ عَلَيۡهُ ٱللَّهَ فَسَيُؤۡتِيهِ أَجۡرًا عَظِيمٗا﴾ ترجمہ: "اے نبیؐ، جو لوگ تم سے بیعت کر رہے تھے، وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے تھے ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا، اب جو اس عہد کو توڑے گا اُس کی عہد شکنی کا وبال اس کی اپنی ہی ذات پر ہو گا، اور جو اُس عہد کو وفا کرے گا جو اس نے اللہ سے کیا ہے، اللہ عنقریب اس کو بڑا اجر عطا فرمائے گا"۔ (سورۃ الفتح: 10)

اس طرح سے ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم جب غزوات کے بارے میں بات کرتا ہے تو اس کا ایک امتیازی اسلوب ہوتا ہے، وہ حقائق کو بیان کرتا ہے، عقائد کی تصحیح کرتا ہے، نفوس کی تربیت کرتا ہے، منافقین کی قلعی کھولتا ہے اور مسلمانوں کو بہت جلد حاصل ہونے والے غنائم کی خوشخبری سناتا ہے، جو خیبر کے موقع پر مسلمانوں کو حاصل ہوئے، اسی طرح عذر والوں کی بھی وضاحت کرتا ہے، لہذا جہاد سے پیچھے رہنے والا ہر شخص سرزنش اور عتاب کا مستحق نہیں ہے، بلکہ اس سے بعض لوگ مستثنیٰ ہیں، یہ رحمت الٰہیہ کا کمال ہے۔ اس کے بعد جب صلح حدیبیہ مکمل ہوتی ہے اور مسلمان مدینہ منورہ واپس جاتے ہیں اور ان کے مکہ میں داخل ہونے کا مقصد پورا نہیں ہو پاتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس خواب کا بھی تذکرہ کیا جو نبی کریم ﷺ نے دیکھا تھا، اور صحابہ کرام کو اس کے ذریعہ خوشخبری سنائی تھی اور اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا کہ وہ خواب سچا تھا اور وہ عنقریب متحقق ہو جائے گا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لَّقَدْ صَدَقَ ٱللَّهُ رَسُولَهُ ٱلرُّءْيَا بِٱلْحَقِّ ۖ لَتَدْخُلُنَّ ٱلْمَسْجِدَ ٱلْحَرَامَ إِن شَآءَ ٱللَّهُ ءَامِنِينَ مُحَلِّقِينَ رُءُوسَكُمْ وَمُقَصِّرِينَ لَا تَخَافُونَ ۖ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوا۟ فَجَعَلَ مِن دُونِ ذَٰلِكَ فَتْحًا قَرِيبًا﴾ ترجمہ: ”فی الواقع اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا تھا جو ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق تھا، ان شاءاللہ تم ضرور مسجد حرام میں پورے امن کے ساتھ داخل ہو گے، اپنے سر منڈواؤ گے اور بال ترشواؤ گے، اور تمہیں کوئی خوف نہ ہو گا، وہ اُس بات کو جانتا تھا جسے تم نہ جانتے تھے، اس لئے وہ خواب پورا ہونے سے پہلے اُس نے یہ قریبی فتح تم کو عطا فرمادی“۔(سورۃ الفتح: 27)

اس کے بعد اس عظیم سورت کو نبی کریم ﷺ اور آپؐ کے صحابہ کرام کی مدح و تعریف کے ذریعہ مکمل کیا گیا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿هُوَ ٱلَّذِىٓ أَرْسَلَ رَسُولَهُۥ بِٱلْهُدَىٰ وَدِينِ ٱلْحَقِّ لِيُظْهِرَهُۥ عَلَى ٱلدِّينِ كُلِّهِۦ ۚ وَكَفَىٰ بِٱللَّهِ شَهِيدًا ﴿٢٨﴾ مُّحَمَّدٌ رَّسُولُ ٱللَّهِ ۚ وَٱلَّذِينَ مَعَهُۥٓ أَشِدَّآءُ عَلَى ٱلْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ۖ تَرَىٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ ٱللَّهِ وَرِضْوَٰنًا ۖ سِيمَاهُمْ فِى وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ ٱلسُّجُودِ ۚ ذَٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِى ٱلتَّوْرَىٰةِ ۚ وَمَثَلُهُمْ فِى ٱلْإِنجِيلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْـَٔهُۥ فَـَٔازَرَهُۥ فَٱسْتَغْلَظَ فَٱسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوقِهِۦ يُعْجِبُ ٱلزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ ٱلْكُفَّارَ ۗ وَعَدَ ٱللَّهُ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَعَمِلُوا۟ ٱلصَّٰلِحَٰتِ مِنْهُم مَّغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًۢا ﴿٢٩﴾﴾ ترجمہ: ”وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اُس کو پوری جنس دین پر غالب کر دے اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے۔ محمد، اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں، تم انھیں دیکھو گے رکوع اور سجود کی حالت میں، اور اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی چاہتے ہوئے، ان کی نشانی ان کے چہروں پر سجدوں کے آثار ہیں، یہ ہے ان کی تمثیل تورات میں اور انجیل میں، ان کی مثال یوں ہے کہ جیسے کھیتی اس نے نکالی اپنی سوئی، پھر اس کی کمر مضبوط کی، پھر وہ سخت ہوئی پھر وہ اپنے تنا پر کھڑی ہو گئی، کاشت کرنے والوں کو وہ خوش کرتی ہے تاکہ کفار اس کے پھلنے پھولنے پر جلیں، اللہ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کئے، مغفرت اور ایک اجر عظیم کا“۔(سورۃ الفتح: 27-28)

اس طرح سے اللہ تعالی اپنی ہمیشہ رہنے والی کتاب میں اس منتخب و چنیدہ جماعت صحابہ کرام کے اوصاف بیان کرتا ہے، سید قطبؒ فرماتے ہیں: "......میں ایک بار پھر چشم خیال سے چودہ صدی پہلے ان خوش بخت لوگوں کے وجود کو دیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں، جن کے دل پاکیزہ ہیں، جو اللہ کی طرف سے فیوض رحمت، رضاو تکریم اور عظیم اجر کے وعدے حاصل کر رہے ہیں، ان کو یہ اعلان سنایا جارہا ہے کہ اللہ کی کتابوں میں اللہ کے پیمانوں میں اور اللہ کے ایوانوں میں ان کے لئے یہ سب کچھ ہے، وہ حدیبیہ سے واپس آرہے ہیں، اسی اثنا میں یہ سورت نازل ہوتی ہے اور ان کے سامنے پڑھی جاتی ہے، اونٹوں کی رفتار کے گرد و غبار میں یہ سورت سنتے ہیں، اب یہ ان کی روح اور زندگی ہے، ان کے کانوں اور ارواح میں یہ اتر رہی ہے، وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں اور مسکراتے ہیں اور ان کا وجود ہی اللہ کا مجسم فضل و کرم ہے"۔ (فی ظلال القرآن: 3333-6/26)

صحابہ کرام کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ تحریک ایک نئے مرحلہ میں داخل ہو گئی ہے، اس کو ایک یقینی فتح حاصل ہوئی ہے اور اس کے سامنے نئے آفاق اور جدید راستے کھل گئے ہیں، اور اس دین کی فطرت یہ ہے کہ اس میں نمو اور اضافہ ہو اور جنگی صورتحال کے مقابلہ میں امن و صلح کی فضاؤں میں زیادہ پھولنے پھلنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ صلح حدیبیہ کے نتائج سامنے آنے لگے، جن میں سے اہم ترین نتائج مندرجہ ذیل تھے:

۱: اس معاہدہ کے ذریعہ قریش نے اسلامی ریاست کی حیثیت کو پہلی مرتبہ تسلیم کیا، اس لئے کہ معاہدہ ہمیشہ برابر مقام کے حامل فریقین کے مابین ہوتا ہے، اس اعتراف کا قریش کے ضدی موقف سے متاثر ہونے والے قبائل پر خاص طور پر اثر پڑا جو یہ سمجھتے تھے کہ قریش کو امامت و قیادت کا مقام حاصل ہے۔

۲: مشرکین اور منافقین کے دلوں میں خوف و ڈر پیدا ہوا اور ان میں سے اکثر کو غلبۂ اسلام کا یقین ہو گیا، اس کے بعد اثرات اس طرح ظاہر ہوئے کہ سردارانِ قریش میں سے بہت سے حلقہ بگوش اسلام ہونے میں ایک دوسرے سے پہل کرنے لگے، جیسے کہ خالد بن ولیدؓ اور عمرو بن العاصؓ، اسی طرح مدینہ کے قریب بسنے والے اعراب بھی سبقت کرنے لگے۔

۳: صلح اور امن کے ماحول نے اسلام کی نشر و اشاعت اور لوگوں کے نزدیک اس کے متعارف ہونے کا موقع فراہم کیا جس کی وجہ سے بہت سے قبائل اسلام میں داخل ہوتے چلے گئے، امام زہریؒ فرماتے ہیں: "اسلام میں اس سے پہلے اس سے بڑی اور عظیم فتح کوئی حاصل نہیں ہوئی، بلکہ اس سے پہلے قتال ہوتا تھا جس میں لوگوں کی ایک دوسرے کے ساتھ مڈبھیڑ ہوتی تھی، لیکن جب صلح ہو گئی اور جنگ بندی ہو گئی اور لوگ ایک دوسرے سے مامون ہو گئے تو ان کو ایک دوسرے کے ساتھ ملنے کا موقع ملا اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ بات چیت کرنے لگے، لہذا اسلام کے بارے میں جس کے ساتھ بھی بات کی گئی اور وہ کچھ بھی عقل و دانش رکھتا تھا وہ اسلام میں داخل ہو گیا، ان دو سالوں میں اتنے لوگ اسلام میں داخل ہوئے جتنے اس سے پہلے پوری مدت میں داخل ہو چکے تھے۔ (سیرت ابن ہشام: 3/351)

ابن ہشامؒ امام زہریؒ کے قول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: زہری کے قول کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ جابر بن عبداللہ کی روایت کے مطابق چودہ سو صحابہ کرام کے ساتھ حدیبیہ تشریف لے گئے، اور پھر فتح مکہ کے موقع پر دو سال کے بعد دس ہزار صحابہ کرام کے ساتھ مکہ تشریف لے گئے۔ (دیکھیں: منہج الاعلام الاسلامی فی صلح الحدیبیہ، ص:329)

۴: مسلمان قریش کی طرف سے مأمون و مطمئن ہو گئے اور انہوں نے اپنی پوری توجہ کا رخ یہود اور دیگر مخالف قبائل کی جانب پھیر دیا، اسی لئے صلح حدیبیہ کے بعد غزوۂ خیبر پیش آیا۔

۵: صلح کے مذاکرات کے ذریعہ قریش کے حلفاء کو مسلمانوں کا موقف سمجھنے کا موقع ملا اور اس کی وجہ سے ان کے اندر مسلمانوں کے تئیں نرم گوشہ پایا گیا، اسی لئے حُلیس بن علقمہ نے جب مسلمانوں کو تلبیہ پڑھتے ہوئے دیکھا تو وہ اپنے اصحاب کے پاس واپس گیا اور ان سے کہا: میں نے قربانی کے جانوروں کو دیکھا کہ ان کو قلادہ پہنایا گیا ہے اور ان کا اشعار کیا گیا ہے، اس لئے اس نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ مسلمانوں کو خانہ کعبہ سے روکا جائے۔

۶: صلح حدیبیہ نے نبی کریم ﷺ کو یہ موقع عنایت کیا کہ غزوۂ موتہ کی تیاری کریں، چنانچہ وہ اسلامی تحریک کو جزیرۃ العرب کے باہر ایک دوسرے اسلوب کے ساتھ منتقل کرنے کا ایک نیا قدم تھا۔

۷: صلح حدیبیہ نے نبی کریم ﷺ کو روم و فارس کے بادشاہوں کی جانب خطوط بھیجنے کا موقع دیا، تاکہ ان تک بھی اسلام کی دعوت پہنچائی جائے۔

۸: صلح حدیبیہ فتح مکہ کا سبب اور مقدمہ ثابت ہوئی، ابن قیمؒ فرماتے ہیں: جنگ بندی اس عظیم فتح کا مقدمہ اور تمہید تھی جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور اپنے لشکر کو نوازا، اور اس کی وجہ سے لوگ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہوئے، لہذا یہ صلح اس فتح عظیم کا دروازہ، اس کی چابی اور اس کی خبر دینے والی تھی اور یہ عظیم امور کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ضابطہ اور سنت ہے، جس کا اللہ تعالیٰ شرعی اور تقدیری طور پر فیصلہ کرتا ہے کہ اس سے پہلے بعض مقدمات اور تمہیدات وجود میں لاتا ہے جو اس کے بارے میں خبر دیتے ہیں اور اس پر دلالت کرتے ہیں۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویۃ لابن ہشام: 3/353)

➢ ابو بصیرؓ مدینہ منورہ میں اور آزاد اسلامی محاذ کی قیادت:

صلح حدیبیہ کے فوراً بعد ابو بصیر عتبہ بن اُسید مکہ کے شرک کے زندانوں سے اپنے دین کی حفاظت کی غرض سے بھاگنے میں کامیاب ہو گئے اور جا کر مدینہ منورہ میں رسول اللہ ﷺ کے سایۂ عاطفت میں پہنچ گئے، لیکن قریش نے ان کے تعاقب میں اپنے دو لوگوں کو رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیج دیا تاکہ وہ ان کو واپس لے کر آئیں اور یہ معاہدہ کی شرائط کی تکمیل و تنفیذ کی وجہ سے تھا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ابو بصیر سے فرمایا: اے ابو بصیر! جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ ہم نے ان لوگوں سے معاہدہ کر لیا ہے اور ہمارے دین میں عہد شکنی اور غداری جائز نہیں ہے، اور اللہ تعالیٰ آپ کے لئے اور آپ کے ساتھ دوسرے کمزوروں کے لئے کوئی راستہ نکال دے گا، اس لئے اپنی قوم کے پاس واپس چلے جاؤ۔ حضرت ابو بصیرؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! کیا آپ مجھے مشرکین کی طرف واپس کر رہے ہیں تاکہ وہ مجھے میرے دین کے

بارے میں آزمائش میں مبتلا کریں؟! آپؐ نے فرمایا: اے ابو بصیر! تم جاؤ، اللہ تعالیٰ بہت جلد آپ کے لئے اور آپ کے ساتھ دوسرے کمزوروں کے لئے کوئی راستہ نکالے گا۔(مسند احمد: 4/325، سیرت ابن ہشام: 3/331)

چنانچہ وہ ان دونوں کے ساتھ چلے اور یہ منظر اور صورتحال مسلمانوں پر سخت گراں گزری جبکہ وہ اپنے ایک دینی بھائی کو غم واندوہ کی کیفیت کے ساتھ دیکھ رہے تھے کہ وہ مکہ کے صعوبت خانہ کی طرف واپس جارہا ہے، حالانکہ وہ قریش کے ظلم وعدوان سے بھاگنے میں کامیاب ہوگئے تھے، لیکن رسول اللہ ﷺ عہد وپیمان کو پورا کرنے کے پابند تھے۔ آپؐ کے نزدیک وہ صرف کاغذ پر لکھا ہوا نظریہ نہیں تھا بلکہ وہ آپؐ کی زندگی کا طرزِ عمل تھا، اور بین الاقوامی تعلقات کی بنیاد وأساس تھا، اللہ تعالیٰ نے ایفائے عہد کی بطور خاص وصیت کی ہے اور بہت سی آیات میں قسمیں کھانے کے بعد ان کو توڑنے کے بارے میں تنبیہ کی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَأَوْفُواْ بِعَهْدِ ٱللَّهِ إِذَا عَـٰهَدتُّمْ وَلَا تَنقُضُواْ ٱلْأَيْمَـٰنَ بَعْدَ تَوْكِيدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ ٱللَّهَ عَلَيْكُمْ كَفِيلًا ۚ إِنَّ ٱللَّهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُونَ﴾ ترجمہ: ”اللہ کے عہد کو پورا کرو جبکہ تم نے اس سے کوئی عہد باندھا ہو، اور اپنی قسمیں پختہ کرنے کے بعد توڑ نہ ڈالو، جبکہ تم اللہ کو اپنے اوپر گواہ بنا چکے ہو، اللہ تمہارے سب افعال سے باخبر ہے“۔(سورۃ النحل: 91)

دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿وَأَوْفُواْ بِٱلْعَهْدِ ۖ إِنَّ ٱلْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔولًا﴾ ترجمہ: ”عہد کی پابندی کرو، بے شک عہد کے بارے میں تم کو جواب دہی کرنی ہوگی“۔(سورۃ الاسراء: 34)

اس لئے مسلمانوں کے نزدیک عہد وپیمان کی پاسداری دینِ اسلامی کے ان بنیادی قواعد میں سے ہے جن کا التزام وپابندی ہر مسلمان پر واجب اور ضروری ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ قریش کے ساتھ کئے ہوئے عہد وپیمان کی پاسداری کرتے ہوئے حضرت ابو بصیرؓ کو قریش کے بھیجے ہوئے کارندوں کے ساتھ بھیج دیتے ہیں اور وہ بھی ان دونوں کے ساتھ چل دیئے، جب وہ "ذوالحلیفہ" پہنچے، راستے میں ان دو میں سے ایک سے کہا: اے بنو عامر کے بھائی! تمہاری یہ تلوار کاٹ مارنے والی ہے؟ اس نے کہا: جی ہاں! کہا: ذرا دکھاؤ تو صحیح! اس نے کہا: دیکھ لو اگر چاہتے ہو! تلوار پکڑتے ہی ابو بصیرؓ نے اسے بے نیام کر دیا، اس کے بعد اسی سے اس پر وار کر کے اس کا کام تمام کر دیا، یہ دیکھ کر دوسرا رسول اللہ ﷺ کے پاس بھاگ کر پہنچ گیا اور کہا: آپ کے صاحب نے میرے ساتھی کو قتل کر دیا، کچھ ہی دیر بعد ابو بصیرؓ بھی تلوار لٹکائے ہوئے حاضر ہوگئے اور کہا: اے اللہ کے رسولؐ! آپ نے اپنا عہد وپیمان پورا کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے بھی آپ کو بریءالذمہ کر دیا، مجھے آپ نے ان لوگوں کے حوالے کر دیا، میں نے اپنے دین کی حفاظت کے لئے اپنا تحفظ کیا ہے، وہ مجھے دین سے ہٹائیں گے یا میرے ساتھ کھلواڑ کیا جائے گا، یہ سن کر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اس کا بُرا ہو، یہ لڑائی بھڑکانے والا ہے۔ کاش اس کو کوئی معاون ومددگار ملتا!۔(مسند احمد: 4/331، صحیح بخاری: 2732، سنن ابوداؤد: 2765)

انہوں نے جب یہ بات سنی تو سمجھ گئے کہ آپؐ ان کو پھر سے ان کے حوالے کردیں گے، اس لئے وہ وہاں سے نکل گئے یہاں تک کہ ساحلِ سمندر پر پہنچ گئے اور مکہ کے کمزور مسلمان رسول اللہ ﷺ کی عبارت اور الفاظ سے سمجھ گئے کہ ابو بصیرؓ کو کچھ لوگوں کی ضرورت ہے۔اس لئے وہ مکہ سے بھاگ کر ابو بصیرؓ کے ساتھ ساحل سمندر پر بھاگ کر جانے لگے۔ان کے ساتھ ابو جندل بن سہیل بن عمرو اور دیگر لوگ ملتے گئے یہاں تک کہ ابو بصیرؓ کے ساتھ ایک طاقتور دستہ جمع ہو گیا، جیسے ہی ان کو معلوم ہوتا کہ قریش کا کوئی قافلہ شام کی طرف جارہا ہے تو وہ اس کا راستہ روک دیتے اور بعض کو قتل کر دیتے اور ان کا مالِ تجارت چھین لیتے، یہاں تک کہ مشرکین نے عاجز آکر حضور ﷺ کے پاس آدمی بھیجا کہ خدا اور صلہ رحمی کا واسطہ! اس مصیبت سے ہم کو نجات دلائیں، ابو بصیر اور ان کے ساتھیوں کو اور جو بھی ان کے ساتھ ملے ہوئے سب مأمون ہیں۔ اس کے ذریعہ مشرکین نے اپنی سخت ترین شرط سے دستبرداری اختیار کرلی جس کی وجہ سے وہ غرور و تکبر میں مبتلا تھے اور قریش کو ایسی جگہ ذلت ورسوائی ہوئی جہاں انہوں نے عزت چاہی تھی۔(دیکھیں: محمد رسول اللہ ﷺ، صادق عرجون: 4/281)

اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے ان سب کو پیغام بھجوایا اور وہ سب 'عیص' کے کنارے پر تھے، وہ سب آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، وہ تقریباساٹھ یا ستر افراد تھے۔(السیرۃ النبویہ الصحیحہ: 2/451)

نبی کریم ﷺ نے اہلِ ایمان کی اس جمعیت کو اپنی پناہ میں لے لیا، انہوں نے قریش کی نیند حرام کر دی تھی اور ان کو اپنی ظالمانہ شرط سے دستبردار ہونے پر مجبور کر دیا، اس کے ذریعہ مسلمان اور زیادہ طاقتور اور مستحکم ہو گئے اور ان کا زورِ بازو اور اعتماد مزید بڑھ گیا، البتہ اس اہلِ ایمان جمعیت کے بانی اور امیر کے مقدر میں نہیں تھا کہ وہ بھی رسول اللہ ﷺ کے دیدار سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرتے، اس لئے کہ نبی کریم ﷺ کا والا نامہ ان کے پاس ایسے وقت پہنچا جبکہ وہ بسترِ مرگ پر تھے، خط ہاتھ میں لے کر پڑھتے پڑھتے روح قفصِ عنصری سے پرواز کر گئی، وہ سرحد پر تھے اور ان کا دل مدینہ کے نبوی معاشرہ کے ساتھ تھا۔(صور وعبر من الجہاد النبوی فی المدینہ، ص:296)

بلاشبہ حضرت ابو جندلؓ اور حضرت ابو بصیرؓ نے عقیدہ کی راہ میں جو کچھ برداشت کیا اور جس صبر و ثبات، اخلاص، عزیمت اور جہاد کے ساتھ ڈٹے رہے، یہاں تک کہ مشرکین کے سرغنوں کو ناک رگڑنے پر مجبور کر دیا اور ان کو مسلمانوں سے حدیبیہ میں عائد کی ہوئی شرط کو ختم کرنے کے لئے منت سماجت کرنے پر مجبور ہونا پڑا، یقیناً یہ ایک قابلِ تقلید نمونہ ہے اور اس کے ذریعہ یہ ضابطہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بسا اوقات ایک فرد کے لئے اس چیز کی گنجائش ہوتی ہے جس کی جماعت کے لئے گنجائش نہیں ہوتی ہے، چنانچہ ابو بصیرؓ اور ان کی جماعت نے مشرکین کو اس وقت نقصان پہنچایا جبکہ اسلامی ریاست معاہدۂ صلح کی وجہ سے ایسا کچھ نہیں کر سکتی تھی، لیکن ابو بصیرؓ اور ان کے ساتھی ظاہری طور پر اسلامی ریاست سے باہر تھے اور ابو بصیرؓ اور مکہ کے کمزوروں نے جو کچھ کیا یہ صرف کوئی انفرادی اجتہاد نہیں تھا جس کو رسول اللہ ﷺ کی طرف سے تائید حاصل نہ ہو، اس لئے کہ آپؐ نے ابو بصیر کو نہ ہی مشرکین کے قافلوں کے ساتھ چھیڑ خانی کرنے سے روکا اور نہ ہی مکہ واپس جانے کا حکم دیا، ایسا کچھ بھی نہیں ہوا، اس لئے یہ ایک قسم کا اقرار اور تائید تھی۔اس لئے کہ ابو بصیرؓ اور ان کے ساتھیوں کا موقف اور طرزِ عمل انتہائی حکیمانہ تھا، وہ سرکش مشرکین مکہ کے سامنے نہیں جھکے، جو ان کو دین سے دور رکھنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے اور ان کو مدینہ جانے سے روکتے تھے، اس لئے انہوں نے ایسا موقف اور طرزِ عمل اختیار کیا جس کے ذریعہ وہ ہر قسم کے ظلم وطغیان سے بچ سکیں اور انہوں نے ایسی سرگرمیاں شروع کیں جو مکہ کی معیشت کو کمزور کر رہی تھیں اور صلح کے دور میں ان کے امن وسکون کے احساس کو ختم کر رہی تھیں، بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ حکمتِ

عملی رسول اللہ ﷺ کے اشارہ اور آپ ؐ کی حوصلہ افزائی کے نتیجہ میں اختیار کی گئی تھی جبکہ آپ ؐ نے ابو بصیرؓ کے بارے میں یہ منظر کشی فرمائی تھی کہ : "یہ لڑائی بھڑکانے والا ہے، کاش اس کو کوئی معاون و مددگار ملتا!"۔

ان واقعات پر غور کرنے والے کے سامنے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان صحابہ کرام کی کس طرح حفاظت وتائید فرمائی، اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ صحابہ کرام نے اس کے لئے بعض ایسے اسباب اختیار کئے جن کی وجہ سے وہ اللہ کی طرف سے حفاظت وتائید کے اہل ہوئے، اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اپنی حفاظت وتائید کا اہل بنانے والی چیزوں کو بیان کیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَٱصۡبِرۡ وَمَا صَبۡرُكَ إِلَّا بِٱللَّهِۚ وَلَا تَحۡزَنۡ عَلَيۡهِمۡ وَلَا تَكُ فِي ضَيۡقٖ مِّمَّا يَمۡكُرُونَ ١٢٧ إِنَّ ٱللَّهَ مَعَ ٱلَّذِينَ ٱتَّقَواْ وَّٱلَّذِينَ هُم مُّحۡسِنُونَ ١٢٨﴾ ترجمہ: "اے محمدؐ، صبر سے کام کئے جاؤ اور تمہارا یہ صبر اللہ ہی کی توفیق سے ہے، اِن لوگوں کی حرکات پر رنج نہ کرو اور نہ ان کی چال بازیوں پر دل تنگ ہو۔ بے شک اللہ (کی تائید ونصرت ان لوگوں کے ساتھ ہے جنہوں نے تقوی کی روش اختیار کی اور جو حسن وعمدگی کے ساتھ عمل کرنے والے ہیں"۔(سورۃ النحل:128)۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے:﴿وَلَا تُفۡسِدُواْ فِي ٱلۡأَرۡضِ بَعۡدَ إِصۡلَٰحِهَا وَٱدۡعُوهُ خَوۡفٗا وَطَمَعًاۚ إِنَّ رَحۡمَتَ ٱللَّهِ قَرِيبٞ مِّنَ ٱلۡمُحۡسِنِينَ﴾ ترجمہ: " زمین میں فساد برپا نہ کرو جبکہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے اور خدا ہی کو پکارو خوف کے ساتھ اور طمع کے ساتھ، یقیناً اللہ کی رحمت نیک کردار لوگوں سے قریب ہے"۔(سورۃ اعراف:56)

ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہے:﴿وَمَن يَتَّقِ ٱللَّهَ يَجۡعَل لَّهُۥ مَخۡرَجٗا﴾ ترجمہ: "جو کوئی اللہ سے ڈرتے ہوئے کام کرے گا اللہ اُس کے لئے مشکلات سے نکلنے کا کوئی راستہ پیدا کر دے گا"۔(سورۃ الطلاق:2) مزید فرمایا ہے: ﴿وَٱلَّذِينَ جَٰهَدُواْ فِينَا لَنَهۡدِيَنَّهُمۡ سُبُلَنَاۚ وَإِنَّ ٱللَّهَ لَمَعَ ٱلۡمُحۡسِنِينَ﴾ ترجمہ: "جو لوگ ہماری خاطر مجاہدہ کریں گے انہیں ہم اپنے راستے دکھائیں گے، اور یقیناً اللہ نیکوکاروں ہی کے ساتھ ہے"۔(سورۃ العنکبوت:69)

یہ تمام صفات صحابہ کرام میں بدرجہ اُتم موجود تھیں، جس کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظت وتائید کے مستحق قرار پائے اور جب بھی یہ صفات کسی شخص میں، یا کسی امت میں کسی بھی جگہ اور کسی بھی وقت پائی جائیں گی تو اللہ کی حفاظت وتائید کا اس پر نزول ہو گا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا وعدہ کیا ہے اور اس کا وعدہ برحق ہے۔(غزوۃ الحدیبیہ، للحمی، ص:320)

➢ مہاجر خواتین کو واپس کرنے سے رسول اللہ ﷺ کا انکار:

مکہ کی بعض کمزور خواتین نے دار الکفر سے دار الاسلام ہجرت کرنے کا ارادہ کیا، ان خواتین میں سرفہرست حضرت ام کلثومؓ بنت عقبہ بن ابی معیط تھیں، انہوں نے صلح حدیبیہ کے بعد رسول اللہ ﷺ کی جانب ہجرت کی، کفارِ مکہ نے چاہا کہ ان کو واپس لائیں گے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں یہ آیات نازل کیں: ﴿مُهَٰجِرَٰتٖ فَٱمۡتَحِنُوهُنَّۖ ٱللَّهُ أَعۡلَمُ بِإِيمَٰنِهِنَّۖ فَإِنۡ عَلِمۡتُمُوهُنَّ مُؤۡمِنَٰتٖ فَلَا تَرۡجِعُوهُنَّ إِلَى ٱلۡكُفَّارِۖ لَا هُنَّ حِلّٞ لَّهُمۡ وَلَا هُمۡ يَحِلُّونَ لَهُنَّۖ وَءَاتُوهُم مَّآ أَنفَقُواْۚ وَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ أَن تَنكِحُوهُنَّ إِذَآ ءَاتَيۡتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّۚ وَلَا تُمۡسِكُواْ بِعِصَمِ ٱلۡكَوَافِرِ وَسۡـَٔلُواْ مَآ أَنفَقۡتُمۡ وَلۡيَسۡـَٔلُواْ مَآ أَنفَقُواْۚ ذَٰلِكُمۡ حُكۡمُ ٱللَّهِ

يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾ ترجمہ: "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب مومن عورتیں ہجرت کر کے تمہارے پاس آئیں تو (ان کے مومن ہونے کی) جانچ پڑتال کر لو، اور ان کے ایمان کی حقیقت اللہ ہی بہتر جانتا ہے، پھر جب تمہیں معلوم ہو جائے کہ وہ مومن ہیں تو انہیں کفار کی طرف واپس نہ کرو، نہ وہ کفار کے لئے حلال ہیں اور نہ کفار ان کے لئے حلال، ان کے کافر شوہروں نے جو مہر اُن کو دیئے تھے وہ انہیں پھیر دو اور ان سے نکاح کر لینے میں تم پر کوئی گناہ نہیں جبکہ تم اُن کے مہر اُن کو ادا کر دو، اور تم خود بھی کافر عورتوں کو اپنے نکاح میں نہ روکے رہو، جو مہر تم نے اپنی کافر بیویوں کو دیئے تھے وہ تم واپس مانگ لو اور جو مہر کافروں نے اپنی مسلمان بیویوں کو دیئے تھے انہیں وہ واپس مانگ لیں، یہ اللہ کا حکم ہے، وہ تمہارے درمیان فیصلہ کرتا ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے"۔ (سورۃ الممتحنہ: 10) (تفصیلی روایت کے لئے دیکھیں: ابن سعد: 8/230-231 السنن الکبری للبیہقی: 9/229، مجمع الزوائد: 7/123)

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: ان کا امتحان یہ تھا کہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ (دیکھیں: تفسیر القرطبی: 18/63)

جس دفعہ کے مطابق قریش کی طرف سے محمد ﷺ کے پاس آنے والے کو واپس کرنا ضروری تھا، اس کے مطابق مشرکین سمجھتے تھے کہ ان الفاظ میں مرد و خواتین سب شامل ہیں، جبکہ رسول اللہ ﷺ سمجھتے تھے کہ ان الفاظ میں صرف مرد داخل ہیں، نہ کہ خواتین۔ اس لئے کہ عبادت میں مذکر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے بھی رسول اللہ ﷺ کی رائے کی تائید کی، اس لئے آپؐ نے کسی بھی مسلمان خاتون کو واپس نہیں کیا، جو اپنے دین کی حفاظت کی غرض سے مدینہ ہجرت کر کے آئی تھی، بلکہ آپؐ نے ان کا امتحان لیا اور رب کے حکم کے مطابق ان کو مدینہ میں ہی رہنے دیا۔ (دیکھیں: غزوۃ الحدیبیہ، ص178)

استاذ محمد عزہ دروزہ مذکورہ آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: اس آیت سے متعلق روایات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ بعض مومن خواتین جو صلح حدیبیہ سے قبل مدینہ کی جانب ہجرت نہ کر سکیں، انہوں نے صلح حدیبیہ کے بعد موقع کو غنیمت جانتے ہوئے خفیہ طور پر ہجرت کی، ان کے اہلِ خانہ شرائطِ صلح کے پیش نظر ان کی واپسی کا مطالبہ لے کر آئے۔ اس لئے آیت نازل ہوئی جس میں ان کو واپس لوٹانے کے بارے میں ممانعت کی گئی ہے، اور ان کے شوہروں کو ان پر خرچ کیا ہوا مال دینے کا حکم دیا گیا ہے، صلح کی دستاویز کی نص کی حقیقت کے بارے میں مختلف آراء اور اقوال پائے جاتے ہیں، بعض کے مطابق اس کے الفاظ مطلق اور مذکر کے صیغہ کے ساتھ تھے، اہل مکہ نے یہ سمجھا کہ اس میں مرد و خواتین سب شامل ہیں، اس لئے وہ واپسی کا مطالبہ کرنے کے لئے آئے جبکہ نبی کریم ﷺ یہ سمجھتے تھے کہ اس میں عورتیں داخل نہیں تھیں، اس لئے اس کا فیصلہ کرنے کے لئے یہ آیت نازل ہوئی۔ (دیکھیں: سیرۃ الرسول لدروزہ: 2/354)

استاذ غزالی فرماتے ہیں: صلح حدیبیہ کے بعد مسلمانوں نے مہاجرین خواتین کو ان کے اولیاء کے پاس واپس کرنے سے انکار کیا، انہوں نے ایسا اس لئے کیا کیونکہ انہوں نے یہ سمجھا کہ معاہدہ صرف مردوں کے ساتھ خاص ہے، یا اس لئے کیونکہ ان کو خواتین کے بارے میں اندیشہ تھا کہ وہ تعذیب و توہین کے مقابلہ میں کمزور پڑ جائیں گی، وہ نہ ہی بھاگ سکتی ہیں اور نہ ہی مقابلہ کر سکتی ہیں، جیسے کہ ابو جندلؓ اور ابو بصیرؓ اور ان جیسے حضرات نے کیا، بہر حال جو بھی صورتحال ہو مسلمان ہونے والی خواتین کو روکنا قرآنی تعلیم کے مطابق ہوا۔ (دیکھیں: فقہ السیرۃ للغزالی: 367)

تیسرا باب

غزوۂ حدیبیہ سے مستفاد دروس واسباق اور فوائد و عبرتیں

غزوہ حدیبیہ میں عقائد، فقہ، اصول، تربیت اور دیگر پہلوؤں سے متعلق بہت سے اسباق و دروس پائے جاتے ہیں، ان میں سے بعض اسباق و دروس کا مندرجہ ذیل سطور میں ذکر کیا جاتا ہے:

➢ عقیدہ سے متعلق احکام:

ا: بڑے شخص کے سر کے پاس کھڑے ہونے کا حکم جبکہ وہ بیٹھا ہوا ہو؛ اگرچہ رسول اللہ ﷺ کی عادت مبارکہ یہ نہیں تھی کہ آپؐ کے سر کے پاس کوئی کھڑا ہو اور آپؐ بیٹھے ہوئے ہوں، لیکن حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کا نبی کریم ﷺ کے سر کے پاس تلوار لے کر کھڑا ہونا، اس میں یہ سنت پائی جاتی ہے کہ دشمنوں کی طرف سے سفراء آنے کے وقت ضروری ہے کہ عزت و فخر کا اظہار کیا جائے، امام کی تعظیم واطاعت کی جائے اور دوسروں سے اس کی حفاظت کی جائے، یہی طریقہ رائج ہے جبکہ اہلِ ایمان کے سفراء کفار کے پاس جاتے ہیں اور اہلِ کفر کے سفراء اہل ایمان کے پاس آتے ہیں، اس کا تعلق کھڑے ہونے کی اس نوع سے نہیں ہے جس کی رسول اللہ ﷺ نے اپنے اس قول کے ذریعہ مذمت بیان کی ہے: "جو شخص اس بات کو پسند کرتا ہو کہ لوگ اس کے لئے کھڑے رہیں تو اس کو اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالینا چاہیے"۔ (سنن ابو داؤد: 5229، سنن ترمذی: 2755)

اسی طرح جنگ کے موقع پر فخر اور اِترانا بھی مذموم نہیں ہے، جیسے کہ وہ عام حالات میں مذموم ہے جیسے کہ حضرت ابو دجانہؓ نے غزوۂ احد میں کیا تھا، ہر وہ عمل و حرکت جو تکبر پر دلالت کرے یا متکبرانہ چال اختیار کرنا سب شرعی اعتبار سے ممنوع ہے، لیکن حالتِ جنگ میں یہ جائز ہے، اس لئے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت ابو دجانہؓ کی چال کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا: "یہ ایسی چال ہے جس کو اللہ تعالی ناپسند کرتا ہے، سوائے اس جگہ کے"۔ (المعجم الکبیر للطبرانی: 65085، مجمع الزوائد: 6/109)

۲: نیک فال لینے کا استحباب:

سہیل بن عمرو جب رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مذاکرات کرنے کے لئے آئے تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اللہ نے تمہارے معاملہ کو آسان (سہل) کر دیا"۔ لہذا اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نیک فال لینا مستحب ہے اور اس کا تعلق اس بد فالی سے نہیں ہے جس کے بارے میں ممانعت وارد ہے۔

نیک فال اور بد فالی میں فرق یہ ہے کہ نیک فال کا تعلق اللہ تعالی کے بارے میں حسنِ ظن کے ساتھ ہے، جبکہ بد فالی میں اللہ کے بارے میں بد گمانی اور سوءِ ظن ہوتا ہے، اس لئے وہ ناپسندیدہ ہے۔ (فتح الباری: 10/225)

۳: اس شخص کے کفر کا بیان جس نے یہ عقیدہ رکھا کہ بارش کسی تارے کی وجہ سے ہوتی ہے:

حضرت خالد جہنیؓ فرماتے ہیں: "رسول اللہ ﷺ نے حدیبیہ میں ہم کو صبح کی نماز پڑھائی، رات کو بارش ہو چکی تھی، جب نماز سے فارغ ہوئے تو لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: تم جانتے ہو تمہارا رب کیا فرماتا ہے؟! انہوں نے کہا: اللہ اور اس کا رسول ﷺ خوب جانتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: آج میرے دو طرح کے بندوں نے صبح کی، ایک مومن ہے ایک کافر۔ جس نے کہا: اللہ کے فضل اور رحم سے بارش ہوئی، وہ تو مجھ پر ایمان لایا اور ستاروں کا منکر ہوا، اور جس نے کہا: فلاں تارے کے فلاں جگہ آنے سے بارش ہوئی اس نے میرا کفر کیا اور تاروں پر ایمان لایا"۔ (صحیح البخاري: 846 صحیح مسلم: 71)

علماء نے حدیث میں مذکور کفر کو کفر اعتقادی یا کفران نعمت پر محمول کیا ہے، جو یہ کہے کہ ہم پر فلاں ستارے کی وجہ سے بارش ہوئی، یہ اعتقاد رکھتے ہوئے کہ ستارہ کو بارش پیدا کرنے کی فاعلیت اور تاثیر حاصل ہے تو ایسا شخص ایسے کفر کا مرتکب ہے جو اس کو ملت سے ہی خارج کر دیتا ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں: ہم پر فلاں ستارے کی وجہ سے بارش ہوئی، یا اسی طرح کا اعتقاد جیسے کہ زمانۂ جاہلیت میں رکھتے تھے، جو یہ سمجھتے تھے کہ بارش فلاں ستارے کی وجہ سے ہوتی ہے، اس طرح کا اعتقاد یہ کفر ہے، جیسے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے، اس لئے کہ تارا ایک مخلوق ہے جو نہ خود اپنے آپ کو نفع وضرر پہنچا سکتا ہے اور نہ دوسرے کو، اور اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ فلاں ستارے کی وجہ سے بارش ہوئی اور اس کا مطلب یہ ہو کہ فلاں ستارے کے نکلنے کے وقت بارش ہوئی، تو یہ کفر نہیں ہے، البتہ اس طرح کے کلام کے علاوہ اور کوئی اسلوبِ گفتگو میرے نزدیک زیادہ محبوب ہے۔ (الأم: 1/252)

۴: صالحین کے فضلات اور اُن کے آثار سے تبرک کا حکم:

عروہ بن مسعود جب اصحاب رسول ﷺ کے بارے میں منظر کشی کرتا ہے تو وہ کہتا ہے: "..... قسم بخدا! جب وہ ناک صاف کرتے ہیں تو اس کی ریزش صحابہ کرام اپنی ہتھیلی میں لے لیتے ہیں اور اس کو اپنے چہرے پر اور جلد پر مل لیتے ہیں، جب وہ وضو کرتے ہیں تو وضو کا پانی لینے کے لئے وہ ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑتے ہیں"۔

امام شاطبیؒ نے اس حدیث پر اور اس جیسی دیگر احادیث پر تبصرہ و تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: "اس طرح کی چیزوں کے بارے میں بظاہر ایسا لگتا ہے کہ یہ اس شخص کے حق میں مشروع اور درست ہو جس کی ولایت اور اتباعِ سنت ثابت ہو، اس کے وضو کے زائد پانی سے تبرک حاصل کیا جا سکتا ہے، اس کی ناک کی ریزش کو ملا جا سکتا ہے اور اس کے تمام آثار سے شفا یابی حاصل کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں ایک قطعی طرزِ عمل اور ضابطہ اس کے معارض و مخالف ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کی وفات کے بعد صحابہ کرامؓ میں سے کسی کی طرف سے کوئی ایسا طرزِ عمل یا طریقہ اختیار نہیں کیا گیا۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے اپنے بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ سے افضل شخصیت کوئی نہیں چھوڑی، وہ آپؐ کے خلیفہ بھی تھے، لیکن ان کے ساتھ ایسا کچھ نہیں کیا گیا، نہ ہی حضرت عمرؓ کے ساتھ ایسا کچھ کیا گیا، جبکہ وہ حضرت ابو بکرؓ کے بعد افضل الأمۃ تھے۔ پھر اسی طرح حضرت عثمانؓ اور پھر حضرت علیؓ اس کے بعد تمام صحابہ کرام جن سے افضل پوری امت میں کوئی نہیں ہو سکتا ہے، لیکن ان میں سے کسی کے بارے میں کسی صحیح اور معروف سند سے کہیں ثابت نہیں ہے کہ کسی تبرک حاصل کرنے والے نے اس طرح سے تبرک حاصل کیا ہو، بلکہ انہوں نے صرف افعال و اقوال اور اس طرزِ زندگی میں اقتدار اور اتباع پر اکتفا کیا، جو نبی

کریم ﷺ کے طرزِ زندگی کے مطابق تھا، لہذا اس طرح تبرک حاصل کرنے کے سلسلہ میں تمام صحابہ کرام کی طرف سے اجماع ثابت ہے۔ (دیکھیں: غزوۃ الحدیبیہ، للحکمی، ص:305)

ابن وہب نے اپنی جامع میں یونس بن یزید سے اور انہوں نے ابن شہاب سے حدیث نقل کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے انصار کے ایک شخص (عبدالرحمن بن اُبَی قرادؓ) نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ جب وضو فرماتے تھے اور ناک صاف کرتے تھے تو آپؐ کے آس پاس مسلمان آپؐ کے وضو کا پانی اور ریزش لینے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھتے تھے اور اس کو اپنے جسم پر ملتے تھے، جب آپؐ نے ان کو ایسا کرتے ہوئے دیکھا تو ان سے دریافت کیا: آپ لوگ ایسا کیوں کرتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا: ہم اس کے ذریعہ پاکی اور برکت حاصل کرتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے جو شخص چاہتا ہو کہ اللہ اور اس کا رسول اس سے محبت کرے تو اس کو سچ بولنا چاہیے، امانت ادا کرنی چاہیے اور وہ اپنے پڑوسی کو تکلیف نہ دے۔ (مصنف عبدالرزاق:19748، الصحیحہ للألبانی:2998)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بہتر یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے آثار سے تبرک حاصل کرنے کو ترک کرنا زیادہ بہتر ہے، اور جہاں تک تعلق ہے حدیبیہ کے روز رسول اللہ ﷺ کے سکوت اختیار کرنے کا، تو اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے تاکہ قریش کا سفیر عروہ بن مسعود رسول کریم ﷺ کے ساتھ صحابہ کرام کے تعلق اور محبت کا مشاہدہ کرلیتا، خاص طور پر جب کہ اس نے یہ بات کہی تھی کہ میں کچھ ایسے چہرے دیکھ رہا ہوں جو بہت جلد آپ کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔

➤ فقہی اور اصولی احکام:

ا: حضرت کعب بن عجرہ کا واقعہ اور آیتِ فدیہ کا نزول:

حضرت کعب بن عجرہؓ فرماتے ہیں: اللہ کے رسول ﷺ حدیبیہ میں میرے قریب آکر کھڑے ہوگئے جب کہ میرے چہرے پر جوئیں گرتی جارہی تھیں، آپؐ نے دریافت کیا: ان جوؤں سے تمہیں تکلیف ہے؟ میں عرض کیا: جی ہاں! آپؐ نے فرمایا: آپ حلق کرالو۔ فرماتے ہیں: اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ بِهِۦٓ أَذًى مِّن رَّأْسِهِۦ فَفِدْيَةٌ مِّن صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ﴾ ترجمہ: ”مگر جو شخص مریض ہو یا جس کے سر میں کوئی تکلیف ہو اور اس بنا پر اپنا سر منڈوالے، تو اُسے چاہیے کہ فدیے کے طور پر روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے“۔ (سورۃ البقرہ:196) اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تین دن کے روزے رکھو یا چھ مسکینوں کو ایک فَرَق (تین صاع غلّہ) صدقہ دے دو، یا جو میسر ہو قربانی کرلو۔ (صحیح بخاری: 1815، صحیح مسلم: 1201/82، سنن ترمذی:2974)

سورۂ بقرہ کی مذکورہ آیت میں اس شخص کا حکم بیان کیا گیا ہے جو حالتِ احرام میں ہو اور اس کے سر میں تکلیف ہو، یہ آیت اگرچہ حضرت کعب بن عجرہؓ کے بارے میں بطور خاص نازل ہوئی ہے لیکن اس آیت میں مذکور حکم ایسی صورتحال میں مبتلا ہر شخص کے لئے ہے۔

۲: خیموں میں نماز پڑھنے کی مشروعیت:

ابن ماجہ نے ابوالملیح بن اُسامہ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں: میں ایسی رات میں مسجد کی جانب نکلا جبکہ پوری رات بارش ہو رہی تھی، جب میں واپس آیا تو دروازہ کھولنے کے لئے کہا، میرے والد (اسامہ بن عمیر ہذلی بصری) نے پوچھا: کون ہے؟ انہوں نے کہا: ابو الملیح۔(میرے والد) نے کہا: ہم حدیبیہ کے روز رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے اور اتنی ہلکی پھلکی بارش ہوئی جس سے ہمارے جوتوں کا نیچے کا حصہ تر نہیں ہوا، رسول اللہ ﷺ کے منادی نے ندا دی: اپنے خیموں میں نماز پڑھو۔(سنن ابوداؤد:1059، نسائی:2/111، ابن ماجہ:936)

یہ صحیح حدیث ہے، اس کی سند متصل ہے اور ثقہ راویوں نے اس کو روایت کیا ہے، ابنِ حجرؒ نے بھی اس کو صحیح قرار دیا ہے۔(فتح الباری:2/184، غزوۃ الحدیبیہ، للحکمی، ص221)

۲: حدیبیہ سے واپسی اور نماز فجر کے وقت سوتے رہ جانا:

حدیبیہ میں مسلمانوں کی مدتِ اقامت سترہ دن رہی، واقدی اور ابن سعد کے قول کے مطابق بیس دن، جبکہ ابن عائذ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس غزوہ میں ڈیڑھ مہینہ رہے۔(دیکھیں: مغازی الواقدی: 2/616، الطبقات الکبری: 2/98، شرح الزرقانی علی المواہب:2/210)

بظاہر ایسا لگتا ہے کہ واقدی اور ابن سعد نے متعین طور پر اس مدت کا ذکر کیا ہے جو آپ ﷺ نے حدیبیہ میں گزاری، اور ابن عائذ نے اس پوری مدت کا ذکر کیا ہے جس میں آپ ﷺ مدینہ سے نکلنے کے بعد سے لے کر واپس آنے تک مدینہ سے باہر رہے۔

مسلمان جب عمرہ کے احرام سے باہر آگئے تو اس کے بعد مدینہ کی جانب واپس آئے، رات ہوئی تو راستے سے ہٹ کر سونے کے لئے چلے گئے اور بلالؓ کو حراست و پہرہ کے لئے متعین کیا، حضرت بلالؓ بھی سو گئے اور وہ سورج کی دھوپ سے ہی جاگ پائے، جیسے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث میں وارد ہے، وہ فرماتے ہیں: ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حدیبیہ کے زمانہ میں سفر سے واپس آئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کون ہماری حفاظت و پہرہ پر رہے گا؟ حضرت بلالؓ نے کہا: میں، سب سو گئے، یہاں تک کہ سورج طلوع ہو گیا۔ نبی کریم ﷺ بیدار ہوئے تو فرمایا: ویسے ہی کرو جیسے عام حالات میں کرتے تھے، فرماتے ہیں: ہم نے ایسے ہی کیا۔ فرماتے ہیں: جو شخص سو جائے یا بھول جائے تو ایسے ہی کیا کرے۔(سنن ابو داؤد:447، السنن الکبری للنسائی:8802، مسند احمد:1/386)

بعض دوسری احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ صبح کی نماز کے وقت سونے کا واقعہ حدیبیہ کے علاوہ دیگر اسفار میں پیش آیا۔ بعض علماء نے ان نصوص کے مابین تطبیق کی کوشش کی ہے۔ڈاکٹر حافظ الحکمی نے یہ رائے اختیار کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور دیگر صحابہ کی احادیث میں جو اختلاف ہے وہ تعدّدِ واقعات پر محمول ہے، جیسے کہ اسی کو امام نوویؒ نے راجح قرار دیا ہے اور ابن کثیرؒ، ابن حجرؒ اور زرقانیؒ نے بھی یہی رائے اختیار کی ہے، اِمام سیوطیؒ فرماتے ہیں: تعدّدِ واقعات پر محمول کرنے سے ہی ان کے مابین تطبیق ہو سکتی ہے۔(دیکھیں: شرح النووی علی صحیح مسلم:5/181، غزوۃ الحدیبیہ، ص258، البدایہ والنہایہ: 4/213، فتح الباری:449، شرح الزرقانی علی الموطأ: 1/47)

۴: مسلمانوں اور اعداء کے مابین جنگ بندی کی مشروعیت اور جنگ بندی کی مدت:

علماء اور ائمہ نے صلح حدیبیہ کے ذریعہ مسلمانوں کے مابین اور ان کے دشمن اہلِ حرب کے درمیان ایک مدت تک جنگ بندی کے جواز پر استدلال کیا ہے، چاہے یہ کسی عوض کے بدلے میں ہو یا بغیر کسی عوض کے، جہاں تک بغیر عوض کے جنگ بندی کا تعلق ہے تو چونکہ مدینہ کی جنگ بندی اسی طرح تھی، اور جہاں تک بالعوض کا تعلق ہے تو پہلے پر قیاس کرتے ہوئے وہ درست ہے۔ اس لئے کہ جب بغیر عوض کے جائز ہے تو بالعوض جائز ہونا بدرجہ اولیٰ درست اور قرینِ قیاس ہے۔

اور اگر مصالحت اس پر ہو کہ مسلمان مال دیں گے تو یہ جمہور علماء کے نزدیک جائز نہیں ہے، اس لئے کہ اس میں ان کی تذلیل و توہین ہے اور اس کے جواز کی قرآن اور سنت سے کوئی دلیل بھی ثابت نہیں ہے۔ علماء کہتے ہیں: ہاں، اگر کوئی ایسی ضرورت متقاضی ہو جس سے کوئی مفر نہ ہو جیسے کہ مسلمانوں کو ہلاکت یا گرفتاری کا اندیشہ ہو تو اس صورت میں جائز ہے، جیسے کہ قیدیوں کے لئے اپنے آپ کو مال دے کر رہا کرانا جائز ہے۔

امام شافعیؒ اور امام احمدؒ اور بہت سے ائمہ کی رائے یہ ہے کہ مصالحت ایک متعینہ مدت تک ہی ہونی چاہیے اور یہ جائز نہیں ہے کہ دس سالوں سے زائد ہو۔ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے حدیبیہ کے سال قریش کے ساتھ اتنی ہی مدت کے لئے مصالحت کی تھی۔ (دیکھیں: فقہ السیرۃ النبویۃ، للبوطی، ص242)

دیگر علماء کی رائے یہ ہے کہ دس سال سے زائد کے لئے بھی جنگ بندی کی جاسکتی ہے، اگر امام کو اس میں مصلحت محسوس ہو، یہ امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے۔ (دیکھیں: فتح القدیر: 5/546، غزوۃ الحدیبیہ، ص294)

صحیح قول یہ ہے کہ ظاہر حدیث کی وجہ سے پہلا قول زیادہ راجح ہے اور اگر دس سال سے زائد مصالحت کرنے میں مصلحت ہو تو دس سال کے بعد اس کی تجدید کی جائے، جیسے کہ امام شافعیؒ کا قول ہے۔

بعض متاخرین کا قول ہے کہ غیر متعینہ مدت تک ہمیشہ کے لئے صلح کا معاہدہ کرنا جائز ہے، اللہ تعالیٰ کے اس قول کے ذریعہ استدلال کیا ہے: ﴿إِلَّا ٱلَّذِينَ يَصِلُونَ إِلَىٰ قَوۡمِۭ بَيۡنَكُمۡ وَبَيۡنَهُم مِّيثَٰقٌ أَوۡ جَآءُوكُمۡ حَصِرَتۡ صُدُورُهُمۡ أَن يُقَٰتِلُوكُمۡ أَوۡ يُقَٰتِلُواْ قَوۡمَهُمۡۚ وَلَوۡ شَآءَ ٱللَّهُ لَسَلَّطَهُمۡ عَلَيۡكُمۡ فَلَقَٰتَلُوكُمۡۚ فَإِنِ ٱعۡتَزَلُوكُمۡ فَلَمۡ يُقَٰتِلُوكُمۡ وَأَلۡقَوۡاْ إِلَيۡكُمُ ٱلسَّلَمَ فَمَا جَعَلَ ٱللَّهُ لَكُمۡ عَلَيۡهِمۡ سَبِيلٗا﴾ ترجمہ: ''البتہ وہ منافق اس حکم سے مستثنیٰ ہیں جو کسی ایسی قوم سے جاملیں جس کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہے، اسی طرح وہ منافق بھی مستثنیٰ ہیں جو تمہارے پاس آتے ہیں اور لڑائی سے دل برداشتہ ہیں، نہ تم سے لڑنا چاہتے ہیں نہ اپنی قوم سے، اللہ چاہتا تو ان کو تم پر مسلط کر دیتا اور وہ بھی تم سے لڑتے، لہٰذا اگر وہ تم سے کنارہ کش ہو جائیں اور لڑنے سے باز رہیں اور تمہاری طرف صلح و آشتی کا ہاتھ بڑھائیں تو اللہ نے تمہارے لئے ان پر دست درازی کی کوئی سبیل نہیں رکھی ہے''۔ (سورۃ النساء: 90)

یہ قول اس اصول اور ضابطہ پر مبنی ہے کہ کفار کے ساتھ مسلمانوں کے تعلق میں اصل چیز امن و صلح ہے نہ کہ جنگ، اور جہاد صرف مسلمانوں کی طرف سے دفاع کرنے کے لئے مشروع کیا گیا ہے۔ (دیکھیں: آثار الحرب فی الفقہ الاسلامی، الدکتور وہبہ الزحیلی، ص680)

لیکن یہ قول کئی اعتبار سے درست نہیں ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ اس رائے کو اختیار کرنے والے نے اجماع واتفاق کے بر خلاف رائے اختیار کی ہے، حالانکہ بذات خود پہلے اجماع کی بات نقل کی ہے۔ (دیکھیں: آثار الحرب فی الفقہ الاسلامی للزحیلی، ص675)

دوسری بات یہ ہے کہ جس آیت سے استدلال کیا ہے وہ آیت اس آیت کے ذریعہ منسوخ ہے: ﴿فَإِذَا ٱنسَلَخَ ٱلْأَشْهُرُ ٱلْحُرُمُ فَٱقْتُلُوا۟ ٱلْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَٱحْصُرُوهُمْ وَٱقْعُدُوا۟ لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَإِن تَابُوا۟ وَأَقَامُوا۟ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتَوُا۟ ٱلزَّكَوٰةَ فَخَلُّوا۟ سَبِيلَهُمْ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ ترجمہ: ”پس جب حرام مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو جہاں پاؤ اور انہیں پکڑو اور گھیرو اور ہر گھات میں اُن کی خبر لینے کے لئے بیٹھو، پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو انہیں چھوڑ دو، اللہ در گزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے“۔ (سورۃ التوبہ: 5)

تیسری بات یہ ہے کہ جس بنیاد پر قول اختیار کیا گیا ہے وہ یہ کہ کفار کے ساتھ اصل چیز امن اور صلح ہے، یہ سابقہ آیتِ براءۃ کی وجہ سے اور رسول اللہ ﷺ کی سیرت اور طرزِ عمل کی وجہ سے غلط اور بے بنیاد ہے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ یہ کہنا کہ جہاد کی مشروعیت مسلمانوں کے دفاع کے لئے ہوئی ہے، یہ باہر سے آئی ہوئی فکر ہے جس کا تشفی بخش جواب سید قطبؒ نے دیا ہے اور واضح کیا ہے کہ یہ فکر مستشرقین کی فکری وعلمی یلغار کے سامنے شکست اور دعوتی مراحل کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ (دیکھیں: تفسیر الطبري 9/24، في ظلال القرآن: 3/1433، غزوۃ الحدیبیہ للحمی، ص:296)

۵: مطلق کا عمومی اطلاق:

مطلق کو اس کے اطلاق اور عموم پر محمول کیا جائے گا، یہ ایک اصولی قاعدہ ہے جس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ ابن ہشام نے ابو عبید سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ چھ اصحاب تھے، ان میں سے بعض نے آپؐ سے فرمایا جبکہ آپؐ مدینہ تشریف لائے: اے اللہ کے رسولؐ! کیا آپ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ آپ مکہ میں امن کے ساتھ داخل ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کیوں نہیں! کیا میں نے یہ کہا تھا کہ اسی سال داخل ہوں گے؟ اُنہوں نے کہا: نہیں، آپؐ نے فرمایا: ایسے ہی مجھ سے جبرئیل علیہ السلام نے کہا تھا۔ (سیرت ابن ہشام: 3/341، صور وعبر من الجهاد النبوي في المدينة، ص:297)

اس روایت میں اہلِ ایمان کو مستقبل میں مکہ کے فتح ہونے کی خوشخبری دی گئی ہے، اور مبنی بر حق وحی کے ذریعہ نصرت و فتح کی جانب اشارہ کیا گیا ہے اور ان کو اس جانب متوجہ کیا گیا ہے کہ جب بھی کوئی حکم مطلقاً بیان کیا گیا ہو تو اس کے ساتھ ایسی حدود اور قیود اور ایسے اضافے شامل نہ کئے جائیں جو اس کے اطلاق و عموم کو مقید و محدود کر دیں۔ (دیکھیں: غزوۃ الحدیبیہ، للحمی، ص: 313)

۶: اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت وفرمانبرداری کا وجوب اگرچہ یہ عقل وقیاس کے برخلاف ہو اور نفس اس کو ناپسند کرے:

حدیبیہ کے قصہ میں آیا ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ اور بعض دیگر صحابہ کرام نے قریش کے ساتھ صلح کو ناپسند کیا، اس لئے کہ اس کی شرائط میں ظلم اور حق تلفی ظاہری طور پر نظر آرہی تھی، لیکن بعد میں ان کو اپنے اس طرزِ عمل پر ندامت ہوئی اور انہوں نے سمجھا کے وہ حرج میں پڑ گئے ہیں، اس لئے کہ وہ کس طرح ایسی چیز کو ناپسند کر سکتے ہیں جس سے رسول اللہ ﷺ راضی تھے، یہ واقعہ پوری زندگی ان کے لئے ایک سبق کے طور پر باقی رہا، وہ دوسروں کو اس طرح کا طرزِ عمل اختیار کرنے سے ڈراتے تھے کہ اپنی رائے پر اعتبار نہ کیا جائے۔ حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا: اے لوگو! دین کے مقابلہ پر رائے کو متّہم قرار دو، میں نے اپنے آپ کو اس حال میں پایا ہے کہ میں اجتہاد کرتے ہوئے اپنی رائے کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ کے حکم کو رد کر رہا تھا، اللہ کی قسم! میں حق کے بارے میں کوتاہی نہیں کروں گا اور یہ ابو جندل والے دن کی بات ہے۔(البزار 1813، مجمع الزوائد: 6/145)

حضرت سہیل بن حنیفؓ فرمایا کرتے تھے: اپنی رائے کو متّہم قرار دو، میں نے ابو جندل والے دن اپنے آپ کو اس حال میں دیکھا کہ اگر وہ رسول اللہ ﷺ کے حکم کو رد کر سکتا تھا تو میں رد کرتا۔(دیکھیں: غزوۃ الحدیبیہ، للحکمی، ص: 313)

حضرت عمر بن خطابؓ ایک زمانہ تک خوفزدہ رہے کہ کہیں حدیبیہ میں اختیار کئے گئے طرزِ عمل کی وجہ سے ان کے بارے میں وحی نہ نازل ہو جائے۔ حضرت عمرؓ اس قصہ کے بارے میں بیان کرتے تھے اور کہتے: میں مسلسل اپنے طرزِ عمل کی وجہ سے روزہ رکھتا رہا، صدقہ کرتا رہا اور غلام آزاد کرتا رہا، اس ڈر سے کہ میں نے اس روز غیر مناسب گفتگو کی ہے، یہاں تک کہ مجھے امید ہو گئی کہ اب اچھا ہی ہو گا۔ (سیرت ابن ہشام: 3/331، حدائق الانوار ومطالع الأسرار: 2/622)

ابن الدبیع شیبانی اس واقعہ پر تعلیق و تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: علماء کہتے ہیں: اس قصہ میں رسول اللہ ﷺ کی اطاعت و فرمانبرداری کا واجب وضروری ہونا کسی سے مخفی نہیں ہے، اگرچہ وہ حکم بظاہر قیاس کے برخلاف ہو یا نفس اس کو پسند کرتا ہو، اس لئے ہر مکلف پر یہ اعتقاد رکھنا واجب ہے کہ بھلائی اسی میں ہے جس کا آپ ﷺ حکم دیں، اور اسی میں دنیا و آخرت کی سعادت و فلاح مضمر ہے، اور یہی حکم بہتر و مکمل ہے، البتہ بہت سی عقلیں اس کے مقصد کا ادراک کرنے اور اس کے انجام کو سمجھنے سے قاصر ہوتی ہے۔(دیکھیں: مرویات الحدیبیہ، ص 315)

۳: نبوی تربیت کا ایک نمونہ:

اللہ کے رسول ﷺ کا یہ فرمان: "جو المرار پہاڑی پر چڑھے گا اس کے گناہ اسی طرح معاف ہوں گے جیسے بنی اسرائیل کے معاف ہوئے تھے"۔

اس حدیث کے ذریعہ نبوی تربیت کا ایک عظیم پہلو ظاہر ہوتا ہے جو غور و فکر متقاضی ہے، اللہ کے رسول ﷺ پہاڑی پر چڑھنے کی ترغیب دے رہے ہیں اور ساتھ میں یہ بھی فرما رہے ہیں کہ جو اس پر چڑھے گا اس کو اللہ کی طرف سے مغفرت ملے گی، اس حدیث پر غور و فکر کرنے سے عظیم معانی و مفاہیم حاصل ہوتے ہیں:

۱: اللہ کے رسول ﷺ چاہتے ہیں کہ زندگی کے ہر لمحہ میں اپنے اصحاب کے دلوں کو آخرت کے ساتھ مربوط کریں۔

۲: اللہ کے رسول ﷺ چاہتے ہیں کہ ان کی ہر حرکت اور ہر عمل کو یہاں تک کہ ان کی فطری عادات اور جذبات کو یوم آخرت کے لئے زادِ راہ کے طور پر اختیار کرنے کی طرف متوجہ کریں، اللہ کے رسول ﷺ صحابہ کے دلوں میں ان معانی کو راسخ و مستحکم کرنے کی ہمیشہ کوشش کرتے تھے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ؐ ایک دوسرے موقع پر ارشاد فرماتے ہیں: "اور جائز طریقہ سے ازدواجی تعلق قائم کرنا بھی صدقہ ہے"۔ صحابہ کرام نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ؐ! کیا ہم میں سے کوئی اپنی خواہش پوری کرے اور اس کے لئے اس میں اجر ہے؟ آپ ؐ نے فرمایا: آپ کا کیا خیال ہے اگر حرام کا مرتکب ہوتا تو کیا اس پر گناہ تھا؟ لہذا جب اس نے حلال طریقہ اختیار کیا تو اس کے لئے اجر وثواب ہے۔ (مسند احمد: 5/167-168، صحیح مسلم: 1006، سنن ابوداؤد: 5243-5244)

ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرماتے ہیں: ”آپ جو بھی انفاق کرتے ہیں وہ صدقہ ہے، یہاں تک کہ اس لقمہ میں بھی صدقہ کا اجر ہے جو آپ اپنی شریکِ حیات کو ہاتھ سے کھلاتے ہو“۔ (صحیح بخاری: 2742، صحیح مسلم: 1628)

یقیناً یہ معانی و مفاہیم جب ایک مسلمان کے دل میں راسخ ہو جاتے ہیں تو اس بات کی ضمانت ہے کہ اس کی مکمل زندگی ایک اللہ کی عبودیت کے رنگ میں رنگ جائے اور اگر عبادت کا تصور ایک مسلمان کی زندگی کے تمام پہلوؤں میں شامل ہو جائے گا تو اس کے بابرکت اثرات کا ظہور ہوگا، جس کو ایک فرد اپنی ذات میں اور آس پاس کے لوگوں میں محسوس کرے گا۔ (دیکھیں: مرویات غزوۃ الحدیبیہ للحکمی، ص 315)

صحابہ کرام نے انہی مفاہیم اور تصورات کے ساتھ اپنی زندگی بسر کی اور ان مفاہیم کو انہوں نے اپنی پوری زندگی میں محسوس کئے جانے والے حقائق میں تبدیل کر کے دکھایا، اللہ تعالیٰ نے ان کی زندگی اور سیرت کو اسی لئے محفوظ رکھا تاکہ ہم اپنی زندگی میں ان کے نقشِ قدم پر چلیں اور بعد میں آنے والوں کے لئے وہ حجت و دلیل اور نشانِ راہ کا کام دے سکیں۔ (دیکھیں: مرویات غزوۃ الحدیبیہ للحکمی، ص 316)

....

چودہویں فصل

حدیبیہ اور فتح مکہ کے مابین کے اہم واقعات

پہلا باب

غزوۂ خیبر

ا: غزوۂ خیبر کی تاریخ اور اسباب:

ابن اسحاق نے ذکر کیا ہے کہ غزوۂ خیبر سن سات ہجری کے ماہ محرم میں پیش آیا۔(سیرت ابن ہشام: 3/455) واقدی نے ذکر کیا ہے کہ یہ غزوہ حدیبیہ سے واپسی کے بعد سن سات ہجری میں ماہ صفر یا ربیع الاول میں پیش آیا۔(المغازی: 2/634) جبکہ ابن سعد کا کہنا ہے کہ یہ سن سات ہجری کے ماہ جمادی الاولی میں پیش آیا۔(طبقات ابن سعد: 2/106) جبکہ امام زہریؒ اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ یہ سن چھ ہجری کے ماہ محرم میں پیش آیا۔(دیکھیں: تاریخ دمشق، ابن عساکر: 1/33)

ابن اسحاق اور واقدی کے مابین اختلاف معمولی ہے اور وہ دو ماہ کا اختلاف ہے، اسی طرح ان دونوں کہ مابین اور امام زہری اور امام مالک کے مابین اختلاف کی بنیاد پہلی سن ہجری کے آغاز کے سلسلہ میں اختلاف ہے۔ ابن حجرؒ نے واقدی کے مقابلہ میں ابن اسحاق کے قول کو راجح قرار دیا ہے۔(فتح الباری: 16/41، السیرۃ النبویۃ فی ضوء المصادر الاصلیہ، ص: 500)

خیبر کے یہود نے مسلمانوں کے خلاف عداوت و دشمنی کا اظہار اس وقت تک نہیں کیا جب تک کہ بنی نضیر کے زعماء وہاں جا کر قیام پذیر نہیں ہوئے، بنی نضیر کی اپنے گھروں سے جلاوطنی نے ان کے دلوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور ان کے زورِ بازو اور حوصلوں کو پست اور ختم کرنے کے لئے صرف جلاوطنی کافی نہیں تھی، چنانچہ انہوں نے مدینہ اس حال میں چھوڑا کہ ان کے ساتھ عورتیں، بچے اور مال واسباب بھی تھے اور ان کے پیچھے پیچھے گانے والی عورتیں بڑے طمطراق اور غرور کے ساتھ دف بجا رہی تھیں، ایسا منظر اس زمانہ میں کسی قوم کا نہیں دیکھا گیا۔(السیرۃ النبویۃ الصحیحہ: 1/319)

زعمائے بنی نضیر میں خیبر میں قیام پذیر ہونے والوں میں نمایاں ترین یہ لوگ تھے: سلام بن ابی الحقیق، کنانہ بن ابی الحقیق، حُیی بن اُخطب۔ جب یہ لوگ وہاں پہنچے تو وہاں کے تمام باشندے ان کے تابع فرمان ہو گئے۔

خیبر کے یہودیوں کا لیڈر و قائد بننے کے لئے یہی کافی تھا کہ وہ ان کو مسلمانوں کے خلاف محاذ آرائی کرنے، انتقام لینے اور ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی دلدل میں لے کر آئیں، اس لئے کہ ان کے اندر پوشیدہ عداوت و دشمنی بار بار انگڑائی لے رہی تھی اور مدینہ کے اندر اپنے گھروں میں واپس جانے کا شوق بار بار ان کو تحریک دیتا رہتا تھا، اس سلسلہ میں ان کی پہلی کوشش اس وقت شروع ہوئی تھی جبکہ انہوں نے غزوۂ احزاب کے موقع پر اہلِ خیبر اور زعمائے بنی نضیر نے قریش کو اور اُعراب کو مسلمانوں کے خلاف جمع کرنے میں اہم رول ادا کیا، ان کے مال واسباب کو بھی مسلمانوں کے خلاف استعمال کرانے میں بنیادی کردار ادا کیا اور پھر بنی قریظہ کو غداری اور بدعہدی کرنے اور اُحزاب کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے تیار کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، بلکہ انہوں نے اپنے مال خرچ کئے اور بنی قریظہ کے یہود کے ساتھ

اپنے تعلقات وروابط سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کی پیٹھ میں پیچھے سے چھرا گھونپنے کی پوری کوشش کی،اس طرح سے خیبر مسلمانوں اوران کی ابھرتی ہوئی ریاست کے لئے ایک بہت بڑے خطرے کا مرکزاور چیلنج بن گیا تھا۔

صلح حدیبیہ کے بعد مسلمان خیبر کے یہود کے اس خطرہ سے نمٹنے کے لئے فارغ ہو گئے جو اب مسلمانوں کے امن کے لئے ایک خطرہ کی گھنٹی بن گئے تھے، حدیبیہ کے بعد نازل ہونے والی سورۃ الفتح میں فتح خیبر کا وعدہ الٰہی بھی موجود تھااور یہ بھی خوشخبری تھی کہ وہاں کا مال بطورِ غنیمت حاصل ہونے والا تھا۔(دیکھیں: نضرۃ النعیم:1/349،فتح الباری:7/530)

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿لَّقَدْ رَضِيَ ٱللَّهُ عَنِ ٱلْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ ٱلشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنزَلَ ٱلسَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَٰبَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا ﴿١٨﴾ وَمَغَانِمَ كَثِيرَةً يَأْخُذُونَهَا ۗ وَكَانَ ٱللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿١٩﴾ وَعَدَكُمُ ٱللَّهُ مَغَانِمَ كَثِيرَةً تَأْخُذُونَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هَٰذِهِۦ وَكَفَّ أَيْدِيَ ٱلنَّاسِ عَنكُمْ وَلِتَكُونَ ءَايَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَٰطًا مُّسْتَقِيمًا ﴿٢٠﴾ وَأُخْرَىٰ لَمْ تَقْدِرُوا۟ عَلَيْهَا قَدْ أَحَاطَ ٱللَّهُ بِهَا ۚ وَكَانَ ٱللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا ﴿٢١﴾﴾ ترجمہ: ”اللہ مومنوں سے خوش ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے ان کے دلوں کا حال اُس کو معلوم تھا،اس لئے اس نے ان پر سکینت نازل فرمائی،ان کو انعام میں قریبی فتح بخشی۔اور بہت سامال غنیمت انہیں عطا کر دیا جسے وہ(عنقریب) حاصل کریں گے ،اللہ زبردست اور حکیم ہے۔اللہ تم سے بکثرت اموال غنیمت کا وعدہ کرتا ہے جنہیں تم حاصل کرو گے فوری طور پر، تو یہ فتح اس نے تمہیں عطا کر دی اور لوگوں کے ہاتھ تمہارے خلاف اٹھنے سے روک دیئے،تاکہ یہ مومنوں کے لئے ایک نشانی بن جائے اور اللہ سیدھے راستے کی طرف تمہیں ہدایت بخشے۔اِس کے علاوہ دوسرے اور غنیمتوں کا بھی وہ تم سے وعدہ کرتا ہے جن پر تم ابھی تک قادر نہیں ہوئے ہو اور اللہ نے ان کو گھیر رکھا ہے،اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔(سورۃ الفتح:18-21)

۲: خیبر کی جانب اسلامی لشکر کی روانگی:

اسلامی لشکر بلند حوصلوں اور ایمانی روح کے ساتھ روانہ ہوا، حالانکہ ان کو معلوم تھا کہ خیبر کے قلعے انتہائی مضبوط ہیں،وہاں کے باشندے انتہائی طاقتور ہیں اور وہ سامانِ حرب وضرب سے لیس ہیں، مسلمان بلند آواز کے ساتھ تکبیر و تہلیل کر رہے تھے، یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا کہ قدرے نرمی اختیار کریں،آپؐ نے فرمایا: ”اے لوگو!ذرا نرمی اختیار کرو،اس لئے کہ آپ کسی بہرے اور غائب کو نہیں پکار رہے ہو،بلکہ آپ سمیع وبصیر کو پکار رہے ہو“۔(صحیح بخاری:6384، صحیح مسلم:2704)

آپ ﷺ نے اپنے لشکر کے ساتھ رات میں سفر کیا، حضرت سلمہ بن اکوعؓ فرماتے ہیں: ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ خیبر کی جانب رات کو چلے اور عامر بن اکوع لوگوں کے آگے آگے حدی خوانی کر رہے تھے وہ کہہ رہے تھے:

اللهم لولا أنت ما اهتدينا ... ولا تصدّقنا ولا صلّينا

فاغفر فداءً لك ما اقتنينا ... وثبّت الأقدام إنْ لاقينا

وَأَلْقِيَنْ سَكِينَةً عَلَيْنَا ... إِنَّا إِذَا صِيحَ بِنَا أَتَيْنَا
وبالصياحِ عولوا علَينا

ترجمہ: اے اللہ! اگر تیری ذات نہ ہوتی تو ہم نہ ہی ہدایت پاتے، نہ صدقہ کرتے اور نہ ہی نماز پڑھتے، لہذا جب تک ہم زندہ ہیں ہماری مغفرت فرما، اگر ہماری مڈبھیڑ ہو جائے تو ہمیں ثابت قدمی عطا فرمانا، ہم پر سکینت نازل فرما۔ جب ہمیں دشمن کے خلاف پکارا جائے گا ہم اس پکار پر لبیک کہتے ہیں اور پکار سنتے ہی وہ ہمارے مقابلہ میں استغاثہ شروع کرتے ہیں۔

یہ سن کر اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: یہ آگے آگے کون شخص ہے؟ لوگوں نے کہا: عامر بن اَکوع۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کی رحمت ہو ان پر!۔

ایک شخص (وہ عمر بن خطابؓ تھے) نے کہا: اے اللہ کے نبی! ان کے لئے رحمت واجب ہو گئی! کاش آپ ہمیں ان سے لطف اندوز ہونے کا موقع دیتے۔ (صحیح بخاری: 4196 صحیح مسلم: 1802)

جب اسلامی لشکر مقام صہباء - جو خیبر کے قریب ہے - پہنچا تو آپ ﷺ نے نماز عصر پڑھی، اس کے بعد زادِ سفر منگوایا اور صرف ستو لایا گیا، اس کو پانی کے ساتھ ملانے کا حکم دیا، آپ ﷺ نے کھایا اور آپؐ کے ساتھ صحابہ کرام نے بھی کھایا۔ اس کے بعد آپؐ مغرب کی نماز کے لئے اٹھے اور کلی کی اور پھر صحابہ کو نماز پڑھائی اور پھر سے وضو نہیں کیا۔ (صحیح بخاری: 4195، الدلائل للبیہقی: 4/200، الصراع مع الیہود: 2/30)

آپ ﷺ نے یہ عباد بن بشرؓ کو ایک خبر رساں دستہ کے طور پر دشمنوں کی خبریں معلوم کرنے کے لئے پہلے ہی روانہ کر دیا تھا، ان کو راستہ میں قبیلہ اُشجع سے تعلق رکھنے والا یہودیوں کا ایک جاسوس ملا۔ حضرت عبادؓ نے پوچھا: آپ کو کون ہو؟ اس نے کہا: میں گمشدہ اونٹوں کو تلاش کر رہا ہوں۔ حضرت عبادؓ نے کہا: کیا آپ کو خیبر کے بارے میں کچھ علم ہے؟ انہوں نے کہا: میں تازہ تازہ وہاں سے آیا ہوں، آپ مجھ سے کس کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہیں؟ اس نے کہا: یہود کے بارے میں؟ حضرت عبادؓ نے جواب دیا: ہاں! کنانہ بن اَبی الحقیق اور ہوذہ بن قیس اپنے غطفانی حلفاء کے پاس گئے تھے، اور ان کو آمادۂ جنگ کیا اور ایک سال تک خیبر کے پھل انہیں دینے کا وعدہ کیا، اس لئے وہ سامانِ حرب وضرب کے ساتھ تیار ہو کر آ گئے، ان کی قیادت عتبہ بن بدر کر رہا ہے اور یہ سب یہود کے ساتھ ان کے قلعوں میں داخل ہو گئے ہیں، ان میں دس ہزار جنگجو ہیں، وہ ایسے قلعوں میں قلع بند ہیں جہاں تک کسی کی رسائی نہیں ہے، ان کے پاس بہت زیادہ اسلحہ اور کھانے پینے کا سامان بھی ہے، اگر کئی سال تک بھی وہ محصور رہیں گے تو یہ سامان ان کے لئے کافی ہو جائے گا، ان کے پاس قلعوں میں ہی پانی بھی ہے، میرا خیال یہ ہے کہ کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا ہے۔ یہ سن کر حضرت عباد بن بشیرؓ نے اپنا کوڑا اٹھایا اور اس کو چند کوڑے مارے، مارنے کے بعد کہا: تم تو ان کے جاسوس ہو، مجھ سے سچ سچ بولو ورنہ میں تمہاری گردن اڑا دوں گا۔ اس اَعرابی نے کہا: وہ لوگ آپ سے مرعوب ہیں، آپ سے خوفزدہ اور سہمے ہوئے ہیں۔ آپ نے یثرب (مدینہ) کے یہود کے ساتھ جو کچھ کیا ہے وہ اس سے سہم گئے ہیں، کنانہ نے مجھ سے کہا کہ تم ان کے راستے میں جاؤ، اس لئے کہ وہ تمہیں دیکھ کر کوئی اجنبیت محسوس نہیں کریں گے، ان کی تعداد کا اندازہ لے کر آؤ، ان کے قریب جا کر

دیکھنا جیسے کہ تم کوئی سائل ہو،اس کے بعد ان کے سامنے ہماری تعداد کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا اور جلدی سے ان کے بارے میں معلومات لے کر آجانا۔(دیکھیں: المغازی للواقدی:2/610)

جب مسلمانوں کا لشکر خیبر کی سرحدوں پر پہنچ گیا تو رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام سے فرمایا: رک جاؤ! اس کے بعد فرمایا: ''اللّٰهم ربَّ السَّموات وما أظْلَلن وربَّ الأرضين وما أقلَلْن، وربَّ الشَّياطين وما أضلَلْن، وربَّ الرياح وما أذْرين فإنَّا نسأَلُك خير هذه القرية وخير أهلها وخير ما فيها، ونعوذُ بك من شرها وشر أهلها وشر ما فيها''۔ ترجمہ: ''اے اللہ! آسمانوں اور ان کے نیچے بسنے والی مخلوقات کے رب، زمینوں اور ان پر بسنے والی مخلوقات کے رب، شیاطین اور ان کے ذریعہ گمراہ ہونے والوں کے رب، ہواؤں اور ان کے ذریعہ اڑنے والی چیزوں کے رب، ہم اس بستی کے خیر، یہاں کے باشندوں کے خیر اور جو کچھ اس میں ہے اس کے خیر کا مطالبہ کرتے ہیں، اس کے شر سے پناہ طلب کرتے ہیں، اللہ کا نام لے کر آگے بڑھو''۔(ابن حبان: 2709، مستدرک حاکم:2/100، الیوم واللیلۃ للنسائی:543، السنن الکبری للبیہقی:5/252، ابن خزیمہ:565، المعجم الکبیر للطبرانی:7299)

اللہ کے رسول ﷺ جس بستی میں بھی داخل ہوتے تھے یہ دعا پڑھتے تھے۔

جب رات ہو گئی تو رسول اللہ ﷺ نے لشکر کو خیبر کی سرحدوں پر سو جانے کا حکم دیا اور پھر صبح جلدی جاگے اور انہوں نے اپنی چھاونی 'الرجیع' وادی میں بنائی، وہیں خیمے نصب کئے، یہ وادی خیبر اور غطفان کے مابین واقع ہے، یہاں پر پڑاؤ کا مقصد یہ تھا کہ قبیلۂ غطفان کی طرف آنے والی امداد کو یہود سے روک دیں، جب صبح ہوئی تو یہود اپنی کدالوں، پھاڑوں اور ٹوکریوں کے ساتھ کھیتی باڑی کے لئے نکلے، انہوں نے جب اچانک مسلمانوں کا لشکر دیکھا تو کہنے لگے: اللہ کی قسم! محمد اور لشکر! نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اللہ اکبر! اللہ اکبر! خیبر تباہ و برباد ہو گیا، ہم جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو متنبہ کئے جانے والوں کی صبح بہت بُری ہو جاتی ہے۔(صحیح البخاری:610، صحیح مسلم: 120/1305)

۳: خیبر کے قلعوں کا سقوط:

یہود اپنے قلعوں میں پناہ گزین ہو گئے، مسلمانوں نے ان کا محاصرہ کیا اور یکے بعد دیگرے ان کے قلعوں کو فتح کرتے رہے، سب سے پہلے منطقہ نطاۃ میں قلعہ ناعم اور قلعہ الصعب کا سقوط ہوا۔ منطقہ شق میں ابو النزار قلعہ کا سقوط ہوا، اور یہ دونوں منطقے خیبر کے شمال مشرقی علاقہ میں تھے،اس کے بعد الکتیبہ منطقہ میں حصن القموص کو فتح کیا اور یہ ابو الحقیق کے بیٹے کا قلعہ تھا اور اس کے بعد الوطیح اور السلالم علاقوں میں دو قلعوں کو فتح کیا۔(السیرۃ النبویہ فی ضوء المصادر الاصلیہ، ص: 501)

بعض قلعوں کو فتح کرتے ہوئے مسلمانوں کو سخت مقابلہ آرائی اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، ان میں سے ایک قلعہ حصنِ ناعم تھا جس کو فتح کرتے ہوئے محمود بن مسلمہ انصاریؓ شہید ہوئے، قلعہ کے اوپر سے مرحب نے ان پر چکی کا پاٹ گرایا اور اس کو فتح کرتے کرتے دس دن لگ گئے۔ اس کا محاصرہ کرتے وقت مسلمانوں کا پرچم حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اٹھایا، جب فتح نہیں ہوئی اور لوگ پریشان ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں کل جھنڈا ایک ایسے آدمی کو دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے، وہ اس وقت تک واپس نہیں آئے گا جب

تک کہ اس کو فتح نہیں ملے گی، یہ سن کر مسلمانوں کو اطمئنان حاصل ہوا، جب آپ ﷺ نے تیسرے روز نماز فجر ادا فرمائی تو آپؐ نے حضرت علی بن اَبی طالبؓ کو بلایا اور جھنڈا ان کے حوالے کیا۔ انہوں نے جھنڈا اٹھایا اور پھر ان کے ذریعہ وہ قلع فتح ہو گیا۔(مستدرک حاکم: 3/37)

حضرت علی بن ابی طالبؓ آنکھوں کی تکلیف میں مبتلا تھے، جب رسول اللہ ﷺ نے ان کو بلایا، آپ نے ان کی آنکھوں میں لعابِ دہن لگا کر ان کے لئے دعا کی تو وہ صحتیاب ہو گئے۔(صحیح البخاری: 4210، صحیح مسلم: 2406)

اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت علیؓ کو وصیت فرمائی کہ ان پر حملہ کرنے سے پہلے ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کریں اور مزید فرمایا: ''اللہ کی قسم! آپ کے ذریعہ اگر اللہ ایک شخص کو بھی ہدایت عطا کرتا ہے تو یہ آپ کے لئے سرخ اونٹوں سے زیادہ بہتر ہے''۔ (صحیح البخاری: 3009، صحیح مسلم: 2406)

جب آپ ﷺ سے حضرت علیؓ نے دریافت کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ! میں ان کے ساتھ کس بنیاد پر جنگ کروں گا؟ آپؐ نے فرمایا: ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، جب وہ ایسا کریں گے تو انہوں نے اپنے خون اور مال کو آپ سے محفوظ کر لیا، سوائے اس کے حق کے، اور ان کا حساب اللہ کے ذمہ ہے۔(صحیح مسلم: 2405، دلائل النبوۃ للبیہقی: 4/260)

جب مسلمانوں نے اس قلعہ کا محاصرہ کیا تو وہاں کا سردار اور ان کا ہیرو 'مرحب' نمودار ہوا اور یہ حضرت عامر بن اَکوعؓ کی شہادت کا سبب بنا تھا، حضرت علیؓ اس کے مقابلہ کے لئے نکلے اور اس کو قتل کر دیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ محمد بن مسلمہؓ نے اس کو قتل کیا، اس کا یہود کی نفسیات پر منفی اثر پڑا اور یہیں سے ان کی شکست شروع ہو گئی۔(السیرۃ النبویۃ فی ضوء المصادر الاصلیہ: 502)

حصنِ ناعم کو فتح کرنے کے بعد مسلمانوں نے حصن الصعب بن معاذ کی جانب رخ کیا، ان کے پرچم بردار حباب بن منذرؓ نے انتہائی جوانمردی کا مظاہرہ کیا، یہاں تک کہ تین روز بعد قلعہ کو فتح کر دیا اور اس میں مسلمانوں کو بہت سارا کھانا اور ضروریات زندگی مل گئیں، جبکہ وہ ان دنوں میں قلتِ طعام کے شکار تھے۔ اس کے بعد قلعہ ُزبیر کی طرف متوجہ ہوئے جس میں حصن ناعم اور حصن الصعب اور دوسرے قلعوں سے فرار اختیار کرنے والے پناہ گزیں بھی موجود تھے، مسلمانوں نے ان کا محاصرہ کیا اور ان کے لئے پانی کا راستہ بند کر دیا اور ان کو لڑنے پر مجبور کر دیا، یہاں تک کہ تین دن کے بعد ان کو شکست دے دی۔ اس طریقہ سے مسلمانوں نے منطقہ نطاۃ میں واقع آخری قلعہ پر بھی کنٹرول حاصل کر لیا، اس منطقہ میں سخت قسم کے یہود رہتے تھے، اس کے بعد مسلمان منطقہ ٔالشق کی جانب متوجہ ہوئے اور حصن اُبی سے آغاز کیا، اس پر پھلانگ کر داخل ہو گئے اور وہاں سے بعض جنگجو حصن نزار کی طرف بھاگ گئے، مسلمانوں نے ان کا بھی محاصرہ کر لیا اور اس کے بعد اس قلعہ کو بھی فتح کر لیا اور منطقہ ٔالشق کے باقی ماندہ لوگ بھی اپنے قلعوں سے بھاگ گئے اور القموص کے مضبوط قلعہ میں الوطیح قلعہ میں اور السلالم قلعہ میں جمع ہو گئے، مسلمانوں نے چودہ دنوں تک ان کا محاصرہ کیا یہاں تک کہ انہوں نے صلح کا مطالبہ کر لیا۔ (دیکھیں: الواقدی: 2/658)

اس طرح سے خیبر کو بزورِ بازو فتح کیا گیا، واقعات کی جو تفصیلات ہم نے بیان کی ہیں اور جو کچھ امام بخاریؒ، امام مسلمؒ اور امام ابو داؤدؒ نے روایت نقل کی ہیں ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر پر حملہ کیا اور بزورِ بازو اس کو فتح کیا۔

اس طرح سے پورا خیبر مسلمانوں کے کنٹرول میں آگیا اور خیبر کے شمال میں بسنے والے اہلِ فدک نے صلح کرنے کی جلد ہی پیشکش کر دی، انہوں نے جان طلبی کی درخواست کی اور مال دینے پر راضی ہو گئے جس کو رسول اللہ ﷺ نے تسلیم کر لیا۔(صحیح مسلم: 1551، مسند احمد: 2/451، ابوداؤد: 3006، السنن الکبری للبیہقی: 9/137، مغازی الواقدی: 699)

اس لئے فدک کا پورا علاقہ رسول اللہ ﷺ کے لئے خاص تھا، اس لئے کہ اس میں جنگ کی نوبت نہیں آئی، اس کے بعد مسلمانوں نے وادی القری کا محاصرہ کیا، یہ خیبر اور 'تیماء لیالی' کے مابین چند بستیوں پر مشتمل علاقہ تھا، اس کے بعد یہاں کے باشندوں نے بھی ہتھیار ڈال دیئے اور اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کو بہت سارا مالِ غنیمت حاصل ہوا، مسلمانوں نے وہاں کی زمین اور کھجور کے باغات یہودیوں کے پاس رکھے اور خیبر کی طرح ان کے ساتھ معاملہ کیا اور تیماء کے لوگوں نے بھی خیبر اور وادی القری کی طرح صلح کی۔(زاد المعاد: 3/354)

اس طرح یہودیوں کے تمام قلعے مسلمان لشکر کے سامنے یکے کے بعد دیگرے فتح ہوئے، خیبر کے تمام معرکوں میں یہود کے مقتولین کی تعداد ترانویں (۹۳) تک پہنچ گئی، عورتوں اور بچوں کو قیدی بنایا گیا، انہی قیدیوں میں حضرت صفیہ بنت حیی بن اُخطب بھی تھیں، ان کو رسول اللہ ﷺ نے آزاد کر دیا اور اس کے بعد ان سے نکاح کر لیا۔(صحیح بخاری: 371، صحیح مسلم: 1365)

ابن اسحاق کے مطابق اس غزوہ میں بیس مسلمان شہادت سے سرفراز ہوئے اور واقدی کے مطابق پندرہ مسلمان شہید ہوئے۔(السیرة النبویة الصحیحة 327/1 المغازي 700/2)

۴: شہید اُعرابی، سیاہ رنگ کے چرواہے کا واقعہ، اور ایک جانباز جہنم کی طرف

ا: شہید اُعرابی:

شداد بن الہادؓ سے روایت ہے کہ ایک بادیہ نشین نبی اکرم ﷺ کے پاس آیا اور آپؐ پر ایمان لا کر آپ کی اتباع کی، پھر اس نے عرض کیا: میں آپ کے ساتھ ہجرت کروں گا، نبی اکرم ﷺ نے اپنے بعض اصحاب کو اس کا خیال رکھنے کی وصیت کی، جب غزوۂ خیبر ہوا تو نبی اکرم ﷺ کو مالِ غنیمت میں کچھ مال ملا، آپؐ نے اسے تقسیم کیا، اور اس کا (بھی) حصہ لگایا، چنانچہ اس کا حصہ اپنے ان اصحاب کو دے دیا جن کے سپرد اسے کیا گیا تھا، وہ ان کی سواریاں چراتا تھا، جب وہ آیا تو انہوں نے (اس کا حصہ) اس کے حوالے کیا، اس نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ تو انہوں نے کہا: یہ حصہ نبی اکرم ﷺ نے تمہارے لئے لگایا تھا، اس نے اسے لے لیا، (اور) نبی اکرم ﷺ کے پاس لے کر آیا، اور عرض کیا: (اللہ کے رسولؐ) یہ کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''میں نے تمہارا حصہ دیا ہے''۔ اس نے کہا: میں نے اس (حقیر بدلے) کے لئے آپ کی پیروی نہیں کی ہے، بلکہ میں نے اس بات پر آپ کی پیروی کی ہے کہ میں تیر سے یہاں مارا جاؤں، (اس نے اپنے حلق کی طرف اشارہ کیا) پھر میں مروں اور جنت میں داخل ہو جاؤں۔ آپؐ نے فرمایا: ''اگر تم سچے ہو تو اللہ تعالیٰ بھی اپنا وعدہ سچ کر دکھائے گا''۔ پھر وہ لوگ تھوڑی دیر

ٹھہرے رہے، پھر دشمنوں سے لڑنے کے لئے اٹھے، تو انہیں (کچھ دیر کے بعد) نبی اکرم ﷺ کے پاس اٹھا کر لایا گیا اور انہیں اسی جگہ تیر لگا تھا جہاں انہوں نے اشارہ کیا تھا، نبی اکرم ﷺ نے پوچھا: "کیا یہ وہی شخص ہے؟" لوگوں نے جواب دیا: جی ہاں، آپ نے فرمایا: "اس نے اللہ تعالیٰ سے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا تو (اللہ تعالیٰ) نے (بھی) اپنا وعدہ اسے سچ کر دکھایا"۔ پھر نبی اکرم ﷺ نے اپنے جبّہ (قمیص) میں اسے کفنایا، پھر اسے اپنے سامنے رکھا، اور اس کی جنازے کی نماز پڑھی۔ آپؐ کی نماز میں سے جو چیز لوگوں کو سنائی دی وہ یہ دعا تھی: «اللهم هذا عبدك خرج مهاجرا في سبيلك فقتل شهيدا أنا شهيد على ذلك» "اے اللہ! یہ تیرا بندہ ہے، یہ تیری راہ میں ہجرت کر کے نکلا اور شہید ہو گیا، میں اس بات پر گواہ ہوں"۔ (سنن نسائی 60/4 مستدرک حاکم: 595/3 الدلائل للبیہقی 22/4 السنن الکبری 15/4)

۲: سیاہ رنگ کا چرواہا:

اہلِ خیبر میں سے ایک سیاہ رنگ کا حبشی غلام آیا، وہ اپنے مالک کی بکریوں کے ساتھ تھا، جب اس نے دیکھا کہ اہل خیبر ہتھیار لے کر نکلے ہیں، اس نے ان سے پوچھا: کیا ارادہ ہے؟ انہوں نے جواب دیا: ہم اس شخص کے ساتھ جنگ کریں گے جو دعوی کرتا ہے کہ وہ نبی ہیں! اس کے دل میں نبی کریم ﷺ کا ذکر اور خیال آیا، اس لئے وہ اپنی بکریاں لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آ گیا اور کہنے لگا: آپ کیا کہتے ہیں اور کس چیز کی دعوت دیتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: میں اسلام کی طرف بلاتا ہوں اور یہ کہ آپ گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور میں اللہ کا رسول ہوں اور اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ اس غلام نے کہا: اگر میں نے گواہی دی اور اللہ پر ایمان لایا تو مجھے کیا ملے گا؟ آپؐ نے فرمایا: تمہیں جنت ملے گی، اگر اسی حال میں تم اس دنیا سے رخصت ہوتے ہو۔ چنانچہ اس نے اسلام قبول کیا، اس کے بعد کہا: اے اللہ کے نبی! یہ بکریاں میرے پاس امانت ہیں، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ان کو لے کر جاؤ اور حصباء میں ان کو چھوڑ دو، اللہ تعالیٰ تمہاری طرف سے امانت ادا کرے گا۔ اس نے ایسا ہی کیا اور بکریاں اپنے مالک کے پاس چلی گئیں۔ یہودی کو معلوم ہو گیا کہ اس کے غلام نے اسلام قبول کیا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ لوگوں کے درمیان کھڑے ہوئے، وعظ و نصیحت کی، اور ان کو جہاد کی ترغیب دی، جب مسلمانوں اور یہودیوں کے مابین مڈبھیڑ ہوئی تو شہید ہونے والوں میں یہ حبشی غلام بھی شہید ہو گیا اور مسلمان اس کو لے کر اپنے کیمپ میں لے کر گئے، اس کو خیمے میں داخل کیا گیا، کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اس خیمے میں تشریف لے گئے اور پھر اپنے اصحاب کی جانب متوجہ ہو کر فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس غلام پر اکرام کیا اور اس کو خیبر لے کر آیا، میں نے اس کے سر کے پاس دو حور عین دیکھیں، حالانکہ اس کو اللہ کے لئے ایک سجدہ کرنے کا بھی موقع نہیں ملا۔ (مستدرک حاکم: 2/136، السنن الکبری للبیہقی: 9/143، السیرۃ الحلبیہ: 3/39)

۳: جانباز لیکن جہنم کی طرف:

غزوۂ خیبر میں مسلمانوں کے لشکر میں ایک شخص تھا، کسی نے ذکر کیا کہ یہودیوں کا کوئی بھی آدمی اگر انہیں مل جائے تو وہ اس کا پیچھا کر کے اسے قتل کئے بغیر نہیں رہتے۔ کہا گیا کہ آج فلاں شخص ہماری طرف سے جتنی بہادری اور ہمت سے لڑا ہے شاید اتنی بہادری سے کوئی

بھی نہیں لڑا ہو گا، لیکن نبی کریم ﷺ نے ان کے متعلق فرمایا کہ وہ اہلِ دوزخ میں سے ہے۔ایک صحابی نے اس پر کہا کہ پھر میں ان کے ساتھ ساتھ رہوں گا، بیان کیا کہ پھر وہ ان کے پیچھے ہو لئے جہاں وہ ٹھہرتے یہ بھی ٹھہر جاتے اور جہاں وہ دوڑ کر چلتے یہ بھی دوڑنے لگتے۔بیان کیا کہ پھر وہ صاحب شدید زخمی ہو گئے، اور چاہا کہ جلدی موت آجائے۔اس لئے انہوں نے اپنی تلوار زمین میں گاڑھ دی اور اس کی نوک سینہ کے مقابل کر کے اس پر گر پڑے اور اس طرح خودکشی کرلی۔اب دوسرے صحابی (جو ان کی جستجو میں لگے ہوئے تھے) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔پوچھا کیا بات ہے؟ان صحابی نے عرض کیا کہ جن کے متعلق ابھی آپ نے فرمایا تھا کہ وہ اہل دوزخ میں سے ہیں تو لوگوں پر آپ کا یہ فرمانا بڑا شاق گزرا تھا۔میں نے ان سے کہا کہ میں تمہارے لئے ان کے پیچھے پیچھے جاتا ہوں۔چنانچہ میں ان کے ساتھ ساتھ رہا۔ایک موقع پر جب وہ شدید زخمی ہو گئے تو اس خواہش میں کہ موت جلدی آجائے اپنی تلوار انہوں نے زمین میں گاڑھ دی اور اس کی نوک کو اپنے سینہ کے سامنے کر کے اس پر گر پڑے اور اس طرح انہوں نے خود اپنی جان کو ہلاک کر دیا۔اسی موقع پر آپ ؐ نے فرمایا کہ انسان زندگی بھر جنت والوں کے عمل کرتا ہے حالانکہ وہ اہل دوزخ میں سے ہوتا ہے۔اسی طرح دوسرا شخص زندگی بھر اہل دوزخ کے عمل کرتا ہے حالانکہ وہ جنتی ہوتا ہے۔(صحيح البخاري:4202،4207دلائل النبوة للبيهقي252/4)

۵: حضرت جعفر بن ابی طالب اور دیگر صحابہ کی حبشہ سے واپسی:

فتح خیبر کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کے پاس حضرت جعفر بن ابی طالب ؓ اور ان کے ساتھ دیگر مہاجرینِ حبشہ آئے، اللہ کے رسول ﷺ نے ان کو آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا اور ان کو چمٹالیا اور فرمایا: مجھے معلوم نہیں ہو پا رہا ہے کہ میں دونوں میں سے کس سے زیادہ خوش ہوں، فتح خیبر سے یا آمدِ جعفر سے!۔(المعجم الصغير للطبراني:30،الاوسط:2024،الكبير:1470،ابن سعد:4/35، مستدرک حاکم: 3/408،السنن الكبرى للبيهقي:8/101،مجمع الزوائد:9/271)

اللہ کے رسول ﷺ نے ان کو نجاشی کے ہاں سے بلانے کے لئے عمرو بن امیہ ضمری کو بھیجا تھا، وہ ان کو دو کشتیوں میں سوار کر کے لے آئے اور ان کی آمد اسی روز ہوئی جس دن خیبر فتح ہوا، حضرت جعفر ؓ کے ساتھ حضرت ابو موسی اشعری ؓ اور ان کے ساتھ دوسرے اشعری لوگ تھے۔(دیکھیں: من معين السيرة، ص:353)

حضرت ابو موسی اشعری ؓ سے روایت ہے کہ ہمیں نبی کریم ﷺ کی ہجرت کی خبر ملی تو ہم یمن میں تھے، اس لئے ہم بھی آپ کی خدمت میں مہاجر کی حیثیت سے حاضر ہونے کے لئے روانہ ہوئے، میں تھا اور میرے دو بھائی تھے، میری عمر ان دونوں سے کم تھی، ایک ابو بردہ ؓ تھے اور دوسرے ابو رہم ؓ۔یا انہوں نے یہ کہا کہ اپنی قوم کے چند افراد کے ساتھ یا یہ کہا تریپن یا باون آدمیوں کے ساتھ (یہ لوگ روانہ ہوئے تھے) ہم کشتی میں سوار ہوئے تو ہماری کشتی نجاشی کے ملک حبشہ پہنچ گئی اور وہاں ہمیں جعفر بن ابی طالب ؓ اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ ملے، جعفر ؓ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں یہاں بھیجا تھا اور حکم دیا تھا کہ ہم یہیں رہیں، چنانچہ ہم بھی وہیں ٹھہر گئے اور پھر سب

ایک ساتھ (مدینہ) حاضر ہوئے ، جب ہم خدمت نبوی میں پہنچے تو آپ ﷺ خیبر فتح کر چکے تھے۔ (صحيح البخاري:4230 صحیح مسلم:2502)

حضرت جعفرؓ اوران کے دوسرے بھائی حبشہ میں دس سال سے زائد عرصہ تک رہے، اس دوران بہت سی آیات قرآنیہ نازل ہوئیں اور کفار کے ساتھ متعدد معرکے ہوئے اور ہجرت عامہ سے پہلے اور بعد میں مختلف مراحل سے گزرنا پڑا، یہاں تک کہ بعض یہ سمجھنے لگے کہ مہاجرین حبشہ سے یہ سب کچھ چھوٹ گیا، اس لئے وہ دوسروں کے مقابلہ میں کم مقام رکھتے ہیں۔ (فقہ السیرۃ للغزالی، ص350)

حضرت ابو موسیٰؓ سے روایت ہے: ''..... بعض لوگ ہم سے کہا کرتے تھے: ہم نے تم سے پہلے ہجرت کی ہے اور اُسماء بنت عمیس ﷺ جو ہمارے ساتھ مدینہ آئی تھیں وہ اُم المؤمنین حفصہؓ سے ملاقات کے لئے خدمت میں حاضر ہوئیں،- وہ (اسماء) بھی نجاشی کے ملک میں ہجرت کرنے والوں کے ساتھ ہجرت کر کے چلی گئی تھیں- عمرؓ بھی حفصہؓ کے گھر پہنچے، اس وقت اسماء بنت عمیسؓ وہیں تھیں، جب عمرؓ نے انہیں دیکھا تو دریافت فرمایا کہ یہ کون ہیں؟ اُم المومنینؓ نے بتایا کہ اسماء بنت عمیسؓ ہیں۔ عمرؓ نے اس پر کہا: اچھا وہی جو حبشہ سے بحری سفر کر کے آئی ہیں۔ اسماءؓ نے کہا کہ جی ہاں۔ عمرؓ نے ان سے کہا کہ ہم تم لوگوں سے ہجرت میں آگے ہیں، اس لئے رسول اللہ ﷺ سے ہم تمہارے مقابلہ میں زیادہ قریب ہیں، اسماءؓ اس پر بہت غصہ ہو گئیں اور کہا ہر گز نہیں، خدا کی قسم! تم لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہے ہو، تم میں جو بھوکے ہوتے تھے اسے آنحضور ﷺ کھانا کھلاتے تھے اور جو ناواقف ہوتے اسے آنحضور ﷺ نصیحت و موعظت کیا کرتے تھے، لیکن ہم بہت دور حبشہ میں غیروں اور دشمنوں کے ملک میں رہتے تھے، یہ سب کچھ ہم نے اللہ اور اس کے رسول کے راستے میں ہی تو کیا ہے، اور خدا کی قسم! میں اس وقت تک نہ کھانا کھاؤں گی نہ پانی پیوں گی جب تک تمہاری یہ بات رسول اللہ ﷺ سے نہ کہہ لوں، ہمیں اذیت دی جاتی تھی، دھمکایا ڈرایا جاتا تھا، میں آنحضور ﷺ سے اس کا ذکر کروں گی اور آپؐ سے اس کے متعلق پوچھوں گی۔ خدا کی قسم! نہ میں جھوٹ بولوں گی، نہ کج روی اختیار کروں گی اور نہ کسی (خلافِ واقعہ بات کا) اضافہ کروں گی۔ چنانچہ جب حضور اکرم ﷺ تشریف لائے تو انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! عمر اس طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ حضور ﷺ نے دریافت فرمایا کہ پھر تم نے انہیں کیا جواب دیا؟ انہوں نے عرض کیا کہ میں نے انہیں یہ یہ جواب دیا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے اس پر فرمایا کہ وہ تم سے زیادہ مجھ سے قریب نہیں ہیں۔ انہیں اور ان کے ساتھیوں کو صرف ایک ہجرت حاصل ہوئی اور تم کشتی والوں نے دو ہجرتوں کا شرف حاصل کیا۔

انہوں نے بیان کیا کہ اس واقعہ کے بعد ابو موسیٰؓ اور تمام کشتی والے میرے پاس گروہ در گروہ آنے لگے اور مجھ سے اس حدیث کے متعلق پوچھنے لگے۔ ان کے لئے دنیا میں حضور اکرم ﷺ کے ان کے متعلق اس ارشاد سے زیادہ خوش کن اور باعثِ فخر اور کوئی چیز نہیں تھی۔ ابو بُردہ (راوی حدیث) نے بیان کیا کہ حضرت اسماءؓ نے بیان کیا کہ حضرت ابو موسیٰؓ مجھ سے اس حدیث کو بار بار سنتے تھے۔ (صحیح مسلم:1687)

اللہ کے رسول ﷺ نے ان مہاجرینِ حبشہ کو بھی خیبر کے مالِ غنیمت میں شریک فرمایا، جبکہ آپ ﷺ نے پہلے اُن صحابہ کرام سے اس سلسلہ میں اجازت لی جو فتح خیبر میں شریک تھے۔ (دیکھیں: الصراع مع الیہود، ابو فارس:3/96)

٦: اموالِ غنیمت کی تقسیم:

ا: اللہ کے رسولؐ نے جتنے بھی غزوات کئے ہیں ان میں سب سے زیادہ مالِ غنیمت غزوۂ خیبر میں حاصل ہوا، مالِ غنیمت میں اراضی، کھجور کے باغات، کپڑے، کھانے پینے کی اشیاء، اور دیگر سامان موجود تھا، کتبِ سیرت کے بیان کے مطابق معلوم ہوتا ہے کہ اموالِ غنیمت مندرجہ ذیل اجناس پر مشتمل تھے:

اَ: غلّہ؛ مسلمانوں کو خیبر کے قلعوں سے بہت سا کھانے پینے کا سامان بطور مالِ غنیمت حاصل ہوا، اس میں چربی، تیل، شہد، گھی اور دیگر اشیاء شامل تھیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ان اشیاء کے کھانے اور استعمال کرنے کی عمومی اجازت دی، اور ان میں سے پانچواں حصہ الگ نہیں کیا گیا۔

ب: کپڑے، فرنیچر، اونٹ، گائے، بیل بکریاں؛ اللہ کے رسولؐ نے ان تمام چیزوں میں پانچواں حصہ نکالا اور اس کو اللہ کے حکم کے مطابق تقسیم کیا اور بقیہ چار حصے مجاہدین کے مابین تقسیم کئے۔

ج: قیدی؛ اللہ کے رسول ﷺ کو بہت سی یہودی عورتیں بطور قیدی حاصل ہوئیں اور ان قیدیوں کو آپؐ نے مسلمانوں میں تقسیم کیا، یہ مالِ غنیمت تھا اور اس میں مالِ غنیمت کے احکام لاگو ہوتے تھے۔

د: اراضی اور کھجور کے باغات: اراضی اور باغات کی تقسیم اس طرح کی گئی کہ اسے چھتیس حصوں میں تقسیم کیا گیا، ہر حصہ ایک سو حصوں پر مشتمل تھا، اس طرح کل چھتیس سو حصے ہو گئے، اس میں سے نصف، یعنی اٹھارہ سو حصے رسول اللہ ﷺ، آپ کے نائبین اور مسلمانوں کے تھے، عام مسلمانوں کی طرح اس میں رسول اللہ ﷺ کا بھی ایک حصہ تھا۔ باقی یعنی اٹھارہ سو حصوں پر مشتمل دوسرا نصف مسلمانوں کی اجتماعی ضروریات اور حوادث کے لئے الگ کیا گیا۔

ھ: مسلمانوں کو خیبر کے یہود کی طرف سے جو چیزیں ملی تھیں ان میں تورات کے کچھ نسخے بھی شامل تھے، یہود نے ان کو واپس لوٹانے کا مطالبہ کیا تو آپ ﷺ نے انہیں ان کے حوالے کر دینے کا حکم صادر فرمایا۔ آپؐ نے اس طرح کا طرزِ عمل اختیار نہیں کیا جیسے کہ رومیوں نے یروشلم کو فتح کرتے وقت کیا تھا، انہوں نے کتب مقدسہ کو جلا دیا تھا اور اپنے پیروں تلے ان کو روندا تھا، اسی طرح اندلس میں عیسائیوں کے ذریعہ یہود پر کئے گئے ظلم وزیادتی کے دور میں تورات کے نسخوں کو جلا دیا گیا تھا۔

اللہ کے رسول ﷺ نے خیبر کے یہود کو ان کی اراضی پر بدستور باقی رکھا، اس شرط کے ساتھ کہ وہ ان زمینوں کو آباد کریں اور اپنا مال ان پر صرف کریں اور ان کو ان کے پھلوں کا نصف ملے گا، البتہ مسلمانوں کو انہیں وہاں سے نکالنے کا حق رہے گا جب بھی وہ چاہیں گے، اور یہود نے ہی رسول اللہ ﷺ کے سامنے یہ پیشکش رکھی تھی کہ ان کو ان کی اراضی پر ہی بدستور باقی رکھا جائے، وہ کہنے لگے کہ ہم اس زمین کے بارے میں زیادہ واقف ہیں، اگرچہ آپؐ نے ان کو وہاں سے نکالنے کا ارادہ کیا تھا لیکن ان کی درخواست اور مطالبہ کے بعد ان کی زمینیں انہی کے قبضے میں باقی رہیں۔ (سنن ابو داؤد: 3410، سنن ابن ماجہ: 1820، الصراع مع الیہود، ابو فارس: 3/141، السیرۃ النبویہ لأبی شہبہ: 2/419، السیرۃ النبویہ الصحیحہ: 1/328)

اللہ کے رسول ﷺ نے ان پر یہ شرط عائد کی تھی کہ آپؐ ان کو وہاں سے جب چاہیں جلا وطن کر سکتے ہیں، اس کے ذریعہ معاہدہ کرنے اور شرائط عائد کرنے کی ایک نئی حکمتِ عملی ظاہر ہوتی ہے، اس لئے کہ یہود کو اس زمین میں باقی رکھنے اور انہی سے کھیتی باڑی کرانے کے ذریعہ مسلمانوں کو الگ سے کچھ لوگوں کو وہاں رکھنے کی ضرورت نہیں پڑے گی اور مجاہدین اپنے اصل کام کے لئے فارغ رہیں گے، دوسرے اعتبار سے یہود ہی پہلے اس اراضی کے مالک تھے، وہ وہاں کھیتی باڑی کے بارے میں زیادہ علم رکھتے تھے، اس لئے ان کے وہاں باقی رہنے سے فصل اور پھل زیادہ اور بہتر ہوں گے، خاص طور پر وہ کوئی اجرت بھی نہیں لیں گے، بلکہ وہ زمین کی پیداوار کا نصف لیں گے چاہے وہ کم ہو یا زیادہ۔

ان کو کسی بھی وقت وہاں سے نکالنے کی شرط کے ذریعہ اللہ کے رسول ﷺ نے ان کو کنٹرول میں رکھنے اور ان کی قوت کو توڑنے کی ضمانت لے لی، اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ جب بھی وہ کوئی ایسا کام کریں گے جس سے مسلمانوں کو ضرر پہنچے گا تو وہ جلد ہی ان کو وہاں سے نکال دیں گے اور پھر وہ کبھی وہاں واپس نہیں آسکیں گے۔

اور سیدنا عمر بن خطابؓ کے عہد میں عملاً ایسی صورتحال پیش آئی جبکہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ زیادتی کی اور کہنیوں سے ان کے ہاتھ توڑ دیئے اور اس سے پہلے وہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں بھی حضرت عبداللہ بن سہیلؓ کے ساتھ زیادتی کر چکے تھے، یہاں تک کہ ان کو شہید کر دیا تھا، جب حضرت عمرؓ نے ان کی غداری اور بد عہدی کے بارے میں پوری تحقیق کر لی تو ان کو جلا وطن کرنے کا حکم دے دیا۔ (دیکھیں: تأملات فی سیرۃ الرسول، محمد سید الوکیل، ص: 228-229)

اسی طرح خیبر کے یہود نے سونا اور چاندی چھپانے کی کوشش کی اور انہوں نے حیی بن اخطب کی سونے چاندی سے بھری ہوئی چمڑے کی تھیلی غائب کر دی اور حیی بن اخطب بنو قریظہ کے ساتھ مارا جا چکا تھا، اور جب بنو نضیر کو جلا وطن کیا گیا تھا، اس دن اس نے اس تھیلی کو اپنے ساتھ لیا تھا، اللہ کے رسول ﷺ نے حیی بن اخطب کے چچا سعیہ سے اس کے بارے میں دریافت کیا کہ حیی بن اخطب کی تھیلی کہاں ہے؟ اس نے کہا: وہ جنگوں اور مصارف کے ذریعہ ختم ہو چکی ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ابھی زمانہ بہت کم گزرا ہے اور مال کہیں اس سے زیادہ تھا تو اتنا جلدی کیسے خرچ ہوا؟ اللہ کے رسول ﷺ نے اس کو حضرت زبیر بن عوامؓ کے حوالہ کیا اور اس کو تھوڑی سزا دی اور حیی اس سے پہلے ایک ویران جگہ میں داخل ہوا تھا تو اس کے چچا نے کہا: میں نے حیی کو یہاں اس ویرانے میں چکر لگاتے ہوئے دیکھا تھا، صحابہ کرام وہاں گئے اور تلاش کیا اور اس ویرانے میں وہ تھیلی مل گئی۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویۃ الصحیحہ: 1/326، السیاسۃ الشرعیۃ فی اصلاح الراعی والرعیۃ، ابن تیمیہ، المغازی للواقدی: 424)

رسول اللہ ﷺ اور خیبر کے یہودیوں کے مابین معاہدہ طے پانے کے بعد اللہ کے رسولؐ نے حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کو ہر سال ان کے پاس جانے کی ذمہ داری دی، وہ وہاں آنے کے بعد پھلوں کا حساب لگاتے تھے اور پھر ان کو نصف دینے کا پابند بناتے تھے، یہود نے رسول اللہ ﷺ سے شکایت کی کہ یہ حساب لگانے میں بڑی سختی کرتے ہیں اور ان کو انہوں نے رشوت دینے کی بھی کوشش کی تو انہوں نے جواب دیا: اے اللہ کے دشمنو! کیا تم مجھے حرام کا لالچ دیتے ہو، اللہ کی قسم! میں تمہارے پاس اس شخصیت کے پاس سے آیا ہوں جو میرے نزدیک

سب سے زیادہ محبوب ہے اور تم میرے نزدیک تمہاری اصل بندروں اور خنزیروں سے بھی زیادہ ناپسندیدہ اور مبغوض ہو۔ لیکن تم سے نفرت اور آپؐ سے محبت کی وجہ سے میں کبھی ایسا نہیں کر سکتا ہوں کہ میں تمہارے ساتھ عدل وانصاف نہ کروں، یہ سن کر انہوں نے کہا: اسی وجہ سے آسمان اور زمین قائم ہیں۔(تاریخ الاسلام للذھبی، المغازی للواقدی، ص: 424)

۷: حضرت صفیہ بنت حیی بن اخطب کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نکاح:

جب مسلمانوں نے بنو أبي الحقیق کے قلعہ قموص کو فتح کیا تو صفیہؓ بھی قیدیوں میں تھیں، آپؐ نے انہیں حضرت دحیہؓ کلبی کو عنایت فرمایا۔ ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! آپ نے صفیہ بنت حیی جو اپنی قوم کی سیدہ ہے، کو دحیہ کو دے دیا اور وہ صرف آپ کے شایانِ شان ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس مشورہ کو پسند فرمایا اور دحیہؓ سے فرمایا: ان کے علاوہ قیدیوں میں سے اور کوئی باندی لے لو، اس کے بعد ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لیا اور ان کو آزاد کر دیا اور ان کی آزادی کو ہی ان کا مہر قرار دیا، اس کے بعد آپؐ نے ان کے ساتھ نکاح فرمایا، جبکہ وہ حیض سے پاک ہو گئیں اور انہوں نے اسلام قبول کیا۔ (دیکھیں: من معین السیرۃ، ص 1352، الصراع مع الیہود: 3/101)

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خیبر سے نکلے تو حضرت صفیہؓ کو اپنے پیچھے سوار کیا، جب خیبر سے چھ میل کے فاصلے پر پہنچے تو آپؐ نے رسمِ عروسی ادا کرنا چاہی، لیکن حضرت صفیہؓ نے منع کر دیا اور آپؐ کو ایسا کرنے سے روک دیا۔ آپ کو ان کی یہ بات ناگوار گزری، جب آپؐ مقام صہباء میں پہنچے تو آپؐ آرام کے لئے سواری سے نیچے اترے، حضرت اُم سلیمؓ نے حضرت صفیہؓ کو تیار کیا اور آپؐ کے پاس حسن وجمال کی پیکر دلہن بنا کر بھیجا، آپؐ نے ان سے دریافت کیا کہ یہ بتاؤ پہلے کون سی چیز اس کے لئے مانع تھی؟ انہوں نے جواب دیا: وہاں آپ یہود سے بہت زیادہ قریب تھے، اس لئے مجھے آپ کی ذات کے بارے میں ان سے خطرہ تھا۔ جب آپؐ نے ان کی یہ بات سنی تو اس کی وجہ سے آپؐ کے دل میں ان کی عظمت پیدا ہوئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مقام صہبا میں تین دن تک قیام فرمایا، وہیں ولیمہ کیا اور تمام مسلمانوں کو اس میں دعوت دی۔ اس ولیمہ میں گوشت نہیں تھا بلکہ صرف کھجور، پنیر اور گھی تھا۔ صحابہ کرام کہنے لگے: یہ امہات المؤمنین میں سے ایک ہیں یا آپ کی باندی ہیں؟ جب آپؐ نے کوچ کیا تو اپنے پیچھے ان کے لئے کجاوا بچھایا اور ان پر حجاب ڈالا، جس کے ذریعہ صحابہ سمجھ گئے کہ یہ اُم المومنین ہیں۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویۃ لأبی شہبہ: 2/384)

اُم المؤمنین حضرت صفیہؓ بنت حیی نے ایک خواب دیکھا تھا، امام بیہقیؒ نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن عمرؓ سے ایک طویل حدیث میں روایت کیا ہے، فرماتے ہیں: ".....اور اللہ کے رسولؐ نے حضرت صفیہؓ کی آنکھ میں کچھ ہرا نشان دیکھا تو پوچھا: اے صفیہ! یہ سبز نشان کیا ہے؟ حضرت صفیہؓ نے جواب دیا: میرا سر ابن حُقیق کی گود میں تھا اور میں سوئی ہوئی تھی، میں نے خواب میں دیکھا گویا کہ میری گود میں چاند آکر گرا ہو، میں نے اس کو یہ خواب بتایا تو اس نے مجھے تھپڑ مارا اور کہا: تم شاہِ یثرب کی تمنا کر رہی ہو؟!۔ (السنن الکبری للبیہقی: 9/138)

اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے حضرت صفیہؓ کے خواب کو سچا کر کے دکھایا اور ان کو اپنے رسولؐ کے ساتھ نکاح کا شرف عطا کیا اور ان کو جہنم سے آزادی عطا کی، ان کو اُم المؤمنین اور جنت میں خاتم الانبیاء والمرسلین کی زوجہ بننے کا شرف عطا کیا۔ (دیکھیں: الصراع مع الیہود: 3/122)

اللہ کے رسول ﷺ بھی حضرت صفیہؓ کا انتہائی درجہ کا اکرام کرتے تھے، آپؐ اپنے اونٹ کے پاس کھڑے ہوتے تھے اور اپنا زانو مبارک (ران) قریب کرتے تھے تاکہ حضرت صفیہؓ اس پر پاؤں رکھ کر اونٹ پر سوار ہو جائیں، لیکن رسول اللہ ﷺ کی تعظیم کے پیشِ نظر حضرت صفیہؓ آپؐ کے زانو مبارک پر پاؤں نہیں رکھتیں، بلکہ اپنا گھٹنا آپ کے زانو مبارک پر رکھ کر سوار ہوتیں۔ (صحیح بخاری: 2235)

حضرت صفیہؓ خود رسول اللہ ﷺ کے اخلاق کریمانہ کے بارے میں بیان کرتی ہیں اور کہتی ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ سے زیادہ بہتر اخلاق والا کسی کو نہیں دیکھا ہے، میں نے دیکھا کہ آپؐ نے خیبر میں مجھے سوار کیا، میں رات میں آپؐ کی اونٹنی کے پیچھے بیٹھی تھی، مجھے اونگھ آنے لگی، میرا سر کجاوے کے ساتھ ٹکرانے لگا، آپ ﷺ اپنے ہاتھ سے مجھے ہلانے لگے اور فرمانے لگے: اے محترمہ! آہستہ آہستہ۔ (مسند ابو یعلی: 7120، مجمع الزوائد: 9/252، السیرۃ الحلبیہ: 3/45)

حضرت صفیہؓ سے روایت ہے کہ ان کو حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کے بارے میں معلوم ہوا کہ انہوں نے کہا ہے: ہم رسول کے نزدیک صفیہؓ سے زیادہ مقام و مرتبہ والی ہیں، ہم آپؐ کی ازواج اور آپ کی چچازاد بہنیں ہیں۔ آپؐ حضرت صفیہؓ کے پاس جب تشریف لائے تو انہوں نے آپؐ کو یہ بات بتائی، آپؐ نے فرمایا: کیا آپ نے یہ نہیں کہا: آپ دونوں مجھ سے بہتر کیسے ہو سکتی ہیں؟! جبکہ میرے شوہر محمدؐ ہیں، میرے والد ہارون ہیں، اور میرے چچا موسیٰ ہیں۔ (سنن ترمذی: 3982، مستدرک حاکم: 4/29)

حضرت صفیہؓ رسول اللہ ﷺ کے اخلاقِ کریمانہ سے انتہائی متاثر ہوئیں اور آپؐ کی ذات گرامی ان کے نزدیک اپنے والد، اپنے سابق شوہر اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب بن گئی، بلکہ اپنی ذات سے بھی زیادہ آپؐ ان کے نزدیک محبوب بن گئے۔ ان کے پاس جو کچھ ہوتا سب آپؐ پر قربان کرنے کے لئے تیار ہوتیں اور جب آپؐ کو کوئی تکلیف یا بیماری لاحق ہوتی تو وہ یہ تمنا کرتی تھیں کہ کاش وہ تکلیف اور مرض ان کو ہوتا اور رسول اللہ ﷺ صحیح سلامت ہوتے۔ چنانچہ ابن سعد نے صحیح سند کے ساتھ حضرت زید بن اسلم سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کے مرض الوفات میں آپؐ کی ازواج جمع ہوئیں تو حضرت صفیہ کہنے لگیں: اے اللہ کے نبیؐ! واللہ، میری تمنا یہ ہے کہ آپ کو جو تکلیف ہے کاش مجھے ہوتی۔ آپؐ کی ازواج ان کے بارے میں ایک دوسرے کو اشارہ کرنے لگیں، اللہ کے رسولؐ نے ان کو دیکھ لیا اور فرمایا: کلی کر لو! انہوں نے دریافت کیا: کیوں؟ اے اللہ کے رسولؐ! آپؐ نے فرمایا: ان کے بارے میں ایک دوسرے کو اشارہ کرنے کی وجہ سے، اللہ کی قسم! وہ یقیناً سچی ہیں۔ (دیکھیں: شرح المواہب ا للدنیہ: 2/233، الاصابہ فی معرفۃ الصحابہ، کتاب النساء)

حضرت صفیہؓ اپنی قوم سے بھی اچھی طرح واقف تھیں اور ان کے مکر و فریب کو بھی اچھی طرح جانتی تھیں، اسی لئے ان کو رسول اللہ ﷺ کے بارے میں یہود کی طرف سے خطرہ محسوس ہوا، بلند پایہ اور دور اندیش صحابہ بھی اس بات کو بھانپ گئے تھے، چنانچہ ابن اسحاقؒ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت صفیہؓ سے خیبر میں نکاح فرمایا اور راستے میں رسم عروسی ادا کی، رسول اللہ ﷺ اپنے

خیمے میں تھے، حضرت ابوایوب خالد بن زید انصاریؓ نے بیدار ہو کر پوری رات گزاری، تلوار لٹکائے ہوئے حضورؐ کے خیمہ کے ارد گرد چکر لگاتے ہوئے پہرہ دیتے رہے، جب صبح ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے ان کو وہاں دیکھا تو پوچھا: اے ابوایوب! کیا بات ہے؟ انہوں نے جواب دیا: اس عورت کی وجہ سے مجھے آپ کے بارے میں خوف لاحق ہوا، اس لئے کہ اس کا باپ، شوہر اور قوم کے لوگ مارے گئے ہیں اور ابھی اسلام قبول کئے ہوئے زیادہ وقت بھی نہیں ہوا ہے، اس لئے مجھے آپ کے بارے میں خوف لاحق ہوا، یہ سن کر اللہ کے رسول ﷺ ان کے اس عمل کے ذریعہ انتہائی خوش ہوئے، جس کے ذریعہ ان کی انتہائی محبت اور ایمان کا پتہ چلتا ہے، آپؐ نے دعا دی اور فرمایا: اے اللہ! ابوایوب کی ویسے ہی حفاظت فرما جیسے انہوں نے میری حفاظت کرتے ہوئے رات گزاری۔ (سیرت ابن ہشام: 3/355، السیرۃ النبویہ لأبی شہبہ: 2/385)

حضرت صفیہؓ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے نکاح میں عظیم حکمت پوشیدہ تھی، آپؐ ان کے ساتھ نکاح کے ذریعہ جنسی خواہشات کی تکمیل نہیں چاہتے تھے، جیسے کہ افتراء اندازی کرنے والوں کا گمان ہے، بلکہ آپؐ نے ان کو اعزاز واکرام عطا کرنا چاہا اور ان کو کسی ایسے شخص سے محفوظ رکھا جو ان کے شرف ومقام اور قوم میں ان کے حسب ونسب سے واقف نہ ہو، اس کے ذریعہ ان کی تعزیت بھی مطلوب تھی، اس لئے کہ ان کے والد بھی مارے گئے تھے اور ان کے شوہر اور قوم کے بہت سے افراد مارے جا چکے تھے، اور آپؐ نے ان کے ساتھ جو حسنِ سلوک کیا اس سے بہتر کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا، اسی طرح اس کے ذریعہ نبی کریمؐ اور یہود کے مابین مصاہرت کا رشتہ اور تعلق بھی قائم ہوا ،تاکہ اس کے ذریعہ ان کی اسلام دشمنی میں کمی واقع ہو، وہ اسلام کے پرچم تلے آنے کے لئے تیار ہوں اور ان کے مکر وفریب اور شر اور فساد کی کوششوں میں کمی ہو۔

اُم المومنین حضرت صفیہؓ عاقل وزیرک، بردبار اور صدق وصفا کی پیکر تھیں، بیان کیا جاتا ہے کہ ان کی ایک باندی حضرت عمر بن خطابؓ کے پاس آئی اور کہا: صفیہ سنیچر کے دن کو پسند کرتی ہیں اور یہود کے ساتھ صلہ رحمی کرتی ہیں۔ حضرت عمرؓ نے ان کے پاس پیغام بھیجوایا اور اس سلسلہ میں ان سے دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا: جہاں تک سنیچر کا تعلق ہے تو میں نے کبھی اس کو پسند نہیں کیا جب سے اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کے بدلے جمعہ عطا کیا ہے، اور جہاں تک یہود کا تعلق ہے تو میری ان کے ساتھ قرابت داری ہے تو میں ان کے ساتھ صلہ رحمی کرتی ہوں۔ حضرت عمرؓ نے اس بات کو تسلیم کیا۔ اس کے بعد حضرت صفیہؓ نے باندی سے کہا: آپ کو یہ شکایت کرنے پر کس نے آمادہ کیا؟ اس نے کہا: شیطان نے۔ حضرت صفیہؓ نے اس سے کہا: جاؤ تم آزاد ہو۔

حضرت صفیہؓ کی وفات حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں سن پچاس ہجری میں ماہِ رمضان میں ہوئی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ سن باون ہجری میں ہوئی۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویہ لأبی شہبہ: 2/385)

۸: یہود کی ایک خطرناک کوشش: زہر آلود بکری:

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں: ''جب خیبر فتح ہوا تو رسول اللہ ﷺ کو ایک بکری ہدیہ میں پیش کی گئی (ایک یہودی عورت زینب بنت حرث نے پیش کی تھی) جس میں زہر بھرا ہوا تھا، اس پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ یہاں پر جتنے یہودی ہیں انہیں میرے پاس جمع کرو۔

چنانچہ سب آنحضرت ﷺ کے پاس جمع کئے گئے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میں تم سے ایک بات پوچھوں گا کیا تم مجھے صحیح صحیح بات بتادو گے ؟ انہوں نے کہا کہ ہاں، اے ابو القاسم ! پھر آنحضرت ﷺ نے فرمایا: تمہارا پردادا کون ہے ؟ انہوں نے کہا کہ فلاں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تم جھوٹ کہتے ہو، تمہارا پردادا تو فلاں ہے۔ اس پر وہ بولے کہ آپ نے سچ فرمایا، درست فرمایا۔ پھر آنحضرت ﷺ نے ان سے فرمایا: کیا اگر میں تم سے کوئی بات پوچھوں گا تو تم مجھے سچ سچ بتادو گے ؟ انہوں نے کہا کہ ہاں، اے ابو القاسم ! اور اگر ہم جھوٹ بولیں بھی تو آپ ہمارا جھوٹ پکڑ لیں گے جیسا کہ ابھی ہمارے پردادا کے متعلق آپ نے ہمارا جھوٹ پکڑ لیا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: دوزخ والے کون لوگ ہیں ؟ انہوں نے کہا کہ کچھ دن کے لئے تو ہم اس میں رہیں گے پھر آپ لوگ ہماری جگہ لے لیں گے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: تم اس میں ذلت کے ساتھ پڑے رہو گے، واللہ ! ہم اس میں تمہاری جگہ کبھی نہیں لیں گے۔ آپ نے پھر ان سے دریافت فرمایا: کیا اگر میں تم سے ایک بات پوچھوں تو تم مجھے اس کے متعلق صحیح صحیح بتادو گے ؟ انہوں نے کہا کہ ہاں، آنحضرت ﷺ نے دریافت فرمایا: کیا تم نے اس بکری میں زہر ملایا تھا؟ انہوں نے کہا کہ ہاں۔ آنحضرت ﷺ نے دریافت فرمایا کہ تمہیں اس کام پر کس چیز نے آمادہ کیا تھا؟ انہوں نے کہا کہ ہمارا مقصد یہ تھا کہ اگر آپ جھوٹے ہوں گے تو ہمیں آپ سے نجات مل جائے گی اور اگر سچے ہوں گے تو آپ کو نقصان نہیں پہنچا سکے گا"۔ (صحیح البخاري:3169 مسند أحمد 451/2)

صاحب "بلوغ الأماني" اس زہر آلود بکری کے بارے میں لکھتے ہیں: سلّام بن مشکم کی بیوی زینب بنت حارث یہودیہ نے آپ ﷺ کو یہ بکری ہدیہ میں دی تھی اور اس نے پہلے دریافت کیا تھا کہ بکری کا کون سا حصہ آپ ﷺ کو پسند ہے؟ اس سے کہا گیا کہ ران، اس لئے اس نے اس میں بہت زیادہ زہر ملایا تھا، آپ ؐ نے اس ران میں سے کھانا شروع کیا اور ایک لقمہ ابھی منہ میں رکھا ہی تھا مگر ابھی نگلا نہیں تھا، لیکن آپ ؐ کے ساتھ اس میں سے حضرت بِشر بن براءؓ نے بھی کھایا اور ایک لقمہ نگلا بھی تھا اور اس سے ان کی شہادت ہوگئی۔ (بلوغ الأماني بحاشية فتح الرباني: 21/123)

مغازی عروہ میں ہے کہ: آپ ؐ نے اس ران کو لیا اور اس میں سے گوشت منہ میں رکھا اور حضرت بشرؓ نے ایک دوسری ہڈی لی اور اس میں سے گوشت نوچا، جب اللہ کے رسول ؐ نے اس کی وجہ سے تکلیف محسوس کی تو حضرت بِشرؓ کو بھی اس کے زہر کی وجہ سے تکلیف ہوئی، منہ میں لقمہ رکھتے ہی اللہ کے رسول ؐ نے فرمایا: رک جاؤ! اس لئے کہ بکری کا یہ شانہ مجھے بتا رہا ہے کہ اس کے ذریعہ مجھے نقصان پہنچانے کا منصوبہ بنایا گیا ہے، یہ سن کر حضرت بشر بن براءؓ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس نے آپ کو عزت سے سرفراز کیا ہے! مجھے اپنے کھانے میں اس کا اثر یہ محسوس ہوا تھا اور آپ بھی تناول فرمارہے تھے، اس کو اگلنے میں میرے لئے صرف یہ بات مانع رہی کہ کہیں میں آپ کے کھانے کے مزے کو خراب نہ کردوں، جب آپ نے لقمہ کو منہ میں رکھ لیا تو مجھے اپنی جان آپ کی جان سے زیادہ عزیز نہیں لگی اور مجھے لگا کہ آپ کو اس کی وجہ سے کوئی ناگواری نہیں ہوئی۔ (المعجم الكبير للطبراني:1204، مجمع الزوائد:6/153)

ابن قیمؒ فرماتے ہیں: اس عورت کو رسول اللہ ﷺ کے پاس لایا گیا تو اس نے کہا: میں نے آپ کو مارنے کا ارادہ کیا تھا، آپ ؐ نے فرمایا: اللہ تمہیں مجھ پر مسلط نہیں کر سکتا ہے۔ صحابہ کرام نے فرمایا: کیا ہم اس کو قتل کردیں؟ آپ ؐ نے فرمایا: نہیں۔ (صحیح مسلم:2190)

آپؐ نے اس کے ساتھ کوئی تعرض نہیں کیا اور نہ ہی اس کو کوئی سزا دی، آپؐ نے اپنے شانۂ مبارک (کاندھے) پر حجامہ (پچھنا) کروایا اور جس نے بھی اس میں سے کھایا ان کو بھی بچھنا لگوانے کا حکم دیا، لیکن بعض صحابہ ان میں سے شہید ہو گئے۔ (دیکھیں: مغازی رسول اللہ ﷺ، عروہ بن الزبیر، ص: 198)

اس عورت کے قتل کے بارے میں مختلف آراء ہیں، صحیح قول یہ ہے کہ جب حضرت بشرؓ کی وفات ہوئی تو پھر اس کو (قصاصاً) قتل کیا گیا، جو زہر اس یہودی عورت نے اس گوشت میں ڈالا تھا وہ بہت زود اثر تھا، اس لئے کہ حضرت بِشر بن براءؓ کا فوراً ہی انتقال ہو گیا اور رسول اللہ ﷺ بھی مسلسل اس زہر کا اثر محسوس کرتے رہے، یہاں تک کہ آپؐ رسالت کی ادائیگی کے بعد رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے۔ امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ اپنے مرض الوفات میں فرماتے تھے: اے عائشہ! میں اس کھانے کا اَلم محسوس کر رہا ہوں جو میں نے خیبر میں کھایا تھا، ایسا لگتا ہے کہ میری شہ رگ اس زہر کی تکلیف سے کٹ جائے گی۔ (صحیح بخاری: 4428)

۹: حجاج بن علاط سلمی اور مکہ سے مال کی واپسی:

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں: فتحِ خیبر کے بعد حجاج بن علاط نے ایک دن رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا: یارسول اللہ، مکہ مکرمہ میں میرے بیوی بچے ہیں اور میرا کافی پیسہ بھی وہاں کے لوگوں کے ذمہ باقی ہے، اگر میں ان سے وصول کرنے نہیں گیا تو میرا سارا پیسہ ڈوب جائے گا، اگر آپؐ اجازت دیں تو میں مکہ چلا جاؤں، وہاں سے اپنا پیسہ بھی لے آؤں اور بیوی بچوں سے بھی ملاقات کرلوں۔ ان کی اہلیہ اُم شیبہ؛ بنی عبدالدار سے تعلق رکھتی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو مکّہ جانے کی اجازت دے دی۔ حجاج نے عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے اپنا پیسہ نکلوانے کے لئے کچھ باتیں خلافِ واقعہ بھی کہنی پڑیں گی، سچ سے گریز بھی کرنا پڑے گا اور کچھ ایسا ہی آپؐ کے تعلق سے بھی کہنا سننا پڑے گا، قریش کی ہاں میں ہاں بھی ملانی ہو گی، کیا میں ایسا کر سکتا ہوں؟ آپؐ نے ان کو اجازت مرحمت فرما دی۔

حجاج بن علاطؓ دربار نبویؐ سے اجازت پا کر عازم مکہ ہوئے، ان کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح وہ فتح خیبر کی خبر عام ہونے سے پہلے مکہ پہنچ جائیں اور اپنا مقصد پورا کر کے لوَٹ آئیں، وہ تیز رفتاری کے ساتھ سفر کرتے ہوئے مکّہ پہنچے، اپنی بیوی کے پاس گئے، اور اس سے کہا کہ جو مال تمہارے پاس ہے وہ سب اکٹھا کر کے مجھے دو، میں محمدؐ کے اموالِ غنیمت خریدنا چاہتا ہوں، انہیں شکست ہو چکی ہے اور بہت کچھ مالِ غنیمت دشمنوں کے ہاتھ لگا ہے، اس سے پہلے کہ دوسرے تاجروں کو اس کی بھنک لگے میں زیادہ سے زیادہ مال خرید لینا چاہتا ہوں، ذرا سی دیر میں یہ خبر پورے مکّہ میں پھیل گئی، وہاں جو مسلمان تھے وہ یہ خبر سن کر رنجیدہ ہو گئے جبکہ مشرکین خوشی سے رقص کرنے لگے۔

ایک روایت میں یہ ہے کہ حجاج بن علاط ثنیۃ الوداع میں پہنچے جو مکّہ سے پہلے ایک وادی ہے، وہاں کچھ مشرکین بیٹھے ہوئے آنے جانے والوں سے مدینہ کی خبریں معلوم کر رہے تھے، انہوں نے حجاج کو دیکھا تو ایک دوسرے سے کہنے لگے: یہ تو حجاج بن علاط ہے، وہ ان کے اسلام سے بے خبر تھے، انہیں دیکھ کر کہنے لگے: ابو محمد! ہمارے لئے بھی تمہارے پاس کوئی خبر ہے؟ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ محمد خیبر گئے ہوئے ہیں،

اور خیبر یہودیوں کا بڑا شہر اور بڑا زرخیز علاقہ ہے۔ حجاج نے کہا: میرے پاس تمہارے لئے ایک خوش کن خبر ہے، یہ سنتے ہی وہ حجاج کی اونٹنی کے ارد گرد جمع ہوگئے اور ان سے وہ خبر سننے کیلئے بے تاب نظر آنے لگے، حجاج نے انہیں بتلایا کہ یہودیوں نے محمد ﷺ کو کراری شکست دی ہے، ایسی شکست کے بارے میں تم نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا، ان کے ساتھی (صحابہ کرام) بھی بُری طرح قتل کردیئے گئے ہیں، تم نے اس طرح کے قتل کا تصور بھی نہیں کیا ہوگا، محمد (ﷺ) گرفتار کرلئے گئے ہیں، یہودی کہتے ہیں کہ ہم انہیں خود قتل نہیں کریں گے، بلکہ ان کو مکّہ بھیجا جائے گا، اہل مکّہ محمد کو ان لوگوں کے سامنے قتل کریں گے جن کے آدمیوں کو انہوں نے مارا ہے۔

حجاج بن علاط کہتے ہیں کہ میری یہ باتیں سن کر قریش کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا، وہ ایک دوسرے کو بتلانے لگے کہ یہ ابو محمد (حجاج بن علاط) وہاں سے آیا ہے اور ہمارے لئے نہایت خوش کن خبر لے کر آیا ہے، محمد (ﷺ) کو یہاں لایا جائے گا اور انہیں سب کے سامنے قتل کیا جائے گا، میں نے قریش مکہ کو بتلایا کہ مکہ کے کچھ لوگوں پر میرا قرض ہے، ان سے میرا قرض واپس دلانے میں میری مدد کرو، میں واپس جاکر اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں، محمد اور ان کے ساتھیوں سے لوٹا ہوا سامان خرید لینا چاہتا ہوں جو سستے داموں بک رہا ہے، ایسا نہ ہو کہ دوسرے تاجر مجھ سے پہلے وہاں پہنچ جائیں۔ قریشیوں نے یہ سن کر میری مدد میں کوئی کسر نہ چھوڑی، اور اتنی تیزی سے میرا قرض وصول کرایا کہ میں نے ایسا منظر کبھی نہ دیکھا تھا۔

حضور ﷺ کے چچا حضرت عباس بن عبد المطلب مکہ میں ہی رہتے تھے، وہ مسلمان نہیں ہوئے تھے، لیکن بھتیجے کی محبت میں وہ اسلام اور مسلمانوں کے خیر خواہ تھے، انہوں نے یہ خبر سنی تو دل تھام کر بیٹھ گئے، حضرت ثابت بن انسؓ کہتے ہیں کہ یہ خبر سن کر انہوں نے اپنے ایک غلام کو حجاج کے پاس بھیج کر یہ کہلوایا کہ او بدبخت انسان! تو یہ کیسی خبر لے کر آیا ہے؟! اللہ تعالیٰ نے محمدؐ سے خیر کا وعدہ کر رکھا ہے، اس خبر کی حقیقت کیا ہے؟! حجاج نے غلام سے کہا: ابو الفضل سے میرا اسلام کہنا اور عرض کرنا کہ میں ان سے تنہائی میں ملاقات کروں گا، خبر آپ کیلئے باعثِ مسرت ہے، حجاج کی خبر سن کر حضرت عباسؓ بیمار پڑ گئے تھے، غلام نے آکر یہ بات بتلائی تو اٹھ کر بیٹھ گئے، غلام کی پیشانی پر بوسہ دیا اور اس خوشی میں اسے آزاد بھی کردیا، جب حجاج اپنے کام سے فارغ ہوگئے تب وہ حضرت عباسؓ سے ملنے گئے، حضرت عباسؓ بے تابی سے ان کا انتظار کر رہے تھے، انہیں دیکھتے ہی کہنے لگے: کیسی خبر ہے جو تم لے کر آئے ہو؟ حجاج اتنے عرصہ میں اپنا مال جمع کرچکے تھے، اور اب وہ جلد از جلد یہاں سے نکلنا چاہتے تھے، انہیں ڈر تھا کہ کہیں مدینہ کے اطراف سے کوئی شخص ادھر نہ آنکلے اور قریشیوں کو صحیح صورت حال سے آگاہ نہ کردے، مکّہ والے صحیح بات سن کر برداشت نہیں کرپائیں گے، انہیں قتل بھی کردیں گے اور ان کا مال بھی چھین لیں گے۔ حجاج نے حضرت عباسؓ سے کہا کہ محمد ﷺ نے خیبر فتح کرلیا ہے، بہت سا مال غنیمت ہاتھ آیا ہے، اللہ کے مقرر کردہ اصولوں کے مطابق اس کی تقسیم عمل میں آچکی ہے، پورا خیبر محمد ﷺ اور ان کے ساتھیوں کا ہے، میں یہاں صرف اپنا مال لینے کے لئے آیا ہوں، اگر میں یہ تدبیر اختیار نہ کرتا تو یہاں کے لوگ میرا ایک حبّہ بھی واپس نہ کرتے، میں نے جو کچھ کیا ہے اور جو کچھ کہا ہے وہ رسول اللہ ﷺ کی مرضی اور اجازت سے کیا اور کہا ہے، میں مسلمان ہوچکا ہوں اور اب یہاں سے رخصت ہو رہا ہوں، آپ تین دن تک خاموش رہیں، تین دن کے بعد جس سے جو کہنا ہو کہیں۔

یہ تین دن حضرت عباسؓ کے لئے ہجر کی تین راتوں کی طرح طویل تھے، ان سے اس خوشی کو جو حجاج کے ذریعہ ملی تھی چھپانا مشکل تھا، ایک ایک دن ان پر بھاری گزر رہا تھا، جب تین دن پورے ہوگئے تو حضرت عباسؓ حجاج کے گھر گئے اور خاتونِ خانہ سے پوچھا کہ حجاج کہاں ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ وہ تین دن پہلے ہی یہاں سے جا چکے ہیں، اس کے ساتھ ہی اس خاتون نے حضرت عباسؓ کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کے طور پر یہ بھی کہا کہ اے ابوالفضل! اللہ تعالی تمہیں رسوا اور ذلیل نہ کرے، ہمیں بھی اس خبر سے بہت دکھ ہوا ہے۔ حضرت عباسؓ نے جواب دیا، اللہ مجھے رسوا نہ کرے، بات ایسی نہیں ہے جیسی تم لوگوں تک پہنچی ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ تعالی نے میرے بھتیجے محمد ﷺ کو خیبر فتح کرا دیا ہے، مالِ غنیمت کی تقسیم عمل میں آچکی ہے۔

حجاج کے گھر سے حضرت عباسؓ قریش مکہ کی بیٹھکوں اور ان کی قیام گاہوں پر پہنچے، اور ایک ایک کو پکڑ پکڑ کے یہ بتلایا کہ صحیح خبر وہ نہیں تھی جسے سن کر تم خوش ہو، صحیح خبر یہ ہے، تین چار دن تک قریش کا حال یہ رہا کہ وہ حضرت عباسؓ کی طرف دیکھ کر تمسخرانہ انداز میں مسکراتے، اور بظاہر ہمدردی کے دو چار بول بھی بول دیتے، اب موقع ملا تو حضرت عباسؓ نے پورا پورا بدلہ لے لیا۔ قریش یہ سن کر ہکا بکا رہ گئے، کہنے لگے: اے ابوالفضل! تمہیں یہ خبر کس نے دی ہے؟ فرمایا: یہ خبر وہی شخص لایا ہے جو تمہارے پاس پہلی خبر لے کر آیا تھا، وہ مسلمان تھا، اس نے اس تدبیر سے اپنا مال حاصل کیا اور چلتا بنا۔ قریش ایک دوسرے سے کہنے لگے: تمہارا ناس ہو، دشمنِ خدا ہاتھ سے نکل گیا، خدا کی قسم! اگر ہمیں معلوم ہو جاتا تو ہم ہوتے اور وہ ہوتا۔ (مسند أحمد 138/3، البزار: 1816، أبو يعلى: 3479، المعجم الكبير للطبراني: 3196، السنن الكبرى للبيهقي: 151/9، مصنف عبد الرزاق: 466/5)

اس واقعہ کے ذریعہ بہت سے مسائل اخذ ہوتے ہیں جیسے کہ اگر جھوٹ بول کر اپنا حق حاصل کرنا مطلوب ہو اور اس کے ذریعہ کسی کو ضرر لاحق نہ ہو تو ایسی صورت اپنے بارے میں یا دوسرے کے بارے میں جھوٹ بولنا جائز ہے، جیسے کہ حضرت حجاج بن علاط نے مسلمانوں کے بارے میں جھوٹی خبر پھیلائی یہاں تک کہ انہوں نے مسلمانوں کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر مکہ سے اپنا مال حاصل کیا اور مکہ میں مسلمانوں کو کچھ وقت کے لئے جو پریشانی اور غم لاحق ہوا تو یہ مطلوبہ مصلحت کے مقابلہ میں بہت معمولی تھی اور صحیح خبر سننے کے بعد یہ پریشانی اور حزن وغم بھی فرحت وسرور میں تبدیل ہوگیا۔

۱۰: غزوۂ خیبر سے متعلق بعض فقہی احکام:

غزوۂ خیبر کے دوران بہت سے شرعی احکام کی تشریع عمل میں آئی، جس میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

۱: پالتو گدھوں کے گوشت کی حرمت:

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے دن پالتو گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرمایا۔ (دیکھیں: صحیح بخاری: 4218، صحیح مسلم: 561، زاد المعاد: 4/122)

۲: حاملہ قیدی باندیوں سے جماع کی ممانعت:

اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہو تو اس کو چاہیے کہ اپنے سوا کسی اور کی کھیتی کو سیراب نہ کرے''۔(سنن ابو داؤد:2158، سنن ترمذی:1131، الطبقات:2/113)

۳: غیر حاملہ قیدی باندیوں سے استبراء رحم سے پہلے جماع کی ممانعت:

اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لانے والے کسی شخص کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ کسی قیدی لونڈی سے جماع کرے یہاں تک کہ وہ استبراء رحم کرلے (یعنی یہ جان لے کہ یہ عورت حاملہ نہیں ہے)۔(مسند احمد:4/108، سنن ابو داؤد:2159، السنن الکبری للبیہقی:9/124، الروض الانف:4/41)

استبراء اس طور پر ہوگا کہ وہ ایک حیض سے پاک ہو، اس پر عدت ضروری نہیں ہے اگرچہ وہ کسی کافر شخص کی زوجیت میں رہی ہو، چاہے وہ وفات پاچکا ہو یا زندہ ہو، اس لئے کہ عدت وفات پانے والے شوہر کے ساتھ وفاداری اور اظہارِ افسوس کے لئے ہوتی ہے اور کافر شخص کے حق میں کوئی سوگ نہیں ہے۔(دیکھیں: الصراع مع الیہود:3/134)

۴: زیادتی کے ساتھ سود لینے کی حرمت:

حضرت ابو سعید خدریؓ اور ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو خیبر کا عامل بنایا، وہ 'جنیب' (نامی عمدہ قسم کی) کھجور لے کر آیا تو آپؐ نے فرمایا: ''کیا خیبر کی ساری کھجوریں اسی طرح ہیں؟''۔ وہ بولا: نہیں، اللہ کی قسم! ہم یہ کھجور دو صاع کے بدلہ ایک صاع یا تین صاع کے بدلے دو صاع لیتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ایسا نہ کرو، گھٹیا اور ردی کھجوروں کو درہم (پیسوں) سے بیچو، پھر درہم سے 'جنیب' خرید لو''۔(صحیح البخاري:4244 صحیح مسلم:1593)

ربا الفضل (اضافہ کے ساتھ سود) یہ ہے کہ ایک جنس کی چیزوں میں زیادتی کے ساتھ بیع ہو، جیسے کہ ایک صاع کو ایک صاع سے زائد کے بدلہ خریدا تو یہاں زیادتی کو سود مانا جائے گا اور یہ حرام ہے، اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے اور اس کا بہترین حل اور متبادل بھی عطا کیا ہے، وہ یہ کہ پہلے اپنے کھجوروں کو پیسوں کے عوض میں خریدے، اس کے بعد ان پیسوں کے بدلے دوسری کھجوریں خریدے۔

۵: کمی زیادتی کے ساتھ سونا اور چاندی کی خرید و فروخت کا حکم:

حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے روز ہمیں اس بات سے منع کیا کہ ہم سونے کو سونے کے بدلے یا چاندی کو چاندی کے بدلے کمی زیادتی کے ساتھ بیچیں یا خریدیں۔ اور فرمایا کہ سونے کو چاندی کے بدلے اور چاندی کو سونے کے بدلے خرید و فروخت کر سکتے ہو۔(سیرت ابن ہشام:3/346)

اس حدیث سے مراد یہ ہے کہ سونے کو سونے کے بدلے برابر سرابر اور چاندی کو چاندی کے بدلے برابر سرابر خرید نا بیچنا جائز ہے اور اس میں کمی اور زیادتی کے ساتھ خرید و فروخت جائز نہیں ہے، البتہ سونے کو چاندی کے بدلے اور چاندی کو سونے کے بدلے خرید نا بیچنا جائز ہے۔

٦: مساقاۃاور مزارعت کی مشروعیت:

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے خیبر کی اراضی کو یہود کو اس شرط کے ساتھ دیا کہ وہ اس میں کام کریں اور اس میں کھیتی باڑی کریں، ان کے لئے اس کی پیداوار کا نصف ہوگا۔

بعض محققین نے یہ سوال کیا ہے کہ خرید و فروخت کے یہ احکام خیبر کے موقع پر کیوں دیئے گئے اور اس کی حکمت کیا ہے؟

شیخ ابو زہرہؒ نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے کہ خیبر کی فتح مالی معاملات کے اعتبار سے ایک نئی فتح تھی، اس لئے اس موقع پر مزارعت، مساقات اور دیگر مالی معاملات کے احکام دیئے گئے۔ (خاتم النبیین: 1104، الصراع مع الیہود: 3/136)

٧: گھوڑوں کا گوشت کھانے کی رخصت:

حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے خیبر کے روز گدھوں کا گوشت کھانے سے منع کیا اور گھوڑوں کے بارے میں رخصت دی۔ (صحیح بخاری: 5520، صحیح مسلم: 1941)

٨: متعہ کی حرمت:

حضرت علیؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے روز عورتوں کے ساتھ متعہ کرنے سے منع فرمایا اور پالتو گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرمایا۔ (صحیح بخاری: 5523 صحیح مسلم: 1407)

٩: غزوۂ خیبر میں خواتین کی شرکت:

اُمیہ بنت اُبی الصلت نے بنو غفار کی ایک خاتون سے روایت کیا ہے کہ وہ فرماتی ہیں: میں بنو غفار کی کچھ خواتین کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی، انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! ہم نے ارادہ کیا ہے کہ ہم آپ کے ساتھ اس جانب نکلیں، یعنی خیبر کی جانب، ہم زخمیوں کی مرہم پٹی کریں گی اور اپنی استطاعت کے بقدر مسلمانوں کی مدد کریں گی۔ آپؐ نے فرمایا: چلیں، اللہ کا نام لے کر! فرماتی ہیں: ہم آپ کے ساتھ نکلیں، اللہ کے رسولؐ نے صبح تک ایک جگہ پڑاؤ ڈالا، میں آپؐ کے کجاوے کی پچھلی جانب سے اتر گئی، اچانک دیکھتی ہوں کہ اس پر میرا خون لگا ہوا ہے اور یہ میری پہلی ماہواری تھی۔ فرماتی ہیں: میں اونٹنی کے ساتھ چمٹ گئی اور مجھے شرم لاحق ہوئی، جب رسول اللہ ﷺ نے میری یہ حالت دیکھی اور خون دیکھا تو فرمایا: آپ کو کیا ہوا؟ لگتا ہے آپ بیمار ہو گئی ہو۔ فرماتی ہے: میں نے عرض کیا: جی ہاں! آپؐ نے فرمایا: اپنے آپ کو ٹھیک کر لو، اس کے بعد پانی کا ایک برتن لو، اس میں نمک ڈالو اور اس سے کجاوے میں لگا ہوا خون دھولو، اور پھر اپنی سواری پر بیٹھ جاؤ۔ فرماتی ہیں: جب اللہ تعالیٰ نے خیبر کی فتح سے سرفراز کیا تو آپؐ نے مالِ غنیمت میں ہمیں بھی شریک

کیا، آپؐ نے یہ ہار اٹھایا جو آپ میری گردن میں دیکھ رہی ہو، آپؐ نے وہ مجھے عطا کیا اور اپنے ہاتھ سے میرے گلے میں لٹکایا۔اللہ کی قسم! میں کبھی بھی اس کے بغیر نہیں رہتی ہوں۔(دیکھیں: البدایہ والنہایہ: 4/205)

یہ ہار ان کی وفات تک ان کے گلے میں ہوتا تھا اور پھر انہوں نے وصیت کی تھی کہ اس کو ان کے ساتھ دفن کر دیا جائے۔ فرماتی ہیں: وہ جب بھی حیض سے پاک ہوتی تھیں تو غسل کے پانی میں نمک ڈالتی تھیں اور انہوں نے وصیت کی تھی کہ جب ان کا انتقال ہو تو ان کے غسل کے پانی میں بھی نمک ڈالا جائے۔(مسند احمد: 6/380، السنن الکبریٰ للبیہقی: 2/407، طبقات ابن سعد: 8/214، البدایہ والنہایہ لابن کثیر: 4/204، سیرت ابن ہشام: 3/357)

یہ ہر اُس مسلمان خاتون کے لئے زندہ نمونہ ہے جو بھی مسلمانوں کے ساتھ جہاد کے اجر و ثواب میں شریک ہونا چاہتی ہو، اس طرح سے اللہ کے رسول ﷺ امن اور جنگ کی حالت میں عقائد اور عبادت کی بھی تعلیم و تربیت کا فریضہ انجام دیتے تھے اور یہ آپ کی زندگی کے بحرِ بیکراں کا ایک قطرہ ہے۔

خیبر، فدک، وادی القری، تیماء کی فتح کی وجہ سے جزیرۃ العرب کے مختلف قبائل میں تہلکہ مچ گیا، قریش غیظ و غضب کی وجہ سے حواس باختہ ہو گئے، اس لئے کہ ان کو اس کی بالکل بھی توقع نہیں تھی، وہ خیبر کے یہود کے قلعوں کی مضبوطی، ان کے جنگجوؤں کی کثرتِ تعداد اور سامانِ حرب و ضرب سے اچھی طرح واقف تھے اور جہاں تک دیگر قبائل کا تعلق ہے جو قریش کے معاون و حلیف تھے وہ خیبر کے یہود کی شکست کی خبر سن کر خوفزدہ اور مرعوب ہو گئے۔انہوں نے قریش سے علحیدگی اختیار کر کے مسلمانوں کے ساتھ مصالحت کرنے میں عافیت سمجھی جس کی وجہ سے پورے جزیرۃ العرب میں اسلام کی نشر و اشاعت کے دروازے کھل گئے اور دشمنوں کے دلوں میں مسلمانوں کی عظمت اور دھاک بیٹھ گئی۔(دیکھیں: فقہ السیرۃ، منیر عضبان، ص534، نضرۃ النعیم: 1/353)

سرایا کی تحریک خیبر کے بعد بھی مسلسل جاری رہی، آپ ﷺ نے کبار صحابہ کو ان کا امیر مقرر فرمایا، بعض میں جنگ ہوئی جبکہ بعض میں جنگ کی نوبت نہیں آئی۔

....

دوسرا باب

ملوک وامراء کو دعوت

ا: صلح حدیبیہ اسلام کی نشرواشاعت کے آغاز کا اعلان:

صلح حدیبیہ کے بعد اسلام جزیرۃ العرب کے کونے کونے میں پھیل گیا، بلکہ جزیرۃ العرب کی حدود سے باہر بھی عام ہوگیا، اللہ کے رسولؐ نے جیسے ہی قریش کے ساتھ حدیبیہ میں معاہدہ کیا اور اس کے بعد شمالی حجاز کے خیبر علاقہ میں، وادی القری، تیاء اور فدک میں تمام یہود کو اسلامی ریاست کی ماتحتی میں آنا پڑا تو اس کے فوراً بعد ہی سے رسول اللہ ﷺ نے حدودِ حجاز کے باہر بھی اور جزیرۃ العرب کے باہر بھی اسلام کی نشرواشاعت کے سلسلہ میں کوششیں تیز کردیں، اللہ کے رسولؐ نے اس نظامِ حیات کو قول وعمل دونوں کے ذریعہ واضح کیا، آپؐ نے جزیرۃ العرب کے اطراف واکناف میں اور جزیرۃ العرب کے باہر معاصر شاہانِ عالم کے پاس قاصدین اور وفود روانہ فرمائے۔

اس اقدام کو تاریخِ عرب اور تاریخِ اسلام میں ایک نقطۂ انقلاب کی حیثیت حاصل ہے، ایسا صرف اس لئے نہیں ہوا کہ رسول اللہ ﷺ اب پورے جزیرۃ العرب کو اسلامی پرچم کے سائے تلے متحد کریں گے بلکہ ایسا اس لئے بھی ہوا کیونکہ ان عربوں نے اب اسلام کو گلے لگایا اور یہ اب آسمانی پیغام کے نمائندے بن گئے، اور اب ان کے ذمہ پوری انسانیت تک اسلامی دعوت پہنچانے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ (دیکھیں: السفارات النبویۃ، د۔ محمد العقیلی، ص:15)

زعماء اور بادشاہوں کو دعوت دینے کے سلسلہ میں نبوی منہج سے پتہ چلتا ہے کہ دعوتی وسائل کیا کیا اور کس طرح ہونے چاہئیں، امراء واقوام کو دعوت دینے کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ نے ایک نیا اسلوب اختیار کیا، اور وہ اسلوب تھا: بادشاہوں اور قبائل کے امراء کے نام خطوط اور مراسلت۔ اس اسلوب کا بادشاہوں اور امراء پر گہرا اثر پڑا، بعض حلقہ بگوش اسلام ہوگئے، بعض کی جانب سے ہمدردی اور محبت حاصل ہوگئی، اسی طرح سے ان خطوط کے ذریعہ تحریکِ اسلامی اور مدینہ کی اسلامی ریاست کے بارے میں بعض بادشاہوں اور امراء کا موقف بھی واضح ہوگیا، اس طرح سے ان خطوط کے ذریعہ بہت اہم نتائج حاصل ہوئے اور ان خطوط کے تئیں مختلف قسم کا ردعمل سامنے آنے کی وجہ سے اسلامی ریاست کو یہ سمجھنے میں آسانی ہوگئی کہ ایک واضح اور امتیازی سیاسی اور عسکری طریقہ کار اختیار کرنا ضروری ہے، مندرجہ ذیل سطور میں اہم خطوط پیش کئے جارہے ہیں:

ا: صحیح روایات میں نبی کریم ﷺ کا وہ خط منقول ہے جو آپؐ نے حضرت دحیہ کلبیؓ کے ذریعہ شاہِ روم ہرقل کے نام بھیجا تھا اور یہ حدیبیہ کی مدتِ مصالحت کے دوران بھیجا گیا، خط کا متن مندرجہ ذیل ہے:

''بسم اللہ الرحمن الرحیم، من محمد عبد الله ورسوله إلى هرقل عظيم الروم، سلام على من اتبع الهدى، أما بعد، فإني أدعوك بدعاية الإسلام أسلم تسلم يؤتك الله أجرك مرتين، فإن توليت فإن عليك إثم الأريسيين- ﴿قُلْ يَـٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَـٰبِ تَعَالَوْا۟

إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا ٱللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِۦ شَيْـًٔا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ ٱللَّهِ ۚ فَإِن تَوَلَّوْا۟ فَقُولُوا۟ ٱشْهَدُوا۟ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ﴾ (آل عمران:64)

ترجمہ: اللہ کے نام سے جو بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔

من جانب: محمد بن عبد اللہ بطرف: ہرقل بادشاہ روم

"اس پر سلام ہے جو ہدایت کی پیروی کرے، میں تجھے اسلام کی دعوت دیتا ہوں، اسلام لے آؤ تاکہ سلامتی کے ساتھ رہو گے، خدا تجھے دوگنا اجر دے گا، (ایک خود تمہارے ایمان لانے پر اور دوسرا ان لوگوں کی وجہ سے جو تمہاری پیروی کرکے ایمان لائیں گے) اور اگر تو نے قانونِ اسلام سے روگردانی کی تو اریسیوں کا گناہ بھی تیری گردن پر ہو گا، اے اہل کتاب، ہم تمہیں ایک مشترک بنیاد کی طرف دعوت دیتے ہیں اور وہ یہ کہ ہم خدائے یگانہ کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک قرار نہ دیں، حق سے روگردانی نہ کریں، اور ہم میں سے بعض بعض کو رب نہ بنائیں، اگر روگردانی اختیار کرتے ہو تو ان سے کہو کہ گواہ رہو ہم تو مسلمان ہیں"۔(صحیح البخاری:4553 صحیح مسلم:1773)

ہرقل نے رسول اللہ ﷺ کا نامہ وصول کیا، اور اس سلسلہ میں کافی باریک بینی کے ساتھ تحقیق کی جیسے کہ اُس طویل گفتگو میں اس کی تفصیلات آئی ہیں جو ابوسفیان اور ہرقل کے درمیان ہوئی تھی، اور وہ صحیحین میں مروی ہے جبکہ ہرقل نے ابوسفیان سے نبی کریم ﷺ کے بارے میں تمام حالات دریافت کئے تھے اور اس کے بعد ابوسفیان سے کہا تھا: آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں اگر یہ حق ہے تو بہت جلد وہ میرے ان دو پیروں کی جگہ یہ بھی مالک ہو جائیں گے، اور مجھے معلوم تھا کہ وہ مبعوث ہونے والے ہیں لیکن میں نہیں سمجھتا تھا کہ وہ آپ کے درمیان سے ہوں گے، اگر میں ان تک پہنچ سکتا تو میں ان سے ملنے کی پوری کوشش کرتا اور اگر میں ان کے پاس ہوتا تو میں ضرور ان کے پیر دھوتا۔

۲: نبی کریم ﷺ نے فارسی سلطنت کے بادشاہ کسریٰ کے نام بھی حضرت عبداللہ بن حذیفہ سہمیؓ کے ذریعہ ایک مکتوب بھیجا، آپؐ نے ان کو حکم دیا کہ یہ خط بحرین کے گورنر کو دیں اور اس کے بعد بحرین کے گورنر نے وہ خط کسریٰ کو دیا، جب کسریٰ نے اس کو پڑھا تو اس کو پھاڑ دیا، اس کی وجہ سے اللہ کے رسول ﷺ نے ان کے خلاف بد دعا فرمائی کہ اللہ اس کے بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔(مسند أحمد: 1/243، صحیح بخاری:4424، دلائل النبوۃ للبیہقی:4/387)

یہ خط سن سات ہجری ماہ محرم میں بھیجا گیا، جیسے کہ زاد المعاد میں ہے۔امام طبریؒ نے اس مکتوب کے جو الفاظ نقل کئے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

"بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ- من محمد رسول الله إلى كسرى عظيم فارس، سلام على من اتبع الهدى، وآمن بالله ورسوله، وشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له، وأن محمدا عبده ورسوله، وأدعوك بدعاية الله، فإني أنا رسول الله إلى الناس كافة، لينذر من كان حيا ويحق القول على الكافرين، فأسلم تسلم، فإن أبيت فإن إثم المجوس عليك".

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" محمد رسول اللہ کی طرف سے کسریٰ عظیمِ فارس کی جانب

اس شخص پر سلام جو ہدایت کی پیروی کرے اور اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی لائقِ عبادت نہیں۔ وہ تنہا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور محمد اس کے بندے اور رسول ہیں۔ میں تمہیں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، کیونکہ میں تمام انسانوں کی طرف اللہ کا فرستادہ ہوں تاکہ جو شخص زندہ ہے اسے انجامِ بد سے ڈرایا جائے اور کافرین پر حق بات ثابت ہو جائے (یعنی حجت تمام ہو جائے) پس تم اسلام لاؤ سلامتی کے ساتھ رہوگے اور اگر اس سے انکار کیا تو تم پر مجوس کا بھی بار گناہ ہوگا"۔

۳: شاہِ حبشہ نجاشی کے نام نبی کریم ﷺ نے اپنا مکتوب حضرت عمرو بن امیہ ضمری کے ہاتھ بھیجا، اس نامہ میں تھا:

بسم اللہ الرحمن الرحیم، محمد رسول اللہ کی جانب سے نجاشی عظیم حبشہ کے نام!

اس شخص پر سلام جو ہدایت کی پیروی کرے۔ اَمابعد! میں تمہاری طرف اللہ کی حمد کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں، جو قدوس اور سلام ہے۔ امن دینے والا محافظ و نگراں ہے، اور میں شہادت دیتا ہوں کہ عیسیٰ ابن مریم اللہ کی روح اور اس کا کلمہ ہیں۔ اللہ نے انہیں پاکیزہ اور پاکدامن مریم بتول کی طرف ڈال دیا۔ اور اس کی روح اور پھونک سے مریم عیسیٰ کے لئے حاملہ ہوئیں۔ جیسے اللہ نے آدمؑ کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا۔ میں اللہ وحدہ لاشریک لہ کی جانب اور اس کی اطاعت پر ایک دوسرے کی مدد کی جانب دعوت دیتا ہوں۔ اور اس بات کی طرف (بلاتا ہوں) کہ تم میری پیروی کرو اور جو کچھ میرے پاس آیا ہے اس پر ایمان لاؤ۔ کیونکہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ اور میں تمہیں اور تمہاری قوم کو اللہ عزوجل کی طرف بلاتا ہوں اور میں نے تبلیغ و نصیحت کر دی، لہٰذا میری نصیحت قبول کرو اور اس شخص پر سلام جو ہدایت کی پیروی کرے۔ (نصب الرایہ للزيلعي 421/4)

۴: جہاں تک حاکمِ مصر مقوقس کے نام نبی کریم ﷺ کے مکتوب اور مقوقس کے جواب کا تعلق ہے تو صحیح سندوں سے اس کا ثبوت نہیں ملتا ہے لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مقوقس کی جانب کوئی مکتوب نہیں بھیجا، اسی طرح یہ بھی درست نہیں ہے کہ تاریخی اعتبار سے اس مکتوب کے نصوص پر شکوک و شبہات پیدا کئے جائیں، یہ نصوص الفاظ اور مضمون کے اعتبار سے درست ہو سکتے ہیں، البتہ شرعی سیاست کے سلسلہ میں ان کے ذریعہ استدلال نہیں کیا جاسکتا ہے، محمد بن سعد نے 'طبقات' میں ذکر کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے شاہِ اسکندریہ اور قبطیوں کے حاکم مقوقس جُریج بن مینا کے نام ایک مکتوب حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ اللخمی کے ذریعہ بھیجا اور اس نے مثبت جواب دیا، لیکن اس نے اسلام قبول نہیں کیا، اس نے نبی کریم ﷺ کے لئے متعدد ہدیے اور تحفے بھیجے جن میں حضرت ماریہ قبطیہؓ بھی شامل تھیں اور جب نبی کریم ﷺ کے پاس مقوقس کا جواب پہنچا تو آپؐ نے فرمایا: "خبیث نے اپنی بادشاہت کی وجہ سے بخل کیا، حالانکہ اس کی بادشاہت کو کوئی دوام نہیں ہے"۔ (نصب الرایہ للزيلعي: 4/422، البدایہ والنہایہ: 5/340)

۵: رسول اللہ ﷺ نے شجاع بن وہب کے ہاتھ ایک خط دمشق کے حاکم منذر بن حارث بن اَبی شمر غسّانی کے نام بھیجا، جبکہ آپؐ اور مسلمان حدیبیہ سے واپس آرہے تھے، اس خط کا مضمون یہ تھا: "اس شخص پر سلام ہو جس نے ہدایت کی اتباع کی اور اس پر ایمان لایا، میں

آپ کو اس بات کی دعوت دیتا ہوں کہ اللہ پر ایمان لاؤ جو تنہا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہے، وہ تمہاری بادشاہت کو باقی رکھے گا"۔(نصب الرایہ للزیلعی:4/424،تاریخ طبری:2/652)

٦: رسول اللہ ﷺ نے حدیبیہ سے واپس آتے ہوئے ہوذہ بن علی حنفی کے پاس سُلیط بن عمرو عامری کو ایک خط لے کر بھیجا، ہوذہ حنفی نے آپ ﷺ کا نامۂ مبارک پڑھنے کے بعد یہ شرط عائد کی کہ اس کو بھی حکومت میں شریک کریں، لیکن نبی کریم ﷺ نے اس کی اس شرط کو قبول کرنے سے انکار کیا۔(نصب الرایہ للزیلعی:4/425،اعلام السائلین،ابن طولون:105-107)

٧: اللہ کے رسول ﷺ نے حدیبیہ سے واپسی کے موقع پر اُمیر البحرین منذر بن ساوی العبدی کے نام ابو العلاء حضرمی کو خط لے کر بھیجا، کتبِ تاریخ میں یہ بات مذکور ہے کہ منذر نے نبی کریم ﷺ کا خط پڑھ کر اچھا ردعمل دکھایا اور اسلام قبول کیا اور اس کے ساتھ بحرین کے تمام عربوں نے بھی اسلام قبول کیا، اور جہاں تک وہاں کے یہود اور مجوس کا تعلق ہے تو انہوں نے علاء اور منذر کہ ساتھ جزیہ دینے پر مصالحت کر لی اور ہر بالغ کی طرف سے ایک دینار دینے پر اتفاق کیا۔(نصب الرایہ للزیلعی:4/420)

ابو عبید قاسم بن سلام نے منذر بن ساوی کے نام نبی کریم ﷺ کے خط کے الفاظ حضرت عمرو بن زبیر کی روایت سے نقل کئے ہیں، اس کے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں:

محمد رسول اللہ کی طرف سے منذر بن ساوی کی طرف

تم پر سلام ہو، میں تمہاری طرف اللہ کی حمد کرتا ہوں جس کے سوا کوئی لائقِ عبادت نہیں اور میں شہادت دیتا ہوں کہ محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں۔

اَمابعد: میں تمہیں اللہ عزوجل کو یاد دلاتا ہوں، یاد رہے کہ جو شخص بھلائی اور خیر خواہی کرے گا وہ اپنے ہی لئے بھلائی کرے گا، اور جو شخص میرے قاصدوں کی اطاعت اور ان کے حکم کی پیروی کرے اس نے میری اطاعت کی، اور جو ان کے ساتھ خیر خواہی کرے اس نے میرے ساتھ خیر خواہی کی اور میرے قاصدوں نے تمہاری اچھی تعریف کی ہے اور میں نے تمہاری قوم کے بارے میں تمہاری سفارش قبول کر لی ہے، لہٰذا مسلمان جس حال پر ایمان لائے ہیں انھیں اس پر چھوڑ دو، اور میں نے خطاکاروں کو معاف کر دیا ہے، لہٰذا ان سے قبول کر لو۔ اور جب تک تم اصلاح کی راہ اختیار کئے رہوگے ہم تمہیں تمہارے عمل سے معزول نہ کریں گے اور جو یہودیت یا مجوسیت پر قائم رہے اس پر جزیہ ہے۔ (زاد المعاد، کتاب الأموال لأبي عبيد، ص:30)

٨: سن آٹھ ماہ ذی قعدہ میں نبی کریم ﷺ نے حضرت عمرو بن عاصؓ کے ہاتھ اپنا مکتوب عمان میں جُلندیٰ کے دونوں بیٹوں جَیفر اور عبد کے نام بھیجا۔ اس خط کا مضمون یہ تھا:

ترجمہ: اللہ کے رسولؐ اور نبی محمدؐ کی طرف سے، اللہ کے اردنی بندوں، عمان کے بادشاہوں اور ان میں سے بحرین میں مقیم لوگوں کے نام؛ اگر وہ ایمان لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوۃ ادا کرتے ہیں، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں، نبی کا حق ادا کرتے ہیں اور اہلِ ایمان کی طرح حج اور قربانی کرتے ہیں تو وہ مامون و محفوظ ہیں اور ان کو اس طرح حقوق ملیں گے جس کے مطابق انہوں نے اسلام قبول کیا ہو،

البتہ بیت النار (وہ عبادت گاہ جہاں آگ کی عبادت کی جاتی ہے) میں آنے والا مال اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہے، کھجوروں کا عشر اور غلوں کا نصف عشر دینا ہوگا، مسلمانوں پر ان کی مدد کرنا اور ان کے ساتھ خیر خواہی کرنا ضروری ہے۔ان کے لئے بھی اسی طرح مسلمانوں کی مدد کرنا ضروری ہے، ان کے پاس موجود چکیاں انہی کے پاس رہیں گی اور ان کے ذریعہ جو چاہیں پیس سکتے ہیں۔(کتاب الأموال، ابو عبید، ص30-31)

سیرت وتاریخ کے بعض مصادر میں دیگر خطوط کے بارے میں بھی متعدد روایات منقول ہیں، لیکن وہ سند کے اعتبار سے ثابت نہیں ہیں۔(دیکھیں: نضرۃ النعیم:1/348)

۲: اسلامی سفیر کی صفات

میجر جنرل محمود شیت خطاب نے اللہ کے رسول ﷺ کے مکتوبات کو جمع کیا ہے اور اپنی منفرد کتاب "سفراء النبی" میں نبی کریم ﷺ کے بھیجے ہوئے سفراء اور قاصدین کے بارے میں گفتگو کی ہے، ان مکتوبات کی روشنی میں انہوں نے اسلامی سفیر کی صفات و شرائط کا استنباط کیا ہے، مندرجہ ذیل سطور میں اہم صفات و شرائط کا ذکر کیا جارہا ہے:

۱: مسلمان ہونا اور اسلام کا داعی ہونا:

ارشاد باری تعالی ہے: ﴿قُلْ هَٰذِهِۦ سَبِيلِىٓ أَدْعُوٓا۟ إِلَى ٱللَّهِ ۚ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا۠ وَمَنِ ٱتَّبَعَنِى ۖ وَسُبْحَٰنَ ٱللَّهِ وَمَآ أَنَا۠ مِنَ ٱلْمُشْرِكِينَ﴾ ترجمہ: ”تم ان سے صاف کہہ دو کہ "میرا راستہ تو یہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی، اور اللہ پاک ہے اور شرک کرنے والوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں“۔(سورہ یوسف:108)

اگرچہ سب کے سب مسلمان داعیانِ حق ہیں لیکن نبی کریم ﷺ کے سفراء اور قاصدین اپنے زمانہ کے ممتاز ترین اور چنیدہ داعیانِ حق تھے۔

۲: فصاحت و وضاحت:

سفارت کی ذمہ داری ادا کرنے والے شخص کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ سامعین تک مفاہیم و معانی اور پیغام پہنچانے میں فصاحت و توضیح اور الفاظ میں باریک بینی سے کام لے، موسی-علیہ السلام-نے اپنے بھائی ہارون-علیہ السلام-کی فصاحتِ لسانی کی وجہ سے اپنی معاونت کی درخواست کی تھی، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَٱجْعَل لِّى وَزِيرًا مِّنْ أَهْلِى ﴿٢٩﴾ هَٰرُونَ أَخِى ﴿٣٠﴾ ٱشْدُدْ بِهِۦٓ أَزْرِى ﴿٣١﴾﴾ ترجمہ: ”اور میرے لئے میرے اپنے کنبے سے ایک وزیر مقرر کردے۔ہارونؑ، جو میرا بھائی ہے۔اُس کے ذریعہ سے میرا ہاتھ مضبوط کر“۔(سورۂ طہ:29-31) اللہ کے رسول ﷺ نے بھی اپنے تمام سفراء اور مبعوثین کو عربوں میں سے منتخب کیا جو جزیرۃ العرب میں اور بسا اوقات دیہات میں پروان چڑھے تھے، وہ فصاحت و زبان دانی میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے اور ان کی زبان ابھی عجمیوں کے اختلاط کی وجہ سے مکدّر و متاثر نہیں ہوئی تھی، وہ فصاحت و توضیح میں اہم مقام رکھتے تھے۔

۳: حسنِ اخلاق:

نبوی سفیر ان اسلامی اخلاق سے آراستہ ہوتا تھا جن کو اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے قرآن کریم میں بیان کیا ہے اور نبی کریم ﷺ نے ان کو اپنی سنت میں واضح کیا ہے، ان صفات میں خاص طور پر سچائی اور تواضع قابل ذکر ہیں۔

۴: علم:

یہاں ہم علم کے مقام و مرتبہ کی وضاحت نہیں کریں گے، اس لئے کہ اس مسئلہ کے بارے میں تفصیلات بہت زیادہ ہیں، لیکن یہاں پر ہم اس بات کو مؤکد کرنا چاہتے ہیں کہ کسی بھی چیز کے بارے میں صحیح علم فکر اور پیغام کو دوسروں تک پہنچانے کا اہم وسیلہ ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت جعفر بن ابی طالبؓ جب نجاشی کے ساتھ گفتگو کر رہے تھے اور انہوں نے سورۂ مریمؑ کی تلاوت کی تھی تو اس سے ان کے وقتِ انتخاب، خطاب کی پختگی اور الفاظ و عبارات کے حسنِ انتخاب کا پتہ چلتا ہے۔ (دیکھیں: الفقہ السیاسی للوثائق النبویۃ، خالد الفھداوی، ص: 114)

۵: صبر:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِل لَّهُمْ ۚ كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوعَدُونَ لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا سَاعَةً مِّن نَّهَارٍ ۚ بَلَاغٌ ۚ فَهَلْ يُهْلَكُ إِلَّا الْقَوْمُ الْفَاسِقُونَ﴾ ترجمہ: "پس اے نبیؐ، صبر کرو جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا ہے، اور ان کے معاملہ میں جلدی نہ کرو، جس روز یہ لوگ اُس چیز کو دیکھ لیں گے جس کا اِنہیں خوف دلایا جارہا ہے تو اِنہیں یوں معلوم ہوگا کہ جیسے دنیا میں دن کی ایک گھڑی بھر سے زیادہ نہیں رہے تھے، بات پہنچادی گئی، اب کیا نافرمان لوگوں کے سوا اور کوئی ہلاک ہوگا؟۔ (سورۃ الاحقاف: 35)

حقیقت یہ ہے کہ صبر ایک داعی کا مستقل زادِ راہ اور اس کے تمام اسباب و وسائل کی اصل بنیاد ہے، اگر آپ سیرت رسول ﷺ اور آپؐ کے جلیل القدر صحابہ کرام کی سیرت اور زندگیوں کا جائزہ لیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ ان کی سیرت صبر و ثبات کے صفات سے مکمل طور پر آراستہ تھیں، طائف کا واقعہ اس کی بہترین اور واضح دلیل ہے۔

۶: شجاعت و بہادری:

تاریخ اسلامی میں بادشاہوں کی جانب بھیجے گئے سفراء اور قاصدین کی شجاعت و بہادری کا اور ان کی بے خوفی کا تفصیل سے تذکرہ کیا گیا ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ ان کو کسی بھی ملامت گر کا کوئی خوف نہیں ہوتا تھا۔

۷: حکمت:

رسول اللہ ﷺ کے سفراء حکمت و دانش سے بھی مکمل طور پر آراستہ تھے، حضرت عمرو بن العاصؓ اس کی بہترین مثال ہیں، جو اپنے اقوال وافعال کے اعتبار سے انتہائی حکیم تھے، حضرت عمروؓ سے دریافت کیا گیا: عاقل ہونے کا کیا مطلب ہے؟ انہوں نے جواب دیا: "درست اندازہ

اور جو کچھ ہو چکا اس کے ذریعہ آئندہ کی صورتحال کو بھانپ لینا"۔ عاقل صرف وہی نہیں ہے جو خیر وشر کی پہچان رکھتا ہو بلکہ اصل عاقل وہ ہے جو دو(۲)شروں کے خیر کو جانتا ہے۔(دیکھیں: مقومات السفراء فی الاسلام، حسن فتح الباب، ص:60)

۸: موقع ومناسبت کے اعتبار سے تدبیر اور ردِ عمل:

سفیر کے لئے ضروری ہے کہ وہ سیاسی حکمتِ عملی کے پیچ وخم کا اچھی طرح ادراک رکھتا ہو، متانت وسنجیدگی کا آئینہ دار ہو، رازوں کی پاسداری کرنے والا ہو، موقع ومناسبت کے اعتبار سے تدبیر اور ردّ عمل دکھانا سفیر کی بنیادی صفت ہے، سفرائے رسول ﷺ ذہانت وچالاکی اور آئندہ پیش آنے والی صورتحال کا صحیح اندازہ لگانے کی صفات سے مکمل طور پر آراستہ تھے۔

۹: ظاہری حلیہ اور حسنِ مظہر:

نبی کریم ﷺ کے سفراء باطنی صفات کے ساتھ ساتھ حسنِ مظہر میں بھی امتیازی مقام رکھتے تھے، نبی کریم ﷺ نے اپنے اصحاب میں سے ایسے سفراء کا انتخاب فرمایا جن کے اندر عقلی، فکری اور نفسیاتی صفات کے ساتھ ساتھ حسن وجمال کی صفات بھی بدرجہ اُتم موجود تھیں۔(دیکھیں: مقومات السفراء فی الاسلام، حسن فتح الباب، ص60، الفقہ السیاسی للوثائق النبویۃ، 114، سفراء الرسول، محمود شیت خطاب: 2/258)

یہ وہ ایک صفات ہیں جن کو میجر جنرل محمود شیت خطاب نے سفرائے رسول ﷺ کے بارے میں اپنی قیمتی تحقیق کے بعد اُخذ کیا ہے، ان صفات کا ایک مسلمان سفیر میں پایا جانا ضروری ہے، اور اسلامی حکومت کے لئے بھی اپنے سفیر اور نمائندہ کے انتخاب کے وقت ان صفات کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

۳: دروس واسباق اور فوائد وعبرتیں

۱: اُریسی کون تھے؟:

"اُریسین" یا "یریسین" کا لفظ روایت کے اختلاف کے باوجود صرف اس خط میں آیا ہے جو ہرقل کے نام لکھا گیا، اس کے علاوہ جتنے مکاتیب سلاطین کو آپؐ نے روانہ فرمائے کسی میں یہ لفظ نہیں آیا ہے، علمائے حدیث ولغت کا اس لفظ کے اصلی مفہوم کے بارے میں کافی اختلاف ہے، مشہور قول یہ ہے کہ "اریسین" "اریسی" کی جمع ہے اور وہ خدمت گاروں، شاگردوں اور کاشتکاروں کے لئے آتا ہے۔(دیکھیں: السیرۃ النبویہ، للندوی، ص:304)

علامہ ابوالحسن ندویؒ نے مختلف آراء نقل کرنے کے بعد اس رائے کو صحیح قرار دیا ہے کہ اُریسین سے مراد اُریوس مصر کے پیرو ہیں، جو ایک ایسے مستقل مسیحی فرقہ کا بانی تھا جس نے مسیحی عقائد اور اصلاح کے شعبہ میں ایک خاص کردار ادا کیا ہے، اس فرقے نے بازنطینی سلطنت اور مسیحی کلیسہ کو عرصۂ دراز تک پریشان رکھا تھا، اُریوس وہ شخص ہے جس نے توحید کا نعرہ بلند کیا اور خالق ومخلوق (عیسائیوں کے الفاظ) میں "باپ بیٹے" کے درمیان فرق کرنے کی دعوت دی، اس نے اس موضوع پر بحث ومباحثہ کا دروازہ کھول دیا اور عیسائی معاشرہ میں صدیوں تک یہی موضوع رہا........ یہ عقیدہ اور دعوت الوہیت مسیح کی کھلی ہوئی دعوت کے ساتھ ہمیشہ برسرپیکار رہی، کبھی اس کا پلڑا

بھاری ہوا کبھی اس کا، باز نطینی مملکت کی مشرقی ریاستوں میں عیسائیوں کی بہت بڑی تعداد اریوس کے عقیدہ کی حامل تھی، یہاں تک کہ تھیوڈوسس نے قسطنطنیہ میں عیسائی کانفرنس طلب کی جس نے الوہیتِ مسیح اور ان کے خدا کا بیٹا ہونے کے عقیدہ کو باقاعدہ منظور کر لیا، اور اس کے اعلان کے بعد اریوس عقیدہ کی دعوت ختم ہوگئی اور یہ تحریک نظروں سے اوجھل ہوگئی، تاہم عیسائیوں کی ایک جماعت اس کے بعد بھی اس سے وابستہ رہی اور یہ لوگ فرقہ "اریسیہ" یا "اریسین" کے نام سے مشہور ہوئے۔

اس لئے قابل ترجیح اور قرینِ قیاس یہی قول ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اس جملہ سے ''فإن توليت فإن عليك اثم الأريسيين'' مراد یہی ہے۔ اس لئے کہ اس وقت کی مسیحی دنیا میں جس کی زمام قیادت عظیم باز نطینی مملکت کے ہاتھ میں تھی اور جس کا سربراہ ہرقل تھا، یہی فرقہ نسبتاً توحید کا حامل اور اس پر اب تک قائم تھا۔ (السيرة النبويہ للندوی، ص: 304-307)

امام ابو جعفر طحاویؒ نے اس فرقہ کے بارے میں گفتگو کی ہے وہ کہتے ہیں: بعض اہلِ معرفت نے ان معانی کا ذکر کیا ہے کہ ہرقل کی قوم میں ایک فرقہ تھا جو اُروسیہ کے نام سے معروف تھا، وہ اللہ کی توحید کے قائل تھے، مسیح علیہ السلام کی عبودیت کے معترف تھے، اور نصاریٰ ان کے بارے میں ربوبیت کا جو عقیدہ رکھتے ہیں وہ اس کے قائل نہیں ہیں، اور وہ ان کی نبوت پر ایمان رکھتے ہیں، وہ دین مسیح پر قائم ہیں اور انجیل میں مذکور عقائد پر ایمان رکھتے ہیں اور نصاری نے جو غلط عقائد اختیار کئے ہیں وہ اس کے منکر ہیں۔ (دیکھیں: مشکل الآثار: 3/399)

۲: بادشاہوں کے حالات اور امتیازات کا اعتبار

بادشاہوں کے نام رسول اللہ ﷺ کے مکتوبات میں باریک فرق کا لحاظ کیا گیا ہے جو دعوتی حکمت پر مبنی ہیں، ان میں ان بادشاہوں کے عقائد، پس منظر اور امتیازات و خصوصیات کی رعایت کی گئی ہے، چنانچہ ہرقل اور مقوقس عیسی علیہ السلام کی الوہیت کے کلی طور پر یا جزئی طور پر قائل تھے اور وہ مانتے تھے کہ وہ اللہ کے بیٹے ہیں، ان دونوں کے نام جو مکتوب بھیجے گئے ان میں نبی کریم ﷺ کے نام کے ساتھ "عبداللہ" کا کلمہ خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے، تسمیہ کے بعد دونوں مکتوبات ان الفاظ کے ساتھ شروع ہوتے ہیں: "من محمد عبد الله ورسوله إلى هرقل عظيم الروم" اسی طرح دوسرے خط میں "من محمد عبد الله ورسوله المقوقس عظيم القبط" کے الفاظ آئے ہیں، جبکہ کسری کے نام خط میں صرف ان الفاظ پر اکتفا کیا ہے: "من محمد رسول الله إلى كسرى عظيم الفرس" اسی طرح دو مکتوبات میں یہ آیت بھی ذکر کی گئی ہے: ﴿قُلْ يَـٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَـٰبِ تَعَالَوْا۟ إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا ٱللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِۦ شَيْـًٔا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ ٱللَّهِ ۚ فَإِن تَوَلَّوْا۟ فَقُولُوا۟ ٱشْهَدُوا۟ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ﴾ ترجمہ: کہو: "اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنالے۔ اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو کہ ہم تو مسلم (صرف خدا کی بندگی واطاعت کرنے والے) ہیں۔ (سورۃ آل عمران: 64)

اور کسری کے مکتوب میں اس آیت کا ذکر نہیں کیا گیا ہے،اس لئے کہ اس آیت کے ذریعہ ان اہلِ کتاب کو خطاب کیا گیا ہے جو مسیح علیہ السلام کی الوہیت کے قائل ہیں اور انہوں نے اپنے پوپ پادریوں کو اور مسیح ابن مریم کو اللہ کے مقابلہ میں رب بنالیا تھا،اسی طرح باز نطینی حکومت کا سربراہ ہرقل اور مصر کا حاکم مقوقس دونوں سیاسی قائد ہونے کے ساتھ ساتھ مسیحی دنیا کے دو بڑے مذہبی پیشوا تھے اور مسیح علیہ السلام کے بارے میں ان کے مابین معمولی اختلاف پایا جاتا تھا۔(دیکھیں: ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین للندوی، ص38-39)

کسری پرویز اور اس کی قوم چونکہ آفتاب پرست اور آتش پرست تھی اور وہ دو خداؤں: خدائے خیر "یزداں" اور خدائے شر "اہرمن" کو مانتی تھی اور نبوت اور آسمانی رسالت کے صحیح مفہوم سے ناآشنا تھی،اسی لئے ایرانی بادشاہ کے نامہ مبارک میں یہ عبارت لکھی گئی: "وإني رسول الله إلى الناس كافة لينذر من كان حيا"۔ (السیرۃ النبویۃ للندوی، ص:290)

ان سلاطین کے ذریعہ ان مکاتیب کے بارے میں مختلف قسم کے ردّ عمل سامنے آئے، ہرقل، نجاشی اور مقوقس ان تینوں نے مکاتیبِ نبوی کے ساتھ ادب کا معاملہ کیا،ان کی طرف سے ان کے جواب میں تواضع اور احترام تھا، نجاشی اور مقوقس نے رسول اللہ ﷺ کے قاصدوں کا بہت اکرام کیا، مقوقس نے آپ ؐ کو ہدایا بھی بھیجے،ان میں دو باندیاں بھی تھیں، جن میں ایک کا نام ماریہ ؓ تھا اور رسول اللہ ﷺ کے صاحبزادے ابراہیم ؑ انہی کے بطن سے تھے اور جہاں تک کسری پرویز کا تعلق ہے اس نے نامہ مبارک سنتے ہی چاک کر ڈالا اور بولا: میرا غلام ہو کر مجھ کو یوں لکھتا ہے! رسول اللہ ﷺ کو اطلاع ملی تو آپ ؐ نے فرمایا: اللہ اس کے ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔

کسری نے یمن کے حاکم باذان کو اس کا حکم دیا کہ آپ ؐ کو حاضر کیا جائے،اس نے 'بابویہ' کو آپ کے پاس بھیجا اور یہ کہلوایا کہ شہنشاہ کسری نے باذان کو ہدایت کی ہے کہ کسی کو بھیج کر آپ کو وہاں حاضر کیا جائے،انہوں نے مجھے اس لئے بھیجا ہے کہ آپ ؐ میرے ساتھ چلیں، رسول اللہ ﷺ نے اس کو یہ اطلاع دی کہ اللہ تعالی نے کسری پر اس کے بیٹے شیرویہ کو مسلط کر دیا ہے جس نے اس کو قتل کر دیا ہے۔(تاریخ طبری:3/90)

رسول اللہ ﷺ نے جو خبر دی تھی وہ حرف بہ حرف صحیح نکلی، کسری کے تخت پر اس کا لڑکا 'قباذ' جس کا لقب 'شیرویہ' تھا، قابض ہوا، کسری اسی کے اشارہ پر سن 628م میں قتل کیا گیا،اس کی موت کے بعد ملک کا شیرازہ منتشر ہو گیا اور حکمران خاندان کے ہاتھ سلطنت ایک کھلونا بن گئی، شیرویہ بھی چھ ماہ سے زیادہ حکومت نہ کر سکا اور اس کے تخت پر چار سال کے اندر یکے بعد دیگرے دس بادشاہ متمکن ہوئے، سلطنت کی چولیں ہل گئیں، آخر میں 'یزدگر' پر سب کا اتفاق ہوا، اور اس سلطنت کا تاج اس کے سر پر رکھا گیا، یہ ساسانی خاندان کا آخری فرمانروا تھا اور اسی کو اسلامی افواج کا سامنا کرنا پڑا تھا، جنہوں نے بالآخر سلطنت آلِ ساسان کی قسمت پر مہر لگا دی اور جس سلطنت کا چار سو سال تک دنیا میں ڈنکا بجتا رہا اس کا چراغ گل ہو گیا۔یہ واقعہ سن 637ء میں پیش آیا اور اس طرح یہ پیشن گوئی آٹھ سال کے اندر اندر پوری ہو گئی اور آپ ؐ کی پیشن گوئی کا دوسرا جزء بھی پورا ہوا کہ "إذا هلك كسرى فلا كسرى بعده"۔(السیرۃ النبویہ للندوی، ص:300)

۳: مکاتیبِ رسولؐ کی عمومی خصوصیات:

مکاتیبِ رسولؐ پر غور و فکر کرنے والے کے سامنے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سلاطین و امراء کے نام ان مکاتیب کی عمومی خصوصیات مشترک اور یکساں تھیں، ان کے ذریعہ مندرجہ ذیل نکات اخذ کئے جاسکتے ہیں:

أ: ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے سلاطین و امراء کے نام جو مکاتیب بھیجے تھے ان کا افتتاح 'بسم اللہ' کے ذریعہ ہوتا ہے اور 'بسم اللہ' کتاب اللہ کی ایک آیت ہے اور مکتوب کو اس کے ذریعہ شروع کرنے کے ذریعہ چند اہم امور معلوم ہوتے ہیں، جیسے کہ کتابوں اور مکاتیب کا آغاز 'بسم اللہ' کے ذریعہ کرنا مستحب ہے، چنانچہ اللہ کے رسولؐ نے تمام مکاتیب میں اس کا اہتمام کیا ہے، اسی طرح اس کے ذریعہ مکتوب میں قرآنی آیت تحریر کرنے کا بھی جواز معلوم ہوتا ہے، اگرچہ یہ خط کسی غیر مسلم کے لئے لکھا گیا ہو، اس کے ذریعہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلم قرآن کریم کی کوئی ایک یا زائد آیات کی تلاوت کر سکتا ہے، اس میں اس کا بھی جواز ہے کہ جنبی قرآن کریم کی ایک یا زائد آیت پڑھ سکتا ہے، اس لئے کہ جن غیر مسلموں کی جانب یہ مکاتیب بھیجے گئے تھے ان میں 'بسم اللہ' اور دیگر آیات تحریر تھیں اور یہ غیر مسلم جنابت و نجاست کی حالت میں ہو سکتے تھے اور وہ اسی حالت میں ان آیات کو پڑھتے تھے۔

ب: سلاطین و امراء کو بھیجے گئے خطوط کے ذریعہ مندرجہ ذیل احکام مستنبط ہوتے ہیں:

- مسلمان سفراء کو کفر کے زعماء کے پاس بھیجنے کی مشروعیت؛ اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ جو بھی خط لکھتے تھے اس کو لے کر کسی مسلمان شخص کو ہی روانہ فرماتے تھے۔
- دینی اور دنیاوی دونوں امور کے بارے میں کفار کو مکتوب لکھا جاسکتا ہے۔
- مکتوب میں بھیجنے والے کا نام، مکتوب الیہ کا نام اور خط کا موضوع لکھا جائے گا۔
- غیر مسلم کو اسلامی سلام نہ کیا جائے اور وہ ہے 'السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ' اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے غیر مسلم سلاطین و امراء کے کسی خط میں مشروع سلام کے ذریعہ آغاز نہیں کیا ہے، بلکہ "السلام علی من اتبع الہدی" کے ذریعہ آغاز کیا ہے۔
- مہر بنانے کی مشروعیت؛ اللہ کے رسول ﷺ خطوط لکھنے کے بعد ان کے اختتام پر اپنی مہر لگاتے تھے اور اس میں تین کلمات تحریر تھے: "محمد رسول اللہ"۔ چنانچہ حضرت انسؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ نے رومیوں کو خط لکھنے کا ارادہ فرمایا تو آپؐ سے کہا گیا: وہ اسی وقت خط پڑھتے ہیں جبکہ اس پر مہر لگی ہو، اس لئے آپؐ نے چاندی کی ایک انگوٹھی بنائی جس میں مہر ثبت تھی، ایسا لگ رہا ہے گویا کہ میں ابھی بھی آپؐ کے دست مبارک میں اس کی سفیدی کو دیکھ رہا ہوں اور اس میں آپ نے "محمد رسول اللہ" نقش کیا تھا۔ (صحیح البخاری:2938، صحیح مسلم:2092، غزوۃ الحدیبیہ، لابی فارس، ص:239)

۴: افراد اور شخصیات کی صفات کا صحیح اندازہ:

جب باذان بن سامان نے اسلام قبول کیا اور وہ یمن کا امیر تھا تو آپ ﷺ نے اس کو اس کے منصب سے معزول نہیں کیا بلکہ اس کو قبولِ اسلام کے بعد امیر برقرار رکھا، جبکہ آپ ؐ کو اس کے ایک کامیاب منتظم اور مناسب حاکم ہونے کا علم ہو گیا، اس سے واضح ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ افراد و شخصیات کے اندر موجود صلاحیتوں کا صحیح اندازہ کرتے تھے اور مناسب شخص کو مناسب جگہ متعین فرماتے تھے، قابلِ ذکر یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کے بیٹے کو اپنے والد کی وفات کے بعد ایک ماہ تک یمن کا حاکم متعین فرمایا۔ (غزوۃ الحدیبیہ، لابی فارس، ص:242)

۵: مجوس سے جزیہ لینے کا جواز:

اس حکم کا استنباط نبی کریم ﷺ کے اس مکتوب کے ذریعہ کیا گیا ہے جس کو آپ ؐ نے منذر بن ساوی کے نام بھیجا تھا اور اس میں آپ ؐ نے یہود اور مجوس کے بارے میں موقف کی تعیین کی تھی اور اس میں یہ دفعہ بھی شامل تھی کہ "اور جو اپنی یہودیت اور مجوسیت پر باقی رہے گا تو اس پر جزیہ دینا ضروری ہے"۔ (أیضاً)

ابن قیمؒ اور علماء کا ایک گروہ اس طرف گیا ہے کہ ہر قسم کے افراد سے جزیہ لینا جائز ہے، چاہے وہ کتابی ہوں یا غیر اہل کتاب، جیسے کہ بت پرست عرب وغیرہ۔ "زاد المعاد" میں ہے: ایک گروہ کا کہنا یہ ہے کہ تمام امتوں اور قوموں سے جزیہ قبول کیا جائے گا جبکہ وہ دینے کے لئے تیار ہو جائیں، دونوں قسم کے اہلِ کتاب کی دلیل تو قرآن میں موجود ہے اور مجوس کے بارے میں سنت سے جواز ثابت ہے اور ان کے علاوہ جو لوگ بھی ہیں وہ بھی انہی کے حکم میں داخل ہیں، اس لئے کہ مجوس اہلِ شرک ہیں، ان کے پاس کوئی کتاب نہیں ہے، لہذا ان سے جزیہ لینا اس بات کی دلیل ہے کہ تمام مشرکین سے لینا درست ہے، اور اللہ کے رسول ؐ نے عرب بت پرستوں سے جزیہ اس لئے نہیں لیا کیونکہ وہ آیتِ جزیہ کے نزول سے پہلے ہی اسلام لے آئے اور آیتِ جزیہ غزوۂ تبوک کے بعد نازل ہوئی۔ (دیکھیں: زاد المعاد: 5/91)

٦: غیر مسلم سے ہدیہ قبول کرنے کا جواز:

حاکمِ مصر قبطیوں کے سردار مقوقس نے - جو کہ غیر مسلم تھا - رسول اللہ ﷺ کے سفیر حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ کے پاس کچھ ہدایا بھیجے، جن میں دو باندیاں، رسول اللہ کے لئے کپڑا اور ایک خچر شامل تھا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اس کو قبول فرمایا اور ان دونوں باندیوں میں سے ایک باندی حضرت ماریہ قبطیہؓ تھیں۔ (دیکھیں: غزوۃ الحدیبیہ، ابو فارس، ص 243)

۷: سلاطین و امراء کے نام مکتوبات بھیجنے کے نتائج:

اللہ کے رسول ؐ نے اپنی خارجہ سیاست میں ناقابل تصور سیاسی بصیرت اور حکمتِ عملی سے کام لیا جو بعد میں آنے والے خلفاء کے لئے ایک مثال اور نقش راہ پر ثابت ہوئی، اللہ کے رسول ؐ نے انتہائی قوت و شجاعت اور بے خوفی کا بھی اظہار فرمایا، اگر اللہ کے رسول ؐ کے علاوہ اور کوئی شخص ہوتا تو وہ اس کے انجام ہی سے خوفزدہ ہو کر رہ جاتا، خاص طور پر ان میں سے بعض مکتوبات طاقتور سلاطین کی جانب بھیجے گئے تھے

، جیسے کہ ہرقل، کسری، مقوقس، لیکن اللہ کے رسول ؐ دعوت الی اللہ کے ابلاغ کے سلسلہ میں پُر عزم اور باحوصلہ تھے اور آپ ؐ کو اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت پر ایمان مطلق تھا، اس لئے آپ کو اس اقدام کے سلسلہ میں کسی طرح کے پس و پیش کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور اس حکیمانہ سیاست کے مندرجہ ذیل نتائج نکل کر سامنے آ گئے:

اَ: اللہ کے رسول ﷺ نے اس طرزِ سیاست کے ذریعہ بین الاقوامی تعلقات کے سلسلہ میں ایک نئے اسلوب کی داغ بیل ڈالی، جس کے بارے میں اس سے پہلے انسان ناواقف تھا۔

ب: اس کے نتیجہ میں اسلامی ریاست میں عالمی سطح پر اپنی قوت و مقام اور ساکھ کو تسلیم کرایا اور اس وقت کے بین الاقوامی نقشہ میں اپنے وجود کو منوالیا۔

ج: اس کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے سلاطین و امراء کے ارادے، ان کی نیتیں، ان کی سیاست اور دعوت کے سلسلہ میں ان کا موقف کھل کر نمایاں ہو گیا۔

د: جزیرۃ العرب کے باہر کے بادشاہوں کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی مراسلت تحریکِ اسلامی کی بین الاقوامی حیثیت کا عملی اعلان تھا، جس عالمیت کی وضاحت عہد مکی کی آیات ہی میں کر دی گئی تھی، جیسے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَآ أَرۡسَلۡنَٰكَ إِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعَٰلَمِينَ﴾ ترجمہ: ''اے محمدؐ، ہم نے جو تم کو بھیجا ہے تو یہ دراصل دنیا والوں کے حق میں ہماری رحمت ہے''۔(سورۃ الانبیاء:107)

اس اعتبار سے آس پاس کے سلاطین اور امرائے عرب کے نام نبی کریم ﷺ کے مکتوبات رسول اللہ ﷺ کی خارجہ سیاست کے سلسلہ میں ایک نقطۂ انقلاب تھا، جس کے بعد اسلامی ریاست کو عالمی سطح پر ایک اہم مقام حاصل ہوا اور اقوام کے مابین اس کو ایک دینی اور سیاسی مقام حاصل ہو گیا، اور یہ فتح مکہ سے پہلے کا مرحلہ تھا، اسی طرح اس حکمتِ عملی کے نتیجہ میں عام الوفود میں بلادِ عرب کے کونے کونے میں رسول اللہ ﷺ کو ہی بحیثیتِ سربراہ تسلیم کرنے کا راستہ بھی ہموار ہو گیا۔ (دیکھیں: التاریخ السیاسی و العسکری لدولۃ المدینۃ، ص:351)

....

تیسرا باب

عمرۃ القضاء

سن سات ہجری کے ماہ ذیقعدہ میں رسول اللہ ﷺ مکہ مکرمہ کی جانب عمرہ کے ارادہ سے نکلے، جیسے کہ صلح حدیبیہ میں قریش کے ساتھ اس پر اتفاق ہوا تھا، عمرۃ القضا میں بچوں اور خواتین کے علاوہ جو صحابہ کرام شریک ہوئے ان کی تعداد دو ہزار تک پہنچتی ہے، حدیبیہ میں شریک صحابہ کرام میں سے عمرۃ القضا میں کوئی پیچھے نہیں رہا، سوائے ان حضرات کے جو خیبر میں شہید ہوئے یا عمرۃ القضا سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہوئے۔(دیکھیں: السیرۃ النبویۃ الصحیحہ، ص:464)

اللہ کے رسول ﷺ اپنے صحابہ کرام کے ساتھ مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ کی جانب ایک پُر وقار قافلہ کے ساتھ روانہ ہوئے، مختلف بستیوں اور دیہاتوں سے اس قافلہ کا گزر ہوا، جب بھی یہ نبوی قافلہ کسی بستی کے پاس سے گزرتا جو مکہ اور مدینہ کے راستے کے دونوں طرف بستے تھے، وہ اپنے گھروں سے نکل کر اس منظر کا مشاہدہ کرتے جو کبھی اس سے پہلے انہوں نے نہیں دیکھا تھا، اس قافلہ میں شریک تمام مسلمان احرام کے ایک طرح کے لباس میں تھے، تلبیہ کے ذریعہ ان کی آوازیں گونج رہی تھیں اور قربانی کے جانوروں پر مخصوص علامتیں لگی ہوئی تھیں، ان کو وہ اپنے ساتھ لے جا رہے تھے، یہ ایک خوبصورت منظر تھا جس کا مشاہدہ انہوں نے کبھی نہیں کیا تھا۔(دیکھیں: منہج الاعلام الاسلامی فی صلح الحدیبیہ، ص:310)

ا: قریش کی جانب سے بدعہدی کے بارے میں احتیاطی تدابیر:

نبی کریم ﷺ نے اپنے ساتھ مکمل اسلحہ لیا تھا، آپؐ نے صرف تلواروں پر اکتفا نہیں کیا تھا، آپؐ ہر قسم کی متوقع صورتحال سے نمٹنے کے لئے مکمل طور پر تیار تھے، خاص طور پر جبکہ مشرکین عام طور پر اپنے عہد و پیمان کا پاس و لحاظ نہیں کرتے تھے۔(صلح الحدیبیہ، ابو فارس، ص267)

نبی کریم ﷺ کی روانگی کی خبر جیسے ہی مکہ پہنچی جبکہ آپؐ کے ساتھ ایک کثیر تعداد تھی اور آپ ﷺ کے ساتھ متنوع قسم کے ہتھیار تھے اور قافلہ کے ہراول دستہ میں دو سو گھوڑ سوار محمد بن مسلمہؓ کی قیادت میں آگے آگے چل رہے تھے، اسی اثناء میں قریش نے رسول اللہ ﷺ کے پاس مکرز بن حفص کو قریش کے کچھ لوگوں کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ اصل صورتحال معلوم کریں، انہوں نے "یاجج" کی وادی میں مرّالظہران میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ملاقات کی اور آپؐ سے کہا: محمد ہم نے بچپن اور جوانی میں کبھی آپ کی طرف سے بدعہدی نہیں دیکھی، آپ حرم میں ہتھیاروں سمیت اپنی قوم کے پاس داخل ہو رہے ہیں، حالانکہ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ آپ معاہدہ کے مطابق ہی داخل ہوں گے اور حرم میں تلواریں نیاموں میں رکھ کر ہی داخل ہوں گی، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ہم مکہ میں معاہدہ کے مطابق ہی

داخل ہوں گے۔اس کے بعد مکرز اپنے ساتھیوں کے ساتھ جلد مکہ واپس آیا اور کہا: بے شک محمدؐ ہتھیاروں کے ساتھ داخل نہیں ہوں گے، وہ معاہدہ پر قائم ہیں جو انہوں نے آپ کے ساتھ کیا ہے۔(دلائل النبوۃ للبیہقی: 4/321، المغازی للواقدی: 3/734، طبقات ابن سعد: 2/121)

اللہ کے رسول ﷺ نے حرم سے باہر قریب ہی ہتھیار رکھے تاکہ کسی بھی اضطراری صورتحال سے نمٹا جاسکے، آپؐ نے دو سو گھوڑ سوار حضرت محمد بن مسلمہؓ کی قیادت میں اپنے ساتھ رکھے جو آپؐ کی حفاظت پر مأمور تھے اور رسول اللہ ﷺ کی طرف سے کسی بھی حکم کے منتظر تھے تاکہ وہ کسی بھی سمت متحرک ہو کر کسی بھی حکم کی تنفیذ کریں اور اگر ضرورت پڑی تو قتال بھی کریں۔(دیکھیں: صلح الحدیبیہ، ابو فارس، ص268)

نبی کریم ﷺ مشرکین قریش کی بد عہدی اور غداری کے بارے میں مطمئن نہیں تھے، وہ مسلمانوں کے لئے گھات میں بیٹھ سکتے تھے اور ان پر اچانک حملہ آور ہو سکتے تھے، اس لئے آپؐ نے احتیاطی تدابیر اختیار کیں، البتہ آپؐ نے اپنے عہد و پیمان اور وعدہ کو پورا کیا اور امت کو تعلیم دی کہ اپنے اعداء کے بارے میں چوکنا اور محتاط رہیں، صحابہ کرام کے ایک گروہ کو آپؐ نے اسلحہ اور سامان کی حفاظت پر مأمور کیا تاکہ وہ صورتحال کا جائزہ لیتے رہیں، اس کے ذریعہ یہ پتہ چلتا ہے کہ دینِ اسلام میں یہ بھی عبادت کا ایک اہم حصہ ہے۔(دیکھیں: صلح الحدیبیہ، لابی فارس، ص:268)

۲: مکہ میں داخلہ، طواف اور سعی:

"یأجج" کی وادی سے رسول اللہ ﷺ نے مکہ کی جانب اپنی سواری القصواء پر سفر جاری رکھا، آپؐ حجون کی طرف نکلنے والی وادی سے داخل ہوئے اور مسلمان آپؐ کے ارد گرد اپنی تلواریں لئے ہوئے آپ کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھے، وہ مشرکین سے آپ کی حفاظت کر رہے تھے اور فضا ان کے تلبیہ کی آوازوں سے گونج رہی تھی۔(دیکھیں: التاریخ السیاسی والعسکری، ص:353)

اس اجتماعی تلبیہ کے ذریعہ مسلمانوں کی آوازیں گونج رہی تھیں اور احرام باندھنے کے وقت سے اس میں کوئی انقطاع نہیں آیا تھا اور مکہ کے داخلہ تک یہ جاری تھا، یہ تلبیہ اپنے اندر ایک پیغام اور اعلان تھا، یہ توحید کا اعلان تھا، توحید کے شعار کو بلند کر رہا تھا اور شرک کے باطل و غلط ہونے کا اور اس کے پرچم کے سرنگوں ہونے کا اعلان کر رہا تھا، اس کے ذریعہ اللہ کی حمد و ثناخوانی کی جا رہی تھی، جس نے ان کو اس اہم عمل کی ادائیگی کا موقع عنایت کیا، ایک مسلمان جب تلبیہ میں یہ الفاظ ادا کرتا ہے: "لبيك اللهم لبيك، لبيك لا شريك لك لبيك، إن الحمد والنعمة لك والملك لا شريك لك"۔ تو وہ اس اہم پیغام اور مفاہیم کا اعلان اور اقرار کرتا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن رواحہؓ آپؐ کی سواری کی لگام پکڑے ہوئے تھے اور یہ اشعار پڑھ رہے تھے:

خَلُّوا بني الْكُفَّارِ عَنْ سبيله ... خَلُّوا فَكُلُّ الْخَيْرِ فِي رَسُوله
يَا رَبِّ إِنِّي مؤمن بقيله ... أَعْرِفُ حَقَّ اللَّهِ فِي قَبوله
ضَربا يزيل الْهَام عَنْ مَقيله ... ويذْهل الْخَليل عَنْ خَليله

ترجمہ: اے کافروں کی اولاد! ان کے راستے سے ہٹ جاؤ، ہٹ جاؤ! اس لئے کہ ہر خیر، اس کے رسول میں ہے۔اے میرے رب، میں ان کی بات پر ایمان رکھتاہوں اور جانتاہوں کہ اس کو قبول کرنے میں ہی اللہ کا حق اداہوتاہے۔ ہم ان کے اشارہ پر ایسی مار ماریں گے جو تمہارے سروں کو گردنوں سے اڑادے گی اور دوست کواس کے دوست سے غافل کردے گی۔ (دلائل النبوۃ للبیہقی: 4/323، سنن ترمذی: 2847، سنن نسائی: 5761)

یہ ایک مؤثر دعوتی مظہر و منظر تھاجبکہ نبوی قافلہ مکہ مکرمہ کے گھروں اور عمارتوں کے قریب ہورہاتھا، یہ قافلہ کعبہ مشرفہ کی جانب جانے والے راستے پر رواں دواں تھا، وہ پُر وقار لباس زیب تن کئے ہوئے تھے اوران کے تلبیہ کی گونج فضاؤں اور آسمان سے ٹکرارہی تھی، اکثر کتبِ سیرت و مغازی میں یہ مذکور ہے کہ مکہ کے باشندوں میں سے کچھ لوگ پہاڑوں کی چوٹیوں پر چلے گئے تاکہ مسلمانوں کو بلند جگہوں سے دیکھ سکیں جبکہ ایک بڑی تعداد کعبہ مشرفہ کے قریب دارالندوہ کے پاس کھڑے ہوگئی تاکہ رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے اصحاب کے مکہ مکرمہ میں داخلہ کے منظر کامشاہدہ کرسکیں۔(دیکھیں: منہج الاعلام الاسلامی فی صلح الحدیبیہ، ص:34)

مشرکین نے مسلمانوں کے خلاف یہ افواہ عام کردی تھی کہ ان کو یثرب کے بخار نے کمزور اور لاغر کردیاہے، اس لئے نبی کریم ﷺ نے اپنے اصحاب کو حکم دیاکہ طواف کے تین چکروں میں رمل کریں تاکہ مشرکین ان کی قوت کا بھی مشاہدہ کرلیں، اللہ کے رسول ﷺ بیت حرام میں اس حال میں داخل ہوئے کہ دایاں ہاتھ احرام سے باہر نکلاہواتھا، آپؐ نے طواف کاآغاز فرمایااور صحابہ کرام آپ کی اقتدا ءواتباع کررہے تھے اور جب مشرکین نے اس منظر کامشاہدہ کیاتووہ کہنے لگے: جن کے بارے میں آپ سمجھ رہے تھے کہ ان کو بخار نے کمزور کردیاہے یہ تواس سے بھی زیادہ مضبوط وتواناہیں۔(صحیح مسلم:1266، صحیح بخاری:4256، صحیح السیرۃ النبویۃ، ص:481)

رمل، اضطباع اور تیز چلنے کے اس اسلوب کے ساتھ داخلہ کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ کاایک مقصد یہ تھاکہ قریش کومرعوب کریں اوران کے سامنے مسلمانوں کی قوت، ان کی عزیمت، استقامت اوران کے بلند حوصلوں کااظہار کریں۔

اس اسلوب کامشرکین کے دلوں میں اہم اثر پڑا، اوراس اسلوب کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ نے مشرکین کوغیظ وغضب میں مبتلاکیا اور یہ اسلوب آپؐ نے کئی مقامات پر اختیار فرمایا، چنانچہ غزوۂ احد میں آپؐ نے حضرت ابودجانہؓ کواس بات کی اجازت دی کہ مشرکین کے سامنے فخریہ چال کے ساتھ اکڑ کے چلیں تاکہ ایک مومن کی عزت کااظہار ہواوراس کے ذریعہ مشرکین غیظ وغضب میں مبتلاہوں گے، ان کومزید غصہ دلانے کے لئے حضرت ابودجانہؓ اپنے سرپر ایک سرخ پٹی باندھتے تھے اور رسول اللہ ﷺ اس پر کوئی نکیر نہیں کرتے تھے، غزوۂ حدیبیہ میں رسول اللہ ﷺ نے ہدی (قربانی) کے جانور میں ابوجہل کااونٹ لایا تھا، جو غزوۂ بدر میں بطور مالِ غنیمت حاصل کیاتھاتاکہ مشرکین اس کو دیکھیں اور اندر ہی اندر غصہ کاگھونٹ پی لیں اور اپنے مقتولین کی یاد بھی تازہ ہوجائے، اسی لئے آپؐ نے عمرۃ القضا میں بھی مسلمانوں کواس طرزِ اسلوب کاحکم دیا۔(دیکھیں: صلح الحدیبیہ، ابوفارس، ص: 282)

یہ نبی کریم ﷺ کی طرف سے مشرکین کے خلاف ایک نفسیاتی جنگ تھی جس کے بہترین نتائج سامنے آئے، چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ نے مکہ مکرمہ میں تین روز تک قیام فرمایااور آپؐ کے ساتھ مسلمان توحید کاعَلم بلند کررہے تھے، بیت عتیق کاطواف کررہے

تھے، اذان کے کلمات بلند کر رہے تھے، نماز قائم کر رہے تھے اور رسول اللہ ﷺ باجماعت پانچوں نمازیں ان کو پڑھا رہے تھے، حضرت بلالؓ بن رباح اپنی شیریں آواز کے ذریعہ خانہ کعبہ کے اوپر اذان دیتے تھے جو مشرکین کے لئے بجلی کا کام کر رہی تھی۔(دیکھیں: صلح الحدیبیہ لأبی فارس، ص:270)

۳: حضرت میمونہ بنت الحارثؓ کے ساتھ نکاح:

حضرت میمونہؓ حضرت عباس بن عبد المطلب کی زوجہ اُم الفضل کی بہن تھیں، آپؓ چھبیس سال کی تھیں، انہوں نے اپنے شوہر اُبورہم بن عبد العزیٰ کی وفات کے بعد اپنے نکاح کا اختیار اپنی بہن حضرت اُم الفضل کو دیا تھا اور حضرت اُم الفضل نے اپنے شوہر حضرت عباس سے بات کی جس کے بعد حضرت عباس نے ان کا نکاح اپنے بھتیجے نبی کریم ﷺ کے ساتھ کیا اور آپ کی طرف سے چار سو درہم مہر ادا کیا۔(دیکھیں: صور وعبر من الجہاد النبوی فی المدینۃ، ص326)

حضرت میمونہؓ حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت خالد بن ولید کی خالہ تھیں، جب تین دن مکمل ہو گئے جن کے بارے میں معاہدہ حدیبیہ میں اتفاق ہوا تھا تو نبی کریم ﷺ نے حضرت میمونہؓ کے ساتھ نکاح کے ذریعہ یہ چاہا کہ اس کو قریش کے ساتھ باہمی تفاہم کا ایک ذریعہ بنائیں، آپؐ کے پاس سہیل بن عمرو اور حویطب بن عبد العزیٰ قریش کے ایک وفد کے ساتھ آئے، انہوں نے کہا: آپ کا وقتِ مقررہ مکمل ہو چکا ہے، لہذا آپ ہمارے یہاں سے تشریف لے جائیں، نبی کریم ﷺ نے فرمایا (جیسے کہ ابن اسحاق نے ذکر کیا ہے): تمہارے لئے کون سا حرج ہے اگر آپ لوگ مجھے اپنے ہی درمیان شادی کرنے کی اجازت دے دو، ہم آپ لوگوں کے لئے دعوتِ ولیمہ کا نظم کریں گے جس میں آپ لوگ شریک ہوں؟! انہوں نے جواب دیا: ہمیں آپ کے کھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، بس آپ یہاں سے چلے جائیں، آپ وہاں سے تشریف لے آئے اور اپنے غلام ابو رافعؓ کو حضرت میمونہؓ کے پاس رکھا جو ان کو لے کر مقام سَرِف آئے اور وہاں پر آپؐ نے رسمِ عروسی ادا فرمائی۔ (سیرت ابن ہشام: 4/14، دلائل النبوۃ للبیہقی: 4/330)

ازواج مطہرات میں حضرت میمونہؓ کے ساتھ آپؐ نے سب سے اخیر میں نکاح فرمایا اور آپؐ کے بعد ازواج مطہرات میں سب سے آخر میں وفات پانے والی خاتون حضرت میمونہؓ ہی ہیں، ان کی وفات ہوئی اور مقام سَرِف میں ہی تدفین ہوئی، مقام سَرِف میں ہی آپؐ کا نکاح ہوا اور وہیں آپؓ کی تدفین بھی ہوئی۔(دیکھیں: ھذا الحبیب محمد ﷺ یا محب، الجزائری، ص: 375)

حضرت میمونہؓ کے نکاح کے بارے میں ایک اہم فقہی مسئلہ فقہاء کے مابین زیرِ بحث رہا ہے اور وہ ہے کہ کیا آپؐ نے حضرت میمونہؓ کے ساتھ حالتِ احرام میں نکاح فرمایا، یا احرام سے باہر آنے کے بعد نکاح فرمایا؟! فقہاء نے اس کے بارے میں بہترین تفصیلات بیان کی ہیں، کتبِ فقہ میں وہ تفصیلات دیکھی جا سکتی ہیں۔(دیکھیں: ھذا الحبیب محمدؐ، یا محب، الجزائری، ص: 375)

۴: حضرت حمزہ بن عبد المطلب کی صاحبزادی کی مسلمان قافلہ میں شمولیت:

اسلام کی وجہ سے دل و دماغ بہت زیادہ بدل چکے تھے، وہ بیٹی جس کو اشراف عرب باعثِ ننگ وعار سمجھتے تھے اور اس کو زندہ درگور کیا جاتا تھا، وہی بیٹی اب لوگوں کے نزدیک محبوب بن چکی تھی، جس کی تربیت کے بارے میں مسلمان آپس میں تنافس کرتے تھے اور اب

سب کے سب لوگ برابر تھے، صاحبِ حق اور صاحبِ فضل و کمال ہونے کی وجہ سے ہی اب وہ ایک دوسرے سے آگے بڑھتے تھے، چنانچہ نبی کریم ﷺ نے جب مکہ مکرمہ سے واپس جانے کا ارادہ فرمایا تو حضرت حمزہؓ کی صاحبزادی آپ ﷺ کے پیچھے پیچھے آپ کو آواز دیتے ہوئے آئی، وہ پکار رہی تھی: اے چچا! اے چچا! حضرت علیؓ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر حضرت فاطمہؓ سے کہا: اپنے چچا کی بیٹی کو پکڑ لو، لیکن اس کے بارے میں حضرت علیؓ، حضرت زیدؓ اور حضرت جعفرؓ کے مابین اختلاف ہو گیا، حضرت علیؓ کہنے لگے: میں نے اس کو پکڑا ہے اور وہ میرے چچا کی بیٹی ہے، حضرت جعفرؓ کہنے لگے: وہ میرے چچا کی بیٹی ہے اور ان کی خالہ میری زوجیت میں ہے، حضرت زیدؓ نے کہا: وہ میرے بھائی کی بیٹی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ان کے بارے میں فیصلہ کیا کہ ان کی خالہ ان کی پرورش کی زیادہ حقدار ہیں اور فرمایا: خالہ ماں کے درجہ میں ہے۔ حضرت علیؓ سے فرمایا: تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں۔ حضرت جعفرؓ سے فرمایا: تم سیرت و صورت میں مجھ سے مشابہت رکھتے ہو، اور حضرت زیدؓ سے فرمایا: تم میرے بھائی اور میرے مولی ہو۔ (صحیح بخاری: 2700، سنن ترمذی: 1904)

حضرت علیؓ نے نبی کریم ﷺ سے فرمایا: آپ حمزہ کی بیٹی سے شادی کیوں نہیں کر لیتے؟! آپ ﷺ نے فرمایا: وہ میرے رضاعی بھائی کی بیٹی ہے۔ (صحیح بخاری: 4251، صحیح مسلم: 1446)

اس واقعہ سے مستفاد دروس و احکام اور فوائد:

۱: خالہ، ماں کے برابر اور اس کے درجہ میں ہے۔

۲: پرورش کے سلسلہ میں خالہ دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ حقدار ہے جبکہ والدین موجود نہ ہوں۔

۳: اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کا تزکیہ فرمایا اور ان الفاظ کے ذریعہ ان کی تعریف و توصیف کی: ''تم سیرت و صورت میں مجھ سے مشابہت رکھتے ہو''۔

۴: آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کے مناقب و فضائل بھی بیان فرمائے، آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: ''تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں''۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میرا اور آپ کا تعلق نسب و مصاہرت، قبولِ اسلام میں سبقت اور محبت کا ہے۔

۵: حضرت زید بن حارثہؓ کے بھی آپ ﷺ نے مناقب و فضائل بیان کئے، آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: ''تم میرے بھائی اور میرے مولی ہو''۔ اس لئے کہ وہ حضرت حمزہؓ کے دینی بھائی تھے اور آپ ﷺ نے ان دونوں کے مابین مؤاخات کرائی تھی، اس لئے وہ اپنے اجتہاد کی بنیاد پر یہ سمجھ رہے تھے کہ جس طرح حقیقی بھائی پر حقوق ہوتے ہیں اسی طرح مجھ پر بھی ذمہ داری اور حقوق عائد ہوتے ہیں۔

۶: پرورش کے سلسلہ میں پھوپھی کے مقابلہ میں خالہ زیادہ حقدار ہے، اس لئے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت حمزہؓ کی بیٹی کی خالہ کو پرورش کا حق دیا جبکہ ان کی پھوپھی صفیہؓ بنت عبد المطلب موجود اور حیات تھیں۔

۷: کسی عورت کے شادی کرنے کی وجہ سے پرورش کا حق ساقط نہیں ہوگا، چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ نے پرورش کے بارے میں خالہ کے حق میں فیصلہ سنایا اور وہ حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کی زوجیت میں تھیں۔

۸: اپنی بہن کی اولاد کی پرورش کے سلسلہ میں شوہر کی اجازت ضروری ہے، اس لئے کہ بیوی کے لئے اپنے شوہر کی مصلحت وفائدہ کا خیال کرنا ضروری ہے اور دوسرے بچے کی پرورش کی وجہ سے جزوی طور پر اس میں کمی آسکتی ہے، اس لئے اس سے اجازت ضروری ہے، مذکورہ واقعہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت جعفر بن ابی طالبؓ نے اپنی چچازاد بہن کے سلسلہ میں خود ہی درخواست کی کہ انہیں ان کی خالہ کی پرورش میں دے دیا جائے جو کہ ان کی شریکِ حیات تھیں، اس لئے یہ از خود ان کی طرف سے اجازت اور رضامندی تھی۔

۹: بچہ جب اپنے چچا کے ساتھ دودھ پیئے تو وہ اس کا رضاعی بھائی بھی بن جاتا ہے اور اس کی تمام بیٹیاں اس کے رضائی بھائی کی بیٹیاں بن جاتی ہیں جن کے ساتھ نکاح کرنا جائز نہیں ہے۔ (دیکھیں: زاد المعاد: 3/374، صلح الحدیبیہ، لابی فارس، ص: 286-287)

۵: جزیرۃ العرب پر عمرۃ القضا کے اثرات اور حضرت خالد بن ولید، حضرت عمرو بن عاص اور حضرت عثمان بن طلحہ کا قبولِ اسلام:

اس عمرہ کے قریش اور پورے جزیرۃ العرب پر انتہائی گہرے اثرات مرتب ہوئے، یہ عمرہ اپنے معانی اور مفاہیم کے اعتبار سے ایک اہم عظیم دعوتی مشن اور پیغام تھا، اس پُرامن عمرہ کے ذریعہ اہلِ مکہ بہت زیادہ متاثر ہوئے۔

میجر جنرل محمود شیت خطاب کہتے ہیں: اس مرحلہ میں عمرۃ القضاء نے قریش کی نفسیات پر بہت گہرا اثر مرتب کیا، قریش کے بہت سے لوگ مکہ میں دار الندوہ کے پاس کھڑے ہوئے، اسی طرح کچھ لوگ اس کے چاروں طرف دیوار پر کھڑے ہوئے تاکہ وہ رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے اصحاب کے مکہ مکرمہ میں داخلہ کا مشاہدہ کریں، جب اللہ کے رسول ﷺ مسجدِ حرام میں داخل ہوئے تو آپؐ نے اپنی چادر لپیٹ لی اور اپنا دایاں ہاتھ چادر سے باہر نکالا، اس کے بعد فرمایا: ''اللہ اس شخص پر رحم کرے جو آج اِن کے سامنے اپنی قوت کا مظاہرہ کرے گا''۔ اس کے بعد آپؐ نے حجر اسود کا استلام کیا اور تیزی کے ساتھ چلنے لگے اور آپؐ کے اصحاب آپ کے ساتھ مناسکِ عمرہ ادا کر رہے تھے، اللہ کے رسول ﷺ جب مکہ مکرمہ سے رخصت ہوئے تو حضرت خالد بن ولید قریش کے ایک جم غفیر میں کھڑے ہو کر کہنے لگے: ہر ذی عقل وشعور کے سامنے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ محمدؐ نہ کوئی جادوگر ہے اور نہ ہی کوئی شاعر ہے اور آپؐ کا کلام رب العالمین کی طرف سے ہے، اس لئے ہر ذی عقل کے لئے آپؐ کی اتباع لازم وضروری ہے۔ ابو سفیان نے حضرت خالد بن ولید کی یہ باتیں سنیں تو ان کو بلا کر ان سے اس بات کی تصدیق کی، حضرت خالد نے اپنی بات کی تصدیق کی، یہ سنتے ہی ابو سفیان غضبناک ہو کر حضرت خالد کی طرف بڑھے لیکن حضرت عکرمہ نے ان کو پکڑ لیا جو وہاں موجود تھے اور کہا: اے ابو سفیان! ذرا رکیں، اللہ کی قسم! خالد نے جو بات کہی ہے میں وہ بات کہنے سے اور ان کا دین کو قبول کرنے سے خوفزدہ تھا، آپ خالد کو ایک رائے کی وجہ سے قتل کر رہے ہیں جس کو وہ درست سمجھ رہے ہیں! قریش کے تمام لوگوں نے ان کی اتباع کر لی ہے، واللہ، مجھے اندیشہ ہے کہ ایک سال بھی نہیں گزرنے پائے گا یہاں تک کہ تمام اہلِ مکہ ان کی اتباع کر لیں گے۔ اس کے بعد حضرت خالد بن ولید، حضرت عمرو بن عاص اور خود دربانِ کعبہ حضرت عثمان بن طلحہ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے، بلکہ قریش کے ہر گھر میں خفیہ اور اعلانیہ اسلام ظاہر ہو گیا، ان بہترین نتائج کی وجہ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ عمرۃ القضا نے مسلمانوں کے ذریعہ مکہ کے دروازے فتح کرنے سے پہلے ہی اہلِ مکہ کے دلوں کو فتح کر لیا تھا۔ (دیکھیں: الرسول القائد، ص: 209-210)

استاذ عباس محمود العقاد فرماتے ہیں: ''آپ کے لئے یہی کافی ہے کہ اس عمرۃ القضاء نے اپنے آثار و نتائج کے اعتبار سے دعوت محمد یہ کے بارے میں اطمئنان کے وہ اسباب فراہم کئے جنہوں نے حضرت خالد بن ولیدؓ اور حضرت عمرو بن عاصؓ جیسے لوگوں کو مطمئن کر دیا اور یہ دونوں شخصیات عقل و اخلاق کی پختگی میں قابل تقلید نمونہ تھے۔(دیکھیں: عبقریۃ محمد، ص:69)

ا: حضرت عمرو بن عاصؓ کا قبولِ اسلام

حضرت عمرو بن عاصؓ کے قبولِ اسلام کی روداد انہی کی زبانی سنتے ہیں، وہ فرماتے ہیں: جب ہم لوگ غزوۂ خندق سے واپس ہوئے تو میں نے قریش کے کچھ ایسے افراد کو بلایا جو میری بات سنتے تھے اور میری رائے کو اہمیت دیتے تھے، میں نے ان لوگوں سے کہا: خدا کی قسم میں یہ سمجھتا ہوں کہ محمدؐ کی بات تمام باتوں پر فوقیت لے جارہی ہے، اس سلسلہ میں میری ایک رائے ہے، اسی کے متعلق میں تم سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے پوچھا: تمہاری رائے کیا ہے؟ میں نے کہا: میری رائے یہ ہے کہ ہم نجاشی کے پاس چل کر رہیں، اگر محمد (ﷺ) نے ہماری قوم پر غلبہ پالیا تو ہم نجاشی کے پاس ہوں گے، ان کی فتح و کامرانی سے ہم پر کوئی فرق نہیں پڑے گا، ہم نجاشی کے ملک میں رہتے رہیں گے، محمد (ﷺ) کی ماتحتی سے کہیں بہتر یہ ہے کہ ہم نجاشی کے ماتحت رہیں، اور اگر ہماری قوم غالب آگئی تو ہم جانے پہچانے لوگ ہیں، ہماری قوم ہم سے بہتر ہی سلوک کرے گی۔ سب لوگوں نے ایک زبان ہو کر کہا: یہ رائے بہت اچھی ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ وہاں جانے سے پہلے بہتر یہ ہوگا کہ ہم نجاشی کے لئے کچھ تحائف اکٹھے کرلیں۔ نجاشی کو ہمارے ملک کا چمڑا بہت زیادہ پسند تھا، چنانچہ ہم نے اس کے لئے بہت سا چمڑا جمع کیا اور اسے لے کر حبشہ روانہ ہوئے اور نجاشی کے پاس جا پہنچے۔

ابھی ہم نجاشی کے دربار میں پہنچے بھی نہ تھے کہ ہم نے عمرو بن امیۃ الضمریؓ کو دربار سے نکلتے ہوئے دیکھا، رسول اللہ ﷺ نے انہیں جعفرؓ اور ان کے ساتھیوں کے سلسلہ میں کسی کام سے نجاشی کے پاس بھیجا تھا، میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ یہ عمرو بن امیۃ الضمریؓ ہے، میں نجاشی سے جاکر کہوں گا کہ وہ اس شخص کو ہمارے سپرد کردے، اگر اس نے ایسا کیا تو میں اس کی گردن ماردوں گا اور قریش کو بتلاؤں گا کہ ہم نے محمدؐ کے قاصد کو قتل کر کے ان کا بدلہ لے لیا ہے۔ چنانچہ میں نجاشی کے دربار میں پہنچا، حسبِ معمول اس کو سجدہ کیا، اس نے کہا: خوش آمدید میرے دوست! پھر اس نے مجھ سے پوچھا کہ تم اپنے ملک سے میرے لئے کیا چیز لے کر آئے ہو؟ میں نے کہا: بادشاہ سلامت! ہم لوگ بہت سا چمڑا لے کر حاضر ہوئے ہیں، پھر میں نے وہ تمام سامان نجاشی بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دیا، اس نے میرا لایا ہوا تحفہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور کافی تعریف کی۔ میں نے نجاشی سے عرض کیا: عالی جاہ! میں نے ابھی ایک شخص کو یہاں سے باہر جاتے ہوئے دیکھا ہے، یہ شخص ایک ایسے شخص کے پاس سے آیا ہے جو ہمارا دشمن ہے۔ آپ اسے ہمارے حوالے کردیں، ہم اس کو قتل کرنا چاہتے ہیں، اُس شخص نے جس کے پاس سے یہ آیا ہے ہمارے شرفاء کی عزتیں پامال کر رکھی ہیں۔

میری یہ بات سن کر نجاشی کو غصہ آگیا، پھر اس نے اپنا ہاتھ اس زور سے اپنی ناک پر مارا کہ مجھے لگا کہ شاید اس کی ناک ٹوٹ گئی ہے، اس کے اس طرزِ عمل سے مجھے اس قدر ندامت اور شرمندگی ہوئی کہ میں یہ تمنا کرنے لگا کہ کاش زمین شق ہو جائے اور میں اس کے اندر سما جاؤں۔ میں نے عرض کیا: بادشاہ سلامت! شاید آپ کو میری بات بُری لگی ہے۔ اس نے جواب دیا: کیا تو یہ چاہتا ہے کہ میں ایسے شخص کو

قتل کرنے کے لئے تیرے حوالے کردوں جو اس آدمی کا قاصد ہے جس کے پاس موسیٰ علیہ السلام کی طرح ناموس اکبر (فرشتہ) آتا ہے،؟! میں نے کہا: کیا حقیقت میں ایسا ہی ہے جیسا آپ فرمارہے ہیں؟ اس نے کہا: اے عمرو! تیرا ناس ہو، میری بات مان اور اس شخص کی اتباع کر، خدا کی قسم! وہ شخص حق پر ہے۔ جس طرح حضرت موسیٰؑ فرعون اور اس کے لشکر پر غالب آئے تھے اسی طرح یہ بھی اپنے دشمنوں پر غالب آکر رہیں گے۔ میں نے نجاشی سے عرض کیا: بادشاہ سلامت! آپ مجھے اسلام پر بیعت کرلیں، انہوں نے اپنا ہاتھ بڑھایا، میں نے ان سے اسلام پر بیعت کی۔

اس کے بعد میں اپنے ساتھیوں کے پاس آیا، اب میری رائے محمد ﷺ کے متعلق یکسر بدل چکی تھی، مگر میں نے اپنے ساتھیوں سے یہ بات چھپائی کہ میں مسلمان ہوچکا ہوں۔ پھر میں نے مدینہ منورہ کا قصد کیا تاکہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر باقاعدہ اسلام قبول کرلوں۔ یہ فتحِ مکہ سے پہلے کا واقعہ ہے، خالد بن ولیدؓ مکّہ سے مدینہ کی طرف جارہے تھے اور میں حبشہ سے ادھر جارہا تھا، راستے میں ہماری ملاقات ہوگئی، میں نے ان سے پوچھا: کدھر کا قصد ہے؟ انہوں نے کہا: اب یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوگئی ہے کہ یہ صاحب (محمد ﷺ) نبی ہیں۔ واللہ! میں تو اب ان کے پاس جارہا ہوں تاکہ اسلام لے آؤں، کب تک ہم اس حقیقت سے راہِ فرار اختیار کریں گے اور کہاں تک حیلے بہانے تراشیں گے؟! میں نے خالدؓ سے کہا: خدا کی قسم! میں بھی اسی ارادہ سے چلا ہوں، چنانچہ ہم لوگ مدینہ پہنچے اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، پہلے خالد بن ولیدؓ آگے بڑھے، انہوں نے کلمۂ شہادت پڑھا اور آپؐ کے دستِ مبارک پر بیعت کی، پھر میں قریب ہوا اور عرض کیا: یارسولؐ اللہ! میں اس شرط پر بیعت کروں گا کہ میرے تمام پچھلے گناہ معاف ہوجائیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے عمرو! تم بیعت کرو، اسلام اپنے سے پہلے کے تمام گناہوں کو ختم کردیتا ہے، اسی طرح ہجرت سے بھی تمام پچھلے گناہ ختم ہوجاتے ہیں، چنانچہ میں نے بیعت کی اور واپس مکّہ چلا گیا۔

بعض روایات میں یہ ہے کہ حضرت عمرو بن العاصؓ کے دل میں جب اسلام کی محبت پیدا ہوئی تو وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یارسولؐ اللہ! آپؐ اپنا دستِ مبارک بڑھائیں، میں بیعت کرنا چاہتا ہوں، چنانچہ آپؐ نے میری طرف اپنا دستِ مبارک بڑھایا، میں نے اسے تھام لیا۔ آپؐ نے پوچھا: اے عمرو! تم کچھ کہنا چاہتے ہو۔ میں نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! میری ایک شرط ہے اور وہ یہ ہے کہ میرے تمام گناہ معاف ہوجائیں۔ آپؐ نے فرمایا: کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اسلام لانے سے پچھلے تمام گناہ ختم ہوجاتے ہیں؟ اسی طرح ہجرت سے بھی ماقبل کے تمام گناہ معاف ہوجاتے ہیں اور حج سے بھی پہلے کے تمام گناہ ختم کردئے جاتے ہیں۔ (مسند أحمد بن حنبل: 198/4 الدلائل للبیہقی 343/4 سیرت ابن ھشام 3/ 289)

۲: حضرت خالد بن ولیدؓ کا قبولِ اسلام

حضرت خالد بن ولیدؓ بھی اپنی قبولِ اسلام کا قصہ خود ہی سناتے ہیں، وہ فرماتے ہیں: "....جب اللہ تعالیٰ نے میرے ساتھ خیر کا ارادہ فرمایا تو اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں اسلام کی محبت ڈال دی، یکایک میرے دل میں یہ خیال آیا کہ جس لڑائی میں بھی قریش مکہ کی طرف سے

آنحضرت ﷺ کے مقابلہ میں جاتا ہوں واپسی پر میرا دل مجھ سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہوتا ہے: اے خالد! تیری یہ تمام کوشش لاحاصل اور بے سود ہے، اور یقیناً محمد ﷺ ضرور غالب آ کے رہیں گے۔

چنانچہ صلح حدیبیہ کے موقع پر میں قریش مکہ کے سواروں میں سے تھا۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو مقام عُسفان میں مسلمانوں کو ''صلوۃ الخوف'' پڑھاتے دیکھا، میرے دل میں خیال آیا کہ بڑا اچھا موقع ہے، مجھے حملہ کر دینا چاہیے، لیکن میرے حملہ کرنے سے قبل ہی رسول اللہ ﷺ میرے ارادہ سے واقف ہو گئے اور میں حملہ نہ کر سکا تو اسی وقت میں سمجھ گیا کہ یہ شخص من جانب اللہ مأمون و محفوظ ہے، غیب سے ان کی حفاظت کی جا رہی ہے۔ چنانچہ میں حدیبیہ سے ناکام واپس ہو گیا۔

آنحضرت ﷺ قریش سے جب صلح کر کے واپس ہوئے تو میں نے سوچا کہ قریش کی شان و شوکت ختم ہو چکی ہے اور شاہِ حبشہ نجاشی بھی آپ کا پیروکار ہو چکا ہے اور ہجرت کرنے والے آپ کے اصحاب وہاں پُرسکون زندگی بسر کر رہے ہیں، ایسی صورت میں شاہِ روم ہرقل کے پاس چلا جانا چاہیے اور وہاں یہودی یا نصرانی مذہب قبول کر لینا چاہیے اور عجم کے تابع ہو کر زندگی بسر کرنی چاہیے یا اپنے ہی وطن میں رہ کر دیکھوں کہ پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ رسول اللہ ﷺ آئندہ سال ''عمرۃ القضاء'' کے لئے مکہ مکرمہ تشریف لائے، آپ ﷺ کی آمد کی اطلاع پا کر میں مکہ سے باہر روپوش ہو گیا۔ حضور ﷺ جب عمرہ سے فارغ ہو گئے تو میرے بھائی ''ولید بن ولید'' (جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھا) نے مجھے ڈھونڈا مگر میں نہ ملا، بعد ازاں اس نے میرے نام ایک خط لکھا۔ خط کا مضمون درج ذیل تھا:

''بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ اَمابعد! میں نے اس سے زیادہ تعجب خیز کوئی امر نہیں دیکھا کہ تیری رائے اسلام جیسے پاکیزہ دین کے قبول کرنے سے کیوں منحرف ہے، حالانکہ تیری عقل، تیری عقل ہے! (جو مشہور و معروف ہے) اور اسلام جیسے پاکیزہ دین سے کسی کا بے خبر رہنا تعجب خیز ہے۔ اور آنحضرت ﷺ نے تمہارا حال دریافت کیا تھا کہ خالد کہاں ہے؟ میں نے کہا: یارسول اللہ! عنقریب اللہ تعالیٰ اس کو لے کر آئے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تعجب ہے! اس جیسا عاقل اسلام جیسے پاکیزہ دین سے بے خبر و نادان ہو جائے، اور فرمایا کہ اگر خالد دین اسلام میں داخل ہو کر اور مسلمانوں کے ساتھ مل کر دین حق کی مدد کرتا تو یہ اس کے لیے بہتر ہوتا اور ہم اس کو دوسروں پر مقدم رکھتے۔ پس اے بھائی! تجھ سے جو عمدہ مقامات فوت ہو گئے ہیں تو ان کی تلافی اور تدارک کر لے کہ ابھی وقت ہے۔''

سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: میرے بھائی کا خط میرے پاس پہنچا تو اس نے میرے دل میں اسلام کے لیے اور رغبت پیدا کر دی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے بارے جو کچھ فرمایا اس نے مجھے خوش کر دیا۔ اسی اثنا میں میں نے ایک خواب دیکھا، وہ خواب یہ تھا کہ: ''میں ایک تنگ شہر میں ہوں جہاں قحط پڑا ہوا ہے، میں اس تنگ شہر سے نکل کر سرسبز و شاداب علاقہ میں چلا گیا''۔ بیدار ہوا تو میں سمجھ گیا یہ ایک خاص خواب ہے جو میری تنبیہ کے لئے دکھایا گیا ہے۔

میں مکہ مکرمہ آیا اور اسبابِ سفر مہیا کر کے مدینہ منورہ کی طرف چلنے کا ارادہ کیا تو میں نے چاہا کہ کوئی اور بھی میرے ساتھ ہو جائے، چنانچہ میں نے صفوان بن امیہ سے ملاقات کی اور کہا: کیا تم دیکھتے نہیں کہ ہم کس حال میں ہیں؟ اور محمدؐ نے عرب و عجم پر غلبہ پا لیا ہے، اگر ہم ان کے پاس جائیں اور ان کی اتباع کریں تو یہ ہمارے لئے بہتر ہو گا، محمدؐ کا شرف ہمارا شرف ہو گا۔ صفوان نے میری بات سن کر سختی سے انکار کر دیا اور کہا: زمین پر موجود سبھی لوگ محمدؐ کے تابع ہو جائیں، صرف میں ہی بچ جاؤں تب بھی اس کی اتباع نہیں کروں گا۔ خالد فرماتے ہیں: میں نے سوچا

اس کا باپ اور بھائی بدر میں مارے گئے تھے اس لئے اس سے کوئی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اس کے بعد میں عکرمہ بن ابی جہل کے پاس گیا، ساری بات کی تو اس نے بھی وہی جواب دیا جو صفوان نے دیا تھا۔

سیدنا خالد بن ولیدؓ فرماتے ہیں: میں اپنے گھر گیا، اونٹنی کو تیار کیا اور سوچا ایک بار عثمان بن طلحہ سے بات کر لیتا ہوں، وہ میرا سچا دوست ہے، لیکن مجھے اس کے باپ دادا کے قتل ہونے کا خیال آیا، سوچنے لگا بات کروں یا نہ کروں، بالآخر یہی فیصلہ کیا کہ بات کرنے میں کیا تردد ہے۔ چنانچہ میں نے عثمان سے بات کی تو عثمان نے میرے مشورے کو قبول کیا کہ میں بھی مدینہ چلتا ہوں لیکن ہم مکہ سے علحیدہ علحیدہ نکلیں گے اور مقام 'یاجج' میں ہماری ملاقات ہوگی، جو پہلے پہنچ جائے گا وہ دوسرے کا انتظار کرے گا۔

سیدنا خالد بن ولیدؓ فرماتے ہیں: ہم مکہ مکرمہ سے روانہ ہوگئے اور حسبِ وعدہ مقام یاجج میں عثمان بن طلحہ مجھے مل گئے، ہم علی الصبح وہاں سے روانہ ہوئے، جب مقام 'ھدہ' میں پہنچے تو وہاں عمرو بن عاص سے ملاقات ہوئی، وہ بھی مدینہ جارہے تھے، انہوں نے ہمیں مرحبا کہا، ہم نے ان کو مرحبا کہا۔ جانے کی غرض معلوم کی تو پتہ چلا وہ بھی اسلام قبول کرنے کی غرض سے مدینہ جارہے ہیں۔

ہم تینوں مل کر روانہ ہوئے اور مدینہ پہنچ کر مقام حرہ میں اپنی سواریاں بٹھلائیں، کسی نے رسول اللہ ﷺ کو ہماری آمد کی خبر دے دی تو آپؐ بہت زیادہ مسرور ہوئے۔ سیدنا خالد کہتے ہیں: حرہ میں میں نے عمدہ لباس پہنا اور آپ کی خدمت میں حاضری کے لئے چلا تو راستے میں مجھے میرا بھائی ولید ملا اور کہا جلدی چلو، رسول اللہ ﷺ کو آمد کی اطلاع ہو چکی ہے، آپؐ بہت زیادہ مسرور ہونے کے ساتھ ساتھ آپ کے منتظر ہیں۔ ہم تیز قدموں سے چل کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچے۔

آنحضرت ﷺ مجھے دیکھ کر مسکرائے۔ میں نے کہا: السلام علیک یا رسول اللہ! آپ نے نہایت خندہ پیشانی سے جواب دیا۔ میں نے عرض کیا: ''أشھد أن لا الہ الا اللہ وأنک رسول اللہ''۔ آپؐ نے فرمایا: قریب ہو جاؤ۔ میں قریب ہوا تو فرمایا: ''حمد ہے اس پاک ذات کی جس نے آپ کو اسلام کی توفیق دی، میں دیکھتا تھا کہ آپ میں عقل ہے اور وہ عقل خیر اور بھلائی کی طرف رہنمائی کرے گی''۔

میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! آپ کو معلوم ہی ہے کہ میں تمام معرکوں میں آپ کے خلاف لڑتا رہا، لہذا میرے لئے دعا فرمائیں کہ اللہ مجھے معاف فرمائے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: اسلام پہلے کے تمام گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔ فرماتے ہیں: میں نے عرض کیا: دعا فرمائیں، آپؐ نے فرمایا: اے اللہ! خالد نے تیری راہ سے روکنے کے لئے جو کچھ کیا ہے اس کو معاف فرما۔ حضرت خالدؓ کہتے ہیں: اور عمرو اور عثمان آگے بڑھے اور رسول ﷺ سے بیعت کی۔ ہم ماہِ صفر سن آٹھ ہجری میں حاضر ہوئے تھے۔ اللہ کی قسم! آپؐ ہمارے قبولِ اسلام کے بعد جب بھی کوئی اہم معاملہ پیش آتا تھا تو ہمارے مقابلہ میں کسی کو ترجیح نہیں دیتے تھے۔ (دلائل النبوۃ للبیھقي 349/4 البدایۃ والنھایۃ 239/4 التاریخ الإسلامی 95/7)

یقیناً حضرت عمرو بن عاصؓ اور حضرت خالد بن ولیدؓ کا اسلام لانا اسلام کے لئے قوتِ واستحکام اور شرک کے کمزور ہونے کا ذریعہ تھا، اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے ہاتھوں کے ذریعہ مسلمانوں کی جہادی تاریخ کے روشن صفحات تحریر کرنا مقدر کر رکھا تھا، جو مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ ہمیشہ امت کے ذہن ودماغ اور اس کی عظیم تاریخ میں سنہری حروف کے ساتھ محفوظ گے۔ (دیکھیں: التاریخ الاسلامی للحمیدی: 7/95)

....

چوتھا باب

غزوۂ مؤتہ (سن 8 ہجری)

ا: اسباب وتاریخ:

شام کے عربوں نے مسلمانوں اور بیزنطینیوں کے درمیان جنگ کی آگ سلگادی، قبیلۂ قضاعہ کی شاخ کلب کے لوگ دومۃ الجندل میں آکر مسلمانوں کو پریشان اور تنگ کرتے تھے اور انہوں نے شام سے مدینہ کی طرف آنے والے تاجروں کو پریشان کرکے مسلمانوں کے خلاف ایک قسم کا اقتصادی محاصرہ کرر کھا تھا، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے سن پانچ ہجری میں دومۃ الجندل میں قبیلہ کلب کے خلاف کاروائی کی، لیکن آپ نے دیکھا کہ وہ وہاں سے بھاگ گئے ہیں، اسی طرح سے قبیلۂ جذام اور قبیلہ لخم کے لوگوں نے حضرت دحیہ بن خلفیہ کلبی پر اچانک حملہ کرکے ڈاکہ زنی کی جبکہ وہ 'حِسمیٰ' کے پاس سے رسول اللہ ﷺ کے دیئے ہوئے مشن کی تکمیل کے بعد گزر رہے تھے اور ان کے پاس جو کچھ تھا انہوں نے چھین لیا، اس کے نتیجہ میں حسمی کی جانب سن چھ ہجری میں سریہ زید بن حارثہ ہوا، اسی طرح سے 'مذحج' اور 'قضاعہ' کے دونوں قبائل نے حضرت زید بن حارثہؓ اور آپ کے ساتھیوں کے ساتھ زیادتی کی جبکہ وہ دعوت الی اللہ کی غرض سے ایک مہم میں وادی القری کی جانب گئے تھے۔

صلح حدیبیہ کے بعد ظلم وزیادتی کے اس طریقہ کار نے ایک خطرناک رخ اختیار کیا جبکہ رومی حکومت کے تابع حاکمِ بُصری کے پاس بھیجے گئے اللہ کے رسولؐ کے سفیر اور قاصد کو شہید کر دیا گیا، شرحبیل بن عمرو غسّانی نے اللہ کے رسولؐ کے سفیر کو شہید کر دیا، حالانکہ سفراء اور قاصدوں کو قتل کرنے کی اُس وقت بھی اجازت نہیں تھی، اسی طرح حاکمِ دمشق حارث بن اَبی شمر غسّانی نے رسول اللہ ﷺ کے مبعوث و قاصد کے ساتھ بدسلوکی کی اور مدینہ کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔

اس کے بعد ایک سال گزرنے کے ساتھ ہی رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمرو بن کعب غفاریؓ کی قیادت میں ایک سریہ روانہ فرمایا تاکہ وہ ''ذات اُطلاح'' نامی علاقہ میں دعوتی کام کئے لیکن وہاں کے باشندوں نے ان کی دعوت پر لبیک نہیں کہا، بلکہ تمام داعیوں کو چاروں طرف سے گھیر کر ان کے خلاف جنگ چھیڑ دی یہاں تک کہ ان سب کو شہید کر دیا، صرف ان کے امیر زخمی حالت میں ہی وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوگئے، یہاں تک کہ وہ اسی حالت میں مدینہ منورہ پہنچ گئے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو اس واقعہ کی اطلاع دی۔ (دیکھیں: المسلمون والروم فی عصر النبوۃ، عبدالرحمن اُحمد سالم، ص 87، تاریخ الطبری: 3/103)

شام کے عیسائیوں نے بھی رومی حکومت کی سرپرستی میں ہر اس شخص کے خلاف ظلم وزیادتی شروع کی جو اسلام قبول کرتا تھا یا اسلام قبول کرنے کے بارے میں سوچتا تھا، انہوں نے مَعَان کے گورنر کو شہید کر دیا جبکہ اس نے اسلام قبول کیا، اسی طرح شام کے والی نے شام کے عربوں میں سے اسلام قبول کرنے والوں کو شہید کر دیا۔ (دیکھیں: خاتم النبیین: 2/1139، الصراع مع الصلیبیین، ابوفارس، ص 20)

یہ تمام المناک اور افسوسناک واقعات خاص طور پر رسول اللہ ﷺ کے سفیر حضرت حارث بن عمیر اُزدی کی شہادت مسلمانوں کے قلوب وجذبات کو تحریک دینے کا باعث بنے،اور اب ضروری تھا کہ صلیبیوں کی ان معاندانہ حرکات پر لگام لگائی جائے اور اپنے دینی بھائیوں کے لئے بدلہ لینا اب ضروری ہو گیا تھا، جن کا ناحق خون بہایا گیا تھا اور ان کا گناہ صرف یہ تھا کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے اور نبی کریم ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔

اسی طرح رومی سلطنت کے تابع شام کے عربوں کو سبق سکھانا بھی ضروری ہو گیا تھا، جو مسلسل مسلمانوں کے جذبات کو برانگیختہ کر رہے تھے اور ان کو چیلنج دے رہے تھے اور داعیانِ حق کے خلاف مسلسل جرائم کا ارتکاب کر رہے تھے،اس لئے ان کی تادیب اور ان کو سبق سکھانا ایک اہم ہدف بن گیا تھا،اس لئے کہ اس ہدف کے حصول کا مطلب یہ تھا کہ ان تمام علاقوں میں اسلامی ریاست کی دھاک بیٹھ جائے گی اور پھر مستقبل میں اس طرح کے جرائم کی کسی کو ہمت نہیں ہو گی اور داعیانِ حق بھی اپنی جانوں کے بارے میں تحفظ محسوس کریں گے اور مدینہ اور شام کے مابین آنے جانے والے تجار بھی ہر قسم کی ایذاء رسانی سے محفوظ رہیں گے۔(دیکھیں:المسلمون والروم فی عصر النبوۃ، ص:89)

سن آٹھ ہجری میں اللہ کے رسولؐ نے مسلمانوں کو جنگ کی تیاری کا حکم دیا، تمام مسلمانوں نے نبوی حکم کی تعمیل کی اور اتنی تعداد جمع ہو گئی جتنی اس سے پہلے کبھی جمع نہیں ہوئی تھی،اس لئے کہ اس سریہ میں مجاہدین کی تعداد تین ہزار تھی اور نبی کریم ﷺ نے قیادت کے لئے بالترتیب تین امراء کا انتخاب کیا: حضرت زید بن حارثہؓ، حضرت جعفر بن ابی طالبؓ اور حضرت عبداللہ بن رواحہؓ۔امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمر بن خطابؓ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں:اللہ کے رسول نے غزوۂ موتہ میں حضرت زید بن حارثہؓ کو امیر مقرر کیا،اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:اگر زیدؓ شہید ہوئے تو جعفرؓ امیر ہوں گے اور اگر جعفرؓ شہید ہوئے تو عبداللہ بن رواحہؓ امیر ہوں گے۔(صحیح بخاری:4261)

اللہ کے رسول ﷺ نے اسلامی لشکر کو حکم دیا کہ اس جگہ پڑاؤ ڈالیں جہاں حضرت حارث بن عمیر اُزدیؓ شہید کئے گئے تھے اور وہاں کے تمام باشندوں کو اسلام کی دعوت دیں،اگر وہ دعوت پر لبیک کہتے ہیں تو بہت اچھی بات ہے اور اگر وہ انکار کرتے ہیں تو پھر ان کے مقابلہ میں اللہ سے مدد طلب کر کے ان کے ساتھ قتال کریں،اللہ کے رسول ﷺ نے اس سریہ میں اور دیگر سرایا میں شریک مجاہدین کو وصیتیں اور ہدایات دیں جن میں قتال کے آداب بتائے گئے تھے،رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کو یہ وصیت فرمائی: میں تمہیں اللہ سے ڈرنے، تقویٰ اختیار کرنے اور اپنے ساتھی مسلمانوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے کی وصیت کرتا ہوں،اللہ کے راستہ میں اللہ کا نام لے کر لڑنا،جو اللہ کے ساتھ کفر کرے اس سے لڑنا،بد عہدی نہ کرنا،کسی بچے یا عورت کو قتل نہ کرنا،نہ ہی کسی بے کار بزرگ کو اور کسی گرجا گھر میں الگ تھلگ رہنے والے شخص کو قتل کرنا،کھجوروں کے درختوں کے قریب مت جانا،نہ کسی درخت کو کاٹنا اور نہ ہی کسی عمارت کو منہدم کرنا، جب اپنے مشرک دشمنوں سے تمہاری مڈبھیڑ ہو جائے تو انہیں تین باتوں میں سے ایک کی دعوت دینا: یا تو اسلام قبول کریں، یا جزیہ دیں، یا جنگ کریں۔(دیکھیں:السیرۃ الحلبیہ:2/787،الصراع مع الصلیبین، ص21)

۲: اسلامی لشکر کی روانگی:

جب اسلامی لشکر تیار ہو گیا اور اس کی تیاری مکمل ہو گئی تو رسول اللہ ﷺ اور تمام مسلمان اس لشکر کو الوداع کرنے کے لئے نکلے، وہ اللہ کے سامنے آہ وزاری کے ساتھ دعا کر رہے تھے کہ ان کے مجاہدین بھائیوں کی نصرت وتائید فرما، ان کے لئے سلامتی کی دعا کی اور ان کو دعائیں دیں کہ اللہ آپ کی ہر مصیبت وپریشانی کو دور فرمائے اور آپ کو صحیح سالم اور فتح مند ہو کر واپس لائے۔(سیرت ابن ہشام: 4/21)

جب لوگوں نے حضرت عبداللہ بن رواحہ ؓ کو الوداع کیا تو وہ رو پڑے، ان کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں، لوگوں کو اس پر تعجب ہوا اور کہنے لگے: اے ابن رواحہ! آپ کیوں رو رہے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: واللہ! نہ ہی میں دنیا کی محبت میں گرفتار ہوں اور نہ ہی آپ کی بے جا چاہت میں مبتلا ہوں، لیکن میں نے رسول اللہ ﷺ کو کتاب اللہ کی ایک آیت پڑھتے ہوئے سنا ہے جس میں جہنم کا ذکر ہے: ﴿وَإِن مِّنكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا﴾ ترجمہ: ”تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو جہنم پر وارد نہ ہو، یہ تو ایک طے شدہ بات ہے جسے پُورا کرنا تیرے رب کا ذمہ ہے“۔(سورۂ مریم: 71) میں نہیں جانتا ہوں کہ وہاں جانے کے بعد واپسی کیسے ہو گی؟ مسلمان ان سے کہنے لگے: اللہ کی نصرت وتائید آپ کے ہمرکاب ہو، آپ سے ہر دکھ اور تکلیف کو دور فرمائے اور آپ کو صحت وسلامتی کے ساتھ ہمارے پاس واپس لائے، اس موقع پر حضرت عبداللہ بن رواحہ ؓ نے بہترین اشعار بھی کہے۔(دیکھیں: سیرت ابن ہشام: 4/15، الدلائل للبیہقی: 4/359، مغازی الرسول لعروۃ الزبیر، ص:204)

۳: مقام مَعان پر لشکر کا پہنچنا اور تینوں امراء کی شہادت:

جب اسلامی لشکر سرزمین شام کے مقام مَعان پر پہنچا، (مَعان اب اردن کا ایک صوبہ ہے) وہاں پہنچ کر یہ معلوم ہوا کہ عرب وعجم صلیبی نصاریٰ ان سے جنگ کرنے کے لئے ایک جم غفیر اور بھاری فوج لے کر جمع ہوئے ہیں، عرب قبائل نے قبیلہ لخم، جزام، بَہراء اور بلی کے ایک لاکھ جنگجو جمع کئے ہیں، اور مالک بن رافلہ کو اپنا قائد متعین کیا ہے، اسی طرح ہرقل نے روم سے ایک لاکھ صلیبیوں کو جمع کیا ہے اور صلیبی لشکر کی مجموعی تعداد دو لاکھ پہنچ گئی ہے جو ہتھیاروں سے لیس تھے اور ریشمی لباس پہنے ہوئے تھے تاکہ مسلمان ان کے ذریعہ اور ان کی قوت دیکھ کر حیران وششدر ہو کر رہ جائیں۔(دیکھیں: شرح المواھب اللدنیۃ: 2/271)

مسلمانوں نے مَعان میں دو روز تک قیام کیا اور وہاں اس لشکرِ جرار کا مقابلہ کرنے کے سلسلہ میں مشورہ کر رہے تھے۔

بعض کی رائے یہ تھی کہ ہم رسول اللہ ﷺ کو دشمن کی کثرتِ تعداد کے بارے میں مدینہ منورہ اطلاع بھیجیں گے، اگر آپ چاہیں گے تو ہمیں کمک بھیجیں گے اور اگر چاہیں گے تو ہمیں قتال کا حکم دیں گے۔ جبکہ بعض نے امیرِ لشکر حضرت زید بن حارثہ ؓ سے کہا: آپ اس ملک تک پہنچ گئے ہیں اور یہاں کے باشندوں کو خوفزدہ کر دیا ہے، لہذا اب آپ واپس تشریف لے چلیں، اس لئے کہ عافیت کے مقابلہ میں کوئی چیز بہتر نہیں ہے۔

لیکن حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے اس رائے کی مخالفت کی اور یہ کہہ کر لوگوں کو گرمادیا کہ لوگو! اللہ کی قسم! جس چیز سے آپ کترارہے ہیں یہ وہی تو شہادت ہے جس کی طلب میں آپ نکلے ہیں۔ یادرہے دشمن سے ہماری لڑائی تعداد، قوت اور کثرت کے بل پر نہیں ہے بلکہ ہم محض اس دین کے بل پر لڑتے ہیں جس سے اللہ نے ہمیں مشرف کیا ہے، اس لئے چلیے آگے بڑھئے! ہمیں دو بھلائیوں میں سے ایک بھلائی حاصل ہو کر رہے گی: یا تو ہم غالب آئیں گے یا شہادت سے سرفراز ہوں گے۔

حضرت عبداللہ بن رواحہ کے ان کلمات نے مجاہدین کے جذبات کو گرمادیا اور حضرت زید بن حارثہؓ لوگوں کو لے کر 'کرک' کے جنوب میں مقام مؤتہ کی جانب لے کر بڑھے، وہاں پر دشمن کے ساتھ مڈبھیڑ ہوئی اور تینوں قائدین نے عظیم بہادری کے جوہر دکھائے اور بالآخر تینوں شہادت سے سرفراز ہوگئے، حضرت زید بن حارثہؓ نے انتہائی جوانمردی اور بہادری کا مظاہرہ کیا اور دشمنوں کی صفوں میں پرچم نبوی اٹھائے ہوئے آگے بڑھے، یہاں تک کہ دشمن کے تیروں کی وجہ سے ان کے جسم سے خون بہنے لگا۔ (دیکھیں: تاریخ دمشق، ابن عساکر، السیرۃ النبویہ الصحیحہ: 2/468، المعجم الکبیر للطبرانی: 4655، سیرت ابن ہشام: 4/19، مجمع الزوائد: 6/159)

اس کے بعد حضرت جعفرؓ نے لپک کر جھنڈا اٹھایا اور بے نظیر جنگ شروع کردی، ان پر پے درپے حملے شروع ہوئے لیکن ان کی عزیمت میں کوئی کمی نہیں آئی، جب لڑائی کی شدت شباب کو پہنچی تو اپنے سُرخ وسیاہ گھوڑے کی پشت سے کود پڑے، کوچیں کاٹ دیں اور وار پر وار کرتے اور روکتے رہے، یہاں تک دشمن کی ضرب سے داہنا ہاتھ کٹ گیا، اس کے بعد انہوں نے جھنڈا بائیں ہاتھ میں لے لیا اور اسے مسلسل بلند رکھا یہاں تک کہ بایاں ہاتھ بھی کاٹ دیا گیا، پھر دونوں باقی ماندہ بازوؤں سے جھنڈا آغوش میں لے لیا اور اس وقت تک بلند رکھا جب تک کہ خلعتِ شہادت سے سرفراز نہ ہوگئے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک رومی نے ان کو ایسی تلوار ماری کہ ان کے دو ٹکڑے ہوگئے، اللہ نے انہیں ان کے دونوں بازوؤں کے عوض جنت میں دو بازو عطا کئے جن کے ذریعہ وہ جہاں چاہتے ہیں اڑتے ہیں، اسی لئے ان کا لقب جعفر طیّار اور جعفر ذُوالجنَاحین پڑگیا۔ (طیّار معنی اڑنے والا اور ذُوالجناحین معنی: دو بازوؤں والا)

امام بخاریؒ نے نافع کے واسطے سے ابن عمرؓ کا یہ بیان روایت کیا ہے کہ میں نے جنگ مؤتہ کے روز حضرت جعفرؓ کے پاس جبکہ وہ شہید ہوچکے تھے، کھڑے ہو کر ان کے جسم پر نیزے اور تلوار کے پچاس زخم شمار کئے، ان میں سے کوئی بھی زخم پیچھے نہیں لگا تھا۔

ایک دوسری روایت میں ابن عمرؓ کا یہ بیان اس طرح مروی ہے کہ میں بھی اس غزوہ میں مسلمانوں کے ساتھ تھا، ہم نے جعفر بن ابی طالبؓ کو تلاش کیا تو انہیں مقتولین میں پایا اور ان کے جسم میں نیزے اور تیر کے نوے سے زیادہ زخم پائے۔ (صحيح بخاري: 4261 الدلائل للبيهقي 4/361)

اس طرح کی شجاعت وبہادری سے بھرپور جنگ کے بعد جب حضرت جعفرؓ بھی شہید کردیئے گئے تو اب حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے پرچم اٹھایا اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر آگے بڑھے اور کہنے لگے:

أَقْسمت يا نَفْسُ لَتنزلَنَّهْ ... بطَاعَة منْك لَتُكْرَمنَّه
إنْ أَجلَب النَّاس وشدُّوا الرنه ... ما لِي أَرَاكَ تَكْرَهين الجَنَّهْ

"اے نفس! قسم ہے کہ تو ضرور مدِّ مقابل اُتر، خواہ ناگواری کے ساتھ خواہ خوشی خوشی، اگر لوگوں نے جنگ برپا کر رکھی ہے اور نیزے تان رکھے ہیں تو میں تجھے کیوں جنت سے گریزاں دیکھ رہا ہوں"۔

اس کے بعد وہ مدمقابل میں اترے، اتنے میں ان کا چچازاد بھائی ایک گوشت لگی ہوئی ہڈی لے آیا اور بولا: اس کے ذریعہ اپنی پیٹھ مضبوط کرلو، کیونکہ ان دنوں تمہیں سخت حالات سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ انہوں نے ہڈی لے کر ایک بار نوچی پھر پھینک کر تلوار تھام لی اور اپنے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے آگے بڑھے: تم دنیا میں مشغول ہو؟! گوشت کا ٹکڑا پھینک کر آگے بڑھے اور لڑتے لڑتے شہید ہو گئے، اور یہ دن کا آخری حصہ تھا۔ (الصراع مع الصلیبیین، ص: 61)

۴: حضرت خالد بن ولیدؓ بحیثیتِ سپہ سالار:

جب حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کی شہادت ہوگئی تو علم ان کے ہاتھ سے گر گیا اور حضرت ثابت بن اَقرم بن ثعلبہ بن عدی بن عجلان البلوی الأنصاری نے علم پکڑ لیا اور کہا: اے مسلمانو! اپنے میں سے ایک شخص کا انتخاب کرو، صحابہ کرام نے کہا: یہ کام میں نہیں کرسکتا ہوں! اس کے بعد لوگوں نے حضرت خالد بن ولیدؓ کے بارے میں اتفاق کرلیا۔ (دیکھیں: سیرت ابن ہشام: 4/27)

"امتاع الأسماع" میں ہے کہ حضرت ثابت بن اَقرم نے حضرت خالد بن ولیدؓ کی جانب دیکھا اور کہا: اے ابو سلیمان! علم تھام لیجئے! انہوں نے کہا: میں اس کو نہیں پکڑوں گا، آپ اس کے زیادہ حقدار ہیں، آپ ایک بزرگ شخصیت کے مالک ہیں اور بدر میں بھی شریک رہے ہیں، حضرت ثابتؓ نے کہا: جناب! آپ اس کو پکڑ لیں، اللہ کی قسم! میں نے تو یہ آپ ہی کے لئے پکڑا ہے، اس کے بعد حضرت خالد بن ولیدؓ نے علم پکڑ لیا۔ (امتاع الأسماع: 1/348)

اس سخت جاں گھڑی میں حضرت خالدؓ کے ذمہ بنیادی منصوبہ یہ تھا کہ مسلمانوں کو اجتماعی قتل عام سے بچائیں، انہوں نے سب سے پہلے صورتحال کا اور مختلف احتمالات کا باریک بینی کے ساتھ جائزہ لیا اور معرکہ کے حالات کا مکمل مطالعہ کیا اور اس کے نتائج پر غور کیا اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ کم سے کم نقصان برداشت کرکے یہاں سے نکل جانا افضل ترین حل ہے، اس لئے کہ دشمن کی طاقت و قوت مسلمانوں کی طاقت و قوت سے چھیاسٹھ گنا زیادہ ہے، اس لئے منظم طریقہ سے یہاں سے نکل جانا ہی ایک راستہ ہے، اس بنیاد پر حضرت خالدؓ نے مندرجہ ذیل منصوبہ کے مطابق کام کیا:

أ: اسلامی لشکر میں کچھ تبدیلیاں کی جائیں تاکہ اسلامی لشکر کا وہاں سے نکلنا آسان ہو۔

ب: اس ہدف کے حصول کے لئے دشمن کو دھوکہ میں رکھنا اور یہ باور کرانا ضروری تھا کہ اسلامی لشکر کے پاس نئی کمک پہنچ گئی ہے جس کی وجہ سے ان کے حملوں میں کمی آئے اور مسلمانوں کے لئے وہاں سے نکلنا ممکن ہو، اس منصوبہ پر عمل کرتے ہوئے شام تک حضرت خالدؓ ڈٹے رہے اور رات کی تاریکی میں اپنے لشکر کی طرف ترتیب بدل دی، میمنہ کو میسرہ اور میسرہ کو میمنہ کی طرف کردیا، مقدمہ کو ساقہ اور ساقہ کو مقدمہ کی طرف کردیا، انہوں نے بلند آواز سے نعرے لگائے اور خوب شور کیا، اس کے بعد فجر کے وقت دشمن پر تازہ دم ہوکر پے در پے حملے

کر کے ان کو خوفزدہ اور حیران کر دیا، اور ان کو ایسا لگا جیسے کہ بہت سی کمک مسلمانوں تک پہنچ گئی ہے۔(دیکھیں: البدایہ والنہایہ: 4/247، الواقدی: 2/764)

حضرت خالدؓ کا یہ منصوبہ کامیاب ہوا، اس لئے جب صبح ہوئی تو دشمن نے دیکھا کہ ان کے سامنے چہرے اور جھنڈے بالکل نئے ہیں جو انہوں نے اس سے پہلے نہیں دیکھے تھے اور مسلمان تازہ دم ہو کر تابڑ توڑ حملے کر رہے ہیں، اس لئے ان کو یقین ہو گیا کہ ان کو نئی کمک مل گئی ہے اور ایک نیا لشکر میدانِ کارزار میں اتر چکا ہے اور مسلمانوں کی جوانمردی اور استقامت نے رومیوں کو اور ان کے خلفاء کو منتشر کر دیا، اس لئے ان کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ مسلمانوں کے خلاف حتمی اور یقینی کامیابی حاصل کرنا ایک ناممکن چیز ہے، اس لئے ان کی ہمتیں ٹوٹ گئیں ،ان کے حملوں میں کمی آگئی اور اس کے نتیجہ میں مسلمان لشکر پر دباؤ کم ہوا اور حضرت خالدؓ نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور میدان سے نکلنے کا عمل شروع کیا اور پسپائی کا یہ عمل عسکری تاریخ میں کامیاب ترین عمل رہا ہے، بلکہ یہ عمل جدید حکمتِ عملی کے عین مطابق ہے۔

مؤرخین کہتے ہیں کہ اس معرکہ میں مسلمانوں کو صرف نو جانوں کا خسارہ اٹھانا پڑا اور حضرت خالدؓ کا قول ہے کہ: ''جنگ مؤتہ کے روز میرے ہاتھ میں نو تلواریں ٹوٹ گئیں، پھر میرے ہاتھ میں صرف ایک یمنی چھوٹی سی تلوار بچی''۔(صحیح بخاری: 4265، الدلائل للبیہقی: 4/373، معارک خالد بن الولید، ڈاکٹر یاسمین سوید، ص: 173)

یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت خالدؓ نے اپنی اس حکمتِ عملی کے ذریعہ مسلمانوں کو ایک خطرناک شکست اور یقینی قتلِ عام سے بچا لیا اور ان کی پسپائی معرکہ کی صورتحال کو دیکھتے ہوئے عظیم کامیابی تھی، اس لئے کہ اس طرح کی صورتحال میں میدانِ جنگ سے پسپائی اختیار کرنا مفید ترین عمل ہوتا ہے۔

۵: معجزۂ رسولؐ اور اسلامی لشکر کے بارے میں اہلِ مدینہ کا موقف:

اس سریہ میں رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ایک اہم معجزہ کا ظہور ہوا، اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے خبر پہنچنے سے پہلے ہی مدینہ میں مسلمانوں کو حضرت زیدؓ، حضرت جعفرؓ اور حضرت عبداللہ بن اَبی رواحہؓ کی شہادت کی خبر دی، اللہ کے رسولؐ انتہائی غمگیں ہوئے، آپؐ کی مبارک آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، اور اس کے بعد آپؐ نے مسلمانوں کو خبر دی کہ اب خالد نے جھنڈا تھام لیا ہے اور ان کے ذریعہ ہونے والی فتح کی خوشخبری دی اور آپؐ نے ان کو "سیف اللہ" کا لقب دیا۔(نضرۃ النعیم: 1/360)

بعد میں رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے پاس مؤتہ سے خبر دینے والا پہنچا تو اس نے بھی ہو بہو وہ بات بتائی جو رسول اللہ ﷺ نے بتادی تھی۔(دیکھیں: البدایہ والنہایہ: 4/255)

جب اسلامی لشکر مدینہ کے قریب پہنچا تو رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں نے ان کا استقبال کیا، بچوں نے لپک کر ان سے ملاقات کی اور رسول اللہ ﷺ لوگوں کے ساتھ ایک سواری پر سوار تھے اور فرمایا: بچوں کو اٹھاؤ اور مجھے جعفرؓ کا بیٹا دو، حضرت عبداللہؓ کو لایا گیا، آپؐ نے ان کو ہاتھوں میں لیا اور لوگ لشکر کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کرنے لگے اور کہنے لگے: اے بھگوڑو! کیا تم اللہ کے راستے سے بھاگ

گئے ؟! رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ بھگوڑے اور فرار اختیار کرنے والے نہیں ہیں، بلکہ وہ ان شاءاللہ پلٹ کر حملہ کرنے والے ہیں۔ (الدلائل للبیہقی: 4/374، سیرت ابن ہشام: 4/24، السیرۃ النبویۃ للندوی، ص328، تاریخ الذہبی، ص: 491)

انسان کو اس نبوی تربیت پر تعجب ہوتا ہے جس نے چھوٹے بچوں کو بھی یہ شعور دیا جو اللہ کے راستہ سے بغیر شہادت کے واپس آنے کو فرار قرار دے رہے ہیں اور اس کی وجہ سے طرح طرح کے طعنے دیتے ہیں، لہذا آج کے ہمارے نوجوانوں کا ان بچوں کے ساتھ کیا موازنہ کیا جا سکتا ہے ؟! امت اپنے عظیم مقاصد کو ایسی ہی نبوی تربیت کے ذریعہ حاصل کر سکتی ہے۔ (دروس و عبر من الجہاد النبوی، ص: 358)

٦: دروس واسباق اور فوائد:

اس غزوہ میں بہت سے دروس و عبر تیں ہیں، ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

أ: اس معرکہ کی اہمیت:

مسلمانوں اور صلیبیوں کے درمیان جو بھی معرکے ہوئے اس معرکہ کو سب سے اہم معرکہ سمجھا جاتا ہے، اس لئے کہ یہ فریقین کے درمیان پہلا اہم معرکہ تھا اور اس معرکہ کے رومی حکومت کے مستقبل پر اہم اثرات مرتب ہوئے، یہ معرکہ بلادِ شام کی فتوحات اور رومیوں کے تسلط سے اس کو آزاد کرانے کی تمہید تھا، ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ غزوہ بلادِ شام کی جابرانہ رومی حکومت کے خاتمہ کے لئے نبی کریم ﷺ کی طرف سے عملی اقدام تھا، اس کی ہیبت سے عربوں کے دل دھل گئے اور اس نے مسلمانوں کے حوصلوں کو بلند کر دیا، اسی طرح اس کے ذریعہ صلیبی فوج کی معنوی اور نفسیاتی کمزوری کا بھی اظہار ہوا اور اس کے ذریعہ مسلمانوں کو اس بات کا موقع ملا کہ وہ رومی افواج کی طاقت و قوت اور اس کے جنگی اسالیب سے واقف ہوں۔ (دیکھیں: الصراع مع الصلیبین، ص64)

٢: شوقِ شہادت قربانی کا محرک:

بے شک صبر و ثبات اور قربانی کے جس کردار کا تینوں امراء نے اور تمام لشکر نے مظاہرہ کیا، اس کا اصل محرّک مجاہدین کے لئے اجر وثواب اور حصولِ شہادت کا شوق تھا، تاکہ اللہ تعالیٰ ان کو انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی رفاقت سے سرفراز فرمائے اور وہ وسیع اور عریض جنت میں داخل ہو سکیں۔

٣: اس معرکہ کی اہم خصوصیات اور امتیازات:

یہ تنہا ایسا معرکہ ہے جس کے متعلق آسمان سے وحی آئی، اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے تینوں جانباز امراء کی شہادت کے بارے میں سرزمینِ معرکہ سے خبر ملنے سے پہلے ہی اطلاع دی، بلکہ نبی کریم ﷺ نے وہاں کی صورتحال اور واقعات کے بارے میں خبر دی، اس معرکہ کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ تنہا ایسا معرکہ ہے جس کے لئے نبی کریم ﷺ نے بالترتیب تین امراء کا انتخاب فرمایا: حضرت زید بن حارثہ، حضرت جعفر بن ابی طالب اور حضرت عبداللہ بن رواحہ - رضی اللہ عنہم -

۴: آلِ جعفرؓ کے لئے نبی کریمؐ کا اعزاز واکرام:

جب حضرت جعفرؓ کی شہادت ہوئی تو رسول اللہ ﷺ حضرت اُسماء بنت عمیسؓ کے پاس تشریف لے گئے اور کہا: میرے پاس جعفرؓ کے بیٹوں کو لاؤ، وہ ان کو لے کر آئیں، آپؐ نے ان کو قریب کیا اور ان کو بوسہ دیا۔ آپؐ کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں، حضرت اُسماءؓ نے دریافت کیا: کیا آپ کو جعفر اور ان کے اصحاب کے بارے میں کچھ معلوم ہوا؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں، وہ آج شہادت سے سرفراز ہو گئے۔ حضرت اُسماءؓ یہ سن کر آہ وبکا اور گریہ زاری کرنے لگیں، یہ دیکھ کر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جعفر کے گھر والوں کے لئے کھانا پکاؤ، اس لئے کہ آج وہ اپنے صاحب کی وجہ سے مشغول ہیں۔ (مسند أحمد: 6/380، سنن ابن ماجہ: 1611، مجمع الزوائد: 6/161، الدلائل للبیہقی: 4/370، سیرت ابن ہشام: 4/22)

<u>اس واقعہ میں چند امور قابل غور ہیں:</u>

أ: جس عورت کے شوہر کا انتقال ہو اس کے لئے رونے کا جواز۔

ب: میت کے گھر والوں کے لئے کھانا تیار کرنے کا استحباب۔

البتہ اللہ کے رسول ﷺ نے تین روز کے بعد میت پر رونے کو ممنوع قرار دیا ہے، آپؐ تین دن کے بعد حضرت اُسماءؓ کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے فرمایا: آج کے بعد میرے بھائی پر مت رونا، میرے پاس میرے بھائی کے بچوں (بھتیجوں) کو لاؤ۔ ان کو لایا گیا، وہ چوزوں کی طرح لگ رہے تھے، آپؐ نے حلاق (نائی) کو بلوایا اور ان کے سروں کو منڈوایا۔ (مسند احمد: 1/204، سنن ابوداؤد: 4192، سنن نسائی: 8/182)

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا: جہاں تک محمد کا تعلق ہے تو وہ ہمارے چچا ابو طالب کے مشابہ ہیں اور جہاں تک عبد اللہ کا تعلق ہے تو وہ میری صورت وسیرت کے مشابہ ہیں، اس کے بعد آپؐ نے حضرت عبد اللہ کا دایاں ہاتھ پکڑا اور کہا: اے اللہ! جعفر کے اہلِ خانہ کو نعم البدل عطا فرما اور عبد اللہ کے لئے ان کی بیع میں برکت عطا فرما۔ آپؐ نے تین مرتبہ یہ دعا دی۔ (البدایہ والنہایہ: 4/252) اور جب ان کی والدہ نے آپؐ سے ان کی یتیمی اور ان کی لاچاری کا ذکر کیا تو آپؐ نے ان سے فرمایا: آپ کو ان کے فقر کا اندیشہ ہے؟! میں دنیا اور آخرت میں ان کا ولی ہوں۔ (مسند أحمد: 1/204)

یہ نبوی منہج ہے جو آپؐ نے شہداء کے بچوں کی کفالت وتکریم کے سلسلہ میں متعین فرمایا ہے تاکہ امت آپؐ کے مبارک طریقہ کار کے مطابق عمل پیرا رہے۔

ج: حضرت ابو بکر صدیقؓ کے ساتھ اُسماء بنت عمیسؓ کا نکاح:

جب حضرت اُسماء بنت عمیسؓ کی عدت مکمل ہو گئی تو حضرت ابو بکر صدیقؓ نے ان کو پیغامِ نکاح دیا اور ان سے شادی کر لی، ان کے بطن سے محمد بن ابو بکر کی ولادت ہوئی اور حضرت ابو بکر صدیقؓ کی وفات کے بعد ان کے ساتھ حضرت علی بن ابی طالبؓ نے شادی کی اور کئی بچے ان کے بطن سے تولد ہوئے۔ دیکھیں: البدایہ والنہایہ: 4/353)

۵: قیادت کا طریقہ کار:

صحابی جلیل حضرت ثابت بن اکرم عجلانی نے ہمارے لئے ایک عظیم درس چھوڑا جبکہ انہوں نے آخری امیر حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کی شہادت کے بعد پرچم سنبھالا، ایسا انہوں نے اپنی ذمہ داری نبھاتے ہوئے کیا، اس لئے کہ عَلم کے گر جانے کا مطلب تھا لشکر کی ہزیمت، اس کے بعد انہوں نے مسلمانوں کو آواز دی کہ اپنے لئے ایک قائد کا انتخاب کریں، اس سنگین صورتحال میں لوگوں نے کہا: آپ ہی قیادت سنبھالیں، انہوں نے کہا: میں یہ نہیں کرسکتا ہوں، اس لئے تمام صحابہ کرام نے حضرت خالدؓ کی قیادت پر اتفاق کرلیا۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت ثابتؓ عَلم لے کر حضرت خالدؓ کے پاس گئے تو خالدؓ نے کہا: میں تم سے یہ نہیں لوں گا! آپ اس کے زیادہ حقدار اور اہل ہیں۔ انہوں نے کہا: میں نے اس کو آپ ہی کے لئے پکڑا ہے۔

ان دونوں روایتوں کا مضمون ایک طرح کا ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت ثابتؓ نے پہلے تمام مسلمانوں کو جمع کیا اور اہل اور مستحق شخص ابو سلیمان حضرت خالد بن ولیدؓ کو عَلم دے دیا، انہوں نے مسلمانوں کی یہ بات نہیں مانی کہ آپ ہی ہمارے امیر ہو، اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ ان کے درمیان ایسا شخص موجود ہے جو اس کام کے لئے زیادہ اہل ہے اور جب ایسا شخص کسی کام کی ذمہ داری سنبھالے گا جو اس کا اہل نہ ہو تو اس کے نتیجہ میں بگاڑ برپا ہوگا، اور جب عمل اللہ کے لئے ہوگا تو اس میں طلبِ شہرت یا نفسانی خواہش کا کوئی عمل دخل نہیں ہوگا۔

بے شک بہت سے لوگ جو آج تحریکِ اسلامی کی قیادت کرتے ہیں، وہ نئی ابھرنے والی طاقتوں اور صلاحیت مند افراد کے سامنے رکاوٹیں حائل کرتے ہیں اور ان کو اپنی قیادت اور دنیاوی مفادات کے بارے میں خطرہ ہوتا ہے، اس لئے ایسے قائدین کو اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔

٦: قیادت کے احترام کے سلسلہ میں درس نبوی:

حضرت عوف بن مالک اُشجعیؓ کہتے ہیں: میں بھی زید بن حارثہؓ کے ساتھ دوسرے رفقاء کے ساتھ غزوۂ مؤتہ میں نکلا، قبیلۂ حمیر کا ایک شخص میرا رفیقِ سفر تھا، رومی لشکروں کے ساتھ ہمارا آمنا سامنا ہوا، ایک رومی سردار سرخ رنگ کے گھوڑے پر سوار تھا جس کی زین اور اسلحہ پر سونے کا ملمع کیا گیا تھا، وہ مسلمانوں کو بے تحاشا نقصان پہنچانے لگا۔ حمیری نے جب اس رومی کو دیکھا کہ وہ مسلمانوں کو مسلسل نقصان پہنچا رہا ہے تو وہ ایک چٹان کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ جب رومی اس کے قریب سے گزرا تو اس نے اچانک اس کے گھوڑے پر حملہ کر دیا، گھوڑا اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا، سوار سمیت گر گیا، رومی سردار اپنی جان بچانے کے لئے بھاگا تو حمیری نے اس کا پیچھا کیا اور اس پر حملہ کر کے اسے قتل کر دیا، رومی کا گھوڑا، اس کی زین، اس کا اسلحہ اب حمیری کے قبضے میں آگیا۔ جب مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی تو حضرت خالد بن ولیدؓ نے اس حمیری کو پیغام بھیجوایا کہ اس سامان میں سے کچھ سامان انھیں بھجوا دیں، چنانچہ اس حمیری نے کچھ مالِ غنیمت سیدنا خالد بن ولیدؓ کو بھجوا دیا۔

اِدھر سیدنا عوف بن مالک اشجعیؓ کے نزدیک یہ بات درست نہ تھی، وہ خالد بن ولیدؓ کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ خالد! آپ کو علم نہیں رسول اللہ ﷺ نے مقتول کا سامان (سلب) قاتل کو دلایا ہے۔ سیدنا خالدؓ نے جواب دیا کہ آپ کی بات درست ہے مگر میرے نزدیک یہ سامان بہت زیادہ ہے، اس لئے میں نے حمیری سے کچھ منگوالیا ہے۔

عوف بن مالکؓ کہنے لگے کہ آپ یہ پورا سامان اس حمیری کو دے دیں، ورنہ میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے اس مال کے حوالہ سے ضرور سوال اٹھاؤں گا، اس کے باوجود حضرت خالدؓ نے وہ مال واپس کرنے سے انکار کر دیا۔

لشکر واپس مدینہ طیبہ آگیا، سیدنا عوف بن مالکؓ اللہ کے رسول ﷺ سے ملاقات کرتے ہیں، دورانِ ملاقات انہوں نے اس حمیری کا سارا واقعہ بیان کر دیا اور سیدنا خالدؓ کا موقف بھی بیان کر دیا۔

اللہ کے رسول ﷺ نے خالد بن ولیدؓ سے پوچھا: "يَا خَالِدُ! مَاحَمَلَكَ عَلَى مَا صَنَعْتَ؟" "خالد! تم نے ایسا کیوں کیا؟"

سیدنا خالدؓ کہنے لگے: اللہ کے رسول ﷺ! میرے نزدیک وہ ساز و سامان ایک آدمی کے لئے بہت زیادہ تھا۔ آپ ﷺ نے حکم دیا: "رُدَّ عَلَيْهِ الَّذِي أَخَذْتَ"۔ "حمیری سے جو کچھ لیا ہے، اسے واپس کر دو"۔

عوف بن مالکؓ کے حق میں فیصلہ ہو گیا تو بشری تقاضوں کے مطابق انہوں نے خالدؓ سے کہا: ہاں خالد، مزہ چکھ لو۔ کیا میں نے اپنی بات پوری نہیں کر دکھائی؟ آپ ﷺ نے پوچھا: وہ کیا بات ہے؟ میں نے آپ ﷺ کو پوری بات بتائی تو سخت ناراضی کا اظہار کیا اور فرمایا: "يَاخَالِدُ لَا تردہ عليه" "خالد! اب اس کا سامان واپس نہ کرنا۔" مزید ارشاد فرمایا: "کیا تم میرے مقرر کردہ امیروں کو میری وجہ سے معاف نہیں کر سکتے؟ ان کے معاملہ کا صاف صاف تمہارے لئے اور معاملہ کا گدلا پن ان کے اپنے ذمہ ہے"۔ (مسند أحمد 27/6 صحیح مسلم: 1753 سنن أبو داؤد: 2719)

یہ نبی کریم ﷺ کی طرف سے قائدین و امراء کی حمایت کے بارے میں عظیم موقف ہے کہ ان کے ساتھ کسی غلطی کی وجہ سے اہانت کا معاملہ نہ کیا جائے، اس لئے کہ وہ بشر ہیں، ان سے خطا کا امکان ہے اور بغیر کسی تنقیص اور توہین کے ان کی لغزشوں کی اصلاح کی کوشش کی جائے۔

اللہ کے رسول ﷺ کا یہ فرمانا: "کیا تم میرے مقرر کردہ امیروں کو میری وجہ سے معاف نہیں کر سکتے؟" اس میں حضرت خالدؓ کو ایک مزید تمغہ عطا کیا گیا، اس لئے کہ ان کو آپ نے امراء الرسول میں شمار کیا، اس طریقہ سے رسول اللہ ﷺ مختلف افراد کو اعزاز و اکرام سے نوازتے تھے۔ (دیکھیں: التاریخ الاسلامی للحمیدی: 7/130، من معین السیرۃ، ص: 378)

....

پانچواں باب

سریہ ذات السلاسل

ابھی غزوۂ مؤتہ سے آئے ہوئے مسلمانوں کو چند ہی ایام گزرے تھے یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت عمرو بن عاصؓ کی قیادت میں ذات السلاسل کی جانب بھیجنے کے لئے ایک لشکر تیار کیا اور یہ لشکر قبیلۂ قضاعہ کو سبق سکھانے کے لئے روانہ کیا گیا، جو جنگ مؤتہ کی وجہ سے غلط فہمی کا شکار تھے اور وہ اس میں رومیوں کے شانہ بشانہ کھڑے تھے، وہ جمع ہونے لگے تاکہ مدینہ کے قریب جا کر حملہ کریں، حضرت عمرو بن عاصؓ ان کے علاقہ میں پہنچے اور آپ کے ساتھ تین سو مہاجرین وانصار تھے، جب آپؓ دشمنوں کے جمع ہونے کی جگہ پہنچے تو ان کو معلوم ہوا کہ دشمن بہت بڑی تعداد میں جمع ہیں اس لئے انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے پاس پیغام بھجوایا کہ مزید کمک بھجوائیں، چنانچہ حضرت حضرت ابو عبیدہ بن جراحؓ کی قیادت میں کمک پہنچ گئی اور مسلمانوں نے کفار کے ساتھ جنگ شروع کر دی، حضرت عمروؓ قضاعہ کے علاقہ میں اندر تک پہنچ گئے، وہ اپنے گھروں کو چھوڑ کر بھاگ گئے، وہ اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے اور شکست کا شکار ہو گئے، حضرت عمروؓ اطرافِ شام میں اسلامی دھاک کو واپس لانے اور مسلمانوں کے سابق حلفاء کو واپس لانے میں کامیاب ہو گئے، یہاں تک کہ مزید قبائل بھی مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ کرنے لگے اور بنو عبس، بنو مرہ، اور بنو ذبیان میں سے بہت سے لوگ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے، اسی طرح قبیلۂ فزارہ اور اس کے سردار عیینہ بن حصن نے مسلمانوں کے ساتھ حلیفانہ معاہدہ کیا اور ان کے بعد عباس بن مرداس کی قیادت میں بنو سلیم نے بھی اور بنو اشجع نے بھی حلیفانہ معاہدہ کیا اور اس کی وجہ سے مسلمان بلادِ عرب کے شمال میں سب سے بڑی قوت بن کر نمودار ہوئے۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویہ الصحیحہ: 2/471، السیرۃ النبویہ، ابوشہبہ: 2/433)

دروس واسباق اور عبرت وفوائد:

اس سریہ میں بہت سے دروس واسباق اور عبرت وفوائد ہیں جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

ا: حضرت عمرو بن عاصؓ کا اخلاص:

حضرت عمرو بن عاصؓ فرماتے ہیں: اللہ کے رسول ﷺ نے مجھے بلوایا اور فرمایا: اپنے کپڑے پہنو اور ہتھیار لو، اس کے بعد میرے پاس آؤ، میں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؐ وضو فرما رہے تھے، آپؐ نے اوپر سے نیچے تک مجھ پر نظر دوڑائی اور فرمایا: میں آپ کو ایک لشکر کا امیر بنا کر بھیجنا چاہتا ہوں، اللہ آپ کی حفاظت بھی کرے گا اور آپ کو مالِ غنیمت بھی عطا کرے گا اور میں آپ کو مال کے بارے میں بہتر رغبت دلاتا ہوں۔ فرماتے ہیں: میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! میں نے مال کی وجہ سے اسلام قبول نہیں کیا ہے بلکہ میں نے اسلام کی رغبت میں اسلام قبول کیا ہے اور اس شوق میں کہ مجھے رسول اللہ ﷺ کی معیت نصیب ہو گی۔ یہ سن کر اللہ کے رسولؐ نے فرمایا:

اے عمرو! بہترین مال ایک صالح شخص کے لئے عمدہ چیز ہے۔(مسند أحمد 197/4 الأدب المفرد للبخاري: 299 صحیح ابن حبان: 3211 مستدرک حاکم 2/2و236/2)

یہ موقف حضرت عمرو بن عاصؓ کے اخلاص وللہیت، سچائی اوران کی ایمانی قوت پر دلالت کرتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کی معیت ورفاقت کاان کے اندر کتنا شوق تھااس سے اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے ان کے سامنے یہ واضح کیا کہ حلال مال جب ایک صالح شخص کو ملے تو وہ ایک عظیم نعمت ہے، اس لئے کہ وہ اس کے ذریعہ اللہ کی رضا حاصل کرتا ہے، اس کو خیر کے کاموں میں صرف کرتا ہے اور اپنے آپ کو اور اپنے گھرانے کی عزت کو محفوظ رکھتا ہے۔(دیکھیں: التاریخ الاسلامی للحمیدی: 7/133)

۲: اتحاد ذریعۂ طاقت ہے اور اختلاف باعثِ کمزوری:

جب رسول اللہ ﷺ کی طرف سے حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ کی قیادت میں غزوۂ ذات السلاسل کے لشکر کے لئے کمک پہنچی تو حضرت ابوعبیدہؓ نے لوگوں کی امامت کرنا چاہی اور حضرت عمروؓ سے آگے بڑھنا چاہا، حضرت عمروؓ نے کہا: آپ میرے پاس کمک اور مدد کی حیثیت سے آئے ہیں، آپ کے لئے مناسب نہیں ہے کہ آپ میری امامت کریں بلکہ امیر میں ہوں، اللہ کے رسول ﷺ نے آپ کو میری مدد کے لئے بھیجا ہے، مہاجرین کہنے لگے: ہر گز نہیں، بلکہ آپ اپنے اصحاب کے امیر ہیں اور وہ اپنے اصحاب کے امیر ہیں، حضرت عمروؓ نے کہا: نہیں، بلکہ آپ ہمارے لئے بطور کمک اور مدد ہیں، جب حضرت ابوعبیدہؓ نے اختلافی صورتحال دیکھی، وہ حسنِ اخلاق کے پیکر اور نرم طبیعت کے مالک تھے، تو انہوں نے کہا: اے عمرو، آپ مطمئن رہیں اور آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے جو آخری ہدایت کی ہے وہ یہ ہے کہ جب آپ اپنے ساتھی کے پاس پہنچو گے تو ایک دوسرے کی اطاعت کرنا اور اختلاف مت کرنا۔ اللہ کی قسم! اگر آپ میری بات نہیں مانیں گے تو میں ضرور آپ کی اطاعت کروں گا، اس کے بعد حضرت ابوعبیدہؓ نے حضرت عمروؓ کی اطاعت کی اور حضرت عمروؓ لوگوں کو نماز پڑھاتے تھے۔(دیکھیں: مغازی رسول اللہ لعروہ، ص: 207)

حضرت ابوعبیدہؓ کو اس بات کا ادراک تھا کہ سریہ ذات السلاسل میں مسلمانوں کے مابین کسی طرح کے اختلاف کے نتیجہ میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑ سکتا ہے اور اس طرح سے دشمن غالب ہو جائے گا، اسی لئے انہوں نے نزاعی صورتحال کو ختم کرنے میں پہل کی، اور حضرت عمرو بن عاصؓ کی امامت میں ایک سپاہی کی حیثیت سے شامل ہو گئے اور اس میں انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی ہدایت کی تعمیل کی۔(دیکھیں: غزوۃ الحدیبیہ، ابوفارس، ص 209)

۳: حضرت عمرو بن عاصؓ کا اپنے لشکر کی حفاظت کا اہتمام:

حضرت عمروؓ کی عبقریت ذات السلاسل کی جنگ میں اس وقت ظاہر ہوئی جبکہ انہوں نے وحدتِ صف اور اپنے لشکر کی حفاظت کا خصوصی اہتمام کیا، اس کے لئے انہوں نے متعدد اسالیب اور طریقے اختیار کئے جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

أ: وہ رات کو چلتے تھے اور دن میں چھپ جاتے تھے، اس کے ذریعہ وہ دشمن سے اپنی ہر نقل و حرکت کو مخفی رکھتے تھے اور اپنے لشکر کو سخت گرمی سے بھی محفوظ رکھتے تھے تاکہ وہ تازہ دم رہیں اور پورے نشاط اور قوت کے ساتھ دشمن کا مواجہہ کریں۔

ب: لشکر کو آگ جلانے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

ج: دشمن کی شکست کے بعد دشمن کا پیچھا کرنے سے مسلمانوں کو منع کیا۔

۴: حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کا تفقہ:

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''غزوہ ذات السلاسل کی ایک ٹھنڈی رات میں مجھے احتلام ہو گیا اور مجھے یہ ڈر لگا کہ اگر میں نے غسل کر لیا تو مر جاؤں گا، چنانچہ میں نے تیمم کر کے اپنے ساتھیوں کو فجر پڑھائی، لوگوں نے نبی اکرم ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''عمرو! تم نے جنابت کی حالت میں اپنے ساتھیوں کو نماز پڑھائی؟''۔ چنانچہ میں نے آپ ﷺ کو غسل نہ کرنے کا سبب بتایا اور کہا: میں نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان سنا کہ ﴿وَلَا تَقْتُلُوٓا۟ أَنفُسَكُمْ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا﴾ ترجمہ: ''تم اپنے آپ کو قتل نہ کرو، بیشک اللہ تم پر رحم کرنے والا ہے''۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ ہنسے اور آپ ﷺ نے کچھ نہیں کہا''۔ (مسند أحمد:203/4 سنن أبو داؤد:334 صحیح السیرة النبویة، ص:509)

اس واقعہ سے بعض احکام مستنبط ہوتے ہیں:

أ: پانی کے موجود ہونے کے باوجود جنبی کے لئے تیمم غسل کے قائم مقام ہو جاتا ہے، جبکہ پانی کے استعمال سے ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہو، چنانچہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے تیمم کیا جبکہ انہوں نے حالتِ جنابت میں صبح کی، حالانکہ پانی موجود تھا اور تیمم کر کے انہوں نے نماز پڑھائی اور رسول اللہ ﷺ نے بھی اس پر خاموشی اختیار کی اور کوئی نکیر نہیں کی۔

ب: اس کے ذریعہ اللہ کے رسول ﷺ کے دور میں بھی اجتہاد کا جواز ملتا ہے، چنانچہ حضرت عمرو رضی اللہ عنہ نے اجتہاد کیا اور پھر رسول اللہ ﷺ کی طرف سے دو چیزوں کی تائید حاصل ہوئی:

۱) اجتہاد کا جواز ۲) حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کے اجتہاد کا صحیح ہونا۔

ج: تیمم کے جواز کا ایک سبب سخت سردی کی وجہ سے پانی استعمال نہ کر سکنے کا عذر بھی ہے۔

د: تیمم کرنے والا وضو کرنے والے شخص کی امامت کر سکتا ہے، حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے تیمم کر کے وضو کرنے والے پانچ سو صحابہ کرام کو نماز پڑھائی اور رسول اللہ ﷺ نے بھی اس کی تائید فرمائی۔

ھ: حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کا یہ اجتہاد ان کے تفقہ، عقلمندی و ذہانت اور دلیل سے حکم کو مستنبط کرنے کی صلاحیت پر دلالت کرتا ہے، حالانکہ ابھی حضرت عمرو کو اسلام لائے ہوئے صرف چار ماہ ہوئے تھے، لیکن ان کی فقہی بصیرت نے ان کو اس آیت کے ذریعہ یہ مسئلہ مستنبط کرنے کا اہل بنایا۔ (دیکھیں: غزوة الحدیبیہ، ابو فارس، ص:210 من معین السیرة، ص:381)

۵: شمالی علاقوں میں رسول اللہ ﷺ کی عسکری مہموں کے نتائج:

صلح حدیبیہ کے بعد مسلمانوں کے عسکری حملوں کا رخ شمالی علاقوں کی جانب مڑ گیا اور جزیرۃ العرب کا مغرب اور اس کا مغربی جنوبی حصہ بھی مکہ کی جانب صلح حدیبیہ کی وجہ سے پُر امن و محفوظ ہو گیا اور جزیرۃ العرب کے شمال میں رسول اللہ ﷺ کی طرف سے شروع کی گئی جنگی مہموں اور سرایا نے اپنے مقاصد اور اہداف مکمل طور پر حاصل کر لئے، اور یہ عسکری تحریک رومی حدود تک پہنچ گئی، اس کی وجہ سے اسلامی حکومت کی تمام حدود پُر امن و محفوظ ہو گئیں، چاروں طرف اس کی ہیبت بیٹھ گئی اور دشمنوں کی طرف سے مدینہ پر حملہ کرنے کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں اور اس طرح سے سرایا کی تحریک کے ذریعہ نبوی حکمتِ عملی کے نتیجہ میں دو عظیم ہدف حاصل ہوئے اور وہ تھے:

۱: داخلی سطح پر دین اسلامی کی حمایت کا یقینی بن جانا۔ ۲: بیرون سے بھی حمایت کا حصول۔(دیکھیں: المجتمع المدنی، للعمری، ص:170 الاعلام فی صدر الاسلام، د۔عبد الطیف حمزہ، ص:173)

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ سیرت نبویہ کے تمام واقعات اور اس کی تفصیلات و باریکیوں پر غور و فکر کرنے والے کے سامنے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ صلح حدیبیہ اہم ترین سیاسی، عسکری اور اعلامی فوائد و نتائج میں سے ہیں، بلکہ عہد نبوی میں اسلام اور بت پرستی کے درمیان ہونے والے معرکوں کا اہم ایجابی نتیجہ ہے جس نے ایک طرف سے اسلامی بنیادوں کو راسخ کیا اور دوسری طرف شرک و بت پرستی کی بنیادوں کو متزلزل کر کے رکھ دیا، خیبر کی فتح ہو، مؤتہ کی کامیابی ہو یا ذات السلاسل میں اسلامی ریاست کی ہیبت اور دھاک کا مسئلہ ہو، یہ سب صلح حدیبیہ سے حاصل ہونے والے نتائج ہیں اور یہ اقوام و ملل کے بارے میں اور حکومت سازی کے بارے میں اللہ کے قوانین اور ضوابط پر نبوی تعامل اور حکمتِ عملی کا نتیجہ ہے۔(دیکھیں: منہج الاعلام الاسلامی، ص:337)

....

پندرھویں فصل

غزوۂ فتح مکہ (8ھ)

پہلا باب

فتح مکہ کے اسباب، تیاری اور آغاز

ا: اسباب:

قریش نے اس وقت ایک خطرناک غلطی کا ارتکاب کیا جبکہ انہوں نے مسلمانوں کے حلیف قبیلۂ خزاعہ کے مقابلہ میں اپنے حلیف قبیلۂ بنو بکر کی اعانت کی، ان کی مدد انہوں نے ہتھیاروں اور گھوڑوں کے ذریعہ بھی کی اور قریش کے لوگ بھی ان کے ساتھ شریک ہوئے، بنو بکر اور ان کے حلیفوں نے "الوتیر" نامی پانی کے پاس قبیلۂ خزاعہ پر حملہ کیا اور ان کے بیس سے زائد افراد کو قتل کر دیا اور جب خزاعہ کے لوگوں نے حرم میں پناہ لی اور وہ جنگ کے لئے تیاری کے ساتھ نہیں نکلے تھے، انہوں نے بنو بکر کے قائد سے کہا: اے نوفل! اب ہم حرم میں داخل ہو گئے ہیں، اپنے معبود کا خیال کرو! اپنے معبود کا خیال کرو! جواب ملا کہ آج کے دن کوئی معبود نہیں۔ اے بنی بکر! آج بدلہ چکا لو، اس کے بعد تمہیں موقع نہیں ملے گا۔ اس موقع پر عمرو بن سالم خزاعی قبیلۂ خزاعہ کے چالیس افراد کے ساتھ نکلے، یہاں تک کہ مدینہ منورہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچ گئے اور آپ کے سامنے بنو بکر کے بارے میں اپنے مارے گئے لوگوں کے بارے میں اور قریش کی اعانت کے بارے میں پوری صورتحال بتادی اور عمرو بن سالم رسول اللہ ﷺ کے سامنے کھڑے ہوئے جب کہ رسول اللہ ﷺ لوگوں کے درمیان مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے، اس نے آپ ؐ کے سامنے ان اشعار کے ذریعہ اپنی فریاد کی:

يا رب إني ناشدٌ محمَّدا ... حلفَ أبينا وأبيه الأَتْلدا
قدْ كنتم ولْداً وكُنَّا والدا ... ثُمَّت أَسلمنا فلَم ننزِع يدا
فانصر هداكَ اللَّه نصرًا أعتدا ... وادعُ عبادَ اللَّه يأْتُوا مددا
فيهم رسولُ اللَّه قدْ تجرَّدا ... إنْ سيم خسفًا وجهه تربَّدا
في فيلق كالْبحرِ يجري مزبدًا ... إنَّ قريشا أخلفوكَ الْموعدَا
ونقضوا ميثاقكَ الْموكَّدا ... وجعلوا لي في كداء رصَّدا
وزعموا أَنْ لست أَدعو أحدا ... وهم أَذلُّ وأَقلُّ عددا
هم بيَّتونَا بالْوتير هجَّدًا ... وقتلُونا ركَّعا وسجَّدا

ترجمہ: "اے پروردگار! میں محمد سے ان کے عہد اور ان کے والد کے قدیم عہد کی دہائی دے رہا ہوں۔ آپ لوگ اولاد تھے اور ہم جننے والے تھے، پھر ہم نے تابعداری اختیار کی اور کبھی دست کش نہ ہوئے۔ اللہ آپ کو ہدایت دے، آپ پر زور مدد کیجئے اور اللہ کے بندوں کو پکاریئے، وہ نصرت و مدد کے لئے آئیں گے جن میں اللہ کے رسول خود موجود ہوں گے، آپ ہتھیار پوش، چودھویں کے چاند کی طرح گورے اور خوبصورت، اگر ان پر ظلم اور ان کی توہین کی جائے تو چہرہ تمتما اٹھتا ہے۔ آپ ایک ایسے لشکر جرار کے اندر تشریف لائیں گے جو جھاگ بھرے سمندر کی طرح تلاطم خیز ہوگا۔ یقیناً قریش نے آپ کے عہد کی خلاف ورزی کی ہے اور آپ کا پختہ پیمان توڑ دیا ہے، انہوں نے میرے لئے

کداء میں گھات لگائی، اور یہ سمجھا کہ میں کسی کو مدد کے لئے نہ پکاروں گا، حالانکہ وہ بڑے ذلیل اور تعداد میں قلیل ہیں۔ انہوں نے 'وتیر' پر رات میں حملہ کیا اور ہمیں رکوع اور سجود کی حالت میں قتل کیا"۔

یہ سن کر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اے عمرو بن سالم! تمہاری مدد لازمی ہے، اگر میں بنو کعب کی مدد نہ کروں تو اللہ میری مدد نہ کرے، اس کے بعد جب آسمان میں بادل کا ایک ٹکڑا دکھائی پڑا تو آپؐ نے فرمایا: یہ بادل بنو کعب کی مدد کی بشارت سے دمک رہا ہے۔ (السنن الکبریٰ للبیہقی: 9/233، لابن کثیر: 4/278)

ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب قریش کی اس حرکت کے بارے میں سنا اور اس خبر کی تحقیق کرلی تو آپؐ نے قریش کو پیغام بھجوایا اور ان سے فرمایا: اَمابعد! اگر آپ لوگ بنو بکر کے حلیفانہ معاہدہ سے اعلانِ براءت کروگے تو خزاعہ کے مقتولین کی دیت ادا کروگے، ورنہ میں تمہارے خلاف اعلانِ جنگ کرتا ہوں، یہ سن کر قرظہ بن عبد عمرو بن نوفل بن عبد مناف - جو حضرت معاویہؓ کے داماد تھے - نے کہا: بلاشبہ بنو بکر ایک منحوس قوم ہے، لہذا ہم ان کے مقتولین کی دیت نہیں دے سکتے ہیں، اگر ہم نے ایسا کیا تو پھر ہمارے پاس کچھ بھی نہیں بچے گا، اور نہ ہی ہم ان کے حلیفانہ معاہدہ سے دستبردار ہو سکتے ہیں، اس لئے کہ ان کے سوا اب کوئی ہمارے دین پر باقی نہیں بچا ہے، البتہ ہم اعلانِ جنگ کرتے ہیں۔ (دیکھیں: المطالب العالیہ: 4/243)

اس میں اس بات کی دلیل موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قریش کے خلاف اچانک جنگ نہیں کی بلکہ پہلے ان کو اختیار دیا تھا اور آگاہ کیا تھا لیکن انہوں نے جنگ کا انتخاب کیا تھا۔

۲: ابوسفیان کے ذریعہ قریش کی حماقت کی تلافی کی کوشش:

قریش نے ابوسفیان کو تجدیدِ صلح اور مدتِ صلح میں توسیع کے لئے بھیجا وہ جب مدینہ منورہ پہنچا اور رسول اللہ ﷺ کے پاس اپنی ضرورت پیش کرنے کے لئے حاضر ہوا لیکن آپؐ نے اس سے اعراض کیا اور اس کو کوئی جواب نہیں دیا، اس لئے اس نے حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ جیسے کبار صحابہ سے اس سلسلہ میں مدد طلب کی تاکہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ان کی سفارش کریں لیکن سب نے ایسا کرنے سے انکار کیا، اس لئے ابوسفیان اپنے مقصد میں بغیر کسی کامیابی کے مکہ واپس لوٹ گیا۔

مدینہ میں قیام کے دوران قابلِ ذکر واقعہ یہ ہے کہ وہ جب اپنی صاحبزادی اُم المؤمنین حضرت اُم حبیبہؓ کے گھر گیا اور اس نے رسول اللہ ﷺ کے فرش پر بیٹھنا چاہا تو حضرت ام حبیبہؓ نے فرش لپیٹ دیا، اس نے سوال کیا: بیٹی مجھے معلوم نہیں ہو پارہا ہے کہ کیا آپ نے اس بستر کو میرے لائق نہیں سمجھا، یا مجھے اس کے لائق نہیں سمجھا؟ انہوں نے جواب دیا: بلکہ یہ رسول اللہ ﷺ کا بستر ہے اور آپ مشرک اور ناپاک ہیں۔ اس نے کہا: اللہ کی قسم! میرے بعد تجھے شر لاحق ہو گیا ہے۔ (دیکھیں: البدایہ والنہایہ: 4/479)

حضرت اُم حبیبہؓ کی طرف سے اس طرح کے موقف میں کوئی تعجب نہیں ہے، انہوں نے دو ہجرتیں کی ہیں اور انہوں نے ایک عرصہ دراز سے جاہلیت سے اپنے تعلقات منقطع کر دیئے تھے، بلکہ آپ نے سولہ سال سے اپنے والد کو نہیں دیکھا تھا اور جب ان کو دیکھا تو ان

کے اندر اس باپ کی شخصیت کو نہیں پایا جس کی عزت و توقیر کی جائے بلکہ ان کے اندر کفر کے اس سرغنہ کی شخصیت کو دیکھا جو اسلام کی مخالفت میں پیش پیش رہا اور سالہا سال تک رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بر سرِ پیکار رہا۔(دیکھیں: من معین السیرۃ، ص:395)

حضرت اُم حبیبہؓ نے اپنے والد کو جس اسلوب میں مخاطب کیا حالانکہ وہ ان کے والد تھے اور اپنی قوم اور عربوں میں ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت اُم حبیبہؓ کا ایمان کتنا راسخ اور قوی تھا۔

قریش کی ان عہد شکنیوں اور بد عہدی کے بعد رسول اللہ ﷺ نے مکہ کو فتح کرنے اور کفار کو سبق سکھانے کا ارادہ کیا، اللہ کی توفیق کے بعد چند اسباب اس کے لئے محرک بنے، ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

أ: مدینہ منورہ میں مسلمان داخلی طور پر مضبوط و مستحکم ہو چکے تھے، اسلامی حکومت یہود کے مکر و غدر سے آزاد ہو چکی تھی، بنو قینقاع، بنو نضیر، بنو قریظہ کے یہود اور خیبر کے یہود کا خاتمہ کر دیا گیا تھا۔

ب: اندرونی دشمنوں کا محاذ کمزور ہو گیا تھا، ان دشمنوں میں سرِ فہرست وہ منافقین تھے جنہوں نے اپنا بنیادی رکنِ رکین کھو دیا تھا، اور وہ تھے: مدینہ کے یہود، وہی ان کے استاد تھے جو ان کی رہبری اور رہنمائی کا کام کرتے تھے۔

ج: اللہ کے رسولؐ نے صلح کے مرحلہ میں عسکری قوت کو بہتر بنانے اور سرایا کی تحریک تیز کرنے کا اہتمام فرمایا، جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کی عسکری قوت مشرکین قریش کی عسکری قوت کے مقابلہ میں تعداد کے اعتبار سے، ساز و سامان کے اعتبار سے اور معنوی روح کے اعتبار سے کہیں بہتر اور فائق تھی۔

د: یہ غزوہ اس وقت پیش آیا جبکہ قریش اقتصادی طور پر کمزور ہو چکے تھے اور اسلامی ریاست اقتصادی اعتبار سے طاقتور اور مستحکم ہو چکی تھی، مسلمانوں کو فتح خیبر کے ذریعہ بہت سامالِ غنیمت حاصل ہو گیا تھا۔

ھ: مدینہ کے آس پاس کے قبائل میں اسلام پھیل چکا تھا، اس کے ذریعہ اسلامی قیادت کو کوئی بھی فیصلہ لینے کے وقت اطمینانی کیفیت رہتی تھی۔

و: غزوۂ مکہ کے لئے ایک جوہری اور قانونی سبب وجود میں آیا تھا اور وہ تھا: قریش کی عہد شکنی اور بد عہدی۔ (دیکھیں: السیرۃ لأبی فارس، ص:401)

قابلِ غور یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے "مواقع ملنے کے ضابطہ" کو ضائع نہیں کیا اور حکمتِ بالغہ کے ساتھ اس موقع کے بارے میں حکمتِ عملی اختیار کی، چنانچہ خیبر فتح ہوا، اس کے بعد صلح حدیبیہ ہوئی اور اب قریش کی عہد شکنی کے بعد ایک دوسرا موقع مل رہا ہے، اب علاقہ میں قوتیں بدل چکی تھیں، اس لئے ان جدید مواقع سے فائدہ اٹھانا ضروری تھا، اس لئے آپ نے ایسا لشکرِ جرار تیار کیا جس کی مثال اس سے پہلے حجاز میں نہیں ملتی ہے، اس لشکر میں افرادی قوت دس ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ (دیکھیں: الکامل فی التاریخ: 2/244، التاریخ السیاسی والعسکری، ص:366)

۲: روانگی کی تیاری:

بے شک ریاست کی تعمیر، معاشرہ کی تربیت، سرایا کو بھیجنے اور غزوات میں شرکت کرنے کے سلسلہ میں نبوی تحریک کے ذریعہ ہمیں یہ تعلیم ملتی ہے کہ اسباب کو اختیار کرنے کے سلسلہ میں کیا حکمتِ عملی اختیار کی جانی چاہیے، چاہے وہ اسباب مادی ہوں یا معنوی، غزوۂ فتح

مکہ میں ہم اس سلسلہ میں واضح خطوط ملاحظہ کرتے ہیں، چنانچہ جب آپؐ نے فتح مکہ کے لئے روانگی کا ارادہ فرمایا تو آپؐ نے انتہائی رازداری کا اہتمام فرمایا تاکہ یہ خبر قریش تک نہ پہنچے، آپؐ نے ان پر اچانک حملہ آور ہونے کے لئے مندرجہ ذیل اسباب اختیار کئے:

۱: آپؐ نے اس بات کو اپنے قریب ترین لوگوں سے بھی راز میں رکھا:

اللہ کے رسولؐ نے انتہائی رازداری سے کام لیا، یہاں تک کہ حضرت ابو بکرؓ جو کہ تمام صحابہ کرام میں آپؐ کے نزدیک قریب ترین شخص تھے، اسی طرح اپنی زوجہ حضرت عائشہؓ جو آپ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب خاتون تھیں، ان میں سے کسی کو بھی آپؐ کے حقیقی اہداف اور آپ کی سمتِ سفر کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا، اور نہ ہی دشمن کو اس کے متعلق کوئی خبر تھی، اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے جب اپنی بیٹی حضرت عائشہؓ سے رسول اللہ ﷺ کے قصد وارادہ کے بارے میں دریافت کیا تو آپؓ نے جواب دیا: آپؐ نے ہمیں کوئی بات نہیں بتائی ہے اور کبھی کبھی وہ خاموش رہتی تھیں۔ دونوں باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کو بھی آپؐ کے ارادہ کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ (دیکھیں: البدایہ والنہایہ: 4/282، الرسول القائد (ص) محمد شیت خطاب، ص: 333)

نبی کریم ﷺ کے اس حکیمانہ منہج کے ذریعہ یہ مستنبط ہوتا ہے کہ عسکری قائدین کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی بیویوں سے اپنے منصوبوں کو مخفی رکھیں، اس لئے کہ اس بات کا امکان ہے کہ وہ غیر شعوری طور پر ان اسرار اور رازوں کو عام کر دیں گی جس کے نتیجہ میں کوئی خطرناک صورتحال پیش آسکتی ہے۔ (القیادۃ العسکریہ فی عہد الرسول ﷺ، ص: 395)

۲: بطن 'اِضَم' کی جانب حضرت ابو قتادہؓ کی قیادت میں سریہ کی روانگی:

نبی کریم ﷺ نے مکہ مکرمہ کی جانب روانگی سے پہلے ایک سریہ روانہ کیا جو آٹھ افراد پر مشتمل تھا اور ایسا آپ نے اس لئے کیا تھا تاکہ آپ کے حقیقی ارادہ کے بارے میں کسی کو خبر نہ لگ پائے، اس سلسلہ میں ابن سعد کہتے ہیں: "جب اللہ کے رسول ﷺ نے اہلِ مکہ پر چڑھائی کرنے کا ارادہ فرمایا تو آپؐ نے حضرت ابو قتادہؓ بن ربعی کو آٹھ افراد پر مشتمل ایک سریہ میں بطن اِضَم کی جانب روانہ فرمایا تاکہ دیکھنے والا یہ سمجھے کہ رسول اللہ ﷺ اس سمت کی جانب روانہ ہوئے ہیں، یہ لوگ آگے بڑھے لیکن انہوں نے کسی کو اس راستہ پر نہیں پایا، اس لئے وہ واپس آگئے یہاں تک کہ وہ 'ذی خُشُب' تک پہنچ گئے ان کو وہاں معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ مکہ کی جانب متوجہ ہوئے ہیں، اس لئے انہوں نے بھی اسی راستے کو اختیار کیا یہاں تک کہ مقام سُقیا میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ جا ملے۔ (دیکھیں: الطبقات الکبریٰ، ابن سعد 2/132)

۳: جاسوسوں کو چاروں طرف پھیلانا:

نبی کریم ﷺ نے اسلامی ریاست کے انٹیلیجنس کے افراد کو مدینہ کے اندر اور باہر پھیلا دیا تاکہ آپؐ کی کوئی خبر قریش تک نہ پہنچ پائے، آپؐ نے اس کے لئے کچھ افراد کا انتخاب فرمایا اور حضرت عمر بن خطابؓ ان افراد کی نگرانی کے لئے ان کے پاس جاتے تھے اور ان سے کہتے تھے: جو بھی کوئی اجنبی شخص تمہارے پاس سے گزرے تو اس کو واپس کر دینا۔ (مغازی الواقدی: 2/796)

۴: قریش سے خبریں مخفی رہنے کے سلسلہ میں دعا:

جب اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی استطاعت کے بقدر تمام بشری اسباب اختیار کر لئے تو اس کے بعد دعا و تضرع کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوئے: آپؐ کی دعا تھی: اے اللہ! ان کی سماعت اور بصارت کو چھین لے اور وہ ہمیں اچانک ہی دیکھ پائیں اور ہمارے بارے میں اچانک ہی سنیں۔(الدلائل للبیہقی: 5/11، البدایہ والنہایہ: 4/282)

۵: حضرت حاطبؓ کی کوشش کی ناکامی:

نبی کریم ﷺ نے جب فتح مکہ کے لئے روانہ ہونے کی تیاری مکمل کر لی تو حضرت حاطبؓ بن اَبی بلتعہ نے اہلِ مکہ کے نام ایک خط لکھا اور یہ اطلاع بھیجی کہ رسول اللہ ﷺ حملہ کرنے والے ہیں، انہوں نے یہ رقعہ ایک عورت کو دیا تھا اور اسے قریش تک پہنچانے پر معاوضہ رکھا تھا، عورت سر کی چوٹی میں رقعہ چھپا کر روانہ ہوئی، لیکن رسول اللہ ﷺ کو بذریعۂ وحی حاطبؓ کی اس حرکت کی خبر دے دی گئی، چنانچہ آپؐ نے حضرت علیؓ، حضرت مقدادؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت ابو مرثد غنویؓ کو یہ کہہ کر بھیجا کہ جاؤ روضۂ خاخ پہنچو، وہاں ایک ہودج نشین عورت ملے گی جس کے پاس قریش کے نام ایک رقعہ ہوگا، یہ حضرات گھوڑوں پر سوار تیزی سے روانہ ہوئے، وہاں پہنچے تو عورت موجود تھی، اس سے کہا کہ وہ نیچے اُترے اور پوچھا کہ کیا تمہارے پاس کوئی خط ہے؟ اس نے کہا: میرے پاس کوئی خط نہیں۔ انہوں نے اس کے کجاوے کی تلاشی لی لیکن کچھ نہ ملا۔ اس پر حضرت علیؓ نے اس سے کہا: میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ نہ رسول اللہ ﷺ نے جھوٹ کہا ہے نہ ہم جھوٹ کہہ رہے ہیں، تم یا تو خط نکالو، یا ہم تمہیں ننگا کر دیں گے۔ جب اس نے یہ پختگی دیکھی تو بولی: اچھا منہ پھیرو۔ انہوں نے منہ پھیرا تو اس نے چوٹی کھول کر خط نکالا اور ان کے حوالے کر دیا۔ یہ لوگ خط لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچے۔ دیکھا تو اس میں تحریر تھا: "حاطب بن ابی بلتعہ کی طرف سے قریش کی جانب"۔ پھر قریش کو رسول اللہ ﷺ کی روانگی کی خبر دی تھی۔

رسول اللہ ﷺ نے حضرت حاطب کو بلا کر پوچھا کہ حاطب! یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا: اے محمد ﷺ! میرے خلاف جلدی نہ فرمائیں۔ اللہ کی قسم! اللہ اور اس کے رسول پر میرا ایمان ہے، میں نہ تو مرتد ہوا ہوں اور نہ مجھ میں تبدیلی آئی ہے، بات صرف اتنی ہے کہ میں خود قریش کا آدمی نہیں، البتہ ان کا حلیف تھا اور میرے اہل وعیال اور بال بچے وہیں ہیں، لیکن قریش سے میری کوئی قرابت نہیں کہ وہ میرے بال بچوں کی حفاظت کریں۔ اس کے برخلاف دوسرے لوگ جو آپ کے ساتھ ہیں وہاں ان کے قرابت دار ہیں جو ان کی حفاظت کریں گے۔ اس لئے جب مجھے یہ چیز حاصل نہ تھی تو میں نے چاہا کہ ان پر ایک احسان کر دوں جس کے عوض وہ میرے قرابت داروں کی حفاظت کریں۔ اس پر حضرت عمر بن خطابؓ نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ! مجھے اجازت دیں میں اس کی گردن مار دوں، کیونکہ اس نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیانت کی ہے اور یہ منافق ہو گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دیکھو! یہ جنگ بدر میں حاضر ہو چکا ہے، اور عمر! تمہیں کیا پتہ؟ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ اہلِ بدر کیا کیا کریں گے لیکن اس نے ان کے بارے میں کہہ دیا: تم لوگ جو چاہو کرو، میں نے تمہیں بخش دیا۔ (مسند أحمد 79/1 صحیح البخاري: 3983 صحیح مسلم: 2494)

اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا تَتَّخِذُواْ عَدُوِّى وَعَدُوَّكُمۡ أَوۡلِيَآءَ تُلۡقُونَ إِلَيۡهِم بِٱلۡمَوَدَّةِ وَقَدۡ كَفَرُواْ بِمَا جَآءَكُم مِّنَ ٱلۡحَقِّ يُخۡرِجُونَ ٱلرَّسُولَ وَإِيَّاكُمۡ أَن تُؤۡمِنُواْ بِٱللَّهِ رَبِّكُمۡ إِن كُنتُمۡ خَرَجۡتُمۡ جِهَـٰدًا فِى سَبِيلِى وَٱبۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِىۚ تُسِرُّونَ إِلَيۡهِم بِٱلۡمَوَدَّةِ وَأَنَا۠ أَعۡلَمُ بِمَآ أَخۡفَيۡتُمۡ وَمَآ أَعۡلَنتُمۡۚ وَمَن يَفۡعَلۡهُ مِنكُمۡ فَقَدۡ ضَلَّ سَوَآءَ ٱلسَّبِيلِ﴾ ترجمہ: ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر تم میری راہ میں جہاد کرنے کے لئے اور میری رضاجوئی کی خاطر (وطن چھوڑ کر گھروں سے) نکلے ہو تو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ، تم اُن کے ساتھ دوستی کی طرح ڈالتے ہو، حالانکہ جو حق تمہارے پاس آیا ہے اُس کو ماننے سے وہ انکار کر چکے ہیں، اور اُن کی روش یہ ہے کہ رسول کو اور خود تم کو صرف اِس قصور پر جلاوطن کرتے ہیں کہ تم اپنے رب، اللہ پر ایمان لائے ہو تم چھپا کر اُن کو دوستانہ پیغام بھیجتے ہو، حالانکہ جو کچھ تم چھپا کر کرتے ہو اور جو علانیہ کرتے ہو، ہر چیز کو میں خوب جانتا ہوں، جو شخص بھی تم میں سے ایسا کرے وہ یقیناً راہ راست سے بھٹک گیا“۔ (سورۃ الممتحنہ: 1)

میرے استاد اور شیخ ڈاکٹر محمد بن بکر آل عابد فرماتے ہیں: اس آیت کریمہ کو ہم فتح مکہ سے پہلے تمہید کی حیثیت سے دیکھتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کفار کے ساتھ موالات و دوستی نہ رکھنے کی تاکید کی ہے، تاکہ مہاجرین قرابت و رشتہ داری یا مادی مصلحت کی وجہ سے متاثر نہ ہونے پائیں، اس لئے کہ ان میں سے بہت سے افراد کے اہلِ مکہ کے ساتھ روابط و تعلقات تھے۔ (دیکھیں: حدیث القرآن: 2/568)

استاد سید قطب شہیدؒ فرماتے ہیں: مسلمانوں میں ابھی بعض لوگ ایسے تھے جنہوں نے اگرچہ اپنا علاقہ، اپنا گھر، اپنا مال اور اپنے اہل و عیال اور اپنا خاندان مکہ میں چھوڑ دیا تھا لیکن ان کے دل ابھی تک مکہ کے ان لوگوں اور چیزوں کے ساتھ اٹکے ہوئے تھے، ان لوگوں نے قریش کے ہاتھوں نہایت دکھ اور درد سہے تھے لیکن ابھی تک بعض لوگوں کی یہ خواہش تھی کہ مکہ اور مدینہ کے درمیان صلح ہو جائے اور یہ جھگڑا ختم ہو جائے جس میں دونوں طرف سے لوگ اپنے بھائیوں کو قتل کر رہے ہیں، اس لئے ایسے لوگ موجود تھے جو چاہتے تھے کہ یہ خصوصیت ختم ہو جائے، لیکن اللہ کی منشا یہ تھی کہ اس قسم کے دلوں میں سے اس قسم کے تعلقات اور ہمدردیوں کا صفایا ہو جائے اور وہ اپنے دین، عقیدہ، نظریات اور نظام کے لئے یکسو ہو جائیں...... چنانچہ قرآن کریم ہر روز کسی نہ کسی واقعہ کے ضمن میں ان کے دلوں کو صاف کرنے میں لگا ہوا تھا، جو بھی واقعہ پیش آتا تو کوئی سورت اس کا تجزیہ کرتی اور اس سے سبق نکالتی، تاکہ یہ تربیت اور یہ علاج قابل فہم ہو جائے اور محض نظریاتی تربیت کے بجائے عملی تربیت ہو۔ (دیکھیں: فی ظلال القرآن: 6/358)

حضرت حاطبؓ نے جو کچھ کیا وہ ایک حسّاس مسئلہ تھا، اسی لئے اس سلسلہ میں قرآن کریم نازل ہوا جس کے ذریعہ مسلم معاشرہ کی رہنمائی کی گئی کہ اعدائے دین کے تئیں ان کو کیا طریقہ کار اختیار کرنا چاہیے، اسی طرح نبی کریم ﷺ نے حضرت حاطبؓ کے ساتھ مشفقانہ معاملہ فرمایا، جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آپؐ اپنے اصحاب کے ساتھ وفاداری کا اور ان کی لغزشوں کو معاف کرنے کا کس قدر خیال فرماتے تھے، اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت حاطبؓ کے عظیم ماضی کی وجہ سے ان کے لئے معافی کا اعلان کر دیا۔

یہ حکیمانہ منہج نبوی کی ایک مثال ہے جس میں نبی کریم ﷺ نے حضرت حاطبؓ کی جانب صرف ان کی مخالفت کے پہلو کو مد نظر رکھتے ہوئے نہیں دیکھا اگرچہ یہ بہت بڑا جرم تھا، بلکہ آپؐ نے جہاد فی سبیل اللہ اور دینی خدمات کے بارے میں ان کے ماضی کے اعمال اور کارناموں کا جائزہ لیا تو دیکھا کہ وہ بدر میں شریک رہے ہیں، اس کے ذریعہ مسلمانوں کی رہنمائی کی گئی کہ وہ غلطی کرنے والوں پر وسیع تناظر میں جائزہ لیں، وہ دیکھیں کہ انہوں نے دعوت وجہاد اور تعلیم وتربیت کے میدان میں امت کے لئے کیا خدمات انجام دی ہیں، بلاشبہ جو شخص امت کی طرف سے فرض کفایہ ادا کرنے کی ذمہ داری ادا کرے وہ عزت واحترام کا مستحق ہے اگرچہ اس سے بعض غلطیاں سرزد ہوں، یہ حکم تو اس شخص کے بارے میں ہے جس سے کوئی غلطی یا لغزش سرزد ہو جائے، اور ایسا شخص تو اور زیادہ عفو درگذر کا مستحق قرار پاتا ہے جس سے کوئی اجتہاد پر مبنی عملی رائے ظاہر ہوئی ہو!

دورِ حاضر کے بعض طلبائے علم بعض اجتہادی آراء کی وجہ سے علماء اور دعاۃ پر نقد کرنا شروع کر دیتے ہیں اور ان کا یہ نقد تمسخر و مذاق کی حد تک پہنچ جاتا ہے، آپ دیکھیں گے کہ یہ طلبہ علمائے کبار کی غلطیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں اور ان کو لوگوں کے سامنے ایسے پیش کرتے ہیں جیسے کہ ان علماء وداعیان نے اسلام اور مسلمانوں کے تئیں کوئی بھی خدمت انجام نہیں دی ہے۔

اس سلسلہ میں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ پہلے ان لوگوں کی اچھی خدمت کا ذکر کیا جاتا اور مسلمانوں کو ان کی جدوجہد اور خدمات کے بارے میں آگاہ کیا جاتا اور اس کے بعد علمی تنقید کے آداب کا خیال کرتے ہوئے اور تمسخر و تنقیص کے اسلوب سے اجتناب کرتے ہوئے ان کے قابل اعتراض امور کو ذکر کیا جائے، حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ کے تئیں رسول اللہ ﷺ کے ردّ عمل اور طرزِ عمل سے اسی بات کی رہنمائی ملتی ہے، حضرت حاطبؓ کی جہاد فی سبیل اللہ کی عظیم تاریخ نے رسول اللہ ﷺ کے پاس ان کو معذور بنانے میں اہم رول ادا کیا، اسی لئے نہ ان کی سرزنش کی گئی اور نہ ہی وہ کسی طرح کی سزا کے سزاوار قرار پائے، بلکہ یہ چیز اس کے لئے مانع اور رکاوٹ بن گئی، بایں طور کہ کسی بھی مسلمان کی طرف سے ان کے بارے میں کوئی نقد یا بُری بات نہیں سنی گئی جبکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمادیا: ''ان کے لئے خیر ہی کی بات کہو!''۔ (دیکھیں: التاریخ الاسلامی للحمیدی: 7/176)

اللہ کے رسولؐ اور حضرت عمر بن خطابؓ کے مابین حضرت حاطبؓ کے سلسلہ میں جو گفتگو ہوئی اس سے بعض دروس واسباق مستنبط کئے جا سکتے ہیں:

۱: جاسوس کے بارے میں قتل کا حکم:

حضرت عمرؓ نے رسول اللہ ﷺ سے قتل ہی بات کہی تھی اور رسول اللہ ﷺ نے بھی اس سے انکار نہیں کیا، لیکن یہ سزا دینے میں صرف یہ بات مانع بنی کہ وہ بدری صحابی تھے۔

۲: حق کے بارے میں حضرت عمرؓ کی شدت و سختی: حضرت عمرؓ کی طرف سے حق کے بارے میں شدت و سختی اور دینی غیرت کا اظہار اس وقت ہوا جبکہ انہوں نے حضرت حاطبؓ کی گردن مارنے کا مطالبہ کیا۔

۳: گناہ کبیرہ کی وجہ سے ایمان سلب نہیں ہوتا ہے؛حضرت حاطبؓ نے جس جرم کا ارتکاب کیا تھا وہ گناہِ کبیرہ تھا لیکن اس کے باوجود وہ صاحبِ ایمان رہے۔

۴: حضرت عمرؓ نے حضرت حاطبؓ کے بارے میں لغوی نفاق کی بات کی نہ کہ اصطلاحی نفاق کی،اس لئے کہ نفاق کا مطلب ہے کفر کو چھپا کر اسلام کا اظہار کرنا، حضرت عمرؓ کا مطلب تھا کہ انہوں نے دل میں اور کچھ رکھا اور ظاہر اور کچھ کیا،ان کے دل میں ایمان تھا لیکن اس کے باوجود خط بھیج دیا۔

۵: رسول اللہ ﷺ کے ردّ عمل سے حضرت عمرؓ چند ہی لمحات میں اتنے متاثر ہوئے کہ ابھی وہ حضرت حاطبؓ پر حد جاری کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے اور فوراً ہی وہ خشیت وتاثر کی وجہ سے رونے لگے اور کہنے لگے: اللہ اور اس کے رسول بہتر جانتے ہیں،اس لئے کہ ان کا غصہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی وجہ سے تھا اور جب ان کے سامنے یہ واضح ہو گیا کہ اللہ اور اس کے رسول کو راضی کرنے والی بات یہ ہے کہ اس غلطی سے صرفِ نظر کیا جائے اور غلطی کے مرتکب شخص کے ساتھ عزت واحترام کا معاملہ کیا جائے تو وہ فوراً اس کے لئے تیار ہو گئے۔

۶: حضرت حاطبؓ کے بارے میں کیا گیا فیصلہ ان کی خصوصیت ہے؛اس رائے کو ڈاکٹر عبدالکریم زیدان نے اختیار کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: حضرت حاطبؓ کے بارے میں معافی کا جو فیصلہ رسول ﷺ کی جانب سے کیا گیا اس کی اقتداء درست نہیں ہے،اس لئے کہ ان کے معافی ایک ایسی علت کی وجہ سے تھی جس کا پایا جانا دورِ صحابہ کے بعد کسی اور میں ممکن نہیں ہے،اور وہ علت ہے: ان کا بدر میں شریک ہونا،اس لئے اس چیز کو سمجھنا ضروری ہے،اور اس نقطہ کو امام مالکؒ نے اچھی طرح سمجھا تھا،انہوں نے بیان کیا ہے کہ مسلمان جاسوس کو قتل کیا جائے گا ۔جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جاسوس کا مسلمان ہونا اس کے جرم کی خطرناکی کی وجہ سے اس کو قتل سے نہیں بچا سکتا ہے، اگر کوئی شخص حضرت حاطبؓ جیسے جرم کا ارتکاب کرے گا تو اس کو اس کے مطابق سزا دی جائے گی۔(دیکھیں:المستفاد من قصص القرآن:2/402)

علامہ ابن قیمؒ نے بھی اس مسئلہ پر گفتگو کی ہے،اور انہوں نے ائمہ اربعہ کے اقوال ذکر کئے ہیں اور پھر فرماتے ہیں: صحیح یہ ہے کہ اس کے قتل کرنے کا فیصلہ امام کی رائے پر منحصر ہے، اگر اس کو اس کے قتل میں مصلحت نظر آئے گی تو وہ اس کو قتل کرے گا،اور اگر اس کو باقی رکھنے میں مصلحت ہو گی تو وہ اس کو باقی رکھے گا۔(دیکھیں:زاد المعاد:3/443)

۳: روانگی کا آغاز اور راستے میں پیش آنے والے واقعات:

۱: اللہ کے رسول ﷺ سن آٹھ ہجری کے رمضان المبارک کی دس تاریخ کو مکہ کی جانب نکلے اور مدینہ منورہ میں اُبو رہم، کلثوم بن حصین بن عتبہ بن خلف غفاری کو اپنا جانشین مقرر فرمایا، لشکر میں شامل افراد کی تعداد دس ہزار تھی، جن میں مہاجرین وانصار سب شامل تھے اور ان میں سے کوئی پیچھے نہیں رہا تھا، جب یہ لشکر- قدید اور عسفان کے مابین موجود چشمہ - الکَدِید کے پاس پہنچا تو رسول ﷺ نے بھی افطار کیا اور آپ کے ساتھ سب لوگوں نے بھی افطار کیا۔(صحیح بخاری:4275، صحیح مسلم:113)

جحفہ میں آپؐ کے چچا حضرت عباس بن عبد المطلبؓ آپؐ سے ملے، وہ بال بچوں سمیت ہجرت کرتے ہوئے مکہ سے تشریف لا رہے تھے، وہ مکہ مکرمہ میں آپؐ کے ایک عسکری نمائندہ یا انٹیلیجنس آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے، اب مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے

آجانے سے پتہ چلتا ہے کہ اب ان کا کام وہاں مکمل ہو چکا تھا، خاص طور پر جبکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مکہ مکرمہ میں رہنا رسول ﷺ کے حکم سے تھا۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویہ فی ضوء المصادر الاصلیہ، ص560، البدایہ والنہایہ: 4/286، السیرہ النبویۃ لابی فارس، ص: 406، تأملات فی السیرۃ النبویۃ، محمد السید الوکیل، ص:254)

۲: حضرت ابوسفیان بن حارث بن عبد المطلب اور عبد اللہ بن امیہ کا قبولِ اسلام:

ابوسفیان بن حارث اور عبد اللہ بن امیہ بن مغیرہ مکہ مکرمہ سے نکلے اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مکہ اور مدینہ کے مابین 'العقاب' گھاٹی میں ملے، انہوں نے آپؐ سے ملنے کی کوشش کی، یہاں تک کہ حضرت اُم سلمہؓ نے آپؐ سے اس سلسلہ میں بات کی اور عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! آپ کے چچازاد بھائی، پھوپھی زاد بھائی اور آپ کے داماد ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: مجھے ان کی کوئی ضرورت نہیں ہے، جہاں تک میرے چچازاد بھائی کا تعلق ہے تو اس نے میری عزت کو پامال کیا ہے، اور جہاں تک میرے پھوپھی زاد بھائی اور داماد کا تعلق ہے تو یہ وہی شخص ہے جس نے مکہ میں مجھ سے کیا کچھ کہا تھا، جب ان دونوں کو رسول اللہ کے ردعمل کی خبر معلوم ہوئی تو ابوسفیان بن حارث کے ساتھ اپنا ایک بیٹا تھا تو اس نے کہا: واللہ! رسول اللہ ﷺ مجھے ملنے کی اجازت دے دیں ورنہ میں اپنے اس بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر ریگستان میں نکل جاؤں گا یہاں تک کہ بھوک اور پیاس کی وجہ سے مر جائیں گے۔ جب اللہ کے رسول ﷺ کو اس بات کی اطلاع ملی تو آپؐ ان کے لئے نرم پڑ گئے اور وہ دونوں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے، ابوسفیان نے اسلام کے بارے میں اور سابقہ طرزِ عمل کے بارے میں معذرت پر مبنی اشعار آپؐ کے سامنے پڑھے، ان میں سے چند اشعار یہ تھے:

لَعمرُكَ إنِّي يوم أَحْمِلُ رايةً ··· لتغلبَ خيلُ اللّاتِ خيلَ مُحَمَّدِ

لَكَالْمُدلجِ الْحَيْرانِ أَظْلَمَ لَيْلُهُ ··· فَهَذَا أَوانِي حِينَ أُهْدَى وَأَهْتَدي

هَدَانِي هَادٍ غيرُ نفْسِي ونَالَنِي ··· مع اللَّهِ مَنْ طَرَّدْتُ كُلَّ مُطَرَّدِ

"تیری عمر کی قسم! جس وقت میں نے اس لئے جھنڈا اٹھایا تھا تاکہ لات کے شہسوار محمدؐ کے شہسواروں پر غالب آجائیں تو میری کیفیت رات کے اس مسافر کی سی تھی جو تاریک رات میں حیران و سرگردان ہو، لیکن اب وقت آگیا ہے کہ مجھے ہدایت دی جائے اور میں ہدایت پاؤں۔ مجھے میرے نفس کی بجائے ایک ہادی نے ہدایت دی اور اللہ کا راستہ اسی شخص نے بتایا جسے میں نے ہر موقع پر دھتکار دیا تھا"۔

یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے اس کے سینے پر ضرب لگائی اور فرمایا: تم نے مجھے ہر موقع پر دھتکارا تھا۔ (طبقات ابن سعد 49/4 المعجم الكبير للطبراني: 7264 تاریخ طبري 114/3 الدلائل للبيهقي 27/5 سیرت ابن ہشام 43/4 مجمع الزوائد 165/6)

ابوسفیان بن حارث اپنے اشعار کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ کی بہت زیادہ ہجو کیا کرتے تھے۔ اور جہاں تک تعلق ہے عبد اللہ بن امیہ کا تو اس نے رسول اللہ ﷺ سے کہا تھا: اللہ کی قسم! میں آپ پر اس وقت تک ایمان نہیں لاؤں گا یہاں تک کہ آپ آسمان پر چڑھنے کے لئے ایک سیڑھی نہ لگا دیں، اس کے بعد آپ اس میں چڑھ کر جائیں اور میرے سامنے آسمان پر چڑھنے کے بعد وہاں سے اپنے ساتھ ایک صحیفہ لے

کرآئیں، جس کے ساتھ چار فرشتے ہوں جو آپ کے حق میں گواہی دیں۔ اللہ کی قسم! اگر آپ ایسا بھی کریں گے تو میں نہیں سمجھتا ہوں کہ میں آپ کی تصدیق کر پاؤں گا۔(سیرت ابن ہشام: 1/295)

ان دونوں کے خطرناک جرائم کے باوجود نبی کریم ﷺ نے ان دونوں کو معاف کر دیا اور ان کے عذر کو قبول کر لیا، یہ عفو در گزر اور رحمت کی ایک اعلیٰ مثال ہے، ابو سفیان نے اپنے اس بلیغ قصیدہ کے ذریعہ اپنے سابقہ تمام اشعار کا کفارہ ادا کر دیا، اسلام قبول کرنے کے بعد حضرت ابو سفیان نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اہم کارہائے نمایاں انجام دیئے۔(دیکھیں: التاریخ الاسلامی: 7/182)

۳: مرّ الظہران میں قیام اور سردارِ قریش ابو سفیان بن حرب کا قبولِ اسلام:

اللہ کے رسول ﷺ نے اپنا سفر جاری رکھا یہاں تک کہ مر الظہران پہنچ گئے، عشاء کے وقت وہاں پڑاؤ ڈالا، آپؐ نے لشکر کو حکم دیا تو انہوں نے وہاں پر آگ جلائی، دس ہزار جگہ آگ جلائی گئی اور رسول اللہ ﷺ نے پہرہ کی ذمہ داری حضرت عمر بن خطابؓ کو دی۔

حضرت عباسؓ فرماتے ہیں: میں نے کہا: ہائے قریش کی بربادی! اللہ کی قسم! اگر رسول اللہ ﷺ مکہ میں بزورِ بازو داخل ہوئے قبل اس کے کہ وہ آپ کے پاس آکر امان طلب کرلیں تو پھر قریش ہمیشہ ہمیش کے لئے ہلاک ہو جائیں گے۔ فرماتے ہیں: واللہ! میں رسول اللہ ﷺ کے خچر پر سوار جارہا تھا کہ مجھے ابو سفیان اور بدیل بن ورقاء کی گفتگو سنائی پڑی۔ وہ باہم ردو قدح کر رہے تھے۔ ابو سفیان کہہ رہا تھا کہ اللہ کی قسم! میں نے آج رات جیسی آگ اور ایسا لشکر تو کبھی دیکھا ہی نہیں، اور جواب میں بدیل کہہ رہا تھا: یہ اللہ کی قسم! بنو خزاعہ ہیں۔ جنگ نے انہیں نوچ کر رکھ دیا ہے، اور اس پر ابو سفیان کہہ رہا تھا: خزاعہ اس سے کہیں کمتر اور ذلیل ہیں کہ یہ ان کی آگ اور ان کا لشکر ہو۔

حضرت عباسؓ کہتے ہیں کہ میں نے اس کی آواز پہچان لی اور کہا: ابو حنظلہ؟ اس نے بھی میری آواز پہچان لی اور بولا: ابو الفضل؟ میں نے کہا: ہاں، اس نے کہا: کیا بات ہے؟ میرے ماں باپ تجھ پر قربان، میں نے کہا: یہ رسول اللہ ﷺ ہیں لوگوں سمیت۔ ہائے قریش کی تباہی، واللہ! اس نے کہا: اب کیا حیلہ ہے؟ میرے ماں باپ تم پر قربان۔ میں نے کہا: واللہ! اگر وہ تمہیں پاگئے تو تمہاری گردن ماردیں گے، لہٰذا اس خچر پر پیچھے بیٹھ جاؤ، میں تمہیں رسول اللہ ﷺ کے پاس لے چلتا ہوں اور تمہارے لئے امان طلب کئے دیتا ہوں۔ اس کے بعد ابو سفیان میرے پیچھے بیٹھ گیا اور اس کے دونوں ساتھی واپس چلے گئے۔

حضرت عباسؓ کہتے ہیں کہ میں ابو سفیان کو لے کر چلا، جب کسی الاؤ کے پاس سے گزرتا تو لوگ کہتے: کون ہے؟ مگر جب دیکھتے کہ رسول اللہ ﷺ کا خچر ہے اور میں اس پر سوار ہوں تو کہتے کہ رسول اللہ ﷺ کے چچا ہیں اور آپ کے خچر پر ہیں، یہاں تک کہ عمر بن خطابؓ کے الاؤ کے پاس سے گزرا۔ انہوں نے کہا: کون ہے؟ اور اٹھ کر میری طرف آئے، جب پیچھے ابو سفیان کو دیکھا تو کہنے لگے: ابو سفیان؟ اللہ کا دشمن؟ اللہ کی حمد ہے کہ اس نے بغیر عہد وپیمان کے تجھے (ہمارے) قابو میں کر دیا، اس کے بعد وہ نکل کر رسول اللہ ﷺ کی طرف دوڑے اور میں نے بھی خچر کو ایڑ لگائی، میں آگے بڑھ گیا اور خچر سے کود کر رسول اللہ ﷺ کے پاس جا گھسا۔ اتنے میں عمر بن خطابؓ بھی گھس آئے اور بولے کہ اے اللہ کے رسولؐ! یہ ابو سفیان ہے۔ مجھے اجازت دیجئے میں اس کی گردن ماردوں۔ میں نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ! میں نے اسے پناہ دے دی ہے۔ پھر میں نے رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھ کر آپ کا سر پکڑ لیا اور کہا: اللہ کی قسم! آج رات میرے سوا کوئی اور آپ

سے سر گوشی نہ کرے گا۔ جب ابو سفیان کے بارے میں حضرت عمرؓ نے بار بار کہا تو میں نے کہا: عمر! ٹھہر جاؤ۔ اللہ کی قسم! اگر یہ بنی عدی بن کعب کا آدمی ہوتا تو تم ایسی بات نہ کہتے۔ عمرؓ نے کہا: عباس! ٹھہر جاؤ۔ اللہ کی قسم! تمہارا اسلام لانا میرے نزدیک خطّاب کے اسلام لانے سے- اگر وہ اسلام لاتے - زیادہ پسندیدہ ہے اور اس کی وجہ میرے لئے صرف یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے نزدیک تمہارا اسلام لانا خطاب کے اسلام لانے سے زیادہ پسندیدہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عباس! اسے (یعنی: ابو سفیان کو) اپنے خیمہ میں لے جاؤ، صبح میرے پاس لے آنا، اس حکم کے مطابق میں اسے خیمہ میں لے گیا اور صبح خدمتِ نبوی ﷺ میں حاضر کیا۔ آپ نے اسے دیکھ کر فرمایا: ابوسفیان! تم پر افسوس، کیا اب بھی تمہارے لئے وقت نہیں آیا کہ تم یہ جان سکو کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں؟ ابوسفیان نے کہا: میرے ماں باپ آپ پر فدا، آپ کتنے بردبار، کتنے کریم اور کتنے خویش پرور ہیں، میں اچھی طرح سمجھ چکا ہوں کہ اگر اللہ کے ساتھ کوئی اور بھی الٰہ ہوتا تو اب تک میرے کچھ کام آیا ہوتا۔

آپؐ نے فرمایا: ابوسفیان تم پر افسوس! کیا تمہارے لئے اب بھی وقت نہیں آیا کہ تم یہ جان سکو کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ ابوسفیان نے کہا: میرے ماں باپ آپ پر فدا۔ آپ کس قدر حلیم، کس قدر کریم اور کس قدر صلہ رحمی کرنے والے ہیں، البتہ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں اب بھی دل میں کچھ نہ کچھ کھٹک ہے، اس پر حضرت عباسؓ نے کہا: ارے! گردن مارے جانے کی نوبت آنے سے پہلے پہلے اسلام قبول کر لو! اور یہ شہادت و اقرار کر لو کہ اللہ کے سوا کوئی لائقِ عبادت نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اس پر ابو سفیان نے اسلام قبول کر لیا اور حق کی شہادت دی۔

حضرت عباسؓ نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ! ابوسفیان اعزاز پسند ہے، لہٰذا اسے کوئی اعزاز دے دیجیے۔ آپؐ نے فرمایا: ٹھیک ہے، جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے اسے امان ہے اور جو اپنا دروازہ اندر سے بند کر لے اسے امان ہے اور جو مسجدِ حرام میں داخل ہو جائے اسے امان ہے۔

رسول اللہ ﷺ مر الظہران سے مکہ روانہ ہوئے اور حضرت عباسؓ کو حکم دیا کہ ابوسفیان کو وادی کی تنگنائے پر پہاڑ کے ناکے کے پاس روک رکھیں تاکہ وہاں سے گزرنے والی الٰہی فوجوں کو ابوسفیان دیکھ سکے۔ حضرت عباسؓ نے ایسا ہی کیا، ادھر قبائل اپنے اپنے پھریرے لئے گزر رہے تھے، جب وہاں سے کوئی قبیلہ گزرتا تو ابوسفیان پوچھتا کہ عباس! یہ کون لوگ ہیں؟ جواب میں حضرت عباس - بطورِ مثال- کہتے کہ بنو سلیم ہیں۔ تو ابوسفیان کہتا کہ مجھے سلیم سے کیا واسطہ؟ پھر کوئی قبیلہ گزرتا تو ابوسفیان پوچھتا کہ اے عباس! یہ کون لوگ ہیں؟ وہ کہتے: مزینہ ہیں۔ ابوسفیان کہتا: مجھے مزینہ سے کیا مطلب؟ یہاں تک کہ سارے قبیلے ایک ایک کر کے گزر گئے۔ جب بھی کوئی قبیلہ گزرتا تو ابوسفیان حضرت عباسؓ سے اس کی بابت ضرور دریافت کرتا اور جب وہ اسے بتاتے تو وہ کہتا کہ مجھے بنی فلاں سے کیا واسطہ؟ یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ اپنے سبز دستے کے جلو میں تشریف لائے۔ آپؐ مہاجرین و انصار کے درمیان فروکش تھے، یہاں انسانوں کے بجائے صرف لوہے کی باڑھ دکھائی پڑ رہی تھی۔ ابوسفیان نے کہا: سبحان اللہ! اے عباسؓ! یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے کہا: یہ انصار و مہاجرین کے جلو میں رسول اللہ ﷺ تشریف فرما ہیں۔ ابوسفیان نے کہا: بھلا ان سے محاذ آرائی کی طاقت کسے ہے؟ اس کے بعد اس نے مزید کہا کہ ابو

الفضل! تمہارے بھتیجے کی بادشاہت تو واللہ بڑی زبردست ہوگئی۔ حضرت عباسؓ نے کہا: ابوسفیان! یہ نبوت ہے۔ ابوسفیان نے کہا: ہاں! اب تو یہی کہا جائے گا۔ میں نے کہا: اپنی قوم کو بچاؤ"۔(صحیح البخاري: 4280 مصنف عبد الرزاق 374/5 طبقات ابن سعد 134/2 الدلائل للبيهقي 32/5 المطالب العالية 244/4 مجمع الزوائد 164/6 سيرة ابن هشام 44/4 صحيح السيرة النبوية، ص: 518، 519، 520)

دروس واسباق:

اس قصہ میں انسانی نفوس کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے تعامل کی کیفیت کے بارے میں متعدد دروس واسباق موجود ہیں جن میں سے چند اہم دروس مندرجہ ذیل ہیں:

۱: جب ابوسفیان مسلمانوں کے کنٹرول اور دسترس میں آگئے اور وہ رسول اللہ ﷺ کے اشارۂ ابرو کے رحم و کرم پر آگئے، اور ان کے بارے میں حضرت عمرؓ نے ارادہ بھی کر لیا لیکن حضرت عباسؓ نے ان کو امان دے دی اور پھر وہ دوسرے روز صبح رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوگئے، ان کے لئے یہ حیرت انگیز ردعمل تھا کہ تذلیل، ڈانٹ اور سرزنش کے بجائے ان کو اسلام کی دعوت دی جائے، اس لئے وہ اس موقف سے متاثر ہوتے ہیں اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں: اے محمد! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، آپ کتنے حلیم و کریم اور صلہ رحمی کرنے والے ہیں، وہ رسول اللہ ﷺ پر اپنے ماں باپ قربان کرتے ہیں اور آپ کے لئے کلماتِ خیر کہتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ نے بھی ان کے ساتھ عزت و تکریم کا معاملہ فرمایا اور ان کے گھر میں داخل ہونے والے کو امان دی گئی، رسول اللہ ﷺ نے اس کے ذریعہ ان کو ایک امتیاز عطا کیا جس کو ابوسفیان پسند کرتے تھے، اس کے ذریعہ ان کو مزید ثابت قدم رکھنا مقصود تھا، یہ نبوی اسلوب ابوسفیان کے دل سے ہر قسم کی نفرت کو ختم کرنے کا ذریعہ بنا۔

۲: اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے چچا حضرت عباسؓ سے فرمایا: "ابوسفیان کو وادی کی تنگنائے پر پہاڑ کے ناکے کے پاس روک رکھیں تاکہ وہاں سے گزرنے والی الٰہی فوجوں کو ابوسفیان دیکھ سکے"۔ حضرت عباسؓ نے ایسا ہی کیا اس کے ذریعہ اللہ کے رسول ﷺ نے قریش کو متاثر کرنے کے لئے ایک نفسیاتی جنگ چھیڑ دی تاکہ اس کی وجہ سے سردارِ قریش کے اندر مقابلہ آرائی کا جذبہ بالکل ختم ہو جائے اور ابوسفیان اپنے سر کی آنکھوں سے خود اسلامی لشکر کے سامانِ حرب وضرب، ان کی تنظیم اور حسنِ اطاعت و پابندی کا مشاہدہ کر لیں، اس کے ذریعہ اہلِ مکہ کی مزاحمت کی ہر قسم کی سوچ ختم ہو جائے گی اور عملی طور پر ایسا ہی ہوا کہ ابوسفیان کے پاس سے جب مہاجرین وانصار کا دستہ گزرا تو ابوسفیان نے کہا: سبحان اللہ! اے عباس یہ کون ہے؟ حضرت عباس فرماتے ہیں: میں نے کہا: یہ مہاجرین وانصار کے جلو میں رسول اللہ ہیں۔ ابوسفیان نے کہا: ان کے مقابلہ کی کسی کے پاس کوئی طاقت و قوت نہیں ہے، اے ابوالفضل! واللہ! تمہارے بھتیجے کی بادشاہت تو بڑی زبردست ہوگئی۔ حضرت عباسؓ نے کہا: ابوسفیان! یہ نبوت ہے۔ ابوسفیان نے کہا: اب تو یہی کہا جائے گا۔ (سیرت ابن ہشام: 4/152)

"یہ نبوت ہے"۔ یہ وہ کلمہ ہے جو حکمتِ الٰہیہ کے مطابق حضرت عباسؓ کی زبان پر آیا تاکہ تاقیامِ قیامت اس شخص کے لئے جواب بن جائے جو یہ سمجھتا ہو کہ نبی کریم ﷺ کی دعوت بادشاہت و حکومت، قومیت اور عصبیت کے حصول کے لئے تھی، یہ کلمہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی کی ابتدا سے اخیر تک ایک عنوان تھا، آپؐ کی زندگی کی ساعتیں اور تمام مراحل اس کی دلیلِ ناطق تھے۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعدائے دین کے خلاف نفسیاتی جنگ چھیڑ رکھی تھی، اسی لئے آپؐ نے آگ جلانے کا حکم بھی دیا تھا اور ایک ہی رات میں دس ہزار جگہ آگ جلائی گئی، یہاں تک کہ پورا افق روشن ہو گیا اور اس چھاونی کا ایک خوفناک منظر پیدا ہو گیا، جس کی وجہ سے قریشیوں کے دل خوفزدہ اور لرزیدہ ہو گئے، اللہ کے رسولؐ کے اس طرزِ عمل کو بعد کے فوجی اداروں میں عسکری اعتبار سے خاص اہمیت کی نظر سے دیکھا گیا۔ (دیکھیں: العبقریۃ العسکریۃ وغزوات الرسول، میجر جنرل محمد فرج: ص،565)

....

دوسرا باب

مکہ میں داخلہ اور فتح مکہ کا نبوی منصوبہ

ا: قائدین صحابہ کے مابین ذمہ داریوں کی تقسیم:

جب نبی کریم ﷺ ذی طویٰ پہنچے تو آپ نے وہاں لشکر کو ترتیب دیا اور ذمہ داریاں تقسیم فرمائیں، آپ ﷺ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو دائیں بازو (میمنہ) پر (امیر) مقرر کیا اور زبیر رضی اللہ عنہ کو بائیں بازو (میسرہ) پر اور اَبو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو پیادوں پر اور وادی کے اندر (کے راستے) پر تعینات کیا، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: "ابوہریرہ! انصار کو بلاؤ"۔ میں نے ان کو بلایا، وہ دوڑتے ہوئے آئے۔ آپؐ نے فرمایا: انصار کے لوگو! کیا تم قریش کے اوباشوں کو دیکھ رہے ہو؟ انہوں نے کہا: جی ہاں۔ آپؐ نے فرمایا: "دیکھو! کل جب تمہارا ان سے سامنا ہو تو ان کو اس طرح کاٹ دینا جس طرح فصل کاٹی جاتی ہے"۔ اور آپ ﷺ نے پوشیدہ رکھتے ہوئے ہاتھ سے اشارہ کرکے بتایا اور داہنا ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھا۔ اور فرمایا: "اب تم سے ملاقات کا وعدہ کوہِ صفا پر ہے"۔ (صحیح مسلم:1780)

رسول اللہ ﷺ نے حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کو مہاجرین کا امیر بنا کر حکم دیا کہ وہ مکہ میں بالائی حصہ یعنی 'کداء' سے داخل ہوں اور 'حجون' میں اپنا جھنڈا گاڑھ کر آپ کی آمد تک وہیں ٹھہرے رہیں، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو قضاعہ، سلیم اور دوسرے قبائل کے ساتھ روانہ فرمایا اور ان کو حکم دیا کہ مکہ میں زیریں حصہ سے داخل ہوں اور اپنا جھنڈا گھروں کے قریب گاڑھ دیں، حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو انصار کے دستے کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے آگے آگے چلنے کا حکم دیا اور ان کو حکم دیا کہ اپنے ہاتھوں کو روکے رکھیں اور صرف جنگ کرنے والے کے ساتھ ہی جنگ کریں۔

اس طرح سے تمام ذمہ داریاں بالکل واضح تھیں اور ہر شخص کو اپنے متعلق ذمہ داریوں کا پورا علم تھا۔

مسلمانوں کی افواج مکہ مکرمہ میں ایک ہی وقت میں چاروں جانب سے داخل ہوئیں، ان کو کسی طرح کی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور چاروں طرف سے ایک ہی وقت میں داخل ہونے کے ذریعہ مشرکین پر ایک کاری ضرب لگ گئی اور ان کو جمع ہونے کا موقع نہیں مل پایا، یہ ایک حکیمانہ جنگی تدبیر تھی جس کو رسول اللہ ﷺ نے اس وقت اختیار کیا جبکہ آپؐ افرادی قوت اور سامانِ حرب وضرب کے اعتبار سے قوت کا مرکز بن چکے تھے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا منصوبہ مکمل طور پر کامیاب ہوا، مشرکین کسی طرح کی مزاحمت کا سوچ بھی نہیں پائے اور نہ ہی اس لشکرِ جرار کے سامنے آنے کی ہمت ہوئی، ہر فوجی دستہ اپنی متعینہ جگہ سے امن و سلامتی کے ساتھ داخل ہو رہا تھا، سوائے اس جانب کے جہاں حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو بھیجا گیا تھا، وہاں اس سمت میں قریش کے شدت پسند صفوان بن امیہ، عکرمہ بن ابی جہل، سہیل بن عمرو اور دیگر لوگ اپنے بعض حلیفوں کے ساتھ مقام 'خندمہ' میں جمع ہوئے اور تیروں کے ذریعہ پیش قدمی کرنے والی فوج کا مقابلہ کرنے لگے اور انہوں نے قتال کرنے کی کوشش کی، حضرت خالد بن ولیدؓ نے ان پر حملہ کرنے کے احکامات صادر کیئے اور چند ہی لمحات میں اس کمزور ٹولے کا خاتمہ کر

دیا گیا اور اس کے افراد کو منتشر کر دیا گیا، اس طرح سے اسلامی فوج نے مکہ مکرمہ پر پوری طور کنٹرول حاصل کر لیا۔ (دیکھیں: قیادۃ الرسولؐ السیاسیۃ والعسکریہ، ص:122)

کتبِ سیرت وتاریخ میں قبیلۂ بنی بکر کے حماس بن قیس بن خالد کا واقعہ ذکر کیا گیا ہے، وہ مسلمانوں سے جنگ کرنے کے لئے اسلحہ تیار کرتا تھا اور اس کی بیوی جب اس کو ان ہتھیاروں کو ٹھیک کرتے ہوئے اور بار بار ان کی دیکھ ریکھ کرتے ہوئے دیکھتی تھی تو وہ اس سے پوچھتی: آپ یہ کیوں تیاری کر رہے ہیں؟ وہ کہتا تھا: محمدؐ اور ان کے اصحاب کے لئے۔ ایک دن اس کی بیوی نے اس سے کہا: واللہ! میں نہیں سمجھتی کہ اس کے ذریعہ محمد اور اس کے اصحاب کا کچھ بگاڑ پاؤ گے۔ اس نے کہا: واللہ! مجھے یقین ہے کہ میں ان میں سے بعض کو تمہارا خادم بناؤں گا۔ جب فتح مکہ کا دن آیا تو حماس نے عکرمہ کے دستہ کے ساتھ مل کر مقابلہ آرائی کی کچھ کوشش کی، اس کے بعد اس نے مشرکین کو دیکھا کہ وہ خالد کی فوج کے سامنے ہوا ہو رہے ہیں تو وہ شکست خوردہ ہو کر اپنے گھر میں جا گھسا اور اپنی بیوی سے بولا: دروازہ بند کر لو۔ اس نے کہا: وہ کہاں گیا جو تم کہا کرتے تھے؟ کہنے لگا:

إِنَّكَ لَوْ شَهِدْتَ يَوْمَ الْخَنْدَمَهْ ... إِذْ فَرَّ صَفْوَانُ وَفَرَّ عِكْرِمَهْ
وَأَبُو يَزِيدَ قَائِمٌ كَالْمُوتَمَهْ ... وَاسْتَقْبَلَتْهُمْ بِالسُّيُوفِ الْمُسْلِمَهْ
يَقْطَعْنَ كُلَّ سَاعِدٍ وَجُمْجُمَهْ ... ضَرْبًا فَلَا يُسْمَعُ إِلَّا غَمْغَمَهْ
لَهُمْ نَهِيتٌ خَلْفَنَا وَهَمْهَمَهْ ... لَمْ تَنْطِقِي فِي اللَّوْمِ أَدْنَى كَلِمَهْ

ترجمہ: ”اگر تم نے جنگ خندمہ کا حال دیکھا ہوتا جب کہ صفوان اور عکرمہ بھاگ کھڑے ہوئے اور ابو یزید (سہیل بن عمرو) ایک بیوہ کی طرح کھڑا تھا، سونتی ہوئی تلواروں سے ہمارا استقبال کیا گیا، جو کلائیاں اور کھوپڑیاں اس طرح کاٹتی جا رہی تھیں کہ پیچھے سوائے ان کے شور وغوغا اور ہمہمہ کے کچھ سنائی نہیں پڑتا تھا، تو تم ملامت کی ادنی بات نہ کہتیں“۔

مکہ مکرمہ میں اسلامی لشکر کے داخل ہونے سے پہلے کرفیو لگا دیا گیا، لوگوں کے گھومنے پھرنے پر پابندی عائد کی گئی تھی، تاکہ مکہ میں داخل ہونے کے وقت کم سے کم محاذ آرائی اور جنگی صورتحال کی نوبت آئے، مسلسل یہ اعلان کیا جا رہا تھا: ”جو ابو سفیان کے گھر میں داخل ہو گا وہ مامون ہے، جو اپنا دروازہ بند کر کے اندر رہے گا وہ مامون ہے اور جو مسجد حرام میں داخل ہو گا وہ مامون ہے“۔ اللہ کے رسولؐ نے ابو سفیان کے گھر کو امتیازی خصوصیت عطا کی تھی تاکہ ابو سفیان اہلِ مکہ کو پُرامن رہنے اور پر سکون رہنے پر مطمئن کریں اور ان کے دل میں ایمان بھی راسخ ہو جائے۔ (دیکھیں: دراسۃ فی السیرۃ النبویہ، د۔ عماد الدین خلیل، ص:245)

ابو سفیان تیزی کے ساتھ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے اور بلند آواز سے پکارنے لگے: قریش کے لوگو! یہ محمد ﷺ ہیں۔ تمہارے پاس اتنا لشکر لے کر آئے ہیں کہ مقابلہ کی تاب نہیں، لہٰذا جو ابو سفیان کے گھر داخل ہو جائے اسے امان ہے۔ یہ سن کر اس کی بیوی ہند بنت عتبہ اٹھی اور اس کی مونچھ پکڑ کر بولی: مار ڈالو اس چرب دار، کڑے گوشت والے مشک کو۔ بُرا ہو ایسے پیشرو خبر رساں کا!۔

ابو سفیان نے کہا: تمہاری بُربادی ہو۔ دیکھو تمہاری جانوں کے بارے میں یہ عورت تمہیں دھوکہ میں نہ ڈال دے، کیونکہ محمدؐ ایسا لشکر لے کر آئے ہیں جس سے مقابلہ کی تاب نہیں۔ اس لئے جو ابو سفیان کے گھر میں داخل ہو جائے اسے امان ہے۔ لوگوں نے کہا: اللہ تجھے غارت کرے، تیرا گھر ہمارے کتنے آدمیوں کے کام آسکتا ہے؟ ابو سفیان نے کہا: اور جو اپنا دروازہ اندر سے بند کر لے اسے بھی امان ہے، اور جو مسجد حرام میں داخل ہو جائے اسے بھی امان ہے۔ یہ سن کر لوگ اپنے اپنے گھروں اور مسجد حرام کی طرف بھاگے۔

نبی کریم ﷺ نے مکہ کے بالائی حصہ 'الکداء' سے داخل ہونے کا بطور خاص اہتمام کیا تاکہ حضرت حسان بن ثابتؓ کے قول کو ثابت کریں، جبکہ انہوں نے قریش کی اپنے اشعار کے ذریعہ ہجو کی تھی اور ان کو بتایا تھا کہ اللہ کی فوج عنقریب 'کداء' سے داخل ہو گی، یہ قصیدہ حضرت حسان کا بہترین قصیدہ شمار کیا جاتا ہے، انہوں نے ان اشعار میں کہا تھا:

عَدِمْنَا خَيْلَنَا إِنْ لَمْ تَرَوْهَا ... تُثِيرُ النَّقْعَ مَوْعِدُهَا كَدَاءُ

تَظَلُّ جِيَادُنَا مُتَمَطِّرَاتٍ ... يُلَطِّمُهُنَّ بِالْخُمُرِ النِّسَاءُ

ترجمہ: "ہمارے جنگی گھوڑے نیست و نابود ہو جائیں اگر آپ ان کو غبار اڑاتے ہوئے نہیں دیکھو گے، جبکہ وہ 'کداء' سے داخل ہو رہے ہوں گے، ہمارے عمدہ گھوڑے معرکہ کی سرزمین پر موصلا دھار بارش کی طرح سرگرم ہوں گے، لیکن ان کا مقابلہ کرنے والا کوئی نہیں ہو گا سوائے عورتوں کے، جو اپنی چادروں سے ان کے چہروں پر مار رہی ہوں گی"۔ (دیکھیں: البدایہ والنھایہ: 4/309)

اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں: جب رسول اللہ ﷺ فتح مکہ کے سال مکہ میں داخل ہوئے تو آپؐ نے دیکھا کہ عورتیں گھوڑوں کے چہروں پر اپنی چادروں سے مار رہی ہیں، آپ حضرت ابو بکرؓ کی جانب دیکھ کر مسکرانے لگے اور فرمایا: اے ابو بکر! حسان نے کیا کہا تھا؟! حضرت ابو بکر نے یہی شعر پڑھا:

تَظَلُّ جِيَادُنَا مُتَمَطِّرَاتٍ ... يُلَطِّمُهُنَّ بِالْخُمُرِ النِّسَاءُ (دیکھیں: مغازی الواقدی: 2/831)

۲: متکبر فاتح کے بجائے متواضع فاتح کا داخلہ:

اللہ کے رسولؐ فتح مکہ کے روز مکہ مکرمہ میں اس حال میں داخل ہوئے کہ آپؐ کے سر پر ایک سیاہ عمامہ تھا اور آپؐ بغیر احرام کے تھے۔ (مسند احمد: 1/363، صحیح مسلم: 1358، سنن ابو داؤد: 4076، سنن ترمذی: 1735، سنن نسائی: 5/201، سنن ابن ماجہ: 2822) آپؐ تواضع اور انکساری اختیار کئے ہوئے اپنا سر جھکائے ہوئے تھے یہاں تک کہ آپؐ کی ٹھوڑی کجاوے کے ساتھ مَس ہو رہی تھی۔ (الدلائل للبیہقی: 5/68، مستدرک حاکم: 3/47، مسند أبو یعلی: 3393، مجمع الزوائد: 6/169) آپؐ سورۃ الفتح کی تلاوت کرتے ہوئے داخل ہوئے۔ (صحیح بخاری: 4281 صحیح مسلم: 794-238)

آپؐ کو نعمتِ فتح کا، گناہوں کی معافی کا اور بھرپور نصرت و تائید کا پورا احساس تھا اور جب آپؐ فاتحانہ طور پر مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے۔ جو جزیرۃ العرب کا قلب، اس کا روحانی اور سیاسی مرکز ہے۔ آپؐ نے عدل و مساوات اور انکساری اور تواضع کے تمام شعائر کا اظہار فرمایا، آپؐ نے حضرت اسامہ بن زیدؓ کو ردیف کے طور پر اپنے ساتھ سواری پر بٹھایا۔ (صحیح بخاری: 4289) وہ رسول اللہ ﷺ کے آزاد

کردہ غلام کے بیٹے تھے، آپؐ نے بنوہاشم میں سے یا اشرافِ قریش میں سے کسی کو اپنی سواری پر بحیثیتِ ردیف نہیں بٹھایا حالانکہ وہ بہت بڑی تعداد میں موجود تھے، یہ اکیس رمضان المبارک سن آٹھ ہجری بروز جمعہ کی صبح کا واقعہ ہے۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویہ، ابوالحسن ندویؒ، ص:337)

شیخ محمد غزالیؒ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مکہ میں داخلہ کی منظر کشی کرتے ہوئے رقمطراز ہیں: "جب ٹھاٹھیں مارتا ہوا لشکر پیش قدمی کر رہا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی اونٹنی پر سوار تھے، آپؐ کے سر پر ایک سیاہ عمامہ نمایاں طور پر نظر آرہا تھا اور آپؐ کا سر خشیتِ الٰہی کی شدت سے جھکا جارہا تھا، آپؐ اپنی سواری پر جھکے جارہے تھے اور آپؐ پر مکمل تواضع ظاہر تھا، عظمت وہیبت سے پُر لشکر حرم کی جانب بڑھ رہا تھا اور آپؐ کے چاروں طرف زرہ پوش دستہ آپ کی طرف سے اشارۂ ابرو کا منتظر تھا، آج پورا مکہ آپؐ کے زیرِ کنٹرول تھا، بلاشبہ یہ فتح مبین آپؐ کو مختلف مراحل پر مشتمل طویل ماضی کو یاد دلا رہی تھی کہ کیسے آپ کو وہاں سے نکلنے پر مجبور کیا گیا اور کس طرح آج فاتحانہ طور پر کامیاب وکامران ہو کر واپس آرہے ہیں؟! اللہ تعالیٰ نے اس مبارک صبح میں آپؐ کو کس عظیم کرامت وعزت سے سرفراز کیا ہے، جب جب آپ کو اس عظیم نعمت کا احساس ہوتا تھا آپؐ اپنی سواری پر خشیت وانابت اور انکساری کے ساتھ جھکتے جارہے تھے۔ (دیکھیں: فقہ السیرۃ للغزالی، ص:379)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتح مکہ کے روز مکہ کے داخلی ماحول کو پُرامن رکھنے کی پوری کوشش کی، اسی لئے جب آپؐ کو یہ معلوم ہوا کہ حضرت سعد بن عبادہؓ نے ابوسفیان سے یہ کہا ہے: آج جنگ اور خونریزی کا دن ہے، آج کعبہ میں سب جائز ہو جائے گا۔ تو آپؐ نے فرمایا: یہ وہ دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ کعبہ کو عظمت عطا کرے گا اور آج کعبہ کو غلاف پہنایا جائے گا۔ (صحیح بخاری:4280، الدلائل للبیہقی:5/38، تاریخ طبری:3/118) آپؐ نے حضرت سعد بن عبادہؓ سے جھنڈا لے کر ان کے بیٹے حضرت قیس بن سعدؓ کے حوالہ کیا، اس حکیمانہ تصرف کے ذریعہ آپؐ نے کسی بھی جزوی معرکہ کا احتمال ہی ختم کر دیا، ساتھ ہی ساتھ آپؐ نے انصار کو بھی ناراض نہیں کیا، آپؐ نے جھنڈا کسی انصاری سے لے کر مہاجر کو نہیں دیا بلکہ انصاری سے لے کر ان کے بیٹے کو دیا، انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ کسی کو اپنے سے برتر اور افضل نہیں دیکھنا چاہتا ہے، سوائے اپنی اولاد کے۔ (قیادۃ الرسولؐ السیاسیہ والعسکریہ، ص:196)

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ مکرمہ میں پہنچ گئے اور لوگ ہر اعتبار سے مطمئن ہو گئے تو آپؐ خانہ کعبہ تشریف لائے اور آپؐ نے وہاں جا کر بیت اللہ کا طواف کیا، اس وقت آپؐ کے دستِ مبارک میں ایک کمان تھی، کعبہ میں تین سو ساٹھ بت تھے، آپ اس کمان سے ان بتوں کو مارتے تھے اور فرماتے تھے: ﴿وَقُلْ جَآءَ ٱلْحَقُّ وَزَهَقَ ٱلْبَٰطِلُ ۚ إِنَّ ٱلْبَٰطِلَ كَانَ زَهُوقًا﴾ ترجمہ: "اور اعلان کر دو کہ حق آگیا اور باطل مٹ گیا، باطل تو مٹنے ہی والا ہے"۔ (سورۃ الاسراء: 81) ﴿قُلْ جَآءَ ٱلْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ ٱلْبَٰطِلُ وَمَا يُعِيدُ﴾ ترجمہ: "کہہ دیجئے کہ حق آگیا اور باطل نہ ابتدا کرتا ہے اور نہ پھر کر لاتا ہے"۔ (سورۃ سبأ:49)۔ اس طرح یہ تمام بت ایک ایک کر کے منہ کے بل گرتے جاتے۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویہ للندوی، ص:339)

آپؐ کو کعبہ میں کچھ تصویریں اور شبیہیں بھی نظر آئیں اور آپؐ کے حکم سے ان کو بھی توڑ پھوڑ دیا گیا۔ (ایضاً)

اللہ کے رسول ﷺ نے اس وقت تک خانہ کعبہ کے اندر داخل ہونے سے انکار کیا جب تک کہ وہاں موجود مجسموں کو نکال نہ دیا گیا، اس میں ایک مجسمہ تھا جس کے متعلق وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ ابراہیم (علیہ السلام) اور اسماعیل (علیہ السلام) کا مجسمہ ہے، ان دونوں کے ہاتھوں میں فال نکالنے کے تیر تھے، یہ دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ انہیں غارت کرے، انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ان دونوں نے کبھی بھی فال نہیں نکالا۔ (مسند أحمد: 1/365، صحیح بُخاری: 4288)

اس کے بعد آپؐ خانہ کعبہ کے اندر داخل ہوئے اور اس کے کونے کونے میں اللہ کی کبریائی بیان کی، اس کے بعد نماز ادا فرمائی، چنانچہ حضرت ابن عمر سے روایت ہے: آنحضرت ﷺ کعبہ کے اندر تشریف لے گئے اور اسامہ بن زیدؓ، بلالؓ اور عثمان بن طلحہؓ بھی آپ ﷺ کے ساتھ تھے۔ پھر عثمانؓ نے کعبہ کا دروازہ بند کر دیا اور آپ ﷺ اس میں ٹھہرے رہے۔ جب آپؐ باہر نکلے تو میں نے بلالؓ سے پوچھا کہ نبی کریم ﷺ نے اندر کیا کیا؟ انہوں نے کہا کہ آپؐ نے ایک ستون کو تو بائیں طرف چھوڑا اور ایک کو دائیں طرف اور تین کو پیچھے۔ اور اس زمانہ میں خانہ کعبہ میں چھ ستون تھے۔ پھر آپ ﷺ نے نماز پڑھی۔ (صحیح مسلم: 1329 سنن أبو داؤد: 2023)

اسلام قبول کرنے سے پہلے خانہ کعبہ کی چابی عثمان بن طلحہؓ کے پاس تھی حضرت علیؓ نے چاہا کہ سقایہ (پانی پلانے کا انتظام) کے ساتھ ساتھ چابی بھی ان کے پاس رہے لیکن نبی کریم ﷺ نے خانہ کعبہ سے نکلنے کے بعد فرمایا: عثمان بن طلحہؓ کہاں ہے؟ ان کو بلایا گیا اور یہ کہتے ہوئے چابی ان کو دی: لو یہ تمہاری کنجی ہے، آج حسنِ سلوک اور پاسِ وفا کا دن ہے، یہ تمہارے پاس ہمیشہ ہمیش رہے گی اور ظالم کے سوا کوئی تم سے اس کو نہیں چھین نہ سکے گا۔ (المعجم الکبیر للطبرانی: 8395، مصنف عبدالرزاق: 5/83، مجمع الزوائد: 6/177، سیرت ابن ہشام: 4/62)

اس سے پہلے جب آپؐ نے ہجرت سے قبل ایک دن کلیدِ کعبہ طلب فرمائی تھی تو عثمان بن طلحہؓ نے سخت جواب دیا تھا اور آپؐ سے اہانت آمیز گفتگو کی تھی اور آپؐ نے حلم اور بردباری سے کام لیتے ہوئے یہ فرمایا تھا: "عثمان! تم یہ کلید کسی وقت میرے ہاتھ میں دیکھو گے، اس وقت میں جسے چاہوں گا اسے یہ دوں گا، اس کے جواب میں انہوں نے کہا تھا: اگر ایسا ہوا تو وہ دن قریش کی بڑی ذلت و تباہی کا ہوگا"۔ آپؐ نے فرمایا: نہیں، اس دن وہ آباد اور باعزت ہوں گے۔ یہ الفاظ عثمان بن طلحہؓ کے دل نشین ہو گئے اور انہوں نے محسوس کیا کہ جیسا آپؐ نے فرمایا ہے ایسا ہی ہوگا۔ (دیکھیں: المغازی: 2/838)

اللہ کے رسول ﷺ نے کلیدِ کعبہ پر خود قبضہ نہیں کیا بلکہ بنو ہاشم میں سے بھی کسی کو یہ شرف عطا کرنا پسند نہیں فرمایا، بہت سے لوگوں نے اس کو حاصل کرنے کی کوشش بھی کی لیکن آپؐ نے ایسا نہیں کیا، اس لئے کہ اس کے ذریعہ دل آزاری بھی ہوتی تھی اور یہ اپنے کنٹرول اور دسترس کا ایک مظہر بھی تھا، اور یہ نبوت کی ذمہ داریوں کا حصہ نہیں ہے...... اللہ کے رسولؐ کی شریعت میں عظیم فتح کا مفہوم یہ تھا کہ حسنِ سلوک اور وفاداری کا معاملہ کیا جائے حتیٰ کہ ان لوگوں کے ساتھ بھی جنہوں نے عہد شکنی کی، مکر و فریب سے کام لیا اور محاذ آرائی اور مقابلہ کیا۔ (دیکھیں: صور و عبر من الجهاد النبوی فی المدینة، ص: 401)

اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے حضرت بلالؓ کو خانہ کعبہ کی چھت پر چڑھنے کا حکم دیا تاکہ وہ نماز کے لئے اذان دیں، حضرت بلالؓ خانہ کعبہ کی چھت پر چڑھے اور اذان دی، تمام اہلِ مکہ اس نئی آواز پر گوش بر آواز تھے گویا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہے تھے، یہ کلمات فضا میں

ایک تلاطم برپا کردیتے ہیں اور شیاطین کے دلوں میں خوف اور ڈر پیدا کرتے ہیں، ان الفاظ کی گونج کے سامنے وہ بھاگنے پر مجبور ہوتے ہیں یا پھر ایمان والوں کی صف میں شامل ہو جاتے ہیں، اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر۔(دیکھیں: فقہ السیرۃ للغزالی، ص:383)

یہی وہ آواز ہے جو ایک دن عذاب اور سزاؤں کے زیر سایہ آہستہ آہستہ ان الفاظ میں سنائی دیتی تھی: أحد أحد! آج یہی آواز خانہ کعبہ کے اوپر علانیہ طور پر پورے جوش و خروش کے ساتھ گونج رہی ہے: "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" اور ہر ایک اس آواز کے سامنے خاموش، ڈرا ہوا، سہما ہوا اور پیکرِ عجز و نیاز بنا ہوا ہے۔

۳: عمومی معافی کا اعلان:

اہلِ مکہ کے لئے عمومی معافی کا اعلان کیا گیا، اگرچہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو طرح طرح کی ایذائیں دی تھیں اور آپ ﷺ کی دعوت کے تئیں انتہائی ناروا سلوک کیا تھا، اسلامی لشکر ان کو مکمل طور پر ختم کردینے اور سزا دینے پر پوری طرح قدرت رکھتا تھا، عمومی معافی کا اعلان اس وقت کیا گیا جب کہ وہ خانہ کعبہ کے پاس جمع تھے اور اپنے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی طرف سے فیصلہ کے منتظر تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: آپ لوگوں کا کیا خیال ہے میں تمہارے ساتھ کیا کرنے والا ہوں؟ انہوں نے جواب دیا: ہم اچھی ہی امید رکھتے ہیں، آپ کریم النفس اور شریف بھائی ہیں، اور کریم و شریف بھائی کے بیٹے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں تم سے وہی کہتا ہوں جو یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا: لا تثریب علیکم الیوم، یغفر اللہ لکم! آج تم پر کوئی الزام نہیں، جاؤ، اللہ تمہیں معاف کرے۔(السنن الکبری للبیہقی: 9/118، الدلائل: 5/58، طبقات ابن سعد: 2/141، المجتمع المدنی للعمری، ص179)

اس عفو عام کے نتیجہ میں تمام جانیں قتل سے اور گرفتاری سے محفوظ ہو گئیں، اور اراضی اور اموال منقولہ ان کے مالکوں کے پاس ہی رہے، ان پر کوئی خراج عائد نہیں کیا گیا، اور مکہ کے ساتھ اس طرح کا معاملہ نہیں کیا گیا جیسا کہ دیگر مفتوحہ علاقوں کے ساتھ کیا گیا، اس لئے کہ مکہ مقدس و محترم مقام تھا، وہ مقام حج، جائے عبادت اور رب کا حرم ہے، اسی لئے جمہور سلف و خلف کا موقف یہ ہے کہ اراضی مکہ کا بیچنا اور وہاں کے گھروں کو کرایہ پر دینا جائز نہیں ہے، وہ حجاج اور زائرین کے قیام کی جگہ ہے، وہاں کے باشندوں کو جس قدر گھروں کی ضرورت ہوگی وہ ان میں رہیں گے اور جو ان کی ضرورت سے زائد ہوں گے وہ حجاج، زائرین اور عمرہ کرنے والوں کے قیام کے لئے ہوں گے۔ البتہ دیگر علماء کا موقف یہ ہے کہ اراضی مکہ کی خرید و فروخت اور وہاں کے گھروں کو کرایہ پر دینا جائز ہے، ان کے دلائل قوی اور مضبوط ہیں جبکہ منع کرنے والوں کے دلائل مرسل اور موقف ہیں۔(المجتمع المدنی للعمری، ص:180)

۴: بعض مجرموں کا خون رائیگاں قرار دیا گیا:

اس عمومی معافی اور تحسین و عفو و درگزر کے ساتھ ساتھ سخت فیصلہ بھی لیا گیا جو حکیمانہ قیادت کی امتیازی خصوصیات میں سے ہے، اسی لئے اس عمومی معافی سے دس سے زائد افراد کو مستثنیٰ قرار دیا گیا، آپ ﷺ نے حکم دیا کہ اگر وہ کعبہ کے پردہ کے پیچھے بھی پائے جائیں تو انہیں

قتل کیا جائے، اس لئے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے حق میں ان کے جرائم بہت خطرناک تھے اور فتح کے بعد بھی ان کی طرف سے فتنہ انگیزی کا خطرہ تھا۔

حافظ ابن حجرؒ 'فتح الباری' میں فرماتے ہیں: متفرق مقامات سے میں نے ان کے نام جمع کئے ہیں اور وہ ہیں: عبدالعزی بن خطل، عبداللہ بن سعد بن أبی سرح، عکرمہ بن أبی جہل، حویرث بن نُقید، مِقیس بن صُبابہ، ہبار بن أسود، ابن خطل کی دو گانے والی: فَرتنی اور قُریبہ، یہ دونوں نبی کریم ﷺ کے بارے میں ہجو کے اشعار گاتی تھیں، بنی عبدالمطلب کی لونڈی سارہ۔ ابو معشر نے ان لوگوں میں حارث بن طُلاطِل خزاعی کا بھی ذکر کیا ہے۔ حاکم نے ذکر کیا ہے کہ جن کا خون رائیگاں قرار دیا گیا ان میں کعب بن زبیر، وحشی بن حرب اور ہند بنت عتبہ بھی تھے۔ (فتح الباری، حدیث نمبر: 4280)

ان میں سے بعض کو قتل کیا گیا، بعض بعد میں تائب و مسلمان ہو کر آگئے اور رسول اللہ ﷺ نے ان کے ساتھ عفو در گزر کا معاملہ فرمایا اور انہوں نے مخلصانہ اسلام قبول کیا۔

۳: فتح مکہ کی صبح نبی کریم ﷺ کا خطبہ اور اہلِ مکہ کا قبولِ اسلام:

فتح مکہ کی صبح نبی کریم ﷺ کو یہ اطلاع ملی کہ آپؐ کے حلیف قبیلۂ خزاعہ نے ہذیل کے ایک مشرک شخص پر حملہ کر کے اس کو قتل کر دیا ہے، اس لئے کہ ھذیل کے ہاتھوں ان کا ایک شخص قتل ہوا تھا، آپؐ یہ سن کر غضبناک ہو گئے اور لوگوں کے درمیان خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہو گئے، آپؐ نے فرمایا: "لوگو! اللہ نے جس دن آسمان کو پیدا کیا اسی دن مکہ کو حرم (حرمت والا شہر) ٹھہرایا، اس لئے وہ اللہ کی حرمت کے سبب قیامت تک کے لئے حرم ہے، کوئی آدمی جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو اس کے لئے حلال نہیں کہ اس میں خون بہائے یا یہاں کا کوئی درخت کاٹے، یہ نہ مجھ سے پہلے کسی کے لئے حلال تھا اور نہ ہی میرے بعد کسی کے لئے حلال ہوگا، اور میرے لئے بھی اسے صرف دن کی ایک ساعت میں حلال کیا گیا، پھر آج اس کی حرمت اسی طرح پلٹ آئی جس طرح کل اس کی حرمت تھی، اب چاہیے کہ جو حاضر ہے وہ غائب کو یہ بات پہنچادے"۔

"خزاعہ کے لوگو! اپنا ہاتھ قتل سے روک لو، کیونکہ قتل اگر نفع بخش ہوتا تو بہت قتل ہوتا۔ تم نے ایک ایسا آدمی قتل کیا ہے کہ میں اس کی دیت لازماً ادا کروں گا۔ پھر میرے اس مقام کے بعد اگر کسی نے کسی کو قتل کیا تو مقتول کے اولیاء کو دو باتوں کا اختیار ہوگا: چاہیں تو قاتل کا خون بہائیں اور چاہیں تو اس سے دیت لیں"۔ (سنن أبو داود: 4504 سنن ترمذي: 1406 الدلائل للبيهقي 83/5)

اہلِ مکہ کے بارے میں اور بعض اشتہاری مجرموں کے لئے جب عمومی معافی کا اعلان کر دیا گیا تو اہلِ مکہ مرد و زن، آزاد و غلام سب اللہ کے دین میں اختیار و اطاعت کے ساتھ داخل ہو گئے اور اہلِ مکہ کے حلقہ بگوش اسلام ہونے کی وجہ سے لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہونا شروع ہو گئے اور اللہ کی طرف سے نعمت تمام ہو گئی اور شکر واجب ہو گیا۔ (السيرة النبوية لأبي شهبة: 2/456)

اللہ کے رسول ﷺ نے مرد و خواتین اور چھوٹے بڑوں سب لوگوں کے ساتھ بیعت کی، آپؐ نے مردوں سے بیعت شروع کی، آپؐ بیعت لینے کے لئے صفا پر بیٹھے، آپؐ نے ان سے اسلام پر اور بقدرِ استطاعت اللہ اور اس کے رسول کے لئے سمع و اطاعت پر بیعت لی،

مجاشع بن مسعود اپنے بھائی مجالد کو لے کر فتح کے دوسرے روز آئے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: میں آپ کے پاس اپنا بھائی لے کر آیا ہوں تاکہ آپ ان سے ہجرت پر بیعت کریں، آپؐ نے فرمایا: ”اہلِ ہجرت اس کا اجر و ثواب لے گئے“۔ انہوں نے کہا: آپ پھر ان سے کس چیز پر بیعت لیں گے؟ آپؐ نے فرمایا: میں ان سے اسلام، ایمان اور جہاد پر بیعت لوں گا۔ (مسند أحمد: 3/469، صحیح بخاری: 4305، صحیح مسلم: 1863)

امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن فرمایا: اب ہجرت (مکہ سے مدینہ کے لئے) باقی نہیں رہی، البتہ حسنِ نیت اور جہاد باقی ہے، اس لئے اب تمہیں جہاد کے لئے بلایا جائے تو فوراً نکل جاؤ“۔ (صحیح بخاری: 1834، صحیح مسلم: 1353)

مراد یہ ہے کہ مکہ سے جو ہجرت واجب تھی وہ اب فتح مکہ کے ذریعہ ختم ہو گئی، اب اسلام سربلند و قوی ہو چکا ہے اور اس کی بنیادیں مضبوط و مستحکم ہو گئی ہیں اور لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہو گئے، اور جہاں تک دار الکفر سے دار الاسلام کی جانب ہجرت کرنے کا تعلق ہے یا کسی ایسے مقام سے جہاں دین اور شعائرِ اسلام کا قیام ممکن نہ ہو وہاں سے کسی دوسری جگہ ہجرت کرنے کا حکم تو قیامت تک باقی ہے، البتہ اس ہجرت کا حکم مختلف ہو گا، یہ ہجرت کبھی واجب ہو گی اور کبھی واجب نہیں ہو گی، اسی طرح جہاد اور انفاق فی سبیل اللہ قیامت تک کے لئے مشروع اور باقی ہے، لیکن اس کا حکم فتح مکہ سے پہلے کئے جانے والے انفاق اور جہاد کی طرح نہیں ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَا لَكُمْ أَلَّا تُنفِقُوا۟ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ وَلِلَّهِ مِيرَٰثُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ ۚ لَا يَسْتَوِى مِنكُم مَّنْ أَنفَقَ مِن قَبْلِ ٱلْفَتْحِ وَقَٰتَلَ ۚ أُو۟لَٰٓئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ ٱلَّذِينَ أَنفَقُوا۟ مِنۢ بَعْدُ وَقَٰتَلُوا۟ ۚ وَكُلًّا وَعَدَ ٱللَّهُ ٱلْحُسْنَىٰ ۚ وَٱللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ﴾ ترجمہ: ”آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے حالانکہ زمین اور آسمانوں کی میراث اللہ ہی کے لئے ہے، تم میں سے جو لوگ فتح کے بعد خرچ اور جہاد کریں گے وہ کبھی اُن لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جنہوں نے فتح سے پہلے خرچ اور جہاد کیا ہے، اُن کا درجہ بعد میں خرچ اور جہاد کرنے والوں سے بڑھ کر ہے، اگرچہ اللہ نے دونوں ہی سے اچھے وعدے فرمائے ہیں، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے“۔ (سورۃ الحدید: 10)

جب نبی کریم ﷺ مردوں کی بیعت سے فارغ ہو چکے تو وہیں صفا ہی پر عورتوں سے بیعت لینی شروع کی، حضرت عمرؓ آپ ﷺ سے نیچے بیٹھے تھے اور آپ ﷺ کے حکم پر عورتوں سے بیعت لے رہے تھے اور انہیں آپؐ کی باتیں پہنچا رہے تھے، اسی دوران ابو سفیان کی بیوی ہند بنت عتبہ بھیس بدل کر آئی، دراصل حضرت حمزہؓ کی لاش کے ساتھ اس نے جو حرکت کی تھی اس کی وجہ سے وہ خوف زدہ تھی کہ کہیں رسول اللہ ﷺ اسے پہچان نہ لیں۔ ادھر رسول اللہ ﷺ نے (بیعت شروع کی) تو فرمایا: میں تم سے اس بات پر بیعت لیتا ہوں کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو گی۔ حضرت عمرؓ نے (یہی بات دہراتے ہوئے) عورتوں سے اس بات پر بیعت لی کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گی۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اور چوری نہ کرو گی۔ اس پر ہندہ بول اٹھی کہ ابو سفیان بخیل آدمی ہے۔ اگر میں اس کے مال سے کچھ لے لوں تو؟ ابو سفیان نے (جو وہیں موجود تھے) کہا: تم جو کچھ لے لو وہ تمہارے لئے حلال ہے۔ رسول اللہ ﷺ مسکرانے

لگے، آپ ﷺ نے ہندہ کو پہچان لیا، فرمایا: اچھا! تو تم ہو ہندہ؟ وہ بولی: ہاں، اے اللہ کے نبی، جو کچھ گزر چکا ہے اسے معاف فرمادیجیے، اللہ آپ کو معاف فرمائے۔

اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: اور زنا نہ کرو گی۔ اس پر ہندہ نے کہا: بھلا کہیں حُرَّہ (آزاد عورت) بھی زنا کرتی ہے؟! پھر آپ ﷺ نے فرمایا: اور اپنی اولاد کو قتل نہ کرو گی۔ ہندہ نے کہا: ہم نے تو بچپن میں انہیں پالا پوسا، لیکن بڑے ہونے پر آپ لوگوں نے انہیں قتل کر دیا۔ اس لئے آپ اور وہی بہتر جانیں۔ یاد رہے کہ ہندہ کا بیٹا حنظلہ بن ابی سفیان بدر کے دن قتل کیا گیا تھا۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ ہنستے ہنستے چت لیٹ گئے اور رسول اللہ ﷺ نے بھی تبسم فرمایا۔

اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: اور کوئی بہتان نہ گڑھو گی۔ ہندہ نے کہا: واللہ! بہتان بڑی بُری بات ہے اور آپ ہمیں واقعی رشد اور مکارم اخلاق کا حکم دیتے ہیں۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: اور کسی معروف بات میں رسول کی نافرمانی نہ کرو گی۔ ہندہ نے کہا: اللہ کی قسم! ہم اپنی اس مجلس میں اپنے دلوں کے اندر یہ بات لے کر نہیں بیٹھی ہیں کہ آپ کی نافرمانی بھی کریں گی۔

اللہ کے رسول نے عورتوں کے ساتھ بغیر مصافحہ کے بیعت کی، آپؐ عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتے تھے اور سوائے حلال (محرم) عورتوں کے کسی عورت کا ہاتھ نہیں چھوتے تھے۔ صحیحین میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: ''نہیں، واللہ! رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ نے کبھی بھی کسی (غیر) عورت کے ہاتھ کو نہیں چھوا''۔ (صحیح بخاری:5288، صحیح مسلم:1866)

ایک اور روایت میں ہے: آپؐ ان کے ساتھ صرف زبان سے بیعت لیتے تھے، آپؐ فرماتے تھے: میرا ایک خاتون سے جس طرح کلام ہوتا ہے وہی کلام سو عورتوں کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ (دیکھیں: البدایہ والنہایہ 319/4)

۴: بنو جذیمہ کی جانب حضرت خالد بن ولیدؓ کی روانگی:

اللہ کے رسولؐ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو بنو جزیمہ کی جانب بحیثیت داعی بھیجا، یہ سن آٹھ ہجری کے ماہ شوال کا حنین سے پہلے کا واقعہ ہے، حضرت خالدؓ کے ساتھ بنو سلیم، مدلج اور انصار و مہاجرین کے مجاہدین تھے، ان کی تعداد تقریباً ساڑھے تین سو تھی، جب بنو جذیمہ کے لوگوں نے حضرت خالدؓ کی قیادت میں لشکر دیکھا تو انہوں نے ہتھیار اٹھائے، حضرت خالدؓ نے ان سے کہا: ہتھیار ڈال دو! اس لئے کہ لوگ اسلام قبول کر چکے ہیں، ان میں سے 'جحدر' نامی ایک شخص کھڑا ہوا، اور کہا: اے بنو جذیمہ! تمہارا بُرا ہو، یہ خالد ہیں، واللہ! ہتھیار ڈالنے کے بعد گرفتاری ہونی ہے اور گرفتاری کے بعد گردنیں ماری جائیں گی، واللہ! میں کبھی بھی ہتھیار نہیں ڈالوں گا۔ وہ اس کو مسلسل سمجھاتے رہے یہاں تک کہ اس نے ہتھیار ڈال دیئے، جب اس نے ہتھیار ڈال دیئے تو حضرت خالدؓ نے ان کو اسلام کی دعوت دی۔

انہوں نے أسلمنا (ہم اسلام لائے) کے بجائے صبأنا صبأنا (ہم نے اپنا دین چھوڑا، ہم نے اپنا دین چھوڑا) کہا۔ اس پر حضرت خالدؓ نے ان کا قتل اور ان کی گرفتاری شروع کر دی، اور ایک ایک قیدی اپنے ہر ساتھی کے حوالے کیا۔ پھر ایک دن حکم دیا کہ ہر آدمی اپنے قیدی کو قتل کر دے، لیکن حضرت ابن عمرؓ اور ان کے ساتھیوں نے اس حکم کی تعمیل سے انکار کر دیا اور جب نبی ﷺ کے پاس آئے تو

آپ ﷺ سے اس کا تذکرہ کیا۔ آپ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور دو بار فرمایا: اے اللہ! خالد نے جو کچھ کیا میں اس سے تیری طرف براءت اختیار کرتا ہوں۔ (مسند أحمد 150/2 صحيح البخاري: 4339 سنن نسائي 237/8 طبقات ابن سعد 147/2 السيرة النبوية لأبي شهبة 464/2)

اس موضوع سے متعلق حضرت خالدؓ اور حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کے درمیان بحث بھی ہوئی یہاں تک کہ ان کے درمیان تلخ کلامی بھی ہوئی، حضرت ابن عوفؓ کو اندیشہ تھا کہ خالدؓ کی طرف سے جو کچھ رد عمل سامنے آرہا ہے وہ ان کے چچا 'الفاکہ بن مغیرہ' کا بدلہ نہ ہو جس کو جذیمہ نے زمانۂ جاہلیت میں مارا تھا، شاید اسی کی جانب صحیح مسلم میں مروی حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے: ابن الولید اور عبدالرحمن بن عوف کے درمیان کچھ اختلاف ہوا تو خالد نے ان کو گالی دی، یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میرے کسی صحابی کو برا بھلا مت کہو، اس لئے کہ تم میں سے کوئی اگر اُحد پہاڑ کے برابر بھی سونا خرچ کرے گا تو ان کے خرچ کئے ہوئے مُد یا اس کے نصف تک بھی نہیں پہنچے گا''۔ (صحیح بخاری: 3673 صحیح مسلم: 2541)

اس کے بعد اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت علیؓ کو بھیجا اور ان کے مقتولین کی دیت ادا کی اور ان کی دلجوئی کے لئے اور ان کے خون سے اظہارِ براءت کے لئے زیادہ دیت ادا کی۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویہ فی ضوء المصادر الاصلیہ، ص: 579)

اس حکیمانہ نبوی تصرف کے ذریعہ نبی کریم ﷺ نے بنی جذیمہ کے ساتھ ہمدردی اور غمخواری کی اور ان کے حزن و ملال کو ختم کر دیا، حضرت خالدؓ کا انہیں قتل کرنا ان کی ایک اجتہادی غلطی اور غلط تاویل کا نتیجہ تھا، اسی لئے آپؐ نے ان کے اس فعل پر ان کو کوئی سزا نہیں دی۔

۵: بت خانوں کا منہدم کرنا:

جب خانہ کعبہ اور بیت حرام کو بتوں سے پاک کر دیا گیا تو ضروری تھا کہ ان تمام عمارتوں کو بھی منہدم کیا جائے جن کو بت پرستی کے لئے تعمیر کیا گیا تھا، وہ ایک طویل عرصہ سے جاہلیت کے مَعلَم (نشان) رہ چکے تھے، اس مقصد سے رسول اللہ ﷺ نے جزیرۃ العرب میں بہت سے سرایا اور فوجی دستے روانہ فرمائے، ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

ا: عزیٰ کی جانب سریہ خالد بن ولیدؓ:

فتح مکہ سے یک سو ہو جانے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کی سرکردگی میں عُزّیٰ کے انہدام کے لئے ایک سریہ روانہ فرمایا۔ عُزّیٰ نخلہ میں تھا، قریش اور سارے بنو کنانہ اس کی پوجا کرتے تھے اور یہ ان کا سب سے بڑا بت تھا، بنو شیبان اس کے مجاور تھے، حضرت خالدؓ نے تیس سواروں کی معیت میں نخلہ جا کر اسے ڈھا دیا، اس کو ڈھاتے ہوئے حضرت خالدؓ یہ بار بار پڑھ رہے تھے:

كفرانك لا سبحانك إني رأيت الله قد أهانك

یعنی: ہم تمہارا انکار کرتے ہیں، تیری پاکی نہیں بیان کر سکتے ہیں، میں نے دیکھا ہے کہ اللہ نے تجھے ذلیل و خوار کر دیا ہے۔

واپسی پر رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ تم نے کچھ دیکھا بھی تھا۔ حضرت خالدؓ نے کہا: نہیں۔ آپؐ نے فرمایا: تب تو در حقیقت تم نے اسے ڈھایا ہی نہیں، پھر سے جاؤ اور اسے ڈھا دو۔ حضرت خالدؓ بپھرے ہوئے اور تلوار سونتے ہوئے دوبارہ تشریف لے گئے۔ جب حضرت

خالدؓ وہاں پہنچے اور وہاں کے مجاوروں نے ان کو دیکھا وہ سمجھ گئے کہ وہ اس مرتبہ اس لئے آئے ہیں تا کہ اپنی مہم کی تکمیل کریں،اس لئے وہ پہاڑوں پر بھاگ گئے اور وہ چلا رہے تھے: اے عزیٰ! اس کی عقل خراب کردے، اے عزیٰ! اس کو اندھا کردے۔ حضرت خالدؓ وہاں پہنچے تو اب کی باران کی جانب ایک ننگی، کالی، پراگندہ سر عورت نکلی۔ مجاور اسے چیخ چیخ کر پکارنے لگا۔ لیکن اتنے میں حضرت خالدؓ نے اس زور کی تلوار ماری کہ اس عورت کے دو ٹکڑے ہوگئے۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کے پاس واپس آکر خبر دی۔ آپؐ نے فرمایا: ہاں! وہی عُزّیٰ تھی۔ اب وہ مایوس ہو چکی ہے کہ تمہارے ملک میں کبھی بھی اس کی پوجا کی جائے۔ (المعجم الكبير للطبراني:3811 مجمع الزوائد 176/6 مسند أبي يعلى:902 الدلائل للبيهقي 77/5 السرايا والبعوث النبوية، ص:282)

۲: مناۃ کی جانب سریہ سعد بن زید اشہلی:

مناۃ ایک بت تھا جو مُشَلّل علاقہ میں 'قدید' کے قریب بحر احمر کے ساحل پر واقع تھا، یہ اوس اور خزرج، غسان اور ان کے دین پر عمل پیرا لوگوں کا بت تھا، زمانہ جاہلیت میں وہ اس کی عبادت و تعظیم کرتے تھے، وہیں سے حج کا احرام باندھتے تھے، وہ اس کی اس قدر تعظیم کرتے تھے کہ اس کی وجہ سے وہ صفا اور مروہ کے درمیان طواف نہیں کرتے تھے، ان کے آباء واجداد سے یہ طریقہ چلا آرہا تھا کہ جو مناۃ سے احرام باندھے گا وہ صفا اور مروہ کے مابین طواف نہیں کرے گا، اسلام لانے تک ان کی عادت یہی رہی، جب وہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ حج کے لئے آئے اور اس بات کا ذکر آپؐ سے کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی: ﴿إِنَّ ٱلصَّفَا وَٱلْمَرْوَةَ مِن شَعَآئِرِ ٱللَّهِ ۖ فَمَنْ حَجَّ ٱلْبَيْتَ أَوِ ٱعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَن يَطَّوَّفَ بِهِمَا ۚ وَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ ٱللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ﴾ ترجمہ: "یقیناً صفا اور مروہ، اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں، لہٰذا جو شخص بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرے، اس کے لئے کوئی گناہ کی بات نہیں کہ وہ ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان سعی کرلے اور جو برضا و رغبت کوئی بھلائی کا کام کرے گا، اللہ کو اس کا علم ہے اور وہ اس کی قدر کرنے والا ہے"۔ (سورۃ البقرہ: 158) شرح النووي على مسلم:9/22، السرايا والبعوث النبوية، ص:286)

سب سے پہلے جس نے ان کے لئے مناۃ کو نصب کیا تھا وہ جزیرۃ العرب میں شرک کا بانی بتوں کا موجد اور دین ابراہیمی میں تحریف کرنے والا 'عمرو بن لحیی خزاعی' تھا، جب اللہ تعالیٰ نے مکہ میں مسلمانوں کو فتح سے سرفراز کیا تو رسول اللہ ﷺ نے مناۃ کی جانب انہی کے ایک سابق باشندہ سعد بن زید اشہلیؓ کو ایک سریہ کا امیر بنا کر بھیجا، اس سریہ میں بیس شہسوار تھے، اس سریہ کا مشن یہ تھا کہ مناۃ کا سرے سے ہی وجود ختم کردیا جائے۔ (دیکھیں: السرايا والبعوث النبوية، ص: 288)

حضرت سعدؓ اور ان کے ساتھی تیز رفتاری کے ساتھ اپنی مہم سرانجام دینے کے لئے نکلے یہاں تک کہ وہاں پہنچ گئے، وہاں کا مجاور ان سے ملا اور ان سے اس نے پوچھا: کیا ارادہ ہے؟ حضرت سعدؓ نے کہا: مناۃ کو منہدم کرنے کا ارادہ ہے۔ اس نے کہا: آپ اور آپ کا کام جانے! حضرت سعدؓ اس کی جانب بڑھے اور وہاں سے ایک ننگی کالی، پراگندہ سر عورت واویلا کرتے ہوئے اپنے سینے کو پیٹتی ہوئی نکلی، مجاور پورے اعتماد کے ساتھ اس کو پکارنے لگا: مناۃ اپنے ان نافرمانوں کو دور کرو۔ لیکن یہ آواز فضاؤں میں تحلیل ہو کر رائیگاں چلی گئی، حضرت

سعدؓ نے ان سب چیزوں کی کوئی پرواہ نہیں کی اور اس پر ایک قاتلانہ وار کر کے اس کا خاتمہ کر دیا، اس کے بعد اپنے ساتھیوں کے ساتھ بت کی جانب بڑھے اور اس کو منہدم کر دیا، اس کے خزانہ میں کوئی چیز نہیں ملی اور اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کے پاس واپس آ گئے۔ (دیکھیں: السرایاوالبعوث النبویہ، ص288)

۳: سواع کی جانب سریہ عمرو بن عاصؓ:

اللہ تعالیٰ نے اس قوم کے متعلق بیان فرمایا ہے: ﴿وَقَالُواْ لَا تَذَرُنَّ ءَالِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا﴾ ترجمہ: "اِنہوں نے کہا: ہر گز نہ چھوڑو اپنے معبودوں کو، اور نہ چھوڑو وَدّ اور سُواع کو، اور نہ یَغُوث اور یَعُوق اور نَسر کو"۔ (سورۂ نوح: 23)

سواع بھی وہاں ایک مشہور بت تھا، یہ قومِ نوح کے بت کا نام تھا، اس کے بعد یہ قبیلہ ھذیل مضر یہ کا بت ہو گیا، یہ بت مسلسل باقی رہا، ہذیل اس کی عبادت کرتے اور اس کی تعظیم کرتے، یہاں تک کہ وہ اس کی جانب حج کرتے تھے، مکہ فتح ہوا تو ہذیل کے لوگ بھی فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہوئے، اللہ کے رسول ﷺ نے سواع کو منہدم کرنے کے لئے حضرت عمرو بن عاصؓ کی قیادت میں ایک سریہ بھیجا۔ قائدِ سریہ اپنے مشن کے بارے میں بیان کرتے ہیں: جب میں وہاں پہنچا تو مجاور نے پوچھا: تم کیا چاہتے ہو؟ میں نے کہا: مجھے رسول اللہ ﷺ نے اسے ڈھانے کا حکم دیا ہے۔ اس نے کہا: تم اس پر قادر نہیں ہو سکتے۔ حضرت عمروؓ نے کہا: کیوں؟ اس نے کہا: (قدرتاً) روک دیئے جاؤ گے۔ میں نے کہا: تم اب تک باطل پر ہو؟ تم پر افسوس، کیا یہ سنتا یا دیکھتا ہے؟ اس کے بعد میں نے بت کے پاس جا کر اسے توڑ ڈالا اور اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ اس کے خزانہ والا مکان ڈھا دیں لیکن اس میں کچھ نہ ملا۔ پھر مجاور سے کہا: کہو کیسا رہا؟ اس نے کہا: میں اللہ کے لئے اسلام لایا۔ (المغازي للواقدي 870/2)

اللہ کے رسول ﷺ نے بتوں کو ختم کرنے کے لئے سرایا اور مہمات کی جو تحریک شروع کی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شرک و طاغوت کی جگہوں کا باقی رکھنا ایک دن کے لئے بھی جائز نہیں ہے، جبکہ ان کو منہدم کرنے اور ختم کرنے کی قدرت مل جائے، اس لئے کہ وہ کفر و شرک کے شعائر اور سب سے بڑا منکر ہیں، اس لئے ان کو باقی رکھنا قطعاً جائز نہیں ہے۔

یہی حکم ان مزاروں کا ہے جن پر قبریں بنائی گئی ہوں اور ان کو صنم و طاغوت بنا کر ان کی عبادت کی جاتی ہو، اسی طرح وہ پتھر جن کے پاس لوگ تعظیم و تبرک اور نذر و نیاز کے لئے جاتے ہوں، ان میں سے کسی کو منہدم کرنے کی قدرت کے باوجود باقی رکھنا جائز نہیں ہے، ان میں سے بہت سی جگہیں لات و عزیٰ اور منات کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ شرک ان کے پاس اور ان کے ذریعہ ہوتا ہے۔ (دیکھیں: السرایاوالبعوث النبویہ، ص:302)

....

تیسرا باب

دروس واسباق اور عبرت وفوائد

ا: سورہ النصر اور رسول اللہ ﷺ کے لئے اس میں بعض علامتیں:

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: نبی کریم ﷺ اپنی آخری عمر میں ان کلمات کا اکثر ورد کرتے تھے "سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ وَاَتُوبُ اِلَیْہِ"۔ اللہ کی ذات پاک ہے، اسی کے لئے سب تعریفیں مختص ہیں، میں اللہ سے استغفار کرتا ہوں اور اسی کی طرف جھکتا ہوں۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ "میرے رب نے مجھے حکم دے رکھا ہے کہ جب میں یہ علامت دیکھ لوں کہ مکہ فتح ہو گیا اور دین اسلام میں فوجیں کی فوجیں داخل ہونے لگیں تو میں ان کلمات کو بکثرت کہوں، چنانچہ الحمد للہ میں اسے دیکھ چکا، لہٰذا اب اس وظیفے میں مشغول ہوں۔ (صحیح مسلم: 220/484)

علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں: جب مکہ فتح ہو گیا تو عرب کہنے لگے: اگر محمد اہل حرم کے مقابلہ میں کامیاب ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے تو اہلِ حرم کو اصحاب الفیل کے مقابلہ میں بچا لیا تھا تو پھر آپ ان کا مقابلہ نہیں کر پاؤ گے، اس لئے فتح مکہ کے بعد وہ فوج در فوج اسلام میں داخل ہو رہے تھے۔ (تفسیر القرطبی: 20/230)

حضرت عمرو بن سلمہ فرماتے ہیں: ہم لوگوں کی گزرگاہ پر ایک چشمہ کے پاس تھے اور ہمارے پاس سے قافلے گزرتے تھے، ہم ان سے پوچھتے تھے: لوگوں کا کیا حال ہے؟ لوگوں نے کیا کیا؟ یہ شخص کون ہے؟ تو وہ جواب دیتے تھے: یہ شخص یہ دعوی کرتا ہے کہ اس کو اللہ نے بھیجا ہے اور اس کی جانب وحی کی جاتی ہے، میں اس کلام کو یاد کرتا تھا اور ایسا لگتا تھا گویا کہ وہ میرے دل کی آواز ہے، عرب لوگ فتح کا انتظار کر رہے تھے اور کہتے تھے: اس کو اور اس کی قوم کو ان کے حال پر چھوڑو، اگر وہ ان پر غالب آتا ہے تو وہ نبی پر برحق ہے، پھر جب مکہ فتح ہوا تو ہر قوم نے اسلام لانے میں جلدی کی۔

سورۃ النصر کو سورۃ التودیع (الوداع کرنے والی سورت) بھی کہا جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس سورت میں رسول اللہ ﷺ کی وفات کے قریب ہونے کی بھی خبر دی گئی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ بڑی عمر والے بدری مجاہدین کے ساتھ ساتھ عمر فاروقؓ مجھے بھی شامل کر لیا کرتے تھے، تو شاید کسی کے دل میں اس کی کچھ ناراضگی پیدا ہوئی ہو گی، اس نے کہا کہ یہ ہمارے ساتھ نہ آیا کریں، ان جتنے تو ہمارے بچے ہیں، خلیفۃ المسلمین نے فرمایا کہ تم انہیں خوب جانتے ہو، ایک دن سب کو بلایا اور مجھے بھی یاد فرمایا، میں سمجھ گیا کہ آج انہیں کچھ دکھانا چاہتے ہیں، جب ہم سب جا پہنچے تو امیر المومنین نے ہم سے پوچھا کہ سورۃ «اِذَا جَآءَ» کی نسبت تمہیں کیا علم ہے؟ بعض نے کہا: اس میں ہمیں اللہ کی حمد و ثناء بیان کرنے اور گناہوں کی بخشش چاہنے کا حکم کیا گیا ہے کہ جب اللہ کی مدد آ جائے اور ہماری فتح ہو تو ہم یہ کریں، اور بعض بالکل خاموش رہے تو آپؓ نے میری طرف توجہ فرمائی اور کہا: کیا تم بھی یہی کہتے ہو؟ میں نے کہا: نہیں، فرمایا: پھر اور کیا کہتے ہو؟ میں

نے کہا: یہ رسول اللہ ﷺ کے انتقال کا پیغام ہے، آپ ؐ کو معلوم کرایا جارہا ہے کہ اب آپ کی دنیوی زندگی ختم ہونے کو ہے، آپ تسبیح، حمد اور استغفار میں مشغول ہو جایئے، سیدنا عمر فاروق ؓ نے فرمایا: یہی میں بھی جانتا ہوں۔ [صحیح بخاری: 4394]

سید قطب شہیدؒ اس سورت سے مستفاد معانی کے بارے میں فرماتے ہیں: ''اس سورت کے آغاز میں ہی ایک متعین اشارہ ہے اور یہ اشارہ کائناتی واقعات کے بارے میں ایک خاص تصور پیدا کرتا ہے اور اس تصور میں یہ بتلایا جاتا ہے کہ ان واقعات میں اہلِ ایمان کا کردار کیا ہے اور نبی کریم ﷺ کا کردار کیا ہے اور انسانی زندگی اور ان کا کائناتی واقعات و حادثات میں اہلِ ایمان اور نبی کے دائرہ کار کی حد کیا ہے، یہ اشارہ اس فقرہ میں ہے ﴿إِذَا جَآءَ نَصۡرُ ٱللَّهِ وَٱلۡفَتۡحُ﴾ تمام دار و مدار اللہ کی نصرت و مدد پر ہے، اور اللہ کا وقت مقرر ہے جس شکل میں نصرت آئے گی وہ بھی متعین ہے اور جس مقصد کے لئے نصرت آئے گی وہ بھی مقرر ہے۔ نبی اور اس کے ساتھیوں کا اس کی آمد کے سلسلہ میں کوئی اختیار نہیں ہے اور نہ ہی ان کا نصرت الہیہ میں کوئی کردار ہے، نہ اس نصرت کے سلسلہ میں ان کی ذات کا کوئی دخل ہے، یہ نصرت ایک ایسا واقعہ ہے جو اللہ کے فیصلے کے مطابق ان کی شخصیات سے نہیں، بلکہ باہر سے آتی ہے، ان کے لئے یہ اعزاز بھی کافی ہے کہ یہ نصرت بظاہر اللہ ان کے ذریعہ لاتا ہے اور ان کو اس نصرت کا محافظ و نگران مقرر کرتا ہے، وہ ان کو اس نصرت کا امین بناتا ہے، بس فتح و نصرت میں ان کا حصہ یہی ہوتا ہے کہ لوگ جوق در جوق دین اسلام میں داخل ہوتے ہیں۔ (دیکھیں: فی ظلال القرآن: 6/3996)

یہ انتہائی گہرا ایمانی تصور ہے جس کو قرآن اہلِ ایمان کے دلوں میں راسخ کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے، اور وہ تصور یہ ہے کہ فتح و نصرت اور اقتدار عطا کرنے کا مکمل اختیار اللہ کے پاس ہے، وہی اس کے لئے زمان و مکان اور ان اشخاص کا انتخاب کرتا ہے جن کے ذریعہ اس کی نصرت و فتح کا ظہور ہو، یہ محض اللہ تعالی کا فضل و کرم ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالی اپنے سچے بندوں کو نوازتا ہے۔

۲: دعوتی موقف اور دوسروں کے ساتھ تعامل کی حکمتِ عملی:

۱: حضرت سہیل بن عمرو کا قبولِ اسلام:

حضرت سہیل بن عمرو بیان فرماتے ہیں: جب رسول اللہ ﷺ مکہ میں داخل ہوئے اور فتحیاب اور غالب ہو گئے تو میں اپنے گھر میں جا کر بیٹھ گیا اور دروازہ بند کر دیا، میں نے اپنے بیٹے عبد اللہ بن سہیل کو پیغام بھجوایا کہ میرے لئے محمد ؐ سے امان طلب کرو، مجھے اندیشہ ہے کہ مجھے قتل کر دیا جائے گا، میں محمد ؐ اور آپ کے اصحاب کے تئیں اپنی حرکتیں یاد کرنے لگا، مجھ سے زیادہ بُری حرکتیں کرنے والا کوئی نہیں تھا، حدیبیہ کے روز میں رسول اللہ ﷺ سے اس طرح ملا تھا جیسے اور کوئی نہیں ملا تھا، میں نے ہی آپ کے ساتھ معاہدہ کیا تھا، میں آپ کے مقابلہ میں بدر میں اور احد میں بھی شریک تھا اور جب بھی قریش کے لوگ کوئی کاروائی کرتے تو میں اس میں شریک ہوتا تھا۔ عبد اللہ بن سہیل رسول اللہ ﷺ کے پاس گئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول ؐ! کیا آپ انہیں امان دیں گے؟ آپ نے فرمایا: ہاں! وہ مامون ہیں، لہذا باہر آ جائیں، اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا: سہیل بن عمرو سے جس کی بھی ملاقات ہو کوئی اس کی جانب نظر اٹھا کے نہ دیکھے، وہ باہر نکل سکتے ہیں، قسم بخدا! سہیل عقل و شرافت کے مالک ہیں اور سہیل جیسا شخص اسلام کے بارے میں جاہل نہیں رہ سکتا ہے، اس نے

دیکھ لیا ہے کہ کوئی اس کو فائدہ پہنچانے والا نہیں ہے، چنانچہ عبداللہ اپنے والد کے پاس گئے تو سہیل نے بے ساختہ کہا: واللہ! وہ بچپن میں بھی حسنِ سلوک کے پیکر تھے اور بڑے ہو کر بھی نیک ہیں۔ سہیل کبھی آگے جاتے اور کبھی پیچھے آتے، وہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ حنین کی جانب نکلے جبکہ وہ ابھی حالتِ شرک میں ہی تھے اور مقام جعرانہ پر آکر حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ (مستدرک حاکم: 3/281، مغازی الواقدی: 2/846)

ان ترغیبی کلمات کا سہیل بن عمرو پر گہرا اثر پڑا، انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی ازخود تعریف کی، اس کے بعد اسلام سے مشرف ہو گئے اور اسلام لانے کے بعد وہ انتہائی مخلص رہے، بہت زیادہ اعمالِ صالحہ کرتے رہے، زبیر بن بکار کہتے ہیں: بعد میں سہیلؓ بہت زیادہ صوم و صلاۃ کے پابند تھے اور صدقہ کیا کرتے تھے، وہ مجاہدین کی جماعت کے ساتھ شام کی جانب گئے، کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اس قدر روزے رکھے اور شب بیداری کی یہاں تک کہ ان کا رنگ تبدیل ہو گیا تھا، جب وہ قرآن سنتے تھے تو بہت زیادہ روتے تھے، وہ جنگ یرموک کے موقع پر ایک بڑے دستے کے امیر تھے۔ (دیکھیں: التاریخ الاسلامی، الحمیدی: 7/216، سیر أعلام النبلاء: 2/195)

۲: صفوان بن امیہ کا قبولِ اسلام:

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ روایت کرتے ہیں کہ صفوان بن امیہ مکہ مکرمہ سے نکل کر جدہ کے ساحل پر چلے گئے، یہاں حجاز سے آنے والی کشتیاں لنگر انداز ہوا کرتی تھیں، ان دنوں یہ علاقہ شُعَیبَہ کہلاتا تھا۔ ایک دن صفوان نے اپنے غلام یسار سے پوچھا: کیا تجھے کوئی شخص آتا ہوا نظر آرہا ہے؟ اس نے کہا کہ عمیر بن وہب آرہے ہیں۔ صفوان نے کہا: میں عمیر کے ساتھ کیا سلوک کروں، خدا کی قسم! یہ شخص مجھے قتل کرنے کے ارادہ سے یہاں آرہا ہے۔ اس نے میرے مقابلہ میں محمد کا ساتھ دیا ہے، انہوں نے ہی اس کو میرے پیچھے لگایا ہے۔ اتنے میں عمیرؓ ان دونوں کے قریب آگئے۔ صفوان نے پوچھا: اے عمیر! تم میرے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہو؟ تم یقیناً مجھے قتل کرنے کے ارادہ سے یہاں آئے ہو۔ عمیرؓ نے کہا: میں ایک ایسی شخصیت کے پاس سے آیا ہوں جو لوگوں میں سب سے زیادہ نیک اور سب سے زیادہ صلہ رحمی کرنے والے ہیں۔

اصل قصہ یہ ہے کہ عمیرؓ نے صفوان کے بھاگ جانے کے بعد رسول اکرم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! میری قوم کا سردار سمندر میں ڈوب کر مرنے کے لئے یہاں سے بھاگ کر جدہ کی جانب چلا گیا ہے، آپؐ پر میرے ماں باپ قربان ہوں، اسے ڈر ہے کہ آپؐ اسے امان نہیں دیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں نے اسے امان دی۔ یہ سن کر عمیرؓ صفوان کی تلاش میں نکلے، ایک جگہ دونوں کی ملاقات ہو گئی، عمیرؓ نے انہیں یہ خوش خبری سنائی کہ رسول اللہ ﷺ نے تمہیں معاف کر دیا ہے، اس لئے مکّہ واپس چلو، صفوان کو اس خبر پر حیرت ہوئی، کیونکہ اس کے جرائم ہی اتنے بڑے اور اتنے زیادہ تھے کہ کسی حاکم وقت سے ان کی معافی کی امید ہی نہیں کی جا سکتی تھی۔ عمیرؓ نے جو خبر دی اُس سے حیرت تو ہونی ہی تھی، اس لئے صفوان نے مکہ مکرمہ واپس جانے کے بجائے عمیرؓ سے کہا کہ میں اس صورت میں واپسی کا ارادہ کر سکتا ہوں کہ تم کوئی ایسی چیز لے کر آؤ جسے میں پہچانتا ہوں اور جسے دیکھ کر میں یقین کر لوں کہ واقعی تم رسول اللہ ﷺ کے پاس سے آرہے ہو۔ عمیرؓ یہ سن کر واپس مکہ گئے اور حضورؐ کی خدمت میں پہنچ کر عرض کناں ہوئے: یا رسولؐ اللہ! صفوان اپنے اطمینان کے لئے آپؐ کی کوئی چیز دیکھنا چاہتے ہیں، انہیں میری بات کا یقین نہیں ہے۔ آپؐ نے فوراً اپنی یمنی چادر جو آپؐ نے

فتح مکہ کے دن عمامہ کے طور پر سر پر لپیٹ رکھی تھی اور اس کا کچھ حصہ چہرۂ انور پر ڈال رکھا تھا، اتار کر عمیرؓ کو دی اور فرمایا کہ لو میرا یہ عمامہ لے کر جاؤ۔

راوی کہتے ہیں کہ عمیرؓ دوبارہ صفوان کے پاس آئے اور اسے وہ چادر دکھلائی جو سرکار دوعالم ﷺ نے فتح والے دن اپنے سرِ مبارک پر لپیٹ رکھی تھی اور جس کا کچھ حصہ آپؐ کے چہرۂ مبارک سے مس کر رہا تھا۔ عمیرؓ نے اس سے یہ بھی کہا کہ میں ایک ایسے شخص کے پاس سے آرہا ہوں جو لوگوں میں سب سے بہتر ہے، سب سے زیادہ صلہ رحمی کرنے والا ہے، سب سے زیادہ نیک ہے، سب سے زیادہ متحمل مزاج ہے، انؐ کی عزت تمہاری عزت ہے اور انؐ کی قدر و منزلت تمہاری قدر و منزلت ہے، انؐ کا اقتدار تمہارا اقتدار ہے، وہ تمہارے بھائی ہیں۔ صفوان نے کہا: مجھے قتل کا ڈر ہے۔ عمیرؓ نے کہا: انہوں نے تمہیں اسلام میں داخل ہونے کی دعوت دی ہے، اگر تم چاہو تو ابھی مسلمان ہو جاؤ، ورنہ دو مہینے کی مہلت مانگ لو، وہ اپنے وعدہ میں نہایت پکے اور حسنِ سلوک میں نہایت ارفع و اعلیٰ ہیں، انہوں نے تمہارے پاس اپنی چادر بھیجی ہے، اس چادر کو سر پر لپیٹ کر وہ مکہ شہر میں داخل ہوئے تھے، کیا تم یہ چادر نہیں پہچانتے؟ صفوان نے جواب دیا: ہاں، میں یہ چادر اچھی طرح پہچانتا ہوں، میں تمہارے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہوں۔

راوی کا بیان ہے کہ صفوان واپس مکّہ آئے، جس وقت وہ رسول اللہ ﷺ کے قریب پہنچے آپؐ اس وقت مسلمانوں کو مسجد حرام میں عصر کی نماز پڑھا رہے تھے، یہ دونوں ایک طرف کھڑے ہوگئے۔ صفوان نے مسلمانوں کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ کر عمیرؓ سے سوال کیا کہ تم دن رات میں کتنی مرتبہ نماز پڑھتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا: ہم پانچ نمازیں پڑھتے ہیں۔ پوچھا: کیا محمدؐ ہی نماز پڑھاتے ہیں؟ عمیرؓ نے کہا: ہاں! تمام نمازیں آپؐ ہی پڑھاتے ہیں۔ اتنے میں نماز مکمل ہوگئی، صفوان نے وہیں سے چیخ کر کہا: یا محمدؐ! یہ عمیر میرے پاس آپؐ کی چادر لے کر آیا تھا اور یہ کہہ رہا تھا کہ آپؐ نے مجھے اپنے پاس بلایا ہے اسلام قبول کرنے کے لئے، اگر میں اس پر راضی ہوں تو فبہا، ورنہ مجھے آپؐ دو مہینے کی مہلت دیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے ابو وہب! یہاں آؤ۔ اس نے کہا: نہیں خدا کی قسم! میں اسی وقت آپؐ کے پاس آؤں گا جب آپ مجھے دو مہینے کی مہلت دیں گے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: تمہیں چار ماہ کی مہلت ہے۔ اس یقین دہانی کے بعد صفوان، رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں تو رہے مگر انہوں نے اپنا مذہب نہیں چھوڑا۔ آپؐ قبیلۂ ہوازن کی طرف تشریف لے گئے، صفوان ساتھ تھے، حنین کا غزوہ ہوا، اس میں بھی ساتھ رہے، غزوۂ طائف میں بھی وہ موجود تھے، جنگ حنین کے لئے آپؐ نے ان سے سو(۱۰۰) زرہیں طلب فرمائیں، انہوں نے پوچھا: میں بہ خوشی یہ اسلحہ آپؐ کو دوں یا آپؐ مجھ سے زبردستی لیں گے؟۔ آپؐ نے فرمایا: نہیں! ہم تو عاریتاً لے رہے ہیں، اگر تم چاہو تو دے دو، نہیں تو کوئی حرج نہیں۔ انہوں نے یہ زرہیں اپنی خوشی سے مسلمانوں کو دیں اور دوسرا اسلحہ بھی دیا۔

طائف سے واپسی پر آپؐ جعرانہ کے مقام پر فروکش تھے، ایک دن آپؐ مالِ غنیمت میں آئے ہوئے اونٹ اور بھیڑ بکریوں کا معائنہ فرما رہے تھے، صفوان ساتھ تھے اور نہایت دلچسپی سے اموالِ غنیمت دیکھ رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا: اے ابو وہب! یہ اونٹ تمہیں اچھے لگ رہے ہیں؟ انہوں نے عرض کیا: جی ہاں، یارسولؐ اللہ! آپؐ نے فرمایا: یہ سب تمہارے ہیں، یہ لطف و کرم اور سخاوت وفیاضی دیکھ کر صفوان بول اٹھے: یہ عنایت اور کرم فرمائی صرف نبی ہی کی ذات سے ممکن ہے، میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود

نہیں ہے اور محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں، اسی جگہ وہ اسلام سے مشرف ہوگئے۔ (المغازي للواقدي 853/2 کنز العمال:30170،مسند أحمد 401/3 أبوداؤد:3562 مستدرک حاکم 49/3 سیرت ابن هشام 60/4)

اس واقعہ میں قابلِ غور بات یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے صفوان بن امیہ کو اسلام کی طرف مائل کرنے اور ان کی تالیفِ قلب کی کوشش کی، یہاں تک کہ وہ اسلام قبول کرنے کے لئے آمادہ ہوگئے، آپؐ نے ان کو امان دی، اس کے بعد چار ماہ تک ان کو اختیار دیا اور پھر ان کو اتنے عطیے دیئے جن کا کسی عام انسان سے تصور نہیں کیا جاسکتا ہے، یہاں تک کہ خود انہوں نے اقرار کیا کہ ایسا کوئی نبی ہی کر سکتا ہے اور اس کے بعد وہ اسی جگہ اسلام قبول کر لیتے ہیں۔ صفوان بن امیہ نبی کریم ﷺ کے عطایا کی منظر کشی کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ نے مجھے اتنا کچھ دیا یہاں تک کہ آپ میرے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ شخص تھے، آپؐ مجھے مسلسل عطا کرتے رہے یہاں تک کہ آپ میرے نزدیک محبوب ترین شخص بن گئے۔(صحیح مسلم:2313)

۳: حضرت عکرمہ بن أبي جہل کا قبولِ اسلام:

حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ فرماتے ہیں: عکرمہ بن أبي جہلؓ کی بیوی اُم حکیم نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! عکرمہ اس خوف سے بھاگ گئے ہیں کہ آپ انہیں قتل کردیں گے، اے اللہ کے رسولؐ! آپ انہیں امان بخش دیں اللہ آپ کو امان دے گا۔ نبی اکرم ﷺ نے ان کی درخواست سن کر ارشاد فرمایا: عکرمہ بن ابی جہل کو امان دی جاتی ہے۔ شوہر کی جاں بخشی کا اعلان سن کر ام حکیمؓ اسی وقت اپنے رومی غلام کو ساتھ لے کر ان کی تلاش میں نکل پڑیں، جب وہ چلتے چلتے دور نکل گئے تو دورانِ سفر میں غلام کی نیت خراب ہوئی اور اس نے ان کے اوپر ڈورے ڈالنا شروع کردیئے، وہ اسے امید دلاتی اور ٹالتی ہوئی عرب کے ایک قبیلہ میں پہنچ گئیں، وہاں پہنچ کر اہلِ قبیلہ سے مدد کی طالب ہوئیں، اہلِ قبیلہ نے غلام کو اپنے پاس قید کردیا اور ام حکیمؓ نے تن تنہا اپنا سفر جاری رکھا اور آخر کار تہامہ کے علاقے میں سمندر کے کنارے عکرمہ کو پاگئیں، اس وقت وہ ایک مسلمان مَلاح سے گفتگو کر رہا تھا کہ وہ اسے اس پار پہنچادے، مگر مَلاح اس بات پر مصر تھا کہ پہلے تم اخلاص کا اظہار کرو تب میں تم کو اس پار لے جاوں گا، عکرمہ نے پوچھا کہ میں اخلاص کا اظہار کس طرح کروں؟ تو اس نے کہا کہ کہو: ''لاالٰہ الا اللہ''۔ عکرمہ نے جواب دیا کہ اسی سے بھاگ کر تو میں یہاں آیا ہو۔ ابھی ان دونوں کی گفتگو کا سلسلہ جاری تھا کہ ام حکیمؓ عکرمہ کے پاس پہنچ گئیں اور ان سے بولیں: میرے چچازاد بھائی! میں تمہارے پاس سب سے افضل، سب سے نیک اور سب سے اچھے انسان کے پاس سے آئی ہوں، میں تمہارے پاس محمد بن عبداللہ ﷺ کے پاس سے آئی ہوں، میں نے اُن سے تمہاری جان بخشی کا وعدہ لے لیا ہے، تم اپنی جان کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ عکرمہ نے پوچھا کہ کیا تم نے خود ان سے بات کی ہے؟ انہوں نے جواب دیا: ''ہاں! میں نے خود بات کی ہے اور انہوں نے تم کو امان دی ہے، وہ برابر اُنہیں ان کی جان بخشی کا یقین دلاتی رہیں یہاں تک کہ وہ مطمئن اور ان کے ساتھ واپسی پر رضا مند ہوگئے، دورانِ راہ میں نے اس نے غلام کی اس خباثتِ نفس کا ذکر کیا جو اس نے سفر کے دوران میں کی تھی، عکرمہ نے مسلمان ہونے سے پہلے وہاں پہنچ کر اسے قتل کردیا۔ دورانِ سفر جب وہ دونوں ایک منزل پر رکے تو عکرمہ نے بیوی سے ہمبستری کی خواہش ظاہر کی لیکن انہوں نے سختی سے انکار کرتے ہوئے کہا: میں ایک مسلمان عورت ہوں اور تم ابھی مشرک ہو۔ عکرمہ نے اس بات پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے

کہا: وہ بات جو تمہیں میرے ساتھ خلوت سے روک دے یقیا کوئی نہایت ہی بڑی بات ہو گی۔ جب عکرمہ مکہ کے قریب پہنچے تو رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا: "سيأتيكم عكرمة بن أبى جهل مؤمنا مهاجرا فلا تسبوا أباه فان سب الميت يوذي الحي ولا يبلغ الميت"۔ عکرمہ ابن ابی جہل بہت جلد ایک مومن ومہاجر کی حیثیت سے تمہارے پاس پہنچنے والا ہے، اس کے باپ کو برا مت کہنا، مردے کو برا کہنے سے زندہ کو اذیت پہنچتی ہے اور میت کو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی۔

اس کے تھوڑی ہی دیر بعد عکرمہ اپنی بیوی ام حکیمؓ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں پہنچ گئے، نبی ﷺ اسے دیکھتے ہی فرطِ مسرت سے اچھل پڑے اور چادر کے بغیر ہی اس کے استقبال کے لئے لپکے، پھر جب نبی ﷺ اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئے تو عکرمہ نے کھڑے کھڑے عرض کیا اور ان کی زوجہ پردے میں تھی: اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! ام حکیم نے مجھے بتایا ہے کہ آپ نے مجھے امان دے دی ہے، نبی ﷺ نے جواب دیا: "اس نے صحیح کہا ہے، تم مامون ہو"۔ اس نے دوبارہ سوال کیا: اے محمدؐ! آپ مجھے کس بات کی دعوت دیتے ہیں؟ آپؐ نے ارکانِ اسلام گناتے ہوئے فرمایا: میں تمہیں اس بات کی دعوت دیتا ہوں کہ تم گواہی دو کہ اللہ تعالی کے سوا کوئی دوسرا لائقِ عبادت وپرستش نہیں اور اس بات کی کہ میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں اور اس بات کی کہ تم زکوۃ دو۔ عکرمہ نے کہا: اللہ کی قسم! آپ نے حق کی دعوت دی اور خیر کا حکم دیا۔ واللہ! آپ اس دعوت کے پہلے بھی ہم میں سب سے سچے اور نیکوکار تھے، یہ کہہ کر انہوں نے بیعت کے لئے اپنا ہاتھ بڑھا دیا اور کلمۂ شہادت پڑھ کر دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔

اسلام لانے کے بعد عکرمہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی: اللہ کے رسولؐ! مجھے سب سے اچھی چیز بتا دیجئے تا کہ میں اسے برابر پڑھا کروں۔ نبی ﷺ نے جواب دیا: أشهد أن لا اله الا الله وأشهد أن محمدا عبده و رسوله پڑھا کرو۔ عکرمہ بولے: اس کے بعد کیا؟ فرمایا: کہو کہ میں اللہ تعالی اور حاضرین کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں مسلم ہوں، مجاہد ہوں اور مہاجر ہوں۔ اور عکرمہؓ نے یہ کہہ دیا۔ اس وقت بھی نبی ﷺ نے ان سے فرمایا کہ آج تم جو چیز بھی مجھ سے مانگو گے وہ تمہیں عطا کروں گا۔ عکرمہؓ نے کہا: میں چاہتا ہوں کہ میں نے آپ کے ساتھ جتنی بھی عداوت کی جہاں کہیں بھی آپ کے مدمقابل ہوا اور آپ کے خلاف جو بات بھی خواہ آپ کے روبرو یا پس پشت کی ہو ان سب کے بارے میں میرے لئے مغفرت کی دعا فرمائیں، رسول اللہ ﷺ نے ان کے لئے دعا کی: اللهم اغفرله كل عداوة عادانيها وكل مسير سار فيه الى موضع يريد به اطفاء نورك واغفر له ما نال من عرضي في وجهي أو أنا غائب عنه. "اے اللہ! ہر اس عداوت سے عکرمہ کی مغفرت فرما جو اس نے میرے ساتھ کی اور معاف فرما دے اس کی ہر اس سرگرمی کو جس کے ذریعہ سے اس نے تیرے نور کو بجھانے کی کوشش کی اور درگزر فرما اس کی ہر اس حرکت کو جو اس نے میری آبرو سے کھیلتے ہوئے میرے سامنے یا میری عدم موجودگی میں کی ہو"۔ اس دعا کو سن کر عکرمہؓ کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا اور انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! اللہ کی قسم! آج سے پہلے اللہ کی راہ سے اللہ کے بندگان کو باز رکھنے کے لئے جتنا مال میں خرچ کرتا رہا ہوں اب آج کے بعد سے اللہ کی راہ میں اس سے دوگنا خرچ کروں گا اور آج سے پہلے اللہ کے دین سے روکنے کے لئے جتنی قوت سے لڑتا رہا آج کے بعد سے اس سے دوگنی طاقت کے ساتھ اللہ کی راہ میں

لڑوں گا۔ اسلام لانے کے بعد حضرت عکرمہؓ نے جہاد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا یہاں تک کہ (جنگ یرموک میں) شہادت سے سرفراز ہوگئے۔

اسلام قبول کرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ان کی بیوی کو پہلے نکاح کی بنیاد پر ہی ان کے حوالے کر دیا۔(سیرت ابن ھشام 61/4المغازي للواقدي851/2)

نبی کریم ﷺ کا حضرت عکرمہؓ کے ساتھ تعامل اور حسنِ سلوک انتہائی لطیف اور مشفقانہ تھا جوان کے اسلام کی طرف مائل کرنے کے لئے کافی تھا، آپؐ نے ان کی آمد پر جلدی سے اپنے جسم پر چادر ڈال دی، آپؐ نے تبسم فرمایا اور ان کا استقبال کیا۔ ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے ان سے فرمایا: مہاجر سوار کو خوش آمدید!۔(سنن ترمذی: 2735، المعجم الکبیر للطبرانی: 7/373، مجمع الزوائد: 9/385)

حضرت عکرمہؓ اس موقف سے متاثر ہوئے، ان کے جذبات واحساسات میں ایک ہلچل مچ گئی اور وہ حلقہ بگوش اسلام ہوگئے، اسی طرح حضرت اُم حکیم بنت حارث بن ہشام کا اپنے شوہر کے اسلام لانے میں اہم کردار رہا ہے، انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے ان کے لئے امان حاصل کی اور ان کی تلاش میں اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالا اور پھر مختلف اسالیب اور طریقوں سے اسلام کے بارے میں ان کی ذہن سازی کی، یہاں تک کہ وہ اسلام قبول کرنے کے لئے آمادہ ہوگئے، اور پھر حضرت عکرمہؓ اسلام قبول کرنے میں مخلص تھے، انہوں نے آپؐ سے کسی دنیا کا مطالبہ نہیں کیا، بلکہ آپؐ سے مغفرت کی دعا کرنے کا مطالبہ کیا اور اس کے بعد نبی کریم ﷺ کے سامنے وعدہ کیا کہ وہ اسلام کی خدمت کرنے میں اب اس سے زیادہ جدوجہد کریں گے اور انہوں نے عملی طور پر اس وعدہ کو نبھا کر دکھایا، ارتداد کی جنگوں میں اور پھر شام کی فتوحات میں مجاہدین اور قائدین کی صفِ اول میں رہے، یہاں تک کہ معرکہ یرموک میں جامِ شہادت نوش کر لیا۔ (دیکھیں: التاریخ الاسلامی: 7/223)

۴: نبی کریم ﷺ کے تواضع کی ایک مثال اور حضرت ابو بکرؓ کے والد کا قبولِ اسلام:

حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیقؓ فرماتی ہیں: جب رسول اللہ ﷺ مکہ پہنچے اور مسجد حرام میں داخل ہوئے تو ابو بکرؓ اپنے والد کو لے کر آئے، والد اُن کے آگے آگے تھے، جب ان کو رسول اللہ ﷺ نے دیکھا تو فرمایا: آپ بزرگوار رہنے دیتے یہاں تک کہ میں خود ہی ان کے پاس آجاتا، حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا: اے اللہ کے رسولؐ! ان کا زیادہ حق بنتا ہے کہ وہ آپ کے پاس چل کر آئیں بجائے اس کے کہ آپ ان کے پاس تشریف لے جائیں۔

حضرت اسماءؓ فرماتی ہیں: آپؐ نے ان کو اپنے سامنے بٹھایا، اس کے بعد ان کے سینے پر ہاتھ پھیرا اور پھر ان سے فرمایا: اسلام قبول کریں، انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ فرماتی ہیں: حضرت ابو بکرؓ ان کو لے کر داخل ہوئے ان کا سر بالکل سفید تھا، اللہ کے رسولؐ نے فرمایا: ان کے بالوں کے رنگ کو تبدیل کرو۔(مسند أحمد 349/6 المعجم الکبیر للطبرانی 24/88 ابن حبان: 7208 مستدرک حاکم 46/3 مجمع الزوائد 173/6)

یہ بھی مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو بکرؓ کو اپنے والد کے قبولِ اسلام کی وجہ سے مبارکباد دی۔

اس واقعہ میں بزرگوں کی عزت واحترام اور توقیر کے سلسلہ میں نبوی منہج معلوم ہوتا ہے، اللہ کے رسول ﷺ کے اس فرمان سے اس کی مزید تاکید ہوتی ہے:" وہ شخص ہم میں سے نہیں جو ہمارے بڑوں کا احترام نہ کرے اور ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے"۔ (مسند احمد 257/1 سنن ترمذی:1921 ابن حبان:459)

ایک دوسری حدیث ہے :"اللہ کی عزت و توقیر کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان سفید ریش شخص کا اکرام کیا جائے"۔(سنن ابو داؤد: 4843)اسی طرح آپؐ نے بذل وعطاء اور خدمات کے حامل افراد اور اسلام میں سبقت اختیار کرنے والوں کا اکرام کرنے کی تلقین کی ہے تاکہ اسلام اور مسلمانوں کے تئیں ان کی خدمات کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

۵: نبی کریم ﷺ کے عفوودر گزر اور بُردباری کی ایک مثال؛ فضالہ بن عمیرؓ کا قبولِ اسلام:

فضالہ بن عمیر بن الملوح لیثی نے نبی کریم ﷺ کو شہید کرنے کا ارادہ کیا جبکہ آپؐ فتح مکہ کے موقع پر خانہ کعبہ کا طواف کر رہے تھے، جب وہ رسول اللہ ﷺ کے قریب سے گزرا، اللہ کے رسول ﷺ نے اسے مخاطب کیا اور فرمایا: "ارے کیا تم فضالہ ہو؟!" کہنے لگا: اللہ کے رسول، ہاں! میں فضالہ ہوں۔ آپؐ نے صرف اتنا فرمایا: "تم اپنے دل میں کیا بات سوچ رہے تھے؟"۔ فضالہ کہنے لگا: کچھ نہیں، میں تو اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہا تھا۔ اللہ کے رسول ﷺ فضالہ کی بات سن کر ہنس پڑتے ہیں۔ فرمایا: "فضالہ! اللہ سے استغفار کرو"۔ اور ساتھ ہی اپنا دستِ مبارک اس کے سینے پر رکھ دیا۔ فضالہ کا دل پُر سکون اور سازشی خیالات سے پاک ہوگیا۔ فضالہ کہتے تھے: اللہ کی قسم! آپ ﷺ نے اپنا دستِ مبارک میرے سینے سے اٹھایا ہی تھا کہ اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوق میں میرے لئے آپؐ سے زیادہ محبوب کوئی نہ رہا۔ فضالہ کہتے ہیں: میں اپنے اہل وعیال کی طرف واپس جا رہا تھا۔ راستے میں میری پرانی محبوبہ کھڑی تھی جس کے ساتھ میں بات کیا کرتا تھا، اس نے روک لیا، کہنے لگی: آؤ چند لمحے میرے پاس گزارو۔ میں نے کہا: نہیں! اس نے انہوں نے برجستہ کچھ اشعار پڑھے، ان اشعار میں اس نے کہا:

قَالَت هلُمَّ إِلَى الْحَدِيث فَقُلْتُ لَا ... يأْبى عليكَ اللهُ والْإِسْلَامُ
لَوما رأَيت مُحمَّدًا وَقَبيلَه ... بالْفتحِ يوم تكَسَّر الْأَصْنام
لَرأَيت دينَ اللَّه أَضْحى بينًا ... والشّرك يغْشَى وجهه الْإِظْلَام

ترجمہ:"میری محبوبہ نے کہا: آؤ باتیں کریں۔ میں نے کہا: نہیں، اللہ تعالیٰ اور اسلام مجھے ایسے کاموں سے منع کرتے ہیں۔ اگر تو محمد ﷺ اور آپ کی جماعت کو فتح مکہ مکرمہ کے موقع پر دیکھ لیتی جب بت ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے تو دیکھ لیتی کہ اللہ تعالیٰ کا دین بالکل واضح ہو گیا ہے اور شرک کے چہرے پر تاریکی چھا گئی ہے۔ (سیرت ابن ھشام 59/4)

۶: حدوداللہ کے بارے میں سفارش اور رسول ﷺ کا ردّ عمل:

حضرت عروہ بن زبیرؓ فرماتے ہیں کہ غزوۂ فتح (مکہ) کے موقع پر ایک عورت نے نبی کریم ﷺ کے عہد میں چوری کر لی تھی۔ اس عورت کی قوم گھبرائی ہوئی اُسامہ بن زیدؓ کے پاس آئی تاکہ وہ نبی کریم ﷺ سے اس کی سفارش کر دیں (کہ اس کا ہاتھ چوری کے جرم میں نہ کاٹا جائے)۔ عروہ نے بیان کیا کہ جب اسامہؓ نے اس کے بارے میں نبی کریم ﷺ سے گفتگو کی تو آپؐ کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور

آپؐ نے فرمایا: تم مجھ سے اللہ کی قائم کی ہوئی ایک حد کے بارے میں سفارش کرنے آئے ہو؟! اسامہؓ نے عرض کیا: میرے لئے دعائے مغفرت کیجئے، یا رسول اللہ! پھر دوپہر بعد نبی کریم ﷺ نے صحابہؓ کو خطاب کیا، اللہ تعالیٰ کی اس کے شان کے مطابق تعریف کرنے کے بعد فرمایا: اَمابعد! تم میں سے پہلے لوگ اس لئے ہلاک ہو گئے کہ اگر ان میں سے کوئی معزز شخص چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے لیکن اگر کوئی کمزور چوری کر لیتا تو اس پر حد قائم کرتے، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے! اگر فاطمہ بنت محمدؐ بھی چوری کرلے تو میں اس کا ہاتھ کاٹوں گا۔ اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے اس عورت کے بارے میں حکم دیا اور اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ پھر اس عورت نے صدقِ دل سے توبہ کرلی اور شادی بھی کرلی۔ عائشہؓ نے بیان کیا کہ بعد میں وہ میرے یہاں آتی تھیں، ان کو کوئی ضرورت ہوتی تو میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کر دیتی۔ (صحیح البخاري: 4304 صحیح مسلم: 1688)

اس طرح سے امت کی تربیت کا عمل جاری تھا، ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ کی شریعت کا نفاذ ہر قریب و بعید پر یکساں کیا جاتا ہے، قریش نے بھی اپنے آپ کو شریعتِ ربانی کے سامنے اس حال میں دیکھا کہ وہاں لوگوں کے درمیان کوئی امتیاز نہیں پایا جاتا ہے، وہ سب رب العالمین کے سامنے برابر ہیں، اللہ کے رسولؐ کے اس طرزِ عمل سے غضبناک ہونے میں مسلمانوں کے لئے عبرت اور سبق موجود ہے تاکہ وہ اللہ کے احکام کی تنفیذ میں کسی طرح کی تفریق و امتیاز نہ برتیں اور نہ ہی حاکم کے سامنے سفارش کرکے اسلامی حدود کو معطل کرنے کی کوشش کریں۔ (دیکھیں: من معین السیرۃ، ص: 402، التاریخ الاسلامی: 7/233)

۴: اے اُم ہانی! جس کو آپ نے پناہ دی ہم نے بھی اسے پناہ دی!:

حضرت اُم ہانی بنت ابی طالب فرماتی ہیں: جب رسول اللہ مکہ کے بالائی حصہ میں اترے تو میرے رشتہ دار بنو مخزوم کے دو لوگ میرے پاس بھاگ کر آئے- حضرت اُم ہانی، ہبیرہ بن اَبی وہب- کے پاس تھیں- فرماتی ہیں: میرے پاس میرے بھائی علی بن ابی طالبؓ آئے اور کہنے لگے: واللہ! میں ان دونوں کو قتل کر دوں گا، میں نے اپنے گھر کا دروازہ بند کر کے ان کو اپنے گھر میں پناہ دی، اس کے بعد میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی، جبکہ آپؐ مکہ کے بالائی حصہ میں تھے، میں نے دیکھا کہ آپؐ ایک برتن میں پانی لے کر غسل فرما رہے تھے، اس برتن میں آٹے کے نشانات بھی تھے اور ان کی بیٹی فاطمہؓ اپنے کپڑے سے آپ پر پردہ کر رہی تھیں، جب آپؐ نے غسل کر لیا تو آپؐ نے اپنا کپڑا لیا اور اس کو لپیٹ لیا، اس کے بعد چاشت کی آٹھ رکعتیں ادا فرمائیں اور پھر میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: اے اُم ہانی! خوش آمدید! آپ کیوں آئی ہیں؟ میں نے آپ کو دونوں لوگوں کا اور حضرت علیؓ کا واقعہ بتایا، تو آپؐ نے فرمایا: جسے تم نے پناہ دی اسے ہماری طرف سے بھی پناہ ہے، جس کو آپ نے امان دی ہم نے بھی اس کو امان دی، لہٰذا وہ انہیں قتل نہ کریں۔ (صحیح بخاری: 3171، صحیح مسلم: 336، سیرت ابن ہشام: 4/59، صحیح السیرۃ النبویۃ، ص527)

۵: عبداللہ بن سعد بن اَبی السرح کا واقعہ:

عبداللہ بن سعد بن ابی السرح نے اسلام قبول کیا تھا اور وہ کاتبِ وحی بھی تھے، اس کے بعد مرتد ہو گئے، جب اللہ کے رسول ﷺ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو ان کو آپؐ نے اشتہاری مجرم قرار دیا تھا، اس لئے وہ حضرت عثمانؓ کے پاس بھاگ کر گئے اور وہ ان کے رضاعی بھائی تھے، جب وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ان کے لئے اَمان طلب کرنے کے لئے آئے تو رسول اللہ ﷺ بہت دیر تک خاموش

رہے،اس کے بعد فرمایا: ہاں! ٹھیک ہے،ان کو اَمان ہے۔جب وہ عثمانؓ کے ساتھ واپس گئے تو رسول اللہ ﷺ نے پاس بیٹھے ہوئے لوگوں سے فرمایا: کیا تمہارے درمیان کوئی بھلا آدمی نہیں تھا جو اس کو اٹھ کر قتل کر دیتا، جب مجھے دیکھا کہ میں خاموش ہوں؟! صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! آپؐ نے ہمیں اشارہ کیوں نہیں کیا؟! آپؐ نے فرمایا: بے شک نبی اشارہ کے ذریعہ قتل نہیں کیا کرتا ہے۔(المعجم الاوسط للطبرانی: 6573، مجمع الزوائد: 6/167، البدایہ والنہایہ: 4/296)

ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: کسی نبی کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ آنکھوں کے ذریعہ خیانت کرے۔(سنن ابو داؤد: 2683، سنن نسائی: 7/105، صحیح السیرۃ النبویۃ، ص: 528)

ابن ھشام فرماتے ہیں: اس کے بعد انہوں نے مخلصانہ اسلام قبول کیا اور حضرت عمرؓ نے بعض ذمہ داریاں بھی ان کو دیں اور پھر عثمانؓ نے بھی ان کو امیر مقرر کیا۔(سیرت ابن ہشام: 4/58) ابن کثیرؒ فرماتے ہیں: ان کا انتقال نمازِ فجر میں سجدہ کی حالت میں، یا اپنے گھر میں نماز مکمل کرنے کے بعد ہوا۔(البدایہ والنہایہ: 4/296)

۶: انصار کے ساتھ رسول ﷺ کا اظہارِ ہمدردی:

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں: اللہ کے رسول ﷺ صفا پر تشریف لائے اور اس کے اوپر چڑھے جہاں سے خانہ کعبہ نظر آتا تھا، آپؐ نے اپنے ہاتھ اٹھائے اور اللہ کا ذکر کرنے لگے اور دعا کرنے لگے اور انصار آپؐ کے نیچے تھے، فرماتے ہیں: ان میں سے بعض کہنے لگے: آپ پر اپنے عزیزوں کی محبت اور اپنے شہر کی الفت غالب آگئی ہے۔اسی اثناء میں رسول اللہ ﷺ پر وحی نازل ہوئی اور جب آپ پر وحی نازل ہوتی تھی تو ہم پر مخفی نہیں رہتی تھی، لوگوں میں سے کوئی بھی رسول اللہ ﷺ کی جانب وحی مکمل ہونے سے پہلے نظر نہیں اٹھاتا تھا، جب وحی مکمل ہوئی تو آپؐ نے فرمایا: "تم لوگوں نے کہا: مجھ پر کنبے والوں کی محبت اور اپنے شہر کی الفت غالب آگئی ہے، دیکھو! پھر (اس صورت میں) میرا نام کیا ہوگا؟" آپ نے تین بار فرمایا: "میں محمد اللہ تعالیٰ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔میں نے اللہ کے لئے تمہاری طرف ہجرت کی، تو اب زندگی تمہاری زندگی (کے ساتھ) ہے اور موت تمہاری موت (کے ساتھ) ہے"۔فرماتے ہیں: انصار آپ کی جانب روتے ہوئے بڑھے اور کہنے لگے: اللہ کی قسم! ہم نے یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی شدید چاہت (اور آپ کی معیت سے محرومی کے خوف) کے علاوہ کسی وجہ سے نہیں کہا تھا۔آپ ﷺ نے فرمایا: "تو اللہ اور اس کا رسول دونوں تم کو سچا جانتے ہیں اور تمہارا عذر قبول کرتے ہیں۔(مسند أحمد: 538/2 صحیح مسلم: 1780 صحیح السیرۃ النبویۃ، ص: 529)

۷: شاعرِ قریش عبداللہ بن زبعری کا قبولِ اسلام:

جب مکہ فتح ہوا تو اسلام سے سخت بغض رکھنے والا عبداللہ بن زبعری اپنی جان کے ڈر سے نجران بھاگ گیا۔اس زمانہ میں شاعروں کے اشعار مخالفین کے لئے بڑی اہمیت کے حامل سمجھے جاتے تھے۔عبداللہ ساری زندگی اللہ کے رسول ﷺ کی مخالفت میں اشعار کہتا رہا اور

قریش کو آپؐ کے خلاف بھڑکاتا رہا۔ شاعرِ اسلام حسان بن ثابتؓ بھی ان لوگوں کو ترکی بہ ترکی جواب دیتے رہے۔ جب یہ نجران بھاگا تو وہاں بھی اسے سیدنا حسانؓ کے اشعار سے واسطہ پڑ گیا۔ انہوں نے اپنے اشعار میں اسے بزدلی اور راہِ فرار اختیار کرنے پر عار دلائی، اس سے کہا:

لَا تَعْدَمَنْ رَجُلًا أَحَلَّكَ بُغْضُه ... نَجرانَ في عَيش أَحَذَّ لئيمِ

''اللہ تعالیٰ! ہمارے لئے عظیم ہستی محمد ﷺ کو باقی رکھے۔ یہ وہ ہستی ہیں جن کے ساتھ بغض و عناد نے تجھے نجران کے علاقے میں لا پھینکا ہے۔ اے ابن زبعری! اللہ تعالیٰ تجھے دائمی ذلت آمیز زندگی، اہانت آمیز سلوک اور نحوست میں رکھے''۔

جب عبداللہ بن زبعری تک یہ اشعار پہنچے تو وہ سخت تلملایا، اپنے معاملات کا کئی بار جائزہ لیا اور غور و فکر کیا کہ میں کس شخصیت کی مخالفت کرتا رہا اور کیوں کرتا رہا؟ اپنے ماضی میں جھانکا، اللہ کے رسول ﷺ کا اعلیٰ اخلاق یاد آگیا، ادھر اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے اس بندے کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرمایا تو اس کا ذہن صاف ہو گیا، اللہ نے ہدایت دی اور اس نے اسلام لانے کا فیصلہ کر لیا، پھر وہ مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہو گیا، مکہ مکرمہ پہنچا تو سیدھا اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، گزشتہ زندگی پر ندامت کا اظہار کیا اور اسلام قبول کر لیا، ساتھ ہی عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! میں نے اپنی گزشتہ زندگی میں آپ کے اور اسلام کے متعلق عداوت کا جس طرح بھی اظہار کیا، اس کی معافی کی دعا فرمادیں۔ ادھر اللہ کے رسول ﷺ کی یہ شان ہے کہ آپ اس نئے ساتھی کو تسلی دے رہے ہیں، اسے پرانے گناہوں پر عار نہیں دلا رہے، فرمایا: ''اسلام گزشتہ تمام کوتاہیوں اور گناہوں کو ختم کر دیتا ہے''۔

اللہ کے رسول ﷺ عبداللہ کو اپنے قریب کر لیتے ہیں، اس سے محبت بھرا سلوک فرماتے ہیں اور ایک کپڑوں کا جوڑا بھی عنایت فرماتے ہیں۔ مؤرخین نے بالاتفاق ذکر کیا ہے کہ عبداللہ، رسول اللہ ﷺ کے حسنِ سلوک سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اس نے بہت عمدہ اشعار کہے جن میں وہ اللہ کے رسولؐ کی مدح بیان کرتا ہے اور آپ ﷺ سے گزشتہ دور میں کہے ہوئے اشعار پر ندامت کا اظہار کرتا ہے۔

ابن عبدالبرؒ کہتے ہیں: ان کے نبی کریم ﷺ کی مدح میں بہت سے اشعار ہیں، ان کے ذریعہ وہ حالتِ کفر میں کہے گئے اشعار کی تلافی کرتے تھے۔ (الاستیعاب لابن عبدالبر 310/2)

امام قرطبیؒ کہتے ہیں کہ یہ بڑے عمدہ شاعر تھے، انہوں نے اسلام لانے کے بعد رسول اللہ ﷺ کی مدح میں بڑی تعداد میں ایسے اشعار کہے جن کے ذریعہ وہ حالت کفر میں کہے ہوئے اشعار کی تلافی کر دیتے ہیں۔ (تفسیر القرطبی 407/6)

۸: بعض شرعی احکام اور مکہ میں رسولؐ کی جائے قیام:

ا: فتح مکہ کے ذریعہ بہت سے شرعی احکام معلوم ہوئے ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

اَ: رمضان میں مسافر کے لئے روزہ رکھنے یا نہ رکھنے کا جواز: اللہ کے رسولؐ نے مدینہ سے لشکر کی روانگی کے وقت روزہ رکھا، یہاں تک کہ مقام کدید پہنچے اس کے بعد آپؐ نے روزہ نہیں رکھا۔

ب: اللہ کے رسولؐ نے چاشت کی مختصر آٹھ رکعتیں ادا فرمائیں، بعض لوگوں نے اس سے استدلال کیا ہے کہ چاشت کی نماز سنت مؤکدہ ہے۔

ج: مسافر کے لئے چار رکعت والی نمازوں میں قصر کرنے کا حکم؛ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے مکہ میں انیس روز قیام فرمایا اور اس میں نماز میں قصر کرتے رہے۔

د: نکاح متعہ کا ہمیشہ ہمیش کے لئے حرام قرار دیا جانا؛ جبکہ غزوۂ خیبر کے موقع پر اس کو تین روز کے لئے جائز قرار دیا گیا تھا، امام نوویؒ کا کہنا یہ ہے کہ متعہ کی تحریم اور اباحت دو مرتبہ ہوئی ہے، اس لئے کہ غزوۂ خیبر سے پہلے وہ حلال تھا اور خیبر کے موقع پر اس کو حرام قرار دیا گیا۔ اس کے بعد فتح مکہ کے روز جائز قرار دیا گیا اور پھر دوسری مرتبہ ہمیشہ کے لئے حرام قرار دیا۔ (شرح النووی علی مسلم: 9/181) جبکہ ابن قیمؒ کا کہنا یہ ہے غزوۂ خیبر میں حرام نہیں کیا گیا بلکہ اس کی تحریم صرف فتح مکہ کے موقع پر ہوئی، انہوں نے اس سے متعلق طویل گفتگو کی ہے۔ (زاد المعاد: 3/343، السیرۃ النبویۃ فی ضوء المصادر الأصلیہ، ص: 575)

ھ: اللہ کے رسولؐ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ "بچہ صاحبِ فراش (یعنی شوہر یا مالک) کا ہوگا اور زانی کے لئے پتھر ہوں گے"۔ جیسے کہ زمعہ کی بیٹی کے بیٹے کے سلسلہ میں وارد حدیث میں آیا ہے، اس کے بارے میں سعد بن ابی وقاصؓ اور عبد بن زمعہ میں اختلاف ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے عبد بن زمعہ کے حق میں فیصلہ سنایا، اس لئے کہ وہ انہی کے فراش پر پیدا ہوا تھا۔

و: تہائی مال سے زیادہ کے بارے میں وصیت کرنے کا عدم جواز؛ جیسے کہ حضرت سعد بن أبی وقاص کے واقعہ میں ہے جب وہ مکہ میں بیمار ہوئے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے تہائی سے زائد مال کے بارے میں وصیت کرنے کا مشورہ طلب کیا۔

۲: مکہ مکرمہ میں رسول ﷺ کی جائے قیام:

اللہ کے رسول ﷺ نے مکہ مکرمہ میں مقام 'حجون' میں قیام فرمایا، یہ وہی جگہ ہے جہاں قریش نے بنو ہاشم اور مسلمانوں کے خلاف معاہدہ کیا تھا اور جب حضرت اسامہ بن زیدؓ نے آپؐ سے دریافت کیا کہ اگر آپ اپنے ہی گھر میں قیام کرتے تو آپؐ نے فرمایا: "کیا عقیل نے ہمارے لئے احاطوں یا گھروں میں سے کوئی چیز چھوڑی ہے؟!"۔ (صحیح بخاری: 1588، صحیح مسلم: 1351) یہ آپؐ نے اس ضابطہ کے مطابق فرمایا کہ کوئی مسلمان کسی کافر کا وارث نہیں ہوگا۔ (صحیح بخاری: 6764، صحیح مسلم: 1614، السیرۃ النبویۃ الصحیحہ للعمری: 2/482)

عقیل نے اور ان کے بھائی طالب نے حضرت ابو طالب کی وراثت پائی تھی اور تمام گھر بیچ دیئے تھے اور حضرت علیؓ اور حضرت جعفرؓ کو ان کی وراثت نہیں ملی تھی، اس لئے کہ وہ مسلمان تھے اور ابو طالب کی وفات حالتِ کفر میں ہوئی تھی۔ (ایضاً)

۹: فتح مکہ کے نتائج:

فتح مکہ کے بہت سے نتائج سامنے آئے، ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

۱: مکہ مکرمہ مسلمانوں کے اثر و نفوذ میں داخل ہوا اور وہاں سے کفر کا اقتدار ختم ہو گیا اور اب حُنین وطائف کے علاقوں سے اور پھر پوری دنیا سے شرک کو ختم کرنے کا موقع آ گیا تھا۔

۲: مسلمان اب جزیرۃ العرب میں ایک عظیم قوت بن کر سامنے آئے تھے، فتح مکہ کے بعد رسول اللہ ﷺ کی یہ تمنا بھی پوری ہوگئی کہ قریش کے لوگ اسلام میں داخل ہوگئے اور جزیرۃ العرب میں ایک عظیم قوت ابھر کر سامنے آگئی جس کے سامنے کوئی بھی قبائلی اتحاد ٹِک نہیں سکتا تھا، یہ قوت تمام عربوں کو اسلامی پرچم تلے متحد کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی اور پھر ظالم حکومتوں اور ظلم وزیادتی کو ختم کرنے اور انسانوں کو آزادی فراہم کرنے کے لئے آس پاس کے علاقوں کو آزاد کرانے پر قادر تھی۔

۳: اس فتح کے عظیم دینی، سیاسی اور معاشرتی آثار ونتائج تھے اور یہ اثرات ہر اس شخص کے سامنے واضح طور پر ظاہر ہوئے جو بھی اس مبارک فتح پر بنظر غائر غور وفکر کرے۔

- جہاں تک اس کے معاشرتی اثرات کا تعلق ہے تو وہ یوں ظاہر ہوئے کہ آپؐ نے لوگوں کے ساتھ نرمی کا معاملہ کیا، اپنے آپ ان کا اعتماد بحال کیا، ان کے علاقہ میں پیدا شدہ نئی صورتحال کے بارے میں بھی ان کو مطمئن کردیا، ان کی تعلیم وتربیت کا بطورِ خاص اہتمام کیا، آپؐ نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو مکہ مکرمہ میں ہی باقی رکھا تاکہ وہ امامت کے فرائض بھی ادا کریں اور ان کو دین کی تعلیم بھی دیں۔
- جہاں تک سیاسی اثرات کا تعلق ہے تو آپؐ نے حضرت عتاب بن اسیدؓ کو مکہ کا امیر متعین کیا، وہ وہاں پر لوگوں کے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کرتے اور ظالم کے مقابلہ میں کمزور اور مظلوم کی مدد کرتے۔
- اور جہاں تک دینی آثار کا تعلق ہے تو فتح مکہ کے ذریعہ اور اس کے اسلامی نظام کے زیرِ سایہ آنے کی وجہ سے تمام عرب اس بات پر مطمئن اور قانع ہوگئے تھے کہ اسلام ہی وہ دین ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے پسند کیا ہے، اس لئے وہ دین میں فوج در فوج داخل ہوگئے۔

۴: سچے اہلِ ایمان کے لئے اللہ کی طرف سے غلبہ وتمکین کا وعدہ پورا ہوگیا، جبکہ انہوں نے ہر چھوٹی بڑی چیز اللہ کی راہ میں قربان کردی اور انہوں نے فتح وغلبہ کی تمام شرائط پوری کیں، اس کے اسباب کو اختیار کیا، اس کے مطلوبہ مراحل کو طے کیا اور اس کے ضوابط وقوانین پر عمل پیرا ہوئے، وہ خوبصورت منظر ہم کبھی نہیں بھلا سکتے ہیں جبکہ حضرت بلالؓ خانہ کعبہ کے اوپر مؤذن کی حیثیت سے کھڑے ہوئے، جبکہ اس سے پہلے ان کو مکہ کے ریگستان میں تعذیب کا نشانہ بنایا گیا اور وہ اُحد اُحد کی صدا لگا رہے تھے اس حال میں کہ وہ لوہے کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے، وہی بلالؓ آج خانہ کعبہ کے اوپر چڑھ کر اپنی خوبصورت آواز میں اذان دے رہے ہیں اور فضا ان کی آواز سے گونج رہی ہے۔

....

سولہویں فصل

غزوۂ حنین وطائف (8ھ)

پہلا باب

غزوہ کے اسباب اور معرکہ کے واقعات

جب فتح کے بعد مکہ مکرمہ اللہ کے رسول ﷺ اور اہلِ ایمان کے زیرِ کنٹرول آگیا اور قریش آپؐ کے سامنے سرنگوں ہو گئے تو قبیلۂ ہوازن اور قبیلۂ ثقیف ششدر و خوفزدہ ہو کر رہ گئے، وہ کہنے لگے کہ محمدؐ ہمارے خلاف جنگ کرنے کے لئے فارغ ہو گئے ہیں، اگر ہم نے اقدام کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کی تو مسلمان ہم پر حملہ کریں گے، انہوں نے اس پر اتفاق کیا اور مالک بن عوف نصری کو اپنا امیر مقرر کیا، قبیلۂ ہوازن، ثقیف اور بنو ہلال اس کے پاس جمع ہوئے اور ہوازن میں سے کعب اور کلاب کے لوگ اس کے پاس جمع نہیں ہوئے، ان کے ساتھ دُرید بن صمّہ بھی تھا، یہ جنگ میں اپنی بہادری اور صحیح رائے کی وجہ سے معروف تھا، لیکن بہت بوڑھا ہو چکا تھا، اس لئے اب صرف رائے اور مشورہ دینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

مالک بن عوف کی رائے یہ تھی کہ وہ اپنے ساتھ عورتوں، بچوں اور مویشیوں کو بھی لے کر جائیں تاکہ وہ فرار کی راہ نہ اختیار کریں، جب دُرید کو اس کا علم ہوا تو اس نے دریافت کیا: کیا بات ہے کہ میں اونٹوں کی بلبلاہٹ، گدھوں کی ڈھینچ، بچوں کا گریہ اور بکریوں کی ممیاہٹ سن رہا ہوں؟ لوگوں نے کہا: مالک بن عوف فوج کے ساتھ ان کی عورتوں، بچوں اور مال مویشی بھی ہانک لایا ہے۔ اس پر دُرید نے مالک کو بلایا اور پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا ہے؟ اس نے کہا: میں نے سوچا کہ ہر آدمی کے پیچھے اس کے اہل اور مال کو لگا دوں، تاکہ وہ ان کی حفاظت کے جذبہ کے ساتھ جنگ کرے۔ دُرید نے کہا: اللہ کی قسم! بھیڑ کے چرواہے ہو، بھلا شکست کھانے والے کو بھی کوئی چیز روک سکتی ہے؟! دیکھو، اگر جنگ میں تم غالب رہے تو فائدہ مند وہی شخص ہو گا جو اپنی تلوار اور نیزے سمیت ہو گا، اور اگر شکست کھا گئے تو پھر تمہیں اپنے اہل اور مال کے سلسلہ میں رسوا ہونا پڑے گا۔ لیکن مالک نے اس کے مشورہ پر کان نہیں دھرا۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویۃ، لأبي شهبة 467/2 سیرت ابن ھشام 88/4)

ا: غزوۂ حنین کے اہم واقعات:

مسلمانوں نے حنین کی جانب سن آٹھ ہجری 5 شوال کو کوچ کیا اور دس شوال کی شام کو حنین پہنچے، اللہ کے رسول ﷺ نے مکہ سے نکلتے وقت حضرت عتاب بن اسیدؓ کو مکہ میں اپنا جانشین مقرر فرمایا، مسلمان لشکر کی تعداد بارہ ہزار تھی اور ہوازن و ثقیف کی تعداد مسلمانوں سے دوگنی یا اس سے زیادہ تھی، مسلمانوں میں سے بعض لوگوں نے جب مسلمان لشکر کو دیکھا تو وہ کہنے لگے: آج قلتِ تعداد کی وجہ سے ہم مغلوب نہیں ہو سکتے ہیں اور ان کے دلوں میں خود پسندی پیدا ہو گئی۔ (دیکھیں: طبقات ابن سعد: 2/150، السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ: 2/497)

أ: ہوازن وثقیف کے کمانڈر مالک بن عوف کی تیاریاں:

ہوازن وثقیف کے کمانڈر مالک بن عوف نے اپنے لشکر کو تیار کرنے کے لئے جو اقدامات کئے وہ کئی مراحل پر مشتمل تھے:

ا: اپنی فوج کے حوصلے بلند کئے:

مالک بن عوف نے اپنی فوج کو نفسیاتی طور پر بلند کرنے کے لئے ان کا حوصلہ بڑھایا، مالک اپنے لشکر کے درمیان تقریر کرتے ہوئے کھڑا ہوا اور اس کو ثبات و بہادری پر ابھارا اور وہ اس لشکرِ جرار کے درمیان کھڑے ہو کر کہنے لگے: محمدؐ کو اس سے پہلے کبھی بھی جنگ سے سابقہ نہیں پڑا ہے بلکہ ان کا سابقہ ناتجربہ کار لوگوں کے ساتھ پڑا ہے جو جنگ وقتال کے بارے میں بالکل ناواقف کار ہیں، اس لئے اس کو فتح ملتی تھی۔(دیکھیں: المغازی:3/893)

۲: جنگجوؤں کے بچوں اور ان کے مال مویشی کو لشکر کے ساتھ رکھا:

ہوازن کے کمانڈر نے جنگجوؤں کی عورتوں، بچوں اور مال مویشی کو ان کے پیچھے جمع کرنے کا حکم دیا، اس کے ذریعہ ان کا مقصد یہ تھا کہ جنگجوؤں کو اپنے دشمنوں کے سامنے بہادری کا مظاہرہ کرنے اور ثابت قدمی اختیار کرنے پر آمادہ کیا جائے، اس لئے کہ جنگجو کو جب اس کا احساس ہو کہ اس کا سب سے قیمتی متاع معرکہ میں اس کے پیچھے پیچھے ہے تو اس کے لئے یہ بات مشکل ہو جاتی ہے کہ وہ میدانِ جنگ میں اپنے بال بچوں کو چھوڑ کر فرار کی راہ اختیار کرے۔ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں: ہم نے مکہ فتح کیا، اس کے بعد ہم نے حنین کی جنگ کی تو مشرکین نے بہترین صف بندی کی جو میں نے دیکھی ہے، فرماتے ہیں: سب سے پہلے گھوڑ سواروں کی صف تھی، اس کے بعد جنگجو تھے، اس کے بعد ان کے پیچھے عورتوں کی صف تھی، اس کے بعد بھیڑ بکریوں کی صف تھی اور پھر چوپائیوں کی صف تھی۔ (صحیح مسلم:1059)

۳: تلوار کے نیام توڑ دیئے:

جنگوں میں عربوں کی عادت یہ تھی کہ وہ جنگ شروع ہونے سے پہلے اپنی تلواروں کے نیام توڑ دیتے تھے اور اس کے ذریعہ وہ یہ پیغام دینا چاہتے تھے کہ جنگجو کامیابی تک یا موت تک دشمن کے سامنے ثابت قدم رہے، مالک نے اپنے لشکر کو اسی لئے ایسا کرنے کا حکم دیا، اس نے ان کو حکم دیا کہ جب تم دشمن کو دیکھو تو اپنی تلواروں کے نیام توڑ دینا اور ان پر یکبارگی حملہ کرنا۔ (مستدرک حاکم:3/48، مجمع الزوائد:6/179)

۴: اچانک حملہ کرنے کے لئے گھات میں بیٹھ گئے:

مالک بن عوف نصری کے پاس میدانِ جنگ والی سرزمین کے متعلق کافی معلومات تھیں، اس لئے اس نے سوچا کہ اس جغرافیائی اور زمینی صورتحال کو اپنے لشکر کے مفاد میں استعمال کرے، اس لئے اس نے تجربہ کار جنگجو دُرید بن صمّہ کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے مسلمانوں کے لشکر کے لئے گھات لگائی، اس منصوبے کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان افواج کا خاتمہ کر دیا جائے اور قریب تھا کہ یہ منصوبہ کامیاب بھی ہو جاتا اگر اللہ کی طرف سے لطف وکرم اور عنایت وحفاظت شامل حال نہ ہوتی۔

۵: مسلمانوں پر حملہ کرنے میں پہل کرنے کی کوشش:

ہوازنی کمانڈر نے جو منصوبہ تیار کیا تھااس کے مطابق ان کو مسلمانوں پر حملہ آور ہونے میں پہل کرنی تھی،اس لئے کہ کامیابی زیادہ تر حملہ آور اور اقدام کرنے والے کو ملتی ہے اور دفاع کرنے والا کمزور ہو جاتا ہے،اس لئے اس منصوبے کا کچھ وقت تک فائدہ حاصل ہوا لیکن جلد ہی اللہ کی نصرت وتائید اور مسلمانوں کی ثابت قدمی کی وجہ سے مسلمانوں کا پلڑا بھاری ہو گیا اور انہوں نے اپنے دشمنوں پر کامیابی حاصل کر لی۔(دیکھیں:القیادۃ العسکریۃ علی عہد رسول اللہ ﷺ،ص:252)

۶:مسلمانوں کے خلاف نفسیاتی جنگ کا آغاز:

مالک بن عوف ہوازنی نے جنگی حکمتِ عملی میں یہ بھی شامل کیا تھا کہ مسلمانوں کے خلاف معنوی ہتھیار بھی استعمال کیا جائے،اس نے مسلمانوں کے دلوں میں خوف پیدا کرنے کے لئے ان کے خلاف نفسیاتی جنگ چھیڑ دی،اس نے دسیوں ہزار اونٹوں پر اپنے پیچھے عورتوں کو سوار کیا اور یہ ایک خوفناک منظر لگ رہا تھا جس کے ذریعہ دیکھنے والے کو یہ لگتا تھا کہ یہ لشکر لاکھوں افراد پر مشتمل ہے،حالانکہ ایسا نہیں تھا۔(دیکھیں:غزوۃ حنین،الشیخ محمد احمد باشمیل،ص:128)

ب: رسول اللہ ﷺ کی منصوبہ بندی اور حکمتِ عملی:

اللہ کے رسول ﷺ کو جب ہوازن کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ جنگ کرنے کے لئے پُر عزم ہیں تو آپؐ نے مندرجہ ذیل اقدامات فرمائے:

ا: حضرت عبداللہ بن اَبی حدرد اَسلمیؓ کو روانہ فرمایا تاکہ وہ ہوازن کے متعلق مکمل معلومات فراہم کریں،چنانچہ حضرت عبداللہؓ اس مہم پر روانہ ہوئے اور ایک روز یا دو روز اُن کے درمیان قیام کیا اور واپس آکر نبی کریم ﷺ کو حاصل شدہ معلومات فراہم کی،حضرت عبداللہؓ رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق مطلوبہ جگہ تک گئے اور جلد از جلد دشمن کی خبر لے کر حاضرِ خدمت ہوئے،البتہ انہوں نے اپنی ذمہ داری کی ادائیگی میں بعض چیزوں کو نظرانداز کیا،وہ ہوازن کے لوگوں کے ساتھ اس طور پر نہیں مل پائے کہ وہ سب کچھ سن اور دیکھ لیتے جو مسلمانوں کے خلاف منصوبہ بندی کی جا رہی تھی،سب سے اہم ترین چیز جس کے بارے میں جاننا ضروری تھا وہ یہ تھی کہ مشرکین نے جن مقامات پر قبضہ کر رکھا تھا ان کے بارے میں معلومات حاصل کی جاتی لیکن مسلمانوں کو اچانک گھات میں چھپے ہوئے لوگوں کا سامنا کرنا پڑا،وہ وادی کے نشیب و فراز میں گھات لگا کر بیٹھے تھے اور وہیں سے انہوں نے مسلمانوں پر تیروں کی بارش کر دی اور مسلمانوں کو پہلے مرحلے میں پسپائی کا سامنا کرنا پڑا،ان کمین گاہوں کے بارے میں عدمِ واقفیت ابتدائی مرحلہ میں مسلمانوں کی پسپائی کا اہم سبب تھی۔(دیکھیں:القیادۃ العسکریۃ علی عہد الرسول ﷺ،ص:369)

۲: لشکر کا ساز و سامان اور زرہوں اور نیزوں کا عاریۃً حاصل کرنا:

اللہ کے رسول ﷺ نے دس ہزار افراد پر مشتمل لشکر تیار کیا،یہ وہ افراد تھے جو آپؐ کے ساتھ مدینہ منورہ سے نکلے تھے اور دو ہزار فتح مکہ کے روز مسلمان ہونے والوں میں سے تھے،اس لئے اس غزوہ میں شریک ہونے والوں کی کل تعداد بارہ ہزار تھی۔حضرت انس بن

مالکؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں: جب حنین کی جنگ ہوئی تو ہوازن اور غطفان بچوں اور مویشیوں کے ساتھ آئے اور آپؐ کے ساتھ اس دن دس ہزار لوگ تھے اور آپؐ کے ساتھ وہ طلقاء (فتح مکہ میں آزاد کئے ہوئے) دو ہزار افراد بھی تھے۔ (صحیح مسلم: 1059)

آپؐ نے لشکر کو ساز و سامان سے لیس کرنے کی بھی کوشش کی، آپؐ نے اپنے چچازاد بھائی نوفل بن حارث بن عبد المطلب سے تین ہزار نیزے عاریۃً لئے اور صفوان بن اُمیہ سے زرہیں لیں اور ان کی واپسی کے ضمانت بھی لی، اس وقت نوفل اور صفوان مسلسل اپنے شرک پر قائم تھے، صفوان بن یعلی بن امیہ اپنے والد سے اور وہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: جب تمہارے پاس میرے قاصد پہنچیں تو ان کو تیس زرہیں اور تیس اونٹ یا اس سے کم دینا۔ اس نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ! کیا عاریہ واجب الأدا ہے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ہاں!۔ (مسند أحمد: 4/222، سنن أبو داود: 3566، السنن الکبری للنسائی: 5744)

ایک دوسری روایت میں ہے: رسول اللہ ﷺ نے جنگ حنین کے موقع پر اس (صفوان) سے کچھ زرہیں عاریۃً لیں، اس نے کہا: اے محمدؐ! کیا آپ زبردستی غصب کر رہے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: نہیں، بلکہ ضمانت کے ساتھ عاریتاً لے رہا ہوں۔ راوی کہتے ہیں: ان میں سے بعض ضائع ہو گئیں اور رسول اللہ ﷺ نے اس کے سامنے یہ پیشکش رکھی کہ وہ ان کو آپ کے لئے چھوڑ دے۔ اس نے جواب میں کہا: اے اللہ کے رسولؐ! میں آج اسلام کی طرف زیادہ راغب ہوں۔ ابو داؤد کہتے ہیں: اسلام قبول کرنے سے پہلے اس نے آپ کو وہ عاریتاً دی تھیں، اس کے بعد اسلام قبول کیا۔ (مسند أحمد: 6/465، سنن أبو داؤد: 3562، مستدرک حاکم: 3/49، السنن الکبری للبیہقی: 6/89)

۳: آپؐ کی ثابت قدمی اور استقامت اور معرکہ پر آپؐ کی ثابت قدمی کے اثرات:

ہوازن کا لشکر مسلمانوں سے پہلے ہی وادئ حنین میں پہنچ گیا، انہوں نے اپنے لئے اچھی جگہوں کا انتخاب کر لیا اور گھاٹیوں میں، راستوں میں اور درختوں کے پاس اپنے دستے پھیلا دیئے، ان کا منصوبہ یہ تھا کہ مسلمان جیسے ہی وادئ حنین میں پیش قدمی کریں گے تو ان پر اچانک تیروں کی بارش کر دیں گے۔

مشرکین نے اچانک مسلمانوں پر حملہ کر دیا اور ہر طرف سے ان پر تیروں کی بارش کر دی جس کی وجہ سے مسلمانوں کی صفوں میں اضطراب پیدا ہو گیا اور اس خوفناک صورتحال کی وجہ سے لشکر کا معتد بہ حصہ پسپائی کا شکار ہو گیا اور راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے، ہر ایک اپنی حفاظت کی فکر میں سرگرداں تھا اور رسول اللہ ﷺ اور چند افراد میدان میں ڈٹے رہے، جو مشرکین کے حملوں کا مقابلہ کر رہے تھے، رسول اللہ ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ اس ہیبت ناک صورتحال کی خود ہی منظر کشی کرتے ہیں، انہی کی زبانی سنتے ہیں، وہ فرماتے ہیں: میں غزوۂ حنین میں اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ موجود تھا، میں اور ابو سفیان بن حارث رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہے، ہم آپؐ سے جدا نہیں ہوئے، آپ ﷺ اپنے سفید خچر پر سوار تھے، جب مسلمان اور کفار گتھم گتھا ہو گئے تو مسلمان پیچھے کی طرف بھاگنے لگے، اور رسول اللہ ﷺ کفار کی جانب اپنے خچر کو ایڑھ لگا رہے تھے۔ حضرت عباسؓ فرماتے ہیں: میں نے رکاب تھام لی تھی کہ کہیں تیزی سے آگے نہ بڑھ جائے، اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ اے عباس! ببول کے درخت والوں کو پکاریں۔ حضرت عباسؓ کہتے ہیں کہ میں نے نہایت بلند آواز سے پکارا: درخت والو! (بیعت رضوان والو!) کہاں ہو؟ واللہ! وہ لوگ میری آواز سن کر اس طرح مڑے جیسے گائے اپنے بچوں پر

مڑتی ہے اور جواباً کہا: ہاں ہاں، لبیک! آئے آئے۔ فرماتے ہیں: انہوں نے دشمن کا استقبال کیا اور لڑائی شروع کردی۔ اس کے بعد انصار کی پکار شروع ہوئی، او انصاریو! او انصاریو! پھر یہ پکار بنو حارث بن خزرج کے اندر محدود ہوگئی۔ ادھر مسلمان دستوں نے جس رفتار سے میدان چھوڑا تھا اسی رفتار سے ایک کے پیچھے ایک آتے چلے گئے اور دیکھتے دیکھتے فریقین میں دھواں دھار جنگ شروع ہوگئی، رسول اللہ ﷺ نے میدانِ جنگ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو گھمسان کا رن پڑ رہا تھا، فرمایا: "اب گھمسان کا رن پڑا ہے"۔ (صحیح مسلم: 1775 مصنف عبد الرزاق 379/5 سیرت ابن ھشام 87/4)

اللہ تعالی نے غزوۂ حنین میں نبی کریم ﷺ کی تائید و نصرت متعدد طریقوں سے کی، ان میں سے چند امور مندرجہ ذیل ہیں:

۱) آسمان سے فرشتوں کا نزول۔

۲) دشمنوں کے اندر رعب پیدا کیا۔

۳) اعدائے دین کی آنکھوں میں رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ پھینکی گئی مٹی اور کنکریوں کی تاثیر۔

مادی اسلحہ جس کے ذریعہ اللہ تعالی نے غزوۂ حنین میں اپنے رسول ﷺ کی تائید کی وہ مٹی اور کنکریاں تھیں جو آپؐ نے مشرکین کے چہروں کی جانب پھینکی، یہ مٹھی بھر مٹی اس طرح پھیلی کہ دشمن کا کوئی آدمی ایسا نہ تھا جس کی آنکھ اس سے بھر نہ گئی ہو، یہ ان کی ہزیمت وشکست کا ایک اہم سبب بنا۔ حضرت عباسؓ فرماتے ہیں: اس کے بعد اللہ کے رسولؐ نے کچھ کنکریاں لیں اور ان کو کفار کے چہروں پر مار کر فرمایا: رب کعبہ کی قسم! وہ پسپا ہوگئے، حضرت عباسؓ فرماتے ہیں: میں دیکھنے گیا تو دیکھتا ہوں کہ میدانِ جنگ اسی طرح گرم تھا اور جیسے ہی آپؐ نے ان کی جانب کنکریاں ماریں تو اس کے بعد ان کی دہار کند ہوتی چلی گئی اور وہ پسپا ہوتے چلے گئے۔ (سیرت ابن ہشام: 4/87)

۲: اَوطاس وطائف کی جانب بھاگنے والوں کا تعاقب:

حضرت ابوموسی اشعریؓ فرماتے ہیں: جب رسول اللہ ﷺ غزوۂ حنین سے فارغ ہوگئے تو آپؐ نے ایک دستے کے ساتھ ابوعامرؓ کو وادیٔ اوطاس کی طرف بھیجا، اس معرکہ میں دُرید ابن الصمہ سے مقابلہ ہوا، درید قتل کردیا گیا اور اللہ تعالی نے اس کے لشکر کو شکست دے دی۔ ابوموسیٰ اشعریؓ نے بیان کیا کہ ابوعامرؓ کے ساتھ نبی کریم ﷺ نے مجھے بھی بھیجا تھا۔ ابوعامرؓ کے گھٹنے میں تیر آکر لگا۔ بنی جعشم کے ایک شخص نے ان پر تیر مارا تھا اور ان کے گھٹنے میں اتار دیا تھا، میں ان کے پاس پہنچا اور کہا: چچا! یہ تیر آپ پر کس نے پھینکا؟ انہوں نے ابوموسیؓ کو اشارے سے بتایا کہ وہ جعشمی میرا قاتل ہے جس نے مجھے نشانہ بنایا ہے۔ میں اس کی طرف لپکا اور اس کے قریب پہنچ گیا لیکن جب اس نے مجھے دیکھا تو وہ بھاگ پڑا، میں نے اس کا پیچھا کیا اور میں یہ کہتا جاتا تھا: تجھے شرم نہیں آتی، تجھ سے مقابلہ نہیں کیا جاتا! ۔ آخر وہ رک گیا اور ہم نے ایک دوسرے پر تلوار سے وار کیا۔ میں نے اسے قتل کردیا اور ابوعامرؓ سے جاکر کہا کہ اللہ نے آپ کے قاتل کو قتل کروادیا۔ انہوں نے فرمایا کہ میرے (گھٹنے میں سے) تیر نکال لے، میں نے نکال دیا تو اس سے پانی جاری ہوگیا پھر انہوں نے فرمایا: بھتیجے! نبی کریم ﷺ کو میرا سلام پہنچانا اور عرض کرنا کہ میرے لئے مغفرت کی دعا فرمائیں۔ ابوعامرؓ نے لوگوں پر مجھے اپنا نائب بنادیا۔ اس کے بعد وہ تھوڑی دیر اور زندہ رہے اور شہادت پائی۔ میں واپس ہوا اور نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پہنچا۔ آپؐ اپنے گھر میں بانوں کی ایک چارپائی پر تشریف فرما تھے۔

اس پر کوئی بستر بچھا ہوا نہیں تھا اور بانوں کے نشانات آپ کی پیٹھ اور پہلو پر پڑ گئے تھے۔ میں نے آپ سے اپنے اور ابو عامرؓ کے واقعات بیان کئے اور یہ کہ انہوں نے دعا مغفرت کے لئے درخواست کی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے پانی طلب فرمایا اور وضو کیا، پھر ہاتھ اٹھا کر دعا کی: اے اللہ ! عبید ابو عامر کی مغفرت فرما۔ میں نے آپ ﷺ کی بغل میں سفیدی (جب آپ دعا کر رہے تھے) دیکھی۔ پھر نبی کریم ﷺ نے دعا کی، اے اللہ ! قیامت کے دن ابو عامر کو اپنی بہت سی مخلوق سے بلند تر درجہ عطا فرمانا۔ میں نے عرض کیا: اور میرے لئے بھی اللہ سے مغفرت کی دعا فرمادیجئے۔ آپ ﷺ نے دعا کی اے اللہ ! عبد اللہ بن قیس ابو موسیٰ کے گناہوں کو بھی معاف فرما اور قیامت کے دن اچھا مقام عطا فرمانا۔ ابو بردہ (أبو موسى أشعريؓ) نے بیان کیا کہ ایک دعا ابو عامرؓ کے لئے تھی اور دوسری ابو موسیٰؓ کے لئے۔ (صحيح البخاري: 2884 صحیح مسلم: 2498)

ب: طائف کی جانب بھاگنے والوں کا محاصرہ:

اللہ کے رسول ﷺ نے اہلِ طائف کا محاصرہ کیا اور قتال اور محاصرہ کے سلسلہ میں متنوع قسم کے اسالیب اختیار کئے، آپؐ نے اس سلسلہ میں صحابہ کرام کے ساتھ مشاورت کی، محاصرہ کے وقت مناسب جگہ کا انتخاب فرمایا، دشمنوں کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے کے لئے نفسیاتی جنگ اور پروپیگنڈہ مہم کا بھی استعمال کیا، چند اسالیب کا ذکر مندرجہ ذیل سطور میں کیا جاتا ہے:

ا: آپؐ نے قتال کا ایک نیا اسلوب اختیار فرمایا، آپؐ نے طائف کا محاصرہ کرتے ہوئے ایک جدید قسم کا اسلحہ استعمال فرمایا جو اس سے پہلے کبھی استعمال نہیں کیا گیا تھا، آپؐ نے اسلحہ کی یہ اقسام استعمال فرمائیں:

- <u>منجنیق:</u>

روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے منجنیق کا استعمال طائف میں قلعہ ثقیف کے محاصرہ کے دوران کیا، مکحول سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اہلِ طائف کے مقابلہ میں منجنیق نصب کی۔ (مراسیل أبي داود: 335، سنن ترمذی: 2767)

'منجنیق' ایک بھاری اسلحہ کی قسم ہے جو انتہائی مؤثر ہتھیار ہے، یہ بالکل کرین کی طرح ہوتی ہے، یہ چیزوں کو دور تک پھینکنے کی صلاحیت رکھتی ہے، اس کے ذریعہ پھینکے گئے پتھروں سے قلعہ اور بلند عمارتیں گرائی جاتی ہیں اور اس کے ذریعہ پھینکے گئے بموں کے ذریعہ مکانات اور چھاؤنیاں خاکستر کی جاتی ہیں، اس کو استعمال کرنے کے لئے کئی افراد کی ضرورت ہوتی ہے۔ (دیکھیں: المدرسة العسكرية الاسلامية، میجر جنرل محمد فرج، ص: 407)

- <u>ٹینک:</u>

اللہ کے رسول ﷺ نے طائف کے محاصرہ میں پہلی مرتبہ جو اسلحہ استعمال کیا اس میں ٹینک بھی تھا، ٹینک ایک چھوٹے گھر کی شکل کا ہوتا ہے، جس کو لکڑی یا لوہے سے بنایا جاتا ہے اور دشمنوں کے تیروں سے حفاظت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور جدید دور میں اس کو مزید دوسرے مقاصد کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ (دیکھیں: القيادة في عهد الرسول، ص: 405)

- **خار دھار لوہا:**

اللہ کے رسول ﷺ نے طائف کے محاصرہ میں خار دھار لوہے کو بھی بطور اسلحہ استعمال کیا، یہ دفاعی وسائل کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے، دو لکڑیوں یا لوہے پر مشتمل صلیب کی شکل میں ہوتا ہے اور اس کی چار نوکیلی دھاریں ہوتی ہیں اور اس کو مارنے سے پیدل فوج اور گھوڑوں کے پاؤں زخمی ہوتے ہیں، جس کے ذریعہ ان کی رفتار اور تیزی میں کمی آتی ہے۔ (دیکھیں: الفن الحربی فی صدر الاسلام، میجر عبد الرؤوف، عون، ص: 195، الطبقات الکبریٰ: 2/214)

۲: اللہ کے رسول ﷺ نے جنگ کے وقت مناسب جگہ کا انتخاب فرمایا، ابتدائی مرحلہ میں مسلمانوں کا لشکر قلعہ کے قریب ایک کھلی جگہ میں ٹھہرا، جیسے ہی لشکر نے اپنا سامان اتارا تو فوراً دشمنوں نے تیروں کی بارش کر دی اور اس کے نتیجہ میں بہت سے افراد زخمی ہو گئے، اس وقت حضرت حباب بن منذرؓ نے رسول اللہ ﷺ کو اس جگہ سے کسی دوسری محفوظ جگہ منتقل ہونے کا مشورہ دیا، آپؐ نے اس مشورہ کو قبول فرمایا اور حبابؓ کو ہی مناسب جگہ تلاش کرنے کی ذمہ داری سونپی، اس لئے کہ وہ اس میدان میں اچھا جنگی تجربہ رکھتے تھے، حضرت حبابؓ نے مناسب جگہ تلاش کرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ کو آکر اس کی اطلاع دی۔

عینی شاہد آنکھوں دیکھا حال ہم سے بیان کرتے ہیں، عمرو بن امیہ ضمریؓ فرماتے ہیں: جب ہم وادی کی طرف اترنے لگے اس وقت ان کی طرف سے ہم پر اتنی زیادہ تیر اندازی ہوئی جس کو اللہ ہی جانتا ہے، ایسا لگ رہا تھا جیسے کہ ٹڈی دل ہے، ہم نے ڈھالوں سے اپنا تحفظ کیا لیکن اس وقت تک بہت سے مسلمان زخموں سے چور ہو چکے تھے، اللہ کے رسولؐ نے حضرت حبابؓ کو طلب کیا اور فرمایا: کوئی اونچی جگہ تلاش کرو جو دشمن سے ہٹ کر ہو، حضرت حبابؓ نکلے یہاں تک کہ بستی سے باہر مسجد الطائف کی جگہ پہنچے، اس کے بعد نبی کریم ﷺ کے پاس آکر اس جگہ کے بارے میں بتایا اور آپؐ نے اس جگہ منتقل ہونے کا حکم دیا۔ (دیکھیں: مغازی الواقدی: 1/416)

۳: نفسیاتی جنگ اور پروپیگنڈہ مہم کا استعمال:

جب اہلِ طائف کی طرف سے مقابلہ اور جنگ میں شدت آئی اور مسلمانوں میں سے کئی افراد شہید ہو گئے تو نبی کریم ﷺ نے ثقیف پر دباؤ بنانے کے لئے طائف کے مضافات میں انگور اور کھجور کے درخت جلانے کا حکم دیا اور اس کے ذریعہ ان کی نفسیات اور مقابلہ آرائی کے جذبات پر جیسے ہی اثر ہوا تو آپؐ نے آگ لگانے سے منع کر دیا، ثقیف کے لوگ اللہ اور قرابت کا واسطہ دینے لگے، نبی کریم ﷺ نے طائف کے غلاموں کے لئے یہ اعلان کروایا کہ جو بھی قلعہ سے نیچے آکر مسلمانوں کے ساتھ شامل ہو جائے گا وہ آزاد ہے، اس اعلان کے نتیجہ میں تیئس (۲۳) غلام نکل کر مسلمانوں میں شامل ہو گئے جن میں ابو بکرہ ثقفی بھی تھے، وہ سب حلقہ بگوش اسلام ہو گئے اور آپؐ نے ان کو آزاد کر دیا اور ان کے اسلام قبول کرنے کے بعد ان کو ثقیف کے حوالہ نہیں کیا۔ (دیکھیں: السیرة النبویہ الصحیحہ 510/2)

۴: محاصرہ ختم کرنے کی حکمت:

محاصرہ ختم کرنے کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی حکمتِ عملی بالکل واضح تھی، آس پاس کا علاقہ اب اسلامی ریاست کے ماتحت ہو گیا تھا اور طائف کے لوگ اب صرف اپنے قلعوں کی وجہ سے محفوظ تھے جبکہ باہر کا علاقہ ان کے کنٹرول میں نہیں تھا، اس لئے رسول

اللہ ﷺ نے محاصرہ کے سلسلہ میں صحابہ کرام کے ساتھ مشورہ کیا، آپ ﷺ نے نوفل بن معاویہ دیلیؓ سے مشورہ طلب کیا۔ انہوں نے کہا: لومڑی اپنے بھٹ میں گھس گئی ہے، اگر آپ اس پر ڈٹے رہے تو پکڑ لیں گے اور اگر چھوڑ کر چلے گئے تو وہ آپ کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے محاصرہ ختم کرنے کا فیصلہ فرما لیا اور حضرت عمر بن خطابؓ کے ذریعہ لوگوں میں اعلان کروادیا کہ ہم ان شاء اللہ کل واپس ہوں گے۔ لیکن یہ اعلان صحابہ کرام پر گراں گزرا، وہ کہنے لگے: ہوں! طائف فتح کئے بغیر واپس ہوں گے؟!۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اچھا تو کل صبح لڑائی پر چلنا ہے، چنانچہ دوسرے دن لوگ لڑائی پر گئے، لیکن چوٹ کھانے کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا، اس کے بعد آپؐ نے پھر فرمایا کہ ہم ان شاء اللہ کل واپس ہوں گے، اس پر لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور انہوں نے بے چوں وچرا رختِ سفر باندھنا شروع کر دیا۔ یہ کیفیت دیکھ کر رسول اللہ ﷺ مسکراتے رہے، اس کے بعد جب لوگوں نے سامانِ سفر اٹھا کر کوچ کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ یوں کہو: "آئبون، تائبون، عابدون، لربنا حامدون". ''ہم پلٹنے والے، توبہ کرنے والے، عبادت گزار ہیں، اور اپنے رب کی حمد کرتے ہیں''۔ کہا گیا کہ اے اللہ کے رسولؐ! آپ ثقیف پر بددعا کریں۔ آپؐ نے فرمایا: "اے اللہ! ثقیف کو ہدایت دے اور انہیں (اسلام میں) لے آ"۔ (صحیح البخاري:4325 صحیح مسلم:1778 مسند أحمد:21/2 سنن ترمذي:2942 زاد المعاد 497/3 صحیح السیرۃ النبویۃ، ص:566)

....

دوسرا باب

لوگوں کے ساتھ تعامل میں رسول ﷺ کی حکمتِ عملی

اس غزوہ میں رسول ﷺ کی حکمتِ عملی اور لوگوں کے ساتھ تعامل کے سلسلہ میں آپؐ کے طرزِ عمل اور فہم و فراست کا کئی مقامات پر اظہار ہوتا ہے، ان میں سے چند مواقف مندرجہ ذیل ہیں:

(الف): بت پرستی کے لئے اب کوئی جگہ نہیں:

اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ حنین کی جانب بعض وہ افراد نکلے جو ابھی تازہ تازہ مسلمان ہوئے تھے، ایک قبیلہ کے یہاں ایک بہت بڑا ہرا بھرا درخت تھا جس کو "ذات أنواط" کہا جاتا تھا، وہ ہر سال وہاں آتے تھے اور اس پر اپنے ہتھیار لٹکاتے تھے اور اس کے پاس جانور ذبح کرتے تھے، ایک دن تک وہاں قیام کرتے تھے، رسول اللہ ﷺ کے ساتھ چلتے چلتے ان کی نظر اس درخت پر پڑی تو ان کے ذہن میں جاہلی تہواروں اور مناظر کی یاد تازہ ہوگئی، انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے مطالبہ کر لیا کہ ہمارے لئے بھی ''ذات أنواط'' متعین کر لیں جیسے کہ ان کے پاس 'ذات أنواط' ہے، یہ سن کر اللہ کے رسولؐ نے فرمایا: اللہ أکبر! اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمدؐ کی جان ہے! آپ لوگ ویسے ہی کہہ رہے ہیں جیسے کہ موسی کی قوم نے موسی سے کہا: ﴿ٱجۡعَل لَّنَآ إِلَٰهٗا كَمَا لَهُمۡ ءَالِهَةٞۚ قَالَ إِنَّكُمۡ قَوۡمٞ تَجۡهَلُونَ﴾ ترجمہ: ''ہمارے لئے بھی کوئی ایسا معبود بنا دے جیسے اِن لوگوں کے معبود ہیں۔ موسیٰؑ نے کہا: تم لوگ بڑی نادانی کی باتیں کرتے ہو''۔ (سورۃ الأعراف: 138) (آپ ﷺ نے فرمایا:) آپ لوگ سابقہ امتوں کے طور طریقوں کو ضرور اختیار کرو گے۔ (سنن ترمذی: 2180، الدلائل للبیہقی: 5/125، السیرۃ النبویہ للندوی، ص349)

اس کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام قبول کرنے کے باوجود توحید خالص کے بارے میں ان کا تصور واضح نہیں تھا، لیکن نبی کریم ﷺ نے ان کے سامنے واضح کر دیا کہ ان کے اس مطالبہ میں شرک کی آمیزش ہے اور اس سلسلہ میں ان کو متنبہ بھی کیا، لیکن نہ ہی ان کی سرزنش کی اور نہ ہی ان کو کوئی سزا دی، اس لئے کہ نبی کریم ﷺ جانتے تھے کہ ان کو اسلام قبول کئے ہوئے ابھی کوئی زیادہ وقت نہیں ہوا ہے۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویہ الصحیحہ: 2/497)

اللہ کے رسول ﷺ نے ان کو جہاد میں شرکت کی اجازت دی، اس لئے کہ جہاد میں شرکت کے لئے ضروری نہیں ہے کہ اس میں شریک ہونے والے نے اپنے عقائد کو ہر قسم کی جاہلیت پر مبنی آمیزش سے پاک کر لیا ہو، بلکہ جہاد تو ایک عملِ صالح ہے جو باعثِ اجر و ثواب ہے، اگرچہ دین کے دوسرے امور کے بارے میں کوتاہی پائی جاتی ہو، بلکہ جہاد تو ایک تعلیمی اور تربیتی ادارہ ہے جہاں مجاہدین بہت سے عقائد واحکام اور اخلاق سیکھتے ہیں، اس لئے کہ اس کے لئے سفر کرنا پڑتا ہے اور بہت سی ملاقاتیں ہوتی ہیں جن میں افکار واحکام کا تبادلہ ہوتا ہے۔ (دیکھیں: التاریخ الاسلامی للحمیدی، 8/62)

ب: کثرتِ تعداد پر اترانہ نصرتِ الٰہی کے لئے حجاب:

کثرتِ تعداد پر اِترانے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے معرکہ کے آغاز میں مسلمانوں سے نصرت و مدد کو روک لیا، قرآن کریم نے اس کی منظر کشی اس طرح کی ہے: ﴿لَقَدْ نَصَرَكُمُ ٱللَّهُ فِى مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنكُمْ شَيْـًٔا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ ٱلْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُم مُّدْبِرِينَ﴾ ترجمہ: ''اللہ اس سے پہلے بہت سے مواقع پر تمہاری مدد کر چکا ہے، ابھی غزوۂ حنین کے روز (اُس کی دستگیری کی شان تم دیکھ چکے ہو) اس روز تمہیں اپنی کثرتِ تعداد کا غرّہ تھا مگر وہ تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی اور تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے''۔ (سورۃ التوبہ: 25) اور نبی کریم ﷺ نے بھی اس جانب اپنے اس فرمان کے ذریعہ توجہ دلائی ہے کہ "لا حول ولا قوة إلا بالله'' آپؐ یہ فرمایا کرتے تھے: "اللهم بك أجول وبك أصول، وبك أقاتل"۔ ''اے اللہ! تیری ہی مدد سے میں چلتا پھرتا ہوں، تیری ہی مدد سے میں حملہ کرتا ہوں اور تیری ہی مدد سے میں لڑتا ہوں''۔ (مسند أحمد: 3/332، صحیح ابن حبان: 1975، الیوم واللیلہ للنسائی: 614، الدارمی: 2485)

اس طرح سے اللہ کے رسول ﷺ مسلسل مسلمانوں کی نگرانی فرماتے رہتے تھے اور ان کی طرف سے تصورات اور طرزِ زندگی میں جہاں بھی انحرافات پائے جاتے تھے ان کی اصلاح فرماتے تھے، یہاں تک کہ میدانِ جنگ میں دشمنوں سے مقابلہ کرتے ہوئے سخت ترین حالات میں بھی ان کی تربیت فرماتے تھے۔ (دیکھیں: المجتمع المدنی فی عہد النبوہ، للعمری، ص: 199)

اگرچہ مسلمانوں کو غزوۂ حنین کے ابتدائی مرحلہ میں پسپائی کا سامنا کرنا پڑا اور بہت سے مسلمان میدانِ جنگ چھوڑ کر بھاگ گئے ، اس لئے کہ ان کو اس طرح کی صورتحال کی بالکل توقع نہیں تھی، لیکن رسول اللہ ﷺ نے کسی بھی بھاگنے والے کی سرزنش نہیں کی یہاں تک کہ جب بعض صحابہ کرام نے آپؐ سے یہ مطالبہ کیا کہ طلقاء (فتح مکہ کے روز جن کو معاف کیا گیا) کو قتل کر دیا جائے اس لئے کہ انہوں نے میدانِ جنگ سے فرار اختیار کیا ہے لیکن آپؐ نے ان کے اس مطالبہ کو قبول نہیں کیا۔

ج: مالِ غنیمت تالیفِ قلب کا ذریعہ:

اللہ کے رسول ﷺ نے یہ مناسب سمجھا کہ مالِ غنیمت کے ذریعہ طلقاء اور اُعراب کی تالیفِ قلب کریں، اس لئے کہ وہ نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے ہیں، اس لئے آپؐ نے قریش، غطفان اور تمیم کے زعماء اور سرداروں کو بہت زیادہ عطیے دیئے، ان میں سے ایک کو سو سو اونٹ کا عطیہ دیا گیا، ان زعماء میں یہ لوگ شامل تھے: ابو سفیان حرب، سہیل بن عمرو، حکیم بن حزام، صفوان بن امیہ، عیینہ بن حصن فزاری، اُقرع بن حابس، ابو سفیان کے دو بیٹے: معاویہ اور یزید، قیس بن عدی۔ (دیکھیں: من معین السیرۃ، ص: 421)

ان عطایا اور ہدایا کا مقصد یہ تھا کہ ان کے دلوں کو حبّ دنیا سے اسلام کی محبت کی طرف مائل کیا جائے جیسے کہ حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں: ''بعض لوگ اسلام قبول کرتے تھے اور اس کے ذریعہ ان کا مقصد حصولِ دنیا ہوتا تھا، وہ جیسے ہی اسلام قبول کرتا تھا تو اسلام اس کے نزدیک دنیا و مافیہا سے زیادہ محبوب بن جاتا تھا''۔ (صحیح مسلم: 2312)

حضرت صفوان بن امیہ نے بھی اس کی منظر کشی ان الفاظ میں کی ہے وہ فرماتے ہیں: ”مجھے رسول اللہ ﷺ عطا کرتے رہے حال یہ تھا کہ آپؐ میرے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ شخص تھے، لیکن آپؐ مجھے مسلسل دیتے رہے یہاں تک کہ آپ میرے نزدیک محبوب ترین شخص بن گئے“۔(صحیح مسلم: 2313)

ان عطایا اور ہدایا کو دیکھ کر انصار کے نوجوان اپنے فطری تقاضے کی وجہ سے متاثر ہوئے اور ان کے درمیان چہ مہ گوئیاں بھی شروع ہو گئیں، آپؐ نے ان کے اعتراض کو بغور سنا اور ان کو مطمئن کرنے کی کوشش کی، آپؐ نے ان کے سامنے مالِ غنیمت تقسیم کرنے کی حکمت بیان کی اور انصار کے سامنے ایک ایمان افروز، جذباتی، عقلی اور وجدانی خطاب کیا، مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اور مختلف حالات میں جب بھی ایک مسلمان قاری اس عظیم واقعہ کو پڑھتا ہے اس کی آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں، جب حضرت سعد بن عبادہؓ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو فرمایا: اے اللہ کے رسولؐ! آپ نے حاصل شدہ مالِ فئی میں جو کچھ کیا ہے اس پر انصار اپنے جی ہی جی میں آپ پر پیچ وتاب کھا رہے ہیں، آپ نے اسے اپنی قوم میں تقسیم فرمایا، قبائلِ عرب کو بڑے بڑے عطیے دیئے لیکن انصار کو کچھ نہ دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اے سعد! اس بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ انہوں نے کہا: یارسول اللہ! میں بھی تو اپنی قوم ہی کا ایک آدمی ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: اچھا، اپنی قوم کو اس احاطہ میں جمع کرو۔ سعدؓ نے نکل کر انصار کو اس احاطہ میں جمع کیا۔ کچھ مہاجرین بھی آ گئے تو انہیں داخل ہونے دیا، پھر کچھ دوسرے لوگ بھی آ گئے تو انہیں واپس کر دیا۔ جب سب لوگ جمع ہو گئے۔

حضرت سعدؓ نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ قبیلۂ انصار آپ کے لئے جمع ہو گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ ان کے پاس تشریف لائے، اللہ کی حمد وثنا کی پھر فرمایا: انصار کے لوگو! تمہاری یہ کیا چہ مہ گوئی ہے جو میرے علم میں آئی ہے؟! اور یہ کیا ناراضگی ہے جو جی ہی جی میں تم نے مجھ پر محسوس کی ہے؟! کیا ایسا نہیں کہ میں تمہارے پاس اس حالت میں آیا کہ تم گمراہ تھے، اللہ نے تمہیں ہدایت دی؟! اور محتاج تھے، اللہ نے غنی بنا دیا؟ اور باہم دشمن تھے، اللہ نے تمہارے دل جوڑ دیئے؟! لوگوں نے کہا: کیوں نہیں! اللہ اور اس کے رسول کا بڑا فضل و کرم ہے۔

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا: انصار کے لوگو! مجھے جواب کیوں نہیں دیتے؟! انصار نے عرض کیا: یارسول اللہ! بھلا ہم آپ کو کیا جواب دیں؟ اللہ اور اس کے رسول کا فضل و کرم ہے۔ آپؐ نے فرمایا: دیکھو! اللہ کی قسم! اگر تم چاہو تو کہہ سکتے ہو اور سچ ہی کہو گے اور تمہاری بات سچ ہی مانی جائے گی کہ آپ ہمارے پاس اس حالت میں آئے کہ آپ کو جھٹلایا گیا تھا، ہم نے آپ کی تصدیق کی۔ آپ کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا تھا، ہم نے آپ کی مدد کی۔ آپ کو دھتکار دیا گیا تھا، ہم نے آپ کو ٹھکانا دیا۔ آپ محتاج تھے، ہم نے آپ کی غمخواری و غمگساری کی۔

اے انصار کے لوگو! تم اپنے جی میں دنیا کی ایک حقیر سی چیز کے لئے ناراض ہو گئے جس کے ذریعہ میں نے لوگوں کا دل جوڑا تھا تاکہ وہ مسلمان ہو جائیں، اور تم کو تمہارے اسلام کے حوالے کر دیا تھا؟ اے انصار! کیا تم اس سے راضی نہیں کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے کر جائیں اور تم رسول ﷺ کو لے کر اپنے خیموں میں پلٹو؟ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے! اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں بھی

انصار ہی کا ایک فرد ہوتا۔ اگر سارے لوگ ایک راہ چلیں اور انصار دوسری راہ چلیں تو میں بھی انصار ہی کی راہ چلوں گا۔ اے اللہ! انصار پر رحم فرما اور انصار کے بیٹوں اور انصار کے بیٹوں کے بیٹوں (پوتوں) پر۔

رسول اللہ ﷺ کا یہ خطاب سن کر لوگ اس قدر روئے کی داڑھیاں تر ہو گئیں اور کہنے لگے: ہم راضی ہیں کہ ہمارے حصے اور نصیب میں رسول الل ﷺ ہوں۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ واپس تشریف لے گئے اور لوگ بھی چلے گئے۔ (مسند أحمد: 76/3 مجمع الزوائد 32/10)

اس موقع پر اس چیز کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ اعتراض تمام انصار کی طرف سے نہیں کیا گیا تھا بلکہ ان کے نو عمر نوجوان نے کیا تھا، اس کی دلیل وہ روایت ہے جو صحیحین میں حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ "جب قبیلہ ٔ ہوازن کے مال میں سے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو جو دینا تھا وہ دیا تو انصار کے کچھ لوگوں کو رنج ہوا کیونکہ آپؐ نے کچھ لوگوں کو سو سو اونٹ دے دیئے تھے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ اللہ اپنے رسول کو معاف کرے، قریش کو تو آپ عنایت فرما رہے ہیں اور ہم کو آپ نے چھوڑ دیا ہے، حالانکہ ہماری تلواروں سے ان کا خون ٹپک رہا ہے!۔ انسؓ نے بیان کیا کہ انصار کی یہ بات نبی کریم ﷺ کے کانوں میں پڑی تو آپ نے انہیں بلا بھیجا اور چمڑے کے ایک خیمے میں انہیں جمع کیا، ان کے ساتھ ان کے علاوہ کسی کو بھی آپ نے نہیں بلایا تھا۔ جب سب لوگ جمع ہو گئے تو آپ ﷺ کھڑے ہوئے اور آپؐ نے فرمایا: تمہاری جو بات مجھے معلوم ہوئی ہے کیا وہ صحیح ہے؟! انصار کے جو سمجھدار لوگ تھے انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! جو لوگ ہمارے معزز اور سردار ہیں، انہوں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی، البتہ ہمارے کچھ لوگ جو ابھی نو عمر ہیں، انہوں نے کہا ہے کہ اللہ، رسول اللہ ﷺ کو معاف کرے، قریش کو آپ دے رہے ہیں اور ہمیں آپ نے چھوڑ دیا ہے حالانکہ ہماری تلواروں سے ان کا خون ٹپک رہا ہے!۔ نبی کریم ﷺ نے اس پر فرمایا کہ میں ایسے لوگوں کو دیتا ہوں جو ابھی نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے ہیں، اس طرح میں ان کی دلجوئی کرتا ہوں۔ کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ دوسرے لوگ تو مال و دولت لے جائیں اور تم نبی کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاؤ۔ اللہ کی قسم! جو چیز تم اپنے ساتھ لے جاؤ گے وہ اس سے کہیں بہتر ہے جو وہ لے جا رہے ہیں۔ انصار نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہم اس پر راضی ہیں۔ اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میرے بعد تم دیکھو گے کہ تم پر دوسروں کو ترجیح دی جائے گی، اس وقت صبر کرنا، یہاں تک کہ اللہ اور اس کے رسول سے آملو۔ میں حوض کوثر پر ملوں گا۔ انس ﷺ نے کہا: لیکن انصار نے صبر نہیں کیا"۔ (صحيح البخاري: 4331 صحيح مسلم: 1059)

امام ابن قیمؒ اس واقعہ سے استدلال کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ امام کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کو قریب کرنے کے لئے اور مسلمانوں سے ان کے شر کو دور کرنے کے لئے ان کی تالیف قلب کرے۔ فرماتے ہیں: "امام مسلمانوں کا نائب ہے، وہ ان کے مصالح اور دین کے قیام کے اعتبار سے حکمتِ عملی اختیار کرے گا، اگر یہ چیز ضروری ہو۔ یعنی اسلام کے دفاع کے لئے اور اعدائے دین میں سے اہم لیڈروں کو قریب کرنے کے لئے تالیف قلب کی جائے تاکہ مسلمان ان کے شر سے محفوظ رہ سکیں۔ تو ایسا کرنا اس کے لئے جائز بلکہ لازم ہے...."۔ (دیکھیں: زاد المعاد: 3/486)

شیخ محمد غزالیؒ اس چیز کو ایک محسوس مثال کے ذریعہ سمجھاتے ہیں، فرماتے ہیں: ''دنیا میں بہت سے لوگ اس طرح کے ہیں جن کو حق کی جانب عقل کے بجائے پیٹ کے ذریعہ لایا جاتا ہے، جیسے کہ جانوروں کو گھاس کی چند ڈالیوں کے ذریعہ راستے پر چلایا جاتا ہے اور وہ مسلسل اپنا منہ اس کی طرف اٹھاتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ اپنے باڑے میں اطمینان کے ساتھ داخل ہو جاتے ہیں، اسی طرح انسانوں کی یہ قسم بھی ہے جس کو ترغیب اور لالچ کی ضرورت ہوتی ہے یہاں تک کہ وہ ایمان سے مانوس ہو جاتے ہیں''۔ (دیکھیں: فقه السيرة، ص:427)

اس طرح کے لوگوں کے لئے تالیف کا مقصد ابتدائی مرحلہ میں ترغیب، لالچ اور حوصلہ افزائی ہوتا ہے یہاں تک کہ ایمان دل میں جاگزیں ہو جاتا ہے اور صاحبِ ایمان اس کی حلاوت محسوس کرتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے انصار کے سامنے ایک مؤثر تصویر پیش کی، ایک طرف وہ لوگ ہیں جن کو ایمان کی خوشخبری دی جاتی ہے اور ان کے مقابلہ میں وہ لوگ ہیں جن کو اونٹوں کی خوشخبری سنائی جاتی ہے، ایک طرف وہ لوگ ہیں جن کو رسول اللہ ﷺ کی محبت نصیب ہوتی ہے، جبکہ ان کے مقابلہ میں وہ لوگ ہیں جن کو ساتھ میں بکریاں اور اونٹ ملتے ہیں، اس تصویر نے ان کو بیدار کر دیا اور ان کو اس بات کا احساس ہو گیا کہ وہ ایسی خطا کے مرتکب ہوئے ہیں جس طرح کی غلطی کا ارتکاب ان جیسے لوگوں کے شایانِ شان نہیں تھا، نتیجتاً وہ رونا شروع کر دیتے ہیں اور ان کی آنکھوں سے اشک جاری ہو جاتے ہیں اور زبانوں سے رضامندی کا اظہار ہوتا ہے، اور نبی کریم ﷺ کی حکیمانہ حکمتِ عملی کے ذریعہ ان کے دل مطمئن اور شاد ہو جاتے ہیں۔ (دیکھیں: المجتمع المدنی فی عہد النبوہ، ص: 219)

د: اَعراب کی درشتی پر صبر:

رسول اللہ ﷺ نے اعراب کی درشتی ان کے طمع اور لالچ اور مالی مفادات کے حرص پر بہت زیادہ صبر کیا، آپؐ ایک عظیم مربی کی اعلیٰ مثال تھے، آپؐ ان کے حالات، ان کی طبیعت و مزاج ان کے طرزِ زندگی اور ان کے انفرادی اور اجتماعی احوال سے اچھی طرح واقف تھے، آپؐ نے ان کے ساتھ اخلاقِ کریمانہ کا مظاہرہ کیا، آپؐ ان کے مصالح ومفادات کے بارے میں ان کو اطمئنان دلاتے تھے اور ان کی عقلی سطح کے اعتبار سے ان کے ساتھ معاملہ کرتے تھے، آپؐ ان کے حق میں رحیم و شفیق اور مربی و مصلح تھے، آپؐ نے ان کے ساتھ بادشاہوں کا سا سلوک نہیں کیا جن کے سامنے لوگ آکر جھکتے تھے اور ان کے سامنے سجدہ ریز ہوتے تھے اور وہ ان کے ساتھ ملاقات نہیں کر سکتے تھے، ان کو تعظیم واجلال کی عبارتوں کا اہتمام کرنا پڑتا تھا، جیسے کہ ایک غلام اپنے مالک کے ساتھ کرتا ہے، لیکن اللہ کے رسول ﷺ ایک عام انسان کی طرح تھے، وہ آپؐ سے براہِ راست بات کرتے، آپؐ سے سوالات بھی کرتے، آپؐ کبھی بھی ان کو اپنے آپ سے روکتے نہیں تھے، صحابہ کرام آپؐ کے ساتھ ادب و تعظیم کا معاملہ کرتے تھے، آپؐ کے مقام و مرتبہ کی رعایت کرتے تھے، آپؐ کے سامنے پست آواز سے بات کرتے تھے اور آپؐ کے لئے اپنے دلوں میں بے پناہ محبت رکھتے تھے، لیکن جہاں تک تعلق ہے تند خو اَعراب کا، تو قرآن نے ان کی بے ادبی، ان کی درشتی، ان کے زور زور سے بولنے اور ان کی جرأت و بے باکی پر سرزنش کی ہے، مندرجہ ذیل سطور میں چند واقعات پیش کئے جاتے ہیں جو اَعراب کے ساتھ حسنِ معاملہ اور بہترین سلوک پر دلالت کرتے ہیں:

۱: وہ اَعرابی جس نے خوشخبری لینے سے انکار کیا:

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کے پاس تھا- جب آپؐ جعرانہ میں، جو مکہ اور مدینہ کے درمیان میں ایک مقام ہے قیام پذیر تھے- آپ ﷺ کے ساتھ بلالؓ تھے، اسی دوران نبی کریم ﷺ کے پاس ایک بدوی آیا اور کہنے لگا کہ آپ نے جو مجھ سے وعدہ کیا ہے وہ پورا کیوں نہیں کرتے ؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمہیں بشارت ہو !۔ اس پر وہ بدوی بولا: بشارت تو آپ مجھے بہت دے چکے !۔ آپ ﷺ نے چہرہ مبارک ابو موسیٰؓ اور بلالؓ کی طرف پھیرا، آپؐ بہت غصے میں معلوم ہو رہے تھے۔ آپؐ نے فرمایا: اس نے بشارت واپس کر دی، اب تم دونوں اسے قبول کر لو۔ ان دونوں حضرات نے عرض کیا کہ ہم نے قبول کیا۔ پھر آپؐ نے پانی کا ایک پیالہ طلب فرمایا اور اپنے دونوں ہاتھوں اور چہرے کو اس میں دھویا اور اسی میں کلی کی اور (ان دونوں) سے فرمایا کہ اس کا پانی پی لو اور اپنے چہروں اور سینوں پر اسے ڈال لو اور بشارت حاصل کرو۔ ان دونوں نے پیالہ لے لیا اور ہدایت کے مطابق عمل کیا۔ پردہ کے پیچھے سے ام سلمہؓ نے بھی کہا: اپنی ماں کے لئے بھی کچھ چھوڑ دینا۔ چنانچہ ان دونوں نے ان کے لئے ایک حصہ چھوڑ دیا"۔(صحیح البخاري:4328 صحیح مسلم:2497)

۲: اَعرابی کا یہ کہنا: "یہ عادلانہ تقسیم نہیں ہے":

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں: "حنین کی جنگ کے بعد نبی کریم ﷺ نے (غنیمت کی) تقسیم میں بعض لوگوں کو زیادہ دیا، جیسے اَقرع بن حابس کو سو اونٹ دیئے، اتنے ہی اونٹ عیینہ کو دیئے اور کئی عرب کے اشراف لوگوں کو اسی طرح تقسیم میں زیادہ دیا۔ اس پر ایک شخص نے کہا کہ اللہ کی قسم! اس تقسیم میں نہ تو عدل کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور نہ اللہ کی خوشنودی کا خیال ہوا۔ میں نے کہا کہ واللہ! اس کی خبر میں رسول اللہ ﷺ کو ضرور دوں گا۔ چنانچہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپؐ کو اس کی خبر دی۔ نبی کریم ﷺ نے سن کر فرمایا: "اگر اللہ اور اس کا رسول بھی عدل نہ کرے تو پھر کون عدل کرے گا؟!۔ اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام پر رحم فرمائے کہ ان کو لوگوں کے ذریعہ اس سے بھی زیادہ تکلیف پہنچی لیکن انہوں نے صبر کیا"۔(صحیح البخاري:4336 صحیح مسلم:1062)

۳: ہوازن کے قبولِ اسلام کے بعد آپؐ کا تعامل:

مقام جعرانہ میں ہوازن کے چودہ سرداروں کا ایک وفد زہیر بن صرد سعدی کی قیادت میں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ اسلام لا چکے تھے، جن میں آنحضرت ﷺ کے رضاعی چچا ابو یرقان بھی تھے، انہوں نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ ہم مسلمان ہو چکے ہیں اور یہ درخواست کی کہ ہمارے اہل و عیال اور اموال ہمیں واپس دے دیئے جائیں، اس درخواست میں عرض کیا گیا کہ یارسول اللہ! ہم بسلسلہ رَضاعت آپ کے خویش و عزیز ہیں اور جو مصیبت ہم پر پڑی ہے وہ آپ سے مخفی نہیں، آپ ہم پر احسان فرمائیں، رئیس وفد ایک شاعر آدمی تھا، اس نے کہا کہ یارسول ﷺ! اگر ہم بادشاہ روم حارث غسانی یا شاہ عراق نعمان بن منذر سے اپنی ایسی مصیبت کے پیش نظر کوئی درخواست کرتے تو ہمارا خیال یہ ہے کہ وہ بھی ہماری درخواست کو رد نہ کرتے اور آپ کو تو اللہ تعالیٰ نے اخلاقِ فاضلہ میں سب سے زیادہ ممتاز بنایا ہے، آپ سے ہم بڑی امید لے کر آئے ہیں۔

اس کے بعد وہ یہ اشعار پڑھنے لگا:

امنن علينا رسولَ الله في كرم ... فإنّك الْمرء نرجوه وننتظر

"اللہ کے رسول! سخاوت کرتے ہوئے ہم پر احسان فرمایئے، آپ تو ایسے شخص ہیں جن سے ہم امیدیں لگائے منتظر بیٹھے ہیں"۔

یہاں تک کہ اخیر میں یہ اشعار کہے:

امنن على نسوة قد كنت ترضعها ... إذْ فوك يملؤه من محضها الدُّرر

"ان عورتوں پر آپ احسان فرمایئے جن کا آپ دودھ پیتے رہے"۔

اس کی وجہ سے ان کے تمام قیدی آزاد کر دئے گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میرے ساتھ جو لوگ ہیں انہیں دیکھ ہی رہے ہو۔ اور مجھے سچ بات زیادہ پسند ہے، اس لئے بتاؤ کہ تمہیں اپنے بال بچے زیادہ محبوب ہیں یا مال؟ انہوں نے کہا: ہمارے نزدیک خاندانی شرف کے برابر کوئی چیز نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اچھا تو جب میں ظہر کی نماز پڑھ لوں تو تم لوگ اُٹھ کر کہنا کہ ہم رسول اللہ ﷺ کو مسلمانوں کی جانب سفارشی بناتے ہیں اور مسلمانوں کو رسول اللہ ﷺ کی جانب سفارشی بناتے ہیں کہ آپ ہمارے قیدی ہمیں واپس کر دیں۔ اس کے بعد جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو ان لوگوں نے یہی کہا۔ جواباً آپؐ نے فرمایا: جہاں تک اس حصے کا تعلق ہے جو میرا ہے اور بنی عبدالمطلب کا ہے تو وہ تمہارے لئے ہے۔ اور میں ابھی لوگوں سے پوچھے لیتا ہوں۔ اس پر انصار اور مہاجرین نے اٹھ کر کہا: جو کچھ ہمارا ہے وہ سب بھی رسول اللہ ﷺ کے لئے ہے۔ اس کے بعد اَقرع بن حابس نے کہا: لیکن جو کچھ میرا اور بنو تمیم کا ہے وہ آپ کے لئے نہیں۔ اور عُیینہ بن حصن نے کہا کہ جو کچھ میرا اور بنو فزارہ کا وہ بھی آپ کے لئے نہیں۔ اور عباس بن مرداس نے کہا: جو کچھ میرا اور بنو سلیم کا ہے وہ بھی آپ کے لئے نہیں۔ اس پر بنو سلیم نے کہا: جی نہیں، جو کچھ ہمارا ہے وہ بھی رسول اللہ ﷺ کے لئے ہے۔ عباس بن مرداس نے کہا: تم لوگوں نے میری توہین کر دی۔ رسول اللہ نے فرمایا: دیکھو! یہ لوگ مسلمان ہو کر آئے ہیں (اور اسی غرض سے) میں نے ان کے قیدیوں کی تقسیم میں تاخیر کی تھی۔ اور اب میں نے انہیں اختیار دیا تو انہوں نے بال بچوں کے برابر کسی چیز کو نہیں سمجھا۔ لہٰذا جس کسی کے پاس کوئی قیدی ہو، اور وہ بخوشی واپس کر دے تو یہ بہت اچھی راہ ہے اور جو کوئی اپنے حق کو روکنا ہی چاہتا ہو تو وہ بھی ان کے قیدی تو انہیں واپس ہی کر دے۔ البتہ آئندہ جو سب سے پہلا مالِ فئی حاصل ہوگا اس سے ہم اس شخص کو ایک کے بدلے چھ دیں گے۔ لوگوں نے کہا: ہم رسول اللہ ﷺ کے لئے بخوشی دینے کو تیار ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: ہم جان نہ سکے کہ آپ میں سے کون راضی ہے اور کون نہیں؟ لہٰذا آپ لوگ واپس جائیں، اور آپ کے امراء حضرات آپ کے معاملہ کو ہمارے سامنے پیش کریں۔ اس کے بعد سارے لوگوں نے ان کے بال بچے واپس کر دیئے۔ صرف عُیینہ بن حصن رہ گیا جس کے حصے میں ایک بڑھیا آئی تھی۔ اس نے واپس کرنے سے انکار کر دیا، لیکن آخر میں اس نے بھی واپس کر دیا۔ اور رسول اللہ ﷺ نے سارے قیدیوں کو ایک ایک قبطی چادر عطا فرما کر واپس کر دیا۔ (مسند أحمد 184/2 المعجم الكبير للطبراني: 5304 تاريخ طبري 135/3 الدلائل للبيهقي 194/5 البداية والنهاية 352/4)

اللہ کے رسول ﷺ کو قبیلۂ ہوازن کے اسلام قبول کرنے کی وجہ سے انتہائی خوشی ہوئی، آپؐ نے ان کے سردار مالک بن عوف نصری کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ وہ "ثقیف" کے ساتھ طائف میں ہیں، آپؐ نے ان سے وعدہ کیا کہ اگر وہ مسلمان ہو کر میرے پاس آجائے تو میں اس کا سارا مال اور اس کے گھر والے واپس دے دوں گا اور اس کے علاوہ اس کو سو اونٹ بھی دوں گا، یہ سن کر مالک مسلمان ہو کر آئے تو آپؐ نے ان کا اکرام کیا اور ان کو اپنی قوم اور بعض دیگر قریبی قبائل کا امیر مقرر کیا، مالک بن عوف آپؐ کے اخلاقِ کریمانہ سے بے حد متاثر ہوئے اور آپؐ کی مدح میں ایک قصیدہ پڑھا، جس میں اس نے یہ کہا:

ما إنْ رأَيت ولَا سَمْعتُ بمثْله ... في النَّاس كُلّهم بمثْل مُحَمَّد

أَوْفَى وَأَعْطَى للْجَزيْل إذَا اجتَدي ... ومتى تشَأْ يُخبِرْكَ عَمَّا في غَد

ترجمہ: ”تمام انسانوں میں حضرت محمدؐ کا مثل نہ میں نے دیکھا نہ سنا، جو سب سے زیادہ وعدہ کو پورا کرنے والے اور سب سے زیادہ مال عطا کرنے والے ہیں، اور جب تم چاہو ان سے پوچھو وہ آئندہ کی خبر تم کو بتا دیں گے“۔(دیکھیں: سیرت ابن ہشام: 4/144)

یقیناً اللہ کے رسول ﷺ کی حکمتِ عملی اپنے مخالفین کے تئیں انتہائی نرم اور لچکدار تھی، اس حکیمانہ سیاست کے ذریعہ آپؐ ہوازن اور ان کے حلفاء کو اسلام کے قریب لانے میں کامیاب ہوئے، اس طاقتور قبیلہ کو اپنا ہمنوا بنا کر علاقہ کی تمام بت پرست طاقتوں پر ضرب کاری لگائی، ان بُت پرست طاقتوں کو کچلنے میں ہوازن کے سردار مالک بن عوف کی قیادت سے فائدہ اٹھایا جنہوں نے طائف میں ثقیف کے ساتھ جنگ کی یہاں تک کہ ان کو چاروں طرف سے گھیر کر مجبور کر دیا، ثقیف کے زعماء اس مشکل سے خلاصی حاصل کرنے کے لئے سوچنے پر مجبور ہو گئے جبکہ اسلام طائف کے چاروں طرف پھیل چکا تھا، وہ نہ ہی کوئی حرکت کر سکتے تھے اور نہ ہی تجارت کر سکتے تھے، اور ثقیف کے بعض زعماء اسلام کی طرف راغب ہو گئے، جیسے کہ حضرت عروہ بن مسعود ثقفیؓ جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ فوری طور پر ملاقات کی جبکہ آپؐ حنین کا مالِ غنیمت تقسیم کرنے کے بعد مدینہ کے راستے میں تھے اور آپؐ نے جعرانہ سے عمرہ کیا، مدینہ پہنچنے سے پہلے ہی حضرت عروہؓ نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ملاقات کی، وہاں انہوں نے اسلام کا اعلان کیا اور اس کے بعد طائف واپس چلے گئے، وہ ثقیف کے ایک محبوب سردار تھے، انہوں نے ان کو اسلام کی دعوت دی اور اپنے مکان کے اوپر سے اذان دی، بعض نے ان پر تیر اندازی شروع کی یہاں تک کہ ان کو شہید کر دیا، انہوں نے اپنی قوم سے مطالبہ کیا کہ ان کو محاصرۂ طائف میں شہید ہونے والے مسلمانوں کے ساتھ دفن کریں۔(سیرت ابن ہشام: 4/192)

نبی کریم ﷺ کے لوگوں کے ساتھ تعامل پر اور اللہ کے دین کو استحکام بخشنے کے سلسلہ میں آپؐ کی تیز تر کوششوں پر انتہائی تعجب ہوتا ہے، بت پرستی کے معالم و آثار کو مٹانے اور مکہ میں کفر کے مراکز کو ختم کرنے میں آپؐ نے کامیابی حاصل کر لی اور اسلامی ریاست میں شامل ہونے والے تمام علاقوں اور اراضی میں تنظیمی امور کو بہترین انداز سے مرتب کر لیا، آپؐ نے حضرت عتاب بن اُسیدؓ کو مکہ کا امیر متعین فرمایا اور حضرت معاذ بن جبلؓ کو مرشد و معلم اور مربی کی حیثیت سے مقرر فرمایا اور قبیلۂ ہوازن پر مالک بن عوفؓ کو قائد و مجاہد کی حیثیت سے مقرر فرمایا، اس کے بعد عمرہ ادا کر کے مدینہ کی جانب واپس تشریف لائے۔(دیکھیں: سیرت ابن ہشام: 4/153)

....

تیسرا باب

دروس واسباق اور عبرت وفوائد

- غزوۂ حنین کے بارے میں نازل شدہ آیات:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿لَقَدْ نَصَرَكُمُ ٱللَّهُ فِى مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنكُمْ شَيْـًٔا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ ٱلْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُم مُّدْبِرِينَ ﴿٢٥﴾ ثُمَّ أَنزَلَ ٱللَّهُ سَكِينَتَهُۥ عَلَىٰ رَسُولِهِۦ وَعَلَى ٱلْمُؤْمِنِينَ وَأَنزَلَ جُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ ۚ وَذَٰلِكَ جَزَآءُ ٱلْكَٰفِرِينَ ﴿٢٦﴾ ثُمَّ يَتُوبُ ٱللَّهُ مِنۢ بَعْدِ ذَٰلِكَ عَلَىٰ مَن يَشَآءُ ۗ وَٱللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٢٧﴾﴾ ترجمہ: ''اللہ اس سے پہلے بہت سے مواقع پر تمہاری مدد کر چکا ہے ابھی غزوہ حنین کے روز (اُس کی دستگیری کی شان تم دیکھ چکے ہو) اس روز تمہیں اپنی کثرتِ تعداد کا غرّہ تھا مگر وہ تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہوگئی اور تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔ پھر اللہ نے اپنی سکینت اپنے رسول پر اور مومنین پر نازل فرمائی اور وہ لشکر اتارے جو تم کو نظر نہ آتے تھے اور منکرینِ حق کو سزا دی کہ یہی بدلہ ہے اُن لوگوں کے لئے جو حق کا انکار کریں۔ پھر (تم یہ بھی دیکھ چکے ہو کہ) اس طرح سزا دینے کے بعد اللہ جس کو چاہتا ہے توبہ کی توفیق بھی بخش دیتا ہے، اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے''۔ (سورۃ التوبہ: 25-27)

سابقہ آیات میں مسلمانوں کی صورتحال کی بہترین عجیب وغریب منظر کشی کی گئی ہے، اس میں سامع کو ایک منظر سے دوسرے منظر کی جانب لے جایا گیا ہے، مسلمانوں کا ایک منظر وہ ہے جبکہ وہ اپنی کثرتِ تعداد کی وجہ سے اِترائے ہوئے ہیں، اس پر نازاں اور فرحاں ہیں ،اور اس کے بعد اس منظر کی جانب منتقل کیا جاتا ہے جبکہ وہ کثرتِ تعداد کے باوجود پسپائی اور ناکامی کا شکار ہو جاتے ہیں اور کثرتِ تعداد نے ان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا، جس کے بعد ان کو لاحق ہونے والے خوف کے منظر کو پیش کیا گیا ہے جبکہ زمین اپنی وسعتوں کے باوجود ان کے لئے تنگ ہوگئی اور ان کے سامنے تمام راستے بند ہوگئے اور فرار، پسپائی اور میدان چھوڑنے کی وجہ سے فرار کا ایک محسوس ومشاہداتی منظر پیش کیا گیا ہے، یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ چند لوگ ہی رہ گئے اور دشمن کے ساتھ مڈبھیڑ کے ابتدائی مرحلہ میں مسلمانوں کو جو خطرناک خوف لاحق ہوا اس کے بعد ہی اللہ کی طرف سے نصرت ومدد آتی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: [ثُمَّ أَنزَلَ ٱللَّهُ سَكِينَتَهُۥ عَلَىٰ رَسُولِهِۦ وَعَلَى ٱلْمُؤْمِنِينَ وَأَنزَلَ جُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ ۚ وَذَٰلِكَ جَزَآءُ ٱلْكَٰفِرِينَ]

سکینت کا مطلب ہے: اطمئنان، رحمت اور امن، یہ سکون سے مشتق ہے اور اس کا مفہوم ہے: حرکت کے بعد کسی چیز کا پُرسکون ہونا، یا یہ سَکن سے مشتق ہے اور اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جس سے آپ کو سکون اور اطمئنان ملے، چاہے وہ اہل وعیال ہوں یا مکان وغیرہ۔ (دیکھیں: حدیث القرآن الکریم: 2/598)

سید قطبؒ فرماتے ہیں: مغفرت کا دروازہ اللہ کے ہاں ہمیشہ کھلا رہتا ہے اور خطاکار جس وقت چاہیں توبہ کر کے واپس آ سکتے ہیں، یہاں غزوۂ حنین کی اس جھلکی کو اس لئے پیش کیا گیا ہے تا کہ یہ بتایا جائے کہ جو لوگ اللہ سے غافل ہو جاتے ہیں اور اللہ کے بجائے دوسری کی قوتوں پر اعتماد کرنے لگتے ہیں، اس کے نتائج کیا ہوتے ہیں، لیکن اس واقعہ سے ہمارے سامنے ایک دوسری ضمنی حقیقت بھی آجاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ کون سی قوت ہے جس پر کوئی نظریہ اعتماد کر سکتا ہے، نظریاتی تحریکات میں عددی کثرت کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی بلکہ ثابت قدم اور نظریات کے جاننے والے مخلص لوگوں کی ایک چھوٹی تعداد ہی اہمیت رکھتی ہے......... ہمیشہ یوں ہوا ہے کہ مخلصین کی ایک چھوٹی سی پاکیزہ تعداد کسی نظریہ کو لے کر اٹھتی ہے، عوام کی بھیڑ جو پانی پر جھاگ کی طرح ہوتی ہے کسی نظریہ کی حامل نہیں ہو سکتی ہے اور گھاس اور کوڑا کرکٹ مشکلات و مصائب کی آندھیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں۔ (دیکھیں: فی ظلال القرآن: 3/1618)

- حُنین میں ہزیمت و نصرت کے اسباب و عوامل:

أ: ہزیمت کے اسباب:

ابتدائی مرحلہ میں مسلمانوں کو پسپائی کا سامنا کرنا پڑا، اس کے متعدد اسباب تھے جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

۱) عُجب اور خود پسندی کا کچھ عنصر مسلمانوں کے دلوں میں اس وقت پیدا ہوا جبکہ انہوں نے اپنی کثیر تعداد دیکھی یہاں تک کہ ان میں سے بعض کہنے لگے: آج ہم قلتِ تعداد کی وجہ سے مغلوب نہیں ہو سکتے، یہ بات نبی کریم ﷺ کو بھی اچھی نہیں لگی، اس کی وجہ سے ہزیمت ہو گئی۔

۲) بعض نوجوان اس حالت میں نکلے تھے کہ یا تو ان کے پاس ہتھیار بالکل بھی نہیں تھے یا بالکل کم ہتھیار تھے اور وہ صرف جذبات اور شوق میں نکلے تھے۔

۳) مشرکین کی تعداد بہت زیادہ تھی جو مسلمانوں کی تعداد سے دوگنی سے بھی زیادہ تھی۔

۴) مالک بن عوف اپنا لشکر لے کر پہلے ہی حنین پہنچ گئے تھے، وہاں اچھی طرح تیاری کر لی تھی، وادی کے راستوں میں کمین گاہیں بنالی تھیں اور تیر انداز مختلف مقامات پر متعین کر لئے تھے، انہوں نے مسلمانوں پر اچانک حملہ کیا اور تیروں کی بارش کر دی، مسلمانوں کے مقابلہ میں دشمن کی فوج تیار، منظم اور سامانِ حرب و ضرب سے لیس تھی، مشرکین نے اس جنگ میں سب سے بہترین صف بندی کی تھی۔

۶) جن لوگوں نے مکہ میں تازہ تازہ اسلام قبول کیا تھا وہ بھی اس جنگ میں شریک تھے، جن کے ایمان میں ابھی پختگی نہیں آئی تھی، جس کی وجہ سے انہوں نے فرار کی راہ اختیار کی اور اس کی وجہ سے دوسرے لوگ بھی متاثر ہوئے۔ (دیکھیں: حدیث القرآن الکریم: 2/602)

ب: نصرت و مدد کے عوامل:

۱) میدانِ جنگ میں رسول اللہ ﷺ کی ثابت قدمی اور استقامت، جس کی وجہ سے دوسرے لوگ بھی ڈٹے رہے اور پُر عزم و ثابت قدم قائد کی آواز پر لبیک کہتے رہے۔

۲) قائد کی شجاعت و بہادری: رسول قائدؐ صرف اپنی ہی جگہ ثابت قدم نہیں رہے بلکہ اپنی سواری پر سوار ہو کر دشمن کی جانب آگے بڑھے، آپؐ کفار کی جانب اپنی سواری کو ایڑھ لگا رہے تھے اور حضرت عباسؓ آپؐ کی سواری کی لگام پکڑ کر اس کو روک رہے تھے، تاکہ وہ زیادہ تیز نہ چلے۔

۳) مسلمانوں میں سے چند ہی گنے چنے لوگ آپؐ کے ساتھ اور آپؐ کے آس پاس ثابت قدم اور ڈٹے رہے، جو لوگ میدان چھوڑ کر چلے گئے تھے وہ بھی شامل ہوتے چلے گئے، یہاں تک کہ انہوں نے صبر و ثبات اور معرکہ آرائی کا سفر فتح و کامیابی تک جاری رکھا۔

۴) بھاگنے والوں نے بہت جلد رسول اللہ ﷺ کی ندا پر لبیک کہا اور فوری طور پر از سر نو میدانِ کارزار میں آگئے۔

۵) مخالف لشکر سے ایک خطرناک عسکری غلطی ہوئی اور وہ یہ تھی کہ فرار کے بعد اسلامی لشکر کا تعاقب کرنا انہوں نے چھوڑ دیا، جس سے اسلامی لشکر کو واپس آنے کا زرّیں موقع مل گیا۔

۶) کنکریوں کا پھینکنا: اللہ کے رسولؐ نے کچھ کنکریاں لیں اور ان کو کفار کے چہروں پر پھینک دیا، اس کے بعد فرمایا: رب کعبہ کی قسم! وہ ہزیمت و شکست کا شکار ہو گئے!۔

۷) اللہ عزوجل سے استعانت واستغاثہ: اللہ کے رسول ﷺ مسلسل اللہ تعالی سے دشمن کے مقابلہ میں فتح و نصرت کی دعا مانگ رہے تھے۔

۸) غزوہ میں فرشتوں کا نزول اور ان کی مشارکت: اللہ تعالی نے اس مشارکت کا قرآن کریم کی سورۂ توبہ میں ذکر کیا ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَأَنزَلَ جُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ ۚ وَذَٰلِكَ جَزَآءُ ٱلْكَٰفِرِينَ﴾ ترجمہ: "اور وہ لشکر اتارے جو تم کو نظر نہ آتے تھے اور منکرینِ حق کو سزا دی کہ یہی بدلہ ہے اُن لوگوں کے لئے جو حق کا انکار کریں"۔

- غزوۂ حنین وطائف سے مستنبط احکام:

۱: ﴿وَٱلْمُحْصَنَٰتُ مِنَ ٱلنِّسَآءِ إِلَّا مَا مَلَكَتْ أَيْمَٰنُكُمْ ۖ﴾ ترجمہ: "اور وہ عورتیں بھی تم پر حرام ہیں جو کسی دوسرے کے نکاح میں ہوں (محصنات) البتہ ایسی عورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں جو (جنگ میں) تمہارے ہاتھ آئیں"۔ (سورۃ النساء: 24)

یہ آیت جنگِ اوطاس کے موقع پر نازل ہوئی تاکہ شادی شدہ قید کی گئی عورتوں کا حکم بیان کیا جائے، قید ہونے کی وجہ سے ان کے شوہروں سے وہ علحیدہ ہو گئی تھیں، اس لئے آیت نے وضاحت کر دی کہ جب ان کی عدت مکمل ہو جائے تو ان کے ساتھ ازدواجی تعلق قائم کرنا جائز ہے، اس لئے کہ قید ہونے کی وجہ سے ان کے مابین اور ان کے کفار شوہروں کے مابین تفریق ہو جائے گی اور حاملہ کی عدت وضعِ حمل ہو گی اور غیر حاملہ کی عدت حیض کے ذریعہ مکمل ہو گی۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویہ، لأبی فارس، ص: 423)

۲: خِلقتاً مخنّث لوگوں (ہجڑوں) کو غیر محرم عورتوں کے پاس داخل ہونے سے منع کیا گیا، اس سے پہلے یہ مباح تھا، اس لئے کہ مخنّث کو عورتوں کی نہ کوئی ضرورت ہے اور نہ ہی رغبت، اور ممانعت کا سبب وہ روایت ہے جو امام بخاریؒ نے حضرت زینبؓ بنت ابی سلمہ سے اور انہوں نے اپنی والدہ حضرت ام سلمہؓ سے روایت کی ہے کہ "نبی کریم ﷺ میرے یہاں تشریف لائے تو میرے پاس ایک مخنّث بیٹھا ہوا تھا پھر نبی

کریم ﷺ نے سنا کہ وہ عبد اللہ بن امیہ سے کہہ رہا تھا کہ اے عبد اللہ ! دیکھو اگر کل اللہ تعالی نے طائف کی فتح تمہیں عطا فرمائی تو غیلان بن سلمہ کی بیٹی کو لے لینا، وہ جب سامنے آتی ہے تو پیٹ پر چار بل اور پیٹھ موڑ کر جاتی ہے تو آٹھ بل دکھائی دیتے ہیں (یعنی بہت موٹی تازہ عورت ہے) تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: یہ لوگ اب تمہارے گھر میں نہ آیا کریں"۔ (صحیح البخاري:4324)

اس ممانعت کے ذریعہ نبی کریم ﷺ کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی معاشرہ کو اخلاقی بگاڑ سے محفوظ رکھا جائے۔

۳: جنگ میں عورتوں، بچوں، بزرگوں اور جنگ میں شریک نہ ہونے والے مزدوروں کو جان بوجھ کر قصداً قتل کرنے کی ممانعت: ابن کثیرؒ نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جنگ حنین کے موقع پر ایک عورت کے پاس سے گزرے جس کو خالد بن ولیدؓ نے قتل کیا تھا اور لوگ اس عورت کے چاروں طرف جمع تھے، یہ دیکھ کر اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: یہ عورت جنگ نہیں کر سکتی تھی، ایک شخص سے آپؐ نے فرمایا: خالد کے پاس جاؤ اور ان سے کہو: کسی بچے یا مزدور کو قتل نہ کریں۔ ایک دوسری روایت میں ہے: آپؐ نے اس سے کہا: رسول اللہ ﷺ آپ کو کسی بچے، عورت یا مزدور کو مارنے سے منع کر رہے ہیں۔ (مسند أحمد: 3/488، سنن أبو داؤد: 2669، سنن ابن ماجہ: 2842، السنن الکبریٰ للنسائی: 8571)

۴: جعرانہ سے عمرہ کرنے کی مشروعیت:

نبی کریم ﷺ نے جعرانہ سے عمرہ کا احرام باندھا، جبکہ آپ مکہ میں داخل ہو رہے تھے، یہ اس شخص کے حق میں سنت ہے جو طائف کے راستے سے یا اس کے ملحقہ علاقوں سے مکہ میں داخل ہو رہا ہو۔

۵: ایک أعرابی کو حکم دینا کہ عمرہ میں ویسے ہی کرو جیسے حج میں کرتے ہو:

حضرت یعلی بن منبہ فرماتے ہیں: "نبی کریم ﷺ جعرانہ میں تھے، تو آپؐ کی خدمت میں ایک شخص جبہ پہنے ہوئے حاضر ہوا اور اس پر خلوق یا زردی کا نشان تھا۔ اس نے پوچھا: مجھے اپنے عمرہ میں آپ کس طرح کرنے کا حکم دیتے ہیں؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ پر وحی نازل کی اور آپؐ پر کپڑا ڈال دیا گیا، میری بڑی آرزو تھی کہ جب نبی کریم ﷺ پر وحی نازل ہو رہی ہو تو میں آپ کو دیکھوں۔ عمرؓ نے فرمایا: یہاں آؤ، نبی کریم ﷺ پر جب وحی نازل ہو رہی ہو، اس وقت تم نبی کریم ﷺ کو دیکھنے کے آرزو مند ہو؟ میں نے کہا: ہاں! انہوں نے کپڑے کا کنارہ اٹھایا اور میں نے اس میں سے آپؐ کو دیکھا، آپؐ زور زور سے خراٹے لے رہے تھے، پھر جب وحی کا نزول بند ہوا تو آپؐ نے فرمایا کہ پوچھنے والا کہاں ہے جو عمرہ کے بارے میں پوچھتا تھا؟ "اپنا جبہ اتار دے، خلوق کے اثر کو دھو ڈال اور (زعفران کی) زردی صاف کر لے اور جس طرح حج میں کرتے ہو اسی طرح اس میں بھی کرو"۔ (صحیح البخاري:1536 صحیح مسلم:1180)

۶: جس نے کسی کو قتل کیا اس کا سامان اس کو ملے گا:

حضرت ابو قتادہؓ فرماتے ہیں: "غزوۂ حُنین کے دن میں نے ایک مسلمان کو دیکھا کہ ایک مشرک سے لڑ رہا تھا اور ایک دوسرا مشرک پیچھے سے مسلمان کو قتل کرنے کی گھات میں تھا، پہلے تو میں اسی کی طرف بڑھا، اس نے اپنا ہاتھ مجھے مارنے کے لئے اٹھایا تو میں نے اس کے

ہاتھ پر وار کر کے کاٹ دیا۔ اس کے بعد وہ مجھ سے چمٹ گیا اور اتنی زور سے مجھے بھینچا کہ میں ڈر گیا، آخر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور ڈھیلا پڑ گیا، میں نے اسے دھکا دے کر قتل کر دیا اور مسلمان بھاگ نکلے اور میں بھی ان کے ساتھ بھاگ پڑا، لوگوں میں عمر بن خطاب ؓ نظر آئے تو میں نے ان سے پوچھا کہ لوگ بھاگ کیوں رہے ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالی کا یہی حکم ہے، پھر لوگ آنحضور ﷺ کے پاس آکر جمع ہو گئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ "جو شخص اس پر گواہ قائم کر دے گا کہ کسی مقتول کو اسی نے قتل کیا ہے تو اس کا سارا سامان اسے ملے گا"۔ میں اپنے مقتول پر گواہ کے لئے اٹھا لیکن مجھے کوئی گواہ دکھائی نہیں دیا۔ آخر میں بیٹھ گیا پھر مجھے اس کی ایک صورت نظر آئی، میں نے اپنے معاملہ کی اطلاع حضور اکرم ﷺ کو دی، آپ ؐ کے پاس بیٹھے ہوئے ایک شخص نے کہا کہ ان کے مقتول کا ہتھیار میرے پاس ہے، آپ میرے حق میں انہیں راضی کر دیں۔ اس پر حضرت ابو بکر ؓ نے کہا: ہرگز نہیں، اللہ کے شیروں میں سے ایک شیر کو چھوڑ کر جو اللہ اور اس کے رسول کے لئے جنگ کرتا ہے، اس کا حق قریش کے ایک بزدل کو آنحضرت ﷺ نہیں دے سکتے۔ ابو قتادہ ؓ نے بیان کیا کہ حضور ﷺ کھڑے ہوئے اور مجھے وہ سامان عطا فرمایا۔ میں نے اس سے ایک باغ خریدا اور یہ سب سے پہلا مال تھا جسے میں نے اسلام لانے کے بعد حاصل کیا تھا"۔ (صحیح البخاري: 4321 صحیح مسلم: 1751)

اس واقعہ میں قابل غور نکتہ یہ ہے کہ حضرت ابو قتادہ انصاری ؓ نے اپنے مسلمان بھائی کو بچانے کو پوری کوشش کی اور بہت مشکل سے بڑی جدوجہد کے بعد اس کافر کو قتل کیا، اسی طرح حضرت ابو بکر صدیق ؓ کے موقف میں اس بات کی دلیل موجود ہے کہ وہ احقاقِ حق اور حق کے دفاع کے لئے کس قدر کوشش کرتے تھے اور ان کا ایمان کتنا راسخ، ان کا یقین کتنا عمیق اور اخوت اسلامی کا وہ کس قدر خیال کرتے تھے۔ (دیکھیں: التاریخ الاسلامی، للحمیدی: 8/26)

۷: مالِ غنیمت میں خیانت کی ممانعت:

حنین کے دن نبی کریم ﷺ اپنے اونٹ کے قریب گئے اور اس کے کوہان سے ایک بال لیا اور اسے اپنی شہادت والی اور درمیان والی انگلی سے پکڑا اور اسے بلند کر کے فرمایا: "لوگو! خُمُس کے علاوہ اس مالِ غنیمت میں میرا اس بال کے برابر کوئی حصہ نہیں ہے، اور خمس بھی تم پر ہی لوٹا دیا جاتا ہے، اس لئے اگر کسی نے سوئی دھاگہ بھی لیا ہو تو وہ واپس کر دے، کیونکہ مالِ غنیمت میں خیانت قیامت کے دن اس خائن کے لئے باعثِ شرمندگی اور جہنم میں جانے کا ذریعہ اور بدترین عیب ہو گی"۔

یہ سن کر ایک آدمی کھڑا ہوا جس کے پاس بالوں کا ایک گچھا تھا اور کہنے لگا کہ میں نے یہ اس وجہ سے لئے ہیں تاکہ اپنے اونٹ کا پالان صحیح کر لوں، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جو میرے لئے اور بنو عبد المطلب کے لئے ہے وہی تمہارے لئے بھی ہے۔ وہ کہنے لگا: یا رسول اللہ! جب بات یہاں تک پہنچ گئی ہے تو اب مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں اور اس نے اسے پھینک دیا۔ (مسند أحمد 2/184 سنن أبو داؤد: 2694 نسائی 6/263)

حضرت عقیل بن أبي طالب ؓ اپنی شریکِ حیات فاطمہ بنت شیبہ کے پاس حنین کے موقع پر داخل ہوئے اور ان کی تلوار ابھی خون آلود تھی، انہوں نے کہا: یہ سوئی لو اس سے اپنے کپڑے سلا کرو، انہوں نے وہ سوئی ان کو دے دی، اسی دوران انہوں نے ایک منادی کو کہتے

ہوئے سنا: "اگر کسی نے سوئی دھاگہ بھی لیا ہو تو وہ واپس کردے"۔ یہ سنتے ہی حضرت عقیلؓ واپس آئے اور انہوں نے اپنے بیوی سے وہ سوئی واپس لی، اور اس کو مالِ غنیمت میں جمع کر دیا۔ (سیرت ابن ھشام 145/4)

خیانت کے بارے میں اس قدر سخت ممانعت اور اس کو خوفناک شکل میں پیش کرنے کے ذریعہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ افراد کی تربیت کے سلسلہ میں نبوی منہج میں کس قدر اہتمام کیا گیا ہے اور عملی زندگی میں ایک مسلم فرد کو ایمان و امانت داری کے اعتبار سے کیسا ہونا چاہیے، اور اس ہدایت پر عمل پیرا ہو کر مسلم معاشرہ خیانت کی بیماری سے پاک ہو جاتا ہے، اس لئے کہ معمولی خیانت کے بارے میں تساہل کے بعد انسان بڑی خیانت کے ارتکاب تک پہنچ جاتا ہے اور خیانت کا تعلق انتہائی گھٹیا اخلاق سے ہے جو مسلم معاشرہ کے شایان شان نہیں ہے۔ (دیکھیں: محمد رسول اللہ، محمد صادق عرجون: 4/387)

۸: جاہلیت میں مانی ہوئی نذر:

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں: جب ہم حنین سے واپس آئے تو عمرؓ نے نبی کریم ﷺ سے زمانۂ جاہلیت میں اعتکاف کے بارے میں مانی ہوئی نذر کے متعلق دریافت کیا، نبی کریم ﷺ نے اس کو پورا کرنے کا حکم دیا۔ (صحیح بخاری: 4320، صحیح مسلم: 1566)

- بعض صحابہ اور صحابیات کے اہم مواقف:

ا: حضرت انس بن أبی مرثد الغنوی اور مسلمانوں کا پہرہ:

معرکۂ حنین شروع ہونے سے پہلے اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''رات میں ہماری پہرہ داری کون کرے گا؟''۔ انس بن ابو مرثد غنویؓ نے کہا: اللہ کے رسولؐ! میں کروں گا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو سوار ہو جاؤ''۔ چنانچہ وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس گھاٹی میں جاؤ یہاں تک کہ اس کی بلندی پہ پہنچ جاؤ اور ایسا نہ ہو کہ ہم تمہاری وجہ سے آج کی رات دھوکہ کھا جائیں''۔ جب ہم نے صبح کی تو رسول اللہ ﷺ اپنے مصلے پر آئے، آپؐ نے دو رکعتیں پڑھیں پھر فرمایا: ''تم نے اپنے سوار کو دیکھا؟'' لوگوں نے کہا: اللہ کے رسولؐ! ہم نے اسے نہیں دیکھا، پھر نماز کے لئے اقامت کہی گئی تو رسول اللہ ﷺ نماز پڑھنے لگے، لیکن دورانِ نماز کنکھیوں سے گھاٹی کی طرف دیکھ رہے تھے، یہاں تک کہ جب آپؐ نماز پڑھ چکے اور سلام پھیرا تو فرمایا: ''خوش ہو جاؤ! تمہارا سوار آگیا''۔ ہم درختوں کے درمیان سے گھاٹی کی طرف دیکھنے لگے، یکایک وہی سوار رسول اللہ ﷺ کے پاس آکر کھڑا ہو گیا اور سلام کیا اور کہنے لگا: میں گھاٹی کے بالائی حصہ پہ چلا گیا تھا جہاں رسول اللہ ﷺ نے مجھے حکم دیا تھا تو جب صبح کی تو میں نے دونوں گھاٹیوں پر چڑھ کر دیکھا تو کوئی بھی نہیں دکھائی پڑا، رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: ''کیا تم آج رات گھوڑے سے اترے تھے؟''۔ انہوں نے کہا: نہیں، البتہ نماز پڑھنے کے لئے یا قضائے حاجت کے لئے اترا تھا، اس پر رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: ''تم نے اپنے لئے جنت کو واجب کر لیا، اب اگر اس کے بعد تم عمل نہ کرو تو تمہیں کچھ نقصان نہ ہو گا"۔ (سنن أبو داؤد: 2501 السنن الکبری للنسائی: 8819 صحیح السیرۃ النبویۃ، ص: 550)

اس واقعہ سے پتہ چلتاہے کہ نبی کریم ﷺ افراد کے بارے میں کس قدر اہتمام فرماتے تھے،اہتمام کا پتہ اس سے بھی چلتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نماز کی حالت میں التفات فرمارہے تھے اور یہ کسی اہم معاملہ کی وجہ سے ہی ہو سکتاہے،اسی طرح آپ ؐ کا خوشخبری دینا بھی آپ کے اہتمام کی واضح دلیل ہے۔

اسی طرح اس قصہ میں نبوی منہج کا اہم ایک پہلو بھی سامنے آتاہے کہ دشمن کے مقابلہ میں چوکنا رہنا، حالات معلوم کرنا،اس کی حرکات وسکنات پر نظر رکھنا،اس کی تعداد ووسائل کو جاننااور منصوبوں اور حکمتِ عملی کو جاننا انتہائی ضروری ہے،اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے کام کرنے والے قائدین کے لئے اس طرح کی حکمتِ عملی اختیار کرنا انتہائی ضروری ہے۔(دیکھیں: محمد رسول اللہ، صادق عرجون 366/4)

آپ ؐ کا یہ فرمانا: ''تم نے اپنے لئے جنت کو واجب کر لیا،اب اگر اس کے بعد تم عمل نہ کرو تو تمہیں کچھ نقصان نہ ہوگا''۔اس سے مراد نفلی عبادتیں ہیں جن کے ذریعہ اللہ تعالی سیئات کو معاف کر دیتا ہے اور درجات بلند کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انہوں نے ایک عظیم عمل کیا ہے جو مستقبل میں ہونے والی سیئات کے لئے کفارہ بنے گا۔اس کا مطلب ہر گز یہ نہیں ہے کہ یہ عمل فرائض وواجبات کی ادائیگی کے لئے بھی کافی ہو جائے گا۔

۲: غزوۂ حنین میں حضرت اُم سلیم کی شجاعت:

سیدنا انس ؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں: حضرت اُم سلیم ؓ (ان کی ماں) نے حنین کے دن ایک خنجر لیا، وہ ان کے پاس تھا، یہ ابو طلحہ ؓ نے دیکھا تو عرض کیا: یا رسول اللہ ! یہ ام سلیم ہے اور ان کے پاس ایک خنجر ہے۔آپ ؐ نے پوچھا: یہ خنجر کیسا ہے ؟۔ام سلیم نے کہا: یا رسول اللہ ! اگر کوئی مشرک میرے پاس آئے گا تو اس خنجر سے اس کا پیٹ پھاڑ ڈالوں گی۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ ہنسے۔ پھر ام سلیم ؓ نے کہا: یا رسول اللہ ! ہمارے سوا جو لوگ (فتح مکہ کے روز) آزاد ہوئے ہیں ان کو مار ڈالئے، وہ آپ کو چھوڑ کر پسپا ہو گئے، آپ ؐ نے فرمایا: ''اے ام سلیم ! کافروں کے شر کو اللہ تعالی کفایت کر گیا اور اس نے ہم پر احسان کیا ہے"۔(صحیح مسلم:1809)

۳: نبی کریم ﷺ کی رضاعی بہن حضرت شیماء بنت حارث ؓ:

مسلمانوں نے حنین کے قیدیوں میں سیدہ حلیمہ کی بیٹی اور رسول اللہ ﷺ کی رضاعی بہن شیماء بنت حارث کو بھی پیش کیا،انہوں نے بے خبری میں دیگر قیدیوں کے ہمراہ ان پر بھی سختی کی تو شیماء کہنے لگی: تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہارے ساتھی (یعنی رسول اللہ ﷺ)کی رضاعی بہن ہوں ؟ صحابہ کرام ؓ نے اس کی بات تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اسے اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔ شیماء آپ ؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہی کہنے لگی: اللہ کے رسول ! میں آپ کی رضاعی بہن ہوں۔آپ ؐ نے پوچھا: ''اس کی کوئی نشانی بھی ہے؟''۔ شیماء نے عرض کیا: میری پشت پر دانت سے کاٹنے کا ایک نشان ہے۔ یہ آپ ؐ نے اس وقت کاٹا تھا جب میں آپ کو پشت پر اٹھائے ہوئے تھی۔اللہ کے رسول ؐ نے علامت پہچان لی اور آپ ؐ نے شیماء کے لئے اپنی چادر بچھادی اور ارشاد فرمایا: ''اگر تم چاہو تو میرے پاس رہو، تمہیں بڑی چاہت اور عزت دی جائے گی اور اگر تم چاہو تو میں تمہیں ساز وسامان دے دوں اور تم اپنی قوم میں واپس چلی جاؤ تو میں یہ بھی کر

دوں گا"۔ شیماء کہنے لگی: آپ مجھے کچھ ساز و سامان دے دیجیے اور مجھے اپنی قوم میں واپس بھیج دیجیے۔ چنانچہ آپ ؐ نے انہیں بہترین ساز و سامان سے نوازا اور واپس بھیج دیا۔ شیماء اپنے رضاعی بھائی کے اعلیٰ اخلاق سے نہایت متاثر ہوئیں اور اسلام قبول کر لیا۔ آپ ﷺ نے انہیں تین غلام، ایک لونڈی، کچھ اونٹ اور چند بکریاں عنایت فرمائیں۔ (تاریخ طبري 131/3 سيرة ابن هشام 100/4 الدلائل للبيهقي 199/5 مصنف عبد الرزاق 479/7 السيرة النبوية للندوي، ص: 358)

- کعب ؓ بن زہیر شاعر کا قبولِ اسلام اور جزیرۃ العرب میں میڈیا پر کنٹرول:

وہ شعراء جو حضور اکرم ﷺ کی ہجو کیا کرتے تھے ان میں کعب بن زہیر اسلمی بھی پیش پیش رہتے تھے، کعب بن زہیر عرب کے عظیم ترین شاعر تھے، یہ ان مجرموں کی فہرست میں شامل تھے جن کے متعلق فتح مکّہ کے موقع پر حضور اکرم ﷺ نے حکم دیا تھا کہ اگر وہ خانہ کعبہ کے پردہ کو پکڑے ہوئے بھی پائے جائیں تو بھی ان کو قتل کر دیا جائے، لیکن یہ کسی نہ کسی طرح بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے، ان کے حقیقی بھائی حضرت بجیر ؓ بن زہیر حضور اکرم ﷺ کے ساتھ غزوۂ طائف کے بعد مکّہ واپس تشریف لائے تو انہوں نے اپنے بھائی کعب کو لکھا کہ "جن لوگوں نے آنحضرت ﷺ کو ایذائیں پہنچائیں یا آپ ﷺ کی ہجو کی ان کی گردنیں ماری جا رہی ہیں اور جو لوگ گرفت سے بچ گئے ہیں وہ اِدھر اُدھر سر چھپائے پھرتے ہیں، لہٰذا اگر تمہیں اپنی جان عزیز ہے تو جس قدر جلد ہو سکے مدینہ پہنچ کر حضور ﷺ سے معافی طلب کرو کیونکہ جو کوئی شخص بھی توبہ کر کے آپ ﷺ کے پاس آتا ہے تو آپ ﷺ اسے معاف کر دیتے ہیں، اگر تم اس کے لئے تیار نہیں تو اپنی نجات کے لئے کوئی اور جگہ تلاش کر لو"۔

جب بجیر کا یہ مکتوب کعب کے پاس پہنچا تو ان پر زمین تنگ ہو گئی، اپنی جان کے لالے پڑتے نظر آئے، کعب کے لئے جب کوئی چارۂ کار نہ رہا تو وہ مدینہ پہنچے اور قبیلہ جہینہ کے ایک آدمی کے پاس ٹھہرے جس سے ان کی جان پہچان تھی، وہ شخص کعب کو صبح کی نماز کے وقت حضور اکرم ﷺ کے پاس لے گیا، اس نے حضور ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی اور پھر کعب کو حضور ﷺ کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ وہ رسول اللہ ہیں، ان کے سامنے کھڑے ہو کر امان مانگ لو، پھر کعب رسول اللہ ﷺ کے سامنے جا کر کھڑے ہوئے، پھر بیٹھ گئے اور اپنا ہاتھ رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر رکھ دیا، آپ ﷺ انہیں پہچانتے نہ تھے، کعب نے کہا: یا رسول اللہ! کعب بن زہیر تائب اور مسلمان ہو کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا ہے اور امان کا طالب ہے، کیا اسے قبول فرمائیں گے اگر میں اسے آپ کے پاس لے آؤں؟! حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ہاں، اب کعب نے بتلایا کہ یا رسول اللہ ! میں ہی کعب بن زہیر ہوں۔ یہ سنتے ہی ایک انصاری صحابی اچھل کر کعب پر آئے اور حضور اکرم ﷺ سے عرض کیا: یا رسول اللہ! مجھے اور اس دشمنِ خدا کو چھوڑ دیجیے، میں اس کی گردن تلوار سے اڑا دوں، حضور ﷺ نے فرمایا: "اسے جانے دو، یہ تائب ہو کر آیا ہے، اسے پچھلی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ اس موقع پر کعب بن زہیر نے اپنا مشہور قصیدۂ لامیہ حضور ﷺ کے سامنے پیش کیا جس کا پہلا شعر یہ ہے:

بانَت سعاد، فَقَلْبي اليوم متبولُ، ... متيَّم إثرها، لَم يفْدَ، مكبولُ

''میری سعاد مجھ سے دور ہوگئی ہے، اس لئے (اس صبر آزمااور جاں گسل فراق کے باعث) آج کل میرا قلبِ بیمار محبت اور لاغر ناقابل رہائی اسیر الفت محبوبہ کے نقش پائی میں جگہ جگہ کی خاک چھاننے میں ذلیل ور سواہو کر رہ گیاہے''۔

اس قصیدہ میں کعب نے حضور اکرم ﷺ سے معذرت کرتے ہوئے اور آپ ﷺ کی مدح کرتے ہوئے آگے یوں کہاہے:

أُنبئتُ أنّ رسولَ اللّه أوعَدَني، ··· والعفو عندَ رسول اللّه مأمولُ

مَهلاً! هداك اللّه الذي أعطاكَ نافلة ال ··· قُرآن فيها مَواعيظٌ، وتفْصيل

لا تأخذَنّي بأقْوالِ الوشاة، ولَم ··· أُذْنب، وإن كثُرتْ فِي الأقَاويل

لَقَدْ أقُومُ مقاماً لَوْ يقُومُ به، ··· أرَى وأسْمعُ ما لو يسمعُ الفيل

لَظَل يرعد، إلاّ أنْ يكُونَ لَه ··· من النّبي، بإذن اللّه، تَنْويلُ

حتى وضعْتُ يمين، لا أُنازعه، ··· في كَفِّ ذي نَقِمَات قيلُه القيل

وَلَهْو أهيب عندي إذ أُكلّمه، ··· وقيل: إنك منسوبٌ ومسؤولُ

من ضيغمٍ منَ ضراء الأسد مُخدره ··· ببطنِ عثَّر، غيلٌ دونه غيلِ

يغدو، فيلحم ضرغامين، عيشهما ··· لحمٌ من القوم معفورٌ، خراذيل

إنّ الرسولَ لنورٌ يستضاء به، ··· وصارمٌ من سيوف اللّه مسلُولُ

(ترجمہ)" مجھے بتایا گیاہے کہ اللہ کے رسول نے مجھے دھمکی دی ہے حالانکہ اللہ کے رسول سے درگذر کی توقع ہے، آپ ﷺ ٹھہریں، چغل خوروں کی بات نہ لیں، وہ ذات آپ کی رہنمائی کرے جس نے آپ کو نصائح اور تفصیل سے پُر قرآن کا تحفہ دیاہے، اگرچہ میرے بارے میں باتیں بہت کہی گئی ہیں لیکن میں نے جرم نہیں کیاہے، میں ایسی جگہ کھڑاہوں اور وہ باتیں دیکھ اور سن رہاہوں کہ اگر ہاتھی بھی وہاں کھڑا ہواور ان باتوں کو سنے اور دیکھے تو تھرّ اتارہ جائے، سوائے اس صورت کے کہ اس پر اللہ کے اذن سے رسول کی نوازش ہو حتیٰ کہ میں نے اپنا ہاتھ کسی نزاع کے بغیر اس ہستیٔ محترم کے ہاتھ میں رکھ دیا جسے انتقام پر پوری قدرت ہے اور جس کی بات بات ہے، جب میں اس سے بات کرتاہوں...درآں حالانکہ مجھ سے کہا گیاہے کہ تمہاری طرف (فلاں فلاں باتیں) منسوب ہیں اور تم سے بازپرس کی جائے گی، تو وہ میرے نزدیک اس شیر سے بھی زیادہ خوفناک ہوتے ہیں جس کا کچھار کسی ہلاکت خیز وادی کے بطن میں واقع کسی ایسی سخت زمین میں ہو جس سے پہلے بھی ہلاکت ہی ہو، یقیناً رسول ایک نور ہیں جن سے روشنی حاصل کی جاتی ہو، اللہ کی تلواروں میں سے ایک سونتی ہوئی ہندی تلوار ہیں"۔

(مستدرک حاکم 579/3 المعجم الکبیر للطبرانی 176/19 الدلائل للبیہقی 207/5 مجمع الزوائد للہیثمی 393/9 البدایۃ والنہایۃ 369/4)

کہاجاتاہے کہ جب زہیر نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے اپنا یہ مشہور قصیدہ پڑھاتو آپؐ نے ان کو اپنی بردہ (چادر) عطا کی اور یہ بعد میں خلفاء کے پاس رہی، ابن کثیرؒ کہتے ہیں: یہ بہت مشہور واقعہ ہے، لیکن مشہور کتابوں میں مجھے یہ کہیں یہ صحیح سند کے ساتھ نہیں ملا۔ واللہ أعلم (البدایۃ والنہایۃ 373/4)

کہاجاتاہے کہ اس کے بعد رسول ﷺ کی فرمائش پر انہوں نے ایک قصیدہ انصار کی مدح میں کہا، چنانچہ اس قصیدہ میں انھوں نے کہا:

مَن سرہ کَرمُ الحیَاۃ فلا یزلْ ۰۰۰ فی مقنَب مِنْ صالحي الأنصارِ
ورَثُوا الْمَکَارِم کَابراً عن کَابر ۰۰۰ إنَّ الْخیَار ھم بنو الْأَخیَار

" جسے کریمانہ زندگی پسند ہو وہ ہمیشہ صالح اَنصار کے کسی دستہ میں رہے، انہوں نے خوبیاں باپ دادا سے ورثہ میں پائی ہیں، در حقیقت اچھے لوگ وہی ہیں جو اچھوں کی اولاد ہیں"۔(دیکھیں: سیرۃ ابن ھشام 167/4)

حضرت کعب بن زہیرؓ کے قبولِ اسلام کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ دعوت اسلامی کے مخالف شعراء کا دور اب ختم ہو گیا تھا، چنانچہ ضرار بن خطاب، عبداللہ بن الزبعری، ابو سفیان بن حارث، حارث بن ہشام اور عباس بن مرداس سب حلقہ بگوش اسلام ہو گئے، یہ سب اسلامی صف میں داخل ہو گئے اور امن واطمئنان اور ایمان کے ساتھ اسلام کے زیرِ سایہ زندگی کے ایام گزارنے لگے، ان میں سے بعض نے صرف اپنی زبان سے ہی اسلام کی طرف سے دفاع نہیں کیا بلکہ زبان وبیان کے ساتھ ساتھ وہ اسلام کے دفاع میں شمشیر لے کر بھی میدانِ کارزار میں آئے اور یہ فتح مکہ کی برکات میں سے تھا۔(دیکھیں: من معین السیرۃ، ص: 431)

- غزوۂ حنین اور طائف کے نتائج واثرات:

۱: قبیلۂ ہوازن وثقیف کے مقابلہ میں مسلمانوں کی فتح۔

۲: مشرکینِ عرب کے خلاف غزوۂ حنین وطائف نبی کریم ﷺ کا آخری غزوہ تھا۔

۳: بہت سے اہلِ مکہ اور اَعراب مالِ غنیمت لے کر اپنے وطن واپس لوٹے اور اس کے ذریعہ ان کی تالیف قلب مقصود تھی، اسی طرح انصار کو رسول اللہ ﷺ کی طرف سے عظیم تمغۂ امتیاز نصیب ہوا اور آپؐ نے ان کے حق میں ایمان کی گواہی دی، ان کے لئے، ان کی اولاد کے لئے اور ان کے پوتوں کے لئے دعا کی اور وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مدینہ منورہ واپس لوٹے۔

۴: اہلِ مکہ اور ہوازن کی قیادت میں سے ایک مبارک جماعت اسلام کی صف میں شامل ہو گئی اور وہ جزیرۃ العرب میں بت پرستی اور جاہلی آثار کے خلاف شمشیرِ بے نیام بن گئے، اسی طرح اہلِ طائف کے خلاف جنگ کرنے اور ان پر سختی کرنے میں قبیلۂ ہوازن کا ایک کردار رہا یہاں تک کہ انہوں نے بھی اسلام قبول کر لیا۔

۵: اسلامی ریاست کی حدود اور اس کا اثر ونفوذ مزید وسیع ہو گیا اور رسول اللہ ﷺ نے مکہ پر بھی اور قبیلۂ ہوازن پر بھی اپنے امراء مقرر فرمائے اور وہ سب مقامات اسلامی ریاست کا ایک جزء بن گئے جن کا دار الخلافہ مدینہ منورہ تھا اور اب رسول اللہ ﷺ کے لئے یہ ممکن تھا کہ آپ بغیر کسی خوف اور پس وپیش کے دعوتی مشن بھیج سکتے تھے، اور فتح مکہ کے بعد مدینہ منورہ نئے وفود کا بھی استقبال کرنے لگا اور سرایا کی تحریک کا ہدف اب بت شکنی بن گیا، اب جزیرۃ العرب میں ان کا خاتمہ انتہائی آسان بن چکا تھا اور رسول اللہ ﷺ نے فریضۂ زکوۃ کو بھی منظم کر دیا اور اسلامی ریاست کے تابع قبائل سے زکوۃ وصول کرنے کے لئے محصلینِ زکوۃ کو متعین کیا۔(دیکھیں: الاساس فی السنۃ وفقھہا فی السیرۃ النبویۃ: 2/961)

چوتھا باب

غزوۂ حنین اور تبوک کے مابین کے اہم واقعات

ا: صدقات اور جزیہ کی وصولیابی کے لئے عمال کی تعیین:

ذی قعدہ کے اواخر میں مدینہ منورہ واپس کے بعد اللہ کے رسول ﷺ نے زکوۃ، صدقات اور جزیہ کی وصولی اور تنظیمی امور کو مرتب و منظم کرنا شروع کر دیا، آپؐ نے حضرت عتاب بن اسیدؓ کو عمرہ کی ادائیگی کے بعد مکہ میں اپنا خلیفہ مقرر فرمایا اور حضرت معاذ بن جبلؓ کو بھی ان کے ساتھ وہیں پر رکھا تاکہ وہ لوگوں کو دین کی اور قرآن کی تعلیم دیں اور ان کی تربیت کریں، جب بھی کوئی قبیلہ اسلام قبول کرتا تھا تو نبی کریم ﷺ اس کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام فرماتے تھے اور کسی شخص کو اس کی نگرانی کے لئے ذمہ دار مقرر فرماتے تھے، اس لئے کہ نفوس کو اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کیا جائے اور ان میں صحیح عقائد و تصورات کے بیج بوئے جائیں۔

سن نو ہجری کے ماہِ محرم کے آغاز میں رسول اللہ ﷺ نے اپنے عمال اور محصّلین مختلف علاقوں میں روانہ فرمائے، آپؐ نے حضرت بریدہ بن الحصیب کو قبیلۂ اَسلم اور قبیلۂ غفار کی جانب بھیجا، حضرت عباد بن بشر اُشہلیؓ کو قبیلۂ سُلیم اور قبیلۂ مُزینہ کی جانب بھیجا، حضرت رافع بن مکیث کو قبیلۂ جُہینہ کی جانب بھیجا، حضرت عمرو بن عاصؓ کو قبیلۂ فزارہ کی جانب بھیجا، حضرت ضحاک بن شعبان کلابیؓ کو بنو کلاب کی جانب بھیجا، حضرت بسر بن سفیان الکعبیؓ کو بنو کعب کی جانب، حضرت ابن اللتبیّہ اَزدی کو بنو ذبیان کی جانب، بنو سعد بن ھذیم کے ایک شخص کو بنو ھذیم کی جانب، مہاجر بن اَبی اُمیہؓ کو صنعاء کی جانب، زیاد بن لبیدؓ کو حضر موت کی جانب، زبرقان بن بدرؓ اور قیس بن عاصمؓ کو بنو سعد کی جانب، علاء بن حضرمیؓ کو بحرین کی جانب اور حضرت علی بن ابی طالبؓ کو نجران کی جانب بھیجا، تاکہ وہ ان سے صدقات بھی وصول کریں اور ان سے جزیہ بھی وصول کریں۔ (دیکھیں: الدولة العربية الاسلامية، منصور الحرابي، ص: 43 نضرة النعيم 384/1)

اللہ کے رسول ﷺ عمال سے پورا پورا حساب لیتے تھے، آمدنی اور مصارف کے بارے میں دریافت فرماتے تھے، جیسے کہ حضرت ابن اللتبیہ سے آپؐ نے پورا پورا حساب لیا جبکہ انہوں نے یہ کہا تھا: "یہ مال آپ کے لئے ہے اور یہ مجھے ہدیہ دیا گیا ہے"۔ یہ سن کر اللہ کے رسولؐ ممبر پر تشریف لے گئے اور اللہ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا: "یہ کیا بات ہے کہ میں کسی عامل کو کہیں بھیجتا ہوں اور وہ کہتا ہے: یہ مال آپ کا ہے اور یہ مجھے ہدیہ دیا گیا ہے؟! پھر کیوں نہ تم اپنے ماں باپ کے گھر بیٹھے رہے تو وہیں یہ تحفہ تمہارے پاس آجاتا۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمدؐ کی جان ہے! تم میں سے جو بھی حق کے سوا کوئی چیز لے گا وہ اللہ تعالی سے اس حال میں ملے گا کہ اس چیز کو اٹھائے ہوئے ہوگا، بلکہ میں تم میں ہر اس شخص کو پہچان لوں گا جو اللہ سے اس حال میں ملے گا کہ اونٹ اٹھائے ہوگا جو بلبلا رہا ہوگا یا گائے اٹھائے ہوگا جو اپنی آواز نکال رہی ہوگی یا بکری اٹھائے ہوگا جو اپنی آواز نکال رہی ہوگی۔ پھر آپؐ نے اپنا ہاتھ اٹھایا یہاں تک کہ آپ کے بغل کی سفیدی دکھائی دینے لگی اور فرمایا: اے اللہ کیا میں نے پہنچا دیا؟!۔ (صحيح البخاري: 6979 صحيح مسلم: 1832) ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے

فرمایا: ہم جس کسی عامل کو متعین کریں اور اس کے لئے کوئی رزق (تنخواہ) متعین کریں تو تنخواہ متعین کرنے کے بعد جو کچھ وہ لے گا تو وہ خیانت ہے۔(سنن أبوداؤد: 2943التراتیب الإداریة للکتاني 265/1)

۲: اس مرحلہ کے اہم سرایا:

أ: ذوالکفلین کی جانب سریہ طفیل بن عمروؓ:

نبی کریم ﷺ نے طائف کی جانب کوچ کرنے سے پہلے حنین سے ہی حضرت طفیل بن عمروؓ کو مہم پر روانہ فرمایا تھااور ان کو حکم دیا تھا کہ عمرو بن حُممہ دوسی کے بت "ذوالکفلین" کو منہدم کریں اور اس کے بعد ان کی قوم سے مدد حاصل کریں اور وہ مدد لے کر طائف پہنچ جائیں، حضرت طفیل بن عمروؓ نے نبی کریم ﷺ کے احکام وعوامل کی تنفیذ کی، حضرت طفیلؓ ذوالکفلین کو منہدم کیااور اس کو جلادیا، اور وہ وہاں سے چار سوافراد کی کمک ساتھ لائے، ان کے ساتھ ایک ٹینک اور منجیق بھی تھی، اللہ کے رسول ﷺ جب طائف پہنچے تو چار دن کے بعد حضرت طفیلؓ کمک لے کر آپؐ کے پاس پہنچ گئے۔(دیکھیں: نضرۃ النعیم: 1/385)

ب: سریہ عبداللہ بن حذافہ سہمیؓ:

اس سریہ کو 'سریۃ الانصار' بھی کہا جاتا ہے، حضرت علی بن ابی طالبؓ فرماتے ہیں: نبی کریم ﷺ نے ایک دستہ روانہ کیااور اس کا امیر ایک انصاری صحابی (عبداللہ بن حذافہ سہمیؓ) کو بنایااور صحابہ کو حکم دیا کہ سب اپنے امیر کی اطاعت کریں، پھر امیر کسی وجہ سے غصہ ہو گئے اور اپنے ساتھیوں سے پوچھا کہ کیا تمہیں رسول اللہ ﷺ نے میری اطاعت کرنے کا حکم نہیں فرمایا ہے ؟! سب نے کہا کہ ہاں فرمایا ہے۔ انہوں نے کہا: پھر تم سب لکڑیاں جمع کرو، انہوں نے لکڑیاں جمع کیں تو امیر نے حکم دیا کہ اس میں آگ لگاؤ، انہوں نے آگ لگادی۔ اب انہوں نے حکم دیا کہ سب اس میں کود جاؤ۔ مجاہدین کود جانا ہی چاہتے تھے کہ انہی میں سے بعض نے بعض کو روکااور کہا کہ ہم تو اس آگ ہی کے خوف سے رسول اللہ ﷺ کی طرف آئے ہیں ! ان باتوں میں وقت گزر گیااور آگ بھی بجھ گئی، اس کے بعد امیر کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا، جب اس کی خبر رسول اللہ ﷺ کو پہنچی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اگر یہ لوگ اس میں کود جاتے تو پھر قیامت تک اس میں سے نہ نکلتے، اطاعت کا حکم صرف نیک کاموں کے لئے ہے"۔(صحیح البخاري: 4340 صحیح مسلم: 1840)

ج: الفُلس نامی بت کو ڈھانے کے لئے سریہ علی بن ابی طالبؓ:

ربیع الاول میں حضرت علی بن أبي طالبؓ کو ایک سریہ کا امیر مقرر کر کے انہیں قبیلۂ طئ کے ایک بُت کو جس کا نام الفلس تھا، ڈھانے کے لئے بھیجا گیا، آپؓ کی سرکردگی میں ایک سو اونٹ اور پچاس گھوڑوں سمیت ڈیڑھ سو آدمی تھے، جھنڈیاں کالی اور پھریرا سفید تھا، مسلمانوں نے فجر کے وقت حاتم طائی کے محلہ پر چھاپہ مار کر فُلس کو ڈھادیا، اور قیدیوں، چوپایوں اور بھیڑ بکریوں کو اپنے قبضہ میں کرلیا، انہی قیدیوں میں حاتم طائی کی صاحبزادی بھی تھیں، البتہ حاتم کے صاحبزادے عدی ملک شام بھاگ گئے تھے۔(تاریخ الإسلام للذہبی. ص: 624)

د: ذوالخلصہ کی جانب سریہ جریر بن عبداللہ البجلی:

حضرت جریر بن عبداللہ بجلیؓ فرماتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ذوالخلصہ کے بارے میں مجھے کیوں راحت نہیں دلاتے ؟! میں نے عرض کیا: میں حکم کی تعمیل کروں گا۔ چنانچہ قبیلہ اُحمس کے ڈیڑھ سو سواروں کو ساتھ لے کر میں روانہ ہوا، سب ساتھی اچھے سوار تھے، لیکن میں سواری اچھی طرح نہیں کرپاتا تھا، میں نے اس کے متعلق نبی کریم ﷺ سے ذکر کیا تو آپؐ نے اپنا ہاتھ میرے سینے پر مارا جس کا اثر میں نے اپنے سینہ میں دیکھا اور نبی کریم ﷺ نے دعا فرمائی: "اے اللہ! اسے اچھا سوار بنادے اور اسے ہدایت کرنے والا اور خود ہدایت پایا ہوا بنادے"۔

بیان کرتے ہیں کہ پھر اس کے بعد میں کبھی کسی گھوڑے سے نہیں گرا۔ کہتے ہیں کہ ذوالخلصہ یمن میں قبیلہ خثعم اور بجیلہ کا ایک بت خانہ تھا، اس میں بت تھے جن کی پوجا کی جاتی تھی اور اسے کعبہ بھی کہتے تھے۔ راوی کہتے ہیں کہ پھر جریر وہاں پہنچے اور اسے آگ لگادی اور منہدم کردیا۔ بیان کیا کہ جب جریرؓ یمن پہنچے تو وہاں ایک شخص تھا جو تیروں سے فال نکالا کرتا تھا، اس سے کسی نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کے ایلچی یہاں آگئے ہیں، اگر انہوں نے تمہیں پالیا تو تمہاری گردن ماردیں گے۔ بیان کیا کہ ابھی وہ فال نکال ہی رہے تھے کہ جریرؓ وہاں پہنچ گئے۔ آپؓ نے اس سے فرمایا کہ یہ فال کے تیر توڑ کر کلمہ لاالٰہ الا اللہ پڑھ لے ورنہ میں تیری گردن ماردوں گا۔ راوی نے بیان کیا اس شخص نے تیر وغیرہ توڑ ڈالے اور اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد جریرؓ نے قبیلہ اُحمس کے ایک صحابی ابو اَرطاۃؓ نامی کو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں بھیجا، جب وہ خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے، میں آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے اس وقت تک نہیں چلا جب تک اس بت کدہ کو خارش زدہ اونٹ کی طرح جلا کر سیاہ نہیں کردیا۔ بیان کیا کہ پھر آپؐ نے قبیلہ اُحمس کے گھوڑوں اور سواروں کے لئے پانچ مرتبہ برکت کی دعا فرمائی۔(صحیح البخاري:4357 صحیح مسلم:2476 مسند أحمد4/362 سنن أبوداؤد:2772 السنن الکبری للنسائي:8245)

۳: حضرت عدی بن حاتمؓ کا قبول اسلام:

جب عدی بن حاتم کی بہن مسلمانوں کے ذریعہ گرفتار ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے ان کے ساتھ انتہائی کریمانہ معاملہ فرمایا اور اعزاز واکرام کے ساتھ ان کو رکھا، اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے ان کو کپڑے دئے اور ان کو اتنا کچھ دیا جس کے ذریعہ وہ بآسانی اپنے وطن تک سفر کرسکتی تھیں، جب وہ شام میں اپنے بھائی کے پاس پہنچیں تو اپنے بھائی کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے تیار کیا، وہ اپنی بہن کی ناصحانہ باتوں سے متاثر ہوئے اور مدینہ آنے کے لئے تیار ہوگئے۔

حضرت عدیؓ کے قبولِ اسلام کا قصہ حضرت ابو عبیدہ بن حذیفہؓ کی زبانی سنتے ہیں، فرماتے ہیں: میں عدی بن حاتم کے واسطے سے حدیث بیان کرتا تھا میں نے سوچا کہ عدی کوفہ کے ایک علاقہ میں موجود ہیں تو اگر میں ان کے پاس جاتا تو میں ان سے براہِ راست حدیث سنتا، بالآخر میں ان کے پاس آیا اور عرض کیا: میں آپ کے بارے میں ایک حدیث بیان کرتا تھا تو میں نے چاہا کہ میں آپ سے براہِ راست سنوں،

انہوں نے بیان کیا کہ جب اللہ عزوجل نے نبی کریم ﷺ کو مبعوث فرمایا تو میں ان سے بھاگ گیا اور روم کے قریب مسلمانوں کے زیرِ کنٹرول سرزمین سے دور چلا گیا۔

فرماتے ہیں جس جگہ میں مقیم تھا وہ مجھے اچھی نہیں لگی، یہاں تک کہ جس جگہ سے میں آرہا تھا اس کے مقابلہ میں میرے نزدیک وہ بہت زیادہ ناپسند تھی۔ فرماتے ہیں: میں نے سوچا کہ میں اس شخص کے پاس ضرور جاؤں گا، اللہ کی قسم! اگر وہ سچا ہوگا تو میں ضرور اس کی بات سنوں گا اور اگر جھوٹا ہوگا تو مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ فرماتے ہیں: میں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور لوگ مجھے توجہ اور اہتمام کے ساتھ دیکھنے لگے اور کہنے لگے: عدی بن حاتم! عدی بن حاتم! فرماتے ہیں: میرا خیال یہ ہے کہ یہ انہوں نے تین مرتبہ کہا، فرماتے ہیں: آپؐ نے مجھ سے کہا: اے عدی بن حاتم! اسلام قبول کرو، سلامتی پاؤ گے۔ میں نے کہا: میں تو خود ایک دین کا ماننے والا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: اسلام قبول کرو، سلامتی پاؤ گے، آپ ﷺ نے یہ تین مرتبہ فرمایا، آپؐ نے فرمایا: میں تمہارا دین تم سے بہتر طور سے جانتا ہوں۔ میں نے کہا: آپ میرا دین مجھ سے بہتر طور پر جانتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں! کیا ایسا نہیں کہ تم اپنی قوم کے رہبر ہو اور مذہباً رکوسی ہو، اور پھر بھی اپنی قوم کے مالِ غنیمت کا چوتھائی کھاتے ہو؟ میں نے کہا: کیوں نہیں!۔ آپؐ نے فرمایا کہ یہ تمہارے دین کی رو سے حلال نہیں۔ آپؐ کی اس بات پر مجھے سرنگوں ہو جانا پڑا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: ''عدی! شاید تم اس دین کو قبول کرنے سے اس لئے ہچکچارہے ہو کہ آج مسلمان مفلس اور تنگ دست ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عدی! تم نے مقام حیرہ دیکھا ہے؟ (جو کوفہ کے پاس ایک بستی ہے) میں نے عرض کیا کہ میں نے دیکھا تو نہیں، البتہ اس کا نام میں نے سنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایک دن آئے گا جب ہودج میں ایک عورت اکیلی حیرہ سے سفر کرے گی اور (مکہ پہنچ کر) کعبہ کا طواف کرے گی۔ اور ضرور بالضرور کسریٰ بن ہرمز کے خزانے فتح کئے جائیں گے۔ میں (حیرت میں) بول پڑا کسریٰ بن ہرمز (ایران کا بادشاہ) کسریٰ؟! آپؐ نے فرمایا: ہاں کسریٰ بن ہرمز! تین مرتبہ یہ فرمایا۔ اور ضرور وہ وقت بھی آئے گا جب ایک شخص اپنے ہاتھ میں سونا چاندی بھر کر نکلے گا، اسے کسی ایسے آدمی کی تلاش ہوگی (جو اس کی زکوٰۃ) قبول کرلے لیکن اسے کوئی ایسا آدمی نہیں ملے گا جو اسے قبول کرلے۔ سیدنا عدیؓ نے بیان کیا کہ میں نے ہودج میں بیٹھی ہوئی ایک اکیلی عورت کو تو خود دیکھ لیا کہ حیرہ سے سفر کے لئے نکلی اور (مکہ پہنچ کر) اس نے کعبہ کا طواف کیا اور اسے اللہ کے سوا اور کسی سے (ڈاکو وغیرہ) کا (راستے میں) خوف نہیں تھا اور مجاہدین کی اس جماعت میں تو میں خود شریک تھا جس نے کسریٰ بن ہرمز کے خزانے فتح کئے۔ اور اللہ کی قسم! تیسری نشانی بھی پوری ہو کر رہے گی، یہ اللہ کے رسول ﷺ کی حدیث ہے جو آپؐ نے مجھ سے بیان کی ہے۔ (مسند أحمد 257/4 صحيح البخاري: 3595)

اور دوسری روایت میں ہے: جب میں مدینہ پہنچا تو اس وقت رسول ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے۔ میں نے حاضر ہو کر آپ ﷺ کو سلام کیا تو پوچھا: کون ہو؟ میں نے جواب دیا: عدی حاتم کا بیٹا۔ یہ سُن کر آپ ﷺ اپنی جگہ سے اُٹھے اور میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر کی طرف لے چلے۔ آپؐ مجھے ساتھ لئے چلے جارہے تھے کہ راستے میں انہیں ایک نہایت بوڑھی عورت ملی جس کے ساتھ ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ وہ ان کو روک کر اپنی کسی ضرورت کے متعلق باتیں کرنے لگی، آپؐ ٹھہر کر پوری توجہ کے ساتھ اس کی باتیں سُنتے رہے۔ دورانِ گفتگو میں کھڑا رہا، کھڑا کھڑا میں اپنے دل میں سوچ رہا تھا کہ '' بخدا یہ بادشاہ نہیں ہو سکتے ''۔ بڑی بی سے فارغ ہو کر آپؐ نے پھر میرا ہاتھ تھام لیا اور

چلتے ہوئے اپنے گھر پہنچ گئے۔ گھر میں پہنچ کر آپ ﷺ نے چمڑے کا ایک تکیہ اُٹھایا جس میں کھجور کے ریشے بھرے ہوئے تھے، آپؐ نے اس کو میری طرف ڈالتے ہوئے فرمایا: اس پر بیٹھ جاؤ، میں نے اسے بے ادبی پر محمول کرتے ہوئے عرض کیا: نہیں، اس پر آپ تشریف رکھیں ، لیکن آپؐ نے اصرار کر کے مجھے اس پر بٹھایا اور خود زمین ہی پر بیٹھ گئے، کیونکہ گھر میں اس کے علاوہ دُوسرا تکیہ نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر میں نے دل میں کہا: ''بخدا یہ انداز کسی بادشاہ کا ہرگز نہیں ہو سکتا''۔ (سیرۃ ابن ہشام 236/4)

اس واقعہ میں متعدد دروس واسباق ہیں جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

۱: حضرت عدیؓ جب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے جا رہے تھے تو آپؐ کی شخصیت کے بارے میں دو طرح کے تصورات لے کر جا رہے تھے کہ وہ یا تو نبی ہیں یا بادشاہ ہیں، جب انہوں نے دیکھا کہ آپؐ ایک سن رسیدہ کمزور عورت کے ساتھ کافی وقت تک کھڑے رہے تو حضرت عدیؓ نے آپؐ کی عاجزی اور انکساری کا مشاہدہ کر لیا اور بادشاہ ہونے کا تصور آپ کے ذہن سے نکل گیا اور نبوت کا تصور ذہن میں راسخ ہو گیا۔

۲: نبی کریم ﷺ نے بالکل مناسب وقت پر حضرت عدیؓ پر تنقید کی کہ وہ جس دین پر ہونے کا دعوی کر رہے ہیں وہ خود ہی اس کی خلاف ورزی کر رہے ہیں، اس وقت حضرت عدیؓ کو یقین ہو گیا کہ آپؐ رسولِ برحق ہیں جو ان کے دین کے بارے میں وہ باتیں جانتے ہیں جن سے دوسرے لوگ ناواقف ہیں۔

۳: جب نبی کریم ﷺ کے سامنے یہ بات واضح ہو گئی کہ حضرت عدیؓ کو آپؐ کی نبوت پر یقین ہو گیا ہے تو آپؐ نے بھی ان رکاوٹوں کا ذکر کیا جو لوگوں کے لئے اتباعِ حق کے لئے مانع بنتی ہیں، جن میں خاص طور پر مسلمانوں کے فقر واحتیاج اور کمزوری کا ذکر کیا ہے، اور اس سلسلہ میں نبی کریم نے پیشنگوئی بھی فرمادی۔

۴: حضرت علیؓ نے نبی کریم ﷺ کے طرزِ زندگی میں نبوتِ صادقہ کی علامتیں دیکھ لیں، اسی طرح آپؐ کے طرزِ گفتگو اور کلام میں بھی کچھ نشانیاں دیکھیں اور بعد میں آپؐ کے ذریعہ کی گئی پیشن گوئیوں کا انہوں نے خود مشاہدہ کر لیا جس سے ان کے ایمان ویقین میں مزید اضافہ ہو گیا۔ (دیکھیں: فقہ السیرۃ للبوطی، ص: 321)

۴: سن آٹھ ہجری کے متفرق واقعات:

واقدی سے نقل کرتے ہوئے ابن کثیرؒ فرماتے ہیں: اس سال اللہ کے رسولؐ نے حضرت عمرو بن عاصؓ کو قبیلۂ اَزد کے الجلندی کے دو بیٹوں: جیفر اور عمرو کی جانب بھیجا اور وہاں کے مجوس اور آس پاس کے اَعراب سے جزیہ وصول کیا گیا، اسی سال اللہ کے رسول ﷺ نے فاطمہ بنت ضحاک بن سفیان کلابی سے ماہ ذوالقعدہ میں نکاح فرمایا، لیکن انہوں نے آپؐ سے علحیدگی کا مطالبہ کیا تو آپؐ نے ان کو علحیدہ کر دیا، اسی سال ماہ ذی الحجہ میں حضرت ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے رسول اللہ ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیمؑ کی ولادت ہوئی جس کی وجہ سے دیگر امہات المؤمنین کو حضرت ماریہؓ کے بارے میں غیرت لاحق ہوئی جبکہ ان کے بطن سے آپ کی اولاد نرینہ ہوئی۔ (دیکھیں: البدایہ والنہایہ: 4/374)

سن آٹھ ہجری میں ہی رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی اور حضرت ابوالعاص بن ربیع کی شریکِ حیات سیدہ زینبؓ کی وفات ہوئی جن کی ولادت بعثت سے بیس برس پہلے ہوئی تھی اور وہ آپؐ کی سب سے بڑی صاحبزادی تھیں، ان کے بعد حضرت رقیہؓ اور پھر حضرت ام کلثومؓ اور پھر حضرت فاطمہؓ سب سے چھوٹی صاحبزادی تھیں، اللہ کے رسولؐ حضرت زینبؓ سے بہت محبت فرماتے تھے، وہ بہت پہلے اسلام میں داخل ہوئی تھیں، اس کے بعد اپنے شوہر کے اسلام قبول کرنے سے چھ سال پہلے ہجرت کی اور ہجرت کے دوران ان کا حمل ساقط ہو گیا تھا، ان کے جسم سے بہت خون بہہ گیا تھا اور اس کی وجہ سے ان کی بیماری بڑھتی رہی یہاں تک کہ ان کی وفات ہو گئی۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویہ لأبی شہبہ: 2/490)

....

سترہویں فصل

غزوۂ تبوک (غزوۃ العسرہ)

پہلا باب

غزوہ کی تاریخ، اس کے مختلف نام اور اسباب

ا: اس غزوہ کی تاریخ اور اس کے مختلف نام:

اللہ کے رسول ﷺ اس غزوہ کے لئے سن نو ہجری کے ماہِ رجب میں روانہ ہوئے، طائف کے محاصرہ سے واپسی کو تقریباً چھ ماہ ہو چکے تھے، یہ غزوہ غزوۂ تبوک کے نام سے معروف ہے اور تبوک جگہ کا نام ہے اور اسی کی جانب نسبت کرتے ہوئے اس کو غزوہ تبوک کہا جاتا ہے۔ صحیح مسلم میں مذکور روایت میں اس غزوہ کو اسی نام سے ذکر کیا گیا ہے، حضرت معاذؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کل —ان شاءاللہ- آپ تبوک کے چشمے کے پاس پہنچو گے اور آپ وہاں اس وقت پہنچو گے جب دن کافی روشن ہو چکا ہوگا، تم میں سے جو وہاں پہنچ جائے تو اس وقت تک اس کے پانی کو ہاتھ نہ لگائے جب تک کہ میں نہ آجاؤں۔ (مسند أحمد: 5/237، صحیح مسلم: 706، سنن ابو داؤد: 1206، سنن ترمذی: 553، سنن نسائی: 1/285، سنن ابن ماجہ: 1070)

اس غزوہ کا ایک دوسرا نام بھی ہے اور وہ ہے: "غزوۃ العُسرہ"۔ اس غزوہ سے متعلق سورۂ توبہ میں کی گئی گفتگو کے دوران یہ نام ذکر کیا گیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لَّقَد تَّابَ ٱللَّهُ عَلَى ٱلنَّبِيِّ وَٱلۡمُهَٰجِرِينَ وَٱلۡأَنصَارِ ٱلَّذِينَ ٱتَّبَعُوهُ فِي سَاعَةِ ٱلۡعُسۡرَةِ مِنۢ بَعۡدِ مَا كَادَ يَزِيغُ قُلُوبُ فَرِيقٖ مِّنۡهُمۡ ثُمَّ تَابَ عَلَيۡهِمۡۚ إِنَّهُۥ بِهِمۡ رَءُوفٞ رَّحِيمٞ﴾ ترجمہ: "اللہ نے معاف کر دیا نبیؐ کو اور ان مہاجرین وانصار کو جنہوں نے بڑی تنگی کے وقت میں نبیؐ کا ساتھ دیا، اگرچہ ان میں سے کچھ لوگوں کے دل کجی کی طرف مائل ہو چکے تھے (مگر جب انہوں نے اس کجی کا اتباع نہ کیا بلکہ نبیؐ کا ساتھ ہی دیا تو) اللہ نے انہیں معاف کر دیا، بے شک اُس کا معاملہ اِن لوگوں کے ساتھ شفقت ومہربانی کا ہے"۔ (سورۃ التوبہ: 117)

امام بخاریؒ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: "مجھے میرے ساتھیوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بھیجا تاکہ میں ان کے لئے آپؐ سے سواریاں مانگوں، جبکہ وہ آپؐ کے ساتھ جیش العسرہ میں تھے اور اس غزوہ سے مراد غزوۂ تبوک ہے..... امام بخاریؒ نے اس غزوہ کا عنوان ان الفاظ میں قائم کیا ہے: "باب غزوة تبوك وهي غزوة العسرة"۔ (البخاری تعلیقاً: 8/138)

اس غزوہ کو یہ نام غزوۃ العُسرہ (تنگدستی والا غزوہ) اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ مسلمانوں کو اس غزوہ میں سخت مشکل صورتحال کا سامنا کرنا پڑا، چنانچہ موسم انتہائی سخت گرم تھا، مسافت دور تھی اور سفر دشوار تھا، اس لئے کہ زادِ راہ اور وسائل بھی کم تھے اور سرزمین معرکہ کی جانب لے جانے والی سواریاں بھی کم تھیں، اس طویل سفر اور گرم موسم میں پانی بھی بہت کم تھا، لشکر کو تیار کرنے کے لئے مالی حالات بھی کمزور تھے، چنانچہ تفسیر عبدالرزاق میں معمر سے روایت ہے، وہ ابن عقیل سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا ہے کہ "مسلمان

قلیل سواریوں کے ساتھ اور سخت گرمی کی حالت میں نکلے یہاں تک کہ وہ اونٹ ذبح کرتے تھے اور اس کے اندر سے نکلنے والا پانی پیتے تھے، اس غزوہ میں پانی کی انتہائی قلت تھی۔(الصراع مع الصلیبیین، لأبی فارس، ص: 83، فتح الباری: 4415)

حضرت عمر بن خطاب ؓ مسلمانوں کی صورتحال کی منظر کشی کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تبوک کی جانب سخت گرمی کی حالت میں نکلے، ہم نے ایک جگہ قیام کیا جہاں ہمیں بہت زیادہ پیاس لگی، ہماری کیفیت یہ ہو گئی تھی یہاں تک کہ ہمیں لگ رہا تھا کہ ہمارے گلے نہ کٹ جائیں، ہم میں سے کوئی قضائے حاجت کے لئے جاتا تھا تو واپس آتے آتے اس کو ایسا لگتا تھا جیسے کہ اس کا گلا کٹا جا رہا تھا، ایک شخص اپنے اونٹ کو ذبح کرتا تھا تو اس کی اوجھڑی کو نچوڑتا تھا اور اس کا پانی پیتا تھا اور بچے ہوئے حصے کو اپنے پیٹ پر رکھتا تھا''۔ (البزار 1841، مجمع الزوائد للبیہقی: 6/194)

اس غزوہ کا ایک تیسرا نام بھی ہے اور وہ ہے 'الفاضحۃ' (رسوا کرنے والا) اس نام کا ذکر علامہ زرقانی نے اپنی کتاب ''شرح المواھب اللدنیہ'' میں ذکر کیا ہے، یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ اس نے منافقین کی حقیقت ظاہر کر دی، ان کا پردہ چاک کیا اور ان کے دشمنانہ منصوبے اور چالیں، ان کے پوشیدہ بغض و عداوت اور ان کے خبیث نفوس اور ان کے جرائم کو طشت از اسباب کر دیا۔ (دیکھیں: شرح المواھب اللدنیہ: 3/62، الصراع مع الصلیبیین، ص: 84)

جہاں تک تبوک کے جائے وقوع کا تعلق ہے تو وہ حجاز کے شمال میں مدینہ منورہ سے موجودہ راستے کے حساب سے 778 میل دور ہے اور وہ اس وقت قضاعہ کے علاقہ میں شامل تھا جو اس وقت رومی حکومت کے تابع تھا۔(دیکھیں: المجتمع الاسلامی، للعمری، ص: 229)

۲: غزوۂ تبوک کے اسباب:

مؤرخین نے اس غزوہ کے اسباب میں ذکر کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو شام سے مدینہ آنے والے انباط کے ذریعہ یہ اطلاعات ملیں کہ رومیوں نے بہت سی افواج جمع کی ہیں اور اپنے ساتھ لخم، جذام اور عیسائیت قبول کرنے والے دیگر عربوں کو بھی جمع کیا ہے اور بلقاء کی طرف اپنا ہراول دستہ بھیج دیا ہے، اس لئے نبی کریم ﷺ نے ارادہ کیا کہ ان کے حملہ کرنے سے پہلے ہی ان پر حملہ کر دیں۔(دیکھیں: الطبقات الکبری، ابن سعد: 2/165)

ابن کثیرؒ کی رائے یہ ہے کہ اس غزوہ کا سبب فریضۂ جہاد پر عمل پیرا ہونا ہے، اسی لئے اللہ کے رسول ﷺ نے رومیوں سے جنگ کرنے کا عزم کیا، اس لئے کہ وہ سب سے زیادہ قریب تھے اور دعوتِ حق کے سب سے زیادہ اہل تھے، اس لئے کہ وہ اسلام اور اہلِ اسلام سے قریب تھے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ قَـٰتِلُوا۟ ٱلَّذِينَ يَلُونَكُم مِّنَ ٱلْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا۟ فِيكُمْ غِلْظَةً ۚ وَٱعْلَمُوٓا۟ أَنَّ ٱللَّهَ مَعَ ٱلْمُتَّقِينَ﴾ ترجمہ: ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جنگ کرو اُن منکرینِ حق سے جو تم سے قریب ہیں اور چاہیے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں، اور جان لو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے''۔(سورۃ التوبہ: 123)

ابن کثیرؒ نے جو کچھ کہا ہے یہ حقیقت کے قریب ہے،اس لئے کہ جہاد جس حکم پر برقرار رہا وہ یہ تھا کہ تمام مشرکین کے ساتھ قتال کیا جائے، جن میں اہلِ کتاب بھی شامل ہیں جو دعوت کی راہ میں حائل ہوئے اور مسلمانوں کے خلاف ان کی عداوت ظاہر ہوئی، جیسے کہ سیرت نگاھوں نے بیان کیا ہے۔

مؤرخین نے جو سبب بیان کیا ہے کہ اس غزوہ کے لئے نکلنے کا سبب یہ تھا کہ رومی مسلمانوں پر چڑھائی کرنے کا ارادہ رکھتے تھے،اس سبب اور ابن کثیرؒ کے ذکر کردہ سبب میں کوئی تعارض وتضاد نہیں ہے،اس لئے کہ رومیوں کا یہ عمل جہاد کا مزید محرک بنا ہوگا۔

مسلمان شام سے اہلِ غسان کی طرف سے ہوشیار اور چوکنا تھے،اس کا اظہار حضرت عمر بن خطابؓ کی بیان کردہ صورتحال سے ہوتا ہے جبکہ نبی کریم ﷺ نے ازواجِ مطہرات کے ساتھ ایک ماہ تک ایلاء کیا، صحیح بخاری میں ہے: عمرؓ نے فرمایا: ان دنوں یہ چرچا ہو رہا تھا کہ غسان کے فوجی ہم سے لڑنے کے لئے گھوڑوں کو سم لگا رہے ہیں، میرے پڑوسی ایک دن اپنی باری پر مدینہ گئے ہوئے تھے، پھر عشاء کے وقت واپس لوٹے، آکر میرا دروازہ انہوں نے بڑی زور سے کھٹکھٹایا اور کہا: کیا آپ سوگئے ہیں؟ میں بہت گھبرایا ہوا باہر آیا، انہوں نے کہا کہ ایک بہت بڑا حادثہ پیش آگیا ہے! میں نے پوچھا: کیا ہوا؟ کیا غسان کا لشکر آگیا؟ انہوں نے کہا: بلکہ اس سے بھی بڑا اور سنگین حادثہ، وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی....۔(صحيح البخاري: 5191 صحیح مسلم:1749)

۳: اس غزوہ میں انفاق اور اہلِ ایمان کا شوقِ جہاد:

اللہ کے رسول ﷺ نے صحابہ کرام کو اس غزوہ کے لئے انفاق کرنے کی ترغیب دی،اس لئے کہ اس کی مسافت بھی دور تھی اور مشرکین بھی اس میں کثیر تعداد میں تھے،آپؐ نے انفاق کرنے والے کے لئے اجر عظیم کا وعدہ کیا،اس لئے ہر شخص نے اپنی استطاعت کے بقدر خرچ کیا، حضرت عثمانؓ کا اس غزوہ میں سب سے زیادہ حصہ تھا، حضرت عبدالرحمن بن حُبابؓ اس غزوہ میں حضرت عثمانؓ کے انفاق کے بارے میں بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "میں نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپؐ جیش عسرہ (غزوہ تبوک) کے لئے انفاق کی لوگوں کو ترغیب دے رہے تھے، عثمان بن عفانؓ کھڑے ہوئے اور بولے: اللہ کے رسولؐ! میرے ذمہ اللہ کی راہ میں سو اونٹ ہیں مع ساز و سامان کے، آپؐ نے پھر اس کی ترغیب دلائی تو عثمانؓ پھر کھڑے ہوئے اور بولے: اللہ کے رسولؐ! میرے ذمہ اللہ کی راہ میں دو سو اونٹ ہیں مع ساز و سامان کے، آپؐ نے پھر اسی کی ترغیب دی تو عثمانؓ پھر کھڑے ہوئے اور بولے اللہ کے رسولؐ! میرے ذمہ اللہ کی راہ میں تین سو اونٹ ہیں مع ساز و سامان کے، میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا، آپؐ منبر سے یہ کہتے ہوئے اتر رہے تھے کہ ’’اب عثمان پر کوئی مؤاخذہ نہیں جو بھی کریں، اب عثمان پر کوئی مؤاخذہ نہیں جو بھی کریں‘‘۔(سنن ترمذي:3700 مسند أحمد 75/4)

حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہؓ کہتے ہیں کہ عثمانؓ نبی اکرم ﷺ کے پاس ایک ہزار دینار لے کر آئے، (حسن بن واقع جو راوی حدیث ہیں کہتے ہیں: دوسری جگہ میری کتاب میں یوں ہے کہ وہ اپنی آستین میں لے کر آئے)، جس وقت انہوں نے جیش عسرہ کو تیار کیا، اور اسے آپؐ کی گود میں ڈال دیا، میں نبی اکرم ﷺ کو اسے اپنی گود میں الٹتے پلٹتے دیکھا اور یہ کہتے سنا کہ ’’آج کے بعد سے عثمان کو کوئی بھی عمل نقصان نہیں پہنچائے گا‘‘۔ایسا آپؐ نے دو بار فرمایا۔(سنن ترمذي: 3701 مسند أحمد 63/5)

اور جہاں تک تعلق ہے حضرت عمرؓ کا تو انہوں نے اپنا نصف مال صدقہ کر دیا اور وہ سمجھ رہے تھے کہ اس کے ذریعہ وہ حضرت ابو بکرؓ سے سبقت لے جائیں گے، حضرت عمرؓ خود ہی اس کے بارے میں بیان فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے ہمیں صدقہ کرنے کا حکم دیا اور اتفاق سے ان دنوں میرے پاس مال بھی تھا، میں نے (دل میں) کہا: اگر میں ابو بکرؓ سے کسی دن آگے بڑھ سکوں گا تو آج کے دن آگے بڑھ جاؤں گا، پھر میں اپنا آدھا مال آپ کے پاس لے آیا تو رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: ''اپنے گھر والوں کے لئے کیا چھوڑا ہے؟'' میں نے عرض کیا: اتنا ہی (ان کے لئے بھی چھوڑا ہوں) اور ابو بکرؓ وہ سب مال لے آئے جو ان کے پاس تھا تو آپؐ نے پوچھا: ''ابو بکر! اپنے گھر والوں کے لئے کیا چھوڑا ہے؟'' انہوں نے عرض کیا: ان کے لئے تو اللہ اور اس کے رسول کو چھوڑ کر آیا ہوں، میں نے (اپنے جی میں) کہا: اللہ کی قسم! میں ان سے کبھی بھی آگے نہیں بڑھ سکوں گا۔(سنن ترمذي: 3675 سنن أبوداؤد: 1678)

یہ بھی مروی ہے کہ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے دو ہزار درہم خرچ کئے اور یہ ان کے کل مال کا نصف تھا۔(دیکھیں: السیرۃ النبویہ فی ضوء المصادر الاصلیہ، ص: 616)

اسی طرح دیگر صحابہ کرام نے بھی بہت زیادہ انفاق کیا جیسے کہ حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ، حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ، حضرت محمد بن مسلمہؓ اور عاصم بن عدیؓ۔

مال کے بارے میں مسلمانوں کا تصور یہی ہے کہ مال ایک وسیلہ اور ذریعہ ہے اور اغنیائے صحابہ یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ ان کا مال اس دین کی خدمت کے لئے وقف ہے، جس کو وہ رغبت و شوق اور اطاعت کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں مالدار مسلمانوں کی تاریخ ایک روشن تاریخ ہے، اس لئے کہ مسلمانوں کی مال کے بارے میں یہ تاریخ رہی ہے کہ مال ان کی ملکیت اور ان کے کنٹرول میں ہوتا ہے نہ کہ وہ مال کے کنٹرول اور دسترس میں ہوں، اور جس طرح جان کے ذریعہ جہاد ہوتا ہے اسی طرح مال کے ذریعہ بھی جہاد ہوتا ہے اور جن کی تربیت اس طور پر ہوئی ہو کہ وہ اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کریں اسی طرح ان کے لئے اللہ کے راستے میں مال قربان کرنا بھی ہیچ اور آسان ہوتا ہے۔(من معین السیرۃ، ص 449)

خوشحال صحابہ کرام کا بذل و انفاق میں پیش پیش رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ ایمان اہلِ ایمان کے اندر کس طرح کا انقلاب پیدا کرتا ہے، پھر انسان خیر کے کاموں میں پیش پیش رہتا ہے اور نفسانی خواہشات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتا ہے جس کی ہر اس امت کو ضرورت ہوتی ہے جو اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں نصرت و مدد کی طالب ہو اور مصلحین اور تحریکوں کے زعماء اور قائدین جو سب سے اہم کام کرتے ہیں وہ یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں بہترین انداز سے دین کا پودا لگا دیتے ہیں۔(دیکھیں: السیرۃ النبویہ، دروس و عبر، للسباعی، ص: 161)

غریب اور نادار صحابہ کرام نے بھی شرماتے ہوئے اپنی محنت کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا اور ان کو منافقین کی طرف سے تمسخر، مذاق اور تنقید کا سامنا کرنا پڑا، چنانچہ حضرت ابو عقیلؓ نصف صاع کھجور لے کر آئے اور ایک دوسرے صحابی اس سے کچھ زیادہ مقدار لے کر حاضر ہوئے تو منافقین ان پر جملے کسنے لگے کہ اللہ اس کے صدقہ سے بے نیاز ہے اور اس نے صرف ریاکاری اور دکھاوے کے لئے صدقہ کیا ہے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ٱلَّذِينَ يَلۡمِزُونَ ٱلۡمُطَّوِّعِينَ مِنَ ٱلۡمُؤۡمِنِينَ فِي ٱلصَّدَقَٰتِ وَٱلَّذِينَ لَا

يَجِدُونَ إِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُونَ مِنْهُمْ سَخِرَ ٱللَّهُ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴾ ترجمہ: "(وہ خوب جانتا ہے اُن کنجوس دولت مندوں کو) جو برضا و رغبت دینے والے اہل ایمان کی مالی قربانیوں پر باتیں چھانٹتے ہیں اور ان لوگوں کا مذاق اڑاتے ہیں جن کے پاس (راہ خدا میں دینے کے لئے) اُس کے سوا کچھ نہیں ہے جو وہ اپنے اوپر مشقت برداشت کرکے دیتے ہیں، اللہ ان مذاق اڑانے والوں کا مذاق اڑاتا ہے اور ان کے لئے دردناک سزا ہے"۔ (سورۃ التوبہ: 79)

اسی طرح وہ یہ کہنے لگے کہ ابن عوفؓ نے ریاکاری اور دکھاوے کے لئے اتنا مال خرچ کیا ہے، اغنیاء صحابہ پر وہ ریاکاری کا الزام لگاتے تھے اور فقراء کے صدقہ کا مذاق اڑاتے تھے۔

نادر اہلِ ایمان کو انتہائی غم لاحق ہوا، اس لئے کہ ان کے پاس انفاق کے لئے کچھ بھی نہیں تھا، اللہ کے سامنے بہت زیادہ آہ وزاری کرنے والے صحابی حضرت عُلبہ بن زیدؓ رات میں نماز پڑھتے ہیں اور روتے ہیں اور اللہ کے سامنے یہ فریاد کرتے ہیں: اے اللہ! تو نے جہاد کا حکم دیا ہے اور اس کی ترغیب بھی دی ہے لیکن مجھے اتنے وسائل نہیں دیئے ہیں جن کے ذریعہ میں تیرے رسول کے ساتھ طاقت و قوت حاصل کرسکوں، لہذا میرے جسم اور میری عزت و آبرو پر جو کوئی بھی ظلم ہوا ہو میں اسے مسلمانوں کے لئے صدقہ کرتا ہوں، نبی کریم ﷺ نے ان کو خوشخبری سنائی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی مغفرت فرمائی ہے۔ (دیکھیں: المجتمع المدنی للعمری، ص: 235، الاصابہ لابن حجر)

اس واقعہ میں اور اسی طرح دوسرے واقعات میں اس بات کے دلائل موجود ہیں کہ صحابہ کرام اس دین کے تئیں کتنے مخلص تھے، اس دین کی مدد کرنے کے لئے ان کے اندر جہاد کا کس قدر شوق تھا اور اس دین کو آفاق تک پہنچانے کی ان کے اندر کس قدر تڑپ تھی، اسی طرح اللہ تعالیٰ کمزور اہلِ ایمان پر کس قدر شفیق ہے جو عملی زندگی گزارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ (دیکھیں: محمد رسول اللہ، صادق عرجون: 4/443)

حضرت واثلہ بن اسقعؓ خود ہی اپنا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: "......رسول اللہ ﷺ نے غزوہ تبوک کے سلسلہ میں منادی کرائی، میں اپنے گھر والوں کے پاس گیا اور وہاں سے ہو کر آیا تو صحابہ کرام نکل چکے تھے، میں شہر میں پکار لگانے لگا کہ کوئی ایسا ہے جو ایک آدمی کو سوار کرلے، اور جو حصہ مالِ غنیمت سے ملے اسے لے لے، ایک بوڑھے انصاری بولے: اچھا ہم اس کا حصہ لے لیں گے اور اس کو اپنے ساتھ بٹھالیں گے اور ساتھ کھانا کھلائیں گے، میں نے کہا: ہاں قبول ہے، انہوں نے کہا: ٹھیک ہے، اللہ کی برکت پر بھروسہ کرکے چلو، میں بہت ہی اچھے ساتھی کے ساتھ نکلا یہاں تک کہ اللہ نے ہمیں غنیمت کا مال دیا، میرے حصہ میں چند تیز رو اونٹنیاں آئیں، میں ان کو ہنکا کر اپنے ساتھی کے پاس لایا، وہ نکلے اور اپنے اونٹ کے پچھلے حصہ (حقیبہ) پر بیٹھے، پھر کہا: ان کی پیٹھ میری طرف کرکے ہانکو، پھر بولے: ان کا منہ میری طرف کرکے ہانکو، اس کے بعد کہا: تیری اونٹنیاں میرے نزدیک عمدہ ہیں۔ میں نے کہا: یہ تو آپ کا وہی مال ہے جس کی میں نے شرط رکھی تھی۔ انہوں نے کہا: میرے بھتیجے! تو اپنی اونٹنیاں لے لے، میرا ارادہ تیرا حصہ لینے کا نہ تھا"۔ (سنن أبو داؤد: 2676) جامع الأصول: 6188 من معین السیرۃ، ص: 453)

اس طرح سے حضرت واثلہؓ نے ابتدائی مرحلہ میں اپنے مالِ غنیمت سے دستبرداری اختیار کرلی تاکہ اخروی مالِ غنیمت اجر وثواب کی شکل میں بروز قیامت حاصل کریں اور انصاری صحابی نے بھی اپنی راحت کا ایک بڑا حصہ قربان کر دیا تاکہ وہ اور حضرت واثلہؓ باری باری سواری کا استعمال کر سکیں اور انصاری صحابی اجر وثواب کے حصول کی غرض سے ان کو کھانا بھی کھلاتے رہے۔

یہ وہ مفاہیم و تصورات ہیں جو کتاب اللہ اور سنت رسولؐ کے مطابق تربیت کے نتیجہ میں پروان چڑھتے ہیں، ان تصورات و مفاہیم کی روشنی ایک جیسی ہے وہی تنویر کی خصوصیات ان میں موجود ہیں اور یہ ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ (من معین السیرۃ، ص 453)

اللہ کے رسولؐ کی خدمت میں اشعری صحابہ حاضر ہوتے ہیں جن کی قیادت حضرت ابو موسی اشعریؓ کر رہے تھے، وہ نبی کریم ﷺ سے سواری کا مطالبہ کرتے ہیں تاکہ وہ جہاد کے لئے نکل سکیں لیکن آپؐ کے پاس اس وقت کوئی سواری نہیں تھی، یہاں تک کہ اسی میں کچھ وقت گذر گیا، اس کے بعد ان کے لئے تین اونٹ مل جاتے ہیں۔ (المجتمع المدنی، ص: 236)

وہ کمزور اور عاجز لوگ جو بیماری کی وجہ سے یا مصارفِ سفر کی کمی کی وجہ سے شریکِ جہاد نہیں ہو پا رہے تھے، وہ شوقِ جہاد کی وجہ سے رونے لگے یہاں تک کہ ان کے حق میں قرآن پاک کی یہ آیات نازل ہوئیں: ﴿لَّيْسَ عَلَى ٱلضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى ٱلْمَرْضَىٰ وَلَا عَلَى ٱلَّذِينَ لَا يَجِدُونَ مَا يُنفِقُونَ حَرَجٌ إِذَا نَصَحُوا۟ لِلَّهِ وَرَسُولِهِۦ ۚ مَا عَلَى ٱلْمُحْسِنِينَ مِن سَبِيلٍ ۚ وَٱللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝٩١ وَلَا عَلَى ٱلَّذِينَ إِذَا مَآ أَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ أَجِدُ مَآ أَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوا۟ وَّأَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ ٱلدَّمْعِ حَزَنًا أَلَّا يَجِدُوا۟ مَا يُنفِقُونَ﴾ ترجمہ: "ضعیف اور بیمار لوگ اور وہ لوگ جو شرکتِ جہاد کے لئے راہ نہیں پاتے، اگر پیچھے رہ جائیں تو کوئی حرج نہیں جبکہ وہ خلوص دل کے ساتھ اللہ اور اس کے رسولؐ کے وفادار ہوں، ایسے محسنین پر اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور اللہ در گزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اسی طرح اُن لوگوں پر بھی کوئی اعتراض کا موقع نہیں ہے جنہوں نے خود آکر تم سے درخواست کی تھی کہ ہمارے لئے سواریاں بہم پہنچائی جائیں، اور جب تم نے کہا کہ میں تمہارے لئے سواریوں کا انتظام نہیں کر سکتا تو وہ مجبوراً واپس گئے اور حال یہ تھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور انہیں اس بات کا بڑا رنج تھا کہ وہ اپنے خرچ پر شریک جہاد ہونے کی مقدرت نہیں رکھتے"۔ (سورۂ توبہ: 91-92)

یہ عہد نبویؐ میں سچے اہلِ ایمان کے شوقِ جہاد کی اور ان کے مادی حالات کی مؤثر اور سچی منظر کشی ہے، ان نادار، کمزور، بیمار اور سن رسیدہ لوگوں کو اللہ کی طرف سے معذور قرار دیا گیا تھا، لیکن ان کے دل مجاہدین کے ساتھ تھے، اللہ کے رسولؐ کے اس فرمان میں اسی طرح کے لوگ مراد ہیں، جبکہ آپؐ نے فرمایا: "مدینہ میں بہت سے ایسے لوگ ہیں کہ جہاں بھی تم چلے اور جس وادی کو بھی تم نے قطع کیا وہ (اپنے دل سے) تمہارے ساتھ ساتھ تھے۔ صحابہؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اگرچہ ان کا قیام اس وقت بھی مدینہ میں ہی رہا ہو؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں، وہ مدینہ میں رہتے ہوئے بھی (اپنے دل سے تمہارے ساتھ تھے) وہ کسی عذر کی وجہ سے رک گئے تھے"۔ (صحیح البخاري: 4423 مسند أحمد 103/3 سنن أبو داؤد: 2508 سنن ابن ماجة: 2764 ابن حبان: 4731)

۴: غزوۂ تبوک کے بارے میں منافقین کا موقف:

اللہ کے رسولؐ نے جب نفیرِ عام کا اعلان فرمایا اور اس غزوہ کی تیاری کے لئے انفاق کی دعوت دی تو منافقین لوگوں کے حوصلوں کو پست کرنے کا کام کر لینے لگے اور کہنے لگے: گرمی کی حالت میں مت نکلو! اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں: ﴿فَرِحَ ٱلْمُخَلَّفُونَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلَٰفَ رَسُولِ ٱللَّهِ وَكَرِهُوٓاْ أَن يُجَٰهِدُواْ بِأَمْوَٰلِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ وَقَالُواْ لَا تَنفِرُواْ فِى ٱلْحَرِّ ۗ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ أَشَدُّ حَرًّا ۚ لَّوْ كَانُواْ يَفْقَهُونَ ﴿٨١﴾ فَلْيَضْحَكُواْ قَلِيلًا وَلْيَبْكُواْ كَثِيرًا جَزَآءًۢ بِمَا كَانُواْ يَكْسِبُونَ﴾ ترجمہ: ''جن لوگوں کو پیچھے رہ جانے کی اجازت دے دی گئی تھی، وہ اللہ کے رسولؐ کا ساتھ نہ دینے اور گھر بیٹھے رہنے پر خوش ہوئے اور انہیں گوارا نہ ہوا کہ اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کریں، انہوں نے لوگوں سے کہا کہ "اس سخت گرمی میں نہ نکلو" ان سے کہو کہ جہنم کی آگ اس سے زیادہ گرم ہے، کاش انہیں اس کا شعور ہوتا۔ اب چاہیے کہ یہ لوگ ہنسنا کم کریں اور روئیں زیادہ، اس لیے کہ جو بدی یہ کماتے رہے ہیں اس کی جزا ایسی ہی ہے (کہ انہیں اس پر رونا چاہیے)''۔ (سورۃ التوبہ: 81-82)

غزوۂ تبوک کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جدّ بن قیس سے کہا: "اے جدّ! اس سال بنی اَصفر (گورے رومیوں) سے لڑائی میں تمہیں رغبت ہے؟" اس نے کہا: اللہ کے رسولؐ! بہتر یہ ہے کہ آپ مجھے نہ جانے کی اجازت دے دیں اور مجھے فتنہ میں نہ ڈالیں۔ اللہ کی قسم! میری قوم کے لوگ خوب جانتے ہیں کہ میں ان سب سے زیادہ عورتوں پر فریفتہ ہوں، مجھے خدشہ ہے کہ اگر میں نے بنی اصفر کی عورتوں کو دیکھ لیا تو میں صبر نہ کر سکوں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے بے رخی کرتے ہوئے فرمایا: میں نے تجھے اجازت دی۔ درج ذیل آیت اسی کے بارے میں نازل ہوئی: ﴿وَمِنْهُم مَّن يَقُولُ ٱئْذَن لِّى وَلَا تَفْتِنِّىٓ ۚ أَلَا فِى ٱلْفِتْنَةِ سَقَطُواْ ۗ وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌۢ بِٱلْكَٰفِرِينَ﴾ ترجمہ: "ان میں وہ بھی ہے جو کہتا ہے: مجھے اجازت دو اور مجھے فتنہ میں نہ ڈالو۔ سن لو! فتنہ ہی میں تو یہ گرے پڑے ہیں، اور بلاشبہ جہنم کافروں کو گھیرے ہوئے ہے''۔ (التوبۃ9: 49) (تفسیر طبري148/10 الدلائل للبيهقي213/5 المعجم الكبير للطبراني:2154، 12654 مجمع الزوائد للهيثمي30/7)

بعض منافقین نبی کریم ﷺ کی خدمت میں جھوٹے اور جعلی عذر پیش کرنے لگے تاکہ آپ انہیں گھر رہنے کی اجازت دے دیں، آپؐ نے انہیں اجازت دے دی، اللہ تعالیٰ نے آپؐ پر ناراضگی کا اظہار فرمایا: ﴿عَفَا ٱللَّهُ عَنكَ لِمَ أَذِنتَ لَهُمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكَ ٱلَّذِينَ صَدَقُواْ وَتَعْلَمَ ٱلْكَٰذِبِينَ﴾ ترجمہ: ''اے نبیؐ، اللہ تمہیں معاف کرے، تم نے کیوں انہیں رخصت دے دی؟ (تمہیں چاہیے تھا کہ خود رخصت نہ دیتے) تاکہ تم پر کھل جاتا کہ کون لوگ سچے ہیں اور جھوٹوں کو بھی تم جان لیتے''۔ (سورۃ التوبہ: 43)

رسول اللہ ﷺ کو پتہ چلا کہ منافقین کے کچھ لوگ سُویلم یہودی کے گھر جمع ہو کر لوگوں کو ورغلانے کی تدبیریں کرتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے اپنے آدمی بھیج کر اس گھر کو آگ لگوا دی۔ (سیرۃ ابن ہشام160/4 السيرة النبوية في ضوء المصادر الأصلية، ص:618)

قرآن کریم نے غزوہ سے پہلے منافقین کے طرزِ عمل اور موقف کے بارے میں بھی گفتگو کی ہے اور غزوہ کے دوران اور اس کے بعد ان کے طرزِ عمل کو بھی موضوعِ بحث بنایا ہے، غزوہ سے پہلے قرآن کریم نے جن پہلوؤں کو بیان کیا ہے وہ ہیں: ان کا غزوہ سے پیچھے رہنے کے لئے اجازت طلب کرنا اور غزوہ سے پیچھے رہنا.... عبداللہ بن اُبی بن سلول بھی غزوہ سے پیچھے رہا تھا، قرآن کریم نے ان کے متعلق منظر کشی کرتے ہوئے فرمایا ہے: ﴿لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيبًا وَسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوكَ وَلَٰكِن بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ۚ وَسَيَحْلِفُونَ بِاللَّهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ يُهْلِكُونَ أَنفُسَهُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ﴾ ترجمہ: "اے نبیؐ، اگر فائدہ سہل الحصول ہوتا اور سفر ہلکا ہوتا تو وہ ضرور تمہارے پیچھے چلنے پر آمادہ ہو جاتے، مگر ان پر تو یہ راستہ بہت کٹھن ہو گیا، اب وہ خدا کی قسم کھا کھا کر کہیں گے کہ اگر ہم چل سکتے تو یقیناً تمہارے ساتھ چلتے، وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں، اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں"۔(سورۃ التوبہ:42)

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں اجازت دینے کے بارے میں نبی کریم ﷺ کو عتاب بھی کیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿عَفَا اللَّهُ عَنكَ لِمَ أَذِنتَ لَهُمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَتَعْلَمَ الْكَاذِبِينَ﴾ ترجمہ: "اے نبیؐ، اللہ تمہیں معاف کرے، تم نے کیوں انہیں رخصت دے دی؟ (تمہیں چاہیے تھا کہ خود رخصت نہ دیتے) تاکہ تم پر کھل جاتا کہ کون لوگ سچے ہیں اور جھوٹوں کو بھی تم جان لیتے"۔(سورۃ التوبہ:43)

مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ یہ آیت ایسے لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے آپس میں یہ مشورہ کیا کہ رسول اللہ ﷺ سے اجازت طلب کرو، اگر وہ آپ کو اجازت دیتے ہیں تو غزوہ میں شریک مت ہونا اور اگر اجازت نہ دیں تو بھی شریک مت ہونا، یہ منافقین کا گروہ تھا، ان میں عبداللہ بن اُبی بن سلول، جد بن قیس اور رفاعہ بن تابوت تھے اور یہ ترانویں لوگ تھے اور جھوٹے اعذار لے کر آئے۔(دیکھیں: التحریر والتنویر:10/210)

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَن يُجَاهِدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ ﴿٤٤﴾ إِنَّمَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوبُهُمْ فَهُمْ فِي رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُونَ ﴿٤٥﴾﴾ ترجمہ: "جو لوگ اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہیں وہ تو کبھی تم سے یہ درخواست نہ کریں گے کہ انہیں اپنی جان و مال کے ساتھ جہاد کرنے سے معاف رکھا جائے اللہ متقیوں کو خوب جانتا ہے۔ ایسی درخواستیں تو صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو اللہ اور روز آخر پر ایمان نہیں رکھتے، جن کے دلوں میں شک ہے اور وہ اپنے شک ہی میں متردد ہو رہے ہیں"۔(سورۃ التوبہ:44-45)

یقیناً غزوۂ تبوک ابتدائی مرحلہ سے ہی اہلِ ایمان اور منافقین کو ایک دوسرے سے ممتاز کر رہا تھا اور فریقین کے مابین واضح علامتیں قائم کی گئیں اور اب منافقین پر پردہ ڈالنے اور ان کے ساتھ رواداری برتنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی، بلکہ اب ان کو بے نقاب کرنا اور ان کے خلاف کاروائی کرنا ایک ضروری مسئلہ بن گیا تھا، جبکہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ اور دعوت کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنی طرف سے حتی

المقدور کوششیں کر ڈالیں اور مسلمانوں کے حوصلوں کو پست کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا، بلکہ اب منافقین کو بے نقاب کرنا اور ان پر روک لگانا ایک شرعی ذمہ داری بن گئی تھی۔ (دیکھیں: نضرۃ النعیم: 1/389)

۵: نفیرِ عام کا اعلان اور لشکر کی تیاری:

غزوۂ تبوک میں نکلنے کے لئے نفیرِ عام کا اعلان کیا گیا یہاں تک کہ تبوک پہنچنے والے لشکر میں شامل افراد کی تعداد تیس ہزار تک پہنچ گئی اور جو لوگ پس و پیش کا شکار رہے قرآن کریم نے ان الفاظ میں ان کی سرزنش کی: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمُ ٱنفِرُوا۟ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ ٱثَّاقَلْتُمْ إِلَى ٱلْأَرْضِ ۚ أَرَضِيتُم بِٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا مِنَ ٱلْـَٔاخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَـٰعُ ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا فِى ٱلْـَٔاخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ﴾ ترجمہ: ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تمہیں کیا ہو گیا کہ جب تم سے اللہ کی راہ میں نکلنے کے لئے کہا گیا تو تم زمین سے چمٹ کر رہ گئے؟ کیا تم نے آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی کو پسند کر لیا؟ ایسا ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ دنیوی زندگی کا یہ سب سروسامان آخرت میں بہت تھوڑا نکلے گا“۔ (سورۃ التوبہ: 38)

قرآن کریم نے ان سے مطالبہ کیا کہ جوان، بزرگ، مالدار اور نادار سب اس غزوہ میں شریک ہوں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ٱنفِرُوا۟ خِفَافًا وَثِقَالًا وَجَـٰهِدُوا۟ بِأَمْوَٰلِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ ترجمہ: ”نکلو، خواہ ہلکے ہو یا بوجھل اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ، یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو“۔ (سورۃ التوبہ: 41)

اللہ کے رسولؐ تیس ہزار مجاہدین کا لشکر جمع کرنے میں کامیاب ہو گئے جس میں مہاجرین، انصار، اہلِ مکہ اور دیگر عرب قبائل شامل تھے، اللہ کے رسولؐ نے عادت کے برخلاف اس غزوہ کا ہدف و مقصد اور سمتِ سفر اور جگہ کا واضح الفاظ میں تعین بھی فرما دیا، آپؐ نے اعلان کر دیا کہ آپؐ بنوالاصفر (رومیوں) کے ساتھ جنگ کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ دیگر غزوات کے سلسلہ میں آپؐ توریہ اور اشارات سے کام لیتے تھے اور اپنا مقصد، سمتِ سفر اور دیگر امور کی صراحت نہیں فرماتے تھے، تاکہ رازداری برقرار رہے اور دشمن پر اچانک حملہ کیا جائے۔ (دیکھیں: الصراع مع الصلیبین، ص97)

بعض علماء نے آپؐ کے اس عمل کے ذریعہ استدلال کیا ہے کہ غزوہ کی سمت کی صراحت کرنا جائز ہے جبکہ اس کو راز رکھنا مصلحت کا تقاضا نہ ہو، اللہ کے رسولؐ نے اپنی عادت کے برخلاف غزوہ کے مقام اور سمت کی وضاحت کر دی اور مسلمانوں کے لئے اس معاملہ کو بالکل واضح کر دیا، اس کے متعدد اسباب تھے:

۱: مسافت کا دور ہونا۔ ۲: رومیوں کی کثرتِ تعداد اور ان کا سامانِ حرب و ضرب سے لیس ہونا، اس لئے ان کے مقابلہ کے لئے خاص قسم کی تیاری مطلوب تھی۔ ۳: وقت اور موسم بہت کٹھن اور سخت تھا۔

۵: اس وقت اب راز میں رکھنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں تھی، اس لئے کہ اب جزیرۃ العرب میں کوئی مخالف طاقت باقی نہیں بچی تھی، سوائے رومیوں کے اور نصاریٰ عرب کے جو تبوک، دومۃ الجندل اور عقبہ کے قریب رہتے تھے۔

اللہ کے رسول ﷺ نے جنگی منصوبہ بندی کرتے ہوئے کتمان وتصریح کی دونوں حالتوں میں ہمارے لئے گنجائش کا ضابطہ متعین فرمایا، اور حالات کے اعتبار سے اس کا فیصلہ کیا جائے گا کہ کب کتمان ضروری ہے اور کب تصریح ضروری ہے۔

مسلمانوں کو دشمن کی جہت کے بارے میں جب اچھی طرح علم ہو گیا تو انہوں نے نکلنے میں جلدی کی اور رسول اللہ ﷺ نے بھی انفاق کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا: ” جو جیش العسرۃ کو تیار کرے گا اس کے لئے جنت کا وعدہ ہے“۔ (صحیح البخاری تعلیقاً: 7/65، الدار قطنی: 4401، السنن الکبری للبیہقی: 6/167)

اللہ کے رسول ﷺ نے مدینہ منورہ میں حضرت محمد بن مسلمہ انصاری ؓ کو اپنا جانشین مقرر فرمایا اور حضرت علی بن ابی طالب ؓ کو اپنے اہلِ خانہ کی دیکھ ریکھ اور حفاظت کے لئے مقرر فرمایا، منافقین نے حضرت علی ؓ کے بارے میں پروپیگنڈہ مہم شروع کر دی اور کہنے لگے: انہوں نے ان کو صرف اس لئے مدینہ میں رکھا ہے کیونکہ ان کا جہاد میں شریک کرنا بوجھل ہو رہا تھا اور ان کے لئے اس میں تخفیف ہے، یہ سن کر حضرت علی ؓ نے اپنے ہتھیار لئے، اس کے بعد نکلے یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچ گئے جبکہ آپ ؐ مقام 'جُرف' میں مقیم تھے، آپ ؐ سے عرض کیا: اے اللہ کے نبی ؐ! منافقین سمجھ رہے ہیں کہ میرا جہاد میں شریک کرنا آپ کے لئے مشکل ہو رہا تھا اور آپ نے مجھے تخفیف دی ہے، یہ سن کر آپ ؐ نے فرمایا: وہ جھوٹ بولتے ہیں، بلکہ میں نے آپ کو اپنے اہل وعیال کی وجہ سے مدینہ میں رکھا ہے، اس لئے آپ واپس جائیں اور میرے اہلِ خانہ اور اپنے اہلِ خانہ میں میرے جانشین بنیں، کیا آپ کو یہ بات پسند نہیں ہے کہ مجھ سے آپ کو وہی نسبت ہو جو موسیٰ ؑ سے حضرت ہارون ؑ کو تھی، البتہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔ (صحیح البخاری: 3706، صحیح مسلم: 2404، زاد المعاد: 3/530)

حضرت علی ؓ کو آپ ؐ نے اس لئے اپنا جانشین مقرر فرمایا تھا کیونکہ حضرت علی ؓ کے ساتھ آپ ؐ کی قرابت ورشتہ داری کا تعلق تھا، اس لئے ان کی خلافت ایک مخصوص معاملہ کے بارے میں تھی جبکہ حضرت محمد بن مسلمہ انصاری ؓ کی جانشینی عمومی خلافت تھی، بعض لوگوں نے اس واقعہ کے ذریعہ حضرت علی ؓ کی خلافت پر استدلال کیا ہے، لوگوں نے اس واقعہ کے ذریعہ حضرت علی ؓ کی خلافت پر استدلال کیا ہے جو کہ درست نہیں ہے، اس لئے کہ یہاں ان کی خلافت خاص گھر والوں کے بارے میں تھی۔ (دیکھیں: صور وعبر من الجهاد النبوي في المدينة، ص: 446-467)

جب رسول اللہ ﷺ کی قیادت میں مسلمانوں کا لشکر ثنیۃ الوداع کے پاس جمع ہو گیا تو آپ ؐ نے امراء وقائدین کا انتخاب فرمایا، مختلف جھنڈے اور پرچم متعین فرمائے، سب سے بڑا علم حضرت ابو بکر صدیق ؓ کو دیا، دوسرا بڑا جھنڈا حضرت زبیر بن العوام ؓ کو دیا، اُوس کا جھنڈا حضرت اُسید بن حضیر کو دیا اور خزرج کا جھنڈا حضرت اَبو دجانہ ؓ کو دیا، انصار کے ہر قبیلہ کو حکم دیا کہ وہ اپنا ایک مخصوص پرچم متعین کریں، تبوک میں پہرہ کی ذمہ داری آنے کے وقت سے لے کر کوچ کرنے کے وقت تک حضرت عباد بن بشر ؓ کو دی، حضرت عباد ؓ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مسلسل چکر لگاتے رہتے تھے، اس غزوہ میں رسول اللہ ﷺ کو راستے کے بارے میں رہنمائی کرنے کا کام حضرت علقمہ بن الفغواء خزاعی انجام دے رہے تھے اور وہ تبوک کے راستے کے بارے میں اچھی طرح معلومات اور تجربہ رکھتے تھے۔ (دیکھیں: المغازی للواقدی 3/996، الطبقات الکبریٰ لابن سعد: 2/166، سبل الھدیٰ والرشاد: 5/652، امتاع الأسماء: 1/451، شرح المواہب اللدنیہ: 3/72)

واقدی نے تبوک جانے والے لشکر کے راستے اور جھنڈوں اور پرچموں کی تقسیم کے بارے میں منفرد معلومات فراہم کی ہے، لیکن ان کی فراہم کردہ معلومات مستند نہیں سمجھی جاتی ہے، البتہ سیرت کے بارے میں وہ کافی معلومات فراہم کرتے ہیں، ان معلومات کو لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

جو بھی دعوت اسلامی کی تاریخ کا اور اسلامی ریاست اور اس کے مختلف اداروں کے بننے اور ترقی کرنے کے بارے میں مطالعہ کرے گا-ان اداروں میں اسلامی فوج کا ادارہ سب سے مقدم ہے-تو یہ بات واضح ہو کر سامنے آجائے گی کہ عسکری قوت کے میدان میں تیزی کے ساتھ تبدیلی ہو رہی تھی، اس لئے کہ غزوۂ بدر میں مجاہدین کی تعداد 313 تھی، غزوۂ احد میں یہ تعداد تقریبا 700 ہو گئی، اس کے بعد غزوۂ احزاب میں یہ تعداد 3 ہزار ہو گئی اور غزوۂ فتح مکہ کے موقع پر یہ تعداد 10 ہزار پہنچ گئی، غزوۂ حنین میں تعداد 12 ہزار تھی اور اخیر میں غزوۂ تبوک میں مجاہدین کی تعداد 30 ہزار یا اس سے زائد تھی۔

اس میں مزید یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ صرف افرادی قوت میں ہی اضافہ نہیں ہوا، بلکہ مجاہدین کے اسباب و وسائل اور سامانِ حرب و ضرب میں بھی تیزی کے ساتھ ترقی ہوتی رہی، غزوۂ بدر میں گھوڑ سواروں کی تعداد بعض روایات کے مطابق صرف دو تھی، غزوۂ احد میں بھی یہ تعداد آگے نہیں بڑھ پائی، جبکہ صرف چھ سال بعد یہ تعداد 10 ہزار گھوڑ سواروں تک پہنچ جاتی ہے۔ اس کی اہم وجہ یہ تھی کہ اسلام جزیرۃ العرب میں پھیل رہا تھا اور خاص طور پر دیہی علاقوں میں، اور دیہات کے لوگ ہی زیادہ تر گھوڑے پالنے اور ان کی تربیت کا کام شہر کے لوگوں کے مقابلہ میں کیا کرتے تھے۔ (دیکھیں: الصراع مع الصلیبین، ص: 100)

....

دوسرا باب

راستے کے واقعات اور تبوک پہنچنے تک کا سفر

جیشِ اسلامی کو تیار کرنے کے بعد اور ذمہ داریوں، جھنڈوں اور پرچموں کو تقسیم کرنے کے بعد اسلامی لشکر رسول اللہ ﷺ کی قیادت میں تبوک کی جانب روانہ ہوا اور آپؐ نے اب کسی پیچھے رہنے والے کا انتظار نہیں کیا، مسلمانوں میں سے بہت سے لوگ پیچھے رہ گئے تھے جن کے بارے میں رسول اللہ حسنِ ظن رکھتے تھے اور جب بھی پیچھے رہنے والے کسی شخص کا آپؐ سے ذکر کیا جاتا تو آپؐ فرماتے: اس کو اس کے حال پر رہنے دو، اگر اس میں کوئی بہتری ہو گی تو عنقریب اللہ تعالیٰ اس کو تمہارے ساتھ شامل کرلے گا اور اگر اور کچھ ہو گا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے راحت دے دی ہے۔(مستدرک حاکم: 3/50)

ا: حضرت ابوذر غفاریؓ کا واقعہ:

ابن اسحاقؒ نے حضرت ابن مسعودؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ جب رسول اللہ (ﷺ) روانہ ہو گئے تو (راستہ میں) بعض لوگ ساتھ چھوڑ (کر واپس) جانے لگے۔ صحابہ عرض کرتے تھے: یارسول اللہ (ﷺ)! فلاں شخص نے ساتھ چھوڑ دیا۔ حضور (ﷺ) فرماتے تھے: اس کو رہنے دو، اگر اس (کے ساتھ آنے) میں کوئی بہتری ہوگی تو اللہ خود اس کو پیچھے سے تم سے لا ملائے گا، ورنہ میں اس کے متعلق اللہ کے حکم کا انتظار کروں گا (اللہ جو حکم دے گا ویسا کروں گا) آخر جب حضرت ابوذرؓ ساتھ سے رہ گئے تو لوگوں نے عرض کیا: یارسول اللہ (ﷺ)! ابوذر پیچھے رہ گئے، ان کا اونٹ سست پڑ گیا، حضور (ﷺ) نے حسبِ معمول وہی پہلا جواب دے دیا۔ حضرت ابوذرؓ نے اونٹ کو ڈانٹا مگر اونٹ سست پڑا رہا (چال میں تیزی نہ آئی) یہ دیکھ کر حضرت ابوذر اپنا سامان پشت پر اٹھا کر پیدل رسول اللہ (ﷺ) کے پیچھے قدم بقدم چل پڑے۔ محمد بن عمر کا بیان ہے کہ حضرت ابوذر فرماتے تھے: میں غزوۂ تبوک میں اپنے اونٹ کی وجہ سے پیچھے رہ گیا تھا (ساتھ نہ جاسکا تھا) اونٹ بہت کمزور اور دبلا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ اس کو چند روز چارہ اور خوراک دے دوں، پھر پیچھے سے (تیزی کے ساتھ) رسول اللہ (ﷺ) سے جاملوں گا۔ چنانچہ میں چند روز تک اس کو چارہ دیتا رہا، پھر روانہ ہو کر ذی المودہ میں پہنچا تھا کہ اونٹ اڑ گیا۔ میں نے دن بھر اس پر محنت کی مگر وہ اپنی جگہ سے نہ ہلا، آخر میں نے اپنا سامان اپنے اوپر لادا اور (چل دیا) دوپہر کو ایسے مقام پر پہنچ گیا جہاں سے رسول اللہ (ﷺ) پر نظر پڑ رہی تھی (جانے والے) مسلمانوں میں سے کسی مسلمان نے مجھے دیکھ لیا اور عرض کیا: یارسول اللہ (ﷺ)! یہ شخص تنہا پیدل چل رہا ہے۔ حضور (ﷺ) نے فرمایا: ابوذر ہو (تو اچھا ہے)۔لوگوں نے میری طرف غور سے دیکھا اور عرض کیا: یارسول اللہ (ﷺ)! خدا کی قسم! یہ ابوذر ہی ہے۔ حضور (ﷺ) نے فرمایا: ابوذر پر اللہ کی رحمت ہو، تنہا جارہا ہے، اکیلا مرے گا اور اکیلا اٹھایا جائے گا۔(سیرۃ ابن ھشام 178/4)

اور پھر وقت گزرتا رہا، اور سیّد عالم ﷺ نے جو فرمادیا وہی ہو کر رہا، سیّدنا عثمانِ غنیؓ دورِ خلافت آیا، حالات بدلتے رہے اور حضرت ابوذرؓ کو دمشق کے علاقہ 'ربذہ' بھیج دیا گیا، جب وصال کا وقت ہوا تو بوقتِ وصال اہلیہ محترمہ حضرت سیّدتنا اُمّ ذرؓ رونے لگیں تو پوچھا: کیوں

رو رہی ہو؟ عرض کیا: میرے پاس اتنا کپڑا نہیں ہے کہ آپ کو کفن دے سکوں، آپؓ نے فرمایا: ایک مرتبہ ہم چند افراد سے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم لوگوں میں سے ایک شخص کی موت ویرانے میں ہوگی اور اس کے جنازے میں مسلمانوں کی ایک جماعت حاضر ہوگی، پھر آپؓ نے فرمایا: اس وقت وہاں موجود تمام لوگ کسی نہ کسی شہر یا گاؤں میں انتقال کر چکے ہیں، اب میں ہی ان میں سے باقی ہوں اور مجھے یقین ہے کہ میں ہی وہ شخص ہوں، لہٰذا اب تم باہر جا کر دیکھو مسلمانوں کی کوئی نہ کوئی جماعت ضرور آتی ہوگی۔ حضرت اُمّ ذرؓ باہر راستے پر انتظار کر رہی تھیں کہ ایک قافلہ کے آثار نظر آئے، قافلہ قریب آیا تو حضرت اُمّ ذرؓ نے فرمایا: ایک مسلمان اپنی آخری سانسیں لے رہا ہے تم اس کے کفن دفن کا بندوبست کرو، قافلہ والوں نے پوچھا: وہ کون ہے؟ فرمایا: صحابیِ رسول حضرت ابوذر غفاریؓ، یہ سُنتے ہی قافلہ والے بے چین و بے قرار ہوگئے اور بے تابانہ آپؓ کے پاس پہنچے، آپؓ نے انہیں چند وصیتیں کیں اور اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی، اس قافلہ میں موجود صحابیِ رسول حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے آپؓ کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ حضرت ابن مسعودؓ اس وقت رونے لگے اور رسول اللہ ﷺ کی پیشن گوئی کو یاد کیا۔ (مستدرک حاکم 50/3 تاریخ طبری 145/3 الدلائل للبیهقي 221/5 سیرۃ ابن هشام 178/4)

اس قصہ میں بہت سے دروس و اسباق ہیں ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

۱: حضرت ابوذر غفاریؓ کو بہت سی مشکلات و مصائب اور خطرات کا سامنا کرنا پڑا، اور اللہ تعالیٰ نے ان کو ان مصائب و مشکلات سے نجات بھی دی اور ان کو صبر و ثابت قدمی عطا فرمائی، حضرت ابوذر غفاریؓ کو پیدل چلنے میں اور اپنا سامان اٹھانے میں انتہائی مشقت کا سامنا کرنا پڑا، یہاں تک کہ وہ نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کے ساتھ شامل ہوگئے، یہ سب کچھ انہوں نے اس لئے برداشت کیا تاکہ جہاد فی سبیل اللہ کا شرف حاصل کریں۔

۲: آپ ﷺ کا یہ فرمانا: "ابوذر پر اللہ کی رحمت ہو، تنہا جا رہا ہے، تنہا وفات پائے گا اور اکیلا اٹھایا جائے گا"۔ اس میں چڑھتے سورج کی طرح رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی دلیل موجود ہے، اس لئے کہ ایسے امور کے بارے میں خبر دینا جو ابھی واقع نہیں ہوئے ہیں اور خبر دینے کے بعد وہ واقع ہو جاتے ہیں، اس میں رسول اللہ ﷺ کو من جانب اللہ اعزاز و تکریم عطا کرنے اور آپ ﷺ کے معجزہ کی واضح دلیل ہے اور اس طرح کے نبوت کے دلائل سیرت نبویہ میں کثیر تعداد میں موجود ہیں۔

۳: اس واقعہ میں حضرت ابن مسعودؓ کے علم، ان کی یادداشت اور استحضار کی دلیل بھی موجود ہے، اس لئے کہ انہوں نے کئی سالوں کے بعد رسول اللہ ﷺ کی پیشن گوئی سے متعلق حدیث کو یاد کیا۔ (دیکھیں: التاریخ الاسلامی للحمیدی: 8/114، الصراع مع الصلیبین، ص 29)

۴: حضرت ابو خیثمہؓ کا واقعہ:

ابن اسحاقؒ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کی روانگی کو چند دن گذر گئے تو حضرت ابو خثیمہ (ایک روز) اپنے گھر پہنچے، دن گرم تھا، گھر پہنچ کر دیکھا کہ باغ کے اندر ان کی دونوں بیویوں نے الگ الگ دو اٹاریاں بنائی ہیں اور ہر ایک نے اپنی جھونپڑی کو ٹھنڈا کرنے کیلئے چھڑکاؤ کیا ہے اور حضرت ابو خثیمہؓ کے لئے پانی ٹھنڈا کر کے رکھا ہے اور کھانا تیار کیا ہے، جھونپڑی کے دروازہ پر پہنچ کر انہوں نے جب یہ کیفیت دیکھی اور بیویوں نے جو کچھ کیا تھا، اس کا معائنہ کیا تو کہنے لگے: سبحان اللہ! رسول اللہ ﷺ کی اگلی پچھلی لغزشیں تو اللہ نے معاف

کر دیں ہیں، اس کے باوجود آپ ؐ ٹھیک دوپہر کو (گرم) ہوا اور گرمی میں اپنا اسلحہ کاندھے پر اٹھائے ہوئے (راہ خدا میں نکلے) ہیں اور ابو خثیمہ تیار کھانے پر، ٹھنڈے سایہ میں، خوبصورت بیوی کے ساتھ، اپنے مال میں موجود ہے، یہ انصاف کی بات نہیں ہے۔ خدا کی قسم! میں دونوں میں سے کسی کی جھونپڑی میں داخل نہ ہوں گا، بلکہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچوں گا۔ تم دونوں میرے لئے زادِ راہ تیار کردو، بیویوں نے زادِ راہ تیار کر دیا، پھر آپ ؓ اپنے اونٹ پر سوار ہو کر رسول اللہ ﷺ کی تلاش میں چل دیئے، یہاں تک کہ حضور ﷺ سے جا ملے، راستہ میں حضرت ابو خثیمہ ؓ اور عمیر بن وہب جمحی ؓ کا ساتھ ہو گیا تھا، وہ بھی رسول اللہ ﷺ کی تلاش میں نکلے تھے، راستہ میں دونوں ساتھ ہو گئے، تبوک کے قریب پہنچ کر حضرت ابو خثیمہ ؓ نے عمیر ؓ سے کہا: مجھ سے ایک گناہ ہو گیا ہے، اس لئے کوئی حرج نہیں اگر تم مجھ سے الگ ہو جاؤ، غرض جب حضرت ابو خثیمہ ؓ رسول اللہ ﷺ کے قریب پہنچے تو لوگوں نے کہا: یہ کوئی سوار آرہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ابو خثیمہ ہو گا۔ صحابہ نے عرض کیا: واللہ! ابو خثیمہ ہی ہے، حضور ﷺ نے حضرت ابو خثیمہ ؓ سے فرمایا: ابو خثیمہ! تیرا بُرا ہو۔ حضرت ابو خثیمہ ؓ نے آپ کو واقعہ بتایا تو رسول اللہ ﷺ نے ان کے حق میں کچھ کلماتِ خیر فرمائے اور دعائے خیر کی۔ (المعجم الكبير للطبراني: 5419 الدلائل للبيهقي 222/5 البدایۃ والنہایۃ 8/5)

ابن ہشام کہتے ہیں: ابو خیثمہ ؓ کا نام مالک بن قیس ہے، اس واقعہ کے بارے میں انہوں نے اشعار بھی کہے ہیں جو یہ ہیں:

لَمَّا رَأَيْتُ النَّاسَ فِي الدِّينِ نَافَقُوا ... أَتَيْتُ الَّتِي كَانَتْ أَعَفَّ وَأَكْرَمَا
وَبَايَعْتُ بِالْيُمْنَى يَدِي لِمُحَمَّدٍ ... فَلَمْ أَكْتَسِبْ إِثْمًا وَلَمْ أَغْشَ مَحْرَمَا
تَرَكْتُ خَضِيبًا فِي الْعَرِيشِ وَصِرْمَةً ... صفايا كِرَامًا بُسْرُهَا قَدْ تَحَمَّمَا
وَكُنْتُ إِذَا شَكَّ الْمُنَافِقُ أَسْمَحَتْ ... إِلَى الدِّينِ نَفْسِي شَطْرَهُ حَيْثُ يَمَّمَا

ترجمہ: "جب میں نے لوگوں کو دین کے معاملہ میں منافقت کرتے دیکھا تو میں نے وہ راستہ اپنایا جو زیادہ پاکیزہ اور زیادہ باعزت تھا۔ میں نے محمد ﷺ کے ہاتھ پر اپنے دائیں ہاتھ سے بیعت کی ہے، چنانچہ اس کے بعد سے میں نے کوئی گناہ نہیں کمایا اور نہ حرام کا ارتکاب کیا ہے۔ میں اپنی رہائش گاہ میں مہندی سے آراستہ بیویاں، صاف ستھری کھجوریں اور سرخی مائل انگور چھوڑ آیا ہوں۔ جب منافق آدمی شک میں مبتلا ہوتا ہے تو میں اپنے آپ کو دین کی طرف لے چلتا ہوں وہ مجھے جہاں بھی لے جائے"۔ (البدایۃ والنہایۃ 8/5)

اس قصہ میں جو دروس واسباق موجود ہیں ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

ا: زندہ ضمیر مسلمان:

حضرت ابو خیثمہ ؓ نے وہ سب دیکھا جو کچھ ان کی دونوں بیویوں نے تیار کر رکھا تھا، ٹھنڈا پانی، لذیذ کھانا، ٹھنڈا سایہ، جائے قیام، لیکن انہوں نے فوراً ہی رسول اللہ ﷺ اور آپ ؐ کے حالات کو یاد کیا کہ آپ ؐ دھوپ کی تمازت میں اور گرم لو میں محوِ سفر ہیں، ان کی آنکھیں کھل گئیں، انہوں نے غور و فکر کیا، ان کا ضمیر جاگ گیا، انہوں نے اپنے نفس کا محاسبہ کیا اور فوراً جہاد کے لئے نکلنے کا عزم کر لیا، وہ تنہا نکلتے ہیں اور صحرا اور بیاباں عبور کرتے ہوئے حضرت عمیر بن وہب جمحی ؓ کے ساتھ مل جاتے ہیں، شاید وہ مکہ سے آرہے تھے۔ یہ منظر ہمارے سامنے ان تقویٰ شعار اہلِ ایمان کے طرزِ عمل کو واضح کرتا ہے جن پر کبھی ضعف و کمزوری کے لحظات آجاتے ہیں، لیکن وہ فوراً ہی زیادہ قوی الایمان بن

جاتے ہیں جیسے ہی انہیں اس کا احساس ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق قرآن یوں منظر کشی کرتا ہے: ﴿إِنَّ ٱلَّذِينَ ٱتَّقَوۡاْ إِذَا مَسَّهُمۡ طَٰٓئِفٞ مِّنَ ٱلشَّيۡطَٰنِ تَذَكَّرُواْ فَإِذَا هُم مُّبۡصِرُونَ﴾ ترجمہ: ''حقیقت میں جو لوگ متقی ہیں اُن کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ کبھی شیطان کے اثر سے کوئی برا خیال اگر انہیں چھو بھی جاتا ہے تو وہ فوراً چوکنے ہو جاتے ہیں اور پھر انہیں صاف نظر آنے لگتا ہے کہ ان کے لئے صحیح طریقِ کار کیا ہے''۔(سورۃ الاعراف:201)

حضرت ابو خیثمہؓ کو بہت جلد اس کا احساس ہو گیا اور وہ تلافی مافات کے لئے نکل پڑے اور مسلسل ان کو گناہ کا احساس ہوتا رہا یہاں تک کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس جا پہنچے اور آپ ﷺ کی رضامندی اور خوشی حاصل کر لی۔

۲: رسول اللہ ﷺ کا اپنے اصحاب اور ان کی صلاحیتوں کو پہچاننا:

جب صحابہ کرامؓ نے آپ ﷺ سے فرمایا کہ یہ کوئی سوار راستے پر آرہا ہے تو آپ ﷺ نے یہ فرمایا: یہ ابو خیثمہ ہوں گے، اور واقعتاً جب وہ قریب ہوئے اور صحابہ کرام نے ان کو پہچان لیا تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: واللہ! یہ ابو خیثمہؓ ہی ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب کے بارے میں کس قدر واقف تھے اور آپ ﷺ ان کی صلاحیتوں اور فطرت سے سب سے زیادہ واقف تھے، آپ ﷺ جانتے تھے کہ کون فرمانبردار ہے اور کون رب کی طرف رجوع کرنے والا ہے، ایسا اس لئے تھا کیونکہ آپ ﷺ صحابہ کرام کے بالکل قریب رہتے تھے اور ان کے ساتھ معاملات کرتے تھے، وہ آپ ﷺ کے ساتھ چلتے اور آپ ﷺ کے پرچم تلے جہاد کرتے تھے۔(دیکھیں: الصراع مع الصلیبین، ص:133)

۳: حضرت ابو خیثمہؓ کا صبر و حزم اور قوتِ فیصلہ:

حضرت ابو خیثمہؓ کے اس فیصلہ پر غور کیجئے جبکہ وہ تنہا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ملنے کا فیصلہ لے لیتے ہیں، ان کو سخت جان سفر کرنا تھا، ریگستان اور بیاباں میں سخت گرمی میں اور پانی کی عدم دستیابی میں سفر کرنا تھا، لیکن انہوں نے یہ اٹل فیصلہ لے لیا اور اس پر سختی کے ساتھ عمل کیا، اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ کس قدر عزم و حزم کے مالک، صاحبِ عزیمت اور صبر و استقامت کے پہاڑ تھے۔

۴: قائد کا سپاہی کو عتاب اور اس کا اثر:

حضرت ابو خیثمہؓ اپنے گناہ کا اعتراف کرتے ہوئے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ ﷺ کو سلام کرتے ہیں، آپ ﷺ مشفقانہ انداز میں ان کو سرزنش بھی کرتے ہیں، آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: ''اے ابو خیثمہ تیرا بُرا ہو''۔ اس کلمہ میں سرزنش کا مفہوم پوشیدہ ہے، اس کے معنی ہیں: تم ہلاکت کے قریب پہنچ گئے تھے۔

بلاشبہ اس کلام کا ایک سپاہی کے نفس پر ایک خاص اثر تھا جس کے ذریعہ انہیں اپنی غلطی کا احساس دلایا، یہ نبوی منہج ہے جس کے ذریعہ قائدین کو کارکنوں کی غلطیوں پر سکوت و خاموشی اختیار نہ کرنے کی تعلیم دی گئی ہے، اس لئے کہ سکوت ان کے لئے ضرر رساں ہو سکتا

ہے اور دوسروں کو بھی اس کا نقصان پہنچ سکتا ہے، بلکہ یہ قائدین کی ذمہ داری ہے کہ غلطیوں کی اصلاح کریں اور غلطی کرنے والے کا محاسبہ کریں، اسی کے ذریعہ وہ حقیقی مربی، معلم و مرشد کہلانے کے اہل ہوں۔(دیکھیں: الصراع مع الصلیبین، ص:134)

۳: تبوک میں آمد:

جب نبی کریم ﷺ تبوک پہنچ گئے تو وہاں رومی فوج کا کوئی نام و نشان نہیں پایا اور نہ ہی وہاں عرب قبائل موجود تھے، حالانکہ اسلامی لشکر تبوک میں بیس دنوں تک خیمہ زن رہا، لیکن رومی قیادت کو مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے کی ہمت نہیں ہوئی، یہاں تک کہ عیسائیت قبول کرنے والے عرب قبائل نے بھی دور رہنے میں ہی عافیت محسوس کی، اور جہاں تک تعلق ہے مضافاتِ شام کے مختلف علاقوں کے حکام کا، تو انہوں نے مصالحت کرنے اور جزیہ دینے کو ترجیح دی، اُیلہ کے حاکم نے نبی کریم ﷺ کے لئے ایک سفید خچر اور چادر بطور ہدیہ بھیجی اور آپ ﷺ کو جزیہ دینے کی شرط پر صلح کی۔

اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو چار سو بیس سواروں کا رسالہ دے کر دومۃ الجندل کے حاکم اُکیدر کے پاس بھیجا، حضرت خالد رضی اللہ عنہ وہاں تشریف لے گئے، جب اتنے فاصلہ پر رہ گئے کہ قلعہ صاف نظر آرہا تھا تو اچانک ایک نیل گائے نکلی اور قلعہ کے دروازے پر سینگ رگڑنے لگی۔ اُکیدر اس کے شکار کو نکلا، چاندنی رات تھی، حضرت خالد رضی اللہ عنہ اور ان کے سواروں نے اسے جالیا اور گرفتار کرکے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر کیا، آپ ﷺ نے اس کی جان بخشی کی اور دو ہزار اونٹ، آٹھ سو غلام، چار سو زرہیں اور چار سو نیزوں کی شرط پر مصالحت فرمائی، اس نے جزیہ بھی دینے کا اقرار کیا، چنانچہ آپ ﷺ نے اس سے یحنہ سمیت دُومہ، تبوک، اُیلہ اور تیماء کے شرائط پر معاملہ طے کیا۔(سیرۃ ابن ھشام 180/4)

اکیدر کے جسم پر جو قبا تھی جس کو وہ پہنے ہوئے تھا تو مسلمانوں کو اس پر تعجب سا ہوا، یہ دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "کیا تمہیں اس پر تعجب ہوتا ہے؟ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے! یقیناً سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے رومال جنت میں اس سے کہیں زیادہ حسین ہیں"۔(صحیح البخاري:3802 صحیح مسلم:2468)

اللہ کے رسول ﷺ نے اہل جرباء، اُذرح اور اہل مقنا کے ساتھ معاہدے کئے اور ان کے لئے معاہدہ کی تحریریں لکھیں جن کے بموجب ان لوگوں کو سالانہ جزیہ ادا کرنا تھا اور یہ مسلمانوں کی حکومت کے ماتحت رہیں گے، اللہ کے رسول ﷺ نے جزیرۃ العرب کے شمال میں واقع چھوٹی چھوٹی حکومتوں کے ساتھ معاہدے کئے، اس طریقے سے اسلامی ریاست کی تمام شمالی حدود بھی محفوظ و مامون ہو گئیں۔

ان معاہدوں کے ذریعہ روم کے پر و باز و کٹ گئے، اس لئے کہ یہ قبائل روم کے تابع تھے اور یہ عیسائیت میں داخل ہو گئے تھے، اور ان کے ساتھ رسول ﷺ کا مصالحت کرنا اور ان کا جزیہ دینے کا اقرار کرنا رومیوں کے پر و باز و کٹنے کے مترادف تھا، اس کے ذریعہ یہاں پر رومیوں کا اثر و رسوخ ختم ہو گیا اور وہ ان کی ماتحتی سے آزاد ہو گئے، جو ان کے ساتھ ذلت آمیز سلوک کرتے تھے اور وہ رومی ٹکڑوں پر پلتے تھے اور ان کے ظلم کے خوف کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے، اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ مصالحت کرنے کے بعد انہوں نے معاہدہ کو پورا کیا اور جزیہ دینے کا اہتمام کرتے رہے۔(دیکھیں: الصراع مع الصلیبین، ص:217 محمد رسول اللہ، محمد صادق عرجون:4/479)

یہ حکیمانہ نبوی حکمتِ عملی اور سیاست تھی جو رسول اللہ ﷺ نے ریاست کی تعمیر کے سلسلہ میں تشکیل دی تھی، آپؐ اس میں کامیاب ہو گئے کہ مسلمانوں اور رومیوں کے درمیان ایسی چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم کر دیں جو رسول اللہ ﷺ کے تابعِ فرمان اور ماتحت رہیں، اور خلفائے راشدین کے دور میں یہی حکومتیں نقطۂ ارتکاز بن گئیں جن کی وجہ سے اسلامی فتوحات کا سلسلہ آسان ہو گیا، وہیں سے مسلم افواج نے شمال کی جانب پیش قدمی کی اور انہی کو انہوں نے مرکز بنالیا۔

۴: دیارِ ثمود سے گزرتے ہوئے رسول ﷺ کی ہدایات:

حضرت ابو کبشہ انصاریؓ سے مروی ہے کہ غزوۂ تبوک کے موقع پر کچھ لوگ تیزی سے قوم ثمود کے کھنڈرات میں جانے لگے، نبی ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپؐ نے منادی کروادی کہ نماز تیار ہے، ابو کبشہؓ کہتے ہیں کہ میں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؐ نے اپنے اونٹ کو پکڑا ہوا تھا اور فرمارہے تھے: تم ایسی قوم پر کیوں داخل ہوتے ہو جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا؟ ایک آدمی کہنے لگا: یارسول اللہ! ہم ان پر تعجب کرتے ہیں، نبی ﷺ نے فرمایا: کیا میں تمہیں اس سے زیادہ تعجب انگیز بات نہ بتاؤں؟ تم ہی میں کا ایک آدمی تمہیں ماضی اور مستقبل کے واقعات کی خبر دیتا ہے، لہذا استقامت اور سیدھا راستہ اختیار کرو، کیونکہ اللہ کو تمہارے عذاب میں مبتلا ہونے کی کوئی پروانہیں ہوگی اور عنقریب ایک ایسی قوم آئے گی جو کسی بھی چیز کے ذریعہ اپنا دفاع نہیں کر سکے گی۔(مسند أحمد 18039 مجمع الزوائد للهيثمي 194/6 الفتح الرباني 195/21)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ لوگوں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ ثمود کی بستی حجر میں پڑاؤ کیا تو وہاں کے کنوؤں کا پانی اپنے برتنوں میں بھر لیا اور آٹا بھی اس پانی سے گوندھ لیا، لیکن نبی کریم ﷺ نے انہیں حکم دیا کہ جو پانی انہوں نے اپنے برتنوں میں بھر لیا ہے اسے انڈیل دیں اور گندھا ہوا آٹا جانوروں کو کھلادیں، اس کے بجائے نبی کریم ﷺ نے انہیں یہ حکم دیا کہ اس کنویں سے پانی لیں جس سے صالح علیہ السلام کی اونٹنی پانی پیا کرتی تھی۔ اللہ کے رسول ﷺ نے مزید فرمایا: "ان لوگوں کی بستی میں جنہوں نے ظلم کیا تھا نہ داخل ہو، لیکن اس صورت میں کہ تم روتے ہوئے ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم پر وہی عذاب آجائے جو ان پر آیا تھا"۔ پھر آپ ﷺ نے اپنی چادر چہرۂ مبارک پر ڈال لی، آپ ﷺ اس وقت کجاوے پر تشریف رکھتے تھے۔(صحيح البخاري: 3379، 3380 صحيح مسلم: 2980)

یہ منہجِ نبوی ہے جس کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کرام کو دیار ثمود سے گزرتے ہوئے عبرت حاصل کرنے کی ہدایت دی ہے اور یہ تعلیم دی کہ اس کے ذریعہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی تکذیب کرنے والوں پر اللہ کے غضب کو یاد کریں اور ان کے مٹے ہوئے نشانات اور ان کے قدیم کھنڈرات کے ذریعہ عبرت و نصیحت حاصل کرنے کے بارے میں غفلت نہ برتیں، آپؐ نے ان کو وہاں کی سرزمین کی کسی چیز حتی کہ پانی سے فائدہ اٹھانے سے منع فرمایا تاکہ اس کے ذریعہ عبرت و نصیحت حاصل کرنے کا پہلو فوت نہ ہونے پائے، بلکہ آپؐ نے ان کو رونے یا رونے کی شکل بنانے کا حکم دیا تاکہ وہ وہاں سے اثر لے سکیں، اور اگر وہ بھی وہاں سے اسی طرح گزر جاتے جیسے کہ ہم سابقہ قوموں کے آثار سے گزر جاتے ہیں تو وہ بھی اللہ کے غضب کا شکار ہو جاتے، اس لئے کہ سابقہ قوموں نے معجزات اور دلائلِ نبوت کا مشاہدہ

کیا ہے اور عجائبات کا معائنہ کیا ہے لیکن ان کے دل سخت ہوئے اور انہوں نے ان کو کوئی اہمیت نہیں دی، یہاں تک کہ وہ بھی عذاب کے مستحق قرار پائے اور اللہ کے غضب اور انتقام کا شکار ہو گئے۔

اللہ عزوجل نے اُمم سابقہ کے واقعات اسی لئے بیان کئے ہیں تاکہ ہم ان سے عبرت و موعظت حاصل کریں، اس لئے ان کے دیار کا مشاہدہ کرتے ہوئے بھی ضروری ہے کہ ان سے اور زیادہ عبرت اور نصیحت حاصل کی جائے، اسی لئے نبی کریم ﷺ نے بھی لعنت زدہ اور معذّب مقام سے گزرتے ہوئے اپنی چادر سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور اپنی سواری کو تیزی سے ایڑھ لگائی۔ (دیکھیں: صور و عبر من الجہاد النبوی فی المدینۃ، ص480)

۵: صحابیِ رسولؐ حضرت عبداللہ "ذوالبجادین" کی وفات:

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ میں تبوک میں آدھی رات کو بیدار ہوا تو فوجی پڑاؤ کے ایک کنارے روشنی نظر آئی، اُسے دیکھنے کے لئے آگے بڑھا تو دیکھا کہ وہاں رسول اللہ ﷺ ہیں اور ابو بکرؓ و عمرؓ ایک میّت کو آپ ﷺ سے قریب کر رہے ہیں۔ آپؐ فرما رہے تھے: تم دونوں اپنے بھائی کو مجھ سے قریب کرو۔ دونوں حضرات نے اُن کو آپ ﷺ سے قریب کر دیا اور آپؐ نے جب انہیں لٹانا چاہا تو فرمایا: اے اللہ! میں اِس سے راضی رہا ہوں تو بھی اس سے راضی ہو جا۔ ابن مسعودؓ کہتے ہیں: میں نے دل میں سوچا، کاش میں اس میں دفن ہوا ہوتا۔ (مسند بزار: 2736 الدلائل لأبي نعيم 524/2 مجمع الزوائد 369/9)

ابن ہشام کہتے ہیں: اُن کا نام ذوالبجادین اس لئے پڑا کیونکہ وہ اسلام لانا چاہتے تھے تو اُن کی قوم نے انہیں روک دیا اور پریشان کیا، اس لئے وہ وہاں سے نکل پڑے، اُس وقت اُن کے پاس صرف ایک موٹی چادر تھی، اُس کے انہوں نے دو ٹکڑے کر دیئے، ایک کو پہن لیا اور دوسرے کو اوڑھ لیا، اور اسی حال میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے، اس لئے آپؐ نے ان کا نام 'ذوالبجادین' رکھ دیا۔ (سیرۃ ابن ھشام 182/4)

اس واقعہ میں متعدد دروس و اسباق اور حکمتیں ہیں، ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

ا: ذو البجادین کے ساتھ عزت و اکرام کا یہ معاملہ اس بات کی دلیل ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ کس قدر تکریم کا معاملہ فرماتے تھے، حتیٰ کہ وفات کی حالت میں بھی ان کو اعزاز سے نوازتے تھے، اس لئے کہ انہوں نے اللہ کی راہ میں اپنی جانیں قربان کر دیں اور اپنا قیمتی متاع بھی قربان کر دیا، لہذا آپؐ کی طرف سے یہ اہتمام و اعزاز ان کی دنیاوی تکریم کا ایک مظہر ہے، آپؐ نے ان کے جسم کو یوں ہی نہیں چھوڑا بلکہ اعزاز کے ساتھ ان کی تدفین کی تاکہ یہ دوسروں کی حوصلہ افزائی کا بھی ذریعہ بنے۔

قابل ذکر یہ ہے کہ اس طرح کا طرزِ عمل دور حاضر میں اختیار کیا جاتا ہے، اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ ایک مسلمان قائد کی طرف سے اپنے سپاہیوں کو یہ اعزاز و تکریم دینا اور ان کو خاص پروٹوکول دینا؛ اس میں نبی کریم ﷺ کو سبقت حاصل ہے اور خود ساختہ نظاموں اور قوانین نے طلوعِ اسلام کے طویل زمانہ کے بعد اس کو اختیار کیا ہے۔

یہ حسنِ سلوک اور تکریم کی یکتا تصویر ہے جو ملوک و سلاطین کی تاریخ میں کہیں نظر نہیں آتی ہے کہ ایک بادشاہ یا سربراہِ مملکت اس حد تک تواضع اختیار کرے، اپنے ہاتھ سے اپنے ایک سپاہی کو سپرد خاک کرے اور اس کے لئے رب العالمین سے رضامندی کی دعا کرے اور خود یہ اعلان کردے کہ میں اس سے راضی ہوں۔ (صور و عبر من الجهاد النبوی فی المدینہ، ص: 472)

۲: رات میں تدفین کرنے کا جواز اور خیر کے بارے میں رشک کرنا:

اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت ذوالبجادین کو رات میں دفن کیا اور سنت یہ ہے کہ میت کی تدفین میں جلدی کی جائے، اسی طرح معلوم ہوا کہ خیر کے بارے میں رشک کرنا مشروع ہے، وہ اس طور پر کہ جس طرح کسی اور کو کوئی خیر ملا ہے اسی طرح اپنے لئے اس کے حصول کی تمنا کرنا، یہ حسد کے برعکس ہے، اس لئے کہ حسد میں دوسرے کی نعمت سلب ہونے اور ختم ہونے کی تمنا ہوتی ہے، اور حسد ایک خطرناک مرض ہے، یہاں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جب حضرت ذوالبجادین کے ساتھ یہ اعزاز و تکریم دیکھتے ہیں تو وہ یہ تمنا کرتے ہیں کہ کاش میں یہ شخص ہوتا!۔

۶: اس غزوہ میں ظہور پذیر بعض معجزات:

غزوۂ تبوک میں مختلف معجزات کا ظہور ہوا جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

ا: نبی کریم ﷺ کی دعا پر بادلوں کا آنا:

جب نبی کریم ﷺ نے دیار ثمود کو عبور کر لیا تو اس وقت لوگوں کے پاس پانی بالکل بھی نہیں تھا، انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کی شکایت کی اور آپؐ نے اللہ تعالیٰ سے بارش کے لئے دعا فرمائی، آپؐ کی دعا کے بعد اللہ تعالیٰ نے بادلوں کو بھیجا تو اتنی بارش ہوئی کہ لوگ سیراب ہوگئے اور انہوں نے ضرورت کے بقدر اپنے ساتھ بھی پانی لیا، ابن اسحاقؒ نے ایک ایسے شخص کے واسطے سے بیان کیا ہے جس نے محمود بن لبید سے پوچھا کہ کیا لوگ اہلِ نفاق کو پہچانتے تھے؟ انہوں نے کہا: ہاں! واللہ، ایک شخص اپنے بھائی میں، والد میں، چچا میں اور اپنے خاندان میں نفاق کو پہچان لیتا تھا، لیکن اس کے باوجود وہ ایک دوسرے کے ساتھ رہتے تھے، اس کے بعد محمود نے کہا: مجھے اپنی قوم کے لوگوں نے منافقین میں سے ایک شخص کے متعلق بتایا جس کا نفاق معروف تھا، وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ چلتا تھا جہاں آپؐ چلتے تھے، جب لوگوں کے ساتھ مقامِ حجر میں وہ صورتحال ہوئی اور رسول اللہ ﷺ نے دعا فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے بادل بھیجے اور بارش ہوگئی، یہاں تک کہ لوگ سیراب ہوگئے۔ کہتے ہیں کہ ہم اس شخص کے پاس آئے اور اس سے کہا: تیرا بُرا ہو، کیا اس کے بعد بھی اور کوئی معجزہ ہوگا؟ اس نے کہا: ارے! یہ تو ایک عام گزرنے والا بادل ہے۔ (دیکھیں: سیرت ابن ہشام: 4/176، صور و عبر من الجهاد النبوی، ص: 473)

۲: رسول اللہ ﷺ کی اونٹنی کا واقعہ:

جب رسول اللہ ﷺ غزوۂ تبوک کے موقع پر راستے میں تھے تو آپ ﷺ کی اونٹنی گم ہوگئی، صحابہ کرامؓ اونٹنی کی تلاش میں نکلے، عمارہؓ بن حزم اس وقت رسول ﷺ کے پاس موجود تھے اور وہ عقبہ میں شریک اور بدری صحابی تھے اور وہ بنو عمرو بن حزم کے چچازاد تھے، ان

کی سواری پر زید بن اللُّصیت قینقاعی تھا جو کہ منافق تھا، زید بن اللصیت نے کہا جب کہ وہ حضرت عمارہؓ کی سواری کے کجاوے پر تھا اور حضرت عمارہؓ رسول اللہ ﷺ کے پاس تھے: محمد نبوت کا دعوی کرتا ہے اور تمہیں آسمان کی خبریں سناتا ہے اور اسے یہ بھی پتہ نہیں کہ اس کی اونٹنی کہاں ہے؟

حضور ﷺ نے حضرت عمارہؓ سے کہا: ایک شخص نے یہ کہا ہے کہ محمد نبوت کا دعوی کرتا ہے اور لوگوں کو آسمان کی خبریں سناتا ہے اور اسے یہ بھی پتہ نہیں کہ اس کی اونٹنی کہاں ہے؟! خدا کی قسم! میں وہی جانتا ہوں جو اللہ نے مجھے بتادیا ہے، مجھے وہی کچھ معلوم ہے جس کا علم اللہ نے مجھے عطا کر دیا ہے، اللہ نے مجھے اونٹنی کے بارے میں خبر دی ہے کہ اونٹنی ایک درے میں ہے اور اس کی نکیل ایک درخت میں پھنسی ہوئی ہے، تم جا کر اسے لے آؤ۔ صحابہ کرام گئے اور اس اونٹنی کو لے کر آئے، اس کے بعد عمارہ بن حزمؓ اپنے سامان کے پاس واپس آئے اور کہنے لگے: اللہ کی قسم ابھی ابھی رسول اللہ ﷺ نے ہمیں بڑی عجیب بات فرمائی! کسی کہنے والے نے ایک بات کہی اور اللہ تعالی نے آپ کو اس کی خبر دے دی، حضرت عمارہؓ کے سامان کے پاس ایک شخص تھا اور وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس اس وقت موجود نہیں تھا، اس نے کہا: اللہ کی قسم! یہ بات آپ کے آنے سے پہلے زید نے کہی ہے، یہ سن کر حضرت عمارہؓ زید کے پاس آئے اور اس کی گردن پر نیزہ مارتے ہوئے کہ کہا: اللہ کے بندو! میرے پاس آؤ، میرے کجاوے میں ایک مصیبت آن پڑی ہے اور مجھے اس کا پتہ نہیں تھا، اے اللہ کے دشمن! میرے کجاوے سے نکل جا، میرے ساتھ مت رہنا۔ (تاریخ طبری: 3/145، أنساب الأشراف للبلاذری: 1/285، الدلائل للبیہقی: 5/232، أعلام النبوہ للماوردی، ص: 100 سیرت ابن ہشام: 4/177)

ابن اسحاق کہتے ہیں: بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ زید نے اس کے بعد توبہ کرلی، جبکہ بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ زید بعد میں بھی اس بیماری کے بارے میں متّہم رہے یہاں تک کہ وفات پائی۔ (دیکھیں: سیرت ابن ہشام: 4/177)

۳: سخت آندھی چلنے کی پیشن گوئی اور احتیاط برتنے کی ہدایات:

اللہ کے رسول ﷺ نے تبوک میں صحابہ کرام کو بتایا کہ عنقریب ایک سخت آندھی چلے گی، آپؐ نے ان کو اپنے بارے میں اور اپنے جانوروں کے بارے میں احتیاط برتنے کی ہدایت کی، اور بتایا کہ باہر نہ نکلیں اور اپنے جانوروں کو باندھ کر رکھیں، آپؐ کی یہ پیشن گوئی برحق ثابت ہوئی اور ایک سخت قسم کی آندھی چلی اور جو اس آندھی کے دوران کھڑا ہوا اُس کو اٹھا کر دور لے گئی، صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ابو حمید سے روایت ہے فرماتے ہیں: ہم تبوک کی جانب روانہ ہوئے یہاں تک کہ تبوک پہنچ گئے، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: آج رات بڑی زور کی آندھی چلے گی، اس لئے کوئی شخص کھڑا نہ رہے اور جس کے پاس اونٹ ہو تو وہ اسے باندھ کر رکھے، اس کے بعد ایک سخت آندھی چلی تو ایک شخص کھڑا ہوا تو ہوا اُس کو اٹھا کر لے گئی یہاں تک کہ طیئ پہاڑ پر اس کو پھینک دیا۔ (صحیح مسلم: 1392، صحیح بخاری: 1481)

امام نوویؒ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اس حدیث میں آپؐ کی نبوت کا واضح معجزہ موجود ہے کہ آپؐ نے غیب کے بارے میں خبر دی اور بتایا کہ آندھی کے وقت کھڑے ہونے کی وجہ سے ضرر لاحق ہو سکتا ہے۔ (شرح النووی علی صحیح مسلم: 15/42)

۴: تبوک کے چشمہ میں برکت اور وہاں سر سبز و شادابی کی پیشن گوئی:

سیدنا معاذ بن جبلؓ فرماتے ہیں کہ وہ غزوۂ تبوک والے سال، رسول اللہ ﷺ کے ساتھ (جہاد کے لئے) نکلے تو رسول اللہ ﷺ ظہر و عصر کی اور مغرب و عشاء کی (نمازیں) جمع کرتے تھے، سیدنا معاذؓ نے فرمایا: ایک دن آپ ﷺ نے نماز مؤخر کی پھر (خیمے سے) باہر آکر ظہر و عصر کی دونوں نمازیں پڑھائیں، پھر آپؐ اندر تشریف لے گئے، پھر (بعد میں) باہر آکر مغرب و عشاء کی دونوں نمازیں اکٹھی پڑھائیں پھر فرمایا: ''تم سب ان شاء اللہ کل تبوک کے چشمے پر پہنچو گے اور تم دن چڑھنے سے پہلے نہیں پہنچ سکو گے، پس تم میں سے جو بھی چشمے پر پہنچے تو میرے آنے سے پہلے اس کے پانی کو ہاتھ نہ لگائے''۔ سیدنا معاذؓ نے فرمایا: پھر جب ہم وہاں پہنچے تو دو آدمی ہم سے پہلے پہنچ چکے تھے اور چشمہ (تھوڑے سے) پانی کے ساتھ چمک رہا تھا گویا کہ ایک تسمہ ہے، رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں سے پوچھا: ''کیا تم نے اس چشمے کے پانی میں سے کچھ چھوا ہے؟'' انہوں نے کہا: جی ہاں! آپؐ نے انہیں ڈانٹا اور جو اللہ چاہتا تھا وہ فرمایا، پھر لوگوں نے چشمے میں سے اپنے ہاتھوں کے ساتھ تھوڑے تھوڑے چلو بھر کے پانی لیا حتیٰ کہ وہ کسی چیز (برتن) میں اکٹھا ہو گیا، پھر رسول اللہ ﷺ نے اس سے اپنا چہرہ (رخ انور) اور ہاتھ دھوئے، پھر اس پانی کو چشمے میں ڈال دیا تو اس چشمے سے بہت زیادہ پانی بہنے لگا، لوگوں نے پانی پیا اور پلایا، پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے معاذ! اگر تمہاری زندگی لمبی ہوئی تو عنقریب دیکھو گے کہ یہ علاقہ باغوں سے بھرا ہو گا''۔ (موطأ مالک: 172 مسند أحمد 235/5 صحیح مسلم 706/10 سنن أبو داؤد: 1260 سنن ترمذي: 553 سنن ابن ماجة: 1070)

تبوک کا علاقہ اور وہ وادی جس میں چشمہ تھا، پانی کی قلت کی وجہ سے بے آب و گیاہ علاقہ تھا، لیکن اللہ عزوجل نے اپنے رسول کے ذریعہ اس پانی میں برکت عطا فرمائی یہاں تک کہ وہ پورے بہاؤ کے ساتھ بہنے لگا اور اس کے ذریعہ صرف لشکر کی ہی ضرورت پوری نہیں ہوئی بلکہ اللہ کے رسولؐ نے یہ بھی پیشن گوئی فرمادی کہ یہ مسلسل جاری رہے گا، اور عنقریب یہاں باغات ہوں گے جن میں پھل دار درخت ہوں گے، اور رسول اللہ ﷺ کی پیشن گوئی کچھ ہی وقت کے بعد متحقق ہو گئی، تبوک آج تک مسلسل اپنے باغات، کھجوروں اور سر سبز و شادابی کی وجہ سے ممتاز رہا ہے جس سے رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی صداقت ظاہر ہوتی ہے، اور یہ اس بات کی شہادت ہے کہ رسولؐ سچ اور حق ہی بیان کرتے ہیں اور جس چیز کے بارے میں بھی آپؐ نے خبر دی وہ متحقق ہو کر رہ گئی۔ (دیکھیں: الصراع مع الصليبين، ص: 142)

۵: کھانے میں برکت کا معجزہ:

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ جب غزوہ تبوک تھا تو لوگوں کو بہت سخت بھوک لگی، انہوں نے آپ ﷺ سے کہا: یارسول اللہ! اگر آپ اجازت دیں تو ہم اپنے سواری کے اونٹ ذبح کر لیں تا کہ ان کا گوشت کھائیں اور ان کے روغن سے فائدہ اٹھائیں، رسول اللہ ﷺ نے کہا: 'کر لو'۔ عمرؓ آپ ﷺ کے پاس آئے اور کہا: یارسول اللہ، اگر آپ نے یہ کیا تو سواریاں کم ہو جائیں گی، اس کے بجائے آپ ان کے بچے ہوئے زادِ راہ منگوائیں اور اس پر اللہ سے برکت کی دعا کریں تا کہ اللہ تعالیٰ اس میں برکت ڈال دے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: 'یہ ٹھیک ہے'۔ چنانچہ آپؐ نے ایک کھال کی چٹائی منگوائی اور اسے بچھا دیا پھر ان لوگوں کا بچا کھچا کھانے کا سامان منگوایا، کوئی شخص مٹھی بھر مکئی،

کوئی مٹھی بھر کھجور اور کوئی (روٹی کا) ٹکڑا لے آیا، یہاں تک کہ کھال پر چھوٹا سا ڈھیر لگ گیا، پھر رسول اللہ ﷺ نے برکت کی دعا کی اور فرمایا: اسے اپنے برتنوں میں ڈال لو، چنانچہ لوگوں نے اپنے برتن بھر لئے، لشکر میں کوئی برتن نہیں بچا جسے انہوں نے نہ بھرا ہو، پھر انہوں نے کھایا اور سیر ہو گئے لیکن کھانا پھر بھی بچا رہا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں، جو بندہ ان دونوں شہادتوں پر یقین رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے گا اسے جنت سے ہرگز نہ روکا جائے گا۔ (مسند أحمد 11/3 صحيح مسلم: 45/27 الدلائل للبيهقي 229/5 ابن حبان: 6530 مسند أبو يعلى: 1199)

یہ اللہ کے رسول ﷺ کے ذریعہ غزوۂ تبوک میں ظہور پذیر ہونے والے بعض معجزات ہیں، جو اللہ کے رسولؐ کی نبوت ورسالت کی صداقت کے واضح دلائل ہیں اور آپؐ کے مقام بلند اور رب کے نزدیک آپؐ کی عزت وتکریم پر دلالت کرتے ہیں۔

۷: غزوۂ تبوک کے دوران منافقین کے بارے میں قرآن کریم کے بیانات:

أ: حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں: ایک شخص نے ایک دن غزوۂ تبوک کے موقع پر ایک مجلس میں یہ کہا کہ میرے خیال میں ہم میں سے جو لوگ زیادہ قرآن پڑھتے ہیں وہ ہم سے پیٹ کے بارے میں زیادہ لالچی ہیں اور بات میں ہم سے زیادہ جھوٹے ہیں اور جنگ کے وقت بزدل ہیں، مجلس میں موجود ایک شخص نے کہا: تو جھوٹ بول رہا ہے تو منافق ہے، میں یہ بات رسول اللہ ﷺ کو بتاؤں گا، یہ بات رسول اللہ ﷺ تک پہنچی اور اس سلسلہ میں قرآن نازل ہوا، حضرت عبداللہ فرماتے ہیں: میں نے اس کو دیکھا اس شخص کے پاؤں پتھر پر رگڑے جا رہے تھے اور یہ شخص رسول اللہ ﷺ کی اونٹنی کے کجاوے کے ساتھ لٹکا ہوا تھا اور وہ کہہ رہا تھا: رسول خدا! ہم تو گپ شپ لگا رہے تھے، حضورؐ نے فرمایا: کیا تم اللہ، اس کی آیات اور اس کے رسول کی بابت گپ شپ لگا رہے تھے۔؟! (تفسير ابن جرير 172/10 الدر المنثور للسيوطي 230/4)

حضرت قتادہ کی روایت میں ہے فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ غزوۂ تبوک کے لئے پابہ رکاب تھے کہ آپ کے ساتھ ایک گروہ منافقین کا بھی تھا جنہوں نے کہا: کیا یہ شخص یہ امید لگائے بیٹھا کہ شام کے محلات اور قلعے اس کے لئے فتح ہو جائیں گے! یہ ہرگز نہیں ہو سکتا ہے۔ اللہ نے حضور ﷺ کو اس کی اطلاع دے دی تو حضورؐ نے حکم دیا کہ ان لوگوں کی سواریوں کو روک دو، حضورؐ نے ان لوگوں سے جا کر دریافت کیا کہ کیا تم نے یہ کہا ہے؟! تو انہوں نے جواب دیا کہ رسول اللہ، ہم تو ہنسی مذاق کر رہے تھے، ان کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئیں: ﴿يَحْذَرُ ٱلْمُنَٰفِقُونَ أَن تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُورَةٌ تُنَبِّئُهُم بِمَا فِى قُلُوبِهِمْ ۚ قُلِ ٱسْتَهْزِءُوٓا۟ إِنَّ ٱللَّهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُونَ ﴿٦٤﴾ وَلَئِن سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ ۚ قُلْ أَبِٱللَّهِ وَءَايَٰتِهِۦ وَرَسُولِهِۦ كُنتُمْ تَسْتَهْزِءُونَ﴾

ترجمہ: ”منافقین ڈرتے ہیں کہ کہیں اہلِ ایمان پر کوئی ایسی سورت نہ نازل کر دی جائے جو ان کو ان کے دلوں کے بھیدوں سے آگاہ کر دے، کہہ دیجئے: مذاق اڑا لو، اللہ ظاہر کر کے رہے گا جس سے تم خوف زدہ ہو۔ اگر آپ ان سے پوچھیں تو جواب دیں گے کہ ہم تو صرف دل لگی اور خوش طبعی کر رہے تھے، کہہ دیجئے: کیا تم اللہ، اس کی آیات اور اس کے رسول کے ساتھ ہنسی مذاق کر رہے تھے؟“۔

ب: منافقین کی ایذاء رسانی اور رسول ﷺ کو شہید کرنے کی کوشش:

منافقین کے بارے میں اللہ تعالی کا یہ قول نازل ہوا: ﴿يَحْلِفُونَ بِٱللَّهِ مَا قَالُوا۟ وَلَقَدْ قَالُوا۟ كَلِمَةَ ٱلْكُفْرِ وَكَفَرُوا۟ بَعْدَ إِسْلَـٰمِهِمْ وَهَمُّوا۟ بِمَا لَمْ يَنَالُوا۟ ۚ وَمَا نَقَمُوٓا۟ إِلَّآ أَنْ أَغْنَىٰهُمُ ٱللَّهُ وَرَسُولُهُۥ مِن فَضْلِهِۦ ۚ فَإِن يَتُوبُوا۟ يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ ۖ وَإِن يَتَوَلَّوْا۟ يُعَذِّبْهُمُ ٱللَّهُ عَذَابًا أَلِيمًا فِى ٱلدُّنْيَا وَٱلْـَٔاخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِى ٱلْأَرْضِ مِن وَلِىٍّ وَلَا نَصِيرٍ﴾ ترجمہ: "یہ لوگ خدا کی قسم کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہم نے وہ بات نہیں کہی، حالانکہ انہوں نے ضرور وہ کافرانہ بات کہی ہے، وہ اسلام لانے کے بعد کفر کے مرتکب ہوئے اور انہوں نے وہ کچھ کرنے کا ارادہ کیا جسے کر نہ سکے، یہ ان کا سارا غصہ اسی بات پر ہے نا کہ اللہ اور اس کے رسول نے اپنے فضل سے ان کو غنی کر دیا ہے! اب اگر یہ اپنی اس روش سے باز آجائیں تو انہی کے لئے بہتر ہے، اور اگر یہ باز نہ آئے تو اللہ ان کو نہایت دردناک سزا دے گا، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، اور زمین میں کوئی نہیں جو ان کا حمایتی اور مددگار ہو"۔ (سورۃ التوبہ: 74)

ابن کثیرؒ فرماتے ہیں: ضحاک کا قول ہے کہ منافقین کے ایک ٹولے نے نبی کریم ﷺ کو جان سے مارنے کا ارادہ کیا جب آپؐ غزوہ تبوک کے سفر میں تھے اور یہ منصوبہ ایک رات کے لئے تیار کیا گیا اور وہ دس سے زیادہ افراد پر مشتمل ٹولہ تھا جنہوں نے یہ منصوبہ تیار کیا، انہی کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئیں۔ (تفسیر ابن کثیر: 2/372)

واحدی کی روایت میں ضحاک سے یہ قول مروی ہے کہ منافقین رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تبوک کی جانب نکلے تو وہ جب ایک دوسرے سے تنہائی میں ملتے تھے تو رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کو بُرا بھلا کہتے تھے اور دین کے بارے میں طعن و تشنیع کرتے تھے، حضرت حذیفہؓ نے ان کی ان باتوں کو رسول اللہ ﷺ سے بیان کیا، رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: اے اہلِ نفاق! مجھے تمہارے بارے میں یہ کیا معلوم ہوا ہے؟ وہ قسمیں کھانے لگے کہ انہوں نے ایسا کچھ بھی نہیں کہا ہے، اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کی حقیقت کو بیان کرنے کے لئے یہ آیات نازل کیں۔

ان کا وہ ارادہ جو پورا نہ ہو سکا، اس سے مراد ہے ان کا رسول اللہ ﷺ کو قتل کرنے کا منصوبہ، جبکہ آپؐ ایک گھاٹی میں تھے اور آپؐ تبوک سے واپس آرہے تھے، ابن کثیر فرماتے ہیں: حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں: میں اور حضرت عمارؓ آنحضرت ﷺ کی اونٹنی کے آگے پیچھے تھے، ایک چلتا تھا دوسرا نکیل تھامتا تھا، ہم عقبہ میں تھے کہ بارہ شخص منہ پر نقاب ڈالے آئے اور اونٹنی کو گھیر لیا حضور ﷺ نے انہیں للکارا اور وہ دم دبا کر بھاگ کھڑے ہوئے، آپؐ نے ہم سے فرمایا: کیا تم نے انہیں پہچانا؟ ہم نے کہا: نہیں، لیکن انکی سواریاں ہماری نگاہوں میں ہیں، آپؐ نے فرمایا: یہ منافق تھے اور قیامت تک ان کے دل میں نفاق رہے گا، جانتے ہو کہ کس ارادے سے آئے تھے؟! ہم نے کہا: نہیں، فرمایا: ان کا ارادہ یہ تھا کہ عقبہ میں اللہ کے رسولؐ کے مقابلہ میں آکر آپ کو تکلیف پہنچائیں۔ (الدلائل للبیهقي 260/5 الدر المنثور للسيوطي 244/4)

....

تیسرا باب

تبوک سے مدینہ واپسی، غزوہ سے پیچھے رہنے والوں اور مسجد ضرار کے بارے میں قرآن کی تصریحات

نبی کریم ﷺ تبوک میں بیس راتیں گزارنے کے بعد مدینہ منورہ واپس تشریف لائے، مدینہ واپس آتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے مسجدِ ضرار کو منہدم کرنے کا حکم دیا جس کو منافقین نے بنایا تھا، اور جب آپؐ مدینہ کے قریب پہنچے تو چھوٹے بچے بھی ثنیۃ الوداع کی جانب آپؐ سے ملاقات اور استقبال کے لئے نکلے، آپؐ مدینہ منورہ میں داخل ہوئے، آپؐ نے اپنی مسجد میں دو رکعتیں ادا کیں، اس کے بعد لوگوں سے ملاقات کے لئے بیٹھے، غزوہ سے پیچھے رہنے والے آپؐ کے پاس آئے اور وہ اپنے اپنے عذر پیش کر رہے تھے، عذر پیش کرنے والے لوگ چار طرح کے تھے: ان میں سے بعض وہ لوگ تھے جن کے پاس شرعی عذر تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو معذور قرار دیا۔ ان میں سے بعض وہ تھے جن کے پاس شرعی عذر نہیں تھے اور انہوں نے توبہ کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کی۔ ان میں سے بعض اُعراب منافقین تھے جو مدینہ کے آس پاس رہتے تھے۔ اور بعض مدینہ کے منافقین تھے۔

۱: شرعی عذر والے لوگ:

عذر پیش کرنے والوں میں سے بعض لوگ وہ تھے جن کے پاس شرعی عذر تھے اور اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو معذور قرار دیا، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿لَّيْسَ عَلَى ٱلضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى ٱلْمَرْضَىٰ وَلَا عَلَى ٱلَّذِينَ لَا يَجِدُونَ مَا يُنفِقُونَ حَرَجٌ إِذَا نَصَحُوا۟ لِلَّهِ وَرَسُولِهِۦ ۚ مَا عَلَى ٱلْمُحْسِنِينَ مِن سَبِيلٍ ۚ وَٱللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٩١﴾ وَلَا عَلَى ٱلَّذِينَ إِذَا مَآ أَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ أَجِدُ مَآ أَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوا۟ وَّأَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ ٱلدَّمْعِ حَزَنًا أَلَّا يَجِدُوا۟ مَا يُنفِقُونَ ﴿٩٢﴾﴾ ترجمہ: ’’ضعیف اور بیمار لوگ اور وہ لوگ جو شرکتِ جہاد کے لئے راہ نہیں پاتے، اگر پیچھے رہ جائیں تو کوئی حرج نہیں، جبکہ وہ خلوصِ دل کے ساتھ اللہ اور اس کے رسولؐ کے وفادار ہوں، ایسے محسنین پر اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور اللہ در گزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اسی طرح اُن لوگوں پر بھی کوئی اعتراض کا موقع نہیں ہے جنہوں نے خود آکر تم سے درخواست کی تھی کہ ہمارے لئے سواریاں بہم پہنچائی جائیں، اور جب تم نے کہا کہ میں تمہارے لئے سواریوں کا انتظام نہیں کر سکتا تو وہ مجبوراً واپس گئے اور حال یہ تھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور انہیں اس بات کا بڑا رنج تھا کہ وہ اپنے خرچ پر شریکِ جہاد ہونے کی مقدرت نہیں رکھتے‘‘۔ (سورۃ التوبہ: 91-92)

شرعی اعذار والوں میں ضعفاء، یعنی معذور اور سن رسیدہ لوگ، بچے، مجنون اور مریض لوگ شامل ہیں۔

۲: جن کے پاس شرعی عذر نہیں تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کی:

عذر پیش کرنے والوں میں سے بعض لوگ وہ تھے جن کے پاس شرعی عذر تو نہیں تھے لیکن انہوں نے توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کی، ایسے لوگوں کے بارے میں قرآنِ پاک میں تین آیات آئی ہیں اور وہ ہیں:

اَ: ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَءَاخَرُونَ ٱعۡتَرَفُواْ بِذُنُوبِهِمۡ خَلَطُواْ عَمَلٗا صَٰلِحٗا وَءَاخَرَ سَيِّئًا عَسَى ٱللَّهُ أَن يَتُوبَ عَلَيۡهِمۡۚ إِنَّ ٱللَّهَ غَفُورٞ رَّحِيمٌ﴾ ترجمہ: ’’کچھ اور لوگ ہیں جنہوں نے اپنے قصوروں کا اعتراف کر لیا ہے، ان کا عمل مخلوط ہے، کچھ نیک ہے اور کچھ بد، بعید نہیں کہ اللہ ان پر پھر مہربان ہو جائے کیونکہ وہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے‘‘۔(سورۃ التوبہ:102)

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ بغیر کسی شرعی عذر کے غزوہ سے پیچھے رہے لیکن وہ نادم ہوئے اور انہوں نے جھوٹے عذر پیش نہیں کئے بلکہ توبہ کی، اپنے گناہوں کا اعتراف کیا اور اللہ سے توبہ قبول کرنے کے امیدوار رہے۔

ب: دوسری آیت میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَءَاخَرُونَ مُرۡجَوۡنَ لِأَمۡرِ ٱللَّهِ إِمَّا يُعَذِّبُهُمۡ وَإِمَّا يَتُوبُ عَلَيۡهِمۡۗ وَٱللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٞ﴾ ترجمہ: ’’کچھ دوسرے لوگ ہیں جن کا معاملہ ابھی خدا کے حکم پر ٹھہرا ہوا ہے، چاہے انہیں سزا دے اور چاہے اُن پر از سر نو مہربان ہو جائے، اللہ سب کچھ جانتا ہے اور حکیم و دانا ہے‘‘۔(سورۃ التوبہ:106)

جیسے کہ صحیحین میں ہے کہ ان سے مراد ہیں: ہلال بن امیہؓ، کعب بن مالکؓ اور مرار بن ربیعؓ، جو رسول اللہ ﷺ سے کسی وجہ سے پیچھے رہے تھے، حالانکہ ان کا ارادہ تھا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ شامل ہوں گے لیکن وہ شامل نہیں ہو سکے، اور ان کا یہ پیچھے رہنا نفاق کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ وہ مخلص اہلِ ایمان میں سے تھے، اور جب رسول اللہ ﷺ تبوک سے واپس تشریف لائے تو انہوں نے صاف صاف کہا کہ ہمارے پاس سوائے غلطی کے اور کوئی عذر نہیں ہے اور انہوں نے منافقین کی طرح خود ساختہ اعذار پیش نہیں کئے، اللہ کے رسولؐ نے ان سے اجتناب کرنے اور دور رہنے کا حکم دیا اور ان پر سختی کی، پچاس دنوں تک ان کے بارے میں اللہ کی طرف سے کوئی حکم نازل نہیں ہوا اور پھر ان کی توبہ قبول ہوئی جیسے کہ آگے اس کی تفصیلات آئیں گی۔

ج: تیسری آیت میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَعَلَى ٱلثَّلَٰثَةِ ٱلَّذِينَ خُلِّفُواْ حَتَّىٰٓ إِذَا ضَاقَتۡ عَلَيۡهِمُ ٱلۡأَرۡضُ بِمَا رَحُبَتۡ وَضَاقَتۡ عَلَيۡهِمۡ أَنفُسُهُمۡ وَظَنُّوٓاْ أَن لَّا مَلۡجَأَ مِنَ ٱللَّهِ إِلَّآ إِلَيۡهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيۡهِمۡ لِيَتُوبُوٓاْۚ إِنَّ ٱللَّهَ هُوَ ٱلتَّوَّابُ ٱلرَّحِيمُ﴾ ترجمہ: ’’اور ان تینوں پر بھی (نظرِ رحمت فرمائی) جن کا معاملہ مؤخر کیا گیا، یہاں تک کہ جب زمین ان پر تنگ ہو گئی باجود کشادہ ہونے کے اور تنگ ہو گئیں ان پر اُن کی جانیں اور وہ سمجھ گئے کہ کہیں پناہ نہیں اللہ سے مگر اسی کی طرف۔ پھر اللہ نے ان پر عنایت کی نظر کی تاکہ وہ توبہ کریں۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہی ہے بہت توبہ قبول فرمانے والا اور ہمیشہ رحم کرنے والا‘‘۔(سورۃ التوبۃ:118)

ان تینوں سے مراد ہیں: ہلال بن امیہؓ، کعب بن مالکؓ اور مرار بن ربیعؓ، انہی کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی، اس واقعہ کی مزید تفصیلات آگے آرہی ہیں۔

۳: مدینہ کے آس پاس رہنے والے اُعراب منافقین:

غزوہ سے پیچھے رہنے والے لوگوں کی تیسری قسم اُعراب منافقین کی تھی، ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ قول نازل ہوا: ﴿وَجَآءَ ٱلۡمُعَذِّرُونَ مِنَ ٱلۡأَعۡرَابِ لِيُؤۡذَنَ لَهُمۡ وَقَعَدَ ٱلَّذِينَ كَذَبُواْ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥۚ سَيُصِيبُ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ مِنۡهُمۡ عَذَابٌ

أَلِيمٌ﴾ ترجمہ: "بدوی عربوں میں سے بھی بہت سے لوگ آئے جنہوں نے عذر کئے تاکہ انہیں بھی پیچھے رہ جانے کی اجازت دی جائے، اِس طرح بیٹھے رہے وہ لوگ جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول سے ایمان کا جھوٹا عہد کیا تھا، ان بدویوں میں سے جن لوگوں نے کفر کا طریقہ اختیار کیا ہے عنقریب وہ دردناک سزا سے دوچار ہوں گے"۔(سورۃ التوبہ:90)

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ اعراب صحیح یا غلط عذر لے کر آئے تاکہ رسول اللہ ﷺ ان کو غزوہ سے پیچھے رہنے کی اجازت دے دیں اور ایک گروہ وہ بھی تھا جنہوں نے نہ تو عذر پیش کیا بلکہ بغیر کسی عذر کے غزوہ میں شریک نہیں ہوئے، یہ بدوی منافقین تھے جنہوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی تکذیب کی، اور نہ ہی وہ ایمان لائے اور نہ ہی انہوں نے تصدیق کی، ان کو اللہ تعالیٰ نے عذاب کی وعید سنائی۔

۴: منافقینِ مدینہ:

چوتھی قسم ان منافقین کی تھی جو مدینہ کے اندر رہتے تھے، ان کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَرِحَ ٱلۡمُخَلَّفُونَ بِمَقۡعَدِهِمۡ خِلَٰفَ رَسُولِ ٱللَّهِ وَكَرِهُوٓاْ أَن يُجَٰهِدُواْ بِأَمۡوَٰلِهِمۡ وَأَنفُسِهِمۡ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ وَقَالُواْ لَا تَنفِرُواْ فِي ٱلۡحَرِّۗ قُلۡ نَارُ جَهَنَّمَ أَشَدُّ حَرّٗاۚ لَّوۡ كَانُواْ يَفۡقَهُونَ ۝٨١ فَلۡيَضۡحَكُواْ قَلِيلٗا وَلۡيَبۡكُواْ كَثِيرٗا جَزَآءَۢ بِمَا كَانُواْ يَكۡسِبُونَ ۝٨٢ فَإِن رَّجَعَكَ ٱللَّهُ إِلَىٰ طَآئِفَةٖ مِّنۡهُمۡ فَٱسۡتَـٔۡذَنُوكَ لِلۡخُرُوجِ فَقُل لَّن تَخۡرُجُواْ مَعِيَ أَبَدٗا وَلَن تُقَٰتِلُواْ مَعِيَ عَدُوًّاۖ إِنَّكُمۡ رَضِيتُم بِٱلۡقُعُودِ أَوَّلَ مَرَّةٖ فَٱقۡعُدُواْ مَعَ ٱلۡخَٰلِفِينَ ۝٨٣﴾ ترجمہ: "جن لوگوں کو پیچھے رہ جانے کی اجازت دے دی گئی تھی وہ اللہ کے رسول کا ساتھ نہ دینے اور گھر بیٹھے رہنے پر خوش ہوئے اور انہیں گوارا نہ ہوا کہ اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کریں، انہوں نے لوگوں سے کہا کہ "اس سخت گرمی میں نہ نکلو" ان سے کہو کہ جہنم کی آگ اس سے زیادہ گرم ہے، کاش انہیں اس کا شعور ہوتا! ۔اب چاہئے کہ یہ لوگ ہنسنا کم کریں اور روئیں زیادہ، اس لئے کہ جو بدی یہ کماتے رہے ہیں اس کی جزا ایسی ہی ہے (کہ انہیں اس پر رونا چاہیے)۔اگر اللہ ان کے درمیان تمہیں واپس لے جائے اور آئندہ ان میں سے کوئی گروہ جہاد کے لئے نکلنے کی تم سے اجازت مانگے تو صاف کہہ دینا کہ "اب تم میرے ساتھ ہرگز نہیں چل سکتے اور نہ میری معیت میں کسی دشمن سے لڑ سکتے ہو، تم نے پہلے بیٹھے رہنے کو پسند کیا تھا تو اب گھر بیٹھنے والوں ہی کے ساتھ بیٹھے رہو"۔(سورۃ التوبہ:81-83)

منافقین کے بارے میں جملہ تفصیلات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ منافقین کے تئیں رسول اللہ ﷺ کی حکمتِ عملی مختلف رہی ہے، حقیقی منافقین نے جب اپنے عذر پیش کئے تو ان کے ساتھ آپؐ کا رویہ غزوہ سے پیچھے رہنے والے سچے اہلِ ایمان سے مختلف رہا ہے، آپؐ نے منافقین کے ساتھ نرمی اور درگزر کا معاملہ کیا، جبکہ سچے اہلِ ایمان کے ساتھ سختی اور سزا کا معاملہ فرمایا، بلاشبہ اہلِ ایمان کے ساتھ اس موقع پر شدت اور سختی کا معاملہ کرنا ان کے ساتھ عزت و تکریم اور شرف کا ایک مظہر ہے جس کے منافقین مستحق نہیں تھے کہ ان کی توبہ کے بارے میں- کسی بھی حال میں- آیات نازل ہوتیں، وہ تو کفار تھے اور دنیا میں ان کی ریاکاری اور ایمان کا جھوٹا اظہار ان کو بروزِ قیامت جہنم کے نچلے طبقے میں گرنے سے نہیں بچا سکتا ہے، اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ہم اُن کو ان کی ظاہری حالت پر چھوڑ دیں اور ان

کے ظاہری حالات کے اعتبار سے ان پر حکم لگائیں گے، لہذا اُن اعذار کی اصل صورتحال اور ان کے اقوال کی حقیقت کے بارے میں تحقیق کی کیا ضرورت ہے؟! اور ان کی کذب بیانی پر دنیا میں ان کو کیوں کر سزا دی جائے؟! ہم بھی ان کے ظاہری احوال وعقائد کے اعتبار سے ان کے ساتھ ظاہری احکام اور معاملہ کرنے کے مکلف ہیں۔

ابن قیمؒ فرماتے ہیں: رب کریم بندوں کے ساتھ ان کے جرائم کی سزا کے بارے میں ایسا ہی معاملہ کرتا ہے، اپنے جس بندے سے وہ محبت کرتا ہے-اور وہ اس کے نزدیک صاحبِ عزت ہوتا ہے-تو معمولی لغزش وخطا پر بھی وہ اس کی تادیب کرتا ہے اور اس کے بعد وہ مسلسل بیدار اور چوکنا رہتا ہے، اور رہا وہ شخص جو اللہ کی نگاہ سے گر جائے اور اس کے نزدیک ذلیل وخوار ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس کو اس کے گناہوں کے حوالے کر دیتا ہے اور جب بھی وہ کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو مزید نعمت عطا کرتا ہے"۔زاد المعاد 578/3)

۵: مسجدِ ضرار:

تبوک سے مدینہ منورہ واپس آتے ہوئے آپ ﷺ پر مندرجہ ذیل آیات نازل ہوئیں: ﴿وَٱلَّذِينَ ٱتَّخَذُواْ مَسۡجِدٗا ضِرَارٗا وَكُفۡرٗا وَتَفۡرِيقَۢا بَيۡنَ ٱلۡمُؤۡمِنِينَ وَإِرۡصَادٗا لِّمَنۡ حَارَبَ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ مِن قَبۡلُۚ وَلَيَحۡلِفُنَّ إِنۡ أَرَدۡنَآ إِلَّا ٱلۡحُسۡنَىٰۖ وَٱللَّهُ يَشۡهَدُ إِنَّهُمۡ لَكَٰذِبُونَ ۝١٠٧ لَا تَقُمۡ فِيهِ أَبَدٗاۚ لَّمَسۡجِدٌ أُسِّسَ عَلَى ٱلتَّقۡوَىٰ مِنۡ أَوَّلِ يَوۡمٍ أَحَقُّ أَن تَقُومَ فِيهِۚ فِيهِ رِجَالٞ يُحِبُّونَ أَن يَتَطَهَّرُواْۚ وَٱللَّهُ يُحِبُّ ٱلۡمُطَّهِّرِينَ ۝١٠٨﴾ ترجمہ:"کچھ اور لوگ ہیں جنہوں نے ایک مسجد بنائی اِس غرض کے لئے کہ (دعوتِ حق کو) نقصان پہنچائیں، اور (خدا کی بندگی کرنے کے بجائے) کفر کریں، اور اہلِ ایمان میں پھوٹ ڈالیں، اور (اس بظاہر عبادت گاہ کو) اُس شخص کے لئے کمین گاہ بنائیں جو اس سے پہلے خدا اور رسولؐ کے خلاف برسرِپیکار ہو چکا ہے، وہ ضرور قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہمارا ارادہ تو بھلائی کے سوا کسی دوسری چیز کا نہ تھا مگر اللہ گواہ ہے کہ وہ قطعی جھوٹے ہیں۔ تم ہرگز اس عمارت میں کھڑے نہ ہونا، جو مسجد اول روز سے تقویٰ پر قائم کی گئی تھی وہی اس کے لئے زیادہ موزوں ہے کہ تم اس میں (عبادت کے لئے) کھڑے ہو، اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنا پسند کرتے ہیں اور اللہ کو پاکیزگی اختیار کرنے والے ہی پسند ہیں"۔(سورۃ التوبہ: 107-108)

ان آیاتِ بینات کا سببِ نزول یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچے، اس سے پہلے مدینہ میں ایک شخص تھا جس کا نام ابو عامر راہب تھا، یہ خزرج کے قبیلہ میں سے تھا، جاہلیت کے زمانہ میں نصرانی بن گیا تھا، اہلِ کتاب کا علم بھی پڑھا تھا، عابد بھی تھا اور قبیلۂ خزرج اس کی بزرگی کا قائل تھا، جب حضور ﷺ یہاں آئے، مسلمانوں کا اجتماع آپ ﷺ کے پاس ہونے لگا، یہ قوت پکڑنے لگے یہاں تک کہ بدر کی جنگ ہوئی اور اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے انہیں غالب رکھا تو یہ جل بھن گیا، کھلم کھلا مخالفت وعداوت کرنے لگا اور یہاں سے بھاگ کر کفارِ مکہ سے مل گیا اور انہیں مسلمانوں سے لڑائی کرنے پر آمادہ کرنے لگا، یہ تو عداوتِ اسلام میں پاگل ہو رہے تھے، تیار ہو گئے اور اپنے ساتھ عرب کے اور بھی بہت سے قبائل کو ملا کر جنگ کے ارادہ سے نکل کھڑے ہوئے اور میدانِ احد میں جم کر لڑے، اس لڑائی میں مسلمانوں کا جو حال ہوا وہ ظاہر ہے، ان کا پورا امتحان ہو گیا، گو انجام کار مسلمانوں کا ہی بھلا ہوا، اور اچھا انجام تو اللہ سے ڈرنے والوں

کے لئے ہی ہے۔ اسی فاسق نے مسلمانوں اور کافروں کے درمیان بہت سے گڑھے کھود رکھے تھے، جن میں سے ایک میں اللہ کے رسول ﷺ گر پڑے، چہرے پر زخم آئے، سامنے سے نیچے کی طرف کے چار دانت شہید ہوگئے، سر بھی زخمی ہوا، شروع لڑائی کے وقت ہی ابو عامر فاسق اپنی قوم کے پاس گیا اور بہت ہی خوشامد اور چاپلوسی کی کہ تم میری مدد اور موافقت کرو، لیکن انہوں نے بالاتفاق جواب دیا کہ اللہ تیری آنکھیں ٹھنڈی نہ کرے تو نامراد ہے۔ اے بدکار! اے اللہ کے دشمن! تو ہمیں راہِ حق سے بہکانے کو آیا ہے، الغرض برا بھلا کہہ کر ناامید کر دیا گیا، یہ لوٹا اور یہ کہتا ہوا کہ میری قوم تو میرے بعد بہت ہی شریر ہوگئی ہے۔ مدینہ میں اس نانہجار کو رسول اللہ ﷺ نے بہت سمجھایا تھا قرآن پڑھ پڑھ کر نصیحت کی تھی اور اسلام کی رغبت دلائی تھی لیکن اس نے نہ مانا تھا تو حضور ﷺ نے اسکے لئے بددعا کی تھی کہ اللہ تعالیٰ اسے کہیں دور دراز ذلت و حقارت کے ساتھ موت دے۔ جب اس نے دیکھا کہ احد میں بھی اس کی چاہت پوری نہ ہوئی اور اسلام کا کلمہ بلندی پر ہی ہے تو یہ یہاں سے شاہِ روم ہرقل کے پاس پہنچا اور اسے رسول اللہ ﷺ سے لڑائی کے لئے آمادہ کیا، اس نے بھی اس سے وعدہ کر لیا اور تمنائیں دلائیں، اس وقت اس نے اپنے ہم خیال لوگوں کو جو منافقانہ رنگ میں مدینہ میں رہتے تھے اور جن کے دل اب تک شک و شبہ میں تھے لکھا کہ اب میں مسلمانوں کی جڑیں کاٹ دوں گا، میں نے ہرقل کو آمادہ کر دیا ہے، وہ لشکر جرار لے کر چڑھائی کرنے والا ہے، مسلمانوں کو ناک چنے جبوادے گا اور ان کا بیج بھی باقی نہ رکھے گا، تم ایک مکان مسجد کے نام سے تعمیر کرو تاکہ میرے قاصد جو آئیں وہ وہیں ٹھہریں، وہیں مشورے ہوں اور ہمارے لئے وہ پناہ گاہ اور محفوظ جگہ بن جائے، انہوں نے مسجد قبا کے پاس ہی ایک اور مسجد کی تعمیر شروع کر دی اور تبوک کی جنگ کے لئے آنحضرت ﷺ کی روانگی سے پہلے ہی اسے خوب مضبوط اور پختہ بنا لیا اور آکر آنحضرت ﷺ سے کہنے لگے کہ آپ ﷺ ہماری مسجد میں تشریف لائیے اور نماز ادا کیجئے تاکہ ہمارے لئے یہ بات حجت ہو جائے اور ہم وہاں نماز شروع کر دیں، ضعیف اور کمزور لوگوں کو دور جانے میں بڑی تکلیف ہوتی تھی، خصوصاً جاڑے کی راتوں میں کمزور، بیمار اور معذور لوگ دور دراز کی مسجد میں بڑی دقت سے پہنچتے ہیں، اس لئے ہم نے قریب ہی یہ مسجد بنالی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: اس وقت تو سفر در پیش ہے، پابہ رکاب ہوں، ان شاءاللہ واپسی میں سہی۔ اس طرح اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے نبی کو اس کفر کے مورچے سے بچا لیا، جب تبوک سے آپؐ سلامتی اور غنیمت کے ساتھ واپس لوٹے، ابھی مدینہ سے ایک دن یا کچھ کم کے فاصلے پر تھے کہ وحی نازل ہوئی اور اس مسجدِ ضرار کی حقیقت آپؐ پر ظاہر کر دی گئی اور اس کے بانیوں کی نیت کا بھی علم آپؐ کو کرا دیا گیا، اور وہاں کی نماز سے روک کر مسجد قبا میں جس کی بنیاد اللہ کے خوف پر رکھی گئی تھی، نماز پڑھنے کا حکم صادر ہوا۔ اس لئے آپؐ نے وہیں سے مسلمانوں کو بھیج دیا کہ جاؤ میرے پہنچنے سے پہلے اس مسجد کو منہدم کر دو۔ (تفسیر ابن جریر 23/11 الدلائل للبیھقی 262/5 سیرۃ ابن ھشام 173/4 تفسیر ابن کثیر 388/2)

<u>ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے واضح کیا ہے کہ اس مسجد کی تعمیر چار اسباب کی بنیاد پر کی گئی:</u>

۱: دوسروں کو ضرر اور نقصان پہنچانا۔

۲: اللہ کے ساتھ کفر اور اہلِ اسلام کے ساتھ مقابلہ آرائی، اس لئے کہ انہوں نے اس کی تعمیر کے ذریعہ اہلِ نفاق کو قوت فراہم کرنے کی کوشش کی تھی۔

۳: اہلِ ایمان کے درمیان تفریق ڈالنا، اس لئے کہ انہوں نے منصوبہ بنایا تھا کہ مسجد قبا نہیں جائیں گے جس کے ذریعہ مسلمانوں کی تعداد کم ہو جائے گی اور اس کے ذریعہ مسلمانوں کے درمیان تفریق ہو جائے گی۔

4: اللہ اور اس کے رسولؐ کے خلاف منصوبہ بندی کے لئے مرکز بنانا اور ان کو نقصان پہنچانے کے لئے تیاری کرنا۔ (دیکھیں: تفسیر الشوکانی: 2/403)

لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی تمام کوششوں اور سازشوں کو ناکام و نامراد بنادیا اور اپنے نبی کو اسے منہدم کرنے اور ڈھانے کا حکم دے دیا۔ ابن عاشورؒ کی رائے یہ ہے کہ تقویٰ کی بنیاد پر تعمیر کی گئی مسجد سے مراد ہر وہ مسجد ہے جو ان صفات کی بنیاد پر تعمیر کی گئی ہو، نہ کہ کوئی متعین مسجد، ورنہ اس میں صرف دو مسجدیں: مسجد نبوی اور مسجد قبا منحصر ہو جائیں گی۔ (التحریر والتنویر: 11/31)

مسجد ضرار کے واقعہ میں بہت سے دروس واسباق اور فوائد موجود ہیں جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

۱: کفر ایک ہی ملت ہے:

اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں ابو عامر راہب کے موقف سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کفر کی تمام طاقتیں ایک ہی ملت ہیں، جب بدر میں مشرکین کی ہزیمت دیکھ کر وہ سخت پریشان اور غضبناک ہوا اور اس کو تکلیف ہوئی تو اس نے رسول اللہ ﷺ کے خلاف عداوت کا اعلان کر دیا اور اس وقت شرک کے مرکز اور دار السلطنت مکہ کی جانب متوجہ ہوا، وہاں جا کر وہاں کے لوگوں کو مسلمانوں کے خلاف برانگیختہ کرنا شروع کر دیا، احد میں ان کے ساتھ جنگ میں خود شریک رہا اور اسلامی صفوں میں انتشار پیدا کرنے کی پوری کوشش کی، اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے: ﴿وَٱلَّذِينَ كَفَرُواْ بَعۡضُهُمۡ أَوۡلِيَآءُ بَعۡضٍۚ إِلَّا تَفۡعَلُوهُ تَكُن فِتۡنَةٌ فِي ٱلۡأَرۡضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ﴾ ترجمہ: "جو لوگ منکر حق ہیں وہ ایک دوسرے کی حمایت کرتے ہیں، اگر تم یہ نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد برپا ہو گا"۔ (سورۃ الانفال: 73)

۲: مسلمانوں پر تدلیس کی کوشش:

منافقین نے کوشش کی کہ اس تعمیر پر اس کے جائز و شرعی ہونے کی مہر لگا دیں اور یہ ثابت کریں کہ انہوں نے یہ مسجد ظاہری اعتبار سے قابل اطمئنان اسباب و وجوہات کی بنیاد پر بنائی ہے، وہ رسول اللہ ﷺ سے اس نئی عمارت میں نماز پڑھنے کا مطالبہ کرنے کے لئے آئے تاکہ وہ ایسی مسجد قرار پائے جس میں رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھ کر اس کو اپنی برکت سے سرفراز کیا ہے، اور اگر ایسا ہو جاتا تو ان کا مقصد پورا ہو جاتا، یہ ایک مکارانہ خبیث اسلوب ہے جو بہت سے لوگ اختیار کر کے اپنے اہداف پورے کر سکتے ہیں۔

۳: اللہ بہترین محافظ:

ایک قاری اور محقق کے سامنے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کس قدر اہتمام و توجہ اور حفاظت اور رعایت کا معاملہ کرتا ہے، اللہ عزوجل نے آپؐ کو ان منافقین کے خفیہ منصوبوں، ان کے رازوں اور اس مسجد کی تعمیر کے ذریعہ ان کے اصل ارادوں اور عزائم کے بارے میں باخبر کر دیا، اگر اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو ان تمام امور کے بارے میں آگاہ نہ کرتا تو اللہ کے رسولؐ ان کے عزائم و ارادوں کی حقیقت کو نہ جانتے، آپؐ اس عمارت میں نماز پڑھ لیتے، اس کو ظاہری طور پر قانونی اور شرعی حیثیت حاصل ہو جاتی اور لوگ بھی

اس میں نماز پڑھنے کے لئے آجاتے اور اس طرح سے منافقین اور کمزور ایمان والے ایک دوسرے کے ساتھ ملتے اور منافقین علٰحیدہ مل کر ان پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتے۔

۴: نبی کریم ﷺ کے ذریعہ حتمی اور دانشمندانہ علاج:

اللہ کے رسول ﷺ نے مسجدِ ضرار کو منہدم کرنے کا جو حکم دیا یہ اس سلسلہ میں بہترین علاج تھا، یہ امت کے قائدین کے لئے نبوی منہج اور طریقہ کار ہے کہ ہر وہ عمل جس کے ذریعہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانا اور ان کے درمیان تفریق پیدا کرنا مقصود ہو تو اس کی جڑیں ہی کاٹ دی جائیں، اس لئے کہ جان لیوا مرض کو دبا کر یا کم کر کے علاج نہیں کیا جا سکتا ہے، بلکہ اس کے علاج کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو سرے سے ہی ختم کیا جائے اور اس کے اثرات کو بھی زائل کر دیا جائے تاکہ وہ کسی دوسری صورت میں ظاہر نہ ہو، اللہ کے رسولؐ نے اس سلسلہ میں جو حکمتِ عملی اختیار فرمائی اس کے جو اثرات مسلمانوں نے محسوس کئے وہ حکمتِ عملی یہ واضح کرتی ہے کہ مسلم معاشرہ میں نفاق کی تحریک اور ان کے منصوبوں کو ختم کرنے کے لئے بہترین حکمتِ عملی اور طریقہ کار یہی ہے، چنانچہ اس کے بعد منافقین کے تمام منصوبے آہستہ آہستہ خاک میں ملتے چلے گئے، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کے اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت ان کی معمولی سی تعداد باقی رہی تھی اور مسجدِ ضرار کو منہدم کرنے کے لئے ان کی طرف سے اس طرح کا کوئی عمل دیکھنے کو نہیں ملا، اس لئے کہ ان کو اس کے نتائج کا اب اچھی طرح اندازہ تھا۔

۵: مسجدِ ضرار جیسی دوسری مساجد کا حکم:

مفسرین کرام نے ان مساجد اور عمارتوں کا ذکر کیا ہے جو مسجدِ ضرار کے حکم میں ہیں، چند اقوال مندرجہ ذیل ہیں:

علامہ زمخشریؒ فرماتے ہیں: ''.......ہر وہ مسجد جو فخر کی وجہ سے، ریاکاری کی وجہ سے یا شہرت کی وجہ سے تعمیر کی گئی ہو، یا اللہ کی خوشنودی یا رضاجوئی کے بجائے اور کسی مقصد سے تعمیر کی گئی ہو، یا ناجائز و حرام مال سے بنائی گئی ہو تو اس کا حکم بھی مسجدِ ضرار جیسا ہے''۔(تفسیر الزمخشری:2/310)

ڈاکٹر عبدالکریم زیدان نے علامہ زمخشریؒ کے قول پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے: لیکن کیا اس طرح کی عمارت مسجدِ ضرار کے حکم میں ہونے کی وجہ سے منہدم کی جائے گی، جیسے کہ مدینہ میں منافقین کے ذریعہ بنائی گئی مسجد منہدم کی گئی اور نبی کریم ﷺ نے اس کو منہدم کرنے کا حکم دیا؟! میں اس حق میں نہیں ہوں، بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ مسجد جو ان مقاصد کے تحت تعمیر کی گئی ہو وہ صرف اس اعتبار سے مسجدِ ضرار کے حکم میں ہوگی کہ وہ تقوی اور اخلاص کی بنیاد پر تعمیر نہیں کی گئی ہے۔(دیکھیں: المستفاد من قصص القرآن:1/504)

ب: علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں: ہمارے علماء فرماتے ہیں: ہر وہ مسجد جو ضرر اور نقصان پہنچانے کے لئے ریاکاری اور حصولِ شہرت کے لئے بنائی گئی ہو تو وہ مسجدِ ضرار کے حکم میں ہے جس میں نماز پڑھنا جائز نہیں ہے۔(تفسیر القرطبی:8/254)

ج: سید قطبؒ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں: ''یہ مسجدِ ضرار جو حضورؐ کے دور میں تعمیر ہوئی تھی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک گہری سازش تھی ،اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو نقصان پہنچایا جائے.......آج بھی دشمنانِ دین مختلف شکل و صورت میں مساجد ضرار بناتے رہتے ہیں اور دورِ جدید میں جدید وسائل کے مطابق اسلام کے خلاف سازشیں کرتے رہتے ہیں، بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص خالصتاً اسلام کے لئے کام کرتا ہوا

نظر آتا ہے، لیکن حقیقت میں وہ اسلام کی بیخ کنی کے لئے کام کرتا ہوتا ہے، اگر وہ اسلام کی بیخ کنی نہیں کر سکتا تو اس کی شکل بدلنے، اس کی چولیں ہلانے اور اسے لچکدار بنانے کا کام کرتا ہے، یہ مساجد ضرار ایسی ہوتی ہیں جن کے اوپر خدمتِ دین کا لیبل لگایا جاتا ہے اور خدمتِ دین کے لیبل کے نیچے سے دین پر تیر پھینکے جاتے ہیں، یہ مساجد ضرار انجمنوں، جماعتوں، کتابوں، تحقیقاتی اداروں اور ایسے کلبوں کی صورت میں ہیں جہاں لوگوں کے دلوں میں شک پیدا کیا جاتا ہے، ایسے لوگ شکی اور کمزور ایمان لوگوں کو شکار کرتے ہیں، جو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ اسلام ذبح ہوتا ہے لیکن ان کے ماتھے پر بل بھی نہیں پڑتا ہے، ایسے لوگ کمزور ایمان والے لوگوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ اسلام تو بالکل خیریت سے ہے اور ان کو بالکل بے فکر رہنا چاہیے اور پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے"۔(دیکھیں: فی ظلال القرآن:3/1710)

٦: مسجدِ ضرار کے حکم میں شامل ہونے والی عمارتوں کے بارے میں کلیہ:

ڈاکٹر عبدالکریم زیدان کہتے ہیں: ہر وہ چیز جس کا ظاہر مشروع ہو اور اس کے بنانے والے کسی کے غیر شرعی مقصد کا حصول چاہتے ہوں تو اس کا بھی حکم مسجدِ ضرار جیسا ہے، اس لئے کہ اپنی روح اور اپنے عناصر کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے، اگر ہم ایجاز واختصار کے ساتھ اس قاعدہ کو بیان کرنا چاہیں تو یوں کہیں گے: ہر وہ چیز جس کا ظاہر مشروع ہو اور اس کے بنانے والوں کا مقصد مسلمانوں کو نقصان پہنچانا ہو تو وہ بھی مسجدِ ضرار کے حکم میں ہے۔(دیکھیں: المستفاد من قصص القرآن:2/506)

٧: مسلم ممالک میں مساجد ضرار:

منافقین، ملحدین، مشنریز اور استعماری طاقتوں پر مشتمل اعدائے اسلام عبادت کے نام پر مختلف جگہیں بناتے ہیں، حالانکہ وہ عبادت کرنے کے لئے نہیں ہوتی ہیں، بلکہ ان کا مقصد اسلام پر طعن و تشنیع کرنا اور مسلمانوں کے عقائد واصول میں شکوک وشبہات پیدا کرنا ہے، اسی طرح وہ درس وتعلیم کے نام پر مدارس اور اسکول قائم کرتے ہیں تاکہ ان کے ذریعہ وہ مسلمان نوجوانوں کے افکار وعقائد کو زہر آلود کر سکیں اور ان کو ان کے دین سے دور کر سکیں، اسی طرح وہ کلچر کے نام پر کلب بناتے ہیں اور ان کے ذریعہ ان کا مقصد دلوں میں عقائد کو متزلزل کرنا اور اخلاقی اقدار میں بگاڑ پیدا کرنا ہوتا ہے، اسی طرح حفظانِ صحت اور انسانی خدمت کے نام پر ہسپتال قائم کرتے ہیں، ان کے ذریعہ ان کا مقصد بیماروں اور کمزوروں پر اثر انداز ہو کر ان کو دین سے دور کرنا ہوتا ہے، وہ غیر تعلیم یافتہ اور غریب سوسائٹی میں بطورِ خاص افریقی ممالک میں اس طرح کی چیزوں کو اپنے دینی مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں جس کی نہ عقل اجازت دیتی ہے اور نہ ہی کوئی شریعت و قانون اس کی اجازت دیتے ہیں۔
(دیکھیں: السیرۃ النبویہ، ابوشہبہ:2/508)

بلاشبہ مسجدِ ضرار صرف پہلے اسلامی معاشرہ میں پیش آنے والا ایسا واقعہ نہیں ہے جو پیش آیا اور ختم ہو گیا، بلکہ یہ باقی رہنے والی فکر ہے جس کی منصوبہ بندی خطرناک اہداف و مقاصد کے لئے کی جاتی ہے اور اس کے نفاذ کے لئے غیر محسوس وسائل اختیار کئے جاتے ہیں، اور ان تمام منصوبوں کا مقصد اسلام کے خلاف سازش کرنا اور اسلام کی شبیہ بگاڑ کر حقائق کو بدل کر شکوک وشبہات پیدا کر کے اور فتنوں کے بیج بو کر مسلمانوں کے خلاف سازشوں کا جال بچھانا ہے تاکہ لوگ دین سے دور ہوں اور ان کو ایسی چیزوں میں مشغول کیا جائے جو ان کو نقصان پہنچانے اور ان کے اخروی انجام کو تہس نہس کر دے۔(دیکھیں: الصراع مع الصلیبین، ص:182)

چوتھا باب

پیچھے رہ جانے والے تین صحابہ کا قصہ

ان تین صحابہ کرام کا واقعہ حضرت کعب بن مالکؓ کی زبانی سیرت، حدیث اور تفسیر کی مختلف کتابوں میں مختلف سندوں کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، ان روایات کے الفاظ باہم ملتے جلتے ہیں اور ہر دور میں ان کی تشرح و توضیح اور تدریس کا خاص اہتمام کیا گیا ہے، اور صحیح بخاری میں اس واقعہ کی تفصیلات باریک بینی اور وضاحت کے ساتھ منقول ہیں۔

ہم اس واقعہ کو حضرت کعب بن مالکؓ کی زبانی ہی سنتے ہیں، وہ فرماتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ نے جتنے غزوات کئے ہیں میں ان میں سے کسی غزوہ میں بھی آپ ﷺ سے پیچھے نہیں رہا، میں صرف غزوۂ تبوک میں پیچھے رہ گیا تھا، البتہ میں غزوۂ بدر میں بھی شریک نہیں تھا لیکن جنگ بدر سے پیچھے رہ جانے پر اللہ تعالیٰ نے کسی پر عتاب نہیں فرمایا، کیونکہ رسول اللہ ﷺ قریش کے ایک قافلہ کا ارادہ کرکے باہر نکلے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے وقت طے کئے بغیر مسلمانوں کا سامنا دشمن سے کرادیا۔ میں تو عقبہ کی رات بھی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا جہاں میں نے اسلام پر قائم رہنے کا مضبوط قول و قرار کیا تھا، اگرلوگوں میں غزوۂ بدر کی شہرت زیادہ ہے لیکن میں یہ بات پسند نہیں کرتا کہ مجھے بیعت عقبہ کے بدلہ میں غزوۂ بدر میں شرکت کا موقع ملا ہوتا۔ اور میرا قصہ یہ ہے کہ میں جس زمانہ میں غزوۂ تبوک سے پیچھے رہا، اتنا طاقت ور اور خوشحال تھا کہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا، اللہ کی قسم! اس سے پہلے میرے پاس دو اونٹنیاں کبھی جمع نہیں ہوئی تھیں جبکہ اس موقع پر میرے پاس دو اونٹنیاں موجود تھیں۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ قاعدہ تھا کہ جب کسی غزوہ میں جانے کا ارادہ کرتے تو اس کو مکمل طور پر ظاہر نہ کرتے بلکہ کسی اور مقام کا نام لیا کرتے تھے، لیکن یہ غزوہ چونکہ سخت گرمی میں ہوا اور طویل بیابان کا سفر تھا اور دشمن زیادہ تعداد میں تھے، اس لئے آپؐ نے مسلمانوں سے یہ معاملہ صاف صاف بیان کردیا تاکہ وہ اس جنگ کے لئے اچھی طرح تیار ہو جائیں، انہیں وہ سمت بھی بتلادی جس سمت آپؐ جانا چاہتے تھے، رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مسلمان کثیر تعداد میں تھے اور کوئی رجسٹر یا دفتر وغیرہ نہ تھا جس میں ان کے نام محفوظ ہوتے۔ حضرت کعبؓ کہتے ہیں کہ صورتِ حال ایسی تھی کہ جو شخص لشکر میں سے غائب ہونا چاہتا وہ یہ سوچتا تھا کہ میری غیر حاضری کا اسی وقت تک کسی کو پتہ نہ چل سکے گا جب تک کہ اس کے بارے میں وحی کا نزول نہ ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے اس جنگ کا ارادہ ایسے وقت میں کیا تھا جب پھل پک چکے تھے اور ہر طرف سایہ عام تھا۔ خیر رسول اللہ ﷺ نے اور آپؐ کے ساتھ دیگر مسلمانوں نے بھی سفر کا سامان تیار کرنا شروع کیا، میری کیفیت یہ تھی کہ میں صبح اس ارادے سے نکلتا کہ میں بھی باقی مسلمانوں کے ساتھ مل کر تیاری کروں گا لیکن جب شام کو واپس آتا تو کوئی فیصلہ نہ کرسکا ہوتا، پھر میں اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لیتا کہ میں تیاری مکمل کرنے پر پوری طرح قادر ہوں، اسی طرح وقت گزرتا رہا حتیٰ کہ لوگوں نے زور شور سے تیاری کرلی، پھر رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے ساتھ مسلمان روانہ ہوگئے جبکہ میں اپنی تیاری کے سلسلہ میں کچھ بھی نہ کرسکا، میں نے اپنے دل میں یہ کہا کہ میں آپ کی روانگی کے ایک یا دو دن بعد تیاری مکمل کرلوں گا اور ان سے جاملوں گا، لیکن ان کے روانہ ہو جانے کے بعد بھی یہی کیفیت رہی کہ صبح کے وقت تیاری

کے خیال سے نکلا لیکن جب گھر لوٹا تو وہی کیفیت تھی، یعنی کچھ بھی نہ کر سکا۔ پھر دوسری صبح کو بھی اسی خیال سے نکلا لیکن واپس آیا تو کچھ نہ کر پایا، میری کیفیت مسلسل یہی رہی یہاں تک کہ مسلمان تیز تیز چل کر آگے بڑھ گئے، میں نے پھر ارادہ کیا کہ میں بھی چل پڑوں اور ان سے جا ملوں، کاش کہ میں نے ایسا کر لیا ہوتا! لیکن یہ سعادت میرے مقدر ہی میں نہ تھی۔ رسول اللہ ﷺ کے جانے کے بعد حالت یہ تھی کہ جب میں باہر لوگوں کے پاس جاتا اور ان میں چل پھر کر دیکھتا تو جو بات مجھے غمگین کرتی یہ تھی کہ جو شخص نظر آتا وہ صرف ایسا شخص ہوتا جس پر نفاق کا الزام تھا، یا پھر وہ ضعیف اور کم زور لوگ تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے معذور قرار دیا تھا۔ ادھر رسول اللہ ﷺ نے راستے میں تو مجھے کہیں بھی یاد نہ فرمایا، مگر جب تبوک پہنچ گئے اور ایک موقع پر لوگوں کے ساتھ تشریف فرما تھے تو آپؐ نے فرمایا: "کعب کا کیا ہوا؟"۔ بنو سلمہ کے ایک شخص نے کہا: اللہ کے رسولؐ! اسے صحت و خوشحالی کی دو چادروں نے روک رکھا ہے اور وہ اپنی ان چادروں کے کناروں کو دیکھنے میں مشغول ہو گا۔ یہ سن کر حضرت معاذ بن جبلؓ نے اس سے کہا: تم نے بہت بُری بات کہی ہے۔ اللہ کے رسول! اللہ کی قسم! ہم نے کعب میں بھلائی کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ یہ گفتگو سن کر رسول اللہ ﷺ خاموش ہو گئے۔

کعب بن مالکؓ کا بیان ہے کہ جب مجھے یہ خبر ملی کہ آپؐ واپس آرہے ہیں تو خیال ہوا کہ کوئی حیلہ سوچنا چاہئے تاکہ آپ کی ناراضگی سے بچ جاؤں، نیز میں نے اس سلسلہ میں اپنے خاندان کے ہر صاحبِ عقل شخص سے مدد مانگی۔ پھر جب یہ اطلاع ملی کہ رسول اللہ ﷺ (شہر کے) قریب آگئے ہیں تو یہ خیال باطل میرے قلب سے نکل گیا اور میں نے یقین کر لیا کہ جھوٹ بول کر آپ کی ناراضی سے نہیں بچ سکوں گا، اس لئے میں نے سچ بولنے کا ارادہ کر لیا۔ رسول اللہ ﷺ صبح کے وقت تشریف لائے اور آپؐ کا دستور تھا کہ جب سفر سے واپس آتے تو سب سے پہلے مسجد میں جا کر دو رکعت نماز پڑھتے، پھر لوگوں سے ملاقات کے لئے تشریف فرما ہوتے، چنانچہ جب آپؐ نماز سے فراغت کے بعد ملاقات کے لئے بیٹھے تو پیچھے رہ جانے والوں نے آنا شروع کیا اور قسمیں اٹھا کر آپ کے سامنے طرح طرح کے عذر پیش کرنے لگے۔ ان لوگوں کی تعداد اَسی سے کچھ زیادہ تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے بیان کردہ عذر قبول کر لئے، ان سے بیعت لی اور ان کے لئے مغفرت کی دعا فرمائی اور ان کی نیتوں کو اللہ کے حوالے کر دیا۔ الغرض میں بھی آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے جب آپ کو سلام کیا تو آپ مسکرائے لیکن ایسی مسکراہٹ جس میں غصے کی آمیزش تھی۔ پھر آپؐ نے فرمایا: ''ادھر آؤ''۔ میں آگے بڑھا اور آپ کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔ آپؐ نے دریافت فرمایا: ''تم کیوں پیچھے رہ گئے؟ تم نے سواری نہیں خریدی تھی؟'' میں نے عرض کی: بجا ارشاد! اللہ کی قسم! میں اگر آپ کے علاوہ کسی اور دنیاوی شخصیت کے سامنے ہوتا تو ضرور یہ خیال کرتا کہ میں کسی عذر بہانے سے اس کے غضب سے نجات پا سکتا ہوں کیونکہ میں قوتِ گویائی اور دلیل بازی میں ماہر ہوں۔ لیکن اللہ کی قسم! مجھے یقین ہے کہ اگر آج میں آپ کے سامنے جھوٹ بول کر آپ کو راضی بھی کر لوں تو عنقریب اللہ آپ کو حقیقت حال سے آگاہ کر دے گا اور آپ مجھ سے ناراض ہو جائیں گے۔ اور اگر میں آپ سے ساری بات سچ سچ بیان کر دوں تو آپ مجھ سے ناراض تو ہوں گے، تاہم مجھے امید ہے کہ اس صورت میں اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرما دے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ اللہ کی قسم! مجھے کوئی معذوری نہیں تھی اور یہ حقیقت ہے کہ اللہ کی قسم! میں اتنا تنومند اور خوشحال کبھی نہ تھا جتنا میں اس موقع پر تھا جس

میں آپ کے ساتھ جانے سے رہ گیا۔ میری یہ گفتگو سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "یہ شخص ہے جس نے صحیح بات بتائی ہے، اچھا جاؤ اور انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ تمہارے بارے میں کوئی فیصلہ صادر فرمائے"۔

میں اٹھ گیا اور جب میں جانے لگا تو بنو سلمہ کے کچھ لوگ میرے گرد جمع ہو گئے اور میرے پیچھے چلنے لگے، انہوں نے کہا: اللہ کی قسم! ہمارے علم میں نہیں ہے کہ تم نے آج سے پہلے کبھی کوئی گناہ کیا ہو تو تم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عذر پیش کرنے سے کیوں قاصر رہے جیسا کہ دوسرے پیچھے رہ جانے والوں نے آپ کی خدمت میں عذر پیش کئے ہیں؟! تم نے جو گناہ کیا تھا اس کی تلافی کے لئے تو رسول اللہ ﷺ کا تمہارے لئے استغفار ہی کافی تھا۔ اللہ کی قسم! ان لوگوں نے مجھے اتنی ملامت کی کہ ایک دفعہ تو میں نے ارادہ کر لیا کہ میں واپس جاؤں اور جو کچھ میں نے آپ سے کہا تھا اس کے متعلق کہوں کہ وہ جھوٹ تھا۔ پھر میں نے ان لوگوں سے پوچھا: یہ معاملہ جو میرے ساتھ پیش آیا ہے میرے علاوہ کسی اور کے ساتھ بھی ہوا ہے؟ وہ کہنے لگے: ہاں، دو آدمیوں نے بھی وہی کچھ کہا ہے جو تم نے کہا ہے اور ان کو بھی وہی جواب ملا جو آپ کو ملا ہے۔ میں نے پوچھا: وہ دونوں کون ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ ایک حضرت مرارہ بن ربیع العمریؓ اور دوسرے حضرت ہلال بن امیہ واقفیؓ ہیں۔ انہوں نے میرے سامنے دو نیک آدمیوں کے نام لئے جو غزوۂ بدر میں شرکت کر چکے تھے اور ان کا طرزِ عمل میرے لئے قابلِ تقلید تھا، چنانچہ ان دونوں کا ذکر سن کر میں (نے اپنا ارادہ بدل دیا اور) آگے چل پڑا۔ اور رسول اللہ ﷺ نے باقی تمام پیچھے رہ جانے والوں میں سے صرف ہم تینوں کے ساتھ بات چیت کرنے سے لوگوں کو منع فرما دیا تھا، لہذا لوگ ہم سے دور دور رہنے لگے اور ہمارے لئے اس حد تک بدل گئے کہ میں محسوس کرنے لگا کہ کوئی اجنبی سرزمین ہے، ہم پچاس دن تک اسی حال میں رہے، دوسرے دونوں ساتھی تو تھک ہار کر گھر میں بیٹھ گئے اور روتے رہے لیکن میں چونکہ سب میں جوان اور طاقتور تھا، لہذا باہر نکلا کرتا تھا، مسلمانوں کے ساتھ نماز میں شریک ہوا کرتا اور بازاروں میں پھرا کرتا تھا لیکن مجھ سے کوئی شخص بات نہ کرتا، میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بھی اس وقت حاضر ہوتا جب آپؐ نماز کے بعد لوگوں کے ساتھ تشریف فرما ہوتے، میں جب آپؐ کو سلام کرتا تو اپنے دل میں یہی سوچتا رہتا کہ آیا میرے سلام کے جواب میں رسول اللہ ﷺ کے لبِ مبارک متحرک ہوئے تھے یا نہیں؟ پھر میں آپؐ کے قریب ہی نماز پڑھتا اور دزدیدہ نظروں سے آپؐ کی طرف دیکھتا، جب میں نماز کی طرف متوجہ ہوتا تو آپؐ میری طرف دیکھتے اور جب میں آپؐ کی طرف توجہ کرتا تو آپؐ دوسری طرف دیکھنے لگتے۔ جب لوگوں کی یہ بے اعتنائی بہت طویل اور ناقابل برداشت ہو گئی تو ایک دن میں حضرت ابو قتادہؓ کے باغ کی دیوار پھلانگ کر اندر چلا گیا، یہ صاحب میرے چچازاد بھائی اور میرے محبوب ترین دوست تھے، میں نے انہیں سلام کیا لیکن اللہ کی قسم! انہوں نے میرے سلام کا جواب نہ دیا، میں نے ان سے کہا: اے ابو قتادہ! میں تمہیں اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں، کیا تم مجھے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا دوست جانتے ہو؟ لیکن وہ خاموش رہے۔ میں نے ان سے دوبارہ یہی سوال کیا لیکن وہ پھر خاموش رہے، میں نے پھر یہی بات دہرائی تو کہنے لگے: اللہ اور اس کے رسول ﷺ ہی بہتر جانتے ہیں۔ یہ سن کر میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور میں منہ موڑ کر واپس چلا آیا اور دیوار پھلانگ کر باہر آ گیا۔

حضرت کعبؓ کا بیان ہے کہ ایک دن میں مدینہ کے بازار سے گزر رہا تھا، میں نے دیکھا کہ علاقہ شام کا ایک نبطی جو مدینہ میں غلہ فروخت کرنے آیا تھا لوگوں سے پوچھ رہا تھا: کوئی شخص ہے جو مجھے کعب بن مالک کا بتا سکے؟ لوگ میری طرف اشارہ کر کے اسے بتانے لگے، جب وہ میرے پاس آیا تو اس نے مجھے شاہِ غسان کا ایک خط دیا جس میں لکھا ہوا تھا: مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے صاحب نے تم پر زیادتی کی ہے، حالانکہ تمہیں اللہ نے اس لئے نہیں بنایا کہ تم ذلیل وخوار اور بُرباد رہو، لہذا تم ہمارے پاس چلے آؤ، ہم تمہیں شایان شان عزت ومرتبہ دیں گے۔ میں نے جب یہ خط پڑھا تو دل میں کہا: یہ بھی ایک امتحان ہے اور وہ خط لے کر تنور کی طرف گیا اور اسے نذرِ آتش کر دیا، پھر جب پچاس دنوں میں سے چالیس راتیں گزر گئیں تو میرے پاس رسول اللہ ﷺ کا ایک قاصد آیا اور کہنے لگا: رسول اللہ ﷺ نے تمہیں حکم دیا ہے کہ تم اپنی رفیقۂ حیات سے کنارہ کش ہو جاؤ۔ میں نے کہا: کیا میں اسے طلاق دے دوں؟ یا پھر کیا کروں؟ اس نے کہا: نہیں، بس اس سے کنارہ کش ہو جاؤ اور اس کے قریب نہ جاؤ۔ میرے دونوں ساتھیوں کو بھی اسی قسم کا حکم دیا گیا تھا۔ میں نے اپنی بیوی سے کہا: تم اپنے میکے چلی جاؤ اور جب تک اللہ تعالیٰ اس معاملہ کا فیصلہ صادر نہ فرمادے وہیں مقیم رہو۔

حضرت کعبؓ کا بیان ہے کہ حضرت ہلال بن امیہؓ کی بیوی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا: اللہ کے رسولؐ! ہلال بن امیہؓ ایک ناتواں اور بوڑھا شخص ہے، اس کے پاس کوئی خادم بھی نہیں تو کیا آپ یہ بھی ناپسند فرمائیں گے کہ میں ان کی خدمت کرتی رہوں؟ آپؐ نے فرمایا: ''نہیں، لیکن وہ تمہارے قریب نہ آئے''۔ اس نے کہا: اللہ کی قسم! انہیں تو کسی بات کا ہوش ہی نہیں اور جس دن سے یہ معاملہ پیش آیا ہے وہ مسلسل رو رہے ہیں۔ یہ سن کر میرے بعض اہلِ خانہ نے مشورہ دیا کہ اگر تم بھی رسول اللہ ﷺ سے اپنی بیوی کے سلسلہ میں اجازت لے لو تو کیا حرج ہے جیسے آپ نے حضرت ہلال بن امیہؓ کی بیوی کو خدمت کرنے کی اجازت دے دی ہے؟ میں نے کہا: اللہ کی قسم! میں اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ سے اجازت ہرگز نہیں طلب کروں گا۔ نامعلوم میرے اجازت طلب کرنے پر آپ کیا جواب دیں جبکہ میں ایک نوجوان آدمی ہوں۔ الغرض اس کے بعد دس دن اور گزر گئے حتیٰ کہ جس دن سے رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو ہمارے ساتھ بائیکاٹ کرنے کا حکم دیا تھا، اس دن سے پچاس دن پورے ہو گئے۔

پچاسویں رات کی صبح کو میں اپنے ایک گھر کی چھت پر نمازِ فجر سے فراغت کے بعد بیٹھا ہوا تھا اور میری حالت بعینہ وہی تھی جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے کیا ہے کہ میں اپنی جان سے تنگ تھا اور زمین اپنی فراخی کے باوجود میرے لیے تنگ ہو چکی تھی کہ اچانک میں نے کسی پکارنے والے کی آواز سنی جو کوہ سلع پر چڑھ کر اپنی بلند ترین آواز میں پکار رہا تھا: اے کعب بن مالک! خوشخبری حاصل کرو۔ میں یہ سنتے ہی سجدے میں گر گیا اور سمجھ گیا کہ آزمائش کا وقت ختم ہو گیا ہے، دراصل رسول اللہ ﷺ نے نمازِ فجر کے بعد اعلان فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمالی ہے، لہذا لوگ ہمیں خوشخبری دینے کے لئے دوڑ پڑے۔ کچھ لوگ خوشخبری دینے کے لئے میرے دوسرے دونوں ساتھیوں کی طرف گئے اور ایک شخص گھوڑا دوڑا کر میری طرف چلا اور ایک دوڑنے والا جو قبیلۂ اسلم کا فرد تھا دوڑ کر پہاڑ پر چڑھ گیا اور اس کی آواز گھوڑے سے تیز نکلی، لہذا یہ شخص جس کی آواز میں، میں نے خوشخبری سنی تھی میرے پاس پہنچا تو میں نے اپنے کپڑے اتار کر خوشخبری دینے والے کو انعام میں پہنا دیئے۔

اللہ کی قسم! میرے پاس اس دن ان کپڑوں کے علاوہ کوئی جوڑا نہ تھا، لہذا میں نے دو کپڑے ادھار لے کر پہنے اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں جانے کے لئے چل پڑا۔ لوگ گروہ در گروہ مجھ سے ملتے اور توبہ قبول ہونے کی مبارک دیتے ہوئے کہتے: تم کو مبارک ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری توبہ قبول فرمالی اور تمہیں معاف کر دیا۔ حضرت کعبؓ بیان کرتے ہیں کہ جب میں مسجد میں پہنچا تو رسول اللہ ﷺ تشریف فرما تھے اور لوگ آپ کے ارد گرد بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ دوڑتے ہوئے آئے اور انہوں نے مصافحہ کیا اور مجھے مبارکباد دی۔ اللہ کی قسم! مہاجرین میں سے ان کے علاوہ اور کوئی شخص میری طرف اٹھ کر نہیں آیا اور حضرت طلحہؓ کے اس سلوک کو میں کبھی نہیں بھولا۔

حضرت کعبؓ کا بیان ہے کہ جب میں نے رسول اللہ ﷺ کو سلام کیا تو آپؐ نے خوشی سے دمکتے ہوئے چہرے کے ساتھ فرمایا: "تمہیں آج کا دن مبارک ہو۔ یہ دن ان تمام دنوں میں سے سب سے بہتر ہے جو تمہاری پیدائش کے بعد سے آج تک تم پر گزرے ہیں"۔ میں نے عرض کیا: اللہ کے رسولؐ! یہ (معافی) آپ کی طرف سے ہے یا اللہ کی طرف سے؟ آپؐ نے فرمایا: "نہیں، یہ معافی اللہ کی طرف سے ہے"۔ رسول اللہ ﷺ جس وقت خوش ہوتے تو آپ کا چہرۂ مبارک اس طرح دمک اٹھتا جیسے وہ چاند کا ٹکڑا ہو اور ہم اس چہرے کو دیکھ کر جان لیا کرتے تھے کہ آپ خوش ہیں۔ الغرض جب میں آپ کے سامنے بیٹھا تو میں نے عرض کیا: اللہ کے رسولؐ! میں اس توبہ کی خوشی میں چاہتا ہوں کہ اپنا مال اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لئے بطور صدقہ دوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "سب نہیں، اپنا کچھ مال اپنے پاس بھی رکھو کیونکہ ایسا کرنا تمہارے لئے بہتر ہوگا"۔ میں نے عرض کیا: اچھا میں اپنا وہ حصہ جو خیبر میں ہے (اپنے پاس) روک لیتا ہوں۔ پھر میں نے عرض کیا: اللہ کے رسولؐ! چونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے صرف سچ بولنے کی برکت سے نجات دی ہے، اس لئے میں اپنی توبہ کی (قبولیت کی) خوشی میں یہ عہد کرتا ہوں کہ جب تک زندہ رہوں گا ہمیشہ سچ بات کہوں گا، چنانچہ اللہ کی قسم! میرے علم میں ایسا کوئی مسلمان نہیں جسے سچ بولنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اتنے خوبصورت انداز میں نوازا ہو جس قدر حسین و خوبصورت انداز میں اس نے مجھے نوازا ہے جس دن سے میں نے رسول اللہ ﷺ کے روبرو یہ عہد کیا تھا۔ میں نے جس دن رسول اللہ ﷺ سے یہ بات کہی اس دن سے آج تک کبھی قصداً جھوٹ نہیں بولا اور مجھے توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ باقی ماندہ زندگی میں بھی مجھے جھوٹ سے محفوظ رکھے گا۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ پر یہ آیات نازل فرمائیں: ﴿لَّقَد تَّابَ ٱللَّهُ عَلَى ٱلنَّبِيِّ وَٱلۡمُهَٰجِرِينَ وَٱلۡأَنصَارِ ٱلَّذِينَ ٱتَّبَعُوهُ فِي سَاعَةِ ٱلۡعُسۡرَةِ مِنۢ بَعۡدِ مَا كَادَ يَزِيغُ قُلُوبُ فَرِيقٖ مِّنۡهُمۡ ثُمَّ تَابَ عَلَيۡهِمۡۚ إِنَّهُۥ بِهِمۡ رَءُوفٞ رَّحِيمٞ ۝١١٧ وَعَلَى ٱلثَّلَٰثَةِ ٱلَّذِينَ خُلِّفُواْ حَتَّىٰٓ إِذَا ضَاقَتۡ عَلَيۡهِمُ ٱلۡأَرۡضُ بِمَا رَحُبَتۡ وَضَاقَتۡ عَلَيۡهِمۡ أَنفُسُهُمۡ وَظَنُّوٓاْ أَن لَّا مَلۡجَأَ مِنَ ٱللَّهِ إِلَّآ إِلَيۡهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيۡهِمۡ لِيَتُوبُوٓاْۚ إِنَّ ٱللَّهَ هُوَ ٱلتَّوَّابُ ٱلرَّحِيمُ ۝١١٨ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱتَّقُواْ ٱللَّهَ وَكُونُواْ مَعَ ٱلصَّٰدِقِينَ ۝١١٩﴾ ترجمہ: "اللہ نے رحمت کی نظر کی نبی پر اور ان مہاجرین اور انصار پر جنہوں نے نبی کی پیروی کی مشکل کی گھڑی میں، اس کے بعد کہ قریب تھا کہ دل ٹیڑھے ہو جائیں ان میں سے ایک گروہ کے۔ پھر اللہ نے ان پر رحمت کی نگاہ کی۔ بیشک وہ ان پر نہایت مہربان اور رحم کرنے

والا ہے۔ اور ان تینوں پر بھی (نظرِ رحمت فرمائی) جن کا معاملہ اٹھار کھا گیا تھا۔ یہاں تک کہ جب ان پر زمین تنگ ہوگئی باوجود کشادہ ہونے کے اور تنگ ہوگئیں ان پر ان کی جانیں اور وہ سمجھ گئے کہ کہیں پناہ نہیں اللہ سے مگر اسی کی طرف۔ پھر اللہ نے ان پر عنایت کی نظر کی تاکہ وہ توبہ کریں۔ بیشک اللہ تعالیٰ ہی ہے بہت توبہ قبول فرمانے والا اور ہمیشہ رحم کرنے والا۔ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور سچے لوگوں کے ساتھ رہو''۔ (التوبہ:117-119)

حضرت کعبؓ فرماتے ہیں: اللہ کی قسم! جب سے مجھے اللہ نے دین اسلام کی رہنمائی فرمائی ہے اس کے بعد سے اللہ تعالیٰ نے مجھے جو نعمتیں عطا فرمائی ہیں ان میں سب سے عظیم نعمت میرے نقطۂ نگاہ سے یہ ہے کہ مجھے رسول اللہ ﷺ کے سامنے سچ بولنے کی توفیق عطا فرمائی اور میں جھوٹ بول کر ہلاک نہ ہوا جیسے دوسرے وہ لوگ ہلاک ہوگئے جنہوں نے جھوٹ بولا تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے نزولِ وحی کے وقت ان لوگوں کے متعلق ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں جس سے زیادہ بُرے الفاظ کسی اور کے لئے استعمال نہیں فرمائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿سَيَحۡلِفُونَ بِٱللَّهِ لَكُمۡ إِذَا ٱنقَلَبۡتُمۡ إِلَيۡهِمۡ لِتُعۡرِضُواْ عَنۡهُمۡۖ فَأَعۡرِضُواْ عَنۡهُمۡۖ إِنَّهُمۡ رِجۡسٞۖ وَمَأۡوَىٰهُمۡ جَهَنَّمُ جَزَآءَۢ بِمَا كَانُواْ يَكۡسِبُونَ ۝٩٥ يَحۡلِفُونَ لَكُمۡ لِتَرۡضَوۡاْ عَنۡهُمۡۖ فَإِن تَرۡضَوۡاْ عَنۡهُمۡ فَإِنَّ ٱللَّهَ لَا يَرۡضَىٰ عَنِ ٱلۡقَوۡمِ ٱلۡفَٰسِقِينَ ۝٩٦﴾ ترجمہ: ''منافقین تمہاری واپسی پر تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے درگزر کرو، پس تم ان سے اعراض کرو بے شک وہ ناپاک ہیں اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے، بدلہ اس کا جو وہ کمایا کرتے تھے۔ یہ لوگ تمہارے سامنے قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے خوش ہو جاؤ، پس اگر تم ان سے خوش ہو بھی گئے تو اللہ ان بدعہد لوگوں سے راضی ہونے والا نہیں''۔ (التوبہ:95-96)

حضرت کعبؓ کا بیان ہے: ہم تینوں کا معاملہ ان لوگوں کے معاملہ سے مؤخر کر دیا گیا تھا جن کے عذر رسول اللہ ﷺ نے ان کی قسموں کی وجہ سے قبول کر لئے تھے ان سے بیعت لے لی تھی اور ان کے گناہ معاف ہونے کی دعا بھی فرمادی تھی اور ہمارے مقدر کا فیصلہ معلق کر دیا تھا یہاں تک کہ اللہ نے خود اس کا فیصلہ فرمایا۔ اس کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے: "اور ان تینوں پر بھی (اللہ نے توجہ فرمائی) جن کا فیصلہ مؤخر کر دیا گیا تھا۔ (ان کی توبہ بھی قبول کی گئی)"۔ اس آیت میں خُلِّفُوا سے مراد یہ نہیں کہ انہیں جہاد سے پیچھے چھوڑ دیا گیا بلکہ اس سے مراد یہی ہے کہ انہیں معلق کر دیا گیا اور ان کے مقدر کا فیصلہ مؤخر کر دیا گیا تھا جبکہ ان لوگوں کے عذر قبول کر لئے گئے تھے جنہوں نے قسمیں اٹھا اٹھا کر عذر پیش کئے تھے''۔ (صحیح البخاري:4418 صحیح مسلم:2769)

اس واقعہ میں بہت سے دروس واسباق اور فوائد ہیں جن میں سے چند مندرجہ ذیل سطور میں ذکر کئے جاتے ہیں:

ا: خوبصورت اسلوب، عمدہ بیان اور اعلیٰ ادب:

اس حدیث کو خوبصورت اسلوب، عمدہ بیان اور اعلیٰ ادبی چاشنی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، یہ صلح حدیبیہ اور واقعۂ افک سے متعلق احادیث کی طرح ادب عربی کا بہترین اور اعلیٰ نمونہ سمجھا جاتا ہے، کاش نصابِ تعلیم تیار کرنے والے اس طرح کی احادیث کو شاملِ نصاب کر کے طلبہ کی صلاحیتوں کو پروان چڑھاتے اور ان کی ادبی اور لغوی صلاحیت کو نکھارنے کے لئے ان کا انتخاب کرتے۔

۲: سچائی میں نجات ہے:

حضرت کعبؓ، حضرت ہلالؓ اور حضرت مرارہؓ کو جھوٹ کے خطرناک نتائج کا ادراک تھا، اس لئے انہوں نے سچائی اور صراحت کا طریقہ اختیار کرنے کا عزم کیا، اگرچہ ان کو اس سلسلہ میں مشکلات و مصائب کا سامنا ہی کیوں نہ کرنا پڑا، لیکن اللہ کے بارے میں وہ پُر امید تھے کہ وہ ان کی توبہ قبول کرے گا اور وہ از سر نو اسلامی صف میں شامل ہو جائیں گے۔

۳: تربیتی بائیکاٹ اور معاشرہ پر اس کے اثرات:

بلاشبہ نبوی بائیکاٹ کے مسلم معاشرہ کی تربیت کے سلسلہ میں عظیم فوائد ہیں، اس کے ذریعہ مسلم معاشرہ استقامت پر قائم رہتا ہے، اس کے افراد ہر قسم کی غلطی اور نافرمانی سے باز رہتے ہیں، اس لئے کہ جس کو بھی اس بات کا ڈر ہو کہ اگر اس کی طرف سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی تو اس کو سوسائٹی کے تمام افراد کی طرف سے بائیکاٹ کیا جائے گا، اس لئے وہ اس طرح کے فعل کے اقدام کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا ہے۔

یہ بات واضح رہے کہ اس طرح کا حکم نافذ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اسی طرح کے حالات میں نافذ کیا جائے جیسے کہ عہد نبوی میں مسلمانوں کے حالات تھے، جہاں کنٹرول کرنے والی حکومت اور طاقتور معاشرہ ہو اور جس پر اس حکم کا نفاذ کیا جائے اس کے کسی فتنہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔

یہ تربیتی بائیکاٹ اس بائیکاٹ سے مختلف ہے جو مسلمانوں کے مابین دنیاوی امور کے بارے میں ہوتا ہے، دینی اور دنیاوی بائیکاٹ میں بہت بڑا فرق ہے، دینی بائیکاٹ ایک شرعی ضرورت ہے جو اجر و ثواب کا باعث ہے اور جہاں تک دنیاوی بائیکاٹ کا تعلق ہے تو وہ ناپسندیدہ عمل ہے اور اگر وہ تین روز سے زائد ہو تو اس صورت میں وہ حرام ہے، اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: "کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ ترکِ تعلق کرے، وہ ایک دوسرے سے ملتے ہوں اور پھر یہ اُس سے اعراض کرے اور وہ اِس سے اعراض کرے اور ان دونوں میں سے سب سے زیادہ بہتر وہ ہے جو سلام کرنے میں پہل کرے"۔ (صحیح بخاری: 6237، صحیح مسلم: 2560) اور دوسری حدیث میں آپ ﷺ کا فرمان ہے: "جس نے اپنے بھائی سے ایک سال تک ترکِ تعلق رکھا تو یہ اس کے خون بہانے اور قتل کرنے کے برابر ہے"۔ (مسند أحمد: 4/220، سنن ابوداؤد: 4915، مستدرک حاکم: 4/163، الأدب المفرد للبخاری: 404)

۴: مسلم معاشرہ کے تمام افراد کا قیادت کے اوامر کا نفاذ کرنا:

قائدِ اعلیٰ کی طرف سے جیسے ہی بائیکاٹ اور ترکِ تعلق کا حکم صادر ہوا تو مسلم معاشرہ کے تمام افراد نے اس پر من و عن عمل کیا اور سب نے ان تین صحابہ کرام سے بات کرنا ترک کر دی، حضرت کعبؓ اس کی منظر کشی کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "....لہذا لوگ ہم سے دور دور رہنے لگے اور ہمارے لئے اس حد تک بدل گئے کہ میں محسوس کرنے لگا کہ کوئی اجنبی سرزمین ہے، ہم پچاس دن تک اسی حال میں رہے، دوسرے دونوں ساتھی تو تھک ہار کر گھر میں بیٹھ گئے اور روتے رہے لیکن میں چونکہ سب میں جوان اور طاقتور تھا، لہذا باہر نکلا کرتا تھا، مسلمانوں کے ساتھ نماز میں شریک ہوا کرتا اور بازاروں میں پھرا کرتا تھا لیکن مجھ سے کوئی شخص بات نہ کرتا......"۔

حضرت کعبؓ نے اپنے چچازاد بھائی ابو قتادہؓ کو سلام کیا، تو انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور کئی مرتبہ ان کو یہ کہہ کر پکارا: کیا تم میرے بارے میں جانتے ہو کہ میں اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہوں؟ تو وہ خاموش رہے، حالانکہ وہ ان کے نزدیک محبوب ترین شخص تھے،

حضرت ابو قتادہؓ کے سامنے اس موقع پر دو موقف تھے: یا تو وہ اپنے نزدیک محبوب اور عزیز شخص کی بات کا جواب دیں یا پھر تربیتی بائیکاٹ کے نبوی حکم کو نافذ کریں، لیکن وہ کسی پس و پیش اور تردد کا شکار نہیں ہوئے، حضرت ابو قتادہؓ کے ایمان نے تقاضا کیا کہ اس موقع پر نبی کریم ﷺ کے حکم کی تنفیذ کی جائے۔

یہ ترکِ تعلق اس وقت اپنی آخری حد کو پہنچ گیا جبکہ ان تینوں اصحاب کو رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیویوں سے علیحدگی اختیار کرنے کا حکم دیا اور سب نے اس کی بھی پابندی کی اور حضرت ہلال بن اُمیہ کی بیوی نے اس بات کی اجازت طلب کی کہ وہ اپنے شوہر کی خدمت کرنا چاہتی ہے، اس لئے کہ ان کے شوہر حضرت ہلال ایک سن رسیدہ بزرگ ہیں اور کوئی ان کی خدمت کرنے والا نہیں ہے، نبی کریم ﷺ نے اس شرط کے ساتھ ان کو اجازت دی کہ وہ ان کے قریب نہ جائیں اور انہوں نے اس کا پورا اہتمام والتزام کیا۔

۵: اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ مکمل وفاداری:

صلیبی دشمن اس موقع کے انتظار میں تھا، وہ اس صورتحال کی ٹوہ میں لگا تھا اور اس کو داخلی انتشار پیدا کرنے اور مسلمانوں کے درمیان فتنوں کی آگ بھڑکانے کے لئے استعمال کرنا چاہتا تھا، اسی لئے مسلمانوں کے اس ترکِ تعلق اور بائیکاٹ کو اور رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ عائد کردہ اس سزا کو شاہِ غسان اہم موقع سمجھتے ہوئے اپنے ایک سفیر کے ذریعہ اپنا خط حضرت کعبؓ کے پاس بھیجتا ہے جس میں وہ ان کو لالچ دیتا ہے۔ اس خط کے ان الفاظ پر غور کریں: "مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے صاحب نے تم پر زیادتی کی ہے، حالانکہ تمہیں اللہ نے اس لئے نہیں بنایا ہے کہ تم ذلیل وخوار اور برباد رہو، لہذا تم میرے پاس چلے آؤ، ہم تمہیں شایان شان عزت و مرتبہ دیں گے"۔ اس خط پر حضرت کعبؓ کا تبصرہ کچھ اس طرح کا تھا: "یہ ایک اور آزمائش ہے، میرے اس عمل کی وجہ سے بات یہاں تک جا پہنچی ہے کہ اہلِ شرک بھی میرے بارے میں لالچ کر رہے ہیں"۔ اس کے بعد انہوں نے اس خط کو آگ کی نذر کر دیا۔

حضرت کعبؓ کا یہ موقف اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ ان کی وفاداری، ان کی قوتِ ایمانی اور ان کی عظمت کی واضح دلیل ہے۔ انہوں نے اچھی طرح اس کا ادراک کر لیا کہ یہ ایک نئی آزمائش ہے جو پہلی آزمائش سے زیادہ سخت ہے، اس لئے شاہِ غسان کا کوئی لالچ ان کو خرید نہ سکا بلکہ انہوں نے اس خط کو ہی نذر آتش کر دیا تاکہ وہ راکھ بن کر فضاؤں میں تحلیل ہو جائے، اور وہ اس آزمائش میں بھی کامیاب ہو کر نکلے اور پہلے سے زیادہ قوی ایمان اور پاکیزہ روح اور اعلیٰ اخلاق و کردار کے حامل بن کر نکلے۔

۶: توبہ کی قبولیت ایک اعلیٰ معراج اور کامیابی:

سچے اہلِ ایمان کے نزدیک بندے کی توبہ قبول ہونا ایک اعلیٰ معراج اور عظیم کامیابی ہے جس کے لئے مخلص سچے اہلِ ایمان تمنا کرتے رہتے ہیں، چنانچہ جب وہ آیاتِ کریمہ نازل ہوئیں جن میں ان تین صحابہ کرام کی توبہ کی قبولیت کا ذکر تھا تو وہ دن مسلمانوں کے نزدیک عظیم دن تھا، جب رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ انور پر خوشی کے آثار نمایاں ہو گئے اور آپ کا چہرہ اتنا منور ہو گیا گویا کہ وہ چاند کا ایک ٹکڑا ہو اور صحابہ کرام کے چہروں پر بھی خوشی کے آثار واضح ہو گئے، یہاں تک کہ وہ مبارک بادی کے لئے حضرت کعبؓ اور ان کے دونوں ساتھیوں کے پاس آ کر جوق در جوق ملاقات کرنے لگے اور حضرت کعبؓ خود نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا، آپؐ نے ان سے

فرمایا: ''سب سے بہتر دن کی خوشخبری حاصل کرو، یہ دن آپ کی ولادت سے اب تک کا بہترین دن ہے''۔ اس سے توبہ کے مقام واہمیت کا اندازہ کیاجا سکتاہے، یہ اسلام میں داخل ہونے سے بھی زیادہ عظیم ہے۔

حضرت کعبؓ کی توبہ ان کے نزدیک اس قدر اہم تھی یہاں تک کہ ان کے جسم پر جو کپڑے اس وقت تھے- اور ان کے پاس ان دو کے علاوہ دوسرے کپڑے تھے بھی نہیں- وہ انہوں نے خوشخبری دینے والے کو انعام کے طور پر دے دئے، اسی طرح باقی دونوں صحابہ کی خوشی بھی انتہائی عظیم تھی۔ واقدی کی روایت میں ہے کہ حضرت ہلال بن امیہؓ کو توبہ کی قبولیت کی خوشخبری حضرت سعید بن زیدؓ نے دی۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں بنو واقف کی جانب نکلا تو میں نے ان کو جیسے ہی خوشخبری سنائی تو وہ سنتے ہی سجدہ ریز ہوگئے۔ حضرت سعیدؓ فرماتے ہیں: میں سمجھنے لگا کہ وہ اس وقت تک اپنا سر نہیں اٹھائیں گے جب تک کہ ان کی جان ہی نہ نکل جائے۔ (المغازی للواقدی:1054)

۷: انعام کے شکرانہ میں عبادت کی مشروعیت:

توبہ کی قبولیت کے ذریعہ حضرت کعب بن مالکؓ کی فرحت وخوشی اتنی زیادہ تھی جس کو الفاظ میں بیان کرنا اور تصور میں لانا ممکن نہیں ہے، آپ نے مختلف عبادات کے ذریعہ اس کا اظہار کیا جیسے کہ:

(الف): سجدۂ شکر:

جب حضرت کعبؓ نے قبولیتِ توبہ کی خوشخبری سنی تو وہ فوراً سجدۂ شکر میں گر گئے، چنانچہ صحابہ کرام کی عادت یہ تھی کہ جب بھی ان کو کوئی نعمت ملتی یا ان سے کوئی آزمائش ختم ہوتی تو وہ سجدۂ شکر ادا کرتے اور انہوں نے یہ بات رسول اللہ ﷺ سے سیکھی تھی۔ (دیکھیں: صور وعبر من الجہاد النبوی، ص:493)

ب: خوشخبری دینے والے کو انعام:

حضرت کعبؓ نے جس شخص سے خوشخبری سنی اس کو پہنے ہوئے اپنے دونوں کپڑے اتار کر پہنا دیئے، اور اس وقت ان کی ملکیت میں ان دو کے علاوہ دوسرے کپڑے نہیں تھے، اس کے بعد کسی سے دو کپڑے لے کر پہن لئے، بلاشبہ اس طرح کا ہبہ اور ہدیہ مشروع ہے، اگر خوشخبری دینے والا مالدار ہوگا تو یہ اس کے حق میں ہدیہ ہوگا اور اگر وہ فقیر ہوگا تو یہ اس کے حق میں صدقہ ہوگا اور ان دونوں صورتوں میں مال کا نکالنا شکرانے کے طور پر ہوگا۔

ج: مالی صدقہ:

حضرت کعبؓ نے قبولیتِ توبہ کی وجہ سے اپنا مال صدقہ کیا لیکن آپؐ نے ان کو نصیحت کی کہ تمام مال کا صدقہ نہ کریں اور فرمایا: ''اپنا کچھ مال اپنے پاس رکھو، یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے''۔ اس سلسلہ میں فقہی اختلاف پایا جاتا ہے کہ اگر کوئی اپنے تمام مال کو صدقہ کرنے کی نذر مانے تو کیا اس کے لئے پورے مال کا صدقہ کرنا ضروری ہے؟ چنانچہ صدقہ کرنا مستحب ہے اور نذر کو پورا کرنا واجب ہے، لیکن حضرت کعبؓ نے نذر نہیں مانی تھی بلکہ انہوں نے آپؐ سے اپنا پورا مال صدقہ کرنے کا مشورہ طلب کیا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں اپنا کچھ مال اپنے پاس رکھنے کا مشورہ دیا۔

....

پانچواں باب

قصہ ٔ تبوک سے مستفاد دروس واسباق اور فوائد

ا: غزوۂ تبوک کے بارے میں منہجِ قرآنی کی امتیازی خصوصیات:

غزوۂ تبوک کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں جو آیات نازل کی ہیں، قتال کے بارے میں نازل ہونے والی یہ طویل ترین آیات ہیں،ان آیات کا آغاز مسیحت کے حملوں کو روکنے کے لئے عزائم وحوصلوں کو بلند کرنے کے ذریعہ ہوتا ہے،اوران کو یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی حمایت اور اپنے نبی کی نصرت کے سلسلہ میں ذرہ برابر کوتاہی قبول نہیں کرتا ہے اور رومیوں کے ساتھ جنگ کرنے کے سلسلہ میں حائل رکاوٹوں کے سامنے پسپائی اختیار کرنا ارتداد اور نفاق کا پیش خیمہ ہو سکتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ مَا لَكُمۡ إِذَا قِيلَ لَكُمُ ٱنفِرُواْ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ ٱثَّاقَلۡتُمۡ إِلَى ٱلۡأَرۡضِۚ أَرَضِيتُم بِٱلۡحَيَوٰةِ ٱلدُّنۡيَا مِنَ ٱلۡأٓخِرَةِۚ فَمَا مَتَٰعُ ٱلۡحَيَوٰةِ ٱلدُّنۡيَا فِي ٱلۡأٓخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ ٣٨ إِلَّا تَنفِرُواْ يُعَذِّبۡكُمۡ عَذَابًا أَلِيمٗا وَيَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَيۡرَكُمۡ وَلَا تَضُرُّوهُ شَيۡـٔٗاۗ وَٱللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيۡءٖ قَدِيرٌ ٣٩﴾ ترجمہ: ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تمہیں کیا ہو گیا کہ جب تم سے اللہ کی راہ میں نکلنے کے لئے کہا گیا تو تم زمین سے چمٹ کر رہ گئے؟ کیا تم نے آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی کو پسند کر لیا؟ ایسا ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ دنیوی زندگی کا یہ سب سروسامان آخرت میں بہت تھوڑا نکلے گا۔ تم نہ اٹھوگے تو خدا تمہیں دردناک سزادے گا،اور تمہاری جگہ کسی اور گروہ کو اٹھائے گا،اور تم خدا کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکوگے،وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے“۔(سورۃ التوبہ:38-39)

سورۂ توبہ پر غور وفکر کے نتیجہ میں قاری کے سامنے یہ واضح ہوتا ہے کہ غزوۂ تبوک کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے اس کی بعض امتیازی خصوصیات ہیں جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

ا: قرآن کریم نے غزوہ سے پیچھے رہنے والوں پر سخت عتاب کیا ہے، تمام غزوات کے مقابلہ میں غزوۂ تبوک کی خصوصیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں نکلنے پر ابھارا ہے اور اس سے پیچھے رہنے والوں پر عتاب کیا ہے،اس سلسلہ کی آیات میں یہ آیت بھی ہے: ﴿ٱنفِرُواْ خِفَافٗا وَثِقَالٗا وَجَٰهِدُواْ بِأَمۡوَٰلِكُمۡ وَأَنفُسِكُمۡ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِۚ ذَٰلِكُمۡ خَيۡرٞ لَّكُمۡ إِن كُنتُمۡ تَعۡلَمُونَ﴾ ترجمہ: نکلو، خواہ ہلکے ہو یا بوجھل،اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ، یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو“۔(سورۃ التوبہ:41)

غزواتِ نبویہ کا اختتام اسی غزوہ کے ذریعہ ہوا اور یہ قرآنی حکم کی عملی تطبیق وتنفیذ تھی جس میں یہ کہا گیا ہے: ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ قَٰتِلُواْ ٱلَّذِينَ يَلُونَكُم مِّنَ ٱلۡكُفَّارِ وَلۡيَجِدُواْ فِيكُمۡ غِلۡظَةٗۚ وَٱعۡلَمُوٓاْ أَنَّ ٱللَّهَ مَعَ ٱلۡمُتَّقِينَ﴾ ترجمہ: ”اے ایمان والو جنگ کرو ان کافروں سے جو تم سے قریب ہیں اور چاہئے کہ وہ تم میں سختی پائیں اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ متقیوں کے ساتھ ہے“۔(سورۃ التوبہ:123)

۲: قرآن کریم نے اس غزوہ کو دوسرے غزوات کے مقابلہ میں یہ امتیاز دیا ہے کہ اس کو 'ساعۃ العسرۃ' کا نام دیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لَّقَد تَّابَ ٱللَّهُ عَلَى ٱلنَّبِيِّ وَٱلْمُهَٰجِرِينَ وَٱلْأَنصَارِ ٱلَّذِينَ ٱتَّبَعُوهُ فِي سَاعَةِ ٱلْعُسْرَةِ مِنۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيغُ قُلُوبُ فَرِيقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ۚ إِنَّهُۥ بِهِمْ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ﴾ ترجمہ: ''اللہ نے معاف کر دیا نبیؐ کو اور ان مہاجرین و انصار کو جنہوں نے بڑی تنگی کے وقت میں نبیؐ کا ساتھ دیا اگرچہ ان میں سے کچھ لوگوں کے دل کجی کی طرف مائل ہو چکے تھے (مگر جب انہوں نے اس کجی کا اتباع نہ کیا بلکہ نبیؐ کا ساتھ ہی دیا تو) اللہ نے انہیں معاف کر دیا، بے شک اُس کا معاملہ اِن لوگوں کے ساتھ شفقت و مہربانی کا ہے''۔ (سورۃ التوبہ: 117)

۳: اس عظیم غزوہ کی منظر کشی کرتے ہوئے قرآنی منہج کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان منافقین کا رد کیا ہے جو فقراء صحابہ پر ان کے دیئے ہوئے مال پر طعن و تنقید کر رہے تھے اور انہوں نے اس سلسلہ میں طرح طرح کی باتیں کیں، اس لئے یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ٱلَّذِينَ يَلْمِزُونَ ٱلْمُطَّوِّعِينَ مِنَ ٱلْمُؤْمِنِينَ فِي ٱلصَّدَقَٰتِ وَٱلَّذِينَ لَا يَجِدُونَ إِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُونَ مِنْهُمْ سَخِرَ ٱللَّهُ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ ترجمہ: ''(وہ خوب جانتا ہے اُن کنجوس دولت مندوں کو) جو برضا و رغبت دینے والے اہلِ ایمان کی مالی قربانیوں پر باتیں چھانٹتے ہیں اور ان لوگوں کا مذاق اڑاتے ہیں جن کے پاس (راہ خدا میں دینے کے لئے) اُس کے سوا کچھ نہیں ہے جو وہ اپنے اوپر مشقت برداشت کر کے دیتے ہیں، اللہ اِن مذاق اڑانے والوں کا مذاق اڑاتا ہے اور ان کے لئے دردناک سزا ہے''۔ (سورۃ التوبہ: 79)

۴: قرآن کریم نے یہ بیان کیا ہے کہ جو اہلِ ایمان رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اس غزوہ میں نکلے ان کی تعداد تیس ہزار سے زائد تھی، اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے اجر عظیم لکھ دیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لَٰكِنِ ٱلرَّسُولُ وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ مَعَهُۥ جَٰهَدُوا۟ بِأَمْوَٰلِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ ۚ وَأُو۟لَٰٓئِكَ لَهُمُ ٱلْخَيْرَٰتُ ۖ وَأُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْمُفْلِحُونَ﴾ ترجمہ: ''بخلاف اس کے رسولؐ نے اور ان لوگوں نے جو رسولؐ کے ساتھ ایمان لائے تھے اپنی جان و مال سے جہاد کیا اور اب ساری بھلائیاں انہی کے لئے ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں''۔ (سورۃ التوبہ: 88)

دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ لَا يُصِيبُهُمْ ظَمَأٌ وَلَا نَصَبٌ وَلَا مَخْمَصَةٌ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ وَلَا يَطَـُٔونَ مَوْطِئًا يَغِيظُ ٱلْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُونَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا إِلَّا كُتِبَ لَهُم بِهِۦ عَمَلٌ صَٰلِحٌ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ ٱلْمُحْسِنِينَ﴾ ترجمہ: ''اس لئے کہ ایسا کبھی نہ ہوگا کہ اللہ کی راہ میں بھوک، پیاس اور جسمانی مشقت کی کوئی تکلیف وہ جھیلیں، اور منکرین حق کو جو راہ ناگوار ہے اُس پر کوئی قدم وہ اٹھائیں، اور کسی دشمن سے (عداوت حق کا) کا کوئی انتقام وہ لیں اور اس کے بدلے ان کے حق میں ایک عمل صالح نہ لکھا جائے، یقیناً اللہ کے ہاں محسنوں کا حق الخدمت مارا نہیں جاتا ہے''۔ (سورۃ التوبہ: 120)

۲: اس غزوہ میں شورائی نظام پر عمل کا نمونہ:

اس غزوہ میں اللہ کے رسول ﷺ نے شورائی نظام پر عمل فرمایا اور بعض مسائل کے بارے میں حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کے مشوروں پر عمل کیا، جن میں سے چند مسائل مندرجہ ذیل ہیں:

أ: جب لشکر کو پانی کی ضرورت پڑی اوران کو سخت پیاس کا سامنا کرناپڑاتوآپؐ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کے مشورہ پر عمل کیا جس میں انہوں نےآپؐ سے دعاکرنے کی درخواست کی تھی۔

ب: آپؐ نے حضرت عمر بن خطابؓ کامشورہ قبول کیاجب حضرت عمرؓ نے یہ مشورہ دیاتھاکہ خوراک کی کمی کی وجہ سے اونٹوں کو ذبح نہ کریں، اس لئے کہ اس کی وجہ سے سواریاں کم ہو جائیں گی جبکہ ان کوایسے حالات میں سواریوں کی شدید ضرورت ہے،اور حضرت عمرؓ نے اس مشکل کاحل بھی بتایاکہ تمام لوگوں کے زادِ سفر کو جمع کر کے اس کے لئے برکت کی دعاکی جائے،آپؐ نے اس مشورہ پر عمل کیایہاں تک کہ پوری قوم شکم سیر ہو گئی۔

ج: آپؐ نے حضرت عمرؓ کایہ مشورہ بھی قبول فرمایاکہ حدود شام کو پار نہ کیاجائےاور واپس مدینہ کارخ کیاجائے،چنانچہ جب نبی کریمؐ تبوک کے علاقے میں پہنچ گئے توآپؐ نے دیکھاکہ مسلمان لشکر کے خوف سے رومی بھاگ گئے ہیں،اس لئے آپؐ نے حدودِ شام کو عبور کرنے کے سلسلہ میں صحابہ کرام سے مشورہ طلب کیااور حضرت عمرؓ نے یہ مشورہ دیاکہ آپ لشکر کولے کر مدینہ واپس تشریف لے چلیں اورانہوں نے اس کی وجہ یہ بیان کی کہ رومیوں کے پاس بہت زیادہ فوج ہےاور وہاں پر مسلمانوں میں سے کوئی نہیں ہےاور حقیقتاً یہ مشورہ مبارک مشورہ تھا،اس لئے کہ رومی علاقے میں اندر جاکر قتال کرنابہت مشکل کام تھا،اس کے لئے مخصوص حکمتِ عملی مطلوب تھی کیونکہ صحرامیں جنگ کرنامیدانی علاقوں میں جنگ کرنے سے مختلف ہےاور رومیوں کی تعداد بھی کہیں زیادہ تھی اور وہ محفوظ مقامات پر جمع تھے جس کے ذریعہ مسلمانوں کو خطرات کاسامنا کرناپڑ سکتا تھا۔

بلاشبہ امتِ مسلمہ کے تمام سیاسی، عسکری اور معاشرتی امور و مسائل میں شورائی نظام کے مطابق عمل کرنانبوی طریقہ ہے، جس کے مطابق حبیب مصطفیٰ ﷺ نےاپنی پوری زندگی میں عمل فرمایاہے۔(دیکھیں:الرسول القائد، ص:281)

۳: سخت جان عملی تربیت:

غزوۂ تبوک میں آپؐ اپنے صحابہ کے ساتھ نکلے،اس میں بہت سے فوائد تھے جیسے کہ ان کو سخت جان عملی تربیت دینا، آپؐ نے سخت موسمی حالات میں ان کولے کر طویل مسافت طے کی، سخت حرارت و گرمی بھی تھی اور سخت معاشی حالات سے بھی دوچار تھے، پانی کی بھی کمی تھی یہاں تک کہ شدت پیاس کی وجہ سے وہ ہلاکت کے قریب پہنچ گئے تھے،زادِ سفر اور سواریوں کی بھی قلت تھی،بلاشبہ ان تمام امور کے ذریعہ سخت قسم کی عملی تربیت مقصود تھی۔

اس سخت جاں عملی تربیت کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ کا مقصد یہ تھاکہ مسلمانوں کو جزیرۃ العرب کے باہر اسلام کا پیغام لے کر جانے کااہل بنایا جائےاور یہ غزوات الرسول میں سے آخری غزوۃ تھا،اس لئے اپنے سپاہیوں کی اہلیت وصلاحیت کے بارے میں اطمئنان حاصل کرناضروری تھا۔

چنانچہ اس عملی تدریب وتربیت نے صحابہ کرام کو خلفائے راشدین کے عہد میں کافی فائدہ پہنچایااور انہوں نے اپنی قوتِ ایمانی کے ذریعہ،اپنے خالق پراعتماد کے ذریعہ،بدنی اور جسمانی صلاحیت کے ذریعہ اور تیغ وسناں اوراپنے عہد کے متنوع اسلحہ کواستعمال کرنے کی اہلیت وصلاحیت کے ذریعہ بلاد شام وفارس اور دیگر علاقوں پراپنی فتوحات کے جھنڈے گاڑھ دئے۔

۴: اس غزوہ کے اہم نتائج:

اس غزوہ کے اہم نتائج مندرجہ ذیل تھے:

ا: عرب کے تمام مسلمان اور کفار باشندوں کے دلوں سے رومیوں کی ہیبت کم ہو، اس لئے کہ عربوں کے نزدیک رومی طاقت ایسی تھی جس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی رومیوں کو مغلوب کیا جا سکتا تھا، وہ رومیوں کے ساتھ جنگ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے اور غزوۂ مؤتہ میں مسلمانوں کو لاحق ہونے والی پسپائی نے اس سوچ کو اور زیادہ پختہ کر دیا تھا کہ روم ناقابلِ شکست طاقت ہے، اس لئے اس نفسیاتی شکست کو ختم کرنے کے لئے نفیرِ عام ضروری تھی۔

۲: اس غزوہ کے ذریعہ یہ ظاہر ہو گیا کہ اسلامی ریاست کی قوت ہی اب اس علاقہ کی تنہا قوت ہے جو اس وقت کی سپر پاور طاقتوں کو چیلنج دے سکتی ہے اور اس کا محرّک عصبیت، نسل پرستی یا حصولِ قیادت کا لالچ نہیں ہے بلکہ اس کا محرّک انسانوں کو آزادی فراہم کرنا ہے تاکہ انسانوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر رب العباد کی غلامی میں داخل کیا جائے، اور رومیوں کے ساتھ عملی طور پر مزاحمت اور جنگ نہ ہونے کے باوجود یہ تمام مقاصد حاصل ہو گئے، اللہ کے رسول ﷺ نے اس غزوہ کے ذریعہ بلادِ شام اور دیگر فتوحاتِ اسلامیہ کے لئے بنیاد ڈال دی اور ابتدائی مراحل طے کر لئے۔

۳: اس غزوہ نے پورے جزیرۃ العرب کو رسول اللہ ﷺ کی سیادت و قیادت کے تحت موحد کر دیا، فتحِ مکہ، فتحِ خیبر اور غزوۂ تبوک جیسے اہم واقعات کے ذریعہ پیدا شدہ داخلی صورتحال کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ اور دعوتِ اسلامی کے بارے میں عرب قبائل کا موقف بھی بدل گیا تھا، مسلمانوں کے رومی سرحدوں تک پہنچ جانے کے بعد ہر قوم اسلام کی جانب سبقت کرنے لگی اور جنوبی علاقوں میں نجران نے جزیہ دینے پر مصالحت کر لی تھی، اس کا بھی آس پاس کے ماحول پر اثر پڑا، اس لئے اب عرب قبائل کے سامنے صرف ایک ہی راستہ تھا کہ وہ سب کے سب اسلام کو گلے لگائیں اور پوری اطاعت و فرمانبرداری کے ساتھ قافلۂ نبوت میں شامل ہو جائیں، رسول اللہ ﷺ کے غزوۂ تبوک سے واپس آنے کے بعد عرب قبائل کے وفود جزیرۃ العرب کے گوشہ گوشہ سے مدینہ منورہ کا رخ کرنے لگے تاکہ وہ اور ان کی قوم حلقہ بگوش اسلام ہو، اسی لئے اسلامی مصادر میں سن نو ہجری کو عام الوفود کا نام دیا گیا ہے۔ (دیکھیں: نضرۃ النعیم: 1/395، دراسات فی عہد النبوۃ، للشجاع، ص: 209)

اس غزوۂ مبارکہ کے ذریعہ غزواتِ نبویہ کے بارے میں گفتگو اپنے اختتام کو پہنچتی ہے، آپ ﷺ نے ان غزوات میں بنفسِ نفیس قیادت فرمائی ہے اور آپ ؐ کی مبارک زندگی اسباق و دروس سے بھری ہوئی ہے جن کے مطابق آنے والی نسلوں نے تربیت پائی اور امت اور اسلامی ریاست انہی نقشِ قدم پر چلتے ہوئے آگے کی منزلیں طے کرتی رہی۔

....

چھٹا باب

غزوۂ تبوک اور حجۃ الوداع کے مابین کے اہم واقعات

ا: ثقیف کا وفد اور ان کا قبولِ اسلام:

رسول اللہ ﷺ جب غزوۂ طائف سے واپس تشریف لائے تو آپؐ کے مدینہ پہنچنے سے پہلے ہی قبیلۂ ثقیف کے سردار عُروہ بن مسعود نے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کر لیا، پھر اپنے قبیلہ میں واپس جا کر لوگوں کو اسلام کی دعوت دی، وہ چونکہ اپنی قوم کے سردار تھے، اور صرف یہی نہیں کہ ان کی بات مانی جاتی تھی، بلکہ انہیں اس قبیلہ کے لوگ اپنی بچیوں اور عورتوں سے بھی زیادہ محبوب رکھتے تھے، اس لئے ان کا خیال تھا کہ لوگ ان کی اطاعت کریں گے، لیکن جب انہوں نے اسلام کی دعوت دی تو توقع کے بالکل برخلاف لوگوں نے ان پر ہر طرف سے تیروں کی بوچھاڑ کر دی اور انہیں شہید کر دیا، پھر اس کے بعد ان لوگوں کو احساس ہوا کہ گردو پیش کا علاقہ جو مسلمان ہو چکا ہے اس سے ہم مقابلہ کی تاب نہیں رکھتے۔ قبیلۂ ثقیف کے لوگوں نے باہم مشورہ کیا اور طے پایا کہ ایک وفد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بھیجا جائے، اس لئے آپ ﷺ کی خدمت میں چھ افراد پر مشتمل ایک وفد رمضان المبارک کے مہینے میں حاضر ہوا۔

یہ وفد بنو مالک اور ان کے حلیفوں کے چھ بڑے اور معزز افراد پر مشتمل تھا، تین افراد بنو مالک سے اور تین حلفاء سے تھے، اور ان سب کے امیر و سربراہ عبد یالیل بن عمرو تھے، وفد کا ان افراد پر مشتمل ہونا گہری سیاسی بصیرت کا پتہ دیتا ہے، اس لئے کہ ثقیف نے اس پر غور کیا کہ بنو امیہ کے مہاجرین رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صلح اور معاہدہ کرانے میں اہم رول ادا کریں گے، اس لئے کہ حلیفوں کے ساتھ بنو امیہ کے تاریخی تعلقات تھے۔

سفارت نے مدینہ کا رخ کیا، بستی کے قریب اس کی ملاقات حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے ہو گئی، ان کا تعلق اسی قبیلہ سے تھا، وہ دوڑے کہ رسول اللہ ﷺ کو اس کی آمد کی خبر پہنچائیں، راستے میں ان کی ملاقات حضرت ابو بکر صدیقؓ سے ہو گئی، ان کو معلوم ہوا تو مغیرہؓ کو قسم دلائی کہ یہ خوش خبری مجھے پہنچانے دو، اس وفد کی آمد پر رسول اللہ ﷺ نے بھی مسرت کا اظہار کیا، وفد کو مسجدِ نبوی میں ٹھہرایا گیا، اس کے لئے صحنِ مسجد میں خیمے نصب کئے گئے، یہ لوگ نماز اور خطبہ کے وقت مسجد میں موجود رہتے تھے اور مسلمانوں کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے تھے اور قرآن سنتے تھے، یہ وفد چند دن ٹھہرا، اس عرصہ میں وقتاً فوقتاً رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری دیتا، آپؐ بھی ان کے پاس ہر رات عشاء کے بعد تشریف لے جاتے تھے اور کھڑے کھڑے ان سے گفتگو فرماتے تھے۔

اس وفد میں عثمان بن ابی العاص نامی ایک نوجوان بھی تھا، ارکانِ وفد نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں جاتے تو اسے بچہ سمجھ کر خیمہ میں چھوڑ جاتے۔ خدمتِ نبوی میں حاضری سے محرومی اور تعلیماتِ اسلام سیکھنے کی تڑپ اسے بے چین کئے رہتی، چنانچہ جب وہ لوگ واپس آکر دوپہر میں آرام کرتے تو عثمان آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتا، آپؐ سے قرآن سن کر یاد کرتا اور دین کی تعلیم حاصل کرتا، کسی موقع

پر اگر وہ آپؐ کو سوتا ہوا پاتا تو حضرت ابو بکرؓ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور ان سے دین سیکھتا، یہ کام وہ اپنے قبیلہ والوں سے چھپ کر کرتا تھا، اس کا ذوق و شوق دیکھ کر رسول اللہ ﷺ کو بہت خوشی ہوئی اور آپ ﷺ ان سے محبت کرنے لگے، یہ وفد کئی دنوں تک وہاں مقیم رہا، وہ نبی کریم ﷺ کے پاس جاتے اور آپؐ ان کو اسلام کی دعوت دیتے، ان کے امیر عبد یالیل نے آپ ﷺ سے کہا: کیا آپ ہمارے ساتھ ایک معاہدہ کریں گے تاکہ ہم اپنے اہل خانہ اور قوم کے پاس واپس جائیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں، اگر آپ اسلام قبول کرو گے تو میں تمہارے ساتھ معاہدہ کروں گا، ورنہ تمہارے ساتھ نہ کوئی معاہدہ ہو گا اور نہ ہی کوئی صلح ہو گی۔

عبد یالیل نے کہا: ہمیں کثرت سے سفر کرنا پڑتا ہے، ہمارے لئے جنسی جذبہ پر قابو پانا مشکل ہے، ہمیں زنا کی اجازت دے دیجئے۔ آپؐ نے فرمایا: اس کا تعلق ان چیزوں سے ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَلَا تَقْرَبُواْ ٱلزِّنَىٰٓ إِنَّهُۥ كَانَ فَٰحِشَةً وَسَآءَ سَبِيلًا﴾ ترجمہ: ''زنا کے قریب نہ بھٹکو، وہ بہت بُرا فعل ہے اور بڑا ہی بُرا راستہ ہے''۔ (الاسراء: 32)

اس نے کہا: ہماری ساری تجارت سود پر مبنی ہے، ہمیں سود لینے کی اجازت دے دیجیے۔ آپؐ نے فرمایا: تمھیں صرف اصل سرمایہ لینے کا حق ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱتَّقُواْ ٱللَّهَ وَذَرُواْ مَا بَقِيَ مِنَ ٱلرِّبَوٰٓاْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ﴾ ترجمہ: ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو اور جو کچھ تمہارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو''۔ (البقرۃ: 278)

اس نے کہا: ہمارے علاقے میں شراب بڑے اہتمام سے کشید کی جاتی ہے اور وہ ہمارے لئے ضروری ہے۔ آپؐ نے فرمایا: اللہ نے اسے حرام قرار دیا ہے، اس کا ارشاد ہے: ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِنَّمَا ٱلْخَمْرُ وَٱلْمَيْسِرُ وَٱلْأَنصَابُ وَٱلْأَزْلَٰمُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ ٱلشَّيْطَٰنِ فَٱجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ ترجمہ: "اے لوگو جو ایمان لائے ہو! یہ شراب اور جوا اور یہ آستانے اور پانسے، یہ سب گندے شیطانی کام ہیں، ان سے پرہیز کرو، امید ہے کہ فلاح نصیب ہو گی"۔ (المائدۃ: 90)

یہ سن کر سب لوگ وہاں سے اٹھ گئے اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ الگ الگ بیٹھ گئے، عبد یالیل نے کہا: تمہارا بُرا ہو! ہم اپنی قوم کے پاس ان تینوں چیزوں کو حرام کر کے واپس جائیں گے، اللہ کی قسم! ثقیف کے لوگ شراب کے بغیر کبھی نہیں رہ سکتے ہیں اور نہ ہی وہ کبھی زنا کے بغیر رہ سکتے ہیں!۔

سفیان بن عبد اللہ کہنے لگا: ارے جناب! اگر اللہ نے ان کے ساتھ خیر کا معاملہ کیا ہو گا تو وہ ان چیزوں کے بغیر رہ سکیں گے! یہ لوگ جو آپ کے ساتھ ہیں یہ بھی اسی طرح کے تھے، لیکن انہوں نے صبر کیا اور اپنے تمام سابقہ گناہوں کو ترک کر دیا، اگرچہ ہم اس شخص سے ڈرے ہوئے ہیں، اس نے اس سرزمین پر غلبہ حاصل کر لیا ہے اور ہم زمین کے ایک گوشے میں ایک قلعہ میں محفوظ ہیں اور اسلام ہمارے آس پاس پھیل رہا ہے، اللہ کی قسم! اگر وہ ہمارے قلعے کا ایک ماہ تک بھی محاصرہ کرے گا تو ہم بھوک کی وجہ سے ختم ہو جائیں گے، میں تو اب صرف اسلام ہی دیکھ رہا ہوں اور مجھے فتح مکہ کی طرح کے دن کا خوف ہے۔

حضرت خالد بن سعید بن العاص رسول اللہ ﷺ اور ان کے درمیان سفارت کاری کا کام کر رہے تھے، یہاں تک کہ انہوں نے معاہدہ تحریر کیا اور حضرت خالدؓ نے ہی وہ معاہدہ تحریر کیا، اللہ کے رسولؐ ان کے پاس کھانا بھیجتے تھے، وہ اس میں سے کچھ بھی نہیں کھاتے تھے، جب تک کہ رسول اللہ ﷺ اس میں سے نہ کھاتے، یہاں تک کہ انہوں نے اسلام قبول کیا، انہوں نے آپؐ سے دریافت کیا کہ ہمارے "لات "بت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ آپؐ نے فرمایا: اس کو منہدم کیا جائے گا۔ انہوں نے کہا: ایسا نہ کریں! اگر اس بت کو پتہ چلے گا کہ ہم نے اس کو منہدم کیا ہے تو وہ ہمارے گھر والوں کو قتل کر دے گا۔ حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا: اے عبد یالیل! تیرا بُرا ہو! بے شک وہ بت ایک پتھر ہے، اس کو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ کون اس کی عبادت کرتا ہے اور کون اس کی عبادت نہیں کرتا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اسلام قبول کر لیا اور صلح کا معاہدہ مکمل ہو گیا، معاہدہ کی تحریر حضرت خالد بن سعیدؓ نے تحریر کی، جب صلح مکمل ہو گئی اور معاہدہ تحریر کیا گیا تو انہوں نے نبی کریم ﷺ سے بات کی کہ تین سال تک ان کے بت کو چھوڑ دیں اور اس کو منہدم نہ کریں لیکن رسول اللہ ﷺ نے انکار کیا، انہوں نے کہا: دو سال تک رہنے دیں، آپؐ نے انکار کیا۔ انہوں نے کہا: ایک سال تک رہنے دیں، آپؐ نے انکار کیا۔ انہوں نے کہا: اچھا ایک ماہ تک رہنے دیں لیکن آپؐ نے کوئی مہلت دینے سے انکار کیا، وہ بت کو منہدم کرنے کے بارے میں اس لئے مہلت مانگ رہے تھے اس لئے کہ ان کو اپنی قوم کے نادانوں، عورتوں اور بچوں کی طرف سے ردّ عمل کا خوف تھا اور وہ اس کو منہدم کر کے اپنی قوم کو خوفزدہ نہیں کرنا چاہتے تھے، بالآخر انہوں نے نبی کریم ﷺ سے یہ درخواست کی کہ ان کے ہاتھوں اس کو منہدم نہ کرائیں، اللہ کے رسول ﷺ نے ان کی اس شرط کو قبول فرمایا، اس کے بعد انہوں نے نبی کریمؐ سے درخواست کی کہ ان سے نماز کو معاف رکھا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اُس دین میں کوئی خیر نہیں جس میں نماز نہ ہو۔ (مسند أحمد: 4/218، سنن ابو داؤد: 3026، مسند الطیالسی: 939، الدلائل للبیہقی: 5/299، التاریخ الاسلامی للحمیدی: 8/50)

اللہ کے رسول ﷺ نے ان کے ساتھ عزت و اکرام کا معاملہ فرمایا اور ان کی بہترین ضیافت فرمائی، آپؐ نے حضرت عثمان بن ابی العاصؓ کو طائف کا امیر مقرر فرمایا، اس لئے کہ ان کو ان سب میں سب سے زیادہ قرآن سیکھنے کا اور تفقّہ فی الدین کا شوق تھا اور وہ سب سے کم سن تھے، یہ وفد نبی کریم ﷺ کے حسنِ سلوک سے اور مسلمانوں کے ساتھ ملنے جلنے سے متاثر ہوئے، یہاں تک کہ انہوں نے رمضان کے باقی ایام کے روزے رکھے اور انہوں نے مدینہ منورہ میں پندرہ دن تک قیام کیا اور اس کے بعد طائف واپس آ گئے، ان کے واپس آنے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کی قیادت میں اور حضرت مغیرہ بن شعبہؓ اور حضرت ابو سفیان بن حربؓ کی شراکت میں ایک سریہ تیار کیا اور اس کو وفد کے بعد ان کی جانب روانہ فرمایا۔

اسی دوران ثقیف کو قبولِ اسلام کے لئے تیار کرنے کے سلسلہ میں وفد کی کوششیں کامیاب ہو گئیں اور انہوں نے اپنی قوم کو بتایا کہ لات کا انجام کیا ہونے والا ہے، تب تک سریہ بھی طائف پہنچ گیا اور حضرت مغیرہ بن شعبہؓ دس سے زائد افراد کے ساتھ لات بت کو منہدم کرنے کے لئے گئے اور یہ ان کی قوم بنی معتّب کے سخت پہرہ میں ہو رہا تھا، وہ حضرت مغیرہؓ کی حفاظت کے لئے کھڑے تھے کہ کہیں ان پر تیر اندازی نہ کی جائے یا ان کو شہید نہ کر دیا جائے، جیسے کہ حضرت عروہ بن مسعودؓ کے ساتھ کیا گیا، قبیلہ ثقیف مرد و زن، بچے، یہاں تک کہ

دوشیزائیں اور تمام لوگ باہر نکل آئے، شرک کو چھوڑے ہوئے انہیں ابھی تھوڑی ہی مدت ہوئی تھی، اس لئے ثقیف کے عام لوگ یہ نہیں سمجھ رہے تھے کہ اس کو منہدم کیا جا سکتا ہے، اور وہ سمجھتے تھے کہ وہ محفوظ رہے گا۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویہ الصحیحہ: 2/519، سیرت ابن ہشام: 4/195، دلائل النبوۃ للبیہقی: 5/304، السرایا والبعوث، ص: 300)

حضرت مغیرہ مزاح اور خوش طبعی کیا کرتے تھے، اس لئے انہوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا: واللہ! میں تمہیں ثقیف کے لوگوں کے بارے میں ہنساؤں گا، چنانچہ انہوں نے بت پر کلہاڑی ماری اور اس کے بعد خود چکراتے ہوئے گر پڑے، یہ دیکھ کر تمام اہلِ طائف یک آواز بول پڑے: اللہ نے مغیرہ کو دور کر دیا، اس کو بت نے مار دیا۔ ان کو گرا ہوا دیکھ کر وہ خوش ہوئے اور سریہ کے افراد کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگے: تم میں سے جو چاہے اس کے قریب جا کر دیکھے اور اس کو منہدم کرنے کی کوشش کرے، واللہ! اس کو کبھی منہدم نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یہ سن کر حضرت مغیرہ بن شعبہؓ اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا: اے ثقیف کے لوگو! اللہ تمہیں غارت کرے، یہ تو بیوقوفی ہے، یہ پتھر اور گارا ہے، اس لئے اللہ کی عافیت کو قبول کرو اور اس کی عبادت کرو۔

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ اور ان کے ساتھیوں نے اس سرکش کو منہدم کر دیا، یہاں تک کہ اس کو زمین کے ساتھ برابر کر دیا، اس کا مجاور گویا کہ انگاروں پر کھڑا تھا اور وہ بت کی طرف سے انتقام کا منتظر تھا اور اس کو گرانے والوں کے لئے اس کی طرف سے غضب کا انتظار کر رہا تھا، وہ جیسے ہی اس کی بنیاد تک پہنچ گئے تو وہ چیخ پڑا: آپ دیکھو گے جیسے ہی اس کی بنیاد ختم ہو جائے گی تو یہ بنیاد ہی ان پر غضبناک ہو کر ان کو اپنے اندر دھنسا دے گی۔ جب حضرت مغیرہؓ نے یہ بے سروپا بات سنی تو سریہ کے قائد نے کہا: مجھے اس کی بنیاد کھودنے دو۔ انہوں نے خود اس کی بنیاد کھودی یہاں تک کہ اس کی مٹی نکال دی اور وہاں سے زیورات نکالے اور اس کے کپڑے لے لئے۔ یہ دیکھ کر ثقیف کے لوگ حیران و ششدر رہ گئے اور انہوں نے اصل حقیقت کا ادراک کر لیا، جس کے بارے میں ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا تھا۔

یہ وفد وہاں سے واپس آیا، یہاں تک کہ وہاں سے ملے ہوئے زیورات اور کپڑے لے کر رسول اللہ کے پاس پہنچ گئے، اللہ کے رسول ﷺ نے اسی روز ان کو تقسیم کر دیا، انہوں نے اپنے نبی ﷺ کی نصرت و مدد اور دین کے غلبہ پر اللہ کا شکر ادا کیا۔ (دیکھیں: السرایا والبعوث، ص: 300، تاریخ ابن شیبہ: 2/507)

اس طرح سے جزیرۃ العرب کے شرک کے دوسرے سب سے بڑے بت کا خاتمہ ہو گیا، اس کی جگہ اللہ کا گھر تعمیر کیا گیا جس میں اللہ کی عبادت کی جانے لگی اور نبی کریم ﷺ نے حضرت عثمان بن ابی العاصؓ کو جو طائف کے گورنر تھے، یہ حکم دیا کہ طائف کی مسجد اس جگہ بنائیں جہاں ان کا طاغوت قائم تھا۔ (دیکھیں: سنن أبو داؤد: 450، سنن ابن ماجہ: 743)

۲: رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی بن سلول کی وفات:

رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی بن سلول شوال کے آخری ایام میں بیمار ہوا اور ماہ ذی قعدہ سن نو ہجری میں اس کی وفات ہوئی، حضرت اسامہ بن زیدؓ فرماتے ہیں: میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عبداللہ بن اُبی کے پاس اس کی بیماری میں عیادت کے لئے داخل ہوا تو نبی

کریم ﷺ نے اس سے فرمایا: میں نے تمہیں یہود کی محبت سے منع کیا تھا۔ یہ سن کر عبد اللہ نے کہا: سعد بن زرارہؓ نے ان کو ناپسند کیا تو ان کا انتقال ہو گیا۔

جب عبد اللہ بن اُبَی بن سلول مر گیا تو اس کے بیٹے عبد اللہ بن عبد اللہؓ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور آپؐ سے سوال کیا کہ آپ اپنی قمیص عطا فرمائیں جس میں وہ اپنے باپ کو کفن دیں، آپؐ نے (وہ قمیص) ان کو عطا کی، پھر آپ ﷺ سے درخواست کی کہ آپ اس کی نماز جنازہ پڑھیں، چنانچہ رسول اللہ ﷺ اس پر نماز جنازہ پڑھنے کے لئے کھڑے ہوئے تو حضرت عمرؓ کھڑے ہو گئے اور (التجا کرنے کے لئے) رسول اللہ ﷺ کے کپڑے (کے ایک کنارے) کو پکڑ لیا اور کہا: اللہ کے رسولؐ! کیا آپ اس کی نماز جنازہ پڑھائیں گے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کی نماز جنازہ پڑھنے سے منع فرمایا ہے؟! رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے مجھے اختیار دیا ہے۔ اس نے فرمایا ہے: "آپ ان کے لئے استغفار کریں یا استغفار نہ کریں، خواہ آپ ان کے لیے ستر مرتبہ استغفار کریں" ۔ اور میں ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار کروں گا۔ (عمرؓ نے) کہا: یقیناً وہ منافق ہے، (مگر) رسول اللہ ﷺ نے اس کی نماز جنازہ پڑھا دی، اس پر اللہ عزوجل نے (واضح حکم) نازل فرمایا: ﴿وَلَا تُصَلِّ عَلَىٰٓ أَحَدٍ مِّنْهُم مَّاتَ أَبَدًا وَلَا تَقُمْ عَلَىٰ قَبْرِهِۦٓ﴾ "اور ان (منافقین) میں سے جو شخص مر جائے آپ کبھی اس کی نماز جنازہ نہ پڑھیں اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہوں"۔ (صحیح البخاري: 4670 صحیح مسلم: 2400)

اللہ کے رسول ﷺ نے اس کی نماز جنازہ اس کے ظاہری حکم یعنی اسلام کی وجہ سے پڑھی اور اس کے ذریعہ اس کے بیٹے حضرت عبد اللہؓ کا اکرام بھی مقصود تھا، جو بہترین اور فضلائے صحابہ میں شمار ہوتے تھے اور انہوں نے ہی رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی تھی کہ وہ اپنے والد کو قتل کریں گے جبکہ اس نے غزوہ بنی المصطلق کے موقع پر نازیبا باتیں کی تھیں، اس کے ذریعہ شرعی مصلحت بھی مقصود تھی اور وہ یہ تھی کہ اس کی قوم کی اور اس کے پیروکاروں کی تالیفِ قلب ہو، اس لئے کہ منافقین کی ایک بڑی جماعت اس کی وفاداری کا دم بھرتی تھی، اس لئے اس کے ذریعہ ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ہو سکتا ہے کہ وہ متاثر ہو کر اپنے نفاق سے رجوع کر لیں اور عبرت حاصل کر کے اللہ اور اس کے رسولؐ کے لئے مخلص ہو جائیں، اور اگر آپؐ صریح ممانعت کا حکم نازل ہونے سے پہلے ہی اس کے بیٹے کی درخواست کو قبول نہ کرتے اور اس کی نمازِ جنازہ نہ پڑھتے تو یہ اس کے بیٹے اور اس کی قوم کے حق میں باعثِ عار ہوتا، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے دو اختیارات میں سے بہتر حکمتِ عملی اختیار کی، یہاں تک کہ آپؐ کو صاف طور پر اس سے منع کیا گیا اور اس کے بعد آپؐ اس سے رک گئے۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویہ، ابو شہبہ: 2/533)

اور جہاں تک تعلق ہے اس کو قمیص دینے کا تو آپؐ نے اس کو اپنی قمیص اس لئے دی کیونکہ اس کے بارے میں بخل سے کام لینے سے اور قمیص نہ دینے کی وجہ سے آپؐ کے کرم و سخاوت پر حرف آتا تھا، آپؐ کے اخلاقِ کریمانہ یہ تھے کہ آپؐ کبھی بھی کسی مانگنے والے اور ضرورتمند کو واپس نہیں کرتے تھے، مزید یہ آپؐ کی طرف سے اس کو بدلہ بھی تھا، اس لئے کہ اس نے آپؐ کے چچا حضرت عباسؓ کو اپنی قمیص دی تھی جبکہ ان کو بدر کے موقع پر قیدی بنا کر لایا گیا تھا اور رسول اللہ ﷺ اور اہلِ بیت کے اخلاقِ کریمانہ یہ تھے کہ کسی کے حسنِ سلوک کا اس سے بہتر بدلہ دیتے تھے۔ (دیکھیں: صحیح السیرۃ النبویہ، ص: 62)

عبداللہ بن سلول کی موت کے ذریعہ مدینہ میں نفاق کی تحریک پسپائی کا شکار ہوگئی، یہاں کہ سن دس ہجری میں ہمیں منافقین کا کوئی واضح اور نمایاں کردار نظر نہیں آتا ہے اور چند غیر معروف افراد کے علاوہ ان میں سے کوئی باقی نہیں رہا جن کی فہرست رسول اللہ ﷺ کے صاحبِ راز (سیکریٹری) حضرت حذیفہ بن یمانؓ کے پاس تھی اور حضرت عمرؓ بعد میں ایسے شخص کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھتے تھے جس کا حال مجہول اور غیر معروف ہو یہاں تک کہ حضرت حذیفہ بن یمانؓ نماز نہ پڑھتے، اس لئے کہ حضرت حذیفہؓ نمایاں منافقین کو جانتے تھے جن کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے ان کو بتادیا تھا۔ (دیکھیں: دراسات في عهد النبوة، للشجاع، ص: 221، من معين السيرة النبوية، ص: 464)

نو ہجری کا سال اسلامی معاشرہ میں نفاق کی تحریک کا خاتمہ کرنے والا سال تھا، اس وقت اسلامی نظام اپنی طاقت و قوت کا بام عروج پر پہنچ گیا تھا، اس لئے تمام طاقتوں کے ساتھ تعلقات رکھنے کے سلسلہ میں واضح حکمتِ عملی اختیار کرنا ضروری ہو گیا تھا، امام ابن قیمؒ نے منافقین کے تئیں اسلامی حکمتِ عملی کو یوں بیان کیا ہے: ''آپؐ اس بات پر مأمور تھے کہ ان کی ظاہری چیزوں کو قبول کریں، ان کے اندرون اور رازوں کو اللہ کے حوالے کریں اور علم و دلیل کی بنیاد پر ان کے ساتھ جہاد کریں، آپؐ کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ ان سے اعراض کریں، ان پر سختی کریں اور قولِ بلیغ کے ذریعہ ان کے دلوں تک پہنچنے کی کوشش کریں، آپؐ کو ان کی نمازِ جنازہ پڑھنے اور ان کی قبروں پر کھڑے ہونے سے منع کیا گیا تھا، اور آپؐ کو باخبر کر دیا گیا تھا کہ اگر آپ ان کے لئے استغفار کریں گے تو اللہ تعالیٰ ہرگز ان کی مغفرت نہیں کرے گا''۔ (زاد المعاد: 2/91)

یہ حکمتِ عملی قرآنی نصوص کے بالکل عین مطابق تھی جن کو سورۃ التوبہ میں بیان کیا گیا ہے، اسی لئے اس سورت کو سورۃ البراءۃ اور سورۃ الفاضحۃ (رسوا کرنے والی) بھی کہا گیا ہے، اس سورت کے نصف سے زائد حصہ میں منافقین کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے، ان کے ارادوں اور نیتوں کو اور ان کے اعمال کی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے اور ان کے نفسیاتی اور قلبی حالات کو بیان کیا گیا ہے، غزوۂ تبوک کے بارے میں، اس سے پہلے، اس کے دوران اور اس کے بعد ان کے موقف و کردار کو واضح کیا گیا ہے اور جہاد میں ان کے پیچھے رہنے کے بہانوں اور اعذار کی حقیقت بیان کی گئی ہے اور صفوں کے درمیان ان کے ذریعہ فتنہ پروری، انتشار اور کمزوری پیدا کرنے اور اپنے اقوال و اعمال کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ کو ایذاء پہنچانے کے تمام احوال کو بیان کیا گیا ہے۔ (دیکھیں: المنافقون، محمد جمیل غازی، ص: 92-93)

اس مرحلہ پر منافقین کے خلاف جو اقدامات کئے گئے ان میں سے نمایاں ترین مندرجہ ذیل ہیں:

ا: منافقین کی نمازِ جنازہ نہ پڑھنے کا حکم اور ان کے بارے میں کفر کا حکم:

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَا تُصَلِّ عَلَىٰٓ أَحَدٍ مِّنْهُم مَّاتَ أَبَدًا وَلَا تَقُمْ عَلَىٰ قَبْرِهِۦٓ ۖ إِنَّهُمْ كَفَرُوا۟ بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ وَمَاتُوا۟ وَهُمْ فَـٰسِقُونَ ﴿٨٤﴾ وَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَٰلُهُمْ وَأَوْلَـٰدُهُمْ ۚ إِنَّمَا يُرِيدُ ٱللَّهُ أَن يُعَذِّبَهُم بِهَا فِى ٱلدُّنْيَا وَتَزْهَقَ أَنفُسُهُمْ وَهُمْ كَـٰفِرُونَ ﴿٨٥﴾﴾ ترجمہ: ''اور آئندہ ان میں سے جو کوئی مرے اس کی نمازِ جنازہ بھی تم ہرگز نہ پڑھنا اور نہ کبھی اس کی قبر پر کھڑے ہونا کیونکہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ کفر کیا ہے، اور وہ مرے ہیں اس حال میں کہ وہ فاسق تھے۔ ان کی مالداری اور

ان کی کثرتِ اولاد تم کو دھوکہ میں نہ ڈالے، اللہ نے تو ارادہ کر لیا ہے کہ اِس مال و اولاد کے ذریعہ سے ان کو اسی دنیا میں سزا دے اور ان کی جانیں اس حال میں نکلیں کہ وہ کافر ہوں"۔(سورۃ التوبہ:84-85)

۲: ان کی مسجد کا انہدام؛ جس کو انہوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی غرض سے بنایا تھا اور وہ مسجدِ ضرار تھی جس کو منافقین نے ایک خاص مقصد سے تعمیر کیا تھا۔

۳: کفار کے ساتھ جہاد کرنے کی طرح منافقین کے ساتھ جہاد کرنے کا حکم؛ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِىُّ جَـٰهِدِ ٱلْكُفَّارَ وَٱلْمُنَـٰفِقِينَ وَٱغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۚ وَمَأْوَىٰهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ ٱلْمَصِيرُ﴾ ترجمہ: " اے نبیؐ، کفار اور منافقین سے جہاد کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ، ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بہت بُرا ٹھکانہ ہے"۔(سورۃ التحریم:9)

یہ جہاد چاہے بذریعۂ قتال ہو، یا معاملات میں ہو، یا مواجہہ اور آمنا سامنا کرنے میں ہو، یا ان کی قلعی کھولنے اور رسوا کرنے کے سلسلہ میں ہو، یہ بات بالکل واضح ہے کہ سورۂ براءت کے نزول کے بعد منافقین کے بارے میں تعامل پہلے کے مقابلہ میں مختلف تھا۔

۴: ان کی صفات و کردار اور ان کی بداعمالیوں کا اظہار و بیان:

جیسے کہ سورۃ التوبہ میں بھی ان کی بداعمالیوں کو بیان کیا گیا ہے، یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے مسلمانوں کے حوصلوں کو پست کرنے کے لیے کہا تھا: ﴿لَا تَنفِرُواْ فِى ٱلْحَرِّ﴾ ترجمہ: "اس سخت گرمی میں نہ نکلو"۔(سورۃ التوبہ:81) یہی لوگ صدقات کے بارے میں انفاق کرنے والوں پر جملے کستے تھے اور اپنے اقوال و افعال کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ کو ایذا پہنچاتے تھے۔ (دیکھیں: دراسات فی عہد النبوۃ، للشجاع، ص:220)

سن نو ہجری میں اسلامی معاشرہ میں نفاق کی تحریک کے تئیں منہجِ نبوی کے معالم و حکمتِ عملی کے اہم نکات یہی تھے۔

۳: ازواجِ مطہرات کو اختیار (نبوی گھرانوں سے دروس و اسباق):

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِىُّ قُل لِّأَزْوَٰجِكَ إِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ ٱلْحَيَوٰةَ ٱلدُّنْيَا وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا ۝٢٨ وَإِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ وَٱلدَّارَ ٱلْـَٔاخِرَةَ فَإِنَّ ٱللَّهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَـٰتِ مِنكُنَّ أَجْرًا عَظِيمًا ۝٢٩﴾ ترجمہ: "اے نبیؐ، اپنی بیویوں سے کہو: اگر تم دنیا اور اس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ، میں تمھیں کچھ دے دلا کر بھلے طریقے سے رخصت کر دوں۔ اور اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ اور دارِ آخرت کی طالب ہو تو جان لو کہ تم میں سے جو نیکوکار ہیں اللہ نے ان کے لئے بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے"۔(سورۃ الاحزاب:28-29)

احادیث صحیحہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان دونوں آیات کا نزول اس کے بعد ہوا، جبکہ نبی کریم ﷺ نے ازواجِ مطہرات سے علحید گی اختیار کی اور آپؐ نے قسم کھائی تھی کہ آپؐ ایک ماہ تک ان کے پاس نہیں جائیں گے، یہ قصہ ایلاء کے نام سے معروف ہے اور یہ آیات سن نو ہجری میں نازل ہوئیں۔(دیکھیں: قضایا نساء النبی (ص) والمؤمنات، ص: 68)

جہاں تک تعلق ہے ان آیات کے سببِ نزول کا تو وہ یہ تھا کہ ازواجِ مطہرات نے نفقہ میں توسیع کی درخواست کی تھی، امام مسلمؒ نے حضرت جابرؓ سے روایت نقل کی ہے فرماتے ہیں: ''حضرت ابو بکرؓ آئے اور وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت مانگ رہے تھے، انہوں نے لوگوں کو آپ ﷺ کے دروازے پر بیٹھے ہوئے پایا، ان میں سے کسی کو اجازت نہیں ملی تھی، کہا: ابو بکر کو اجازت ملی تو وہ اندر داخل ہوگئے۔ پھر عمرؓ آئے، انہوں نے اجازت مانگی، انہیں بھی اجازت مل گئی، انہوں نے نبی ﷺ کو غمگیں اور خاموش بیٹھے ہوئے پایا، آپؐ کی ازواج آپؐ کے ارد گرد تھیں۔ کہا: تو انہوں (ابو بکرؓ) نے کہا: میں ضرور کوئی ایسی بات کروں گا جس سے میں نبی ﷺ کو ہنساؤں گا۔ انہوں نے کہا: اللہ کے رسولؐ! کاش کہ آپ بنت خارجہ کو دیکھتے جب اس نے مجھ سے نفقہ کا سوال کیا تو میں اس کی جانب بڑھا اور اس کی گردن دبا دی۔ اس پر رسول اللہ ﷺ ہنس پڑے اور فرمایا: ''یہ بھی میرے ارد گرد بیٹھی ہیں، جیسے تم دیکھ رہے ہو، اور مجھ سے نفقہ مانگ رہی ہیں''۔ ابو بکرؓ، عائشہؓ کی جانب اٹھے اور ان کی گردن پر ضرب لگانا چاہتے تھے اور عمرؓ حفصہؓ کی جانب بڑھے اور وہ ان کی گردن پر مارنا چاہتے تھے، اور دونوں کہہ رہے تھے: تم رسول اللہ ﷺ سے اس چیز کا سوال کرتی ہو جو ان کے پاس نہیں ہے!۔ وہ کہنے لگیں: اللہ کی قسم! آج کے بعد ہم کبھی رسول اللہ ﷺ سے ایسی چیز کا مطالبہ نہیں کریں گی جو آپ کے پاس نہ ہوگی۔ پھر آپ ﷺ نے ایک ماہ یا انتیس دن تک کے لئے ان سے علیحدگی اختیار کرلی، پھر آپؐ پر یہ آیت نازل ہوئی۔(صحیح مسلم: 1478 مسند أحمد 328/3)

اللہ کے رسولؐ کے گھرانوں میں ایک ہی طرز کا متواضعانہ معیشت کا نظام تھا، حالانکہ بعض اوقات اس میں توسیع کے امکانات بھی تھے اور ازواجِ مطہرات بھی انسان ہی تھیں، ان کو بھی ان چیزوں کی رغبت وچاہت ہوتی تھی جن کی چاہت لوگوں کو ہوتی تھی، ان کے گھر انتہائی متواضع اور سیدھے سادھے تھے، ڈاکٹر ابو شہبہ ان کی منظر کشی کرتے ہوئے فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے اپنی مسجد کے آس پاس کچھ حجرے بنائے تاکہ آپ کے لئے اور اہلِ خانہ کے لئے رہنے کے مکانات بن سکیں اور وہ حجرات بادشاہوں اور قیصر وکسری کے مکانات کی طرح نہیں تھے بلکہ وہ ان لوگوں کے گھروں کی طرح تھے جو دنیا اور اس کی زیب وزینت سے دور ہوں اور انہوں نے آخرت کے گھر کو اپنا مطلوب بنالیا ہو، وہ حجرات بھی آپ کی مسجد کی طرح کچی اینٹوں، گارے اور پتھروں سے بنے ہوئے تھے، ان کی چھت کھجور کے تنوں اور چھالوں پر مشتمل تھی، صحن چھوٹے چھوٹے اور چھت اتنی اونچی کہ ایک نو عمر لڑکا اس کو اپنے ہاتھ سے چھو لیتا تھا۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں: وہ اپنی والدہ حضرت ام سلمہ کی باندی خیرہ کے ساتھ تھے، میں نبی کریمؐ کے حجروں کی سب سے اونچی چھت کو اپنے ہاتھ سے چھوتا تھا، ہر حجرے کے دو دروازے تھے: ایک خارجی اور ایک مسجد سے آنے والا داخلی، تاکہ نبی کریم ﷺ آسانی سے اس میں داخل ہو سکیں۔(دیکھیں: السیرۃ النبویہ فی ضوء القرآن والفقہ: 2/35)

جہاں تک روشنی کا تعلق ہے تو وہاں جلانے کے لئے کوئی چراغ نہیں تھا، اس کی دلیل امام بخاریؒ کی وہ روایت ہے جو حضرت عائشہؓ سے مروی ہے وہ فرماتی ہیں: میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے سوتی تھی اور میرے پاؤں آپ کے سامنے قبلہ کی جانب ہوتے تھے، جب آپؐ سجدہ کرتے تو مجھے ہاتھ سے دباتے تو میں اپنے پاؤں سمیٹ لیتی تھی اور جب آپؐ کھڑے ہوتے تو میں پھیلا لیتی تھی۔ فرماتی ہیں: اور ان دنوں گھروں میں چراغ نہیں ہوتے تھے۔ (صحیح بخاری:382، صحیح مسلم:512/272)

اور جہاں تک تعلق ہے آپؐ کے بستر کا جس پر نبی کریم ﷺ آرام فرماتے تھے تو وہ صرف ایک چٹائی پر مشتمل تھا، آپؐ اور چٹائی کے درمیان کوئی بستر نہیں ہوتا تھا، اس چٹائی کے نشانات آپؐ کے جسم پر پڑتے تھے اور آپؐ چمڑے کے ایک تکیہ پر ٹیک لگاتے تھے، اس تکیہ میں کھجور کے درخت کے پتے بھرے ہوئے تھے۔ (صحیح بخاری:6456، صحیح مسلم:2082)

آپؐ کی معیشت اور آپؐ کے طرزِ زندگی سے پتہ چلتا ہے کہ آپؐ سخت زندگی بسر کرتے تھے، حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں: ''میں نہیں جانتا ہوں کہ نبی کریم ﷺ نے کبھی نرم چپاتی کھائی ہو یہاں تک کہ آپؐ اللہ سے جا ملے، اور نہ ہی نبی کریم ﷺ نے کبھی اپنی آنکھ سے سموچی بھنی ہوئی بکری دیکھی''۔ (صحیح بخاری:6457)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے فرماتی ہیں: ہم دو مہینوں میں تین چاند دیکھ لیتے تھے اور رسول اللہ ﷺ کے گھروں میں چولہا نہیں جلتا تھا۔ حضرت عروہ بن زبیر نے ان سے پوچھا: پھر آپ لوگ کس چیز پر زندہ رہتے تھے؟ فرمایا: دو کالی چیزوں پر: کھجور اور پانی۔ (صحیح بخاری: 6459)

ایک طرف یہ صورتحال تھی اور اس کے بعد فتح خیبر، فتح مکہ اور غزوۂ تبوک کے بعد اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو وسعت عطا کی، ازواج مطہرات نے کتاب اللہ کی آیات میں پڑھا تھا کہ بغیر اسراف کے اللہ کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونا جائز ہے، اس لئے انہوں نے چاہا کہ ان کو بھی اس کا کوئی حصہ ملے، جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿يَٰبَنِيٓ ءَادَمَ خُذُواْ زِينَتَكُمۡ عِندَ كُلِّ مَسۡجِدٖ وَكُلُواْ وَٱشۡرَبُواْ وَلَا تُسۡرِفُوٓاْۚ إِنَّهُۥ لَا يُحِبُّ ٱلۡمُسۡرِفِينَ﴾ ترجمہ: ''اے بنی آدم، ہر عبادت کے موقع پر اپنی زینت سے آراستہ رہو اور کھاؤ پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو، اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا''۔ (سورۃ الاعراف:31)

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے پاکیزہ رزق کھانے کی ترغیب دی ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿قُلۡ مَنۡ حَرَّمَ زِينَةَ ٱللَّهِ ٱلَّتِيٓ أَخۡرَجَ لِعِبَادِهِۦ وَٱلطَّيِّبَٰتِ مِنَ ٱلرِّزۡقِۚ قُلۡ هِيَ لِلَّذِينَ ءَامَنُواْ فِي ٱلۡحَيَوٰةِ ٱلدُّنۡيَا خَالِصَةٗ يَوۡمَ ٱلۡقِيَٰمَةِۗ كَذَٰلِكَ نُفَصِّلُ ٱلۡأٓيَٰتِ لِقَوۡمٖ يَعۡلَمُونَ﴾ ترجمہ: ''اے محمدؐ، ان سے کہو: کس نے اللہ کی اُس زینت کو حرام کر دیا جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لئے نکالا تھا اور کس نے خدا کی بخشی ہوئی پاک چیزیں ممنوع کر دیں؟ کہو: یہ ساری چیزیں دنیا کی زندگی میں بھی ایمان لانے والوں کے لئے ہیں، اور قیامت کے روز تو خالصتاً انہی کے لئے ہوں گی، اِس طرح ہم اپنی باتیں صاف صاف بیان کرتے ہیں اُن لوگوں کے لئے جو علم رکھنے والے ہیں''۔ (سورۃ الاعراف:32)

اللہ تعالیٰ نے انفاق میں توسط واعتدال اختیار کرنے کا حکم دیا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَا تَجۡعَلۡ يَدَكَ مَغۡلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبۡسُطۡهَا كُلَّ ٱلۡبَسۡطِ فَتَقۡعُدَ مَلُومًا مَّحۡسُورًا﴾ ترجمہ: "نہ تو اپنا ہاتھ گردن سے باندھ رکھو اور نہ اسے بالکل ہی کھلا چھوڑ دو کہ ملامت زدہ اور عاجز بن کر رہ جاؤ"۔(سورۃ الاسراء:29)

البتہ ایک دوسرا پہلو بھی ہے جو آپ ﷺ سے متعلق ہے، آپ ؐ نے اپنے رب کے حکم سے ایک مخصوص طرزِ زندگی اختیار کیا تھا، آپ ؐ دنیا کی طرف نظرِ التفات نہیں فرماتے تھے، جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ ہدایت کی تھی: ﴿لَا تَمُدَّنَّ عَيۡنَيۡكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعۡنَا بِهِۦٓ أَزۡوَٰجًا مِّنۡهُمۡ وَلَا تَحۡزَنۡ عَلَيۡهِمۡ وَٱخۡفِضۡ جَنَاحَكَ لِلۡمُؤۡمِنِينَ﴾ ترجمہ: "تم اُس متاعِ دنیا کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھو جو ہم نے اِن میں سے مختلف قسم کے لوگوں کو دے رکھی ہے، اور نہ اِن کے حال پر اپنا دل کڑھاؤ، انہیں چھوڑ کر ایمان لانے والوں کی طرف جھکو"۔(سورۃ الحجر:88)

ایک دوسری آیت میں ہے: ﴿وَلَا تَمُدَّنَّ عَيۡنَيۡكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعۡنَا بِهِۦٓ أَزۡوَٰجًا مِّنۡهُمۡ زَهۡرَةَ ٱلۡحَيَوٰةِ ٱلدُّنۡيَا لِنَفۡتِنَهُمۡ فِيهِۚ وَرِزۡقُ رَبِّكَ خَيۡرٌ وَأَبۡقَىٰ﴾ ترجمہ: "اور نگاہ اُٹھا کر بھی نہ دیکھو دُنیوی زندگی کی اُس شان وشوکت کو جو ہم نے اِن میں سے مختلف قسم کے لوگوں کو دے رکھی ہے، وہ تو ہم نے انہیں آزمائش میں ڈالنے کے لئے دی ہے، اور تیرے رب کا دیا ہوا رزق حلال ہی بہتر اور پائندہ تر ہے"۔(سورۃ طٰہ:131)

اسی لئے تخییر (اختیار) والی آیات جب نازل ہوئیں تو آپ ﷺ کی ازواج نے اس موقع پر ایک دوٹوک موقف اختیار کیا اور وہ کسی طرح کے پس وپیش اور تردد کا شکار نہیں ہوئیں، بلکہ انہوں نے اللہ، اس کے رسول اور دارِ آخرت کا انتخاب کیا، انہوں نے آپ ؐ سے نفقہ میں وسعت کا مطالبہ کیا تھا، اور وہ تاکید کے ساتھ اس مطالبہ کو پیش کر رہی تھیں، لیکن جب صورتحال یہ ہوگئی کہ ان کو دو چیزوں میں سے ایک چیز کو انتخاب کرنے کا اختیار دیا گیا: دنیا اور اس کی زیب وزینت یا اللہ، اس کے رسول اور دارِ آخرت۔ تو ایک منٹ کے لئے بھی ان کو اللہ اور اس کے رسول اور دارِ آخرت کا انتخاب کرنے میں تردد نہیں ہوا، بلکہ انہوں نے بیک آواز ہو کر کہا: ہم اللہ، اس کے رسول اور دارِ آخرت چاہتی ہیں۔(دیکھیں: قضایا نساء النبي والمؤمنات في سورة الاحزاب، ص:77)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے فرماتی ہیں: "جب رسول اللہ ﷺ کو حکم ہوا کہ اپنی ازواج کو اختیار دیں تو آپ ؐ میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ میں تم سے ایک معاملہ کے متعلق کہنے آیا ہوں، ضروری نہیں کہ تم جلدی کرو، اپنے والدین سے بھی مشورہ لے سکتی ہو۔ انہوں نے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ کو تو معلوم ہی تھا کہ میرے والدین آپ سے جدائی کا کبھی مشورہ نہیں دے سکتے۔ عائشہ ﷺ نے بیان کیا کہ پھر نبی کریم ﷺ نے (وہ آیت جس میں یہ حکم تھا) پڑھی کہ اللہ پاک کا ارشاد ہے: «يا أيها النبي قل لأزواجك إن كنتن تردن الحياة الدنيا وزينتها» "اے نبی! اپنی بیویوں سے فرمادیجئیے کہ اگر تم دنیوی زندگی اور اس کی زینت کو چاہتی ہو سے «أجرا عظيما» تک۔ عائشہؓ نے بیان کیا کہ میں نے عرض کیا: لیکن اپنے والدین سے مشورہ کس بات کے لئے ضروری ہے، ظاہر ہے کہ میں اللہ اور اس کے رسول اور عالمِ

آخرت کو چاہتی ہوں۔ بیان کیا کہ پھر دوسری ازواج مطہرات نے بھی وہی کہا جو میں کہہ چکی تھی"۔ (صحيح البخاري:4786 صحيح مسلم:1457)

اس طرح سے ازواجِ مطہرات کے موقف اور طرزِ عمل سے ایمانی قوت اور اللہ تعالیٰ کے لئے صدق واخلاص کے حقیقی امتحان کی روشن اور واضح تصویر سامنے آتی ہے، خلفائے راشدین نے بھی اختیار کے اس واقعہ کو اسلام کے ایک اہم نشانِ راہ اور اہم منہجِ نبوی کی حیثیت سے سمجھا جس کے نشانِ راہ پر امت کی قیادت کو چلنا چاہئے۔

تاریخ اسلامی پر ایک طائرانہ نگاہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس پہلو کو ایک اہم معیار سمجھا جاتا ہے، جس کے ذریعہ دین پر استقامت اور عدمِ استقامت کو پہچانا جاسکتا ہے، اہلِ ایمان قائدینِ امت کو بھی ہر زمانہ میں اس پہلو کی اہمیت کا اچھی طرح ادراک تھا اور انہوں نے اس پہلو کی مکمل رعایت کی اور خلافتِ راشدہ کی تاریخ میں اس کی عملی مثالیں بھری پڑی ہیں جن کو تلاش کرنا کسی کے لئے مشکل نہیں ہے۔

بے شک امت کی قیادت ایک اہم ذمہ داری اور فرض ہے، وہ کوئی مالِ غنیمت نہیں ہے، اس لئے قیادت پر فائز ہونے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ دنیاوی ٹکروں سے بالاتر رہنے اور اللہ اور آخرت کو ترجیح دینے کی اہمت کا اچھی طرح ادراک کریں۔ (دیکھیں: من معین السیرۃ، ص:475)

۴: حضرت ابو بکرؓ کا لوگوں کو حج کرانا:

دورِ نبوی میں معاشرہ کی تربیت اور ریاست کی تعمیر ہر سطح پر جاری تھی، عقائد، اقتصاد و معیشت، معاشرت، سیاست، عسکریت اور عبادت ہر میدان میں تربیت مسلسل جاری تھی، سابقہ سالوں میں فریضہ حج کی ادائیگی کا موقع میسر نہیں آیا تھا، چنانچہ فتحِ مکہ کے بعد سن آٹھ ہجری کے حج کا ذمہ دار حضرت عتاب بن اسیدؓ کو بنایا گیا تھا اور مسلمانوں کا حج مشرکین کے حج سے کسی طرح ممتاز و مختلف نہیں تھا، اس کے اگلے سال جب حج کا زمانہ آیا تو آپؐ نے حج کا ارادہ فرمایا لیکن آپؐ نے فرمایا: خانہ کعبہ میں مشرکین برہنہ طواف کرنے کے لئے آئیں گے، اس لئے میں اس حالت میں حج نہیں کرنا چاہتا ہوں، یہاں تک کہ ایسا نہ ہو، اس لئے آپؐ نے حضرت صدیق اکبرؓ کو سن نو ہجری میں امیر حج بنا کر بھیجا، حضرت ابو بکرؓ اور آپؐ کے ساتھ صحابہ کرام کی ایک جماعت حج کے لئے نکلی اور ان کے ساتھ ہدی (قربانی) کے جانور بھی تھے۔ (دیکھیں: فتح الباری:8/82)

جب حضرت ابو بکر صدیقؓ قافلۂ حج لے کر نکلے تو سورۂ براءت نازل ہوئی، نبی کریم ﷺ نے حضرت علیؓ کو بلایا اور حکم دیا کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے ساتھ شریک سفر ہو جائیں، حضرت علیؓ رسول اللہ ﷺ کی 'العضباء' اونٹنی پر سوار ہو کر نکلے، یہاں تک کہ ذوالحلیفہ میں حضرت ابو بکر صدیقؓ کے ساتھ جا ملے، جب صدیقؓ نے حضرت علیؓ کو دیکھا تو ان سے دریافت کیا: آپ امیر بن کر آئے ہیں یا بحیثیتِ مأمور آئے ہیں؟ حضرت علیؓ نے فرمایا: نہیں! بلکہ مأمور بن کر آیا ہوں۔ اس کے بعد دونوں نے کوچ کیا اور حضرت ابو بکرؓ نے لوگوں کو انہی

مقامات پر حج کرایا جہاں وہ زمانۂ جاہلیت میں کیا کرتے تھے اور اس سال حج ماہ ذی الحجہ میں تھا جیسے کہ صحیح روایات سے معلوم ہوتا ہے، نہ کہ ماہ ذیقعدہ میں جیسے کہ بعض لوگوں کا خیال ہے۔

حضرت ابو بکرؓ نے ترویہ سے پہلے، عرفہ کے دن، قربانی کے دن اور بارہ ذی الحجہ کو خطبہ دیا، آپؓ لوگوں کو وقوف کے بارے میں، مزدلفہ میں قربانی کے بارے میں اور رمی کے بارے میں اور دیگر مناسکِ حج کی تعلیم دیتے تھے اور علیؓ ہر جگہ ان کے پیچھے جاتے تھے اور لوگوں کے سامنے سورۂ براءت کی ابتدائی آیات پڑھ کر سناتے تھے، اس کے بعد لوگوں میں ان چار باتوں کا اعلان کرتے تھے: ''جنت میں مؤمن کے علاوہ کوئی داخل نہیں ہو سکتا ہے، کوئی بھی شخص برہنہ ہو کر خانہ کعبہ کا طواف نہیں کرے گا اور جس کا رسول اللہ کے ساتھ معاہدہ تھا تو اس کا معاہدہ اس کی مدت تک برقرار رہے گا اور اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا''۔ (مسند أحمد: 1/79، سنن ترمذی: 3090، 871، مسند ابو یعلی: 452، صحیح السیرۃ النبویۃ، ص: 625)

حضرت ابو بکر صدیقؓ نے ابو ہریرہؓ کو صحابہ کرام کی ایک دوسری جماعت کی معیت میں حکم دیا کہ وہ حضرت علیؓ کو سونپی گئی ذمہ داری کی ادائیگی میں تعاون کریں۔

بلاشبہ سورۂ براءت کی ابتدائی آیات کا نزول بت پرستی اور اس کے متبعین کے ساتھ براءت وعلیحدگی کا واضح اعلان تھا، ان آیات کے ذریعہ ان کے طریقۂ حج کو بھی کالعدم قرار دیا گیا اور ان کے خلاف اعلانِ جنگ کیا گیا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿بَرَآءَةٌ مِّنَ ٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦٓ إِلَى ٱلَّذِينَ عَـٰهَدتُّم مِّنَ ٱلْمُشْرِكِينَ ۝١ فَسِيحُوا۟ فِى ٱلْأَرْضِ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَٱعْلَمُوٓا۟ أَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى ٱللَّهِ ۙ وَأَنَّ ٱللَّهَ مُخْزِى ٱلْكَـٰفِرِينَ ۝٢ وَأَذَٰنٌ مِّنَ ٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦٓ إِلَى ٱلنَّاسِ يَوْمَ ٱلْحَجِّ ٱلْأَكْبَرِ أَنَّ ٱللَّهَ بَرِىٓءٌ مِّنَ ٱلْمُشْرِكِينَ ۙ وَرَسُولُهُۥ ۚ فَإِن تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَإِن تَوَلَّيْتُمْ فَٱعْلَمُوٓا۟ أَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى ٱللَّهِ ۗ وَبَشِّرِ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝٣﴾ ترجمہ: ''اعلانِ براءت ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے، اُن مشرکین کو جن سے تم نے معاہدے کئے تھے۔ پس تم لوگ ملک میں چار مہینے اور چل پھر لو، اور جان رکھو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو، اور یہ کہ اللہ منکرینِ حق کو رسوا کرنے والا ہے۔ اعلانِ عام ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے حج اکبر کے دن تمام لوگوں کے لئے کہ اللہ مشرکین سے بری الذمہ ہے اور اُس کا رسول بھی، اب اگر تم لوگ توبہ کر لو تو تمہارے ہی لیے بہتر ہے اور جو منہ پھیرتے ہو تو خوب سمجھ لو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو، اور اے نبیؐ، انکار کرنے والوں کو سخت عذاب کی خوشخبری سنا دو''۔ (سورۃ التوبہ: 1-3)

اور جن کے ساتھ معاہدہ تھا ان کو معاہدہ کی مدت تک مہلت دی گئی، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِلَّا ٱلَّذِينَ عَـٰهَدتُّم مِّنَ ٱلْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ يَنقُصُوكُمْ شَيْـًٔا وَلَمْ يُظَـٰهِرُوا۟ عَلَيْكُمْ أَحَدًا فَأَتِمُّوٓا۟ إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَىٰ مُدَّتِهِمْ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ يُحِبُّ ٱلْمُتَّقِينَ﴾ ترجمہ: ''بجز اُن مشرکین کے جن سے تم نے معاہدے کئے، پھر انہوں نے اپنے عہد کو پورا کرنے میں تمہارے ساتھ کوئی کمی

نہیں کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کی مدد کی، تو ایسے لوگوں کے ساتھ تم بھی مدتِ معاہدہ تک وفا کرو، کیونکہ اللہ متقیوں ہی کو پسند کرتا ہے"۔(سورۃالتوبہ:4)

اور مشرکین میں سے جن کے ساتھ عہد نہیں تھا ان کے لئے اشہرِ حُرم تک کے لئے مہلت مقرر کی گئی اور ان محترم مہینوں کے بعد ان کے ساتھ بھی مسلمانوں کی طرف سے اعلانِ جنگ ہوگا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿فَإِذَا ٱنسَلَخَ ٱلْأَشْهُرُ ٱلْحُرُمُ فَٱقْتُلُوا۟ ٱلْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَٱحْصُرُوهُمْ وَٱقْعُدُوا۟ لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَإِن تَابُوا۟ وَأَقَامُوا۟ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتَوُا۟ ٱلزَّكَوٰةَ فَخَلُّوا۟ سَبِيلَهُمْ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ ترجمہ: "پس جب حرام مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو جہاں پاؤ اور انہیں پکڑو اور گھیر و اور ہر گھات میں اُن کی خبر لینے کے لئے بیٹھو، پھر اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو انہیں چھوڑ دو، اللہ در گزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے"۔(سورۃالتوبہ:5)

نبی کریم ﷺ نے حضرت علیؓ کو موسمِ حج میں تمام مشرکین کے سامنے اعلانِ برات کرنے کے لئے بھیجا اور اس میں آپؐ نے عربوں کے ہاں موجود عُرف کی رعایت کی، اس لئے کہ معاہدہ کرنے یا معاہدہ توڑنے کا اہل یا تو قبیلہ کا سردار ہوتا تھا یا اس کی جماعت و قوم کا کوئی اہم فرد، اور اس عُرف کا اسلام کے ساتھ کوئی تعارض نہیں ہے، اسی لئے نبی کریم ﷺ نے اس عرف کا لحاظ فرمایا اور حضرت علیؓ کو اس ذمہ داری کے لئے روانہ فرمایا، بعض حضرات نے اس سے حضرت علیؓ کی خلافت کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس میں اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ حضرت علیؓ حضرت ابو بکرؓ سے زیادہ خلافت کے حقدار ہیں، ڈاکٹر محمد ابو شہبہ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: میں یہ نہیں سمجھ پاتا ہوں کہ ایسے لوگ حضرت صدیقؓ کے قول کو کیسے نظر انداز کردیتے ہیں جبکہ انہوں نے پوچھا تھا: آپ امیر ہیں یا مأمور؟ اور مأمور خلافت کا زیادہ حقدار کیسے ہو سکتا ہے؟!(السیرۃ النبویہ لأبی شہبہ:2/540)

یہ حج آئندہ حجِ اکبر یعنی حجۃ الوداع کے لئے تمہید کے طور پر تھا، حضرت ابو بکرؓ کے حج میں اعلان کیا گیا کہ: بتوں کا عہد اب ختم ہو چکا ہے اور اب ایک نئے مرحلہ کا آغاز ہو گیا ہے، اور اب لوگوں کے سامنے یہی راستہ ہے کہ وہ اللہ کی شریعت پر لبیک کہیں۔

یہ اعلان جب جزیرۃ العرب کے تمام قبائل میں عام ہو گیا تو اس اعلان کے بعد تمام قبائل کو یقین ہو گیا کہ اب صورتحال سخت ہو گئی ہے اور عملًا اب بت پرستی کا عہد ختم ہو گیا ہے، اس لئے تمام قبائل نے اپنے اپنے وفود بھیجنا شروع کردئے تاکہ وہ اسلام اور توحید میں داخل ہونے کا اعلان کریں۔(دیکھیں: قراءۃ سیاسیۃ للسیرۃ النبویۃ، ص:283)

٥: عام الوفود (سن نو ہجری):

جب رسول اللہ ﷺ نے مکہ کو فتح کیا اور تبوک سے بھی فارغ ہو گئے، ثقیف نے بھی اسلام قبول کرلیا اور انہوں نے بیعت کرلی، آپؐ نے عرب کے تمام مشرکین قبائل کو چار ماہ کی مہلت دی تاکہ وہ اپنے بارے میں کوئی فیصلہ کرلیں کہ انہیں کیا کرنا ہے اس سے پہلے کہ اسلامی حکومت ان کے بارے میں کوئی متعین موقف اختیار کرے، اسی اثناء میں رسول اللہ ﷺ کے پاس ہر جگہ اور ہر سمت سے عرب کے

وفود کا ایک سلسلہ شروع ہوا، وہ اپنے ایمان اور وفاداری کا اعلان کر رہے تھے، رسول اللہ ﷺ کے پاس وفود کے آنے کی تاریخ کے بارے میں اور ان کی تعداد کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے، حدیث و تاریخ کے بعض مصادر اس جانب اشارہ کرتے ہیں کہ بعض وفود سن نو ہجری سے بہت پہلے مدینہ آئے، اسی بنیاد پر یہ اختلاف بھی وجود میں آیا کہ بعض کے نزدیک ان وفود کی تعداد ساٹھ سے زیادہ ہے جبکہ دوسروں کے نزدیک ان کی تعداد سو سے بھی زائد تک پہنچ جاتی ہے، شاید بعض نے صرف ان میں سے مشہور وفود کا ذکر کیا ہے۔ (دیکھیں: قراءۃ سیاسیۃ للسیرۃ النبویہ، ص: 284، نضرۃ النعیم: 1/396، البدایہ والنہایہ: 5/46-47)

ابن سعد نے وفود کے بارے میں تمام معلومات کا استقصاء ہے اور تفصیل سے معلومات بیان کی ہیں، اسی طرح وفود کے افراد کے مکمل تراجم اور حالات بھی ذکر کئے ہیں، ان میں سے کس کو صحابی ہونے کا شرف حاصل ہے اور ان کے واسطے سے جو آثار و اقوال وارد ہیں ان کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن بسا اوقات ابن سعد کی اسناد طعن و ضعف سے خالی نہیں ہوتی ہیں، لیکن ان میں بعض اسانید ثقہ راوۃ کی بھی ہیں، البتہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مؤرخین نے جو واقعات ذکر کئے ہیں وہ محدثین کے اصول و ضوابط کے مطابق قابل اعتماد طریقہ سے ثابت نہیں ہیں، اگرچہ ان وفود کے بارے میں روایات کی ایک بڑی تعداد ثابت و صحیح ہے۔ (دیکھیں: نضرۃ النعیم: 1/397، السیرۃ النبویۃ الصحیحہ: 2/542)

امام بخاریؒ نے قبیلۂ تمیم کے وفد کے بارے میں معلومات نقل کی ہیں، اسی طرح دوسرے وفود کا بھی ذکر کیا ہے جیسے کہ وفد عبد القیس، وفد بنی حنیفہ، وفد نجران، وفد اشعریین، وفد اہلِ یمن، وفد دوس۔ (دیکھیں: صحیح البخاری: 4365، 4368، 4372، 4392)

ان وفود کے بارے میں بعض اضافی معلومات سیرت و مغازی کے مصادر کے ساتھ ساتھ دیگر تاریخی مصادر میں بھی وارد ہوئی ہیں، امام مسلمؒ نے بھی مذکورہ اکثر وفود کے بارے میں معلومات ذکر کی ہیں جبکہ دیگر کتب میں اس سے زیادہ معلومات موجود ہیں جن میں وفود کی ایک بڑی تعداد کا ذکر موجود ہے۔

وفود کے بارے میں واقعات و تفصیلات اور ان کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے تعامل کی اپنی جگہ انتہائی اہمیت ہے، البتہ ان وفود کے بارے میں وارد تفصیلی روایات کے متون کے تاریخی نقد کی ضرورت ہے، ان روایت اور واقعات میں ان وفود کے ساتھ نبی کریم ﷺ کے تعامل کا ایک بہترین نبوی منہج موجود ہے جس سے اس سلسلہ میں استفادہ کیا جا سکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کا انسانی نفسیات کے ساتھ اور اس کی تربیت کے بارے میں کیا طرزِ عمل رہا ہے، اسی طرح آپؐ اس سلسلہ میں کس قدر باریک بینی سے کام لیتے تھے اور آپ کس طرح ان کی ترتیب و تنظیم فرماتے تھے، ان روایات میں علم و فقہ کا ایک بڑا خزانہ موجود ہے جس کا تعلق تعلیم و تربیت اور تہذیب و ثقافت سے ہے، اور اس کی بھی رہنمائی بھی موجود ہے کہ اس کے ذریعہ قلوب کو ایک مقصد پر اور مختلف افراد کو ایک مرکز کے ساتھ کس طرح مربوط کیا جا سکتا ہے، بایں طور کے ہر قسم کی صورتحال اور حالات میں اسلام کے ساتھ مضبوط و مستحکم تعلق برقرار اور استوار رہے، اس کے علاوہ بھی بہت اہم امور ہیں جو نفسیاتی، معاشرتی، اقتصادی، تنظیمی، سیاسی اور عسکری میدانوں میں کام کرنے والوں کے لئے نقشِ راہ کا کام دے سکتے ہیں، اور ان کے ذریعہ رہنمائی اور استفادہ کا کام لیا جا سکتا ہے۔ (دیکھیں: الاساس فی السنۃ: 2/1014)

بہر حال ہجرت کا نواں سال مدینہ کی جانب وفود کی آمد کا سال ہے، اسلامی ریاست ان وفود کا استقبال کرنے اور ان کے لئے مناسب تربیتی ماحول فراہم کرنے کے لئے مکمل طور پر تیار تھی، ان کے لئے مناسب جگہ بھی تیار کی گئی تھی، وہ ایک دار الضیافہ اور مہمان خانہ بھی تھا جہاں آنے والے وفود قیام کرتے تھے، اور وہاں مسجد نبوی بھی تھی جہاں ان کا استقبال کیا جاتا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ وہاں بعض رضاکار اور بعض ذمہ دار صحابہ کرام بھی موجود رہتے تھے جو آنے والے وفود کی مہمان نوازی کرتے تھے۔ (دیکھیں: المدینۃ النبویۃ، فجر الاسلام والعصر الراشدی، محمد شرّاب: 2/400، دراسات فی عہد النبوۃ، للشجاع، ص: 221)

اللہ کے رسول ﷺ نے ان وفود کے بارے میں کافی اہتمام فرمایا اور ان کی تعلیم و تربیت پر بھی پوری توجہ مرکوز کی، ان وفود میں بھی اس بات کا شوق تھا کہ وہ اسلام کو سمجھیں اور اس کے احکام و مسائل، آداب، اس کا نظامِ حیات اور اس کی عملی شکلوں کو اچھی طرح سیکھیں، ان وفود میں سے اکثر افراد کی طرف سے سوالات بھی کئے گئے اور وہ سوالات ایسی چیزوں کے بارے میں تھے جو ان کے مابین عام تھیں اور وہ ان کے بارے میں حلال و حرام کے احکام معلوم کرنا چاہتے تھے اور نبی کریم ﷺ ان کو دینی تعلیم دینے اور ان کے سوالات کے جوابات دینے کے سلسلہ میں کافی فکر مند تھے، ان میں سے جس شخص کے بارے میں آپ ﷺ کو معلوم ہوتا کہ اس کے اندر قرآن سیکھنے اور اس کو یاد کرنے کا زیادہ شوق ہے اس کو مزید قریب کرتے اور صحابہ کرام سے فرماتے: "اپنے بھائیوں کو دین سکھاؤ"۔ (دیکھیں: محمد رسول اللہ، صادق عرجون: 4/520)

اللہ کے رسول ﷺ ان قبائل کے شرفاء اور معزز شخصیات کے بارے میں دریافت فرماتے تھے اور جب وہ اپنے وطن واپس جانے کا ارادہ کرتے تھے تو ان کو حق پر قائم رہنے کی وصیت کرتے تھے اور صبر کو مضبوطی سے تھامنے کی ترغیب دیتے تھے، پھر ان کو بہترین انعامات وعطایا سے بھی نوازتے تھے اور ان کے ساتھ ایک جیسا سلوک کرتے تھے، اور جب وہ اپنی قوموں کے پاس واپس جاتے تھے تو داعی اور رہنما بن کر واپس جاتے تھے، ان کے قلوب نورِ ایمان سے منور ہوتے تھے، وہ اپنے ہم وطنوں اور قوم کے لوگوں کو وہ باتیں سکھاتے تھے جو انہوں نے خود سیکھی ہوتیں، اور جو کچھ سنا ہوتا وہ ان کے سامنے بیان کرتے، اور نبی کریم ﷺ کے مکارمِ اخلاق، آپ ﷺ کے حسنِ سلوک اور ملاقات کے وقت آپ ﷺ کی خندہ پیشانی اور استقبال کا ذکر کرتے اور صحابہ کرام کی جس اخوت وہمدردی اور باہمی الفت و محبت کا انہوں نے مشاہدہ کیا ہوتا ان کے سامنے اس کا تذکرہ کرتے، تاکہ ان کے دلوں میں بھی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام کے ساتھ ملاقات کا شوق پیدا کر سکیں اور ان کے اندر بھی انہی جیسا طرزِ زندگی اختیار کرنے اور انہی جیسے مکارمِ اخلاق اختیار کرنے کا جذبہ پیدا کر سکیں۔

بعض وفود نے اپنے لئے عیسائیت پر باقی رہنے اور جزیہ دینے کا انتخاب کیا، جیسے کہ نصاری نجران کے وفد نے اپنے لئے نصرانیت کا انتخاب کیا، مندرجہ ذیل سطور میں بعض وفود کے بارے میں گفتگو کی جاتی ہے، اس لئے کہ ان میں بہت سے اسباق و دروس اور فوائد و عبرتیں ہیں:

أ: وفد عبد القیس:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ان کی آمد کے بارے میں تفصیلات بیان کی ہیں، وہ فرماتے ہیں: عبد القیس کا وفد جب نبی کریم ﷺ کے پاس آیا تو آپ ﷺ نے پوچھا کہ یہ کون سی قوم کے لوگ ہیں؟ یا کہا: یہ وفد کہاں کا ہے؟ انہوں نے کہا کہ ربیعہ خاندان کے لوگ ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: مرحبا اس قوم کو یا کہا اس وفد کو، نہ ذلیل ہونے والے، نہ شرمندہ ہونے والے (یعنی ان کا آنا بہت خوب ہے)۔ وہ کہنے لگے: اے

اللہ کے رسولؐ! ہم آپ کی خدمت میں صرف ان حرمت والے مہینوں میں آسکتے ہیں، کیونکہ ہمارے اور آپ کے درمیان مضر کے کافروں کا قبیلہ آباد ہے، پس آپ ہم کو ایک ایسی قطعی بات بتلا دیجیے جس کی خبر ہم اپنے باقی لوگوں کو بھی کر دیں جو یہاں نہیں آئے اور اس پر عمل درآمد کر کے ہم جنت میں داخل ہو جائیں، اور انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنے برتنوں کے بارے میں بھی پوچھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو چار باتوں کا حکم دیا اور چار قسم کے برتنوں کو استعمال میں لانے سے منع فرمایا۔

ان کو حکم دیا کہ ایک اللہ پر ایمان لاؤ، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا کہ جانتے ہو ایک اللہ پر ایمان لانے کا مطلب کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ اللہ اور اس کے رسول ہی کو معلوم ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے سچے رسول ہیں اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا اور مال غنیمت سے جو ملے، اس کا پانچواں حصہ (مسلمانوں کے بیت المال میں) داخل کرنا۔ اور چار برتنوں کے استعمال سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو منع فرمایا، سبز رنگ کے مٹکے سے اور کدو کے بنائے ہوئے برتن سے، لکڑی کے کھودے ہوئے برتن سے، اور تارکول ملے ہوئے برتن سے۔ اور فرمایا کہ ان باتوں کو حفظ کر لو اور ان لوگوں کو بھی بتلا دینا، جو تم سے پیچھے ہیں اور یہاں نہیں آئے ہیں۔ (صحیح البخاري: 53 صحیح مسلم: 17)

ایک دوسری روایت میں ہے: اشج بن عبد قیس سواریوں کے ساتھ پیچھے رہے یہاں تک کہ ان کو اپنی جگہوں پر بٹھا دیا، اور ساتھیوں کے سامان کو ترتیب سے رکھا، اس کے بعد چلتے ہوئے آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ کو پکڑ کر بوسہ دیا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا: بے شک آپ کے اندر دو صفات ہیں جن کو اللہ اور اس کے رسول پسند کرتے ہیں، انہوں نے پوچھا: یہ میری فطری صفات ہیں یا میری اپنائی ہوئی عادتیں ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نہیں، یہ فطری صفات ہیں۔ (سنن ابن ماجۃ: 4187) یہ سن کر انہوں نے کہا: تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے میری فطرت میں ایسی صفات رکھی ہیں جن کو اللہ اور اس کے رسول پسند کرتے ہیں۔ (مسند أحمد 204/4 الأدب المفرد للبخاري: 584 صحیح السیرۃ النبویۃ، ص 631)

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے استقبال میں اتنے مشغول ہوگئے یہاں تک کہ آپؐ نے ظہر کی بعد کی سنتیں مؤخر کر دیں اور ان کو عصر کے بعد ادا کیا۔ (صحیح السیرۃ النبویۃ: ص: 635)

ب: بنو سعد بن بکر کی طرف سے ضمام بن ثعلبہؓ کا وفد:

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں: قرآن مجید میں ہمیں اِس بات سے روک دیا گیا تھا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کسی چیز کے بارے میں سوال کریں۔ چنانچہ ہم لوگوں کو بڑی خوشی ہوتی تھی کہ دیہاتیوں میں سے کوئی سمجھ بوجھ رکھنے والا شخص آئے، آپؐ سے سوال کرے اور ہم سنیں۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ سوال کرنے میں ہم سے کچھ زیادہ جرأت دکھاتے تھے۔ سیدنا انسؓ فرماتے ہیں کہ ایک موقع پر ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اِس اثناء میں اونٹ پر سوار ایک شخص آیا۔ اُس نے آکر اپنا اونٹ مسجد میں بٹھایا، پھر اُسے ایک جگہ باندھ دیا، پھر پوچھا: تم میں سے اللہ کے رسول محمد کون ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُس وقت صحابہ کے درمیان کسی چیز سے ٹیک لگائے تشریف فرما تھے۔ انسؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے جواب دیا: یہ گورے شخص جو ٹیک لگائے ہوئے ہیں، (یہی محمد

ہیں)۔اُس شخص نے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: عبدالمطلب کے بیٹے، رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا: کہو، میں سن رہاہوں۔اُس شخص نے کہا:اے محمد، میں آپ سے سوالات کروں گااوراُن میں کچھ سخت لب ولہجہ بھی اختیار کرسکتاہوں، آپ بُرا محسوس نہ کیجیے گا۔آپؐ نے فرمایا:پوچھو،جو پوچھناچاہتے ہو۔اُس نے عرض کیا:اے محمدؐ، آپ کا قاصد ہمارے ہاں آیاتھا۔اُس نے ہمیں باور کراناچاہاکہ آپ کا دعویٰ ہے کہ اللہ نے آپ کواپنارسول بناکر بھیجاہے۔آپؐ نے فرمایا:اُس نے سچ کہاہے۔دیہاتی نے کہا:اچھایہ بتایئے کہ آسمان کوکس نے بنایاہے؟آپؐ نے فرمایا:اللہ نے۔اُس نے کہا:اورزمین کوکس نے تخلیق کیاہے؟آپؐ نے فرمایا:اللہ نے۔اُس نے کہا:اوریہ پہاڑکس نے گاڑے ہیں؟اورجو کچھ اِن میں رکھا،وہ کس نے رکھاہے؟آپؐ نے فرمایا:اللہ نے۔اِس پراُس نے کہا:آپ کواُس ذات کی قسم جس نے آسمان کوبنایا،زمین کو تخلیق کیااوراِن پہاڑوں کوگاڑاہے، کیااللہ نے فی الواقع آپ کورسول بناکر بھیجاہے؟آپؐ نے فرمایا:یقیناً۔اُس نے کہا:پھرآپ کے قاصد نے یہ بھی باور کراناچاہاکہ ہمیں شب وروز میں پانچ نمازیں لازماًپڑھنی ہیں۔آپؐ نے فرمایا:سچ کہاہے۔اُس نے کہا:یہی بات ہے تومیں آپ کواُس ذات کی قسم دے کرپوچھتاہوں جس نے آپ کورسول بناکر بھیجاہے،کیافی الواقع اُس نے آپ کویہ حکم دیاہے؟آپؐ نے فرمایا:یقیناً۔اُس نے کہا:اورآپ کے قاصد نے یہ بھی باور کراناچاہاکہ ہمیں اپنے اموال میں سے کچھ زکوٰۃ بھی لازماًاداکرنی ہے۔آپؐ نے فرمایا:سچ کہاہے۔اُس نے کہا:میں اِس پربھی آپ کواُس ذات کی قسم دے کرپوچھتاہوں جس نے آپ کورسول بناکر بھیجاہے،کیافی الواقع اُس نے آپ کویہ حکم دیاہے؟ آپؐ نے فرمایا:یقیناً۔اُس نے کہا:اورآپ کے قاصد نے یہ بھی باور کراناچاہاکہ ہمیں ہرسال ماہِ رمضان کے روزے بھی ضروررکھناہوں گے۔آپؐ نے فرمایا:سچ کہاہے۔اُس نے کہا:میں پھراُسی ذات کی قسم دے کرپوچھتاہوں جس نے آپ کورسول بناکر بھیجاہے،کیافی الواقع اُس نے آپ کویہ حکم دیاہے؟آپؐ نے فرمایا:یقیناً۔اُس نے کہا:اورآپ کے قاصد نے یہ بھی باور کراناچاہاکہ ہم میں سے جوخداکے گھرتک پہنچنے کی استطاعت رکھتاہو،اُس پرفرض ہے کہ اُس کاحج کرے۔آپؐ نے فرمایا:اُس نے یہ بات بھی بالکل سچ کہی ہے۔اِس پراُس شخص نے کہا:آپ جوہدایت لے کرآئے ہیں، میں اُس پرایمان لاتاہوں،میرے پیچھے میری قوم ہے جس نے مجھے قاصد کی حیثیت سے آپ کے پاس بھیجاہے۔میں ضمام بن ثعلبہ ہوں اورمیرا تعلق بنوسعد بن بکر کے قبیلہ سے ہے۔انسؓ کابیان ہے کہ پھروہ پلٹااوریہ کہتے ہوئے چل پڑا:اُس ذات کی قسم جس نے آپ کوحق کے ساتھ مبعوث فرمایاہے، میں اِن باتوں میں اپنی طرف سے کوئی اضافہ یاکمی نہیں کروں گا۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:اِس آدمی نے اگرفی الواقع سچی بات کہی ہے تویہ ضرورجنت میں جائے گا۔[صحیح البخاري:63 سنن ابی داوٗد:486 سنن ابن ماجۃ:1402 مسند أحمد 168/3 سنن نسائی 122/4)

سیدناعبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اِس کے بعدوہ اپنے اونٹ کے پاس آیا،اُس کی رسی کھولی، پھرواپسی کے لئے نکل کھڑاہوا۔ یہاں تک کہ اپنی قوم کے پاس پہنچاتوسب اُس کے گرد جمع ہوگئے۔لوگوں کودیکھتے ہی پہلی بات جواُس کی زبان سے نکلی،وہ یہ تھی کہ کیاہی بُرے ہیں یہ لات اورعزّٰی۔لوگ پکاراُٹھے: ضمام،(یہ کیاکہہ رہے ہو؟)رک جاؤ۔برص اورجذام سے بچو،پاگل ہوجانے سے ڈرو۔ضمام نے کہا:تم پرافسوس!خداکی قسم، یہ دونوں کوئی نفع یانقصان نہیں پہنچاسکتے۔اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ نے اپنارسول بھیج دیاہے اوراُس پروہ کتاب نازل کی ہے جس کے ذریعہ سے اُس نے تمھیں اُن سب خرافات سے نجات دلادی ہے جن میں تم مبتلارہے ہو۔میں گواہی دیتاہوں کہ

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، وہ یکتا ہے، اُس کا کوئی شریک نہیں ہے، اور گواہی دیتا ہوں کہ محمد اُس کے بندے اور رسول ہیں۔ میں اُن کے ہاں سے تمہارے لئے اُن کے اوامر و نواہی لے کر تمہارے پاس آیا ہوں۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں: خدا کی قسم، اُس دن شام نہیں ہوئی کہ اُن کے قبیلے میں سب مرد و عورت مسلمان ہو گئے۔ راوی کا بیان ہے کہ ابن عباسؓ نے فرمایا: ہم نے ضمام بن ثعلبہ سے بہتر کسی قبیلہ کے نمائندہ کے بارے میں نہیں سنا۔ (مسند أحمد 264/1 سنن أبو داؤد: 487 سنن دارمی: 656 صحیح السیرۃ النبویۃ، ص: 630)

حضرت ضمامؓ کے قبولِ اسلام کے واقعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس وقت عرب قبائل میں اسلامی تعلیمات کس قدر عام ہو چکی تھیں، یہاں تک کہ حضرت ضمامؓ اسلامی تعلیمات کے بارے میں پوچھنے نہیں آئے تھے بلکہ ان کی توثیق و تاکید کے لئے آئے تھے اور وہ ایک کے بعد دوسرا مسئلہ پوچھتے رہے، جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آنے سے پہلے ہی وہ ان کا استیعاب کر چکے تھے۔

ج: نصاریٰ نجران کا وفد:

اللہ کے رسول ﷺ نے اہلِ نجران کے نام ایک مکتوب لکھا جس میں تحریر فرمایا: أما بعد! میں آپ کو بندوں کی عبادت کے بجائے اللہ کی عبادت کی دعوت دیتا ہوں اور آپ کو بندوں کی ولایت کے بجائے اللہ کی ولایت کی دعوت دیتا ہوں، اگر آپ ایسا کرنے سے انکار کرو گے تو پھر جزیہ دینا ہوگا، اور اگر جزیہ دینے سے بھی انکار کرو گے تو پھر میں آپ کے خلاف اعلانِ جنگ کرتا ہوں، والسلام۔ (دیکھیں: البدایہ والنہایہ، ص: 5/48)

جب یہ مکتوب وہاں کے پادری کے پاس پہنچا تو اس نے لوگوں کو جمع کیا اور ان کے سامنے یہ خط پڑھا اور ان سے اس کے متعلق رائے معلوم کی، انہوں نے یہ طے کیا کہ ان کے أشراف اور بڑے لوگوں میں سے چودہ افراد پر مشتمل ایک وفد آپ ﷺ کی خدمت میں بھیجیں، یہ بھی منقول ہے کہ یہ وفد ساٹھ افراد پر مشتمل تھا، اور ان میں سے تین افراد بڑے سردار تھے جو ان سب کے مرجع سمجھے جاتے تھے: عاقب۔ جو امیرِ قوم تھا اور عقلمند سمجھا جاتا تھا اور صاحب مشورہ تھا اور اسی کی رائے پر یہ لوگ مطمئن ہو جاتے تھے۔ السید۔ جو ان کا امیرِ سفر ہوتا تھا۔ اور ابو الحارث۔ جو ان کا پادری اور مدرسِ اعلیٰ تھا۔ یہ وفد مدینہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مسجد نبوی میں حاضر ہوا، آپؐ اس وقت عصر کی نماز سے فارغ ہو کر بیٹھے ہی تھے، یہ لوگ نفیس پوشاکیں پہنے ہوئے اور خوبصورت نرم ریشمی چادریں اوڑھے ہوئے تھے، ان کے ہاتھوں میں سونے کی انگوٹھیاں تھیں، ان کی نماز کا وقت آ گیا تو انہوں نے مشرق کی طرف منہ کر کے مسجد نبوی میں ہی اپنے طریقہ پر نماز ادا کر لی، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ان کو رہنے دو، اس کے بعد وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے ان سے اعراض کیا، اور ان کے ساتھ کوئی بات نہیں کی، ان سے حضرت عثمانؓ نے کہا: آپ کے لباس کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے، اس لئے اس دن وہ اپنی قیام گاہوں میں واپس چلے گئے، اس کے بعد وہ دوسرے دن راہبوں کا لباس پہن کر آئے اور آپؐ کو سلام کیا، آپؐ نے ان کے سلام کا جواب دیا اور ان کو اسلام کی طرف بلایا، لیکن انہوں نے انکار کیا اور انہوں نے کہا کہ ہم تو آپ سے پہلے کے مسلمان ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: تمہارا اسلام تین باتوں کی وجہ سے قبول نہیں ہے: تم صلیب کی عبادت کرتے ہو، تم خنزیر کا گوشت کھاتے ہو اور تم اللہ کی اولاد مانتے ہو۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویۃ، لأبی شھبہ: 2/547)

اس کے درمیان اور رسول اللہ ﷺ کے مابین کافی بحث ومباحثہ ہوا، نبی کریم ﷺ ان کے سامنے قرآن پڑھ کر سناتے تھے اور ان کے باطل کے مقابلہ میں دلیل دیتے تھے، انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے ایک بات یہ کہی: آپ ہمارے صاحب ومقتدا کے بارے میں نازیبا باتیں کیوں کہتے ہیں؟ اور آپ کہتے ہیں کہ وہ اللہ کے بندے ہیں!۔ آپؐ نے فرمایا: ہاں ایسا ہی ہے۔ بے شک وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور اس کا وہ کلمہ ہیں جس کا القاء اس نے پاک دامن وعفیف مریمؑ کی جانب کیا ہے، یہ سن کر وہ ناراض ہوئے اور کہنے لگے: کیا آپ نے کوئی ایسا انسان دیکھا ہے جو بغیر باپ کے پیدا ہوا ہو، اگر آپ سچے ہیں تو ہمیں ان جیسا کسی کو دکھادیں، اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کے رد میں یہ آیت نازل فرمائی: ﴿إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ ٱللَّهِ كَمَثَلِ ءَادَمَ ۖ خَلَقَهُۥ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُۥ كُن فَيَكُونُ ﴿٥٩﴾ ٱلْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَلَا تَكُن مِّنَ ٱلْمُمْتَرِينَ﴾ ترجمہ: ''اللہ کے نزدیک عیسیٰؑ کی مثال آدمؑ کی سی ہے کہ اللہ نے اسے مٹی سے پیدا کیا اور حکم دیا کہ ہو جا اور وہ ہو گیا۔ یہ اصل حقیقت ہے جو تمہارے رب کی طرف سے بتائی جارہی ہے اور تم ان لوگوں میں شامل نہ ہو جو اس میں شک کرتے ہیں''۔(سورۃ آل عمران: 59-60)

یہ ایک ناقابل تردید حجت ودلیل تھی جس میں ایک عجیب وغریب چیز کو اس سے زیادہ عجیب وغریب چیز سے تشبیہ دی گئی ہے، جب حکمت اور موعظتِ حسنہ کے ساتھ بحث ومباحثہ کا ان کے ساتھ کوئی نتیجہ خیز فائدہ سامنے نہیں آیا تو آپؐ نے ان کو اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر عمل کرتے ہوئے مباہلہ کی دعوت دی، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَمَنْ حَآجَّكَ فِيهِ مِنۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ ٱلْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا۟ نَدْعُ أَبْنَآءَنَا وَأَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَأَنفُسَنَا وَأَنفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَل لَّعْنَتَ ٱللَّهِ عَلَى ٱلْكَٰذِبِينَ﴾ ترجمہ: ''یہ علم آجانے کے بعد اب کوئی اس معاملہ میں تم سے جھگڑا کرے تو اے محمدؐ! اس سے کہو: "آؤ ہم اور تم خود بھی آجائیں اور اپنے اپنے بال بچوں کو بھی لے آئیں اور خدا سے دعا کریں کہ جو جھوٹا ہو اُس پر خدا کی لعنت ہو''۔(سورۃ آل عمران: 61)

نبی کریم مباہلہ کے لئے نکلے اور آپؐ کے ساتھ حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ اور حضرت فاطمہؓ تھیں، آپؐ نے فرمایا: جب میں دعا کروں گا تو آپ آمین کہنا، وفد کے لوگوں نے آپس میں مشورہ کیا اور وہ ہلاکت سے ڈرے، اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ آپؐ سچے نبی ہیں اور جو قوم بھی نبی کے ساتھ مباہلہ کرتی ہے وہ ہلاک ہوتی ہے، اس لئے انہوں نے مباہلہ کرنے سے انکار کیا اور کہنے لگے: آپ جیسے چاہیں ہمارے بارے میں فیصلہ کریں، آپؐ نے دو ہزار حلّوں (کپڑے کے جوڑوں) پر مصالحت کی، ایک ہزار ماہِ رجب میں ادا کریں گے اور ایک ہزار ماہِ صفر میں ادا کریں گے، جب انہوں نے اپنے وطن واپس جانے کا ارادہ کیا تو انہوں نے نبی کریم ﷺ سے فرمایا: ہمارے ساتھ کسی امانت دار شخص کو بھیجیں جو ہم سے مصالحت والا مال وصول کرے، آپؐ نے ان سے فرمایا: ٹھیک ہے، میں تمہارے ساتھ حقیقتاً ایک امین شخص کو بھیجوں گا، رسول اللہ ﷺ کے اصحاب خود کو نمایاں کرنے لگے کہ آپؐ کس کا انتخاب کرتے ہیں، آپؐ نے فرمایا: اے ابو عبیدہ بن جراح! تم کھڑے ہو جاؤ، جب وہ کھڑے ہوئے تو آپؐ نے فرمایا: یہ اس امت کے امین ہیں۔(السیرۃ النبویۃ لأبی شہبہ: 2/547، زاد المعاد: 3/633)

٦: اسلامی مبادیات کی تعلیم اور تنظیمی امور کی ترتیب کے لئے ٹیموں کی روانگی:

مختلف وفود مدینہ کی جانب تیزی سے آرہے تھے تاکہ وہ اپنے اسلام کا اعلان کریں، اسلامی ریاست کے زیرِ سایہ اپنی زندگی گزاریں اور اپنے وطن واپس جانے سے پہلے مدینہ میں رہتے ہوئے دین کے ضروری احکام سیکھ لیں، اللہ کے رسول ﷺ ان کے ساتھ کسی ایسے شخص کو روانہ فرماتے تھے جو ان کو دین کی تعلیم دے سکے، اسی طرح آپ ؐ نے اپنے داعیوں کی ٹیمیں مختلف سمتوں میں بھیجنا شروع کر دیں اور جزیرۃ العرب کے جنوب میں خاص اہتمام کیا جہاں یمنی قبائل رہتے تھے تاکہ ان کو اسلام کی بنیادیں، تعلیمات اور احکام کی تعلیم دی جاسکے، اسلام اب پورے جزیرۃ العرب میں اور مختلف مقامات پر پھیل چکا تھا اور اب ہر جگہ معلمین و دعاۃ اور مرشدین کی ضرورت تھی جو لوگوں کے سامنے اسلامی حقائق کو بیان کریں، قبیلۂ بنی حارث بن کعب نے اسلام قبول کرنے میں پس و پیش سے کام لیا، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے ان کی جانب حضرت خالد ؓ کو ایک دعوتی اور جہادی دستہ لے کر روانہ فرمایا۔

اَ: بنو حارث بن کعب کی جانب سریہ خالد کی روانگی (سن 10ھ):

بنو حارث بن کعب نجران کے علاقہ میں رہتے تھے اور ان میں سے کسی نے بھی اسلام قبول نہیں کیا، اس لئے اللہ کے رسول ؐ نے حضرت خالد بن ولید ؓ کو سن دس ہجری میں ماہِ ربیع الآخر یا جُمادی الاولی میں ان کی جانب بھیجا اور ان کو حکم دیا کہ ان کے ساتھ قتال کرنے سے پہلے ان کو تین مرتبہ اسلام کی دعوت دیں، اگر وہ اسلام قبول کریں تو ان کے اسلام کو قبول کر لیں اور اگر وہ ایسا نہ کریں تو ان کے ساتھ جنگ کریں، حضرت خالد ؓ روانہ ہوئے یہاں تک کہ ان کے پاس پہنچ گئے، انہوں نے ہر چہار جانب اپنے نمائندے بھیج دیئے جو لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے، ان کی دعوت پر لوگوں نے اسلام قبول کیا اور اسلام کی دعوت قبول کی، حضرت خالد ؓ نے وہیں پر قیام کیا، ان کو اسلام کی تعلیم دیتے، کتاب اللہ اور سنت رسول ؐ کی وضاحت کرتے جیسے کہ اللہ کے رسول ؐ نے ان کو حکم دیا تھا، اس کے بعد حضرت خالد ؓ نے رسول اللہ ﷺ کو لکھ کر بھیجا کہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا ہے اور وہ اب ان کے درمیان مقیم ہیں، اللہ کے رسول ؐ نے ان کو خط بھیجا کہ مدینہ واپس آجائیں اور ان کے ساتھ ان کا ایک وفد ہونا چاہیے، حضرت خالد ؓ نے ایسا ہی کیا ،جب وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے تو آپ ؐ نے قیس بن حصین کو ان کا امیر مقرر کیا اور اس کے بعد ان کی جانب حضرت عمرو بن حزم کو بھیجا تاکہ وہ ان کو دین کی تعلیم دیں، سنت اور اسلامی تعلیمات سکھائیں۔(سیرت ابن ہشام:4/250)

ایک روایت میں ہے کہ آپ ؐ نے ان کی جانب حضرت خالد ؓ کے بجائے حضرت علی ؓ کو بھیجا اور جب وہ ہمدان کے قبائل کے پاس پہنچے تو انہوں نے ان کو رسول اللہ ﷺ کا خط پڑھ کر سنایا، جس کے بعد ہمدان کے تمام لوگوں نے اسلام قبول کیا اور حضرت علی ؓ نے ان کو اسلام لانے کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کو خط لکھ کر اطلاع دی، جب اللہ کے رسول ﷺ نے خط پڑھا تو آپ ؐ سجدہ میں گر گئے، اس کے بعد اپنا سر اٹھایا تو فرمایا: سلام ہو ہمدان پر، سلام ہو ہمدان پر۔(الدلائل للبیہقی:5/396)

اللہ کے رسولؐ ریاست کے جنوبی حصہ کے بارے میں انتہائی فکر مند تھے اور یہ چاہتے تھے کہ یمنی قبائل اسلام میں داخل ہوں، اسی اہتمام اور توجہ کا نتیجہ اس طور پر ظاہر ہوا کہ یمن کی ہر جگہ سے مختلف وفود مدینہ کی طرف رخ کر رہے تھے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ یمن گئے ہوئے داعیوں کی سرگرمیاں مسلسل جاری تھیں اور ان کی سرگرمیاں نتیجہ خیز تھیں، اور رسول اللہ ﷺ کے سراپا اس دعوتی مشن میں معاون ومددگار بن رہے تھے، یہاں تک کہ آپؐ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو اور ان کے بعد حضرت علی بن ابی طالبؓ کو بھی اسی مشن پر روانہ فرمایا۔(دیکھیں: الفقہ السیاسی للوثائق النبویہ، ص: 231)

اللہ کے رسولؐ نے یمن اور حضرموت کے قبائل کے ساتھ جو معاہدے کئے ہیں ان کی تعداد اچھی خاصی ہے، ان تمام معاہدوں کی دستاویزات کو محمد حمید اللہؒ نے اپنی کتاب "مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ" میں جمع کیا ہے۔(دیکھیں: الوثائق السیاسیۃ، حمید اللہ، ص: 230)

بلاشبہ مختلف معاشروں میں اور حکومتوں میں طاقت وقوت کی جگہوں اور اثر انداز ہونے والے مراکز پر توجہ مرکوز کرنا اہم نبوی منہج ہے جس کو نبی کریم ﷺ نے اپنی زندگی میں اختیار کیا ہے۔

ب: یمن کی جانب حضرت معاذؓ اور حضرت ابو موسیٰؓ کی روانگی:

ا: صحابہ کرام میں حلال و حرام کے بارے میں سب سے زیادہ علم رکھنے والے صحابی حضرت معاذ بن جبل انصاریؓ کو اللہ کے رسول ﷺ نے یمن کی جانب بحیثیتِ قاضی، فقیہ، امیر اور محصل زکوۃ بھیجا اور ان کو یمن کے ایک صوبہ کا ذمہ دار مقرر فرمایا، اور جب حضرت معاذؓ یمن کی جانب روانہ ہونے لگے تو نبی کریم ﷺ نے ان کو الوداع کیا اور ہدایات دینے کے لئے ساتھ نکلے، حضرت معاذؓ سوار تھے اور رسول اللہ ﷺ ان کی سواری کے ساتھ پیدل چل رہے تھے، آپؐ نے ان کو بہت سی وصیتیں کیں اور ہدایات دیں اور ان کے لئے ایک عظیم دعوتی منہج مقرر فرمایا، آپؐ نے ان سے فرمایا: "دیکھو! تم ایک ایسی قوم کے پاس جارہے ہو جو اہلِ کتاب (عیسائی اور یہودی) ہیں، اس لئے سب سے پہلے انہیں اللہ کی عبادت کی دعوت دینا، جب وہ اللہ تعالیٰ کو پہچان لیں تو انہیں بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے دن اور رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں، جب وہ اسے بھی ادا کریں تو انہیں بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر زکوٰۃ فرض کی ہے جو ان کے سرمایہ داروں سے لی جائے گی اور انہی کے فقیراء میں تقسیم کردی جائے گی، جب وہ اسے بھی مان لیں تو ان سے زکوٰۃ وصول کرنا، البتہ ان کی عمدہ چیزیں (زکوٰۃ کے طور پر لینے سے) پرہیز کرنا، اور مظلوم کی بددعا سے بچنا، اس لئے کہ اس کی دعا اور اللہ کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہے"۔(صحیح البخاري: 1458 صحیح مسلم: 19)

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے داعیانِ حق کو یہ ہدایت کی ہے کہ تدریج کا طریقہ اختیار کیا جائے اور اہم ترین بات سے دعوت کا آغاز کیا جائے، دعوت کی اصل بنیاد یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان کو ایسا راسخ کیا جائے کہ وہ دلوں کی دھڑکن بن جائے اور افکار اور طرزِ عمل پر اسی کا کنٹرول ہو اور اس کے بعد اسلام کے عملی ارکان کی پابندی کرنے کی دعوت دی جائے، جس کے ذریعہ یہ ایمان مزید راسخ ہوگا اور اس کے اندر نمو اور قوت پیدا ہوگی، اس کے بعد واجبات کا حکم اور محرمات سے ممانعت کا مرحلہ آتا ہے، اور اس مرحلہ پر لوگ پھر ان

اسلامی احکام کو بھی برضا ورغبت قبول کرلیں گے اگرچہ وہ ان کی خواہشاتِ نفس کے برخلاف ہوں، اس لئے کہ ان کے دل پہلے ہی ایمان ویقین سے معمور ہوچکے ہوں گے۔(دیکھیں: التاریخ الاسلامی: 8/187)

یہ منہج اور طریقہ کار نبی کریم ﷺ نے حضرت معاذ بن جبلؓ کے لئے بھی متعین فرمایا اور ہر اس شخص کے لئے بھی متعین فرمایا جو صحابہ کرام کے نقوشِ قدم کے مطابق چلنا چاہتا ہو، جن لوگوں نے اپنے لئے راہِ دعوت کا انتخاب کیا ہے ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسی نبوی منہج کو اختیار کریں جو آپؐ نے متعین فرمایا ہے، اسی صورت میں ان کا ہر قدم صحیح سمت میں اٹھے گا۔(دیکھیں: من معین السیرۃ، ص:486)

جب اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت معاذؓ کو ہدایت دے دی اور آپؐ ہدایات ووصایا سے فارغ ہوئے تو آپؐ نے ان سے آخر میں یہ بات ارشاد فرمائی: اے معاذ! شاید اس سال کے بعد مجھ سے ملاقات نہ ہونے پائے اور آپ کا گزر میری مسجد اور میرے روضہ کے پاس سے ہو، یہ سن کر حضرت معاذؓ رسول اللہ ﷺ کے فراق وجدائی کی وجہ سے رو پڑے، اور ہوا بھی ایسا ہی جیسے کہ رسول اللہ ﷺ نے اشارہ فرمایا تھا، حضرت معاذؓ یمن میں مقیم رہے اور رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد ہی مدینہ منورہ آنے کا موقع ملا۔

۲: اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت ابوموسی اشعریؓ کو بھی یمن کے ایک دوسرے صوبہ کا ذمہ دار بنایا، یہ نیچے والا علاقہ تھا، آپؐ کو بھی بحیثیتِ قاضی، فقیہ، امیر اور محصّلِ زکوۃ بھیجا اور ان کو بھی اور حضرت معاذؓ کو بھی وصیت کی: ''آسانی پیدا کرنا، مشکلات پیدا مت کرنا، خوشخبری دینا اور لوگوں کو متنفّر نہیں کرنا، ایک دوسرے کی بات ماننا، اختلاف نہیں کرنا''۔(صحیح بخاری: 4342، صحیح مسلم: 1733)

اس طرح سے اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت معاذؓ اور حضرت ابوموسیؓ کو ہدایت کی کہ لوگوں کے لئے آسانی کا راستہ اختیار کریں اور ان کے لئے مشکلات اور سختیاں پیدا کرنے سے ان کو منع فرمایا، ان کو حکم دیا کہ لوگوں کو خوشخبری دیں اور ان کو متنفر نہ کریں، اور یہی دعوت واصلاح کا نبوی منہج ہے۔

ج: تنظیمی اموراور مالیات کی ترتیب:

بلاشبہ اجتماعی نظام اس دین کا ایک اہم جزء اور اس کے تمام امور کا لازمی حصہ ہے، اس لئے کہ اجتماعی نظام کے ذریعہ منتشر چیزیں مرتب ہوتی ہیں اور اس کے ذریعہ مطلوبہ اہداف ومقاصد حاصل ہوتے ہیں، پہلے ہی مرحلہ سے اجتماعی نظام اسلام کا ایک طرۂ امتیاز رہا ہے، اس لئے کہ تصورات، شعائر، عبادات اور زندگی کے تمام اعمال واحکام میں اور اسلام کے تمام پہلوؤں میں اجتماعی نظام کا عمل دخل ہے، اللہ کے رسولؐ جب مدینہ میں موجود نہیں ہوتے تھے تو وہاں پر کسی کو اپنا نائب متعین فرماتے تھے اور جب بھی کسی علاقہ کو فتح کرتے تھے تو کسی کو اس کا امیر متعین فرماتے، اللہ کے رسولؐ کی خدمت میں مختلف وفود آتے تھے تو آپؐ ان پر بھی کسی کو امیر متعین فرماتے تھے اور اس کے بعد ان کے پاس کسی ایسے شخص کو رکھتے جو ان کو دین کی تعلیم دیتا، اسی طرح کسی ایسے شخص کو بھی بھیجتے تھے جو ان سے صدقات کو وصول کرتا۔ (دیکھیں: دراسات فی عہد النبوۃ للشجاع، ص: 221)

آپؐ ایسے افراد کو عمال متعین فرماتے تھے جو صالح، اہلِ علم، دیندار، عربوں میں نمایاں اور اپنے قبائل میں مؤثر شخصیات کے حامل ہوں، چنانچہ آپؐ نے مکہ میں اپنا نائب حضرت عتاب بن اُسیدؓ کو متعین فرمایا، طائف پر حضرت عثمان بن عاصؓ کو مقرر فرمایا، حضرت علیؓ اور

حضرت ابو موسیٰؓ کو یمن بھیجا، بعض حالات میں اللہ کے رسول ﷺ نے سابق امراء اور بادشاہوں کو ہی برقرار رکھا جبکہ انہوں نے اسلام قبول کرلیا یا ان سے جزیہ لیا گیا، ان میں سے ایک بازان بن سامان سے جو بہرام کی اولاد میں سے تھا، اس کو اللہ کے رسول ﷺ نے اس کے قبولِ اسلام کے بعد یمن کا ذمہ دار برقرار رکھا اور جب آپؐ کو اس کی وفات کا علم ہوا تو آپؐ نے اس کے کام کو صحابہ کی ایک جماعت کے درمیان تقسیم کردیا، چنانچہ صنعاء پر شمرؓ بن باذان کو متعین فرمایا، مأرب پر ابو موسیٰ اشعریؓ کو متعین فرمایا، فوج پر یعلی بن امیہؓ کو متعین فرمایا، ھمذان پر عامر بن شمر ھمدانی کو متعین فرمایا اور نجران، زمع اور زبید پر خالد بن سعید بن عاصؓ کو متعین فرمایا، نجران پر عمرو بن حزمؓ کو مقرر کیا، حضر موت کے علاقہ پر زیاد بن لبید البیاضیؓ کو مقرر کیا اور سکاسک اور سکون پر عکاشہ بن ثورؓ کو مقرر فرمایا۔ (دیکھیں: العبر ودیوان المبتدأ والخبر، ابن خلدون: 2/59)

اللہ کے رسول ﷺ کے حسابات عمال کے بارے میں بالکل واضح تھے، آمدنی اور مصارف کا ان سے حساب لیتے تھے، بعض عمال کے لئے تنخواہیں متعین کی تھیں، جیسے کہ حضرت عتاب بن اُسیدؓ جو مکہ کے گورنر تھے، ان کے لئے ہر روز کا ایک درہم متعین تھا۔ (سیرت ابن ہشام: 4/153) اور جب آپؐ نے قیس بن مالکؓ کو اپنی قوم ہمدان کا گورنر متعین کیا تو ان کے لئے زمین کا ایک حصہ مخصوص کیا جس کا وہ خراج لیتے تھے، آپؐ کے عمال کی تنخواہیں معیشت کی صورتحال کے اعتبار سے کم زیادہ ہوتی رہتی تھیں، وہ مستقل نہیں تھیں۔ (دیکھیں: الدولۃ العربیۃ الاسلامیۃ، منصور الحرابی، ص: 44)

اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ہے: ''جو شخص عامل بنے اور اس کا گھر نہ ہو تو وہ بیت المال سے ایک گھر لے لے، جس کی بیوی نہ ہو تو وہ شادی کر لے، اور جس کے پاس سواری نہ ہو تو وہ سواری لے لے''۔ (مسند احمد: 4/229، سنن ابو داؤد: 2945، ابن خزیمہ: 2370، الدولۃ العربیۃ الاسلامیۃ، ص: 44، التراتیب الاداریۃ للکتانی: 1/227)

یہ اس وقت کے اعتبار سے ایک ذمہ دار شخص کی بنیادی ضروریات تھیں، تاکہ وہ رشوت خوری سے محفوظ رہ سکے، سب سے پہلے اسلام نے ہی یہ قاعدہ متعین کیا ہے، جبکہ جدید نظاموں کی دفعات میں اس کو اب شامل کیا گیا ہے کہ حاکم کو ملنے والا ہدیہ صریح رشوت ہے۔ (دیکھیں: الدولۃ العربیۃ الاسلامیۃ، ص: 44)

ساتواں باب

حجۃ الوداع (10ھ)

حج ارکانِ خمسہ میں سے ایک اہم رکن ہے، حج سن 10 ہجری میں فرض کیا گیا، ابن قیمؒ کی یہی رائے ہے، انہوں نے قوی دلائل کے ذریعہ استدلال کیا ہے اور آپؐ کے طرزِ عمل سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے کہ آپؐ ایسے عمل میں تاخیر نہیں کرتے تھے جو فرض ہو، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَلِلَّهِ عَلَى ٱلنَّاسِ حِجُّ ٱلْبَيْتِ مَنِ ٱسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا﴾ ترجمہ: "لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے"۔ (سورۃ آل عمران: 97) یہ آیت وفود کے سال سن نو ہجری کے اواخر میں نازل ہوئی۔ (دیکھیں: زاد المعاد: 595، السیرۃ النبویۃ فی ضوء المصادر الاصلیۃ، ص: 680)

اللہ کے رسول ﷺ نے مدینہ منورہ سے صرف ایک حج کیا، جو سن دس ہجری میں ادا کیا، یہ حج 'حجۃ البلاغ' 'حجۃ الاسلام' اور 'حجۃ الوداع' کے ناموں سے معروف ہے، حجۃ الوداع کا نام اس لئے دیا گیا کیونکہ آپؐ نے اس میں لوگوں کو الوداع کیا اور اس کے بعد کوئی حج نہیں کیا۔ حجۃ البلاغ اس لئے کہا گیا کیونکہ آپؐ نے حج کے موقع پر قول و عمل کے اعتبار سے اللہ کی شریعت کو لوگوں تک پہنچایا، اسلام کے ارکان اور قواعد میں کوئی چیز ایسی نہیں بچی تھی جس کو آپؐ نے بیان نہ کیا ہو اور جب آپؐ نے لوگوں کے سامنے حج کے احکام بھی بیان کر دیئے اور ان کی شرح و وضاحت بھی کر دی تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، جبکہ آپؐ عرفہ میں وقوف فرما رہے تھے: ﴿ٱلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ ٱلْإِسْلَٰمَ دِينًا﴾ ترجمہ: "آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے پسند کر لیا ہے"۔ (سورۃ المائدۃ: 3)

جب یہ آیت نازل ہوئی تو بعض صحابہ اس موقع پر رو پڑے، جن میں عمر بن خطابؓ بھی تھے، گویا کہ انہوں نے اس کے ذریعہ یہ سمجھ لیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے دنیا سے جانے کا وقت آچکا ہے، اور جب حضرت عمرؓ سے پوچھا گیا: آپ کیوں رو رہے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: کمال کے بعد کمی ہوا کرتی ہے، اس وقت رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک لاکھ سے زائد صحابہ کرام تھے۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویہ، لأبی شھبہ: 2/575، السیرۃ النبویہ للندوی: 386)

ا: نبی کریم ﷺ کے حج کی کیفیت:

رسول اللہ ﷺ نے حج کا ارادہ فرمایا اور لوگوں کو اس کی اطلاع کر دی کہ آپ حج کے لئے جانے والے ہیں، یہ سن کر لوگوں نے آپؐ کے ساتھ حج میں جانے کی تیاریاں شروع کر دیں، اس کی خبر مدینہ کے اطراف میں بھی پہنچی اور وہاں سے لوگ جوق در جوق مدینہ حاضر ہو گئے، راستہ میں اتنی بڑی تعداد میں لوگ اس قافلہ میں شامل ہوتے گئے یہاں کہ ان کا شمار مشکل تھا، لوگوں کا ایک ہجوم تھا جو آگے، پیچھے، دائیں، بائیں، حدِ نگاہ تک آپ ﷺ کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے تھے، آپؐ مدینہ سے دن میں ظہر کے بعد 25/ذی قعدہ کو سنیچر کے دن روانہ ہوئے، پہلے ظہر کی چار رکعتیں ادا فرمائیں، اس سے پہلے خطبہ دیا اور اس میں احرام کے واجبات اور سنن بیان فرمائے۔

پھر تلبیہ کہتے ہوئے روانہ ہوئے: "لبيك اللهم لبيك، لبيك لا شريك لك لبيك، إن الحمد والنعمة لك والملك، لا شريك لك" مجمع ان الفاظ میں کبھی اختصار، کبھی فرطِ شوق سے حذف واضافہ کرتا، آپؐ اس پر کوئی نکیر نہ فرماتے، تلبیہ کا سلسلہ آپ نے جاری رکھا اور ''عرج'' میں پہنچ کر پڑاؤ ڈالا، پھر آگے روانہ ہوئے اور ''أبواء'' پہنچے، وہاں سے چل کر وادیٔ 'عسفان' اور 'سرف' میں پہنچے، پھر وہاں سے روانہ ہو کر 'ذی طوی' میں قیام کیا، وہاں سنیچر کی رات گزاری، یہ ذی الحجہ کی چار تاریخ تھی، فجر کی نماز آپؐ نے یہیں ادا فرمائی، اسی روز غسل فرمایا اور مکہ کی طرف روانہ ہوئے، مکہ میں آپ کا داخلہ دن میں مکہ کے بلند حصہ کی طرف سے روانہ ہوا، وہاں سے چلتے ہوئے آپؐ حرم میں داخل ہوئے اور یہ چاشت کا وقت تھا، حجر اسود کا سامنا ہوا تو اس کا استلام کیا، اس کے بعد طواف کے پہلے تین شوط میں رمل کیا اور چار شوط میں بغیر تیز قدم کے چلتے رہے، طواف سے فراغت کے بعد مقام ابراہیم کے پاس پہنچے اور وہاں یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿وَإِذْ جَعَلْنَا ٱلْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا وَٱتَّخِذُوا۟ مِن مَّقَامِ إِبْرَٰهِـۧمَ مُصَلًّى ۖ وَعَهِدْنَآ إِلَىٰٓ إِبْرَٰهِـۧمَ وَإِسْمَـٰعِيلَ أَن طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِينَ وَٱلْعَـٰكِفِينَ وَٱلرُّكَّعِ ٱلسُّجُودِ﴾ ترجمہ: ''اور یہ کہ ہم نے اس گھر (کعبہ) کو لوگوں کے لئے مرکز اور امن کی جگہ قرار دیا تھا اور لوگوں کو حکم دیا تھا کہ ابراہیمؑ جہاں عبادت کے لئے کھڑا ہوتا ہے اس مقام کو مستقل جائے نماز بنالو اور ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کو تاکید کی تھی کہ میرے گھر کو طواف اور اعتکاف اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک رکھو''۔ (سورۃ البقرۃ: 125) (دیکھیں: السيرة النبوية للندوي، ص:387)

آپؐ نے مقامِ ابراہیم کو اپنے درمیان اور بیت اللہ کے درمیان رکھ کر دو رکعتیں ادا فرمائیں اور ان دو رکعتوں میں "قل يا أيها الكافرون" اور "قل هو الله أحد" تلاوت فرمائی، اس کے بعد حجر اسود والے رکن کے پاس واپس آئے اور دروازے سے صفا کی جانب تشریف لے گئے، جب آپؐ صفا سے قریب پہنچے تو یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿إِنَّ ٱلصَّفَا وَٱلْمَرْوَةَ مِن شَعَآئِرِ ٱللَّهِ ۖ فَمَنْ حَجَّ ٱلْبَيْتَ أَوِ ٱعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَن يَطَّوَّفَ بِهِمَا ۚ وَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ ٱللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ﴾ ترجمہ: ''یقیناً صفا اور مروہ، اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں لہٰذا جو شخص بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرے، اس کے لئے کوئی گناہ کی بات نہیں کہ وہ اِن دونوں پہاڑیوں کے درمیان سعی کرلے اور جو برضا ورغبت کوئی بھلائی کا کام کرے گا، اللہ کو اس کا علم ہے اور وہ اس کی قدر کرنے والا ہے''۔ (سورۃ البقرۃ: 158)

آپؐ نے وہیں سے سعی شروع کی، جہاں سے اللہ تعالیٰ نے شروع کیا ہے، اس لئے آپؐ نے صفا سے آغاز کیا، آپؐ صفا پر چڑھے یہاں تک کہ بیت اللہ آپ کو نظر آنے لگا، پھر قبلہ کی طرف متوجہ ہو کر آپؐ نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت وکبریائی کا اعلان کیا اور فرمایا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ یکتا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اسی کا سب ملک اور بادشاہی ہے، اسی کے لئے ساری حمد وتعریف ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے، اس نے اپنا وعدہ پورا کیا، اپنے بندے کی مدد فرمائی اور تمام جماعتوں اور گروہوں کو تنہا شکست دی۔ اس کے بعد آپؐ نے دعا فرمائی اور اسی طرح کے کلمات تین بار ادا فرمائے، اس کے بعد مروہ کی جانب آئے، اور جب درمیان وادی میں پہنچے تو آپؐ نے سعی کی اور جب وادی سے اوپر چڑھے تو آہستہ آہستہ چلے، اس کے بعد مروہ پہنچے تو جیسے صفا پر کیا تھا، اسی طریقہ سے مروہ پر بھی کیا، یہاں تک کہ سعی کرتے کرتے

جب آخری مرتبہ مروہ پہنچے تو فرمایا: ''اگر مجھے پہلے معلوم ہو گیا ہوتا جواب معلوم ہوا تو میں ہدی (کا جانور) لے کر نہ آتا اور اسے عمرہ میں تبدیل کر دیتا (اور طواف اور سعی کر کے احرام کھول دیتا) لہذا جس کے پاس ہدی نہ ہو وہ احرام کھول دے اور اسے عمرہ قرار دے''۔

یہ سن کر سراقہ بن مالک بن جعشم کھڑے ہوئے اور کہا: اے اللہ کے رسولؐ! کیا یہ صرف اس سال کے لئے ہے یا ہمیشہ ہمیش کے لئے؟ رسول اللہ ﷺ نے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں داخل کر کے فرمایا: ''عمرہ اب حج میں داخل ہو گیا ہے''۔ یہ آپؐ نے دو مرتبہ فرمایا۔ ''نہیں! بلکہ یہ ہمیشہ ہمیش کے لئے ہے''۔

آپؐ نے مکہ میں چار روز قیام فرمایا: اتوار، پیر، منگل اور بدھ۔ اور جمعرات کے روز دن نکلتے ہی آپؐ تمام مسلمانوں کے ساتھ منی تشریف لے آئے، وہاں قیام کیا اور وہیں ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور فجر کی نمازیں ادا فرمائی، فجر کے بعد رکے رہے یہاں تک کہ آفتاب نکل آیا، آپؐ نے نمرہ میں ایک خیمہ لگانے کا حکم دیا تھا، آپؐ وہاں سے روانہ ہوئے اور قریش کو پورا یقین تھا کہ آپؐ مشعر حرام (مزدلفہ) میں ہی ٹھہریں گے، جیسے کہ قریش کے لوگ زمانۂ جاہلیت میں کیا کرتے تھے، لیکن اللہ کے رسولؐ مزدلفہ سے آگے بڑھے یہاں تک کہ عرفات پہنچ گئے، آپؐ نے دیکھا کہ وہاں نمرہ میں خیمہ لگایا گیا ہے، چنانچہ آپؐ اسی میں ٹھہرے، جب زوال کا وقت ختم ہوا تو اپنی اونٹنی قصواء کو تیار کرنے کا حکم دیا، اونٹنی کو آپؐ کے لئے تیار کیا گیا اور آپؐ عرفات کے میدان کے وسط میں آگئے اور وہاں لوگوں کے سامنے خطبہ دیا، آپؐ نے فرمایا:

"لوگو! میری بات سن لو، کیونکہ میں نہیں جانتا غالباً اس سال کے بعد اس مقام پر تم سے کبھی نہ مل سکوں گا۔ تمہارا خون اور تمہارا مال ایک دوسرے پر اسی طرح حرام ہے جس طرح تمہارے آج کے دن کی، رواں مہینے کی اور موجودہ شہر کی حرمت ہے۔ سن لو! جاہلیت کی ہر چیز میرے پاؤں تلے روند دی گئی۔ جاہلیت کے خون بھی ختم کر دیئے گئے اور ہمارے خون میں سے پہلا خون جسے میں ختم کر رہا ہوں وہ ربیعہ بن حارث کے بیٹے کا خون ہے - یہ بچہ بنو سعد میں دودھ پی رہا تھا کہ انہی ایام میں قبیلہ ہذیل نے اسے قتل کر دیا- اور جاہلیت کا سود ختم کر دیا گیا اور ہمارے سود میں سے پہلا سود جسے میں ختم کر رہا ہوں وہ عباس بن عبدالمطلب کا سود ہے، اب یہ سارا کا سارا سود ختم ہے۔ ہاں! عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرو کیونکہ تم نے انہیں اللہ کی امانت کے ساتھ لیا ہے اور اللہ کے کلمہ کے ذریعہ حلال کیا ہے، ان پر تمہارا حق یہ ہے کہ وہ تمہارے بستر پر کسی ایسے شخص کو نہ آنے دیں جو تمہیں گوارا نہیں، اگر وہ ایسا کریں تو تم انہیں مار سکتے ہو لیکن سخت مار نہ مارنا، اور تم پر ان کا حق یہ ہے کہ تم انہیں معروف کے ساتھ کھلاؤ اور پہناؤ۔ اور میں تم میں ایسی چیز چھوڑے جا رہا ہوں کہ اگر تم نے اسے مضبوطی سے پکڑے رکھا تو اس کے بعد ہرگز گمراہ نہ ہو گے اور وہ ہے: اللہ کی کتاب۔ اور تم سے میرے متعلق پوچھا جانے والا ہے تو تم لوگ کیا کہو گے؟ صحابہ نے کہا: ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپ نے تبلیغ کر دی، پیغام پہنچا دیا اور خیر خواہی کا حق ادا فرما دیا۔ یہ سن کر آپ ﷺ نے انگشت شہادت کو آسمان کی طرف اٹھایا اور لوگوں کی طرف جھکاتے ہوئے تین بار فرمایا: اے اللہ گواہ رہنا"۔ (صحیح السیرۃ النبویۃ: 661)

خطبہ کے بعد حضرت بلالؓ نے اذان اور پھر اقامت کہی، رسول اللہ ﷺ نے ظہر کی نماز پڑھائی، اس کے بعد حضرت بلالؓ نے پھر اقامت کہی اور آپؐ نے عصر کی نماز پڑھائی اور ان دونوں نمازوں کے درمیان کوئی نماز نہیں پڑھی۔ اس کے بعد سوار ہو کر آپؐ جائے وقوف

پر تشریف لے گئے، اپنی اونٹنی قصواء کا شکم چٹانوں کی جانب کیا اور حبل مشاۃ (پیدل چلنے والوں کی راہ میں واقع ریتیلے تودے) کو سامنے کیا اور قبلہ رُخ مسلسل (اسی حالت میں) وقوف فرمایا، یہاں تک کہ سورج غروب ہونے لگا، تھوڑی زردی ختم ہوئی، پھر سورج کی ٹکیہ غائب ہوگئی۔

شیخ ابوالحسن ندویؒ نے ذکر کیا ہے کہ نماز سے فارغ ہو کر آپؐ اپنی سواری پر تشریف لے گئے اور موقف پر آئے، یہاں آکر غروب آفتاب تک دعا و مناجات اور مالک الملک کے حضور تضرع وابتہال اور اپنی عاجزی و بے چارگی کے اظہار میں مشغول رہے، دعا میں اپنا دستِ مبارک سینے تک اٹھاتے تھے جیسا کہ کوئی سائل و مسکین نانِ شبینہ کا سوال کر رہا ہو، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرما رہے تھے:

"اَللّٰهُمَّ إِنَّكَ تَسْمَعُ كَلَامِيْ وَتَرٰى مَكَانِيْ وَتَعْلَمُ سِرِّيْ وَعَلَانِيَتِيْ لَا يَخْفٰى عَلَيْكَ شَيْءٌ مِّنْ أَمْرِيْ وَأَنَا الْبَائِسُ الْفَقِيْرُ الْمُسْتَغِيْثُ الْمُسْتَجِيْرُ الْوَجِلُ الْمُشْفِقُ الْمُقِرُّ الْمُعْتَرِفُ بِذَنْبِهٖ، أَسْأَلُكَ مَسْأَلَةَ الْمِسْكِيْنِ وَأَبْتَهِلُ إِلَيْكَ ابْتِهَالَ الْمُذْنِبِ الذَّلِيْلِ وَأَدْعُوْكَ دُعَاءَ الْخَائِفِ الضَّرِيْرِ وَدُعَاءُ مَنْ خَضَعَتْ لَكَ رَقَبَتُهٗ وَفَاضَتْ لَكَ عَبْرَتُهٗ وَذَلَّ جَسَدُهٗ وَرَغِمَ لَكَ أَنْفُهٗ اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْنِيْ بِدُعَائِكَ شَقِيًّا وَّكُنْ بِيْ رَؤُوْفًا رَّحِيْمًا يَّا خَيْرَ الْمَسْئُوْلِيْنَ وَيَا خَيْرَ الْمُعْطِيْنَ". ترجمہ: "اے اللہ! تو میری بات سنتا ہے اور میں جہاں جس حال میں ہوں تو اس کو دیکھتا ہے، اور میرے ظاہر و باطن سے تو باخبر ہے، تجھ سے میری کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں، میں دکھی ہوں، محتاج ہوں، فریادی ہوں، پناہ جو ہوں، ترساں ہوں، ہراساں ہوں، اپنے گناہوں کا اقراری ہوں، تجھ سے سوال کرتا ہوں جیسے کوئی عاجز مسکین بندہ سوال کرتا ہے، تیرے آگے گڑگڑاتا ہوں جیسے گناہ گار ذلیل و خوار گڑگڑاتا ہے، اور تجھ سے دعا کرتا ہوں جیسے کوئی خوف زدہ آفت رسیدہ دعا کرتا ہے، اور اس بندے کی طرح مانگتا ہوں جس کی گردن تیرے سامنے جھکی ہوئی ہو اور آنسو بہہ رہے ہوں اور تن بدن سے وہ تیرے آگے فروتنی کئے ہوئے ہو اور اپنی ناک تیرے سامنے رگڑ رہا ہو۔ اے اللہ! تو مجھے اس دعا مانگنے میں ناکام و نامراد نہ رکھ اور میرے حق میں بڑا مہربان اور رحیم ہو جا۔ اے ان سب سے بہتر و برتر جن سے مانگنے والے مانگتے ہیں اور جو مانگنے والوں کو دیتے ہیں"۔

اسی موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿أَكۡمَلۡتُ لَكُمۡ دِينَكُمۡ وَأَتۡمَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ نِعۡمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ ٱلۡإِسۡلَٰمَ دِينٗاۚ﴾ ترجمہ: "آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے پسند کر لیا ہے"۔ (سورۃ المائدہ: 3)

جب آفتاب غروب ہو گیا تو آپؐ عرفہ سے روانہ ہو گئے اور اسامہ بن زیدؓ کو اپنے پیچھے بٹھایا، آپؐ آگے بڑھے، اونٹنی کی مہار آپؐ نے اس طرح سمیٹ لی تھی کہ قریب تھا کہ آپؐ کا سر کجاوے سے لگ جائے، آپؐ کہتے جاتے تھے کہ لوگو! سکون واطمینان کے ساتھ چلو۔ راستے میں پھر آپؐ تلبیہ پڑھ رہے تھے اور جب تک مزدلفہ نہ پہنچ گئے یہ سلسلہ جاری رہا، وہاں پہنچتے ہی آپؐ نے حضرت بلالؓ کو اذان کا حکم دیا، اذان دی گئی اور آپؐ کھڑے ہو گئے، اور اونٹوں کو بٹھانے اور سامان اتارنے سے پہلے مغرب کی نماز ادا کی، جب لوگوں نے سامان اتار لیا تو آپؐ نے عشاء کی نماز ادا فرمائی پھر آپ آرام فرمانے کے لئے لیٹ گئے اور فجر تک سوئے، جب فجر کا وقت ہوا تو اول وقت میں فجر ادا فرمائی، پھر سواری پر بیٹھے اور مشعر الحرام آئے اور قبلہ رو ہو کر دعا و تضرع، تکبیر و تہلیل اور ذکر میں مشغول ہو گئے یہاں تک کہ خوب روشنی پھیل گئی، یہ طلوع آفتاب سے پہلے کی بات ہے۔

اس کے بعد آپؐ مزدلفہ سے روانہ ہوئے، فضل بن عباسؓ سواری پر آپؐ کے پیچھے تھے، آپؐ برابر تلبیہ میں مشغول رہے، آپؐ نے ابن عباسؓ کو حکم دیا کہ رمی جمار کے لئے سات کنکریاں چن لیں، جب آپؐ وادی محسّر کے وسط میں پہنچے تو آپؐ نے اونٹنی کو تیز کر دیا اور بہت تیزی کے ساتھ چلنے لگے، اس لئے کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں اصحاب فیل پر عذاب نازل ہوا تھا، یہاں تک کہ منی پہنچے اور وہاں سے جمرۃ العقبہ تشریف لائے اور طلوعِ آفتاب کے بعد سوار ہو کر ہی رمی کی اور تلبیہ موقوف کیا۔(دیکھیں: السیرۃ النبویۃ، للندوی، ص: 389)

پھر منی سے واپسی ہوئی یہاں پہنچ کر آپؐ نے ایک بلیغ خطبہ دیا جس میں آپؐ نے یوم النحر کی حرمت سے آگاہ کیا اور اللہ کے نزدیک اس دن کی جو فضیلت ہے اس کو بیان کیا، دوسرے تمام شہروں پر مکہ کی فضیلت و برتری کا ذکر کیا، اور جو کتاب اللہ کی روشنی میں ان کی قیادت کرے گا اس کی اطاعت و فرمانبرداری ان پر واجب قرار دی، پھر آپؐ نے حاضرین سے کہا کہ وہ اپنے مناسک و اعمالِ حج آپؐ سے معلوم کر لیں، آپؐ نے لوگوں کو یہ بھی تلقین فرمائی کہ دیکھو میرے بعد کافروں کی طرح نہ ہو جانا، جو ایک دوسرے کی گردن مارتے رہتے ہیں، آپ نے یہ بھی حکم دیا کہ یہ سب باتیں دوسروں تک پہنچا دیں۔

اس خطبہ میں آپ ﷺ نے فرمایا: یہ کون سا مہینہ ہے ؟ ہم نے کہا: اللہ اور اس کے رسول بہتر جانتے ہیں۔ اس پر آپ ﷺ خاموش رہے، یہاں تک کہ ہم نے سمجھا کہ آپؐ اس کا کوئی اور نام رکھیں گے، لیکن پھر آپؐ نے فرمایا: کیا یہ ذی الحجہ نہیں ہے ؟ ہم نے کہا: کیوں نہیں! آپؐ نے فرمایا: یہ کون سا شہر ہے ؟ ہم نے کہا: اللہ اور اس کے رسول بہتر جانتے ہیں۔ اس پر آپؐ خاموش رہے یہاں تک کہ ہم نے سمجھا آپؐ اس کا کوئی اور نام رکھیں گے، مگر آپؐ نے فرمایا: کیا یہ بلد حرام نہیں ہے ؟ ہم نے کہا: کیوں نہیں!۔ آپؐ نے فرمایا: اچھا تو یہ دن کون سا ہے ؟ ہم نے کہا: اللہ اور اس کے رسول بہتر جانتے ہیں۔ اس پر آپؐ خاموش رہے یہاں تک کہ ہم نے سمجھا آپؐ اس کا کوئی اور نام رکھیں گے مگر آپؐ نے فرمایا: کیا یہ یوم النحر (قربانی کا دن، یعنی دس ذی الحجہ) نہیں ہے ؟ ہم نے کہا: کیوں نہیں! آپؐ نے فرمایا: اچھا تو سنو کہ تمہارا مال اور تمہاری آبرو ایک دوسرے پر ایسے ہی حرام ہے جیسے تمہارے اس شہر اور تمہارے اس مہینے میں تمہارے آج کے دن کی حرمت ہے، اور تم لوگ بہت جلد اپنے پروردگار سے ملوگے، اور وہ تم سے تمہارے اعمال کے متعلق پوچھے گا، لہٰذا دیکھو! میرے بعد پلٹ کر گمراہ نہ ہو جانا کہ آپس میں ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔ بتاؤ! کیا میں نے تبلیغ کر دی ؟ صحابہ نے کہا: ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا: اے اللہ! گواہ رہ۔ جو شخص موجود ہے وہ غیر موجود تک (میری باتیں) پہنچا دے، کیونکہ بعض وہ افراد جن تک (یہ باتیں) پہنچائی جائیں گی وہ بعض (موجود) سننے والے سے کہیں زیادہ ان باتوں کے دَر و بست کو سمجھ سکیں گے"۔

اس کے بعد آپؐ منی میں منحر (قربان گاہ) تشریف لے گئے اور تریسٹھ اونٹ اپنے دست مبارک سے ذبح کئے، جتنے اونٹ آپؐ نے ذبح کئے وہی تعداد آپ کی عمر شریف کے برسوں کی بھی ہے، اتنی تعداد کے بعد آپؐ نے توقف کیا اور حضرت علیؓ سے فرمایا کہ سو (۱۰۰) میں جتنے باقی ہیں وہ پورے کریں، آپؐ نے جب قربانی مکمل کی تو حجام کو طلب فرمایا اور حلق کروایا اور اپنے موئے مبارک قریب کے لوگوں میں تقسیم کئے، پھر سواری پر مکہ کی جانب روانہ ہوئے اور وہاں طواف افاضہ (طواف زیارت) کیا اس کے بعد ظہر کی نماز مکہ میں ہی ادا فرمائی اور پھر آپؐ بنو عبد المطلب کے پاس آئے، جو لوگوں کو زمزم پلا رہے تھے، آپؐ نے فرمایا: اے بنی عبد المطلب! پانی نکالتے رہو، اگر مجھے یہ

اندیشہ نہ ہوتا کہ تمہارے سقایہ پر لوگ تم پر غالب آئیں گے تو میں بھی تمہارے ساتھ پانی نکالتا، لوگوں نے ایک ڈول آپ کو دیا، آپ نے اس میں سے پانی پیا۔(دیکھیں: صحیح السیرۃ النبویہ، للندوی، ص:390)

اس کے بعد آپؐ اسی روز منی واپس تشریف لے گئے اور شب وہیں گزاری، دوسرے دن آپؐ زوالِ آفتاب کا انتظار کرتے رہے، جب زوال کا وقت ہو گیا تو آپؐ اپنی سواری سے اتر کر رمی جمار کے لئے تشریف لے گئے، جمرہ اُولی سے آغاز فرمایا، اس کے بعد جمرہ وسطی اور جمرہ عقبہ (ثالثہ) کے قریب جا کر رمی کی، منی میں آپؐ نے دو خطبے دیئے، ایک قربانی کے دن، دوسرا قربانی کے دوسرے روز، اور اس دوسرے خطبہ میں آپؐ نے خطبہ یوم عرفہ اور منی میں خطبہ یوم النحر میں بیان کی ہوئی باتوں کی مزید تاکید فرمائی۔

حقیقت یہ ہے کہ حجۃ الوداع میں خطبہ میں تکرار مسلمانوں کے لئے ایک ضروری امر تھا، اللہ کے رسولؐ نے صرف یہی ایک حج کیا ہے، اس حج کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کی عزت کا اظہار ہوا اور پورے جزیرۃ العرب میں ان کا نظام اور حکم نافذ ہوا، اسی طرح یہ ایک الوداعی اجتماع تھا، اس لئے اس اجتماع میں مسلمانوں کو تذکیر، نصیحت، ہدایات اور وصیت کی اشد ضرورت تھی، اور بار بار تکرار کے ساتھ باتوں کو دہرانے اور تاکید کرنے کا تقاضا تھا تاکہ وہ ان تمام باتوں کو محفوظ اور یاد رکھ سکیں اور ان کو بھول نہ جائیں اور پیغام حق کو پہچاننے اور امانت کو ادا کرنے کی ذمہ داری ادا کر سکیں۔

بہر حال اللہ کے رسول ﷺ نے منی میں ہی قیام کیا یہاں تک کہ ایام تشریق کے تینوں ایام کی رمی مکمل کر لی، اس کے بعد آپؐ مکہ کی جانب روانہ ہوئے اور سحر کے وقت رات میں طوافِ وداع کیا اور لوگوں کو روانہ ہونے کا حکم دے دیا اور آپؐ خود بھی مدینہ کی جانب روانہ ہو گئے۔

حجۃ الوداع سے واپسی کے دوران راستے میں رسول اللہ ﷺ نے اٹھارہ ذی الحجہ کو جحفہ کے قریب غدیر خم میں لوگوں کے سامنے ایک خطبہ دیا، اس خطبہ میں آپؐ نے ارشاد فرمایا:

"اَمابعد! آگاہ رہو، اے لوگو! میں ایک بشر ہوں، قریب ہے کہ میرے رب کا قاصد میرے پاس آئے تو میں اس کی دعوت پر لبیک کہوں، میں تمہارے درمیان دو بھاری چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں: ان میں سے پہلی اللہ کی کتاب ہے، جس میں ہدایت اور نور ہے، تم اللہ کی اس کتاب کو پکڑے رکھو اور اس کے ساتھ مضبوطی سے قائم رہو۔ آپؐ نے اللہ کی کتاب (قرآن مجید) کی خوب رغبت دلائی، پھر آپؐ نے فرمایا: (دوسری چیز) میرے اہلِ بیت ہیں، میں تم لوگوں کو اپنے اہل بیت کے بارے میں اللہ یاد دلاتا ہوں، میں اپنے اہل بیت کے بارے میں تم لوگوں کو اللہ یاد دلاتا ہوں، میں اپنے اہل بیت کے بارے میں تم لوگوں کو اللہ یاد دلاتا ہوں"۔(مسند اُحمد 14/3 صحیح مسلم:2408)

ایک دوسری روایت میں ہے: "...... آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: اے اللہ! جو مجھے دوست رکھے گا وہ علیؓ کو بھی دوست رکھے گا، میں جس کا محبوب ہوں گا علیؓ بھی اس کا محبوب ہو گا، اے اللہ! جو علیؓ سے محبت رکھے تو اس سے محبت رکھ، اور جو علیؓ سے دشمنی رکھے تو اس کا دشمن ہو جا"۔(مسند اُحمد 118/1 سنن ترمذي:3713 السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ 550/2)

حضرت علیؓ براہ راست یمن سے حجۃ الوداع میں شریک ہوئے تھے، بعض لوگوں نے حضرت علیؓ کے بارے میں شکایت کی تھی کہ انہوں نے ان کے ساتھ بعض معاملات میں سختی کی ہے، حضرت علیؓ نے ان سے کچھ کپڑے واپس لئے تھے جو ان کے نائب نے ان کے درمیان تقسیم کئے تھے۔ اس لئے نبی کریم ﷺ نے غدیر خم میں حضرت علیؓ کا مقام ومرتبہ واضح کیا اور ان کے فضل وکمال کا ذکر کیا، تاکہ وہ اس طرح کی شکایات کرنے سے احتراز کریں، اس لئے کہ حضرت علیؓ ان کے ساتھ معاملہ کرنے میں برحق تھے۔

اور جب رسول اللہ ﷺ ذوالحلیفہ پہنچے تو رات وہیں قیام فرمایا، جب آپؐ کی نظر مدینہ پر پڑی تو آپؐ نے تین مرتبہ تکبیر کہی اور اس کے بعد فرمایا: "لا إله إلا الله وحده، لا شريك له، له الملك وله الحمد، وهو على كل شيء قدير، آيبون تائبون عابدون سائحون لربنا حامدون، صدق الله وعده، ونصر عبده، وهزم الاحزاب وحده "۔ ترجمہ: ''اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، سلطنت اسی کی ہے اور تمام تعریفیں بھی اسی کے لئے ہیں اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ہم لوٹنے والے ہیں، رجوع کرنے والے ہیں، عبادت کرنے والے ہیں، سیر وسیاحت کرنے والے ہیں، اپنے رب کی تعریف کرنے والے ہیں۔ اللہ نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا، اپنے بندے کی مدد کی، اور تنہا ہی ساری فوجوں کو شکست دے دی''۔ (صحیح البخاري: 1797 صحیح مسلم: 1314 زاد المعاد 249/1 السیرۃ النبویۃ للندوي، ص: 391)

۲: اسباق ودروس اور فوائد واحکام:

ا: امت کے عروج وکمال کا مرحلہ:

سن دس ہجری میں امتِ مسلمہ عروج وکمال اور پختگی کے مرحلہ تک پہنچ گئی تھی اور اب ضرورت تھی کہ آخری اور تکمیلی پہلوؤں کو بھی پُر کیا جائے، اس لئے آپ ﷺ نے سن نو اور دس ہجری میں وفود کے استقبال وملاقات کے ذریعہ اور سفرِ حج کے ذریعہ براہِ راست استفادہ کے دائرہ کو وسیع تر کر دیا، آپؐ نے ایک وسیع دعوتی حلقہ کی بنیاد ڈالی جو آپؐ کی دعوت کو لے کر ہر طرف پھیل جائے، اس حلقہ کے افراد نے براہِ راست آپؐ سے ہدایات اور تعلیمات حاصل کیں اور اس حکمتِ عملی کا اسلام کو باقی اور زندہ رکھنے میں سب سے اہم کردار رہا ہے اور حجۃ الوداع کا موقع کتاب اللہ اور سنت رسول کے مطابق افراد اور معاشرہ کی تربیت کا آخری اور تکمیلی مرحلہ تھا۔

۲: جاہلیت کے ساتھ قطع تعلق اور گناہوں سے اجتناب کی تربیت:

اللہ کے رسول ﷺ نے جاہلیت کے ساتھ ایک مسلمان کے قطع تعلق اور دوری اختیار کرنے کی اہمیت کو بیان کیا ہے، چاہے جاہلیت کے بت ہوں، انتقامی جذبات ہوں یا پھر سود ہو، سب سے دوری اور اجتناب کو آپؐ نے ضروری قرار دیا ہے، آپؐ کی گفتگو کی حیثیت صرف ایک وصیت کی نہیں تھی بلکہ وہ ایک حتمی فیصلہ تھا جس کا اعلان آپؐ نے اس وقت کے تمام لوگوں کے سامنے بھی کیا اور آپؐ کے بعد آنے والی تمام امتوں کے لئے بھی کیا، اس فیصلہ کے الفاظ یہ تھے: ''سن لو! جاہلیت کی ہر چیز میرے پاؤں تلے روندی گئی، جاہلیت کے خون بھی ختم کر دئے گئے..... جاہلیت کا سود بھی ختم کر دیا گیا''۔ اس لئے کہ ایک مسلمان اسلام لانے کے بعد جس نئی زندگی کا آغاز کرتا ہے اس کا ماضی کی آلودگیوں اور گندگیوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے۔

ب: اللہ کے رسول ﷺ نے ظاہری اور باطنی تمام گناہوں اور خطاؤں کے بارے میں متنبہ کیا،اس لئے کہ گناہ اور خطائیں ایک انسان کو اتنا نقصان پہنچاتی ہیں جتنا نقصان ایک دشمن بھی نہیں پہنچا سکتا ہے، یہی گناہ انسان کے دنیاوی مصائب کا بھی سبب ہوتے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَآ أَصَٰبَكُم مِّن مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُواْ عَن كَثِيرٍ﴾ ترجمہ: ”تم پر جو مصیبت بھی آئی ہے، تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے آئی ہے،اور بہت سے قصوروں سے وہ ویسے ہی درگزر کر جاتا ہے“۔(سورۃ الشوریٰ:30)

اور انہی گناہوں کی پاداش میں انسان جہنم میں جائے گا اور یہی گناہ معاشرہ اور سوسائٹی میں اتنی تباہی مچاتے ہیں جتنی تباہی تلوار بھی نہیں پہنچا سکتی ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ نے یہ اعلان فرمایا کہ خطاؤں اور گناہوں سے مراد دوبارہ بتوں کی عبادت نہیں ہے،اس لئے کہ جن عقول نے توحید کو قبول کرلیا ہو وہ شرکِ ظاہر کو اختیار کرنے سے اِبا کرتی ہیں، شیطان اگرچہ بت پرستی سے مایوس ہو چکا ہے لیکن خطاؤں اور گناہوں کے ذریعہ انسان کو ہلاکت تک پہنچانے کے بارے میں وہ مایوس نہیں ہوا ہے۔

۳: مبادیات کے بارے میں معاشرہ کی تربیت:

أ: اللہ کے لئے اخوت ایک ایسا مضبوط بندھن ہے جو تمام مسلمانوں کو آپس میں مربوط رکھتا ہے: ﴿إِنَّمَا ٱلْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ﴾ ترجمہ: ”مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں“۔(سورۃ الحجرات:10)اللہ کے رسولؐ نے فرمایا:”اے لوگو! میری بات سنو اور اس کو اچھی طرح ذہن نشین کرلو،آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور مسلمان سب کے سب آپس میں بھائی بھائی ہیں،اس لئے کسی شخص کے لئے وہی چیز جائز ہے جو اس کا بھائی اس کو خوش دلی سے دے گا، لہذا ایک دوسرے پر ظلم مت کرنا“۔اسی طرح آپؐ نے جان،مال اور عزت وآبرو کی حرمت کو بھی واضح انداز میں بیان فرمایا۔

ب: کمزور اور مظلوم کا ساتھ دینے پر آپؐ نے ابھارا تاکہ ضعف وکمزوری اجتماعی اور معاشرتی تعمیر میں کوئی خلا نہ بن جائے اور اس کی وجہ سے نقصان نہ اٹھانا پڑے،اسی لئے آپؐ نے اپنے خطبہ میں عورت اور غلام کا بطور خاص ذکر کیا،اس لئے کہ وہ کمزور طبقے کی دو اہم مثالیں ہیں، آپؐ نے کمزور کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے کی خصوصی تاکید فرمائی۔

ج: آپؐ نے اس بات کی تاکید کی کہ احکام اسلامی کی تطبیق ونفاذ اور اللہ کی شریعت پر عمل کرنے میں اسلامی حکومت کے ساتھ تعاون کرنا ضروری ہے، اگرچہ حاکم وامیر حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو،اس لئے کہ اسی میں دنیاوی اور اخروی فلاح اور نجات ہے،آپؐ نے یہ واضح کردیا کہ حاکم ومحکوم کے مابین سمع واطاعت کا تعلق ہے جب تک کہ امیر وحاکم کتاب اللہ اور سنت رسول کے مطابق حکم دیتا رہے،اور اگر وہ کتاب اللہ اور سنت رسول سے ہٹ جائے تو پھر اس کی اطاعت ضروری نہیں ہے۔(فقہ السیرۃ للبوطی، ص:332)

د: انسانوں کے مابین مساوات:

اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر اور کسی گورے کو کسی کالے پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت نہیں ہے سوائے تقوی کے، لوگ آدم سے ہیں اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں۔ (مسند احمد: 5/411، مسند البزار: 2044)

آپ ﷺ نے واضح فرمادیا کہ تفاضل و برتری میں جنس، قوم، رنگ اور وطن کا کوئی اعتبار نہیں ہے بلکہ تفاضل و برتری کی اساس اخلاقی اقدار ہے جو انسان کو بہت بلند مقام عطا کرتی ہے۔ (دیکھیں: الموسوعۃ فی سماحۃ الاسلام، عرجون: 2/876)

ھ: شریعت کے مصادر کی تعیین:

اللہ کے رسول ﷺ نے مسلمانوں کو پیش آنے والی مشکلات کے حل کے لئے اور شریعت کے مصادر کے سلسلہ میں دو مصادر و مآخذ کی طرف رجوع کرنے کی تاکید فرمائی اور واضح فرمایا کہ دو ہی مصادر و سرچشمے ہیں جن کی طرف رجوع کیا جائے گا، تیسرا کوئی سرچشمہ نہیں ہے، آپؐ نے یہ بھی ضمانت دی کہ اگر ان دونوں کو مضبوطی سے پکڑے رہو گے تو ہر قسم کی ضلالت و بدبختی سے محفوظ رہو گے اور وہ سرچشمے ہیں: کتاب اللہ اور سنت رسولؐ۔

اور آپؐ کی طرف سے یہ ضمانت آنے والی تمام نسلوں کے لئے ہے اور کوئی بھی تہذیب یا کلچر یا کوئی نیا تمدن یا عُرف ان دونوں چیزوں پر غالب نہیں آسکتا ہے۔ آپؐ نے مرض اور دوا کی بھی تعیین فرمائی اور تمام مشکلات کا حل بھی متعین فرمایا اور وہ یہ ہے کہ کتاب اللہ اور سنت رسولؐ کے تمام احکام کی مکمل پابندی کی جائے، آپؐ نے حجۃ الوداع کے تمام خطبوں میں: ''اے مومنو! اے مسلمانو! اے حاجیو!'' کے بجائے عمومی خطاب: ''اے انسانو!'' کے ذریعہ کیا ہے، جس کے ذریعہ اس دین کی عالمیت اور آپؐ کے رحمۃ للعالمین ہونے کا واضح ثبوت ملتا ہے۔

۴: حجۃ الوداع کے خطبوں میں تعلیمی اسالیب:

أ: عمل کے ذریعہ تعلیم:

اللہ کے رسول ﷺ نے صحابہ کرام کو مناسکِ حج عملی شکل میں سکھائے، اس طور پر کہ آپؐ نے خود ان کو کر کے دکھایا اور صرف زبانی اور قولی طور پر سکھانے پر اکتفا نہیں کیا، اسی لئے آپؐ نے فرمایا: ''مجھ سے اپنے مناسکِ حج سیکھ لو!''۔ (صحیح مسلم: 1297، سنن ابو داؤد: 1970، نسائی: 5/275)

اسی لئے داعیانِ حق کے لئے مستحسن ہے کہ جب وہ لوگوں کو اسلامی تعلیمات کی تعلیم دیں تو ان کو اسلام کے معانی اور تعلیمات اور شرعی مطلوبات یا کم از کم ان میں سے بعض عملی صورت میں دکھائیں جیسے کہ وضو، نماز اور صحیح طریقہ سے قرآن پاک کی تعلیم۔

ب: خطبوں میں تکرار:

میں نے دیکھا کہ نبی کریم ﷺ نے مکرر اور بار بار خطبے دئے، آپؐ نے عرفہ میں خطبہ دیا، منی میں دو بار خطبہ دیا، اسی طرح ان خطبوں میں بیان کردہ بعض معانی اور مفاہیم کو بھی دہرایا، اس لئے داعیان کو بھی چاہیے کہ اس سلسلہ میں بھی رسول اللہ ﷺ کی اقتدا کریں اور بوقتِ ضرورت بعض باتوں کو تکرار کے ساتھ بیان کریں، تاکہ سامعین ان کو اچھی طرح یاد کر سکیں، اس لئے کہ خطبہ کا اصل مقصد یہ ہے کہ سامعین کو بعض چیزوں کی تعلیم دی جائے اور جب مکرر بیان کرنے سے ہی یہ فائدہ حاصل ہو توان باتوں اور خطبوں کو مکرر بیان کیا جانا چاہیے، داعی کو یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ میں ہر خطبہ میں کوئی نئی چیز ہی پیش کروں، اس لئے کہ داعی کو سب سے زیادہ اس بات کی فکر ہونی چاہیے کہ سامعین کو فائدہ ہو، نہ کہ اپنی صلاحیت اور فنکاری کا مظاہرہ ہو۔

ج: غائب تک حاضر پہنچائے:

اس کے ذریعہ نبی کریم ﷺ کی طرف سے یہ ہدایت دی گئی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک دینی تعلیمات پہنچ جائیں، یہ تعاون علی الخیر کی ایک شکل ہے، اس لئے کہ ہو سکتا ہے غائب شخص حاضر شخص سے زیادہ حفظ وفہم کا حامل ہو، اس لئے علماء وداعیان کو بھی چاہیے کہ جب اپنے بھائیوں کے سامنے کوئی درس پیش کریں تو حاضرین سے یہ بھی کہیں کہ حاضرین غائب لوگوں تک بھی یہ بات پہنچادیں۔

د: حاضرین کی توجہ مبذول کرانا:

اللہ کے رسول ﷺ نے حاضرین سے سوالات کئے کہ یہ کون سا دن ہے؟ یہ کون سا مہینہ ہے؟ اور یہ کون سا شہر ہے؟ حالانکہ وہ یہ سب جانتے تھے، اس کے ذریعہ ان کو متوجہ کرنا مقصود تھا تاکہ وہ پوری توجہ اور یکسوئی کے ساتھ بات کو سنیں، علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ کا تین چیزوں کے بارے میں سوال کرنا اور ہر سوال کے بعد خاموشی اختیار کرنا؛ یہ ان کے ذہنوں کو مستحضر اور متوجہ کرنے کے لئے تھا، تاکہ وہ مکمل طور پر یکسوئی کے ساتھ اور اہمیت کے ساتھ بیان کی جانے والی بات کو سنیں...... اس لئے علماء اور داعیوں کو بھی چاہیے کہ بات کو پیش کرنے سے پہلے سامعین کو متوجہ کرنے والے اسالیب کو اختیار کریں۔ (دیکھیں: المستفاد من قصص القرآن للدعوۃ والدعاۃ: 2/518)

۵: حجۃ الوداع سے مستنبط بعض فقہی احکام:

حجۃ الوداع کے ضمن میں بہت سے فقہی اور شرعی احکام معلوم ہوتے ہیں، خاص طور پر حج اور وصایا سے متعلق بہت سے احکام ومسائل حجۃ الوداع اور بطور خاص خطبۂ عرفات میں بیان کئے گئے ہیں، اسی لئے علماء نے حجۃ الوداع کے بارے میں خصوصی اہتمام کیا ہے اور اس سے بہت سے مناسکِ حج اور دیگر مسائل کا استنباط کیا ہے، جس سے کتب فقہ اور شروح الحدیث کی کتابیں بھری ہوئی ہیں، بعض مصنفین نے حجۃ الوداع کے بارے میں مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں، مندرجہ ذیل سطور میں اختصار کے ساتھ بعض احکام کی جانب اشارہ کیا جاتا ہے:

أ: عرفہ کے دن حاجی کا افطار کرنا:

حضرت میمونہ بنت حارثؓ فرماتی ہیں کہ عرفہ کے دن کچھ لوگوں کو نبی کریم ﷺ کے روزہ کے متعلق شک ہوا، اس لئے انہوں نے آپؐ کی خدمت میں دودھ بھیجا، آپؐ اس وقت عرفات میں وقوف فرما رہے تھے، آپؐ نے دودھ پی لیا اور سب لوگ دیکھ رہے تھے۔ (صحيح البخاري:1989 صحیح مسلم:1123)

ب: حالتِ احرام میں وفات پانے والے شخص کا حکم:

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص عرفہ میں اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ تھا کہ اچانک وہ اپنی سواری سے گر گیا اور اونٹنی نے اس کی گردن توڑ ڈالی، نبی اکرم ﷺ سے اس کا ذکر کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا: "اس کو پانی اور بیر کی پتی سے غسل دو، اور اس کے دونوں کپڑوں ہی میں اسے کفنا دو، اس کا منہ اور سر نہ ڈھانپو، کیونکہ وہ قیامت کے دن لبیک کہتا ہوا اٹھایا جائے گا"۔ (مسند أحمد 215/1 صحیح مسلم:1206 سنن نسائی 195/5 سنن:3084)

ج: دوسرے کی طرف سے حج کا حکم:

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ فضل بن عباس (حجۃ الوداع میں) رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سواری کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے کہ قبیلۂ خثعم کی ایک عورت آئی، فضلؓ اس کو دیکھنے لگے، وہ بھی انہیں دیکھ رہی تھی، لیکن رسول اللہ ﷺ فضلؓ کا چہرہ بار بار دوسری طرف موڑ رہے تھے۔ اس عورت نے کہا: یا رسول اللہ! اللہ کا فریضۂ حج میرے والد کے لئے ادا کرنا ضروری ہو گیا ہے، لیکن وہ بہت بوڑھے ہیں، اونٹنی پر بیٹھ نہیں سکتے۔ کیا میں ان کی طرف سے حج (بدل) کر سکتی ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں۔ یہ حجۃ الوداع کا واقعہ تھا۔ (صحيح البخاري:1513 صحیح مسلم:1334)

د: آسانی کا منہج:

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ فرماتے ہیں کہ حجۃ الوداع میں رسول اللہ ﷺ لوگوں کے مسائل دریافت کرنے کی وجہ سے منیٰ میں ٹھہر گئے تو ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ میں نے بے خبری میں ذبح کرنے سے پہلے سر منڈا لیا۔ آپؐ نے فرمایا: (اب) ذبح کر لو اور کچھ حرج نہیں۔ پھر دوسرا آدمی آیا، اس نے کہا کہ میں نے بے خبری میں رمی کرنے سے پہلے قربانی کر لی۔ آپؐ نے فرمایا: (اب) رمی کر لو۔

(اور پہلے کر دینے سے) کچھ حرج نہیں۔ ابن عمرو کہتے ہیں (اس دن) آپ ﷺ سے جس چیز کا بھی سوال ہوا، جو کسی نے آگے اور پیچھے کر لی تھی تو آپؐ نے یہی فرمایا کہ اب کر لو اور کچھ حرج نہیں۔ (صحیح البخاري: 83 صحیح مسلم: 1306)

یہ چند شرعی اور فقہی مسائل تھے، جو مزید تفصیلات جاننا چاہتا ہو تو اس کو شیخ البانیؒ کی حجۃ الوداع کے بارے میں "حجۃ النبیؐ" کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے، انہوں نے بہتر (72) مسائل کا خلاصہ اس کتاب میں تحریر کیا ہے، اسی طرح ڈاکٹر فاروق حمادہ کی کتاب "الوصیة النبویة للأمة الإسلامیة" بھی اس موضوع پر ایک اہم مرجع ہے، انہوں نے اس کتاب میں ادب و حدیث کے مصادر اور کتبِ سیرت سے اڑتیس (38) مباحث کا ذکر کیا ہے، اس کے بعد انہوں نے ان کا تجزیہ، تخریج اور جرح و تعدیل کے اصول و ضوابط کے مطابق نصوص کی توثیق بھی کی ہے، انہوں نے عمدہ اور مفید مباحث بیان کئے ہیں۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویہ فی ضوء المصادر الاصلیہ، ص: 683)

٦: ایامِ حج کے نام اور ان کی وجہ تسمیہ:

ذی الحجہ کے ساتویں دن کو "یوم الزینۃ" کہا جاتا تھا، اس لئے کہ اس روز قربانی کے جانوروں کو مزین کیا جاتا تھا۔ آٹھویں دن کو "یوم الترویہ" کہا جاتا تھا، اس لئے کہ اس دن وہ اپنے اونٹوں کو پانی پلاتے تھے اور حالتِ وقوف اور بعد میں ان کو جتنے پانی کی ضرورت ہوتی تھی وہ ساتھ لیتے تھے، کیوں کہ ان مقامات پر اس وقت نہ کنویں تھے اور نہ ہی چشمے تھے، لیکن اب وہاں ہر جگہ پانی کی کثرت ہے۔ نویں روز کو "یوم عرفہ" کہا جاتا تھا، اس لئے کہ اس روز عرفات میں وقوف ہوتا تھا، دسویں دن کو "یوم النحر" "یوم الأضحیٰ" اور "یوم الحج الأکبر" کہا جاتا تھا۔ گیارہویں دن کو "یوم القرّ" کہا جاتا تھا، اس لئے کہ وہ اس روز آرام کرتے تھے، اسی طرح اس دن کو "یوم الرؤوس" بھی کہا جاتا تھا، اس لئے کہ وہ اس میں قربانی کے جانوروں کے سر کھاتے تھے، اور یہ ایام تشریق کا پہلا دن ہوتا تھا، ایام تشریق کے دوسرے دن کو "یوم النفر الأول" (روانگی کا پہلا دن) کہا جاتا ہے، اس لئے کہ جو جلد روانہ ہونا چاہے وہ اس دن روانہ ہو سکتا ہے اور ایامِ تشریق کا تیسرا دن "یوم النفر الثانی" (روانگی کا دوسرا دن) کہلاتا ہے۔ (دیکھیں: السیرۃ النبویۃ، لأبی شہبہ: 2/579)

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَٱذْكُرُواْ ٱللَّهَ فِىٓ أَيَّامٍ مَّعْدُودَٰتٍ ۚ فَمَن تَعَجَّلَ فِى يَوْمَيْنِ فَلَآ إِثْمَ عَلَيْهِ وَمَن تَأَخَّرَ فَلَآ إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ لِمَنِ ٱتَّقَىٰ ۗ وَٱتَّقُواْ ٱللَّهَ وَٱعْلَمُوٓاْ أَنَّكُمْ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ﴾ ترجمہ: "یہ گنتی کے چند روز ہیں، جو تمہیں اللہ کی یاد میں بسر کرنے چاہییں پھر جو کوئی جلدی کر کے دو ہی دن میں واپس ہو گیا تو کوئی حرج نہیں، اور جو کچھ دیر زیادہ ٹھہر کر پلٹا تو بھی کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ یہ دن اس نے تقویٰ کے ساتھ بسر کئے ہوں، اللہ کی نافرمانی سے بچو اور خوب جان رکھو کہ ایک روز اس کے حضور میں تمہاری پیشی ہونے والی ہے"۔ (سورۃ البقرہ: 203)

....

آٹھواں باب

مرض کا آغاز اور رفیقِ اعلیٰ کی جانب

بے شک صاف و شفاف اور قوی روحیں ان بعض چیزوں کا ادراک کر لیتی ہیں جو اللہ کی قدرت کی وجہ سے غیب کے پردوں کے پیچھے پوشیدہ ہوتی ہیں، اسی طرح پاکیزہ اور مطمئن دل انسان کو مستقبل میں پیش آنے والی بعض باتوں کے بارے میں احساس دلاتے ہیں اور نورِ ایمان کے ذریعہ منور اور روشن عقلیں الفاظ و واقعات کے پسِ پردہ اشارات و تلمیحات کا ادراک کر لیتی ہیں، ہمارے نبی محمد ﷺ کو ان صفات کا حصہٗ وافر نصیب تھا اور آپ ؐ کو اس اعتبار سے مقام بلند حاصل تھا، جہاں کسی اور کا پہنچنا ناممکن تھا۔(دیکھیں: السیرۃ النبویہ، لأبی شہبہ: 2/587)

بعض قرآنی آیات میں نبی کریم ﷺ کی بشریت کی حقیقت کی تاکید و توثیق کی گئی ہے اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ آپ ؐ دوسرے انسانوں کی طرح بشر ہیں جن کو موت کا کڑوا گھونٹ پینا ہے اور سکرات الموت کا سامنا کرنا ہے، جیسے کہ آپ ؐ سے پہلے انبیاء کو ان مراحل سے گزرنا پڑا ہے ۔اللہ کے رسول ؐ نے بعض نشانیوں کے ذریعہ سمجھ لیا تھا کہ وقتِ اجل قریب آچکا ہے،اللہ کے رسول ﷺ نے بہت سی احادیثِ صحیحہ میں وفات کے قریب ہونے کی جانب اشارات کئے ہیں، بعض تو وفات پر صریح الدلالت ہیں جبکہ دیگر احادیث ایسی نہیں ہیں،اس طور پر کہ اس بات کو صرف چند کبار صحابہ جیسے کہ ابو بکرؓ، عباسؓ اور معاذؓ ہی سمجھ سکے۔(دیکھیں: مرض النبی ووفاتہ، خالد ابو صالح، ص: 33)

- **آپ ﷺ کی وفات سے متعلق آیات واحادیث:**

ا: <u>آیات قرآنیہ:</u>

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ ٱلرُّسُلُ ۚ أَفَإِيْن مَّاتَ أَوْ قُتِلَ ٱنقَلَبْتُمْ عَلَىٰٓ أَعْقَٰبِكُمْ ۚ وَمَن يَنقَلِبْ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ فَلَن يَضُرَّ ٱللَّهَ شَيْـًٔا ۗ وَسَيَجْزِى ٱللَّهُ ٱلشَّٰكِرِينَ﴾ ترجمہ: ”محمدؐ اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں،اُن سے پہلے اور رسول بھی گزر چکے ہیں، پھر کیا اگر وہ وفات پا جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ یاد رکھو! جو الٹا پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نقصان نہ کرے گا، البتہ جو اللہ کے شکر گزار بندے بن کر رہیں گے انہیں وہ اس کی جزا دے گا“۔(سورۃ آل عمران:144)

علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں باخبر کیا ہے کہ رسول ﷺ اپنی قوم میں ہمیشہ باقی نہیں رہتے ہیں اور رسولوں کے لائے ہوئے پیغامِ حق کو مضبوطی سے پکڑنا ضروری ہے اگر رسول دنیا میں نہ رہے۔(تفسیر قرطبی: 4/222)

ب:ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُم مَّيِّتُونَ﴾ ترجمہ: ”(اے نبیؐ) تمہیں بھی مرنا ہے اور ان لوگوں کو بھی مرنا ہے“۔(سورۃ الزمر:30)

ابن کثیرؒ فرماتے ہیں: یہ آیت ان آیات میں سے ہے جن کے ذریعہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے رسول اللہ ﷺ کی وفات کے وقت استشہاد اور استدلال کیا تھا یہاں تک کہ لوگوں کو آپ کی وفات کا یقین ہو گیا۔ (تفسیر ابن کثیر: 4/53)

ج: ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّن قَبْلِكَ ٱلْخُلْدَ ۖ أَفَإِيْن مِّتَّ فَهُمُ ٱلْخَٰلِدُونَ﴾ ترجمہ: "اور اے محمدؐ، ہیشگی تو ہم نے تم سے پہلے بھی کسی انسان کے لئے نہیں رکھی ہے، اگر تم مر گئے تو کیا یہ لوگ ہمیشہ جیتے رہیں گے؟"۔ (سورۃ الأنبياء: 34) اس آیت کے بعد اس بات کو بھی واضح کیا گیا ہے کہ موت ایک حتمی اور لازمی چیز اور تقدیری فیصلہ ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ ٱلْمَوْتِ ۗ وَنَبْلُوكُم بِٱلشَّرِّ وَٱلْخَيْرِ فِتْنَةً ۖ وَإِلَيْنَا تُرْجَعُونَ﴾ ترجمہ: "ہر نفس موت کا مزہ چکھنے والا ہے، اور ہم تم لوگوں کو دکھ اور سکھ دونوں سے آزما رہے ہیں، اور آخر کار تم سب کو ہماری طرف ہی لوٹ کے آنا ہے"۔ (سورۃ الأنبياء: 35)

یہ تمام آیات واضح اور صریح ہیں اور ان میں آپؐ کی وفات کی بات کہی گئی ہے، بعض دوسری آیات بھی ہیں جن میں آپؐ کی وفات کی جانب اشارات ہیں، اگرچہ اس کی صراحت نہیں ہے۔

- ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَلْءَاخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ ٱلْأُولَىٰ ﴿٤﴾ وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰٓ ﴿٥﴾﴾ ترجمہ: "اور یقیناً تمہارے لئے بعد کا دور پہلے دور سے بہتر ہے۔ اور عنقریب تمہارا رب تم کو اتنا دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے"۔ (سورۃ الضحیٰ: 5-4)
- دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴿٢٦﴾ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو ٱلْجَلَٰلِ وَٱلْإِكْرَامِ ﴿٢٧﴾﴾ ترجمہ: "ہر چیز جو اس زمین پر ہے فنا ہو جانے والی ہے۔ اور صرف تیرے رب کی جلیل و کریم ذات ہی باقی رہنے والی ہے"۔ (سورۃ الرحمٰن: 26-27)
- ایک اور آیت میں ہے: ﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُۥ ۚ لَهُ ٱلْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ﴾ ترجمہ: "ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اُس کی ذات کے، فرماں روائی اُسی کی ہے اور اُسی کی طرف تم سب پلٹائے جاؤ گے"۔ (سورۃ القصص: 88)

ان آیات میں واضح کیا گیا ہے کہ روئے زمین کی تمام مخلوقات پر اللہ تعالیٰ کا موت کے سلسلہ میں بنایا ہوا قانون نافذ ہوگا اور اس سے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں ہوگا۔

- ایک اور آیت میں ہے: ﴿ٱلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِى وَرَضِيتُ لَكُمُ ٱلْإِسْلَٰمَ دِينًا﴾ ترجمہ: "آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے پسند کر لیا ہے۔ (سورۃ المائدہ: 3)

جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت عمر بن خطابؓ رو پڑے، ان سے پوچھا گیا: آپ کیوں رو رہے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: کمال کے بعد نقصان ہی ہوتا ہے، گویا کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کی وفات کا ادراک کر لیا تھا۔ (البدایہ والنہایہ: 5/189)

- ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہے:﴿إِذَا جَآءَ نَصۡرُ ٱللَّهِ وَٱلۡفَتۡحُ ۝١ وَرَأَيۡتَ ٱلنَّاسَ يَدۡخُلُونَ فِي دِينِ ٱللَّهِ أَفۡوَاجٗا ۝٢ فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ وَٱسۡتَغۡفِرۡهُۚ إِنَّهُۥ كَانَ تَوَّابَۢا ۝٣﴾ ترجمہ: ”جب اللہ کی مدد اور فتح آچکی۔اور آپ نے لوگوں کو اللہ کے دین میں جوق در جوق داخل ہوتے دیکھ لیا۔تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کیجیے اور اس سے معافی مانگئے، بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے“۔ (سورۃ النصر:1-3)

حضرت عمرؓ نے اس آیت کے بارے میں حضرت ابن عباسؓ سے دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ اس میں اللہ کے رسولؐ کی وفات کی خبر دی گئی ہے، حضرت عمرؓ نے کہا: میں بھی اس سے یہی سمجھتا ہوں۔(صحیح بخاری:4430)

طبرانی کی روایت میں ہے: ابن عباسؓ نے فرمایا: اس سورت کے نزول کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ کو وفات کی خبر دی گئی ہے، اس لئے آپ ﷺ آخرت کے بارے میں پہلے سے کہیں زیادہ محنت کرنے لگے۔(المعجم الکبیر للطبرانی:2676، مجمع الزوائد:9/26)

۲: احادیث نبویہ:

وہ احادیث جن میں آپ ﷺ کی وفات کی جانب اشارات آئے ہیں، مندرجہ ذیل ہیں:

أ: حضرت عائشہ -رضی اللہ عنہا- فرماتی ہیں کہ ہم تمام ازواج مطہرات (نبی کریم ﷺ کے مرض وفات میں) آپؐ کے پاس تھیں، کوئی وہاں سے دور نہیں جاتی تھی، اسی اثناء میں فاطمہؓ چلتی ہوئی آئیں۔اللہ کی قسم! ان کی چال رسول اللہ ﷺ کی چال سے الگ نہیں تھی (بلکہ بہت ہی مشابہ تھی) جب نبی کریم ﷺ نے انہیں دیکھا تو خوش آمدید کہا۔فرمایا بیٹی! مرحبا! پھر نبی کریم ﷺ نے اپنی دائیں طرف -یا بائیں- طرف انہیں بٹھایا۔اس کے بعد آہستہ سے ان سے کچھ کہا اور فاطمہؓ بہت زیادہ رونے لگیں۔جب نبی کریم ﷺ نے ان کا غم دیکھا تو دوبارہ ان سے سرگوشی کی، اس پر وہ ہنسنے لگیں۔تمام ازواج میں سے میں نے ان سے کہا کہ نبی کریم ﷺ نے ہم میں صرف آپ کو سرگوشی کی خصوصیت بخشی، پھر آپ رونے لگیں۔جب نبی کریم ﷺ اٹھے تو میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کے کان میں نبی کریم ﷺ نے کیا فرمایا تھا؟ انہوں نے کہا کہ میں نبی کریم ﷺ کا راز افشا نہیں کرسکتی ہوں۔پھر جب آپ ﷺ کی وفات ہوگئی تو میں نے فاطمہؓ سے کہا کہ میرا جو حق آپ پر ہے اس کا واسطہ دیتی ہوں کہ آپ مجھے وہ بات بتادیں۔انہوں نے کہا کہ اب بتاسکتی ہوں، چنانچہ انہوں نے مجھے بتایا کہ جب نبی کریم ﷺ نے مجھ سے پہلی سرگوشی کی تھی تو فرمایا تھا کہ ”جبرئیل علیہ السلام ہر سال مجھ سے سال میں ایک مرتبہ دور کیا کرتے تھے لیکن اس سال مجھ سے انہوں نے دو مرتبہ دور کیا، اور میرا خیال ہے کہ میری وفات کا وقت قریب ہے، اللہ سے ڈرتی رہنا اور صبر کرنا کیونکہ میں ایک اچھا شخص تمہارے لئے آگے جانے والا ہوں“۔بیان کیا کہ اس وقت میرا رونا جو آپ نے دیکھا تھا اس کی وجہ یہی تھی۔جب نبی کریم ﷺ نے میری پریشانی دیکھی تو آپؐ نے دوبارہ مجھ سے سرگوشی کی اور فرمایا: ”فاطمہ بیٹی! کیا تم اس پر خوش نہیں ہو کہ جنت میں تم مؤمنوں کی عورتوں کی -یا (فرمایا کہ) اس امت کی عورتوں کی- سردار ہوگی“۔(صحیح البخاري:6285، 6286)

اس حدیث میں قطعی دلیل اور واضح اشارہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اجل قریب آچکی ہے اور جدائی کی گھڑی آپہنچی ہے، البتہ نبی کریم ﷺ نے صرف حضرت فاطمہ ؓ کو اس کے بارے میں باخبر کیا اور مسلمانوں کو اس کا علم آپ کی وفات کے بعد ہوا۔ (دیکھیں: مرض النبی (ص) ووفاتہ، ص: 35)

ب: حضرت جابر ؓ فرماتے ہیں: میں نے نبی کریم کو یوم یوم النحر میں سواری پر رمی کرتے ہوئے دیکھا اور آپ ؐ فرما رہے تھے: مجھ سے مناسکِ حج سیکھ لو اس لئے کہ میں نہیں جانتا ہوں کہ میں اس حج کے بعد حج نہ کرپاؤں۔ (صحیح مسلم)

ج: حضرت ابو سعید خدری ؓ فرماتے ہیں: ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے خطبہ میں فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک بندے کو دنیا اور آخرت کے بارے میں اختیار دیا (کہ وہ جس کو چاہے اختیار کرے) بندے نے وہ پسند کیا جو اللہ کے پاس ہے یعنی آخرت۔ یہ سن کر ابو بکر ؓ رونے لگے، میں نے اپنے دل میں کہا کہ اگر اللہ نے اپنے کسی بندے کو دنیا اور آخرت میں سے کسی کو اختیار کرنے کو کہا اور اس بندے نے آخرت پسند کرلی تو اس میں ان کے رونے کی کیا وجہ ہے۔ لیکن یہ بات تھی کہ بندے سے مراد رسول اللہ ﷺ ہی تھے اور ابو بکر ؓ ہم سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا: ابو بکر آپ روئیے مت۔ اپنی صحبت اور اپنی دولت کے ذریعہ تمام لوگوں سے زیادہ مجھ پر احسان کرنے والے آپ ہی ہیں، اور اگر میں کسی کو خلیل بناتا تو ابو بکر کو بناتا۔ لیکن (جانی دوستی تو اللہ کے سوا کسی سے نہیں ہو سکتی) اس کے بدلہ میں اسلام کی برادری اور دوستی کافی ہے۔ مسجد میں ابو بکر ؓ کی طرف کے دروازے کے سوا تمام دروازے بند کر دیئے جائیں"۔ (صحیح البخاري: 466 صحیح مسلم: 2382)

د: حضرت عباس بن عبد المطلب فرماتے ہیں: میں نے خواب میں دیکھا گویا کہ زمین آسمان کی طرف مضبوط رسیوں کے ذریعہ کھینچی جا رہی ہے، میں نے یہ خواب نبی کریم ﷺ سے بیان کیا تو آپ ؐ نے فرمایا: یہ آپ کے بھتیجے کی وفات ہے۔ (مسند بزار: 844، مجمع الزوائد: 9/23)

ھ: حضرت معاذ ؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جب ان کو یمن کی جانب بھیجا تو وہ سوار ہو کر نکلے اور نبی کریم ﷺ ان کی سواری کے ساتھ پیدل چل رہے تھے، آپ ؐ نے فرمایا: اے معاذ! ہو سکتا ہے اس سال کے بعد آپ کی مجھ سے ملاقات نہ ہو اور آپ بعد میں میری قبر اور مسجد کے پاس سے گزرو گے۔ یہ سن کر معاذ ؓ رو پڑے، آپ ؐ نے فرمایا: اے معاذ! رو ؤمت، اس لئے کہ رونا شیطان کی طرف سے ہے۔ (مسند احمد: 5/235، المعجم الکبیر: 20/121)

- رسول اللہ ﷺ کا مرض الوفات:

علالت کا آغاز:

اللہ کے رسول ﷺ حجۃ الوداع سے ماہ ذی قعدہ میں واپس تشریف لائے اور مدینہ میں ذی قعدہ کے بقیہ ایام اور محرم اور صفر میں قیام فرمایا، آپ ؐ نے حضرت اسامہ ؓ کے لشکر کو تیار کرنا شروع کیا اور حضرت اسامہ بن زید بن حارثہ ؓ کو اس کا امیر مقرر فرمایا اور ان کو حکم دیا کہ بلقا اور فلسطین کی جانب روانہ ہوں، لوگوں نے تیاری کی، ان میں مہاجرین وانصار تھے اور ان میں حضرت ابو بکر ؓ اور حضرت عمر ؓ بھی تھے، اس

وقت حضرت اسامہ بن زید اٹھارہ سال کے تھے۔ بعض نے ان کی امارت کے بارے میں اعتراض بھی کیا، اس لئے کہ وہ آزاد کردہ غلام اور مہاجرین وانصار کے مقابلہ میں کم سن تھے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے کسی کے اعتراض کو قبول نہیں کیا، آپ ﷺ نے فرمایا: "اگر آج تم اس کے امیر بنائے جانے پر اعتراض کررہے ہو تو اس سے پہلے اس کے باپ کے امیر بنائے جانے پر بھی تم نے اعتراض کیا تھا، اور اللہ کی قسم! وہ (زیدؓ) امارت کے مستحق تھے اور مجھے سب سے زیادہ عزیز تھے اور یہ (اسامہؓ) اب ان کے بعد مجھے سب سے زیادہ عزیز ہیں"۔ (صحیح البخاري:3730 صحیح مسلم:2426)

لوگ حضرت اسامہؓ کے لشکر کے ساتھ جانے کی تیاری کررہے تھے اسی دوران رسول اللہ ﷺ کی علالت شروع ہوگئی، آپ ﷺ کی علالت اور وفات کے دوران کئی واقعات پیش آئے، ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

أ- نبی ﷺ بقیع میں اور شہدائے احد کی زیارت اور ان کے لئے دعا:

رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام حضرت ابو مویہبہؓ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے نصف شب میں جگایا اور فرمایا: اے ابو مویہبہ! مجھے حکم ملا ہے کہ میں اہلِ بقیع کے لئے استغفار کروں، لہذا میرے ساتھ چلو۔ میں آپؐ کے ساتھ گیا، جب آپؐ ان کے درمیان کھڑے ہوئے تو فرمایا: "السلام علیکم، اے اہلِ مقابر! تمہیں اپنا حال اور قبروں کا قیام مبارک ہو، کیونکہ اب دنیا میں رات کے تاریک ٹکڑوں کی طرح فتنے ٹوٹ پڑے ہیں، جو پے بہ پے آرہے ہیں اور بعد میں آنے والا فتنہ پہلے سے زیادہ بُرا ہے"۔ اس کے بعد آپؐ میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: اے ابو مویہبہ! مجھے دنیا کے خزانوں کی چابیاں اور دنیا میں ہمیشہ رہنے اور پھر جنت کی نعمت عطا کی گئی۔ مجھے اس کے درمیان اور رب سے ملاقات کے درمیان اختیار دیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں: میں نے عرض کیا: میرے ماں باپ آپ پر قربان! آپ دنیا کے خزانوں کی چابیاں اور اس میں ہمیشہ رہنا اور پھر جنت کو اختیار کرلیجئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں! اللہ کی قسم! اے ابو مویہبہ! میں نے رب سے ملاقات اور جنت کو اختیار کیا ہے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے اہلِ بقیع کے لئے استغفار کیا اور پھر آپ واپس تشریف لائے۔ اللہ کے رسول ﷺ کی وہ تکلیف اسی وقت شروع ہوگئی جس میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے پاس بلا لیا۔ (مسند أحمد 489/3 المعجم الکبیر للطبراني 346/22 الدارمي: 79 مستدرک حاکم 56/3 مجمع الزوائد للہیثمي 24/9)

حضرت عقبہ بن عامر جہنیؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے احد کے شہیدوں پر آٹھ سال بعد اس طرح نماز پڑھی جیسے کہ آپؐ زندہ اور مردوں کو الوداع کررہے ہوں، پھر منبر پر تشریف لائے اور فرمایا: دیکھو، میں تم سے پہلے جارہا ہوں اور میں تم پر گواہ رہوں گا۔ تم سے حوض پر ملاقات ہوگی، اور میں اس وقت اپنے حوض کو دیکھ رہا ہوں، اور مجھے اس کا ڈر نہیں کہ میرے بعد تم شرک کروگے، بلکہ اس کا ڈر ہے کہ تم لوگ دنیا حاصل کرنے میں ایک دوسرے سے مقابلہ آرائی کروگے۔ حضرت عقبہؓ فرماتے ہیں: یہ آخری نظر تھی جو میں نے آپ ﷺ کو دیکھا۔ (صحیح البخاري:1344 صحیح مسلم:2296)

ب: حضرت عائشہؓ کے گھر میں ایام مرض گزارنے کی اجازت اور مرض کی شدت:

اُم المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کے لئے اٹھنا بیٹھنا دشوار ہو گیا اور آپؐ کے مرض نے شدت اختیار کر لی تو تمام ازواج مطہراتؓ سے آپؐ نے میرے گھر میں ایام مرض گزارنے کے لئے اجازت مانگی۔ سب نے جب اجازت دے دی تو آپؐ میمونہؓ کے گھر سے نکلے، آپؐ دو آدمیوں کا سہارا لیئے ہوئے تھے اور آپ کے پاؤں زمین سے گھسٹ رہے تھے۔ جن دو صحابہ کا آپؐ سہارا لیئے ہوئے تھے، ان میں ایک عباسؓ تھے اور ایک اور صاحب۔ جب میرے گھر میں آگئے اور تکلیف بہت بڑھ گئی تو آپؐ نے فرمایا کہ سات مشکیزے پانی کے بھر کر لاؤ جن کے ڈھکن کھولے نہ گئے ہوں اور مجھ پر ڈال دو، ممکن ہے اس طرح میں لوگوں کو کچھ نصیحت کرنے کے قابل ہو جاؤں۔ چنانچہ ہم نے آپؐ کو آپؐ کی زوجہ مطہرہ حفصہؓ کے ایک لگن میں بٹھایا اور ان مشکیزوں سے آپ پر پانی بہانے لگے۔ آخر حضورؐ نے اپنے ہاتھ کے اشارہ سے روکا کہ بس ہو چکا، پھر آپؐ لوگوں کے مجمع میں گئے اور نماز پڑھائی اور لوگوں کو خطاب کیا۔(صحیح البخاري:1198) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے (مرض وفات کی تکلیف) رسول اللہ ﷺ سے زیادہ اور کسی میں نہیں دیکھی۔(صحیح البخاري:5646 صحیح مسلم:2571)

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپؐ کو شدید بخار تھا، میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ کو بہت تیز بخار ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ہاں، مجھے تنہا ایسا بخار ہوتا ہے جتنا تم میں کے دو آدمیوں کو ہوتا ہے، میں نے عرض کیا: یہ اس لئے کہ آپ کا ثواب بھی دوگنا ہے؟ فرمایا کہ ہاں، یہی بات ہے، مسلمان کو جو بھی تکلیف پہنچتی ہے، کانٹا ہو یا اس سے زیادہ تکلیف دینے والی کوئی چیز تو جیسے درخت اپنے پتوں کو گراتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ اس تکلیف کو اس (مسلمان) کے گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے۔[صحیح البخاري/کتاب المرضی:5648]

- **آخری ایام میں آپ ﷺ کی بعض وصیتیں:**

ا: انصار کو وصیت:

حضرت انس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں کہ عباسؓ انصار کی ایک مجلس سے گزرے، دیکھا کہ تمام اہلِ مجلس رو رہے ہیں، پوچھا: آپ لوگ کیوں رو رہے ہیں؟ مجلس والوں نے کہا کہ ابھی ہم رسول اللہ ﷺ کی مجلس کو یاد کر رہے تھے جس میں ہم بیٹھا کرتے تھے (یہ آپؐ کے مرض الوفات کا واقعہ ہے) اس کے بعد حضرت عباسؓ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ کو واقعہ کی اطلاع دی، بیان کیا کہ اس پر آپ ﷺ باہر تشریف لائے، سر مبارک پر کپڑے کی پٹی بندھی ہوئی تھی، راوی نے بیان کیا کہ پھر آپؐ منبر پر تشریف لائے اور اس کے بعد پھر کبھی منبر پر آپؐ تشریف نہ لا سکے، آپؐ نے اللہ کی حمد وثنا کے بعد فرمایا: میں تمہیں انصار کے بارے میں وصیت کرتا ہوں کہ وہ میرے جسم و جان ہیں، انہوں نے اپنی تمام ذمہ داریاں پوری کی ہیں، لیکن اس کا بدلہ جو انہیں ملنا چاہیے تھا، وہ ملنا ابھی باقی ہے، اس لئے تم

لوگ بھی ان کے نیک لوگوں کی نیکیوں کی قدر کرنا اور ان کے خطا کاروں سے در گزر کرتے رہنا۔ (صحيح البخاري:3799 صحيح مسلم:2510)

۲: جزیرۃ العرب سے مشرکین کا اخراج اور وفود کے ساتھ حسنِ سلوک کی وصیت:

اللہ کے رسول ﷺ کا مرض شدت اختیار کرتا گیا یہاں تک کہ ایک دن میں کئی مرتبہ آپؐ بے ہوش ہو جاتے تھے، لیکن اس کے باوجود آپؐ نے چاہا کہ دنیا سے اس حال میں رخصت ہوں کہ آپؐ اپنی امت کے بارے میں مطمئن ہوں کہ وہ گمراہ نہیں ہوگی، اس لئے آپؐ نے چاہا کہ ان کے لئے ایک تفصیلی تحریر لکھ دیں تاکہ وہ اسی کے مطابق عمل پیرا ہوں اور ان کے مابین اختلاف نہ ہو، لیکن جب اختلافی صورتحال پیدا ہو گئی تو پھر آپؐ نے تین باتوں کی وصیت کی، راوی نے ان میں سے دو کا ذکر کیا ہے:

- مشرکین کو جزیرۃ العرب سے نکال دو۔
- وفود سے ایسا ہی سلوک کرتے رہنا جیسے میں کرتا رہا۔ (صحيح البخاري:3053 صحيح مسلم:1637)

۳: آپؐ کی قبر کو سجدہ گاہ بنانے کی ممانعت:

اللہ کے رسول ﷺ نے جو آخری بات ارشاد فرمائی وہ تھی: ''یہودیوں پر اللہ کی لعنت ہو انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا''۔ (صحيح البخاري:437 صحيح مسلم:530)

۴: اللہ کے بارے میں حسنِ ظن:

حضرت جابر بن عبد اللہؓ کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو آپؐ کی وفات سے تین دن پہلے فرماتے ہوئے سنا: ''تم میں سے ہر شخص کی وفات اس حال میں ہو کہ وہ اللہ سے حسنِ ظن رکھتا ہو''۔ (مسند أحمد 293/3 صحيح مسلم:2877 سنن أبو داؤد:3113 سنن ابن ماجة:4167)

۵: نماز اور غلاموں کے بارے میں وصیت:

حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے قریب جب آپؐ کی سانس اٹک رہی تھی تو آپ ﷺ کی عمومی وصیت یہ تھی: ''لوگو! نماز اور غلاموں کا خیال رکھنا''۔ (مسند أحمد 117/3 سنن ابن ماجة:2697 ابن حبان 66/5)

۶: خواب؛ نبوت کا ایک پرتُو:

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے (مرض الموت میں اپنے کمرہ کا) پردہ اٹھایا، (دیکھا کہ) لوگ ابو بکرؓ کے پیچھے صف باندھے ہوئے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''لوگو! نبوت کی بشارتوں (خوشخبری دینے والی چیزوں) میں سے اب کوئی چیز باقی نہیں رہی، سوائے سچے خواب کے جسے مسلمان خود دیکھتا ہے یا اس کے سلسلہ میں کوئی دوسرا دیکھتا ہے، مجھے رکوع اور سجدہ کی حالت میں قرآن پڑھنے

سے منع کر دیا گیا ہے، رہا رکوع تو اس میں تم اپنے رب کی بڑائی بیان کیا کرو، اور رہا سجدہ تو اس میں تم دعا کیا کرو، کیونکہ یہ تمہاری دعا کی مقبولیت کے لئے زیادہ موزوں ہے"۔[سنن أبي داود: 876 مسند أحمد 219/1 صحیح مسلم: 479 سنن نسائی 189/2 سنن ابن ماجة: 3899)

- حضرت ابو بکرؓ امامت فرماتے ہیں:

حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کے مرض الوفات میں جب نماز کا وقت آیا اور اذان دی گئی تو فرمایا: "ابو بکر سے کہو کہ لوگوں کو نماز پڑھائیں"۔ اس وقت آپ ﷺ سے کہا گیا: ابو بکر بڑے نرم دل ہیں، اگر وہ آپ کی جگہ کھڑے ہوں گے تو نماز پڑھانا ان کے لئے مشکل ہو جائے گی۔ آپ ﷺ نے پھر وہی حکم فرمایا، اور آپؐ کے سامنے پھر وہی بات دہرا دی گئی۔ تیسری مرتبہ آپؐ نے فرمایا: "تم تو بالکل یوسف کی ساتھ والی عورتوں کی طرح ہو۔ (کہ دل میں کچھ ہے اور ظاہر کچھ اور کر رہے ہو)۔ ابو بکرؓ سے کہو کہ وہ نماز پڑھائیں۔ آخر ابو بکرؓ نماز پڑھانے کے لئے تشریف لائے، اتنے میں نبی کریم ﷺ نے مرض میں کچھ کمی محسوس کی اور دو آدمیوں کا سہارا لے کر باہر تشریف لے گئے، گویا میں اس وقت آپ ﷺ کے قدموں کو دیکھ رہی ہوں کہ تکلیف کی وجہ سے زمین پر لکیر کھینچتے ہوئے جاتے تھے۔ ابو بکرؓ نے یہ دیکھ کر چاہا کہ پیچھے ہٹ جائیں لیکن نبی کریم ﷺ نے اشارہ سے انہیں اپنی جگہ رہنے کے لئے کہا۔ پھر ان کے قریب آئے اور بازو میں بیٹھ گئے۔ جب اعمش نے یہ حدیث بیان کی، ان سے پوچھا گیا کہ کیا نبی کریم ﷺ نے نماز پڑھائی اور ابو بکرؓ نے آپؐ کی اقتداء کی اور لوگوں نے ابو بکرؓ کی نماز کی اقتداء کی؟ اعمش نے سر کے اشارہ سے بتلایا: ہاں۔(صحیح البخاري: 664 صحیح مسلم: 418)

- اللہ کے رسول ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کی آخری ساعتیں:

ا: حضرت ابو بکر صدیقؓ مسلمانوں کی امامت کے فرائض انجام دے رہے تھے، یہاں تک کہ جب پیر کا دن ہوا اور صحابہ کرام صفوں میں کھڑے نمازِ فجر ادا کر رہے تھے، اسی اثنا میں نبی کریم ﷺ نے حجرۂ مبارک کا پردہ اٹھایا اور مسلمانوں کے اس منظر کا مشاہدہ کرنے لگے، وہ اپنے رب کے سامنے کھڑے تھے، آپؐ نے دیکھا کہ کس طرح آپؐ کی دعوت اور جہاد کا پودا ثمر آور ہوا ہے، اور کس طرح ایک ایسی امت پروان چڑھی ہے جو نماز کی حفاظت کر رہی ہے اور نبی کی موجودگی اور عدم موجودگی میں اس کی پابندی کر رہی ہے، اس دلفریب منظر کو دیکھ کر اور اس عظیم کامیابی کو دیکھ کر آپؐ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں، ایک ایسی کامیابی کو دیکھ کر جو اس سے پہلے کسی نبی یا داعی کو نصیب نہ ہو سکی، آپؐ کو اطمینان ہو گیا کہ اس امت کا اپنے دین اور اللہ کی عبادت کے ساتھ ربط و تعلق دائمی اور نہ ختم ہونے والا ہے، جو نبی کے اس دنیا سے رخصت ہونے کی وجہ سے منقطع نہیں ہو گا، اس لئے آپؐ اس منظر کو دیکھ کر انتہائی خوش ہوئے اور آپؐ کا چہرہ روشن ہو گیا۔ صحابہ کرام بیان فرماتے ہیں کہ "رسول اللہ ﷺ نے حجرۂ عائشہ کا پردہ کھولا اور کھڑے ہوئے، ہمیں برابر دیکھتے رہے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپؐ کا روئے مبارک ورقِ مصحف ہے، پھر آپؐ مسکرائے اور ہنس پڑے، ہمیں یہ خیال ہوا کہ کہیں ہم لوگ بھی خوشی کی وجہ سے آزمائش میں نہ پڑ جائیں اور بے قابو ہو جائیں، ہمیں یہ بھی گمان ہوا کہ شاید آپؐ نماز کے لئے باہر تشریف لانے والے ہیں، آپؐ نے اشارہ فرمایا کہ نماز پوری کر لو!۔ اس کے بعد آپؐ نے پردہ گرایا"۔(صحیح البخاري: 4448)

بعض صحابہ کرام واپس آکر اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے، حضرت ابو بکر صدیقؓ اپنی صاحبزادی حضرت عائشہ کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا: میرا خیال یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی تکلیف ختم ہو گئی ہے اور یہ ان کی ایک زوجہ بنت خارجہ کی باری کا دن تھا- جو "سخ" میں رہتی تھیں- آپؓ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں تشریف لے گئے۔(دیکھیں: السیرۃ النبویہ، ابو شہبہ: 2/593)

۲: رفیقِ اعلیٰ کی رفاقت میں:

نبی کریم ﷺ کی سکرات الموت کی تکلیف شدت اختیار کر گئی، حضرت اسامہ بن زیدؓ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپؐ خاموش تھے اور آپؐ بول نہیں پا رہے تھے، آپؐ آسمان کی جانب اپنے ہاتھ اٹھانے لگے اور اس کے بعد حضرت اسامہؓ پر ہاتھ رکھتے، وہ سمجھ گئے کہ آپؐ ان کے لئے دعا کر رہے ہیں، حضرت عائشہؓ نے آپ ﷺ کو اپنے اُوپر سہارا دے کر ٹیک لیا۔ حضرت عبد الرحمن بن ابی بکرؓ آپ ﷺ کے پاس تشریف لائے، ان کے ہاتھ میں مسواک تھی، آپ ﷺ مسواک کی طرف دیکھ رہے تھے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: میں سمجھ گئی کہ آپ ﷺ مسواک چاہتے ہیں۔ میں نے عرض کیا: آپ کے لئے لے لوں؟ آپ ﷺ نے سر سے اشارہ فرمایا کہ ہاں! میں نے مسواک لے کر آپ ﷺ کو دی تو آپؐ کو سخت محسوس ہوئی۔ میں نے عرض کیا: اسے آپ کے لئے نرم کر دوں؟ آپؐ نے سر کے اشارہ سے کہا: ہاں! میں نے مسواک نرم کر دی، اور آپ ﷺ نے نہایت اچھی طرح مسواک کی۔ آپ ﷺ کے سامنے کٹورے میں پانی تھا۔ آپؐ پانی میں دونوں ہاتھ ڈال کر چہرہ پونچھتے جاتے تھے۔ اور فرماتے جاتے تھے: "لاإله إلا الله"۔ موت کے لئے سختیاں ہیں۔ مسواک سے فارغ ہوتے ہی آپ ﷺ نے ہاتھ - یا انگلی - اٹھایا، نگاہ چھت کی طرف بلند کی اور دونوں ہونٹوں پر کچھ حرکت ہوئی، آپؐ فرما رہے تھے: اے اللہ! رفیق اعلیٰ"۔(صحیح البخاري: 4449)

ایک روایت میں ہے: نبی ﷺ فرما رہے تھے: اے اللہ، سکرات الموت میں میری مدد فرما۔(مسند أحمد 6/64 سنن ترمذي: 978 سنن ابن ماجة: 1623)

ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے بتایا کہ وفات سے کچھ پہلے نبی کریم ﷺ پشت سے ان کا سہارا لئے ہوئے تھے، آپؓ نے کان لگا کر سنا کہ نبی کریم ﷺ دعا کر رہے ہیں: «اللهم اغفر لي وارحمني، وألحقني بالرفيق» "اے اللہ! میری مغفرت فرما، مجھ پر رحم کر اور مجھے میرے رفیق سے ملا"۔(صحیح البخاري: 4440 صحیح مسلم: 2444)

یہ بھی مروی ہے کہ شدتِ مرض کے زمانہ میں نبی کریم ﷺ کی بے چینی بہت بڑھ گئی تھی، فاطمۃ الزہراءؓ نے کہا: آہ، ابا جان کو کتنی بے چینی ہے!۔ آپ ﷺ نے اس پر فرمایا کہ آج کے بعد تمہارے ابا جان کی یہ بے چینی نہیں رہے گی۔ پھر جب نبی کریم ﷺ کی وفات ہو گئی تو فاطمہؓ کہتی تھیں: ہائے ابا جان! آپ اپنے رب کے بلاوے پر چلے گئے، ہائے ابا جان! آپ جنت الفردوس میں اپنے مقام پر چلے گئے۔ ہم جبرئیل علیہ السلام کو آپ کی وفات کی خبر سناتے ہیں۔ پھر جب نبی کریم ﷺ کی تدفین ہوئی تو آپ رضی اللہ عنہا نے انسؓ سے کہا: "انس! تمہارے دل رسول اللہ ﷺ کے جسم پر مٹی ڈالنے کے لئے کس طرح آمادہ ہو گئے تھے؟!"۔(صحیح البخاري: 4462)

۳: رسول اللہ ﷺ دنیا سے کس حال میں رخصت ہوئے؟!

رسول اللہ نے جب اس دنیا سے پردہ فرمایا تو اس وقت پورا جزیرۃ العرب آپؐ کے زیرِ نگیں تھا، دنیا کے سلاطین اور امراء پر آپؐ کا رعب وجلال قائم تھا، آپؐ کے اصحابِ کرام آپؐ پر اپنی جان واولاد اور مال ومتاع سب نثار کرنے کے لئے تیار رہتے تھے، اس کے باوجود آپؐ دنیا سے اس حال میں تشریف لے گئے کہ آپؐ نے ایک درہم یا دینار، ایک غلام یا لونڈی اور کوئی چیز بھی اپنے پیچھے نہیں چھوڑی، صرف آپؐ کا ایک سفید خچر تھا، آپؐ کے ہتھیار تھے اور ایک قطعۂ زمین جس کو آپؐ نے صدقہ کر دیا۔ (صحیح بخاری: 4461) آپؐ کی وفات اس حال میں ہوئی کہ آپؐ کی زرہ ایک یہودی کے پاس تیس (۳۰) صاع جَو کے عوض رہن رکھی ہوئی تھی اور آپؐ کے پاس کوئی چیز نہیں تھی کہ آپؐ اسے دے کر زرہ کو چھڑا سکتے، یہاں تک کہ آپؐ دنیا سے تشریف لے گئے۔

آپؐ کی وفات دوشنبہ کے روز 12/ ربیع الاول سن 11/ ہجری کو زوال کے بعد ہوئی، اس وقت آپؐ کی عمر شریف 63/ سال تھی۔ (صحیح بخاری: 2903، 3902 صحیح مسلم: 2351)

یہ مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ تاریک اور وحشت ناک دن، سب سے بڑا صدمہ اور ابتلاء، اور پوری انسانیت کے لئے سب سے بڑا سانحہ تھا، حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ جس دن رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تھے تو مدینہ کی ہر چیز آپؐ کی آمد سے روشن اور منور ہو گئی تھی اور جس دن آپؐ کی وفات ہوئی اس دن اس کی ہر چیز تاریک ہو گئی۔ (مسند احمد: 3/221 سنن ترمذی: 3618، ابن ماجہ: 1631)

حضرت اُم ایمن بھی رو رہی تھیں اور لوگوں نے سبب پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ بے شک مجھے معلوم تھا کہ رسول اللہ ﷺ اس دنیا سے تشریف لے جائیں گے، لیکن میں اس بات پر رو رہی ہوں کہ وحی کا سلسلہ اب ہم سے ہمیشہ کے لئے منقطع ہو گیا۔ (صحیح مسلم: 2454 ابن ماجہ: 1635)

۴: مصیبت کی ہولناکی اور ابو بکرؓ کا موقف:

ابن رجبؒ فرماتے ہیں: جب رسول اللہ ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے تو مسلمانوں میں انتہائی اضطراب پایا گیا، ان میں سے بعض مدہوش وبے بس ہو گئے، بعض بیٹھ ہی گئے اور وہ اوپر اٹھنے کی قدرت نہیں رکھتے تھے، بعض کی زبانیں بند ہو گئیں اور وہ بات نہیں کر پا رہے تھے اور بعض آپؐ کی وفات کا مطلقاً انکار کرنے لگے۔ (دیکھیں: لطائف المعارف، ص: 114)

علامہ قرطبیؒ اس مصیبت کی ہولناکی اور اس پر مرتب ہونے والے نتائج کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ”مصیبتوں میں سب سے بڑی مصیبت دین کی مصیبت ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جب تم میں سے کسی کو کوئی مصیبت لاحق ہو تو اس کو میری (وفات کی) وجہ سے لاحق ہونے والی مصیبت کو یاد کرنا چاہیے، اس لئے کہ وہ سب سے بڑی مصیبت ہے“۔ (المعجم الکبیر للطبرانی: 6718، شعب الایمان للبیہقی، 10152، مجمع الزوائد للبیہقی: 3/2)

اللہ کے رسول ﷺ نے بجا فرمایا ہے، اس لئے کہ آپؐ (کی وفات) کے ذریعہ لاحق ہونے والی مصیبت قیامت تک آنے والی مصیبتوں میں سب سے بڑی مصیبت ہے، وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا، نبوت ختم ہو گئی اور ارتداد کے ذریعہ شر کا ظہور ہو گیا، یہ خیر کا پہلا انقطاع اور پہلا نقصان تھا۔ (دیکھیں: تفسیر القرطبی: 2/176)

وفات کی خبر سن کر حضرت عمرؓ کے ہوش جاتے رہے، انہوں نے کھڑے ہو کر کہنا شروع کیا: کچھ منافقین سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات ہو گئی لیکن حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات نہیں ہوئی، بلکہ آپؐ اپنے رب کے پاس تشریف لے گئے ہیں، جس طرح موسیٰ بن عمران علیہ السلام تشریف لے گئے تھے اور اپنی قوم سے چالیس رات غائب رہ کر ان کے پاس پھر واپس آ گئے تھے۔ اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ بھی ضرور پلٹ کر آئیں گے اور ان لوگوں کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالیں گے جو سمجھتے ہیں کہ آپ ﷺ کی موت واقع ہو چکی ہے۔

حضرت ابو بکرؓ 'سنح' میں واقع اپنے مکان سے گھوڑے پر سوار ہو کر تشریف لائے اور اُتر کر مسجد نبوی میں داخل ہوئے، پھر لوگوں سے کوئی بات کئے بغیر سیدھے حضرت عائشہؓ کے پاس گئے، اور رسول اللہ ﷺ کا قصد فرمایا، آپؐ کا جسدِ مبارک دھار دار یمنی چادر سے ڈھکا ہوا تھا، حضرت ابو بکرؓ نے رُخ انور سے چادر ہٹائی، اسے بوسہ دیا اور روئے، پھر فرمایا: میرے ماں باپ آپ پر قربان! اللہ آپ ﷺ پر دو موتیں جمع نہیں کرے گا، جو موت آپ پر لکھ دی گئی تھی وہ آپ کو آچکی۔

اس کے بعد ابو بکرؓ باہر تشریف لائے، اس وقت بھی حضرت عمرؓ لوگوں سے بات کر رہے تھے، حضرت ابو بکرؓ نے ان سے کہا: عمر! بیٹھ جاؤ۔ حضرت عمرؓ نے بیٹھنے سے انکار کر دیا، ادھر صحابہ کرامؓ حضرت عمرؓ کو چھوڑ کر حضرت ابو بکرؓ کی طرف متوجہ ہو گئے، حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا: "أما بعد: فإن من كان يعبد محمدًا فإن محمدًا قد مات، ومن كان يعبد الله فإن الله حي لا يموت"۔ ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ ٱلرُّسُلُ ۚ أَفَإِيْن مَّاتَ أَوْ قُتِلَ ٱنقَلَبْتُمْ عَلَىٰٓ أَعْقَٰبِكُمْ ۚ وَمَن يَنقَلِبْ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ فَلَن يَضُرَّ ٱللَّهَ شَيْـًٔا ۗ وَسَيَجْزِى ٱللَّهُ ٱلشَّٰكِرِينَ﴾ (آل عمران: 144) "أما بعد! تم میں سے جو شخص محمد ﷺ کی عبادت کرتا تھا تو (وہ جان لے) کہ محمد ﷺ کی وفات واقع ہو چکی ہے۔ اور تم میں سے جو شخص اللہ کی عبادت کرتا تھا تو یقیناً اللہ ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے، اس کو کبھی موت لاحق نہیں ہو گی، اللہ کا ارشاد ہے: "محمدؐ نہیں ہیں مگر رسول ہی۔ ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں، تو کیا گروہ وفات پا جائیں یا وہ قتل کر دیئے جائیں تو تم لوگ اپنی ایڑھی کے بل پلٹ جاؤ گے؟ اور جو شخص اپنی ایڑھی کے بل پلٹ جائے تو (یاد رکھے کہ) وہ اللہ کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اور عنقریب اللہ شکر کرنے والوں کو جزا دے گا"۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں: اللہ کی قسم! مجھے اس وقت ہوش آیا جب میں نے ابو بکرؓ کو اس آیت کی تلاوت کرتے ہوئے سنا، جس وقت میں نے انہیں تلاوت کرتے ہوئے سنا کہ نبی کریم ﷺ کی وفات ہو گئی ہے تو میں سکتے میں آ گیا اور ایسا محسوس ہوا کہ میرے پاؤں میرا بوجھ نہیں اٹھا پائیں گے اور میں زمین پر گر جاؤں گا۔ (صحيح البخاري: 4454)

علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں: یہ آیت حضرت صدیقؓ کی شجاعت و بہادری اور جرأتمندی کی سب سے بڑی دلیل ہے، اس لئے کہ شجاعت و جرأتمندی یہ ہے کہ مصائب کے موقع پر دل ثابت قدم اور مطمئن رہے، نبی کریم ﷺ کی وفات سے بڑی کوئی مصیبت نہیں ہے اور اس وقت حضرت ابو بکرؓ کی شجاعت و علم کا ظہور ہوا، لوگ کہنے لگے کہ رسول اللہ ﷺ کا انتقال نہیں ہوا ہے، حضرت عمرؓ کا بھی یہی کہنا تھا، حضرت عثمانؓ کی زبان بند ہو گئی، حضرت علیؓ چھپ کر بیٹھ گئے، صورتحال مضطرب اور پریشان کن ہو گئی اور حضرت ابو بکرؓ جب "سنح" میں واقع اپنے گھر سے واپس تشریف لائے تو آپؓ نے اس آیت کے ذریعہ صورتحال کو واضح کر دیا۔(تفسیر القرطبی: 4/222)

اللہ کی رحمت ہو صدیق اکبرؓ پر، آپؓ نے امت سے کتنی مصیبتوں کو دور کیا اور کتنے فتنوں کو انہوں نے اپنے آہنی ہاتھوں سے کچل دیا، کتنی مشکلات و پریشانیوں کو انہوں نے قرآن و سنت کے ایسے دلائل کے ذریعہ منکشف کیا جو حضرت عمرؓ جیسی عظیم شخصیت سے بھی مخفی رہے، لہذا صدیق اکبرؓ کا حق پہچانو، ان کے مقام و مرتبہ کا صحیح اندازہ کرو اور رسول اللہ ﷺ کے اس محبوب سے محبت کرو، چنانچہ ان کی محبت ایمان اور ان سے بغض و نفرت نفاق ہے۔(دیکھیں: مرض النبی (ص) ووفاتہ، ص: 24)

۵: ابو بکرؓ کے ہاتھ پر بیعتِ خلافت:

اس کے بعد تمام مسلمانوں نے سقیفۂ بنو ساعدہ میں حضرت ابو بکرؓ کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کی، اس عجلت کا مقصد یہ تھا کہ شیطان کو ان کے دلوں میں پھوٹ ڈالنے اور ان کے اندر رخنہ پیدا کرنے کا موقع نہ ملے اور نفسانی خواہشات سر نہ اٹھا سکیں، اور حضور ﷺ اپنے آخری سفر پر اس حال میں روانہ ہوں کہ مسلمان ایک رشتہ میں منسلک اور پوری طرح متحد اور ہم رنگ و ہم آہنگ ہوں، ان کا امیر موجود ہو اور وہ ان کے سارے معاملات کی دیکھ بھال کر رہا ہو حتی کہ خود رسول اللہ ﷺ کی تجہیز اور تکفین اور تدفین کا کام بھی امیر المؤمنین اور خلیفۃ المسلمین کے ہاتھوں انجام پائے۔(دیکھیں: السیرۃ النبویہ للندوی، ص: 406)

۶: رسول اللہ ﷺ کو غسل، تکفین اور نمازِ جنازہ:

اُم المؤمنین عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کو غسل دینے کا ارادہ کیا تو کہنے لگے: قسم اللہ کی! ہمیں نہیں معلوم کہ ہم جس طرح اپنے مُردوں کے کپڑے اتارتے ہیں آپؐ کے کپڑے بھی اتار دیں، یا انہیں آپؐ کے بدن پر رہنے دیں اور اوپر سے ہی غسل دے دیں، تو جب لوگوں میں اختلاف ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر نیند طاری کر دی یہاں تک کہ ان میں سے کوئی آدمی ایسا نہیں تھا جس کی ٹھڈی اس کے سینہ سے نہ لگ گئی ہو، اس وقت گھر کے ایک گوشے سے کسی آواز دینے والے کی آواز آئی کہ نبی اکرم ﷺ کو ان کے اپنے پہنے ہوئے کپڑوں ہی میں غسل دو، آواز دینے والا کون تھا کوئی بھی نہ جان سکا، (یہ سن کر) لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس اٹھ کر آئے اور آپ کو کُرتے کے اوپر سے غسل دیا، لوگ قمیص کے اوپر سے پانی ڈالتے تھے اور قمیص سمیت آپ ﷺ کا جسم مبارک ملتے تھے، نہ کہ اپنے ہاتھوں سے۔ ام المؤمنین عائشہؓ کہتی تھیں: اگر مجھے پہلے یاد آ جاتا جو بعد میں یاد آیا تو آپؐ کی ازواج ہی آپ کو غسل دیتیں۔(سنن اُبو داؤد: 3141 سنن ابن ماجۃ: 1464 مستدرک حاکم 59/3)

نبی کریم ﷺ کو تین سحیولی (یمنی شہر سحول کی جانب منسوب) کپڑوں میں کفن دیا گیا تھا، آپ ﷺ کے کفن میں نہ قمیص تھی اور نہ عمامہ۔(صحیح البخاري: 1271 صحیح مسلم: 941)

مسلمانوں نے آپ ﷺ کی نماز جنازہ ادا کی، حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب لوگ منگل کے دن آپؐ کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہو گئے، تو آپؐ کو اپنے گھر میں تخت پر رکھا گیا، اور لوگوں نے جماعت در جماعت اندر آنا شروع کیا، لوگ نماز جنازہ پڑھتے جاتے تھے، جب سب مرد فارغ ہو گئے، تو عورتیں جانے لگیں، جب عورتیں بھی فارغ ہو گئیں تو بچے جانے لگے، اور آپؐ کے جنازے کی کسی نے امامت نہیں کی۔(سنن ابن ماجة: 1628)

ابن کثیرؒ فرماتے ہیں: آپ ﷺ کی نمازِ جنازہ کا انفرادی طور پر پڑھنا اور کسی کا امامت نہ کرنا، اس کے بارے میں سب کا اجماع واتفاق ہے اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔(البدایۃ والنھایۃ 232/5)

۷: تدفین کی جگہ، قبر کی کیفیت، تدفین کب اور کس نے کی؟

غسل اور تدفین کے بعد تدفین کے بارے میں صحابہ کرام کے مابین اختلاف رائے پیدا ہوا، بعض کی رائے تھی کہ آپؐ کو ممبر کے پاس دفن کیا جائے، بعض نے کہا کہ بقیع میں دفن کیا جانا چاہیے اور کسی نے کہا کہ نماز کی جگہ پر دفن کیا جائے۔(موطأ: 545، طبقات ابن سعد: 2/293)

اسی اثنا میں ابو بکرؓ تشریف لائے اور انہوں نے اس اختلاف کو رسول اکرم ﷺ سے سنے ہوئے فرمان کے ذریعہ سرے سے ختم کر دیا، حضرت عائشہؓ اور ابن عباسؓ فرماتے ہیں: جب رسول اللہ کی رحلت ہوئی اور آپ کو غسل دیا گیا تو تدفین کے بارے میں لوگوں کے درمیان اختلاف رائے ہوا، ابو بکرؓ نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے جو سنا ہے میں بھولا نہیں ہوں، آپؐ نے فرمایا ہے: ”جس نبی کا بھی انتقال ہوا اسے وہیں دفن کیا گیا جہاں اس کا انتقال ہوا“۔ اس لئے آپؐ کو آپؐ کے بستر کی جگہ دفن کرو۔(سنن ابن ماجہ: 1628) اگرچہ اس حدیث کی صحت کے بارے میں اختلاف ہے لیکن یہ بات متفق علیہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی تدفین اسی جگہ عمل میں آئی جہاں آپ اس دنیا سے رخصت ہوئے تھے۔

ابن کثیرؒ فرماتے ہیں: تواتر کے ذریعہ یہ بات معلوم ہے کہ نبی کریم ﷺ کو حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں دفن کیا گیا جو حضرت عائشہؓ کے ساتھ خاص تھا، وہ مسجد نبوی کی مشرقی سمت میں تھا اور آپؐ کو حجرہ میں قبلہ کی جانب مغربی کونے میں دفن کیا گیا، اس کے بعد حضرت ابو بکرؓ اور پھر حضرت عمرؓ کی تدفین بھی وہیں عمل میں آئی۔(البدایہ والنہایہ: 5/238)

اللہ کے رسول ﷺ کی قبر لحدی بنائی گئی، علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ لحدی (بغلی) قبر اور صندوقچی قبر دونوں طرح سے بنانا جائز ہے، لیکن اگر زمین سخت ہو اور اس کی مٹی نیچے نہ گرتی ہو تو پھر لحدی (بغلی) قبر افضل ہے اور اگر مٹی نرم ہو تو صندوقچی قبر افضل ہے۔(المجموع للنووی: 5/287)

علامہ البانیؒ فرماتے ہیں: قبر میں لحدی اور صندوقچی دونوں طرح کی قبریں بنانادرست ہے،اس لئے کہ دور نبوی میں دونوں پر عمل ہوتا تھا، لیکن پہلی قسم افضل ہے۔(دیکھیں: أحکام الجنائز، ص: 144)اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کے لئے افضل ہی کا انتخاب کرتا ہے اور آپ ﷺ کی قبر کوہان نمابلند تھی۔(صحیح بخاری:1390)

جمہور علماء کی رائے یہ ہے کہ قبروں کو کوہان نمابنانا مستحب ہے اور مسطّح قبر بنانے کے مقابلہ میں ایسا کرنا افضل ہے، علامہ ابن قیمؒ دونوں قسم کی آراء کو جمع کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کے اصحاب کی قبریں نہ بہت زیادہ بلند تھیں اور نہ ہی بہت زیادہ مسطح تھیں، اسی طرح آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے دونوں ساتھیوں کی قبریں بھی تھیں، اللہ کے رسول ﷺ کی قبر مبارک زمین سے ملی ہوئی قدرے بلند تھی اور مدینہ کے آس پاس کے میدان کی سرخ کنکریاں اس پر بچھی ہوئی تھیں، نہ اس پر کوئی تعمیر کی گئی تھی اور نہ ہی اس کو پکی اینٹوں سے مضبوط بنایا گیا تھا، اور اسی طرح آپ ﷺ کے صاحبین حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کی قبریں بھی ہیں، اللہ کے رسول ﷺ کی قبر مبارک سطح زمین سے قدرے بلند تھی۔(دیکھیں: زادالمعاد:1/524، تہذیب السنن، ابن القیم:4/338)

تدفین کرنے والے صحابہ کرامؓ:

جن صحابہ کرام نے اللہ کے رسول ﷺ کی تدفین میں براہِ راست حصہ لیا اس سلسلہ میں ابن اسحاقؒ کہتے ہیں: اللہ کے رسول ﷺ کی قبر میں جو لوگ اترے یہ حضرات تھے: علی بن ابی طالبؓ، فضل بن عباسؓ، قثم بن عباسؓ، رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام شقرانؓ۔(سیرت ابن ہشام:1/321)

امام نوویؒ اور مقدسیؒ نے حضرت عباسؓ کا نام بھی ذکر کیا ہے۔(تہذیب الأسماء، ص:23، مختصر السیرۃ، ص:35)

امام نوویؒ فرماتے ہیں: یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کے ساتھ اسامہ بن زیدؓ اور اوس بن خولیؓ بھی تھے اور آپ ﷺ کی لحد میں اینٹیں بھی لگائیں گئیں تھیں۔ یہ بھی منقول ہے کہ آپ ﷺ کی لحد میں نو اینٹیں لگائی گئیں اور پھر اس پر مٹی ڈال دی گئی۔ (دیکھیں مرض النبی ووفاتہ، ص:173، تہذیب الاسماء، للنووی، ص23)

تدفین کا وقت:

جہاں تک آپ ﷺ کی تدفین کے وقت کا تعلق ہے تو بہت سے علماء کی رائے یہ ہے کہ آپ ﷺ کو بدھ کی رات میں دفن کیا گیا۔ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں: جمہور سے یہی بات معروف ہے کہ آپ کی وفات دوشنبہ (پیر) کے روز ہوئی اور آپ ﷺ کو بدھ کی رات میں دفن کیا گیا۔ (دیکھیں: البدایہ والنہایہ، 5/237، صحیح السیرۃ النبویہ، ص:728)

اللہ کے رسول ﷺ کی وفات کا صحابہ کرام پر انتہائی اثر پڑا، اس کی منظر کشی حضرت انسؓ یوں کرتے ہیں: جس دن رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تھے اس کی ہر چیز روشن اور تابناک ہو گئی تھی اور جس دن آپ ﷺ نے رحلت فرمائی اس سے زیادہ تاریک اور

بُرا دن میں نے کبھی نہیں دیکھا، ہم نے آپؐ کی تدفین کے بعد ابھی ہاتھ بھی نہیں جھاڑے تھے یہاں تک کہ ہمارے دل بدل گئے''۔(سنن ترمذی:3618، سنن ابن ماجہ:1631، صحیح السیرۃ النبویہ، ص:729)

۶: رسول اللہ ﷺ کی وفات پر بعض مرثیے:

ا: حضرت حسانؓ کے اشعار:

آقا کی یاد میں اشک بہاتی آنکھیں

حضرت حسان بن ثابتؓ نے رسول اللہ ﷺ کی طرف سے آپؐ کی زندگی میں بھی دفاع کیا اور اپنے عمدہ قصیدوں کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کا بھی دفاع کیا، ان کے قصیدوں نے جزیرۃ العرب میں ایک زلزلہ پیدا کر دیا اور ان پر انتہائی اثرات ڈالے، حضرت حسانؓ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے ذریعہ انتہائی متاثر ہوئے اور انہوں نے آپؐ کے بارے میں رُلا دینے والے اور دل کی تاروں کو چھیڑنے والے اشعار کہے، تاریخ نے ان کے اشعار کو ہمارے لئے حرف بحرف محفوظ رکھا ہے اور گردشِ لیل و نہار، حادثاتِ زمانہ اور زمانی فاصلوں نے ان کو بوسیدہ نہیں کیا ہے، اللہ کے رسول ﷺ کے فراق میں انہوں نے جو اشعار کہے ہیں ان میں سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

مَا بَالُ عَيْنِكَ لَا تَنَامُ كَأَنَّمَا ... كُحِلَتْ مَآقِيهَا بِكُحْلِ الْأَرْمَدِ
جَزَعًا عَلَى الْمَهْدِيِّ أَصْبَحَ ثَاوِيًا ... يَا خَيْرَ مَنْ وَطِئَ الْحَصَى لَا تَبْعَدْ
وَجْهِي يَقِيكَ التُّرْبَ لَهْفِي لَيْتَنِي ... غُيِّبْتُ قَبْلَكَ فِي بَقِيعِ الْغَرْقَدِ
بِأَبِي وَأُمِّي مَنْ شَهِدْتُ وَفَاتَهُ ... فِي يَوْمِ الِاثْنَيْنِ النَّبِيُّ الْمُهْتَدِي
فَظَلِلْتُ بَعْدَ وَفَاتِهِ مُتَبَلِّدًا ... مُتَلَدِّدًا يَا لَيْتَنِي لَمْ أُولَدْ
أَأُقِيمُ بَعْدَكَ بِالْمَدِينَةِ بَيْنَهُمْ ... يَا لَيْتَنِي صُبِّحْتُ سَمَّ الْأَسْوَدِ
أَوْ حَلَّ أَمْرُ اللَّهِ فِينَا عَاجِلًا ... فِي رَوْحَةٍ مِنْ يَوْمِنَا أَوْ مِنْ غَدِ
فَتَقُومُ سَاعَتُنَا فَنَلْقَى طَيِّبًا ... مَحْضًا ضَرَائِبُهُ كَرِيمَ الْمَحْتِدِ
يَا بِكْرَ آمِنَةَ الْمُبَارَكَ بِكْرُهَا ... وَلَدَتْهُ مُحْصَنَةٌ بِسَعْدِ الْأَسْعَدِ
نُورًا أَضَاءَ عَلَى الْبَرِيَّةِ كُلِّهَا ... مَنْ يُهْدَ لِلنُّورِ الْمُبَارَكِ يَهْتَدِي
يَا رَبِّ فَاجْمَعْنَا مَعًا وَنَبِيَّنَا ... فِي جَنَّةٍ تَثْنِي عُيُونُ الْحُسَّدِ
فِي جَنَّةِ الْفِرْدَوْسِ فَاكْتُبْهَا لَنَا ... يَا ذَا الْجَلَالِ وَذَا الْعُلَا والسؤدد
وَاللَّهِ أَسْمَعُ مَا بَقِيتُ بِهَالِكٍ ... إِلَّا بَكَيْتُ عَلَى النَّبِيِّ مُحَمَّدِ
يَا وَيْحَ أَنْصَارِ النَّبِيِّ وَرَهْطِهِ ... بَعْدَ الْمُغَيَّبِ فِي سَوَاءِ الْمَلْحَدِ
ضَاقَتْ بِالْأَنْصَارِ الْبِلَادُ فَأَصْبَحُوا ... سُودًا وُجُوهُهُمْ كَلَوْنِ الْإِثْمِدِ
وَلَقَدْ وَلَدْنَاهُ وَفِينَا قَبْرُهُ ... وَفُضُولُ نِعْمَتِهِ بِنَا لَمْ نَجْحَدْ
وَاللَّهُ أَكْرَمَنَا بِهِ وَهَدَى بِهِ ... أَنْصَارَهُ فِي كُلِّ سَاعَةِ مَشْهَدِ
صَلَّى الْإِلَهُ وَمَنْ يَحُفُّ بِعَرْشِهِ ... وَالطَّيِّبُونَ عَلَى الْمُبَارَكِ أَحْمَدَ

ترجمہ: ''تیری آنکھوں کو کیا ہوا؟ ان کو نیند کیوں نہیں آتی ہے؟ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے انہیں پیکرِ ہدایت شخصیت کی یاد کا سرمہ لگا دیا گیا ہے، آپ کی ذات گرامی ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گئی ہے، اے روئے زمین پر چلنے والے انسانوں میں سب سے بہتر انسان! آپ ہم سے

دور نہ جائیں۔ہائے کاش! میرا چہرہ آپ کے جسم اقدس کو مٹی سے بچالیتااور کاش کہ میں آپ سے پہلے بقیع (غرقد) قبرستان میں دفن کر دیا گیا ہوتا! میرے ماں باپ اس پیکرِ ہدایت نبی پر قربان ہوں! جن کی وفات پیر کے دن ہوئی، آپ کی وفات کے وقت میں بھی حاضر تھا۔

آپ کی وفات حسرت آیات کے بعد میں غم و اَلم کا نشان ہوں، بے قراریوں کا جہان ہوں، ہائے کاش! میری ماں نے مجھے یہ دن دیکھنے کے لئے جنا ہی نہ ہوتا، یہ بات میرے لئے ناقابل برداشت ہے کہ آقا کی وفات کے بعد میں مدینہ میں زندہ رہوں، کاش مجھے صبح صبح کالے ناگوں کا زہر پلا دیا جاتا، یا پھر ہم سب پر اللہ اپنے فیصلہ کو آج یا کل نافذ کر کے ہمیں بھی اپنے پاس بلالے اور ہم پر قیامت آجائے اور ہم حضور سے ملاقات کر لیں جو کہ اعلیٰ صفات والے بہترین خصائل و شمائل والے اور سنجیدہ طبیعت والے ہیں۔

اے آمنہ کے مبارک لال! جسے انہوں نے انتہائی پاکیزگی اور عفت کے ساتھ جنم دیا اور وہ دنیا کے لئے برکت کا جہاں ثابت ہوئے، آپؐ ایک ایسا نور تھے جو ساری مخلوق پر چھا گیا اور جسے اس مبارک نور کی اقتدا نصیب ہوئی اور وہ ہدایت یافتہ ہو گیا۔

اے میرے رب! ہمیں اور ہمارے نبی کو اس جنت میں اکٹھا فرمادے جس کو دیکھ کر حاسدین کی انکھیں چندھیا جائیں، ہمیں جنت الفردوس میں ایک ساتھ جمع فرما، اے عظمت و بزرگی اور سرداری کے مالک رب! اللہ کی قسم! میں جب تک زندہ ہوں میں جب بھی کسی وفات پانے والے کے بارے میں سنوں گا تو نبی محمد ﷺ کی یاد سے میری آنکھیں اشکبار ہو جائیں گی۔

اے انصارِ نبی اور ان کی پاکیزہ جماعت! نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد تمہارے حزن و غم کی کیفیت کو بیان کرنا میرے بس سے باہر ہے، اب انصار کا حال یہ ہے کہ زمین ان کے لئے تنگ ہو چکی ہے اور غم کی وجہ سے ان کے چہرے اثمد نامی سرمے کی طرح سیاہ ہوئے پڑے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ہمارے درمیان جنم لیا اور ہمارے پاس ہی آپ کی قبر بھی ہے اور ان کے بہت سے انعامات واحسانات ہم پر ہیں، جن کا انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں حضورؐ کے ذریعہ ہدایت عطا فرمائی اور ان کے ذریعہ ہمیں عزت بخشی، اللہ تعالیٰ، اس کے عرش کے ارد گرد عبادت کرنے والے فرشتے اور تمام پاکیزہ لوگوں کا درود و سلام سراپا خیر و برکت احمد مصطفی ﷺ پر نازل ہو"۔(دیکھیں: سیرت ابن ہشام: 4/328)

حضرت حسانؓ نے یہ اشعار بھی کہے:

تَاللهِ ما حَمَلَت أُنثى وَلا وَضَعت ... مِثْلَ الرَّسولِ نَبِيِّ الْأُمَّةِ الْهَادي
وَلا بَرا اللهُ خَلْقًا مِن بَريَّتِهِ ... أَوفى بِذِمَّةِ جارٍ أَو بِميعادِ
مِنَ الَّذي كانَ فينا يُستَضاءُ بِهِ ... مُبارَكِ الْأَمرِ ذا عَدلٍ وَإِرشادِ
يا أَفضَلَ النّاسِ إِنّي كُنتُ في نَهَرٍ ... أَصبَحتُ مِنهُ كَمِثْلِ الْمُفْرَدِ الصّادي

ترجمہ: "اللہ کی قسم! رسولِ برحق، نبی امت اور ہادیٔ اعظم جیسا انسان نہ کسی ماں نے اپنے پیٹ میں رکھا، نہ اپنی گود میں اٹھایا ہے اور نہ ہی جنا ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی ساری مخلوق میں ان جیسا کوئی پیدا نہیں کیا جو اپنی بات کا پکا اور وعدہ نبھانے والا ہو، ان سے روشنی کا فیضان حاصل کیا جاتا ہے آپؐ بابرکت، انصاف پرور اور رہبری ورہنمائی کرنے والے تھے۔

اے ساری مخلوق میں افضل ترین ذات! میری مثال اس شخص کی سی ہے جو ایک نہر میں تھا اور سیر اب ہو رہا تھا اور میں اس نہر سے نکل کر تنہا بیاباں میں آ گیا ہوں''۔

۲: حضرت ابو بکر صدیقؓ اشکبار آنکھوں کے ساتھ کہتے ہیں:

لما رأيت نبينا متجندلا ... ضاقت علي بعرضهن الدور

فارتاع قلبي عند ذاك لموته ... والعظم مني ما حييت كسير

أعتيق ويحك إن خلّك قد ثوى ... والصبر عندك ما بقيت يسير

يا ليتني من قبل مهلك صاحبي ... غيبت في لحد عليه صخور

فلتحدثن بدائع من بعده ... تعيا بهن جوانح وصدور

ترجمہ: ''جب میں نے اپنے نبی کو دیکھا کہ آپؐ کے جسمِ اطہر سے روح پرواز کر گئی ہے تو تمام گھر اپنی وسعتوں کے باوجود میرے لئے تنگ ہو گئے۔ آپؐ کے وصال کی وجہ سے میرا دل بے قرار اور خوفزدہ ہو گیا اور جب تک میں زندہ رہا میری ہڈیاں چور ہو گئیں۔

اے عتیق! تیرا محبوب تو سپرد خاک ہو گیا، اب تو تنہا رہ گیا اور جب تک تو باقی رہے گا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا ہے، ہائے کاش! میں اپنے رفیق و دوست سے پہلے ہی اسی لحد میں دفن کیا گیا ہوتا جس پر بھاری چٹانیں ہوتیں، آپؐ کے بعد کارہائے نمایاں کا ذکر کیا جائے گا جن کو بیان کرنے اور زندگی میں اختیار کرنے سے قلب و جوارح عاجز ہیں۔ (دیکھیں: المستطرف للأبشیھی، ص:366، دیوان أبی بکر صدیق، شرح راجی الأسمر، ص:32-33)

۳: حضرت ابو سفیان بن حارث بن عبد المطلب بن ہاشم نمدیدہ آنکھوں کے ساتھ کہتے ہیں:

أَرِقْت فَبَاتَ لَيْلِي لَا يَزُولُ ··· دَلِيلُ أَخِي الْمُصِيبَةِ فِيهِ طُولُ

وَأَسْعَدَنِي الْبُكَاءُ وَذَاكَ فِيمَا ··· أُصِيبَ الْمُسْلِمُونَ بِهِ قَلِيلُ

لَقَدْ عَظُمَتْ مُصِيبَتُنَا وَجَلَّتْ ··· عَشِيَّةَ قِيلَ قَدْ قُبِضَ الرَّسُولُ

وَأَضْحَتْ أَرْضُنَا مِمَّا عَرَاهَا ··· تَكَادُ بِنَا جَوَانِبُهَا تَمِيلُ

فَقَدْنَا الْوَحْيَ وَالتَّنْزِيلَ فِينَا ··· يَرُوحُ بِهِ وَيَغْدُو جِبْرَئِيلُ

وَذَاكَ أَحَقُّ مَا سَالَتْ عَلَيْهِ ··· نُفُوسُ النَّاسِ أَوْ كَرَبَتْ تَسِيلُ

نَبِيٌّ كَانَ يَجْلُو الشَّكَّ عَنَّا ··· بِمَا يُوحَى إِلَيْهِ وَمَا يَقُولُ

وَيَهْدِينَا فَلَا نَخْشَى ضَلَالًا ··· عَلَيْنَا وَالرَّسُولُ لَنَا دَلِيلُ

أَفَاطِمُ إِنْ جَزِعْتِ فَذَاكَ عُذْرٌ ··· وَإِنْ لَمْ تَجْزَعِي، ذَاكَ السَّبِيلُ

فَقَبْرُ أَبِيكِ سَيِّدُ كُلِّ قَبْرٍ ··· وَفِيهِ سَيِّدُ النَّاسِ الرَّسُولُ

ترجمہ: ''میری رات بے خوابی کی حالت میں گزری، میں نے اس حال میں رات گزاری کہ وہ ختم ہونے میں نہیں آ رہی ہے، ہاں، مصیبت زدہ کی رات طویل ہوا کرتی ہے۔

رونے اور اشک بہانے سے مجھے سکون ملا اور مسلمانوں پر جو مصیبت آن پڑی ہے اس کے لئے جتنا رویا جائے کم ہی ہے۔ اس روز ہماری مصیبت وپریشانی کی انتہا ہو گئی جب یہ خبر سننے کو ملی کہ رسول اللہ ﷺ کی روح پرواز کر گئی ہے۔ اس ہولناک صورتحال میں ایسا لگ رہا تھا گویا کہ زمین پر بھونچال آ گیا ہو اور زمین اندر دھنس جائے گی۔

آپ کے وصال کے ذریعے ہمارے درمیان وحی اور نزولِ قرآن کا سلسلہ منقطع ہو گیا جس کو لے کر حضرت جبرئیلؑ صبح وشام آیا کرتے تھے۔ یہ وہ چیز ہے جس کے لئے لوگوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا یا وہ جانیں قربان کرنے کے لئے تیار تھے، وہ ایک ایسے نبی تھے جو شک وشبہہ اور ریب وتذبذب کے موقع پر نازل ہونے والی وحی اور اپنے فرامین واشارات کہ ذریعہ شکوک وشبہات کو دور کرتے تھے۔ آپؐ ہماری ہدایت اور رہنمائی کرتے رہتے تھے، ہمیں کسی ملامت وسرزنش کا خوف نہیں ہوتا تھا، رسولؐ ہمارے درمیان دلیل ورہبر کی حیثیت سے موجود تھے۔

اے فاطمہؓ! اگر آپ غمگیں ونمدیدہ ہو تو آپ کو اس کا حق ہے، آپ کا عذر قابل قبول ہے اور اگر آپ اپنے دل پر غم نہ لو تو یہی اس کا حل ہے، آپ کے والد محترم کی قبر ہر قبر کی سردار ہے اور اس میں لوگوں کے سردار اور رسول برحق ہیں۔ (دیکھیں: الاکتفاء للکلاعی: 2/456)

۴: حضرت صفیہ بنت عبد المطلبؓ رسول اللہ پر روتے ہوئے کہتی ہیں:

أَلَا يا رسولَ اللهِ كُنْتَ رجاءَنا، ... وكُنْتَ بنا برًّا ولم تكُ جافيا!

وكُنْتَ رحيما هاديا ومعلما، ... ليبكِ عليكَ اليومَ من كانَ باكيا

لَعَمرُكَ ما أبكي النّبيّ لموته! ... ولكنْ لما أخشى من الهرج آتيا

أفاطمَ صلّى الله، ربّ مُحمّدٍ، ... على جدثٍ أمسى بيثربَ ثاويا!

فدًا لرسول الله أُمّي وخالَتي ... وعمي وآبائي ونفسي وماليا

صَدقْتَ وبلّغتَ الرّسالةَ صادقًا، ... ومت صليب العود أبلَج صافيا!

فلَو أنّ ربّ النّاس أبقاكَ نبينَا ... سَعدْنَا، ولكن أمرهُ كان ماضيا!

عَلَيْكَ من الله السّلامُ تحيّةً، ... وأُدخلْتَ جنّاتٍ من العدْنِ راضيا

ترجمہ: "اے اللہ کے رسولؐ! آپ ہمارے لئے امید کی ایک کرن تھے، آپ ہمارے ساتھ حسنِ سلوک کرنے والے تھے اور ہمارے لئے تندخو اور سخت نہیں تھے۔ آپ رحم وکرم کے پیکر، ہادی اور رہنما اور معلم تھے، جس کو اشک بہانے ہوں وہ آج آپ پر اشک بہائے۔ اللہ کی قسم! نبی کی رحلت پانے کی وجہ سے میری آنکھیں زیادہ اشکبار نہیں ہیں، لیکن میری آنکھیں اس وجہ سے اشکبار ہیں کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ اس کے بعد فتنوں کا دروازہ کھل جائے گا۔

اے فاطمہؓ! جو محمدؐ کا رب اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ہوں اس جسم اطہر پر جس کو یثرب میں دفن کر دیا گیا۔ فدا ہوں، میری ماں، میری خالہ، میرے چچا، میرے آباء، میرے نفس اور میرا مال سب رسول اللہ کی ذات پر فدا ہوں۔ آپ نے صدق وسچائی کے ساتھ زندگی بسر کی اور حق گوئی کے

ساتھ آپ نے رسالت کی تبلیغ کی، آپ اس دنیا سے اس حالت میں رخصت ہوئے کہ آپ کا سر اونچا تھا اور آپ کی ذات ہر قسم کے عیب اور داغ سے پاک تھی۔

اگر تمام کائنات کا رب ہمارے نبی کو بقا اور دوام عطا کرتا تو یہ چیز ہمارے لئے باعثِ مسرت و سعادت ہوتی لیکن اس کا حکم تو نافذ ہو کر رہنے والا ہے۔

آپ پر اللہ کی طرف سے سلام اور رحمتیں ہوں اور آپ کو ہمیشگی اور دائمی جنتوں میں اس حال میں داخل کیا گیا کہ آپ کا رب بھی آپ سے راضی ہے اور آپ بھی اپنے رب سے خوش ہیں۔(دیکھیں: تفسیر القرطبی: 4/219-220)

....

اختتامیہ

یہ وہ مباحث و مضامین ہیں جن کے جمع و ترتیب اور تحلیل و تجزیہ کی اللہ تعالیٰ نے مجھے توفیق عطا کی، یہ مباحث سیرت نبویہؐ سے متعلق ہیں جن میں یہ طرز اختیار کیا گیا ہے کہ اس سے حاصل ہونے والے اسباق و دروس اور فوائد و عبرتوں کو بھی ذکر کیا گیا ہے، اس میں جو صحیح اور درست ہے تو وہ مجھ پر محض اللہ کا فضل و کرم ہے، اس کے لئے اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں اور اس میں جو خطائیں ہوں گی تو اس کے لئے میں اللہ سے استغفار کرتا ہوں اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں، اللہ اور اس کے رسول اس سے بری ہیں، البتہ میری پوری کوشش رہی ہے کہ مجھ سے عمداً کوئی غلطی نہ ہونے پائے، اس لئے پُر امید ہوں کہ میں اجر سے محروم نہیں رہوں گا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب کے ذریعہ میرے اہلِ ایمان بھائیوں کو نفع پہنچائے، اس کتاب کے قارئین سے درخواست ہے کہ مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں، اس لئے کہ اپنے بھائی کے لئے غائبانہ میں کی گئی دعا اللہ کے نزدیک مقبول ہوتی ہے، میں اس کتاب کا اختتام ان دعائیہ کلمات کے ساتھ کرتا ہوں: ﴿رَبَّنَا ٱغۡفِرۡ لَنَا وَلِإِخۡوَٰنِنَا ٱلَّذِينَ سَبَقُونَا بِٱلۡإِيمَٰنِ وَلَا تَجۡعَلۡ فِي قُلُوبِنَا غِلّٗا لِّلَّذِينَ ءَامَنُواْ رَبَّنَآ إِنَّكَ رَءُوفٞ رَّحِيمٌ﴾ ترجمہ: ”اے ہمارے رب، ہمیں اور ہمارے اُن سب بھائیوں کو بخش دے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں اور ہمارے دلوں میں اہل ایمان کے لئے کوئی بغض نہ رکھ، اے ہمارے رب، تو بڑا مہربان اور رحیم ہے“۔(سورۃ الحشر:10)

اور شاعر کے ان الفاظ کے ساتھ اپنی دعا کا اختتام کرتا ہوں:

إلهي أنتَ للإحسان أهلٌ ... ومنك الجودُ والفضلُ الجزيلَ
إلهي باتَ قلبي في هموم ... وحالي لا يسرُّ به خليلَ
إلهي تب وجدْ وارحم عبيدًا ... من الأوزار مدمعه يسيلَ
إلهي ثوبُ جسمي دنّسته ... ذنوبٌ حملُها أبدًا ثقيلَ
إلهي جد بعفوكَ لي فإني ... على الأبواب منكَسرٌ ذليل
إلهي خانني جلَدي وصبري ... وجاء الشيب واقترب الرحيل
إلهي داوني بدواء عفو ... به يشفَى فؤادي والغليل
إلهي ذابَ قلبي من ذُنوبي ... ومن فعل القبيحِ أنا القتيل
إلهي قلت ادعوني أُجبكُم ... فهاك العبدُ يدعو يا وكيل
إلهي هذه الأوقات تمضي ... بأعمار لنا وبها تزولُ

ترجمہ: اے میرے اللہ! تو ہی فضل و احساناً کا اہل ہے اور تیری ہی طرف سے جود و احسان اور عظیم فضل ہے، اے میرے اللہ! میرا دل ہموم و غموم کا شکار ہے اور میرا حال ایسا ہے کہ اس کے ذریعہ دوست کو بھی مسرت نہیں ہوتی ہے، اے میرے الہ! اس چھوٹے سے بندے کی توبہ قبول

فرما، جود و سخا اور رحم کا معاملہ فرما، گناہوں سے بوجھل ہونے کی وجہ سے اس بندے کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلِ رواں جاری ہے۔ اے میرے الہ! میرے جسم کے کپڑوں کو گناہوں نے داغدار اور گندا کر دیا ہے، ان گناہوں کا اٹھانا انتہائی بوجھل ہے، اے میرے الہ! اپنے عفو در گذر کے ذریعہ میرے ساتھ جود و کرم فرما، اس لئے کہ میں تیرے دَر پر ٹوٹا ہوا اور سراپا عجز و نیاز ہوں۔ اے میرے الہ! میری طاقت و قوت اور میرے صبر نے میرے ساتھ خیانت کی اور اب بڑھاپا آ پہنچا ہے اور کوچ کا وقت بھی قریب ہے۔ اے میرے الہ! عفو در گذر کی دوا کے ذریعہ میرا علاج فرما، اس کے ذریعہ میرے دل کو شفا ملتی ہے اور اسی سے میری پیاس بجھتی ہے۔ اے میرے الہ! میرا دل گناہوں کی وجہ سے پگھل گیا اور بداعمالیوں کی وجہ سے میں ختم ہو چکا ہوں۔ اے میرے الہ! تیرا ہی فرمان ہے کہ مجھے پکارو میں تمہاری پکار سنوں گا، تو یہ بندہ تجھے پکار رہا ہے۔ اے وکیل و کارساز! اے میرے الہ! یہ اوقات بھی ہماری عمر کے گزر جائیں گے اور یہ زندگی اپنے اختتام کو پہنچ جائے گی۔

ایک اور شاعر کے قول کے ذریعہ اس کتاب کا اختتام کرتا ہوں، وہ کہتا ہے:

اطلب العلم ولا تكسل فما ... أبعد الخير على أهلِ الكسل

واحتفل للفقه في الدينِ ولا ... تشتغل عنه بمالٍ أو خولْ

واهجرِ النومَ وحصّلْه فمن.....يعرفِ المطلوبَ يحقر ما بذلْ

لا تقلْ قد ذهبتْ أربابه ... كلُّ من سار على الدرب وصل

ترجمہ: علم حاصل کرو اور سستی اور کاہلی کا شکار نہ بنو، سست و کاہل لوگوں سے خیر بہت دور ہوتا ہے، دین میں تفقّہ اختیار کرنے کا اہتمام کرو اور مال اور طاقت و قوت کی وجہ سے اس سے بے اعتنائی نہ برتو، نیند کو قربان کر کے علم حاصل کرو اور جو مقصد کو جان لیتا ہے وہ اس کے لئے ہر قربانی کو ہیچ سمجھتا ہے، یہ مت کہو کہ اہلِ علم تو گزر چکے ہیں اور اب ان کا زمانہ ختم ہو گیا، حقیقت یہ ہے کہ جو بھی کسی راہ کا راہی بنے گا وہ منزل تک پہنچ جائے گا۔

سبحانك اللهم وبحمدك، أشهد أن لا إله إلا أنت، أستغفرك وأتوب إليك.

....

مصادر و مراجع

(أ)

١ – آثار الحرب في الفقه الإسلامي، د. وهبة الزحيلي، دراسة مقارنة، دار الفكر، ١٩٨١م.

٢ – آثار تطبيق الشريعة، د. مُحَمَّد عبد الله الزاحم، دار المنار، الطبعة الأولى، ١٤١٢هـ – ١٩٩١م.

٣ – آفات على الطريق، مُحَمَّد سيد نوح، دار الوفاء، المنصورة، مصر، ١٩٩٠م.

٤ – أسد الغابة في معرفة الصحابة، علي بن أبي الكرم ابن الأثير.

٥ – الأم، مُحَمَّد إدريس الشافعي، طبعة الفكر، بيروت، لبنان، سنة ١٤١٠هـ – ١٩٩٠م.

٦ – الإتقان في علوم القرآن، عبد الرحمن السيوطي، المكتبة الثقافية، بيروت، لبنان.

٧ – الإدارة الإسلامية في عصر عمر بن الخطاب، د. فاروق مجدلاوي، دار مجدلاوي، عمان.

٨ – الإصابة في تمييز الصحابة، أحمد بن حجر العسقلاني، تحقيق علي مُحَمَّد البجاوي، دار النهضة مصر.

٩ – الاعتصام للإمام الشاطبي، دار الفكر، الناشر مكتبة الرياض الحديثة بالرياض.

١٠ – الإعلام في صدر الإسلام، د. عبد اللطيف حمزة، دار الفكر.

١١ – إمتاع الأسماع بما للرسول من الأبناء والأموال والحفدة والمتاع، للشيخ أحمد المقريزي، صححه وشرحه محمود مُحَمَّد شاكر، مطبعة لجنة التأليف والترجمة بالقاهرة ١٩٤١م.

١٢ – الأحاديث الواردة في فضائل المدينة، صالح الرفاعي، دار الخضيري، المدينة، ١٤١٨هـ.

١٣ – أحكام الجنائز وبدعها للألباني، المكتب الإسلامي، بيروت.

١٤ – أحكام السوق في الإسلام، أحمد الدريويش، دار عالم الكتب، ١٤٠٩هـ– ١٩٨٩م.

١٥ – أحكام القرآن لأبي بكر مُحَمَّد بن عبد الله المعروف بابن العربي تحقيق: مُحَمَّد عبد القادر عطاء، دار الكتب العلمية بيروت، ط١/ ١٤٠٨هـ.

١٦ – الأخلاق الإسلامية وأسسها، عبد الرحمن الميداني، دار القلم، دمشق.

١٧ – الأخوات المسلمات وبناء الأسرة القرآنية، محمود مُحَمَّد الجوهري.

١٨ – إرواء الغليل في تخريج أحاديث منار السبيل, مُحَمَّد ناصر الدين الألباني –إشراف زهير الشاويش.

١٩ – الأساس في السنة وفقهها، السيرة النبوية، سعيد حوى، دار السلام بمصر، ١٩٨٩م.

٢٠ – الأساس في السنة، سعيد حوى، دار السلام، مصر.

٢١ – أساليب التشويق والتعزيز في القرآن الكريم، د. الحسين جرنو محمود جلو، مؤسسة الرسالة، دار العلوم الإنسانية، الطبعة الأولى ١٤١٤هـ– ١٩٩٤م.

٢٢ – أسباب النزول، أبو الحسن علي بن أحمد الواحدي النيسابوري، دار الكتب العلمية، بيروت لبنان، الطبعة الأولى، ١٤٠٢هـ- ١٩٨٢م.

٢٣ – أسباب هلاك الأمم السالفة، سعيد مُحَمَّد بابا سيلا، سلسلة الحكمة البريطانية، ٢٠٠٠م.

٢٤ – الاستخبارات العسكرية في الإسلام، عبد الله علي السلامة مناصرة, مؤسسة الرسالة، بيروت، لبنان، الطبعة الثانية، ١٤١٢هـ – ١٩٩١م.

٢٥ – الإسلام في خندق، مصطفى محمود، دار أخبار اليوم القاهرة، مصر،١٩٩٤م.

٢٦ – أصول الفكر السياسي في القرآن المكي، التجاني عبد القادر حامد، الطبعة الأولى، عمان، الأردن، دار البشير ١٤١٦هـ – ١٩٩٥م.

٢٧ – أضواء على الهجرة، توفيق مُحَمَّد سبع، مطبعة الهيئة العامة لشئون المطابع الأميرية ١٩٧٣م.

٢٨ – أعلام النبوة للماوردي، الكليات الأزهرية.

٢٩ – إغاثة اللهفان من مصائد الشيطان، لابن قيم الجوزية، دار الكتب العلمية بيروت.

٣٠ – الاكتفاء بما تضمنه من مغازي الرسول والثلاثة الخلفاء، تأليف أبي الربيع سليمان ابن موسى الكلاعي الأندلسي، عالم الكتب، الطبعة الأولى، ١٤١٧هـ – ١٩٩٧م.

٣١ – الأموال، أبو عبيد القاسم بن سلام، مؤسسة ناصر الثقافية، بيروت.

٣٢ – الانحرافات العقدية والعلمية، علي بن نجيب الزهراني، دار طيبة، ١٤١٨هـ

٣٣ – أنساب الأشراف للبلاذري، تحقيق مُحَمَّد حميد الله، دار المعارف – مصر.

٣٤ – الأنساب، أبو سعيد عبد الكريم بن مُحَمَّد السمعاني، تحقيق عبد الرحمن المعلمي اليماني، نشر مجلس دائرة المعارف العثمانية، الهند ١٣٨٢هـ-١٩٦٢م.

٣٥ – أهمية الجهاد في نشر الدعوة، د. علي العلياني، دار طيبة، الطبعة الأولى، ١٤٠٥هـ

٣٦ – الإيمان والحياة، يوسف القرضاوي، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة العاشرة، ١٩٨٤م.

(ب)

٣٧ – البحر الرائق في الزهد والرقائق، أحمد فريد، دار البخاري، القصيم بالسعودية.

٣٨ – بدائع السالك في طبائع الملك، أبو عبد الله بن الأزرق, تحقيق وتعليق علي سامي النشار، منشورات وزارة الإعلام، الجمهورية العراقية.

٣٩ – البداية والنهاية، أبو الفداء ابن كثير الدمشقي. دار الريان للتراث.

٤٠ – بلوغ الأرب في معرفة أحوال العرب، محمود شكري الآلوسي، تحقيق مُحَمَّد بهجة الأثري، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الثانية.

٤١ – بناء المجتمع الإسلامي في عصر النبوة، مُحَمَّد توفيق رمضان، دار ابن كثير، دمشق.

٤٢ – بهجة المحافل وبغية الأماثل في تلخيص المعجزات والسير والشمائل، شرح جمال الدين مُحَمَّد الأشخر اليمني، دار صادر – بيروت.

(ت)

٤٣ – تأملات في سورة الكهف للشيخ أبي الحسن الندوي، دار القلم.

٤٤ – تأملات في سيرة الرسول ﷺ، د. مُحَمَّد السيد الوكيل، دار المجتمع، ١٤٠٨هـ.

٤٥ – تاريخ الإسلام للذهبي (المغازي) ، تحقيق عمر عبد السلام تدمري، دار الكتاب العربي.

٤٦ – التاريخ الإسلامي مواقف وعبر، د. عبد العزيز الحميدي، دار الدعوة، الإسكندرية.

٤٧ – التاريخ السياسي والحضاري، د. السيد عبد العزيز سالم.

٤٨ – التاريخ السياسي والعسكري لدولة المدينة في عهد الرسول ﷺ، استراتيجية الرسول السياسية والعسكرية، د. علي معطي، مؤسسة المعارف بيروت.

٤٩ – تاريخ الطبري، لأبي جعفر بن جرير، تحقيق مُحَمَّد أبو الفضل إبراهيم، دار سويدان،

٦٨ – تفسير القرطبي، لأبي عبد الله القرطبي، دار إحياء التراث العربي، بيروت، لبنان، ١٩٦٥م.

٦٩ – تفسير المراغي، لأحمد مصطفى المراغي، طبع دار الفكر، بيروت، الطبعة الثالثة، ١٣٩٤هـ.

٧٠ – تفسير المنار، مُحَمَّد رشيد رضا، دار المعرفة، بيروت، لبنان.

٧١ – التفسير المنير، د. وهبة الزحيلي، دار الفكر المعاصر، بيروت، دار الفكر, دمشق، الطبعة الأولى ١٤١١هـ– ١٩٩١م.

٧٢ – تفسير النسفي المسمى بمدارك التنزيل وحقائق التأويل، تأليف الإمام عبد الله أحمد بن مُحَمَّد النسفي، المتوفى سنة ٧١٠هـ، الناشر دار الكتاب العربي، بيروت.

٧٣ – تفسير ابن عطية المسمى المحرر الوجيز في تفسير الكتاب العزيز، لأبي مُحَمَّد عبد الحق ابن عطية الأندلسي، من مطبوعات رئاسة المحاكم الشرعية والشؤون الدينية بدولة قطر، الطبعة الأولى، ١٤١٢هـ – ١٩٩١م.

٧٤ – تفسير سورة فصلت، د. مُحَمَّد صالح علي مصطفى، دار النفائس، الطبعة الأولى، ١٤٠٩هـ –١٩٨٩م.

٧٥ – تلقيح فهوم أهل الأثر، لابن الجوزي، مكتبة الآداب، القاهرة، دون ذكر الطبعة.

٧٦ – التمكين للأمة الإسلامية في ضوء القرآن الكريم، مُحَمَّد السيد حمد يوسف، دار السلام، مصر، الطبعة الأولى ١٤١٨هـ – ١٩٩٧م.

٧٧ – تنظيمات الرسول الإدارية في المدينة، صالح أحمد العلي، مجلة المجمع العلمي العراقي، المجلد السابع عشر، بغداد ١٩٦٩م.

٧٨ – تنوير الحوالك شرح موطأ مالك، جلال الدين السيوطي، دار إحياء الكتب.

٧٩ – تهذيب مدارج السالكين لابن القيم، هذبه عبد المنعم صالح العلي العزي مؤسسة الرسالة، الطبعة الثالثة، ١٤٠٩هـ – ١٩٨٩م.

(ج)

٨٠ – جامع الأصول، لابن الأثير المتوفى سنة ٦٠٦هـ، تحقيق عبد القادر الأرناؤوط، طبع مكتبة الحلواني سوريا، عام ١٣٩٢هـ.

٨١ – جامع العلوم والحكم، للإمام ابن رجب الحنبلي، دار الفكر، بيروت.

٨٢ – الجامع لأخلاق الراوي، وآداب السامع للخطيب البغدادي، مكتبة المعارف بالرياض، ١٤٠٣هـ– ١٩٨٣م.

٨٣ – الجهاد والقتال في السياسة الشرعية، مُحَمَّد خير هيكل، دار البيارق، عمان، بيروت الطبعة الأولى ١٤١٤هـ– ١٩٩٣م.

٨٤ – الجواب الصحيح لمن بدل دين المسيح، لابن تيمية، مطابع المجد.

٨٥ – جوامع السيرة لابن حزم، المتوفى ٤٥٦هـ، تحقيق الدكتور إحسان عباس والدكتور ناصر الدين الأسد، طبع دار إحياء السنة باكستان ١٣٦٨هـ.

٨٦ – جيل النصر المنشود، د. يوسف القرضاوي، مكتبة وهبة، القاهرة، مصر، الطبعة السادسة، ١٤٠٥هـ – ١٩٨٥م.

(ح)

٨٧ – حاشية ابن عابدين، مطابع مصطفى البابي وأولاده.

٨٨ – حدائق الأنوار ومطالع الأسرار، لابن الدَّيبع الشيباني، تحقيق عبد الله إبراهيم الأنصاري.

٨٩ – حديث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ، د. مُحَمَّد بكر آل عابد، دار الغرب الإسلامي، الطبعة الأولى.

٩٠ – الحرب النفسية ضد الإسلام في عهد الرسول ﷺ في مكة، د. عبد الوهاب كحيل، عالم الكتب بيروت، الطبعة الأولى، ١٤٠٦هـ – ١٩٨٦م.

٩١ – الحركة السنوسية في ليبيا، علي مُحَمَّد الصلابي، دار البيارق، عمان طبعة أولى ١٩٩٩م.

٩٢ – حقوق النبي ﷺ على أمته، د. مُحَمَّد بن خليفة التميمي، دار أضواء السلف، الطبعة الأولى، ١٤١٨هـ – ١٩٩٧م.

٩٣ – الحكم والتحاكم في خطاب الوحي، عبد العزيز مصطفى كامل، دار طيبة، الطبعة الأولى، ١٤١٥هـ– ١٩٩٥م.

٩٤ – الحكومة الإسلامية، أبو الأعلى المودودي، ترجمة أحمد إدريس، المختار الإسلامي للطباعة والنشر، القاهرة، الطبعة الأولى، ١٣٩٧هـ – ١٩٧٧م.

٩٥ – حلية الأولياء، أبو نعيم أحمد بن عبد الله الأصبهاني، مطبعة السعادة، مصر، ١٣٥١هـ.

٩٦ – حوار الرسول مع اليهود، د. محسن الناظر، الطبعة الثانية، ١٤١٢هـ– ١٩٩٢م، دار الوفاء.

(خ)

٩٧ – خاتم النبيين ﷺ، للشيخ مُحَمَّد أبي زهرة، دار الفكر بيروت الطبعة الأولى ١٩٧٢م.

٩٨ - الخصائص العامة للإسلام، د. يوسف القرضاوي، مكتبة وهبة، القاهرة، مصر، الطبعة الرابعة ١٤٠٩هـ - ١٩٨٩م.

٩٩ - الخصائص الكبرى، عبد الرحمن بن أبي بكر السيوطي، دار الكتب العلمية بيروت.

(د)

١٠٠ - دائرة المعارف الكاثوليكية، مقال التثليث.

١٠١ - الدر المنثور في التفسير بالمأثور، الإمام السيوطي، الناشر مُحَمَّد أمين دمج، بيروت، لبنان.

١٠٢ - دراسات في السيرة النبوية، د. عماد الدين خليل، دار النفائس، بيروت الطبعة الحادية عشرة ١٤٠٩هـ - ١٩٨٩م.

١٠٣ - دراسات في عهد النبوة، د. عبد الرحمن الشجاع، دار الفكر المعاصر، صنعاء، اليمن، الطبعة الأولى، ١٤١٩هـ - ١٩٩٩م.

١٠٤ - دراسات قرآنية، مُحَمَّد قطب، دار الشروق، الطبعة الخامسة ١٤٠٨هـ- ١٩٨٨م.

١٠٥ - دراسة تحليلية لشخصية الرسول، د. مُحَمَّد قلعجي، دار النفائس الطبعة الأولى، سنة ١٤٠٨هـ -١٩٨٨م.

١٠٦ - الدرر في اختصار المغازي والسير، يوسف بن عبد البر، وزارة الأوقاف بمصر، لجنة إحياء التراث، القاهرة ١٤١٢هـ- ١٩٩٤م.

١٠٧ - دروس في الكتمان، محمود شيت خطاب، مكتبة النهضة، بغداد، الطبعة العاشرة، ١٩٨٨م.

١٠٨ - دستور للأمة من القرآن والسنة، د. عبد الناصر العطار، مؤسسة علوم القرآن، الشارقة، الإمارات، دار ابن كثير، دمشق، بيروت، الطبعة الأولى، ١٤١٤هـ - ١٩٩٣م.

١٠٩ - الدعوة الإسلامية، عبد الغفار عزيز.

١١٠ - دعوة الله بين التكوين والتمكين، د. علي جريشة، مكتبة وهبة، مصر، الطبعة الأولى، ١٤٠٦هـ - ١٩٨٦م.

١١١ - دلائل النبوة ومعرفة أحوال صاحب الشريعة، للحافظ أبي بكر أحمد البيهقي، تحقيق عبد المعطي قلعجي، دار الكتب العلمية، بيروت الطبعة الأولى، ١٤٠٥هـ.

١١٢ - دور المرأة في خدمة الحديث، آمال قرداش، كتاب الأمة، الطبعة الأولى، ١٤٢٠هـ.

١١٣ - دولة الرسول ﷺ من التكوين إلى التمكين، كامل سلامة الدقس، دار عمار، عمان، الطبعة الأولى، ١٤١٥هـ- ١٩٩٤م.

١١٤ - الدولة العربية الإسلامية، منصور الحرابي، منشورات جمعية الدعوة الإسلامية بليبيا الطبعة الثانية ١٩٨٣م.

١١٥ - ديوان أبي بكر الصديق، حققه وشرحه راجي الأسمر، دار صادر بيروت، الطبعة الأولى، ١٩٩٧م.

١١٦ - ديوان شوقي، الأعمال الشعرية الكاملة، دار العودة، بيروت، طبعة ١٩٨٦م.

١١٧ - ديوان عنترة، فاروق الطباع، دار القلم بيروت، لبنان.

(ر)

١١٨ - الرؤى والأحلام في النصوص الشرعية، أسامة عبد القادر.

١١٩ - الرؤيا ضوابطها وتفسيرها، هشام الحمصي، دار الكلم الطيب، دمشق، بيروت، الطبعة الثانية، ١٤١٧هـ - ١٩٩٦م.

١٢٠ - رجال الإدارة في الدولة الإسلامية، د. حسين محمد سليمان، دار الإصلاح، الدمام بالسعودية.

١٢١ - الرحيق المختوم، لصفي الدين عبد الرحمن المباركفوري، الطبعة الأولى، ١٤١٧هـ - ١٩٩٦م، مؤسسة الرسالة، لبنان.

١٢٢ - رسالة الأنبياء، عمر أحمد عمر، دار الحكمة دمشق، الطبعة الأولى، ١٤١٨هـ - ١٩٩٧م.

١٢٣ - الرسول القائد، محمود شيت خطاب، دار مكتبة الحياة ومكتبة النهضة بغداد الطبعة الثانية، ١٩٦٠م.

١٢٤ - الرسول المبلغ، د. صلاح عبد الفتاح الخالدي، دار القلم، دمشق، الطبعة الأولى، ١٤١٨هـ- ١٩٩٧م.

١٢٥ - الرسول المعلم وأساليبه في التعليم للشيخ عبد الفتاح أبي غدة، دار مكتب المطبوعات الإسلامية، حلب، الطبعة الأولى ١٤١٧هـ - ١٩٩٦م.

١٢٦ - الروض الأنف في شرح السيرة النبوية لابن هشام، لأبي القاسم السهيلي، تحقيق عبد الرحمن الوكيل، دار الكتب الحديثة، طبعة ١٣٨٧هـ.

(ز)

١٢٧ - زاد المسير في علم التفسير، أبو الفرج الجوزي، المكتب الإسلامي، الطبعة الأولى، ١٣٨٤هـ- ١٩٦٥م.

١٢٨ - زاد المعاد في هدي خير العباد، أبو عبد الله ابن القيم حققه: شعيب الأرناؤوط وعبد القادر، الطبعة الأولى، ١٣٩٩هـ، دار الرسالة.

١٢٩ - زاد اليقين لأبي شنب، لاشين أبو شنب، دار البشير، طنطا، مصر، الطبعة الأولى، ١٤١٣هـ- ١٩٩٣م.

١٣٠ - الزهد، أحمد بن حنبل، دار الريان للتراث، القاهرة، مصر، الطبعة الثانية، ١٤١٢هـ- ١٩٩٢م.

١٣١ - زيد بن ثابت، كاتب الوحي، وجامع القرآن، صفوان داوودي، دار القلم، دمشق، الطبعة الأولى، ١٤١١هـ- ١٩٩٠م.

(س)

١٣٢ - سبل الهدى والرشاد في سيرة خير العباد، محمد بن يوسف الصالحي، تحقيق: مصطفى عبد الواحد، لجنة إحياء التراث الإسلامي، ١٣٩٤هـ- ١٩٧٤م.

١٣٣ - السرايا والبعوث النبوية حول المدينة ومكة، د. بريكك محمد بريكك، دار ابن الجوزي، الطبعة الأولى، ١٤١٧هـ- ١٩٩٦م.

١٣٤ - السفارات النبوية، د. محمد العقيلي، دار إحياء العلوم، بيروت، الطبعة الأولى، ١٤٠٦هـ - ١٩٨٦م.

١٣٥ - سفراء الرسول، محمود شيت خطاب، مؤسسة الريان, دار الأندلس الخضراء، الطبعة الأولى، ١٤١٧هـ- ١٩٩٦م.

١٣٦ – سنن الدارقطني: على بن عمر الدارقطني وبذيله التعليق المغني لأبي الطيب مُحَمَّد شمس الحق العظيم آبادي- عالم الكتب- لبنان – دون تاريخ.

١٣٧ – سنن أبي داود: الإمام أبو داود السجستاني، تحقيق وتعليق عزت الدعاس، ١٣٩١هـ، سوريا.

١٣٨ – سنن ابن ماجة: الحافظ أبو عبد الله بن زيد القزويني، دار الفكر.

١٣٩ – سنن الترمذي: الإمام أبو عيسى الترمذي، دار الفكر، ١٣٩٨هـ.

١٤٠ – سنن النسائي: أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب النسائي، مطبعة مصطفى الحلبي القاهرة، ١٩٦٤م.

١٤١ – سير أعلام النبلاء: شمس الدين الذهبي، مؤسسة الرسالة، الطبعة الأولى، ١٤٠٣هـ.

١٤٢ – السير والمغازي لابن إسحاق، تحقق سهيل زكار، دار الفكر، طبعة أولى ١٩٧٨م.

١٤٣ – السيرة الحلبية في سيرة الأمين المأمون، علي بن برهان الدين الحلبي، دار المعرفة.

١٤٤ – سيرة الرسول ﷺ صور مقتبسة من القرآن الكريم، تأليف الأستاذ مُحَمَّد عزة دروزة، عني بها الأستاذ عبد الله إبراهيم الأنصاري، المؤتمر العالمي للسيرة النبوية الدوحة ١٤٠٠هـ.

١٤٥ – السيرة النبوية، أبو الحسن الندوي، دار التوزيع والنشر الإسلامية، القاهرة ط٧/ ١٤٠٨.

١٤٦ – السيرة النبوية، دراسة تحليلية، مُحَمَّد أبو فارس، دار الفرقان، عمان الطبعة الأولى ١٤١٨هـ- ١٩٩٧م.

١٤٧ – السيرة النبوية، للذهبي، تحقيق حسام الدين القدسي، مكتبة هلال بيروت.

١٤٨ – السيرة النبوية الصحيحة، د. أكرم العمري، الطبعة الأولى ١٤١٢هـ/ ١٩٩٢م، مكتبة العلوم والحكم بالمدينة المنورة.

١٤٩ – السيرة النبوية تربية أمة وبناء دولة، صالح أحمد الشامي، المكتب الإسلامي، الطبعة الأولى، ١٤١٢هـ – ١٩٩٢م.

١٥٠ – السيرة النبوية دروس وعبر، د. مصطفى السباعي، المكتب الإسلامي، بيروت، لبنان، الطبعة التاسعة، ١٤٠٦هـ – ١٩٨٦م.

١٥١ – السيرة النبوية في ضوء القرآن والسنة، مُحَمَّد أبو شهبة، دار القلم، دمشق، الطبعة الثالثة، ١٤١٧هـ – ١٩٩٦م.

١٥٢ – السيرة النبوية في ضوء المصادر الأصلية، د. مهدي رزق الله أحمد، مركز الملك فيصل للبحوث والدراسات الإسلامية، الرياض الطبعة الأولى، ١٤١٢هـ – ١٩٩٢م.

١٥٣ – السيرة النبوية لأبي حاتم البستي، مؤسسة الكتب الثقافية، بيروت الطبعة الأولى ١٤٠٧هـ – ١٩٨٧م.

١٥٤ – السيرة النبوية، لأبي مُحَمَّد بن عبد الملك بن هشام، دار الفكر، بدون تاريخ.

١٥٥ – السيرة النبوية، لابن كثير، للإمام أبي الفداء إسماعيل، تحقيق مصطفى عبد الواحد، الطبعة الثانية، ١٣٩٨هـ، دار الفكر بيروت، لبنان.

١٥٦ – السيرة النبوية، لمحمد الصوياني، مؤسسة الريان، الطبعة الأولى، ١٤٢٠هـ – ١٩٩٩م.

(ش)

١٥٧ – شذرات الذهب لابن العماد الحنبلي، دار إحياء التراث العربي، بيروت.

١٥٨ – شرح ديوان حسان بن ثابت, ضبطه وصححه عبد الرحمن البرقوقي –دار الأندلس بيروت, بدون تاريخ

١٥٩ – شرح السنة، لأبي مُحَمَّد الحسين بن مسعود البغوي، تحقيق: علي مُحَمَّد معوض وعادل أحمد, دار الكتب العلمية، الطبعة الأولى، ١٩٦٥م، القاهرة.

١٦٠ – شرح الشفا: نور الدين ملا علي قاري– تحقيق حسنين مخلوف, مطبعة المدني – القاهرة– مصر – ١٣٩٨هـ

١٦١ – شرح العقيدة الطحاوية لابن أبي العز الحنفي، تحقيق وتعليق وتخريج أحاديث وتقديم د/ عبد الله بن عبد المحسن التركي وشعيب الأرناؤوط، ط٤، ١٤١٢هـ – ١٩٩٢م، مؤسسة الرسالة، بيروت.

١٦٢ – شرح المعلقات للحسين الزوزني، تحقيق يوسف علي بدوي، دار ابن كثير، دمشق، الطبعة الأولى، ١٤١٠هـ– ١٩٨٩م.

١٦٣ – شرح المواهب اللدنية للقسطلاني، لمحمد بن عبد الباقي الزرقاني، دار المعرفة، بيروت.

١٦٤ – شرح النووي على صحيح مسلم للإمام النووي المتوفى ٦٧٦هـ – طبع المطبعة المصرية ومكتبتها – القاهرة عام ١٣٤٧هـ.

١٦٥ – الشفاء في التعريف بحقوق المصطفى، الإمام القاضي عياض، استانبول، عثمانية.

(ص)

١٦٦ – صبح الأعشي في صناعة الإنشا، أحمد بن علي القلقشندي، تحقيق مُحَمَّد حسين شمس الدين، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى، ١٤٠٧هـ – ١٩٨٧م.

١٦٧ – الصحابي الشاعر عبد الله بن الزبعرى، تأليف مُحَمَّد علي كابتي، دار القلم، دمشق، الطبعة الأولى، ١٤١٩هـ– ١٩٩٩م.

١٦٨ – صحيح البخاري، مُحَمَّد إسماعيل البخاري، دار الفكر، الطبعة الأولى، ١٤١١هـ – ١٩٩١م.

١٦٩ – صحيح الجامع الصغير وزيادته، مُحَمَّد ناصر الدين الألباني المكتب الإسلامي، بيروت، لبنان، الطبعة الثالثة ١٤٠٨هـ– ١٩٨٨م.

١٧٠ – صحيح السيرة النبوية للطرهوني، مكتبة ابن تيمية، القاهرة، الطبعة الأولى ١٤١٤هـ.

١٧١ – صحيح السيرة النبوية، إبراهيم العلي، دار النفائس، الطبعة الثالثة، ١٤٠٨هـ –١٩٩٨م.

١٧٢ – صحيح سنن ابن ماجة: ناصر الدين الألباني، مكتب التربية العربية لدول الخليج الرياض، الطبعة الثالثة، ١٤٠٨هـ– ١٩٨٨م.

١٧٣ – صحيح مسلم بشرح النووي، المطبعة المصرية بالأزهر، الطبعة الأولى، ١٣٤٧هـ– ١٩٢٩م.

١٧٤ – صحيح مسلم، تحقيق مُحَمَّد فؤاد عبد الباقي، دار إحياء التراث العربي، بيروت، لبنان الطبعة الثانية، ١٩٧٢م.

١٧٥ – الصراع مع الصليبين، مُحَمَّد عبد القادر أبو فارس، دار البشير، طنطا، طبعة عام ١٤١٩هـ- ١٩٩٩م.
١٧٦ – الصراع مع اليهود، مُحَمَّد أبو فارس، دار الفرقان، الطبعة الأولى، ١٤١١هـ- ١٩٩٠م.
١٧٧ – صفة الصفوة لابن الجوزي، تحقيق: محمود خوري، ومُحَمَّد قلعجي، دار المعرفة، بيروت، الطبعة الثانية ١٣٩٩هـ.
١٧٨ – صفة الغرباء, سلمان العودة، دار ابن الجوزي، الطبعة الثانية، ١٤١٢هـ- ١٩٩١م.
١٧٩ – صفوة التفاسير للصابوني، دار القرآن الكريم، بيروت، الطبعة الأولى، عام ١٤٠١هـ.
١٨٠ – صلاح الدين الأيوبي، عبد الله علوان.
١٨١ – صلح الحديبية، مُحَمَّد أحمد باشميل، دار الفكر، الطبعة الثالثة، ١٩٧٣م – ١٣٩٣هـ.
١٨٢ – صور من حياة الرسول، أمين دويدار، الطبعة الرابعة، دار المعارف، القاهرة، بدون تاريخ.
١٨٣ – صور وعبر من الجهاد النبوي في المدينة، تأليف: د. مُحَمَّد فوزي فيض الله، دار القلم، دمشق، الدار الشامية، بيروت، الطبعة الأولى، ١٤١٩هـ- ١٩٩٦م.

(ض)

١٨٤ – ضوابط المصلحة، مُحَمَّد رمضان سعيد البوطي، مؤسسة الرسالة ط٤، سنة ١٤٠٢هـ.

(ط)

١٨٥ – الطاعة والمعصية وأثرهما في المجتمع، مُحَمَّد بن العثيمين، غزوة أحد.
١٨٦ – طبقات الشعراء الجاهليين والإسلاميين، أبو عبد الله مُحَمَّد بن سلام بن عبد الله الجمحي بدون معلومات نشر.
١٨٧ – طبقات ابن سعد الكبرى، مُحَمَّد بن سعد الزهري، دار صادر، ودار بيروت للطباعة
والنشر، ١٣٧٦هـ- ١٩٥٧م.
١٨٨ – طريق النبوة والرسالة، د. حسين مؤنس، دار الرشاد، الطبعة الثانية، ١٤١٨هـ – ١٩٩٧م.
١٨٩ – الطريق إلى المدائن، عادل كمال، دار النفائس، بيروت، لبنان الطبعة الخامسة، ١٤٠٧هـ- ١٩٨٧م.
١٩٠ – الطريق إلى المدينة، مُحَمَّد العبده، دار الجوهرة، عمان، الطبعة الثانية، ١٩٩٩م.
١٩١ – الطريق إلى جماعة المسلمين، حسين بن محسن بن علي جابر، دار الوفاء بالمنصورة في مصر الطبعة الخامسة، ١٤١٣هـ-١٩٩٢م.

(ظ)

١٩٢ – ظاهرة الإرجاء، سفر الحوالي، مكتبة الطيب، الطبعة الأولى، ١٤١٧هـ، القاهرة، مصر.

(ع)

١٩٣ – العبادة في الإسلام، يوسف القرضاوي، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الثانية عشرة، ١٤٠٥هـ- ١٩٨٥م.
١٩٤ – عبد الله بن مسعود، عبد الستار الشيخ، دار القلم، دمشق، الطبعة الثانية ١٤١٠هـ- ١٩٩٠م.
١٩٥ – العبقرية العسكرية في غزوات الرسول، مُحَمَّد فرج، دار الفكر العربي، القاهرة الطبعة الثالثة، سنة ١٩٧٧م.

١٩٦ - عقيدة أهل السنة في الصحابة، د. ناصر حسن الشيخ، مكتبة الرشد، الطبعة الأولى، ١٤١٣هـ- ١٩٩٣م.
١٩٧ - علاج القرآن الكريم للجريمة، د. عبد الله الشنقيطي، مكتبة ابن تيمية، القاهرة، الطبعة الأولى، ١٤١٣هـ.
١٩٨ - العلاقات الخارجية للدولة الإسلامية، د. سعيد عبد الله حارب المهيري، مؤسسة الرسالة، الطبعة الأولى، ١٤١٦هـ- ١٩٩٥م.
١٩٩ - علاقة الآباء بالأبناء في الشريعة الإسلامية، د. سعاد الصالح، الناشر: تهامة جدة، الطبعة الأولى، ١٤٠١هـ.
٢٠٠ - عمدة التفسير (مختصر ابن كثير) الشيخ أحمد شاكر, مكتبة التراث الإسلامي, ١٩٩١م
٢٠١ - عمدة القاري، شرح صحيح البخاري، بدر الدين العيني.
٢٠٢ - العهد والميثاق في القرآن الكريم، د. ناصر العمري، دار العاصمة، الطبعة الأولى، ١٤١٣هـ.
٢٠٣ - عون المعبود، شرح سنن أبي داود، تحقيق عبد الرحمن مُحَمَّد عثمان، دار الفكر بيروت.
٢٠٤ - عيون الأثر في فنون المغازي والشمائل والسير، ابن سيد الناس، دار المعرفة، بيروت.

(غ)

٢٠٥ - الغرباء الأولون، سلمان العودة، الطبعة الثالثة، دار ابن الجوزي، الدمام السعودية عام ١٤١٢هـ- ١٩٩١م.
٢٠٦ - غزوة أحد, أحمد عز الدين.
٢٠٧ - غزوة أحد دراسة دعوية، مُحَمَّد عيظة بن سعيد بن مذجح، دار إشبيليا، الطبعة الأولى، ١٤٢٠هـ- ١٩٩٩م.
٢٠٨ - غزوة أحد لأبي فارس، مُحَمَّد عبد القادر أبو فارس، ط١، ١٤٠٢هـ- ١٩٨٢م، دار الفرقان، عمان - الأردن.
٢٠٩ - غزوة الأحزاب, مُحَمَّد عبد القادر أبو فارس، دار الفرقان، عمان، الطبعة الأولى، ١٤٠٣هـ- ١٩٨٣م.
٢١٠ - غزوة الأحزاب، مُحَمَّد أحمد باشميل، دار الفكر، الطبعة الخامسة، ١٣٩٧هـ- ١٩٧٧م.
٢١١ - غزوة بدر الكبرى الحاسمة، محمود خطاب.
٢١٢ - غزوة بدر الكبرى، مُحَمَّد أبو فارس، دار الفرقان، الطبعة الأولى، ١٤٠٢هـ- ١٩٨٢م.
٢١٣ - غزوة بدر الكبرى، مُحَمَّد أحمد باشميل، طبعة دار الفكر، الطبعة السادسة، سنة ١٣٩٤هـ.
٢١٤ - غزوة تبوك، مُحَمَّد أحمد باشميل، دار الفكر، بيروت.

(ف)

٢١٥ - فتح الباري، ابن حجر العسقلاني، دار المعرفة، بيروت، لبنان.
٢١٦ - الفتح الرباني، للساعاتي، أحمد عبد الرحمن الساعاتي، في ترتيب مسند الإمام أحمد، أحمد عبد الرحمن الساعاتي، مطبعة الفتح الرباني بالقاهرة، الطبعة الأولى.
٢١٧ - فتح القدير الجامع بين فني الرواية والدراية، من علم التفسير، مُحَمَّد بن علي الشوكاني، دار الفكر.
٢١٨ - الفصل في الملل والنحل، لابن حزم، مكتبة السلام العالمية.
٢١٩ - فصول في السيرة النبوية، عبد المنعم السيد.

٢٢٠ - فقه الإسلام، شرح بلوغ المرام، لفضيلة الشيخ عبد القادر شيبة الحمد، مطابع الرشيد، المدينة المنورة، الطبعة الأولى، عام ١٤٠٣هـ.

٢٢١ - فقه الابتلاء مُحَمَّد أبو صعيليك، دار البيارق، عمان - بيروت، الطبعة الأولى، ١٤٢٠هـ- ١٩٩٩م.

٢٢٢ - فقه التمكين في القرآن الكريم، علي مُحَمَّد الصلابي، دار البيارق، عمان، الطبعة الأولى، ١٩٩٩م.

٢٢٣ - فقه الدعوة إلى الله، عبد الحليم محمود، دار الوفاء، الطبعة الأولى، ١٤١٠هـ - ١٩٩٠م.

٢٢٤ - فقه الدعوة الفردية، د. سيد مُحَمَّد نوح، دار اقرأ، صنعاء.

٢٢٥ - فقه الزكاة للقرضاوي، مكتبة وهبة، الطبعة الحادية والعشرون، ١٤١٤هـ- ١٩٩٤م.

٢٢٦ - الفقه السياسي للوثائق النبوية، خالد الفهداوي، دار عمار، الطبعة الأولى ١٤١٩هـ- ١٩٩٨م.

٢٢٧ - فقه السيرة النبوية، منير الغضبان، معهد البحوث العلمية وإحياء التراث مكة المكرمة.

٢٢٨ - فقه السيرة، مُحَمَّد سعيد رمضان البوطي، الطبعة الحادية عشرة، دار الفكر، دمشق- سوريا، ١٩٩١م.

٢٢٩ - فقه السيرة للغزالي، دار القلم، دمشق، سوريا الطبعة الرابعة، ١٤٠٩هـ- ١٩٨٩م.

٢٣٠ - فلسفة التربية الإسلامية، ماجد عرسان الكيلاني، مكتبة هادي، مكة المكرمة، طبعة عام ١٤٠٩هـ.

٢٣١ - الفوائد لابن القيم، مُحَمَّد بن أبي بكر بن قيم الجوزية، دار الريان للتراث، القاهرة مصر، الطبعة الأولى ١٤٠٧هـ- ١٩٨٧م.

٢٣٢ - في السيرة النبوية قراءة لجوانب الحذر والحماية، الدكتور إبراهيم علي مُحَمَّد أحمد، وزارة الأوقاف بدولة قطر الطبعة الأولى، رجب ١٤١٧هـ.

٢٣٣ - في ظلال السيرة النبوية، الهجرة النبوية، الدكتور مُحَمَّد عبد القادر أبو فارس، دار الفرقان، عمان، الأردن، الطبعة الثانية، ١٤٠٨هـ- ١٩٨٨م.

٢٣٤ - في ظلال القرآن، سيد قطب، دار الشروق، الطبعة التاسعة، ١٤٠٠هـ- ١٩٨٠م.

(ق)

٢٣٥ - القاموس المحيط، مجد الدين مُحَمَّد الفيروزآبادي، مطبعة مصطفى البابي وأولاده، بمصر, الطبعة الثانية ١٣٧١هـ- ١٩٥٢م.

٢٣٦ - قراءة سياسية للسيرة النبوية، مُحَمَّد قلعجي، دار النفائس بيروت لبنان، الطبعة الأولى ١٤١٦هـ- ١٩٩٦م.

٢٣٧ - قصيدة بانت سعاد لكعب بن زهير وأثرها في التراث العربي، تأليف د. السيد إبراهيم مُحَمَّد، المكتب الإسلامي، الطبعة الأولى، ١٤٠٦هـ- ١٩٨٦م.

٢٣٨ - قضايا في المنهج، سلمان العودة، دار مكتبة القدس، الطبعة الثالثة، ١٤٢٠هـ- ١٩٩٩م.

٢٣٩ - قضايا نساء النبي ﷺ والمؤمنات, حفصة بنت عثمان الخليفي، دار المسلم, الطبعة الأولى، ١٤١٨هـ- ١٩٩٧م.

٢٤٠ - قواعد الأحكام في مصالح الأنام، عز الدين عبد العزيز بن عبد السلام السلمي (٦٦٠ هـ)
المكتبة الحسينية المصرية، بجوار الأزهر، الطبعة الأولى، ١٣٥٣هـ - ١٩٣٤م.

٢٤١ - القول المبين في سيرة سيد المرسلين، د. مُحَمَّد الطيب النجار، دار اللواء، الرياض، ١٤٠١هـ- ١٩٨١م.

٢٤٢ - قيادة الرسول السياسية والعسكرية، أحمد راتب عرموش، دار النفائس، الطبعة الأولى ١٤١٩هـ- ١٩٨٩م.
٢٤٣ - القيادة العسكرية في عهد الرسول ﷺ، دار القلم، الطبعة الأولى، ١٤١٠هـ- ١٩٩٠م.

(ك)

٢٤٤ - الكامل في التاريخ، لابن الأثير، دار صادر، بيروت.

(ل)

٢٤٥ - لسان العرب، محمد بن مكرم بن منظور، دار صادر، بيروت.
٢٤٦ - لقاء المؤمنين، عدنان النحوي، مطابع الفرزدق التجارية، الرياض - السعودية، الطبعة الثالثة، ١٤٠٥هـ- ١٩٨٥م.

(م)

٢٤٧ - ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين، لأبي الحسن الندوي، دار المعارف الطبعة السابعة، ١٤٠٨هـ- ١٩٨٨م.
٢٤٨ - المال في القرآن الكريم، سليمان الحصين، دار المعراج الدولية، الطبعة الأولى، ١٤١٥هـ- ١٩٩٥م.
٢٤٩ - مباحث في إعجاز القرآن، مصطفى مسلم، دار المسلم، الرياض، الطبعة الثانية، ١٤١٦هـ- ١٩٩٦م.
٢٥٠ - مباحثات في التفسير الموضوعي، مصطفى مسلم، دار القلم، دمشق، سوريا.
٢٥١ - مباحث في علوم القرآن، مناع القطان، مكتبة المعارف، الرياض، الطبعة الثامنة، ١٤٠١هـ- ١٩٨١م.
٢٥٢ - مبادئ علم الإدارة، محمد نور الدين عبد الرزاق، مكتبة الخدمات الحديثة، جدة السعودية، الطبعة الأولى، بدون تاريخ.
٢٥٣ - مبادئ نظام الحكم في الإسلام، عبد الحميد متولي، دار المعارف, الطبعة الأولى.
٢٥٤ - المبسوط، شمس الدين السرخسي، مطبعة السعادة، مصر، الطبعة الأولى.
٢٥٥ - المجتمع المدني في عهد النبوة، د. أكرم العمري، الطبعة الأولى ١٤٠٤هـ- ١٩٨٤م.
٢٥٦ - مجلة المجتمع الكويتية، عدد رقم ٢٤٨، ١٧ صفر ١٣٩٩هـ.
٢٥٧ - مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، نور الدين علي بن أبي بكر الهيثمي، دار الكتاب العربي، بيروت الطبعة الثالثة، سنة ١٤٠٢هـ- ١٩٨٢م.
٢٥٨ - مجموع فتاوى شيخ الإسلام ابن تيمية، جمع عبد الرحمن بن محمد قاسم العاصمي النجدي، المكتب التعليمي السعودي بالمغرب.
٢٥٩ - مجموعة الوثائق السياسية، لمحمد حميد الله، دار النفائس، الطبعة الخامسة، ١٤٠٥هـ- ١٩٨٥م.
٢٦٠ - محاسن التأويل، محمد جمال الدين القاسمي، دار الفكر، بيروت.
٢٦١ - المحرر الوجيز في تفسير الكتاب العزيز لابن عطية، أبي محمد بن عبد الحق بن غالب الأندلسي، تحقيق المجلس العلمي بفاس، وزارة الأوقاف والشؤون الإسلامية بالمغرب طبعة ١٣٩٥هـ.
٢٦٢ - محمد رسول الله، محمد الصادق عرجون، دار القلم، الطبعة الثانية، ١٤١٥هـ- ١٩٩٥م.
٢٦٣ - محمد رسول الله، محمد رشيد رضا، دار الكتب العلمية، بيروت، ١٩٧٥م.

٢٦٤ – محنة المسلمين في العهد المكي، د. سليمان السويكت، مكتبة التوبة, الرياض، الطبعة الأولى، ١٤١٢هـ- ١٩٩٢م.

٢٦٥ – المختار من كنوز السنة، مُحَمَّد عبد الله دراز، دار الأنصار القاهرة، الطبعة الثانية ١٩٧٨م.

٢٦٦ – مختصر الصواعق المرسلة على الجهمية المعطلة، لابن قيم الجوزية، اختصره مُحَمَّد الموصلي، مكتبة الرياض الحديثة.

٢٦٧ – مختصر سيرة الرسول ﷺ، لمحمد بن عبد الوهاب، جامعة الإمام مُحَمَّد بن سعود.

٢٦٨ – مختصر صحيح مسلم للحافظ زكي المنذري، تحقيق مُحَمَّد ناصر الدين الألباني، المكتب الإسلامي، دمشق الطبعة الثالثة، سنة ١٣٩٧هـ- ١٩٧٧م.

٢٦٩ – المدخل إلى العقيدة والإستراتيجية العسكرية، مُحَمَّد جمال الدين علي محفوظ، مطابع الهيئة المصرية للكتاب بالقاهرة.

٢٧٠ – مدخل لفهم السيرة، د. يحي اليحي، أخذها المؤلف من صاحب الكتاب قبل أن يطبعها.

٢٧١ – المدرسة النبوية العسكرية لأبي فارس، دار الفرقان، عمان.

٢٧٢ – المدينة المنورة فجر الإسلام والعصر الراشدي، مُحَمَّد حسين شراب، دار القلم، دمشق، الطبعة الأولى ١٤١٥هـ- ١٩٩٤م.

٢٧٣ – المرأة في العهد النبوي، د. عصمة الدين كركر، دار الغرب الإسلامي، بيروت الطبعة الأولى ١٩٩٣م.

٢٧٤ – مرض النبي ﷺ ووفاته وأثره على الأمة, خالد أبو صالح، دار الوطن، الطبعة الأولى، ١٤١٤هـ.

٢٧٥ – مرويات غزوة أحد، حسين أحمد الباكري، رسالة ماجستير نوقشت في الجامعة الإسلامية، إشراف، د. أكرم العمري، عام ١٣٩٩هـ.

٢٧٦ – مرويات غزوة الحديبية، د. حافظ الحكمي، دار ابن القيم، الطبعة الأولى، ١٤١١هـ - ١٩٩١م.

٢٧٧ – مرويات غزوة بدر، أحمد باوزير، مكتبة طيبة، الطبعة الأولى ١٤٠٠هـ- ١٩٨٠م.

٢٧٨ – مرويات غزوة بني المصطلق، إبراهيم القريبي، طبع المجلس العلمي بالجامعة الإسلامية، المدينة المنورة، الطبعة الأولى، عام ١٤٠٢هـ.

٢٧٩ – مساجد القاهرة ومدارسها، أحمد فكري، طبعة الإسكندرية، ١٩٦١م.

٢٨٠ – المستدرك على الصحيحين، للإمام أبي عبد الله النيسابوري بذيله التلخيص للذهبي، دار النشر مكتب المطبوعات الإسلامية, طبعة سنة ١٣٩٠هـ - ١٩٧٠م.

٢٨١ – المستشفيات الإسلامية، د. عبد الله عبد الرزاق، مسعود العيد, دار الضياء للنشر والتوزيع، عمان، الأردن الطبعة الأولى، ١٤٠٨هـ- ١٩٨٧م.

٢٨٢ – المستطرف في كل فن مستطرف، شهاب الدين الأبشيهي، مكتبة الحياة، بيروت.

٢٨٣ – المستفاد من قصص القرآن للدعوة والدعاة، عبد الكريم زيدان، مؤسسة الرسالة، الطبعة الأولى، ١٤١٨هـ- ١٩٩٧م.

٢٨٤ – المسلمون والروم في عصر النبوة، عبد الرحمن أحمد سالم، دار الفكر العربي، طبعة ١٤١٨هـ- ١٩٩٧م.

٢٨٥ – مسند أبي يعلي الموصلي, الحافظ أحمد بن علي التميمي – دار المأمون للتراث- دمشق, بيروت, ط١.

٢٨٦ – المسند، أحمد بن حنبل، المكتب الإسلامي، بيروت.

٢٨٧ – المشروع الإسلامي لنهضة الأمة قراءة في فكر حسن البنا، لمجموعة من الباحثين لم تطبع حتى كتابة هذا البحث .

٢٨٨ – مشكاة المصابيح، الخطيب التبريزي المكتب الإسلامي، دمشق، الطبعة الأولى، ١٣٨١هـ– ١٩٦١م.

٢٨٩ – مصعب بن عمير، الداعية المجاهد، مُحَمَّد حسن بريغش، دار القلم، دمشق، الطبعة الرابعة،

(١) طبع فيما بعد بعنوان: حول أساسيات المشروع الإسلامي لنهضة الأمة –قراءة في فكر الإمام الشهيد حسن البنا– المركز الإسلامي للدراسات والبحوث – إعداد أ. د. عبد الحميد الغزالي. ١٤٠٧هـ– ١٩٨٧م.

٢٩٠ – مصنف عبد الرزاق، لأبي بكر عبد الرزاق بن همام الصنعاني، تحقيق: حبيب الرحمن الأعظمي، الطبعة الأولى.

٢٩١ – المطالب العالية بزوائد المسانيد الثمانية: أحمد حجر العسقلاني، تحقيق: حبيب الرحمن الأعظمي.

٢٩٢ – معارك خالد بن الوليد، د. ياسين سويد، المؤسسة العربية للدارسة والنشر الطبعة الرابعة، ١٩٨٩م.

٢٩٣ – معالم قرآنية في الصراع مع اليهود، د. مصطفى مسلم مُحَمَّد، دار المسلم، الرياض، الطبعة الأولى، ١٤١٥هـ– ١٩٩٤م.

٢٩٤ – المعاهدات في الشريعة الإسلامية والقانون الدولي، د. مُحَمَّد الديك،، دار الفرقان للنشر والتوزيع, الطبعة الثانية، ١٤١٨هـ– ١٩٩٧م.

٢٩٥ – معجم البلدان، الياقوت الحموي، دار صادر، ودار بيروت، ١٤٠٤هـ–١٩٨٤م.

٢٩٦ – معجم الطبراني، سليمان بن أحمد الطبراني، دار العربية، بغداد، ١٣٩٨هـ.

٢٩٧ – المعجم الكبير لأبي القاسم سليمان بن أحمد الطبراني, م:٢٦٠هـ– ت٣٦٠هـ، دار مكتبة العلوم والحكم، طبعة ٢، ١٤٠٦هـ– ١٩٨٥م.

٢٩٨ – معركة الوجود بين القرآن والتلمود، عبد الستار فتح الله سعيد، مكتبة المنار.

٢٩٩ – المعوقون للدعوة الإسلامية في عهد النبوة وموقف الإسلام منها، د. سميرة مُحَمَّد جمجوم، دار المجتمع جدة، الطبعة الأولى، ١٤٠٧هـ– ١٩٨٧م.

٣٠٠ – المغازي النبوية، تحقيق سهيل زكار، للزهري، دار الفكر، دمشق، ١٤٠١ – ١٩٨١م.

٣٠١ – مغازي رسول الله ﷺ، عروة بن الزبير، تحقيق: د. مُحَمَّد الأعظمي، نشر: مكتب التربية العربي لدول الخليج، الرياض، الطبعة الأولى، ١٤٠١هـ– ١٩٨١م.

٣٠٢ – المغازي للواقدي، مُحَمَّد عمر بن واقد المتوفي ٢٠٧هـ، تحقيق د. مارسدن جونس، عالم الكتب، بيروت، الطبعة الثالثة، ١٤٠٤هـ– ١٩٨٤م.

٣٠٣ – مفاهيم ينبغي أن تصحح، مُحَمَّد قطب، دار الشروق, القاهرة، الطبعة الثامنة، ١٤١٣هـ– ١٩٩٣م.

٣٠٤ – المفصل في أحكام النساء، عبد الكريم زيدان، مؤسسة الرسالة، الطبعة الأولى، ١٤١٣هـ – ١٩٩٣م.

٣٠٥ – مقاصد الشريعة الإسلامية، د. مُحَمَّد سعد اليوبي، دار الهجرة، الرياض، الطبعة الأولى، ١٤١٨هـ– ١٩٩٨م.

٣٠٦ – المقاصد العامة للشريعة الإسلامية، يوسف حامد العالم، الدار العلمية للكتاب الإسلامي، ط٢، سنة ١٤١٥هـ – ١٩٩٣م، الرياض.

٣٠٧ – مقدمة ابن الصلاح وشرحها، للحافظ العراقي، طبع دار الكتب العلمية بيروت، لبنان.

٣٠٨ – مقدمة ابن خلدون، للعلامة عبد الرحمن بن خلدون، ط، المكتبة التجارية الكبرى، القاهرة بدون تاريخ.

٣٠٩ – مقومات الداعية الناجح، د. علي بادحدح، دار الأندلس الخضراء، جدة، الطبعة الأولى، ١٤١٧هـ- ١٩٩٦م.

٣١٠ – مقومات السفراء في الإسلام، حسن فتح الباب، المجلس الأعلى للشئون الإسلامية، القاهرة ١٩٧٠م.

٣١١ – مقومات النصر، د. أحمد أبو الشباب, المكتبة العصرية، لبنان ١٤٢٠هـ- ١٩٩٩م.

٣١٢ – مكة والمدينة في الجاهلية وعصر الرسول للأستاذ أحمد الشريف.

٣١٣ – ملامح الشورى في الدعوة الإسلامية، عدنان النحوي، الطبعة الثانية.

٣١٤ – من معين السيرة، صالح أحمد الشامي، المكتب الإسلامي، الطبعة الثانية، ١٤١٣هـ- ١٩٩٢م.

٣١٥ – من هدي سورة الأنفال، مُحَمَّد أمين المصري، طبع مكتبة دار الأرقم، الكويت.

٣١٦ – المنافقون، مُحَمَّد جميل غازي، مكتبة المدني ومطبعتها، جدة، السعودية ١٩٧٢م.

٣١٧ – منامات الرسول ﷺ، عبد القادر الشيخ إبراهيم، دار القلم العربي، بحلب، الطبعة الأولى، ١٤١٩هـ- ١٩٩٩م.

٣١٨ – مناهج وآداب الصحابة في التعلم والتعليم، د. عبد الرحمن البر، دار اليقين المنصورة، الطبعة الأولى، ١٤٢٠هـ- ١٩٩٩م.

٣١٩ – المنتظم في تاريخ الملوك والأمم لأبي الفرج بن الجوزي، دراسة وتحقيق مُحَمَّد عبد القادر عطا، مصطفى عبد القادر عطا، دار الكتب العلمية بيروت، لبنان.

٣٢٠ – منهاج السنة النبوية، لابن تيمية مؤسسة قرطبة للطباعة والنشر والتوزيع، الطبعة الأولى، ١٤١٦هـ- ١٩٨٦م.

٣٢١ – المنهاج القرآني في التشريع، عبد الستار فتح الله سعيد، مطابع دار الطباعة الإسلامية، الطبعة الأولى، ١٤١٣هـ، ١٩٩٢م.

٣٢٢ – منهج الإعلام الإسلامي في صلح الحديبية، سليم حجازي، دار المنارة، الطبعة الأولى، ١٤٠٦هـ- ١٩٨٦م.

٣٢٣ – منهج الإسلام في تزكية النفس، د. أنس أحمد كرزون، دار نور المكتبات، دار ابن حزم، الطبعة الثانية، ١٤١٨هـ- ١٩٩٧م.

٣٢٤ – المنهج التربوي للسيرة النبوية- التربية الجهادية، منير الغضبان، مكتبة المنار، الطبعة الأولى، ١٤١١هـ- ١٩٩١م.

٣٢٥ – منهج التربية الإسلامية، مُحَمَّد قطب، دار الشروق، الطبعة الخامسة، ١٤٠٣هـ- ١٩٨٣م.

٣٢٦ – المنهج الحركي للسيرة النبوية، منير الغضبان، مكتبة المنار، الأردن الطبعة الثالثة ١٤١١هـ – ١٩٩٠م.

٣٢٧ – منهج الرسول في غرس الروح الجهادية في نفوس الصحابة، السيد مُحَمَّد نوح، نشرته جامعة الإمارات العربية المتحدة, الطبعة الأولى، ١٤١١هـ – ١٩٩٠م.

٣٢٨ – الموازنة بين ذوق السماع وذوق الصلاة والقرآن، للإمام ابن القيم الجوزية، تحقيق: مجدي فتحي السيد.

٣٢٩ – الموافقات في أصول الشريعة، لأبي إسحاق إبراهيم موسى اللخمي الشهير بالشاطبي، دار الفكر، ١٣٤١هـ.

٣٣٠ - الموسوعة في سماحة الإسلام، مُحَمَّد الصادق عرجون، الدار السعودية للنشر والتوزيع جدة ط الثانية ١٤٠٤هـ.- ١٩٨٤م

(ن)

٣٣١ - نشأة الدولة الإسلامية، د. عون الشريف قاسم، دار الكتب اللبناني، بيروت، ط٢، ١٤٠٠هـ - ١٩٨٠م.

٣٣٢ - نصب الراية في أحاديث الهداية، بحاشية بغية الألمعي في تخريج الزيلعي، عبد الله ابن يوسف بن مُحَمَّد الزيلعي, المكتب الإسلامي، دمشق، ١٣٩٣هـ.

٣٣٣ - نضرة النعيم في مكارم أخلاق الرسول الكريم، إعداد مجموعة من المختصين بإشراف صالح بن حميد، دار الوسيلة، الطبعة الأولى ١٤١٨هـ.

٣٣٤ - نظام الحكم، في الشريعة والتاريخ الإسلامي، ظافر القاسمي، دار النفائس، الطبعة السادسة، ١٤١١هـ- ١٩٩٠م.

٣٣٥ - نظام الحكومة النبوية المسمى التراتيب الإدارية، مُحَمَّد عبد الحي الكتاني، دار الأرقم، بيروت، لبنان، الطبعة الثانية.

٣٣٦ - النظام السياسي في الإسلام، مُحَمَّد عبد القادر أبو فارس، دار الفرقان، الطبعة الثانية ١٤٠٧هـ- ١٩٨٦م.

٣٣٧ - نظرات في رسالة التعاليم, مُحَمَّد عبد الله الخطيب, مُحَمَّد عبد الحليم حامد، دار التوزيع والنشر الإسلامية, مصر ١٩٩٥.

٣٣٨ - نظرات في السيرة للإمام حسن البنا، سجلها وأعدها للنشر أحمد عيسى عاشور، مكتبة الاعتصام، القاهرة، الطبعة الأولى، ١٣٩٩هـ- ١٩٧٩م.

٣٣٩ - نفوس ودروس في إطار التصوير القرآني، توفيق مُحَمَّد سبع، مجمع البحوث الإسلامية القاهرة، مصر الطبعة الأولى، بدون تاريخ.

٣٤٠ - النكت والعيون (تفسير الماوردي) ، لأبي الحسن علي بن حبيب الماوردي، تحقيق خضر مُحَمَّد خضر - نشر وزارة الأوقاف والشئون الإسلامية والتراث الإسلامي، بالكويت.

٣٤١ - النهاية في غريب الحديث، لابن الأثير, تحقيق طاهر أحمد الزاوي، ومحمود مُحَمَّد الطناحي ط/ المكتبة الإسلامية ١٣٨٥هـ.

٣٤٢ - نور اليقين، مُحَمَّد الخضري، دار القلم، دمشق، سوريا.

٣٤٣ - نيل الأوطار، شرح منتقى الأخبار من أحاديث سيد الأخيار، مُحَمَّد بن علي الشوكاني، دار الحديث، القاهرة.

(هـ)

٣٤٤ - الهجرة الأولى في الإسلام، د. سليمان العودة، دار طيبة للنشر، الرياض، الطبعة الأولى، ١٤١٩هـ.

٣٤٥ - هجرة الرسول وصحابته في القرآن والسنة، أحمد عبد الغني النجولي الجمل، دار الوفاء، الطبعة الأولى، ١٤٠٩هـ- ١٩٨٩م.

٣٤٦ - الهجرة النبوية المباركة، د. عبد الرحمن البر، دار الكلمة، المنصورة، مصر، الطبعة الأولى، ١٤١٨هـ - ١٩٩٧م.

٣٤٧ - الهجرة في القرآن الكريم، أحزمي سامعون جزولي، مكتبة الرشد الرياض، الطبعة الأولى، ١٤١٧هـ- ١٩٩٦م.

٣٤٨ - هذا الحبيب مُحَمَّد ﷺ يا محب، لأبي بكر الجزائري، مكتبة لينة.

٣٤٩ - هذا الدين، سيد قطب، دار الشروق، القاهرة، مصر، الطبعة الرابعة، ١٤١٢هـ-١٩٩٢م.

(و)

٣٥٠ - واقعنا المعاصر، لمحمد قطب، مؤسسة المدينة للصحافة والطباعة والنشر، جدة الطبعة الثانية، ١٤٠٨هـ- ١٩٨٧م.

٣٥١ - الوحي والرسالة، د. يحيى اليحيى، أخذت من المؤلف صورة قبل الطبع.
٣٥٢ - الوسطية في القرآن الكريم، علي مُحَمَّد الصلابي، دار النفائس، دار البيارق، الطبعة الأولى، ١٤١٩هـ- ١٩٩٩م.
٣٥٣ - وفاء الوفا بأخبار دار المصطفى، أبو الحسن بن عبد الله السمهوري، دار المصطفى، طبعة القاهرة، ١٣٢٦هـ.
٣٥٤ - الوفود في العهد المكي وأثره الإعلامي، لعلي رضوان أحمد الأسطل، دار المنار، الأردن عمان الطبعة الأولى ١٤٠٤هـ - ١٩٨٤م.
٣٥٥ - وقفات تربوية مع السيرة النبوية، أحمد فريد، دار طيبة، الرياض، الطبعة الثالثة، ١٤١٧هـ- ١٩٩٧م.
٣٥٦ - وقفات تربوية من السيرة النبوية، عبد الحميد البلالي، المنار، الكويت, الطبعة الثالثة، ١٤١١هـ - ١٩٩١م.
٣٥٧ - الولاء والبراء في الإسلام، مُحَمَّد سعيد القحطان، دار طيبة الرياض، الطبعة السادسة، ١٤١٣هـ.
٣٥٨ - ولاية الشرطة في الإسلام، نمر مُحَمَّد الحميداني، دار عالم الكتب، الطبعة الثانية، ١٤١٤هـ- ١٩٩٤م.

(ي)

٣٥٩ - يقظة أولي الاعتبار مما ورد في ذكر الجنة والنار، لصديق حسن.
٣٦٠ - اليهود في السنة المطهرة، د. عبد الله الشقاري، دار طيبة، الرياض، طبعة أولى، ١٤١٧هـ- ١٩٩٦م.
٣٦١ - اليوم الآخر في الجنة والنار، د. عمر الأشقر، مكتبة الفلاح، الكويت، الطبعة الثانية، ١٤٠٨هـ- ١٩٨٨م.

مؤلف کتاب

ڈاکٹر علی محمد صلابی، بنغازی، لیبیا سے تعلق رکھنے والے عالمِ اسلام کے ایک معروف محقق، عالم، داعی اور صاحبِ قلم مؤرخ ہیں، موصوف کو تفسیر، تاریخ اور فکرِ اسلامی میں تخصص حاصل ہے، موصوف اس وقت ''الاتحاد العالمی لعلماء المسلمین'' کے جنرل سیکریٹری کے فرائض انجام دے رہے ہیں، ڈاکٹر صلابی نے ابتدائی تعلیم بنغازی شہر میں حاصل کی، اس کے بعد بنغازی کی قار یونس یونیورسٹی میں انجینئرنگ میں داخلہ لیا، لیکن دعوتی و تحریکی سرگرمیوں کی وجہ سے انہیں 1981 میں گرفتار کیا گیا اور قید و بند کا یہ مرحلہ سات سال 1988 تک جاری رہا، رہائی کے بعد انہوں نے اپنے آپ کو دعوتی اور علمی کاموں کے لئے وقف کر دیا اور مدینہ یونیورسٹی سے 1993 میں بی، اے اور سوڈان کی ام درمان یونیورسٹی سے 1996 میں ایم، اے کیا اور وہیں سے 1999 میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، ڈاکٹر صلابی نے فکرِ اسلامی کے بڑے بڑے علماء سے بھی استفادہ کیا، ڈاکٹر صلابی اخوانی فکر سے متاثر ہوئے اور اسی فکر اور تحریک کو آگے بڑھانے کا کام کرتے رہے، لیبیا میں عرب بہاریہ کے دوران ڈاکٹر صلابی کا حکومت اور انقلاب پسندوں کے درمیان اور لیبیا کے سیاسی منظر نامہ میں اہم کردار رہا ہے۔

ڈاکٹر یوسف القرضاویؒ کے ذریعہ قائم کئے گئے علماء فورم ''الاتحاد العالمی لعلماء المسلمین'' میں ڈاکٹر صلابی ابتدا ہی سے شریک رہے، وہ اس وقت اتحاد کے جنرل سیکرٹری کے عہدے پر فائض ہیں، ڈاکٹر صلابی اسی (۸۰) سے زائد کتابیں تصنیف کر چکے ہیں جن میں بعض کئی کئی جلدوں پر مشتمل ہیں، سیرت و تاریخ کی ایک مکمل سیریز انہوں نے تیار کی ہے، ان کا اسلوبِ نگارش علمی اور تحقیقی اسلوب پر مشتمل ہے۔

زیرِ نظر کتاب سیرت رسول ﷺ کے موضوع پر انتہائی جامع اور مفصل کتاب ہے، اس کتاب میں مؤلف نے حیات رسولؐ کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے، واقعات کے ساتھ ساتھ ان سے حاصل ہونے والے دروس و اسباق اور فوائد و عبرتوں کو بھی بیان کیا ہے، اس کتاب میں قرآنی تناظر میں سیرت کو بیان کیا گیا ہے، یہ کتاب سینکڑوں مصادر و مراجع سے جمع کئے گئے علمی ورثے اور علمی افکار کا محاصل ہے۔

مترجم کتاب

ڈاکٹر عنایت اللہ وانی ندوی، جموں و کشمیر کے ضلع ڈوڈہ سے تعلق رکھنے والے ایک نوجوان عالم و داعی اور محقق و مترجم ہیں، ابتدائی تعلیم آبائی وطن میں ہی حاصل کی، اس کے بعد شرعی علوم کے حصول کے لئے دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کا رخ کیا، وہاں سے 2000 میں عالمیت اور 2002 میں فضیلت (تخصص فی التفسیر) کی سند حاصل کی، اس کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی سے 2005 میں ایم، اے (عربی) اور 2010 میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، کویت کے معہد کرسی النور سے 2007 میں " تأہیل القیادات الاجتماعیة " کا کورس کیا، کئی سال تک جامعہ سید احمد شہید، کٹولی، لکھنؤ اور مرکز المعارف جموں و کشمیر میں بحث و تحقیق اور تدریس کے کام میں مصروف رہے، 2010 تا 2013 دوحہ، قطر میں مترجم و باحث کی حیثیت سے کام کیا، مختلف ممالک میں مختلف کانفرنسوں اور سیمیناروں میں شرکت کی، 2016 سے تا حال ہائر ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ، جموں و کشمیر میں اسسٹنٹ پروفیسر (عربی) کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہے ہیں، موصوف کی 20 سے زائد ترجمہ شدہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں، متعدد موضوعات پر کئی کتابیں تالیف کی ہیں، اس کے علاوہ جموں یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے لیے نصاب کی دس سے زائد کتابیں ترتیب دی ہیں، موصوف کے مضامین مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں، زیرِ نظر کتاب بھی موصوف کا ایک علمی کام ہے جس کے لیے موصوف مبارکباد کے مستحق ہیں۔

Published by:
Mishkaat Publications House
Firdaus Nagar-B, Aligarh, U.P. (INDIA)
e-mail:sarahmanrafiq@gmail.com, Mob. 9897674550

₹ 900/-